

مظلوم اور شیرہ کی ہر گام و خیز و آستان  
آشتِ جنوں



اقبال کاظمی

شہری مہنگین کی مقبول ترین ہنگامہ بینر سرگزشت

1

## دشت جنوں

یہ کہانی مخصوص اقدار کے حامل جاگیردارانہ نظام کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ مصنف اقبال کاظمی نے اس پورے نظام کا بڑی گہرائی سے اور قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور یہ مشاہداتی تجزیہ آپ کو کہانی میں جگہ جگہ متحرک نظر آئے گا۔

مذکورہ کہانی ایک ٹکشن کہانی ہے جس کا حقیقت سے اور حقیقی کرداروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کہانی کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی فرد یا کسی واقع سے ان کی مماثلت محض اتفاق ہوگی اور اس کے لئے مصنف یا ادارہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ادارہ



# 1

## دشتِ حنول

### اقبال کاظمی

رحیم یار خان ریلوے اسٹیشن کے قریب شہر کے سب سے خوبصورت چوراہے کے ایک طرف واقع سلطان زید ہسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں بیڈ پر بے ہوش پڑی ہوئی مریضہ ڈاکٹروں کے توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بیڈ کے ساتھ اسٹینڈ پر خون کی بوتل لٹکی ہوئی تھی جس سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والا خون ٹیوب کے بلڈ جمیئر میں جمع ہو رہا تھا اور یہی خون مریضہ کے بازو کی ٹس میں پیوست سوئی کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر زندگی کا پیغام بن رہا تھا۔ مریضہ کے جسم پر گردن تک سفید رنگ کی چادر تھی۔ اس چادر کے نیچے اس کے پیٹ پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس کا کچھ حصہ خون کی سرخی لئے ہوئے تھا۔ پانک کے سرہانے کی طرف دیوار پر ایک گلاب بورڈ لٹکا ہوا تھا جس پر لگے ہوئے چارٹ میں مریضہ کی کیفیت درج تھی۔ چارٹ کے اوپر کا حصہ، جہاں عام طور پر کسی مریض کا 'مریضہ کا نام'، 'عمر'، 'جنس' اور 'ایڈریس' وغیرہ لکھا ہوتا ہے، خالی تھا۔

پانک پر پڑی ہوئی مریضہ کی عمر بائیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چہرے پر پیلاہٹ ہونے کے باوجود وہ بے حد حسین تھی۔ سفید چادر کے نیچے اس کے سینے کے مخروطی ابھار اس کے بھرپور جوان ہونے کی عکاسی کر رہے تھے۔ اسے رات نوبت کے لگ بھگ زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی جس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اسے دو گھنٹے تک آپریشن تھیٹر میں رکھا گیا تھا۔ پیٹ سے گولی نکالنے کے لئے دو ماہر ڈاکٹروں نے آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ آپریشن سے پہلے گولی لگنے سے اور آپریشن کے دوران بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ مگر یہ اس مریضہ کی خوش قسمتی تھی کہ فوری طور پر اس کے گردپ کے خون کا بندوبست ہو گیا تھا۔ اس کے جسم میں منتقل ہونے والے خون سے اس کی زندگی کو لاحق خطرہ ٹل گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر ابھی کچھ دیر پہلے ہی اسے چیک کر کے گیا تھا۔ اس نے کمرے میں موجود نرس کو مریضہ کے بارے میں کچھ ہدایات بھی دی تھیں۔

اس خوبصورت اور جوان لڑکی کے بارے میں پولیس کو اطلاع نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک سائیکل سوار نے دی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ آج شام اچانک ہی آسمان پر بادل چھائے تھے اور ہلکی سی بوند باندی ہوئی تھی جس سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور لوگ سردی سے بچنے کے لئے گھروں میں دبک گئے تھے۔

صادق نامی وہ سائیکل سوار تندرہ موڑ کی طرف سے آ رہا تھا۔ اس نے کریم کلر کی پرانی سی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے اندر فرنگی ہوئی تھی۔ سرد ہوا سے بچنے کے لئے اس نے جیکٹ کی زپ اوپر آخر تک کھینچ

B/23



رکھی تھی۔ یہ جیکٹ اس نے دو روز پہلے ایک نمیلے سے پندرہ روپے میں خریدی تھی اور آج شدت کی سردی سے بچنے کے لئے یہی جیکٹ اس کے لئے نعت بن گئی تھی۔ جیکٹ کا کارڈن تک اٹھا ہوا تھا اور سر پر مقرر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ کان بھی چھپ گئے تھے۔

سڑک کے دونوں طرف ٹنگ ٹنگ سی گلیاں تھیں۔ بیشتر گلیاں تاریک تھیں۔ غالباً بجلی کا ایک فیئر نہیں تھا جس سے بہت سی گلیاں اور گھر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

سائیکل پر سوار ادھیڑ عمر صادق اپنی دھن میں بڑے آرام سے پیڈل چلا رہا تھا۔ کہ گولی چلنے کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور بدستور پیڈل چلاتے ہوئے گولی کی آواز کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بائیں طرف کی تاریک گلی سے ایک سایہ دوڑتا ہوا آیا اور اس کی سائیکل سے ٹکرا گیا۔ سائیکل سوار صادق بدحواس ہو کر گر پڑا۔ اس کے منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی تھی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس سے ٹکرانے والا سایہ دوڑتا ہوا سڑک عبور کر کے دوسری طرف ایک اور تاریک گلی میں داخل ہو کر ٹگا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن یہ انکشاف ادھیڑ عمر صادق کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں تھا کہ اس سے ٹکرانے والا سایہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ جس جگہ ان دونوں میں ٹکرا ہوئی تھی اس سے چند فاصلے پر الیکٹرک پول پر مرل سی زرد روشنی والا بلب بھی جل رہا تھا۔

سائیکل سنبھالتے ہوئے صادق کی نظر اپنی جیکٹ کے بائیں آستین پر پڑ گئی۔ آستین پر خون کا لکھا سا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے آستین کو چھو کر دیکھا دھبہ تازہ بھی تھا جس سے صادق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس سے ٹکرانے والی عورت زخمی تھی۔ اور جس گولی کی آواز اس نے سنی تھی وہ غالباً اس عورت پر ہی چلائی گئی تھی۔ لیکن وہ عورت کون تھی اور اس پر گولی کس نے اور کیوں چلائی تھی؟ صادق یہی سوچتے ہوئے سائیکل کا پیڈل سیدھا کرنے لگا کیونکہ کرنے سے اس پرانی سی سائیکل کا پیڈل ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے اگلے پہیے کو دونوں ٹانگوں میں ٹکے کی طرح کس لیا اور پیڈل کو سیدھا کرنے لگا۔ پہلے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ دوسری گلی میں جا کر اس زخمی عورت کو تلاش کرنا چاہئے ہو سکتا ہے اسے اس کی مدد کی ضرورت ہو۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے سر جھٹک دیا کہ اسے اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہئے۔

ٹھیک اسی لمحہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ صادق نے چونک کر دیکھا۔ دو آدمی دوڑتے ہوئے اسی تاریک گلی سے نکلے تھے جہاں سے پہلے وہ عورت دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ سڑک پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ ان دونوں نے پتلون اور چڑے کی جیکسنس پہن رکھی تھی۔ اور ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ پستول دیکھ کر صادق کانپ کر رہ گیا۔ وہ دونوں سڑک پر رک کر سڑک پر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا صادق کے قریب پہنچ گیا۔

”کون ہو تم اور یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟“ اس شخص نے فراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر شیطانیت تھی۔ لگتا تھا انسانیت اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ لہجے میں بھی شرافت اور انسانیت کا عنصر مفقود تھا۔

”سائیکل کا چین اتر گیا تھا۔ اسے ٹھیک کرنے کے لئے رکا تھا۔“ صادق نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ”مم... مگر... میں مزدور آدمی ہوں۔ میری جیب میں دس بارہ روپوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

”ہمیں تمہارے مزدور یا ر نہیں ہونے سے کوئی سروکار نہیں۔“ اس شخص کے حلق سے ایک بار پھر

غراہٹ سی نکلی۔ ”تم نے کسی کو اس گلی سے نکلتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟“

”دو۔ دیکھا تھا۔“ صادق ہٹکایا۔ پستول کا رخ اپنی طرف دیکھ کر اس کا دل کانپنے لگا تھا۔ ”ایک عورت دوڑتی ہوئی اس گلی سے آئی تھی۔ اسی وقت ایک موٹر بھی سڑک پر آ رہی تھی۔ اس عورت نے ہاتھ کے اشارے سے اس موٹر کو روکا اور اس میں سوار ہو گئی۔ موٹر اس طرف گئی تھی۔“ اس نے ترنڈہ کی طرف جانے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ اسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا۔

”وہ موٹر کیسی تھی۔ اس میں کون لوگ تھے؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”سفید رنگ کی لمبی سی موٹر تھی جی۔ اس میں ایک آدمی کے علاوہ دو عورتیں اور ایک بچہ بھی تھا۔ موٹر ترنڈہ روڈ کی طرف گئی ہے۔ وہ عورت کون تھی جناب... کیا گھر سے بھاگی ہے؟“ آخری الفاظ صادق نے ڈرتے ڈرتے کہے تھے۔

”بکو مت... بھاگ جاؤ یہاں سے... اور ہاں... کیا تم نے اس موٹر کا نمبر دیکھا تھا؟“ اس شخص نے صادق کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

صادق اس کی ڈانٹ سے بدحواس سا ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے مقدر کو کوس رہا تھا کہ اس طرف سے آیا ہی کیوں تھا۔ حالانکہ اس کے گھر کی طرف جانے کا ایک دوسرا راستہ بھی تھا۔ اس شخص نے بھاگ جانے کو کہا تو اس کی جان میں جان آئی۔

”نہیں جی۔“ اندھیرے میں موٹر کا نمبر نظر نہیں آیا تھا۔ اور پھر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کو اس کے نمبر کی ضرورت پڑے گی۔“

صادق نے اس شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے سائیکل کے پیڈل پر پیر رکھا اور تب پتہ چلا کہ چین واقعی اتر گئی تھی۔ اس نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا اور بیٹھ کر چین درست کرنے لگا۔ ان دونوں آدمیوں نے سرگوشیوں میں آپس میں کوئی مشورہ کیا اور دوڑتے ہوئے اسی تاریک گلی میں غائب ہو گئے جہاں سے آئے تھے۔ کچھ دیر تک ان دونوں کے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی پھر وہ بھی معدوم ہو گئی۔

صادق نے چین درست کیا اور سائیکل پر سوار ہونا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور خیال اس کے دماغ میں گھس آیا۔ یہ دونوں بد معاش کون تھے اور وہ عورت کون تھی جو ان کے ہاتھوں زخمی ہو کر بھاگی تھی۔ یہ لوگ شاید اسے قتل کرنا چاہتے تھے اور اسے گولی لگی تھی۔ ہو سکتا ہے اس زخمی عورت کو کسی مدد کی ضرورت ہو؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ روزانہ اسی راستے سے گزرا کرتا تھا۔ اور یہ جگہ اب اس نے پہچان لی تھی۔ اسے یاد آگیا کہ وہ عورت جس گلی میں گھسی تھی وہ آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ ممکن ہے وہ اسی گلی میں کہیں چھپی بیٹھی ہو۔

صادق نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک اب بھی سنان تھی۔ اسے حیرت تھی کہ فائر اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر کوئی بھی شخص گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس شہر پر کیا موقوف پورے ملک میں لاقانونیت بڑھ گئی تھی۔ چوریاں، ڈکیتیاں، قتل اور اغواء جیسی سنگین وارداتیں روز کا معمول بن چکی تھیں۔ اور کوئی بھی شریف آدمی کسی ایسے موقع پر اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسی لئے فائر کی آواز سن کر کسی گھر کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔

صادق سائیکل لے کر سامنے والی گلی میں گھس گیا۔ گلی تاریک تھی۔ شام کی بارش کی وجہ سے کچھ سنا

ہو گیا تھا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کردی اور کچھ سے بچنے کی کوشش کرتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ تاریکی میں اس کی نظریں سرچ لائٹس کی طرح ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ تقریباً پچاس قدم آگے جا کر گلی بائیں طرف مڑ گئی۔ اس طرف دو تین مکان تھے اور اس سے آگے ایک اونچی دیوار کی وجہ سے گلی بند ہو گئی تھی۔ اس دیوار کے دوسری طرف ایک گندہ نالا تھا۔ اور یہ اونچی دیوار اس گندے نالے ہی کی وجہ سے بنائی گئی تھی۔

وہ لڑکی دیوار کے ساتھ کچھ میں پڑی تھی۔ صادق نے جیکٹ کی جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی۔ تیلی کی زرد کپکپاتی ہوئی روشنی میں اس لڑکی کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی اور پیٹ پر سے اس کی قمیض خون سے تر ہو رہی تھی۔ تیلی بجھ گئی۔ صادق نے دوسری تیلی جلائی۔ لڑکی جوان اور بہت حسین تھی۔ صادق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہولے سے جھنجھوڑا۔ مگر لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔

صادق بدحواس سا ہو گیا۔ عجائے کیوں اسے اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ سڑک پر اس سے ٹکرانے کے بعد جس رفتار سے دوڑی تھی اس کے پیش نظر صادق بھی سمجھا تھا کہ وہ معمولی زخمی ہوگی۔ مگر یہاں تو صورت حال بالکل مختلف تھی۔ لڑکی کے پیٹ میں غالباً گولی لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ تاخیر کی صورت میں خون زیادہ بہہ جانے سے وہ ختم بھی ہو سکتی تھی۔

مگر صادق اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دائیں طرف والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ تیسری مرتبہ دستک دینے پر اندر سے قدموں کی آواز سنائی دی پھر کنڈا ہٹایا گیا اور دروازہ چند انچ کے قریب کھل گیا۔ وہ کوئی بوڑھا آدمی تھا۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا جس کا اندازہ صادق نے دے دے قدموں کی آواز سے لگایا تھا۔

”کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟“ بوڑھے نے پوچھا۔ اس کے لمبے میں ناگواری تھی۔  
 ”ایک جوان لڑکی زخمی حالت میں یہاں پڑی ہے۔ اس کے پیٹ میں شاید گولی لگی ہے۔ اسے فوری طور پر ہسپتال پہنچانا ہے۔ آپ لوگ میری کچھ مدد کیجئے۔“ صادق نے کہا۔  
 ”تم کون ہو؟“ بوڑھے نے پھر پوچھا۔

”میں ایک راہگیر ہوں۔ میں نے دو بد معاشوں کو سڑک تک اس کے پیچھے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہی میں سے کسی نے اسے گولی ماری تھی۔ لڑکی اس گلی میں گھس گئی تھی اور وہ بد معاش اسے تلاش کرتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ میں یہ سوچ کر اس طرف آ گیا کہ شاید اس لڑکی کو میری مدد کی ضرورت ہو۔ وہ بہت زیادہ زخمی ہے اور بے ہوش ہے۔ اسے فوری طور پر ہسپتال پہنچانا ضروری ہے۔ اسے ہسپتال پہنچانے میں میری مدد کیجئے۔“ صادق نے کہا۔

”تم بہت بے وقوف ہو۔“ بوڑھے نے اسے گھورا۔ اس نے دروازے سے باہر جھانک کر لڑکی کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ ”یہ پولیس کیس ہے۔ اور تم جانتے ہو جو اس زخمی لڑکی کو ہسپتال لے جائے گا پولیس اسی کو حوالات میں بند کر دے گی۔ اور اگر لڑکی مر گئی اور اصل مجرم کا سراغ نہ ملا تو پولیس اسی ہمدرد کے گلے میں پھانسی کا پھندہ فٹ کرنے کی کوشش کرے گی جو اس لڑکی کو لے کر ہسپتال جائے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ اس انسانی ہمدردی کو بھول جاؤ اور اپنی کھال بچانے کی کوشش کرو۔“

”لیکن یہ ایک انسان کی زندگی کا سوال ہے۔“  
 ”تو پھر تم لے جاؤ اسے ہسپتال۔ ہم نے تو کچھ نہیں دیکھا، نہ ہی کچھ سنا ہے۔“ بوڑھے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور دروازہ دھڑسے بند کر لیا۔

ٹھیک اسی وقت بڑی آہستگی سے سامنے والے مکان کا دروازہ بند ہونے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سامنے والے مکان کے دروازے میں بھی کوئی کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اور بوڑھے کے دروازہ بند کرتے ہی اس نے بھی اپنا دروازہ بند کر لیا تھا۔  
 صادق کے منہ سے بے اختیار گرا سانس نکل گیا۔ کیا لوگوں کا خون اس قدر سفید ہو چکا ہے کہ وہ سسکتی اور دم توڑتی ہوئی ایک زندگی کو بچانے کے لئے اس کی مدد کرنے کو تیار نہیں۔ انہیں خوف ہے کہ پولیس الٹا انہی کو نہ دھر لے۔

صادق منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید خدا سے انسانوں کی بے رحمی اور سنگدلی کا شکوہ کر رہا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے پانی کی دو بوندیں اس کے چہرے پر پڑیں۔ صادق چونک گیا۔ آسمان پر بادل گہرے تھے اور بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ یہ ہلکی بوند باندی تیز بارش میں بھی بدل سکتی تھی۔ اس نے ایک نظر زخمی اور بے ہوش لڑکی کی طرف دیکھا اور مڑ کر تیز قدم اٹھاتا ہوا لگی سے باہر آگیا۔ ایک دو مرتبہ نیچڑ میں اس کا پیر پھسلا تھا اور وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ اس نے دیوار سے لگی لکڑی سنبھالی اور سڑک پر آتے ہی سائیکل پر سوار ہو کر تیزی سے پڈل چلائے لگا۔

ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ سڑک بھیجی ہوئی تھی۔ صادق ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ سگریٹ نوشی کا عادی تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہی اس کا سانس پھولنے لگا۔ اسے دل ہی دل میں یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ اس نے بہت عرصہ بعد اس قدر تیز رفتاری سے سائیکل چلائی تھی۔

سائیکل چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ہسپتال دور تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہسپتال والے اس زخمی لڑکی کو لانے کے لئے ایمبولینس اس کے ساتھ نہ بھیجیں۔ پولیس اسٹیشن قریب تھا۔ اس نے سائیکل کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ جہاں پہنچے میں اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے پولیس اسٹیشن کے گیٹ پر تعینات مسلح کانسٹیبل کو اپنی رام کہانی سنانے میں کامیاب ہو سکا۔

”ایس ایچ او تو کسی کیس کی تفتیش پر گیا ہوا ہے۔ اندر محرر کے پاس چلے جاؤ۔ وہ بائیں طرف والے کمرے میں بیٹھا ہے۔ سائیکل ادھر درخت کے نیچے کھڑی کر دو۔“ کانسٹیبل نے عمارت کے کپڑوں میں ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔

صادق گیٹ میں داخل ہو گیا۔ سائیکل درخت کے نیچے کھڑی کر دی اور تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ اس وقت تک وہ اپنی کیفیت پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔

برآمدے میں داخل ہوتے ہی اسے ایک آدمی کے پیچھے کی آوازیں سنائی دیں۔ صادق دروازے میں داخل ہو گیا۔ سامنے راہداری تھی جو چند قدم آگے جا کر دائیں بائیں تقسیم ہو گئی تھی۔ بائیں طرف کی راہداری میں دو آدمی مرغا بنے ہوئے تھے اور سادہ لباس میں ایک پولیس والا ہاتھ میں پکڑے ہوئے چڑے کے بیٹ سے ان میں سے ایک کی پٹائی کر رہا تھا۔ انہیں شاید کسی الزام میں پکڑ کر لایا گیا تھا اور اس طرح جہر قہوں کر لایا جا رہا تھا۔

دائیں طرف کی راہداری میں مڑتے ہی محرر کا کمرہ تھا۔ اور اسی راہداری کے آخر میں ایس ایچ او کا دفتر تھا۔ صادق جھجکتا ہوا محرر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں دو میزیں تھیں اور پانچ پولیس والے بیٹھے چائے پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ شخص وقت گزارنے کے لئے یہاں آئے ہوں۔

”کیا بات ہے اوئے؟ اس طرح منہ اٹھائے اندر کیوں چلے آئے ہو؟“ محرر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ایک اطلاع دینے آیا ہوں سرکار۔“ صادق نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اس کی سانس اچانک ہی بے قابو ہو گئی تھی اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اور اس لمحہ وہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ اس نے یہاں آکر واقعی کوئی غلطی تو نہیں کی تھی۔

”کیا اطلاع ہے۔ تمہاری بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے کیا؟“ محرر نے اسے گھورا۔

”نہیں سرکار، وہ تو بہت نیک عورت ہے۔ پچیس سال ہو گئے ہمارے بیاہ کو۔ وہ تو مجھے جھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ صادق نے سادگی سے جواب دیا۔

”تو پھر... کوئی قتل ہو گیا ہے کیا؟“ محرر کے لبے میں مزید ناگواری آگئی۔

”نہیں سرکار، ابھی تو وہ زندہ ہے۔ اگر اسے جلدی ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو وہ ضرور مر جائے گی۔“ صادق نے کہا۔

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ اس مرتبہ محرر کسی قدر چونکا تھا۔

”ایک جوان لڑکی ہے سرکار۔ کسی نے اسے گولی مار دی ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہے کچھ نہیں۔“ صادق نے جواب دیا۔

”تفصیل سے بتاؤ۔ کیا قصہ ہے۔ کون ہے وہ... اسے گولی کس نے ماری ہے اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟“ محرر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دو سرے پولیس والے بھی اب دلچسپ لگا ہوں سے صادق کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”میں ترمذہ موڑ پر پھلوں کی ریڑی لگاتا ہوں۔ آج سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے میں نے ریڑی جلدی بند کر دی۔ سائیکل پر سوار گھر آ رہا تھا کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک لڑکی کسی تاریک گلی سے نکلی اور میری سائیکل سے ٹکرائی ہوئی دو سری گلی میں غائب ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو آدمی بھی پستولیں لئے سڑک پر آ گئے۔ اور مجھ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھنے لگے۔“ صادق ایک لمحہ کو خاموش ہوا۔ اور پھر اس زخمی لڑکی تک پہنچنے کی پوری تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ کسی بڑے گھمڑی لڑکی معلوم ہوتی ہے سرکار، لباس بہت قیمتی ہے اور وہ سونے کی چوڑیاں بھی پہنے ہوئے ہے۔“

”تم نے اندھیرے میں یہ سب کچھ کیسے دیکھ لیا؟“ محرر نے اسے گھورا۔

”میں نے ماچس کی تیلی جلا کر اسے دیکھا تھا۔ اس علاقے کی آدمی جی تو گئی ہوئی ہے۔“ صادق نے سادگی سے جواب دیا۔ ”وہ بہت زخمی ہے۔ اسے ہسپتال پہنچا دیں سرکار۔“

”تم باہر آمدے میں بیٹھ جاؤ۔ ایس ایچ او صاحب کسی کیس کی تفتیش پر مگے ہوئے ہیں۔ وہ آئیں گے تو کوئی فیصلہ کریں گے۔“ محرر نے کہا۔

”وہ مر جائے گی سرکار۔ بہت خون بہہ رہا تھا اس کے پیٹ سے... بارش بھی شروع ہو رہی ہے۔ وہ تو“

مر جائے گی۔ اس کی مدد کریں سرکار۔“ صادق جھکھکیا ہوا سر پر چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔  
 ”اس وقت تھانے میں کوئی موبائل بھی موجود نہیں ہے۔ جب تک کوئی موبائل نہ آجائے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”ہسپتال والوں کو ٹیلی فون کر دیں سرکار۔“ صادق بولا۔ وہ دل ہی دل میں چیخ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک انسان کی زندگی اور موت کا سوال تھا اور محرم ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ محرم کچھ سوچ کر بولا۔ ”یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا ہے۔ ٹھیک ٹھیک لوکیشن بتاؤ۔ میں ایمبولینس کو فون کر دیتا ہوں جو وہاں پہنچ جائے گی اور تم دو آدمیوں کو اپنے ساتھ رکشے پر لے جاؤ۔“  
 ”آپ بہت ہمدرد اور نیک دل ہیں سرکار۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔“ صادق اسے دل کھول کر دعائیں دینے لگا۔ وہ اس حقیقت کی ترہ تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ محرم کسی انسانی ہمدردی کی بناء پر یا اپنی فرض شناسی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ جان کر دو آدمی اس کے ساتھ بھیجے پر تیار ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے تھا اور وہ قیمتی زیور پہنے ہوئے تھی۔

محرم نے ہسپتال کے ایمر جنسی شے کو فون کر کے جائے وقوعہ کا پتہ بتاتے ہوئے ایمبولینس کو وہاں بھیجنے کو کہہ دیا اور کمرے میں بیٹھے ہوئے دو کانشیلوں کو ہدایت دینے لگا۔  
 صادق ان دونوں کانشیلوں کے ساتھ تھانے سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی انہیں خالی ٹانگہ مل گیا اور وہ تانگے پر بیٹھ کر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایمبولینس ان کے دس منٹ بعد جائے وقوعہ پر پہنچی تھی۔ تانگے کا کرایہ صادق ہی کو اپنی جیب سے دینا پڑا تھا۔ آسمان سے برسنے والی بوندیں اب کچھ تیز ہو گئی تھیں اور اس علاقے کی بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

وہ ٹارچوں کی مدد سے کچھ دے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے گلی کے اختتام پر پہنچ گئے جہاں وہ زخمی لڑکی ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ بارش کی وجہ سے وہ تر ہو چکی تھی اور اس کے جسم سے بننے والا خون آس پاس کے کچھ کو سرخ کر رہا تھا۔

ایمبولینس کا عملہ لڑکی کو اٹھا کر گلی سے باہر لے آیا اور اسے بڑی احتیاط سے ایمبولینس میں ڈال دیا۔ صادق نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ آس پاس کے گھروں کے لوگ اس دوران کھڑکیوں اور دروازے کی درازوں سے جھانکتے رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا تھا۔

صادق اور دونوں پولیس والے بھی ایمبولینس میں بیٹھ گئے تھے اور ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی تیز رفتاری سے سلطان زید ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

لڑکی کو اسٹریچر پر ڈال کر فوراً ہی آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ ایمر جنسی میں ڈاکٹر کو صادق نے بتا دیا تھا کہ لڑکی کو گولی ماری گئی تھی۔ لڑکی کو تو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا اور صادق میڈیکولیکل والوں کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اس سے لڑکی کے بارے میں پوچھتے رہے۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ صادق پریشان ہو رہا تھا۔ وہ عام طور پر رات دس بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ آج شدید سردی کی وجہ سے اس نے اپنی پھلوں کی ریڑی جلدی بند کر دی تھی لیکن اب گیارہ بج چکے تھے۔

پھر میڈیکولیکل آفیسر سے اطلاع ملی کہ آپریشن کے ذریعے لڑکی کے پیٹ سے گولی نکالی جا چکی ہے۔ یہ سن کر وہ انتہائی مسرت کے زیر اثر بے ہوش ہے۔ اس کا بیان ہوش میں آنے کے بعد ہی لیا جائے گا۔



ایک پولیس کانسٹیبل ہسپتال ہی میں رہ گیا تھا اور دو سراسدق کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر پولیس اسٹیشن آگیا۔ اس مرتبہ بھی تانگے کا کرایہ صادق ہی کو دینا پڑا تھا۔ لیکن صادق بہت خوش تھا۔ اس کے چند روپے تو خرچ ہو گئے تھے لیکن ایک انسان کی زندگی بچ گئی تھی۔ اسے گھر پہنچنے میں بھی دیر ہو گئی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ جب وہ یہ واقعہ بتائے گا تو اس کی بیوی کی ناراضگی بھی ختم ہو جائے گی بلکہ اس نیکی پر وہ بھی خوش ہوگی۔

تھانے کے گیٹ میں داخل ہو کر وہ درخت کے نیچے کھڑی اپنی سائیکل کی طرف بڑھا لیکن اس کے ساتھ آنے والے کانسٹیبل نے اسے ٹوک دیا۔

”پہلے محرر صاحب کو بتادو۔“ پھر جانے کے بارے میں سوچنا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ صادق کہتے ہوئے کانسٹیبل کے ساتھ محرر والے کمرے میں آگیا۔ اس وقت تک دو پولیس والے اور بھی وہاں آچکے تھے۔

”اس لڑکی کو ہسپتال پہنچا دیا ہے سرکار۔“ اس نے محرر کو بتایا۔ ”آپریشن کر کے اس کے پیٹ سے گولی نکال دی گئی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اب میں جاؤں سرکار۔“ صادق بولا۔

”جب تک لڑکی ہوش میں آکر بیان نہیں دیتی تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔“ محرر نے کہا۔

”مم... مگر سرکار... میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“ صادق بولا۔

”کیا یہ ممکن نہیں کہ اس لڑکی کو گولی تم نے ہی ماری ہو اور اپنے آپ کو بے گناہی کا تاثر دینے کے لئے تھانے چلے آئے ہو۔“ محرر نے اسے گھورا۔

”مم... میں اسے گولی کیوں مارنے لگا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں سرکار۔ میں نے تو انسانی ہمدردی کی بناء پر تھانے آکر اس لڑکی کے بارے میں اطلاع دی تھی۔“ صادق کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

”تو اب ہمدردی کی سزا بھی بھگتو۔“ محرر بولا۔ ”فضل کریم! اسے باہر راہداری میں لے جا کر بٹھا دو۔ اور خیال رکھنا کہیں چپکے سے نکل نہ جائے۔“

”چل اوئے۔“ فضل کریم نامی کانسٹیبل نے اسے گردن سے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا محرر کے کمرے سے باہر لے گیا۔

صادق چیختا چلا تا رہا۔ مگر وہ پولیس والے تھے۔ ان پر اس کی چیخوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ایک کانسٹیبل نے چیختے اور شور مچانے کے جرم میں اس کے دو چار ہاتھ جڑ دیئے تھے۔

صادق دیوار سے ٹیک لگائے راہداری کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس زخمی لڑکی سے ہمدردی اسے واقعی بہت مہنگی پڑی تھی۔ جن لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال پہنچانے کے سلسلے میں اس کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ صادق کے خیال میں انہوں نے ٹھیک ہی تو کیا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہی کانپ رہا تھا کہ اگر لڑکی مر گئی اور اصل قاتل کا سراغ نہ لگ سکا تو پولیس والے اسی کے گٹھے میں پھانسی کا پھندہ فٹ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور اس طرح گزرنے والے ہر لمحہ کے ساتھ صادق کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ بار بار یہی دعا مانگ رہا تھا کہ ہسپتال میں پڑی ہوئی وہ لڑکی ہوش میں آجائے اور یہ بیان دیدے کہ گولی اسے صادق نے نہیں ماری تو وہ اس عذاب سے نجات پاسکتا تھا۔

ادھر سلطان زید ہسپتال کا منظر کچھ دلچسپ صورت حال اختیار کر گیا تھا۔ اس لڑکی کو آپریشن کے بعد جب وہ ہیل اسٹریچر پر آپریشن تھیمڑے سر جیکل وارڈ میں لے جایا گیا تو پتہ چلا کہ اس وارڈ میں کوئی بھی بیڈ خالی نہیں ہے جہاں اس لڑکی کو ڈالا جاسکے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال اس مریضہ کو ایمرجنسی روم کے بیڈ پر لٹا دیا جائے بعد میں کوئی دیگر بندوبست کر لیا جائے گا۔ ایمرجنسی روم میں دو بیڈ تھے۔ اس لئے اس مریضہ کو وہاں رکھے جانے سے کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بیڈ کے سامنے اسکرین کھڑی کر دی گئی تھی۔

رات کے بارہ بجے تھے۔ ہسپتال کی عمارت پر سکوت سا طاری تھا۔ لیکن دفعتاً ”کچھ آوازوں نے یہ سکوت توڑ دیا۔ کچھ لوگ چھ سات سال کی عمر کے ایک بچے کو لے کر آئے تھے جسے کالرا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ کچی بستی کے رہنے والے تھے۔ بچے کی طبیعت شام ہی سے خراب تھی۔ اسے کبھی تے ہونے لگتی اور کبھی دست آنے لگتے۔ ماں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اسے کچی بستی کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ یہ کوئی باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ مڈل پاس ایک ایسا شخص تھا جو زندگی میں نجانے کیا کیا کرتا رہا تھا۔ آخر میں ایک ڈاکٹر کے پاس کمپاؤنڈری سیکھنے لگا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس دو ڈھائی سال کام کیا تھا اور اپنے آپ کو بھی ایک ماہر ڈاکٹر سمجھنے لگا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی نوکری چھوڑ دی اور کچی بستی میں اپنا کلینک کھول لیا۔

یہ اس ملک کی بد قسمتی رہی ہے کہ قومی تشخص کو ہمیشہ پس پشت ڈالا گیا۔ ایثار اور خدمت کے جذبے کو کبھی سرا بھارنے ہی نہیں دیا گیا۔ ہر شخص دولت کی ہوس میں مبتلا رہا ہے۔ وہ دولت کے حصول کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں تو دولت کے نشان نمایاں ہوتے چلے گئے مگر گاؤں دیہاتوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ گاؤں دیہاتوں کے باشندوں کو ہمیشہ اناج کے حصول کا ایک ڈربہ سمجھا گیا۔ یہ کبھی نہیں سوچا گیا کہ یہ بھی انسان ہیں۔ انہیں بھی زندگی کی سہولتوں کی ضرورت ہے۔ انہیں پینے کے لئے صاف پانی چاہئے۔ بیمار ہوں تو انہیں بھی ڈاکٹروں کی اور دوا داروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح دیہی علاقوں میں رہنے والوں کو طبی سہولتوں سے بھی محروم رکھا گیا۔ اگر کسی گاؤں میں کوئی ڈپنری وغیرہ بنائی بھی گئی تو یہ علاج گاہ کسی ڈاکٹر کے وجود سے محروم رہی۔ کوئی ڈاکٹر شہر کی ریگینیاں اور رونقیں چھوڑ کر کسی دیہات میں جانے کو تیار نہیں ہوتا۔ شہر میں تو وہ روزانہ ہزاروں روپے کمایا کرتا ہے۔ جبکہ وہ جانتا ہے کہ کسی دیہات میں اسے غریب کسانوں کی دعاؤں کے سوا کچھ نہیں ملے گا اور دولت کے سامنے دعا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

سند یافتہ اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی اس روش نے بلکہ ہوس زر نے گاؤں دیہات اور بڑے بڑے شہروں کی کچی بستیوں کو عطاویوں اور کمپاؤنڈر نما ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا تھا۔

کچی بستی کے اس نیم حکیم کے علاج سے بچے کی حالت مزید بگڑ گئی اور آدھی رات کے لگ بھگ ماں باپ نے جب محسوس کیا کہ بچہ ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے تو وہ اسے اٹھا کر ہسپتال لے آئے تھے۔ بچے کو ہسپتال لانے والوں میں تین مرد اور پانچ عورتیں تھیں، بچے کی ماں اور دوسری عورتوں نے دھاڑیں مار مار کر پورے ہسپتال کو جگا دیا تھا۔

جب بچے کو ایمرجنسی روم میں لے جایا گیا تو تین عورتیں بھی اندر کھس گئیں تھیں۔ ان میں سے ایک نامی عورت نے دونوں بیڈوں کے درمیان ابستادہ لکڑی کی فولڈنگ اسکرین کے پیچھے جھانک کر دیکھا۔ بید پر اس نوجوان اور خوبصورت بے ہوش مریضہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ بیڈ

کے ساتھ ہی اسٹینڈ پر خون کی وہ بوتل بھی ٹنگی ہوئی تھی جس سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والا خون مریضہ کو زندگی کے قریب تر لارہا تھا۔

زینب نے اپنے ساتھ کھڑی ہوئی دوسری عورت کو کہنی مار کر متوجہ کیا اور اسکرین کے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔

”ہو ہائے!“ دوسری عورت کے سیدھے ہاتھ کی شادت کی انگلی اپنی ٹھوڈی پر پہنچ گئی۔ یہ انداز خواتین میں استعجاب کی علامت تھی۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

”یہ نائلہ بی بی کو کیا ہوا ہے۔ اسے تو خون چڑھایا جا رہا ہے۔ آج دوپہر کو تو یہ بالکل ٹھیک تھی۔“ زینب نے کہا۔ اس کے لمبے میں بھی حیرت تھی۔

”اللہ جانے بہن! آج کل کسی بیماری کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ نذیرہ کا بیٹا بھی تو شام تک بالکل ٹھیک تھا۔ اب دیکھ لو ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔“ دوسری عورت نے جواب دیا۔

اس دوران اردلی ڈیوٹی روم سے ڈاکٹر کو بلا لایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔ کمرے میں رش دیکھ کر ڈاکٹر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے ڈانٹ کر تمام عورتوں اور مردوں کو ایمرجنسی روم سے باہر نکال دیا۔ صرف بچے کا باپ کمرے میں رہ گیا تھا جو ڈاکٹر کو بچے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ڈاکٹر بچے کا معائنہ کرنے لگا، ویسے اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بچے کو ہیضہ ہو گیا تھا۔

اسی دوران نرس کمرے سے باہر نکلی تو زینب نے اسے روک لیا۔

”اے سسٹرایہ نائلہ بی بی کو کیا ہوا ہے؟“

”کون نائلہ بی بی؟“ نرس نے اسے گھورا۔

”یہ جو اندر بے ہوش پڑی ہے اور اسے خون کی بوتل لگی ہوئی ہے۔“ زینب نے جواب دیا۔

”تم اسے جانتی ہو؟“ نرس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”اچھی طرح جانتی ہوں جی۔ یہ درانی صاحب کی بیٹی ہے۔ اس کا باپ تو مرجکا ہے۔ بڑی دولت ہے

نائلہ بی بی کے پاس۔ بڑے مربع اور بڑی جائیداد ہے اس کی۔ میں ان کے گھر میں کام کرتی تھی۔ لیکن پھر چھوڑ دیا۔ ان کی دوسری نوکرانی سے جھگڑا ہو گیا تھا میرا۔“ زینب نے بتایا۔

درانی کا نام سن کر نرس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ عبدالصمد درانی کو کون نہیں جانتا تھا۔ پچھلے سال کار کے حادثے میں درانی اور اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن کہا جاتا تھا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے بڑے بھائی نے اسے قتل کر دیا تھا کیونکہ زرعی اراضی کے معاملے میں ان دونوں میں عرصہ سے ایک مقدمہ چل رہا تھا جس کا فیصلہ عبدالصمد درانی کے حق میں ہوا تھا اور اس کے چند ہی روز بعد دونوں میاں بیوی ٹریفک کے اس الناک حادثہ کا شکار ہو گئے تھے۔ نائلہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور ماں باپ کی موت کے بعد ساری جائیداد کی وہی واحد اور قانونی وارث قرار پائی تھی۔

نرس دوبارہ کمرے میں آگئی۔ ڈاکٹر سفید ٹاپ والی میز پر لیٹے ہوئے بچے کا معائنہ کر رہا تھا۔ بچے کا باپ اس کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچا رہا تھا اور نرس ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق چارٹ پر ضروری کوائف لکھتی جا رہی تھی بالاخر فوری طبی امداد بہم پہنچانے کے بعد بچے کو ایڈمنٹ کر کے وارڈ میں بھیج دیا گیا۔

”صرف بچے کی ماں اس کے ساتھ وارڈ میں رہ سکے گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، پچہ انشاء

اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

ان لوگوں کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرس سے کہا۔

”اس کا کیا حال ہے؟“

”ابھی تک تو ٹھیک ہے۔“ نرس نے جواب دیا۔

”یہ ایمر جنسی روم کے دروازے پر جو پولیس والا بیٹھا ہوا ہے نا اس سے کہو اپنے دفتر میں جا کر بیٹھ جائے۔ مریضہ کے ہوش میں آنے پر اسے اطلاع دے دی جائے گی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا، عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وجیہ و تکلیف آدمی تھا۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی لیکن اس ہسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے اس کا فیشر بھی چل رہا تھا اور اسی بناء پر بعض اوقات اسے دوستوں کے مذاق کا نشانہ بھی بننا پڑتا تھا۔

”میں دو مرتبہ اس کا نشیبل سے کہہ چکی ہوں۔ مگر وہ یہاں سے ہلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ہر آدمی گھسنے بعد اندر آکر جھانکنے لگتا ہے۔“ نرس نے جواب دیا۔

”اسے منع کر دو کہ اجازت کے بغیر ایمر جنسی روم میں داخل نہ ہو۔“ ڈاکٹر نے کہا اور پھر مگر سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”پتہ نہیں بے چاری کون ہے اور اسے گولی کس نے ماری تھی۔ ہو سکتا ہے کسی نے اسے اغواء کرنے کی کوشش کی ہو اور مزاحمت کرنے پر گولی مار کر فرار ہو گیا۔ لیکن یہ لڑکی ہے بے حد حسین۔“

”اس لڑکی کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور پولیس کو اس کے بارے میں اطلاع دینے والے صادق نامی اس آدمی کا بیان بھی یہی ہے کہ دو بد معاش اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے جن کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ لیکن... میں نے اس لڑکی کے بارے میں پتہ چلا لیا ہے کہ یہ کون ہے۔“ نرس نے آخری الفاظ بڑے معنی خیز انداز میں کہے تھے۔

”کیا مطلب؟ کیا تم نے سراغ رسائی بھی شروع کر دی ہے؟“ ڈاکٹر نے اسے گھورا۔

”کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔“ نرس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ٹائٹ ڈیوٹی کے دوران ڈائجسٹوں

میں اس قسم کی کہانیاں بڑھ بڑھ کر ایسے واقعات کے بارے میں تجسس پیدا ہونا فطری بات ہے۔“

”تو کون ہے یہ لڑکی؟“ ڈاکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ابھی نہیں۔“ نرس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”میں ذرا تصدیق کر لوں اس کے بعد ہی

بتاؤں گی۔“

نرس ایمر جنسی روم سے نکل گئی۔ ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ دروازے کے سامنے بیٹچہ پر تھانے کا ایک کانشیبل اور وارڈ ڈیوٹی والا بیٹھا ہوا تھا۔ کانشیبل سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے وارڈ ڈیوٹی کو اپنے کسی سر کے کی داستان سنا رہا تھا۔ ڈاکٹر تو ڈیوٹی روم کی طرف چلا گیا۔ لیکن نرس وہاں رک گئی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ میڈیکول سیکل کے دفتر میں جا کر بیٹھیں۔ لڑکی ہوش میں آئے گی تو آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔ اور کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ہسپتال کی حدود میں سگریٹ پینا منع ہے۔“

نرس نے پولیس کانشیبل کو گھورتے ہوئے کہا۔

کانشیبل نے سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے پیر سے مسل دیا۔ بیچ کے آس پاس سگریٹوں کے اور بھی

مٹے سے بھڑے بکھرے ہوئے تھے۔

”سمیے افسر کا حکم ہے جی کہ میں ہسپتال میں موجود رہوں۔ لڑکی کا بیان لیتا ہے کہ اسے گولی کس نے

ماری تھی؟“ کا ٹیبل نے جواب دیا۔

”مریضہ نہ تو ہوش میں آنے سے پہلے بیان دے سکتی ہے اور نہ ہی بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے فرار ہو سکتی ہے۔ اور صابر!“ وہ وارڈ بوائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”کسی کو کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ سمجھ!“

”سمجھ گیا سسٹر!“ وارڈ بوائے نے جواب دیا۔

نرس وہاں سے ہٹ کر نرسوں والے ڈیوٹی روم میں آ گئی۔ یہاں ایک اور نرس کرسی پر بیٹھی اورنگہ رہی تھی۔ قدموں کی جگہ کی چاپ سن کر اس نے آنے والی نرس کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ اونچنے لگی۔ آنے والی نرس بھی رات کی ڈیوٹی کے دوران عام طور پر یہیں بیٹھا کرتی تھی لیکن امیرجنسی روم میں بے ہوش لڑکی کی وجہ سے اسے بھی وہیں بیٹھنا پڑا تھا۔ ڈیوٹی روم میں آتے ہی وہ میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ٹیلی فون اپنی طرف سرکا کر اس کا ریسیور اٹھایا لیکن پھر ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا اور ڈیوٹی روم سے نکل کر میڈیکل وارڈ کی طرف چل پڑی۔

وارڈ کے برآمدے میں ایک مرد اور دو عورتیں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ وہی لوگ تھے جو بیٹے میں جتلا بیچے کو لے کر آئے تھے۔ بچے کی ماں وارڈ میں بچے کے پاس تھی۔ جبکہ دو مرد اور دو عورتیں واپس جا چکی تھیں۔ یہ ایک مرد اور دو عورتیں یہیں رہ گئی تھیں۔ مرد اس بچے کا باپ تھا۔ ایک عورت خالہ اور دوسری پچھو بھی تھی۔ برآمدے میں چونکہ اندھیرا تھا اس لئے نرس کو ان کے چہرے صاف نظر نہیں آرہے تھے۔

”تم میں زینب کون ہے؟“ نرس نے ان کے قریب رک کر پوچھا۔

”میں ہوں جی۔۔۔ میرا نام زینب ہے۔ منیرا کیسا ہے؟“ ایک عورت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری عورت اور مرد بھی کھڑا ہو گیا۔ نرس کو دیکھ کر وہ لوگ یقیناً یہی سمجھتے تھے کہ وہ بچے کے بارے میں کچھ بتانے آئی ہے۔

”بچہ ٹھیک ہے“ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔ ایک بہت ہی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں تم سے۔“ نرس زینب نامی عورت کا ہاتھ پکڑ کر اسے چند قدم دور لے گئی۔ پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ ”جب تم لوگ اپنے بچے کو لے کر آئے تھے تو امیرجنسی روم کے بیڈ پر بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر تم نے اپنی ساتھی سے کہا تھا کہ نائلہ بی بی کو کیا ہوا ہے۔ کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہو؟“

”ہاں جی۔ بہت چٹکی طرح جانتی ہوں۔ یہ درانی فیملی کی لڑکی ہے۔ پچھلے سال اس کے ماں باپ ایکسیڈنٹ میں مر گئے تھے۔ بہت اچھے لوگ تھے پچھارے۔“ زینب نے کہا۔

”اس لڑکی کو پہچاننے میں تم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی؟“ نرس نے پوچھا۔

”نہیں سسٹر!“ زینب نے جواب دیا۔ ”آج دوپہری کو تو صادق بازار میں نائلہ بی بی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ درزی سے کپڑے لینے آئی تھی اور مجھے دس روپے بھی دیئے تھے اور دو چار دن بعد گھر آنے کے لئے بھی کہا تھا۔ لیکن میں تو اسے ہسپتال میں دیکھ کر حیران ہی رہ گئی ہوں۔ کیا ہوا ہے اسے؟ خون کیوں چڑھایا جا رہا ہے؟“

”اسے گولی لگی ہے۔“ نرس نے سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اسے پولیس بے ہوشی کی حالت میں یہاں لائی تھی ابھی تک پولیس والوں کو بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کون ہے۔ مگر تم نائلہ کو کیسے جانتی

”میں ان کے گھر میں کام کرتی تھی جی۔ دو مہینے پہلے میں نے کام چھوڑ دیا تھا۔ مگر نائلہ بی بی کو گولی کس نے ماری ہے؟“ زینب کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھر آئے۔

”پھر تو تمہیں اس کے گھر کا پتہ اور فون نمبر بھی معلوم ہو گا؟“ نرس نے کہا۔  
”نائیلہ بی بی کا گھر تو دور ہے۔ فون نمبر مجھے یاد نہیں ہے۔ اس کی پھوپھی کا لڑکا شبیر قریب ہی رہتا ہے۔ اس کا دو منزلہ مکان ہے۔ بڑے پیسے والے لوگ ہیں جی یہ، لیکن کیا نائلہ بی بی کے گھر والوں کو پتہ نہیں چلا؟“

”یہی تو مسئلہ ہے۔ ہمیں تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کے گھر والوں کو اطلاع کس طرح دی جاتی۔ اب تم سے پتہ چلا ہے کہ یہ کون ہے۔ کیا تم میرا ایک کام کرو گی؟“ نرس نے کہا۔

”کیوں نہیں جی۔ آپ کہہ کر تو دیکھیں۔“ زینب بولی۔  
”یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟“ نرس نے اس کے سامنے مڑکی طرف اشارہ کیا۔

”میرا بندہ ہے جی۔“ زینب نے جواب دیا۔

”میں ایک پرچہ لکھ کر دے رہی ہوں۔ اپنے بندے سے کہو کہ وہ نائلہ کے پھوپھی زاد بھائی شبیر کو دے آئے۔ میں آنے جانے کا کرایہ دے دوں گی۔“ نرس نے کہا۔

”کرایہ دینے کی ضرورت نہیں سسر جی۔ شبیر صاحب کا گھر تو بہت ہی قریب ہے۔ میرا بندہ تو دس منٹ میں واپس بھی آجائے گا۔ آپ پرچہ لکھ کر دے دیں۔“ زینب نے کہا۔

”بیس روپے۔ میں پرچہ لکھ کر لاتی ہوں۔ لیکن نائلہ کے بارے میں ابھی کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہارا بندہ شبیر صاحب کو ساتھ لے کر آئے تو اس سے کہنا کہ سیدھا میرے پاس ہی آئے۔ میں ایمر جی روم میں بیٹھی ہوں گی۔“

نرس ڈیوٹی روم میں آگئی۔ دوسری نرس اب بھی اونگھ رہی تھی۔ ایمر جی ڈیوٹی والی نرس نے کرسی پر بیٹھ کر میز کی دراز سے ایک کاغذ نکالا۔ بال چین اسے اپنی یونیفارم کی جیب سے نکالتا پڑا تھا۔

اس نے نائلہ کے حوالے سے شبیر درانی کے نام ایک مختصر سا پیغام لکھ کر نیچے اپنا نام رضیہ لکھ دیا۔ اور کاغذ کو بند کرتی ہوئی ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔ زینب اسے برآمدے میں دیکھتے ہی دو قدم آگے بڑھ آئی۔ اس کا شوہر بھی ساتھ تھا۔ نرس رضیہ نے رقعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کچھ ہدایات بھی دے ڈالیں۔ زینب کا شوہر رقعہ جیب میں ڈال کر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ اور رضیہ دوبارہ ایمر جی روم کی طرف آگئی۔ پولیس کانسٹیبل اب وہاں موجود نہیں تھا۔ البتہ وارڈ بوائے بج پر بیٹھا ہوا تھا۔

”صابر! نرس دروازے کے قریب رک کر بولی۔ ”ڈیوٹی روم سے میرا چائے والا تھرمس اٹھا لاؤ۔ اس وقت سردی کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے۔ چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔“

صابر اٹھ کر ڈیوٹی روم کی طرف چلا گیا اور رضیہ کمرے میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ درانی فیملی کی دولت کے اس نے بہت قہر سن رکھے تھے۔ نائلہ کے بارے میں معلوم ہو جانے کے بعد اس نے نائلہ کے کزن کے نام چوری چھپے پیغام اس لالچ میں بھیجا تھا کہ شاید اس طرح اسے کوئی انعام بھی مل جائے۔

نرس رضیہ کی عمر بیس اکیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ قد قدرے لمبا اور جسم بے حد متناسب تھا۔ رنگت گوری اور چہرے کے نقوش دلکش تھے۔ وہ خانپور کے ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ سات بہن بھائیوں میں وہ تیسرے نمبر پر تھی۔ باپ ٹاؤن کمیٹی میں ملازم تھا۔ لگی بندھی تنخواہ میں بڑی مشکل سے گزر اوقات ہو رہی تھی۔ رضیہ نے میٹرک کر لیا تھا اور گھر پر ہی بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔ وہ ٹیوشن سے ملنے والے سارے پیسے اپنی ذات پر ہی خرچ کرتی۔ اپنی ٹیوشن کی کمائی میں سے اس نے ماں باپ کو کبھی ایک پیسہ تک نہیں دیا تھا۔ اسے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا اور وہ ہمیشہ بن ٹھن کر رہا کرتی تھی۔ اس نے محلے کے بعض لڑکوں کو بھی اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ لڑکوں کو بیوقوف بنانے کا فن بھی جانتی تھی۔ اور بعض لڑکوں سے تو وہ کچھ پیسے بھی انٹھتی رہتی تھی۔

چند سال پہلے اخبار میں نرسنگ کے کورس کا اشتہار شائع ہوا تو اس نے فوراً ہی داخلہ لے لیا، یہ کورس اس نے خانپور ہی کے سرکاری ہسپتال میں مکمل کیا تھا۔ کورس کے بعد وہ تقریباً چھ ماہ تک اسی ہسپتال میں ڈیوٹی دیتی رہی پھر اسے ایک رورل ہیلتھ سینٹر ٹرانسفر کر دیا گیا۔ وہ گاؤں خانپور سے تقریباً تیس میل دور تھا۔ رضیہ کو مجبوراً وہاں جانا پڑا کیونکہ نرسنگ کے کورس میں داخلہ لیتے وقت نرس نے جو فارم پر کیا تھا اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اسے دو سال تک لازمی سرکاری ملازمت کرنی پڑے گی جس میں ایک سال دیہی علاقے میں خدمات انجام دینا ہوں گی۔

اس گاؤں کی آب و ہوا رضیہ کو اس آگئی۔ گاؤں میں ایک مڈل گرلز اسکول بھی تھا جس کی دو تین ہیچرز رضیہ کی دوست بن گئیں۔ اس طرح اس گاؤں میں رضیہ کا دل بھی لگ گیا تھا۔ وہ مہینے میں صرف ایک دو دن کے لئے خان پور آتی۔

گاؤں میں ایک سال گزارنے کے بعد رضیہ پھر خانپور کے سرکاری ہسپتال میں واپس آگئی۔ یہاں اسے کچھ کر دکھانے کا موقع مل گیا۔ وہ مریضوں کے رشتہ داروں سے مختلف جیلوں بہانوں سے کچھ نہ کچھ پیسے انٹھتی رہتی۔ اس طرح وہ تنخواہ سے زیادہ رقم کمالیتی۔ اب وہ تنخواہ گھروالوں کو دے دیتی اور فاضل آمدنی سے اپنے اخراجات پورے کرتی۔

ملازمت کے دو سال مکمل ہوتے ہی رضیہ نے رحیم یار خان کے سلطان زید ہسپتال میں ملازمت کی کوشش شروع کر دی۔ خانپور کے سرکاری ہسپتال میں اکثر اسپیشل وارڈ میں ڈیوٹی ہونے کی وجہ سے بعض بڑے اور بااثر لوگوں سے بھی اس کی شناسائی ہو گئی تھی اور اس نے ان تعلقات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک بااثر آدمی کی وجہ سے اسے رحیم یار خان کے اس ہسپتال میں ملازمت مل گئی۔ یہاں نہ صرف تنخواہ بہت اچھی تھی بلکہ اور بھی بہت سی سہولتیں حاصل تھیں۔ ہوسٹل میں کمرہ لینے کی بجائے اس نے دو اور نرسوں کے ساتھ ہسپتال سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع ایک مکان میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ دونوں نرسیں بھی اس کی طرح خود مختار، آزاد منش اور اپنے حسن سے فائدہ اٹھانے کے لئے نوجوانوں کو بے وقوف بنانے کے چکر میں رہتی تھیں۔

ان دونوں نرسوں کے ساتھ رہتے ہوئے رضیہ کی پرانی عادتیں پھر لوٹ آئیں۔ لیکن اس نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوئی نوجوان خود اسے بیوقوف بنانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ رضیہ کو اس ہسپتال میں کام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے۔ اس دوران اس نے کچھ شرفاء سے بھی تعلقات استوار کر لئے تھے لیکن یہ تعلقات شرافت کی حد تک ہی محدود رہے کیونکہ رضیہ کسی بہت ہی آڑے

وقت میں ان کے تعلقات سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

سلمان بنید ہسپتال کے قیام کا اصل مقصد اس شر اور اس کے گرد و نواح کی دیہی آبادیوں کے غریب لوگوں کو طبی سہولتیں فراہم کرنا تھا لیکن اس ہسپتال کا زیادہ فائدہ امراء اٹھارے تھے۔

ان دو برسوں کے دوران رضیہ نے درانی فیملی کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا تھا۔ صدر درانی اور اس کے بھائی کا مقدمہ تو خاصی شہرت حاصل کر گیا تھا۔ کروڑوں کی جائیداد کا معاملہ تھا جس کا فیصلہ سپریم کورٹ میں ہی ہوا تھا۔ یہ فیصلہ عبدالصمد درانی کے حق میں ہوا تھا لیکن اس کے چند ہی روز بعد وہ دونوں میاں بیوی ٹریفک کے ایک خوفناک حادثہ کا شکار ہو گئے۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ وہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ ان دونوں کو حادثے کے رنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

اور اب اسی خاندان کی ایک لڑکی زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں اس کے سامنے پڑی تھی۔ نائلہ کے بارے میں معلوم ہو جانے کے بعد اس کے فطین ذہن نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنالیا تھا اور وہ نائلہ کے کزن شبیر سے زیادہ سے زیادہ رقم اکٹھے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اس لئے اس نے کسی ڈاکٹریا میڈیکولیکل کونسل کی اصلیت کے بارے میں ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔

صابر چائے دے گیا تھا۔ رضیہ چائے پیتے ہوئے بھی یہی سب کچھ سوچ رہی تھی۔ باہر شدت کی سردی تھی لیکن کمرے کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ اس ہسپتال کی عمارت کی تعمیر میں سینٹرل کوننگ اور ہیٹنگ سسٹم قائم کیا گیا تھا۔

ٹھیک ایک بجے برآمدے میں قدموں کی آوازیں سن کر نرس رضیہ چونک گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خالی کپ ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ چار آدمی تھے جن میں ایک تو زینب کا شوہر تھا۔ دوسرا وہی کانسیل جو ایمر جنسی روم کے سامنے جم کر بیٹھا رہا تھا۔ تیسرا میڈیکولیکل آفیسر اور چوتھا قدرے بھاری بھر کم اور دروازہ قفل آدی تھا۔ ٹوٹھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھوں نے اس کی شخصیت کو خاصا بارعب بنادیا تھا۔ وہ گرے رنگ کی شلوار قمیض اور سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

”سٹر رضیہ؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے نرس کی طرف دیکھا۔

”جی... میں ہی ہوں۔ آپ اندر آجائیے۔“ رضیہ نے کہا۔ اس شخص نے اگرچہ اپنا تعارف نہیں کرایا تھا لیکن رضیہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ نائلہ کا کزن تھا۔

وہ شبیر درانی ہی تھا جو اندر آگیا۔ پولیس والوں نے بھی کمرے میں داخل ہونا چاہا مگر نائلہ نے انہیں روک دیا۔

”آپ لوگ باہر ہی رکئے۔ مریضہ ہوش میں آئے گی تو آپ کو بتادیا جائے گا۔“ اس نے دروازہ بند کر دیا اور مختصر الفاظ میں شبیر درانی کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے جیسے ہی پتہ چلا کہ یہ نائلہ درانی ہے میں نے آپ کو پیغام بھیج دیا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد پولیس والے اسے پریشان کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”بہت اچھا کیا تم نے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ نرس لالچی قسم کی ہے۔ اور انعام ہی کے لالچ میں اس نے اس کے گھر اطلاع بھجوائی ہے۔ حالانکہ اصولی طور پر ہونا یہ چاہئے تھا کہ اگر اسے نائلہ کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تھا تو وہ پولیس کو مطلع کرتی۔ مگر شبیر درانی اسے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”کہاں ہے نائلہ؟“ اسے گولی کیسے لگی۔ ”اس نے پوچھا۔“



”یہ تو بچہ نہیں کہ اسے گولی کیسے لگی۔ اسے پولیس یہاں لائی تھی۔ ان کے ساتھ کوئی اور آدمی بھی تھا جس نے پولیس کو نائلہ کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ نائلہ کو جب یہاں لایا گیا تو خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی حالت بہت تشویش ناک تھی۔ لیکن اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اس کی پوری پوری دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ اس طرف آئیے۔ نائلہ یہاں ہے۔“ نرس رضیہ نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں اسکرین کے پیچھے آگئے۔ نجائے کیا بات تھی کہ نائلہ کو دیکھ کر شبیر درانی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے اسٹینڈ پر فٹکی ہوئی خون کی بوتل کی طرف دیکھا اور پھر نائلہ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

”اسے گولی کہاں لگی ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”پیٹ پر۔“ نرس نے جواب دیا۔

”شبیر درانی نے نائلہ کے جسم پر سے چادر ہٹا دی۔ اور دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ نائلہ کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ البتہ سینے پر ایک اور کپڑا پڑا ہوا تھا جو چادر کے ساتھ ہی ہٹ گیا تھا۔ شبیر درانی چادر کو آہستہ آہستہ نیچے کھینچتا چلا گیا۔

نائلہ کے پیٹ پر پٹی تھی جس کا ایک حصہ خون کی سرخی لئے ہوئے تھا۔ شبیر درانی نے جب نائلہ کے جسم پر سے چادر ہٹائی تھی تو نرس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس چادر کے نیچے نائلہ کا جسم بے لباس ہے۔ اور اسے عورت ہوتے ہوئے عورت کی حرمت کا احساس ہونا چاہئے تھا۔

شبیر درانی چند لمحوں کے بعد نائلہ کے پیٹ کے زخم پر پٹی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظریں نائلہ کے پیٹ پر ریچھتی ہوئی اس کے سینے پر جم گئیں۔ سینے کے دونوں ابھاروں کے عین وسط میں کسی پودے کے پتے کی طرح ایک نشان نظر آرہا تھا۔ یہ پیدائشی نشان تھا اور اس جگہ کی جلد قدرے سرخی مائل تھی۔ نائلہ جب کبھی کھلے کھلے کی قیص پہنتی تو اس نشان کا کچھ حصہ نظر بھی آتا تھا۔ ممکن ہے شبیر درانی یونہی کھڑا نائلہ کے برہنہ جسم کو گھورتا رہتا لیکن رضیہ نے کچھ سوچ کر چادر نائلہ کے جسم پر کھینچ دی اور اس کے کونے درست کرنے لگی۔

”نائلہ کو کس وقت یہاں لایا گیا تھا؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”تقریباً ساڑھے نو بجے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”اور یہ اس وقت سے یہیں پڑی ہے۔ کیا کوئی پرائیویٹ روم خالی نہیں تھا؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”اسے آبزرویٹن کے لئے یہاں رکھا گیا ہے جناب‘ میں یہاں موجود ہوں۔ ہر آدھے گھنٹے بعد ان کا نمبر بچ چیک کیا جاتا ہے اور ان کی کیفیت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ حالانکہ نائلہ کو اس لئے یہاں رکھا گیا تھا کہ جزل وارڈ میں کوئی بیڈ خالی نہیں تھا اور ظاہر ہے بغیر کسی وارث کے نائلہ کو پرائیویٹ روم میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

”اوہ! تمہیں تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ شبیر درانی نے کوٹ کی جیب سے ہزار روپے کا ایک نوٹ نکال کر رضیہ کی مٹھی میں ڈبا دیا۔ ”مجھے اطلاع بھجوانے کا بہت بہت شکریہ۔ کیا اس وقت کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ نائلہ لاوارث نہیں ہے۔ اسے ابھی اور اسی وقت کسی پرائیویٹ روم میں منتقل کرنا ہوگا۔ اس کی دیکھ بھال اور علاج میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہئے۔“

”آپ بالکل مطمئن رہئے جناب۔“ رضیہ نے ہزار کا نوٹ یونیفارم کے نیچے گریبان میں ٹھونس لیا۔  
 میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔“

رضیہ نے دروازہ کھول دیا۔ شبیر درانی بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل کر رابڈاری میں آیا تھا۔ دونوں پولیس والے اس کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔  
 ”ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا جناب کہ یہ آپ کے گھر کی خاتون ہے۔ اگر پتہ چل جاتا تو ہم فوراً آپ کو اطلاع دیتے۔“ کاشیپیل نے کہا۔ اس کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔

اس دوران دو ڈاکٹر بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہیں وارڈ بوائے صابر نے شبیر درانی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ دونوں ڈاکٹر بھی اپنے نمبر بڑھانے کے لئے شبیر درانی کی چالپوسی میں لگ گئے۔ وہ کمرے میں آگئے تھے۔ کبھی مریضہ کا چارٹ اٹھا کر دیکھتے اور کبھی نائلہ کی کلائی تھام کر نبض دیکھنے لگتے۔

اور پھر آدھے گھنٹے کے اندر اندر بے ہوش نائلہ کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔ پرائیویٹ رومز کے لئے اگرچہ دو اور نرسوں کی ڈیوٹی تھی مگر شبیر درانی کی خواہش پر نرس رضیہ کی نائلہ کی دیکھ بھال کے لئے اس کمرے میں ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اسی دوران پولیس اسٹیشن کا ایس ایچ او بھی پہنچ گیا۔ وہ عہدے میں سب انسپکٹر تھا، اور کاشیپیل نے ٹیلی فون پر اس کے گھر پر اطلاع دی تھی کہ اس لڑکی کی شناخت ہو چکی ہے اور وہ شرکی ایک معزز شخصیت شبیر درانی کی ماموں زاد بہن ہے۔ سب انسپکٹر بھی شبیر درانی کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔

”حملہ آور کا کچھ سراغ ملا۔ نائلہ پر گولی کس نے چلائی تھی۔“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”ابھی تک سراغ نہیں ملا سرا! لیکن جس شخص نے پولیس اسٹیشن آکر نائلہ کے بارے میں اطلاع دی تھی اسے ہم نے روک رکھا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق دو بد معاش نائلہ کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور نائلہ کو گولی انہی میں سے کسی ایک نے ماری تھی۔ اس وقت ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے اور انہوں نے اس شخص سے پوچھا تھا کہ اس نے کسی عورت کو ادھر سے بھاگتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ اس شخص کو ہم نے حراست میں لے رکھا ہے۔ اس نے اگرچہ ان دونوں آدمیوں کے حلقے بھی بتائے ہیں لیکن یہ ایک من گھڑت کہانی بھی ہو سکتی ہے۔ نائلہ ہوش میں آجائے تو اس کا بیان لینے کے بعد ہی اس شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔“ سب انسپکٹر نے بتایا۔  
 ”وہ شخص کون ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”ترنہ موڑ پر پھلوں کی ریڑی لگاتا ہے۔ صادق نام ہے اس کا۔ ادھیڑ عمر آدمی ہے۔“ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی خود جا کر دیکھوں گا کہ وہ کون ہے؟“ شبیر درانی نے کہا پھر ایک ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”یہ کب تک ہوش میں آجائے گی؟“

”انستہسیا کا اثر ہے۔ میرا خیال ہے چار بجے تک ہوش آ جانا چاہئے۔ لیکن بات کرنے کے قابل نہ رہے گا۔“ ایک دو گھنٹوں بعد ہی ہو سکے گی۔“ ڈاکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت پونے دو بجنے والے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ ذرا باہر جائیے۔ میں نرس سے مریضہ کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا

ہوں۔ ”شیردرانی نے کہا۔

”مریضہ کے بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت...“  
”پلیز ڈاکٹر!“ شیردرانی نے اس کی بات کاٹ دی۔

دونوں ڈاکٹر اور سب انسپکٹر کمرے سے باہر نکل گئے۔ شیردرانی نے دروازہ بند کر دیا اور نرس رضیہ کے قریب کھڑے ہو کر دم لہجے میں بولا۔

”تم بڑی اچھی لڑکی ہو اور کام کی بھی۔ تم نے نائلہ کے بارے میں اطلاع دے کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ تمہیں میرا ایک اور کام کرنا ہو گا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ اس پر گھر کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ نائلہ جیسے ہی ہوش میں آئے مجھے فوراً مطلع کر دینا۔ آج کی رات یہاں گزر جائے تو میں سوچ رہا ہوں کہ کل صبح ہی نائلہ کو گھر لے جاؤں۔ وہاں بھی نرسنگ کے لئے تمہیں ہی رکھا جائے گا۔ اور تمہاری خدمات کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔“

”شکریہ جناب۔ لیکن ڈاکٹر“ نائلہ کو اس حالت میں گھر لے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل دن میں اسے خون کی ایک اور بوتل لگانی پڑے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”یہ سب کچھ گھر پر بھی ہو سکتا ہے۔ پیسہ بڑی کمال کی چیز ہے مس رضیہ! پیسہ ہو تو سب کام ہو جاتے ہیں۔ تم تو اس کی دیکھ بھال کے لئے موجود ہو گی اگر ضرورت پڑی تو میں اسی ہسپتال کے کسی ڈاکٹر کی خدمات بھی حاصل کر لوں گا جو چوبیس گھنٹے وہیں رہے گا۔“

”لیکن نائلہ کو ہسپتال ہی میں رکھنے میں کیا قیاحت ہے؟“ رضیہ نے پوچھا۔  
”تم اس بات کو نہیں سمجھ سکو گی۔“ شیردرانی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہماری خاندانی دشمنیاں چل رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نائلہ کو گولی بھی ہمارے کسی دشمن ہی نے ماری ہو گی۔ ہسپتال میں بھی دشمن کے کسی وار کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے صبح ڈاکٹر سے بات کر کے میں نائلہ کو اپنی ذمہ داری پر گھر لے جاؤں گا۔ لیکن تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ نائلہ جیسے ہی ہوش میں آئے مجھے فون کر دینا اور کسی کو پتہ نہ چلے کہ نائلہ کو ہوش میں آنے کی اطلاع مجھے تم نے دی ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔

”آپ مطمئن رہئے جناب۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ اس کی جیب میں ہزار روپے کا نوٹ آچکا تھا اور مزید نوٹ ملنے کی توقع تھی۔ اس جیسی لالچی لڑکی کچھ بھی کر سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ میں نے جو باتیں کہی ہیں ان کا خیال رکھنا۔“ شیردرانی کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

رضیہ بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکلی تھی۔ دونوں ڈاکٹر رضیہ کو کھانچا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شیردرانی بہت بڑا زمیندار، بہت بڑا رئیس اور اس شہر کا غالباً سب سے بااثر آدمی تھا۔ صرف شیر ہی کیا اس درانی فیملی کا ہر شخص اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ یہ خاندان اگرچہ خود سیاست میں نہیں تھا لیکن سب ہی لوگ جانتے تھے کہ علاقے کے بڑے بڑے سیاستدان ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کے دروازوں پر حاضر رہتے تھے۔ اسمبلیوں تک پہنچنے کے لئے وہ اسی خاندان کے مرہون منت تھے۔ اور دونوں ڈاکٹروں کو اس بات پر تاؤ آ رہا تھا کہ رضیہ جیسی ایک معمولی سی نرس شیردرانی جیسے بااثر شخص کے اتنا قریب پہنچ گئی تھی کہ اس سے راز و نیاز تک ہونے لگا تھا اور انہیں گھاس بھی نہیں ڈالی جا رہی تھی۔ وہ دونوں ڈاکٹر چیچ و تاب کھاتے ہوئے غالباً یہی سوچ رہے تھے

کہ کاش! شبیر درانی کی آمد کے موقع پر وہ ایمر جنسی روم میں موجود ہوتے اور اس طرح رضیہ کو آگے بڑھنے کا موقع مل ہی نہ ملتا۔ لیکن اب تو رضیہ ان سے بازی لے چکی تھی۔

ایس اچ او نے ایک ہیڈ کائٹیل کو وہیں چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکٹر دوبارہ اپنے ڈیوٹی روم میں چلے گئے۔ رضیہ نے بھی کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور نائلہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے سینے کا زیر و بم رضیہ کے خیال میں طبعی نقطہ نگاہ سے نارمل تھا۔ اس نے خون کی بوتل کی طرف دیکھا۔ بوتل کا تین چوتھائی خون نائلہ کے جسم میں منتقل ہو چکا تھا۔ رضیہ نے ٹیوب کے بلڈ جمیٹر کے نیچے لگی ہوئی اسٹاپر والی پائپنگ کی تاب ذرا سی ڈھیلی کر دی۔ بوتل میں سے خون کے قطرے گرنے کی رفتار کسی حد تک تیز ہو گئی۔

رضیہ پلنگ کے قریب کھڑی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نائلہ کا خون آلود لباس بھی چھوٹی سی کٹھڑی کی صورت میں کمرے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ اسپیشل روم میں منتقل کرنے کے بعد نائلہ کے لئے ہسپتال کے زریں کا ایک جوڑا بھی منگوا لیا گیا تھا۔ صاف ستھرا استری شدہ یہ جوڑا کرسی پر پڑا تھا۔ رضیہ نے وہ کپڑے خالے اور نائلہ کے جسم پر سے چادر ہٹا دی۔ پاجامہ تو اس نے نائلہ کو بڑی آسانی سے پہنا دیا تھا لیکن برٹ نما قمیص پہنانے میں اسے کچھ دشواری پیش آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے بوتل کا اسٹاپر بند کر کے خون بند کیا پھر نائلہ کے بازو کی ٹس میں پوسٹ نیڈل نکال دی اور قمیص پہنانے کے بعد ٹس میں دوبارہ سوئی لگادی اور اس طرح ایک بار پھر بوتل کا خون نائلہ کے جسم میں منتقل ہونے لگا۔

اس کام سے فارغ ہو کر رضیہ نے کمرے میں تیز روشنی والی ٹیوب لائٹ بجھا کر نیلگوں روشنی والا نائٹ بلب جلا دیا اور کھڑکی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی بند تھی لیکن شیشے سے باہر کا منظر نظر آرہا تھا۔ پرائیویٹ رومز کی پشت پر ایک خوبصورت لان تھا جس میں فوارہ بھی لگا ہوا تھا اور رنگین پولز پر فینسی لائٹس بھی لگی ہوئی تھیں۔ پرائیویٹ رومز والی راہداری کا ایک دروازہ اس لان کی طرف بھی کھلتا تھا۔ شام کے وقت اس لان میں بڑی رونق رہتی تھی۔ بعض مریض اور ان کے پاس آنے والے عزیز و اقارب اس لان میں آجاتے تھے۔ بعد میں فوارے کا پانی تو بند کر دیا جاتا تھا لیکن فینسی شیڈز والی بتیاں رات بھر جلتی رہتی تھیں۔

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں پر بھی بارش کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔ رضیہ چند منٹ کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی پھر پلنگ کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔ یہ کرسی مریض کے انڈنٹ کے لئے تھی اور اس پر نیم دراز ہو کر آرام سے سو یا بھی جاسکتا تھا۔

رضیہ نائٹ ڈیوٹی کے دوران عام طور پر بارہ ساڑھے بارہ بجے تک کوئی نہ کوئی ڈائجسٹ پڑھتی رہتی تھی اور پھر ڈیوٹی روم میں کرسی پر بی بیٹھے بیٹھے میز پر سر ٹکائے سو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج نائلہ کی وجہ سے اسے نہ تو ڈائجسٹ پڑھنے کا موقع ملا تھا اور نہ ہی وہ سو سکی تھی۔

اس وقت تین بج رہے تھے۔ نیند کے بوجھ سے اس کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔ داغ بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ پہلے اسے خیال آیا کہ ڈیوٹی روم میں جا کر اپنی میز کے دراز سے ڈائجسٹ نکال لائے لیکن پھر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ شبیر درانی نے بتایا تھا کہ نائلہ پر حملہ ان کے کسی خاندانی دشمن نے کیا ہوگا۔ اور وہ ہسپتال میں بھی اس پر وار کر سکتے ہیں۔ یہ بات رضیہ کے داغ میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ ایک نرس تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی ہسپتال میں کسی مریض کو ختم کرنے کے لئے کیسی کیسی سازشیں ہو سکتی ہیں۔ وہ نائلہ کو ایک لمحہ کو بھی تنہا چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ شبیر درانی نے اس پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی لیکن

حساس ذمہ داری سے زیادہ رضیہ حرص کا شکار تھی۔ شبیر درانی نے معمولی سی اطلاع پر اسے ہزار روپے کا نوٹ دے دیا تھا جس کا مطلب تھا کہ رضیہ اس سے اور بھی بہت کچھ نکلا سکتی تھی۔ اور ویسے بھی شبیر درانی نے کہا تھا کہ وہ نالکہ کو صبح ہسپتال سے اپنے گھر لے جائے گا اور اس کی دیکھ بھال کے لئے رضیہ ہی کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔

رضیہ اپنے آپ کو بیدار رکھنے کے لئے کرسی سے اٹھ گئی۔ اس نے یونہی بلا مقصد دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری کے آخری سرے پر بیچ پر پولیس کے ہیڈ کانٹیل کے ساتھ لمبی مونچھوں والا ایک آدمی آ رہا تھا۔ رضیہ کو دیکھ کر وہ دونوں بیچ سے اٹھے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ بڑی بڑی مونچھوں کی وجہ سے اس شخص کا چہرہ بہت ہی بھیاں لگ رہا تھا۔ اس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔

”رضیہ بی بی کو ہوش آگیا؟“ اس شخص نے سوالیہ نگاہوں سے رضیہ کی طرف دیکھا۔  
 ”نہیں، مگر تم کون ہو؟“ رضیہ نے اسے گھورا۔ اسے اس شخص کی چادر میں چھپی ہوئی کلاشکوف رائفل نظر آگئی تھی۔

”یہ درانی صاحب کا ذاتی محافظ ہے سسٹر! اسے نالکہ بی بی کی حفاظت کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے۔“  
 ہیڈ کانٹیل نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ نالکہ بی بی کو ہوش آئے گا تو بتا دوں گی۔“ رضیہ نے کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بارش بند ہو چکی تھی اور اب اکا دکا بوندیں ہی پڑ رہی تھیں۔  
 رضیہ مزید آدھا گھنٹہ کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی۔ لیکن نیند کی شدت سے اب اس کی ٹانگیں بھی بے جان ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ نالکہ کے پلنگ کے قریب آگئی۔ نالکہ کے ہوش میں آنے کے ابھی کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس وقت صبح کے پونے چار بجے تھے۔ رضیہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

اس وقت صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ بے ہوش نالکہ کے جسم میں اب بہت معمولی سی حرکت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ پہلے اس کے پیروں کی انگلیوں میں حرکت پیدا ہوئی پھر ہاتھوں کی انگلیاں حرکت کرنے لگیں۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔

چند منٹ بعد اس کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ اس کی نظروں کے سامنے دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ سر بے انتہا بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند بتدریج چھٹنے لگی۔ اور حواس بھی آہستہ آہستہ کام کرنے لگے۔

اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہسپتال میں تھی۔ اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی بوتل سے اس کے جسم میں منتقل ہونے والا خون اس کے اس خیال کی تصدیق کر رہا تھا۔ اس کی نظریں آرام کرسی پر سوئی ہوئی نرس پر جم گئیں جس کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے کی فضا میں گونج رہے تھے۔

نالکہ کو حیرت تھی کہ وہ ہسپتال کیسے پہنچی۔ اسے کیا ہوا تھا اور اسے خون کیوں دیا جا رہا تھا؟ اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تو پیٹ کے زخم کی تکلیف سے اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ وہ دوبارہ بے حس و حرکت ہو کر لیٹ گئی اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اور پھر اسے سب کچھ یاد آگیا۔

وہ شام کو ایک کام کے سلسلے گھر سے نکلی تھی۔ اسے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ وہ ایک جنرل اسٹور سے نکلی رہی تھی کہ یکایک اسے احساس ہوا تھا کہ دو آدمی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے بھی وہ ان دونوں آدمیوں کو اپنے آس پاس دیکھ چکی تھی۔ وہ دونوں پتلون اور چڑے کی جیککسن پہنے ہوئے تھے۔ وہ دونوں چروں ہی سے جھپٹے ہوئے بد معاش لگ رہے تھے۔

اس وقت شام ہو چکی تھی۔ نائلہ اپنی شاپنگ کے سلسلہ میں مختلف بازاروں میں گھومتی رہی۔ اگلے روز وہ ہفتہ دس دن کے لئے گاؤں جانے والی تھی۔ گھر گ نامی وہ خوبصورت گاؤں اگرچہ شہر سے بارہ چودہ میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ لیکن نائلہ چاہتی تھی کہ ضرورت کی ہر چیز خرید لی جائے تاکہ گاؤں میں قیام کے دوران اسے دوبارہ شہر نہ آنا پڑے یا کوئی چیز منگوانے کے لئے کسی کو بھیجنا نہ پڑے۔

شہر میں گھومتے ہوئے آخر میں وہ ریلوے روڈ پر آگئی۔ یہاں کتابوں کی چند اچھی دوکانیں تھیں۔ اس نے ایک دکان سے گاؤں میں قیام کے دوران مطالعہ کے لئے چند تازہ جرائد اور کچھ کتابیں خریدیں اور دکان سے باہر آکر رسالے اور کتابیں بھی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیں جہاں خریدی ہوئی دوسری چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کتابیں سیٹ پر رکھ کر وہ سیدھی ہوئی تھی کہ اس کی نظریں ایک بار پھر ان دونوں آدمیوں پر پڑ گئیں جو سڑک کے دوسری طرف کھڑے تھے۔ نائلہ بزدل نہیں تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی تھی اور لاہور میں تعلیم کے دوران اس نے مارشل آرٹس کے ایک ماہر استاد سے اپنے دفاع اور حفاظت کے لئے یہ فن بھی سیکھا تھا۔ وہ اس فن کی بدولت خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی دو تین غنڈوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس وقت ایک بار پھر ان دونوں آدمیوں کو دیکھ کر اس کے سینے میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی تھی۔

نائلہ گاڑی کے اوپر سے گھوم کر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور کن انکھیوں سے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں اشارت کر دیا۔ گاڑی جیسے ہی آگے بڑھی اس نے ان دونوں آدمیوں کو بھی ایک سفید ٹیوٹا کار کی طرف لپکتے ہوئے دیکھا تھا۔

نائلہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ وہ دونوں آدمی کون تھے۔ باپ کی چھوڑی ہوئی کروڑوں کی جائیداد کی وجہ سے اس کی کچھ خاندانی رقابتیں بھی چل رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے یہ دونوں غنڈے بھی اسی چکر میں اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہوں۔

نائلہ اب بار بار عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ سفید ٹیوٹا پر سوار وہ دونوں آدمی مسلسل اس کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ فردوس سنیما کے سامنے سے گزر کر نائلہ نے گاڑی کا رخ شیخ زید کے محل کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ جب یہ محل تغیر ہوا تھا تو اس وقت شہر اور محل کے درمیان ایک طویل دیرانہ تھا۔ لیکن پھر اس طرف کا علاقہ بھی بتدریج آباد ہوتا چلا گیا۔ ایک وسیع و عریض علاقہ خوبصورت اور عالیشان کٹھنیوں پر مشتمل تھا اور نائلہ کی کوٹھی بھی اسی طرف تھی۔

اس وقت آٹھ بجنے والے تھے۔ نائلہ سوچ رہی تھی کہ راستے میں تندرہ موڑ پر کسی دکان سے کچھ بھل وغیرہ خرید لے لیکن وہ تندرہ موڑ سے ابھی بہت دور متوسط درجے کی آبادی سے گزری رہی تھی کہ پیچھے سے آنے والی سفید ٹیوٹا آگے بڑھ کر اس طرح سامنے آگئی کہ نائلہ کو مجبوراً گاڑی روک لینی پڑی۔

سفید ٹیوٹا پر سوار دونوں غنڈے بڑی پھرتی سے اپنی کار سے اتر کر اس کی گاڑی کے قریب آگئے۔ نیٹ جیم سائیڈ پر اور دوسرا دوسری طرف کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ؟“ ناملہ نے اپنی طرف کھڑے ہوئے آدمی کو گھورا۔

”خاموشی سے نیچے اتر آؤ لڑکی۔ اگر تم نے کسی قسم کی ضد کی تو بلا در بلی گولی مار دوں گا۔“ اس شخص کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیکٹ کی جیب سے پستول نکال لیا تھا جس کا سرخ ناملہ کے سینے کی طرف تھا۔

یہ شخص اتفاق تھا کہ اس وقت سڑک پر کسی قسم کا ٹریفک نہیں تھا اور غالباً یہ موقع دیکھ کر ہی انہوں نے ناملہ کی گاڑی روک لی تھی۔ ناملہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ لوگ اسے اغواء کرنا چاہتے تھے۔ اس نے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ اس دوران اس شخص نے ایک زوردار جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول دیا۔

”خاموشی سے اس کار میں بیٹھ جاؤ۔ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔“ وہ شخص دوبارہ غرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پستول سے آگے کھڑی ہوئی سفید ٹیوٹا کی طرف اشارہ کیا۔

ناملہ اپنی گاڑی کے آگے سے نکل کر سفید ٹیوٹا کے پیچھے سے ہوتی ہوئی آگے بڑھی۔ دوسری طرف والا آدمی اس سے دو قدم آگے تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سفید ٹیوٹا کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ ناملہ کو اس کی گاڑی سے نکالنے والا غنڈہ اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔ ناملہ نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ جبک کر ٹیوٹا میں بیٹھنا چاہتی ہو۔ لیکن اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیک لک لگائی۔ اس کے پیر کی ٹھوکریں پیچھے کھڑے ہوئے آدمی کے بازو پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں اڑتا ہوا دور سڑک پر جا گرا۔ وہ شخص خود بھی لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا تھا۔ اس شخص پر بیک لک لگانے کے ساتھ ہی ناملہ نے سامنے والے شخص پر بھی وار کیا تھا۔ وہ شخص ٹیوٹا کے کھلے ہوئے دروازے کے پیچھے کھڑا تھا۔ ناملہ نے اس کی گردن پر کھڑی پتیلی کا وار کرنا چاہا لیکن ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا۔ وہ شخص کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا۔ لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ ناملہ نے اچھل کر اس پر چلائنگ لگانا چاہی لیکن اس شخص نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا ٹرانگٹر دبا دیا۔ گولی ناملہ کے پیٹ میں لگی۔ اسے یوں لگا جیسے دکھتا ہوا انکار اکھال چیر کر پیٹ کے اندر چلا گیا ہو۔ ناملہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ لیکن گولی کھانے کے بعد وہ گری نہیں۔ آگے کی طرف دوہری ہو گئی۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر تھا جو زخم سے بننے والے خون سے تر ہو رہا تھا۔ پھر ایک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کھول ہوا لادہ اس کے پورے جسم میں پھیلتا جا رہا ہو۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

اس پر فائر کرنے والا شخص پستول ہاتھ میں لئے اس کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ وہ غالباً سوچ رہا تھا کہ گولی کھانے کے بعد ناملہ ڈھیر ہونے ہی والی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ناملہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح ہوا میں اچھلی۔ اس کی فلائنگ لک اس شخص کے سینے پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا پشت کے بل گرا اور قلا بازیاں کھاتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس دوران دوسرا غنڈہ اٹھ کر ناملہ کی طرف لپکا تھا۔ ناملہ نے اسے بھی گردن پر ایک زور دار اسپن لک لگائی۔ وہ شخص بھی کراہتا ہوا الٹ گیا۔ ناملہ اگر کار میں بیٹھ کر فرار ہونے کی کوشش کرتی تو ممکن نہ ہوتا۔ کار کے آگے صرف دو تین فٹ کے فاصلے پر ٹیوٹا کھڑی تھی۔ اپنی کار کو موڑ کر سڑک پر لانے کی کوشش کے دوران وہ دونوں غنڈے اسے پھر گھیر سکتے تھے۔ اس نے سڑک کے بائیں طرف ایک تاریک گلی میں دوڑ لگا دی۔

وہ تیز دوڑتے ہوئے تاریک گلیوں میں دوڑتی رہی۔ اس کے زخم سے خون بہہ رہا تھا اور اس نے ایک ہاتھ سے پیٹ کے زخم کو دبا رکھا تھا۔ اس علاقے میں شاید کبھی کا ایک فیر نہیں تھا۔ بعض گھروں میں روشنی نظر

ری تھی اور بعض تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نائلہ کو اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ پیٹ میں گولی  
نے کے بعد وہ اس طرح کیسے دوڑ رہی تھی۔

اپنے پیچھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں غنڈے  
اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ لیکن قدموں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ اس سے بہت دور تھے۔ نائلہ دوڑتی ہوئی  
گلیوں کے دوسری طرف ایک سائیکل سوار سے ٹکرائی۔ سائیکل سوار گر پڑا تھا۔ اس کے منہ سے غالباً کوئی  
بجلی بھی نکلی تھی۔ مگر نائلہ دوڑتی ہوئی سڑک پار کر کے ایک اور تاریک گلی میں گھس گئی۔

شام کو ہلکی سی بارش ہو جانے سے سڑکوں اور گلیوں میں کچھ دھوپ رہا تھا۔ نائلہ کئی مرتبہ کچھ دھوپ میں پھسل کر  
مڑتے مڑتے پچی تھی۔ ویسے بھی اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ پیٹ کے زخم سے مسلسل خون بہہ  
رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی قوت سلب ہوتی جا رہی ہو۔ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور اب  
وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ یہ گلی آگے جا کر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ اور پھر چند گز آگے جا کر راستہ بند ہو گیا۔  
اس کے سامنے ایک اونچی دیوار تھی۔ نائلہ کی ہمت اب پوری طرح جواب دے چکی تھی۔ وہ دیوار کے  
ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن ٹانگوں میں اب کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ  
نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ اس کے چہرے پر بارش کے چند قطرے پڑے تھے اور اس کے بعد  
اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

اور اب ہوش آیا تو وہ ہسپتال کے اس کمرے میں موجود تھی۔ نائلہ کو حیرت تھی کہ اسے ہسپتال کون  
دیا تھا۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ یہ ہسپتال کا پرائیویٹ روم تھا اور اس  
کی دیکھ بھال کے لئے ایک نرس بھی رکھی گئی ہے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کے خاندان والوں کو پتہ چل گیا  
تھا۔

نائلہ کو یقین تھا کہ اسے اتواء کرائے جانے کی کوشش اور قاتلانہ حملے میں اس کے خاندان ہی کے  
کسی فرد کا ہاتھ تھا۔ وہ کروڑوں کی جائیداد کی انکوائری وارث تھی اور اس کی یہ جائیداد ہتھیانے کے لئے اس  
کے خاندان کے افراد مختلف جھگڑائے استعمال کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ پہلے بھی اس پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا  
جس میں وہ بال بال بچ گئی تھی۔

اگر اس کے خاندان کا کوئی شخص اسے ہسپتال لایا تھا تو وہ اس ہسپتال میں بھی محفوظ نہیں تھی۔ وہ  
کمائیوں میں بھی پڑھ چکی تھی اور بہت سی ایسی فلمیں بھی دیکھی تھیں جن میں زن 'ذر اور زمین کی خاطر  
ہسپتالوں میں بھی ایسی گھٹاؤنی سازشیں کی جاتی تھیں کہ انسانیت کا بھی سر جھک جاتا تھا۔ وہ کروڑوں کی  
جائیداد اور بعض بہت قریبی رشتے داروں کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل تھی۔ وہ جائیداد کے راستے  
میں بہت بڑی رکاوٹ تھی اور وہ اس رکاوٹ کو ہر صورت میں دور کرنا چاہتے تھے۔ اس کے پیٹ میں گولی  
مچی تھی اور وہ اسے ہسپتال لے آئے تھے۔ یہاں بظاہر اسے پرائیویٹ روم میں رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کو اس  
کے بہترین علاج کی ہدایات بھی دی گئی ہوں گی۔ کمرے کے اندر ایک خصوصی نرس کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔  
نرس کو دراصل اس کی نگرانی کے لئے رکھا گیا ہو گا اور نائلہ کو یقین تھا کہ کمرے کے باہر کوئی محافظ بھی  
موجود ہو گا۔

نائلہ کے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ اسے ہسپتال ہی میں موت کے گھاٹ اتارنے کی  
کوشش کی جائے گی۔ وہ زخمی تو تھی ہی۔ پیٹ میں گولی لگی تھی۔ خوش قسمت تھی جو بچ گئی تھی مگر اسے بڑی



آسانی سے موت کی نیند سلایا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر بھی انسان ہی تھے، فرشتے تو نہیں۔ دولت کا لالچ انہیں کبھی کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

نالہ کا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس نے نرس کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی اور اس کے خزانے سنائی دے رہے تھے۔ اس بلڈ والی نیڈل اپنے بازو سے نکال دی۔ ٹیوب سے منسلک نیڈل اسٹینڈ کے ساتھ لٹک کر جھولنے لگی اور اس سے پینکٹ والے خون کے قطرے فرش پر ادھر ادھر گرنے لگے۔

نالہ بڑی آہستگی سے پلنگ سے اٹھ کر نیچے اتر آئی۔ اس کے جسم پر ہسپتال کا لباس تھا اور پیٹ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تکلیف اگرچہ ناقابل برداشت تھی لیکن اس نے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔ وہ نرس کی طرف دیکھتی ہوئی دبے قدموں دروازے کے قریب آگئی اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر بڑی احتیاط سے دائیں بائیں جھانکا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ راہداری کے آخری سرے پر ایک پولیس ہیڈ کانسیٹیل اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والے اس شخص کو بچانے میں نالہ نے کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ اس کے کرن شیردرانی کا ذاتی محافظ اکرم تھا۔ اکرم کو وہ بھی طرح جانتی تھی۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ وہ اپنے مالک کے اشارے پر اب تک تین آدمیوں کی موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ لیکن شیردرانی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ ہیڈ کانسیٹیل اور اکرم سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے مدہم لہجے میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے کمرے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ نالہ نے بڑی آہستگی سے دروازہ بھیر دیا۔ اور کرسی پر خوابیدہ نرس کی طرف دیکھتی ہوئی دبے قدموں عقبی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔

نالہ نے آہستگی سے کھڑکی کھول دی اور باہر جھانکنے لگی۔ عقبی لان میں ابھی تک بٹیاں جل رہی تھیں مگر اس طرف سناٹا تھا۔ وہ چوکھٹ پر دو دنوں ہاتھ جما کر کھڑکی پر چڑھ گئی اور بڑی احتیاط سے دوسری طرف کود گئی۔ کھڑکی پر چڑھنے اور کودنے میں اسے شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے بڑی سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔

اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سردیوں کے موسم میں ویسے بھی صبح دیر سے ہوتی ہے اور اس وقت تو ویسے بھی گرمے بادل چھائے ہوئے تھے اور فضا میں اچھی خاصی تاریکی تھی۔ نالہ کو پیٹ کے زخم میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ گھاس پر تیز تیز قدموں سے چلتی رہی اور بالا آخر عقبی دیوار کے قریب پہنچ گئی۔ یہاں دیوار میں ایک چھوٹا دروازہ تھا جس کا اندر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے کنڈا ہٹا دیا اور باہر نکل گئی۔

ہسپتال کی حدود سے باہر نکلتے ہی وہ دوڑنے لگی۔ اس وقت بڑی شدت کی سردی تھی۔ نالہ کے جسم پر ہسپتال کا ڈریس صرف قیض اور پاجامہ تھا لیکن نہ تو اسے سردی کا احساس ہو رہا تھا اور نہ ہی اندازہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔ وہ تو یہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ نالہ ایک سنان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اس کے زخم سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ سڑک کے کنارے پر پڑی تکلیف سے تڑپتی رہی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ اگر اس کے ہسپتال سے فرار کا پتہ چل گیا تو اس کی تلاش شروع ہو چکی ہوگی اور

وہ ایک بار پھر ان جلاوطنوں کے ہاتھ لگ جائے گی جو علاج کے بہانے اسے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔  
 دفعہ تیسرا ”گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ وہ کوئی ٹانگا تھا جو سڑک پر اسی طرف آرہا تھا۔  
 ٹانگہ نے وہاں سے اٹھ کر کسی جگہ چھپنے کی کوشش کی مگر تکلیف کی وجہ سے اٹھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی  
 اور آہستہ آہستہ ایک طرف گھٹنے لگی۔ ہلکی بارش جاری تھی۔ سڑک پر کچھڑا تھا اور وہ کچھڑیں لت پت تھیں۔  
 ٹانگہ قریب آگیا۔ ٹانگہ سڑک کے کنارے پر تھی۔ یہ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ کسی کو نظر نہ  
 آسکتی۔ ٹانگے والے نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ٹانگہ رک گیا اور کوچوان اتر کر نیچے آگیا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی  
 تھا۔ عمر پچاس باون کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سر کے بال سفید تھے اور دو چار دن کا شیوہ بڑھا ہوا تھا۔ اس نے  
 اپنے جسم پر کمل پیٹ رکھا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹانگہ کے قریب پہنچ گیا۔

”کون ہو بھی تم؟ کوئی گاڑی والا شاید مگر مار کر بھاگ گیا ہے۔ تم زخمی بھی ہو شاید۔۔۔“  
 ”ہاں بابا! میں زخمی ہوں۔ مہم۔۔۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ ٹانگہ کراہی پھر اس نے سختی سے  
 دانت بھینچ لئے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔  
 ”اوہ! تم تو لڑکی ہو۔۔۔“ بوڑھا کوچوان اچھل پڑا۔ ”چلو، میں تمہیں ہسپتال لے چلوں۔ کیا تم اٹھ کر  
 ٹانگے تک چل سکتی ہو۔۔۔“

”نہیں بابا۔“ ٹانگہ کراہی۔ ”مجھے ہسپتال مت لے جانا۔۔۔ وہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔ اگر  
 میری مدد کرنا چاہتے ہو تو مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں کوئی اور نہ مجھے دیکھ سکے۔ میں تمہاری جھولی دولت  
 سے بھر دوں گی۔ مجھے ان انسانی بھیزوں سے بچا لو بابا۔“  
 ”میں سمجھ گیا بیٹی۔۔۔ فکر مت کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔  
 میں تمہیں سہارا دیتا ہوں۔ بس تھوڑی سی ہمت کر لو۔ ٹانگے تک چل لو۔“ بوڑھے کوچوان نے اس کی  
 بانہوں میں ہاتھ ڈال دیا۔

احتیاط سے بابا میرے پیٹ میں گولی لگی ہے۔ زخم پر ٹانگے تازہ ہیں۔“ ٹانگہ نے کراہتے ہوئے کہا۔  
 بوڑھے نے بڑی احتیاط سے اسے سہارا دے کر اسے ٹانگے کی چھچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور پرانا سا کمل  
 اپنے جسم پر سے اتار کر اس کے اوپر ڈال دیا اور ٹانگے کا رخ موڑتے ہوئے بولا۔  
 ”سواری گاڑی تانے والی ہے۔ میں اسٹیشن جا رہا تھا۔ اچھا ہوا تمہیں دیکھ لیا۔ ساری زندگی پیسے ہی  
 کماتا رہا ہوں۔ آج خدا نے ایک نیکی کمانے کا موقع دے دیا ہے۔ نیکی کمانے کے موقع تو زندگی میں کبھی  
 کبھار ہی آتے ہیں۔“ بوڑھا کوچوان خود کھائی کے انداز میں بولا جا رہا تھا۔  
 ٹانگہ چھچھلی سیٹ پر بڑی کراہتی رہی۔ ٹانگے کے جھٹکوں سے اس کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔  
 لیکن وہ یہ تکلیف برداشت کرتی رہی۔

ٹانگہ مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا سنی والا لیل کی طرف آگیا۔ یہاں ٹانگوں کا اڑہ تھا اور یہیں سے بسیں  
 بھی گھر گھر کی طرف جاتی تھیں۔ کچھ دور ایک کچی آبادی تھی۔ بوڑھا ٹانگے کو کچی آبادی میں لے آیا۔ اور  
 مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ٹانگے کو ایک مکان کے سامنے روک لیا۔ یہ گلی کا آخری سرا تھا اور مکان کے  
 سامنے کافی کشادہ جگہ تھی جہاں دو اور ٹانگے کھڑے تھے لیکن ان کے گھوڑے شاید کسی اصطبل میں بندھے  
 ہوئے تھے۔ بوڑھے نے اتر کر مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی  
 یہ عورت تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

”تم واپس کیوں آگئے بابا؟“ عورت کے لمحے میں حیرت بھی تھی اور پریشانی بھی۔

”بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس عورت کو تانگے سے اتارنے میں میری مدد کرو۔ مگر خیال رکھنا یہ زخمی ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔

وہ دونوں نائلہ کو اتار کر مکان کے اندر ایک کمرے میں لے گئے۔ نائلہ پر ڈالا ہوا کمبل بھیک چکا تھا۔ اسے چارپائی پر لٹاتے ہی بوڑھے کی بیٹی نے اسے لحاف اوڑھا دیا۔

”سکینہ بیٹی۔“ بوڑھے نے اسی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بی بی زخمی ہے۔ مجھے سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی۔ میں اسے اٹھا کر گھر لے آیا ہوں۔ سردی نے بھی اس پر اثر کیا ہو گا۔ پتہ نہیں کب سے سڑک پر پڑی بارش میں بھگ رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر کو دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ تم اس کے کپڑے بدل دو اور پھر ایک گلاس گرم گرم دودھ پلا دو اسے۔“ بوڑھے نے کہا۔

”ابا! اگر یہ زخمی تھی تو اسے ہسپتال لے جاتے۔ اٹھا کر گھر کیوں لے آئے ہو۔ ممکن ہے کوئی سنگین معاملہ ہو۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا تو۔۔۔“

”پولیس نے تو کبھی کسی شہری کے اچھے کام کی بھی تعریف نہیں کی بلکہ الٹا شریف اور عزت دار لوگوں کو ہی تھانوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ غنڈے، بد معاش، ڈاکو اور قاتل آزادی سے سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں۔ یہ لڑکی زخمی حالت میں ہسپتال ہی سے بھاگی ہے۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ اتنی شدید زخمی ہونے کے باوجود یہ ہسپتال سے کیوں بھاگی۔ یقیناً یہ جانتی ہو گی کہ ہسپتال میں بھی اس کی زندگی کو خطرہ ہے۔ ہسپتال تو ایسی جگہ ہے جہاں بیماروں کو شفا دی جاتی ہے۔ جاں بلب لوگوں کو زندگی کی نوید سنائی جاتی ہے مگر آج کل تو ہسپتال قتل گاہیں بن چکے ہیں۔ زندگی کی نوید سنانے والے میساجھائی بن گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے یہ لڑکی بے گناہ ہے۔ تم اپنا کام کرو۔ میں دوسرے کمرے میں ہوں۔“

بوڑھا اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ جہاں ایک جھلک سی چارپائی پر میلا سا بستر جوں کا توں پڑا تھا۔ چارپائی کے قریب ہی حقہ بھی رکھا ہوا تھا۔ بوڑھے نے چارپائی پر بیٹھ کر حقے کا کش لگایا۔ حقہ بجھا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے کے ٹوکا پکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ اور اتنی شدید زخمی حالت میں ہسپتال سے کیوں بھاگی ہے۔ کیا ہسپتال میں واقعی اس کی زندگی کو خطرہ تھا؟

تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کی بیٹی سکینہ نے آکر بتایا کہ لڑکی کا لباس تبدیل کر دیا گیا ہے اور وہ بوڑھے سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔

”ابا۔“ سکینہ نے کہا۔ ”میں باورچی خانے میں جا رہی ہوں دودھ گرم کرنے کے لئے۔ تم اندر چل کر بیٹھو۔“

بوڑھا کوچوان اس کمرے سے نکل کر پہلے کمرے میں آگیا۔ زخمی لڑکی لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کے ہسپتال والے گیلے کپڑے کمرے میں الگنی پر ٹنگے ہوئے تھے۔ بوڑھا کوچوان ایک موڑھا کھینچ کر چارپائی کے قریب بیٹھ گیا۔

”میں تمہاری بہت احسان مند ہوں بابا۔“ نائلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کمزور سی آواز میں کہا۔ ”اللہ تمہیں اس نیکی کا صلہ ضرور دے گا۔ مجھے اپنے گھر لا کر تم نے بہت بڑا خطرہ بھی مول لیا ہے۔ میرے دشمن بڑے اثر و رسوخ والے ہیں۔ میرے ہسپتال سے فرار کا راز فاش ہو گیا ہو گا اور ممکن ہے اس وقت

پورے شہر میں میری تلاش ہو رہی ہو۔ اس طرح تمہیں بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”اگر مجھے کوئی خوف ہوتا تو تمہیں اپنے گھر لے کر نہ آتا بیٹی۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”لیکن اپنے بارے میں کچھ بتاؤ، تم کون ہو۔ تمہیں گولی کس نے ماری تھی اور تم ہسپتال سے کیوں بھاگی ہو؟“

”میں عبدالصمد درانی کی بیٹی ہوں بابا۔“ نانکھ نے کہا۔ ”سارا جھگڑا جائیداد کا ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد ان کی ساری جائیداد مجھے ملی ہے مگر میرے بعض قریبی رشتہ دار یہ جائیداد ہتھیانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے وہ مختلف جھگڑے استعمال کر رہے ہیں۔ کل رات میرے کسی رشتہ دار کے دو غنڈوں نے مجھے اغواء کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری مزاحمت پر انہوں نے مجھے گولی مار دی جو میرے پیٹ میں لگی۔ لیکن اس کے باوجود میں وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں تاریک گلیوں میں بڑبڑاتے ہوئے ان کی پہنچ سے دور نکل گئی تھی۔ لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ ہسپتال کس نے پہنچایا۔ میرا آپریشن کر کے گولی پیٹ سے نکال لی گئی۔ لیکن ہوش آنے پر پتہ چلا کہ ہسپتال میں میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ میرے ایک رشتے دار کا گن مین میری نگرانی کے لئے ہسپتال میں موجود تھا۔ ان سے کسی خبر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہو سکتا ہے میرے زخمی ہونے کی آڑ میں وہ کسی ڈاکٹر کو دولت کا لالچ دے کر مجھے موت کی نیند سلائے کی کوشش کرے۔ میری نگرانی کے لئے ایک نرس بھی میرے کمرے میں موجود تھی۔ شاید رات بھر جاگتے رہنے کے بعد وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ میں کمرے کی کھڑکی سے کود کر ہسپتال سے بھاگ نکلی۔ اگر تم مجھے راستے میں نہ مل جاتے تو شاید اب تک میں مر چکی ہوتی یا دوبارہ ان کے ہاتھ لگ جاتی۔ تم نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔“

”نانکی کا مطلب احسان نہیں ہوتا بیٹی۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ اسے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی تھی کہ نانکھ عبدالصمد درانی کی بیٹی تھی۔ وہ درانی فیملی کے بارے میں بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اس خاندان میں جائیداد کے جھگڑے بھی اکثر و بیشتر عوام الناس کا موضوع بحث بنے رہتے تھے۔ عبدالصمد درانی کو تو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ان کی زرعی اراضی گھمگ میں تھی۔ کئی مربع زمین تھی۔ عبدالصمد درانی گھمگ آمدورفت کے لئے سنی والا پل ہی سے گزرتا تھا۔ وہ پھل وغیرہ لینے کے لئے کئی مرتبہ پل کے اڑے پر رک بھی جایا کرتا تھا۔ ان دنوں یہ بوڑھا کوچوان رحمت بھی نانکھ انہی اطراف میں چلایا کرتا تھا۔ سنی والا پل سے ریلوے اسٹیشن اور اسٹیشن سے سنی والا پل۔ یہی اس کا روٹ ہوا کرتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ عبدالصمد درانی کو دیکھا تھا اور جب وہ پھل وغیرہ لینے کے لئے اڑے پر رکا کرتا تھا تو بہت سے لوگ اسے گھیر لیا کرتے تھے۔ رحمت نے بھی کئی مرتبہ آگے بڑھ کر اسے سلام بھی کیا تھا۔ عبدالصمد درانی بہت نیک دل اور ہمدرد انسان تھا۔ اس کی نیکیوں کے انکشافات تو اس کی حادثاتی موت کے بعد ہوئے تھے۔ ہزاروں لوگ اس کی موت کی خبر سن کر دھاڑیں مار مار کر روئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے گھروں کے چولے عبدالصمد درانی کے دم کرم ہی سے جلنے لگے۔

”میں تمہارے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں بیٹی۔“ بوڑھے کوچوان رحمت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت نیک اور ہمدرد انسان تھے۔ میں بھی ان کے ایک احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔ میرا داماد پولیس کی حراست میں تھا۔ میں خود بیمار تھا۔ گھر میں فاقے ہو رہے تھے۔ اس موقع پر درانی صاحب ہی نے ہماری مدد کی۔ میری بیوی کو پانچ ہزار روپے نقد رقم دینے کے علاوہ دو مہینے کا راشن بھی ڈلوایا۔ اللہ کا

شکر ہے کہ اس نے مجھے درانی صاحب کی بیٹی کی خدمت کا موقع دیا ہے۔ تم مجھے اس معاملے میں پیچھے نہیں پاؤ گی بیٹی۔ مجھے حکم دو کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“

”تم بہت ہمدرد اور نیک دل ہو باا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہاں میری موجودگی کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ڈر ہے کہ اس بھاگ دوڑ میں میرا زخم نہ بگڑ جائے۔ ڈاکٹر احمد ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے۔ اس کا کلینک صادق بازار کے بالکل آخر میں سامنے والی گلی میں ہے۔ کلینک کی نشانی یہ ہے کہ دروازے کے سامنے اونچا تھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کلینک کے دروازے تک پہنچنے کے لئے تھڑے کی چار پانچ میڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ ڈاکٹر احمد کی رہائش بھی کلینک کے اوپر ہی ہے۔ اوپر جانے کا راستہ کلینک کے دروازے کے بالکل ساتھ ہے۔ تم ابھی وہاں چلے جاؤ۔ اسے بتانا کہ نائلہ درانی شدید زخمی ہے۔ وہ فوراً تمہارے ساتھ آجائے گا۔ لیکن اسے یہ بھی بتادینا کہ کسی کو اس معاملے کی ہوا تک نہیں لگنی چاہئے۔“

”تم مطمئن رہو بیٹی۔ میں ڈاکٹر صاحب کو اس طرح یہاں لاؤں گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔“ بوڑھے رحمت نے جواب دیا۔

اس دوران سیکنہ گلاس میں گرم گرم دودھ لے آئی۔ اس نے دودھ کا گلاس ایک سالخورہ سی کافی ٹیبل پر رکھ دیا اور دو تکتے دیوار کی طرف پلنگ پر رکھ دیئے۔ ان دونوں نے بڑی احتیاط سے نائلہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ ٹکیوں کے سارے چارپائی پر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ نائلہ نے دانت بھینچ رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ جب وہ قدرے پرسکون ہوئی تو سیکنہ نے دودھ کا گلاس اٹھالیا اور اپنے ہاتھ سے اسے گھونٹ گھونٹ دودھ پلانے لگی۔

”تم نائلہ بی بی کا خیال رکھنا سیکنہ بیٹی۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔ محلے میں کسی کو نائلہ کی یہاں موجودگی کا پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ بہتر ہو گا کہ باہر والے دروازے کا کنڈا لگا لیتا۔ اول تو اتنی صبح کسی کے آنے کی توقع نہیں لیکن اگر کوئی پڑوسن یا کسی کا بچہ آج بھی جائے تو اسے باہر سے ٹال دینا۔ نائلہ ہمارے ایک محسن عبدالصمد درانی کی بیٹی ہے۔ تمہیں یاد ہے ناکہ پولیس جب تمہارے خاوند کو پکڑ کر لے گئی تھی تو درانی صاحب نے اس موقع پر کس طرح ہماری مدد کی تھی۔ نائلہ بیٹی کی حفاظت اور دیکھ بھال ہمارا فرض ہے۔ تم خیال سے رہنا میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔“

رحمت دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سیکنہ نے دودھ کا گلاس نائلہ کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود بھی رحمت کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی۔

سیکنہ کا رخ دروازے ہی کی طرف تھا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھنے لگی۔ دن کی روشنی پھیل چکی تھی لیکن آسمان پر گرے بادل تھے اور ہلکی ہلکی بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ اس کمرے کے آگے برآمدہ اور اس سے آگے ایک کشادہ صحن تھا۔ صحن کچا تھا اور بارش کا پانی جمع ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سیکنہ واپس آگئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر دودھ کا گلاس لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”نہیں رہنے دو۔ میں خود ہی پی لوں گی۔“ نائلہ نے کہا اور چند لمحوں بعد بولی۔ ”تمہارے بچے کہاں ہیں۔ کوئی نظر نہیں آ رہا۔ شاید دوسرے کمرے میں سو رہے ہوں گے؟“

”میرا کوئی بچہ نہیں ہے نائلہ بی بی۔ بے اولاد ہوں۔ کوکھ جلی۔“ سیکنہ نے افسردہ سے لہجے میں جواب

”اوہ! نائلہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہارا خاوند کہاں ہے؟ کیا وہ بھی تانگہ چلاتا ہے؟“  
 ”قادر کو تو تین سال پہلے پولیس نے تھانے میں تشدد کر کے مار ڈالا تھا۔ پھر اس کی لاش باہر سڑک پر  
 پھینک کر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور کہا کہ اس نے پولیس کی حراست سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔  
 پچیس مقابلے میں مارا گیا۔“ سیکنہ نے بتایا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔  
 ”اوہ! مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچا۔ میں نے تمہارے پرانے زخم تازہ کر دیے۔  
 سین قصہ کیا تھا؟ پولیس نے تمہارے شوہر کو کیوں پکڑا تھا؟“ نائلہ نے کہا۔

”وہ بھی ابا کی طرح تانگہ چلاتا تھا۔ ایک دن شر کا کوئی امیر آدمی اپنی بیٹی کے جیز کے لئے کراچی سے  
 زیورات اور کچھ اور قیمتی چیزیں خرید کر لایا تھا۔ وہ ٹرین سے اتر کر اسٹیشن کے باہر دیر تک کھڑا اپنی گاڑی کا  
 انتظار کرتا رہا۔ لیکن اس کے گھر والوں کو اس کا بھیجا ہوا ٹیلی گرام نہیں مل سکا تھا۔ اس لئے اس کے گھر  
 سے کوئی لینے کے لئے اسٹیشن پر نہیں آ سکا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے تانگہ اسٹینڈ پر اس وقت تین چار تانگے  
 بی رہ گئے تھے۔ جن میں قادر کا تانگہ بھی تھا۔ اس شخص نے پہلے قادر سے بات کی لیکن وہ بھاڑہ کم دے رہا  
 تھا اور قادر نے انکا کر دیا۔ وہ آدمی کسی اور تانگہ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کے دو تین گھنٹے کے بعد پولیس  
 والے قادر اور تین چار دوسرے تانگے والوں کو پکڑ کر لے گئے۔ تھانے پہنچ کر پتا چلا کہ کراچی سے آنے والا  
 شر کا وہ امیر آدمی تانگے میں اپنا وہ سوٹ کیس بھول گیا تھا جس میں زیورات اور قیمتی ملبوسات تھے۔ قادر کی  
 بیٹی موچھوں کی وجہ سے اس شخص کو قادر کا چہرہ یاد رہ گیا تھا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ سوار کسی اور کے  
 تانگے پر ہوا تھا۔ اس نے دو کوچوانوں پر شبہ ظاہر کیا جن میں ایک قادر بھی تھا۔ دوسرے کوچوان کی بھی بڑی  
 بڑی موچھیں تھیں۔

”پولیس والے پورا دن ان دونوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر مار پیٹ کرتے اور ان سے پوچھ گچھ کرتے  
 رہے۔ شام کو دوسرے تانگے والے کو تو ایک بڑے آدمی کی سفارش پر چھوڑ دیا گیا لیکن ہمارے پاس نہ کوئی  
 سفارش تھی اور نہ ہی پیسے کہ پولیس کو رشوت دی جاتی۔ بہر حال جو کچھ تھا وہ ہم پولیس کی نذر گر پٹے تھے  
 لیکن پولیس نے پھر بھی قادر کو نہیں چھوڑا۔ وہ اس پر تشدد کرتے اور گشددہ سوٹ کیس کے بارے میں پوچھتے  
 رہے۔ اس امیر آدمی نے پولیس کو اچھا خاصا چڑھا دیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق سوٹ کیس میں ڈھالی  
 لاکھ روپے کے زیورات اور تقریباً پچاس ہزار کی ساڑھیاں اور دیگر ملبوسات تھے۔ وہ ہر قیمت پر اپنا سوٹ  
 کیس واپس لینا چاہتا تھا۔

”بیس روز گزر گئے۔ پولیس نے قادر پر تشدد اور بربریت کی انتہا کر دی تھی۔ سوٹ کیس اس کے  
 پاس ہوتا تو وہ بتاتا۔ وہ تو اس شخص کو اپنے تانگے پر لے کر ہی نہیں گیا تھا۔ مگر اس امیر آدمی کے اثر و رسوخ  
 کی وجہ سے پولیس قادر کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔

”پولیس والے ابا کو بھی پریشان کر رہے تھے۔ مجھے اور اماں کو بھی تنگ کیا جا رہا تھا۔ آئے دن تھانے  
 لے جا کر فجر سے شام تک بھوکا پیاسا بٹھائے رکھا جاتا۔ اور مجھ سے تو ایسے شرمناک سوالات کئے جاتے  
 جنہیں زبان پر لاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ ابا شدید بیمار ہو گئے تھے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی تھا وہ پولیس  
 کو دے چکے تھے۔ مگر میں کھانے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ نوبت قاتوں تک آگئی تھی۔ پھر کسی ہمدرد نے مشورہ دیا  
 کہ آپ کے والد عبدالصمد درانی صاحب سے ملا جائے۔ وہ انسان دوست، غریب پرور اور ہمدرد آدمی ہیں

اس معاملہ میں ضرور ہماری مدد کریں گے۔ درانی صاحب ان دنوں گھر گ میں تھے۔ اپنی زمینوں پر، اماں ایک آدمی کو لے کر ان کے پاس پہنچ گئی۔ اور رو رو کر سارا قصہ بیان کیا۔ درانی صاحب بڑی ہمدردی سے پیش آئے۔ انہوں نے فوری طور پر اماں کو پانچ ہزار روپے دیئے اور قادر کے معاملے میں بھی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن درانی صاحب خود ہمارے گھر آئے۔ وہ ہمارے لئے پورے مہینے کا راشن لے کر آئے تھے۔ وہ ہمیں قادر کے معاملے میں تسلی دے کر چلے گئے۔

”اسی روز پولیس والے ایک بار بھرا باکو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ پولیس والے اس بات پر ناراض تھے کہ ہم نے بات درانی صاحب تک کیوں پہنچائی تھی۔ اس روز خلاف معمول ابا کو مارا پیٹا تو نہیں گیا لیکن انہیں برا بھلا بت کہا گیا۔

”اور پھر اسی رات ان خالموں نے قادر پر اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گیا۔ اس کی لاش باہر پھینک کر گولیوں سے چھلنی کر دی اور کہا کہ اس نے پولیس کی حراست سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ بھاگتے ہوئے اس نے ایک کانٹھیل کی رائفل بھی چھین لی تھی۔ پولیس نے اسے دوبارہ گرفتار کرنا چاہا تو اس نے گولی چلا دی۔ اس طرح وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ مگر...

”پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا کہ قادر کی موت تشدد سے واقع ہوئی تھی اور گولیاں اس کی موت کے آدھے گھنٹے بعد ماری گئی تھیں کیونکہ گولیاں گلنے سے اس کے جسم سے نکلنے والے خون کی مقدار نہ ہونے کے برابر تھی۔ پولیس کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ انہوں نے عدالت کی اجازت کے بغیر قادر کو اپنی تحویل میں رکھا تھا اور اس پر تشدد کرتے رہے تھے۔ پولیس نے تو قادر کو عدالت میں پیش تک نہیں کیا تھا۔ جب سے پکڑا تھا اس وقت سے آخر تک تھانے ہی میں رکھا تھا۔

”میری درخواست پر پولیس کے خلاف عدالت میں کیس دائر کیا گیا۔ بعض پولیس والوں کو معطل کر کے گرفتار بھی کر لیا گیا۔ لیکن ہمیں پولیس کی طرف سے مسلسل دھمکیاں ملتی رہیں کہ ہم اپنا کیس واپس لے لیں۔ اس دوران اماں کا انتقال ہو گیا۔ انہیں قادر کی موت کا بہت صدمہ پہنچا تھا۔ اور یہ صدمہ ہی ان کی موت کا باعث بنا، ابا بھی بہت عرصہ بیمار رہے پھر جب سنبھلے تو انہوں نے دوبارہ تانکھ چلانا شروع کر دیا۔“

”اور کیس کا کیا بنا؟“ تانکھ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”مقدمہ عدالت میں چلتا رہا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ درانی صاحب اس معاملے میں ہماری پشت پناہی کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے وکیل کا بندوبست بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ لیکن تقریباً ایک سال بعد درانی صاحب ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے انتقال کے بعد صورت حال بتدریج تبدیل ہونے لگی۔ وکیل نے مقدمے میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ وہ اکثر پیشیوں پر غائب رہنے لگا۔ اور بالا خرہ عدم پیروی کی بناء پر ہمارا کیس خارج کر دیا گیا۔ زیر حراست پولیس والوں نے ہمارا مقدمہ خارج ہوتے ہی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے عدالت میں ایک نئی درخواست دے دی۔ قادر کی لاش کو قبر سے نکال کر دوبارہ پوسٹ مارٹم بھی کیا گیا۔ اس مرتبہ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر دوسرے تھے۔ انہوں نے نئی رپورٹ عدالت میں پیش کی کہ قادر کی موت گولیاں گلنے سے واقع ہوئی تھی۔ اس طرح پولیس یہ ثابت کرنے میں ثابت ہو گئی کہ قادر نے پولیس کی حراست سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ پولیس والے معصوم اور بے گناہ ثابت ہوئے اور انہیں ان کی نوکریوں پر بحال کر دیا گیا۔ وہی سب

انپکڑ جس نے میرے شوہر پر سب سے زیادہ تشدد کیا تھا۔ انپکڑ کے عہدے پر ترقی پا کر آج اسی تھانے کا ایس ایچ او ہے۔“

”تمہاری کمائی سن کرو واقعی بڑا دکھ ہوا۔“ نائلہ نے کہا۔ اس نے دودھ کا خالی گلاس سیکینہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”کاش! ہمارے ملک کی پولیس ڈاکوؤں اور قاتلوں کی پشت پناہی کرنے کی بجائے عوام کی محافظ بن کر ہی رہتی۔ اب مجھے لانا دو سیکینہ... زخم میں تکلیف ہونے لگی ہے۔“

سیکینہ نے بڑے احتیاط سے نائلہ کو لٹا کر اس پر حلف درست کر دیا نائلہ ایک بہت بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ اب تو وہ خود مالک و مختار تھی۔ کیا کیا عیش میسر نہیں ہوں گے اسے اپنے گھر میں۔ اور اب وہ زخمی حالت میں کبھی بہتی کے ایک ایسے گھر میں پناہ لئے ہوئے بھی جہاں صرف غربت ہی کا راج تھا۔ اپنے اوپر میلا سا حلف دیکھ کر وہ نچانے کیا سوچ رہی ہوگی۔

نائلہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ہسپتال سے فرار ہو کر اچھا ہی کیا تھا۔ اگر وہ ہسپتال ہی میں رہتی اور انپکڑ کو یہ پتہ چل جاتا کہ نائلہ اسی عبدالصمد درانی کی بیٹی ہے جس نے قادر کی پشت پناہی کرتے ہوئے اس کے خلاف عدالت میں کیس کروایا تھا بلکہ اسے معطل کر کے قادر کے قتل کے الزام میں گرفتار بھی کر دیا تھا۔ وہ ضمانت پر رہا تو ہو گیا تھا لیکن اس عرصہ کے دوران وہ ذہنی اذیت کا شکار رہا تھا۔ وہ تو محض اتفاق تھا کہ عبدالصمد درانی کا ر کے حادثہ میں جاں بحق ہو گیا تھا اور قادر کی بیوی کی پشت پر وہ قوت ختم ہو گئی تھی جو اسے قادر کے قتل کے جرم میں پھانسی کے تحت پر بھی پہنچا سکتی تھی۔ اگر عبدالصمد درانی اس معاملے میں مداخلت نہ کرتا تو اسے ان اذیت وہ مراحل سے نہ گزرنا پڑتا۔ وہ اپنی اس بے عزتی کا انتقام نائلہ سے لے سکتا تھا۔ گو کہ ہسپتال کی رابرداری میں شبیر درانی کے ذاتی محافظ کو دیکھ کر نائلہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اسے شبیر کی سرپرستی حاصل تھی مگر پولیس انپکڑ اپنی دردی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس ملک کا یہی تو المیہ تھا۔ پولیس کے حکم میں لوگ ملک و قوم اور عوام کی خدمت کا جذبہ لے کر نہیں، ناجائز دولت کمائے کی ہوس لے کر آتے تھے۔ نائلہ کو اب بھی اندیشہ تھا کہ ہسپتال سے فرار کے بعد ممکن ہے انپکڑ اس کے خلاف کسی اور قسم کی کارروائی کرنے کی کوشش کرے۔

نائلہ ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ باہر کا دروازہ کھٹکٹانے کی آواز سنائی دی۔ سیکینہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ چند منٹ بعد بوڑھا رحمت ڈاکٹر احمد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ رحمت، ڈاکٹر کو اس طرح لے کر آیا تھا کہ محلے میں بھی اگر کسی نے دیکھا ہو گا تو اسے شبہ تک نہیں ہوا ہو گا کہ وہ کوئی ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر احمد نے ایک میلے سے تھیس کی بیکل ماری ہوئی تھی۔ سر پر ادنیٰ ٹوپی بھی اس طرح اوڑھی گئی تھی کہ اس کے چہرے کا بھی زیادہ حصہ چھپ گیا تھا۔ ڈاکٹر احمد کا میڈیکل کٹ بیک بوڑھے برکت نے اپنے کبل میں چھپا رکھا تھا۔

سیکینہ دوسرے کمرے سے ایک کرسی اٹھا لائی اور میز پر رکھی ہوئی چپرس ہٹا دیں۔ رحمت نے بیک میز پر رکھ دیا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر نائلہ کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ آئی۔ جبکہ ڈاکٹر احمد کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔

”یہ سب کیسے ہوا“ ان بڑے میاں نے بتایا تھا کہ تمہیں پیٹ میں گولی لگی ہے۔ اور تم ہسپتال سے بھاگ کر آئی ہو؟“ ڈاکٹر احمد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چہرے پر سفید اور کالے بالوں پر مشتمل گول داڑھی اسے بڑی بھلی لگی رہی تھی۔



”قسمت تھی جو بچ گئی ورنہ ان لوگوں نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ نائلہ نے جواب دیا اور پھر شروع سے تمام واقعات کی تفصیل بتانے لگی۔  
 ”وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟“ ڈاکٹر احمد نے پوچھا۔

”میرے خاندانی دشمنوں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”تایا ابا کے بارے میں آپ جانتے ہیں۔ وہ سپریم کورٹ میں بیٹج کر کیس ہار گئے تھے اور عدالت عظمیٰ نے زمین پر ہمارا قبضہ تسلیم کر لیا تھا۔ تایا ابا کو دو مربع زمین ہاتھ سے نکلنے کا جو دکھ ہوا ہوگا اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک مرتبہ پہلے بھی مجھ پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے جس میں میں بال بال بچ گئی تھی۔ میرا اندازہ اب بھی یہی ہے کہ میرا تعاقب کرنے والے وہ دونوں غنڈے تایا ابا ہی کے کرائے کے غنڈے تھے۔ جنہوں نے اغواء میں ناکام ہونے پر مجھے گولی مار دی۔ لیکن گولی لگنے کے باوجود میں ان کے ہاتھ لگنے سے بچ نکل۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے ہسپتال کس نے پہنچایا تھا لیکن ہسپتال کی رابڈاری میں شبیر درانی کے ذاتی محافظ کو دیکھ کر مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ اس معاملے میں اس کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ شبیر کے بارے میں میرا یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس نے آج تک کوئی ایسی حرکت تو نہیں کی جس سے اس کے بارے میں شبہات پیدا ہو سکیں۔ لیکن اس کی والدہ یعنی ہماری چھو بھی بھی ہماری جائیداد ہتھیانے کے لئے مختلف جھکنڈے استعمال کرتی رہی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال جب میں لاہور میں تھی تو چھو بھی نے ہمارے سے مجھے یہاں بلایا تھا اور زبردستی شبیر سے میری شادی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں گھر سے بھاگ کر تقریباً ایک ہفتہ اپنی ایک سہیلی کے گھر میں چھپی رہی تھی۔“

”میں سب جانتا ہوں۔ تمہارے یہ خاندانی معاملات واقعی بے حد پیچیدہ اور سمجھیر ہیں۔ اور افسوسناک بات تو یہ ہے کہ تم اکیلی ہو۔ تمہارے خاندان کا کوئی مرد ایسا نہیں ہے جو بے لوث ہو کر تمہارا ساتھ دے سکے۔ ہر شخص کی نظریں تمہاری جائیداد پر لگی ہوئی ہیں۔ تم ان کے لئے سونے کی چڑیا ہو اور ہر شخص سونے کی اس چڑیا کو اپنے فحش میں بند کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال، یہ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ پہلے میں دیکھوں کہ گولی کہاں لگی ہے اور زخم کیسا ہے؟ ویسے مجھے شدید حیرت ہو رہی ہے کہ آپریشن کے بعد ہوش میں آتے ہی تم ہسپتال سے بھاگ نکلیں اور اس وقت بالکل ہوش و حواس میں ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔“ ڈاکٹر کہتے ہوئے اپنا بیگ کھولنے لگا۔

”میں بہت سخت جان ہوں ڈاکٹر۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”اپنے دشمنوں کے ہاتھوں اس طرح آسانی سے نہیں مروں گی۔“

ڈاکٹر نے بوڑھے رحمت اور سیکنڈ کو اشارہ کیا، وہ اس کا مطلب سمجھ کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ رحمت نے البتہ جاتے ہوئے اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ آواز دے لے۔ باہر جاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھول کر مختلف چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ ان میں اسپرٹ کی ایک بوتل، روٹی کا بنڈن، کچھ ادویات، ڈسپوزیبل سرنج اور انسجکشن وغیرہ شامل تھے۔ اس نے تمام چیزیں نکالنے کے بعد کرسی چھوڑ دی اور چارپائی کے قریب جھک کر پہلے نائلہ پر بڑا ہوا لحاف ہٹایا پھر فیض اور انھادی۔

بینڈج ناف کے قریب ندرے بائیں طرف تھی۔ بینڈج سرخ ہو رہی تھی۔ نائلہ نے آنکھیں بند کر لیں اور ڈاکٹر احمد پٹی کھولنے لگا۔

”حیرت انگیز!“ پٹی کھولنے کے بعد اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اس بوڑھے نے جو کمائی سناٹی تھی تم نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ لیکن مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آپریشن کے چند گھنٹے بعد اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود زخم کے اسنجز بالکل ٹھیک ہیں۔ جبکہ میرے خیال میں زخم دوبارہ کھل جانا چاہئے تھا۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں بڑی سخت جان ہوں اور اپنے دشمنوں کے ہاتھوں آسانی سے نہیں مروں گی۔“ نائلہ نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

”زخم زیادہ بڑا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے گولی آسانی سے نکال لی گئی تھی۔ اس بھاگ دوڑ میں زخم سے خون ضرور رسا ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم بے پناہ قوت ارادی کی مالک ہو۔ انشاء اللہ چند روز میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔ اس دوران البتہ تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہوگی۔“

ڈاکٹر احمد کہتے ہوئے اسپرٹ سے اس کا زخم صاف کرنے لگا۔ پھر دوا وغیرہ لگا کر بندبج کر دی۔ اور قیض درست کر کے اسے سینے تک لٹاف اوڑھا دیا اور انجکشن تیار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ڈاکٹر دے کر رحمت اور سیکنہ کو اندر بلا لیا تھا۔

”کچھ کھایا ہے یا خالی پیٹ ہو؟“ ڈاکٹر نے نائلہ سے پوچھا۔

”سیکنہ نے تھوڑی دیر پہلے زبردستی ایک گلاس دودھ پلا دیا تھا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”میں یہ انجکشن لگا رہا ہوں۔ انجکشن کا خطرہ ٹل جائے گا اور زخم بھی جلدی خشک ہونے لگے گا۔ کچھ گولیاں بھی دے دوں گا۔ انہیں باقاعدگی سے استعمال کرنا ہوگا۔ تھوڑا بہت نمیر پیچ ہو سکتا ہے لیکن پریشانی کی ضرورت نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”سر بہت بھاری ہو رہا ہے۔“ نائلہ نے بتایا۔

”وہ تو ہوگا۔“ ڈاکٹر احمد نے جواب دیا۔ ”انسٹیمپیا کا اثر ہے۔ اصولی طور پر ہوش میں آنے کے بعد تمہیں چند گھنٹے بستر دراز رہنا چاہئے تاہم اگر تم نے فوراً ہی ہائی پمپ اور لانگ پمپ کے مظاہرے شروع کر دیئے۔“

نائلہ مسکرا دی۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا اور کچھ نیپلس نکال کر سیکنہ اور رحمت کو سمجھانے لگا کہ ہر چھ گھنٹے بعد یہ گولیاں اور کیپسول کس طرح استعمال کرانے ہوں گے۔ جب وہ اپنی چیزیں سنبھال رہا تھا تو نائلہ نے کہا۔

”آپ کو میرا ایک اور کام کرنا ہوگا ڈاکٹر۔“

”ضرور۔۔۔ کہو کیا بات ہے؟“ ڈاکٹر فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مجھے یقین ہے کہ پورے شرم میں میری تلاش ہو رہی ہوگی۔ ایسی صورت حال میں میرے بینک کاؤنٹ سے پیسے نکلوانا یا اپنے منیجر سے منگوانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ رحمت ابھی آپ کو چھوڑنے بائے تو اسے کچھ رقم دے دیجئے۔ آپ سے کچھ مانگتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے نا؟“ نائلہ نے کہا۔

”کیوں شرمندہ کرتی ہو بیٹی۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا ہی تو ہے۔ تم شاید بھول گئی ہو کہ جب تم چھوٹی تھیں اور میں گھر پر تمہارے والد مرحوم سے ملنے آیا کرتا تھا تو تم میری جیب سے زبردستی چوکیٹ اور ٹافیاں نکال لیا کرتی تھیں۔“ ڈاکٹر مسکرا دیا۔ ”بہر حال“ میں فوری طور پر پانچ ہزار روپے بھیج دے گا۔ کل تمہیں دیکھنے آؤں گا تو مزید رقم لیتا آؤں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دواؤں کے استعمال کے ساتھ خوراک اور آرام کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ خوراک بہت نرم استعمال کی جائے گی۔ سوپ

وغیرہ زیادہ استعمال کرو۔“

”ٹھیک ہے، میں ان ہدایات کا خیال رکھوں گی۔“ نائلہ نے کہا اور پھر رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب تمہیں پیسے دیں گے۔ واپسی پر سوپ کے لئے مرغی وغیرہ لیتے آنا۔ اور ڈاکٹر صاحب!“ وہ ایک بار پھر ڈاکٹر احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ ”یہاں آمد و رفت کے لئے آج والا طریقہ ہی اختیار کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے صبح کی بجائے رات دس بجے کے بعد کا وقت اختیار کیا جائے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے یہ لوگ بھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔“

”مطمئن رہو بیٹی۔ میں یہاں آمد و رفت میں محتاط رہوں گا۔“ ڈاکٹر احمد نے بیک بند کرتے ہوئے کہا۔

رحمت نے کبل اوڑھ کر بیک کو کبل میں چھپا لیا۔ ڈاکٹر احمد نے بھی ٹھیکس کی ہکل مار کر سربراہی ٹوپی پہن کر اس طرح نیچے کھینچ لیا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ کر رہ گیا۔ ان دونوں کے پیچھے ہی سکیئر بھی گئی تھی جو باہر والے دروازے کا کنڈا لگا کر واپس آگئی اور نائلہ کو گولیوں کی پہلی خوراک کھلانے لگی۔ دوا کھانے کے بعد نائلہ سکیئر سے باتیں کرنے لگی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اوجھنے لگی۔ سکیئر خاموشی سے اٹھ کر گھر کے کاسوں میں مصروف ہو گئی۔

بوڑھے رحمت کو اس مرتبہ واپسی میں تقریباً دو گھنٹے لگے۔ وہ مرغی وغیرہ لے آیا تھا۔ سکیئر فوراً ہی سوپ چڑھانے کی تیاری کرنے لگی۔ ان کی آوازیں سن کر نائلہ بھی جاگ گئی۔ رحمت نے جو رقم سودا سلف کی خرید پر استعمال ہوئی تھی، اس کا حساب اور پانچ ہزار میں سے باقی رقم نائلہ کی طرف بڑھا دی۔

”میں اس رقم کو کیا کروں گی۔“ نائلہ بولی۔ ”اسے اپنے ہی پاس رکھو یا سکیئر کو دے دو۔ تم لوگوں کو اخراجات کے لئے تو پیسوں کی ضرورت پڑے گی نا۔“

رحمت اور سکیئر نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور رحمت نے وہ رقم سکیئر کے حوالے کر دی۔

نائلہ کو پہل سنی والا کے قریب کچی آبادی کے اس مکان میں رہتے ہوئے دس بارہ دن ہو چکے تھے۔ اب اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ زخم مندمل ہو رہا تھا اور وہ اٹھ کر چل پھر بھی لیتی تھی۔ اس دوران اس نے ڈاکٹر احمد کے علاوہ اپنی اسٹیٹ کے منیجر عبدالرحمن یا خاندان کے کسی فرد سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ تازہ ترین معلومات کے لئے وہ رحمت کے ذریعے ایک مقامی اخبار منگوا لیتی تھی۔ خبروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے خاندان کے علاوہ مقامی پولیس بھی اسے بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہی تھی۔ جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔

تائید بان رحمت کے گھر آنے کے دوسرے ہی دن ڈاکٹر احمد نے اسے بتایا تھا کہ پولیس نے صادق نامی ایک شخص کے قتل الزام میں نائلہ کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کر لی تھی۔ یہ خبر اخبار میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اخبار کے مطابق صادق نامی وہ شخص نائلہ درانی کے پاس حال ہی میں ملازم ہوا تھا۔ نائلہ نے اسے اپنے ذاتی محافظ کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا اور اسے گمن بھی دی تھی۔ دو روز قبل نائلہ درانی نے صادق کو دس ہزار روپے دیتے ہوئے اسے اپنے نامی کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا مگر صادق نے انکار کر دیا جس پر دونوں میں تلخی پیدا ہو گئی۔ نائلہ نے اپنے محافظ صادق کو گولی مار دی جو اب میں صادق نے بھی گولی چلا دی جو نائلہ درانی کے پیٹ میں لگی۔ نائلہ درانی گولی کھانے کے باوجود وہاں سے بھاگ نکلی اور بالا خرے ہوش ہو کر

ایک جگہ گر پڑی جسے بعض راہگیروں نے اٹھا کر سلطان زید ہسپتال پہنچا دیا جہاں ایک معمولی آپریشن سے اس کے پیٹ سے گولی نکال دی گئی۔

صادق زخمی حالت میں پولیس کی ایک گشتی پارٹی کو ایک سڑک کے کنارے پڑا ہوا ملا تھا جسے سرکاری ہسپتال پہنچا دیا۔ صادق نے مرنے سے پہلے پولیس کو جو بیان دیا تھا اس کے مطابق اسے گولی نالکہ درانی نے ماری تھی۔

ادھر سلطان زید ہسپتال میں ہوش میں آنے کے بعد نالکہ درانی شدید زخمی ہونے کے باوجود ہسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ پولیس اس کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔

اس روز نالکہ یہ خبر پڑھ کر مسکرا دی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اسی حالت میں عدالت میں پیش ہو کر ضمانت قلمی از گرفتاری کروالے اور عدالت کو پولیس اور اپنے خاندان کے بعض افراد کی اس مشترکہ سازش سے آگاہ کرے مگر ڈاکٹر احمد نے اسے روک دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایسی کسی کارروائی کے لئے ابھی مناسب وقت نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ ٹھیک ہوئے تو اس سلسلے میں کوئی مثبت قدم اٹھایا جائے گا۔

اس کچے گھر میں پناہ حاصل کئے ہوئے وہ تیرہواں روز تھا۔ رات کے پونے بارہ بجے تھے۔ ڈاکٹر احمد رحمت کے ساتھ چند سیکنڈ پہلے ہی آیا تھا۔ اب وہ صرف نالکہ کی خیریت ہی معلوم کرنے آتا تھا۔ نالکہ کی پٹی کھل چکی تھی۔ اور زخم پر دوا وغیرہ بھی اب وہ خود ہی لگا لیتی تھی۔

سیکنڈ نے چائے بنا دی۔ وہ سب چائے پی رہے تھے کہ یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے لوگ دیوار چاند کر آگن میں کودے ہوں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ڈاکٹر احمد دروازے کے زیادہ قریب تھا۔ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اسے یوں لگا جیسے منہ پر زور دار ہتھوڑا لگا ہو۔ وہ جیتا ہوا لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

انپکٹر اعظم بڑی پھرتی سے دو کانشیلوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ انپکٹر اعظم کے ہاتھ میں رپوالور تھا اور کانشیلوں کے پاس رائفلیں۔ انہوں نے سب کو رائفلیں کی زد پر لے لیا۔ کچھ مسلح کانشیل آگن میں بھی موجود تھے۔

”کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ بھون دیئے جاؤ گے۔ انپکٹر اعظم خونخوار بھیڑیے کی طرح غرایا۔

ان سب پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔ اور وہ متوحش لگا ہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

...●...●...●...

یہ اسی رات کی بات تھی جب نالکہ درانی سلطان زید ہسپتال کے پرائیویٹ روم سے کھڑکی کے راستے فرار ہوئی تھی۔

رات بھر کی جاگی ہوئی نرس رضیہ عین اس وقت گہری نیند سو گئی تھی جب مریضہ کے ہوش میں آنے کا وقت قریب آرہا تھا۔ رضیہ کی جب آنکھ کھلی تو صبح کے چھ بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے۔ ممکن ہے اس کی آنکھ اس وقت بھی نہ کھلتی لیکن کمرے میں بج بنگلی سی بھر گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھوٹے اس کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ نیند سے کسمپاسے لگی۔ اور پھر پانی کی دو بوتلیں اس کے چہرے پر پڑیں تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اس کی نظر سب سے پہلے کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی تھی جس سے بارش کی چھینٹیں اندر آرہی

تھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ کھڑکی کیسے کھل گئی تھی۔ حالانکہ رات کو وہ بار بار کھڑکی کے سامنے آکر کھڑی ہوتی رہی تھی اور کھڑکی بند تھی۔

دفعۃً نرس رضیہ کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا، وہ تیزی سے پلنگ کی طرف گھوم گئی۔ پلنگ خالی تھا اور نالکہ کمرے میں نہیں تھی۔ رضیہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ نالکہ کہاں گئی؟ یہ ایک سوال اس کے دماغ پر وزنی ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ وہ ہاتھ روم کی طرف دیکھنے لگی۔ ہاتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ پہلے ہاتھ روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی مگر اندر سے جواب نہیں ملا تو اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ ہاتھ روم خالی تھا۔

رضیہ کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شبیر درانی نے محض اس اطلاع پر کہ نالکہ ہسپتال میں ہے اسے ایک ہزار روپیہ انعام دیا تھا اور اس کی ڈیوٹی خاص طور پر نالکہ کے پرائیویٹ روم میں لگوائی تھی۔ مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ نالکہ کی نگرانی کی جائے اور نالکہ جیسے ہی ہوش میں آئے اسے فون پر اطلاع دے دی جائے۔ نالکہ کی حفاظت یا نگرانی کے لئے اس نے اپنا ایک مسلح آدمی بھی ہسپتال بھیج دیا تھا جو پولیس کے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ راہداری میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ درانی خاندان کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ بہت اثر و رسوخ رکھتے تھے اور اس علاقے کے سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ شبیر درانی تو ویسے بھی شکل سے بڑا خوفناک لگتا تھا۔ نالکہ درانی کسی وجہ سے اس کے لئے یقیناً بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اسی لئے تو آدھی رات کو اطلاع ملتے ہی بھاگا آیا تھا۔ اور پھر رات بھر کے لئے نالکہ کی حفاظت یا نگرانی کے علاوہ اس نے یہ پروگرام بھی بنالیا تھا کہ نالکہ کو صبح اپنے گھر لے جائے گا۔ اور گھر پر ہی اسے علین کی تمام سولتیں فراہم کرے گا۔ اس نے رضیہ کو بھی پہلے ہی سے نالکہ کی دیکھ بھال کے لئے بک کر لیا تھا لیکن نالکہ پر اسرار طور پر کمرے سے غائب ہو گئی تھی۔

رضیہ کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ ہوش میں آنے کے فوراً بعد نالکہ کسی سارے کے بغیر بیڈ سے اٹھی کیسے تھی۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی اور گولی آپریشن کے ذریعے نکالی گئی تھی۔ اسے تو کم از کم دو تین دن تک کسی سارے کے بغیر بستر سے ہٹا بھی نہیں چاہئے تھا۔ چہ جائیکہ وہ کمرے ہی سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ انسان تھی یا کوئی مافوق الفطرت ہستی؟ وہ کچھ بھی ہو لیکن یہ طے تھا کہ جب شبیر درانی کو نالکہ کے اس طرح غائب ہونے کا پتہ چلے گا تو رضیہ کو یقین تھا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ پورے جسم پر چیونٹیاں سی ریگیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ اس کی محظوظ الحواس ہی تو تھی کہ وہ نالکہ کی تلاش میں پلنگ کے نیچے اور پلنگ کے قریب پڑے ہوئے میڈیسن کے چھوٹے سے کب بورڈ کے پیچھے بھی جھانک رہی تھی۔ اس نے دوبارہ ہاتھ روم کا دروازہ پوری طرح کھول کر اچھی طرح اندر دیکھا۔ پھر کھڑکی کے قریب آگئی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس بات کا اسے یقین ہو گیا تھا کہ رضیہ اس کھڑکی کے راستے ہی کو در فرار ہوئی تھی۔ مگر یہی تو اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ چند گھنٹے پہلے جس لڑکی کے پیٹ کا آپریشن کر کے گولی نکالی گئی تھی وہ کھڑکی سے کیسے کود سکتی تھی۔

بارش کے چھینٹے رضیہ کے چہرے پر پڑ رہے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور پلنگ کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے میڈیسن کے اندر نہ ٹھس گئی ہو۔ اس کی نظرس اسٹینڈ پر ٹٹکی ہوئی خون کی بوتل اور ٹیوب پر ریگیتی ہوئی نیڈل پر جم گئیں۔ پلنگ کے آس پاس خون کے قطرے فرش پر بکھرے ہوئے تھے جو جم چکے تھے۔ البتہ

سوئی کے مین نیچے خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا اور سوئی سے چپکتے ہوئے خون کے قطرے بدستور نیچے گر رہے تھے۔ بوتل میں ابھی تھوڑا سا خون باقی تھا۔

رضیہ دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور بدحواس سی ہو کر راہداری میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہیڈ کانسٹیبل اور شبیر درانی کا گمن مین کرم داد اس وقت بھی بچہ پر بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے مدہم لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے رضیہ کو دیکھ لیا۔ اس نے گمن مین کرم داد کو اشارہ کیا اور وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آگئے۔

”میریضہ کو ہوش آگیا؟“ یہ سوال ان دونوں نے بیک وقت کیا تھا۔

”نہیں۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ وہ بدحواس لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ نالکھ بی بی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ اس کی حالت بگڑ تو نہیں گئی؟“ گمن مین کرم داد نے کہتے ہوئے کھلے ہوئے دروازے سے کمرے میں دیکھا۔ ہیڈ کمرے میں ایک سائینڈ پر تھا۔ اس لئے وہ باہر سے ہیڈ کو پوری طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”نن... نالکھ کمرے میں نہیں ہے۔“ رضیہ نے رک رک کر کہا۔

”کیا کہا؟ نالکھ کمرے میں نہیں ہے۔ وہ کہاں گئی؟“ کرم داد اسے ایک طرف دھکیلا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ پلنگ خالی تھا۔ اس نے خون کی بوتل سے منسلک ٹیوب اور نیڈل کی طرف دیکھا جس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ پھر وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اور باہر جھانکنے لگا۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے باہر دیکھتا رہا پھر دوڑ کر دوبارہ راہداری میں آگیا۔

”کہاں گئی نالکھ؟ بتاؤ وہ کہاں گئی؟“ کرم داد نے رضیہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا دیا۔

”پہلے... پتہ نہیں۔“ رضیہ ہٹکائی۔ ”میں اسی کو دیکھنے کے لئے باہر نکلی تھی۔“

”وہ کمرے سے باہر نہیں آئی۔ ہم سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر وہ باہر آتی تو ہم اسے ضرور دیکھ لیتے۔“ کرم داد چیخا۔

”حت... تو پھر وہ کھڑکی پھاند کر بھاگی ہوگی۔“ رضیہ نے کہا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ کرم داد دھاڑا۔ ”ایک ایسی لڑکی جس کا چند گھنٹے پہلے پیٹ کا آپریشن ہوا ہو اتنی اونچی کھڑکی پھلانگ کر کیسے جاسکتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم کیا کر رہی تھیں؟“

”مم... میں سو گئی تھی۔ رات بھر جاگتی رہی تھی۔ چار بجے کے قریب آنکھ لگ گئی تھی۔ اور شاید میرے سوتے ہی وہ ہوش میں آگئی تھی اور موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ گئی۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”تلاش کرو اسے۔ وہ زخمی حالت میں زیادہ دور نہیں جاسکتی۔ ہو سکتا ہے ہسپتال ہی میں کسی جگہ موجود ہو۔ تلاش کرو اسے۔ اگر وہ نہ ملی تو شبیر درانی تمہاری کھال کھینچ کر بھس بھروادے گا۔ اور مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ کرم داد نے کہا۔

”اور میری نوکری بھی نہیں بچے گی۔“ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

”نیلی فون کہاں ہے؟“ کرم داد نے پوچھا۔

”راہداری کے آخر میں دائیں طرف مڑ جانا۔ تیسرا کمرہ ڈیوٹی روم ہے۔ ٹیلی فون وہیں ہے۔“ رضیہ

نے اشارے سے بتایا۔ اور خود راہداری کی دوسری طرف مڑ گئی۔  
کانشیل کمرے میں داخل ہو کر کھلی ہوئی کھڑکی سے پچھلی طرف کود گیا اور نائلہ کی تلاش میں بارش  
میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔

چند منٹ کے اندر اندر ہسپتال میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ڈیوٹی پر موجود تمام ڈاکٹر، نرسیں اور دوسرا  
اسٹاف مختلف راہداریوں میں جمع تھے اور جب انہیں پتہ چلا کہ پیٹ کے آپریشن والی مریضہ ہوش میں آنے  
کے بعد اپنے کمرے سے غائب ہو گئی ہے تو سب کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔  
نائلہ کو پورے ہسپتال میں تلاش کیا جا رہا تھا۔ کوئی وارڈ اور پرائیویٹ روم یا کوئی اور کمرہ نہیں چھوڑا  
گیا۔ وارڈز میں بیڈز کے نیچے تک جھانکا گیا۔ گیٹ پر دو چوکیدار موجود تھے۔ ان کا بیان تھا کہ انہوں نے کسی  
فحش روح کو گیٹ سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

گن مین کرم داد بھی شیردرانی کو فون پر نائلہ کی گمشدگی کی اطلاع دینے کے بعد اس تلاش میں شامل  
ہو گیا تھا۔ ہیڈ کانشیل نے بھی تھانے کو نائلہ کی گمشدگی کی اطلاع کر دی تھی۔ ایس ایچ او انسپکٹر اعظم کو گھر  
سے جگا کر یہ اطلاع دی گئی اور وہ بھی جیب پر چند آدمی لے کر ہسپتال پہنچ گیا۔ اس دوران شیردرانی بھی  
آگیا۔ اس کے ساتھ دو گن مین بھی تھے۔ شیردرانی رضیہ سے سوالات کرتا رہا۔ رضیہ بری طرح خوفزدہ  
ہو رہی تھی۔

ایک وارڈ بوائے نے اطلاع دی کہ ہسپتال کے کمپاؤنڈ کی پچھلی دیوار کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا ہے۔  
اب نائلہ کی تلاش ہسپتال کے باہر بھی شروع ہو چکی تھی۔ آٹھ دس آدمی بارش میں بھٹکے ہوئے ادھر ادھر  
سڑکوں پر دوڑتے رہے لیکن نائلہ کا سراغ نہیں ملا۔  
شیردرانی اور انسپکٹر اعظم ڈاکٹرز کے ڈیوٹی روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”حیرت اس بات پر ہے کہ نائلہ بھاگی کیوں وہ زخمی تھی؟ ہوش میں آنے کے بعد اگر اسے پتہ لگ گیا  
تھا کہ وہ ہسپتال میں زیر علاج ہے تو اسے اطمینان ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس نے بھاگنے کو ترجیح کیوں دی؟“  
”میرے ذہن میں اب مختلف شبہات سر ابھار رہے ہیں۔“ انسپکٹر اعظم نے جواب دیا۔ پہلے شبہ تو یہ  
کہ جن غنڈوں نے نائلہ کے اغواء کی کوشش میں ناکام ہو کر اسے گولی مار دی تھی۔ انہیں کسی طرح پتہ چل  
گیا ہو گا کہ نائلہ زندہ ہے اور ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے تو انہیں یہ خوف لاحق ہو گیا ہو گا کہ ہوش میں  
آنے کے بعد نائلہ ان کے بارے میں پولیس کو بتانہ دے۔ اس لئے انہوں نے نائلہ کو اغوا کر لیا۔“

”میرا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا۔“ شیردرانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انہیں ایک زخمی اور بے  
ہوش لڑکی کو ہسپتال سے اٹھا کر لے جانے کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ وہ کھڑکی سے اسے گولی  
مار کر آسانی سے ختم کر کے فرار ہو سکتے تھے۔“

”دوسرا شبہ یہ ہے... آپ میری بات کا برا مت مانیئے۔“ انسپکٹر اعظم نے بات ادھوری چھوڑ کر اس  
کی طرف دیکھا۔ ”ہو سکتا ہے مس نائلہ ہی نے کوئی گینگ بنا رکھا ہو۔ اور اتفاق سے کسی مخالف گینگ سے  
سامنا ہو گیا ہو۔ فائرنگ کے تبادلے میں وہ زخمی ہو گئی۔ اور اس کے آدمیوں کو جب پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں  
ہے تو وہ اسے ہسپتال سے اٹھا کر لے گئے۔“

”کیا احمقانہ بات ہے۔“ شیردرانی نے اسے گھورا۔ ”بات کرنے سے پہلے تم شاید یہ بھول گئے تھے  
کہ نائلہ کس خاندان کی لڑکی ہے۔“

”آپ کو میری بات سے تکلیف پہنچی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر اعظم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں نے تو ایک اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ آج کے اس دور میں کسی بھی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یا اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی دشمن کے آدمیوں نے مس نائلہ کو گولی مار دی ہو اور جب مس نائلہ کے محافظوں کو پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں ہے تو وہ اسے اٹھا کر لے گئے۔“

”ایسا بھی نہیں ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”وہ ایک دلیر لڑکی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی کچھ خاندانی دشمنیاں ہیں مگر اس نے اپنی حفاظت کے لئے کبھی کوئی باڈی گارڈ نہیں رکھا۔ نائلہ کا باپ بھی اس معاملے میں بڑا ضدی تھا۔ ہمیں شاید معلوم نہیں کہ نائلہ عبدالصمد درانی کی بیٹی ہے۔ اور عبدالصمد درانی کو تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”اوہ!“ انسپکٹر اعظم بری طرح چونک گیا۔ عبدالصمد درانی کو بھلا وہ کیسے بھلا سکتا تھا۔ تو یہ نائلہ اس کی بیٹی تھی۔

دن کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل نہ ہوتے تو اچھی روشنی پھیل چکی ہوتی۔ کرم داد اور ہسپتال کے آدمی واپس آگئے تھے۔ نائلہ کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ انہیں حیرت تھی کہ وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔

”تلاش جاری رکھو، وہ زیادہ دور نہیں جاسکتی۔ اسے ہر قیمت پر ملنا چاہئے۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اگر اس کے زخم کے ٹانگے کھل گئے تو اسے بچانا مشکل ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنی کسی دوست کے ہاں پناہ لے لی ہو۔ میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”اور انسپکٹر اعظم۔“ وہ انسپکٹر کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”آپ بھی اپنے طور پر تلاش جاری رکھیے۔ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کرادو اور ہر گاڑی کو چیک کرو۔ اگر نائلہ مل گئی تو تمہیں منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔“

”مجھے انعام کا لالچ نہیں درانی صاحب۔“ انسپکٹر اعظم بولا۔ ”لیکن اب میں نے مس نائلہ کی تلاش کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ میں نے اس کے مرحوم باپ کا ایک پرانا قرض چکانا ہے۔ اور یہ میرے لئے ایک بہترین موقع ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ شبیر درانی نے اسے گھورا۔

”آپ بی الحال نہیں سمجھ سکیں گے۔“ انسپکٹر اعظم نے جواب دیا۔

شبیر درانی واقعی نہیں سمجھا تھا۔ کیونکہ جن دنوں قادر ٹانگے والے کا واقعہ ہوا تھا اسی زمانے میں شبیر درانی تعلیم کے سلسلے میں برطانیہ میں تھا۔ اور ابھی تقریباً آٹھ نومبر پہلے ہی آیا تھا۔ قادر والی بات چونکہ پرانی ہو چکی تھی اس لئے کسی نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ ویسے قادر کوئی اہم شخصیت تو تھا نہیں۔ ایک معمولی تانگہ بان تھا اور عبدالصمد درانی نے اسے بے قصور اور غریب سمجھ کر ہی اس کی مدد کی تھی۔

شبیر درانی ہسپتال سے گھر آیا۔ رات کا بیستر حصہ جاگنے اور نائلہ کے فرار نے اس پر جھنجھلا ہٹ سی ماری کر دی تھی۔ اس نے ملازمہ سے چائے بنوائی اور ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس کی والدہ اوپر کی منزل پر غالباً ابھی تک سو رہی تھی۔ اس نے نہ تو رات کو نائلہ کے زخمی ہونے کی اطلاع دی تھی اور نہ ہی اس کے ہسپتال سے فرار کی خبر اس کو سننے کی جلدی تھی۔

ملازمہ چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے بھی وہ سوچتا رہا کہ نائلہ زخمی حالت میں



کہاں جاسکتی ہے۔ وہ ہسپتال سے بھاگی تھی اور ظاہر ہے وہ کسی دوسرے ہسپتال کا رخ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر سے علاج کرانے کی کوشش کرے۔

شبیر درانی نے اپنے آدمی پورے شہر میں پھیلا دیئے تھے۔ جو شکاری کتوں کی طرح نالہ کی بوسٹ گھنٹے بھر رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ نالہ اپنے بنگلے پر نہیں پہنچی۔ انہوں نے بنگلے کی تلاشی بھی لی تھی مگر ملازمین کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ نالہ کی بعض دوستوں کے ہاں، جن کے پتے شبیر درانی کو معلوم تھے، بھی چیک کیا گیا۔ نالہ ان میں سے کسی کے گھر نہیں پہنچی تھی۔

تمام ہسپتالوں کو بھی احاطہ چیک کر لیا گیا تھا۔ ممکن ہے سلطان زید ہسپتال سے فرار ہونے کے بعد نالہ بے ہوش ہو کر کہیں گر پڑی ہو اور کسی نے اسے سرکاری ہسپتال پہنچا دیا ہو مگر کسی ہسپتال میں ایسا کوئی کیس نہیں آیا تھا۔ اب پرائیویٹ ڈاکٹر رہ گئے تھے۔ شہر میں بیسیوں ڈاکٹر تھے۔ انہیں چیک کرنے کے لئے کئی دن درکار تھے۔ لیکن دفعتاً اسے نالہ کے فیملی ڈاکٹر احمد کا خیال آگیا۔ اس نے ایک آدمی کو فوراً ہی ڈاکٹر احمد کے کلینک کی طرف روانہ کر دیا۔ ہو سکتا ہے نالہ نے وہیں پناہ لی ہو یا کہیں اور پناہ لی ہو اور ڈاکٹر احمد سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیکن ایک گھنٹے بعد اس کے آدمی نے آکر یہ اطلاع دی کہ ڈاکٹر احمد گزشتہ شام ایک ضروری کام سے خانپور گیا تھا اور آج دوپہر تک اس کی واپسی کی توقع ہے۔ اتفاق سے اسپیکٹر اعظم بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔ پہلے اس نے تمام ہسپتالوں کو چیک کرایا اور پھر پرائیویٹ ڈاکٹروں کی فہرست مرتب کرنے کا حکم دیا۔

پولیس کے علاوہ شبیر درانی کے آدمی بھی دن بھر شہر کے مختلف ڈاکٹروں سے معلومات حاصل کرتے رہے۔ لیکن نالہ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی تھی۔ شبیر درانی کا آدمی دو مرتبہ ڈاکٹر احمد کے کلینک پر گیا تھا۔ کلینک صبح نو بجے کھل گیا تھا لیکن صرف کپاؤنڈری تھا جو پچھلی پرچیوں کے مطابق مریضوں کو دوائیں دے رہا تھا۔ کپاؤنڈر نے بھی یہی بتایا کہ ڈاکٹر احمد گزشتہ شام کسی کام کے سلسلے میں خانپور گئے تھے آج وہ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔

دوپہر ایک بجے کے قرب شبیر درانی کے آدمی نے اطلاع دی کہ ڈاکٹر احمد خانپور سے واپس آگیا ہے۔ کلینک اگرچہ اس وقت بند ہو چکا ہے لیکن ڈاکٹر احمد کلینک کے اوپر اپنے رہائشی مکان میں موجود ہے۔ اس اطلاع پر شبیر درانی نے خود ڈاکٹر احمد سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

ڈاکٹر احمد گھر پر موجود تھا۔ شبیر درانی کی آمد کی اطلاع پا کر اس نے درانی کو اوپر ہی بلا لیا۔ نیچے کلینک اگرچہ چھوٹا تھا لیکن اوپر کا رہائشی حصہ خاصا وسیع و عریض تھا کئی رہائشی کمرے تھے۔ اس رہائشی حصے کا ایک زینہ پچھلی گلی میں بھی تھا لیکن اس گلی سے گھر والوں کی آمد و رفت بہت ہی کم ہوتی تھی۔ ڈرائنگ روم بھی خاصا وسیع و عریض تھا۔ اور بڑے سلیقے سے آراستہ تھا۔

شبیر درانی پہلی مرتبہ ڈاکٹر احمد کے گھر آیا تھا۔ یہ ڈاکٹر اگرچہ ان کے گھر کا فیملی ڈاکٹر نہیں تھا لیکن اپنے ماموں عبدالصمد درانی کے ہاں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔

”میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کو اس غریب کی یاد آگئی۔ کئے کیسے زحمت کی درانی صاحب۔ خیریت تو ہے نا؟“ ڈاکٹر احمد نے ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد پوچھا۔

”ہم جیسے لوگوں کے گھروں میں خیریت جیسی چیزوں کا گزر کم ہی ہوتا ہے۔“ شبیر درانی نے مسکراتے

ہوئے جواب دیا۔ ”قصور اس میں دراصل ہمارا ہی ہے۔ ہم لوگوں نے خود ہی اتنے بکھیرے پال رکھے ہیں کہ خیریت جیسی چیزیں ہمارے قریب آتے ہوئے گھبراتی ہے؟“

”یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ کچھ زیادہ ہی مصروف رہتے ہیں۔ اس شہر کے لوگ آپ کے خاندان کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جس کو کوئی تکلیف ہو کسی مدد کی ضرورت ہو وہ آپ ہی لوگوں کے پاس آتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں جہاں گڑ ہو گا وہاں کھیاں ضرور آئیں گی۔ بہر حال، فرمائیے آپ نے کیسے زحمت کی، مجھے بلوایا ہوتا۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ شیردرانی اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”معاملہ کچھ زیادہ ہی گھمبیر ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے خود آنا پڑا۔ گزشتہ رات ہماری ماموں زاد بہن نانکھ کو کسی نے گولی مار دی تھی۔“

”کیا؟“ ڈاکٹر احمد اس طرح اچھلا جیسے یہ خبر پہلی دفعہ سن رہا ہو۔ ”کیا ہوا نانکھ کو۔ کس نے گولی ماری ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ نانکھ کو گولی مارنے والا کون تھا، مگر جس شخص نے نانکھ کو سڑک پر بے ہوش پڑے دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی تھی وہ ابھی تک پولیس کی حراست میں ہے۔ گولی نانکھ کے پیٹ میں لگی تھی۔ اسے سلطان زید ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں آپریشن سے اس کے پیٹ سے گولی نکال دی گئی۔ مجھے رات ایک بجے کے قریب اطلاع ملی تھی۔ میں جب ہسپتال پہنچا تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اس کے لئے پرائیویٹ روم اور ایک نرس کا خاص طور پر بندوبست کروا دیا تھا اور اس کی حفاظت کے لئے اپنا ایک گن من بھی وہاں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن آج صبح جب مجھے اطلاع ملی کہ نانکھ ہسپتال سے غائب ہو چکی ہے۔ پہلے تو اسے ہسپتال میں تلاش کیا جاتا رہا لیکن پتہ نہیں چلا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ پیٹ کا آپریشن ہونے کے بعد ہوش میں آتے ہی نانکھ بستر سے اٹھ کر کہاں جاسکتی تھی۔ حالانکہ اس قسم کا آپریشن ہونے کے بعد کوئی مریض ہوش میں آنے کے گھنٹوں بعد بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔ مگر نانکھ کا معاملہ بالکل ہی مختلف ثابت ہوا ہے۔ اسے پورے شہر میں تلاش کیا جا رہا ہے مگر ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آپ نانکھ کے فیملی ڈاکٹر ہیں ہو سکتا ہے وہ آپ کے پاس آئی ہو۔ وہ زخمی ہے اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔ کوئی طبی امداد نہ ملنے کی صورت میں پیٹ کا زخم اس کے لئے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”نانکھ نے ابھی تک تو مجھ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔ ویسے بھی میں کل شام کو ایک ضروری کام سے خانپور چلا گیا تھا۔ ابھی تقریباً دو گھنٹے پہلے واپس آیا ہوں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نانکھ ہسپتال سے بھاگی کیوں تھی؟ آپ کے کہنے کے مطابق اسے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ ایسی صورت میں تو اسے ہسپتال ہی میں رہنا چاہئے تھا۔“ ڈاکٹر احمد نے کہا۔

”یہی تو حیرت کی بات ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”ایک خیال ذہن میں آتا ہے۔ وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ نانکھ بہت زیادہ خوفزدہ ہو۔ اسے ڈر ہو کہ جن لوگوں نے اسے گولی ماری تھی وہ کہیں ہسپتال بھی نہ پہنچ جائیں۔ شاید اسی خوف سے وہ ہسپتال سے بھاگ گئی ہے۔“

”نانکھ کے بچکے سے معلوم کیا؟“ ڈاکٹر احمد نے پوچھا۔

”وہ اپنے بچکے پر نہیں پہنچی۔ مجھے اس کی جن سیلیوں کے بارے میں معلوم تھا ان سے بھی معلوم

ہو گیا۔ وہ ان میں سے کسی کے ہاں نہیں گئی۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔

”اس کی ایک دو دوستوں کو تو میں جانتا ہوں۔ ان سے بھی معلوم کر لیتا ہوں۔“ ڈاکٹر احمد نے کہتے ہوئے ٹیلی فون اپنی طرف سر کا لیا اور ریسپور اٹھا کر ایک نمبر ملانے لگا اس کے چہرے پر اس قسم کے تاثرات تھے جیسے وہ نالکہ کے سلسلے میں واقعی بہت پریشان ہو۔ آخر وہ نالکہ کا فیملی ڈاکٹر تھا اور اسے اس کی گمشدگی پر پریشانی ہونی ہی چاہئے تھی۔

دو تین جگہوں پر فون کرنے کے بعد اس نے ریسپور رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ مایوسی تھی۔ ”نہیں درانی صاحب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ اپنی کسی دوست کے ہاں نہیں گئی۔“

”اچھا ڈاکٹر صاحب۔ بہت بہت شکریہ۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”اگر نالکہ آپ سے رابطہ کرے تو مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔ میں اس کے لئے بہت پریشان ہوں۔“

”آپ مطمئن رہئے درانی صاحب۔ نالکہ کے بارے میں جیسے ہی کچھ پتہ چلا میں آپ کو فوراً ہی مطلع کر دوں گا۔“ ڈاکٹر احمد نے جواب دیا۔ وہ شبیر درانی کو رخصت کرنے نیچے تک آیا تھا۔ مکان کے دروازے کے سامنے شبیر کا ایک گن مین کھڑا تھا۔ یہ نگلیاں اور بازار چونکہ بہت تنگ تھے اس لئے شبیر درانی کو اپنی گاڑی بہت دور چھوڑنا پڑی تھی۔

جب وہ گاڑی کے پاس پہنچے تو ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ شبیر درانی گاڑی میں بیٹھ گیا اور گن مین ڈرائیور کی تلاش میں ادھر ادھر نظرس دوڑانے لگا۔ ڈرائیور سامنے ایک چھوٹے سے ریسٹورانٹ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شبیر درانی کو گاڑی میں بیٹھے دیکھتے ہی وہ چائے ادھوری چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اس نے دو روپے کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھا اور دوڑتا ہوا گاڑی کی طرف آگیا۔

”کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ گن مین کرم داد نے اپنے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ڈرائیور کو گھورا۔

”چائے پینے چلا گیا تھا۔“ ڈرائیور نے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

آسمان پر اس وقت بھی گہرے بادلی تھے۔ بارش اگرچہ نہیں ہو رہی تھی لیکن ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس جگہ شبیر درانی کی گاڑی کھڑی تھی وہاں سے چند قدم آگے دو ریڑیاں کھڑی تھیں جن پر پرانے کپڑے فروخت ہو رہے تھے۔ ان میں کوٹ بھی تھے، چمڑے کے جیکٹ بھی، سویٹر بھی اور مظرد وغیرہ بھی۔ ریڑیوں کے چاروں طرف رش لگا ہوا تھا اور لوگ کپڑے اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ایک نوجوان ریڑی پر کھڑا حلق پھاڑ پھاڑ کر ”پندرہ روپے... لوٹ لو... پندرہ روپے میں لوٹ لو...“ کے نعرے لگا رہا تھا۔

”کہاں چلوں صاحب؟“ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”گھر گھر!“ شبیر درانی نے کوٹ کی جیب سے گولڈ لیف کا پیکٹ اور ایک خوبصورت لائیسٹر نکالتے ہوئے جواب دیا۔

گاڑی شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی سنی والا پل کی طرف آگئی۔ اور پھر گھر گ کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں بارش کا پانی جمع تھا۔ اس لئے ڈرائیور کو بہت محتاط ہو کر گاڑی چلانا پڑی تھی۔

پچھلی سیٹ پر سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے درانی نالکہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر احمد اس کی آخری امید تھی۔ اسے یقین تھا کہ زخمی نالکہ نے ہسپتال سے فرار ہو کر کہیں پناہ حاصل کرنے کے بعد

طرح کے لئے ڈاکٹر احمد سے ضرور رابطہ کیا ہوگا۔ لیکن اسے یہاں بھی مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن اگر اسے شبہ بھی ہو جاتا کہ ڈاکٹر احمد آج صبح سویرے ہی نائلہ سے مل چکا ہے اور اسے نائلہ کی پناہ گاہ کا علم ہے تو اس کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے وہ ڈاکٹر احمد کی کھال تک ادھیڑ ڈالتا۔

نائلہ، شبیر درانی کے سبکے ماموں کی بیٹی تھی۔ عبدالرحمن درانی اس کا بڑا بھائی تھا۔ نائلہ کے باپ عبدالصمد درانی اور عبدالرحمن درانی میں زرعی اراضی کے معاملے میں کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا۔ اگر زمین کا کوئی معمولی سا ٹکڑا ہوتا تو خون کے رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے شاید دونوں میں سے کوئی ایک بھائی پیچھے ہٹ جاتا۔ مگر معاملہ دو مربیعہ زمین کا تھا۔ جس نے دونوں بھائیوں کا خون سفید کر دیا تھا اور وہ تمام رشتے بھول کر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے۔ خون کے پیاسے ہو گئے تھے ایک دوسرے کے۔ زمین کے اس جھگڑے پر دونوں بھائیوں میں کئی مرتبہ فسادات ہو چکے تھے۔ اور چند برسوں میں دونوں طرف کے کئی آدمی مارے جا چکے تھے۔

زمین کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت تھا۔ اس تنازعہ اراضی میں شبیر کی والدہ کا بھی حصہ تھا مگر وہ اس مقدمے میں فریق نہیں تھی۔ وہ بہت ذہین و فطین عورت تھی۔ وہ محض دو مربیعہ اراضی کے تنازعہ میں الجھنے کے بجائے بہت دور کی سوچ رہی تھی۔ شبیر اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور نائلہ بھی عبدالصمد کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان تنازعہ دو مربیعہ اراضی کے علاوہ شہری جائیداد بھی بے حساب تھی۔ رحیم یار خان شہر میں کئی مکان اور دوکانیں تھیں جو کرائے پر دی ہوئی تھیں۔ لاہور میں گلبرگ، ماڈل ٹاؤن اور شادمان ٹاؤن میں وسیع و عریض عالی شان کوٹھیاں تھیں جن میں سے ایک گلبرگ والی کو بھی ذاتی رہائش کے لئے تھی اور باقی کوٹھیاں کرائے پر دی ہوئی تھیں۔ شبیر کی والدہ حسینہ بیگم کی نظر اپنے بھائی عبدالصمد کی اس ساری جائیداد پر تھی۔ وہ محض دو مربیعہ زمین کے تنازعہ میں الجھ کر اس ساری جائیداد کو نہیں کھوٹنا چاہتی تھی۔ اس نے اس جائیداد کا قبضہ ہونے کے لئے کوئی اور ہی راستہ تلاش کیا تھا۔

حسینہ بیگم کے بڑے بھائی عبدالرحمن درانی کی بھی دو جوان بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا بھی تھا۔ ایک مرتبہ عبدالرحمن کی بیوی نے دبے لفظوں میں خود ہی اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ اس کی ایک بیٹی کا رشتہ شبیر کے لئے لے لے کر وہ بات کو ٹال گئی تھی۔ حسینہ بیگم اپنے بڑے بھائی کے ہاں بیٹے کا رشتہ اس لئے نہیں کرنا چاہتی تھی کہ عبدالرحمن کی جائیداد کا وارث اس کا بیٹا موجود تھا جبکہ عبدالصمد درانی کا نائلہ کے سوا کوئی وارث نہیں تھا۔ عبدالصمد کے بعد ساری جائیداد نائلہ ہی کو ملتی۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کی شادی نائلہ سے کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کے توسط سے ساری جائیداد پر قابض ہو سکے۔

ایک موقع پر وہ بیٹے کا رشتہ لے کر عبدالصمد کے گھر پہنچ بھی گئی تھی۔ مگر عبدالصمد نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ نائلہ ابھی زیر تعلیم ہے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے تو اس کے بعد ہی اس کے رشتے کے بارے میں سوچا جائے گا۔ اور رشتے کے معاملے میں نائلہ کی پسند اور ناپسند کو ترجیح دی جائے گی۔

نائلہ ان دنوں لاہور میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی۔ اور کبھی کبھار رحیم یار خان آتی تھی۔ البتہ بات کے بعد حسینہ بیگم اکثر لاہور جانے لگی۔ لاہور میں اس کا قیام نائلہ ہی کے پاس ہوتا۔ شبیر بھی ماں کی حمایت پر اکثر لاہور آنے جانے لگا تھا۔ وہ بھی نائلہ ہی کی کوشش پر ٹھہرتا۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ نائلہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ نائلہ اس کی بڑی آؤ بھگت کرتی۔ اس کے ساتھ بہت ہی خوش اخلاقی سے پیش آتی۔ مگر شبیر نے محسوس کیا تھا کہ جیون ساتھی کے انتخاب کے سلسلہ میں

نالہ کے خیالات اس سے قطعی مختلف تھے۔ اور ایک موقع پر تو نالہ نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ زندگی بھر کے سفر کے لئے شیر جیسے ہمسفر کو ترجیح نہیں دے سکتی۔

شیر کے ساتھ نالہ کے اس رویے اور اس کی ناپسندیدگی معلوم ہو جانے کے باوجود حسین بیگم نے ہمت نہیں ہاری تھی اور ایک بار پھر بھائی کے سامنے دست سوال دراز کر دیا لیکن اس مرتبہ بھی اسے ٹال دیا گیا۔

حسین بیگم اچھی طرح سمجھتی تھی کہ عبدالصمد درانی نالہ کے رشتے کے معاملے میں ٹال مٹول سے کام کیوں لے رہا تھا۔ اس کے اپنے بیٹے ہی کے گمن کچھ اچھے نہیں تھے۔ شیر کچھ عرصے سے آوارگی کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں میں کچھ ایسے لوگ شامل ہو گئے تھے جنہیں معاشرے میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس نے ایک الگ مکاں بھی لے رکھا تھا اور وہ کبھی کبھار اپنے گھر سے بھی راتوار کو غائب رہنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تو اس کے بارے میں ایک اسکیئنڈل بھی پورے شہر میں مشہور ہو گیا تھا۔ اگر کوئی عام آدمی ایسے واقعہ میں ملوث ہوتا تو عام لوگوں کو شاید اس کا پتہ بھی نہ چلتا۔ لیکن شیر کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جسے پورے علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہیں معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ایسے خاندانوں کے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ اور یہاں تو معاملہ ایک ایسی لڑکی کا تھا جسے شیر درانی کے ساتھی اٹھالائے تھے اور رات بھر اس کے ساتھ زیادتی کرتے رہے تھے۔

یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ حسین بیگم نے لڑکی کے والدین کو کچھ دے دلا کر اور کچھ دھونس دھمکیوں سے خاموش کروا دیا تھا۔ پولیس کے ساتھ بھی مکا ہو گیا تھا۔ لڑکی کے والدین متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ درانی خاندان کے اثر و رسوخ کے بارے میں جانتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ بات کو آگے بڑھانے سے کچھ نہیں ملے گا۔ وہ شریف لوگ تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دو دن بعد ہی وہ لوگ یہ شر چھوڑ کر چلے گئے۔

اس کے بعد بھی شیر درانی کے نام کے حوالے سے چھوٹی چھوٹی باتیں سامنے آتی رہیں اور اس کی آوارگیوں ہی کی وجہ سے عبدالصمد درانی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا تھا۔ زمین کا تنازعہ پریم کورٹ تک پہنچ گیا۔ جہاں سے فیصلہ عبدالصمد درانی کے حق میں ہوا۔ لیکن اس کے چند ہی روز بعد عبدالصمد درانی اور اس کی بیوی ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ یہ حادثہ شہر کی ایک ایسی سڑک پر پیش آیا تھا جہاں زیادہ ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں شام کے وقت اپنی کار پر سوار شہر سے گاؤں جا رہے تھے کہ سنی والا پل کے قریب سامنے سے آنے والے ایک ٹرک نے ان کی کار کو بری طرح کچل دیا۔ ٹرک کار کو گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا تھا۔ اور وہ دونوں میاں بیوی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کی چلی ہوئی لاشیں بڑی مشکل سے کار کے ٹوٹے اور پچکے ہوئے پتھر میں سے نکالی گئی تھیں۔

نالہ ان دونوں کی بوری میں تھی۔ اسے فوراً اس حادثے کی اطلاع دی گئی۔

اپنے ماں باپ کی لاشیں دیکھ کر وہ حواس کھو بیٹھی۔ کئی روز تک ہلکی ہلکی باتیں کرتی رہی۔ اور پھر بتدریج اس کا دماغ معمول پر آتا چلا گیا۔ یوں تو خاندان کا ہر فرد اس سے ہمدردی جتا رہا تھا لیکن حسین پھوپھی اس معاملے پیش پیش تھی۔ چہلم کے بعد تو وہ باقاعدہ نالہ کے ذہن میں یہ ایک بابت بٹھانے کی کوشش کرنے لگی کہ یوں تو سب لوگ اس کے ساتھ ہیں لیکن ایک جوان اور اکیلی لڑکی کے لئے زندگی

مزار نامشکل ہو جاتا ہے اور اب اسے اپنے مستقبل کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔

نامک پھوپھی کی باتوں کو خوب سمجھتی تھی۔ بعض اوقات تو اس کا خون کھول جاتا۔ ابھی تو اس کے ماں باپ کا کفن بھی میلانہیں ہوا تھا۔ ابھی تو وہ مدے سے پوری طرح سنبھلی بھی نہیں تھی اور پھوپھی اسے اپنے بیٹے سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ نامک اچھی طرح سمجھتی تھی کہ پھوپھی کو اس سے ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ کروڑوں کی جائیداد پر قابض ہونا چاہتی تھی جو نامک کا باپ چھوڑ کر مر رہا تھا۔

شہر میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ عبدالصمد درانی اور اس کی بیوی کو ایک باقاعدہ پلانک کے تحت قتل کیا گیا تھا اور اس قتل میں نامک کے تایا عبدالرحمن درانی کا ہاتھ تھا جو مقدمہ ہار کر دو مرتبہ زمین سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ لیکن نامک نے بات کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دو تین مہینے گھر گ رہنے کے بعد نامک لاہور واپس چلی گئی۔ حسینہ بیگم بھی وقتاً فوقتاً اس کے پاس لاہور کے چکر لگاتی رہی۔ تقریباً دس مہینے بعد حسینہ بیگم نے بہانے سے نامک کو لاہور سے بلوالیا۔

نامک اپنے شہر والے بنگلے میں قیام پذیر تھی۔ حسینہ بیگم تقریباً روزانہ ہی وہاں آ رہی تھی۔ وہ نامک کو اپنے بیٹے سے شادی کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن نامک کسی طرح ہاں کرنے کو تیار نہیں تھی۔ بالآخر ایک روز حسینہ بیگم کچھ لوگوں کو لے کر نامک کے بنگلے پر پہنچ گئی۔ ان کے ساتھ قاضی بھی تھا۔ حسینہ بیگم زبردستی شبیر سے نامک کا نکاح کروانا چاہتی تھی مگر نامک موقع پاتے ہی اپنے کمرے کی کھڑکی سے کود کر بھاگ نکلی اور تقریباً ایک ہفتہ تک اپنی ایک سہیلی کے گھر میں چھپی رہی اور پھر لاہور چلی گئی۔ اب اسے یہاں آئے ہوئے تین چار مہینے ہو چکے تھے۔ کبھی وہ گھر گ چلی جاتی اور کبھی شہر والے بنگلے میں آ جاتی۔ اس دوران یہ خوفناک واقعہ رونما ہوا۔

نامک کو اگرچہ شبیر درانی پر بھی شبہ تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس میں شبیر کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ رات ایک بجے جب اسے اطلاع ملی تو وہ فوراً ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی یہ منصوبہ بنالیا تھا کہ اپنی نگرانی میں نامک کا علاج کروائے گا اور اس طرح اس کے قریب رہ کر اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرے مگر نامک نے ہسپتال سے بھاگ کر اس کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا اور اب وہ بالگلوں کی طرح اس کی تلاش میں بھاگا پھر رہا تھا۔ اب وہ گھر گ جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے نامک کسی طرح گاؤں پہنچ گئی ہو۔

شبیر درانی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد تقریباً ڈھائی سو سال پہلے ہجرت کر کے افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ اس قبیلے کے کچھ لوگ لاہور میں آباد ہوئے کچھ دہلی کی طرف چلے گئے اور کچھ ملتان میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ملتان میں آباد ہونے والے درانی قبیلے کے چند افراد رحیم یار خان کی طرف نکل آئے تھے۔ یہ پٹان پہلے تو کاروباری شیعے سے وابستہ رہے پھر کھیتی باڑی کی طرف مائل ہونے لگے۔ اور آہستہ آہستہ زمینوں پر قابض ہوتے چلے گئے۔

اس درانی قبیلے نے یہاں بہت اثر و رسوخ حاصل کیا تھا۔ خود عملی طور پر سیاست میں نہ ہوتے ہوئے بھی علاقے کی سیاست پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اتنا اثر و رسوخ اور دولت ہونے کے باوجود اس خاندان کے کسی فرد کے بارے میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں سنی گئی تھی جسے غیر اخلاقی گردانا جاسکتا۔ پھر جب عبدالصمد درانی اور اس کے بڑے بھائی عبدالرحمن درانی کے مابین دو مرتبہ اراضی کا تنازعہ شروع ہوا تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے دونوں بھائی ایک دوسرے کے خون کے

پہا سے ہو گئے تھے۔ علاقے کے بعض معززین نے ان میں تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ تنازعہ دو مرحلہ اراضی کا ہے۔ اگر وہ ایک ایک مرحلہ لے لیں تو جھگڑا ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن بد قسمتی یہ تھی کہ اس تنازعہ زمین کا ایک حصہ آباد تھا اور دوسرا زیادہ تر بنجر اور ریتیلہ تھا اور دونوں کا دعویٰ تھا کہ اس حصے کو زرخیز اور آباد بنانے میں ان کی ذاتی محنت کا دخل ہے۔ دونوں میں سے ہر کوئی زمین کا زرخیز علاقہ ہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح معاملہ طے نہ ہو سکا اور بات عدالت تک پہنچ گئی۔

کچھ عرصہ پہلے لوگوں نے شبیر درانی کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے کسی آوارہ دوست کے ساتھ کسی لڑکی کو اغوا کر لے گیا تھا۔ دولت اگرچہ سارے عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات تو تھی نہیں جو ڈھکی چھپی رہ سکتی۔ یہ قصہ ہر زبان تک پہنچ گیا تھا۔ اور اب نالکہ کا یہ قصہ... اس کے بارے میں ابھی تک اگرچہ کسی کو پتہ نہیں چلا تھا۔ اخبار میں صرف اتنی سی خبر چھپی تھی کہ کسی نامعلوم عورت کو گولی مار دی گئی تھی جسے ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ اخبار کو یہ خبر پولیس کے ذرائع سے ملی تھی اور اس وقت تک نالکہ کی شناخت نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر اس وقت نالکہ کی شناخت ہو چکی ہوتی تو مختصر خبر کی بجائے پورا اخبار قصے کمانیوں سے بھرا ہوا ہوتا۔ لیکن اب اس کی شناخت ہو گئی تھی۔ اور آنے والے کل کے اخبارات اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھیں وہ کم ہوگا۔

گھر گھر میں شبیر کے ماموں کے علاوہ ان کی اپنی بھی حویلی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد وہ شہر والے مکان میں منتقل ہو گئے تھے اور گاؤں کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ حسینہ بیگم تو پھر بھی گاؤں آتی رہتی تھیں مگر شبیر مہینوں بعد آیا تھا۔

وہ سیدھا اپنی حویلی ہی میں گیا تھا۔ حویلی میں رہنے والے ملازمین اسے دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ اپنی حویلی میں تھوڑی دیر رکنے کے بعد شبیر درانی نالکہ کی حویلی کی طرف چلا گیا۔  
 ”تم لوگوں کو نالکہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“ شبیر درانی نے نالکہ کے ملازم برکت سے پوچھا۔  
 ”آج صبح شہر والے مکان کا نوکر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ نالکہ بی بی رات کو گھر نہیں آئی۔ وہ یہی معلوم کرنے آیا تھا کہ وہ یہاں تو نہیں آگئی۔“ برکت نے جواب دیا۔  
 ”اس کے بارے میں کچھ اور پتہ چلا؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”نہیں جی۔“ برکت نے جواب دیا۔

شبیر درانی وہاں سے نکل کر اپنے بڑے ماموں عبدالرحمن کی حویلی میں آگیا۔ عبدالرحمن درانی حویلی ہی میں موجود تھا۔ اس نے بڑی سرد مہری سے شبیر کا استقبال کیا۔  
 ”نالکہ کے بارے میں کچھ معلوم ہوا آپ کو؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”کیوں... کیا ہوا اسے؟“ عبدالرحمن نے اسے گھورا۔ ”نالکہ کی زیادہ فکر تو تمہاری ماں کو ہونی چاہئے۔ وہ ہر قیمت پر اسے اپنی بیوی بنانا چاہتی ہے۔“

”کل رات کسی نے نالکہ کو گولی مار دی تھی۔“ شبیر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔  
 ”دو غنڈوں نے پہلے اسے اغواء کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہونے کی صورت میں اسے گولی مار کر فرار ہو گئے۔ نالکہ کو زخمی حالت میں سلطان زید ہسپتال لایا گیا۔ لیکن وہ آج صبح ہسپتال سے فرار ہو گئی اور ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے؟“  
 عبدالرحمن درانی کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات ظاہر نہیں ہوئے۔

”میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟ میرا اس معاملہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ عبدالرحمن درانی نے اسے گھورا۔  
 ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس سارے معاملے کے پس منظر میں آپ کا ہاتھ تو نہیں؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”کیا یک رہے ہو؟“ عبدالرحمن دھاڑا۔ ”تم حد سے بڑھ رہے ہو۔“  
 ”نانکھ کے ماں باپ کا حادثہ میں انتقال ہوا تو اس وقت بھی اس قسم کی باتیں سننے میں آئی تھیں کہ وہ خانی حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت انہیں قتل کیا گیا تھا۔ اور اب نانکھ کو قتل کرنے کی کوشش۔ کیا یہ واقعات صرف ایک ہی سمت میں اشارہ نہیں کرتے؟“  
 ”تم شاید پاگل ہو گئے ہو؟“ عبدالرحمن درانی نے اسے گھورا۔ ”میرا عبدالصمد سے زمین کا جھگڑا ضرور تھا لیکن عبدالصمد اور بھاج کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ اور نانکھ سے میری کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میں اسے قتل کیوں کروانے لگا؟“  
 ”اس لئے کہ نانکھ کی موت کے بعد ماموں عبدالصمد کی جائیداد آپ ہی کو ملے گی۔ کیونکہ قانونی طور پر نانکھ کے بعد آپ ہی اس کے وارث بنتے ہیں۔“ شبیر نے کہا۔

”ایسی صورت میں تو تمہاری ماں پر بھی شبہ کیا جاسکتا ہے۔“ عبدالرحمن درانی نے کہا۔ ”حسینہ بیگم کو عبدالصمد کی جائیداد کی سب سے زیادہ فکر ہے۔ وہ کئی مرتبہ نانکھ سے تمہارے رشتے کی کوشش کر چکی ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مایوس ہو کر اس نے نانکھ کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہو۔ کیونکہ نانکھ کے بعد عبدالصمد کی وراثت میں میرے ساتھ تمہاری ماں کا نام بھی آتا ہے۔ اس لئے ایسی کوئی بات سامنے آئی ہے جو اس میں میرے ساتھ تمہاری ماں حسینہ بیگم اور خود تمہارا نام بھی آئے گا۔ اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی بات منہ سے نکالنے سے پہلے سوچ لینا چاہئے۔“  
 شبیر درانی لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی صورت میں اس کی ماں اور خود اس پر بھی الزام آسکتا ہے۔

”معاف کیجئے بڑے ماموں۔“ شبیر پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”نانکھ کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ اور ہسپتال سے اس کی گمشدگی نے میرا ذہن ماؤف کر رکھا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکال گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔“

”سب کچھ بھول کر نانکھ کو تلاش کرو۔“ عبدالرحمن درانی نے کہا۔ ”اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ مجھے نانکھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اگر زمین کے مسئلے پر اس کے باپ سے کوئی اختلاف تھا تو وہ اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو چکا ہے۔ جاؤ نانکھ کو تلاش کرو اور اپنی زبان پر قابو رکھو۔“  
 شبیر درانی کچھ اور سوچ کر یہاں آیا تھا لیکن یہاں صورت حال یکسر بدل گئی تھی۔ بڑے ماموں سے ملاقات کے بعد وہ گھر گئے واپس آگیا۔

نانکھ والا معاملہ الجھتا جا رہا تھا۔ شہر کا کوئی ڈاکٹریا ایسی کوئی جگہ نہیں چھوڑی گئی تھی جہاں اسے تلاش کیا جاسکے۔ یہ جو گھر لگتا تھا جیسے نانکھ کو زمین کھا گئی ہو یا آسمان نے اچک لیا ہو۔

شہر کے نانکھ کی گمشدگی کا افسوس اس لئے بھی تھا کہ وہ اس سے شادی کر کے اس کی جائیداد پر قابض ہو جاتا۔ لیکن نانکھ نے شادی سے انکار کر کے ان دونوں کی



امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اور اب نائلہ کی گمشدگی نے معاملے کو مزید گھمبیر بنا دیا تھا۔

نائلہ کو اغواء کرانے کی کوشش اور اس پر قاتلانہ حملے کی ذمہ داری قبول کرنے سے عبدالرحمن نے انکار کر دیا تھا اور اب شبیر درانی سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے وہ کوئی عام غنڈے ہی ہوں جو نائلہ کو اغواء کر چاہتے ہوں مگر ناکام ہو کر اسے گولی مار کر فرار ہو گئے۔

شبیر درانی نے دن کا زیادہ حصہ اس مکان میں گزارا تھا جو اس نے اپنی عیاشیوں کے لئے کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہ یہاں بیٹھا نائلہ کے سلسلے میں اپنے آدمیوں سے رپورٹس وصول کرتا رہا لیکن دن بھر کی کوششوں کے بعد بھی نائلہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔

شام کو جب وہ گھر پہنچا تو ڈرائنگ روم میں اپنی ماں حسینہ بیگم کے ساتھ اپنے بڑے ماموں عبدالرحمن درانی اور پولیس انسپکٹر اعظم کو بیٹھے دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے دیکھ کر عبدالرحمن درانی کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ آگئی تھی۔

”اچھا ہوا“ تم میری موجودگی ہی میں آ گئے۔ تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔ بیٹھو۔ اس طرح کھڑے حیرت سے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟“ عبدالرحمن نے شبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے اب اجازت دیجئے درانی صاحب۔“ انسپکٹر اعظم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں بھی جانا ہے۔ ایک دو دن بعد آپ سے ملاقات کروں گا۔“ انسپکٹر اعظم رخصت ہو گیا۔

شبیر درانی ماں کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”انسپکٹر اعظم یہاں کیوں آیا تھا؟ نائلہ کے بارے میں کوئی اطلاع؟“ شبیر نے کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ ماں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم نے نائلہ کے بارے میں ایک اور پروگرام بنایا ہے۔ اس کی تفصیل تم اپنے ماموں سے پوچھ لو۔“

شبیر سوالیہ نگاہوں سے عبدالرحمن درانی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چند منٹ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے شبیر کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنا پروگرام سمجھانے لگا۔

”کیا ایک بے گناہ آدمی کو مروانا ضروری ہے؟“ شبیر اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”اس کے بغیر بھی تو منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ مثلاً نائلہ پر کوئی اور سنگین الزام بھی عائد کیا جاسکتا ہے۔“

”قتل سے زیادہ سنگین اور کیا الزام ہو سکتا ہے۔“ عبدالرحمن درانی نے جواب دیا۔ ”ہم جیسے لوگوں کے لئے کسی معمولی آدمی کی زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اور پھر جس آدمی کو اس سلسلہ میں قربانی کا بکرا بنایا جائے گا۔ اس کے گھر والوں کو امداد کے بہانے ایک معقول رقم بھی ادا کر دی جائے گی۔ اب مسئلہ صرف نائلہ کی تلاش کا ہے۔ اسے تلاش کرو۔ مجھے ڈاکٹر احمد پر شبہ ہے۔ وہ نائلہ کا فیملی ڈاکٹر ہے۔ عبدالصمد کائنک خوار ہے۔ ہو سکتا ہے اسے نائلہ کے بارے میں علم ہو اور وہی اس کا علاج بھی کر رہا ہو۔“

”میں نے آج دوپہری ڈاکٹر احمد سے ملاقات کی تھی۔ بقول اس کے وہ نائلہ کے بارے میں بالکل لاعلم ہے۔ اسے اٹھانہ لیا جائے۔ وہ مرل سا آدمی ہے تھوڑی سی سختی کی جائے گی تو سب کچھ بتا دے گا۔“

شبیر درانی نے کہا۔

”نہیں، یہ حماقت مت کرنا۔“ عبدالرحمن درانی نے کہا۔ ”ڈاکٹر کو اٹھا لینے سے نائلہ کو پتہ چل جائے گا اور ممکن ہے وہ اپنا ٹھکانہ بدل دے۔ بہتر ہو گا کہ اس کی نگرانی کی جائے۔ اس طرح اس کے ذریعے

ہم نالکہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں تلاش کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے۔ میں نے بھی اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش پر لگا دیا ہے۔ تم بھی اپنی کوشش جاری رکھو۔“

”میں کل ہی سے ڈاکٹر احمد کی نگرانی شروع کر دیتا ہوں۔“ شبیر نے جواب دیا۔

وہ دیر تک اس منصوبے پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد عبدالرحمن درانی گاؤں واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حسینہ بیگم دیر تک شبیر کو سمجھاتی رہیں اور پھر شبیر اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ وہ رات دیر تک جاگتا رہا اور اس منصوبے پر غور کرتا رہا۔ اس کی ماں اور ماموں نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ بلاشبہ بہت شاندار تھا۔ اگر ان کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو نالکہ اور اس کی ساری جائیداد ان کے قبضے میں آجائے گی۔ منصوبہ ناکام ہونے کی صورت میں بھی ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ منصوبے کی کامیابی کی صورت میں وہ دو مریضہ اراضی عبدالرحمن کے حوالے کرنا ہوگی جو عبدالصمد کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ لیکن نالکہ کی دوسری زرعی زمین اور شہری جائیداد کے مقابلے میں یہ دو مریضہ اراضی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اگر وہ اسے دو مریضہ نہ بھی دیتا چاہے تو عبدالرحمن درانی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

شبیر درانی صبح سو کر اٹھا تو دس بج رہے تھے۔ سائینڈ ٹیبل پر پانی کا گلاس، چائے کے کپ کے علاوہ آج کا اخبار بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ عام طور پر اس وقت اٹھا کرتا تھا۔ ملازمہ چائے وغیرہ رکھنے کے سلسلے میں اسے جگا کر بھی گئی تھی۔ شبیر پانی کا گلاس لے کر ہاتھ روم کی طرف چلا گیا۔ کلی کر کے واپس آیا بیڈ پر تلنے کے سارے نیم دراز بیٹھ کر اس نے چائے کا کپ اٹھالیا۔ ایک گھونٹ بھرنے کے بعد دوسرے ہاتھ سے اس نے اخبار بھی اٹھالیا۔ اور پھر پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ خبر اس اخبار نے ہیڈ لائن کے طور پر شائع کی تھی۔

”نالکہ درانی اپنے نئے محافظ کو قتل کر کے فرار ہو گئی“

شبیر درانی چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے پوری خبر پڑھنے لگا۔ اخبار نے یہ خبر پولیس کے ذرائع سے شائع کی تھی۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق نالکہ درانی نے حال ہی میں صادق نامی ایک شخص کو اپنے محافظ کے طور پر ملازم رکھا تھا۔ پروسوں شام اس نے صادق کو دس ہزار روپے دیئے اور اس کے ساتھ ہی اسے حکم دیا کہ وہ اس کے تایا عبدالرحمن کو قتل کر دے۔ لیکن صادق نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ جس پر دونوں میں تلخ کلامی ہوئی اور نالکہ نے ہسپتال نکال کر صادق کو گولی مار دی۔ جواب میں صادق نے بھی گولی چلا دی جو نالکہ درانی کے پیٹ میں لگی۔ یہ واقعہ ایک ویران سڑک پر پیش آیا تھا۔ نالکہ درانی پیٹ میں گولی لگنے کے بعد وہاں سے بھاگ نکلی اور ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بعض لوگوں نے اسے اٹھا کر سلطان زید ہسپتال پہنچا دیا۔ زخمی صادق بھی پولیس کی عیشی پارٹی کو مل گیا جسے سرکاری ہسپتال پہنچا دیا۔

سلطان زید ہسپتال میں نالکہ کے پیٹ سے گولی نکال لی گئی لیکن رات کے آخری پہر نالکہ درانی ہوش میں آنے کے بعد زخمی حالت میں ہسپتال سے فرار ہو گئی۔ اور زخمی صادق طویل بے ہوشی کے بعد کل رات ہوش میں آیا تو اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بتایا کہ نالکہ درانی اس سے اپنے تایا کو قتل کر دینا چاہتی تھی جس کے لئے اس نے دس ہزار روپے بھی دیئے تھے مگر صادق کے انکار پر نالکہ نے اسے گولی مار دی جس کے جواب میں صادق کو بھی نالکہ پر گولی چلانا پڑی۔

رپورٹر کے مطابق ہوش میں آنے کے ایک گھنٹے بعد صادق نے دم توڑ دیا۔ اس کے بعد بیان کی روشنی

میں پولیس نے نائلہ درانی کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا ہے اور نائلہ درانی کو سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا ہے۔

شہید درانی نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ ان کے منصوبے کا ایک مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ صادق وہی سائیکل سوار تھا جس نے نائلہ کے بارے میں پولیس کو اطلاع دی تھی اور پولیس نے اسے تھانے میں روک لیا تھا۔ اور اب اس کو قربانی کا کبکرا بنایا گیا تھا۔ اس کا انتخاب اس لئے بھی کیا گیا تھا کہ وہ نچلے طبقہ کا آدمی تھا۔ کوئی اس کے لئے شور مچانے والا نہیں ہوگا۔ ہمدردی کے طور پر اس کی بیوی اور بچوں کو ایک معقول رقم دے دی جائے گی اور وہ رو دھو کر خاموش ہو جائیں گے اور اس طرح یہ معاملہ پیس پر ختم ہو جائے گا۔

شہید درانی نے اپنی تماشہ توجہ نائلہ کی تلاش پر مبذول کر رکھی تھی۔ اس کے جو دوست اس کی دولت پر عیش کرتے رہے تھے وہ بھی شکاری کتوں کی طرح ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ صادق آباد اور خانپور تک آدمی پھیلادینے گئے تھے۔ نائلہ کی زخمی حالت کے پیش نظر توقع نہیں تھی کہ وہ شہر سے باہر جا سکی ہوگی لیکن وہ کسی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے شہر کے گرد و نواح میں بھی ہر اس جگہ تلاش کیا جا رہا تھا جہاں اس کے روپوش ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا۔

دو آدمی ڈاکٹر احمد کی عمرانی پر بھی لگا دیئے گئے تھے۔ ڈاکٹر احمد کے کلینک کے عین سامنے صادق بازار میں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا جو رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔ وہاں سے ڈاکٹر احمد کا کلینک، مکان کا دروازہ اور اوپر ایک رہائشی کمرے کی کھڑکی صاف نظر آتی تھی۔ ایک آدمی دن کے وقت اس ریسٹورنٹ میں بیٹھا کھینٹ اور مکان کی عمرانی کرتا اور دو سرائات کو اس وقت تک بیٹھا تھا جب تک یہ ریسٹورنٹ کھلا رہتا۔ رات کو عمرانی کرنے والے نے گیارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر کو ہمیشہ اس کھڑے کی کھڑکی میں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر کے جسم پر ہمیشہ بنیان ہی نظر آتی تھی جس سے عمرانی کرنے والے کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی تھی کہ وہ کمرہ ڈاکٹر کی خوابگاہ تھا اور اس وقت شاید وہ سوئے کی تیاری کیا کرتا تھا۔

وہ نائلہ کی گمشدگی کا دسواں دن تھا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر عمرانی کرنے والے نے رات گیارہ بجے ڈاکٹر احمد کو حسب معمول کمرے کی کھڑکی میں دیکھا تھا اور پھر جتنی جتنی تھی۔ لیکن ایک بجے کے قریب عمرانی کرنے والا بازار کی آخری گلی سے ایک آدمی کو نکلنے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ شخص ڈاکٹر احمد کے کلینک سے ملحق مکان کے دروازے کے سامنے رکا تھا۔ یہاں بجلی کے کھمبے پر شب بھی جلی بھا تھا۔ وہ شخص کھیل اوڑھے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ڈاکٹر احمد تھا جس نے ہاتھ کھینچ کر سے نکال کر دروازے کی بیل بجائی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ڈاکٹر احمد اندر چلا گیا۔

عمرانی کرنے والا حیران تھا کہ ڈاکٹر احمد اس وقت کہاں سے آیا تھا اور وہ گھر سے گیا کب تھا۔ حالانکہ عمرانی کرنے والا ایک لمحہ کو بھی وہاں سے نہیں ہٹا تھا اور اس نے ڈاکٹر احمد کو گھر سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ دفعہ ایک اور خیر کے تحت وہ اچھل پڑا۔ کس بجلی گلی میں تو اس مکان کا دروازہ نہیں تھا۔

وہ ریسٹورنٹ سے اٹھ کر بجلی گلی میں آیا تو اس کا خیال درست نکلا۔ بجلی گلی میں ڈاکٹر کے مکان کے زینے کا دروازہ تھا۔

شہید درانی نے عقی گلی کی بھی عمرانی شروع کرادی۔ اس کے خدشات درست نکلے۔ رات سو گیارہ بجے ڈاکٹر احمد کھیل اوڑھے عقی گلی والے دروازے سے نکلا کچھ دور تک پیدل چلا رہا اور گلیوں سے باہر

ہر ایک تانگے پر سوار ہو گیا جو غالباً اسی کا بھڑکا تھا۔

گمرانی کرنے والے نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک مکان کے سامنے ایک سائیکل کھڑی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سائیکل لے اڑا اور اس طرح تانگے کا قلاب شروع ہو گیا کہ ڈاکٹر احمد کو شبہ تک نہ ہو سکا کہ اس کا قلاب کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر احمد سنی والا پل کے قریب کچی آبادی کے جس مکان میں گیا تھا وہ شبیر درانی کی نظروں میں آگیا۔ گلے دو دن اس تحقیق میں گزرے کہ نالکہ درانی واقعی اس مکان میں موجود تھی یا نہیں۔ اور جب اس مکان میں نالکہ کی موجودگی کی تصدیق ہو گئی تو پروگرام کے مطابق نالکہ درانی، ڈاکٹر احمد اور رحمت کو گرفتار لے لیا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے ہی انسپٹر اعظم نے دو تین اخباری رپورٹوں کو فون کر کے تھانہ بلالیا اور نالکہ درانی اور ڈاکٹر احمد کی ڈرامائی گرفتاری کی تفصیلات بتائے لگا۔

صبح شائع ہونے والے اخبارات نے نالکہ درانی کی گرفتاری کی خبر شہر سرخیوں سے شائع کی تھی۔ جبکہ اخبارات کے پہلے صفحے انہی کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ نالکہ، ڈاکٹر احمد اور رحمت وغیرہ کی تصویریں بھی شائع کی گئی تھیں۔ اور نالکہ درانی کے لئے پراسرار قاتلہ اور نجانے کیا کیا سنسنی خیز الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔

ان اخبارات میں نالکہ درانی کا بھی ایک چھوٹا سا بیان شائع ہوا تھا جس میں پولیس کی طرف سے اس پر عائد کئے جانے والے الزامات کی تردید کی گئی تھی اور اسے اپنے خلاف ایک گھناؤنی سازش قرار دیا گیا تھا۔ لیکن ان شہر سرخیوں کے ساتھ نالکہ درانی کا یہ مختصر سا بیان کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

چالان مکمل ہونے میں پانچ دن لگے۔ اس دوران نالکہ درانی کو اپنے وکیل سے ملاقات کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ پانچویں دن نالکہ اور ڈاکٹر احمد وغیرہ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ اسی روز نالکہ کے وکیل نے بھی نالکہ سے ملاقات کے لئے اجازت کی درخواست عدالت میں پیش کر دی۔

عدالت میں نالکہ درانی کو اس پر عائد الزامات کی فہرست آگاہ کیا گیا۔ نالکہ نے ہر جرم سے انکار کر دیا اور ہر الزام کی تردید کرتی رہی۔ عدالت نے طرمان کو اگلے دن پیش کرنے کا حکم دے کر انہیں جیل بھیج دیا اس روز وکیل نے جیل میں نالکہ درانی اور ڈاکٹر احمد وغیرہ سے ملاقات کی اور وکالت نامہ پر ان کے دستخط کروائے۔

اگلے روز صبح سات بجے پولیس کی گاڑی نالکہ درانی اور دیگر طرمان کو عدالت میں پیش کرنے کی لئے جیل سے نکلی۔ اس گاڑی میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی قیدی نہیں تھا۔ آج کی پیشی پر نالکہ کا وکیل عدالت میں یہ درخواست بھی پیش کرنے والا تھا کہ زخمی حالت کے پیش نظر نالکہ درانی کو جیل کی بجائے ہسپتال میں رکھا جائے اور اس کی معزز حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے بہتر سہولتیں فراہم کی جائیں۔

پولیس کی گاڑی بکھری سے تقریباً نصف میل دور ایک سڑک کا موڑ گھومی ہی تھی کہ اچانک ہی بغیر نمبر کی ایک کار نے پولیس کی گاڑی کا راستہ روک لیا۔ چار نقاب پوش ایس ایچ جی سب مشین گنز سنبھالے بیٹھ پھرتی سے کار سے اترے اور اندھا دھند پولیس کی گاڑی پر فائرنگ شروع کر دی۔

فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ پولیس گاڑی کی وینڈ اسکرین اور ڈرائیور کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ گاڑی بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ اور نقاب پوش سب مشین گنزوں سے پولیس کی

گاڑی پر اندھا دھند فائرنگ کرتے رہے۔

...●...●...●...

فائرنگ بہت شدید تھی۔

پولیس کی گاڑی کا ڈرائیور تو فوراً ہی چھٹی ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا اسسٹنٹ سب انسپکٹر پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ ایک دم بدحواس ہو گیا تھا۔ گاڑی بے قابو ہو کر درخت سے ٹکرائی تو اس کا سر بھی بدل گیا تھا۔ اے ایس ٹی بھی جیسے ہوش میں آ گیا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے چلاؤنگ لگا دی۔ وہ بولسٹر میں اڑسا ہوا ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے حواس اس قدر محض ہو رہے تھے کہ بولسٹر کا بٹن ہی اس سے نہیں کھل رہا تھا۔ ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بولسٹر سے ریوالور نکالنے میں کامیاب ہو پاتا ایک نقاب پوش کی رائفل سے نکلنے والی گولیاں نے اسے بھی چھتی کر دیا۔ وہ نیچے گر کر ترپنے لگا۔ اس کے زخموں سے بننے والا خون زمین پر پھیلے گا۔

پولیس کی یہ گاڑی دراصل ایک موبائل دین تھی۔ حالانکہ جیل سے عدالت تک قیدیوں کو لانے سے جانے کے لئے بند گاڑیاں ہوتی ہیں۔ لیکن اس روز عدالت میں پیش کئے جانے والے قیدیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے نائٹہ درانی، ڈاکٹر احمد اور بوڑھے نائٹہ بان رحمت کو عدالت لے جانے کے لئے انسپکٹر اعظم نے خاص طور پر اس موبائل دین کا انتظام کیا تھا۔

اس موبائل دین کے چھپلے حصے میں آنے والے دو لمبی سیٹیں تھیں، ایک سیٹ پر دو پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں گھٹنوں میں چسکا کر کھڑی کر رکھی تھیں۔ سامنے والی سیٹ پر نائٹہ درانی، ڈاکٹر احمد اور بوڑھا رحمت بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں کے ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

فائرنگ شروع ہوتے ہی پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں پولیس والے بھی بدحواس ہو گئے تھے۔ اور یہ ان کی بدحواسی تھی کہ انہوں نے رائفلیں اٹھا کر گاڑی کے باہر کے رخ پر فائرنگ شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں چند گز پیچھے چوراہے پر سے گزرنے والا ایک سائیکل سوار ان کی فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ اسے دو گولیاں لگیں اور وہ سائیکل سمیت سڑک پر گر کر ترپنے لگا۔

میران پولیس والوں کو زندگی نے زیادہ مہلت نہیں دی۔ انہوں نے ایک حماقت یہ بھی کی کہ انہوں نے گاڑی سے چلاؤنگ لگا دی تھی۔ اس طرح وہ حملہ آور نقاب پوشوں کی فائرنگ کی زد میں آ گئے۔

بوڑھا نائٹہ بان رحمت سیٹ پر شروع ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر احمد تھا۔ رحمت؛ بائیں اور ڈاکٹر احمد کا بائیں ہاتھ ایک ہی ہتھکڑی میں جکڑا ہوا تھا۔ سیٹ کے آخری سرے پر نائٹہ درانی تھے۔ اسے ایک ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ ہتھکڑیوں کی زنجیریں سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں پولیس والوں نے قہر رکھی تھیں۔ مردین پر حملہ ہوتے ہی انہوں نے ہتھکڑیوں کی زنجیریں چھوڑ کر رائفلیں سنبھال لی تھیں۔ اور پولیس والے جیسے ہی دین سے کودے بوڑھے رحمت نے بھی نیچے چلاؤنگ لگا دی۔ ڈاکٹر احمد بھی اس کے ساتھ ہی دین سے گرا تھا۔ لیکن اس کا ایک پیر سیٹ کے نیچے پھنس گیا اور وہ دین کی پچھلی طرف اتار تک گیا۔

بوڑھا رحمت ایک حملہ آور کی فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ ایک گولی اس کی کھوپڑی میں لگی اور اس کا

مجھ چاروں طرف بکھر گیا۔ حملہ آور کی دوسری گولی ڈاکٹر احمد کے کندھے کی ہڈی توڑتے ہوئے نکل گئی تھی۔  
 نائلہ درانی سیٹ کے آخری سرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیٹ کے نیچے چلائگ لگا دی اور دین  
 فرش پر اوندھی ہو گئی۔ خوف کی شدت سے وہ تھر تھرا رہی تھی۔

ایک حملہ آور بڑی پھرتی سے دین پر چڑھ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ دوسرے  
 ہاتھ سے اس نے نائلہ درانی کا بازو پکڑا اور اسے دین سے باہر کھینچنے لگا۔  
 نائلہ درانی کھینچتی ہوئی دین سے نیچے گری۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ اس کی ٹانگیں تھر تھرا رہی  
 تھیں۔ نقاب پوش اسے کھینچتا ہوا اپنی کار تک لے گیا۔ ایک دوسرے نقاب پوش نے جلدی سے کار کا پچھلا  
 بازو کھول دیا اور نائلہ درانی کو اندر ٹھونس دیا گیا۔

”واپس چلو۔ ہری اپ۔“

وہ نقاب پوش چنچا جس نے نائلہ درانی کو پولیس دین سے نکالا تھا۔ وہ بھی نائلہ کے ساتھ ہی کار میں  
 بیٹھ گیا تھا۔ ایک نقاب پوش اور بھی اس کے ساتھ آگیا تھا جبکہ تیسرا نقاب پوش دوسری طرف کا دروازہ  
 کھول کر نائلہ کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ اس طرح نائلہ ان کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔ چوتھا نقاب  
 پوش آگے سپر جاز سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس ساری کارروائی کے دوران ڈرائیور اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا رہا  
 تھا۔ انجن اشارت ہی تھا۔ اپنے ساتھیوں کے بیٹھتے ہی اس نے کار ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔  
 وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ بکھری ہوئی لاشوں اور زخموں کی چیخوں نے ماحول پر دہشت سی طاری کر دی  
 تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ ابھی دوکانیں پوری طرح نہیں کھلی تھیں اور جو کھلی تھیں وہ بھی پولیس دین پر فائرنگ  
 شروع ہوتے ہی بند ہو گئی تھیں۔

چوک پر سناٹا تھا۔ حملہ آوروں کی کار دھول اڑاتی ہوئی تیز رفتاری سے غائب ہو گئی تھی۔ اس کے  
 قریب پانچ منٹ بعد آہستہ آہستہ لوگ وہاں جمع ہونے لگے۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ اس دوران جمع  
 ہونے والے لوگوں میں سے کسی نے آگے بڑھنے کی بہت نہیں کی تھی۔ حالانکہ دو زخمی پولیس والے ان کے  
 سامنے تڑپ رہے تھے۔ اور ڈاکٹر احمد دین کے پچھلے حصے پر الٹا لٹکا بیٹھا تھا۔ اس کے زخمی کندھے سے بھی  
 خون کی دھار بہ رہی تھی۔

پولیس کی پہلی گاڑی آدھے گھنٹے بعد پہنچی تھی۔ اس پولیس پارٹی کے ساتھ ایک اے ایس آئی آیا  
 تھا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ ایک قریبی مکان سے انسپکٹر  
 عظم کے گھر پر فون کر رہا تھا۔ انسپکٹر عظم کو بھی وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اے ایس آئی کا فون  
 ریسو کرنے کے بعد وہ لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ اسے سوتے میں سے جگایا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کوئی  
 معمولی واقعہ پیش آیا ہو گا جسے اے ایس آئی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا تھا۔ لیکن یہاں کا منظر دیکھ کر تو اس کے  
 حواس پر بجلی سی گری تھی۔ سب سے پہلے زخمی کانسٹیبلوں اور ڈاکٹر احمد کو ہسپتال بھجوا دیا گیا۔

یوں تو قتل، اغوا اور ڈکیتی وغیرہ کے واقعات ہوتے ہی رہتے تھے لیکن اس قسم کا بھیانک واقعہ راجم  
 درخان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آیا تھا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی اور لوگ  
 سڑکوں کی تعداد میں وہاں جمع ہونے لگے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پولیس کے تمام اعلیٰ افسران بھی  
 جائے وقوع پر پہنچ چکے تھے۔

دو گھنٹے کے اندر اندر مقامی اخبارات نے ضمیمے بھی شائع کر دیئے اس واقعہ کی خبر بھی پولیس کے ذرائع۔

کے حوالے ہی سے شائع ہوئی تھی لیکن رپورٹوں نے اپنے طور پر بھی کچھ رپورٹنگ کی تھی۔ انسپکٹر اعظم نے اعلیٰ افسران کی موجودگی میں پولیس کی نمائندگی کرتے ہوئے اخباری رپورٹوں کو بتایا تھا کہ نائلہ درانی کو چند روز قبل اپنے ایک محافظ کے قتل کے الزام میں بڑی جدوجہد کے بعد ڈرامائی انداز میں کچی آبادی کے ایک مکان سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر احمد اور نائلہ درانی کو پناہ دینے والا رحمت نامی ایک بوڑھا تانگے والا بھی گرفتار ہوا تھا اور آج ان تینوں کو رہنمائے حاصل کرنے کے سلسلے میں عدالت میں پیش کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا کہ بعض نامعلوم مسلح شہاب پوشوں نے پولیس وین پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پولیس وین ڈرائیور ایک اے ایس آئی ایک راہگیر اور بوڑھا تانگہ بان رحمت ہلاک ہو گئے تھے۔ جبکہ دو کانٹریبل اور ڈاکٹر احمد شدید زخمی ہوئے تھے۔

انسپکٹر اعظم کے بیان کے مطابق نائلہ درانی کو رہا کرانے کے لئے پولیس وین پر حملہ کیا گیا تھا اور حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہ نائلہ درانی کو اپنی کار میں ڈال کر لے گئے تھے۔ بوڑھا رحمت اور ڈاکٹر احمد عابثاً حملہ آوروں کے بارے میں جانتے تھے اس لئے حملہ آوروں نے انہیں بھی ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر ڈاکٹر احمد بچ گیا تھا۔ اسے زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا اور اس کی حفاظت کے لئے بڑے سخت انتظامات کر دیئے گئے تھے۔

اخباری نمائندے مختلف سوالات کرتے رہتے تھے اور انسپکٹر اعظم ان کے جوابات دیتا رہا تھا۔ بعض اخباری نمائندوں نے پولیس کے اعلیٰ افسران سے بھی سوالات کئے تھے جن کے جوابات گول مول دیئے گئے تھے۔ ایک اخباری نمائندے نے سوال کیا تھا کہ کیا یہ سارا ہنگامہ درانی فیملی کی آپس کی چپقلش کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

”نہیں۔“ انسپکٹر اعظم نے جواب دیا۔ ”چھوٹے چھوٹے تنازعات تو ہر خاندان میں ہوتے ہیں لیکن یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ نائلہ درانی نے ایک قتل کیا تھا۔ وہ روپوش تھی اور اسے بڑی جدوجہد کے بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ ہمیں شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ حملہ آور اس کے آدمی ہوں گے جنہوں نے اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے یہ کارروائی کی تھی۔ ظاہر ہے وہ روپوشی کے دوران اپنے آدمیوں سے ملتی رہی تھی۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ نائلہ کو چھڑانے کے لئے اس کارروائی کے پیچھے اس کے تایا عبدالرحمن درانی یا کزن شبیر درانی کا ہاتھ ہو۔ وہ مزید رسوائی سے بچنے کے لئے نائلہ کو پولیس کی حراست سے چھڑانا چاہتے ہوں؟“ یہ سوال ایک اخباری نمائندے نے کیا تھا۔

”نہیں۔“ انسپکٹر اعظم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ نائلہ درانی کی وجہ سے درانی فیملی کی بہت رسوائی ہوئی تھی۔ لیکن وہ معزز اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اس قسم کی کسی کارروائی کا تصور بھی نہیں کرتے۔ کچھ دیر پہلے شبیر درانی سے ٹیلی فون پر میری بات ہوئی ہے۔ وہ اس کارروائی سے بالکل لاعلم ہیں۔ بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ عدالت میں نائلہ درانی کے مقدمے کی پیروی کے لئے کل شام ہی شہر کے سب سے بڑی وکیل سے بات بھی کر چکے ہیں۔ شبیر درانی کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اگر آپ لوگ ان سے کچھ پوچھنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ انسپکٹر اعظم کے اس جواب سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ درانی فیملی کا دفاع کر رہا ہے۔

”کیا عام لوگوں کو معلوم تھا کہ نائلہ درانی کو رہنمائے کے لئے آج عدالت میں پیش کیا جانے والا ہے؟“

ایک اخباری نمائندے نے سوال کیا۔

”نہیں۔“ انسپکٹر اعظم نے جواب دیا۔

”یہ خبر عام نہیں تھی۔ اس کے باوجود پولیس وین پر حملہ ہوا اور حملہ آور قتل و غارت کرتے ہوئے ناکہ درانی کو لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ پولیس میں کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے حملہ آوروں کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیا تھا؟“ اس اخباری نمائندے نے کہا۔

”جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ روپوشی کے دوران ناکہ درانی کے آدمی چوری جیسے اس سے ملے رہے ہوں گے۔ ناکہ کی گرفتاری کے بعد وہ لوگ آرام سے تو نہیں بیٹھے ہوں گے۔ موقع کی ناک میں ہوں گے۔ اور عین ممکن ہے کہ ناکہ درانی نے کسی طرح انہیں یہ اطلاع بجوا دی ہو کہ آج اسے عدالت میں پیش کرنے کے لئے لے جایا جائے گا۔“

”اس سے تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ناکہ درانی نے یہ پیغام پولیس ہی کے کسی آدمی کے ذریعے بجوایا ہو گا۔“ اسی اخباری نمائندے نے انسپکٹر اعظم پر ایک اور حملہ کیا۔

”دیکھئے؟“ انسپکٹر اعظم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے محل سے کہا۔ ”پولیس میں سب لوگ فرشتے نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی لالچ میں آ گیا ہو۔ بہر حال اس سلسلے میں بھی تحقیق ضرور کی جائے گی۔ اگر کسی پولیس والے کے خلاف ایسی بات ثابت ہو گئی تو اس کے خلاف قانونی کارروائی ضرور ہوگی۔ بہر حال میں آپ سب حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ ہم سے تعاون کریں گے۔ اور اس کیس کے حوالے سے غیر مصدقہ سنسنی خیز خبریں شائع کرنے کے بجائے پہلے پولیس سے اس کی تصدیق کر لیں گے۔ بہت شکریہ۔“

انسپکٹر اعظم نے اپنے افسروں کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ کرسیوں سے اٹھ گئے۔ اور اس طرح یہ ہنگامی نیوز کانفرنس ختم ہو گئی۔ اور اس کے دو گھنٹے بعد اخبارات کے جوڑھے بازار میں آئے تھے انہوں نے پورے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی۔

...●...●...●...

وہ کار جائے وقوعہ سے طوفانی رفتار سے نکلی تھی۔ وہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ تھوڑی ہی دیر بعد پورے شہر کی ناکہ بندی ہو جائے گی اور اس طرح وہ شہر سے نہیں نکل سکیں گے۔

ناکہ بھجلی سیٹ پر تین نقاب پوشوں کے درمیان پھنسی بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ہتھکڑی تھی اور اس کی زنجیر پیروں کے قریب ٹھکی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے پولیس کی حراست سے اغواء کرنے والوں نے چروں سے نقاب اتار دیئے۔

ناکہ درانی اب بھی بے حد خوفزدہ تھی۔ اس کی رگت پہلی ہو رہی تھی۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ یہ لوگ کون تھے اور انہوں نے اس قدر خون ریزی کر کے اسے پولیس کی حراست سے کیوں چھڑایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بے گناہ تھی اور اسے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مقدمے کی کارروائی کے دوران وہ عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن... یہ خونی کارروائی؟ اس سے تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ واقعی مجرم تھی اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے پولیس کی حراست سے فرار ہو گئی تھی۔



وہ باری باری ان کے چہرے دیکھنے لگی۔ صرف ایک چہرہ ایسا تھا جو کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کو اس نے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

کار بڑی سڑکوں سے ہٹ کر چھوٹی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور بالا خرہ شہری حدود سے باہر آ گئے۔ شہری حدود سے تقریباً دو میل آگے کار اینٹوں کے ایک بھٹے کے قریب رک گئی۔ وہاں سیاہ رنگ کی ایک کار پہلے ہی سے کھڑی تھی۔ اس سیاہ کار میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دو پیچھے۔ وہ دونوں نالکہ والی کار رکے ہی اپنی کار سے اتر آئے۔ نالکہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی بھی دروازہ کھول کر اتر آئے تھے۔

”نالکہ بی بی!“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”آپ اس کار میں بیٹھ جائیے۔“  
”مگر تم لوگ ہو کون اور مجھے اس طرح پولیس کی حراست سے اغواء کیوں کیا گیا ہے؟“ نالکہ درانی نے پوچھا۔

”یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ نہ ہی ہم کسی ایسے سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ لیکن پلیز! آپ جلدی کیجئے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ اس شخص نے کہا۔ چہرہ خوفناک ہونے کے باوجود لمبے میں شائستگی تھی۔

”تم لوگ خونی ہو۔ قاتل ہو۔۔۔ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔“ نالکہ نے کہا۔

”واپسی تو اب ممکن نہیں رہی نالکہ بی بی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”آپ مجھے اپنا لہجہ تبدیل کرنے پر مجبور نہ کریں۔ پلیز! آپ دوسری گاڑی میں بیٹھ جائیے تاکہ آپ کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے۔“  
اس شخص نے پھٹکڑی والی زنجیر پکڑ لی۔ نالکہ درانی کو مجبور آئیے اترنا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اینٹوں کا بھندہ بند تھا۔ شاید بہت عرصہ سے اب وہاں کام نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ بھٹے کے قریب ہی چار پانچ کچے مکان بھی دیران پڑے تھے۔ ان کے دروازے اور کھڑکیاں غائب تھیں۔ یہاں یقیناً بھٹے پر کام کرنے والے مزدور رہتے ہوں گے مگر اس بھٹے پر کام بند ہو جانے کی وجہ سے وہ یہ جگہ چھوڑ کر کسی اور بھٹے پر چلے گئے تھے۔

نالکہ درانی سیاہ رنگ کی دوسری کار میں بیٹھ گئی۔ ایک آدمی دائیں طرف سے اور دوسرا آدمی بائیں طرف سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس طرح نالکہ ایک بار پھر ان دو آدمیوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔ ان دونوں آدمیوں نے چادریں اوڑھی ہوئی تھیں۔ اور نالکہ کو ان چادروں میں چھپی ہوئی رائفلوں کا علم ہو گیا تھا۔

نالکہ درانی کو یہاں تک لانے والی کار قدرے پیچھے ہٹ کر دائیں طرف ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ وہ چادروں آدمی بھی اسی کار میں چلے گئے تھے۔ نالکہ والی یہ دوسری سیاہ کار بھی حرکت میں آ گئی۔ بھٹے سے آگے نکل کر کار کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر دوڑنے لگی۔ راستہ ناہموار تھا جس سے کار کو اچھے خاصے جھٹکے لگ رہے تھے۔

”کیا تم کار آہستہ نہیں چلا سکتے۔ میرے پیٹ کا آپریشن ہوا ہے اور ٹانگے ابھی کچے ہیں۔“ نالکہ نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے افسوس ہے بی بی۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”کچے راستے پر ہم زیادہ دور تک نہیں جائیں

”اس کے بعد آپ کو تکلیف نہیں ہوگی۔ لیکن گاڑی آہستہ چلانا ہمارے لئے خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ آپ تو جانتی ہیں کہ کس قسم کی صورت حال کا سامنا ہے۔“

”مگر تم لوگ ہو کون اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ نائلہ بولی۔

”ہم آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے بی بی۔ اور آپ یہ چادر اس طرح اوڑھ لیں کہ آپ کا چہرہ بھی چھپ جائے اور ہاتھ میں پڑی ہوئی زنجیر بھی نظر نہ آئے۔“ ڈرائیور نے کہتے ہوئے اگلی سیٹ پر پڑی بی بی ایک چادر اٹھا کر پیچھے پھینک دی۔

نائلہ کو یوں بھی سردی لگ رہی تھی۔ اس نے چادر اوڑھ لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کھیتوں میں سس کھیں کسان کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی کار کی طرف دیکھ لیتا پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔

تقریباً پانچ میل کا فاصلہ کچے راستوں پر طے کرنے کے بعد کار صادق آباد کی طرف جانے والی پختہ پل پر آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ انہیں صادق آباد کی طرف سے آنے والی بسیں، بعض کاریں اور مال بردار ٹرک تو نظر آئے تھے مگر رحیم یار خان کی طرف سے آنے والی کسی گاڑی نے انہیں اور ٹریفک نہیں کیا تھا۔

نائلہ درانی نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی اور آج کی اس کارروائی کے بارے میں سوچنے لگی۔ عقب پوشوں کی اس وحشیانہ کارروائی میں نجانے کتنے آدمی مارے گئے تھے۔ تین لاشیں تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں جن میں ایک بوڑھے رحمت کی لاش بھی شامل تھی۔ اس نے ڈاکٹر احمد کو بھی زخمی حالت میں جینختے ہوئے دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ زندہ بچا تھا یا وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

لیکن... نائلہ حیران تھی کہ یہ کون لوگ تھے اور اسے اس طرح پولیس کی حراست سے کیوں نکالا گیا تھا۔ نائلہ کا ذہن الجھنے لگا۔ جب اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو ہوش میں آنے کے بعد ہسپتال میں شبیر درانی کے باڈی گارڈ کو دیکھ کر وہ سمجھی تھی کہ اس پر حملہ شبیر نے کروایا ہوگا۔ اس کا خیال اپنے تایا عبدالرحمن کی طرف بھی گیا تھا۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اسے اغواء کرنے کی کوشش اور پھر گولی مارنے کی کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا... پھر ہسپتال سے بھاگنے کے دوسرے دن اس نے اخبار میں وہ سنسنی خیز خبر پڑھی تھی کہ وہ اپنے ایک باڈی گارڈ کو قتل کر کے فرار ہو گئی ہے اور پولیس بڑی سرگرمی سے سے تلاش کر رہی ہے۔

نائلہ درانی کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ پولیس اس تک کیسے پہنچ گئی۔ پولیس تو ظاہر ہے ڈاکٹر احمد؛ تعاقب کرتے ہوئے ہی رحمت کے مکان تک پہنچی تھی لیکن انہیں ڈاکٹر احمد پر کیسے شبہ ہوا ہوگا کہ وہ اس کا علاج کر رہا ہے؟ اور اب یہ خونریز کارروائی؟

نائلہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ کارمین روڈ سے ہٹ کر محمد نگر کی طرف جانے والے ایک کچے رستے پر مڑ گئی۔ مین روڈ پر محمد نگر کا اسٹاپ اگرچہ آگے تھا جہاں بسیں وغیرہ رکتی تھیں اور تانگے وغیرہ مڑے رہتے تھے لیکن یہ کار ایک اور کچے راستے پر مڑ گئی تھی اور یہ راستہ بھی کھیتوں میں سے ہوتا ہوا محمد نگر کی طرف چلا گیا تھا۔

مگر یہ کار محمد نگر نہیں جا رہی تھی۔ اس سے پہلے ہی ایک اور راستے پر مڑ گئی۔ آگے آموں کے باغ تھے اور تقریباً تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار باغوں میں گھرے ہوئے ایک مکان کے سامنے پہنچ کر

رک گئی۔ سرخ اینٹوں کا یہ مکان خاصا بڑا تھا۔ ایک بڑا گیٹ بھی تھا۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو صرف ایک منٹ بعد گیٹ کھل گیا اور ڈرائیور گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔ وسیع و عریض صحن تھا۔ دائیں طرف رہائشی کمرے تھے جن کے سامنے ایک کشادہ برآمدہ تھا۔ گاڑی برآمدے کے سامنے رک گئی۔  
 نائلہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر نیچے اتر آئے۔

”گاڑی سے اتر آؤ نائلہ لی بی۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”یہ کوئی جگہ ہے۔ تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو؟“ نائلہ درانی کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سرخ اینٹوں کا بنا ہوا یہ مکان خوبصورت تھا۔ وسیع آنگن کے دوسری طرف ایک بہت بڑا شیڈ بنا ہوا تھا۔ جس کے نیچے ایک طرف لکڑی کی بیڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ یہ بیڑیاں چار پانچ انچ چوڑی اور تقریباً اٹھارہ انچ لمبی تھیں۔ آم کے سیزن میں پیکنگ کے لئے انہی بیڑوں سے بیڑیاں بنائی جاتی تھیں۔ اس شیڈ کے دوسری طرف ایک بھینس بھی بندھی ہوئی تھی۔ اور دو بکرے بھینس کے قریب ادھر ادھر ٹھل رہے تھے۔

اسی دوران مکان کے برآمدے والے دروازے سے ایک اوجڑ عمر عورت باہر آگئی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لیکن وہ خاص صحت مند اور لمبی ترنگی عورت تھی۔ جس مخالف کے لئے اس میں خاصی کشش تھی۔ وہ برآمدے سے نکل کر تیز قدم اٹھاتی ہوئی کار کے قریب پہنچ گئی۔

”یہ تمہاری ممان ہے مراد۔“ نائلہ کے ساتھ آنے والے ایک گن مین نے کہا۔ ”چند روز پہیں رہے گی۔ لیکن اسے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ اوئے بخشو!“ اس شخص نے گیٹ کی طرف رخ کر کے پکارا۔ جس شخص نے گیٹ کھولا تھا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ ”جھینی اور ہتھوڑا لے کر آجا“ یہ زنجیر کاٹی ہے۔“ گن مین نے نائلہ کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

”سارے اوزار شیڈ میں پڑے ہیں۔ بی بی کو وہیں لے چلیں۔“ بخشو نے جواب دیا۔

وہ نائلہ کو شیڈ میں اس جگہ لے آئے جہاں لکڑی کی بیڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ وہاں لکڑی کا ایک صندوق بھی رکھا ہوا تھا جس میں مختلف قسم کے اوزار بھرے ہوئے تھے۔ اس نے جھینی ہتھوڑا نکال لیا اور پھر نائلہ کی ہتھکڑی کاٹی جانے لگی۔

ہتھوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ نائلہ کی کللی کو بھی جھٹکے لگ رہے تھے۔ ایک مرتبہ تو اس کے منہ سے ہلکی سی سکاری بھی نکل گئی تھی۔ بالا خر چند ضربوں کے بعد ہتھکڑی ٹوٹ گئی۔ نائلہ دوسرے ہاتھ سے کللی سہلانے لگی۔ ہتھکڑی کاٹے جانے سے اسے خوشی ہوئی چاہئے تھی لیکن اس کا ذہن مزید الجھ گیا تھا۔ پولیس کی حراست سے فرار کے بعد اس پر عائد قتل کا الزام گویا کفرم ہو گیا تھا۔ اور اب اس کا ردوائی میں جو تین چار آدمی مارے گئے تھے وہ بھی نائلہ ہی کے کھاتے میں آگئے تھے۔

”اس ہتھکڑی کو گڑھا کھود کر دفن کر دو تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے۔“ گن مین نے بخشو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی۔“ بخشو نے کہتے ہوئے ہتھکڑی اٹھالی۔ زنجیر بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ پھر اس نے ایک پھاؤڑہ اٹھایا اور حویلی سے باہر نکل گیا۔

”آؤ نائلہ لی بی۔“ گن مین نے نائلہ کو اشارہ کیا۔

نائلہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ ان لوگوں سے اب کوئی سوال پوچھنا بیکار تھا۔ ظاہر ہے یہ

کارروائی کسی اور کے اشارے پر کی گئی تھی اور یہ لوگ کسی سوال کا جواب نہیں دیں گے۔  
 ”مرادو۔“ گن مین نے برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے  
 نائلہ بی بی کے لئے ناشتہ تیار کرو اور پھر ان کے لئے ایک کمرہ صاف کرو۔ یہ چند روز تک یہیں رہیں گی۔  
 انہیں کھانے پینے یا کسی اور معاملے میں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ جانتی ہو کہ مالک تمہاری کھال  
 اڑھڑوے گا۔“

”مجھے پتہ ہے تم نصیحتیں مت کرو۔“ مرادو نے تنک کر جواب دیا۔  
 ”بہت زبان چلانے لگی ہو۔ لگتا ہے تمہارا بندوبست بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔“ گن مین نے اسے  
 گھورا۔

”ارے جا جا۔“ مرادو نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”بڑا آیا میرا بندوبست کرنے والا۔ چل بی بی، تو تو  
 اندر چل۔“ مرادو نے آخری الفاظ نائلہ سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔  
 ”میں جا رہا ہوں۔ باہر یہیں رہے گا۔ اور تم اپنے حواس قائم رکھنا۔“ گن مین مرادو کو گھورتا ہوا کار  
 کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرا گن مین یہیں وہ گیا تھا جبکہ وہ آدمی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ نائلہ درانی،  
 مرادو کے ساتھ دروازے سے اندر آگئی۔ یہ راہداری تھی۔ جس کے اختتام پر دائیں بائیں بھی دو  
 راہداریاں تھیں۔ ہر راہداری میں آنے والے سامنے دو دو کمرے تھے۔ مرادو اسے کوٹنے والے کمرے میں لے  
 گئی۔

کمرہ صاف ستھرہ تھا۔ ایک طرف مسہری پیچھی ہوئی تھی جس پر بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ مرادو نے بستر کی  
 چادر جھاڑ کر دوبارہ بچھا دی۔ اور تنکیہ درست کر کے رکھ دیا۔

اب تک کی ساری کارروائی اور کئے راستوں پر سفر کے دوران کار میں جھٹکے لگنے سے نائلہ کو اپنے  
 سینے کے زخم میں تکلیف سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ فوراً ہی بستر پر لیٹ گئی۔  
 ”تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے لئے ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔ تم شہری لوگ تو ذلیل زوٹی کھاتے ہو جو یہاں  
 نہیں ملے گی۔ میں تمہارے لئے پرائیڈ بنا کر لاتی ہوں۔“

”تم میرے لئے صرف چائے بنا کر لے آؤ۔ میں کھاؤں گی کچھ نہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔  
 ”باہر تو کچھ ٹھونسنے گا۔ وہ بھوکا تو نہیں رہے گا۔“ مرادو کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ کمرے سے نکلتے  
 ہوئے اس نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

مرادو کے جاتے ہی نائلہ نے فیض اغا کر پیٹ کا زخم دیکھا۔ خیریت ہی گزری تھی کہ کار کے جھکوں  
 سے زخم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ البتہ ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ فیض درست کر کے وہ کمرے کا جائزہ لینے  
 گئی۔

کمرے کی کھڑکی عقبی سمت میں کھلتی تھی جہاں سے آموں کے باغ اور اس سے پرے کھیتوں کا منظر  
 صاف دے سکتا تھا۔ کھڑکی میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ اوپر ایک روشندان بھی تھا۔  
 میں اگرچہ لوہے کی سلاخیں نہیں تھیں مگر روشندان اتنا چھوٹا تھا کہ اس سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا  
 جاسکتا تھا۔

نائلہ درانی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں اس کی حیثیت ایک قیدی کی سی ہوگی۔ اس کی نگرانی

کے لئے ایک گن مین یہاں رہ گیا تھا۔ ویسے مراد نامی وہ عورت بھی بڑی خزانہ لگ رہی تھی۔ مراد کی عمر چالیس کے لگ بھگ تو ضرور رہی ہوگی جبکہ بخشو نامی آدمی پچاس سے اوپر ہی کا لگتا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید اور گال نارنگی کی طرح پچکے ہوئے تھے۔ وہ غالباً مراد کا شوہر تھا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد مراد چائے لے کر آگئی۔ نائلہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ مراد بھی اس کے سامنے ایک موڑے پر بیٹھ گئی۔

”تمہارا نام مراد ہے اور بخشو غالباً تمہارا گھر والا ہے۔“ نائلہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی بی بی۔“ مراد نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ نام مراد میرا گھر والا ہی ہے۔ قسمت ہی خراب تھی جو اس کے پلے بندھ گئی۔ اور آج تک پیچھتا رہی ہوں۔“

”تمہارے بچے کہاں ہیں؟ کتنے بچے ہیں؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”بے اولاد ہوں بی بی۔“ مراد نے جواب دیا۔ ”ماں باپ نے میرا نام مراد بی بی رکھا تھا مگر آج تک کوئی مراد پوری نہیں ہوئی۔ بخشو سے جب میری شادی ہوئی تھی تو وہ بڑا گھبرو جوان تھا۔ مگر شادی کے بعد پتہ چلا کہ اس کے پلے کچھ نہیں ہے۔ وہ اندر سے بالکل کھوکھلا ثابت ہوا۔ یا پھر میں ہی کوکھ جلی تھی۔ اولاد کے لئے ہم نے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ حکیموں سے علاج کروائے۔ مزاروں پر فیتیں مانیں مگر میں بے مراد ہی رہی۔“

”یہ گھر کس کا ہے مراد؟“ نائلہ نے پوچھا۔ وہ دراصل اسے باتوں میں لگا کر یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔ مگر مراد اس سے زیادہ چالاک ثابت ہوئی تھی۔

”مجھے اور بھی کام کرنے ہیں بی بی۔ تم چائے پیو۔ میں بعد میں آؤں گی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

نائلہ درانی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہاں اسے کوئی بھی اصل بات نہیں بتائے گا۔ جس کا مطلب تھا کہ ان لوگوں کو پہلے ہی سے سختی سے ہدایت کر دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کی کارروائی بھی پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت کی گئی تھی اور یہ بھی پہلے ہی سے طے تھا کہ پولیس کی حراست سے چھڑانے کے بعد نائلہ کو یہاں لایا جائے گا۔

لیکن یہ بات نائلہ درانی کے لئے الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی کہ اس کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے اس کی ذہن میں اپنے تایا عبدالرحمن درانی کا خیال آیا تھا۔ پھر چھوٹی سی حسینہ بیگم اور اس کے بیٹے شبیر درانی پر بھی شبہ تھا۔ حسینہ بیگم اس کی شادی اپنے بیٹے سے کرنا چاہتی تھی لیکن انکار کے وجہ سے اس کا رویہ بدل گیا تھا۔ نائلہ اچھی طرح جانتی تھی کہ چھوٹی کو اس سے محبت نہیں تھی۔ اس کی نظریں تو نائلہ کی جائیداد پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ خاندان کے کچھ اور نوجوان بھی اس سے شادی کے خواہش مند تھے لیکن نائلہ جانتی تھی کہ سب کی نظریں اس کی دولت پر تھیں۔ مگر یہ کون ہو سکتا تھا جس نے یہ خونریز کارروائی کر کے اس کے راستے میں کانٹے کھیر دیئے تھے۔

دفعۃً نائلہ درانی کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ پچھلے سال وہ لاہور میں تھی تو اس نے اپنے کسی رشتہ دار سے سنا تھا کہ حسینہ بیگم نے آموں کا کوئی باغ خریدا تھا۔ اس وقت نائلہ کو یہ تو پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ باغ کس علاقے میں خریدا گیا تھا لیکن اب ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ مکان آموں کے باغ ہی

میں تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اس وقت اپنے کزن شبیر درانی کی قید میں تھی اور پولیس کے خلاف کارروائی میں بھی شبیری کا ہاتھ تھا۔ اغواء کرنے والوں میں سے ایک چہرہ جانا بچانا سا نظر آیا تھا۔ اس وقت تو اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ چہرہ اس نے کب اور کہاں دیکھا تھا لیکن اب اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ شبیر درانی کا آدمی تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ایک مرتبہ شبیر درانی جب لاہور آیا تھا تو یہ آدمی بھی اس کے ساتھ تھا۔

لیکن یہ بات نائلہ کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ شبیر درانی نے یہ کارروائی کیوں کی تھی۔ اگر اسے نائلہ سے ہمدردی تھی تو قتل کے جھوٹے مقدمے کے خلاف اس کی قانونی مدد کرنا چاہئے تھی۔ لیکن یہ کارروائی کر کے اس نے نہ صرف پولیس کو اپنا دشمن بنالیا تھا بلکہ خود اس کے لئے بھی بہت سی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔

ذہن بری طرح الجھا ہوا ہونے کے باوجود نائلہ کو غنودگی آگئی تھی۔ گزشتہ رات جیل میں بھی وہ رات بھر نہیں سو سکی تھی۔ بلکہ جب سے وہ گرفتار ہوئی تھی جیل کی کوٹھری اس کے لئے عذاب بن گئی تھی۔ دنگا فرش اور پینا پرائیسا کبیل جس سے نہ صرف بدبو آ رہی تھی بلکہ اس میں جوئیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ کوٹھری میں قفص سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ جیل میں اس نے جتنے بھی دن گزارے تھے وہ ایک گھنٹہ بھی سکون کی نیند نہیں سو سکی تھی۔ اور اب آرام وہ بستر لیٹتے ہی وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔

نائلہ درانی جب بیدار ہوئی تو تین بج چکے تھے۔ اگر اسے بری طرح سمجھوڑا نہ جاتا تو شاید وہ شام تک سوئی ہی رہتی۔

”اے بی بی!“ مراد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم تو مردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہو۔ میں تو تمہیں مردہ ہی سمجھ بیٹھی تھی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے اس بی بی کا جس نے تمہاری نبض دیکھ کر بتایا کہ تم مری نہیں زندہ ہو۔ مگر بی بی! تمہارے پیٹ کا آرٹیش ہوا تھا کیا؟ اتنا لمبا زخم ہے۔ جیسے... جیسے...“ مراد خاموش ہو کر مشتبہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تو گویا تم نے سوتے میں میری قیض اٹھا کر دیکھا تھا؟“ نائلہ درانی نے اسے گھورا۔

”توبہ توبہ کرو نائلہ بی بی۔“ مراد نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”میں کوئی دانی تو نہیں ہوں کہ جوان لڑکیوں کے پیٹ ٹولتی پھروں۔ وہ تو اس بی بی نے یہاں آتے ہی سب سے پہلے تمہارا پیٹ دیکھا تھا۔“

”کک... کون ہے وہ؟ کس کی بات کر رہی ہو؟“ نائلہ نے پوچھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھی گئی تھی۔

”چہ نہیں کون ہے۔“ مراد کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ ”مالک نے تمہاری دیکھ بھال کے لئے اسے رحیم یار خان سے بھیجا ہے۔ مجھ پر تو مالک کو اب بھروسہ ہی نہیں رہا۔“

نائلہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا ریشمی شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ قیض بے حد چست تھی۔ گریبان بھی خاصا فراخ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ نائلہ نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ یہ وہی نرس تھی جسے نائلہ نے سلطان زید ہسپتال میں ہوش میں آنے کے بعد پٹنگ کے قریب کرسی پر سوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لڑکی کو یہاں دیکھ کر نائلہ کو اب یقین ہو گیا کہ وہ اپنے کزن شبیر درانی ہی کی قید میں تھی۔

”کیسی ہو مس نائلہ؟“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ سلطان زید ہسپتال کی نرس رضیہ تھی۔

”تم یہاں بھی پہنچ گئیں۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”یہ سب کیا چکر ہے۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو اور

مجھے اس طرح پولیس کی حراست سے اغواء کیوں کیا گیا ہے؟

”یہ سب تو میں نہیں جانتی۔“ رضیہ مسکرائی۔ ”میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ مجھے یہاں تمہاری خدمت اور دیکھ بھال کے لئے بھیجا گیا ہے اور اس کے لئے اس قدر گراں قدر معاوضے کی پیشکش کی ہے کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا مس نائلہ! ہسپتال کے پرائیویٹ روم سے تو تم دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تھیں مگر... یہاں ایسا نہیں ہو گا۔“

”تم شیر کی زر خرید ہو۔“ نائلہ بولی۔ ”تم سے کسی ہمدردی کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن شیر چاہتا کیا ہے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم مس نائلہ۔“ رضیہ مسکرائی۔ ”میں ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ کوئی دوسرا کیا کر رہا ہے اس سے مجھے غرض نہیں ہوتی۔ شیر درانی تم سے کیا چاہتا ہے؟ یہ تم اس سے پوچھ لیتا۔“

”کہاں ہے وہ؟ میں ابھی اور اسی وقت اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔

”ناممکن۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”شیر درانی یہاں نہیں ہے۔ وہ چند روز بعد یہاں آئے گا۔ مجھے اس لئے یہاں بھیجا گیا ہے کہ اس دوران تمہاری دیکھ بھال کرنی رہوں۔ ویسے تم ہو خوش قسمت۔ تم جس حالت میں ہسپتال سے بھاگی تھیں مجھے یقین تھا کہ شہر کی کسی سڑک پر تمہاری لاش ہی پڑی ہوئی ملے گی۔ تمہاری کنڈیشن تو ایسی تھی کہ ڈاکٹر کئی روز تک تمہیں بیڈ سے اٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کسی ایسی ہی بات کو کہا جاتا ہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ وہ بوڑھا تانگے والا تمہیں اٹھا کر اپنے گھر لے گیا اور پھر ڈاکٹر احمد جیسے قابل اور ماہر ڈاکٹر سے تمہارا رابطہ ہو گیا جس نے تمہیں موت کے منہ میں جانے سے بچایا۔ لیکن وہ دونوں بچارے...“

”کیا ہوا... ڈاکٹر احمد کو کیا ہوا؟“ نائلہ اچھل پڑی۔ ”بوڑھے رحمت کی لاش تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی۔ اور ڈاکٹر احمد زخمی ہوا تھا... کیا وہ بھی...؟“

”ہاں...“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”ہسپتال پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ختم ہو گیا۔ وہ پولیس کے لئے بہت بہت رکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر گولی کدھ کی بڑی توڑتی ہوئی پسیلوں میں پھنس گئی تھی۔ خون بہت ضائع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”یہ بہت برا ہوا۔“ نائلہ بڑبڑائی۔ ”وہ دونوں بہت عظیم تھے۔ انہوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر سچی کاساتھ دیا تھا۔ اور انہیں اتنی بھیانک سزا ملی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”بہر حال اب انہیں بھول جاؤ۔ وہ قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔“ رضیہ بولی۔

”سچی بے رحم ہو تم۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”تم ایک نرس ہو اور نرس کا دل بڑا نرم ہوتا ہے۔ مگر

تم نے نرسنگ کی نہیں، بے رحمی کی تربیت لی ہے۔ بڑی سنگدل ہو تم...“

”ہمدردی، رحمہ، دھمی انسانیت کی خدمت!“ رضیہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ ”یہ سب افسانوی

باتیں ہیں مس نائلہ۔ آج تو ہر شخص دولت اور صرف دولت کمانے کے چکر میں ہے۔ ڈاکٹروں کو فرشتہ سمجھا

جاتا تھا۔ سچا کہا جاتا تھا انہیں۔ نوجوان لڑکیاں دھمی انسانیت کی خدمت کا عزم لے کر نرسنگ کی تربیت

مائل کرتی تھیں مگر آج دولت کی چمک نے ڈاکٹروں اور نرسوں کے دل بھی کھوکھلے کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر

حاضریت تو ہسپتالوں میں کرتے ہیں مگر ہسپتالوں میں زیر علاج غریبوں کے لئے آنے والی دوائیں ڈاکٹروں کے

پرائیویٹ کلینکوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ ہسپتالوں میں صرف دولت مندوں کا علاج ہوتا ہے۔ انہیں

سچی ترین دوائیں بھی فراہم کی جاتی ہیں اور رہائش کے لئے پرائیویٹ روم بھی... تمہاری ہی مثال سامنے ہے۔ تمہیں زخمی حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا۔ ہسپتال میں تمہارے گروپ کا خون موجود تھا مگر تمہیں خون س لئے نہیں دیا گیا کہ ہسپتال کی انتظامیہ کو اس بات کی فکر تھی کہ اس خون کے پیسے کون دے گا۔ خون کے بغیر تمہاری زندگی نہیں بچائی جاسکتی تھی۔ تم لاوارثوں کی طرح ایمرجنسی روم میں پڑی تھیں۔ وہ تو تمہاری خوش قسمتی تھی کہ ریلوے اسٹیشن کا ایک کانٹے والا اپنی بیوی کو ہسپتال میں داخل کرانے کے لئے آگیا۔ اس کی بیوی کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ وہ بیچاری تو ڈاکٹروں کی مناسب توجہ نہ ملنے کی وجہ سے مر گئی مگر اس کانٹے والے نے اپنا خون دے کر تمہاری جان بچائی۔ اور پھر رات بارہ بجے تمہاری شناخت ہوئی تو ہسپتال کے سارے ڈاکٹر تمہارے بید کے گرد جمع ہو گئے۔ تمہیں فوری طور پر پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا اور تمہاری دیکھ بھال کے لئے میری ڈیوٹی تمہارے کمرے ہی میں لگا دی گئی۔ تمہارے کزن شبیر درانی نے تمہاری دیکھ بھال کے لئے مجھے بھاری معاوضہ دیا تھا۔ میں رات بھر جاگتی رہی۔ لیکن رات کے آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔ اس دوران تم ہوش میں آ گئیں۔ اور اپنے زخم کی پرواہ کئے بغیر ہسپتال سے بھاگ نکلیں۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے اس طرح بھاگ جانے سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ہسپتال کی انتظامیہ نے فرائض سے غفلت برتنے کے الزام میں مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ پولیس نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے تمہیں ہسپتال سے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔

ادھر شبیر درانی مجھے جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ میں چونکہ تمہاری اصلیت سے واقف ہو چکی ہوں۔ اس لئے میں نے تمہاری طرف سے کسی بڑے لالچ میں آکر تمہیں ہسپتال سے بھاگنے میں مدد دی تھی۔ شبیر درانی نے مجھ پر سختیاں بھی کی تھیں۔ تمہارا پیہ پوچھنے کے لئے اس نے میرا جسم بھی داغنا تھا... یہ دیکھو... ”رضیہ نے قیض اور اٹھا کر پشت نالکہ کی طرف کردی۔ اس کی پشت پر تین چار جگہوں پر داغے جانے کا نشان تھا۔ اس نے قیض نیچے کھینچ لی اور نالکہ کی طرف گھوم گئی۔

”میں بڑی مشکل سے شبیر درانی کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو سکی تھی کہ میں بالکل بے قصور ہوں اور ہسپتال سے تمہارے فرار میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس نے پولیس سے بھی میرا چچا چھڑا دیا۔

”اس دوران اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ تم نے اپنے ایک نئے محافظ کو قتل کر دیا تھا اور خود بھی اس کی گولی لگنے سے زخمی ہوئی تھیں۔ اور ہسپتال سے تم اس لئے بھاگی تھیں کہ تمہیں گرفتار نہ کر لیا جائے۔ شہر بھر میں تمہاری تلاش ہوتی رہی اور بالا خرہ تمہیں گرفتار کر لیا۔ لیکن شبیر درانی کے آدمیوں نے اپنی جان پر کھیل کر تمہیں پولیس کے شکنجے سے نکال لیا۔ اب تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے یہاں اسی لئے بھیجا گیا ہے کہ تمہارا خیال رکھوں کہ اس ساری بھاگ دوڑ میں تمہارا زخم نہ بگڑ جائے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا نالکہ! یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں تمہاری کڑی نگرانی کی جارہی ہے۔ گن مین باہر کے علاوہ یہ مرادو اور اس کا شوہر بخشو بھی بہت خطرناک ہیں۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ مزارعے اپنے مالکوں کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دیتے ہیں۔ وہ زندگی بھر ان کے اشاروں پر ناچتے رہتے ہیں اور انہی کے اشاروں پر اپنی جانیں دے دیتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ پولیس بڑی سرگرمی سے تمہاری تلاش میں مصروف ہے۔ پورے ضلع کی پولیس کو الارٹ کر دیا گیا ہے۔ نیچے کا پچھ بھی پولیس کی نظروں میں آئے بغیر ضلع کی حدود سے باہر نہیں جاسکتا۔ تم پر کم از کم چھ آدمیوں کے قتل کا الزام ہے۔ اگر تم کسی طرح شبیر درانی کے آدمیوں کو دھوکا دے کر اس مکان سے بھاگ نکلنے میں



کامیاب ہو بھی گئیں تو پولیس کے ہاتھ لگ جاؤ گی اور تم جانتی ہو کہ پولیس تمہارا کیا حشر کرے گی۔ اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں اخبارات کے دو صفحے لا کر دکھاتی ہوں جو تمہارے بارے میں شائع ہوئے ہیں۔“

رضیہ باہر چلی گئی۔ نائلہ درانی کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رضیہ نے جو کچھ بتایا تھا اس میں کتنے فیصد سچ تھا اور کتنا مبالغہ۔ مراد تو اس وقت کمرے سے چلی گئی تھی جب رضیہ آئی تھی۔ اور اب نائلہ کو تنہائی میں کچھ سوچنے کا موقع مل گیا تھا۔ مگر رضیہ کی باتوں سے اس کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا اور کوئی ڈھنگ کی بات اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد رضیہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے اخبارات کا پلندہ اٹھا رکھا تھا۔ ”لو... یہ اخبارات دیکھ لو۔ تمہیں میری باتوں کا یقین آجائے گا۔“ رضیہ نے اخبارات کا پلندہ اس کے سامنے پلنگ پر پھینک دیا۔

نائلہ درانی ایک ایک اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ رضیہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ تمام اخبارات پولیس وین پر حملہ کے خلاف اسی کارروائی کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے تمام اخباروں نے نائلہ درانی، ڈاکٹر احمد، نائلہ بان رحمت اور ہلاک و زخمی ہونے والے پولیس والوں کی تصویریں بھی شائع کی تھیں، ایک اخبار نے تو نائلہ درانی کی تصویر کے نیچے بڑا سنسنی خیز کپشن لگایا تھا۔ ”صدی کی خوفناک ترین قاتل... پاکستانی پھولن دیوی۔“ اخباروں کی یہ خبریں پڑھ کر نائلہ کا دماغ چکر ا گیا تھا۔

”آخر شیر درانی نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ اسے کیا ضرورت تھی یہ حرکت کرنے کی۔“ نائلہ چیخی۔  
”اس سلسلے میں شیر درانی ہی بتا سکتا ہے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔  
”وہ کب آئے گا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”کم از کم ایک ہفتے بعد۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”اس وقت اس کا رحیم یار خان میں رہنا بے حد ضروری ہے۔ اگر وہ شہر سے باہر گیا تو اس پر بھی شبہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اتنے دن میاں آرام کرو۔ کھاؤ پیو اور خوب عیش کرو۔ تمہیں پوری حویلی میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔ لیکن... حویلی سے باہر نہیں نکل سکو گی۔“

رضیہ کی باتوں سے نائلہ نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بہت مختصر سے عرصہ میں شیر درانی کے بہت قریب پہنچ چکی ہے۔ وہ حسین اور بھرپور جوان تھی۔ شیر عیاش آدمی تھا۔ اس جیسی لڑکیاں اس کی دسترس سے نہیں بچ سکتی تھیں۔ رضیہ ویسے بھی لالچی تھی۔ عین ممکن تھا کہ کچھ حاصل کرنے کے لئے وہ اخلاقیات اور شرافت کی تمام حدود بھی پھلانگ چکی ہو۔

اسی دوران مراد ایک ٹرے میں کھانا لے آئی۔ اس نے مرغی پکائی تھی۔ ٹرے اس نے پلنگ کے سامنے میز پر رکھ دی۔

”میں کھانے کے وقت تمہیں جگانے کی کوشش کرتی رہی مگر تم بہت گہری نیند میں تھیں۔ اب میں دوبارہ کھانا گرم کر کے لائی ہوں۔ کھاؤ...“ مراد نے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔ کھانا واپس لے جاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

”کیوں اپنی جان سے دشمنی کر رہی ہو۔“ رضیہ نے کہا۔ ”مجھے چہ چلا ہے کہ صبح بھی تم نے صرف چائے کا ایک کپ پیا تھا۔ اور اب ساڑھے تین بج رہے ہیں کھانا نہیں کھاؤ گی تو زندہ کیسے رہو گی۔ چلو...“

شمع ہو جاؤ۔ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔“  
 نائلہ درانی کچھ دیر تک خاموش بیٹھی کھانے کی ٹرے کو گھورتی رہی پھر پلنگ پر پھر لٹکا کر بیٹھ گئی اور  
 کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ رضیہ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ کھانے سے انکار کر کے وہ اپنے آپ سے دشمنی  
 بنی ہے۔ رضیہ بھی کھانے میں اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

کھانے کے بعد وہ دونوں برآمدے میں آکر موڑھوں پر بیٹھ گئیں۔ بخشو شیڈ کے نیچے بھینس کا گوتا وہ بنا  
 تھا اور مرغیاں اس پاس دانہ دٹکا چکتی پھر رہی تھیں۔

نائلہ کو یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ گل مرگ والی اپنی حویلی میں بھی یہ سب کچھ ہوتے دیکھتی  
 تھی۔ لیکن آج اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ گن مین باہر دو مرتبہ حویلی میں آیا اور باہر گیا تھا۔ اس  
 چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اور چادر کے اندر چھپی ہوئی راقول صاف نظر آرہی تھی۔

مرادو نے سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چار پانچ لالینیں جلا دی تھیں۔ ایک لالین بھینس والے  
 تیر میں ٹانگ دی گئی۔ ایک برآمدے میں۔ اور باقی مختلف کمروں میں رکھ دی گئی تھیں۔

سورج غروب ہونے کے بعد سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نائلہ اور رضیہ برآمدے سے اٹھ کر کمرے  
 میں آ گئیں۔ اس دوران مرادو نے نائلہ کے بستر کی چادر وغیرہ تبدیل کر دی تھی اور ایک صاف ستھرا لحاف  
 سجھ رکھ دیا تھا۔ ان انتظامات سے نائلہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شبیر درانی اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔  
 اس کے شہر والے مکان کے بارے میں تو وہ جانتی تھی۔ لیکن اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس مکان کو بھی وہ  
 میزبانی کے لئے استعمال کرتا تھا۔

کمرے میں لالین جل رہی تھی۔ نائلہ نے تو بستر پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا اور رضیہ اس کے ساتھ  
 سہمے پر بیٹھ گئی۔

”تم زخم میں کوئی تکلیف تو محسوس نہیں کر رہیں؟“ رضیہ نے پوچھا۔  
 ”صبح کچھ تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ لیکن سو جانے کے بعد تکلیف کا احساس نہیں رہا۔“ نائلہ نے  
 جواب دیا۔

”میں نے سوتے میں تمہارا زخم دیکھا تھا۔ اور آئنمنٹ لگا دیا تھا۔ میں نے میز پر یہ ٹیوب رکھ دی  
 ہے۔ سونے سے پہلے ایک مرتبہ خود ہی لگا لینا۔“ رضیہ نے میز پر رکھی ہوئی آئنمنٹ کی ایک ٹیوب کی طرف  
 اشارہ کیا۔ ”ویسے چند روز تمہیں یہاں آرام کا موقع ملے گا تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

”آرام تو اب اپنی زندگی سے رخصت ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آنے والے دور میں مقدر کیا  
 میں کھیلتا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

”ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ رضیہ نے کہا۔ ”شبیر درانی تمہارا اکرن ہے۔ وہ تمہاری  
 رونا چاہتا ہے۔ تم اس سے خوفزدہ کیوں ہو؟“

”میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔  
 اس سے پہلے کہ رضیہ کوئی اور بات کرنی مرادو کھانا لے کر آگئی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے کھانا

کھاتے لگیں۔ کھانے کے بعد بھی وہ دیر تک باتیں کرتی رہیں پھر رضیہ جمائیاں لینے لگی۔  
 ”عجیب بات ہے۔“ رضیہ کلائی پر بندھی ہوئی کھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ابھی دس بجے ہیں اور نیند

سے کھینچ بند ہوئی جا رہی ہیں۔“

”گاؤں کی زندگی شہروں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”شام کا اندھیرا پھیلنے ہی گاؤں کے لوگ اپنے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہاں تو صرف یہی ایک گھر ہے۔ تمہیں نیند آرہی ہے تو جا کر سو جاؤ۔۔۔ مجھے بھی غودگی سی محسوس ہو رہی ہے۔“

”سونے سے پہلے زخم پر آئنٹمنٹ لگالینا۔ میں ساتھ والے کمرے میں ہوں۔ بیچ میں یہ دروازہ میرے ہی کمرے میں کھلتا ہے۔ اگر رات کو کسی وقت ضرورت محسوس کرو تو دروازہ کھٹکھٹا دینا۔۔۔ اور یہ دوسرا دروازہ۔“ رضیہ نے دوسری طرف ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس طرف مرادو کا کمرہ ہے۔۔۔ اچھا۔۔۔ اب میں چلتی ہوں۔“

رضیہ جمانی لیتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسی وقت مرادو کمرے میں داخل ہوئی۔  
 ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو نائلہ بی بی۔ میں سوئے جا رہی ہوں۔“ مرادو نے کہا۔  
 ”نہیں، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

مرادو کمرے سے نکل گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ کنڈے کی آواز سے نائلہ نے محسوس کر لیا تھا کہ باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ نائلہ نے اٹھ کر اندر سے کنڈہ لگا دیا اور ساتھ والے کمروں میں کھلنے والے دروازوں میں بھی کنڈے لگا دیئے۔ پھر بستر پر لیٹ کر اس نے پیٹ کے زخم پر آئنٹمنٹ لگائی اور لحاف اوٹھ لیا۔ لائٹیں کی لودم م کر کے اس نے نیچے زمین پر رکھ دی تھی۔ اس نے رضیہ سے سوئے کا ہمانہ کیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے دماغ میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ رضیہ کے لائے ہوئے اخبارات کی خبروں سے اس کے روئے کھٹے ہو گئے تھے۔ پولیس اسے ہر طرح سے پھنسانا چاہتی تھی لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اچانک پولیس اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی۔ جب تک اس کا باپ عبدالصمد درانی زندہ رہا تھا پولیس کے بڑے بڑے آفیسران کے دروازے پر حاضری دیا کرتے تھے۔ لیکن پھر کایک پولیس کے رویئے میں یہ تبدیلی بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد اس نے کبھی پولیس کو منہ نہیں لگایا تھا۔ زیادہ عرصہ تو وہ لاہور میں رہی تھی۔

اسے دو غنڈوں نے اغواء کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر گولی مار کر زخمی کر دیا تھا اور جس شخص نے انسانی ہمدردی کی بناء پر اسے ہسپتال پہنچایا تھا پولیس نے اسی کے قتل کے الزام میں نائلہ کو گرفتار کیا تھا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ اس شخص کو قتل کس نے کیا تھا؟ کیا نائلہ کو کسی سازش کے تحت کسی کیس میں پھنسانے کے لئے اس بے گناہ شخص کو پولیس نے قتل کیا تھا؟ بہت سے سوالات تھے جو نائلہ درانی کے ذہن میں جکرا رہے تھے لیکن کسی کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

رات کے سنانے میں کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اگر یہ مکان کسی بستی میں ہوتا تو ممکن ہے کبھی کبھار کوئی ایک آدھ آواز سنائی دے جاتی مگر یہ مکان اکیلا تھا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

نائلہ درانی بستر سے نکل کر کھڑکی کے سامنے آگئی۔ کھڑکی کا شیشہ والا پٹ کھولتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اور اسے جھرجھری سی آگئی۔ وہ کھڑکی کی آہنی سلاخوں کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور باہر گہری تاریکی میں گھورنے لگی۔ جھینگروں اور حشرات الارض کی آوازیں رات کے سنانے میں عجیب سا تاثر دے رہی تھیں۔ تاریکی میں کبھی کبھی کوئی جھٹکنا بھی چمکتا ہوا نظر آ جاتا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر اس نے کھڑکی بند کر دی اور دوبارہ بستر پر آکر لیٹ گئی

اور لحاف سینے تک اوڑھ لیا۔ وہ رات کو دیر تک مطالعہ کی عادی تھی۔ یہاں اس کے پاس رضیہ کے لئے ہوئے چند اخبارات تھے۔ مگر لائین کی روشنی میں مطالعہ کی کوشش کر کے وہ اپنی آنکھوں کا بیڑا غرق نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یوں بھی ان اخباروں میں پڑھنے کو تھا ہی کیا؟ اس کے خلاف جھوٹی خبریں!

نالہ درانی کے لئے وقت گزرانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وقت ختم گیا ہو۔ وہ گاؤں کی زندگی کی عادی تھی۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ گاؤں ہی میں گزرا تھا۔ لیکن اس کے گاؤں کے گھر میں تو کبھی ایسا سا نا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس گھر میں اس کے علاوہ چار افراد اور تھے لیکن ان کے ہوتے ہوئے بھی یہاں قبر کی سی خاموشی تھی۔ نالہ کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ لوگ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر خود بھی سو گئے ہوں۔ ان کے اطمینان کی بہت سی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ کھڑکی میں آہنی سلاخیں اور اس کے کمرے کے دروازے پر باہر سے آلا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے نالہ کمرے سے نہیں نکل سکتی تھی۔

نالہ درانی بستر پر لیٹے لیٹے یہاں سے فرار کے امکانات کا جائزہ لیتی رہی۔ اگر کھڑکی کی کم از کم دو سلاخیں نکال دی جائیں تو فرار کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ مگر سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ انہیں تو اپنی جگہ سے ہلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کی نگرانی کے لئے یہاں چار افراد موجود تھے۔ ان میں ایک تو باقاعدہ تربیت یافتہ گن مین تھا جسے خاص طور پر اس کی نگرانی ہی کے لئے یہاں چھوڑا گیا تھا۔ اگر ان لوگوں میں سے کسی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اطمینان سے سو گئے ہوں گے۔ ممکن ہے وہ کسی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہوں اور ان کی آوازیں یہاں تک نہ پہنچ رہی ہوں۔

نالہ کو وقت کا اندازہ نہیں تھا لیکن اس کے خیال میں رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ لحاف میں دبی کر نہیں بدل رہی تھی کہ بائیں طرف والے دروازے کے دوسری طرف آہٹوں کی بہت ہلکی سی آواز سن کر وہ چونک سی گئی۔ رضیہ نے بتایا کہ وہ کمرہ مرادو کا تھا۔ اور دوسری طرف والا کمرہ رضیہ کو دیا گیا تھا۔ آٹھیس ایک دو بار پھر سنائی دیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دو افراد آپس میں کسی قسم کی جدوجہد کر رہے ہوں۔ نالہ بڑی آہستگی سے پلنگ سے اتر آئی اور دبے قدموں چلتی ہوئی اس دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ اور دوسری طرف جھانکنے کی جگہ تلاش کرنے لگی۔ بالاخر اسے دروازے میں ایک جھری سی نظر آئی گئی۔ اس نے جھری میں آنکھ لگا دی۔

دوسرے کمرے میں لائین جل رہی تھی۔ روشنی مدھم تھی۔ نالہ کو پہلے تو کچھ نظر نہ آ سکا اور پھر جب دوسری طرف کا منظر دکھائی دیا تو اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔

وہ مرادو تھی اور اس کے ساتھ گن مین باہر تھا۔ مرادو باہر کے کنبے میں تھی اور باہر اسے بے لباس کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ مرادو اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی جدوجہد کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

”آج میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔“ باہر کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔ ”میں جب بھی اس ڈیرے پر آتا ہوں تمہیں دیکھ کر پاگل ہو جاتا ہوں۔ پچھلی مرتبہ میں نے بڑے سیدھے سادے طریقے سے تم سے اپنی خواہش پوری کرنے کی کوشش کی تھی مگر تم نے مالک سے میری شکایت کر کے مجھے ان کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ آج میں نہ صرف اپنی توہین کا بدلہ لوں گا بلکہ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ آئندہ تم میرے سامنے

انکار نہیں کر سکو گی۔“

”چھوڑ دو مجھے کہنے۔ میں آواز دے کر بخشو کو بلا لوں گی۔“ مراد بولی۔

”بخشو!“ باہر کے لمبے میں طر تھا۔ ”وہ تو ایون کھا کر سو رہا ہوگا۔ اس وقت تو فرشتے بھی اسے گہری نیند سے نہیں جگا سکیں گے۔ آج میں نے اسے چھٹانک بھر ایون لا کر دی تھی۔ اس نعمت کے بدلے تو وہ تمہیں بخوشی میرے حوالے کر سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں شرافت سے مان جاؤ ورنہ...“

”میں شور مچا دوں گی۔“ مراد نے دھمکی دی۔

باہر نے بڑی پھرتی سے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا اور دوسرا ہاتھ اس کی قیض کے گلے پر ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ مراد کی قیض پھٹ گئی۔ لیکن وہ آسانی سے باہر کے سامنے ہتھیار ڈالنے والی عورت نہیں تھی۔ شروع میں اس کے بارے میں نالہ درانی کا خیال کچھ اور تھا۔ لیکن اب اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کم از کم اس معاملے میں باکردار عورت تھی۔ اس نے پوری زندگی ایک ایسے آدمی کے ساتھ گزار دی تھی۔ جو اس کے جذبات کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکا تھا۔ مگر اس نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کوئی غلط راستہ بھی اختیار نہیں کیا تھا۔

وہ ایک نیم خیم عورت تھی لیکن ایک مرد کے مقابلے میں پھر بھی کمزور تھی۔ نالہ درانی دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے لیکن وہ خود بھی ایک عورت تھی اور اس طرح عورت کی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”مرادو!“ نالہ درانی دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے چیخی۔ ”اس کمرے میں کون ہے۔ دروازہ کھولو۔“

دروازہ دھڑ دھڑانے کے بعد اس نے ایک بار پھر جھری سے آنکھ لگا دی۔

گن مین باہر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے مراد کو چھوڑ دیا اور دیوار کے ساتھ لگی کھڑی اپنی رائفل اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے جاتے ہوئے مراد سے کچھ کہا بھی تھا۔ غالباً کوئی دھمکی دی تھی۔

مراد اپنی قیض درست کرنے لگی۔ مگر قیض سامنے سے پھٹ چکی تھی۔ اس نے چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔ نالہ نے ایک بار پھر دروازہ دھڑ دھڑایا۔

”دروازہ کھولو مرادو۔“

چند سینکڑ بعد دوسری طرف سے کنڈا ہٹائے جانے کی آواز سنائی دی۔ نالہ نے بھی اپنی طرف کا کنڈا ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ مراد کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے۔ کون تھا وہ؟“ نالہ نے اسے ہانپوں سے تھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں بی بی... کوئی بات نہیں ہوئی۔“ مراد نے جواب دیا۔

”لیکن میں خود دروازے کی جھری میں سے دیکھ چکی ہوں۔ وہ تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے شور کیوں نہیں مچا دیا۔“ نالہ بولی۔

”کیا کروں بی بی۔“ مراد روہا لسی آواز میں بولی۔ ”ہم غریب مزار سے اپنے مقدر میں ذلت و رسوائی لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ زمینداروں کے ظلم سہتا اور ان کے کارندوں کے ہاتھوں رسوا ہونا ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم اس طرح کسی کے ہاتھوں کا کھلونا بن جائیں۔ یہ باہر پہلے بھی ایک دو مرتبہ دست درازی کی کوشش کر چکا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے مالک سے اس کی شکایت بھی کی تھی۔“

تین اس بے غیرت پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔“

دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز سن کر رضیہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اسے بھی باہر کی اس دیدہ دلیری پر حیرت ہوئی تھی۔ اگر مرادو گھر میں اکیلی ہوتی تو اس پر دست درازی کی کوشش کسی حد تک سمجھ میں آتی تھی مگر اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے ایسی کوئی کوشش حماقت ہی ہو سکتی تھی۔ اس کا شاید دماغ ہی خراب ہو گیا تھا۔

بخشو واقعی انیوں کھا کر سویا تھا۔ اسے اس واقعہ کی خبر تک نہیں ہو سکی تھی۔ مرادو نے نائلہ اور رضیہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے کہ وہ بخشو کو اس سلسلے میں کچھ نہ بتائیں۔

باہر غالباً حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔ کیونکہ اس کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد رضیہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور مرادو نے بھی نائلہ کو اس کے کمرے میں دھکیل کر اپنی طرف سے دروازے کا کنڈہ لگا دیا تھا۔

نائلہ بستر پر لیٹ گئی۔ وہ یہاں سے فرار کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔ لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اب اس واقعہ نے اسے امید کی ایک ہلکی سی کرن دکھا دی تھی۔ وہ مرادو سے ہمدردی کا اظہار کر کے اسے باہر کے خلاف استعمال کر سکتی تھی۔ اس طرح اسے یہاں سے فرار کا موقع مل سکتا تھا۔

صبح ہوتے ہی نائلہ درانی نے اس منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ مرادو سے ہمدردی جتنا کر وہ اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور نائلہ درانی نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ مرادو کا رویہ تبدیل ہو رہا تھا۔ گزشتہ روز اس کے رویے میں جو سختی تھی وہ بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

بابردن میں حویلی میں نظر نہیں آیا تھا۔ بخشو کو رات والے واقعہ کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا اسی کے ذریعے باہر کو حویلی سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ سہ پہر کے قریب نائلہ درانی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کو حویلی کے پچھلی طرف باغ میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔

تین چار روز گزر گئے۔ نائلہ درانی اس حویلی میں قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ اس دوران باہر کا کوئی بھی شخص حویلی میں نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی کوئی یہاں سے گیا تھا۔ نائلہ کا رابطہ دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ اس حویلی کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ اسے پولیس کی سرگرمیوں کا بھی کوئی علم نہیں تھا۔

وہ پانچواں دن تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا کہ اچانک ایک موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی اور بالاخر ایک موٹر سائیکل حویلی کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی۔ باہر اس وقت اندر تھا اور حویلی کا گیٹ بند ہو چکا تھا۔ اس نے چھوٹی سی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور پھر گیٹ کھول دیا۔ موٹر سائیکل سوار شیر درانی کا آدمی تھا۔

”کیا بات ہے برکت؟ تم کچھ گھبرائے ہوئے سے لگ رہے ہو؟“ باہر نے پوچھا۔

”مالک نے بھیجا ہے مجھے۔“ برکت نے جواب دیا۔ ”پولیس ایک گھنٹے میں یہاں پہنچنے والی ہے۔ مالک کا حکم ہے کہ نائلہ بی بی اور دوسری لڑکی کو لے کر حویلی سے نکل جاؤ۔ انہیں کہیں بھی لے جاؤ۔ کھیتوں میں کسی باغ میں یا نہر کے دوسری طرف ٹیلوں میں۔ مگر یہاں ان کی موجودگی کا کوئی نشان نہیں رہنا چاہئے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ تم جلدی سے ان کو لے کر نکل جاؤ۔“

برکت موٹر سائیکل پر سوار ہو کر واپس چلا گیا اور باہر گیٹ بند کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمد ہو گیا۔

طرف آیا۔

نالکہ درانی اور رضیہ اس وقت برآمدے میں موڑھوں پر بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے بابر کو گیٹ پر کسی موٹر سائیکل سوار سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور پھر بابر کو تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھ کر نالکہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”نالکہ بی بی اور لڑکی تم؟“ وہ رضیہ کی طرف مڑ گیا۔ ”اپنا سامان سمیٹو۔ ہمیں دس منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکلتا ہے۔ پولیس آنے والی ہے اور پولیس کو یہاں تمہاری موجودگی کا کوئی نشان نہیں ملنا چاہئے۔“ رضیہ اٹھ کر کمرے کی طرف دوڑی۔ مگر نالکہ درانی موڑھے پر بیٹھی رہی۔ نجانے کیوں اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

”تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ چلو۔۔۔ تم بھی اپنی چیزیں سمیٹو۔“ بابر چیخا۔

”میرے پاس کیا ہے۔ یہی کپڑے جو پہنے ہوئے ہوں۔“ نالکہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بابر نے بخشتو اور مراد کو بلا لیا اور انہیں ہدایات دینے لگا۔

”پولیس کو پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ یہاں کوئی آیا تھا۔ سمجھے تم لوگ! اگر تم لوگوں کی باتوں سے پولیس کو ان کی یہاں آمد کا شبہ بھی ہو گیا تو مالک کو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ تم دونوں کو الٹا لٹکا کر کھال کھینچو دیں گے۔“

تقریباً دس منٹ بعد رضیہ اپنا بیگ لے کر آگئی۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھی کہ اگر وہ نالکہ کے ساتھ پکڑی گئی تو اس کا شر بھی ڈاکٹر احمد اور رحمت سے مختلف نہیں ہوگا۔

”تمہاری کوئی چیز یہاں رہ تو نہیں گئی؟“ بابر نے اسے گھورا۔

”نہیں“ میں نے کمرہ اچھی طرح چیک کر لیا ہے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ بابر نے شیڈ سے ایک تھیلی اٹھالیا اور وہ ان دونوں کو لے کر حویلی سے باہر آگیا۔ اس نے تھیلیا کدھے پر لٹکا لیا تھا اور آٹو بیگ را نقل ہاتھ میں پکڑی تھی۔ وہ ان دونوں کو بکریوں کی طرح ہانکتا ہوا باغ میں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ درختوں کی وجہ سے یہاں کچھ زیادہ تاریکی محسوس ہو رہی تھی۔

”نالکہ بی بی۔“ بابر نے نالکہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس موقع سے تم کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ مالک کا حکم ہے کہ اگر تم بھاگنے کی کوشش کرو تو تمہیں گولی مار دی جائے اور میں ٹرائیگر دبانے میں دریغ نہیں کروں گا۔“

”میں پاگل نہیں ہوں اور میرا خود کشی کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

وہ آموں کے باغ سے نکل کر کھیتوں میں آگئے۔ اور پگڈنڈیوں پر چلتے رہے رضیہ اور نالکہ آگے تھیں اور بابر را نقل تانے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

وہ حویلی سے تقریباً دو فرلانگ دور نکل آئے۔ آگے ایک چھوٹی سی نہر تھی۔ آس پاس کوئی پل نظر نہیں آ رہا تھا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ نالکہ کپکپا کر رہ گئی۔

نہر کے دوسری طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر لکڑی کا ایک سائبان سا بنا ہوا تھا۔ دن کے وقت کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اسی سائبان کے نیچے کچھ دیر کو سستالیتے ہوں گے لیکن اس وقت سائبان سنان پڑا تھا۔ زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ جگہ مناسب رہے گی۔ زیادہ دور جانا بھی مناسب نہیں ہوگا۔“ بابر نے ادھر ادھر

بچتے ہوئے کہا۔

رضیہ اور نائلہ چٹائی پر بیٹھ گئیں۔ یہاں کھیتوں میں کھلی جگہ پر سردی زیادہ تھی۔ نائلہ چادر میں سمٹ کر سانبان کے لکڑی کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ رضیہ تو نئی تمام چیزیں بیک میں سمیٹ لائی تھی۔ اور ممکن ہے اس نے کوئی نشان بھی نہ چھوڑا ہو لیکن نائلہ حویلی میں اپنی موجودگی کے نشانات چھوڑ آئی تھی۔ اس کے کمرے میں میز پر ایک تو آئنمنٹ کی وہ ٹیوب تھی جو زخموں پر لگائی جاتی تھی اور حویلی میں اس کی موجودگی کا دوسرا ثبوت وہ اخبارات تھے جو گزشتہ روز رضیہ رحیم یار خان سے لے کر آئی تھی۔ اگر صرف ایک اخبار ہوتا تو اسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا لیکن وہ تین چار اخبار تھے اور تمام اسی تاریخ کے خمبے تھے جب نقاب پوشوں نے پولیس کی دین پر حملہ کر کے نائلہ کو پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا۔ نائلہ کو یقین تھا کہ اگر پولیس حویلی میں پہنچ گئی تو یہ اخبارات نظر انداز نہیں کئے جاسکتے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بہت دور کھیتوں میں دو تیز روشیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ کسی گاڑی کے ہیڈ لمپس کی روشنیاں تھیں اور اس گاڑی کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ روشنیاں کبھی غائب ہو جاتیں اور کبھی نظر آنے لگتیں اور بالا خرہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ گاڑی واپس چلی گئی۔ بابر نے انجن کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ جیب تھی اور یقیناً پولیس کی جیب تھی۔ جو سڑک کی طرف واپسی جاری تھی، نائلہ درانی دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ خدا کرے میز پر رکھی ہوئی آئنمنٹ کی ٹیوب اور اخبارات پولیس کی نظروں میں آگئے ہوں۔

”چلو... اب واپس چلو... لیکن حویلی کے قریب پہنچ کر ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے پولیس کا کوئی آدمی حویلی میں رہ گیا ہو۔“ بابر نے کہا۔

وہ لوگ واپس چل پڑے۔ انہیں ایک بار پھر نہر کے ٹھنڈے پانی میں سے گزرنا پڑا۔ حویلی کی پشت پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ بابر ایک کمرے کی کھڑکی سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے انگلی سے ہولے سے کھڑکی کا شیشہ بجایا۔ یہ مرادو کا کمرہ تھا۔ کھڑکی فوراً ہی کھل گئی۔

”آجادو... وہ لوگ جا چکے ہیں۔“ مرادو نے اس کی صورت دیکھے بغیر کہا۔ یہ اشارہ شاید ان میں پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا۔

بابر ان دونوں کو لے کر گیٹ کی طرف آگیا۔ بخشو نے گیٹ کھول دیا اور وہ اندر آگئے۔ اپنے کمرے میں آتے ہی نائلہ درانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میز پر سے آئنمنٹ کی ٹیوب اور تمام اخبارات غائب تھے۔ نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پولیس والے دوبارہ آئیں گے۔

بابر، مرادو اور بخشو سے سوالات کر رہا تھا۔

”انہوں نے پورے گھر کی تلاشی لی تھی۔“ بخشو نے بتایا۔ ”ہم سے بہت سے سوال بھی کئے تھے۔ لیکن ہم نے صاف کہہ دیا کہ یہاں کئی دن سے کوئی نہیں آیا۔“

”ٹھیک ہے؟“ بابر نے جواب دیا۔ پھر مرادو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”بلا وجہ کی بھاگ دوڑ ہو گئی۔ بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو دو۔“

”ایک گھنٹہ لگے گا۔ تمہیں تو ہر وقت کھانے کی فکر لگی رہتی ہے۔“ مرادو نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا اور وہاں سے ہٹ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔



نائلہ رضیہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ اس وقت اسے اپنے کمرے میں نہیں لے جاتی تھی تاکہ اخبار غائب پا کر اسے پولیس کے بارے میں شبہ نہ ہو جائے۔

نوبت کے لگ بھگ انہیں کھانا ملا۔ وہ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی آدمی تھا جو شام کے وقت بھی آیا تھا۔ اس نے آکر اطلاع دی کہ شیر درانی آج رات یہاں آنے والا ہے۔ شیر درانی کا نام سن کر نائلہ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ یہ ساری مصیبت اسی کی لائی ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیر درانی اس سے کیا چاہتا تھا لیکن اس نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ شیر کی خواہش پوری نہیں ہونے دے گی۔

رات گیارہ بجے کے قریب شیر درانی پہنچ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ نائلہ کی چھوٹی بیٹی بیگم بھی تھی۔ حسینہ بیگم نے آتے ہی نائلہ کو اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کی تھی لیکن نائلہ نے اسے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

”نفرت ہے مجھے اس منافقت سے۔ مجھے ایسے پیار کی ضرورت نہیں ہے جس میں فریب، دھوکا اور حرص ہو۔“ نائلہ درانی نے کہا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا لڑکی؟“ حسینہ بیگم غصے میں چینی۔ ”کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میرے بیٹے نے کتنا بڑا خطرہ مول لے کر تمہیں پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا۔ اس میں چھ آدمی مارے گئے تھے۔ اگر ساتھ بھی مارے جاتے تو ہمیں پرواہ نہ ہوتی۔ ہمیں تو تمہاری جان اور تمہاری عزت پیاری ہے۔ آخر کو تم ہماری بیٹی ہو۔ اگر تمہارے سر پر باپ کا سایہ نہیں تو کیا ہوا۔ ہم تو زندہ ہیں۔“

”میرا باپ زندہ ہوتا تو آپ لوگوں کو یہ سب کچھ کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ میرے لئے یہ ساری مصیبتیں آپ ہی لوگوں نے کھڑی کی ہیں۔ پہلے مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام لگایا گیا اور جب پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا تو چھ آدمیوں کو قتل کر کے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا گیا۔ کیا اس کا ردروائی سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ قتل بھی میں نے ہی کیا تھا، مجھے چھڑانے کے لئے میرے ہی آدمیوں نے پولیس کے خلاف کارروائی کی ہوگی۔ کیا اس ساری کارروائی نے مجھے مجرم نہیں بنا دیا۔ حالانکہ اگر مجھے عدالت میں پیش کیا جاتا تو میں اپنی بے گناہی ثابت کر سکتی تھی۔ اب میں زندگی بھر پولیس سے چھٹی پھروں گی۔“

”اگر تم ہماری بات مان لو تو پولیس تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ جانتی ہو کہ اس علاقے میں درانی خاندان کی کتنی عزت اور کتنا رسوخ ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسر ہمارے دروازے پر حاضری دیتے ہیں۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔

”لیکن اب درانی خاندان کی یہ عزت آپ کے اس نالائق بیٹے کی وجہ سے خاک میں مل چکی ہے۔ یہ ہنگامے، یہ قتل و غارت... کیا آپ کے خیال میں اس سے خاندان کی عزت و وقار کو چار چاند لگے ہوں گے؟“ نائلہ کے لہجے میں طنز تھا۔

”بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کے مزارعے مرتے ہی رہتے ہیں اور عدالتوں میں مقدمے بازیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یہ قتل و غارت اور مقدمے بازیاں تو زمینداروں کا ساگ ہوتی ہیں۔“ حسینہ بیگم بولی۔

”لیکن مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے۔ نفرت ہے مجھے ایسی باتوں سے۔ اور آپ جو چاہتی ہیں وہ نہیں ہو سکتا۔“ نائلہ نے دو ٹوک جواب دیا۔

”میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آئی ہوں۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔ ”تم اب اکیلی ہو۔ سب کی نظریں تمہاری جائیداد پر لگی ہوئی ہیں۔ خاندان کے بہت سے نوجوان تم سے شادی کرنے کے خواہشمند ہیں۔۔۔۔۔ وہ دراصل تم سے نہیں تمہاری دولت سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ تم میرے بھائی کی اولاد ہو اور تمہاری بھلائی کے لئے سب کچھ کر رہی ہوں۔ میرا اب بھی مشورہ یہی ہے کہ میری بہو بن جاؤ۔ بڑی سکھی رہو گی اور زندگی کے سارے جھنجھنوں سے نجات مل جائے گی۔ شبیر سب کچھ سنبھال لے گا۔“

”میرا باپ اس رشتے سے انکار کر چکا ہے۔ وہ تمہارے بیٹے کے پھن اچھی طرح جانتا تھا۔ میں بھی اتنی بھولی نہیں ہوں۔ تمہارے بیٹے کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ اور سب کچھ جانتے ہوئے جہنم میں جھلانگ نہیں لگا سکتی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”جو کوئی کی باتیں مت کرو۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔ ”بڑے زمینداروں کے بیٹے ایسی چھوٹی موٹی حرکتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں میرا بیٹا ایک شریف نوجوان ہے۔ دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر ذرا ہلک گیا ہے۔ تم سے شادی ہو جائے گی تو خود ہی سدھر جائے گا۔ ذمے داریوں کا بوجھ اسے سیدھے راستے پر لے آئے گا۔“

”نہیں۔“ نائلہ درانی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا جواب اب بھی نفی میں ہے۔“

”سوچ لو نائلہ؟“ حسینہ بیگم نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”سوچ لیا ہے۔“ میرا فیصلہ امل ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”میں تمہیں صرف دو دن کی مہلت دے رہی ہوں نائلہ درانی۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔ اس کا لہجہ بیکر بدل گیا تھا۔ ”اگر دو دن کے بعد بھی تم نے اپنا فیصلہ شبیر کے حق میں نہیں بدلا تو ہمیں کوئی دوسرا طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔“

”میں تمہارا ہر ظلم سننے کو تیار ہوں۔ لیکن میں جو فیصلہ کر چکی ہوں اس پر مرتے دم تک قائم رہوں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ حسینہ بیگم کچھ کہتی ایک بھاری آواز فضا میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”اس حویلی کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شبیر درانی اور اس کی والدہ حویلی میں موجود ہے۔ تم لوگوں کی بہتری اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔“

یہ آواز انسپکٹر اعظم کی تھی جسے سنتے ہی حویلی میں کھلبلی مچ گئی۔ شبیر کے ساتھ آنے والے گن مین مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ مگر شبیر درانی نے چیخ کر انہیں حکم دیا کہ کوئی گولی نہ چلائی جائے۔ میگافون پر پولیس کی آواز سن کر نائلہ درانی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ شبیر سب کچھ سنبھال لے گا۔ یہ پولیس والے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔“ حسینہ بیگم نے اسے تسلی دی۔

شبیر درانی اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی اس کے ساتھ انسپکٹر اعظم اور دو مسلح کانسیبل تھے، کانسیبل تو برآمدے میں ہی رک گئے اور انسپکٹر اعظم، شبیر درانی کے ساتھ کمرے میں آگیا۔

نالہ درانی انسپکٹر اعظم کو دیکھ کر خوفزدہ سی ہو گئی۔ آخر پولیس اس تک پہنچ ہی گئی تھی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی وہ مجرم تھی۔

”مجھے یقین تھا کہ یہ قاتلہ یہیں ہوگی۔“ انسپکٹر اعظم نے نالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شام کو ایک خبر کی اطلاع پر جب میں نے یہاں پر ریڈ کیا تھا تو یہ تو نہیں ملی تھی البتہ ایک کمرے سے زخموں پر لگانے والے مرہم کی ٹیوب اور اخبارات کے وہ پیچھے مل گئے تھے جن میں پولیس دین پر حملے کی خبریں تھیں۔ میں اسے گرفتار کر کے لے جا رہا ہوں اور شبیر درانی صاحب آپ کو بھی ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔“

”تم حواس میں تو ہو انسپکٹر اعظم؟“ حسینہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”کیا تم بھول گئے ہو کہ تمہیں یہاں تک پہنچانے میں کس کا ہاتھ ہے۔ جو نیڑی میں رہنے والا تیل قیلے کا ایک جاہل لڑکا جب پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہوا تو تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ زندگی بھر کانسٹیبل کی حیثیت ہی سے دھکے کھاتا رہتا۔ تم بھول گئے ہو کہ تمہاری جھگیاں ہمارے بنگلے کے قریب ہی تھیں اور تم پولیس کی ڈیوٹی دینے کے بعد خدنگاروں کی طرح ہمارے دروازے پر کھڑے رہتے تھے۔ ہم نے ہی تمہیں پرائیویٹ طور پر تعلیم دلوائی تھی اور پولیس میں تمہاری ترقیوں کی سفارش بھی کرتے رہے تھے۔ اور شاید تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ کچھ عرصہ پہلے جب جعلی پولیس مقابلے میں ایک آدمی کے قتل کے الزام میں معطل کر کے تمہیں گرفتار کیا گیا تھا تو وہ ہم ہی تھے جنہوں نے تمہیں اس عذاب سے نجات دلا کر نہ صرف دوبارہ ملازمت پر بحال کرایا تھا بلکہ تمہیں سب انسپکٹر سے انسپکٹر کے عہدے پر بھی ترقی دلوائی تھی۔ مگر تم ہمارے تمام احسانات بھول کر ہمارے خاندان کی ایک لڑکی کے پیچھے پڑ گئے۔ تم نالہ کو لاوارث سمجھتے ہو لیکن تم جانتے ہو کہ نالہ میری بھانجی ہے۔ میں اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوں دوں گی۔“

”لیکن... بیگم صاحبہ...“

”ایک منٹ۔“ حسینہ بیگم نے انسپکٹر اعظم کی بات کاٹ دی۔ ”دوسرے کمرے میں چلو۔ ہم وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔ اور نالہ بیٹی۔ تم آرام سے یہاں بیٹھی رہو۔ پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

وہ لوگ ساتھ والے کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ نالہ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر بیٹھی رہی پھر نجانے کیسے سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب آگئی اور کان لگا کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت انسپکٹر اعظم کہہ رہا تھا۔

”میں آپ کا نمک خوار ہوں بیگم صاحبہ۔ آپ کے احسانات تو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ میں نے نالہ کے سلسلے میں آپ کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اسے قتل کے ایک جھوٹے کیس میں پھسانے کی کوشش کی تاکہ آپ اس کی ہمدردی سے اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔ لیکن... پولیس دین پر حملہ ہمارے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ یہ شبیر درانی کی بہت بڑی غلطی تھی۔ ان کے آدمیوں کی اس کارروائی کی وجہ سے چھ آدمی مارے جا چکے ہیں۔ جن میں تین پولیس والے بھی شامل ہیں۔ پولیس اور اعلیٰ حکام کی طرف سے مجھ پر شدید دباؤ ہے۔ مجھے کچھ تو کرنا ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ایک خبر سے اطلاع ملی تھی کہ شبیر درانی نے نالہ کو یہاں چھپا رکھا ہے۔ اور اس وقت اتفاق سے یہ خود بھی یہاں موجود ہیں۔ انہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔ معاملہ چھ آدمیوں کے قتل کا ہے۔“

”قتل چھ آدمیوں کا ہوا ایک کا... پچاسی کا پچندہ صرف ایک ہی مرتبہ گلے میں پڑتا ہے۔“ شبیر درانی نے انسپٹر اعظم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم شاید یہ بھی بھول گئے ہو کہ نائلہ کو قتل کے جھوٹے الزام میں جسنانے کے لئے تم نے ایک بے گناہ آدمی کو قتل کیا تھا۔ تم نے اسے خود گولی ماری تھی۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے نائلہ کو زخمی حالت میں بے ہوش دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی تھی اور اسے ہسپتال پہنچایا تھا۔ لیکن تم نے...“

”یہ منصوبہ بھی آپ ہی لوگوں نے تیار کیا تھا۔“ انسپٹر اعظم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ کی داندہ اور آپ کے بڑے ماموں عبدالرحمن نے ہی یہ پلاننگ کی تھی کہ نائلہ کو قتل کے جھوٹے کیس میں جسنان دیا جائے اور پھر آپ لوگ اس کے ہمدرد بن کر اسے اس کیس سے نجات دلا دیں۔ اور...“

”میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتا انسپٹر اعظم۔“ شبیر درانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم نے ایک بے گناہ پھل فروش کو گولی مار کر قتل کیا تھا۔ آج بھی بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ صادق ثانی اس شخص نے نائلہ کے پاس گارڈ کی حیثیت سے کبھی ملازمت نہیں کی۔ بلکہ اس رات اٹھ بجے کے قریب وہ ترنڈہ موڑ پر اپنی پھلوں کی ریڑھی بند کر کے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں نائلہ والا واقعہ پیش آیا۔ تم اس شخص کے قاتل ہو جو پولیس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اور تم جانتے ہو کہ پہلے بھی تم پہلے ایک بے گناہ کے قتل کا کیس چل چکا ہے۔ اس کیس سے تمہاری جان ہم نے بچائی تھی اور تمہیں ملازمت پر بحال کرایا تھا لیکن اب معاملہ مختلف ہے۔ یہ ہمارے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ ہم تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔“

”لیکن... یہ معاملہ چھ آدمیوں کے قتل کا ہے۔“ انسپٹر اعظم نے جواب دیا۔ وہ آگے بھی کہہ رہا تھا مگر نائلہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر بنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی سی پھیل رہی تھی اور دماغ میں اندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اب ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے خلاف بہت بڑی سازش کی جا رہی تھی۔ اور یہ سازش اس کے اپنے کر رہے تھے۔ اس کی پھوپھی اور تایا اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

حینہ بیگم اور شبیر درانی تقریباً ایک گھنٹے تک دوسرے کمرے میں باتوں میں مصروف رہے۔ ان کی آوازیں کبھی تیز ہو جاتیں اور کبھی سرگوشیوں کی صورت اختیار کر لیتیں۔ نائلہ درانی کو اب مزید کچھ سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لئے اتنا ہی جان لینا کافی تھا کہ وہ اپنی پھوپھی اور تایا کی سازش کا شکار ہوئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد انسپٹر اعظم اور شبیر درانی دوسرے دروازے سے باہر چلے گئے اور حینہ بیگم اندرونی دروازے سے نائلہ کے کمرے میں آگئی۔

”وہ لوگ چلے گئے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ تمہیں کسی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اس وقت میری پناہ میں ہو اور پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”میں... میں سب کچھ سن چکی ہوں۔“ نائلہ درانی نے اس کے چہرے پر نظرس جاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے آپ لوگوں نے ایک بے گناہ کو قتل کر کے مجھے قتل کے جھوٹے کیس میں پھنسوا یا۔ اور اب آپ انسپٹر اعظم کو بلیک میل کر رہی ہیں۔ اب تک آپ کم از کم سات بے گناہ افراد کو موت کی بھیٹ چڑھا چکی ہیں۔ لیکن میرے خلاف آپ کی یہ سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

”اوہ!“ حینہ بیگم کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ ”اگر تم نے ہماری باتیں سن لی ہیں تو تمہیں یہ اندازہ بھی ہو گیا ہو گا کہ میں یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہوں۔“

”صرف اور صرف میری دولت بھیانے کے لئے۔“ ٹائلہ نے جواب دیا۔

”تم غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔“ حینہ بیگم بولی۔ ”میں تمہیں ان انجانے دشمنوں سے بچانا چاہتی ہوں جو تمہاری دولت پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ میں تو تمہیں اپنی بوسہ دانا چاہتی ہوں تاکہ گھر کی لڑکی بھی گھر ہی میں رہے اور جائیداد کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”میں سب سمجھتی ہوں۔“ ٹائلہ نے اسے گھورا۔ ”میری جائیداد اور دولت کی سب سے زیادہ فکر تمہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں پہلے ہی اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔ اور اس سازش سے آگاہ ہونے کے بعد تو میں تمہارے اوباش بیٹے سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”میرا نام بھی حینہ بیگم ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ تم اپنی ضد پر کب تک قائم رہتی ہو۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ”میں تمہیں صرف دو دن کی مہلت دے رہی ہوں۔ اور اس کے بعد تمہیں میری بات ماننا ہی پڑے گی۔“

حینہ بیگم کمرے سے نکل گئی۔ ٹائلہ درمیانی دونوں ہاتھوں میں سر کو تھامے بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے سگے تایا اور بھوپچی کا خون اس قدر سفید ہو جائے گا اور وہ اس کے خلاف ایسی گھناؤنی سازشیں بھی کر سکتے ہیں۔ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔ یہ تو ایک معمولی سازش تھی۔ وہ اسے ایک سنگین کیس میں پھنسا کر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے بچا لیتے اور اس طرح حینہ بیگم اسے احسان کے بوجھ تلے لاد کر اس کی شادی اپنے بیٹے سے کر دیتی۔ لیکن ان کی سازش بے نقاب ہو چکی تھی۔ لوگ تو چند روپوں کے لئے اپنے مخالفین کو قتل کروا دیتے تھے اور یہاں تو معاملہ کروڑوں کی جائیداد کا تھا۔ شبیر درانی سے شادی سے انکار کی صورت میں اسے قتل بھی کر سکتے تھے۔ بعد میں اس کی لاش اس طرح غائب کر دی جاتی کہ کسی کو اس کا سراغ بھی نہ ملتا۔ اسے گمشدہ اور لاپتہ قرار دے کر اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیا جاتا۔

ٹائلہ درانی کو یقین تھا کہ شادی سے انکار کے بعد یہ لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اسے یا تو پولیس کے ہاتھوں مروا دیا جائے گا یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ پولیس کے ہاتھوں مروانا زیادہ آسان ہو گا۔ انسپکٹر اعظم ان کے چھتے میں تھا۔ وہ اب زندگی بھر ان سے بلیک میل ہوتا رہے گا۔ وہ ٹائلہ کو گولی کا نشانہ بنا کر یہ جواز پیش کر سکتا تھا کہ وہ قتل جیسے سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب تھی اور روپوش تھی۔ اس کا سراغ ملنے پر پولیس نے اس کے خفیہ ٹھکانے پر چھاپہ مارا۔ ٹائلہ نے گرفتاری سے بچنے کے لئے فرار ہونے کی کوشش کی اور پولیس کے ہاتھوں ماری گئی۔ اس طرح ٹائلہ کا قصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔

اب ٹائلہ کا ان کی قید میں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ حینہ بیگم نے اسے دو دن کی مہلت دی تھی۔ اور اسے ان دونوں میں فیصلہ کرنا تھا کہ شبیر درانی سے شادی پر آمادگی کا اظہار کر دے یا مہلت پوری ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے فرار کا کوئی راستہ تلاش کرے۔ لیکن فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ٹائلہ درانی کو رات بھر نیند نہیں آ سکی۔ وہ کبھی بستر پر لیٹ جاتی اور کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹپکنے لگتی۔

اس کا داغ بری طرح پکرا رہا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ دفعتاً اس کے سمجھنے ہوئے داغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اور وہ ایک جھٹکے سے ٹھک کر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں جو نیا خیال آیا تھا وہ اگرچہ خطرناک تھا مگر ناکلہ جانتی تھی کہ خطرہ لئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

دوسرے دن موقع ملنے ہی اس نے مراد سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔  
 ”مرادو!“ وہ بڑے رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ”بابر نے تمہیں بے عزت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر تم چاہو تو اس سے ایسا انتقام لے سکتی ہو کہ وہ زندگی بھر نہیں بھولے گا۔“  
 ”کل رات مالک بہت غصے میں تھے۔ اس لئے میں نے بابر کی شکایت نہیں کی لیکن اب مالک آئیں گے تو میں ان سے شکایت ضرور کروں گی۔“ مراد نے کہا۔  
 ”شبیر سے شکایت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ وہ بابر کو ڈانٹ دے گا۔ اس سے انتقام لینے کے اور طریقے بھی ہیں۔“ ناکلہ نے کہا۔  
 ”وہ کیا ناکلہ بی بی۔“ مراد نے پوچھا۔

”تم جانتی ہو کہ میں بھی اسی خاندان کی ایک فرد ہوں۔ میری جائیداد ان سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ میری جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے مختلف جھگڑے استعمال کر رہے ہیں۔ میرے خلاف قتل کے جھوٹے مقدمات بنائے گئے۔ مجھے پولیس کی حراست سے اس طرح چھڑایا گیا کہ چھ بے گناہ آدمی مارے گئے۔ میری پھوپھی حسینہ بیگم میری جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے میری شادی زبردستی اپنے بیٹے سے کرنا چاہتی ہے۔ تم شبیر درانی کو جانتی ہو وہ کس قدر عیاش اور بدکار آدمی ہے۔ وہ عورتوں کو یہاں بھی لاتا ہو گا۔ تم ایک عورت ہو۔ عورت ہوتے ہوئے تم عورت کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ کیا تمہارے خیال میں مجھے کسی ایسے آدمی سے شادی کر لینی چاہئے جو نہ صرف بدکار اور عیاش ہو بلکہ صرف میری دولت کے لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہو۔ میں جانتی ہوں وہ شادی کے بعد میری جائیداد پر قبضہ کرے مجھے کسی طرح قتل کروادے گا۔“

”شبیر درانی کے بارے میں میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں ناکلہ بی بی۔“ مراد نے جواب دیا۔ ”وہ آئے دن یہاں آوہ عورتوں کو لے کر آتا رہتا ہے۔ اور مجھے ان رنڈیوں کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ اور ایک مرتبہ تو۔۔۔“

”ہاں ہاں کھو۔۔۔ چپ کیوں ہو گئیں؟“ ناکلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ مراد جیسی عورت راستے پر آ رہی تھی۔  
 ”کیا بتاؤں بی بی۔“ مراد نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ کہتے ہیں ناکہ قیص اٹھانے سے اپنا ہی پیٹ تنگ ہوتا ہے۔“

”مجھے تم سے ہمدردی ہے مراد۔ تم جانتی ہو کہ میں تمہاری بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ ہو سکتا ہے بات کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔“

”یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔“ مراد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ان دنوں بہت سخت بیمار تھی۔ میں نے اپنی بہن کو یہاں بلوایا تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً دس سال چھوٹی اور بہت خوبصورت تھی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی مگر ایک جگہ رشتے کی بات چل رہی تھی۔“

”جس دن میری بہن شادو یہاں آئی اس سے اگلے ہی روز شبیر درانی شام کو دو آوارہ عورتوں اور اپنے چند بد معاش دوستوں کو لے کر یہاں آیا۔ ان سب کے لئے کھانا شادو نے تیار کیا اور وہی انہیں کھانا دینے کے لئے کمرے میں گئی تھی۔ بعد میں شادو نے بتایا تھا کہ شبیر درانی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔

”رات کو میں سو رہی تھی کہ چیخوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو میں سمجھی کہ شبیر درانی کے ساتھ آنے والی عورتیں چیخ رہی ہیں۔ لیکن چیخوں کی یہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ بخشوبھی جاگ گیا تھا۔ شادو دوسرے کمرے میں سوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں جھانکا تو شادو اپنے بستر پر نہیں تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

”میں ڈرتے ڈرتے شبیر درانی والے کمرے کی طرف گئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شبیر درانی اور اس کے بد معاش ساتھیوں نے شادو کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ لوگ بھوکے بھیڑیوں کی طرح اسے دبھوڑ رہے تھے۔ میں جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور شبیر درانی کے پیر پکڑ لئے کہ وہ میری بہن کو چھوڑ دیں۔ مگر میری فریادوں اور شادو کی چیخوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”شبیر درانی نے مجھے ٹھوکر مار کر کمرے سے نکال دیا اور اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس دوران بخشوبھی وہاں آیا۔ شبیر کا آدمی ہم دونوں کو ٹھوکر مارتا ہوا ہمارے کمرے میں لے آیا اور رات اٹھل تانے دروازے پر کھڑا رہا۔

”شادو کی چیخیں گونجتی رہیں مگر یہاں اس کی چیخیں سننے والا کون تھا۔ وہ دبھڑیے رات بھر شادو کو نوچتے رہے، دبھوڑتے رہے۔ پھر شادو کی چیخیں خاموش ہو گئیں۔

”شادو مر گئی۔ اسے ان لوگوں نے مار ڈالا تھا۔ مگر یہ لوگ دولت والے تھے۔ انہوں نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم نے کسی کو شادو کی موت کی اصل وجہ بتائی تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شبیر درانی نے میرے ماں باپ کو بھی دھمکا کر خاموش کر دیا تھا۔ اور شادو کی موت کو خود کشی قرار دے کر بات ختم کر دی گئی۔“

”مجھے بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔“ ناملہ درانی نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”پہلے مالک نے تمہاری بہن کی عزت لوٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور اب اس کا نوکر تمہاری عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ بھی تم پر ہاتھ ڈالے گا۔ اگر تم میری بات مانو تو ان دونوں سے اپنی بے عزتی اور بہن کی موت کا بدلہ لے سکتی ہو۔“

”میں تو دو سال سے انتقام کی آگ میں جل رہی ہوں۔“ مراد نے گہرا سانس لیا۔ ”مگر شبیر درانی پیسے والا ہے۔ اثر و رسوخ والا ہے۔ ہم غریب مزارے اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ابھی تم نے خود ہی دیکھ لیا ہے۔ پولیس نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ تمہیں اور شبیر درانی کو گرفتار کرنے آئے تھے۔ لیکن انپکڑ کس طرح بھیجی ملی بن کر چلا گیا تھا۔“

”میں سب جانتی ہوں۔ لیکن تم میری بات مان لو تو ان سے انتقام لیا جاسکتا ہے۔“ ناملہ نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ مراد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ناملہ درانی چند لمبے حطاط نگاہوں سے اوپر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر سر کو شیانہ لمبے میں مراد کو بتانے لگی

”اے کیا کرنا ہو گا۔“  
 ”نہیں نائلہ بی بی۔“ مرادو اس کے خاموش ہونے پر بولی۔ ”یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا مرادو۔ سارا الزام باہر پر آئے گا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اور پھر میں ایک مرتبہ یہاں سے نکل جاؤں تو دیکھنا کیا کرتی ہوں۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ میرے بھی حکومت کے اعلیٰ افسروں اور وزیروں سے تعلقات ہیں۔ شیردردانی کو اگر سلاخوں کے پیچھے بند نہ کرایا تو میرا بھی نام نہیں۔ بس میرا یہاں سے نکلنا شرط ہے۔ اور یہاں سے نکلنے میں صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔ یقین کرو تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ میرے فرار کا سارا الزام باہر پر آئے گا۔ اور شیردردانی باہر کی جو درگت بنائے گا اس کا اندازہ تم بھی لگا سکتی ہو۔ اور اس کے بعد شیردردانی سے میں منٹ لوں گی۔ اس سے تمہاری معصوم بہن کی بے عزتی اور قتل کا بدلہ لیا جائے گا۔ یہی موقع ہے مرادو۔ اگر تم نے میری مدد نہ کی تو زندگی بھر سکتی رہو گی۔ تمہاری بہن کی بے چین روح تمہیں ایک لمحہ کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔“

مرادو چند لمحے خاموش رہی۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”اگر بالفرض میں تمہیں یہاں سے نکال بھی دوں تو تم کہاں جاؤ گی۔ اپنے گھر تو نہیں جاسکو گی۔“  
 ”اے گھر تو میں واقعی نہیں جاؤں گی۔ لیکن یہاں سے نکل کر سب سے پہلے میں کسی ایسے اعلیٰ آفیسر سے رابطہ قائم کروں گی جو بلا خوف و خطر شیردردانی اور اس پولیس انسپکٹر کے خلاف کارروائی کر سکے جو جھپلی رات یہاں آیا تھا۔ ساری گڑبادی پولیس انسپکٹر کی پھیلائی ہوئی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔  
 ”مجھے بت ڈر لگ رہا ہے۔ تمہارے فرار کا پتہ چلتے ہی شیردردانی یہاں پہنچ جائے گا۔ باہر کے ساتھ وہ ہم دونوں میاں بیوی کی بھی چوڑی ادھیڑ ڈالے گا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم ہمیں بھی اپنے ساتھ یہاں سے لے چلو۔ میں سندھ میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں چلی جاؤں گی۔“ مرادو نے کہا۔  
 ”ایسا ممکن تو ہے لیکن... یہاں سے نکلنے ہی ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔ سندھ تمہیں اپنے خرچ پر جانا ہو گا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اگر تم اپنے اس رشتہ دار کا پتہ بتا دو تو حالات سدھرتے ہی تمہیں اتنا کچھ دے دوں گی کہ تمہیں اور تمہارے شوہر کو زندگی بھر کام کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

مرادو کی آنکھوں میں چمک سی ابھرائی۔  
 ”تمہارا منصوبہ کیا ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے نائلہ کی طرف دیکھا۔  
 ”بعد میں بتاؤں گی۔ رضیہ اس طرف آ رہی ہے۔ یہ بھی شیردردانی کی خاص ایجنٹ ہے۔ اسے ہماری باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 اور پھر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ رضیہ بھی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی نائلہ درانی صحن میں چلتی ہوئی مرغیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے پہلے ہی سے اس موضوع پر بات کر رہی ہو۔

رات کے کھانے کے بعد رضیہ حسب معمول دیر تک نائلہ کے کمرے میں بیٹھی رہی پھر جب اسے جانیایاں آنے لگیں تو اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نائلہ نے دروازہ بند کر کے اپنی طرف سے کڑا لگا لیا۔  
 نائلہ کے کمرے کو باہر سے آلا پہلے ہی لگایا جا چکا تھا۔  
 اس رات بھی سردی کچھ زیادہ تھی۔ نائلہ بستر میں لیٹی وقت گزرنے کا انتظار کرتی رہی۔ گزرنے والا



ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ دفععتاً دوسری طرف والے کپڑے کے دروازے پر دستک کی بہت ہلکی سی آواز سن کر نالکہ چونک گئی۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے اٹھنے سے بہت آہستگی سے دروازہ بجایا ہو۔ وہ بڑی پھرتی سے بستر سے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گئی اور بڑی آہستگی سے اپنی طرف کا کٹا کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ آہستگی سے کھل گیا۔ مرادو اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے اپنے کمرے کی لائٹیں بجھا رکھی تھیں اور اندر اندر میرا تھا۔

”میں نے سارا انتظام مکمل کر لیا ہے۔“ مرادو نے سرگوشی میں کہا۔ ”بابر رات کو دو تین بجے قریب چائے پئے گا۔ اس کے لئے چائے میں ہی بناؤں گی اور چائے میں اتنی انیون ملا دوں گی کہ وہ صبح نو ذرے بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکے گا۔ اور یہ جو لڑکی ہے نارضیہ۔ اسے ہم جانے سے پہلے سوتے ہی میٹر رسیوں سے باندھ دیں گے۔ میں نے اپنا سارا بندوبست کر لیا ہے۔ اپنے اور بخشو کے کپڑوں کے دو چار جوڑے زیور اور نقد پیسے جتنے بھی تھے ایک پوٹلی میں باندھ لئے ہیں۔ بخشو کو میں نے بڑی مشکل سے بھانگے پر آمادہ کیا ہے۔ اسے میں نے یہ لالچ دیا ہے کہ حالات ٹھیک ہونے پر نالکہ بی بی ہمیں پیسے دے گی تو وہ سندھ میں دوکان کھول لے گا۔“

”میں تم لوگوں کو اتنا کچھ دوں گی کہ دوکان کھولنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔“ نالکہ درانی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم جا کر سو جاؤ۔ تھوڑی سی نیند پوری کرنا۔“ بابر کو چائے دینے کے بعد میں تمہیں جگا دوں گی۔“ مرادو نے کہا۔

نالکہ اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔ نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، وہ لحاف اوڑھے کمرے میں بدلتی رہی۔

اس کے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن راہداری میں گھسٹتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ دو اور تین کے درمیان کا کوئی وقت ہو گا۔ اور وہ مرادو تھی جو گھسٹتے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد در آمدے سے باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ غالباً مرادو، بخشو اور بابر کی باتوں کی آوازیں تھیں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد راہداری میں گھسٹتے ہوئے قدموں کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ مرادو اپنے کمرے میں واپس آگئی تھی۔ نالکہ نے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد راہداری میں ایک بار پھر قدموں کی دبی دبی سی چاپ سنائی دی۔ اس کے تھوڑے ہی دیر بعد نالکہ کے کمرے کے اندر درونی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ نالکہ نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

”جلدی کرو نالکہ بی بی۔“ مرادو نے کہا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ ”کم بخت کو چاہئے میں تولہ بھرا انیون ڈال کر دیں۔ اب کیس جا کے سویا ہے۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے ہیں۔ وہ نو ذرے بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔“

”میرا خیال ہے کہ رضیہ کو باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بھی صبح آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھتی۔ اور میرا خیال ہے اس وقت تک ہم یہاں سے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔“ نالکہ نے بستر سے نکل کر چٹا

پہنچے ہوئے کہا۔ اس نے گرم چادر اوڑھ لی تھی۔

وہ دبے قدموں حویلی سے نکل آئے اور پھر باغ میں ایک پگڈنڈی پر تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے گئے۔ آگے بٹھو تھا۔ اس کے پیچھے نائلہ اور آخر میں مراد۔ جس نے ایک پولی بغل میں دبا رکھی تھی۔ نائلہ سول ہی دل میں اپنی اس رہائی پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ حویلی میں آنے کے بعد شروع کے دنوں میں مراد کا رویہ دیکھ کر تو نائلہ سمجھی تھی کہ یہ عورت اس کے لئے جلاوطن ہوگی لیکن اس رات اگر بارہ مراد پر دست درازی نہ کرتا تو نائلہ کو اس کے قریب آنے کا موقع نہ ملتا۔

اب نائلہ درانی کو اندازہ ہوا کہ باغ کی یہ حویلی سڑک سے بہت دور تھی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں سڑک پر پہنچے تھے۔ تقریباً دو سو گز آگے عمر نگر کابسون کا اسٹاپ بھی تھا۔ لیکن وہ لوگ اسٹاپ کی طرف جانے کی بجائے وہیں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد رحیم یار خان کی طرف سے ایک بس آتی ہوئی نظر آئی۔ نائلہ درانی اور مراد نے اپنے چہرے چادروں میں چھپا لیے۔ بخشونے بھی مظر اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ بخشونے سڑک کے بیچ میں آکر ہاتھ اٹھا دیا۔ اور بس جیسے ہی قریب پہنچی وہ پیچھے ہٹ گیا۔

یہ سکھر جانے والی بس تھی۔ وہ تینوں بس میں سوار ہو گئے اور بس آگے روانہ ہو گئی۔ نائلہ نے مراد اور بخشونے کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کے لئے بھی سکھر کا ہی ٹکٹ لیا جائے لیکن وہ راستے میں کہیں اتر جائے گی۔ بخشونے سکھر کے تین ٹکٹ لے لئے تھے۔

نائلہ درانی صادق آباد کے اسٹاپ پر اتر گئی۔ اترنے سے پہلے اس نے مراد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد سے جلد سندھ کے گاؤں میں ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔

دن کی روشنی پھیل چکی تھی، بس اسٹینڈ پر کئی ٹانگے کھڑے تھے۔ دو اور مسافر بھی اسی بس سے اترے تھے۔ ان میں ایک مراد اور ایک عورت تھی۔ وہ ٹاؤن شپ جانے کے لئے ایک ٹانگے پر بیٹھ گئے۔ ان کے پاس ایک ٹرنک بھی تھا۔ جو سیٹ کے نیچے رکھ دیا گیا تھا۔ نائلہ کے پاس دس روپے کا صرف ایک نوٹ تھا یہ نوٹ بھی اسے مراد نے دیا تھا۔ مراد تو اسے کچھ اور رقم دینا چاہتی تھی مگر نائلہ نے صرف دس ہی کا ایک نوٹ لیا تھا۔ اسے بھی ضیاء شہید ٹاؤن ہی جانا تھا۔ وہ بھی پچھلی سیٹ پر دوسری عورت کے ساتھ ٹانگے پر بیٹھ گئی۔ مزید کوئی سواری نہیں ملی تو کوچوان نے گھوڑے کو ہانک لگا دی۔

نائلہ درانی ٹاؤن شپ کے شروع ہی میں اتر گئی۔ حالانکہ اسے آگے جانا تھا۔ مگر وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے مٹھی میں دبا ہوا دس روپے کا نوٹ ٹانگے والے کی طرف بڑھا دیا۔

”کھلے پیسے دو بی بی۔ صبح میرے پاس کھلے پیسے کہاں سے آئے۔“ ٹانگے والے نے کہا۔  
”کھلے پیسے تو میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ چلو دس کا نوٹ ہی رکھ لو۔“ نائلہ کہتی ہوئی۔ ایک گلی میں داخل ہو گئی۔

اس وقت دھوپ نکل آئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مختلف گلیوں میں چلتی رہی اور بالا خر گلی نمبر ستاون کے ایک دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس وقت موٹر سائیکل پر سوار ایک نوجوان گلی میں سے گزر رہا تھا۔ مگر اس نے نائلہ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

نائلہ درانی نے لرزتی ہوئی انگلی سے کال بیل کا مٹن دبا دیا۔ اندر کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور

اس کے دو منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک بارلیش آدمی تھا۔ عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

”کیا بات ہے بیٹی۔ کس سے ملنا ہے تمہیں؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”جی سلطانہ سے۔ وہ لاہور میں میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی رہی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔  
 ”آؤ... اندر آجاؤ بیٹی۔ میں سلطانہ کو بلاتا ہوں۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہے۔“ بڑے میاں نے جواب دیا۔ نائلہ اندر آگئی۔ بڑے میاں نے دروازہ بند کر دیا اور منہ اوپر اٹھا کر سلطانہ کو آوازیں دینے لگے۔

سلطانہ بیٹی۔ نیچے آؤ... دیکھو کون آیا ہے۔“

اوپر والی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی کھلی۔ ایک لڑکی نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ چادر میں لپٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہ نائلہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی لیکن وہ کھڑکی سے ہٹ کر صرف دو منٹ بعد نیچے آگئی۔  
 ”ارے نائلہ تم؟“ سلطانہ اسے دیکھ کر ششدر سی رہ گئی۔

نائلہ نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا تاکہ بڑے میاں کی موجودگی میں وہ کچھ اور نہ کہہ دے۔ سلطانہ اس کا مطلب سمجھ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

”آؤ... اوپر میرے کمرے میں آجاؤ۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”یہ سب کیا ہے نائلہ؟“ سلطانہ نے اپنے کمرے میں آتے ہی پوچھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔  
 ”میں نہیں سمجھ سکتی کہ تم جیسی لڑکی کسی کو قتل کر سکتی ہے اور پھر پولیس کی حراست سے فرار کے لئے مزید پانچ چھ آدمیوں کا قتل۔ اس کا الزام بھی تم پر ہی ہے اور پولیس تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے؟“

”سمجھ میں تو میرے بھی کچھ نہیں آ رہا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ سب میرے تایا اور پھوپھی کا کیا دھرا ہے۔ وہ لوگ میری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ پھوپھی زبردستی میری شادی اپنے اوباش بیٹے سے کرنا چاہتی تھی۔ میرے انکار پر یہ سارا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ پہلے میرے خلاف قتل کا ایک جھوٹا کیس بنایا گیا پھر شیردرانی کے آدمیوں نے پولیس دین پر حملہ کر کے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑا لیا، اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ پولیس دین پر میرے آدمیوں نے حملہ کیا تھا۔ میں کئی روز سے صادق آباد سے چند میل دور محمد نگر کے قریب مکان میں شیردرانی کی قیدی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کرنے کے لئے آخری مرتبہ مجھے دو دن کی مہلت دی تھی۔ لیکن آج صبح چار بجے میں موقع پا کر بھاگ نکلی۔ میرے ساتھ شیردرانی کا ستایا ہوا ایک مزارع اور اس کی بیوی بھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مراد نامی اس عورت کی مدد سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔ وہ دونوں میاں بیوی سندھ میں کسی گاؤں میں اپنے کسی رشتہ دار کے پاس چلے گئے ہیں۔ میں تمہارے پاس آگئی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے سلطانہ۔ اب میں تمہارے ہی رحم و کرم پر ہوں۔ اگر تم چاہو تو مجھے پولیس کے حوالے کر سکتی ہو اور چاہو تو اس برے وقت میں میری مدد کر سکتی ہو۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے تمہارے گھر والے کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔“

”بڑی عجیب بات بتائی تم نے تو۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ تمہارے سگے تایا اور سگی پھوپھی کا خون اس قدر سفید ہو جائے گا کہ وہ تمہاری جان کے دشمن ہو جائیں۔“ سلطانہ نے کہا۔

”وہ ہر قیمت پر میری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”اس طرح راہ فرار اختیار کر کے کیا یہ ثابت نہیں ہو جائے گا کہ تم واقعی مجرم ہو اور پولیس سے  
 بچتی پھر رہی ہو۔ میرے خیال میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس طرح چھپنے کی بجائے تم خود اپنے آپ کو  
 پیس کے حوالے کر دو اور انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کر دو۔“ سلطانہ نے کہا۔

”شبیر درانی اور اس کی ماں حسینہ بیگم نے میرے خلاف یہ سارا منصوبہ پولیس سے مل کر ہی تیار کیا  
 تھا۔ مجھ پر جس شخص کے قتل کا الزام ہے اسے خود پولیس انسپکٹر نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔ پولیس تو شبیر  
 انی جیسے لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے۔ بلکہ شبیر درانی تو اس پولیس انسپکٹر کو اب بلیک میل کر رہا  
 ہے۔ پولیس میری بات کا یقین کب کرے گی۔ وہ تو ہر قیمت پر مجھے سلاخوں کے پیچھے بند کرنا چاہتے ہیں۔  
 یہ ساری کوئی نہیں سنے گا۔ میں کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ جاؤں تو آئی جی یا کسی اور اعلیٰ افسر سے مل کر  
 میں اصل حقائق سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن...“ سلطانہ نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔  
 ”اگر تم میرے یہاں آنے سے خوفزدہ ہو تو میں چلی جاتی ہوں۔“ نائلہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔  
 ”ارے کیا کر رہی ہو۔ آرام سے بیٹھو۔“ سلطانہ جلدی سے بولی۔ ”میں تو کہہ رہی تھی کہ معاملہ بہت  
 پیچیدہ ہے۔ اس شر کا پچھ پچھ بھی تمہارے بارے میں جان چکا ہے۔ اخبارات میں تمہاری تصویریں بھی  
 چھپی ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی کوئی بھی آسانی سے شناخت کر سکتا ہے۔ میرا مطلب تھا کہ ابا جان کو تمہارے  
 بارے میں سب کچھ بتانا ہوگا۔ لیکن... پہلے میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔“

سلطانہ کمرے سے نکل گئی۔ نائلہ درانی وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ سلطانہ اس کی بہت اچھی سہیلی تھی  
 ۔ لاہور یونیورسٹی میں اس کے ساتھ پڑھتی رہی تھی۔ لیکن اس کے باپ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا  
 تھا کہ وہ اس کی مدد پر آمادہ ہو جائیں گے یا ہمدردی کے دد بول کہہ کر معذرت کرتے ہوئے اسے رخصت  
 نہیں گئے۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد سلطانہ چائے لے آئی۔ اس کے فوراً ہی بعد وہ بڑے میاں بھی کمرے میں  
 داخل ہوئے جنہوں نے بیل بجانے پر دروازہ کھولا تھا۔ وہ سلطانہ کے والد رئیس احمد تھے۔ جنہوں نے ایک  
 سرکاری محکمہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد شہر میں کپڑے کی دوکان کھول لی تھی۔

”جب تم آئی تھیں تو میں نے تمہارا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔“ رئیس احمد ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔  
 ”سلطانہ نے اب مجھے بتایا کہ تم نائلہ درانی ہو تو میں تم سے بات کرنے چلا آیا ہوں۔ تمہارے بارے میں  
 اخبارات میں تو بہت کچھ پڑھا ہے مگر مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اب تم بتاؤ اصل قصہ کیا  
 ہے؟“

”میرے لئے مصائب کا آغاز میرے والدین کے انتقال کے بعد ہوا تھا۔“ نائلہ نے کہا اور ایک بار پھر  
 شہر سے داستان سنانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ لوگ بھی  
 کسی مصیبت کا شکار ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اس ضلع کی حدود سے نکلنے میں  
 مدد کی جائے۔ میں ایک مرتبہ لاہور پہنچ جاؤں تو پھر مجھے کوئی ڈر نہیں رہے گا۔“

”مجھے حیرت ہے کہ درانیوں کو کیا ہو گیا ہے۔“ رئیس احمد نے کہا۔ ”اس پورے علاقے میں ان کا بڑا  
 سہارہ تھا۔ بڑا احترام تھا لوگوں کی نظروں میں۔ مگر شاید تمہارے اس خاندان کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ پہلے

دونوں بھائیوں میں مقدمے بازی ہوئی۔ جس کا پورے ضلع میں چرچہ ہوتا رہا اور اب کئی روز سے تمہارے قصے اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ لوگوں کا موضوع گفتگو یہی ہے۔ ”وہ چند لمحوں کے بعد خاموش ہوئے پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”تم سلطانہ کی دوست ہو اور میرے لئے سلطانہ ہی کی طرح ہو۔ لیکن دولت مندوں کے کھیل بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ انسانی زندگیاں تو ان کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ دولت ہی ان کے لئے سب کچھ ہوتی ہے۔ تمہاری باتوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمہارا کزن شبیر درانی ہر قیمت پر تمہیں اور تمہاری جائیداد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ بقول تمہارے پولیس کو بھی بلیک میل کر رہا ہے اور وہ اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ تمہیں پناہ دینے والوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ...“ نائلہ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔ ”مجھے پوری بات کر لینے دو۔“ رئیس احمد نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”یہ اتفاق ہے کہ سلطانہ کی ماں چند روز کے لئے کراچی گئی ہوئی ہے اور گھر میں میرے اور سلطانہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس طرح کسی تیسرے فرد کو یہ علم نہیں ہے کہ تم ہمارے گھر میں موجود ہو بشرطیکہ تمہیں کسی اور نے اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔“

”جب میں آپ کے مکان کے دروازے پر رکی تھی تو موٹر سائیکل پر سوار ایک نوجوان نے میری طرف دیکھا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے میرا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور نے مجھے اس گلی میں داخل ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شبیر درانی کے پاس وسائل بہت ہیں۔ اسے جب تمہارے فرار ہونے کا پتہ چلے گا تو وہ زمین کا چپہ چپہ بھان مارے گا۔ میں تمہاری یہی مدد کر سکتا ہوں کہ تم دو چار دن یہاں رہو۔ سلطانہ بھی اس بات کا خیال رکھے گی کہ محلے میں کسی کو بھی تمہاری یہاں موجودگی کا پتہ نہ چلے۔ میں بھی باہر سن گمن رکھوں گا۔ دو چار روز میں تلاش کا سلسلہ ذرا سرد پڑے گا تو تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔“

”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”احسان مند ہونے کی کوئی بات نہیں بیٹی۔“ رئیس احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم چائے پو پھر ناشتہ کر کے آرام کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اگر تم حق پر ہو تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ حق و باطل کی جنگ ازل ہی سے ہوتی آئی ہے اور حق ہمیشہ سرخرو ہوا ہے۔ اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔ سلطانہ بیٹی چائے پینے کے بعد نیچے آکر ناشتہ تیار کر دینا۔ کہیں دوکان پر جانے میں دیر نہ ہو جائے۔“

”میں ابھی آتی ہوں ابو۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ رئیس احمد کمرے سے چلے گئے۔ نائلہ درانی اور سلطانہ چائے پیتے ہوئے باتیں کرتی رہیں۔ وہ تقریباً ایک سال بعد ملی تھیں اور بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ان کی یہ ملاقات عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ سلطانہ نے چائے پی کر الماری میں سے اپنا کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ ”میرا خیال ہے تم بہت دنوں سے نہائی بھی نہیں ہو اور تمہارا لباس بھی میلا جکت ہو رہا ہے۔ وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ تم نما کر لباس تبدیل کرلو۔ میں نیچے جا رہی ہوں۔ تمہیں یاد ہے جب میں لاہور میں

ساری کو غمی آیا کرتی تھی تو تم مجھے روک لیا کرتی تھیں اور مجھے تمہارے کپڑے پہننا پڑتے تھے۔ جو مجھے بھل فٹ آتے تھے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ میرے یہ کپڑے بھی تمہیں فٹ آجائیں گے۔ ناشتہ تیار ہو جائے گا تو میں تمہیں نیچے ہی بلا لوں گی۔“ سلطانہ کستی ہوئی باہر چلی گئی۔

نائلہ کچھ دیر تک کرسی پر بیٹھی سوچتی رہی۔ وہ زندگی کے عجیب اور انوکھے تجربات سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف اس کے خونی رشتے دار تھے جو اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ قانون کے محافظ تھے جو عین ترین جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو تحفظ فراہم کر کے بے گناہوں کے پیچھے رانٹلیں لئے گھوم رہے تھے اور دوسری طرف نائلہ بان رحمت، ڈاکٹر احمد اور رئیس احمد جیسے بھی لوگ تھے جو اپنی زندگیوں کی پرواہ کئے بغیر اسے پناہ دے رہے تھے۔ حالانکہ سب ہی اچھی طرح جانتے تھے کہ موت اس کے تعاقب میں تھی اور موت کا خونی بچہ اس کے ساتھ ان کا گلا بھی دبوچ سکتا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد نائلہ نے اٹھ کر سلطانہ کے دیئے ہوئے کپڑے اٹھائے اور ہاتھ روم میں گھس گئی۔ یہ حقیقت تھی کہ پیٹ میں گولی لگنے کے بعد سے وہ نہیں نہائی تھی۔ اس کے جسم پر میل جی ہوئی تھی۔ سر کے بال بھی جڑے ہوئے تھے۔ بعض اوقات تو اسے اپنے آپ سے بھی گھن آنے لگتی تھی۔ اور آج اسے نہانے کا موقع مل گیا۔ پیٹ کا زخم مندمل ہو چکا تھا اور پانی پڑنے سے زخم کو بھی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا۔

ہاتھ روم میں شاور لگا ہوا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بالوں میں دو مرتبہ شیمپو کرنے کے بعد وہ شاور کے نیچے کھڑی گرم پانی کی دھاروں سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ گیزر کے گرم پانی سے اسے نہانے میں واقعی مزہ آرہا تھا۔ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ چونکی تو اس وقت جب ہاتھ روم کے دروازے پر دستک دی گئی۔

”اب باہر بھی ٹنگوکی یا پورا دن ہاتھ روم میں ہی گزار دو گی؟“ یہ سلطانہ کی آواز تھی۔  
 ”ابھی نکل رہی ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا اور شاور بند کر کے تولیئے سے جسم رگڑنے لگی، لباس پہننے میں مزید دو منٹ لگ گئے۔ اس نے تولیئے کو ٹیڑی کی طرح سر کے بالوں پر لپیٹا اور باہر آگئی۔  
 ”توبہ ہے بھئی... اتنی دیر کردی نہانے میں۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔“ سلطانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج واقعی کئی دنوں بعد نہانے کا موقع ملا تھا۔ خوب جی بھر کے نہائی ہوں۔ کہاں ہے ناشتہ۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتے کے لئے نیچے جانا پڑے گا؟“ نائلہ نے کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں، ابو تو ناشتہ کر کے دکان پر جا چکے ہیں۔ میں ناشتہ اوپر ہی لے آئی ہوں... آؤ... دوسرے کمرے میں آجاؤ۔“ سلطانہ نے کہا۔

دوسرے کمرے میں کافی ٹیبل پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ ڈبل روٹی، پیڑ، مکھن اور جام وغیرہ دیکھ کر نائلہ کی بھوک چمک اٹھی۔ مراد تو اسے دیکھی تھی میں تلے ہوئے پرائٹھے اور انڈے ہی کھلاتی رہی تھی۔ یہ ساری چیزیں کئی روز بعد نظر آئی تھیں۔ نائلہ ناشتے پر اس طرح ٹوٹ پڑی جیسے کئی روز کی بھوک ہو۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں چائے کے کپ ہاتھوں میں لئے سلطانہ کے بیڈ روم میں آگئیں۔ چائے کی جسکیوں کے دوران وہ پرانی یادیں تازہ کرتی رہیں۔ لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد نائلہ کی موجودہ صورت

حال بھی زیر بحث آجاتی۔

”اچھا! اب تم آرام کرلو۔۔۔ میں گھر کے کاموں سے نمٹ لوں۔“ سلطانہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

نائلہ سلطانہ کے بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے کبل اوپر اوڑھ لیا تھا۔ وہ پچھلی رات ایک لمحہ کو بھی نہیں سو سکی تھی۔ اور پھر اس کے بعد کی بھاگ دوڑ نے بھی اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اب بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

اس کے چاروں طرف دیرانہ تھا اور وہ اس دیرانے میں دوڑی جا رہی تھی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی، ٹانگوں میں جسم کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی مگر وہ دوڑ رہی تھی۔ موت کے سائے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس دیرانے میں اسے کوئی جائے پناہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دوڑتے ہوئے وہ اچانک ہی لڑکھڑا کر گر گئی۔ پیہیہیزوں کی قوت جواب دے گئی تھی۔ سینہ پھٹا جا رہا تھا اور منہ سے کف جاری تھا۔ چند سیکنڈ تنفس پر قابو پانے کے بعد وہ پھر اٹھ کر دوڑنے لگی لیکن ایک بار پھر اسے اچانک ہی رک جانا پڑا۔ اس کے سامنے آگ کی دیوار تھی۔ آگ کی یہ دیوار آسمان تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاریخی اور سرخ شعلے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ وہ پلٹ کر پیچھے دوڑی لیکن پھر رک گئی۔ اس طرح سے لاتعداد بھڑپے اس کی طرف دوڑے آرہے تھے۔ ان کی سرخ زبانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور وہ اپنے خونخوار نوکیلے دانتوں سے چیر پھاڑ کے لئے اس کی طرف دوڑے آرہے تھے۔

نائلہ درانی پلٹ کر دوسری طرف دوڑی۔ اس طرف بھی آگ کی دیوار تھی، آگ کی یہ دیوار پھیلتی جا رہی تھی اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ ایک طرف خونخوار بھڑپے تھے جو غراتے ہوئے اس کے قریب آرہے تھے۔ نائلہ پر دہشت طاری تھی۔ وہ کبھی آگ کی دیوار کی طرف دیکھتی اور کبھی مڑ کر اپنی طرف لپکتے ہوئے ان خونخوار بھیزلوں کو دیکھنے لگتی جو لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب پہنچ رہے تھے۔ وہ بھڑپے اپنی شکلیں بدل رہے تھے۔ انہوں نے انسانوں جیسے چہرے اختیار کر لیے تھے۔ عجیب سی شکلیں تھیں۔ آڑھی ترچھی۔۔۔ بھیانک اور خوفناک اس نے کچھ چہرے پہچان لئے تھے۔ ایک اس کے تایا عبدالرحمن درانی کا چہرہ تھا۔ ایک اس کی چھوٹی حسینہ بیگم کا اور ایک اس کے کزن شبیر درانی کا چہرہ تھا۔ آڑے ترچھے بگڑے ہوئے یہ چہرے کتنے خوفناک تھے۔ جو خونخوار بھیزلوں کا روپ دھار کر اسے چیر پھاڑ دینے کے لئے اس کی طرف لپک رہے تھے۔

نائلہ مڑ کر ایک بار پھر اس طرف دوڑی جہاں آگ کی دیوار نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ وہ رک گئی۔ لیکن پھر دفعتاً ”آگ کی دیوار میں ایک خلا سی پیدا ہوئی اور اسے اپنے باپ کا چہرہ دکھائی دیا۔ کتنا شفیق تھا وہ چہرہ۔۔۔ اس کے باپ نے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیئے۔۔۔ نائلہ اس طرف لپکی۔ وہ اپنے باپ کی آغوش میں سمٹ جانا چاہتی تھی۔ لیکن ان کے درمیان بہت طویل فاصلہ حائل تھا۔ نائلہ میں اب ایک قدم اٹھانے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ بھیزلوں کی غراہیں کچھ اور تیز ہو گئی تھیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بھڑپے اس کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ اور پھر سب سے آگے والے بھڑپے نے اس پر چلا ٹنگ لگا دی۔ نائلہ لڑکھڑا کر نیچے گری۔ بھڑپے نے اسے دبوچ لیا اور اس کے کندھے پر دانت گاڑ دیئے، نائلہ کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔

”نائلہ۔۔۔ نائلہ۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ اٹھو۔۔۔ ہوش میں آؤ۔“

سلطانہ اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ نائلہ مسلسل چیخ رہی تھی پھر دفعتاً ”جیسے ہوش میں

آہی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ چرے پر خوف کے سائے جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ آنکھیں خوف سے پھٹی جا رہی تھیں۔

”وہ... وہ... خونی بھڑیے...“ وہ ہکلائی۔

”تم شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھیں۔“ سلطانہ پلنگ پر بیٹھ گئی اور اس کا سراپنی گود میں رکھ لیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری حالت دیکھ کر مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ مگر گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب اٹھ جاؤ... شام کے پانچ بج رہے ہیں۔“

”اوہ! شام ہو رہی ہے۔“ نائلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”کیا میں سارا دن سوتی رہی ہوں؟“

”ہاں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ ”میں نے دوپہر کو کھانا کھانے کے لئے تمہیں جگانے کی کوشش کی تھی مگر تم گہری نیند میں تھیں۔ اس لئے میں نے تمہیں سوتے رہنے دیا۔ اب اگر بھوک لگ رہی ہو تو کھانا گرم کر دو؟“

”نہیں۔“ نائلہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”صرف چائے پیوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ بے تحاشہ گہری نیند اور اس بھیاںک خواب نے اس کے دماغ اور پورے جسم میں سنسنی سی پیدا کر دی تھی۔ نیم گرم پانی کے غسل سے اس کی طبیعت کسی حد تک سنبھل گئی۔

جب وہ ہاتھ روم سے باہر نکلی تو ٹھیک اسی وقت سلطانہ نے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ رُے میں چائے کے علاوہ بسکٹ اور دیگر لوازمات بھی تھے۔

نائلہ درانی کے دماغ میں اب بھی ہلکی سی سنناٹا ہو رہی تھی۔ چائے پیتے ہوئے وہ اس خواب کے بارے میں سوچ رہی تھی جس نے اس پر دہشت سی طاری کر دی تھی۔ چاروں طرف آگ... تعاقب کرتے ہوئے خونی بھڑیے... کیا وہ ان بھیڑیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گی۔ کیا اس کے خونی رشتہ دار اسے زندہ نہیں رہنے دیں گے؟ وہ بار بار سر کو جھٹک کر ان خوفناک خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر یہ محض خیالات نہیں تھے۔ ایک زندہ حقیقت تھی۔ اس کے اپنے اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے در وہ جان بچانے کے لئے بھاگی پھر رہی تھی۔ وہ کروڑوں کی جائیداد کی مالک تھی۔ اس کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ اس کی معاشرے میں بہت عزت تھی۔ نائلہ کو یقین تھا کہ اگر وہ اپنے باپ کے دوستوں میں سے کسی سے رابطہ قائم کرے تو وہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ یہ خیال اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

”تمہاری ہاں ٹیلی فون ہے یا نہیں؟“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ ”ٹیلی فون نیچے ہے۔ ٹھہرو میں اوپر لی آتی ہوں۔“

سلطانہ کچھ دیر بعد ٹیلی فون اوپر لے آئی۔ اس کے کمرے میں بھی لائن کا کنکشن موجود تھا۔ اس نے ٹیلی فون کی تار سے منسلک پن دیوار میں لگے ہوئے ساکٹ میں لگا دی اور ٹیلی فون پلنگ پر ہی نائلہ کے سامنے رکھ دیا۔

نائلہ نے فون کا ریسیور اٹھا کر پبلر رحیم یار خان کا کوڈ نمبر ملایا اور پھر اپنے والد کے ایک دوست ہاشم عباسی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ لائن ملنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ عباسی رحیم یار خان کی



ضلعی انتظامیہ کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اسے اس عہدے تک پہنچانے میں نانکھ کے باپ کا بڑا ہاتھ تھا۔

”ہاں نانکھ بیٹی۔ تم کہاں سے بول رہی ہو؟“ عباسی نے اس کا نام سن کر کہا۔  
 ”یہ میں فی الحال آپ کو نہیں بتا سکتی۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت بہت بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں۔“ نانکھ نے کہا۔  
 ”مجھے حالات کا علم ہے۔ لیکن...“

”آپ کو جن حالات کا علم ہے وہ سب جھوٹ ہے۔“ نانکھ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے فریم کیا جا رہا ہے۔ میرے خلاف سازش ہو رہی ہے اور یہ سازش میرے اپنے ہی کر رہے ہیں اور پولیس بھی اس میں شامل ہے۔“

”معاملہ بہت سنگین ہے نانکھ بیٹی۔“ عباسی نے جواب دیا۔ ”تمہارے آدمیوں نے تمہیں چھڑانے کے لئے پولیس دین پر جو حملہ کیا تھا اس میں پانچ آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔ اس کارروائی نے حکومت کی پوری مشینری کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔“  
 ”وہ میرے آدمی نہیں تھے۔“ نانکھ نے کہا۔ ”پولیس دین پر حملہ اور مجھے پولیس کی حراست سے نکالنا بھی اسی سازش کا ایک حصہ ہے۔“

”اگر تم بے گناہ ہو تو اس طرح چھپتی کیوں پھر رہی ہو۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر کے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کرو۔“

”میں ایسا کرنا چاہتی ہوں۔“ نانکھ نے جواب دیا۔ ”میں خود سے نہیں چھپتی پھر رہی۔ مجھے قیدی بنا کر روپوش رکھا گیا تھا۔ کل رات مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ میں جیسے ہی منظر عام پر آؤں گی مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔“  
 ”سنو نانکھ بیٹی۔“ عباس نے جواب دیا۔ ”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ لیکن جب تک تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے نہیں کر دیتیں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

نانکھ نے ریسورٹ چن دیا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ ریسورٹ اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس مرتبہ اس نے جس شخص کا نمبر لایا تھا وہ ایک سیاست دان تھا۔ اسے سیاست میں اس مقام پر لانے میں بھی نانکھ کے باپ ہی کا ہاتھ تھا۔ وہ بھی ایک بار سوخ آدمی تھا اور علاقے کا کوئی بڑے سے بڑا آفیسر اس کی بات ٹالنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نانکھ کی بات سننے کے بعد اس نے بھی سوسائز تراشا شروع کر دیئے۔

نانکھ درانی نے کئی لوگوں سے فون پر رابطے کئے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو بااثر تھے اور کسی نہ کسی طرح اس کے باپ کے احسان مند تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی مصیبت کی اس گھڑی میں نانکھ کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔

نانکھ کے چہرے پر مایوسی کے گہرے سائے تھے۔ سلطانہ قریب ہی کھڑی تھی اور فون پر ہونے والی ساری گفتگو سن رہی تھی۔

”یہ... یہ لوگ... میرے باپ کے ٹکڑوں پر پلنے والے یہ لوگ...“ نانکھ درانی غصے کی شدت سے

بت بھی پوری نہیں کر پائی تھی۔

”یہ زمانے کی پرانی ریت ہے۔“ سلطانہ نے اسے سینے سے لپٹا لیا۔ ”سب ہی چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ مصیبت کے وقت کوئی بھی کام نہیں آتا۔ تم پریشان مت ہو۔ اللہ بہتر ہی کرے گا۔“

نائلہ کا غصہ اب سسکیوں میں بدل گیا تھا۔ اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا میں بالکل اکیلی محسوس کر رہی تھی۔ یہ انسانوں کی دنیا تھی اور انسان نہ بخوار بھیڑیوں کی طرح اس کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور سلطانہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

سلطانہ کا باپ رئیس احمد عام طور پر رات نوبے دوکان بند کیا کرتا تھا اور گھر تک پہنچتے ہوئے کبھی نہ بڑے نوادر کبھی پونے دس بج جایا کرتے تھے لیکن آج وہ نوبے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ باپ کے جلدی گھر نہ آنے پر سلطانہ کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

”خیریت ابو۔ آج آپ جلدی دوکان بند کر کے آگئے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا۔ تمہاری سینیبل کے لئے ایک بری خبر ہے۔“ رئیس احمد نے کہا۔

نائلہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ بات آئی تھی کہ شیردرانی یا اس کے آدمی اس کی تلاش میں یہاں تک تو نہیں پہنچ گئے۔

”تمہارے خدشات درست ہیں۔“ رئیس احمد نے نائلہ کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا، جیسے اس نے نائلہ کے خیالات بڑھ لئے ہوں۔ ”شیردرانی کے آدمیوں نے یہ تو پتہ چلا لیا ہے کہ تم صادق آباد میں موجود ہو۔ انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ تم ٹاؤن شپ کے کسی مکان میں روپوش ہو۔ ایک ٹانگے والے نے انہیں بتایا تھا کہ ایک عورت کو اس نے صبح سویرے اس آبادی کے شروع میں ٹانگے سے اتارا تھا۔ اس عورت کا لباس اور پیر کچڑ آلود تھے اور اس عورت نے اسے دس روپے دیئے تھے۔“ رئیس احمد نے محو کو خاموش ہوئے پھریات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”جو لوگ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ تم شہری اس سٹی میں ہو تو ان کے لئے یہ سراغ لگانا بھی مشکل نہیں ہوگا کہ تم اس بہتی کے کس مکان میں چھپی ہوئی ہو۔“

نائلہ درانی کی آنکھوں سے ایک بار پھر بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ کیا ان انسانی بھیڑیوں سے اسے میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔

”تم پریشان نہ ہو بیٹی۔“ رئیس احمد نے آگے بڑھ کر نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ہم اپنی جان دے رہے ہیں لیکن جیتے جی تم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔“

”وہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ درندے ہیں۔“ نائلہ نے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ لوگ بھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ میں ابھی یہاں سے نکل چکی ہوں۔“

”یہ تمہاری بے وقوفی ہوگی۔“ رئیس احمد نے کہا۔ ”اگر تم آج ہی رات یہاں سے نکلتا چاہتی ہو تو اس کے لئے باقاعدہ بندوبست کرنا ہوگا۔ میں ابھی کھانا کھا کر جاتا ہوں اور تمہیں یہاں سے نکالنے کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ تم کھانا لگاؤ بیٹی۔ میں منہ ہاتھ دھو لوں۔“ اس نے آخری الفاظ سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

”صرف روٹیاں پکانی ہیں۔ آپ تیار ہو جائیں۔“ سلطانہ کہتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ نائلہ بھی اس

کے ساتھ ہی کچن میں آگئی۔

کھانا کھاتے ہی رئیس احمد باہر چلے گئے اور سلطانہ نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور نالکہ کو اپنے کمرے میں آگئی۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابو تمہیں بحفاظت یہاں سے نکالنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گے۔“ سلطانہ نے نالکہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور الماری سے اپنے تین چار جوڑے نکال کر ان پوٹلی سی بنا دی۔ پھر کچھ رقم نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ ”یہ رکھ لو، راستے میں ضرورت پڑ جائے گی۔“

نالکہ نے مٹھی کھول کر دیکھا۔ وہ سو اور پانچ پانچ سو روپے والے کئی نوٹ تھے۔ اس نے انکو آنکھوں سے سلطانہ کی طرف دیکھا اور نوٹ قبض کے گریبان میں ٹھونس لئے۔ رئیس احمد دو گھنٹے بعد واپس آئے۔

”ایک گاڑی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ میرے ایک جاننے والے کی گاڑی ہے جو تمہیں شہر سے نکال بھاگلہ کی طرف لے جائے گا۔ یہ چند میل دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اگر تم لوگ بحیرت بھاگلہ تک گئے تو وہ شخص تمہیں رات ہی رات میں دراؤ فورٹ پہنچا دے گا۔ وہاں سے تمہیں احمد پور شرقیہ کے بس مل جائے گی۔ احمد پور شرقیہ سے ملتان اور پھر وہاں سے لاہور پہنچنا تمہارے لئے مشکل نہیں ہو گا۔ تیار رہنا۔ ٹھیک دو بجے یہاں سے نکلنا ہو گا۔“

”میں تو تیار ہی بیٹھی ہوں۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

اور پھر رات ٹھیک دو بجے نالکہ، سلطانہ سے رخصت ہو کر رئیس احمد کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔ سلطانہ کی دی ہوئی پوٹلی اس نے بغل میں دبا رکھی تھی اور گرم چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اس کا کچھ بھی چھپ گیا تھا۔

نبی سے نکل کر وہ ایک ویران جگہ پر آگئے۔ درختوں کے نیچے ایک پرانا سا سوزو کی پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ جس پر پرانا سا فرنچر لدا ہوا تھا۔ نالکہ کو اس طرح بٹھایا گیا کہ وہ فرنچر کے نیچے چھپ کر رہ گئی۔ رئیس احمد نے اسے خدا حافظ کہا اور سوزو کی ٹرک حرکت میں آگیا۔

نالکہ درانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ نجانے اسے بار بار یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ عافیت کی طرف نہیں موت کے منہ میں جا رہی تھی۔

...●...●...●...

رضیہ نرس تھی۔ ہسپتال میں اس کی ڈیوٹی شفٹوں میں رہتی تھی۔ صبح کی ڈیوٹی ہوتی تو اسے صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھنا پڑتا تھا کیونکہ سات بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا جبکہ عام دنوں میں وہ صبح دیر تک سو رہتی تھی۔

شبیر درانی نے نالکہ کی دیکھ بھال کے لئے رضیہ کی خدمات حاصل کیں تو اس نے ہسپتال سے لبر رخصت لے لی تھی۔ اور اب آبادی سے دور آموں کے باغ کے ساتھ واقع اس حویلی میں نالکہ درانی کی دیکھ بھال کے علاوہ اسے کوئی کام بھی نہیں تھا۔ اور نالکہ بھی ایسی بیمار نہیں تھی کہ چوبیس گھنٹے اس کے سرہانے بیٹھے رہا جاتا۔ نالکہ کی تمار داری کے علاوہ یہاں رضیہ کی موجودگی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ تمار

داری کی آڑ میں نہ صرف اس کی نگرانی کرے بلکہ اسے باتوں ہی باتوں میں شبیدرانی سے شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کرنا تھا۔

یہاں آبادی سے دور اس اکلوتی حویلی میں کوئی کام نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ باتوں میں وقت گزارا جائے۔ نالکہ کی نگرانی کے معاملے میں وہ مطمئن تھی۔ ایک گن مین کے علاوہ مرادو اور اس کا شوہر بھی موجود تھا۔ اور ظاہر ہے نالکہ فرار کی کوشش کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔

رضیہ رات کو دیر تک نالکہ سے باتیں کرتی رہتی۔ اس رات بھی وہ دیر تک باتیں کرتی رہی تھی اور جب جمائیاں آنے لگیں تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنے بستر پر لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

وہ جب سے اس حویلی میں آئی تھی عام طور پر صبح آٹھ بجے اٹھ جایا کرتی تھی۔ آٹھ کھلتے ہی اسے مرادو سے بیڈ ٹی مل جایا کرتی تھی۔ اس روز بھی اس کی آٹھ ٹھیک آٹھ بجے کھل گئی تھی۔ لیکن خلاف معمول اس کے پٹنگ کے ساتھ چھوٹی میز پر چائے کا کپ نہیں تھا۔ مرادو شاید چائے لانا بھول گئی تھی یا اسے ابھی پتہ نہیں چلا ہو گا کہ وہ جاگ گئی ہے۔ اس نے مرادو کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری آواز پر بھی خاموشی رہی۔

رضیہ نے پٹنگ سے اتر کر سیلپر پینے اور چادر اوڑھتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ راداری سے گزرتے ہوئے بھی وہ مرادو کو آوازیں دے رہی تھی اس کا خیال تھا کہ مرادو باورچی خانے میں ہوگی۔ وہ برآمدے سے ہوتی ہوئی باورچی خانے میں آگئی لیکن یہاں کوئی نہیں تھا۔ باورچی خانے میں تو ایسے آثار بھی نہیں تھے کہ ابھی یا تھوڑی دیر پہلے مرادو یہاں آئی ہوگی۔ چولہا بھی ٹھنڈا تھا اور کھورے میں چائے کے جھوٹے برتن پڑے تھے۔ یہ برتن غالباً رات ہی کے تھے۔

رضیہ باورچی خانے سے نکل آئی اور برآمدے میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بخشو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شڈ کے نیچے بندھی ہوئی بھینس اسے دیکھ کر ڈکرانے لگی۔

رضیہ نے دو تین مرتبہ پھر مرادو اور بخشو کو پکارا مگر کسی طرف سے جواب نہیں ملا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر آگئی۔ مرادو کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا، کمرہ خالی تھا۔

دفعۃً اس کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ وہ نالکہ والے کمرے کے سامنے آگئی۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر نالکہ کو آواز دی۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے اپنے اور نالکہ کے کمرے کے بیچ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر نالکہ کی طرف سے دروازے میں کنڈالگا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا۔ آوازیں بھی دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

رضیہ کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی ایک بار پھر مرادو والے کمرے میں آگئی۔ اس طرف سے بھی نالکہ کے کمرے میں ایک دروازہ تھا۔ اور یہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نالکہ کے کمرے میں جھانکتے ہوئے رضیہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ کمرہ خالی تھا۔

رضیہ دوڑتی ہوئی برآمدے میں آگئی۔  
”مرادو... بخشو... نالکہ... کہاں ہو تم لوگ؟“ وہ زور زور سے پکارنے لگی مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

رضیہ کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ عجیب و غریب خیالات اس کے ذہن میں ابھرنے لگے۔ دفعۃً اسے بابر کا خیال آگیا۔ وہ زور زور سے بابر کو پکارنے لگی مگر جواب میں خاموشی رہی۔ انہوں نے نظریں حویلی کے گیٹ کی طرف اٹھ کھین۔ گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی گیٹ باہر آگئی۔

گیٹ کے دائیں طرف بابر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھا تھا اس کا سر سینے پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی گود میں بڑی چھی اور بابر کے ہلکے ہلکے خزانے سنائی دے رہے تھے۔

”بابر... بابر!“ رضیہ نے بابر کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ”اٹھو بابر... تم یہاں خزانے لے ہو اور ناکہ حویلی سے غائب ہو گئی ہے۔“

مگر رضیہ کے جھنجھوڑنے یا چیخنے کا بابر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رضیہ کے لئے صورت حال بڑی خطرناک ہو گئی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ناکہ بھاگ گئی تھی اور شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً مراد اور بخشہ بھاگنے میں اس کی مدد کی تھی اور وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ہی بھاگ گئے تھے۔ ایک دو رات پہلے بابر مراد کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی، ہو سکتا ہے مراد اور بخشہ نے بابر سے انتقام لینے کے ناکہ حویلی سے بھاگنے میں مدد دی ہو۔ ناکہ بھی درانی خاندان ہی کی فرد تھی۔ اس کے پاس بھی ذولر کی نہیں تھی ممکن ہے اس نے مراد اور بخشہ کو کوئی بڑا لالچ بھی دیا ہو۔ لیکن ان کی اس حرکت سے کی جان پر یں آئی تھی۔ اسے بابر پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا جو اس کے جھنجھوڑنے کے باوجود خزانے لے گیا تھا۔ رضیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ رات بھر اٹھائے اور اس کی تمام گولیاں بابر کے سینے میں اتار دے۔

یہ ایک رضیہ کے ذہن میں خیال آیا کہ بابر نشے میں تو نہیں۔ وہ دوڑ کر اندر سے پانی کا جگ اٹھا لائے پہلے تو وہ بابر کے منہ پر چھینٹے مارتی رہی پھر اس نے پورا جگ اس کے منہ پر اندر دیا۔ بابر کسمسایا، بابر مگر ہوش میں نہیں آیا۔

رضیہ کے حواس جواب دے رہے تھے۔ شبیر درانی کا خوف اس کے ذہن پر طاری تھا۔ یہ دوسرا تھا کہ ناکہ اس کی کسندھی سے بھاگ نکلی تھی۔ پہلی مرتبہ ناکہ ہسپتال سے بھاگی تھی تو رضیہ کو فرائض غفلت برتنے کے الزام میں معطل کر دیا گیا مگر بعد میں شبیر درانی کی سفارش پر اسے دوبارہ ملازمت پر رکھ کر دیا گیا تھا۔ آج کل وہ ہسپتال سے چھٹی پر تھی مگر شبیر درانی نے اس کی خدمات کے لئے بھاری معاوضہ کیا تھا۔

رضیہ پر بدحواسی اور خوف طاری تھا۔ وہ کبھی حویلی کے اندر آجاتی اور کبھی باہر آکر بابر کو ہوش لانے کی کوشش کرتی۔ اس نے بابر کا منہ بھی سونگھا تھا مگر شراب کی بو نہیں آئی تھی۔ پتہ نہیں اس نے قسم کا نشہ کیا تھا کہ ہوش میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دفعۃً ایک اور خیال اس کے ذہن ابھرا۔ بخشہ انیون کھانے کا عادی تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے چائے یا دودھ میں بابر کو بھی انیون دی ہو۔

رضیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ جب یہاں آئی تھی تو ان کی گاڑی کوٹ ساہیہ صادق آباد کے درمیان کسی جگہ سڑک سے اتر کر کچے راستے پر مڑی تھی اور کھیتوں میں تقریباً پندرہ میل فاصلہ طے کرنے کے بعد اس حویلی تک پہنچی تھی۔ گویا اسے سڑک تک جانے کے لئے کم از کم پندرہ میل فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ ایک مرتبہ تو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ بھی یہاں سے بھاگ

لیکن وہ جانتی تھی کہ شبیر درانی اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔

دفعۃً "موٹر سائیکل کی آواز سن کر وہ چونک گئی اور پگھلنے لگی کی طرف دیکھنے لگی۔ موٹر سائیکل دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ چند منٹ بعد موٹر سائیکل اس کی نظروں میں آگئی۔ موٹر سائیکل سوار شبیر درانی کا وہی گن مین اکرم تھا جو اس رات ہسپتال میں بھی نائلہ کی نگرانی پر مامور تھا اور نائلہ ان سب کو چمکے دے کر زخمی حالت میں بھاگ نکلی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم یہاں کیوں کھڑی ہو اور اسے کیا ہوا؟" اکرم نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔ باہر کو اس طرح دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی تھی۔

"شاید نٹے میں ہے۔ بہت کوشش کر چکی ہوں۔ ہوش میں نہیں آ رہا۔" رضیہ نے جواب دیا۔

"اور نائلہ کہاں ہے؟" اکرم نے پوچھا۔

"وہ... وہ بھاگ گئی... مرادو اور بخشو بھی بھاگ گئے۔" رضیہ نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔ "اس کے چہرے پر خوف کے سائے گرے ہو گئے تھے۔" انہوں نے شاید باہر کو دودھ یا چائے میں ایفون کھلا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ یہ لوگ آدھی رات کے بعد کسی وقت بھاگے ہیں۔" اکرم 'باہر کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر مزید آدھے گھنٹے بعد ہوش میں آسکا تھا۔ وہ اب بھی ہسکی ہسکی سی باتیں کر رہا تھا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ نائلہ 'مرادو اور بخشو کے ساتھ حویلی سے بھاگ گئی ہے تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

اکرم اسی وقت موٹر سائیکل پر سوار ہو کر تیز رفتاری سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور باہر کھیتوں میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے کہ صبح اٹھتے ہی نائلہ کسی فطری تقاضے کے تحت کھیتوں میں گئی ہو اور مرادو اور بخشو اس کے ساتھ ہوں۔ مگر اس کا یہ خیال ہی اجتماع نہ تھا۔

دوپہر سے پہلے پہلے شبیر درانی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ کئی آدمی تھے۔ رضیہ سے صورت حال جاننے کے بعد ان آدمیوں کو نائلہ وغیرہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑا دیا گیا اور باہر کو اس کی غفلت کی سزا دینے کے لئے ایک درخت سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ ایک آدمی اس کے برہنہ جسم پر بید کی چھڑی سے پٹائی کر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر رضیہ کانپ اٹھی۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر نائلہ بھاگ گئی ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور... قصور تو اس حرامزادے کا ہے جس کی غفلت سے نائلہ کو بھاگنے کا موقع ملا۔ یقین کرنا نائلہ بچ کر نہیں جاسکے گی۔ وہ جلد ہی یہاں واپس پہنچ جائے گی۔ آؤ... تم اندر چلو۔" شبیر درانی نے رضیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے ساتھ حویلی کے گیٹ کی طرف چلے لگا۔

کندھے پر شبیر درانی کے ہاتھ کے دباؤ سے رضیہ اپنے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑتی ہوئی محسوس کرنے لگی۔

شبیر درانی اسے ایک کمرے میں لے آیا اور دروازہ بند کر دیا۔

"بیٹھو۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" شبیر نے اسے پکڑ کر چارپائی پر بٹھادیا اور خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اب رضیہ کے کندھے سے پھسل کر کمر پر آ گیا تھا۔

رضیہ کے پورے بدن میں سنسنی سی ہورہی تھی۔ اس نے سرک پر پیچھے ہٹا جا کر شبیر نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شیردرانی نے بولا۔ ”ناٹک بھاگ گئی ہے تو کھلی بات نہیں۔ وہ پہلے بھی بھاگی تھی تو پکڑی گئی تھی۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو دن بعد پھر ہمارا ہوگی۔ تم جانتی ہو کہ ناٹک درانی کمرڈوں کی جائیداد اور دولت کی واحد وارث ہے اور میں اس کی یہ دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور تم جانتی ہو کہ دولت میں کتنی کشش ہوتی ہے۔ اس سے دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ اور اگر تم ناٹک درانی کی اسی دولت میں مجھے وارث بنا چاہتی ہو تو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“ رضیہ کی پشت پر شیردرانی کا ہاتھ مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ وہ اپنے بدن میں سنسنی کی لہریں سی دوڑتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

”مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟“ رضیہ نے پوچھا۔ اس کے لمبے میں خمار سا تھا۔  
 ”ابھی بتاتا ہوں۔“ شیردرانی نے کہا۔ اس کا ہاتھ مسلسل حرکت میں تھا۔ رضیہ اس کے ہاتھ کی حرکت کو روکنا چاہتی تھی مگر وہ کوئی مزاحمت نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر دس منٹ بعد وہ پلنگ پر شیردرانی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ خوف تو اب اس کے ذہن میں نہیں رہا تھا لیکن وہ پہلی بار زندگی کے ایک نئے لطف سے آشنا ہوئی تھی۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ عجیب سا سرور تھا جس نے اسے اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ شیردرانی کب کمرے سے نکل کر چلا گیا تھا۔

رضیہ آنکھیں بند کئے بستر پر لیٹی زندگی کے اس نئے خط سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے اپنے اوپر پھر کسی کا بوجھ محسوس کیا۔ شیردرانی کے سوا کمرے میں آنے کی ہمت کون کر سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر اپنی بانہیں اس کے گرد حائل کر دیں۔ لیکن کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے حلق سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ وہ شیردرانی نہیں اس کا گن مین اکرم تھا۔ اس نے اکرم کو اپنے اوپر سے دھکیلتا چاہا مگر وہ ایک چیز یا کی طرح اکرم کے ٹکنبے میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ چیختی اور چلاتی رہی لیکن اکرم نے اسے چھوڑا اسی وقت تھا جب وہ چھوڑنا پ گیا تھا۔

اکرم کمرے سے چلا گیا تھا۔ رضیہ بستر پر پڑی آنسو بہاتی رہی۔ اپنی حوس زر کی بدولت آج وہ اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع سے محروم ہو گئی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ زمیندار اور دولت مند لوگ اپنے سے کتر لوگوں کے ساتھ کس قسم کے کھیل کھیلتے ہیں۔

اسی شام شیردرانی کو اس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ ناٹک درانی صادق آباد کے علاقے ٹاؤن شپ میں روپوش ہے۔ اس کی پناہ گاہ کا اگرچہ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا مگر مختلف ذرائع سے سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

”اور ان دونوں تراخوروں کا کچھ پتہ چلا؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ صبح سویرے سکھر جانے والی بس پر سوار ہوئے تھے۔ ناٹک بی بی بھی ان کے ساتھ تھی۔ ناٹک بی بی تو صادق آباد اتر گئی لیکن وہ دونوں آگے چلے گئے۔ ان کا بھی پتہ چل جائے گا سرکار۔“ اطلاع لانے والے نے جواب دیا۔

”صادق آباد میں کتنے آدمی ہیں؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”تم بھی پہنچ جاؤ۔ اور ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اگر ناٹک وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تو تم چاروں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جانتے اب دیر مت کرو۔“ شیردرانی نے کہا۔

تم چاروں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جاؤ... اب دیر مت کرو... "شیردرانی نے کہا۔  
 "وہ بچ کر نہیں جائے گی سرکار۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"جاؤ... اب دیر مت کرو۔" شیردرانی بولا۔

وہ شخص مونڑ سائیکل پر سوار ہو کر تیز رفتاری سے صادق آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔

شیردرانی برآمدے سے اٹھ کر رضیہ کے کمرے میں آگیا۔ شام ہو چکی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔

رضیہ چادر اوڑھے بستر پر پی اپنے مقدر پر آنسو بہا رہی تھی۔

"تم ابھی تک بستر پر پی ہو۔ لائین بھی نہیں جلائی۔" شیردرانی نے کہتے ہوئے جیب سے ماچس

نکال کر دیا سلائی جلائی اور پھر میز پر رکھی ہوئی لائین جلانے لگا۔

لائین جلانے کے بعد شیردرانی نے رضیہ پر سے چادر کھینچ لی۔ اور پھر دوسرے لمحہ اس کی آنکھوں

میں چمک ابھر آئی۔ "ارے تم ابھی تک اسی طرح پی ہو؟"

"میں سمجھی تھی تمہارا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔" رضیہ نے رندے ہوئے لمبے میں جواب دیا۔

"ناراض ہو گئیں۔" شیردرانی مسکرایا۔ "کھیل تو واقعی ختم نہیں ہوگا۔ ایسے کھیل تو زندگی کے

آخری لمحوں تک جاری رہتے ہیں۔ میں اب تمہیں کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ کیونکہ ایک شکار پر دوسری

مرتبہ منہ نہیں مارتا۔ میرے آدمیوں کو خوش کرتی رہنا۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اور ہاں کچھ کھانا وغیرہ

بھی پکانا جانتی ہو کہ زندگی بھر ہسپتال کے مریضوں کے دل بھلاتی رہی ہو۔"

رضیہ اٹھ کر کپڑے پہنے لگی۔

"مجھے شہر پہنچاؤ۔ تم نے جو رقم دی تھی میں وہ بھی واپس کرنے کو تیار ہوں۔" اس نے شیر کی طرف

دیکھے بغیر کہا۔

"اب سب کچھ بھول جاؤ۔" شیر کے لمبے میں کرنگلی تھی۔ "اگر کچھ پکانا جانتی ہو تو باورچی خانے میں

چلی جاؤ۔ وہاں ہر چیز موجود ہے۔"

رضیہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں آگئی۔ اور لائین جلا کر باورچی خانے کی چیزوں کا جائزہ لینے

لگی۔ ایک کتہر میں چاول رکھے ہوئے تھے۔ یہی ایک چیز تھی جو آسانی سے تیار ہو سکتی تھی۔ اس نے چولہا

جلا کر پتلی میں پانی چڑھا دیا اور ایک سٹی میں چاول نکال کر چننے لگی۔

ایک گھنٹے بعد اس نے چاولوں کی پتلی اور پلیٹیں میز پر رکھ دیں۔ چاولوں کے ساتھ اس نے موگ کی

پتلی سی دال بھی پکائی تھی۔ چاول دیکھ کر شیردرانی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ

ایسا کھانا دیکھا تھا۔

رضیہ، شیر اور اس کے آدمیوں کو کھانا دے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے مقدر پر

آنسو بہا رہی تھی۔

باہر کی سزا بھی معاف کر دی گئی تھی۔ وہ ساتھ والے کمرے میں چار پائی پر پڑا تھا اور اس کی کراہوں

کی آوازیں رضیہ کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ رضیہ کو اب اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ دولت

مند اور زمیندار لوگ اپنے وفاداروں کو بھی بخشتے۔ وہ تو مالکوں کے لئے جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں

اور مالک ان کی معمولی معمولی غلطیوں پر ان کی کھال تک ادھیڑ دیتے ہیں۔ باہر کی مثال تو اس کے سامنے

تھی۔



رضیہ اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ بھی شبیر درانی کے کھنبے میں پھنس چکی تھی۔ اور اس جیسے لوگوں کے کھنبوں میں پھنسنے والوں کو زندگی بھر رہائی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ بھی اب شبیر کے کھنبے سے رہائی کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی شبیر درانی نے اسے کہیں اور جانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اب اسے زندگی بھر انہی کے ہاتھوں کا کھلو تباہن کر رہنا تھا۔

رضیہ کو یکایک نالہ درانی کا خیال آیا۔ غیر متوقع طور پر اس کے دل میں نالہ کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی اور وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ نالہ ان کے ہاتھ نہ لگے۔ ویسے اس نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر نالہ ان کے ہاتھ لگ بھی گئی تو وہ نالہ کی مدد کرے گی۔ شبیر درانی سے اپنی زندگی کی بربادی کا انتقام لینے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے اطمینان کا احساس ہوا اور اس کا دل سکون پذیر ہوتا چلا گیا۔

...●...●...●...

پچھلی رات کا چاند نکل آیا تھا۔  
ٹوٹے پھوٹے فرنیچر سے لدا ہوا سوزوکی ٹرک شہر کی بیرونی سڑک پر ہوتا ہوا ہائی وے پر گیا۔ بھاگلہ کی طرف مڑنے والی سڑک ذرا آگے تھی اس لئے سوزوکی کو کچھ فاصلہ ہائی وے پر ہی طے کرنا پڑا تھا۔ لیکن تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پولیس نے انہیں روک لیا۔

”اوئے... کون ہو تم... اس وقت یہ سامان کہاں لے جا رہے ہو۔ چوری کا تو نہیں؟“ ایک پولیس والے نے کہا۔ وہ دو پولیس والے تھے اور دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔  
”کباڑی کا سامان ہے سرکار! ٹوٹا پھوٹا فرنیچر۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔  
”چیک کراؤ... اس کے نیچے کچھ اور تو نہیں۔ ہمیں ایک لڑکی کی تلاش ہے۔ وہ قتل کر کے بھاگی ہوئی ہے۔“ پولیس والے نے کہا۔

فرنیچر کے نیچے چھپی ہوئی نالہ درانی کو سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر پولیس والوں نے سامان اتروا لیا تو وہ بے موت ماری جائے گی۔

”قق... قاتل لڑکی۔“ ڈرائیور ہلکایا۔ ”توبہ کریں سنتری بادشاہ۔ ہمارا ایسے لوگوں سے کیا واسطہ۔ میں تو ایک غریب کباڑیہ ہوں۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر خریدتا ہوں اور مرمت کر کے بیچ دیتا ہوں چار پیسے مل جاتے ہیں۔“

”مگر اس وقت آدمی رات کے بعد یہ مال کہاں سے لا رہے ہو؟“ سپاہی نے پوچھا۔  
”رحیم یار خان سے جی... گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ کئی گھنٹے رکنا پڑا۔ میرے تو بیوی بچے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اور آپ سامان اتارنے کو کہہ رہے ہیں میرے نئے نئے بچوں پر ترس کھاؤ سنتری بادشاہ۔“ ڈرائیور نے کہتے ہوئے پچاس کا نوٹ جیب سے نکال کر سنتری کی مٹھی میں دبا دیا۔  
”چل جا۔ کیا یاد کرے گا۔ معاف کیا تجھے۔“ سنتری نے نوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ نالہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

سوزوکی کچھ دور تک مین روڈ پر دوڑتی رہی پھر ایک کچی سڑک پر مڑ گئی۔ راستہ ناہموار ہونے کی وجہ

سے نالہ درانی کو یہی طرح جھٹکے لگ رہے تھے۔ اور پھر ایک زوردار جھٹکا لگنے سے ایک دوسرے کے اوپر اٹکا ہوا فرنچر پیچے گرا اور نالہ ایک میز کے نیچے دب گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار جھپٹیں نکلنے لگیں۔ ڈرائیور نے چیخوں کی آواز سن کر سوزو کی روک لی اور نیچے اتر آیا۔ اس مرتبہ بہر حال اسے اوپر کا فرنچر اتارنا پڑا۔ نالہ کے لئے جگہ بنانے کے بعد اس نے دوبارہ فرنچر لاد دیا اور سوزو کی آگے روانہ ہو گئی۔ بھاگہ ابھی کئی میل دور تھا۔ لیکن ایک جگہ سوزو کی اچانک ہچکولے لینے لگی۔ اس کا انجن دے کے مریض کی طرح کھانسنے لگا تھا۔ اور بالاخر سوزو کی جھٹکے لیتی ہوئی رک گئی۔ ڈرائیور نیچے اتر گیا اور اپنی سیٹ اٹھا کر تارچ کی روشنی میں انجن کا جائزہ لینے لگا۔ پھر سوزو کی کچھلے حصے میں کھٹ کھٹ کی آواز سن کر پیچھے آگیا۔

”آرام سے بیٹھی رہو لی بی۔ پلگ کا تار نکل گیا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ ڈرائیور نے کہا اور دوبارہ آگے انجن درست کرنے لگا جس میں پانچ منٹ لگے۔

سوزو کی ایک بار پھر چل پڑی۔ اس مرتبہ وہ کہیں نہیں رکے۔ بھاگہ سے گزرتے ہوئے کچھ کتوں نے ان کا تعاقب کیا تھا مگر سوزو کی چلتی رہی۔ اب ان کا رخ خیر گڑھ کی طرف تھا۔ اس طرح وہ خیر گڑھ سے ہوتے ہوئے رحیم یار خان سے ملیوں دور کا چکر لگا کر دروازہ فورٹ پہنچ جاتے۔

یہ علاقہ ریٹلا تھا اور ٹیلے بکھرت تھے۔ وہ ابھی خیر گڑھ سے چند میل دور ہی تھے کہ بائیں طرف سے کسی گاڑی کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ کوئی جیب یا لینڈ کروزر تھی۔ جو رحیم یار خان کی طرف سے کچے راستے پر بڑی تیزی سے دوڑی آ رہی تھی۔ راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ گاڑی کئی کئی فٹ اوپر اچھل رہی ہو۔

سوزو کی ڈرائیور کو شاید اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ کونسی گاڑی ہو سکتی تھی لیکن نالہ بھی اپنے اوپر لدے ہوئے فرنچر کے انبار میں سے وہ روشنیاں دیکھ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس خطرے کی کھٹی بجانے لگی۔ اس نے زور زور سے فرنچر بجانا شروع کر دیا۔ سوزو کی رک گئی۔

”اب کیا ہوا؟“ ڈرائیور نے نیچے اتر کر پوچھا۔

”میرے اوپر سے فرنچر ہٹاؤ... جلدی۔“ نالہ چیخی۔

ڈرائیور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی فرنچر ہٹانے لگا۔ فرنچر ہٹتے ہی نالہ نے سوزو کی سے چھلانگ لگا دی اور ”دوڑو“ کہتی ہوئی ٹیلوں کی طرف بھاگنے لگی۔

ڈرائیور کچھ نہیں سمجھا۔ اسے شاید اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اس گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جو بہت قریب پہنچ گئی تھی۔ وہ جیب تھی اور چاند کی روشنی میں ایک آدمی جیب پر آؤٹریک را نقل لئے کھڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ خطرہ بھانپتے ہی ڈرائیور نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن وہ چند قدم سے زیادہ دور نہیں جاسکا تھا کہ دیرانہ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ گولیوں نے اسے چھلنی کر دیا اور وہ منہ کے بل ریت پر گر کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

نالہ درانی پوری قوت سے ٹیلوں میں دوڑ رہی تھی۔ ریت کی وجہ سے اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ دو آدمی جیب سے اتر کر فائرنگ کرتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ گولیاں نالہ کے آس پاس ریت میں دھنس رہی تھیں۔ نالہ جان توڑ کر دوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کے پیر یار ریت میں دھنس رہے تھے۔ اور بالاخر وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گری۔

وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اس کے قریب پہنچ کر رک گئیں۔ موت اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ اور پھر اسے اپنے چہرے کے قریب ہی ایک بوٹ نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی رانفل کی ٹال اس کی کھوپڑی سے لگ گئی۔۔۔ ٹالکہ درانی نے بڑی آہستگی سے گردن گھما کر دیکھا۔

وہ شبیر درانی تھا۔ جو رانفل کی ٹال اس کی کھوپڑی سے لگائے کھڑا تھا۔

...●...●...●...

شبیر درانی کے چہرے پر درندگی تھی۔ مدہم چاندنی میں اس کا چہرہ کیس زیادہ خوفناک لگ رہا تھا۔ رانفل کی ٹال اب بھی ٹالکہ درانی کے سر سے لگی ہوئی تھی اور شبیر درانی کی انگلی ٹرائیگر پر تھی۔ اس سے چند قدم پیچھے دو آدمی اور بھی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی رانفلیں تھیں۔  
”تم سمجھتی تھیں کہ مجھے دھوکا دے کر بچ نکلو گی۔“ شبیر درانی کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔ ”لیکن شاید تمہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ شبیر اپنے شکار کا پیچھا آخر تک کرتا ہے۔ میں اب تک تمہارے ساتھ نری برتاؤ آیا ہوں لیکن تم نے میری اس نری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب اگر تم نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو میں تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کروں گا جو آج تک دوسری لڑکیوں کے ساتھ کرتا آیا ہوں۔ اب اٹھ کر خاموشی سے جیب میں بیٹھ جاؤ۔“

شبیر درانی نے رانفل ٹالکہ کے سر پر سے ہٹالی۔ ٹالکہ نے اوپر دیکھا، شبیر نے رانفل اس طرح کندھے پر نکالی تھی کہ اس کی ٹال کا رخ آسمان کی طرف تھا لیکن اس کی انگلی اب بھی ٹرائیگر پر ہی تھی۔ ٹالکہ درانی نے دونوں ہاتھ ریت پر نکا دیئے۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے وہ اٹھنا چاہتی ہے۔ لیکن پھر اچانک ہی اس نے شبیر درانی کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ شبیر درانی کو ٹالکہ سے کسی ایسی حرکت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ٹانگوں کو جھٹکا لگنے سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پشت کے بل ریت پر گرا۔ نیچے گرتے ہوئے انگلی کا دباؤ پڑنے سے رانفل کا ٹرائیگر دب گیا۔ رانفل سے نکلنے والی گولی نے شبیر سے چند قدم پیچھے کھڑے ہوئے اس کے ایک آدمی کی کھوپڑی اڑا دی۔ اور وہ چپٹا ہوا ڈیر ہو گیا۔

یہ سب کچھ بالکل غیر متوقع طور پر ہوا تھا۔ دوسرا آدمی بدحواس ہو کر چند قدم مزید پیچھے ہٹ گیا۔ شبیر درانی بھی گر کے اور اپنے آدمی کی چیخ سن کر ایک لمحہ کو بدحواس ہو گیا تھا۔

ٹالکہ درانی نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر شبیر کے سر پر زوردار ٹھوکر مار دی۔ وہ اگرچہ نکلے پیر تھی لیکن ٹھوکر پوری قوت سے ماری گئی تھی۔ شبیر درانی کا دماغ بل کر رہ گیا۔ ٹالکہ درانی نے بڑی پھرتی سے اس کے ہاتھ سے رانفل چھین لی۔ یہ اے کے 47 رانفل تھی۔ کالج کے زمانے میں جوائن سی سی کی ٹریننگ حاصل کی تھی اس ٹریننگ کے دوران اسے مختلف اسلحہ کا استعمال سکھایا گیا تھا اور اس رانفل کا استعمال وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے رانفل اٹھاتے ہی شبیر درانی سے دور چلائی لگا دی اور اس کے دوسرے محافظ کو رانفل کی زد پر لے لیا۔

”رانفل پھینک دو اور بائیں طرف ہٹ جاؤ۔“ ٹالکہ درانی ٹلی کی طرح غرائی۔ وہ اس وقت زخمی شہرٹی کی طرح پھری ہوئی تھی۔ ”اگر تم نے گولی چلائی اور وہ گولی میرے دل میں بھی لگی تو مجھے اتنی سہولت مل جائے گی کہ میں تمہاری اور تمہارے اس شیطان مالک کی کھوپڑی اڑا سکوں۔“

نالکہ درانی نے کہنے کے ساتھ ہی رانقل کا رخ سا بچے کر کے ٹرانگہر دبا دیا تھا۔ رانقل نے تین شعلے اگلے، تین گولیاں محافظ کے پیروں کے قریب ریت میں دھس گئیں۔ رات کا سناٹا فائرنگ سے ایک بار بھر گونج اٹھا۔

”میں تمہیں آخری موقع دے رہی ہوں۔ یہ گولیاں تمہارا سینہ بھی چھلی کر سکتی تھیں۔ تم دونوں اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔ رانقل پھینک دو۔“ نالکہ ایک بار بھر دھاڑی۔  
محافظ نے اپنے آقا کی طرف دیکھا۔ شیر درانی نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ محافظ رانقل پھینک کر وہاں سے کئی قدم دور ہٹ گیا۔

”میرے کزن... میرے رشتے دار بھائی۔“ نالکہ درانی رانقل کی ٹال شیر کی طرف جھکاتے ہوئے بولی۔ ”تم انسان نہیں شیطان ہو۔ دولت کی ہوس نے تمہیں اندھا کر رکھا ہے۔ اگر تم نے اور تمہاری ماں نے شرافت کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو ہو سکتا ہے میں بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتی۔ مگر تم ماں بیٹوں نے تو دولت کی ہوس میں تمام خونیں رشتوں اور انسانی قدروں کو پامال کر دیا ہے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔ دولت کے لئے اب تک نجانے کتنے بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔ لیکن نالکہ درانی تمہارے لئے تر توالہ ثابت نہیں ہوگی۔“

”اس وقت تو بازی تمہارے ہاتھ میں ہے نالکہ۔“ شیر درانی ایک ہاتھ سے کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ اس کا داغ تک جھنجھٹا رہا تھا۔ ”لیکن تم میری یہ بات یاد رکھنا۔ شیر درانی اپنے شکار کا آخر تک چھپا کرتا ہے۔ اور تم تو سونے کی وہ چڑیا ہو جسے کوئی بھی کھونا نہیں چاہے گا۔ تمہیں دنیا کے کسی کو نے میں مجھ سے پناہ نہیں ملے گی۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ تم کہاں تک میرا چھپا کرتے ہو۔ لیکن میری ایک بات تم بھی یاد رکھنا۔ تمہارا مقصد کبھی بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔“ نالکہ نے کہا اور آگے بڑھ کر دوسری دونوں رانقلیں بھی اٹھا کر کندھے پر لٹکالیں اور ان دونوں کو رانقل کی زور پر لئے اٹلے قدموں پیچھے بٹنے لگی۔

وہ جیب سے تقریباً پچاس گز دور تھی اور اٹلے قدموں تیزی سے چلتی ہوئی جیب تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جیب سے دس گز دور تھی کہ سوز کی ڈرائیور کی لاش دیکھ کر رک گئی۔ نالکہ کو ڈرائیور کی موت پر افسوس ہوا تھا۔ بے چارہ بے گناہ مارا گیا تھا۔ نجانے کتنے بے گناہ شیر درانی جیسے درندوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہوں گے۔ یکایک وہ شیر کو اپنی جگہ سے حرکت کرتے دیکھ کر چیخی۔

”اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔“ نالکہ چیخی۔ ”اگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو گولی سے اڑا دوں گی۔“

اس نے جیب تک کا باقی راستہ دوڑ کر طے کیا۔ کندھے پر لٹکی ہوئی دونوں رانقلیں اس نے جیب کی بھجلی سیٹ پر پھینک دیں اور اچھل کر جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شیر درانی سے چھپنی ہوئی رانقل اس نے پہنچر سیٹ پر رکھ دی اور انجن اشارت کرنے لگی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان لوگوں نے چابی اگنییشن ہی میں چھوڑ دی تھی۔

انجن اشارت ہوا ہی تھا کہ فضا گولی کی آواز سے گونج اٹھی۔ نالکہ بڑی پھرتی سے نیچے جھک گئی۔ گولی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ یہ پستول پارو الور کی گولی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شیر درانی کی جیب میں پارو الور یا پستول بھی ہو گا اور موقع پاتے ہی اس نے گولی چلا دی تھی۔

نالکہ درانی نے جیب کو گیس میں ڈال کر ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ جیب ایک زوردار جھٹکے سے

آگے بڑھی۔ ریت کا بادل اڑا اور نالہ نے ایک سیلر میٹر پر پیر کا دباؤ ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تیزی سے جیب کا اسٹیرنگ گھما دیا۔ ریت کا بادل اڑاتی ہوئی جیب پوری طرح گھوم گئی۔ اب جیب کا رخ خیر گڑھ کی طرف تھا۔

فائر کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ لیکن اس مرتبہ بھی گولی نالہ کے کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ نالہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مگر ریت کے اڑتے ہوئے بادل کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہیں آسکا۔ ویسے اسے یقین تھا کہ شبیر اور اس کا ساتھی ٹوٹے پھوٹے فرنیچر سے لدی ہوئی سوزو کی پک اپ میں اس کا تعاقب کریں گے۔ نالہ جیب کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔

نالہ درانی کا خیال درست نکلا۔ اس نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے دو چمکتی ہوئی بیاں نظر آئیں۔ وہ سوزو کی پک اپ کے ہیڈ لیمپس تھے۔ تعاقب شروع ہو گیا تھا۔

نالہ درانی نے جیب کی تمام بیاں بچھادیں۔ اور رفتار مزید بڑھادی۔ سوزو کی پک اپ کے بارے میں وہ جان چکی تھی کہ اس کا انجن درست نہیں تھا۔ اور اس کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ وہ جیب کی رفتار بڑھا کر زیادہ سے زیادہ فاصلہ حائل کر لینا چاہتی تھی۔

یہ دم چاندنی میں سڑک صاف نظر آرہی تھی۔ خیر گڑھ ابھی کئی میل دور تھا۔ لیکن وہ خیر گڑھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اب اس نے فیصلہ تبدیل کر دیا تھا۔ اب وہ دراوڑ قلعہ کی طرف نہیں جانا چاہتی تھی۔ اگر چولستان میں وہ راستہ بھٹک گئی تو صحرا میں پھنس کر رہ جائے گی۔ ویسے بھی اب وہ اپنے دشمنوں کی نظروں میں آگئی تھی اور طویل راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب اس نے بہتر یہی سمجھا تھا کہ خیر گڑھ سے پہلے ہی باغ و بہار نامی قصبہ کی طرف مڑ جائے۔ باغ و بہار سے پکی سڑک خانپور تک چلی گئی تھی۔ خانپور میں بھی اس کی ایک دوست رہتی تھی۔ نالہ کو یقین تھا کہ اگر اسے خانپور پہنچنے میں شبیر درانی پر آدمے گھنٹے کی بھی سبقت مل گئی تو اسے اپنی سیلی کے ہاں پناہ مل جائے گی۔

تقریباً دو میل کا مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے باغ و بہار کی طرف جانے والی سڑک نظر آگئی۔ اس نے رفتار کم کئے بغیر جیب اسی طرف موڑ دی۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تعاقب میں آنے والی ہیڈ لیمپس کی روشنیاں بہت دور رہ گئی تھیں۔ نالہ جیب کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔

ریگستانی علاقہ ختم ہو رہا تھا۔ اب آگے اکا دکا کھیت بھی نظر آنے لگے اور پھر باقاعدہ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نالہ درانی کی جیب ایک چھوٹی سی بستی میں سے گزری تو کتوں نے بھونکتے ہوئے جیب کا تعاقب شروع کر دیا۔

رات کی آخری گھنٹیاں تھیں۔ آخری تاریکوں کا چاند بھی غروب ہو رہا تھا۔ فضا تاریک ہو رہی تھی۔ راستہ دیکھنا دشوار ہو رہا تھا مگر نالہ نے جیب کے ہیڈ لیمپس روشن نہیں کئے۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا۔ سوزو کی پک اپ کی روشنی کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ پک اپ یا تو سیدھی خیر گڑھ کی طرف چلی گئی تھی یا بہت پیچھے رہ گئی تھی اور کھیتوں کی وجہ سے اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نظر نہیں آرہی تھی یا پھر شبیر درانی نے بھی سوزو کی پک اپ کی روشنیاں بجھا رکھی تھیں۔

تقریباً دو میل کے بعد نالہ کی جیب طوفانی رفتار سے ایک اور بستی سے گزر گئی۔ رات کی تاریکی اب رخصت ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ فضا میں نہ تو تاریکی تھی نہ اجالا، بس دھاپ سی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اجالا پھیلنے والا تھا۔

دفعۃً جیب پھولے کھانے لگی۔ نائلہ نے فیول میٹر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر طلق میں ا گیا۔ جیب میں پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ تیل بتانے والی سوئی ڈاکل پر زبرد پر تھر تھرا رہی تھی۔ کچھ آگے ایک اور بستی نظر آرہی تھی۔ نائلہ درانی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بڑی تیزی سے جیب کو کھیتوں میں موڑ دیا۔ کھیت میں تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے ہونے کے بعد جیب خود بخود رک گئی۔

نائلہ درانی نے ساتھ والی سیٹ پر بڑی ہوئی رانقل اٹھا کر جیب سے چھلانگ لگا دی اور سڑک کی طرف دوڑی۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جیب وہاں سے نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سڑک سے اتر کر دوسری طرف بستی کی طرف دوڑنے لگی جو وہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔

بستی میں داخل ہوتے ہی کتوں نے بھونک کر نائلہ درانی کا استقبال کیا نائلہ دونوں ہاتھوں میں رانقل سنبھالے کتوں کو ہشکاری ہوئی آگے بڑھتی رہی اور بالا خرا ایک مکان کے دروازے پر رک گئی۔ اس مکان کے صحن میں باتوں اور مویشیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی کسان کھیتوں کو جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

نائلہ درانی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دو کتے اب بھی بھونکتے ہوئے اس پر لپک رہے تھے اور نائلہ رانقل ہلا ہلا کر انہیں اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند سینکڑ بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی نائلہ اندر گھس گئی اور بڑی پھرتی سے دروازہ بھڑ دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی باہر بھونکتے ہوئے کتے بھی خاموش ہو گئے تھے۔

”کک..... کون ہو تم.....“ دروازہ کھولنے والا آدمی پکلا کر رہ گیا۔ وہ تقریباً چالیس سال کی عمر کا ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ جس نے گرم چادر کی بیکل مار رکھی تھی۔

”ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ پہلے دروازے کو کنڈا لگا دو۔“ نائلہ نے کہا۔ اس کی آواز میں خوف کی جھلک تھی۔

دروازہ کھلتے ہی جب وہ اندر داخل ہوئی تھی تو وہ کسان اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن نسوانی آواز سنتے ہی وہ چونک گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازے کا کنڈا لگا دیا۔

”مم... مگر تم کون ہو بی بی؟ کہاں سے آئی ہو۔ اور تمہارے ہاتھ میں یہ بندوق...“  
 ”کون ہے اصغر علی؟“ چند گز دور ایک نسوانی آواز نے کسان کی بات کاٹ دی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بوڑھی عورت ہے۔

”کوئی بی بی ہے۔“ کسان نے جواب دیا۔

”یہ عورت کون ہے؟“ نائلہ نے اصغر علی نامی اس کسان سے پوچھا۔

”میری ماں ہے۔“ اصغر علی نے جواب دیا۔

”چلو... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ وہ شاید مویشیوں کے پاس کھڑی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ دونوں مویشیوں کے پاس کھڑی اس بوڑھی عورت کے پاس آگئے۔

”یہ... یہ کون ہے... یہ تو کوئی ڈاکو...“

”نہیں ماں جی۔ میں ڈاکو نہیں ہوں۔ مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ نائلہ درانی نے

جواب دیا۔ ”میں تو خود نیازہ کی تلاش میں ہوں۔ دو قاتل میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ دو آدمیوں کو قتل کر چکے ہیں اور مجھے بھی قتل کر دینا چاہتے ہیں۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ بوڑھی عورت ٹھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ”مگر تم ہو کون؟“  
 ”پہلے یہ بتائیے اس گاؤں کا نام کیا ہے؟ اور باغ و بہار یہاں سے کتنی دور ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 اس نے یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ باغ و بہار کے قرب و جوار میں واقع کسی گاؤں میں بھی اس کے باپ کی  
 کچھ زمین تھی۔ کسان نے بستی کا نام بتایا تو نائلہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ وہی گاؤں تھا۔ اس گاؤں  
 کے کئی گھرانے کے مزارعے تھے۔ لیکن وہ خود یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ اس گاؤں کی کچھ زمین اس کی  
 پھوپھی حسینہ بیگم کی بھی ملکیت تھی۔

”تمہاری اپنی زمین ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔ وہ کوئی بات کرنے سے پہلے یہ تسلی کر لینا چاہتی تھی کہ  
 اصغر علی انہی کا مزارعہ تھا یا شبیر درانی کا۔

”نہیں۔ ہم درانی صاحب کے مزارعے ہیں۔ ہمارا مالک بہت اچھا آدمی تھا۔ اس کے انتقال کے بعد  
 اس خاندان پر تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی ہے۔ اس کی جوان بیٹی چھٹی پھر رہی ہے۔ سنا ہے اس نے کئی قتل کئے  
 ہیں اور اس کی پھوپھی کا بیٹا بھی اسے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ سنا ہے وہ بھی پولیس سے ملا ہوا ہے۔“ اصغر علی  
 نے جواب دیا۔

”شبیر درانی کے بارے میں تم نے ٹھیک سنا ہے۔ لیکن یہ جھوٹ ہے کہ تمہارے مرحوم مالک کی بیٹی  
 نے کوئی جرم کیا ہے۔ میں ہی تمہارے مرحوم مالک کی بیٹی نائلہ درانی ہوں۔ اور اپنی جان بچانے کے لئے  
 چھٹی پھر رہی ہوں۔ شبیر درانی اب بھی میرے تعاقب میں ہے۔ میں اس کی قید سے بھاگی ہوں۔ مجھے پکڑنے  
 کی کوشش میں وہ دو تین گھنٹے پہلے دو آدمیوں کو قتل کر چکا ہے۔ اور مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے۔ مجھے پناہ  
 چاہئے۔“

اصغر علی اور اس کی ماں کے رونگھٹنے کھڑے ہو گئے۔ ان کے مرحوم مالک کی بیٹی ان کے سامنے  
 تھی۔ اس پر کئی آدمیوں کے قتل کا الزام تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ اور شبیر درانی بھی شکاری کتے  
 کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کل صبح ہی تو اس کے آدمی نائلہ کو تلاش کرتے ہوئے اس طرف آئے  
 تھے۔ اس بستی کے لوگ شبیر درانی کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ کبھی کبھار جب بھی اس گاؤں میں آتا تو  
 گاؤں کے لوگ اپنی جوان بیٹیوں کو گھروں میں چھپا لیتے اور بو بیٹیوں کو اس وقت تک گھر کی چار دیواری  
 سے باہر نہ نکلنے دیتے جب تک شبیر درانی واپس نہ چلا جاتا۔

اس سے پہلے کہ اصغر علی یا اس کی ماں کچھ کہتی، خاموش فضا میں اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ گاؤں کی  
 چھوٹی سی مسجد کا بوڑھا مولوی گاؤں کے لوگوں کو اللہ کے گھر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

”اندر آ جاؤ بیٹی۔“ اصغر علی کی ماں نے کہا۔ ”میرا نام فاطمہ ہے۔ اللہ بخشے تمہارے والد جب بھی  
 یہاں آیا کرتے تھے ان کے لئے کھانا وغیرہ میں ہی پکاتی تھی۔ آؤ۔۔۔ اندر آ جاؤ۔“

وہ نائلہ درانی کو ایک کمرے میں لے آئے۔ جہاں ایک جھلنگ سی چارپائی پر ایک عورت سوئی ہوئی  
 تھی۔ لائین کی روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی عمر تیس بیس سال کے  
 لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے لحاف اوڑھا ہوا تھا مگر نائلہ صاف طور پر محسوس کر سکتی تھی کہ وہ عنقریب ماں  
 بننے والی ہے۔

”میری بہو ہے۔“ بوڑھی فاطمہ نے کہا۔ ”اصغر علی کی شادی کو بارہ برس ہو گئے ہیں۔ اللہ نے پہلی  
 بار بھاگ لگایا ہے۔ پورے دنوں سے ہے۔ بیٹی، دعا کرو، اللہ خیر سے وہ وقت لائے۔“

”اللہ خبری کرے گا۔“ نائلہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”میں شبیر درانی کی جیب چھین کر ہانگی ہوں۔ یہ رانقل بھی اس سے چھینی ہے۔ جیب میں پیڑول ختم ہو گیا تھا جسے میں نے سڑک کے دوسری طرف کھیتوں میں چھپا دیا ہے۔ وہ اپنے آدمی کے ساتھ ایک اور گاڑی میں میرا چچا کر رہا ہے اور اگر۔۔۔“ نائلہ اچانک خاموش ہو گئی۔ اور کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کا خیال درست نکلا۔ وہ کسی گاڑی ہی کی آواز تھی جو غالباً تیز رفتاری سے بہتی کے قریب سڑک سے گزر گئی تھی۔

”اگر انہوں نے جیب تلاش کر لی تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ تم اس گاؤں کے کسی گھر میں چھپی ہوئی ہو۔ کل اس کے آدمی اعلان کر کے گئے تھے کہ اگر کسی نے تمہیں پناہ دی تو گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔“

فاطمہ نے کہا۔

نائلہ درانی اس کا مطلب سمجھ گئی۔ گویا فاطمہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ نائلہ کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اپنی ہی زمین پر اس کے لئے پناہ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

”باغ و بہار یہاں سے کتنی دور ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”چار میل۔“ فاطمہ نے جواب دیا۔ ”لیکن تم پیدل وہاں تک نہیں جا سکتیں۔ میں وہاں تک جانے کے لئے تمہارا ہندو دوست کر دیتی ہوں۔ اس میں خطرہ تو ہمارے لئے بھی ہے مگر ہم نے تمہارے باپ کا نمک کھایا ہے۔ آؤ تم میری چارپائی پر لیٹ جاؤ اور اصغر علی! تم ریڑے میں گھوڑی جو تو۔ جلدی کرو۔“ اس نے آخری الفاظ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

اصغر علی گھر سے نکل گیا۔ بوڑھی فاطمہ، نائلہ درانی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے نائلہ کی قبضہ اٹھادی اور پرانے کپڑے اٹھا اٹھا کر نائلہ کے پیٹ پر رکھنے لگی۔ نائلہ نہیں سمجھ پاری تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اور وہ سمجھی تو اس وقت جب فاطمہ نے اس کی قمیص کھینچ تان کر درست کر دی۔ اپنی بیست دیکھ کر نائلہ کو شرم بھی آئی۔ اس کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر کہا جاسکتا تھا جیسے وہ بھی ماں بننے والی ہو اور پورے دنوں سے

ہو۔

چند منٹ بعد اصغر علی گھر سے نکلا۔

”ریڑہ تیار ہو گیا ہے ماں۔“ اس نے کہا، پھر نائلہ کو دیکھ کر چونک گیا۔

”یہ گدا ریڑے پر بچھا دو اور یہ لحاف بھی لے جاؤ۔“ فاطمہ نے کہا۔ اور اسے مزید ہدایات دینے لگی۔ آخر میں وہ نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہمیں معاف کر دینا بیٹی۔ ہم تمہاری کوئی خدمت نہیں کر سکے۔ تمہیں اپنے گھر میں پناہ بھی نہیں دے سکے۔ جاؤ۔۔۔ اللہ وارث ہے۔“

نائلہ، اصغر علی کے ساتھ گھر سے باہر آگئی۔ اس نے فاطمہ کی دی ہوئی چادر خوب اچھی طرح اوڑھ لی تھی۔ نائلہ نے رانقل کا سیٹھی کچھ لگا کر اسے فاطمہ کے حوالے کر دیا تھا۔

”اے کہیں چھپا دینا۔ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔“ اس نے کہا۔

”تم اس کی فکر مت کرو۔ میں چھپا دوں گی۔“ فاطمہ نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے رانقل لے

لی۔

اصغر علی ریڑے پر گدا بچھا کر لحاف رکھ چکا تھا۔ نائلہ نے گدے پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔ اور اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ اصغر علی نے بھی ریڑے پر سوار ہو کر گھوڑی کی لگام سنبھال لی۔ بوڑھی فاطمہ نے پچھلی



طرف کا گیت کھول دیا۔ اصغر نے گھوڑی ہانک دی۔

گاؤں سے نکل کر سڑک پر آتے ہی گھوڑی کو چابک رسید کر دیا اور گھوڑی سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگی۔ سڑک ناہموار ہونے کی وجہ سے نانکہ کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے مگر وہ برداشت کرتی رہی۔

باغ و بہار تقریباً ایک میل دور رہ گیا تھا کہ نانکے کی رفتار ہلکی ہو گئی اور بالا خرہ نانکہ رک گیا۔ سڑک پر وہی سوزو کی پک اپ کھڑی تھی۔ اس کا فرنیچر غالباً کہیں پھینک دیا گیا تھا۔ لیکن سوزو کی پر شبیر درانی نہیں تھا۔ بلکہ اس محافظ کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس نے کندھے پر راتفل لٹکا رکھی تھی۔

”اوئے... کون ہے تو... اور یہ کون ہے؟“ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

نانکہ درانی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا اور لحاف بھی اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے یہ آواز سن کر بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پایا اور نہایت کمزور آواز میں کراہتے ہوئے بولی۔

”میں کون جلدی ہسپتال پہنچا۔ میں تھاں مردیاں... میری جان نکل گئی... ہائے...“

”یہ میری گھر والی ہے۔ بچہ ہونے والا ہے۔ ہسپتال لے کر جا رہا ہوں۔“ اصغر علی نے راتفل والے کی بات کا جواب دیا۔

اس شخص نے آگے بڑھ کر اچانک ہی نانکہ کے اوپر سے لحاف کھینچ لیا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کے چہرے سے چادر نہیں ہٹی تھی۔

”ٹٹ پینا، کیڑا ہے او توں... زنانیوں کو یوں دیکھتا ہے۔ تیری ماں بہن نہیں ہے کیا۔“ نانکہ درانی انتہائی خوفزدہ ہونے کے باوجود بڑی اچھی اداکاری کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں کرب کا حقیقی رنگ جھلک رہا تھا۔ ”میں کون جلدی لے کر چل۔ ہائے... ہائے... میں مر گئی...“

راتفل والے نے نانکہ درانی کا پھولا ہوا پیٹ دیکھا تو اس نے لحاف دوبارہ اس کے اوپر کھینچ دیا۔

”اسے جلدی ہسپتال لے جا کہیں راستے ہی میں نہ نیڑ جائے۔ اور ہاں... تم نے ادھر کوئی جیپ تو نہیں دیکھی۔ عورت چلا رہی تھی۔“

”نہیں جی... مجھے تو اپنا ہوش نہیں ہے۔“ اصغر علی نے جواب دیا۔

نانکہ درانی بدستور کراہ رہی تھی۔ مقام شکر تھا کہ اس شخص نے چادر کھینچ کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اصغر علی نے گھوڑی کو ہانک دیا۔ ریڑہ ایک بار پھر تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگا۔

ریڑے کو باغ و بہار کی بیرونی چنگی پر ایک بار پھر رکنا پڑا۔ اس وقت بھی نانکہ درانی نے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ کسی نے اس کے جسم پر سے لحاف ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ مشرقی افق پر پھیلی ہوئی سرخی بتا رہی تھی کہ سورج طلوع ہونے ہی والا تھا۔ قصبے کے بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ اصغر علی نے عقل مندی یہ کی کہ سیدھا مالاری اڈے پر جانے کی بجائے ریڑے کو مختلف سڑکوں پر گھماتا ہوا خانپور روڈ پر آگیا۔ قصبے سے باہر آکر اس نے ریڑہ سڑک کے کنارے پر روک لیا۔ اور نانکہ درانی کی طرف منہ پھیر کر بولا۔

”اب اٹھ جاؤ نانکہ بی بی۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

نانکہ درانی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کی زردی تھی۔ لیکن اپنے آپ کو محفوظ پا کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں اصغر علی۔“ وہ بولی۔ ”اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمہارے اس احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کروں گی۔“

”میں نے کوئی احسان نہیں کیا یا بی۔ حق نمک ادا کیا ہے۔ تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو میری جیب میں چند روپے موجود ہیں۔“ اصغر بولا۔

”نہیں، میرے پاس پیسے ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ اس نے چادر کے اندر قبض کے گلے میں ہاتھ ڈال کر سلطانہ کے دیئے ہوئے پیسے نکال لئے اور پانچ سو کا ایک نوٹ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ ”رکھ لو۔۔۔ تمہیں ضرورت پڑے گی۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے فشی تک یہ پیغام پہنچا دوں گی کہ وہ تم لوگوں کا خیال رکھے۔“

”خانپور جانے والی بس آرہی ہے۔ میرا سارا لے کر ریڑے سے اتر آؤ۔“ اصغر علی کتا ہوا ریڑے سے اتر آیا اور پھر نائلہ کو سہارا دے کر اس طرح ریڑے سے اتارنے لگا جیسے وہ واقعی حاملہ ہو۔

بس قریب آ رہی تھی۔ اصغر علی نے سڑک کے بیچ میں آکر بس کو رکنے کا اشارہ کیا اور نائلہ کو سہارا دے کر کھڑا ہو گیا۔ نائلہ نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ چادر میں اس کا پھولا ہوا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔

بس قریب آ کر رک گئی۔ اصغر علی نے سہارا دے کر نائلہ کو بس میں سوار کر دیا۔ اور بس کے روانہ ہوتے ہی ریڑے پر سوار ہو گیا۔

نائلہ کو ایک عورت کے ساتھ سیٹ مل گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر عورت کچھ سمٹ گئی تاکہ نائلہ آرام سے بیٹھ سکے۔ کنڈیکٹر قریب آیا تو نائلہ نے اسے سو کا نوٹ دے کر خانپور کا ٹکٹ خریدا اور باقی پیسے مٹھی میں دا بے بیٹھی رہی۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس کی کھڑکی سے ٹیک لگا کر سو جائے۔ وہ جاگتے رہنا چاہتی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر وہ سو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے جسم پر سے چادر سرک جائے اور اس کا راز فاش نہ ہو جائے۔ حاملہ عورت کا بھیس اس نے خانپور تک اپنائے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اس پر کوئی شبہ نہ کیا جاسکے۔ اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ بس کی کھڑکی سے آنے والی صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے تھکیاں دیتے رہے لیکن وہ جاگتی رہی۔

...●...●...●...

نائلہ درانی کو اس طرح ہاتھ سے نکلنے دیکھ کر شبیر درانی تملکا کر رہ گیا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بھی طیش آ رہا تھا کہ وہ اس طرح غافل کیوں ہو گیا تھا کہ نائلہ کو اسے اس طرح ڈھیر کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے ہاتھوں اپنا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔ لیکن اسے اپنے آدمی کے مرنے کا افسوس نہیں تھا۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ بے بسنے کی چڑیا ہاتھ سے نکل جا رہی تھی۔ اس کی جیب میں اگرچہ پستول بھی موجود تھا لیکن نائلہ کے ہاتھ میں گولیوں کا رائل تھا اور وہ دیکھ چکا تھا کہ وہ اسے استعمال کرنا بھی جانتی تھی۔ آٹوٹیک رائل نقل کے سامنے پستول کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اور پھر وہاں کوئی آڑ نہیں تھی۔ وہ کھلی جگہ پر کھڑا تھا اور نائلہ اسے چھلنی کر سکتی تھی۔

وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا نائلہ کو اگلے قدموں جیب کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ نائلہ نے

رائل اس طرح تان رکھی تھی کہ وہ اور اس کا محافظ اس کی زد میں تھے۔ شبیر درانی کی نظریں نائلہ پر مرکوز تھیں۔ ایک مرتبہ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر نائلہ نے گولیوں سے بمون دینے کی دھمکی دے کر اسے اپنی جگہ پر کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شبیر درانی موقع کی تاک میں تھا۔ اور پھر اسے موقع مل گیا۔ نائلہ نے کندھے پر ہتھیار ہٹائی دوڑنے لگی۔ جیب کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیں اور ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ کر نائلہ نے اس سے ٹھیکس ہوئی رائیل جیسے ہی ساتھ والی سیٹ پر رکھی۔ شبیر درانی نے بڑی پھرتی سے جیب سے پستول نکال کر نائلہ پر فائر کر دیا۔ لیکن ایک تو فاصلہ زیادہ تھا اور پھر فائر جلت میں کیا گیا تھا۔ گولی نائلہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی۔

جیب بڑی تیزی سے گھوم کر ریت کا بادل اڑاتی ہوئی خیر گڑھ کی طرف دوڑنے لگی۔ شبیر درانی نے دوڑتے ہوئے ایک اور فائر کر دیا مگر یہ گولی بھی نائلہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ وہ چیخا ہوا سڑک کی طرف دوڑا یہاں سوزو کی پک اپ کھڑی تھی۔ اس کا منتہا محافظ بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

شبیر درانی کے محافظ لعل بخش نے پک اپ کا اسٹیرنگ سنبھال لیا جبکہ شبیر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لعل بخش انجن اشارت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہر مرتبہ انجن گڑگڑا کر رہ جاتا۔ اور بالا خرچہ لعل بخش پر انجن اشارت ہو گیا۔

یہ پک اپ خاصی پرانی تھی۔ انجن بھی دے کا مریض ہی لگتا تھا۔ جو بار بار کھانسنے لگتا۔ لعل بخش بار بار گیسٹر بدل رہا تھا۔

”رفار بڑھاؤ، وہ حرامزادی نکلی جا رہی ہے۔“ شبیر درانی بار بار چیخ چیخ کر رفتار بڑھانے کو کہہ رہا تھا۔ ”میں کیا کروں سرکار؟“ لعل بخش کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ”اس کا انجن بھی صدیوں پرانا لگتا ہے۔ رفتار بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔“

”اگر وہ ہاتھ سے نکل گئی تو بہت برا ہوگا۔“ شبیر درانی دہاڑا۔ اس کی نظریں آگے جاتی ہوئی جیب کی عقبی سرخ بتیوں پر مرکوز تھیں۔ جیب کی رفتار خاصی تیز تھی اور فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اور پھر اچانک ہی جیب ٹکا ہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کی عقبی سرخ بتیاں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سڑک پر گیس کس موڑ بھی تھے اور درمیان میں ریت کے ٹیلے حائل تھے۔ شبیر درانی پہلے تو یہی سمجھتا رہا کہ جیب ٹیلوں کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی لیکن پھر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نائلہ نے جیب کی بتیاں بجھا دی تھیں۔

بالا خرچہ اس موڑ پر پہنچ گئے جہاں سے ایک سڑک سیدھی خیر گڑھ اور دوسری باغ و بہار کی طرف چلی گئی تھی۔ لعل بخش نے شبیر درانی کی ہدایت پر اس سٹیم پر پک اپ روک لی۔ ”تمہارے خیال میں وہ کس طرف گئی ہوگی؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔ ”وہ کسی بھی طرف جاسکتی ہے سرکار۔“ لعل بخش نے جواب دیا۔

”اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو خیر گڑھ کی بجائے یہاں سے باغ و بہار کا رخ کرتا۔ کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے لئے یہ راستہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ باغ و بہار سے خانپور کے لئے بس بھی مل سکتی ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”تو پھر اس طرف چلیں سرکار۔“ لعل بخش نے کہا۔

”ہاں، لیکن پہلے پک اپ پر لدا ہوا یہ سامان اتار کر یہاں پھینک دو۔ اس کی وجہ سے بھی رفتار تیز

نہیں ہو رہی۔ ”شیردرانی نے کہا۔

لعل بخش نے انجن چلتا ہی چھوڑ دیا اور پیچھے آکر پک اپ پر لدا ہوا فرنیچر اتار کر پھینکنے لگا۔ شیردرانی بھی پنجرز سیٹ سے اتر کر آیا۔ اور سامان اتارنے میں لعل بخش کی مدد کرنے لگا۔ اس دوران انجن خود بخود بند ہو گیا۔

لعل بخش دیر تک انجن اشارت کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ شیردرانی مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔ اس نے بھی لعل بخش کو ہٹا کر انجن اشارت کرنے کی کوشش کی مگر مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ وہ اسٹیرنگ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

”اشارت کرو اسے۔“ شیردرانی چیختا ہوا نیچے اتر گیا۔  
لعل بخش ایک بار پھر کوشش کرنے لگا مگر انجن اشارت ہو کر نہیں دیا۔  
”دھکا لگا کر اشارت کرنے کی کوشش کی جائے۔“ لعل بخش نے کہا۔

”اسٹیرنگ سنبھالو۔ میں دھکا لگاتا ہوں۔“ شیردرانی بولا۔ وہ اس قدر شدید غصے میں تھا کہ وہ یہ بھول گیا کہ وہ آقا ہو کر دھکا لگا رہا ہے اور ادنیٰ تو کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سڑک ڈھلانی تھی۔ تقریباً پچیس نہیں گز دور تک دھکا لگانے سے انجن اشارت ہو گیا۔ شیردرانی اتنے ہی میں بری طرح ہانپ گیا تھا۔ وہ پک اپ کی پنجرز سیٹ پر بیٹھا اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اتفاق کی بات تھی کہ اس مرتبہ انجن نے کوئی گڑبڑ نہیں کی، اور پک اپ کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ شیردرانی پک اپ کی رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے گالیاں بک رہا تھا۔

ریتیل علائقہ ختم ہو گیا تھا اور اب سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے۔ وہ دو بستیوں سے گزر چکے تھے۔ تیسری بستی کے قریب سے گزرے تو بستی کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ یہی وہ گاؤں تھا جہاں اس وقت نالہ موجود تھی۔ اسی گاؤں میں شیردرانی کے مزارعوں کے بھی کئی گھر تھے۔ پہلے اسے خیال آیا کہ گاؤں میں رک کر معلوم کرے۔ ممکن ہے نالہ اپنے کسی مزارعے کے گھر میں پناہ گزین ہو گئی ہو۔ لیکن پھر یہ خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ نالہ اتنی احمق نہیں تھی۔ اسے فرار کا موقع حاصل تھا تو ایک چھوٹی سی بستی میں رکنے کی حماقت کیوں کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بانگ و بہار کی بیرونی چٹکی پر پہنچ گئے۔ اس وقت دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سوزو کی پک اپ رکتے دیکھ کر جوگی کا ایک کارندہ باہر آگیا۔ وہ شیردرانی کو اچھی طرح جانتا تھا۔

”یہاں سے میری جیب تو نہیں گزری؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”نہیں سرکار۔ رات کو آپ خودی جیب پر اس طرف گئے تھے۔ اس کے بعد تو جیب واپس نہیں آئی۔“ چٹکی کے کارندے نے جواب دیا۔

”سبزل کہاں ہے؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”گھر میں سویا ہوا ہے سرکار۔“

”اگر میری جیب آئے تو اسے روک لینا۔ مگر ہوشیار۔ اس میں ایک لڑکی ہے اور اس کے پاس راتقل بھی ہے۔“ شیردرانی نے کہا اور لعل بخش کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ”سبزل کے گھر چلو۔“

چٹکی کے کارندے نے بیریز کے طور پر سڑک پر لگی ہوئی لوہے کی زنجیر نیچے گرا دی اور سوزو کی پک اپ

آگے نکل گئی۔

”سبزل“ شبیر درانی ہی کا پروردہ غنڈہ تھا اور چنگی کا ٹھیکہ بھی اسی کے پاس تھا۔ یہ ٹھیکہ اسے شبیر درانی ہی نے دلایا تھا۔ اس کا گھر چنگی سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔  
سبزل کو سوتے سے جگایا گیا تھا۔ وہ شبیر درانی کو دیکھ کر گڑبڑا سا گیا۔  
”سرکار آپ؟“

”ہاں۔“ شبیر درانی نے سوزوکی سے اترتے ہوئے کہا۔ ”اپنی رائفل لے کر لعل بخش کے ساتھ چلے جاؤ۔ میری ماموں زاد میری جیب لے کر بھاگ گئی ہے۔ اس طرف جتنی بھی بستیاں ہیں سب میں جا کر معلوم کرو وہ کہاں ہے۔ میں بارہ بجے تک یہیں رہوں گا۔ تمہارے گھر میں“ اس کے بعد رحیم یار خان چلا جاؤں گا۔ نالکہ کو تلاش کر کے دیں لے آنا۔ اگر تم لوگ اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تو اپنا انجام بھی سوچ لیتا۔“

”میں ابھی جاتا ہوں سرکار۔“ سبزل نے جواب دیا۔ اس نے اندر آکر بیٹھک میں شبیر درانی کے لئے بستر لگوا دیا اور ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ لعل بخش کے ساتھ سوزوکی میں سوار تھا اور سوزوکی کا رخ اسی طرف تھا جس طرف سے آئی تھی۔

سوزوکی پک اپ چنگی ناکہ سے تقریباً ”ایک میل آگے“ نکلی تھی کہ سامنے سے ایک ریڑھ آتا دکھائی دیا۔ لعل بخش نے پک اپ سڑک کے وسط میں روک لیا اور سبزل کو اشارہ کیا۔ سبزل نیچے اتر گیا۔ رائفل اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ریڑے کو روک لیا۔ وہ عبدالصمد درانی کے مزارعے اصغر علی کا ریڑھ تھا۔ ریڑے پر کوئی لحاف اوڑھ لیا ہوا تھا۔ سبزل اصغر علی کو پہچانتا تھا کہ یہ کون ہے لیکن ان میں تعلقات نہیں تھے۔ سبزل اس سے مختلف سوال کرتا رہا۔ لحاف میں سے کسی عورت کے کراہنے اور بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آواز سے لگتا تھا کہ وہ عورت شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ سبزل نے لحاف کا کونا پکڑ کر کھینچ دیا جس پر عورت نے اسے برا بھلا بھی کہا تھا۔ عورت کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر سبزل نے لحاف دوبارہ عورت کے اوپر ڈال دیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اور خود پک اپ میں بیٹھ گیا۔ پک اپ آگے روانہ ہو گئی۔

پک اپ تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ لعل بخش کو حیرت بھی ہو رہی تھی رات کو اس پک اپ نے انہیں پریشان کر ڈالا تھا اور اب تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

سورج نکل رہا تھا۔ نرم دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد لعل بخش نے پک اپ روک لی اور سڑک کے کنارے کچی زمین پر ٹائروں کے نشان دیکھنے لگا۔  
”وہ اسی طرف آئی ہے۔ آگے جانا بیکار ہے۔“ وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ بات تم شاید ٹائروں کے یہ نشان دیکھ کر کہہ رہے ہو۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے کہ۔۔۔“

”میں بہت عرصہ سے شبیر درانی کی جیب چلا رہا ہوں۔ ٹائروں کے نشان کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اور یہ نشان تازہ ہیں۔ وہ باغ و بہار بھی نہیں پہنچی جس کا مطلب ہے کہ وہ راستے میں کسی بستی ہی میں چھپی ہوئی ہوگی۔ چلو۔۔۔ بیٹھو گاڑی میں۔۔۔“ لعل بخش اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور پھر سبزل کے بیٹھنے ہی اس نے سوزوکی اشارت کر کے اسے تیزی سے گھما دیا۔

پہلی بستی والوں کو نالکہ درانی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ دوسرے گاؤں سے بھی کوئی امید

افزاء اطلاع نہیں لی۔ آگے صرف ایک گاؤں رہ گیا تھا اور اس گاؤں میں شیردرانی کے مزارے بھی آباد تھے اور اس کے ماموں عبدالصمد درانی کے بھی۔

لعل بخش کو یقین ہو چکا تھا کہ نالہ درانی اسی گاؤں میں اپنے کسی مزارے کے گھر میں چھپی ہوئی ہوگی۔ بستی کے قریب پہنچ کر دفعتاً اس نے پک اپ روک لی۔ بائیں طرف سڑک کے ساتھ نالہ کے باپ کی زمین تھی۔ سڑک کے بالکل کنارے والے کھیت میں ایک جگہ پودے دبے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ لعل بخش پک اپ سے اتر آیا۔ اسے کھیت کے کنارے پر جیپ کے ٹائروں کے نشان بھی نظر آ گئے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ٹائروں کے نشان کھیت کے اندر تک چلے گئے تھے۔ پودے کچلے ہوئے تھے۔

سبز بھی پک اپ سے اتر آیا تھا۔ وہ دونوں کھیت میں دوڑنے لگے۔ کچھ دور کھیتوں میں کچھ کسان کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر کسانوں کو حیرت بھی ہوئی تھی۔

وہ دونوں بالاخر جیپ تک پہنچ گئے۔ لعل بخش نے سب سے پہلے راتھیں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر راتھیں جیپ میں نہیں تھیں۔ وہ اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ جیپ میں پیٹرول نہیں تھا۔ اس دوران دو تین کسان ان کے قریب آ گئے۔

”کیا ہوا لعل بخش!“ ایک بوڑھے کسان نے پوچھا۔ ”شیردرانی کی یہ جیپ صبح سے یہاں کھڑی ہے۔ خراب ہو گئی ہے کیا؟“

”تم لوگوں میں سے کسی نے نالہ درانی کو دیکھا ہے؟“ لعل بخش نے جواب دینے کے بجائے الٹا انہی سے سوال کر دیا۔

”نالہ درانی!“ بوڑھے نے حیرت سے کہا۔ ”ہم نے عبدالصمد کی بیٹی کا نام تو سن رکھا ہے لیکن وہ یہاں کبھی نہیں آئی۔ شیردرانی کے آدمی پرسوں بھی اسے تلاش کرتے ہوئے اس طرف آئے تھے۔“

”سبز!“ لعل بخش نے سبز کو مخاطب کیا۔ ”بستی میں چلو اور عبدالصمد درانی کے جتنے بھی مزارے ہیں ان کے گھروں کی تلاشی لو۔ اور تم لوگ سن لو۔“ وہ کسانوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”اگر تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ نالہ درانی کسی گھر میں چھپی ہوئی ہے تو بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اگر تلاشی کے دوران نالہ جس گھر سے برآمد ہوئی اس گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ نالہ کو کسی نے نہیں دیکھا۔“ اسی بوڑھے نے جواب دیا۔ ”صبح سویرے جب میں یہاں آیا تو شیردرانی کی یہ جیپ یہاں کھڑی تھی۔“

”چلو سبز۔“ لعل بخش نے اشارہ کیا اور دونوں سڑک پار کر کے بستی کی طرف چل پڑے۔ کچھ بچے اور تین چار عورتیں بستی کے پہلے گھر کے قریب درختوں کے نیچے جمع ہو گئی تھیں۔ بکائن کے ان درختوں کی چھاؤں بڑی گھنی تھی۔ زمین کی لپائی کر کے ایک بہت بڑا چوڑا سا بنا لیا گیا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں عام طور پر دوپہر کے وقت گاؤں کی بوڑھی عورتیں بچے اور بوڑھے وقت گزارنے کے لئے یہاں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اس وقت تو وہ عورتیں اور بچے ان دونوں کو دیکھ کر یہاں جمع ہوئے تھے۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر عورتیں تو اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں اور بچے وہیں کھڑے رہے۔ اس دوران مسجد کا بڑھا مولوی گلی میں سے آتا ہوا نظر آیا۔

”کیا بات ہے لعل بخش۔“ مولوی نے پوچھا۔ ”شبیر درانی کی جیب کھیتوں میں کیوں کھڑی ہے؟“  
 ”ہمیں نائلہ درانی کی تلاش ہے۔ وہ جیب چرا کر بھاگی تھی۔ یہاں جیب کی موجودگی ثابت کرتی ہے  
 وہ اس بستی کے کسی گھر میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر کسی نے اسے اپنے گھر میں چھپایا ہے یا کسی اور طرف فر  
 ہونے میں مدد دی ہے تو اس کے گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔“

”تم گھروں کی تلاش لے لو۔۔۔ سب لوگ یا تو کھیتوں میں موجود ہیں یا گھروں پر ہیں۔ ہاں۔۔۔ اصغر علی  
 کی اذان کے وقت ریڑے پر گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اپنی گھروالی کو باغ و بہار کے ہسپتال لے کر گیا ہے  
 اس کے بچہ ہونے والا ہے۔ میں نے اذان کے بعد اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے ابھی تک  
 واپس نہیں آیا۔“ مولوی نے کہا۔ وہ تھا تو اس گاؤں کی مسجد کا امام لیکن اسے وظیفہ حینہ بیگم سے ملتا تھا۔  
 عبدالصمد درانی کے مزارعوں سے اس کی ویسے ہی نہیں جنتی تھی۔ اس لئے اس نے بڑے اطمینان سے کہ  
 دیا تھا کہ وہ لوگ گھروں کی تلاشی لے لیں۔

”صبح سویرے باغ و بہار کی طرف جاتے ہوئے اسے ہم نے بھی دیکھا تھا۔ اور۔۔۔“  
 ”آپ جھوٹ بول رہے ہیں مولوی جی۔“ ایک بچے نے لعل بخش کی بات کاٹ کر مولوی کی طرف  
 دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شبیرہ چاچی تو گھر میں ہے۔ میں صبح لے آئے انکے گھر گیا تھا تو خود دیکھا تھا۔ اس کے کوئی بچہ  
 وچہ نہیں ہوا۔“

”کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟“ لعل بخش اچھل پڑا۔  
 ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم خود جا کر دیکھ لو۔“ بچے نے جواب دیا۔  
 لعل بخش اور سبزل، اصغر علی کے مکان کی طرف دوڑے۔ لعل بخش سوچ رہا تھا کہ اگر اصغر علی کی  
 بیوی گھر پر تھی تو وہ عورت کون تھی جسے وہ صبح سویرے ریڑے پر ڈالے ہسپتال لے جا رہا تھا۔  
 ”صبح تم نے اصغر علی کے ساتھ ریڑے پر اس عورت کی شکل دیکھی تھی؟“ لعل بخش نے سبزل کی  
 طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”نہیں۔ اس کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔ اس کا بیٹ بٹکے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ اور وہ تکلیف سے  
 چیخ رہی تھی۔“ سبزل نے جواب دیا۔

وہ اصغر علی کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ کچھ بچے بھی ان کے پیچھے چلے آئے تھے۔ لعل بخش نے زور  
 زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ دروازہ اصغر علی کی ماں فاطمہ نے کھولا تھا۔ لعل بخش کو دیکھ کر اس کا دل اچھل  
 کر حلق میں آگیا اور چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ دونوں اسے دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔  
 ”تمہاری بو کہاں ہے؟“ لعل بخش غرایا۔

”وہ۔۔۔ وہ اندر لیٹی ہے۔“ فاطمہ نے جواب دیا۔ اس کے لمبے میں کپکپاہٹ تھی۔ خوف کی شدت  
 سے وہ قمر قمر کانپ رہی تھی۔

”اور وہ کون تھی جسے تمہارا بیٹا صبح سویرے باغ و بہار کے ہسپتال لے کر گیا تھا اور ابھی تک واپس  
 نہیں آیا۔“ لعل بخش بھڑبھڑائی کی طرح غرایا۔

فاطمہ خاموش کھڑی قمر قمر کانپ رہی تھی۔ جواب نہ پا کر لعل بخش نے اس پر تھپڑوں اور لاتوں کی  
 بارش کر دی۔ اس دوران سبزل، اصغر علی کی بیوی کو گھسیٹا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ اس کی بھی پٹائی  
 ہو رہی تھی۔ اس کی چیخیں آسمان کی خبر لارہی تھیں۔

مکان کے باہر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ قرب و جوار کے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان بھی چیخوں کی آوازیں سن کر دوڑتے ہوئے آگئے تھے۔ سب لوگ مکان کے باہر جمع تھے لیکن کسی نے آگے بڑھنے کی جرات نہیں کی۔

اس دوران فاطمہ نے یہ تو بتا دیا تھا کہ اصغر علی کے جانے کے بعد وہ کھیتوں میں جا کر جیب سے راتھلیں لے آئی تھی جنہیں اس نے بھوسے والی کوٹھری میں بھوسے کے اندر چھپا دیا تھا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا بیٹا نالہ درانی کو لے کر کہاں گیا تھا۔

اصغر علی کی بیوی نالہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس بچاری کو تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ نالہ کب آئی اور کب گئی تھی۔

لعل بخش نے فاطمہ کی نشان دہی پر بھوسے میں چھپائی گئی راتھلیں نکال لیں اور ایک راتھل سے ہوا میں برست چلا دیا۔ پھر وہ فاطمہ اور اس کی بہو کو گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے تشدد سے فاطمہ کی بہو بے ہوش ہو گئی تھی۔ انہیں کمرے میں بند کر کے لعل بخش نے باہر سے کنڈی لگا دی۔

”آگ لگا دو۔۔۔ زندہ جلا دو ان حرامزادوں کو۔“ لعل بخش چیخا۔

سبزل علی آگن سے لکڑیاں اٹھا اٹھا کر کمرے کے دروازے کے سامنے ڈھیر کرنے لگا۔ ان لکڑیوں پر بھوسہ بھی ڈال دیا گیا تھا۔ فاطمہ چیختے ہوئے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ اس کی بہو بھی شاید ہوش میں آگئی تھی۔ اور وہ بھی چیخ رہی تھی مگر ان درندوں پر ان چیخوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

لعل بخش نے جیب سے ماچس نکال کر لکڑیوں کے ڈھیر میں آگ لگا دی۔ لکڑیاں خشک تھیں۔ فوراً ہی عمل بھڑک اٹھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں نے مکان کو لپیٹ میں لے لیا۔

فاطمہ اور اس کی بہو کی چیخیں گونجتی رہیں۔ ان کی چیخوں سے آسمان کانپ گیا۔ دھرتی قرعہ اٹھی مگر ان درندوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اسی دوران اصغر علی پہنچ گیا۔ نالہ نے اسے پانچ سو روپے دیئے تھے اور وہ کچھ چیزیں خریدنے کے لئے قصبے ہی میں رک گیا تھا۔ آگ کے شعلے دیکھ کر وہ ریڑھے سے کودا اور گھر کی طرف دوڑنے لگا۔ اسے بچنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شعلے اس کے گھر سے اٹھ رہے تھے۔

وہ جیسے ہی گلی میں داخل ہوا کچھ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ مگر اصغر علی اپنے آپ کو چھڑا کر گھر کی طرف دوڑا۔

”آؤ۔۔۔ شیر دل جوان۔“ سبزل اسے دیکھ کر بولا۔ ”ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بتاؤ اپنی اس سگی کو کہاں چھوڑ کر آئے ہو۔“

”یہ کیا کیا تم لوگوں نے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔“ اصغر علی چیخا۔

”یہ تو تمہیں اس وقت سوچنا چاہئے تھا جب نالہ تمہارے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ تم جانتے تھے کہ شبیر درانی کو اس کی تلاش ہے۔ اگر تم نالہ کو شبیر کے حوالے کر دیتے تو تمہیں وہ دولت سے مالا مال کر دیتا اور یہ سب کچھ نہ دیکھنا پڑتا۔ اپنی ماں اور بیوی کی چیخیں سن لو۔۔۔ یہ ان کی آخری چیخیں ہیں۔“

اصغر علی جلتے ہوئے کمرے کی طرف دوڑا۔ ان دونوں نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔ گلی میں جمع لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

”اگر کسی نے آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی تو اسے بھی زندہ جلا دیا جائے گا۔“ لعل بخش لوگوں کی



طرف دیکھتے ہوئے دھاڑا۔

وہ اصغر علی کو گھسیٹتے ہوئے درختوں کے نیچے لے آئے۔ کچھ دیر ویسے ہی پٹائی کرتے رہے پھر اسے ایک درخت سے الٹا لٹکا دیا۔

”بتاؤ، نالکہ کو کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟“ لعل بخش اس کے سر پر زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے دھاڑا۔

”مجھے... نہیں پتہ وہ کہاں گئی ہے۔“ اصغر علی نے جواب دیا۔

”بتاؤ... تم نے اسے کہاں چھوڑا تھا؟“ لعل بخش نے راقط کا بٹ اس کی پسلیوں پر مارا۔ شاید کوئی پہلی ٹوٹ گئی تھی۔ اصغر علی کے منہ سے خون بہہ نکلا۔

دور دور کھڑے ہوئے گاؤں کے لوگ یہ شیطانی کھیل دیکھ رہے تھے۔ مگر کوئی آگے آنے کی جرات نہ کر سکا۔ گاؤں کی بہت سی عورتیں خوف سے چیخ و پکار کر رہی تھیں۔ سینہ کو پی کر رہی تھیں۔ ان کی نظروں کے سامنے فاطمہ اور اس کی بہو کو زندہ جلا دیا گیا تھا اور کوئی کچھ نہیں کر سکا تھا اور اب اصغر علی کو برہیت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

”بتاؤ اسے تم نے کہاں چھوڑا تھا؟“ اس مرتبہ سبزل نے اس کی کھوپڑی پر ٹھوکر ماری۔

”خانا... خان... پو... بس... کی بس...“ اصغر علی کے منہ سے یہ الفاظ بڑی مشکل سے نکلے تھے۔

سبزل نے لعل بخش کی طرف دیکھا۔ لعل بخش نے آنکھ سے اشارہ کیا اور سبزل نے راقط کا رخ اصغر علی کی طرف کر کے ٹرانسگر دبا دیا۔

اصغر علی کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ لعل بخش اور سبزل سڑک کی طرف دوڑ گئے۔ اصغر علی کی لاش درخت سے الٹی لٹکی جھولتی رہی اور خون کی دھاریں اس پاس کی زمین کو سرخ کرتی رہیں۔

سبزل اور لعل بخش باغ و بہار پہنچ گئے اور شبیر درانی کو رپورٹ پیش کر دی۔

”بہت ٹھیک کیا تم لوگوں نے۔“ شبیر درانی بولا۔ ”نالکہ کا ہندوستان بھی کر لیں گے۔ تم دونوں میرے ساتھ رحیم یار خان چلو۔“

انہوں نے پیٹرول پمپ سے سوزو کی پک اپ میں پیٹرول بھروایا اور اسی وقت رحیم یار خان روانہ ہو گئے۔

اسی رات دس بجے کے قریب پولیس کا ایس پی بھاری نفری لے کر شبیر درانی کے مکان پر پہنچ گیا۔ ”معاملہ بہت سنگین ہے درانی صاحب!“ ایس پی نے کہا۔ ”آج صبح پولیس کو دو لاشیں صادق آباد سے خیر گڑھ کی طرف جانے والی سڑک کے قریب بھی ملی ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو آپ کے ذاتی محافظ کی حیثیت سے شناخت کر لیا گیا ہے اور دوسری لاش کی ابھی شناخت نہیں ہو سکی۔ اور پھر گاؤں والا واقعہ، گاؤں والوں نے باغ و بہار کے چنگی ٹھیکیدار سبزل اور آپ کے ایک آدمی لعل بخش کا نام لیا ہے۔“

”کوئی بات نہیں ایس پی صاحب۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”ان دونوں آدمیوں کی گرفتاری دے دیتے ہیں۔ آپ انہیں لے جایئے۔“

”شکریہ۔ میں یہی چاہتا تھا۔“ ایس پی نے کہا۔

شبیر درانی نے سبزل اور لعل بخش کو بلا لیا۔

”تم لوگ اپنی گرفتاری دے دو۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے گھر کا خیال رکھوں گا اور تم لوگ بھی کچھ دن سرکاری مہمان رہ آؤ گے۔ جاؤ... ان کے ساتھ چلے جاؤ۔“

ان دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔ ایک اے ایس آئی آگے بڑھ کر دونوں کو جھٹکایا ہرٹانے لگا۔ شیردرانی مطمئن تھا۔ اس کیس میں اس کا نام نہیں آیا تھا۔ یہی تو دولت کے کھیل تھے۔

...●...●...●...

ٹائلہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اس ہیئت میں اپنی سیملی نمکت کے گھر گئی تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچے گی۔ لیکن پھر اس خیال کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ چند روز پہلے تک وہ عبدالصمد درانی کی بیٹی تھی۔ لیکن بڑے درپے جو واقعات پیش آئے تھے۔ انہوں نے اس کی حیثیت بدل کر رکھ دی تھی۔ اب وہ عبدالصمد درانی کی بیٹی نہیں تھی۔ ایک قاتلہ تھی، خوفناک قاتلہ۔ جس کے کھاتے میں کئی قتل تھے اور وہ پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھی۔ اور وہ مفروز تھی۔ شہر، گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ اس کے نام کی شہرت تھی۔ بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہو چکا تھا اور وہ سب اسے صرف ایک ہی نام سے جانتے تھے۔ خوفناک قاتلہ!

ٹائلہ درانی جب لاری اڑے پر بس سے اتر کر ٹانگے میں سوار ہو رہی تھی تو اس کی چادر کا ایک کونہ ٹانگے کے پائیدان میں اٹک گیا تھا جس سے چادر ایک جھٹکے سے اس کے سر سے اتر گئی تھی لیکن اس نے فوراً ہی چادر سنبھال لی تھی۔ اس کا چہرہ صرف ایک لمحہ کو برہنہ ہوا تھا۔ اور یہی ایک لمحہ آگے چل کر ٹائلہ کے لئے قیامت بننے والا تھا۔ مگر ٹائلہ کو اس کا احساس تک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر تھی کہ اس کے پیچھے آنے والے ٹانگے میں سوار ایک آدمی اس کے پیچھے لگ رہا تھا۔

اس شخص نے گرم چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ شیردرانی کا نمک خوار تھا اور دو دن پہلے جب ٹائلہ صادق آباد کے قریب آموں کے باغ والی حویلی سے فرار ہوئی تھی۔ وہ شخص اسی روز سے خانپور کے لاری اڑے کی نگرانی کر رہا تھا۔ صرف خانپور ہی کیا، شیردرانی کے آدمی تو ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ قرب وجوار کے تمام ریلوے اسٹیشن، لاریوں کے اڑے اور آمد و رفت کے تمام راستے ان کی نگاہوں میں تھے۔

اس وقت جب ٹانگے پر بیٹھے ہوئے ٹائلہ کے سر سے چادر اتری تھی تو اس نے ٹائلہ درانی کا چہرہ دیکھ لیا تھا مگر چادر کے نیچے اس کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر وہ الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کی شکل تو ٹائلہ سے بہت ملتی جلتی تھی۔ مگر اس کا پیٹ بتا رہا تھا کہ وہ ماں بننے والی تھی اور غالباً پورے دنوں سے تھی۔ مگر وہ ذہین آدمی تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال ابھرا تھا کہ ٹائلہ شیردرانی ہی کو نہیں، پولیس کو بھی مطلوب تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے یہ سوانگ رچالیا ہو۔ فیض کے اندر کوئی کپڑا وغیرہ ٹھونس کر بھی تو یہ حالت بنائی جاسکتی تھی۔ یہ محض شبہ تھا اور شے کی بنیاد پر ہی اس نے ایک ٹانگے پر بیٹھ کر ٹائلہ درانی کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔

شہر کے منجان آباد علاقے کے ایک چوک پر ٹائلہ ٹانگے سے اتر گئی اور کچھ دور جانے کے بعد ایک گلی میں داخل ہو گئی۔ یہ شہر کا پرانا علاقہ تھا اور گلیاں تنگ تنگ سی تھیں۔ وہ ایک موڑ گھوم کر دوسری گلی میں آگئی۔ اس گلی کے تقریباً سب ہی مکان دو منزلہ تھے۔ بعض مکان تو اس قدر قدیم تھے کہ ان کی اینٹیں خستہ ہو کر جھڑنے لگی تھیں۔ اس قسم کی مکان خاصے مخدوش ہو گئے تھے لیکن لوگ اب بھی ان میں رہائش اختیار کئے ہوئے تھے۔

گلی میں لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ نالکہ درانی نے صرف ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اسے اپنے پیچھے گلی میں آتے ہوئے لوگوں میں وہ آدمی بھی نظر آیا تھا جس نے گرم چادر کی بکلی مار رکھی تھی۔ اس کا چہرہ اگرچہ چھپا ہوا تھا مگر نالکہ کو اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ یہ سردی کا موسم تھا اور بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے سردی سے بچنے کے لئے بکلی، گرم چادر یا کھیس کی بکلی مار رکھی تھی جس سے ان کے چہرے بھی تقریباً چھپ جاتے تھے۔ لہذا اس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

گلی کے بیشتر مکانوں میں ڈیوڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ فن تعمیر کا ایک دور ایسا بھی گزرا تھا جب داخل دروازے کے اندر ڈیوڑھی لازمی طور پر ہوا کرتی تھی اور یہ مکان اس دور کے بنے ہوئے تھے۔

نالکہ درانی جس مکان کے سامنے رکی تھی اس میں بھی ڈیوڑھی تھی۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں اور تقریباً دس بارہ فٹ آگے مکان کے نچلے حصے کا دروازہ تھا۔

ڈیوڑھی میں کسی قدر تاریکی تھی۔ نالکہ درانی بیرونی دروازے میں داخل ہو کر سامنے والے دروازے کی طرف بڑھی، وہ دروازے پر دستک دینا ہی چاہتی تھی کہ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ دستک دینے کی بجائے سیڑھیوں کے نیچے خالی جگہ پر چلی گئی اور چادر اٹھا کر بڑی پھرتی سے قبض کے نیچے بھرے ہوئے کپڑے نکال کر سیڑھیوں کے نیچے پھینکنے لگی۔ اصغر علی کی ماں فاطمہ نے اس کی قبض کے نیچے نبھانے کیا کیا بھر دیا تھا پھر ان کپڑوں کو مخصوص شیبہ میں جمائے رکھنے کے لئے ایک دوپٹہ بھی پھیلا کر ان کے اوپر اچھی طرح لپیٹ دیا تھا۔ نالکہ نے تمام کپڑے نکال کر پھینک دیئے اور انہیں پیر سے سیڑھیوں کے مزید نیچے کر دیا۔ وہ کچھ دیر تک پیٹ پر ہاتھ پھیرتی رہی پھر آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ ایک لڑکی نے کھولا جو نالکہ کی تقریباً ہم عمر تھی۔ نالکہ نے اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی تھی۔ ”ارے نالکہ تم!“ وہ ٹھٹکتی تھی۔ نالکہ کی سہیلی۔ ”تمہیں کسی نے یہاں آتے ہوئے دیکھا تو نہیں؟“ وہ نالکہ درانی کو دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئی تھی۔

”دیکھا تو بہت سے لوگوں نے ہو گا مگر کسی کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں۔ ویسے بھی میں نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ ویسے اگر تم میری صورت دیکھ کر ڈر گئی ہو تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔ کہیں نہ کہیں پناہ مل ہی جائے گی۔“ نالکہ نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

”میرا خون ابھی اتنا سفید نہیں ہوا۔ اندر آجاؤ۔“ ٹھٹکتے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

”گھر میں کون کون ہے؟“ نالکہ درانی نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

”کوئی بھی نہیں۔ اس وقت تو میں بالکل اکیلی ہوں۔ نا صدف تر گیا ہوا ہے اور امی کچھ دیر پہلے ہی سودا سلف لینے کے لئے بازار گئی ہیں۔ آؤ۔ اندر کمرے میں چلو۔“ ٹھٹکتے کہا۔ نا صراف کا شوہر تھا۔ ”اور اوپر کون رہتا ہے؟“ نالکہ نے اس کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ کرائے دار ہیں۔ صرف میاں بیوی ہیں۔ اور دونوں ملازمت کرتے ہیں۔ شوہر بلدیہ کے دفتر میں ملازم ہے اور بیوی اسکول بچہ ہے۔ اس وقت ان میں سے بھی کوئی نہیں ہے۔“ ٹھٹکتے جواب دیا۔ ”تمہارے ڈیڈی اور تمہارا بھائی؟“

”ڈیڈی کا تو چھ مہینے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اور بھائی ان کے انتقال سے صرف ایک ہفتہ پہلے ملازمت

کے سلسلے میں دعی کیا تھا۔ وہ بچارہ تو باپ کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔ "گتھت نے بتایا۔  
 "بہت دکھ ہوا سن کر۔" نائلہ نے افسوس کا اظہار کیا۔

"یہ دکھ درد تو زندگی کا ایک حصہ ہیں۔" گتھت نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور تم سناؤ یہ سب  
 کچھ کیا کرتی پھر رہی ہو؟ میں تو تمہیں بہت شریف اور نیک پر دین سمجھتی تھی مگر تم تو بہت خونخوار نکلیں۔ قتل  
 قتل کرتی چلی جا رہی ہو اور پکڑائی بھی نہیں دیتیں۔ حالانکہ پورے ضلع کی پولیس تمہاری تلاش میں  
 ہے۔"

"یہ لمبی کہانی ہے۔" نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔  
 "یہ لمبی کہانی بعد میں سنوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں؟" گتھت نے کہا۔  
 "کل رات کو کھانا کھایا تھا۔ لیکن رات سے اب تک اس قدر اذیت ناک مرحلوں سے گزری ہوں  
 کہ بھوک و پیاس کا احساس تک مٹ گیا ہے۔" نائلہ نے جواب دیا اور گزشتہ رات صادق آباد میں سلطانہ  
 کے گھر سے روانگی سے اب تک کے واقعات بتانے لگی۔

"میں پہلے تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے آؤں۔" گتھت کہتی ہوئی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔  
 نائلہ کرسی پر بیٹھی بیٹھے اوٹھنے لگی۔ گتھت تقریباً چندرہ منٹ بعد ٹرے اٹھائے اندر آئی تھی۔ جس میں  
 دو کپ چائے اور فرائی انڈہ ڈبل روٹی کے سلائس اور ٹھنڈا وغیرہ تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے نائلہ کو  
 بگائے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو نائلہ اچھل پڑی۔ پھر گتھت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر افسردہ  
 سی مسکراہٹ آگئی۔

"بہت تھک گئی ہوں۔۔۔ نیند آ رہی ہے۔ دماغ جیسے پھٹا جا رہا ہے۔"  
 "ناشہ کر کے سو جاؤ۔۔۔ نیند پوری ہو گئی تو تھکن بھی اتر جائے گی اور ذہن کو بھی سکون ملے گا۔" گتھت  
 نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ ہمدردی تھی۔

نائلہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔ اپنے اس کے خون کے پیا سے ہو رہے تھے اور  
 غیر اپنی زندگیوں خطرے میں ڈال کر اسے سینے سے لگانے کو تیار تھے۔

ناشہ کرنے کے فوراً بعد نائلہ، گتھت کے پلنگ پر لیٹ کر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔  
 وہ تقریباً پورا دن سوئی رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود دماغ بوجھل سا ہو رہا تھا۔ وہ بے سدھ سی بستر پر لیٹی  
 رہی۔ پھر گتھت کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ گئی۔

"تم تو خوب سوئیں۔" گتھت اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "امی نے کئی مرتبہ کہا کہ تمہیں  
 جگا دوں لیکن۔۔۔"

"میں واقعی بے ہوشی کی نیند سوئی تھی۔ تمہارے شوہر آگئے کیا؟" نائلہ نے کہا۔  
 "ہاں۔۔۔ کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں۔" گتھت بولی۔ "اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ چاہو تو نالو۔۔۔ تمہارے  
 لئے ایک اہم خبر ہے۔ بعد میں بتاؤں گی۔"

نائلہ درانی نے پہلے اس اہم خبر کے بارے میں جاننا چاہا مگر گتھت ٹال مٹل مانی کہ چائے پر باتیں ہوں گی۔  
 نائلہ اٹھ کر گتھت کے ساتھ کمرے میں آگئی۔ گتھت نے اسے ہاتھ روم دکھایا۔ ہاتھ روم میں داخل  
 ہو کر نائلہ نے دروازہ بند کر لیا اور نمائے کے لئے کپڑے اتارنے لگی۔ کپڑے اتارتے ہوئے گر بیان میں  
 اڑے ہوئے نوٹ نیچے گر گئے۔ ان نوٹوں کو تو وہ بھول ہی گئی تھی۔ اس نے نوٹ اٹھا کر دیوار میں لگے ہوئے

چھوٹے سے شیعہ پر رکھ دیئے اور نہانے لگی۔

نہانے کے بعد اس نے نوٹ اٹھا کر دوبارہ گریبان میں ٹھونس لئے اور تولیئے سے بال جھاڑتی ہوئی جیسے ہی ہاتھ روم سے باہر نکلی گت کے شوہر ناصر سے آتما سامنا ہو گیا۔ ناصر کو اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اور نائلہ کو پہلی ہی نظر میں ناصر پسند نہیں آیا تھا۔ نائلہ نے اسے سلام کیا تو وہ جواب دینے کے بجائے اس کے سینے کو گھورتا رہا۔ نائلہ نے تولیہ سینے پر ڈال لیا اور گت کی طرف دیکھ کر مسکرا دی جو کمرے سے نکل رہی تھی۔ ناصر اپنی بیوی کو دیکھ کر دوسری طرف مڑ گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ سب اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ نائلہ نے محسوس کیا تھا کہ ناصر بار بار کن اگھیں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں میل تو نائلہ نے پہلی مرتبہ آتما سامنا ہوتے ہی محسوس کر لیا تھی اور اب نائلہ کا تجزیہ یہ تھا کہ ناصر کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔

ناصر کے پارے میں نائلہ درانی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ ایک بد چلن اور لالچی آدمی تھا۔ اسے جوئے کی عادت تھی۔ آدمی آدمی رات اور بعض اوقات رات بھر گھر سے غائب رہتا۔ وہ ایک سرکاری محکمہ میں اسٹور کیپر تھا۔ ساری تنخواہ جوئے میں ہار جاتا۔ وہ دفتری معاملات میں بھی گڑبگڑ چکا تھا۔ تقریباً ایک سال پہلے وہ پکڑا گیا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کا سرکاری سامان خوردہ رو کر چکا تھا۔ اگر گت کا باپ بیچ میں نہ آتا تو ناصر آج جیل میں ہوتا۔ گت کے باپ نے نہ صرف محکمہ کا نقصان پورا کر دیا تھا بلکہ کچھ اور دے دلا کر اسے ملازمت پر بھی بحال کر دیا تھا۔

ناصر گھر واپس آیا تھا۔ گت کے باپ کے انتقال کے بعد اب وہ اسی کوشش میں تھا کہ یہ مکان اپنے نام کر والے۔ یہ مکان درحقیقت گت کی والدہ کی ملکیت تھا۔ خانپور شہر سے تریبا تیس میل دور مگڑھی اختیار خان کی طرف تھوڑی بہت زمین بھی تھی جو بٹائی پر رکھی تھی وہاں سے تھوڑا بہت حصہ مل جاتا تھا۔

”وہ اہم خیر تم نے ابھی تک نہیں بتائی گت۔“ نائلہ نے پوچھا۔

گت نے پہلے ماں پھر شوہر کی طرف دیکھا۔ پھر نائلہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ خبر تمہارے لئے بہت اہم بھی ہے اور بری بھی۔“ وہ بولی۔ ”تم نے باغ و بہار سے چند میل دور گاؤں میں اصغر علی نامی جس شخص کے گھر میں پناہ لی تھی۔ شبیر درانی کے آدمیوں نے اصغر علی کے مکان کو آگ لگا دی۔ اس کی ماں اور بیوی کو زندہ جلا دیا اور اصغر علی کو ایک درخت سے الٹا لٹکا گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ ان سب کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے تمہیں پناہ دی تھی اور اصغر علی نے فرار میں تمہاری مدد کی تھی۔ یہ منظر اس گاؤں کے بیسیوں لوگوں نے دیکھا تھا۔ یہ خبر دوپہر ایک بجے تک لگ بھگ پورے خانپور میں پھیل گئی تھی۔“

”اوہ خدا یا!“ نائلہ درانی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ ”وہ انسان نہیں واقعی درندے ہیں۔“

”ان حالات میں تمہیں یہاں رکھنا مناسب نہیں ہے۔“ گت کہہ رہی تھی۔ ”لیکن ہم تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ لہذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمہیں مگڑھی اختیار خان کے قریب گاؤں بھیج دیا جائے۔ امی نے اپنی زمین شوکت علی نامی زمیندار کو دے رکھی ہے۔ وہ بہت شریف آدمی ہے لیکن امی کا رشتے کا بھائی بھی اس گاؤں میں رہتا ہے۔ رحیم نام ہے اس کا۔ تمہاری عمر کی ایک بیٹی بھی ہے اس کی۔ تمہیں رحیم کے گھر رہنا ہوگا۔“

”حالات بتا رہے ہیں کہ میں بہت سبز قدم واقع ہوئی ہوں۔ جہاں جاتی ہوں وہاں تباہی و بربادی نازل ہونے لگتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے مزید بے گناہ لوگ مارے جائیں۔ اس لئے...“

”بالکل نہیں۔“ نگت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ شیطان شبیر درانی محض تمہیں حاصل کرنے کے لئے یہ خونریزی کر رہا ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو گی۔ اور کیا اس طرح تمام بے گناہوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ اس شیطان کو قانون کی گرفت میں آنا ہو گا۔ ایک ایک جرم کا حساب دینا ہو گا۔ اور تم ہی وہ واحد ہستی ہو جو اس کی گھٹاؤنی سازشوں کو بے نقاب کر سکتی ہو۔ حوصلہ مت دو نا ملکہ... چائے پی کر تم تیار ہو جاؤ۔ امی تمہارے ساتھ جائیں گی۔ تمہیں گاؤں چھوڑ کر صبح سویرے واپس آجائیں گی۔ اس طرح کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تم کہاں ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ نا ملکہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”میں کہیں بھی چلی جاؤں وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ تمہاری باتوں سے میرا حوصلہ بڑھا ہے۔ اسے واقعی ایک ایک جرم کا حساب دینا ہو گا۔“

”تو ٹھیک ہے، شام کا اندھیرا پھیل چکا ہے۔ امی بالکل تیار ہیں۔ چائے پیتے ہی نکل جاؤ۔“ نگت نے کہا۔

نا ملکہ کا اب چائے پینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اصغر علی اور اس کے گھر والوں کے بارے میں سن کر اسے واقعی بے حد دکھ ہوا تھا۔ وہ گڑھی اختیار خان سے کسی اور طرف بھی نکل سکتی تھی۔ اس طرح سے لاہور پہنچ کر حکومت کے کسی اعلیٰ حاکم یا کسی وزیر یا کسی بھی اہم شخصیت تک رسائی کا موقع مل سکتا تھا۔

وہ نگت کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی اور ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر بال سنوارنے لگی۔ دس گھنٹے بعد جب وہ نگت کی ماں کے ساتھ چادر میں لپیٹی گھر سے نکل رہی تھی تو نا ملکہ نے محسوس کیا تھا کہ مرعجب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ گاؤں گڑھی اختیار خان سے پہلے ہی تھا۔ رات دس بجے وہ سڑک بر بس سے اترے۔ حالانکہ خانپور سے یہاں تک کا راستہ زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ میں طے ہو جاتا تھا۔ لیکن راستے میں نہر کے پل پر بس خراب ہو گئی تھی جسے ٹھیک کرنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔

گاؤں سڑک سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ غروب آفتاب سے پہلے پہلے یہاں اسٹاپ پر تانگے وغیرہ مل جایا کرتے تھے لیکن رات دس بجے تو کسی سواری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بس سے اترتے ہی نا ملکہ درانی اور نگت کی ماں کھیتوں میں گاؤں کی طرف جانے والے کچے راستے پر چل پڑیں۔ رات کی تاریکی، ہر طرف ہو کا عالم اور کھیتوں میں حشرات الارض کی آوازیں دل پر دہشت سی طاری کر رہی تھیں مگر وہ دونوں بے خوف و خطر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی رہیں۔ راستے میں کئی جگہ کچھڑ بھی تھا۔ مگر تاریکی میں انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک مرتبہ تو نا ملکہ کچھڑ میں پھنس بھی گئی تھی۔

رجیم کا مکان گاؤں کے باہری تقریباً سو گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ مکان کے چاروں طرف درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں اور خاردار جھاڑیوں کی لمبی چوڑی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ اس باڑھ کے اندر گھاس پھوس کا ایک بہت بڑا شیدنا ہوا تھا جس کے نیچے موٹی بندھے ہوئے تھے۔

یہ دونوں جیسے ہی باڑھ کے قریب پہنچیں دو کتے بھونکتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔ نا ملکہ کتوں کو دیکھ کر زرمی گئی تھی۔ نگت کی ماں نے ایک کتے کا نام لے کر ڈانٹنا شروع کر دیا۔

”نارو... کیوں بھونک رہے ہو۔ پہچانتے بھی نہیں کون آیا ہے؟“  
 کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ انہوں نے نکتہ کی ماں کی آواز پہچان لی تھی جس سے نالکہ کو یہ سمجھنے میں  
 دیر نہیں لگی کہ وہ اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔  
 کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر ایک آدمی مکان سے نکل آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل بیل بندوق  
 تھی۔

”کون ہے بھئی... کون ہو تم لوگ۔ وہیں رک جاؤ۔“ ایک بھاری آواز گونجی۔  
 ”میں ہوں بھائی رحیم...“ نکتہ کی ماں نے جواب دیا۔  
 ”مریم آپا تم... خیریت؟“ رحیم آگے آگیا اور اس نے باڈھ میں لگا ہوا لکڑی کا عارضی گیٹ کھول  
 دیا۔ یہ گیٹ بھی درختوں کی شاخوں وغیرہ کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ ”اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے۔ نکتہ ہے  
 کیا؟“

”نہیں۔ اندر چل کر بتاتی ہوں۔“ مریم نے جواب دیا۔  
 ان کی آوازیں سن کر رحیم کی بیوی اور بیٹی بھی جاگ اٹھیں۔ گاؤں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔  
 دن بھر کے تھکے بارے کسان شام کو جب کھیتوں سے گھر لوٹتے ہیں تو پھر بھی دل چاہتا ہے کہ بستر پر لیٹے  
 رہیں۔ کوئی اور دلچسپی تو ہوتی نہیں۔ نوبے تک گاؤں میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اور اس وقت تو ساڑھے دس  
 سے اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔

”یہ لڑکی کون ہے۔ اور اس وقت یہاں آنے کا مطلب ہے کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہوگی۔“ رحیم نے مریم  
 کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ مریم نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا اور پھر نالکہ کے بارے میں  
 بتانے لگی۔

نالکہ درانی کی داستانیں تو گاؤں گاؤں پہنچ چکی تھیں۔ رحیم اور اس کے گھروالے ہی نہیں، گاؤں  
 کے سب ہی لوگ جانتے تھے۔

”کوئی بات نہیں بیٹی۔“ رحیم نے نالکہ درانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”زندگی میں اونچ نیچ تو ہوتی ہی  
 رہتی ہے۔ میں تمہارے باپ سے کبھی ملا تو نہیں لیکن سنا بہت کچھ ہے۔ وہ بہت نیک آدمی تھے۔ ریاست کا  
 ہر شخص انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تمہارے رشتے داروں نے اس وقت تمہاری زندگی اگرچہ عذاب  
 بنا رکھی ہے لیکن ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چوہدری شوکت علی بھی بڑے اثر و رسوخ والا ہے۔ شبیر  
 درانی سے تو دیے بھی اس کی نہیں بنتی۔ شبیر درانی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ میں صبح ہی  
 چوہدری سے بات کروں گا۔ تم راجہ کے ساتھ جا کر اس کے کمرے میں سو جاؤ۔ راجہ... اسے اپنے کمرے  
 میں لے جاؤ اور اس کے لئے بستر چھاؤ۔“ رحیم نے آخری الفاظ اپنی بیٹی راجہ سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

”آؤ نالکہ بہن۔“ راجہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ نالکہ ہی کی تقریباً ہم عمر تھی۔ دہلی پٹی بڑی باری سی  
 لڑکی تھی۔ اس نے میزک کا امتحان پاس کر رکھا تھا۔ اور اب گھر کے چولہا بجلی میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

راجہ نے پہلے آگن میں آکر نالکہ کے کچڑا آلود پیر دھلائے پھر کمرے میں لے آئی۔ کمرے میں دو چار  
 پائیاں تھیں۔ بستر دونوں پر بچے ہوئے تھے۔ لیکن لحاف ایک ہی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ ان کے آنے سے پہلے  
 راجہ اسی بستر پر لحاف میں دبی سو رہی تھی۔ اسی چارپائی کے قریب ایک سال خورہ سی میچ دو تین پرانے

ناول پڑے ہوئے تھے۔ لائین کی روشنی میں سب سے اوپر والے ناول کے ٹائٹل پر ”چشمہ“ لکھا ہوا تھا۔  
اے آر خاتون کا یہ ناول نائلہ نے بھی پڑھا تھا۔ اے آر خاتون کے برسوں پہلے لکھے ہوئے ناول خواتین میں  
آج بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

”بستر تو بچھا ہوا ہے۔ لحاف چینی میں سے نکالنا پڑے گا۔ میرے ساتھ چینی کے اوپر والا یہ ٹرک  
آر وادو۔“ رابعہ نے کہا۔

”چینی میں سے لحاف نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ ایک ہی لحاف ہم دونوں کے لئے کافی نہیں  
ہو گا؟“ نائلہ نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ تو پھر آجاؤ... سردی ہو رہی ہے۔“ رابعہ نے جواب دیا اور وہ دونوں ایک ہی لحاف  
میں گھس گئیں۔

کچھ دیر تک وہ باتیں کرتی رہیں۔ نائلہ، رابعہ سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ اس کی معنی  
نعمت کے بھائی اعجاز سے ہوئی تھی جو دعیٰ گیا ہوا تھا۔ اور پروگرام یہ تھا کہ اعجاز دعیٰ میں اپنی ملازمت کے دو  
سال مکمل کر کے چھٹی پر آئے گا تو ان کی شادی کر دی جائے گی۔

باتیں کرتے کرتے رابعہ تو سو گئی مگر نائلہ درانی دیر تک جاگتی رہی۔ وہ اصغر علی اور اس کے گھر والوں  
کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جنہیں محض اس جرم میں انتہائی خوفناک طریقے پر موت کے گھاٹ اتارا گیا  
تھا کہ انہوں نے نائلہ کی مدد کی تھی۔

شبیر درانی پر تو جیسے جنون سا طاری ہو چکا تھا۔ وہ نہ صرف اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ  
نائلہ کو اس لئے بھی تلاش کر رہا تھا کہ وہ اس کی سازشیں بے نقاب کر سکتی ہے۔ اور پھر دنیا کی کوئی طاقت  
اس کے گلے میں پڑنے والے پھانسی کے پھندے کو نہیں روک سکے گی۔ نائلہ درانی نے بھی بہر حال یہ طے  
کر لیا تھا کہ وہ بے گناہوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لے گی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے  
بالآخر نائلہ بھی سو گئی۔

صبح سات بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ رابعہ صبح چھ بجے ہی جاگ چکی تھی۔ اور رحیم بھی زمیندار  
شوکت علی کو نائلہ کے بارے میں آگاہ کرنے کے لئے اس کی حویلی گیا ہوا تھا۔ وہ آٹھ بجے واپس آیا چوہدری  
شوکت بھی اس کے ساتھ تھا۔ نائلہ اس وقت رابعہ کے ساتھ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔

چوہدری شوکت علی کی عمر پچاس سے اوپر ہی تھی۔ کلین شیو تھا لیکن سر کے بال برف کی طرح سفید  
تھے۔ اس عمر میں بال حالانکہ اس قدر سفید نہیں ہوتے۔ وہ ایک شریف آدمی تھا۔ شرافت اس کے چہرے  
سے چلتی تھی۔

”مجھے رحیم نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ویسے بھی تمہارا نام بچے بچے کی زبان پر  
ہے۔ لیکن تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ شبیر درانی یا اس کا کوئی آدمی اس گاؤں کی حدود میں قدم رکھنے  
کی جرات نہیں کر سکتا۔ تم رحیم کے گھر میں رہو یا حویلی میں آجاؤ۔ وہاں بھی تمہاری دو بہنیں موجود ہیں۔ تم  
پورے گاؤں میں آزادی سے گھوم پھر سکتی ہو۔ تمہارے دل میں کوئی خوف نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن احتیاط کا  
دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ تم یہاں کسی کو اپنا نام نائلہ درانی نہیں بتاؤ گی۔ چند روز کے لئے اپنا  
نام سلیٹی رکھ لو۔ چند روز یہاں رہو۔ آرام کرو۔ اس کے بعد میں اوپر کسی اعلیٰ شخصیت سے رابطہ قائم  
کرنے کی کوشش کروں گا۔“ چوہدری شوکت نے کہا۔



”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں یہاں پہنچ گئی ہوں۔ آپ رائے صاحب سے رابطہ کیجئے۔ وہ اسمبلی کے ممبر ہیں۔ انہیں اسمبلی تک پہنچانے والے بھی میرے ڈیڑی ہی تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس سلسلے میں میری کوئی مدد ضرور کریں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”بیکار ہے۔“ چوہدری شوکت نے جواب دیا۔ ”میں ان سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ چڑھنے سورج کی پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ اسمبلیوں میں بھی یہ لوگ پارٹیاں بدل کر بے پندے کے لوٹنے کی طرح ادھر ادھر لڑھکتے رہتے ہیں۔ تمہارے والد کے انتقال کے بعد رائے صاحب سے میری ایک دو ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ وہ تمہارے والد کے احسانات کو بھول چکے ہیں اور اب عبدالرحمن درانی کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن تم فکر مت کرو... میں کسی اور اعلیٰ شخصیت سے رابطہ کروں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا... اور ہاں... ناشتہ کر کے تم دونوں حویلی آجاؤ... اور رابعہ بیٹی! شکیلہ کو تم سے شکایت ہے۔ تم دونوں سے اس سے ملنے نہیں گئیں۔“

”وہ بھی تو نہیں آئی چاچا جی۔“ رابعہ نے جواب دیا۔

”تمہاری شکایت بھی بجا ہے۔“ چوہدری شوکت علی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”بہر حال، ناشتے کے بعد تم دونوں آجاؤ... شام تک وہیں رہنا۔“

”جی اچھا۔“ رابعہ نے جواب دیا۔

چوہدری شوکت چلا گیا۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد نائلہ اور رابعہ بھی حویلی پہنچ گئیں۔ رابعہ نے نائلہ کا تعارف اپنی کزن سلمیٰ کے نام سے کرایا تھا۔ شوکت علی گھر پر نہیں تھا وہ زمینوں پر جا چکا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ شکیلہ اور عقیلہ، شکیلہ بڑی تھی اور عقیلہ اس سے دو سال چھوٹی۔ ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ دونوں بہنیں بھی میٹرک کر چکی تھیں اور اب خانپور کے گرلز کالج میں داخلہ لینے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ وہ دونوں نائلہ سے مل کر بے حد خوش ہوئیں۔ وہ خوش شکل، خوش اخلاق اور ملنسار لڑکیاں تھیں۔

پورا دن حویلی میں گزر گیا۔ جب سے نائلہ زخمی حالت میں سلطان زید ہسپتال سے فرار ہوئی تھی۔ اس کے بعد آج یہ پہلا دن تھا جو نائلہ نے نہی خوشی گزارا تھا۔ اور ایک لمحہ کو بھی اس کے ذہن میں شبیر درانی یا پولیس کا خیال نہیں آیا تھا۔

لیکن رات کے کھانے کے بعد رابعہ کے گھر آتے ہی اس کا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔ شبیر درانی ایک بار پھر موت بن کر اس کے ذہن پر مسلط ہو گیا۔ یہ شبیری تو تھا جس نے اسے گھر بے بے گھر کیا تھا اور وہ مجرموں کی طرح چھپتی پھر رہی تھی۔

رابعہ سوچتی تھی۔ اس کے ہلکے ہلکے خزانے کمرے کی فضا میں گونج رہے تھے۔ نائلہ کو اعزاء نہیں تھا کہ اس وقت کیا بجا ہوگا۔ لیکن رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اور ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اور حیرت کی بات تھی کہ کوئی کتابھی نہیں بھونک رہا تھا۔ کتے بھی شاید سردی سے بچنے کے لئے کہیں دبکے سو رہے تھے۔

دفعتا! ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر نائلہ درانی چونک گئی۔ رات کے وقت کتا عام طور پر کسی کو دیکھ کر ہی بھونکتا ہے۔ لیکن کتا ایک مرتبہ بھونکنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اور پھر دفعتا! باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ نائلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے رابعہ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

”کیا بات ہے؟“ رابعہ نے غبار آلود لمبے میں پوچھا۔

”باہر کوئی ہے۔“ نائلہ نے سرگوشی کی۔

”ابا ہوگا۔“ رابعہ نے جواب دیا۔ ”حقے کے لئے آگ جلانے کے لئے کمرے سے نکلا ہوگا۔ وہ اکثر رات کو اٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگتا ہے۔“

”نہیں۔“ نائلہ نے پھر سرگوشی کی۔ ”وہ تمہارا ابا نہیں ہو سکتا۔ کئی آدمیوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔“

رابعہ بستر سے نکل کر دروازے کے قریب پہنچ گئی اور باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دوسرے ہی لمحہ وہ پلٹ کر واپس آگئی۔ لائین کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرتے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ اسی لمحہ دروازہ دھڑدھڑایا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک آواز سنائی دی۔

”رحیمو! دروازہ کھولو۔ ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔“

رابعہ کے منہ سے خوف کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ دوڑ کر نائلہ سے پلٹ گئی رابعہ تو اس آواز کو شاید پہچان سکی ہو مگر نائلہ نے اس آواز میں جو جھلک محسوس کی تھی اس سے اس نے آواز کے مالک کو پہچان لیا تھا۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ بھی دھڑدھڑایا جا رہا تھا۔ رابعہ اندر سے دونوں کمروں کو ملانے والے دروازے کی طرف دوڑی۔

”ابا... باہر کا دروازہ مت کھولنا۔ باہر ڈاکو ہیں۔“ رابعہ نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

رحیم نے دوسری طرف سے کنڈا گرا کر دروازہ کھول دیا۔ نائلہ اور رابعہ اس کمرے میں آگئیں۔ وقت باہر سے ایک بار پھر گردار آواز میں لگا گیا۔

”رحیم! دروازہ کھول دو۔ میں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں۔ اگر تم نے تمیں سینڈ میں دروازہ نہیں کھولا تو توڑ دیا جائے گا اور اس کے بعد تمہارا جو حشر ہو گا وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“ اس کے ساتھ ہی باہر سے باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی آدمی اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

”دروازہ کھول دو رحیم چاچا۔“ نائلہ نے رحیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رحیم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دو آدمی دروازہ کھلتے ہی اندر گھس آئے تھے۔ ان دونوں کے تھوڑے تھوڑے آٹومیک رائف تھے۔ ان میں سے ایک آدمی رحیم کی طرف بڑھا مگر نائلہ درانی بڑی پھرتی سے ان کے پیچ میں آگئی۔

”کسی پر ہاتھ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”منہ بڑھا تا بندھا ہونے کے باوجود میں نے تمیں پہچان لیا ہے شہر کے کتے پہلے تم میرے باپ کے غلوں پر پانچ گرتے تھے اور اب شہر درانی کے پیر پٹنے پھرتے ہو۔ تم لوگوں نے جتنے بھی بے گناہوں کا خون کیا ہے تمیں ان کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہوگا۔ لیکن... اس جگہ میں تم لوگوں کو خونریزی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تم لوگوں کو میری خوش چاہی میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

رحیم وغیرہ حیرت سے نائلہ درانی کی طرف دیکھنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت ایک آدمی اور آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ گنت کا شوہر بنا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نہ صرف نائلہ بلکہ رحیم وغیرہ بھی چونک گئے۔ نائلہ درانی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شہر درانی کے آدمیوں کو یہاں لانے والا نامصری تھا۔ نائلہ کو رحیم کے گھر

پہنچانے کا منصوبہ نگہت کے گھر میں بنا تھا اور وہاں نگہت اس کی ماں اور ناصر کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نگہت کی ماں خود اسے یہاں چھوڑ کر گئی تھی۔ نگہت کے گھر سے نکلنے اور گاؤں پہنچنے تک نالکہ نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوئی شخص ان کا تعاقب تو نہیں کر رہا تھا۔ لیکن ان کا تعاقب نہیں ہوا تھا۔ نگہت اور اس کی ماں کے علاوہ ناصر ہی وہ واحد آدمی تھا جسے نالکہ کی یہاں موجودگی کا علم تھا اور نالکہ کو سو فیصد یقین تھا کہ ان لوگوں کو یہاں لانے والا وہی تھا۔

مگر... نالکہ کو حیرت تھی کہ وہ تو جاگ رہی تھی۔ اس نے کسی گاڑی وغیرہ کی آواز نہیں سنی تھی۔ حالانکہ رات کے سناٹے میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز تو دور تک سنائی دیتی تھی۔ اور پھر کتا بھی صرف ایک ہی مرتبہ بھونک کر رہ گیا تھا۔ نالکہ درانی کو یاد آگیا کل رات جب وہ نگہت کی ماں کے ساتھ یہاں آئی تھی تو کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا تھا مگر مریم کے ڈانٹنے پر کتے خاموش ہو گئے تھے۔ انہوں نے مریم کی آواز پہچان لی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ناصر بھی اکثر یہاں آتا رہتا ہوگا۔ اس نے بھونکنے والے کتے کو پکڑ کر خاموش کر دیا تھا۔

”اگر تم ہمارے ساتھ چلے کو تیار ہو تو ہمیں کسی پر ہاتھ اٹھانے کی ضرورت نہیں نالکہ بی بی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اب چلو۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔“

”ایک منٹ رک جاؤ۔ میں چپل پہن لوں اور چادر اوڑھ لوں۔“ نالکہ کہتی ہوئی دوسرے کمرے میں آگئی۔ شیر درانی کا گن مین بھی رانقل تانے اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔ نالکہ نے چپل پہنی اور خالی چارپائی پر پڑی ہوئی چادر اٹھا کر اوڑھنے لگی۔ جب وہ واپس آئی تو رحیم چاچا ناصر سے کہہ رہا تھا۔

”میں یہ تو جانتا تھا کہ تم جواری، شرابی اور لاپٹی ہو۔ مگر یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم چند گھنٹوں کے لالچ میں کسی کی زندگی بھی داؤ پر لگا دو گے۔“

”چند گھنٹے۔“ ناصر نے قہقہہ لگایا۔ ”شیر درانی نے مجھے پچیس ہزار روپے دیئے ہیں۔ پورے پچیس ہزار“ یہ دیکھو۔“ اس نے کوٹ کی جیب سے نوٹوں کے بٹل نکال کر دکھائے۔

”تم بہت گھنیا آدمی ہو۔ مریم بہن نے تم سے اپنی بیٹی کی شادی کر کے زندگی کی سب سے بڑی بھول کی تھی۔“ رحیم نے کہا۔

جواب میں ناصر نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ ”ایسے سنہری موقعے بار بار نہیں آتے رحیمو چاچا۔ مجھے ایک موقع ملا تھا میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اگر میں شیر درانی سے پچاس ہزار بھی مانگتا تو وہ دینے کو تیار ہو جاتا مگر میں نے مانگے ہی پچیس ہزار تھے۔“

نالکہ نے رحیم چاچا، رابعہ اور اس کی ماں کو خدا حافظ کہا اور ان لوگوں کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ وہ ان لوگوں کی درندگی سے واقف ہو چکی تھی۔ انہوں نے اصغر علی کی ماں اور اس کی بیوی کو زندہ جلا دیا تھا۔ اصغر علی کو درخت سے الٹا لٹکا کر اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ درندے کئی بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے اور نالکہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے رابعہ اور اس کے گھر والے بھی ان کی بربریت کا شکار ہوں۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو سرنڈر کر دیا تھا لیکن اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ شیر درانی کے قبضے میں نہیں رہے گی اور اس کا مقصد پورا نہیں ہونے دے گی۔

وہ کھیتوں کے راستے پر اس طرح چل رہے تھے کہ نالکہ درانی اور ناصر آگے آگے تھے اور شیر درانی

کے دونوں کن مین، ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ مغرب کی طرف جھکتے ہوئے چاند کی مدھم سی روشنی بڑا سرسرا تاثر دے رہی تھی۔ چاند بالکل مغربی افق پر تھا اور کچھ ہی دیر میں غروب ہونے والا تھا۔ چاند کی اس پوزیشن سے نائلہ کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ رات کا آخری پر تھا۔

ناصر، نائلہ کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے بارے میں شیخیال بگاریا رہا تھا۔

”کل شام کو جب نکت نے مجھے بتایا کہ تم وہی نائلہ درانی ہو جس کی پولیس کے علاوہ شیردرانی کو بھی پیش ہے تو میں نے اسی وقت تمہارے وجود سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں تمہارے بارے میں پولیس کو بھی اطلاع دے سکتا تھا۔ لیکن پولیس سے مجھے کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بلکہ ممکن ہے کہ وہ ایک ضرور قاتلہ کو پناہ دینے کے الزام میں مجھے بھی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیتے۔ اس لئے میں نے شیردرانی سے بطور کرنے کا فیصلہ کیا جس سے کچھ ملنے کی توقع بھی تھی۔

”کل شام ہی کو تمہیں گاؤں پہنچانے کا منصوبہ بنالیا گیا۔ آج صبح میں دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو خزانے کی بجائے میں لاری اڈے پہنچ گیا اور پہلی بس پر رحیم یار خان پہنچ گیا۔

”شیردرانی بہت بڑا آدمی ہے۔ مجھ جیسے لوگ تو اس سے ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہی ہوا، اس نے اپنے نوکروں کے ذریعے مجھے باہری سے ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے تمہارے نام کا حوالہ دے ملاقات پر اصرار کیا تو اس نے مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا۔

”میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اس سے تمہارے عوض پچیس ہزار روپے کا مطالبہ کیا۔ اس نے رقم میرے ساپنے رکھ دی اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو مجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ میں نے شیردرانی سے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ پچیس ہزار میری جیب میں ہیں۔ اب مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس کے لئے کس قدر اہم ہو کہ وہ تمہیں گرفت میں لینے کے لئے خود دوڑا آئے گا۔ مجھے پچاس ہزار کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔ مجھے تو اب اس بات کا بھی افسوس ہو رہا ہے کہ میں رحیمو چاچا اور اس کے گھروالوں کے سامنے کیوں آیا۔ اگر سامنے آیا ہی تھا تو مجھے اپنے چہرے پر کوئی کپڑا لپیٹ لینا چاہئے تھا مگر وہ میری شکل نہ دیکھ سکتے۔ لیکن بہر حال مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“

نائلہ درانی نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا لیکن وہ یہ سن کر چوٹے بغیر نہیں رہ سکی تھی کہ شیردرانی خود آیا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنی جیب میں سڑک پر ہی رک گیا ہو۔

چاند غروب ہو چکا تھا اور اب فضا تاریکی کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ گاؤں سے نکل کر تقریباً دو فرلانگ کا مسلے طے کرنے کے بعد وہ رک گئے۔ ایک درخت کے نیچے جیب کھڑی تھی اور کوئی آدمی اسٹرنگ کے نیچے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ شیردرانی تھا۔ جب وہ سگریٹ کا کش لگاتا تو تاریکی میں چنگاری سی چمک مچتی۔ جب یہ لوگ قریب پہنچے تو شیردرانی نے سلگتا ہوا سگریٹ دور اچھال دیا۔ جتنوں کی طرح سگریٹ کی جتنی ہوئی روشنی تاریک فضا میں محراب سی بناتی ہوئی پودوں میں غائب ہو گئی۔

”میں نے کہا تھا کہ تمہیں دنیا کے کسی کونے میں مجھ سے پناہ نہیں ملے گی۔ دیکھا، میں نے کتنی جلدی نہیں ڈھونڈ نکالا۔“ شیردرانی کہتا ہوا جپ سے اتر کر نائلہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”جب تک ناصر جیسے لالچی لوگ دنیا میں موجود ہیں تم جیسے لوگ سیدھے راستے سے بھٹکے رہیں گے۔“

نائلہ نے یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لو کہ میں بھی اپنی دھن کی پکی ہوں۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

”اس میں شبہ نہیں کہ تم آہنی اعصاب کی مالک ہو۔ کوئی دوسری عورت ہوتی تو اب تک بکھر جاتی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے اعصاب کب تک تمہارا ساتھ دیتے ہیں۔ چلو... اگلی سیٹ پر بیٹو جاؤ۔“ شیردرانی نے کہا۔

نائلہ درانی اوپر سے گھوم کر اسٹیئرنگ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شیردرانی کے پاس اگرچہ اور بھی کئی گاڑیاں تھیں، ایک پاجیرو بھی تھی لیکن وہ زیادہ تر بغیر چھت والی یہی جیب استعمال کیا کرتا تھا۔ ”اور نوجوان!“ شیردرانی، ناصر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو میرے آؤں اتنی خنزیری کے بعد بھی نہیں کر سکے۔ میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔“ اس نے خاموش ہو کر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے مخصوص اشارہ کر دیا۔

”اس میں شکریے کی کیا بات ہے جی۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔“ ناصر کہتے ہوئے پچھلی سیٹ پر سوار ہونے کے لئے جیب کی طرف بڑھا۔

”تم کہاں چلے جان؟“ شیردرانی کے ایک گن مین نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

”میں بھی تو واپس جاؤں گا۔“ ناصر بولا۔

”ہم تمہیں واپس لے جانے کے لئے تو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ تم یہیں رہو گے۔“ گن مین اسے کھینچ کر جیب سے دور لے جانے لگا۔

”لگ... کیا مطلب...! لگ... کیا کر رہے ہو۔ مجھے کہاں لے جا رہے ہو تم۔ درانی صاحب دیکھئے۔ آپ کا آدمی میرے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔“ ناصر چیخ رہا تھا۔

جیب سے تقریباً دس گز دور لے جا کر گن مین نے ناصر کا بازو چھوڑ دیا اور رائفل تان لی۔

”نن... نہیں... تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ ناصر چیخا۔ اسے اپنے سامنے موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی لیکن وہ پانچ گز سے زیادہ دور نہیں جاسکا۔ تاریک اور خاموش فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گن مین کی رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے ناصر کا جسم چھلنی کر دیا۔ ناصر چیخا ہوا اوندھے منہ کھیت میں گرا۔ اس کی پشت پر کئی جگہوں سے خون کی دھاریں بہہ نکلی تھیں۔

گن مین ناصر کی لاش کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے پیر سے لاش کو سیدھا کیا اور اس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال لی اور اسے اپنی جیب میں ڈالتا ہوا جیب کی طرف آگیا۔

نائلہ درانی کو ناصر کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اس جیسے لاپرواہی انسان کا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔ مگر اسے اپنی سہیلی نگہت کی بیوگی کا افسوس تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دینے لگی کہ نگہت کون سا اپنے شوہر سے خوش تھی۔ ناصر نے تو ان ماں بیٹیوں کی زندگی بھی عذاب بنا رکھی تھی اور انہیں اس عذاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی تھی۔ نگہت جوان تھی۔ رو دھو کر اسے بھی صبر آئی جائے گا اور وہ دوسری شادی کر لے گی۔

شیردرانی جیب کا انجن اشارت کر چکا تھا۔ اس کے دونوں گن مین پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے تو اس نے جیب آگے بڑھا دی۔

”چوہدری شوکت کو تو پتہ نہیں چلا؟“ شیردرانی نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اپنے آدمیوں سے پوچھا۔ ”نہیں سرکار۔“ ایک گن مین نے جواب دیا۔ ”لیکن اسے پتہ تو چل ہی جائے گا کہ اس کے گاؤں

سے سونے کی اس چڑیا کو لے جانے والا کون ہے۔“  
تھوڑی ہی دیر بعد جیب کھیتوں کے کچے راستے سے نکل کر پکی سڑک پر آگئی اور تیز رفتاری سے خانپور  
طرف دوڑنے لگی۔ تیز اور غنڈی ہوا تیر کی طرح لگ رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں گمن  
بجس نے گرم چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ نائلہ درانی نے بھی چادر اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ ونڈ اسکرین  
نہ وجہ سے وہ تیز ہوا سے کسی حد تک بچی ہوئی تھی۔

سڑک پر ایک جگہ ٹریفک کا ایک بورڈ دیکھ کر نائلہ کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ بورڈ محکمہ ہائی وے  
ن طرف سے لگایا گیا تھا جس پر پل کا نشان بنا ہوا تھا۔ یہ نشان درمیان سے تنگ سا تھا۔ اس بورڈ پر اس  
نشان کا مطلب تھا کہ آگے تنگ پل ہے۔

یہ اسی نہر کا پل تھا جہاں محل بس خراب ہوئی تھی۔ خاصی بڑی نہر تھی۔ اس بورڈ کو دیکھتے ہی نائلہ نے  
ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی کہ شیردرانی جیسے درندے کے قبضے میں نہیں رہے گی۔ وہ  
نیوٹن پیر سیٹ پر رکھ کر اکڑوں بیٹھ گئی اور سامنے ونڈ اسکرین پر لگے ہوئے راڈ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔  
”کیا ہوا؟“ شیردرانی نے اس کی طرف دیکھا۔

”سردی لگ رہی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

وہ پل کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ٹھیک اسی لمحہ مخالف سمت سے ایک مال بردار ٹرک بھی نہر کے پل پر  
آیا۔ ٹرک کے سامنے والے حصے پر لگے ہوئے لاتعداد ری فلیکنگ ز جیب کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں  
چمک رہے تھے۔ ٹرک ڈرائیور نے ہیڈ لیمپس کی روشنی ڈم کر دی۔ شیردرانی نے بھی ڈپر دبایا اور اس کے  
ساتھ ہی جیب کی رفتار کم کر کے اسے پل کے بالکل کنارے پر لے آیا۔

نائلہ درانی نے پل کے کنارے کی طرف دیکھا۔ پل کے کنارے پر صرف دو ڈھائی فٹ اونچی پتلی سی  
منڈیر بنی ہوئی تھی۔ نائلہ نے کن اکھیوں سے شیردرانی کی طرف دیکھا۔ اس کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ کی  
طرف تھی۔ وہ جیب کو کچھ اور کنارے پر لے آیا تھا کیونکہ ٹرک سڑک کے بالکل وسط میں آ رہا تھا۔  
نائلہ درانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ شیردرانی کے کھنکھنے سے نکلنے کا وقت آ گیا تھا۔ ٹرک جیسے ہی  
جیب کے بالکل قریب پہنچا نائلہ درانی کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح سیٹ سے اچھلی اور اس نے نہر میں  
چھلانگ لگا دی۔

اسپرنگ پر شیردرانی کا ہاتھ کانپ گئے۔ جیب لہرائی۔ پہلے تو وہ ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے پچی پھر پل  
کے کنارے کی طرف بڑھی۔ شیردرانی نے پوری قوت سے بریک پیدل دبا دیا۔ جیب کا ایک پیسہ پل کے  
کنارے تقریباً دو فٹ چوڑے اور آٹھ انچ اونچے فٹ ہاتھ پر چڑھ گیا تھا۔ اس کا اگلا حصہ پل کی منڈیر سے  
ٹکرایا۔ منڈیر کا کچھ حصہ ٹوٹ کر نہر میں گر ا۔ شیردرانی اگر بروقت بریک نہ لگا دیتا تو جیب بھی نہر میں گر چکی  
ہوتی۔

جیب رکے ہی وہ چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ اس کے دونوں گن مین بھی نیچے اتر چکے تھے اور اب وہ  
تینوں پل کی منڈیر کے قریب کھڑے نیچے نہر میں جھانک رہے تھے۔

ٹرک ڈرائیور نے بھی شاید کسی کو جیب سے نہر میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چند گز آگے جا کر  
ٹرک بھی رک گیا تھا۔ ڈرائیور اور کلینر بھی ٹرک سے اتر کر دوڑتے ہوئے ان کے قریب پہنچے۔

”کیا ہوا۔ نہر میں کس نے چھلانگ لگائی تھی؟“ ٹرک ڈرائیور نے شیردرانی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے

ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ شبیر درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس نے ایک جھٹکے سے ڈرائیور کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا تھا۔ ”تم اپنے کام سے کام رکھو... جاؤ۔ اپنی منزل کھوٹی مت کرو۔“

ڈرائیور نے دوسرے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ شبیر درانی کے دونوں گن مینوں نے اپنے جسم پر سے چادریں ہٹا دیں۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے چادریں درست کر کے اوڑھنا چاہتے ہوں۔ لیکن ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے ان دونوں کے کندھوں پر راتھلیں دیکھ لی تھیں۔ وہ اپنے کلیئر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

”چلو... ہمیں پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔“

وہ ٹرک میں بیٹھ گئے۔ اور ٹرک اشارت ہو کر حرکت میں آگیا۔

”میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ چھلانگ لگا دو نہر میں اور اسے بچاؤ۔“ شبیر درانی اپنے محافظوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

”ہم میں سے کوئی بھی تیرتا نہیں جانتا سرکار اور یہ نہر بہت گہری ہے۔“ ایک گن مین نے جواب دیا۔

”تو پھر یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ نہر کے کنارے پر جا کر دیکھو۔ کس نظر آئے تو اسے بچانے کی کوشش کرو۔“ شبیر درانی دہاڑا۔

وہ دونوں گن مین پل پر ایک ہی طرف دوڑ پڑے۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ نہر کے کنارے پر دوڑ رہے تھے۔ ان کی نظریں نہر کے تیز رفتار پانی پر مرکوز تھیں مگر تاریکی میں انہیں کچھ بھی نظر نہیں آسکا۔

ادھر نالکہ درانی نے جیب سے نہر میں چھلانگ لگاتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں اور دل ہی دل میں کلمہ پڑھنے لگی تھی۔ چادر اس کے جسم سے الگ ہو کر ہوا میں اڑتی ہوئی بائیں طرف جا رہی تھی۔

نالکہ شزاپ کی آواز سے پانی میں گری۔ پانی خاصا گہرا تھا۔ وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اور جب وہ پانی سے ابھری تو تیز رفتار پانی اسے تقریباً بیس گز آگے لے چکا تھا۔ نالکہ درانی نے بچپن میں کبھی پیراکی سیکھی تھی۔ اور اس کے بعد وہ آج پہلی مرتبہ پانی میں کودی تھی۔ بچپن میں سیکھی ہوئی پیراکی کے سارے تیز رفتار اور گہری نہر میں چھلانگ لگا دینا خود کشی کے مترادف تھا۔ لیکن شبیر درانی جیسے درندے کے چنگل سے تو موت ہی بہتر تھی۔ اس نے یہی سوچ کر نہر میں چھلانگ لگائی تھی۔ ویسے اسے یقین تھا کہ جب تک وہ اس شیطان سے اپنی بے عزتی اور بے گناہوں کے خون کا انتقام نہیں لے لیتی، موت اس کے قریب نہیں آئے گی۔ وہ بچپن میں سیکھی ہوئی پیراکی تقریباً بھول چکی تھی لیکن اپنے آپ کو سطح آب پر رکھنے کے لئے وہ ہاتھ پیر مارنے لگی۔ تیز رفتار پانی اسے تیزی سے دھکیل رہا تھا۔

اسی لمحہ جیب پل کی منڈیر سے ٹکرا کر رکی تھی۔ نالکہ نے اوپر دیکھا۔ اسے شبیر درانی اور اس کے گن مینوں کے سائے پل پر نظر آئے۔ نالکہ نے پانی غوطہ لگا دیا۔ اس نے منہ سختی سے بند کر کے ایک ہاتھ سے ناک دبالی تھی۔ تیز رفتار لہریں اسے بڑی تیزی سے دھکیلتی ہوئی لے جا رہی تھیں۔ نالکہ کا دم جھٹکنے لگا لیکن اس نے پانی کے اوپر آنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پانی کے اندر ہی اندر بہتی رہی۔ اس کے پیچھے بڑے جواب دینے لگے۔ وہ اس وقت تک برداشت کرتی رہی جب تک اس کے پیچھے ہڈوں میں طاقت رہی۔ اور جب قوت برداشت بالکل ہی جواب دے گی تو سطح آب پر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

پانی پر سر ابھارتے ہی وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس نے پل کی طرف دیکھا۔ وہ پل سے بہت

پر پہنچ گئی تھی۔ مگر اس نے دو آدمیوں کو بل پر دوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

نہر کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اس کا جسم سن ہونے لگا۔ اس کا دماغ بھی برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اور پھر دفعتاً ”گویا پانی میں اس کے قدم اکڑ گئے۔ اب وہ پانی کی تیز رفتار لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ بھی غوطے کھانے لگتی اور کبھی پانی کی سطح پر آجاتی۔ نالکہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے بری طرح ہاتھ پیر مارتی تھی۔ مگر بے رحم تیز رفتار لہروں اسے بری طرح بٹختی رہی تھیں۔ وہ ایک مرتبہ جب پانی سے ابھری تو اس نے بل کی طرف دیکھا۔ لیکن اب بل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نالکہ درانی نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ پانی سے لڑتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دل ہی دل میں خدا سے مدد طلب کرتی رہی۔

نالکہ درانی کے حواس پوری طرح جواب دے چکے تھے۔ وہ غوطے کھاتی ہوئی لہروں پر بہہ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح موت سے لڑتی چلی آ رہی ہو لیکن اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی، قوت برداشت ختم ہو گئی تھی اور آہنی اعصاب میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بے رحم لہروں کے حوالے کر دیا۔

اور پھر اس کے دل سے نکلی ہوئی پر غلوص دعائیں عرش معلیٰ تک پہنچ گئیں۔ چند مزید غوطے کھانے کے بعد جب وہ پانی کی سطح پر ابھری تو اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس چیز سے لپٹ گیا۔

وہ تقریباً چار فٹ لمبا درخت کا تانا تھا جو لہروں پر بہتا ہوا اس کے قریب آ گیا تھا۔ نالکہ درانی چھلکی کی طرح اس تنے سے لپٹ گئی تھی۔ اور درخت کا وہ تانا پانی کی لہروں پر بہتا رہا۔ درخت کا وہ تانا نالکہ درانی کو لئے ہوئے نہر میں بہتا رہا۔ اور بالاخر ایک اور بل کے قریب نہر کے کنارے کی جھاڑیوں میں انک کر رک گیا۔ نالکہ بے ہوش تھی۔ مگر درخت کے اس تنے سے وہ اب بھی جھنجکی کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

اس وقت دن کا مدھم سا اجالا پھیل رہا تھا۔ درخت کا وہ تانا جس بل کے قریب جھاڑیوں میں رکا تھا۔ اس سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر اینٹوں کا ایک بھنڈ تھا جس کے ساتھ ہی چند جھونپڑوں پر مشتمل ایک جھونپڑی بستی بھی تھی۔ یہ جھونپڑے دراصل ان پتھیروں کے تھے جو اس بھٹے کے لئے اینٹیں بنایا کرتے تھے۔ بھٹے اور اس نہر کے درمیان چند کھیت بھی تھے۔ پتھیروں کی تین چار عورتیں کھیتوں سے نکل کر نہر کی طرف آ رہی تھیں۔

نہر کی پڑی پر چڑھ کر ایک عورت ٹھیک اس طرف آگئی جہاں درخت کا وہ تانا نالکہ درانی کو لئے جھاڑیوں میں انکا بلکھوڑے لے رہا تھا۔ وہ عورت جیسے ہی نہر کے کنارے پر اندر کی طرف اترنے لگی اس کی فکر نالکہ پر پڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”اے روشن!“ اس نے اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک کا نام پکارا۔ ”بھاگ کے آ۔۔۔ نہر میں نہر کی لاش پڑی ہے۔“

وہ تمام عورتیں دوڑتی ہوئی اس طرف آگئیں۔ درخت کے تنے سے چکی ہوئی نالکہ کو دیکھ کر ان سب کے چہروں پر خوف کے سائے لہرا گئے۔ وہ اسے لاش ہی سمجھ رہی تھیں۔ لیکن پھر روشن نامی لہجی تڑگئی عورت کو خیال آیا کہ وہ عورت زندہ تو نہیں۔ وہ ہمت کر کے کنارے پر اترنے لگی۔ دوسری عورتیں اسے حرا کرتی رہیں مگر روشن کنارے کی جھاڑیوں کا سہارا لیتی ہوئی نالکہ تک پہنچ گئی۔ اس نے نالکہ کو چھو کر



دیکھا۔ اس کی ناک کے سامنے انگلی رکھ کر دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر چلی۔

”اری یہ زنانی جندہ ہے۔ آؤ اسے باہر نکالو۔“

باقی تینوں عورتیں بھی جھاڑیوں میں اتر گئیں۔ ان چاروں نے مل کر بڑی مشکل سے نائلہ درانی کو باہر نکال کر زمین پر لٹا دیا اور اس کا پیٹ دبا کر پیٹ میں بھرا ہوا پانی نکالنے لگیں۔

یہ ان گنوار عورتوں کی طرف سے ابتدائی طبی امداد تھی مگر جب نائلہ ہوش میں نہیں آئی تو ان چاروں نے مل کر اسے اٹھالیا اور کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی تیز تیز قدموں سے بھٹے کی طرف چلے گئیں۔ جھوپڑیاں نظر آتے ہی انہوں نے اپنے مردوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ جھوپڑوں میں کچھ مرد سو رہے تھے کچھ جاگ گئے تھے۔ جو جاگ گئے تھے وہ آوازیں سن کر باہر بھاگے۔

نائلہ درانی کو روشن والے جھوپڑے میں لے آیا گیا۔ روشن کا خاوند پہلے ہی باہر تھا۔ سات آٹھ سال کی ایک بچی زمین پر بھی ہوئی چٹائی پر سو رہی تھی نائلہ کو بھی چٹائی پر ہی ایک طرف ڈال دیا گیا تھا۔

”اے روشن!“ ایک عورت نے کہا۔ ”اس کے کپڑے تو بدللو۔ تھیکے ہوئے ہیں پتہ نہیں کب سے پانی میں پڑی تھی۔ ٹھنڈ سے مر جائے گی۔“

”تم دروجہ بند کر کے اس کے کپڑے اتارو۔ میں ٹرنک میں سے اس کے لئے اپنے کوئی کپڑے نکالتی ہوں۔“ روشن نے کہا۔

جھوپڑے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ دو عورتیں نائلہ کے کپڑے اتارنے لگیں جن سے اب بھی پانی نچو رہا تھا۔ روشن نے جھانگاسی چارپائی کے نیچے سے ایک پرانا سا ٹرنک گھسیٹ لیا اور اس میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

”اے روشن! یہ دیکھ ری۔ اس کی انگلیاں تو نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔“ ایک عورت نے کہا۔ اس کا نام جیرو تھا۔

روشن نے مڑ کر دیکھا۔ جیرو کے ہاتھ میں سو سو اور پانچ پانچ سو کے کئی نوٹ تھے جو پانی میں تر ہو رہے تھے۔

”یہ تو مجھے کسی اچھے گھر کی لگے ہے۔ کپڑے بھی دیکھ اس کے کتنے اچھے ہیں۔“ جیرو نے کہا۔ اور ایک پرانی سی چادر اٹھا کر نائلہ کا بھیگا ہوا بدن پونچھنے لگی۔ پھر نائلہ کو وہ کپڑے پہنا دیئے گئے جو روشن نے ٹرنک میں سے نکالے تھے۔ یہ جینٹ کا گھاکھرا اور چولی تھی۔ چولی نائلہ کے جسم پر قدرے ڈھیلی تھی۔ کپڑے بدل کر نائلہ کو چٹائی سے اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا گیا اور لحاف اوڑھا دیا۔ نائلہ کے لباس سے برآمد ہونے والی رقم روشن نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔

جھوپڑے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ بہت سی عورتیں اور مردانہ گھس آئے تھے۔ وہ لوگ نائلہ کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ اور نہر میں کود کر خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے نہر میں پھینک دیا تھا۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر لوگ ایک ایک کر کے جھوپڑے سے نکلنے لگے۔

جھوپڑے میں صرف روشن اور جیرو رہ گئی تھی۔ روشن کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ خوب لمبی ترنگی عورت تھی جبکہ جیرو پچیس چھبیس کی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کی تھی۔ روشن بار بار نائلہ کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ نائلہ کے پیٹ میں بھر جانے والا پانی نکال دیا گیا تھا۔ اور روشن کے خیال میں اب اس کی

زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ البتہ اسے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ نائلہ کو نمونیہ نہ ہو جائے۔ سردی کا موسم تھا اور وہ نجانے کتنی دیر تک نہر کے برف جیسے ٹھنڈے پانی میں پڑی رہی تھی۔ روشن کا خیال تھا کہ وہ کہیں دور سے نہر میں بہتی ہوئی آئی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نائلہ درانی کو ہوش آگیا۔ وہ کراہتی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نظریں روشن کے چہرے پر جم گئیں جو اس کے بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھی۔  
”میں کہاں ہوں... اور تم... تم لوگ کون ہو؟“ نائلہ نے جیو کی طرف دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”شکر کرو تم بچی گئی ہو۔ ہم نے تمہیں نہر میں سے نکالا تھا۔“ روشن نے کہا۔  
”نہر میں سے۔“ نائلہ بیڑوائی اور پھر اسے سب کچھ یاد آگیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
”یہ... یہ کونسی جگہ ہے؟“

”رشید عباس کا اینٹوں کا بھندہ ہے یہ۔“ روشن نے جواب دیا۔  
”رشید عباس کا اینٹوں کا بھندہ...“ نائلہ بیڑوائی۔ ”اور وہ نہر کا پل کہاں ہے۔ گڑھی اختیار خان کی سڑک والا پل؟“

”بی بی، وہ پل تو یہاں سے دس بارہ کوس دور ہے۔ پر تو ہے کون؟ نہر میں کیسے گری تھی؟ خود چھلانگ لگائی تھی یا تیرے کہمسم نے پھینک دیا تھا۔ گھر سے بھاگ کر آئی تھی؟“ روشن نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”نہ میں گھر سے بھاگی ہوں اور نہ میرے کہمسم نے مجھے نہر میں پھینکا تھا۔ میں نے خود نہر میں چھلانگ لگائی تھی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”مرنا چاہتی تھی تو؟“ روشن نے اسے گھورا۔  
”نہیں۔ لیکن تم لوگ کون ہو اور یہ کونسی بہتی ہے؟“ نائلہ بولی۔

”ہم پتھیرے ہیں اور یہ خورشید عباس کا اینٹوں کا بھندہ ہے۔ صرف ہمارے پانچ چھ جھونپڑے ہیں۔ آس پاس کوئی بستی نہیں ہے۔ خان پور کٹورہ یہاں سے پانچ چھ کوس ہے۔ پر تو نے نہر میں چھلانگ کیوں لگائی تھی؟“ روشن نے پھر پوچھا۔

”کچھ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بچنے کے لئے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ میری تلاش میں اس طرف بھی آجائیں۔ مگر کسی کو میرے بارے میں مت بتانا۔ میں بہت سے سارے پیسے دول گی۔ تم لوگوں کو... سب کو...“ نائلہ نے کہا۔

”ہم گریب ہیں، بے گیت نہیں ہیں جو تم سے پیسے لیویں گے۔ لے سنبھال یہ بھی... یہ نوٹ تمہاری انگلیا سے نکلے تھے۔“ روشن نے کہتے ہوئے ہیکے ہوئے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

”ناراض ہو گئیں؟“ نائلہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”میرا نام روشن ہے اور یہ جیرو ہے۔“ روشن نے بتایا۔

”دیکھو روشن!“ نائلہ نے کہا۔ ”بہت ستائی ہوئی ہوں میں۔ میرے اپنے پیسے میرے دشمن بورے ہیں۔ میں ان سے بچنا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے کچھ دن تم لوگوں کے ساتھ رہنا پڑے۔ یہ پیسے تمہارے پاس رکھ لو۔ خرچ کے لئے۔ میں تم لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ لیکن اگر کوئی میرے بارے میں پوچھتا ہو

اس طرف آنکے تو میرے بارے میں کسی کو کچھ مت بتانا۔ اپنی بستی والوں کو بھی سمجھا دینا۔ میں تم لوگوں کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“ نائلہ نے کہا۔

”تم بھکر ہی مت کرو۔ کوئی تیراں لے تو اس کی جبان کاٹ لوں گی۔ تجھے بخار ہو رہا ہے۔ تو لیٹی رہ میں تیرے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ روشن کستی ہوئی جھونپڑے سے باہر نکل گئی۔ جیرو خاموش بیٹھی نائلہ کی طرف دیکھتی رہی۔

نائلہ، شبیر درانی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ انہوں نے نہر کے کنارے پر دوڑتے ہوئے اسے دور تک تلاش کیا ہوگا۔ لیکن پانی کی تیز لہریں اسے اتنی دور لے آئی تھیں کہ نائلہ کو خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ لیکن اسے اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وہ دور جانے کی بجائے دوبارہ قریب آگئی تھی۔ روشن کے کہنے کے مطابق خان پور میاں سے صرف پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ دفعۃً ”روشن کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ روشن نے شاید تمام پتھیروں کو جمع کر لیا تھا اور وہ کڑکتی ہوئی آوازیں کہہ رہی تھی۔

”جس عورت کو ہم نے نہر میں سے نکالا ہے وہ ایک مظلوم عورت ہے۔ کچھ بد معاش اسے شر سے اٹھالائے تھے اور اس کی عزت لوٹنا چاہتے تھے۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لئے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ وہ گناہگار نہیں ہے۔ اس کی بے گناہ کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ بارہ کوس دور سے نہر میں بستی ہوئی آ رہی ہے مگر اللہ نے اسے بچا لیا۔ مظلوموں اور بے گناہوں کا ساتھ اللہ بھی دیتا ہے۔“

نائلہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ روشن ان پڑھ اور جاہل عورت تھی لیکن وہ جو فلسفہ بیان کر رہی تھی وہ قابل غور تھا۔ وہ پھر روشن کی آواز کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہم پتھیرے ہیں۔ گریب ہیں، بے گیرت نہیں ہیں۔ اس لی بی کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اسے تلاش کرتے ہوئے اس طرف آجائیں۔ اگر کسی نے انہیں اس عورت کے بارے میں کچھ بتایا تو جان لو کہ روشن سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

روشن پتھیروں سے جس لمحے میں بات کر رہی تھی اس سے نائلہ درانی کو اندازہ ہوا کہ اپنے اس مختصر سے فیملے میں اس کا خاصا نہکا تھا۔ وہ لمبی ترنگی مرد مار قسم کی عورت تھی۔ ہو سکتا ہے فیملے والے پہلے ہی اس سے مرعوب ہوں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد روشن بکری کے دودھ کی چائے بنا کر لے آئی۔ اس کے ساتھ ایک گرم گرم موٹی سی روٹی بھی تھی جو اسی وقت پکائی گئی تھی۔ چائے کا مگ اور روٹی والی چنگیر چٹائی پر رکھ دی اور نائلہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چونک گئی۔ نائلہ کو تیز بخار ہو رہا تھا۔

”چائے کے ساتھ یہ روٹی کھا لو۔۔۔ پھر میں تمہیں ایک گولی دے دوں گی، وہ کھالینا۔ بخار اتر جائے گا۔“ روشن نے کہا۔

نائلہ درانی چائے کے ساتھ روٹی کے چند نوالے ہی کھا سکتی تھی۔ روشن نے اسے پیرا سینا مول کی ایک گولی بھی دے دی جسے نائلہ نے چائے کے گھونٹ کے ساتھ حلق میں اتار لیا۔ نائلہ نے گولی کھالی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس سے بخار نہیں اترے گا۔ وہ کئی گھنٹوں تک برف جیسے ٹھنڈے پانی میں رہی تھی اور ٹھنڈ اس کی ہڈیوں تک میں اتر گئی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہیں نمونیہ کا اثر نہ ہو جائے۔

”میں نے بستی والوں کو سمجھا دیا ہے۔ اگر ادھر کوئی آیا تو وہ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ میں نے انہیں منع کر دیا ہے کہ وہ بھٹے کے منشی کو بھی کچھ نہ بتائیں۔ منشی خان پور سے دس بجے یہاں آتا ہے اور

ایک دو گھنٹوں بعد واپس چلا جاتا ہے۔ تم لیف اوپر لے کر سو جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو بخار اتر جائے گا۔“ روشن نے کہا۔

نانکھ نے لحاف اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اور کچھ دیر بعد وہ واقعی سو گئی۔  
دھوپ نکل آئی تھی۔ پتھیرے اپنا کام شروع کر چکے تھے۔ روشن تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھونپڑے میں آکر نالکھ کو دیکھ جاتی۔ نالکھ کا بخار کم نہیں ہوا تھا۔ دس بجے منشی بھی آگیا تھا۔ وہ چنگی سی داڑھی والا ایک ادیمز عمر آدمی تھا سر پر میلی سی ٹوپی تھی۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے پرانی سی ہونڈا اففنی موٹر سائیکل عارضی طور پر بنے ہوئے دفتر کے سامنے کھڑی کر دی۔ جب سے چابی نکال کر دفتر کا تالا کھولا اور موٹر سائیکل کے کیریئر سے کپڑے کا ایک میلا سا تھیلا اتار کر دفتر میں رکھ گیا۔ اس تھیلے میں وہ رجسٹر تھا جس میں ان پتھیروں کی کارکردگی کا حساب لکھا جاتا تھا۔ اس نے تھیلا دفتر میں پرانی سی گرد آلود میز پر رکھا اور اس جگہ آگیا جہاں پتھیرے سانچوں میں اینٹیں بنا رہے تھے۔

”قاسو!“ اس نے ایک پتھیرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کو نلکھ یہاں پہنچنا شروع ہو جائے گا۔ مالک نے کہا ہے کہ اگلے جمعہ کو بھٹے کو آگ دکھا دی جائے گی۔ اس وقت تک بعینہ ہر حالت میں تیار ہو جانا چاہئے۔“

”تیار ہو جائے گا منشی جی۔ کیوں گھبراتے ہو۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ کام وقت پر نہ ہوا ہو۔“ قاسو نے جواب دیا۔

”اچھا“ دفتر میں آؤ اور ان سب کا کل کا حساب لکھو۔ آج میں بھی شام تک یہیں رہوں گا۔ کوئلے کے ٹرک چار پانچ بجے ہی یہاں پہنچیں گے۔“ منشی کہتا ہوا اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد قاسو بھی دفتر میں بیٹھا اسے پتھیروں کی گزشتہ روز کی کارکردگی کا حساب لکھوا رہا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب روشن اپنا کام چھوڑ کر ایک بار پھر جھونپڑے میں آگئی۔ اس نے نالکھ کی پیشانی کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو اچھل پڑی۔ نالکھ بخار میں پھنک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی خونی کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ نالکھ نے اس سے پیرا بیٹا مول کی دو گولیاں اور لے کر کھالیں۔ کچھ دیر بعد اسے پسینہ آیا۔ بخار کچھ ہلکا ہوا لیکن ایک گھنٹے بعد بخار پھر تیز ہو گیا۔ روشن کی پریشانی بڑھ گئی۔ بالآخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اور وہ منشی کے دفتر میں پہنچ گئی جو اکیلا بیٹھا کوئی کتاب پڑ رہا تھا۔

”آؤ روشن! کیسے آئی ہو؟“ منشی نے کتاب میز پر اوندھی رکھ دی۔

”تیرے سے ایک کام ہے منشی۔ دیکھ! میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تو انکار مت کرنا۔“ روشن اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

”ایڈوانس پیسے چاہئیں؟“ منشی نے پوچھا۔

”نہیں منشی!“ روشن بولی۔ ”کل شام کو خانپور سے میری بہن آگئی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود رات کو اس نے ٹھنڈے پانی سے نہالیا۔ اب اسے تپ چڑھ گیا ہے۔ بہت تیز ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کیسے...“

”میں کیا کر سکتا ہوں روشن۔ میں کوئی ڈاکٹر تو ہوں نہیں۔ اسے شر لے جاؤ۔ کسی ڈاکٹر کے پاس۔“ منشی نے کہا۔

”اس کی حالت تو بہت خراب ہے۔ یہاں تو ریڑھ تانگہ بھی نہیں ملے گا۔ تو ایسا کر منشی! اپنی یہ بھٹ

پھٹی میرے بندے کو دیدے۔ وہ پھٹ پھٹی چلانا جانے ہے۔“  
 ”لیکن روشن یہ پرانی سی پھٹ پھٹی بہت کمزور ہے۔ اس پر دو آدمی نہیں بیٹھ سکتے۔“ منشی نے کہا۔  
 ”دو آدمی نہیں، شاہو اکیلا شہر جاوے گا اور ڈاکدار کو حال بتا کر دوادارو لے آوے گا۔ میں شاہو کو  
 پھٹ پھٹی کے لئے پیٹرول کے پیسے بھی دے دوں گی۔“ روشن نے کہا۔  
 منشی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ شاہو کو بھیج دو۔ میں اسے موٹر سائیکل دے دوں  
 گا۔“

”تیرا اللہ بھلا کرے رے منشی۔“ روشن اسے دعائیں دیتی ہوئی دفتر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔  
 ”اللہ تجھے اس کا اجر دے گا۔ تیرے بھاگ لگے رہیں۔“

روشن پنہیروں کے پاس آگئی جہاں اس کا شوہر شاہو بھی موجود تھا۔ اس نے تمام پنہیروں کو بتایا  
 کہ انہوں نے جس عورت کو نہر سے نکالا تھا اسے بہت تیز بخار ہے اور وہ شاہو کو دارو لینے کے لئے منشی کی  
 پھٹ پھٹی پر شہر بھیج رہی ہے۔ اگر منشی ان لوگوں سے کوئی سوال کرے تو وہ یہی بتائیں کہ وہ روشن کی بہن ہے  
 جو کل شام خانپور سے آئی تھی۔

روشن اپنے شوہر شاہو کو ایک طرف لے جا کر سمجھانے لگی کہ اسے ڈاکٹر سے کیا کہنا ہے۔ پھر اس نے  
 اپنی چولی کے نیچے انگلیاں منہسے ہوئے نالکہ کے دیئے ہوئے نوٹ نکالے اور سو سو کے دو نوٹ نکال کر  
 شاہو کے حوالے کر دیئے۔

”دھیان سے خرچ کرنا پیسے۔ اور ہاں منشی کی پھٹ پھٹی میں پیٹرول بھی ڈلوالیتا۔“ روشن اسے  
 سمجھاتے ہوئے بولی۔

”تو پھر سو روپیہ اور دے دو۔ چالیس پچاس کا تو پیٹرول ہی آجائے گا۔ اور تمہیں پتہ ہے دوائیں کتنی  
 مہنگی ہے۔ ڈاکدار اپنی فیس بھی لے گا۔“ شاہو بولا۔

روشن نے سو کا ایک اور نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شاہو منشی کے دفتر کی طرف چلا گیا۔ روشن  
 اسے دیکھتی رہی۔ منشی دفتر سے نکل کر کچھ دیر تک اسے موٹر سائیکل کے بارے میں سمجھاتا رہا۔ پھر موٹر  
 سائیکل اس کے حوالے کر دی۔ شاہو کو موٹر سائیکل پر روانہ ہوتے دیکھ کر روشن نے اطمینان کا سانس لیا  
 اور جھونپڑے میں آگئی۔

”میں نے اپنے بندے کو شہر بھیجا ہے ڈاکدار کے پاس دارو لینے تو فکر مت کر۔ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں  
 آجائے گا۔“ روشن نے نالکہ کی پیشانی چھوتے ہوئے کہا۔

”تو کتنی اچھی ہے روشن۔ تم لوگ انسان نہیں فرشتے ہو۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ان کی محبت دیکھ کر  
 اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے تھے۔

”ارے روتی کیوں ہے۔“ روشن نے جھک کر اس کی چتی ہوئی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”میں نے تمہیں  
 اپنی بہن کہہ دیا ہے۔ روشن مرجائے گی بہن کو کچھ نہیں ہونے دے گی۔ نہ رو میری لاڈو۔“

نالکہ درانی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ روشن کی محبت سے وہ بے حد متاثر ہوئی تھی اور بے اختیار دل  
 بھر آیا تھا۔ آنسو بہ جانے سے اس کے دل کا غبار بھی ہلکا ہو گیا تھا۔

شاہو کی واپسی تقریباً دو گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ مکسچر، گولیاں اور کیپسول لے کر آیا تھا۔ وہ تمام  
 دوائیں روشن کے حوالے کرتے ہوئے اسے ان کے استعمال کا طریقہ سمجھانے لگا۔ آخر میں بولا۔

”ڈاکٹر ار نے کہا ہے کہ بخار زیادہ تیز ہو تو برف کے پانی کی پٹیاں رکھی جائیں۔ میں برف لے آیا ہوں اور ڈبل روٹی بھی۔ اسے ڈبل روٹی کھانا۔“

”تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے کھانا کھلا دیا تھا۔ لا‘ میں دوا دے دوں پھر برف کی پٹیاں رکھتی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آج بخار اتر جائے گا۔“ روشن نے کہا۔ اس نے نائلہ کو بٹھا دیا اور اپنے ہاتھ سے دوا کھلانے لگی۔

”اتر جائے گا۔ بخار اتر جائے گا۔ پریشان نہ ہو۔ اللہ کرم کرے گا۔“ شاہو جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ اس نے بوری میں لپٹا ہوا برف کا ایک بڑا سا ٹکڑا اندر لاکر رکھ دیا۔ ”یہ برف رکھی ہے۔ ضرورت پڑے تو اس میں سے تھوڑی نکال لیتا۔“

شاہو باہر جا کر پتھیریوں کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ نائلہ کو دوا کھلانے کے بعد روشن کچھ دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی پھر وہ بھی باہر آگئی۔ جس جگہ کام ہو رہا تھا وہ جھونپڑوں کے سامنے ہی تھی۔ مٹی کھود کھود کر بہت لمبا چوڑا کھد بن گیا تھا۔ اس کھد میں گارا بھی بنایا جا رہا تھا اور یہی گارا سانچوں میں ڈال کر اینٹیں بنائی جا رہی تھیں۔

بہنہ اس کھد کے دوسری طرف تقریباً پچاس گز دور تھا۔ دو ٹرک بھٹے کے دوسری طرف کھڑے تھے اور مزدور ٹرکوں سے کوئلہ اتار رہے تھے۔ روشن ایک کھٹے تک اپنے کام میں مصروف رہی۔ پھر اٹھ کر جھونپڑے میں آگئی۔ نائلہ سو گئی تھی۔ کسی دوا میں غالباً نیند کا اثر بھی تھا۔ روشن نے نائلہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ وہ انگارے کی طرح تپ رہی تھی۔ روشن کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ صبح سے یہ وقت ہو گیا تھا اور کم بخت بخار کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے بوری میں لپٹی ہوئی برف کا ایک ٹکڑا توڑ کر مٹی کے ایک بڑے پیالے میں ڈالا اور اس میں تھوڑا سا پانی بھی ڈال دیا۔ پھر سر پر اوڑھی ہوئی اوڑھنی کا ایک کنارہ پھاڑ کر اسے تہہ کر لیا اور ٹھنڈے پانی میں بھگو کر اسے نائلہ کی پیشانی پر رکھ دیا۔

نائلہ درانی نے گڑبڑ کر آنکھیں کھول دیں۔ روشن کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”میرے لئے تم کتنا پریشان ہو رہی ہو روشن!“ وہ مدھم سے لمبے میں بولی۔

”تو ٹھیک ہو جا میری لاڈو۔ میری ساری پریشانی دور ہو جاوے گی۔“ روشن نے جواب دیا اور پٹی دوبارہ پانی میں بھگو کر پیشانی پر رکھ دی۔

”کیا تو مجھے جانتی ہے روشن؟“ نائلہ درانی نے پوچھا۔

”منے کیا پتہ تو کون ہے۔ میں تو تیرا نام بھی نہ جانوں۔ پر یہ جو انسانیت ہووے نا۔۔۔ یہ نہ تو کوئی رستہ دیکھے ہے نہ دین دھرم۔“ روشن نے جواب دیا۔

”روشن!“ نائلہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تو ہے تو ان پڑھ لیکن باتیں کتنی اچھی کرتی ہے۔

کاش! پڑھے لکھے لوگ بھی انسانیت کے اس فلسفے کو سمجھ سکیں۔“

”میں ان پڑھ نہ ہوں ری بی بی۔“ روشن نے تنک کر جواب دیا۔ ”میں نے مولوی جی سے نورانی

قاعدہ پڑھا تھا۔“

”اور اس کے بعد؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس کے بعد میری سادی ہو گئی۔“ روشن نے جواب دیا۔

روشن باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھی پیشانی پر رکھتی جا رہی تھی۔  
 ”اب بس کروشن۔ مجھے سردی لگنے لگی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

روشن نے اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ وہ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس نے کپڑا پیالے میں ڈال کر پیالہ چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور نائلہ پر لحاف درست کرنے لگی۔

”اب تو سوجا۔ میں کام ختم کر کے آؤں گی۔“ روشن کہتی ہوئی جھونپڑے سے باہر چلی گئی۔

نائلہ، روشن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کتنی عظیم عورت ہے۔ اس ان پڑھ اور جاہل عورت کے خیالات کتنے ارفع و اعلیٰ تھے۔ کتنا عظیم تھا اس کا انسانیت کا فلسفہ۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

روشن کا تعلق اوڈھ قبیلے سے تھا، یہ قبیلہ مختلف شاخوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر شاخ نے الگ الگ بیٹے اپنا رکھے تھے۔ روشن کا یہ قبیلہ چھ سات گھروں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے پتھیرا گری کا کام اپنایا تھا۔ کچھ مرد راج گری کا کام بھی جانتے تھے۔ برسات کے دنوں میں جب بھٹوں کا کام بند ہو جاتا تو یہ لوگ کچھ عرصے کے لئے دوسرے کام شروع کر دیتے۔

ان کی زندگی خانہ بدوشوں کی طرح تھی۔ آج یہاں، کل وہاں، پاکستان کے میدانی علاقوں میں واقع کوئی اینٹوں کا ایسا بھند نہیں تھا جہاں انہوں نے کام نہ کیا ہو۔ اس بھٹے پر آئے ہوئے انہیں ابھی چند ہی ہفتے ہوئے تھے۔ کام تو پہلے شروع ہو جاتا لیکن چند روز تک ہلکی بارش ہوتی رہی تھی جس وجہ سے کام شروع نہیں ہو سکا تھا۔ اور اب اگلے جمعہ کو اس بھٹے کو پہلی آگ دکھائی جانے والی تھی۔ پچھلے سیزن میں بھی یہ لوگ اس بھٹے پر کام کر چکے تھے۔

پانچ بجے کام بند ہو گیا۔ مٹی نے شہر جانے سے پہلے ازراہ ہمدردی روشن سے اس کی بہن کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

نائلہ دیر تک سوئی رہی۔ روشن کے دو بچے تھے۔ ایک گیارہ سال کا بیٹا اور ایک سات آٹھ سال کی بچی۔ شوہر اور بیٹے سے تو اس نے کہہ دیا تھا کہ جب تک لاڈو یہاں موجود ہے وہ دونوں باپ بیٹے کسی اور جھونپڑے میں جگہ تلاش کر لیں۔

روشن رات بھر نائلہ کے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے نائلہ کو وقت پر دوا کھلائی تھی۔ اور رات میں کم از کم دو مرتبہ اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی تھیں، چھ چھ گھنٹے کے وقفے سے نائلہ کو اب تک تین مرتبہ دوا دی جا چکی تھی مگر بخار کسی طرح کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

نائلہ درانی دو دن تک بخار میں پھنکتی رہی۔ یوں تو پتھیروں کی دوسری عورتیں بھی اس کی دیکھ بھال کرتی رہی تھیں لیکن روشن نے تو تیمارداری میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ نائلہ کو یقین تھا کہ اس کی اپنی کوئی سگی بہن ہوتی تو وہ بھی اس کی اتنی خدمت نہ کرتی۔

تیسرے دن بخار کم ہونا شروع ہوا تو روشن نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی روز شام تک نائلہ کا بخار اتر گیا۔ لیکن اس بخار نے اس بری طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اپنے آپ بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ قبیلے والوں نے مرغیاں بھی پال رکھی تھیں اور روشن مرغیاں کاٹ کاٹ کر نائلہ کو ان کی نیچی پلا رہی تھی۔ اس کا شوہر مٹی کی پھٹ پھٹی پر روزانہ شہر جا کر نائلہ کے لئے پھل وغیرہ بھی لے آتا

تھا۔ فشی بھی روزانہ روشن سے اس کی بہن کی خیریت دریافت کرتا رہتا تھا۔ لیکن اس نے ابھی تک روشن کی اس بہن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ روشن نے اسے کبھی جھونپڑے کے اندر داخل ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

روشن کی تیار داری اور بہتر خوراک کی وجہ سے نائلہ بڑی تیزی سے روبصحت بھی ہونے لگی۔ شروع کے دو تین دن تو شدید بخار کی وجہ سے نائلہ کو اپنا ہوش تک نہیں رہا تھا۔ اور اب وہ ایک بار پھر شبیر درانی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ شبیر درانی یا اس کے آدمی اس کی تلاش میں اس طرف نہیں آئے تھے۔ پھر اس نے سوچا کہ ممکن ہے کوئی نہ کوئی آدمی یہاں پہنچا ہو اور روشن اور اس کے قبیلے والوں نے اسے اطمینان دلادیا ہو کہ یہاں کوئی اجنبی لڑکی نہیں آئی۔

”روشن! میری تلاش میں یہاں کوئی آیا تو نہیں تھا؟“ بالا خرا یک روز نائلہ نے پوچھ ہی لیا۔  
”نہیں، کوئی بھی تو نہیں آیا۔“ روشن نے جواب دیا۔ ”اری آئے گا بھی کون؟“ نے ان لوگوں کے سامنے نہر میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ ڈوب کر مر گئی۔ اس لئے میں نے تیرے کو تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہوگی۔“  
”وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ انہیں میری موت کا اس وقت تک یقین نہیں آئے گا جب تک میری لاش کو وہ آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔“ نائلہ بولی۔

”اری تو پریشان کیوں ہوتی ہے لاڈو۔“ روشن نے کہا۔ ”کوئی آئے گا بھی؟“ اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گی میں۔“  
نائلہ مسکرا دی۔ اسے روشن کی سادگی پر ہنسی آ رہی تھی۔ اگر وہ شبیر درانی کا نام سن لیتی تو شاید یہ بات نہ کرتی۔

چار دن مزید گزر گئے اور بالا خرا نائلہ نے وہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا یہ فیصلہ سن کر روشن افسردہ سی ہو گئی۔  
”ارے میں تو تجھے اپنی بہن بنا بیٹھی تھی لاڈو۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب تو ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔“  
روشن بولی۔

”میں ہمیشہ تیرے پاس نہیں رہ سکتی روشن۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر زندہ بچ گئی اور حالات بہتر ہو گئے تو میں تمہیں اپنے پاس ضرور بلا لوں گی۔“  
”ارے ہم تو خانہ بدوش ہیں۔ آج یہاں کل وہاں... تم مجھے کہاں ڈھونڈ سکتی ہو۔“ روشن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”میں تیری بہن ہوں۔ تم نے مجھے لاڈو کہا ہے نا۔ میں تیری لاڈوی رہوں گی۔ تو دنیا کے جس کونے میں بھی ہوگی میں تجھے تلاش کر لوں گی۔ بس دعا کر کہ میں زندہ رہوں اور حالات بہتر ہو جائیں۔ تم نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے وہ میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گی۔ بس تجھے میرا ایک اور کام کرنا ہو گا۔“  
”میں تیرے ہزار کام کروں گی تو کہہ کر تو دیکھ۔“ روشن بولی۔

”میں خانہ بدوش جانا چاہتی ہوں۔ اپنے بندے شاہو یا کسی اور کو میرے ساتھ بھیج دے جو مجھے وہاں چھوڑ آئے۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں خود چھوڑ کے آؤں گی تجھے۔ وہاں تیرے رستے دار ہیں کیا؟ کہاں رہتے ہیں؟“



”خانپور میں میرا کوئی نہیں ہے۔“ ناملہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”تو پھر کہاں جائے گی؟“ روشن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”کہیں نہ کہیں تو پناہ مل ہی جائے گی۔ ویسے میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔ وہاں میرے رشتے دار ہیں۔“  
 ناملہ نے جواب دیا۔

”لاہور تو بہت دور ہے لاڈو۔ تو وہاں کیسے جائے گی؟“ روشن بولی۔  
 ”ٹرین پر۔“ ناملہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اچھا تو ایسا کر کہ اپنے قبیلے کی کسی عورت کا لباس مجھے لے دے۔ تمہارے کپڑے تو مجھے بہت ڈھیلے ہیں۔ میرا خیال ہے جیرو یا رقیہ کے کپڑے مجھے ٹھیک آئیں گے۔“

”ایک کیا میں تجھے کئی جوڑے لے دوں گی۔ یہاں کپڑوں کی کمی ہے کیا۔ اور میں بھی تمہارے ساتھ شرچلوں گی۔ ہمارے قبیلے کے کچھ لوگ شہر میں بھی بیٹھے ہیں۔ کب جاؤ گی؟“ روشن نے پوچھا۔  
 ”آج ہی۔“ ناملہ نے جواب دیا۔

”آج نہیں۔“ روشن نے کہا۔ ”کل جمعرات ہے اور پرسوں جمعہ کو بھٹے سے ہماری چھٹی ہوگی۔ کل دوپہر کے بعد چلیں گے۔ رقیہ، جیرو اور دوسری عورتیں بھی ہمارے ساتھ جائیں گی۔ ایک دن تم ہمارے ساتھ شہر میں بھی رہ لینا۔“  
 ”ٹھیک ہے، کل ہی سہی۔“ ناملہ نے جواب دیا۔

اور پھر دوسرے دن دوپہر کے وقت پانچ عورتیں شہر کے لئے روانہ ہو گئیں۔ ان کے ساتھ روشن کا گھروالا شاہو بھی تھا۔ ناملہ نے جیرو کا لباس پہن رکھا تھا۔ پھولدار گھاگرا، تنگ سی چولی اور پھولدار کپڑے کی اوڑھنی۔ ناملہ کی دونوں ہانہوں میں سفید اور کالے رنگ کی پلاسٹک کی موٹی موٹی چوڑیاں بھی تھیں۔ اس کی دونوں ہانہیں ان چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے اور ناک میں چوڑی جتنی بڑی پیتل کی نتھ بھی تھی۔ یہ ساری چیزیں اسے روشن نے دی تھیں۔ رواجی سے تھوڑی دیر پہلے روشن نے اسے وہ رقم بھی دے دی تھی جو خرچ سے بچ گئی تھی۔ ناملہ نے وہ رقم گنی تو ساڑھے تین ہزار روپے کے لگ بھگ تھی۔ اس نے ایک ہزار روپے اپنے پاس رکھ لئے اور باقی رقم روشن کو لوٹا دی۔

”یہ اپنے پاس رکھ لو۔ میرے ساتھ شہر جا رہی ہوں۔ اپنے بچوں کے لئے کچھ خرید لینا۔“  
 روشن انکار کرتی رہی مگر ناملہ نے زبردستی وہ رقم اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ ناملہ نے جو لباس پہن رکھا تھا اس میں وہ کوئی خانہ بدوش لڑکی ہی لگتی تھی۔ چہرہ اس نے اوڑھنی میں گھونکھٹ کی طرح چھپایا تھا۔ لیکن بلاؤز نما چولی چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس کی کمر اور پیٹ نگاہور ہا تھا۔ اس کی گوری رنگت اس کے غیر جیسی ہونے کی چٹلی کھا رہی تھی۔ اس لئے وہ بار بار اوڑھنی کو درست کر رہی تھی۔ سڑک پر پہنچ کر وہ رک گئیں۔

”تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤ۔ کوئی نہ کوئی ریزہ یا ٹرائی آجائے گی تو اس پر بیٹھ جائیں گے۔“ روشن نے کہا۔

انہیں تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ پھر سڑک پر ایک ریزہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ شاہو نے ریزے کو روک لیا۔ ریزے پر دودھ کے صرف چار وٹو ہے رکھے ہوئے تھے۔ یہ ریزے والا کسی قریبی گاؤں سے آیا تھا اور دودھ لے کر شہر جا رہا تھا۔ وہ لوگ بھی ریزے پر بیٹھ گئیں۔

ریڑے والا راستے بھران عورتوں سے مذاق کرتا رہا۔ جس سے نائلہ کو اندازہ ہوا کہ خانہ بدوشوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا جیسے ان کی کوئی عزت نہ ہو۔ نائلہ قدرے آگے بیٹھی تھی اور ایک مرتبہ ریڑے والے نے اس کے بازو پر بھی چٹکی بھری تھی۔ نائلہ سسکاری سی بھرتی ہوئی پیچھے سرک گئی تھی۔ ریڑے والے نے انہیں پہلے چوک پر اتار دیا بلکہ اس نے ریڑہ روشن کے کہنے پر ہی روکا تھا۔ کیونکہ ان کے قبیلے کے جو لوگ شہر میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے وہ جگہ جہاں سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ نائلہ نے شاہو کو وہیں سے ریلوے اسٹیشن کی طرف بھیج دیا تھا کہ وہ لاہور کی طرف جانے والی ٹرینوں کی روانگی کے اوقات معلوم کر کے آئے۔

نائلہ 'روشن' اور جیرو وغیرہ سڑک پر چلتی رہیں۔ راستہ چلتے ہوئے لوگ بھی انہیں مذاق کا نشانہ بناتے رہے۔ ایک من چلے تو نائلہ کی اوڑھنی بھی کھینچ لی تھی۔ اوڑھنی اترتے ہی نائلہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس کا برہنہ پیٹ اور حسین چہرہ دیکھ کر اس شخص کے منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکلی۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔

”ارے واہ۔“ ایک نوجوان بولا۔ ”سے کہتے ہیں گودڑی میں لعل۔ چلوگی ہمارے ساتھ۔ منہ نہ۔“ پیسے دیں گے۔“ وہ شخص چمکتی ہوئی نظروں سے نائلہ کے سر پاپا کا جائزہ لے رہا تھا۔ چولی تنک ہونے کی وجہ سے اس کا سینہ کچھ اور بھی کسا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس شخص کی نظریں چولی کے اندر تک جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”یہ تو پتہ چل گیا کہ چڑی کے نیچے کیا ہے۔ پھر یہ بھی تو بتادو کہ چولی کے اندر کیا ہے؟“ دوسرے نوجوان نے کہا۔

نائلہ درانی کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ اس نے اس نوجوان کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اور اس کا یہ تھپڑ مارنا ہی غضب ہو گیا۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک شریف آدمی نے تو تھپڑ رسیدہ نوجوان کو پکڑ کر اس کی پٹائی شروع کر دی جبکہ اس کے دوسرے دونوں ساتھی موقع سے فائدہ اٹھ کر بھاگ گئے تھے۔ دو تین اور آدمی بھی تھپڑ رسیدہ نوجوان کی پٹائی کرنے لگے تھے جیسے کسی کار خیر میں جھوٹا حصہ لینے کی کوشش کر رہے ہوں۔

نائلہ کی اوڑھنی ابھی تک اسی نوجوان کے ہاتھ میں تھی جو پٹ رہا تھا۔ نائلہ نے بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ سے اوڑھنی پھینچی اور اسے اوڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس بات کا اندازہ نہیں کر سکی تھی کہ جہوم میں کھڑا ہوا ایک آدمی بڑی گہری نظروں سے نائلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اس بد معاش کو تھپڑ مار کر تو نے بہت اچھا کیا لاڈ۔ یہ شہروالے تو ایسے ہی ہو رہے ہیں۔ چل اب آگے چل۔“ روشن نائلہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کھینچنے لگی۔

وہ آدمی بھی ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ مگر نائلہ نے شاید اس کی پرواہ نہیں کی۔ کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر کے مرد اس طرح عورتوں اور خاص طور پر خانہ بدوش عورتوں کے پیچھے مارے مارے چلتے ہی رہتے ہیں۔ نائلہ کا تعاقب کرنے والا یہ وہی شخص تھا جس نے کئی روز پہلے تانے پر محنت کے عوض نائلہ کا تعاقب کیا تھا اور اس نے نائلہ کے بارے میں شبیر درانی کو اپنے شے سے آگاہ کر دیا تھا۔ شبیر نے نائلہ کی نگرانی کی ہدایت کی تھی۔ لیکن دوسرے روز ناکت کا شوہر نائلہ کے بارے میں اعلان کیا۔ شبیر درانی کے پاس رحیم یار خان پہنچ گیا تھا۔

اس شخص کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ نائلہ درانی، شبیر کے ہاتھ لگ گئی تھی مگر اس نے نہر میں چلا گیا کہ دی تھی۔ اس وقت شبیر درانی کے دونوں گن مین نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دور تک نائلہ کو تلاش کرتے رہے تھے۔ مگر رات کی تاریکی میں نائلہ کا پتہ نہیں چلا تھا۔

صبح سویرے شبیر درانی کے کچھ آدمی نہر پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے نہر کے دونوں کناروں پر تقریباً پانچ میل تک دیکھ ڈالا تھا مگر نائلہ انہیں نہیں ملی تھی۔ اس علاقے میں آس پاس کی بستیوں سے بھی معلومات حاصل کی گئی تھیں مگر نائلہ کا سراغ نہیں ملا تھا اور وہ یہی سمجھے تھے کہ نائلہ نہر میں ڈوب کر مر گئی ہوگی اور تیز لہریں اس کی لاش کو بہا کر کہیں بہت دور لے گئی ہوں گی۔ نہر کے کنارے نائلہ کی تلاش میں ظہور نامی یہ آدمی بھی شامل تھا۔ وہ بھی یہی سمجھا تھا کہ نائلہ درانی نہر میں ڈوب کر مر گئی ہوگی۔ مگر اب وہ اس حسین و جمیل خانہ بدوش لڑکی کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا تھا۔ اس نے نائلہ کی شکل اچھی طرح دیکھی تھی اور اسے سو فیصد یقین تھا کہ یہ نائلہ درانی ہی تھی۔

ظہور اور اس کے ساتھیوں نے جب شبیر درانی کو یہ اطلاع دی تھی کہ انہوں نے کئی میل تک کا علاقہ دیکھ ڈالا مگر نائلہ کی لاش بھی نہیں ملی تو شبیر درانی نے کہا تھا کہ نائلہ اس قدر آسانی سے مرنے والی نہیں ہے۔ اس کی تلاش جاری رکھی جائے۔ اور اب شبیر درانی کا خیال درست نکلا تھا۔ نائلہ درانی واقعی آسانی سے مرنے والی نہیں تھی۔

اور اب نائلہ درانی کو دیکھ کر ظہور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ممکن ہے نائلہ پانی کی لہروں میں بہتی ہوئی بہت دور نکل گئی ہوگی اور کسی طرح نہر کے کنارے پر ان خانہ بدوشوں کے ہاتھ لگ گئی ہوگی جنہوں نے اسے بچا لیا تھا۔ لیکن نائلہ کو شہر میں دیکھ کر بھی ظہور کو حیرت ہوئی تھی حالانکہ نائلہ کو معلوم تھا کہ اسے چپے چپے تلاش کیا جا رہا ہے۔ اسے تو دور چلے جانا چاہئے تھا۔ ظہور کے خیال میں نائلہ درانی نے شہر آکر بہت بڑی غلطی کی تھی۔

نائلہ اور روشن وغیرہ ایک چھوٹے سے میدان میں بنی ہوئی جگہوں میں داخل ہو گئیں۔ یہ ایک رفاہی ادارے کا پلاٹ تھا جو عرصہ سے خالی پڑا تھا اور پچھلے ایک سال سے خانہ بدوشوں نے یہاں ڈیرے جما رکھے تھے۔

ظہور انہیں جگہوں میں داخل ہوتے دیکھ کر رکا نہیں تھا۔ وہ سیدھا بازار کی طرف چلا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایک مکان میں گھس گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ فون پر رحیم یار خان میں شبیر درانی کو نائلہ کے بارے میں اطلاع دے رہا تھا اور نائلہ درانی اس خوفناک صورت حال سے بے خبر جھوپڑیوں میں روشن کی رشتہ دار خواتین سے مل رہی تھی۔

...●...●...●...

شبیر درانی بری طرح تملایا ہوا تھا۔ وہ دو دن خانپور میں رہا تھا۔ جب اس کے آدمیوں نے یہ اطلاع دی کہ انہوں نے نہر کے آس پاس دور دور کا علاقہ دیکھ ڈالا ہے لیکن نائلہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ممکن ہے نائلہ نہر میں ڈوب کر مر گئی ہو اور پانی کی لہریں اسے بہا کر بہت دور لے گئی ہوں۔ لیکن شبیر درانی کو نائلہ کی موت کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے برعکس اسے یہ یقین تھا کہ نائلہ بچ گئی ہے۔ وہ زندہ ہے اور کہیں پناہ لئے ہوئے ہے۔ وہ خانپور میں اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش جاری رکھنے کی ہدایت دے کر رحیم یار خان چلا

آیا تھا۔

دس بارہ دن گزر گئے۔ اسے اپنے آدمیوں سے وقتاً فوقتاً یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ نائلہ کی تلاش جاری ہے اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اس روز دوسرے کا کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے رحیم یار خان والے مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا انسپکٹر اعظم سے باتیں کر رہا تھا۔ انسپکٹر اعظم کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کسی معاملے میں پھنس گیا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی اور شبیر درانی نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

”شبیر درانی بول رہا ہوں۔ تم کون ہو بابا؟“ اس نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ اور پھر دوسری طرف سے جو کچھ بھی کہا گیا اسے سن کر شبیر درانی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ انسپکٹر اعظم نے بھی شبیر کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو نوٹ کر لیا تھا۔ مگر شبیر درانی نے بھی فوراً ہی چہرے کے تاثرات پر قابو پالیا اور وہ قدرے کرخت لمحے میں بولا۔

”فون کرنے سے پہلے ٹائم بھی دیکھ لیا کرو بابا۔ یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ اور ویسے بھی میرے پاس سمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہارا باپ بیمار ہے تو میں کیا کروں بابا... اچھا اچھا... ایک گھنٹے بعد فون کرنا۔ میں کچھ کر دوں گا۔“ اس نے غصے کا اظہار کر کے ریسیور ہنچ دیا اور انسپکٹر اعظم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بھی قارون کی طرح بہت خزانوں کا مالک ہوں۔ جس کو دیکھو جھولی پھیلائے چلا آتا ہے یا وقت بے وقت لوگ ٹیلی فون کرتے رہتے ہیں۔ مگر کیا کروں انسپکٹر! کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ انہی لوگوں کی دعاؤں کے سہارے تو یہ سب کچھ ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے ڈرائنگ روم میں ادھر ادھر دیکھا۔

انسپکٹر اعظم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شبیر درانی جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ فون کال کسی سائل کی نہیں تھی۔ مالی امداد کا طالب کوئی شخص کسی رئیس کو اس طرح فون نہیں کرتا۔ وہ تو خود روزانے پر آکر گڑگڑاتا ہے۔ یقیناً یہ فون کال شبیر درانی کے کسی اپنے آدمی کی تھی جس نے اسے کوئی اہم اطلاع دی تھی جسے سن کر شبیر کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی مگر اس کی موجودگی کی وجہ سے شبیر درانی نے بات کو دوسرا رخ دینے کی کوشش کی تھی۔ انسپکٹر اعظم کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال ابھرا کہ یہ اطلاع یقیناً نائلہ درانی کے بارے میں ہوگی مگر اس کے پاس اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا تا آنکہ شبیر درانی خود نہ بتائے۔

”ہاں انسپکٹر! بے تاؤ کیا معاملہ ہے؟“ شبیر درانی انسپکٹر اعظم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”معاملہ بہت سنگین ہے درانی صاحب!“ انسپکٹر اعظم نے کہا۔ ”کسی نے ایس بی صاحب کو گمنام خط لکھا ہے کہ نائلہ درانی پر جس شخص کے قتل کا کیس بنایا گیا ہے وہ جھوٹا ہے۔ اس شخص کو نائلہ نے نہیں پولیس نے قتل کیا ہے کیونکہ نائلہ درانی جب زخمی حالت میں سلطان زید ہسپتال سے فرار ہوئی تھی تو وہ شخص اس وقت پولیس کی کسٹنڈی میں تھا۔ نائلہ درانی سے اس شخص کا کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ تو شخص انسانیت کے ناطے نائلہ درانی کو زخمی حالت میں ہسپتال لے کر آیا تھا اور پولیس نے اسے محض اس لئے روک لیا تھا کہ نائلہ کے ہوش میں آنے کے بعد اس شخص کے بارے میں نائلہ کا بیان لیا جاسکے۔ لیکن پولیس نے کسی بڑے آدمی کے ساتھ مل کر کسی سازش کے تحت اس شخص کو قتل کر کے اس کا الزام نائلہ درانی پر عائد کر دیا۔ گمنام خط لکھنے والے نے یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس معاملے

کی تحقیقات شروع نہ کی گئی تو وہ پریس کو بھی خطوط لکھے گا۔  
 ”تو اس میں تمہارے لئے ڈرنے کی کیا بات ہے انسپکٹر۔“ شیردرانی نے پوچھا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ  
 کسی گناہ خط پر کوئی کارروائی ہو سکتی ہے۔“  
 ”معاملہ سنگین ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔“ انسپکٹر اعظم نے جواب دیا۔ ”بلکہ کارروائی شروع ہو چکی ہے۔  
 ایس پی صاحب نے اس خط کے حوالے سے مجھ سے وضاحت طلب کر لی ہے۔“

”تو وضاحت پیش کر دو۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”تمہارے ریکارڈ میں اس شخص کا یہ بیان تو موجود ہے  
 کہ اسے نالہ درانی نے گولی ماری تھی۔ کیا قانون کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بیان کافی نہیں۔ اور پھر اگر  
 نالہ بے گناہ ہوئی تو اسے زخمی حالت میں ہسپتال سے بھاگنے اور روپوش ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اور  
 جب اس کی گرفتاری کے بعد ریمانڈ کے لئے عدالت میں پیش کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا تو نالہ درانی  
 کے آدمیوں نے پولیس کی گاڑی پر حملہ کر کے اسے چھڑوا لیا۔ یہ سب کچھ ریکارڈ پر موجود ہے۔ تمہیں ڈرنے  
 کی کیا ضرورت ہے۔“

”مجھ سے وضاحت طلب کرنے کے علاوہ ایس پی صاحب نے ڈی ایس پی صاحب کو بھی اس کیس کا  
 جائزہ لینے کی ہدایت کر دی ہے۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب تحقیقات اتنی اوپر کی سطح پر شروع ہو جائے گی  
 تو آپ کا نام بھی ضرور آئے گا۔“ انسپکٹر اعظم نے کہا۔

انسپکٹر اعظم کی اس بات پر شیردرانی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ واحد شخص تھا جو اس سازش سے  
 آگاہ تھا۔ شیردرانی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا نام لینے سے انسپکٹر اعظم خود بھی پھنس سکتا تھا۔ لیکن وہ  
 پولیس آفیسر تھا۔ اس کے پاس اختیارات تھے۔ وہ اس کیس کو کوئی بھی رنگ دے سکتا تھا۔ وہ انسپکٹر اعظم کی  
 فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب وہ بھنے گا تو شیردرانی کو بھی اپنے ساتھ تھپیٹ لے گا۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے انسپکٹر۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”تم جاؤ، اطمینان سے اپنا  
 کام کرتے رہو۔ کچھ نہیں ہو گا۔ میں آج ہی شام کو ایس پی سے ملوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ معاملے کو یہیں  
 ختم کر دے گا۔ کوئی تحقیقات نہیں ہو گی۔“

”سوچ لیں درانی صاحب۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔“ انسپکٹر اعظم بولا۔

”ارے بابا تم کیوں گھبراتے ہو۔ کچھ نہیں ہو گا۔“ شیردرانی کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اس  
 بات کا اشارہ تھا کہ ملاقات ختم۔

انسپکٹر اعظم بھی اٹھ گیا۔ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر شیردرانی اس سے مصافحہ کرنے کی  
 بجائے ہاتھ ہلاتا ہوا اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ انسپکٹر اعظم چند لمحے وہاں کھڑا عجیب سی نگاہوں سے  
 شیردرانی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔  
 پانچ منٹ بعد شیردرانی دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اس نے ملازم کو آواز دی۔ وہ فوراً ہی حاضر  
 ہو گیا۔

”موجمدار کہاں ہے۔ بلاؤ اسے۔“ شیردرانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی سرکار۔“ ملازم کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد موجمدار کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک لمبا ترنکا آدی تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں  
 نے اس کے چہرے کو بے حد خوفناک بنا دیا تھا۔ کندھے پر آٹومیک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔

”جی سرکار! وہ دروازے سے دو قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔  
 ”ابھی انسپکٹر اعظم یہاں سے گیا ہے۔ وہ سادہ لباس میں ہے۔“ شبیر بولا۔

”جی سرکار، میں نے اسے دیکھا تھا۔“ موجد ار بولا۔  
 ”یہ انسپکٹر ہمارے لئے خطرناک بن گیا ہے۔ ہمارے کلکوں پر پلنے والے بھیل قوم کے اس جیسے بچ  
 لوگ بھی ہمارے راستے میں دیواریں بن کر کھڑے ہونے لگیں تو تم لوگوں کی موجودگی کا کیا فائدہ بابا؟“ شبیر  
 درانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ گیا سرکار۔“ موجد ار نے جواب دیا۔ ”ایک دو دن میں اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“  
 ”ایک دو دن نہیں۔ یہ تو بڑی لمبی مدت ہے۔ آج شام سے پہلے پہلے اس کا کام ہو جانا چاہئے۔“ شبیر  
 درانی نے کہا۔

”ہو جائے گا سرکار۔ کوئی اور حکم؟“ موجد ار بولا۔  
 ”بس، یہی کہنا تھا اب تم جاؤ۔“ شبیر درانی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔  
 موجد ار باہر چلا گیا۔ شبیر درانی صوفے پر نیم دراز ہو کر خانپور سے ظہور کی کال کا انتظار کرنے لگا۔  
 انسپکٹر اعظم کی موجودگی میں جو کال آئی تھی وہ ظہور کی تھی اور شبیر درانی نے بات بدلتے ہوئے ایک گھنٹہ بعد  
 کال کرنے کو کہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ظہور ایک گھنٹے سے پہلے کال نہیں کرے گا۔ اس ایک گھنٹے کا وقت پورا  
 ہونے میں ابھی سات منٹ باقی تھے۔ اور پھر ٹھیک ایک گھنٹہ بعد فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ایک لمحہ ضائع کئے  
 بغیر ریپور اٹھالیا۔

”بس، شبیر درانی بول رہا ہوں۔“  
 ”ظہور بات کر رہا ہوں سرکار۔“ ریپور پر آواز سنائی دی۔  
 ”ہاں بولو، کیا بات ہے۔ ناکہ کہاں ہے۔ وہ زندہ کیسے بچ گئی اور اتنے دن کہاں غائب رہی؟“ شبیر  
 درانی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔  
 ”یہ تو معلوم نہیں کہ وہ زندہ کیسے بچی اور اتنے روز کہاں غائب رہی۔ لیکن اس وقت وہ خانپور شہر میں  
 موجود ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے میں نے اسے چند خانہ بدوش عورتوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ خانہ  
 بدوشوں کی جھکیوں میں موجود ہے۔“ ظہور نے جواب دیا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ناکہ ہی ہے؟“ شبیر نے پوچھا۔  
 ”جی سرکار، میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔“ ظہور نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ تم اس کی نگرانی جاری رکھو۔ قریب جانے کی ضرورت نہیں اسے کسی طرح شبہ نہیں  
 ہونا چاہئے۔ میں یہاں ایک ضروری کام میں پھنسا ہوا ہوں۔ رات کو خانپور پہنچ جاؤں گا۔ تم کسی اور کو بھی  
 اپنے ساتھ ملا لو تاکہ نگرانی میں آسانی رہے۔“  
 ”جی سرکار۔“ ظہور نے جواب دیا۔

شبیر درانی نے ایک بار پھر اسے محتاط رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے فون بند کر دیا اور اپنے کمرے میں  
 آکر بستر لیٹ گیا۔ وہ آج کچھ تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ بستر پر لیٹنے ہی اوجھلنے لگا۔  
 شام کو تقریباً چھ بجے ملازم نے اسے جگایا۔  
 ”کیا بات ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”موجمدار آیا ہے سرکار، کتا ہے بہت ضروری بات کہنی ہے۔“ ملازم نے کہا۔

”ٹھیک ہے، اس سے کہو میں آ رہا ہوں۔“ شیردرانی کتا ہوا ہاتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارنے سے ذہن پر طاری نیند کا خمار چھٹ گیا۔ وہ تولیے سے منہ پونچھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو موجمدار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ رائفل حسب معمول اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

”کیا رہا؟“ شیردرانی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کام ہو گیا سرکار۔“ موجمدار نے جواب دیا۔

”تفصیل بتاؤ۔“ شیردرانی نے پوچھا۔

”وہ یہاں سے سیدھا اپنے گھر گیا تھا۔ اب سے ایک گھنٹہ پہلے وہ وردی پن کر گھر سے نکلا تو خونخوار بھیڑیوں نے اسے چیر پھاڑ ڈالا۔ خونی بھیڑیے چاروں طرف سے اس پر جھٹ پڑے تھے۔“ موجمدار نے بتایا۔

”کسی کو شبہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں سرکار۔“ موجمدار مسکرایا۔ ”وہ خونی بھیڑیے جنگل سے آئے تھے اپنے شکار کی چیر پھاڑ کر کے واپس جنگل کو چلے گئے۔“

”ٹھیک ہے، تم باہر بیٹھو۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد خانپور جانے والا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔“ شیردرانی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

”جی سرکار۔“ موجمدار باہر نکل گیا۔

شیردرانی دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے راتے کا ایک کانٹا نکل گیا تھا۔ یہ بھی اچھای ہوا تھا کہ انسپکٹر اعظم نے اسے ایس بی کے نام اس گناہ خط اور تحقیقات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ورنہ وہ اندھیرے ہی میں رہتا اور قانون کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتے۔ انسپکٹر اعظم واحد شخص تھا جو ناکلہ کے خلاف اس سازش سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ناکلہ بے گناہ ہے اور شیردرانی نے اس سے شادی کرنے اور اس کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے یہ سازش تیار کی تھی اور اس سازش میں اس کی ماں حینہ بیگم اور ماموں عبدالرحمن شیردرانی بھی شامل تھے۔ لیکن سازش کا واحد گواہ ختم ہو گیا تھا اور شیردرانی کو اس طرف سے اب کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اگر کوئی خطرہ تھا تو ناکلہ کی طرف سے۔ اور اسی لئے وہ ہر قیمت پر اسے اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتا تھا۔

شیردرانی رات دس بجے کے قریب خانپور پہنچ گیا۔ وہ سیدھا ظہور کے مکان پر پہنچا تھا۔ ظہور گھر پر ہی تھا۔ اب وہ اسے ناکلہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

”وہاں کون ہے۔“ شیردرانی نے پوچھا۔

”میرا ایک بھروسے کا آدمی ہے سرکار، وہ جھوٹوں کی نگرانی کر رہا ہے۔“ ظہور نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، ہم آدھی رات کے بعد چلیں گے۔“ شیردرانی نے کہا اور ظہور اندر جا کر اپنی بیوی سے

کہہ کر ان کے لئے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے لگا۔

گیارہ بجے ایک آدمی پہنچ گیا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جسے ظہور نے خانہ بدوشوں کے جھوٹوں کی نگرانی پر مقرر کر رکھا تھا۔

”خانہ بدوشوں کی چار عورتیں اور ایک آدمی تانگے پر سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن کی طرف گئے ہیں۔“

اس آدمی نے بتایا۔  
شیردرانی یہ اطلاع ملتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ  
نانکھ خانپور سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ جیب پر سوار تھا  
اور جیب تیز رفتاری سے ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑ رہی تھی۔

...●...●...●...

نانکھ درانی کو یقین تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کے ان جموں پڑوں میں بالکل محفوظ تھی لیکن وہ یہاں رہ نہیں  
سکتی تھی۔ اس لئے اس نے آج ہی رات خانپور سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس نے روشن کو بھی اپنے اس  
فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ شاہو نے اسے لاہور جانے والی ٹریوں کے بارے میں بتایا تھا۔ نانکھ نے اسی ٹرین کا  
انتخاب کیا تھا جو آدمی رات کے لگ بھگ روانہ ہوتی تھی۔  
منع کرنے کے باوجود روشن نے راستے کے لئے اسے پراٹھے بنا دیئے تھے اور ساتھ میں آم کا آچار

بھی رکھ دیا تھا۔

پونے گیارہ بجے کے قریب شاہو نانکھ لے آیا۔ اور روشن وغیرہ بھی اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کے لئے  
اس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گئیں۔ اسٹیشن کے سامنے تانگے سے اترتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے اسٹیشن کی  
عمارت میں داخل ہو گئیں۔ ٹرین آچکی تھی۔ نانکھ نے لاہور کا ٹکٹ خریدنے کی بجائے سب کے لئے پلیٹ  
فارم ٹکٹ خرید لئے اور گیٹ سے داخل ہو کر پلیٹ فارم پر آگئیں۔ نانکھ کا خیال تھا کہ لاہور کا ٹکٹ  
خریدنے میں دیر لگے گی۔ اس لئے اس نے صرف پلیٹ فارم ٹکٹ خریدے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ لاہور  
کا ٹکٹ راستے میں ایس ٹی سے بزا لے گی۔

پلیٹ فارم پر رش تھا۔ وہ زنانہ کپار ٹنٹ کی تلاش میں ٹرین کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسی لمحہ  
انجن کے دسل کی آواز گونجی۔ وہ ایک زنانہ کپار ٹنٹ کے سامنے رک گئیں۔

نانکھ درانی، روشن وغیرہ سے گلے ملی۔ ٹھیک اسی لمحہ گارڈ کے دسل کی آواز سنائی دی۔ نانکھ بوگی کے  
دروازے کی طرف مڑی۔ لیکن دروازے کے سامنے پلیٹ فارم پر ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ آدمی اس کا راستہ  
روکے ہوئے تھا۔ نانکھ درانی نے سر اٹھا کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے سینے میں اپنا دل ڈبوتا ہوا محسوس  
ہوئے لگا۔

وہ شیردرانی تھا جس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔

نانکھ درانی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اسے سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شیردرانی کسی  
چٹان کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹرین حرکت میں آچکی تھی اور نانکھ، شیردرانی کی طرف دیکھ رہی تھی  
جس کے چہرے پر خباثت اور شیطنت رقص کرتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی چل پڑی ری لاؤڈ... تو بیٹھتی کیوں نہیں؟“ روشن کہتے ہوئے جلدی سے آگے بڑھی لیکن شیر  
درانی کے ایک گن مین نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے روک لیا۔ روشن نے گھوم کر اس شخص کی  
طرف دیکھا پہلے تو وہ سمجھی تھی کہ اسے جیو دیا رقیہ نے روکا ہو گا لیکن اپنا بازو ایک اجنبی آدمی کی گرفت میں  
دیکھا تو اس کا داغ گھوم گیا۔ داغ کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی گھوما تھا۔ روشن کا ہاتھ یقیناً ”چھڑکی صورت



میں اس شخص کے منہ پر پڑا مگر اس شخص نے بڑی پھرتی سے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔  
 ”چھوڑ رے مجھے۔ بدامی دکھاوے ہے۔ میں تیرا کھون پی جاؤں گی۔ کیا سمجھے ہے اپنے آپ کو؟“  
 روشن ملی کی طرح غرائی۔

”چمکی کھڑی رہ اپنی جگہ پر ورنہ بازو توڑ دوں گا تمہارا۔“ وہ شخص بھی غرایا۔

رقیہ اور جیرو وغیرہ یہ صورت حال دیکھ کر اس شخص پر ہل پڑیں۔

ٹرین سامنے سے گزر رہی تھی اس کی رفتار میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ نائلہ درانی ٹرین کے مسافروں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی جو کھڑکیوں سے باہر جھانکتے ہوئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کچھ لوگ ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے ٹرین پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ٹرین کی آخری بوکی بھی گزر گئی۔ اس کے پیچھے لگی ہوئی سرخ بتی لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ ریلوے لائن خالی ہو گئی نائلہ عجیب سی نگاہوں سے دور ہوتی ہوئی ٹرین کی سرخ بتی کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑو۔۔۔ اس وقت کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔“ شبیر درانی نے نائلہ کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

نائلہ درانی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کون ہے اور شبیر درانی اسے اغواء کرنا چاہتا ہے لیکن اس طرح معاملہ بننے کی بجائے بگڑ جاتا۔ شبیر درانی سے تو وہ بچ جاتی لیکن پولیس کی گرفت میں چلی جاتی کیونکہ وہ پولیس کو اس وقت سب سے زیادہ مطلوب تھی۔ اس پر تین پولیس والوں سمیت کئی افراد کے قتل کا الزام تھا۔ وہ پولیس کی حراست سے بھاگی ہوئی تھی حالانکہ وہ پولیس کی حراست سے نہیں بھاگی تھی لیکن اس پر یہ الزام تو بہر حال تھا کہ اس کے آدمیوں نے پولیس کی گاڑی پر حملہ کر کے اسے چھڑایا تھا۔ وہ عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کر سکتی تھی لیکن اس کے لیے ایک طویل مدت درکار تھی۔ عدالتی نظام سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ کوئی کیس خواہ کتنا ہی معمولی سا کیوں نہ ہو اس کا فیصلہ ہونے میں کئی کئی سال لگ جاتے تھے اور پھر نائلہ پر تو کئی افراد کے قتل کا الزام تھا۔ اس کی پوری زندگی عدالتی کارروائی میں گزر جاتی۔ سنگین الزامات کے باعث اس کی ضمانت بھی شاید نہ ہو پاتی اور اس کی ساری زندگی جیل ہی میں تمام ہو جاتی۔ پولیس کے ہاتھ لگنے سے بہتر تھا کہ وہ شبیر درانی کے ساتھ چلی جائے۔ اس کی قید میں رہ کر وہ ایک بار پھر فرار کا کوئی نہ کوئی چانس بنا سکتی تھی۔

نائلہ درانی نے روشن کی طرف دیکھا۔ روشن اور اس کی تینوں ساتھی عورتیں شبیر درانی کے اس آدمی کی پٹائی کر رہی تھیں جس نے روشن کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ ظہور تھا جس نے شبیر کو خانپور میں نائلہ کی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

شبیر درانی نے اپنے دوسرے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ بھی شبیر کے ساتھ چل پڑے۔ چادر اوڑھے ہوئے ایک گن مین نائلہ کے ساتھ ہویا۔ شبیر دوسرے آدمی کو لے کر الگ ہٹ گیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص اسے ایک بنجارن کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لے کیونکہ نائلہ نے اس وقت بنجاروں والا لباس ہی پہنا ہوا تھا۔ بانسوں میں اوپر تک پلاسٹک کی سفید اور کالی پیلی چوڑیاں بھی تھیں اور اس نے اوڑھنی کا گھونگٹ سا نکال رکھا تھا جس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔

گن مین نائلہ کو لے کر باہر آگیا۔ شبیر درانی اس کے دو منٹ بعد گیٹ سے نکلا تھا۔ وہ علاقے کا ایک مشہور و معروف آدمی تھا۔ یوں تو بہت سے لوگ اسے پہچانتے تھے لیکن گیٹ سے نکلتے ہی اس کا ایک واقعہ

دی مل گیا۔ اس سے علیک سلیک کرنے میں شبیر درانی کو تھوڑی دیر وہاں رکنا پڑا۔ جب وہ جیب کے پاس بچا تو دوسرا گن مین نالہ کے ساتھ جیب پر بیٹھا ہوا تھا۔ شبیر درانی کے ساتھ آنے والا گن مین بھی پیچھے بیٹھ گیا اور شبیر نے اشیہ رنگ سنبھال لیا، انجن اسٹارٹ کرتے ہی اس نے جیب کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ ریلوے پلیٹ فارم پر ابھی تک جوم لگا ہوا تھا۔ لوگ بڑی دلچسپی سے بخارنوں کے ہاتھوں ایک آدمی کے بیٹے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ظہور کی قیص پھٹ گئی تھی۔ بال بھر گئے تھے۔ گردن اور چہرے پر کچھ نراشیں بھی آگئی تھیں جو روشن اور اس کی ساتھیوں کے ناخنوں کا کمال تھا۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے دلوں میں سے کسی نے مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔ ظہور اب جج جی کر معافی مانگ رہا تھا۔

”ارے بابا مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے تمہیں اپنے فیملے کی عورت سمجھ کر تمہارا ہتھ پکڑا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ میری بہن۔۔۔ میری ماں۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔“

”اب ماں اور بہن بناوے ہے۔“ روشن نے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دیتے ہوئے کہا۔ ”جب میری باہن پکڑی تھی تو اس وقت تو تیری جوانی جوش مارے تھی۔ میں تنے چھوڑوں گی نہیں۔ تیرا منہ کالا کر کے باجاریں لے چلوں گی۔“

اسی دوران ریلوے پولیس کا ایک کانٹیلبل وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جو ”بابا“ کسی درخت کی شاخ سے کاٹ کر بنائی گئی تھی۔

”اوئے کیا بات ہے، کیا ہنگامہ چار کھا ہے؟“ اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

”اس منچلے نے ان بخارنوں کو چھیڑا تھا۔ اب بھگت رہا ہے۔“ مجمع میں سے ایک آدمی نے کہا۔

”اے۔۔۔ چھوڑ دو اسے۔“ کانٹیلبل نے روشن کو مخاطب کرتے ہوئے تھکمانہ لہجے میں کہا۔

”تو بچ میں نہ آسنتری۔“ روشن بولی۔ ”اس حرام کے بنے کو تو میں ایسی سزا دوں گی کہ جندگی بھریاد کھے گا۔ پوری حیاتی میں کسی عورت کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔“

”دیکھو۔۔۔ قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کرنا۔۔۔“

”ارے میں جانوں ہوں تیرا قانون شنون۔“ روشن نے کانٹیلبل کی بات کاٹ دی اور ظہور کے بالوں کو بے سے بھی زیادہ زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ رقیہ اور جیرو وغیرہ ظہور کو چھوڑ کر الگ ہٹ چکی تھیں۔

”میں کہتا ہوں چھوڑو اسے ورنہ تمہی کو لے جا کر بند کر دوں گا۔“ پولیس والے نے دھمکی دی اور گے بڑھ کر ظہور کو اس کی گرفت سے چمڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ جس میں اسے بڑی مشکل سے کامیابی ہوئی تھی۔

ظہور کا حلیہ بگڑ چکا تھا لیکن اس نے حق نمک ادا کر دیا تھا اور اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ ان بخارنوں کی توجہ نالہ اور شبیر درانی سے ہٹانا چاہتا تھا تاکہ شبیر درانی نالہ کو لے کر اطمینان سے وہاں سے نکل سکے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ نالہ، شبیر درانی اور اس کے گن میتوں کا دور دور تک نشان نظر نہیں رہا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

”معافی مانگ اوئے ان عورتوں سے۔ ورنہ تمہانے لے جا کر بند کر دوں گا۔“ پولیس والے نے ظہور کو

بلکی سی چھڑی ماری۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں تو پہلے ہی معافی مانگ رہا تھا۔“ ظہور نے کہا پھر روشن کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”مجھے معاف کر دو میری ماں، میری بہن، مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔“

”ارے جاماف کیا تجھے پر آگے کو خیال رکھنا۔ کسی لگائی کو مت چھیڑنا۔“ روشن نے کہا۔  
 ”چل بھاگ جا اب۔ منہ کیا دیکھ رہا ہے۔“ کانٹیل نے ظہور کو ڈانٹ دیا۔

ظہور ان خونخوار قسم کی بخارنوں سے نجات ملتے ہی وہاں سے بھاگ نکلا۔ روشن اور جیرو وغیرہ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پلیٹ فارم پر اکا دکا لوگ ہی رہ گئے تھے۔

”اوجیرو۔“ روشن، جیرو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ اپنی لاڈو کہاں گئی۔ مجھے تو ٹیشن پر کہیں نہ دے۔“

”خبر تو مجھے بھی نہیں آوے۔ میرا خیال ہے وہ گاڑی پر چڑھ گئی تھی۔“ جیرو نے کہا۔

”اللہ کرے چڑھ گئی ہو اور کھیریت سے اپنے گھر چلی جائے۔ پر وہ بندہ کون تھا جس نے اس کا راستہ روکا تھا۔“ روشن نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کیا جانوں کون تھا وہ؟“ جیرو نے جواب دیا۔

”اور یہ ساہو کہاں گھیب ہو گیا۔ ایسا نامرد منے کبھی نہیں دیکھا جو لڑائی کھترے کے وقت چھپ جاوے۔“ روشن بولی۔

”ارے تو اسے نامرد کہے ہے، تو تیرے بچے کہاں سے آگئے؟“ جیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بکو اس بند کر ری۔ چل اب چلیں، کھد ہی آجاوے گا ساہو۔“ روشن نے کہا۔

وہ تینوں گیٹ سے نکل کر باہر آگئیں۔ شاہو نانگہ اسٹینڈ کے قریب کھڑا ایک نانگے والے کے ساتھ چرس بھرے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ چرس کی بو محسوس کرتے ہی روشن نے شاہو کو بے نقط سا ڈالیں۔ شاہو کے چرس پینے پر ان میں پہلے بھی کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا۔

”مت پیا کر رہے چرس۔“ کسی دن مراوے گا۔“ روشن آخر میں بیٹھ ہی جملہ دوہرایا کرتی تھی۔

وہ اسی نانگے میں بیٹھ کر اپنی جیکبوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ظہور تقریباً ”چالیس منٹ کی تاخیر سے اپنے گھر پہنچا تھا۔ شیردرانی وغیرہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ وہ بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے اور نانگہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ صورت حال نہایت سنجیدہ ہونے کے باوجود ظہور کا گہر ہوا حلیہ دیکھ کر ان سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

”میں تو سمجھا تھا کہ وہ بخار نہیں تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گی۔ وہ لمبی والی تو بڑی خونخوار نظر آ رہی تھی۔“ شیردرانی مسکراتے ہوئے بولا۔

”انہوں نے کسر تو نہیں چھوڑی تھی۔ اگر پولیس والا نہ آجاتا تو کم بخت ہیرا بہت برا حشر کرتیں،“ بنخوں نے ایسی مار لگائی ہے کہ پورا جسم دکھ رہا ہے۔“ ظہور نے کہا۔

”ویسے تم نے کام خوب دکھایا۔“ شیردرانی مسکرایا پھر بولا۔ ”چھا اب اسے اندر لے جاؤ۔“ اس نے نانگہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اپنی بیوی سے کہو اس کے یہ کپڑے اتروا کر اپنا کوئی جوڑا پہنا دے۔ سارے چوڑیاں اور یہ گینے بھی اتروا دینا اور خیال رکھنا یہ غچہ دے کر پچھلی طرف سے نکل نہ جائے۔“

”اب نہیں بھاگے گی۔“ ظہور نے کہا۔ ”اسے پتہ چل گیا ہے کہ ہم لوگوں سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔“

ظہور، نانگہ، درانی کو لے کر بیٹھک کے اندر رونی دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کی بیوی جاگ رہی تھی۔ ظاہر ہے شیردرانی کے گھر میں ہوتے ہوئے اسے نیند کیسے آ سکتی تھی۔ ظہور اپنی بیوی کو نانگہ کے بارے میں

ہدایات دے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور اپنا حلیہ درست کرنے لگا۔  
 نائلہ درانی آدھے گھنٹے بعد بیٹھک میں واپس آئی تو اس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ شبیر درانی اسے دیکھتے ہی  
 اٹھ گیا اور اپنے گمن مینوں کو بھی اشارہ کر دیا، وہ لوگ بیٹھک سے نکل کر گلی میں آگئے۔ سامنے ہی جیب  
 کھڑی تھی۔

”چلو بیٹھو۔“ شبیر درانی نے نائلہ کو جیب کی اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”میں تمہیں آخری بار  
 وارننگ دے رہا ہوں۔ اگر اس مرتبہ تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دی جاؤ گی۔“  
 نائلہ درانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شبیر درانی نے اسٹیئرنگ  
 سنبھال لیا اور اس کے گمن مین پیچھے بیٹھ گئے۔ جب وہ روانہ ہوئے تو رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔  
 خانپور شہر سے نکلتے ہی شبیر درانی نے جیب کی رفتار بڑھا دی۔ نائلہ نے سردی سے ہنپتے کے لیے گرم  
 چادر کو اپنے جسم پر اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ جیب طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

رجیم یار خان سے بہت پہلے شبیر درانی نے جیب بائیں طرف جانے والی ایک سڑک پر موڑ دی۔ وہ رجیم  
 یار خان شہر کی حدود میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہ سڑک چھوٹی چھوٹی بستیوں کو ملاتی اور بڑے گھومتی ہوئی  
 رجیم یار خان شہر کے دوسری طرف اس چھوٹی سی بستی تک چلی گئی تھی جہاں سے ایک سڑک رجیم یار خان  
 شہر اور دوسری بھاگلہ کی طرف چلی گئی تھی۔ اس بستی سے نکل کر شبیر درانی نے جیب اس سڑک کی طرف  
 موڑ دی جو کچھ آگے جا کر تیراچی کی طرف جانے والی سڑک سے مل گئی تھی۔ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے  
 بعد جیب آدم صحابہ کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

آدم صحابہ نامی یہ قصبہ پیش نظر ہائی وے پر واقع تھا۔ اس سڑک پر چند میل آگے جانے کے بعد شبیر درانی  
 نے جیب کھیتوں میں ایک کچے راستے پر موڑ دی اور کچھ ہی دیر بعد وہ آدموں والے باغ کی اسی حویلی میں پہنچ  
 گئے جہاں سے کئی روز پہلے نائلہ درانی، مراد اور اس کے شوہر کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔  
 شبیر درانی، نائلہ کو حویلی میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ نائلہ درانی کو اسی کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ نائلہ  
 چارپائی پر گر کر اپنی تقدیر کو کونسنے لگی۔

صبح نائلہ کو کمرے سے نکالا گیا۔ دروازہ کھولنے والی نرس رضیہ تھی۔ رضیہ کا چہرہ ستا ہوا تھا اور  
 آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے صاف نظر آ رہے تھے۔

”اوہ! تو تمہیں پھر یہاں بلا لیا گیا ہے؟“ نائلہ نے اسے دیکھ کر برا سامنہ بنایا۔  
 ”میں گئی ہی کب تھی۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ اس کے لیے میں افسردگی تھی۔ ”لیکن مجھے تمہاری  
 واپسی کا افسوس ہوا ہے۔ کاش! تم دوبارہ ان درندوں کے ہاتھ نہ نہتیں۔ تم ٹھیک کتنی تھیں۔ تمہارا کزن  
 انسان نہیں واقعی درندہ ہے۔“  
 ”کیا مطلب!“ نائلہ نے اسے گھورا۔ اسے رضیہ کے اس بدلے ہوئے انداز پر بڑی شدید حیرت ہوئی  
 تھی۔

”آؤ... میں تمہیں دکھاؤں۔“ رضیہ اسے صحن میں لے آئی۔  
 نائلہ درانی برآمدے میں کھڑی اور ادھر دیکھنے لگی اور پھر اس کے جیسے ہوش اڑ گئے۔ اس کی نظریں  
 مویشیوں والے شیڈ کے نیچے لوہے کی سلاخوں والے اس بوے سے بچرے پر جم گئی تھیں جس میں بھی کتے  
 بند کیے جاتے تھے۔ لیکن اس وقت اس بچرے میں کتوں کی بجائے دو انسان بند تھے۔ ایک مرد اور ایک

عورت۔

نالکہ دوڑتی ہوئی بنجرے کے پاس پہنچ گئی اور بنجرے میں بند انسانوں کو دیکھنے لگی۔ وہ مراد اور اس کے شوہر تھا۔ دونوں بالکل برہنہ تھے اور سٹے ہوئے سر جھکائے بیٹھے تھے۔  
”مراد۔“ نالکہ نے ہولے سے آواز دی۔

مراد نے سر اٹھا کر نالکہ کی طرف دیکھا۔ نالکہ نے دونوں ہاتھوں سے بنجرے کی سلاخوں کو پکڑ رکھا تھا۔ مراد کا چہرہ دیکھ کر نالکہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ مراد کا شوہر سر جھکائے سگڑا سمٹا بیٹھا تھا۔  
”مجھے افسوس ہے مراد۔ میری وجہ سے....“

”نہیں نالکہ بی بی۔“ مراد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”افسوس تو مجھے ہو رہا ہے۔ تمہیں دوبارہ یہاں دیکھ کر یہ ذلت اور رسوائی تو ہم غریبوں کا مقدر ہے۔ تمہارے لیے اگر ہماری جان بھی چلی جاتی تو ہمیں پرواہ نہ ہوتی۔ ہم نے ساری زندگی شبیر درانی اور اس کے ماں باپ کی خدمت کی۔ ان کی خاطر بہت دکھ بھی اٹھائے۔ ہم نے دوسروں پر ظلم ہونے دیکھا مگر اپنی زبان بند رکھی۔ تم نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں اور ہم نے تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ہم دوسرے ہی دن پکڑے گئے۔ پکڑے جانے کے بعد بھی یہ بھی دعائیں مانگتے رہے کہ خدا تمہیں ان سے محفوظ رکھے۔ مگر سب کچھ بیکار گیا۔ تم پھر ان کے قبضے میں آ گئیں۔“

”ظالم کی رسی دراڑ ہوتی ہے مراد۔۔۔ لیکن ایک نہ ایک دن وہ قدرت کی گرفت میں ضرور آتا ہے۔ اس بھڑیے کو ان تمام مظالم کا حساب ضرور دینا ہوگا۔“ نالکہ نے کہتے ہوئے مراد اور اس کے شوہر کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے جھونپڑوں پر پتھروں اور کپڑے کوڑوں کے کاٹے کے بے شمار نشانات تھے۔  
نالکہ درانی کو پہلی مرتبہ جب یہاں لایا گیا تھا تو حقیقتاً ”وہ مراد کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ وہ بڑی عجم عورت تھی۔ بڑا رعب دار چہرہ تھا۔ لیکن اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ پتکے ہوئے رخسار اور اندر کو دھنسی ہوئی دیران سی آنکھیں۔“  
”انہیں کب سے اس بنجرے میں بند رکھا گیا ہے؟“ نالکہ نے رضیہ سے پوچھا۔ وہ بھی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”فرار کے تیسرے ہی روز انہیں پتو عاقل کے قریب ایک گاؤں سے پکڑ لیا گیا تھا۔ انہیں تین دن تک بھوکا پیاسا رکھ کر تشدد کے ذریعے تمہارے ارے میں پوچھا جاتا رہا مگر انہوں نے زبان نہیں کھولی۔ مراد کے جسم کے نازک ترین حصے پر سکتے ہوئے۔ سکرٹ سے داغا گیا تھا مگر اس خدا کی بندی کے لبوں پر تمہارا نام نہیں آیا۔ اس کے بعد سے انہیں برہنہ حالت میں اسی بنجرے میں اسی جگہ رکھا گیا ہے۔ انہیں کھانے کو بھی بچا کھچایا دیا جاتا ہے۔ رات کو شدت کی سردی اور دن کی دھوپ میں یہ بنجرہ بیس پڑا رہتا ہے۔“  
”اور گرن مین بابر کا کیا ہوا؟“ نالکہ نے پوچھا۔

”اسے بھی درخت سے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ اب وہ یہاں نہیں ہے اس کی جگہ ایک اور آدمی کو یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ وہ شکل ہی سے بے حد خوفناک لگتا ہے۔“ رضیہ نے بتایا۔  
”اور تم؟“ نالکہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہارا جرم معاف کر دیا گیا تھا حالانکہ تمہیں کبھی میری نگرانی کے لیے لایا گیا تھا۔“  
”میرے ساتھ جو کچھ ہوا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ رضیہ کہتی ہوئی برآمدے کی طرف

مڑ گئی۔ نائلہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ ”سب سے پہلے خود شبیر درانی نے میری عزت لوٹی اور اس کے بعد آج تک اس کے کارندے ہستی گناہیں ہاتھ دھو رہے ہیں۔ مجھ جیسی لاپچی اور دولت کی بھوک عورت کا یہی انجام ہونا چاہئے۔ میں نے تم پر ہونے والے ظلم میں ان لوگوں کا ساتھ دیا اور مجھے اس کی سزا مل گئی۔“

”اوہ! تو تم اسی لیے بدل گئی ہو۔“ نائلہ بولی۔

”جب میں شبیر درانی کی ہوس کا شکار ہوئی تھی تو میں نے اسی روز فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں ظلم میں ان کا مزید ساتھ نہیں دوں گی اور یہاں سے واپس جاتے ہی پولیس کو اطلاع دوں گی کہ انہوں نے نہیں اس خوبی میں قید کر رکھا ہے لیکن مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں بھی یہاں قیدی ہوں اور شبیر درانی کے کارندوں کے لیے کھلوانی ہوئی ہوں۔ میں ہر وقت یہی دعائیں مانگا کرتی تھی کہ تم ان کے ہاتھ نہ لگ سکو۔“

”شکر ہے، تمہیں احساس تو ہوا۔ ظالم اور مظلوم میں فرق تو محسوس کیا تم نے۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھ سے جو کچھ بھی بن پڑا تمہارے لیے کروں گی۔“ رضیہ نے کہا پھر بولی۔ ”تم کمرے میں چلو۔ میں ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔ یہ سارے کام بھی اب مجھے ہی کرنا پڑتے ہیں یہاں دو گن مین رہتے ہیں۔ دن میں تو وہ زیادہ تر باہر ہی رہتے ہیں لیکن رات کو ایک خوبی کے اندر آ جاتا ہے اور دور سرا باہر ہی رہتا ہے۔“

نائلہ دڑانی اپنے کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گئی۔ مراد اور اس کے شوہر کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ شبیر درانی واقعی شیطان تھا انسانیت تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ تقریباً ”ایک گھنٹے بعد رضیہ ناشتہ لے کر آگئی۔ وہی پرانہ اور چائے۔“

”پہلے میں نے ان دونوں مسئلوں کو ناشتہ کرایا ہے اور اب اپنے اور تمہارے لیے لے کر آئی ہوں۔“ اس نے ٹرے چارپائی کے سامنے میز پر رکھ دی۔

”اور مراد اور اس کا شوہر؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”انہیں بھی تین چار پرانے کپڑے میں لیٹ کر دے آتی ہوں۔ پچارے کئی روز بعد آج پہلی مرتبہ پیٹ بھر کر کھائیں گے۔ ایک روز پہلے میں نے انہیں گن مینوں سے چوری کھانا دینے کی کوشش کی تھی مگر ایک گن مین نے دیکھ لیا اور مجھ سے کھانا چھین کر بھینس کی کھولی میں ڈال دیا۔ اس نے مجھے بھی ایک پھنڑ رسید کر دیا تھا کہ آئندہ اگر میں نے انہیں ان کی اجازت کی بغیر کچھ کھانے کو دیا تو مجھے بھی ننگا کر کے ان کے ساتھ پتھرے میں بند کر دیا جائے گا۔“

رضیہ نے بتایا۔

نائلہ پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے تھے تو ذکر کھانے لگی۔ مراد اور اس کے شوہر کی حالت دیکھ کر اس کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن جسم و جان کا ناٹھ قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھانا ضروری تھا۔

”ایک روز مجھے صادق آباد جانے کا موقع مل گیا تھا۔“ رضیہ نے مدھم سی آواز میں کہا۔ ”رولڈو نامی گن مین ان دنوں مجھ پر کچھ زیادہ ہی مروان تھا۔ میں نے اسے لالچ دیا کہ اگر وہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے صادق آباد لے جائے تو میں اس کی خواہش پوری کر دوں گی۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے بازار سے کچھ چیزیں خریدنی ہیں اور وعدہ کیا تھا کہ کہیں بھانے یا بازار میں کسی سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش نہیں کروں گی۔“

وہ پہلے تو ڈر رہا۔ لیکن لالچ بری بلا ہے اور داؤ پر جب ایک حسین اور جوان لڑکی لگی ہوئی ہو تو مرد جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے دن مجھے صادق آباد لے جائے گا۔

اسی رات میں نے رحیم یار خان کے ایس پی کے نام ایک گناہ خط لکھا۔ جس میں میں نے اسے بتایا کہ نائلہ بے گناہ ہے۔ صادق نامی شخص کو نائلہ نے قتل نہیں کیا بلکہ اسے پولیس نے مارا تھا اور نائلہ درانی کو ایک سازش کے تحت جھوٹے کیس میں پھنسا دیا گیا ہے۔ مجھے تمہارے کیس کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں تھیں ورنہ سب کچھ لکھتی۔ میں نے اس خط کے ذریعے ایس پی سے مطالبہ کیا تھا کہ نائلہ درانی کے اس کیس کی غیر جانبدارانہ تحقیق کرائی جائے۔ بصورت دیگر میں اخبارات کو خط لکھوں گی۔ یہاں مجھے کوئی لفافہ تو نہیں ملا۔ میں نے کاپی کا ایک کاغذ پھاڑ کر لفافہ بنایا اور اس میں خط لپیٹ کر آٹے سے جوڑ دیا۔

دوسرے دن رولڈو مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر صادق آباد لے گیا۔ شہر پہنچ کر اس نے موٹر سائیکل اپنے ایک جاننے والے کی دوکان کے سامنے روک دی اور ہم دونوں ہیدل چلنے لگے۔ وہ لفافہ میں نے چادر میں چھپا رکھا تھا۔ ایک جگہ لیٹر بکس دیکھ کر میں اس سے ٹیک لگا کر رک گئی اور ایک ہاتھ سے چپل درست کرنے لگی۔ اس طرح موقع پا کر میں نے وہ خط لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اب پتہ نہیں وہ خط اپنی منزل پر پہنچا ہے یا نہیں؟

”یہ کب کی بات ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”خط میں نے چار دن پہلے پوسٹ کیا تھا۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”کوئی فائدہ نہیں۔“ نائلہ بولی۔ ”پولیس شیردرانی کی زر خرید ہے۔ انسپٹر اعظم اس کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر کتے کی طرح اس کے پیچھے چلنے پر مجبور ہے۔ وہ شیردرانی اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے سینکڑوں ہتھکنڈے استعمال کر سکتا ہے۔“

نائلہ کو رضیہ کی اس تبدیلی پر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ اس سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اب وہ بھی شیردرانی سے اپنی ذلت اور رسوائی کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اور یہ صورت حال نائلہ کے حق میں بہتر تھی۔ وہ رضیہ کی مدد سے ایک بار پھر شیردرانی کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

اسی روز شام سے ذرا پہلے شیردرانی آگیا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں حسینہ بیگم بھی تھی۔ حسینہ بیگم کو دیکھ کر نائلہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”نائلہ بیٹی، تم ہماری بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ کیوں اس طرح بھاگی پھر رہی ہو؟“ حسینہ بیگم نے کہا۔

”مت کو مجھے بیٹی۔“ نائلہ کے لہجے میں حقارت تھی۔ ”تم عورت نہیں عورت کے نام پر بد نما دھبہ ہو۔ تم نے انسانیت کے تمام رشتوں کو پیروں تلے روند ڈالا ہے۔ دولت کی ہوس نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔“

”میں جو کچھ بھی ہوں تمہاری چھو بھی ہوں۔ تم میرے بھائی کی اولاد ہو۔ اگر تم ہماری پناہ میں آ جاؤ تو تمہاری ساری مصیبتیں ختم ہو سکتی ہیں۔ تمہارے خلاف کوئی پولیس کیس نہیں رہے گا۔ کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔

”میں تمہاری باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔ تمہاری پناہ میں آنے کی بجائے میں چھانی کے پھندے کو ترجیح دوں گی۔ تم عورت نہیں ڈائن ہو۔ تمہارے دل میں عورت کے تقدس کا احساس بھی مٹ چکا ہے۔ ایک عورت ہوتے ہوئے تم نے عورت کے تقدس کو جس طرح پامال کیا ہے وہ

تعل شرم ہے۔ شیطان بھی شرمایا ہو گا تم لوگوں کی اس حرکت پر۔“ نائلہ کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

”میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی یہ تمہاری اپنی غلطی ہے کہ تم بھاگی پھر رہی ہو۔“ حسینہ نے جواب دیا۔

”میں اپنی بات نہیں کر رہی۔“ نائلہ چیخی۔ ”باہر جا کر دیکھ لو جہاں دو انسانوں کو برہنہ کر کے جانوروں کی طرح پنجرے میں بند کیا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے زندگی بھر تمہاری خدمت کی، تمہارے یہ دھودھو کر گئے۔ ان کے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک... جاؤ... باہر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو... اور تم تو سچ حقیقت کا بھی اعتراف نہیں کرو گی کہ تمہارا سپوت کس طرح خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔ وہ اب تک تھے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ اس نے کتنوں کو زندہ جلا دیا ہے۔ تم ماں بیٹے انسان نہیں، زیوان ہو... درندے۔“ نائلہ کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ وہ غصے کی شدت سے تھر تھرا رہی تھی۔

”تم اماں کی توہین کر رہی ہو نائلہ... اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔“ شیردرانی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”تم برداشت کیا کر سکتے ہو؟“ نائلہ اس کی طرف مڑی۔ ”تم ماں بیٹوں کی غیرت مریچکی ہے۔ بے ضمیر ہو گئے ہو تم دونوں اور تم...“ اس نے انگلی سے شیردرانی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارا انجام تو بہت برا ہو گا۔ تم نے انپکٹر اعظم کے ساتھ مل کر میرے خلاف جو سازش تیار کر رکھی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تم قانون کے شکنجے میں آؤ گے اور پھر تمہاری دولت بھی نہیں بچا سکے گی۔“

”آبا!...“ شیردرانی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”قانون کا شکنجہ ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں بنا۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جو کوئی جرم کر کے بھاگتے پھرتے ہیں، تمہاری طرح... ہم جیسے لوگ تو درجنوں افراد کو قتل کر کے بھی بے گناہ ہوتے ہیں۔ دولت سارے عیب چھپا لیتی ہے...!!!“

”میرے پاس تم سے زیادہ دولت ہے۔“ نائلہ غرائی۔ ”اور اگر میں نے بھی اسی رنگ میں دولت کا استعمال...“

”تم دولت کو اس رنگ میں استعمال نہیں کر سکتیں۔“ شیردرانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اسی لیے میں وہ دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اسے کسی کام میں تولایا جائے۔“

”لیکن... یہ بات ذہن میں رکھو شیر کہ جرم کبھی نہیں چھپتا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”تم نے انپکٹر اعظم سے مل کر ایک بے گناہ کو قتل کیا اور اس کا الزام مجھ پر عائد کر دیا۔ انپکٹر اعظم کب تک اپنی اس گھناؤنی رکت کو چھپا سکے گا۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ اس سے اوپر بھی کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ جن کے کانوں میں یہ تک پہنچ چکی ہے کہ...“

”اوہو۔“ شیردرانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تو ایس بی کو وہ گناہ خط تم نے لکھا تھا۔“ شیردرانی کے اس جملے سے نائلہ کو کم از کم یہ تصدیق ضرور ہو گئی کہ رضیہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس نے واقعی ایس بی کو گناہ خط لکھا تھا جو ایس بی تک پہنچ چکا تھا۔

”لیکن تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ انپکٹر اعظم کو کل شام کسی نے قتل کر دیا ہے۔ وہ تمہارے خلاف بری اس سازش کا واحد گواہ تھا۔ جو ختم ہو چکا ہے۔ اب کوئی مالی کا لال یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ صادق بائی



اس شخص کو انپکڑ اعظم نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔ انپکڑ اعظم کی موت سے صادق کے قتل کا الزام تم پر کفر ہو چکا ہے اور انپکڑ اعظم کے قتل کے سلسلے میں بھی تمہارا ہی نام لیا جا رہا ہے کیونکہ وہ تمہارے کیس کی تحقیقات کر رہا تھا اور تم نے اسے قتل کر دیا۔“

نالہ درانی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس سمجھنے میں دیر نہیں گئی کہ انپکڑ اعظم کو بھی اسی نے قتل کر دیا تھا۔ نالہ اس کے خلاف سازش کا کوئی ثبوت نہ رہے۔  
”تم بہت کہتے ہو۔“ نالہ غرائی۔ ”اب تک نجانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔ کیا تم اپنے آپ کو بچا سکو گے۔“

”کسی بھی کیس میں میرا نام نہیں آیا۔“ شبیر درانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”البتہ تمہارے جرائم کی فہرست طویل ہوتی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے تم نے صادق نامی ایک شخص کو قتل کیا اور خود بھی زخمی ہو میں اور پکڑے جانے کے خوف سے ہسپتال سے بھاگ نکلیں اور کئی روز تک ایک تانگے والے کے گھر میں روپوش رہیں۔ گرفتاری کے بعد جب تمہیں جیل سے عدالت لے جایا جا رہا تھا تو تمہارے آدمیوں نے پولیس وین پر حملہ کر دیا جس میں کم از کم چھ آدمی مارے گئے۔ تمہارے آدمی تمہیں پولیس کی حراست سے نکال لے گئے۔ کئی روز روپوش رہنے کے بعد چولستان کی طرف فرار ہوتے ہوئے تم نے دو اور آدمیوں کو قتل کر دیا۔ تم نے آدھی رات کو ایک سوزوکی ڈرائیور کو گن پوائنٹ پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ تمہیں چولستان کی طرف لے جائے۔ اتفاق سے میرا ایک آدمی اسی رات خیر گڑھ سے صادق آباد کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے تمہیں دیکھ لیا۔ اس نے تمہیں پکڑنے کی کوشش کی مگر تم نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور سوزوکی پک اپ کے ڈرائیور کو بھی چھلنی کر دیا تاکہ میرے آدمی کے قتل کا کوئی چشم دید گواہ نہ رہے۔ تم میرے آدمی کی جیب لے کر فرار ہو گئیں اور جب جیب میں پیٹرول ختم ہو گیا تو قریبی بستی میں اپنے ایک مزارع کے گھر میں چھپ گئیں پھر تم ایک حاملہ عورت کے بھیس میں وہاں سے بھی بھاگ نکلیں لیکن بہر حال وہ راتقل پولیس کے ہاتھ لگ گئی جس سے تم نے سوزوکی ڈرائیور اور میرے آدمی کو قتل کیا تھا۔ راتقل پر تمہاری انگلیوں کے نشانات محفوظ کر لیے گئے ہیں۔“

نالہ درانی سانے میں آ گئی۔ وہ جب بھاگلہ اور خیر گڑھ کے قریب شبیر درانی کو بے بس کر کے اس کی جیب پر فرار ہوئی تھی تو اس نے تینوں راتقلوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور اس طرح ان تینوں راتقلوں پر اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے اور پولیس نے انگلیوں کے وہ نشانات محفوظ کر لیے تھے۔ انہی میں ایک راتقل شبیر کے گن مین کی تھی جس سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے سوزوکی ڈرائیور کو چھلنی کر دیا گیا تھا اور دوسری راتقل شبیر درانی کے ہاتھ میں تھی۔ نالہ نے جب شبیر درانی کو تانگوں سے پکڑ کر گرایا تھا تو شبیر کی راتقل سے گولی چل گئی تھی جس سے اس کا ایک گن مین ہلاک ہو گیا تھا۔ بعد میں نالہ نے سب سے پہلے اسی راتقل پر قبضہ کیا تھا۔ ان راتقلوں پر اس کی انگلیوں کے نشانات اس کے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کیے جاسکتے تھے۔ شبیر درانی نے اسے پھسانے کے لیے جو جال پھیلایا تھا وہ بہت مضبوط تھا۔ لیکن نالہ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ سازش کے اس جال میں نہیں پھنسے گی اور اسی جال کی رسیوں سے شبیر درانی کے گلے کے لیے پھندہ تیار کرے گی۔

”قانون کی نگاہوں میں تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔“ حسینہ بیگم نے ایک بار پھر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر تم اپنی بے جا ضد چھوڑ کر ہم سے سمجھوتہ کر لو تو یہ سب کچھ ختم ہو سکتا

ہے۔ ”یہ کچھ کاغذات ہیں۔ ان پر دستخط کرو تو بات یہیں پر ختم ہو جائے گی۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے ایک فائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

”کیسے کاغذات ہیں یہ؟“ نائلہ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”خود ہی دیکھ لو۔“ شبیر درانی نے فائل اسے تھما کر جیب سے قلم بھی نکال لیا۔ جیسے اسے توقع رہی ہو کہ نائلہ ان کاغذات پر دستخط کر ہی دے گی۔

نائلہ نے فائل لے کر کھولا۔ سب سے اوپر نکاح نامہ تھا۔ جس کے تمام اندراجات مکمل تھے۔ حق مہر والے خانے میں شرعی حق مہر مبلغ بیس روپے پچاس پیسے لکھا ہوا تھا۔ اس نکاح نامہ پر گواہوں، لڑکی کے وکیلوں اور نکاح خوان کے دستخط بھی ثبت تھے۔ مہر بھی لکھی ہوئی تھی۔ صرف نائلہ درانی کے دستخط ہونا باقی تھے۔

یہ نکاح نامہ دیکھ کر نائلہ کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نے نکاح نامے کے نیچے والے کاغذات نکال لیے۔ یہ چار کاغذات تھے۔ سب سے اوپر اسٹامپ پیپر تھا اور اس کے نیچے گرین پیپر تھے۔ یہ ایک قانونی دستاویز تھی۔ اسٹامپ پیپر پر اس دستاویز کا موضوع پڑھتے ہی نائلہ کو سینے میں اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ یہ نائلہ درانی کی طرف سے شبیر درانی کے نام جنرل پاور آف اٹارنی تھی۔ جس کی رو سے شبیر درانی کو نائلہ درانی کی تمام زرعی اراضی، شہری، منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا مختار تصور کیا گیا تھا۔ نائلہ درانی جیسے جیسے یہ تحریر پڑھ رہی تھی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ پاور آف اٹارنی ناقابل تسخیر تھی۔

”لو۔ ان پر دستخط کرو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ شبیر درانی نے قلم اس کی طرف بڑھا دیا۔  
 نائلہ درانی ان کاغذات پر دستخط کر دینے کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس سے نہ صرف وہ خود شبیر درانی کے گھٹنے میں آجاتی بلکہ اس کی ساری جائیداد بھی اس کے قبضے میں چلی جاتی۔ آج وہ پاور آف اٹارنی پر دستخط کروا رہا تھا کل کا وہ اسے مجبور کر کے جائیداد اپنے نام منتقل بھی کروا سکتا تھا اور پھر وہ اسے اس طرح سسکا سکا کر مارے گا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”دستخط کرو بیٹی۔“ حسینہ بیگم دو قدم آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو نا اس دنیا میں ہمارے سوا تمہارا ہے ہی کون۔ تم جوان ہو۔ اتنی بڑی جائیداد کی تھو وارث ہو۔ تم جیسی جوان و حسین اور دولت مند لڑکی اس دنیا میں ایکی تو نہیں رہ سکتی جہاں قدم قدم پر ہوس پرست انسان خونخوار بھیڑیوں کے روپ میں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ کرو دستخط... اس کے بعد تمہیں کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔“

”سب سے زیادہ خونخوار بھیڑیے اور درندے تو تم ماں بیٹے ہو۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے نکاح نامہ اور پاور آف اٹارنی والے کاغذات پھاڑ کر اس کے پرزے شبیر درانی کے منہ پر دے مارے۔

”حرام زادی۔“ شبیر درانی دھاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔  
 بھرپور تھپڑ نائلہ کے منہ پر لگا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ لڑکھار کر نیچے گر گئی۔ شبیر درانی نے آگے بڑھ کر اس پر ٹھوکرؤں کی بارش کر دی۔ نائلہ اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”لعنت ہے تمہاری مردانگی پر“ ایک عورت پر ہاتھ اٹھا کر اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھ رہے ہو لیکن ہر عورت موم کی گڑیا نہیں ہوتی۔ اب سنبھلو!“

نالکہ کہتے ہوئے اچانک ہی ہوا میں اچلی۔ اس موقع پر اس نے شیردرانی کو اپنے بھی دو ہاتھ دکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مارشل آرٹ کا فن ایسے ہی مواقع پر تو کام آتا تھا۔ اس کی راؤنڈ ہاؤس کلک شیردرانی کی گردن پر لگی اور وہ کراہتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

”اٹھو بزدل!“ نالکہ کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”ابھی تمہیں پتہ چل جائے گا کہ عورت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔“

شیردرانی ایک ہاتھ سے گردن سہلاتا ہوا اٹھ گیا۔ نالکہ پھر ہوا میں اچلی۔ اس مرتبہ اس کی کلک شیردرانی کی پسلیوں پر لگی۔ یہ ضرب پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ نالکہ درانی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور بے درپے اس پر کلکس برساتی رہی۔ شیردرانی بری طرح بلبلا رہا تھا۔

حسینہ بیگم چند لمحوں تک تو کچھ بھی سمجھ نہیں سکی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے پھر بیٹے کو نالکہ کے ہاتھوں پٹنے دیکھ کر وہ چیختی نکلی۔

”رولڈو... صدیقی... بھاگو... جلدی آؤ۔“

ان دونوں گن مینوں کے آنے تک نالکہ شیردرانی کی اچھی خاصی دھناتی کر چکی تھی۔ وہ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ نالکہ نے اس کا جوڑو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گن مین بھی بڑی مشکل سے نالکہ کو قابو کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

”اس کتیا کو دوسرے کمرے میں لے جا کر بند کر دو۔“ حسینہ بیگم چیخی اور پھر آگے بڑھ کر بیٹے کو سہارا دے کر اٹھانے لگی۔

رضیہ بھی شور کی آواز سن کر آگئی تھی۔ وہ شیردرانی کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”دیکھ کیا رہی ہو، پانی لے کر آؤ۔“ حسینہ بیگم رضیہ کی طرف دیکھ کر چیخی۔ رضیہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئی۔

”بیٹھ جاؤ... یہاں بیٹھ جاؤ بیٹا۔“ حسینہ بیگم اسے کرسی کی طرف لے گئی۔

”میں ٹھیک ہوں ماں جی۔“ شیردرانی بولا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کتیا مارشل آرٹ بھی جانتی ہے اور پھر اس نے حملہ بھی اچانک ہی کیا تھا۔ شیردرانی پر آج تک کسی نے ہاتھ اٹھانے کی جرات نہیں کی۔ اس کتیا کو تو اس طرح سکا سکا کر ماروں گا کہ نہ تو یہ زندہ رہے گی اور نہ اسے موت آئے گی۔“

شیردرانی بری طرح تھلا کر رہ گیا تھا۔ اپنی ماں، گن مینوں اور رضیہ کے سامنے وہ ایک نازک سی لڑکی سے پٹ گیا تھا۔ ندامت کے احساس نے اس کے حواس چھین لیے تھے اور وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔

”اب تک میری یہی کوشش رہی تھی کہ کسی طرح اسے رام کر کے تم سے شادی پر آمادہ کر لیا جائے مگر ہمارے تمام شریفانہ چمکنڈے ناکام ہو گئے ہیں۔ اب صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے۔ تم کل ہی انپکڑ صوبہ خان کو پیغام بھیج دو کہ وہ فوراً آکر مجھ سے ملے۔ اس کتیا کو اسی کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ تمہیں لے جا کر اسے قتل کر دے اور لاش ریگستان میں کسی ایسی جگہ پھینکوا دے کہ اس کا سراغ نہ مل سکے۔ اس کی موت کے بعد جائیداد پر قابض ہونا ہمارے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو گا۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔

حسینہ بیگم نے جب یہ بات شروع کی تھی تو رضیہ پانی کا گلاس لے کر راہداری میں آ رہی تھی۔ کسی انپکڑ صوبہ خان کا نام سن کر وہ دروازے کے باہر ہی رک گئی اور باتیں سننے لگی۔ ماں بیٹے نالکہ کے لیے جو

منصوبہ بننا ہے تھے وہ پہلے سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ رضیہ کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور قدموں کی آواز پیدا کرتی ہوئی پانی کا گلاس لیے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے پانی کا گلاس شبیر درانی کی طرف بڑھا دیا۔

شبیر درانی کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور پھر رولڈو اور صدیق کو بھی کمرے میں بلا لیا۔

”ہم رحیم یا رخاں واپس جا رہے ہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں دو تین دن بعد واپس آؤں گا اور اگر یہ لڑکی اس مرتبہ بھاگنے میں کامیاب ہوئی تو تم تینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا“ سمجھے۔ ”اس نے باری باری رضیہ اور دونوں گمن مینوں کی طرف دیکھا۔

”اور ان کا کیا کریں سرکار! جو بیجرے میں بند ہیں۔“ رولڈو نے کہا۔ اس کا اشارہ مرادو اور اس کے شوہر کی طرف تھا۔

”وہ دونوں ہمارے لیے بیکار ہیں لیکن انہیں زندہ چھوڑ دینا بھی ہمارے لیے خطرناک ہو گا۔“ حنیہ بیگم نے کہا۔ ”انہیں آج ہی رات حویلی سے دور لے جا کر گولی مار دو اور لاشیں نہر میں پھینک دو۔“ حنیہ بیگم اور شبیر درانی حویلی سے چلے گئے۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ سائے میں کچھ دیر تک جیب کے ٹچن کی آواز سنائی دیتی رہی پھر معدوم ہو گئی۔

رضیہ، نالکہ کے کمرے کی طرف آئی تو دروازے کو باہر سے کنڈا لگا ہوا تھا اور رولڈو راہداری میں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم جاؤ... میں یہاں موجود ہوں۔“ رضیہ نے رولڈو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حویلی کے اندر کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ اگر یہ گیٹ سے باہر نکلی تو اسے تو ہم سنبھال ہی لیں گے۔“ یکن میرے غصے سے تم بھی نہیں بچ سکو گی۔“ رولڈو نے رضیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بہت خوفناک تھا۔

”دیکھا ہوا ہے تمہارا غصہ۔“ رضیہ بولی۔ ”اطمینان رکھو۔ یہ گیٹ سے باہر نہیں نکل سکے گی۔“ رولڈو اسے گھورتا ہوا یا ہر چہا گیا اور رضیہ، نالکہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ نالکہ چارپائی پر پڑی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ رضیہ نے میز پر رکھی ہوئی لائٹیں جلائی اور نالکہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ اب بھی غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ رضیہ نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور نالکہ کے قریب چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”وہ ماں بیٹا جا چکے ہیں۔“ شبیر درانی نے دو تین دن بعد واپس آنے کو کہا ہے لیکن تمہارے لیے انہوں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ بے حد خوفناک ہے۔“ رضیہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”شبیر درانی کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں ہر صورت میں یہاں سے نکلنا ہو گا۔“

”اس سے زیادہ خوفناک منصوبہ اور کیا ہو گا کہ مجھے چاروں طرف سے قانون کے جال میں پھنسا دیا گیا ہے اور میں ان درندوں کے قبضے میں ہوں۔ یہ لوگ جب چاہیں مجھے پولیس کے حوالے کر سکتے ہیں۔“ ”تمہیں پولیس کے حوالے کر دینے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ تو اب تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ تمہارے مرنے کے بعد یہ لوگ آسانی سے تمہاری جائیداد پر قبضہ کر سکیں۔“ رضیہ نے کہا۔

”اوہ!“ نائلہ چونک گئی۔ ”اب کیا منصوبہ بنایا ہے ان لوگوں نے؟“

”یہ منصوبہ تمہاری پھوپھی حسینہ بیگم کا ہے۔“ رضیہ بولی۔ ”وہ صوبہ خان نامی کسی پولیس انسپکٹر کو بلانے والے ہیں۔ منصوبے کے مطابق تمہیں صوبہ خان کے حوالے کر دیا جائے گا جو قمر کے صحرا میں لے جا کر تمہیں قتل کر دے گا اور تمہاری لاش ریگستان میں کہیں پھینک دی جائے گی۔ تمہاری موت کے بعد ان لوگوں کو تمہاری جائیداد پر قبضہ کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”لیکن ان دو خونخوار گن مینوں کی موجودگی میں یہاں سے نکلتا آسان نہیں ہو گا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”میں کوئی ترکیب سوچتی ہوں تم بھی سوچو، کوئی نہ کوئی ترکیب ذہن میں تو آئی جائے گی۔ ہمیں کل رات ہر صورت میں یہاں سے نکل جانا ہے۔ لیکن ایک مسئلہ ہو گا۔“ رضیہ بولی۔

”وہ کیا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہمیں پیدل جانا ہو گا اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دور چلے جانے کی کوشش کرنا ہو گی۔“ رضیہ نے کہا۔

”حویلی کے اندر ایک موٹر سائیکل بھی تو کھڑی ہے۔“ نائلہ بولی۔

”وہ رولڈو کی موٹر سائیکل ہے لیکن ہمیں اس کا کیا فائدہ؟“ رضیہ نے جواب دیا۔

”میں موٹر سائیکل چلا سکتی ہوں۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لاہور میں رہتے ہوئے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کی اور رات کو تو میں گلیبرگ کی سڑکوں پر بڑی تیز رفتاری سے موٹر سائیکل دوڑایا کرتی تھی۔ کچھ من چلے بھی موٹر سائیکلوں پر میرا پیچھا کیا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔“

”گڈ! پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔“ رضیہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ ”اب میں روٹی پکالوں ورنہ رولڈو چننا شروع کر دے گا۔“

رضیہ باہر نکل گئی اور نائلہ درانی چارپائی پر لیٹی اپنی پھوپھی حسینہ بیگم کے اس نئے منصوبے کے بارے میں سوچتی رہی۔ منصوبہ واقعی بے حد خوفناک تھا۔ اگر اسے انسپکٹر صوبہ خان نامی شخص کے حوالے کر دیا گیا تو وہ اسے قمر لے جائے گا اور وہاں سے زندہ نکلتا ممکن نہیں رہے گا۔ اس کی لاش ہی صحرا میں پڑی سڑتی رہے گی۔ رضیہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انہیں کل رات تک ہر صورت میں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ لیکن وہ جائے گی کہاں؟

دفعہ ۱۱۱ اس کے ذہن میں رائے منصور کا نام ابھر آیا۔ رائے منصور فوج کا ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھا اور اس کے والد عبدالصمد درانی کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھا۔ وہ ایک اصول پرست آدمی تھا۔ ۶۵ء کی جنگ میں وہ کھیم کرن کے محاذ پر تھا۔ اس وقت وہ لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ اس جنگ میں اس نے بہت شاندار کارنامے انجام دیئے تھے۔ لیفٹیننٹ رائے منصور کھیم کرن پر قبضہ کرنے والے فوجی دستے میں شامل تھا۔ پھر ۷۷ء کی جنگ میں بھی اس نے بہادری کے جوہر دکھائے تھے اور بہترین جنگی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا تھا۔ رائے منصور اس وقت بریگیڈیئر کے رینک پر تھا۔ جنگ کے دوران اسے دائیں ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ بڑی بچ گئی تھی لیکن اس کی چال میں ہلکی سی لنگراہٹ آگئی تھی۔ اسے میڈیکل بیس پر فوج سے ریٹائر کر دیا گیا تھا اور اس کی خدمات کے طور پر اسے صادق آباد سے چند میل دور احمد پور لاما میں کچھ زرعی

اراضی دی گئی تھی۔ اس نے جمع پونجی سے کچھ اور زمین خرید لی تھی۔ بعد میں بھی وہ تھوڑی تھوڑی زمین خریدتا رہا تھا۔ اس وقت وہ اس علاقے میں کم از کم تین مربعہ زمین کا مالک تھا۔

ریٹائرڈ فوجی ہونے کی وجہ سے لوگ اس کا احترام کرتے تھے اور ایک زمیندار ہونے کی حیثیت سے بھی اس نے بڑی اچھی ساکھ بنالی تھی۔ اس پاس کے زمیندار اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔

نانکھ کے والد سے رائے منصور کی دوستی اس وقت سے تھی جب وہ فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ اب نانکھ کو اس کا خیال آیا تھا۔ اس موقع پر رائے منصور ہی اس کا بہترین محافظ ثابت ہو سکتا تھا۔

نانکھ درانی یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ کسی کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر چونک سی گئی۔ وہ رولدو تھا۔ نانکھ اس وقت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے سو رہی ہو۔ رولدو چارپائی کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں نانکھ کے سینے پر مرکوز تھیں سینے کا زیرو دم اس کے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ قدرے جھک کر ایک ہاتھ نانکھ کے سینے کی طرف بڑھانے لگا۔

اپنے سینے پر ہاتھ کا بوجھ محسوس کرتے ہی نانکھ نے آنکھیں کھول دیں، اسی کے ساتھ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور بھرپور پھپھر رولدو کے منہ پر پڑا۔ ٹھیک اسی لمحہ رضیہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ رضیہ نے رولدو کو گھورا حالانکہ رولدو کو اپنا گال سلاتے دیکھ کر اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”یونہی آگیا تھا۔“ رولدو گال سلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

”یہ اندر کیسے آگیا، کیا کہہ رہا تھا؟“ رضیہ نے رولدو کے جانے کے بعد نانکھ سے پوچھا۔

”میں لیٹی ہوئی تھی اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں جانا چاہتی تھی کہ یہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ مجھے سویا ہوا سمجھ کر اس نے بدتمیزی کی کوشش کی، میں نے تھپڑ مار دیا۔ اتفاق سے تم آگئیں۔ میں نے تو اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔“ نانکھ نے جواب دیا۔

”جیسا مالک ویسے ہی اس کے کارندے غیبت ہیں۔“ رضیہ بولی۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ اسے یہ پتہ چل گیا ہے کہ حسینہ بیگم اور اس کے بیٹے نے تم سے نجات حاصل کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے اور شاید اسی لیے یہ تمہارے ساتھ بدتمیزی کرنے آیا تھا۔ ورنہ تمہارے کمرے میں داخل ہونے کی بھی جرات نہ کرتا۔“

”ٹھیک ہے۔ یہاں سے نکلنے سے پہلے میں اسے ایسا سبق سکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔“ نانکھ نے جواب دیا۔

”تم دروازہ اندر سے بند کرلو۔ میں ایک گھنٹے میں واپس آؤں گی۔“ رضیہ کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔

نانکھ درانی نے اٹھ کر دروازہ بند کر کے کنڈا چڑھا دیا اور دوبارہ چارپائی پر لیٹ کر رولدو کی اس بدتمیزی کے بارے میں سوچنے لگی۔ رضیہ نے ٹھیک کہا تھا رولدو کو پتہ چل گیا تھا کہ اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے اور وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتا تھا۔ وہ دوسری مرتبہ بھی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ سمجھتی تھی کہ اب ان دونوں خبیثوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔

اب وہ ایک بار پھر رائے منصور کے بارے میں سوچنے لگی۔ نانکھ کی رائے منصور سے ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب اس کا باپ عبدالصمد درانی زندہ تھا۔ یہ تقریباً چار سال پہلے کی بات تھی۔ وہ سردیوں کی چٹیلوں میں لاہور سے رحیم یار خان آئی ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں مکمل برگ والی حویلی میں تھے۔ نانکھ کو اگلے

روز لاہور واپس چلے جانا تھا۔

رائے منصور اپنی فیملی کو لے کر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی کے ساتھ اس کی گیارہ بارہ سال کی پوتی بھی تھی۔ بڑی پیاری سی بچی تھی لیکن اسے ذہنی طور پر ایب نارمل بنا کر قدرت نے اس کے حسن کو داغ لگا دیا تھا۔ رائے منصور کا بیٹا فوج میں کیپٹن تھا۔ اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے بچی کے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لندن تک لے جا کر علاج کروایا گیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

رائے منصور کی پوتی راحیلہ لاہور ہی میں ایک ایسے اسکول میں پڑھ رہی تھی جہاں ذہنی طور پر ایب نارمل بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کی رہائش بھی ہوسٹل ہی میں تھی۔ وہ بھی سردیوں کی چھٹیوں میں آئی ہوئی تھی اور رائے منصور اسے ملوانے کے لیے لایا تھا۔ رائے منصور کی بہو بھی ان کے ساتھ تھی، اسی نے بتایا تھا کہ راحیلہ بھی دو دن بعد لاہور واپس جانے والی ہے۔

رائے منصور سے نانکہ کی وہ آخری ملاقات تھی اور نانکہ درانی کو حیرت تھی کہ اسے اب تک رائے منصور کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ اسے تحفظ فراہم کر سکتا تھا۔ شبیر درانی سے بچنے کے لیے بھاگتے ہوئے اس نے اب تک جہاں جہاں پناہ لی تھی۔ وہ سب چھوٹے لوگ تھے اور ان کے بارے میں پتہ چل جانے کے بعد کہ انہوں نے نانکہ کو پناہ دی تھی، شبیر درانی نے ان سب کو ختم کر دیا۔ کسی کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا اور کسی کو زندہ جلادیا تھا۔ لیکن رائے منصور کے خلاف وہ کوئی ایسی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔

نانکہ درانی، رائے منصور یا کسی اور کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ صرف تھوڑا سا تحفظ چاہتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے اور سنبھلنے کا موقع چاہئے تھا اسے اور رائے منصور کی پناہ میں آکر اسے یہ موقع مل سکتا تھا۔

نانکہ درانی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ رضیہ کی آواز سن کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ رضیہ کھانا لے کر آئی تھی۔ اگرچہ ابھی آٹھ بجے تھے لیکن لگتا تھا جیسے بہت رات بیت گئی ہو۔ ”تم کھانا کھاؤ۔۔۔ اندر سے دروازے کا کڑا لگا لینا۔ آج رات رولدو حویلی کے اندر رہے گا۔ میں ساتھ والے کمرے میں ہوں گی۔ اس دروازے کو بھی اندر سے کڑا لگائے رکھنا۔ جب میں ہولے سے دروازہ کھٹکھٹاؤں تو کڑا کھول دینا۔ خود سے نہ تو دروازہ کھٹکھٹانا اور نہ ہی کڑا کھولنا۔ یہ غبیث جس رات حویلی کے اندر ہوتا ہے وقت بے وقت میرے کمرے میں گھس آتا ہے۔ اب میں جا رہی ہوں۔ تم آرام سے کھانا کھاؤ۔“ رضیہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

نانکہ نے بھی اٹھ کر دروازے کو اندر سے کڑا لگالیا اور بیٹھ کر اطمینان سے کھانا کھانے لگی۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے برتن ایک طرف رکھ دیئے۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر تک کمرے میں ادھر سے ادھر شلتی رہی پھر چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ اسی کے ساتھ ہی رضیہ کی آواز سنائی دی۔

”نانکہ، دروازہ کھولو۔“

نانکہ نے اٹھ کر کڑا ہٹا دیا۔ رضیہ کے ساتھ رولدو بھی کمرے میں داخل ہوا اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نانکہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیار اپنے اس گال پر پہنچ گیا جہاں نانکہ نے تھپڑ مارا تھا۔ وہ گال سہلاتے ہوئے چند لمحوں کے عیب سی نگاہوں سے نانکہ کی طرف دیکھتا رہا پھر کڑکی کے قریب پہنچ کر سلاخوں کو ہلا کر دیکھنے لگا۔ سلاخیں خاصی مضبوط تھیں، پھر اس نے اوپر روشن دان کی طرف دیکھا۔

روشن دان اتنا تک تھا کہ تین چار سال کا بچہ بھی اس سے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر دروازے کی طرف مڑ گیا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے عجیب سی نگاہوں سے نائلہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس مرتبہ دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ نائلہ نے بھی اندر سے کنڈا چڑھادیا اور چارباہی پر لیٹ گئی۔ اس کا ذہن ایک بار پھر سوچوں میں الجھ گیا اور پھر اس پر غنودگی طاری ہونے لگی، اس کی پلکیں جھپک جھپک گئیں۔

وہ نجانے رات کا کون سا پہر تھا۔ گولیوں کی آواز سن کر نائلہ کی آنکھ کھل گئی اس نے گڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا وہ اپنے کمرے میں تھی۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ شاید اس نے کوئی خواب دیکھا تھا لیکن گولی کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ آواز خاصی دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

وہ دیر تک اس فائرنگ کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے قرب و جوار کی کسی بستی پر ڈاکوؤں نے حملہ بول دیا ہو۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ایک بار پھر اونچے غلی لیکن اونچتے ہوئے اسے ساتھ والے کمرے میں ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ نائلہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے سوچا شاید رضیہ بھی فائرنگ کی آواز سن کر جاگ گئی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ رضیہ والا دروازہ کھلوا کر اس سے صورت حال معلوم کرے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ کیونکہ رضیہ نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ خود سے دروازہ نہ کھولے۔ وہ ایک بار پھر اونچنے لگی۔

تقریباً ”آدھ گھنٹے بعد اسے یوں لگا جیسے ساتھ والا دروازہ آہستہ آہستہ بجایا جا رہا ہو۔ نائلہ نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے۔ یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ دروازے کو انگلی سے بجایا جا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر بڑی آہستگی سے دروازے کا کنڈا گرادیا۔ دروازہ کھلتے ہی رضیہ اندر آگئی۔

”یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟ تم نے سنی تھی؟“ نائلہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

”ہاں۔“ رضیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر اچانک ہی افسردگی چھا گئی تھی۔ ”مرادو اور اس کے شوہر کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میں نے نہیں جان بوجھ کر نہیں بتایا تھا۔ حسینہ بیگم نے واپس جانے سے پہلے حکم دیا تھا کہ آج رات انہیں حویلی سے باہر لے جا کر گولی مار دی جائے اور ان کی لاشیں نہریں پھینک دی جائیں۔ صدیق ان دونوں کو پنجرے سے نکال کر جانوروں کی طرح ہانکتا ہوا لے گیا تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ گولیوں کی آواز سن کر تم دروازہ نہ کھٹکھٹاؤ کیونکہ وہ حرام کا جتا رولدو میرے کمرے میں آگیا تھا۔“

نائلہ نے جواب نہیں دیا۔ مرادو اور اس کے شوہر کی ہلاکت کی خبر سن کر اس کا دل کانپ کر رہ گیا تھا۔ اسے ان دونوں کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ نجانے کتنے بے گناہ اس کی وجہ سے مارے گئے تھے اور ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہیں ایک مظلوم لڑکی سے ہمدردی تھی۔

راہداری میں قدموں کی آواز سن کر رضیہ چونک گئی۔

”شاید ان دونوں میں سے کوئی آیا ہے۔ تم دروازے کو کنڈا لگالو۔“ رضیہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا اور دسے قدموں چلتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ نائلہ نے بھی آہستگی سے کنڈا چڑھادیا اور بستر پر لیٹ گئی۔

قدموں کی آواز اس کے دروازے کے سامنے رک گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا تالا چیک کر کے واپس چلا گیا تھا اور اس نے غالباً ”رضیہ کا دروازہ بھی کھول کر اندر جھانکا تھا۔

نائلہ نے رات کا باقی حصہ جاگتے ہوئے گزارا تھا۔ مرادو اور اس کے شوہر کا خیال بار بار اس کے ذہن



میں آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں شبیر درانی ایک ایسا درندہ تھا جو پاگل ہو گیا تھا اور اب اس کا علاج ضروری ہو گیا تھا۔ وہ رات بھر فرار کی ترکیب سوچتی رہی اور بالا خرچہ روشن دان سے دن کا دم سا اجالا نظر آنے لگا تو نالکہ کی پلکیں بھی نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔

وہ صبح گیارہ بجے سو کر اٹھی تھی۔ کمرے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ رضیہ کے کمرے والا دروازہ بھی دوسری طرف سے بند تھا۔ وہ زور زور سے اپنے کمرے کا دروازہ دھڑکھڑانے لگی۔ چند منٹ بعد راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ پہلے تالا کھلا اور پھر ایک دھماکے سے دروازہ کھل گیا۔ اگر نالکہ دروازے کے تھوڑا سا اور قریب ہوتی تو دروازے کا پٹ اس کے منہ پر لگتا۔

”کیا بات ہے، کیوں شور مچا رہی ہو؟“ رولدو نے چیخ کر کہا۔  
 ”میرے سامنے زیادہ اکڑ دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ کل اپنے مالک کا حشر دیکھ لیا تھا تم نے؟“ نالکہ نے اسے گھورا۔

”مالک اور نوکر میں بڑا فرق ہوتا ہے اور میں تو ابھی اس تھپڑ کو بھی نہیں بھولا ہوں جو رات کو تم نے میرے منہ پر مارا تھا۔“ رولدو نے غراتے ہوئے جواب دیا۔ ”چلو نکلو کمرے سے لیکن اگر تم نے حویلی کے گیٹ کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“  
 نالکہ درانی جواب دیئے بغیر اسے گھورتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

برآمدے میں آتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے شیڈ کے نیچے خالی بنجرے پر پڑی۔ بنجرہ خالی تھا۔ نالکہ کے دل پر ایک گھونسا لگا۔ مرادو اور اس کے شوہر کی لاشیں نہر میں بہہ کر پتا نہیں کہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ رضیہ آنگن کے ایک کونے میں پنڈ پپ کے نیچے بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ نالکہ کو دیکھ کر وہ مسکرا دی۔  
 ”میں نے خود ہی تمہیں نہیں جگا یا تھا۔ بھوک لگ رہی ہوگی۔ میں ابھی تمہارے لیے ناشتہ تیار کرتی ہوں، ابھی تو وہ دونوں مسٹڈے کھائی کر گئے ہیں۔ کم بخت تین تین پراٹھے کھا جاتے ہیں۔“ رضیہ نے کہا۔  
 رضیہ دھلے ہوئے برتن لے کر بارہوی خانے میں آگئی۔ نالکہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ دروازے ہی میں کھڑی رضیہ سے باتیں کر رہی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد نالکہ برآمدے ہی میں فرش پر بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ رضیہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”میں نے آج رات یہاں سے فرار کی ترکیب سوچ لی ہے۔ بس یہ دعا کرو کہ آج شبیر درانی یہاں نہ پہنچ جائے۔“ رضیہ بولی۔

”مجھے بھی بتاؤ۔“ نالکہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”تم نے کل رات رولدو کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ وہ تم سے اس تھپڑ کا انتقام لینے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے اور اس کا یہ انتقام ہی ہمارے فرار کا ذریعہ بنے گا۔“ رضیہ نے کہا۔  
 ”وہ کیسے؟“ نالکہ نے پوچھا۔

رضیہ چند لمبے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر فرار کی ترکیب بتانے لگی۔ نالکہ درانی کے ہاتھ سے لقمہ جھوٹ گیا۔ یہ ترکیب سن کر ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ رضیہ اس کے ساتھ کوئی چال تو نہیں چل رہی؟ لیکن کل سے اب تک بہت سی ایسی باتیں سامنے آئی تھیں جن سے رضیہ کی صداقت کا ثبوت ملتا تھا۔

”تم فکر مت کرو۔“ رضیہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔ ”میں ساتھ والے کمرے میں موجود ہوں گی۔ وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“

نالکہ درانی اب بھی خاموش تھی اور رضیہ سرگوشیوں میں اسے بتا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔

”لیکن تمہارے ذہن میں یہ خوفناک خیال کیسے آیا؟“ نالکہ نے پوچھا۔

”تمہارے بھانسنے سے پہلے رولدو نے خود ہی مجھ سے یہ بات کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں اس کی مدد کروں تو وہ تم سے اپنا انتقام لے سکتا ہے۔ اس کی بات سن کر ہی میرے ذہن میں یہ ترکیب آئی تھی۔ تم اطمینان رکھو۔ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔“ رضیہ نے کہا۔

وہ پورا دن نالکہ نے بے بڑی بے چینی میں گزارا۔ رات ہوئی اور نالکہ کو کھانے کے بعد اس کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ رضیہ کی ہدایت کے مطابق نالکہ نے دونوں دروازوں میں سے کسی کو بھی اندر سے کھڑا نہیں لگایا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے بیت رہا تھا اور نالکہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

رات نے ابھی اپنا نصف سفر بھی طے نہیں کیا تھا کہ تالا کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اندر داخل ہونے والا رولدو ہی تھا۔ نالکہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

رولدو نالکہ کی چارپائی کے قریب آکر رک گیا۔ اس نے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل اتار کر دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور نالکہ کی طرف دیکھتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ چہرہ آہستہ آہستہ نالکہ پر جھنسنے لگا۔ نالکہ کے سینے کا زیر و بم اس کے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ نالکہ کے سینے کی طرف بڑھایا لیکن اس سے پہلے کہ رولدو کا ہاتھ نالکہ کے سینے پر پہنچتا نالکہ کے ہاتھ اس کے گلے پر پہنچ گئے۔ نالکہ کے ہاتھ اس قدر تیزی سے حرکت میں آئے تھے کہ رولدو کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال ابھرا تھا۔ دھوکا..... اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ رضیہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ نالکہ درانی کو خواب آور گولیاں کھلا دے گی اور اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن یہاں تو اسے اپنی جان کے لالے بڑھ گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

نالکہ درانی مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انسانی جسم میں کتنے اور کہاں کہاں پریش پوائنٹ ہوتے ہیں اور پریش پوائنٹ کو نشانہ بنا کر کیا نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ پوری قوت سے رولدو کی شہ رگ کے دونوں طرف نیسے دبا رہی تھی۔ اسی لمحہ رضیہ والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ رضیہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ربر کا ایک لمبا سا ٹکڑا تھا۔ ربر کا یہ ٹکڑا تقریباً ”دو فٹ لمبا اور دو ڈھائی انچ لمبا تھا۔ ربر کا یہ ٹکڑا آج دن میں ہی اس نے شیڈ کے نیچے اوزاروں والے صندوق سے نکال کر اپنی چارپائی کے نیچے چھپا لیا تھا۔ رضیہ نے بڑی احتیاط سے ربر کے اس ٹکڑے سے رولدو کی کھوپڑی پر بھرپور وار کیا۔ رولدو منہ سے آواز نکالے بغیر نالکہ کے سینے پر ڈھیر ہو گیا۔ نالکہ نے اسے ایک طرف دھکیلا اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر بستر سے نکل آئی۔

نالکہ اور رضیہ، رولدو کو گھسیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے آئیں اور اسے چارپائی کے نیچے دھکیل

دیا۔

”یہ ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا تم تیار رہو۔ میں دوسرے کو بھی لے کر آتی ہوں۔ وہ بھی باہر بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہوگا۔“ رضیہ نے اپنے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور دوڑتی ہوئی دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔

نالہ درانی دروازے کے پیچھے دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی تقریباً "دس منٹ بعد راہداری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی جو دروازے کے باہر رک گئی۔

"یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو" اندر جاؤ۔" یہ رضیہ کی آواز تھی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صدیق جیسے ہی اندر داخل ہوا نالہ نے دروازے کی آڑ سے نکل کر ہوا میں ٹانگ چلا دی۔ اس کی ٹانگ صدیق کی ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ وہ چیخ کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ پیچھے سے رضیہ نے دھکا دیا۔ صدیق پھر کمرے میں آ گیا۔ نالہ نے اسے ککس پر رکھ لیا۔

صدیق بری طرح بلبلاتا رہا تھا لیکن رضیہ اور نالہ کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ دور دور تک اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ رضیہ نے آگے بڑھ کر پھر وہی ربر اٹھالیا اور صدیق کی دھناتی کرنے لگی۔ ربر کا ایک وار اس کی کھوپڑی پر پڑا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

رضیہ کچھ دیر تک صدیق کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ گرتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ رضیہ نے ربر پھینک دیا اور نالہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف دوڑی۔

"چلو... اب بھاگ نکلو... موٹر سائیکل شیڈ کے نیچے کھڑی ہے۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی شیڈ کے نیچے موٹر سائیکل کے پاس آ گئیں۔ چابی موٹر سائیکل میں لگی ہوئی تھی۔ نالہ ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اچھل کر موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ اس نے چابی تھما کر کک لگائی۔ موٹر سائیکل پہلی ہی کک میں اشارت ہو گئی۔ رضیہ نے دوڑ کر باہر کا گیٹ کھول دیا اور نالہ جیسے ہی موٹر سائیکل لے کر گیٹ کے باہر پہنچی۔ رضیہ کچھل سیٹ پر بیٹھ گئی۔ نالہ نے ہیڈ لیمپ روشن کر دیا اور موٹر سائیکل کو کچے راستے پر دوڑا دیا۔

"کہاں جا رہی ہو، کوئی ٹھکانہ ہے؟" رضیہ نے چیخ کر پوچھا۔ وہ موٹر سائیکل پر مردوں کی طرح کچھل سیٹ پر بیٹھی تھی اور اس نے نالہ کے ساتھ لپٹ کر اپنے دونوں بازو اس کے سینے پر لپیٹ رکھے تھے۔

"ہاں، اب میں ایسی جگہ جا رہی ہوں جہاں شبیر درانی اور اس کے گرگے اپنا کوئی ہنر نہیں دکھا سکیں گے۔" نالہ نے جواب دیا۔

"مگر کہاں... وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟" رضیہ نے پوچھا۔

"احمد پور لانا... صادق آباد سے چند میل آگے۔" نالہ نے جواب دیا۔ "مگر ہم صادق آباد شہر سے گزرنے کے بجائے اوپر سے گھوم کر جائیں گے۔"

موٹر سائیکل کچے راستے پر دوڑتی رہی۔ یہ راستہ سیدھا ہائی وے کی طرف چلا گیا تھا مگر نالہ نے موٹر سائیکل دائیں طرف ایک اور راستے پر موڑ دی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ صحیح راستے پر مڑی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد صادق آباد شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ راستہ شہر کے دائیں طرف اوپر سے گھومتا ہوا شہر سے ذرا آگے ہائی وے سے مل گیا تھا۔ یہاں سے ایک پختہ سڑک محمد پور اور دوسری ذرا آگے جا کر احمد پور لانا کی طرف چلی گئی تھی۔ نالہ نے موٹر سائیکل اسی طرف موڑ دی۔ نہر کا پل پار کرتے ہی احمد پور لانا والی سڑک شروع ہو گئی۔

سڑک سسنان تھی۔ نالہ بے خوف ہو کر پوری رفتار سے موٹر سائیکل دوڑاتی رہی۔ ایک تو ویسے ہی سردی کا موسم تھا۔ انہوں نے سویٹر وغیرہ بھی نہیں پہن رکھے تھے۔ موٹر سائیکل کی تیز رفتاری سے ہوا تیز

طرح نائلہ کے جسم سے ٹکرا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی رضیہ تو اس سے بری طرح چپکی ہوئی تھی۔ احمد پور لاما سے ذرا پہلے موٹر سائیکل کی رفتار خود بخود کم ہونے لگی۔ ٹنگی میں پٹرول ختم ہو رہا تھا۔ نہر کے پل پر پہنچ کر تو موٹر سائیکل رک گئی۔ وہ دونوں نیچے اتر آئیں اور موٹر سائیکل کو دھکیلتی ہوئی نہر کے کنارے پر لے آئیں اور موٹر سائیکل کو نہر میں دھکیل دیا۔ پل کے دوسری طرف احمد پور لاما کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ اچھا خاصا بڑا قصبہ ہے۔

بازار سنسان پڑا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں لیکن کسی ذی روح کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد نجانے کہاں سے آوارہ کتوں کی ایک ٹیم نکل آئی۔ نائلہ اور رضیہ پہلے ہی سردی سے کانپ رہی تھیں۔ کتوں کے خوف نے ان پر کچھ اور کچکی طاری کردی۔ وہ کتوں کو ہشکارتی ہوئی آگے بڑھتی رہیں۔

نائلہ پہلی مرتبہ میاں آئی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رائے منصور کا مکان کہاں ہے۔ وہ بس چلی جا رہی تھیں۔ پھر دفعہً "بازار کے چوکیدار کی سیٹی کی آواز سن کر وہ چونک گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد سائیکل پر سوار چوکیدار سیٹی بجاتا ہوا ان کے سامنے آگیا۔ دونوں جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو اس طرح دیکھ کر اس کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"اے... کون ہو تم لوگ؟ کہاں سے آرہی ہو؟ معلوم ہے اس وقت کیا بجا ہے؟" چوکیدار نے باری باری دونوں کو گھورا۔

"کیا بجا ہے؟" رضیہ نے کپکپاتے ہوئے لمبے میں پوچھا۔

"ایک بج چکا ہے کون ہو تم لوگ؟" چوکیدار کے لمبے میں سختی تھی۔

"بھیا! ہمیں رائے منصور صاحب کے گھر جانا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان کا مکان کس طرف ہے؟" نائلہ نے کہا۔

رائے منصور کا نام سن کر چوکیدار چونک گیا۔

"مگر... ان کی حویلی تو بہت دور ہے۔ تم لوگ کہاں سے آئی ہو؟"

"کتنی دور ہے؟" نائلہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

"قصبے سے باہر... تقریباً" ایک میل... یہاں سے دو میل کا فاصلہ تو ضرور ہو گا۔" چوکیدار نے کہا۔

"مگر اس وقت....."

"اگر تم ہمیں وہاں تک پہنچا دو تو رائے منصور صاحب تم سے بہت خوش ہوں گے اور یقیناً تمہیں انعام بھی دیں گے۔" نائلہ بولی۔

چوکیدار کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے اپنی گرم چادر اتار کر نائلہ کی طرف بڑھادی۔ نائلہ اور رضیہ نے مل کر چادر اوڑھ لی اور ایک دوسری کے ساتھ چپک کر چوکیدار کے پیچھے چلنے لگیں۔

چوکیدار نے دو میل کما تھا لیکن قصبے سے نکل کر انہیں تقریباً "تین میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ یہ بہتی بیس پچیس گھروں پر مشتمل تھی اور یہاں تک بجلی کی لائن موجود تھی۔ بستی کی گلیاں بھی پختہ تھیں اور اسٹریٹ لائٹس بھی جل رہی تھیں۔ چوکیدار نے انہیں بستی کے آخر میں ایک بہت بڑی حویلی کے گیٹ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

”یہ ہے رائے منصور صاحب کی حویلی۔“ چوکیدار نے کہا۔

نانکہ درانی نے آگے بڑھ کر گیٹ کے پلر پر لگا ہوا کھٹی کاٹن دبا دیا اور رضیہ کے قریب آکر گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔

..... \* \* \* .....

حسینہ بیگم اور شبیر درانی حویلی سے واپس آئے تو بہت غصے میں تھے۔ ملازمین ان ماں بیٹے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ غصے میں تو یہ دونوں انسانیت کی تمام حدود پھلانگ جایا کرتے تھے۔ بات بات پر وحشیوں کی طرح چنچم دھاڑ کرنا اور کاٹ کھانے کو دوڑانا کا معمول بن چکا تھا۔ گھر کے ملازمین ایسے مواقع پر ان کے سامنے آنے سے گریز ہی کیا کرتے تھے۔ وہ سامنے اسی وقت آتے جب کسی کو بلایا جاتا۔

نانکہ درانی ان ماں بیٹوں کے لیے زندگی کا اہم ترین مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ بار بار ہاتھ میں آکر نکل جاتی تھی۔ صرف جائیداد ہی نہیں بلکہ نانکہ ان کے لیے اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی تھی کہ وہ ان کا ڈینہ وارنٹ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نانکہ بے گناہ تھی۔ محض اس سے شادی اور اس کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے شبیر درانی نے انسپکٹر اعظم سے مل کر اس کے خلاف سازش تیار کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نانکہ بلیک میل ہو کر اس کے قابو میں آجائے گی۔ اس نے پولیس وین پر اپنے آدمیوں سے حملہ کروا کے نانکہ کو آزاد بھی اسی لیے کروایا تھا کہ اسے یہ تاثر دیا جاسکے کہ اسے نانکہ سے ہمدردی اور محبت ہے اور وہ نانکہ کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ دوسری طرف اس نے انسپکٹر اعظم کو یہ تاثر دیا تھا کہ نانکہ کو چھڑانے کے لیے وین پر حملہ نانکہ کے آدمیوں نے کیا تھا۔ انسپکٹر اعظم نے تو اس کی بات کا یقین کر لیا تھا مگر نانکہ اس کے جھانسنے میں نہیں آئی تھی اور وہ مراد اور اس کے شوہر بخشو کی مدد سے اس کے محافظوں کو بے ہوش کر کے حویلی سے بھاگ نکلی تھی۔

شبیر درانی کے آدمی شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے۔ اس مرتبہ ایک ایسے شخص کے ذریعے نانکہ کا سراغ ملا جس نے دولت کے لالچ میں اسے نانکہ کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ نانکہ پھر اس کے ہاتھ آگئی تھی مگر وہ نانکہ کی نفرت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگا سکتا تھا کہ نانکہ نے اس کی قیدی بن کر رہنے کی بجائے مرجائے کو ترجیح دی تھی اور نہریں چھلانگ لگا دی تھی۔

نانکہ درانی کو دور دور تک تلاش کیا گیا تھا مگر نہریں اس کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔ اس کے آدمیوں نے اگرچہ اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ نہریں ڈوب کر مر گئی ہوگی اور تیز رفتاری پانی اس کی لاش کو کہیں بہت دور بہا کر لے گیا ہوگا مگر شبیر درانی کو یقین تھا کہ نانکہ زندہ تھی اور کہیں روپوش تھی۔ اس نے اپنی تلاش جاری رکھی اور بالاخر ایک بار پھر نانکہ کو عین اس وقت گرفت میں لے لیا گیا جب وہ ایک بنجارن کے بھیس میں ٹرین پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر اسے ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو نانکہ اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہوتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ نانکہ اب تک کسی ایسے آدمی سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی جو اس معاملے میں اس کی مدد کر سکتا۔ ویسے نانکہ نے فون پر جن لوگوں سے رابطہ کر کے ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی انہوں نے شبیر درانی کو بتا دیا تھا۔ اسے یہ شبہ ہی نہیں یقین تھا کہ اگر نانکہ کسی اعلیٰ شخصیت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو اس کے لیے ڈینہ وارنٹ ہی ثابت ہوگی اور پولیس کے پاس نانکہ شاید اس لیے نہیں جاری تھی کہ پہلے تو اسے گرفتار کر لیا جاتا، اس پر کئی آدمیوں کے

قتل کا الزام تھا اور اسے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے میں کئی سال لگ جاتے۔

دوسری طرف انسپٹر اعظم بھی شبیر درانی کے لیے خطرے کی جھنڈی بن رہا تھا۔ اس کے خیال میں انسپٹر اعظم دنیا کا سب سے بڑا احمق تھا جو ایس بی کو نائلہ کے بارے میں گمنام خط ملنے کے بعد اپنی چڑی بچانے کے لیے اس کے پاس دوڑا آیا تھا۔ اگر انسپٹر اعظم یہ حماقت نہ کرتا تو شاید شبیر درانی کو اس خطرے کا احساس بھی نہ ہو پاتا جو آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صرف انسپٹر اعظم ہی نائلہ کے خلاف اس سازش سے واقف اور اس میں شریک تھا۔ اس لیے اس نے انسپٹر اعظم کو راستے سے ہٹا کر اپنی طرف بڑھتے ہوئے اس خطرے کا راستہ روک دیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ خطرہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ پولیس کے کچھ اور آدمی بھی یہ جانتے ہوں گے کہ انسپٹر اعظم نے جس شخص کو مروایا تھا وہ بے گناہ تھا اور نائلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن شبیر درانی کو یقین تھا کہ وہ پولیس والے اس سلسلے میں اپنی زبان کھولنے کی کوشش نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح وہ خود بھی سلاخوں کے پیچھے پھنچ سکتے تھے۔ شبیر درانی کو نائلہ کے اس ہمدرد کا بھی خیال آ رہا تھا جس نے ایس بی کو گمنام خط لکھا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟ شبیر درانی اس اجنبی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا لیکن بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا اس کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا تھا لیکن شبیر درانی کے لیے سب سے بڑا خطرہ تو خود نائلہ تھی!

نائلہ درانی کو آسموں والی حویلی میں چھوڑ کر وہ رحیم یار خان واپس آ گیا تھا۔ حسینہ بیگم گلہریگ میں تھی۔ شبیر درانی نے رات ہی کو اپنے ایک آدمی کے ہاتھ ماں کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ نائلہ مل گئی ہے۔ وہ صبح گاڑی سے شہر آجائے۔

حسینہ بیگم پیغام پا کر صبح سویرے ہی شہر پہنچ گئی تھی۔ ناشتہ اس نے بیٹے کے ساتھ ہی کیا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ دونوں کمرے میں آ گئے اور تقریباً دو گھنٹے تک ایک نئی سازش کے تانے بانے بننے رہے اور بالاخر فیصلہ کن مرحلے پر شبیر درانی نے اپنے وکیل کو فون کر دیا کہ وہ سارے کام چھوڑ کر اس کے مکان پر پہنچ جائے۔

وکیل ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔ انہوں نے اپنا منصوبہ وکیل کے سامنے پیش کیا، ان تمام پہلوؤں پر بھی غور کیا گیا جو قانونی پیچیدگیاں پیدا کر سکتا تھا۔ وکیل ایک کانڈ پر کچھ پوائنٹس بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا اور پھر دوپہر کے لگ بھگ آئے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

وکیل دوپہر کو ٹھیک اس وقت پہنچا جب وہ ماں بیٹا کھانے کی میز پر آئے تھے اور کھانا شروع کرنے ہی والے تھے۔

”آئیے وکیل صاحب! پہلے کھانا ہو جائے پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

وکیل نے اپنا بریف کیس ایک طرف رکھ دیا اور ایک کرسی کھینچ کر کھانے کی میز کے سامنے بیٹھ گیا اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔

کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وکیل نے اپنا بریف کیس کھول کر کچھ کانڈز نکال لیے۔

”یہ نکاح نامہ ہے۔“ اس نے اوپر والے کانڈز اٹھا کر حسینہ بیگم کی طرف بڑھا دیئے۔ ”آپ انہیں دیکھ لیجئے۔ تمام اندراجات مکمل ہیں۔ نکاح خواں اور گواہوں کے دستخط موجود ہیں اور نکاح رجسٹرار کی مہریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ان سب کو پانچ ہزار روپے فی کس دیئے گئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو وقت آنے پر انکار کر سکتا ہو۔ ضرورت صرف نائلہ کے دستخطوں کی ہے۔“

حینہ بیگم نکاح نامہ کے کاغذات دیکھنے لگی۔ وہ چار پرت تھے اور ہر لحاظ سے مکمل تھے۔ اس نے مطمئن انداز میں سرہلاتے ہوئے کاغذات شبیردرانی کی طرف بڑھا دیے۔

”اور یہ جنرل پاور آف اٹارنی ہے۔ نائلہ درانی کی طرف سے شبیردرانی کے نام۔ میں نے رجسٹرار سے بات کر لی ہے۔ وہ اگرچہ بہت زیادہ مطالبہ کر رہا تھا لیکن پچاس ہزار میں معاملہ طے ہوا ہے۔ یہ رقم اس وقت ادا کی جائے گی جب سرکاری کاغذات میں اس پاور آف اٹارنی کا اندراج ہو گا اور اس پر رجسٹرار کی مہریں اور دستخط وغیرہ ثبت ہو جائیں گے۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں۔“ وکیل نے پاور آف اٹارنی کے کاغذات حینہ بیگم کی طرف بڑھا دیے۔

حینہ بیگم گہری توجہ سے ان کاغذات کا مطالعہ کرتی رہی پھر مطمئن انداز میں سرہلادیا اور کاغذات میز پر رکھ کر وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”نائلہ درانی مفور ہے اور قتل جیسے سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب ہے۔ کوئی قانونی پیچیدگی تو نہیں ہوگی۔“

”آپ نے شاید غور نہیں کیا بیگم صاحبہ۔“ وکیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ان کاغذات پر دو مہینے پہلے کی تاریخ ہے۔ اس وقت نائلہ درانی نہ تو مفور تھی اور نہ ہی کسی جرم میں ملوث تھی۔ اس کے آخر میں رجسٹرار کی طرف سے یہ جملہ بھی تحریر ہے کہ نائلہ درانی نے کسی دباؤ اور گراہ کے بغیر میرے روبرو اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔ نائلہ کے دستخط ہو جانے کے بعد سرکاری کاغذات میں اسی تاریخ میں اس کا اندراج ہو جائے گا جو اس پر درج ہے۔ اس طرح اس دستاویز کو باقاعدہ قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور اسے کسی بھی عدالت میں جعلی ثابت نہیں کیا جاسکے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ حینہ بیگم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”شبیر! وکیل صاحب کو فی الحال تیس ہزار روپے دے دو۔ باقی حساب کتاب بعد میں کر لیا جائے گا۔“

شبیردرانی اٹھ کر ڈرائنگ روم سے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آکر اس نے سو سو کے نوٹوں کے تین بنڈل وکیل کے سامنے میز پر اس طرح پھینک دیے جیسے کتے کے سامنے ہڈی پھینکی ہو۔ وکیل نے مسکراتے ہوئے نوٹوں کے بنڈل اٹھا کر بریف کیس میں رکھ لیے اور بریف کیس بند کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب میں اجازت چاہوں گا بیگم صاحبہ۔ یہ مجھے واپس کب ملیں گے؟“ اس نے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ کل صبح آکر لے جائیے۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔

اور پھر اسی شام دونوں ماں بیٹا وہ کاغذات لے کر آموں والی حویلی پہنچ گئے جہاں نائلہ درانی قید تھی۔ حینہ بیگم اور شبیردرانی کو یقین تھا کہ معمولی سے تشدد کے بعد نائلہ درانی ان کاغذات پر دستخط کر دے گی لیکن..... نائلہ درانی نے جس طرح ان کاغذات کے پرزے شبیر کے منہ پر دے مارے تھے اس سے شبیردرانی کا دماغ گھوم گیا تھا اور طیش میں آکر اس نے نائلہ کو تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مار مار کر نائلہ کو ادھ موا کر دے گا لیکن پہلا تھپڑ کھاتے ہی نائلہ نے اس کی جو درگت بنائی تھی اسے شاید وہ زندگی بھر نہیں بھلا سکے گا۔

اور جب وہ حویلی سے واپس آیا تو بری طرح جھنجھلا یا ہوا تھا۔ گھر کے ملازم اس کے غصے سے واقف تھے اس لیے وہ اس سے دور ہی رہنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن بہر حال کسی نہ کسی کو تو شبیردرانی تک وہ پیغام

پہنچانا تھا جو اس کی عدم موجودگی میں موصول ہوا تھا۔ اس کے لیے عاشق نامی بوڑھے ملازم کو ہی ہمت کرنی پڑی۔ شبیر درانی اس وقت ڈرائنگ روم میں اکیلا ہی بیٹھا نالکہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ صوفے پر بار بار پلو بدل رہا تھا۔ نالکہ کی لگائی ہوئی محکس اسے بے چین کیے ہوئے تھیں۔

”کیا بات ہے عاشق!“ اس نے ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لمبے میں کرخنگی نمایاں تھی۔

”سرکار!“ بوڑھے عاشق نے کہا۔ ”آپ کے بعد دو مرتبہ ڈی ایس پی صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ جب بھی واپس آئیں انہیں فون کر لیں۔ وہ دیر تک اپنے دفتر میں بیٹھے رہیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بات کر لوں گا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ بوڑھا عاشق خاموشی سے باہر چلا گیا۔

شبیر درانی کی پیشانی پر سلونیں ابھر آئیں۔ ڈی ایس پی نے اسے فون کیوں کیا تھا۔ وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ کس ایسا تو نہیں کہ انسپکٹر اعظم کے قتل کے سلسلے میں کوئی شبہ ہو گیا ہو؟ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ حینہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”ایک معمولی سی بات پر اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو بیٹا۔“ حینہ بیگم اسے پریشان بیٹھے دیکھ کر بولی۔

”نالکہ نے تمہارے ساتھ جو گستاخی کی ہے اس کا احساس مجھے بھی ہے۔ اب بس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔“

نالکہ سے نجات! صوبہ خان کو ابھی اور اسی وقت فون کرو۔ ہمارا یہ مسئلہ وہی حل کر سکتا ہے۔“

”میں اس وقت نالکہ کے بارے میں نہیں ڈی ایس پی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ہماری عدم موجودگی میں وہ دو مرتبہ فون کر چکا ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے اور غالباً اس وقت بھی اپنے دفتر میں بیٹھا میرے فون کا انتظار کر رہا ہے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ فون کر کے معلوم کر لو کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

شبیر درانی نے ریسپور اٹھا کر ابھی پہلا ہندسہ ہی گھمایا تھا کہ بوڑھے ملازم عاشق نے اندر داخل ہو کر ڈی ایس پی کی آمد کی اطلاع دی۔

”اندر بھیج دو اسے۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے ریسپور رکھ دیا اور حینہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ڈی ایس پی شجاعت علی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ ایک صحت مند اور دراز قامت آدمی تھا۔ گوری چٹنی رنگت اور چہرہ بارعب تھا۔ پولیس کی وردی اس کے جسم پر خوب چر رہی تھی۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

”آئیے شجاعت علی صاحب!“ شبیر درانی نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ”مجھے آپ کا پیغام مل گیا اور میں ابھی آپ ہی کو فون کر رہا تھا۔“

”دفتر سے نکلا تو میں نے سوچا کہ آپ سے بھی ملتا چلوں۔“ شجاعت علی کہتے ہوئے حینہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیسے زحمت فرمائی۔ تشریف رکھئے نا!“ شبیر درانی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”درانی صاحب!“ شجاعت علی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی کزن نالکہ درانی کا معاملہ کچھ خاصا محمبیہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے تو بہت سے حقائق سامنے آسکتے ہیں۔“

لیکن.....

”ہم تو خود اس کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔“ حینہ بیگم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس نے



شجاعت علی کو بات پوری کرنے یا بیٹے کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ”وہ ہمارے خاندان کی عزت ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اس خاندان کی عزت کس طرح مٹی میں مل رہی ہے۔ اس کے روپوش ہو جانے سے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل رہا ہے۔ جو لوگ کبھی ہم سے نظریں ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے آج ان کی زبانیں ہمارے خلاف زہر اگل رہی ہیں۔ اگر نائلہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیتی تو ہم بھی قانون کا سارا لے کر اسے بچانے کی کوشش تو کر سکتے تھے۔ لیکن اس کا تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا کہ وہ کہاں ہے۔“

”کاش! اس کا کچھ پتہ چل سکتا۔“ شجاعت علی نے کہا۔ ”دو تین روز پہلے ایس بی صاحب کو ایک گم نام خط ملا تھا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ نائلہ درانی کو جس شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اس کا نائلہ سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ ایک بااثر شخصیت کی سازش سے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ گم نام خط لکھنے والے نے اس سلسلے میں انسپکٹر اعظم کا نام لیا تھا۔“

”لیکن وہ بااثر شخصیت کون ہو سکتی ہے جو نائلہ کے خلاف اس قسم کی گمناؤنی سازش کر سکے۔ نائلہ کو کسی جھوٹے کیس میں پھنسا کر اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”کوئی ایسی شخصیت جسے نائلہ درانی کی جائیداد سے دلچسپی ہو۔“ ڈی ایس بی شجاعت علی نے کہتے ہوئے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”خاندان کے ہر فرد کو نائلہ اور اس کی جائیداد سے دلچسپی ہے۔ لیکن ہمارے خاندان کا کوئی فرد اس کے خلاف ایسی گمناؤنی سازش نہیں کر سکتا۔ گم نام خط لکھنے والے نے اگر انسپکٹر اعظم کا نام لیا تھا تو اس کے خلاف کارروائی کی گئی ہوتی۔“ شبیر درانی بولا۔

”گم نام خط پر اس وقت تک کوئی ایسی کارروائی نہیں ہو سکتی جب تک کوئی ثبوت نہ ہو، لیکن بہر حال اس سے وضاحت پیش کرنے کو کہا گیا تھا لیکن کل شام اسے قتل کر دیا گیا۔ شبہ ہے کہ انسپکٹر اعظم کے قتل میں اس بااثر شخصیت کا ہاتھ ہو سکتا ہے جس نے انسپکٹر کے ساتھ مل کر نائلہ درانی کے خلاف سازش کی تھی۔“ شجاعت علی نے کہا۔

”لگتا ہے آپ کوئی دلچسپ اور سنسنی خیز قسم کی کہانی سنا رہے ہیں۔“ شبیر درانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایسا صرف فلموں اور وی ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ایسی کہانیوں کے مصنف مفروضوں پر ایسی شاندار عمارتیں کھڑی کر دیتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آنے لگتی ہے۔“

”مفروضے ہی حقائق کی بنیاد بنتے ہیں درانی صاحب۔“ شجاعت علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال، انسپکٹر اعظم کی بیوہ کے بیان کے مطابق اس سانحہ سے پہلے وہ آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ آپ کے ہاں سے جانے کے بعد وہ اپنے گھر پہنچا تو بے حد پریشان تھا۔ اس نے بیوی کو پریشانی کی وجہ نہیں بتائی۔ آپ کے ہاں سے جانے کے بعد وہ گھر سے نہیں نکلا۔ وہ بہت مضطرب تھا، بار بار بچوں کو ڈانٹ رہا تھا۔ ایک بار تو اس نے اپنی بیوی کو بھی ڈانٹ دیا تھا۔ حالانکہ مسز اعظم کے بیان کے مطابق انسپکٹر اعظم نے اس سے پہلے نہ تو کبھی بچوں کو ڈانٹا تھا نہ اسے۔ اس کی گھریلو زندگی بالکل مختلف تھی۔ وہ ایک محبت کرنے والا شوہر اور شفیق باپ تھا، لیکن اس روز وہ ایک بالکل مختلف شخص نظر آ رہا تھا۔ بیوی کے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی۔ شام سے ذرا پہلے وہ وردی پن کر ڈیوٹی پر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔“ شجاعت علی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر شبیر درانی کے چہرے پر

نظرس جماتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انسپکٹر اعظم آپ کے پاس کیوں آیا تھا؟“  
 ”شجاعت صاحب!“ شبیر درانی بولا۔ ”ہم زمین دار ہیں، زمین لوگ ہیں، حکومت کے ایوانوں تک اثر  
 رسوخ رکھنے والے ہیں۔ انسپکٹر اعظم جیسے کئی لوگ سائل بن کر روزانہ ہمارے دروازے پر آتے ہیں۔ ہم  
 کسی کو یہاں آنے سے روک تو نہیں سکتے!“

”ڈی ایس پی صاحب!“ حینہ بیگم، شبیر کے خاموش ہوتے ہی بولی۔ اس کے لہجے میں کرتخی تھی۔ ”کیا  
 اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ انسپکٹر اعظم کے قتل کے سلسلے میں آپ میرے بیٹے پر شبہ کر رہے ہیں؟“  
 ”نہیں بیگم صاحبہ۔“ شجاعت علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے ویسے ہی ایک بات پوچھ لی  
 تھی۔ ویسے آپ کی ایک اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نائلہ پر جس شخص کے قتل کا الزام ہے اس کا نائلہ  
 سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”کیا مطلب؟ کیا کتنا چاہتے ہیں آپ۔ کیا اس نے بلاوجہ ہی کسی کو گولی ماری تھی؟“ حینہ بیگم چونک  
 کر بولی۔

”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ نائلہ درانی نے اسے گولی ماری تھی۔“ شجاعت علی نے اس کے چہرے پر  
 نظرس جمادیں۔ ”آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ ایس پی کے نام لکھا جانے والا وہ گناہ خط کچھ رنگ لارہا  
 ہے۔“

”ہاں ہاں... کیوں نہیں۔ ہمیں تو واقعی خوش ہونا چاہئے۔“ حینہ بیگم نے گڑبڑا کر جواب دیا۔  
 ”ایف آئی آر کے مطابق صادق نامی وہ مقتول نائلہ درانی کا محافظ تھا جسے چند روز پہلے ہی ملازم رکھا گیا  
 تھا۔ نائلہ درانی نے اسے دس ہزار روپے دے کر اس کے ہاتھوں اپنے تایا عبدالرحمن درانی کو قتل کروانا  
 چاہا تھا لیکن صادق نے انکار کر دیا اور نائلہ نے غصے میں آکر اسے گولی ماری جس کے جواب میں صادق نے  
 بھی اس پر گولی چلا دی جو اس کے پیٹ میں لگی۔ نائلہ درانی کو بعض نامعلوم لوگوں نے ہسپتال پہنچا دیا جہاں  
 ہوش میں آنے کے بعد وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے ہسپتال سے بھاگ نکلی۔ ایف آئی آر کے مطابق صادق  
 نامی وہ شخص پولیس کو زخمی حالت میں سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔ ہوش آنے پر اس نے پولیس کو بتایا کہ اسے  
 نائلہ درانی نے گولی ماری تھی۔ یہ بیان دینے کے بعد وہ ختم ہو گیا۔“ شجاعت علی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر  
 بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس گناہ خط کے ملنے کے بعد خفیہ طور پر ہم نے تحقیقات کی تو یہ دلچسپ  
 انکشاف ہوا کہ صادق نامی اس شخص کا نائلہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ نائلہ درانی کا محافظ نہیں تھا۔ وہ تو  
 تازہ موٹر پر پھلوں کا ٹھیلہ لگاتا تھا اور اس روز بارش اور سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے شام آٹھ بجے ہی  
 ٹھیلہ بند کر کے گھر کے لئے روانہ ہو گیا تھا لیکن وہ گھر نہیں پہنچا۔ ایک اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ایف آئی  
 آر کے مطابق صادق نامی وہ شخص پولیس کو زخمی حالت میں ملا تھا اور بے ہوش تھا۔ ایسی صورت میں سب  
 سے پہلے اسے ہسپتال لے جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ہسپتال میں اس کا  
 ریکارڈ نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ صادق نامی وہ شخص اور نائلہ درانی واقعی کسی  
 سازش کا شکار ہوئے ہیں اور پولیس کے بعض اہلکار بھی اس سازش میں شریک ہیں۔“

”مجھے یہ سب کچھ سن کر حیرت ہو رہی ہے۔“ شبیر درانی اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”آپ ایک  
 ذمہ دار پولیس آفیسر ہیں اور پولیس کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔“  
 ”پولیس کے محکمے میں بھی میرے اور آپ جیسے انسان ہی ہیں، فرشتے نہیں۔“ شجاعت علی نے جواب

دیا۔ ”لیکن اگر کوئی شخص پولیس کی وردی پہن لیتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ قانون سے بالاتر ہو گیا ہے۔ قانون تو سب کے لیے ایک ہے۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا آفیسر بھی قانون شکنی کرے گا تو وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”ہم سے کسی تعاون کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔“

”اس کیس کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات شروع ہو چکی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ بعض دلچسپ انکشافات ہوں گے۔ اس سلسلے میں آپ کے تعاون کی ضرورت پڑی تو ضرور زحمت دوں گا۔ اچھا اب میں اجازت چاہوں گا۔“ ڈی ایس پی شجاعت علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شبیر درانی ڈرائنگ روم کے دروازے تک اسے رخصت کرنے گیا۔ جب وہ واپس پلٹا تو اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تشویش کے سائے صاف طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ حینہ بیگم بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھی۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ شبیر درانی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس گناہم خطہ نے ہمارے لیے اچھی خاصی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ خطرہ دہے قدموں ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔“

”اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”نائلہ کو ختم کر دیا جائے۔ اگر وہ کتیا کسی طرح سامنے آگئی تو ہمارے بجائے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ تم ابھی اور اسی وقت صوبہ خان کو فون کرو کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں پہنچ جائے۔ نائلہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ ہم تو نائلہ کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں کیس ایسا نہ ہو کہ پھانسی کا پھندہ ہمارے گلے میں پڑ جائے۔“

”میں ابھی فون کرتا ہوں۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھالیا اور میرپور ماٹھیلو کا نمبر ملانے لگا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ شبیر درانی کو یقین تھا کہ انیکٹر صوبہ خان پولیس اسٹیشن میں ہی ہو گا۔ اس لیے اس نے پولیس اسٹیشن کا بھی نمبر ملایا تھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔

”صوبہ خان۔“ شبیر درانی اس کی آواز سننے ہی بولا۔ ”تم جلد سے جلد کب ہمارے پاس آسکتے ہو... ہاں بابا بہت ضروری کام ہے۔ ہاں بیگم صاحبہ ہی تم سے بات کریں گی۔ ٹھیک ہے ہم کل رات کے کھانے پر تمہارا انتظار کریں گے اچھا... خدا حافظ....“ شبیر درانی نے فون بند کر دیا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ کل رات یہاں پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ کل رات ہی نائلہ کو اس کے حوالے کر دو۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔ اسی وقت نوکرانی نے آکر اطلاع دی کہ کھانا لگ گیا ہے۔ وہ دونوں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

دوسرے دن حینہ بیگم اور شبیر درانی ناشتہ کرتے ہی گھر گھر روانہ ہو گئے۔ گھر گھر سے وہ سیدھے عبدالرحمن درانی کی حویلی پہنچے تھے۔ حینہ بیگم نے اپنے بھائی کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم دونوں ماں بیٹے آگ کا کھیل کھیل رہے ہو۔ اگر نائلہ اس سے شادی پر آمادہ نہیں تھی تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔“ عبدالرحمن درانی نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔

”بات نائلہ سے شبیر کی شادی کی نہیں تھی۔ اصل بات تو جائیداد کی ہے۔ ہم کروڑوں کی یہ جائیداد کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اور پھر آپ ہی نے تو مجھے مشورہ دیا تھا کہ....“

”ہاں اور تم نے مجھے بھی جائیداد کا لالچ دے کر اس آگ میں لپیٹ لیا ہے۔“ عبدالرحمن درانی نے

اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”اب تو یہ آگ پھیل چکی ہے۔ اگر ہم نے کوئی بندوبست نہ کیا تو ہم سب اس میں جل کر راکھ ہو جائیں گے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”کوئی حل سوچا ہے تم نے؟“ عبدالرحمن درانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”جی ہاں۔“ اس مرتبہ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”میں نے انسپکٹر صوبہ خان کو فون کیا ہے۔ وہ آج رات رحیم یار خان پہنچ جائے گا۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ نائلہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ خود ہی اسے ٹھکانے لگا دے گا۔“

”کیا تمہارے خیال میں اس طرح نائلہ سے نجات مل جائے گی اور ہم سب کے لیے قانونی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہو جائیں گی۔ اس کے قتل کا شبہ ہم پر نہیں کیا جائے گا؟“ عبدالرحمن درانی نے اسے گھورا۔  
 ”اس وقت لوہا گرم ہے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”عقل مندی کا قصہ یہی ہے کہ گرم گرم لوہے پر چوٹ لگادی جائے۔ نائلہ اس وقت مفرد ہے۔ اسے ان حالات کا علم نہیں جو ڈی ایس پی شجاعت علی سے ہمیں معلوم ہوئے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ اس کے کانوں میں اس نئی تحقیقات کی بھنگ پڑے اور وہ پھر فرار ہونے کی کوشش کرے، ہمیں اس کا قصہ تمام کر دینا چاہئے۔ اس کے بارے میں یہی سوچا جائے گا کہ وہ سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب تھی۔ پکڑے جانے کے خوف سے کیس غائب ہو گئی ہے۔“  
 ”اور اگر اس کی موت کا پتہ چل گیا تو؟“ عبدالرحمن درانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ایسی صورت میں بھی ہم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ یہ جو نئی تحقیقات شروع ہوئی ہے نا وہ اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔

”اس خوش فہمی میں بھی ہتلا مت رہنا۔“ عبدالرحمن درانی نے کہا۔ ”پولیس والوں کو اتنا بے وقوف مت سمجھو۔ وہ ایک بار جس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“  
 ”یہ بعد کی باتیں ہیں بھائی صاحب۔“ حینہ بیگم بولی۔ ”سب سے پہلے تو ہمیں نائلہ کا قصہ پاک کرنا ہے۔ بعد میں جو کچھ ہو گا اس سے نمٹ لیا جائے گا۔ آخر ہمارا یہ اثر رسوخ اور دولت کس کام آئے گی۔ شجاعت علی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ پولیس فرشتے نہیں انسان ہی ہوتے ہیں۔ دولت کی حرص انسانی فطرت میں شامل ہے۔ ان کے منہ بند کیے جاسکتے ہیں اور پھر ہم لاکھوں روپے خرچ کر کے جن لوگوں کو اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں وہ لوگ کس دن کام آئیں گے؟ ایسی پی اور ڈی ایس پی تو اس بساط کے بت معمولی سے مرے ہیں انہیں بڑی آسانی سے بساط سے ہٹایا جاسکتا ہے۔“

”سوچ لو حینہ بیگم۔“ عبدالرحمن درانی نے مہم۔ ”کوئی نیا تماشہ شروع نہ ہو جائے۔ اس خاندان کی پہلی ہی بت رسوائی ہو چکی ہے۔“  
 ”میں نے سوچ لیا ہے۔“ حینہ بیگم بولی۔ ”اگر کروڑوں روپے کا یہ ادا حاصل کرتی ہے تو ہمیں یہ آخری چال چلنی ہی پڑے گی۔“

”لیکن کیا تم نے صوبہ خان کے بارے میں بھی سوچا ہے کیا وہ ہمیں زندگی بھر بلک سیل نہیں کرتا رہے گا؟“ عبدالرحمن درانی نے خندہ ظاہر کیا۔  
 ”وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا کیونکہ اس طرح خود اس کی گردن بھی پھنس جائے گی۔“ حینہ بیگم

نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ عبدالرحمن نے گہرا سانس لیا۔ ”لیکن صوبہ خان کو اس شر کے بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اسے تمہارے گھر آتے ہوئے دیکھا گیا تو کسی کو شبہ نہیں ہوگا؟“

”اس میں شبہ کی کیا بات ہے۔ وہ پہلے بھی آتا رہا ہے۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔

”پہلے کی بات اور تھی۔ میں موجودہ حالات کی بات کر رہا ہوں۔“ عبدالرحمن درانی نے کہا۔ ”عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ صوبہ خان سے ملاقات کو خفیہ رکھا جائے۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ یہاں آیا تھا۔“

”کتنے تو آپ ٹھیک ہیں۔“ حینہ بیگم بولی۔ ”تو پھر اسے پیغام بھیج دیا جائے کہ وہ شہر والے مکان پر جانے کی بجائے ہمیں پر آجائے، شبیر...“ وہ بیٹے کی طرف مڑ گئی۔ ”تم ابھی شہر جا کر صوبہ خان کو فون کر دو کہ وہ شہر والے مکان پر جانے کے بجائے کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں آجائے۔ یہاں بھائی صاحب کی موجودگی ہی میں اس سے سارا معاملہ طے کر لیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

شبیر درانی گھر گ سے نکل کر ایک گھنٹے میں اپنے شہر والے مکان پر پہنچ گیا۔ یہاں آتے ہی اس نے ایک آدمی کو آموں والی حویلی کی طرف روانہ کر دیا کہ وہاں کی صورت حال کا جائزہ لے کر آئے۔ پھر اپنے کمرے میں آکر ٹیلی فون پر صوبہ خان کا نمبر ملانے لگا۔ لائن تو فوراً ہی مل گئی لیکن اسے بتایا گیا کہ انسپکٹر صوبہ خان قتل کے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں گیا ہوا ہے اور واپسی کم سے کم دو تین گھنٹوں بعد ہوگی۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ شبیر درانی نے ساڑھے تین بجے دوبارہ فون کیا۔ اس مرتبہ صوبہ خان سے بات ہو گئی۔

”لگتا ہے معاملہ کچھ زیادہ ہی اہم ہے۔“ صوبہ خان نے کہا۔

”ہاں بابا کوئی ایسا ہی معاملہ ہے۔ مگر فون پر بات نہیں ہو سکتی۔ تم ایسا کہو کہ شہر والے مکان کی بجائے گھر آجانا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارا کوئی جاننے والا تمہیں اس طرف آتے ہوئے نہ دیکھ لے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”مطمئن رہئے درانی صاحب۔“ صوبہ خان نے جواب دیا۔ ”میری آمدورفت اس طرح ہوگی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر ہم گھر گ والی حویلی میں ہی تمہارا انتظار کریں گے۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

شام چھ بجے اس کا بھیجا ہوا آدمی واپس آگیا۔

”آموں والی حویلی میں سب ٹھیک ہے سرکار!“ اس آدمی نے بتایا۔ ”جگرے والے پنچھیوں کو بھی کل رات آزاد کر دیا گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، عاشق کو بلاؤ۔“ شبیر درانی نے کہا۔

وہ شخص باہر نکل گیا اور اس کے چند ہی سیکنڈ بعد بوڑھا عاشق اندر آگیا۔

”جی سرکار!“

”ارے بابا، آج تم کوئی چائے وغیرہ نہیں پلاؤ گے؟ پوچھا تک نہیں تم نے؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”ابھی لایا سرکار۔“ عاشق باہر نکل گیا۔

تقریباً ”پندرہ منٹ بعد وہ چائے لے آیا۔ چائے پینے کے بعد شبیر درانی کچھ لوگوں کو فون کرتا رہا۔ آخر میں اس نے بھاولپور میں اپنے ایک دوست کو فون کیا تھا۔ کچھ دیر تک اس سے گپ شپ ہوتی رہی پھر فون بند کر کے اٹھ گیا۔ جب وہ مکان سے نکلا تو سات بج رہے تھے۔ اسے دروازے سے برآمد ہوتے دیکھتے ہی اس کے دونوں گن مین بھی تیزی سے جیب کی طرف بڑھے تھے۔

شبیر درانی جب گھر گ والی حویلی پہنچا تو ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ حسینہ بیگم، عبدالرحمن درانی والی حویلی ہی میں تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی بڑے ہال کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شبیر درانی ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

”میں نے صوبہ خان کو فون کر دیا تھا۔ وہ سیدھا یہیں آئے گا۔“ شبیر درانی نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ حسینہ بیگم نے جواب دیا اور پھر بھائی سے باتیں کرنے لگی۔

شبیر درانی لا تعلق سا بیٹھا رہا۔ ان کی باتوں سے اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ حسینہ بیگم اپنے بھائی کی بیٹی سے شبیر درانی کے رشتہ کی بات کر رہی تھی اور عبدالرحمن درانی اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ذرا اس معاملے سے منٹ لینے دو اس کے بعد میں اس سلسلے میں بھی سوچوں گا۔“ عبدالرحمن درانی نے جواب دیا اور اس سے پہلے کہ حسینہ بیگم کچھ اور کتنی ملازمہ نے آکر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے۔

عبدالرحمن درانی نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ نو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔

”صوبہ خان ابھی تک نہیں آیا۔ بہر حال، چلو ہم لوگ تو کھانا کھالیں۔“ عبدالرحمن درانی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ میزوں کھانے کی میز پر آگئے اور کھانا شروع کر دیا۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ وہ بڑے کمرے میں آگئے۔ حویلی کے اندر گھر کے افراد اور ملازمین کے چلنے پھرنے اور باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جبکہ حویلی کے باہر سناٹا تھا۔ وقت بڑی ست رفتاری سے گزر رہا تھا۔

ساڑھے دس بج گئے۔ صوبہ خان ابھی تک نہیں آیا تھا شبیر درانی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے صوبہ خان پر بڑی شدت سے غصہ آ رہا تھا۔ یہاں ٹیلی فون نہیں تھا ورنہ وہ اب تک بیسیوں مرتبہ فون کر چکا ہوتا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی پھر کسی گاڑی کے انجن کی بھی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے چند ہی منٹ بعد شبیر درانی کے ایک گمن مین نے اندر آکر انسپکٹر صوبہ خان کی آمد کی اطلاع دی۔

”اسے باہر کیوں روک لیا ہے۔ اندر لے کر آؤ۔ اسی کے انتظار میں تو بیٹھے ہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔

گمن مین تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے چند منٹ بعد صوبہ خان اندر داخل ہوا۔ وہ ایک لمبا تڑنگ آدمی تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کا رنگ توڑے کی طرح کالا تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ اس نے سیاہ رنگ کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ٹوٹھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھوں اور آنکھوں میں جھلکتی ہوئی سرخی نے اس کے رو سیاہ کو اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ شاید تم نہیں آؤ گے۔“ شبیر درانی نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”میں ماحیلو سے تو وقت پر ہی نکلا تھا لیکن راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ صادق آباد سے ایک موٹر کینک کو لے کر جانا پڑا۔ دو گھنٹے تو گاڑی کو ٹھیک کرنے میں لگ گئے۔“ صوبہ خان نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کر عبدالرحمن درانی سے ہاتھ ملایا اور حسینہ بیگم کو سلام کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”لگتا ہے معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین ہے۔ نالکہ بی بی کا کچھ پتہ چلا۔“ اس نے حسینہ بیگم کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ حسینہ بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ”اسی کیتا کی وجہ سے ہمارے خاندان کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور تمہیں اسی لیے بلایا ہے تاکہ اس سلسلے میں تم سے کوئی مدد لی جاسکے۔ لیکن تم پہلے کھانا کھاؤ، میں کھانا گرم کرواتی ہوں۔ بعد میں اطمینان سے بات کریں گے۔“

حسینہ بیگم نے ملازمہ کو بلوا کر صوبہ خان کے لیے کھانا گرم کرنے کو کہا۔ اس دوران وہ نالکہ بی کے حوالے سے صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے کچھ دیر بعد ملازمہ کھانا گرم کر کے دیں لے آئی اور صوبہ خان کے سامنے کافی ٹیبل پر رکھ دیا۔

صوبہ خان قوم کا رائٹرز تھا۔ وہ چولستان کے ایک دور دراز قصبے خان گڑھ کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ ایک چھوٹے سے زمیندار کا کامی تھا۔ ریگستان کی زندگی بڑی ٹھنکن تھی۔ قصبے کے آس پاس کی زمین بھی زیر کاشت تھی۔ اس سے بڑے چاروں طرف ریگستان پھیلا ہوا تھا۔

صوبہ خان نے انھوں نے کلاس تک خان گڑھ ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا کیونکہ قرب و جوار کے کسی قصبے میں ہائی اسکول نہیں تھا۔ صوبہ خان کو پڑھنے کا شوق تھا مگر اس کے باپ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اسے کسی شہر کے اسکول میں داخل کرواتا اور اس کے اخراجات برداشت کرتا۔ اس طرح صوبہ خان بھی ماں باپ کی طرح زمیندار کے گھرانے کی خدمت کرنے لگا۔

اس وقت صوبہ خان کی عمر چودہ سال تھی۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا اور وہ خوب قد نکال رہا تھا۔ انہی دنوں زمیندار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی، خوب تیاریاں ہو رہی تھیں، ڈھیروں جینز بن رہا تھا۔ زمیندار نے غریبوں کا خون چوس چوس کر جو دولت جمع کر رکھی تھی وہ بیٹی کی شادی پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا۔

زمیندار کی بیٹی کی شادی سے صرف تین دن پہلے ڈاکوؤں نے زمیندار کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ صوبہ خان کا باپ اور دو اور کارندے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ زمیندار کے کارندوں کی قربانی کے باوجود ڈاکو سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔

اس واقعہ کے تین ماہ بعد صوبہ خان کی ماں اسے لے کر رحیم یار خان آگئی۔ وہ گھروں میں کام کر کے اپنا اور بیٹے کا پیٹ پالنے لگی۔ صوبہ خان بھی محنت مزدوری کر رہا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے پڑھنا بھی شروع کر دیا۔

میٹرک کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس نے انٹر کا امتحان دیا تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ انٹر میں پاس ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آڑھتی کے پاس ملازمت کر لی لیکن چند ہی روز بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے صوبہ خان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور اسے ہر چیز سے نفرت ہو گئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح شبیر درانی کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا اور اس طرح وہ شبیر درانی تک پہنچ گیا۔

صوبہ خان اونچا لبا جوان تھا۔ حسینہ بیگم اور شبیر درانی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ صوبہ خان ان

کے احسانوں کے بوجھ تلے دھتا چلا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ دولت سے اس کی محبت بڑھتی گئی۔ اسے ہوس ہو گئی تھی وہ ہر جائز و ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید اس کے دل میں پیدا ہونے والا وہ احساس تھا کہ دولت کے بغیر اس دنیا میں سانس لینا بھی دشوار ہے۔ دولت ہی سے عزت ہے اور اس سے دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ دولت نہ ہو تو انسان کو کتے کے برابر بھی نہیں سمجھا جاتا۔

اور پھر ایک روز کراچی کے ایک اخبار میں سندھ پولیس میں بھرتی کا اشتہار شائع ہوا تو اس کے دل میں پولیس میں بھرتی ہونے کا شوق چرایا۔ اس نے حینہ بیگم سے بات کی۔ حینہ بیگم نے نہ صرف اسے اجازت دے دی بلکہ کراچی کی ایک بااثر شخصیت کے نام خط بھی دے دیا۔ لیکن پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے صوبہ خان کو کسی سفارش کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ لمبا ترنگا اور صحت مند جوان تھا اور انٹریاس تھا۔ اسے اے ایس آئی بھرتی کر لیا گیا۔ پولیس اکیڈمی میں ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اسے کراچی ہی کے ایک تھانے میں تعینات کر دیا گیا۔

صوبہ خان ایک بہت سخت گیر پولیس آفیسر ثابت ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے وہ مقصد حاصل کرنا بھی شروع کر دیا جس کے لیے وہ پولیس میں آیا تھا۔ وہ یہی سوچ کر پولیس میں بھرتی ہوا تھا کہ یہاں اسے دولت سمیٹنے کے بے شمار مواقع ملیں گے۔ وہ چالاک آدمی تھا، رشوت کے معاملے میں وہ اپنے ہاتھ پیر ہمیشہ بچائے رکھتا۔

چند سال بعد صوبہ خان سب انسپکٹر ہو گیا۔ وہ ان دنوں بھی کراچی ہی میں تھا کہ ایک رات اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ گشت کے دوران اس نے ایک مشکوک گاڑی کو روکنا چاہا تو کار کے ڈرائیور نے رکنے کی بجائے رفتار بڑھادی۔ صوبہ خان نے جیب پر تعاقب کر کے اس کار کو جالیا۔ کار میں ڈرائیور کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تلاشی لینے پر کار سے دس کلو ہیروئن برآمد ہوئی۔ عالمی منڈی میں اس ہیروئن کی قیمت کروڑوں روپے تھی۔ صوبہ خان کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کار سے اس ہیروئن کے علاوہ دو پستول بھی برآمد ہوئے تھے۔ صوبہ خان نے اپنے دونوں ماتحتوں کے ساتھ فوراً ہی ایک منصوبہ بنالیا اور کار کے ڈرائیور کو گولی مار کر ختم کر دیا۔

ہیروئن عائب ہوئی۔ پچیس کے روز گئے میں یہ رپورٹ درج ہوئی کہ سب انسپکٹر صوبہ خان اور اس کے ساتھیوں نے رات کے وقت گشت کے دوران ایک مشتبہ کار کو روکنے کا اشارہ کیا مگر ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔ جس پر پولیس نے جیب پر اس کا تعاقب کیا۔ کار ڈرائیور نے ان پر قاتلنگ شروع کر دی۔ پولیس کو بھی جوابی کارروائی کرنی پڑی جس کے نتیجے میں کار ڈرائیور مارا گیا۔ کار سے غیر قانونی اسلحہ برآمد ہوا۔ شبہ ہے کہ اس کار ڈرائیور کا تعلق اسلحہ کا ناجائز کاروبار کرنے والے کسی گروہ سے تھا۔

صوبہ خان کے لیے وہ دس کلو ہیروئن فروخت کرنا زیادہ مشکل بہت نہیں ہوا تھا۔ عالمی منڈی میں اس ہیروئن کی قیمت دس کروڑ کے لگ بھگ تھی لیکن صوبہ خان نے وہ ہیروئن ایک منشیات فروش کے ہاتھ صرف ایک کروڑ میں فروخت کر دی۔ دس دس لاکھ اس نے اپنے دونوں ماتحتوں کو دے دیے اور اسی لاکھ روپے خود ہضم کر لیے۔

ہیروئن کے اس سودے کے توسط سے صوبہ خان کے منشیات فروشوں اور اسمگلروں سے بھی تعلقات استوار ہو گئے۔ وہ کمیشن لے کر ان لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے لگا۔ ایک مرجہ کمیشن کے معاملے پر صوبہ خان



کا ایک منشیات فروش سے جھگڑا ہو گیا۔ معاملہ ایک من ہیروئن کا تھا جس کی عالمی منڈی میں مالیت چالیس پچاس کروڑ روپے بنتی تھی۔ منشیات کا وہ اسمگلر صوبہ خان کوکیشن کے طور پر صرف دس لاکھ دے رہا تھا مگر صوبہ خان پچاس لاکھ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ بات بڑھی تو صوبہ خان نے پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ منشیات فروشوں کے اڈے پر چھاپہ مار دیا۔ منشیات فروش غالباً "اس قسم کی صورت حال کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کے دو آدمی مارے گئے جبکہ پولیس کا ایک کانٹیل بھی کام آگیا۔ سب انسپکٹر صوبہ خان بھی زخمی ہوا، اس کے بازو پر گولی لگی تھی۔

باقی منشیات فروش اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس مکان سے ایک من سے زائد ہیروئن، پانچ کلاشکوف رائفلیں، ایک درجن پستول اور ہزاروں کی تعداد میں کلاشکوف کی گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔

اس کارنامے پر صوبہ خان کو انسپکٹر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ اس کے بعد انسپکٹر صوبہ خان کراچی ہی کے مختلف علاقوں میں تعینات رہا پھر اس کا تبادلہ حیدر آباد ہو گیا۔ وہ دو سال تک حیدر آباد میں رہا۔ یہاں اسے کوئی بڑا "کارنامہ" دکھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے تبادلے اندرون سندھ مختلف علاقوں میں ہوتے رہے اور بالاخر دو سال پہلے میرپور ماٹیلو آگیا۔ صوبہ خان کا خیال تھا کہ یہاں اسے بڑے موٹے نذرانوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا لیکن ایک ہی مہینے میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ تو جنت میں آگیا تھا۔ بھارتی صوبہ راجستھان کی سرحد زیادہ دور نہیں تھی۔ یہ علاقہ اسمگلروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پاکستان سے آتا گیوں، چینی، گھی، تیل اور ہر قسم کی اجناس نینوں کے حساب سے سرحد پار پہنچائی جاتی تھیں جبکہ سرحد پار سے بھی ہر قسم کا مال اسمگل کیا جاتا تھا۔ صوبہ خان کے یہاں بھی دارے مارے ہو گئے۔ اسمگلر جھولیاں بھر بھر کر اسے نوٹ دے رہے تھے۔ بھارتی اسمگلر اپنے ساتھ خوبصورت اور حسین لڑکیاں بھی لے کر آتے تھے۔ ان لڑکیوں کی وجہ سے انہیں سرحد پار کرنے میں آسانی رہتی تھی۔

یہاں آنے کے بعد انسپکٹر صوبہ خان کو کچھ شہرت بھی ملی۔ وہ بہت جلد راشی اور اسمگلروں کے سرپرست کی حیثیت سے مشہور ہو گیا مگر صوبہ خان کا کہنا تھا کہ "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔" صوبہ خان کے خلاف بعض محب وطن لوگوں کی رپورٹس اوپر پہنچ رہی تھیں لیکن صوبہ خان کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ اپنے خلاف ان رپورٹوں کا اثر ذرا کم کرنے میں بڑی ذہانت کا مظاہرہ کر رہا تھا کیونکہ یہ بات تو اس نے شروع ہی سے ذہن میں رکھی تھی کہ وہ اکیلا نہیں کھا سکتا، مل بانٹ کر کھانا ہو گا اور وہ اوپر کا حصہ اوپر پہنچا رہا تھا اور اوپر والوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

صوبہ خان پولیس کی ملازمت کے بعد حسینہ بیگم اور شبیر درانی سے ملاقات کے لیے اکثر و بیشتر رحیم یار خان جایا کرتا تھا۔ میرپور ماٹیلو آنے کے بعد تو اس کی آمدورفت میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اسے خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ وہ نالکہ درانی کے بارے میں اخبارات پڑھتا رہتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اس نے نالکہ درانی کے بارے میں سنا تھا تو وہ فوراً "رحیم یار خان پہنچ گیا تھا لیکن شبیر درانی اور حسینہ بیگم نے اصل بات اس سے چھپائی تھی۔ اور اب اسے یقین تھا کہ اسے نالکہ درانی ہی کے سلسلے میں بلایا گیا تھا اور یہاں آتے ہی جب اس نے حسینہ بیگم سے نالکہ کے بارے میں دریافت کیا تھا تو صوبہ خان کے خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔

کھانے کے بعد صوبہ خان نے سگریٹ سلگایا اور جب ملازمہ برتن اٹھا کر لے گئی تو وہ حسینہ بیگم کی

طرف متوجہ ہو گیا۔

”جی بیگم صاحبہ! اب فرمائیے۔ اس ناچیز کو کیسے یاد فرمایا؟“

”نالہ ہم سب کے لیے بہت بڑا خطرہ بن گئی ہے۔“ حسینہ بیگم نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”یہ سب کچھ شبیر کی حماقت سے ہوا ہے۔ اب تک تو صورت حال ہمارے کنٹرول میں تھی مگر اب اس پل کو طے والے گناہم خط نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اگر نالہ کسی طرح پولیس تک پہنچ گئی تو ہمارے لیے قیامت آجائے گی۔ ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ نالہ کا وجود...“

”ہاں۔“ حسینہ بیگم نے صوبہ خان کی بات کاٹ دی۔ ”اس کا وجود ہی تلوار بن کر ہماری شہ رگ پر لٹکا ہوا ہے۔“

”تو آپ چاہتی ہیں کہ نالہ کو ڈسپوز آف کر دیا جائے؟“ صوبہ خان نے کہتے ہوئے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ حسینہ بیگم نے جواب دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ قمر کا صحرا بہت وسیع ہے، اس کے کسی ایک کونے میں نالہ درانی کے لیے جگہ نکل ہی آئے گی۔“

”میں سمجھ گیا۔ لیکن آپ جانتی ہیں یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ حسینہ بیگم بولی۔ ”دولاکھ میں کام ہو جائے گا؟“

”صرف دولاکھ؟“ صوبہ خان نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

حسینہ بیگم خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ انہوں نے صوبہ خان پر بے شمار احسانات کیے تھے اور یہ ایک کام کے لیے ان سے سوڈے بازی کر رہا تھا۔ بالاخر پانچ لاکھ میں معاملہ طے ہو گیا۔

”ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔“ حسینہ بیگم نے دیوار گیر کھاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم ابھی چل دیتے ہیں۔ تم نالہ کو لے کر رات ہی رات میں وہاں سے نکل جانا، ہم حویلی میں رہ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، چلے۔“ صوبہ خان اٹھ گیا۔

اس گفتگو کے دوران عبدالرحمن درانی خاموش ہی بیٹھا رہا تھا۔ سارا معاملہ حسینہ بیگم ہی نے طے کیا تھا۔ اپنے بھائی کو اس نے اس لیے بٹھائے رکھا تھا کہ وہ کسی موقع پر اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔

وہ لوگ حویلی سے باہر آگئے۔ انسپکٹر صوبہ خان کی سفید رنگ کی سان سیڈان گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ صوبہ خان نے پہلے اسٹیرنگ سائیڈ کا دروازہ ان لاک کیا اور پھر حسینہ بیگم کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ حسینہ بیگم ٹھسے سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ صوبہ خان دروازہ بند کر کے اسٹیرنگ کے سامنے آگیا۔

شبیر درانی اور اس کے دونوں گن مین جیب پر بیٹھ چکے تھے۔ پہلے جیب حرکت میں آئی اور اس کے پیچھے صوبہ خان کی کار چل پڑی۔ دونوں گاڑیاں بستی سے نکل کر سڑک پر آگئیں اور تیزی سے رحیم یار خان کی طرف دوڑنے لگیں۔ سنی والا پل سے نکل کر دونوں گاڑی اس سڑک پر مڑ گئیں جو آگے جا کر قوی شاہراہ سے مل گئی تھی۔

آدم صحابہ سے آگے اور صادق آباد سے چند میل پہلے دونوں گاڑیاں دائیں طرف کچے راستے پر مڑ گئیں۔ یہی راستہ سیدھا آموں والی حویلی کی طرف چلا گیا تھا۔

دونوں گاڑیاں حویلی کے گیٹ کے سامنے رک گئیں۔ شبیر درانی جیپ کے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ نائلہ کی نگرانی کے لیے دو محافظ تھے۔ ان میں سے ایک کو حویلی کے باہر ہونا چاہئے تھا اور اسے گاڑیاں دیکھ کر سامنے آ جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور پھر حویلی کے گیٹ کا ایک پٹ تقریباً ”آدھا کھلا ہوا تھا۔“

شبیر درانی کا ماتھا ٹھکا، اس نے جیپ کا ہارن بجایا۔ اس دوران ایک گن مین جیپ سے کود کر گیٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ شبیر درانی جیپ کو اندر لے گیا۔ صوبہ خان کی کار بھی حویلی کے اندر آگئی۔

شبیر درانی کے دونوں محافظ جیپ سے اترنے کے بعد رولڈو اور صدیق کو پکارتے ہوئے برآمدے کی طرف دوڑے۔ شبیر درانی نے بھی انجن چلا چھوڑ کر جیپ سے چھٹانگ لگا دی۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ صوبہ خان اور حسینہ بیگم بھی کار سے اتر کر تیز تیز قدموں سے اس کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

شبیر درانی جیسے ہی راہداری میں داخل ہوا اپنے ایک گن مین سے ٹکراتے ٹکراتے بچا جو بدحواسی سے باہر کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔

”س... سر کار... وہ...“ گن مین ہٹکا کر رہ گیا۔

شبیر درانی اسے ایک طرف دھکا دے کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ جب وہ نائلہ والے کمرے میں داخل ہوا تو دروازے ہی میں اس طرح رک گیا جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔ نائلہ کی نگرانی کے لیے حویلی میں چھوڑا جانے والا ایک محافظ صدیق فرش پر پڑا تھا اور اس کا گن مین اس پر جھکا ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے ہی چارپائی کے نیچے سے ایک پیر جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شبیر درانی نے دوسرے کمرے میں پہنچ کر اس پیر کو نچنے کے قریب سے پکڑ کر باہر پھینچ لیا۔ وہ بریلی کا دوسرا محافظ رولڈو تھا۔ شبیر درانی اسے چھوڑ کر دوبارہ پہلے کمرے میں آگیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نائلہ ایک بار پھر اس کے قفس سے فرار ہو گئی تھی۔

اسی دوران حسینہ بیگم اور صوبہ خان بھی کمرے میں آگئے تھے۔ کمرے کی صورت حال دیکھ کر حسینہ بیگم کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔

”یہ سب کیا ہوا؟“ نائلہ کہاں ہے؟“ حسینہ بیگم کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔

”وہ پھر نکل گئی اور رضیہ...“ شبیر درانی اچانک خاموش ہو گیا اور اپنے گن میتوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔ ”جاؤ دیکھو، رضیہ بھی حویلی میں ہے یا نہیں؟“

دونوں گن مین باہر بھاگ گئے۔ صوبہ خان اس دوران دوسرے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے جھک کر رولڈو کو دیکھا۔ وہ زندہ تھا... صوبہ خان پہلے کمرے میں آگیا اور صدیق کو دیکھنے لگا۔ اس نے کئی بار اس کی نبض ٹٹولی۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور پھر گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ ختم ہو چکا ہے۔“ وہ باری باری شبیر درانی اور حسینہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

صوبہ خان کے منہ سے نکلا ہوا یہ جملہ ان ماں بیٹوں کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ حسینہ بیگم کو یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلتی جا رہی ہو۔ وہ سر کو تیزی سے گھمانے لگی۔ دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر دم سے چارپائی پر گر گئی۔

”یہ کتیا ہمیں پھانسی لگوا کر ہی چھوڑے گی۔“ حسینہ بیگم کے منہ سے کراہ سی نکلی۔  
 ”آپ... اپنے آپ کو سنبھالے بیگم صاحبہ۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”معاذ اب پہلے سی زیادہ ٹھیک ہو گیا۔ یہاں ایک لاش پڑی ہے اور نالہ فرار ہو گئی ہے۔ جو سارے راز جانتی ہے۔“  
 ”لیکن... یہ سب ہوا کیسے؟ یہ دو مشنڈے اسے نہیں سنبھال سکے۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔  
 ”یہ تو رولدو کے ہوش میں آنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا اور نالہ فرار ہونے میں کامیاب کیسے ہوئی؟ مجھے شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے یہ سازش رضیہ کے ساتھ مل کر تیار کی ہوگی۔ میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ شیردرانی غرایا۔  
 ”مجھے اس پر پہلے ہی شبہ تھا۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔ ”میں کئی روز سے تمہیں کہہ رہی تھی کہ اس لڑکی سے بچھا چڑھو، لیکن تم تو ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ وہ قابل اعتماد ہے۔ دیکھ لیا اس کا اعتماد؟“  
 ”بیگم صاحبہ!“ صوبہ خان نے کہا۔ ”یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ یہاں ایک لاش پڑی ہے۔ پہلے اس کے بارے میں سوچئے۔“

”سوچنا کیا ہے۔“ حسینہ بیگم بولی۔ ”اس حرام خور کی لاش کو اٹھا کر نہر میں پھینک دو۔“  
 ”یہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔“ صوبہ خان بولا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ صادق آباد تھانے میں ڈیکیتی کی رپورٹ لکھوادی جائے۔“  
 ”پہلے اسے ہوش میں آنے دو صوبہ خان۔“ شیردرانی نے کہا۔ اس کا اشارہ رولدو کی طرف تھا۔  
 ”اس کے بعد ہی سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔“  
 مزید آدھے گھنٹے بعد رولدو کو ہوش آگیا۔ اس نے ایک فرضی کمائی سادی کہ رضیہ اور نالہ انہیں دھوکا دے کر بھاگ گئی ہیں۔ اسے جب پتہ چلا کہ صدیق ختم ہو چکا ہے تو وہ کانپ کر رہ گیا۔  
 اس کے مزید آدھے گھنٹے بعد شیردرانی کا ایک گن من صادق آباد تھانے میں ڈیکیتی کی رپورٹ لکھوانے چلا گیا۔ اسی وقت حسینہ بیگم اور شیردرانی، صوبہ خان کی گاڑی میں بیٹھ کر رحیم یار خان کی طرف روانہ ہو گئے۔

..... \* \* \* .....

دوسری مرتبہ گھنٹی بجانے پر حویلی کے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا۔ وہ حویلی کا چوکیدار تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے ایک چھوٹے سے سوراخ سے جھانک کر اطمینان کر لیا تھا۔ وہ بازار کے چوکیدار کو پہچانتا تھا اسی لیے وہ دروازہ کھول کر بے دھڑک باہر نکل آیا تھا۔ اس کے کندھے پر آٹومٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔  
 ”کیا بات ہے خان۔ اس وقت تم یہاں کیسے آگئے اور یہ کون ہیں؟“ چوکیدار نے کہتے ہوئے باری باری رضیہ اور نالہ کے چروں کی طرف دیکھا۔ ان دونوں نے اب بھی چوکیدار کی دی ہوئی چادر مشترکہ طور پر لپیٹ رکھی تھی۔

”یہ عورتیں بازار میں پھر رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ رائے صاحب کی مسمان ہیں۔ میں انہیں یہاں پہنچانے آیا۔ تم جانتے ہو آدھی رات کے وقت جوان عورتوں کا اس طرح گھومنا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اور پھر ان کے سروں پر نہ دوپٹے نہ چادر۔“ چوکیدار بولا۔  
 ”کون ہو بھی تم لوگ.... کہاں سے آئی ہو؟ گھر سے بھاگی ہوئی تو نہیں؟“ چوکیدار نے نہیں گھورا۔

”ہمیں رائے منصور صاحب سے ملنا ہے۔ انہیں اطلاع کرو۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”توبہ کرو جی۔“ چوکیدار نے کانوں کو ہاتھ لگا دیے۔ ”میں اس وقت تو رائے صاحب کو جگانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ صبح آتا۔“

”ہم سکھر سے آئی ہیں۔ ہمارا سامان بھی راستے میں چوری ہو گیا۔ یہاں ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ کوئی ہمارا جاننے والا بھی نہیں جس کے گھر رات گزار سکیں۔“ نائلہ درانی نے جواب دیا۔

”رات گزارنے کے لیے میں ایک جگہ بتا دیتا ہوں۔ جس گلی سے ہو کر آئی ہو اسی میں رائے صاحب کا مہمان خانہ ہے۔ یہ خانہ ہمیں بتا دے گا، رات وہیں گزار لو۔ صبح رائے صاحب سے مل لیتا۔“ چوکیدار نے کہا اور پھر ان کے ساتھ آنے والے چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”خانہ! انہیں مہمان خانے میں پہنچا دو۔ عزیز کو آواز دے کر جگا لیتا۔ وہ ان کے لیے ایک کمرہ کھول دے گا۔“

”ہم کیسے نہیں جانیں گے۔ تم اندر جا کر رائے صاحب کو جگا دو۔ ان سے کہنا بتلی آئی ہے۔ وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ نائلہ درانی نے کہا۔

گن مین کسی طرح بھی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن جب نائلہ نے یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے رائے صاحب کو نہ جگایا تو وہ زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیں گی تو گن مین کو طوعاً و کرہاً اس کی بات ماننی پڑی۔

”ٹھیک ہے، تم لوگ ہمیں رکو۔ لیکن اگر رائے صاحب مجھ پر ناراض ہوئے تو میں تم لوگوں کو دھکے دے کر یہاں سے بھاگ دوں گا۔“ چوکیدار کہتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد دروازہ کھلا۔ پہلے چوکیدار باہر نکلا۔ وہ بری طرح سہا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہی رائے منصور باہر آیا تھا۔ اس نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر نائلہ درانی نے اپنے اوپر سے چادر ہٹائی۔

”بہلی تم....“ رائے منصور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تم خیریت سے ہو؟“  
 نائلہ درانی دوڑ کر رائے منصور سے لپٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے سسکیاں سی نکلتی لگیں۔ رائے منصور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”گھبراؤ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ آؤ اندر چلو۔“  
 نائلہ اس سے الگ ہٹ گئی۔ رائے منصور کا گن مین تو بری طرح سہم گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ان لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی، اب کیسے اس کی شامت ہی نہ آجائے.....  
 ”یہ خانہ لالہ... ہمیں قصبے سے یہاں تک لے کر آیا ہے۔ اگر یہ ہماری مدد نہ کرتا تو ہم یہاں تک نہ پہنچ پاتیں۔“ نائلہ نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا بہت شکریہ خان۔“ رائے منصور نے قصبے کے چوکیدار کی طرف دیکھا۔ ”کل دن میں کسی وقت آنا... اور ہاں... ان بچیوں کے بارے میں کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہئے۔ سمجھ گئے نا؟ تم ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“

”سمجھ گیا سرکار۔“ خان لالہ نے جواب دیا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ رضیہ نے جلدی سے چادر اس کے حوالے کر دی تھی۔

رائے منصور، نائلہ درانی اور رضیہ کو اندر لے کر آیا۔ اس نے گن مین کو بھی ہدایت کر دی کہ ان

لڑکیوں کے بارے میں زبان بند رکھی جائے۔  
 باہر کی چار دیواری اور گیٹ دیکھ کر یہی ذہن میں آتا تھا کہ یہ چوہلی بھی زمینداروں کی چوہلیوں کی طرح  
 ہوگی، پرانے طرز کی، لیکن چار دیواری کے اندر تقریباً "پچاس گز آگے جدید طرز تعمیر کا ایک شاندار بنگلہ تھا۔  
 گیٹ سے بچلے تک لان تھا اور بجری کی ایک کشادہ روش بچلے کے پورچ تک چلی گئی تھی۔

وہ وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں آگئے۔ یہ ڈرائنگ روم شہری اور دیہی تہذیب کی عکاسی کرتا ہوا نظر  
 آ رہا تھا۔ آدھا حصہ قیمتی صوفوں اور بہترین جدید ترین فرنیچر سے آراستہ تھا جبکہ باقی آدھے حصے میں دیہی طرز  
 کا خوبصورت فرنیچر سجا ہوا تھا۔ رنگین پیڑھے، سرکنڈے کے موڑھے اور چوکیاں، یہ سب بہت اچھا لگ رہا  
 تھا۔ چھت پر خوبصورت فانوس لٹکا ہوا تھا اور دیواروں پر لائینش لٹکی ہوئی تھیں لیکن وہ کیروسن آئل سے  
 جلنے والی لائینش نہیں تھیں ان میں بلب لگے ہوئے تھے۔

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے اندرونی دروازے سے رائے منصور کی بیوی آصفہ بیگم بھی ڈرائنگ روم  
 میں آگئی۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بھاری بھر کم اور بارعب شخصیت کی مالک اس  
 عورت کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ وہ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوگی۔  
 "ارے بلی تم؟" آصفہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور پریشانی بھی۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے دونوں

ہاتھیں پھیلا دیں۔  
 "آئی! نالکہ درانی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔ آصفہ بیگم اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلا سہ دے رہی تھیں۔  
 پورا گھر جاگ گیا تھا۔ نالکہ، رائے منصور کی بہو سے بھی لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ آصفہ بیگم  
 نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ سردی سے ٹھہر رہی تھیں۔ اس نے دونوں کے لیے کبل منگوا لیے اور وہ دونوں  
 کبل لپیٹ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"یہ لڑکی کون ہے بلی؟" آصفہ نے پوچھا۔  
 "میری ایک بھہر۔" نالکہ نے جواب دیا۔ "میری خاطر اس نے بھی اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی  
 ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو میں ان درندوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔"  
 "ہاں بیٹے۔" آصفہ نے کہا۔ "ابھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دوسروں کی خاطر اپنی زندگیاں

خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔"  
 رضیہ کبل میں لپٹی ہوئی بھی سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ نالکہ کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں  
 تھی۔ اس کے منہ سے تو بات بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ رائے صاحب کی بہو خالدہ ان کے لیے  
 چائے بولائی۔ گرم گرم چائے پینے سے ان کے حواس کچھ بحال ہوئے۔

رائے منصور ایک موڑھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔ وہ نالکہ کے بارے میں  
 ایک ایک بات سے واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ضلع بھر کی پولیس بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں  
 تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نالکہ پولیس کی حراست سے فرار ہونے کے بعد یا تو رحیم یار خان سے نکل گئی تھی یا  
 کسی ایسی جگہ روپوش ہو گئی تھی جہاں سے اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ لیکن یہ انکشاف اس کے لیے بے  
 حد سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ وہ شیردرانی کی قید میں تھی اور اب میری مرتبہ فرار ہوئی تھی۔  
 "میرا خیال ہے اب انہیں آرام کرنے دیا جائے۔ صبح اطمینان اور تفصیل سے بات کریں گے۔"

رائے منصور نے اٹھتے ہوئے کہا پھر وہ نالکہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”پریشان مت ہو۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح بات ہوگی۔“ وہ شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔  
 ”ہاں بیٹی، اب تم لوگ آرام کرو۔ آصف بیگم بھی اٹھ گئی۔ اس نے اپنی بہو خالدہ کو ہدایت کی کہ ان دونوں کو ان کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔“

خالدہ انہیں ایک کمرے میں لے آئی جہاں کنگ سائز کا ڈبل بیڈ بچا ہوا تھا۔ اس نے دو لحاف لاکر بستر پر رکھ دیئے اور شب بخیر کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ نالکہ اور رضیہ ابھی تک سردی سے ٹھنڈی تھیں۔ سردی دراصل ان کی ہڈیوں میں اتر گئی تھی۔ وہ ایک ہی لحاف میں گھس کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ لحاف میں دیکھی بھی وہ کچھ دیر تک ٹھنڈی رہیں۔ پھر لحاف کی گرمی اور ایک دوسرے کے جسوں کی حرارت سے ان کی ٹھنڈی کم ہونے لگی۔ اور پھر وہ دونوں سو گئیں۔

صبح دس بجے ابیں جگایا گیا۔ گھر والے صبح سویرے ہی ناشتہ کر چکے تھے۔ ان کے لیے ناشتہ بنوایا گیا۔ رائے منصور اس وقت گھر پر نہیں تھا لیکن تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ بھی آگیا۔ اور وہ لوگ ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ البتہ ان کی بہو خالدہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔  
 ”ہاں بھئی، اب بتاؤ... یہ سب کچھ کیا ہے؟“ رائے منصور نے نالکہ درانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 نالکہ درانی نے اپنے اغواء کی کوشش اور پیٹ میں گولی لگنے سے اب تک کے واقعات پوری تفصیل سے بتادیئے۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔

”تین دن پہلے بھوپچی اور شبیر نے مجھ سے نکاح نامہ اور جائیداد کے کاغذات پر دستخط کروانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے وہ کاغذات پھاڑ کر پھینک دے جس پر انہوں نے میرے قتل کا منصوبہ بنالیا اور صوبہ خان نامی کسی آدمی کو پیغام بھجوایا ہے کہ وہ مجھے یہاں سے لے جا کر قتل کر دے اور میری لاش تھر کے صحرائیں کہیں پھینک دی جائے۔“

”صوبہ خان۔“ رائے منصور کی بھنویں سکڑ گئیں۔ ”میرا خیال ہے کہ راگنڈرات کا یہ شخص پولیس انسپکٹر ہے اور میرا پورا تھیلومیں ہے۔ بہت بدنام آدمی ہے، لیکن ان لوگوں کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“  
 ”ان کے تعلقات تو ایسے ہی بدنام لوگوں سے ہو سکتے ہیں۔“ نالکہ درانی نے کہا۔

”کل رات تم کہاں سے فرار ہوئی تھیں۔ میرا مطلب ہے وہ حویلی کہاں ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”صادق آباد سے چند میل دوسری طرف۔ وہ حویلی آموں کے باغ میں واقع ہے۔ آموں کا وہ باغ بھی کچھ عرصہ پہلے ہی شبیر درانی نے خریدا تھا۔“ نالکہ نے بتایا۔

”تو میرا خیال درست نکلا۔“ رائے منصور بولا۔  
 ”کیا مطلب؟“ نالکہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پورے علاقے میں یہ خبر پھیلی ہوئی ہے کہ کل رات اس حویلی پر ڈاکوؤں نے ہلہ بول دیا تھا وہ حویلی میں موجود دو آدمیوں میں سے ایک کو قتل کر کے بھاگ گئے۔“ رائے منصور نے بتایا۔

”قت.... قتل....“ نالکہ ہکلا کر رہ گئی۔ ”لیکن... ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ ہم نے تو ان دونوں کو بے ہوش کر دیا تھا۔“

”میں نے ڈاکوؤں کی بات کی تھی۔“ رائے منصور مسکرا دیا۔ ”شبیر درانی کے بارے میں تم نے جو کچھ

بھی بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ آج صبح حویلی آیا ہو اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ تم فرار ہو گئی ہو تو اس نے طیش میں آکر اپنے ایک آدمی کو مار ڈالا ہو۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ اب تک کئی بے گناہوں کو قتل کر چکا ہے۔“

”نائلہ بیٹی۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”صورت حال بے حد سنگین ہے۔ میں اخبارات میں سب کچھ پڑھتا رہا ہوں۔ تم پر ایک دو نہیں کئی افراد کے قتل کا الزام ہے۔ اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو اور قانون کا سارا لے کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن یہ پراسس اتنا طویل ہوگا کہ تمہاری ساری زندگی سلاخوں کے پیچھے ہی گزر جائے گی۔ ایک ریٹائرڈ فوجی اور قانون پسند شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے تمہیں یہی مشورہ دینا چاہئے تھا لیکن میں تمہیں ایسا مشورہ نہیں دوں گا کیونکہ تم بے گناہ ہوتے ہوئے بھی جیل میں رہو گی۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے کی بجائے پولیس سے دور رہ کر اپنی بے گناہی اور شبیر درانی کے جرائم کے ثبوت جمع کرو۔ ایسی صورت میں تمہیں بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا ہوگا۔ ایک طرف قانون اور دوسری طرف شبیر درانی۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرتی ہو۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں اسی طرح....“

”نہیں بیٹی۔“ رائے منصور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں اپنی بیٹی کو اس دشت جنوں میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جو بھی فیصلہ کرو گی میں اس کے مطابق ہی چلوں گا۔“

”میں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتی انکل۔“ نائلہ درانی نے جواب دیا۔ ”آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ میری ساری زندگی جیل میں گزر جائے گی لیکن کیس ختم نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس جیل کی چار دیواری سے باہر رہ کر میں بہت کچھ کر سکوں گی۔ آپ جانتے ہیں میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ مجھے صرف پیر ٹکانے کا موقع چاہئے۔“

”ٹھیک ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”تو اب تم اپنے آپ کو تنہا نہیں پاؤ گی۔ میں آج ہی رحیم یار خان میں اپنے وکیل کو فون کرتا ہوں بلکہ اسے یہیں بلوا لیتا ہوں وہ اس سلسلے میں ہماری خاصی مدد کر سکتا ہے۔“

”شکریہ انکل۔“ نائلہ نے پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا۔ ”آج تک میں بھاگتی رہی ہوں لیکن اب ان لوگوں کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دوں گی۔“

”یہ خیال میرے ذہن میں بھی ہے کہ انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے۔“ رائے منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں آج ہی دلاور کو بھی بلوا لیتا ہوں۔ شبیر درانی کو تو وہ نچائے رکھے گا۔“

”یہ دلاور کون ہے انکل؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ہے ایک نوجوان، بڑا جی دار ہے۔ اگر پڑھ لکھ کر اس نے سیدھا راستہ اپنایا ہوتا تو کچھ اور ہوتا لیکن اب... بہر حال چھوڑو اس قصبے کو، میں خود ہی منٹ لوں گا۔ اب تم لوگ اپنی آغوش کے ساتھ گپ شپ کرو۔ میں ایک دو کام نمٹا ہی لوں۔“ رائے منصور کہتے ہوئے اٹھ کر اپنے اسٹڈی روم میں آگیا۔

یہ کمرہ بھی خاصا وسیع و عریض تھا۔ ایک طرف شیشے کے ٹاپ والی رائفنگ ٹیبل تھی جس پر دیگر چیزوں



کے علاوہ ایک خوبصورت آرک لیپ بھی رکھا ہوا تھا۔ لیپ کے ساتھ ہی ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ ٹیلی فون صادق آباد ایکسچینج کے ذریعے این ڈبلیو ڈی سے منسلک تھا۔

کمرے کی دیواروں پر خوبصورت شیلٹ بنے ہوئے تھے جن کے سامنے شیشے لگے ہوئے تھے۔ شیلٹوں میں بڑے سبقت سے کتابیں جچی ہوئی تھیں۔ ایک شیلٹ قدرے بڑا تھا اور اس میں رائے منصور کے وہ تحفے اور میڈلز وغیرہ سجے ہوئے تھے جو اس نے فوجی زندگی میں بہادری کے کارناموں اور اعلیٰ خدمات کے عوض حاصل کیے تھے۔

رائے منصور نے کرسی پر بیٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا اور رحیم یار خان میں اپنے وکیل کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

رائے منصور دوسرے زمینداروں سے مختلف تھا۔ وہ اپنے سے زیادہ اپنے مزارعین کا خیال رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اسے جو کچھ بھی مل رہا ہے مزارعین کی محنت و مشقت کی بدولت ہی مل رہا ہے۔ یہ بہتی اس نے اپنے مزارعین کے لیے بنائی تھی۔ بہتی کی تمام گلیاں پختہ تھیں۔ اس بہتی کے لیے اس نے اپنے خرچ پر احمد پور لاما سے یہاں تک بجلی کی لائن بچھوائی تھی اور ٹیلی فون کی لائن یہاں تک لانے کے لیے بھی اس نے اپنے ہی پلے سے خرچ کیا تھا۔ اس کے مزارع اس سے خوش تھے نہ تو انہوں نے کبھی کوئی بدعنوانی کی تھی اور نہ ہی وہ اسے چھوڑ کر کہیں اور جانے کا تصور کر سکتے تھے۔

ٹیلی فون کال دوسری گھنٹی پر ہی ریسیو ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سے ڈاکٹر علی ایڈووکیٹ کا کلرک بول رہا تھا۔

”رائے منصور بول رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب سے بات کراؤ۔“ رائے منصور نے کہا۔  
”وہ تو کچھری گئے ہو گئے ہیں جناب۔ کوئی پیغام دینا چاہتے ہوں تو بتا دیجئے۔ وہ جیسے ہی آئیں گے انہیں بتادیا جائے گا۔“ کلرک نے جواب دیا۔

”ان سے کہنا آج شام کو میرے پاس آجائیں۔ ایک اہم معاملے پر ان سے بات کرنی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”جی بہتر ہے۔ میں انہیں پیغام دے دوں گا۔“

”صرف پیغام ہی نہیں دیتا۔ یہ تاکید بھی کرنی ہے کہ وہ شام کو یہاں پہنچ جائے۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔“ رائے منصور نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر اسٹڈی روم سے باہر آگیا۔ آصفہ، نائلہ اور رضیہ ابھی تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رائے منصور ان کی طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ پورچ میں اس کی پاجیو کھڑی تھی۔ وہ برآمدے میں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مالی لان میں پودوں میں سے فالٹو جھاڑیاں نکال رہا تھا وہ رائے منصور کو برآمدے میں دیکھ کر اس طرف آگیا۔

”دارا کہاں ہے، بلاؤ اسے۔“ رائے منصور نے کہا۔

مالی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ تقریباً ”دس منٹ بعد ایک لمبا تڑنگا سا آدمی گیٹ میں داخل ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔

”آپ نے یاد فرمایا سرکار؟“

”ہاں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ دلاور کہاں مل سکتا ہے؟“ رائے منصور نے کہا۔

”دلاور!“ دارا چونک گیا۔ وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ رائے منصور کو دلاور جیسے شخص سے کیا کام

”دلادو!“ دارا چونک گیا۔ وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ رائے منصور کو دلادو جیسے شخص سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ ”وہ تو کل دہر صادق آباد گیا تھا سرکار۔“

”کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دو کہ وہ آج شام یہاں آجائے۔“ رائے منصور نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”نہیں، کسی اور کو بھیجنے کی ضرورت نہیں تم خود چلے جاؤ۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں نے اسے بلایا ہے۔“

”سمجھ گیا سرکار۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”میں ابھی جا رہا ہوں۔“

”ہاں۔ فوراً روانہ ہو جاؤ ایسا نہ ہو وہ کسی اور طرف نکل جائے۔“ رائے منصور نے کہا۔ دارا کے جانے کے بعد اس نے مالی کو بلالیا۔ ”احمد پور لاما کے بازار کا چوکیدار آئے گا۔ اسے میں نے بلوایا ہے وہ آئے تو مجھے بتادینا۔“

”جی سرکار۔“ مالی نے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

رائے منصور کچھ دیر برآمدے میں کھڑا رہا پھر برآمدے سے اتر کر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور بستی کی ایک گلی سے ہوتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔

نائلہ اور رضیہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی آصف بیگم سے باتیں کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد رضیہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ آصف بیگم کہہ رہی تھیں۔

”میں تمہاری چھوچی کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ میں کئی مرتبہ اس سے مل چکی ہوں۔ اس کی باتوں سے بھی کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ تمہارے خلاف اس قسم کے عزائم رکھتی ہے۔ وہ تو ہمیشہ تمہاری تعریفیں کیا کرتی تھی۔“

”یہ اس وقت کی بات ہے جب ابو حلیف تھے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے بڑے میرے رشتے کی بات کی تھی لیکن ابو ثال مٹول سے کام لیتے رہے۔ ابو کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ میں نے زہرہ بستی اپنے بیٹے سے میرا نکاح پڑھوانے کی کوشش کی تھی لیکن میں بھاگ کر لاہور چلی گئی تھی۔ وہ صل اس شادی کے ذریعے میری دولت و جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ میرے پیچھے لاہور بھی گئی اور مجھے آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب بالاخر میں نے صاف انکار کر دیا تو اس کا رویہ بتدریج بدلتا گیا۔ تاپا، ابو سے زمین کا مقدمہ ہار گئے تھے۔ انہیں دو مرحلہ زمین ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس تھا۔ یہ بھی حینہ بیگم نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہیں زمین کا لالچہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔“

”خون کے رشتے کی ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رہی۔ حینہ بیگم ہر قیمت پر میری جائیداد پر قبضہ ہونا چاہتی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے قتل کرنے کا بھی منصوبہ بنالیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میری موت کے بعد وہی لوگ میری جائیداد کے وارث قرار پائیں گے لیکن میں ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گی۔“

”اچھا ہوا تم یہاں آگئی ہو۔ اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے اکل ٹٹ لیں گے ان لوگوں سے۔“ آصف بیگم نے کہا۔

”ان لوگوں سے تو میں ہی نمٹوں گی۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے ان لوگوں سے ان بے گناہوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لینا ہے جنہیں بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ میں انہیں سکھ کا سانس نہیں لینے دوں گی۔“

”اللہ کی لاشی بے آواز ہے بیٹا۔“ آصف بیگم نے کہا۔ ”اگر وہ تمہارے انتقام اور دنیاوی قانون سے بچ بھی جائیں تو قانون قدرت سے کبھی نہیں بچ سکیں گے۔ اچھا، اب اٹھ جاؤ یہاں سے۔ سوچ سوچ کر اپنا داغ خراب مت کرو۔ جاؤ۔۔۔ خالده کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاؤ۔۔۔ اپنے آپ کو مصروف رکھو۔ اس طرح تمہارا ذہن پر اگندہ نہیں ہوگا۔“

نالکہ درانی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اٹھنے کے بجائے آصف کی گود میں سر رکھ دیا۔ آصف بیگم اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ نالکہ کو بڑا سکون مل رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ماں کی آغوش میں آگئی ہو۔ آصف بیگم بھی پیار سے اس کا سر سلاتی رہی۔ اسے نالکہ پر بہت ترس آرہا تھا۔ ناز و نعم میں پلٹی ہوئی بچی اپنی جان کے خوف سے بھاگی پھر رہی تھی۔ وہ بہت دالی تھی جو موت کے منہ میں جا جا کر لپٹ رہی تھی۔

آصف بیگم نے نالکہ کو اپنی گود سے اٹھانا چاہا تو پتہ چلا کہ نالکہ سو گئی تھی۔ اس نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بڑے پیار سے نالکہ کا سر سلاتی رہی۔ تقریباً ”پون گھنٹے بعد خالده اندر داخل ہوئی۔ وہ کچھ کن چاہتی تھی مگر آصف بیگم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نالکہ اس کی آواز سن کر اٹھ جائے۔ نالکہ کو آصف بیگم کی آغوش میں سر رکھے ہوئے دیکھ کر خالده خاموشی سے باہر نکل گئی اور آصف بیگم نالکہ پر متاخم اور کتنی رہی۔

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ نالکہ آصف بیگم کی گود میں سر رکھے سوئی رہی پھر کچن میں ملازمہ سے کوئی برتن گر کر ٹوٹا۔ چمٹا کے کی آواز سے نالکہ گڑبڑا کر اٹھ گئی اور متوحش لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”اوہ آئی!“ وہ آصف بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں شاید آپ کی گود میں سر رکھے ادکھ گئی تھی۔“

”ادکھ نہیں گئی تھیں، تم میری گود میں سر رکھے پورے ڈیڑھ گھنٹے تک سوئی رہی ہو۔“ آصف بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”نیند آ رہی ہے؟ جاؤ کمرے میں جا کر سو جاؤ۔۔۔“

”نہیں آئی۔ آپ کی گود میں سر رکھتے ہی مجھے یوں لگا تھا جیسے میں ماں کی آغوش میں آگئی ہوں۔ بڑا سکون مل رہا تھا۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

”میں تمہاری ماں ہی تو ہوں۔“ آصف بیگم نے کہتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لیا پھر وہ اٹھ گئی۔ ”میرا ذرا کچن میں جا کر دیکھوں کہ کہاں نے کیا توڑا ہے۔“

آصف بیگم کچن کی طرف چلی گئی اور نالکہ صوفے پر بیٹھی دیر تک آصف بیگم کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے آج بڑی شدت سے اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر خالده کے کمرے میں آگئی جو کسی کپڑے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ نالکہ سامنے بیٹھ کر اسے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ایڈووکیٹ ڈاکٹر علی شام سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ رائے منصور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ پتہ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر رائے منصور اصل موضوع پر آگیا۔

”نالکہ درانی کے بارے میں کیا جانتے ہو ڈاکٹر علی؟“

”نالکہ درانی؟“ ڈاکٹر علی چونک گیا۔ ”اس کے بارے میں تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ قتل جیسے سنگین جرم میں ملوث ہے اور پولیس کو مطلوب ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ نالکہ درانی نے کوئی جرم نہیں کیا تو تم کیا کہو گے؟“ رائے منصور نے اس کے چہ

نظر میں جاتے ہوئے کہا۔

”اگر اس نے کوئی جرم نہیں کیا تو وہ روپوش کیوں ہے؟“ ذاکر علی بولا۔

”اس کے خلاف تمام الزامات جھوٹے ہیں۔ اسے ایک سازش کے تحت پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس پر صادق نامی جس شخص کے قتل کا الزام عائد تھا وہ نائلہ کے ہاتھوں نہیں، پولیس کے ہاتھوں مرا ہے۔ انسپکٹر اعظم نے اسے گولی ماری تھی لیکن راز فاش ہو جانے کے خوف سے اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ یا پھر نائلہ جانتی ہے کہ صادق کو اس نے نہیں مارا تھا۔ وہ تو صادق کو جانتی تک نہیں تھی۔“

”ایسی صورت میں وہ عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کر سکتی تھی۔ اسے اپنے آدمیوں کی مدد سے پولیس کی حراست سے فرار ہونے کی ضرورت کیا تھی۔ اس کا ردوائی میں کم از کم چھ آدمی مارے گئے تھے۔ اس طرح نائلہ درانی پر نہ صرف پہلا جرم کنفرم ہو گیا بلکہ اپنے آدمیوں کی مدد سے پولیس گاڑی پر حملہ اور کئی آدمیوں کے قتل کا الزام بھی لگ گیا۔“ ذاکر علی نے کہا۔

”میں سے تو صورت حال جھڑپی ہے۔ پولیس کی گاڑی پر حملہ نائلہ کے آدمیوں نے نہیں کیا تھا۔ یہ بھی اس کے خلاف ایک گھٹاؤنی سازش تھی تاکہ وہ اسی دلدل میں مزید دھنس جائے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ ذاکر علی نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پولیس پارٹی پر حملہ ایک اور پارٹی نے کیا تھا اور وہی نائلہ کو فرار کروا کر لے گئے تھے۔ نائلہ روپوش نہیں ہوئی تھی اسے غائب کیا گیا تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”لیکن قدم قدم پر نائلہ درانی کے جراتم اور ان کی شہادتیں موجود ہیں۔ چند روز پہلے پولیس کو خیر گڑھ کے قریب ریگستان میں دو لاشیں ملی تھیں جنہیں گولیوں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ بعد میں پولیس کو وہ راتفل بھی مل گئی تھی جس سے انہیں قتل کیا گیا تھا بلکہ پولیس کو تین راتفلیں ملی تھیں اور تینوں پر نائلہ درانی کی گولیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔“

”یہ سب کچھ نائلہ کو فریم کرنے کے لیے کیا جاتا رہا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نائلہ درانی کا ان جرائم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تو اپنی جان بچانے کے لیے اپنے دشمنوں سے چھٹی پھر رہی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”اور اس کے دشمن کون ہیں؟“ ذاکر علی نے پوچھا۔

”یہ میں فی الحال نہیں بتا سکتا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”لیکن تمہیں میں نے اس لیے بلایا ہے کہ نائلہ درانی کے کیس کا جائزہ لو۔ اس کیس کے حوالے سے جہاں سے بھی کچھ معلوم ہو سکتا ہے معلوم کرو۔ کوئی معمولی سے چھوٹی بات بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہئے اور اپنی قانونی کتابیں کھنگال کر یہ بھی دیکھو کہ ان بات میں نائلہ درانی کی ضمانت ہو سکتی ہے یا نہیں؟“

”ضمانت تو مجھے مشکل ہی نظر آتی ہے۔ اس کے خلاف قتل کے کئی کیسز میں ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ میں بہر حال جائزہ لوں گا ممکن ہے کوئی قانونی موٹنگالی کوئی راستہ دکھا دے۔“

”نائلہ پر سب سے پہلا الزام صادق نامی اس شخص کے قتل کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نائلہ نے چند روز پہلے اسے اپنے محافظ کے طور پر ملازم رکھا تھا اور پھر اسے اپنے تایا کو قتل کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انکار کرنے پر نائلہ نے اسے گولی ماری۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ شخص کتنا تھا، کہاں رہتا تھا اور نائلہ سے اس کا کیا تعلق تھا؟ کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں؟ اخراجات کی فکر مت

کرنا۔ میری ساری زمینیں بھی بک جائیں تو مجھے پرواہ نہیں ہوگی۔ میں نائلہ درانی کے خلاف اس گھناؤنی سازش کے پیچھے اصل مجرموں کو سامنے لانا چاہتا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ نائلہ درانی اس وقت کہاں ہے؟“ ایڈووکیٹ ذاکر علی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے اس کا پیغام ملا تھا۔ وہ جان کے خوف سے کسی نامعلوم جگہ پر روپوش ہے۔ وہ میرے دوست کی بیٹی ہے۔ میں اس کے لیے پریشان تھا۔ یہ پیغام ملنے کے بعد میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اس کی قانونی مدد کر سکوں۔ میں اسے باعزت طور پر عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہم قدم بہ قدم آگے بڑھیں گے۔ پہلے صادق کے بارے میں معلومات جمع کرو اس کے بعد ان لوگوں کا سراغ لگایا جائے گا جنہوں نے پولیس کی گاڑی پر حملہ کر کے نائلہ کو چھوڑ دیا تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ایک دو دن میں یہ سب کچھ معلوم کر لوں گا۔“ ذاکر علی نے کہا۔

”تو اب مجھے اجازت!“

”بہتر ہے۔“ رائے منصور نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ذرا احتیاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”آپ مطمئن رہئے۔“ ایڈووکیٹ ذاکر علی یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

ایڈووکیٹ ذاکر علی کے جانے کے بعد رائے منصور نے نائلہ کو ڈرائنگ روم میں بلالیا اور اسے ذاکر علی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔

”یہ پتہ چل جائے کہ صادق نامی وہ شخص کون تھا تو ہمیں قدم آگے بڑھانے میں بہت آسانی ہو سکتی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”یہ بھی معلوم کرنا چاہئے کہ مجھے زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچانے والا کون تھا؟ ممکن ہے یہ صادق نامی وہی شخص ہو جسے انسپٹر اعظم نے شبیر درانی کی سازش سے موت کے گھاٹ اتار کر اس کے قتل کا الزام میرے سر پر عائد کر دیا۔“ نائلہ نے کہا۔

”ذاکر علی ذہین آدمی ہے۔ مجھے اس پر مکمل بھروسہ ہے۔ وہ کسی بات کو نظر انداز نہیں کرے گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”لیکن ایک اور تعین صورت حال سامنے آئی ہے۔ وہ یہ کہ خیر گڑھ کے قریب ریگستان میں جو دو لاشیں پائی گئی تھیں انہیں جن رائفٹوں سے گولیاں ماری گئی تھیں ان پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے کچھ الجھن پیدا کر سکتی ہے۔“

”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ سوزوکی ڈرائیور کو شبیر درانی کے گمن مین نے ہلاک کیا تھا اور درانی کا دوسرا گمن مین خود شبیر کی گولی سے مرا تھا۔ بعد میں میں نے شبیر درانی اور اس کے زندہ بچ جانے والے گمن مین کو بے بس کر کے ان تینوں رائفٹوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح ان تینوں رائفٹوں پر میری انگلیوں کے نشان رہ گئے ہوں گے۔ لیکن ہر حال ایک مرحلہ طے ہو جائے تو اس مسئلے کا حل بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

اسی دوران دارا نے آکر اطلاع دی کہ دلاور کو پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ رات نو بجے تک یہاں پہنچ جائے گا۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ رائے منصور باہر چلا گیا اور نائلہ کچن میں آگئی جہاں خالدہ رات کا کھا:

پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔  
رات نو بجے انہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ  
دارا نے دلاور کے آنے کی اطلاع دی۔

”اسے مسمان خانے میں بیٹھاؤ۔ میں آتا ہوں۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔  
دارا واپس ہو گیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد رائے منصور بھی اٹھ کر باہر چلا گیا۔ نائلہ درانی سوچنے لگی  
کہ دلاور کون ہے اور رائے منصور اس سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ جیسے جیسے سوچتی رہی اس کا ذہن الجھتا  
چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد خالدہ، نائلہ اور رضیہ کو اپنے کمرے میں لے آئی اور انہیں وہ کپڑے دکھانے لگی جن پر  
اس نے خود کڑھائی کی تھی۔ بڑے اچھے ڈیزائن تھے اور بڑی نفاست سے کام کیا گیا تھا۔  
تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے بعد ملازمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”ہلی بی بی۔“ آپ کو صاحب بار ہے ہیں ڈرائنگ روم میں۔ ان کے ساتھ دلاور بھی بیٹھا ہے۔“  
نائلہ درانی ایک گھبراہٹ سے لیتے ہوئے اٹھ گئی۔ دلاور کے لیے اس کے دل میں ایک عجیب سا تجسس  
پیدا ہو چکا تھا۔ وہ جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو رائے منصور سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ دلاور  
جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کی پشت اس کی طرف تھی۔

”آؤ نائلہ بی بی۔“ رائے منصور بولا۔ ”میں دلاور کو یہیں لے آیا ہوں۔ میں نے اسے صورت حال  
سمجھا دی ہے۔ اب تم بھی بات کرلو۔“

نائلہ درانی غوم کر اس صوفے کے سامنے آگئی جس پر دلاور بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے آکر نائلہ اس طرح  
رک گئی جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لئے ہوں۔ دلاور بھی اسے دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔  
نائلہ درانی کی نظریں دلاور کے چہرے پر مرکوز تھیں اور اس کے دل کی دھڑکن گزرنے والے ہر لمحہ  
کے ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

...●...●...●...

”سلام نائلہ بی بی!“ دلاور کا ہاتھ پیشانی کی طرف اٹھ گیا۔ ”بیٹھے نا، آپ کھڑی کیوں ہیں اور مجھے اس  
طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟“

”اوہ! کچھ نہیں۔“ نائلہ درانی چونک گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ خواب سے جاگی ہو۔ وہ رائے  
منصور کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں بدستور دلاور کے چہرے پر مرکوز تھیں، گورا چٹا رنگ،  
اوپر کے پورے ہونٹ پر پھلتی ہوئی بھاری مونچھیں اور سیاہ گھنگھریالے بال، مضبوط گٹھا ہوا جسم اور قد چھ  
فٹ سے گسی طرح بھی کم نہیں رہا ہو گا۔ وہ مردانہ وجاہت کا ایک بہترین شاہکار تھا۔ اور نائلہ درانی کو یوں  
محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل و دماغ کو دلاور کے حسن و جمال نے جکڑ لیا ہو۔

وہ نائلہ درانی کو اس طرح اپنی طرف دیکھتے پا کر جزبہ سا ہو گیا، اس نے مڑ کر رائے منصور کی طرف  
دیکھا اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”نائلہ بی بی!“ رائے منصور نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ دلاور ہے۔ میں نے اسے تمہارے  
بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کر دیا ہے۔ یہ دشمنوں کو نچانے میں بڑی مہارت رکھتا ہے اور میرے لئے ہر

لحاظ سے قابل اعتماد ہے۔ تم جو کچھ چاہتی ہو اسے کھل کر بتا دو۔ اس کے بعد یہ سب کچھ خود ہی سنبھال لے گا۔ تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں ابھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔“

رائے منصور اٹھ کر ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ نائلہ درانی اب بھی گہری نظروں سے دلاور کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”رائے صاحب نہ بھی بتاتے تو میں تمام حالات سے واقف تھا۔ صرف اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ آپ قید و بند کی صعوبتیں اور شبیر درانی کی سختیاں برداشت کرتی رہی ہیں۔ میں شبیر درانی کو ایک بہادر آدمی سمجھتا تھا لیکن اس کی ان حرکتوں نے میرے دل میں اس کے لئے نفرت پیدا کر دی ہے۔ اب آپ کیا چاہتی ہیں؟ اپنے دشمن کو ایک ہی وار میں ملیا میٹ کرنا چاہتی ہیں یا قسطوں میں؟“ دلاور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شبیر درانی اور اس کی ماں نے مجھے بڑے زخم لگائے ہیں۔ میں زخمی ہرنی کی طرح اس دشت جنور میں بھاگتی پھر رہی ہوں۔ میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ اور جن لوگوں نے مجھے پناہ دی بھی تو انہیں بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا انہیں زندہ جلا دیا گیا۔ ان بے گناہوں اور معصوم لوگوں کے جینیں آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ آج مجھے سنبھلنے کا موقع ملا ہے۔ میں انسانیت کے ان دشمنوں کو ایک دم سے تباہی کے غار میں دھکیلنا نہیں چاہتی۔ میں انہیں کچوکے لگا لگا کر سسکا سکا کر مارنا چاہتی ہوں۔ لیکن...“ نائلہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”جی کہتے نائلہ بی بی، آپ اور کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم کون ہو؟“ نائلہ نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”اکھل نے مجھے تمہارا صرف نام بتایا ہے۔ لیکن تم ہو کون؟ میرے دشمنوں سے انتقام کیوں اور کیسے لو گے؟“

”کیوں اور کیسے کا مسئلہ میرا ہے۔ اسے میرے لئے ہی رہنے دیں۔ اور باقی رہا یہ سوال کہ میں کون ہوں؟ یہ سوال پہلی مرتبہ مجھ سے پوچھا گیا ہے۔ آج تک کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟ آپ کی زبان سے یہ سوال بڑا عجیب سا لگا ہے۔ اس کا جواب آپ کو خود بخود مل جائے گا۔ آنے والا وقت بتا دے گا کہ میں کون اور کیا ہوں؟“ دلاور نے جواب دیا۔

نائلہ درانی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ رائے منصور ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ اٹھا رکھا تھا جسے انہوں نے صوفے کے سامنے کافی ٹیبل پر رکھ دیا۔

”ہاں بیٹی! کچھ ملے ہوا؟“ رائے منصور نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”جی رائے صاحب!“ دلاور نے جواب دیا۔ ”میں نائلہ بی بی کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ آپ مطمئن رہئے۔ میں انہیں اس طرح نچا تا رہوں گا کہ انہیں سکھ کا سانس لینے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”ایک بار کا خیال رکھنا دلاور۔“ رائے منصور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ نائلہ بعض سنگین کمبیز میں پولیس کو مطلوب ہے اور پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ تمام الزامات جھوٹے ہیں۔ ہم قانونی پہلوؤں سے اس صورت حال کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جیسے ہی مناسب سمجھیں گے نائلہ کو سامنے لے آیا جائے گا لیکن اس وقت تک...“

”آپ مطمئن رہئے رائے صاحب!“ دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے برسوں آپ کا نمک کھایا ہے۔ اور ویسے بھی ہم جیسے لوگوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ دھوکا یا فریب میری سرشت میں شامل

نہیں ہے۔ میں آپ کے اعتماد کو مخفی نہیں پہنچاؤں گا۔ یہاں ناملہ بی بی کی موجودگی کا کسی کو علم نہیں ہوگا۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے۔ تم پر بھروسہ نہ ہوتا تو تمہیں کبھی نہ بلاتا۔“ رائے منصور نے کہا پھر میز پر بڑے ہوئے پکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال اخراجات کے لئے یہ رکھ لو۔ مزید ضرورت ہو بتا دیتا۔“

”رائے صاحب!“ دلاور نے بڈل اٹھا کر واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے طے کر رکھا ہے کہ میری گردن اپنے احسانوں کے بوجھ تلے دبائے رکھیں گے۔“ اس نے صوفے کی سائیڈ میں رکھی ہوئی کلا شکوفہ رانقل اٹھالی۔

ناملہ درانی نے وہاں رکھی ہوئی رانقل پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ دلاور نے اٹھ کر رانقل کندھے سے نکالی اور صوفے پر پڑی ہوئی گرے رنگ کی گرم شال اٹھا کر اوڑھنے لگا۔ اس نے پیشانی کی طرف ہاتھ اٹھا کر دونوں کو سلام کیا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”دلاور کون ہے انکل؟ آپ نے اس کے بارے میں پہلے بھی کچھ نہیں بتایا تھا“ ناملہ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے رائے منصور کی طرف دیکھا۔

”دلاور!“ رائے صاحب کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر ناملہ کو دلاور کے بارے میں بتانے لگے۔

دلاور کا باپ رحمت اللہ درمنہار میں اسکول ماسٹر تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ دلاور اور ایک بیٹی عمینہ، دلاور اپنی بہن سے دو سال بڑا تھا۔ اس نے پرائمری تک تو پڑھ لیا تھا لیکن آگے پڑھنے کا نہ موقع تھا اور نہ اسے شوق، جسمانی لحاظ سے اس کی اٹھان بڑی اچھی تھی۔ پندرہ سال کی عمر ہی میں وہ ایک گھرو جوان نظر آنے لگا تھا۔ ماسٹر رحمت اللہ نے دلاور کو گاؤں کے زمیندار کے حوالے کر دیا کہ چلو کھیتی باڑی ہی سیکھ لے گا۔ لیکن دلاور دو سال سے زیادہ زمیندار کے پاس نہیں نکلا۔ زمیندار عنایت علی بہت سخت گیرانہ کام آدی تھا۔ وہ خود تو عیش کرتا لیکن شب و روز محنت و مشقت کرنے والے مزارعے نان شبینہ تک کو کھانا جاتے۔ فصل کی کٹائی کے موقع پر زمیندار کے کارندے ان سے اناج کا ایک ایک دانہ تک چھین لیتے۔

دلاور ایک کھرانو جوان تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ مزارعین کو اس کا حق دلائے گا۔ وہ کئی مرتبہ زمیندار کے کارندوں سے جھگڑا۔ زمیندار سے اس کی شکایتیں کی گئیں۔ زمیندار پہلے تو مسکرا کر ٹال رہا۔ لیکن بالاخر ایک روز زمیندار نے اپنے کارندوں کے ہاتھوں اس کی پٹائی کروادی۔ گاؤں کے سب ہی لوگوں نے دلاور کو زمیندار کے کارندوں کے ہاتھوں پتے ہوئے دیکھتے ہوئے غیبت مند دلاور اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکا اور دوسرے ہی دن اس نے زمیندار کے ایک کارندے کو گھوڑے کے چوراہے پر پکڑ لیا اور اس کی اس قدر دھتائی کی کہ اس کی ایک پٹلی اور ٹانگ کی ہڈی توڑ دی۔

زمیندار نے دلاور کو رسیوں سے بندھوا کر چوراہے پر ڈال دیا اور ایک آدمی کو پولیس کو بلوانے کے لئے بھیج دیا۔ ماسٹر رحمت اللہ زمیندار سے اپنے بیٹے کے لئے رجم کی جھک مانتا تھا لیکن وہ ایسے کسی آدمی کو معاف کرنے کو تیار نہیں تھا جو اس کے راستے کی دیوار بننے کی کوشش کر رہا ہو۔

پولیس دلاور کو پکڑ کر لے گئی۔ چھ ماہ تک اس کا مقدمہ چلتا رہا اور پھر اسے چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ ایک سال بعد جب وہ گاؤں واپس آیا تو گاؤں والے اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس نے خوب تہ نکالا تھا



اور جیل کی سختیوں نے اس کے جسم کو فلابا دیا تھا۔

انہی دنوں گاؤں سے کچھ فاصلہ پر دریا کا علاقہ ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہر رات کسی نہ کسی گاؤں میں ڈاکہ پڑتا۔ لوٹ مار کے علاوہ ڈاکو گھروں کو آگ لگا دیتے۔ دریا کے آس پاس، یہاں کے باشندوں نے کئی مرتبہ تھانے جاکر ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کی اطلاع دی تھی مگر پولیس نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

دلاور دو دن پہلے رحیم یار خان گیا تھا۔ تیسرے دن واپس آ رہا تھا کہ گاؤں سے کئی میل دور بس خراب ہو گئی۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ڈرائیور اور کلینر بس کا نقص تلاش کرنے لگے۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ انجن میں کیا خرابی تھی لیکن وہ خرابی کسی طرح درست ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ بس میں قریبی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے مسافر تھے انہوں نے جب دیکھا کہ بس کو ٹھیک ہونے میں کافی وقت لگے گا تو وہ بس سے اتر کر پیدل ہی اپنے گھروں کو چل پڑے مگر دلاور انجن ٹھیک ہونے کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

رات کے نو بج گئے۔ انجن پر کام کرتے ہوئے ڈرائیور اور کلینر کے ہاتھ اور منہ بھی کالے ہو چکے تھے مگر وہ انجن کی خرابی کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

ورمنٹھار وہاں سے تقریباً آٹھ کوس دور تھا۔ رات سنان اور اندھیری تھی۔ کھیتوں میں کبھی کبھار گیدڑوں کے بولنے کی آواز سنائی دے جاتی۔ ان علاقوں میں سور بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ دن کے وقت تو یہ سور کہیں نہ کہیں چھپے رہتے لیکن رات کو اپنی اپنی کمین گاہوں سے باہر آکر کھیتوں کو اجاڑنا شروع کر دیتے۔ ان دنوں ویسے بھی کئی کئی فصل تھی۔ اور سور کو تو مٹی کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ یہ سور بھی فصلوں میں زیادہ تباہی پھیلانے لگتے تو بعض علاقوں میں کاشتکار اکٹھے ہو کر سوروں کے شکار کو نکل کھڑے ہوتے۔ ان سوروں کے خوف سے کوئی اکیلا آدمی رات کے وقت گھر سے نکلتے ہوئے گھبراتا تھا۔

دلاور نے جب محسوس کیا کہ مزید ڈیڑھ دو گھنٹوں میں بھی بس ٹھیک ہونے والی نہیں تو اس نے پیدل ہی آگے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ رحیم یار خان سے اپنی چھوٹی بہن کے لئے کچھ چیزیں لے کر آیا تھا۔ اس نے پوٹلی اٹھائی اور بس کے ڈرائیور اور کلینر کو خدا حافظ کہتا ہوا سڑک پر چل پڑا۔

تقریباً ایک میل تک سڑک پر ہی چلتا رہا پھر کھیتوں میں ایک پگڈنڈی پر اتر گیا۔ اس پگڈنڈی کے ایک طرف مٹی کی فصل تھی اور دوسری طرف کسی اور فصل کے کھیت تھے۔ دلاور نے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں کا راستہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس طرح فاصلہ کم ہو جاتا۔

ساڑے دس بج چکے تھے۔ وہ گاؤں کے قریب پہنچ رہا تھا۔ دفعتاً شور اور گولیوں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ یہ آوازیں اس کے گاؤں کی طرف سے آرہی تھیں۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکوؤں نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ آگے جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا جس سے ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا جاسکتا۔ وہ کھیتوں میں کھڑا رہا۔ پھر دفعتاً اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور جوان بہن کا خیال آگیا۔ لیکن ان کا مکان گاؤں کے دوسری طرف اسکول کے قریب تھا اور فائرنگ اور شور کی آوازیں گاؤں کے شروع والے حصے میں آرہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ ڈاکوؤں نے حملہ چوہدری کے مکان پر کیا تھا۔ کسی گاؤں پر حملہ کرتے وقت ڈاکوؤں کا ٹارگٹ اگرچہ کوئی مالدار گھرانہ ہوتا تھا لیکن بونس کے طور پر وہ دوسرے گھروں میں بھی تباہی پھیلا دیتے تھے۔ اور بعض اوقات جوان اور حسین لڑکیوں کو بھی اٹھا کر لے جاتے تھے۔ اس کی بہن تو لاکھوں میں ایک تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ وہ ابھی تقریباً سو گز دور تھا کہ فائرنگ اور لوگوں کے شور کے ساتھ گھوڑوں کی آوازیں بھی سنائی دینے

لگیں۔ آوازیں قریب آرہی تھیں۔ دلاور کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکو راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ فرار کے لئے انہوں نے اسی طرف کے راستے کا انتخاب کیا تھا اور گاؤں کے لوگ فائرنگ کرتے ہوئے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔

تاریکی کے باوجود اسے گھوڑا سوار اور ان کے پیچھے پیدل دوڑتے ہوئے لوگ نظر آرہے تھے۔ ان کا رخ اس کی طرف تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے دلاور نے مٹی کے کھیت میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ ہی دیر بعد دو گھوڑے دوڑتے ہوئے اس کے قریب سے گزر گئے۔ اور اس کے چند منٹ بعد بندوقیں، لٹائیاں اور کلباڑیاں اٹھائے لوگ دوڑتے ہوئے قریب پہنچ گئے۔ جن کے پاس بندوقیں تھیں وہ مسلسل ہوائی فائرنگ کرتے جا رہے تھے۔

”ادھر... وہ مٹی کے اس کھیت میں گھسا ہے۔ میں نے خود اسے اس کھیت میں گھستے ہوئے دیکھا ہے۔“ ایک آدمی نے چیخ کر کہا۔

”ڈھونڈو اسے۔ کھیت کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ اسے پتہ نہیں جانا چاہئے۔“ اس دوسری آواز نے کہا۔

دلاور کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور اسے سینے میں سانس رکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے والے گاؤں کے لوگ تھے۔ کہیں انہوں نے اسے بھی تو ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں سمجھ لیا تھا۔ یہ سوچتے ہی اس کے دماغ میں تیز سننا ہٹ ہونے لگی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرنا لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اور بہت جلد وہ لوگوں کی گرفت میں آگیا۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں دلاور ہے مگر پھرے ہوئے لوگوں نے اس کی ایک نہیں سنی اور اس پر لٹائیاں برساتے رہے۔ دلاور کی چیخیں گونجتی رہیں۔ اس کا سر پٹ گیا۔ چہرہ لولہمان ہو گیا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جس پر لٹائیاں نہ برس رہی ہوں۔ اس نے قوت برداشت جواب دے مگنی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

گاؤں کے لوگ اسے اٹھ کر چوہدری کی حویلی میں لے آئے اور جب روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا گیا تو سب ہی چونک گئے۔

”ارے!“ ایک آدمی نے کہا۔ ”یہ تو، مہر رحمت اللہ کا بیٹا دلاور ہے۔“

”مجھے تو پہلے ہی اس حرام خور پر شبہ تھا۔“ چوہدری کے ایک کارندے نے بے ہوش دلاور کو زوردار غور کر مارتے ہوئے کہا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی دلاور نے دھتکتی کی تھی اور اس جرم میں اسے چھ ماہ کی سزا کاٹنی پڑی تھی۔

چوہدری عنایت بھی آگیا اور جب اسے پتہ چلا کہ ڈاکوؤں کا چڑا جانے والا ایک ساتھی دلاور ہے تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔

”یہ جب جیل سے واپس آیا تھا تو مجھے اسی وقت اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ مجھ سے انتقام لینے کے لئے یہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنے گھرا جاڑے ہوں گے اس نے۔ لیکن بالاخر آج یہ قابو آ ہی گیا۔“ چوہدری نے کہا۔

کسی نے مہر رحمت اللہ کو بھی خبر کر دی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی ہانپتے کانپتے وہاں پہنچ گئے۔ بیٹے کو لولہمان دیکھ کر ماں دوڑ کر اس سے پٹ گئی۔

”یہ کیا کیا تم لوگوں نے خالوا! وہ سیدھی ہوتے ہوئے چینی۔“ مار دیا تم لوگوں نے میرے بیٹے کو۔ کیا جرم کیا تھا اس نے جس کی اتنی بھیاں کم سزا دی گئی ہے؟“

”سزا تو اسے قانون سے ملے گی بڑھیا۔“ چوہدری نے کہا۔ ”کیا اس کا یہ جرم کافی نہیں ہے کہ یہ ڈاکو اور قاتل ہے۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو کر اس نے اب تک نجانے کتنے گھرا جاڑے ہوں گے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ ماسٹر رحمت اللہ چیخا۔ ”میرا بیٹا ڈاکو نہیں ہو سکتا۔ یہ قاتل نہیں ہے۔ اس نے کسی کا گھر نہیں اجاڑا۔ گھر تو تم نے میرا اجاڑ دیا ہے چوہدری۔ میرا بیٹا ڈاکو اور قاتل نہیں ہو سکتا۔“

”یہ ڈاکو اور قاتل ہے ماسٹر رحمت اللہ۔“ چوہدری دباڑا۔ ”گاؤں کے لوگوں نے اسے ڈاکوؤں کے ساتھ بھاگتے ہوئے پکڑا ہے۔“

”نہیں چوہدری جی!“ ماسٹر رحمت اللہ کھمکھایا۔ ”میں نے زندگی بھر آپ کی خدمت کی ہے۔ اس گاؤں کے بچوں کو جمالت کی تاریکی سے نکال کر روشنی کا راستہ دکھایا ہے۔ آپ کے بچوں کو بھی میں نے ہی تختی پکڑنا سکھائی تھی۔ میرے بیٹے پر رحم کرو چوہدری۔ یہ بے قصور ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تمہارے آدمیوں کو دھوکا ہوا ہے۔ یہ تو دو دن سے شہر گیا ہوا تھا اپنی خالہ کے پاس۔ آج اسے واپس آنا تھا۔“

”یہ واپس تو آگیا مگر ڈاکوؤں کو ساتھ لے کر۔“ چوہدری نے کہا۔ ”یہ شہر نہیں ڈاکوؤں کے پاس گیا ہوا تھا۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا۔ جیل سے آتے ہی یہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔“

”نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے۔“ ماسٹر رحمت اللہ روتے ہوئے بولا۔ ”یہ ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہے۔ میرا گھر برباد ہونے سے بچا لو چوہدری۔ میری عزت بچا لو۔“ اس نے اپنی پگڑی چوہدری کے قدموں پر رکھ دی۔

چوہدری نے پیر کی ٹھوک سے پگڑی کو دور اچھال دیا اور اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ اس کے تین چار کاندے آگے بڑھے۔ دو ماسٹر رحمت اللہ کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ دو نے دلاور کی ماں کو بانہوں نے پکڑ لیا جو بیٹے سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسے بھی گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ ماسٹر رحمت اللہ اور اس کی بیوی چیخ رہے تھے۔ چوہدری سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے مگر ان کی آہ و بکا کا چوہدری پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

ماسٹر رحمت اللہ اور اس کی بیوی کو چوہدری کی حویلی سے دور ایک مکان میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ دو آدمی کمرے کے سامنے جم کر بیٹھ گئے۔ دلاور کے ماں باپ چیخنے چلاتے اور دروازہ دھڑھڑاتے رہے مگر باہر بیٹھے ہوئے چوہدری کے وفاداروں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ دروازے کے سامنے اطمینان سے بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔

دلاور ہوش میں آگیا تھا۔ وہ اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا مگر چوہدری کے کان پر جوں تک نہیں رہنچی۔ ڈاکوؤں کے فرار ہونے کے فوراً ہی بعد چوہدری نے اپنے دو آدمی جیپ پر پولیس کو اطلاع دینے کے لئے بھیج دیئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔

تھانے دار نے چوہدری کی پسند کے مطابق گاؤں کے لوگوں کے بیانات قلم بند کئے اور دلاور کو گرفتار کر کے لے گئی۔ روانگی سے پہلے چوہدری نے تھانے دار کی مٹھی گرم کر دی تھی۔

”اس نمک حرام کے خلاف ایسا کیس تیار کرو کہ یہ ساری زندگی جیل ہی میں پڑا سڑتا رہے۔ اگر اس جیسے بچ اور کامی کاری ہمارے منہ لگنے لگیں تو ہم جیسے لوگوں کی نہ عزت محفوظ رہے گی اور نہ جان و مال۔“

”آپ مطمئن رہنے چوہدری صاحب!“ تھانیدار نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”بہت عرصہ سے ہمیں ان ڈاکوؤں کے بارے میں شکایات مل رہی تھیں اور ہم بھی عرصہ سے ان کی تلاش میں تھے۔ ایک آدمی ہاتھ اگیا ہے تو پورے گروہ کا بھی پتہ چل جائے گا۔“

دلاور کو ایک ہفتے تک تھانے میں رکھا گیا۔ اس پر تشدد کی انتہا کر دی گئی تھی۔ پولیس اس سے گروہ کے دوسرے ڈاکوؤں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ مگر دلاور کا ایک ہی جواب تھا۔

”میں ان ڈاکوؤں کو نہیں جانتا۔ میں تو دو دن شہر میں اپنی خالہ کے ہاں رہنے کے بعد واپس جا رہا تھا کہ راستے میں بس خراب ہو گئی۔ میں بس سے اتر کر پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ابھی گاؤں سے دور ہی تھا کہ گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور پھر ڈاکو اسی راستے سے فرار ہوئے جس راستے سے میں گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ میں ڈاکوؤں کو دیکھ کر گھبت میں چھپ گیا۔ ڈاکوؤں کے تعاقب میں آنے والے لوگ مجھے بھی ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھے اور مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ چوہدری کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں بے گناہ ہوں لیکن وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے اور مجھے جھوٹے کیس میں پھنسانا چاہتا ہے۔“

مگر پولیس اس کے اس بیان سے مطمئن نہیں تھی۔ بقول چوہدری کے، گاؤں کے لوگوں نے اسے ڈاکوؤں کے ساتھ بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔ اور پھر چوہدری نے تھانیدار کی مٹھی بھی گرم کر دی تھی۔ اسے تو ہر صورت میں دلاور سے یہ قبول کروانا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی ہے مگر دلاور نے تھرو ڈگری کے استعمال کے باوجود کسی قسم کا اعتراف نہیں کیا۔

دس دن بعد دلاور کا چالان مکمل کر کے اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہاں بھی دلاور نے یہی بیان دیا اور پہلی مرتبہ یہ کہا کہ بس ڈرائیور اور کلینر سے اس امر کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ وہ رحیم یار خان سے اس بس پر بیٹھا تھا اور وہ بس گاؤں سے کئی میل دور خراب ہو گئی تھی۔ اور وہ تقریباً ساڑھے نو بجے تک ڈرائیور اور کنڈکٹر کے پاس ہی بیٹھا رہا تھا جبکہ وہ دونوں بس کا انجن درست کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ پھر وہ باپوس ہو کر پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑا تھا۔

کیس چلتا رہا۔ عدالتوں کے کام بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کسی مقدمے کا فیصلہ ہو جانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بے گناہ بھی پکڑا جائے تو اسے مہینوں بلکہ برسوں عدالت اور جیل کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں کہ محض شبہ میں پکڑے جانے والے کسی شخص کو برسوں عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے گزر گیا۔

چوہدری عنایت کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دلاور نے مقدمے کی پہلی پیشی پر عدالت کے سامنے کسی بس ڈرائیور اور کلینر کا ذکر کیا تھا۔ چوہدری عنایت اس کے اگلے ہی روز اپنے علاقے کے تھانے پہنچ گیا اور تھانیدار کو یہ بات سمجھا دی کہ بس ڈرائیور اور کلینر یہ کیس خراب کر سکتے ہیں۔

”کیس تو خراب ہو رہا ہے چوہدری جی۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”دلاور ایسے کئی گواہ پیش کر دے گا کہ وہ دو دن رحیم یار خان میں رہا ہے۔ اور پھر اس بس کا کلینر اور ڈرائیور، ان کی گواہی سب سے زیادہ اہم ہوگی۔ آپ ڈرائیور اور کلینر کو تلاش کیجئے اور انہیں مضبوط کر لیجئے۔ اگر وہ عدالت میں یہ بیان دے دیں کہ اس رات دلاور نے ان کی بس میں سفر نہیں کیا تھا تو سمجھئے کہ دلاور کم از کم تین سال کے لئے تو اندر ہو ہی سکتا ہے۔ رحیم یار خان میں دو دن تک اس کی موجودگی کی شہادت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بس آپ ڈرائیور اور کلینر کا بندوبست کریں۔“

”ان کی تم فکر مت کرو۔“ چوہدری نے کہا۔ ”میں انہیں تلاش کر لوں گا۔ وہ عدالت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اور اگر پہنچ بھی گئے تو دلاور کے حق میں بیان نہیں دے سکیں گے۔“

اور پھر چوہدری کے کارندے اس بس کے ڈرائیور اور کلینر کو تلاش کرنے لگے۔ انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ بس کو نہی تھی جس کا انجن اس رات ورمنٹھار کے راستے میں خراب ہو گیا تھا۔ یہ بس رحیم یار خان سے ورمنٹھار تک ہی چلا کرتی تھی۔ چوہدری کے کارندے بس کے ڈرائیور اور کلینر کو پکڑ کر چوہدری کے پاس لے گئے۔ چوہدری نے دس دس ہزار روپے ان کی جیبوں میں ڈال دیئے اور کہا کہ اگر انہیں عدالت میں طلب کیا جائے تو وہ دونوں یہی بیان دیں کہ دلاور نے اس رات ان کی بس میں سفر نہیں کیا تھا۔

مقدمہ چھ مہینے تک چلتا رہا۔ عدالت نے دلاور کے وکیل کی درخواست پر پولیس کو حکم دیا کہ بس کے ڈرائیور اور کلینر کو عدالت میں پیش کیا جائے۔

پولیس مزید تین پیشیوں تک ان دونوں کو عدالت میں پیش کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ ہر مرتبہ یہ عذر پیش کیا جاتا کہ ان کا پتہ نہیں ہے اور سمن کی تعمیل کروانا ممکن نہیں ہو سکا۔

اس دوران جیل میں دلاور کو اطلاع ملی کہ اس کے والد ماسٹر رحمت اللہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ دلاور اس دن جیل میں بہت رونا تھا۔ ماسٹر عنایت اللہ تو دراصل اسی روز مرگیا تھا جب دلاور کو چوہدری کے آدمیوں نے ڈاکو کی حیثیت سے پکڑا تھا۔ وہ مردوں کی طرح بستر پر پڑا رہتا۔ حیرت تھی کہ وہ اپنی زندگی کے لاشے کو اب تک کیسے کھینچتا رہا تھا۔

مزید دو پیشیوں کے بعد اس بس کے ڈرائیور اور کلینر کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس روز چوہدری بھی عدالت میں موجود تھا۔ اسے یقین تھا کہ ڈرائیور اور کلینر کے بیان کے بعد عدالت فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائے گی اور دلاور کو سزا سن کر لمبی مدت کے لئے جیل بھیج دیا جائے۔ لیکن ان دونوں کے بیان سے بازی ہی پلٹ گئی۔

پہلے ڈرائیور کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ طویل عرصہ سے اس روٹ پر بس چلا رہا ہے اور بس پر سفر کرنے والے اس علاقے کے اکثر لوگوں کو پہچانتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس روز دلاور رحیم یار خان سے اس کی بس میں سوار ہوا تھا۔ ورمنٹھار سے کئی میل پہلے بس خراب ہوئی۔ انجن درست کرنے میں دیر ہوئی تو اس پاس کی بستیوں کے لوگ بس سے اتر کر پیدل ہی اپنے گھروں کو چلے گئے مگر دلاور بس میں رہا اور ان سے گپ شپ بھی کرتا رہا اور بالاخر رات ساڑھے نو بجے جب دلاور مایوس ہو گیا کہ بس ٹھیک ہونے میں مزید ایک دو گھنٹے لگ سکتے ہیں تو اپنے گاؤں کی طرف پیدل ہی چلا گیا تھا۔ بس ڈرائیور نے مزید بتایا کہ چوہدری عنایت نے اسے اور کلینر کو دس دس ہزار روپے دیئے تھے تاکہ وہ دلاور کے خلاف بیان دے سکیں کہ اس نے بس میں سفر نہیں کیا۔ لیکن وہ بے ضمیر نہیں ہیں کہ چند روپوں کی خاطر کسی انسان کی زندگی برباد کر دیں۔

کلینر نے بھی ڈرائیور کے بیان کی تائید کی۔ بس ڈرائیور نے دس دس ہزار کے نوٹوں کی وہ دونوں گڈیاں بھی عدالت میں پیش کر دیں جو چوہدری نے انہیں دی تھیں مگر انہوں نے یہ رقم خرچ کرنے کے بجائے سنبھال کر رکھ لی تھی۔

بازی پلٹ گئی... چوہدری عنایت کو جھوٹی رپورٹ لکھوانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور مقدمے؛

فیصلہ سنانے کے لئے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے دی۔  
چوہدری عنایت نے تو اسی روز عدالت کا وقت ختم ہونے سے پہلے اپنی ضمانت کروالی مگر دلاور کو ایک بار پھر جیل بھیج دیا گیا۔ ایک ہفتہ بعد جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو عدالت نے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے اسے باعزت طور پر بری کر دیا اور پولیس کو تنبیہ کی گئی کہ آئندہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کسی بے گناہ کو پکڑ کر حوالات میں بند نہ کیا جائے۔  
بے گناہ ہوتے ہوئے بھی دلاور نے دس مہینے جیل کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ وہ عدالت سے نکل کر گاؤں جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔

جب وہ گاؤں پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ گاؤں کے بعض لوگوں نے دلاور کو گاڑی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس طرح چوہدری کو بھی اس کی آمد کی اطلاع ہو گئی۔

دلاور اپنے مکان کے سامنے پہنچا تو ٹھنک کر رک گیا۔ ماسٹر رحمت اللہ کا مکان آبادی سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر اسکول کی عمارت کے قریب تھا۔ مکان کے دروازے پر تالہ دیکھ کر دلاور چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ باپ تو اس کے غم میں مر گیا تھا۔ ماں اور بہن کہاں چلی گئیں۔

دلاور نے ادھر ادھر دیکھا۔ شام کا اندھیرا ابھی اتنا گہرا نہیں ہوا تھا مگر قرب و جوار میں بستی کا کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے وہ اپنی ماں اور بہن کے بارے میں پوچھتا۔ دفعۃً اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اس کی ماں بیٹی کو لے کر رحیم یار خان اپنی بہن کے ہاں تو نہیں چلی گئی۔

دلاور واپس مڑتا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اس کی ماں اور بہن جب بستی میں کسی کے گھر جایا کرتی تھیں تو چالی دروازے کے اوپر ایک طاقچہ میں رکھ جایا کرتی تھیں تاکہ بعد میں دلاور اور ماسٹر رحمت اللہ آئیں تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ طاقچہ دراصل دیوار کی ایک اینٹ اکٹڑ جانے سے بن گیا تھا۔ دلاور نے طاقچہ میں ٹٹول کر دیکھا مگر چابی وہاں نہیں تھی۔

مکان کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر صحن میں پھاند گیا اور کمروں کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن قریب پہنچتے ہی وہ ایک بار پھر چونک گیا۔ ایک کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ دروازہ پوری طرح کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں سامان اس طرح بکھرا ہوا تھا جیسے لوٹ مار کی گئی ہو۔ وہ بھاگ کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں بھی وہی صورت حال تھا۔ سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ تیسرے کمرے کی حالت بھی ان دو کمروں سے مختلف نہیں تھی۔

دلاور کے دماغ پر دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اس کی ماں اور بہن کہاں گئیں۔ اگر وہ رحیم یار خان چلی گئی تھیں تو کمروں میں سامان کیوں بکھرا ہوا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے جانے کے بعد اس گھر میں چور گھس آئے ہوں۔ دلاور ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دھب دھب کی آوازیں سن کر وہ چونک گیا۔ ایسا لگا تھا جیسے دو تین آدمی دیوار پر سے کودے ہوں۔

وہ مڑ کر دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ تین آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ان تینوں کے کندھوں پر رافٹیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ چوہدری عنایت کے کارندے تھے۔

”ہمیں یقین تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد تم سیدھے ہمیں آؤ گے۔ چوہدری کو تمہاری آمد کی اطلاع اسی وقت مل گئی تھی جب تم نے گاؤں کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ کیا لینے آئے ہو یہاں؟“ ایک کارندے نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ میرا گھر ہے۔ مجھے یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے۔“ دلاور بولا۔  
 ”اب یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ چوہدری نے یہ گھر ماسٹر رحمت اللہ کو دیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اب اس گھر پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔“ اسی کارندے نے جواب دیا۔  
 ”میری ماں اور بہن کہاں ہیں؟“ دلاور نے پوچھا۔ ”وہ کہاں چلی گئی ہیں۔“  
 ”تمہاری ماں اور بہن!“ دوسرے کارندے نے قہقہہ لگایا۔ ”تم لوگوں کے گھروں میں ڈاکے مارتے رہے لیکن یہ بھول گئے تھے کہ تمہارے گھر میں بھی ڈاکہ پڑ سکتا ہے۔ تم نے کبھی اپنی جوان بہن کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ارے کم بخت، ڈاکوؤں سے جمع کی ہوئی رقم سے ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دیتا۔ اس کی جوانی تو پھٹی پڑی تھی۔ آخر اس نے اپنے لئے کوئی مرد ڈھونڈ لی۔ تم جیل میں چکی پیس رہے تھے اور تمہاری بہن اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی اور اس کے غم میں تمہاری ماں بھی مر گئی۔“  
 ”بند کر دو یہ بکواس۔“ دلاور چیخا ہوا اس کی طرف لپکا۔ ”تم میری بہن پر الزام لگا رہے ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

دلاور نے اچانک ہی حملہ کیا تھا۔ ایک آدمی اس کے شنبے میں آگیا۔ اس نے اپنی بہن کے بارے میں بکواس کرنے والے کا گلا دبوچ لیا تھا۔ باقی دونوں آدمی پہلے تو اپنے ساتھی کو چھڑانے کی کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے دلاور پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ وہ شخص دلاور کی گرفت سے نکل گیا اب وہ تینوں دلاور کو پیٹنے لگے۔ دلاور بری طرح چیخ رہا تھا لیکن اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش اس وقت تک جاری رہی جب تک وہ بے ہوش ہو کر بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔

وہ تینوں اسے اٹھا کر بیرونی دروازے پر لے آئے۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے دیوار پھاند کر فائر کر کے تالا توڑ دیا اور کنڈا کھول دیا۔ پھر وہ تینوں بے ہوش دلاور کو اٹھا کر گاؤں سے باہر بہت دور کھیتوں میں پھینک کر آگئے۔

دلاور کو دو گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔ اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ جسم کے ہر حصے سے نیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بہت دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے حواس رفتہ رفتہ بحال ہونے لگے تو اسے انتہائی بلندیوں پر جگنو سے نمٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ آسمان پر چپکتے ہوئے ستارے تھے۔

دلاور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تب اسے پتہ چلا کہ وہ کھیتوں میں پڑا ہوا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف اس کا گاؤں تھا اور چاروں طرف کھیت تھے۔ گاؤں میں اب اس کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ ماں باپ مر گئے تھے اور بہن غائب تھی۔ اپنی بہن کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قسم کی کوئی حرکت کر سکتی تھی۔ وہ بہت شریف اور نیک لڑکی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ اس کے ماں باپ کی موت اور بہن کی گمشدگی میں چوہدری عنایت کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ اس وقت گاؤں واپس جانا مناسب نہیں تھا۔ اس گاؤں میں اس کا کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ وہ کھیتوں سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ کچھ دور تک سڑک پر چلتا رہا پھر دفعتاً اسے یاد آگیا کہ سڑک سے تین کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی میں پارونامی اس کا ایک دوست رہتا تھا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں ایک پگڈنڈی پر آگیا۔ اس کا رخ اسی پگڈنڈی کی طرف تھا۔ اسے یقین تھا کہ پارو اس موقع پر اس کی کوئی مدد ضرور کرے گا۔

پارو کا گاؤں سڑک سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ دلاور کو یہ تین میل کا فاصلہ طے کرنے میں

ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ اس کا ایک ایک دکھ رہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھا پا رہا تھا۔ گاؤں میں کیس کیس روشنی دیکھ کر دلاور کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ گاؤں کی واحد کریانے کی دوکان بھی کھلی ہوئی تھی۔ دوکان کے دروازے کے سامنے دو تین آدمی بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دلاور ان کی طرف دیکھے بغیر آگے چلا گیا۔ ایک گلی کا موڑ گھوم کر وہ دوسرے دروازے کے سامنے رک گیا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔ دروازہ تقریباً تین منٹ بعد کھلا تھا اور دروازہ کھولنے والا پارو ہی تھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ دلاور کو نہیں پہچان سکا تھا۔

”کون ہو بھائی۔ کیا بات ہے کس سے ملنا ہے؟“ پارو نے پوچھا۔  
 ”میں دلاور ہوں پارو۔“ دلاور نے کراچے ہوئے کہا۔ ”میں زخمی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”اوہ دلاور... آؤ... اندر آ جاؤ۔“ پارو نے جلدی سے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور اسے ایک کمرے میں لے آیا۔

پارو ذات کا موچی تھا۔ اس کا باپ بھی موچی تھا۔ یہ کام اس نے اپنے باپ ہی سے سیکھا تھا۔ پھر وہ شہر میں ایک ایسی دوکان پر چلا گیا جہاں جوتے بنائے جاتے تھے۔ پارو نے کئی سال وہاں کام کیا۔ خواتین کے سینڈل اور فینسی چمپل وغیرہ بنانے میں اس نے بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ گاؤں واپس آ گیا اور کچھ عرصہ بعد اس نے گاؤں ہی میں کام شروع کر دیا۔ وہ شہر سے میٹرل لے آتا اور گھر میں بیٹھا خواتین کے سینڈل اور فینسی چمپل بناتا رہا۔ جب سارا مال تیار ہو جاتا۔ تو شہر کی اسی دوکان پر دے آتا جہاں سے اس نے کام سیکھا تھا۔ اس طرح اسے اچھے خاصے پیسے بچ جاتے تھے۔ ایک سال پہلے اس کی شادی ہو گئی تھی۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ماں کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ دونوں میاں بیوی اکیلے ہی تھے۔ ابھی ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ پارو نے بیوی کو بھی کام سکھایا تھا اور وہ بھی اس کے کام میں پوری پوری مدد کرتی تھی۔

”کیا ہوا دلاور...؟ تم تو جیل میں تھے۔ جیل توڑ کر آئے ہو کیا؟“ پارو نے اسے سہارا دے کر ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ کمرے میں کاربائیڈ لیپ جل رہا تھا جس کی روشنی خاصی تیز تھی اور اس روشنی میں دلاور کے چہرے پر مار کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ ایک رخسار نیلا ہو رہا تھا دوسرے رخسار اور آنکھ کے درمیان سیاہ دھبہ سا نظر آ رہا تھا۔ آنکھ سو جھی ہوئی تھی اور پیشانی پر بھی دائیں طرف گوڑھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ”تم بول کیوں نہیں رہے، جیل توڑ کر آئے ہو؟ کس نے مارا ہے تمہیں؟“

”میں جیل توڑ کر نہیں آیا۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”آج عدالت نے مجھے بری کر دیا تھا۔ شام کو جب میں گاؤں پہنچا تو گھر میں میری ماں تھی نہ بہن۔ گھر کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے اسے لوٹ گیا ہو۔ سارا سامان بکرا ہوا تھا۔ میں ابھی یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ چوہدری عنایت کے کارندے پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک بتایا کہ میری ماں مر گئی اور میری بہن اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میں اپنی معصوم بہن پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا اور اس کارندے کا گلا دبوچ لیا۔ اس کے دوسرے ساتھی مجھے لائیں اور گھونے مارنے لگے۔ ان تینوں نے مجھے مار مار کر ادھ موٹا کر دیا اور جب میں بے ہوش ہو گیا تو مجھے اٹھا کر گاؤں کے باہر کھیتوں میں پھینک گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد میں یہاں چلا آیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں



یہاں تک کیسے پہنچا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد چاہئے پارو... تمہیں شاید معلوم ہو۔ میری ماں اور بہن کہاں ہیں؟“

”تمہاری ماں اور بہن!“ پارو بڑبڑایا۔ ”وہ... وہ ٹھیک ہیں... میں بعد میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ ابھی تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر کا تو اس قصبے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پارو دلاور کے کپڑے اتار کر ان جگہوں کا جائزہ لینے لگا جہاں جہاں اسے زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔ بظاہر کوئی زخم نہیں تھا۔ اندرونی چوٹیں تھیں۔ پارو نے اپنی بیوی سے تیل اور ہلدی ملائے کو کہا۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر یہ دسکی نسخہ استعمال کر رہا تھا۔

دلاور تکلیف کی شدت سے رات کو ایک لمحہ بھی نہیں سو سکا تھا۔ پارو اور اس کی بیوی رات بھر بیٹھے اس کی سینکائی اور ٹکڑ کر رہے۔ صبح اذان کے وقت دلاور کی آنکھ لگ گئی تو ان دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

دلاور پانچ دن تک بستر پر پڑا اپنی چوٹیں سہلاتا رہا۔ اس دوران اس نے کئی مرتبہ پارو سے اپنی ماں اور بہن کے بارے میں دریافت کیا تھا لیکن وہ ہر مرتبہ اسے ٹال گیا تھا۔

”آخر تم کچھ بتاتے کیوں نہیں پارو...“ ایک روز دلاور نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔ آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ پارو سے پوچھ کر ہی رہے گا۔ ”میری ماں اور بہن کہاں ہیں؟“

”تمہاری ماں اور بہن۔“ پارو نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تمہیں پہلے ہی روز بتا دیتا لیکن تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ... وہ...“

”ہاں بولو۔“ دلاور اسے خاموش ہوتے دیکھ کر چیخا۔ ”کہاں ہیں وہ... کیا ہوا ہے انہیں؟“

”وہ دونوں چوہدری عنایت کے ظلم کا شکار ہو گئیں۔“ پارو بولا۔

”کیا... کیا کیا کام نے؟“ دلاور دباؤا۔

”چند روز پہلے جب بس ڈرائیور اور کلیر کے بیان پر چوہدری عنایت کو جھوٹی رپورٹ لکھوانے پر گرفتار کیا گیا تھا۔ اس نے اسی روز ضمانت کروالی تھی اور پھر اس روز شہر سے واپس آتے ہی اس نے تمہاری ماں اور بہن شاداں پر بربریت کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس کے کارندے ان دونوں ماں بیٹی کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے آئے۔ ان کے کپڑے پھاڑ دیئے اور انہیں گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا گیا۔ اس کے کارندے شیطان کی طرح قہقہے لگاتے رہے۔ انسانیت کو پیروں تلے روند رہے تھے۔ مگر گاؤں کا کوئی آدمی ان عورتوں کی مدد کرنے کے لئے آگے نہیں آیا۔ تمہاری ماں یہ ذلت و رسوائی برداشت نہ کر سکی اور اس نے گاؤں کی گلیوں ہی میں دم توڑ دیا۔ چوہدری کے کارندے بہن شاداں کو اٹھا کر چوہدری کے دریا والے ڈیرے پر لے گئے۔“

”چوہدری نے تمہانیدار کو بھی دریا والے ڈیرے پر دعوت میں بلا لیا تھا۔ تمہانیدار رات بھر وہاں دعوت اڑاتا رہا۔ تمہاری بہن کی چیخیں گونجتی رہیں مگر ان چیخوں کو کون سنتا۔ قانون کا محافظ خود اس کی بوٹیاں نوچ رہا تھا۔“

”دوسرے دن چوہدری اور تمہانیدار واپس چلے گئے۔ مگر چوہدری کے کارندے تین دن تک خونخوار بھیڑیوں کی طرح شاداں کی بوٹیاں نوچتے رہے اور پھر شاداں کو چوہدری کے ڈیرے سے فرار ہونے کا موقع

مل گیا۔ ڈیرے سے نکلنے کے بعد اس نے کسی بستی کا رخ نہیں کیا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ آج تک اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ دریا کی لہریں اسے بہا کر نجانے کہاں لے گئی تھیں۔“

دلاور کے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ خون اس کی رگوں میں لاوہ بن کر کھولنے لگا۔ جسم کا سارا خون جیسے چرے پر سمٹ آیا تھا۔ کنپٹیوں کی نیس پھول گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ غصے کی شدت سے اس کا جسم تھر تھرا رہا تھا۔

”میں ان درندوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک سے اپنی ماں اور معصوم بہن کی ذلت و رسوائی کا انتقام لوں گا۔ زندہ جلا دوں گا ان سب کو۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

پارو اور اس کی بیوی نے بڑی مشکل سے اسے پکڑ کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔

”انسانوں کے اس جنگل میں بھیڑیے بستے ہیں۔ خونخوار بھیڑیے اور تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے دلاور۔ یہ تمہیں بھی چیرھاڑ ڈالیں گے۔ حوصلے سے کام لو۔ جذبات اور جوش تم سے عقل چھین لے گا اور تم خود بھی ان کا شکار ہو جاؤ گے۔ پھر کون لے گا ماں اور بہن کا انتقام۔ اس وقت جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہو گا۔ چوہدری عنایت اس وقت طاقت میں ہے۔ اسے قانون کے محافظوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ تم ایک قدم بھی نہیں چل سکو گے۔ اس وقت جذبات میں آنے کی بجائے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ تم اپنے آپ کو اکیلے مت سمجھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے بھی تو چوہدری عنایت سے اپنی پھوپھی زاد بہن کا حساب لینا ہے۔ تمہیں یاد ہے جب ہم اس گاؤں میں رہتے تھے تو چوہدری نے میری پھوپھی زاد بہن کو اٹھوایا تھا۔ اور اس نے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی۔ اس وقت ہم بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر اس بستی میں آگئے تھے۔ لیکن۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ وقت آگیا ہے کہ چوہدری عنایت کو اس کے جرائم کا حساب دینے پر مجبور کیا جائے۔۔۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ چوہدری تمہارے قدموں پر گر کر رحم کی بھیک مانگے گا۔ وہ گڑگڑا کر تم سے زندگی کی بھیک مانگے گا۔۔۔ مگر میرے دوست۔۔۔ میرے بھائی۔۔۔ اس وقت صبر اور ہوش کی ضرورت ہے۔“

پارو کا طویل لیکچر دلاور کی سمجھ میں آگیا تھا۔ پارو بھی اگرچہ اس کے ساتھ صرف پانچ جماعتیں ہی پڑھا تھا لیکن باتیں اس نے بڑے پتے کی کمی تھیں۔ اس وقت جوش و جذبات اسے واقعی موت کے منہ میں دھکیل سکتے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ لیکن تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ دو تین دن اور گزرنے دو۔ میں اس دوران کچھ سوچ لوں گا۔“ پارو نے کہا۔

”اور میں یہ دو تین دن انگاروں پر لوٹا رہوں گا۔“ دلاور کے جڑے بھنچ گئے۔

”تمہیں یہ دکھ تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔“ پارو نے کہا۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ دلاور کو سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دلاور واقعی انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اسے جب بھی ماں اور بہن کا خیال آتا۔۔۔ خون کھولنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ پارو کو بتائے بغیر ابھی جائے اور چوہدری عنایت کا گلا گھونٹ دے۔

مصلحت اس کے قدم روکے ہوئے تھی۔

”کل رات۔“ پارو نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس رات وہ اس کمرے میں بیٹھے تھے جہاں پارو جنت سازی کا کام کیا کرتا تھا۔ پارو کی بیوی جنت بھی وہیں بیٹھی تھی۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک قبول صورت سی لڑکی تھی۔ ”تھانیدار چوہدری عنایت کی دعوت پر اس کے گاؤں آ رہا ہے۔ وہ گھوڑے پر آئے گا۔ واپسی پر بھی وہ اکیلا ہی ہو گا۔ اور یہ ہمارے لئے بہترین موقع ہو گا۔“

دلاور نے معنی خیز نگاہوں سے پارو کی بیوی جنت کی طرف دیکھا۔ پارو اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”جنت میری بیوی ہے۔ اس نے ہر برے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اور اب بھی یہ میرے بلکہ ہمارے ساتھ ہوگی۔ اس کا ردوائی میں اس کا کردار بہت ہی اہم ہو گا۔ یہ ڈرنے والی عورت نہیں ہے۔“ دلاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمبے خاموشی رہی پھر وہ کل کے لئے پروگرام بنانے لگے۔ دلاور کے لئے وہ رات بھی کاٹنا مشکل تھی۔ اس کے اندر انگارے سے بھرے ہوئے تھے جو اسے بے چین اور مضطرب کئے ہوئے تھے۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔ کبھی وہ بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگتا اور کبھی کمرے سے نکل کر صحن میں ٹہلنے لگتا۔

دوسرا دن بھی بڑی بے چینی سے گزرا، شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا آگیا۔ وہ ایک پرانی سی سائیکل پر تھا۔ پارو اسے صحن میں لے آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ دلاور نے اس لڑکے کو پہچان لیا تھا۔ وہ چوہدری عنایت کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اسے دیکھ کر دلاور کمرے ہی میں دروازے کی آڑ میں کھڑا رہا۔ پارو کچھ دیر تک اس لڑکے سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر لڑکے کے ہاتھ میں تھا دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ لڑکے نے دس روپے کا نوٹ جیب میں رکھا اور سائیکل سنبھال کر باہر چلا گیا۔ پارو دروازہ بند کر کے تیز قدم اٹھاتا ہوا دلاور کے کمرے میں آگیا۔

”تھانیدار چوہدری عنایت کی حویلی میں پہنچ چکا ہے۔ اس کی واپسی دس بجے کے قریب ہوگی۔ واپسی کے لئے وہ مختصر راستہ اختیار کرے گا اور وہ راستہ ہے ٹہے والا۔۔۔ تمہیں معلوم ہے نا۔ اس راستے میں کئی جگہیں ایسی ہیں جہاں ہم اسے گھیر سکتے ہیں۔ ویسے وہ منہ اس مقصد کے لئے بہترین جگہ ثابت ہو گا۔ ہم آٹھ بجے کے قریب یہاں سے نکل چلیں گے۔“ دلاور نے بتایا۔

کچھ دیر بعد وہ کسی جگہ چھپا ہوا ایک پستول لے آیا جو اس طرح چمک رہا تھا جیسے ابھی ابھی اس کی دغائی کی گئی ہو۔

”یہ پستول میں نے بہت عرصہ سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ آج اس کے استعمال کا وقت آگیا ہے۔“ پارو نے کہا۔ ”آج دوپہر جب تم سو رہے تھے تو میں نے اس کی خوب اچھی طرح صفائی کی تھی اور اسے چمک گر لیا تھا۔ اس پستول کے ساتھ ہم ایک کھماڑی بھی لے لیں گے۔“

اور پھر ٹھیک آٹھ بجے وہ تینوں چوری چھپے بستی سے نکل گئے۔ ان تینوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ کھماڑی دلاور کے پاس تھی جو اس نے چادر کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ کھماڑی کا پھل اس قدر تیز تھا کہ ایک ہی وار میں کسی کی گردن اٹھا سکتا تھا۔

پارو آگے تھا اور جنت اور دلاور اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ان کی رفتار خاصی تیز تھی۔

کھیتوں میں چلتے ہوئے جنت کی مرتبہ لڑکھائی تھی اور دلاور نے ہر مرتبہ اسے سنبھال لیا تھا۔ وہ درمنہار کی طرف جانے والی سڑک پر آگئے۔ وہ تیزی سے سڑک عبور کر کے دوسری طرف کے کھیتوں میں آگئے اور پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے چلتے گئے۔ مزید آدھے گھنٹے بعد وہ ٹبے پر پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ٹبے پر درختوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ کاشنکار دن کے وقت یہاں اپنے موٹی باندھا کرتے تھے اور خود بھی درختوں کے نیچے بیٹھ کر کچھ دیر آرام کر لیا کرتے تھے۔ مگر شام کے بعد یہاں الو ہی بولا کرتے تھے۔

درمنہار سے آنے والا ایک کچا راستہ سیدھا اس قصبے تک چلا گیا تھا جہاں تھانہ تھا۔ اس رات سے تقریباً دو میل کی مسافت کم ہو جاتی تھی۔

وہ درختوں کے نیچے رک کر گاؤں سے آنے والے راستے کی طرف دیکھنے لگے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر ایک گھوڑا سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔

”جنت!“ پارو نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”سمجھ گئیں نا۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم قریب ہی موجود ہوں گے۔“

”تم فکر مت کرو۔ میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔“ جنت نے کہتے ہوئے اپنے جسم پر سے چادر اتار دی۔ پارو نے دو تین جگہوں سے اس کی فیض پھاڑ دی اور دلاور کو اشارہ کیا۔

جنت درختوں کی آڑ میں کھڑی رہی۔ پارو اس سے تقریباً بیس گز دور ہٹ کر پودوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اور دلاور دوڑتا ہوا راستے کے دوسری طرف جا چھا۔ ان سب کی نظریں گھوڑا سوار پر مرکوز تھیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔

گھوڑا سوار بڑے اطمینان سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کو شاید زیادہ غلٹ نہیں تھی۔ وہ تھانیدار تھا جو چوہدری عنایت کی حویلی سے دعوت کھانے کے بعد واپس جا رہا تھا۔ چوہدری عنایت اس کی دعوتیں بلا مقصد نہیں کر رہا تھا۔ دلاور کے خلاف جھوٹی رپورٹ کے الزام میں الٹا اس پر ٹیس ہو گیا تھا۔ وہ اگرچہ ضمانت کروا چکا تھا مگر اس تھانیدار کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ موقع ملے ہی اسے بھی ہتھکڑی پٹانے سے نہیں چوکے گا۔ اور شاید اسی لئے وہ وقتاً فوقتاً ”تھانیدار کی دعوتیں کرتا رہتا تھا۔ اور دلاور کے خیال میں اس تھانیدار نے آج زندگی کی آخری دعوت کھائی تھی۔“

تھانیدار وردی میں تھا۔ ہولسٹر میں سروس ریولور بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس کا گھوڑا جیسے ہی ٹبے کے قریب پہنچا ایک نسوانی چیخ کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ یہ آواز ٹبے کی طرف سے آئی تھی۔ اس نے گھوڑا روک کر اس طرف دیکھا مگر تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ اس چیخ کو اپنا وہم سمجھ کر گھوڑے کو آگے بڑھاتا ہی چاہتا تھا کہ نسوانی آواز ایک بار پھر دکھائی دی۔

”بچاؤ... بچاؤ... مجھے ان ڈاکوؤں سے بچاؤ۔“

تھانیدار نے ٹبے کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی عورت تھی جو درختوں سے نکل کر مدد کے لئے چیختی ہوئی ٹبے کی دھلان پر اسی طرف دوڑی آ رہی تھی۔ تھانیدار بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھوڑے سے اتر گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ہولسٹر سے پستول نکال لیا تھا۔

وہ عورت دوڑتی ہوئی اس کے قریب آ کر گر گئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور خوف کی شدت سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تھانیدار نے ٹبے کی طرف دیکھا لیکن اسے کوئی اور نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے جھک

کر عورت کو بازو سے پکڑ کر اٹھالیا۔

”کون ہو تم... کیا بات ہے۔ کس سے ڈر کر بھاگ رہی ہو؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

”وہ... وہ... دو ڈاکو... وہ مجھے اس بستی سے میرے گھر سے اٹھالائے تھے۔ وہ... وہ میری عزت لوٹا چاہتے تھے... میں کسی طرح بھاگ نکلی ہوں۔ وہ ڈاکو اس ٹبے کے پیچھے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے... مجھے بچا لو۔“ تھانیدار جی مجھے بچا لو۔“ عورت نے روتے ہوئے کہا۔

”ڈرو نہیں... میں ابھی دیکھتا ہوں۔ وہ بچ کر نہیں جائیں گے۔“ تھانیدار نے کہا اور ریو الور سنبھالے محتاط انداز میں ٹبے کی طرف بڑھا۔ لیکن ابھی اس نے دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ اپنے عقب میں ایک غراہٹ سن کر اچھل پڑا۔

”بچ کر تو تم نہیں جاؤ گے تھانیدار! ریو الور پھینک دو ورنہ یہ ککھاڑی جو تم اپنی گردن کی کھال پر محسوس کر رہے ہو تمہاری گردن کے اندر تک اتر جائے گی۔“

تھانیدار کو اپنی گردن پر ککھاڑی کی ٹھنڈی اور تیز دھار محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی خیال ابھرا تھا۔ دھوکا... کیونکہ وہ عورت سامنے والے ٹبے کی طرف سے دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ ڈاکوؤں کو بھی اس ٹبے کے پیچھے ہونا چاہئے تھا مگر اسے دھمکی دینے والا مخالف سمت سے آیا تھا۔ غالباً وہ راستے کے دوسری طرف کھیت میں چھپا ہوا تھا۔ وہ عورت بھی کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ تھانیدار کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ چال اسے گھیرنے کے لئے چلی گئی تھی۔ اس کے دشمنوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ وہ ایک راشی اور ظالم پولیس آفیسر تھا۔ اس کا علاقہ کئی دہات پر مشتمل تھا۔ ہر علاقے میں اس کے دشمن موجود تھے۔ جس میں سے کسی نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینے کے لئے آج اسے گھیر لیا تھا۔ ککھاڑی اس کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ تیزی سے نیچے جھک جائے تو اپنی گردن بچا سکتا ہے۔ لیکن وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک پستول کی نال اس کی بائیں کپٹی کو چھوئے لگی۔

”ریو الور پھینک دو تھانیدار۔“

یہ پہلے والی آواز نہیں تھی۔ تھانیدار کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دو آدمی تھے۔ ممکن ہے اس کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں۔ اس طرح اس کے بچ نکلنے کے امکانات محدود ہو گئے تھے۔ اس نے ریو الور پھینک دیا۔

”شاباش! اب کم از کم پانچ قدم آگے بڑھ جاؤ۔ بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ میری گولی تمہیں ڈھیر کر دے گی۔“ پستول والے نے کہا۔

تھانیدار پانچ قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔ اس نے آج تک اپنے احکامات کی تعمیل کرائی تھی۔ آج پہلی مرتبہ کسی کے حکم کی بلاچوں وچ ا تعمیل کر رہا تھا۔

دلاور نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر تھانیدار کا ریو الور اٹھالیا اور ککھاڑی جنت کے حوالے کر کے ریو الور کا سیٹھی کچھ مٹا دیا۔

”اب تم چاہو تو ہماری طرف گھوم سکتے ہو۔“ دلاور نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ تھانیدار پیچھے گھوم گیا۔ اندھیرے کے باوجود اس نے دلاور کو پہچان لیا تھا۔

”اوہ تم!“ تھانیدار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہیں یہ حرکت بت مہنگی پڑے گی دلاور... بچھلی مرتبہ تو تم بچ گئے تھے۔ لیکن اس مرتبہ تم نہیں بچ سکو گے۔ بہتر ہے کہ میرا ریو الور واپس کر دو۔ میں اس

واقعہ کو نظر انداز کر دوں گا۔“ تھانیدار بولا۔

”گھوٹا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہاتھ آئے ہوئے ایک ایسے زہریلے ناگ کو چھوڑ دیا جائے جو اب تک لا تعداد معصوم اور بے گناہ لوگوں کو ڈس چکا ہے۔ نہیں تھانیدار! آج تم چوہدری عنایت کی حویلی سے جو دعوت کھا کر آئے ہو وہ تمہاری زندگی کی آخری دعوت تھی۔ اب تم صبح کا سورج نہیں دیکھ سکو گے۔“ دلاور نے کہا۔

”دیکھو... تم ایک سنگین جرم کرنے جا رہے ہو...“

”بند کرو یہ بکواس۔“ دلاور دباؤ۔ اس نے اچانک ہی آگے بڑھ کر تھانیدار کے پیٹ پر زور دار ٹھوکر مار دی۔ تھانیدار بلبلاتا ہوا آگے کو دوہرا ہو گیا۔ دلاور کی دوسری ٹھوکر اس کے منہ پر لگی۔ وہ پھر سیدھا ہو گیا لیکن دوسری طرف سے پارونے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر مار دی۔

اور اب تھانیدار ان دونوں کے درمیان فٹ بال بنا ہوا تھا۔ وہ پارو کی ٹھوکر کھا کر لڑکھڑاتا ہوا دلاور کی طرف آتا تو دلاور اسے زوردار ٹھوکر مار دیتا۔ تھانیدار کی چیخیں دیرانے میں گونج رہی تھیں۔

”خوب چیخو، اور زور سے چیخو۔“ دلاور نے فتنہ لگایا۔ ”یہاں تمہاری چیخیں سن کر مدد کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔ جس طرح میری معصوم بہن کی چیخیں سن کر کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا تھا۔ تم لوگوں کی عزت و آبرو کے محافظ تھے لیکن تم خود لٹیرے بن گئے تھے۔“

”مم... مجھے معاف کر دو دلاور...“ تھانیدار کھمکھمکیا۔ ”مجھ پر رحم کرو... اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔“

”اس رات میری بہن نے بھی تم سے اسی طرح رحم کی بھیک مانگی ہوگی۔ اس نے اسی طرح تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے ہوں گے۔ خدا اور رسول کا واسطہ دیا ہو گا۔ مگر تمہاری انسانیت تو ختم ہو گئی تھی۔ تم تو بھیڑیے بن گئے تھے۔“ دلاور نے ایک بار پھر اس پر ٹھوکر دلی کی بارش کر دی۔

ان دونوں نے مار مار کر تھانیدار کو ادھ موا کر دیا تھا۔ دلاور پر جنون سا طاری ہو چکا تھا۔ جنت دور کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دلاور جب ان کے گھر آیا تھا تو وہ اس کی حالت دیکھ چکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ چوہدری عنایت نے اس کی نند کا کیا حشر کیا تھا۔ اگر چوہدری عنایت جیسے لوگوں کو اس جیسے تھانیداروں کی حمایت اور سرپرستی حاصل نہ ہو تو یہ لوگ کبھی انسانیت کے دائرے سے باہر نہ نکلیں۔ مگر قانون کے یہ محافظ ہی انہیں ظلم و بربریت پر اکساتے ہیں۔ اور آج جب وہ فرعون تھانیدار دو مظلوموں کے ہتھے چڑھ گیا تھا تو ان سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ خدا اور رسول یاد آرہے تھے۔ جنت ایک عورت تھی اور عورت نرم دل کی ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر اسے ترس آتا چاہئے تھا لیکن اس تھانیدار پر اسے ذرا بھی ترس نہیں آرہا تھا۔

دلاور نے تھانیدار کے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھی ہوئی ایک لمبی سی رسی کھول لی اور اس کے ایک سرے پر پھندا بنا کر تھانیدار کے گلے میں ڈال دیا۔ تھانیدار بری طرح جھل رہا تھا۔

دلاور اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے کھینچتا ہوا درختوں کی طرف لے جانے لگا۔ تھانیدار نے گردن سے اوپر دونوں ہاتھوں سے رسی پکڑ لی تھی تاکہ گردن پر پھندے کی گرہ ٹاٹ نہ ہونے پائے۔ ایک درخت کے نیچے پہنچ کر دلاور نے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ وہی درخت تھا جس کے نیچے کھڑے ہو کر وہ تھانیدار کی آمد کا انتظار کرتے رہے تھے اور پگڈنڈی کے دونوں طرف چھپنے کے لئے انہوں نے اپنی چادریں اتار کر یہاں

پھینک دی تھیں۔ دلاور نے ایک چادر اٹھا کر اس میں سے ایک لمبی سی پٹی پھاڑ لی اور تھانیدار کو ٹھوکر مار مار کر اوندھا کر دیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔

تھانیدار اب بھی بری طرح چل رہا تھا۔ وہ خدا اور رسول کے واسطے دے کر ان سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

”تم تو یہ وردی پن کر فرعون بن گئے تھے۔“ دلاور اسے ٹھوکر مارتے ہوئے چیخا۔ ”حالانکہ تمہیں حکومت نے یہ وردی اس ملک کی سلامتی اور عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے دی تھی۔ مگر تم فرعون بن گئے۔ اس ملک کو اپنے باپ کی جاگیر اور رعایا کو زور خرید غلام سمجھ لیا۔ تمہاری زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں تھانیدار۔۔۔ معافی ہم سے نہیں خدا سے مانگو۔“

دلاور دوڑتا ہوا درخت پر چڑھ گیا۔ ایک موٹی سی شاخ پر وہ دونوں طرف پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔

”پارو۔۔۔ یہ رسی اوپر پھینک دو۔“ اس نے آواز دی۔

تھانیدار کے گلے میں پھندے والی رسی کافی لمبی تھی۔ پارو نے اس کا ایک سرا اوپر اچھال دیا جسے دلاور نے جھپٹ لیا اور اسے درخت کی شاخ کے گرد ایک بل دے کر کھینچنے لگا۔ گردن پر زور پڑنے سے تھانیدار خود بخود اٹھتا چلا گیا۔ وہ اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ پارو اس کی دونوں ٹانگوں سے پلٹ گیا اور اسے اس طرح اوپر اٹھانے لگا جیسے کسی چھوٹے بچے کو پیار سے ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھایا جاتا ہے۔

تھانیدار بری طرح چل رہا تھا۔ مگر پارو نے اس کی دونوں ٹانگیں بڑی مضبوطی سے گرفت میں لے رکھی تھیں۔ دلاور رسی کو بدستور کھینچتا رہا۔ تھانیدار کے پیر زمین سے تقریباً دو میٹر اوپر اٹھ گئے تو پارو نے دلاور کو آواز دی۔ دلاور نے رسی کو درخت کی شاخ کے گرد کئی بل دیئے اور کئی گرہیں لگا دیں۔ وہ درخت سے اتر آیا۔ پارو ابھی تک تھانیدار کی ٹانگیں جکڑے ہوئے تھا۔ دلاور نے بھی اس کی ٹانگوں کو پکڑ لیا اور ایک دو تین کہتے ہوئے دونوں نے ایک زوردار جھولہ دے کر تھانیدار کو چھوڑ دیا۔

تھانیدار پھندے کے ساتھ جھولتا رہا۔ دلاور اور پارو نے زمین پر پڑی ہوئی چادر میں اٹھائیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ جنت منہ پھیرے دور کھڑی تھی۔ دلاور نے آخری بار تھانیدار کی طرف دیکھا۔ تھانیدار کے منہ سے خرخر کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”چلو۔۔۔ اب بھاگو۔۔۔“ دلاور بولا۔

وہ دونوں دوڑتے ہوئے جنت کے پاس آگئے۔ جنت والی چادر دلاور نے اٹھائی تھی۔ اس نے چادر جنت پر ڈال دی اور وہ تینوں پگڈنڈی پر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سڑک کی طرف چلے گئے۔

جب وہ بستی میں پہنچے تو سناٹا تھا۔ دو کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا۔ مگر پارو کے پچکارنے پر کتے خاموش ہو گئے اور وہ لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔

دلاور کا انتقام پورا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس رات وہ سکون سے سویا تھا۔ صبح پورے علاقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ کسی نے تھانیدار کو درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی ہے۔ دلاور تو ایک گھرے میں بند رہا مگر پارو اور اس کی بیوی سے اسے صورت حال کا پتہ چلتا رہا۔

اس تھانیدار کے سینکڑوں دشمن تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جو اس کی وجہ سے اپنی عمر عزیز کا بہت سا حصہ جھوٹے الزامات کے تحت جیل کی نذر کر کے آئے تھے۔ ایک دو جیل توڑ کر بھی بھاگے ہوئے تھے۔ مختلف نام لئے جا رہے تھے۔ مگر پارو اور دلاور کا نام کسی کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ ان پر تو کوئی شبہ کبھی نہیں

سکتا تھا۔ دلاور کے بارے میں یہ سننے میں آیا تھا کہ جب وہ عدالت سے بری ہو کر گاؤں واپس آیا تھا تو چوہدری عنایت کے کارندوں نے اسے مار پیٹ کر بے ہوشی کی حالت میں گاؤں سے باہر پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد سے اسے نہیں دیکھا گیا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دلاور دن بھر پارو کے گھر کے ایک کمرے میں بند رہتا۔ وہ صرف آدمی رات کے وقت پارو کے ساتھ گھر سے نکل کر بستی سے باہر جاتا اور ضروریات سے فارغ ہو کر واپس آ جاتا۔ بستی والوں میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ دلاور پارو کے گھر میں چھپا ہوا ہے۔ ایک ہفتے بعد چوہدری عنایت کے گاؤں کے اسی لڑکے نے پارو کو اطلاع دی کہ چوہدری اپنے ایک مہمان کو لے کر دریا والے ڈیرے پر گیا ہے۔ وہ رات وہیں رہے گا اس کے ساتھ صرف ایک ہی کارندہ ہوگا۔

دلاور کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چوہدری نے آج پھر کسی لڑکی کو انھویا ہوا ہوگا۔ یہ بہر حال ان کے لئے بہترین موقع تھا۔ دلاور اور پارو رات نو بجے کے بعد بڑی خاموشی کے ساتھ بستی سے نکل گئے۔ اور آدمی رات کے لگ بھگ چوہدری کے دریا والے ڈیرے پر پہنچ گئے۔

دلاور کا خیال درست نکلا۔ چوہدری عنایت کسی طوائف کو لے کر آیا ہوا تھا۔ وہ اپنے مہمان کے ساتھ کمرے میں رنگ رلیاں مٹا رہا تھا جبکہ چوہدری کا کارندہ باہر چار پائی پر بیٹھا حقہ کھڑکڑا رہا تھا۔ دلاور اور پارو نے بڑی خاموشی سے اسے جالیا اور رسیوں سے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ اور پھر وہ دونوں ایک زور دار دھکے سے دروازہ توڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔

دلاور اور پارو کو دیکھ کر چوہدری کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس نے موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا ہو۔

”کیوں... ڈر گئے چوہدری! تم تو بڑے بہادر آدمی ہو، بڑی طاقت والے ہو۔“ دلاور اس کی طرف رہو الور تاتے ہوئے بولا۔

”تم دونوں کو یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی۔ کالو کہاں مر گیا ہے۔ کالو... اوئے کالو...“ چوہدری اپنے کارندے کو آوازیں دینے لگا۔

”کالو کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ باہر بندھا پڑا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”اسے پہچانتے ہوتا؟ یہ پارو ہے۔ چند سال پہلے تم نے اس کی پھوپھی زاد بہن کو ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور اس نے گاؤں کے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی۔ پھر میری معصوم بہن تمہاری اور اس تھانیدار کی ہوس کا شکار ہوئی۔ تمہارے کارندے بھی اس کی لاش کو گدھوں کی طرح نوچتے رہے۔ بالآخر اس نے بھی دریا میں کود کر جان دے دی۔ تم نے میری بھولھی ماں اور معصوم بہن کو بھی گاؤں کی گلیوں میں کھینٹا تھا۔ اور جب مجھے ان حالات کا پتہ چلا تو میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک ان کی ذلت و رسوائی اور موت کا انتقام نہیں لے لوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ ایک ایک کو جہنم میں پہنچا کر رہوں گا۔ ایک ہفتہ پہلے تم اپنے سرپرست تھانیدار کا انجام دیکھ چکے ہو۔ اب اپنے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”اوہ! تو تھانیدار کو تم نے پھانسی دی تھی۔“ چوہدری عنایت کے چہرے پر پشیمانی پھیل گئی۔

”لیکن میں تمہیں پھانسی نہیں دوں گا۔ تمہیں تو میں نے زندہ جلانے کی قسم کھائی تھی اور آج میری یہ قسم پوری ہو رہی ہے۔“ دلاور بولا۔



”خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔“ چوہدری اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔

”ہر غلام بد دل ہوتا ہے۔“ دلاور نے اسے زوردار ٹھوکر ماری۔ ”جب تم اور تمہارے کارندے مجھے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے تو میرے بوڑھے باپ نے بھی رو رو کر تم سے اسی طرح فریاد کی تھی۔ میرے بوڑھے باپ نے اپنے سر کی عزت تمہارے قدموں پر رکھ دی تھی اور تم نے اسی طرح ٹھوکر مار کر اسے دور اچھال دیا تھا۔ پارو۔۔“

دلاور پارو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”باہر بہت سی رسیاں پڑی ہیں۔ ان تینوں کو باندھ کر ڈال دو۔ اور پھر اس کے اس نمک خوار کو بھی اندر لے آنا۔“

چند منٹ بعد ہی ان تینوں کو باندھ کر ڈال دیا گیا۔ وہ طوائف چیخ چیخ کر فریاد کر رہی تھی کہ وہ بے قصور ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔

”تم عورت کے نام پر ایک بد نما دھبہ ہو۔“ دلاور غرایا۔ ”تم جیسی عورتوں نے ہی اس دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ آج تم بھی ذرا جہنم کی آگ کا مزہ چکھ لو۔“

پارو چوہدری کے کارندے کو بھی اندر لے آیا تھا۔ دلاور اور پارو نے باہر سے بہت سی خشک لکڑیاں لا کر ان کے آس پاس جمع کر دیں اور پھر باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ اس ڈیرے کے نیچے چار فٹ تک کی دیواریں اینٹوں کی تھیں اور اوپر کی ساری عمارت لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ دلاور نے جیب سے ماچس نکال لی۔ پارو نے اس کی تقلید کی اور دونوں نے بیک وقت تیلیاں جلا کر دروازے کے سامنے جمع کئے جانے والے گھاس پھوس پر اچھال دیں۔

لکڑی کی عمارت نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ اندر سے چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں اس وقت تک دور کھڑے رہے جب تک چھین سنائی دیتی رہیں اور پھر دونوں دریا کی طرف دوڑنے لگے۔ دریا خاصا دور تھا۔ وہ کھیتوں میں دوڑتے ہوئے دریا پر پہنچ کر رک گئے۔

”اب کیا خیال ہے، کس طرف جانا ہے۔“ پارو نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہم یہاں سے دریا پار کر لیں تو ہم ضلع ڈیرہ غازی خان کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ جبکہ دریا کے ساتھ ساتھ بہاؤ کی طرف سفر کرتے ہوئے رحیم آباد تک جاسکتے ہیں۔“

”میراں پور کتنی دور ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔ ”میرا رشتے کا ایک بھائی میراں پور میں رہتا ہے۔ وہاں اس کی تھوڑی بہت زمین ہے۔ ہم دو چار روز وہاں رہ سکتے ہیں۔ جب یہاں کا معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو ہم واپس آجائیں گے۔“

”تو پھر چلو۔۔۔ بائیں طرف کشتیوں کا گھاٹ ہے۔ کوشش کریں گے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر کوئی کشتی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔“ پارو نے کہا۔

وہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رک گئے۔ کشتیوں کا گھاٹ وہاں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا۔ لکڑی کے ایک کھمبے کے ساتھ لائین لٹکی ہوئی تھی جس کی مرل سی روٹنی چند فٹ تک ہی محدود تھی۔ گھاٹ سے تقریباً پچاس گز پیچھے نشیب میں چند جھونپڑیاں تھیں۔ یہ ان ملاحوں کی جھونپڑیاں تھیں جو دن بھر یہاں کشتیوں پر مسافروں کو لاتے لے جاتے تھے۔ چند جھونپڑے ان مامی گھروں کے بھی تھے جو دریا سے مچھلیاں پکڑ کر شہر لے جا کر بیچتے تھے۔ یہی ان لوگوں کا ذریعہ

محاش تھا۔

پارو کو یقین تھا کہ رات کے وقت کشتیوں کی حفاظت کے لئے کوئی نہ کوئی چوکیدار ضرور موجود ہوگا۔ اس لئے وہ بڑی احتیاط سے دبے قدموں آگے بڑھ رہے تھے۔ پارو کا خیال درست نکلا۔ ایک بوڑھا ملاح جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

پارو نے دلاور کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے قدموں چلتا ہوا بوڑھے ملاح کے پیچھے پہنچ گیا۔ بوڑھے ملاح نے شاید قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ پارو نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ بوڑھے کے منہ سے خرماہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر چلا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ پارو نے اسے جھلنگا سی چارپائی پر ڈال دیا اور دلاور کو اشارہ کر دیا۔ دلاور تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

”تم نے مار ڈالا اسے؟“ دلاور بولا۔

”نہیں۔“ پارو نے جواب دیا۔ ”اس بیچارے نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ بس ذرا اس کے اسکر بوڑھلے کر دیئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں ہوش میں آجائے گا۔ آؤ دیکھتے ہیں ہمارے کام کی کوئی کشتی ملتی بھی ہے یا نہیں؟“

وہ دونوں گھاٹ پر آگئے۔ دس بارہ بڑی کشتیاں تھیں۔ انہیں ایک چھوٹی کشتی بھی مل گئی جس میں دس بارہ مسافر بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے کشتی کی رسیاں کھول لیں اور آہستہ آہستہ چو پہنچنے لگے۔

”دریائے سندھ اسی مقام پر بازو کی مڑی ہوئی کہنی کی طرح ضلع رحیم یار خان کی سرحد میں داخل ہو کر دوبارہ ضلع کی سرحد کے دوسری طرف چلا گیا تھا۔ وہ پوری قوت سے چو پہنچ رہے تھے کیونکہ کشتی کافی بڑی تھی۔ یہاں پر دریا کا پائت بھی بہت چوڑا تھا اور دریا کے عین وسط میں خشکی کا ایک وسیع و عریض قطع بھی تھا۔ وہ اسی ٹاپو کے قریب سے ہوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ دوسرے کنارے پر ایک جگہ لائین کی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ دوسری طرف کشتیوں کا گھاٹ تھا۔ انہوں نے کشتی کو ہماؤ کی طرف موڑ دیا تاکہ گھاٹ سے دور رہ سکیں۔“

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان کی کشتی کنارے پر جا گئی۔ انہوں نے کشتی کی رسی کو دریا کے کنارے جھاڑیوں سے باندھ دیا اور کنارے کی ڈھلان اترتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلنے لگے۔

میراں پور نامی گاؤں وہاں سے کئی میل دور تھا۔ وہ رکے بغیر چلتے رہے۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ فصلوں کی وجہ سے سردی کچھ زیادہ سی ہو رہی تھی۔ لیکن تیز تیز اور مسلسل چلتے رہنے سے وہ زیادہ سردی محسوس نہیں کر رہے تھے۔

صبح کا اجالا پھیلنے سے بہت پہلے وہ میراں پور کے قریب پہنچ گئے۔ گاؤں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر درختوں کے جمنڈ میں ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا احاطہ سا بھی بنا ہوا تھا جس کے اندر غالباً موسیٰ بندھے ہوئے تھے کیونکہ وہاں سے موسیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”یہ آس پاس کی زمین میرے بھائی کی ہے۔“ دلاور نے ہاتھ سے دائرہ سا بناتے ہوئے کہا۔ ”یہ احاطہ بھی اسی کا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں گاؤں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاشم کا نوکر یہاں موجود ہوگا۔ اسی کو اطلاع دینے کے لئے گاؤں بھیج دیں گے۔“

وہ جیسے ہی آگے بڑھے ایک خوفناک کتا بھونکتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ دلاور نے زمین پر پڑی ہوئی ایک

لکڑی اٹھالی اور کتے کو اپنے آپ سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کتابت ہی خوشخوار قسم کا تھا۔ وہ کبھی دلاور کی طرف لپکتا اور کبھی یارو کی طرف۔ ایک مرتبہ جب وہ پارو کی طرف لپکا تو پارو نے لات چلا دی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ کتے نے اس کا پیر جڑے میں دبوچ لیا تھا۔ پارو تو ازان بگڑ جانے سے پشت کے بل گرا۔ کتا اس کے پیر کو بری طرح بھنبھوڑ رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ پارو نے جڑے کے بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس نے کتے کے جڑے سے پیر چمڑانے کے لئے زوردار جھٹکا دیا تو اس کا بچہ تو آزاد ہو گیا مگر جو کتے کے جڑے ہی میں رہ گیا۔ اسی لمحہ دلاور نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی پورے زور سے کتے کو ماری تھی۔ کتا پارو کا جو تانہ میں دبائے غراتا ہوا ایک طرف کو بھاگ نکلا۔

”ستے چھوٹ گئے پارو... کتے نے صرف جوتے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اگر وہ تمہارا پیر بھی چبا ڈالتا تو پیٹ میں چودہ ٹیکے لگوانے پڑتے۔“ دلاور نے کہا۔

”تم ہنس رہے ہو۔“ پارو بولا۔ ”میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ میں تو آج تک انسان ہی کو سب سے خطرناک اور خوشخوار حیوان سمجھتا تھا مگر یہ کتا تو انسانوں سے بھی زیادہ خوشخوار نکلا۔“

”درندہ... درندہ ہی ہوتا ہے، چاہے وہ انسان ہو یا حیوان۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”کون ہو تم لوگ... اپنی جگہ سے ہلنا مت ورنہ گولی مار دوں گا۔“ مکان کی طرف سے ایک آواز سن کر دونوں چونک گئے۔

”قادر! یہ میں ہوں۔ درمنہار والا دلاور... ماسٹر رحمت اللہ کا بیٹا۔“ دلاور نے چوکیدار کا نام لے کر اپنا تعارف کرایا۔

”اوہ! دلاور! آگے آجاؤ... تمہارے ساتھ یہ دوسرا کون ہے۔“ قادر نے پوچھا۔

”میرا یار ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ وہ دونوں آگے آگئے۔ قادر اب بھی دو تالی بندوق تانے کھڑا تھا۔ دلاور کو پہچاننے کے بعد ہی اس نے بندوق کا رخ نیچے کیا تھا۔

”یہاں تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”کوئی بھی نہیں۔ آج کل اکیلا ہی ہوں۔“ قادر نے جواب دیا۔ ”باہر سردی ہو رہی ہے۔ اندر آجاؤ۔“

”تمہاری بیوی؟ کیا وہ بھی نہیں ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”تین چار دن پہلے وہ لڑکر پھر راجن پور چلی گئی ہے۔ اپنے ماں باپ کے پاس۔ اب تو میں نے طے کر لیا ہے کہ اسے لینے کے لئے نہیں جاؤں گا۔ دل کرے گا تو خود ہی آئے گی سالی... تم سناؤ... اس وقت کیسے آئے ہو؟ سنا ہے تم پر کوئی مقدمہ بن گیا تھا؟“ قادر نے پوچھا۔

”ہاں... ایک جھوٹا مقدمہ تھا۔ ختم ہو گیا۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”پہلے ہمارے لئے کوئی چائے وائے کا بندوبست کرو۔ سردی نے تو بھینڈ کے رکھ دیا ہے۔“

”میں ابھی چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ قادر کتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایلو مینیم کی کالی سیاہ کیتلی اور تین پیالے لے کر آگیا۔ اس نے پیالے زمین پر رکھ دیئے اور ان میں چائے انڈیلنے لگا۔ دو پیالے اس نے دلاور اور پارو کی طرف بڑھا دیئے اور ایک پیالہ خود لے لیا اور زمین پر ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا چکیاں لینے لگا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی دلاور نے قادر کو گاؤں بھیج دیا تھا کہ ہاشم کو ان کے بارے میں اطلاع دیدے۔

”کسی اور کو یہاں ہماری موجودگی کا پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ ہاشم کی بیوی کو بھی نہیں۔ ہاشم سے کہنا وہ فوراً یہاں آجائے۔“ دلاور نے کہا۔

قادر فوراً ہی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ دلاور اور پارو چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ نے انہیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ پارو تو چارپائی پر لیٹتے ہی سو گیا۔ مگر دلاور جاگتا رہا۔ وہ گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے کنبے پر ڈھائے جانے والے ظلم کی داستان کے دو مرکزی کرداروں تھانیدار اور چوہدری عنایت کو وہ جنم رسید کر چکا تھا۔ چوہدری کا ایک کارندہ، ایک مہمان اور ایک طوائف بھی اس کے انتقام کی بیجٹ چڑھ گئے تھے لیکن اس کے سینے میں بھڑکنے والا انتقام کا لاوا بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو بہت سے کردار باقی تھے جنہوں نے اس کی ماں اور بہن کو گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا تھا۔ یہ لاوا اس وقت تک سرد نہیں ہو گا جب تک وہ ظلم کی داستان کے ان تمام کرداروں کو ملیا میٹ نہیں کر دیتا۔

دلاور دو مرتبہ جیل گیا تھا۔ اور دونوں مرتبہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ بے گناہی ہی اس کا جرم بنی تھی۔ لیکن... اب وہ قائل تھا... پانچ افراد کو اس نے نہایت بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا اور شریف نوجوان تھا۔ وہ محنت مزدوری کر کے زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ مگر دولت کے پجاریوں اور طاقت کے نشے میں چور دور جدید کے ان فرعونوں نے اسے بھی انسان سے حیوان بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اور پارو نے اگرچہ پانچ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا مگر ان کے جرم کا کوئی کواہ نہیں تھا۔ ابھی تک ان قتلوں کے حوالے سے کسی کی زبان پر ان کا نام نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کا نام بھی سامنے آکر ہی رہے گا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہاشم آگیا۔ وہ دلاور کو دیکھ کر واقعی حیران ہوا تھا دلاور، اس کے ماں باپ اور بہن پر جو کچھ جیتی تھی، ہاشم سب کچھ جانتا تھا۔ دلاور اس کی نظروں میں دنیا کا مظلوم ترین آدمی تھا جس کے گھر اور زندگی کو اس طرح برباد کیا گیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ اسے دلاور سے ہمدردی تھی۔

”سنا ہے اس تھانیدار کو کسی نے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔“ ہاشم نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔

”اس تھانیدار نے نجانے کتنے بے گناہوں کو قانون کے جال میں پھنسا کر پھانسی کے تخت پر پھنچایا ہو گا۔ اس کے بیسیوں دشمن تھے۔ کسی کے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔“ دلاور نے جواب دیا اس کا چہرہ بالکل ساٹھا تھا۔ ”بے گناہوں پر ظلم کرنے والے آخر ایک نہ ایک دن قانون قدرت کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔“

”تم کیسے اس طرف آنکھیں؟“ ہاشم نے پوچھا۔ ”اس کے لیےج میں شے کی جھلک تھی۔“

”میں اپنے دوست کے ساتھ لعل گوشتی گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کے رشتے دار ہیں۔ واپسی پر سوچا کہ تم سے بھی ملتا جاؤں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”گاؤں آنے کی بجائے یہاں ڈیرے پر کیوں رک گئے؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”تھک گئے تھے یار... ہم نے سوچا یہیں آرام کر لیں۔ اور ہاں سنو، بھابھی کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا...“ دلاور بولا۔ ”کسی اور کو بھی پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ میں یہاں موجود ہوں۔“

”تمہاری باتیں مجھے الجھا رہی ہیں۔“ ہاشم کی آنکھوں میں شے کے سائے گہرے ہو گئے۔

”ابھن و ابھن کوئی نہیں یار... بس میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ ہم آج شام کو یہاں سے چلے جائیں

کے۔ اپنے دماغ کو زیادہ مت الجھاؤ... اور قادر سے کہو کہ ہمارے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرے۔“  
دلاور بولا۔

”میں کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہوں۔“ ہاشم بولا۔ ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک چاہو یہاں رہو... اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔“

ہاشم نے قادر کو بلا کر ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنے کی ہدایت کی اور یہ بات بھی اسے ذہن نشیں کرا دی کہ گاؤں کا یا کوئی اور شخص احاطے کی طرف نہ آئے پائے۔ پھر وہ دلاور سے دوپہر کے لگ بھگ آنے کا وعدہ کر کے گاؤں واپس چلا گیا۔

”میں کھانے وانے کا بندوبست کروں گی۔“ قادر نے ہاشم کے جانے کے بعد کہا۔  
”پہلے میرے جوتے کا بندوبست کرو جسے تمہارا کتا میرے پیر سے اتار کر لے گیا تھا۔“ پارو نے کہا۔  
ہاشم کے آجانے سے وہ بھی جاگ گیا تھا۔

...●...●...●...

قادر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے ایک ہاتھ میں پارو کا جوتا اٹھا رکھا تھا جسے شناخت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کتے نے جوتے کو اس طرح ادھیڑ ڈالا تھا کہ وہ پہننے کے قابل نہیں رہا تھا۔  
”میرا کھسہ پن لیتا۔ یہ جوتا تو آپ اب پن نہیں سکتے۔“ قادر نے کہا۔ اور چارپائی کے نیچے سے اپنا پرانا سا کھسہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔  
ایک گھنٹے بعد قادر نے روٹیاں پکالیں، لسی اور مکھن کے ساتھ روٹی کا واقعی بڑا مزہ آیا تھا۔ پیٹ بھرے ہی وہ دونوں سو گئے۔

تقریباً گیارہ بجے کے لگ بھگ ہاشم نے انہیں جگا دیا۔

”کیا بات ہے۔ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“ دلاور نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔  
”گزشتہ رات کسی نے چوہدری عنایت اور اس کے تین ساتھیوں کو دریا والے ڈیرے پر زندہ جلا دیا تھا۔ اس سلسلے میں واضح طور پر تمہارا نام لیا جا رہا ہے۔ پولیس کی بھاری نفری دریا کے دونوں طرف بستیوں میں تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ پولیس کی پارٹی ہمارے گاؤں کی طرف بھی آرہی ہے۔“ ہاشم نے بتایا۔  
”پریشان مت ہو۔ ہم ابھی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“ دلاور ایک دم اٹھ گیا۔  
”مجھے افسوس ہے دلاور...“

”اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔“ دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی اور بھی مصیبت میں پڑ جائے۔“  
وہ دونوں تیار ہو گئے۔ روانگی سے پہلے دلاور نے قادر کو ہدایت کی کہ وہ پارو کے جوتے گہرا گڑھا کھود کر اس طرح دفن کر دے کہ ان کا سراغ نہ لگایا جاسکے۔

وہ دونوں ہاشم کے ڈیرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کھیتوں میں چلنے لگے۔ انہوں نے چادریں اس طرح پلٹ رکھی تھیں کہ چہرے بھی کسی حد تک چھپ گئے تھے۔ کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں ایک ٹریکٹر ٹرالی مل گئی جس پر پٹھے لدے ہوئے تھے۔ وہ ٹرالی پر سوار ہو گئے۔  
ٹریکٹر کا ڈرائیور ادھیڑ عمر کا شکار تھا جو پٹھے لے کر رو جھان جا رہا تھا۔ دلاور اور پارو بیرونی چنگی سے دور

ہی ٹرائی سے اتر گئے اور سڑک سے ہٹ کر ایک لمبا چکر کانٹے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔

روحان میں وہ زیادہ دیر نہیں رکے۔ دوپہر کا کھانا ایک غیر معروف سے ریسٹورانٹ میں کھانے کے بعد وہ بس پر سوار ہو کر کینو اور پھر وہاں سے شاہ والی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک ریڑے پر بیٹھ کر وہ شاہ والی سے دریا پر پہنچے۔ اس وقت شام ہونے والی تھی۔ گھاٹ پر دریا پار جانے والے صرف تین مسافر تھے۔ ایک بوڑھا کسان، اس کی ہوا اور مینا، دو یہ آگئے تھے جبکہ کشتی پر دس مسافروں کی گنجائش تھی اور ملاح اس انتظار میں تھا کہ کچھ اور مسافر آجائیں۔

”زیادہ لاچ مت کر بھائی۔ اب چل دے، تیرا کونسا پیٹرول خرچ ہوتا ہے جو نقصان ہو جائے گا۔ چل، چپو ہم چلا دیں گے۔“ بوڑھے کسان نے کہا۔

ملاح نے دس پندرہ منٹ مزید انتظار کیا پھر کنارے پر لکڑی کے ایک ستون سے بندھی ہوئی سی کھول دی اور کشتی کو ڈھیل کر اس پر سوار ہو گیا اور چپو سنبھال لئے۔

یہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ لیکن ملاح نے بڑی مہارت سے کشتی کھینچے ہوئے انہیں پندرہ منٹ میں دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ دوسری طرف دو تین کشتیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن اس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ دو حلال پر کھیتوں کے قریب ایک ٹانگہ کھڑا تھا، ٹانگے والا غالباً اسی کشتی کا انتظار کر رہا تھا۔

یہ لوگ ابھی تک ضلع راجن پور کی حدود میں تھے۔ ٹانگے نے انہیں ضلع رحیم یار خان اور ضلع راجن پور کی سرحد پر واقع ایک گاؤں میں پہنچا دیا۔ دوسرے مسافر تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور یہ دونوں ایک چھوٹی سی دوکان پر آکر پوچھنے لگے کہ انہیں رحیم آباد جانے کے لئے اس وقت کوئی سواری مل سکتی ہے یا نہیں؟ لیکن پتہ چلا کہ اس وقت کوئی سواری نہیں ملے گی۔ انہیں رات اس بستی ہی میں گزارنی پڑے گی۔

وہ رات انہوں نے گاؤں کی مسجد میں گزار دی۔ اور صبح جیسے ہی موزن نے فجر کی اذان دی، وہ اٹھ کر مسجد سے باہر آگئے اور گاؤں سے نکل کر کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

صبح آٹھ بجے کے قریب رحیم آباد سے بس آگئی۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ بس واپس روانہ ہوئی تو دلاور اور پارو بھی اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں راستے ہی میں کنڈیکٹر سے پتہ چل گیا تھا کہ یہ کھٹارہ ہی بس شفل ٹرین کی طرح رحیم آباد اور اس گاؤں کے درمیان چلتی ہے اور دن میں تین چار چکر لگا لیتی ہے۔

رحیم آباد سے انہیں صادق آباد کے لئے بس مل گئی اور وہ سہ پہر کے قریب صادق آباد پہنچ گئے۔

صادق آباد میں دلاور کا ایک دوست مشتاق موجود تھا جو تھا تو صرف بس پاس مگر بلا کا ذہن آدمی تھا۔ اس کا کوئی مستقل کام نہیں تھا۔ کبھی ایک دھندہ کرنا اور کبھی دوسرا شروع کر دیتا۔ جب کوئی کام نہ ہوتا تو دادا گیری شروع کر دیتا۔ مشتاق، دلاور کا ہم عمر ہی تھا۔ پہلے وہ رحیم یار خان میں اس کی خالہ کے گھر کے قریب رہا کرتا تھا۔ ان دونوں کی دوستی وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ دلاور جب بھی رحیم یار خان آتا اس کا زیادہ وقت مشتاق کے ساتھ ہی گزرتا۔ دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ مشتاق کو اس وقت کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ وہ پارو کو لے کر شہر کے مرکزی چوراہے پر آگیا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ بتیاں جگمگا اٹھی تھیں اور چوک پر بڑی چل چل تھی۔ مشتاق ایک چھوٹے سے ریسٹورانٹ کے سامنے تھڑے پر اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور اس کے قریب آکر رک گیا۔ مشتاق اسے دیکھ کر اچھل پڑا اور اس طرح گرجوٹی سے ملا جیسے برسوں سے پھڑے ہوئے ہوں۔

”جی خوش کر دیا تو نے دلاور۔“ مشتاق اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ”تیرے جیسے دو چار اور دلاور پیدا ہو جائیں تو کم از کم اس ضلع سے پولیس اور زمینداروں کی فرعونیت ختم ہو جائے۔ ہر طرف تیرے ہی نام کے چرچے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے پولیس یہاں بھی میری تلاش میں ہوگی“ دلاور بولا، وہ مشتاق کی بات سن کر چونک گیا تھا۔

”پولیس تمہاری تلاش میں ہے تو کیا ہوا۔“ مشتاق بولا۔ ”تم نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ تو تو کئی روز سے میرے پاس ہے۔ اپنے گاؤں کی طرف گیا ہی نہیں۔ بہت سے لوگ یہاں تمہاری موجودگی کی گواہی دے سکتے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ میں نے تو سنا ہے کہ علاقے کے بہت سے زمیندار بھی تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ایسے جاگیردار اور زمیندار تم جیسے بہادروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھو... میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور یہ کون ہے؟“

”میرا جگری یار ہے پارو۔“ دلاور نے تعارف کرایا۔  
 ”تو پھر میرا بھی جگری یار ہوا نا... آؤ... اندر بیٹھتے ہیں۔ کوئی چائے وائے... ٹھنڈا گرم...“ مشتاق کہتے ہوئے ان دونوں کو ریسنورنٹ کے اندر لے آیا اور وہ کونے کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ دلاور کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دلاور گہری سوچ میں تھا۔ تھانیدار کو پھانسی اور چوہدری عنایت اور اس کے زندہ جلائے جانے کی خبریں ہر طرف پھیل چکی تھیں۔ تھانیدار کے قتل پر اگرچہ کسی نے دلاور کا نام نہیں لیا تھا لیکن چوہدری عنایت کے واقعہ سے لوگوں نے ان دونوں واقعات کی کڑیاں آپس میں ملا لی تھیں اور پولیس کو بھی اب دلاور پر شبہ تھا۔ مشتاق کے سامنے اگرچہ اس نے اپنے منہ سے ان واقعات کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی لیکن اسے بہر حال یہ جان کر اطمینان ہوا تھا کہ مشتاق اس کا ساتھ دینے کو تیار تھا۔  
 ”آؤ... گھر جا کر بات کرتے ہیں۔“ مشتاق نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں بھی چائے پی چکے تھے۔

وہ دونوں اس کے ساتھ مشتاق کے گھر آ گئے۔ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک کمرہ جو مشتاق کے استعمال میں تھا، اتھری کا شکار تھا۔ چارپائی اور دو کرسیوں پر بے ترتیبی سے میلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر سگریٹوں کے لاتعداد ٹوٹے پھیلے ہوئے تھے۔  
 ”بیٹھو یار دلاور...“ مشتاق نے کرسیوں پر سے میلے کپڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اپنی زندگی تو بس ایسے ہی گزر جائے گی۔“

”اسی لئے تو ایک مرتبہ کہا تھا کہ شادی کرلو۔ زندگی سدھر جائے گی۔“ دلاور بولا۔  
 ”اپنا پیٹ بھرنے کا تو بندوبست نہیں ہوتا، جسے بیاہ کر لاؤں گا اسے کہاں سے کھلاؤں گا۔ نہیں بھئی، میں یہ جھنجھٹ نہیں پال سکتا۔“ مشتاق بولا۔ ”اچھا چھوڑو ان باتوں کو، پہلے یہ بتاؤ کہ آکھاں سے رہے ہو؟“

”مقدمے سے بری ہونے کے بعد گاؤں گیا تھا مگر چوہدری عنایت کے آدمیوں نے مار مار کر ادھ موا کر کے گاؤں سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد میرا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ یہ اپنا پارو ہے، اگر یہ مجھے سارا نہ دے تو شاید میں بھی ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ بڑا جی دار آدمی ہے۔ بڑا ساتھ دیا ہے اس نے میرا۔“ دلاور نے کہا۔

”ایسے موقعوں پر یاری کام آتے ہیں۔“ مشتاق نے کہا۔ ”اگر مصیبت کے وقت کوئی ہاتھ نہ پکڑے تو یاری کس کام کی۔ اچھا تاؤ اب پروگرام کیا ہے؟“

”پروگرام تو بڑے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ ہمارے کیا پروگرام ہوں گے۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”گھاؤں سے نکلنے کے بعد تمہیں کسی نے علاقے میں تو نہیں دیکھا؟“ مشتاق نے پوچھا۔

”نہیں۔“ دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہوش آنے کے بعد میں پارو کے پاس چلا گیا تھا۔ میری حالت بہت خراب تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ اور اس کے بعد بھی پارو نے میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔“

”عام لوگوں کو اور پولیس کو محض یہ شبہ ہے کہ اپنے گھر کی بربادی اور ماں اور بہن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے تم نے پہلے تھاندار کو پھانسی دی اور پھر چوہدری عنایت کو زندہ جلا دیا۔ لیکن یہ محض شبہ ہے۔ کوئی عینی یا واقعاتی شہادت ابھی تک تمہارے خلاف نہیں ملی۔ پولیس کو تمہاری تلاش ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس تمہیں ڈھونڈ نکالے، میرے خیال میں تمہیں ضمانت قبل از گرفتاری کرا لینی چاہئے۔“ مشتاق نے کہا۔

”کون دے گا میری ضمانت؟“ دلاور بولا۔

”بہت لوگ ہیں۔“ مشتاق نے جواب دیا۔ ”کئی زمیندار تم جیسے دلاور کو اسے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی تمہاری ضمانت دے سکتا ہے۔ لیکن میں ایک مشورہ دوں گا۔ کسی کا ملازم بن کر مت رہنا۔ فری لانس بن کر رہو۔ وہ جیسے اخبار والے کہتے ہیں ٹافرٹی لانس، بس وہی... غلامی کسی کی نہیں، کام سب کا کرو۔ لیکن... تمہاری ضمانت کے لئے رائے منصور سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں ہوگا۔ بہت شریف آدمی ہے اور بڑا شہکا ہے اس کا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں... آج دوپہری کو تو پکھری میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں تمہارا ذکر بھی آیا تھا۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو کمزور سے کمزور آدمی بغاوت پر اتر آتا ہے اور بڑا خطرناک بن جاتا ہے۔ رائے منصور میرا بڑا لحاظ کرتا ہے۔ میرے باپ نے اس کی بڑی خدمت کی ہے۔ رائے منصور نے جب یہاں زمین خریدی تھی تو میرا باپ پہلا آدمی تھا جس نے اس کی ملازمت کی تھی۔ اگر تم کو تو میں اس سے بات کروں؟“

”کر دیکھو۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں صبح ہی تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔ احمد پور لاما کے قریب اس کی زمین ہے۔ قصبے سے دو میل دور اس نے اپنے مزارعین کے لئے جو بستی بنائی ہے تم اسے بھی دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ بڑا خیال رکھتا ہے وہ اپنے آدمیوں کا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری ضمانت ضرور کروا دے گا۔“ مشتاق نے کہا۔

اور پھر وہ رات ان دونوں نے مشتاق کے گھر میں گزاری۔ صبح سویرے پارو تو درمنہار کی طرف روانہ ہو گیا اور دلاور اور مشتاق احمد پور لاما جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔

وہ دوپہر کے وقت رائے منصور کی حویلی پہنچے تھے۔ رائے منصور سے ملاقات کے لئے انہیں تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ اور جب مشتاق نے رائے منصور سے دلاور کا تعارف کرایا تو رائے منصور دیر



تک گہری اور دلچسپ نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔

دلاور نے شروع میں چوہدری عنایت کے کارندے سے ہونے والے جھگڑے سے لے کر اب تک پیش آنے والے تمام واقعات سنا دیئے۔

”تو تمہیں یقین ہے کہ تمہارے ان جرائم کا کوئی ثبوت نہیں ہے؟“ رائے منصور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“ لوگ سمجھتے ہیں کہ آخری مرتبہ چوہدری کے کارندوں نے مجھے ادھ موا کر کے گاڑی میں پھینک دیا تھا تو ہوش میں آنے کے بعد میں چوہدری سے ڈر کر کہیں بہت دور چلا گیا تھا۔ اس کے بعد کسی نے میلوں دور تک مجھے اس علاقے میں نہیں دیکھا۔ لیکن اب لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ سب کچھ میں نے ہی انتقاماً کیا ہے۔“ دلاور نے کہا۔

تقریباً دو گھنٹوں تک اس موضوع پر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ رائے منصور دلاور کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اگر اس کے ساتھ بربریت کا مظاہرہ نہ ہوتا تو وہ کسی صورت میں بھی بغاوت پر نہ اترتا۔ وہ ایک گہرو جوان تھا۔ رائے منصور کے کام کا آدمی تھا۔ اس نے اسی وقت دلاور کی سرپرستی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”آج تم یہیں رہو... کل صبح میں خود تمہارے ساتھ صادق آباد جاؤں گا۔ تجھے یقین ہے کہ تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ مشتاق! اسے مہمان خانے میں لے جاؤ۔“ رائے منصور نے آخری الفاظ مشتاق سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔ پھر ایک ملازم کو بلا کر ان کے آرام اور کھانے وغیرہ کے بارے میں ہدایت کر دی۔

دوسرے دن رائے منصور نے صادق آباد کی عدالت سے دلاور کی ضمانت قبل از گرفتاری کرائی۔

”اب تم میرے ساتھ چلو گے یا مشتاق کے پاس رہو گے۔“ رائے منصور نے پوچھا۔

”میں مشتاق کے پاس ہی رہوں گا رائے صاحب۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”لیکن وقتاً فوقتاً“ آپ کی خدمت میں حاضری دیتا رہوں گا۔ میں ان پڑھ اور جاہل ضرور ہوں لیکن کم اصل نہیں ہوں۔ آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ میری جان بھی آپ کے لئے حاضر ہے۔“

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا نوجوان۔“ رائے منصور نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک شریف اور بخیر نوجوان ہو۔ میں تمہارے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا جو تم نے بتایا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہاری اس کمائی میں کہیں بھی جھوٹ کی آمیزش نہیں ہے۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔ لودہ... یہ رکھ لودہ... کام آئیں گے۔“ رائے منصور نے کچھ نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیئے۔ ”جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو... کوئی مسئلہ ہو... بلا تکلف حویلی چلے آنا۔“

”شکریہ رائے صاحب۔“ دلاور کی گردن جھک گئی۔

رائے منصور اپنی پاجیرو پر سوار ہو کر چلا گیا۔ دلاور سڑک پر دیر تک کھڑا دور ہوتی ہوئی پاجیرو کو دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا میں ایسے بھی آدمی موجود ہیں۔

دلاور نے مشتاق کے ساتھ ہی مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رائے منصور نے واپس جاتے ہوئے اسے جو رقم دی تھی وہ پورے دس ہزار روپے تھی۔ کچھ رقم خرچ کر کے گھر کے لئے کچھ سامان وغیرہ

خرید لیا۔ ضمانت ہو جانے کے بعد اسے کیس چھپنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آزادی سے شہر میں گھومتا رہا۔ لیکن تیسرے روز آدمی رات کو پولیس نے دلاور کی گرفتاری کے لئے مکان پر چھاپہ مار دیا دلاور نے جب پولیس آفیسر کو ضمانت قبل از گرفتاری کے کاغذات دکھائے تو پولیس آفیسر اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

”کس نے دی ہے تمہاری ضمانت؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔  
 ”رائے منصور نے... میرا خیال ہے اسے تم اچھی طرح جانتے ہو گے۔“ دلاور بولا۔ رائے منصور کا نام سن کر پولیس آفیسر کا منہ لٹک گیا۔

پولیس کو دلاور کا سراغ مل گیا۔ تھانیدار کو پھانسی اور چوہدری عنایت اور اس کے ساتھ تین افراد کو زندہ جلائے جانے کا کیس راجہ یار خان کی عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ دلاور کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ رائے منصور نے راجہ یار خان میں اپنے وکیل کو دلاور کے مقدمے کی پیروی کی ہدایت کر دی تھی۔

دلاور کے وکیل نے پہلی دو پیشیوں پر ہی استغاثہ کے پرچے اڑا دیئے۔ استغاثہ کوئی عینی یا واقعی شہادت پیش نہیں کر سکا تھا جس سے یہ پتہ چلتا کہ دلاور ان جرائم میں ملوث ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس مشتاق اور دوسرے بہت سے لوگوں نے یہ گواہی دی تھی کہ جن تاریخوں میں یہ واقعات پیش آئے تھے ان تاریخوں میں دلاور ان جگہوں سے میلوں دور صادق آباد میں موجود تھا۔ دلاور کے خلاف کوئی شہادت نہ ہونے اور گواہوں کے بیانات کی روشنی میں عدالت نے دلاور کا نام اس مقدمے سے خارج کر دیا۔

قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے زمیندار دلاور کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ ان سب کو یقین تھا کہ تھانیدار اور چوہدری عنایت دلاور ہی کے انتقام کا نشانہ بنے ہیں لیکن دلاور نے اپنی ذہانت سے اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی بہادری اور ذہانت سے متاثر ہو کر ہی چھوٹے چھوٹے زمیندار اسے اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے مگر... دلاور نے بقول مشتاق ”فری لانس“ رہنا ہی پسند کیا تھا۔

علائے کے زمیندار اسے تحفے تحائف بھیجتے رہتے۔ اسے نقد نذرانے بھی مل رہے تھے۔ محمد عمر کے ایک زمیندار نے صادق آباد کے نواح میں اپنا خوبصورت بنگلہ جو عرصہ سے خالی پڑا تھا، رہائش کے لئے دلاور کو دے دیا تھا اور اسے ایک بہت خوبصورت اور جاندار گھوڑا بھی بھیج دیا تھا۔

دلاور اس سفید گھوڑے پر سوار آس پاس کے علاقوں میں گھومتا پھرتا اس کے نام کا بڑا ہنکا تھا۔ چھوٹے زمیندار تو اس کی عزت کرتے بعض بڑے زمیندار ایسے بھی تھے جو دلاور سے خائف رہنے لگے تھے۔ دلاور ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھنک رہا تھا۔ دلاور بھی ایسے لوگوں سے بے خبر نہیں تھا۔ لیکن وہ کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھا کر بلا وجہ ان لوگوں کی دشمنی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

دلاور وقتاً فوقتاً ”رائے منصور کے ہاں بھی چکر لگاتا رہتا تھا۔ رائے منصور اسے دیکھ کر اکثر گہرا سانس بھر کر رہ جاتا۔ وہ اکثر سوچتا کہ کاش! دلاور اس کا بیٹا ہوتا!

رائے منصور کو معلوم تھا کہ اب دلاور کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن وہ ہر مینے کچھ نہ کچھ رقم اسے بھجواتا رہتا تھا۔ اس نے آج تک دلاور سے کوئی کام نہیں لیا تھا۔ لیکن نالہ درانی کے معاملے میں اس نے پہلی بار خود دلاور کو بلایا تھا۔ کیونکہ رائے منصور کے خیال میں دلاور جیسا شخص ہی شبیر درانی سے نمٹ سکتا تھا۔

نالہ درانی نے جب دلاور کو دیکھا تھا تو اس نے اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی۔ وہ

اس کے دل و دماغ پر چھاتا چلا گیا تھا۔ رائے منصور سے اس کی کمائی سننے کے بعد تو اسے یوں لگا کہ جیسے وہ ایک ہی کشتی کے سوار ہوں، فرق صرف اتنا تھا کہ دلاور پانچ آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد بھی قانون کی نظروں میں بے گناہ ثابت ہو گیا تھا اور وہ کوئی جرم نہ کرنے کے باوجود قانون سے جھپٹی پھر رہی تھی۔

نائلہ درانی نے وہ رات جاگتے ہوئے گزاری۔ وہ ایک لمحہ کو بھی نہیں سو سکی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر دلاور مسلط تھا۔ کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے دلاور اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔

کھڑکی سے صبح کا اجالا جھانکنے لگا تھا۔ ایک نئے دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ رات بھر کی نیند پوری کرنے کے بعد لوگ بیدار ہو رہے تھے لیکن نائلہ درانی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔

...●...●...●...

دلاور کے جانے کے تین دن بعد کی بات تھی۔

رائے منصور کے ہاں اخبار روزانہ آیا کرتا تھا اور نائلہ درانی یہاں آنے کے بعد باقاعدگی سے اخبار پڑھا کرتی تھی۔ اس روز بھی صبح ناشتے کے بعد وہ رضیہ کے ساتھ لان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ حویلی کا چوکیدار اخبار لے کر اندر داخل ہوا۔

”اخبار آگیا... یہاں لے آؤ دارا۔“ نائلہ نے اسے آواز دی۔

دارالان میں آگیا اور اخبار دے کر گیٹ کی طرف واپس چلا گیا۔ نائلہ درانی نے اخبار کھول لیا۔ رحیم یار خان سے شائع ہونے والے اس اخبار کی ہیڈ لائن ایک صوبائی وزیر کے بیان پر مشتمل تھی۔ جس نے گزشتہ روز شہر کے کسی فلاحی ادارے کا افتتاح کیا تھا۔ نائلہ کو اس قسم کی خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دوسری سرخیوں پر نظر دوڑانے لگی اور پھر اخبار کی لوح کے نیچے تین کالمی سرخی پر نظر پڑتے ہی وہ اس طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

”کیا ہوا نائلہ! کوئی خاص خبر؟“ رضیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں... یہ دیکھو... کسی نے شیر درانی کے کلیان میں آگ لگا دی۔ اس کا لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔“ نائلہ کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس نے اخبار سامنے رکھی ہوئی بانس کی کھچھیوں والی میز پر پھیلا دیا۔ رضیہ بھی آگے جھک آئی۔

نائلہ درانی وہ خبر پڑھنے لگی۔ شیر درانی کی گھرگ والی زمین پر کئی ہوئی فصل کے کلیانوں میں بعض نامعلوم افراد آگ لگا کر فرار ہو گئے۔ کلیان مکمل طور پر تباہ ہو گئے جس سے لاکھوں روپے کی فصل جل کر راکھ ہو گئی۔ شیر درانی نے الزام لگایا ہے کہ یہ آگ اس کے دشمنوں نے لگائی ہے جن کا وہ نام نہیں بتانا چاہتا۔ بلکہ وہ اپنے دشمنوں سے خود نمونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

نائلہ درانی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دشمنوں سے شیر درانی کا اشارہ کس طرف تھا۔ اس اخبار میں نائلہ درانی کے بارے میں بھی ایک خبر تھی۔ یہ نیبل نیوز تھی اور اس میں پولیس پر الزام لگایا گیا تھا کہ ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود پولیس کئی افراد کی قاتلہ کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ پولیس پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ نائلہ درانی ایک دولت مند اور بااثر عورت ہے۔ اس کا خاندان اس علاقے کی سیاست پر حاوی ہے جس وجہ سے پولیس جان بوجھ کر نائلہ درانی پر ہاتھ ڈالنے سے ہچکچا رہی ہے۔ حالانکہ پولیس اچھی طرح جانتی ہوگی کہ نائلہ درانی کہاں روپوش ہے۔

نالہ درانی ابھی طرح جانتی تھی کہ یہ خبر شیردرانی کے اشارے پر شائع کی گئی تھی تاکہ پولیس نالہ کی تلاش میں مزید سرگرمی پیدا کرے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیردرانی کے آدمی شکاری کتوں کی طرح اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔

رائے منصور اس روز صبح سویرے ہی کھیتوں پر چلا گیا تھا۔ اس کے لئے دوپہر کا کھانا بھی کھیتوں ہی پر بھیجا گیا تھا۔ اس کی واپسی شام سے ذرا پہلے ہوئی تھی۔ وہ رات کے کھانے پر جمع ہوئے تو نالہ نے شیردرانی کے کھلیانوں میں آتشزدگی کا ذکر کیا۔

”میں تو یہ خبر بڑھ کر حیران رہ گئی ہوں۔“ نالہ درانی نے کہا۔ ”ایسا کون جرات مند شخص ہو سکتا ہے جو شیردرانی جیسے شخص کو نقصان پہنچا کر اس سے ٹکر لینے کی کوشش کرے گا۔“

”سیر پر سوار میر تو ہوتا ہی ہے نا بیٹی۔“ رائے منصور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہو گا کوئی اس کا ستایا ہوا۔ میں نے ایک مرتبہ کہا تھا تاکہ جب ظلم انتہا سے بڑھ جاتا ہے تو کمزور سے کمزور شخص بھی انتہائی خطرناک بن جاتا ہے۔ دلاور کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اسے بھی ظلم نے ہی سرائٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ کتنا خطرناک ہو گیا تھا۔ پانچ افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد بھی میں جانتا ہوں کہ اس کے سینے میں انتقام کی آگ سرد نہیں ہوئی۔ اسے جب بھی موقع ملے گا وہ ایسی حرکتیں کرتا رہے گا جس سے اس کے جذبات کو تسکین ملتی ہو۔ کیا تم اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھول سکتی ہو؟ کیا تمہارے سینے میں انتقام کی آگ نہیں بھڑک رہی۔ کیا تم اس شخص سے انتقام نہیں لینا چاہتیں جس نے تمہیں دردِ در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا ہے اور جو تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے؟“

”اس سے تو میں ایسا انتقام لوں گی کہ آنے والی کئی نسلیں یاد کریں گی۔“ نالہ درانی کے دانت بھنج گئے۔

”تو پھر یوں سمجھو کہ تمہاری طرف سے یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شیر کے کھلیانوں میں لگائی جانے والی یہ آگ...“ نالہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہارا خیال درست ہے۔“ رائے منصور مسکرایا۔ ”دلاور کے سوا کون ہو سکتا ہے! تمہیں یاد ہے اس نے کہا تھا کہ وہ شیردرانی کو چین سے نہیں بیٹھے دے گا۔ شیردرانی کے کھلیان میں آتشزدگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنا کام شروع کر چکا ہے۔“

”اوہ!“ نالہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”لیکن اگر دلاور پکڑا گیا تو کیا شیردرانی آپ کی طرف نہیں جھپٹے گا؟“

”دلاور بہت ذہین ہے۔ اس نے میلوں دور تک اپنی موجودگی کا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہو گا۔ بالفرض وہ پکڑا بھی گیا تو جان دے دے گا لیکن اس کے ہونٹوں پر میرا یا تمہارا نام نہیں آئے گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ کہنے لگا۔ ”لیکن شیردرانی کے خلاف ہونے والی اگلی کارروائی تمہارے نام سے کی جائے گی تاکہ اسے پتہ چل جائے کہ اب تم بے بس نہیں رہی ہو بلکہ تم بھی اس پوزیشن میں ہو کہ اس کے خلاف کچھ کر سکو۔“

”ٹھیک ہے، میں بھی اسے یہی احساس دلانا چاہتی ہوں کہ اب میں بے بس نہیں رہی۔“ نالہ درانی نے جواب دیا۔

”کچھ اور باتیں کریں بھی! مجھے تو قتل و غارت کی ان باتوں سے ہول آنے لگا ہے۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔

اور پھر واقعی انہوں نے موضوع بدل دیا۔ رضیہ خاموش ہی رہی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ البتہ وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کی تقدیر اب نائلہ ہی سے وابستہ تھی۔ وہ زمینداروں کے لڑائی جھگڑوں سے واقف تھی جو نسل در نسل چلتے رہتے تھے۔ اب وہ بھی اپنے گھر جانے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نائلہ کو شبیر درانی کی قید سے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔

دوسرے دن اخبار میں ایک اور سنسنی خیز خبر چھپی۔ صادق آباد پولیس نے رحیم یار خان سے شبیر درانی کے ایک گمن مین سبزل کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس پر خیر گڑھ کے قریب ایک سوزوکی ڈرائیور عبدالحق کو قتل کرنے کا الزام تھا جس کی لاش شبیر درانی کے ایک عدد گمن مین کے ساتھ سڑک کے کنارے ریگستان میں پڑی ہوئی پائی گئی تھی۔ وہ آنویک رائل بھی پولیس کے قبضے میں تھی جس پر نائلہ درانی کی انگلیوں کے نشانات بھی تھے لیکن ٹرائیگر پر صرف سبزل کی انگلی کا نشان تھا۔۔۔ سبزل کی گرفتاری کے بعد پولیس یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ شبیر درانی کے دوسرے گمن مین کو کس نے ہلاک کیا تھا۔

یہ خبر پڑھ کر نائلہ درانی جھوم ہی تو اٹھی تھی۔ وہ دلاور کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ پولیس کو اس راستے پر بھی یقیناً دلاور ہی نے لگایا تھا۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ پولیس نے شبیر درانی کے کسی آدمی پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ چشم تصور سے دیکھ رہی تھی کہ جب پولیس نے سبزل کو گرفتار کیا ہو گا تو شبیر درانی کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس نے کس کس طرح کے حربے استعمال کر کے پولیس کو دبانے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن پولیس اس کے دباؤ میں نہیں آئی تھی اور اسے گرفتار کر کے صادق آباد لے آئی تھی۔

نائیلہ درانی کو یقین تھا کہ اگر دلاور اسی طرح مرحلہ وار آگے بڑھتا رہا تو بالآخر ایک نہ ایک روز نائلہ کی پیشانی پر لگے ہوئے تمام داغ دھل جائیں گے اور وہ سرخرو ہو کر لوگوں کے سامنے آسکے گی۔ نائلہ ایک بار پھر دلاور کے بارے میں سوچنے لگی۔ نجانے کیا بات تھی کہ وہ جب بھی دلاور کے بارے میں سوچتی اس کے دماغ میں ایک عجیب سی سنساٹھ ہونے لگتی۔ کبھی یوں لگتا جیسے پورے جسم پر چوہیاں سی رینگ رہی ہوں۔ کبھی لگتا کوئی اسے گدگدا رہا ہو۔

”کیا بات ہے، کہاں کھوئی ہوئی ہو؟“ رضیہ نے قریب آکر پوچھا۔

”دلاور کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔“ نائلہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”دلاور کے بارے میں سوچ رہی تھیں!“ رضیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے، آج کل تم دلاور کے بارے میں بہت سوچنے لگی ہو۔ لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا کہ وہ بہت سنگدل اور۔۔۔“

”رضیہ!“ نائلہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ شبیر درانی کی قید سے فرار کے بعد ان دونوں میں بہت زیادہ بے تکلفی ہو گئی تھی۔ رضیہ کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ نائلہ درانی ایک کروڑ پتی عورت ہے۔ اگر حالات اسے اس موڑ پر لے آئے ہیں تو کیا ہوا۔ اس کی حیثیت تو نہیں بدلی تھی۔ نائلہ نے بھی رضیہ کو کبھی کمتر نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ وہ تو اس کی احسان مند تھی۔ وہ جو زندگی کے سانس لے رہی تھی اس کے لئے وہ رضیہ ہی کی مرہون منت تھی۔ اگر شبیر درانی کی قید میں رہتے ہوئے رضیہ کو اس پر رحم نہ آتا تو شبیر درانی اسے صوبہ خان کے حوالے کر چکا ہوتا۔ صوبہ خان اسے قتل کر کے لاش قہر کے صحرا میں پھینک دیتا جہاں

گدھ اس کی ہڈیوں سے گوشت کے باریک باریک ریٹے تک نوچ چکے ہوتے۔  
 اسی رات نوبے کے قریب نالکہ درانی، رائے منصور، آصف بیگم اور رضیہ ڈرانگ روم میں بیٹھے  
 چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے کہ باہر کال بیل کی آواز سنائی دی۔  
 ”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ نالکہ کھنٹی کی آواز سن کر چونک سی گئی۔  
 ”بستی ہی کا کوئی آدمی ہوگا۔ اس دروازے پر آنے کے لئے کسی کے لئے وقت کی کوئی پابندی  
 نہیں۔“ آصف بیگم نے جواب دیا۔

چند منٹ گزر گئے... پھر برآمدے میں قدموں کی آواز سنائی دی اور دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔  
 ”آجاؤ دارا... دروازہ کھلا ہوا ہے!“ رائے منصور نے آواز لگائی۔  
 دروازہ کھلا اور دارا اندر داخل ہوا۔ اس کے کندھے پر آٹومیک گن لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے جوتا  
 دروازے کے قریب ہی اتارا اور رائے منصور کے سامنے آکر رک گیا۔  
 ”کیا بات ہے، کون آیا ہے اس وقت؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”صادق آباد سے مشتاق آیا ہے سرکار... کہتا ہے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے اسے مہمان  
 خانے کی طرف بھیج دیا ہے۔“ دارا نے کہا۔

”ٹھیک ہے... میں آ رہا ہوں۔“ رائے منصور نے جواب دیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔  
 دارا واپس چلا گیا تھا۔ مشتاق کا نام سن کر رائے منصور کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ یقیناً کوئی اہم بات ہوگی جو  
 مشتاق کو اس وقت یہاں آنا پڑا۔ اگر معاملہ اہم نہ ہوتا تو وہ دن میں آتا یا ٹیلی فون پر بھی بات کر سکتا تھا۔  
 چائے کا آخری گھونٹ بھر کھالی کپ میز پر رکھتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔  
 ”تم لوگ گپیں لڑاؤ... میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔“

رائے منصور جب مہمان خانے میں داخل ہوا تو مشتاق ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ  
 اٹھ گیا۔

”کیا بات ہے۔ خیریت؟ دلاور تو ٹھیک ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”دلاور ٹھیک ہے سرکار لیکن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا ہے جس کے بارے میں آپ کو اطلاع دینا  
 ضروری سمجھا۔ میں نے فون پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لئے خود آ گیا ہوں۔“ مشتاق نے کہا۔  
 ”کہو... کیا بات ہے؟“

”صادق آباد پولیس کلر رحیم یار خان سے شبیر درانی کے جس گن مین کو سوزوکی ڈرائیور عبدالحق کے  
 قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لائی تھی۔ اسے حوالات میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے!“ مشتاق نے  
 بتایا۔

”کیا...؟ گولی کس نے ماری...؟ پولیس نے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”جی نہیں...“ مشتاق بولا۔ ”سبزل کو تھانے کے جس لاک اپ میں رکھا گیا تھا اس کی پچھلی طرف  
 ایک تنک سی گولی ہے۔ حوالات کی عقیبی دیوار میں ایک چھوٹا سا روشندان بھی ہے۔ جس میں لوہے کی  
 سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ کسی نامعلوم شخص نے اس روشندان سے سبزل پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کے  
 جسم میں سات گولیاں لگی ہیں۔ کچھ گولیاں سامنے والی دیوار اور فرش پر بھی لگی ہیں۔“  
 ”یہ بہت برا ہوا۔“ رائے منصور بولا۔ ”قاتل کا پتہ چلا؟“

”جی نہیں۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ وہ کم از کم دو آدمیوں تھے جو سبزل کو چھپائی کرنے کے بعد موٹر سائیکل پر فرار ہو گئے۔

”یہ واقعہ کس وقت رونما ہوا تھا؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”مغرب کے تقریباً دس منٹ بعد۔“ مشتاق نے بتایا۔ ”میں ایک گھنٹہ پہلے موٹر سائیکل پر روانہ ہوا تھا۔ پولیس اس وقت تک درجنوں مشتبہ لوگوں کو گرفتار کر چکی ہے۔ پولیس والے دلاور کے بارے میں بھی پوچھنے آئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ دودن سے رحیم یار خان اپنی خالہ کے ہاں گیا ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہارا واپس جانا ٹھیک نہیں ہے رات یہیں رہو۔ صبح چلے جانا۔ کھانا وغیرہ کھایا ہے یا نہیں؟“

”کھانے کی تو بھوک نہیں سرکار۔ اگر دارا کے ہاتھ چائے کا ایک کپ بھیجو دیجئے تو۔۔۔“

”اچھا، میں چائے بھیجو آتا ہوں۔“ رائے منصور مسمان خانے سے نکل حویلی میں آگیا۔ اس نے پہلے مشتاق کے لئے چائے بھیجوائی اور پھر نائلہ درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”سبزل کو آج شام گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔“

”کیا...؟“ نائلہ چونک گئی۔ ”مگر وہ تو پولیس کی حراست میں تھا۔“

”اسے گولی حوالات ہی میں ماری گئی ہے۔ بلکہ آٹومیک رائفل سے پورا برسٹ مار کر اسے چھپائی کر دیا گیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اسے کس نے گولی ماری ہوگی؟“ رائے منصور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شبیر درانی کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔ اسی نے مروایا ہو گا سبزل کو۔۔۔ اگر وہ زندہ رہتا تو پولیس کے سامنے اس کے بہت سے جرائم سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن بہر حال، مجھے سبزل کے مرنے کا افسوس نہیں ہوا۔ افسوس تو صرف اس بات کا ہو رہا ہے کہ وہ پولیس کو شبیر درانی کے بارے میں کچھ بتائے بغیر مر گیا۔“

نائلہ درانی نے کہا۔

”اچھا بھئی۔ آپ لوگ باتیں کریں میں تو جا رہی ہوں۔“ آصفہ بیگم کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ رضیہ نے بھی جمائی لیتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

رائے منصور اور نائلہ درانی دیر تک بیٹھے اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

”آپ نے بتایا تھا کہ پولیس دلاور کے بارے میں بھی پوچھ رہی تھی۔ اسے تو۔۔۔“

”اسے کچھ نہیں ہو گا۔“ رائے منصور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ ایک ذہین نوجوان ہے۔ صورت حال سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہے۔ ویسے بھی جب سبزل کو گولی ماری گئی تو دلاور اس وقت صادق آباد میں نہیں رحیم یار خان میں موجود تھا۔ اور اب بھی وہیں ہے۔“

نائلہ درانی کے منہ سے بے اختیار اطمینان کا سانس نکل گیا۔ اس کے چہرے پر بھی طمانیت سی آگئی تھی۔

”دلاور کو تمہاری ساری کہانی معلوم ہے۔ کچھ وہ خود بھی جانتا تھا اور اندر کی کچھ باتیں اسے بتادی گئی ہیں۔ اگر اس کی سبزل والی چال ناکام ہو گئی ہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ شاطر آدمی ہے۔ کوئی اور چال چلے گا۔“ رائے منصور نے کہا۔

نائلہ درانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دلاور کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نجانے کیوں دلاور کا نام

اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔

”اب تم جا کر سو جاؤ۔۔۔ ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔“ رائے منصور کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

ناگلہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ رضیہ اپنے بستر پر سو رہی تھی۔ ناگلہ کا بیڈ اگرچہ الگ تھا لیکن وہ رضیہ کے بستر پر لیٹ گئی اور رضیہ کے ساتھ لپٹ گئی۔ رضیہ نیند میں کسمپاسی لیکن ناگلہ نے اسے اپنے ساتھ بچھینچ لیا۔

دفعۃً ”باہر دور کیس کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ ناگلہ نے رضیہ کو چھوڑ دیا اور سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔ کتا تو ایک مرتبہ بھونک کر خاموش ہو گیا تھا لیکن ناگلہ کا ذہن پر آگندہ ہو گیا تھا۔ نجانے کیوں کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر شیردرانی کا خیال اس کے ذہن میں کھس آیا تھا اور وہ سوچنے لگی تھی کہ شیردرانی پاگلوں کی طرح اپنے بال فوج رہا ہوگا اور اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔

اگلے تین دن کسی غیر معمولی واقعہ کے بغیر گزر گئے۔ البتہ اخبار کے ذریعے ناگلہ کو یہ پتہ چلتا رہا کہ پولیس سبزل کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ لگانے کی سرٹوڈ کو شش کر رہی تھی۔ درجنوں مشتبہ افراد کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ جن میں سے بعض کو چھوڑ دیا گیا تھا اور بعض سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ سبزل کے قتل کے سلسلے میں پولیس نے شیردرانی سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن وہ کچھ نہیں بتا سکا تھا البتہ اس نے سبزل کے قتل کا الزام اپنے ان نامعلوم دشمنوں پر عائد کیا تھا جو اسے نقصان پہنچانے کے درپے تھے۔ پہلے اس کے کھلیان کو آگ لگا کر اسے مالی نقصان پہنچایا گیا اور لیج سبزل کو پولیس کی حراست میں قتل کر کے اسے قانونی پیچیدگیوں میں الجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

پولیس نے رحیم یار خان میں دلاور سے بھی رابطہ کیا تھا۔ لیکن اس کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ سبزل کے قتل سے دو دن پہلے سے رحیم یار خان میں اپنی خالہ کے ہاں مقیم تھا اور عین اس وقت جب صادق آباد کے حوالات میں سبزل کو گولی ماری گئی تھی، دلاور اس وقت بھی اپنے دوستوں کے ساتھ رحیم یار خان کے ایک ریستورنٹ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

چوتھے روز اخبار میں ایک اور سنسنی خیز خبر شائع ہوئی۔ یہ خبر پڑھ کر بھی ناگلہ درانی مسکرا دی تھی۔ لگتا تھا کہ دلاور واقعی شیردرانی اور حینہ بیگم کو چھین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔

چند روز پہلے صادق آباد سے کئی میل دور ایک ادھڑ عمر عورت اور ایک مرد کی جو رہنہ لاشیں نہر سے ملی تھیں۔ ان کے بارے میں انکشاف کیا گیا تھا کہ وہ حینہ بیگم کے ملازم تھے۔ عورت کی لاش کو مرادو اور مرد کی لاش کو بخشو کے نام سے شناخت کر لیا گیا تھا۔ اور یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی نہر میں ڈوب کر ہلاک نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا تھا۔ ان دونوں کے قتل کے سلسلے میں بھی شیردرانی کے ایک گن مین کا نام لیا جا رہا تھا۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق پولیس نے تفتیش شروع کر دی تھی اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع تھی۔

یہ خبر پڑھنے کے بعد ناگلہ درانی کے ذہن میں ایک بار پھر دلاور کا خیال ابھر آیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ پھیلی چلی گئی۔



شیردرانی واقعی پاگل ہو رہا تھا۔



اس روز صبح سویرے جب گھرگ سے آنے والے ایک مزارع نے یہ اطلاع دی کہ رات کو کسی نے کھلیانوں میں آگ لگا دی ہے تو وہ اسی وقت اپنی جیب پر گھرگ روانہ ہو گیا تھا۔ حسینہ بیگم گھرگ ہی میں تھی۔ شبیر درانی حویلی کی طرف جانے کی بجائے سیدھا کھیتوں پر آیا تھا۔ حسینہ بیگم اور اس کے بڑے ماموں عبدالرحمن درانی بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ ساری فصل جل کر راکھ ہو چکی تھی اور راکھ میں جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کئی مزارع بھی وہاں جمع تھے اور اگرچہ کھلیان کے جل کر راکھ ہونے میں ان کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن وہ سب تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اس مزارع کی تو بری حالت تھی جو گزشتہ رات کھلیان کے قریب بنی ہوئی ایک چھوٹی سی جھگی میں بیٹھ کر چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہوا۔ کس نے آگ لگائی تھی؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”عبدل سے پوچھ لو۔۔۔ وہ تمہیں تفصیل سے بتائے گا۔“ عبدالرحمن درانی نے اس مزارع کی طرف اشارہ کیا جو رات کو یہاں چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

”بتاؤ، کیا ہوا تھا... کیسے آگ لگی تھی؟“ شبیر درانی عبدل کے سامنے پہنچ گیا۔

”سرکار!“ عبدل نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ خوف کی شدت سے وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ ”میں جھگی کے سامنے بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ دو گھوڑا سوار اس طرف آگئے۔ آدمی رات کے بعد کا وقت تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ کون لوگ ہیں لیکن ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ مسافر ہیں اور کہیں بہت دور سے آرہے ہیں لیکن راستہ بھول گئے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ اصل راستے سے بہت دور آگئے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ یہ کھلیان کس کا ہے۔ اور جب میں نے سرکار کا نام بتایا تو وہ گھوڑوں سے اتر آئے اور اچانک ہی مجھے پکڑ لیا۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن انہوں نے مجھے باندھ کر یہاں سے دور لے جا کر پھینک دیا۔ وہ مجھے پھینک کر واپس آئے اور انہوں نے کھلیان کو کئی جگہوں پر آگ لگا دی۔ جب آگ بھڑک اٹھی تو وہ دیر تک یہاں کھڑے قہقہے لگاتے رہے۔ پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر اسی طرف چلے گئے۔ میں بندھا ہوا تھا۔ چیخ کر مدد کے لئے پکارتا رہا لیکن یہاں کون تھا جو مدد کو آتا! تقریباً دو گھنٹے بعد گاؤں کی طرف سے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ اس وقت تک آگ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے بھی دیکھ لیا اور میرے ہاتھ پیر کھول دیئے۔ جب میں نے لوگوں کو بتایا کہ آگ کیسے لگی تھی تو ایک آدمی گاؤں کی طرف دوڑ گیا اور حویلی میں جا کر بیگم صاحبہ کو بتا دیا۔“

”حرام خور... نمک حرام!“ شبیر درانی دباؤ۔ ”تم جیسا ہٹا کٹا آدمی دو آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔“

”انہوں نے مجھے اچانک ہی دبوچ لیا تھا سرکار۔“ عبدل نے کہا۔

شبیر درانی اس کا یہ عذر قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اپنی فصل کو راکھ کے ڈھیر کی صورت میں دیکھ کر وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے عبدل پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ عبدل کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ ممکن ہے شبیر درانی اسے ماری ڈالتا لیکن عبدالرحمن درانی نے آگے بڑھ کر اسے بچالیا۔

شبیر درانی تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں رہا پھر حسینہ بیگم اور ماموں کے ساتھ حویلی واپس آگیا۔

”کھلیان کو آگ لگانے والے دو گھوڑا سوار کون ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کس کی شہ پر ایسا کیا ہو گا؟“ حسینہ بیگم نے کہا۔

”اس کتیا کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ اسی کے آدمی ہوں گے۔“ شبیر درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکل۔

”وہ تو خود اپنی جان کے خوف سے جھپٹی پھر رہی ہے۔ وہ کیا کر سکتی ہے۔“ حسینہ بیگم نے جواب دیا۔  
 ”اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“ شبیر درانی بولا۔ ”اس پورے علاقے میں کس کی جرات ہو سکتی ہے کہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اس حرافہ کو یقیناً کوئی ایسا سارا مل گیا ہے جس سے اسے شل رہی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک مرتبہ میرے ہاتھ لگ جائے۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔“

”میرا یہ مشورہ ہے کہ اب اس معاملے کو ہمیں پر ختم کر دیا جائے۔ بھول جاؤ نالکہ اور اس کی جائیداد کو۔ ختم کر دو اس قصے کو۔“ عبدالرحمن درانی نے ماں بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ قصہ اب ختم نہیں ہو گا۔“ شبیر درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”اگر نالکہ کو قدم جمانے کا موقع مل گیا تو وہ ہمیں برباد کر ڈالے گی۔ آج کھلیان جلا ہے۔ کل کو وہ ہمیں بھی جلا کر راکھ کر ڈالے گی۔ اگر نالکہ نے کچھ نہ بھی کیا تو پولیس ہمیں زندہ نہیں رہنے دے گی۔ ہمارے گھروں پر پلنے والے یہ پولیس آفیسر ہمیں ایک لمحہ کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ صادق والے کیس کی خفیہ تحقیقات شروع ہو چکی ہے۔ انسپکٹر اعظم اس سازش کا واحد گواہ تھا۔ وہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ پتہ چل جائے گا کہ صادق کو قتل کرنے میں اور کون کون سے پولیس والے شامل تھے۔ ان پولیس والوں کو اس سازش کا علم نہیں ہو گا لیکن وہ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ صادق واقعی بے گناہ تھا اور اسے نالکہ نے گولی نہیں ماری تھی بلکہ وہی نالکہ کو زخمی حالت میں ہسپتال لے کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا انکشاف ہم تینوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا ہے۔“

”اسی لئے میں نے شروع میں یہ کہا تھا کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ مگر دولت کی ہوس نے تو تم دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی... اب بھی وقت ہے۔ اپنے قدم پیس روک لو۔ میں اوپر والوں سے مل کر کوشش کروں گا کہ یہ معاملہ ہمیں پر ختم ہو جائے۔“ عبدالرحمن درانی نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”شبیر درانی نے بڑھا ہوا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹایا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اگر آپ کے دل میں کسی قسم کا خوف پیدا ہو گیا ہے تو آپ اس معاملے سے الگ ہو جائیں۔“  
 ”تم دونوں نے تو مجھے بھی اس دلدل میں پھنسا دیا ہے۔“ عبدالرحمن درانی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شبیر درانی اور حسینہ بیگم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر حسینہ بیگم بھی اٹھ کر باہر چلی گئی اور شبیر درانی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ دو آدمی کون ہو سکتے ہیں جنہوں نے کھلیان کو آگ لگا لی تھی۔ عدل نے ان کے طے بھی بتائے تھے لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ان آدمیوں کو کبھی کہیں دیکھا ہو۔

شبیر درانی سارا دن گھمگھم ہی میں رہا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو تھانے بھیج کر کھلیان کی آتش فشاں کی رپورٹ بھی لکھوا دی تھی اور پولیس آئی بھی تھی۔ شبیر درانی نے کسی نامعلوم دشمن پر الزام عائد کیا تھا لیکن اپنے دشمن کا نام نہیں لیا تھا۔ پولیس کھلیان کے چوکیدار اور دوسرے لوگوں کے بیانات نوٹ کر کے واپس چلی گئی تھی۔

شبیر درانی دوسرے دن شہر واپس آیا تھا۔ اخبار میں اس کے کھلیان کے راکھ ہونے والی خبر اور اس کا پولیس کو دیا جانے والا بیان بھی موجود تھا۔ شہر کے بہت سے معززین شبیر درانی کے پاس آکر اس واقعہ پر

افسوس کا اظہار کرتے ہوئے۔ کئی لوگوں نے ٹیلی فون پر بھی اظہار افسوس کیا تھا۔

شہر بھر میں اسی موضوع پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ وہ کون ایسا جی دار تھا جس نے شبیر درانی جیسے شخص سے نکلری تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شبیر درانی اپنے اس دشمن کو ڈھونڈ نکالے گا اور اس کا جو حشر کرے گا اسے بھی دنیا دیکھ لے گی۔

شبیر درانی اس صدمے سے ابھی پوری طرح سنبھل نہیں پایا تھا کہ اسی شام پولیس نے اس کے ایک گمن مین سبزل کو گرفتار کر لیا۔ سبزل کو بازار کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ شبیر درانی کو بھی فوراً ہی اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے تھانے ٹیلی فون کیا تو انکشاف ہوا کہ سبزل کو صادق آباد پولیس نے عبدالحق نامی ایک سوزوکی ڈرائیور کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے جس کی لاش خیر گڑھ کے راستے میں ریگستان میں پڑی ہوئی پائی گئی تھی۔

شبیر درانی فوراً ہی تھانے پہنچ گیا۔ انسپکٹر اعظم کے قتل کے بعد ایک سب انسپکٹر کو تھانے کا انچارج مقرر کیا گیا تھا۔ سب انسپکٹر ظہیر بھی دوسرے پولیس انسپکٹروں سے مختلف نہیں تھا۔

”میرے آدمی کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کا عبدالحق نامی اس شخص سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ شبیر درانی نے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ریگستان میں میرے گمن مین اور عبدالحق نامی اس شخص کو نالکہ درانی نے قتل کیا تھا۔ راتقل پر اس کی انگلیوں کے نشان بھی ملے تھے اور وہ روپوش ہے۔“

”صادق آباد پولیس ریگستان میں پائی جانے والی لاشوں کے بارے میں تحقیقات کر رہی تھی۔ آپ کے گمن مین کی تو شناخت ہو گئی تھی لیکن دوسری لاش کی شناخت باقی تھی۔ بالآخر اسے بھی عبدالحق کے نام سے شناخت کر لیا گیا۔ نالکہ درانی پر اس کے قتل کا الزام غلط ہے۔ صادق آباد کے مین روڈ پر رات کو گشت کرنے والے دو پولیس والوں نے عبدالحق کی سوزوکی روک کر اسے چیک کیا تھا۔ اس کی سوزوکی پر ٹوٹا پھوٹا فرنچیز لدا ہوا تھا۔ ڈرائیور اکیلا تھا اس کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ صادق آباد پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ انہوں نے مجسٹریٹ کی اجازت سے وہ تینوں راتقلیں دوبارہ چیک کروائی تھیں جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ان پر نالکہ درانی کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔“ سب انسپکٹر ظہیر چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”درانی صاحب! اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات پولیس کی تفتیش غلط رخ اختیار کر سکتی ہے یا اسے غلط راستے پر ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ صادق آباد پولیس بالکل صحیح راستے پر تفتیش کر رہی تھی۔ پولیس نے آپ کے مقتول گمن مین کی انگلیوں کے نشان محفوظ کر لئے تھے اور پھر کسی طرح سبزل کی انگلیوں کے نشانات بھی حاصل کر لئے۔ تینوں راتقلیں، آپ کے دونوں آدمیوں کی انگلیوں کے نشانات اور نالکہ درانی کی انگلیوں کے نشانات فنگر پرنٹس کے ماہرین کو بھیج دیئے گئے۔ پولیس کو اس کی رپورٹ کل ملی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تینوں راتقلوں پر نالکہ درانی کی انگلیوں کے نشان پائے گئے ہیں لیکن جس راتقل کی گولیوں سے عبدالحق کو قتل کیا گیا تھا اس کے ٹرائیگر پر سبزل کی انگلیوں کے نشان پائے گئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبدالحق کو نالکہ درانی نے نہیں، آپ کے گمن مین سبزل نے قتل کیا تھا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ آپ کے گمن مین کو کس نے گولی ماری تھی؟ یہ معہ بھی جلد ہی حل ہو جائے گا۔ راتقلوں پر پائے جانے والے انگلیوں کے دوسرے نشان یہ معہ بھی حل کر دیں گے۔“

شبیر درانی اس وقت میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ سے کھیل رہا تھا۔ اس نے ایک دم پیپر ویٹ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ سب انسپکٹر ظہیر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”میں نہیں جانتا کہ وہ سوزوکی ڈرائیور کون تھا۔“ وہ سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن بابا تم لوگ کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ لے دے کر معاملے کو ختم کرو۔ ڈرائیور کے گھر والے کیا مانگتے ہیں۔ میں دے دوں گا۔“

”نہیں درانی صاحب۔“ سب انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ یہ کیس ہمارا نہیں صادق آباد پولیس کا ہے۔ یہ اے ایس آئی صاحب بیٹھے ہیں جو سبزل کو لے کر کچھ دیر بعد صادق آباد چلے جائیں گے۔ اور پھر یہ معاملہ اتنا آگے نکل چکا ہے کہ میرے خیال میں کمپرومائز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”اس دنیا میں کونسا ایسا معاملہ ہے جس پر کمپرومائز نہیں ہو سکتا۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”کسی کو مجرم یا بے گناہ ثابت کرنا بھی تو ہمیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے نا۔“

”درانی صاحب! سب انسپکٹر نے کہا۔ ”اگر آپ اپنے آدمی کی کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں تو کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل کریں۔“

”ہاں۔ مجھے کوئی وکیل کرنا ہی ہو گا۔ یہ درانی فیملی کی عزت کا سوال ہے نا بابا۔ ہمارے کلکڑوں پر ملنے والے آج ہمارے آدمیوں کو ہتھکڑیاں پہنا رہے ہیں۔ کل کو ان کے ہاتھ ہمارے گریبان تک بھی پہنچ جائیں گے۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے اٹھ کر تھانے سے باہر آگیا۔

شبیر درانی کے ساتھ اس وقت ایک ہی گمن مین تھا جو تھانے کے سامنے کھڑی ہوئی جیب میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شبیر درانی جب تھانے سے باہر آیا تو وہ بے حد جھنجھلایا ہوا تھا، اس نے اسٹیمرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارٹ کیا اور جیب کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

”اس وقت سات بج رہے تھے۔ سردیوں میں تو ویسے بھی جلدی شام ہو جاتی ہے۔ سات بجے تو لوگ عشاء کی نماز پڑھنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن شبیر درانی جیسے شخص کو نماز جیسی چیز سے کیا سروکار۔ اپنے مکان کے سامنے جیب سے اترتے ہی اس نے دربان کو دو تین آدمیوں کو بلانے کا حکم دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد تین آدمی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ شبیر درانی چند لمحوں کی شکلیں دیکھتا رہا پھر بولا۔

”تم لوگوں کو معلوم ہے سبزل کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے؟“

”جی سرکار۔“ ایک آدمی نے جواب دیا۔ ”ہمیں شام ہی کو پتہ چل گیا تھا۔“

”سبزل کو صادق آباد کی پولیس نے گرفتار کیا ہے اور کچھ دیر بعد وہ اسے صادق آباد لے جانے والے ہیں۔ تم لوگ فوراً صادق آباد والی سڑک پر پہنچ جاؤ۔ اور جیسے ہی پولیس کی جیب نظر آئے گولیوں سے بھون ڈالو سب کو۔ سبزل کو زندہ نہیں بچنا چاہیے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

وہ تینوں فوراً ہی باہر نکل گئے۔ شبیر درانی کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس سبزل کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئی تو مت سے راز فاش ہو جائیں گے اور پولیس ہتھکڑیاں لے کر سیدھی اس کے دروازے پر پہنچ جائے گی اسی لئے اس نے سبزل کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وقت صدفوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ لمحے گھٹنے بن کر گر رہے تھے۔ شبیر درانی کبھی اٹھ کر ٹیلے نکلتا اور کبھی دوبارہ صوفے پر بیٹھ جاتا۔ اسے اپنے آدمیوں کی طرف سے اس اطلاع کا انتظار تھا کہ انہوں

نے سبزل کو ختم کر دیا ہے۔

دس بج گئے۔ شبیر درانی کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اب وہ کسی اور رخ پر سوچ رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پولیس نے بھی جوابی کارروائی کی ہو اور اس کے آدمی مارے یا پکڑے گئے ہوں۔

سوا دس بجے کے قریب اس کے آدمی واپس آگئے۔ ان تینوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔  
”معلوم ہوتا ہے تم لوگ ناکام لوٹے ہو۔ تمہارے لٹکے ہوئے تھوڑے تمہاری ناکامی کی داستان سنا رہے ہیں۔“ شبیر درانی نے باری باری ان کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم ایک سنسان جگہ پر گھات لگا کر بیٹھے رہے لیکن پولیس کی جیپ وہاں سے گزرتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ کسی دوسرے راستے سے تو نہیں نکل گئے۔ واپس آتے ہوئے ہم نے کسی طرح تھانے سے بھی پتہ کر لیا ہے سرکار! وہ تو سبزل کو لے کر اسی وقت روانہ ہو گئے تھے جب آپ تھانے سے واپس آئے تھے۔“ ان تینوں میں سے ایک نے جواب دیا۔

”اوہ! اس کا مطلب ہے کہ وہ تم لوگوں سے پہلے ہی نکل گئے تھے۔“ شبیر درانی نے کہا پھر ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم اسی وقت صادق آباد چلے جاؤ اور ہیڈ کانسٹیبل مہران خان سے مل کر اس سے کہو کہ وہ سبزل کو سمجھا دے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر اس نے زبان کھولی تو اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔“

وہ آدمی فوراً ہی نکل گیا۔  
شبیر درانی نے وہ رات جاگ کر گزاری۔ اسے ایک پل بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ سبزل کب تک اپنی زبان بند رکھے گا۔ دو دن..... چار دن..... پولیس کی تھرڈ ڈگری تو چہروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت اس نے اپنے خاص گن مین کو بلا لیا۔  
”سبزل ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ وہ پولیس کے تشدد کے سامنے اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے گا۔ اسے خاموش کرانا ضروری ہے۔“

”اسے آج ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کرادیے ہیں جناب!“ اس شخص نے جواب دیا۔  
”مگر ذرا احتیاط سے... اور اپنے آدمیوں سے کہہ دینا کہ میں اس مرتبہ ناکامی کی خبر نہیں سننا چاہتا۔“  
شبیر درانی نے کہا۔

کمدا رہا ہر چلا گیا۔ شبیر درانی اب یہ سوچ رہا تھا کہ پولیس سبزل تک کیسے پہنچی تھی۔ حالانکہ نائلہ کو اس قتل کا ذمے دار قرار دے کر معاملہ ختم کر دیا گیا تھا۔ یقیناً کوئی ایسا آدمی تھا جس نے پولیس کو یہ نئی راہ دکھائی تھی۔ لیکن وہ کون ہو سکتا تھا؟ نائلہ کا خیال کئی بار اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کے ذریعے یہ کارروائی کر رہی ہو۔ اگر پولیس اسی طرح تحقیقات کرتی رہی تو ایک ایک کر کے اس کے سارے راز کھلتے چلے جائیں گے۔ نائلہ کے خلاف سازش کے لئے صادق کا قتل، نائلہ کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے پولیس وین پر حملہ جس میں پانچ چھ آدمی مارے گئے تھے۔ انسپٹر اعظم کا قتل، باغ و بہار کے قریب اصغر علی، اس کی ماں اور حاملہ بیوی کو زندہ جلادینا، خانپور سے کئی میل دور ڈاکر نامی اس شخص کا قتل جس نے اس گاؤں میں نائلہ کی موجودگی کی اطلاع دی تھی اور پھر مرادو اور اس کے شوہر بخشو کا قتل۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے سنگین جرائم تھے جو اس سے منسوب تھے۔ اگر یہ سارے جرائم بے نقاب ہوتے

چلے گئے تو نالہ کے بجائے اسے بھاگنا پڑے گا۔ نالہ کو تو جگہ جگہ پناہ مل رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے تو کہیں پناہ بھی نہیں ملے گی۔

اس رات شبیر درانی کو اطلاع ملی کہ سبزل کو بیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، ایک بہت بڑا بوجھ سر سے اتر گیا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کے گیارہ بجے تھے لیکن شبیر درانی اسی وقت گھر گھر روانہ ہو گیا۔

شبیر درانی کا خیال تھا کہ سبزل کے قتل کے بارے میں پولیس اس سے کوئی باز پرس نہیں کرے گی لیکن دوسرے روز صبح گیارہ بجے صادق آباد کا ایک انسپکٹر اور ریجمنٹ یار خان کا سب انسپکٹر ظہیر گھر گھر پہنچ گئے۔ شبیر اس وقت حویلی سے نکل کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پولیس کی جیب کو دیکھ کر رک گیا۔

”لگتا ہے برائی نے میرے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔“ شبیر درانی بولا۔

”اب ہم اتنے برے بھی نہیں ہیں درانی صاحب۔“ صادق آباد کے انسپکٹر جبار نے جیب سے اتر کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ سب انسپکٹر ظہیر بھی جیب سے اتر آیا تھا۔ ”ہم بد کم بد نام زیادہ ہیں۔ بعض اوقات ہمیں کچھ ناخوشگوار فرائض انجام دینا پڑتے ہیں جو آپ جیسے معززین کو ناگوار گزرتے ہیں۔“

”اب کونسا ناخوشگوار فرض ادا کرنے آئے ہو؟“ شبیر درانی نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”میرے کسی آدمی کو گرفتار کرنے آئے ہو یا مجھے؟“

”جی نہیں۔ ہم کسی کو گرفتار کرنے نہیں آئے۔ بلکہ یہ اطلاع دینے آئے ہیں کہ کل آپ کے جس آدمی کو گرفتار کیا گیا تھا اسے کل شام گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔“ انسپکٹر جبار نے کہا۔

”اوہ! کیا اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی کہ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ جعلی پولیس مقابلے کب تک ہوتے رہیں گے۔“ شبیر درانی بولا۔ اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا جیسے سبزل کی موت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

”وہ پولیس کے ہاتھوں نہیں مارا گیا۔ نہ ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی پولیس مقابلہ ہوا۔“ انسپکٹر جبار نے کہا۔

”تو پھر گولی کس نے ماری اسے؟“ شبیر درانی نے اسے گھورا۔

”تھانے کی حوالات کے عقبی روشندان سے کسی نے اس پر گولیوں کی پوچھاڑ کر دی۔ اسے چھ سات گولیاں لگی تھیں۔ یہ خبر تو کل رات ہی ریجمنٹ یار خان شہر میں بھی پھیل گئی تھی۔ کیا آپ کو اس کی اطلاع نہیں ملی تھی۔“

”میں کل رات سے یہاں ہوں۔ مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی۔“ شبیر درانی بولا۔ ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کی تحویل میں حوالات میں بند کسی ملزم کو باہر کا کوئی آدمی کیسے قتل کر سکتا ہے۔ جیل یا حوالات میں کوئی ملزم پولیس تشدد سے مارا جاتا ہے تو اسے ملزم کی خودکشی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کسی ملزم کی زندگی اگر پولیس کے لئے خطرے کا باعث بن رہی ہو اسے گولی مار کر پولیس مقابلے کا رنگ دیا جاتا ہے۔ آپ لوگ قانون کے محافظ ہیں۔ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت آپ کا فرض ہے۔ لیکن آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ یہ سب لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اب مجھے پولیس کے خلاف مقدمے کی تیاری کرنی ہوگی۔“

”آپ تو بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں درانی صاحب!“ سب انسپکٹر ظہیر نے کہا۔ ”ہم تو ایک درخواست

لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔“

”تم حکم کرو بابا۔ درخواست کیوں کرتے ہو۔“ شبیر درانی بولا۔

”ہم آپ کے نمک خوار ہیں درانی صاحب! درخواست ہی کر سکتے ہیں۔“ اس مرتبہ انسپٹر جبار بولا۔  
”کو... کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”اس میں شبہ نہیں کہ سبزل پولیس کی کمسنڈی میں مارا گیا ہے۔ لیکن اگر اس قتل کی تفتیش شروع کی گئی تو ہمارے ساتھ آپ کے لئے بھی کچھ پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو یہ کیس ختم بھی ہو سکتا ہے۔“ انسپٹر جبار نے کہا۔

”کیس کیسے ختم ہو سکتا ہے؟“ شبیر درانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس کے لئے تفصیل سے بات کرنی ہوگی۔“ انسپٹر جبار بولا۔

شبیر درانی چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر انہیں حوصلی میں لے آیا۔ حسینہ بیگم کو پہلے ہی پولیس کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ شبیر انہیں ڈرانگ روم میں چھوڑ کر جیسے ہی اندر آیا حسینہ بیگم نے اسے روک لیا۔  
”یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟“

”دو دن پہلے صادق آباد کی پولیس سبزل کو قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ کل شام تھانے کے حوالات میں کسی نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس معاملے کو اٹھایا نہ جائے۔ کیونکہ معاملہ بڑھے گا تو ہمارے لئے بھی پریشانیاں ہوں گی۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔  
”ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا۔ کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔  
”میں بات کر لوں گا۔ آپ نوکر کے ہاتھ چائے بھجوا دیجئے۔“ شبیر درانی کہتا ہوا دوبارہ ڈرانگ روم میں آگیا۔

”ہاں... کو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شبیر درانی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ سوزوکی ڈرائیور عبدالحق کو سبزل ہی نے قتل کیا تھا۔“  
”مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے بابا۔ اگر مجھے اس بات کا پتہ ہوتا تو میں خود اسے پولیس کے حوالے کر دیتا۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”پولیس والوں کو اتنا بے وقوف نہ سمجھیں درانی صاحب۔“ انسپٹر جبار مسکرایا۔ ”یہ تو ہم معلوم کر ہی چکے ہیں کہ آپ اپنے دو گن میٹوں کے ساتھ اپنی کرنز نانکہ درانی کی تلاش میں باغ و بہار سے ہوتے ہوئے صادق آباد کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں عبدالحق کی کاٹھ کباڑ سے لدی ہوئی سوزوکی سے آتا سامنا ہو گیا۔ فرنیچر کے نیچے نانکہ درانی بھی چھپی ہوئی تھی جو آپ کی جیب دیکھ کر بھاگ نکل۔ عبدالحق بھی ڈر کر بھاگ نکلا۔ سبزل نے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اگر اس وقت ایک اور کیس نہ آجاتا تو ہم سبزل سے آگے کی کمائی بھی معلوم کر لیتے۔ لیکن بہر حال ہم اس پوری کمائی کو بھولنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ بھی سبزل کی موت کو بھول جائیے۔“

شبیر درانی کی پیشانی پر ہل پر گئے۔ یہ بھی غیبت تھا کہ وہ لوگ سبزل سے اس سے آگے کی کمائی معلوم نہیں کر سکے تھے۔ ورنہ یہ پولیس آفیسر کیس ختم کرنے کی تجویز کی بجائے اس کے لئے ہتھیار لے کر آتے۔  
”ایس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ لوگ بعد میں مجھے بلیک میل نہیں کریں گے؟“ شبیر درانی نے

کہا۔

”آپ کے لئے بھی راستہ کھلا رہے گا۔“ انپکٹر جبار نے کہا۔ ”اگر آپ ایسی کوئی بات محسوس کریں تو جب چاہیں سبزل والے معاملے کو اٹھا سکتے ہیں۔ ہم ویسے بھی آپ کے نمک خوار ہیں۔ ایسی کوئی گستاخی نہیں کر سکتے۔“

شبیر دارنی چند لمحے خاموش رہا۔ اس دوران ملازم چائے لے کر آیا۔ اس نے چائے بنا کر ایک ایک کپ تینوں کے سامنے رکھ دیا۔

”نہیک ہے۔“ شبیر دارنی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کی تجویز منظور ہے۔ مگر کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔“

”آپ بالکل مطمئن رہئے۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔“ سب انپکٹر ظہیر نے کہا۔  
اس کے بعد وہ دیگر موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ شبیر دارنی کے کھلیان کی آتشزدگی کا واقعہ بھی زیر بحث آیا۔

”ہم ان دو آدمیوں کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔“ سب انپکٹر ظہیر نے کہا۔ ”آپ کے مزارعے نے ان کے جوہلے بتائے تھے مجھے لگتا ہے کہ ان میں سے ایک کو کہیں دیکھ چکا ہوں۔“  
”کون ہے وہ؟“ شبیر دارنی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”آپ نے دلاور کا نام سنا ہوگا۔“ سب انپکٹر ظہیر نے کہا۔ ”اس کا باپ درمنہار میں اسکول ماسٹر تھا۔ پہلی مرتبہ اسے درمنہار کے ایک چوہدری کے مزارعے کو مار پیٹ کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ دلاور نے مزارعے کی ایک ٹانگ اور دو ہسلیاں توڑ دی تھیں۔ دوسری مرتبہ اسے ڈاکے کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ پہلے کیس میں اسے ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ دوسرے کیس میں اسے بری کر دیا گیا اور گاؤں کے چوہدری پر جھوٹی رپورٹ لکھوانے کا کیس بن گیا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ چوہدری نے دلاور کی ماں اور جوان بہن کو بے عزت کیا تھا۔ ماں تو وہیں مرگئی اور بہن نے دریا میں جھلانگ لگا دی۔“

”اس کے کچھ ہی عرصہ بعد کسی نے اس علاقے کے تھانیدار کو ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی اور زمیندار کو بھی زندہ جلا دیا۔ یہ تمام واقعات دلاور کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ اس نے انتقام“ یہ کارروائیاں کی ہوں گی لیکن وہ کہی نہ کسی طرح احمد پور لاما کے ایک زمیندار رائے منصور کے پاس پہنچ گیا۔ رائے منصور نے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کرائی۔ اس علاقے کے تھانیدار اور چوہدری اور اس کے ساتھیوں کو زندہ جلائے جانے کا کیس عدالت میں تھا۔ کچھ مشتبہ لوگوں کو گرفتار بھی کیا تھا۔ دلاور کا نام مشتبہ لوگوں میں سرفہرست تھا۔ ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کے بعد وہ متعلقہ عدالت میں پیش ہو گیا۔ رائے منصور کا وکیل اس کی پیروی کر رہا تھا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ اس نے عدالت میں ایک سبیل، کئی گواہ پیش کر دیئے جن کے بیانات کی روشنی میں یہ ثابت ہو گیا کہ جن دنوں یہ واقعات پیش آئے تھے دلاور وہاں سے میلوں دور تھا۔ دلاور کو اس کیس میں بری کر دیا گیا۔ لیکن بہر حال یہ سب ہی کو یقین ہے کہ تھانیدار اور چوہدری کو دلاور ہی نے مارا تھا۔ یہ اوپن سیکرٹ ہے۔ قانون دلاور کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا۔ آج وہ دندناتا پھر رہا ہے۔ اسے رائے منصور ہی کی نہیں، علاقے کے چند اور زمینداروں کی بھی سرپرستی حاصل ہے۔ آپ کے مزارعے کے بتائے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک کا حلیہ دلاور سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ دلاور اس رات کہاں تھا۔ یقین کیجئے کہ اگر وہ اس واقعہ میں ملوث پایا



کیا تو میں اس کا پچھلا حساب بھی چکانے کی کوشش کروں گا۔

”دلاور کے بارے میں میں نے سنا ضرور ہے لیکن آج تک دیکھا نہیں ہے۔ سنا ہے بہت جی دار اور گھرو جوان ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ میرے خلاف اس قسم کی کوئی کارروائی کیوں کرنے لگا۔ مجھ سے اسے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ رائے منصور سے بھی میں صرف ایک مرتبہ ملا ہوں۔ اس علاقے کا کوئی اور زمیندار بھی ایسا نہیں ہے جس سے میری کوئی پرغاش ہو۔ نہیں آفیسر! میرا دل نہیں مانتا۔“

”پیرہ سب کچھ کروا سکتا ہے۔“ سب انسپکٹر ظہیر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے آپ کے کسی دشمن سے پیرہ لے کر کھلیان کو آگ لگائی ہو۔ مقصد تو آپ کو نقصان پہنچانا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔“ شبیر درانی بولا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دونوں پولیس آفیسر رخصت ہو گئے۔

شبیر درانی بھی اس روز شہر آگیا۔ دوسرے دن اس نے صادق آباد سے ہیڈ کانسٹیبل مہران خان کو بلوایا۔ مہران خان ان کا پرانا نمک خوار تھا۔ وہ پہلے رحیم یار خان ہی میں تھا پھر چند ماہ پہلے اسے تبدیل کر کے صادق آباد بھیج دیا گیا۔

”کیا تمہیں سبزل کے سلسلے میں میرا پیغام نہیں ملا تھا؟“ شبیر درانی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”پیغام مل گیا تھا جناب اور میں نے سبزل کو بتا بھی دیا تھا۔ اس سے تو ابھی کسی قسم کی باز پرس شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے چھپنی کر دیا گیا۔“ مہران خان نے جواب دیا۔

”کیا...؟“ شبیر درانی اچھل پڑا۔ ”تو پھر انسپکٹر جبار کو کیسے پتہ چلا کہ...“ وہ یکایک خاموش ہو گیا۔

”آپ یقین کیجئے جناب کہ سبزل نے انہیں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا...“ مہران خان بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“ شبیر درانی نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور دھب سے صوفے پر گر گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سبزل نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا تھا تو انسپکٹر جبار کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ اس کا ذہن ٹائلہ کی طرف ہلک گیا۔ یہ معلومات یقیناً ٹائلہ ہی نے کسی طرح پولیس تک پہنچائی ہوں گی۔ ٹائلہ اس کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئی تھی۔ شبیر درانی کو یقین تھا کہ اگر ٹائلہ کو اچھی طرح قدم جمائے گا موقع مل گیا تو وہ اسے برباد کر ڈالے گی۔

شبیر درانی نے ایک بار پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ٹائلہ کو تلاش کیا جائے۔ دنیا کا کونہ کونہ کھنگال ڈالا جائے اور وہ جہاں بھی نظر آئے اسے گولیوں سے بھون ڈالا جائے۔

ایک بار پھر شبیر درانی کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ دوسری طرف یہ دو پولیس آفیسر بھی بڑی خوبصورتی سے اسے بے وقوف بنا گئے تھے۔ پولیس نے سبزل کی موت والے واقعہ سے تو جان چھڑالی تھی لیکن اس کی دکھتی رگ پر انگوٹھا رکھ دیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اسے ہلک میل کر سکتے تھے۔

اس رات شبیر درانی کو بڑی دیر میں نیند آئی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دیر نہیں سو سکا۔ ایک بھیانک خواب دیکھتے ہوئے وہ گڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ حلق خشک تھا۔ وہ خوفزدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

وہ خواب بڑا بھیانک تھا۔ تپتا ہوا لٹ و دق صحرا تھا جس میں وہ بھاگا جا رہا تھا۔ لباس پہنا ہوا، الجھے ہوئے خاک آلود بال، کئی روز کا بڑھا ہوا شیو اور پیروں میں جوتے تک نہیں تھے۔ تپتی ہوئی ریت پر دوڑتے دوڑتے اس کے پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ اس کے پیچھے جواب دے رہے تھے۔ وہ کبھی ایک طرف

دوڑنے لگا اور کبھی دوسری طرف۔ لیکن وہ جس طرف بھی جاتا اسے اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر نالکہ کھڑی ہوئی دکھائی دیتی۔ نالکہ نے دائیں ہاتھ میں ہتھکڑی پکڑ رکھی تھی جسے وہ اس کے سامنے ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔

شیردرانی کا حلق ریت کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے گر گیا۔ نالکہ ہتھکڑی لئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ نالکہ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہناتی اس کے منہ سے ہلکی سی چیز نکلے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

شیردرانی نے سائینڈ ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اسے کچھ سکون ملا اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

نالکہ آسیب کی طرح شیردرانی کے اعصاب پر مسلط ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا اور جھنجھلا تا رہتا۔ ان حالات میں اگر نالکہ اس کے ہاتھ لگ جاتی تو شاید وہ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر ڈالتا۔

دو دن خیریت سے گزر گئے۔ لیکن شیردرانی اس سکون میں بھی بے سکونی محسوس کر رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی ہے۔ اگر کھلیان کی آتشزدگی اور سبزل کی گرفتاری کے پیچھے نالکہ کا ہاتھ تھا تو اسے یقین تھا کہ نالکہ کوئی اور وار بھی کرے گی۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس کو مطلوب ہونے کے باوجود نالکہ کا ترش زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ کہیں چھپی بیٹھی بڑے اطمینان سے ایک ایک تیر چلا رہی تھی۔

اور پھر وہ طوفان بھی آگیا جس کا شیردرانی انتظار کر رہا تھا۔ پولیس نے اس کی آموں والی حویلی سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ملنے والی مرادو اور اس کے شوہر کی لاشیں شناخت کر لی تھیں۔ یہ لاشیں کئی روز پہلے دریافت ہوئی تھیں اور انہیں قرب وجوار کے علاقوں میں رہنے والا کوئی بھی شخص شناخت نہیں کر سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرادو اور بخشو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ انہیں نالکہ کی وجہ سے گھمگھم سے لاکر یہاں رکھا گیا تھا۔ نہر سے لاشیں ملنے کے بعد پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہ دونوں کہیں دور سے نہر میں بہتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھیں۔ کسی دشمن نے انہیں قتل کر کے نہر میں پھینک دیا ہو گا۔ پولیس نے ان دونوں پر نہر لاشوں کو لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا تھا۔ اور اب کئی روز بعد ان لاشوں کو شناخت کر لیا گیا تھا۔

وہ علاقہ صادق آباد تھا جس کی حدود میں تھا۔ اس طرح انسپکٹر جبار ایک بار پھر شیردرانی کے دروازے پر موجود تھا۔

”یہ آپ کے مزارعے تھے اور برسہا برس سے گھمگھم والی زمینوں پر آپ کی خدمت کر رہے تھے۔ جب نہر سے ان کی لاشیں دریافت ہوئی تھیں تو آپ نے انہیں شناخت کیوں نہیں کیا تھا؟“ انسپکٹر جبار نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں میاں بیوی کئی روز پہلے میرے ہاں سے کام چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ میں نے نہر سے ملنے والی لاشوں کے بارے میں سنا ضرور تھا مگر میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مرادو اور بخشو کی لاشیں ہوں گی۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔

”چند روز پہلے جب ڈاکوؤں نے آپ کی حویلی پر حملہ کیا تھا تو کیا یہ دونوں اس رات حویلی میں موجود تھے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”کیسے ہو سکتے ہیں بابا۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”میں نے بتایا نا کہ وہ کئی روز پہلے میرے ہاں سے کام چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔“

”انہیں گھرگ سے اس حویلی میں کیوں لایا گیا تھا؟“ انسپکٹر نے ایک اور سوال کیا۔  
 ”میں نے آموں کا وہ باغ خریدا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے کسی نہ کسی کی ضرورت تو تھی۔ میں ان دونوں میاں بیوی کو یہاں لے آیا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ کام چھوڑ کر چلے گئے۔“ شیردرانی نے کہا۔

”لیکن ہمیں ملنے والی اطلاع کے مطابق وہ آپ کی زیادتیوں کی وجہ سے بھاگ گئے تھے اور آپ کے آدمی انہیں پڑاقل کے قریب ایک گاؤں سے پکڑ لائے تھے۔“ انسپکٹر نے اس کے چہرے پر نظر پڑ جاتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر! شیردرانی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم میرے ذاتی معاملات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہو۔ ارے بابا وہ ہمارے کارندے تھے۔ مقروض تھے ہمارے۔ ان کے بھاگ جانے پر اگر میرے آدمی انہیں دوبارہ پکڑ لائے تھے تو یہ کوئی جرم نہیں۔“

”لیکن دو انسانوں کو برہنہ کر کے پنجرے میں بند رکھنا اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرنا اور پھر انہیں گولی مار کر لاشیں نہریں پھینک دینا یقیناً جرم ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

شیردرانی کو سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ ناکہ کا کیا دھرا تھا اور وہی پولیس کو اس کے خلاف اطلاعات فراہم کر رہی تھی۔

”میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔“ شیردرانی نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس حویلی میں بہت کم جاتا ہوں۔ ممکن ہے میرے کارندوں نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو۔ لیکن ان کے کسی فعل کا ذمہ دار مجھے نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔“

”آپ بہت بڑے آدمی ہیں درانی صاحب۔“ انسپکٹر جبار نے جواب دیا۔ ”آپ کی اسٹیٹ میں آپ کی مرضی کے بغیر کوئی پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ کارندے آپ کے سامنے آتے ہوئے ہر ہر کچھ کچھتے ہیں۔ کوئی کارندہ اتنی جرات کیسے کر سکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے گڑے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے انسپکٹر، کوئی اور بات کرو۔“ شیردرانی بولا۔

”یہ دو انسانوں کے قتل کا معاملہ ہے درانی صاحب۔“ انسپکٹر جبار نے کہا۔ ”قانون آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ جس رات آپ کی حویلی پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اس رات حویلی میں آپ کے دو آدمی اور بھی تھے۔ جن میں سے ایک کو بقول آپ کے ڈاکوؤں نے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے دماغ پر بھی چوٹ لگی تھی۔ آپ کا دوسرا کارندہ کہاں ہے؟“

”وہ دوسرے ہی دن نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آج کل کہاں ہو گا۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔

”درانی صاحب! انسپکٹر بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں تین دن کا وقت دے رہا ہوں۔ آپ اس

کارندے کو قانون کے حوالے کریں۔“  
 ”ورنہ تم مجھے پھانسی پر لٹکا دو گے۔“ شبیر درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”انسپکٹر! تم یہ بھول رہے ہو کہ کس سے بات کر رہے ہو۔ میں اگر چاہوں تو میرے ایک اشارے پر یہ وردی تمہارے جسم سے اتر سکتی ہے۔“

”اور آپ جوش میں آکر یہ بھول رہے ہیں کہ یہ معاملہ پھر بھی ختم نہیں ہو گا۔ میرے بعد جو بھی آئے گا اس کیس کی فائل اس کے سامنے ضرور رکھی جائے گی۔ آپ اس کی وردی اتروا دیں گے تو کوئی تیسرا آجائے گا۔ جوش میں آنے کی بجائے ہوش سے کام لیں۔ اپنے اس کارندے کو قانون کے حوالے کریں یا اگر آپ کے بس میں ہو تو یہ فائل ہی غائب کر دیاں۔ نہ رہے گا بس نہ اور نہ بجے گی بانسری۔“ انسپکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اوہ! تو گویا تم مجھے بلک میل کرنے آئے ہو۔ لیکن میرے خیال میں چند روز پہلے میرے اور تمہارے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ کیا یہ اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں؟“ شبیر درانی نے اسے کھورا۔  
 ”وہ ایک الگ معاملہ تھا۔ یہ دوسرا کیس ہے اور اس کے لئے آپ کو ایک نیا معاہدہ کرنا ہو گا۔“ انسپکٹر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔  
 ”ہوں۔“ شبیر درانی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

اور پھر ان میں ایک نیا معاہدہ ہو گیا۔  
 اسی رات انسپکٹر جبار کو صادق آباد ٹیلی فون ایجنسی کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ انسپکٹر جبار تھانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ ڈاکوؤں نے ایک مکان پر ہلہ بول دیا ہے۔ اس وقت تھانے میں صرف دو کانٹیل تھے۔ انسپکٹر انہیں ساتھ لے کر جائے وقوعہ کی طرف دوڑ پڑا۔  
 بھادری کے جوش میں انسپکٹر جبار ڈاکوؤں کے گھرے میں آگیا اور چاروں طرف سے برسنے والی ڈاکوؤں کی گولیوں نے اسے چھلی کر دیا۔ ایک کانٹیل بھی مارا گیا جبکہ دوسرا کانٹیل جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈاکو فرار ہو گئے۔ دو گھنٹے بعد ڈاکوؤں کا سرغنہ رحیم یار خان میں شبیر درانی کے مکان کے ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس سے اگلے روز صبح سویرے ہیڈ کانٹیل مہران خان کے ذریعے مراد اور بخش والی قاتل بھی شبیر درانی کے پاس پہنچ گئی۔ شبیر درانی نے اس قاتل کے پرزے کر کے آتھان میں ڈال دیئے۔ وہ ناشتہ کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے ٹیلی فون لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”ہیلو... شبیر درانی اسپیکنگ“ وہ ریسپور پر بولا۔

”یہ جھکنڈے کب تک استعمال کرتے رہو گے شبیر درانی۔“ ایک نسوانی آواز شبیر درانی کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”کب تک بے گناہوں کے خون سے کھیتے رہو گے؟ لیکن وہ وقت اب دور نہیں جب پھانسی کا پتھر تمہارے گلے میں ہو گا۔ تمہاری دولت، تمہاری طاقت، تمہارا ساتھ نہیں دے گی۔“

”نانک!“ شبیر درانی اچھل پڑا۔ ”تو یہ سب کچھ تم کر رہی ہو؟“

”ہاں... تمہاری بہن، نانکہ درانی۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”غیرت مند نوجوان اپنی بہنوں کے سروں سے دوپٹے نہیں ڈھکنے دیتے مگر تم نے دولت کی ہوس میں اپنی بہن کو سرعام نکال کر دیا۔ کیا کیا ظلم نہیں

تو ذاتم نے اس پر، 'تم اتنے بے غیرت ہو کہ تم نے پانچ لاکھ میں اپنی بہن کا سودا بھی کر لیا... مجھے اسے فٹے میں کئے کے لئے تم نے کونا ایسا حربہ ہے جو استعمال نہیں کیا لیکن... میں تمہارے چٹکل میں نہیں پھنسی۔ اب تک میں مجرموں کی طرح بھاگتی رہی ہوں۔ لیکن اب تمہاری باری ہے۔ اور اس بات کا یقین کر لو کہ تمہیں کہیں بھی نہ ملے گی۔'

”مم... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ شبیر درانی دہاڑا وہ گالیاں بک رہا تھا مگر دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔

شہید درانی نے ریسورنچ دیا اور شدید غصے کے عالم میں اٹھتے ہوئے اس نے ناشتے کی میز بھی الٹ دی۔ شہید درانی بری طرح دباؤ رہا تھا۔ نوکر ڈر کر باہر بھاگ گیا۔

شیردرانی ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ اب تک نالکے کی تلاش میں تھا اور جب فون پر نالکے کی آواز سنی تو اس کے سر پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ غصے میں بار بار منھیاں بھیج رہا تھا۔

............

دلاور کسی کام سے جمال دین والی گیا ہوا تھا۔ واپسی پر اسے ایک رات کے لئے محمد پور رکنا پڑا۔ وہ صبح سویرے ہی محمد پور سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا مگر اس کے میزبان نے اسے زبردستی دوپہر کے کھانے تک کے لئے روک لیا۔ وہ دلاور کا پرانا دوست تھا۔ دلاور کو مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بھی دلاور کو مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ رکنا پڑا اور جب وہ اپنے دوست سے رخصت ہوا تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ حالانکہ صبح بادلوں کے اکا دکا ٹکڑے ہی دکھائی دیئے تھے لیکن اس وقت پورا آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے موسم بچہ خوشگوار ہو گیا۔ دلاور کا ارادہ صادق آباد جانے کا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو سڑک کے راستے جاسکتا تھا۔ فاصلہ بھی پندرہ سولہ میل سے زیادہ نہیں تھا لیکن وہ سن موچی آدمی تھا۔ وہ اس حسین موسم سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے گھوڑے کا رخ نہر کی طرف موڑ دیا تھا۔

اس کا سفید براق گھوڑا دلکی چال سے نہر کی پنہری پر چل رہا تھا اور دلاور گھوڑے پر بالکل سیدھا تن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی اور بائیں ہاتھ میں شہتوت کی ایک پتلی سی چھری تھی۔ چھری وہ شوقیہ طور پر ہاتھ میں رکھا کرتا تھا۔ اس نے گھوڑے کو دوڑانے کے لئے چھری سے کبھی کام نہیں لیا تھا۔ وہ گھوڑے کو ہمیشہ اس کی مرضی پر چلنے دیا کرتا تھا۔ کندھے پر آئوٹینک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ وہ ادھر ادھر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی جاگیردار یا حکمران اپنی سلطنت کا دورہ کر رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت لطیف احساس دل رہے تھے۔ وہ اس موسم سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا پھر نجانے کیسے اس کے ذہن میں نائلہ درانی کا خیال ابھر آیا..... نائلہ درانی کو اس نے صرف دو مرتبہ دیکھا تھا۔ پہلی ملاقات رائے منصور کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ نائلہ کو پہلی مرتبہ دیکھ کر دل اور نے اپنے آپ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی۔ یہ دونوں ایسا س...۔۔۔ دور اسے شبیر درانی کے کلیان میں آتش فشاں اور سبز کی گرفتاری اور اس سے شبیر درانی کے لئے پیدا ہونے والی الجھنوں کے بارے میں رپورٹ دینے آیا تھا۔ اس وقت رائے منصور زمینوں پر گیا ہوا تھا۔ آصف بیگم بھی کچھ چیزیں وغیرہ خریدنے کے لئے صادق آباد گئی ہوئی تھی۔ رضیہ حسب معمول اپنے کمرے میں تھی اور رائے منصور

کی ہونو کرائیوں کے ساتھ گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔  
 نائلہ درانی کو اکیلا اپنے سامنے دیکھ کر دلاور کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ بھرپور جوان تھا۔  
 وجہ وہ کھیل تھا لڑکیوں کو اس میں دلچسپی تھی لیکن کسی عورت کے بارے میں اس نے کبھی اس انداز میں  
 نہیں سوچا تھا جیسے نائلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نائلہ درانی بید حسین تھی۔ وہ اس کے دل کی گہرائیوں  
 میں اترتی چلی گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ وہ نائلہ کو پسند کرنے لگا تھا لیکن وہ دل کی بات زبان  
 پر لانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ نائلہ درانی اس علاقے کی امیر ترین عورت تھی۔ اس کے پاس اتنی  
 دولت تھی جس کا اندازہ شاید خود اسے بھی نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں دلاور اپنی حیثیت سے بھی واقف  
 تھا۔ ایک معمولی سے اسکول ماسٹر کا ان پڑھ اور جاہل بیٹا۔ پانچ جماعتیں پڑھ لینا بھی کوئی تعلیم ہوتی ہے جبکہ  
 نائلہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ دو مرتبہ جیل میں رہ چکا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ  
 عدالت نے اسے باعزت طور پر بری کر دیا تھا لیکن یہ دنیا جانتی تھی کہ وہ پانچ آدمیوں کا قاتل تھا۔ نائلہ درانی  
 بھی اس کے اس اوپن سیکرٹ سے واقف تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ وجہ و کلیل اور بھرنو جوان تھا۔  
 لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ اسکی راہ دیکھا کرتی تھیں۔ نائلہ درانی اگر اس سے غلوں اور بے تکلفی سے  
 بات کر لیتی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ بھی اس کی طرف مائل تھی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ  
 نائلہ درانی کو دل ہی دل میں پوجتا رہے اور دل کی بات کبھی زبان پر لائے۔ خاموش محبت بھی تو کوئی چیز ہوتی  
 ہے۔

اور اس وقت اچانک ہی نائلہ درانی کا خیال اس کے ذہن میں آگیا تھا۔ وہ موسم کے حسن اور نائلہ کے  
 حسین تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ سامنے سے نہر کی پٹری پر ایک جیب کو آتے دیکھ کر وہ اپنے  
 تصورات کی دنیا سے باہر آگیا۔ اس علاقے کے اکثر زمیندار آمد و رفت کے لئے نہر کی پٹری استعمال کرتے  
 تھے۔ فاصلہ ذرا کم ہوا تو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ شیر درانی کی جیب تھی۔  
 جیب اس سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اسٹیرنگ کے سامنے شیر درانی اور پچھلی سیٹ پر اس کے  
 دو بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ دلاور نے بھی جیب کے قریب پہنچ کر گھوڑا روک لیا۔  
 ”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم دلاور ہو۔ رائے منصور کے بندے؟“ شیر درانی نے اس کے چہرے پر  
 نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”بندہ تو میں خدا کا ہوا۔ رائے منصور کے کچھ احسانات ہیں مجھ پر، لیکن.....“ دلاور اس کی طرف دیکھتے  
 ہوئے ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔ کسی چھوٹے بڑے زمیندار کا چہرہ  
 میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ آپ شاید کسی کے صمان آئے ہوئے ہیں؟“

”موجمدار“ شیر درانی بولا۔ ”اے تاجو ہم کون ہیں؟“  
 ”ارے بابا تم ان کو نہیں جانتے۔ یہ خلع کے سب سے بڑے رئیس اور جاگیردار شیر درانی ہیں۔  
 بڑے بڑے افسران ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایم پی اے اور ایم این اے تو ان کی  
 مٹھی میں ہیں۔ کسی کی مجال نہیں جو ان کا حکم ٹال سکے۔“ موجمدار نے جواب دیا۔  
 ”اوہ!“ دلاور بولا۔ ”لیکن اس کے باوجود تمہارے یہ رئیس اپنی بہن کے لئے کچھ نہیں کر سکے۔ وہ

پجاری پولیس سے بچنے کے لئے چھٹی پھر رہی ہے۔“  
 ”اب سے بات کرو۔“ موجمدار نے کھڑے ہو کر راکھل تان لی۔ ”درانی صاحب کی شان میں گستاخی

کی تو تمہارے جسم میں اتنے سوراخ کروں گا کہ گھنے مشکل ہو جائیں گے۔“

شبیر درانی نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس طرح ہاتھ اٹھادیا جیسے موجددار کو مزید کچھ کہنے سے روکنا چاہتا ہو۔ موجددار دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”بڑے جیدار معلوم ہوتے ہو۔“ شبیر درانی پرسکون لہجہ میں بولا۔ ”میں نے تمہاری بہت تعریفیں سنی ہیں۔ آج دیکھ بھی لیا۔ کبھی آؤ نا ہمارے ڈیرے پر۔ آج رات میں آموں والی حویلی میں رہوں گا۔ دیکھی ہے نا وہ حویلی؟“

”دیکھی ہے۔“ دلاور نے گردن ہلائی۔ ”لیکن آج رات نہیں آسکوں گا۔ مجھے کچھ ضروری کام نمنانے ہیں۔“

”تو پھر کسی دن رحیم یار خان آجاؤ۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ جب دل چاہے چلے آنا۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”دیکھوں گا۔ موقع ملا تو ضرور حاضر ہوں گا۔“ دلاور نے کہتے ہوئے گھوڑے کو آگے بڑھادیا۔ شبیر درانی جیب کی سائیز میں لگے ہوئے عقی منظر پیش کرنے والے آئینے میں اسے دیکھتا رہا پھر اس نے بھی جیب آگے بڑھادی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی، کھلیان کے چوکیدار نے آگ لگانے والے جن دو آدمیوں کا حلیہ بتایا تھا ان میں سے ایک دلاور پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کھلیان کو آگ لگانے والا دلاور ہی تھا تو نالکہ سے یقیناً ”اس کا تعلق ہو گا۔ اس نے نالکہ ہی کے اشارے پر کھلیان کو آگ لگائی ہوگی۔ ورنہ اس علاقے کے کسی زمیندار سے اس کی دشمنی نہیں تھی جو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نالکہ قرب وجوار ہی میں کہیں موجود تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ صادق آباد ہی میں نہیں چھپی ہوئی ہو۔

نہر کی پٹری پر تقریباً ”دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے جیب واپس موڑی اور اسے بہت ہلکی رفتار سے چلانے لگا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ نالکہ کے ساتھ ساتھ اب دلاور کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اگر واقعی دلاور اور نالکہ میں کوئی تعلق ہو گیا تھا تو نالکہ اس کی سوچ سے کہیں زیادہ خطرناک ہو سکتی تھی۔

”موجددار۔“ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اپنے گن مین کو مخاطب کیا۔ ”سنا ہے دلاور صادق آباد ہی میں کہیں رہتا ہے۔ اس کے ڈیرے کا پتہ کرو اور یہ بھی معلوم کرو کہ کہ اس کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے۔“

”میں آج رات ہی کو معلوم کر لوں گا سرکار، اگر کہیں تو اسے آپ کے قدموں پر لا کر ڈال دوں؟“ موجددار نے کہا۔ ”بہت بد تمیز آدمی ہے۔ کسی رئیس سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے اسے۔ میں تو اسے گولی مار دیتا آپ نے روک دیا۔“

”دلاور کو کمزور مت سمجھو موجددار۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اس علاقے کے تمام چھوٹے بڑے زمیندار اس کی پشت پر ہیں۔ دلاور کی موت پر وہ ایک ہنگامہ کھڑا کریں گے۔ میں پہلے ہی بہت سی الجھنوں میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ اپنے لئے مزید الجھنیں پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ بس یہ معلوم کرنا ہے کہ صادق آباد میں وہ رہتا کہاں ہے؟ لیکن یہ کام تم خود نہیں کرو گے۔ کسی اور کو بھیج دینا۔“

”کسی کو بھیجنے کی کیا ضرورت ہے سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔ ”اپنا حوالدار مران خان کس

مرض کی دوا ہے۔ اسے تو دلاور کے بارے میں معلوم ہوگا۔  
 ”اوہ! اسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ شبیر درانی بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم آج ہی شام کو مران خان سے ملو..... بلکہ اسے ساتھ ہی لے آنا۔ میں خود معلوم کر لوں گا۔“  
 ”بہت اچھا سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔

شبیر درانی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ آرام سے گاڑی چلاتا رہا اور اس کا ذہن دلاور اور نائلہ کے مابین کوئی تعلق تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ نائلہ یا تو صادق آباد ہی میں تھی یا قرب دجوار میں کسی جگہ موجود تھی۔ کسی ایسی جگہ جہاں وہ آسانی سے پولیس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اس رابطے کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہ خود پولیس اسٹیشن آتی۔ پولیس اسٹیشن آنے کی صورت میں سب سے پہلے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پھنسی جاتی..... پولیس کو سبزل اور مرادو اور اس کے شوہر بخشو والے کیس میں جو معلومات فراہم کی گئی تھیں وہ صرف نائلہ ہی کو معلوم تھا۔ اس کے ذہن میں رضیہ کا خیال بھی آیا تھا جو نائلہ کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ لیکن رضیہ کا خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ ایک بزدل لڑکی تھی۔ بالفرض اس نے کسی طرح پولیس کو اطلاع پہنچانی بھی ہو تو وہ بخشو اور مرادو کے بارے ہی میں بتا سکتی تھی جبکہ خیر گڑھ کے راستے پر ریگستان میں پیش آنے والے واقعہ کی گواہ صرف نائلہ ہی تھی۔ نائلہ ہی نے پولیس کو اس واقعہ کی ساری تفصیلات فراہم کی ہوں گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔  
 ادھر شبیر درانی کا ذہن دلاور اور نائلہ کے خلاف ایک نئی سازش کے تانے بانے بن رہا تھا ادھر دلاور اپنی دھن میں مست گھوڑے پر سوار موسم سے لطف اندوز ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بادل کچھ زیادہ گہرے ہو جانے سے فضا میں اندھیرا سا پھیل گیا تھا۔ وہ بار بار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک مرتبہ جو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو پانی کی ایک بوند اس کی ناک پر پڑی۔  
 ”اوہ!“ دلاور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اگر تیز بارش ہو گئی تو۔“ اسے قرب دجوار میں سر چھانے کی کوئی جگہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑھ لگا دی۔  
 لیکن اس کا خدشہ بے بنیاد نکلا۔ پانی کی چند بوندیں ہی برس کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اب فاصلہ بھی دو تین میل سے زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔

دلاور کسی دشواری کے بغیر صادق آباد پہنچ گیا۔ سیاہ بادلوں کی وجہ سے اس وقت خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ شہر میں دوکانوں وغیرہ کی جتیاں جل رہی تھیں لیکن وہ بازار کی طرف جانے کی بجائے ادھر سے گھومتا ہوا اپنے بیٹنگلے پر آگیا۔ جہاں مشتاق بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔  
 ”کہاں غائب ہو گئے تھے تم؟“ مشتاق نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”کیس جانے سے پہلے کچھ بتا تو دیا کرو۔“

”کیوں..... کیا ہوا؟“ دلاور نے اسے گھورا۔ ”اواس ہو گئے تھے کیا؟“  
 ”میں تو نہیں البتہ رائے صاحب ضرور اواس ہو گئے ہیں۔ کل سے اب تک دو پیغام آچکے ہیں ان کے۔“ مشتاق نے جواب دیا۔ ”انہوں نے کہا ہے کہ تم جیسے ہی واپس آؤ تمہیں حویلی بھیج دیا جائے۔“  
 ”اس وقت تو نہیں جاسکتا بھئی۔ اگر راستے میں بارش نے گھیر لیا تو پھنس جاؤں گا۔ ویسے بھی گھوڑا بہت تھکا ہوا ہے۔ بہت لمبا سفر کیا ہے اس جانور نے۔“ دلاور نے کہا۔ ”بہرحال تو چائے بنا۔ میں سوچتا ہوں۔“



دلاور کتا ہوا کمرے میں کھس گیا۔ یقیناً ”کوئی اہم معاملہ ہو گا جو رائے منصور نے اسے بلانے کے لئے دو مرتبہ آدی بھیجا تھا۔ رائے منصور کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں نائلہ درانی کا تصور ابھر آیا۔ اس نے بہر حال حویلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ صادق آباد سے احمد پور لاما کے لئے دیر تک بسیں چلتی رہتی تھیں۔ وہ کسی بس پر بھی جاسکتا تھا۔ اس نے الماری کھول کر دھوپ کا دھلا ہوا ایک جوڑا نکالا اور دروازہ بند کر کے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ مشتاق چائے لے کر آگیا۔ بہت خوبصورت، قیمتی اور نازک سے کپتے تھے۔

”یار مشتاق۔“ دلاور اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ہم مٹی کے پیالوں میں چائے پینے والے لوگ ہیں۔ ان نازک اور خوبصورت پیالیوں میں چائے پیتے ہوئے الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ چائے کا مزہ ہی نہیں آتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اس بنگلے میں رہتے ہوئے بھی تجھے وحشت سی ہونے لگی ہے۔ دیکھو..... یہ کتنا نرم اور آرام دہ گدا ہے۔ دولت مند لوگ ایسے گدوں پر پتہ نہیں کیسے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ مجھے تو نیند نہیں آتی اس پر۔ بان کی کھردری چارپائی پر ایسی نیند آتی ہے کہ بس سوادی آ جاتا ہے۔“

”پر مجھے تو اس گدے پر بڑے مزے کی نیند آتی ہے۔ قسم خدا کی خوب چوڑا ہو کے سوتا ہوں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ اپنے پلنگ پر ایسا ایک اور گدا بچا لوں۔“ مشتاق نے کہا۔

”سارا دن سویا ہی رہتا ہے کہ کسی کام دھندے کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے؟“ دلاور نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک دوکان دیکھی ہے۔ مگر وہ پگڑی بہت مانگ رہا ہے۔“ مشتاق بولا۔

”دوکان کیسی ہے اور پگڑی کتنی ہے۔“ دلاور نے پوچھا۔

”دوکان ہے تو چھوٹی پر بڑے موقع کی ہے۔ بازار کے بیچ میں، جہاں سے عورتوں کے غول کے غول گزرتے ہیں۔ اگر وہاں جنرل اسٹور کھول لیا جائے تو بس پیسہ ہی پیسہ ہے۔ خدا کی قسم بڑا منافع کماتے ہیں یہ دوکاندار۔ ساری دوکانوں میں دو نمبر کا مال بھرا ہوا ہے۔ سیدھے جنم میں جائیں گے یہ لوگ۔“ مشتاق نے کہا۔

”تو کیا تو بھی جنم میں جانے کا پروگرام بنا رہا ہے؟“ دلاور نے اسے گھورا۔

”توبہ کرو جی۔ اللہ کسی دشمن کو بھی جنم میں نہ لے جائے۔“ مشتاق نے اپنے چائے کا کپ رکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”اچھا بھئی، میں تو چلا۔ کل صبح ہی واپس آؤں گا۔ تو دوکان والے سے بات پکی کر لے۔ کرتے ہیں کوئی بندوبست۔“ دلاور کہتے ہوئے اٹھ گیا اس نے رافٹل اٹھا کر کندھے پر لٹکائی اور بستر پر پڑی ہوئی چادر اوڑھنے لگا۔ ”میرے یار کا خیال رکھنا..... اگر صبح مجھے دیر ہو گئی تو پیٹھے پانی ڈال دینا اس بے زبان کو..... ورنہ بددعا میں دے گا۔ تجھے بھی اور مجھے بھی۔“

”تم فکر ہی نہ کرو۔“ مشتاق نے جواب دیا۔

دلاور بنگلے سے نکل کر مختلف راستوں سے گھومتا ہوا احمد پور لاما کی طرف جانے والی سڑک پر آگیا۔ یہاں بھی ایک بس اسٹاپ بنا ہوا تھا۔ شام ہو چکی تھی بس اسٹاپ پر رونق تھی۔ پھلوں کی اور موٹنگ پھلی، چٹنوزے وغیرہ بیچنے والی تین چار ریڑیاں کھڑی تھیں۔ دو تین چائے کی دوکانیں بھی تھیں۔ کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے تھے۔ وہ بھی یقیناً ”احمد پور لاما کی طرف جانے والی بس کے انتظار میں تھے۔“

دلاور نے ایک ریڑی سے مونک پھلی خریدی اور ایک طرف کھڑا ٹھونگ رہا۔ گرے بادلوں کی وجہ سے سرزدی میں ایک بار پھر کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی آسمان پر بجلی بھی چمک اٹھتی۔ موسم کے طور پر کچھ خطرناک ہی نظر آرہے تھے۔

تقریباً ”دندہ منٹ بعد بس آگئی..... بس جیسے ہی اسٹاپ پر رکی لوگ اس طرح لپکے جیسے اس بس پر ہتھوار ہونے سے رہ گئے تو قیامت ہی آجائے گی۔ بس پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ کچھ آدمی دھکم پیل کرتے ہوئے بس میں گھس گئے اور کچھ چھت پر سوار ہو گئے۔ دلاور کو بھی بمشکل کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی تھی۔ اس کے آگے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کی عمر ساٹھ سے اوپر ہی رہی ہوگی۔ دہلی پتلی، کمزور سی..... جس جگہ وہ عورت کھڑی تھی اس کے ساتھ دائیں بائیں سیٹوں پر بٹے کئے قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس بڑھیا اور دوسری کھڑی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھا تھا۔ دو عورتوں نے بغلوں میں شیرخوار بچوں کو بھی دبوچ رکھا تھا مگر ان آدمیوں میں سے کسی نے ان کے لئے سیٹ خالی کرنے کی زحمت نہیں کی تھی.....

”اؤئے..... اٹھو۔ کھڑے ہو۔“ دلاور نے سیٹ پر بیٹھے ہوئے بٹے کئے آدمیوں کے کندھوں کو باری باری چھوتے ہوئے کہا۔

”کیہڑا ہے اوتوں؟“ ایک آدمی نے گردن گھما کر اسے گھورا۔

”شرم تو نہیں آتی تم لوگوں کو.....“ دلاور کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔ ”یہ بچاری بوڑھی اماں اور یہ ہماری بہنیں بچوں کو لئے کھڑی ہیں اور تم لوگ آرام سے بیٹھے ہو..... چلو۔ اٹھو..... جلدی کرو۔“ ممکن ہے وہ آدمی کچھ کتا مگر اس کے دوسرے ساتھی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑھیا اور عورتیں سیٹوں پر بیٹھ گئیں اور دیر تک دلاور کو دعائیں دیتی رہیں۔

دلاور نے پورا راستہ کھڑے رہ کر ہی سفر کیا تھا۔ راستے میں ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ لیکن جب وہ احمد پور لاما کے اڈے پر بس سے اترا تو بارش بند ہو چکی تھی البتہ آسمان پر بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ رائے منصور کی حویلی قصبے سے پورے دو میل دور تھی۔ وہاں جانے کے لئے عام طور پر کوئی ٹانگہ وغیرہ مل جایا کرتا تھا۔ لیکن شاید بارش کے خوف سے ٹانگے والے بھی گھروں کو جا چکے تھے۔ دلاور پیدل ہی چل پڑا۔

جب وہ رائے منصور کی حویلی پہنچا تو رات کے نو بج چکے تھے، رائے منصور نے اسے فوراً ہی اندر بلا لیا۔

”کہاں غائب تھے؟ دو مرتبہ پیغام بھیج چکا ہوں۔“ رائے منصور نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”بس جی، ذرا گھومنے نکل گیا تھا۔ شام کو واپس آیا ہوں تو آپ کا پیغام ملا۔ فوراً چلا آیا ہوں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”بیٹھو۔“ رائے منصور نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم نے شیردرانی کے خلاف اب تک جو کچھ بھی کیا ہے اس سے وہ پریشان اور بدحواس ضرور ہوا ہے لیکن وہ دولت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو بچا رہا ہے۔“

”کب تک بچے گا جی۔“ دلاور نے کہا۔ ”ہم نے تو اسے چین سے نہیں بیٹھنے دینا۔ کتنی دولت خرچ کرے گا وہ..... کتنے آدمیوں کو قتل کرے گا۔ اس طرح تو وہ اس دلدل میں اور بھی دھنستا چلا جائے گا۔ مجھے

تو لگتا ہے کہ انسپکٹر جبار کو بھی انہی نے مروایا ہے۔ جعلی پولیس مقابلے تو ہوتے ہی تھے۔ یہ جعلی ڈاکو مقابلہ تھا۔ انسپکٹر کے قتل کے بعد قاتل غائب ہونے کا یہ مطلب بھی ہے کہ تھانے میں اس کا کوئی اور آدمی بھی موجود ہے۔ لیکن قاتل گم ہو جانے سے مراد اور بخشو کا کیس ختم تو نہیں ہو گیا۔

”ہاں..... لیکن میں نے تمہیں ایک اور کام سے بلایا تھا۔“ رائے منصور بولا۔

”جی حکم کیجئے رائے صاحب۔“ دلاور بولا۔

”کل میرا وکیل یہاں آیا تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”اس نے ان دونوں پولیس کانسٹیبلوں کا پتہ چلا لیا ہے جن کی موجودگی میں انسپکٹر اعظم نے صادق کو گولی ماری تھی۔ وہ دونوں پولیس والے ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ عدالت میں ان کی گواہی نالکہ کو صادق کے قتل کے کیس میں بے گناہ ثابت کر سکتی ہے۔ میرے وکیل نے اس سلسلے میں قانونی کارروائی شروع کر دی ہے۔“

”میرے لئے کیا حکم ہے جی؟“ دلاور نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”وکیل کو شش کر رہا ہے کہ وہ دونوں پولیس والے کچھ عرصہ کے لئے چھٹی لے لیں۔ تم ان دونوں کو لے کر جمال الدین والی چلے جانا۔ انہیں اس وقت تک اپنی حفاظت میں رکھنا ہو گا جب تک عدالت میں یہ بیان نہیں دیدیتے کہ صادق کو گولی نالکہ درانی نے نہیں انسپکٹر اعظم نے ماری تھی۔“ رائے منصور نے کہا۔

”کیا ان کی کچھ خاطر تواضع بھی کرنی ہوگی۔“ دلاور نے پوچھا۔

”نہیں بھئی۔“ رائے منصور مسکرا دیا۔ ”اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہم ان دونوں کو ان کی صحیح بیانی کا انعام دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بے گناہ کو بچانے کے لئے حقیقت پر مبنی بیان دینے سے نہیں ہچکچائیں گے۔ ضرورت صرف اسی بات کی ہے کہ انہیں اس بات کی ضمانت دی جائے کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ انسپکٹر اعظم کا انجام وہ دیکھ چکے ہیں اس لئے ڈرتے ہیں۔ انہیں چھٹی دلوا کر کہیں اور بھیجنے کا مقصد یہی ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ شیر درانی کو بھی اس کا پتہ چل جائے تو وہ انہیں بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ جبکہ ان دونوں کی گواہی نالکہ کو اس بنیادی کیس میں بے گناہ ثابت کر سکتی ہے۔“

”انہیں کب لے جانا ہو گا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”مجھے جیسے ہی رحیم یار خان سے وکیل کی طرف سے اطلاع ملے گی میں تمہیں پیغام بھجوا دوں گا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”شروع میں جب میں یہاں آیا تھا تو جمال الدین والی میں بھی تھوڑی سی زمین خریدی تھی اور میں نے وہاں اپنی پسند کا ایک مکان بھی بنوایا تھا۔ بعد میں زمین تو میں نے بیچ دی تھی لیکن وہ مکان اب بھی میرا ہی ہے اور عرصہ سے خالی پڑا ہے میں نے کل اپنے ایک آدمی کو وہاں بھیج دیا ہے تاکہ وہ مکان کی صفائی وغیرہ کے علاوہ راشن وغیرہ کا بھی بندوبست کر لے۔ جب تک وکیل اس کیس کو عدالت میں نہیں لے جاتا اس وقت تک تمہیں ان دونوں کانسٹیبلوں کے ساتھ وہیں رہنا ہو گا۔“

”جی ہمت رہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”ویسے کل شیر درانی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔“

”کہاں.....؟“ رائے منصور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

جواب میں دلاور اسے شیر درانی سے اپنی ملاقات کا حال سنانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرے اندازے کے مطابق اسے شبہ ہے کہ نالکہ درانی انہی اطراف میں کہیں موجود ہے اور وہ اس کی تلاش میں ہے۔“

اس وقت نالکہ بھی آگئی اور وہ بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گئی۔

”تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے میں اس سے بہت مطمئن ہوں۔“ نالکہ درانی نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب کچھ دنوں تک خاموش ہی رہا جائے۔ صادق والا کیس کلیمٹر ہو جائے تو مراد اور بخشو والا معاملہ دوبارہ اٹھا دو۔۔۔۔۔ اسے چین سے نہیں بیٹھنا چاہئے۔ ویسے اسے پتہ چل گیا ہے کہ اس کے خلاف یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔“

”لیکن میں تو بڑی احتیاط سے کام کر رہا ہوں۔ اسے یہ شبہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ دلاور نے کہا۔  
”میں نے خود اس سے فون پر بات کی تھی۔“ نالکہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ کب کی بات ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”جس رات انسپکٹر جبار کو قتل کیا گیا تھا اس کے دوسرے روز صبح۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ”میں اسے یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ کئی جھوٹے مقدمات میں پولیس کو مطلوب اور روپوش ہونے کے باوجود میں بے بس نہیں ہوئی ہوں اور اس کے خلاف بہت کچھ کر سکتی ہوں۔“

”ایک بات کا مجھے افسوس ہو رہا ہے نالکہ بی بی۔“ دلاور نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”درانی خاندان کی بڑی عزت تھی اس علاقے میں۔ بڑا نہکا تھا اس خاندان کا۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر سوچتے ہوئے مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔ کتنی نفرتیں پیدا ہو گئی ہیں ایک دوسرے کے لئے۔۔۔۔۔“  
”رائے منصور دلاور کی بات سن کر چونک گیا۔ وہ گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”تمہارے یہ جملے ثابت کرتے ہیں کہ تمہاری رگوں میں شریف والدین کا خون دوڑ رہا ہے۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ”لیکن شروعات میری طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ حسینہ بیگم اور اس کے بیٹے نے میری جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے ہی یہ سب ہنگامہ شروع کیا تھا۔“

”میں جانتا ہوں۔“ دلاور بولا۔ ”کوئی باعزت مقام حاصل کرنے کے لئے طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن عزت کو خاک میں ملانے کے لئے ایک پل بھی نہیں لگتا۔ کاش! شبیر درانی نے بھی یہ سوچا ہو تا کہ اس خاندان کی عزت بنانے کے لئے اس کے پرکھوں نے دو صدیوں کے دکھ جھیلے ہیں۔ لیکن اس کم عقل نے سب کچھ منٹوں میں ختم کر دیا۔“

نالکہ بھی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ جاہل اور ان پڑھ تھا مگر اس کی سوچ بڑی گہری تھی۔

”ٹھیک ہے دلاور۔“ رائے منصور کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”موسم کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ تمہیں رات یہیں گزارنا پڑے گی۔ صبح یہاں سے جانے کے بعد تم صادق آباد ہی میں رہو گے۔ مجھے جیسے ہی وکیل کی طرف سے اطلاع ملے گی تمہیں پیغام بھجوادوں گا۔“

”جی ہر ہے۔“ دلاور بھی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ وہ چند لمحے نالکہ کی طرف دیکھتا رہا پھر دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔

دلاور کو مسمان خانے میں آئے ہوئے پندرہ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ حویلی کا ایک ملازم اس کے لئے کھانا لے آیا۔ کھانا کھانے کے بعد دلاور دیر تک برآمدے میں کھڑا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ سیاہ بادلوں نے آسمان کو پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو روشنی کی تڑپتی ہوئی لہریں آسمان پر دور تک پھیلی

چلی جاتیں۔

دلاور کرسی پر بیٹھ گیا، اسے بادلوں کی کھن گرج اور بادلوں کے اندر بجلی کی آنکھ مچولی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نالکہ درانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

ایکایک آسمان سے بارش کی موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ دلاور کچھ دیر اور برآمدے میں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ وہ بستر پر لیٹا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

دلاور ندی کے کنارے نالکہ درانی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان دونوں نے پیرپانی میں لٹکا رکھے تھے اور نالکہ کا ہاتھ دلاور کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے لب خاموش تھے مگر آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں..... دفععتاً نالکہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور ندی میں اتر گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دلاور پر پانی کے چھینٹے اڑانے لگی۔ دلاور ہاتھ ہلا ہلا کر پانی کے چھینٹوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نالکہ کے فرتنی قہقہے فضا میں بکھر رہے تھے۔ دفععتاً یہ قہقہے خونخاک چیخوں میں بدل گئے۔ نالکہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی اور وہ پانی کے اندر جاری تھی۔

دلاور نے نالکہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی مگر تیز لہریں نالکہ کو اس سے دور لے گئیں۔ ندی کا پاٹ پھیل چلا گیا..... تاحہ نگاہ پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ تند و تیز لہریں نالکہ کو بری طرح بٹخ رہی تھیں اور وہ گزرنے والے ہر لمحہ کے ساتھ دلاور سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

دلاور نے پانی میں چھلانگ لگادی۔ اونچی لہروں نے نالکہ کو دلاور کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ وہ متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور بالاخر نالکہ اسے نظر آگئی۔ وہ اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے چپٹے ہوئے پانی میں ہاتھ پیر مار رہی تھی..... دلاور بڑی تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا اور اس سے پہلے کہ پانی کی لہریں نالکہ کو دوبارہ اپنی آغوش میں لے لیتیں، دلاور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔

دلاور کو یوں محسوس ہوا جیسے کنارہ اس سے بہت دور ہو گیا ہو لیکن پھر دفععتاً ندی کا پاٹ سینٹے لگا۔ کنارہ قریب آگیا۔ دلاور نے نالکہ کو پانیوں میں اٹھالیا اور ندی سے باہر آگیا۔ نالکہ اسے گلاب کے پھول سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی محسوس ہو رہی تھی۔ نالکہ کے چہرے پر خوف کے سائے بتدریج سینٹے چلے گئے اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھیں دلاور کے گلے میں محاسل کر دیں۔ دلاور اسے گود میں اٹھائے چلا رہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسی طرح چلا رہے۔

دفععتاً ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پیروں تلے زمین کانپنے لگی۔ دلاور لڑکھڑا گیا چاروں طرف سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے پاڑ ٹوٹ رہے ہوں۔ نالکہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ دلاور نالکہ کو اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ دھڑام سے نیچے گرا۔

دلاور کے کولے پر چوٹ لگی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے کولہا سہلانے لگا۔ وہ آوازیں اب بھی آرہی تھیں، بہت دور سے آتی ہوئی آوازیں بتدریج قریب پہنچ رہی تھیں..... قریب..... بہت قریب.....

دلاور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ نالکہ کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ وہ ندی تھی نہ لہلاتے ہوئے کھیت..... وہ زور زور سے سر کو جھٹکے دینے لگا۔ تب اسے پتہ چلا کہ وہ پلنگ سے نیچے فرش پر پڑا تھا۔ وہ سب کچھ خواب تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ آواز اب بھی آرہی تھی۔ کوئی دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔  
”دھت تیرے کی۔“ دلاور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

زمین پر طاری نیند کا خمار چھٹ رہا تھا۔ کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ دروازہ بدستور دھزدھڑایا جا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ مسمان خانے کا نوکر تھا۔  
 ”کیا بات ہے، کیوں جگا دیا؟“ دلاور نے اسے گھورا۔ باہر تیز روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔  
 دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر کہیں بادلوں کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ رات کو چمکتی ہوئی بجلی اور گرہنے ہوئے بادل دیکھ کر تو لگتا تھا کہ قیامت خیز بارش ہوگی لیکن اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے بادل کبھی آئے ہی نہ ہوں۔ قدرت کے کام زرا لے ہی ہوتے ہیں۔  
 ”صادق آباد سے ایک آدمی آیا ہے، وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ نوکر نے کہا۔

”کون ہے، کہاں ہے وہ؟“ دلاور نے پوچھا۔  
 ”میں نے اسے بینک میں بٹھا دیا ہے۔ اس سے مل لو اور منہ ہاتھ دھولو۔ میں ناشتہ لینے کے لئے حویلی جا رہا ہوں۔ پتہ ہے نونج چکے ہیں۔“ نوکر کتا ہوا باہر چلا گیا۔  
 دلاور بینک کی طرف آگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صادق آباد سے آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ مشتاق کو تو حویلی کے سارے ہی نوکر پہچانتے تھے۔  
 بینک میں ایک دہلا پتلا سا آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جو دلاور کو دیکھ کر اٹھ گیا۔ دلاور کو اس شخص کا چہرہ جانا پہچانا سا لگتا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔  
 ”میں مشتاق کا دوست نادر ہوں۔“ اس شخص نے کہا۔  
 ”کیسے آئے ہو؟ مشتاق نے بھیجا ہے تمہیں؟“ دلاور نے پوچھا۔ اب اسے یاد آگیا تھا کہ اس شخص کو اس نے ایک دو مرتبہ مشتاق ہی کے ساتھ دیکھا تھا۔  
 ”میں خود آیا ہوں۔ مشتاق کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ مجھے صبح سویرے جیسے ہی پتہ چلا میں آپ کو بتانے کے لئے سیدھا یہاں بھاگا آیا ہوں۔“ نادر نے کہا۔  
 دلاور اچھل پڑا۔ مشتاق کو پولیس نے کیوں پکڑ لیا تھا؟ یہ سوال اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

”مشتاق کو پولیس نے کیوں پکڑا ہے۔ کیا کیا تھا اس نے؟“ دلاور نے پوچھا۔  
 ”پولیس نے آدھی رات کے بعد جنگلے پر چھاپہ مارا تھا۔ انہوں نے جنگلے سے ایک عورت بھی برآمد کی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے رحیم یار خان سے اغواء کر کے لایا گیا تھا۔ خفیہ اطلاع پر پولیس نے جنگلے پر چھاپہ مارا اور عورت کو برآمد کر کے مشتاق کو اغواء کے الزام میں پکڑ لیا ہے۔“ نادر نے بتایا۔  
 ”اوہ!“ دلاور چونک گیا۔ مشتاق میں لاکھ برائیاں سی لیکن کسی عورت کے حوالے سے اس پر کوئی الزام درست ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اسے عورت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر رحیم یار خان سے اغواء کی جانے والی عورت کی جنگلے سے برآمدگی! یہ یقیناً ”کوئی ڈرامہ تھا۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟“ دلاور نے پوچھا۔  
 ”مجھے صبح سویرے ماتھے تلے والے نے آکر جگایا تھا۔ اسی نے بتایا تھا مجھے۔ میں تو صبح جگے ہی گھر سے نکل آیا تھا مگر بس تلے میں دیر ہو گئی.....“ نادر نے کہا۔  
 ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں۔“ دلاور نے پوچھا۔  
 ”میں اور مشتاق رات گیارہ بجے تک ہوٹل میں بیٹھے رہے تھے۔ اسی نے بتایا تھا کہ آپ یہاں ہیں۔“

نادر نے جواب دیا۔ ”مشتاق ایسا نہیں ہے جی! وہ تو عورتوں کی بڑی عزت کرتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک غنڈے نے بازار میں کسی عورت کو چھیڑا تھا تو مشتاق نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، تم جھوٹے میں ابھی آتا ہوں۔ پھر چلتے ہیں۔“ دلاور کہتے ہوئے بیٹھک سے باہر آگیا۔

نمانے کے بعد وہ تیار ہو کر غسل خانے سے نکلا تو نوکر نے بتایا کہ اس نے ناشتہ کمرے میں رکھ دیا ہے۔

”ایک کپ چائے بیٹھک میں نادر کو بھی دے آؤ۔“ دلاور نے کہا۔

”اسے میں نے چائے دیدی ہے۔“ نوکر نے کہا۔

”رائے صاحب حویلی میں ہیں؟“

”نہیں، وہ تو سویرے ہی زمین پر چلے گئے تھے۔“ نوکر نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ انہیں بتادیا کہ میں صادق آباد میں موجود رہوں گا۔ کوئی کام ہو تو پیغام بھجوادیں۔“ دلاور نے کہا اور کمرے میں آگیا۔ جہاں کافی ٹیبل پر ناشتہ رکھا ہوا تھا۔

ناشتہ کرتے ہوئے بھی وہ مشتاق ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ ظاہر ہے اسے جھوٹے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ دفعہاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کسی کے اشارے پر پولیس نے یہ چکر اسے اندر کرنے کے لئے تو نہیں چلایا تھا۔ اس کے کچھ جن تھے تو بہت سے دشمن بھی ہو سکتے تھے۔

دفعہاً اس کے ذہن میں شبیر درانی کا خیال ابھر آیا۔ اگر شبیر درانی کو یہ شبہ ہو گیا کہ وہ نالہ درانی کے لئے کام کر رہا ہے تو یقیناً یہ حرکت اس کی ہوگی۔ اس نے اسے پھسانے کی کوشش کی ہوگی لیکن مشتاق قابو آگیا۔

ناشتہ کرتے ہی دلاور، نادر کو لے کر قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں سے انہیں فوراً ہی بس مل گئی۔ صادق آباد میں بس سے اترتے ہی دلاور نے نادر کو تو رخصت کر دیا اور خود سیدھا تھاٹے پہنچ گیا۔

ایس ایچ او کوئی نیا انسپکٹر آیا تھا لیکن اس وقت تھاٹے میں موجود نہیں تھا۔ دلاور کو دیکھ کر پولیس کے دوسرے اہلکار معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ دلاور سیدھا ایس ایچ او کے کمرے میں گھس گیا جہاں ایک اے ایس آئی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے دلاور کی طرف دیکھا مگر اسے کوئی لفٹ نہیں دی اور فون پر بات کرتا رہا۔ دلاور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو منٹ بعد اے ایس آئی نے فون بند کر دیا اور دلاور کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم بڑی مشکل میں پھنس گئے ہو دلاور۔“ اے ایس آئی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اپنی ضمانت کا بندوبست کرلو۔“

”ایس ایچ او کون ہے اور کہاں ہے؟“ دلاور بولا۔ اس نے ضمانت والی بات نظر انداز کر دی تھی۔

”انسپکٹر جمال۔ بہت سخت آدمی ہے۔ کسی کی دھونس میں آنے والا بھی نہیں۔ تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ بس ابھی آتا ہی ہوگا۔“ اے ایس آئی نے کہا۔

”اگر وہ میرے بارے میں کچھ جانتا ہو تا تو ایسی گندی حرکت کبھی نہ کرتا۔“ دلاور نے کہتے ہوئے دونوں پیردوسری کرسی پر رکھ دیئے۔

ٹھیک اسی وقت ایس ایچ او انسپکٹر جمال آگیا۔ وہ درمیانے قد کا دھلا پتلا سا آدمی تھا۔ انسپکٹر کی وردی اس کے جسم پر بالکل نہیں فٹ رہی تھی لیکن چہرے سے بے پناہ کراختگی تھی۔ اسے دیکھ کر اے ایس آئی نے انہر کر سلوٹ کیا مگر دلاور بدستور اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ انسپکٹر اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر شکا تھا پھر وہ

میز کے پیچھے اپنی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”یہ کون ہے! اور کیا اسے یہ معلوم نہیں کہ تھانے میں کس طرح بیٹھا جاتا ہے۔“  
”تھانے میں آنے والا ہر شخص پولیس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا نہیں ہوتا انسپکٹر جمال۔“ دلاور نے  
کہتے ہوئے دوسری کرسی سے پھر ہٹائے اور انسپکٹر کی طرف گھوم گیا۔ اس کی نظریں انسپکٹر کے چہرے پر مرکوز  
تھیں۔

”یہ دلاور ہے سر!“ اے ایس آئی نے بتایا۔

”اوہ!“ انسپکٹر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہاری تو مجھے تلاش تھی۔ رات کو تو تم فرار ہو گئے تھے۔  
اچھا ہوا خود ہی آگئے۔ ورنہ تمہارے خلاف دو چار دفعات کا مزید اضافہ ہو جاتا۔ کھڑے ہو جاؤ۔۔۔۔۔ یہ تھانہ  
ہے۔ تمہارے گھر کا ڈرائنگ روم نہیں۔“ انسپکٹر کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کافی بلند تھے۔

”آہستہ بولو انسپکٹر۔ تم جیسے آفیسر کو اس طرح حلق پھاڑ کر چیخا زب نہیں دیتا۔“ دلاور نے پرسکون لہجے  
میں کہا۔ ”میں یہاں یہ جاننے کے لئے آیا ہوں کہ میرے مکان پر چھاپہ کس کے اشارے پر مارا گیا تھا۔  
میرے آدمی کو کیوں پکڑا گیا ہے اور وہ عورت کون ہے؟“

”تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ جرم کرتے ہو اور پھر دھونس جمار ہے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح  
جاننا ہوں دلاور!“ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ انسپکٹر چیخا۔

”اگر تم میرے بارے میں کچھ جاننے ہوتے تو چند گھنٹوں کے لالچ میں یہ گھٹاؤنی حرکت نہ کرتے۔“ دلاور  
کا لہجہ اب بھی پرسکون تھا اور وہ بدستور کرسی پر بیٹھا رہا تھا۔ ”نئے آئے ہوتا۔۔۔۔۔ کارکردگی دکھانے کے اور  
بھی بہت سے طریقے ہیں۔“

”کارکردگی دکھانے کے کیا طریقے ہیں؟ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری تو میں ضمانت بھی نہیں  
ہونے دوں گا۔“ انسپکٹر بولا۔ دلاور کا اطمینان اور پرسکون لہجہ اسے طیش دل رہا تھا۔

”انسپکٹر جمال!“ دلاور میز پر جھک گیا۔ ”ضمانت ہونے یا نہ ہونے کا خوف تو اسے ہونا چاہئے جس نے  
کوئی جرم کیا ہو۔ میں تو یہ جاننے کے لئے آیا ہوں کہ یہ نالگ کس کے اشارے پر رچایا گیا ہے اور وہ عورت  
کون ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کون ہے؟“

”مغویہ کو اس کے دروازے کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ لیکن پہلے تم اپنے آدمی سے مل لو جس نے یہ تحریری  
بیان دیا ہے کہ اس عورت کو کل رات تم رجم یار خان سے اغواء کر کے لائے تھے۔“ انسپکٹر نے کہا پھر اے  
ایس آئی کی طرف دیکھا۔ ”اسے یہاں لے کر آؤ۔“ انسپکٹر نے اس مرتبہ دلاور کو کرسی سے اٹھنے کے لئے  
نہیں کہا تھا۔

”کل رات!“ دلاور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”اگر تمہیں یہ پتہ چل جاتا کہ کل رات میں کہاں  
تھا تو شاید مجھ پر یہ شرمناک الزام نہ لگاتے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔ لیکن اب کسی کی سفارش تمہارے کام نہیں آئے گی۔“ انسپکٹر نے کہا۔  
”ٹھیک اسی وقت اے ایس آئی مشتاق کو لے کر اندر داخل ہوا۔ مشتاق کو دیکھ کر دلاور ایک جھٹکے سے  
اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مشتاق کی حالت بہت ہی ابتر تھی اس کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ ناک سو جھجی ہوئی تھی  
دونوں رخساروں پر غلغلے سے بھرے تھے، بائیں آنکھ بند تھی۔ رخسار پر سیاہ دھبہ تھا اور آنکھوں کے اوپر  
پیشانی بھی سو جھجی ہوئی تھی جس سے آنکھ بند ہو گئی تھی۔ وہ شاید اپنے حواس میں بھی نہیں تھا اگر اے ایس



آئی اسے سارا نہ دیئے ہوتا تو شاید اس سے کھڑا بھی نہ ہوا جاتا۔

”انہوں نے مجھے بہت مارا ہے دلاور۔“ مشتاق کراہتے ہوئے بولا۔ ”اور ایک سادے کانڈ پر دستخط بھی کرائے ہیں۔“

”انپکٹر!“ دلاور، انپکٹر کی طرف گھوم گیا۔ اس کے لمبے میں دبی دبی سی غراہٹ تھی۔ ”تمہیں شاید اپنے جسم پر یہ وردی اچھی نہیں لگتی۔“

”بند کرو یہ بکواس۔“ انپکٹر نے دھاڑتے ہوئے اچانک ہی اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ دلاور لڑکھڑا گیا۔ اس دوران ایک اور اے ایس آئی اندر آ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دلاور کے کندھے پر ہتھیار ہوئی رانقل اتاری۔ دلاور نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ”اس رانقل کالائسنس ہے تمہارے پاس؟“ انپکٹر نے خونخوار نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھا۔

دلاور نے دائیں ہاتھ سے گال سلاتے ہوئے بائیں ہاتھ سے جیب سے رانقل کالائسنس نکال کر انپکٹر کے سامنے میز پر پھینک دیا۔ انپکٹر نے لائسنس اٹھا کر دیکھا اور پھر اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

”بند کرو ان دونوں کو اور محرر کو بلاؤ..... پرچہ کاٹو اس کے خلاف اور بغیر لائسنس کی رانقل رکھنے کا چارج بھی شامل کرو۔“

”معلوم ہوتا ہے کسی نے کوئی لمبا ہی چڑھاوا چڑھایا ہے۔“ دلاور بدستور گال سلاتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ پھر پرسکون ہو گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ انپکٹر کچھ کتابیلی فون کی تھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

”ہیں۔ انپکٹر جمال اسپیکنگ۔“ وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔

دوسری طرف کی آواز سننے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ جی جناب..... سرکار..... وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بات کرتا رہا۔ بالاخر ریسیور ہنچ دیا اور اے ایس آئی کی طرف دیکھتے ہوئے شکست خوردہ سے لمبے میں بولا۔

”چھوڑ دو ان دونوں کو.....“

”کیوں..... کس کا فون تھا انپکٹر؟“ دلاور کے ہونٹوں پر آنی والی مسکراہٹ طیش دلانے والی تھی۔

”اے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“ انپکٹر نے کھا جانے والی نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”ڈاکٹر کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔ کہہ دینا کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔“

”ایک تھپڑ تو میرے گال پر بھی پڑا ہے انپکٹر!“ دلاور نے کہا۔ ”میں بہت ایماندار آدمی ہوں۔ دوسروں کا قرضہ بہت جلد چکا دینے کا عادی ہوں۔“

دلاور نے اے ایس آئی کے ہاتھ سے اپنی رانقل چھین لی اور مشتاق کو سہارا دے کر تھانے سے باہر لے آیا۔ شہر کے ایک ڈاکٹر سے مرہم پٹی کرانے کے بعد وہ اسے گھر لے آیا۔ اس نے ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ بھی لے لیا تھا جس میں شدید اندرونی اور بیرونی چوٹوں کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اس کے گھر پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد نادر بھی پہنچ گیا۔ وہ مشتاق کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

دلاور اب بھی حیران تھا کہ انپکٹر نے کس کے فون پر انہیں چھوڑا تھا۔ یہ معمہ نادر نے حل کر دیا۔

”دلاور بھائی۔ تم تو تھانے چلے گئے تھے اور میں سیدھا چوہدری حاکم علی کے ہاں چلا گیا تھا۔ چوہدری

سے ملاقات کے لئے مجھے بہت دیر انتظار کرنا پڑا اور پھر میں نے جب انہیں سب کچھ بتادیا تو اس نے اسی وقت تھانے ٹیلی فون کر دیا تھا اور پھر چوہدری نے مجھے بتایا کہ تم دونوں تھوڑی دیر میں گھر پہنچ جاؤ گے تو میں سیدھا ادھر ہی آیا۔“ نادر نے بتایا۔

چوہدری حاکم علی اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ دلاور جس بنگلے میں رہائش پذیر تھا یہ بھی اسی کی ملکیت تھا۔ دوسرے بڑے لوگوں کی طرح وہ بھی دلاور کی پشت پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ لیکن اس نے آج تک دلاور سے کبھی کوئی کام نہیں لیا تھا۔ البتہ دلاور کبھی کبھی اس کی زمینوں پر چکر لگایا کرتا تھا۔ اس رات انسپکٹر جمال کو اپنے دروازے پر دیکھ کر دلاور کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے انسپکٹر! کیا پھر.....“

”نہیں دلاور۔“ انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لگتا ہے تم ابھی تک ناراض ہو۔ ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کسی کے دباؤ میں بھی آنا پڑتا ہے۔ یہ لو..... میں تمہارا رانقل کا لائسنس واپس کرنے آیا تھا۔“ انسپکٹر نے جیب سے لائسنس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اؤ..... اندر آؤ..... بیٹھو نا ہمارے ساتھ بھی۔“ دلاور نے لائسنس لیتے ہوئے اس کے لئے راستہ

چھوڑ دیا۔

انسپکٹر اندر آیا۔ دلاور اسے اسی کمرے میں لے آیا جہاں مشتاق لیٹا ہوا تھا۔ مشتاق سو رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے.....“

”اؤ..... آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ دلاور اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ”میں نے اس کا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوایا ہے اور ایک دو روز میں پولیس کے خلاف کیس کرنے والا ہوں۔ اب تم یہ بھی جان گئے ہو کہ میرے پیچھے کون لوگ ہیں۔ تمہارے کندھے پر تین پھول۔“ دلاور نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ”ان کے لئے تم نے بڑی محنت کی ہوگی۔ کئی سال بتائے ہوں گے انہیں حاصل کرنے کے لئے..... لیکن ان کے اترنے میں ایک منٹ نہیں لگے گا۔“

”دلاور؟“ انسپکٹر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا تھا

لیکن تم.....“

”دوستی!“ دلاور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”تم سے دوستی ہو سکتی ہے۔ بالکل ہو سکتی ہے لیکن پہلے تمہیں یہ بتانا ہو گا کہ میرے خلاف یہ سازش کس نے کی تھی اور کس کے کہنے پر میرے مکان پر چھاپہ مارا گیا تھا۔“

”کیا یہ شرط ہے؟“ انسپکٹر نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں!“ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دوستی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ میں دوستی کو کاروبار نہیں سمجھتا۔ لیکن تمہارے ساتھ دوستی نہیں کاروبار ہو گا۔ کچھ لو اور کچھ دو پر بات ہوگی۔ اگر تم مجھے اس ہستی کا نام بتا دو جس کے اشارے پر یہ سب کچھ ہوا تھا تو نہ تو میں عدالت میں جاؤں گا اور نہ ہی کوئی اود کار روائی کروں گا۔ اپنے منہ پر لگنے والے اس تھپڑ کو بھی بھول جاؤں گا جس نے میرے اندر کے حیوان کو جگایا تھا۔“

”بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے۔“ انسپکٹر جزبہ سا ہو کر بولا۔

”سوچ لو انسپکٹر۔“ دلاور نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”میں تمہارے لئے زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتا ہوں۔ ویسے بھی میرے خلاف کچھ نہ کر سکتے پروہ شخص تم سے ناراض تو ہو گیا ہو گا۔ مجھے اندازہ ہے کہ

وہ کون ہو سکتا ہے لیکن میں اس کی تصدیق تمہاری زبان سے چاہتا ہوں۔“

”شبیر درانی۔“ بالاخر انسپکٹر کے منہ سے نکلا۔ ”اسے شبہ ہے کہ اس کے کلیان کو آگ تم نے لگائی تھی۔ اسے تم پر کچھ اور بھی شبہ ہے۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ تمہیں کچھ عرصہ کے لئے الجھائے رکھا جائے۔“

”تو میرا اندازہ درست نکلا۔“ دلاور کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ”ٹھیک ہے انسپکٹر! تمہارا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔ لیکن مجھ جیسے ان پڑھ اور جاہل شخص کی ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہ رئیس اور جاگیردار کسی کے نہیں ہوتے۔ میں اور تم وہ کچھ چلتیاں ہیں جنہیں یہ اپنی انگلیوں کے اشاروں سے نچاتے ہیں۔ ہم شطرنج کے وہ معمولی سے مہرے ہیں جنہیں شاہ کو بچانے کے لئے مروادیا جاتا ہے۔ تمہاری تو ساری زندگی پولیس میں گزری ہے۔ تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو۔ تم ان رئیسوں اور جاگیرداروں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ کئی لوگ آئے دن ان کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ پھر بھی صاف ہی رہتے ہیں۔ مارے جاتے ہیں مجھ جیسے اور تم جیسے لوگ..... انسپکٹر جبار کو قتل ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔ تمہارے خیال میں وہ کیا واقعی ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اگر تم تفتیش کرو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ اس کے پیچھے بھی شبیر درانی جیسے کسی جاگیردار کا ہاتھ تھا۔ انسپکٹر جبار بھی ان جاگیرداروں کی بساط کا ایک مہرہ تھا جسے شاہ کو بچانے کے لئے مروادیا گیا۔ جاؤ اور یہ معلوم کرو کہ انسپکٹر جبار کن کیسز پر کام کر رہا تھا۔ کہیں وہ کیسز ہی تو اس کی موت کا باعث نہیں بنے۔“

انسپکٹر جمال خاموش کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ دلاور غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ جاگیرداروں اور دولت مندوں کی بساط کے مہرے ہی تو تھے۔ کچھ چلتیاں..... جو ان کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں۔ انسپکٹر کے جانے کے بعد دلاور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کا شبہ درست نکلا تھا۔ یہ سازش شبیر درانی ہی کی تھی۔ لیکن اس نے یہ چال اسی پر پلٹ دی تھی۔ انسپکٹر جمال اگر جرات کا مظاہرہ کرے تو سبزل اور مرادو اور بخشو والے کیس کی دوبارہ تفتیش شروع ہو سکتی تھی اور اس طرح شبیر درانی دوبارہ الجھنوں میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

تیسرے دن دلاور کو رائے منصور کا پیغام مل گیا کہ وہ فوراً رحیم یار خان پہنچ کر اس کے وکیل انور سے رابطہ قائم کرے۔ دلاور نے نادر کو مشتاق کا خیال رکھنے کو کہا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر رحیم یار خان روانہ ہو گیا۔

ایڈووکیٹ انور اپنے دفتر میں موجود تھا۔

”مجھے تمہارے بارے میں اطلاع مل گئی تھی۔“ انور نے کہا۔ ”یہ ایک گھر کا پتہ ہے۔“ اس نے وزٹنگ کارڈ اس کی طرف بوجھادیا۔ ”صبح سات بجے اس پتے پر آجانا۔ وہ دونوں آدمی تمہارے منتظر ہوں گے۔ انہیں لے کر جمال دین والی روانہ ہو جانا۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ جس روز انہیں عدالت میں پیش کرنا ہو گا اس سے ایک روز پہلے میں تمہیں پیغام بھیج دوں گا۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ ہمارے مخالفین کو بھک مل چکی ہے۔ وہ کوشش کریں گے کہ یہ دونوں عدالت میں پیش نہ ہونے پائیں۔ اس لئے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔“

”فکری نہ کریں جی۔“ دلاور نے کہا۔ ”میرا کام ان کی حفاظت کرنا ہے۔ دلاور کی جان تو جاسکتی ہے لیکن وہ اپنے ممانوں پر آج بھی نہیں آنے دے گا۔“

”گڈ!“ وکیل نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ”وش یو گڈ لک۔“  
 ”اپنی زبان میں بات کیا کریں جی۔“ یہ گٹ مٹ میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ دلاور نے ہاتھ ملائے  
 ہوئے کہا۔

”خدا حافظ۔“ وکیل مسکرا دیا۔

دلاور وکیل کے دفتر سے باہر آگیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اس نے بازار سے کچھ چیزیں اور پھل  
 وغیرہ خریدے اور اپنی خالہ کے ہاں پہنچ گیا۔  
 رات اس نے وہیں گزاری۔ صبح چھ بجے گھر سے روانہ ہوتے وقت اچانک ہی اسے خیال آگیا کہ وکیل  
 نے جو کارڈ دیا تھا اس پر بھی پتہ انگریزی ہی میں لکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے کزن کو کارڈ دکھا کر وہ پتہ سمجھ لیا  
 اور گھر سے نکل گیا۔

فردوس سینما کے پچھلی طرف وہ مکان تلاش کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ دونوں  
 پولیس والے تیار بیٹھے تھے۔ دلاور انہیں لے کر فوراً ہی لاری اڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ انہوں نے  
 شاہیں اس طرح اوڑھ رکھی تھیں کہ ان کے چہرے بھی چھپ گئے تھے۔ لاری اڑے پر تانگے سے اترنے  
 کے فوراً ہی بعد انہیں جمال دین والی کی بس مل گئی۔

جمال دین والی میں رائے منصور کا مکان قصبے سے تقریباً ایک میل دور نہر کے قریب واقع تھا۔ رائے  
 منصور کا نوکر کئی روز پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ کسی زمانے میں یہ مکان یقیناً ”بہت شاندار رہا ہو گا لیکن عرصہ  
 سے دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ پلستر جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔  
 دو دن گزر گئے۔ وہ تیسری رات تھی۔ دلاور کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ دلاور کبھی نالکہ  
 درانی کے بارے میں سوچنے لگتا اور کبھی اسے مشتاق کا خیال آ جاتا۔

دفعۃً وہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ وہ کسی کار کے انجن کی آواز تھی۔ قصبے کی سڑک وہاں سے بہت  
 دور تھی۔ وہاں سے کسی گاڑی کی آواز کا یہاں تک سنائی دینا ممکن نہیں تھا۔ اور پھر یہ آواز تو بہت قریب کی  
 محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر باہر آگیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ قصبے کی طرف سے آنے والے کچے  
 راستے پر کوئی متحرک شے دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی کار تھی اور اس کی تمام بتیاں بجھی  
 ہوئی تھیں۔ دلاور کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ آنے والا یا آنے والے جو کوئی بھی تھے ان کی  
 نیت اچھی نہیں تھی۔ ورنہ گاڑی کی تمام بتیاں نہ بجائی جاتیں۔

## دشت جنوں

مظلوم اور معصوم دوشیزہ نالکہ درانی کی لو رنگ  
 داستان کا پہلا حصہ ختم ہوا مزید ہنگامہ خیر  
 واقعات کے لئے دشت جنوں کی جلد نمبر  
 2 ملاحظہ فرمائیں



معلوم و دشمن کی ہنگامہ خیز داستان  
دشنتِ جہول



اقبال کاظمی

سٹری میگرین کی مقبول ترین ہنگامہ خیز سرگزشت

2

## دشت جنوں

یہ کہانی مخصوص اقدار کے حامل جاگیردارانہ نظام کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ مصنف اقبال کاظمی نے اس پورے نظام کا بڑی گہرائی سے اور قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور یہ مشاہداتی تجزیہ آپ کو کہانی میں جگہ جگہ متحرک نظر آئے گا۔

مذکورہ کہانی ایک فکشن کہانی ہے جس کا حقیقت سے اور حقیقی کرداروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کہانی کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی فرد یا کسی واقع سے ان کی مماثلت محض اتفاق ہوگی اور اس کے لئے مصنف یا ادارہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ادارہ

# 2

## دشت جنوں

### اقبال کاظمی

دلاور نے اندر آکر راقل اٹھالی اور رائے منصور کے نوکر رحیم کو آہستگی سے جگادیا۔ رحیم کے پاس بھی دو تالی بندوق تھی۔ دلاور نے سرگوشیوں میں اسے آنے والی کار کے بارے میں بتایا اور وہ دونوں بڑی آہستگی سے باہر آگئے۔

کار تقریباً ”سوگزدور رک چلی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے اس کے اندر بیٹھا ہوا کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن چند منٹ بعد باری باری تین آدمی کار سے اترے اور مختلف سمتوں سے ہوتے ہوئے محتاط انداز میں مکان کی طرف بڑھنے لگے، تاریکی ہونے کے باوجود ان کے ہاتھوں میں راقلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ دلاور نے رحیم کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ رحیم دیوار کے ساتھ سرکتا ہوا آہستہ آہستہ دوسری طرف سرکتے لگا۔

دلاور بھی مکان کے سامنے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ ایک آدمی بالکل سامنے سے آ رہا تھا۔ دوسرا دائیں اور تیسرا بائیں طرف مڑ گیا تھا۔ وہ تینوں بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ سامنے والا آدمی جیسے ہی تقریباً ”پچیس گز کے فاصلے پر پہنچا دلاور چیخا۔

”تم لوگ جو کوئی بھی ہو اپنی اپنی جگہ پر رک جاؤ ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے..... خبردار! آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔“

جواب میں سامنے والے شخص نے گولی چلا دی۔ گولی دلاور سے تقریباً ”پانچ فٹ کے فاصلے سے ہوتی ہوئی مکان کی دیوار میں لگی۔ جواب میں دلاور نے بھی گولی چلا دی۔ اب دونوں طرف سے باقاعدہ فائرنگ ہونے لگی۔ ان تینوں آدمیوں نے بھی پوزیشن لے لی تھی۔

فائرنگ کی آواز سن کر اندر سوتے ہوئے دونوں پولیس والے جاگ گئے۔ ان میں سے ایک تو چارپائی

B/27





کے نیچے گھس گیا اور دوسرا بدحواس ہو کر مکان سے باہر بھاگ نکلا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی اس کی چیخ کی آواز فضا میں گونجی تھی۔ حملہ آوروں میں سے ایک کی گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی اور وہ چیخ مار کر گر ا تھا۔

دلاور دوڑتا ہوا اس طرف پہنچ گیا۔ اس نے حملہ آور کو پوزیشن بدلنے کے لئے ایک طرف سے دوسری دوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ٹرانسگر دبا دیا اس کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی اور حملہ آور چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

باقی دونوں حملہ آور اپنے ساتھی کی چیخ سن کر فائرنگ کرتے ہوئے واپس بھاگے۔ دلاور نے انہیں کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن گولی نہیں چلائی۔ کار اشارت ہوئی اور گھوم کر تیزی سے واپسی کے راستے پر دوڑنے لگی۔

”بھاگ گئے سارے۔“ دلاور بڑبڑایا۔

سب سے پہلے وہ زخمی پولیس والے کو اٹھا کر اندر لائے تھے۔ دلاور اس پر برس پڑا۔

”تم کمرے سے نکل کر باہر کیوں بھاگے تھے؟ اگر گولی ٹانگ کی بجائے تمہارے سینے یا کھوپڑی میں لگتی تو تم بھی اوپر پہنچ چکے ہوتے۔“

گولی پنڈلی کا گوشت چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ دلاور نے چادر پھاڑ کر کس کر پٹی باندھ دی تاکہ خون بند ہو جائے۔

”تمہارا دوسرا ساتھی کہاں غائب ہو گیا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”وہ اس چارپائی کے نیچے گھسا ہوا ہے۔“ زخمی پولیس والے نے بتایا۔

”دیکھا؟“ دلاور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”میں نے پہلے کہا تھا تاکہ تمہارا ساتھی تم سے زیادہ عقل مند ہے۔ اس نے بزدلوں کی طرح بھاگنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کھوپڑی استعمال کی اور منجی کے نیچے چھپ کر جان بچائی۔ نکل آوئے..... چلے گئے وہ لوگ.....“ دلاور نے آخری جملہ چارپائی کی طرف رخ کر کے کہا تھا۔

دوسرا پولیس والا چارپائی کے نیچے سے نکل آیا۔

”تم دونوں بیس رکو..... میں ابھی آتا ہوں۔“ دلاور، رحیم کو اشارہ کرتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔

رحیم نے برآمدے میں رکھی ہوئی لائین اٹھالی۔ وہ دونوں اس طرف آگئے جہاں دلاور نے حملہ آور کو گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس کی لاش پودوں میں پڑی ہوئی مل گئی۔ گولی ٹھیک اس کے دل میں لگی تھی۔

”ارے! یہ تو.....“ رحیم کہتے کہتے رک گیا۔

”کون ہے یہ؟“ جاننے والا اسے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”قصبے میں رہتا تھا۔ یہ تو پملوان ہے۔ اکھاڑہ بھی ہے اس کا۔“ رحیم نے بتایا۔

”اوہ!“ دلاور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر بولا۔ ”میں ان دونوں کو لے کر قصبے میں جا رہا ہوں۔ رائے صاحب یا وکیل کا پیغام آئے تو پرویز ہو مل والے کو بتا دیتا۔ پیغام مجھ تک پہنچ جائے گا اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہاری گولی سے نہیں مرا۔ تمہارے پاس بارہ بور کی ڈبل بیرل

بندوق ہے جبکہ اس کے سینے میں آٹونیک رائفل کی گولی لگی ہے۔ پولیس اگر ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ رائے صاحب کے مہمان تھے جو سیر و تفریح کے لئے آئے تھے اور آج شام شہر واپس چلے گئے تھے۔ تمہارا بیان یہی ہو گا کہ ڈاکوؤں نے مکان پر حملہ کیا تھا تم نے اپنی بندوق سے ہوائی فائرنگ کی جس کے جواب میں ڈاکوؤں نے فائرنگ شروع کر دی اور یہ اپنے ہی کسی ساتھی کی گولی سے مارا گیا۔ چلو تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔۔۔۔۔ تم تھانے چلے جانا اور میں ان دونوں کو لے کر اپنے ایک جاننے والے کے ہاں چلا جاؤں گا۔“

وہ لاش کو وہیں چھوڑ کر قصبے کی طرف روانہ ہو گئے۔ قصبے کے قریب پہنچ کر ان کے راستے الگ ہو گئے۔ رحیم تھانے کی طرف چلا گیا تھا اور دلاور ان دونوں پولیس والوں کو لے کر اپنے اسی دوست کے ہاں آ گیا جس سے ملنے کے لئے چند روز پہلے آیا تھا۔

”دلاور تم کہاں سے آرہے ہو اور یہ کون ہیں؟“ دوست نے پوچھا۔

”اندر تو آنے دو۔ بعد میں بتا دوں گا۔“ دلاور بولا۔

ان کے لئے بیٹھک کھول دی گئی۔ دلاور نے اپنے دوست کو ایک فرضی کمائی سنادی۔ ظاہر ہے اس نے اس کمائی پر یقین نہیں کیا تھا لیکن جرح بھی نہیں کی۔

دلاور دو دن اسی مکان میں رہا۔ پولیس والے کی فائرنگ کے زخم کی مرہم پٹی بھی اپنے طور پر کی جاتی رہی۔ تیسرے دن دلاور کو پیغام مل گیا کہ وہ مہمانوں کو لے کر رات کو رحیم یار خان پہنچ جائے اور انہیں سیدھا اسی مکان میں لے جائے جہاں سے لے کر گیا تھا۔

دوسرے دن شام سے ذرا پہلے وہ تنہا رحیم یار خان کی طرف جانے والی بس پر سفر کر رہے تھے۔ آج دن میں دلاور نے رحیم کو اپنے دوست کے گھر پر بلا کر اس سے صورتحال معلوم کر لی تھی۔ پولیس نے اس کی رپورٹ درج کر کے پہلوان کے نامعلوم ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔

دلاور دونوں پولیس والوں کو لے کر شہر کے نواح میں بس سے اتر گیا اور انہیں بحفاظت اسی مکان میں لے آیا جہاں سے وہ انہیں لے کر گیا تھا۔ رائے منصور کا وکیل وہاں موجود تھا۔ وہ انہی کے انتظار میں وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں پوری طرح ان کی حفاظت نہیں کر سکا۔ ایک زخمی ہو گیا ہے اور اس میں غلطی اس کی اپنی ہے۔“ دلاور نے کہا اور پورے واقعہ کی تفصیل بتادی۔

”معمولی زخم ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وکیل نے پولیس والے کا زخم دیکھتے ہوئے کہا اور پھر انہیں سمجھانے لگا کہ صبح عدالت میں انہوں نے کیا بیان دیتا ہے۔

”ٹھیک ہے دلاور۔“ وکیل نے کہا۔ ”میں یہاں تم ہی لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم صبح آٹھ بجے انہیں لے کر عدالت پہنچ جانا۔ اس کے بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ پہنچ جاؤں گا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

دلاور نے رات اسی مکان میں گزاری تھی اور پھر صبح ٹھیک آٹھ بجے وہ ان دونوں پولیس والوں کو لے کر پہنچ گیا۔ وہاں وکیل ان کا منتظر تھا۔ پہلا کیس انہی کا تھا۔ اس لئے فوراً ہی مجسٹریٹ کے سامنے لائے گئے۔ ان دونوں پولیس والوں کے بیانات مجسٹریٹ کے سامنے ریکارڈ کر دئیے گئے۔ ان کے بیان

کے مطابق صادق نامی وہ شخص نالکہ درانی کو زخمی حالت میں ہسپتال لے کر آیا تھا۔ نالکہ اس وقت بے ہوش تھی۔ پولیس نے صادق کو روک لیا تاکہ نالکہ درانی کے ہوش میں آنے کے بعد اس کے بیان سے یہ تسلی کر لی جائے کہ اسے گولی صادق ہی نے تو نہیں ماری تھی۔

کسی طرح نالکہ کے کزن شیر درانی کو بھی نالکہ کے بارے میں اطلاع ہو گئی۔ اس نے نالکہ درانی کے لئے پرائیویٹ کمرے اور ایک نرس کا انتظام کر دیا اور اپنا ایک گن میں بھی ہسپتال کی راہداری میں بٹھادیا۔ صادق کو رات بھر تھانے میں بٹھائے رکھا گیا اور جب نالکہ پر اسرار طور پر ہسپتال سے غائب ہو گئی تو صادق کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن انسپکٹر اعظم ان دونوں کو اور صادق کو لے کر تھانے سے روانہ ہو گیا۔ ایک سنسان سڑک پر اس نے جیب روک کر صادق کو نیچے اتارا اور اسے گولی مار دی۔ تھانے سے روانگی سے پہلے انسپکٹر اعظم نے سادے کاغذ پر صادق کے دستخط بھی کروائے تھے۔ صادق کی لاش سرکاری ہسپتال پہنچانے کے بعد ہم دونوں انسپکٹر اعظم کے ساتھ تھانے واپس آ گئے جہاں انسپکٹر اعظم نے اپنے ہاتھ سے نالکہ درانی کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کی اور صادق کے دستخط شدہ کاغذ پر بیان بھی خود ہی تحریر کیا۔ نالکہ درانی بے گناہ ہے۔ صادق کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مزید سماعت کے لئے ایک اگلی پیشی مقرر کر دی گئی تھی۔ وکیل کے سرے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ جب عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

دلاور کچہری کے احاطے میں ٹہل رہا تھا۔ وکیل کو دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ دونوں پولیس والے گیٹ کی طرف چلے گئے تھے۔ دلاور وکیل سے بات کر رہا تھا کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ ادھر ادھر دوڑنے لگے..... فائرنگ کچہری کے گیٹ کی سامنے کھڑی ہوئی ایک کار سے کی گئی تھی اور پھر وہ کار بڑی تیزی سے ایک طرف چلی گئی تھی۔

اس اندھا دھند فائرنگ سے تین آدمی مرے تھے اور چھ سات زخمی ہوئے تھے۔ مرنے والوں میں ایک پولیس والا بھی شامل تھا جس نے نالکہ درانی کے حق میں بیان دیا تھا جبکہ دوسرا بال بال بچ گیا تھا۔

دلاور کی ذمہ داری اب ختم ہو گئی تھی۔ وہ اس ہنگامے میں الجھنے کی بجائے وکیل سے اجازت لے کر لاری اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

صادق آباد پہنچے ہی اسے رائے منصور کا پیغام ملا کہ وہ فوراً "حویلی پہنچ جائے۔ دلاور تقریباً" ایک گھنٹہ مشتاق کے پاس بیٹھا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔

دلاور نے اس مرتبہ بس پر احمہ پور لانا جانے کی بجائے گھوڑے پر سوار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے گھوڑے پر زین کسی اور احمہ پور لانا کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ شام سے ذرا پہلے حویلی پہنچ گیا۔ رائے منصور اس وقت حویلی ہی میں تھا۔ وہ دلاور کو دیکھتے ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"ویل ڈن جو ان اتم واقعی بہادر اور فرض شناس آدمی ہو۔ میں ایسے نوجوانوں کی قدر کرتا ہوں۔"

"شکریہ رائے صاحب! آپ کے احسانات نے تو مجھے بندہ بے دام بنادیا ہے۔ آپ نے مجھے بچایا اور میں نالکہ بی بی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے لئے چاہے میری جان بھی چلی جائے تو مجھے پروا نہیں

ہوگی۔ میں تو ان پڑھ اور جاہل آدمی ہوں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ انصاف قدرت کا نظام اور انسان کا حق ہے جو اسے ملنا چاہئے۔ غلط طرفداری ہمیں جاہی اور بربادی کی طرف لے جائے گی۔“ دلاور نے کہا۔

رائے منصور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم ہمیں دھوکا تو نہیں دے رہے؟“ رائے منصور بولا۔

”جی! میں سمجھا نہیں۔“ دلاور گڑبڑا گیا۔

”کیا تم واقعی صرف پانچ جماعتیں پڑھے ہوئے ہو؟“ رائے منصور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”لیکن بعض اوقات تمہاری باتیں مجھے بہت بری طرح الجھا دیتی ہیں۔“

”یہ سب باتیں میں نے آپ ہی جیسے پڑھے لکھے لوگوں سے سیکھی ہیں رائے صاحب! خیر، چھوڑیے ان باتوں کو آپ نے کیسے یاد فرمایا تھا؟“ دلاور بولا۔

”بات تو بہت معمولی سی ہے لیکن ہو سکتا ہے آگے چل کر ہمارے لئے الجھن کا باعث بن جائے۔“

رائے منصور ایک لمحہ خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”آج دوپہر قصبے کے شروع میں نہر کے پل کے نیچے ایک موٹر سائیکل ملی ہے۔ یہ وہی موٹر سائیکل ہے جس پر کئی روز پہلے نائلہ درانی اور رضیہ شہیر درانی کی آموں والی حویلی سے فرار ہوئی تھیں۔ عین پل پر پہنچ کر موٹر سائیکل کا پیٹرول ختم ہو گیا تھا اور نائلہ نے اسے نہر میں پھینک دیا تھا۔“

”نائلہ بی بی!..... موٹر سائیکل! دلاور کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

”ہاں! وہ موٹر سائیکل بھی چلا لیتی ہے اور بہترین گھڑ سوار بھی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”بہر حال وہ

موٹر سائیکل کئی روز تک گھرے پانی میں چھپی رہی اور کسی طرح پانی کے اندر ہی اندر سرکتی ہوئی پل کے نیچے پہنچ کر کچڑ میں پھنس گئی۔ نہر میں پانی کے ساتھ بہہ کر آنے والی جھاڑیاں اور اسی قسم کی چیزیں موٹر سائیکل کے

ساتھ انک کر پل کے نیچے جمع ہوئی رہیں۔ جس کے نتیجے میں نہر کے اس اسپین سے پانی کا اخراج رکنے لگا۔

آج دوپہر دو آدمی پل کے اس جھے کی صفائی کے لئے نہر میں اترے تو جھاڑیوں کے ساتھ وہ موٹر سائیکل بھی

برآمد ہوئی جو اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے اور پولیس اس کے نمبر کے ذریعے اس کے مالک کا سراغ

لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ نمبر رحیم یار خان کا ہے۔ اس کے مالک کا پتہ لگانا زیادہ مشکل ثابت نہیں

ہوگا۔ لیکن ہمارے لئے مسئلہ یہ ہے کہ جب شہیر درانی کو پتہ چلے گا کہ موٹر سائیکل احمد پور لاما میں ملی ہے تو وہ

نہر! سمجھ جائے گا کہ نائلہ اسی نواح میں کہیں موجود ہے۔ وہ مجھے نائلہ کے والد کے دوست کی حیثیت سے

جاتا ہے۔ اس کا شبہ سب سے پہلے مجھ پر ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی وقت حویلی پر چڑھ دوڑے۔ اس لئے میں

ہاتھتا ہوں کہ تم اب یہیں رہو۔ شہیر درانی نے اگر کوئی حماقت کی تو میرے آدمی اس سے نمٹ لیں گے لیکن

نائلہ درانی کی حفاظت اب تمہاری ذمہ داری ہے۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں رائے صاحب!“ دلاور بولا۔ ”شہیر درانی کے ہاتھ اب نائلہ بی بی تک نہیں پہنچ

سکتے۔“

”اب میں مطمئن ہو گیا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”اور ہاں، مشتاق کا کیا حال ہے..... مجھے

تمہارے مکان پر چھاپے کا پتہ چل گیا تھا۔ کیا معاملہ تھا؟“

”مشتاق اب ٹھیک ہے جی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”یہ بھی شیردرانی ہی کی حرکت تھی۔ اس نے انسپکٹر جمال کی جیب گرم کر کے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح قانونی چکروں میں پھنسائے رکھے۔ لیکن اب وہ بچا رہ خود معافیاں مانگتا پھر رہا ہے۔“

”کون؟ شیردرانی؟“ رائے منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں جی۔ میں انسپکٹر جمال کی بات کر رہا ہوں۔“ دلاور مسکرایا۔

”ٹھیک ہے دلاور۔“ رائے منصور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم آرام کرو۔۔۔۔۔ رات کو کھانے کے بعد بات ہوگی۔“

”جی ہمترا“ دلاور بھی اٹھ گیا۔

دلاور مہمان خانے میں آگیا۔ وہ برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز اس تازہ ترین صورتحال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بیچہ تھکا ہوا تھا، کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔

..... \* \* \* .....

”مل گئی سرکار! وہ مل گئی۔۔۔۔۔“

”نالکھ مل گئی۔ کہاں ہے وہ؟“ شیردرانی اپنے معتد خاص موجددار کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ وہ اس وقت شہر والے مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا نالکھ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”نالکھ نہیں سرکار۔ موٹر سائیکل مل گئی ہے۔“ موجددار نے جواب دیا۔

”کوئی موٹر سائیکل! کیا بکواس کر رہے ہو؟“ شیردرانی نے اسے گھورا۔

”اپنے گمن مین صدیق کی موٹر سائیکل سرکار! آپ شاید بھول گئے ہیں کہ نالکھ اور وہ نرس رضیہ اسی موٹر سائیکل پر آسموں والی حویلی سے فرار ہوئی تھیں اور ان دونوں کے ساتھ اس موٹر سائیکل کا بھی سراغ نہیں مل رہا تھا لیکن آج وہ موٹر سائیکل مل گئی ہے۔“ موجددار نے جواب دیا۔

”موٹر سائیکل مل گئی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نالکھ تو نہیں ملی۔“ شیردرانی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت فرق پڑتا ہے سرکار۔“ موجددار بولا۔ ”اس نے ہمیں یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ نالکھ کس علاقے میں ہے۔“

”کھل کر بات کرو موجددار، پہیلیاں مت بھجواؤ۔ تم جانتے ہو میں کس قدر پریشان ہوں۔ بلاوجہ میرے لئے مزید الجھنیں پیدا کرنے کی کوشش مت کرو۔“ شیردرانی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں بتاتا ہوں سرکار۔“ موجددار نے کہا۔ ”آج دوپہر احمد پور لاما والی نہر کے پل کے نیچے کچھ زمیں چھنی ہوئی ایک موٹر سائیکل برآمد ہوئی ہے۔ وہ صدیق کی موٹر سائیکل ہے۔ جس پر نالکھ اور رضیہ حویلی سے فرار ہوئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ پل پر پہنچ کر موٹر سائیکل کا پیٹرول ختم ہو گیا تھا اور اسے نہر میں پھینک دیا گیا۔“

”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ شیردرانی بولا۔

”میں نے اپنی بات پوری ہی کب کی ہے سرکار۔“ موجددار بولا۔ ”رولدر کے کہنے کے مطابق وہ

دونوں رات گیارہ بجے کے لگ بھگ حویلی سے فرار ہوئی تھیں اور جب احمد پور لاما والی نہر پر پہنچی ہوں گی تو

رات کا تقریباً "ایک تو بج رہا ہوگا۔ سونر سائیکل سے جان چھڑانے کے لئے اسے تو انہوں نے نہر میں پھینک دیا لیکن رات ایک بجے انہیں احمد پور لانا جیسے قصبے سے کوئی سواری تو نہیں مل سکتی۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتنی دور جا سکتی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے....." شیردرانی کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"جی سرکار۔" موجددار مسکرا دیا۔ نالکہ کے باپ عبدالصمد درانی کے دوست رائے منصور کی حویلی وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ دونوں آسانی سے وہاں تک پہنچ سکتی تھیں اور سچ پوچھیں سرکار تو میں اس سونر سائیکل کے ملنے کے بعد پورے یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ دونوں رائے منصور کی حویلی میں موجود ہیں۔"

"بات تو تم نے بڑے چپے کی کہی ہے موجددار! شیردرانی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ "لیکن رائے منصور ایک با اثر آدمی ہے۔ علاقے کے تمام زمیندار اس کے دوست ہیں۔ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا خطرناک ہوگا۔ اور پھر یہ بھی یقینی نہیں کہ نالکہ وہاں موجود ہو۔"

"مجھے رائے منصور کی حویلی میں نالکہ کی موجودگی کا یقین ہے لیکن پھر بھی اپنی تسلی کے لئے ہم کسی اور ذریعے سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر احمد پور لانا بازار کا رات کی ڈیوٹی کا چوکیدار..... رات ایک بجے کے لگ بھگ دو بدحواس اور پریشان حال جوان اور خوبصورت لڑکیاں چوکیدار کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ اس نے یقیناً ان دونوں کو دیکھا ہوگا اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ دونوں کہاں گئی ہیں۔"

"تم اتنے عقلمند کب سے ہو گئے ہو موجددار۔" شیردرانی مسکرایا۔

"تو پھر سب سے پہلے بازار کے چوکیدار سے اس کی تصدیق کر لی جائے۔"

"یہی مناسب رہے گا سرکار۔" موجددار نے کہا۔ "میں آج رات ہی کو چوکیدار کو آموں والی حویلی میں اپنا چھپاتا ہوں۔ اس کی زبان کھلوانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"آج کا دن رہنے دو۔ کل اپنے کسی آدمی کو بھیج دینا۔ تمہاری یہاں موجودگی ضروری ہے۔ آج ضلع پکڑی میں جو کچھ ہوا ہے اس سے مجھے کچھ تشویش ہو رہی ہے۔" شیردرانی نے کہا۔

"بہتر ہے سرکار! موجددار نے جواب دیا۔

موجددار کے جانے کے بعد شیردرانی سوچ رہا تھا کہ اس نے واقعی بڑی چپے کی بات کہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ خود اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ نالکہ رائے منصور کے ہاں پناہ لے سکتی ہے۔ لیکن اب سونر سائیکل ملنے کے بعد موجددار نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نالکہ کہاں ہو سکتی ہے۔

بہت سی باتیں موجددار کے اس شبے کی تصدیق کر رہی تھیں۔ اس کے کلیان میں آتشنی جس کا شبہ دلاور پر تھا اور دلاور رائے منصور کا آدمی تھا۔ اس نے صادق آباد کے نئے پولیس انسپکٹر جمال کے ذریعے دلاور کو ایک عورت کے اغواء کے جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی مگر چوہدری حاکم علی نے اسے بچا لیا تھا۔ چوہدری حاکم اس علاقے کا ایک با اثر زمیندار تھا اور وہ موجودہ حالات میں چوہدری حاکم جیسے شخص سے نہیں ٹکرانا چاہتا تھا۔

پھر اسے یہ اطلاع بھی ملی کہ رحیم یار خان میں رائے منصور کا وکیل کچھ پولیس والوں کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہے۔ شیردرانی نے ایک نوجوان وکیل کو روپے کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ

رائے منصور کے وکیل کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھے اور اسے صورتحال سے آگاہ کرتا رہے۔  
وہ نوجوان وکیل ضلع کچہری کے احاطے میں بیٹھے پر بیٹھا کرتا تھا۔ اسے کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا کیس مل جاتا۔ بصورت دیگر وہ بیٹھے پر بیٹھا مقدمات کے سلسلے میں عدالت آنے والوں کی عرضیاں ہی ٹائپ کرتا رہتا تھا۔ اس کا وکیل بہت چالاک تھا وہ لوگوں کو گھیر گھار کر لے آتا۔

وکالت کا پیشہ بھی ایک دلچسپ مذاق بن کر رہ گیا۔ بیٹے کے پیدا ہوتے ہی والدین منصوبے بنانا شروع کر دیتے ہیں کہ اسے وکیل یا ڈاکٹر بنائیں گے۔ بیٹے کو جیسے تیسے کر کے ایل ایل بی کروا بھی دیا تو وہ وکیل کی بجائے عرضی نویس بن کر رہ جاتا ہے۔ عدالتوں میں وکیلوں کی بھمار دیکھ کر اس پیشے کی بے قدری کا احساس ہوتا ہے۔ اس نوجوان وکیل زاہد کا شمار بھی ایسے ہی وکیلوں میں ہوتا تھا۔ وہ بھی محض عرضی نویس بن کر رہ گیا اور اب جو اسے شبیر درانی کی طرف سے اچھی خاصی رقم کی آفر ہوئی تو اس نے اسے نعت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کر لیا اور رائے منصور کے وکیل کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے لگا۔

رائے منصور کا وکیل اگرچہ بھد مختلط آدمی تھا لیکن نوجوان وکیل زاہد بھی بہت چالاک تھا۔ اس نے بہت جلد یہ معلوم کر لیا کہ وہ نالکہ درانی کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے صادق کے قتل کا کیس عدالت میں پیش کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور دو پولیس والوں کو گواہوں کے طور پر عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔  
شبیر درانی کے لئے یہ اطلاع بے حد اہم تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ان پولیس والوں کو عدالت میں پیش کر دیا گیا اور ان کی گواہی کے نتیجے میں نالکہ بے گناہ ثابت ہو کر اس کیس سے بری ہو گئی تو اسے مزید قدم جانے کا موقع مل جائے گا۔

شبیر درانی نے اپنے آدمیوں کے ذریعے یہ معلوم کر لیا کہ وہ دو پولیس والے کون تھے۔ وہ انہیں راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنا ہی رہا تھا کہ وہ دونوں پولیس والے روپوش ہو گئے اور پھر اسے اطلاع ملی کہ دلاور نے رائے منصور کے وکیل سے ملاقات کی تھی۔ پھر دوسرے دن اسے پتہ چلا کہ دلاور صبح سویرے دو آدمیوں کے ساتھ جمال دین والی جانے والی بس پر سوار ہوا تھا۔

شبیر درانی کو یاد آگیا کہ رائے منصور نے شروع میں جمال دین والی میں کچھ زمین خریدی تھی اور ایک مکان بھی بنایا تھا۔ زمین تو اس نے بعد میں بیچ دی تھی مگر وہ مکان اب بھی اس کی ملکیت ہی تھا۔

شبیر درانی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رائے منصور کے وکیل کو کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے پہلے ان دونوں پولیس والوں کو شہر میں چھپائے رکھا پھر انہیں شہر سے باہر بھیج دیا۔ دلاور کے ساتھ جانے والے وہ دونوں آدمی یقیناً "دو پولیس والے ہی تھے۔ اس نے ان دونوں پولیس والوں کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن..... یا تو دلاور بہت چالاک تھا یا شبیر درانی کی قسمت اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ اس کے آدمی اپنا ہی ایک بندہ مردا کر بھاگ نکلے تھے۔

شبیر درانی کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ کل ان دونوں پولیس والوں کا بیان ریکارڈ کروانے کے لئے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس کے آدمی صبح ہی سے ضلع کچہری کے سامنے سڑک پر ایک کار میں تیار بیٹھے تھے۔ یہ کرائے کے قاتل تھے اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی خدمات حاصل کرنے والا کون ہے۔ اس لئے شبیر درانی مطمئن تھا کہ اگر وہ پکڑے بھی گئے تو اس کا نام نہیں آئے پائے گا۔

مگر دلاور ذہین آدمی تھا۔ وہ ان دونوں پولیس والوں کو اس طرح عدالت میں لایا تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آسکے تھے۔ لیکن جب وہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد کمرہ عدالت سے نکل کر احاطے میں گیٹ کے قریب آئے تو باہر کار پر بیٹھے ہوئے کرائے کے قاتلوں نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ یہی سمجھے کہ یہ لوگ ابھی عدالت میں آئے ہیں۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس فائرنگ میں تین آدمی مارے گئے تھے جن میں ایک پولیس والا بھی تھا جبکہ دوسرا معجزانہ طور پر بچ گیا تھا۔

شیردرانی کو جب یہ اطلاع ملی کہ وہ دونوں پولیس والے اپنا بیان ریکارڈ کرا چکے تھے تو وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔ اس پر ایک بار پھر باگل پن کا دورہ پڑا اور اس نے موجددار کو حکم دیا کہ رائے منصور کے وکیل کو اڑا دیا جائے۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا سرکار۔“ موجددار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”وہ دونوں تو اپنا بیان دے چکے ہیں۔ وکیل کو مارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔“ شیردرانی دباؤا۔

لیکن شیردرانی اس مرتبہ بھی تھملا کر رہ گیا۔ پولیس والے کے قتل کے بعد رائے منصور کی درخواست پر فوری طور پر اس کی حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا چار مسلح پولیس والے ہر وقت اسے گھیرے رہتے تھے اس طرح شیردرانی کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا لیکن ان ساری باتوں سے شیردرانی کے ان شبہات کو تقویت مل رہی تھی کہ نائلہ، رائے منصور کی پناہ میں تھی اور وہ اس کی پوری پوری مدد کر رہا تھا۔ اور اب احمد پور لاما کی نہر کے پل کے نیچے سے صدیق کی موٹر سائیکل کی برآمدگی نے ایک اور کڑی ملادی تھی۔ اب صرف تصدیق کی ضرورت تھی کہ نائلہ رائے منصور کی حویلی میں تھی یا اسے کہیں اور رکھا گیا تھا۔

شیردرانی اس رات اپنے شہر والے مکان پر ہی رہا۔ عدالت میں فائرنگ کے حوالے سے پولیس نے اس سے یا اس کے کسی آدمی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ شیردرانی دوسرے دن ناشتے کے بعد آموں والی حویلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

دوپہر دو بجے کے لگ بھگ اس کے آدمی احمد پور لاما بازار کے چوکیدار کو پکڑ لائے تھے۔ شیردرانی بڑے پیار و محبت سے لمبے ترنگے پھان چوکیدار سے ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں پوچھتا رہا لیکن وہ مسلسل لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ شیردرانی نے اسے ایک بڑی رقم کا لالچ بھی دیا تھا مگر وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتا رہا۔

”موجددار!“ شیردرانی نے کہا۔ ”اس خان لالہ کی زبان کھلو آؤ نا۔ یہ تو کچھ بولتا ہی نہیں!“

”یہ تو فر فر بولے گا سرکار۔ طوطے کی طرح۔“ موجددار نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

اور پھر کچھ ہی بعد حویلی میں خان لالہ کی چیخیں گونجنے لگیں۔ موجددار اس پر تشدد کے تمام حربے آزما رہا تھا۔ لاتوں اور گھونٹوں نے خان لالہ کے جسم کا جوڑ جوڑ ڈھیر کر دیا تھا۔ اس کی ناک اور ایک کان سے خون بہنے لگا تھا مگر اس نے زبان نہیں کھولی۔

موجددار میویشیوں والے شیڈ کے نیچے رکھے ہوئے صندوق میں سے پلاس نکال لایا۔ سب سے پہلے اس نے خان لالہ کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن پلاس کی گرفت میں لیا اور اسے آہستہ آہستہ کھینچنے لگا۔ خان لالہ کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے اور پھر اس کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔

موجددار نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ انگوٹھے کا ناخن الگ ہو گیا اور انگوٹھے سی خون کی دھار بہہ نکلی۔



خان لالہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ موجمدار نے اس کے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن بھی اکھاڑ دیا۔  
 ”میں ایک ایک کر کے تمہارے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن اسی طرح ادھیڑ ڈالوں گا۔“ موجمدار کے  
 منہ سے غراہٹ نکلی۔ ”اور اس کے بعد بھی تم نے زبان نہیں کھولی تو تمہارے جسم کی کھال ادھیڑی جائے  
 گی۔ میں تمہاری کھال کے جوتے بنواؤں گا۔ دیکھو نا۔ میرے جوتے بہت پرانے ہو گئے ہیں۔“  
 ”تم میری کھال کے جوتے بنواؤ یا اس میں بھس بھر دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ خان لالہ نے  
 کہا۔

لیکن وہ اپنے اس ارادے پر قائم نہیں رہ سکا تھا۔ تین اور انگلیوں کے ناخن اکھڑنے کے بعد اس کی  
 قوت برداشت جواب دے گئی۔

”وہ..... وہ لڑکیاں.....“ خان لالہ کی آواز حلق میں انک کر رہ گئی۔

”ہاں ہال..... بتاؤ وہ لڑکیاں کہاں گئی تھیں؟“ موجمدار بولا۔

”رائے منصور کے گھر..... میں خود انہیں حویلی تک چھوڑ کر آیا تھا۔“ خان لالہ نے جواب دیا۔

”میں ٹھیک ہی کہتا تھا نا سرکار!“ موجمدار نے شیردرانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بابا! تم تو ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہو۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”اب یہ تحفہ رائے منصور کو بھیج دو۔“ اس  
 نے خان لالہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اے پتھر چل جائے گا کہ ہم اس کے دروازے تک پہنچ گئے ہیں۔ اس  
 سے نالکہ کی واپسی کا مطالبہ ہم شرفیادہ طریقے سے کریں گے۔“

”لیکن میں نے کچھ اور سوچا ہے سرکار۔“

”وہ کیا؟“ شیردرانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم خود رائے منصور سے نالکہ کا مطالبہ نہیں کرتے۔ پولیس کو اس کے ہاں مہمان بنا کر بھیج دیتے  
 ہیں۔ کسی مجرم کو پناہ دینا بھی تو جرم ہے نا سرکار۔“ موجمدار نے کہا۔

”لیکن اس طرح نالکہ پولیس کے ہاتھ چلی جائے گی۔“ شیردرانی بولا۔

”ایسا نہیں ہو گا سرکار۔“ موجمدار بولا۔ ”ہم نے اتنے ڈھیر سارے حراخوڑ کس لئے پال رکھے ہیں۔  
 پولیس جب نالکہ کو رائے منصور کی حویلی سے لے کر آئے گی تو راستے میں گھات لگائے بیٹھے ہمارے آدمی  
 نالکہ کو ان سے چھین لیں گے۔“

”کہتے تو تم ٹھیک ہو۔“ شیردرانی بولا۔ ”آج رات یہ تحفہ رائے منصور کو بھجوا دو۔ اس کے بعد  
 پروگرام بناتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سرکار۔“ موجمدار کہتا ہوا خان لالہ کی طرف چلا گیا جو بے ہوش ہو چکا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے ایک گھنٹے بعد شیردرانی کے آدمی بے ہوش خان لالہ کو اٹھا کر کھیتوں میں ایک  
 طویل چکر کاٹنے لگے۔ رائے منصور کی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے اور شیردرانی برآمدے میں کرسی پر بیٹھا  
 ایک نئی سازش کے تانے بانے بننے لگا۔

..... \*\*\* .....  
 رات کے گیارہ بج رہے تھے۔  
 دلاور، رائے منصور کی حویلی میں بیٹھا رائے صاحب اور نالکہ درانی سے باتیں کر رہا تھا۔ گھر کے دیگر

افراد سوچتے تھے۔ نائلہ کو بھی ایک دو جمائیاں آئی تھیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بستر لیٹے گی تو نیند نہیں آئے گی۔ اس لئے وہ بیس بیٹھی رہی تھی۔ اس وقت موٹر سائیکل والا مسئلہ ہی زیر بحث تھا۔

”مجھے شبہ ہے کہ وہ لوگ یہاں تک پہنچ جائیں گے۔“ نائلہ درانی کہہ رہی تھی۔ ”وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ یہاں موٹر سائیکل ملنے کے بعد اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ میں قرب و جوار ہی میں کہیں موجود ہوں۔ سب سے پہلے اس کا ذہن آپ ہی کی طرف جائے گا۔“ نائلہ کا اشارہ رائے منصور کی طرف تھا۔

”میں تو اس سے نمٹ لوں گا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”لیکن اگر اس نے پولیس کو اس طرف کا راستہ دکھا دیا تو مشکل ہو جائے گی۔ تمہارے خلاف کیس تو بہر حال موجود ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صادق والے کیس کا فیصلہ جلد از جلد ہو جائے۔ اس کے بعد ہم دوسرے کیسز کی طرف توجہ دیں گے۔ تم پر سے یہ الزامات ختم ہو جائیں تو ہمیں بے فکری ہو جائے گی۔ پھر ہمیں صرف ایک ہی محاذ پر لڑنا ہو گا اور اس ایک محاذ پر ہم دشمن کو آسانی سے شکست دے سکتے ہیں۔“

”تم کیوں خاموش بیٹھے ہو دلاور۔“ نائلہ درانی اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم بھی تو کوئی مشورہ دو۔“

”میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں نائلہ بی بی۔“ دلاور بولا۔ ”بلتہ میں نے یہ ضرور کیا ہے کہ شبیر درانی پولیس کو یہاں کی راہ نہ دکھائے میں نے انسپکٹر جمال کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ انسپکٹر جبار کے قتل کے پیچھے شبیر درانی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں انسپکٹر جبار، مراد اور بخشو والے کیس پر کام کر رہا تھا۔ انسپکٹر جبار کے قتل کے بعد تھانے سے بخشو اور مراد والی فائل بھی غائب ہے۔ میں نے انسپکٹر جمال کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ انسپکٹر جبار ٹیلی فون ایکیچینج کے قریب ایک مکان پر ڈاکوؤں کے حملے کی اطلاع پاکر بھاگا تھا لیکن خود ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ لیکن شاید کسی نے اس بات پر توجہ نہیں دی تھی کہ جس مکان پر ڈاکوؤں کے حملے کی اطلاع تھانے پہنچی تھی وہ مکان خالی تھا۔ میں نے انسپکٹر جمال کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ ڈاکوؤں والا یہ ڈرامہ انسپکٹر جبار کو راستے سے ہٹانے کی سازش بھی ہو سکتا ہے۔ جمال نے اگرچہ شبیر درانی کے کہنے پر میرے خلاف کارروائی کی تھی لیکن میں اس کی فطرت سے واقف ہو چکا ہوں۔ وہ ایسا آدمی ہے کہ وقت آنے پر اپنے باپ کو بھی سلاخوں کے پیچھے بند کر سکتا ہے۔ اگر وہ شبیر درانی کے پیچھے لگ گیا تو پھر شبیر درانی کو اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔“

نائلہ درانی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ گاڑی بڑی تیزی سے وہاں سے روانہ ہوئی ہو حالانکہ انہوں نے گاڑی کے آنے کی آواز نہیں سنی تھی..... اس کے ٹھیک دو منٹ بعد گیٹ کا چوکیدار دارا دوڑتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ رائے منصور نے اسے دروازے سے آتے دیکھ لیا تھا۔

”کیا بات ہے دارا؟ یہ گاڑی کس کی تھی؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”صاحب جی! یہ نہیں وہ نقاب پوش تھے۔ ایک لاش گلی کے موٹر پر پھینک کر بھاگ گئے ہیں۔ میں جب دوڑتا ہوا گلی کے موٹر پر پہنچا ہوں تو وہ گاڑی دوسری گلی میں غائب ہو گئی تھی۔“ دارا نے جواب دیا۔

لاش کا سنتے ہی دلاور اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازے سے نکلتے ہی آٹومیک رائفل اس کے کندھے سے اتر کر ہاتھ میں آگئی تھی۔ رائے منصور بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکلا تھا۔ نائلہ درانی برآمدے میں آکر رک گئی تھی۔

دلاور دارا کے ساتھ دوڑتا ہوا حویلی سے باہر آگیا۔

”کہاں ہے لاش؟“ وہ گیٹ سے باہر نکلتے ہی بولا۔

”وہ ادھر ہی..... گلی کے موڑ پر۔“ دارا نے چلتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا وہ دونوں دوڑتے ہوئے گلی کے موڑ پر پہنچ گئے۔ گلی کے موڑ پر بجلی کے کھمبے پر بلب روشن تھا اور پکی گلی میں ایک آدمی آڑا تر چھاڑا تھا۔ دلاور نے جبکہ کر اسے سیدھا کیا تو اچھل پڑا۔ اس شخص کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسے اگرچہ آسانی سے شناخت نہیں کیا جاسکتا تھا مگر دلاور نے تشدد سے بگاڑے گئے اس چہرے کو پہچان لیا۔ وہ قصبے کا چوکیدار خان لالہ تھا۔ رات کو کئی مرتبہ قصبے سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور کئی مرتبہ ان میں گپ شب بھی ہوئی تھی۔ خان لالہ کا لباس پھٹا ہوا تھا۔ جسم پر تشدد کے نشان نمایاں تھے۔ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں اور تین انگلیوں کے ناخن اکڑے ہوئے تھے جیسے انہیں زہور سے کھینچا گیا ہو۔ انگوٹھوں اور انگلیوں پر خون جم چکا تھا۔ دلاور نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ نبض ٹٹول کر دیکھی۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ اتنے تشدد کے بعد کسی کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ اسی دوران رائے منصور بھی وہاں پہنچ گیا۔

”کون ہے یہ؟ زندہ ہے یا.....؟“ رائے منصور نے جملہ ادھر وہرہ چھوڑ دیا۔

”قصبے کا چوکیدار ہے۔ خان لالہ۔ ختم ہو چکا ہے۔“ دلاور نے سیدھا ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ!“ رائے منصور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”وہ کون تھے؟“

”کھیل شروع ہو چکا ہے رائے صاحب!“ دلاور نے جواب دیا۔ ”یہ ہمارے لئے ایک چیلنج ہے۔ خان لالہ کی لاش حویلی کے دروازے پر پھینکنے کا مطلب یہ ہے کہ شبیر درانی کو ناکلہ کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔ اس کا لہجہ پرسکون تھا۔ ”میری زندگی ہی بڑے بڑے چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزری ہے۔ مجھے شبیر درانی کا یہ چیلنج بھی قبول ہے۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی بربریت کا مظاہرہ دیکھ لیا ہے۔ اس شخص کو تو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہونا چاہئے۔ تم بیس روک..... میں ٹیلی فون پر پولیس کو اطلاع دیتا ہوں۔ دارا! تم اس لاش پر کوئی چادر ڈال دو۔“ رائے منصور نے آخری الفاظ دارا سے مخاطب ہو کر کہے اور مرکز تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

دارا نے اپنی گرم شمال کندھے سے اتار کر خان لالہ کی لاش پر ڈال دی۔ رائے منصور کی آواز سن کر قریبی مکانوں میں رہنے والے چند مزارعے بھی گھروں سے نکل کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ خان لالہ کی لاش دیکھ کر وہ بھی حیران و پریشان ہو گئے۔ اتنی جرات کس میں ہو سکتی ہے کہ کسی کو قتل کر کے لاش رائے منصور کی حویلی کے دروازے پر پھینک جائے۔

ایک گھنٹے بعد پولیس آگئی۔ پولیس پارٹی کا انچارج ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس وقت رائے منصور بھی حویلی سے باہر آچکا تھا۔

”معاف کیجئے رائے صاحب!“ سب انسپکٹر اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”آپ کا پیغام مجھے چند منٹ پہلے ملا ہے۔ دراصل ایک تیز رفتار کار قصبے کے مرکزی چوک میں لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی۔ اس حادثے میں کار کا ڈرائیور تو ہلاک ہو گیا۔ جبکہ دو آدمی زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں بھی شدید چوٹیں آئی ہیں اور ان کے بھی بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ بہر حال انہیں صادق آباد کے ہسپتال بھجوا کر آیا ہوں۔“

”کارا“ رائے منصور چونک گیا۔ ”وہ کار والے ہی لاش یہاں پھینک کر گئے ہیں۔ یہ قصبے کا چوکیدار خان لالہ ہے۔ دیکھو اس کے ساتھ کس قدر بربریت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔“

سب انسپکٹر چونک گیا۔ دارا نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا اور پھر بیانات وغیرہ لکھنے کے بعد اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے شال میں لپٹی ہوئی خان لالہ کی لاش اٹھا کر جیب میں سیٹوں کے درمیان ڈال دی۔

”اس لاش کو بھی پوسٹ مارٹم کے لئے صادق آباد ہسپتال ہی لے جانا پڑے گا۔ میں خود ساتھ جاؤں گا اور کار کے حادثے میں زخمی ہونے والوں کو بھی حراست میں لے لیا جائے گا۔“ سب انسپکٹر نے کہا اور رائے منصور سے ہاتھ ملا کر جیب میں سوار ہو گیا۔

پولیس کے جانے کے بعد دلاور، رائے منصور کے ساتھ ایک بار پھر حویلی میں آگیا۔ اب ان کے سامنے ایک نئی صورت حال تھی اور اب وہ اس تازہ ترین صورت حال پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

”تم ٹھیک کتنی ٹھیک ناکہ بنی۔“ رائے منصور بولا۔ ”وہ واقعی انسان نہیں وحشی ہے۔ ایک خونخوار درندہ اس سے کسی بھی اقدام کی توقع کی جاسکتی ہے۔ آج اس نے خان لالہ کی لاش حویلی کی گیٹ پر پھینک کر ہمیں یہ باور کرانا چاہا ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”وہ جو کچھ کرے گا اس سے تو ہم نمٹ لیں گے لیکن اندیشہ اس بات کا ہے کہ وہ پولیس کو ناکہ کی یہاں موجودگی کی اطلاع نہ کر دے۔“ دلاور بولا۔

”اس کا بھی میں نے ایک حل سوچ لیا ہے۔“ رائے منصور بولا۔ ”تم ناکہ کو لے کر نہروالے ڈیرے پر چلے جاؤ۔ میرے ڈیرے پر نہیں، ملک کے ڈیرے پر اس طرح نہ تو شبیر درانی کو کوئی شبہ ہوگا اور نہ ہی پولیس کو۔ دو چار دن کی بات ہے۔ پولیس جب مطمئن ہو جائے گی تو میں تم لوگوں کو واپس بلا لوں گا۔“

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی روانہ ہو جاؤ۔ میں ان لوگوں کے بارے میں معلوم کروں گا کہ خان لالہ کی لاش کو یہاں پھینکنے والے کون تھے۔ ان میں سے ایک تو حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے اور دوسرے زخمی ہوئے ہیں۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک یہ بیان دے دے کہ یہ حرکت شبیر درانی کی ہے تو اس پر خان لالہ کے قتل کا کیس بھی بن سکتا ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”ٹھیک ہے رائے صاحب!“ دلاور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں صبح پانچ بجے تیار رہوں گا۔“

دلاور مہمان خانے چلا گیا اور ناکہ درانی بھی اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے دل پر ایک بار پھر ہلکا سا خوف طاری ہونے لگا تھا۔ شبیر درانی تو کسی بدروح کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب تک شبیر درانی اس سے نجات حاصل نہیں کر لے گا اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔

یونکہ ناکہ کی زندگی اس کے لئے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔

صبح پانچ بجے دلاور اور ناکہ درانی نہایت خاموشی سے بستی سے نکل گئے۔ دلاور کے پاس تو اپنا سفید کھڑا تھا اور ناکہ کے لئے رائے منصور کے اصطبل سے ایک گھوڑی کا بندوبست کیا گیا تھا۔

اس وقت بستی پر سناٹا تھا۔ وہ دونوں بڑی خاموشی سے بستی سے نکل کر کھیتوں میں پگھنڈی پر چل پڑے۔ نہروہاں سے تقریباً دو میل دور تھی اور نہر کے قریب ہی ملک عزیز کا ڈیرہ تھا۔ ملک عزیز اور رائے منصور کی زمینیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ ملک عزیز کی کچھ زمین نہر کے دوسری طرف بھی تھی۔ اس کا ڈیرہ

نہر کے اسی طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ رائے منصور اور ملک عزیز میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دلاور اور نائلہ جب ملک عزیز کے ڈیرے پر پہنچے تو دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ یہ ڈیرہ ایک بہت بڑے احاطے اور اس کے ایک طرف چند کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے ملک عزیز کے لئے مخصوص تھے۔ اس کا ایک ملازم کالو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ مستقل طور پر یہاں رہتا تھا۔ احاطے کے ایک طرف بہت بڑا شید تھا جس کے نیچے گائے، بھینس اور دوسرے مویشی بندھے ہوئے تھے۔

کالو اور اس کی بیوی بھینسوں کا دودھ دہہ رہے تھے۔ وہ بھینسوں سے نکالا جانے والا دودھ پیتل کے بڑے بڑے مشکوں میں، جنہیں دلوںے کہا جاتا تھا، جمع کر رہے تھے۔ کالو دلاور کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کے ساتھ نائلہ اس کے لئے اجنبی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ ان کی طرف اٹھ گیا۔

”یہ کون ہے دلاور، بھاگ کر تو نہیں لائے؟“ کالو نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔  
 ”نہیں اے، میری ماں لکن ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”لیکن کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر ہمارے لئے کچھ ناشتے پانی کا بندوبست کر دو۔۔۔۔ اور ان جانوروں کو بھی ایک طرف باندھ دو۔“

”تم لوگ ملک جی والے کمرے میں چلو۔ رہڑے والا آتا ہی ہو گا کہیں وہ تم لوگوں کو دیکھ نہ لے۔“ کالو نے کہا اور ملک عزیز کے لئے مخصوص دونوں کمروں میں سے وہ کمرہ کھول دیا جس میں ایک آرام دہ بینک بچھا ہوا تھا۔ دوسرا کمرہ بیشک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

بیڈ والے کمرے میں دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کی پشت پر بھی کور چڑھے ہوئے تھے جن پر ہاتھ سے خوبصورت کڑھائی کی گئی تھی۔ کرسیوں کے کشن پر بھی ہاتھ کی کڑھائی تھی۔ بینک پر گلابی رنگ کی چار سوئی کی چادر بچھی ہوئی تھی اس پر بھی خوبصورت کڑھائی تھی۔ نکتے کے کور پر بھی پھول کڑھے ہوئے تھے۔  
 دلاور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رائفل کندھے سے اتار کر دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی تھی۔۔۔۔  
 ”بیٹھو نائلہ بی بی۔“ دلاور نے کہا۔ ”اگر آپ میری وجہ سے کچھ الجھن محسوس کر رہی ہوں تو میں دوسرے کمرے میں چلا جاؤں۔“

”نہیں نہیں۔ بیٹھو، تم بیٹھو، بیٹھو، اہلی تو میں یہاں بورتی رہوں گی۔ تم سے باتیں کر کے دل تو ہیلے گا۔“ نائلہ درانی نے کہا اور خود بینک پر بیٹھ گئی۔ اس نے نکتے سے ٹیک لگالی۔

وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر ایک آواز سن کر دلاور چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی نائلہ احاطے کے سامنے آکر رکا ہو۔ دلاور نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول کر باہر بھانکا۔ وہ رہڑہ تھا۔ کالو اور ایک اور آدمی دودھ کے دلوںے پر لا رہے تھے۔ وہ دس دلوںے تھے۔ دلاور کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ دودھ شہر جا رہا تھا۔

رہڑے کے جانے کے بعد دلاور نے کھڑکی بھینڈ دی اور اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی۔ نائلہ بستر پر نیم دراز ہو کر اونگھ رہی تھی۔ وہ کچھ اس طرح لیٹی تھی کہ اس کی قمیض سینے پر سے کھینچ گئی تھی۔ جس سے اس کے سینے کے ابھار کچھ نمایاں ہو گئے تھے۔ سینے کے اوپر کا کچھ حصہ برہنہ ہو گیا تھا اور دونوں ابھاروں کے عین وسط میں کسی پودے کے پتے کی طرح کا سرفی مائل نشان بہت بھلا لگ رہا تھا۔ سینے کا زیر و بم دلاور کے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے نائلہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بے پناہ مصومیت تھی اس کے چہرے پر۔ بالوں کی ایک لٹ اس کی

پشانی پر آگئی تھی۔ دلاور کی نظریں نائلہ کے چہرے سے پھسلتی ہوئی ایک بار پھر اس کے سینے پر مرکوز ہو گئیں۔

دلاور کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اسے اپنے خون میں حرارت سی محسوس ہونے لگی۔ جسم پر پسینے کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب آگیا۔ اس نے کھڑکی کو پوری طرح کھول دیا اور کلبے کلبے سانس لینے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اس کے داغ کی گرمی دور ہونے لگی۔

دلاور دوسروں کی نظروں میں اچھا آدمی نہیں تھا، وہ قاتل تھا، آوارہ تھا۔ لیکن اس کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون تھا۔ اس نے اپنی ماں اور بہن کی توہین اور موت کا انتقام لینے کے لئے پانچ خون کئے تھے لیکن اس نے کسی عورت کی طرف کبھی میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دل میں عورت کا بیحد احترام تھا۔ ان بڑھ اور جاہل ہونے کے باوجود عورت کے بارے میں اس کا اپنا ایک فلسفہ تھا۔ عورت ہی کے دم سے اس کائنات کی رونق تھی۔ عورت وہ نازک ترین پھول تھی جس کی طرف اگر نظر بھر کر بھی دیکھ لیا جائے تو مرجھا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں عورت اس دنیا کی سب سے قابل احترام ہستی تھی۔ عورت ہی کی کوکھ سے پیغمبروں نے جنم لیا تھا جنہوں نے اس دنیا کو کفر و جہالت کے اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی سے منور کیا تھا۔ عورت ماں تھی، بہن تھی، بیٹی تھی اور محبوبہ تھی۔ اس کا ہر روپ حسین اور قابل احترام تھا۔

دلاور بہت دیر تک کھڑکی کے سامنے کھڑا کمرے کمرے سانس لیتا رہا۔ نائلہ کے لئے تو اس کے دل میں بہت کچھ تھا۔ بہت احترام تھا اس کا..... نائلہ کا سامنا ہوتے ہی اس نے ہمیشہ اپنے میں عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی۔ اس کے خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی اور آج تو اس پر کچھ عجیب سا سحر طاری ہو گیا تھا۔ نشہ سا تھا جس نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کالو تھا، مٹی کے دو پالوں میں چائے لے کر آیا تھا۔ نائلہ بھی دروازے کی آواز سن کر اٹھ گئی تھی۔ کالو نے چائے لے پالے چھوٹی پتائی پر رکھ دیئے۔ نائلہ نے اس سے پانی منگو کر کھڑکی کے قریب جا کر کھلی کی اور دوبارہ پتنگ کی پتی پر بیٹھ گئی۔ دلاور بھی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

”تم لوگ چائے پو، فردوس آنا گوندھ رہی ہے۔ آدھے گھنٹے میں ناشتہ تیار ہو جائے گا۔“ کالو کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

نائلہ اور دلاور چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ چائے میں پتی تو برائے نام ہی تھی۔ دودھ ہی دودھ تھا۔ ناشتے کے بعد نائلہ درانی کالو کی بیوی فردوس کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی۔ اس نے ٹوکے پر مویشیوں کو لائے بیٹھے کترے، گھماؤ بنایا اور دوسرے چھوٹے چھوٹے کام کرنے لگی۔ ان کاموں میں اسے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ فردوس مسکرا مسکرا کر اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کئی بار نائلہ کو کام سے منع کیا تھا مگر وہ اس مانی تھی دلاور بھی کالو کے ساتھ مختلف کاموں میں مصروف رہا تھا۔

”پھر دو بجے کے لگ بھگ ملک عزیز کا ایک کارندہ آگیا۔ دلاور اور نائلہ اس کی موٹر سائیکل کو احاطے میں لے کر مڑے۔ دیکھ کر کمرے میں چلے گئے تھے۔ لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ ملک عزیز کا وہ آدمی انہی سے ملنا چاہتا تھا۔“

فردوس صاحب نے ملک صاحب کو تم دونوں کے بارے میں اطلاع بھجوا دی تھی۔ ملک صاحب نے یہ بیان ہونے کی ضرورت نہیں جب تک حالات ٹھیک نہیں ہوتے تم لوگ یہیں رہو۔ کالو اور

اس کی بیوی یہاں ہر طرح سے تم لوگوں کا خیال رکھیں گے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔“  
 ”فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”ملک صاحب کو میرا سلام کہتا۔“  
 ملک عزیز کا کارندہ کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلا گیا۔

دو تین دن گزر گئے۔ دلاور اور نانکہ درانی، کالو اور فردوس کے ساتھ دن بھر کاموں میں مصروف رہتے۔ لیکن نانکہ کبھی کبھی سوچنے لگتی کہ کیا ایک بار پھر بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی؟  
 چوتھے دن انہیں ملک عزیز بی کے ایک آدمی کے ذریعے اطلاع ملی کہ پولیس نے رائے منصور کی حویلی کی تلاشی لی تھی۔ وہ ایک خفیہ اطلاع پر نانکہ درانی کی تلاش میں وہاں آئے تھے۔ ان کے ساتھ تین ایڈی سرچ بھی تھیں۔ رائے منصور پہلے تو پولیس انسپکٹر پر خوب برہم ہوا تھا پھر اس نے ایڈی سرچ کے ذریعے حویلی کی تلاشی لینے کی اجازت دیدی تھی۔ جنہوں نے حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا تھا لیکن انہیں نانکہ نہیں ملی تھی۔ پولیس نے بہتی کے کچھ گھروں کی تلاشی بھی لی تھی مگر انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ بالاخر پولیس والے رائے منصور سے معذرت کرتے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔

نانکہ سوچ رہی تھی کہ شبیر درانی کو جب پولیس کی اس ناکامی کی اطلاع ملی ہوگی تو اس نے پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچ لئے ہوں گے۔ اس کے دو دن بعد نانکہ کو جو اطلاع ملی اس نے نانکہ کے حواس پر بجلی سی گرا دی تھی۔ یہ خبر اسے خود ملک عزیز نے سنائی تھی۔ ملک عزیز درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ توند ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چھوٹی داڑھی جس کے کالے اور سفید بال بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ماتھے پر سیاہ نشان تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ پانچ وقت کا نمازی ہے۔ وہ ایک روایتی زمیندار تھا اپنے مزارعوں پر سختی بھی کرتا تھا اور ان کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ زمینیں ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے رائے منصور سے اس کی بڑی دوستی تھی۔

”یہ قسمت کے کھیل ہیں نانکہ بیٹی۔“ وہ نانکہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کاش! تمہارا والد زندہ ہوتا تو کسی کو تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات بھی نہ ہوتی۔ میں نے تمہارے والد کو نہیں دیکھا لیکن رائے صاحب مرحوم ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔“

باپ کے ذکر پر نانکہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کا باپ واقعی بہت اچھا تھا۔ ایک شریف، نیک اور ہمدرد انسان۔ جو دوسروں کی تکلیف دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ اگر اس کے باپ میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو آج اسے کہیں پناہ نہ ملتی۔

”میں اس وقت تمہارے لئے کوئی اچھی خبر تو نہیں لایا بیٹی۔ لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ملک عزیز نے کہا۔

”میں ہر بری سے بری خبر سننے کے لئے تیار ہوں۔ اب میرے لئے بری خبروں کے سوارہ بھی کیا گیا ہے۔ آپ بے دھڑک ہو کر بتائیے، کیا معاملہ ہے؟ جب تک آپ جیسے مہربان، ہمدرد اور مشفق لوگ موجود ہیں مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بتائیے کیا بات ہے؟“ نانکہ درانی نے اس کے چہرے پر نظرسنجما دیں۔  
 ”تمہاری پھوپھی حینہ بیگم نے تمہارے اسٹیٹ منیجر حسن پر لاکھوں روپے کے غبن کا الزام عائد کر کے اسے گرفتار کروا دیا ہے اور سرکاری طور پر اجازت حاصل کر کے تمہاری جائیداد کی مگرانی سنبھال لی ہے۔“  
 ملک عزیز نے بتایا۔

”یہ..... یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟“ یہ خبر سن کر نانکہ کے حواس پر واقعی بجلی سی گری تھی۔ ”عدالت نے

میری اسٹیٹ اس کی نگرانی میں کیسے دیدی؟“

”سب سے پہلے حینہ بیگم نے ہمارے فیجر حسن کے خلاف خرد برد اور غبن کی رپورٹ لکھوا کر اسے گرفتار کروادیا پھر عدالت میں یہ درخواست دی کہ نائلہ درانی اس کی سگی بھتیجی ہے اور بعض عظیم مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہے اور گرفتاری کے خوف سے روپوش ہے۔ نائلہ کی عدم موجودگی سے قاعدہ اٹھاتے ہوئے فیجر اور اس کے کارندے اسٹیٹ کو لوٹ رہے ہیں۔ اس لئے اسٹیٹ کی نگرانی قانونی طور پر اس کے سپرد کی جائے۔ عدالت نے ایک ہی دن میں کارروائی مکمل کر کے حینہ بیگم کو تمہاری اسٹیٹ کا نگران مقرر کر دیا ہے۔“

”یہ بہت برا ہوا۔“ نائلہ درانی بولی۔ ”کیا رائے منصور اٹکل کو یہ معلوم ہے؟“

”ہاں۔“ مجھے رائے صاحب نے بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے حینہ بیگم کی یہ نگرانی منسوخ کروانے کے لئے اپنے وکیل کے ذریعے کارروائی شروع کر دی ہے اور ہاں! ”ملک عزیز ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”کل رحیم یار خان کی عدالت میں صادق والے کیس کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ رائے صاحب کے وکیل نے اس کیس پر بڑی محنت کی ہے۔ اس نے عدالت کے سامنے یہ شواہد بھی پیش کئے ہیں کہ تمہیں بے ہوشی اور زخمی حالت میں سلطان زید ہسپتال لانے والا صادق ہی تھا۔ میڈیکولجکل آفیسر اور ہسپتال کے عملے کے بعض افراد اور ڈاکٹروں کے بیانات بھی حاصل کرتے ہیں کہ صادق ہی تمہیں زخمی حالت میں ہسپتال لایا تھا اور وہ خود بالکل ٹھیک تھا اور جب پولیس والوں کے ساتھ ہسپتال سے گیا تھا تو بالکل صحیح سلامت تھا..... امید ہے کہ کل مقدمے کا فیصلہ تمہارے ہی حق میں ہوگا۔“

”خدا یا!“ نائلہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔۔۔۔۔ کب ختم ہوں مجھے یہ مصیبت کے دن۔“

اسی دوران کالو دو پلیٹنوں میں پھل اور مٹھائی لے آیا۔ وہ پلیٹیں میز پر رکھ کر باہر چلا گیا۔ بہت سارے پھل، مٹھائی اور بہت سی دوسری چیزیں ملک عزیز ہی نائلہ کے لئے لے کر آیا تھا۔

”ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔“ ملک عزیز نے کہا۔ ”لو..... یہ کھاؤ۔“

ملک عزیز تین چار گھنٹے وہاں رکھا تھا۔ پھر وہ نائلہ کو تسلی دیتا ہوا اپنی کار پر رخصت ہو گیا۔

نائلہ درانی کے لئے ایک نئی پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔ اسٹیٹ کا اس کی چھوٹی حینہ بیگم کی نگرانی میں چلے جانا بہت خطرناک تھا اور پھر اسٹیٹ کے فیجر حسن پر غبن کا الزام عائد کر کے اسے گرفتار کروادینا تو اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی تھی۔ نائلہ اسے بچپن سے دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ وہ بہت نیک اور شریف آدمی تھا اسٹیٹ کا سارا انتظام اسی نے سنبھالا ہوا تھا اور کبھی ایک پیسے کا ہیر پھیر نہیں ہوا تھا۔ نائلہ کے والد نے بھی اس سے کبھی حساب کتاب نہیں لیا تھا۔ چہ جائیکہ حینہ بیگم نے اسے لاکھوں کے غبن کے الزام میں اندر کر دیا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا اور نائلہ یہ سوچ کر ہی کانپ مٹی تھی کہ پولیس اس کا کیا حشر کرے گی۔

”یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں نائلہ بی بی!“ دلاور نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ تاریکی بہت جلد چھٹ جائے گی اور آپ کی زندگی میں ایک نئی اور روشن صبح طلوع ہوگی۔“

نائلہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم لوگوں کی یہ ہمدردانہ باتیں ہی تو مجھے اب تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اگر مجھے یہ ہمدردیاں حاصل نہ ہوتیں تو شاید میں بہت عرصہ پہلے اس درندے کے ہاتھوں ختم ہو چکی ہوتی۔“ نائلہ درانی نے کہا۔



”جب تک دلاور زندہ ہے آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔“ دلاور بولا۔  
 دلاور کا لہجہ محسوس کر کے نائلہ چونکے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ انتہائی پریشان ہونے کے باوجود وہ اپنے  
 سینے میں دلاور کے لئے لطف جذبات محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دیر تک عجیب سی نگاہوں سے  
 دلاور کی طرف دیکھتی رہی۔

اس سے اگلی رات اچانک ہی گولیوں کی آواز سن کر دلاور کی آنکھ کھل گئی۔ اسے وقت کا اندازہ نہیں  
 تھا۔ اس نے بستر سے چلا نکل لگا دی اور رائفل اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ مکان سے چند گز دور  
 درختوں میں کھڑے دو آدمی مکان کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ دلاور دوڑتا ہوا اندرونی دروازے سے نائلہ  
 کے کمرے آگیا۔ نائلہ بھی جاگ گئی تھی اور اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ دلاور نے اس کمرے کی کھڑکی سے  
 جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں آدمی درختوں کی آڑ میں کھڑے فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ آدمی نظر نہیں آرہے تھے  
 البتہ رائفلوں سے نکلنے والے شعلے ان کی پوزیشن کا پتہ بتا رہے تھے۔ دلاور نے بھی درختوں کی طرف دو فائر  
 کر دیئے۔

”دلاور! ایک بھاری آواز فضا میں گونجی۔ ”تم چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو۔ ہماری تم  
 سے کوئی دشمنی نہیں۔ اگر تم نائلہ درانی کو ہمارے حوالے کر دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“  
 ”نائلہ درانی میری حفاظت میں ہے۔“ دلاور چیخا۔ ”نائلہ تک تم لوگ میری لاش پر سے ہی گزر کر  
 جاسکتے ہو۔“

جواب میں زبردست فائرنگ شروع ہو گئی۔ دلاور نے بھی ایک دو فائر کئے پھر تیزی سے نائلہ کی طرف  
 گھوم گیا۔

”میرے ساتھ آؤ..... جلدی..... ہم دوسری طرف سے احاطے سے باہر نکل سکتے ہیں۔“ دلاور نے نائلہ  
 کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے لئے اپنی زندگی خطرے میں مت ڈالو دلاور..... مجھے یہیں چھوڑ دو اور خود یہاں سے نکلنے کی  
 کوشش کرو۔“ نائلہ بولی۔

”تمہاری زندگی مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ جلدی کرو، وہ گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔“ دلاور نے  
 اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی احتیاط سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ یہ غنیمت تھا کہ حملہ آوروں کا کوئی آدمی  
 ابھی تک کود کر احاطے میں نہیں آیا تھا۔ ساتھ والے کمروں سے کالو اور اس کے بیوی بچوں کے چیخنے کی  
 آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

باہر تاریکی تھی۔ دلاور نائلہ کا ہاتھ پکڑے دے قدموں مویشیوں کے شید کی طرف دوڑا جہاں ان کے  
 گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے۔ دلاور نے اپنے گھوڑے کی رسی کھول لی..... زین ڈالنے کا وقت نہیں تھا۔  
 وہ گھوڑے کی رسی پکڑے مویشیوں کے شید کے دوسری طرف احاطے کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ احاطے کا  
 یہ دروازہ صرف مویشیوں کو باہر لانے کے لئے استعمال ہوا تھا اور حملہ آوروں نے اس دروازے  
 کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

احاطے سے باہر آکر دلاور نے پہلے نائلہ درانی کو سارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا پھر اچھل کر خود بھی اس  
 کے پیچھے سوار ہو گیا۔ رائفل اس نے کندھے پر ٹانگ لی تھی۔ اس نے دونوں بانہیں آگے بٹھی ہوئی نائلہ  
 کے جسم کے گرد لپیٹ کر گھوڑے کی رسی پکڑ لی۔

گھوڑا ایک سوار کا عادی تھا۔ دوہرا بوجھ پڑنے سے وہ ہنسانے لگا۔

”شور نہ مچا میرے دوست، یہی تمہاری آزمائش کا وقت ہے۔“ دلاور نے گھوڑے کی گردن پر جھکی

دی۔

اسی لمحہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ حملہ آوروں نے گھوڑے کے ہنسانے کی آواز سن لی تھی۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں پچھلی طرف سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دلاور نے گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ گھوڑا ایک بار پھر ہنسایا اور بدوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح بھاگ اٹھا۔ دلاور، نالکھ پر جھک گیا۔ نالکھ بالکل دوہری ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں بازو گھوڑے کی گردن پر پلپٹ رکھے تھے اور دلاور اس پر تقریباً ”لدا ہوا تھا۔“

حملہ آور اب اس طرف پہنچ گئے تھے۔ وہ مسلسل فائرنگ کر رہے تھے، گولیاں گھوڑے کے آس پاس سے گزر رہی تھیں۔ دلاور گھوڑے کو مسلسل ایڑ لگا رہا تھا اور گھوڑا کھیتوں میں برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ اسے بھی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کے مالک کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ دونوں کا بوجھ اٹھائے جان توڑ کر دوڑ رہا تھا۔

فائرنگ بند ہو گئی۔ دلاور نے گردن گھما کر دیکھا۔ احاطے کے سامنے اسے کسی کار کے ہیڈ لیمپ کی روشنی دکھائی دی۔ حملہ آور کار پر سوار ہو گئے تھے اور کار کھیتوں کے درمیان کشادہ کپے راستے پر آگئی تھی۔ دلاور نے گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔

گھوڑا کھیتوں میں سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ کھیتوں میں اس کا رخ رحیم آباد کی طرف تھا۔ کار پر سوار حملہ آوروں نے بھی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے بھی کار کا رخ اس کپے راستے پر موڑ دیا تھا جو رحیم آباد کی طرف جانے والی پکی سڑک کی طرف چلا گیا تھا۔

دلاور بھی ان کی نیت آڑ گیا تھا۔ وہ گھوڑے کو پے درپے ایڑ لگا رہا۔ وہ ان سے پہلے رحیم آباد کے قریب سے گزرتا ہوا ضلع کی سرحد پار کر کے دریا پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ ان لوگوں سے پہلے دریا پار کر لیں تو ان سے بچ سکتے تھے۔

رحیم آباد وہاں سے کئی میل دور تھا اور ضلع کی سرحد اس سے بھی چند میل آگے اور دریا اس سے بھی کئی میل آگے۔ لیکن دلاور کو یقین تھا کہ وہ ان لوگوں سے پہلے دریا پر پہنچ جائیں گے۔ گھوڑا پوری طرح ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

نالکھ درانی اس کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اگر وہ کچھ دیر اور اسی طرح جھکی رہی تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ مگر اسے صورتحال کی نزاکت کا احساس تھا۔ وہ اس تکلیف کو برداشت کر رہی تھی۔

ایک جگہ پر گھوڑے کی رفتار سست ہو گئی۔ غالباً ”وہ تھک گیا تھا۔ دلاور نے اس مرتبہ ایڑ لگانے کی کوشش نہیں کی بلکہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نالکھ درانی بھی سیدھی ہو گئی۔ دلاور نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی ری پکڑی ہوئی تھی اور دوسرا ہاتھ اس نے نالکھ کے گرد حائل کر دیا تھا تاکہ جھٹکا لگنے سے وہ گر نہ پائے۔ اس کا بازو نالکھ کے گداز سینے کو چھو رہا تھا۔

گھوڑے کی پشت پر سوار وہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے اور اب خطرے کی حدود سے نکلنے ہی ان دونوں کو اپنی پوزیشن کا احساس ہو گیا تھا۔ دلاور پہلا مرد تھا جو نالکھ کے اس قدر قریب آیا تھا وہ اپنے سینے اور



نالہ درانی عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

دلاور برآمدے میں فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کی سوچ کا محور نالہ درانی ہی تھی۔ وہ کتنا قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے کتنا دور تھا۔ وہ چاہتا تو اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ نالہ ہر لحاظ سے اس کے رحم و کرم پر تھی۔ لیکن وہ شریف والدین کی اولاد تھا۔ اس نے دل ہی دل میں نالہ کی پرستش ضرور کی تھی لیکن ابھی تک اسے میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نالہ کا محافظ تھا، لیرا نہیں۔ نالہ نے اس پر جو اعتماد کیا تھا وہ اسے نہیں نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دن کی روشنی پھیلنے لگی۔ اس نے اٹھ کر کمرے میں جھانکا۔ نالہ چارپائی پر سگری مٹی سی پڑی سو رہی تھی۔ اسے یقیناً ”سردی لگ رہی تھی۔ دلاور نے اپنے کندھے سے چادر اتار کر بڑی احتیاط سے نالہ پر ڈال دی اور دوبارہ برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔

مکان کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہ برآمدے میں کھڑا دور تک کھیتوں میں دیکھ سکتا تھا۔ مویشیوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز صبح کی خاموش فضا میں بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک کسان مویشیوں کو ہانکتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اسے یقیناً ”مکان کے سامنے والی پکڈنڈی سے گزرنا تھا۔ وہ جیسے ہی سامنے پہنچا، دلاور مکان سے نکل کر پکڈنڈی پر آ گیا۔ وہ کسان اسے دیکھ کر دھنک گیا۔

”دلاور بھائی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”مجھے جانتے ہو؟“ دلاور نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں کون نہیں جانتا دلاور۔“ وہ کسان بولا۔ ”اب تو تمہیں بچہ بچہ پہچاننے لگا ہے۔“

”فرید کو جانتے ہو؟“ دلاور نے اپنے اسی دوست کے بارے میں پوچھا جس کے گھر میں اس نے پولیس والوں کے خوف سے ایک رات گزاری تھی۔

”اچھی طرح جانتا ہوں۔“ کسان نے جواب دیا۔

”اچھا تو ایسا کرو۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔“ دلاور کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا اور جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پسو اپنے کھیت پر چھوڑ کر قصبے کے بازار چلے جاؤ اور میرے لئے کچھ کھانے پینے کو لے آؤ۔ مجھے شام تک یہاں رہنا ہے۔ اچھی خاصی چیزیں لے کر آنا اور دیکھو کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے کہ میں یہاں موجود ہوں اور یہ لو۔۔۔۔۔ اسے تم اپنے پاس رکھ لو۔۔۔۔۔ شام کو گھر جاتے وقت بچوں کے لئے کوئی مٹھائی وغیرہ لے جانا۔“ دلاور نے کہتے ہوئے سو کا ایک اور نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”دلاور بھائی۔ اگر زیادہ بھوک لگ رہی ہو تو میرے پاس روٹی موجود ہے۔ تم اس وقت کھا لو۔۔۔۔۔ میں بازار سے اپنے لئے بھی دوپہر کے کھانے کو کچھ لے آؤں گا۔“ کسان نے کہتے ہوئے ایک چھوٹی سی پوٹلی اس کی طرف بڑھا دی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ دلاور نے اس کے ہاتھ سے پوٹلی لے لی۔ ”اب تم پسو چھوڑ کر جلدی سے بازار چلے جاؤ۔“

”پسو خود ہی چلے جائیں گے۔ وہ اپنی جگہ پہچانتے ہیں۔ میں بازار جا رہا ہوں۔“ کسان نے کہتے ہوئے مویشیوں کی طرف دیکھا جو اس دور ان کا پیچھے تھے۔

کسان کے جانے کے بعد دلاور دوبارہ برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ کسان کی دی ہوئی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ نالہ کو جگائے یا نہیں؟ لیکن اسے نالہ کو جگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نالہ خود ہی اٹھ گئی تھی۔ آنکھ کھلنے پر اپنے اوپر گرم شال دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔ دلاور خود سردی میں غصہ کرتا رہا تھا اور اپنی شال اس کے جسم پر ڈال دی تھی۔

وہ چارپائی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہی چاہتی تھی کہ دلاور اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پوٹلی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ناشتے کا انتظام تو ہو گیا ہے۔ دیکھیں، ہے کیا؟“ دلاور نے چارپائی پر بیٹھ کر پوٹلی کھول لی۔

تین موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ سب سے اوپر والی روٹی پر آم کے اچار کی دو قاشیں اور ایک لیو کی قاش تھی۔ اچار دیکھ کر نالہ کی رال ٹپکنے لگی۔ وہ دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

وہ دونوں چارپائی پر آئے سائے بیٹھ کر روٹی کھانے لگے۔ اچار کے ساتھ روٹی کھانے میں مزہ تو بہت آ رہا تھا لیکن اس وقت اور اس حالت میں دلاور کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے وہ اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے لاہور میں کئی پنجابی فلمیں دیکھی تھیں۔ ان پنجابی فلموں میں جہاں اور بہت کچھ ہوتا تھا وہاں اکثر فلموں میں یہ بھی دیکھنے میں آتا تھا کہ گاؤں کی الزمیاں ٹھیتوں پر کام کرنے والے اپنے محبوب کے لئے دوپہر کا کھانا لے کر آتی ہے اور درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر ایک ہاتھ سے خوبصورت پنکھا جھلٹے ہوئے اپنے محبوب کو کھانا کھلاتی ہے۔ اب فرق صرف اتنا تھا کہ یہ کھانا نالہ نہیں دلاور لایا تھا اور نالہ کے ہاتھ میں خوبصورت پنکھا نہیں تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اچانک نالہ کے چہرے پر سرنخی چھا گئی اور وہ کن انکھیوں سے دلاور کی طرف دیکھنے لگی۔

”کھاؤ .... بڑا مزہ آ رہا ہے اچار کے ساتھ روٹی کھانے میں۔“ دلاور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کھار ہی ہوں۔“ نالہ نے کہا اور نوالہ توڑنے لگی۔

کھانے بعد پانی کی طلب ہوئی۔ وہ دونوں مکان سے باہر آگئے۔ نالہ نے شال اوڑھ لی تھی۔ مکان سے تھوڑی دور ایک چھوٹی سی ندی تھی۔ پانی اگرچہ گدلا تھا مگر انہوں نے اپنی پیاس بجھالی۔ ندی سے پانی پینے کے بعد وہ پھر مکان میں آگئے۔

”تقریباً“ دو گھنٹے بعد کسان قصبے سے واپس آگیا۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں پر پورا سو روپیہ خرچ کر آیا تھا۔ وہ ان چیزوں پر دو تین دن گزارہ کر سکتے تھے۔

وہ سارا دن مکان کے اندر ہی رہے۔ نالہ نے زیادہ وقت سوتے ہوئے ہی گزارا تھا۔ اسے دلاور پر حیرت تھی۔ وہ ایک لمحہ کو بھی نہیں سویا تھا۔ نالہ کی جب بھی آنکھ کھلی تھی اس نے دلاور کو جاگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ ویسے وہ دلاور کی شرافت کی قائل ہو گئی تھی۔ وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ بھرپور جوان تھا۔ وہ خود بھی جوان اور حسین تھی۔ اسے دیکھ کر کسی بھی مرد کی رال ٹپک سکتی تھی مگر دلاور نے اسے چھوا تک نہیں تھا۔ چھونا تو درکنار نگاہ بھر کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا حالانکہ وہ چاہتا تو اس کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس مکان سے روانہ ہو گئے۔ نائلہ درانی اس مرتبہ بھی گھوڑے پر دلاور کے پیچھے بیٹھی تھی۔

آدھی رات کے وقت راجن پور نامی چھوٹے سے قصبے کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ درمنہار کی طرف جا رہے تھے۔ دلاور نائلہ کو درمنہار کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یہی اس کا آبائی قصبہ تھا اور اس قصبے میں اس کی ماں اور بہن کے ساتھ ایسی بربریت کا مظاہرہ کیا گیا تھا جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ ”کیا اس وقت تم درمنہار جا رہے ہو؟“ نائلہ نے پوچھا۔ وہ دلاور کی پشت سے چپکی ہوئی تھی۔

”نہیں۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”اپنے ایک دوست کے ہاں۔ جو یاروں کا یار ہے۔ اس کا نام بھی یار محمد ہے۔ اس نے میری خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگادی تھی۔ دونوں میاں بیوی بہت اچھے ہیں۔ تم ان سے مل کر خوش ہوگی۔“

درمنہار سے دو میل پہلے دلاور نے گھوڑے کو پارو کے گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا اور اس کے آدھے گھنٹے بعد دلاور اپنے جگر یار پارو کے مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

..... \* \* \* .....

شیردرانی کی ہر چال الٹی پڑی تھی۔ اس کا ہر مہرہ پٹ رہا تھا۔ کچھ اس کی اپنی حماقتیں اور غلطیاں تھیں اور کچھ اس کے آدمی غلطیوں پر غلطیاں کرتے چلے جا رہے تھے۔

ندی کے پل کے نیچے سے موٹر سائیکل برآمد ہونے کے بعد وہ بالکل صحیح نتیجے پر پہنچے تھے کہ بازار کے چوکیدار کو کچھ نہ کچھ معلوم ہوگا۔ اسی لئے وہ خان لالہ کو پکڑ کر آموں والی حویلی میں لے گئے تھے اور بالآخر بربریت کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ اس رات وہ خود سردی کی ماری ہوئی دو بد حال اور پریشان لڑکیوں کو رائے منصور کی حویلی چھوڑ کر آیا تھا اور رائے منصور نے ایک لڑکی کو بلی کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے سینے سے لگالیا تھا۔ بلی نائلہ کا بچپن کا نام تھا اور پھر خان لالہ نے ان لڑکیوں کا جو حلیہ بتایا تھا اس سے بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ نائلہ اور رضیہ بھی تھیں جنہوں نے رائے منصور کی حویلی میں پناہ لے رکھی تھی۔

رائے منصور زمینداری کے لحاظ سے شیردرانی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ شیردرانی کا خاندان دو ڈھائی صدیوں سے یہاں آباد تھا۔ وہ ضلع رحیم یار خان اور آس پاس کے علاقہ میں ہزاروں ایکڑ اراضی کے مالک تھے۔ انہیں بہت بڑا جاگیردار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس رائے منصور صرف دو ڈھائی مربعہ اراضی کا مالک تھا۔ اس طرح شیردرانی کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ رائے منصور کے خلاف کوئی براہ راست قدم اٹھانے سے گھبراتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ صرف ایک بہت بڑا ریٹائرڈ فوجی آفیسر تھا بلکہ علاقے کے چھوٹے بڑے زمینداروں سے اس کے تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ سب لوگ اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ رائے منصور کے خلاف براہ راست کوئی کارروائی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان سب کو اپنا دشمن بنالیا جائے۔ رائے منصور کے خلاف براہ راست کارروائی نہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ شیردرانی اپنی کزن کے خلاف سازشوں کے چکر میں قتل جیسے بہت سے سنگین جرائم میں ملوث ہو چکا تھا۔ اگرچہ اعلیٰ سرکاری افسران اور علاقے کے ایم پی اے اور ایم این اے وغیرہ اس کے دخیل تھے لیکن اس موقع پر وہ ان سے بھی مدد نہیں لے سکتا تھا کیونکہ معاملہ ایک قتل کا نہیں

تھا۔ اس نے تو لاتعداد افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جن میں دو پولیس انسپکٹر، ایک سب انسپکٹر اور تین اور دیگر اہلکار تھے۔ اس کے آدمیوں کے ہاتھوں مرنے والے دوسرے لوگ الگ تھے۔ کوئی ایم پی اے یا ایم این اے اس کی حمایت کر کے اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ اس لئے شیردرانی کو جو کچھ بھی کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ نائلہ اس فساد کی جزئی تھی۔ اس کی موت سے نہ صرف اسے ان تمام جہنمیتوں سے نجات مل جائے گی بلکہ اس کی جائیداد بھی قبضے میں آجائے گی۔ اسی لئے وہ پوری توجہ نائلہ پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔

خان لالہ سے نائلہ کے بارے میں تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو کہا تھا کہ زخمی خان لالہ کو بے ہوشی کی حالت میں رائے منصور کی حویلی کے سامنے ڈال دیا جائے۔ لیکن بد قسمتی کہ خان لالہ نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔ اس کے آدمیوں نے یہ تو فونی یہ کی کہ وہ قصبے سے کسی کی کار چرالائے اور خان لالہ کی لاش کو رائے منصور کی حویلی کے قریب پھینک کر بھاگ نکلے۔ نہ صرف انہیں لاش پھینکنے ہوئے دیکھ لایا گیا تھا بلکہ واپسی پر ڈرائیور پر اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ تیز رفتار کار پر قابو نہ پاسکا، کار چوک پر بجلی کے کھمبے سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ ڈرائیور تو موقع بر ہی ہلاک ہو گیا تھا جبکہ دوسرے دونوں آدمی زخمی ہوئے تھے اور پولیس نے انہیں فوری طور پر صادق آباد کے ہسپتال بھیج دیا تھا۔ یہ تو غصیت ہو ا کہ ان دونوں نے بیان دینے سے پہلے راستے ہی میں دم توڑ دیا تھا۔

رائے منصور کی حویلی کے سامنے خان لالہ کی لاش پھینکنے کا مطلب اسے وارنٹک دینا تھا تاکہ وہ نائلہ کی پشت پناہی ترک کر دے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خفیہ ذرائع سے احمد پور لاما کی پولیس کو بھی یہ اطلاع دیدی کہ محل کے کئی کیمسٹری میں پولیس کو مطلوب نائلہ درانی، رائے منصور کی حویلی میں روپوش ہے۔ اس نے پولیس کو کچھ ایسے شواہد بھی فراہم کر دیئے تھے جن سے حویلی میں نائلہ کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔ لیکن شیردرانی کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ جب پولیس نے تین لیڈی سرچر کے ہمراہ حویلی کی تلاشی لی تھی تو حویلی میں نائلہ کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ بہت سی چند گھروں کی بھی تلاشی لی گئی تھی لیکن نائلہ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اس کے برعکس رضیہ کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ حویلی ہی میں تھی اور رائے منصور نے اس کے بارے میں پولیس کو بتایا تھا کہ وہ اس کے دوست کی بیٹی ہے اور کچھ دن رہنے کے لئے یہاں آئی ہوئی ہے۔

رضیہ، شیردرانی کے لئے اس لحاظ سے اہمیت رکھتی تھی کہ وہ مراد اور بخشو کے کیس میں اہم گواہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن شیردرانی کے خیال میں وہ کیس ہی ختم ہو چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ رضیہ اس کے خلاف گواہی دینے کی ہمت نہیں کر سکے گی۔

پولیس کا سب انسپکٹر رائے منصور سے معافی مانگ کر ناکام واپس آگیا تھا لیکن شیردرانی حیران تھا کہ نائلہ کو کہاں غائب کر دیا گیا تھا۔ اس نے رائے منصور کی زمینوں پر اس کا ڈیرہ بھی چیک کر لیا تھا نائلہ وہاں بھی نہیں تھی۔

اور پھر ایک روز اس کے آدمی نے اطلاع دی کہ دلاور اور نائلہ، ملک عزیز کے ڈیرے پر موجود ہیں۔ یہ پتہ بھی بالکل غیر متوقع طور پر لگا تھا۔ ملک عزیز کے ڈیرے سے دودھ لانے والا رہڑے والا دوکان والے کو بتا رہا تھا کہ وہ تین چار دن سے دلاور کا گھوڑا ملک عزیز کے ڈیرے پر دیکھ رہا ہے۔ اس کی یہ بات شیردرانی کے ایک کارندے نے بھی سن لی اور اس طرح یہ اطلاع شیردرانی تک پہنچ گئی۔

شہید درانی نے اس مرتبہ عھندی سے کام لیا۔ اس نے اسی علاقے کے ایک کاشکار کو لالچ دے کر معلومات حاصل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ کاشکار دور رہ کر ملک عزیز کے ڈیرے کی نگرانی کرتا رہا اور پھر ایک روز اس نے اطلاع دی کہ اس نے رات کے وقت اپنی جان خطرے میں ڈال کر کچھ قریب جا کر کھڑکی میں سے دلاور کو ڈپرے میں دیکھ لیا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔

شہید درانی نے اسی رات اپنے آدمیوں کے ذریعے ملک عزیز کے ڈیرے پر حملہ کروادیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم دیا تھا کہ اگر نالہ زندہ ہاتھ نہ آسکے تو اسے گولیوں سے اڑا دیا جائے۔ مگر..... یہاں بھی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ دلاور برستی گولیوں میں نالہ کو لے کر گھوڑے پر بھاگ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے کچھ دور تک کار پر اس کا چھچھ کیا مگر دلاور کھیتوں میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے ان سے دور ہی رہا تھا۔ اس کا رخ رحیم آباد کی طرف تھا۔ شہید درانی کے آدمیوں کا خیال تھا کہ وہ رحیم آباد سے ہوتا ہوا ضلع کی سرحد عبور کر کے دریا پار کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ ان کی دسترس سے دور نکل جائے۔ اس کے آدمیوں نے رحیم آباد کی سڑک کی ناکہ بندی کردی لیکن وہ انتظار کرتے رہے اور دلاور اس طرف نہیں آیا۔ وہ غالباً ”نی اور طرف سے دریا پار کر گیا تھا۔

شہید درانی کے آدمی رات بھر اس کے انتظار میں رحیم آباد کی سڑک کی ناکہ بندی کر کے کھڑے رہے، مگر میلوں کا فاصلہ طے کر کے وہ دریا پر پہنچ گئے۔ دریا عبور کرنے کے لئے کئی گھاٹ تھے اور ہر گھاٹ کے درمیان کئی کئی میل کا فاصلہ تھا۔ وہ ہر گھاٹ پر کشتی والے ملاحوں سے دلاور اور نالہ درانی کے بارے میں پوچھتے رہے مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ انہوں نے اس محلے کے کسی مرد یا عورت کو دریا پار نہیں کروایا تھا۔ دلاور کو تو ویسے بھی بہت سے لوگ جانتے تھے۔ اس علاقے میں کسی نے دلاور کو نہیں دیکھا تھا۔

”سرے روز جب یہ لوگ ناکام و نامراد رحیم یار خان واپس پہنچے تو شہید درانی ان پر برس پڑا تھا۔ ”حرام خورد۔ تم لوگ مفت کی روٹیاں توڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ تم چاروں مل کر ایک آدمی کو گرفت میں نہیں لے سکے۔ وہ حرافہ اگر اسی طرح ہاتھوں سے پھسلتی رہی تو ایک روز مجھے پھانسی کے تختے پر بٹھا دیا جائے گا۔“

شہید درانی دہاڑا۔ وہ حیران تھا کہ دلاور نالہ کو لے کر کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ورممنہار کا خیال آیا تھا جو اس کا آبائی گاؤں تھا۔ لیکن دلاور نے ورممنہار کے چوہدری کو زندہ جلادیا تھا۔ اس کے بیٹے اپنے باپ کا اقام لینے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ اس طرف جانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ تو پھر وہ کہاں آیا۔

اسی دوران اس کی ماں نے اس سے مشورہ کئے بغیر ایک اور حرکت کر ڈالی۔ اس نے نالہ کے بوڑھے بھائی کو غبن کے الزام میں گرفتار کروا کے عدالت سے نالہ کی اسٹیٹ کی نگرانی کے حقوق حاصل کر لئے۔ شہید درانی کے خیال میں اس کی ماں نے یہ عھندی کا کام کیا تھا۔ اس طرح نالہ کی اسٹیٹ کئی حد تک ان کے اپنے میں آگئی تھی۔ عدالت نے حینہ بیگم کو ہدایت کی تھی کہ وہ اسٹیٹ کا حساب کتاب درست رکھے۔ لیکن شہید جانتا تھا کہ نالہ کی موت کے بعد یہ اسٹیٹ مستقل طور پر انہی کے قبضے میں آجائے گی۔

لیکن اس کے دو روز بعد اس نے اخبار میں ایک اور چونکا دینے والی خبر پڑھی۔ اس خبر کے مطابق پولیس نے گزشتہ رات زبردست مقابلے کے بعد ایک ڈاکو کو زخمی حالت میں گرفتار کیا تھا۔ اس نوجوان نے ملن اور ساتھیوں کی مدد سے ایک جوہری کی دوکان پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ مال لوٹنے کے بعد ڈاکو ہوائی فائرنگ



کرتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے کہ پولیس کی ایک حشّی پارٹی اس طرف آگئی اور اس طرح ڈاکوؤں اور پولیس میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ایک ڈاکو زخمی ہو کر گر پڑا جبکہ اس کے باقی ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس نے زخمی ڈاکو کو گرفتار کر لیا اور جوہری کی دوکان سے لوٹا ہوا مال بھی جو ایک تحیلے میں بھرا گیا تھا اس کے قبضے سے برآمد ہو گیا۔ اس ڈاکو کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔

پولیس کے مطابق اس زخمی نوجوان نے شہر میں نہ صرف اور بہت سی وارداتوں کا اعتراف کیا ہے بلکہ اس نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ پولیس انسپکٹر اعظم کے قتل میں وہ بھی شامل تھا۔ پولیس اس سے اس کے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اخبار نے انسپکٹر اعظم کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات کی توقع ظاہر کی تھی۔

یہ خبر پڑھ کر شیردرانی کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ جسم پر چیونٹیاں سی ریٹھنے لگیں اور سینے میں سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

”موجمدار!“ بالا خروہ دبا ڈالا۔

موجمدار غالباً ”آس پاس ہی موجود تھا۔ وہ شیردرانی کی دبا ڈس کر دوڑتا ہوا اندر گیا۔

”جی سرکار!“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ شیردرانی کا چہرہ دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔

”یہ کیا ہے؟“ شیردرانی نے چیخے ہوئے اخبار اس کے چہرے کے سامنے لہرایا۔

”اخبار ہے سرکار۔“ موجمدار نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اخبار کے بچے؟ اس میں کیا لکھا ہے؟“ شیردرانی دبا ڈالا۔

”میں تو ان پڑھ آدمی ہوں سرکار۔“ موجمدار بولا۔ ”آپ ہی پڑھ کر سنا دیجئے کہ اس میں کیا لکھا ہے؟“

”ناٹک لہی بی پکڑی گئی ہے کیا؟ ضرور اسی کے بارے میں خبر چھپی ہوگی۔“

”ناٹک پر لعنت بھیجو۔“ شیردرانی چیخا۔

”بھج دی سرکار.....“ موجمدار بولا۔

”موجمدار۔“ شیردرانی نے اسے گھورا۔ ”تم یو قوف ہو یا مجھے یو قوف بنا رہے ہو۔“

”میں سمجھا نہیں مائی باپ۔“ موجمدار نے کہا۔

”پولیس نے کل شام ایک ڈاکو کو پکڑا ہے جس نے اسے گروہ کے ساتھ ایک جوہری کی دوکان لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس ڈاکو نے پولیس کو بتایا ہے کہ وہ انسپکٹر اعظم کے قتل میں بھی شامل تھا۔ پولیس اس سے اس کے ڈاکو ساتھیوں اور ان ساتھیوں کا پتہ پوچھنے کی کوشش کر رہی ہے جو انسپکٹر اعظم کے قتل میں اس کے ساتھ شامل تھے۔“ شیردرانی نے کہا۔

”پہلے وہ اپنے ساتھیوں کے پتے بتا دے سرکار۔“ موجمدار مسکرا دیا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم چاہتے ہو کہ پولیس ہتھکڑیاں لے کر یہاں پہنچ جائے؟“ شیردرانی نے اسے گھورا۔

”نہیں سرکار۔“ موجمدار نے جواب دیا۔ ”جس شخص نے انسپکٹر اعظم کو قتل کرنے کے لئے ان کی

خدمات حاصل کی تھیں وہ تو اگلے ہی دن نہر میں ڈوب کر مر گیا تھا۔“

”اوہ!“ شیردرانی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”تم واقعی بہت عقلمند ہو گئے ہو۔“

”آپ کے سامنے میں رہ کر تھوڑی بہت عقل تو آگئی ہے سرکار۔“ موجمدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا زیادہ مسکے مت لگاؤ۔ پھر بھی خیال رکھنا۔“ شبیر درانی بولا۔  
 ”سرکار۔ کل ماحیلو سے جیٹھانند کا ٹیلی فون آیا تھا۔ وہ آج رات آپ سے ملنے کے لئے آ رہا ہے۔“  
 اجمدار نے بتایا۔

”جیٹھانند!“ شبیر درانی چونک گیا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“  
 موجددار باہر جا چکا تھا اور شبیر درانی، جیٹھانند کے بارے میں سوچنے لگا۔  
 جیٹھانند میرپور ماحیلو کا رہنے والا تھا۔ وہ بہت بڑا بیوپاری تھا۔ سندھ کے دوسرے اندرونی علاقوں کی  
 طرح ماحیلو میں بھی ہر قسم کے کاروبار پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اس علاقے میں رہنے والے غریب مسلمان ہندو  
 مہاجروں کے قتلے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کی زمین اور جائیداد ہندو بیویوں کے پاس رہیں تھیں۔ وہ سودور  
 قرضوں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی آنے والی کئی نسلیں ہندو بیویوں کے قرض نہیں چکا سکتی  
 تھیں۔

بھارت کی سرحد کے قریب سندھ کے اندرونی علاقوں میں رہنے والے یہی ہندو پاکستان کی معیشت کو  
 سب سے طریقوں سے بھی نقصان پہنچا رہے تھے اور انہی میں بہت سے ہندو ایسے بھی تھے جو پاکستان کی سلامتی  
 کے خلاف بہت بڑا خطرہ بنے ہوئے تھے۔

سرحدوں کے قریب آباد ہندو تاجر پاکستان سے اجناس، تیل اور ہر قسم کی خورد و نوش کی اشیاء بڑی  
 مقدار میں بھارت کو اسمگل کر رہے تھے۔

ماحیلو کے سینٹھ جیٹھانند کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا جو پاکستانی معیشت کی جڑیں کھوکھلے کرنے  
 میں مصروف تھے۔ وہ بڑی مقدار میں اناج اور کھجی تیل وغیرہ پاکستان سے بھارت اسمگل کیا کرتا تھا اور شبیر  
 درانی جیسے ہوس پرست لوگ اس کے مددگار بن رہے تھے۔ جیٹھانند سال میں دو مرتبہ شبیر درانی سے بڑی  
 مقدار میں اناج خرید کرتا تھا۔ وہ شبیر درانی کی اناج کی قیمت منڈی سے زیادہ ادا کیا کرتا تھا اور اس مرتبہ  
 ہی سب معمول وہ اناج خریدنے کے لئے آ رہا تھا۔

اس روز شبیر درانی سارا دن گھر ہی رہا۔ موجددار نے اگرچہ اسے یقین دلایا تھا کہ گزشتہ رات  
 لالے جانے والے ڈاکو نے اگرچہ انکسپکٹر اعظم کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا لیکن وہ مزید ایسا کوئی انکشاف  
 اس کر سکتا تھا جس سے پولیس کو شبیر درانی کی طرف نگاہ اٹھانے کا موقع مل سکتا ہو۔ لیکن موجددار کی اس  
 بات کے باوجود شبیر درانی کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔

شبیر درانی کو پوری طرح احساس تھا کہ وہ دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بچانے کی  
 کوشش کرنے کی بجائے اس دلدل میں مزید دھنستا جا رہا تھا۔ دولت کے زعم اور جوش جوانی میں وہ غلطیوں پر  
 مہمیاں کرتا چلا جا رہا تھا۔ احمد پور لالہ بازار کے چوکیدار کا اغواء اور تشدد کے ذریعے اس سے نالکہ کے  
 نام میں معلوم کر لینے کی حد تک تو درست تھا لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ خان لالہ کی لاش رائے  
 درانی کی حویلی سامنے پھینکو کر ہنگامی لیا تھا اور پھر پولیس کو اس کے دروازے پر بھیج کر اس نے مزید حماقت کا  
 شوق اٹھایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ نالکہ کے بارے میں پتہ چل جانے کے بعد وہ خود رائے منصور کے پاس  
 اور کسی شریفانہ طور پر نالکہ کو اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کی حماقتوں نے رائے  
 درانی اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ رائے منصور اسے معاف نہیں کرے گا۔

شبیر درانی کا اندیشہ درست نکلا۔ سہ پہر کے قریب جب موجددار نے اسے اطلاع دی کہ رائے منصور

اس سے ملنے آیا ہے تو اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر ڈرائنگ روم میں آگیا جہاں رائے منصور اکیلا ہی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

”آہا!“ شبیر درانی مکارانہ انداز میں دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے رائے منصور کی طرف بڑھا۔ ”میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ یا واقعی میں اس قدر خوش قسمت ہوں کہ رائے صاحب میرے غریب خانے کو روٹی بخش رہے ہیں۔ آپ میرے بزرگ ہیں، مجھے بلوایا ہوتا۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی رائے صاحب!“

”کبھی کبھی بزرگوں کو چل کر چھوٹوں کے پاس آنا ہی پڑتا ہے۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

”تشریف رکھئے نا۔ آپ کھڑے کیوں ہیں۔“ شبیر درانی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں تم سے صرف دو باتیں کرنے کے لئے آیا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔

”آپ حکم کیجئے رائے صاحب! میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔“ شبیر درانی اس کی بزرگی کا لحاظ کئے بغیر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تم نالکہ کا چچا چھوڑ دو۔ اسی میں تمہاری اور تمہارے خاندان کی بھلائی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

شبیر درانی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ مجھے دھمکی دینے آئے ہیں۔ لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ نالکہ میری کزن ہے اور یہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے اور میں کسی غیر کو اپنے خاندانی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”تم بھول رہے ہو کہ نالکہ میرے دوست کی بیٹی ہے اور مجھے بھی بیٹی ہی کی طرح عزیز ہے۔ میں اسے تمہارے ہاتھوں اسی طرح ذلیل و خوار ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور.....“ رائے منصور نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”اپنے خاندان کی ذلت کا باعث بھی تم ہی بن رہے ہو اور دوسروں کو مدخلت کا موقع بھی تم ہی دے رہے ہو۔ کیا تم مجھے اتنا بیوقوف سمجھتے ہو کہ تمہاری سازشوں کو نہ سمجھ سکوں۔ میں خاموش رہ کر نالکہ کی قانونی مدد کر رہا تھا تاکہ تمہاری سازشوں سے اس پر جو جھوٹے الزامات ہیں وہ صاف ہو سکیں۔ لیکن مجھے اس معاملے میں تم نے ہی گھسیٹا ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ میری حویلی کے دروازے پر خان لالہ کی لاش کس نے پھنکوائی تھی اور پولیس نے میری حویلی پر چھاپہ کس کے اشارے پر مارا تھا؟ وہ تو شکر کرو کہ خان لالہ کی لاش پھینک کر جانے والے وہ تینوں آدمی کار کے حادثہ کا شکار ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھی زندہ بچ جاتا تو تم اس وقت سلاخوں کے پیچھے بند ہوتے۔“

”دیکھئے رائے صاحب!“ شبیر درانی ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ بڑی عزت ہے میرے دل میں آپ کی۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور مجھ سے کوئی گستاخی ہو جائے۔“

”صبر اور بیڑوں کی عزت کرنا تم نے سیکھا ہی کب ہے۔“ رائے منصور بولا۔ ”تم نے تو ہمیشہ بزرگوں کی عزت خاک میں ملائی ہے۔ تمہارے بزرگوں نے دو صدیوں کی محنت سے اس علاقے میں اپنی عزت بنائی تھی لیکن تم نے لمحوں میں اس عزت کو خاک میں ملا دیا۔ آج درانی فیملی کی جو جگہ ہنسائی ہو رہی ہے اس کی وجہ تم اور صرف تم ہو۔“

”بس رائے صاحب۔ اب اس سے آگے اور کچھ مت کہئے۔“ شبیر درانی کرخت لہجے میں بولا۔  
 ”تم مجھے بولنے سے نہیں روک سکتے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”ناکلہ تمہاری کزن ہے۔ تمہاری بہن ہے، ماں باپ کی موت کے بعد وہ بے سارا ہو گئی تھی۔ تمہارا فرض تھا کہ تم سرپرست بن کر اس کی دلجوئی کرتے، اس کی حفاظت کرتے، پیار و محبت اور شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرتے۔ ایسی صورت میں وہ سب کچھ تمہیں مل سکتا تھا جس کے لئے آج تم اپنے خاندان کی ذلت و رسوائی کا باعث بن رہے ہو۔ مگر پیار و محبت اور شرافت تو تمہاری فطرت میں شامل ہی نہیں۔ تم تو دولت کے پیچاری ہو۔ تمہاری نظریں صرف اور صرف ناکلہ کی جائیداد اور دولت پر ہیں۔ تم نے سیدھا راستہ چھوڑ کر غلط طریقہ اپنایا۔ تمہارے خون میں تو نفرت ہی نفرت بھری ہوئی ہے۔ تم نے اپنی یتیم بہن کا محافظ بننے کے بجائے اسکی دولت حاصل کرنے کے لئے اس کے خلاف سازشوں کے جال پھیلانا شروع کر دیئے اسے ذلیل و رسوا کیا اور اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔ تم اس قدر بے غیرت بن گئے کہ تم نے.....“  
 ”رائے صاحب.....“ شبیر درانی نے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی کے آثار ابھر آئے اور اس کی مٹھیاں بھیج مٹی تھیں۔ ”اب آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔ ایسا نہ ہو کہ میری قوت برداشت جواب دے جائے۔“

”تم میں برداشت کی قوت ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔“ رائے منصور نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”اب تک جو کچھ ہو چکا میں اسے نظر انداز کرنے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔“  
 ”اگر میں آپ کا یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دوں تو؟“ شبیر درانی نے کہا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تو ایسی صورت میں تم زندگی بھر بچھتاؤ گے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”تم نے سوز کی ڈرائیور کے قاتل کو خالات میں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ مراد اور اس کے شوہر بخشو کے کیس کی تحقیقات کرنے والے انسپکٹر جبار کو مراد اور مراد اور بخشو والی فائل تھانے سے غائب کرادی۔ لیکن فائل غائب کروا دینے سے کیس ختم نہیں ہو گیا۔ ناکلہ اور رضیہ ابھی زندہ ہیں۔ صرف رضیہ کی گواہی تمہیں پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی ہے۔ وہ تمہارے بہت سے راز جانتی ہے اور تمہیں یہ بھی پتہ چل چکا ہے کہ رضیہ اس وقت میری تحویل میں ہے۔ میں جب چاہوں اسے تمہارے خلاف عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔“

شبیر درانی کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کے سینے میں لاوہ سا کھول رہا تھا۔ رائے منصور کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اسی ڈرائنگ روم میں اپنی زندگی کی سانسیں پوری کر چکا ہوتا لیکن رائے منصور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بڑے اطمینان سے ڈرائنگ روم سے نکل گیا تھا۔

شبیر درانی تمللا کر رہ گیا۔ اس کے سینے میں لاوہ سا کھول رہا تھا۔ رائے منصور نے بہت واضح الفاظ میں اسے دھمکی دیدی تھی۔ لیکن اس دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جس طرح کوئی شخص اپنے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا جاتا ہے اس طرح شبیر درانی اپنے ایک جرم کو چھپانے کے لئے جرم پر جرم کرتا چلا جا رہا تھا..... رائے منصور کے جانے کے بعد شبیر درانی نے اسے بھی ٹھکانے لگا دینے کے بارے میں سوچا تھا لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ رائے منصور کو ختم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ناکلہ اور رضیہ زندہ تھیں۔ رضیہ اس کے جرائم کی سب سے بڑی گواہ تھی۔ وہ اس کے بہت سے رازوں سے واقف تھی۔ ناکلہ تو شاید قانونی طور پر اس کے خلاف کچھ نہ کر سکے لیکن رضیہ اس کی ہر سازش

سے واقف تھی۔ اس کی گواہی واقعی اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی تھی۔

شبیردرانی اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے رضیہ کے ساتھ زیادتی کیوں کی تھی۔ اگر اس زیادتی کو اپنے تک ہی محدود رکھتا تو شاید رضیہ اس کے ساتھ رہتی لیکن اس نے تو رضیہ کو اپنے کارندوں کے لئے کھلونا بنادیا۔ جس نے رضیہ کو باغی کر دیا۔ کوئی عورت کیسی ہی آوارہ اور بد چلن کیوں نہ ہو ایسی ذلت برداشت نہیں کر سکتی اور اب رضیہ تلوار بن کر اس کی گردن پر لٹکی ہوئی تھی۔

رات کے کھانے سے تھوڑی دیر پہلے جیٹھانند پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اصل موضوع پر آگئے۔

”اس مرتبہ تو میں آپ کی اناج کی پوری فصل اٹھانے کے لئے آیا ہوں درانی صاحب!“ جیٹھانند نے کہا۔ ”اور اب کی بار میں آپ کو دھن بھی زیادہ دوں گا۔“

”لیکن اس مرتبہ آپ کو مجھ سے کچھ نہیں ملے گا سیٹھ جیٹھانند۔“ شبیردرانی نے جواب دیا۔

”کیوں سائیں۔“ جیٹھانند نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ جانتے ہیں میں ہمیشہ نقد ادائیگی کرتا ہوں اور آج بھی روکڑا ساتھ لے کر آیا ہوں۔ میں تو مال لے کر ہی جاؤں گا درانی صاحب۔“

”میرے انکار کی بہت سی وجوہات ہیں سیٹھ جیٹھانند۔“ شبیردرانی نے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ کسی نے میرے کھلیان کو آگ لگا دی تھی جس سے بہت سا اناج جل کر راکھ ہو گیا۔“

”کھلیان کو آگ لگا دی۔“ سیٹھ جیٹھانند اچھل پڑا۔ ”ایسا یو قوف کون ہو سکتا ہے جس نے آپ کے کھلیان کو آگ لگانے کی جرات کی؟“

”یہ زمینداری ہے بابا۔ بیسیوں دشمن ہوتے ہیں۔ کسی کو موقع مل گیا ہو گا۔“ شبیردرانی نے جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ آج کل میں کچھ قانونی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہوں اور یوں بھی تم جانتے ہو کہ دفعہ ایک سو چوالیس کے تحت اناج ضلع کی حدود سے باہر لے جانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔“

”اناج کی نقل و حرکت پر پابندی تو ہر فصل کے موقع پر لگ جایا کرتی ہے درانی صاحب، لیکن آپ بھی یہ جانتے ہیں کہ ادھر کا مال ادھر ہوتا رہتا ہے۔ آپ ضلع کی حدود کی بات کر رہے ہیں ہمیں دیکھ لیں۔ ہم تو مال ملک کی سرحد کے پار پہنچا دیتے ہیں۔ ارے صاحب! یہ قانونی پابندیاں تو چھوٹے لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کو دفعہ چوالیس جیسی پابندیوں کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ کون روکے گا آپ کے ٹرکوں کو؟“

”تم میری بات نہیں سمجھ رہے۔“ شبیردرانی نے کہا۔ ”افران آج کل مجھ سے کچھ ناراض ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔“

”افروں کی ناراضگیاں تو بس ایسے ہی ہوتی ہیں۔ مٹھی گرم کر دو تو ان کی سب ناراضگی ختم ہو جاتی ہے۔“ سیٹھ جیٹھانند نے کہا۔ ”یہ اپنی امانت سنبھالیں۔ گن لیں..... پورے پورے ہیں۔“ اس نے بریف کیس میز پر رکھ کر کھول دیا۔

بریف کیس میں ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی دیکھ کر شبیردرانی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ بالا خر گمراہ سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں کتنا مال دے سکتا

ہوں۔“

”میں آج رات یہیں ہوں درانی صاحب۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کل مال لے کر ہی جاؤں گا۔“

سیٹھ جیٹھانند نے کہا۔

”ٹھیک ہے بابا۔ لے جانا۔“ شبیر درانی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

سیٹھ جیٹھانند نے کھانا وہیں کھایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد شبیر درانی نے موجمدار کو بلا لیا۔

”گودام میں گیسوں کی کتنی بوریاں ہیں موجمدار؟“ اس نے پوچھا۔

”جیٹھانند پانچ ٹرک مانگ رہا ہے سرکار۔“ موجمدار نے جواب دیا۔ ”اور اپنے گودام میں تو اتنا مال

نہیں ہے۔ دوسری زمینوں سے تو ابھی اناج پوری طرح گودام میں نہیں پہنچا۔“

”لیکن جیٹھانند کل مال لے کر جانا چاہتا ہے۔ اسے پانچ ٹرک کہاں سے پورے کر کے دیئے جائیں گے۔ وہ تو رقم بھی پھینک گیا ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”ایک تجویز ہے سرکار۔“ موجمدار مسکراتے ہوئے بولا۔

”وہ کیا؟“ شبیر درانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نانکھ لہی بی کی حویلی والے گودام میں بھرا ہوا اناج کس دن کام آئے گا سرکار۔ وہیں سے جیٹھانند کو

پانچ ٹرک بھر دیں اور باقی اپنے گودام میں منتقل کر دیں۔“ موجمدار نے کہا۔

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کے چکر میں نہ پڑیں سرکار۔“ موجمدار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کل رات جیٹھانند

کو اس کا مال دیدیں اور باقی مال اپنے گودام میں منتقل کرنے کے بعد گودام کو آگ لگادیں۔“

”تم تو واقعی بہت عقلمند ہو گئے ہو موجمدار۔“ شبیر درانی مسکرایا۔

”آپ ہی کی سرپرستی ہے سرکار۔“ موجمدار بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ شبیر درانی بولا۔ ”کل صبح ٹرکوں کا بندوبست کرو۔ ٹرک آدھی رات کے بعد گل مرگ

پہنچنے چاہئیں اور جیٹھانند کو بھی اس کے ہوٹل فون کر کے بتا دینا کہ وہ آدھی رات کے بعد گل مرگ پہنچ

جائے۔“

”ٹھیک ہے سرکار!“ موجمدار بولا۔ ”کل ٹرکوں کا بندوبست ہو جائے گا اور میں جیٹھانند کو بھی اطلاع

کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اب تم جاؤ۔“ شبیر درانی نے کہا اور میز پر رکھا ہوا فونوں کا بریف کیس اٹھا کر اوپر اپنے

کمرے میں آگیا۔

اس نے الماری کھول کر بریف کیس اندر رکھا اور الماری کو تالا لگا کر بستر پر لیٹ گیا۔ پہلے تو وہ جیٹھانند

سے ہونے والے اس سودے کے بارے میں سوچتا رہا۔ موجمدار نے واقعی بڑے پتے کی بات کہی تھی۔

نانکھ لہی جانیہ ادا بھی اس کے قبضے میں نہیں آئی تھی لیکن اس سے آمدنی کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اسے لاکھوں

روپے مفت میں مل گئے تھے اور یہ ایک نیک شگون تھا۔ پھر اس کی ذہنی رو نالکھ اور رائے منصور کی طرف

مڑ گئی۔ نالکھ اگرچہ روپوش تھی لیکن اب تک کی صورتحال سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک ایک بات سے باخبر

رہتی تھی۔ اسے اپنے گودام کے بارے میں پتہ چلے گا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جائے گی۔

شبیر درانی دو سرے دن دوسرے کے بعد گل مرگ پہنچ گیا۔ وہ سیدھا نالکھ کی حویلی گیا تھا۔ جواب انہی کے

قنبے میں تھی۔ حویلی کے ایک حصے میں گودام بھی تھا۔ اس نے گودام کھلو کر دیکھا۔ اناج کی بوریاں بھری ہوئی تھیں۔

رات ساڑھے گیارہ بجے ٹرک پہنچ گئے اور سینٹھ جیٹھانند بھی۔ شیردرانی نے ابھی تک حسینہ بیگم کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اب ٹرک حویلی کے اندر آ کر کے تو اسے ماں کو اپنا پروگرام بتانا پڑا۔ صبح چار بجے تک نہ صرف ٹرک لوڈ ہو گئے بلکہ اناج کی باقی بوریاں بھی حسینہ بیگم والی حویلی کے گودام میں منتقل کر دی گئیں۔ چند بوریاں اسی گودام میں رہنے دی گئی تھیں۔

صبح پانچ بجے سینٹھ جیٹھانند پانچ ٹرک لے کر روانہ ہو گیا۔ اس وقت ابھی دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوا ہی تھا۔ گاؤں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں محو خواب تھے۔ صرف دو آدمی جاگ رہے تھے جنہیں رات ہی کو حویلی میں روک لیا گیا تھا۔ ٹرکوں کی روانگی کے پندرہ منٹ بعد شیردرانی بھی شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حسینہ بیگم اپنی حویلی میں سو رہی تھی۔ شیردرانی نے جاتے وقت ماں سے ملنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شہر والے مکان میں پہنچ کر شیردرانی اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر گرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح دس بجے جب وہ سو کر اٹھا تو دو خبریں اس کی منتظر تھیں۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ گل مرگ میں نائلہ درانی کی حویلی والے گودام کو آگ لگ گئی تھی۔ گودام کے ساتھ حویلی بھی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ یہ خبر سن کر شیردرانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن دوسری خبر سن کر اس کی پیشانی پر سلونٹیں ابھر آئیں۔

پولیس نے ہائی وے پر گیٹوں کی بوریوں سے لدے ہوئے پانچوں ٹرک پکڑ لئے تھے اور سینٹھ جیٹھانند کو دفعہ ایک سو چوالیس کی خلاف ورزی کرنے پر حراست میں لے لیا تھا۔ شیردرانی کو اس بات پر بعد حیرت ہوئی تھی۔ سینٹھ جیٹھانند ہمیشہ یہاں سے اناج لے جایا کرتا تھا اور وہ جب بھی اناج لے جاتا تھا۔ دفعہ ایک سو چوالیس کے تحت ایک ضلع سے دوسرے ضلع کو اناج کی نقل و حرکت پر پابندی ہوتی تھی۔ سینٹھ جیٹھانند کئی برسوں سے یہ کام کر رہا تھا لیکن آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ شیردرانی کی اطلاع کے مطابق سینٹھ جیٹھانند نند نے پولیس کو دس ہزار روپے فی ٹرک رشوت کی پیشکش بھی کی تھی۔ لیکن پولیس نے رشوت قبول کرنے کی بجائے اسے حراست میں لے لیا تھا اور تھانے میں لا کر بند کر دیا تھا۔

”کیا اس نے پولیس کو یہ بتایا تھا کہ اناج اس نے کہاں سے خریدا تھا؟“ شیردرانی نے موجمدار سے پوچھا۔

”وہ تو آپ کے نام کی دہائی دیتا رہا تھا سرکار۔ لیکن پولیس نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اس کے پاس تو اناج کی خریداری کی رسید بھی موجود نہیں تھی۔“ موجمدار نے جواب دیا۔

”کیا پولیس نے تصدیق کے لئے یہاں تو فون نہیں کیا تھا؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”نہیں سرکار۔ ابھی تو نہیں۔“ موجمدار نے نفی میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔“ شیردرانی بولا۔ ”اگر پولیس تصدیق کرنا چاہے تو صاف کہہ دیتا کہ اس نے اناج ہم سے نہیں خریدا تھا اور میرے بارے میں پولیس کو یہی معلوم ہونا چاہئے کہ میں رات کو یہیں تھا۔ ماموں کی حویلی کو آگ لگنے کی اطلاع ملنے پر دس بجے گل مرگ چلا گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے سرکار۔ ایسا ہی ہو گا۔“ موجمدار نے جواب دیا۔

شیردرانی چند منٹ کے اندر اندر تیار ہو گیا اور ناشتہ کئے بغیر گل مرگ کے لئے روانہ ہو گیا۔  
 آس پاس کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے لوگ بھی گل مرگ میں جمع تھے اور عبدالصمد درانی کی حویلی کو لگنے والی آگ کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ حویلی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ کئی جگہوں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ شیردرانی مسکراتا ہوا اپنی حویلی کی طرف چلا گیا۔ حویلی میں داخل ہو کر وہ بیٹھک میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے حسینہ بیگم اور عبدالرحمن درانی کی آوازیں سن کر رک گیا۔ وہ دونوں جھگڑ رہے تھے۔ اس کاموں کہہ رہا تھا۔

”تم دونوں ماں بیٹا پاگل ہو گئے ہو۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تم دونوں کا۔ تم دونوں تباہی اور بربادی پر تلے ہوئے ہو۔ اب بھی وقت ہے۔ روک لو اپنے قدم ورنہ ہم سب اس آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں گے۔“  
 حسینہ بیگم نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا مگر شیردرانی نے سنا نہیں اور وہ اندر داخل ہونے کی بجائے واپس مڑ کر حویلی سے باہر آ گیا۔ وہ اس موقع پر اپنے ماموں سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔  
 شیردرانی بڑی مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوگوں سے آگ لگنے کی وجہ دریافت کر رہا تھا۔ جنہیں معلوم تھا ان کی زبانیں بند تھیں اور جو نہیں جانتے تھے وہ مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔  
 شیردرانی شام کو شہر آ گیا۔ موجددار نے بتایا کہ پولیس نے اناج کے بارے میں تصدیق کرنا چاہا تھا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا کہ جیسا مندر نے ان سے اناج نہیں خریدا تھا۔  
 رات دس بجے شیردرانی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ موجددار اندر آیا۔  
 ”ایک عورت آپ سے ملنے آئی ہے سرکار۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا ہے۔“ موجددار نے کہا۔

”کون ہے؟“ شیردرانی نے پوچھا۔  
 ”پتہ نہیں سرکار۔ چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ کتنی ہے ہارون آباد سے آئی ہوں۔“ موجددار نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ چلو میں آ رہا ہوں۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔  
 چند منٹ بعد جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں نالکہ درانی کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔  
 اناج کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی اور شیردرانی یوں بے حس و حرکت کھڑا تھا جیسے اس پر سکتہ طاری آیا ہو۔ نالکہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

...●...●...●...

”تت... تم... یہاں...؟“ شیردرانی ہکلا کر رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس کی ماں میں اس نے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا وہ اس طرح اطمینان سے اس کے گھر آ سکتی ہے۔  
 ”کیوں... بدحواس ہو گئے مجھے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں دیکھ کر۔“ نالکہ درانی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”اوں ہوں...“ وہ دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”اپنے کسی گرگے کو آواز دینے پہلے روشن دان کی طرف دیکھ لو۔“

شیردرانی کی نظریں بے اختیار روشن دان کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے ایک آئوٹنک رائفل کی نال نکلتی رہی تھی اور اس نال کے پیچھے دلاور کا چہرہ بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دلاور کی شکل دیکھ کر اس نے سینے میں لاوہ سا کھولنے لگا۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔



”تو تم اپنے اس یار کو لے کر یہاں آئی ہو۔“ شبیر درانی کے حلق سے بھڑپے کی سی غراہٹ نکلی۔ ”تمہا نے شیر کی کچھار میں آکر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے نائلہ! اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جاسکو گی۔ نہ تم اور نہ تمہارا وہ یار۔“ اس نے روشن دان کی طرف اشارہ کیا۔

”آہستہ بولو۔“ نائلہ درانی نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”یہ شیر کی کچھار نہیں گیدڑ کا بھٹ ہے۔ اور تم جانتے ہو گیدڑ کتنا بزدل ہوتا ہے۔ شاید دنیا کا سب سے زیادہ ڈرپوک جانور۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نے دلاور کو میرا یار کہہ کر گالی دی ہے۔ مجھے بھی اور اپنے آپ کو بھی۔ تمہاری غیرت واقعی مرچکی ہے۔ مردہ ضمیر ہو چکے ہو تم۔! لیکن تمہارا ضمیر تھا ہی کب؟ تم میں غیرت تھی ہی کہاں؟ اگر تم میں رتی بھر غیرت بھی ہوتی تو بہن کو اس طرح سر باز رنگا نہ کرتے۔ اسے گلی گلی، قریہ قریہ رسوا نہ کرتے۔ جس دلاور کو تم نے میرا یار کہہ کر گالی دی ہے وہ تمہاری طرح شیطان نہیں، انسان کے بھیس میں فرشتہ ہے۔ شرافت کا پتلا ہے وہ۔۔۔ رشتوں کی قدر جانتا ہے۔ جس شخص نے اس کی ماں اور بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اسے جلا کر بھسم کر ڈالا اس نے، اور تم اتنے بے غیرت نکلے کہ تم نے اپنی بہن کا گھر جلا کر راکھ کر دیا۔“

”مجھے بار بار اپنا بھائی مت کہو۔“ شبیر درانی غرایا۔

”مجھے بھی شرم آتی ہے، تمہیں اپنا بھائی کہتے ہوئے۔“ نائلہ بولی۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا نائلہ!“ شبیر درانی بولا۔

”اب تم صرف دھمکیاں ہی دے سکتے ہو۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہو۔ میں تو تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ تم نے میری حویلی کو آگ لگا کر اچھا نہیں کیا۔ تم نے میرے گودام میں بھرا ہوا اناج اس ہندو بننے کو فروخت کر دیا جو اس وقت حالات میں بیٹھا تمہیں گالیاں دے رہا ہے۔ باقی اناج تم نے مال غنیمت سمجھ کر اپنے گودام میں منتقل کر لیا۔ لیکن یہ تمہیں ہضم نہیں ہو گا۔ اب تم جو کچھ بھی کرو گے اس کا رد عمل بھی دیکھ لو گے۔ تم نے میری حویلی کو جلا کر راکھ کیا ہے اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد تمہارا یہ خوبصورت مکان دھماکے سے اڑ جائے گا۔ تم میرے قتل کے درپے ہو، لیکن میں تمہیں زندہ رکھوں گی اور اس طرح سکاؤں گی کہ تمہیں نہ تو زندگی کے دامن میں پناہ ملے گی اور نہ ہی موت قبول کرے گی۔“

”یہ تمہاری بھول ہے نائلہ۔“ شبیر درانی بولا۔ ”تم میرا کچھ بھی نہیں لگاؤ سکو گی۔“

نائلہ مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے پہلے ایک دروازہ بند کیا اور پھر دوسرا کھڑکیوں کے سامنے پردے تے ہوئے تھے۔ وہ مطمئن ہو کر شبیر درانی کی طرف گھوم گئی اور اوڑھی ہوئی چادر اتار کر صوفے پر پھینک دی۔

شبیر درانی کے چہرے پر شدید الجھن کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نائلہ نے کمرے کے دروازے کیوں بند کر دیئے تھے۔ اس نے روشن دان کی طرف دیکھا۔ رات نکل کی نال بدستور جھانکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد یہ مکان دھماکے سے اڑ جائے گا اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن جانے سے پہلے میں بھی تمہیں ایک دو ہاتھ دکھانا چاہتی ہوں۔ اگر تم مجھے اپنی گرفت میں لے سکو تو یہ تمہاری جیت ہوگی اور یقین کرو کہ دلاور اس وقت ہمارے معاملے میں مداخلت نہیں کرے گا۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شبیر درانی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ نالہ کے ہاتھ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ لیکن وہ دلاور کی موجودگی میں کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ غراتا ہوا نالہ کی طرف بڑھا۔ نالہ سکون اور اطمینان سے اپنی جگہ پر کھڑی مسکراتی رہی۔ اس کا یہ پرسکون انداز اور ہونٹوں کی مسکراہٹ اشتعال دلانے والی تھی۔

شبیر درانی جیسے ہی قریب پہنچا نالہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح ہوا میں اچھلی۔ اس سے پہلے کہ شبیر درانی کچھ سمجھ سکتا نالہ کی کک اس کے جڑے پر لگی۔ وہ کراہ کر لڑکھڑایا۔ نالہ نے دوسری کک اس کے پلو پر رسید کر دی۔

”یہ فن میں نے شوقیہ طور پر سیکھا تھا۔ لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ تم جیسے شیطانوں سے نمٹنے کے لئے لڑیوں کو مارشل آرٹ کا یہ فن ضرور سیکھنا چاہئے۔“ نالہ نے کہا اور پھر اس پر تابڑ توڑ حملے کر دیئے۔ شبیر درانی ایک مرتبہ سنبھلا تھا لیکن اسی لمحہ نالہ کی فلائنگ کک اس کے سینے پر لگی اور وہ چیخا ہوا پشت کے بل صوفے پر گرا۔ صوفہ الٹ گیا اور شبیر درانی الٹی قلابازی کھاتا ہوا دیوار سے ٹکرا گیا۔ نالہ بھی چلائنگ لگا کر صوفے کی دوسری طرف آگئی۔

”اٹھو بزدل!“ نالہ کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”اس روز تو تمہارے آدمیوں نے تمہیں بچا لیا تھا لیکن آج میں تمہاری ایک آدھ بڈی ضرور توڑوں گی تاکہ تم زندگی بھر یاد رکھ سکو کہ کسی عورت نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا۔“

شبیر درانی دیوار کے سارے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ابھی پوری طرح کھڑا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ نالہ نے بڑی تیزی سے نیچے جھک کر دونوں ہاتھ اس کے ٹخنوں پر جمادیئے اور پوری قوت سے اسے اوپر اچھال دیا۔ شبیر درانی ہوا میں اڑتا ہوا پشت کے بل کمرے کے وسط میں قایلین پر گرا۔

دلاور روشندان سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نالہ درانی جس طرح شبیر کی پٹائی کر رہی تھی وہ اس کے لئے حیرت انگیز تھا اور جب نالہ نے شبیر درانی کو اٹھا کر ہوا میں اچھالا تو وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ دھان پان کی لڑکی نے شبیر درانی جیسے مجسم مجسم آدمی کو کس قدر آسانی سے اٹھا کر شیخ دیا تھا۔

شبیر درانی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نالہ کی زوردار کک اس کی کھوپڑی پر لگی وہ کراہتا ہوا پھر الٹ گیا۔ وہ نالہ سے بری طرح پٹ رہا تھا لیکن خود نالہ کو ایک ہاتھ بھی نہیں لگا سکا تھا۔

نالہ نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور پیر شبیر درانی کی بغل پر رکھ دیا۔ ٹی وی پر دکھائی جانے والی ریسنگ کا منظر تھا۔ روشن دان سے جھانکتے ہوئے دلاور کا خیال تھا کہ نالہ شبیر درانی کے بازو کو جھٹکا دے کر اس کے اندھے کا جوڑا کھانڈنے کی کوشش کرے گی لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ نالہ نے شبیر کے ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا لیں اور بازو کو اوپر اٹھانے لگی۔ دوسرے ہی لمحہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ دلاور کے لئے بالکل غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔

نالہ درانی نے دائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے شبیر درانی کی کلائی کی بڈی پر وار کیا۔ شبیر درانی کے حلق سے خوفناک چیخ نکلی۔ وہ بری طرح چل رہا تھا۔ دلاور نے کچھ عرصہ پہلے فردوس سنیما میں مارشل آرٹ کی ایک فلم دیکھی تھی جس میں ایک لڑکی کو اپنے دشمن پر اس طرح حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ لڑکی کی کھڑی ہتھیلی کے وار سے اس کے دشمن کی کلائی کی بڈی ٹوٹ گئی تھی اور اب شبیر درانی جس طرح چیخ اٹھا اس سے دلاور کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ شبیر درانی کی بھی کلائی کی بڈی سلامت نہیں رہی ہوگی۔

”چینو مت۔“ نالہ نے شبیر درانی کا وہ ہاتھ چھوڑ کر دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”سرکار!“ ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے موجددار کی آواز سنائی دی۔ ”کیا ہوا سرکار!“  
 ”اس سے کہو کہ تم دیوار پر تصویر ٹانگتے ہوئے گر گئے ہو اور معمولی چوٹ لگی ہے۔ اپنی آواز پر قابو  
 رکھنا ورنہ اس بازو کی ہڈی بھی توڑ دوں گی۔“ نائلہ نے جھک کر سرگوشی کی۔  
 ”کچھ نہیں ہوا موجددار۔“ شبیر درانی بڑی مشکل سے اپنے لیے پر قابو پاسکا تھا۔ ”تم اپنی جگہ پر جاؤ  
 بابا۔ میں صوفے پر کھڑے ہو کر تصویر ٹانگ رہا تھا کہ گر گیا۔ معمولی چوٹ لگی ہے۔“  
 ”اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ چوک والے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جائیں اور ایک گھنٹے سے پہلے واپس نہ  
 آئیں۔“ نائلہ پھر غرائی اور بازو پر ہلکا سا دباؤ ڈال دیا شبیر درانی نے اس حکم کی تعمیل میں ہی عافیت سمجھی۔  
 ”موجددار۔“ اس نے پکار کر کہا۔

”جی سرکار۔“ باہر سے موجددار کی آواز سنائی دی۔  
 ”تم لوگ چوک والے ہوٹل پر جا کر بیٹھو۔ ایک گھنٹے سے پہلے واپس مت آنا۔ میں اس مہمان بلی بی سے  
 ضروری باتیں کر رہا ہوں۔“ شبیر درانی نے کہا۔  
 ”بہت اچھا سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔

نائلہ نے دو منٹ انتظار کیا اور شبیر درانی کے دوسرے بازو کو زور دار جھکا دیا۔ شبیر درانی کا کندھا اکھڑ  
 گیا۔ اس مرتبہ شبیر درانی اپنی چیخ کو دبا گیا لیکن اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔  
 نائلہ نے شبیر درانی کو جھوٹا دیا اور روشن دان کی طرف دیکھ کر دلاور کو اشارہ کیا۔ روشن دان سے دلاور  
 کا چہرہ اور راتفل کی ٹال غائب ہو گئی۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد پیٹرول کی بوتل نائلہ کے ہاتھوں سے ٹکرائی۔  
 پیٹرول کی بوتل شبیر درانی نے بھی سونگھ لی تھی۔ اس نے انٹھنے کی کوشش کی مگر اسکے دونوں بازو بیکار ہو چکے  
 تھے۔ وہ بے بسی سے کراہ کر رہ گیا۔ نائلہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی ڈرائنگ روم کے خارجی دروازے کی  
 طرف بڑھ گئی اور قریب پہنچ کر اس نے کنڈی کھول دی۔ صرف تین سیکنڈ بعد دلاور اندر داخل ہوا۔  
 دلاور کے ایک ہاتھ میں راتفل تھی اور دوسرے ہاتھ میں پیٹرول کا ڈبہ۔ اس نے مسکراتی ہوئی نظروں  
 سے نائلہ کی طرف دیکھا اور ڈرائنگ روم کے قالین اور فرنیچر پر پیٹرول چھڑکنے لگا۔

شبیر درانی کا چہرہ خوف کی شدت سے اس طرح سفید ہو رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون خڑ گیا ہو۔ اسے یہ  
 سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ لوگ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ زندہ جلا دیئے جانے کے تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا  
 تھا۔

”گھبراؤ نہیں۔“ نائلہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ”میں تمہیں زندہ نہیں جلاؤں گی۔ کسی کی زندگی  
 اور موت پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ لیکن تم سے اپنا حساب تو لے سکتی ہوں۔ یہ ابتداء ہے۔ اس کے بعد  
 وقتاً فوقتاً تم سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا... یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے یا چند  
 منٹ بعد ہونے والا ہے اس سلسلے میں اگر میرا یا دلاور کا نام تمہاری زبان پر آیا تو ہماری اگلی ملاقات اس  
 سے زیادہ ہنگامہ خیز ثابت ہوگی۔“

دلاور ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ کھول کر دوسری طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی تین چار منٹ بعد  
 ہوئی تھی۔ پیٹرول کا ڈبہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نائلہ کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ نائلہ نے  
 صوفے پر پڑی ہوئی اپنی چادر اٹھا کر اوڑھ لی اور شبیر درانی کو بڑی بیدردی سے سہارا دے کر اٹھادیا۔  
 ”چلو... میں تمہیں ہسپتال پہنچا دوں۔“ وہ شبیر کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔

وہ لوگ مکان سے باہر آگئے۔ شبیر درانی کا کوئی بھی آدمی موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ سب چوک کے ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے ہوں گے۔ اپنے آقا کی بات وہ کس طرح ٹال سکتے تھے۔ شبیر درانی کی جیب سامنے کھڑی تھی۔ نائلہ نے شبیر درانی کو پچھلی سیٹ پر بٹھادیا اور خود اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا۔

نائلہ نے دلاور کی طرف دیکھ کر دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اٹھادیا۔ دلاور نے ڈبے میں بچا ہوا پیٹرول دروازے پر چمڑکا اور چند قدم دور ہٹ کر مچاس کی تیلی جلا کر دروازے کی طرف اچھال دی۔ بھک کی آواز ابھری اور شعلوں کی زبانیں لپکنے لگیں۔ جیب حرکت میں آگئی تھی... دلاور دوڑ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور نائلہ نے ایکسیلریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھادیا۔ اگلا موڑ گھومنے کے لئے نائلہ نے جیب کی رفتار کم کرتے ہوئے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ شبیر درانی کا مکان پوری طرح آگ کی پلیٹ میں آچکا تھا۔

نائلہ نے جیسے ہی موڑ پر جیب کا اسٹیرنگ گھمایا پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شبیر درانی نے چھلانگ لگا دی۔ ان دونوں نے اسے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر دونوں میں سے کسی نے بھی اس کی پروا نہیں کی۔

تیسرے موڑ پر نائلہ نے جیب روک لی۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ دلاور نے بھی شال اس طرح پلیٹ لی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔ آج سردی کچھ کم تھی اس لئے سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت بھی نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلتے رہے۔ شبیر درانی کے مکان سے اٹھنے والے شعلے یہاں سے بھی نظر آرہے تھے اور کئی لوگ تو یہ دیکھنے کے لئے اسی طرف دوڑے جا رہے تھے کہ آگ کہاں لگی تھی۔

تقریباً "چالیس منٹ بعد نائلہ دلاور کے ساتھ اپنے اسی بنگلے میں آگئی جو اس کے جانے کے بعد سے خالی رہا تھا اور یہاں اس کا صرف ایک نوکر رہتا تھا۔ وہ دونوں دیوار پھاند کر اس طرح بنگلے میں داخل ہوئے تھے کہ کوئی انہیں دیکھ نہیں سکا تھا۔ اندر ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ نوکر جاگ رہا تھا۔ نائلہ نے ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کہ نوکر کچھ کہتا وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

"ٹھک... کون ہو تم لوگ...؟" نوکر ہکھلایا۔

"میں ہوں شباب الدین۔" نائلہ نے کہتے ہوئے سر پر سے چادر اتار دی اور دروازہ بند کر دیا۔ "ما لکن! شباب الدین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "آئیے... آپ کو دیکھ کر مجھے جو خوشی ہو رہی ہے اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ لیکن... یہ سب کیا ہو گیا ہے ما لکن... کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں ہو رہا شباب الدین۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نائلہ درانی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ ارانگ روم میں آگئے۔ شباب الدین نے بتی جلانی چابی مگر نائلہ نے اسے روک دیا۔ ایک کمرے کی جتی جل رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے آنے والی روشنی کافی تھی۔

"یہاں کی صورت حال کیا ہے" نائلہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پولیس آپ کی تلاش میں جھاپے مارتی پھر رہی ہے ما لکن۔" شباب الدین نے جواب دیا۔ دو مرتبہ ہاں والے یہاں بھی آچکے ہیں لیکن اب تو کئی روز سے کوئی پولیس والا نہیں آیا لیکن... حینہ بیگم کل

یہاں آئی تھیں۔“

”کیوں؟“ نائلہ چونک گئی۔

”جی انہوں نے کہا تھا کہ اب یہ بنگلہ اور آپ کی ساری جائیداد حکومت نے ان کی نگرانی میں دیدی ہے۔ مجھے انہوں نے کہا تھا کہ میں ایک ہفتے کے اندر اندر کہیں اور اپنی نوکری کا بندوبست کرلوں۔ یہاں وہ اپنا آدمی رکھیں گی۔“ شباب الدین نے بتایا۔

”تمہیں کہیں اور نوکری کا بندوبست کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آگئی ہوں۔ اب تم یہیں رہو گے۔“ نائلہ نے کہا۔ شباب الدین تقریباً ”گیارہ سال کی عمر میں ان کے گھر میں ملازم ہوا تھا اور اب اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اس گھر کا وفادار نوکر تھا۔ اس کا شمار ایسے وفادار نوکروں میں کیا جاسکتا تھا جو مالکوں کے لئے اپنی جان تو دیدیتے ہیں مگر ان کی عزت پر حرف نہیں آنے دیتے۔

”سچ مالکن!“ شباب الدین خوش ہو گیا۔ ”اب آپ یہیں رہیں گی؟“

”اس وقت تک جب تک کسی کو یہاں میری موجودگی کا پتہ نہیں چلتا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”کسی کو پتہ نہیں چلے گا مالکن۔“ شباب الدین بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ کوئی چائے وغیرہ مل سکتی ہے اس وقت“ نائلہ نے پوچھا۔

”آپ لوگ بیٹھیں جی۔ میں ککڑ پر حلوائی کی دوکان سے سے دودھ لے کر آتا ہوں۔ فوراً ہی چائے بن جائے گی۔“

شباب الدین دودھ لینے کے لئے چلا گیا اور وہ دونوں صوفوں پر بیٹھے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ نیم تاریک ماحول میں وہ ایک دوسرے کے آنے سانسے بیٹھے ہوئے تھے۔ دلاور نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ نائلہ نے شبیردرانی کی موجودگی میں اس کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے کیا نائلہ واقعی اسے ایسا سمجھتی ہے۔ جبکہ دنیا والے اسے غنڈہ اور بد معاش تصور کرتے ہیں۔

اور نائلہ اپنی جگہ پر بیٹھی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہاں آنے کا فیصلہ کر کے اس نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی حربہ بھی تھا جسے وہ آزمانا چاہتی تھی۔ سب سے پہلے تو اسے اس بات کا یقین تھا کہ شبیردرانی اس کا نام نہیں لے گا اور اگر اس نے بتا بھی دیا تو پولیس اس کی تلاش میں شہر کی ناکہ بندی تو کر دے گی مگر اس بنگلے پر نہیں آئے گی۔ کیونکہ وہ تو سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ اتنا ہنگامہ کرنے کے بعد نائلہ اپنے اس بنگلے پر پناہ لے سکتی ہے۔ ویسے نائلہ کو یقین تھا کہ شبیردرانی کی زبان پر اس کا نام نہیں آئے گا۔ وہ کس منہ سے بتائے گا کہ ایک عورت اس کی ہڈیاں توڑ گئی ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی اور کہانی گھڑ کر سنا دے۔

اپنے اس بنگلے میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عدالت صادق والے کیس میں صبح فیصلہ سنانے والی تھی اور نائلہ اپنے گھر میں بیٹھ کر یہ فیصلہ سنا چاہتی تھی۔ اگر اس کیس کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا تو اس کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے گا۔ صادق کے اس جھوٹے کیس کے علاوہ اس پر اپنے آدمیوں کی مدد سے پولیس کی حراست سے فرار ہونے اور اس کا رروائی میں پانچ چھ آدمیوں کے قتل کا الزام تھا۔ ظاہر ہے یہ الزام جھوٹا تھا اور اسے بھی غلط ثابت کیا جاسکتا تھا۔

دس منٹ بعد شباب الدین دودھ لے آیا۔ اس نے باورچی خانے میں جا کر چائے بنائی اور ان کے سامنے لا کر رکھ دی۔

وہ دونوں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔ شباب الدین بھی قالین پر خاموش بیٹھا باری باری اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں نائلہ پہلے سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ چہرہ مرچھایا ہوا تھا۔ اس کا دل گرا ہوا نہیں تھا۔ نائلہ تقریباً "ایک مہینے سے موت سے بچنے کے لئے چھپتی پھر رہی تھی اور ایک انجانے وقت نے اس کی صحت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

دل اور 'شباب الدین کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ وہ نائلہ کے گاؤں والے نوکروں کو بھی جانتا تھا اور اس لئے بہت سے دوستوں کا بھی صورت شناس تھا۔ اس کے دوستوں میں زیادہ لڑکیاں ہی تھیں۔ ایک آدھ مرد عام بھی کھارہی دیکھنے میں آتا تھا۔ لیکن یہ آدمی اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ وہ جس طرح نائلہ سے بے اہلی سے باتیں کر رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت قریبی جاننے والا ہے۔

نائلہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ کھڑکیوں کے سامنے پردے تھے ہوئے تھے اس کے باوجود اس نے مراری ٹیوب لائٹ کی بجائے نائٹ لمپ ہی جلایا تھا۔ بیڈ پر بچھا ہوا بستر صاف ستھرا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ صاحب الدین دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا تھا۔

"شباب الدین!" نائلہ نے دروازے میں کھڑے ہوئے شباب الدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مہمان کو دوسرے بیڈ روم میں پہنچا دو۔"

"یہ کون ہے مالکن؟" شباب الدین نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"میرا محافظ؟" نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نائلہ کے اس جواب پر شباب الدین کو حیرت بھی ہوئی تھی۔ وہ محافظ تھا اور نائلہ کے سامنے صوفیہ پر اٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔

"اگر رات کو باہر کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو ہمیں فوراً جگا دینا۔" نائلہ کہتے ہوئے بستر پر لیٹ گئی۔

"آپ آرام سے سو جائیں مالکن... میں جاگتا رہوں گا۔" شباب الدین کہتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔

نائلہ بستر پر لیٹی ہوئی شبیر درانی اور اس کی ماں حینہ بیگم کے بارے میں سوچتی رہی۔ حینہ بیگم کو جب پتہ چلے گا کہ اس کے گھر کو آگ نائلہ نے لگائی تھی اور اس کے بیٹے کی ہڈیاں بھی نائلہ ہی نے توڑی تھیں تو وہ زخمی ناگن کی طرح سو سو بل کھا کر رہ جائے گی۔ نائلہ چشم تصور سے حینہ بیگم کو اپنا سر پیٹتے ہوئے اور بال نوچتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر جلد ہی وہ سو گئی۔

رات میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ صبح جب نائلہ کی آنکھ کھلی تو نونج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر لمرے سے باہر آگئی۔ دل اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک اخبار بھی پڑا ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ اخبار شباب الدین ہی لایا ہو گا۔ نائلہ نے آگے بڑھ کر اخبار اٹھا لیا۔

یہ مقامی اخبار تھا جس کا پہلا صفحہ درانی فیملی کے حوالے سے خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی سرخیوں کے ساتھ دو خبریں آتشزدگی سے متعلق تھیں۔ ایک گل مرگ میں نائلہ کی حویلی اور دوسری شہر میں شبیر درانی کے مکان کو جلا کر راکھ کر دینے کی خبر تھی۔ اخبار نے اپنے تین رپورٹروں کے حوالے سے مخصوص انداز میں درانی فیملی سے متعلق بہت سی خبریں شائع کی تھیں۔ ایک سرخی یہ بھی تھی کہ درانی خاندان تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ اس سرخی کے نیچے متن میں درانی فیملی کی مختصر سی تاریخ تھی جس کے آخر میں لکھا تھا کہ ذاتی جھگڑے

اس معزز ترین خاندان کو تاجی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

اخبار نے حسینہ بیگم، شیردرانی اور اس کے ملازمین کے بیانات الگ الگ شائع کئے تھے۔ شیردرانی کے بیان کے مطابق رات دس بجے کے قریب وہ اپنے گھر میں اکیلا بیٹھا تھا کہ چار نقاب پوش اندر داخل ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں راتھلیں تھیں۔ انہوں نے پہلے اسے مارا پیٹا اور پھر فرنیچر وغیرہ پر پٹرول چھڑک کر آگ لگانے کے بعد فرار ہو گئے۔ آگ لگنے کے بعد اس نے بڑی مشکل سے بھاگ کر اپنی جان بچائی تھی۔

شیردرانی کا یہ بیان پڑھ کر نالکہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کا اندازہ درست لگتا تھا اور شیردرانی نے اس کا نام لینے کے بجائے ایک فرضی کمائی گھر کرائی تھی۔ شیردرانی کے ملازمین کا بیان اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق رات دس بجے ایک عورت شیردرانی سے ملنے آئی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد شیردرانی نے تمام نوکروں کو گھر سے باہر بھیج دیا تھا۔ وہ چوک پر واقع ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ مکان سے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھ کر بھاگے۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ موجودار کے بیان کے مطابق پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ وہ عورت اور شیردرانی بھی اس آگ میں جل کر راکھ ہو گئے ہوں گے لیکن کچھ ہی دیر بعد اس نے شیردرانی کو لڑکھڑاتے ہوئے گلی کی طرف آتے دیکھا تو وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ شیردرانی کی حالت بہت خستہ تھی۔ وہ اسے ہسپتال لے گیا اور اسے وہاں چھوڑ کر واپس آ گیا۔

تیسرا بیان حسینہ بیگم کا تھا۔ وہ مکان میں آتش زنی کی اطلاع پا کر رات ہی کو محل مرگ سے شہر پہنچ گئی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں نالکہ کو مورد الزام ٹھہرا دیا تھا اور اس پر یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ محل مرگ میں اپنی حویلی اور اثاثہ کے گودام میں بھی نالکہ ہی نے آگ لگوائی تھی۔ تاکہ انہیں قانونی الجھنوں میں الجھا دیا جائے کیونکہ عدالت نے نالکہ درانی کی ساری جائیداد ان کی نگرانی میں دیدی تھی۔ حسینہ بیگم نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ نالکہ قتل کے کئی مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہے لیکن رائے منصور جیسے بعض بااثر لوگ نالکہ کو پناہ دیئے ہوئے ہیں اور وہی اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ حسینہ بیگم نے اپنے بیان میں پرزور الفاظ میں حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ رائے منصور جیسے لوگوں کے خلاف بھی قانونی کارروائی ہونی چاہئے جو ایک مجرمہ کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

حسینہ بیگم کا بیان نالکہ کی توقع کے عین مطابق تھا لیکن اس نے رائے منصور کو اس معاملے میں ٹھیک کر بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔

اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر صادق کیس کے حوالے سے بھی تھی۔ اس خبر میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ عدالت آج اس کیس کا فیصلہ سنائے گی۔

”میں نے ناشتہ تیار کر دیا ہے ماکن، آپ تیار ہوں تو ناشتہ میز پر لگادیا جائے۔“ شہاب الدین نے ذرا تنگ روم کے دروازے میں آکر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ نالکہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے الماری کھولی۔ اس کے کئی جوڑے الماری میں ٹھکے ہوئے تھے۔ وہ ایک جوڑا نکال کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

دس منٹ بعد جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو شہاب الدین میز پر ناشتہ لگا چکا تھا۔ دلاور ابھی تک ڈانگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔

”سمان کو بلاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

”آپ ناشتہ شروع کیجئے ماکن۔ اسے میں وہیں دیدیتا ہوں۔“ شباب الدین نے جواب دیا۔  
”شباب الدین۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”وہ میرا ملازم نہیں محسن ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید آج میرا وجود بھی ختم ہو چکا ہوتا۔ جاؤ، سمان کو بلا کر لاؤ۔“

نائلہ، شباب الدین کے سامنے دلاور کا نام لینے سے گریز کر رہی تھی۔

شباب الدین ڈرائنگ روم سے دلاور کو بلا لایا۔ اس کے آنے کے بعد ہی نائلہ نے ناشتہ شروع کیا تھا۔  
”ٹیلی فون ٹھیک ہے؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے شباب الدین کی طرف دیکھا۔  
”جی ماکن۔“ شباب الدین نے جواب دیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد نائلہ ڈرائنگ روم میں آگئی اور فون کا ریسپونڈر اٹھا کر رائے منصور کے وکیل کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ لائن جلد ہی مل گئی۔ لیکن کلرک نے بتایا کہ وکیل صاحب عدالت گئے ہوئے ہیں۔ نائلہ نے فون بند کر دیا اور ایک بار پھر اخبار اٹھا کر مطالعہ کرنے لگی۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ کال بیل کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑے۔ دلاور نے فوراً ہی راتقل سنبھال لی۔ شباب الدین بھی تیزی سے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

”آپ لوگ جھپٹے دروازے کی طرف چلے جائیے ماکن۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے۔“ شباب الدین نے سرگوشی کی اور وہ اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک وہ دونوں ڈرائنگ روم سے نہیں گئے۔ اس دوران کال بیل کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ شباب الدین تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر آگیا۔ اس نے جیسے ہی بیرونی گیٹ کھولا سامنے حسینہ بیگم کو دیکھ کر اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”بڑی ماکن آپ...“ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔  
”دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔ کیا کر رہے تھے؟“ حسینہ بیگم نے خوشخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا بڑی ماکن۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔“ شباب الدین نے جواب دیا۔  
”رات کو نائلہ تو یہاں نہیں آئی تھی؟“ حسینہ بیگم نے پوچھا۔

”نائلہ بی بی!“ شباب الدین کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”وہ یہاں کیسے آسکتی ہیں۔ بڑی ماکن... البتہ آدمی رات کے وقت دو پولیس والے آئے تھے۔ وہ بھی نائلہ بی بی کو پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔“

”اگر نائلہ یہاں آئے تو مجھے فوراً اطلاع کر دینا۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔  
”جی بڑی ماکن۔“ شباب الدین بولا۔ ”لیکن میرے خیال میں نائلہ بی بی اس طرف کا رخ نہیں کرے گی۔ وہ تو اب اس شہر میں بھی نہیں آئیں گی۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔“

”وہ کتیا اس شہر میں ہے۔ رات کو اس نے اپنے پالے ہوئے غنڈوں کے ساتھ مل کر ہمارے مکان کو ہلا کر راکھ کر ڈالا۔ وہ میرے ہاتھ لگ جائے تو اس کی ہڈیاں چبا جاؤں گی۔“ حسینہ بیگم نے دانت کچکپائے۔  
”پھر آگے بڑھتی ہوئی بولی۔“ ہنسنے میں ذرا فون کرنا چاہتی ہوں۔“

”فون تو بند پڑا ہے بڑی ماکن۔“ شباب الدین نے جلدی سے کہا۔ ”اس مرتبہ بل نہیں بھرا تھا۔ شاید ٹیلی فون کے جھکے والوں نے کاٹ دیا ہے۔“



حسینہ بیگم کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ شباب الدین کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”میری باتوں کا دھیان رکھنا۔ اگر تم نے اس کتیا سے وفاداری نبھانے کی کوشش کی تو چڑی اوجڑ ڈالوں گی۔“

”اگر نالکہ بی بی یہاں آئی تو میں آپ کو بتا دوں گا مالن۔“ شباب الدین بولا۔

حسینہ بیگم کار میں بیٹھ گئی اور انجمن اشارت کر کے اسے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ شباب الدین اس وقت تک گیٹ پر کھڑا رہا جب تک کار گلی کا موڑ گھوم کر لگا ہوں سے او جھل نہ ہو گئی۔ پھر وہ گیٹ بند کر کے اندر آ گیا۔ وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں آیا دوسری طرف سے نالکہ اور دلاور بھی اندر آ گئے۔

”کون تھا؟“ نالکہ نے سوالیہ لگا ہوں سے شباب الدین کی طرف دیکھا۔

”حسینہ بیگم۔ آپ کو پوچھ رہی تھیں۔“ شباب الدین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے بھی

ایسی کہانی سنائی ہے کہ اب وہ آپ کا پوچھنے کے لئے دوبارہ ادھر نہیں آئے گی۔“

نالکہ مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تھے اس نے ایک بار پھر وکیل کے دفتر فون کیا لیکن پتہ چلا کہ وکیل صاحب ابھی تک عدالت سے واپس نہیں آئے۔ نالکہ نے فون بند کر دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے دوبارہ ریسور اٹھا لیا اور اس مرتبہ احمد پور لاما میں رائے منصور کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رائے منصور کا فون صادق آباد کی سچھ سے منسلک تھا اس لئے ڈائریکٹ ڈائلنگ میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اتفاق سے رائے منصور حویلی میں تھا اور کال اسی نے ریسپو کی تھی۔

”نالکہ بول رہی ہوں انکل۔“ وہ ریسپو پر رائے منصور کی آواز سن کر بولی۔

”آہا! مبارک ہو بیٹی۔“ رائے منصور کی چمکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”معزز عدالت نے صادق کیس میں

تمہیں باعزت طور پر بری کر دیا ہے۔“

”انکل!“ نالکہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ خبر سنتے ہی مارے خوشی کے اس کی آنکھیں تر ہو گئی

تھیں۔

”گمبر او نہیں بیٹی۔“ رائے منصور کی آواز سنائی دی۔ ”تقریباً“ آدھا گھنٹہ پہلے وکیل نے عدالت ہی سے فون کر کے مجھے یہ خوش خبری سنائی تھی۔ اس نے اب دوسرے کیس کی تیاری شروع کر دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم اس میں بھی سرخرو ہو گی۔ میں تو پریشان ہو رہا تھا کہ تمہیں یہ خوشخبری کیسے سناؤں۔ ویسے اس وقت تم کہاں ہو؟“

”اپنے بنگلے میں۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

”اوہ! اس کا مطلب ہے کہ شبیر درانی کا بنگلہ۔۔۔“

”جی ہاں!“ نالکہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ حرکت میں نے ہی کی تھی۔ میں اس پر یہ ثابت کرنا

چاہتی ہوں کہ میں بے بس نہیں ہوئی۔ وہ شاید اس وقت ہسپتال میں پڑا ہے۔“

”کیا تم نے اس کی زیادہ ہی تواضع کر دی؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”زیادہ نہیں۔ بس ایک آدھ ہڈی ٹوٹی ہے۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

”کیا اپنے بنگلے میں رہنا تمہارے لئے خطرناک نہیں ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”مجھے صرف دو تین دن یہاں گزارنے ہیں اور پھر دلاور میرے ساتھ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں

کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتی۔“ نالکہ نے کہا۔

”وہ کہاں ہے۔“  
 ”لیجئے۔ آپ بات کر لیجئے۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور دلاور کی طرف بڑھا دیا جو قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔

”مبارک ہو رائے صاحب۔“ دلاور بولا۔ ”میں نے نائلہ بی بی کی باتوں سے اس خوشخبری کا اندازہ لگایا ہے۔ جی... جی... آپ فکر ہی نہ کریں جی... کوئی میری لاش پر سے گزر کر ہی نائلہ بی بی تک پہنچ سکتا ہے۔ اچھا جی... آپ نائلہ بی بی سے بات لیجئے۔“ دلاور نے ریسیور دوبارہ نائلہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔  
 نائلہ کچھ دیر تک رائے منصور سے باتیں کرتی رہی پھر اس نے فون بند کر دیا اور دلاور کی طرف دیکھنے لگی۔

”مبارک ہو نائلہ بی بی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا... ایک داغ جو دشمن نے لگایا تھا دھل گیا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ دلاور نے کہا۔  
 نائلہ درانی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”تم جیسے مخلص اور ہمدرد لوگ میرا ساتھ نہ دیتے تو شاید آج مجھے یہ خوشی نصیب نہ ہوتی۔“ نائلہ نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔  
 ”میں تو آپ کا ادنیٰ خادم ہوں نائلہ بی بی۔ بڑی عزت ہے آپ کی میرے دل میں۔“ دلاور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

”نہیں دلاور... تم ادنیٰ نہیں، بہت عظیم ہو... مجھے تم پر فخر ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ شاب الدین کو بھی اس خوشخبری کا پتہ چل گیا۔ وہ تینوں دیر تک بیٹھے اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔  
 نائلہ درانی بہت خوش تھی۔ دلاور نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے دامن پر دشمن کا لگایا ہوا ایک داغ دھل گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر پورے گھر میں گھومنے لگی۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ گھر کی بہت سی قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ ٹی وی، وی سی آر... سانیو کا ڈیک اور کیسٹ ریکارڈر، ڈیپ فریزر، فریج اور اس قسم کی ساری چیزیں غائب تھیں، ڈرائنگ روم میں لگا ہوا قیمتی فائوس بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”شاب الدین!“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ سب چیزیں کہاں گئیں؟“  
 ”وہ تو کئی روز پہلے حسینہ بیگم لے گئی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ اب ان چیزوں کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ شاب الدین نے جواب دیا۔  
 ”وہ شاید مال غنیمت سمجھ کر لے گئی ہے۔ لیکن اسے ایک ایک چیز کا حساب دینا ہو گا۔“ نائلہ نے دانت کچکپچائے۔

تین دن تک نائلہ اور دلاور اس مکان میں رہے۔ نائلہ تو اب بھی پولیس کو مطلوب تھی اس لئے وہ مکان سے باہر نہیں نکلی۔ دلاور کا پولیس سے کوئی جھگڑا نہیں تھا البتہ شبیر درانی کے آدمیوں کو اس کی تلاش تھی اس لئے وہ بھی بیچلے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

تیسرے دن شام کو نائلہ نے رائے منصور کو ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ وکیل نے کیس تیار کر لیا ہے اور وہ کل صبح اسے عدالت میں پیش کرنے والا ہے۔ رائے منصور نے نائلہ کو یقین دلایا تھا کہ اس کیس کا فیصلہ بھی بہت جلد اس کے حق میں ہو گا۔ نائلہ نے رائے منصور کو بتا دیا تھا کہ آج رات وہ یہاں سے جا رہی ہے۔

”کیوں...؟“ رائے منصور نے پوچھا۔ ”کوئی گڑبڑ؟“

”ابھی تک تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی لیکن اس کا امکان ہو سکتا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”شباب الدین چونکہ کھانے پینے کی چیزیں اور ناشتہ وغیرہ لے کر آتا ہے اس لئے بعض لوگوں کو بنگلے میں شباب الدین کے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ اس سے پہلے کہ شبیر درانی یا پولیس تک یہ بات پہنچ جائے میں یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔“

”کہاں جاؤ گی؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”شہر میں ایک دو ٹھکانے اور بھی ہیں۔ آپ میں نے شہر کے اندر ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ قریب رہ کر میں ان ماں بیٹے کو زیادہ پریشان کر سکوں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے... مجھ سے رابطہ قائم رکھنا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”جی ہمت۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ نائلہ کا خیال تھا کہ وہ دس بجے تک یہاں سے نکل جائیں گے۔ لیکن فون بند کرنے کے دو منٹ بعد شباب الدین دوڑتا ہوا اندر آیا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ نائلہ اس کی بدحواسی دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”پہلے پولیس...“ شباب الدین ہکھلایا۔ ”پولیس والے بنگلے کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ شاید کسی نے مخبری کر دی ہے۔“

نائلہ درانی کے حواس پر بجلی سی گری۔ دلاور نے فوراً ہی راتقل سنبھال لی۔

”نہیں دلاور۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہم پولیس کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے۔ میرے ساتھ آؤ... جلدی کرو۔“

نائلہ ہال میں آگئی اور تیزی سے اوپر جانے والے زینے پر چڑھنے لگی۔ دلاور بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ وہ اوپر کا دروازہ کھول کر چھت پر آگئے۔ دلاور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پات چھت پر ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ چھپ سکتے۔

”یہاں تو ہم چوہے کی طرح گھیرے میں آجائیں گے۔“ دلاور بولا۔

”میرے ہاتھ آؤ۔“ نائلہ تیزی سے چھت کے ایک کونے کی طرف چلنے لگی۔

چھت کے کونے میں کنکریٹ کی پانی کی ٹنکی بنی ہوئی تھی۔ ٹنکی دیکھ کر دلاور، نائلہ کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

نیچے پولیس والوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پولیس والے دیوار پھاند کر بنگلے میں داخل ہو چکے تھے۔

ٹنکی کے قریب پہنچ کر دلاور نے راتقل دیوار کے ساتھ ٹکا دی اور بڑی احتیاط سے ٹنکی کا ڈھکنا اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور نائلہ کو سہارہ دے کر ٹنکی پر چڑھا دیا۔ نائلہ ٹنکی میں اتر گئی۔ دلاور نے پہلے نائلہ کو اپنی راتقل تھمادی اور خود بھی اچک کر ٹنکی پر چڑھ گیا۔ اسی وقت زینے پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ دلاور بڑی آہستگی سے ٹنکی میں اتر گیا اور ٹھیک اسی وقت جب اس نے ٹنکی کا ڈھکنا ہول پر رکھا تھا دو پولیس والے زینے والے دروازے سے نکل کر چھت پر آگئے۔

یہ ٹنکی چار فٹ اونچی اور اتنی ہی لمبی چوڑی تھی۔ اس میں پانی تقریباً ”ڈیڑھ فٹ کی بلندی تک تھا۔ ان کے لئے کھڑے ہونا ممکن نہیں تھا۔ بہک کر کھڑے رہنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ دونوں بڑی آہستگی سے بیٹھ

گئے۔ دلاور نے بیٹھے ہی نالکہ کے ہاتھ سے رائفل لے لی تھی اور اسے پانی کی سطح سے اوپر ہی رکھا تھا۔  
 نکلی کا ڈھکنا ہول پر بالکل فٹ اُگیا تھا۔ ہوا کے آنے کا بھی کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ گہری تاریکی میں  
 نالکہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جیتے جاگتے قبر میں بند ہو گئی ہو۔

چھت پر بھاری قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دلاور کو قدموں کی آواز سے یہ اندازہ  
 لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ دو پولیس والے تھے جو چھت پر بڑی تیزی سے ایک طرف سے  
 دوسری طرف آ جا رہے تھے۔ ایک پولیس والے کے قدموں کی آواز نکلی کے قریب رک گئی۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ نکلی کے قریب ایستادہ پولیس والے نے اونچی آواز میں اپنے ساتھی کو  
 مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ چھت پر نہیں آئے۔ اگر آئے بھی ہوں گے تو ساتھ والے کسی  
 بنگلے کی چھت پر کود گئے ہوں گے۔“

”تم اس بنگلے کی چھت پر کود جاؤ۔ میں دوسرے بنگلے کی چھت پر کود رہا ہوں۔“ دوسرے پولیس والے  
 نے کہا۔

بھاری قدموں کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ دونوں پولیس والے مختلف سمتوں میں جا رہے  
 تھے اور پھر دھب دھب کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دونوں پولیس والے دائیں بائیں والے بنگلوں کی چھتوں پر  
 کود گئے تھے۔

ان دونوں کو نکلی میں جیسے ہوئے تقریباً ”چار منٹ ہو چکے تھے۔ ڈھکنا کھولنے اور بند کرنے کے دوران  
 جو ہوا نکلی میں داخل ہوئی تھی اس میں شامل آکسیجن ختم ہو رہی تھی اور اب وہ محض سی محسوس کرنے لگے  
 تھے۔

دلاور نے ٹٹولتے ہوئے رائفل نالکہ کے ہاتھ میں تھامدی اور خود کسی قدر آگے بڑھ کر اس نے دونوں  
 ہاتھ نکلی کے ڈھکنے کے نیچے رکھے اور اسے بڑی آہستگی سے اُپر اٹھانے لگا۔ ڈھکنے میں تقریباً ”ایک انچ کی خلا  
 پیدا ہو گئی تھی جس سے زندگی بخش تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ نالکہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

دلاور ڈھکنے کو اسی طرح اٹھائے کھڑا رہا۔ اور تازہ ہوا اندر آتی رہی۔ پھر دفعتاً ”سیڑھیوں پر بھاری  
 قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک پولیس والا دروازے سے نکل کر چھت پر اُگیا۔ دلاور نے ڈھکنا نیچے کر لیا  
 اور اس میں اتنی معمولی سی جھری رہنے دی کہ وہ باہر کا منظر دیکھ سکے۔ اسی لمحہ دائیں طرف والے بنگلے کی  
 چھت پر کودنے والا سپاہی واپس اُگیا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے سر!“ اس نے سیڑھی سے آنے والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ غالباً ”کوئی  
 افسر تھا۔“ میں نے اس بنگلے کی چھت پر بھی دیکھ لیا ہے۔ باقر دوسرے بنگلے کی چھت پر گیا ہے۔ پھیلی ٹکلی میں  
 می ہمارے آدمی موجود ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ لوگ یہاں ہیں ہی نہیں۔ کسی نے ان کی موجودگی کی غلط اطلاع  
 دی ہوگی۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ آفسر نے کہا۔ ”بنگلے میں موجود بوڑھے نوکر کا کہنا ہے کہ وہ یہاں اکیلا ہی  
 رہتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے یار دوست آ جاتے ہیں تو گپ شپ میں اس کا کچھ وقت گزر جاتا ہے۔ ہو سکتا  
 ہے اطلاع دینے والے کو غلط شبہ ہوا ہو۔ چلو واپس چلو۔“

اسی دوران دوسری چھت پر کودنے والا سپاہی بھی واپس اُگیا۔ اس نے بھی جو رپورٹ دی وہ نفی میں

”ٹھیک ہے۔ واپس چلو۔“ آفسر نے کہا اور وہ تینوں بیڑھیوں والے دروازے میں داخل ہو گئے۔  
 نیچے ہال کمرے میں بتی جل رہی تھی اور مدھم سی روشنی بیڑھیوں والے دروازے میں بھی نظر آرہی تھی۔ دلاور نے ٹنگی کا ڈھکنا تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا اب نائلہ بھی اس کے قریب آگئی تھی اور وہ بھی ڈھکنے  
 جھری سے دروازے کی طرف جھانک رہی تھی۔  
 ”وہ لوگ گئے کیا؟“ نائلہ نے سرگوشی کی۔

”ہاں، چلے تو گئے ہیں۔ لیکن کوئی بھروسہ نہیں کہ کوئی اور شبہ ہونے پر واپس آجائیں۔ فی الحال یہ  
 ہی ہمارے لئے محفوظ ترین جگہ ہے۔“ دلاور نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ اس کی نظر بھی بدستور  
 دروازے پر مرکوز تھی۔

نیچے پتکے میں اور گلی میں بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پولیس والے شاید گلی میں  
 دوسرے جنگلوں کے رہنے والوں سے بھی دریافت کر رہے تھے۔ پھر تقریباً ”چالیس منٹ بعد دو گاڑیوں کے  
 انجن اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔

ٹھنڈے پانی میں بیٹھے بیٹھے نائلہ کا نچلا نصف دھڑکن ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم  
 کے نچلے حصے کو برف میں دفن کر دیا گیا ہو۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ کو چھو کر دیکھا، چٹکی کاٹی، مگر کوئی اثر نہیں  
 ہوا۔ ٹانگ بالکل سن ہو چکی تھی۔

پندرہ بیس منٹ اور گزر گئے۔ پھر بیڑھی والے دروازے میں ایک آدمی کا ہولہ دکھائی دیا۔ دلاور نے  
 ٹنگی کا ڈھکنا ذرا نیچے کر دیا۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ کوئی پولیس والا نہیں، نائلہ کا ملازم شباب الدین  
 جو دروازے میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”شباب!“ دلاور نے سرگوشیانہ انداز میں اسے پکارا۔

شباب الدین تیزی سے تین چار قدم آگے آگیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”ادھر... پانی کی ٹنگی کی طرف۔“ دلاور نے دوبارہ سرگوشی کی۔

شباب الدین تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹنگی کی قریب آگیا۔ دلاور نے ٹنگی کا ڈھکنا کچھ اور اوپر اٹھا دیا۔

”کیا صورت حال ہے؟ وہ لوگ گئے کیا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”چلے گئے۔“ شباب الدین نے جواب دیا۔ ”نائلہ بی بی کہاں ہے؟“

”وہ بھی میرے ساتھ اسی ٹنگی میں ہے۔“ دلاور نے کہتے ہوئے ٹنگی کا ڈھکنا اٹھا کر آہستگی سے ایک  
 طرف رکھ دیا۔ نائلہ سے راتقل لے کر شباب الدین کو تھما کر اور دونوں ہاتھ ٹنگی کے کنارے پر جما کر باہر  
 آگیا۔ تقریباً ”ایک ٹھنڈے پانی میں بیٹھے رہنے سے اس کی ٹانگیں بھی سن ہو رہی تھیں مگر وہ سختیاں برداشت  
 کرنے کا عادی تھا۔

دلاور نے نائلہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ نائلہ کو ٹنگی سے نکال کر وہ نیچے اترنے میں  
 اسے مدد دینے لگا۔ نائلہ کے پیر چھت پر لگے تو دلاور نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ نائلہ بھد سے چھت پر  
 گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں سن ہو کر بے جان سی ہو گئی تھیں اور اپنے  
 جسم کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکی تھیں۔

دلاور جلدی سے ٹنگی سے اتر آیا۔ اس نے پہلے بڑی آہستگی سے ٹنگی کا ڈھکن ہول پر رکھا اور پھر جھک  
 کر نائلہ کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔

”نہیں۔ میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔ میری ٹانگیں سن ہو رہی ہیں۔ ان میں بالکل جان نہیں رہی۔“ نائلہ نے کہا۔ اس کے لمحے میں بے بسی تھی۔

ان دونوں کے کپڑوں سے غجز نے والا پانی چھت پر پھیل رہا تھا۔ سامنے کھڑا ہوا بوڑھا شباب الدین لمب سی نگاہوں سے اپنی ماکن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میرا سارا لے کر آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش کرو۔ اتنی دیر تک ٹھنڈے پانی میں بیٹھے رہنے سے ٹانگیں سن ہو گئی ہیں۔ دو چار قدم چلنے سے ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ دلاور بولا۔

”نہیں، میں بالکل نہیں چل سکتی۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ وہ دلاور سے لپٹی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ نیچے جھکتی جا رہی تھی۔

”اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں اٹھا کر لے چلوں۔“ دلاور نے کہا۔ ”اگر کسی بچے کی چھت سے کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو کوئی نئی مصیبت آجائے گی۔“

”ہاں... مجھے اٹھا کر لے چلو۔“ نائلہ نے بے بسی سے جواب دیا۔

دلاور نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور تیزی سے سیڑھیوں کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ شباب الدین بھی ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ ان کے سیڑھیوں پر اترتے ہی شباب الدین نے دروازہ بند کر دیا اور ان کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگا۔

دلاور، نائلہ کو بیڈ روم میں لے آیا اور قالین پر بٹھا کر اس پر کمر ڈال دیا۔ پھر الماری میں سے نائلہ کے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر اس کے قریب رکھ دیا۔

”کوشش کر کے یہ کپڑے بدل لو۔ گیلیے کپڑے مزید نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ میں باہر کھڑا ہوں۔ کپڑے بدل لو تو مجھے آواز دیدیتا۔ میں تمہیں بستر پر لٹا کر لحاف وغیرہ اوڑھا دوں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ دلاور کہتے ہوئے باہر چلا گیا اور اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد اس نے نائلہ کی آواز سن کر دروازہ کھولا۔ شباب الدین بھی دلاور کے ساتھ ہی اندر آ گیا۔ نائلہ کپڑے بدل چکی تھی۔ دلاور نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور اس کے جسم پر لحاف اس طرح لپیٹ دیا کہ اس کی ٹانگوں کو زیادہ سے زیادہ حرارت پہنچ سکے۔ لحاف کے اوپر اس نے ایک کمر ڈال دیا تھا۔

”جسم کو گرمی پہنچے گی تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اور شباب الدین! دلاور، شباب الدین کی طرف مڑ گیا۔ ”یہ گیلیے کپڑے اٹھا کر ایک طرف رکھ دو اور نائلہ بی بی کے لئے چائے بنا دو۔“

”تم بھی پیو گے چائے؟“ شباب الدین نے راتفل دلاور کی طرف بڑھادی جو ابھی تک اسی کے پاس تھی۔

”ہاں پی لوں گا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

شباب الدین نائلہ کے گیلیے کپڑے اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ دلاور پلنگ کے قریب کھڑا رہا۔ اس کے پہلوں سے اب بھی پانی غجز رہا تھا۔

”تم کتنے اچھے ہو دلاور۔“ نائلہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم بھی کپڑے بدل لو کہیں تمہاری طبیعت خراب نہ ہو جائے۔“ شباب الدین سے اس کا کوئی جوڑا لے لو۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوتا نائلہ بی بی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”ابھی شباب الدین آتا ہے تو اس سے پوچھتا

ہوں، اپنی کوئی ننگی شنگھی دیدے۔“

کچھ ہی دیر بعد شباب الدین چائے لے کر آیا۔ اس نے ایک کپ دلاور کے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرا بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”چائے پی کر تم میرے کپڑے پہن لو۔ یہ کپڑے نچوڑ کر پچھلے کے نیچے ڈال دوں گا۔ ہوا سے سوکھ جائیں گے۔“ شباب الدین کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

دلاور نے ٹائل کا چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ٹائل پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ اس طرح اسے چائے پینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ دلاور اپنی چائے ختم کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ جی صرف ہال کمرے میں جل رہی تھی اور باقی تمام کمروں کی جلیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہال کمرے کی روشنی ان کے لئے کافی تھی۔

شباب الدین نے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا اسے دیدیا۔ دلاور نے بغیر استری ہوئے کپڑے پہن کر اپنے کپڑوں کو ہاتھ روم میں نچوڑا اور انہیں پلنگ پر پھیلا کر پٹکھا پوری رفتار سے کھول دیا۔ جب وہ دوبارہ ٹائل والے کمرے میں آیا تو ٹائل کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”میری ٹانگیں ٹھیک ہو رہی ہیں۔“ وہ بولی۔ ”اب میں اپنی ٹانگوں کو آہستہ آہستہ حرکت دے سکتی ہوں۔“

”تقریباً“ ایک گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں بیٹھے رہنے کا اثر تھا۔ تھوری دیر میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ دلاور نے کہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹائل کی ٹانگیں پوری طرح حرکت کرنے لگیں۔ اس نے اپنے اوپر سے کبیل اتارا اور پھر تھوڑی دیر بعد لحاف بھی اتار دیا اور پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی اور کمرے میں آہستہ آہستہ شیلنے لگی۔

”ہاں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور چل سکتی ہوں۔“ ٹائل نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دلاور اپنے کمرے میں آیا۔ اس کے کپڑے پوری طرح نہیں سوکھے تھے لیکن پہننے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے کپڑے پہن لئے۔ وہ ٹائل والے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ دلاور نے جلدی سے رات نقل اٹھالی۔ اسی لمحہ شباب الدین دوڑتا ہوا آیا۔

”تم دونوں پچھلی دروازے کی طرف نکل جاؤ۔ میں نے گاڑی رکھنے کی آواز سنی تھی۔ شیردرانی کی جیب کی آواز میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“ شباب الدین بولا۔

ٹائل اور دلاور فوراً ہی بیڈ روم سے نکل کر پچھلے دروازے کی طرف چلے گئے جبکہ شباب الدین برآمدے والے دروازے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے برآمدے سے نکل کر باہر کا گیٹ کھولا تو شیردرانی اسے دھکا دیتا ہوا اندر آیا۔ اس کے بائیں بازو پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور بازو گردن میں پڑی ہوئی ایک پٹی میں لٹکا ہوا تھا۔

”مالک آپ... اس وقت؟“ شباب الدین سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ شیردرانی کے پیچھے اس کے دو گن مین بھی اندر آ گئے تھے۔ ان میں ایک موجددار تھا۔

”کہاں ہیں وہ دونوں؟“ شیردرانی، شباب الدین کی طرف دیکھ کر غرایا۔

”کون دونوں سرکار؟“ شباب الدین بولا۔ ”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“

شیردرانی نے اپنے تندرست ہاتھ سے بوڑھے شہاب الدین کا گریبان پکڑا اور اسے کھینچا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دونوں آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں راتقلین تانے ڈرائنگ روم سے نکل کر کمروں میں جھانکنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی موجددار واپس آگیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں بھیکے ہوئے زنانہ کپڑے اٹھا رکھے تھے۔

”یہ کپڑے ایک غسل خانے کے فرش پر پڑے ہوئے ملے ہیں سرکار!“ موجددار نے شیردرانی کو کپڑے دکھاتے ہوئے کہا۔

اسی دوران دوسرا گن مین بھی آگیا۔ ”میں نے تمام کمرے دیکھ لئے ہیں سرکار۔“ اس نے کہا۔ ”ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ مگر بعض چیزیں بتا رہی ہیں کہ وہ دونوں کچھ دیر پہلے یہاں موجود تھے۔“

”کہاں ہیں وہ دونوں؟“ شیردرانی نے خوشخوار نگاہوں سے شہاب الدین کی طرف دیکھا۔

”کون سرکار! آپ یقین کریں میرے سوا یہاں کوئی نہیں ہے۔“ شہاب الدین بولا۔

”مجھے فون پر اطلاع ملی ہے کہ پولیس کے چھاپے کے بعد بھی ایک مرد اور ایک عورت کو بنگلے میں دیکھا گیا ہے اور یہ کپڑے بتا رہے ہیں کہ نالکہ یہاں موجود ہے۔ بتاؤ تم نے کہاں چھپا رکھا ہے اسے؟“

”میں نالکہ بی بی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا سرکار۔“ شہاب الدین نے کہا۔

شیردرانی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے شہاب الدین کے منہ پر تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا لیکن اسی وقت راہداری کی طرف سے ایک غراہٹ سنائی دی۔

”ہاتھ روک لو شیردرانی۔ ورنہ تمہیں اور تمہارے ان دونوں گروگوں کو بھون کر رکھ دیا جائے گا۔“

شیردرانی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ دلاور ان پر راتقل تانے کھڑا تھا اور نالکہ اس کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

... \* \* \* ...

شیردرانی کے جڑے بھیج گئے۔ غصے کی شدت سے اس کی آنکھیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔ دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے تھے۔

”تم پولیس والوں کو تو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ لیکن مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں نالکہ!“ شیردرانی کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔

”میں تمہیں دھوکے سے نہیں ماروں گی شیردرانی۔ اسی لئے تو سامنے آگئی ہوں اور تم یہ کہہ کر تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم میں تو اب اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ میرے دو چار ہاتھ مرداشت کر سکو۔ میرے ہاتھ کے ایک ہی وار سے تمہارے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اب کوئی ہڈی تڑوانا چاہتے ہو؟“ نالکہ نے ہنس مکھ لہجے میں کہا۔ اس کا انداز اشتعال دلانے والا تھا۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ شیردرانی دھاڑا۔

”یہ جملہ سن سن کر تو میرے کان پک گئے ہیں۔ اب کوئی نئی بات کرو۔ کوئی ایسی دھمکی سوچو جسے تم عملی طور پر بھی پنا سکو۔“ نالکہ مسکرائی۔

موجددار بہت غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی راتقل کی نال کا رخ بدل رہا تھا۔ دلاور کی نظروں سے اس کی یہ حرکت چھپی نہیں رہ سکی۔ وہ اپنی راتقل کو حرکت دیتے ہوئے غرایا۔



”را اقل پھینک دے اوئے مجھل اتم بھی... تم بھی پھینکو اپنی را اقل... پیچھے... پیچھے کی طرف پھینکو۔“  
 موجوددار اور دوسرے گمن مین کے لئے اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی  
 را اقلیں پیچھے قالین پر اچھال دیں۔

”یہ اوفادار کتا پال لیا ہے تم نے نالکہ!“ شبیر درانی نے کہا۔

”کتا جب انسان کو کاتا ہے تو پیٹ میں چوہہ ٹپکے لگوانے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ کتا جب تمہیں کانٹے کا تو  
 تمہیں گنتی کی چند سائیں لینے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“ دلاور نے کہا۔

”میرا خیال ہے اب تمہیں اپنی شکست تسلیم کرنی چاہئے شبیر درانی۔“ نالکہ نے اس کے چہرے پر  
 نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم لب بھی اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ تو میں تمہارے اور تمہاری ماں کے تمام  
 گناہ معاف کرنے کو تیار ہوں۔ ویسے تم دونوں کو اس بات کا یقیناً بہت دکھ ہوا ہو گا کہ صادق والے کیس  
 میں عدالت نے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا ہے۔ میرے خلاف تمہاری سازش کے پھیلانے ہوئے جال کے  
 پھندے اب ٹوٹنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ حقیقت بھی بہت جلد کھل کر سامنے آ جائے گی کہ مجھے پولیس کی  
 حراست سے چھڑانے کے لئے پولیس کی دین پر حملہ کس نے کروایا تھا اور اس کا ردوائی میں پانچ چھ آدمیوں  
 کو موت کے گھاٹ اتارنے والے کون تھے؟“ نالکہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے  
 بولی۔ ”میں اب یہاں سے جا رہی ہوں۔ لیکن اگر تم نے اس بوڑھے آدمی کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش  
 کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا اور ہاں اپنی ماں سے کہہ دیتا کہ جو سامان یہاں سے لے کر گئی ہے وہ کل  
 شام کا اندیرا پھیلنے سے پہلے پہلے یہاں واپس پہنچا دے۔ ورنہ تم جان گئے ہو کہ میں بھی حساب لینا جان چکی  
 ہوں۔ چلو دلاور... اب تو تمہارے لئے سواری کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ شبیر درانی کی جیب اور کس موقع پر  
 کام آئے گی۔“

وہ دونوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ دلاور نے ان تینوں کو را اقل کی زد پر لے رکھا تھا۔  
 نالکہ نے قالین پر پڑی ہوئی دونوں را اقلیں سنگ سے پکڑ کر اٹھالیں۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے اس  
 احتیاط سے دونوں را اقلوں کے میگزین نکال لئے کہ را اقلوں پر اٹھیلوں کے نشانات نہ آنے پائیں۔ اس نے  
 دونوں را اقلیں گیٹ کے اندر کی طرف لان کے پودوں میں پھینک دیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گیٹ کے  
 سامنے کھڑی ہوئی جیب کے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔

دلاور ڈرائنگ روم کے دروازے کو را اقل کی زد میں لے لے قدموں چلتا ہوا جیب کے قریب پہنچ  
 گیا۔ پچھلی سیٹوں پر دو گرم شالیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ موجوددار اور دوسرے گمن مین کی شالیں تھیں جو  
 جیب سے اترتے ہوئے ہمیں ڈال گئے تھے۔

”یہ چادر لے لو نالکہ بی بی۔“ دلاور نے جیب پر سوار ہو کر ایک چادر اس کی طرف پھینک دی۔

نالکہ درانی انجمن اشارت کر چکی تھی۔ اس نے چادر اپنے اوپر اوڑھ لی اور پھر اسٹیرنگ سنبھال کر جیب  
 کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

جیب جیسے ہی حرکت میں آئی تھی شبیر درانی، شباب الدین کو زوردار دھکے سے ایک طرف گراتا ہوا  
 ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکل کر گیٹ کی طرف دوڑا۔ موجوددار اور دوسرے گمن مین نے بھی اس  
 کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ انہوں نے نالکہ کو را اقلیں پودوں کی طرف پھینکتے ہوئے دیکھ لیا لیکن وہ یہ نہیں  
 دیکھ سکے تھے کہ نالکہ نے دونوں را اقلوں کے میگزین نکال لئے تھے۔

وہ دونوں پودوں کی طرف لپکے۔۔۔ انہیں رائٹلیں مل گئیں۔ وہ رائٹلیں اٹھا کر دوڑتے ہوئے گیٹ سے نکل کر گلی میں آگئے۔ جیپ اس وقت گلی کے موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ ان دونوں نے جیپ کو نشانہ بنانے کے لئے بیک وقت ٹرانسگر دبا دیئے، مگر کسی کی رائٹل نے شعلہ نہیں اگلا۔ دونوں کی رائٹلیں کھٹکھٹا کر رہ گئی تھیں۔ تب انہیں پتہ چلا کہ رائٹلوں میں میگزین نہیں تھے۔

”نمک حرامو! تم لوگ ایک عورت اور اس کتے کو نہیں پکڑ سکے۔“ شبیر درانی دھاڑا۔ ”اور تم!“ اس نے دوسرے گمن مین کو ٹھوکر ماری۔ ”تم تو کہتے تھے کہ وہ لوگ بنگلے میں نہیں ہیں۔ تم تو سارے کمرے چیک کر آئے تھے۔ کیا وہ آسمان سے ٹپک پڑے تھے؟“

”پتہ نہیں وہ کہاں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے تو سارے کمرے دیکھ لئے تھے سرکار۔“ گمن مین نے جواب دیا۔

”چلو۔۔۔ اب نکلویں اسے۔“ شبیر درانی چیخا۔  
ظاہر ہے انہیں پیدل مارچ ہی کرنا پڑا تھا۔ لیکن گلی سے نکل کر تھوڑی فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں ایک خالی ٹانگہ مل گیا جو ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ٹانگے میں سوار ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ٹانگے نے انہیں اس کوٹھی کے سامنے پہنچا دیا جہاں ان دنوں شبیر درانی مقیم تھا۔ شہر میں ان کے کئی مکان تھے جن کا ہر مینے ہزاروں روپے کرایہ آتا تھا۔ دو تین کوٹھیاں اپنے اور باہر سے آنے والے مسافروں کے لئے بھی خالی رکھی ہوئی تھیں۔ ٹانگہ نے جب ان کے مستقل رہائش والے مکان کو جلا کر راکھ کر ڈالا تو وہ اس کوٹھی میں نخل ہو گیا تھا۔

کوٹھی میں آتے ہی شبیر درانی ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کے سامنے بیٹھ گیا اور ریسپور اٹھا کر پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کال ڈیوٹی محرر نے ریسپو کی تھی۔  
”سب انسپکٹر عثمان سے بات کر آؤ۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”وہ اس وقت تھانے میں موجود نہیں ہیں جناب۔ کوئی خدمت ہو۔۔۔“  
شبیر درانی نے محرر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ریسپور پٹج دیا۔ اور صوفے سے ٹپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایک مرتبہ ٹانگہ جب اس کی قید میں تھی تو اس نے کہا تھا کہ عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو کمزور سے کمزور عورت بھی پھری ہوئی شیرنی بن جاتی ہے اور اب ٹانگہ واقعی پھری ہوئی شیرنی بن چکی تھی۔

ٹانگہ نے یہ بھی ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے بچائے ہوئے جال کے پھندے ٹوٹنا شروع ہو گئے ہیں۔ سابق والے کیس میں عدالت نے ٹانگہ درانی کو باعزت طور پر بری کر دیا تھا اور انسپکٹر اعظم کو اصل قاتل قرار دیتے ہوئے کیس ختم کر دیا تھا۔ اگر انسپکٹر اعظم زندہ رہتا تو اس وقت شبیر درانی بھی آہنی سلاخوں کے بندہ ہوتا۔ پولیس نے جو ہری کی دوکان پر ڈکیتی کے الزام میں جس نوجوان کو گرفتار کیا تھا اس نے انسپکٹر اعظم کے قتل میں حصہ لینے کا بھی اعتراف کیا تھا۔ اس نوجوان نے جس شخص کا نام بتایا تھا پولیس اس کو لانے کے لئے پہنچی تو انکشاف ہوا کہ جس روز انسپکٹر اعظم کو قتل کیا گیا تھا اس سے اگلے ہی روز وہ شخص ہی اس میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا تھا۔ پولیس کو بہر حال یہ شبہ تھا کہ انسپکٹر اعظم کے قتل کے پیچھے اصل آدمی لولی اور تھا اور اب ٹانگہ نے یہ دھمکی دی تھی کہ اسے چھڑانے کے لئے پولیس دین پر حملہ کرنے والوں کو بھی ہلد ہی بے نقاب کر دیا جائے گا۔

نالکھ نے واقعی اس کی غنڈیں حرام کر دی تھیں۔ دلاور جیسا خطرناک آدمی اس سے مل گیا تھا اور شیر درانی کو اپنے چاروں طرف خطرے منڈلاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

چند روز پہلے اناج کا ٹرک پکڑے جانے پر پولیس نے سیٹھ جیٹھانند کو بھی حراست میں لے لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ اناج اس نے شیر درانی سے خریدا تھا لیکن شیر درانی نے صاف انکار کر دیا تھا۔ سیٹھ جیٹھانند کے بارے میں سب یہی جانتے تھے کہ وہ کون تھا اور اس کا اصل دھندہ کیا تھا اور وہ ٹرکوں کے حساب سے جو اناج اور دیگر سامان خریدتا تھا وہ کہاں جاتا تھا۔ شیر درانی کی زمینوں کا اناج بھی کئی برسوں سے سیٹھ جیٹھانند کے توسط سے بھارت کو اسمگل ہو رہا تھا۔

اور اب شیر درانی سوچ رہا تھا کہ اگر جیٹھانند اور پکڑے جانے والے اناج کے ٹرک کے بارے میں مزید انکوائری ہوئی تو یہ راز بھی فاش ہو جائے گا کہ اس کی زمینوں پر پیدا ہونے والا آدھے سے زیادہ اناج غیر قانونی طور پر سرحد پار جا رہا تھا۔ لیکن وہ جیٹھانند جیسے لوگوں کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس قسم کا غیر قانونی دھندہ کرنے والے اکیلے نہیں ہوتے۔ انہیں قانون کے محافظوں اور با اثر لوگوں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ سیٹھ جیٹھانند کو اگرچہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع کو غیر قانونی طور پر اناج لے جانے کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا لیکن وہ اسی روز اپنی ضمانت کروا کر ماحیلو واپس چلا گیا تھا۔ اناج کے ٹرک ضبط کر لئے گئے تھے۔ جانے سے پہلے جیٹھانند نے اس سے بھی ملنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ جس سے شیر درانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ لاکھوں روپے کا نقصان ہونے پر جیٹھانند کو غصہ تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح اس پر غصہ اتارنے کی کوشش کرے گا۔

اس کے علاوہ دونوں حویلیوں کی آتشزدگی کا مسئلہ بھی اس کی جان کو اٹکا ہوا تھا۔ گل مرگ میں نالکھ کی حویلی اور اناج کے گودام میں آتشزدگی کے بارے میں تو انہوں نے پولیس کو یہ بیان دے دیا تھا کہ چونکہ نالکھ کی جائیداد قانونی طور پر حسینہ بیگم کی تحویل میں دے دی گئی تھی اس لئے اس نے ان لوگوں کو قانونی الجھنوں میں الجھانے کے لئے اپنی ہی حویلی کو آگ لگوا دی تھی۔ شیر درانی اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس ان کے اس بیان سے مطمئن نہیں تھی۔ کیونکہ سیٹھ جیٹھانند نے بھی یہ بیان دے دیا تھا کہ اس نے گل مرگ کی حویلی کے گودام سے اناج ٹرکوں میں بھر دیا تھا۔ شیر درانی نے گل مرگ کے تمام کسانوں کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر کسی نے ان کے خلاف بیان دیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس طرف سے تو وہ کسی حد تک مطمئن تھا۔ لیکن اپنے شر والے مکان کی آتشزدگی کے معاملے میں زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس آتشزدگی کے بارے میں اس کا اپنا بیان کچھ اور تھا، ملازمین کا بیان کچھ اور، جبکہ حسینہ بیگم نے ان دونوں سے مختلف بیان دیا تھا۔

شیر درانی کے خیال میں اس فساد کی جڑ نالکھ تھی۔ لیکن اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ غلطی اس کی اپنی اور اس کی ماں کی تھی۔ جائیداد کی ہوس میں ان دونوں نے حقائق کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

شیر درانی رات بھر یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ نالکھ نے اسے جو زخم لگائے تھے وہ آسانی سے مندمل ہونے والے نہیں تھے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتا لیکن انتقام کے جذبے اور شدید نفرت نے اس کے حواس چھین لئے تھے۔ وہ نالکھ سے سمجھوتے کے بارے میں کوئی بات سوچنے کو تیار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا کہ اگر نالکھ سے کوئی سمجھوتہ ہو بھی گیا تو قانون اسے

نہیں چھوڑے گا۔ نائلہ کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے پولیس وین پر جو حملہ ہوا تھا اس میں چھ آدمی مارے گئے تھے جن میں تین چار پولیس والے بھی شامل تھے۔ پولیس اس کیس کو آسانی سے ختم نہیں کر سکتی تھی اور جب بات بہت آگے نکل جائے گی تو ایک نہ ایک دن یہ راز کھل ہی جائے گا کہ اس کارروائی کے پیچھے اصلی ہاتھ کس کا تھا۔

شبیر درانی کے مسائل بڑھتے اور الجھتے جا رہے تھے۔ دلاور کی وجہ سے وہ نائلہ کی طرف سے کچھ زیادہ خطرہ محسوس کرنے لگا تھا۔ دلاور کے بارے میں وہ بہت کچھ جان چکا تھا۔ وہ اس کے لئے دنیا کا سب سے خطرناک انسان ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس کے خیال میں سب سے پہلے دلاور کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔

صبح وہ دس بجے کے لگ بھگ سو کر اٹھا ہی تھا کہ موجددار نے ڈی ایس پی کی آمد کی اطلاع دی۔ ”اس کے ساتھ سب انسپکٹر بھی ہے سرکار۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھادیا ہے۔“ موجددار نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں آرہا ہوں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ ڈی ایس پی کو یہ طویل انتظار بہت ناگوار مگزرا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے لیکن شبیر درانی کو دیکھ کر اسے اخلاقی مسکراتا ہوا۔

”ہیلو ڈی ایس پی صاحب۔“ شبیر درانی اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”فرمائیے، کیسے زحمت کی۔ تشریف رکھئے نا۔“

وہ بیٹوں بیٹھ گئے۔ شبیر درانی نے سب انسپکٹر سے ہاتھ ملانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈی ایس پی کی آمد کس سلسلے میں ہو سکتی ہے۔

”فرمائیے جناب۔ کیسے زحمت فرمائی؟“ بالاخر شبیر درانی خود ہی بولا۔

”بات زیادہ پرانی نہیں ہوئی۔“ ڈی ایس پی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ پہلے نائلہ درانی کو حراست سے چھڑانے کے لئے پولیس وین پر حملہ کیا گیا تھا جس میں چھ آدمی مارے گئے تھے؟“

”اس خوفناک واقعہ کو کون بھول سکتا ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اور جہاں تک مجھے یاد ہے پولیس اس سلسلے میں نائلہ درانی کے خلاف کیس بھی درج کر لیا تھا۔“

”جی ہاں۔“ ڈی ایس پی نے جواب دیا۔ ”نائلہ درانی پر قتل کا ایک اور کیس بھی تھا جس میں وہ بے گناہ ثابت ہوئی اور عدالت نے اسے باعزت طور پر بری کر دیا۔ اب اس کیس کی تفتیش نے بھی ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔“

”اور آپ کے خیال میں نائلہ اس کیس میں بھی بے گناہ ہے۔“ شبیر درانی نے اسے گھورا۔ ”کیا آپ درانی کی کچھ زیادہ ہی فیور نہیں کر رہے ڈی ایس پی صاحب!“

”میں کسی کی فیور نہیں کر رہا۔“ ڈی ایس پی نے جواب دیا۔ ”اور جہاں تک کسی کے بے گناہ یا گناہگار ہونا متعلق ہے تو اس قسم کا کوئی فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے۔ واقعات اور شہادتوں کی روشنی میں کسی کو بے گناہ قرار دینا معزز عدالت کا کام ہے۔“

”تو پھر تفتیش نے کونسا نیا رخ اختیار کیا ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”پولیس دین پر حملہ کرنے کے لئے جو گاڑی استعمال کی گئی تھی وہ پولیس کو مل گئی ہے۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ شبیر درانی بولا۔ ”اس سے تو مجرموں کا سراغ لگانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔“

”جی ہاں۔“ ڈی ایس پی نے جواب دیا۔ ”اور شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ گاڑی آپ کی ملکیت ہے۔“

”میری گاڑی!“ شبیر درانی اچھل پڑا۔ ”کہاں سے ملی؟ وہ میری گاڑی کیسے ہو سکتی ہے؟“

”یہ گاڑی شہر سے تقریباً تین میل دور اینٹوں کے بھٹے کے قریب ایک پرانے کنویں سے ملی ہے اور میرا خیال ہے کہ اینٹوں کا وہ بھند بھی آپ کی ملکیت ہے۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”جی ہاں۔ وہ بھند تو میری ملکیت ہے لیکن وہ گاڑی...“

”گاڑی کی نمبر پلیٹیں نہیں تھیں جس کی وجہ سے ہمیں اس گاڑی کی شناخت میں خاصی دشواری پیش آئی اور خاصا وقت لگا۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”گاڑی کی شناخت کے لئے انجن اور چیسز نمبر کے حوالے سے پورے پاکستان میں وہیکل رجسٹریشن کے دفاتر سے رابطہ قائم کیا گیا تھا جس میں خاصا وقت لگ گیا اور بالاخر یہ پتہ چل گیا کہ نوے ماڈل کی وہ ٹیوٹا کرولا کار آپ کی ملکیت ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”اوہ!“ شبیر درانی بولا۔ ”وہ ٹیوٹا کرولا... میری یہ گاڑی تقریباً تین مہینے پہلے صادق آباد سے چوری ہو گئی تھی اور میرے آدمی نے صادق آباد پولیس اسٹیشن میں اس کی رپٹ لکھوا دی تھی۔ آپ تھانے کا ریکارڈ چیک کر کے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں ڈی ایس پی صاحب۔“ شبیر درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”میری گاڑی کی چوری کا یہ واقعہ پولیس وین پرفارمنگ سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے پیش آیا تھا۔“

”ہوں۔“ ڈی ایس پی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”ٹھیک ہے درانی صاحب! آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔“

ڈی ایس پی اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ شبیر درانی نے اس مرتبہ بھی سب انکسٹر سے ہاتھ ملانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید وہ کسی چھوٹے پولیس آفیسر سے مصافحہ کرنے میں اپنی توجہ نہ سمجھتا تھا۔ اگر سب انکسٹر اکیلا آیا ہوتا تو شاید وہ اس سے ملنا بھی پسند نہ کرتا۔

”موجمدار!“ شبیر درانی اندرونی دروازے کی طرف رخ کر کے چیخا۔

”جی سرکار!“ موجمدار اللہ دین کے جن کی طرح فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

”چائے لاؤ۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی۔ ”راجہ صاحب سے بات کراؤ۔“ اس نے دوسری طرف سے ہیلو کے جواب میں کہا۔

”راجہ صاحب ممانوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ وہ اس وقت فون پر کسی سے بات نہیں کر سکتے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”شبیر درانی بول رہا ہوں۔“ شبیر درانی کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ”میرا نام بتاؤ راجہ صاحب کو بتاؤ اور

کنو فوراً مجھ سے بات کریں۔“

”معاف کیجئے جناب۔ میں نے آپ کی آواز نہیں پہچانی تھی۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں راجہ صاحب کو۔ آپ ہولڈ کیجئے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

شبیر درانی ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا۔ اسے یہ انتظار بہت کھل رہا تھا۔ راجہ اس علاقے کا ایک زمیندار تھا۔ اس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔ اسے سیاست میں لانے والے شبیر کا باپ ہی تھا اور اسے ہر ایکشن میں اسمبلی تک پہنچانے والے بھی یہی تھے۔ درانی فیملی انہیں لاکھوں روپے خرچ کر کے اسی لئے آگے لاتی تھی کہ بوقت ضرورت ان سے کام لیا جاسکے اور شبیر درانی بھی اس وقت راجہ صاحب سے ایک کام لینا چاہتا تھا۔

”جی درانی صاحب!“ ٹھیک دو منٹ بعد ریسیور پر راجہ صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”معافی چاہتا ہوں۔“  
 داصل باہر سے کچھ ممان آئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور آپ تو جانتے ہیں کہ انہی لوگوں کی وجہ سے میں اسمبلی تک پہنچا ہوں۔ اگر ان لوگوں کو وقت نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔“  
 ”تو گویا اب ہماری کوئی اہمیت نہیں رہی۔“ شبیر درانی کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں درانی صاحب! آپ ہی کے دم سے تو میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان چھوٹے لوگوں کو بھی تھوڑا بہت وقت دینا ہماری مجبوری ہے۔ آپ حکم کریں سائیں! کیسے یاد فرمایا؟“ راجہ صاحب نے کہا۔

”ایک چھوٹا سا کام تھا۔ میں خود بھی یہ کام کروا سکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرا نام سچ میں آئے۔ اس لئے تمہیں فون کیا ہے۔“ شبیر درانی بولا۔  
 ”آپ حکم کیجئے سرکار۔“ راجہ صاحب نے کہا۔

”یہ ڈی ایس پی کچھ پرزے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ صادق والے کیس کی تحقیقات کرانے اور نائلہ کی عدالت سے بریت میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے یہاں سے کسی ایسی جگہ بھجوا دیا جائے جہاں اسے ہم جیسے لوگوں کی قدر کا احساس تو ہو۔ لیکن اس سے پہلے کوشش کرو کہ وہ ہماری سرپرستی سے کچھ فائدہ اٹھالے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”وہ اس قسم کی کوئی پیشکش قبول نہیں کرے گا۔“ راجہ صاحب نے کہا۔ ”وہ بہت دیا نندار آفیسر ہے۔ اپنی محنت سے یہاں تک پہنچا ہے اور سوکھی تنخواہ پر گزارہ کرتا ہے۔ البتہ آپ کے دوسرے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ میں بات کروں گا لیکن اس میں چند روز لگ جائیں گے۔“

”چند روز۔“ شبیر درانی بولا۔ ”یہ بہت لمبی مدت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ دو تین دن میں اس کا پتہ کٹ جائے۔“

”کوشش کروں گا سرکار۔“ راجہ صاحب نے کہا۔ ”اور کوئی حکم؟“

”بس یہی کام تھا۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اسی دوران موجد دار نے اس کے سامنے کافی ٹیبل پر چائے رکھ دی تھی۔ شبیر درانی چائے کی چسکیاں پیتے ہوئے ڈی ایس پی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ وہ مقیمینا بہت دیا نندار آفیسر تھا۔ وہ ایک اے ایس آئی کی حیثیت سے پولیس میں بھرتی ہوا تھا اور اپنی فرض دانی محنت اور دیا ننداری کے باعث بہت کم عرصہ میں اس عہدے تک پہنچا تھا۔ رشوت اور سفارش کے

نام سے اسے چڑھی۔ سفارش لے کر آنے اور رشوت کی پیشکش کرنے والے کو وہ پہلے سلاخوں کے پیچھے بند کرنا اور پھر اس سے بات کرنا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ سفارش لانے اور رشوت دینے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود کسی نہ کسی جرم یا کسی اور قسم کے کاموں میں ملوث ہوتے ہیں۔

صادق والے کیس کی تحقیقات بھی اسی ڈی ایس پی نے شروع کروائی تھی۔ اگر یہ تحقیقات شروع نہ ہوتی تو ناکہ درانی عدالت سے کبھی بھی پری نہ ہوتی۔ شیردرانی نے اس وقت بھی ڈی ایس پی کو کسی کے ذریعے اچھی خاصی رشوت کی پیشکش کی تھی، ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکایا بھی تھا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

اور اب محض کسی گاڑی کے انجن اور چیسز نمبر کی مدد سے اس کے مالک تک پہنچ جانا بھی ڈی ایس پی کی فرض شناسی، اپنے کام سے لگن اور محنت کی عکاسی کر رہا تھا۔ شیردرانی سوچ رہا تھا کہ جو پولیس آفیسر محض انجن اور چیسز کی مدد سے کار کے مالک تک پہنچ سکتا ہے، وہ یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ پولیس دین پر حملے کے لئے یہ کارکن لوگوں نے استعمال کی تھی۔

شیردرانی نے ناکہ کو پولیس کو حراست سے چھڑانے کے لئے دین پر حملے کا منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ انسپٹر اعظم بھی اس کے اس منصوبے میں شامل تھا اور اس کے مشورے سے اس نے پولیس دین پر حملے سے ایک ہفتہ پہلے یہ کارغائب کر کے صادق آباد میں اپنے ایک آدمی کے ذریعے گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروادی تھی۔ صادق آباد تھانے کے ریکارڈ میں اگرچہ یہ رپورٹ موجود تھی لیکن شیردرانی اب اس ڈی ایس پی سے خطرہ محسوس کرنے لگا تھا اور اسی لئے اس نے راجہ صاحب کے ذریعے اس ڈی ایس پی کو یہاں سے کہیں دور بھجوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی جگہ نیا آنے والا ڈی ایس پی اتنا بیوقوف نہیں ہو گا کہ آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا دے۔

پورا دن گزر گیا۔ شیردرانی کی جیب بھی ابھی تک نہیں ملی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ ناکہ اور دلاور نے جیب کہاں غائب کر دی تھی۔ اگر انہوں نے جیب شہر میں کہیں چھوڑ دی تھی تو اب تک اس کا پتہ چل جانا چاہئے تھا۔ لیکن بالا خرچہ پانچ بجے کے لگ بھگ اسے جیب کے بارے میں بھی اطلاع مل گئی۔

”سرکار! جیب کا پتہ چل گیا ہے۔“ اس کے ایک کارندے نے بتایا۔

”کہاں ہے؟ کہاں سے ملی؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”ریلوے اسٹیشن سے ذرا آگے، پل کے قریب نہریں۔“ کارندے نے جواب دیا۔ ”اسے نکالنے کے لئے کرین کی ضرورت ہوگی سرکار۔ کرین کے بغیر جیب کو نہر سے نہیں نکالا جاسکتا۔“

شیردرانی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی کیفیت پر جلد ہی قابو پایا۔

”موجمدار!“ اس نے موجمدار کو آواز دی اور اس کے آنے پر بولا۔ ”کسی ورک شاپ سے کرین لے کر جاؤ اور جیب کو نہر سے نکلاؤ۔ جیب کو ورک شاپ ہی بھجوا دینا۔“

”جی سرکار۔“ موجمدار اس کارندے کو لے کر باہر نکل گیا۔ موجمدار کی واپسی تقریباً ”تین گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق جیب کو نہر میں پھینکنے سے پہلے اچھا خاصا نقصان پہنچایا گیا تھا۔ اس کے انجن کے بہت سے پرزے نکال کر پھینک دیئے گئے تھے۔ شیردرانی خون کے گھونٹ پی کر ہی توراہ گیا۔

رات دس بجے شیردرانی کھانا کھا رہا تھا کہ موجددار اندر داخل ہوا۔  
 ”سرکار!“ موجددار نے کہا۔ ”بھولو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“  
 ”اس سے پوچھو کیا کام ہے۔ خود ہی نمٹ لو اس سے۔“ شیردرانی نے کہا۔  
 ”سرکار!“ موجددار بولا۔ بھولا کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔ وہ اپنے  
 سے یہ خوشخبری آپ کو سنانا چاہتا ہے۔“  
 ”ہلاؤ اسے۔“ شیردرانی بولا۔

موجددار باہر چلا گیا اور چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ بھولونا می کارندہ بھی تھا۔  
 ”کیا بات ہے۔ کیا خوشخبری ہے تمہارے پاس بھولو؟“ شیردرانی نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی  
 دیکھا۔

”دلاور ہمارے قبضے میں آگیا ہے سرکار۔“ بھولو نے کہا۔  
 ”کیا..... کیا واقعی؟ کہاں ہے وہ؟“ شیردرانی اچھل پڑا۔  
 ”وہ نور پور والے ڈیرے پر ہے سرکار۔“ ہمارے دو آدمیوں نے اسے رسیوں سے باندھ کر وہاں ڈال  
 دیا۔“ بھولو نے جواب دیا۔  
 شیردرانی کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔

”موجددار! پجیرو نکالو..... میں آ رہا ہوں۔“ شیردرانی نے کہا۔  
 موجددار اور بھولو فوراً ہی باہر نکل گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد شیردرانی باہر آیا تو برآمدے کے  
 سرسبز پجیرو تیار کھڑی تھی۔ موجددار اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک گن مین نے شیر  
 درانی کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ شیردرانی کے بیٹھنے کے بعد گن مین نے دروازہ بند کر دیا اور  
 اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پجیرو حرکت میں آگئی۔  
 شیردرانی کا بایاں بازو سڑک میں تھا۔ اور دوسرا ہاتھ اس نے سامنے ڈیش بورڈ پر جمار کھا تھا۔ جپ شہر  
 کے لوگوں پر گھومنے کے بعد نور پور کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئی۔

نور پور شہر سے تقریباً ”چھ میل دور چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی اور اس سے آدھا  
 میل کے وہ ڈیرا تھا جہاں بھولو کے کہنے کے مطابق دلاور کو باندھ کر رکھا گیا تھا۔ یہ ساری زمینیں شیردرانی  
 کی ملکیت تھیں اور بستی سے دور وہ ڈیرا ویران تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس ڈیرے پر مویشی باندھے جاتے تھے  
 اور وہاں کی چوری کی مسلسل وارداتوں کے بعد مویشیوں کو بستی کے ایک احاطے میں منتقل کر دیا گیا تھا  
 اور وہاں پر ویران ہو گیا تھا۔

پلی سڑک سے ڈیرے تک تقریباً ”ڈیڑھ میل کا راستہ کچا تھا۔ پجیرو کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ ان  
 کی جلدی سے شیردرانی بھی کئی مرتبہ سیٹ پر اچھلا تھا۔ بالاخر پجیرو ڈیرے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔  
 شیردرانی نے جلدی سے نیچے اتر کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور شیردرانی نیچے اتر آیا۔

وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ جس کمرے میں داخل ہوا اس میں گوبر کی بو بھری ہوئی تھی۔ کمرے میں دو  
 چار مل رہے تھے جو زمین پر مختلف جگہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کمرے کی چھت کو سارا دینے کے لئے  
 لکڑی کے دو ستون بھی تھے اور ایک ستون کے ساتھ دلاور رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر شیردرانی  
 لہو لہو پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ دلاور کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے کارندوں نے اس کی اچھی خاصی



تواضع کروالی تھی۔

”کیسے پکڑا اس گیدڑ کو تم لوگوں نے؟“ شبیر درانی نے اپنے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا جو پہلے غلے سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رانٹلیں تھیں اور وہ دونوں اس طرح مستعد نظر آ رہے تھے جیسے بندھے ہوئے ہونے کے باوجود دلاور کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ محسوس کر رہے ہوں۔

”شہر میں ایک تندور سے روٹیاں لے رہا تھا کہ ہماری نظر پڑ گئی۔ اتفاق سے اس وقت اسکے پاس رانٹل نہیں تھی۔ ہم نے اپنی رانٹلوں کی زد پر اسے قابو کر لیا اور یہاں لے آئے۔“ ایک کارندے نے بتایا۔

”کیوں دلاور!“ شبیر درانی اس کے قریب آگیا۔ ”تم تو بڑے بہادر ہو۔ موت سے ٹکرا جانے والے۔ ان دو آدمیوں کے قبضے میں کیسے آ گئے۔“

دلاور نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ ”بزدل ہو تم!“ اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”میری رسیاں کھول دو۔ پھر میری بہادری آزمایا۔“

شبیر درانی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دلاور نے اس کے کارندوں کے سامنے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے سے تھوک صاف کیا اور پھر اچانک ہی دلاور کے جڑے پر گھونسا رسید کر دیا۔

دلاور کراہ اٹھا۔ شبیر درانی اس پر گھونسوں اور لالٹوں کی بارش کرتا رہا۔ دلاور کے پیٹ پر اس نے کڑی ٹھوکریں ماری تھیں۔ دلاور بری طرح چیخ رہا تھا مگر اس دیرانے میں اس کی چیخیں سننے والا کون تھا۔ دلاور کو ایک گھونسا مارتے ہوئے دفعتاً ”شبیر درانی بھی کراہ اٹھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے پلستر چڑھے بازو کو تھپک لیا۔ جھٹکے لگنے سے اس کے مضروب بازو میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

”اس حرامزادے سے معلوم کرو وہ کتنا کہاں ہے۔“ شبیر درانی اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے دہاڑا۔ ”اگر یہ زبان نہ کھولے تو اس کے ٹکڑے کر کے باہر کتوں کے سامنے ڈال دو۔“

موجمدار رانٹل زمین پر رکھ کر دلاور کے سامنے آگیا۔ دلاور کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ موجمدار نے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سینے کے ٹھیک دل کے مقام پر ایک زوردار گھونسا مار دیا۔

دلاور کے سینے سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ اسے سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”ابے کچھ بتائے گا یا زبان کھولے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہونے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ لیکن یہ جان لے کہ موجمدار کا ہاتھ مردوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اب بتادے میرا دیر! کہاں چھپی ہوئی ہے وہ کوئی جس نے ہمارے مالک کی عزت کو مٹی میں ملا رکھا ہے۔ اگر تو اسکا پتہ بتادے تو مالک تمہیں دولت سے مال کر دیں گے۔“ موجمدار بولا۔

”تم لوگ مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکتے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”میں ناکہ بی بی کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں گا۔“

”کیوں ایک عورت کے لئے اپنی جان گنوا رہے ہو پاگل آدمی۔“ موجمدار نے کہا۔ ”اور عورت ایسی بے وفا جو اپنوں کی نہیں ہو سکی۔ تمہیں اس سے کیا ملے گا۔ چل جلدی سے بتادے کہاں ہے وہ؟“

دلاور نے جواب دینے کی بجائے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ موجمدار پر جنون سا طاری ہو گیا اور

دلاور پر پل پڑا۔ دلاور بری طرح پٹا رہا لیکن اس نے زبان نہیں کھولی۔  
 ”یہ ایسے نہیں بتائے گا۔“ شبیر درانی نے موجددار کو روک دیا۔ ”اسے رسی سے باندھ کر باہر کنویں  
 میں الٹا لٹکا کر پانی میں دو چار ڈبکیاں دو۔۔۔۔۔ خود ہی زبان کھول دے گا۔“

دلاور کو ستونوں سے کھول کر زمین پر ڈال دیا گیا۔ اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور پیروں کو بھی باندھ  
 ان کے ساتھ ایک لمبی سی رسی بھی باندھ دی گئی۔ ڈیرے کے باہر ایک پرانا کنواں تھا۔ کسی زمانے پر اسی  
 کنویں پر رہٹ چلا کرتا تھا اور اس کنویں کے پانی سے زمینوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔ لیکن بستی کے مکانوں  
 کے قریب ٹیوب ویل لگ جانے سے یہ کنواں متروک ہو گیا تھا۔

دو آدمی دلاور کو اٹھا کر کنویں کے قریب لے آئے اور منڈیر پر چڑھ کر اسے کنویں میں لٹکانے لگے۔  
 دلاور بری طرح پھل رہا تھا مگر وہ لوگ اسے سر کے بل کنویں کے ہمدرد لٹکانے میں کامیاب ہو گئے اور اس کے  
 پاؤں سے بندھی ہوئی رسی کو آہستہ آہستہ ڈھیل دی جاتی رہی۔

ایک آدمی ٹارچ کی روشنی میں دلاور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اشارے پر کبھی رسی ڈھیلی کر دی جاتی اور  
 کبھی اسے اوپر کھینچ لیا جاتا۔ دلاور کو بار بار پانی میں ڈبکیاں دی جا رہی تھی۔ وہ سر کے بل رسی سے لٹکا ہوا  
 ہی طرح پھل رہا تھا۔ دو تین مرتبہ اسے اتنی دیر تک پانی میں ڈبوئے رکھا گیا کہ دلاور کو اپنے پیچھے بڑے پھٹنے  
 کے محسوس ہونے لگے تھے۔

بالآخر شبیر درانی کے اشارے پر دلاور کو کنویں سے نکال کر دوبارہ کمرے میں لے آیا گیا اور ہاتھوں  
 اس کی رسیاں کھولے بغیر اسے زمین پر ڈال دیا گیا۔ دلاور کے منہ سے خون اور پانی بہہ رہا تھا۔  
 شبیر درانی نے آگے بڑھ کر اس کے جسم پر دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں۔  
 ”ہٹاؤ، کہاں چھپا رکھا ہے اس کتیا کو؟“ شبیر درانی دہاڑا۔

”اب تمہیں اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کتیا تمہارے سامنے کھڑی ہے۔“  
 یہ آواز سن کر وہ سب اچھل پڑے شبیر درانی نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں نائلہ درانی کھڑی تھی اور  
 اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی۔ ایک آدمی جلدی سے اپنی رائفل کی طرف لپکا تھا۔ نائلہ درانی نے ٹرائیگر  
 اٹھایا۔ اس کی رائفل سے نکلنے والی گولی اس آدمی کے پیروں کے قریب زمین میں پھونسی ہو گئیں۔  
 ”اگر کسی نے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی تو میں اسے پھینکی کر دوں گی۔“ نائلہ غرائی۔ اس کے چہرے  
 پہ پناہ درندگی تھی۔ ”اس کے ہاتھ پیر کھول دو۔“

وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر شبیر درانی کا اشارہ پا کر ایک آدمی آگے بڑھ کر دلاور  
 کے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھولنے لگا۔

دلاور کی حالت بہت خستہ تھی۔ اسے اٹھ کر کھڑے ہونے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔  
 ”دلاور! کیا تم گاڑی تک چل سکتے ہو؟“ نائلہ نے کہا۔

”ہاں نائلہ بی بی۔“ دلاور نے رک رک کر جواب دیا۔ ”میں بہت سخت جان ہوں۔ یہ بزدل میرا کچھ  
 نہیں ہاڑ سکے۔“

دلاور لڑکھڑاتا ہوا نائلہ کے قریب گیا۔  
 ”اگر تم میں سے کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو گا۔  
 آپ میں تم جیسے درندوں پر کوئی رحم نہیں کروں گی۔“ نائلہ نے کہا اور دلاور کے ساتھ اٹھ قدموں پیچھے ہٹنے

گئی۔ دلاور کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ مگر اتنا تشدد برداشت کرنے کے باوجود اس کی قوت ارادی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ شبیر درانی خونخوار نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا تھا۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی نائلہ نے بڑی پھرتی سے دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا اور ایک ہاتھ سے دلاور کا ہاتھ پکڑ کر پجیرو کی طرف دوڑنے لگی۔ جو چند گز سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دلاور بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ شبیر درانی کی پجیرو کے قریب پہنچ کر پہلے نائلہ نے دلاور کے لئے دروازہ کھولا اور پھر اسیشترنگ سائیڈ پر آگئی۔ اس نے اسیشترنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارٹ کیا ہی تھا کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ کمرے میں بند شبیر درانی کے آدی دروازے پر فائرنگ کر رہے تھے۔

نائلہ نے گاڑی کو مینیر میں ڈال کر اسے تیزی سے کچے راستے پر موڑ دیا اور ایکسیلریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتی چلی گئی۔ ٹھیک اسی وقت کمرے کے دروازے کا کنڈا ٹوٹ گیا۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور شبیر درانی کے آدی راقطنیں سنبالے دوڑتے ہوئے باہر نکلے اور انہوں نے دور دور ہوئی پجیرو پر فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں لہراتی ہوئی پجیرو کے آس پاس سے گزر رہی تھی۔ دو گولیاں پجیرو کے پچھلے فینڈر پر اور دو تین اس سے ذرا اوپر باڈی میں لگی تھیں جس سے باڈی میں سوراخ ہو گئے تھے۔ اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ایک گولی پجیرو کے پچھلے ٹائر میں لگی تھی۔ پجیرو بری طرح لڑکھڑا گئی مگر نائلہ نے بڑی ہوشیاری سے اسے سنبھال لیا اور ایکسیلریٹر پر پیر کا دباؤ مسلسل بڑھاتی رہی اور پجیرو لڑکھڑاتی ہوئی دوڑتی رہی۔

موجمدار اور اس کے ساتھی پجیرو کے پیچھے دوڑتے ہوئے فائرنگ کرتے رہے لیکن ٹائر پھٹ جانے کے باوجود پجیرو فائرنگ کی ریخ سے نکل چکی تھی۔ موجمدار اور اس کے ساتھی کھیتوں میں رک گئے اور بہت دور اچھلتی ہوئی پجیرو کی عقبی سرخ تیلوں کو دیکھتے رہے۔

نائلہ زورانی دلاور کو موت کے منہ سے نکال کر لائی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذرا سی غلطی انہیں دوبارہ موت کے منہ میں دھکیل دے۔ اس لئے وہ پجیرو کا ایک پچھلا ٹائر پھٹ جانے کے باوجود ایکسیلریٹر دبائے جاری تھی۔ ٹائر پھٹ جانے سے رفتار بہت کم ہو گئی تھی اور پجیرو کچے راستے پر بری طرح اچھل رہی تھی۔

نائلہ بار بار دلاور کی طرف بھی دیکھ رہی تھی جو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ ڈیش بورڈ کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا جس سے نائلہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اسے بری طرح بریت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

پجیرو کھیتوں کے کچے راستے سے نکل کر پکی سڑک پر آگئی۔ نائلہ نے اس کی رفتار مزید بڑھانا چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ٹائر پھٹا ہوا ہونے کی وجہ سے رفتار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ پجیرو لڑکھڑاتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ پکی سڑک پر آجانے سے بہر حال کچھ آسانی ہو گئی تھی۔

نائلہ نے پجیرو کے ہیڈ لیمپس اور دیگر تمام بتیاں بجھا رکھی تھیں۔ صرف ڈیش بورڈ کے ڈائمنڈز کی ننھی سرخ، سبز اور نیلی بتیاں جل رہی تھیں جن کی بہت مدھم روشنی میں ان دونوں کے چہرے بڑا عجیب سا تاثر دے رہے تھے۔

دور شرکی اوگھتی ہوئی سی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ نائلہ نے ڈیش بورڈ پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف

دیکھا۔ روشن ہند سے دو بجکر پانچ منٹ کا وقت بتا رہے تھے۔ نائلہ نے دلاور کی طرف دیکھا۔  
 ”کیسے ہوا ب؟“ وہ بولی۔ ”پیدل چل سکو گے! اس بجیر و پر ہم شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ پولیس  
 والے شبیر درانی کی اس گاڑی کو پچانتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ گاڑی کسی کی نظروں میں آجائے۔ اس  
 لئے اسے شہر سے باہر ہی چھوڑنا ہو گا۔“

”ہاں، چل لوں گا۔“ دلاور نے جواب دیا۔  
 نائلہ نے شہر کے قریب ترین لے جا کر بجیر و روک لی اور انجن بند کر دیا پھر رانقل اٹھا کر اس کے بٹ  
 سے ضربیں لگا لگا کر ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے مختلف ڈائلز کے شیشے توڑنے لگی۔ اس نے ڈائلز کی سوئیاں اکھاڑ  
 کر پھینک دیں۔ تمام ٹائپس وغیرہ توڑ ڈالیں۔ ایک ٹائپ کھینچنے سے انجن کا ہڈ کھل گیا۔  
 دلاور اور نائلہ نیچے اتر آئے۔ نائلہ نے رانقل کے بٹ مار مار کر روڈ اسکرین اور تمام شیشے توڑ دیئے  
 اور انجن کو بھی جتنا زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکتی تھی پہنچاتی رہی۔ اس نے تمام تاریں بھی نوچ ڈالی  
 تھیں۔

دلاور ایک طرف کھڑا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس نے نائلہ کو روکنے یا منع کرنے کی کوشش  
 نہیں کی تھی۔ نائلہ دیر تک بجیر و پر اپنا غصہ اتارتی رہی پھر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔  
 جب اپنے تنفس پر قابو پا چکی تو اس نے رانقل کندھے پر لٹکالی اور ایک ہاتھ سے دلاور کا ہاتھ پکڑ کر چلنے  
 لگی۔

دلاور کچھ دور تک تو لڑکھاتا رہا لیکن پھر بتدریج اس کی چال سنبھلتی گئی اور وہ تیز چلنے کی کوشش کرنے  
 لگا لیکن نائلہ کی تیز رفتاری کا ساتھ وہ بہر حال نہیں دے پا رہا تھا۔ نائلہ اسے تقریباً ”تھسٹی ہوئی دوڑ رہی  
 تھی۔“

وہ شہر کے بیرونی علاقے کی ایک کچی بستی میں داخل ہو گئے اور گلیوں میں گھومتے ہوئے چلتے رہے۔ کچی  
 بستی سے نکل کر شہر کے ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں چھوٹے چھوٹے بنگلے تھے۔  
 اس وقت چاروں طرف سناٹا تھا۔ کبھی کبھی اس سناٹے میں چوکیدار کے وسل کی آواز سنائی دے جاتی  
 تھی۔ وہ دونوں ایک بنگلے کے سامنے رک گئے۔ نائلہ نے گیٹ کو دھکا دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ دلاور کے اندر  
 آنے کے بعد اس نے گیٹ بند کر دیا اور وہ دونوں برآمدے میں آگئے۔ برآمدے والا دروازہ بھی لاک نہیں  
 تھا۔ وہ دونوں اندر آگئے اور نائلہ نے دروازہ بند کر کے اندر سے کھڑا لگا دیا۔

یہ بنگلہ بھی نائلہ ہی کی ملکیت تھی جو کئی سال پہلے زیر نانی ایک ادیب عمر حفص کو کرائے پر دیا گیا تھا۔ زیر  
 کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ لیور برادرز کی فیکٹری میں ملازم تھا۔ مقول تنخواہ تھی۔ بیوی اور  
 ایک کسن بیٹا تھا جو ابھی صرف تیسری کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ شادی کے طویل عرصے بعد خدا نے انہیں  
 اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔ دونوں میاں بیوی بیٹے کو بہت چاہتے تھے۔

زیر ایک شریف آدمی تھا۔ وہ کئی سال سے اس بنگلے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ اس نے  
 کرائے کے معاملے میں کبھی بھی پریشان نہیں کیا تھا۔ مکانوں اور دوکانوں کا کرایہ وصول کرنے کے لئے  
 اگرچہ فشی موجود تھا مگر زیر عیش و تاراج کو کرایہ خود پہنچایا کرتا تھا۔ اس طرح نائلہ کے والد عبدالصمد درانی  
 سے بھی اس کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ عبدالصمد درانی اس کی شرافت کا قائل تھا۔ زیر کی چھٹی والے دن وہ  
 خود بھی کبھی کبھی زیر کے گھر آجایا کرتا تھا اور ان میں دیر تک گپ شپ رہتی تھی۔

اور پھر ٹیکسری میں پیش آنے والے ایک حادثے میں زہیر کا انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوہ عقیلہ کو اگرچہ ٹیکسری کی انتظامیہ کی طرف سے ایک معقول رقم ملی تھی مگر عبدالصمد درانی نے اس سے نہ صرف مکان کا کرایہ لیتا بند کر دیا تھا بلکہ عقیلہ کے لئے ایک معقول رقم کا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا اور عقیلہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو زندگی بھر اس مکان میں رہ سکتی ہے۔

عبدالصمد درانی کی طرف سے بہت سے لوگوں کے وظیفے مقرر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد نائلہ نے بھی والد کے اس مشن کو جاری رکھا تھا۔ وہ والد کی زندگی میں دو تین مرتبہ عقیلہ سے مل چکی تھی اور والد کے انتقال کے بعد بھی دو چار مرتبہ اس سے مل چکی تھی۔

عقیلہ پڑھی لکھی عورت تھی۔ شوہر کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس کا بیٹا عبید بھی اسی اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ اس رات اپنے بنگلے پر پولیس کے چھاپے اور پھر شیر درانی کے ہلے بولنے کے بعد نائلہ دلاور کے ساتھ بنگلے سے فرار ہو کر عقیلہ ہی کے ہاں آئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے انہوں نے جیب کو اچھا خاصا نقصان پہنچا کر نمبر میں دھکیل دیا تھا۔

نائلہ دلاور کے ساتھ آدمی رات کے بعد عقیلہ کے مکان پر پہنچی تھی۔ عقیلہ نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تھا۔ اور پھر نائلہ کو دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئی تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ نائلہ کو پہچان ہی نہیں سکی تھی۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی وہ، پیچھے ہوئے رخسار، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ شہر کا بچہ نائلہ درانی کے بارے میں جانتا تھا۔ عقیلہ کیسے بے خبر رہ سکتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک قتل کے کیس میں بے گناہ ثابت ہونے کے باوجود پولیس کو بعض دیگر مقدمات میں اس کی تلاش تھی اور اس کی پھوپھی اور کزن الگ اس کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ اس وقت نائلہ کو اپنے دروازے پر دیکھ کر عقیلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے پناہ کی تلاش تھی اور عقیلہ اتنی بے حس اور احسان فراموش نہیں تھی کہ اسے دروازے سے لوٹا دیتی۔ وہ انہیں اندر لے آئی۔

عقیلہ نے اسکول سے چند روز کی چھٹی لے لی تھی۔ لیکن بیٹا کا قاعدگی سے وین پر اسکول جاتا رہا۔ عقیلہ کے ہاں پڑوسیوں کا آنا جانا ویسے بھی کم تھا۔ اس دوران اگر کوئی پڑوسن آجی جاتی تو اسے ڈرائنگ روم ہی تک محدود رکھا جاتا اور عقیلہ مصروفیت کا عذر کر کے اسے جلد سے جلد واپس چلے جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

”عقیلہ“ تیسرے روز نائلہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے آجانے سے تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہو رہی؟“

”پریشانی کیسی نائلہ بہن۔“ عقیلہ بولی۔ ”میں تو آپ لوگوں کے احسانات کے بوجھ تلے اس قدر دبلی ہوئی ہوں کہ زندگی بھر آپ کی خدمت کرتی رہوں تو بھی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔“

”انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”میرے والد یا میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ بلکہ احسان تو تم نے مجھ پر کیا ہے۔ اپنے ہاں پناہ دے کر۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پولیس اور میرے دوسرے دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میری وجہ سے وہ تمہیں بھی کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے نائلہ بہن۔“ عقیلہ نے جواب دیا۔ ”پولیس اور آپ کے رشتہ داروں کو آپ کی تلاش کیوں ہے؟ یہ میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ گھر آپ ہی کا ہے۔ آپ جب

تک اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں یہاں رہیں اور اگر آپ چاہیں تو لٹان چلی جائیں۔ میرے بھائی اور بھانج کے پاس۔ وہ آپ کے اور آپ کے والد صاحب کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ انہیں آپ کی خدمت کر کے بھید خوشی ہوگی۔“

”تمہاری باتوں سے مجھے بھید خوشی ہوئی ہے۔“ نائلہ بولی۔ ”لیکن اب میں اس شر سے نہیں جانا چاہتی۔ میرے چلے جانے سے دشمنوں کو میرے خلاف مزید کارروائی کا موقع مل جائے گا۔“

نائلہ اور دلاور کو یہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ عقیلہ کے ہاں پہلے بھی مہمان آتے رہتے تھے۔ ان کے آجانے سے کسی کو تجسس نہیں ہوا تھا۔ دلاور بھی دن میں ایک دو مرتبہ باہر چلا جاتا تھا۔ وہ چادر اس طرح اوڑھتا تھا کہ اس کا تقریباً ”آدھا چہرہ چھپ جاتا تھا۔ سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے چادر کی آسانی ہو گئی تھی۔ ہر دوسرا شخص چادر، کھیس یا شال اوڑھے نظر آتا تھا اور بعض لوگ تو شال وغیرہ اس طرح اوڑھتے تھے کہ ان کا تقریباً ”پورا چہرہ ہی چھپ جاتا تھا۔

اس روز اچانک ہی عقیلہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ رات کے کھانے کے لئے سالن تو تیار تھا۔ عقیلہ نے چارپائی سے اٹھ کر روٹی پکانے کے لئے کچن میں جانا چاہا تو نائلہ نے اسے روک دیا۔

”تم آرام سے لیٹی رہو۔ روٹیاں تندور سے منگوائی جائیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

اور پھر نوبت کے لگ بھگ دلاور تندور سے روٹیاں لینے کے لئے چلا گیا۔

دلاور کو گئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ نائلہ کے خیال میں چونکہ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ تندور پر ریش ہونے کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی ہوگی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا نائلہ کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ دس بجے کے لگ بھگ نائلہ چادر اوڑھ کر خود گھر سے باہر نکل گئی۔ گلی کے موڑ پر ہی تندور تھا۔ دو آدمی بیٹھے ہوئے روٹی کھا رہے تھے۔ نائلہ نے نانہائی کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ دلاور جیسے قد و قامت کا کوئی آدمی یہاں روٹیاں لینے نہیں آیا تھا۔ اس نے تندور سے روٹیاں خرید لیں اور گھر واپس آگئی۔ گھر آکر نائلہ نے عقیلہ اور اس کے بیٹے کو زبردستی کھانا کھلادیا اور خود دلاور کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

نائلہ درانی کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی خطرہ کا احساس دلا رہی تھی۔ دلاور اتنا فیروزے دار تو ہرگز نہیں تھا کہ گھر سے روٹیاں لینے کو نکلا ہو اور روٹیاں لینا بھول کر کہیں سیرو تفریح کے لئے اہل گیا ہو۔ وہ یقیناً ”کسی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شبیردرانی کے آدمیوں کی نظروں میں آگیا ہو اور وہ اسے پکڑ کر لے گئے ہوں۔ لیکن دلاور اس قدر آسانی سے ان کے قابو میں آنے والا تو نہیں تھا۔

گیارہ بج گئے..... نائلہ ایک بار پھر چادر اوڑھ کر گھر سے نکلی۔ اس مرتبہ وہ ذرا اور آگے تک چلی گئی تھی۔ چوتھی گلی کے موڑ پر بھی ایک اور تندور تھا۔ جہاں چوتھے پر مزدور قسم کے دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ نانہائی تندور والا تھرا صاف کر رہا تھا۔

”میرا نوکر روٹیاں لینے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ مگر دو گھنٹے ہو چکے ہیں وہ ابھی تک واپس نہیں پہنچا۔ وہ ہاں تو نہیں آیا تھا؟“ نائلہ نے دلاور کا قد و قامت بتاتے ہوئے نانہائی سے پوچھا۔

”نوبت کے قریب دو آدمی رانٹلوں کے زور پر ایک آدمی کو یہاں سے پکڑ کر لے گئے ہیں جو روٹیاں لینے کے لئے یہاں کھڑا تھا۔ اس آدمی کا حلیہ تو تقریباً ”وہی ہے جو آپ بتا رہی ہیں بی بی!“ نانہائی نے کہا۔

”وہ گونگا تھا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”نہیں بی بی۔ وہ گونگا تو نہیں تھا۔ ان میں تو تکرار بھی ہوئی تھی۔“ نانہائی نے بتایا۔

”تو پھر وہ میرا نوکر نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بیچارہ گونگا ہے اور چند روز پہلے ہی ملتان سے آیا ہے۔ یہاں کسی کو اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بچہ نہیں کہاں چلا گیا ہے وہ۔“ نائلہ کہتی ہوئی واپس آگئی۔

نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دلاور شیردرانی کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ گھر واپس پہنچ کر اس نے عقیلہ کو صورت حال سے آگاہ کیا اور فون کا ریسور اٹھا کر شیردرانی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ تقریباً ایک منٹ تک تھکتی جھکتی رہی پھر دوسری طرف سے ریسور اٹھالیا گیا۔

”مجھے شیردرانی سے بات کرنی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”مالک تو گھر پر نہیں ہیں۔ میں ان کا نوکر ستار بول رہا ہوں۔ تم کون بول رہی ہو بی بی؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”ستار۔ میں نائلہ بول رہی ہوں۔ میری بات غور سے سنو۔“ نائلہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

”میں ان ہنگاموں سے تنگ آگئی ہوں ستار اور شیر سے راضی نامہ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے نائلہ بی بی!“ ستار نے کہا۔ ”اس جھگڑے سے کتنی رسوائی ہو رہی ہے آپ دونوں کے خاندان کی۔ مالک نور پور کے ڈیرے تک گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے رات وہیں رہیں۔ آپ صبح ٹیلی فون کر لیں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ صبح آپ خود ہی آجائیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں خود ہی آجاؤں گی۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ جو کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی اسے معلوم ہو گیا تھا۔

”دلاور شیردرانی کے قبضے میں ہے۔“ اس نے عقیلہ کو بتایا۔ ”وہ لوگ اسے نور پور والے ڈیرے پر لے گئے ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔ اگر زندہ رہی تو واپس آجاؤں گی۔ تم دروازہ اندر سے بند مت کرنا۔ اگر میں صبح تک واپس نہ آئی تو سمجھ لینا کہ یا تو میں اجل کا شکار ہو گئی ہوں یا اس درندے کے ہاتھوں سے بچ کر کسی اور طرف نکل گئی ہوں۔ زندہ بچ گئی تو فون پر تمہیں اطلاع کر دوں گی اور اگر مر گئی تو اخبارات کے ذریعے تمہیں پتہ چل جائے گا۔ تمہاری محبت اور خلوص کو میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔“

نائلہ نے دلاور کی رائفل اٹھا کر اسے چیک کر کے کندھے پر لٹکالیا اور شال اوڑھ کر گھر سے نکل آئی۔ اس نے دروازے بھیڑ دیئے تھے۔

وہ گلیوں سے ہوتے ہوئے جا رہی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سردی کی وجہ سے گلیوں اور سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت کم تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلتی رہی۔

نور پور، شہر سے تقریباً ”چھ میل کے فاصلے پر تھا اور ڈیرہ اس سے تقریباً ”نصف میل مزید آگے۔ شہر سے نکل کر نائلہ سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں چل رہی تھی۔ کوئی جوان اور خوبصورت عورت رات کو اس طرح اکیلے گھر سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ نائلہ درانی تھی۔ حالات نے اسے نڈر اور بے خوف بنادیا تھا۔ وہ عرصہ سے خطرات سے کھیل رہی تھی اور ہر لمحہ موت سے بچہ لڑانے کو تیار رہتی تھی۔ اسے بھلا جنگلی جانوروں کا کیا خوف ہو سکتا تھا۔

سڑک سے ہٹ کر چلنے کے باعث وہ راستہ بھٹک گئی۔ اصل راستہ پر آنے کے لئے اسے تقریباً ”دو میل کا مزید طویل فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ اس طرح جب وہ نور پور کے قریب پہنچی تو گھر سے نکلے ہوئے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ کھیتوں میں ڈیرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دلاور ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس دوران

وہ درندے نجانے اس کا کیا حشر کر چکے ہوں گے۔

ڈیرے کے قریب پہنچ کر نالکہ محتاط ہو گئی۔ اسے ڈیرے کے سامنے شبیر درانی کی پیچیدہ نظر آگئی تھی۔ وہ رائفل ہاتھوں میں لے کر ایک درخت کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور تاریکی میں گھور کر دیکھنے لگی۔ اسے چند سائے کنویں کی منڈیر کے قریب حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ کسی کو اٹھا کر ڈیرے کی طرف لے جا رہے تھے۔ نالکہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دلاور کو اٹھا کر اندر لے گئے تھے۔ اس نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر انہوں نے دلاور کو مار دیا ہے تو وہ ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔

وہ لوگ کمرے میں جا چکے تھے۔ نالکہ بھی درخت کی آڑ سے نکل کر رائفل سنبھالے دسبے قدموں کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ ایک لمحہ کو دروازے کی آڑ میں رکی۔ اسی لمحہ شبیر درانی، دلاور کو ٹھوکریں مارتے ہوئے اس سے نالکہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ نالکہ ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر رائفل تان کر دروازے کے سامنے آگئی۔

نالکہ، دلاور کو ان درندوں کے چنگل سے نکال لائی تھی۔ جب وہ مکان میں داخل ہوئے تو عقیلہ جاگ رہی تھی۔ نالکہ نے دلاور کو اس کے کمرے میں لے جا کر بستر لٹا دیا اور عقیلہ کے کمرے میں آگئی۔

”دلاور کا پتہ چلا؟“ عقیلہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ زخمی ہے۔ اسے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ زخموں پر لگانے کے لئے کوئی مرہم وغیرہ ہو گا مگر میں؟“ نالکہ نے پوچھا۔

”پولی فیکس کی ٹیوب فرج کی پوکٹ میں رکھی ہوگی۔ میں اٹھ کر دیتی ہوں۔“ عقیلہ نے کہا۔

”نہیں نہیں، تم لیٹی رہو۔ میں خود نکال لیتی ہوں۔“ نالکہ بولی۔ ”ویسے بائی داوے تم ابھی تک کیوں جاگ رہی ہو۔ طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی؟“

”طبیعت ٹھیک ہے۔ تمہاری خیریت کی دعائیں مانگتی رہی ہوں اب تک۔“ عقیلہ نے کہا۔

”اب تم سو جاؤ۔“ نالکہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

فرج چکن کے دروازے کے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ نالکہ نے اس کے دروازے کے پوکٹ میں سے پولی فیکس کی ٹیوب نکالی۔ وہ ہاتھ روم کے کب بورڈ سے کائن کارول بھی نکال لائی۔

دلاور کی ناک سوج گئی تھی۔ ہونٹ کٹ گیا تھا۔ ایک رخسار اور پیشانی کی کھال بھی پھٹی ہوئی تھی اور خون جم گیا تھا۔ نالکہ کائن سے خون صاف کر کے اس کے زخموں پر مرہم لگانے لگی۔ دلاور خاموش لیٹا ہوا تھا۔

دلاور کے زخموں پر مرہم لگانے کے بعد نالکہ ڈرائنگ روم میں آگئی جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے آئینہ ان کے کارنس پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ تین بجتے والے تھے۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کافی دیر تک کھنٹی بجتی رہی پھر کال ریسیو کر لی گئی۔

”نالکہ بول رہی ہوں انکل۔“ نالکہ نے ریسیور پر رائے منصور کی خمار آلود ہیلو کی آواز سنتے ہی کہا۔

”نالکہ بیٹی، خیریت؟“ رائے منصور کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”خیریت بالکل نہیں ہے انکل۔ شبیر درانی اور اس کے گرگوں نے دلاور کو مار مار کر ادھ موٹا کر دیا ہے۔ اس کی بے ہوش حالت ہے۔“ نالکہ نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔



”میری قوت برداشت جواب دے رہی ہے انکل۔ ایسا نہ ہو کہ میں ان میں سے کسی کو قتل کر کے واقعی قاتلہ بن جاؤں۔“

”ہمت سے کام لو بیٹی۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”معیبت کے دن ختم ہونے ہی والے ہیں۔ وکیل نے کل صبح تمہارا کیس عدالت میں دیدیا ہے۔ کل میں نے بھی ڈی ایس پی سے بات کی تھی۔ تمہیں شاید یہ پتہ نہیں چل سکا کہ پولیس وین پر حملے کے لئے جو گاڑی استعمال کی گئی تھی وہ پولیس کو مل گئی ہے اور وہ گاڑی شیردرانی کی ملکیت ہے۔ ڈی ایس پی ذاتی طور پر اس کیس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میں کل صبح رحیم یار خان آرہا ہوں۔ خود اس سے طوں گا۔ میں تم سے بھی ملنا چاہتا ہوں اور دلاور کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟“

نائلہ نے عقیلہ والے جنگلے کا پتہ بتادیا۔ ”لیکن یہاں آنے کے لئے آپ کو بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ کہیں آپ شیردرانی اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں نہ آجائیں۔ وہ شکاری کتوں کی طرح ہمیں پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔“

”اطمینان رکھو..... کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”کل کسی وقت ملاقات ہوگی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

نائلہ نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور ڈرائنگ روم سے اٹھ کر دلاور والے کمرے میں آگئی۔ وہ کچھ دیر تک دلاور کے پاس بیٹھی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔

دوسرے دن بارہ بجے کے لگ بھگ دروازے کی کھنٹی بجی۔ عقیلہ نے جاکر دروازہ کھولا تو ایک دہلا پتلا سا آدمی سامنے کھڑا تھا جو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر عقیلہ کے ہاتھ میں دیدیا۔

”آپ اندر جا کر یہ خط پڑھ لیجئے۔ میں یہیں رک کر جواب کا انتظار کروں گا۔“

عقیلہ کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔ لفافہ کھولا تو اس میں سے برآمد ہونے والے خط پر نائلہ کا نام لکھا دیکھ کر خط نائلہ کی طرف بڑھا دیا جو ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔

”یہ تمہارے لئے ہے۔“

نائلہ نے خط لے کر پڑھا۔ یہ رائے منصور کا خط تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ احتیاطاً ”وہ خود نہیں آئے۔ نائلہ بے خوف ہو کر اس شخص کے ساتھ چلی آئے جو خط لے کر آ رہا ہے۔ خط پڑھ کر نائلہ خود دروازے پر آگئی اور آڑ میں کھڑی ہو کر اس شخص سے باتیں کرنے لگی۔ نائلہ رائے منصور کی تحریر پر پچاس تھی۔ اسماعیل نامی اس شخص کی باتوں سے بھی اس کی تسلی ہو گئی تھی۔

”آپ تیار ہو جائیے۔ میں نائلہ لے کر آتا ہوں۔“ اسماعیل نے کہا۔

”میں تیار ہوں۔ تم نائلہ لے آؤ۔“ نائلہ کہتی ہوئی دروازہ بند کر کے دلاور والے کمرے میں آگئی۔ اسے صورتحال سے آگاہ کیا اور پھر عقیلہ کو بتانے لگی کہ وہ رائے منصور سے ملنے کے لئے جا رہی ہے اگر اسے واپسی میں دیر ہو جائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

تقریباً ”دس منٹ بعد اسماعیل نائلہ لے آیا۔ نائلہ اس طرح چادر اوڑھ کر مکان سے نکلی کہ اس کی صرف ایک آنکھ ہی نظر آ رہی تھی۔ اسماعیل اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ نائلہ پیچھے بیٹھ گئی اور نائلہ چل پڑا۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا نائلہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ اسماعیل تانگے والے

کو راستہ بتاتا آیا تھا اور پھر اس کے کہنے پر تانگہ ایک جگہ پر رک گیا۔ اسماعیل کو جوان کو پیسے دینے لگا اور تانگہ نیچے اتر آئی۔ پھر وہ دونوں تنگ سی گلیوں میں چلتے ہوئے ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ اسماعیل نے کال بیل بجائی تو چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ اسماعیل، تانگہ کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔ تانگہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کے چہرے پر بیزاری سی نظر آرہی تھی۔

”اس طرف..... اس کمرے میں۔“ بوڑھے نے بائیں طرف کے برآمدے میں ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تانگہ اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی کرسی پر رائے منصور بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری کرسی پر اس کا وکیل تھا۔ رائے منصور تانگہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تانگہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ رائے منصور پیار سے اس کا کندھا تھپتھپاتے رہے۔

”بیٹھو۔“ بالا خیر رائے منصور اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

تانگہ ان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”دلدار کیسا ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ میں اسے دیکھنے کے لئے نہیں آسکا۔ دراصل میں نے شبیر درانی کے ایک آدمی کو وکیل صاحب کے دفتر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لئے احتیاطاً میں نے وہاں آنا مناسب نہیں سمجھا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”دلدار کل رات کسی طرح شبیر درانی کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور وہ لوگ اسے شبیر کے نور پور والے ڈیرے پر لے گئے تھے۔ جہاں اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ میں نے کسی طرح اس کا پتہ چلا لیا اور اسے ان درندوں کے چنگل سے چھڑا لائی۔ لیکن یہ سب کچھ کب تک چلے گا انکل۔ میں اپنے ہاتھ کسی کے خون سے نہیں رنگنا چاہتی لیکن اگر میری قوت برداشت جواب دے گئی تو مجھے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ میں کب تک مجرموں کی طرح چھپی رہوں گی۔ کب تک لوگوں سے پناہ کی بجائے مانگتی رہوں گی؟“

”میں جانتا ہوں۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو اور آہنی اعصاب کی مالک ہو۔“ رائے منصور نے کہا۔

”معصیت کے دن بس اب ختم ہونے ہی والے ہیں۔ وکیل صاحب نے کیس عدالت میں داخل کر دیا ہے۔ میں نے آج ڈی ایس پی صاحب سے بھی ملاقات کی ہے۔ وہ اس کیس میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔ ان کی ذاتی رائے بھی یہ ہے کہ پولیس وین پر تمہارے آدمیوں نے حملہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی تمہیں اس میں ملوث کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کچھ قانونی تقاضے بہر حال ہیں اور وہ دوسروں کے سامنے اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک اصل ملزموں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ ڈی ایس پی صاحب بہت جلد اصل ملزموں تک پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ اس کیس کے سلسلے میں دوسری طرف سے بھی ان پر شدید دباؤ بڑھ رہا ہے۔“

”کیسا دباؤ؟“ تانگہ نے سوالیہ نگاہوں سے رائے منصور کی طرف دیکھا۔

”یہی کہ وہ اس کیس کی فائل بند کر دیں۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”انہیں یہاں سے تباہی اور دیگر خوفناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں۔ لیکن میں اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی دباؤ میں آنے والا یا دھمکیوں سے ڈرنے والا شخص نہیں ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں قانون کا حافظ ہے۔ صاف دالے کیس میں بھی اسے اس قسم کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ مگر اس نے کسی خوف کے بغیر اپنا کام

جاری رکھا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس کیس میں بھی وہ چند روز میں اصل ملزموں تک پہنچ جائے گا اور پھر وکیل صاحب بھی بڑی محنت کر رہے ہیں۔ انہوں نے عدالت میں جو کیس داخل کیا ہے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے بہت اچھے پوائنٹ اٹھائے ہیں۔“

”اور ضمانت کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ لوگوں نے؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”اس کیس کے ساتھ ہی ضمانت کی درخواست بھی داخل کر دی گئی ہے۔ میرا خیال ہے ایک ہفتے کے اندر اندر اس کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔“ وکیل صاحب نے پہلی مرتبہ ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔  
 ”اور ہاں۔ ضمانت والی بات پر یاد آیا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”تمہارے اسٹیٹ منیجر حسن کو بھی ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ میری حویلی میں ہیں۔“  
 ”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ حیدر بیگم نے عدالت سے میری اسٹیٹ کی جو قانونی نگرانی حاصل کی ہے وہ منسوخ کروادی جائے؟“ نائلہ نے کہا۔

”یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”دو تین روز پہلے میں نے تمہارے فیملی ایڈووکیٹ سے بات کی تھی۔ اسی دن وہ لاہور جا رہا تھا۔ ایک دو دن میں واپس آئے گا تو اس سے تفصیلی بات ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اور رضیہ کیسی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”ان حالات نے اسے بھی پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن اپنی پریشانی کے باوجود اسے تمہاری بھی فکر رہتی ہے۔“  
 ”وہ اچھی لڑکی ہے۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”بس لالچ میں آکر اس بھڑے کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ اب وہ ڈر رہی ہے کہ شبیر درانی اسے قتل نہ کروادے۔ وہ اس کے جرائم کی چشم دید اور اہم ترین گواہ ہے۔“

”وہ جب تک میری حفاظت میں ہے شبیر درانی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔“ رائے منصور نے کہا۔  
 ”میں بہت جلد مرادو اور اسکے شوہر بخشو کا کیس دوبارہ سامنے لانے والا ہوں۔ دنگا فساد ہم جیسے لوگوں کو زیب نہیں دیتا لیکن چاروں طرف سے قانونی حملے کر کے ہم شبیر درانی کو گھیرے میں لے سکتے ہیں۔“  
 ”سب سے پہلے آپ لوگ میری ضمانت کی کوشش کیجئے۔ میں ایک مرتبہ سامنے آ جاؤں تو شبیر درانی اور اس کی ماں پر ایسے ایسے وار کروں گی کہ ان دونوں کو ہتھیلے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“ نائلہ نے کہا۔  
 اس سے پہلے کہ رائے منصور یا وکیل میں سے کوئی جواب دیتا وہی بوڑھا آدمی دروازہ میں نمودار ہوا جس نے نائلہ کے آنے پر مکان کا دروازہ کھولا تھا۔

”کھانا لگ گیا ہے جی۔ آپ لوگ آجائیے۔“

”چلو بھئی.... کھانا کھالیں۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“ رائے منصور کہتے ہوئے اٹھ گیا۔  
 نائلہ اور وکیل بھی اس کمرے میں آ گئے جہاں میز پر کھانا چٹا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران بھی اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔

”بات دراصل یہ ہے کہ۔“ رائے منصور کہہ رہا تھا۔ ”ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لینے کے لئے آتی ہے۔ اگر انسان ہمت ہار جائے تو اسے صرف اور صرف موت کے دامن ہی میں پناہ مل سکتی ہے۔ یہاں صرف وہی لوگ زندہ رہ سکتے ہیں جو ہمت ہوں اور مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنا جانتے ہوں۔ میں تمہاری

ہمت کی داد دیتا ہوں۔“ انہوں نے نائلہ کی طرف دیکھا۔  
 نائلہ نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ یہ واقعی اس کی ہمت تھی کہ اب تک حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اب تک خاک میں مل چکی ہوتی۔  
 کھانے کے بعد وہ دوبارہ بیٹھک میں آئے۔

”پانچ بج رہے ہیں۔“ رائے منصور نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم واپس جانا چاہو تو اسماعیل تمہیں چھوڑ آئے گا۔ اور وہاں اگر تم اپنے آپ کو کسی وقت غیر محفوظ سمجھو تو یہاں چلی آنا۔ میں نے بابا سے کہہ دیا ہے۔ وہ یہاں تمہاری ضروریات کا خیال رکھے گا اور یہ اپنے پاس رکھ لو۔ تمہیں ضرورت ہوگی۔“ اس نے جیب سے ایک پھولا ہوا لٹافہ نکال کر نائلہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”دلدار کو میری طرف سے پوچھنا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔“ نائلہ اٹھ کر چادر اوڑھنے لگی۔ رائے منصور نے اسماعیل کو بلا کر ہدایت کی کہ نائلہ کو چھوڑ آئے۔  
 اس کے دو تین منٹ بعد نائلہ مکان سے نکل کر اسماعیل کے پیچھے پیچھے گلی میں چل رہی تھی۔

..... \*\*\* .....  
 \*\*\*\*\*

رضیہ، نائلہ کی طرح اتنی بلند حوصلہ اور باہمت نہیں تھی۔ دولت کے لالچ نے اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔ پہلے اس نے اپنی عزت گنوائی اور اب جان کے خوف سے رائے منصور کی حویلی میں چھپی بیٹھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ شیردرانی کے آدمی شکاری کتوں کی طرح گھات لگائے بیٹھے ہوں گے اور یہاں سے نکلنے ہی موت کا شکار ہو جائے گی۔

شیردرانی کو دولت کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر وہ نائلہ کے خلاف اس کی جھولی میں آن گری تھی۔ لیکن بعد میں شیردرانی کے بارے میں نئے نئے انکشافات ہوتے رہے۔ جن سے رضیہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ نائلہ مظلوم اور بے گناہ ہے اور شیردرانی دنیا کا سفاک ترین انسان، جو دولت کے لالچ میں اپنی ماموں زاد بہن کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ کیسی کیسی سازشوں کے جال نہیں پھیلائے تھے اس نے نائلہ کے خلاف۔ اس نے نائلہ کو اپنی قید میں رکھ کر اس پر کیسے کیسے ستم نہیں ڈھائے تھے۔ وہ نائلہ سے جائیداد کے کاغذات اور نکاح نامے پر اس کے دستخط کروانا چاہتا تھا لیکن نائلہ کے انکار پر اس نے ایک پولیس آفیسر کو پانچ لاکھ روپے کے عوض نائلہ کو موت کے گھاٹ اتروانے پر آمادہ کر لیا تھا مگر نائلہ بھاگ نکلی تھی۔

شیردرانی اگر مرادو اور اس کے شوہر بخشو کے ساتھ بربریت کا مظاہرہ نہ کرتا تو شاید رضیہ کے دل میں شیر کے خلاف نفرت اتنی شدت اختیار نہ کرتی۔ مرادو اڑھتر عمر عورت تھی۔ شیردرانی کے آدمیوں نے اسے اس کے شوہر کے سامنے اس طرح رسوا کیا تھا کہ رضیہ کانپ کر رہ گئی تھی۔ اور پھر ان دونوں میاں بیوی کو برہنہ کر کے جانوروں کی طرح بنجرے میں بند کر دیا گیا تھا۔

رضیہ نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ موقع ملے ہی شیردرانی کے خلاف انتقامی کارروائی کرے گی۔ اسے نائلہ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس نے ایس بی کے نام ایک گناہ خط لکھا جس میں صادق کے قتل کے سلسلے میں نائلہ کو بے قصور گردانتے ہوئے پولیس انسپکٹر اعظم کو اصلی قاتل قرار دیا تھا۔ لیکن اس نے نائلہ کے خلاف اس سازش کے اصل محرک کا نام نہیں لکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اوپر کی سطح پر انکوائری شروع ہوئی تو پولیس معاملے کی تہ تک پہنچ ہی جائے گی اور سازش کے اصل سرغنہ تک بھی پہنچ جائے گی۔

رضیہ نے خط تو لکھ لیا تھا لیکن اسے پوسٹ کرنا کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی شبیر درانی کی قید میں تھی۔ اور اس کی باقاعدہ نگرانی کی جارہی تھی لیکن اس نے شبیر درانی کے کارندے کو لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ شہر لے چلے۔ اس طرح وہ ایس بی کے نام لکھا ہوا خط پوسٹ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اسی دوران نائلہ کو پکڑ کر دوبارہ اس حویلی میں لے آیا گیا لیکن رضیہ کے دل میں نائلہ کے لئے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی اور شبیر درانی سے انتقام لینے کا بھی موقع تھا۔ وہ نائلہ کو لے کر حویلی سے بھاگ نکلی۔ انہوں نے رائے منصور کی حویلی میں پناہ لی تھی۔

شبیر درانی کو رائے منصور کی حویلی میں ان کی موجودگی کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ خود تو رائے منصور کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے پولیس کو نائلہ کی حویلی میں موجودگی سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن رائے منصور نے پولیس کا چھاپہ پڑنے سے پہلے ہی نائلہ درانی کو حویلی سے نکال کر کہیں اور پھنچا دیا تھا۔ شبیر درانی کے آدمی وہاں تک بھی اس کے پیچھے پہنچ گئے تھے لیکن دلاور نائلہ کو وہاں سے نکال لے گیا تھا۔ اس کے کئی روز بعد رضیہ کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ عدالت نے نائلہ درانی کو صادق والے کیس میں باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔

رائے منصور کے ہاں اخبار بھی آتا تھا اور رضیہ اخبار کے ذریعے نائلہ کے حالات سے باخبر رہتی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ پولیس نے ایک خفیہ اطلاع ملنے پر نائلہ کی گرفتاری کے لئے اس کے بنگلے پر چھاپہ مارا تھا لیکن نائلہ پولیس کے ہاتھ نہیں آئی تھی اور اس وقت نائلہ کہاں تھی؟ رضیہ کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ رائے منصور کو معلوم ہو گا۔ لیکن اس نے خود سے کبھی نہیں بتایا تھا۔ رضیہ ہمیشہ نائلہ کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی تھی اور رائے منصور سے اکثر اس کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔

رضیہ جانتی تھی کہ نائلہ جہاں بھی تھی خیریت سے تھی۔ لیکن وہ خود بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ رائے منصور کی حویلی میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہ یہاں محفوظ تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ یہاں سے نکلنے ہی موت کے ہر کارے اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے لیکن اس کے باوجود وہ یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اس پر اگرچہ کوئی پابندی نہیں تھی لیکن وہ اپنے آپ کو حویلی کا قیدی سمجھنے لگی تھی۔

رضیہ کو اپنا گھر بڑی شدت سے یاد آنے لگا تھا۔ ماں باپ، بھائی بہن، سب کے چہرے اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتے۔ وہ بہت عرصہ سے اپنوں سے دور رہ رہی تھی اور اب ان میں واپس جانا چاہتی تھی۔

اس نے کئی مرتبہ رائے منصور سے کہا تھا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے مگر رائے منصور نے یہی جواب دیا تھا کہ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ جب چاہے جا سکتی ہے لیکن اس حویلی کے باہر موت اس کے گھات میں بیٹھی ہے۔ جب تک شبیر درانی کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا، یہ حویلی ہی اس کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہ ہے۔

اور آج تو رضیہ کو اپنے گھر والے بڑی شدت سے یاد آرہے تھے۔ صبح جب رائے منصور نے بتایا تھا کہ وہ رحیم یار خان جا رہا ہے تو رضیہ کا بھی دل چاہا تھا کہ اس کے ساتھ چلی جائے لیکن پھر خاموش رہ گئی تھی۔ لیکن اس نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی۔

وہ دن بھر سوچتی رہی۔ اپنے فیصلے پر بار بار غور کرتی رہی۔ اس نے ہر پہلو پر غور کر لیا اور بالا آخر یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لی۔ اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے پاس

کچھ رقم تھی جو اس نے بستر پٹنے کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے رقم اٹھا کر قبض کے گربان میں ٹھوسی اور گرم شال اوڑھتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

وہ کبھی کبھار حویلی کے باہر بستی میں کسی کسان کے گھر چلی جاتی تھی۔ ان کسانوں کی عورتیں کام کرنے کے لئے حویلی میں آتی رہتی تھیں۔ ان میں رضیہ کی عمر کی دو تین لڑکیاں بھی تھیں جن سے رضیہ کی دوستی ہو گئی تھی اور رضیہ کبھی کبھار وقت گزاری کے لئے ان میں سے کسی کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ رائے منظور کو اس کے بستی کے کسی گھر جانے پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ بستی کی حد تک رضیہ محفوظ تھی۔

”کہاں جاری ہو رضیہ بیٹی؟“ لان میں کھڑی ہوئی آصفہ بیگم نے اسے گیٹ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”حنیفہ کے گھر جاری ہوں آئی۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”شام ہونے والی ہے۔ ذرا جلدی آجانا۔ رائے صاحب بھی آنے والے ہی ہوں گے۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔

”جی ہنر۔“ رضیہ کستی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔

حنیفہ بھی ایک کسان کی بیٹی تھی۔ اس کا کھردھری گلی میں تھا۔ رضیہ جب اس کے گھر پہنچی تو اس کی ماں نے بتایا کہ وہ تو کسی اور سہیلی کے گھر گئی ہوئی ہے۔

”بیٹھو بیٹی۔ حنیفہ تھوڑی دیر میں آتی ہی ہوگی۔“ حنیفہ کی ماں نے کہا۔

”میں بھی وہیں چلی جاتی ہوں۔ ذرا گپ شب ہو جائے گی۔“ رضیہ کہتے ہوئے واپس مڑ گئی اور مکان کے دروازے سے نکلے ہی وہ تیزی سے اس گلی میں مڑ گئی جو سیدھی کھیتوں کی طرف چلی گئی تھی۔

رضیہ کو اس گلی میں مڑنے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن ابھی تو دن کی روشنی تھی۔ کھیتوں میں کوئی بھی اسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلتے گئی۔ پندرہ بیس منٹ میں وہ بستی سے کافی دور نکل گئی تھی۔

دائیں طرف دو ڈھائی میل کے فاصلے پر احمد پور لاما کا قصبہ نظر آ رہا تھا۔ رضیہ قصبے کی طرف جانے کی بجائے اس کے متوازی کھیتوں میں چلتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح کھیتوں میں چلتی ہوئی قصبے سے آگے نکل کر سڑک پر آجائے گی جہاں سے اسے صادق آباد جانے کے لئے کوئی بس مل جائے گی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ رضیہ کھیتوں میں تیز تیز قدم اٹھاتی چلتی رہی۔ وہ بار بار دائیں طرف قصبے کی روشنیوں کو بھی دیکھ رہی تھی تاکہ بھٹک کر سڑک سے دور نہ نکل جائے۔

قصبے کی روشنیاں بھی اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ تاریک کھیتوں میں ناہموار پگڈنڈی پر چلتے ہوئے رضیہ بار بار لڑکھڑائی رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ گرتے پرتے پھیلتی تھی اور اب تو رضیہ کچھ خوف بھی محسوس کرنے لگی تھی۔

کچھ دور آگے جا کر وہ دائیں طرف مڑ گئی اور بالاخر مزید ایک گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد وہ شہر کے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر رہ گئی۔ نہ بار کرنے کے لئے اس پل پر جانا پڑے گا جو قصبے کے شروع میں واقع تھا اور یہاں سے نالہ نے موٹر سائیکل نہر میں پھینکی تھی۔ اس نے ہا میں طرف دیکھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس طرف نہر پر کوئی پل تھا یا نہیں۔ اگر تھا بھی تو وہ کتنی دور

تھا۔ جبکہ احمد پور لاما والے پل کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ دو ڈھائی نہیں تو تین میل کے فاصلے پر ہوگا۔ اس نے احمد پور لاما والے پل کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا اور نہر کی پٹری پر چڑھ کر دائیں طرف چلنے لگی۔

رضیہ نے تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے ایک تیز روشنی دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں کسی موٹر سائیکل کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ رضیہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ روشنی موٹر سائیکل کے ہیڈ لیمپ کی تھی جو اسی طرف آرہی تھی۔ وہ نہر کی پٹری سے اتر کر کھیت کے کنارے پر آگئی۔ اسے اندیشہ تھا کہ موٹر سائیکل کی روشنی میں اسے دیکھ نہ لیا جائے۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی اور جب موٹر سائیکل سامنے سے گزر گئی تو وہ دوبارہ نہر کی پٹری پر آگئی اور تیزی سے چلنے لگی۔

رضیہ کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ اسے پل تک پہنچنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی میل چلنا پڑے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ جب وہ پل پر پہنچی تو آٹھ بج رہے تھے۔ پل پر خاصی رونق تھی۔ پھلوں اور مختلف چیزوں کے کئی ٹھیلے کھڑے تھے۔ پل پر ایک بس بھی کھڑی تھی اور کنڈکٹر بس کی باڈی کو زور زور سے پینتا ہوا حلق چھاڑ کر صادق آباد صادق آباد کی آوازیں لگا رہا تھا۔

رضیہ نے چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ بھی تقریباً چھپ گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی۔ بس میں کئی سیٹیں خالی تھیں۔ رضیہ ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایک مولوی اپنی بیوی کے ساتھ بس میں سوار ہوا۔ مولوی نے سبز گہری باندھ رکھی تھی۔ سفید شلوار قمیض سیاہ واسٹ اور دائیں کندھے پر پٹکا پڑا ہوا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی شمل کاک برقعے میں تھی۔ مولوی کے سوار ہوتے ہی پوری بس عطر کی خوشبو سے مہک اٹھی تھی۔ اس مولوی نے غالباً "عطر کی پوری شیش اپنے کپڑوں میں انڈیل رکھی تھی۔ مولوی نے شمل کاک برقعے میں روپوش اپنی بیوی سے کچھ کہا۔ وہ آگے بڑھ کر رضیہ کے ساتھ بیٹھ گئی جبکہ مولوی دوسری طرف والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

بس تقریباً بیس منٹ تک وہاں رکی رہی۔ کنڈکٹر بس کی باڈی کو مسلسل پینتے ہوئے "جاری ہے..... جاری ہے" کی آوازیں لگا رہا تھا اور پھر بس جیسے ہی حرکت میں آئی ایک آدی دوڑتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔ رضیہ جب نہر کی طرف سے آئی تھی تو اس نے اس شخص کو مونگ پھلی والے ٹھیلے کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔ اس نے سر پر کالے رنگ کا مظہر لپیٹ رکھا تھا۔ اس شخص نے بھی رضیہ کو نہر کی طرف سے اکیلے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ رضیہ تو بس میں بیٹھ گئی تھی اور وہ شخص بھی بس کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ رضیہ کی طرف دیکھا تھا اور رضیہ بھی کئی مرتبہ اسے اپنی طرف کھورتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے کوئی لوفری سمجھی تھی اور ایسے لوگوں کو عورتوں کو گھورنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ شخص دوڑ کر چلتی بس میں سوار ہوا تو رضیہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ شخص رضیہ والی سیٹ کے قریب سے گزرتا ہوا پیچھے کسی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

بس جب صادق آباد کے لاری اڈے پر رکی تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ رضیہ نے بس سے اتر کر ایک آدی سے خان پور جانے والی بس کے بارے میں دریافت کیا۔ اس شخص نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر رضیہ کو پتہ چلا کہ اس وقت خان پور کے لئے بس نہیں ملے گی البتہ رحیم یار خان جانے والی بس تیار تھی۔ رضیہ اسی بس میں سوار ہو گئی اور جب اس نے لوفرنائپ کے اس شخص کو بھی اس

بس میں سوار ہوتے دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شخص اسی کا تعاقب کر رہا ہے۔ رضیہ کے دل میں اس شخص کے بارے میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ کہیں یہ شبیر درانی کا آدمی تو نہیں؟ ممکن ہے اس نے بل پر آتے ہوئے رضیہ کی شکل دیکھ لی ہو؟ لیکن رضیہ کو یقین تھا کہ اس کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا اور کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ تو پھر یہ شخص کون تھا؟ کیا محض اس لئے اس کے پیچھے لگ گیا تھا کہ وہ اکیلی تھی؟

معاشرے کا سب سے بڑا المیہ تو یہی تھا کہ کوئی عورت اکیلی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسے قدم قدم پر اس جیسے غنڈوں اور لوٹروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ نہیں یہ اوباش قسم کے مرد یہ کیوں سمجھتے تھے کہ ان کے ایک مرتبہ سیٹی بجانے یا اشارہ کرنے پر عورت کچے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن کرے گی۔ رات کے وقت اکیلی عورت کو دیکھ کر ایسے مردوں کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ یہ شخص احمد پور لاما سے اس کے پیچھے لگا تھا، تو کیا اسے یقین تھا کہ رضیہ اس کے ہاتھ آجائے گی۔

رضیہ کے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا تھا۔ ممکن ہے اس شخص کو بھی رحیم یار خان ہی جانا ہو اور احمد پور لاما میں وہ محض وقت گزارنے کے لئے بس میں مقید ہو کر بیٹھے رہنے کی بجائے باہر گھوم پھر کر وقت گزار رہا ہو۔ لیکن اس کے لئے اسے رضیہ کی نظروں میں مشکوک بنادیا تھا۔

بس پانچ منٹ آدم صحابہ کے اڈے پر رکی اور پھر رحیم یار خان کی طرف چل پڑی۔

رضیہ جب رحیم یار خان کے اڈے پر بس سے اتری تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ اس وقت اگرچہ یہاں سے خان پور کے لئے بس مل سکتی تھی لیکن رضیہ نے آج کی رات رحیم یار خان ہی میں گزارنے کا فیصلہ لیا اور بس سے اتر کر ٹانگہ اسٹینڈ کی طرف چلنے لگی۔ بعض ٹانگوں پر دو دو تین تین سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں اور ٹانگے والے بل من مزید کی آوازیں لگا رہے تھے۔ رضیہ نے ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھا سر پر سیاہ مفلر لپیٹے ہوئے وہ شخص بھی اس سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ رضیہ کے دل میں ایک بار پھر اس شخص کے بارے میں خدشات سر ابھارنے لگے۔

رضیہ تیز خیر قدم اٹھاتی ہوئی ایک خالی ٹانگہ پر بیٹھ گئی۔ اس ٹانگے والے کو اپنی منزل بتاتے ہوئے سالم ٹانگہ لے چلے کو کہا۔ ٹانگے والا گھوڑے کے سامنے رکھا ہوا اپنے اور بھوسے والا تھپلا اٹھانے لگا۔

ٹھیک اسی لمحہ سیاہ مفلر والا وہ آدمی بھی رضیہ کے ساتھ ٹانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رضیہ اسے دیکھ کر ہلکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”میں نے سالم ٹانگہ کروایا ہے۔ تم کسی اور اور ٹانگے پر بیٹھ جاؤ۔“ رضیہ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”خاموش بیٹھی رہو۔“ وہ شخص کھسک کر رضیہ کے بالکل ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی رضیہ کو اپنے ہاتھ میں کوئی خت چیز جھپتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ ”اگر تم نے شور مچایا تو میرے پستول کی گولی تمہارے دل پر لگ جائے گی۔“

رضیہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اسے سینے میں اپنا سانس گھٹنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس شخص کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی ٹال رضیہ کے پہلو میں چھ رہی تھی۔

ٹانگے والا جب گھوڑے کے سامنے سے دانے والا تھپلا اٹھا کر پچھلی سیٹ کے نیچے رکھنے لگا تو رضیہ کے



ساتھ ایک آدمی کو بیٹھے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔  
 ”لی بی نے سالم تاکہ کرایہ ہے دیر۔“ تاکہ والا بولا۔ ”تم دوسرے تاکے پر بیٹھ جاؤ۔“  
 ”تو کیا تم لی بی کو مجھ سے الگ سمجھتے ہو۔“ وہ شخص لوفرانہ انداز میں مسکرایا۔ ”اب چلو۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔“

تاکے والے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلادیا اور بوری سیٹ کے نیچے رکھ کر آگے بیٹھ گیا۔ تاکہ والا  
 سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے آگے ہانس پر بیٹھا تھا تاکہ تاکہ کا بیلنس قائم رہے۔ اس نے دونوں پیرا ہر کی طرف  
 لٹکا رکھے تھے۔ اس نے لگام سنبھالی اور ٹھوڑے کو ہانک دیا۔  
 تاکہ اڑے سے نکل کر بائیں طرف مڑا تو رضیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بول اٹھا۔  
 ”کریم پورہ جانا ہے۔ اس طرف کیوں موڑ رہے ہو؟“

”لی بی نے تو۔۔۔۔۔“  
 ”میں جو کہہ رہا ہوں وہ کد۔۔۔۔۔“ اس شخص کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔  
 تاکے والے نے مزید کچھ کہے بغیر ٹھوڑے کو دائیں طرف موڑ دیا۔ اس کے دل میں شبہ پیدا ہو گیا تھا۔  
 یہ عورت جب تاکے کی طرف آئی تھی تو اکیلی تھی اور اس نے کہیں اور چلنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن اب یہ  
 آدمی جو شکل ہی سے لوفر لگتا تھا اور اس نے کریم پورہ چلنے کو کہا تھا جو اس عورت کی بتائی ہوئی منزل کے  
 بالکل مخالف سمت میں تھا۔ تاکے والے کے خیال میں یقیناً ”کوئی گڑبڑ تھی۔ یہ شخص اس عورت کو زبردستی  
 اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے چادر میں پستول وغیرہ چھپا رکھا ہو اور اس عورت کو دھمکی  
 دے کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا ہو۔“

تاکہ تقریباً ”پن گھنٹے بعد کریم پورہ پہنچا۔ یہ شہر کے نواح میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک کچی بستی  
 تھی اور اس سے تقریباً ”دو فلائنگ آگے اینٹوں کا بھندہ تھا۔ تاکہ رکتے ہی اس شخص نے رضیہ کو گھورتے  
 ہوئے اترنے کا اشارہ کیا اور جب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر تاکے والے کی طرف بڑھادیا۔  
 ”صرف دس روپے۔ تاکے والا بولا۔ ”یہاں آنے کے لئے تو دن کے وقت بھی پچیس تیس روپے لیں  
 ہیں اور تم آدمی رات کو مجھے یہاں لے کر آئے ہو اور صرف دس روپے۔“  
 ”شکر کر دیہ بھی دیدے۔ بھاگ جاؤ اب۔“ اس شخص نے دس کا نوٹ سیٹ پر پھینک دیا اور رضیہ  
 ہاتھ پکڑ کر بستی کی طرف چلنے لگا۔

رضیہ کے جسم میں سسکی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر اس شخص کی  
 گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی۔

”اگر تم نے کوئی اڑی دکھائی تو یہ دیکھو۔“ میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ گولی مار دوں گا۔“ اس شخص نے  
 کھیس میں سے ہاتھ نکال کر پستول دکھایا۔  
 ”لیکن تم کون ہو اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔“ رضیہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ”میں ایک شریف عورت  
 ہوں۔ تمہیں اس طرح مجھے۔۔۔۔۔“

”اگر تم شریف عورت ہو تیں تو رات کو اس طرح اکیلی گھر سے نہ نکلتیں۔“ اس شخص نے رضیہ کی  
 بات کاٹ دی۔ ”میں نے تمہیں امد پور لاما کے پل پر نہر کی طرف سے آتے ہوئی دیکھ لیا تھا۔ میرا خیال ہے  
 کسی گاؤں کی رہنے والی ہو اور گھر سے بھاگی ہو۔ کہاں جانا چاہتی ہو اور گھر سے کیا لے کر آئی ہو؟“

”نہ میں گھر سے بھاگی ہوں نہ کچھ لے کر آئی ہوں۔ دیکھ لو..... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ رضیہ نے لپٹے ہوئے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی چادر اتار دی۔  
 ”او.....“ اس شخص کے ہونٹوں سے سیٹی کی سی آواز نکل گئی۔ ”مال دولت نہ سہی۔ حسن و جوانی کا لہانہ تو ہے تمہارے پاس.....“

”بکواس بند کر۔..... چھوڑ دو مجھے۔ میں شور مچا دوں گی۔“ رضیہ نے کہا۔  
 ”شور مچانا ہوتا تو تم وہیں پر مچا دیتیں جب میں تمہارے ساتھ تانگے پر بیٹھا تھا۔“ اس شخص نے رضیہ کو کمر را۔ ”اب خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہو۔ آج کی رات دوستوں کی طرح میرے ساتھ گزار لو.....  
 ”جہاں کوئی تمہیں پہنچا دوں گا۔“  
 ”میں کوئی آوارہ عورت نہیں ہوں۔ سمجھے۔“ رضیہ نے اسے مگھورا۔  
 ”آوارہ ہو یا شریف زادی۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہو۔“ اس شخص نے پستول سے اشارہ کیا۔

رضیہ کے منہ سے گرا سانس نکل گیا۔ اس شخص کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ چادر لپیٹ کر خاموشی سے اس شخص کے ساتھ چل پڑی۔

وہ لوگ بستی کے باہر ہی باہر سے ہوتے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ آوارہ کتوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ شخص کتوں کو ہشکارتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے رضیہ کی کلائی تھام لی تھی۔ اس شخص نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی کو شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اس عورت کو زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اگر تانگے والے کو کچھ شبہ ہوا ہو گا تو اس نے ڈر کر مداخلت نہیں کی تھی۔ یوں بھی تانگے واپس جا چکا تھا۔

لیکن یہ اس شخص کی بھول تھی۔ تانگے والے کو شروع ہی سے اس پر شبہ ہو گیا تھا، لیکن اس نے کسی آدم کی مداخلت نہیں کی تھی۔ اس نے ان دونوں کو کریم پورہ کے سامنے اتارنے کے بعد دس روپے پر ہی صبر لائے تانگا واپس موڑ لیا تھا لیکن کچھ دور جا کر اس نے تانگا روک لیا اور گھوڑے کی لگام سڑک کے کنارے الگ درخت کی شاخ سے باندھ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس چلنے لگا۔ اس نے ان دونوں کو بستی کے باہر ہی اہر جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ غنڈہ اس عورت کو زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

تانگے والا بڑی ہوشیاری سے چھپ کر ان کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ لوگ بستی کی کسی گلی یا مکان میں داخل ہونے کے بجائے بستی کے قریب سے گزرتے ہوئے دوسری طرف کھیتوں میں نکل گئے۔ تانگے والا کئی مرتبہ سواریوں کو لے کر اس طرف آچکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کریم پورہ سے آگے کوئی بستی نہیں تھی۔ البتہ تقریباً ”دو فرلانگ آگے خشت سازی کا ایک بھنڈ تھا اور تانگے والے کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ غنڈہ اس عورت کو اینٹوں کے اس بھٹے کی طرف ہی لے جا رہا تھا۔

تانگے والے کا خیال درست نکلا۔ وہ غنڈہ اس عورت کو لے کر اینٹوں کے بھٹے پر ہی گیا تھا۔ بھٹے پر ماضی طور پر بنا ہوا ایک جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر تانگے والا واپس مڑ گیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بستی کی طرف چلنے لگا۔

وہ شخص رضیہ کو لے کر بھٹے پر پہنچ گیا۔ بھٹے پر کام بند تھا۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ موجو اپنے

جھوپڑے میں موجود ہوگا۔ مہوج پتھیرا تھا اور اس کا پرانا دوست تھا۔ وہ کئی برسوں سے شیردرانی کے اس بھٹے پر کام کر رہا تھا۔ پچھلے ایک سال سے بھنہ بند پڑا تھا۔ دوسرے پتھیرے روزگار کی تلاش میں کہیں اور جا چکے تھے مگر مہوج یہیں رہتا تھا۔ وہ دن میں شہر میں پھلوں کا ٹھیلہ لگاتا اور رات کو یہاں آجاتا۔ ٹھیلہ وہیں رہتا تھا جہاں اس نے جگہ لے رکھی تھی۔

اس شخص نے جب دروازہ کھٹکھٹایا تو مہوج سو رہا تھا۔ دوسری مرتبہ جب دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ڈر گیا تھا۔ اس کے ملنے والوں میں ایسا کوئی نہیں تھا جو آدمی رات کو یہاں آسکتا ہو۔ اس کے ذہن میں کسی چور یا ڈاکو کا خیال ابھرا تھا۔ اس نے چارپائی کے قریب رکھی ہوئی کھلاڑی اٹھالی اور دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر آوازیں رعب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”کون ہے..... باہر کون ہے؟“  
 ”اوائے میں ہوں مہوج..... تمہارا دوست سراج..... سا جہا۔“ باہر کھڑے ہوئے شخص نے جواب دیا۔  
 مہوج نے دروازہ کھول دیا۔ کھلاڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔  
 ”اوائے! کون سا بھٹا کوئی واردات کر کے آئے ہو کیا؟ تمہارے پیچھے پولیس تو نہیں..... یہ..... یہ کون ہے اوائے؟“ وہ چادر میں لپیٹی ہوئی رضیہ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

”اندر تو آنے دو..... دیکھو گے تو اچھل پڑو گے۔“ وہ غنڈہ بولا جس نے اپنا نام سراج بتایا تھا۔ ”ایسی چیزیں تم نے صرف لمبی لمبی، قیمتی اور چم چماتی کاروں ہی میں دیکھی ہوں گی۔ کبھی ان کے قریب جانے کا تصور بھی نہیں کیا ہو گا لیکن آج ایسی ہی ایک چیز تمہارے سامنے ہے۔ تم نہ صرف اسے چھو سکتے ہو بلکہ آج اسے استعمال بھی کر سکتے ہو۔“

وہ اندر آگئے اور سراج نے رضیہ کے اوپر سے چادر کھینچ دی۔  
 ”ارے!“ مہوج رضیہ کو دیکھ کر اچھل پڑا..... ”یہ..... یہ تو نرس رضیہ ہے اور شیردرانی کو بہت عرصہ سے اس کی تلاش ہے۔“

”کیا..... کیا بکواس کرتے ہو؟“ سراج بولا۔ ”میں تو احمد پور لانا سے اس کے پیچھے آ رہا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ تو گھر سے بھاگی ہوئی کوئی لڑکی ہے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے کئی روز پہلے موجد ار نے بتایا تھا کہ نرس رضیہ شیردرانی کو دھوکا دے کر نالہ بی بی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ وہ تو بہت عرصہ سے اس کی تلاش میں ہے۔“ مہوج نے بتایا۔  
 ”یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔“ سراج بولا۔ ”لیکن..... میں اپنی محنت ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ بڑی محنت کا ہے میں نے اسے گرفت میں لینے کے لئے۔“

”تمہاری محنت ضائع نہیں جائے گی۔“ مہوج مسکرایا۔ ”اس کے بارے میں میں نے سنا تھا کہ آموں والی حویلی میں شیردرانی کے آدمیوں کا دل خوش کرتی رہی ہے۔ آج ہمارے ہاتھ آگئی ہے تو ہم اسے ایسے ہی تو نہیں جانے دیں گے۔ کوئی خدمت خاطر تو کریں گے نا اس کی۔“

”اگر تم میں سے کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو اچھا نہیں ہوگا۔“ رضیہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”میں شیردرانی سے تمہاری شکایت کر دوں گی اور وہ تم دونوں کی کھال ادھیڑ ڈالے گا۔“  
 ”تم..... شیردرانی سے شکایت کرو گی؟“ مہوج نے قہقہہ لگایا۔ ”تم تو خود اس سے چھٹی پھر رہی ہو ہمارے شکایت کیا کرو گی۔“

”یہ تم لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ میں رائے منصور کی حویلی سے بھاگ کر شبیر درانی کے پاس ہی جا رہی تھی۔ لیکن اسے جب پتہ چلے گا کہ تم نے مجھے راستے ہی میں اغواء کر لیا تھا تو وہ تم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ رضیہ نے کہا۔

”وہ ہمیں زندہ چھوڑے یا نہ چھوڑے یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو تمہیں ہماری پیاس بجھانا پڑے گی۔“ سراج کہتے ہوئے اچانک ہی رضیہ پر چھٹ پڑا۔

رضیہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ دونوں وحشیوں کی طرح اس پر جھٹ پڑے تھے۔ اس دھینگا مشتی میں رضیہ کی قیض پھٹ گئی۔ اس کے گریبان میں اڑے ہوئے نوٹ گر کر بکھر گئے۔ مگر ان دونوں کو نوٹوں کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تو حسن کا خزانہ لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رضیہ کی قیض تار تار ہو چکی تھی۔ اس کا گداز بدن دیکھ کر ان دونوں کی ہوس کچھ اور بھڑک اٹھی۔ ان دونوں نے اسے چارپائی پر گر ادیا۔ رضیہ چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ اس کوشش میں اتفاق سے اس کا ہاتھ سراج کی واسکٹ کی جیب میں چلا گیا۔ جس میں پستول رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے پستول کھینچ لیا۔ سراج کو جب پستول کا احساس ہوا تو اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ رضیہ نے پستول اس کے سینہ پر رکھ کر ٹراننگر دبا دیا۔ ایک دھماکہ ہوا۔

سراج کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی اور وہ رضیہ کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ رضیہ چند لمحے بے حس و حرکت پڑی رہی پھر اس نے سراج کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”تت..... تم نے سراج کا خون کر دیا۔“ موجو ہکلا کر رہ گیا۔ مارے خوف کے اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

”میں..... میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی.....“ رضیہ چیخی۔

ٹھیک اسی لمحہ باہر چاروں طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ موجو چیخا ہوا باہر دوڑا لیکن جھوپڑے سے نکلنے ہی دو پولیس والوں کے ہاتھ آگیا۔

”اس نے سراج کو گولی مار دی..... قتل کر دیا اسے۔“ موجو چیخا۔

دو پولیس والے راتھلیں تانے جھوپڑے میں گھس گئے۔ رضیہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جسم کا اوپری حصہ برہنہ تھا۔ سینہ اور پیٹ خون سے تر ہو رہا تھا۔

”پستول پھینک دو اور اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔“ ایک پولیس والا غرایا۔

رضیہ نے پستول پولیس والے کے سامنے پھینک دیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔

”کیا تم زخمی ہو؟“ دوسرے پولیس والے نے پوچھا۔ وہ ہیڈ کا نشیبل تھا۔

”نہیں..... یہ اس شیطان کا خون ہے۔“ رضیہ نے چارپائی پر سراج کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے اسے گولی مار دی ہے۔ یہ لاری اڑے سے مجھے گن پوائنٹ پر اغواء کر کے یہاں لایا تھا۔ اور یہ دونوں میری عزت لوٹنا چاہتے تھے۔“

”کوئی لفظ منہ سے نکالنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ اس وقت تمہاری کھی ہوئی کوئی بات تمہارے خلاف ہی استعمال ہو سکتی ہے۔“ ہیڈ کا نشیبل نے آگے بڑھ کر زمین پر پڑی ہوئی شال اٹھا کر رضیہ پر ڈال دی۔

رضیہ نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے جسم پر چادر درست کرنے لگی۔ پیٹ اور

سینہ خون آلود ہونے کی وجہ سے وہ کچھ کراہیت سی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے زمین پر پڑی ہوئی اپنی بھٹی ہوئی قمیض اٹھالی اور پولیس والوں کی طرف سے رخ بدل کر خون پونچھے لگی۔ پھر اس نے قمیض پھینک دی اور شال جسم پر درست کر کے دوبارہ پولیس والوں کی طرف مڑ گئی۔

ایک پولیس والا اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی اندر آیا تھا۔ وہ دوسرا آدمی تانگے والا تھا۔ اسے دیکھ کر رضیہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پولیس کو یہ تانگے والا ہی یہاں لے آیا تھا۔

”تم ٹھیک ہونا بن؟“ تانگے والے نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھ گیا تھا کہ یہ بد معاش تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ میں نے چھپ کر تم لوگوں کو اس بھٹی کی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہاں سے میں سیدھا تھا نے پہنچا اور پولیس کو لے کر یہاں آیا۔ یہ حوالدار صاحب بہت شریف آدمی ہیں۔ میری بات سن کر فوراً ہی نفری کو لے کر میرے ساتھ چل پڑے۔“

”میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں بھائی۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”یہ ذرا لائین ادھر لاؤ..... دیکھو تو یہ کون ہے؟“ حوالدار نے ایک پولیس والے کو اشارہ کیا۔ وہی اس پولیس پارٹی کا انچارج تھا۔

پولیس والے نے لکڑی کے ستون پر ٹنگی ہوئی لائین اتاری اور چارپائی کے قریب آگیا۔ دوسرے پولیس والے نے چارپائی پر اوندھی پڑی ہوئی لاش سیدھی کر دی۔ لاش کا چہرہ دیکھتے ہی حوالدار اچھل پڑا۔

”اوئے..... یہ تو اشتہاری ملزم سراج عرف سا جھا ہے۔“ ہیڈ کانٹیبیل بولا۔

سراج عرف سا جھا ڈکیتی اور قتل کی کئی وارداتوں میں عرصہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔ اسے اشتہاری ملزم قرار دیا گیا تھا اور اس کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لئے پانچ لاکھ روپے کا انعام بھی مقرر تھا۔

پولیس کو اپنی کارروائی مکمل کرنے میں تقریباً ”ایک گھنٹہ لگ گیا۔“

”تم اپنا تانگہ یہاں لے آؤ۔ دوسرا تانگہ بھی لیتے آنا۔“ ہیڈ کانٹیبیل نے تانگے والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تانگے والا جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

تانگے والا جب رضیہ کے اغواء کی اطلاع دینے کے لئے تھا نے پہنچا تھا تو اس وقت تھا نے کی کوئی جیب یا موبائل نہیں تھی۔ ہیڈ کانٹیبیل اپنے چھ آدمیوں کو دو تانگوں پہ لے کر آیا تھا۔ تانگے انہوں نے بھٹے سے دور ہی چھوڑ دیئے تھے تاکہ رضیہ کو اغواء کر کے لانے والے کو خبر نہ ہو سکے۔

سراج کی لاش ایک تانگے کی انگی سیٹ پر ڈال دی گئی۔ دو پولیس والے موجو کو لے کر اسی تانگے کی بچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ موجو کو ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ رضیہ ہیڈ کانٹیبیل اور دوسرے پولیس والوں کے ساتھ دوسرے تانگے پر بیٹھ گئی تھی۔

رضیہ کو آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی ضرب المثل یاد آ رہی تھی۔ لیکن کھجور کا یہ درخت جس پر وہ اٹکی تھی اس کے لئے چھانسی کا تختہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک شخص کا قتل ہو گیا تھا۔ جب کہ وہ آسمان جس سے وہ گری تھی اس کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ اب وہ بچھتا رہی تھی کہ رائے منصور کی حویلی سے کیوں نکلی تھی۔

خوف اور سردی سے وہ کانپ رہی تھی۔ تھا نے پہنچ کر اسے ایک کبل بھی دیدیا گیا تھا لیکن سردی کسی طرح کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

ہیڈ کانسٹیبل تقریباً "ایک گھنٹے تک ایس ایچ او سے مشورہ کرتا رہا پھر رضیہ کے پاس آگیا جسے ایک الگ کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔

"ہاں بی بی! اب بتاؤ تم کون ہو، آدمی رات کے وقت کہاں سے آ رہی تھیں اور اس غنڈے کے ساتھ تم اس بجٹے تک کیسے پہنچی تھیں؟" ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

"میں اس بجٹے تک کیسے پہنچی تھی؟ یہ آپ کو مانگے والا بتا چکا ہے۔ وہ غنڈہ احمد پور لاما سے میرے پیچھے لگا تھا اور یہاں موقع ملنے ہی اس نے مجھے پستول کی زد پر لے کر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا وہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ میں کون ہوں، کیا ہوں، آدمی رات کو کہاں سے آ رہی تھی اور کہاں جا رہی تھی؟ میں فی الحال یہ سب کچھ نہیں بتا سکتی۔" رضیہ نے کہا۔

"دیکھو بی بی! ہیڈ کانسٹیبل نے اس کے چہرے پر نظرسنجاس دیں۔ "مجھے تم ایک شریف گھرانے کی لڑکی لگتی ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتیں کہ تمہارے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا ہے۔ یہاں شہر میں کہاں رہتی ہو؟ گھر کا پتہ یا فون نمبر بتاؤ تاکہ تمہارے والد، بھائی یا کسی اور کو بلا لیا جائے۔"

"اس شہر میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے کچھ ہمدردی ہے تو احمد پور لاما میں رائے منصور صاحب کو فون پر اطلاع کر دیجئے۔" رضیہ نے جواب دیا۔

"رائے منصور! ہیڈ کانسٹیبل اچھل پڑا۔ "رائے صاحب سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"تعلق وہ خود ہی بتائیں گے۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "میرا نام رضیہ ہے۔ آپ فون پر انہیں اطلاع کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں رائے صاحب کو فون کر دیتا ہوں۔" ہیڈ کانسٹیبل کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔ اگر ایک کبیل اور....."

"میں کبیل بھجوا دیتا ہوں۔" ہیڈ کانسٹیبل کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد کانسٹیبل اسے ایک اور کبیل دے گیا جسے رضیہ نے اوڑھ لیا۔ تقریباً "ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ اس دوران کوئی بھی پولیس والا اس کمرے میں نہیں آیا تھا اور پھر بارہ قدموں کی آواز سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل تھا جو دروازے سے دو قدم اندر آ کر رک گیا تھا۔

"میں نے رائے منصور صاحب کو فون پر تمہارے بارے میں اطلاع دیدی ہے۔ ان کا وکیل کچھ دیر بعد یہاں آنے والا ہے۔ ان کی موجودگی میں تمہارا بیان ریکارڈ کیا جائے گا۔ ویسے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہیڈ کانسٹیبل یہ اطلاع دے کر واپس چلا گیا۔ رضیہ کو کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ رائے منصور کو اطلاع ہو گئی تھی اور وہ اسے اس طرح بے سارا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ تقریباً "پندرہ منٹ بعد ایک بار پھر بارہ قدموں کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ دو آدی تھے۔

چند سیکنڈ بعد ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ کمرے میں داخل ہونے والے آدی کو دیکھ کر رضیہ اچھل پڑی۔ اسے سینے میں اپنا سانس رکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ دہشت زدہ سی لگا ہوں سے اس شخص کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ شبیر درانی تھا۔

رضیہ کو حیرت تھی کہ شبیر درانی کو اطلاع کیسے مل گئی تھی۔ لیکن وہ شاید یہ بات بھول گئی تھی کہ پولیس

کے گلے میں شیردرانی کے نمک خوار موجود تھے جو ہر لمحہ حق نمک ادا کرنے کو تیار رہتے تھے۔

پولیس والے جب رضیہ کو لے کر تھانے پہنچے تھے تو موجو نے موقع پا کر ہی تھانے کے ایک کانٹیل کو بتا دیا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور شیردرانی کو کس شدت سے اس کی تلاش ہے۔ وہ کانٹیل موقع ملتے ہی تھانے سے نکل کر اپنی سائیکل پر شیردرانی کے بچلے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

”یہ شیردرانی صاحب ہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ اپنی ضمانت پر تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ ضابطے کی کارروائی صبح مکمل ہو جائے گی۔“ ہیڈ کانٹیل نے رضیہ کے قریب آ کر کہا۔

”نہیں۔“ رضیہ نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”میں ان کے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔ نہ ہی مجھے اس کی ضمانت کی ضرورت ہے۔“

”رضیہ بی بی۔“ شیردرانی اس کے سامنے آگیا۔ ”تم جانتی ہو کہ تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”تمہاری ضمانت پر رہا ہونے سے بہتر ہے کہ یہ لوگ مجھے سلاخوں کے پیچھے بند کر دیں۔“

”حوالدار۔“ شیردرانی ہیڈ کانٹیل کی طرف مڑ گیا۔ ”تم ایک منٹ کے لئے باہر چلے جاؤ۔ رضیہ بی بی شاید مجھ سے ناراض ہے۔ میں ذرا تھائی میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ہیڈ کانٹیل خاموشی سے باہر نکل گیا۔

”میری بات غور سے سنو رضیہ۔“ شیردرانی نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری وجہ سے اگرچہ مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے لیکن اس وقت اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہارا قصور معاف کرنے کو تیار ہوں۔“

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں تم کتنے شریف ہو۔“ رضیہ نے کہا۔

”سوچ لو۔۔۔۔۔“ شیردرانی غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ جس کا ایک چشم دید گواہ بھی موجود ہے اور وہ میرا آدمی ہے۔ رائے منظور بھی اب تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ تمہاری ساری زندگی جیل میں سزا جائے گی۔ تم ان پولیس والوں کو نہیں جانتیں۔ عدالت میں پیش کرنے سے پہلے یہ لوگ تمہارا جو حشر کریں گے اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ بہتر ہے کہ میری بات مان لو۔۔۔۔۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”مجھے جیل میں سزنا منظور ہے مگر میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔“ رضیہ نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔

”ایک بار پھر سوچ لو۔“ شیردرانی نے اسے گھورا۔

”میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

اسے لمحہ ہیڈ کانٹیل دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شیر کے کان میں کچھ کہا۔ شیردرانی کرسی سے اٹھ کر رضیہ کو گھورتا ہوا اس کمرے سے نکل گیا۔ ہیڈ کانٹیل بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔

تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد ہیڈ کانٹیل رضیہ کو ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں رائے منظور کے وکیل کو دیکھ کر رضیہ کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

”بیٹھو بی بی۔“ ایس ایچ او نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ رضیہ کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے کہا۔

”اے اب بتائیے، یہ سارا واقعہ کیسے پیش آیا تھا۔“

رضیہ نے وکیل کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ رضیہ چند لمحے خاموش رہی پھر شروع سے آخر تک سارے واقعہ کی تفصیل بتادی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے رائے صاحب کی حویلی سے نکل کر غلطی کی تھی۔ میرے لئے وہی محفوظ ترین جگہ تھی۔ میری ہان کے دشمن گھات لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے حویلی سے نہیں نکلنا چاہئے تھا۔“

”کیا آپ کو کسی کی طرف سے جان کا خطرہ ہے؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ اور میں اپنی جان کے خوف ہی سے رائے صاحب کی حویلی میں پناہ لئے ہوئے تھی۔“ رضیہ نے کہا۔

”آپ کو کس سے خطرہ ہے؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”میں فی الحال اس کا نام نہیں لینا چاہتی لیکن یہ جانتی ہوں کہ پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں اس کا نام عدالت میں بتاؤں گی اور اس کے خلاف ثبوت بھی پیش کروں گی۔ وہ صرف میری ہی جان کا دشمن نہیں، ہر شریف آدمی اس سے خوف زدہ ہے۔ وہ اب تک کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے اور پولیس اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔“ رضیہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا پھر وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ بات کیجئے وکیل صاحب۔“

”رضیہ بی بی۔“ وکیل اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے رضیہ کی طرف گھوم گیا۔ ”تمہارے ساتھ جو افسوسناک واقعہ پیش آیا اس کا مجھے بھرپور دکھ ہے۔ لیکن سراج نامی جو شخص تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے وہ ذکییت اور قتل کی کئی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ ایس ایچ او صاحب چاہتے ہیں کہ اگر تم ان کی پسند کا بیان دیدو تو ہمیں اس سارے جنجال سے نجات مل سکتی ہے۔“

”کیسا بیان؟“ رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وکیل کے بولنے سے پہلے ایک کانٹیل چائے لے کر اُٹھا۔ اس نے ایک ایک کپ سب کے سامنے رکھ دیا اور باہر چلا گیا۔ یہ چائے تھانے سے ملحق ہیڈ کانٹیل کے گھر سے بن کر آئی تھی اور وہ بھی اس وقت ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔

”چائے پیئیں بی بی۔“ ایس ایچ او نے رضیہ کو اشارہ کیا۔

”وہ بیان یہ ہوگا۔“ وکیل نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم لاری اڈے پر بس سے اتری تھیں اور آدمیوں نے اسلحہ کے زور پر تمہیں اغواء کر لیا اور اس دیر ان جھڑپوں پر لے گئے۔ پولیس کو کسی طرح تمہارے اغواء کی اطلاع مل گئی اور انہیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ تمہیں اغواء کرنے والوں میں مفرد قاتل سراج عرف ساجھا بھی شامل ہے۔ یہ اطلاع ملنے ہی ایس ایچ او صاحب نے پولیس کی نفری کے ساتھ اینٹوں لے کر اس دیر ان جھڑپوں اور اس جھونپڑے کو گھیرے میں لے لیا۔ سراج اور اس کے ساتھی نے پولیس سے مقابلہ کیا اور پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔“

”لیکن وہ تو میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔“ رضیہ بولی۔

”آپ واقعی بہت بھولی ہیں رضیہ بی بی۔“ ایس ایچ او مسکرایا۔ ”یہ بیان دے کر تو آپ پھنس جائیں گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ سراج بہت بڑا ذکییت، کئی لوگوں کا قاتل اور پولیس کو مطلوب تھا۔ اسے سزا دینے



کا حق صرف قانون کو حاصل ہے۔ آپ پر قتل کا الزام آئے گا۔ ہو سکتا ہے بعد میں کسی وقت آپ کے اقدام کی تعریف کرتے ہوئے عدالت آپ کو رہا بھی کر دے۔ لیکن اس دوران آپ کے لئے بہت سی الجھنیں اور قانونی پیچیدگیاں تو پیدا ہوں گی اور ہم آپ کو ان الجھنوں سے بچانا چاہتے ہیں۔

”لیکن آپ کو اس سے کیا فائدہ ہو گا؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”بھئی سیدھی سی بات ہے۔“ ایس ایچ او کے بجائے وکیل نے جواب دیا۔ ”اتنے بڑے مجرم کی ہلاک پر انہیں کریڈٹ ملے گا۔ اور ہو سکتا ہے اس پولیس پارٹی میں شامل پولیس والوں کی پروموشن بھی ہو جائے۔“

”وہ اتنا بڑا مجرم تھا تو اس کی گرفتاری پر کوئی انعام بھی مقرر ہو گا۔“ رضیہ بولی۔

”ہاں“ وکیل نے کہا۔ ”اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر پانچ لاکھ روپے کا انعام مقرر تھا۔ یہ انعام دہائی کی تو حکومت مگر دراصل قانون کے ان محافظوں کے لئے یہ انعام تمہاری طرف سے ہو گا۔ یہ بھی تو سو اس طرح تم کتنی الجھنوں سے بچ جاؤ گی۔“

”رائے صاحب کو تو کوئی اعتراض نہ ہو گا؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”انہیں بھلا کیوں اعتراض ہونے لگا۔“ وکیل نے لگا۔ ”وہ تو ہمیں اس مصیبت سے بچانا چاہتے ہیں انہیں تو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ معاملہ اس قدر آسانی سے ختم ہو گیا۔“

”اور شیردرانی یہاں کیسے آیا تھا؟“ رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے ایس ایچ او کی طرف دیکھا۔

”انہیں کسی طرح اس واقعہ کا پتہ چل گیا تھا۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔ ”آپ شاید نرس

حیثیت سے ان کے گھر پر کچھ خدمات انجام دے چکی ہیں۔ درانی صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے اپنی ضمانت پر آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے آپ کی مرضی کے بغیر ہم زبردستی آپ کو

کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔ اس کے علاوہ درانی صاحب کو میری اس تجویز سے بھی اختلاف تھا۔ وہ چاہتے

کہ اس واقعہ کی رپورٹنگ اسی طرح کی جائے جس طرح یہ پیش آیا تھا۔ یعنی آپ کی طرف سے یہ بیان ہو

آپ نے اپنی عزت بچانے کے لئے سراج کو قتل کیا تھا۔ اس طرح سراج کے خلاف کیس میں شدت

ہو گی اور آپ کو لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہوں گی۔ لیکن اسی طرح جو قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی

انہیں درانی صاحب یا کوئی اور تو نہیں سمجھ سکتا۔ ایسی صورت میں عدالت میں گواہ پیش کرنے

گے۔ تاہم والا اس وقت تو گواہی دینے کو تیار ہے لیکن ہو سکتا ہے سراج کے ساتھیوں کی طرف

دھمکیاں ملنے پر وہ اپنے بیان سے منحرف ہو جائے۔ آپ جانتی ہیں کہ کسی ایسے کیس میں گواہوں کو عدالت

میں پیش کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور اس کیس میں گواہ بھی صرف وہی ایک تانگے والا ہے۔ اس کی گواہی

جھٹلایا بھی جاسکتا ہے۔ اسی لئے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ ساری درد سری پولیس کی ہو گی۔ آپ کو سر

یہ بیان دینا ہو گا جو ابھی وکیل صاحب نے بتایا ہے۔“

”اگر وکیل صاحب اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ رضیہ نے جواب

”ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ رضیہ نے جواب دیا۔  
 ”فہیل!“ ایس ایچ او نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ”آپ بیان تیار کر لیں، ہم ذرا گپ شپ کر لیتے ہیں۔“

”بس سر۔“ ہیڈ کانسٹیبل اپنی چائے کی پیالی اٹھا کر باہر چلا گیا۔  
 وہ تینوں بھی کچھ دیر تک چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔ پھر ایس ایچ او نے کہا۔  
 ”آپ کن لوگوں سے خطرہ محسوس کر رہی ہیں رضیہ بی بی۔ اگر آپ ان کے خلاف رپورٹ لکھوا دیں تو قانون آپ کو تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔“

”نی الحال میں اس دشمن کا نام نہیں لینا چاہتی لیکن وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گی۔ وہ بہت با اثر آدمی ہے۔ جب تک اس کے خلاف میرے قدم مضبوط نہ ہو جائیں اس کا نام زبان پر نہیں لاؤں گی۔“  
 رضیہ نے وکیل کی طرف دیکھا۔ وکیل کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔  
 ”کوئی شخص کتنا ہی با اثر کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ بہر حال، آپ کو جب بھی مدد کی ضرورت ہو ہم حاضر ہیں۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

ہیڈ کانسٹیبل بیان تیار کر کے لے آیا۔ ایس ایچ او نے ایک دو تبدیلیوں کے بعد بیان دوبارہ لکھوایا اور مطمئن ہونے کے بعد رضیہ کے دستخط کروا لئے۔

”اب آپ کو اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ قانون سے تعاون کے لئے بہت بہت شکریہ۔“  
 ایس ایچ او نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آؤ بھئی، اب چلیں۔ رات ختم ہونے والی ہے۔ صبح مجھے کورٹ بھی جانا ہے۔“ وکیل کہتے ہوئے اٹھ اٹھا۔ ایس ایچ او نے بڑی گرجوٹی سے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

”میں آپ کا یہ کمبل نے جاری ہوں۔ صبح کسی کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔“ رضیہ بولی۔  
 ”کوئی بات نہیں۔“ ایس ایچ او مسکرایا۔

وکیل اور رضیہ تھانے سے باہر آ گئے۔ باہر وکیل کی کار کھڑی تھی۔ کمبلوں میں لپی ہوئی رضیہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور وکیل نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

گاڑی آہستگی سے حرکت میں آگئی۔ رات کا آخری پہر تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ تھانے سے تقریباً آٹھ گزے جا کر وکیل نے کار دائیں طرف موڑ دی اور اس کے ساتھ ہی یوں محسوس ہوا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔

سڑک پر دو طرف سے کار پر خود کار ہتھیاروں سے زبردست فائرنگ کی جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی رضیہ کا جسم چھلنی ہو گیا۔ دو گولیاں وکیل صاحب کو لگیں۔ ان کے منہ سے چیخ نکلی اور کار بے قابو ہو کر ادا تھ پر چڑھ کر سانے والے مکان کے دروازے سے ٹکرا کر رک گئی..... اور پھر دوسرے ہی لمحے سکوت پھیل گیا۔ فضا پر ایک بار پھر پہلے جیسا سناٹا چھا گیا تھا۔

\*\*\* ..... ❀ ❀ ❀ ..... \*\*\*

رائے منصور فجر کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے گردن گھما کر اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ اتنی صبح کس کا فون ہو سکتا ہے۔ اور پھر دفعتاً اپنے وکیل کا خیال آگیا۔

گزشتہ روز وہ عشاء کے لگ بھگ رحیم یار خان سے واپس آیا تھا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے کئی گزیدہ کا احساس ہو گیا تھا اور پھر جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ رضیہ شام پانچ بجے سے لاپتہ ہے۔ آصفہ بیگم نے اسے بتایا تھا کہ وہ حنیفہ سے ملنے گئی تھی۔ جب اسے واپس میں دیر ہوئی تو حنیفہ کے گھر پہنچوایا گیا تو حنیفہ کی ماں نے جواب دیا کہ وہ تو اسی وقت شاداں کے گھر چلی گئی تھی کیونکہ حنیفہ بھی وہیں تھی اور شاداں کے گھر سے جواب ملا کہ رضیہ وہاں آئی ہی نہیں تھی۔ آصفہ بیگم نے بہتی کے تمام گھروں میں معلوم کر دیا۔ رضیہ کہیں بھی نہیں تھی۔ کسی نے اسے بہتی سے باہر جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ عشاء کے لگ بھگ رائے منصور رحیم یار خان سے واپس آیا تو آصفہ بیگم نے فوراً ہی اسے رضیہ کی گمشدگی کے بارے میں بتادیا۔

رائے منصور پریشان تھا کہ رضیہ کہاں غائب ہو گئی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ شبیر درانی کے آدمی رضیہ کو بہتی سے اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شبیر درانی اس سے ٹکر لینے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

کیا رضیہ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی تھی؟ یہ سوال بار بار رائے منصور کے ذہن میں آ رہا تھا۔ رضیہ نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی یہاں سے چلے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور رائے منصور نے ہمیشہ یہی جواب دیا تھا کہ اس پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب چاہے جاسکتی ہے۔ لیکن یہ حویلی اس کے لیے محفوظ ترین جگہ ہے۔ جب تک شبیر درانی کی طرف سے تحفظ کا اطمینان نہیں ہو جاتا اسے اس وقت تک یہیں رہنا چاہئے۔ رضیہ نے ہمیشہ اس کی بات مانی تھی۔ لیکن ہو سکتا ہے اس نے جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہو اور اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر خاموشی سے کہیں چلی گئی ہو۔

آدھی رات کے لگ بھگ رائے منصور کو رحیم یار خان کے ایک تھانے سے فون کال ملی تھی۔ پولیس نے اسے بتایا تھا کہ رضیہ ثانی ایک لڑکی کو قتل کے ایک کیس میں تھانے لایا گیا ہے اور رضیہ نے درخواست کی تھی کہ رائے صاحب کو اطلاع کر دی جائے۔ رائے منصور اس وقت بری طرح تھکا ہوا تھا اور ذہنی طور پر کچھ پریشان بھی تھا۔ اس نے فون کرنے والے کو بتادیا کہ وہ خود تو اس وقت نہیں آسکتا البتہ تھوڑی دیر میں اس کا وکیل تھانے پہنچ جائے گا۔

پولیس کی طرف سے رضیہ کے بارے میں یہ اطلاع ملنے کے بعد رائے منصور نے رحیم یار خان میں اپنے وکیل کو فون کیا۔ وہ اس وقت سو رہا تھا۔ اگر کسی اور کی کال ہوتی تو اس کے گھر والے اسے کبھی جگاتے۔ لیکن رائے منصور کا نام سننے ہی اسے جگا دیا گیا تھا۔

رائے منصور نے وکیل کو رضیہ کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ وہ فوراً "تھانے پہنچ جا۔ اور صورت حال معلوم کر کے رضیہ کی ہر قسم کی مدد کی جائے اور کوشش کرے کہ رضیہ کو وہ رات تھانے میں نہ گزارنی پڑے۔

اور اب نماز فجر کے تھوڑی ہی دیر بعد فون کی گھنٹی کی آواز سن کر رائے منصور نے سوچا تھا کہ وکیل کال ہوگی اور وہ اسے رضیہ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھالیا۔

"رحیم یار خان تھانہ سے حوالدار بول رہا ہوں رائے صاحب۔" اس کے ہیلو کے جواب میں دوم

سے کہا گیا۔  
 ”اوہ! رائے منصور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”میرا وکیل ابھی تک تھانے نہیں پہنچا کیا؟“

”وکیل صاحب رات ہی کو تھانے پہنچ گئے تھے جناب لیکن...“  
 ”لیکن کیا؟ خاموش کیوں ہو گئے؟“ رائے منصور نے کہا۔

اور پھر جواب میں جو کچھ بھی کہا گیا اسے سن کر رائے منصور اچھل پڑا۔

”کیا... ٹھیک ہے“ میں آرہا ہوں۔“

رائے منصور نے فون کا ریسیور رکھا ہی تھا کہ آصفہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اس نے دوپٹہ طرح اوڑھ رکھا تھا کہ پیشانی بھی دھکی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ میں سفید دانوں والی تسبیح تھی۔ وہ بھی نماز کے اپنے کمرے سے نکلی تھی۔

”کیا ہوا؟ خیریت کس کا ٹیلی فون تھا؟“ آصفہ بیگم نے پوچھا۔ اس نے شوہر کے چہرے سے اندازہ لگایا۔  
 ”کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔“

”کسی نے رضیہ کو قتل کر دیا ہے اور وکیل بھی شدید زخمی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔  
 ”تم میرے لیے لئے صرف چائے بنا دو۔ میں ابھی رحیم یار خان جا رہا ہوں۔ واپسی پر شام ہو جائے۔“

”لیکن رات کو تو فون آیا تھا کہ رضیہ پولیس کی تحویل میں ہے۔“ آصفہ بیگم بولی۔  
 ”ہاں۔“ رائے منصور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں نے وکیل صاحب کو بھی فون کیا تھا کہ تھانے پہنچ صورت حال کا پتہ کریں اور رضیہ کو جس قسم کی بھی مدد کی ضرورت ہو فراہم کی جائے۔ ابھی پولیس پیش سے فون آیا تھا کہ تقریباً چار بجے وکیل رضیہ کو ساتھ لے کر تھانے سے نکلا تھا کہ تقریباً سو گز کے مل پر بعض نامعلوم لوگوں نے کار پر فائرنگ کر دی۔ رضیہ ختم ہو گئی ہے۔ وکیل صاحب زخمی ہوئے ہیں۔ میں دو گولیاں لگی ہیں۔ تم چائے بناؤ میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔“ رائے منصور کہتے ہوئے بیڈ روم کی طرف چلے گئے۔

رائے منصور کپڑے بدل کر تقریباً دس منٹ بعد دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اس کے دو تین منٹ آصفہ بیگم بھی رُے اٹھائے پہنچ گئی۔ رُے میں چائے کے کپ کے علاوہ ڈبل روٹی اور مکھن رکھا ہوا تھا۔  
 آصفہ بیگم نے دو سلاٹسز پر مکھن لگا کر پلیٹ آگے سرکا دی۔

”تھوڑا بہت کھا لیجئے۔ وہاں پتہ نہیں کیا صورت حال ہو۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔

رائے منصور نے ایک سلاٹس اٹھالیا اور چائے کی چمکیوں کے ساتھ سلاٹس کھانے لگا۔

”میں دارا سے کہتی ہوں وہ گاڑی نکال لے۔“ آصفہ بیگم کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ”بڑی بے وقوف لڑکی تھی۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ظاہر ہے اس کا تدارہ رضیہ کی طرف تھا۔ ”یہاں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن شاید اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ موت سے یہاں سے بچنے کر لے گئی۔“ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ رضیہ کئی روز یہاں ہی تھی اور آصفہ کو اس سے کچھ انس ہو گیا تھا۔

”موت کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اسے اپنے وقت پر ہر صورت میں آنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی جاندار اپنی مخالفت کا کیا ہی بندوبست کیوں نہ کرے“ اسے ایک دن تو موت کے شکنجے میں آنا ہی ہوتا ہے۔ رضیہ

اگر یہاں بھی ہوتی تو وقت پورا ہو جانے پر ہم اسے نہیں بچا سکتے تھے۔ ”رائے منصور نے جواب دیا۔  
 چندہ بیس منٹ بعد جب وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلے تو پاجیرو برآمدے کے سامنے موجود تھی اور دارا  
 گاڑی کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے رائے منصور کو دیکھ کر جلدی سے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔  
 رائے منصور گاڑی میں بیٹھ پچھلی نشست پر بائیں طرف بیٹھا کرتے تھے اور دارا ان کی اس عادت سے  
 اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے بائیں طرف والا دروازہ ہی کھولا تھا۔ ان کے بیٹھنے ہی دارا نے  
 دروازہ بند کر دیا اور خود اسٹیرنگ کے سامنے آگیا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو حویلی سے نکال لے گیا۔  
 دارا نے گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس نے چادر کو اس طرح سیٹ کیا تھا کہ وہ سردی  
 سے بھی محفوظ رہے اور ضرورت کے وقت بائیں پہلو میں ہولسٹر میں اسٹے ہوئے پستول تک ہاتھ لے جانے  
 میں بھی آسانی رہے۔

دارا، رائے منصور کا ڈرائیور بھی تھا اور باڈی گارڈ بھی۔ اسے رائے صاحب کے پاس کام کرتے ہوئے  
 کئی سال ہو گئے تھے۔ اس دوران صرف ایک موقع ایسا آیا تھا جب رائے صاحب کی حفاظت کے لیے اسے  
 کچھ کر دکھانے کا موقع ملا تھا۔

یہ تقریباً ”دو سال پہلے کی بات تھی۔ رائے منصور اس دن بھی رحیم یار خان گئے ہوئے تھے۔ شہر کے  
 ایک بیوپاری سے تین لاکھ روپے کی ادائیگی حاصل کی تھی۔ احمد پور لاما کے علاوہ رحیم یار خان کے ایک  
 بینک میں بھی رائے صاحب کا اکاؤنٹ موجود تھا۔ لیکن بیوپاری نے وہ ادائیگی شام کے وقت کی تھی۔ بینک  
 بند ہو چکا تھا۔ اس طرح شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد جب رائے صاحب گاڑی کے لیے روانہ ہوئے تو تین  
 لاکھ کی وہ رقم بھی گاڑی میں موجود تھی۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ صادق آباد پہنچے تھے۔ یہاں رائے صاحب نے گاڑی رکوا کر بازار سے  
 کچھ چیزیں خریدیں اور جب صادق آباد سے احمد پور لاما کی طرف روانہ ہوئے تو نو بج چکے تھے۔ صادق آباد  
 سے احمد پور لاما کی طرف جانے والی سڑک رات کے وقت تقریباً ”سنسان ہی رہتی تھی۔ اور ویسے بھی وہ  
 سردیوں کا موسم تھا۔ انہیں راستے میں سامنے سے آنے والی صرف ایک بس ہی ملی تھی۔

صادق آباد سے چند میل کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک جیپ تیز رفتاری سے ان کی  
 پاجیرو کو اور ٹیک کر گئی۔ آگے نکلنے ہی جیپ پاجیرو کے سامنے آگئی تھی اور اس کی رفتار بھی ایک دم کم ہو گئی  
 تھی۔ جیپ کو اس طرح راستے میں آنے دیکھ کر دارا کا ماتھا ٹھکا تھا۔ لیکن اس نے پہلے کہ وہ صورت حال کا  
 اندازہ لگا سکا جیپ بریکوں کی تیز چڑھاہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔ دارا کو بھی بڑی پھرتی سے بریک  
 لگا دینا پڑا۔ پاجیرو سے جیپ صرف تین فٹ کے فاصلے پر رکی تھی لیکن دارا کے سنبھلنے سے پہلے ہی جیپ سے  
 اترنے والے تین نقاب پوش پاجیرو کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں  
 تھیں۔ ان میں سے ایک پاجیرو کے سامنے رائفل تانے کھڑا تھا۔ ایک ڈرائیونگ سائیڈ پر اور ایک رائے  
 منصور والی سائیڈ پر۔

وہ ڈاکو تھے لیکن اپنے آپ کو ان کے گھبرے میں دیکھ کر نہ تو دارا خوفزدہ ہو رہا تھا اور نہ ہی رائے  
 منصور صاحب گھبرائے تھے۔ گاڑی کے تمام شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ دارا کی طرف کھڑے ہوئے ڈاکو نے  
 رائفل کی ٹال مار کر شیشہ توڑ دیا۔ شیشے کی ایک کپچی دارا کے رخسار پر لگی جس سے خون رسنے لگا۔ شیشے کے  
 باقی ٹکڑے سیٹ پر اور اس کی گود میں گرے تھے۔ نقاب پوش نے ٹوٹے ہوئے شیشے سے ہاتھ ڈال کر لاک

ہٹایا اور دروازہ کھول کر دار کو پکڑ کر ایک جھکے سے باہر کھینچ لیا۔ دارا منہ کے بل سڑک کے کنارے پر گر گیا۔  
 نقاب پوش نے اسے ایک زوردار ٹھوک بھی رسید کر دی۔  
 ”اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گولی سے اڑا دوں گا۔“ نقاب پوش اس کی طرف را نقل تان کر فرمایا۔

دارا اس روز بھی شال اوڑھے ہوئے تھا اور اس کے ہولشر میں پستول بھی موجود تھا لیکن ان ڈاکوؤں کو شاید اس کے پاس پستول کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ یوں بھی دارا کو گھیسٹ کر گاڑی سے اتارنے اور سڑک پر گرانے سے شال اس کے جسم میں اس طرح لپٹ گئی تھی کہ پستول چھپ گیا تھا۔ اگر ان ڈاکوؤں کو دارا کے پاس پستول کی موجودگی کا علم ہوتا یا پستول دیکھ لیا جاتا تو سب سے پہلے اس پستول پر ہی قبضہ کیا جاتا۔  
 ”رائے صاحب!“ دوسری طرف کھڑے ہوئے ڈاکو کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ”وہ رقم ہمارے حوالے کر دیں جو آج شام کو آپ نے آدمی سے وصول کی تھی۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ رقم میں آسانی سے تمہارے حوالے کر دوں گا۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔ نقاب پوش نے جس طرح رقم کا مطالبہ کیا تھا اس سے انہیں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ انہیں ان کے پاس رقم کی موجودگی کا علم تھا اور یہ اس وقت سے ان کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور اب موقع ملتے ہی انہوں نے گھیر لیا تھا۔

”آسانی سے نہیں، تو ہم دوسرے طریقے سے بھی وصول کر لیں گے۔“ نقاب پوش غرایا اور اس نے بھی را نقل کا دست مار کر شیشہ توڑ دیا اور دروازہ کھول کر رائے منصور کو نیچے اترنے پر مجبور کر دیا۔  
 نقاب پوش نے اچانک ہی را نقل کے دہانے سے رائے منصور پر حملہ کر دیا۔ را نقل کا دست پوری قوت سے رائے منصور کے شانے پر لگا اور وہ لڑکھڑا کر سڑک کے کنارے پر گرے اور ڈھلان پر لڑھکتے پڑے گئے۔  
 دارا زمین پر بے حس و حرکت پڑا اس نقاب پوش کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے اس پر را نقل تان رکھی تھی پھر دارا چادر کے اندر اپنے دائیں ہاتھ کو آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا۔ اس کی نظریں ڈاکو کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں اور ان آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی۔

دارا کا ہاتھ ہولشر پہنچ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے ہولشر کا ٹین کھولا اور بڑے آرام سے پستول نکال لیا اور اسی طرح زمین پر بڑے بڑے پستول کا ٹرا نیگر دیا دیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور دارا کے سامنے کھڑا ہوا نقاب پوش چیخا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ دارا کی گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ نقاب پوش نے ہاتھ سے بھی کلا شکوف کا ٹرا نیگر دب گیا تھا۔ را نقل شعلے اگل رہی تھی لیکن یہ غنیمت تھا کہ اس کے لڑھکانے سے را نقل کی نال اوپر کی طرف اٹھ گئی تھی اور گولیاں آسمان تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔  
 دارا نے لیٹے ہی لیٹے ایک اور گولی چلا دی جو لڑکھڑاتے ہوئے نقاب پوش کے جہزے کو توڑتی ہوئی اس کی طرف سے نکل گئی۔ نقاب پوش ڈھیر ہو گیا۔ دارا اپنے اوپر سے چادر ہٹا کر بڑی پھرتی سے اٹھ گیا اور اس نے گرنے ہوئے نقاب پوش کی کلا شکوف پر قبضہ کر لیا۔

دوسرے دونوں نقاب پوش فائرنگ کی آواز اور اپنے ساتھی کی چیخ کی آواز سن کر بدحواس سے ہو گئے۔  
 رائے صاحب کو گاڑی سے کھینچ کر گرانے والا نقاب پوش گاڑی کے دروازے میں جبکہ کر برف کیس اٹھا کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ پہلی گولی اور اس کے ساتھی کی چیخ کو سنی تھی۔ اس نے

دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل سیدھی کرنا چاہی لیکن رائے صاحب نے اٹھ کر اچانک ہی اس پر چھلانگ لگادی۔ نقاب پوش نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر وہ رائے صاحب کی گرفت میں آچکا تھا۔ نقاب پوش نے ٹرائیگر دبایا۔ کلا شکوف سے نکلنے والی گولیاں سڑک کے کنارے کھیت کے پودوں میں سنسناہٹ پھیلانے لگیں۔

پاجیرو کے سامنے کھڑا ہوا تیرا نقاب پوش فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دارا رفاًز کھول دیا۔ دارا نے ڈھلان پر چھلانگ لگادی۔ لیکن ایک گولی اس کی پائیں ٹانگ کی ران میں پوسٹ ہو چکی تھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی مگر اس کے باوجود اس نے حواس قائم رکھتے ہوئے جوابی فائرنگ کی۔ اس کی ایک گولی نقاب پوش کے رائفل والے بازو پر لگی۔ نقاب پوش بری طرح چیخا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ اور دوسرے ہی لمحہ اس نے کھیتوں کی طرف چھلانگ لگادی اور تاریکی میں دوڑنا چلا گیا۔

دارا رائفل سنبھالے لنگراتا ہوا سڑک پر آگیا۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ پاجیرو کے دوسری طرف سڑک کی ڈھلان پر دھینگا مٹھی کی آواز سن کر وہ اس طرف دوڑا۔ رائے منصور اس وقت اپنے حریف کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ نقاب پوش ہٹا کٹا تھا اور رائے منصور سے زیادہ طاقت ور تھا۔ رائے منصور ہانپ رہے تھے لیکن انہوں نے نقاب پوش کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”اب ختم کر دو اپنی یہ بہادری۔“ دارا نے نقاب پوش کی کھوپڑی پر رائفل کی ٹال رکھ دی۔ نقاب پوش اس وقت رائے منصور صاحب کے گلے پر گرفت جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دارا کی غراہٹ سن کر اس کے ہاتھ بے جان ہو کر نیچے گر گئے۔ رائے منصور اس کے سینے سے اٹھ گئے اور ایک طرف کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔ اس عمر میں ایک بڑے کئے شخص کا مقابلہ کر لینا بھی انہی کی بہت تھی۔

اسی وقت صادق آباد کی طرف سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دکھائی دی۔ دارا نقاب پوش کو رائفل کی زبردستی کھڑا کر دیا اور رائے منصور سڑک پر آگئے۔ اور دونوں ہاتھ اٹھا کر آنے والی گاڑی کو روکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ اگر وہ اشارہ نہ بھی کرتے تو گاڑی رک جاتی۔

وہ سفید رنگ کی مڑا کار تھی جو قریب آکر رک گئی تھی۔ اس میں سے سب سے پہلے جو شخص باہر نکلا وہ اسی علاقے کا زمیندار تھا اور رائے منصور کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

”ارے رائے صاحب! کیا ہوا، گاڑی خراب ہو گئی کیا؟“ زمیندار قریب آتے ہوئے بولا۔

”نہیں، یہاں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا اور....“

”ڈاکو....“ زمیندار اچھل پڑا۔ کار میں سے دو آدمی اور اتر آئے۔ وہ بھی رائے منصور کو اچھی طرح جانتے تھے۔

زندہ ڈاکو کی مشکلیں کس دی گئیں۔ تب رائے منصور کو پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ دارا زخمی ہے۔ زمیندار نے دارا کو اپنی گاڑی میں ڈال دیا اور دونوں آدمیوں کو اس کے ساتھ صادق آباد بھیج دیا۔ وہ لوگ دارا کو ہسپتال پہنچا کر پولیس کو اپنے ساتھ لے آئے۔ زندہ ڈاکو کو گرفتار کر لیا گیا اور مرنے والے ڈاکو کی لاش اٹھا کر پولیس کی گاڑی میں ڈال دی گئی۔ ڈاکوؤں کی تینوں کلا شکوف رائفلیں اور جیب پولیس نے قبضے میں لے لی۔ رائے منصور کو بھی پولیس کے ساتھ صادق آباد آنا پڑا۔ وہ چوہدری بھی رائے صاحب کے ساتھ آگیا تھا۔ جبکہ اس کے آدمی کار پر ان کے پیچھے آرہے تھے۔

رائے منصور سب سے پہلے ہسپتال پہنچے۔ جہاں انہیں پتہ چلا کہ دارا آپریشن ٹیبلٹ میں ہے اور اس کی آپریشن کر کے گولی نکالی جا رہی ہے۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد دارا کو آپریشن ٹیبلٹ سے باہر لے آیا گیا۔ ش میں تھا اور رائے منصور کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

”کیسے ہو بیک مین؟“ رائے منصور نے اسٹریچر کے قریب آکر پوچھا۔

”ٹھیک ہوں سرکار۔“ دارا نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم واقعی بہت بہادر آدمی ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے۔“ رائے منصور بولے۔

انہوں نے دارا کے لیے پرائیویٹ روم کا انتظام کر دیا اور ڈاکٹروں کو اس کے بارے میں ہدایات دے جانے والی آگے۔ بیان وغیرہ لکھوانے میں مزید ایک گھنٹہ لگ گیا۔ زمیندار اور اس کے آدمی رائے کے ساتھ تھانے ہی میں رہے تھے۔ واپسی پر زمیندار رائے منصور ہی کے ساتھ باجیرو میں بیٹھا تھا۔ وہ کے ٹوٹے ہوئے شیشے دیکھ کر بولا۔

”گاڑی کا بھی اچھا خاصا نقصان ہو گیا۔“

”گاڑی کی تو پرواہ نہیں، جان بچ گئی۔ ورنہ جس طرح ان ڈاکوؤں نے ہمیں گھیرا تھا میں تو سمجھا کہ ہمارا وقت آن پہنچا ہے۔ دارا واقعی ایک بہادر نوجوان ہے۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر بازی ہارنے کے منظر کو دیکھ کر بولا۔

احمد پور لاما کے بازار میں پہنچ کر رائے منصور نے باجیرو روک لی۔ زمیندار اس سے ہاتھ ملا کر اپنی کار لایا جو باجیرو کے پیچھے ہی رکھی تھی۔

اس واقعہ کو دو سال بیت گئے تھے۔ اس واردات کے اگلے دن پولیس نے فرار ہونے والے تیسرے بھی گرفتار کر لیا تھا۔ یہ ڈاکو دیکتیوں اور قتل کی کئی وارداتوں میں ضلع کے مختلف تھانوں کو مطلوب رہا۔ ان کی گرفتاری پر پولیس کی طرف سے دارا کو بیس ہزار روپے کا نقد انعام اور بہادری کی سند بھی دی گئی۔ رائے منصور نے بھی انعام کے طور پر دارا کے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار روپے جمع کروا دیئے تھے۔ تندرست ہو کر ہسپتال سے واپس آنے پر جب دارا کو رائے منصور کے انعام کا پتہ چلا تو اگلے ہی روز نے پچاس ہزار روپے بینک سے نکلوا کر رائے منصور کے سامنے رکھ دیئے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”سرکار!“ دارا نے جواب دیا۔ ”میں کئی سال سے آپ کی خدمت کر رہا ہوں۔ آپ سے مجھے بیشک شفقت ملی۔ یہ رقم دے کر آپ میرے اس احساس کو مجروح نہ کریں۔ میرے دل میں یہ احساس رہے دیں کہ میرے مال باپ کا سایہ میرے سر پر ہے۔“ دارا نے کہتے ہوئے باری باری رائے منصور کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

رائے منصور چند لمحے دارا کی طرف دیکھتے رہے پھر انہوں نے سامنے میز پر رکھی ہوئی رقم اٹھالی۔ وہ اس بات کے جواب میں کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتے تھے۔

پھر رائے منصور کی محبت و شفقت اور رحم دلی تھی کہ انہیں دارا جیسے آدمی ملے تھے۔ ان کے مزاحمت ان پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے تھے۔ اور اب دو سال بعد رائے صاحب کو نجانے کیوں دو سال کا واقعہ یاد آ گیا تھا۔

ابو صادق آباد سے گزر کر رحیم یار کی طرف جانے والی ہائی وے پر آگئی تھی۔ دارا نے گاڑی کی رفتار



بڑھادی تھی۔ اسے ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ رائے صاحب اتنی صبح رحیم یار خان کیوں جا رہے تھے۔ حالانکہ وہ کل رات ہی تو وہاں سے آئے تھے۔ ویسے اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ ویسے اسے بار بار ناکہ دارانی کا خیال آ رہا تھا۔

”کہاں جانا ہے سرکار؟“ دارا نے شہر کے نواح میں پہنچ کر پوچھا۔

رائے منصور نے تھانے کا نام بتادیا۔

”خیریت سرکار؟“ دارا چونک گیا۔

”رات کو کسی نے رضیہ کو قتل کر دیا ہے اور وکیل بھی زخمی ہے۔“ رائے منصور نے بتایا۔

”کیا ہوا تھا سرکار؟“ دارا ایک دم پریشان ہو گیا۔

”یہ تو تھانے پہنچ کر ہی پتہ چلے گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

مزید چالیس منٹ بعد وہ تھانے پہنچ گئے۔ ایس ایچ او تھانے میں موجود تھا۔ اس نے اٹھ کر بڑی مگر جو ش سے ہاتھ ملایا۔

”تشریف رکھئے رائے صاحب۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا معاملہ ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ وکیل صاحب کیسے ہیں؟“ رائے منصور نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے

پوچھا۔

ایس ایچ او ابھی کرسی پر بیٹھ گیا اور گزشتہ رات کے واقعہ کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

”ہم نے اسٹیٹ ور سس سراج وغیرہ کیس درج کر کے رضیہ بی بی کو آپ کے وکیل کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ان کی کار یہاں سے تقریباً ”سو گز“ آگے گلی میں مڑی ہی تھی کہ ان پر فائرنگ کی گئی۔ حملہ آور غالباً پہلے ہی سے وہاں پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ہم فائرنگ کی آواز سننے ہی اس طرف دوڑے۔ اس وقت ایک کار تیزی سے مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ میں نے دو آدمی وکیل صاحب کی کار کے پاس چھوڑ دیئے اور باقی آدمیوں کو لے کر اس کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ ہم نے جلد ہی انہیں جالیا۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی اور آخر کار جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ہم ان کا چھپچھاپ نہیں چھوڑیں گے تو وہ ایک گلی کے موڑ پر کار چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ان کا ایک ساتھی زخمی ہو کر ہماری گرفت میں آ گیا جبکہ دوسرے تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تنگ سی گلیوں میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔“

”کہاں ہے وہ؟ اس نے کچھ بتایا؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے اور ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بے ہوش ہونے کی وجہ سے ہم ابھی تک اس سے کچھ معلوم نہیں کر سکے۔“ ایس ایچ او نے

جواب دیا۔

”اور وکیل صاحب؟“ رائے منصور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان کو دو گولیاں لگی ہیں اور اتفاق سے دونوں گولیاں بائیں بازو پر ہی لگی ہیں۔ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ البتہ رضیہ بی بی موقعہ پر ہی جان بحق ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر سترہ گولیاں لگی ہیں۔ وکیل صاحب کی کار بھی چھلنی ہو چکی ہے۔“

”آپ کے خیال میں یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”یہ تو اس زخمی حملہ آور کے ہوش میں آنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔

”ان کی جو کار قبضے میں لی گئی ہے اس پر کراچی کا رجسٹریشن نمبر ہے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ گاڑی کراچی سے چوری کی گئی ہوگی یا اسلحہ کے زور پر چھینی گئی ہوگی بہر حال، اس کے بارے میں بھی معلوم کر لیا جائے گا۔“

”کیا رضیہ کو تھانے میں لائے جانے کے بعد کوئی مشکوک آدمی تھانے میں آیا تھا؟ رائے منصور نے سوال کیا۔“

”مشکوک آدمی!“ ایس ایچ او کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ ”ایسا تو کوئی آدمی نہیں آیا تھا البتہ شبیر درانی صاحب ضرور آئے تھے۔“

”شبیر درانی!“ رائے منصور اچھل پڑا۔

”جی ہاں! وہ رضیہ بی بی کو اپنی ضمانت پر ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن رضیہ بی بی نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔“ ایس ایچ او نے بتایا۔

”لیکن شبیر درانی کو آدمی رات کے وقت رضیہ کی تھانے میں موجودگی کا پتہ کیسے چلا تھا؟“ رائے منصور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال درانی، آپ کے وکیل اور رضیہ بی بی کے جانے سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے واپس چلے گئے تھے۔ رضیہ بی بی شاید ان کے گھر پر نرس کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکی تھی۔ اور وہ شاید اسی لیے آئے بھی تھے۔“

”اور وہ ان دونوں سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے واپس چلے گئے تھے؟“ رائے صاحب نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”جی ہاں۔“ ایس ایچ او نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اور آپ کے کہنے کے مطابق حملہ آور پہلے ہی سے گھات لگائے بیٹھے تھے؟“ رائے صاحب کی نظریں ہستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”واقعات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں، کیا آپ کے خیال میں شبیر درانی....“

”اوہ نہیں۔“ رائے منصور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”زخمی حملہ آور کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ اگر وہ زندہ بچ گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہو سکتا ہے یہ کوشش اس کی بے ہوشی کے دوران ہی کی جائے تاکہ وہ ہوش میں آکر کوئی بیان نہ دے سکے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ زندہ بچ گیا تو ایسے سنسنی خیز انکشافات کرے گا کہ آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“ ایس ایچ او نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”رضیہ بعض معززین اور بااثر لوگوں کے رازوں سے واقف تھی۔ ان لوگوں کو خطرہ تھا کہ اگر رضیہ نے زبان کھول دی تو وہ لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ رضیہ جب تک میری حویلی میں تھی ان لوگوں سے محفوظ تھی لیکن اس نے حماقت کی کہ حویلی سے نکل آئی اور موت کا شکار ہو گئی۔“

”ایسی ہی کوئی بات رضیہ بی بی نے بھی کہی تھی کہ اسے بعض بااثر لوگوں کی طرف سے جان کا خطرہ ہے۔ میں نے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ وقت آنے پر بتائے گی۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟“ ایس ایچ او نے کہا۔

”مگر آپ کچھ جانا چاہتے ہیں تو زخمی حملہ آور کو بچانے کی کوشش کیجئے اور اس کی حفاظت کیجئے۔“  
رائے منصور نے کہا۔

”میں نے دو مسلح کانٹیل ہسپتال میں اس کی نگرانی پر تعینات کر دیئے تھے۔ لیکن بہر حال مزید آدمی لگا دیئے جائیں گے۔ آئیے..... ہسپتال چلتے ہیں۔“ ایس ایچ او کہتے ہوئے اٹھ گیا۔  
اس نے سیٹ چھوڑی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھالیا۔ چند لمحے دوسری طرف کی آواز سنتا رہا پھر بدحواس سا ہو کر بولا۔

”کیا.... اچھا میں آرہا ہوں۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟“ رائے منصور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کا خدشہ درست نکلا۔“ ایس ایچ او میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر جماتے ہوئے بولا۔ ”کسی نامعلوم شخص نے وارڈ میں داخل ہو کر حملہ آور کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک نرس نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر شور مچا دیا۔ اس شخص نے نرس اور دوسرے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے پستول سے ہوائی فائر کر دیا۔ فائر کی آواز سن کر وارڈ کے دروازے پر تعینات ایک کانٹیل دوڑ کر اندر پہنچ گیا۔ اس شخص نے کانٹیل پر گولی چلا دی اور کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی۔ کانٹیل اس کی گولی سے بچ گیا اور فرار ہوتے ہوئے شخص پر گولی چلا دی جو اس کے پیلو میں لگی ہے۔ اس کی حالت تشویش ناک ہے۔ آئیے چل کر دیکھتے ہیں کیا صورت حال ہے۔“

وہ دونوں تھانے سے باہر آگئے۔ ایس ایچ او کے اشارے پر تین چار مسلح کانٹیل چپ میں بیٹھ گئے جبکہ رائے منصور اپنی پاجیرو میں بیٹھ گیا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی سلطان زید ہسپتال کے پارکنگ لائٹ پر رک گئیں لیکن جب وہ آپریشن تھیمبر کے سامنے پہنچے تو برآمدے میں موجود میڈیکولبجگل آفیسر نے بتایا کہ جو شخص زخمی ملزم کو قتل کرنے کے لیے آیا تھا وہ قتل ہو گیا ہے۔ کانٹیل کی چلائی ہوئی گولی اس کے بائیں پیلو کو چرتی ہوئی دل میں پیوست ہو گئی تھی۔ جو جان لیوا ثابت ہوئی اور ڈاکٹر کوشش کے باوجود اسے نہیں بچا سکے تھے۔

رائے منصور ایس ایچ او کے ساتھ اس وارڈ میں آگیا تھا جہاں رضیہ اور وکیل پر حملہ کرنے والوں میں سے زخمی ہونے والے حملہ آور کو رکھا گیا تھا۔ ایک مسلح کانٹیل وارڈ کے دروازے پر تعینات تھا اور دوسرا اس واقعہ کے بعد اندر آگیا تھا۔

زخمی حملہ آور کا بیڈ وارڈ کے آخر میں تھا۔ اس کے بیڈ کے گرد اسکرین لگی ہوئی تھی۔ وہ اسکرین کے دوسری طرف پہنچ کر بیڈ کے قریب پہنچ کر رک گئے اور وہ بے ہوش حملہ آور کی طرف دیکھنے لگے۔

ان کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی آیا تھا۔ وہ ان کی موجودگی میں بے ہوش شخص کا معائنہ کرنے لگا، وہاں اسٹول پر ایک میل نرس بھی بیٹھا ہوا تھا جو انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ رائے منصور کے اندازے کے مطابق اس شخص کی عمر تیس پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بھاری مونچھوں اور دائیں رخسار پر زخم کے ایک پرانے نشان نے اس کے چہرے کو خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کے سینے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”ابھی کچھ دیر پہلے ہی سرجن صاحب اسے دیکھ کر گھمے ہیں۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ میرا خیال ہے ایک آدھ گھنٹے میں اسے ہوش آجانا چاہئے۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”گولی کہاں لگی تھی؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”دائیں طرف سینے میں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”گولی نکال دی گئی ہے لیکن ایک پیچھاڑا مٹا کر ہوا ہے۔“

”اسے فوری طور پر پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیں ڈاکٹر۔ وارڈ میں اس پر دوبارہ بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ اسے ہر حالت میں زندہ رہنا چاہئے۔“ ایس ایچ او بولا۔

”زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن ہم اسے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔ اگر اوپر کوئی پرائیویٹ روم خالی ہے تو اسے وہاں منتقل کر دیا جائے گا۔“

”اگر کوئی کمرہ خالی نہ ہو تو کرا لیا جائے۔ اسے فوری طور پر پرائیویٹ روم میں منتقل کیا جانا ضروری ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

”لیس آفیسر۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”اور وہ نرس کہاں ہے جس نے اس پر حملے کی نیت سے آنے والے شخص کو دیکھ کر شور مچایا تھا۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”اشاف روم میں۔ وہ فائرنگ سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”میں ذرا اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ایس ایچ او بولا۔

”آئیے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور میل نرس کو مریض کے بارے میں ہدایات دیتا ہوا وارڈ سے باہر گیا۔

ایس ایچ او کے ساتھ آنے والے مسلح کانسٹیبل وارڈ کے باہر موجود تھے۔ ایس ایچ او نے دو اور کانسٹیبلوں کو وارڈ کے اندر بھیج دیا اور ڈاکٹر کے ساتھ نرسنگ اشاف روم میں گیا۔ جہاں تین چار نرسیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر پیلاہٹ تھی جس سے رائے منصور کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ وہی نرس تھی جو فائرنگ کے وقت وارڈ میں موجود تھی۔

”آپ لوگ بیٹھے۔ میں مریض کی پرائیویٹ روم میں منتقلی کا بندوبست کرتا ہوں۔“ ڈاکٹر کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

”کیا آپ بتائیں گی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا؟“ ایس ایچ او نے اس نرس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ نو عمری لڑکی تھی اور نرسنگ کا کورس مکمل کر کے تقریباً ”ایک مہینہ پہلے ہی اس نے باقاعدہ ڈیوٹی نبھالی تھی۔“

”میں وارڈ میں ڈیوٹی پر تھی۔“ نرس نے بتایا۔ ”ایم ایس صاحب راؤنڈ پر آنے والے تھے اور میں مریضوں کے بیڈ وغیرہ چیک کر رہی تھی۔ میں ابھی شاید تیسرے یا چوتھے بیڈ کے مریض کا بستر درست کرتے ہوئے اس سے باتیں کر رہی تھی کہ ایک آدمی وارڈ میں آیا۔ اس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ اندر کیسے گیا تھا جبکہ ان اوقات میں اشاف کے علاوہ کسی بھی شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جب میں نے اس شخص سے یہی سوال کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ایم۔ پولیس کا آفیسر ہے اور اس مریض کو دیکھنا چاہتا ہے جو پولیس کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو وارڈ کے باہر کھڑے ہوئے پولیس والوں سے اس کے بارے میں تصدیق کر سکتی ہوں۔ میں مطمئن ہو گئی تھی کہ پولیس والے اسے جانتے ہی ہو گئے اسی لیے اسے اندر آنے دیا گیا ہو گا۔ اس نے ایک بار پھر اس زخمی کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے وارڈ کے آخری بیڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

وارڈ کے وسط میں پہنچ کر وہ شخص رک گیا اور بیڈ پر لیٹے ہوئے مریضوں کی شکلیں دیکھتا ہوا آگے

بڑھنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سمجھا نہیں تھا کہ میں نے کس بیڈ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں اسے آواز دے کر بتانا ہی چاہتی تھی کہ اس شخص کو قیص کے نیچے سے پستول نکالنے دیکھ کر چونک گئی۔ پستول دیکھ کر میں نے شور مچادیا اس شخص نے مجھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے مریضوں کو ڈرانے کے لیے ہوائی فائر کر دیا۔ اور تقریباً ”دوڑتا ہوا آگے والے بیڈ کے مریضوں کو دیکھنے لگا۔

فائر کی آواز سن کر ایک کانٹیل وارڈ میں آگیا۔ اس شخص نے کانٹیل پر گولی چلا دی اور اس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی کی طرف دوڑا۔ کانٹیل اس کی گولی سے بچ گیا تھا۔ اس نے بھی جواب میں گولی چلا دی جو اس شخص کے پہلو میں لگی اور وہ زخمی ہو کر نیچے گر گیا۔ کانٹیل نے دوڑ کر اس کا پستول چھین لیا۔ فائرنگ اور مریضوں کے چیخنے کی آوازیں سن کر دوسرا کانٹیل اور ڈاکٹر وغیرہ بھی دوڑتے ہوئے اندر آگئے اور حملہ آور کو فوری طور پر اٹھا کر آپریشن ٹیبلر میں پہنچا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ابھی تک زندہ ہے یا مر گیا۔ ”نرس خاموش ہو کر باری باری ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ مر چکا ہے۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔ ”اس کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اس زخمی مریض کو قتل کرنے آیا تھا جسے پولیس نے ایک آدمی کو زخمی اور ایک عورت کو قتل کرنے کے الزام میں زخمی حالت میں گرفتار کیا تھا۔ وہ زخمی پولیس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بیان سے پولیس کو یہ پتہ چل جائے گا کہ اس کے ساتھ دوسرے لوگ کون تھے اور یہ کارروائی کس کے کہنے پر کی گئی تھی۔ اس کی زبان خاموش رکھنے کے لیے ہی اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن آپ کی ذہانت اور جرات نے حملہ آور کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ قانون آپ کا بے حد شکر گزار ہے۔ بہر حال آپ کو اب خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

ایس ایچ او اور رائے منصور نرسنگ اسٹاف روم سے باہر آگئے۔ اس وقت وہ ڈاکٹر بھی آگیا جس نے سب سے پہلے ان سے ملاقات کی تھی۔

”مریض کو اوپر کی منزل پر پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا ہے۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔  
”تھینک یو ڈاکٹر۔ اور دوسرا زخمی کہاں ہے جس کے بازو پر گولیاں لگی تھیں۔ میرا مطلب ہے وکیل صاحب۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”ان کے گھر والے زخمی ہونے کی اطلاع ملنے پر آگئے تھے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”انہیں صبح ہی پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ روم نمبر سات۔“

وہ لوگ پرائیویٹ روم نمبر سیون میں آگئے۔ اس کمرے میں وکیل کی بیوی اور اس کا بیٹا بھی موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں کرسیوں سے اٹھ گئے۔ رائے منصور بیڈ کے قریب آگیا۔ وکیل کے بائیں بازو پر کھٹی سے اوپر دو جگہ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے۔“ وکیل رائے منصور کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں رضیہ کو نہیں بچا سکا۔ حملہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ مجھے سنہلنے کا موقع تک نہیں مل سکا۔“

”اٹل آل رائٹ۔“ رائے منصور نے اس کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”وہ جتنی زندگی لے کر آئی تھی وہ پوری ہو چکی تھی۔ بہر حال تم اب کیا محسوس کر رہے ہو؟“

”قسمت تھی بلکہ بقول آپ کے زندگی تھی بچ گیا۔“ وکیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔  
”ڈاکٹر! آپ کی کیا رائے ہے؟“ رائے منصور نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”ایک گولی بازو کا گوشت چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی اور دوسری نے قدرے گہرا زخم لگایا تھا۔ بہر حال تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک دو دن بعد انہیں ہسپتال سے رخصت کر دیں گے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”کیا اب آپ بیان دے سکتے ہیں وکیل صاحب؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میں بیان دینے کو تیار ہوں۔“ وکیل نے جواب دیا۔

”میں اے ایس آئی کو بھیجتا ہوں۔ وہ آپ کا بیان نوٹ کر لے گا۔“ ایس ایچ او نے کہا اور رائے منصور سے اجازت لے کر اس کمرے میں آگیا جہاں زخمی حملہ آور کو منتقل کیا گیا تھا۔

تین مسلح کانسٹیبل کمرے کے باہر بیٹھے تھے اور دو اندر موجود تھے۔ ایک میل ٹرس بھی بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایس ایچ او کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا پھر کانسٹیبلوں کو ہدایات دیتا ہوا کمرے سے نکل کر میڈیکولیکل آفیسر کے دفتر کی طرف چلا گیا۔

رائے منصور کچھ دیر وکیل کے پاس بیٹھا رہا پھر ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا وہ کچھ دیر تک راہداری میں کھڑا وکیل ہی کے بارے میں ڈاکٹر سے باتیں کرتا رہا پھر رضیہ کے بارے میں پوچھا۔

”رضیہ کی لاش کہاں ہے؟“

”سرد خانے میں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو آئیے میرے ساتھ۔“

وہ دونوں ہسپتال کے سرد خانے میں آگئے۔ جہاں دائیں طرف والی میز پر ایک لاش پڑی تھی۔ لاش اگرچہ سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھی مگر وہ چادر جگہ جگہ سے سرخ ہو رہی تھی۔

”یہ رضیہ کی لاش ہے۔ آپ دیکھ لیجئے، میں باہر کھڑا ہوں۔“ ڈاکٹر نے میز کی طرف اشارہ کیا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

رائے منصور کچھ دیر دروازے کے قریب کھڑا رہا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میز کے قریب آکر رک گیا۔ وہ کچھ دیر تک خون آلود سفید چادر کو گھورتا رہا پھر ایک کونا پکڑ کر منہ پر سے چادر ہٹا دی۔

کپٹھی اور ایک رخسار پر گولی کے نشان تھے جن پر خون جما ہوا تھا۔ رائے منصور چادر ہٹاتا چلا گیا۔ سینے اور پیٹ پر جگہ جگہ گولیوں کے نشان تھے۔ رائے صاحب نے چادر دوبارہ اس کے جسم پر سیدھی کر دی۔

پیٹ سے نیچے ٹانگوں تک چادر پر متعدد سرخ دھبے تھے۔ ٹیلی فون پر رائے منصور کو بتایا گیا تھا کہ رضیہ کو سترہ گولیاں لگی تھیں۔ اور اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ رضیہ کا جسم چھلنی ہو گیا تھا۔

رائے منصور کمرے سے باہر آگیا۔ ڈاکٹر دروازے کے سامنے ہی کھڑا تھا۔

”نفل لے جانا چاہیں تو کیا پروسیجر ہو گا؟“ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو پولیس سے بات کرنا ہوگی۔ انکسپکٹر صاحب میڈیکولیکل آفیسر کے دفتر میں گئے ہیں۔ آپ ان سے بات کر لیجئے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

رائے منصور میڈیکولیکل آفیسر کے دفتر میں آگیا۔ ایس ایچ او وہیں موجود تھا۔

”میں رضیہ کی نفش لے جانا چاہتا ہوں۔“ رائے منصور نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ اس کے درمعا کو جانتے ہیں؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”اب تو میں ہی اس کا وارث ہوں۔ اس کی تدفین کا بندوبست میں ہی کروں گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”ویسے اس نے بتایا تھا کہ اس کے گھروالے خانپور میں رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے

پڑوسیوں کے ہاں فون کر کے اپنے گھروالوں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے بات تک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں میرے خیال میں بہتر تو یہی ہو گا کہ انھیں اطلاع دیئے بغیر اس کی تدفین کر دی جائے۔ اگر اس کی موت عام حالات میں ہوئی ہوتی تو میں خود انہیں اطلاع دیتا مگر رضیہ کی موت جس طرح واقع ہوئی ہے وہ ان کے لیے زیادہ اذیت ناک اور رسوائی کا باعث بنے گی۔ بہتر ہے کہ وہ اسے گمشدہ ہی سمجھتے رہیں....

”کیا اتنی شدید رنجش تھی کہ اس کے گھروالے اس کے جنازے تک میں نہ آئیں؟“ ایس ایچ او نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”رضیہ کئی ہفتوں سے میرے پاس تھی۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”میں اس کے حالات کو دوسروں سے بہتر جانتا ہوں۔ اس کی ذلت و رسوائی اور تباہی کے ذمے دار وہی معزز اور بارسوخ لوگ ہیں جن سے رضیہ نے اپنی جان کا خطرہ ظاہر کیا تھا۔“

”آپ کی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں رائے صاحب۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

”زخمی کے ہوش آنے پر اس کا بیان لوگے تو ساری الجھنیں رفع ہو جائیں گی۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ایس ایچ او نے گہری سانس لیا۔ ”آپ نعل لے جانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو نے فون کر دیتا ہوں۔ ہیڈ کانسٹیبل کاغذات تیار کر کے بیس لے آئے گا۔ اور ڈیوٹی سرٹیفکیٹ آپ کو بیس سے مل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے آپ کاغذات تیار کروائیے.... میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں آجاؤں گا۔“ رائے منصور کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئے۔

ٹھیک اسی لمحہ ایک کانسٹیبل دفتر میں داخل ہوا اور سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔

”زخمی کو ہوش آگیا ہے سر۔ اس کے ساتھ ہی اس کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے آپ کو بلایا ہے۔“

میڈیکولجکل آفیسر، ایس ایچ او اور رائے منصور دفتر سے نکل کر پرائیویٹ رومز کی طرف دوڑے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دو نرسیں اور تین ڈاکٹر پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

”چند منٹ پہلے یہ ہوش میں تو آگیا تھا مگر پھر کایک اس کی حالت بگڑنے لگی۔ یہ چند منٹ کا ممان ہے۔ آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں پوچھ لیجئے۔ ہو سکتا ہے یہ آپ کی کسی بات کا جواب دے دے۔“ ڈاکٹر نے ایس ایچ او کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایس ایچ او بیڈ کے قریب آگیا اور زخمی پر جھکتے ہوئے بولا۔

”کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟ میری بات کا جواب دے سکتے ہو؟“

زخمی کی آنکھیں ایک لمحہ کھلیں پھر بند ہو گئیں۔

”ہاں!“ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی آواز بہت دھیمی تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔ رائے منصور اور میڈیکولجکل آفیسر بھی بیڈ کے قریب آگئے تھے۔

”حض... حض... حضور... بخش...“

”تم نے رضیہ کو کیوں مارا تھا؟ کار پر فائرنگ کیوں کی تھی؟ کیا دشمنی تھی؟“  
 ”مم... میری ان سے... کک... کوئی دشمنی نہیں.... تھی۔“ اس شخص نے رک رک کر جواب دیا۔  
 ”پھر تم نے کار... پر فائرنگ کیوں کی؟ تمہارے ساتھ اور کون تھا؟“ ایس ایچ او نے سوال کیا۔  
 ”آ... صف... چاچا... وہ... وہ بھاگ گئے۔“ اس شخص کی آواز کچھ اور کمزور ہو گئی۔  
 ”تم نے ایسا کیوں کیا؟ فائرنگ کس کے کہنے پر کی تھی....؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔  
 ”چا... چا...“

”چاچا کون ہے؟ اس کا پورا نام بتاؤ؟“

”جک... جک... د... چا...“

بات پوری ہونے سے پہلے اس کی گردن ڈھلک گئی۔ ایس ایچ او اس پر جھکا اپنا سوال دہرا رہا تھا۔  
 ”اب یہ آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔“ ایک ڈاکٹر نے ایس ایچ او کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔  
 ایس ایچ او گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ اس نے بیڈ کے قریب اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی خون کی بوتل کی طرف دیکھا۔ بلڈ جیمبر میں خون کے قطرے گرنا بند ہو گئے تھے اور ٹیوب میں خون کا بہاؤ رک گیا تھا۔  
 ڈاکٹر نے نبض سٹولی۔ اسٹینڈ کوپ لگا کر دل کی دھڑکن کو چیک کیا پھر سیدھا ہو کر خون کی بوتل سے ملٹک ٹیوب میں بلڈ جیمبر سے اوپر پلاسٹک کا اسٹاپر بند کر دیا۔ اور ایک ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر کے ہادر اس کے چہرے تک پھینچ دی۔

”جگو چاچا۔“ ایس ایچ او بڑبڑایا۔ ”یہ کون ہو سکتا ہے؟“

”یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے آفیسر۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”دیے میں آپ تمام حضرات سے ایک درخواست کروں گا کہ اس نام کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔ تاکہ لازم ہو شیار نہ ہو جائے۔ اور آفیسر آپ ہائیں کو یہ خبر جاری کریں گے کہ رضیہ کا قاتل ہوش میں آنے سے پہلے ہی جان بحق ہو گیا۔ اس بیان سے دونوں کا بھلا ہو گا۔“

”رائے صاحب!“ ایس ایچ او نے ان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی باتیں میرے لیے مسلسل الجھن کا باعث بن رہی ہیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں کچھ جانتے ہیں تو پلیز! مجھے مزید الجھن میں لانے کی بجائے میری کچھ مدد کیجئے تاکہ اصل مجرموں کو قانون کی گرفت میں لیا جاسکے۔“

”آپ ایک ذمے دار اور فرض شناس آفیسر ہیں۔ کسی کی دھونس دھمکیوں میں آئے بغیر تھوڑی سی صبر کریں تو آپ یقیناً اصل مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔ آپ کو تو ایک کلیو بھی مل گیا ہے۔ سب سے پہلے معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آصف اور جگو چاچا کون ہیں۔ اچھا اب میں چل رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد میرا آدمی تھانے پہنچ جائے گا۔ امید ہے کہ اس وقت تک رضیہ کی نعش سے متعلق کاغذات تیار نہیں گئے۔ دس یو گڈ لک۔“ رائے صاحب ایس ایچ او اور کمرے میں موجود دیگر لوگوں سے ہاتھ ملا کر اٹھ اٹھ گئے۔

دارا پارکنگ میں دو آدمیوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں بھی ڈرائیور ہی تھے۔ رائے صاحب کو آتے دیکھ کر دارا وہاں سے اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پاجیو کے قریب پہنچ گیا اور اس نے رائے صاحب کے لیے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

”کہاں چلوں سرکار۔“ دارا نے انجمن اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔



”بچلے پر چلو... میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔  
 پاجیرو ہسپتال سے نکل کر مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایک خوبصورت بچلے کے سامنے رک گئی۔ ہارن  
 کی آواز سننے ہی بچلے میں موجود چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور پاجیرو بچلے میں داخل ہو کر برآمدے کے سامنے  
 رک گئی۔

”دارا!“ رائے صاحب گاڑی سے اترتے ہوئے بولے۔ ”ڈیڑھ بج رہا ہے۔ تم جا کر کسی ہوٹل سے  
 کھانا کھاؤ۔ بھوک لگ رہی ہوگی تمہیں۔“  
 ”بہتر سرکار۔“ دارا بھی گاڑی سے اتر گیا۔ ”آپ نے بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ حکم کریں تو کچھ لینا  
 آؤں۔“

”نہیں، کچھ کھانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی۔ میں چائے بنا کر پی لوں گا۔ تم کھانا کھا آؤ اور تین بجے کے  
 قریب تھانے جا کر ایس ایچ او سے کاغذات لے آنا۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔“  
 ”جی بہتر۔“ دارا کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

چوکیدار گیٹ بند کر کے آیا تو رائے منصور ڈرائنگ روم میں آگئے۔ انہوں نے چوکیدار سے چائے  
 بنانے کو کہہ دیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں آکر وہ صوفے پر ڈھیر سے ہو گئے۔ وہ نہ صرف بری طرح تھک گئے تھے  
 بلکہ رضیہ کی موت نے انہیں افسردہ کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے صوفے پر بیٹھے  
 رہے پھر فون کا ریسیور اٹھا کر حویلی کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ کال آصفہ بیگم ہی نے ریسیور کی تھی۔ رائے  
 صاحب نے آصفہ بیگم کو بتایا کہ وہ شام کے لگ بھگ رضیہ کی میت لے کر آئیں گے۔ اس کی تدفین کل صبح  
 بستی سے ملحق قبرستان میں ہوگی۔

”اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔“ دوسری طرف سے آصفہ بیگم نے کہا۔ ”نالہ کافون آیا تھا... آپ کے  
 جانے کے تھوڑی دیر بعد۔ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک نمبر بھی دیا ہے کہ  
 آپ کافون آئے تو بتا دوں۔“ آصفہ بیگم نے وہ نمبر بھی بتا دیا۔

”تم نے رضیہ کا بتا دیا اسے؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔  
 ”جی ہاں، لیکن مجھے تفصیل تو نہیں معلوم تھی۔ یہی بتایا تھا کہ کسی نے رضیہ کو قتل کر دیا ہے اور آپ  
 اسی سلسلے میں رحیم یار خان گئے ہوئے ہیں۔“ آصفہ بیگم نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں اس نمبر پر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا اور فون کا  
 ریسیور رکھ دیا۔

اسی دوران ملازم چائے لے آیا۔ رائے صاحب چائے کی چشکیاں لیتے رہے پھر انہوں نے دوبارہ فون  
 کا ریسیور اٹھایا اور آصفہ بیگم کا دیا ہوا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ دوسری طرف سے جلد ہی کال ریسیور کر لی گئی۔  
 آواز کسی عورت کی تھی مگر وہ نالہ نہیں تھی۔

”میں رائے منصور بول رہا ہوں۔ نالہ درانی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ رائے صاحب بولے۔  
 ”ایک منٹ ہو لڈ کیجئے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور خاموشی چھا گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد ریسیور پر  
 نالہ کی آواز سنائی دی۔

”ییس انکل۔ مجھے رضیہ کے بارے میں آصفہ آنٹی سے پتہ چل گیا تھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟“ نالہ  
 نے پوچھا۔

”وہ بے وقوف کل شام میری عدم موجودگی میں حویلی سے نکل گئی تھی۔ شاید وہ خان پور جانا چاہتی تھی یا رحیم یار خان میں کسی کے پاس۔ لیکن لاری اڑے پر غنڈوں کے ہاتھ لگ گئی جو اسلحہ کے زور پر اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر شہر سے باہر اینٹوں کے ایک ویران بھٹے میں لے گئے۔ وہ اس کی عزت لوٹنا چاہتے تھے لیکن ایک غنڈہ اپنے ہی پستول سے رضیہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ مجھے رات ہی کو اس کی اطلاع مل گئی تھی۔ میں نے وکیل کو فون کر کے تھانے بھیج دیا تھا۔ پولیس سے تو رضیہ کا مسئلہ حل ہو گیا لیکن وکیل صاحب جب رضیہ کو اپنے ساتھ لے کر تھانے سے نکلے تو تھانے سے صرف سو گز کے فاصلے پر ان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی۔ حملہ آور پہلے ہی سے وہاں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان کے تھانے سے رخصت ہونے سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے شبیر درانی بھی تھانے سے نکلا تھا۔“

”شبیر درانی! نالکہ کے لہجہ میں شدید حیرت تھی۔ ”وہ وہاں کیسے پہنچ گیا؟“

”وہ رضیہ کو اپنی ضمانت پر لے جانے کے لیے آیا تھا۔“ رائے منصور نے بتایا۔ ”لیکن رضیہ نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”ظاہر ہے اسے انکار کرنا ہی تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شبیر درانی کو تھانے میں رضیہ کی موجودگی کی اطلاع کیسے ملی؟“ نالکہ بولی۔

”وہ غنڈے رضیہ کو اغواء کر کے جس ویران بھٹے پر لے گئے تھے وہ شبیر درانی ہی کی ملکیت ہے۔ ایک غنڈہ تو رضیہ کے ہاتھوں مارا گیا جبکہ دوسرے کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے اور وہ شبیر درانی کا ملازم رہ چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے کہنے پر کسی پولیس والے نے شبیر درانی کو اطلاع دی ہوگی۔“ رائے منصور نے کہا۔

”یقیناً“ ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ”وہ ہشت پا ہے جس کے خونی پنچے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔“

”میں رضیہ کی میت لے کر حویلی جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے شام تک پہنچوں گا کیونکہ پولیس کی طرف سے کاغذات کی تیاری میں کچھ وقت لگ جائے گا۔ اگر تم....“

”میں بھی رات کو حویلی پہنچ جاؤں گی۔“ نالکہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کیا یہ مناسب ہوگا؟“ رائے منصور نے کہا۔

”رضیہ کی وجہ سے آج میں زندگی کے سانس لے رہی ہوں۔ اس کی جان بھی میری ہی وجہ سے گئی ہے۔ میں ضرور آؤں گی انکل۔“ نالکہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے، آجانا۔ مگر احتیاط کی ضرورت ہے۔“

”آپ مطمئن رہئے مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

”اوکے... خدا حافظ۔“ رائے منصور نے فون بند کر دیا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

دارا ساڑھے تین بجے تھانے سے کاغذات لے کر آگیا۔

”تھانیدار صاحب نے ہسپتال کی ایمبولینس کا بھی بندوبست کر دیا ہے سرکار۔ پانچ بجے ہمیں ہسپتال سے لاش مل جائے گی۔“ دارا نے کاغذات رائے صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

رائے صاحب نے کاغذات چیک کر کے کوٹ کی جیب میں رکھ لئے اور پھر شام پانچ بجے وہ رضیہ کی میت لے کر رحیم یار خان سے رخصت ہو رہے تھے۔

نالکہ درانی کو رضیہ کے قتل کی خبر صبح اس وقت مل گئی تھی جب اس نے رائے منصور کی حویلی فون کیا تھا۔ فون کرنے کا مقصد رائے منصور سے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا تھا۔ رائے منصور سے تو بات نہیں ہو سکی تھی البتہ آصفہ بیگم نے اسے رضیہ کے بارے میں مختصر سا بتادیا تھا۔ اور نالکہ کے خیال میں رضیہ کی موت ہی اسے حویلی سے کھینچ کر لے گئی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ رضیہ کے قتل میں یقیناً "شبیر درانی کا ہاتھ ہوگا۔ رضیہ اس کے لیے موت کے پروانے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ اسی کی ناک میں تھا اور موقع ملے ہی اس نے رضیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کرادیا تھا۔ اور جب رائے منصور نے بتایا تھا کہ رضیہ اور وکیل کے تھانے سے رخصت ہونے سے تقریباً "ڈیڑھ گھنٹہ پہلے شبیر درانی بھی تھانے سے نکلا تھا تو نالکہ کو یقین ہو گیا تھا کہ رضیہ کو اس نے مروایا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ بہت وقت ہوتا ہے۔ شبیر درانی کے بالے ہوئے غنڈے جو ہر وقت مرنے مارنے پر تیار رہتے تھے اس کا اشارہ ملتے ہی پہنچ گئے ہوں گے اور رضیہ وکیل کے ساتھ جیسے ہی تھانے سے نکلی اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس سے نالکہ کو یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ حملہ آور صرف رضیہ ہی کو مارنا چاہتے تھے۔ اگر وکیل کو بھی مارنے کا حکم ملا ہوتا تو وہ بھی زندہ نہ بچتا۔

سترہ گولیاں... نالکہ کو جھرجھری سی آگئی۔ رضیہ کے جسم کا کون سا حصہ ایسا ہو گا جہاں گولی پیوست نہیں ہوئی ہوگی۔ برصیت کی انتہا ہو گئی تھی۔ نالکہ سوچ رہی تھی کہ رضیہ اس کی وجہ سے موت کا شکار ہوئی تھی۔ نہ وہ اسے بھاگنے میں مدد دیتی اور نہ ہی شبیر درانی کے عتاب کا نشانہ بنتی۔

نالکہ نے جب دلاور کو رضیہ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی افسردہ سا ہو گیا تھا۔

"وہ ایک شریف لڑکی تھی۔" دلاور نے کہا۔ "اسے دولت سے محبت تھی اور یہ محبت ہی اسے شبیر درانی تک لے گئی تھی جس کا انجام بہت بھیانک ثابت ہوا۔"

"آصف... جگمگایا چا چا کا نام کبھی سنا ہے؟" نالکہ نے پوچھا۔ یہ نام اسے رائے منصور نے بتائے تھے کہ حملہ آور نے مرنے سے پہلے یہ نام لئے تھے۔

"آصف... جگمگو... چا چا... دلاور نے بڑبڑانے والے انداز میں یہ نام دہرائے پھر بولا۔ "جگمگو کا نام کچھ جانا بیچنا لگتا ہے۔ لیکن یہ کون ہیں؟"

"رضیہ پر فائرنگ کرنے والوں میں سے ایک آدمی زخمی ہو کر پولیس کے ہاتھ لگا تھا اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے یہ نام بتائے تھے۔ رائے صاحب کے کہنے کے مطابق اس نے بتایا تھا کہ رضیہ پر حملہ انہوں نے جگمگو کے کہنے پر کیا تھا۔"

"جگمگو..." دلاور نے ایک بار پھر یہ نام دہرایا۔ "ذہن میں نہیں آ رہا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ نام میں نے پہلے سنا ہوا ہے۔ یاد آ جائے گا۔"

"میں آج رات رائے صاحب کی حویلی جانا چاہتی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" نالکہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں اکیلا تو نہیں جانے دوں گا نالکہ بی بی۔" دلاور بولا۔

"لیکن تمہاری یہ حالت....."

"میں ٹھیک ہوں۔" دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کس وقت چلنا ہے؟"

”شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی یہاں سے نکلیں گے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن اس سے پہلے میں ہسپتال کا چکر لگانا چاہتی ہوں۔ صورت حال کا بھی کچھ اندازہ ہو جائے گا۔“

”اکیلی؟“ دلاور نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ نائلہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے دن کے وقت مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ رائے صاحب رضیہ کی میت لے جائیں تو میں اس وقت ہسپتال جاؤں گی جب مریضوں سے ملاقات کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت ہسپتال میں عام لوگوں کی آمدورفت ہوتی ہے اور اگر شبیر درانی کا کوئی آدمی نگرانی کے لیے وہاں موجود بھی ہوا تو مجھ پر شبہ نہیں کر سکے گا۔“

اور پھر پورے پانچ بجے کے قریب نائلہ درانی گھر سے نکلی۔ اس نے عقیلہ کا برقعہ پہن رکھا تھا۔ برقعے کا دھیرا نقاب گرا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ پوری طرح چھپ گیا تھا۔ وہ جنگلوں کی گلیوں سے نکل کر سڑک پر آگئے۔

ہسپتال تک پہنچنے کے لیے اسے دو جگہ ٹانگہ بدلنا پڑا تھا۔ جب وہ ہسپتال کے گیٹ کے سامنے پہنچی تو اسی وقت ایک ایمرولینس ہسپتال کے گیٹ سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ ایمرولینس کے پیچھے رائے منصور کی پاجیرو بھی تھی اور نائلہ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے رائے صاحب کو دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ایمرولینس اور پاجیرو گیٹ سے نکل گئی تو وہ کچھ اور لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔

یہ ہسپتال اس کا دیکھا بھلا تھا۔ پرائیویٹ روم نمبر سیون تک پہنچنے میں اسے کوئی بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ راہداری میں کچھ اور لوگوں کی بھی آمدورفت تھی۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ نائلہ نے ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

کمرے میں وکیل صاحب کی بیگم ان کا بیٹا اور کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ وہ سب ابھی ہوئی نگاہوں سے اس برقعہ پوش عورت کی طرف دیکھنے لگے جس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی چہرے سے نقاب نہیں ہٹایا تھا۔ وکیل صاحب کا بیٹا اور دو اور آدمی کمرے سے نکل گئے۔ وہ یقیناً ”یہی سمجھے ہوں گے کہ یہ برقعہ پوش خاتون وکیل صاحب کی بیگم یا ان کی بیگم کی کوئی ملنے والی ہے جو دو سرے مردوں کے سامنے چہرے سے نقاب نہیں ہٹانا چاہتی۔“

ان آدمیوں کے جاتے ہی نائلہ درانی وکیل صاحب کے بیڈ کے قریب آگئی اور چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ وکیل اس کی شکل دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔

”ارے آپ...“

”میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”رائے صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اب کیسے ہیں آپ؟“

”میں تو ٹھیک ہوں لیکن رضیہ کی موت کا مجھے بے حد افسوس ہے۔“ وکیل نے کہا۔

”قدر کا نکمھا کون ٹال سکتا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ جلدی سے اچھے ہو جائیے۔“

”کوئی نیکی کام آگئی جو بچ گیا ورنہ میرے مرنے میں بھی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔“ وکیل صاحب نے کہا۔

”آپ کے خیال میں حملہ آور کون ہو سکتے ہیں؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”شبیر درانی کے علاوہ اس حملے میں اور کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن میں نے پولیس کو دیئے جانے والے

بیان میں اس کا نام نہیں لیا۔“ وکیل صاحب نے جواب دیا۔  
 ”بہت اچھا کیا آپ نے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”لیکن میرے خیال میں رضیہ پر حملہ کروا کر وہ بھنسن گیا ہے۔ اس نے اپنی سازشوں کے جال اس قدر زیادہ پھیلا دیئے ہیں کہ انہیں سیٹنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا اور بالا خرہ وہ اپنے ہی پھیلائے ہوئے اس جال میں بھنسن کر رہ جائے گا۔“  
 ”مجھے ذرا ہسپتال سے نکل لینے دو۔ پھر میں بھی دیکھ لوں گا کہ اب وہ کیسے بچ سکتا ہے۔“ وکیل صاحب نے جواب دیا۔

”اچھا، اب میں چلتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”لیکن کیا....“ وہ خاموش ہو کر کمرے میں موجود وکیل صاحب کی رشتہ دار خواتین کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”مطمئن رہو۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کو نہیں بتائے گا کہ نائلہ درانی یہاں آئی تھی۔ تم نے میری خاطر یہاں آکر اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔“ وکیل نے کہا۔

”خطرات سے کھیلتا اب میرا مشغلہ بن گیا ہے۔“ نائلہ درانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”کیونکہ اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ بزدلوں کی طرح نہیں جیا جاسکتا۔“

نائلہ چہرے پر نقاب مگر اگر کمرے سے نکل آئی۔ وکیل کا بیٹا اور وہ دونوں آدمی باہر راداری میں کھڑے تھے جو اسے دیکھ کر باہر آگئے تھے اور اب اسے واپس جاتے دیکھ کر دوبارہ کمرے میں چلے گئے۔

نائلہ درانی راداری میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہسپتال کی عمارت سے نکل کر کپاؤنڈ میں آگئی اور گیٹ کی طرف چلے گئی۔ ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ ایک آدمی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے شال اوڑھ رکھی تھی۔ وہ نائلہ کے ساتھ ساتھ اس طرح چلنے لگا جیسے اس کا ساتھی ہو۔

”خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہو نائلہ درانی۔“ اس شخص نے نائلہ کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”اگر تم نے شور مچانے یا کوئی اور گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میرے ہاتھ میں پستول ہے اور میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔“

نائلہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کون ہو؟ تم؟ میں شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔“

”میں نے تمہیں پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی نائلہ درانی۔“ وہ شخص ہولے سے غرایا۔  
 ”شور مچانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہاں پولیس والے بھی موجود ہیں اور تم جانتی ہو کہ پولیس کو کس شدت سے تمہاری تلاش ہے۔ گیٹ کے باہر میری جیب موجود ہے۔ خاموشی سے میرے ساتھ چلتی ہوئی جیب میں بیٹھ جانا... ویسے شیر درانی کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا کہ تم ہسپتال ضرور آؤ گی اس لیے میں صبح ہی سے یہاں موجود تھا۔“

نائلہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ہسپتال کے کپاؤنڈ اور سامنے گیٹ کے قریب سڑک پر بیسیوں لوگ موجود تھے اور کسی کو بھی یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ ایک برقعہ پوش عورت کو اغواء کر کے لے جایا جا رہا تھا۔

نائلہ خاموشی سے اس شخص کے ساتھ چلتی رہی۔ کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ کسی کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ ہسپتال کے گیٹ کے باہر تقریباً ”پندرہ قدم کے فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک پرانی سی جیب کھڑی تھی جس کی سیٹوں پر بڑی ہوئی گرد یہ ثابت کر رہی تھی کہ یہ جیب بہت دیر سے یہاں کھڑی

”خاموشی سے بیٹھ جاؤ!“ اس شخص نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے اگلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ نائلہ خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ شخص اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا اس طرف آتے ہوئے بھی اس کی نظریں نائلہ پر مرکوز رہی تھیں۔ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھ اس طرح اسٹیرنگ پر رکھے کہ شال بھی ساتھ ہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ شال کے اندر چھپے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ سے ہٹا کر اگنیشن کی تھمادی۔ انجن ایک دو مرتبہ غرغرائے کے بعد اشارت ہو گیا۔ نائلہ سیٹ پر بالکل سیدھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس شخص نے ہاتھ جیسے ہی اگنیشن کی سے ہٹایا، نائلہ ایک دم حرکت میں آگئی۔ اس نے پوری قوت سے اس شخص کو سیٹ سے دھکیل دیا۔ اس شخص نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر جمانے کی کوشش کی تھی مگر نائلہ نے اسے موقع نہیں دیا اور اسے جیب سے گرانے کی کوشش جاری رکھی۔

سڑک پر سے گزرنے والے لوگ حیرت سے یہ دلچسپ منظر دیکھ رہے تھے ایک برقعہ پوش عورت ایک آدمی کو جیب سے دھکیل رہی تھی۔ جیب کھلی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی دروازہ وغیرہ نہیں تھا۔ وہ شخص اپنی ہی شال میں الجھ کر اس طرح جیب سے نیچے گرا کہ اس کا سر نیچے اور پیروں پر جیب کے فریم میں پھنس گئے تھے۔ نائلہ نے بڑی پھرتی سے اس کے پیر پکڑ کر اسے پیچھے اچھال دیا۔ وہ شخص فلا بازی کھاتا ہوا قریب سے گزرتے ہوئے ایک سائیکل سوار سے ٹکرایا۔ سائیکل سوار بھی گر گیا۔

نائلہ بڑی پھرتی سے اسٹیرنگ والی سیٹ پر آگئی۔ اسے سیٹ کے سامنے پستول پڑا ہوا نظر آیا۔ یہ اسی شخص کا پستول تھا جو غالباً اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ نائلہ نے پستول اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ جیب کا انجن اشارت تھا۔ نائلہ نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال کر انجن کو گیسٹر میں ڈالا اور جیب کو زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

سائیکل سوار پر گرا ہوا وہ شخص اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اپنی ہی شال میں الجھ کر رہ گیا تھا اور پھر سائیکل سوار بھی گالیاں بکتا ہوا اس سے لپٹ گیا تھا۔

لوگ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے آج کل مردوں کو تو گمن پوائنٹ پر کسی سے گاڑی چھیننے سے دیکھا گیا تھا لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی مثال تھی کہ ایک برقعہ پوش عورت کسی مرد سے جیب چھین کر لے کر ہو رہی تھی.....

وہ شخص سائیکل والے سے پیچھا چھڑا کر شور مچاتا ہوا پیچھے بھاگا، اگرچہ جیب اس دوران خاصی دور نکل چکی تھی۔

نائلہ جیب کا ایک سیبلر بیڑا پاتی چلی گئی۔ شام کا وقت تھا سڑکوں پر اچھا خاصا ٹریفک تھا اور نائلہ بڑی مہارت سے جیب کو دوڑا رہی تھی۔ کئی مرتبہ حادثے ہوتے ہوتے بچا تھا۔ نائلہ کے برقع کا نقاب ہوا سے پیچھے لی طرف اڑ رہا تھا۔ نقاب کے دو پلو تھے۔ ایک پلو اس کی پیشانی پر اس طرح لپٹ گیا کہ آنکھیں بھی چھپ گئیں۔ نائلہ ایک ہاتھ سے پلو ہٹانے لگی اور جب اس نے پلو ہٹایا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ جیب لاٹھاری سے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسٹیرنگ کو دائیں طرف بڑھا دیا۔ جیب کار سے صرف ایک فٹ کے فاصلے سے گزر کر سڑک پر لہرا گئی۔ مگر نائلہ نے اسے فوراً ہی سنبھال لیا۔

عورتوں کا گاڑی چلانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر عورتیں گاڑی چلاتی ہیں مگر عورتوں کو ہمیشہ کار چلاتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور آج لوگ اس عورت کو اس خطرناک انداز میں جیپ چلاتے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ برقعہ پوش عورت جس طرح جیپ چلا رہی تھی وہ لوگوں کے لیے واقعی حیرت انگیز تھا۔

نانکھ نے جیپ ایک گلی میں موڑ لی اور پھر دو تین گلیوں میں گھمانے کے بعد اس نے ایک جگہ جیپ روک لی۔ تین چار بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ کوئی بڑا آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیپ روکتے ہی نانکھ انجن بند کر کے نیچے اتر آئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ایک طرف چلنے لگی۔ چلتے چلتے اس نے برقعہ اتار لیا تھا۔ ایک مرتبہ مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کھیل میں مصروف تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی جیپ یا نانکھ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

نانکھ نے برقعہ لپیٹ کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور وہ تنگ سی گلیوں میں قدم اٹھاتی ہوئی تیزی سے چل رہی تھی۔ گلیوں میں لوگوں کی آمدورفت تھی۔ بعض لوگ تو توجہ دیئے بغیر گزر جاتے اور بعض مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک دو من چلوں نے اسے دیکھ کر سینیاں بھی بجاتی تھیں۔

ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے نانکھ ٹھک کر رک گئی۔ وہ چند قدم آگے جا کر واپس مڑی۔ پہلے گلی میں ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر مکان کے دروازے کو غور سے دیکھنے لگی اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ وہی مکان تھا جہاں کل دوپہر رائے منصور سے ملاقات ہوئی تھی۔ نانکھ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مکان کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا اور اسماعیل کا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ وہی شخص تھا جو کل نانکھ کو عقیدہ کے گھر سے لے کر آیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی نانکھ اندر داخل ہو گئی اور دھڑ سے دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ نیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”نانکھ بی بی آپ... خیریت تو ہے نا؟“ اسماعیل اسے دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

”خیریت ہی نہیں ہے۔“ نانکھ نے جواب دیا۔ ”گھر میں اور کون ہے؟“

”کوئی نہیں“ میں اکیلا ہوں۔“ اسماعیل نے جواب دیا۔

”اور وہ بابا؟“ نانکھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ تو آج صبح گاؤں چلا گیا تھا۔ کل شام کو واپس آئے گا لیکن آپ...“ اسماعیل جملہ ادھر ادھر اچھوڑ کر ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں ہسپتال گئی تھی وکیل صاحب کو دیکھنے کے لیے لیکن ہسپتال سے باہر نکلتے ہی شبیر درانی کے ایک غنڈے کے ہاتھ لگ گئی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگی ہوں۔“ نانکھ نے جواب دیا۔

”وکیل صاحب!“ اسماعیل کے لمحے میں حیرت تھی۔ ”کیا ہوا ان کو، کل تو وہ ٹھیک تھے۔“

”اوہ، تو تمہیں رائے صاحب نے کچھ نہیں بتایا۔“ نانکھ نے کہا پھر بولی۔ ”لیکن آج رائے صاحب سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی یا نہیں؟“

”نہیں نانکھ بی بی۔ رائے صاحب تو کل ہی حویلی واپس چلے گئے تھے۔“ اسماعیل نے بتایا۔

”تو پھر تمہیں واقعی کچھ پتہ نہیں۔“ نانکھ بولی۔ ”آج صبح تڑکے کسی نے وکیل صاحب کو گولی مار دی تھی۔ ایک عورت کو بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔“ نانکھ نے رضیہ کا نام اس لیے نہیں لیا تھا کہ

اسماعیل رضیہ کے نام سے واقف نہیں تھا۔

”اوہ!“ اسماعیل بولا۔ ”وہ تھانے کے قریب پیش آنے والا واقعہ... یہ خبر تو پورے شہر میں پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ بتا رہے تھے کہ اس عورت کو پوری سترہ گولیاں لگی ہیں مگر وکیل صاحب کا اس سے کیا تعلق؟“

”وہ عورت وکیل صاحب کی موکلہ تھی اور وہ اسے تھانے سے ضمانت دے کر لارہے تھے کہ کچھ نامعلوم لوگوں نے اس پر فائرنگ کر دی۔ وہ عورت تو مر گئی تھی مگر وکیل صاحب زخمی ہوئے تھے۔ وہ ہسپتال میں ہیں اور میں انہیں دیکھنے گئی تھی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ اسماعیل بولا۔

”بہر حال۔“ نائلہ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں چند گھنٹے بیٹھ رہوں گی۔ پہلے میرے لیے چائے بناؤ اور پھر رات کے کھانے کا بندوبست کرو اور محلے میں کسی کو یہاں میری موجودگی کا پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“

”آپ مطمئن رہئے نائلہ بی بی۔“ اسماعیل بولا۔ ”آپ بیٹھنے میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ اسماعیل باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔

نائلہ کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ کل دوپہر کو رائے منصور اور وکیل صاحب کے ساتھ بیٹھی رہی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اپنا ہوا برقعہ ایک کرسی پر پھینک دیا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ چہرہ برقع کے نقاب میں چھپا ہوا ہونے کے باوجود اسے کس طرح پہچان لیا گیا تھا۔

پھر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس شخص نے بتایا تھا کہ وہ صبح سے ہسپتال میں موجود ہے۔ شبیر درانی کو شبہ تھا کہ نائلہ رضیہ کی لاش دیکھنے یا زخمی وکیل سے ملنے کے لیے ضرور آئے گی۔ ممکن ہے یہ شخص وکیل کے کمرے کی نگرانی کر رہا ہو۔ نائلہ جس طرح چہرہ برقعے کے نقاب میں چھپائے کمرے میں گئی اور آئی تھی اس سے اس شخص کو نائلہ پر شبہ ہو گیا ہو گا اور اسے ہسپتال کی زد پر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی۔

اسماعیل چائے لے کر آیا۔ چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے اب وہ عقیدہ اور دلاور کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ وہ دونوں پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اسے اندیشہ تھا کہ کیسے دلاور اس کی تلاش میں نہ نکل کھڑا ہو۔ گھر سے وہ بونے پانچ بجے کے لگ بھگ نکلی تھی اور اب سات بج چکے تھے۔ وہ خود اس وقت باہر بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ کیونکہ جس گلی میں اس نے جیب چھوڑی تھی وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اگر جیب مل گئی ہوگی تو اس علاقے میں اس کی تلاش بھی شروع ہو چکی ہوگی۔

آٹھ بج گئے۔ اسماعیل باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہا تھا اور نائلہ کرسی پر بیٹھی سوچوں میں غرق تھی۔ دفعتاً دروازے پر دستک کی آواز سن کر نائلہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اسماعیل باورچی خانے سے نکل کر کمرے کے دروازے پر آگیا۔

”آپ دروازے کی آڑ میں ہو جائیے۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے؟“ اسماعیل نے سرگوشی کی۔ اسی لمحہ دستک کی آواز دوبارہ سنائی دی اور اسماعیل تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ”کون ہے بھی؟“ آ رہا ہوں۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس وقت اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ دروازہ



کھولتے ہی پولیس یا شیردرانی کے آدمی اس پر نہ جھپٹ پڑیں لیکن دروازہ کھلنے پر گلی ہی میں رہنے والے دوست محمد نامی ایک آدمی کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

”کچھ سنا ہے تم نے اسماعیل؟“ دوست محمد نے کہا۔ ”ناٹک درانی انہی گلیوں میں کسی گھر میں چھپی ہوئی ہے۔ شیردرانی اور پولیس والے اسے تلاش کر رہے ہیں۔ شیردرانی کے آدمی کہتے پھر رہے ہیں کہ اگر کسی نے ناٹک درانی کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہو تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ دو لاکھ روپے انعام دیا جائے گا۔“

”دو لاکھ روپے!“ اسماعیل چونک گیا۔

”ناٹک درانی سونے کی چڑیا ہے اسماعیل۔“ دوست محمد نے کہا۔ ”اگر ہاتھ آجائے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

”ناٹک درانی آج تک نہ تو شیردرانی کے ہاتھ آسکی ہے اور نہ ہی پولیس اس کا سراغ لگا سکی ہے۔ کوئی اور اسے کیا پکڑ سکے گا۔ جاؤ بابا، پریشان مت کرو۔“ اسماعیل نے جواب دیا۔

”کیا بات ہے۔ آج تو تم چائے کو بھی نہیں پوچھ رہے۔“ دوست محمد نے کہا۔

”میرا ایک دوست اور اس کی گھر والی گاؤں سے آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے آج میں تمہیں اندر نہیں بلا سکتا۔ جاؤ تم ناٹک درانی کو تلاش کرو۔ ہو سکتا ہے تمہیں دو لاکھ روپے مل ہی جائیں گے۔“ اسماعیل نے کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ناٹک والے کمرے میں آگیا۔ اسے دیکھ کر ناٹک دروازے کی آڑ سے نکل کر سامنے آگئی۔

”شیردرانی کے آدمی اور پولیس والے آپ کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں ناٹک بی بی!“ اسماعیل نے بتایا۔

”شیردرانی کے آدمی کہتے پھر رہے ہیں کہ جو شخص ناٹک درانی کو پولیس کے حوالے کرے گا اسے دو لاکھ روپے کا انعام دیا جائے گا۔“

”تو پھر کیا خیال ہے اسماعیل؟“ ناٹک درانی نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ وفادار اپنی جان تو قربان کر سکتا ہے کسی لالچ میں آکر اپنے محسنوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔“

اسماعیل کہتا ہوا درپہی خانے میں چلا گیا۔

ناٹک کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ جب سے اس کی زندگی نے یہ نیا رخ اختیار کیا تھا اسے اندازہ ہوا تھا کہ غریبوں میں وفا اور دیانت کا مادہ زیادہ ہے۔ وہ محنت و مشقت کر کے اپنے بچوں کو رزق حلال کا لقمہ کھانا پسند کرتے ہیں۔ جبکہ پیسے والے لوگ بہت جلد مل من مزید کے لالچ میں آجاتے ہیں۔

نوبے اسماعیل نے کھانا ناٹک کے سامنے رکھ دیا۔ ناٹک خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

”ناٹک بی بی! آپ رات میں رہ جائیں۔ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“ اسماعیل نے کھانے کے بعد خالی برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں جن کے ہاں ٹھہری ہوئی ہوں وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ ناٹک نے جواب دیا۔ ”میں کچھ دیر بعد یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”اگر آپ جانا ہی چاہتی ہیں تو ایک ترکیب میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“ اسماعیل بولا۔

”وہ کیا؟“ ناٹک نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ برقعہ پن کر چلی جائیے۔ نہ کوئی آپ کا چہرہ دیکھے گا اور نہ پہچان پائے گا۔“ اسماعیل نے تجویز

پیش کی۔

”برقعہ پہن کر ہی تو گھر سے نکلی تھی۔“ نائلہ نے کرسی پر پڑے ہوئے سیاہ ریشتی برقعے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس وقت انہیں کسی بھی برقعہ پوش عورت پر شبہ ہو سکتا ہے۔“

”میرے پاس ایک اور برقعہ رکھا ہوا ہے جی۔“ اسٹیل نے کہا۔ ”چھ مہینے پہلے میری گھر والی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی کچھ چیزیں میں نے ابھی تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک برقعہ بھی ہے۔“

اسٹیل کمرے سے باہر چلا گیا۔ تقریباً ”پندرہ منٹ بعد واپس آیا تو اس نے سفید رنگ کا ایک شنل کاک برقعہ نائلہ کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ میں نے دھوپ سے دھلوا کر نرنگ میں رکھ دیا تھا جی۔“ اسٹیل نے کہا۔

نائلہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے دوسری عورتوں کو شنل کاک برقعہ پہنے دیکھا تھا بالکل یوں لگتا تھا جیسے تہو تان رکھا ہو۔ اس نے اسٹیل کے ہاتھ سے برقعہ لے لیا۔ اس نے اپنی پیوی کی نشانیاں واقعی بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ برقعہ میں سے فینیناٹل کی گولیوں کی مٹک آ رہی تھی۔ نائلہ نے برقعہ کھول کر جھٹکا تو فینیناٹل کی دو تین گولیاں نکل کر فرش پر گر گئیں۔ اس نے اٹھ کر برقعہ پہن لیا۔ برقعہ کی ٹوپی اس کے سر پر بالکل فٹ آئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے والا حصہ باریک جالی پر مشتمل تھا۔ نائلہ اگرچہ طویل قامت تھی مگر یہ برقعہ اتنا لمبا تھا کہ اس کے پیر بھی چھپ گئے تھے۔ خاصا بھاری برقعہ تھا۔ نائلہ کو لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی پول ہو اور اس پر کوئی تہو تان دیا گیا ہو۔ لیکن اسٹیل کی یہ تجویز قابل عمل تھی۔ اور نائلہ نے مزید وقت ضائع کئے بغیر اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے عقیدہ کے گھر سے نکلے ہوئے ساڑھے چار گھنٹے ہو چکے تھے اور اندیشہ تھا کہیں دلاور اس کی تلاش میں باہر نہ نکل گیا ہو۔

تقریباً ”دس منٹ بعد وہ اسٹیل کے ساتھ مکان سے باہر نکل آئی۔ اسٹیل نے مکان کو تالا لگا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ گلی سنان تھی۔ لیکن دوسری گلی میں لوگوں کی آمد و رفت تھی۔

نائلہ دروائی کو یہ شنل کاک برقعہ پہن کر چلنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ کئی مرتبہ اس کا پیر برقعے میں الجھا تھا اور وہ گرتے گرتے پیچ تھی جالی والا حصہ بھی آنکھوں کے سامنے ٹھیک طور سے نہیں آ رہا تھا اور اسے راستہ دیکھنے میں بھی خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس قسم کے برقعے استعمال کرنے والی عورتیں کس طرح چلتی ہوں گی۔

تیسری گلی میں نائلہ کو دو تین پولیس والے بھی نظر آئے تھے۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے نائلہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ ایک پولیس والے نے مشکوک نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا تھا مگر انہیں روکا نہیں تھا۔ کیونکہ انہیں ایسی عورت کی تلاش تھی جس نے فیشن ایبل سیاہ ریشتی برقعہ پہن رکھا تھا۔ اگر وہ سیاہ ریشتی برقعے والی عورتوں کو بھی روک کر ان سے پوچھ گچھ کرتے یا ان کے چہرے دیکھنے کی کوشش کرتے تو الٹا انہی کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی تھی۔ اس لیے پولیس والے خاصی احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ البتہ وہ لوگوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے کہ ان کے گھر میں کوئی مشکوک عورت تو داخل نہیں ہوئی؟

نائلہ اور اسٹیل گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ سڑک کے موڑ پر وہی جیب کھڑی تھی جس پر نائلہ ہسپتال کے سامنے سے فرار ہوئی تھی۔ جیب پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو وہی تھا جس نے نائلہ کو اغوا کرنا چاہا تھا مگر نائلہ اسے جیب سے گرا کر جیب لے کر بھاگ نکلی تھی۔ سڑک پر رونق تھی اور وہ

دونوں قریب سے گزرتی ہوئی عورتوں کو گھور رہے تھے۔

”جگو چاچا....“ اس شخص نے جیب پر بیٹھے ہوئے دوسرے شخص کو مخاطب کیا۔ ”کیس یہ تو نہیں جو دیکھی برقعہ پہن کر جا رہی ہے؟“

”تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے گا۔“ دوسرے شخص نے کہا جسے جگو چاچا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ ”تجھے تو ہر برقعے والی عورت پر ناٹلہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ناٹلہ درانی تجھے ایسی چوٹ لگا کر بھاگی ہے جسے تو زندگی بھر بھول نہیں سکے گا۔ اسی لیے تو کہتا ہوں جگو چاچا سے سیکھ لے کچھ۔ ساری زندگی اسی دھندے میں گزار دی ہے۔ اڑنی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں۔ میرے خیال میں تو تم لوگ وقت ضائع کر رہے ہو۔ وہ اس طرح کسی کے ہاتھ نہیں آئے گی۔“

دوسرے شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر ناٹلہ نے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی یہ گفتگو سن لی تھی۔ اس نے برقعے کی جالی سے جگو چاچا نام کے دوسرے آدمی کو اچھی طرح دیکھ بھی لیا تھا عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سر کے بال سفید اور سفید مونچھیں جو ہونٹوں کے کنارے پر کسی قدر نیچے کو لٹکی ہوئی تھیں۔

”اس آدمی کو جانتے ہو؟“ چند قدم آگے جا کر ناٹلہ نے سرگوشیاں لہجے میں پوچھا۔ ”سفید مونچھوں والا تو جگو چاچا ہے۔ بالشیا ہے۔ پہلے پہلوانی کرتا تھا پھر ماش کا کام شروع کر دیا۔ چوک پر رات کے وقت دھندہ کیا کرتا تھا طراب کچھ عرصہ سے یہ کام بھی چھوڑ چکا ہے اور دوسرا شخص... اسے میں نہیں جانتا۔“ اسماعیل نے کہا۔

”اس شخص نے مجھے اغواء کرنے کی کوشش کی تھی... نہیں... پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ اب جلدی سے کسی ٹانگے پر بیٹھ چلو۔ اس آدمی کو شبہ ہو گیا ہے۔“ ناٹلہ نے کہا۔

کچھ اور آگے جا کر وہ ایک ٹانگے پر بیٹھ گئے۔ اسماعیل نے ٹانگے والے کو چلنے کو کہا اور ناٹلہ چل پڑا۔ ناٹلہ نے غیر محسوس انداز میں گردن گھما کر دیکھا۔ موڑ پر کھڑی ہوئی جیب بھی حرکت میں آگئی تھی۔

ناٹلہ مختلف سڑکوں پر چلا رہا۔ گھوڑا بے حد مرل سا تھا۔ اسے چلانے کے لیے کوچوان کو بار بار چابک استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ ناٹلہ برقعے کی جالی سے پیچھے آنے والی جیب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گامے اور جگو کو اس پر شبہ ہو گیا تھا اور اس لیے وہ اس کا پیچھا کر رہے تھے لیکن ایک سڑک پر جیب دائیں طرف مڑ گئی تو ناٹلہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

آدھے گھنٹے بعد ناٹلہ، عقیلہ کے گھر پہنچ گئی۔ اسماعیل دروازے ہی سے واپس چلا گیا تھا۔ ناٹلہ نے شعل کاک برقعہ واپس نہیں کیا تھا کہ شاید اس کی پھر ضرورت پڑ جائے۔

دلاور بے چینی سے ڈرائنگ روم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی ناک ابھی تک پھولی ہوئی تھی اور رخساروں پر آنکھ کے نیچے سیاہ دھبے کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔

”اوہ! خدا کا شکر ہے تم خیریت سے واپس آ گئیں ناٹلہ بی بی“ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ ”دلاور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں تلاش کرنے ہسپتال بھی گیا تھا۔ گیٹ کے سامنے پھلوں کے ایک ٹھیلے والے نے کچھ عجیب سی بات بتائی تھی۔ کوئی برقعہ پوش عورت کسی آدمی سے جیب چھین کر بھاگ گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں کہاں تلاش کروں۔“

”ٹھیلے والے نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ بد قسمتی سے میں بھی چکر میں آگئی تھی۔ لیکن ناٹلہ درانی اب کسی

مورت کا نام نہیں۔ طوفان بن چکی ہے نائلہ۔ اسے قابو میں کرنا اب شبیر درانی جیسے غنڈوں اور بد معاشوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ ”نائلہ نے جواب دیا۔

”لیکن پھر بھی نائلہ بی بی۔ ہمیں فی الحال محتاط رہنا چاہئے۔“ دلاور بولا۔ ”ان حالات میں ہمارے لیے رائے صاحب کی حویلی کا رخ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ شبیر درانی کو یقین ہو گا کہ تم وہاں ضرور جاؤ گی۔ اس کے آدمی جگہ جگہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ عین ممکن ہے پولیس بھی وہاں تمہاری ہتھکڑی ہو۔“

”ہاں“ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”عقل مندی کا تقاضہ تو یہی ہے کہ اس موقع پر حویلی سے دور ہی رہا جائے۔ لیکن مجھے افسوس رہے گا کہ جس لڑکی نے میری خاطر جان دی۔ میں آخر وقت میں اس کا منہ بھی نہ دیکھ سکی۔“

اسی دوران عقیلہ بھی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ نائلہ نے اسے رضیہ کے بارے میں دوپہری کو بتا دیا تھا جب رائے منصور نے اسے فون پر اطلاع دی تھی۔ وہ بھی افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکی۔

اس رات نائلہ دیر تک جاگتی رہی۔ رضیہ کا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ وہ رضیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔



شبیر درانی حسب معمول ایک بار پھر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا۔

اس روز آدمی رات کے لگ بھگ ایک پولیس والے نے اسے آکر بتایا تھا کہ رضیہ اس وقت تھانے میں موجود ہے۔ پولیس والے نے رضیہ کے بارے میں جو کمانی سنائی تھی وہ خاصی دلچسپ تھی۔ وہ وقت ضائع کئے بغیر تھانے پہنچ گیا۔ تھانیدار سے کیس کی تفصیل سننے کے بعد اس نے تھانے دار کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ رضیہ کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا جائے اور وہ رضیہ کو اپنی ضمانت پر ساتھ لے جائے گا اور راستے ہی میں رضیہ کو ختم کر کے یہ کمانی سنا دے گا کہ رضیہ نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی تیز رفتار گاڑی کے پیچھے آکر ہلاک ہو گئی۔ شبیر درانی نے رضیہ کی ہلاکت کا پورا منصوبہ بنالیا تھا لیکن تھانیدار اس کی اس تجویز سے متفق نہیں تھا۔ رضیہ کے ہاتھوں مارا جانے والا بد معاش سراج، قتل اور ایکٹی کے کئی مقدمات میں پولیس کو مطلوب تھا اور اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر پانچ لاکھ روپے کا انعام بھی مقرر تھا۔ اس کی نظرس سراج کی ہلاکت کے کریڈٹ اور پانچ لاکھ روپے کی انعامی رقم پر تھیں اگر وہ سیدھے سیدھے لفظوں میں اپنا مقصد بیان کرتا تو شاید شبیر درانی پانچ لاکھ روپے اس کی جھولی میں ڈال کر رضیہ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس نے بات گھما پھرا کر کی تھی۔ وہ رضیہ کو ایک گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کرنا چاہتا تھا جو شبیر درانی کو کسی طرح بھی منظور نہیں تھا۔ اس نے رضیہ کو بھی ارانے دھمکانے کی کوشش کی تھی لیکن رضیہ بھی ڈٹ گئی تھی۔

اسی دوران ہیڈ کانسٹیبل نے آکر اس کے کان میں سرگوشی کی کہ رائے منصور کا وکیل آگیا ہے۔ شبیر درانی خاموشی سے تھانے سے نکل گیا۔ اسے یقین تھا کہ وکیل تھانیدار کی تجویز مان لے گا۔ اور وہ رضیہ کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ رضیہ کو راستے سے ہٹانے کا یہ بہترین موقع تھا اور وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”موجمدار؟“ اس نے واپس جاتے ہوئے موجمدار کو مخاطب کیا۔ ”رائے منصور کا وکیل تھانے آیا

ہے۔ وہ رضیہ کو ساتھ لے جائے گا۔ رضیہ کو زندہ اس کے گھر تک نہیں پہنچنا چاہئے۔ اس کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔“

”ہو جائے گا سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔ ”مجھے لیجئے یہ رضیہ کی زندگی کی آخری رات ہے۔ وہ آنے والی صبح کا سورج نہیں دیکھ سکے گی۔“

”لیکن اس مرتبہ کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔“ شبیر درانی نے اسے وارننگ دی۔

”مطمئن رہئے سرکار۔ یہ رضیہ کی زندگی کی آخری سائیس ہیں جو وہ لے رہی ہے۔“ موجددار نے جواب دیا۔

موجددار شبیر درانی کو ہنگلے پر چھوڑ کر شہر کی ایک کچی آبادی میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ جہاں گھوڑوں کا طویلہ بھی تھا اور اکھاڑہ بھی۔ طویلہ احاطے کے شروع میں تھا۔ گھوڑوں کی لید کی بونے فضا کو متعفن کر رکھا تھا۔ اس طرف کئی گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور تانگے بھی کھڑے تھے۔ طویلے سے تقریباً بیس گز آگے اکھاڑہ تھا جس کے دوسری طرف دو تین کچے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کے دروازے کی جھری سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اندر سے کچھ باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ موجددار نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

”آجاؤ بھئی.... کون ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔“ اندر سے ایک آواز سنائی دی۔

موجددار نے دروازہ کھول دیا لیکن اندر داخل ہونے کی بجائے دروازے ہی میں رک گیا۔ کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا اور جس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی چھت پر لٹکا ہوا سووٹ کا بلب روشن تھا لیکن دھوئیں کی وجہ سے بلب کی روشنی بھی دھندلا رہی تھی۔

موجددار دروازے ہی میں رک کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ چھ سات آدمی زمین پر پھیٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دو ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان چٹائی پر ریڑ گاری اور کرنسی نوٹ پڑے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں تاش کے پتے تھے۔ ظاہر ہے وہ جوا کھیل رہے تھے۔ ایک طرف جھلنگاسی چارپائی پر ایک آدمی لیٹا ہوا تھا اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سر کے بال بال بالکل سفید تھے۔ مونچھیں بھی سفید تھیں جو ہونٹوں کے کونوں سے ذرا سی نیچے کوڑھلکی ہوئی تھیں۔

”وہ دیکھو میرا بادشاہ یار آگیا۔“ وہ شخص کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”آؤ، موجددار اندر آجاؤ۔“

”جگو چاچا... تم ایک منٹ کو باہر آجاؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ موجددار کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

جگو چاچا اٹھ کرے سے باہر آگیا۔ وہ دروازے سے چند قدم ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

”کوئی خاص بات موجددار؟“ جگو چاچا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”خاص بات نہ ہوتی تو میں اس وقت یہاں کیوں آتا؟“ موجددار نے کہا۔

”کہو میں سن رہا ہوں۔“ جگو چاچا بولا۔

”ایک عورت کو اوپر پہنچانا ہے لیکن وقت کم ہے اس وقت تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں؟“ موجددار

بولا۔

”وہ عورت کون ہے، نالکہ درانی؟“ جگو چاچا نے پوچھا۔

”نہیں۔“ موجددار نے جواب دیا۔ ”اس کا نام رضیہ ہے اور اس وقت تھانے میں موجود ہے وہ ایک

اور آدمی کے ساتھ تھانے سے باہر نکلے گی۔ آدمی زندہ بچ بھی جائے تو پرواہ نہیں لیکن اس عورت کو نہیں بچنا چاہئے۔ تمہارے پاس جتنے بھی آدمی ہیں لے کر چلے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ تم لوگوں کے پیچھے سے پہلے ہی چلے جائیں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے۔ شبیر درانی تمہاری ناکامی کی خبر سننا پسند نہیں کرے گا۔“

”مجھے پہلے کبھی ناکامی ہوئی ہے۔“ جگمو چا چانے کہا۔ ”بس تم اب بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔ تمہیں اطلاع مل جائے گی۔“

موجمدار وہیں سے واپس مڑ گیا۔

اس کے صرف تین منٹ بعد جگمو چا چانے اور آدمیوں کو لے کر احاطے سے باہر نکلا۔ ان چاروں نے شالیں اوڑھ رکھی تھیں اور ان چاروں کے اندر جدید ترین آئینک رانقلیں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ کچی ہستی سے نکل آئے۔ آدمی رات ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ ایک مکان کے سامنے ایک کار کھڑی دیکھ کر جگمو چا چارک گیا اور اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”آصف! ذرا اس کا دروازہ تو کھول دینا۔“

آصف نامی آدمی نے جیب سے ایک تار نکالا اور کار کا لاک کھولنے لگا۔ ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا اور دروازہ کھل گیا۔

”حضور بخش، تم اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ جاؤ۔ ہم کار کو دھکا لگاتے ہیں۔ تھوڑی دور جانے کے بعد انجن اشارت کرنا۔“ جگمو چا چانے کہا۔

حضور بخش اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا اور وہ تینوں کار کو دھکا لگانے لگے۔ تقریباً ”میں گز آگے جا کر حضور بخش نے انجن اشارت کر دیا اور وہ تینوں بھی کار میں بیٹھ گئے۔ جگمو چا چانے حضور بخش کو بتا دیا تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

تھانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے حضور بخش نے کار کی رفتار کم کر دی۔ ایس اچ او کا کرو میٹ کے بالکل سامنے تھا۔ جگمو چا چانے رائے منصور کے وکیل کو ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ موجمدار نے رضیہ کے ساتھ جس دوسرے آدمی کا ذکر کیا تھا۔ وہ یہ وکیل ہی تھا۔ وکیل کو دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا کہ رضیہ ابھی تھانے ہی میں موجود تھی۔ تھانے سے تقریباً ”سو گز آگے جگمو چا چانے کار پہلی گلی میں رکوا لی۔ اسے یقین تھا کہ رائے منصور کا وکیل رضیہ کو لے کر اسی طرف سے گزرے گا۔

تین آدمی کار میں بیٹھے رہے اور ایک گلی کے موڑ پر چھپ کر تھانے کی طرف دیکھتا رہا۔ تقریباً ”پچیس منٹ بعد تھانے کے سامنے کھڑی ہوئی وکیل کی کار کے ہیڈ لیمپس روشن ہوئے تھے۔ اس شخص نے دوڑ کر جگمو چا چا کو اطلاع کر دی۔ وہ لوگ بڑی پھرتی سے اتر آئے۔ دو گلی کے ایک طرف کھڑے ہو گئے اور دو دوسری طرف۔

وکیل کی کار جیسے ہی گلی میں مڑی جگمو چا چا اور اس کے آدمیوں نے دونوں طرف سے فائرنگ شروع کر دی۔ وکیل کی کار بے قابو ہو کر سامنے والے مکان سے ٹکرا کر رک گئی۔ جگمو چا چانے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ لوگ دوڑتے ہوئے اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ جبکہ جگمو چا چا دوڑ کر وکیل کی کار کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے پچھلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ رضیہ سیٹ پر گری ہوئی تھی اور خون بڑی تیزی سے سیٹ پر پھیل رہا تھا۔ جگمو چا چا مطمئن ہو کر اپنی کار کی طرف دوڑا۔

حضور بخش انجن اشارت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر انجن اشارت ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جگو چاچا جھنجھلا گیا۔

”پولیس نے فائرنگ کی آواز سن لی ہوگی۔ وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“ جگو چاچا نے کہا۔  
”لعلت بھیجو اس کار پر اتر کر پیدل نکل چلو۔“

جگو چاچا نے اترنے کے لیے دروازہ کھولا ہی تھا کہ کار کا انجن اشارت ہو گیا۔ حضور بخش نے گاڑی کو ایک زودار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ پولیس کی جیب سائرن بجاتی ہوئی گلی میں داخل ہو گئی۔ جیب گلی میں مڑنے کے بعد ایک سیکنڈ کو رکی تھی پھر تیزی سے ان کے پیچھے آنے لگی۔  
”رفار بڑھاؤ... پولیس ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔“ جگو چاچا چینا۔

حضور بخش نے رفرار بڑھانے کے ساتھ ہی کار کو بائیں طرف کی گلی میں موڑ دیا۔ ٹائروں کی چرچاہٹ کی تیز آواز فضا میں گونجی تھی۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی پولیس کی جیب بھی اس طرف مڑی۔ ان کے درمیان فاصلہ کم ہو گیا تھا۔ جگو چاچا اور اس کے ایک ساتھی نے مڑ کر پولیس کی جیب پر فائرنگ شروع کر دی۔ جیب کی رفرار کم ہو گئی لیکن جواب میں جیب کی طرف سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔  
”اگلی گلی کے موڑ پر کار روک لو اور اتر کر پیدل بھاگو۔“ جگو چاچا چینا۔

حضور بخش نے اگلے موڑ پر کار روک لی۔ جگو چاچا اور اس کے ساتھی تو بڑی پھرتی سے اتر کر اندھیری گلیوں میں بھاگ گئے۔ حضور بخش کو ایشیئرنگ کی وجہ سے اترنے میں کچھ دشواری پیش آئی۔ جیب قریب پہنچ چکی تھی۔ حضور بخش نے مڑ کر جیب پر فائرنگ شروع کر دی لیکن جیب کی طرف سے چلائی جانے والی ایک گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ چپتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

جگو چاچا اور اس کے بانی دونوں ساتھی اندھیری گلیوں میں گھومتے ہوئے اپنے اڈے پر پہنچ گئے۔  
”یہ بہت برا ہوا۔“ جگو چاچا نے رائفل چارپائی پر بھینکتے ہوئے کہا۔ ”حضور بخش نے اگر پولیس کو کچھ بتا دیا تو وہ لوگ یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے۔ آصف! باہر جا کر گلی پر نگاہ رکھو۔ اگر پولیس آجائے تو فوراً آکر بتا دیتا۔ ہم پھیلی طرف سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔“  
”حضور بخش پولیس کو کچھ نہیں بتا سکتا جگو چاچا۔“ آصف نے جواب دیا۔ ”میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ تو زمین پر گرنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہو گا۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ مگر ہمیں غیر محتاط نہیں رہنا چاہئے۔ جاؤ تم باہر جاؤ۔“ جگو چاچا نے کہا۔

آصف باہر چلا گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی رائفل سنبھالے کمرے کے باہر جا کھڑا ہوا اور جگو چاچا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حضور بخش کے مرجانے کی دعائیں مانگ رہا تھا کیونکہ حضور بخش کی موت ہی ان سب کی زندگی تھی۔

جگو چاچا کی عمر اگرچہ پچاس کے لگ بھگ تھی۔ مگر بالوں کی سفیدی سے قطع نظر اس کی صحت قابل رشک تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور جوانوں سے زیادہ پھرتا پن۔ جگو چاچا پہلوانی کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ اس کے کئی شاگرد بھی تھے۔ جگو نے کئی تانگے بھی بنا رکھے تھے جنہیں وہ کرائے پر دیا کرتا تھا۔ لیکن پھر یہ نہیں کیا ہوا کہ اس نے اکھاڑہ بند کر دیا اور مالشے کا کام شروع کر دیا۔ اس نے شہر کے چوک پر جگہ بنالی تھی۔ جہاں سے بڑے بڑے لوگ بھی مالش کروانے کے لیے اسے اپنی کوشیوں پر لے

جاتے۔ اس طرح وہ شیردرانی تک بھی پہنچ گیا تھا۔ موجددار اکثر اسے گاڑی پر بٹھا کر لے جاتا تھا اور پھر جگہ چاچا نے شیردرانی کے وظیفہ خوار کی حیثیت حاصل کر لی اور اس نے چوک پر بیٹھنا چھوڑ دیا۔ اب وہ اپنے احاطے میں بہت چھوٹے پیمانے پر جو اٹھایا کرتا تھا۔ اس نے موجددار کے کہنے پر کچھ خطرناک قسم کے کام بھی کئے تھے جن کا معاوضہ تو بہت ملا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر پولیس کو اس کی اصلیت کا پتہ چل گیا تو اسے پھانسی سے کم سزا نہیں ہوگی۔ آج ہی کا واقعہ اس سلسلے میں ایک مثال قرار دیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک عورت کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا اور رائے منصور کے وکیل کو بھی گولیاں لگی تھیں۔ اب پتہ نہیں وہ زندہ بچ گیا تھا یا وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

جگہ چاچا کو اس وقت اگر کوئی خطرہ تھا تو حضور بخش کی طرف سے تھا۔ اگر وہ زندہ بچ گیا اور اس نے پولیس کو ان کے بارے میں بتا دیا تو فرار ہونے کے باوجود پولیس انہیں سات پردوں میں سے بھی ڈھونڈ نکالے گی۔

صبح جگہ چاچا کو پتہ چلا کہ حضور بخش زندہ ہے لیکن مسلسل بے ہوش ہے اور ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جگہ چاچا کو یقین تھا کہ ہسپتال میں بھی پولیس حضور بخش کی نگرانی اور حفاظت کے لیے موجود ہوگی لیکن جگہ چاچا نے بہر حال اسے ہوش میں آنے سے پہلے ہی حتم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے یہ ذمہ داری ایک ایسے آدمی کو سونپی جس پر اسے پورا بھروسہ تھا۔ لیکن ایک گھنٹے بعد اسے اطلاع ملی کہ اس کا بیٹھا ہوا آدمی خود پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا کہ اور حضور بخش کو ایک پرائیویٹ روم میں منتقل کر کے کمرے کے اندر اور باہر پولیس کا زبردست پہرہ لگا دیا گیا تھا اور جب دوپہر کے وقت جگہ چاچا کو یہ اطلاع ملی کہ حضور بخش ہوش میں آنے سے پہلے ہی مر گیا ہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ موت کا خطرہ اس کے سر سے ٹل گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ غیر محتاط نہیں رہتا چاہتا تھا۔ اس نے نہ صرف خود احاطے سے نکلنا بند کر دیا بلکہ آصف اور اس مشن میں حصہ لینے والے دوسرے آدمی کو بھی احاطے تک محدود کر دیا اور چند روز کے لیے اس نے جواہریوں کو بھی احاطے میں آنے سے منع کر دیا۔

اسی رات موجددار اس کے احاطے میں پہنچ گیا۔ اس نے نوٹوں کا ایک بڈل اس کی چارپائی پر پھینک دیا۔

”درانی صاحب تمہارے کام سے بہت خوش ہوئے ہیں۔“ موجددار نے کہا۔ ”انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ تم اپنے آدمیوں کو لے کر چند روز کے لیے شہر سے باہر چلے جاؤ۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ جگہ چاچا نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کل تک یہاں سے چلے جاؤ۔“ موجددار نے کہا۔ ”جس عورت کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے وہ رائے منصور کے ہاں پناہ لئے ہوئے تھی اور رائے منصور کو تم جانتے ہو۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک رضیہ کے قاتلوں کا سراغ نہیں مل جاتا اور پھر اس کا وکیل بھی زخمی ہوا ہے۔ جب پولیس کی سرگرمیاں کچھ ٹھنڈی پڑ جائیں گی تو تم لوگوں کو واپس بلا لیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اپنے دونوں آدمیوں کو تو آج ہی یہاں سے بھگا دیتا ہوں۔ کل رات تک میں خود بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے تو مجھے بھادپور کے پتے پر اطلاع کر دینا۔“ جگہ چاچا نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، اب میں جا رہا ہوں۔“ موجددار نے جواب دیا اور احاطے سے باہر آ گیا۔



وہ جگہ چاہا سے ملنے کے بعد مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا شبیر درانی کے بچکے پر پہنچ گیا۔  
 ”میں نے جگہ کو سمجھا دیا ہے سرکار۔ وہ کل رات تک شہر سے چلا جائے گا۔“ موجددار نے بتایا۔  
 ”ہسپتال میں کون ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”گاما ہے سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔

”اسے پیغام بھجوادو کہ ذرا ہوشیار رہے۔ مجھے یقین ہے کہ نائلہ ہسپتال ضرور آئے گی اور صادق آباد میں بھی اپنے آدمیوں کو پیغام بھجوادو کہ وہ احمد پور لاما کی طرف جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دیں۔ رائے منصور رضیہ کی میت کو اپنی حویلی لے جا رہا ہے اور نائلہ بھی وہاں پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ اسے دیکھتے ہی گولی سے اڑا دیا جائے۔ زندہ پکڑنے کی ضرورت نہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔

اور پھر شام کو شبیر درانی کو نائلہ درانی کے بارے میں جو اطلاع ملی تھی اس نے شبیر درانی کو اپنے بال نوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس اطلاع کے مطابق گامے نے نائلہ کو ہسپتال سے نکلے ہوئے پکڑ لیا تھا لیکن وہ اس کی جیب لے کر بھاگ گئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد جیب منجھان آبادی کی ایک گلی میں کھڑی ہوئی مل گئی۔ شبیر درانی کو یقین تھا کہ نائلہ انہی گلیوں میں واقع کسی مکان میں چھپ گئی ہے۔ اس نے پولیس کو بھی نائلہ کے بارے میں اطلاع دے دی اور اس طرح اس علاقے میں نائلہ کی تلاش شروع ہو گئی۔ لیکن نائلہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

شبیر درانی نے اس رات نائلہ کے بچکے پر ایک بار پھر بل بول دیا تھا لیکن اسے وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ نائلہ اور دلاور کہاں روپوش ہو گئے تھے۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ نائلہ کے باپ عبدالصمد درانی کے دوستانہ اور پر غلوں رویے کی وجہ سے اس شہر میں نائلہ کے ہمدردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اسے کہیں بھی پناہ مل سکتی تھی اور اسے تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔ لیکن وہ بھی آسانی سے اس کا چھپا چھوڑنے والا نہیں تھا۔

”موجددار!“ شبیر درانی نے موجددار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”رائے منصور کل بھی تورجم یار خان آیا تھا لیکن کل وہ اپنے بچکے میں نہیں تھا۔ معلوم کرو کہ کل وہ کہاں ٹھہرا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کل اس نے نائلہ سے بھی ضرور ملاقات کی ہوگی۔“

”معلوم کر لوں گا سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔ ”اس کے بچکے کے چوکیدار سے معلوم ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، معلوم کر کے مجھے بتانا۔“ شبیر درانی بولا۔

موجددار باہر چلا گیا۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ موجددار جب دوبارہ اس کے سامنے آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اس مکان کا پتہ چلا لیا ہے سرکار جہاں رائے منصور نے کل کا دن گزارا تھا اور نائلہ نے بھی اسی مکان میں اس سے ملاقات کی تھی۔“ موجددار نے بتایا۔

”گڈ!“ شبیر درانی نے مسکرایا۔ ”کہاں ہے وہ مکان؟“

”جس جگہ نائلہ نے کل شام کو جیب چھوڑی تھی اس سے تیسری گلی میں، وہاں صرف ایک چوکیدار

رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نالکہ نے اسی مکان میں پناہ لے رکھی ہوگی۔“

”کیا تمہیں یقین ہے؟“ شبیر درانی نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی سرکار!“ موجددار نے جواب دیا۔ ”اس گلی میں رہنے والے دوست محمد نامی ایک آدمی نے بتایا ہے کہ کل راتے منصور وہیں تھا اور چاروں میں لپٹی ہوئی ایک عورت بھی وہاں آئی تھی جو رات کو واپس چلی گئی تھی۔ دوست محمد کا کہنا ہے کہ وہ اکثر رات کو مکان کے چوکیدار اسماعیل کے ساتھ وہاں بیٹھا گپ شپ کرتا رہتا ہے لیکن آج جب وہ وہاں گیا تو اسماعیل نے اسے باہر ہی سے ٹرغا دیا کہ گاؤں سے اس کا ایک دوست اپنے گھروالی کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ اس لیے اسماعیل نے اسے اندر بھی نہیں جانے دیا۔“

”تو بابا میرے پاس کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اسے یہاں لے کر آؤ نا۔“ شبیر درانی بولا۔

”ابھی گیا سرکار۔“ موجددار کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

آدھے گھنٹے بعد موجددار دو گن مینوں کے ساتھ اسماعیل والے مکان کے سامنے موجود تھا۔ موجددار کے اشارے پر ایک گن مین نے دروازے پر دستک دی۔ مگر جواب نہیں ملا۔ دوسری مرتبہ ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک دبلے پتلے سے آدمی نے دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ وہ آنے والوں سے کچھ پوچھ سکا موجددار نے اپنی رائفل کی ٹال اس کے سینے پر رکھ دی اور اسے دھکیلا ہوا اندر لے گیا۔ اس کے دونوں گن مین بھی اندر آگئے تھے۔ ایک نے بڑی پھرتی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”کک... کون ہو تم لوگ...؟“ اسماعیل نے ہلکا کر رہ گیا۔

موجددار نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں رائفلیں تانے تیزی سے مختلف کمروں کی تلاشی لینے لگے۔ اس مکان میں چار کمرے تھے اور چاروں کمروں میں انہیں کوئی نہیں ملا تھا۔ انہوں نے واپس آکر لفٹی میں سرلا دیا۔

”کہاں چھپایا ہے اسے تم نے؟“ موجددار نے اسماعیل کے سینے پر رائفل کی ٹال سے دباؤ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”کک... کسی کی بات کر رہے ہو؟ یہاں تو میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔“ اسماعیل بولا۔ اس کا چہرہ خوف سے دھواں ہو رہا تھا۔

”میں نالکہ درانی کی بات کر رہا ہوں۔“ موجددار اسے دھکیلا ہوا اس کمرے میں لے آیا جہاں نالکہ نے بیٹھ کر وقت گزارا تھا۔ ”وہ کل بھی یہاں آئی تھی۔ راتے منصور سے ملنے کے لیے... اور آج بھی وہ مارے آدمی کو دھوکا دے کر یہیں آئی ہوگی۔ بتاؤ، وہ کہاں چھپی ہے؟“

”مم... میں سچ کہتا ہوں یہاں کوئی نہیں آیا۔“ اسماعیل بولا۔

موجددار کی نظر اچانک ہی کمری پر پڑے ہوئے کالے رنگ کے ایک ریشمی کپڑے پر پڑ گئی۔ اس نے اگے بڑھ کر وہ کپڑا اٹھالیا۔ وہ ریشمی فینسی برقعہ تھا۔ موجددار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”اب تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔“ موجددار نے خونخوار نگاہوں سے اسماعیل کی طرف دیکھا۔ ”اگر وہ ہاں سے چلی گئی ہے تو تمہیں اس کا ٹھکانہ ضرور معلوم ہو گا۔ بتاؤ، کہاں چھپی ہوئی ہے نالکہ؟“

”مم... مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا۔“ اسماعیل نے جواب دیا۔

”دیکھو میرے دوست۔“ موجددار نے کہا۔ ”تم بہت دبلے پتلے اور کمزور سے آدمی ہو۔ ایک دو ہاتھ ہی برداشت نہیں کر پاؤ گے۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ شبیر درانی نے نالکہ کو اس کے حوالے کرنے کے

لیے دولاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا ہے۔ اب تم بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ دولاکھ روپے یا اذیت ناک موت؟  
 ”مم۔۔۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ اسٹیل ہکلیا۔

موجمدار نے ایک گن مین کو اشارہ کرتے ہوئے ریشمی برقعے کا ایک حصہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ گن مین نے اپنی رائفل کرسی پر رکھ دی اور بڑی پھرتی سے اسٹیل کا منہ اس طرح باندھ دیا کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل سکتی تھی۔

”ہاں۔۔۔ اب ٹھیک ہے۔“ موجمدار مسکراتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اسے اس وقت تک پیٹتے رہو جب تک یہ ناکلہ کا پتہ بتانے پر تیار نہ ہو جائے۔“

دوسرے آدمی نے بھی رائفل کرسی پر رکھ دی اور وہ دونوں اسٹیل کی دھنائی کرنے لگے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اس سے پوچھ بھی لیتے اور اسٹیل ہر مرتبہ نفی میں سرلا دیتا۔ ایک گن مین نے جیب سے چاقو نکال لیا۔ چاقو کا چمکتا ہوا پھل دیکھ کر اسٹیل کے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہو گئے۔  
 ”کانگری پہلوان! اب بھی کچھ بتاؤ گے یا نہیں؟“ گن مین نے چاقو کی نوک اس کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

اسٹیل نے ایک بار پھر نفی میں سرلا دیا۔ گن مین نے چاقو کی نوک اسٹیل کی پیشانی پر رکھ کر اسے اس طرح گھسیٹا جیسے پنسل سے لکیر کھینچی جاتی ہے۔ اسٹیل کی پیشانی پر بھی ایک لمبی لکیر بن گئی تھی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ اسٹیل بری طرح چملا۔ وہ چیخا بھی تھا مگر چیخ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اس شخص نے دوسرا چکر اسٹیل کے دائیں رخسار پر لگایا تھا۔ پیشانی اور رخسار سے بننے والے خون نے اس کے چہرے کو تر کر دیا تھا۔

”اب بھی وقت ہے۔ بتا دو ناکلہ کے بارے میں۔ اگر اب بھی انکار کرو گے تو تمہارے پورے جسم پر ایسی ہی سرخ لکیریں بنی چلی جائیں گی۔“ اس شخص نے کہا۔

اسٹیل نے اس مرتبہ بھی نفی میں سرلا دیا۔ اس کے ذہن میں ناکلہ سے کبھی ہوئی یہ بات گونج رہی تھی کہ ”یہ وفادار اپنی جان تو دے سکتا ہے کسی لالچ میں آکر اپنے محسنوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔“ یہ الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ جسم پر لگنے والے چاقو کا ہر چرکہ اس کے عزم کو مزید پختہ کر رہا تھا۔ موجمدار وغیرہ تقریباً ”ایک گھنٹے تک اس مکان میں رہے اور پھر واپس چلے گئے۔ ان تینوں کے چہروں پر بایوسی تھی۔

\*\*\*\*\*

ناکلہ درانی کو بے حد افسوس تھا کہ وہ رضیہ کا منہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ لیکن اس نے رضیہ کا قتل بھی ٹھم درانی کے اس کھاتے میں ڈال دیا تھا جس میں اور بھی بہت سے بے گناہوں کے خون کا حساب درج تھا۔ اور اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ شبیر درانی سے ان بے گناہوں کے خون کا حساب ضرور لے گی۔ اس کے ساتھ ہی اسے شبیر درانی سے پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ وہ شاید پاگل ہی ہو گیا تھا جو اس طرح بے درپے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارتا چلا جا رہا تھا۔ شبیر درانی نے جس سے بھی اپنے لئے خطرہ محسوس کیا تھا اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔ رضیہ کے پاس اس کے بہت سے راز تھے۔ مراد اور بخشو کے ساتھ ہونے والی حیوانیت کے سلوک اور ان کے قتل کی وہ چشم دید گواہ تھی۔ اس کے

وہ بھی وہ شبیردرانی کی بہت سی ایسی سازشوں سے آگاہ تھی جن کا انکشاف اسے تختہ دار پر پہنچا سکتا تھا۔ یہ کو موت کے گھاٹ اتار کر شبیردرانی نے یقیناً ”سکھ کا سانس لیا ہوگا۔ لیکن نائلہ ابھی زندہ تھی۔ اگر کے خلاف جھوٹے جرائم کی طویل فہرست نہ ہوتی تو وہ اب تک شبیردرانی کو پھانسی کے پھندے تک پہنچی ہوئی۔ اسی لیے وہ کوشش کر رہی تھی کہ اسے ان الزامات سے بریت مل جائے تاکہ وہ کھل کر نئے آسکے۔ اس پر سب سے بڑا الزام اپنے آدمیوں کے ذریعے پولیس وین پر حملہ کرنا تھا جس میں پانچ آدمی مارے گئے تھے۔

نائلہ رات بھر رضیہ بی کے بارے میں سوچتے ہوئے سو گئی تھی۔ صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس وقت بھی یہی خیال اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج پولیس کو بتا دے گی کہ رضیہ کا کون تھا۔

ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر تک اور سوچتی رہی پھر ڈرائنگ روم میں آگئی اور فون کا ریسیور اٹھا کر اس نے کا نمبر ڈائل کرنے لگی جس کے قریب رضیہ کو قتل کیا گیا تھا۔ کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی تھی۔ کال ہو کرنے والا تھانے کا محرر تھا۔ نائلہ نے جب ایس ایچ او سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو محرر بولا۔

”آپ کس سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہیں خاتون؟“

”آپ کے تھانے کے قریب جس عورت کو قتل کیا گیا تھا اسی سلسلے میں اہم اطلاع دینا چاہتی ہوں۔“

نے جواب دیا۔

”اوہ!“ محرر کی آواز سنائی دی۔ ”انسپکٹر صاحب تو ایک ضروری کام سے نکلے ہیں۔ ان کی واپسی میں ایک گھنٹہ لگ جائے۔ آپ کہاں سے بول رہی ہیں۔ جو اطلاع دینا چاہتی ہیں مجھے بتادیں۔“

نائلہ نے جواب دیئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے دوبارہ ٹیلی فون کیا۔ اس مرتبہ اس نے اسے بات ہو گئی۔

”میں قانون کی ایک ہمدرد بول رہی ہوں انسپکٹر۔“ نائلہ نے کہا۔ ”رضیہ کے قتل کے سلسلے میں قانون مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آپ فوری طور پر ڈی ایس پی کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔“

”آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہی ہیں خاتون؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”آپ اس چکر میں مت پڑیں کہ میں کون ہوں اور کہاں سے بول رہی ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”میری بات غور سے سنیں۔ رضیہ کو ایک بااثر شخصیت کی طرف سے جان کا خطرہ تھا کیونکہ وہ اس کے سامنے سیاہ کارناموں سے واقف ہو چکی تھی۔ اور وہ رائے منصور کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھی کیونکہ وہاں مطلقاً تھی لیکن حویلی سے نکلے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔“

”یہ بات مجھ سے رضیہ بی بی نے بھی کہی تھی اور رائے صاحب نے بھی۔ لیکن ان دونوں نے کسی بہت کا نام نہیں بتایا تھا۔ اور اب یہ بات میں تیسری مرتبہ سن رہا ہوں۔ پلیز! آپ بتائیے وہ شخصیت کون تھی؟“

انسپکٹر نے پوچھا۔

”بہت بااثر ہے وہ شخصیت۔ کیا آپ اس کے خلاف کارروائی کر سکیں گے؟“ نائلہ نے سوال کیا۔

”دیکھو بی بی! قانون سے کوئی بھی بالاتر نہیں ہے۔ وہ شخص خواہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو۔ اگر اس کا قتل یا کسی اور جرم میں ملوث ہونا ثابت ہو گیا تو میں اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے میں کوئی

خوف محسوس نہیں کروں گا۔ آپ نام بتائیے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”رائے منصور کو تو آپ نے پولیس اسٹیشن سے رضیہ کی گرفتاری کی اطلاع تھی لیکن کیا آپ نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ شبیردرانی کو اطلاع کس نے دی تھی اور وہ رضیہ کو اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا؟“  
نائلہ نے کہا۔

”شبیردرانی!“ انسپکٹر کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”آپ جانتی ہیں وہ کون ہے اور اس پر کوئی الزام لگانے کا مطلب....“

”بس!“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”دھری رہ گئی نا آپ کی فرض شناسی۔ میں جانتی ہوں۔ شبیردرانی کا نام سن کر آپ کے پسینے چھوٹ گئے ہوں گے۔“

”یہ بات نہیں ہے خاتون۔“ انسپکٹر بولا۔ ”اگر آپ کے پاس اس شخص کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہے تو آپ تھانے آجائیے۔ آپ کو مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ اگر آپ یہاں آنے میں کوئی خوف محسوس کریں تو مجھے اپنا پتہ بتادیں۔ میں خود آپ کے پاس آجاؤں گا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو مکمل تحفظ فراہم کریں گے۔“

”تحفظ!“ نائلہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”انسپکٹر اعظم اور صادق آباد کا انسپکٹر جبار اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو آپ دوسروں کو کیا تحفظ دیں گے۔ پولیس کی کمنڈی میں، تھانے کے حوالات میں اہم ترین گواہوں کو قتل کر دیا گیا تو آپ مجھے کیا تحفظ دیں گے لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ڈرتی ہوں۔ میں سامنے ضرور آؤں گی۔ اس وقت تک آپ میری بات پر غور کیجئے۔“  
”سنئے خاتون....“

انسپکٹر کچھ کہتا رہا لیکن نائلہ نے ریسپور رکھ دیا اب وہ مطمئن تھی۔ اس نے انسپکٹر کو ایک لائن دے دی تھی۔ اگر انسپکٹر نے اس کی باتوں پر غور کیا اور شبیردرانی کے خلاف تحقیقات شروع کر دیں تو شبیردرانی کے لیے بہت سی پریشانیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

تقریباً دو گھنٹے بعد رائے منصور کا ٹیلی فون آگیا۔ انہوں نے بتایا کہ رضیہ کی تدفین ہو چکی ہے اور وہ دوپہر کو رحیم یار خان آرہے ہیں۔

دو بجے رائے منصور کا دوبارہ فون آیا۔ اس مرتبہ وہ رحیم یار خان میں اپنے بیٹکے میں موجود تھے۔  
”کیا تم اس مکان میں آ سکتی ہو جہاں اس روز اسماعیل کے ساتھ آئی تھیں؟ میں ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”نہیں انکل!“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میرا وہاں آنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“ نائلہ کو صبح فون پر تفصیل سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے کل والے واقعہ کی تفصیل بتادی۔

”اوہ!“ رائے منصور اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”میں پانچ بجے اسماعیل کو بھیجوں گا۔ تم اس کے ساتھ آ جانا۔ میرے پاس بہت سی ایسی جگہیں ہیں جن کے بارے میں شبیردرانی سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا اور دوسری طرف سے لائن کٹ جانے کے بعد اس نے بھی ریسپور رکھ دیا۔

پانچ بجے نائلہ، اسماعیل کا انتظار کر رہی تھی لیکن اسماعیل کی بجائے رائے صاحب کی فون کال آگئی۔  
”میں تو اسماعیل کا انتظار کر رہی تھی انکل، وہ ابھی تک نہیں آیا۔“ نائلہ بولی۔

”اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں اکل!“ نائلہ نے چونک کر کہا۔

”کسی نے کل رات اسے مکان میں ازیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا ہے۔“ رائے منصور نے جواب

دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں چھوڑنے کے بعد جب واپس پہنچا تو شبیر درانی کے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا

تھا۔ وہ اسے ازیتیں دے کر یقیناً تمہارے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے۔ لیکن اس نے جان دے دی مگر

تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”اوہ!“ نائلہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے مگر

کسی لالچ میں آکر اپنے محسنوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا اسے واقعی سچ ثابت کر

دکھایا۔“

”بہر حال کچھ ضروری باتیں ہیں جو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں آج رات یہیں ہوں۔ کوشش کروں

گا کہ رات کو کسی وقت حقیقہ کے مکان پر آکر تم سے ملاقات کروں۔“ رائے منصور نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

دوسری طرف سے لائن منقطع ہو گئی تھی۔ نائلہ نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ اب وہ رضیہ کے ساتھ اسماعیل

کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی۔ شبیر درانی کی درندگی میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ واقعی پاگل ہو گیا

تھا اور نائلہ جانتی تھی کہ جب کوئی پاگل ہو جائے تو اس کا علاج بھی ضروری ہو جاتا ہے اور اس نے انسپکٹر کو

فون کر کے اس کے علاج کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھالیا تھا۔

رائے منصور رات ساڑھے دس بجے پہنچے تھے۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ان کا تعاقب نہ

کیا گیا ہو۔

”رضیہ پر فائرنگ کرنے والوں میں سے جس شخص کو گرفتار کیا گیا تھا اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ

ہوش میں آئے بغیر جان بحق ہو گیا تھا۔“ نائلہ نے پوچھا۔

”پولیس کی طرف سے پریس کو یہی بیان جاری کیا گیا تھا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”لیکن حقیقت

یہ ہے کہ مرنے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے ہوش میں آگیا تھا۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ اس نے دو

نام بتائے تھے اور میرے ہی مشورے پر یہ نام میڈی راز میں رکھے گئے تھے اور پریس کو یہ بیان جاری کیا گیا تھا

کہ وہ شخص بے ہوشی کی حالت میں ہی چل بسا تھا۔“

”کیا نام بتائے تھے، کون ہیں وہ لوگ؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ایک تو آصف تھا اور دوسرا جگمو... جگمو چاچا۔“ رائے منصور نے بتایا۔

”جگمو چاچا۔“ نائلہ اچھل پڑی۔

”کیا تم یہ نام جانتی ہو؟“ رائے منصور چونک گیا۔

”مجھے کل رات ہی اسماعیل نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔“ نائلہ بولی۔ ”دراصل کل رات جب

میں شعل کاک برقعے میں لپٹی ہوئی اس مکان سے نکلی تھی تو ان گلیوں میں میری تلاش جاری تھی۔ گلیوں کے

ہاہر سڑک کے موڑ پر کھڑی ایک جیپ پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ وہی تھی جو میں ہسپتال کے سامنے

اس آدمی سے چھین کر بھاگی تھی۔ ان دو آدمیوں میں سے ایک آدمی وہی تھا جس نے مجھے اغواء کرنے کی

کوشش کی تھی۔ اس کا نام گاما ہے۔ وہ دونوں آدمی میری ہی تلاش میں وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور اتفاق سے

اس وقت میرے ہی بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ گامے کو تو میں نے پہچان لیا تھا اور دوسرے آدمی کو اسماعیل نے جگہ چاچا کے نام سے شناخت کیا تھا۔ اسماعیل کے کہنے کے مطابق پہلے وہ پہلوانی کرتا تھا۔ پھر مالیشیہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور کچھ عرصہ سے اس نے یہ دھندہ بھی چھوڑ رکھا تھا۔

”اوہ!“ رائے منصور اچھل پڑا۔ ”حیرت ہے یہ نام سننے کے بعد جگہ پہلوان کا خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا تھا اور مزید حیرت یہ ہے کہ پولیس نے ابھی تک اسے کیوں نہیں پکڑا۔ وہ تو بہت بدنام آدمی ہے اور جب اس قسم کے واقعات رونما ہوتے ہیں تو سب سے پہلے شہر کے بدنام اور مشتبہ لوگوں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کی جاتی ہے لیکن حیرت ہے کہ پولیس اب تک جگہ پہلوان تک کیوں نہیں پہنچی؟“

”ممکن ہے پولیس اسے حراست میں لے چکی ہو۔“ نائلہ بولی۔

”نہیں۔“ رائے منصور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شام کو انسپکٹر سے فون پر میری بات ہوئی تھی اور میں نے اس سلسلے میں خاص طور سے پوچھا تھا اور ہاں...“ وہ خاموش ہو کر گہری نظروں سے نائلہ کی طرف دیکھنے لگے۔ ”کیا آج صبح تم نے انسپکٹر کو فون کیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”رضیہ کی موت نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ اب یہ خون خرابہ بند ہو جائے اور اس عفریت کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پھنسا دیا جائے۔ میں نے انسپکٹر کو ایک لائن آف ڈائریکشن دے دی تھی۔ اگر وہ پولیس آفسر دیانت دار ثابت ہوا تو بڑی آسانی سے شیردرانی تک پہنچ جائے گا۔“

”میں جگہ کو جانتا ہوں۔“ دلاور نے ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کے اڑے کا بھی پتہ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہو کر بھاگ نکلے، ہمیں اسے گرفت میں لے کر پولیس کے حوالے کر دینا چاہئے۔“

”لیکن یہ خطرناک ہو گا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”اس کی بجائے کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پولیس کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیا جائے؟“

”مجھے آپ سے اختلاف ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”پولیس اس سے کھٹک سکتی ہے اور پھر یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر ہم پولیس کو اس کے بارے میں بتا دیں اور پولیس ہی کا کوئی آدمی اسے اطلاع کر دے تو وہ ضرور فرار ہو جائے گا۔ نہیں انکل... دلاور ٹھیک کہتا ہے۔ ہمیں وقت ضائع کئے بغیر حرکت میں آ جانا چاہئے۔“

”کیا تم...“

”جی ہاں۔“ نائلہ نے رائے منصور کی بات کاٹ دی۔ ”میں بھی دلاور کے ساتھ جاؤں گی۔ ایک آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔“

”تو پھر میں کیسے پیچھے رہ سکتا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”میری گاڑی میں دو رائفیں رکھی ہوئی ہیں۔ دارا بھی موجود ہے۔ تو چلو... اب دیر نہیں کرنی چاہئے۔“ رائے منصور اٹھ کھڑا ہو گیا۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ تینوں عقیلہ کے مکان سے نکل رہے تھے۔ نائلہ اور دلاور نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ دلاور نے چادر کے اندر اپنی آٹویک رائفل بھی چھپا رکھی تھی۔

دو تین گھنٹیں گھومنے کے بعد وہ موٹر پر رک گئے جہاں رائے منصور کی پاجرو کھڑی تھی۔ اسٹیرنگ کے سامنے دارا بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے نیچے اتر کر پہلے پھٹلا دروازہ کھولا پھر آگے کی سیٹ کا۔ نائلہ

دو رائے منصور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے جبکہ دلاور آگے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔  
 ”بھگے پر واپس چلیں سرکار؟“ دارا نے انجن اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”دلاور تمہیں راستہ بتائے گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

پاچروگلی سے نکل کر سڑک پر آگئی۔ اور تیز رفتاری سے دلاور کے بتائے ہوئے راستوں پر دوڑنے لگی۔  
 قریباً ”پندرہ منٹ بعد دلاور نے سچی آبادی کے باہر سڑک پر پاچورو کوالی۔ راستے میں دارا کو بتا دیا گیا تھا کہ وہ  
 یہی آبادی کی طرف کس لیے آرہے ہیں۔ وہ گاڑی روکتے ہی نیچے اتر آیا۔ نالہ اور رائے منصور بھی نیچے  
 تر آئے تھے۔ دارا نے پچھلی سیٹ کے نیچے سے دو آٹومیک رائفلیں نکال لیں۔ ایک رائفل رائے منصور  
 نے لینا چاہی لیکن وہ نالہ نے پکڑ لی۔

”نکل! آپ آرام سے گاڑی میں بیٹھے رہئے۔ ہم تین ہی کافی ہیں۔“ نالہ نے کہا۔  
 ”نالہ بی بی ٹھیک کہتی ہیں سرکار۔“ دارا نے نالہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ٹھیک ہے، اپنا پستول مجھے دے دو۔“ رائے منصور نے کہتے ہوئے دارا کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دارا  
 نے ہولسٹر میں اڑسا ہوا پستول نکال کر رائے منصور کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”ذرا محتاط رہنا“ اور اس بات کا  
 حال رہے کہ ہم جگہ کو پکڑنے آئے ہیں کسی قسم کا خون خرابہ کرنے نہیں۔ ہم نے جگہ کو قانون کے  
 اے کرنا ہے۔ وہ ہمارا نہیں، قانون کا مجرم ہے۔“

”آپ مطمئن رہئے۔ کوئی خون خرابہ نہیں ہوگا۔“ نالہ نے جواب دیا۔  
 وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کچی بستی میں داخل ہو گئے۔ کئی گلیاں گھومنے کے بعد وہ جگہ چاچا  
 احاطے کے سامنے پہنچ گئے۔ لکڑی کا گیت بند تھا۔ انہیں دیوار پھاند کر اندر جانا پڑا۔  
 تین چار گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور کئی تانگے کھڑے تھے۔ ان کے کودنے کی آواز سن کر ایک  
 رڈا ہنسانے لگا۔ وہ لوگ بڑی پھرتی سے ٹانگوں کے پیچھے دبک گئے۔ نالہ جس جگہ کھڑی تھی وہاں اسے  
 طے کے آخر میں ایک کمرے کے دروازے کی جھری سے روشنی نظر آرہی تھی۔ اسی لمحہ دروازہ کھلا اور  
 آدمی باہر آگیا۔

”کون ہے بھی؟“ اس شخص نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔ پھر گھوڑے کے ہنسانے کی آواز  
 کر آگے آگیا۔

وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اس گھوڑے کے قریب آگیا جو ہنساتے ہوئے اگلا ایک پیر بار زمین  
 رہا تھا۔ وہ قریب آکر گھوڑے کو جھپٹانے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستول یا ریوالور تھا۔ نالہ  
 اس کے درمیان صرف چار پانچ قدم کا فاصلہ تھا۔ نالہ نے بڑی احتیاط سے پیچھے ہٹتے ہوئے تانگے کی آڑ  
 ہونے کی کوشش کی کیونکہ جس جگہ وہ کھڑی تھی اگر وہ آدمی گھومتا تو نالہ اس کی نظروں میں آسکتی تھی۔  
 ہٹتے ہوئے نالہ کا پیر زمین پر پڑے ہوئے تین کے ایک خالی ڈبے کو لگا ڈبہ گر گیا۔ ڈبے کو ٹھوکر لگنے سے  
 خاصی آہٹ ہوئی تھی۔ وہ شخص گھوڑے کو چھوڑ کر تیزی سے اس طرف گھوم گیا۔  
 ”کون ہے؟“

نالہ نے بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ہوا میں اڑتی ہوئی اس طرح زمین پر آئی کہ اس کی  
 اس شخص کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس شخص کے ہاتھ سے نکل کر دروازے پر جا گرا۔ وہ شخص  
 آکر گھوڑے سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ گھوڑا اچھل اچھل کر اور بھی زور زور



سے ہنسانے لگا۔

نالکھ نے اس شخص کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کی پیلیوں پر ایک اور لگ رسید کر دی۔ وہ شخص کراہ کر دوہرا ہو گیا۔ نالکھ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن اپنے بازو کی پٹیٹ میں لے لی۔ وہ شخص گردن چمڑانے کے لیے چمکنے لگا۔ مگر نالکھ کے لگائے ہوئے اس چوک ہو لڑے نجات پالینا اتنا آسان نہیں تھا۔ نالکھ نے ایک دو جھٹکے دیئے اور وہ شخص اس کی ہانہوں میں جھول گیا۔ نالکھ نے اسے کھینچ کر ایک تانگے کی آڑ میں ڈال دیا اور اپنی رائفل زمین سے اٹھالی۔

”یہ ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکے گا۔ جلدی کرو، کہیں اس کے ساتھی ہوشیار نہ ہو جائیں۔“ نالکھ نے دلاور اور دارا سے کہا جو اس کے قریب آگئے تھے۔  
وہ تینوں کمرے کی طرف دوڑے۔ اسی لمحہ دو آدمی کمرے سے نکلے۔  
”جیرے کون ہے... کیا ہوا...“ ایک آدمی نے پوچھا۔

اسے اپنے سوال کا جواب اس صورت میں ملا کہ ان تینوں نے ان پر ہلا بول دیا۔ ایک آدمی بری طرح چیخ پڑا تھا۔

”اوئے کون ہے؟“ کمرے کے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔  
ان دونوں آدمیوں کو دلاور اور دارا نے دبوچ رکھا تھا۔ نالکھ آواز سن کر کمرے کی طرف دوڑی اور دروازے ہی میں رک گئی۔

سفید بالوں اور سفید مونچھوں والا ایک بھاری بھر کم آدمی چارپائی پر پڑی ہوئی آئینک رائفل کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ نالکھ کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی مگر صحت قابل رشک تھی۔ وہ جگہ چاچا تھا جسے کل رات اس نے جیپ پر گامے کے ساتھ دیکھا تھا۔  
”جگہ کا ہاتھ رائفل پر پڑا ہی تھا کہ نالکھ ہوا میں اچھل۔ اس کے دونوں پیر جگہ کے بائیں کندھے پر لگے۔ وہ چیخا ہوا چارپائی کی پائنتی پر گر ا۔ نالکھ فوراً ہی سنبھل گئی تھی۔ جگہ نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ مگر اپنے سامنے ایک عورت کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے اور پھر اس نے نالکھ درانی کو پہچان لیا۔

”نالکھ درانی!“ اس کے ملبے میں بھی حیرت تھی۔ ”شیر درانی تو آج تک تم پر قابو نہیں پاسکا لیکن جگہ پہلوان کے ہاتھوں سے تم نہیں بچ سکوگی۔ شاید تمہاری موت ہی یہاں کھینچ لائی ہے تمہیں۔“  
”سنا ہے تم بڑے نامی گرامی پہلوان تھے۔ بڑے مقابلے جیتے ہیں تم نے۔ آج ایک عورت سے تم مقابلہ کر کے دیکھ لو۔“ نالکھ نے کہتے ہوئے اپنی رائفل بھی چارپائی پر پھینک دی اور دونوں ہاتھ مخصوص انداز میں سامنے کو نکال لئے۔

جگہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ نالکھ کی طرف بڑھا۔ مگر نالکھ نے اسے قریب آنے کا سہرا ہی نہیں دیا۔ اس نے ہاتھ کا وار کرنے کی جھکائی دی۔ جگہ اس کے وار سے بچنے کے لیے نیچے جھکا کر دوسرے ہی لمحہ نالکھ کے پیر کی ٹھوکرا اس کی ٹھوڑی پر لگی جگہ کراہتا ہوا سیدھا ہو گیا۔

”بڑے بہادر پہلوان ہو۔“ نالکھ غرائی۔ ”ایک عورت کو دھوکے سے گولیوں سے چھلنی کر کے تم کا تھے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس وقت بھی تمہارے سامنے ایک عورت ہی کھڑی ہے۔ دکھاؤ! بہادری کے جوہر...“

نالکھ نے اسے ایک اور کنگ لگادی اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع دے بغیر اس پر مارشل آرٹس کی مختلف ٹیکنیکس آزمانے لگی۔ جگمو چاچا بری طرح بلبلا رہا تھا۔ ایک موقع پر اس نے چارپائی سے راتقل اٹھنے کی کوشش کی مگر نالکھ کی کنگ اس کے بازو پر لگی اور وہ ”ہائے میری ہانہ“ کہتا ہوا زمین پر گر پڑا اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا بازو پکڑ لیا تھا۔

”بس!“ نالکھ غرائی۔ ”یہی تھی تمہاری بہادری؟ بتاؤ... رضیہ کو تم نے کس کے کہنے پر قتل کیا تھا؟“  
 ”تم چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو لیکن یہ میں نہیں بتاؤں گا۔“ جگمو بولا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ یہ تم سے پولیس معلوم کر لے گی۔“ نالکھ نے کہتے ہوئے چارپائی سے اپنی راتقل اٹھالی۔  
 باہر دلاور اور دارا ان دونوں آدمیوں سے ننٹے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک تو کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو گیا البتہ دوسرے کو انہوں نے گرفت میں لے لیا تھا وہ اسے بھی اندر لے آئے اور ان دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔

”دارا... اسے بھی لے آؤ جو باہر بڑا ہے۔“ نالکھ نے کہا۔  
 دارا تیزی سے باہر نکل گیا لیکن اس کی واپسی میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔  
 ”وہ تو بھاگ گیا نالکھ بی بی۔“ دارا نے بتایا۔  
 نالکھ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کا ہاتھ شاید ہلکا رہ گیا تھا اور وہ خلاف توقع جلد ہوش میں آکر بھاگ نکلا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ اصل آدمی تو ہمارے ہاتھ لگ ہی گیا ہے۔ انہیں لے چلو۔“ نالکھ بولی۔  
 ”انہیں کیس لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بیس کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔“ دلاور نے کہتے ہوئے جگمو چاچا کی طرف راتقل تان لی۔

”نہیں دلاور۔“ نالکھ نے اسے روک دیا۔ ”یہ ہمارے نہیں قانون کے مجرم ہیں اور سزا بھی انہیں قانون ہی دے گا۔“ اس نے رائے منصور کے الفاظ دہرائے۔ ”دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کا جسم پھینک کر دوں۔ لیکن ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں۔“

وہ لوگ جگمو چاچا اور اس کے ساتھی کو راتقلوں کی زد پر دھکیلتے ہوئے بکمرے سے باہر آگئے اور اعلیٰ سے نکل کر تاریک اور تنگ گلیوں میں چلنے لگے۔ وہ لوگ چند ہی منٹ میں کچی بستی سے نکل کر سڑک آ گئے۔ رائے منصور پاجیرو میں نہیں تھے لیکن یہ لوگ جیسے ہی پاجیرو کے قریب پہنچے وہ تاریکی سے نکل کر مابین آگئے۔

”کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟“ انہوں نے پوچھا۔  
 ”دشواری تو پیش نہیں آئی البتہ ان کے دو ساتھی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ نالکھ نے جواب دیا۔  
 ”پولیس خودی ان سے معلوم کر لے گی۔“  
 ”چلو بیٹھو۔“ رائے صاحب نے کہا۔

جگمو چاچا اور اس کے ساتھی کو پچھلی سیٹ پر درمیان میں بیٹھالیا گیا۔ ان کے ایک طرف رائے منصور اور دوسری طرف دلاور بیٹھ گیا۔ اس طرح وہ دونوں رائے صاحب اور دلاور کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئے تھے۔ نالکھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ دارا انجن اشارت کر کے پاجیرو کو حرکت میں لے آیا۔ ٹھیک اسی لمحہ اگلے موڑ سے ایک گاڑی گھوم کر سامنے آگئی۔ اس کے ساتھ ہی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

دوسری گاڑی سے ان پر فائرنگ کی گئی تھی اور گولیاں پاچرو کی چھت پر لگی تھیں۔ ایک گولی نائلہ کے سامنے  
 دنگ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی اس کے چہرے سے صرف دو انچ کے فاصلے سے گزر کر کھڑکی کا شیشہ توڑتی  
 ہوئی نکل گئی تھی۔

”نیچے جھک جائیے۔ آپ لوگ نیچے جھک جائیے۔“ دارا چنچا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نہ صرف  
 ایکسپریڈر پوری قوت سے دبا دیا تھا بلکہ بڑی پھرتی سے گاڑی کو بائیں طرف کی گلی میں موڑ دیا تھا۔  
 وہ سب لوگ نیچے جھک گئے۔ دارا پاچرو کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس نے اپنے حواس قائم رکھے تھے۔  
 دوسری گاڑی بھی اسی طرف مڑی تھی۔ اس سے چلائی جانے والی گولیوں نے پاچرو کا پچھلا شیشہ بھی توڑ دیا  
 تھا۔

دلاور نے سیٹ بردے ہوئے پہلو بدلا اور رائفل کی ٹال سیٹ کے اوپر سے نکال کر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس  
 نے فائرنگ نشانہ لے کر نیس کی تھی لیکن نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ پچھلی گاڑی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ دارا بڑی  
 مهارت کا ثبوت دیتے ہوئے پاچرو کو تیز رفتار سے مختلف گلیوں میں گھما رہا تھا اور آخر کار وہ سڑک پر نکل  
 آئے۔ کچھ دیر بعد ان کے تعاقب میں آنے والی گاڑی بھی سڑک پر آگئی۔

دلاور اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ نائلہ بھی اپنی سیٹ پر رخ بدل کر بیٹھ گئی اور وہ بھی رائفل کی ٹال  
 کھڑکی سے نکال کر پچھلی گاڑی پر فائرنگ کرنے لگی تھی۔ دوسری گاڑی اب خاصی پیچھے رہ گئی تھی لیکن اس  
 سے فائرنگ اب بھی مسلسل ہو رہی تھی۔

تقریباً ”آدھے گھنٹے تک دونوں گاڑیاں فائرنگ کرتی ہوئی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہیں اور بالاخر دارا  
 اس گاڑی سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس نے گاڑی کا رخ تھانے کی طرف موڑ دیا تھا۔  
 لیکن ایک موڑ پر اچانک ہی وہ جپ سامنے آگئی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ نائلہ نے جپ کے اسٹیرنگ  
 کے سامنے گامے کو دیکھ لیا تھا۔

نائلہ نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائر کھول دیا۔ جپ کے سامنے والے دونوں ٹائر ایک دھماکے  
 سے برست ہو گئے۔ جپ میں گاما کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں مگر ان  
 میں سے کسی کو بھی رائفل سیدھی کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ تیز رفتار جپ لڑکھڑاتی ہوئی فٹ پاتھ پر  
 چڑھ کر الٹ گئی۔ ان تینوں کی چھین فضا میں ابھری۔

دارا رفتار کم کئے بغیر پاچرو کو دوڑاتا ہوا لے گیا۔ اور پھر پانچ منٹ بعد پاچرو تھانے کے سامنے رک گئی۔  
 نائلہ اور دارا پاچرو میں بیٹھے رہے۔ رائے منصور اور دلاور ’جگو چاچا اور اس کے ساتھی کو پاچرو سے اتار  
 کر دھکیلتے ہوئے تھانے کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ گیٹ پر موجود مسلح سنتری پاچرو کو رکتے دیکھ کر ہی الرٹ  
 ہو گیا تھا اور جب وہ لوگ نیچے اترے تو اس نے رائفل تان لی تھی۔ مگر رائے منصور کو پہچانتے ہی اس نے  
 رائفل نیچے کر لی۔

ایس ایچ او تھانے میں موجود تھا۔ ایک پولیس والا چوری کے الزام میں پکڑ کر لائے جانے والے ایک  
 آدمی کی چھتروں کر رہا تھا۔ رائے منصور اور دلاور ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے کی طرف  
 بڑھ رہے تھے۔ دو تین پولیس والے شور سن کر اس طرف آگئے۔ دلاور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور  
 رائے منصور نے ان دونوں کو دفتر میں دھکیل دیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے، کون ہو تم لو۔“ انسپکٹر کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظر رائے منصور پر پڑ گئی۔ ”اوہ

رائے صاحب، آپ.... ”وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ گیا۔ ”کیا ہوا؟ یہ کون ہیں؟“  
 ”جن کی تمہیں تلاش تھی لیکن تم ابھی تک ان تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔“ رائے  
 منصور نے کہا۔

”کوئی ذکیت؟“ انپکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے رائے منصور کی طرف دیکھا پھر جگو اور اس کے ساتھی  
 کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ جگو ہے انپکٹر، جگو چاچا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”رضیہ کو اس نے قتل کیا تھا۔ اب یہ  
 تمہاری کسندھی میں ہے۔ جب ہم انہیں ان کے اڈے سے اٹھا کر لائے تو انہیں اور ہمیں ختم کرنے کے  
 لیے ایک جیپ سے میری پاجیرو پر فائرنگ کی گئی۔ ہم بڑی مشکل سے انہیں بچا کر لائے ہیں۔ اب انہیں  
 حالات میں کسی کی گولی کا نشانہ نہیں بننا چاہئے اور نہ ہی پولیس مقابلے کا شکار ہونا چاہئے۔ اس پر ذرا سی  
 منت کرو گے تو رضیہ کے قتل کے اعتراف کے علاوہ کچھ اور سنسنی خیز اعترافات بھی کر سکتا ہے۔ کسی پولیس  
 آفیسر نے اتنی بڑی واردات کے کسی ملزم کو اتنی جلدی نہیں پکڑا ہو گا جتنی جلدی تم اس تک پہنچ گئے ہو۔  
 اب اس کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے۔ تھوڑی دیر بعد یا رات کو کسی وقت تمہارے تھانے پر حملہ بھی  
 ہو سکتا ہے۔ ایک بااثر شخصیت کی طرف سے اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ  
 فوری طور پر اپنی اور ان کی حفاظت کا بندوبست کرو۔ اب میں جا رہا ہوں۔ میں نے ایک قانون پسند شہری  
 ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنی ذمہ داری کیسے نبھاتے ہو۔“

رائے منصور، دلاور کو اشارہ کرتا ہوا تیزی سے باہر آگیا۔ وہ جلد سے جلد تھانے سے نکل جانا چاہتا تھا  
 کیونکہ باہر گاڑی میں ٹائلہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر پولیس کو ٹائلہ درانی کے بارے میں پتہ چل گیا تو ان کے لیے  
 کچھ الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس لیے وہ جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ٹائلہ فرنٹ سیٹ سے اتر کر پچھلی سیٹ پر آگئی تھی اور کونے میں دبک کر چادر اس طرح لپیٹ لی تھی کہ  
 اس کا چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ چادر کے اندر اس نے دونوں ہاتھوں میں رائفل سنبھال رکھی تھی۔ جسے وہ  
 بہت ضرورت بڑی آسانی سے استعمال کر سکتی تھی۔ رائے منصور اور دلاور کو تھانے کے گیٹ سے نکلنے دیکھ  
 کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ سنگین الزامات کے تحت پولیس کو مطلوب تھی اور اس وقت پولیس  
 امپلیشن کے سامنے تھی۔ اگر اسے پہچان لیا جاتا یا اس کے بارے میں پتہ چل جاتا تو رائے منصور کے ہوتے  
 ”بھی پولیس اسے ہتھکڑیاں پہنا سکتی تھی۔“

رائے منصور اور دلاور کے بیٹھے ہی دارا نے پاجیرو آگے بڑھا دی۔

”اب کہاں چلنا ہے سرکار۔“ دارا نے گاڑی بائیں طرف کی سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔

”سلطان پور والے مکان پر چلو۔“ رائے منصور نے کہا۔ پھر ٹائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔  
 ”مہرے خیال میں عقیلہ کے ہاں جانا بھی اب تمہارے لیے مناسب نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے اس جیپ نے  
 اس سے ہمارا تعاقب شروع کیا ہو۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ وہ آپ کی نگرانی کرتے ہوئے عقیلہ کے مکان تک پہنچ گئے ہوں گے؟“ ٹائلہ  
 نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”میں نے عقیلہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس بات کا بہت خیال رکھا تھا لیکن اس امکان کو  
 نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ دور رہ کر میرا تعاقب کیا گیا ہو۔“ رائے منصور بولے۔

”میرے خیال میں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ نائلہ بولی۔

”کیوں؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”اگر انہوں نے آپ کا تعاقب کیا ہوتا تو وہ لوگ ہمارے ہوتے ہوئے ہی عقیلہ کے مکان پر بلہ بول چکے ہوتے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”شبیہ درانی کو معلوم ہے کہ میں شہر میں موجود ہوں۔ اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح مجھے پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے راستے میں مجھے آپ کی پاجرو میں دیکھ لیا ہو اور اس طرح وہ ہمارے پیچھے وہاں تک پہنچ گئے۔“

”امکانات تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔“ رائے منصور گہرا سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ”چلو آج سلطان پورہ والے مکان میں رہ لو۔ اگر صورت حال معمول کے مطابق ہوئی تو کل کسی وقت عقیلہ کے ہاں چلی جانا۔ بصورت دیگر اسی مکان میں رہ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

پاجیرو شہر کی مختلف سڑکوں کے چکر کاٹتی ہوئی سلطان پورہ والے مکان کے سامنے رک گئی۔ ہارن بجانے پر اندر سے ایک آدمی نے گیٹ کھول دیا اور دارا پاجیرو کو اندر لیتا چلا گیا اور وہ لوگ پاجیرو سے اتر آئے۔ ”یہ مکان دراصل تمہارے والدہ کی ملکیت تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”میں شروع میں جب رحیم یار خان آیا تھا تو انہوں نے یہ مکان عارضی رہائش کے لیے مجھے دے دیا تھا پھر بعد میں اس مکان کی رجسٹری بھی میرے نام کرادی۔ میں کافی عرصہ اس مکان میں رہا ہوں جب میں نے وہ بنگلہ بنوایا تو یہاں سے شفٹ ہو گیا۔ میرا فشی یہاں رہتا ہے جو شہر میں آڈیٹوں سے حساب کتاب کرتا رہتا ہے۔“

فشی مسافر ایک اڈیٹر عمر آدمی تھا۔ اس کی بیوی اس سے عمر میں بہت چھوٹی تھی۔ وہ لوگ اس وقت سو رہے تھے۔ ان کی آمد پر اس کی بیوی بھی جاگ گئی تھی۔ نائلہ اسے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ بے حد حسین تھی وہ عورت اور نائلہ کے خیال میں اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس ایکس سال رہی ہوگی۔ رحمت ایسی گوری کہ ہاتھ لگانے سے میلے ہونے کا اندیشہ۔ اس کا نام زینت تھا اور وہ میٹرک پاس تھی۔

”زینت!“ رائے منصور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ”اس وقت تم لوگوں کو ہم نے پریشان کیا ہے۔ اب ذرا چائے بھی پلا دو۔“

”پریشانی کیسی جی!“ زینت نے کہا۔ ”نوکر کے گھر میں مالک کے قدم تو بڑے برکت والے ہوتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کے آنے سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آپ لوگ بیٹھئے۔“

مسافر نے ان کے لیے بیٹھک کھول دی۔ یہ مکان چار کمروں پر مشتمل تھا۔ رائے منصور نے مسافر کو جب بتایا کہ وہ لوگ رات بیس رہیں گے تو وہ فوراً ”ہی دوسرے دو گھرے ٹھیک کرنے لگا تھا۔ اس دوران زینت چائے لے آئی۔

”زینت بیٹی۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”یہ نائلہ ہے اور یہ دلاور۔“ اس نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ ”میں تو صبح چلا جاؤں گا مگر یہ دونوں کچھ دن بیس رہیں گے۔ ان کے آرام کا خیال رکھنا۔“

”کیوں نہیں جی۔“ زینت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پروہنے تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔“

چائے پینے کے بعد وہ لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر رائے منصور اور نائلہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ دلاور اور دارا بیٹھک ہی میں بیچھے ہوئے تخت پر لیٹ گئے تھے۔

نائلہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی دیر تک موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتی رہی۔ اسے بہر حال اس بات

کی خوشی تھی کہ انہوں نے رضیہ کے قاتل کو قانون کے حوالے کر دیا تھا اور رضیہ کا قاتل شبیر درانی کا آدمی تھا۔ جگمو کو پولیس کے حوالے کر کے اس نے گویا شبیر درانی کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ شبیر درانی کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا۔ اور اس نے ان کی پاجیرو پر حملہ کر کے جگمو اور انہیں بھی مروانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچ نکلے تھے۔ نائلہ کو یقین تھا کہ شبیر درانی انسپکٹر کو رشوت کی پیشکش کرے گا یا تو جگمو کو چھڑانے کی کوشش کرے گا اور یا اسے مروانے کی۔ مگر نائلہ جانتی تھی کہ پولیس انسپکٹر کو رشوت قبول نہیں کرے گا کیونکہ جگمو کو رائے منصور نے اس کے حوالے کیا تھا اور ساتھ ہی واضح الفاظ میں وارننگ بھی دے دی تھی کہ جگمو کی حفاظت اب اس کی ذمہ داری ہے۔ انسپکٹر رائے منصور کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے نائلہ کو یقین تھا کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جس سے اس کی اپنی گردن پھسنے کا اندیشہ ہو۔

نائلہ اگرچہ بے حد تھکی ہوئی تھی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آسمان پر چاند روشن تھا اور بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ چاند کبھی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی فضا میں چاندی بکھیرنے لگتا۔ نائلہ نے دونوں کنٹیناں کھڑکی کی چوکھٹ پر لٹالیں اور دلچسپ نظروں سے چاند اور بادلوں کی آنکھ بھولی کا یہ کھیل دیکھنے لگی۔



شبیر درانی کو پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کل جب نائلہ، گامے کی جیب چھین کر فرار ہوئی تھی تو اس کی تلاش میں ناکامی کے بعد موجمدار نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ دو روز پہلے نائلہ کی رائے منصور سے اس علاقے کے کس مکان میں ملاقات ہوئی تھی اور پھر کل رات ہی موجمدار نے دو آدمیوں کے ساتھ اس مکان پر ہلہ بول دیا تھا۔ نائلہ تو وہاں نہیں لی تھی البتہ ایک آدمی ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ موجمدار اور اس کے آدمی اس سے نائلہ کا پتہ دریافت کرتے رہے تھے۔ اس شخص نے اذیتیں اٹھا کر جان تو دے دی تھی مگر نائلہ کا پتہ نہیں بتایا تھا۔

پونے بارہ بجے جب شبیر درانی سونے کے لیے بستر پر لیٹ چکا تھا تو موجمدار دروازہ کھٹکھٹا کر جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے میں آ گیا۔

”کیا بات ہے۔ اب تم مجھے سونے بھی نہیں دو گے۔“ شبیر درانی نے کہا اس کے لمبے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”گاما آیا ہے سرکار۔ اس نے نائلہ کا پتہ لگایا ہے۔“ موجمدار نے کہا۔

”بلاؤ اسے۔“ شبیر درانی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ایک منٹ بعد گاما اس کے سامنے موجود تھا۔

”ہاں بتاؤ... کہاں دیکھا ہے تم نے نائلہ کو؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”میں ایک ریسٹورنٹ سے نکل کر جیب میں بیٹھ رہا تھا کہ سامنے سے رائے منصور کی پاجیرو گزرتی ہوئی نظر آئی۔ پچھلی سیٹ پر رائے منصور کے ساتھ نائلہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ دلاور بھی تھا جو اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جیب پر پاجیرو کا پیچھا شروع کر دیا۔ ان کی پاجیرو کچی آبادی کے باہر سڑک پر رکی تھی۔ رائے منصور تو گاڑی ہی کے قریب کھڑا رہا جبکہ نائلہ، دلاور اور ڈرائیور بستی کی ایک گلی میں چلے گئے۔ ان

تینوں کے پاس رائٹس تھیں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ جگو چاچا کے احاطے کی طرف گئے ہیں۔“ گاما نے بتایا۔  
 ”جگو چلا گیا یا نہیں؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”نہیں سرکار۔“ گامے نے جواب دیا۔ ”دس بجے کے قریب چوک پر اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کل صبح چلا جائے گا فی الحال یہاں ابھی اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“  
 ”بہت ہی کمینہ آدی ہے وہ۔“ شبیر درانی دھاڑا۔ ”موجمدار! چتنے بھی آدی موجود ہیں انہیں لے کر فوراً جگو کے اکھاڑے پر پہنچ جاؤ۔ اور ختم کرو ان سب کو... کسی کو بھی زندہ نہیں بچتا چاہئے۔“  
 ”یہاں تو اس وقت صرف بھولا ہے سرکار یا میں ہوں۔“ موجمدار نے جواب دیا۔  
 ”جو بھی ہے لے جاؤ... دیر مت کرو بابا... جاؤ۔“ شبیر درانی چیخا۔

”جی سرکار۔“ موجمدار اور گاما باہر بھاگ گئے۔ ہنگلے سے باہر آکر انہوں نے بھولا کو ساتھ لیا اور جیپ پر سوار ہو گئے۔ گاما نے انجن اشارت کر کے جیپ کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔  
 جیپ تیز رفتاری سے مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ انہیں کچی آبادی تک پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ جیپ جیسے ہی آخری موڑ پر گھومی گاما چیخا۔  
 ”وہ... رائے منصور کی گاڑی ہے۔ وہ جا رہے ہیں۔“

موجمدار اور بھولے نے ایک دم فائر کھول دیا۔ اس دوران جیپ کے ایک اگلے پہلے کے نیچے کوئی پتھر آگیا تھا جس سے جیپ ذرا سی اچھلی تھی۔ اگر جیپ نہ اچھلتی تو ان کی رائٹسوں سے نکلی ہوئی گولیاں نشانے پر بیٹھتیں۔ فائرنگ ہوتے ہی پاجیرو تیزی سے بائیں طرف کی گلی میں مڑ گئی۔  
 گاما نے بھی جیپ اسی طرف گھمادی۔ اس وقت پاجیرو ایک اور گلی کا موڑ گھوم رہی تھی۔ بھولا اور موجمدار نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن اب پاجیرو سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔  
 دونوں گاڑیاں آدھے گھنٹے تک ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی رہیں۔ پاجیرو سے فائرنگ کی وجہ سے ان میں فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ ایک بات موجمدار نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ پاجیرو سے انہیں فائرنگ کا نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی جا رہی تھی بلکہ شاید یہ کوشش کی جا رہی تھی کہ فائرنگ کے ذریعے انہیں پاجیرو سے دور ہی رکھا جائے۔ وہ کھلی جیپ میں تھے اور انہیں نشانہ بنانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

پاجیرو غائب ہو گئی۔ گاما جیپ کو مختلف گلیوں میں گھماتا رہا اور بالا خرچ جب جیپ سڑک پر آئی تو سامنے ایک موڑ پر پاجیرو بھی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ موجمدار اور بھولا رائٹس سیدھی کرتے پاجیرو سے زبردست فائرنگ کی گئی۔ جیپ کے اگلے دونوں ٹائر زبردست دھماکے سے پھٹ گئے۔ جیپ بے قابو ہو گئی۔ گاما نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور جیپ فٹ پاتھ سے ٹکرا کر الٹ گئی۔

وہ تینوں بیک وقت چیخ اٹھے۔ موجمدار اور بھولا کو تو معمولی چوٹیں آئی تھیں مگر گاما کی دونوں ٹانگیں جیپ کے نیچے دب گئی تھیں۔ موجمدار اور بھولا کچھ دیر تک اپنی چوٹیں سہلاتے رہے پھر گامے کو جیپ کے نیچے سے کھینچنے کی کوشش کرنے لگے مگر گاما باری طرح چیخ رہا تھا۔ ”غالبا“ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔  
 اگر ویسے یہ حادثہ ہوا ہوتا تو جیپ کے اٹنے اور ان کی چیخوں کی آوازیں سن کر بہت سے لوگ گھروں سے نکل کر ان کی مدد کو پہنچ چکے ہوتے مگر ان کی چیخوں سے پہلے زبردست فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ اس لیے قرب و جوار کے گھروں میں سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا تھا۔

گاما اب بھی بری طرح چیخ رہا تھا۔ موجمدار اور بھولانے جیب کو پوری قوت سے اوپر اٹھایا۔ بھاری جیب صرف چند انچ ہی اوپر اٹھ سکی تھی۔

”نکالو... اپنی ٹانگ باہر نکالو۔“ موجمدار چیخا۔  
”میری ہڈی ٹوٹ گئی ہے... ٹانگ کو ہلا بھی نہیں سکتا...“ گامانے اپنی چیخ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کوشش کرو بابا۔ جلدی کرو اگر پولیس آگئی تو ہم تینوں دھڑلے جائیں گے۔ ہمت کرو... ٹانگ کو باہر کھینچو۔“ موجمدار نے کہا۔

گاما آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف مٹھنے لگا اور بالا خروہ اپنی دونوں ٹانگیں جیب کے نیچے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بری طرح چیخ اٹھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں ٹانگ کی پندلی تھام لی تھی۔

”چل سکتے ہو؟“ بھولا اسے سارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”میری ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور تم کہتے ہو چل سکتا ہوں۔“ گامانے جواب دیا۔

بھولانے اپنی اور گاما کی رائفل کندھوں پر لٹکالی۔ ایک طرف سے بھولانے اور دوسری طرف سے موجمدار نے گاما کو سارا دے کر اٹھایا اور وہ اسے تقریباً ”ٹھہینے ہوئے ایک گلی میں دوڑنے لگے۔ گاما بری طرح کراہ رہا تھا۔ تین چار گلیوں میں گھومنے کے بعد وہ ایک سنیما کے قریب پہنچ گئے۔ موجمدار انہیں گلی کے کونے میں چھوڑ کر سنیما کے سامنے کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی لے آیا۔ انہوں نے گاما کو اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ موجمدار نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں تھمادیا۔

”اے سرکاری ہسپتال پہنچا دو... کہنا سڑک کے کنارے پڑا تھا تم اسے اٹھا کر لے آئے۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“ موجمدار نے کہا۔

پچاس کا نوٹ دیکھ کر ڈرائیور نے گردن ہلا دی تھی۔ موجمدار نے راستے میں گاما کو سمجھادیا تھا کہ ہسپتال میں اسے کیا کمائی سنانا ہوگی۔ ٹیکسی جیسے ہی حرکت میں آئی تو وہ سڑک پار کر کے ایک گلی میں داخل ہو گئے اور گلیوں ہی گلیوں میں چلتے ہوئے آدھے گھنٹے بعد شبیر درانی کے بنگلے پر پہنچ گئے۔

ان کی ناکامی کی داستان سن کر شبیر درانی پر ایک بار پھر پاگل پن کا دورہ پڑا اور وہ بری طرح چیخنے لگا۔ اس کے منہ سے مغلطات کا گڑا مل رہا تھا۔

”کس طرف گئے تھے وہ؟“ اس نے چیختے ہوئے پوچھا۔

”تھانے کی طرف۔“ موجمدار نے جواب دیا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ جگہ کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”جی سرکار۔“ موجمدار بولا۔ ”جب ہم ان کی گاڑی کا پیچھا کر رہے تھے تو میں نے پچھلی سیٹ پر جگہ کو دیکھ لیا تھا ہم نے انہیں ختم کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر راتے منصور کا ڈرائیور بڑا پھرتلا آدمی ہے۔ وہ گاڑی کو طوفان کی طرح بھگا رہا تھا اور پھر وہ لوگ فائرنگ بھی کر رہے تھے۔“

”اور تم لوگ شاید پیدل اور خالی ہاتھ تھے۔“ شبیر درانی دبا ڈالا۔

”ہم نے انہیں گھیر لیا تھا سرکار! لیکن ہماری جیب کے دونوں ٹائزیرسٹ ہو گئے جس سے جیب الٹ گئی۔ اگر جیب کے ٹائزیرسٹ نہ ہوتے تو ہم انہیں کبھی بھی نہ نکلنے دیتے۔“ موجمدار بولا۔



”تم اپنی جان چھڑانے کے لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہو۔ جگمو اگر پولیس تک پہنچ گیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”کچھ بھی نہیں ہو گا سرکار۔“ موجددار نے جواب دیا۔ ”جگمو بھروسے کا آدمی ہے وہ اپنی جان دے دے گا مگر ہمارا نام اس کی زبان پر نہیں آئے گا۔“

”تم اس پولیس انسپکٹر کو نہیں جانتے۔ اس روز رضیہ کے معاملے میں اس نے میری ایک بات نہیں مانی تھی۔ میں نے اسے لالچ بھی دیا اور دھمکا یا بھی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کچھ کرو موجددار۔۔۔ کچھ کرو۔“ شبیر درانی پر شدید جھنجھلاہٹ طاری تھی۔

”آپ ایک دفعہ اس پولیس انسپکٹر سے بات کر لیں۔ اگر وہ شرافت سے مان جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں گے۔“ موجددار بولا۔

”یہی کرنا پڑے گا۔ تم میرے ساتھ چلو۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”تم گاڑی نکالو۔ میں آ رہا ہوں۔“ موجددار اور بھولا باہر نکل گئے۔ شبیر درانی نے لباس تبدیل کیا۔ کوٹ پہنا، کچھ چیزیں میز کی دراز سے نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈالیں اور باہر آگیا۔

موجددار نے سفید ٹیوٹا نکال لی تھی۔ یہ ٹیوٹا عام طور پر شبیر کی ماں حسینہ بیگم کے استعمال میں رہتی تھی۔ شبیر درانی کی جیب اور پاجیرو کو ٹائلہ نے برباد کر دیا تھا۔ وہ دونوں گاڑیاں درکشاپ میں تھیں اور شبیر نے کل ہی یہ گاڑی گل مرگ سے منگوائی تھی۔ کیونکہ حسینہ بیگم آج کل گل مرگ ہی میں رہ رہی تھی۔ شبیر درانی کو آتے دیکھ کر موجددار نے پیئرز سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور اس کے بیٹھنے کے بعد اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ انجن اشارت کیا اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ بارہ بج چکے تھے۔ شہر کی سڑکوں پر ٹریفک برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ انہیں متعلقہ تھانے تک پہنچنے میں بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ موجددار گاڑی میں بیٹھا رہ گیا اور شبیر درانی نیچے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا جو بند تھا۔ اس نے جھوٹے دروازے کو دھکا دیا جو چرچر اہٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا کھل گیا۔ گیٹ کے اندر کی طرف دو مسلح کانسٹیبل کھڑے تھے۔ شبیر درانی دو کانسٹیبلوں کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ تھانے کے گیٹ پر عام طور پر ایک ہی کانسٹیبل ہوتا تھا۔ دو مسلح کانسٹیبل یہ آمدے میں بھی ٹھہر رہے تھے۔ شبیر درانی نے اوپر دیکھا۔ اسے عمارت کی چھت پر بھی دو کانسٹیبل نظر آئے تھے۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے دونوں کانسٹیبلوں نے اسے سلام کیا اور ایک طرف ہٹ گئے۔

”انسپکٹر صاحب بیٹھے ہیں؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”جی جناب۔“ ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔

شبیر درانی ایس ایچ او کے دفتر میں آگیا جہاں دو سب انسپکٹر اور ایک اے ایس آئی بھی موجود تھا۔

”آئیے درانی صاحب!“ انسپکٹر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ”کئے اس وقت کیسے زحمت فرمائی۔“

”زحمت کیا بابا، تھانہ پکری تو ہم جیسے لوگوں کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی آپ جیسے لوگوں سے

ملنے ملاتے رہنا چاہئے۔“ شبیر درانی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ابھی پرسوں ہی تو آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔“ انسپکٹر بولا۔ ”بہر حال، خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے یاد

رکھا۔ کئے کیسے زحمت فرمائی؟“

شبیر درانی نے کچھ کہنے کی بجائے دونوں سب انسپکٹروں اور اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر نے

انہیں اشارہ کیا وہ تینوں اٹھ کر باہر چلے گئے۔ شبیر درانی نے جیب سے چیک بک نکالی۔ ایک چیک پر دستخط کئے اور رقم کا اندراج کئے بغیر چیک پھاڑ کر انپکٹر کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

”اس بلیٹنک چیک پر جتنی رقم چاہو بھر سکتے ہو انپکٹر!“

”کیا میں اس عنایت کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ انپکٹر نے چیک کی طرف دیکھے بغیر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میرے اس آدمی کو چھوڑ دو جسے کچھ دیر پہلے یہاں لایا گیا ہے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”اگر آپ کی مراد جگو پہلوان سے ہے تو میں اس سلسلے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکوں گا۔ جگو کو رضیہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اور بات بہت اوپر تک پہنچ چکی ہے۔ ڈی ایس پی صاحب اس کیس میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہے ہیں۔ سوری درانی صاحب!“

”ارے بابا اس میں سے کچھ ڈی ایس پی کو دو گے تو اس کی دلچسپی بھی ختم ہو جائے گی۔“ شبیر درانی نے میز پر رکھے ہوئے چیک کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں درانی صاحب۔“ انپکٹر مسکرایا۔ ”ڈی ایس پی صاحب ایسے آدمی نہیں ہیں۔ آپ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جگو چاچا جیسے شخص سے آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”وہ ایک غریب آدمی ہے اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ کسی کو تو اس کی مدد کے لیے آگے آنا ہی تھا۔“

”یہی الفاظ آپ نے رضیہ کے بارے میں بھی کہے تھے اور رضیہ کو یہاں سے نکلنے ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جس شخص کو رضیہ کے قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے اس کے بارے میں بھی آپ وہی الفاظ دہرا رہے ہیں لیکن یقین کر لیجئے درانی صاحب کہ جگو چاچا کسی کے ہاتھوں قتل نہیں ہو سکے گا۔“ انپکٹر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو تم انپکٹر؟“ شبیر درانی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

”میرا مطلب یہ تھا کہ ہم نے جگو کی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ بھی لگا چکے ہوں گے۔“ انپکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”انپکٹر!“ شبیر درانی نے اسے گھورا۔ ”میں مالی اور قانونی طور پر تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا لیکن شاید تمہیں نہ تو گھر آئی ہوئی دولت سے کچھ لگاؤ ہے اور نہ ہی اپنے عہدے میں ترقی سے کوئی دلچسپی؟“

”قانونی مدد!“ انپکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ قتل کے ایک ملزم کو یہاں سے لے جانے کی کوشش کر کے میری کیا قانونی مدد کرنا چاہتے ہیں؟“

”آپ کو شاید یہ علم نہیں کہ جگو کو یہاں لانے والی وہ عورت ہے جو کئی آدمیوں کے قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”ذرا اپنے الفاظ کی وضاحت کیجئے۔“ انپکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جگو کو یہاں لانے والی ناکہ درانی تھی۔ اس کی گرفتاری آپ کے عہدے میں ترقی کے لیے بیڑھی کا کام دے سکتی ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”کیا آپ مجھے پاگل سمجھتے ہیں درانی صاحب؟ کیا میں مرد اور عورت میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ جگو کو یہاں لانے والی کوئی عورت نہیں، دو مرد تھے۔ میری اور آپ کی طرح... قد آور... مونچھوں

والے... ”انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ شبیر درانی میز پر پڑا ہوا چیک اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مک مکا کسی دوسرے طریقے ہی سے کرنا ہوگا۔ لیکن تم ایک بات ذہن میں رکھنا انسپکٹر۔ میرا نام شبیر درانی ہے۔ تم نے میرے آدمی کو ایک جھوٹے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ میں تمہیں کورٹ سے چیلنج کر دوں گا۔“

”بڑے شوق سے۔“ انسپکٹر کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”لیکن ایک بات آپ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ میں نہ تو انسپکٹر اعظم ہوں اور نہ انسپکٹر جبار۔ میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں اور مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں درانی صاحب۔“ انسپکٹر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

شبیر درانی بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا وہ چند لمحوں کے گھورتا رہا پھر اس سے ہاتھ ملائے بغیر دفتر سے باہر نکل گیا۔

وہ گیٹ سے نکل کر جیسے ہی اپنی کار کی طرف بڑھا پولیس کی ایک گاڑی وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے ایک درجن مسلح پولیس کا نشیبل بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اے ایس آئی گاڑی سے اتر کر شبیر درانی کی طرف دیکھتا ہوا اٹھانے کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ شبیر درانی اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید جھنجھلاہٹ تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ پولیس کی اس گاڑی کی آمد بھی جگہ کے لیے ان حفاظتی انتظامات کا ایک حصہ تھی جس کی جھلک وہ تھانے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور انسپکٹر نے بھی اس کا خاص طور سے ذکر کیا تھا۔ اس کے کار میں بیٹھے ہی موجمدار نے انجمن اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”انسپکٹر کیا بولتا ہے سرکار؟“ موجمدار نے پوچھا۔

”بولتا ہے“ اس کا داغ درست نہیں ہے۔ اسے ٹھکانے پر لانا ہی پڑے گا۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”ابھی تو بہت رات پڑی ہے سرکار، اگر آپ کہیں تو آج ہی رات اس کے دماغ کا آپریشن کر دیا جائے۔“ موجمدار نے کہا۔

”نہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میری الحال ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دیکھ رہے ہو یہاں پولیس کی کتنی نفرت ہے۔ چھت پر بھی مسلح پولیس والے موجود ہیں۔ ہم فی الحال کچھ نہیں کر سکتے لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جگہ پولیس کو بیان کیا دیتا ہے؟“

”اس کی چڑی ادھیڑ دی جائے تو بھی آپ کا نام اس کی زبان پر نہیں آئے گا سرکار۔“ موجمدار نے کہا۔

”پھر بھی اس کا بیان معلوم ہونا ضروری ہے۔ وہ پولیس والا کون ہے جس نے اس رات تمہیں رضیہ کی تھانے میں موجودگی کے بارے میں اطلاع دی تھی؟“

”وہ بھی ڈیوٹی پر ہی ہو گا سرکار۔“ موجمدار نے جواب دیا۔

”تو پھر اس وقت تو اس سے بات نہیں ہو سکے گی جبکہ اس وقت تھانے میں کسی ایسے آدمی کی موجودگی ضروری ہے جو ہمیں صورتحال سے آگاہ کر سکے۔“ شبیر درانی بولا۔

”یہ بندوبست ہو جائے گا سرکار۔ آپ بنگلے پر تو پہنچئے۔ میں اس کا بندوبست بھی کر لیتا ہوں۔“

موجمدار نے کہتے ہوئے کار کی رفتار بڑھا دی۔

شبیر درانی کو بنگلے پر چھوڑنے کے بعد موجمدار تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر کار کو آگے بڑھا لے گیا۔

اس وقت ایک بچہ کر دس منٹ ہوئے تھے۔ شبیر درانی اپنے کمرے میں جانے کی بجائے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ موجددار کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک عورت کو دیکھ کر شبیر درانی کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چہرے ہی سے حرافہ اور بد چلن قسم کی عورت نظر آرہی تھی۔ موجددار پتہ نہیں اسے کہاں سے اٹھالایا تھا۔

”یہ کون ہے؟ اسے کیوں لائے ہو یہاں؟“ شبیر درانی نے اسے گھورا۔  
 ”اس کا کمال آپ کو ابھی دکھاتا ہوں سرکار۔“ موجددار نے کہتے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا اور جیسے ہی ریسیور پر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اس نے ریسیور قریب کھڑی ہوئی اس عورت کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شاید راستے میں اس عورت کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

”ہیلو پولیس اسٹیشن؟“ اس عورت نے ریسیور پر دو مہری طرف کی آواز سنتے ہی کہا۔ ”جی دیکھئے مجھے کانٹیل کریم سے بات کرنی ہے۔ جی ایمر جنسی ہی کہہ لیں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ تقریباً ایک منٹ بعد پھر بولی۔ ”ہیلو... کریم بھائی۔ میں بول رہی ہوں آپ کی پڑوسن... جی خیریت ہی نہیں ہے۔ آپ کی بیوی اس وقت ہسپتال میں ہے۔ اس کی حالت تشویش ناک ہے۔ پتہ نہیں اچانک ہی اس کی طبیعت خراب ہوئی اور پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو مرتبہ خون کی تے ہو گئی۔ جی ہاں ایک پڑوسن کی حیثیت سے آپ کو اطلاع دیتا میرا فرض تھا۔ آپ سرکاری ہسپتال پہنچ جائیے۔ جی ہاں... جی ہاں... آپ جلدی پہنچ جائیے۔“  
 اس عورت نے فون بند کر دیا اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے شبیر درانی کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ سب کیا ہے بابا؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ وہ ابھی ہوئی نگاہوں سے موجددار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کانٹیل کریم کو تھانے سے بلانے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں تھا سرکار۔“ موجددار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اب میں سرکاری ہسپتال جا رہا ہوں کانٹیل کریم کو ہسپتال کے گیٹ پر ہی مل لوں گا۔“

”اسے کہاں سے لائے ہو؟“ شبیر درانی اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”بہت کام کی چیز ہے سرکار یہ۔“ موجددار کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”اگر آپ کہیں تو اسے بعد میں چھوڑ آؤں گا۔ پہلے کانٹیل کریم سے مل آؤں۔“

”ٹھیک ہے۔ چھوڑ جاؤ۔“ شبیر درانی نے لا پر دہی کے انداز میں کہا۔  
 موجددار معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا باہر نکل گیا اور وہ عورت بھی مسکراتی ہوئی شبیر درانی کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

موجددار ٹیوٹا کو تیز رفتاری سے چلاتا ہوا صرف دس منٹ میں سرکاری ہسپتال کے سامنے پہنچ گیا۔ ہسپتال کے سامنے ایک دو ہوٹل اور دو تین میڈیکل اسٹور کھلے تھے۔ موجددار نے کار گیٹ سے چند گز کے فاصلے پر روک لی اور انجن بند کر کے اسٹیمرنگ کے سامنے ہی بیٹھا رہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد اسے ایک پولیس والا سائیکل پر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہسپتال کا بڑا گیٹ بند تھا۔ چھوٹے گیٹ سے اترنے کے لیے اسے سائیکل سے اترنا پڑا۔ گیٹ پر چلنے والی تیز روشنی میں موجددار نے اسے پہچان لیا۔ وہ کانٹیل کریم تھا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کریم خان...“ موجددار نے اسے آواز دی۔

کانٹیل کریم نے مڑ کر کار کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی موجددار کو پہچان لیا تھا۔ وہ گیٹ کے قریب ہی سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر کے کار کے قریب آگیا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کریم خان۔ تمہاری بیوی کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ فون تمہیں تھانے سے بلانے کے لیے کیا گیا تھا۔“ موجددار نے اس کے قریب آتے ہی کہا۔

”اوہ!“ کانٹیل کریم نے سر سے ٹوپی اتار کر پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تو بالکل ہی بدحواس ہو گیا تھا۔“

”ایک کام ہے بابا۔“ موجددار نے کہا۔ ”تمہیں تھانے میں رہ کر یہ معلوم کرنا ہے کہ جگمو پولیس کو کیا بیان دیتا ہے۔ کوشش کرنا کہ جب اس سے پوچھ گچھ کی جائے تو تم اس کے قریب ہی رہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ کریم نے کہا۔ ”ڈی ایس پی صاحب کو جگمو کی گرفتاری کی اطلاع دی گئی ہے۔ ان کے آنے پر جگمو اور اس کے ساتھی سے پوچھ گچھ شروع کی جائے گی۔ میں صبح فون کر کے تمہیں بتا دوں گا۔“

”لو... یہ رکھ لو۔“ موجددار نے جیب سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ واپس بنگلے پر آگیا اس وقت تین بج رہے تھے۔ موجددار صوفے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔

دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ موجددار نے جمائی لیتے ہوئے بیڈروم کی طرف دیکھا۔ اس لمحہ فون کی تھنٹی بجی۔ اس نے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ وہ کانٹیل کریم کی کال تھی۔ موجددار اس بات کی بات سنتا رہا پھر اس طرح اچلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے ریسیور بچ دیا اور دوڑتا ہوا شبیر درانی کے بیڈروم میں گھس گیا۔ اس نے بڑے محتاط انداز میں شبیر درانی کو جگا کرتایا ”جگمو چا چانے رضیہ کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے اور کچھ اور انکشافات بھی کئے ہیں۔“

”کیا انکشافات کئے ہیں؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”کئی وارداتیں قبول لینے کے علاوہ جگمو نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ نائلہ درانی کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے پولیس وین پر نائلہ کے آدمیوں نے نہیں، اس نے کسی کے کہنے پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا تھا۔“ موجددار نے بتایا۔

”کیا؟“ شبیر درانی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس کے ذہن پر طاری نیند کا خمار ہرن ہو گیا تھا۔

...●...●...●...

نائلہ درانی کو یہ اطلاع بھی رائے منصور ہی کے توسط سے ملی تھی۔ لیکن اس مرتبہ وہ خود نہیں آئے تھے بلکہ گاؤں سے ان کا ایک آدمی آیا تھا۔ وہ ایک عام سا مزارع تھا اور اگر شبیر درانی کے آدمیوں کی نظروں میں بھی آیا ہو گا تو اس پر توجہ نہیں دی ہوگی۔ لیکن یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس مزارع کے پاس ایک بہت ہی اہم اطلاع تھی اور وہ گاؤں سے نکل کر شہر کی روشنیاں دیکھنے نہیں آیا تھا بلکہ وہ اہم اطلاع نائلہ درانی تک پہنچانے کے لئے آیا تھا۔

وہ شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا رائے منصور کے منشی صفدر کے مکان پر پہنچا تو دوپہر کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ دستک کے جواب میں دروازہ نائلہ درانی نے کھولا تھا۔ نائلہ نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ حنیفہ کا باپ احمد دین تھا۔

”سلام نائلہ بی بی۔“ احمد دین نے سلام کیا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں چاچا۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”حنیفہ کیسی ہے اور چاچی کی طبیعت اب کیسی ہے۔ جب میں حویلی سے گئی تھی تو اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“

”ٹھنڈ کا اثر ہو گیا تھا۔ اب تو وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور یہ.....“ احمد دین نے خاموش ہو کر پہلے کھیس اتارا۔ پھر قیض کے بن کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور قیض کے اندر پنے ہوئے شلوکا کی اندر کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ خط رائے صاحب نے دیا ہے جی۔ اور زبانی طور پر بھی کہا تھا کہ میں آپ کو مبارک باد دے دوں۔“

”خیر مبارک چاچا۔ لیکن مبارک باد کس بات کی؟“ نائلہ کہتے ہوئے لفافہ چاک کرنے لگی۔ احمد دین کی باتوں سے یقین ہو گیا تھا کہ اس لفافے میں اس کے لئے کوئی خوشخبری موجود تھی۔

”سب کچھ اس خط میں لکھا ہے نائلہ بی بی۔ آپ خود ہی پڑھ لیجئے۔“ احمد دین نے جواب دیا۔

نائیلہ نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگی۔ وہ جیسے جیسے خط پڑھتی جا رہی تھی اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ سرخ ہوتے ہوئے رخساروں پر ہلکی سی پیش محسوس ہونے لگی۔

”نائیلہ بی بی۔“

یہ خوشخبری سنانے کے لئے مجھے خود آنا چاہئے تھا۔ لیکن گاؤں میں ایک دو ایسے کام آن پڑے ہیں کہ کم از کم آج کا دن میرا یہاں رکنا بہت ضروری ہے۔

آج صبح چھ بجے تھانے سے انسپکٹر کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈی ایس پی کی موجودگی میں ابتدائی پوچھ گچھ کے دوران جگہو نے نہ صرف رضیہ کی قتل کا اعتراف کر لیا ہے بلکہ اس نے بہت سی ڈکیتیوں اور قتل کی وارداتوں کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے اور یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ نائلہ درانی کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے پولیس دین پر گھات لگا کر حملہ نائلہ درانی کے آدمیوں نے نہیں اس نے اپنے چند آدمیوں کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ اس منصوبے میں انسپکٹر اعظم بھی شریک تھا۔ دین کی جیل سے روانگی کے وقت اور اس کے روٹ کے بارے میں اطلاعات انسپکٹر اعظم ہی نے فراہم کی تھیں اور اسے (جگہو کو) خاص طور پر یہ ہدایت کی گئی تھی کہ پولیس دین کے خلاف کارروائی کے دوران جتنے بھی آدمی مارے جائیں اس کی پروا نہ کی جائے البتہ نائلہ درانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ اسے صحیح سلامت پولیس کی حراست سے نکال کر شہر سے باہر اینٹوں کے ویران بھٹے کے قریب کچھ اور لوگوں کے حوالے کر دیا جائے جو پہلے سے وہاں ان کے منتظر ہوں گے۔ نائلہ کو ان کے حوالے کرنے کے بعد واردات میں استعمال ہونے والی گاڑی بھٹے سے کچھ دور واقع پرانے کنوئیں میں پھینک دی جائے۔

نائیلہ بی بی! انسپکٹر اور ڈی ایس پی کی موجودگی میں دیا جانے والا جگہو کا یہ بیان ہمارے لئے پھر اہمیت رکھتا ہے سمجھو کہ تمہاری مصیبت کے دن ختم ہونے ہی والے ہیں۔ جگہو کا چالان مکمل کر کے کل اسے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ ہمارے وکیل صاحب بھی آج شام تک ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ آج ہی رات یا کل صبح سویرے رحیم یار خان پہنچ جاؤں۔ عدالت میں جگہو کے بیان کے فوراً ہی بعد تمہاری بریت کی درخواست بھی عدالت میں پیش کر دی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان تلمذہ ترین واقعات اور جگہو کے بیان کی روشنی میں عدالت سے تمہیں بریت مل جائے گی اور پھر ہم ہر لحاظ سے آزاد ہوگی۔

ایک اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ گزشتہ رات جب ہم نے جگہو اور اس کے ساتھی کو پولیس کے

حوالے کیا تھا تو اس کے تھوڑی دیر بعد شبیر درانی بھی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا تھا اور اس نے انسپٹر کو اپنا دستخط شدہ بلیٹک چیک دے کر جگہ کو چھڑانے کی کوشش کی تھی لیکن انسپٹر نے اسے جگہ سے ملاقات تک کی اجازت نہیں دی۔ اس نے انسپٹر کو یہ ترغیب بھی دی تھی کہ جگہ کو پکڑ کر یہاں لانے والی نالہ درانی تھی اور اگر وہ چاہے تو رائے منصور پر دباؤ ڈال کر نالہ درانی کو حراست میں لے سکتا ہے لیکن انسپٹر نے اس کی یہ بات بھی تسلیم نہیں کی اور شبیر درانی اسے برے نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا اور جب رات کے آخر پہرڑی ایس پی کی موجودگی میں جگہ سے باز پرس کی گئی تو صورتحال ہی بدل گئی۔ جگہ نے اگرچہ پولیس وین پر بھی حملے کا اعتراف کر لیا ہے لیکن اس شخص کا نام نہیں بتایا جس کے کہنے پر یہ کارروائی کی گئی تھی۔

بہر حال، ایک اور شخص مرحلہ باقی رہ گیا ہے۔ جگہ کو چالان کل عدالت میں پیش کر کے اس کا بیان بھی مجسٹریٹ کے سامنے ریکارڈ کروادیا جائے گا اور ممکن ہے مزید تفتیش کے لئے پولیس عدالت سے اس کا ریمانڈ بھی حاصل کر لے اور اللہ نے چاہا تو یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہو جائے گا۔ میں اگر آج رات نہ آسکا تو کل صبح سویرے ضرور پہنچ جاؤں گا۔

خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔“

رائے منصور کا یہ خط ایسا ہی تھا جیسے تختہ دار پر کھڑے ہوئے کسی شخص کو اچانک ہی یہ مژدہ سنا دیا جائے کہ اس کی موت کی سزا معاف کر دی گئی ہے۔ رائے صاحب نے ٹھیک ہی لکھا تھا۔ اس کی مصیبتوں کے دن ختم ہونے والے تھے۔ عدالت میں جگہ کے بیان کے بعد اس کی طرف سے بریت کی درخواست دیدی جائے گی اور اس درخواست کا فیصلہ ہوتے ہی اسے قانونی الجھنوں سے نجات مل جائے گی۔ لیکن اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ رائے منصور نے شاید اس تصویر کے دوسرے رخ کا جائزہ نہیں لیا تھا اور اگر تصویر کے اس دوسرے رخ کا جائزہ لیا بھی تھا تو نالہ کو اس خط میں اس کے بارے میں آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا، لیکن نالہ کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اگر جگہ عدالت میں اپنے پہلے بیان سے منحرف ہو گیا تو.....

بات پھر وہیں پہنچ جائے گی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ پولیس سے ایک بار پھر اس کی آنکھ مچولی شروع ہو جائے گی اور وہ مجرموں کی طرح جھپٹی پھرے گی۔ ایک اور اندیشہ بھی اس کے ذہن میں سر ابھار رہا تھا۔ شبیر درانی بہت خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے جگہ کو چھڑانے کے لئے پولیس انسپٹر کو رشوت کے طور پر بلیٹک چیک پیش کیا تھا اور پولیس انسپٹر نے اس کی یہ پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ نالہ جانتی تھی کہ اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے پولیس وین پر حملہ شبیر درانی ہی نے کرایا تھا جگہ نے اگرچہ تھانے میں دیے جانے والے بیان میں اس کا نام نہیں لیا تھا لیکن شبیر درانی کو یہ اندیشہ ضرور رہا ہو گا کہ وہ عدالت میں اس کا نام بتا دے گا اور اندیشہ یہ تھا کہ وہ اسے عدالت میں پیش نہ ہونے دے اور راستے ہی میں اسے ختم کرانے کی کوشش کرے۔ ایک طرف خوشی تھی تو دوسری طرف دوسرے بھی تھے۔

اسی دوران دلاور بھی بیٹھک میں آگیا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ دواؤں کے باقاعدہ استعمال سے ناک اور ہونٹوں کی سوجن بہت کم ہو گئی تھی۔ البتہ زخموں پر نیلے دھبے باقی تھے۔

”ارے دلاور! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ احمد دین اسے دیکھ کر چونک گیا۔

”کچھ نہیں چاچا۔ ذرا جھگڑا ہو گیا تھا۔“ دلاور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کو گھر میں تو سب خیریت ہے

”ہاں بھی سب خیریت ہے۔ ایک کام سے شر آیا تھا۔ رائے صاحب نے کہا کہ تم لوگوں کی خیریت بھی معلوم کرنا آؤں۔“ احمد دین نے جواب دیا۔

”آپ لوگوں کی باتیں ختم ہوئیں یا نہیں۔ روٹی پک گئی ہے۔“ زینت نے دروازے میں آکر کہا۔

”چلو بھی۔ کھانا کھالیں۔ چاچا احمد دین کو گاؤں واپس بھی جانا ہے۔“ نائلہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ لوگ دوسرے کمرے میں آگئے جہاں درہی پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا تھا۔ شور بے والا آلو گوشت کا سالن، مرچ اور لیموں کا اچار اور ماش کی دال تھی۔

”بھائی صفر را بھی نہیں آیا؟“ احمد دین نے پوچھا۔

”کسی دوست کے پاس بیٹھ باتیں کر رہے ہوں گے۔“ زینت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ لوگ خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ احمد دین اپنے آپ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ نائلہ درانی وہ عورت تھی جسے خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں تھا۔ بڑے بڑے لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اور آج وہی کروڑ پتی عورت زمین پر بیٹھی ایک معمولی مزارع کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

کھانے کے بعد احمد دین جلد ہی رخصت ہو گیا۔ زینت برتن وغیرہ سمیٹنے لگی اور نائلہ اور دلاور بیٹھک میں آگئے۔

کھانے کے بعد احمد دین جلد ہی رخصت ہو گیا۔ زینت برتن وغیرہ سمیٹنے لگی اور نائلہ اور دلاور بیٹھک میں آگئے۔

”یہ چاچا احمد دین کسی خاص کام سے آیا تھا؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ نائلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اسے رائے صاحب کے خط کے بارے میں بتانے لگی۔

”حیرت ہے۔“ دلاور بولا۔ ”اس نے یہ تو بتا دیا کہ پولیس دین پر تمہارے آدمیوں نے نہیں، اس نے حملہ کیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ کارروائی اس نے کس کے کہنے پر کی تھی۔ لیکن بہر حال، یہ اندیشہ مجھے بھی ہے کہ شبیر درانی اسے عدالت میں پیش ہونے سے روکے گا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کل کا دن تمہاری زندگی کا اہم ترین دن ہو گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پولیس بھی صورتحال سے پوری طرح واقف ہوگی۔ وہ لوگ جگہ کی حفاظت کا پورا بندوبست کریں گے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ جگہ کل ساتھ خیریت کے عدالت میں پیش ہو جائے۔“ نائلہ بولی۔

دلاور کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر وہ دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

دن بیت گیا۔ شام ہوئی اور نائلہ کو رائے منصور کی آمد کا انتظار شروع ہو گیا۔ خط میں حالانکہ رائے صاحب نے آج رات آنے کا وعدہ نہیں کیا تھا، ایک امکان ظاہر کیا تھا، مگر نجانے کیوں نائلہ کو یقین تھا کہ رائے صاحب آج رات ضرور آئیں گے۔

نائلہ کو مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت شاید رات کے دو بج رہے تھے۔ سب لوگ سو رہے تھے کہ دروازے کی کھنٹی بجی۔ نائلہ اس وقت جاگ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر صفر اور دلاور کو جگا دیا۔ یہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ دلاور نے ایک دم رات نقل سنبھال لی تھی۔ اسی دوران دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دی۔ ان کے چہروں پر طمانیت سی آگئی۔ کوئی دشمن اس طرح شریفانہ طور پر دستک نہیں دے سکتا تھا۔



صفر نے برآمدے میں آکر پوچھا کون ہے تو جواب میں رائے منصور کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

”سوری بھی! تم سب لوگوں کو پریشان کر دیا۔“ رائے منصور اندر آتے ہوئے بولے۔  
 ”میں تو جاگ ہی رہی تھی۔“ نانکھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین تھا کہ آپ آج ہی رات آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔“

”اس یقین کی وجہ؟“ رائے صاحب بھی مسکرا دیے۔

”اے آپ میری صداقت کہہ سکتے ہیں۔“ نانکھ نے جواب دیا۔

”ہاں بھی۔ تمہاری صداقت میں تو کوئی شبہ نہیں۔“ رائے صاحب نے کہا اور پھر دلاور وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تم لوگ سو جاؤ..... میں ذرا نانکھ بیٹی سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ شاید ہم لوگ دیر تک جاگتے رہیں۔“

”اگر دیر تک جاگنے کا ارادہ ہے تو پھر آپ لوگوں کو چائے کی ضرورت بھی ہوگی۔“ زینت نے کہا۔

”ہاں۔ اگر چائے مل جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

دلاور، زینت اور صفر بیٹھک سے نکل گئے، زینت کچھ دیر بعد چائے بنا کر دے گئی۔ رائے منصور نے ایک کپ اٹھالیا۔ وہ اس وقت واقعی چائے کی شدید طلب محسوس کر رہے تھے۔

”میں شام کو ذرا جلدی شہر آگیا تھا۔“ رائے منصور نے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے میں نے انسپکٹر اور پھر ڈی ایس پی سے اس کے دفتر میں ملاقات کی تھی۔ جگہ نے پوچھ گچھ کے دوران کچھ اور نام بھی بتائے تھے جنہوں نے پولیس وین پر حملے اور رضیہ والی واردات میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ سب لوگ مفرور ہیں۔ ان میں سے بیشتر یہ شہر چھوڑ کر دوسری جگہوں پر جا چکے ہیں۔ بہر حال، پولیس ان کی تلاش کے سلسلے میں حرکت میں آچکی ہے اور امید ہے کہ چند روز میں وہ سب بھی پولیس کی حراست میں آجائیں گے۔“

”کیا جھگو کو صبح عدالت میں پیش کیا جائے گا؟“ نانکھ نے پوچھا۔ ”اور کیا اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ شیردرانی کے آدمی اسے عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیں گے؟“

”میں نے ڈی ایس پی کو تمام خطرات سے آگاہ کر دیا ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”وہ خود بھی صورتحال سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ذاتی طور پر پولیس وین پر حملے والے کیس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ خود کئی روز سے اس سلسلے میں تحقیقات کر رہا ہے اور اس نے شہر سے باہر اینٹوں کے بھٹے کے قریب پرانے کنویں سے وہ کار بھی دریافت کر لی تھی جو اس واردات میں استعمال کی گئی تھی۔ ڈی ایس پی کی دلچسپی کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتی ہو کہ کار کی نمبر پلٹیں موجود نہیں تھیں۔ اس نے چیفسز اور انجنیئر کی مدد سے کار کے مالک کا سراغ لگایا اور تمہیں یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ وہ کار شیردرانی کی ملکیت تھی اور جب ڈی ایس پی نے اس سلسلے میں شیردرانی سے رابطہ قائم کیا تو اس نے بتایا کہ یہ کار اس واردات سے کئی روز پہلے صادق آباد سے چوری ہو گئی تھی جس کی رپورٹ صادق آباد تھانے میں درج ہے۔ اب ڈی ایس پی اس پہلو پر سوچ رہا تھا کہ کار واقعی چوری ہو گئی تھی یا اسے کسی خاص مقصد کے تحت کیس چھپا کر اس کی چوری کی رپورٹ درج کروادی گئی تھی اور اب جگہ والے معاملے نے صورتحال کچھ آسان کر دی ہے۔ کڑاں آہستہ آہستہ ملتی جا رہی ہیں اور بہت جلد یہ حلقہ مکمل ہو جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ کے آنے سے پہلے میں یہی سب کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ اگرچہ بڑی دل خوش کن خبر ہے مگر میں اس کے منفی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتی۔ ایک تو یہ اندیشہ کہ جگو کو عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے اور اگر وہ بخیریت کمرہ عدالت میں پہنچ جائے تو اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے بیان ہی سے منحرف ہو جائے۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا۔“

”ایسی صورت میں ہمیں کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”جگو نے اپنے جن ساتھیوں کے نام بتائے ہیں پولیس ان کی تلاش میں مصروف ہے۔ پوری ملک کی پولیس کو ان کے ناموں اور حلیوں سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ وہ سب نہیں تو ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور پکڑا جائے گا اور اس طرح مسئلہ حل ہونے میں کافی مدد ملے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ نے اپنے خط میں جگو کے اس بیان کے بعد میری بریت کی قانونی درخواست کے بارے میں بھی کچھ لکھا تھا۔“

”ہاں۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”وکیل صاحب کو آج ہسپتال سے چھٹی مل گئی ہے اور وہ پانچ بجے گھر چلے گئے تھے۔ انسپکٹر اور ڈی ایس پی سے ملاقات کے بعد میں وکیل صاحب کے گھر ہی گیا تھا اور اس وقت وہیں سے آرہا ہوں۔ وکیل صاحب نے اپنے ٹائپسٹ کو بھی بلوایا تھا۔ اتنی دیر تک ہم اس کیس کے قانونی پہلوؤں کا جائزہ لیتے رہے۔ ہم نے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور درخواست کا ایک رف ڈرافٹ تیار کر لیا گیا ہے۔ صبح جگو کے عدالت میں پیش ہونے کے بعد جو بھی صورتحال سامنے آئے گی اس کے مطابق فائل ڈرافٹ تیار کر کے درخواست عدالت میں پیش کر دی جائے گی۔ یہ درست ہے کہ ہر چیز کے منفی پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے لیکن توقع ہمیشہ بہتری کی رکھنی چاہئے۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ قدرت کا فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوگا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔

اس کے بعد وہ دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے اور مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ باتوں میں اس قدر محو تھے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔ صبح کا ہلکا سا اجالا پھیل رہا تھا اور پھر قرعہ مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی تو رائے منصور اٹھ گئے۔ انہوں نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ اس دوران نائلہ نے ان کے لئے چائے بنادی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر رائے صاحب نے چائے پی اور رخصت ہو گئے۔

رائے صاحب اور ان کا وکیل صبح آٹھ بجے عدالت پہنچ گئے تھے۔ پھنوں پر بہت رش تھا۔ سائل اپنے اپنے وکیلوں کو گھیرے ہوئے تھے اور وکیل نئے سائلوں کو گھیرنے کے چکر میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ رائے منصور کو دیکھ کر بہت سے لوگوں نے انہیں سلام کیا تھا۔ وہ ہر ایک کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے وکیل کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے پھٹے پر پہنچ گئے۔

تقریباً ”ساڑھے نو بجے پولیس کے دو تین ٹرک عدالت کے گیٹ کے سامنے آکر رکے۔ لاتعداد مسلح پولیس والے ٹرکوں سے اتر کر چاروں طرف پھیل گئے۔ ان ٹرکوں کے نرے میں پولیس کی ایک بندوبست بھی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وہیں سے اتر آیا۔ اس کے اشارے پر وہیں کا ہچھلا دروازہ کھول دیا گیا۔ چار مسلح پولیس والے جگو کو لے کر وہیں سے اتر آئے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں

تھیں۔ زنجیر کا دوسرا سر ایک کانٹیل کی پلٹ میں پھنسا ہوا تھا۔

پولیس والے جگمو کو اپنے زرنے میں لے کر گیٹ میں داخل ہو گئے اور عدالت کی عمارت کی طرف چلے گئے۔ لوگ رک رک کر اور مڑ مڑ کر جگمو کو دیکھ رہے تھے۔ وکیل کے پھٹے پر بیٹھے ہوئے رائے منصور نے بھی جگمو کو دیکھ لیا تھا۔

پولیس والے ابھی گیٹ سے تقریباً ”میں گز اندر کی طرف چلے تھے کہ فضا اچانک ہی زبردست فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ عدالت کے احاطے میں پہلے سے موجود چار آدمیوں نے اپنے جسموں پر لپٹی ہوئی چادریں اتار کر پھینک دیں اور کلا مشکوف رائفلوں سے جگمو اور پولیس والوں پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ جگمو کو دو گولیاں لگیں۔ وہ چیخا ہوا نیچے گرا۔ دو اور پولیس والے اس کے اوپر گرے تھے انہوں نے جگمو کو اس طرح اپنے نیچے چھپا لیا تھا کہ کوئی گولی اسے نقصان نہ پہنچا سکے۔ لیکن ان دونوں پولیس والوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ وہ اپنے فرض پر قربان ہو گئے تھے۔

دوسرے پولیس والوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ ان کی فائرنگ سے ایک حملہ آور چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ گولی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی تھی اور خون کے چھینٹوں کے ساتھ بھیجہ بھی چاروں طرف بکھر گیا تھا۔

پکمری کے احاطے میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ چیختے ہوئے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ حملہ آوروں کی اندھا دھند فائرنگ سے ایک اور پولیس والا اور دوسرے آدمی ہلاک ہوئے تھے جبکہ کئی زخمی ہوئے تھے۔ حملہ آور اس بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو گئے۔ فائرنگ بند ہوتے ہی رائے منصور اپنے وکیل کے ساتھ اس طرف دوڑا جہاں جگمو گرا تھا۔ انسپکٹر بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے دونوں پولیس والوں کی لاشیں جگمو کے اوپر سے ہٹائیں۔ جگمو کو دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک پیٹ میں اور ایک دائیں طرف پھٹیل کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اگر وہ دونوں پولیس والے اس کے اوپر نہ گر جاتے تو وہ چھلنی ہو چکا تھا لیکن اسے صرف دو گولیاں لگی تھیں اور وہ ابھی زندہ تھا۔

”انسپکٹر!“ رائے منصور انسپکٹر کی طرف دیکھ کر چیخا۔ ”اسے مجسٹریٹ کے سامنے لے چلو۔ اس کا بیان ریکارڈ کرنا بہت ضروری ہے۔“

”وہ لوگ زخمی جگمو کو اٹھا کر اسی مجسٹریٹ کی عدالت میں لے آئے جہاں اس کا چالان پیش کیا جانے والا تھا۔ اسے ایک بیچ پر لٹا دیا گیا۔ مجسٹریٹ بھی اپنی کرسی سے اٹھ کر قریب آ گیا۔

”جگمو!“ انسپکٹر نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”جن کے لئے تم آگ اور خون کا کھیل کھیلتے رہے، بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے انہوں نے آج تمہیں بھی معاف نہیں کیا۔ وہ اگر چاہتے تو عدالت میں تمہارے کیس کا دفاع کر سکتے تھے لیکن انہوں نے تمہیں موت کے گھاٹ اتار دینے کی کوشش کی۔ تمہیں دو گولیاں لگی ہیں اور شاید تم زندہ نہ بچ سکو۔ تم اس حاکم عالی کی عدالت میں پیش ہونے والے ہو جو کائنات کا سب سے بڑا منصف ہے۔ دلوں کے حال وہ جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ مرنے سے پہلے اگر تم مجسٹریٹ صاحب کو یہ بتا دو کہ رضیہ کو کس نے قتل کیا تھا۔ پولیس وین پر کس نے اور کس کے کہنے پر حملہ کیا تھا تو بہت سے بے گناہ سزا سے بچ جائیں گے۔ اگر تم نے میاں پولیس کو دیا جانے والا اپنا بیان نہ دہرایا تو یاد رکھو انسانوں کے روپ میں وہ خونخوار بھیڑیے اسی طرح بے گناہوں کا خون بہاتے رہیں گے اور تم جیسے مجبور اور معصوم لوگ ان کے آلہ کار بننے رہیں گے..... بتاؤ جگمو.....

بولے.....

”مم..... میں بہت..... برا آدمی ہوں۔“ جگمو کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ ”رضیہ کو..... میں نے قتل..... کیا..... پپ..... پولیس وین پر..... میں نے حملہ کیا..... نانکہ درانی..... بے..... گناہ ہے..... اس..... اس..... زش میں..... انپکٹر اعظم بھی..... شریک تھا..... بعد میں..... اسے بھی مروا..... دیا گیا.....“

”یہ سب کچھ کس کے کہنے پر ہوا؟ کون ہیں وہ لوگ؟“ انپکٹر نے پوچھا۔

”مم..... میں نے خدا کو..... جان دینی..... ہے..... جھو..... ٹ نہیں بول گا۔“ جگمو نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ ”موج..... مدار..... مجھے احکامات..... وہی دیتا تھا..... اس کے پیچھے..... کوئی..... اور بھی..... ہے.....“

”موج مدار کون ہے؟“ انپکٹر نے پوچھا۔

”شبیر..... درانی..... کا.....“ جگمو خاموش ہو گیا۔

انپکٹر نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا۔ مجسٹریٹ نے اشارہ کر دیا۔ جگمو کو کمرہ عدالت سے اٹھا کر فوری طور پر ہسپتال بھجوا دیا گیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے بچانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

رائے منصور کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ٹل گیا تھا۔ نانکہ کے اندیشے بالکل درست نکلے تھے۔ شبیر درانی نے جگمو کو عدالت میں پیش ہونے سے روکنے کے لئے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ حملہ آوروں نے جگمو کو گولیاں لگ کر گرتے دیکھا تھا۔ وہ یقیناً ”مطمئن“ ہو گئے ہوں گے کہ وہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن انہیں یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ جگمو نے مرنے سے پہلے ان کی قسمت پر مہر لگادی تھی۔

جگمو نے مجسٹریٹ کی موجودگی میں بیان دیا تھا۔ جسے کسی طور بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ بیان ٹائپ کرنے کے بعد مجسٹریٹ نے دستخط کر دیے اور اس پر عدالت کی مرثیت کر دی گئی۔ انپکٹر، رائے منصور اور وہاں پر موجود دیگر لوگوں کے دستخط بھی کروائے گئے تھے اور اس طرح اس کاغذ کو ایک مستند قانونی دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

رائے منصور کے وکیل نے وقت ضائع کئے بغیر اس بیان کی ایک نقل حاصل کر لی اور وہ رائے منصور کے ساتھ دوبارہ اپنے پھٹے پر آگیا اور نانکہ درانی کی طرف سے بہت کی درخواست تازہ ترین صورتحال کی روشنی میں دوبارہ تیار کی جانے لگی اور پھر اسی روز پارہ بجے سے پہلے پہلے وہ درخواست عدالت میں پیش کر دی گئی۔ فیصلے کے لئے دو دن بعد کی تاریخ دیدی گئی تھی۔

رائے منصور ابھی عدالت کے احاطے ہی میں تھا کہ اسے یہ اطلاع مل گئی کہ جگمو ہسپتال پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ رائے منصور کو جگمو کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اب تک نجانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہو گا۔ اس نے جس طرح معصوم اور بے گناہ لوگوں کو ازیتیں دے دے کر ہلاک کیا تھا آج خود بھی دو گولیوں کی ازیت اٹھانے کے بعد موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ البتہ اگر وہ مجسٹریٹ کے سامنے بیان دینے سے پہلے مر گیا ہوتا تو رائے منصور کو اس کی موت کا واقعی افسوس ہوتا۔ کیونکہ اس طرح نانکہ درانی کے سلسلے میں کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس روز اگرچہ وکیل کے ایک اور کیس کی بھی پیشی تھی۔ لیکن وکیل نے متعلقہ عدالت میں نائب کورٹ سے مل کر اگلی پیشی کی تاریخ لے لی اور رائے منصور کے ساتھ اپنے دفتر میں آگیا۔

”مبارک ہو رائے صاحب!“ وکیل نے دفتر میں داخل ہونے کے بعد کہا۔ ”اللہ کی رضا سے یہ کٹھن ترین مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ مجھے دو باتوں کا پہلے ہی اندیشہ تھا۔ ایک تو یہ کہ جگمو کو عدالت میں پیش ہونے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا یا اگر وہ عدالت میں پہنچ بھی گیا تو اپنے اس بیان سے منحرف ہو جائے گا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔“

”مجھے بھی یہی اندیشہ تھا۔ لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا۔ مرنے سے پہلے جگمو نے مجسٹریٹ کے سامنے بیان تو دیدیا جس سے ہماری بہت ساری مشکلیں حل ہو گئی ہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔

”دو دن بعد بریت کی درخواست کا فیصلہ بھی ہو جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ بھی ہمارے ہی حق میں ہوگا۔ فشی!“ اس نے دروازے کے باہر بیٹھے ہوئے فشی کو آواز دی۔

”جی سر!“ فشی اندر آکر سوالیہ نگاہوں سے وکیل کی طرف دیکھنے لگا۔

”جاؤ..... جلدی سے مٹھائی لے کر آؤ۔ رائے صاحب کا منہ میٹھا کروایا جائے۔“ وکیل نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر فشی کی طرف بڑھا دیا۔

”ارے بھی تم رہنے دو۔ مٹھائی میں منگواتا ہوں۔“ رائے صاحب نے کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

”ابھی نہیں رائے صاحب۔“ وکیل مسکرایا۔ ”آپ سے تو دو دن بعد مٹھائی کھائی جائے گی۔“

فشی وکیل کا اشارہ پا کر دفتر سے چلا گیا اور یہ لوگ ایک بار پھر آج کے واقعہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ حملہ آوروں میں سے ایک آدمی مارا گیا تھا اور فوری طور پر اس کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔

”جگمو کے بیان کے مطابق اسے قتل و غارت کے احکامات موجب موجددار دیا کرتا تھا۔ اور سب ہی جانتے ہیں کہ موجددار، شبیردرانی کا معتمد خاص ہے جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اسے شبیردرانی کا دایاں بازو سمجھا جاتا ہے اور سنا ہے کہ وہی شبیردرانی کو رائے مشورے بھی دیتا رہتا ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”میرا خیال ہے پولیس کو اب تک موجددار کو حراست میں لے لینا چاہئے ورنہ ہو سکتا ہے کہ جب اسے یہ پتہ چلے کہ جگمو نے موت سے پہلے اس کا نام لیا تھا تو ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں فرار ہو جائے۔“ وکیل نے کہا۔

”ایک منٹ۔ ذرا یہ ٹیلی فون میری طرف بڑھاؤ۔“ رائے منصور نے کہا۔

وکیل نے ٹیلی فون رائے منصور کی طرف سرکا دیا اور رائے منصور ریسیور اٹھا کر پولیس اسٹیشن کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف سے کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی اور اتفاق سے کال ریسیو کرنے والا خود انسپکٹر ہی تھا۔

”جی رائے صاحب فرمائیے؟“ انسپکٹر نے اس کی آواز سن کر کہا۔

”ارے بھی وہ موجددار کے سلسلے میں کیا کیا؟ میں نے یہی پوچھنے کے لئے فون کیا تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”وہ روپوش ہو گیا ہے رائے صاحب۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”اسے حراست میں لینے کے لئے میں نے شبیردرانی کے بنگلے پر چھاپہ مارا تھا۔ لیکن اسے شاید جگمو کے بیان کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے فرار ہو گیا۔ لیکن وہ ہم سے بچ کر جائے گا کہاں۔ پولیس کی مختلف پارٹیاں اس کی

تلاش میں مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مار رہی ہیں۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں کی بھی ناکہ بندی کردی گئی ہے۔ وہ کہیں نہیں جاسکے گا اور نہ ہی زیادہ دیر کہیں چھاپہ رکھے گا۔

”شبیر درانی کے کیا تاثرات ہیں؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

وہ بچہ جھنجھلایا ہوا ہے۔ ”انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”اس کے کہنے کے مطابق وہ اپنے کسی کارندے کی سرگرمیوں کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر موجددار نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے بلاشبہ گرفتار کر لیا جائے۔ اسے کوئی پروا نہیں ہے۔ البتہ وہ حسب معمول دھمکیاں دینے سے باز نہیں آیا۔“

”باز آجائے گا۔ بس ایک دو دن کی بات ہے۔ اچھا، میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔“ رائے منصور نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟“ وکیل نے سوالیہ نگاہوں سے رائے منصور کی طرف دیکھا۔

”وہی ہوا جس کا ذکر تھا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”موجددار کو کسی طرح بھٹک مل گئی تھی۔ وہ روپوش ہو چکا ہے لیکن پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔ آج نہیں تو کل پکڑا ہی جائے گا۔“

”مجھے تو لگتا ہے اسے شبیر درانی ہی نے کہیں چھپا دیا ہوگا۔“ وکیل بولا۔

”ایسا ہی ہوا ہوگا۔ لیکن وہ کب تک اسے چھپائے رکھے گا۔“ رائے منصور بولا۔ ”پولیس نے شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کردی ہے۔ وہ شہر سے باہر بھی نہیں جاسکے گا۔“

اسی وقت فشی مٹھائی لے کر آیا۔ اس نے ڈبہ کھول کر میز پر رکھ دیا۔ وکیل اور رائے منصور نے مٹھائی کا ایک ایک ٹکڑا اٹھالیا۔

”یہ لے جاؤ..... اور دفتر میں سب لوگوں میں بانٹ دو۔“ وکیل نے فشی کو اشارہ کیا اور فشی مٹھائی کا ڈبہ اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

تقریباً ”ایک گھنٹے بعد رائے منصور وکیل کے دفتر سے نکل کر سیدھا سلطان پورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ پولیس نے موجددار کی تلاش میں شبیر درانی کے بنگلے پر چھاپے مارا تھا۔ اس کے نتیجے میں شبیر درانی کے گیمپ میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ اس کے سارے مٹھلوک آدمی ادھر ادھر ترہتر ہو گئے ہوں گے۔ شبیر درانی خود بری طرح بوکھلا گیا ہوگا۔ ایسے میں اسے نگرانی کا ہوش کہاں رہا ہوگا۔ اس لئے رائے صاحب نے دارا سے کہہ دیا تھا کہ گھماؤ پھراؤ کے بجائے سیدھا سلطان پورہ چلے۔ اور دارا نے یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ان کی گاڑی کا تعاقب نہ کیا جائے۔

ناٹکہ درانی بڑی بے چینی سے رائے منصور کی منتظر تھی۔ آج صبح عدالت میں جو کچھ ہوا تھا وہ بہت بڑی خبر تھی اور ایسی خبریں تو شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ ناٹکہ کو بھی صدر کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا کہ بعض نامعلوم لوگوں نے پیشی پر آنے والے جگنو نامی ایک شخص کو ہلاک کرنے کے لئے عدالت کے احاطے میں اندھا دھند فائرنگ کردی تھی جس میں جگنو سمیت چھ آدمی ہلاک ہو گئے تھے اور حملہ آوروں کا بھی ایک آدمی پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

جگنو کی ہلاکت کی خبر سن کر ناٹکہ کو سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بات کا اندیشہ تو اسے پہلے ہی تھا۔ جگنو کا نام امید کی ایک ایسی کرن کی صورت میں سامنے آیا تھا جس سے اس کے راستوں پر چھائی ہوئی تاریکی دور ہو سکتی تھی لیکن امید کی وہ کرن بھی تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔

اس وقت ڈھائی بج رہے تھے اور رائے منصور ابھی تک نہیں آئے تھے۔ نہ ہی ان کی طرف سے کوئی

پیغام ملا تھا۔ جس سے نائلہ کی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ صورتحال کچھ اور تنہا ہو گئی ہوگی۔

نائیلہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس وقت بیٹھک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دلاور بھی موجود تھا۔ نائلہ نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر رائے منصور کی گاڑی دیکھ کر چونک گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران صفدر بیرونی دروازہ کھول چکا تھا اور رائے منصور اندر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

مٹھائی کا ڈبہ دیکھ کر نائلہ کی آنکھوں میں الجھن سی تیر تھئی اور پھر رائے منصور کے ہونٹوں کی مسکراہٹ! وہ برآمدے میں آگئی۔ رائے منصور بھی برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ وہ نائلہ کے سامنے رک گئے۔ انہوں نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور ایک لٹو نکال کر مسکراتے ہوئے بولے۔

”منہ کھولو..... میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کا منہ میٹھا کر اؤں گا۔“

نائیلہ نے دانتوں سے لٹو کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور رائے منصور سے لپٹ گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بات کچھ بن گئی تھی۔ اس دوران دلاور بھی باہر آ گیا تھا۔

”لو بھئی دلاور، تم بھی منہ میٹھا کرو اور ان کو بھی مٹھائی کھلاؤ۔“ رائے منصور نے مٹھائی کا ڈبہ دلاور کی طرف بڑھا دیا۔

”ہم نے تو سنا تھا کہ جج کو عدالت میں پیش ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا تھا مگر یہ مٹھائی کس سلسلے میں ہے رائے صاحب؟“ دلاور نے ڈبہ لیتے ہوئے کہا۔

”جج کو دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک پیٹ میں اور دوسری نے ہنسل کی بڑی توڑ دی تھی۔ اس کے مارتے ہی دو پولیس والے اس کے اوپر لد گئے تھے۔ دونوں پولیس والے چھٹی ہو گئے انہوں نے فرض پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اگر وہ جج کو کے اوپر گر کر ڈھال نہ بن جاتے تو جج کو کا جسم چھٹی ہو جاتا مگر پولیس والوں کی وجہ سے وہ زندہ بچ گیا تھا۔ اسے زخمی حالت میں کمرہ عدالت میں لے جایا گیا اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کا بیان قلمبند کیا گیا اور پھر اسے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ لیکن ہسپتال پہنچنے سے پہلے اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔ اس نے مرنے سے پہلے مجسٹریٹ کی موجودگی میں جو بیان دیا تھا اس سے ہماری ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی۔“ رائے منصور نے مختصراً بتا دیا۔

”لیکن آپ کی طرف سے کوئی پیغام بھی نہیں ملا تھا جس سے میں پریشان ہو رہی تھی۔“ نائلہ نے شکایتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس نئی صورتحال کے بعد تمہاری طرف سے داخل کی جانے والی درخواست ہمیں دوبارہ تیار کرنی پڑی جس میں کچھ وقت لگ گیا۔ بہر حال، درخواست عدالت میں پیش کر دی گئی ہے۔ فیصلے کے لئے دو دن بعد کا وقت دیا گیا ہے۔“ رائے منصور نے بتایا۔

”کیا جج کو نے اپنے بیان میں شبیر درانی کا نام لیا تھا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”نہیں“ اس کے بیان کے مطابق اسے تمام احکامات موجود کر دیا کرتا تھا۔ شبیر درانی سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ موجودہ روپوش ہو چکا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔“

رائے منصور نے بتایا۔

وہ بیٹھک میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران زینت اندر آ گئی۔

”اب تو کھانا لگا دوں نالکہ باجی۔ تین بج رہے ہیں۔“  
 ”ارے! اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟“ رائے منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”کسی نے بھی نہیں کھایا جی۔“ زینت نے جواب دیا۔

”چلو۔ جلدی سے کھانا لگاؤ۔ میں بھی ابھی تک بھوکا پھر رہا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا اور پھر  
 اڑھے گھنٹے بعد وہ سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس موضوع پر باتیں بھی ہوتی رہیں اور پھر  
 بچے چائے پینے کے بعد رائے صاحب اٹھ گئے۔

”اچھا نالکہ بیٹی۔“ اب میں چلتا ہوں۔“ انہوں نے نالکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے وکیل کو  
 بھادیا ہے۔ وہ یہاں کی صورتحال سنبھال لے گا۔ میں فیصلے والے دن صبح سویرے ہی پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں  
 یثاں ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

رائے منصور ان سے رخصت ہو کر باہر کھڑی ہوئی پاجیرو میں بیٹھ گئے۔ دارا نے انجن اسٹارٹ کر کے  
 اڑی آگے بڑھا دی۔ بازار سے رائے منصور نے کچھ چیزیں خریدیں اور پھر پاجیرو شہر کی حدود سے نکل کر بائی  
 بے پر دوڑنے لگی۔

رائے منصور دو دن گاؤں میں رہے اور جس روز عدالت نے نالکہ کی بریت کی درخواست کا فیصلہ سنانا  
 اس روز فجر کی نماز پڑھتے ہی حویلی سے روانہ ہو گئے۔ صبح سویرے سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ دارا  
 تھائی تیز رفتاری اور مہارت سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ رحیم یار خان شہر میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھا  
 عدالت کی طرف آئے تھے۔ جب وہ عدالت پہنچے تو نوپنچے میں سات منٹ باقی تھے۔

رائے صاحب کا وکیل عدالت میں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ ان کا کیس نمبر سات ہے اور ابھی صرف  
 سترے کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ وکیل نے اپنے منشی کو عدالت والے برآمدے میں چھوڑ دیا اور خود پھٹے  
 آ گئے۔

میکارہ بچے منشی نے اطلاع دی کہ ان کا نمبر آگیا ہے۔ وہ دونوں اٹھ کر تیز تیز چلتے ہوئے کمرہ عدالت میں  
 گئے اور انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں حسینہ بیگم کا منشی زبیر بھی بیٹھا ہوا تھا۔

رائے منصور کے وکیل نے نالکہ درانی کی پیروی کرتے ہوئے کچھ کاغذات مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے  
 اپنی جگہ پر آگیا۔ جبکہ نالکہ کے خلاف استغاثہ کی پیروی پر ایسیکوٹر کر رہا تھا۔ پراسیکیوٹر نے نالکہ کے زخمی  
 حالت میں ہسپتال میں لائے جانے، اس کے ہسپتال سے فرار اور پھر کئی روز بعد گرفتاری اور جیل سے پیشی  
 لئے عدالت کی طرف جاتے ہوئے پولیس وین پر نامعلوم لوگوں کے حملے اور نالکہ کے حملہ آوروں کے  
 فرار کی تفصیل بتائی اور عدالت سے یہ درخواست کی کہ نالکہ درانی پر اپنے آدمیوں کے ذریعے پولیس  
 پر حملے اور کئی آدمیوں کے قتل کا الزام ہے اور پولیس ابھی تک اس کا سراغ نہیں لگا سکی۔ پراسیکیوٹر  
 نے نالکہ درانی کی بریت کی درخواست مسترد کرنے اور نالکہ کو پابجولاں عدالت میں حاضر کر کے اس پر کئی  
 وارنٹ کے قتل کا مقدمہ چلانے کی درخواست کی تھی۔

نالکہ درانی کے وکیل نے بڑی خوبصورتی سے اس کا کیس پیش کیا تھا۔ اس نے ایسے ایسے دلائل پیش  
 کئے کہ پراسیکیوٹر کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے عدالت میں چار ایسے گواہ بھی پیش کئے جنہوں نے بتایا کہ اس  
 پولیس دین پر حملہ اور قتل و غارت کے بعد حملہ آوروں نے نالکہ درانی کو بھی گن پوائنٹ پر اپنی کار میں  
 لٹا دیا تھا۔ اگر حملہ آور نالکہ کے آدمی ہوتے تو وہ خود بھاگ کر کار میں سوار ہوتی اسے گن پوائنٹ پر لے



جانے کی ضرورت نہیں تھی اور پھر گرفتار ہونے کے بعد سے وہ اندوہناک واقعہ پیش آنے تک نالکہ کو پولیس کی کڑی نگرانی میں رکھا گیا تھا اور کسی بھی شخص کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ انسپٹر اعظم استغاثہ کا اہم ترین گواہ تھا۔ رضیہ بھی اس کیس کی اہم ترین گواہ تھی۔ وہ اس راز سے واقف تھی کہ پولیس دین پر حملہ کس نے کروایا تھا۔ وہ اپنی جان کے خوف سے جھپٹی پھر رہی تھی۔ لیکن بالآخر اسے بھی قتل کروادیا گیا۔

رضیہ کے قاتل جگمو چاچا کو گرفتار کر لیا گیا جس نے کسی دباؤ اور کسی تشدد کے بغیر پہلے پولیس کو یہ بیان دیا تھا کہ اس نے نہ صرف رضیہ کو قتل کیا ہے بلکہ اور بھی بہت سی وارداتوں کے اعتراف کے علاوہ یہ انکشاف بھی کیا کہ نالکہ درانی کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے حملہ نالکہ درانی کے آدمیوں نے نہیں، اس نے کیا تھا اور یہ سب کچھ علانے کی ایک بہت ہی با اثر شخصیت شبیر درانی کے معتمد خاص موجد مدار کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ جگمو چاچا کو جب عدالت میں پیش کرنے کے لئے لایا جا رہا تھا تو احاطہ عدالت میں چند نامعلوم حملہ آوروں نے خود کار ہتھیاروں سے اس پر فائرنگ کر دی۔ مگر جگمو چاچا نے مرنے سے پہلے فاضل عدالت کے سامنے یہ بیان دیدیا کہ نالکہ درانی بے گناہ ہے۔ اس کا پولیس دین پر حملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وکیل نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ نالکہ درانی کو ان سنگین الزامات سے با عزت طور پر بری کر دیا جائے۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد عدالت نے فیصلہ سنایا کہ نالکہ درانی کو جس شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا وہ غلط ثابت ہو چکا ہے اور نالکہ کو اس کیس سے با عزت طور پر بری کیا جا چکا ہے۔ پولیس دین پر حملے کے سلسلے میں استغاثہ نالکہ درانی کے خلاف کوئی گواہ یا شہادت پیش نہیں کر سکا۔ واقعات اور حقائق اور جگمو کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نالکہ درانی کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ لہذا یہ عدالت اسے بے گناہ تصور کرتے ہوئے اس الزام سے با عزت طور پر بری کرتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ شبیر درانی کے معتمد خاص موجد مدار کو عدالت میں پیش کیا جائے۔

”تھینک یو لارڈ۔“ وکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں جناب والا۔“ عدالت میں بیٹھی ہوئی چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”اس فیصلے سے قانون کا بول بالا ہو گا اور بے گناہوں کو تحفظ کا احساس حاصل ہو گا۔“  
 سب لوگ اس چادر پوش عورت کی طرف دیکھنے لگے۔ اس عورت نے اپنے چہرے سے چادر اتار دی تھی۔ وہ نالکہ درانی تھی۔

وکیل اور رائے منصور، نالکہ کو دیکھ کر اچھل پڑے۔ رائے منصور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

”ارے نالکہ بیٹی تم اتنی کہاں کیسے آگئیں؟“ رائے منصور بولے۔  
 ”اپنی بریت کا فیصلہ میں خود سنا چاہتی تھی۔ اس لئے آگئی۔“ نالکہ درانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اور اگر فیصلہ تمہارے حق میں نہ ہوتا تو؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”تو میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیتی۔ کیونکہ میں بھانپتے بھاگتے تک آگئی تھی۔“ نالکہ نے کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظریں حسینہ بیگم کے منہ پر جم گئیں جو اس وقت دروازے کی طرف

رہا تھا۔

”ذیر چاچا۔“ نائلہ نے اسے آواز دے کر روک لیا اور اس کے قریب جا کر بولی۔ ”اپنی مالکن اور اس کے بیٹے سے کہہ دینا کہ قانون نے مجھے تمام الزامات سے باعزت طور پر بری کر دیا ہے۔ میری جائیداد اپنی رانی میں لینے کے بعد اس نے جتنے بھی گھپلے کئے ہیں وہ درست کر لے۔ میں ایک دو دن بعد حساب لینے کے لئے خود آؤں گی۔“

وہ لوگ عدالت سے باہر آ گئے۔ وکیل نے حینہ بیگم کے نام نائلہ کی اسٹیٹ کی نگرانی کی منسوخی کے لئے بھی درخواست تیار کر رکھی تھی۔ اس نے نائلہ کی بریت کے فیصلے کی نقل اس درخواست کے ساتھ ملک کر کے اسے اس عدالت میں پیش کر دیا جہاں سے حینہ بیگم کے نام نگرانی کے احکامات جاری ہوئے۔ فاضل مجسٹریٹ نے درخواست پڑھنے کے بعد اسی وقت حینہ بیگم کی نگرانی اور جائیداد کی سرپرستی کے احکامات منسوخ کر دیئے اور اس درخواست پر یہ حکم جاری کر دیا کہ وہ نائلہ درانی کو حساب دے کر سب کچھ کے حوالے کر دے۔

یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ نائلہ کو ان قانونی الجھنوں سے نجات مل گئی تھی جن کی وجہ سے وہ چھٹی پھر تھی۔ اب وہ آزاد تھی اور حینہ بیگم اور شیر درانی کا کھل کر مقابلہ کر سکتی تھی۔

”ہاں بھئی..... کہاں چلیں؟“ رائے منصور نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرے بچکے پر۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”دوپہر کا کھانا ہم وہیں کھائیں گے۔ آج آپ سب میرے ساتھ ہیں۔“

”اس طرح جان نہیں چھوٹے گی نائلہ بی بی۔“ وکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دعوت تو بڑے پیمانے پر کی گئی ہے؟“

”میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ لیکن اسے آپ دعوت نہ سمجھیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ہم اکٹھے کمر میں داخل ہوں جہاں سے مجھے نکلنے پر مجبور کیا گیا تھا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”تو چلو..... ہم تیار ہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔

وہ لوگ عدالت کے احاطے سے باہر آ گئے جہاں رائے منصور کی پاجیرو کھڑی تھی۔ نائلہ درانی بڑے فخر سے سینہ تان کر چل رہی تھی۔ آج بڑی مدت بعد اسے اس طرح آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔

راستے میں سلطان پورہ والے مکان سے دلاور، صفدر اور اس کی بیوی زینت کو بھی لے لیا گیا تھا۔

انہوں نے تو نائلہ کو دیکھتے ہی شکوے شروع کر دیے تھے۔

”ارے نائلہ بی بی! آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔“

”میں تمام الزامات سے بری ہو گئی ہوں دلاور۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں عدالت کا فیصلہ خود سننا چاہتی تھی اس لئے کچھری چلی گئی تھی۔ تمہیں میں نے اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تم مجھے نہ جانے“

نائلہ کی بریت کا سن کر دلاور کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے بڑے پر جوش انداز میں مبارک باد دی تھی۔ اور زینت نے بھی مسکراتے ہوئے نائلہ کو مبارک باد دی اور جب وہ اپنے بچکے پر پہنچے تو شہاب الدین بھی اسے مبارک باد دی تھی۔ نائلہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی تھی کہ کتنا غلوں تھا ان لوگوں کی مبارک بادوں کی خوشی کے یہ الفاظ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔ ان میں کوئی نصیحت نہیں تھا، کوئی بناوٹ

نہیں تھی اور کوئی لالچ نہیں تھا۔

بنگلے میں داخل ہوتے ہی نائلہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ چند روز پہلے وہ چوروں کی طرح اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہی گھر میں دو چار دن چوروں کی طرح رہی تھی۔ پھر اس کی گرفتاری کے لیے پولیس نے چھاپہ مارا۔ وہ اور دلاور چھت پر پانی کی ٹنگی میں چھپ کر پولیس کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن بعد میں شبیر درانی اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ ممکن ہے وہ بوڑھے شہاب الدین پر تشدد شروع کر دیتا لیکن ٹھیک وقت پر نائلہ اور دلاور سامنے آ گئے۔ انہوں نے نہ صرف شہاب الدین کو ان کی زیادتی کا شکار ہونے سے بچایا بلکہ وہ شبیر درانی اور اس کے آدمیوں کو بے بس کر کے ان کی چپ بکر لے گئے تھے۔

آج کئی روز بعد نائلہ علی الاعلان اس بنگلے میں آئی تھی۔ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ کسی دم کا ڈر نہیں تھا۔ جب اس نے پورے بنگلے میں گھوم پھر کر جائزہ لیا تو ہر وہ چیز موجود تھی جو پہلے غائب ہو گئی تھی۔ فرج، دی سی آر، بی وی، ایئر کنڈیشنر، ڈیپ فریز اور وہ تمام قیمتی چیزیں جو حسینہ بیگم یہاں سے لے جا کر تھیں اب اپنی جگہ پر نظر آ رہی تھیں۔ وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں وہ خوبصورت فانوس بھی لگا ہوا تھا، اس کے والد سنگا پور سے لے کر آئے تھے۔ اس فانوس کی قیمت پچاس ہزار روپے سے بھی زیادہ تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر نائلہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ شبیر درانی نے اپنی ماں کو اس پیغام پہنچا دیا تھا اور یقیناً ”یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ اگر سامان بنگلے میں واپس نہ پہنچایا گیا تو نائلہ ان کے لئے کم قدر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ پوچھنے پر شہاب الدین نے بتایا کہ یہ سامان دوسرے دن ہی آگیا تھا، سامان کے ساتھ آنے والے آدمی ہر چیز کو اس کی جگہ پر فٹ کر کے گئے تھے۔

شہاب الدین دوڑ دوڑ کر پڑوسیوں کو بتا رہا تھا کہ نائلہ بی بی کیس سے باعزت بری ہو گئی ہے اور اسے واپس آگئی ہے۔ بہت سے پڑوسی، جن سے نائلہ کے تعلقات تھے، اسے مبارک باد دینے کے لئے آ رہے تھے۔

صنذر، زینت اور شہاب الدین دوڑ دوڑ کر کام کر رہے تھے۔ بازار سے سودا بھی آگیا تھا اور زینت باورچی خانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو چارنج رہے تھے۔ میز پر نائلہ کے ساتھ وکیل، رائے منصور ہی بیٹھے تھے جبکہ دلاور کندھے پر رائفل لٹکائے برآمدے میں کھڑا باہر گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ارے! دلاور کہاں ہے؟“ نائلہ نے شہاب الدین سے پوچھا۔

”وہ باہر کھڑا ہے مگر“ شہاب الدین نے بتایا۔

”بلاؤ اسے.... کھانا نہیں کھائے گا کیا؟“ نائلہ نے کہا۔

شہاب الدین، دلاور کو بلا لایا۔

”کیا بات ہے۔ بھوک نہیں لگ رہی؟ کھانا نہیں کھاؤ گے کیا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”میں بعد میں کھالوں گا نائلہ بی بی۔ آپ لوگ کھائیے۔“ دلاور نے جواب دیا۔

نائلہ اس کے لمبے اور انداز خطاب پر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”کیا ہوا دلاور؟ کچھ ناراض ہو گیا؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”نہیں نائلہ بی بی۔“ دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے اور بات تھی۔ حالات آپ کو اس سطح پر لے گئے تھے کہ آپ ہم جیسے چلی سطح کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ مگر اللہ نے بڑا کیا..... آپ کو عزت دی..... ساری دنیا کے سامنے سرخرو کیا اور آپ کا کھویا ہوا وقار بحال ہو گیا۔ اٹھ جیسے لوگوں کو زیب نہیں دیتا کہ آپ کی برابری کروں اور آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔“

”دلاور!“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی بھوکی رہوں۔ کھانا چھوڑ کر اٹھ..... تم نے مجھے اتنا پست ذہنیت کا کیسے سمجھ لیا کہ حالات بدلتے ہی میں بھی بدل جاؤں گی۔ میں نے کبھی اپنا پائا رائے صاحب کا ملازم نہیں سمجھا۔ تم تو میرے محسن ہو۔ قدم قدم پر تم نے میرا ساتھ دیا مجھے بار بار موت کے چنگل سے نکالا ہے۔ انکل!“ نائلہ نے رائے منصور کی طرف دیکھا۔ ”آپ ہی بے نالہ۔“

”دلاور۔“ رائے صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ کھانا کھاؤ۔ بعد میں تم سے بات کروں

دلاور چند لمحوں کے بعد رائے صاحب کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے راتقل کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ نائلہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر کھانے میں شریک ہو گیا۔

ابھی انہوں نے کھانا ختم نہیں کیا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈو سی یا پڑوسن ہوگی۔ شاب الدین دروازہ کھولنے کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ اس کے صرف دو منٹ بعد ورت ڈانگ روم کے دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی اور نائلہ کی طرف دیکھنے لگی۔

اس عورت کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نائلہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وحینہ بیگم تھی۔

..... ❀ ❀ ❀ .....

شبیر درانی کو ایک گھنٹے کے اندر اندر پتہ چل گیا تھا کہ جگجو حملہ آوروں کی گولیوں سے فوری طور پر مرا تھا۔ اسے صرف دو گولیاں لگی تھیں۔ دو پولیس والوں نے اپنے آپ کو جگجو پر گرا کر اسے تو مزید جاننے سے بچالیا تھا مگر خود ان پولیس والوں کے جسم چھلنی ہو گئے تھے۔ شبیر درانی کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ جگجو کو اٹھا کر اسی مجسٹریٹ کے کمرے میں لے جایا گیا تھا جہاں اس کا چالان پیش کیا جانے والا ہو گا۔ مجسٹریٹ اور پولیس افسروں کی موجودگی میں بیان دیا تھا اور اس نے نہ صرف رضیہ کے قتل پر بہت سی سنگین وارداتوں کا اعتراف کیا تھا بلکہ پولیس وین پر حملے کے سلسلے میں نائلہ درانی کو بے گناہ سمجھتے ہوئے یہ بھی اقرار کیا تھا کہ پولیس وین پر حملہ اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ اس قسم کی خوریزی کی کارروائیوں کے احکامات اسے موجودہ طور سے ملتے تھے۔

مگجو نے شبیر درانی کا نام تو نہیں لیا تھا لیکن موجودہ طور پر اس کا معتمد خاص تھا اور کوئی یو قوف آدمی بھی سکتا تھا کہ موجودہ طور پر اس قسم کے احکامات جاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو کٹھ اور شبیر درانی کے اشاروں پر ناچ رہا تھا اور شبیر درانی سوچ رہا تھا کہ اگر موجودہ پولیس کے ہاتھ تو وہ پولیس کے دو چار ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکے گا اور فوراً ہی بک دے گا کہ وہ سب کچھ شبیر

درانی کے اشارے پر کر رہا تھا۔ وہ شروع سے آخر تک پوری کہانی پولیس کو سنا دے گا اور پھر دنیا کی کوئی طاقت شیر درانی کو نہیں بچا سکے گی۔ یوں بھی بعض اعلیٰ افسران اس پر ہاتھ ڈالنے کے لئے کسی موقع کی تلاش میں تھے۔

اطلاع دینے والے نے اسے پوری تفصیل بتائی تھی اور کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ مخبر نے یہ بھی بتایا تھا کہ رائے منصور کے وکیل نے عدالت سے جگہ کے بیان کی نقل حاصل کر لی تھی اور نالہ کی طرف سے پولیس وین پر فائرنگ والے کیس میں بریت کی درخواست عدالت میں پیش کر دی تھی اور عدالت نے فیصلہ سنانے کے لئے دو دن بعد کی تاریخ دیدی تھی۔ مخبر نے یہ بھی بتایا تھا کہ رائے منصور اس معاملے میں پیش پیش تھا۔

رائے منصور کے بارے میں شیر درانی بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کھل کر نالہ کی حمایت کر رہا تھا۔ رضیہ کو بھی اسی نے پناہ دے رکھی تھی جو بالاخر اس کی حویلی سے نکلی اور ماری گئی۔ شیر درانی یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ نالہ اسی شہر میں موجود ہے اور اسے رائے منصور نے کس جگہ چھپا رکھا ہے۔ ایک در مرتبہ تو وہ اس کے ہاتھ آتے آتے پہنچ تھی۔ ایک ٹھکانے کا پتہ چلا تھا۔ ایک ایسا آدمی بھی ہاتھ لگا تھا جو نالہ کے ٹھکانے کا پتہ بتا سکتا تھا لیکن اس نے اپنی جان دیدی تھی مگر نالہ کا پتہ نہیں بتایا تھا۔

شیر درانی کو یقین تھا کہ رائے منصور شہر میں کسی نہ کسی جگہ نالہ سے ملاقات ضرور کرنا ہوگا۔ اس نے ہمیشہ رائے منصور کی نگرانی کے ذریعے نالہ کے ٹھکانے کا پتہ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن رائے منصور اس کے آدمیوں کو ہر مرتبہ غصہ دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس روز بھی اسے یقین تھا کہ رائے منصور نالہ سے ضرور ملاقات کرے گا لیکن کچھ ایسی صورت حال سامنے آگئی تھی کہ رائے منصور پر توجہ دینے کی بجائے وہ اپنے بچاؤ کے طریقے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے فوری طور پر موجددار کو پولیس کی نگاہوں سے اوجھل کرنا تھا۔ اتفاق سے موجددار اسی وقت بیٹنگ پر بھی موجود تھا۔ اس نے فوراً ہی موجددار کو اندر بلا لیا۔

”موجددار؟“ شیر درانی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں پتہ ہے جگہ کے عدالت میں کہا بیان دیا ہے؟“

”بیان؟“ موجددار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تو عدالت کے احاطے میں قدم رکھتے ہی اللہ کو پکارا ہو گیا تھا سرکار اور آپ جانتے ہیں کوئی مردہ بیان نہیں دے سکتا۔“

”نہیں۔“ شیر درانی نے کہا۔ ”وہ سچ کیا تھا اور اس نے مجسٹریٹ کے سامنے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا تھا اور یہ بیان بھی دیا تھا کہ نالہ بے گناہ ہے۔ پولیس وین پر ایک سازش کے تحت حملہ کر کے نالہ کو پولیس کی حراست سے چھڑایا گیا تھا اور یہ کہ خوزیری کی ان تمام کارروائیوں کے لئے اسے تمہاری طرف سے احکامات ملے تھے۔ یعنی تم موجددار.....“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔“ موجددار کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ شیر درانی نے کہا۔ ”پولیس ابھی عدالت ہی میں مصروف ہے لیکن کچھ دیر تمہاری تلاش شروع ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کہاں جاؤں سرکار؟“ موجددار کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”کہیں بھی چلے جاؤ بابا..... یہاں سے نکل جاؤ۔“ شیر درانی نے جھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایسا کہو“

تم نور پور والے ڈیرے پر چلے جاؤ۔ ایک دو دن بعد جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو میں خود تم سے وہاں آکر ملوں گا۔ اس وقت تم چلے جاؤ۔“

اور پھر موجددار نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ جگو اور دوسرے لوگوں کے ذریعے اس قتل و غارت میں شبیردرانی کا ہاتھ تھا۔ لیکن وہ خود کبھی کسی کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسے لوگوں کو تمام احکامات تو موجددار ہی جاری کرتا تھا۔ وہی لوگوں سے رابطہ کرتا تھا اور قیمتی بات تھی کہ وہ شبیردرانی ہی کا نام استعمال کرتا تھا لیکن شبیردرانی خود کبھی کسی کے سامنے نہیں آیا تھا۔ لیکن موجددار کا پولیس کے ہاتھ آجانے کا مطلب یہ ہوتا کہ شبیردرانی کی تمام سازشیں سامنے آجائیں۔ اسی لئے اس نے موجددار کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ زیادہ عرصہ تک پولیس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔ لیکن شبیردرانی نے سوچ لیا تھا کہ وہ پولیس کے موجددار تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا کوئی مناسب بندوبست کر لے گا۔

ایک اور خطرناک بات یہ ہوئی تھی کہ جگو نے پولیس دین پر حملے کا اعتراف کر کے نائلہ کو اس معاملے سے بالکل لا تعلق اور بے گناہ ثابت کر دیا تھا۔ نائلہ کے خلاف یہی تو ایک ایسی سازش تھی جس سے شبیردرانی اسے گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ نائلہ کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے بعد اس نے نائلہ کو یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی تھی کہ اتنا بڑا خطرہ مول لے کر وہ اسے پولیس کی حراست سے نکال کر لایا ہے۔ اگر نائلہ اس کی بات مان لے تو اس پر سے صادق کے قتل کا کیس ختم ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر پولیس دین پر حملے کا الزام بھی اسی پر آئے گا لیکن نائلہ نے اس سے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی کوئی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

شبیردرانی سوچ رہا تھا کہ اگر عدالت نے نائلہ کو ان الزامات سے بری قرار دیدیا تو وہ اس کے لئے اور زیادہ خطرناک ہو جائے گی۔ رضیہ کی طرح وہ بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ انسپٹر اعظم کو کس نے قتل کروایا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ آموں والی حویلی میں کیا کچھ ہوتا رہا تھا۔ پہلے تو نائلہ پولیس کے خوف سے کھل کر سامنے نہیں آسکتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے شبیردرانی کو بہت نقصان پہنچائے تھے۔ اس بے بازو کی ہڈی توڑ دی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی حویلی کو آگ لگائی تھی۔ اس کی بیپ توڑ کر نہر میں پھینک دی تھی اور پھر نہ صرف وہ دلاور کو اس کے چنگل سے نکال کر لے گئی تھی بلکہ اس کی باجیہ کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ نائلہ کو گرفت میں لینے کے لئے اب تک لاکھوں روپے نقد خرچ کر چکا تھا۔ کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لیکن نائلہ پھر بھی اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی اور معاملہ مزید سنگین ہو گیا تھا۔ نائلہ قانون کے حصار سے نکل رہی تھی اور خود اس کے گرد جال تنگ ہو رہا تھا۔ یہ سازشوں کا جال اس نے نائلہ کے لئے پھیلایا تھا۔ لیکن وہ خود اس میں پھنس رہا تھا۔

شبیردرانی یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کا ایک نوکر دوڑتا ہوا اندر آیا۔ وہ بری طرح بدحواس تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے؟ قیامت آرہی ہے کیا؟“ شبیردرانی نے اسے گھورا۔

”پولیس نے جنگلے کو گھیرے میں لے لیا ہے سرکار۔ انسپٹر سپاہیوں کو لے کر اندر آرہا ہے۔“ نوکر نے ہچکتے ہوئے بتایا۔

”آئے دو۔“ شبیردرانی نے کہا۔ اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دھڑ سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور انسپکٹر پانچ چھ سیلنگ کانشیلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

”کیا میں اس مکان پر پولیس کی چڑھائی کا مطلب پوچھ سکتا ہوں انسپکٹر؟ اور کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہاری اس حرکت کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟“ شبیر درانی نے انسپکٹر کو گھورا۔ اس کا لہجہ پرسکون تھا۔

”اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں نتائج کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی اور جہاں تک بنگلے پر پولیس کی چڑھائی کا تعلق ہے تو میرے پاس آپ کے معتمد خاص موجددار کی گرفتاری اور اس بنگلے کی تلاشی کے وارنٹ موجود ہیں۔ ویسے بھی پولیس کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی خطرناک مجرم کی گرفتاری کے لئے وہ کسی بھی جگہ چھاپا مار سکتی ہے۔“ انسپکٹر نے اسے موجددار کی گرفتاری اور گھر کی تلاشی کے وارنٹ دکھائے۔

”سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لو انسپکٹر کہ موجددار میرا معتمد خاص نہیں تھا۔ وہ بھی عام نوکروں کی طرح ایک نوکر تھا جو میرے دروازے پر پڑا مفت کی روٹیاں توڑ رہا تھا۔ لیکن اس نے کونسا سنگین جرم کیا ہے؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”لیکن میں جانتا ہوں کہ کوئی معمولی سا نوکر کسی بڑے اور با اثر آدمی کی پشت پناہی کے بغیر کوئی معمولی سا جرم بھی نہیں کر سکتا۔“

”تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ موجددار نے اگر کوئی جرم کیا ہے تو اسے میری پشت پناہی حاصل ہے۔“ شبیر درانی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا تھا۔

”میں نے کسی کا نام نہیں لیا درانی صاحب۔“ انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن کوئی معمولی آدمی کسی بڑے آدمی کی پشت پناہی کے بغیر بے در پے اتنے سنگین جرائم نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ تو پتہ چل گیا ہو گا کہ آج صبح جگمو کو بھی عدالت کے احاطے میں قتل کر دیا گیا ہے اور اس میں بھی آپ کے اس معتمد خاص موجددار کا ہاتھ ہے۔ آج کی اس کارروائی میں جگمو اور تین پولیس والوں سمیت سات آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔“

”کون جگمو.....؟“ شبیر درانی نے اسے گھورا۔

”جس کے چھڑانے کے لئے آپ نے مجھے بلیسٹک چیک پیش کیا تھا۔ اتنی جلدی بھول گئے اس جگمو کو۔“ آپ۔

”اوہ..... اچھا۔ تم جگمو پملوان کی بات کر رہے ہو۔“ شبیر درانی بولا۔

”جی وہی جگمو پملوان.....“ انسپکٹر بولا۔ ”موجددار کہاں ہے؟“

”وہ میرا معمولی سا نوکر تھا۔ کہیں چلا گیا ہو گا۔“ شبیر درانی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ انسپکٹر نے کانشیلوں کو اشارہ کیا۔ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر پورے بنگلے میں پھیل گئے۔

”یہ حرکت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی انسپکٹر۔“ شبیر درانی بولا۔

”اس قسم کی دھمکیاں آپ مجھے پہلے بھی دے چکے ہیں درانی صاحب۔“ انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ پولیس کے محکمے میں کالی بھیڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ رشوت اور آپ جیسے بڑے آدمیوں کی دھونس دھمکیوں نے پولیس میں کرپشن کو پھیلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ جیسے لوگ ناجائز کاموں کے لئے پولیس کے اہل کاروں پر دباؤ

ڈالیں تو پولیس والے اپنے فرائض سے غفلت نہ برتیں اور نہ ہی ناجائز کاموں میں ملوث ہوں۔ لیکن پولیس

ایسے دیانت دار اور فرض شناس آدمی ابھی موجود ہیں جو فرض کی ادائیگی کو اپنی جان پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال وہ دو معمولی کانٹیل ہیں جنہوں نے اپنی تحویل میں جھگو کو بچانے کے لئے اپنی رگیاں قربان کر دیں۔ ان دونوں کے جسموں پر اتنی گولیاں لگی ہیں کہ زخموں کا شمار مشکل ہو گیا تھا۔ میرے میں اگر بددیانتی ہوتی تو جھگو کو عدالت میں لانے کی بجائے اس رات آپ کا دیا ہوا بلیسنگ چیک قبول لیتا۔“

اس دور ان کانٹیل واپس آ گئے۔ اور انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلادیا۔  
 ”اس تعاون کے لئے شکریہ درانی صاحب۔“ انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔  
 دو جمدار کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے اور آپ سے بھی دوبارہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ جمدار کی گرفتاری سے کچھ مزید سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔“

انسپکٹر اپنے آدمیوں کو لے کر چلا گیا اور شیر درانی زخمی بھڑکے کی طرح کمرے میں ٹھلنے لگا۔ اس کے سے ہلکی ہلکی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایس بی جیسے آفسر سے ملاقات کے لئے گھنٹوں اس کے دروازے پر بیٹھے رہتے تھے اور جب انہیں شرف بازیابی بخشا جاتا تو وہ اس کے سامنے کھڑے رہتے تھے اور جب تک انہیں اجازت نہ دی جائے بیٹھتے نہیں تھے۔ بات تے ہوئے ان کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ لیکن آج ایک معمولی سا انسپکٹر اس کے گھر کی تلاشی لے گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا رہا تھا۔ وہ ٹھلے ٹھلے ٹیلی فون کے قریب رک گیا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

”راجہ صاحب سے بات کرو۔ شیر درانی بول رہا ہوں۔“ اس نے دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سننے لگا۔

”ہولڈ کیجئے سرکار۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی اور پھر ریسیور پر راجہ صاحب کی زنگائی دی۔ ”جی درانی صاحب! کیسے یاد فرمایا؟“  
 ”اے بابا میں نے ایک کام کہا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟“ شیر درانی بولا۔

”میں نے ٹیلی فون پر آئی جی صاحب سے بات کی تھی۔“ راجہ صاحب نے جواب دیا۔ ”لیکن ان کا کہنا کہ اس ڈی ایس پی کے خلاف محکمہ طور پر یا عوام کی طرف سے بھی کبھی کوئی شکایت نہیں ملی۔ اس کا رو بہت شاندار ہے۔ وہ ایک فرض شناس اور ذمے دار آفسر ہے۔ بغیر کسی وجہ سے اسے ٹرانسفر نہیں کیا لگا۔ وہ علاقے میں اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔“

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تم بے بس اور لاچار ہو گئے ہو۔ تمہارا اسمبلی میں جانا بیکار ثابت ہوا۔ ایک دی پولیس انسپکٹر ہمارے گھروں کی تلاشیاں لے، ہمیں ذلیل کرتا پھرے اور تم اس معاملے میں کچھ نہیں کہتے۔“ شیر درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

”درانی صاحب۔ بات یہ ہے کہ ہم پر بھی کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں نا۔ لوگوں نے ہمیں اسمبلی اس لئے تو نہیں بھیجا کہ ہم انہیں نظر انداز کر کے صرف اپنے ذاتی مفاد کی بات کریں اور ان لوگوں

”گولی مارو ان لوگوں کو۔“ شیر درانی نے غراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تمہیں اسمبلی تک بھیجنے لے یہ بھیک مانگنے والے لوگ نہیں، ہم ہیں۔ تم اپنی اوقات بھول گئے ہو۔ یہ فراموش کر چکے ہو کہ تمہیں



میرے باپ نے پالا تھا۔ تمہیں پڑھایا لکھایا تھا۔ تمہیں سیاست میں لانے اور اسمبلی تک پہنچانے والا بھی میرا باپ ہی تھا۔ اس کے مرنے کے بعد میں تمہیں سپورٹ کرتا رہا اور میری وجہ سے تم بھاری دوٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو کر تیسری مرتبہ اسمبلی میں پہنچے ہو۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا آج اس طرح آنکھیں بدل لے گا؟ اس قدر احسان فراموش ثابت ہوگا؟ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔“

”میں احسان فراموش نہیں ہوں درانی صاحب۔“ راجہ صاحب نے جواب دیا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ آپ کے والد کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ مجھے سیاست میں لانے اور اسمبلی تک پہنچانے والے بھی وہی تھے۔ لیکن ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسمبلی میں ان کا اپنا کوئی ایسا آدمی موجود ہو جو اس علاقے کے غریب عوام کی تکالیف دور کرائے، علاقے کے مسائل حل کرائے اور میاں کے لوگوں کی آواز حکومت تک پہنچا سکے۔ آپ کے والد نے مجھ سے کبھی کوئی ناجائز کام نہیں کروایا۔ کسی کی ناجائز سفارش نہیں کی، البتہ وہ عوام کی بھلائی کے کاموں کے لئے مجھ پر ہمیشہ دباؤ ڈالتے رہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد صورتحال بتدریج تبدیل ہونے لگی۔ آپ اور آپ کی والدہ حسدِ بیگم مجھ پر ہمیشہ ایسے کاموں کے لئے دباؤ ڈالتے رہے جو میرے ضمیر کے خلاف ہیں۔ میں آخر تک نک.....“

شیردرانی نے ریسورٹ لیا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے باپ کے ٹکڑوں پر پلنے والا شخص آج اس طرح نظریں پھیر گیا تھا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ لیکن یہ بات اتنی کھوپڑی میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ خود غلط ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھتا تھا اور اس کی یہی منطق اسے بتدریج تباہی کی طرف لے جا رہی تھی۔

شیردرانی اچھی طرح جانتا تھا کہ موجددار کی گرفتاری اس کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ اس لئے اس نے بروقت کارروائی کرتے ہوئے موجددار کو نور پور بھیج دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پولیس موجددار کی تلاش میں کسی جگہ کو نظر انداز نہیں کرے گی۔ لیکن نور پور ایک ایسی جگہ تھی جہاں پولیس کا دھیان نہیں جاسکتا تھا۔

وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ لوگوں کو فون کرتا رہا لیکن اسے کہیں سے بھی کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا تھا۔ اور پھر شام سے ذرا پہلے وہ گل مرگ کے لئے روانہ ہو گیا۔

سنی والا پل پر چار مسلح پولیس والے کھڑے تھے جو شر سے باہر جانے والی بسوں، تمام گاڑیوں اور تانگوں کو بھی چیک کر رہے تھے۔ شیردرانی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی اور پولیس کو موجددار کی تلاش تھی۔

شیردرانی کی کار جیسے ہی پل کے قریب پہنچی پولیس نے اسے بھی روک لیا۔

”کیا بات ہے؟“ شیردرانی نے پولیس والے کو گھورا۔

”گاڑی چیک کرنی ہے۔ ڈکی کھولنے۔“ پولیس والے نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔

”مجھے نہیں جانتے کون ہوں میں؟“ شیردرانی غرایا۔

”اچھی طرح جانتا ہوں جناب۔“ پولیس والے نے جواب دیا۔ ”ہمیں ایک خطرناک مجرم کی تلاش ہے۔ ہمیں حکم ملا ہے کہ شر سے باہر جانے والی ہر گاڑی کو چیک کیا جائے۔ برائے کرم نیچے اتر کر ڈکی کھول دیجئے تاکہ ہم اپنا اطمینان کر لیں۔“

شیردرانی جھنجھلاتے ہوئے انداز میں کار سے اتر آیا اور پچھلی طرف آکر ڈکی کھول دی۔ ڈکی میں کچھ

میں تھا۔

”ٹھیک ہے جناب۔ اس زحمت کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ آپ جا سکتے ہیں۔“ پولیس والے نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

شبیر درانی نے غصے میں دھڑے ڈکی بند کردی اور اسٹیرنگ کے سامنے آگیا۔ انجن اشارت کر کے اس نے کار اس زوردار جھٹکے سے آگے بڑھائی تھی کہ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ مڑ مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے۔ گردوغبار کے بادل نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

شبیر درانی غصے اور جھنجھلاہٹ میں طوفانی رفتار سے کار چلا رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو وہ سامنے سے آتی ہوئی ایک بس اور پھر ایک بیل گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ تیسری مرتبہ پٹھوں سے لدے ہوئے ایک رٹرے سے ٹکرانے کی کوشش میں اس کی کار سڑک سے اتر کر کچے میں پہنچ گئی تھی۔ اگر وہ فوراً ہی کار کو نہ سنبھال لیتا تو کار کھیتوں میں جا کر الٹ جاتی۔

اس طرح تیز رفتاری اور لا پرواہی سے کار چلانے سے اس کے معزوب بازو کو بھی زوردار جھٹکے لگ رہے تھے جس سے اس کے بازو میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ مگر اس نے کار کی رفتار کم نہیں کی تھی۔ مین روڈ سے گاؤں والی سڑک پر مڑتے ہوئے بھی کار اٹلتے اٹلتے بچی تھی۔ حویلی کی طرف جاتے ہوئے راستے میں واندہ دنگا چٹنے والی مرغیاں اس قیامت کو دیکھ کر شور مچاتی ہوئی بچنے کے لئے ادھر ادھر اڑی تھیں مگر ایک مرغی کار کے پے کے نیچے آکر چلی گئی تھی۔ شبیر درانی نے اس زور سے بریک پڈل دبایا تھا کہ کار کچی زمین پر دور تک کھسکتی چلی گئی تھی اور گردوغبار کے ایک گمرے بادل نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

شبیر درانی اس وقت تک کار میں بیٹھا رہا جب تک گردوغبار کا یہ بادل صاف نہ ہو گیا۔ بالاخر جب وہ کار سے اتر کر حویلی میں داخل ہوا تو حسینہ بیگم سے سامنا ہو گیا جو آنگن میں کھڑی کسی بات پر ایک ملازمہ پر برس رہی تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیا ہوا؟ تم اتنے وحشت زدہ کیوں ہو رہے ہو؟“ حسینہ بیگم نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔  
”کچھ نہیں ماں جی۔“ شبیر درانی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ”نبائے مقدر ہم سے کیوں روٹھ گیا ہے۔ ہر کام الٹا ہو رہا ہے۔ دشمن کے خلاف ہم نے جو جال پھیلائے تھے اب وہی جال ہمارے گرد اپنے پھندے تک کر رہے ہیں۔“

”پر ہوا کیا ہے؟“ حسینہ بیگم نے پوچھا۔

”ہمارے آدمیوں نے جگہ کو عدالت میں پیش ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اسے خاموش کرانے کے لئے چھ اور آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ مگر وہ کم بخت جگہ دو گولیاں کھانے کے بعد بھی اتنی دیر زندہ رہا کہ مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کا بیان ریکارڈ کر لیا گیا۔ اس نے بیان میں کہا ہے کہ اسے سارے احکامات موجددار سے ملتے ہیں اور اس نے پولیس وین پر حملے والے کیس میں نالہ کو بھی لا تعلق اور بے گناہ قرار دیتے ہوئے وین پر حملے کی ذمہ داری خود قبول کر لی ہے۔ رائے منصور کے وکیل نے جگہ کے اس بیان کی نقل حاصل کر کے اس کیس سے نالہ کی بریت کے لئے درخواست دیدی ہے۔ عدالت نے دو دن میں فیصلہ سنانے کے لئے تاریخ دی ہے۔“ شبیر درانی نے بتایا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ حسینہ بیگم کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

”اس سے بھی بری خبر یہ ہے کہ پولیس نے موجددار کی تلاش شروع کر دی ہے۔ ہمارے شر والے

مکان پر بھی چھاپہ مارا گیا تھا۔" شبیر درانی نے کہا۔

"پولیس کی یہ ہمت کہ ہمارے مکان پر چھاپہ مارے۔" حینہ بیگم کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔  
 "اب حالات بدل رہے ہیں ماں جی۔" شبیر درانی نے کہا۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارا زوال شروع ہو چکا ہے۔ پولیس یا سرکاری افسروں پر ہمارا دباؤ ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے اب ہمیں ہی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔"

"اور یہ راجہ کا بچہ کس مرض کی دوا ہے۔ یہ کس دن ہمارے کام آئے گا۔ تم نے اسے کیوں نہیں بلایا۔" حینہ بیگم نے کہا۔

"میں نے راجہ سے فون پر بات کی تھی۔" شبیر درانی نے کہا۔ "وہ کہتا ہے کہ وہ عوام کے دونوں سے اسبلی تک پہنچا ہے اور اس علاقے کے عوام کی بہتری اور بھلائی کے لئے کام کرے گا اور کسی ناجائز کام کے لئے کسی کا بھی دباؤ قبول نہیں کرے گا۔ اور اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔"

"اس کا ضمیر؟" حینہ بیگم نے دانت کچکچائے۔ "اس سے تو میں نمٹ لوں گی لیکن موجددار کہاں ہے؟"

"اسے میں نے نور پور والے ڈیرے پر بھیج دیا تھا۔ فی الحال وہی جگہ اس کے لئے محفوظ ہے۔ لیکن..... ہم ساری زندگی اس کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اس کا بھی کوئی نہ کوئی مستقل بندوبست کرنا پڑے گا۔" شبیر درانی نے کہا۔

"موجددار کے بارے میں ابھی تم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گے جو ہمیں اس دلدل میں کچھ اور آگے دھکیل دے۔" حینہ بیگم نے کہا۔

"لیکن ماں جی۔ اس کی زندگی ہمارے لئے موت کا پیغام ثابت ہوگی۔ وہ ہمارے تمام راز جانتا ہے۔ ہماری کوئی بات ہے جو موجددار سے پوشیدہ ہے۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو ایک ایک بات پولیس کو بتا دے گا۔" شبیر درانی نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" حینہ بیگم بولی۔ "لیکن دو تین روز تک تم اپنے حواس اور جذبات قابو میں رکھو۔ میں کل ہی شہر جا کر ڈپٹی کمشنر سے بات کروں گی۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا ماں جی۔" شبیر درانی نے کہا۔ "کوئی بھی شخص اس وقت ہمارے کام نہیں آئے گا۔"

"مجھے ایک مرتبہ اس سے بات تو کر لینے دو۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر ہم کوئی دوسرا حل سوچیں گے۔" حینہ بیگم نے کہا۔ "حینہ بیگم نے ناکام ہونا نہیں سیکھا۔ میں نے زندگی میں جو چاہا ہے وہ حاصل کیا ہے۔ مجھ سے ٹکرانے والا پاش پاش ہو جائے گا۔ نالکہ اگر قانون کی گرفت سے نکل بھی جائے تو میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گی۔"

اس سے پہلے کہ شبیر درانی کوئی جواب دیتا حویلی کا ایک نوکر بھاگا ہوا آیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" حینہ بیگم نے اسے گھورا۔  
 "پولیس نے بستی کو گھیرے میں لے لیا ہے ماکن۔" نوکر نے بتایا۔ "پولیس والے تین ٹرکوں پر بھر کر آئے ہیں۔ ایک انسپکٹر اور کئی پولیس والے حویلی کی طرف آرہے ہیں ماکن..... اگر آپ حکم دیں تو....."

”نہیں۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”حویلی کا گیٹ کھول دو اور پولیس والوں کو اندر آنے دو۔“ حینہ بیگم اور شبیر درانی کمرے سے نکل کر حویلی کے احاطے میں آگئے۔ ٹھیک اسی لمحہ ایک انپکٹر اور نچ چھ پولیس والے حویلی کے گیٹ پر نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ دو لیڈی کانسٹیبل بھی تھیں۔ ”کیا بات ہے انپکٹر۔“ حینہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”کیا ہم یہ سمجھیں کہ ہمارا نام بھی جرم پیشہ افراد کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے جو ہمارے گھروں پر اسی طرح چھاپے مارے جا رہے ہیں۔“ ”معاف کیجئے بیگم صاحبہ!“ انپکٹر نے کہا۔ ”میں آپ کا اور اس خاندان کا بیدار احترام کرتا ہوں۔ لیکن میں اس قسم کے ناخوشگوار فریضے بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔ ہم حویلی اور اس بستی کے گھروں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ میرے پاس تلاشی کا وارنٹ موجود ہے۔“ انپکٹر نے اسے ایک کاغذ دکھایا۔ ”کیوں..... کیوں لینا چاہتے ہو تلاشی؟“ حینہ بیگم غرائی۔ ”میرا خیال تھا کہ درانی صاحب نے آپ کو بتادیا ہو گا۔“ انپکٹر نے کہتے ہوئے شبیر درانی کی طرف دیکھا۔

”تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے کسی قاتل کو اپنی حویلی یا اس بستی میں چھپا رکھا ہے؟“ حینہ بیگم بولی۔ ”ہمیں جس شخص کی تلاش ہے وہ آپ کا ملازم ہے۔ عین ممکن ہے اس نے یہاں پناہ لے رکھی ہو۔ آپ جانتی ہیں کہ اولاد جب کوئی خفیہ محسوس کرتی ہے تو والدین کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتی ہے اور نوکر مرے یا مصیبت کے وقت اپنے مالک کے زیر سایہ ہی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔“ انپکٹر نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم تلاشی لے سکتے ہو۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”میں کل صبح ہی ڈی سی سے بات کر دی تھی۔“ ”فرہارے خلاف یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ کیا بگاڑا ہے ہم نے قانون کا؟ ہمارے خاندان نے اس کے ریگزاروں کو گل گزار بنایا۔ دن رات کی محنت سے لہلہاتی فصلیں اگائیں۔ اس علاقے کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور ہماری خدمات کا یہ صلہ مل رہا ہے کہ ہمیں جرائم پیشہ لوگوں کی صف میں شامل کر کے رسوا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے گھروں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے، لے لو تم حویلی کی تلاشی۔“

انپکٹر نے دونوں لیڈی کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا۔ وہ حویلی کے کمروں کی طرف چلی گئیں اور دوسرے کانسٹیبل حویلی کے دوسرے حصوں کو چیک کرنے لگے۔ حینہ بیگم اور شبیر درانی ڈرائنگ روم میں آگئے جبکہ انپکٹر احاطے میں کھڑا رہا۔

دو گھنٹوں کے بعد پولیس والے بستی سے نکل کر رُکوں پر سوار ہو گئے۔ انپکٹر بھی حینہ بیگم اور شبیر درانی سے معذرت اور تعاون پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا حویلی سے نکل کر اپنی جیب پر سوار ہو گیا اور پولیس کا قافلہ شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

حینہ بیگم اور شبیر درانی بری طرح بھنائے ہوئے تھے۔ ان کا وقار خاک میں مل گیا تھا۔ حویلی کے مین اور بستی میں رہنے والے ان کے مزارعے چھ میگوئیاں کر رہے تھے۔ بڑے بڑے پولیس آفیسر اس حویلی کے دروازے پر حاضری دینے اور وظیفہ وصول کرنے تو آتے رہتے تھے لیکن یہ صورتحال انہوں نے تجربہ دیکھی تھی۔ پولیس والے حویلی اور بستی کے ہر گھر کی تلاشی لے رہے تھے اور حینہ بیگم اور شبیر درانی بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے حکم کے بغیر پتا بھی حرکت نہیں کرتا تھا۔ ان

کے نام ہی سے لوگ قمر قمر کا بننے لگتے تھے اور آج ان کے چروں پر خوف کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

اس رات بھی دونوں ماں بیٹوں میں دیر تک منصوبے بنتے رہے۔ وہ دونوں اگرچہ اپنے ارد گرد منڈلاتے ہوئے خطرات کو واضح طور پر محسوس کر رہے تھے لیکن حقیقت کو سمجھنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ انہیں اب بھی یہی زعم تھا کہ دولت کے بل بوتے پر وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ ہزاروں ایکڑ اراضی کے مالک تھے لیکن ان کی نظرس نائلہ کی اراضی اور دیگر جائیداد پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ماں بیٹا ہر صورت میں نائلہ کی جائیداد پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ اس کے لئے اب تک درجنوں بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ لاکھوں روپے خرچ ہو گئے تھے۔ لیکن ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ صورتحال ان کی توقع کے برعکس رخ بدل رہی تھی۔ نائلہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے خلاف پھیلانے ہوئے ان کی سازشوں کے جال کے پھندے ٹوٹ رہے تھے۔

حسینہ بیگم سوچ رہی تھی کہ پھندے واقعی ٹوٹ رہے تھے۔ ایک آخری پھندہ رہ گیا تھا اور وہ بھی ایک دو روز میں ٹوٹنے والا تھا۔ جگہ کے بیان کے بعد صورتحال بالکل ہی تبدیل ہوتی نظر آرہی تھی۔ رائے منصور کے وکیل نے کیس سے نائلہ کی بریت کے لئے درخواست دیدی تھی اور حسینہ بیگم کو یقین تھا کہ فیصلہ نائلہ ہی کے حق میں ہوگا۔ کیونکہ نائلہ کو کسی ایسے کیس میں پھنسانے کی سازش اسی نے تیار کی تھی اور اس کے لئے انیکٹر اعظم کو بھی دو لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ اگر جگہ پولیس کے ہاتھ نہ لگتا تو نائلہ کی خلاف اس سازش کا راز فاش نہیں ہو سکتا تھا۔ حسینہ بیگم کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ جگہ کو گرفت لینے والی بھی نائلہ ہی تھی۔ اس نے دلاور کے ساتھ جگہ کے اڈے پر بٹہ بول دیا تھا۔ موحمد ار اور اس کے آدمیوں نے جیب پر تعاقب کر کے انہیں اور جگہ کو راستے میں ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں نہ صرف ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا بلکہ جیب الٹ جانے سے ان کا ایک آدمی ٹانگ کی ہڈی بھی تڑوا بیٹھا تھا۔

حسینہ بیگم اچھی طرح جانتی تھی کہ نائلہ کی بریت کے بعد اس کے نام جائیداد کی عمرانی بھی منسوخ ہو جائے گی اور نائلہ اس سے ایک ایک پائی کا حساب لے گی۔ کئی روز پہلے وہ نائلہ کے شروالے بنگلے سے تمام قیمتی سامان اٹھوالائی تھی۔ مگر نائلہ نے اس کے بیٹے کی ٹھیک ٹھاک مرمت کرنے کے بعد حکم دیا تھا کہ تین دن کی اندر اندر تمام سامان واپس بنگلے پر پہنچا دیا جائے۔ شبیر درانی کی چوٹیں تازہ تھیں۔ اس نے ماں کو مجبور کر کے اس کا سارا سامان واپس بھجوا دیا تھا۔

حسینہ بیگم کے خیال میں نائلہ وحشی بن گئی تھی۔ وہ ان سے ایک ایک بات کا حساب لے گی اور کسی صورت میں بھی انہیں نہیں بخشے گی۔

دوسرے روز صبح سویرے ہی حسینہ بیگم اپنے بیٹے کے ساتھ شہر آگئی۔ دس بجے کے قریب حسینہ بیگم نے ڈپٹی کمشنر کو فون کیا تو جواب ملا کہ صاحب میننگ میں ہیں۔ مزید دو مرتبہ فون کرنے کے بعد بھی یہی جواب ملا تو حسینہ بیگم خود ڈی سی کے دفتر پہنچ گئی۔ ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کے لئے حسینہ بیگم کو تقریباً "چالیس منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہ انتظار گاہ میں بیٹھی بے چینی سے کرسی پر پلو بدلتی رہی۔ انتظار گاہ میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی ایسا تھا جو حسینہ بیگم کو پہچانتا تھا۔ لیکن وہ بھی لا تعلق سا بیٹھا رہا۔ دوسرے لوگ بھی حسینہ بیگم کی بے چینی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ حسینہ بیگم نے کم از کم تین مرتبہ چپراسی کو بلا کر کہا تھا کہ وہ ڈی سی صاحب کو اطلاع کر دے کہ حسینہ بیگم ملاقات کے لئے آئی ہے۔

”بیگم صاحبہ! میں نے صاحب کو بتادیا ہے۔ وہ میٹنگ میں مصروف ہیں۔ کچھ اور افسران بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ جیسے ہی فارغ ہوں گے آپ کو بلا لیں گے۔“ چپراسی نے کہا تھا۔  
 اور پھر ٹھیک چالیس منٹ بعد چپراسی نے حسینہ بیگم کو صاحب کے دفتر کا راستہ دکھادیا۔ حسینہ بیگم جب دفتر میں داخل ہوئی تو ڈی سی نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔  
 ”معاف کیجئے بیگم صاحبہ۔“ ڈی سی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”کچھ اہم انتظامی امور درپیش تھے۔ مختلف محکموں کے ضلعی سربراہوں سے میٹنگ ہو رہی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ تشریف رکھئے۔“

حسینہ بیگم میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سرکاری آفیسر کے دفتر آئی تھی۔ ورنہ اس عہدے پر آنے والا ہر شخص سب سے پہلے ان کے دروازے پر حاضری دیا کرتا تھا۔ مگر اب حالات بدل رہے تھے اور اسے ڈی سی سے ملاقات کے لئے چالیس منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔  
 ”میں صرف یہ پوچھنے کے لئے آئی ہوں کہ آپ کا قانون ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے۔ ہمیں اس طرح ذلیل و سوا کیوں کیا جا رہا ہے؟“ حسینہ بیگم نے کہا۔  
 ”میں سمجھا نہیں بیگم صاحبہ!“ ڈی سی نے کہا۔

حسینہ بیگم نے اسے چھاپوں کے بارے میں بتایا تو ڈی سی نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”قانون سے بالاتر تو کوئی بھی نہیں ہو سکتا بیگم صاحبہ۔“ ڈی سی نے کہا۔ ”آپ نے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ پہلے ہی سے میرے علم میں ہے۔ پولیس کو ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جو بہت سے سنگین جرائم میں ملوث ہے اور اتفاق سے وہ شخص آپ کا پرانا ملازم ہے۔ میرا خیال ہے پولیس نے اب تک ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جسے غیر قانونی کہا جاسکے۔ آپ کے شہر والے مکان اور حویلی پر چھاپے بمبھڑٹ کی باضابطہ اجازت کے تحت مارے گئے تھے اور میری اطلاع کے مطابق پولیس کے کسی اہل کار نے کوئی ایسی حرکت بھی نہیں کی جسے بد تمیزی کے زمرے میں شمار کیا جاسکے۔ ہم تو آپ کے بچہ مشکور ہیں کہ آپ لوگ قانون سے تعاون کر رہے ہیں۔“

حسینہ بیگم ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چند لمحے شعلہ بارنگا ہوں سے ڈی سی کی طرف دیکھتی رہی پھر پیر پختی ہوئی دفتر سے نکل گئی۔

حسینہ بیگم کو یقین تھا کہ نوجوان ڈپٹی کمشنر اس سے مرعوب ہو کر اس کی باتوں میں آجائے گا اور اس کے کسی کام آئے گا مگر وہ بھی قانون کی گردان سنانے بیٹھ گیا تھا۔ حسینہ بیگم جب گھر واپس پہنچی تو اس کا موڈ کچھ اور بھی بگڑا ہوا تھا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ اس حاکم ضلع کے پاس جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ شبیر درانی نے کہا۔  
 ”دیکھ لوں گی۔ میں سب کو دیکھ لوں گی۔“ حسینہ بیگم غرائی۔ ”ناکد اور موجددار والا مسئلہ حل ہو جائے تو ایک ایک سے نمٹ لوں گی۔ آج جو لوگ نظریں پھیر رہے ہیں کل کتوں کی طرح میرے پیر چاٹنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تم اپنی ماں کو اتنا بے بس مت سمجھو کہ وہ کسی کے سامنے جھک جائے گی۔ میں نے یہاں آنے والے وزیر کو اپنے قدموں پر جھکے پر مجبور کر دیا تھا تو یہ لوگ کیا ہیں۔“  
 ”موجددار کے مسئلے کا حل تو میں نے سوچ لیا ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اسے ختم کر کے اس کی لاش غائب کر دی جائے۔ پولیس یہی سمجھتی رہے گی کہ وہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔“

”ابھی نہیں۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”پہلے نائلہ کی بریت والی درخواست کا فیصلہ ہو لینے دو۔ اس کے بعد کوئی حل سوچیں گے۔ لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ موجودہ دارنور پور والے ڈیرے پر محفوظ ہے؟“

”جی ماں جی۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”وہاں اس کی موجودگی کا کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے احمد نواز کو بھی پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ اس کا خیال رکھے اور بستی کے کسی شخص کو ڈیرے کی طرف نہ جانے دے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب دو دن خاموشی سے گزار دو۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

دو دن واقعی خاموشی میں گزر گئے اور پھر جس روز نائلہ کی درخواست کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ حینہ بیگم نے اپنے منشی کو عدالت بھیج دیا اور ایک بجے کے قریب جب منشی واپس آیا تو حینہ بیگم نے اس کے چہرے کے تاثرات ہی سے اندازہ لگا لیا کہ عدالت نے کیا فیصلہ سنایا ہو گا۔

”عدالت نے نائلہ بی بی کو باعزت طور پر بری کر دیا ہے ماکن۔“ منشی نے اس کے پوچھے بغیر بتا دیا۔

”مجھے یقین تھا کہ یہی فیصلہ ہوتا تھا۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”اور ماکن.....“

”ہاں ہاں، کو خاموش کیوں ہو گئے؟“ حینہ بیگم نے ابھی ہوئی نگاہوں سے منشی کی طرف دیکھا۔

”نائیلہ بی بی کے وکیل نے عدالت سے وہ احکامات بھی منسوخ کروا دیے ہیں جن کے تحت آپ کو اس کی جائیداد کی نگرانی سونپی گئی تھی۔“ منشی نے بتایا۔

”کیا.....؟“ حینہ بیگم ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اور نائلہ بی بی نے پیغام دیا ہے کہ آپ حساب کتاب درست کر لیں۔ وہ ایک ایک پائی کا حساب لیں گی۔“ منشی نے کہا۔

”اوہ!“ حینہ بیگم چونک گئی۔ ”تو کیا نائلہ بھی عدالت میں موجود تھی؟“

”جی ہاں ماکن۔“ منشی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ پہلے تو کسی کو اس کی موجودگی کا پتہ ہی نہیں چل سکا تھا لیکن جب عدالت نے فیصلہ سنایا تو وہ سر سے چادر ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس نے اس فیصلے پر مجسمیٹ کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس طرح لوگوں کو عدالت میں نائلہ کی موجودگی کا پتہ چلا تھا۔“

”ہوں۔“ حینہ بیگم کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ”حساب تو میں اسے ایسا دوں گی کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر منشی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے وہ رائے منظور کے ساتھ صادق آباد چلی گئی ہوگی۔“

”نہیں ماکن۔“ منشی نے جواب دیا۔ ”وہ ان سب کو لے کر اپنے بیگلے پر گئی ہے۔“

”تمہیں کیسے پتہ کہ وہ اپنے بیگلے پر ہی گئی ہے۔“ حینہ بیگم نے اسے کھورا۔

”اس کے وکیل کے منشی نے بتایا تھا ماکن۔“ منشی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ.....“ حینہ بیگم نے کہا۔

اتفاق سے شبیر درانی اس وقت موجود نہیں تھا۔ حینہ بیگم سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ یہ واقعی بہت برا ہوا تھا۔ عدالت نے نائلہ کی اسٹیٹ اور دیگر جائیداد کی نگرانی امانتاً اس کے سپرد کی تھی۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ہر چیز کی مالک سمجھ بیٹھی تھی۔ تقریباً چھ لاکھ کا اناج سیٹھ جیٹا منڈ کے

تھ فروخت کر شیردرانی نے گودام اور حویلی کو آگ لگادی تھی جس میں ہرچیز جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کچھ کیا تھا۔ ان کے زیر استعمال یہ ٹیوٹا کار بھی دراصل نائلہ ہی کی ملکیت تھی نئے وہ ماں بیٹا بڑی بے تکلفی سے استعمال کر رہے تھے اور حسینہ بیگم سوچ رہی تھی کہ اگر حساب کے لئے نائلہ نے عدالت سے رجوع کیا تو ان کے لئے نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔

اس وقت چار بجتے والے تھے۔ شیردرانی کا پتہ نہیں تھا کہاں چلا گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ بالآخر حسینہ بیگم ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گئی اور ایک جھگڑے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ ٹیوٹا کار ڈرائیو کرتی ہوئی نائلہ کے بنگلے کی طرف جا رہی تھی۔

نائیلہ کے بنگلے کے سامنے پاجرو کھڑی تھی۔ حسینہ بیگم نے کار اس کے پیچھے ہی روک لی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آئی۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور پھر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ قریباً ”دونت بعد شباب الدین نے دروازہ کھولا۔ حسینہ بیگم کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”نائیلہ یہاں آئی ہے؟“ حسینہ بیگم نے خوشخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی بڑی بیگم صاحبہ!“ شباب الدین نے جواب دیا۔

حسینہ بیگم مزید کچھ کہے بغیر شباب الدین کو ایک طرف دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ سیدھی ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ وہاں سے ڈرائنگ روم صاف نظر آرہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ڈرائنگ روم کے دروازے پر رک گئی۔ سامنے ہی نائلہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ حسینہ بیگم کو دیکھ کر ایک جھگڑے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

حسینہ بیگم دروازے میں کھڑی تھی اور وہ دونوں کھاجانے والی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے کی؟ ظاہر ہے آپ مجھے مبارک باد دینے کے لئے تو نہیں آئی ہوں گی؟“ نائلہ نے کہا۔ اس کے چہرے پر کسی حد تک نرمی آگئی تھی۔

”تمہیں مبارک باد دیتی ہے میری جوتی۔“ حسینہ بیگم کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”میں تمہیں یہ کہنے آئی ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہ شہر چھوڑ دو۔ میں اس شہر میں ایک منٹ کو بھی تمہارا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔“

”کھیا نی بلی کے کھبا نو پنے والا محاورہ ویسے تو کئی بار سنا اور پڑھا تھا لیکن اس کا عملی مظاہرہ آج دیکھنے میں آ رہا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر تاؤ دلانے والی مسکراہٹ تھی۔ ”مجھے اس قسم کا مشورہ دینے سے پہلے آپ کو اپنے اور اپنے بیوت کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ دولت کی ہوس نے آپ کو اس حد تک گرا دیا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خلاف آپ نے کیسی کیسی گھٹاؤنی سازشیں نہیں کیں۔ ابھی تو میں نے ان کا حساب لینا ہے اور پھر ان بے گناہوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لیں۔ آپ کو دینا ہو گا جنہیں آپ کے اور بیٹے کے اشاروں پر بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ جمدار کو تو آپ نے چھپا دیا۔ ممکن ہے اب تک اسے اگلی دنیا میں بھی پہنچا دیا ہو۔ لیکن میں ابھی زندہ ہوں۔ آپ کی سازشوں اور آپ کے ڈھیروں جرائم کی گواہ۔ میرا تو آپ کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ قانون نے بھی مجھے باعزت طور پر بری کر دیا لیکن..... آپ دونوں اس دلدل سے نہیں نکل سکیں گے۔ صرف پھانسی کا پھندہ آپ کی زندگی کو ان ذہنوں سے نجات دلا سکے گا۔“



”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ حسینہ بیگم کے دانت بھنج گئے۔  
 ”یہ خیال رہے کہ اس وقت یہاں ایک قانون دان بھی موجود ہے۔“ نائلہ نے رائے صاحب کے  
 وکیل کی طرف اشارہ کیا۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں تم سب پر۔“ حسینہ بیگم نے دانت پکچپائے۔  
 ”لیکن میں آپ پر لعنت اس لئے نہیں بھیج سکتی کہ ابھی میں نے آپ سے ان چیزوں کا حساب لینا ہے  
 جنہیں آپ مال غنیمت سمجھ کر ہضم کر چکی ہیں۔ حویلی کے بدلے حویلی کا حساب برابر ہو سکتا ہے لیکن آپ  
 نے میرے گودام سے سیٹھ جٹھانند کے ہاتھ جو اناج فروخت کیا تھا اس کی قیمت آپ میرے حوالے  
 کر دیں۔ اس کے لئے میں آپ کو صرف تین دن کی مہلت دے رہی ہوں۔ اگر تین دن تک مجھے اناج کی  
 قیمت نہ ملی تو میں عدالت سے رجوع کروں گی اور پھر آپ کو حویلی اور دوسری چیزوں کا حساب بھی دینا ہوگا۔  
 ویسے میری طرف سے ایک اور پیشکش بھی ہے۔“ نائلہ خاموش ہو کر حسینہ بیگم کی طرف دیکھتی رہی۔ جب وہ  
 کچھ نہیں بولی تو نائلہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ اور آپ کا بیٹا یہ خونریزی بند کر دیں تو میں  
 اپنا حساب بھولنے کو تیار ہوں۔ پھر آپ جائیں اور قانون جانے۔ میں کوئی مداخلت نہیں کروں گی۔“  
 ”میں بھیک لینے کی عادی نہیں ہوں۔“ حسینہ بیگم غرائی۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے جو کچھ چاہا  
 ہے اسے حاصل کیا ہے۔ میں اس وقت تو جاری ہوں لیکن پھر آؤں گی۔“  
 ”میں آپ کے استقبال کے لئے یہاں موجود ہوں گی۔ اگر کھانے کا موڈ ہو تو..... یہ سب کچھ حاضر  
 ہے۔“ نائلہ نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

حسینہ بیگم کوئی جواب دے بغیر پیر پختی ہوئی باہر نکل گئی۔  
 نائلہ اور حسینہ بیگم کی گفتگو کے دوران رائے منصور وغیرہ خاموش ہی رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے  
 بھی ان کی گفتگو میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔  
 حسینہ بیگم سچ و تاب کھاتی ہوئی نائلہ کے ہنگلے سے نکلی تھی۔ وہ آئی تو یہاں کچھ اور سوچ کر تھی لیکن  
 رائے منصور اور اس کے وکیل کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی تھی اور نائلہ سے بیکاری پسینے بازی کے بعد  
 واپس آگئی تھی۔

نائلہ کا اطمینان اور سکون دیکھ کر حسینہ بیگم کو کچھ اور تاؤ آگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نائلہ سوکھ کر کاٹا  
 ہو چکی ہوگی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہوگی۔ لیکن وہ ہنسی کٹی تھی۔ دو ڈھائی مہینوں کی بھاگ دوڑ اور موت کے  
 خوف نے اسے زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔

حسینہ بیگم جب اپنے ہنگلے پر واپس پہنچی تو شبیر درانی موجود تھا۔ حسینہ بیگم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ  
 کہاں گئی تھی۔ اور نہ ہی شبیر درانی سے پوچھا کہ وہ کہاں غائب تھا البتہ رات کے کھانے پر شبیر درانی ہی نے  
 گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”موجودہ کار کی تلاش میں پولیس جس طرح چھاپے مار رہی ہے اس سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ وہ لوگ  
 جلد ہی موجودہ کار تک پہنچ جائیں گے۔“

”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“ حسینہ بیگم نے سوالیہ نگاہوں سے اس طرف دیکھا۔  
 ”میرا خیال ہے اسے رخصت کر دیا جائے۔ بصورت دیگر ہماری رخصتی کا بندوبست ہو جائے گا۔“ شبیر  
 درانی نے جواب دیا۔

”تو پھر بھولے کو نور پور پہنچ دو۔ وہ اس کا حساب چکنا کر دے گا۔“ حسینہ بیگم نے کہا اور جگ اٹھا کر گلاس میں پانی اڑیلنے لگی۔

”نہیں۔ میں خود ہی جاؤں گا۔ اب مجھے کسی پر اعتماد نہیں رہا۔ بھولا یا کسی اور کو تو یہ معلوم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ میں کہاں گیا ہوں۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

حسینہ بیگم جواب دینے کی بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”کب جاؤ گے؟“ بالا خر اس نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ پولیس نے پورے شہر کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ آمد و رفت کے تمام راستوں پر پولیس کی نگرانی ہے۔ اگر تم کسی کی نظروں میں آگئے تو.....“

”میں کسی کی نظروں میں نہیں آؤں گا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں آدھی رات کے وقت یہاں سے نکلوں گا۔ پیدل ہی جاؤں گا اور گلیوں ہی گلیوں میں ہوتا ہوا شہر سے باہر نکل جاؤں گا۔ چند میل کا فاصلہ ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہو شیار رہنا۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ موجددار کس قدر خطرناک آدمی ہے۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ تم کس نیت سے آئے ہو تو وہ پھل کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔“

”آپ مطمئن رہئے ناں جی۔ اسے ایسا کوئی موقع نہیں ملے گا۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے کھانے کی میز سے اٹھ گیا۔ اس نے بین میں ہاتھ دھوئے اور ڈائٹنگ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔

تھوڑی دیر بعد حسینہ بیگم بھی وہیں آئی اور وہ دونوں دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور پھر ٹھیک بارہ بجے شبیر درانی بیگلے سے نکل گیا۔ اس نے چادر اوڑھ لی تھی اور اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شبیر درانی شہر کی سڑکوں پر پیدل چل رہا تھا۔ تقریباً ”ایک گھنٹے بعد وہ شہر سے نکل گیا۔ نواحی علاقے میں آتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ لیکن کھیتوں میں پہنچ کر اس کی رفتار پھر کم ہو گئی۔ اس نے جیب سے پشیل ٹارچ نکال لی جو اس نے گھر سے روانہ ہوتے وقت خاص طور پر جب میں رکھی تھی۔ وہ

کھیتوں کے درمیان پگھلندی پر تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ جب نور پور کی بستی کے قریب پہنچا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ وہ بستی سے دور ہٹ کر چلتا رہا۔ ڈیرہ وہاں سے تقریباً ”نصف میل آگے تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں اسے دس بارہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

ڈیرے کے قریب پہنچ کر وہ محتاط ہو گیا۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ نالکہ درانی کے ہاتھوں زک اٹھا چکا تھا۔ اگر اس رات نالکہ نہ پہنچ جاتی تو اس کے آدمی دلاور کا کام تمام کر چکے ہوتے۔

شبیر درانی کو احساس تھا کہ اس نے بیک وقت کئی محاذ کھول رکھے تھے جس کی وجہ سے اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اب محاذوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ رضیہ ختم ہو گئی..... جھگو کو اگلی دنیا

پہنچا دیا گیا۔ اب صرف موجددار اور نالکہ رہ گئے تھے۔ یہ دونوں اہم ترین محاذ تھے۔ آج وہ موجددار سے نجات حاصل کر لے گا تو اس کی بہت سی پریشائیاں ختم ہو جائیں گی اور پھر صرف نالکہ رہ جائے گی جس سے منشا آسان ہو جائے گا۔

شبیر درانی ڈیرے والے مکان کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ اوپر سے گھوم کر مکان کے سامنے والے رخ پر آیا تو ایک لمبے کوڑک کر پشیل ٹارچ کی محدود روشنی میں اس پاس کا جائزہ لیتا رہا پھر دبے قدموں چلتا ہوا ایک

کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کا خیال تھا کہ موجددار سوچکا ہو گا لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک طرف بان کی جھلنگ سی چارپائی پر بستر موجود تھا مگر موجددار نہیں تھا۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ گولی مار دوں گا۔“

اپنی پشت پر یہ غراہٹ سن کر شبیردرانی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ لیکن موجددار کی آواز پہچان کر اسے اطمینان ہوا۔

”میں ہوں موجددار..... شبیردرانی۔“ اس نے کہا۔

”اوہ سرکار آپ۔“ موجددار کی آواز سنائی دی اور راتقل کی نال شبیردرانی کی پشت سے ہٹ گئی۔

موجددار نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور جیب سے ماچس نکال کر فرش پر رکھی ہوئی لائٹیں جلانے لگا۔ شبیردرانی نے پنسل ٹارچ بند کر کے جیب میں ڈال لی۔ لائٹیں کی زردی روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔

”آپ یہاں تک کیسے آئے سرکار۔ میں نے گاڑی کی آواز تو نہیں سنی تھی۔“ موجددار نے پوچھا۔

”آدھی رات کو گاڑی لے کر بنگلے سے نکلتا تو کسی کو شبہ ہو سکتا تھا۔“ شبیردرانی نے جواب دیا۔

”تمہیں اندازہ نہیں کہ شہر میں مجھے کس قدر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پولیس تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ شہر والے بنگلے کے علاوہ گل مرگ والی حویلی پر بھی چھاپے مارا جا چکا ہے۔ میں بڑی مشکل سے چھپتا چھپاتا یہاں تک پہنچا ہوں۔“ شبیردرانی نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے سرکار۔ میری وجہ سے آپ کو یہ پریشانیاں اٹھانا پڑ رہی ہیں۔ آپ بیٹھے نا سرکار۔“

موجددار نے چارپائی پر بے ترتیبی سے پڑا ہوا میلا سالخاف اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور بستر درست کرنے لگا۔ یہ چارپائی اور بستر بستی کا ایک آدمی احمد خودی چوری چھپے لے کر آیا تھا اور اسے کھانا بھی وہی پہنچاتا تھا۔

شبیردرانی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”جگو پر تو بڑا بھروسہ تھا تمہیں۔“ وہ موجددار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن دیکھ لیا اس کی وجہ

سے کیا کچھ ہو رہا ہے۔“

”مجھے حیرت ہے سرکار۔“ موجددار بولا۔ ”جگو پر مجھے سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔ ہمارے سارے

کام اسی نے کئے ہیں۔ اس کی زبان سے کبھی کوئی لفظ نہیں نکلا تھا۔ کوئی کام کرنے کے بعد وہ اس طرح بھول جایا کرتا تھا جیسے کیا ہی نہ ہو۔ لیکن.....“

”لیکن اگر اسے زندگی کچھ اور مہلت دیدیتی تو وہ سارے کارناموں کی ایک ایک تفصیل بتا دیتا۔“ شبیر

درانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور تم تو شاید آزاد ہی رہتے لیکن میں اس وقت آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتا۔“

”اب کیا پوزیشن ہے سرکار؟“ موجددار نے پوچھا۔ ”میرا کیا بنے گا؟“

”دو تین دن تک میں یہی سوچتا رہا ہوں۔“ شبیردرانی نے جواب دیا۔ ”تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں

ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے تمہیں باہر بھیج دیا جائے۔ آج کل سرکاری افسران بھی ہم سے کچھ ناراض نظر آتے ہیں۔ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو میں مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”مجھے کہاں جانا ہو گا سرکار؟“ موجددار نے پوچھا۔ وہ چارپائی کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا تھا اور راتقل

چارپائی کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کر دی تھی۔

”سرحد کے اس پار۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے رات نقل اٹھالی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ”میں نے انسپکٹر صوبہ خان سے بات کر لی ہے۔ کل اس کا ایک آدمی یہاں آکر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ صوبہ خان تمہیں انڈیا کی سرحد پار کرا دے گا۔ سرحد کے دوسری طرف بھی اس کے بڑے تعلقات ہیں۔ چند روز راجستھان میں رہو گے تو تمہاری صحت بھی کچھ بہتر ہو جائے گی۔“

”صوبہ خان؟“ موجددار اس نام پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ صوبہ خان اسے کونسی سرحد پار کرائے گا۔ انڈیا کی یا زندگی کی۔ ”نہیں سرکار۔“ وہ بولا۔ ”میں صوبہ خان کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ آپ اسے مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ وہ زندگی بھر آپ کو بلیک میل کرتا رہے گا اور ممکن ہے وہ مجھے سرحد پار کرانے کی بجائے اپنی قید ہی میں رکھے اور جب آپ اس کا کوئی مطالبہ پورا نہ کریں تو وہ مجھے سامنے لے آئے۔ آپ خود سوچئے تاکہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں علاقہ غیر چلا جاؤں۔ مجھے مہابت خان کے پاس پناہ مل جائے گی۔“

”نہیں موجددار۔“ شبیر درانی رات نقل سیدھی کر کے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ تم میرے سارے راز جانتے ہو۔ میں چاہتا تھا کہ صوبہ خان کے ذریعے تمہیں انڈیا کی سرحد پار کرا دی جائے لیکن صوبہ خان کے بارے میں تمہاری رائے بالکل درست ہے۔ وہ مجھے زندگی بھر بلیک میل کرتا رہے گا۔ تمہاری زندگی میرے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ کیوں نہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری زندگی کا خاتمہ کر کے اپنی زندگی کو محفوظ کر لوں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔“ موجددار بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ”میں نے زندگی بھر آپ کی خدمت کی ہے۔ آپ کی خاطر کئی لوگوں کو اپنے ان ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ آپ میری خدمات کا یہ صلہ دے رہے ہیں۔“

”اگر صرف خدمت ہوتی تو تمہیں اس کا بہت بڑا صلہ ملتا۔ ممکن ہے میں ایک آدھ مرلہ گز زمین بھی تمہارے نام لگا دیتا لیکن تم نے میری خاطر جو خوریزی کی ہے وہی آج میری زندگی کے لئے خطرہ بن گئی ہے۔ تمہارا زندہ رہنا میری موت کا باعث بن سکتا ہے اور تم جانتے ہو کہ جو شخص میرے راستے کی رکاوٹ بن رہا ہو میں اسے زندہ نہیں رہنے دیتا۔ تم بھی مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ موجددار۔“ شبیر درانی نے رات نقل سیدھی کر لی۔

”میں آپ کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنوں گا سرکار۔“ موجددار نے کہا۔ ”میں آج ہی رات یہاں سے نکل جاؤں گا۔ علاقہ غیر چلا جاؤں گا۔ آپ مہابت خان کو جانتے ہیں۔ وہ مجھے اپنے پاس پناہ دیدے گا۔ میں زندگی بھر دیہیں رہوں گا۔ ابھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔“

”نہیں موجددار۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”پولیس جب کسی کے پیچھے پڑ جاتی ہے تو اسے پاتاں سے بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ تم کہیں بھی چلے جاؤ، تمہاری زندگی میرے لئے خطرہ بنی رہے گی۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔“

”نہیں سرکار۔“ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“ موجددار بولا۔ موت کے خوف سے اس کا چہرہ سیاہ پڑتا جا رہا تھا۔ اس نے زندگی میں کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا مگر آج موت کو سامنے دیکھ کر ہر تھر کانپنے لگا تھا۔

تیس سال پہلے موجددار کا باپ شبیر درانی کے باپ کے پاس ملازم ہوا تھا۔ اس وقت موجددار کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس کی ماں مرچکی تھی۔ باپ ہی نے اسے ماں کا پیار بھی دیا تھا۔ درانی کی حویلی میں آنے کے بعد موجددار کی طرف سے اس کی فکر کچھ کم ہو گئی تھی۔ موجددار حویلی میں خدمات انجام دینے لگا تھا۔ حویلی میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔

موجددار کے اس حویلی میں آنے کے تقریباً "ایک سال بعد شبیر نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ شبیر کی صورت میں موجددار کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔ شبیر بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ حسینہ بیگم تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔

شبیر درانی ذرا بڑا ہوا تو ماں باپ کے لاڈ پیار سے وہ مجزتا چلا گیا۔ اس کی ہر خواہش اور ہر ضد پوری کی جاتی۔ موجددار ہر وقت شبیر درانی کے ساتھ لگا رہتا۔ حسینہ بیگم بھی مطمئن تھی۔ موجددار شبیر کا بہت خیال رکھتا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ شبیر پر جان چھڑکتا تھا۔

موجددار کے باپ کا انتقال ہو تو اس وقت موجددار کی عمر چودہ سال تھی۔ لیکن بڑے درانی صاحب کی شفقت نے اسے باپ کی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اسے گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ موجددار اور شبیر درانی ساتھ ساتھ پلتے رہے۔ موجددار نے نڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا مگر شبیر درانی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور جب شبیر کو تعلیم کے لئے شہر بھیجا گیا تو اس کی دیکھ بھال اور خدمت کے لئے موجددار کو بھی ساتھ بھیج دیا گیا۔ شبیر کی تعلیم سے فراغت کے بعد بھی موجددار اس کے ساتھ رہا۔

موجددار بچہ وفادار ثابت ہوا تھا۔ ماں باپ کے لاڈ پیار سے شبیر مجز چکا تھا۔ گاؤں اور شہر میں لڑائی جھگڑے اور دنگا فساد اس کا معمول بن چکا تھا۔ اس نے کالج میں بھی بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں اور موجددار ہمیشہ اس کی ڈھال بنا تھا۔ موجددار نے شبیر کو بچانے کے لئے کئی مرتبہ خود زخم کھائے تھے۔

شبیر درانی کو اپنے باپ کی دولت پر گھمبڑ تھا اور اسی دولت کے بل بوتے پر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کے باپ کی علاقے میں بڑی عزت تھی۔ اس کے باپ کی وجہ سے بھی لوگ شبیر کا لحاظ کرتے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد شبیر درانی کچھ اور پھیلنے لگا۔ ماں کی تو اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ وہ اسے چنگیوں میں اڑاتا اور حسینہ بیگم بلا جوں و چرا اس کا ہر مطالبہ پورا کر دیتی۔

باپ کے انتقال کے بعد زمینوں اور دیگر جائیداد کی نگرانی اس کی ماں کے پاس آگئی تھی۔ یوں تو کئی منشی اور فیجر موجود تھے جو ہر چیز کی دیکھ بھال کر رہے تھے، وہ اگرچہ دیانتدار آدمی تھے مگر حسینہ بیگم نے انتظام سنبھالتے ہی ان میں بد عنوانیاں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ شبیر درانی ماں سے بھی چار ہاتھ آگے نکلتا تھا۔ وہ موجددار کو ساتھ لے کر زمینوں پر نکل جاتا۔ جن مزارعوں سے اس کے باپ نے کبھی سختی سے بات بھی نہیں کی تھی شبیر درانی ان پر سختیاں کرنے لگا۔ موجددار ان کے لئے قبر بن گیا تھا۔ وہ بے گناہ مزارعوں کو روٹی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔

شبیر درانی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ اپنی حدود پھلانگ کر پڑوسی زمینداروں کے مزارعوں پر بھی زیادتیاں کرنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرب و جوار کے چھوٹے زمیندار ناراض ہو گئے۔ کچھ زمینداروں نے حسینہ بیگم سے شبیر درانی کی شکایت کی تھی۔ لیکن شبیر درانی نے ماں کو ہمیشہ یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ ان چھوٹے لوگوں کو دبا کر ہی رکھنا چاہئے۔

موجمدار موت کے فرشتے کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ مزارے اس کی شکل دیکھ کر ہی قہر قہر کانپنے لگتے۔ شبیر درانی نے اب کچھ اور ہاتھ پیر پھیلائے تھے۔ اس نے نور پور والے اس ڈیرہ کو اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا اور اب وہ اس پاس کے دیہاتوں سے جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے آتا۔ ان معصوم لڑکیوں کی چھین رات کے سائے میں گونجتی رہتیں لیکن ان کی چھین سن کر بھی کوئی اس طرف آنے کو تیار نہ ہوتا۔  
موجمدار جب پہلی مرتبہ ایک لڑکی کو اٹھا کر یہاں لایا تھا تو اس نے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دیدی تھی۔

مزارے شبیر درانی اور موجمدار کی حرکتوں سے تنگ آ گئے تھے۔ لڑکی کے باپ نے جب شبیر درانی کے خلاف قانونی کارروائی کی دھمکی دی تو پہلے تو شبیر درانی نے کچھ دے دلا اس کا منہ بند کرنا چاہا لیکن وہ نہیں مانا تو شبیر درانی نے موجمدار کو اشارہ کر دیا۔ موجمدار نے اس شخص کو گولی سے اڑا دیا۔  
یہ موجمدار کے ہاتھوں پہلا قتل تھا۔ بات پولیس تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن حسینہ بیگم نے پولیس کو دے دلا کر معاملہ رفع دفع کروا دیا تھا اور یوں بھی گاؤں کا کوئی آدمی شبیر درانی یا موجمدار کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں تھا اس طرح یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

موجمدار واقعی موت کا فرشتہ بن گیا۔ شبیر درانی کے اشارے پر اس نے کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور جب نالکہ درانی والا معاملہ شروع ہوا تو اس کے ہاتھوں اتنے آدمی مارے گئے تھے جن کا حساب اسے خود بھی معلوم نہیں تھا اور یہ ساری خونریزی اس نے شبیر درانی کے لئے کی تھی اور آج وہی شبیر درانی اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے والا تھا۔

”مجھے ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے موجمدار۔“ شبیر درانی نے راتقل کا سینٹی کیچ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے جو تمہاری موت پر آنسو بہائے گا۔ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ تمہاری لاش اس طرح غائب کر دی جائے گی کہ کسی کو اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔ پولیس یہی سمجھے گی کہ تم اپنی جان بچانے کے لئے فرار ہو کر کہیں دور جا چکے ہو۔ تمہاری تلاش میں ناکام ہونے کے بعد معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اور رہ گئی نالکہ۔ تو بہت جلد اس کا بھی اسی طرح خاتمہ ہو جائے گا اور میرے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔“

”مجھ پر رحم کیجئے سرکار۔“ موجمدار نے دو زانو ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔  
”تم پر رحم کرنے کا مطلب ہے میں اپنے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالواؤں۔“ شبیر درانی غرایا۔ اس نے راتقل کی نال موجمدار کے سینے کی طرف اٹھا دی۔  
”رحم سرکار رحم!“ موجمدار نے کہتے ہوئے اچانک ہی اپنی واسکٹ کی جیب سے پستول نکال کر فائر کر دیا۔

شبیر درانی کو اس کے پاس پستول کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ موجمدار کی چلائی ہوئی گولی اس کی ٹانگ پر لگی۔ شبیر درانی کراہتا ہوا پیچھے گرا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم میری خدمات کا یہی صلہ دو گے۔“ موجمدار غرایا۔ ”اسی لئے میں نے اپنا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ سرہایہ دار کسی کے نہیں بننے۔ میں نے تمہاری خاطر کئی بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے لیکن تم نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے مجھے مار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا انجام ایسا ہی ہوگا۔ میں تو مری جاؤں گا لیکن تم بھی زندہ نہیں رہو گے۔ میری موت پر تو

آنسو بہانے والا کوئی نہیں لیکن تمہاری لاش دیکھ کر حسینہ بیگم پاگل ہو جائے گی۔“  
 موجددار نے اس کے سر پر ایک زوردار ٹھوکر لگائی اور دروازے کی طرف چھلانگ لگادی۔ شیردرانی  
 کے سر پر نکلنے والی ٹھوکر خاصی زوردار تھی۔ اس کا داغ جھنجھٹا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں  
 سی رقص کرنے لگیں۔ اس نے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے اور رانقل اٹھا کر باہر بھاگا لیکن لڑکھڑا کر دروازے  
 میں گر گیا۔ اس کے ایک بازو پر پیسے ہی پلستر چڑھا ہوا تھا اور اب ایک ٹانگ بھی زخمی ہو گئی تھی۔ وہ  
 دروازے کی دہلیز پر ڈاٹا رہی میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اسکے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ اگر  
 موجددار زندہ بچ کر نکل گیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت شیردرانی اور اس کی ماں کو پھانسی کے تختے تک جانے  
 سے نہیں روک سکے گی۔

تاریکی میں ایک سایہ درختوں کی طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے رانقل سیدھی کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔  
 فضا تر تراہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ رانقل سے نکلنے والے شعلے تاریکی میں دوڑتے ہوئے اس سائے کا  
 تعاقب کرتے رہے اور پھر ایک خوفناک چیخ فضا میں گونجی اور دوڑتا ہوا سایہ ڈھیر ہو گیا۔  
 شیردرانی اپنی جگہ سے اٹھ کر نکلوتا ہوا موجددار کے قریب پہنچ گیا۔ اسے دو گولیاں مل گئی تھیں لیکن  
 وہ ابھی زندہ تھا۔ اس نے رانقل کی نال سیدھی کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ کئی گولیاں موجددار کے جسم میں  
 پھوست ہو گئیں۔ دو گولیاں اس کے چہرے پر چلی گئیں جس سے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔  
 شیردرانی نے اس کی لاش کو ٹھوکر ماری اور کنویں کی طرف آگیا۔ اس نے رانقل کنویں میں پھینک  
 دی اور کمرے کی طرف چلنے لگا۔ لیکن پھر دفعہاً رک کر اچھتی ہوئی دو روشنیوں کو دیکھنے لگا جو اس طرف  
 آ رہی تھیں۔

شیردرانی کو سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پولیس کی  
 گاڑی تھی جو تیزی سے اس طرف آ رہی تھی۔ وہ چند لمحے ان روشنیوں کی طرف دیکھتا رہا پھر لنگراتا ہوا  
 درختوں کی طرف دوڑا اور درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھیتوں میں دوڑنے لگا۔ بیسیوں لوگوں کو بے رحمی  
 سے موت کے گھاٹ اتارنے والا آج موت کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر پناہ کی تلاش میں بھاگ رہا تھا۔

..... \*\*\* .....

”تم واقعی ایک حوصلہ مند لڑکی ہو۔“ رائے منصور نے حسینہ بیگم کے جانے کے بعد کہا۔ ”حسینہ بیگم  
 جس قدر طیش میں تھی تم اسی قدر پرسکون تھیں۔ لیکن ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حسینہ بیگم  
 تمہیں محض یہ دھمکی دینے کے لئے نہیں آئی تھی کہ تم یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ۔“  
 ”یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں۔“ نانکھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کے آنے کا مقصد کچھ اور  
 تھا لیکن آپ لوگوں کو یہاں دیکھ کر اس نے بات بدل دی۔“  
 ”مختصری نگرانی کے دوران اس نے تمہاری جائیداد میں بہت سے کھیلے کئے ہیں۔“ وکیل نے کہا۔  
 ”میرا اندازہ ہے کہ وہ تم سے کسی قسم کا کمپیرومانز کرنے آئی تھی تاکہ اسے حساب نہ دینا پڑے۔“  
 ”میں حسینہ بیگم کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ نانکھ نے کہا۔ ”کمپیرومانز یا صلح جیسے الفاظ  
 اس کی ڈکشنری میں شامل نہیں ہیں۔ وہ ایک خود سر عورت ہے۔ اس نے جھکتا نہیں سیکھا۔ وہ یقیناً کسی اور  
 نیت سے یہاں آئی تھی۔ بہر حال، جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ اس کا مقصد کیا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں یہاں اکیلے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ وہ لوگ کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں۔“  
 رائے منصور نے کہا۔ ”ان لوگوں کو اب صرف دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک تم اور دوسرا موجد دار جسے  
 انہوں نے غائب کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو روز میں موجد دار کی لاش کہیں نہ کہیں پڑی مل جائے  
 گی۔ اس کے بعد وہ تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے۔ تمہارے انکشافات ان ماں بیٹے کو  
 مائیں کے تختے پر پہنچا سکتے ہیں اور پھر تمہاری موت سے انہیں جو مالی فائدہ ہو گا تم اس کا بھی اندازہ لگا سکتی  
 ہو۔“

”مجھے بخوبی اندازہ ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں ان کے لئے ترنوالہ ثابت نہیں ہوں گی۔  
 تقریباً دو مہینوں سے اسی کوشش میں ہیں ابھی تک تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب تو میں  
 زائد ہوں۔ وہ میرے قریب نہیں پھٹک سکیں گے اور ویسے بھی دلاور میرے ساتھ موجود ہے۔ اگر آپ  
 مجازت دیں تو میں اسے اپنے پاس ہی رکھ لوں۔“  
 ”کیوں نہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ دار کو بھی چند روز کے لئے یہیں  
 چھوڑ دیا جائے اور اگر تم پسند کرو تو مفدر اور زینت بھی چند روز کے لئے یہیں رہ جائیں۔ گھر میں رونق رہے  
 گی۔ کئی روز سے ویران پڑا تھا۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”آپ مجھے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے۔“  
 ”یہی سمجھ لو۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”چند روز یہاں رہ لو پھر حویلی آجائے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”تو اب ہم چلتے ہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”وکیل صاحب تم سے رابطہ رکھیں گے۔ ویسے کوئی اور  
 شخص ہو تو مجھے بھی فون پر اطلاع دیدیتا۔“  
 ”وکیل صاحب سے تو میں نے ابھی بہت سے کام لینے ہیں۔ آپ میرے اسٹیٹ منیجر حسن کو واپس بھیج  
 دیجئے۔ اسٹیٹ کا سارا حساب اس کے پاس ہے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ حسینہ بیگم نے کیا گڑبڑ کی  
 ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کل ہی اسے بھیج دوں گا۔“ رائے منصور نے کہا اور پھر دار کو بھی اندر بلا کر اسے  
 بھانے لگا کہ وہ چند روز یہیں رہے گا۔  
 اس کے تھوڑی ہی دیر بعد رائے منصور اور وکیل صاحب چلے گئے۔ رائے منصور جاتے ہوئے نائلہ کو  
 بھی خاصی رقم دے گئے تھے۔

”دارا۔“ نائلہ نے دارا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”شباب الدین کو ساتھ لے کر بازار چلے جاؤ اور  
 ٹھکانے لے آؤ۔۔۔۔۔ زینت!“ اس نے زینت کو مخاطب کیا۔ ”ٹھکانے آجائے تو پورے محلے میں تقسیم کر دو۔  
 کوئی گھبر نہیں رہنا چاہئے اور ہاں۔۔۔۔۔ عقیلہ کو تو میں بھول ہی گئی۔ بہر حال، تم جاؤ دارا۔“ نائلہ نے کئی نوٹ  
 دارا کے ہاتھ میں تھما دیے۔

دارا اور شباب الدین کے جانے کے بعد نائلہ نے عقیلہ کو ٹیلی فون کیا اور اپنی برست کی خوش خبری  
 سناتے ہوئے کہا۔

”میں دلاور کو بھیج رہی ہوں۔ تم اپنے بیٹے کو لے کر اس کے ساتھ چلی آنا۔ آج رات تم میرے ہاں  
 ہو گی۔“



”ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گی۔“ عقیلہ نے جواب دیا۔  
 نائلہ نے فون بند کر دیا اور صغدر اور زینت کو رات کے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے لگی۔  
 شام کے وقت پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کر دی گئی۔ محلے کے کچھ اور لوگ نائلہ کو مبارک باد دینے  
 کے لئے آئے تھے اور پھر رات کے کھانے پر بھی بڑی رونق تھی اور ایسی رونق عرصے بعد اس بنگلے میں نظر  
 آئی تھی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب دروازے کی ٹھنٹی بجی۔ کچھ دیر بعد شباب الدین گھبرایا ہوا سا اندر آیا۔  
 ”پولیس انسپکٹر آیا ہے ماگن۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے کہا۔  
 ”تجتنے پولیس والے ہیں اس کے ساتھ؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”اکیلا ہے۔“ شباب الدین نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔  
 چند منٹ بعد وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو انسپکٹر کمرے کے وسط میں کھڑا ہوا ہر دیکھ رہا تھا۔  
 ”ارے آپ کھڑے کیوں ہیں۔ تشریف رکھئے نا؟“ نائلہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”شکریہ نائلہ لی بی۔“ انسپکٹر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”مج عدالت میں اس قدر افراتفری پیدا ہو گئی تھی کہ  
 آپ کو مبارک باد پیش نہیں کر سکا۔ اس کے بعد بھی مصروفیت میں وقت نہیں مل سکا۔ بہر حال، میری طرف  
 سے مبارک باد قبول کیجئے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ سانچ کو آج نہیں۔ آپ حق پر تھیں اس لئے آپ کا  
 بال بھی بکا نہیں ہو سکا۔“

”شکریہ انسپکٹر صاحب۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”کہنے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“  
 ”در اصل یہاں آنے میں میری اپنی غرض بھی پوشیدہ ہے۔“ انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ہمیں موجددار کی تلاش ہے۔ جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے ہیں لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔  
 شاید آپ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکیں۔“

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں انسپکٹر صاحب۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہاں البتہ اگر آپ صادق آباد کے  
 قریب واقع آموں والے باغ کی حویلی کو چیک کریں تو شاید آپ کو وہاں سے کوئی سراغ مل جائے۔ لیکن یقین  
 سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ نائلہ اسے حویلی کا راستہ سمجھانے لگی۔

انسپکٹر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ لیکن نائلہ سوچ رہی تھی کہ اگر موجددار کو شبیر  
 درانی ہی نے چھپایا ہو تو اس کے لئے کوئی جگہ مناسب ہو سکتی ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں دلاور کا خیال  
 ابھر آیا۔ چند روز پہلے جب ان لوگوں نے دلاور کو اغواء کیا تھا تو وہ اسے نور پور والے ڈیرے پر لے گئے  
 تھے۔ نور پور نہ صرف شہر سے قریب تھا بلکہ موجددار کے لئے محفوظ بھی تھے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے  
 دلاور کو ڈرائنگ روم میں بلالیا۔

”دلاور!“ نائلہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پولیس کو موجددار کی تلاش ہے جسے شبیر درانی نے  
 کہیں چھپا رکھا ہے۔ تمہارے خیال میں اس کے لئے محفوظ ترین جگہ کوئی ہو سکتی ہے جو شہر سے زیادہ دور  
 بھی نہ ہو۔“

”مجھے تو اس کے آدمی پکڑ کر نور پور لے گئے تھے۔“ دلاور نے فوراً ہی جواب دیا۔ ”اگر پولیس کو نور  
 پور والے ڈیرے کا علم نہ ہو تو وہ اس کے لئے محفوظ ترین جگہ ہو سکتی ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ابھی پولیس انسپکٹر آیا تھا جو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ موجمدار کہاں روپوش ہو سکتا ہے میں نے اسے صادق آباد کے قریب آموں والی حویلی کے بارے میں تو بتادیا تھا لیکن نور پور والے ڈیرے کا میرے ذہن میں نہیں رہا تھا۔ اگر موجمدار وہیں موجود ہے تو ہو سکتا ہے کہ شہید درانی اسے وہاں سے نکال کر کہیں اور پہنچا دے یا اسے ختم کر دے۔ کیا تمہارے خیال میں یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس سے پہلے ہی ہم موجمدار کو پکڑ کر قانون کے حوالے کر دیں۔“

”اگر وہ نور پور والے ڈیرے پر ہوا تو؟“ دلاور بولا۔

”قسمت آزمائے میں کیا حرج ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”تو پھر چلے..... آج ہی رات نور پور والے ڈیرے پر ہلہ بول دیتے ہیں۔ لیکن.....“

”لیکن کیا جی؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کوئی گاڑی نہیں ہے۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں نائلہ بی بی۔ آپ تیار ہو جائیں۔ میں آدھے گھنٹے میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم گاڑی کا بندوبست کر لو۔ لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے بارہ بجے کے بعد۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ویسے وہ سمجھ گئی تھی کہ دلاور گاڑی کا بندوبست کہاں سے کرے گا۔

”ٹھیک ہے نائلہ بی بی۔ میں گاڑی لے آتا ہوں۔ آپ جب کہیں کی چل پڑیں گے۔“ دلاور کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

تقریباً ”پون گھنٹے بعد دلاور نیلے رنگ کی ایک ڈائن کار لے آیا جسے بنگلے کے اندر پورچ میں کھڑا کر دیا گیا۔

پونے ایک بجے کے لگ بھگ وہ ڈائن پر بنگلے سے نکل گئے۔ دارا نے بتایا تھا کہ اس نے یہ گاڑی ایک بنگلے کے سامنے سے اڑائی تھی۔ اگر مالکوں کو اس کی چوری کا پتہ چل گیا ہو اور اس نے پولیس میں گاڑی کی چوری کی رپورٹ بھی لکھوا دی ہو تو پولیس اتنی مستعد نہیں تھی کہ ایک پرانی کار کی تلاش کے لئے فوراً حرکت میں آجاتی۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ جو شخص گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے گیا ہو اسے پولیس نے ابھی تک تھانے ہی میں بٹھا رکھا ہو۔ یہی تو ہمارا الیہ ہے، اپنے گھر میں چوری کی رپورٹ لکھوانے کے لئے پولیس اسٹیشن جانے والے کو بھی اسی طرح پریشان کیا جاتا ہے کہ جیسے چوری اسی نے کی ہو۔

انہیں معلوم تھا کہ شہر سے باہر جانے والے راستوں کی ناکہ بندی کی گئی تھی لیکن دلاور ایسے راستوں سے بھی واقف تھا جہاں پولیس کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ اس کے لئے اسے گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ بالاخر وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر شہر سے باہر آ گئے۔ نور پور والے راستے پر آنے کے لئے مزید دس منٹ لگ گئے تھے۔

جب وہ نور پور کی بستی کے قریب سے گزرے تو دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ دلاور نے گاڑی کے ہیڈ لمپس بجھا رکھے تھے۔ لیکن وہ جیسے ہی نور پور سے نصف میل آگے ڈیرے کی طرف جانے والے راستے پر مڑے تو فائرنگ کی آواز سن کر چونک گئے۔ یوں لگا تھا جیسے آٹومیک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ دلاور نے گردن گھما کر نائلہ کی طرف دیکھا۔

”تیز چلاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

جب وہ نور پور کی بستی کے قریب سے گزرے تو دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ دلاور نے گاڑی کے ہیڈ لمپس بجھا رکھے تھے۔ لیکن وہ جیسے ہی نور پور سے نصف میل آگے ڈیرے کی طرف جانے والے راستے پر مڑے تو فائرنگ کی آواز سن کر چونک گئے۔ یوں لگا تھا جیسے آٹومیک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ دلاور نے گردن گھما کر نائلہ کی طرف دیکھا۔

”تیز چلاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

جب وہ نور پور کی بستی کے قریب سے گزرے تو دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ دلاور نے گاڑی کے ہیڈ لمپس بجھا رکھے تھے۔ لیکن وہ جیسے ہی نور پور سے نصف میل آگے ڈیرے کی طرف جانے والے راستے پر مڑے تو فائرنگ کی آواز سن کر چونک گئے۔ یوں لگا تھا جیسے آٹومیک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ دلاور نے گردن گھما کر نائلہ کی طرف دیکھا۔

”تیز چلاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

جب وہ نور پور کی بستی کے قریب سے گزرے تو دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ دلاور نے گاڑی کے ہیڈ لمپس بجھا رکھے تھے۔ لیکن وہ جیسے ہی نور پور سے نصف میل آگے ڈیرے کی طرف جانے والے راستے پر مڑے تو فائرنگ کی آواز سن کر چونک گئے۔ یوں لگا تھا جیسے آٹومیک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ دلاور نے گردن گھما کر نائلہ کی طرف دیکھا۔

”تیز چلاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

جب وہ نور پور کی بستی کے قریب سے گزرے تو دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ دلاور نے گاڑی کے ہیڈ لمپس بجھا رکھے تھے۔ لیکن وہ جیسے ہی نور پور سے نصف میل آگے ڈیرے کی طرف جانے والے راستے پر مڑے تو فائرنگ کی آواز سن کر چونک گئے۔ یوں لگا تھا جیسے آٹومیک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ دلاور نے گردن گھما کر نائلہ کی طرف دیکھا۔

”تیز چلاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

دلاور نے ہیڈ لیمپس روشن کر دیے اور رفتار بڑھا دی۔ گاڑی کچے راستے پر اچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔ ابھی وہ ڈبرے سے دور ہی تھے کہ ایک بار پھر فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد انہیں ایک سایہ کھیتوں کی طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔

دلاور نے درختوں کے جھنڈ کے قریب گاڑی روک لی۔ ہیڈ لیمپ کی روشنی میں درختوں کے نیچے ایک لاش پڑی نظر آ رہی تھی۔ دلاور کار سے اتر کر لاش کی طرف دوڑا، رانقل اس کے ہاتھ میں تھی۔ لاش کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور اس کی شکل دیکھ کر وہ اچھل پڑا وہ موجمدار تھا۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ دلاور چند لمحوں لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر کار کی طرف دوڑا۔ اس دوران نائلہ بھی کار سے اتر آئی تھی۔

”موجمدار کی لاش ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں نے ایک آدمی کو اس کنوئیں کے دوسری طرف کھینوں میں بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”تو یہاں کیوں کھڑے ہو۔ اس کا چچا کرو۔“ نائلہ نے کہا۔

دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس شخص کا تعاقب شروع ہو گیا تو انہیں دوبارہ یہ گاڑی استعمال کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ اس نے چادر کے پلو سے اسٹیرنگ اور ایسی تمام جگہیں صاف کر دیں جہاں اس کے یا نائلہ کی انگلیوں کے نشان ہو سکتے تھے۔

وہ دونوں کنوئیں کے قریب سے ہوتے ہوئے کھیتوں کی طرف دوڑے۔ تاریکی میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا کس طرف گیا ہوگا۔ وہ ایک جگہ رک کر کسی قسم کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگے لیکن پودوں کی سرسراہٹ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جس سے یہ اندازہ ہو گا کہ وہ شخص کس طرف ہے۔ وہ یا تو کہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا یا وہاں سے کافی دور نکل گیا تھا۔

دلاور، نائلہ کو اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ ان پر فائرنگ شروع نہ کر دی جائے۔ موجمدار کو جس طرح گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس شخص کے پاس آٹو بینک رانقل موجود تھی۔

مگر شبیر درانی رانقل کنوئیں میں پھینک چکا تھا اور اب وہ بالکل نشتا تھا۔ اس کی زخمی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا وہ دوڑ بھی نہیں سکتا تھا اور پھر اس نے کار سے اترنے والوں کی آوازیں بھی سن لی تھیں۔ دلاور اور نائلہ کی آوازیں پہچان کر اس کی روح تک فنا ہو گئی تھی۔ اسے موت اپنے سامنے ناچتی ہوئی نظر آنے لگی۔ یہ دونوں موت کے فرشتوں سے کم نہیں تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو نائلہ سب سے پہلے تو اس کی ہڈیاں توڑے گی اور پھر اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے لئے بھاگنے کا کوئی موقع نہیں تھا وہ پودوں میں دبکا بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

دلاور اور نائلہ اس سے صرف دس فٹ کے فاصلے سے گزر گئے۔ رانقل صرف دلاور کے ہاتھ میں تھی اور نائلہ خالی ہاتھ تھی۔ شبیر درانی سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے موجمدار کی رانقل کنوئیں میں نہ پھینکی ہوتی۔ اگر اس وقت رانقل اس کے پاس موجود ہوتی تو وہ ان دونوں کو ختم کر کے اپنے دشمنوں سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لیتا۔ لیکن اس کی گردش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر دبکا رہے۔

وہ پودوں کی آڑ سے دلاور اور نائلہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دونوں تقریباً ”دو سو گز آگے نکل چکے تھے۔“

فہمنا" شبیر درانی کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اگر وہ لوگ مایوس ہو کر واپس چلے بھی گئے تو ایسی زخمی حالت میں خود اس کے لئے شہر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس گاڑی تک پہنچ جائے تو سے فرار کا موقع مل سکتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی شبیر درانی نے ذرا سا اوپر اٹھ کر دیکھا۔ وہ دونوں کچھ اور آگے نکل گئے تھے۔ شبیر درانی بڑی احتیاط سے کنویں کی طرف رہینگے لگا۔ بازو اور ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے اسے رہینگے میں بھی خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے سختی سے دانت بھیج رکھے تھے۔ وہ کھیت سے نکل کر پگڈنڈی پر آگیا۔ اور قدرے تیزی سے رہینگے لگا۔ کواں زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جلد ہی کنویں تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا وہ دونوں کانی دور تھے۔ شبیر درانی اٹھ کر نکلنا ہوا کار کی طرف دوڑا۔

رات کے سناٹے میں اس کے قدموں کی دھب دھب کی آواز دور تک پھیل گئی تھی۔ نائلہ اور دلاور آواز سن کر چونک گئے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ کنویں کے قریب ایک سایہ دوڑتا ہوا نظر آیا۔ دلاور نے راکفل اٹھا کر فائر کھول دیا اور وہ دونوں تیزی سے اس طرف دوڑنے لگے۔

شبیر درانی لڑکھڑا کر گرا۔ ایک گولی اس کے سر کے قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ اٹھ کر پھر کار کی طرف دوڑا۔ ایک بار پھر فائرنگ ہوئی لیکن اس مرتبہ وہ کار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر بیٹھتے ہی اس نے انجن اشارت کیا اور ہیڈ لیمپس روشن کئے بغیر کار کو تیزی سے گھما دیا۔

نائلہ اور دلاور دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ دلاور نے ایک بار پھر فائرنگ کی لیکن کار فائرنگ کی ریخ سے نکل چکی تھی۔

"بھاگ گیا۔" دلاور نے گراسانس لیتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے سانس پھول گئے تھے۔ نائلہ زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے بے ربط شخص پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تمہارے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟" نائلہ نے پوچھا۔

"شبیر درانی ہی کا کوئی گرگا ہوگا۔" دلاور نے جواب دیا۔ "لیکن وہ جو کوئی بھی تھا زخمی تھا۔ وہ دوڑتے میں لنگڑا رہا تھا۔"

"میں نے موجمدار کی لاش کے پاس ایک پستول بھی پڑا ہوا دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے مرنے سے پہلے موجمدار کو بھی گولی چلانے کا موقع مل گیا ہو۔ جس سے وہ شخص زخمی ہو گیا۔" نائلہ نے کہا۔

"شبیر درانی نے اپنے ایک اہم ترین دشمن سے نجات حاصل کر لی ہے۔ موجمدار اس کے ہر راز سے واقف تھا۔ اس سے نجات مل جانے کے بعد وہ تمار توجہ آپ کی طرف مبذول کر دے گا نائلہ بی۔بی۔" دلاور نے کہا۔

"میں اس سے نہیں ڈرتی اور پھر تم میرے ساتھ ہو تو مجھے کسی کا کیا خوف ہو سکتا ہے۔ چلو۔۔۔ اب چلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجمدار کا قتل ہمارے کھاتے میں آجائے۔" نائلہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلے۔" دلاور نے راکفل کندھے پر لٹکالی۔

وہ لوگ کچے راستے کی طرف جانے کی بجائے کھیتوں کے بیچ میں پگڈنڈی پر چلے گئے۔ ایک جگہ نائلہ کا پیر لڑکھڑا گیا۔ اگر دلاور فوراً ہی اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً "گر پڑتی۔ دلاور کا اس طرح سہارا دینا نائلہ کو

اچھا لگا تھا۔ اس نے دلاور کا ہاتھ تھامے رکھا اور پگڈنڈی پر چلتی رہی۔

دلاور عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اپنے ہاتھ پر نائلہ کے نرم اور ملائم ہاتھ کی ہلکی سی گرفت سے اسے اپنے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے نائلہ کی گرفت سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی اور پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ اب اس کے اپنے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔

اگلے کھیت میں شاید پانی دیا ہوا تھا۔ ان دونوں کے پیر شزاپ سے پانی میں پڑے تو وہ جیسے ہوش میں آ گئے۔ ان کے پیر ٹخنوں تک کچھڑیں دھسن گئے تھے۔ نائلہ نے جھک کر اپنے پیروں سے پچپی شوز نکال لئے اور دوسرے ہاتھ سے ایک بار پھر دلاور کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں سنبھل کر چلنے لگے۔

دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت۔ رات کا سناٹا اور ایک ساتھ دھڑکتے ہوئے جوان دل..... کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ مگر دلاور کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون تھا۔ وہ نائلہ درانی کا محافظ تھا، لئیرا نہیں۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے کئی مواقع آئے تھے۔ آبادی سے دور دیرانے میں واقع ایک مکان میں انہوں نے ایک ہی کمرے میں کئی راتیں گزاری تھیں۔ دلاور کے دل میں تو اس وقت بھی میل نہیں آیا تھا۔ وہ نائلہ کا احترام کرتا تھا۔ اس کے سینے میں محبت کی چنگاری سلگ اٹھی تھی لیکن وہ اس چنگاری کو سینے کی گہرائیوں میں دبائے رکھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی حرکت سے نائلہ کا اعتماد اس پر سے اٹھ جائے۔

جب وہ کھیتوں سے نکل کر شہری حدود میں داخل ہوئے تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ ان کی پیر کچھڑیں لت پت تھیں۔ اگر اس حالت میں پولیس کی کسی عشتی پارٹی سے سامنا ہو جاتا تو ان کے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ وہ تنگ و تنار ایک گلیوں میں گھومتے ہوئے اپنے بنگلے پر پہنچ گئے۔

نائلہ درانی جب اپنے بستر پر لیٹی تو صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ وہ بستر پر لیٹی دلاور کے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک لطیف سا احساس اس کے سینے میں پھیلتا چلا جا رہا تھا..... اور پھر ایک دلاور کی بجائے موجمدار کا بگڑا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اسے جس بیدردی سے قتل کیا گیا تھا وہ قابلِ عبرت تھا۔ جو زندگی بھر دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے رہے تھے ان کا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔ لیکن..... اسے قتل کرنے والا کون تھا؟ خود شبیر درانی یا اس کا کوئی گرگاہ؟

نائلہ دیر تک شبیر درانی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اور پھر اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔ صبح گیارہ بجے سے پہلے اس کی آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ اس نے دلاور کے بارے میں دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ صرف دو گھنٹے کی نیند لینے کے بعد ناشتہ کر کے باہر چلا گیا تھا۔ نائلہ کچھ دیر تک بستر پر ہی لیٹی کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر ہاتھ روم میں کھس گئی۔ نیم گرم پانی کے غسل سے اس کی ساری کسکندی دور ہو گئی تھی۔ وہ تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آگئی جہاں زینت نے میز پر اس کے لئے ناشتہ لگا دیا تھا۔ ناشتے کے دوران ہی اسے اطلاع دی گئی کہ خشی حسن علی آیا ہے۔

”اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور چائے دے آؤ۔ میں ناشتے کے بعد اس سے ملاقات کروں گی۔“ نائلہ نے کہا۔

تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد نائلہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو بوڑھا خشی حسن علی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”السلام علیکم حسن چچا۔“ نائلہ اسے دیکھتی ہی بولی۔

”جیتی رہو بیٹی۔“ حسن علی نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ”رائے صاحب نے تمہارے بارے

س بتایا تو اتنی خوشی ہوئی جس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ بڑی بیگم صاحب نے تو مجھے اس بڑھاپے میں جیل  
 بھرا کر میری عزت خاک میں ملا دی۔ تمہارے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا انہوں نے بیٹی۔“  
 ”اللہ ظالم کی رسی ضرور دراز کرتا ہے لیکن اسے معاف نہیں کرتا۔ ایک نہ ایک دن ظالم کو اس کے  
 لم کا حساب دینا ہی پڑتا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کا مجھے افسوس  
 ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتی ہوں حسن بچا۔“

”اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے بیٹی۔“ حسن علی نے کہا۔  
 ”اچھا حسن بچا یہ بتائیے کہ حینہ بیگم نے جب عدالت سے میری اراضی اور جائیداد کی سپرد داری لی  
 فی اس سے پہلے کا حساب آپ کو معلوم ہے یا نہیں؟“

”مجھے جیسے ہی پتہ چلا کہ حینہ بیگم نے اس مقصد کے لئے کوئی درخواست دی ہے تو میں نے تمام ہی  
 لکھاتے غائب کر دیے تھے۔ جن میں ایک ایک پائی کا حساب موجود ہے۔ گاؤں والا گودام اناج کی بور یوں  
 سے بھرا ہوا تھا۔ شبیر درانی اور حینہ بیگم نے اناج کے پانچ ٹرک سیٹھ بیٹھانند کے ہاتھ فروخت کر دیئے اور  
 تی بوریاں اپنے گودام میں منتقل کرانے کے بعد گودام کو آگ لگوا دی جس سے حویلی بھی جل کر راکھ ہو گئی۔  
 اس کے دوسرے ہی دن حینہ بیگم نے حساب میں خورد برد کے الزام میں جیل بھجوا دیا۔“

”آپ کے خیال میں گودام میں کتنی مالیت کا اناج ہو گا؟“ نائلہ نے دریافت کیا۔  
 ”تقریباً دس لاکھ کا بیگم صاحبہ۔“ حسن علی نے جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ بھی حینہ بیگم نے بڑی گڑبڑ  
 لی ہے۔ تمہاری کار بھی اس کے پاس ہے۔“

”فکر نہ کرو حسن بچا۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اطمینان سے  
 اپنے گھر جائیے اور کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں اور ہاں..... مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ اس وقت  
 آپ کے پہنچنے تک بینک بند ہو جائے گا۔ صبح بینک کھلتے ہی مجھے رقم پہنچا جائیے۔“  
 ”کتنی رقم چاہیے بیٹی؟“ حسن علی نے پوچھا۔

”فی الحال پچاس ہزار روپے پہنچا دیجئے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے بیٹی۔ میں کل صبح ہی رقم پہنچا دوں گا۔“ حسن علی نے کہا۔  
 حسن علی کے جانے کی تھوڑی ہی دیر بعد دلاور آگیا۔

”ایک دلچسپ خبر ہے آپ کے لئے نائلہ بی بی۔“ دلاور نے آتے ہی کہا۔  
 ”وہ کیا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کل رات ہم نے جو گاڑی چوری کی تھی وہ آج صبح پولیس کو ایک سڑک پر لاوارث کھڑی مل گئی ہے۔  
 کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر اور اس کے سامنے سیٹ پر خون بھی بکھرا ہوا ملا ہے۔“ دلاور نے بتایا۔

”اس میں دلچسپی کی کیا بات ہے؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”یہ تو ہمیں معلوم ہی تھا کہ وہ کار موجد مدار  
 کا قاتل لے کر بھاگا تھا اور وہ زخمی بھی تھا۔“

”دلچسپی کی بات تو یہ ہے کہ شبیر درانی ہسپتال میں زخمی پڑا ہے۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔“ دلاور  
 نے بتایا۔

”کیا.....؟“ نائلہ اچھل پڑی۔  
 ”جی ہاں۔“ دلاور مسکرایا۔ ”اس نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ رات کو دو بجے کے بعد وہ پیدل ہی اپنے

ایک دوست کے گھر سے واپس آ رہا تھا کہ دو تین روزوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ اسے لوٹنا چاہتے تھے۔ شیر نے مزاحمت کی جس پر وہ اسے گولی مار کر بھاگ گئے۔ گولی اس کی ران میں لگی تھی جسے آپریشن کے ذریعے نکال دیا گیا ہے اور وہ ابھی ہسپتال ہی میں ہے۔ ڈاکٹر نے چند روز تک اسے چلنے پھرنے سے سختی سے منع کر دیا ہے۔

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”میں یہی سب کچھ تو معلوم کرنے گیا تھا۔“ دلاور نے بتایا۔ ”بس ذرا سی چالاکی اور ذہانت کی ضرورت تھی، معلوم کر لیا سب کچھ۔“

”اور کار!“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کار کے مالک نے رات ہی کو کار کی چوری کی رپورٹ لکھوادی تھی اور آج صبح جب کار مل گئی تو پولیس نے مالک کو بلا کر کار اس کے حوالے کر دی.....“ دلاور نے بتایا۔

”یہ بہت برا ہوا۔“ نائلہ بولی۔ ”اگر پولیس کار کے اسٹیرنگ سے فنگر پرش حاصل کرنے کی کوشش کرتی تو پولیس کو شیر درانی کی انگلیوں کے نشانات مل جاتے۔“

”جی ہاں۔“ دلاور بولا۔ ”لیکن پولیس شاید کسی جنجال میں نہیں پھنسا چاہتی تھی۔ اسی لئے تو فوری طور پر کار کو اس کے مالک کے حوالے کر دیا گیا۔ ورنہ پولیس والوں سے بازیا فٹ مال واپس لینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کار کی سیٹ پر خون بکھرا ہوا ہونے کے باوجود پولیس نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔“

”اور موجددار کی لاش کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دہشتاویں نے آج صبح سویرے پولیس کو اس لاش کے بارے میں اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ رات کے آخری پہر انہوں نے زبردست فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ ڈاکوؤں نے کسی قریبی بستی پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ موجددار کو بھی ڈاکوؤں ہی کا کوئی ساتھی سمجھتے تھے لیکن بعد میں اس کی شناخت ہو گئی۔ پولیس بستی کے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ لیکن کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ ڈیرے میں کب آیا تھا اور اسے کھانا وغیرہ کون فراہم کرتا تھا۔“

”اتنی دیر میں اتنی ڈھیر ساری باتیں معلوم کر آئے۔ تمہیں تو جاسوس ہونا چاہئے تھا۔“ نائلہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”اگر انسان اپنی یہ کھوپڑی استعمال کرے تو یہ بڑے کام کی چیز ہے۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے کپٹی پر انگلی ماری۔

”اچھا، ذرا میرے ساتھ چلو۔“ نائلہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

”کہاں نائلہ بی بی؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”گھر کے لئے بازار سے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے حینہ بیگم سے اپنی کار واپس لینی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”چلے۔“ دلاور اس سے پہلے ہی دروازے سے باہر گیا۔

دارا کو کچھ ہدایات دے کر نائلہ دلاور کے ساتھ بنگلے سے باہر آگئی۔ وہ کچھ دور تک پیدل چلتے رہے پھر ایک تانگے پر بیٹھ گئے۔ دلاور نے کچھوان کو شیر درانی کے بنگلے کا پتہ بتا دیا تھا۔

تاکہ انہوں نے بچکے سے دور ہی روک لیا اور وہ نیچے اتر کر پیدل ہی آگے چلنے لگے۔ سفید ٹیوٹا بچکے کے سامنے کھڑی تھی اور ایک گمن مین گیٹ کے سامنے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔  
 ”تم ہمیں روکو دلاور“ میں چند منٹ میں واپس آ جاؤں گی۔“ تاکہ نے کہا۔  
 ”لیکن تاکہ بی بی.....“

”مجھے کچھ نہیں ہو گا دلاور۔“ تاکہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں اپنی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو آواز دیدوں گی۔“

دلاور سامنے والے بچکے کی دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا اور تاکہ نے تلے قدم اٹھاتی ہوئی شبیر درانی والے بچکے کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ آج اس نے منہ چھپانے کے لئے چادر نہیں اوڑھی تھی۔ تبہ کیا ہوا دوشہ ایک مخصوص انداز میں بائیں کندھے پر بڑا ہوا تھا۔ اس کا چلنے کا انداز بڑا بیباکانہ تھا۔  
 گیٹ پر بیٹھا ہوا گمن مین اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شاید تاکہ کو روک کر کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر تاکہ اسے ایک طرف ہٹاتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ گمن مین غالباً ”اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے تاکہ کے پیچھے جانے کی کوشش کی مگر سامنے والے بچکے کی دیوار کے قریب کھڑے ہوئے دلاور نے اسے گھر کی دکھائی۔  
 ”اوئے..... آرام سے اپنی جگہ پر کھڑے ڈیوٹی دیتے رہو۔“

دلاور پر نظر پڑتے ہی وہ گمن مین چونک گیا۔ اسے شاید وہ پہچانتا تھا اور اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کے اپنے پاس بھی آٹومیک رائفل تھی اور اسے ملازم ہی اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ اس گھر اور گھر کے مالکوں کی حفاظت کرے مگر دلاور کی شکل دیکھ کر اس کا سارا جوش سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا۔

تاکہ بیباکانہ انداز میں اندر داخل ہو گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور پھر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔ حینہ بیگم ایک صوفے پر اس طرح منہ لٹکائے بیٹھی تھی جیسے کسی کا سوگ ہمارا ہی ہو۔ دروازے کی آواز سن کر اس نے گردن گھما کر دیکھا اور پھر تاکہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک ہلکے سے انھ کرکھڑی ہو گئی۔

”مت..... تم.....“ وہ غصے میں ہلکائی۔ ”تمہیں اندر کس نے آنے دیا۔“  
 ”ہوا کو بھی کبھی کوئی روک سکا ہے۔“ گولوں کو بھی کبھی کسی نے بیڑیاں پہنائی ہیں؟“ تاکہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تو وہ طوفان ہوں جس کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا حینہ بیگم۔“  
 ”کیوں آئی ہو یہاں؟“ حینہ بیگم کے حلق سے بلی کی سی غراہٹ نکلی۔ تاکہ کے اس طرح اپنے گھر میں گھس آنے پر اس کا بارہ چڑھ گیا تھا۔

”آپ کو اپنی بچھٹی کی برست پر تو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں اتنی کم طرف نہیں کہ آپ کے بیٹے کی ایک اور کامیابی پر اور اس کے زندہ بچ جانے پر آپ کو مبارک باد بھی نہ دوں۔“ تاکہ نے کہا۔  
 ”کیا کو اس کر رہی ہو؟“ حینہ بیگم دھاڑی۔

”مبارک باد اس بات پر کہ آپ کے بیٹے نے سب سے بڑا کاٹنا اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ موجددار کے قتل سے اس کے بہت سے جرائم پر پردہ بڑ گیا ہے لیکن ابھی اور بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو اس کے کرتوتوں سے واقف ہیں۔ کس گھس کو قتل کریں گے آپ لوگ؟ کتنی خونریزی کریں گی آپ؟ خونریزی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہئے۔ ورنہ یہ آگ آپ کو بھی جلا کر رکھ کر ڈالے گی۔ ویسے ایک بات



آپ کو سمجھ لیتی چاہئے کہ یہ آگ آپ کے دروازے تک پہنچ چکی ہے۔“  
 ”کیا بک رہی ہو؟“

”میں ٹھیک بک رہی ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”آپ کا بیٹا پہلے دوسروں کے آلہ کار بنا کر قتل و غارت کا بازار گرم کئے ہوئے تھا اور اب موجددار کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے وہ براہ راست اس میں ملوث ہو گیا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ میرے بیٹے نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ حینہ بیگم بولی۔

”پولیس اگر جلد بازی سے کام لے کر آج صبح ملنے والی چوری شدہ کار اس کے مالک کے حوالے کر دینے کی بجائے اس پر سے انگلیوں کے نشانات تلاش کرتی تو پتہ چل جاتا کہ کل رات وہ کار تمہارے ہی بیٹے نے استعمال کی تھی اور اس کی سیٹ پر بکھرا ہوا خون بھی تمہارے ہی بیٹے کا تھا۔ تمہارا بیٹا ضرورت سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ پولیس اگر کوشش کرے تو اسے اب بھی موجددار کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”میرے بیٹے نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ حینہ بیگم چیخی۔ ”تم اپنی ذلت اور رسوائیوں کا بدلہ لینے کے لئے ہمیں بدنام کرنا چاہتی ہو۔ لیکن یاد رکھو، تم اپنے اس کھتاؤ نے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔“ ”شیردرانی پر موجددار کے قتل کا الزام ثابت کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔“ نائلہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”موجددار کا پوتل پولیس کے قبضے میں ہے اور تمہارے بیٹے کی زخمی ٹانگ سے نکلنے والی گولی بھی اب پولیس کی تحویل میں ہے۔ اگر پولیس ذرا سی گہرائی میں جانے کی کوشش کرے تو بڑی آسانی سے یہ پتہ چل جائے گا کہ شیردرانی کی ٹانگ سے برآمد ہونے والی گولی موجددار کے پوتل ہی سے چلائی گئی تھی۔“

”تم جھوٹ کہتی ہو۔“ حینہ بیگم چیخی۔ ”میرے بیٹے نے موجددار کو قتل نہیں کیا۔“

”یہ تو وقت ثابت کرے گا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”میں اگر چاہوں تو تمہارا بیٹا ہسپتال سے سیدھا حوالات میں منتقل ہو سکتا ہے۔ لیکن.....“

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ حینہ بیگم دھاڑی۔ ”تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکو گی..... رو لے.....“ اس نے محافظ کو آواز دی۔

”پیچھے کی ضرورت نہیں۔“ نائلہ بیگم نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہارا رولہ اندر نہیں آئے گا اور پھر تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گی۔ تم جانتی ہو کہ میرے ہاتھ کس قدر مضبوط ہیں اور پھر کئی لوگوں نے مجھے اس بنگلے میں آتے دیکھا ہے۔ اگر تم نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو زندگی بھر پچھتاؤ گی۔“ ”تم چاہتی کیا ہو؟ کیوں پنچے بھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑ گئی ہو؟“ حینہ بیگم نے کہا۔ اس کے انداز میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔

”اس کی شروعات بھی آپ ہی کی طرف سے ہوئی تھیں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ میری جائیداد پر قبضہ جمانا چاہتی تھیں نا! مجھے لاوارث سمجھ کر لیکن کیا ملا آپ کو؟ خاندان کی ذلت اور رسوائی! آگ اور خون کا یہ کھیل آپ نے شروع کیا تھا اور اب یہ ختم میری مرضی سے ہوگا۔“ ”کیا تم یہی بتانے آئے تھیں؟“ حینہ بیگم نے اسے گھورا۔

”گاڑی۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چابی مجھے دیدو۔ بہت سیر کر لی تم نے میری گاڑی پر۔“

”چالی وہ سانسے میز پر رکھی ہے۔ اسے اٹھاؤ اور دفان ہو جاؤ یہاں سے۔“ حسینہ بیگم چیخی۔  
 نائلہ نے آگے بڑھ کر میز پر رکھی ہوئی چالی اٹھالی۔ ”کاغذات کہاں ہیں؟“  
 ”کاغذات گاڑی ہی میں موجود ہیں۔ اب نکل جاؤ یہاں سے۔“ حسینہ بیگم نے ہاتھ سے دروازے کی  
 طرف اشارہ کیا۔

”گاڑی کی واپسی کا شکریہ۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ میں نے دوسری چیزوں کی  
 ہی کے لئے تھیں تین دن کی مہلت دی ہے۔ جس میں سے آج کا دن تو سمجھو کہ گزر رہی گیا۔ ان چیزوں  
 کم از کم دس لاکھ کا اثاثہ اور حویلی کی قیمت بھی شامل ہے۔ مہلت ختم ہو جانے کے بعد تمہارے ساتھ  
 کی رعایت نہیں کی جائے گی۔“

نائلہ کستی ہوئی درانگ روم سے باہر آگئی۔ جب وہ گیٹ سے باہر نکلی تو حسینہ بیگم کا گن مین گیٹ کے  
 باب کھڑا سانسے کھڑے ہوئے دلاور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نائلہ نے کار کا اسٹیرنگ سائیڈ کالاک کھولا اور مسکراتے ہوئے دلاور کو اشارہ کر دیا۔ دلاور تیزی سے  
 اس کے قریب پہنچ گیا۔ نائلہ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پنجرز سیٹ کے دروازے کا لاک کھول دیا  
 ڈرائیونگ بورڈ میں رکھے ہوئے گاڑی کے کاغذات چیک کرنے لگی۔ دلاور اس وقت تک رانقل سنبھالے  
 گاڑی کے باہر ہی کھڑا رہا جب تک نائلہ نے انجن اشارت نہیں کر دیا۔ انجن اشارت ہوتے ہی وہ پنجرز  
 پر بیٹھ گیا اور نائلہ نے گاڑی ایک بلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

نائلہ بہت عرصہ بعد اس گاڑی پر بیٹھی تھی اور وہ اسے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک عجیب سی خوشی محسوس  
 رہی تھی۔ مختلف سڑکوں پر ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے گاڑی ایک جگہ روک لی اور وہ دونوں نیچے اتر  
 گئے۔

وہ تقریباً ”دو گھنٹوں تک بازار میں شاپنگ کرتی رہی۔ رائے صاحب نے واپس جاتے ہوئے اسے اچھی  
 سی رقم دی تھی اور یوں بھی شہر کے بیشتر دوکاندار اسے جانتے تھے۔ پورے شہر کو اخبارات کے ذریعے  
 دلاورانی کی بریت کا پتہ چل گیا تھا اور بیشتر دوکاندار اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

اس شاپنگ کے دوران نائلہ نے اپنے لئے دو جوڑے سینڈل کے سوا کچھ بھی نہیں خریدا تھا البتہ دلاور  
 نے اپنی پسند کے کئی جوڑے، دو جوڑے دارا کے لئے اور زینت، صندل اور شباب الدین کے لئے کئی کئی  
 لاکھ روپوں کے علاوہ اس نے گھر کے استعمال کی کچھ چیزیں بھی خریدی تھیں۔

واپس جاتے ہوئے اس نے اچانک ہی ایک جگہ گاڑی روک لی۔ اس نے گاڑی اس طرح روکی تھی کہ  
 سڑک پر چڑھ گئے تھے۔ آس پاس سڑک پر چلتے ہوئے لوگ بدحواس ہو کر اس طرف دیکھنے لگے۔ دلاور بھی جھٹکا  
 لے کر ڈرائیونگ بورڈ سے نکل گیا تھا۔ لیکن اس نے فوراً ہی سنبھل کر رانقل پر گرفت جمالی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے گھبرا کر نائلہ کی طرف دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔  
 ”کچھ نہیں۔ تم بیٹھو، میں ابھی آ رہی ہوں۔“ نائلہ انجن بند کر کے دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی اور تیز تیز  
 اٹھاتے ہوئے سڑک پار کرنے لگی۔

سڑک کے دوسری طرف تین چار عورتیں مخالف سمت سے آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہی نائلہ نے  
 ڈرائیونگ روکی تھی۔ ان عورتوں نے خانہ بدوشوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ چھینٹ کے گھاگھرے، مختصر  
 لمبائی اور سروں پر رنگ برنگی چھینٹ کی چیزیاں۔ ان کی بانہیں رنگ برنگی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

کانوں میں چھوٹی بڑی کئی کئی بالیاں اور ناک میں نچھنیاں تھیں۔  
 نائلہ ان کے سامنے جا کر اس طرح کھڑی ہو گئی کہ ان کا راستہ رک گیا۔ اس کی نظریں درمیان والی عورت کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ روشن تھی۔

روشن چند لمحے اپنے راستے میں آنے والی اس عورت کو گھور کر دیکھنے لگی پھر اس کے چہرے پر شدید ترین حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔

”ارے بی بی تو.....“ وہ والہانہ انداز میں نائلہ سے لپٹ گئی۔ ”ارے تو ٹھیک ہے نا..... کتنی دعائیں مانگی تھی میں نے تمہاری جندگی کی اپنے رب سے۔ اللہ تیرا شکر ہے..... میری بی بی زندہ ہے۔ تو ٹھیک ہے نا۔“

روشن مسلسل بولے جا رہی تھی۔ وہ کتنی دیر تک نائلہ سے لپٹی رہی اور جب نائلہ نے اسے اپنے سے الگ کیا تو روشن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کتنا خلوص تھا روشن کے دل میں۔ وہ اسے زندہ سلامت دیکھ کر کس قدر خوش ہو رہی تھی جیسے اس کی سگی بہن اسے مل گئی ہو۔

”ہاں روشن، میں زندہ ہوں اور بالکل ٹھیک ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“  
 ”ہم تو خانہ بدوش ہیں بی بی۔ مہرا کیا ٹھکانہ۔ آج یہاں کل وہاں.... تو سناری..... تجھے تو وہ مونچھوں والے بدماں اٹھا کر لے گئے تھے۔“ روشن بولی۔

”اب مجھے کسی بد معاش کا ڈر نہیں ہے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ میں اپنے گھر آگئی ہوں۔ چل، تو بھی میرے ساتھ چل اور یہ تو بتا تیرا بندہ اور بیٹا کیا ہے؟“

”میرا بندہ تو گنہر گیا بی بی۔“ روشن کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔ ”بیمار ہو گیا تھا۔ دوا دارو تو بہت کیا پر ڈاکٹر نے کہا اسے خون کا کنسر ہے۔ وہ نہیں بچے گا اور پھر وہ ایک ہفتے کے اندر اندر مر گیا۔“

”مجھے برا افسوس ہوا روشن۔“ نائلہ نے کہا۔ ”لیکن تو اپنے آپ کو بے آسرا نہ سمجھ۔ چل میرے ساتھ۔ اب تو میرے پاس رہنا۔ اللہ نے بہت کچھ دیا ہے مجھے۔ اور پھر تمہارے احسانات تو میں مرتے دم تک نہیں بھلا سکوں گی۔ تم نے تو مجھے نئی زندگی دی تھی۔“

”جندگی دینے والا تو اللہ ہے بی بی۔“ روشن نے جواب دیا۔

آس پاس کے لوگ حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ نائلہ درانی کو پہچانتے بھی تھے۔ اس کیس کے دوران نائلہ درانی کی تصویریں اس کثرت سے اخبارات میں چھپی تھیں کہ شہر کا بچہ اسے پہچاننے لگا تھا۔ اور پھر عدالت سے باعزت بریت کے بعد تو ہر اخبار نے صفحہ اول پر اس کی تصویریں شائع کی تھیں۔ اسے پہچاننے والے لوگ حیران ہو رہے تھے کہ نائلہ درانی کا اس خانہ بدوش عورت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

”روشن!“ نائلہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”میرے ساتھ چلو..... کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں بی بی۔“ روشن نے جواب دیا۔  
 ”تو چلو..... ان سے کہہ دو تم بعد میں آ جاؤ گی۔“ نائلہ نے کہا۔

روشن چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے اپنی ساتھیوں سے کچھ کہا اور نائلہ کے ساتھ سڑک پار کر کے اس طرف آگئی۔ نائلہ نے جب اس کے لئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو روشن کچھ اور حیران ہو گئی۔

”یہ موٹر تھماری ہے بی بی؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”ہاں..... یہ چیزیں ایک طرف سرکادو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ نائلہ نے سیٹ پر کھڑے ہوئے ڈیوں  
 شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کیا۔ روشن کے بیٹھنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا اور خود اسٹینرنگ کے  
 سے آگئی۔

”یہ روشن ہے۔“ اس نے انجن اشارت کرتے ہوئے دلاور کو بتایا۔ ”اس کے مجھ پر بڑے احسانات  
 ایک رات جب میں نے شبیردرانی سے بچنے کے لئے نہر میں چھلانگ لگا دی تھی تو رات بھر نہر میں  
 طے کھانے کے بعد میں بے ہوشی کی حالت میں نہر کے کنارے چھاڑیوں میں پھنس گئی تھی۔ اس نے مجھے  
 سے نکالا تھا۔ میں کئی روز تک اس کی جھگی میں بیمار پڑی رہی تھی۔ اس نے سگی بہنوں سے بڑھ کر میری  
 ست کی اور پھر جب میں بھیس بدل کر نرین پر سوار ہو رہی تھی تو شبیردرانی اور اس کے آدمیوں نے مجھے  
 لیا تھا۔ یہ پتھیرے ہیں۔ مگر بڑا خلوص ہے ان لوگوں میں۔ ان کے دل بٹھے میں پکی ہوئی اینٹوں کی طرح  
 نہیں بلکہ اس مٹی کی طرح نرم ہیں جن سے اینٹیں بناتے ہیں۔ اس کا شوہر بھی بست اچھا آدمی تھا۔  
 گزر گیا۔ اب یہ میرے پاس ہی رہے گی۔“

”نائلہ بی بی۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”خدا نے آپ کو ایسا دل دیا ہے جس کی مثال  
 ملتی۔ غریبوں کے لئے ہمدردی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ ایک میں نے رائے صاحب کو دیکھا ہے اور  
 آپ ہیں۔“

”غریب بھی انسان ہی ہوتے ہیں دلاور۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”بات صرف احساس کی ہے۔ ان کے  
 رو پیٹھے بول بول لو تو یہ اپنی جان تک دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔“

”یہ کون ہے بی بی۔ تیرا بندہ ہے کیا؟“ روشن نے آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔

روشن کی اس بات پر نائلہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے پورے بدن میں سنسنی کی ایک لہری  
 مٹی تھی۔ اس نے کن آنکھیں سے دلاور کی طرف دیکھا۔ وہ رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔  
 ”اچھا! میں سمجھ گئی۔“ روشن نے اسے خاموش پا کر کہا۔ ”ابھی شادی نہیں کی تم نے.....“

نائلہ نے اس مرتبہ بھی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔ جب اس نے گاڑی اپنے  
 والی گلی میں موڑی تو گلی میں بہت سی گاڑیاں دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ نائلہ نے اپنے بچکے  
 سامنے گاڑی روک لی اور جب وہ روشن کو لے کر اندر داخل ہونے لگی تو روشن نے پوچھا۔  
 ”یہ کس کی کوٹھی ہے؟“

”میری.....“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”اب تم بھی اسی کوٹھی میں رہو گی۔ شام کو دلاور کے ساتھ جا کر اپنا  
 اور اپنے بیٹے کو لے آنا۔“

روشن ایک بار پھر حیرت زدہ سی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کچھ عرصہ پہلے اس نے جس لڑکی کو  
 نکالا تھا اور جو جان کے خوف سے چھپتی پھر رہی تھی وہ اس قدر دولت مند ثابت ہوگی۔

نائلہ جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہاں کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے آج ہی کے اخبارات میں تو  
 رانی کے بارے میں خبر چھپی تھی کہ اسے عدالت نے باعزت طور پر بری کر دیا ہے اور یہ لوگ مٹھائی  
 بے لے کر اسے مبارک باد دینے آئے تھے۔ یہ تمام شہر کے معززین تھے، رئیس اور زمیندار تھے۔ ان  
 لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے مصیبت کے وقت نائلہ کو رانی کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں اور

اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر نائلہ کے دل میں ان کے لئے کوئی کدورت نہیں تھی۔ وہ سب سے بڑی خندہ پیشانی سے ملی۔

نائلہ درانی کا وہ دن بڑی مصروفیت میں گزرا۔ رات تک لوگ اسے مبارک باد دینے کے لئے آتے رہے۔ رات گیارہ بجے کے بعد ہی نائلہ کو ان مہمانوں سے فرصت ملی تھی۔ جب وہ ڈرائنگ روم سے نکلی تو روشن کو راہداری میں سیڑھی پر بیٹھے دیکھ کر چونک گئی۔

”ارے روشن!“ وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”میں تو بھول ہی گئی تھی..... میں ابھی تمہیں دارا کے ساتھ بھیجتی ہوں۔ اور تم نے کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔“

”تیرے تو بڑے اپنے اپنے رستے دار ہیں۔ میں یہاں کیسے رہوں گی نائلہ بی بی۔“ روشن نے کہا۔ ”مجھے تو تم سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

”ایک دو دن کی بات ہے۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک کیس سے بری ہوئی ہوں اور یہ لوگ مجھے مبارک باد دینے کے لئے آرہے ہیں۔ بہر حال، تم دارا کے ساتھ جا کر اپنے بیٹے کو لے آؤ۔“

”یہ دارا کون ہے؟ تم نے تو اس کا نام کچھ اور بتایا تھا۔“ روشن بولی۔ ”دارا دو سرا آدمی ہے۔“ کہیں اسے بھی تم میرا بندہ مت سمجھ لینا۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

روشن نے بھی صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ نائلہ نے دارا کو بلا کر اسے روشن کے بارے میں ہدایات دیں اور گاڑی کی چابی دے کر روشن کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔

”کھانا کب کا تیار ہو چکا ہے نائلہ بی بی۔“ زینت نے کہا۔ ”تم لوگ کھالو..... میں روشن کا انتظار کروں گی۔“ نائلہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔

روشن کی واپسی بارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا غنودگی میں تھا۔ روشن شلید اسے سوتے میں سے جگا کر لائی تھی۔ نائلہ نے روشن کو ایک کمرہ دکھا دیا۔

”بیٹے کو سلا کر جلدی سے آجاؤ۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ نائلہ نے کہا اور زینت کو کھانا گرم کرنے کی ہدایات دینے لگی۔

کھانے کے بعد نائلہ، روشن کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔ روشن کا بیٹا سو رہا تھا۔ وہ دونوں بھی بستر پر نیم دراز ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ نائلہ اسے اپنے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ دراصل کون ہے۔ اس کی ہر بات روشن کے لئے ایک سنسنی خیز اور ناقابل یقین انکشاف ثابت ہو رہی تھی۔

”تو اتنی پیسے والی ہے۔ بڑے بڑے لوگ تمہیں سلام کرنے آرہے ہیں تو تو اس طرح چھپی کیوں پھر رہی تھی۔ اپنے دسمنوں کو پولیس سے پکڑوا کیوں نہیں دیا؟“ روشن نے کہا۔

”وقت وقت کی بات ہوتی ہے روشن۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھ پر براقت تھا تو سب نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ ان بدترین حالات میں مجھے تم جیسے لوگوں نے پناہ دی۔ میں تم لوگوں کا احسان کیسے بھول سکتی ہوں۔“

”ہم نے کوئی احسان و حسان نہیں کیا نائلہ بی بی۔ اب آگے کو ایسی باتاں مت کریو.....“ روشن نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ نہیں کروں گی۔“ نائلہ مسکرا دی۔

انہیں باتوں میں وقت گزرنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی دن کی روشنی نے انہیں

تایا کہ رات بیت چکی ہے۔

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ اب تم بھی تھوڑی دیر آرام کرلو۔“ نائلہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اور دیکھو، اس الماری میں میرے کپڑے نچے ہوئے ہیں۔ ان میں جو قمیص پسند آئے پہن لینا۔“

”تمہارے کپڑے مجھے کہاں پورے آئیں گے۔“ روشن نہیں۔ ”میں اپنے کپڑے لے آئی ہوں۔“

نائلہ جواب دے بغیر اپنے کمرے میں آگئی۔

دو تین دن مبارک باد دینے والوں کی آمد و رفت جاری رہی اور پھر ایک روز نائلہ، دارا اور دلاور کو ساتھ لے کر گل مرگ آگئی۔ اپنی جلی ہوئی حویلی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔۔۔۔۔ اس کی آمد کی اطلاع پا کر بہتی میں رہنے والے مزارعے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ کبھی حویلی کے چلنے کا افسوس کرتے اور کبھی مصائب سے نجات ملنے پر اسے مبارک باد دینے لگتے۔ نائلہ نے وہ سارا دن گل مرگ میں اپنے مزارعوں اور کاشتکاروں کے ساتھ گزارا۔ اس کے تایا عبدالرحمن درانی اگرچہ اپنی حویلی میں موجود تھے مگر اس کی آمد کی اطلاع پا کر بھی وہ حویلی سے باہر نہیں نکلے اور نہ ہی نائلہ نے ان کی حویلی میں جانا مناسب سمجھا کیونکہ اس کے خیال میں عبدالرحمن درانی بھی اس کے خلاف حسینہ بیگم اور شبیر درانی کی سازشوں میں برابر کے شریک تھے۔

شام سے ذرا پہلے نائلہ درانی شہر واپس آگئی۔ اس سے اگلے روز نائلہ کو یہ اطلاع مل گئی کہ شبیر درانی ہسپتال سے گھر منتقل ہو چکا ہے۔ نائلہ نے حسینہ بیگم کو اپنے مال کی واپسی کے لئے تین دن کی مہلت دی تھی اور وہ مہلت ختم ہو گئی تھی۔ مگر نہ حسینہ بیگم نے اس سلسلے میں اس سے کوئی رابطہ قائم کیا اور نہ ہی خود اس نے کوئی کارروائی کی تھی۔ وہ ان ماں بیٹوں کو مزید ڈھیل دینا چاہتی تھی۔

دو تین دن اور گزر گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے نائلہ کی زندگی معمول پر آتی جا رہی ہو۔ صفر اور زینت اپنے گھر واپس چلے گئے تھے اور اب گھر کا انتظام روشن نے سنبھال لیا تھا۔ وہ گھرداری میں بڑے سلیقے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

فرصت ملنے ہی نائلہ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ وکیل کے ذریعے اپنی تمام زرعی اراضی اور جائیداد کی پاور آف اٹارنی رائے منصور کے نام لکھوا دی۔

اس دوران رائے منصور بھی روزانہ ٹیلی فون پر اس کی خیریت دریافت کرتا رہا اور پھر اس روز رائے منصور نے ٹیلی فون کیا کہ اب وہ چند روز کے لئے حویلی آجائے اور نائلہ اس روز احمد پور لانا جانے کی تیاری کرنے لگی۔

نائلہ جب رحیم یار خان سے روانہ ہوئی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دلاور ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر دارا گمن سنبھالے مستعد بیٹھا تھا۔ نائلہ پچھلی سیٹ پر تھی۔ اس کے ساتھ روشن اور اس کا بیٹا بھی تھا۔

کار صادق آباد سے تقریباً ”نصف میل آگے“ ٹکلی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار نے اوور ٹیک کرتے ہوئے راستہ روک لیا اور اس سے پہلے کہ دلاور یا دارا کچھ سمجھ سکتے، کار سے چار آدمی نیچے اترے۔ انہوں نے چروں پر ڈھانے باندھ رکھے تھے اور ہاتھوں میں آٹومٹک رائفلیں تھیں۔۔۔۔۔ دلاور نے اپنی کار کو تیزی سے دائیں طرف موڑنا چاہا لیکن اسی لمحہ ان نقاب پوشوں نے کار پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ کار لڑکھڑاتی ہوئی سڑک سے اتر کر ایک درخت سے ٹکرائی اور گولیاں تیز بارش کی طرح کار

پر برس رہی تھی۔  
 فائرنگ رک گئی۔ وہ نقاب پوش دوڑتے ہوئے نالکہ کی کار کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک جھکے سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ نالکہ کی ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ ان دونوں نے نالکہ کو کھینچ کر باہر نکالا اور کھینچتے ہوئے اپنی کار کی طرف لے گئے اور اسے پچھلی سیٹ پر ٹھونس کر خود بھی اندر گھس گئے۔  
 دوسرے ہی لمحہ کار حرکت میں آئی اور دھول اڑاتی ہوئی تیز رفتاری سے اس سڑک پر دوڑنے لگی جو ریگستان سے ہوتی ہوئی ایک طویل فاصلہ طے کرتی ہوئی ہندوستان کے سرحدی شہر کشن گڑھ کی طرف چلی گئی تھی۔

\*\*\* ..... \* \* \* \* \*

کار تیز رفتاری سے ویران سڑک پر دوڑ رہی تھی۔  
 دو نقاب پوش ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور دو پچھلی سیٹ پر۔ ان دونوں کے درمیان نالکہ درانی سینڈوچ بنی بیٹھی تھی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے اور دانت سختی سے بچھنے ہوئے تھے۔ اس کی دائیں ٹانگ پر پینڈلی اور ران سے بنے والا خون سیٹ کو بھی تر کر رہا تھا۔ دائیں بائیں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے اس طرح دبوچ رکھا تھا جیسے اب بھی اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہو۔

ڈرائیور کے چہرے پر بھی ڈھانپنا بندھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں چمڑے کی پٹی تھی جس میں بنے ہوئے خانوں میں ریوالور کی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ ہولسٹر میں اعشاریہ تین آٹھ کاربو الور بھی اڑسا ہوا تھا۔ ہولسٹر کا ٹین کھلا ہوا تھا اور ریوالور کا دستہ باہر جھانک رہا تھا جبکہ اس کے دوسرے ساتھیوں کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ان کے چروں پر بھی ابھی تک ڈھانٹے بندھے ہوئے تھے۔

کار نے اس سڑک پر تقریباً "دس میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ سامنے سڑک کے عین وسط میں ایک سرخ روشنی دکھائی دینے لگی۔ وہ روشنی ایک ہی جگہ پر کبھی اوپر نیچے اور کبھی دائیں بائیں حرکت کر رہی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کسی ٹارچ وغیرہ کی روشنی تھی اور انہیں رکنے کا اشارہ کیا جا رہا تھا۔  
 "یہ کون لوگ ہیں؟" ڈرائیور نے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھا۔  
 "پولیس والے ہی ہو سکتے ہیں۔ گاڑی بھی نظر آرہی ہے۔" ایک آدمی نے جواب دیا۔

"ان کے اشارے پر رکنے کا مطلب ہے کہ سب کچھ ختم۔" ڈرائیور نے کہا۔ "تم لوگ تیار ہو جاؤ۔ میں قریب پہنچ کر گاڑی کی رفتار کم کر دوں گا۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ گاڑی رک رہی ہے، تم لوگ فائر کھول دینا۔ لیکن خیال رکھنا زیادہ لوگ نہ مرنے پائیں اور ملوک!" اس نے پچھلی سیٹ پر نالکہ کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمی کو مخاطب کیا۔ "تم نے اس گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنانا ہے تاکہ یہ لوگ ہمارے پیچھے نہ آسکیں۔"

"ٹھیک ہے، ہم تیار ہیں۔" ملوک نے جواب دیا۔

اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک آدمی تھوڑا سا ڈرائیور کی طرف دبک گیا جبکہ دوسرا آدمی کھڑکی کی طرف جھک گیا اور اس نے رائفل کی ٹال کھڑکی سے باہر نکالی تھی۔ یہ AK 47 رائفل تھی جو سب مشین گنن کا کام دیتی تھی۔ دوسرے آدمیوں کے پاس بھی ایسی ہی رائفلیں تھیں، پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ملوک نے بھی اپنی رائفل کی ٹال باہر نکالی تھی۔

کار کے ہیڈ لیمنس کی روشنی میں سامنے سڑک پر کھڑے ہوئے تین چار پولیس والے اب صاف نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سرخ روشنی والی ٹارچ تھی جس سے وہ انہیں رکنے کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔ اس سے دو تین قدم پر دو سرا پولیس والا تھری ناٹ تھری کی رائفل سنبھالے کھڑا تھا دو پولیس والے ان سے کچھ ہٹ کر کھڑے تھے۔ ان کے کندھوں پر بھی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں لٹکی تھیں۔

یہ پولیس کی کوئی گشتی پارٹی تھی جو دیہی علاقوں کا طویل چکر کاٹ کر صادق آباد والے ہائی وے کی طرف آ رہی تھی لیکن گاڑی کا اگلا ایک ٹائر فلیٹ ہو جانے کی وجہ سے انہیں وہاں رکتا ہوا تھا اور صادق آباد سے آنے والی اس گاڑی کو دیکھ کر وہ انہیں اس لیے روکنا چاہتے تھے کہ شاید ان گاڑی والوں سے مدد مل سکے لیکن ان کا انداز ایسا تھا جیسے انہوں نے خطرناک مجرموں کی تلاش کے لیے سڑک کی ناک بند کر دی ہو۔

ڈرائیور نے کار کی رفتار کم کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے آدمیوں کو سگنل دے دیا۔ ٹائلڈ نے بھی سامنے سڑک پر پولیس والوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے اچانک ہی بچاؤ بچاؤ کا شور مچاتے ہوئے دوڑ کر دیا۔

”منہ بند کرو اس کتیا کا۔“ ڈرائیور چیخا۔

ٹائلڈ کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے بڑی تیزی سے گھوم کر ٹائلڈ کا منہ اس سختی سے دبا دیا کہ سینے میں اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ڈرائیور نے کار کی رفتار ایک دم تیز کر دی تھی۔ اس تھا ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ملوک اور اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی نے فائر کھول دیا۔ سڑک پر کھڑے ہوئے پولیس والے کار کی رفتار کم ہوتے دیکھ کر یہی سمجھے تھے کہ وہ کار رک رہی ہے۔ ان سے ہو گئے لیکن اسی لمحہ کار سے نسوانی چیخوں کی آواز سن کر وہ بری طرح چونک گئے۔ کوئی عورت اڑ پکار رہی تھی۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کار میں کسی عورت کو اغواء کر کے لے جایا جا رہا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتے آنے والی کار کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی کار ٹرنک ہونے لگی۔

رج والا کانشیل خوفزدہ انداز میں اچھل کر پیچھے گرا۔ ٹارچ بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر گر گئی تھی جو پر لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی تھی۔ اس کا رائفل بردار ساتھی بھی اچھل کر پیچھے ہٹا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے منہ سے خوفناک چیخ نکلی اور وہ سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں لگی تھی جس سے اس کی ٹانگ اڑ کر بکھر گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکا ہوا۔ کار سے چلائی جانے والی ایک گولی پولیس دین کے ایک پہنچنے والے گاڑی کے منہ سے پھٹ گیا تھا۔ دوسرے دو پولیس والے اچھل کر پیچھے جا کر رہے تھے۔ وہ تھیں سے زیادہ عقل مند ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے آنے والی کار میں سے کسی عورت کے چپخنے دہستے ہی سڑک کے کنارے پر چھلانگ لگا دی تھی۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کار عورت کو اغواء کر کے لے جایا جا رہا تھا اور ظاہر ہے کار والے آسانی سے پولیس کا سامنا نہیں کر سکتے یہ بھی سمجھ گئے کہ کار کی رفتار کا کم ہونا بھی دھوکہ ہو سکتا ہے۔ ان کی زندگی پولیس میں گزری تھی زندگی کے تجربوں نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔



ان دونوں کے شبہات درست نکلے تھے۔ کار کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ فضا میں فائرنگ کی آواز سی گونج اٹھی تھی۔ گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر گئی تھیں، اس لمحہ انہیں اپنے ایک ساتھی کی چیخ اور ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔

وہ کار انتہائی تیز رفتار سے سڑک کے کنارے سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ ریت کے بادل نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اڑتی ہوئی دھول میں دور ہوتی ہوئی کار کی عقبی سرخ جیوں کی مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ دونوں پولیس والوں نے سنبھل کر کار پر فائرنگ شروع کر دی لیکن وہ کار فائرنگ کی ریٹ سے نکل چکی تھی۔

وہ دونوں اٹھ کر اپنے اس ساتھی کی طرف دوڑے جسے انہوں نے چیخ کر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی کھوپڑی اڑ گئی تھی اور وہ ختم ہو چکا تھا۔ مارچ والے کانٹیل کے بازو میں بھی گولی لگی تھی اور وہ بھی سڑک کے کنارے پر پڑا چیخ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کانٹیل اٹھ کر دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”حوصلہ کریا۔۔۔ معمولی زخم ہے ٹھیک ہو جائے گا۔“ دوسرے کانٹیل نے اپنے زخمی ساتھی کو تسلی دی۔

”فضل داد کو دیکھ، وہ بچا رہا ختم ہو چکا ہے۔“

زخمی کانٹیل نے چننا بند کر دیا۔ وہ دونوں بھی لاش کے قریب آ گئے۔

”وائریس پر سینٹر کو اطلاع دو نا نور محمد۔“ لاش کے قریب بیٹھے ہوئے کانٹیل نے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پہلے بھی سینٹر کو اطلاع دی تھی کہ ہماری گاڑی کا ٹائر پتھر ہو گیا ہے لیکن جواب ملا تھا کہ تمہارے میں کوئی گاڑی نہیں ہے۔ موبائل کو وہیں چھوڑ کر پیدل آ جاؤ۔“ نور محمد نے جواب دیا۔

”اب تو صورت حال بدل گئی ہے یار۔“ اس کانٹیل نے کہا۔ ”ہم ایک زخمی اور ایک لاش کو اٹھا کر

دس بارہ میل کا فاصلہ پیدل تو طے نہیں کر سکتے۔ اچھا تم یہیں بیٹھو اور یہ لو۔۔۔ اس کے بازو پر پٹی باندھ دو تاکہ

خون زیادہ نہ بہہ جائے۔“ اس نے جیب سے رد مال نکال کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیا اور خود اٹھ کر

موبائل کی طرف چل پڑا۔

اس نے وائریس پر رابطہ قائم کر کے اپنے قہانے کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور پھر کافی دیر تک

دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر ریسیور رکھ کر واپس آ گیا۔

”بڑی گزب ہو گئی ہے یار نور محمد!“ اس نے اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچ کر کہا۔

”کیا ہوا؟“ نور محمد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شر کے قریب مین روڈ پر ایک کار پر بڑی زبردست فائرنگ کی گئی تھی جس میں ایک عورت، ایک نو عمر

لڑکا اور ایک آدمی ہلاک ہو گیا ہے اور جبکہ ایک آدمی شدید زخمی ہوا ہے۔ اسی کار سے ایک عورت کو اغوا

بھی کیا گیا ہے اور جانتے ہو اغواء ہونے والی عورت کون ہے؟“

”کون ہے؟“ نور محمد نے پوچھا۔

”نامہ درانی۔“ اس کانٹیل نے جواب دیا۔

”اوہ!“ نور محمد اچھل پڑا۔ ”کیس یہ وہی گاڑی تو نہیں تھی جس میں نامہ درانی کو اغواء کر کے لے ۱۲

جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کار سے ایک عورت کو بچاؤ بچاؤ چیتے ہوئے بھی سنا تھا۔“

”یقیناً یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے مین روڈ پر کار پر حملہ کر کے نامہ درانی کو اغواء کیا ہے، اور

جانتے ہو جو آدمی حملہ آوروں کی فائرنگ سے ہلاک ہوا ہے وہ کون تھا؟“

”کون تھا؟“ نور محمد نے پوچھا۔

”رائے منصور کا گن مین دارا۔“ اس کانٹیل نے جواب دیا۔ ”اور جو آدمی زخمی ہوا ہے وہ دلاور ہے۔“

”اوہ!“ نور محمد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”چند روز سکون سے گزرے تھے لیکن اب سمجھو کہ پولیس والوں کا سکون ختم ہو گیا۔ رائے منصور تو قیامت مچا دے گا۔ جب تک دارا کے قاتل گرفتار نہیں ہوتے اور نائلہ درانی کو بازیاب نہیں کرایا جاتا وہ اس وقت تک پولیس کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا لیکن... تمہیں کیا جواب دیا سینٹروالوں نے؟“

”وہ ایک گاڑی بھیج رہے ہیں۔“ کانٹیل نے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ وہی گاڑی ہوگی۔“

نور محمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے زخمی ساتھی کے بازو پر رومال باندھ دیا تھا لیکن خون ابھی بہہ رہا تھا۔ اس نے جب سے اپنا رومال نکالا اور زخم سے ذرا اوپر دوسری پٹی باندھنے لگا تاکہ خون کا بہاؤ رک جائے۔

ان پر فائرنگ کرنے والی کار نہایت تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی تقریباً ”پانچ میل آگے جا چکی تھی۔“ یہ تو بہت برا ہوا۔ ”ذرا نیور بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔“ اب پولیس کے لیے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ ہم لوگ کس طرف گئے ہیں۔ اس کتیا کی وجہ سے انہیں اور بھی یقین ہو جائے گا کہ مین روڈ پر اس کار پر ہم نے ہی فائرنگ کی تھی۔ اب اگر یہ منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کرے تو گلا گھونٹ دینا اس حرامزادی کا۔“

”کیوں چیخی تھیں تم؟“ ملوک نے نائلہ درانی کے سر کے بال پکڑ کر پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ نائلہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ”کیا تم یہ سمجھی تھیں کہ وہ پولیس والے تمہیں بچالیں گے! یہ پولیس والے اتنے بہادر نہیں ہوتے کہ اصلی بندوں کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ تو جعلی پولیس مقابلے کرنا ہی جانتے ہیں۔ ان کے سامنے جب گولی چلتی ہے تو ان کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے کسی ساتھی کی لاش پر بیٹھے ماتم کر رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا کم از کم ایک آدمی تو مارا ہی گیا ہو گا۔“

اس نے خاموش ہو کر نائلہ کے سر کو ایک اور جھٹکا دیا۔ نائلہ کے منہ سے ایک بار پھر ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ملوک سیٹ پر مڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی پشت کار کے دروازے سے لگی ہوئی تھی اور رخ نائلہ کی طرف تھا۔ ایک ہاتھ سے وہ نائلہ کے سر کو جھٹکے دے رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے نائلہ کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ بھی رسید کر دیا تھا۔ نائلہ کے منہ سے ایک بار پھر ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”بہت بہادر ہو۔“ نائلہ نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”ایک زخمی اور بے بس عورت پر تشدد کر کے اپنے آپ کو بہت دلیر سمجھ رہے ہو۔ بے غیرت...“ نائلہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

ملوک کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس نے قیص کے دامن سے اپنے چہرے سے تھوک صاف کیا اور فوٹو مار لگا ہوں سے نائلہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے نائلہ کے بالوں کو ایک زوردار جھٹکا دے کر اس کے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور دوسرا ہاتھ اس کی قیص کے گلے پر ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ چر کر آواز کے ساتھ نائلہ کی قیص پھٹ گئی۔

”بھورے!“ ملوک نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بڑی زوردار چیز ہے۔ کیا خیال ہے۔ دعوت نہ

اڑائی جائے۔“

”نہیں ملوک!“ ڈرائیور بھورے نے جواب دیا۔ ”ہم جرائم پیشہ ضرور ہیں لیکن ہمارے بھی کچھ اصول ہیں۔ یہ چھوری ہمارے پاس امانت ہے اور ہم اس امانت میں خیانت نہیں کر سکتے۔“

”لیکن اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اگر یہ زندہ ہاتھ نہ لگے تو اسے قتل کر دیا جائے۔“ ملوک نے کہا۔

”اس سے جی بھلا کر ہم اسے قتل کر دیں گے اور لاش لے جا کر اس کے حوالے کر دیں گے۔“

”نہیں ملوک۔“ بھورے کے لہجے میں سختی تھی۔ ”میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”تو پھر بھورے استاد، ہمیں اس چھوڑ کر پر تھوڑا ہاتھ تو پھیرنے دو۔“ ملوک نے کہا اور بھوکی نظروں سے نالکہ کی طرف دیکھنے لگا۔

نالکہ سیٹ کے درمیان تھی۔ ڈیش بورڈ کی مدھم سی روشنی اگلی دونوں سیٹوں کے درمیان خالی جگہ سے نالکہ تک پہنچ رہی تھی۔ ملوک کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نالکہ کی طرف بڑھنے لگا۔

نالکہ نے اچانک ہی اس کی کلائی پکڑ لی۔ ملوک کی کلائی عین جوڑے نالکہ کی انگلی اور انگوٹھے کی گرفت میں تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے نالکہ کے جسم کی تمام تر قوت اسی ایک انگلی اور انگوٹھے میں سم آئی ہو۔

ملوک کے حلق سے پہلے تو غراہٹ سی نکلی اور پھر یہ غراہٹ کراہوں اور سسکاریوں میں بدل گئی۔ وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی کلائی کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہو اور اس نے ہاتھ کو حرکت دی تو ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔

نالکہ کے چہرے پر سختی ابھر آئی تھی۔ اس کے دانت بھیج گئے۔ اس نے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری اور ملوک کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔ نالکہ کے دوسری طرف بیٹھا ہوا آدمی یہی سمجھتا رہا کہ ملوک مزے اڑا رہا ہے مگر اس کی چیخ سن کر وہ بھی مڑ گیا اور اس نے نالکہ پر گھونسلوں کی بارش کر دی۔

نالکہ بھی چیخنے لگی۔ اس نے ملوک کی کلائی چھوڑ دی اور دوسرے آدمی کے گھونسلوں سے اپنا بچاؤ کرنے لگی۔ اس دوران گاڑی دائیں طرف ایک کچی سڑک پر مڑ گئی تھی لیکن اس کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی کچی سڑک پر اچھلتی ہوئی تیزی سے دوڑتی رہی۔

”استاد بھورے!“ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے یہ جیالے تو اس چھوڑی کو مار ڈالیں گے۔ اس کو بچاؤ نا بابا... ایک چھوڑی پر کیا اپنی مبادری دکھا رہے ہیں یہ لوگ...“

”ملوک! اس چھوڑی کو چھوڑ دو۔“ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر کہا۔

”اس نے میری کلائی کی ہڈی توڑ دی ہے استاد بھورے۔“ ملوک چیخا۔ ”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ دوسرے ہاتھ سے نالکہ پر گھونسنے برسانے لگا۔

نالکہ بری طرح چیخ رہی تھی اور پھر اس نے ملوک کے بازو پر دانت گاڑ دیے۔ اب ملوک چیخنے لگا۔ دوسرے آدمی نے نالکہ کو بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ ملوک کے بازو کو نالکہ کے دانتوں سے نجات مل گئی مگر اس کی ہڈی ادھڑ گئی تھی اور بازو سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ ایک بار پھر نالکہ پر پل پڑا۔

”میں کہتا ہوں چھوڑ دو اسے۔“ بھورے کے لمبے میں اس دفعہ سختی تھی۔

”تم گاڑی چلاتے رہو استاد۔ میں اس چھوکری کو بتاؤں گا کہ ملوک پر ہاتھ اٹھانے اور اس کے منہ پر تھوکنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔“ ملوک نے جواب دیا۔

بھورے نے ایک دم گاڑی روک لی اور بڑے غصے میں نیچے اتر آیا، اوپر سے گھوم کر وہ پچھلے دروازے کی طرف گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ملوک والا دروازہ کھول دیا اور ملوک کو پکڑ کر باہر کھینچنے لگا۔ ملوک نے بڑی مشکل سے نالکہ کو چھوڑا تھا۔ بھورے نے ملوک کو گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔

”تم بھی نیچے اترو۔“ بھورے نے نالکہ کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا۔ اس کے لمبے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ وہ شخص بلا چوں و چرا دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ آگے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی بھی نیچے اتر آئے تھے۔

ملوک کا دایاں ہاتھ لٹکا ہوا تھا۔ نالکہ نے اس کی کلائی کی ہڈی توڑ دی تھی۔ اس کے دوسرے بازو سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ جہاں نالکہ نے دانتوں سے اس کی بوٹی نوچ لی تھی۔

”بڑے زور آور مرد ہو۔“ اگلی سیٹ سے اترنے والے ایک آدمی نے کہا۔ ”ایک چھوکری نے تمہاری ہڈی توڑ دی۔ تم یہ دھندہ چھوڑ دو ملوک۔ تمہاری مردانگی تو ایک عورت کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ تم تو بڑے بڑے دعوے کرتے تھے؟“

”تم اپنی چونچ بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔“ ملوک نے اس شخص کی طرف دیکھ کر غراتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ اڑی مت کرنا ملوک۔“ وہ شخص بھی غرایا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں سمجھو!“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔“ ملوک نے جواب دیا۔ ”اس وقت بہت رعب سے بات کر رہے ہو۔ وہ دن بھول گئے جب لڑکوں نے قصبے کے چوک پر تمہیں ننگا کر دیا تھا۔“

”اپنی زبان بند رکھو ملوک۔“ وہ آدمی ہاتھ اٹھائے ہوئے ملوک کی طرف بڑھا۔

”تم لوگوں کا داغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ آپس میں کیوں لڑنے لگے ہو۔“ بھورے نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تو پھر اس سے کہو اپنی زبان بند رکھو۔“ وہ شخص غرایا۔

”اس میں قصور تمہارا ہے ملوک۔“ بھورے نے ملوک کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ چھوکری کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا، مگر تم نہیں مانے۔ ہم لوگ جرائم پیشہ ضرور ہیں مگر ہمارے بھی کچھ اصول ہیں۔ لوگ ہم پر بھروسہ کرتے ہیں اور لاکھوں روپے دے کر ہم سے کام لیتے ہیں۔ اگر کسی کو ہم پر بھروسہ نہ ہوتا تو آج ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتے۔“

وہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے تھے اور نالکہ کار میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے کراہ رہی تھی۔ ان کم بختوں نے اسے بری طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ وہ زخمی نہ ہوتی تو شاید ملوک کی گردن ہی مروڑ دیتی۔ لیکن اس نے کلائی کی ہڈی توڑ دی تھی اور ملوک کے لیے یہی سزا کافی تھی۔ نالکہ اس وقت کو دعائیں دے رہی تھی جب لاہور میں یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران اس نے مارشل آرٹس دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مارشل آرٹس کی مختلف ٹیکنیکس اب قدم قدم پر اس کے کام آ رہی تھیں۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہ جانتی ہوتی تو نالکہ بہت پہلے اپنے دشمنوں کے ہاتھوں رسوا ہو چکی ہوتی یا اسے ٹھکانے لگایا جا چکا ہوتا۔

سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے نائلہ کی نظر اچانک ہی گاڑی میں پڑی ہوئی ملوک کی رائفل پر پڑی۔ اس نے دائیں طرف دیکھا۔ دوسرے آدمی کی رائفل بھی گاڑی ہی میں تھی اور اگلی سیٹ کے سامنے بھی دونوں رائفلیں رکھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

نائلہ نے کن انکھیوں سے باہر دیکھا۔ وہ پانچوں کار سے باہر تھے اور آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ان میں صرف بھورا ایک ایسا شخص تھا جس کے ہولشر میں ریوالور اڑسا ہوا تھا اور باقی چاروں خالی ہاتھ تھے۔ نائلہ سیٹ پر ایک طرف جھک کر آہستہ آہستہ ملوک والی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کن انکھیوں سے وہ ان لوگوں کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ بالاخر اس کا ہاتھ رائفل پر پہنچ گیا۔ اس نے رائفل پر گرفت جما کر اسے بڑی پھرتی سے اپنی طرف کھینچ لیا۔

”ہینڈ زاپ... کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ نائلہ نے سیٹ کے کنارے پر آکر ان پر رائفل تان لی۔

وہ چاروں اچھل پڑے۔ نائلہ کے ہاتھوں میں رائفل دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے تھے۔ بھورے نے بڑی پھرتی سے ہولشر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نائلہ نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی بھورے کے سینے میں لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

”اپنی عزت اور اپنی جان بچانے کے لیے کسی کو قتل کر دینا جرم نہیں ہوتا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”کسی اور نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو اس کا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اگر میں چاہوں تو تم سب کی لاشیں یہاں گر کر اطمینان سے چلی جاؤ گی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا کون ہے۔ اگر تم لوگ زندگی چاہتے ہو تو ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر یہاں سے کم از کم پچاس قدم دور چلے جاؤ۔ میں تین تک گنتی گنوں گی۔ اگر تین کہنے پر بھی تم لوگوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی تو میں فائر کھول دوں گی، ایک...“ نائلہ نے گنتی شروع کر دی۔ ”دو... تین...“

اس کے تین کہنے سے پہلے ہی وہ چاروں ہاتھ سروں پر رکھ کر مخالف سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ابھی چند قدم دور گئے تھے کہ نائلہ نے رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا۔ ویرانہ ایک بار پھر فائرنگ کے شور اور ان چاروں کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ وہ چاروں منہ کے بل گرے۔ نائلہ نے ان چاروں کی ٹانگیں بیکار کر دی تھیں۔

”تم لوگ ڈاکو اور قاتل ہو۔“ نائلہ نے چیخ کر کہا۔ ”اب تک نبھانے کتنے بے گناہ تم لوگوں کے ہاتھوں مار جا چکے ہوں گے۔ میرے ساتھیوں میں سے پتہ نہیں کوئی زندہ بچا ہو گا یا نہیں۔ تمہارے گھناؤنے جرائم کی سزا تمہیں قانون دے گا اور مجھے یقین ہے کہ تم لوگ بہت جلد قانون کے ہاتھ آ جاؤ گے۔“

نائلہ کار سے اتر آئی۔ ٹانگ کے زخموں سے خون بہہ جانے سے وہ اپنے آپ میں کمزوری سی محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے کار کا سارا لے کر چلتی ہوئی اوپر سے گھوم کر اسٹیرنگ والے دروازے کے سامنے آ گئی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔

گاڑی کو گیئر میں ڈالتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی ہو۔ اس نے سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔ نائلہ کے حواس آہستہ آہستہ جواب دے رہے تھے۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔ وہ تو بس کار کی رفتار بڑھاتی جا رہی تھی۔ نائلہ پر بار بار غنودگی کی سی

کیفیت طاری ہو رہی تھی اور وہ بار بار سر جھٹک رہی تھی۔ کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ اس کا دایاں پیر جیسے ایک سیلیبریت پر چبک کر رہ گیا جبکہ بایاں پیر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا تھا۔ دونوں گولیاں بائیں ٹانگ میں لگی تھیں اور یہ ٹانگ سن ہو کر رہ گئی تھی۔

کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹائلہ نے غیر ارادی طور پر کار کو دائیں طرف ایک کچی سڑک پر موڑ دیا۔ کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ریت ہی ریت نظر آرہی تھی۔ یہ ریت نرم یا بھر بھری نہیں تھی۔ سخت زمین تھی جس کی وجہ سے کار بڑی آسانی سے دوڑ رہی تھی۔

میل پر میل طے ہوتے گئے۔ نقاہت اب پوری طرح ٹائلہ پر غالب آتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار سر کو جھٹکے دے رہی تھی۔ اب تک اس نے اپنی قوت ارادی کے سہارے اپنے حواس کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ لیکن اب اس کی قوت ارادی بھی جواب دے رہی تھی اور حواس بھی ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

بالآخر ٹائلہ کے حواس جواب دے گئے۔ اس سر جھٹکا چلا گیا اور اسٹیرنگ پر ٹک گیا۔ کار تقریباً ایک میل تک سیدھی دوڑتی رہی اور پھر اس کا رخ خود بخود مڑنے لگا۔ کار اب راستے سے ہٹ کر سخت ریت کے میدان میں دوڑ رہی تھی۔ اس میدان میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ کار ان جھاڑیوں میں دوڑ رہی تھی اور پھر اس کی رفتار کم ہونے لگی۔ ٹائلہ کا پیر ایک سیلیبریت سے ہٹ گیا تھا۔ کار کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ ٹائلہ کا سر اسٹیرنگ پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بھی اسٹیرنگ پر تھا اور دوسرا ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔

جھاڑیاں گنجان ہوتی جا رہی تھیں۔ کار بدستور ان جھاڑیوں میں تھکتی چلی جا رہی تھی... رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور بالاخر جھاڑیوں میں رک گئی... کار کا انجن آہستہ آہستہ گرگرا رہا تھا اور ٹائلہ اسٹیرنگ پر سر نکائے بے ہوش پڑی تھی۔

..... \* \* \* .....

وہ کار رحیم یار خان ہی سے ٹائلہ کی کار کے پیچھے لگی تھی۔ وہ اگرچہ مسلسل ٹائلہ کی کار کے پیچھے آرہی تھی مگر فاصلہ زیادہ ہونے اور سڑک پر دیگر گاڑیوں کی وجہ سے بھی ٹائلہ یا دلاور وغیرہ کو شبہ نہیں ہو سکا تھا۔ اگلی سیٹ پر دارا بیٹھا ہوا تھا جو دلاور سے باتیں کر رہا تھا اور پچھلی سیٹ پر ٹائلہ روشن سے گفتگو میں مصروف تھی۔ ایک دروازے کی طرف ٹائلہ بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ روشن اور دوسرے دروازے کے ساتھ روشن کا بیٹا بیٹھا ہوا تھا جو مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ روشن، ٹائلہ کو اپنی کمائی سنارہی تھی کہ جب خانپور ریلوے اسٹیشن پر شبیردرانی اور اس کے آدمی ٹائلہ کو لے گئے تھے تو انہوں نے شبیردرانی کے ایک آدمی کی پٹائی کر ڈالی تھی۔ اگر پولیس والا نہ چھڑاتا تو وہ اس آدمی کو ماری ڈالتی۔

ٹائلہ کے اغوا کے بعد روشن نے پولیس میں اس کے اغوا کی رپورٹ لکھوانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اغوا کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ لوگ کون تھے اور ٹائلہ کو کہاں لے گئے تھے۔ وہ تھانے والوں کو صرف حلیہ ہی بتاتی رہی۔ پولیس نے جب اس کی رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا تو روشن نے تھانے میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ بالاخر دو پولیس والے روشن کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں فلیوں، گیٹ پر کھڑے ہوئے کلکٹ کلکٹروں اور دیگر لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو سب ہی نے اس قسم کے کسی واقعہ سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا جس کے بعد روشن اور اس کی ساتھی عورتوں کو

ڈانٹ ڈپٹ کر کھانے سے بھگا دیا گیا تھا۔

روشن دودن خانیور رہنے کے بعد اپنے بھٹے پر واپس چلی گئی تھی۔ اس کے دوسرے ہی دن اس کا شوہر بیمار پڑ گیا اور پھر چند روز کے اندر ہی اندر وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کے کچھ روز بعد روشن نے اس بھٹے پر کام چھوڑ دیا۔ وہ مختلف جگہوں پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی رحیم یار خان آگئی۔ یہاں اس کے قبیلے کے کچھ لوگ موجود تھے۔ روشن ان کے ساتھ رہنے لگی اور پھر اس روز اتفاق سے نالکہ کی نظروں میں آگئی۔

وہ لوگ مغرب کے وقت رحیم یار خان سے نکلے تھے۔ راستے میں وہ آدم صحابہ میں رکے تھے اور پھر صادق آباد کے اڈے پر بھی کچھ دیر کے لیے انہیں رکن پڑا تھا۔ جب سے نالکہ کو حسینہ بیگم سے یہ گاڑی واپس ملی تھی اس کے آنجن میں تھوڑی گڑبڑ بننے لگی تھی۔ دلاور نے اسے گاڑی کی اس گڑبڑ کے بارے میں بتادیا تھا اور نالکہ نے یہی سوچا تھا کہ دلاور اسے رائے صاحب کی حویلی میں چھوڑ کر کل صبح گاڑی صادق آباد لے آیا ہوگا جہاں کسی کلینک سے اسے اچھی طرح چیک کروایا جائے گا۔ صادق آباد میں انہیں گاڑی کی گڑبڑ ہی کی وجہ سے رکن پڑا تھا۔

جب وہ صادق آباد سے روانہ ہوئے تو دس بجتے والے تھے۔ دلاور اسے بتا رہا تھا کہ کل گاڑی کو ہر صورت میں چیک کروانا پڑے گا۔ نالکہ پھر روشن سے باتیں کرنے لگی اور دلاور دارا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ شہری حدود سے باہر نکلے ہی تھے کہ پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار انہیں اور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وہ کار دلاور والی سائیڈ سے آگے نکلی تھی۔ دلاور نے گردن گھما کر اس کار کی طرف دیکھا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور جو شخص کھڑکی والی سائیڈ پر بیٹھا تھا دلاور نے اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ لی تھی۔ اسے صرف رائفل کی ٹال نظر آئی تھی۔ دلاور کا ماتھا ٹھنکا تھا لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ رات کے وقت ہائی وے پر سفر کرنے والے عام طور پر اسلحہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ خود ان کے پاس بھی دو رائفلیں تھیں۔

وہ کار تیزی سے اور ٹیک کرتی ہوئی تقریباً "بیس گز آگے جاکر سڑک کے وسط میں رک گئی۔ دلاور کی چھٹی حس نے فوراً ہی خطرے کی گھنٹی بجادی۔ ٹھیک اسی لمحے اگلی کار سے چار آدمی اتر آئے۔ ان کے چہروں پر ڈھانے بندھے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

"دارا ہو شیارا!" دلاور نے چیختے ہوئے پوری قوت سے بریک پینڈ دیا۔

ان کی کار رکنے سے پہلے ہی دو نقاب پوش ایک طرف اور دو دوسری طرف آگئے تھے۔ دلاور نے بڑی پھرتی سے اسٹیرنگ دائیں طرف گھمادیا۔ اسی لمحے نقاب پوشوں نے دونوں طرف سے کار پر فائر کھول دیا۔ ایک طرف دارا کا جسم چھلنی ہو گیا۔ پچھلی سیٹ پر روشن اور اس کے بیٹے کے جسم چھلنی ہو گئے تھے۔ دوسری طرف سے دلاور کو ٹانگ اور بازوؤں میں تین گولیاں لگی تھیں۔ وہ سیٹ پر لڑھک گیا، پچھلی سیٹ سے اسے نالکہ کے چیخنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

کار سڑک کی ڈھلان سے اتر کر ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ دو نقاب پوش دوڑتے ہوئے کار کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے نالکہ کو کھینچ کر کار سے نکالا اور اسے گھسیٹتے ہوئے اپنی کار کی طرف لے گئے۔ دلاور پر انہوں نے اس لیے توجہ نہیں دی تھی کہ وہ سیٹ پر لڑھک گیا تھا اور اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ شاید اسے اور دوسروں کو مردہ سمجھ کر انہیں نظر انداز کر گئے تھے۔

دلاور کچھ دیر تک اپنی سیٹ پر بے حس و حرکت پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا اٹھ گیا۔ سب

اس کی نظر دارا پر پڑی جو اپنی سیٹ پر گرا پڑا تھا اور اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا۔ اس کے بائیں بازو اور بائیں ٹانگ پر گولیاں لگی تھیں۔ اس کے عین پیچھے نالکہ تھی۔ دلاور بڑی مشکل سے اڑھ کھول کر گاڑی سے باہر نکلا۔ سب سے پہلے اس نے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ روشن اور اس کا تو سیٹ پر خون میں لت پت پڑے تھے لیکن نالکہ غائب تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بائیں طرف پر ایک کار تیز رفتاری سے جاتی ہوئی نظر آئی۔ کار کی عقبی سرخ بتیاں لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی

دور کے لیے کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے بازو اور ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے تاریکی چھا رہی تھی اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔  
وقت سکھر کی طرف سے ہائی وے پر کوئی گاڑی آتی دکھائی دی۔ ہیڈ لیمپس کی روشنیاں لمحہ بہ لمحہ آتی جا رہی تھیں۔ دلاور کار سے ہٹ کر اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا سڑک کے کنارے پر آگیا اور اس رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔

سکھر سے آنے والی بس تھی۔ دلاور اگر رکنے کا اشارہ نہ بھی کرتا تو بس رک جاتی کیونکہ رانیور نے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں نہ صرف دلاور کو سڑک کے کنارے پڑے ہوئے دیکھ لیا تھا بلکہ درخت سے کی ہوئی کار بھی نظر آگئی تھی۔ بس رکتے ہی ڈرائیور اور کئی مسافر دوڑتے ہوئے قریب پہنچ گئے۔ لوگ یہی سمجھے تھے کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے لیکن یہاں صورت حال دوسری تھی۔

میں آدمیوں نے مل کر دلاور کو اٹھایا۔ کچھ لوگ درخت کے قریب کار کے گرد جمع ہو گئے تھے۔  
”ہوا... کوئی ایکسیڈنٹ؟ کوئی گاڑی والا ٹکرا مار کر بھاگ گیا ہے؟“ ڈرائیور نے دلاور سے پوچھا۔  
”نہیں...“ دلاور نے جواب دیا۔ ”فائرنگ... گاڑی والوں نے ہم پر فائرنگ کی تھی۔ وہ نالکہ بی بی کو مار گئے۔ اس طرف۔“ دلاور نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا جس طرف اس نے اس کار کو جاتے

دیکھا تھا۔  
”نلکہ بی بی کون؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔  
”یری ماکن... نالکہ درانی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”رائے منصور کو احمد پور لاما میں اطلاع

بس میں چند مسافر ایسے بھی تھے جن کا تعلق صادق آباد اور رحیم یار خان سے تھا۔ نالکہ درانی اور مور کا نام ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ایک آدمی نے تو دلاور اور کار میں دارا کی لاش کو بھی پہچان میں پڑی ہوئی خون میں لت پت گولیوں سے چھلنی لاشیں دیکھ کر لوگ کانپ اٹھے تھے۔  
”... میں اسے جانتا ہوں۔“ وہی آدمی بولا۔ ”اس کا نام دلاور ہے اور کار میں جس آدمی کی لاش وہ رائے منصور صاحب کا گمن مین ہے۔ رائے منصور اس علاقے کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔  
ن آباد لے چلو۔ ہسپتال...“

وہی جنہیں صادق آباد میں ہی بس سے اتارنا تھا، کار کے پاس رہ گئے۔ جبکہ دلاور کو بس میں بٹھالیا گیا اس کے پیچھے ہی ڈرائیور نے بس تیز رفتاری سے صادق آباد کی طرف دوڑا دی۔  
ری حالت نازک تھی۔ اسے بس پر ہی ہسپتال پہنچایا گیا۔ جس آدمی نے دلاور کو شناخت کیا تھا وہ نسائی ہمدردی کی بنا پر دلاور کے ساتھ ہسپتال میں ہی رہ گیا تھا۔



پولیس کو بھی اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی۔ پولیس کی ایک پارٹی ہائی وے کی طرف روانہ ہو گئی اور تین پولیس والے ہسپتال پہنچ گئے جن میں ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا۔ تین گولیاں لگنے کے باوجود دلاور ابھی تک ہوش میں تھا لیکن خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس پر نقامت غالب آ رہی تھی۔ اس نے پولیس کو اس واقعہ کے بارے میں بتادیا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

”رائے صاحب کو اطلاع کر دیجئے... وہ لوگ نائلہ بی بی کو اٹھا کر لے گئے ہیں اور مجھے یقین ہے نائلہ بی بی بھی زخمی ہوئی ہے۔ اس کی جان خطرے میں ہے...“

”وہ لوگ کس طرف گئے ہیں؟“ ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

دلاور نے انہیں بتادیا کہ وہ کار کس طرف گئی تھی۔

بیان دینے کے بعد ہی دلاور کو آپریشن ٹیم میں لے جایا گیا تھا۔ بازو پر لگنے والی گولی نوگوشت چرتی ہوئی نکل گئی تھی البتہ بائیں ٹانگ میں لگنے والی گولیاں اندر ہی رہ گئی تھیں اور دونوں گولیاں ران میں لگی تھیں۔ گولیاں نکالنے کے لیے آپریشن ضروری تھا اور اس کے لیے دلاور کو انیسٹھیسیا دے کر بے ہوش کر دیا گیا۔

تقریباً ایک بجے رائے منصور ہسپتال پہنچے۔ انہیں بارہ بجے کے لگ بھگ ٹیلی فون پر پولیس سے اس واقعہ کی اطلاع ملی تھی اور یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ دلاور ہسپتال میں ہے۔ رائے منصور سیدھے ہسپتال پہنچے تھے۔

دلاور ابھی آپریشن ٹیم میں تھا لیکن رائے منصور کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً دس منٹ بعد دلاور کو آپریشن ٹیم سے باہر لے آیا تھا۔ وہ اسٹریچر ٹالی پر بے ہوش پڑا تھا۔ اسے خون بھی لگایا گیا تھا اور ایک وارڈ بوائے نے خون کی بوتل اٹھا رکھی تھی جو اسٹریچر ٹالی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ رائے منصور نے ڈاکٹر کو روک لیا۔

”کیا پوزیشن ہے ڈاکٹر؟“ انہوں نے دلاور کے بارے میں دریافت کیا۔

”مریض ایک دو گھنٹے بعد ہوش میں آجائے گا رائے صاحب۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے ایک صاحب کے خون کا گروپ مل گیا تھا لیکن کم از کم دو بوتل خون اور دینا پڑے گا۔ اس بندوبست کیا جا رہا ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”خون کس نے دیا تھا؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”وہ صاحب یہیں تھے۔ وہی دلاور کے ساتھ آئے تھے۔“ ڈاکٹر کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”سامنے بچ پڑ بیٹھے ہیں۔“

رائے منصور نے مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ پھر ڈاکٹر کو دلاور کے علاج کے سلسلے میں ہدایہ دینے لگا۔ اس کے لیے اسپتال کمرے کا انتظام کروایا گیا تھا۔

”دارا کی لاش... اکیلا لاش ہسپتال پہنچ گئی یا نہیں؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔

”جی۔ تینوں لاشیں تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے ہسپتال پہنچادی گئی تھیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”آپ دیکھنا چاہیں تو...“

”تینوں لاشیں!“ رائے منصور کے لہجے میں حیرت تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ حملہ آور نائلہ درانی کو مار کر کے لے گئے تھے۔ دارا مارا گیا تھا اور دلاور زخمی تھا لیکن یہ باقی دو لاشیں کس کی تھیں؟

”چلے...“ رائے صاحب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
وہ مردہ خانے میں آگئے۔ وہاں دارا کی لاش کے علاوہ ایک نو عمر لڑکے اور ایک عورت کی لاش بھی پڑی۔  
لڑکے کی عمر آٹھ نو سال رہی ہوگی جبکہ اس عورت کے بارے میں رائے منصور کا اندازہ تھا کہ وہ  
س کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کا قد خاصا لمبا تھا۔

”یہ دونوں لاشیں؟“ رائے منصور نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔  
”جی ہاں... یہ دونوں بھی اسی کار میں تھے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

رائے منصور ایک بار پھر عورت کی لاش کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ، کانوں میں چاندی کی کئی پالیاں،  
س کی رنگی رنگی برنگی چوڑیوں سے بھری ہوئی بانیں اور لباس بتا رہا تھا کہ وہ کوئی خانہ بدوش عورت تھی اور  
کاشاید اس کا بیٹا تھا لیکن یہ دونوں ناکہ کی کار میں کیسے آگئے تھے؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب  
ہو سکتا تھا کہ شاید ناکہ نے راستے میں کہیں ان دونوں کو لفٹ دی ہو۔ یہی بات ہوگی۔ اس کے سوا اور  
وہاں جاسکتا تھا۔

رائے صاحب دارا کی لاش کے قریب آگئے۔ اس کے جسم پر کئی گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی گردن اور  
اس کے جڑے کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ دارا کی لاش دیکھ کر رائے منصور کی آنکھوں میں آنسو  
۔ وہ ان کا وفادار ملازم تھا اور بلا خراس نے اپنی جان دے کر حق نمک ادا کر دیا تھا۔  
رائے منصور مردہ خانے سے باہر آگئے۔

”پولیس کا معاملہ نمٹ جائے تو یہ تینوں لاشیں آپ میرے آدمیوں کے حوالے کر دیں۔ اس عورت  
بچے کو تو میں نہیں جانتا لیکن ان کی تجیزو شخص کا بندوبست بھی میں ہی کروں گا۔“ رائے منصور نے ڈاکٹر  
لب کرتے ہوئے کہا اور بچہ پر بیٹھے ہوئے اس آدمی کے قریب رک گئے جس نے دلاور کو خون دیا تھا۔  
”دلاور کو تم ہسپتال لے کر آئے تھے؟“ رائے منصور نے اس شخص سے پوچھا۔

”جی جناب۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”دراصل میں بس پر سکھر سے آ رہا تھا کہ شہر سے کچھ دور  
اور کار کو دیکھ کر بس روک لی گئی۔ میں نے دلاور اور آپ کے گمن مین دارا کو پہچان لیا۔ وہ بیچارہ تو اللہ  
را ہو چکا تھا۔ دلاور کو ہم بس پر ہی ہسپتال لے آئے اور جب ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے خون کی ضرورت  
میں نے اپنا خون میٹ کر دیا جو دلاور کے خون سے مل گیا۔“

”تم واقعی بہت عظیم آدمی ہو۔ اپنا خون دے کر کسی کی جان بچانا بہت بڑی نیکی ہے۔ اللہ تمہیں اس  
اجر دے گا۔ کہاں رہتے ہو؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔

”میں صادق آباد میں جی۔ میں ٹیلی فون کے محکمہ میں ملازم ہوں۔ سکھر میں میری بہن رہتی ہے۔ دو دن  
ی سے ملنے گیا تھا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”اس نیکی کا اجر تو تمہیں اللہ ہی دے گا۔ لو... یہ رکھ لو... کچھ کھاپی لینا اور اب تم اپنے گھر جا کر آرام  
“ رائے منصور نے کہتے ہوئے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

’جناب! میں نے دلاور کو خون اس لیے تو نہیں...“

”میں جانتا ہوں۔“ رائے صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تمہیں خون کا معاوضہ تو نہیں دے  
مھے اپنا بزرگ سمجھ کر یہ رکھ لو... اب تم جاؤ۔ آرام کرو۔“

’دلاور کیسا ہے جی؟“ اس شخص نے کہا۔

”وہ اب ٹھیک ہے۔ تمہارا خون نہ ملتا تو شاید اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اچھا... چلو۔ میں تمہارے  
کی طرف جا رہا ہوں۔ شمس بھی گھر چھوڑ دوں گا۔ اس وقت تو تمہیں کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔“ رائے  
منصور نے کہا۔

رائے منصور دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ ایک تو انہوں نے دلاور کی دیکھ بھال کے لیے  
ہسپتال ہی میں چھوڑ دیا اور دوسرے کو اپنے ساتھ لے کر ہسپتال سے باہر آ گئے۔ وہ آدمی بھی ان کے ساتھ  
پاجیرو میں سوار ہو گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر خود رائے صاحب بیٹھے تھے۔

اس شخص کو شہر کی ایک گلی کے سامنے اتار کر رائے صاحب نے پاجیرو کا رخ تمہارے کی طرف موڑ دیا۔  
جب وہ تمہارے پہنچے تو سوا دو بجے چکے تھے۔ ناکہ کی کار تمہارے کے سامنے کھڑی تھی۔ کار گولیوں سے چھلنی  
تھی۔

رائے صاحب نے پاجیرو سے اتر کر قریب سے گزرتے ہوئے کار میں جھانکا۔ اس کی سیٹوں اور فرٹ  
مینس پر خون بکھرا ہوا تھا۔ وہ کار کے سامنے سے ہٹ کر تمہارے میں داخل ہو گئے۔ ایس ایچ او انسپکٹر خلیل  
تمہارے میں موجود تھا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے رائے صاحب کا استقبال کیا۔

”حملہ آوروں کی کار کا کچھ پتہ چلا؟“ رائے صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔  
”وہ کار سندھ کے ریگستان کی طرف گئی ہے۔ یہاں سے دس بارہ میل دور پولیس کی ایک گشتی پارٹی  
سے بھی ان کا مقابلہ ہوا تھا۔ اس مقابلے میں ہمارا ایک پولیس والا جاں بحق اور ایک زخمی ہوا ہے۔“  
انسپکٹر خلیل نے اسے بتایا۔

”اور حملہ آور نکل گئے؟“ رائے منصور نے اسے گھورا۔

”دراصل اس گشتی پارٹی کی وین کا ایک ٹائر پتھر ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کار کو آتے دیکھ کر اسے  
رکنے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ کار رکنے کی بجائے فائرنگ کرتی ہوئی تیزی سے نکل گئی۔ ہمارے کانسیبلوں کے  
بیان کے مطابق انہوں نے کار سے کسی عورت کے چپخنے کی آوازیں سنی تھیں جو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔  
اس عورت نے غالباً ”سڑک پر پولیس والوں کو دیکھ کر ہی چپخنا شروع کیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ عورت  
ناکہ درانی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ایک پولیس پارٹی کو ریگستان کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے۔“

”کیا جا رہا ہے کیا مطلب؟“ رائے منصور نے اسے گھورا۔

”آپ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس پولیس کی نفری کم ہے اور موبائل وینز کی بھی کمی ہے۔ پارٹی تیار  
کر لی ہے، گاڑی آجائے تو وہ روانہ ہو جائیں گے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”اور آپ کا خیال ہے کہ وہ خطرناک قاتل کسی جگہ پر بیٹھے آپ کی پولیس پارٹی کا انتظار کر رہے ہیں  
گے۔“ رائے منصور نے تلخ لہجے میں کہا۔

”آپ ہماری مجبوریوں کو نہیں سمجھ رہے رائے صاحب۔“ انسپکٹر خلیل نے جواب دیا۔

”جرائم کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اور پولیس کی نفری اتنی کم ہے کہ ہم تو شہریوں کی حفاظت کا بندوبست  
بھی مناسب طور پر نہیں کر سکتے۔ پولیس کو ملنے والے فنڈز اتنے کم ہیں کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔  
ہمارے پاس تو اتنی گاڑیاں بھی نہیں ہیں کہ شہر کا گشت ہی پورا کیا جاسکے اور پھر گاڑیاں آئے دن خراب  
ہوتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی مجبوریاں بعض اوقات ہمیں جرائم پیشہ لوگوں کے سامنے بس کر دیتی ہیں۔“  
”لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ پولیس والوں کی نفری کم ہے۔ گشت کے لیے یا مجرموں کا“

نے کے لیے گاڑیاں نہیں ہیں۔ پولیس اہلکاروں کی تنخواہیں کم ہیں۔ اتنے فنڈز نہیں کہ خراب ہو جانے کا ڈیوں کی مرمت کروائی جاسکے۔ لیکن... پولیس آفیسرز کی ذاتی جائیدادوں اور بینک بیلنس میں اضافہ ہا ہے۔ آپ فنڈز، نفری اور وسائل کی کمی کی بات نہ کریں۔ اگر دستیاب وسائل اور فنڈز ہی کو دیانت سے استعمال کیا جائے تو تمام مسائل کا حل مل سکتا ہے۔ ہماری پولیس کا شمار بھی دنیا کی چند پولیس فنیز میں ہو سکتا ہے لیکن افسوس کی بات تو یہی ہے کہ یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو سنجیدگی سے سوچے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”یہی تو دکھ کی بات ہے۔“ انسپٹر خلیل نے کہا۔ ”اگر کوئی آفیسر سنجیدگی سے سوچتا ہے اور دیانت داری کام کرنا بھی چاہتا ہے تو اسے اس کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اس کے راستے میں اس طرح کی رکاوٹیں کھڑی باقی ہیں کہ وہ اس محکمہ کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے یا اسے بھی کرپٹ بنا دیا جاتا ہے۔“

”بہر حال۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”تاہم درانی کی زندگی خطرے میں ہے۔ زیادہ تاخیر مزید خطرناک ہو سکتی ہے۔ اگر گاڑی کا مسئلہ ہے تو میری پاجیرو لے جائیے۔“

”شکریہ رائے صاحب۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک موبائل آگنی ہے۔“ انسپٹر خلیل نے کہا اور کسی بیل کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔ ”دیکھو باہر کون سی گاڑی آئی ہے؟“

”موبائل تھری ہے سر، اس میں چار کانٹیل اور ایک ہیڈ کانٹیل موجود ہے۔“ کانٹیل نے جواب

”اس وقت تھانے میں کتنے آدمی موجود ہیں۔“ انسپٹر نے پوچھا۔

”تین کانٹیل اور ایک اے ایس آئی۔“ کانٹیل نے بتایا۔

”ان کانٹیل سے کھو اسلحہ لے کر موبائل میں بیٹھیں اور اے ایس آئی کو میرے پاس بھیج دو۔“

”نے کہا۔ کانٹیل سلیوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد ایک نوجوان اے ایس آئی اندر داخل

”یس سر!“ وہ سلیوٹ مار کر انسپٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

”موبائل پر چلے جاؤ کار پر فائرنگ کر کے تین افراد کو ہلاک کرنے والے ملزمان ریگستان کی طرف گئے ان کا پیچھا کرو۔ مگر خیال رہے کہ وہ پوری طرح مسلح ہیں اور تاہم درانی ان کے قبضے میں ہے اور شاید

ی بھی ہے۔“ انسپٹر نے کہا۔

”یس سر۔“ اے ایس آئی نے سلیوٹ کیا اور مڑ کر باہر نکل گیا۔

”مجھے تو نہیں لگتا کہ یہ لوگ ان تک پہنچ سکیں۔“ رائے منصور نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ حادثہ سو اوس بجے کے قریب پیش آیا تھا اور اب سوا دو بج رہے ہیں۔“

”کم از کم یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہیں۔“ انسپٹر خلیل نے کہا اور چند لمحوں کی ٹی کے بعد بولا۔ ”اگر وہ لوگ ہمارے ضلع کی سرحد عبور کر کے صوبہ سندھ میں داخل ہو گئے تو ہمیں کچھ ت پیش آسکتی ہیں، لیکن میں نے دائرہ پولیس پر اس علاقے کے بعض تھانوں کو اطلاع کر دی تھی۔ آپ

ن رہے۔ انشاء اللہ بہت جلد ان کا سراغ مل جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ رائے منصور نے کہا۔

”ویسے رائے صاحب۔“ انسپٹر خلیل نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے خیال

میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟ میرا مطلب ہے کار پر فائرنگ اور نائلہ درانی کا اغوا!! اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟ چند روز پہلے ہی تو عدالت نے نائلہ درانی کو تمام کیسز سے باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔

”نائلہ درانی کے پیچھے بھی وہی دشمن لگے ہوئے ہیں جنہوں نے رضیہ کو قتل کیا تھا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

”لیکن رضیہ کا قاتل تو گرفتار ہو گیا تھا۔“ انسپٹر خلیل نے کہا۔ ”غالباً“ اس کا نام جگمو تھا اور اس کے بیان پر تو عدالت نے نائلہ درانی کو بری کیا تھا۔“

”جی ہاں... آپ درست کہتے ہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”لیکن آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ جگمو کو بھی اس بیان سے چند منٹ قبل عدالت کے احاطے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ زندگی نے اسے اتنی مہلت دے دی کہ اس نے وہ بیان دے دیا جس نے نائلہ کی پیشانی پر لگا ہوا یہ دھبہ صاف کر دیا۔ اور آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ دو تین دن بعد پولیس کو جگمو کے قاتل کی لاش بھی مل گئی تھی۔“

”جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔“ انسپٹر خلیل مسکرایا۔ ”اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پولیس کو موجددار کے قتل کے سلسلے میں شبیر درانی پر شبہ ہے لیکن اس کے خلاف پولیس کوئی ثبوت تلاش نہیں کر سکی لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ پولیس کو شبیر درانی پر شبہ کیوں ہے؟“

”یہ درود سر جیم یار خان پولیس کا ہے اور انہی کے لیے رہنے دیں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”آپ تو انسپٹر جبار کے قتل کے بعد اس تھانے میں آئے تھے نا؟ آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ انسپٹر جبار ان دنوں کس کیس پر کام کر رہا تھا؟“

”ان کے پاس کئی کیسز تھے لیکن کوئی بھی کیس ایسا سنگین نہیں تھا۔ وہ تو ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔“ انسپٹر خلیل نے بتایا۔

”لیکن شاید یہ بات آپ کے علم میں نہیں ہے کہ ڈاکے کی وہ واردات جعلی تھی۔“

”لیکن ایسی کوئی بات مجھے تو معلوم ہوئی تھی لیکن زیادہ تفصیل سے معلوم نہیں ہو سکی تھی۔“ انسپٹر خلیل نے جواب دیا۔

”میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”اس ڈاکو اور پولیس مقابلے کی تفصیل یہ ہے کہ چند بد معاشوں نے ٹیلی فون ایکس چینج کے قریب ایک خالی مکان پر قبضہ کر کے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کی اطلاع تھانے میں بھی دی گئی۔ انسپٹر جبار ایک جوشیلا آدمی تھا۔ ڈاکے کی اطلاع ملنے ہی وہ دستیاب کا نیٹیلوں کو لے کر جائے وقوعہ کی طرف دوڑ پڑا۔ یہی ان ڈاکوؤں کا منصوبہ تھا۔ یہ سب کچھ ایک پلاننگ کے تحت ہوا تھا۔ ڈاکے کا یہ نائلہ دراصل انسپٹر جبار کو وہاں تک لانے کے لیے ہی کھلیا گیا تھا۔ انسپٹر جبار جیسے ہی وہاں پہنچا اسے گھیرے میں لے کر گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکو ایک لمحہ کو بھی وہاں نہیں رکے تھے۔“

”لیکن اس کا پس منظر؟“ انسپٹر خلیل نے ابھی ہوئی نگاہوں سے رائے منصور کی طرف دیکھا۔ پھر خود ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کیس کا تفتیشی آفیسر میں ہی ہوں لیکن مجھے یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں اس سلسلے میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ آپ کی باتیں میرے لیے اعتراف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لگتا ہے آپ اس سلسلے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ کیا آپ مزید کچھ بتانا پسند کریں گے؟ مثال کے طور پر ڈاکے کی اس جعلی واردات کا پس منظر کیا ہو سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے آپ کی باتوں سے مجھے اصل لمزموں تک

نے میں مدد مل سکے۔“

”پس منظر“ رائے منصور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے چند میل دور آموں کا ایک باغ جس میں ایک حویلی بھی ہے۔ یہ باغ اور حویلی شبیردرانی کی ملکیت ہے۔ چند ہفتے پہلے پولیس کو اس حویلی پر تقریباً ”دو میل دور“ سے دو برہنہ لاشیں ملی تھیں۔ ایک اوجیز عمر مرد اور ایک عورت... ان لاشوں کے لیے یہ تصور کر لیا گیا کہ کسی نے پرانی دشمنی کی بنا پر انہیں قتل کر کے نہریں پھینک دیا تھا۔ ان لاشوں کی جگہ کے نشان تھے اور ایسے نشانات بھی تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ قتل سے پہلے ان پر تشدد بھی کیا گیا۔ اس وقت لاشوں کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ پولیس نے کیس بند کر دیا۔ لیکن اس کے کئی روز بعد پلٹ جبار کو کسی نے اطلاع دی کہ وہ لاشیں کن کی تھیں۔ لاشوں کی شناخت کے علاوہ یہ اطلاع بھی دی گئی انہیں کس نے قتل کیا تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ مرادو اور اس کا شوہر، شبیردرانی کے خاندان کے پرانے خدمتگار تھے۔ وہ گل مرگ والی زمینوں پر تھے اور جب آموں کا یہ باغ خرید گیا تو انہیں اس حویلی میں لے آیا گیا۔ قربار میں کوئی آبادی نہیں اس لیے لوگ انہیں نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی لاشوں کی شناخت نہیں ہو سکی تھی لیکن کئی روز بعد گمنام اطلاع ملنے پر انسپکٹر جبار نے تفتیش شروع کی تو وہ جلد ہی اس سے پتہ چل گیا جو اسے اصلی مجرموں تک لے جاسکتا تھا۔ اس نے شبیردرانی کے ایک آدمی کو ان دونوں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا لیکن سبزل نامی ایک شخص کو اسی رات اسی تھانے کی حوالات میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔“

”ویری اتر سنگ۔“ انسپکٹر جلیل مسکرایا۔ ”رائے صاحب! لگتا ہے آپ اپنے طور پر اس کیس کی حقائق کرتے رہے ہیں۔ اور مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ آپ پولیس سے زیادہ باخبر ہیں اور آپ کے پاس زیادہ معلومات ہیں۔“

”میں فوج کے ایک ایسے شعبے سے وابستہ رہ چکا ہوں جہاں کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”میں طویل عرصہ سے اس علاقے میں آباد ہوں۔ یہاں میری اراضی ہے۔ میری آنے والی نسلوں کو یہاں رہنا ہے۔ اس علاقے کے حالات پر نگاہ رکھنا میری فطرت کے عین مطابق ہے۔ وقت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اپنے ارد گرد کے حالات پر نگاہ رکھی جائے۔“

”اس میں شبہ نہیں کہ حالات پر آپ کی نگاہ بہت گہری ہے۔“ انسپکٹر جلیل مسکرایا۔

”بہر حال، آپ انسپکٹر جبار کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔“

”انسپکٹر جبار ان دنوں مرادو اور اس کے شوہر کے کیس پر ہی کام کر رہا تھا۔ اس نے سبزل نامی جس شخص کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ اسے تھانے کی حوالات میں قتل کر دیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ پلٹ جبار کو آگے بڑھنے سے روکا جائے لیکن جب اس نے تفتیش جاری رکھی تو اسے بھی ختم کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی تھانے کے ریکارڈ سے وہ فائل بھی غائب ہو گئی جس میں اس کیس کی تفصیلات موجود تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انسپکٹر جبار اصل مجرموں کے قریب پہنچ چکا تھا اس لیے اسے قتل کرنے کے ساتھ ہی فائل بھی غائب کر دی گئی جس سے اصل مجرموں کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ اس فائل کے غائب کرنے میں نے ہی کے کسی آدمی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”حیرت انگیز۔“ انسپکٹر جلیل بولا۔ ”اس طرف تو میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن آج کی واردات اور

”حیرت انگیز۔“ انسپکٹر خلیل بولا۔ ”اس طرف تو میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن آج کی واردات اور نائلہ درانی کے اغواء سے ان پچھلے واقعات کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”بہت گہرا تعلق ہے۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”اگر آپ اس واردات کی تفتیش کے ساتھ مراد اور اس کے شوہر کے قتل کی تحقیقات بھی شروع کر دیں تو بہت سے حیرت انگیز انکشافات ہوں گے اور اگر آپ زیادہ گہرائی میں جائیں گے تو آپ کو یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ نائلہ درانی کو اس جھوٹے کیس میں پھنسانے والا دراصل کون تھا اور اس سازش کے پیچھے کون کون سے ہاتھ کام کر رہے تھے اور ان کا مقصد کیا تھا۔ لیکن... اس کے لیے وقت بھی درکار ہو گا اور جرات و حوصلہ بھی۔“

”ایک منٹ رائے صاحب۔“ انسپکٹر خلیل نے رائے صاحب کو اشارہ کرتے ہوئے ایک کانٹیل کو آواز دی۔ ”ارے بھی تین بج رہے ہیں۔“ کانٹیل کے آنے پر انسپکٹر نے کہا۔ ”چائے وغیرہ کا بندوبست نہیں ہو سکتا کیا؟“

”گھر سے بنا کر لاتا ہوں سر!“ کانٹیل نے جواب دیا۔ اور باہر نکل گیا۔

”رائے صاحب۔“ انسپکٹر خلیل نے کانٹیل کے جانے کے بعد رائے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حوصلہ اور جرات کی میرے اندر کمی نہیں ہے۔ اس کا اندازہ آپ بھی پچھلے بعض واقعات سے لگا چکے ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ ان تمام واقعات کے پیچھے شبیر درانی کا ہاتھ ہے؟“

”میں کسی کا نام نہیں لوں گا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”لیکن اس کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب نائلہ درانی کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا۔ وہ اس وقت بے ہوش تھی لیکن ہوش میں آنے کے بعد ہسپتال سے فرار ہو گئی۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ ایسی حالت میں کوئی شخص اپنے آپ ہل بھی نہیں سکتا لیکن نائلہ کے فرار سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس صورت حال کے تحت وہ فرار ہوئی تھی وہ کس قدر سنگین ہوگی۔ بعد میں اس پر ایک شخص کے قتل کا کیس بنا دیا گیا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ نائلہ کو اغواء کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور وہ زخمی ہو کر گلیوں میں بھاگتی ہوئی کسی جگہ گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ تقریباً پندرہ دن بعد اسے شہر کی ایک چکی بستی سے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے پناہ دینے والے کو چوان اور نائلہ درانی کے ڈاکٹر احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا جو چوری چھپے اس کا علاج کرتا رہا تھا اور پھر نائلہ کو عدالت لے جانے والی پولیس وین پر حملہ کر کے کئی افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر نائلہ کو اغواء کیا گیا اور یہ تاثر دیا گیا کہ یہ کارروائی نائلہ کے آدمیوں نے اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کی تھی۔ اس کے بعد مختلف نوعیت کے واقعات رونما ہوتے چلے گئے۔ کئی بے گناہ کسی کی ہوس کا شکار ہو کر مارے گئے۔ تازہ ترین واقعہ یہ ہے جو اس وقت میرے اور آپ کے سامنے ہے۔ یہ بکھرے ہوئے واقعات دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جب آپ صحیح رخ پر تحقیق کریں گے تو اس زنجیر کی بکھری ہوئی کڑیاں ملتی چلی جائیں گی اور آپ خود بخود حقیقت کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔“

”میں ان بکھری ہوئی کڑیوں کو ضرور سمیٹوں گا رائے صاحب۔“ انسپکٹر خلیل نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔“

”میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا انسپکٹر اور یہ دراصل آپ کی نہیں، قانون کی مدد ہوگی۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔

اس دوران کانٹیل چائے لے آیا اس کے آجانے سے دونوں خاموش ہو گئے۔ کانٹیل کے جانے کے

بعد وہ چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے ایک بار پھر باتیں کرنے لگے۔  
اس وقت صبح کے پانچ بجتے والے تھے۔ ان کی باتوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ تھانے کا وائزلیس آپریٹر  
اندرا داخل ہوا۔ وہ بھی کانسٹیبل کی یونیفارم میں تھا۔ اس نے اندر آتے ہی سیلوٹ کیا اور رائے منصور کی  
طرف دیکھنے لگا۔

”کوئی اہم بات؟“ انسپکٹر خلیل نے وائزلیس آپریٹر کی طرف دیکھا۔

”موبائل ٹھری سے رپورٹ ملی ہے سر“ وائزلیس آپریٹر نے بتایا۔

”اوہ!“ انسپکٹر چونک گیا۔ ”کیا رپورٹ ہے؟“

”انہوں نے سندھ کی سرحد کے قریب ریگستان میں کچے راستے کے قریب تین آدمیوں کو پکڑا ہے۔ ان  
تینوں کی ٹانگیں زخمی ہیں گولیاں لگی ہیں، موبائل انہیں لے کر آ رہی ہے۔“ وائزلیس آپریٹر نے بتایا۔

”اوہ گڈ!“ انسپکٹر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”وہ کتنی دیر میں پہنچ رہے ہیں؟“

”تقریباً“ آدھے پونے گھنٹے میں پہنچنے والے ہوں گے سر۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر رائے منصور کی طرف دیکھنے لگا۔

”اگر ہمارے پاس وسائل بہتر ہوتے تو ان لوگوں کو اتنی دور جانے کا موقع بھی نہ ملتا۔ لیکن حیرت کی  
بات یہ ہے کہ پکڑے جانے والے تینوں آدمی زخمی ہیں اور ان کی ٹانگوں پر گولیاں لگی ہیں۔ دلاور نے بتایا تھا  
کہ وہ پانچ آدمی تھے۔ ایک کار میں بیٹھا رہا تھا اور چار نے ان پر حملہ کیا تھا۔ بہر حال، پولیس پارٹی واپس  
آجائے تو صورت حال کا کچھ اندازہ ہو گا۔“

رائے منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ اگر حملہ آور پانچ آدمی تھے تو دو  
کہاں گئے اور ناکہ کا کیا ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پکڑے جانے والے یہ تینوں آدمی زخمی کیسے ہوئے  
تھے؟

تقریباً چالیس منٹ بعد پولیس پارٹی ان تینوں زخمی ملزموں کو لے کر پہنچ گئی۔ انسپکٹر نے فوراً ہی  
کارروائی شروع کر دی۔ وہ شکلوں ہی سے ڈاکو اور قاتل لگتے تھے۔ انسپکٹر کافی دیر تک ٹھوکروں اور  
گھونٹوں سے ان کی تواضع کرتا رہا۔ اسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ وہ زخمی تھے۔ ان لوگوں نے  
چار آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ تین ناکہ کی کار میں اور ایک پولیس والا۔ دو زخمی ہوئے تھے اور اغوا کی جانے  
والی ناکہ پتہ نہیں کس حالت میں تھی۔ اس سے پہلے بھی یہ لوگ نجانے کتنے لوگوں کو قتل کر چکے ہوں گے۔  
اس لیے انسپکٹر کے خیال میں یہ لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔

”بتاؤ... یہ سب کچھ کیوں کیا تم لوگوں نے اور ناکہ کہاں ہے؟ وہ عورت جسے تم اپنے ساتھ لے گئے  
تھے۔“ انسپکٹر نے ایک آدمی کی پسلیوں پر زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

”بھورے کے کہنے پر...“ وہ شخص چیختا ہوا بولا۔ ”اس نے ہمیں دس دس ہزار روپے دیئے تھے۔ وہی  
ہمیں دو دن پہلے رحیم یار خان لے آیا تھا۔“

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں تو ڈہری کا رہنے والا ہوں۔ بھورا اس کام کے لیے خاص طور پر میرے پاس آیا تھا۔ وہ میر پور  
ماٹھیل میں رہتا تھا اور یہ دونوں پتو عاقل کے رہنے والے ہیں۔“ اس شخص نے بتایا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔



”جمن نام ہے سرکار۔“ اس شخص نے جواب دیا۔  
 ”نام جمن ہے اور قتل و عارت مگری کرتے پھر رہے ہو۔ اس سے پہلے کتنے لوگوں کو مار چکے ہو؟“ انپکڑ نے پوچھا۔

”کسی کو نہیں سرکار۔“ جمن نے جواب دیا۔ ”میں تو بس دس ہزار کے لالچ میں آگیا تھا۔ اس سے پہلے تو میں نے کبھی کوئی چیونٹی بھی نہیں ماری تھی۔“  
 انپکڑ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے جمن پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ”بتاؤ... اب تک کتنے آدمیوں کو مار چکے ہو اور کتنے گھرا جاڑے ہیں تم نے۔“ وہ دہاڑا۔  
 جمن نے کچھ نہیں بتایا، وہ مار کھاتا اور چیختا رہا۔

”بہاول!“ انپکڑ نے ایک کانٹیل کو مخاطب کیا۔ ”اس سے معلوم کرو کہ اب تک اس نے کیا کچھ کیا ہے۔ لیکن ٹھہرو... ایک دو باتیں میں بھی پوچھ لوں۔“ انپکڑ خلیل ایک بار پھر جمن کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تمہارے دوسرے ساتھی اور وہ عورت کہاں ہے جسے تم لوگ اٹھا کر لے گئے تھے اور تم لوگ زخمی کیسے ہوئے؟“

”آپ یقین نہیں کریں گے سرکار۔“ جمن نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ تو عورت نہیں شیرنی ہے۔ راستے میں ملوک نے اس کے کپڑے پھاڑ دیئے۔ وہ اس پر دست درازی کرنا چاہتا تھا مگر اس عورت نے تو بیٹھے بیٹھے اس کی کلائی کی ہڈی توڑ دی حالانکہ وہ خود زخمی ہے۔ اس کی ٹانگ پر دو گولیاں لگی ہیں بھورے نے ملوک کو منع کیا تھا کہ چھو کر کی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے لیکن ملوک نہیں مانا اور لڑکی پر دست درازی شروع کر دی۔ لڑکی نے جب اس کا ہاتھ توڑ دیا تو ملوک اور یہ راول۔ اس لڑکی کو مارنے لگے۔ بھورے نے گاڑی روک لی اور ہم سب نیچے اتر آئے۔ ہم لوگ آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ اس چھو کر کی کو موقع مل گیا۔ اس نے ملوک کی رائفل اٹھالی اور ہم سب کو گاڑی سے دور ہٹنے کو کہا۔ بھورے نے ریوالتور نکالنا چاہا تو چھو کر کی نے اسے گولی مار کر ختم کر دیا اور ہم سب کو حکم دیا کہ ہم گاڑی سے پچاس گز دور چلے جائیں۔ مگر ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ چھو کر کی نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس نے جس طرح فائرنگ کی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہمیں مارنا نہیں چاہتی تھی اس نے ہماری ٹانگوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر سندھ کی طرف چلی گئی۔“

”ملوک کہاں ہے؟“ انپکڑ نے پوچھا۔  
 ”پتہ نہیں سرکار۔ وہ کسی اور طرف چلا گیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اگر وہ زندہ رہا تو اس چھو کر کی سے انتقام ضرور لے گا۔ اب پتہ نہیں وہ زندہ ہے یا مر گیا۔“ جمن نے جواب دیا۔  
 ”بھورا کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟“ انپکڑ نے پوچھا۔

”وہ مر گیا تھا سرکار۔ چھو کر کی نے اس کے سینے میں گولی ماری تھی۔ وہ اسی وقت مر گیا تھا۔“ جمن نے جواب دیا۔

”وہ لڑکی کس طرف گئی تھی؟“ انپکڑ نے پوچھا۔  
 ”سندھ کی طرف سرکار۔“ جمن نے کہا۔ ”اب پتہ نہیں وہ کسی بستی تک پہنچی ہے یا راستے ہی میں مر گئی ہے۔ اس طرف تو میلوں دور تک کوئی بستی نہیں ہے۔“  
 ”کار پر حملہ کرنے اور اس لڑکی کو اغوا کرنے کے لیے کس نے کہا تھا؟“ انپکڑ نے پوچھا۔

”بھورے نے سرکار۔“

”بھورے کو اس لڑکی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، اسے کس نے کہا تھا؟“

”پتہ نہیں سرکار۔“ ججن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ سندھ کے وڈیروں کا پالا ہوا ہے۔ وڈیرے اس سے اس قسم کے کام لیتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وڈیرے نے اسے بہت سارا پیسہ دے کر اس کام کے لیے کہا ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر اے ایس آئی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ان تینوں کو ہتھکڑیاں لگا کر ہسپتال لے جاؤ اور ہسپتال میں ان کی سخت نگرانی کا بندوبست کیا جائے۔ ان میں سے ایک کی حالت تو تشویش ناک ہو رہی ہے۔ خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ یہ سالا کہیں مری نہ جائے۔ جلدی سے لے جاؤ انہیں۔“

”یس سر!“ اے ایس آئی نے کہتے ہوئے کانٹیل کو اشارہ کیا۔ وہ ان تینوں کو ہتھکڑیاں لگانے لگا۔

”وائریس آپریٹر کو بلاؤ۔“ انسپکٹر نے ایک کانٹیل کو کماؤہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ دو منٹ بعد وائریس آپریٹر اس کے سامنے موجود تھا۔ ”سندھ کے سرحدی تھانوں کو وائریس پر اطلاع کر دو۔۔۔ کار میں نائلہ درانی نامی ایک زخمی لڑکی سندھ کی حدود میں داخل ہوئی ہے۔ اسے تلاش کر کے اس کی حفاظت کی جائے اور ملوک کو بھی تلاش کر کے گرفتار کر لیا جائے۔“ انسپکٹر نے وائریس آپریٹر کی طرف دیکھ کر کہا اور اس سلسلے میں اسے مزید ہدایات دینے لگا۔

”یس سر میں ابھی رابطہ کرتا ہوں سر۔“ وائریس آپریٹر کمرے سے نکل گیا۔

”جی رائے صاحب۔“ انسپکٹر رائے منصور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ نائلہ کی تلاش میں ایک سرچ پارٹی روانہ کر دی جائے؟ ویسے تو نائلہ ایک بہت باہمت لڑکی ہے۔ اس نے بہت دکھ سہے ہیں لیکن وہ شدید زخمی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ریگستان میں کہیں بے ہوش پڑی ہو یا کار کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”جی ہاں۔ میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ سب انسپکٹر عبداللہ آنے ہی والا ہو گا۔ اس کے آنے ہی میں اسے روانہ کر دوں گا۔“ انسپکٹر خلیل نے کہا۔

تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد سب انسپکٹر عبداللہ آگیا۔ انسپکٹر خلیل نے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اسے فوراً ہی روانہ ہو جانے کو کہا۔ اس کے صرف دس منٹ بعد سب انسپکٹر عبداللہ تین مسلح کانٹیلوں کو لے کر نائلہ کی تلاش میں سندھ کے ریگزار کی طرف روانہ ہو گیا۔

چھ بج رہے تھے۔ رائے منصور کرسی پر بیٹھے سامنے والی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ مشرقی افق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ جو شاہ خاوری کی آمد آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

”میں چلتا ہوں انسپکٹر صاحب۔“ رائے منصور کرسی سے اٹھ گئے۔ ”ابھی تو میں سیدھا ہسپتال جاؤں گا۔ دلاور کو دیکھنے کے بعد اس کی رہائش گاہ پر چلا جاؤں گا اور شام تک وہیں رہوں گا۔ اس دوران اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے اطلاع کر دیں۔“

”بہتر ہے۔“ انسپکٹر خلیل نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ ”آپ جا کر آرام کیجئے۔ کوئی بات ہوئی تو میں خود آجاؤں گا۔“

رائے منصور تھانے سے باہر آگئے۔ ان کا ڈرائیور پاجیو کی پچھلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ رائے صاحب نے اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلایا تو وہ گڑبڑا کر اٹھ گیا۔

ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے رائے منصور سوچ رہے تھے کہ نائلہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ کار پر یہ حملہ شبیر درانی ہی نے کر دیا ہو گا لیکن اس مرتبہ اس نے سندھ سے کرائے کے قاتلوں کا انتخاب کیا تھا۔ جن کے بیان کے مطابق انہیں بھورا نے جمع کیا تھا اور دس دس ہزار روپے دے کر اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اصل آدمی کے بارے میں صرف بھورا ہی جانتا تھا اور بھورا نائلہ کے ہاتھوں ختم ہو گیا تھا۔

دلاور ہوش میں آچکا تھا اور اس وقت جاگ رہا تھا۔ رائے منصور کا دوسرا ملازم بھی کمرے میں موجود تھا اور دلاور سے باتیں کر رہا تھا۔ رائے منصور کو دیکھ کر وہ ایک دم کرسی سے اٹھ گیا۔

”کیسی طبیعت ہے اب دلاور؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”میں تو ٹھیک ہوں رائے صاحب۔ لیکن کیا نائلہ بی بی کا کچھ پتہ چلا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”ہاں، کسی حد تک۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”حملہ آوروں میں سے تین کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ نائلہ کے ہاتھوں زخمی ہو کر ریگستانوں میں بھٹک رہے تھے۔“ رائے منصور ایک لمحہ کو خاموش ہوئے پھر اسے پوری تفصیل بتانے لگے۔ آخر میں وہ کہہ رہے تھے۔ ”اگرچہ پولیس پارٹی نائلہ کی تلاش میں روانہ ہو چکی ہے اور سندھ کے بعض تھانوں کو بھی وائرلیس پر اطلاع دے دی گئی ہے لیکن میں نائلہ کی طرف سے پریشان ہوں۔ وہ زخمی ہے۔ اس کی ٹانگ پر دو گولیاں لگی ہیں۔“

”خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔“ دلاور نے کہا۔

”گاڑی میں وہ عورت اور بچہ کون تھا؟“ رائے منصور نے پوچھا۔ ”وہ غالباً“ کوئی خانہ بدوش عورت تھی اور شاید تم لوگوں نے اسے راستے میں لفت دی تھی۔“

”وہ روشن تھی رائے صاحب۔ نائلہ بی بی کی محسنہ۔ دو تین روز پہلے رحیم یار خان کے بازار میں نائلہ بی بی کی اس سے ملاقات ہو گئی تھی اور نائلہ بی بی اسے اپنے ساتھ گھر لے گئی تھی۔“ دلاور نے بتایا۔

”نائلہ کی محسنہ! میں سمجھا نہیں؟“ رائے صاحب نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”نائلہ بی بی جب پولیس اور شبیر درانی کے بھیڑیوں سے چھٹی پھر رہی تھی تو خانپور کے قریب وہ شبیر درانی کے ہاتھ آ گئی تھی۔ وہ اسے واپس لارہے تھے کہ ایک بل پر سے گزرتے ہوئے نائلہ بی بی نے جیب سے نہریں چھلانگ لگادی تھی۔ نہریں تیز لہریں اسے بہا کر وہاں سے میلوں دور لے گئی تھیں۔ وہ پانی میں غوطے کھاتی اور موت سے لڑتی رہی بالاخر نہریں بہتا ہوا درخت کا ایک تنہا نائلہ کے ہاتھ آ گیا وہ اس سے لپٹ گئی۔ درخت کا وہ تنہا نہر کے کنارے جھاڑیوں میں پھنس گیا۔ نائلہ رات بھر نہر کے کنارے پانی میں پڑی رہی۔ روشن نے اسے نہر سے نکالا تھا۔ وہ ان دنوں نہر سے تقریباً ” نصف میل دور اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتی تھی۔ وہ نائلہ کو نہر سے نکال کر اپنے جھونپڑے میں لے گئی۔ رات بھر نہر کے ٹھنڈے پانی میں پڑے رہنے سے نائلہ کو شاید نمونیا ہو گیا تھا۔ روشن نے اس کی بڑی خدمت کی تھی۔ نائلہ کے ٹھیک ہونے پر بھی روشن کئی روز تک اس کی خدمت کرتی رہی تھی۔ اور جب نائلہ نے لاہور جانا چاہا تو اس وقت بھی روشن نے اس کی مدد کی تھی لیکن عین اس وقت جب خانپور ریلوے اسٹیشن پر نائلہ ٹرین میں بیٹھ رہی تھی کہ شبیر درانی اپنے آدمیوں کے ساتھ پہنچ گیا اور اس طرح نائلہ ایک بار پھر اس کے ہاتھ آ گئی۔ نائلہ بہت حوصلہ مند لڑکی ہے رائے صاحب۔ وہ کسی کا احسان نہیں بھولتی۔ اس روز روشن کو بازار میں دیکھ کر وہ اسے اپنے ساتھ لے آئی تھی اور اسے بڑی بہن سمجھ کر ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی لیکن...“ دلاور خاموش

”انسان اس دنیا میں اتنی ہی زندگی گزارتا ہے جتنی اسے ملتی ہے۔“ رائے صاحب نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”روشن اس کا بیٹا اور دارا اتنی ہی زندگی لے کر آئے تھے۔ موت بڑی ظالم ہے۔ وہ کسی کو ایک لمحہ کی مہلت نہیں دیتی بہر حال، مجھے ان کی موت کا افسوس ہے۔ آج میں بیس رہوں گا تمہارے مکان پر۔ ان کی میتیں کل صبح گاؤں لے جا کر دفنانی جائیں گی۔ تم آرام کرو۔ یہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔“ رائے صاحب نے اپنے ملازم کی طرف اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد اپنی یاچرو پر دلاور والے مکان کی طرف جاتے ہوئے رائے منصور کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا۔ نائلہ کی کار پر حملہ کر کے دارا وغیرہ کو قتل کرنے اور نائلہ کو اغواء کرنے والوں کا تعلق سندھ سے تھا۔ اور نائلہ جب شیردرانی کی اموں والی حویلی سے بھاگ کر ان کی حویلی میں آئی تھی تو نائلہ نے بتایا تھا کہ شیردرانی اور اس کی ماں حسینہ بیگم نے سندھ کے علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک پولیس انسپکٹر سے نائلہ کو مردانے کا سودا کیا تھا۔ نائلہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے عوض اس پولیس انسپکٹر کو پانچ لاکھ روپے کی پیشکش کی گئی تھی۔ لیکن نائلہ کے حویلی سے فرار ہو جانے پر ان کے اس منصوبے پر پانی پھر گیا تھا۔ اس کے بعد حالات کرو نہیں بدلتے چلے گئے۔ نائلہ تمام الزامات سے بری ہو کر قانونی الجھنوں سے نجات پا گئی اور اس کے برعکس شیردرانی قانونی الجھنوں کے جال میں پھنسے لگا۔ اب نائلہ ان ماں بیٹے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک ہو گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ حسینہ بیگم اور شیردرانی نے دوبارہ اس پولیس انسپکٹر سے رابطہ قائم کیا ہو اور یہ کارروائی اسی پولیس انسپکٹر نے کروائی ہو؟

بات کچھ سمجھ میں آنے والی تھی۔ حملہ آوروں کا تعلق بھی سندھ ہی کے مختلف علاقوں سے تھا اور اس پارٹی کا سربراہ بھورا میر پور ماتھیلو کا رہنے والا تھا اور جن کے بیان کے مطابق وہ وڈیروں کا پروردہ تھا اور وہ اس سے اسی قسم کے کام لیتے رہتے تھے۔ ایسے لوگ پولیس کی نگاہوں میں بھی رہتے ہیں۔ پولیس ان کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے لیکن ایک تو وڈیروں کی پشت پناہی اور پھر اپنے مفادات کی وجہ سے بھی پولیس ایسے لوگوں پر ہاتھ نہیں ڈالتی اور ان لوگوں کو اپنا آلہ کار بنائے رکھتی ہے۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسی پولیس انسپکٹر نے بھورے کی خدمات حاصل کی ہوں اور بھورے نے رازداری کے خیال سے دوسرے آدمیوں کا انتخاب مختلف علاقوں سے کیا ہو۔

لیکن... اس انسپکٹر کا نام کیا تھا؟ رائے صاحب سوچتے رہے لیکن انسپکٹر کا نام ذہن میں نہیں آسکا۔ البتہ وہ انسپکٹر میر پور ماتھیلو میں تعینات تھا۔ اور جن کے بیان کے مطابق نائلہ درانی گاڑی پر سوار ہو کر سندھ کی طرف گئی تھی۔ رائے صاحب سوچ رہے تھے کہ اس کارروائی میں اگر واقعی اس پولیس انسپکٹر کا ہاتھ تھا تو نائلہ کے لیے خطرات کچھ اور بڑھ گئے تھے۔ اگر اس انسپکٹر کا ہاتھ نہ بھی ہو تو بھی نائلہ خطرے میں تھی۔ سندھ پولیس کو نائلہ درانی کی تلاش کے سلسلے میں اطلاع دے دی گئی تھی اور اگر نائلہ اس پولیس انسپکٹر کے ہاتھ لگ گئی تو وہ فوراً ”حسینہ بیگم اور شیردرانی کو اطلاع کر دے گا اور نائلہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے ان سے بھی پانچ لاکھ روپے وصول کر لے گا۔“

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے رائے منصور کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ بالاخر انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

”گاڑی کو تھانے کی طرف موڑلو۔“ رائے صاحب نے ڈرائیور سے کہا۔

”جی سرکار۔“ ڈرائیور نے سر ہلایا اور اگلے موڑ سے گاڑی تھانے کی طرف لے جانے والے راستے پر گھمادی۔

رائے منصور جب تھانے پہنچے تو ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ محرو نے بتایا کہ انسپکٹر خلیل گھر جا چکا ہے۔  
 ”میں انسپکٹر صاحب کو فون کر دیتا ہوں جناب۔ وہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔“ محرو نے انہیں کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ تشریف رکھئے۔“  
 ”نہیں۔ فون کرنے کی ضرورت نہیں میں ان سے گھر پر ہی مل لیتا ہوں۔“ رائے صاحب کہتے ہوئے تھانے سے باہر آگئے۔

دس منٹ بعد وہ انسپکٹر خلیل کے گھر میں موجود تھے۔ انسپکٹر اس وقت ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ رائے صاحب کو بھی ناشتے کی میز پر لے آیا۔  
 ”مجھے فون کر کے بلوایا ہوتا رائے صاحب۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ یقیناً کوئی بہت ہی اہم بات ہوگی جس کے لیے آپ نے خود زحمت کی؟“

”ہاں، بات واقعی اہم ہے۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔ ”کچھ عرصہ پہلے نائلہ درانی کے ایک دشمن نے اسے مروانے کے لیے سندھ کے ایک پولیس انسپکٹر سے رابطہ کیا تھا لیکن نائلہ کی ایک حرکت کی وجہ سے ان کا یہ منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ وہ انسپکٹر بھی نائلہ درانی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہے کہ نائلہ درانی سندھ کی طرف گئی ہے اور سندھ پولیس کو اس کی تلاش کے سلسلے میں آگاہ کر دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح نائلہ کے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ اگر نائلہ اس انسپکٹر کے ہاتھ لگ گئی تو اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔“

”وہ انسپکٹر کون ہے رائے صاحب؟“ انسپکٹر خلیل نے پوچھا۔  
 ”اس کا نام تو میرے ذہن میں نہیں آ رہا لیکن وہ ماتھیلو میں ہے۔“ رائے صاحب نے کہا۔

”اوہ! آپ انسپکٹر صوبہ خان کی بات تو نہیں کر رہے؟“ انسپکٹر خلیل بولا۔

”بالکل... بالکل یہی نام ہے اس کا۔“ رائے صاحب اچھل پڑے۔

”انسپکٹر صوبہ خان واقعی خطرناک آدمی ہے۔“ انسپکٹر خلیل بولا۔ ”وہ دولت کے لیے ایک تو کیا، درجنوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ وہ سندھ پولیس کا بدنام ترین پولیس آفیسر ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کے خلاف محکمہ طور پر کبھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔“

”اس قسم کے لوگ بہت عیار ہوتے ہیں اور ہاتھ پیر بچا کر کام کرتے ہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔

”بہر حال، آپ مطمئن رہئے۔“ انسپکٹر خلیل نے کہا۔ ”اے معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہم صورت حال سے آگاہ ہیں۔ اگر نائلہ درانی کسی طرح اس کے ہاتھ لگ بھی گئی تو مجھے یقین ہے کہ اس موقع پر وہ اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ یہ لیجئے... آپ کے لیے انڈے فراٹی ہو کر آگئے... آپ اطمینان سے ناشتہ کیجئے۔“

انسپکٹر کی بیگم نے انڈوں کی پلیٹ رائے منصور کے سامنے رکھ دی اور کھن اور ڈبل روٹی والی پلیٹیں بھی اس کی طرف سرکا دیں۔

رائے منصور نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور ناشتہ کرنے لگے۔

نانکہ درانی کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے سر میں دھماکے سے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے اسٹیرنگ پر نکلے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے قہام لیا اور بڑی مشکل سے سیدھی ہو کر سیٹ کی پشت سے نکل گئی۔ اس نے اپنی ٹانگوں کو حرکت دینا چاہی تو اس کے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ بائیں ٹانگہ تختے کی طرح اکڑ گئی تھی اور درد کی شدید نیسیں اٹھ رہی تھیں۔

نانکہ آنکھیں کھول کر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی اور مہیب سناٹا تھا۔ پہلے چند لمحے تو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کی نیسے ملنے لگی۔ چند منٹ بعد حواس کچھ بحال ہوئے تو اسے رفتہ رفتہ سب کچھ یاد آنے لگا۔

وہ رائے منصور کی حویلی جانے کے لیے شام کے وقت رحیم یار خان سے روانہ ہوئی تھی۔ صادق آباد کی شہری حدود سے تقریباً نصف میل آگے نکلے ہی ان کی کار پر حملہ ہوا تھا اور اس کی بھی بائیں ٹانگہ پر دو گولیاں لگی تھیں۔ حملہ آور اسے کھیٹ کر اپنی کار میں لے کر جائے واردات سے فرار ہوئے تھے اور پھر راستے میں ایک پولیس پارٹی کو دیکھ کر نالکہ نے شور مچادیا تھا۔ ان لوگوں نے پولیس والوں پر بھی فائرنگ کردی تھی اور کار کو تیزی سے بھاگے گئے تھے۔ پھر راستے میں اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ملوک نامی شخص نے اس کی قمیص پھاڑ دی تھی اور اس کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی تھی۔ جس پر ان کے لیڈر بھورا نے گاڑی روک لی تھی اور نیچے اتر کر آپس میں جھگڑنے لگے تھے۔

نانکہ کو اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ بھورا اس کے ہاتھوں مارا گیا اور باقی چاروں کو اس نے ٹانگوں پر گولی مار کر مفلوج کر دیا تھا اور خود کار لے کر بھاگ نکلی تھی۔ جب وہ گاڑی لے کر بھاگی تھی تو اس نے ہیڈ لیپس روشن نہیں کئے تھے۔ مدھم سی چاندنی میں وہ کار دوڑتی رہی تھی۔ غصہ اس پر غالب آتی جا رہی تھی۔ نالکہ نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا سراشیئرنگ پر جھٹکا چلا گیا۔ اس کے بعد اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہوا تھا۔

نانکہ اس وقت کاری میں تھی۔ انجن خود بخود بند ہو چکا تھا۔ اس کے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ سردی کی وجہ سے ٹانگہ کے زخموں کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ٹانگہ کو ٹٹول کر دیکھا۔ ہاتھ چپ چاپ نے لگے۔ اس کی ٹانگہ خون میں تر ہو رہی تھی۔ سیٹ پر بھی خون بکھرا ہوا تھا۔

نانکہ نے سختی سے دانت بھینچ لئے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر وہ ایک بار پھر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چاروں طرف تند آور جھاڑیاں تھیں اور یہ جھاڑیاں اس طرح تل رہی تھیں جیسے موت کے سائے رقص کر رہے ہیں۔ سردی کی وجہ سے تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹانگہ کو پکڑ کر سیدھا کرنا چاہا تو تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات پھیلنے چلے گئے۔ دماغ میں تیز سنسنات ہونے لگی اور آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلنے لگی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا اور وہ سیٹ پر لٹک گئی۔

وہ دوبارہ جب ہوش میں آئی تو اس وقت بھی اس کے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ٹانگہ کی تکلیف بدستور تھی۔ وہ کچھ دیر تک کار کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی پھر بڑی مشکل سے سیدھی ہو کر کار کا انجن اشارت کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن انجن ہر مرتبہ غرغرا کر رہ جاتا۔ اس نے ڈیش بورڈ پر لگے

ہوئے فیول میٹر کی طرف دیکھا۔ ڈائل کے اندر چلنے والے نغصے سے بلب کی روشنی میں تیل پتانے والی سوئی زیر و پر کئی ہوئی تھی۔

نائلہ درانی کے منہ سے بے اعتبار گہرا سانس نکل گیا۔ یہ شاید رات کا آخری پہر تھا۔ وہ اس ویرانے میں تنہا تھی۔ آبادی نجانے یہاں سے کتنی دور تھی۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ قرب و جوار میں کوئی آبادی تھی بھی یا نہیں۔ وہ رات کو بے خودی میں گاڑی چلاتے ہوئے نجانے کہاں سے کہاں نکل آئی تھی۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ وہ غالباً "کار کا دروازہ کھولنا چاہتی تھی لیکن غراہٹ کی ایک آواز سن کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ نائلہ کو آواز شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ بھیڑیے کی غراہٹ تھی۔

غراہٹ اب بار بار سنائی دے رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ کوئی بھیڑیا آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سارے کتے آسمان کی طرف منہ اٹھائے دو رہے ہوں۔... بھیڑیوں کا کوئی غول آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ اگر بھیڑیوں نے اس کی بوسوگھ لی تو وہ اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ اس نے جلدی سے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔ پنجرہ والی کھڑکی کا شیشہ بھی اترا ہوا تھا۔ نائلہ نے کسی نہ کسی طرح اس طرف جھک کر وہ شیشہ بھی چڑھا دیا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ اپنی سیٹ کی پشت والا شیشہ تو اس نے چڑھا دیا لیکن دوسری طرف کا پچھلا شیشہ چڑھانے کے لیے اسے پچھلی سیٹ پر آنے کے لیے ایک بہت ہی اذیت ناک مرحلہ سے گزرنا پڑا تھا لیکن اس نے تکلیف اٹھا کر شیشہ بروقت چڑھائے تھے کیونکہ اس نے جیسے ہی کار کی پچھلی سیٹ کا شیشہ چڑھایا تھا ایک بھیڑیا ڈرائیونگ سیٹ والے شیشے پر پنجہ مارنے لگا تھا۔

نائلہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہو گئی۔ اور اسٹیئرنگ سائیڈ والے شیشے کی طرف دیکھنے لگی۔ بھیڑیا اب وہاں سے ہٹ کر پچھلی کھڑکی کے شیشے کے سامنے آگیا تھا۔ اس نے دونوں پنجے شیشے پر جمار کھے تھے اور وہ شیشے سے اندر جھانک رہا تھا۔ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور سفید نوکیلے دانت تاریکی میں بھی چمک رہے تھے۔ خوف کی شدت سے نائلہ تھر تھر کانپنے لگی۔ گاڑی میں اگرچہ رات گھٹیں بڑی ہوئی تھیں لیکن اس میں نہ تو رات نفل اٹھانے کی ہمت تھی اور نہ ہی وہ رات نفل چلانا چاہتی تھی۔ رات نفل کی گولی سے شیشہ ٹوٹ جاتا بھیڑیے اس وقت تو بھاگ جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر واپس آجاتے اور ممکن ہے وہ تکلیف اور کمزوری کی وجہ سے اس وقت بے ہوش ہو چکی ہو اور خونخوار بھیڑیے کار میں گھس کر اسے چیر پھاڑ ڈالیں۔

نائلہ کار کی سیٹ پر بڑی خوف سے تھر تھر کانپتی رہی۔ بھیڑیے کبھی کار کے شیشوں پر پنجہ مارنے لگتے اور کبھی دور ہٹ جاتے۔ ان کی غراہٹیں مسلسل نائلہ کی سماعت سے ٹکراتی تھیں۔ ایک تو ٹانگ کے زخموں کی تکلیف اور پھر بھیڑیوں کا خوف۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ٹانگ کے زخموں کا علاج نہ کیا گیا تو زخم گہرا ہو جائیں گے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ٹانگ ہی کاٹنی پڑے۔ لیکن ٹانگ کاٹنے یا نہ کاٹنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہو سکتا تھا جب وہ کسی ہسپتال میں پہنچ جاتی۔ اس وقت تو دیرانے میں تھی جہاں ان بھیڑیوں کے سوا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا اور یہ بھیڑیے اسے چیر پھاڑ کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

تاریکی اب دم توڑنے لگی تھی۔ تاریکی کو رخصت ہوتے دیکھ کر نائلہ نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔ دن کی روشنی پھیلنے ہی بھیڑیے غائب ہو جائیں گے اور کم از کم ایک خوف سے نجات مل جائے گی۔

ٹائلہ کا خیال درست نکلا۔ جیسے جیسے دن کی روشنی پھیل رہی تھی، بھڑبھڑوں کی آوازیں کم ہوتی جا رہی تھیں اور بالا خر فضا پر ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ ٹائلہ نے سیٹ پر اٹھ کر کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا۔ اس کے چاروں طرف کیکر کی اونچی جھاڑیاں تھیں اور کار ان جھاڑیوں میں پھنس کر رہی تھی۔ اب کوئی بھیڑیا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک کھڑکی کا شیشہ گرا دیا اور گردن باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اور پھر یہ دیکھ کر چونک گئی کہ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

ٹائلہ نے شیشہ بند کر دیا اور سیٹ پر دوبارہ کرسی بیٹھ گئی۔ اب وہ ٹائلہ میں زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہی تھی۔ بعض اوقات تکلیف کا حد سے بڑھ جانا بھی سکون کا باعث بن جاتا ہے۔ ٹائلہ سیٹ پر دیکھی دلاور، روشن اور دارا کے بارے میں سوچنے لگی۔ گزشتہ رات ان سب کا خیال کئی مرتبہ اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ان دردوں نے کار پر بڑی شدید فائرنگ کی تھی۔ پتہ نہیں ان میں سے کوئی زندہ بچا تھا یا نہیں۔ ٹائلہ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے سو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانک کر دیکھا بادل چھٹ گئے تھے اور سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تقریباً آدھا دن سوتی رہی تھی لیکن اس نیند کا یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس کے دماغ کو کچھ سکون ملا تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک بیٹھی سوچتی رہی۔ ظاہر ہے وہ کار میں بیٹھے بیٹھے زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ اسے کسی نہ کسی آبادی تک پہنچنا تھا اور بالا خر اس نے کار سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ کار میں چار راہوں پر موجود تھیں پہلے تو اس نے سوچا کہ ایک راہ نقل لے لے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا ٹائلہ کے زخموں کی وجہ سے اس کے لیے چلنا مشکل ہو جاتا۔ راہ نقل کا بوجھ وہ کیسے اٹھاتی۔

اس نے کار کا دروازہ کھول دیا پھر کچھ سوچ کر اس نے وہ راہ نقل اپنی طرف کھینچ لی جس سے اس نے فائرنگ کی تھی۔ اس نے پھٹی ہوئی قمیص کے دامن سے راہ نقل پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کئے اور راہ نقل وہیں چھوڑ کر اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی بڑی مشکل سے کار سے باہر نکل آئی۔ تکلیف ضبط کرنے کے لیے اس نے بڑی سختی سے دانت پر دانت بجا رکھے تھے۔

زخمی ٹائلہ پر دباؤ نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ کار کا سارا لے کر چند منٹ کھڑی اپنا جائزہ لیتی رہی۔ اس کا لباس خون میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹائلہ کو چند مرتبہ حرکت دی اور کار کا سارا لے کر دو تین قدم اٹھائے۔ اسے یوں لگا تھا جیسے ساری دنیا کا بوجھ اسی ایک ٹائلہ پر آگیا ہو۔ لیکن اسے بہر حال یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ ہمت سے کام لے تو چل سکتی ہے۔

ٹائلہ نے جھک کر ایک لکڑی اٹھالی اور اس کے سارے آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے چند قدم تو اسے بہت زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر وہ اس تکلیف کو ضبط کر کے لکڑی کے سارے لنگراتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی رہی۔

سورج کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا اور کبھی اس کے سر پر چمکنے لگتا۔ ہر چند قدم کے بعد وہ بیٹھ جاتی اور پھر اٹھ کر چلنے لگتی۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی یہ جنگل بھی گھٹا ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹائلہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ چند قدم آگے اس کے



سانے سیاہ رنگ کا ایک سانپ رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ سانپ کم از کم ایک گز لمبا ضرور رہا ہوگا۔ نالکہ کی نظریں اس سانپ کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں اور وہ اس وقت تک اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی رہی جب تک وہ سانپ جھاڑیوں میں گھس کر اس کی نگاہوں سے اوچھل نہیں ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو گھیننے لگی۔۔۔۔۔ وہ رک رک کر چلتی رہی۔ اس کی ٹانگ میں پھر تکلیف شروع ہو گئی تھی اور ران والے زخم سے ہلکا ہلکا خون بھی رسنے لگا تھا۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور نالکہ یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھی تھی کہ اگر وہ شام سے پہلے اس جنگل سے نکل کر کسی بستی تک نہ پہنچی تو اسے رات اسی جنگل میں گزارنی پڑے گی۔ اور پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ زہریلے سانپ، بچھو اور بھیڑیے اسے صبح کا سورج دیکھنے کے لیے زندہ رہنے دیں گے یا نہیں! یہ سب کچھ سوچ کر ہی وہ تیز چلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

..... اور پھر دفعتاً ”وہ ٹھک ٹھک کی آوازیں سن کر چونک گئی۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی درختوں پر کھڑا چلا رہا ہو۔ آواز خاصی دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تیز قدم اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ تقریباً ”پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لڑکھڑاکر گر گئی۔ زمین پر بکھرے ہوئے کانٹے اس کے جسم میں چبھے اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ تقریباً ”پانچ منٹ تک وہاں پڑی رہی اور پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی کے سارے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور دوبارہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

ٹھک ٹھک کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ نالکہ ایک بار پھر گری لیکن وہ پھر اٹھ گئی اور اپنی قوت ارادی کے سارے آگے بڑھنے لگی مگر چند گز سے زیادہ دور نہیں جاسکی اور پھر لڑکھڑاکر گری اور اس مرتبہ وہ اٹھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ اپنے آپ کو گھیننے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا۔ اس طرح گھیننے سے اس کے زخموں کی تکلیف اور بھی بڑھ گئی تھی اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہونے لگی تھیں۔

ٹھک ٹھک کی آوازیں اب بہت قریب سے سنائی دے رہی تھیں جیسے صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا ہو۔ نالکہ گھینتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور بالا خرہ منجانب درختوں سے باہر نکل آئی۔ آگے ایک کچا سارا ستہ تھا جس کے دوسری طرف پھر جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے راستے پر ایک بیل گاڑی کو کھڑے دیکھ کر نالکہ اپنی ساری تکلیف بھول گئی۔ بیل گاڑی پر لکڑیاں لدی ہوئی تھیں اور ٹھک ٹھک کی آواز اس بیل گاڑی کے دوسری طرف کسی جگہ سے سنائی دے رہی تھی۔ بیل گاڑی کے پئے چھوٹے تھے۔ اس کی مخصوص ساخت سے نالکہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ سندھ کے کسی علاقے میں ہے۔

”کوئی ہے؟“ نالکہ بیل گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے چیخی۔ ”کوئی ہے... میری مدد کرو... بچاؤ...“

تقریباً ”ایک منٹ بعد ایک عورت بیل گاڑی کی آڑ سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس نے کندھے پر ایک موٹی سے لکڑی اٹھا رکھی تھی جسے وہ غالباً ”بیل گاڑی پر ڈالنا چاہتی تھی لیکن نالکہ کی آوازیں کر اس طرف آگئی تھی اور اب ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”ادھر... میں ادھر ہوں... مجھے بچاؤ...“ نالکہ پھر چیخی۔

اس عورت نے نالکہ کو دیکھ لیا۔ وہ لکڑی پیٹیک کر اس کی طرف دوڑی مگر نالکہ کے قریب پہنچ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ نالکہ کی پٹنی ہوئی قمیص اور خون میں لتھڑا ہوا دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ دوسرے ہی لمحہ وہ بابا بابا چیختی ہوئی واپس دوڑ گئی اور بیل گاڑی کے دوسری

طرف غائب ہو گئی۔

تقریباً دو منٹ بعد وہ واپس آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا بھی تھا جس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے نیلی شلوار پر گلابی رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر مخصوص انداز میں مختصر سی پگڑی لپیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر بے ترتیب سی داڑھی تھی جیسے کئی روز سے شیونہ بنایا گیا ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کھانا تھا جس سے غالباً وہ درخت کا تار رہا تھا۔

اس کے ساتھ لڑکی کی عمر پچیس جیسے کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے سرخ چیونٹ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ چنری نیلی چیونٹ کی تھی۔ اس کی دونوں ہانہوں میں کنبیوں تک پلاسٹک کی سفید اور سرخ چوڑیاں تھیں۔ دونوں کانوں میں تین تین بالیاں تھیں اور ناک میں کالے دھاگے کی تختی بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ نائلہ کو دیکھ کر بابا بابا کہتے ہوئے بھاگی تھی جس سے نائلہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ بوڑھا اس لڑکی کا باپ تھا اور وہ سندھی تھے۔

”ادی... یہ کون ہے۔ دیکھو یہ خون میں تر ہو رہی ہے۔ بہت زخمی ہے یہ۔“ بوڑھا کھانا اچھینک کر نائلہ کی طرف دوڑا۔ اور نائلہ کو سارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ”تم کون ہو ادی؟ تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی؟“

”مم... میں اٹھ نہیں سکتی بابا۔“ نائلہ کے منہ سے سسکی نکلی۔ ”میری ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں۔ میں بہت زخمی ہوں۔“

”پر تم ہو کون ادی... کس نے گولیاں ماری ہیں تمہیں اور اس جنگل میں کیسے آئی ہو؟“ بوڑھے نے پوچھا۔ اس کی بیٹی نے اپنی چنری اتار کر نائلہ پر ڈال دی تھی۔

”میں بہت دھکی ہوں بابا۔“ نائلہ نے کراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ڈاکو کل رات مجھے صادق آباد سے اٹھا کر لائے تھے۔ میں رات کو ان کے چنگل سے بھاگ نکلی۔ مجھے کسی ہستی تک لے چلو بابا...“

”فکرمت کرو ادی۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”جیسے یہ سسی میری بیٹی ہے نا تو مجھی میری بیٹی ہے... گھبراؤ نہیں، میں تمہیں گھر لے چلتا ہوں۔“ وہ اپنی بیٹی کی طرف مڑ گیا۔ ”مسی! بیٹی میں تیل گاڑی میں جگہ بناتا ہوں۔ تم اسے سارا دے کر وہاں تک لے آؤ۔“

بوڑھا کھانا اٹھا کر دوڑتا ہوا تیل گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے کھانا تیل گاڑی کے ڈنڈے میں پھنسا دیا اور تیل گاڑی کے اگلے حصے سے لکڑیاں اٹھا کر نیچے پھینکنے لگا۔ تیل گاڑی میں اتنی جگہ بن گئی کہ اس کی بیٹی سسی، نائلہ کو لے کر وہاں بیٹھ سکتی تھی۔ سسی نائلہ کو سارا دے کر لارہی تھی۔ بوڑھے نے بھی قریب پہنچ کر دوسری طرف سے نائلہ کو سارا دیا اور دونوں نے مل کر اسے تیل گاڑی پر بٹھادیا۔ سسی نے نائلہ کے قریب بیٹھ کر اس کا سراپی گود میں رکھ لیا اور بوڑھے نے تیل گاڑی کے اگلے ڈنڈے پر بیٹھ کر بیلوں کو ہانک دیا۔ وہ ہاتھ میں پگڑی ہوئی لکڑی سے بیلوں کو مار رہا تھا۔ مرل سے تیل اپنی قوت کے مطابق تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچے راستے پر تیل گاڑی کو زوردار جھٹکے لگ رہے تھے اور نائلہ کے منہ سے مسلسل کراہیں اور سسکیاں خارج ہو رہی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ چار گھروں پر مشتمل ایک ہستی میں پہنچ گئے۔ جموہنڑوں سے تقریباً ”سو گز کے فاصلے پر لکڑیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لکڑیوں کو بڑے پلٹے سے اوپر نیچے چٹا گیا تھا۔ تیل گاڑی روکتے ہی وہ لوگ نائلہ کو اتار کر ایک جموہنڑے میں لے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان چاروں گھروں کے لوگ اس

جھوپڑے میں جمع ہو گئے مگر بوڑھے نے ان سب کو باہر نکال دیا۔ صرف ایک مرد اور دو عورتیں جھوپڑے میں رہ گئی تھیں۔

”کہاں گولی لگی ہے ادی تمہیں؟“ بوڑھے نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 نائلہ جھوپڑے میں موجود دوسرے مرد کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بوڑھا اس کی نگاہوں کا مقصد سمجھ کر اس آدی کو لے کر جھوپڑے سے باہر نکل گیا۔ ایک عورت نائلہ کے قریب آگئی۔ وہ سسی کی ماں عانتھی تھی۔ نائلہ نے اسے ٹانگ کے دونوں زخم دکھادیئے۔  
 ”ادی!“ وہ عورت سیدھی ہوتی ہوئی بولی۔ ”تم شرماؤ نہیں تو تمہارے زخم کا علاج سسی کا باپ ہی کرے گا۔“

”سسی کا باپ!“ نائلہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہاں قریب میں کوئی ایسی آبادی نہیں جہاں کوئی ہسپتال ہو۔ گولی میری ران میں پھنسی ہوئی ہے اور اسے آئینہ ہی سے نکالا جاسکتا ہے۔“  
 ”ہسپتال!“ سسی کی ماں بولی۔ ”یہاں سے قریبی بستی بھی پون گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ اب شام ہو رہی ہے۔ اس طرف کون جائے گا اور وہاں کوئی ہسپتال نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر ہے جو نقلی دوائیں دیتا ہے۔ میرے جوان بیٹے کو اسی نے تو نقلی دوا دے کر مارا تھا۔۔۔ تم فکر مت کرو ادی۔ سسی کا باپ گولی بھی نکال دے گا اور زخم کو داغ دے گا۔ چند روز میں تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“  
 داغ جانے کی بات سن کر نائلہ کانپ اٹھی۔ اس نے اکثر کتابوں اور مضامین میں یہ پڑھا تھا کہ پرانے زمانے میں زخموں کو ٹھیک کرنے کے لیے انہیں گرم لوہے سے داغا جاتا تھا۔ اس ملک میں بھی بعض پسماندہ علاقے ایسے تھے جہاں پیاریوں کے قدیم طریقے رائج تھے۔

نائلہ یہ سوچ رہی تھی کہ کوئی باقاعدہ طبی امداد ملے تک اس کا زخم بگڑ نہ جائے۔ اس سے بہتر ہے کہ یہی قدیم طریقہ اپنایا جائے۔ اس نے سسی کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔  
 سسی کی ماں عانتھی نے اپنے شوہر کو اندر بلا لیا۔ اس نے بھی نائلہ کی ٹانگ کے دونوں زخموں کا جائزہ لیا۔ پنڈلی پر لگنے والی گولی تو گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی لیکن ران کے زخم میں گولی موجود تھی۔ زخم میں پوسٹ گولی کا اوپر کے حصے کا ایک کونا صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ نائلہ کی خوش قسمتی تھی کہ تقریباً ”پس گھٹنے“ گزرنے کے بعد بھی گولی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی حالانکہ وہ خود صبح سے اب تک چلتی اور کھینچتی بھی رہی تھی لیکن گولی گوشت میں کچھ اس طرح پھنسی تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکی تھی اور یہی نائلہ کی خوش قسمتی تھی۔

بوڑھا سندھی زبان میں سسی، عانتھی اور دوسری عورتوں سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر باہر نکل گیا۔  
 عانتھی اور دوسری دونوں عورتیں بھی باہر نکل گئی تھیں۔ سسی نائلہ کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے نائلہ کے سینے پر ایک رلی ڈال دی تھی۔ سسی اردو بہت کم جانتی تھی لیکن وہ ٹوٹی پھوٹی زبان میں نائلہ کو تسلی دیتی رہی۔  
 ”تقریباً“ آدھے گھنٹے بعد بوڑھا ایک اگلیٹھی اندر لے آیا جس میں دیکھتے ہوئے کو نکلوں میں لوہے کی ایک سلاخ رکھی ہوئی تھی۔ وہ سلاخ بھی کو نکلوں کی طرح سرخ ہو رہی تھی بوڑھے نے ہاتھ میں ایک لمبی نوک والا چاقو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے چاقو کی نوک بھی کو نکلوں پر گرم کر لی اور سسی اور دوسری عورتوں کو اشارہ کیا۔ سسی اور عانتھی نے نائلہ کو کندھوں سے پکڑ لیا جبکہ دوسری دونوں عورتوں نے اسے ٹانگوں سے گرفت میں لے لیا تھا۔

بوڑھا نالکہ پر جھک گیا۔ نالکہ کے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہو گئے۔ وہ باری باری ان عورتوں کی طرف دیکھ رہی تھی جنہوں نے اسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ بوڑھا نالکہ کی ران کے زخم کو دیکھنے لگا اور پھر چاقو کی نوک سے گوشت میں پیوست گولی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ایک ماہر سرجن کی طرح چاقو کی نوک کو حرکت دے رہا تھا۔

نالکہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور سختی سے دانت بھیج رکھے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے زخم پر مزید چر کے لگائے جا رہے ہوں اور پھر ایک زوردار جھٹکا لگا۔ گولی زخم سے نکل کر نیچے گر گئی۔ نالکہ کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

زخم سے خون بہہ نکلا تھا۔ بوڑھے نے چاقو رکھ دیا اور عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھتے ہوئے کونکوں پر رکھی ہوئی لوہے کی سلاخ اٹھالی۔ ان چاروں عورتوں نے نالکہ کو مزید سختی سے جکڑ لیا۔ بوڑھے نے انگارے کی طرح سرخ سلاخ نالکہ کے زخموں پر رکھ دی اور بڑی احتیاط سے زخم پر اس طرح حرکت دینے لگا جیسے پلستر کر رہا ہو۔

نالکہ کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ وہ بری طرح چلی تھی مگر ان چاروں عورتوں نے اسے بڑی سختی سے جکڑ رکھا تھا۔ جھوپڑے میں گوشت جلنے کی بو پھیل گئی تھی۔ بوڑھے نے سلاخ دوبارہ دیکھتے ہوئے کونکوں پر رکھ دی اور ایک بوتل میں بھرا ہوا میالے سے رنگ کا سیال نکال کر نالکہ کے جلے ہوئے زخموں پر لگانے لگا۔ نالکہ کو یوں محسوس ہوا جیسے زخم پر ٹھنڈک سی پڑ گئی ہو۔

بوڑھے نے دوبارہ سلاخ اٹھالی۔ اس مرتبہ اس نے نالکہ کی پٹلی کے زخم کو داغا تھا۔ نالکہ ایک بار پھر چیخ اٹھی اور اس مرتبہ نالکہ کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ بوڑھے نے پٹلی کے زخم پر بھی وہ سیال لگا دیا اور سیدھا کرتے ہوئے بولا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ادی سسی! تم اس کے پاس ہی بیٹھو.... ہوش میں آجائے تو اسے وہ لال شربت پلا دینا۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”اچھا بابا!“ سسی نے جواب دیا۔

بوڑھا کونکوں کی انگلیٹھی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ وہ دونوں عورتیں کچھ دیر بیٹھی رہیں پھر عانتہ کے ساتھ وہ بھی جھوپڑے سے باہر نکل گئیں۔ سسی جھنگا سی چارپائی کی پٹی پر بیٹھی نالکہ کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ عانتہ نے لالین جلا کر جھوپڑے کے عین وسط میں لکڑی کے ستون پر لٹکادی۔

”تو اسی کے پاس بیٹھی رہ بیٹا۔ میں روٹی نکالوں۔ اللہ سائیں سے اس کی رحمت اور سلامتی کی دعا مانگتی رہ۔ پتہ نہیں بچاری کون ہے اور اسے کس نے گولی ماری تھی۔“ عانتہ کہتی ہوئی پاہر چلی گئی۔ سسی اپنی جگہ پر بیٹھی نالکہ کی طرف دیکھتی رہی۔ نالکہ کی قمیص پھٹی ہوئی تھی اس کے زخم پر خراشوں کے نشان بھی تھے۔ نالکہ نے بتایا تھا کہ اسے ڈاکو اٹھا کر لائے تھے اور وہ کسی طرح ڈاکوؤں کے چنگل سے بھاگ نکل تھی۔ اسے گولی ڈاکوؤں ہی نے ماری ہوگی۔

نالکہ کا لباس اگرچہ پھنسا ہوا اور خون آلود تھا لیکن کپڑا بے حد قیمتی تھا۔ اس کا چہرہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ کسی امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ لیکن وہ ڈاکوؤں کے ہاتھ کیسے لگ گئی؟ بہت سے سوالات سسی کے ذہن میں گلبلا رہے تھے۔ لیکن ان سوالات کا جواب صرف نالکہ ہی دے سکتی تھی جو اس کے سامنے بے ہوش پڑی تھی۔

نائلہ کو تقریباً ”دو گھنٹے بعد ہوش آگیا۔ اس کے دانے ہوئے زخموں پر جو سیال لگایا گیا تھا اس کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی اپنے زخموں پر ٹھنڈک سی محسوس کر رہی تھی۔ سسی نے فوراً ہی ایک پیالی میں لال شربت انڈیل کر اسے پلا دیا۔ عجب سا ذائقہ تھا لیکن اس کی تاثیر عجیب تر تھی۔ شربت پیتے ہی نائلہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کی تمام توانائیاں بحال ہو رہی ہوں۔

”اب کیسی ہو ادی؟“ سسی نے پوچھا۔  
 ”پہلے سے بہت بہتر ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ شربت کیسا تھا اور وہ دوائی جو میرے زخم پر لگائی گئی تھی، وہ کیا تھی؟“

”وہ دوائیں بابا کے مرشد سائیں نے بنا کر دی ہیں۔ مرشد سائیں نے ان کا نسخہ بھی بتایا ہے۔ کیکر کے ان جنگلوں میں ایسی جڑی بوٹیاں بھی ہیں جو تریاق کا اثر رکھتی ہیں۔ ان علاقوں میں سانپ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بڑی بستیاں تو میلوں دور ہیں۔ کسی بستی پر پہنچنے سے پہلے ہی مریض ختم ہو جاتا ہے۔ ان جڑی بوٹیوں سے ایسی دوائیں بھی تیار کی جاتی ہیں جن سے سانپ کے کاٹنے کے مریض کی جان بچائی جاسکتی ہے۔ بابا کے مرشد سائیں نے جو نسخے بتائے تھے وہ تو بالکل تریاق کا اثر رکھتے ہیں۔ اللہ سائیں نے چاہا تو تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔“ سسی نے کہا۔

”تم لوگ بہت اچھے ہو سسی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”بہت نیک اور ہمدرد۔ اگر تم لوگ نہ ملتے تو شاید اب تک میں مر چکی ہوتی۔“

”اللہ سائیں بچانے والا ہے ادی۔“ سسی نے جواب دیا۔ ”تمہیں بھوک تو لگی ہوئی ادی۔ مانی شانی لاؤں؟“

”ہاں سسی۔ بھوک تو مجھے واقعی بہت لگی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔  
 کچھ ہی دیر بعد سسی جمو پڑے سے باہر نکل گئی اور جب وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ عائنہ بھی تھی جس نے چنگیر میں کھانا اٹھا رکھا تھا۔ دو روٹیاں اور تلی سی وال۔ سسی نے نائلہ کو سارا دے کر اٹھا دیا۔  
 ”ہم تو یہی کچھ کھاتے ہیں ادی۔“ عائنہ نے کہا۔ ”اللہ سائیں کا شکر ہے کہ یہ بھی کھانے کو ملتا ہے۔ تم اپنے گھر میں پتہ نہیں کیا کھاتی ہو گی؟“  
 ”اللہ کا شکر ہے.... دو وقت کی عزت کی روٹی کھانے کو مل جاتی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

سسی اسے اپنے ہاتھ سے روٹی کھلا رہی تھی۔  
 ”ادی! تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا نہیں۔ تم کون ہو اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟“ عائنہ نے پوچھا۔

نائلہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر انہیں اپنے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔  
 ”اللہ نے مجھے اتنی ہمت دی کہ میں ان خطرناک لوگوں کے چنگل سے بھاگ نکلی اور یہاں تک کس طرح پہنچی؟ یہ بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر سسی اور بابا مجھے جنگل میں نہ مل جاتے تو شاید یہ میری زندگی کی آخری رات ہوتی۔ اگر میں ان زخموں سے نہ بھی مرنے تو جنگل میں مجھے کوئی زہریلا سانپ ڈس لیتا یا خونخوار بھیڑیے میری بوٹیاں نوچ کر کھا ڈالتے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ نائلہ درانی کا انجام کیا ہوا۔“  
 ”اللہ سائیں بڑا رحم کرنے والا ہے ادی۔“ عائنہ نے جواب دیا۔ ”تم تین چار روز آرام کر دو گی تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اور پھر سسی کے بابا تمہارے ساتھ جا کر تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔“

نالکھ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سسی کے ہاتھ سے خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ اسے کھانا کھلانے کے بعد سسی نے خالی برتن اپنی ماں کے حوالے کر دیئے۔

”اچھا ادی۔“ عائشہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اب تو آرام کر۔ سسی رات کو تیرے پاس ہی رہے گی۔ کوئی تکلیف ہو تو اسے بتا دیتا۔ اب میں چلتی ہوں۔“

عائشہ کے جانے کے بعد سسی نے جھوپڑے کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈا چڑھا دیا اور دوسری چارپائی گھسیٹ کر نالکھ کی چارپائی کے قریب کر لی اور لالین کی جتنی ہلکی کر کے چارپائی پر لیٹ گئی اور وہ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ باہر دیرانے سے بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن اس وقت نالکھ کو کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

”یہ میرے کپڑے تم نے بدلے تھے؟“ نالکھ نے سسی سے پوچھا۔  
 ”ہاں ادی۔“ سسی نے جواب دیا۔ ”تمہاری قمیص پھٹ گئی تھی اور کپڑے خون میں بھرے ہوئے تھے۔ میں نے وہ کپڑے انار کر تمہیں اپنے کپڑے پہنا دیئے تھے۔“

”تم لوگ یہاں کیسے رہتے ہو؟“ اس دیرانے میں جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے؟“ نالکھ نے پوچھا۔

”ساندھ یہاں سے چھ گھنٹے کا راستہ ہے نیل گاڑی پر۔ وہاں سے ہندوستان کی سرحد قریب اور پاکستان کے دوسرے قصبہ زیادہ دور ہیں۔ ساندھ سے بیس بھی چلتی ہیں۔ میں دو مرتبہ بابا کے ساتھ گئی تھی۔ ایک مرتبہ خیرپور اور دوسری مرتبہ میرپور ماٹھیلو۔ بہت لمبا سفر ہے۔“ سسی نے بتایا۔  
 ”یہاں اور کون کون رہتا ہے؟“ نالکھ نے پوچھا۔

”ایک میرا چاچا ہے اور دو ماموں ہیں۔ ہم سب جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یہاں جمع کرتے رہتے ہیں۔“

”پھر تو اچھی خاصی آمدنی ہوگی؟“ نالکھ بولی۔  
 ”نہیں ادی۔“ سسی کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”یہ جنگل تو دؤیرے کا ہے ہم تو اس کے غلام ہیں۔ لکڑیاں کاٹتے رہتے ہیں۔ ہر مہینے اس کے آدمی ٹرکوں پر یہ لکڑیاں لے جاتے ہیں۔ ہمیں تو بس اتنا ملتا ہے کہ زندہ رہ سکیں۔“

”اوہ!“ نالکھ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے جو کھانا کھایا تھا اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کس قسم کی زندگی گزار رہے تھے۔ پنجاب کے زمین داروں کے بارے میں تو وہ بہت کچھ جانتی تھی۔ شیردرانی کی مثال اس کے سامنے تھی۔ اس کے کارندے مزارعوں سے اناج کا ایک ایک دانہ چھین لیتے تھے اور انہیں صرف اتنا دیا جاتا تھا جس سے جسم اور روح کا رشتہ قائم رہ سکے اور وہ لوگ اس کے لیے کھیتوں میں ہل چلا سکیں۔ سندھ کے وڈیروں کے ظلم کی داستانیں بھی اس نے سن رکھی تھیں۔ انہوں نے ہاریوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ ہاری ان وڈیروں کے چنگل سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بعض وڈیروں نے تو اپنی ذاتی جیلیں بنا رکھی تھیں۔ کوئی ہاری اگر غلطی سے اپنا حق مانگ لیتا یا وڈیرے کی غلامی سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا تو اسے وڈیرے کی پراسیویٹ جیل میں ٹھونس دیا جاتا اور اس کی ساری زندگی اسی جیل میں ظلم سہتے ہوئے گزرتی۔

”تمہاری شادی ہو گئی ہے سسی؟“ نالکھ نے پوچھا۔

”نہیں ادی۔“ سسی نے جواب دیا۔ اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ”پانچ سال پہلے میری مگنی ہوئی تھی۔ میرا مگنیترا کام کے لیے شہر گیا تھا۔ مگر آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں وہ کہاں ہے؟“

”اوہ!“ نائلہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا تو تمہارے ماں باپ تمہارے لیے کوئی اور رشتہ تلاش کیوں نہیں کر لیتے؟“

”بابا نے تو میرے لیے ایک رشتہ تلاش کیا بھی تھا مگر ادی تم جانتی ہو کہ کوئی لڑکی دل میں جس مرد کا نام بسالیتی ہے پھر ساری زندگی اسی نام کی مالا جپتی رہتی ہے۔ یوسف میرا مگنیترا ہے۔ میں اسے بھول کر کسی دوسرے مرد سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟“

”عجیب احق لڑکی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اگر یوسف کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مرکھپ گیا ہے۔ تو کیا تم ساری زندگی اس کے انتظار میں بیٹھی رہو گی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنے بابا کی بات مان لو اور شادی کرلو۔ تمہاری عمر نکلی جا رہی ہے۔ بوڑھی ہو جاؤ گی تو کوئی تمہیں پوچھے گا بھی نہیں۔“

”میری بات چھوڑو ادی۔“ سسی نے کہا۔ ”تم نے شادی کی ہے یا نہیں؟“

”نہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میری بھی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ میرے ماں باپ مر چکے ہیں۔ میری ایک چھوٹی سی بہن ہے جو اپنے آوارہ اور بد معاش بیٹے سے میری شادی کرنا چاہتی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ چھوٹی کو مجھ سے نہیں، میری دولت اور میری زمینوں سے محبت ہے۔ وہ مجھ سے شادی کر کے میری زمینوں اور دولت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”تمہاری زمینیں!“ سسی اس کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”ہاں سسی! میرے باپ کی بہت زمین ہے، کئی مربے۔ شہر میں بھی بہت جائیداد ہے اور اب میں ان سب کی مالک ہوں۔“ نائلہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ کہنے لگی۔ ”مگر یہ زمینیں اور دولت ہی میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت ہو تو کوئی دکھ قریب نہیں آتا مگر میں تو جب سے ان زمینوں اور دولت کی مالک بنی ہوں میں نے سکھ کا ایک سانس نہیں لیا۔ میری زندگی اسی طرح بھاگتے دوڑتے ہوئے ہی گزر رہی ہے۔ میرے دشمن موت کے سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہے ہیں اور میں ان سے جھپتی پھر رہی ہوں۔ اب دیکھ لو۔ میری کیا حالت ہے۔ میرے رشتہ دار میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ وہ کئی مرتبہ مجھے مروانے کی کوشش کر چکے ہیں اور اب بھی انہوں نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انہوں نے ڈاکوؤں کے ذریعے مجھے اٹھوایا مگر میں ان کے چنگل سے بھاگ نکلی۔ میری قسمت اچھی تھی جو تم اور بابا جنگل میں مل گئے اور میں بچ گئی۔“

”اللہ سائیں بچانے والا ہے ادی۔“ سسی نے جواب دیا۔ ”اچھا اب تم سو جاؤ... مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔“

سسی تو کچھ دیر بعد سو گئی مگر نائلہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رائے منصور کو اس واقعہ کا پتہ چل گیا ہو گا یا نہیں؟ اسے تلاش کیا جا رہا ہو گا یا نہیں؟

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور اس سناٹے میں کبھی کبھی کسی بھیڑیے کی آواز سنائی دے جاتی۔ عجیب لوگ تھے یہ بھی... آبادی سے میلوں دور ویرانے میں پڑے زندگی گزار رہے تھے۔

سے شام تک درخت کاٹنے رہتے اور مہینے کے آخر میں وڈرے کے آدمی آکر لکڑیاں لے جاتے۔ یہ واقعی غلاموں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس نے گردن گھما کر سسی کی طرف دیکھا، وہ ملکہ حسن نہ لیکن ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ اگر کسی شہر میں ہوتی تو کئی نوجوان اس کے گرد منڈلاتے رہتے مگر تو بمیلوں دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔۔۔۔۔ پانچ سال پہلے اس کی منگنی ہوئی تھی اور اس کا یوسف کام کی تلاش میں شہر گیا تھا مگر آج تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ اس کے باوجود وہ یوسف کے نام کو اپنے دل میں بسائے ہوئی تھی اور نائلہ کو یقین تھا کہ یوسف اگر ل تک بھی نہ آئے تو سسی اسی کے نام کے سارے زندگی گزار دے گی۔

نائلہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ باپ بیٹی اسے جنگل میں نہ ملتے تو واقعی یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہوتی۔ سسی کے باپ نے اس کے زخم سے جس طرح گولی نکالی تھی وہ ایک قابل تعریف بات تھی۔ وہ ہسپتال میں ہوتی تو اس کے آپریشن میں کئی گھنٹے لگ جاتے مگر اس بوڑھے نے چاقو کی نوک سے صرف ہنٹ میں اس کے زخم سے گولی نکال دی تھی اور دونوں زخموں کو داغ دیا تھا۔ جدید ترین دور میں قدیم علاج! آج وہ خود اس مرحلے سے گزری تھی۔ کس قدر اذیت ناک مرحلہ تھا یہ۔ یہ اس کی زندگی کا انوکھا تجربہ تھا!

نائلہ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے سو گئی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو سسی اور اس کی ماں عائشہ کے علاوہ دن دیگر عورتیں بھی کمرے میں موجود تھیں۔ جھوپڑے سے باہر بچوں کے شور مچانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور ایک عورت بار بار جھوپڑے کے دروازے پر جا کر ان بچوں کو ڈانٹ رہی تھی۔ ”تم اٹھ گئیں ادی۔“ عائشہ اسے بیدار ہوتے دیکھ کر بولی۔ ”مسی! ادی کا منہ ہاتھ دھلا دو۔ میں اس لیے کھانے کو لے کر آتی ہوں۔“ عائشہ باہر نکل گئی۔

”یہ بچے کیوں شور مچا رہے ہیں۔“ نائلہ نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
 ”باہر بارش ہو رہی ہے ادی۔“ مسی نے بتایا۔ ”بچے بارش میں نہا رہے ہیں۔“  
 ”اوہ! بارش میں تو تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی ہوگی۔ جھوپڑوں کی چھتیں تو ٹپکنے لگتی ہوں گی۔“ نائلہ

”چھتوں پر گارے کی لپائی ہے۔ زیادہ تیز بارش ہو تو چپکتی ہیں۔ یہ تو ہلکی بارش ہے۔ اور ادی کئی سال ریش ہوئی ہے۔ یہ تو اللہ سائیں کی رحمت ہے۔“ مسی نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد عائشہ اس کے لیے ناشتہ لے آئی۔ روکھی روٹی اور بغیر دودھ کی چائے۔ سسی نے نائلہ کا ہاتھ دھلا دیا اور نائلہ ناشتہ کرنے لگی۔ دوسری عورتیں بیٹھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کبھی وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتی تھیں۔

دو تین دن گزر گئے۔ نائلہ اس دوران جھوپڑے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کے زخموں پر وہ میالہ سا باقاعدگی سے لگایا جا رہا تھا اور دن میں تین چار مرتبہ لال شربت بھی پینے کو دیا جا رہا تھا اور نائلہ محسوس ہی تھی کہ اس کے زخم نہ صرف تیزی سے مندمل ہو رہے تھے بلکہ اس کی توانائی بھی بحال ہو رہی تھی۔ بڑی بوٹیوں میں واقعی عجیب تاثیر تھی۔ قدرت نے اس دھرتی کو اگر بعض چیزوں سے محروم رکھا تھا تو سی نعمتوں سے مالا مال بھی کیا تھا۔

دو تین دن تک وقفے وقفے سے ہلکی بارش ہوتی رہی تھی اور پھر آسمان صاف ہو گیا تھا۔ ان دو تین دنوں



کے دوران نائلہ صرف رات ہی کو سسی کے ساتھ جھوپڑے سے باہر نکلتی تھی۔ وہ سسی کے سارے تھوڑی دور تک چل لیتی۔ اس کے زخموں میں ابھی اچھی خاصی تکلیف تھی۔ بائیں ٹانگ پر زیادہ زور نہیں بڑھا تھا۔ پانچویں دن نائلہ نے سارے کے بغیر چلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کی زخمی ٹانگ ابھی بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”نائلہ کو وہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ یہ لوگ اپنی حیثیت کے مطابق اس کی خدمت کرتے رہے۔ سسی اس کا بہت خیال رکھتی تھی، وہ تو گویا اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ دسواں دن تھا۔ نائلہ چائے پی رہی تھی کہ عائشہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

”ادی!“ وہ نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مسی کا بابا آج ساندہ جا رہا ہے۔ سسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم بہت اچھے گھر کی لڑکی ہو مگر دشمن تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اگر تم اپنے کسی رشتہ دار کو پیغام بھیجنا چاہتی ہو تو بتادو۔ سسی کے بابا ساندہ سے اپنے بھانجے کو بھیج دیں گے۔“

نائلہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے سسی سے کانڈ اور پنسل وغیرہ کے لیے پوچھا۔ ایک کاپی تھی جس پر ہر مینے ڈیرے کے آدمیوں کے حوالے کی جانے والی لکڑی کا حساب لکھا جاتا تھا۔ نائلہ نے اس کاپی میں سے ایک صفحہ پھاڑ لیا اور پنسل سے رائے منصور کے نام مختصر سا پیغام لکھ دیا۔ اس نے کانڈ پر رائے منصور کا پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ اس دوران سسی کا باپ بھی اندر آگیا۔

”بابا!“ نائلہ نے کانڈ تہہ کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس پر پتہ لکھ دیا ہے۔ جس آدمی کو بھی بھیجو گے اس سے کہہ دینا کہ صادق آباد میں کسی سے بھی رائے منصور کے بارے میں پوچھ لے۔ وہ بہت بڑا زمیندار ہے۔ اسے تلاش کرنے میں تمہارے آدمی کو کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن اسے اچھی طرح سمجھا دینا کہ وہ رائے منصور کے علاوہ کسی کو نہ بتائے کہ میں کہاں ہوں۔“

”میں سمجھ گیا بیٹی۔“ بوڑھے نے اس کے ہاتھ سے رقعہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مسی نے ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ میں اپنے بھانجے کو بھی اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔ ہمیں تو اس بات کا افسوس ہے کہ تمہاری کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔“

”آپ لوگوں نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے بابا۔ میں یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”زندگی دینے والا تو اللہ سائیں ہے بیٹی۔ کسی انسان کی مدد تو ایک بہانہ بن جاتا ہے۔ اچھا اب میں چلا ہوں۔ کل آؤں گا۔“ بوڑھے نے نائلہ کا دبا ہوا پرچہ تہہ کر کے گچڑی میں لپیٹ لیا اور جھوپڑے سے باہر نکل گیا۔ عائشہ بھی باہر چلی گئی تھی لیکن سسی اس کے پاس بیٹھی رہی۔

اس سے اگلے دن نائلہ مسی کے ساتھ جھوپڑے سے باہر نکلی تو تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ نائلہ کچھ دیر تک سسی کے سارے چلتی رہی پھر اس نے سسی کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا اور کسی سارے کے بغیر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگی۔ اب اس کی ٹانگ میں زیادہ تکلیف نہیں رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک جھوپڑوں کے سامنے کھلتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دو چار روز بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور معمول کے مطابق چلنے لگے گی۔

”سسی“ نائلہ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ تین چار بچے بھی ایک طرف بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً ایک طرف سے دھول اڑتے دیکھ کر نائلہ چونک سی گئی۔ دھول کا بادل سا اڑ رہا تھا۔ نائلہ کو کھلے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی گاڑی تھی جو اسی طرف آ رہی تھی۔

”تم اندر چلاؤ۔“ سسی نے نالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ دؤیرہ ہو گیا اس کے آدمی۔ تم ان کی نظروں میں نہ ہی آؤ تو اچھا ہے۔“

”ہاں، میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ فی الحال کسی کی نظروں میں نہ آؤں۔“ نالہ نے کہا۔

وہ دونوں جھوپڑے میں آگئیں۔ اس بستی میں صرف چار جھوپڑے تھے اور بستی کا کوئی نام نہیں تھا۔ نالہ جانتی تھی کہ بستیاں تو بٹے بٹے ہی بستی ہیں۔ ضرورت کے مطابق یہاں جھوپڑوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور یہ ایک گوتھ بن جائے گا پھر اس کا ایک باقاعدہ نام بھی ہو گا اور یہی نام اس علاقے کی شناخت بن جائے گا۔

وہ دونوں جھوپڑے میں آکر بیٹھ گئیں۔ سسی کی آنکھوں میں تشویش کی جھلک نظر آرہی تھی۔ پریشان تو نالہ بھی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ اندیشہ تھا کہ اس رات اس نے بھورا کو ختم کر دیا تھا البتہ اس کے چاروں آدمیوں کی ٹانگیں زخمی کر کے انہیں زندہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوگ بھی یقیناً ”کسی نہ کسی بستی میں پہنچ گئے ہوں گے اور ہو سکتا ہے ان کے دوسرے ساتھیوں نے اس کی تلاش شروع کر دی ہو اور وہ لوگ اسے تلاش کرتے ہوئے ہی اس طرف نکل آئے ہوں۔

اب گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ تقریباً ”پانچ منٹ بعد پانچویں بستی کے قریب آکر رک گئی۔ سسی نے دروازے سے جھانک کر دیکھا پھر نالہ کی طرف مڑ کر سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

”تم لیٹ جاؤ آدمی۔ پتہ نہیں کون لوگ ہیں۔ اماں سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ شاید راستہ بھول کر اس طرف آگئے ہیں۔“

نالہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے رلی سینے تک اپنے اوپر کھینچ لی تھی۔ باہر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دو تین آدمی تھے۔ ان کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں لیکن جھوپڑے کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔

”بستی میں کوئی مرد موجود نہیں ہے کیا؟“ نالہ نے پوچھا۔

”نہیں۔ سب لوگ لکڑیاں کاٹنے گئے ہوئے ہیں۔“ سسی نے جواب دیا۔

اسی دوران باہر سے سسی کی ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ پیچ پیچ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر دوسری عورتوں کی آوازیں بھی اس کی آواز میں شامل ہو گئیں۔ جواب میں مردوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ان کے لہجے دھمکی آمیز تھے۔ اور پھر تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی، کوئی آدمی اس جھوپڑے کی طرف آ رہا تھا۔ نالہ نے اپنا چہرہ بھی رلی میں چھپا لیا۔ دھڑ سے دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر آگئے۔ اس کے ساتھ ہی نالہ کو سسی کی پیچ پیچ سنائی دی تھی۔

”یہاں تو بڑا خزانہ چھپا رکھا ہے اس بڑھیا نے۔ اس لیے ہمیں اندر نہیں آنے دے رہی تھی۔“ ایک مردانہ آواز نے کہا۔ وہ غالباً ”اپنے دوسرے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا اور خزانے سے اس کی مراد ہینا“ سسی ہی تھی۔

”دیکھو! کیسی چھو کر ہے۔ دیکھ کر ہی میرے منہ سے رال نکلنے لگی ہے۔“

”خبردار! مجھے ہاتھ مت لگانا۔“ سسی خوفزدہ لہجے میں چیختی۔

”ہاتھ لگائے بغیر تو کام نہیں بنتا نالہ کی۔“ اس شخص نے کہا۔

اس دوران ایک تیسرا آدمی جھوپڑے میں داخل ہوا۔ وہ لہجے قد کا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ اس کی رنگت

کوہ کی طرح سیاہ تھی اور چہرے سے خباثت چمکتی تھی۔  
”یہ کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس بڑھیا کی بیٹی ہے۔“ پہلے آدمی نے جواب دیا۔ ”کیسی چیز ہے خان؟“

”اچھی چیز ہے۔“ رو سیاہ شخص نے کہا اور چارپائی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”اور یہ کون ہے؟“

”میری ادی ہے، بیمار ہے... سوری ہے۔ اس کو مت چھیڑنا۔“ سسی چپٹی ہوئی دوڑ کر چارپائی کے سامنے آگئی۔

رو سیاہ نے سسی کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور اس کا ایک ہاتھ نالکہ پر پڑی ہوئی رلی کی طرف بڑھنے لگا۔

نالکہ کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون لوگ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی راستہ بھٹک کر اس طرف آنکے ہوں اور عورتوں کو اکیلے دیکھ کر ان کی نیت میں فتور آگیا ہو۔ عائنہ بھی جھونپڑے میں آگئی تھی اور بری طرح چیخ رہی تھی۔ نالکہ نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے اوپر پڑی ہوئی رلی کو پکڑ لیا ایک زوردار جھٹکے سے رلی اس کے اوپر سے ہٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی نالکہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اس کے سامنے انسپکٹر صوبہ خان کھڑا تھا۔

..... \* \* \* .....

صوبہ خان کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں اس طرح چمک ابھرائی تھی جیسے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ اس کے ہاتھ آگیا ہو۔

”میں ایک ہفتے سے تمہاری تلاش میں صحراؤں کی ریت چھاننا پھر رہا ہوں نالکہ درانی۔ صوبہ خان نے اس کے چہرے پر نظرسے جھانکے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری بہادری کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔ دو گولیاں لگنے کے باوجود تم نے جس جرات کا مظاہرہ کیا ہے اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ لیکن تم نے ان چاروں کو زندہ چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ تمہیں چاہئے تھا کہ بھوراک کی طرح ان چاروں کو بھی ختم کر دیتیں۔ لیکن ان کا زندہ بچ جانا ہی تمہارے لیے عذاب بن گیا ہے۔ ان میں سے تین تو صادق آباد پولیس کے ہاتھ لگ گئے لیکن ملوک کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ملوک تو تمہیں یاد ہو گا نا؟ وہی جس کی تم نے کلائی توڑی تھی۔ وہ تم سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو رہا ہے اور وہ بھی تمہیں سندھ کے ریگزاروں میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں میں تلاش کرنا پھر رہا ہے۔“

”تم بہت گھٹیا انسان ہو صوبہ خان۔“ نالکہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ حقارت تھی۔ ”تم مجھے بچ اور گھٹیا لوگ جب کسی اونچے مقام پر پہنچتے ہیں تو اپنی اوقات بھول جاتے ہیں لیکن... یاد رکھو... تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“

”میں شبیر درانی سے ذرا مختلف قسم کا انسان ہوں“ نالکہ درانی۔ ”صوبہ خان نے کہا۔ وہ اس وقت ساا لباس میں تھا۔ اس نے نالکہ کی تلاش کی یہ مهم ذاتی طور پر شروع کر رکھی تھی۔

”ہو سکتا ہے شبیر درانی کے دل میں خون کے رشتے کا کوئی لحاظ ہو لیکن میں تمہارا لحاظ نہیں کروں گا۔ اگر تمہاری ٹانگ کے زخم ٹھیک ہو گئے ہوں اور تم اپنے قدموں سے چل سکتی ہو تو اب یہ چارپائی چھوڑنا۔“

دور نہ میرے آدمیوں کو زحمت کرنی پڑے گی۔“  
 ”کوئی مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرے۔ میں چل سکتی ہوں۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے رلی اپنے اوپر سے ہٹادی اور چارپائی سے نیچے اتر آئی۔  
 ”مجھے معاف کر دینا سسی، اور اماں تم بھی۔۔۔“ نائلہ نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔“  
 ”اس سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ہمارے ساتھ جائے گی۔“ صوبہ خان کے ایک آدمی نے سسی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔  
 سسی چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وہ شخص اسے کھینچتا ہوا جھونپڑے سے باہر لے گیا۔ عائشہ بھی چیختی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔  
 ”اے چھوڑ دو صوبہ خان۔“ نائلہ نے کہا۔ ”یہ لوگ بے قصور ہیں۔ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ اگر کسی مظلوم کو پناہ دینا جرم ہے تو اس جرم کی سزا اتنی خوفناک نہیں ہونی چاہئے کہ ایک باعزت خاندان تباہ ہو جائے۔“

”میرے آدمی کئی دن سے تمہاری تلاش میں میرے ساتھ بھٹک رہے ہیں۔ وہ تمہیں تو ہاتھ نہیں لگا سکتے، لیکن انہیں اس بھاگ دوڑ کا کوئی نہ کوئی معاوضہ تو ملنا چاہئے۔“  
 ”تو پھر اپنی کوئی یا بیٹی ہو تو وہ ان کی خدمت میں پیش کر دو!“ نائلہ بولی۔  
 ”میری نہ کوئی بہن ہے نہ بیٹی“ اس لیے مجبوری ہے۔۔۔“ صوبہ خان نے جواب دیا۔  
 ”بہت ہی بے غیرت ہو۔“ نائلہ کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔

”چلو، باہر نکلو۔“ صوبہ خان نے اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلا۔ نائلہ اچانک ہی مڑ کر صوبہ خان پر جھپٹ پڑی۔ اس کی کھڑی ہتھیلی صوبہ خان کی ہنسی کی ہڈی پر لگی۔ صوبہ خان کے منہ سے بے اختیار جھج جھج نکل گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے ہنسی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ وہ ایک ہاتھ ہنسی کی ہڈی پر رکھ کر کسی قدر نیچے جھک گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

نائلہ نے اسے سنبھلنے کا موقع دینے بغیر اسے کلک لگانا چاہی مگر ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے لڑکھڑائی۔ صوبہ خان کو موقع مل گیا۔ اس نے نائلہ پر گھونسلوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ نائلہ چیختے ہوئے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صوبہ خان اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا جھونپڑے سے باہر لے آیا۔

عائشہ اور دوسری عورتیں سسی کو اس شخص کے قتل سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں جبکہ وہ آدمی سسی کو گھسیٹتا ہوا سامنے کھڑی باجروں کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوبہ خان کے تیرے ساتھی نے دوڑ کر باجروں میں پڑی ہوئی کلا شکوف اٹھالی اور ایک ہوائی برست مار دیا۔ عورتیں چیختی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ بچے بھی چیختے ہوئے جھونپڑوں میں گھس گئے تھے۔

”اب اگر کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“ وہ شخص چیخا۔  
 ”ہماری لڑکیوں کو چھوڑ دو۔۔۔ تمہیں اللہ رسول کا واسطہ انہیں چھوڑ دو۔“ عائشہ نے صوبہ خان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ لڑکی ایک قتل کر کے بھاگی ہوئی ہے اور کسی قاتل کو بھی پناہ دینا جرم ہے۔ اس لیے ہم اس دوسری لڑکی کو ساتھ لے جا رہے ہیں۔“ صوبہ خان نے کہا۔

”مجھے لے چلو ساتھ۔ میری بیٹی کو چھوڑ دو۔“ عائشہ بولی۔

”تم جیسی بڑھیا کو لے جا کر کیا کریں گے۔“ کلا شکوف والے نے کہتے ہوئے ایک اور فائر کر دیا۔

سسی اور نائلہ کو پاجیرو کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا گیا۔ صوبہ خان کے دونوں آدمی ان کے داییں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ سسی بری طرح چل رہی تھی اور دوسرے آدمی نے اسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ صوبہ خان لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ عورتیں پاجیرو کے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ صوبہ خان کے آدمی نے انہیں ڈرانے کے لیے رائفل کی نال کھڑکی سے باہر نکال کر ایک ہوائی برسٹ مار دیا۔

”اس کا خیال رکھنا، بڑی خطرناک ہے یہ۔“ صوبہ خان نے کہا۔ اس کا اشارہ نائلہ کی طرف تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر جما رکھا تھا اور ایک ہاتھ سے ہتھی کی ہڈی سلہا رہا تھا۔

”کم بخت نے اس زور کا ہاتھ مارا ہے کہ جان نکلی جا رہی ہے۔“  
”اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔“ رائفل والے نے کہا۔ ”اگر زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش کی تو گولی اس کی کھوپڑی کے پار ہو جائے گی۔“

سسی نڈھال سی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی مزاحمت ترک کر دی تھی اور اپنا سر نائلہ کے کندھے پر ٹکا کر رو رہی تھی۔ نائلہ اس کا کندھا تھپ تھپ رہی تھی۔ پاجیرو تیز رفتاری سے کچے راستے پر دوڑ رہی تھی لیکن اس کا رخ ساندہ کی طرف نہیں تھا۔ صوبہ خان ساندہ سے بہت فاصلہ سے گزر کر اب گھونگی کی طرف جا رہا تھا۔

کچھ آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حالانکہ گھونگی جانے کے لیے ایک باقاعدہ سڑک موجود تھی مگر صوبہ خان ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جس سے کسی گاڑی وغیرہ سے سامنا کرنے کا اندیشہ نہیں تھا۔

سسی اور نائلہ ان دونوں کے درمیان میں بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں آدمی بہت محتاط نظر آ رہے تھے۔ نائلہ اگر سیٹ پر پہلو بھی بدلتی تو اس کے ساتھ بیٹھا ہوا کلا شکوف والا ایک دم چوکنہ ہو جاتا۔

سر سبز علاقہ اب پیچھے رہ گیا تھا اور ایک بار پھر ریتیللا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ پاجیرو اس ریگزار میں ایک ٹریک پر دوڑتی رہی۔ اور بالا خرد پھر کے بعد تپتی ہوئی دھوپ میں بہت دور کسی عمارت کا عکس جھلکاتا ہوا نظر آنے لگا۔ تیز دھوپ میں یوں لگتا تھا جیسے وہ عمارت پانی کی سطح پر تعمیر کی گئی ہو اور پانی کی لہروں پر ہلکورے لے رہی ہو۔

فاصلہ جیسے جیسے کم ہوتا جا رہا تھا وہ عمارت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اور بالا خرد وہ اس عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ وہ ایک بہت بڑی حویلی تھی اور دائیں طرف تقریباً ”دو میل دور کوئی بہت بڑی آبادی نظر آ رہی تھی۔“

حویلی کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ اس کا گیٹ بھی پرانے طرز کا اور بہت اونچا تھا۔ پاجیرو حویلی کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ صوبہ خان نے ہارن بجایا۔ مگر گیٹ دو تین مرتبہ ہارن بجانے کے بعد ہی کھلا تھا۔ پاجیرو حویلی میں داخل ہو گئی۔ گیٹ کے دوسری طرف بہت بڑا میدان تھا۔ کسی زمانے میں یہاں خوبصورت لان رہا ہو گا لیکن اب صرف میدان ہی رہ گیا تھا۔ اس میدان کے دوسری طرف حویلی کی عمارت تھی۔ پرانے طرز کی حویلی تھی۔ سامنے ایک طویل برآمدہ تھا۔ صوبہ خان نے پاجیرو برآمدہ کی سیڑھیوں کے ساتھ

صوبہ خان نیچے اتر آیا۔ حویلی کا گیٹ کھولنے والا بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی کلاشکوف تھی۔ صوبہ خان نے پاجیرو میں بیٹھے ہوئے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا وہ بھی نیچے اتر آئے اور انہوں نے نائلہ اور سسی کو بھی نیچے اتار لیا۔

”محراب خان کہاں ہے؟“ صوبہ خان نے حویلی کے چوکیدار سے پوچھا۔

”اوپر ہے سائیں۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”سورہا ہوگا۔“

”اسے بلاؤ اور کہو کہ ہمارے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرے اور وہ ملوک کہاں ہے؟ اس کے بارے

میں کوئی اطلاع ملی؟“ صوبہ خان نے پوچھا۔

”وہ آج صبح سویرے آیا تھا، تقریباً“ ایک گھنٹہ پہلے گھونکی گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ شام سے پہلے

واپس آجائے گا۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، جاؤ۔“ صوبہ خان نے اشارہ کیا اور پھر اپنے ساتھ آنے والوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”انہیں اندر لے جاؤ... اور الگ الگ کمروں میں بند کر دو۔ اس وقت تو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔

کچھ کھانے کے بعد ہی ان کے بارے میں سوچیں گے۔“

وہ دونوں نائلہ اور سسی کو دھکیلتے ہوئے برآمدے میں آگئے اور انہیں الگ الگ کمروں میں بند کر دیا

گیا۔ نائلہ کو جس کمرے میں بند کیا گیا تھا اس میں کھردرے بان کی چارپائی بھی ہوئی تھی۔ اس چارپائی کے

علاوہ کمرے میں کچھ نہیں تھا۔ آنے والوں کی دو دیواروں میں طاقچے بنے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں ان

طاقچوں میں دیئے جلائے جاتے ہوں گے لیکن اب اس قدیم حویلی کے کسی کمرے کو روشن کرنے کے لیے

دیوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ دیوار پر بجلی کی وائرنگ نظر آ رہی تھی اور چھت پر سواٹ کا ایک بلب بھی

لٹکا ہوا تھا اور چھت غیر معمولی طور پر اونچی تھی۔ پچھلی دیوار میں روشن دان بھی خاصی بلندی پر تھا۔ نائلہ کچھ

دیر تک کمرے کی دیواروں کو گھرتی رہی پھر چارپائی اٹھا کر روشن دان والی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور

چارپائی پر چڑھ کر روشن دان سے باہر جھانکنے لگی۔ اس نے سہارے کے لیے دونوں ہاتھوں سے روشن دان

میں لگی ہوئی سلاخیں پکڑ رکھی تھیں۔ روشن دان خاصا کشادہ تھا اور ایک صحت مند آدمی بھی آسانی سے اس

میں سے گزر سکتا تھا۔ روشن دان کی سلاخیں لکڑی کی تھیں۔

نائلہ چارپائی پر کھڑی روشن دان کی سلاخیں پکڑے باہر جھانک رہی تھی۔ روشن دان باہر کی زمین سے

تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر تھا۔ دیوار کے ساتھ ڈھلان تھی اور اس سے آگے قد آدم جھاڑیاں پھیلی ہوئی

تھیں۔ دائیں طرف بہت دور آبادی نظر آ رہی تھی وہ یقیناً گھونکی کا قصبہ تھا کیونکہ حویلی کے چوکیدار نے

تایا تھا کہ ملوک گھونکی گیا ہوا ہے۔ گھونکی سے چند میل آگے میرپور ماٹیلو تھا۔ انسپکٹر صوبہ خان ماٹیلو ہی

میں تعینات تھا۔ لیکن وہ جس طرح اس حویلی میں آیا تھا اس سے لگتا تھا جیسے یہ اس کی ملکیت ہو۔

نائلہ چارپائی سے اتر آئی اور چارپائی دیوار کے ساتھ بچھا کر بیٹھ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد برآمدے میں

لہموں کی آواز سنائی دی جو اس کے دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور صوبہ

خان ایک آدمی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ دوسرے آدمی نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں چائے

لاکپ اور ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ صوبہ خان کے اشارے پر اس آدمی نے ٹرے چارپائی کی

الٹائی پر رکھ دی اور دیوار پر لگا ہوا سوچ آن کر کے بتی جلا دی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”چائے پیو اور یہ بسکٹ بھی کھا لو... اس وقت یہی انتظام ہو سکتا ہے۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”در اصل

مخرب خان کو معلوم نہیں تھا کہ میں یہاں آؤں گا۔ اگر اسے اطلاع ہوتی تو وہ کھانا تیار کر کے رکھتا۔  
”مجھے نہیں کھانا کچھ بھی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اٹھا کر لے جاؤ یہ چائے اور بسکٹ۔“

”دیکھو!“ صوبہ خان نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”اپنے پیٹ سے دشمنی کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ زندہ اور صحت مند رہنے کے لیے خوراک بہت ضروری ہے۔ کچھ کھاؤ گی نہیں تو تم میں طاقت کہاں سے آئے گی۔“

نائلہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”لیکن تمہیں میری صحت اور زندگی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تم تو مجھے قتل کرنے کے لیے لائے ہو اور اس کے لیے شاید تم نے شیرداری اور اس کی ماں سے پانچ لاکھ روپے بھی وصول کر لئے ہیں۔“  
”نہیں، وصولی ابھی نہیں ہوئی۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”پہلی مرتبہ جب ان دونوں نے تمہارے قتل کی بات کی تھی تو میں نے طے یہی کیا تھا کہ تمہیں یہاں لا کر واقعی قتل کر دوں گا لیکن جب آسموں والی حویلی میں پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تو میری نیت بدل گئی۔ میں نے اسی وقت طے کیا تھا کہ حیدر بیگم سے پانچ لاکھ تو ضرور وصول کر لوں گا مگر تمہیں قتل نہیں کروں گا لیکن تمہارے فرار ہو جانے سے مجھے بڑا افسوس ہوا تھا۔“ صوبہ خان چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”چند روز پہلے حیدر بیگم نے ایک بار پھر مجھے رحیم یار خان بلایا اور تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ عدالت نے تمہیں تمام الزامات سے بری کر دیا ہے اور تم آزادی سے گھوم رہی ہو۔ تمہیں ٹھکانے لگانا آسان ہو گا۔ میں نے اس علاقے کے چند خطرناک آدمیوں کو جمع کیا۔ وہ لوگ کئی سنگین مقدمات میں سندھ اور پنجاب پولیس کو مطلوب تھے۔ میں نے بھورا کو دو لاکھ روپے کی پیشکش کی تھی کہ تمہیں زندہ پکڑ کر یہاں لایا جائے۔ انہوں نے دو تین دن تک تمہاری نگرانی کی اور پھر موقع ملے ہی تمہاری کار پر حملہ کر دیا۔ میں نے انہیں سختی سے ہدایت کی تھی کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے مگر بد قسمتی سے تم بھی فائرنگ کی زد میں آ گئیں لیکن میں تمہاری دلیری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ تم نے راستے ہی میں ان سے پیچھا چھڑا لیا۔ بھورا کو تو تم نے ختم ہی کر دیا تھا۔ باقی سب کی ٹانگیں ناکارہ کر دیں۔ ان میں سے تین تو صادق آباد پولیس کے ہاتھ لگ گئے۔ ملوک کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ وہ تم سے اپنی توبہ کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ کوئی مرد سورا بھی آج تک اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکا چہ جائیکہ ایک لڑکی نے اس کی کلائی توڑ دی۔ لیکن اطمینان رکھو... وہ تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ میں تو اسے تمہیں چھوٹے کی بھی اجازت نہیں دوں گا...“

”میں جب تک زندہ ہوں کوئی مائی کا لعل مجھے چھو بھی نہیں سکتا۔“ نائلہ غرائی۔

”اس لیے تو کہتا ہوں کہ..... اپنے پیٹ سے دشمنی کر کے توانائی ضائع مت کرو۔ چائے پو اور یہ بھگت بھی کھاؤ۔“ صوبہ خان نے ہونٹوں پر مکروہی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔  
نائلہ نے چائے کا کپ اٹھالیا اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔

”گڈ!“ صوبہ خان بولا۔ ”تمہارے لیے تو میں نے بہت سی شاندار منصوبہ بنا رکھا ہے۔ پانچ لاکھ حیدر بیگم سے وصول ہوں گے اور اس کے بعد بھی میں وقتاً فوقتاً وصولیاں کرتا رہوں گا۔ آخر تمہاری کمزوریوں کی جائیداد انہیں ملے گی تو اس میں سے مجھے بھی تو کچھ حصہ ملنا چاہئے نا... اور پھر سندھ میں ایسے ڈیرے بھی موجود ہیں جنہیں اپنی دولت کا خود بھی اندازہ نہیں ہے۔ یہ ڈیرے تم جیسی حسین عورتوں کی پرستش کرتے

ہیں۔ ایسا کوئی بھی دُورِ ہمارے لیے دس پندرہ لاکھ روپے بڑی آسانی سے دے سکتا ہے۔“  
 ”تمہاری بہنیں اور بیٹیاں ہوتیں تو تم یقیناً“ ان کے بھی اسی طرح سودے کر ڈالتے۔ ”ناٹک نے چائے کی پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔

”ہاں، بہن اور بیٹی.... یہ سب رشتے میرے لیے بے معنی ہیں۔ میرا رشتہ صرف ایک چیز سے ہے.... دولت....“ صوبہ خان نے کہا۔ ”ایک سال پہلے یہ حویلی میں نے ایک دُورِ ہمارے سے بیس لاکھ میں خریدی تھی۔ اس وقت یہ حویلی کھنڈر تھی۔ میں اس پر تقریباً“ پانچ لاکھ روپے خرچ کر چکا ہوں۔ ایک سال بعد اسے دیکھو گی تو یہ حویلی عالی شان محل میں تبدیل ہو چکی ہوگی۔ اس کے لیے میں نے گھونکی سے یہاں تک خاص طور پر بجلی کی لائن ڈلوائی ہے۔ انسان کے پاس دولت ہو تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔“

”اور یہ دولت ہی ایک دن تمہارے گلے کا پھندہ بن جائے گی۔“ ناٹک نے کہا۔  
 ”انسان اگر دولت سے کھیلتا ہوا مرے تو میرے خیال میں اسے کوئی افسوس نہیں ہونا چاہئے۔“ صوبہ خان نے بے غیرتی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بات ذہن نشین کر لو صوبہ خان۔“ ناٹک ایک جھٹکے سے چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں دوسری عورتوں سے بہت مختلف ہوں۔ اس کا اندازہ تم لگا چکے ہو۔ اپنی خواہشوں کے محل تم میری لاش پر ہی تعمیر کر سکتے ہو۔ میرے جیتے جی تو تمہاری کوئی خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ تمہیں قانون کا محافظ بنایا گیا تھا مگر قانون کی آڑ میں تم جو گستاخوں نے کھیل کھیل رہے ہو اس کا انجام بہت برا ہوگا اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لو کہ تمہارا انجام میرے ہی ہاتھوں ہوگا۔“

”لیکن تم بھی شاید یہ بھول رہی ہو کہ چند روز پہلے تم بھورانا می ایک آدمی کو قتل کر چکی ہو۔ اور تم جانتی ہو کہ قتل کی سزا کیا ہوتی ہے۔ میں رحیم یار خان کے پولیس افسروں سے بہت مختلف ہوں۔ یہاں تم عدالت سے بری تو کیا ضمانت بھی نہیں کروا سکو گی۔“ صوبہ خان نے کہا۔  
 ”اگر تم میں اتنی ہی جرات ہے تو مجھے عدالت میں پیش کر دو۔“ ناٹک نے کہا۔

”مجھے عدالتوں پر بھروسہ نہیں ہے۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”میں جن مجرموں کو پکڑتا ہوں ان کے بارے میں فیصلے خودی کرتا ہوں اور موت سے کم سزا کسی کو نہیں دیتا۔ جرائم پیشہ لوگ میرا نام سننے ہی تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔“

”جب قانون کا محافظ ہی سب سے بڑا مجرم بن جائے تو....“  
 ”میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔“ صوبہ خان نے اسے ٹوک دیا۔ ”میں تو تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ تمہیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔“  
 ”یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات سن لو کہ اگر اس لڑکی کو تمہارے آدمیوں کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچا تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔“ ناٹک نے کہا۔

”میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔“ صوبہ خان کے ہونٹوں پر مکروہی مسکراہٹ آگئی۔ ”وہ ایک خوبصورت لڑکی ہے اور دو تین لاکھ تو اس کے بھی مل ہی جائیں گے۔“

وہ چند لمحے بے غیرتی سے ناٹک کی طرف دیکھتا رہا پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔  
 ”اب رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔ ویسے تمہاری تسلی کے لیے میں اس لڑکی کو بھی تمہارے ہی کمرے میں بھیج دوں گا۔ تاکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر میرے آدمی اسے دغا دار کرنے کی کوشش نہ کریں۔“



تمہاری موجودگی میں وہ ایسا نہیں کریں گے۔“

اس کا ایک آدمی کلا شکوف لئے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ صوبہ خان کے باہر نکلنے ہی دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔

نالہ چارپائی پر بیٹھی صوبہ خان کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ واقعی بہت خطرناک آدمی تھا۔ روشن دان کی طرف دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ باہر شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دفعۃً ”چیخوں کی آواز سن کر نالہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ یہ سسی کی چیخوں کی آواز تھی۔ نالہ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ پھر برآمدے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک فائر کی آواز گونج اٹھی۔ تقریباً ”دس منٹ بعد نالہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے سسی کو اندر دھکیل دیا۔ سسی کی قمیص پھٹی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ خوف کی شدت سے پیلا ہو رہا تھا۔ سسی کے پیچھے ہی صوبہ خان بھی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔

”اس کی خاطر میں نے اپنے ایک آدمی کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔“ صوبہ خان نے نالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس بے وقوف نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔“

سسی دوڑ کر نالہ سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

”مجھے بچالوادی۔ ان درندوں سے مجھے بچالو۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اب تمہیں کچھ نہیں ہو گا سسی۔“ نالہ اس کا کندھا تھپتھپانے لگی۔

ایک آدمی دوسری چارپائی لے آیا۔ چارپائی ایک طرف ڈال کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بستر بھی لے آیا جنہیں چارپائی پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد صوبہ خان بھی باہر جا چکا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ نالہ نے دونوں چارپائیوں پر بستر بچھا دیئے اور سسی کو اپنے ساتھ لپٹا کر ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تقریباً ”آٹھ بجے دروازہ پھر کھلا۔ وہ دو آدمی تھے۔ ایک ٹن مین جو دروازے ہی میں رک گیا اور دوسرا آدمی کھانے کی ٹرے لئے ہوئے اندر آ گیا۔ اس نے ٹرے ایک چارپائی پر رکھ دی اور باہر چلا گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔

کھانے میں چپائیاں اور مرغی کا گوشت تھا۔ ٹرے میں پانی سے بھرا ہوا ایک جگ اور ایک گلاس بھی تھا۔ نالہ نے احتیاط سے جگ اٹھا کر فرش پر رکھ دیا اور سسی کو لے کر اس چارپائی پر آ گئی۔

”لو... کھانا کھاؤ...“

”میرا دل نہیں چاہتا آدمی۔“ سسی نے کہا۔

”ارے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ ہم آج رات ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔“ نالہ نے سرگوشی کی۔

”وہ کیسے آدمی؟“ سسی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو درندے ہیں۔ ہمیں کیسے نکلنے دیں گے۔“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ پہلے اطمینان سے کھانا کھاؤ۔“ نالہ بولی۔

وہ دونوں کھانا کھانے لگیں۔ کھانے کے بعد نالہ نے برتن اٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیئے اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے سسی کی طرف دیکھنے لگی۔

”سردی لگ رہی ہے تو لحاف اوڑھ لو۔“ نالہ نے سسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سسی کو واقعی سردی لگ رہی تھی اس نے لحاف اوڑھ لیا اور نالکہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نالکہ اسے لے کر یہاں سے کیسے نکلے گی۔

اس وقت شاید دس بجے تھے کہ دروازہ ایک بار پھر کھلا اس مرتبہ صوبہ خان اندر آیا تھا۔  
 ”میں مانتھیلو جا رہا ہوں۔ ابھی ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ وہاں دو آدمیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ قاتل بھی گرفتار ہو گیا ہے۔ میں یہ معاملہ نمٹا کر صبح ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں گا اور تم میری ایک بات غور سے سن لو! میرے آدمیوں کے ساتھ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ وہ اپنے ایک ساتھی کا انجام دیکھ چکے ہیں۔ تمہاری یہاں سے فرار کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ اگر تم نے میرے آدمیوں کو دھوکا دے کر فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ تمہیں گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔“ صوبہ خان نے کہا اور باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ دروازہ خاصا مضبوط تھا اس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد پاجیرو کا انجن اشارت ہونے کی آواز سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد خاموشی چھا گئی۔  
 نالکہ کے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز نہیں تھا کہ اس حویلی میں نیلی فون بھی موجود تھا۔ دو میل دور گھونکی سے بجلی کی لائن آسکتی تھی تو نیلی فون کی لائن بھی آسکتی تھی۔

وقت دیرے دیرے گزرتا رہا۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ نالکہ نے بستر کی ایک چادر اٹھالی اور بڑی احتیاط سے اس طرح لمبائی کے رخ سے اس کی پٹیاں پھاڑنے لگی کہ کپڑا پھٹنے کی زیادہ آواز نہ ہو۔ اس کے اشارے پر سسی نے بھی اپنے بستر والی چادر کے ساتھ یہی سلوک شروع کر دیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں چادریں لمبی لمبی پیٹوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ وہ ان پیٹوں کو رسی کی طرح بٹ کر گرہیں دینے لگیں۔ اس طرح ایک لمبی رسی تیار ہو گئی۔

نالکہ کو جب یقین ہو گیا کہ پہرہ دینے والا بھی کہیں بیٹھا اونگھ رہا ہو گا تو نالکہ نے ایک چارپائی اٹھا کر روشن دان کے نیچے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور چارپائی پر چڑھ گئی۔ سسی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نالکہ نے روشن دان کی سرے والی ایک سلاخ بائیں ہاتھ سے پکڑ لی اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے دوسری سلاخوں پر وار کرنے لگی۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں ابھریں اور لکڑی کی کئی سلاخیں ٹوٹ گئیں۔

اسی لمحہ باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ محافظ تھا جو دروازے کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔

”اے... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ محافظ نے غراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”چارپائی میں کھٹل بھرے ہوئے ہیں وہ جھاڑ رہی ہوں ورنہ صبح تک تو یہ ہمارا خون چوس جائیں گے۔“ نالکہ نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

”آرام سے سو جاؤ۔ شور مت مچاؤ۔“ محافظ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ غالباً ”صوبہ خان نے اسے بتا دیا تھا کہ نالکہ کس قدر خطرناک عورت ہے۔ تقریباً“ آدھے گھنٹے بعد نالکہ پھر دیوار کے ساتھ چارپائی پر کھڑی ہو گئی اور بڑی احتیاط سے لکڑی کی ٹوٹی ہوئی سلاخیں نکال نکال کر باہر پھینکتے لگی۔ روشن دان میں اتنی جگہ بن گئی تھی کہ ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ اس نے مرکز سسی کو اشارہ کیا۔ سسی نے بنا ہوا رسہ اسے تھما دیا۔ نالکہ نے رسے کا ایک سرا بڑی مضبوطی سے اس سلاخ کے ساتھ باندھ دیا جو اس نے سلامت چھوڑ دی تھی۔ پھر رسہ باہر پھینک دیا۔ وہ دن کے وقت باہر کی زمین سے روشن دان کی بلندی کا اندازہ لگا چکی تھی اور اسے یقین تھا کہ رسے کا دوسرا

سرا باہر زمین تک پہنچ گیا ہوگا۔

نائلہ نے مڑ کر ایک بار پھر سسی کو اشارہ کیا۔ سسی بھی چارپائی پر چڑھ گئی۔  
 ”ڈرو نہیں۔ رسہ بہت مضبوط ہے۔ بس گرفت ذرا مضبوط رکھنا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی دیوار کے ساتھ بیٹھ جانا۔ دوسری طرف ڈھلان ہے، کہیں لڑھک مت جانا۔ چلو.... روشن دان پر چڑھو۔ پہلے پیر باہر نکالنا۔ میں تمہیں سارا دیئے رہوں گی۔“ نائلہ نے سرگوشی کی۔

سسی کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ مگر عزت اور جان بچانے کے لیے یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے روشن دان پر چڑھ گئی اور پیر باہر لٹکاتے ہوئے اس نے رسے کو پکڑ لیا تھا۔ نائلہ اسے ہانپوں میں پکڑے آہستہ آہستہ دوسری طرف سرکاتی رہی اور بالا خر سسی روشن دان سے باہر نکل گئی اور آہستہ آہستہ نیچے سرکنے لگی۔

نائلہ دل ہی دل میں سسی کی خیریت کی دعا مانگنے لگی۔ تقریباً ”دو منٹ بعد روشن دان کی سلاخ سے بندھا ہوا رسہ زور زور سے جلتے لگا۔ نائلہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ سسی نیچے پہنچ گئی تھی۔ نائلہ نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر روشن دان پر چڑھنے لگی۔ صرف تیس سیکنڈ بعد وہ روشن دان سے نکل کر رسہ پکڑے حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ لیکن ٹھیک اسی لمحہ دروازے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر تالا کھلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مردانہ آواز سن کر نائلہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ صوبہ خان کی آواز تھی.... جو چیختے ہوئے محافظ کو جلدی دروازہ کھولنے کو کہہ رہا تھا۔ نائلہ کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ اتنی جلدی واپس کیسے آگیا! ہو سکتا ہے اس کی جھمٹی حس نے اسے خطرے سے آگاہ کر دیا ہو اور وہ راستے ہی سے واپس آگیا ہو! نائلہ نے دروازے کو اندر سے بھی کڑا لگا رکھا تھا جو خاصا مضبوط تھا۔ دروازہ توڑنے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ اور پھر چیخنے کی آواز کے ساتھ ساتھ دروازے پر زور زور سے ٹکریں بھی ماری جانے لگیں۔

نائلہ کا جسم پسینے میں تر ہونے لگا۔ خوف کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں بھی پسینے سے تر ہونے لگیں۔ وہ بڑی تیزی سے نیچے پھسلتی چلی گئی اور پھر دھب سے زمین پر گری۔ سسی نے جلدی سے اسے سنبھال لیا۔

”صوبہ خان واپس آگیا ہے، انہیں ہمارے فرار کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ دروازہ توڑ رہے ہیں۔“ نائلہ نے کہا اور رسے کو پکڑ کر مخصوص انداز میں زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ تیسرے جھٹکے میں وہ سلاخ ٹوٹ گئی جس سے رسا بندھا ہوا تھا۔ رسہ نیچے آن گرا۔ نائلہ نے رسہ وہیں پھینک دیا اور سسی کا ہاتھ پکڑ کر ڈھلان پر دوڑنے لگی اور پھر دفعتاً ”نفا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ فائرنگ روشن دان سے کی جا رہی تھی۔ گولیاں ان کے آس پاس گر رہی تھیں۔ سسی کا پیر پھسل گیا اس کے ساتھ ہی نائلہ بھی گری اور وہ دونوں قلابازیاں کھاتی ہوئی ڈھلان پر لڑھکنے لگیں۔

ڈھلان کے اختتام پر قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ نائلہ نے سسی کا ہاتھ پکڑا اور ان جھاڑیوں میں دوڑتی چلی گئی۔

..... \* \* \* .....

حصہ ۲۰، مح کے لگ بھگ حویلی سے نکلا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنے آدمیوں کو سختی

سے ہدایت کردی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ ان کا انجام بھی دوسرے آدمیوں سے مختلف نہیں ہوگا۔

میں روڑ پر آتے ہی وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ سڑک خالی تھی اس لیے اسے تیز رفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ گھونکی سے ماتیلو زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے اپنے تھانے پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ تھانے میں عملہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

صوبہ خان کے خیال میں وہ کوئی خاص کیس نہیں تھا۔ اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اپنے آشنا کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر کھانسی سے وار کر کے دونوں کو قتل کر دیا تھا اور خود تھانے پیش ہو گیا تھا۔

قاتل بھی تھانے میں موجود تھا اور وہ خون آلود کھانسی بھی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ قاتل کی حالت دیکھ کر صوبہ خان کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس سے ایک ہزار روپیہ بھی نہیں نکلوا یا جاسکتا۔

”لاشیں کہاں ہیں؟“ صوبہ خان نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔  
 ”لاشیں ابھی جائے وقوعہ پر ہی پڑی ہیں۔ آپ معائنہ کر لیں تو انہیں اٹھوا دیا جائے۔“ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے چلو...“ صوبہ خان کرسی سے اٹھ گیا۔  
 لاشیں قاتل کے گھر کے ایک کمرے میں تھیں۔ عورت کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی جبکہ مرد کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دونوں لاشیں نیم برہنہ تھیں۔ دونوں کے جسموں پر کھانسی کے زخموں کے کئی نشان تھے اور خون پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ صوبہ خان نے سب انسپکٹر سے کہا۔ ”لاشیں اٹھوا دو اور جلدی سے تھانے آ جاؤ... مجھے ایک اہم معاملہ درپیش ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں تھانے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“  
 وہ اس مکان سے نکل کر سیدھا تھانے آ گیا۔ سب انسپکٹر تقریباً ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچا تھا۔  
 ”لاشیں ہسپتال بھجوا دی ہیں سر۔ رپورٹ کیا درج کی جائے؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”یہی کہ تھانے کا انچارج انسپکٹر صوبہ خان اپنے چند ماتحتوں کے ساتھ گشت پر تھا۔ ایک آدمی کو مشکوک انداز میں ایک مکان سے نکل کر بھاگتے دیکھا گیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانسی بھی تھی۔ انسپکٹر صوبہ خان اور اس کے ماتحت عملے نے تعاقب کر کے اس شخص کو پکڑ لیا جس سے پوچھ گچھ کے دوران انکشاف ہوا کہ وہ اپنی بدچلن بیوی اور اس کے آشنا کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کرنے کے بعد فرار ہو رہا تھا۔ پولیس نے قتل کو گرفتار کر کے دہرے قتل کا مقدمہ درج کر لیا ہے۔“ انسپکٹر صوبہ خان نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”گشت کرنے والے ماتحت عملے میں اپنا نام بھی ڈال دیتا اور ہاں اس کی ذرا چھترول کرونا، تاکہ اس کو پتہ تو چلے کہ جان کتنی پیاری ہوتی ہے۔“

”یہی سر!“ سب انسپکٹر نے کہتے ہوئے دو کاشیبلوں کو اشارہ کیا۔ وہ قاتل کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئے اور کچھ ہی دیر بعد اس کمرے سے چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

انسپکٹر صوبہ خان کو تقریباً ”ایک گھنٹہ اور تھانے میں بیٹھنا پڑا اور پھر وہ سب انسپکٹر کو کچھ ضروری ہدایات دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔“

”وہ خان جب حویلی کے سامنے پہنچا تو ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اسے ہارن بجانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک گن مین حویلی کے پھانک کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پاجیرو کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دیکھتے ہوئے گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ گاڑی کو اندر لیتا ہوا چلا گیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر دو سرگن مین بیٹھا ہوا تھا۔ ”ہاں بھئی، خیریت؟“ صوبہ خان نے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔ ”انہوں نے کوئی گزبڑ تو نہیں کی؟“

”نہیں سرکار۔“ گن مین نے جواب دیا۔ ”ایک مرتبہ کمرے میں سے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے دروازہ کھولے بغیر باہر سے پوچھا کہ یہ آواز کیسی ہے تو ان میں سے ایک لڑکی نے چیخ کر بتایا کہ چارپائی میں کھٹل ہیں اور وہ چارپائی کو فرش پر بیچ کر کھٹل جھاڑ رہی ہے۔“

”کیا؟“ صوبہ خان کی چھٹی حس نے فوراً ہی خطرے کی گھنٹی بجادی۔ ”چلو، جلدی سے دروازہ کھولو۔ مجھے کسی گزبڑ کا احساس ہو رہا ہے۔“

وہ دونوں اس کمرے کے سامنے آگئے۔ گزبڑ کا نام سن کر گن مین بدحواس سا ہو گیا تھا اور اسی بدحواسی میں اس سے آلا بھی نہیں کھل رہا تھا۔

”جلدی کھولو آلا۔“ صوبہ خان چیخا۔

آلا کھل گیا۔ گن مین نے دروازے کو دھکا دیتا چاہا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دھڑ دھڑایا۔

”دروازہ کھولو نالک۔“ صوبہ خان اونچی آواز میں بولا۔

اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ صوبہ خان نے گن مین کو اشارہ کیا، وہ دروازے پر ٹکریں مارنے لگا۔ چند ٹکریوں کے بعد دروازہ ٹوٹ گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو صوبہ خان کا دل اچھل کر حلق میں اٹ گیا کہ خالی تھا اور سامنے روشن دان کے نیچے دیوار کے ساتھ ایک چارپائی کھڑی تھی اور روشن دان کی سلاخیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ گن مین دوڑتا ہوا چارپائی پر چڑھ گیا اور روشن دان سے باہر جھانکنے لگا۔ حویلی کی دیوار کے ساتھ ڈھلان پر اسے دونوں لڑکیاں بھاگتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے فائر کھول دیا لیکن روشن دان پر اس کے ہاتھ ٹھیک سے نہیں ٹک رہے تھے۔ کوئی بھی گولی نشانے پر نہیں بیٹھ سکی تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں لڑکھڑا کر گریں اور ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی جھاڑیوں میں گھس گئیں۔ گن مین چارپائی سے نیچے اتر آیا۔

”وہ حویلی کے پچھلی طرف جھاڑیوں میں گھس گئی ہیں۔“ اس نے صوبہ خان کو بتایا۔

”اس وقت یہاں کتنے آدمی ہیں؟“ صوبہ خان نے پوچھا۔

”تین...“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں، محراب خان اور حویلی کا چوکیدار مٹھن۔“

”تم تینوں میرے ساتھ آؤ۔“ صوبہ خان چیخا۔

وہ سب لوگ حویلی کے گیٹ کی طرف دوڑے۔ حویلی کے پچھلے حصے کی طرف آنے کے لیے انہیں طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔

”وہ لوگ جھاڑیوں میں زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”محراب خان، تم اس طرف جاؤ... مٹھن، تم اس طرف سے جاؤ اور عبدل تم میرے ساتھ آؤ۔“

صوبہ خان عبدل کو ساتھ لے کر جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ کچھ آگے جانے کے بعد جھاڑیاں منجانب ہو گئی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے چل رہے تھے۔ حویلی میں صرف دو ٹارپیں تھیں جو انہوں نے چلتے ہوئے ساتھ لے لی تھیں۔ ایک ٹارچ محراب خان لے گیا تھا اور دوسری صوبہ خان کے

باکس ہاتھ میں تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ریو الور تھا۔ وہ دونوں ٹارچ کی روشنی میں راستہ بتاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

”سرکار، ذرا احتیاط سے آگے بڑھیں۔ ان جھاڑیوں میں زہریلے سانپ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔“

عبدل نے اپنے آگے کی جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے کہا۔

”سانپوں کی پرواہ مت کرو۔ ہمیں سب سے زیادہ فکر نائلہ درانی کی ہے۔ اگر وہ بچ کر نکل گئی تو ہمارے لیے دنیا کی سب سے زیادہ زہریلی اور خطرناک ناگن ثابت ہوگی۔ جلدی کرو۔ وہ کہیں جھاڑیوں کے اس جنگل میں نکل کر آبادی تک نہ پہنچ جائیں۔“ صوبہ خان نے کہا۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے نہ صرف جھاڑیاں گھبان ہو رہی تھیں بلکہ ان کے پیر بھی کچھڑ میں دھنسنے لگے تھے۔۔۔ آگے کچھڑ اور گہرا ہو رہا تھا اور ان کے لیے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

”وہاں چلیں سرکار۔۔۔ انہیں دوسری طرف سے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ عبدل نے کہا۔

”ہاں چلو۔“ صوبہ خان نے کہا۔

وہ واپس پلٹ گئے۔ ایک جگہ جھاڑیاں ہٹانے کے لیے جیسے ہی عبدل نے ہاتھ آگے بڑھایا اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے عین سامنے والی جھاڑی پر ایک سانپ لٹکا ہوا تھا۔ سانپ نے جھاڑی کی شاخ کو دم کی پلٹ میں لے رکھا تھا اور اس کا پھن پھولا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے دو شاخہ زبان لپک رہی تھی۔ سانپ کا پھن عبدل کے چہرے سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ موت کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر عبدل کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔

صوبہ خان بھی اس سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ اپنا ریو الور والا ہاتھ اٹھا ہی رہا تھا کہ سانپ پھنکار تا ہوا عبدل کی طرف لپکا۔ عبدل نے ایک طرف جھلکنا چاہا مگر سانپ اس کی پیشانی پر ڈس چکا تھا۔ عبدل چیخ کر جھاڑیوں میں گرا۔ صوبہ خان نے سانپ کے پھن پر گولی چلا دی۔ سانپ کے پھن کے پڑنے اڑ گئے۔

صوبہ خان بدحواس ہو کر تیزی سے چلنے لگا۔ جب وہ جھاڑیوں سے باہر نکلا تو اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی اور سانس بھری طرح پھولا ہوا تھا۔

نائلہ درانی اور سسی نے پہلے ایک چیخ اور پھر فار کی آواز سن لی تھی۔ وہ دونوں جھاڑیوں کے زیادہ اندر نہیں گئی تھیں کیونکہ نائلہ جانتی تھی کہ اندرونی حصے میں پانی جمع ہوگا۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو پورے علاقے میں بارش ہوئی تھی۔ وہ کنارے سے تقریباً ”پندرہ بیس فٹ اندر کنارے کے متوازی چلتی رہیں۔ کچھ ہی دیر بعد اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ اس نے سسی کو پکڑ کر روک لیا اور وہ دونوں سانس روک کے بے حس و حرکت ایک جگہ پر بیٹھی رہیں۔

جھاڑیوں کی سرسراہٹ بڑھ رہی تھی۔ کوئی شخص جھاڑیوں میں چلتا ہوا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ ان دونوں نے اپنا سانس تک روک لیا۔ جھاڑیوں میں آنے والا وہ شخص ان کے بالکل سامنے آ کر رک گیا۔

”کہاں غائب ہو گئیں کم بخت۔“ وہ آدمی بڑبڑا رہا تھا۔ ”کم بخت عورتیں ہیں یا بدرواحیں۔ انہیں اس جنگل میں ڈر بھی نہیں لگا۔ اس طرح اندر گھسٹی چلی گئی ہیں جیسے میلہ دیکھنے گئی ہوں۔۔۔“

نائلہ کو اس کے ہاتھ میں کلا مشکوف بھی نظر آئی تھی۔۔۔ وہ شخص اپنی جگہ سے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ نائلہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس شخص نے تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت کی مگر

اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ نائلہ ہوا میں اڑتی ہوئی اس شخص سے ٹکرائی اور اسے ساتھ لیتی ہوئی جھاڑیوں میں گر گئی۔ اس کا دایاں بازو اس شخص کی گردن پر لپٹ چکا تھا۔ نائلہ نے دایاں بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ رکھا اور بائیں ہاتھ سے اس کے سر کو زوردار جھٹکے دینے لگی۔ اس شخص نے جتنا چاہا تھا مگر اس کے زرخے پر نائلہ کے بازو کا دباؤ تھا۔ اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ چوتھے جھٹکے پر کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ اس شخص کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ نائلہ نے کچھ دیر تک اسے دبوچے رکھا اور پھر اسے چھوڑ کر اٹھ گئی اور سسی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے جھاڑیوں میں ایک طرف دوڑنے لگی۔

رائٹل ابھی تک اس شخص کے ہاتھ میں تھی اور انگلی ٹرائیگر پر۔ اس کے جسم میں تشنج پیدا ہوا تو انگلی سے ٹرائیگر دب گیا۔ نائلہ سسی کو لے کر ایک دم نیچے گر گئی۔ گولیاں اس وقت تک چلتی رہیں جب تک رائٹل کا میگزین خالی نہیں ہو گیا۔

پہلے تو نائلہ یہ سمجھی تھی کہ صوبہ خان یا اس کا کوئی اور آدمی اس طرف پہنچ گیا ہے لیکن ان گولیوں کا رخ جھاڑیوں کے اندر کی طرف تھا۔ نائلہ نے مڑ کر اس طرف دیکھا تھا اور پھر اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے سسی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور وہ دونوں تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگیں۔

فائرنگ کی آواز صوبہ خان نے بھی سن لی تھی۔ جس طرف سے فائرنگ کی آواز آئی تھی اس طرف مٹھن گیا تھا۔ وہ جھاڑیوں سے نکل کر کنارے پر اسی طرف دوڑنے لگا۔ ایک جگہ رک کر وہ سرگوشیوں میں مٹھن کو پکارنے لگا۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس جگہ جھاڑیاں اس طرح دبی ہوئی تھیں جیسے کوئی اس طرف سے گزرا ہو۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن چندہر بیس فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ٹھنک کر رک گیا۔ ٹارچ کی روشنی مٹھن پر پڑ رہی تھی جو جھاڑیوں میں آڑا تر چھا پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات جیسے نمودار ہو کر رہ گئے تھے۔ کلا شکوف اس کے ہاتھ میں تھی۔

صوبہ خان نے ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ مٹھن کسی طرح نائلہ درانی کے شنبے میں آگیا تھا اور وہ اس کی گردن مروڑ کر پھینک گئی تھی۔ نائلہ کے بارے میں شبیر درانی نے صوبہ خان کو بتادیا تھا کہ وہ مارشل آرٹس کی ماہر ہے اور یہ فن ایک ایسا ہتھیار ہے جس نے اسے انتہائی خطرناک بنا دیا ہے۔ لیکن صوبہ خان نے اس بات کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب نائلہ کے جوہر آہستہ آہستہ اس کے سامنے کھل رہے تھے.....

سب سے پہلے جب صوبہ خان نے جنگل کے قریب واقع جھوپڑے میں نائلہ کو پکڑنے کی کوشش کی تھی تو نائلہ نے اس پر ہلکا سا وار کیا تھا اور اسے اپنی ہنسی کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ ملوک کی ٹوٹی ہوئی کلائی ایک اور مثال تھی اور پھر حویلی کے روشن دان میں لگی ہوئی لکڑی کی موٹی موٹی سلاخیں... صوبہ خان کو یقین تھا کہ نائلہ نے وہ سلاخیں بھی کسی خاص ٹیکنیک کے تحت توڑی تھیں اور اب وہ مٹھن کی لاش دیکھ چکا تھا۔

صوبہ خان کو صرف ایک ہی فکر تھی۔ نائلہ جھاڑیوں کے اس جنگل سے نکل کر آبادی تک نہ پہنچ جائے۔ اگر وہ آبادی تک پہنچ گئی تو خود اس کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اس نے نائلہ کو سب کچھ بتادیا تھا کہ کس طرح اس نے بھورا کے ذریعے اس کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگر نائلہ زندہ بچ گئی تو وہ خود

زندہ نہیں بچے گا۔ وہ جھاڑیوں سے نکل کر کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ وہ آگے جا کر نالہ کا راستہ روکنا چاہتا تھا لیکن جھاڑیوں کا یہ جنگل بہت وسیع و عریض تھا۔ اسے گھیرے میں لینے کے لیے تو پوری فوج درکار تھی صرف صوبہ خان اور محراب خان کیا کر سکتے تھے۔

نالہ نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن لی تھی۔ وہ اور سسی جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گئیں اور جب دوڑتے ہوئے ان قدموں کی آواز بہت دور نکل گئی تو اس نے ایک رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔  
”مسی!“ وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ”حویلی میں جتنے بھی آدمی تھے وہ اس وقت ہماری تلاش میں جھاڑیوں کے اس جنگل میں بھٹک رہے ہیں اور اس وقت حویلی میں کوئی نہیں ہوگا۔“  
”کیا کتنا چاہتی ہو ادی؟ کیا ہم حویلی میں واپس چلیں؟“ مسی نے پوچھا۔  
”ہاں۔“ نالہ نے مختصر سا جواب دیا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ادی؟“ مسی نے اسے گھورا۔  
”نہیں“ میرا دماغ بالکل درست ہے۔“ نالہ نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ ہماری تلاش میں جھاڑیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ اگر ہم بھی ان جھاڑیوں میں رہے تو پھنس کر رہ جائیں گے۔ حویلی اس وقت خالی ہے اور وہاں صوبہ خان کی پاجیرو بھی موجود ہے۔ اگر ہم کوشش کریں تو اس پاجیرو پر قبضہ کر کے یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”بات تو تم ٹھیک کہتی ہو ادی، مگر اس میں خطرہ ہے۔“ مسی بولی۔

”اور ہمیں یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔“ نالہ نے کہا۔

”تو پھر چلو“ میں تو تمہارے ساتھ ہوں ادی۔“ مسی نے جواب دیا۔

وہ دونوں بڑی احتیاط سے جھاڑیوں کے کنارے کنارے چلنے لگیں۔ حویلی کے گیٹ کی طرف جانے کے لیے ایک لمبا چکر لگانے کی ضرورت تھی۔ وہ قدم بدم آگے بڑھتی رہیں لیکن پھر دفعتاً ”رک گئیں اور بڑی پھرتی سے جھاڑیوں میں دبک گئیں۔

ایک آدمی ان سے تقریباً دس قدم کے فاصلے سے اس طرف نکل گیا جس طرف سے وہ آئی تھیں۔ اس آدمی کے ایک ہاتھ میں ٹارچ بھی اور دوسرے میں کلاشنکوف۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جو رات کو ان کے لیے کھانا لے کر آیا تھا اور یہ یقیناً ”محراب خان تھا۔

محراب خان جب بیس پینیس گز آگے نکل گیا تو وہ دونوں بڑی احتیاط سے جھاڑیوں میں سے نکلیں اور ریچتی ہوئی حویلی کی دیوار کی طرف بڑھنے لگیں۔ گمری تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ دیوار کے قریب رک کر نالہ نے پیچھے دیکھا۔ جھاڑیوں میں دو جگہ ٹارچوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ روشنیاں کافی دور تھیں۔

نالہ نے سسی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں پھر دیوار کے ساتھ ساتھ ریچنے لگیں۔ حویلی کی دیوار کے ساتھ موڑ گھوم کر وہ اٹھ گئیں اور تیزی سے چلنے لگیں۔ اب انہیں جھاڑیوں کی طرف سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ ایک طویل چکر کاٹ کر حویلی کے گیٹ کے سامنے پہنچ گئیں۔ سامنے برآمدے کی بتیاں جل رہی تھیں اور بیڑھیوں کے سامنے صوبہ خان کی پاجیرو بھی کھڑی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر تک گیٹ کے قریب کھڑی کسی قسم کی آہٹ لینے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ حویلی میں ان کا کوئی اور ساتھی بھی موجود ہو۔ لیکن حویلی میں سناٹا طاری تھا۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھنے لگیں۔



حوالی میں واقعی کوئی نہیں تھا۔ وہ دبے قدموں تیز تیز چلتی ہوئی پاجیرو کے قریب پہنچ گئیں۔ پاجیرو کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ نالکہ نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ خوش قسمتی سے چابی بھی انکیشن میں موجود تھی۔ نالکہ نے پہلے سسی کو اندر بٹھایا اور پھر خود راسیونگ سیٹ پر بیٹھ کر بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر کے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے چابی گھمادی۔

پاجیرو کا انجن فوراً ہی بیدار ہو گیا۔ نالکہ نے اسے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا اور اسے گیٹ کی طرف موڑ دیا۔

سائے میں انجن کی ہلکی سی آواز بھی دور تک پھیل گئی تھی اور یہ آواز صوبہ خان نے بھی سن لی تھی۔ ”دھوکا“ اس کے دماغ میں ایک لفظ گونجا اور وہ محراب خان کو پکارتا ہوا جھاڑیوں کے کنارے پر حویلی کی دیوار کی طرف دوڑنے لگا۔ محراب خان بھی جھاڑیوں سے نکل کر حویلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔

پاجیرو کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دیکھ کر صوبہ خان اس راستے کی طرف دوڑا جو جھاڑیوں سے تقریباً ”سو گز“ کے فاصلے پر گھونکی کی طرف چلا گیا تھا۔ پاجیرو اسی طرف آ رہی تھی۔ صوبہ خان پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔

پاجیرو بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ اور پھر پاجیرو جیسے ہی سامنے آئی، صوبہ خان پے در پے ریوالور کا ٹرائیگر دباتا چلا گیا مگر پاجیرو طوفان کی سی رفتار سے نکل گئی اور اس کے ریوالور کی گولیاں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں۔

اسی دوران محراب خان ہانپتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

”نکل گئی!“ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

”ہاں! وہ نکل گئی۔“ صوبہ خان چیخا۔ ”وہ ذلیل عورت صوبہ خان کو دھوکا دے کر نکل گئی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آج تک کوئی شکار صوبہ خان کے چنگل سے بچ کر نہیں نکلا۔ یہ چھو کر کیسے کیسے بچے گی۔“

محراب خان کچھ نہیں بولا۔ وہ خاموش کھڑا صوبہ خان کو دیکھتا رہا جو ان لڑکیوں کے فرار پر پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

...●...●...●...

دلاور حیرت انگیز طور پر رو بصحت ہو رہا تھا۔ یہ دراصل اس کی دل پاور تھی جس نے اسے پانچویں ہی روز چلنے پھرنے کے قابل بنادیا تھا۔ اس کے اس طرح جلد صحت یاب ہونے میں نالکہ درانی کی گمشدگی کا بھی بڑا دخل تھا۔ نالکہ کی سلامتی کا خیال اس کے ذہن پر چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس واقعہ کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ وہ نالکہ درانی کا محافظ تھا لیکن وہ اسے بچا نہیں سکا تھا۔ دارا، روشن اور اس کا کزن بیٹا بھی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ حملہ آور اس کی نظروں کے سامنے گھسٹتے ہوئے نالکہ کو اپنی کار میں لے گئے تھے۔ نالکہ بھی شدید زخمی تھی۔ ہسپتال میں ہوش میں آنے کے بعد بھی سب سے پہلے اس کے ذہن میں نالکہ ہی کا خیال آیا تھا۔

صبح رائے منصور نے اسے یہ خوش خبری تو سنا دی تھی کہ حملہ آوروں میں سے تین آدمی پکڑ لئے گئے تھے۔ ان تینوں کی ٹانگیں زخمی تھیں اور انہوں نے بتایا تھا کہ نالکہ درانی زخمی ہونے کے باوجود ان کے ایک

ساتھی کو قتل کر کے اور چار کو زخمی کر کے ان کی کار لے کر بھاگ نکلی تھی۔ یہ اطلاع پاکر دلاور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ نانکہ واقعی شیرینی تھی۔ اسے قید میں رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ کئی ہفتوں سے دکھ جھیل رہی تھی۔ موت سے بچہ آزمائی کرتی آ رہی تھی اور دلاور کے خیال میں اب تو موت بھی اس کے قریب آتے ہوئے گھبرانے لگی تھی۔

لیکن دلاور، نانکہ کی طرف سے فکر مند تھا۔ پکڑے جانے والے حملہ آوروں کے بیان کے مطابق نانکہ ان کی گاڑی لے کر سندھ کی طرف فرار ہوئی تھی۔ دلاور سندھ کی طرف کبھی نہیں گیا تھا لیکن اس نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ سندھ کے ریگزار بڑے خطرناک ہیں۔ وہاں میلوں دور تک آبادی نہیں تھی۔ پتے ہوئے ان صحراؤں میں سب سے بڑا مسئلہ پانی کا ہوتا ہے۔ کسی صحرا میں راستہ بھگ جانے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دلاور کے ذہن میں طرح طرح کے خدشات سرا بھار رہے تھے۔ نانکہ کی گاڑی کا پیٹرول نہ ختم ہو گیا ہو۔ وہ راستہ نہ بھٹک گئی ہو۔ زخموں سے زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے کہیں بے ہوش نہ ہو گئی ہو۔ صحرا میں بے ہوشی اس کی موت کا باعث بھی بن سکتی تھی۔

صبح سویرے ہی سب انسپکٹر کی نگرانی میں ایک اور سرچ پارٹی روانہ کر دی گئی تھی۔ اس سرچ پارٹی کی واپسی شام سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔ سندھ کی سرحد سے کئی میل پہلے صحرا میں انہیں بھورے کی لاش مل گئی تھی لیکن ملوک نامی اس چوتھے آدمی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جس کی کلائی نانکہ نے توڑ دی تھی اور پھر گاڑی سے اتار کر دو سرے آدمیوں کے ساتھ اسے بھی ٹانگ پر گولی مار دی تھی۔۔۔ پولیس کی یہ سرچ پارٹی گئی تو نانکہ کی تلاش میں تھی لیکن وہ لوگ بھورا کی لاش اٹھا کر لے آئے تھے اور یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ نانکہ صوبائی حد عبور کر کے سندھ میں داخل ہو چکی ہوگی۔ اور وہ علاقہ ان کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔

سندھ کے تمام سرحدی تھانوں کو وائرلیس پر نانکہ درانی کے بارے میں اطلاع دے کر اس کی تلاش کی درخواست کی گئی تھی لیکن تین روز گزر جانے کے باوجود سندھ پولیس سے بھی نانکہ کے بارے میں اطلاع نہیں ملی تھی۔

دلاور کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ نانکہ کے سلسلے میں وہ سندھ پولیس پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ نانکہ نے اسے بتایا تھا کہ حیدر بیگم اور شبیر درانی نے ماتھیلو کے ایک انسپکٹر صوبہ خان کو پانچ لاکھ روپے کی پیشکش کر کے اس کے ذریعے نانکہ کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ تو نانکہ کی قسمت اچھی تھی کہ وہ حویلی سے بھاگ نکلی تھی اور اب قسمت نانکہ کو سندھ کی طرف لے گئی تھی۔ وہ زخمی بھی تھی اور موت صوبہ خان کی صورت میں وہاں بھی گھات لگائے بیٹھی تھی۔ صوبہ خان نہایت خطرناک آدمی تھا۔ اسے وائرلیس کے ذریعے نانکہ کے بارے میں اطلاع مل گئی ہوگی۔ اس نے تمام تھانوں کو یہ ہدایات جاری کر دی ہوں گی کہ نانکہ درانی جیسے ہی ملے اسے اطلاع کر دی جائے۔ جو علاقے اس کی حدود میں نہیں تھے وہاں کے پولیس افسروں سے بھی اپنے تعلقات کی بناء پر اس نے انہیں آمادہ کر لیا ہو گا کہ نانکہ درانی کی بازیابی کی صورت میں اسے مطلع کر دیا جائے۔

دس بارہ روز گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آٹھویں روز دلاور ہسپتال سے زبردستی چھٹی لے کر گھر آگیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ چند روز تک زیادہ چلنے پھرنے کی کوشش نہ کرے۔ رائے منصور کو جب اطلاع ملی تو وہ خود صادق آباد آکر دلاور کو اپنے ساتھ حویلی لے گئے

تھے۔

رائے منصور روزانہ ٹیلی فون پر صادق آباد تھانے سے ٹائلہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے تھے لیکن کوئی حوصلہ افزا اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اب رائے منصور بھی ٹائلہ کے لیے پریشان رہنے لگے تھے۔ دلاور نے صوبہ خان کے بارے میں اپنے خدشات سے آگاہ کیا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ انکسپٹر صوبہ خان کے بارے میں انہوں نے بھی سوچا تھا لیکن یہ بہر حال انہیں اطمینان تھا کہ سندھ کی سرحد کے آس پاس واقع تمام تھانے اس کے کنٹرول میں نہیں تھے۔ وہ میرپور ماٹیلو میں تھا اور ٹائلہ نے جس طرف رخ کیا تھا وہ ماٹیلو سے میلوں دور تھا۔ اور پھر اگر ٹائلہ کہیں دیکھ لی گئی تو اس کی بازیابی کی خبر چھپی نہیں رہ سکے گی۔ لیکن کئی روز گزرنے کے بعد بھی کوئی اطلاع نہیں ملی تو رائے صاحب کی پریشانی بڑھنے لگی۔ وہ ٹائلہ درانی کی گمشدگی کا پندرہواں دن تھا۔ رائے منصور صاحب کھیتوں سے واپس آئے تھے۔ شام کا جھینسا سا ہو رہا تھا۔ حویلی میں آکر انہوں نے منہ ہاتھ دھویا اور بیچلے کے لان میں کرسیاں ڈلو کر بیٹھ گئے۔ نوکر سے چائے کے لیے کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے دلاور کو بھی وہیں بلوایا تھا۔

ابھی وہ لوگ چائے پی رہے تھے کہ نوکر نے کسی مہمان کے آنے کی اطلاع دی۔  
”کون ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”کوئی نوجوان لڑکا ہے سرکار۔“ نوکر نے جواب دیا۔ ”کہتا ہے سندھ سے آیا ہے، بہت ضروری کام ہے۔“

”یہ لو۔ اسے دے کر رخصت کر دو۔ کہتا وہ مصروف ہیں اور....“ رائے منصور نے شاید کچھ رقم نکالنے کے لیے جب میں ہاتھ ڈالا تھا لیکن پھر ان کا ہاتھ رک گیا۔ مدد کے لیے سائل ان کے ہاں آتے رہتے تھے جن میں ایسے بے سروسامان مسافر بھی ہوتے تھے جو ان کا نام سن کر تھوڑی بہت مالی مدد حاصل کرنے کے لیے ان کے ہاں آجاتے تھے لیکن سندھ کے نام سے رائے صاحب کے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ ”ٹھیک ہے۔ بلاؤ اسے۔“ وہ نوکر سے بولے۔

چند منٹ بعد ایک سندھی نوجوان نوکر کے ساتھ حویلی کے گیٹ میں داخل ہوا۔ اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ برس رہی ہوگی۔ ابھی اس نے اپنے چہرے کو ریزر سے متعارف نہیں کرایا تھا۔ ٹھوڑی پر چند بے ترتیب بال تھے۔ بالائی ہونٹ پر بھی روئیں کی طرح بال چمک رہے تھے۔ پیر میں پرانا سا کھسکہ مگرے نیلے رنگ کی شلوار قمیص، مخصوص انداز میں دونوں کندھوں اور کمر پر پڑی ہوئی سیاہ پرنٹ والی اجڑا اور سر پر سندھی ٹوپی۔

اس نوجوان نے جو تالان کے باہری آثار دیا اور ننگے پیر لان میں چلتا ہوا ان کے قریب آکر رک گیا۔ اس نے مخصوص سندھی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ بڑی عاجزی اور انکساری تھی اس کے انداز میں۔

”تم کون ہو بیٹا، کہاں سے آئے ہو؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”میرا نام مول ہے وڈیرہ سائیں۔ میں ساندہ سے آیا ہوں اور مجھے رائے صاحب سے ملنا ہے۔“ نوجوان نے بتایا۔

”میرا نام رائے منصور ہے، کہو کیا کام ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”سائیں! میرے ماموں نے یہ خط دیا ہے اور کہا تھا کہ رائے صاحب کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں نہ

دیا جائے۔“ سندھی نوجوان نے قیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر بڑے احترام سے رائے صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بادشاہ کی خدمت میں کوئی نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس نے یہ خط بڑی حفاظت سے قیص کی اندرونی جیب میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔

رائے صاحب نے وہ خط لے لیا۔ خط پر انہی کا نام تھا اور نالکہ درانی کی تحریر پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”بیٹھو بیٹا... کیا نام بتایا تھا تم نے؟“ انہوں نے کہتے ہوئے سندھی نوجوان کی طرف دیکھا۔

”مول... سائیں۔“ وہ نوجوان کہتے ہوئے گھاس پر بیٹھ گیا۔

”ارے یہاں نہیں، کرسی پر بیٹھو۔“ رائے صاحب بولے۔

”میں آپ کے برابر بیٹھنے کی ہمت نہیں کر سکتا وڈیرہ سائیں۔ یہیں ٹھیک ہوں۔“ مول نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”میں وڈیرہ نہیں ہوں مول بیٹا۔ اور پھر تم تو ہمارے مہمان ہو۔ مہمان کی عزت تو ہمارا فرض بنتا ہے

نا۔ کرسی پر بیٹھو شاباش...“ رائے منصور نے کہا۔

مول بادل خواستہ گھاس سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں بڑی جھجک تھی۔ رائے صاحب نے خط کھولا اور پھر خط پڑھتے ہی اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

”کیا ہوا رائے صاحب؟“ دلاور نے پوچھا۔

”نالکہ کا پتہ چل گیا ہے!“ رائے صاحب بولے۔ ”یہ نوجوان نالکہ کا خط لے کر آیا ہے۔ وہ سندھ کے کسی چھوٹے سے گونڈھ میں مقیم ہے۔ وہ گونڈھ صرف چار جھونپڑیوں پر مشتمل ہے۔ گونڈھ والوں نے نالکہ کی بڑی دیکھ بھال کی ہے اور اب اس کے زخم بھی ٹھیک ہو گئے ہیں۔ یہ سندھی نوجوان ہمیں وہاں لے جائے گا۔“

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ دلاور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”تم نے بتایا تھا کہ ساندہ سے آئے ہو۔“ رائے صاحب نے مول کی طرف دیکھا۔ ”یہ جگہ کہاں ہے؟“

”ماٹھیلو سے واجرو والا اور اس سے آگے ساندہ ہے۔“ مول نے بتایا۔

”اور نالکہ کیسی ہے؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔

”میں اس ادی کو نہیں جانتا سائیں۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔“ مول نے جواب دیا۔ ”یہ ادی

میرے ہامنوں کے گونڈھ میں ہے۔ نیل گاڑی سے پانچ چھ گھنٹے کا راستہ ہے ساندہ سے۔ پرسوں ماما ہمارے گھر

آیا تھا تو اس نے مجھے یہ خط دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ کو لے کر ساتھ آؤں۔“

”میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کچھ کھایا یا پی بھی ہے یا نہیں۔“ رائے

صاحب نے پوچھا۔

”میں نے بازار میں پکڑے کھائے تھے سائیں۔“ مول نے جواب دیا۔

”تم بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ دلاور، تم اس سے باتیں کرو۔ میں آصفہ بیگم کو نالکہ کے بارے میں

بتا دوں اور پھر میرا خیال ہے کہ میں تھوڑی دیر بعد ہی اس نوجوان کے ساتھ نکل چلوں گا۔ نالکہ نجانے کس

حال میں ہوگی؟“

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا رائے صاحب۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”تم۔۔۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں رائے صاحب۔“ دلاور نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”میرے زخم بالکل ٹھیک ہیں اور میں تو اب گھوڑے کی طرح بھاگ سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ رائے صاحب نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس نوجوان کو کچھ کھلا پلا دیں تو پھر چلتے ہیں۔“ رائے صاحب کہتے ہوئے اندر چلے گئے۔

تقریباً ”دس منٹ بعد ایک نوکر اندر سے مول کے لیے چائے اور کھانے پینے کا سامان لے آیا۔ مول جھجکتے ہوئے کھانے لگا۔

”نعم اطمینان سے کھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔ پھر تھوڑی دیر بعد چلتے ہیں۔“ دلاور کہتا ہوا اٹھ کر حویلی کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

مہمان خانے میں اپنے کمرے میں آکر اس نے رانقل اٹھائی اور اسے چیک کرنے لگا۔ اس نے تازہ بھرا ہوا میگزین رانقل میں فٹ کیا۔ ایک فاضل میگزین اس میگزین کے ساتھ ہی ڈوری سے باندھ لیا اور لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے وہ چوڑا ہیٹ بھی کمر پر باندھ لیا جس کی مخصوص طرز کی بنی ہوئی جیبوں میں رانقل کے میگزین بھرے ہوئے تھے۔ پھر اس نے رانقل اٹھا کر کندھے پر لٹکانی اور دوبارہ حویلی میں آگیا۔

کرسی پر بیٹھا ہوا مول کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دلاور نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میز کی طرف دیکھا۔ تمام پلیٹیں خالی ہو چکی تھیں۔ مول سب کچھ کھایا گیا تھا۔ پیچارہ نجانے کب سے بھوکا تھا۔ دلاور نے پورج میں کھڑی ہوئی پاجرو کی طرف دیکھا۔ کرامت پاجرو کو رواں لگی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد رائے صاحب بھی اندر سے آگئے۔ دلاور مول کو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔ وہ دونوں پاجرو کے قریب آگئے۔

مول کو ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھادیا گیا۔ دلاور اور رائے صاحب پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کرامت نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا۔

”پیٹرول پمپ سے فٹکی فل کروالینا اور دو فالتو جیری کین بھی لے لینا۔“ رائے صاحب نے کرامت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بہتر سرکار۔“ کرامت نے پاجرو ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ ”جانا کہاں ہے؟“

”سندھ میں ماتھیلو سے آگے کوئی جگہ ہے ساندہ وہاں جاتا ہے۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔ ”پہلے ماتھیلو جانا ہوگا اس کے بعد راجرو والا اور وہاں سے ساندہ کی طرف۔ یہ نوجوان تمہاری رہنمائی کرتا رہے گا۔“

”ساندہ جانے کے لیے ماتھیلو کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے سرکار۔“ کرامت نے کہا۔ ”اس طرح تو ہمیں بہت طویل چکر کاٹنا پڑے گا۔ کیوں نہ ریگستان والی سڑک سے نکلیں۔ اس طرف سے بہت قریب کا راستہ پڑے گا۔ حملہ آور نائلہ بی بی کو بھی لے کر اسی طرف گئے تھے۔“

”اس راستے کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔

”جی سرکار۔“ کرامت نے جواب دیا۔ ”آپ کے پاس آنے سے پہلے میں ایک دو مرتبہ اس راستے پر

سفر کر چکا ہوں۔ صادق براچ نہر کے پل تک تو کچی سڑک ہے۔ اس سے آگے بھی راستہ زیادہ برا نہیں ہے۔“  
 ”تو ٹھیک ہے، چلو۔“ رائے صاحب نے کہا۔

گاڑی بہتی سے نکل کر احمد پور لاما کے پیٹرول پمپ پر رک گئی۔ کرامت نے ٹشکی فل کرائی اور دو فاضل جیری کین بھی گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھوا لئے اور پمپ مین کو پیٹرول کی پرچی دے کر اسٹیمرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

ہائی وے پر پہنچ کر صادق آباد شہر کی طرف مڑنے کی بجائے کرامت نے گاڑی اسی سڑک پر موڑ دی جو ریگستان کی طرف چلی گئی تھی۔ اس رات حملہ آوروں کی گاڑی بھی نائلہ کو لے کر اسی سڑک پر گئی تھی۔ یہی سڑک ریگستان سے گزرتی ہوئی بھارت کی سرحد تک چلی گئی تھی۔

صادق آباد براچ نہر تک سڑک پختہ تھی اس لیے گاڑی کی رفتار خاصی تیز رہی تھی لیکن اس سے آگے کچی سڑک پر رفتار کم کرنا پڑی۔ شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ہیڈلیمپس کی روشنی میں دور تک ویرانہ ہی دیرانہ نظر آرہا تھا۔ وہ کہیں رکے بغیر سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

چاند نکل آیا تھا۔ مدھم سی چاندنی میں چاروں طرف بگھرا ہوا ویرانہ عجیب سا تاثر دے رہا تھا۔ دلاور بڑی دلچسپ نظروں سے اس ویرانے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی تو ایسے علاقے میں گزری تھی جہاں چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ تاحہ نگاہ لہلہاتی ہوئی فصلیں تھیں۔ زندگی ہی زندگی تھی۔ لیکن یہاں تو میلوں دور تک ویرانہ تھا۔ زندگی کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں کوئی بستیاں ہوں گی بھی تو لوگ کیسے زندگی گزارتے ہوں گے۔

کرامت کو ایک جگہ گاڑی روکنا پڑی۔ ڈیش بورڈ پر فیول میٹر کی سوئی بتا رہی تھی کہ ٹشکی میں پیٹرول ختم ہونے والا تھا۔ وہ ریزرو شروع ہونے سے پہلے ہی اس میں پیٹرول ڈال لینا چاہتا تھا۔ اس نے پچھلے حصے سے ایک جیری کین نکالا اور ڈھکنے کی سیل توڑ کر پائپ کی ٹشکی میں پیٹرول ڈالنے لگا تقریباً ”دس منٹ بعد ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔“

رات اپنے آخری سپر میں تھی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا مول کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑی گہری نظروں سے راستے کو دیکھ رہا تھا۔

”روکو... روکو... موٹر کو روکو...“ ایک مرتبہ وہ اچانک ہی بول پڑا۔

”کیوں... کیا ہوا؟“ کرامت نے رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

”وہ پیچھے سیدھے ہاتھ پر ایک کچا راستہ گزرا ہے نا“ اس کی طرف چلو۔“ مول نے کہا۔

”لیکن وہ راستہ تو ساندہ کی طرف نہیں جاتا اس طرف تو جنگل ہے۔“ کرامت بولا۔

”اس جنگل کے دوسری طرف میرے ماما کا گونڈ ہے۔“ مول نے جواب دیا۔

”تم راستہ بھول تو نہیں رہے۔ ایسا نہ ہو ہم جنگل میں بھٹکتے رہیں۔“ کرامت نے کہا۔

”نہیں سائیں۔“ مول نے پریقین لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا ماما اس جنگل میں لکڑیاں کاٹتا ہے۔ میں

بھی کئی دفعہ ادھر جا چکا ہوں۔“

”ٹھیک ہے کرامت۔“ بچیلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے رائے صاحب نے ان کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں دراصل ساندہ نہیں بلکہ جنگل میں واقع کسی چھوٹے سے گونڈ میں جانا ہے۔ نائلہ اسی گونڈ میں ہے۔ گاڑی اسی راستے پر موڑ لو جس طرف یہ لڑکا کہہ رہا ہے۔“

کرامت نے گاڑی کو ریت پر ایک دائرے کی صورت میں واپس گھمایا اور پھر اسے دائیں طرف والے کچے راستے پر موڑ دیا۔ اس راستے پر کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ راستہ ان جھاڑیوں کے بیچ میں سے گزر رہا تھا۔ ابتدا میں تو یہ جھاڑیاں چھوٹی تھیں لیکن کچھ دور آگے جانے کے بعد باقاعدہ جنگل کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

چاند غروب ہو چکا تھا۔ ان کے سامنے تو گاڑی کے ہیڈلیمپس کی روشنی تھی لیکن دائیں بائیں تاریک اور بھامیں بھامیں کرنا ہوا جنگل تھا۔ جنگل میں یہ راستہ بل کھاتا ہوا اور آڑا تر جھا تھا۔ اس راستے پر تیل گاڑی کے پہلوں کے نشان تو نظر آرہے تھے لیکن کرامت کے خیال میں کوئی اور گاڑی اس طرف سے بھی نہیں گزری ہوگی۔

وہ تقریباً ”دو گھنٹے تک جنگل میں سفر کرتے رہے۔ پھر یہ جنگل خچدر را ہونے لگا اور بالا خروہ جنگل سے باہر آگئے۔ پانچ چھ منٹ مزید سفر کرنے کے بعد جب ہیڈلیمپس کی روشنی میں مخصوص طرز کے بنے ہوئے چند گول جھونپڑے نظر آئے تو مول بے اختیار چیخ اٹھا۔

”یہ... یہ میرے ماما کا گھٹھ ہے۔ موٹر ہمیں روک لو۔“

کرامت نے پاجیرو جھونپڑوں کی طرف موڑ دی۔ تین چار کتوں نے پاجیرو کو گھیر لیا۔ وہ پاجیرو کی طرف لپکتے ہوئے اس قدر زور سے بھونک رہے تھے کہ قبروں میں سوئے ہوئے مردے بھی جاگ گئے ہوں گے۔

پاجیرو رکتے ہی مول دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کیسے کھلے گا۔ اس نے بے بسی سے کرامت کی طرف دیکھا۔ کرامت نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔

مول نے دروازہ کھلتے ہی چلاٹنگ لگا دی۔ کتے بھونکتے ہوئے اس کی طرف لپکے مگر مول نے انہیں ہشکار دیا۔ وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔ کتے اس کی آواز پہچانتے تھے۔ وہ اس کی آواز سننے ہی خاموش ہو گئے۔ ”کون ہے؟ وہیں رک جاؤ... آگے مت آنا۔“ ایک جھونپڑے کی طرف سے آواز سنائی دی۔ آواز اگرچہ بوڑھی تھی مگر اس میں بڑی گونج مگر ج تھی۔

”میں ہوں ماما... مول!“ مول نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ ”وہ دُیرہ سائیں آگئے ہیں جنہیں میں لینے کے لیے گیا تھا۔“

وہ بوڑھا سامنے آگیا۔ وہ سسی کا باپ تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے دتے اور چوڑے پھل والی کلباڑی تھی جو پاجیرو کے ہیڈلیمپس کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ وہ پاجیرو کے قریب آگیا۔ ”آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی رئیس صاحب۔“ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے رائے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا ہوا... کیا نا ٹک...؟“ رائے صاحب دروازہ کھول کر ایک دم نیچے اتر آئے۔ بوڑھے کی بات سن کر ان کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

”آپ آئیں۔ میرے جھونپڑے میں آجائیں۔“ مسی کے باپ نے کہا۔ پھر مول کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مول! اپنی ماما سے کہو دوسرے جھونپڑے میں چلی جائے۔ مہمان آئے ہیں۔“

مول بھاگ کر آگے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھی عورت ایک جھونپڑے سے نکل کر سر پر چادر درست کرتی ہوئی دوسرے جھونپڑے میں چلی گئی۔

”آؤ ڈیرہ سائیں۔ میرے جھونپڑے میں آجاؤ۔“ بوڑھے نے کہا۔  
 دلاور اور رائے منصور اس بوڑھے کے پیچھے جھونپڑے کی طرف بڑھنے لگے۔ دوسرے جھونپڑوں سے  
 تین آدمی نکل کر باہر آگئے تھے۔ کتے ابھی تک دلاور اور رائے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے غرارہے تھے۔  
 ایک آدمی نے کتوں کو مار کر بھاگ دیا۔  
 وہ لوگ جھونپڑے میں آگئے۔ بوڑھا جلدی سے ایک چارپائی پر بچھا ہوا بستر درست کرنے لگا۔ اس  
 رات دو اور آدمی اندر آگئے تھے۔

”بیٹھو... ڈیرہ سائیں بیٹھو۔“ بوڑھے نے کہا۔  
 ”نائلہ کہاں ہے؟ کیسی ہے وہ؟“ رائے منصور نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ دلاور کھڑا رہا تھا۔  
 ”ہم لٹ گئے ڈیرہ سائیں۔“ بوڑھا ایک دم رو دیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں کھڑے  
 ہونے کی سکت نہ رہی ہو۔

”کھل کر بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیا نائلہ زندہ نہیں؟“ رائے منصور نے پوچھا۔ بوڑھے کی باتوں اور اسے اس  
 صبح روتے دیکھ کر ان کا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔  
 ”ہم تو لٹ گئے سرکار۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ وہ ظالم آپ کی بیٹی کے ساتھ میری  
 رات بیتی کو بھی اٹھا کر لے گئے۔“ بوڑھے نے روتے ہوئے بتایا۔  
 ”کیا؟“ رائے منصور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”کون تھے وہ لوگ؟ اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“ رائے منصور  
 نے بوڑھے کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

بوڑھا کچھ دیر تک روتا رہا پھر اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔  
 ”دو دن پہلے میں ساندہ گیا تھا تو نائلہ نے مجھے خط دیا تھا کہ آپ کو اطلاع کر دوں۔ رات میں ساندہ ہی  
 سے رہ گیا تھا۔ کل صبح کچھ لوگ موٹر پر آئے اور نائلہ کے ساتھ میری جوان بیٹی سسی کو بھی اٹھا کر لے گئے۔“  
 ”کسی نے مزاحمت نہیں کی؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”ان کے پاس بھی ایسی رانٹلیں تھیں۔“ بوڑھے نے دلاور کے کندھے پر ہلکی ہوئی رانٹل کی طرف  
 اشارہ کیا۔ ”وہ گولیاں چلا رہے تھے۔ کوئی بھی انہیں نہیں روک سکا۔“  
 ”کون تھے وہ لوگ؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”پتہ نہیں کون تھے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”انہوں نے بولا تھا کہ وہ پولیس والے ہیں اور وہ  
 چھوڑ کر ایک قتل کر کے بھاگی ہوئی ہے۔ ڈھولن!“ وہ اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”تم تو یہاں تھے۔ رئیس کو بتاؤ وہ کون تھے اور سب کچھ کیسے ہوا تھا؟“  
 ڈھولن دو قدم آگے بڑھ آیا۔ وہ درمیانے قد کا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ سیاہ کھٹی داڑھی اور مونچھیں  
 اس طرح لمبی ہوئی تھیں کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔

”وہ تین آدمی تھے سرکار۔ صبح کے وقت آئے تھے۔ ہم تمام مرد اس وقت لکڑیاں کاٹنے کے لیے جنگل  
 کی طرف گئے ہوئے تھے۔ عورتوں کی چیخوں اور گولیوں کی آواز سن کر ہم اس طرف بھاگے آئے تھے لیکن وہ  
 لوگ ہم لوگوں کے پچھنے سے پہلے ہی دونوں چھوڑ کر یوں کو گاڑی میں ڈال کر لے جا چکے تھے... ادی نے بتایا تھا  
 کہ ان میں سے ایک لمبے قد والا آدمی تھا۔ اس کا رنگ بالکل کالا تھا اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس نے  
 بتایا تھا کہ وہ پولیس افسر ہے اور اس چھوڑ کر کو گرفتار کرنے آیا ہے۔“



اس شخص کا حلیہ سن کر رائے منصور چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ حلیہ تو انسپکٹر صوبہ خان پر فٹ آتا تھا مگر یہ علاقہ اس کا نہیں تھا۔ وہ ماحیلو تھانے کا انچارج تھا اور ماحیلو یہاں سے میلوں دور تھا۔ وہ کسی دوسرے علاقے میں کسی کو گرفتار کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ صرف مقامی پولیس ہی کسی کو گرفتار کر سکتی تھی۔

”کیا وہ وردی میں تھے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”نہیں سرکار۔ عورتیں بتاتی ہیں کہ ان میں کسی نے بھی وردی نہیں پہنی تھی اور نہ ہی وہ پولیس کی گاڑی میں تھے۔ ان کے پاس تو ایسی ہی گاڑی تھی جس پر آپ آئے ہیں۔“ ڈھولن نے بتایا۔  
 ”اس لمبے اور کالے آدمی نے اپنا نام بتایا تھا؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”جی سرکار۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ میں ادی سے پوچھ کر آتا ہوں۔“ ڈھولن نے کہا۔  
 ”صوبہ خان نام تو نہیں بتایا تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”جی سرکار۔“ ڈھولن اچھل پڑا۔ ”یہی نام بتایا تھا اس نے۔ آپ جانتے ہیں اسے؟“  
 ”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت کمینہ اور گھٹیا آفیسر ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے۔ ”تم لوگوں نے کسی کو اطلاع نہیں دی؟ پولیس تھانہ... علاقے کا ڈویژن... کسی کو بتایا؟“

”میں کل ساندہ گیا تھا سرکار ڈویژن کے پاس۔“ مہسی کے باپ نے جواب دیا۔  
 ”میں نے ڈویژن کے کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ تھانے لے گیا تھا۔ رپورٹ لکھوائی ہے اس نے۔ لیکن ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔“  
 ”نائلہ تمہاری بیٹی کے ساتھ ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”وہ اپنی جان پر کھیل جائے گی مگر تمہاری بیٹی پر آج نہیں آنے دے گی۔ لیکن یہ بتاؤ نائلہ یہاں کیسے پہنچی تھی؟“

”اس روز میں اور میری بیٹی سسی جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”وہ جنگل میں پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی۔ وہ زخمی تھی۔ اس کی ٹانگ میں دو گولیاں تھیں۔ میں نے چاقو کی نوک سے اس کی ٹانگ سے گولی نکال کر زخموں کو داغ دیا تھا۔ وہ کئی دن یہاں رہی اور ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ زمیندار ہے اور اس کی جائیداد تھیانے کے لیے دشمن اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور وہاں سے بھاگ کر آئی تھی۔ میں آپ کو اطلاع بھجوانے کے لیے اس کا خط لے کر ساندہ گیا تھا۔ دوسرے دن صبح میں نے اپنے بھانجے موہل کو وہ خط دے کر آپ کی طرف بھیج دیا اور خود ادھر آ گیا۔ دوپہر کو یہاں پہنچا تو یہ واقعہ ہو چکا تھا۔ میں کیا کروں ڈویژن سائیں... اپنی بیٹی کو کہاں تلاش کروں؟“ بوڑھا ایک بار پھر رونے لگا۔

”حوصلہ کرو۔“ رائے منصور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں تمہاری بیٹی کو صحیح سلامت واپس لاؤں گا اور اگر خدا نخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں صوبہ خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا... اچھا اب ہم چلتے ہیں...“

”نہیں سائیں! آپ ایسے کس طرح جاسکتے ہیں... میرا مطلب ہے کچھ کھائے پئے بغیر مہمان کو ایسے ہی چلے جانے دینا تو ہماری روایت کے خلاف ہے۔ آپ بیٹھو۔ رات بھر سفر کر کے آئیں ہیں۔ ایک پیالی چائے تو پی لیں سرکار۔“ مہسی کے باپ نے کہا۔

چائے کے لیے انہیں آدھا گھنٹہ مزید رکنا پڑا تھا۔ اس وقت دن نکل آیا تھا۔ جب وہ لوگ چائے پی کر جھونپڑے سے باہر نکلے تو چار جھونپڑوں پر مشتمل اس چھوٹی سی بستی کے چند بچے پاجیو کو گھیرے کھڑے تھے۔

اور کرامت سیٹ پر بیٹھا مٹی کی پالی میں چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس نے رائے منصور وغیرہ کو آتے دیکھ کر چائے کا آخری گھونٹ بھر کر پیالی ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھما دی اور اسٹیمرنگ کے سامنے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

رائے منصور کے ساتھ سسی کا باپ اور گوٹھ کے دوسرے لوگ بھی تھے۔ وہ کچھ دیر تک گاڑی کے قریب کھڑے باتیں کرتے رہے۔ رائے منصور نے سسی کے باپ کو ایک بار پھر تسلی دی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دلاور اس مرتبہ آگے بیٹھا تھا۔

”نانکھہ بی بی کہاں ہے سرکار؟“ کرامت نے رائے منصور کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہ لڑکی تو پتہ نہیں اپنے مقدر میں کیا لے کر آئی ہے؟“ رائے منصور نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”نانکھہ اور اس گوٹھ کے ایک بوڑھے کی جوان لڑکی کو انسپکٹر صوبہ خان اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہاں سے سیدھے ماتھیلو چلو۔ اب ذرا صوبہ خان سے بھی دو دو ہاتھ کر لئے جائیں۔ میں بھی تو ذرا دیکھوں کہ وہ کتنا خطرناک پولیس آفیسر ہے اور اپنی من مانی کیسے کرتا پھر رہا ہے....“

کرامت گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ اس کا رخ اب راجروالا کی طرف تھا۔ وہاں سے وہ سیدھا ماتھیلو کی طرف نکل سکتے تھے۔ راجروالا میں وہ تقریباً ”ایک گھنٹہ رکے تھے۔ انہوں نے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا اور علی الصبح سسی کے باپ کے گھر میں بغیر دودھ کی چائے کا صرف ایک کپ پیا تھا اور اس وقت انہیں بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے پاجیرو روک لی اور بن کھن اور چائے وغیرہ منگوا کر پاجیروی میں بیٹھنا شروع کرنے لگے۔ اس وقت صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ ناشتہ انہوں نے اس حساب سے کیا تھا کہ دوپہر کو کھانا نہ بھی ملتا تو پرواہ نہیں تھی۔

جب وہ ماتھیلو شہر میں داخل ہوئے تو سہ پہر کے چار بجتے والے تھے۔ پولیس اسٹیشن کا راستہ تلاش کرنے میں کرامت کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پاجیرو جب تھانے کے گیٹ کے سامنے رکی تو گیٹ کی ڈیوٹی پر موجود سنتری الرٹ ہو گیا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید کوئی وڈیرہ آیا ہے لیکن رائے منصور کو پاجیرو سے اترتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ ان کا حلیہ مقامی وڈیروں سے بہت مختلف تھا۔ لیکن ظاہر ہے قیمتی پاجیرو میں آنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔

انسپکٹر صوبہ خان تھانے میں موجود نہیں تھا۔ ایک اے ایس آئی نے بتایا کہ وہ ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔ واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ رائے منصور کو بہر حال اس سے ملاقات کرنا تھی اس لیے وہ اے ایس آئی ہی کے کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ دلاور بھی ان کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اے ایس آئی کے پوچھنے پر رائے منصور نے اسے اپنا نام تو بتا دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ بہر حال، انہیں ایک بڑا آدمی سمجھ کر اے ایس آئی نے ان کے لیے چائے منگوا لی تھی۔

یہ رائے منصور کی خوش قسمتی تھی کہ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد ایک پولیس چپ تھانے کے سامنے رکی۔ رائے منصور نے کھڑکی سے باہر دیکھا، چپ سے اترنے والے پولیس آفیسر کو انہوں نے فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ وہ انسپکٹر صوبہ خان تھا۔ جو اس وقت یونیفارم میں تھا۔

انسپکٹر صوبہ خان جب سے اتر کر اندر آیا۔ اس نے اے ایس آئی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک کانٹینیل کو جیب سے چابی نکال کر دی جس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا دفتر کھول دیا۔ اس

کے فوراً ہی بعد اے ایس آئی بھی اٹھ کر انسپکٹر کے کمرے میں چلا گیا تھا۔  
 ”کون ہے یہ؟ پاجیرو کس کی ہے؟ کوئی دؤرہ؟“ انسپکٹر صوبہ خان نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اے ایس آئی کی طرف دیکھا جس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیوٹ جھاڑ دیا تھا۔  
 ”رائے منصور نام بتایا ہے۔ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کچھ نہیں بتایا۔ لیکن باہر کھڑی ہوئی پاجیرو بتا رہی ہے کہ وہ ایک لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔“ اے ایس آئی نے بتایا۔  
 ”میں اپنا تفصیلی تعارف خود ہی کروا دیتا ہوں۔“ رائے منصور نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر صوبہ خان نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ ہونٹوں پر اگرچہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی لیکن دل ہی دل میں شاید وہ کھول کر رہ گیا تھا۔  
 ”میرا نام تو اس آفیسر نے آپ کو بتا ہی دیا ہے۔“ رائے منصور نے بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟“  
 ”نام کچھ جانا پچانا سا لگتا ہے۔“ انسپکٹر صوبہ خان بولا۔ ”لیکن میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ کیا اس سے پہلے ہماری کوئی ملاقات ہو چکی ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔ ”بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ ملے بغیر ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لیتے ہیں۔ مثلاً“ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں اور آپ بھی میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اگر اس کا اعتراف نہ کرنا چاہیں تو دوسری بات ہے۔“  
 ”رائے منصور...“ انسپکٹر صوبہ خان نے زیر لب نام دہرا دیا۔ ”یہ نام جانا پچانا ضرور ہے لیکن اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔“

”اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا ہو گا۔ میں نے کہا تا کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”بہر حال، آدم برسر مطلب، آپ کو صادق آباد پولیس سے وائرلیس پر نائلہ درانی کے بارے میں کوئی اطلاع ضرور ملی ہوگی۔“

”نائلہ درانی۔“ صوبہ خان نے چونک جانے کی اداکاری کی۔ ”اوہ... وہ رحیم یار خان کی زمیندار عورت... جسے چند روز پہلے کچھ غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے۔“

”ہاں، وہی نائلہ درانی۔“ رائے منصور نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔  
 ”جی ہاں۔“ انسپکٹر صوبہ خان نے گہرا سانس بھرا۔ ”ہمیں وائرلیس پر اس کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ ہم اس کی تلاش میں ہیں مگر ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب میں آپ کو بھی پہچان گیا ہوں رائے صاحب... بڑی خوشی ہوئی مجھے آپ سے مل کر آپ نے یہاں تک آنے کی کیسے زحمت کی؟“  
 ”نائلہ درانی ہی کے سلسلے میں آیا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”آپ ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہیں۔ قانون کے محافظ ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی گمشدہ فرد کی بازیابی کے بعد آپ اس تھانے کو اطلاع دینے کے پابند ہیں جس نے آپ سے اس کی تلاش کی درخواست کی تھی۔“  
 ”میں اپنے فرائض کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“ انسپکٹر صوبہ خان کے چہرے پر ناگواراری کے تاثرات پھیل گئے۔

”نائلہ درانی کہاں ہے انسپکٹر؟“ رائے منصور نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”ناٹکہ درانی غنڈوں کے قبضے میں ہوگی۔ ہمیں ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“ انسپکٹر صوبہ خان نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”انسپکٹر صوبہ خان۔“ رائے منصور نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”کل صبح تم ناٹکہ درانی اور سسی نامی ایک بڑی کو یہاں سے میلوں دور جنگل کے قریب واقع ایک بہت چھوٹے سے گوتھ سے اٹھالائے ہو حالانکہ وہ علاقہ تمہارے تھانے کی حدود میں نہیں ہے۔ تمہارا یہ اقدام غیر قانونی ہی نہیں دہشت گردی کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ تم نے گوتھ کی عورتوں کو فائرنگ سے ہراساں کر کے دو نوجوان لڑکیوں کو اغوا کیا ہے اور تم جانتے ہو اس کی کیا سزا ہو سکتی ہے....؟“

”رائے منصور صاحب!“ انسپکٹر صوبہ خان نے کہا۔ ”میں آپ کے نام کا بہت احترام کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھ پر بلا سوچے سمجھے الزامات لگائے چلے جائیں۔“

”میں کوئی الزام نہیں لگا رہا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”یہ ایک ٹھوس اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تم اس گوتھ سے ان دو لڑکیوں کو اغوا کر کے لائے ہو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ناٹکہ درانی اور سسی کہاں ہیں؟“

”رائے صاحب!“ انسپکٹر صوبہ خان کے چہرے کے تاثرات مزید بگڑ گئے۔ ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟“

”جانتا ہوں، تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ رائے صاحب غرائے۔ ”تم ایک بلیک میلر، اسمگلر، قاتل اور ڈاکو ہو۔ مجھے تو افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جنہوں نے تمہارے ناپاک اور گندے جسم پر یہ وردی سجائی تھی۔ کہنے کو تو تم قانون کے محافظ ہو مگر قانون کی آڑ میں تم جو کھیل کھیل رہے ہو وہ سب میرے علم میں ہے۔“

”رائے صاحب!“ انسپکٹر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ ایک پولیس آفیسر کی توہین کر رہے ہیں، اس پر جھوٹے اور بے بنیاد الزامات لگا رہے ہیں۔ لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟“

”میں کوئی ہاری نہیں ہوں جسے تم جیل میں سزا دینے کی دھمکی دو گے یا پولیس مقابلے میں ہلاک کر کے اسے ڈاکو ثابت کرنے کی کوشش کرو گے۔ میں تم جیسے لوگوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے رائے منصور کا صرف نام سنا ہے، لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ کون ہے؟ میں شبیر درانی بھی نہیں جو تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہو جاؤں گا۔ بتاؤ ناٹکہ کہاں ہے؟“

”میں ناٹکہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا رائے صاحب۔“ انسپکٹر صوبہ خان نے جواب دیا۔ اب اس کا غصہ جھاک کی طرح بیٹھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رائے منصور واقعی کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو شخص تھانے میں کھڑے ہو کر اسے دھمکیاں دے رہا ہو وہ معمولی آدمی کیسے ہو سکتا ہے!

”لیکن تم ناٹکہ درانی اور سسی نامی دو سری لڑکی کو اس گوتھ سے اٹھا کر لائے تھے۔“ رائے صاحب نے کہا۔ ”میرے پاس اس کے ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔“

”ہوں۔“ انسپکٹر صوبہ خان نے اسے گھورا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک اسے سلاخوں کے پیچھے بند کر چکا ہوتا۔ مگر رائے منصور جیسے شخص کے ساتھ دھونس دھمکیوں کی نہیں چالاکی سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے کہ ناٹکہ درانی قتل کے ایک کیس میں ملوث ہے؟“

”کیسا قتل؟“ رائے منصور نے اسے گھورا۔

”اس نے ریگستان میں ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔“ صوبہ خان نے بتایا۔

”وہ قتل اس نے اپنی عزت و آبرو اور جان بچانے کے لیے کیا تھا۔“ مقتول ایک ایسا شخص تھا جو اپنے مگرگوں کے ساتھ نالکہ کے ساتھیوں کو قتل کر کے اسے زخمی حالت میں اغوا کر کے لایا تھا۔ وہ لوگ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ نالکہ نے اپنی جان بچانے کے لیے اس بد معاش پر گولی چلائی تھی اور پھر یہ قتل تمہارے قتلے کی حدود میں نہیں ہوا تھا۔ اور جہاں سے تم نے اسے اسلحہ کے زور پر اغوا کیا ہے وہ علاقہ بھی یہاں سے میلوں دور ہے اور تمہارے قتلے کی حدود میں نہیں آتا۔“ رائے صاحب نے کہا۔

”میں نے اسے اغواء نہیں گرفتار کیا تھا۔“ انسپکٹر صوبہ خان بولا۔ ”اور ایک فرض شناس پولیس آفیسر کسی خطرناک مجرم کو کہیں بھی گرفتار کر سکتا ہے۔ وہ نہ تو علاقے کا پابند ہے اور نہ ہی اسے کسی کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”تمہاری فرض شناسی تو میں خوب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔

”آپ حد سے بڑھ رہے ہیں رائے صاحب۔“ انسپکٹر غرایا اپنے ماتحت عملے کی موجودگی میں وہ رائے صاحب کے ہاتھوں مسلسل ذلیل ہو رہا تھا۔

”حد سے نہیں بڑھ رہا، تمہیں آئینہ دکھ رہا ہوں۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ نالکہ کی گاڑی پر حملہ کس نے کروایا تھا اور اسے اغوا کیوں کیا گیا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ نالکہ اور سسی کو میرے حوالے کر دو ورنہ۔۔۔“

”ورنہ آپ کیا کریں گے رائے منصور صاحب؟“ صوبہ خان نے اسے گھورا۔

”تمہارے جسم پر یہ وردی نہیں رہے گی اور تم ساری زندگی جیل میں سڑتے رہو گے۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں! انسپکٹر صوبہ خان کو دھمکی دے رہے ہیں!“

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنے کی ہمت بھی ہے میرے اندر۔“ رائے منصور نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”نالکہ اور سسی کہاں ہیں؟“

”میں اللہ کے بارہے میں کچھ نہیں جانتا۔“ انسپکٹر صوبہ خان نے کہا۔ ”میں انہیں اس گونٹھ سے گرفتار کر کے لا رہا تھا کہ رستے میں ایک جگہ موقع پا کر وہ دونوں فرار ہو گئیں۔ اس وقت میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہوں گی۔۔۔“

”انسپکٹر صوبہ خان!“ رائے منصور نے کہا۔ ”تمہاری بات کا یقین تو وہ کرے جو تمہیں نہیں جانتا۔ لیکن میں۔۔۔ تو تمہاری جڑوں سے بھی واقف ہوں۔ تم وہ شخص ہو جو اپنے محسنوں کو بھی بلیک میل کرنے سے باز نہیں آئے۔ میں تمہیں کل شام تک کی مہلت دے رہا ہوں۔ اگر کل شام کا سورج غروب ہونے سے پہلے تم نے نالکہ درانی اور دوسری لڑکی سسی کو میری حویلی میں نہ پہنچایا تو نہ تو تمہارے جسم پر یہ وردی رہے گی اور نہ ہی تم آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔ یاد رکھنا۔۔۔ کل شام کا سورج غروب ہونے تک کی مہلت ہے تمہارے پاس۔ اور اگر ان دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو نقصان پہنچا تو تم سمجھ سکتے ہو کہ میں کیا کر دوں گا۔“

رائے منصور دفتر سے باہر آگئے۔ برآمدے میں دلاور کھڑا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک

پولیس کا ٹیبیل بھی راقفل سنبھالے کھڑا تھا۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔

”چلو دلاور۔“ رائے صاحب نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کا چہرہ غصے کی شدت سے لال بھوکا ہو رہا تھا۔

دلاور برآمدے میں کھڑا سب کچھ سنتا رہا تھا۔ رائے صاحب کو اس نے پہلی مرتبہ اس طرح چیختے چلاتے سنا تھا۔ وہ کبھی غصے میں نہیں آئے تھے۔ وہ تو بہت نرم لہجے میں بات کرنے کے عادی تھے۔ لیکن آج کی صورت حال سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ ناکلہ کو کس قدر چاہتے تھے۔ دلاور سب کچھ سن چکا تھا اس لیے اس نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تھانے سے باہر نکلتے ہی اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پاجیرو کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ رائے صاحب کے بیٹھنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”صادق آباد واپس چلو کرامت۔“ رائے صاحب نے کہا۔  
انجن اشارت ہوا اور پاجیرو حرکت میں آگئی۔ بازار سے گزرتے ہوئے رائے صاحب نے گاڑی ایک جگہ رکوا لی۔

”گاڑی بند کر کے نیچے آجاؤ۔ وہ سامنے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے۔ ایک ایک کپ چائے پی لیتے ہیں۔“ رائے صاحب نے کہا۔

وہ تینوں پاجیرو سے اتر آئے۔ ریسٹورنٹ صاف ستھرا سا تھا۔ چند سندھی نوجوان بیٹھے چائے کی چٹکیاں لیتے ہوئے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ یہ تینوں بھی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ فوراً ہی ہوٹل کا ملازم موٹی آسامی سمجھ کر ان کے پاس آگیا۔ ظاہر ہے پاجیرو سے اترنے والے اس کے لئے معمولی گاؤں نہیں ہو سکتے تھے۔  
”جی سائیں؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری تینوں کی طرف دیکھا۔  
”چائے لے کر آؤ۔۔۔ مگر بہت اچھی۔“ دلاور نے کہا۔

لڑکا فوراً ہی واپس چلا گیا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد چائے لے کر آیا تھا۔ پیالیاں صاف ستھری تھیں اور چائے بھی واقعی خوش ذائقہ تھی۔ وہ ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ ہوٹل کے سامنے ایک پرانی سی ہونڈا ففسی موٹر سائیکل آکر رکی۔ ایک قدرے بھاری بھر کم آدمی موٹر سائیکل سے اتر ا ہونڈا سے سینڈ پر کھڑا کر کے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ہوٹل میں آگیا۔ اس کا رخ انہی لوگوں کی طرف تھا۔ دلاور ابھی ہوئی نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دلاور نے اسے فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ اس شخص کو وہ تھانے میں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ شخص ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور رائے منصور کے سامنے قدرے جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

”سائیں! اگر آپ کچھ جانتا چاہتے ہیں تو شہر کے باہر جنگی ناکے پر مجھے ملیں۔ میں وہاں آپ کا انتظار کروں گا۔“

وہ شخص فوراً ہی واپس چلا گیا۔ رائے منصور اور دلاور نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اس پر اسرار شخص کی طرف دیکھنے لگے جو موٹر سائیکل اشارت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سینڈ بعد موٹر سائیکل شور مچاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

انہوں نے اطمینان سے چائے ختم کی۔ رائے صاحب نے لڑکے کو بلا کر چائے کے بل کے علاوہ اسے

پانچ روپے ٹپ بھی دیئے اور وہ تینوں ہوٹل سے باہر آکر پاجیرو میں بیٹھ گئے۔ کرامت کو کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شہر سے نکل کر صادق آباد کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے۔

شہر کے بیرونی چنگی ناکے پر وہ پرانی سی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ کرامت نے اس کے قریب ہی پاجیرو روک لی۔ دلاور راٹھل پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ انسپکٹر صوبہ خان کے بارے میں وہ بہت کچھ سن چکا تھا۔ وہ انتہائی کمینہ اور گھٹیا آدمی تھا اور یہ اس کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی ذلت کو آسانی سے بھولنے والا آدمی تو نہیں تھا۔

وہ آدمی چنگی کے دفتر سے نکل کر پاجیرو کے قریب آگیا۔ رائے منصور نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ کھول دیا تھا جبکہ دلاور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا تھا۔

”کیا بات ہے۔ تم کون ہو اور کیا بتانا چاہتے ہو؟“ رائے منصور نے بارعب لمبے میں پوچھا۔  
 ”میرا نام سجاد ہے سائیں۔“ اس شخص نے سندھ کے روایتی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنا تعارف کرایا۔ ”میں تھانے میں حوالدار ہوں۔ انسپکٹر صوبہ خان کے ظلم سے اس شہر کے لوگ اور تھانے کا عملہ بھی بہت تنگ آیا ہوا ہے۔ آپ اس کے خلاف ضرور کچھ کریں سائیں۔“  
 ”بس! یہی بتانا چاہتے تھے؟“ رائے منصور نے اسے گھورا۔

”نہیں سائیں، بات تو کچھ اور ہے۔“ حوالدار سجاد بولا۔  
 ”تو پھر جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ رائے صاحب نے کہا۔  
 ”سائیں! سنا ہے کہ انسپکٹر صوبہ خان کل کسی دور کے گوثھ سے دو چھوڑیوں کو اٹھا کر لایا تھا۔ میں نے ان چھوڑیوں کو نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں اپنی حویلی لے گیا ہو گا اور وہ اب بھی وہاں موجود ہوں گی۔“

”حویلی!“ حوالدار صاحب نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”جی سرکار۔“ حوالدار سجاد نے جواب دیا۔ ”انسپکٹر صوبہ خان نے گھونگی شہر سے دو میل دور ایک پرانی حویلی خرید رکھی ہے جسے وہ محل بنانا چاہتا ہے۔ یہ حویلی اس کی عیاشیوں کا اڈہ ہے اور پرائیویٹ جیل بھی۔ جن لمبھوں کے پڑا روٹوں سے لمبی رقبیں وصول کرنا ہوتی ہیں نا، وہ انہیں اسی حویلی میں اپنا ذاتی قیدی بنا کر رکھتا ہے اور تھانے میں اس کا کوئی اندراج بھی نہیں ہوتا۔ جب وہ کسی چھوڑی کو اٹھا کر لاتا ہے تو اسے بھی اسی حویلی میں پہنچا دیا جاتا ہے اور وہ عیاشی کے لیے بعض وڈیروں کو بھی حویلی میں بلا لیتا ہے۔“

”وہ حویلی کہاں ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”گھونگی شہر سے دو میل دور مشرق کی طرف۔ شہر کے پہلے موڑ سے بھی ایک راستہ سیدھا حویلی کی طرف جاتا ہے۔ حویلی کے آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے۔“ سجاد نے بتایا۔  
 ”یہ انسپکٹر صوبہ خان کی کوئی چال تو نہیں ہے۔“ رائے منصور نے اسے گھورا۔

”نہیں سرکار! اللہ کو جان دینی ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں آپ جیسا کوئی زوردار آدمی آئے اور صوبہ خان کو مزا چکھادے۔ وہ بہت ظالم آدمی ہے۔ وہ فرعون ہے اپنے آپ کو بادشاہ کہتا ہے اس علاقے کا۔ پورے علاقے کو اپنے باپ کی جاگیر اور عوام کو اپنی رعایا سمجھتا ہے۔“ حوالدار سجاد نے کہا۔  
 ”مگر یہ سب کچھ غلط نکلا تو؟ میرا مطلب ہے حویلی والی بات غلط نکلی تو؟“ رائے منصور نے کہا۔

”یہ میرا کارڈ ہے سائیں، آپ اپنی تسلی کر لیں۔“ سجاد نے اپنا پولیس کا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ بہر حال، تمہارا بہت شکریہ۔“  
 رائے منصور نے کہتے ہوئے کرامت کو اشارہ کیا۔

پاچرو حرکت میں آکر صادق آباد کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔  
 کرامت نے ہیڈلیمپس روشن کر لئے تھے۔ تقریباً ”دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رائے صاحب نے  
 کرامت کو پاچرو واپس موڑنے کو کہا۔

”گھونٹنی چلو... ہم اس حویلی کو ضرور چیک کریں گے۔“ رائے صاحب نے کہا۔

کرامت نے رفتار کم کر دی۔ سامنے سے ایک ٹرک آرہا تھا۔ ٹرک کے گزرتے ہی اس نے پوٹن لیا  
 اور پاچرو کو واپس ماتھیلو کی طرف دوڑا دیا۔ مگر اس مرتبہ شہر کی طرف مڑنے کے بجائے وہ پاچرو کو ہائی وے پر  
 سیدھا لیتا چلا گیا۔

گھونٹنی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ شہر کی جگہ گاتی ہوئی روشنیاں دور ہی سے نظر آنے لگی تھیں۔ کرامت  
 نے پاچرو کی رفتار کم ہی رکھی تھی۔ شہر کے بیرونی چنگی ناکہ سے ذرا پہلے ایک کچی سڑک مشرق کی طرف مڑتی  
 ہوئی نظر آئی۔ کرامت نے پاچرو اسی طرف گھما دی۔

گہری تاریکی تھی۔ پاچرو کے ہیڈلیمپس کی روشنی میں دور دور تک ریت ہی ریت نظر آرہی تھی۔  
 چھوٹے چھوٹے ریت کے ٹیلے تھے اور وہ کچا راستہ ان ٹیلوں کے درمیان مل کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ کئی جگہ وہ  
 راستہ بھی ریت میں چھپ گیا تھا اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ صحیح راستے پر جا بھی رہے ہیں یا نہیں۔

وہ ٹھیک راستے پر جا رہے تھے کیونکہ... کچھ ہی دیر بعد تاریکی میں ایک بہت وسیع و عریض عمارت کا پہولہ  
 سامنے نظر آنے لگا۔ لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا قلعہ ویرانے میں کھڑا ہو۔ راستے کے دائیں طرف ٹیلوں کی بجائے  
 اب جھاڑیوں کا جنگل سا تھا۔ جو اس عمارت کی پشت تک چلا گیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ وہی حویلی ہے جس کے بارے میں حوالدار سجاد نے بتایا تھا۔“ رائے منصور نے  
 سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

۱۸

”جی ہاں، یہی لگتی ہے۔“ کرامت نے جواب دیا۔

جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا حویلی کا پہولہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ راستہ حویلی کے  
 بائیں پہلو سے ہوتا ہوا گیٹ کی طرف گیا تھا۔ کرامت نے موڑ گھومنے سے پہلے ہی پاچرو کے ہیڈلیمپس اور  
 دیگر تمام بتیاں بجھا دیں۔

پاچرو حویلی کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ دلاور اور رائے منصور نیچے اتر آئے۔ کرامت نے دور ہی  
 سے گاڑی کے ہیڈلیمپس بجھانے کی جو زحمت کی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ حویلی میں اگر کوئی موجود ہو تو  
 روشنی دیکھ کر ہوشیار نہ ہو جائے۔ مگر کرامت کی یہ احتیاط بے کار ثابت ہوئی۔ یہ بات اس کے ذہن میں  
 نہیں آئی تھی کہ سائے میں گاڑی کے انجن کی آواز بھی دور تک سنی جاسکتی تھی۔

پاچرو جیسے ہی گیٹ کے سامنے رکی سب سے پہلے دلاور نیچے اتر آتا تھا۔ اس نے گیٹ کی جھری میں سے  
 جھانک کر دیکھا۔ سامنے خاصے فاصلے پر حویلی کے برآمدے میں بلب جل رہا تھا اور ایک آدمی کلا شکوف  
 را نقل کندھے پر لٹکائے برآمدے سے نکل کر گیٹ کی طرف آرہا تھا۔ اس سے دلاور کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں  
 لگی کہ یہاں گاڑیوں کی آمد و رفت کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس نے مرکز کرامت کو اشارہ کیا۔



کرامت نے پاچرو کے میڈلیمبس آن کر کے فوراً ہی بجا دیئے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ آنے والے دوست ہیں۔

دلاور نے رائے صاحب کو اشارہ کیا۔ وہ گیٹ سے ایک طرف ہٹ گئے۔ دلاور دونوں ہاتھوں میں رانقل سنبال کر گیٹ کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ تقریباً ”دو منٹ بعد گیٹ کھلا اور ایک آدمی سامنے آگیا۔ وہ محراب خان تھا“ کلا شکوف اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی اور چہرے پر کسی قدر اطمینان تھا۔ وہ غالباً یہی سمجھا تھا کہ صوبہ خان واپس آیا ہو گا۔

محراب خان نے جیسے ہی دروازہ کھولا دلاور نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنی رانقل کی زد پر میں لے لیا۔

”تمہارے منہ سے کوئی آواز نہ نکلے۔“ دلاور غرایا۔ ”رانقل کندھے سے اتار کر نیچے پھینک دو۔۔۔ جلدی کر۔۔۔“

”کک... کون ہو تم لوگ؟“ محراب خان ہکا گیا۔

”میں نے جو کہا ہے وہ کرو۔“ دلاور غرایا۔

محراب خان نے کلا شکوف کندھے سے اتار کر دلاور کے سامنے پھینک دی۔ دلاور نے کلا شکوف اتار کر رائے صاحب کے حوالے کر دی۔

”اس حویلی میں کتنے آدمی ہیں؟“ دلاور نے محراب خان سے پوچھا۔

”کک... کوئی نہیں... میں اکیلا ہوں۔“ محراب خان نے جواب دیا۔

”وہ... وہ لڑکیاں کہاں ہیں جنہیں صوبہ خان یہاں لے کر آیا تھا۔“ دلاور نے پوچھا۔

”وہ بھاگ گئیں۔ کل رات کمرے کے روشن دان سے نکل کر بھاگ گئیں اور صوبہ خان کی پاچرو بھی لے گئیں۔“ محراب خان نے جواب دیا۔

”اندر چلو... لیکن اگر کوئی دھوکا ہوا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ دلاور نے رانقل سے اشارہ کیا۔ اور پھر کرامت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کرامت! تم یہیں رکو اور ہوشیار رہنا۔ اگر کوئی اس طرف آئے تو اسے اڑا دینا گولی ہے۔“

”بہتر ہے۔ اس طرف سے تو آپ مطمئن رہیں۔“ کرامت کہتے ہوئے گاڑی سے اتر آیا اور اس نے قیص کے نیچے چھپا ہوا ہتھول بھی نکال لیا تھا۔

”چلو... آگے بڑھو۔“ دلاور نے محراب خان کو رانقل سے اشارہ کیا۔

وہ حویلی کے برآمدے کی طرف چلے گئے۔ رائے صاحب بھی کلا شکوف سنبھالے محتاط انداز میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

وہ لوگ برآمدے میں پہنچ گئے۔ پرانی طرز کی حویلی تھی۔ طویل برآمدہ تھا۔ دائیں طرف ایک اور دو منزلہ عمارت تھی جو اس طرح لی ہوئی تھی کہ انگریزی کے حرف ایل کی شیب بن گئی تھی۔

”ہمیں اس کمرے میں لے چلو جہاں سے بقول تمہارے وہ لڑکیاں روشن دان سے فرار ہوئی تھیں۔“ دلاور نے کہا۔

”وہ کمرہ اس طرف ہے۔“ محراب خان کہتے ہوئے آگے چل دیا۔

وہ چوتھے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ محراب خان اندر داخل ہو گیا۔ دلاور اور

رائے صاحب بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں پہنچ گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی دلاور کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ایک چارپائی پر دو بستر ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے اور دوسری چارپائی سانے والی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس دیوار میں روشن دان تھا جس میں لگی ہوئی لکڑی کی سلاخیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ دلاور نے رائے صاحب کو اشارہ کیا اور خود چارپائی پر چڑھ کر روشن دان سے باہر جھانکنے لگا۔ باہر کی زمین بیس بائیس فٹ نیچے تھی۔ دیوار کے ساتھ ریلی ڈھلان سی تھی اور اس سے آگے جھاڑیوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ روشن دان اتنا کشادہ تھا کہ ایک صحت مند آدمی بھی آسانی سے اس میں سے گزر سکتا تھا۔ لیکن اسے حیرت تھی کہ اتنی بلندی سے چھلانگ لگا کر نالکھ یا سی سلامت کیسے رہی ہوں گی۔ وہ چارپائی سے نیچے اتر آیا۔

”تم جھوٹ بکتے ہو وہ لڑکیاں اس روشن دان سے فرار ہوئی تھیں۔ وہ اتنی بلندی سے چھلانگ کیسے لگا سکتی ہیں؟“ دلاور نے محراب خان کو گھورا۔

”میں سچ کہتا ہوں۔ وہ اسی طرف سے بھاگی تھیں۔“ محراب خان نے جواب دیا۔ ”انہوں نے بستر کی چادریں پھاڑ کر رسی بنائی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے یہ سلاخیں کیسے توڑیں اور پھر وہ ایک سلاخ سے رسی باندھ کر اس کے ذریعے باہر اتر گئی تھیں۔“

”لیکن یہاں تو کوئی رسی بندھی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔“ دلاور نے اسے گھورا۔

”نیچے اترنے کے بعد انہوں نے رسی کو جھٹکے دیئے تھے جس سے وہ سلاخ بھی ٹوٹ گئی تھی جس کے ساتھ رسی بندھی ہوئی تھی۔ وہ رسی اب بھی باہر دیوار کے ساتھ پڑی ہے۔ تم لوگ چاہو تو باہر جا کر دیکھ سکتے ہو۔“ محراب خان نے جواب دیا۔

”یہ حویلی کس کی ملکیت ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”انسپکٹر صوبہ خان کی۔“ محراب خان نے جواب دیا۔

”دیکھا رائے صاحب!“ دلاور نے رائے صاحب کی طرف دیکھا۔ ”ایک معمولی سا پولیس انسپکٹر اور یہ حویلی... نوابی ٹھاٹھ ہیں۔“

”صوبہ خان پولیس انسپکٹر نہیں اسمگلر اور ڈاکو ہے۔ اس جیسے آدمی کے نیچے یہ حویلی بہت معمولی چیز ہے۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔

”سنا ہے صوبہ خان اس حویلی کو ذاتی جیل کے طور پر استعمال کرتا ہے اور عیاہی کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔“ دلاور نے محراب خان کو گھورا۔

”میں تو معمولی نوکر ہوں سرکار... مجھے تو...“

”تمہاری آنکھیں اور کان بند ہیں کیا؟ تمہیں کچھ سنائی نہیں دیتا یا نظر نہیں آتا کہ یہاں کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔“ دلاور نے اسے زوردار ٹھوکر ماری۔ ”یہ صرف یہ جانتے ہو کہ اپنے مالک کے اشارے پر بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارتے رہو۔ بتاؤ اب تک یہاں کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے اور کتنی معصوم لڑکیوں کی عزت لوٹی گئی ہے؟“

”میں کچھ نہیں جانتا سرکار۔“ محراب خان بولا۔ ”یہاں تو بڑے بڑے وڈیرے بھی آتے ہیں۔ وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”تو کیا تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔“ دلاور غرایا۔ ”بتاؤ یہاں اس وقت کوئی قید،

”بھی ہے یا نہیں؟“

”نہیں، یہاں اس وقت کوئی قیدی نہیں ہے۔“ محراب خان نے جواب دیا۔

”قیدیوں کو کہاں رکھا جاتا ہے۔“ دلاور نے پوچھا۔

”حویلی کے دوسرے حصے میں۔“ محراب خان بولا۔

”چلو... ہمیں وہ کمرے دکھاؤ۔“ دلاور نے رانقل سے اشارہ کیا۔

وہ لوگ اس کمرے سے نکل کر طویل برآمدے میں چلتے ہوئے عمارت کے اس حصے میں آگئے جو دائیں طرف واقع تھا۔ وہ مختلف کمروں میں جھانکتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ بعض کمروں میں بے حد تعفن تھا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی جتی جلائی گئی دلاور اور رائے صاحب اچھل پڑے۔ کمرے میں سامنے والی دیوار کے قریب ایک انسانی ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ شخص دیوار سے ٹیک لگائے لگائے بیٹھا مر گیا ہو۔

”یہ کون تھا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”یہ ماتھیلو کے ایک ہندو سیٹھ کا آدمی تھا جس نے جنگ فیکٹری میں کام کرنے والی ایک عورت کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔ یہ آدمی ہندو سیٹھ کا رشتے دار بھی تھا۔ انسپٹر صوبہ خان نے اس کی رہائی کے لیے پانچ لاکھ روپے مانگے تھے اور اسے لاکر یہاں بند کر دیا تھا۔ ہندو سیٹھ نے اتنی بڑی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ یہ آدمی اسی کمرے میں مر گیا۔ ان دنوں یہ حویلی دس پندرہ دنوں کے لیے بند رہی تھی۔ اسے جیسے سب لوگ بھول گئے تھے۔ اس کے بعد یہ کمرہ نہیں کھولا گیا تھا۔ آج پہلی مرتبہ یہ کمرہ کھلا ہے۔“ محراب خان نے بتایا۔

”اور کتنے آدمی یہاں اس کے ظلم کا شکار ہوئے ہیں؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔

”بہت سے لوگ۔“ محراب خان نے جواب دیا۔ ”جن قیدیوں کے رشتہ دار پیسے دے دیتے تھے انہیں چھوڑ دیا جاتا تھا اور جن سے پیسے نہیں ملتے تھے انہیں مار کر لائیش حویلی کے پیچھے بھاڑیوں کے دلدل میں پھینک دی جاتی تھیں۔“

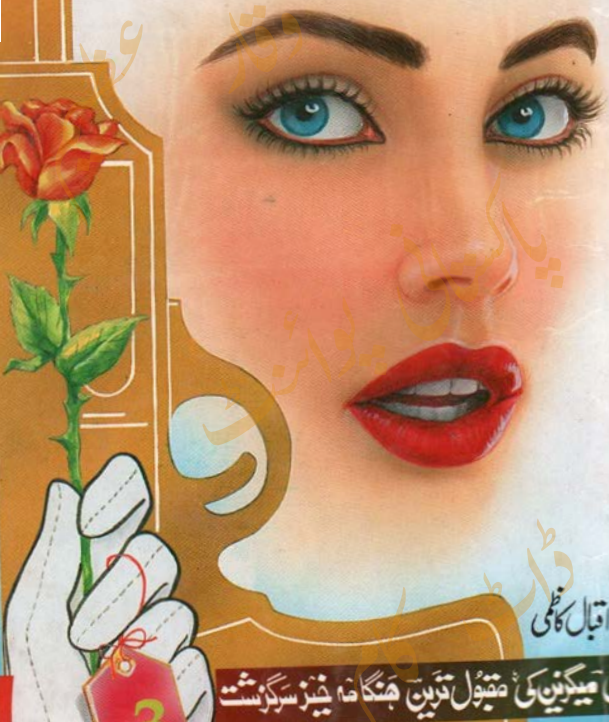
”لیکن... تم لوگوں کی لاشیں اسی کمرے میں رہیں گی۔“ دروازے کی طرف سے ایک آواز سن کر وہ اچھل پڑے۔ وہ ملوک تھا۔ جس کا ایک ہاتھ گلے میں پڑی ہوئی بیٹی میں لٹکا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ”ایک دن تم لوگ بھی یہاں پڑے پڑے اسی طرح ڈھانچے میں تبدیل ہو جاؤ گے... رانقل پھینک دو دلاور... بڑی باتیں کی ہیں تمہارے بارے میں، مگر مجھے حیرت ہے کہ اس روز کار پر حملے کے دوران تم بچ کیے گئے؟ اور رائے صاحب آپ بھی رانقل پھینک دیں۔ یہ آپ کی جاگیر نہیں، صوبہ خان کی عمل داری ہے۔“

## دشت جنوں

مظلوم اور معصوم دو شیرہ ناکہ درانی کی لہو رنگ  
داستان کا دوسرا حصہ ختم ہوا مزید ہنگامہ خیز  
واقعات کے لئے دشت جنوں کی جلد نمبر  
3 ملاحظہ فرمائیں

مظلوم دوشیزہ کی ہنگامہ خیز داستان

# دلشمت جہول



اقبال کاظمی

ہی میکرین کی مقبول ترین ہنگامہ خیز سرگزشت

# 3

## دشت جنوں

### اقبال کاظمی

”اوہ!“ دلاور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم ملوک ہو۔ جس کی کلائی نالکھ نے توڑ دی تھی۔ اور تم اس بازو کو اب بھی گلے میں لکائے ہوئے پھر رہے ہو۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ ملوک غرایا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ نالکھ درانی کو جس روز یہاں لایا گیا میں اس روز یہاں نہیں تھا۔ اگر میں یہاں ہوتا تو اس کتیا کو بتا دیتا کہ ملوک پر ہاتھ اٹھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ رانفلز پھینک دو۔“

دلاور نے رانفلز کو اس طرح حرکت دی جیسے وہ اسے پھینکنا چاہتا ہو۔ لیکن اس نے بالکل اچانک ہی رانفلز کا ٹرانسگر دبا دیا۔ گولیاں ملوک کے پیروں کے قریب فرش پر لگیں۔ اس کے ساتھ ہی دلاور نے اچھل کر محراب خان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے بایاں بازو محراب خان کی گردن میں پلٹ دیا اور اسے ڈھال کی طرح اپنے سامنے کر دیا۔

اس اچانک تبدیل ہونے والی صورت حال نے ملوک کو بدحواس کر دیا۔ اس نے پستول کا ٹرانسگر دبا دیا۔ گولی محراب خان کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ اس کے سینے سے خون کا فوراً بہہ نکلا۔ ملوک دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے باہر کی طرف جھلانگ لگادی۔

دلاور نے محراب خان کی لاش کو دھکا دے کر پھینک دیا۔

”رائے صاحب ہوشیار! حویلی میں کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔“ دلاور چیخا ہوا باہر بھاگا۔

ملوک بائیں طرف کی راہداری میں مڑا تھا۔ اس نے دیوار کی آڑ لے کر دلاور پر گولی چلا دی۔ دلاور بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رانفلز کا ٹرانسگر دبا دیا۔ حویلی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ دلاور اٹھ کر دوسری راہداری کی طرف دوڑا۔

ملوک عمارت کے پچھلی طرف نکل چکا تھا۔ دلاور بھی باہر آگیا۔ اس طرف عمارت سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر حویلی کی فیصل نما دیوار تھی۔ اوپر جانے کے لیے دیوار کے ساتھ میڑھی بھی بنی ہوئی تھی۔ ملوک اسی میڑھی کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ تاریکی میں اس کا ہیولہ دوڑتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔



دلاور بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ ملوک میڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ تیسری یا چوتھی میڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر گولی چلا دی۔ دلاور ایک دم زمین پر گر گیا۔ گولی اس سے دو فٹ کے فاصلے پر ریت میں بیوست ہو گئی۔

ملوک دیوار پر پہنچ چکا تھا۔ دلاور نے نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی ملوک کی ٹانگ میں لگی اور وہ چیختا ہوا میڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے گرنے لگا۔ دلاور دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ملوک سب سے نیچے والی میڑھی پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر والی میڑھی پر تھیں۔ اس کی ایک ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ دلاور نے اسے رانفل کی زد پر لے رکھا تھا۔

”مجھے معلوم ہے تم زندہ ہو۔ تم جیسے بے ضمیر اور بے غیرت لوگ اس طرح آسانی سے نہیں مرا کرتے۔ اب شرافت سے اٹھ جاؤ۔“ دلاور نے اس کی کھوپڑی پر تھوکر ماری۔

ملوک کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ لڑھک کر آخری میڑھی سے بھی نیچے اتر گیا اور کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میڑھیوں پر لڑھکنے کی وجہ سے اس کا پتول بھی کہیں گر گیا تھا۔ دلاور نے اس کا مضروب ہاتھ پکڑا اور اسے عمارت کی طرف گھینے لگا۔

ملوک بری طرح چیخ رہا تھا مگر دلاور نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ اسے گھسیٹتا رہا۔ رائے منصور بھی چیخوں کی آواز سن کر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

”حویلی میں اور کوئی نہیں۔ میں نے تمام کمرے چیک کر لئے ہیں لیکن....“

”لیکن کیا رائے صاحب؟“ دلاور نے پوچھا۔

”دو کمروں میں ایسا سامان موجود ہے جو اذیت دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ حویلی انسپکٹر صوبہ خان کا عشرت کدہ ہی نہیں پرائیویٹ جیل اور عتوبت گاہ بھی ہے۔ وہ یہاں لائے جانے والے لوگوں پر بے پناہ تشدد کیا کرتا تھا۔ ان دونوں کمروں کا فرش اور دیواریں خون کے چھینٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ وہ انسان نہیں بھینٹا ہے۔ ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اب اس شخص کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہونی چاہئے۔ اسے گاڑی میں ڈالو اور گھونگی لے چلو۔ میں آج ہی اس حویلی کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”گھونگی کیوں جناب۔“ دلاور نے کہا۔ ”کیوں نہ اسے صادق آباد لے چلیں۔“

”نہیں۔ اس نے حویلی میں اپنے ایک ساتھی کو قتل کیا ہے۔ یہ حویلی گھونگی تھانے کی حدود میں ہے۔ اسے مقامی پولیس کے حوالے کیا جائے گا اور پھر صادق آباد پولیس کو بھی اس کی گرفتاری کی اطلاع کردی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے، چلے۔“ دلاور نے کہا اور ملوک کو ایک بار پھر مضروب کلائی سے پکڑ کر حویلی کے گیٹ کی طرف گھینے لگا۔

”مم... میرا بازو چھوڑ دو... مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ ملوک چیخا۔

”تکلیف ہو رہی ہے نا؟“ دلاور نے اس کا مضروب بازو چھوڑ دیا۔ ”جب تم دوسروں سے تشدد اور بربریت کا مظاہرہ کرتے ہو تو اس وقت تو تمہیں ان کی چیخیں سن کر بڑا مزہ آتا ہوگا۔ اب تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے بڑا مزہ آ رہا ہے۔ اپنی تکلیف سے ہمیں بھی تو تھوڑا مزہ لینے دو نا۔“ دلاور نے اس کا دوسرا بازو پکڑ لیا اور اس کا بازو سیدھا کر کے اس کی کہنی والے حصے کو اس زور سے اپنے گھٹنے پر مارا کہ چیخ کی آواز سے کہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ملوک بری طرح زمین پر تر پنے لگا۔ اس کی چیخیں رات کے سنائے میں دور تک گونج

B/25

رہی تھیں۔

”پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے میں تمہیں اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ آئندہ تمہارے ہاتھوں سے کسی بے گناہ کو تکلیف پہنچ سکے۔ اب تمہارے یہ ہاتھ بھیک مانگنے کے لیے تو اٹھ سکتے ہیں کسی معصوم اور بے گناہ کو مارنے کے لیے نہیں۔“ دلاور نے کہا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ وہ اسے ٹھوکریں مارتا ہوا گیٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔

کرامت پستول سنبھالے گیٹ کے قریب گھات لگائے بیٹھا تھا۔ انہیں آگے آتے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آیا اور پھر وہ دونوں ملوک کو گھسیٹتے ہوئے پاجیرو تک لے آئے۔ زخمی ٹانگ اور دونوں ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہونے کی وجہ سے ملوک کے لیے پاجیرو پر سوار ہونا ممکن نہیں تھا۔ کرامت اور دلاور نے اسے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔ دلاور، ملوک کے ساتھ بیٹھ گیا اور رائے منصور اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کرامت نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”گھوٹکی چلو... میرا خیال ہے یہ راستہ مناسب رہے گا۔“ رائے صاحب نے حویلی کے بائیں طرف والے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

کرامت نے انجن اشارت کر کے گاڑی اسی راستے پر ڈال دی۔ یہ راستہ حویلی کے عقب میں بھاڑیوں کے جنگل کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ شہر کا فاصلہ وہاں سے دو میل کے لگ بھگ تھا۔ انہیں شہر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

ابھی ساڑھے نو بجے تھے۔ بازار میں رونق تھی۔ لوگوں نے ان کی طرف دیکھا تھا مگر زیادہ تعجب کا اظہار اس لیے نہیں کیا تھا کہ بڑے بڑے دھڑیرے شہر میں آتے ہی رہتے تھے اور ان کے ساتھ گن مین بھی ہوتے تھے۔ کرامت نے دو جگہ گاڑی روک کر تھانے کا راستہ پوچھا تھا اور پھر اسے تھانے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

تھانے کے سامنے پاجیرو رک گئی۔ پہلے رائے صاحب نیچے اترے۔ انہوں نے اپنی کلاشکوف پہلے تو سیٹ کے سامنے فٹ میٹ پر رکھ دی پھر کچھ سوچ کر کلاشکوف اٹھالی اور دلاور کی طرف دیکھنے لگے جو پچھلا دروازہ کھول کر نیچے اتر رہا تھا۔ اس نے راتقل کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور دونوں ہاتھوں سے ملوک کو گھسیٹ کر نیچے اتار رہا تھا۔

تھانے کے گیٹ پر کوئی سنتری نہیں تھا۔ دلاور، رائے صاحب کے پیچھے ہی ملوک کو گھسیٹتا ہوا اندر آگیا۔ اچانک ہی تین چار پولیس والوں نے انہیں گھیر لیا۔

”آپ لوگ کون ہیں اور یہ کون ہے؟“ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے باری باری ان کی طرف دیکھا پھر ملوک کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ شخص قاتل ہے۔ تمہیں دار صاحب موجود ہیں؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔

”جی صاحب! صوبے دار صاحب بیٹھا ہے۔“ حوالدار نے کہا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں ایک ریسٹائرڈ بریگیڈیئر ہوں۔ اس قاتل کو پکڑ کر لائے ہیں۔“ رائے منصور نے کہا۔

حوالدار ان کی شخصیت سے مرعوب ہو گیا تھا۔ وہ انہیں لے کر تمہانیدار کے کمرے میں آگیا۔ انسپکٹر ای۔ ادمیز عمر آدی تھا۔ وہ ابھی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ دلاور نے بھی ملوک کو گھسیٹ کر ای۔ ادمیز کے طرف ڈال دیا تھا۔



تھانیدار اپنے چند اہل کاروں کے ساتھ بیٹھا گیس ہانک رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رائے منصور کی شخصیت سے وہ بھی مرعوب ہو گیا تھا۔

”آپ لوگ کون ہیں بابا... اور یہ آدمی کون ہے۔ اس کی یہ حالت کس نے بنائی ہے۔ یہ تو زخمی ہے۔“

تھانیدار نے کہا۔

”آپ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے ہیں تھانیدار صاحب۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”میں ایک ریٹائرڈ فوجی آفیسر ہوں۔ صادق آباد میں تھوڑی سی زمین ہے اور یہ میرا بڑی گارڈ ہے۔ دلاور۔“ رائے صاحب نے دلاور کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ شخص۔“ انہوں نے ملوک کی طرف دیکھا۔ ”قاتل ہے۔ اس نے ہماری موجودگی میں اپنے ایک ساتھی کو گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔ ہم اسے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں اور یہ کلاشنکوف اسی کے مقتول ساتھی کی ملکیت ہے۔“ انہوں نے کلاشنکوف میر پر رکھ دی۔

”ہینچو سائیں ہینچو۔“ تھانیدار نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ نے تو بڑی بہادری کا کام کیا ہے۔ اس کا تو ہم پورا پورا بندوبست کریں گے۔“ اس نے فرش پر پڑے ہوئے ملوک کی طرف دیکھا پھر اپنے دو ماتحتوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کو تو ابھی لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔ بعد میں بات کریں گے اس سے۔“

دونوں ماتحت ملوک کو پکڑ کر دفتر سے باہر لے گئے۔

”یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ایک حویلی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ حویلی کس کی ملکیت ہے؟“

”سنا ہے کہ وہ ماتھیلو کے انپکٹر صوبہ خان کی ملکیت ہے۔“ تھانیدار نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”بت چسے اس کے پاس۔ ایک ہم ہیں کہ بچوں کو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔ ہوں تو میں بھی انپکٹر لیکن پورا مہینہ دو ستوں سے ادھار مانگ مانگ کر گزارہ ہوتا ہے۔ پہلی تاریخ کو جب تنخواہ ملتی ہے تو قرض خواہوں میں بٹ جاتی ہے اور دو روز بعد پھر ادھار مانگنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔“

رائے منصور کو بڑی حیرت ہوئی۔ کوئی پولیس آفیسر ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

”آپ کو معلوم ہے صوبہ خان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”سب جانتا ہوں سائیں۔ سب جانتا ہوں۔“ تھانیدار نے کہا۔

”آپ وہ طریقے اختیار کیوں نہیں کرتے کہ قرضوں سے بھی نجات مل جائے اور زندگی بھی ٹھانڈے سے گزرے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”میرا باپ ایک وڈیرے کا کارندہ تھا سائیں۔ اس نے زندگی بھر محنت کی۔ وڈیرے کی زمینوں کا حساب کتاب اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چاہتا تو لاکھوں روپیہ ادھر ادھر کر سکتا تھا مگر اس نے اپنی اولاد کو ہمیشہ اپنی محنت کی روٹی کھلائی اور ہمیشہ یہ نصیحت کرتے رہے کہ جو مزہ حلال کی روٹی کھانے میں ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ میرے باپ نے مجھے جیسے تیسے کر کے بی اے کروادیا۔ وڈیرہ سائیں نے بھی میری بڑی مدد کی۔ اب نہ تو وڈیرہ اس دنیا میں ہے اور نہ میرا باپ۔ مگر ان دونوں کی باتیں آج بھی یاد آتی ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کو حلال کی کھلاؤں۔ یہ کھانے پینے والا محکمہ ہے سائیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے اس وڈیرے اور میرے باپ نے محنت، دیانت اور حصول رزق حلال کا جو سبق پڑھایا تھا وہ آج بھی مجھے یاد ہے۔.....!!!!“

”آفرین ہے۔“ رائے صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا سائیں۔“ تھانیدار بولا۔ ”آپ بتائیں کیا معاملہ ہے؟ اس کو کیسے پکڑا؟“  
 ”آپ جانتے ہیں صوبہ خان کی اس حویلی میں کیا ہوتا ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”صوبہ خان اس حویلی میں علاقے کے لوگوں کی دعوتیں کرتا رہتا ہے۔ مجھے بھی ہمیشہ بلاتا ہے مگر میں کبھی نہیں گیا۔“ تھانیدار نے کہا۔

”وہ حویلی...“ رائے منصور نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔ ”عیاشی کا اڈہ ہے۔ صوبہ خان کی پرائیویٹ جیل اور عقوبت خانہ ہے۔ وہاں کئی بے گناہوں کا خون بکھرا ہوا ہے۔ کئی معصوم لڑکیوں کی عزت لوٹی گئی ہے اس حویلی میں۔ حیرت ہے“ اس حویلی کی چار دیواری کے اندر جو کھیل کھیلا جاتا ہے آپ کو اس کا علم نہیں ہے۔“

”مجھے سب معلوم ہے۔“ تھانیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن صوبہ خان بہت پنہنج والا آدمی ہے۔ علاقے کے تمام وڈیرے اس کی پشت پر ہیں۔ لیکن میں موقع کی تلاش میں ہوں۔ مجھے موقع مل گیا تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔“

”میرا خیال ہے اب وہ موقع آگیا ہے جس کی آپ کو تلاش تھی۔“ رائے منصور نے کہا۔  
 ”میں سمجھا نہیں۔“ تھانیدار نے انھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”اس شخص کو ہم حویلی ہی سے پکڑ لائے ہیں۔ اس نے اپنے جس ساتھی کو قتل کیا ہے اس کی لاش حویلی ہی میں پڑی ہے۔ آپ چاہیں تو کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔“ رائے صاحب بولے۔  
 ”لیکن آپ اس حویلی میں کیسے گئے تھے؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

”چند روز قبل صوبہ خان نے چند آدمیوں کے ذریعے ایک کار پر حملہ کروایا تھا جس میں تین افراد ہلاک ہوئے تھے۔ حملہ آور نائلہ درانی نامی ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے تھے لیکن ریگستان میں وہ لڑکی کسی طرح ان کے شکنجے سے بھاگ نکلی۔ اس نے سندھ کے سرحدی علاقے کے ایک چھوٹے سے گھٹھ میں پناہ لی تھی۔ وہ زخمی تھی۔ گوٹھ والوں نے اس کا علاج کیا اور اس کی بڑی خدمت کی۔ اس لڑکی نے ٹھیک ہونے کے بعد کسی طرح مجھے اطلاع بھجوا دی۔ میں جب آج صبح سویرے اس گوٹھ میں پہنچا تو پتہ چلا کہ دو دن پہلے صوبہ خان نہ صرف نائلہ درانی بلکہ گوٹھ کی ایک جوان لڑکی کو بھی اسلحہ کے زور پر اٹھالایا تھا۔ میں نے مائیلو پنہنج کر صوبہ خان سے بات کی لیکن وہ کچھ اور ہی باتیں کرنے لگا کہ اس نے نائلہ درانی کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا لیکن وہ راستے میں موقع پا کر بھاگ گئی۔ مجھے کسی طرح اطلاع مل گئی کہ صوبہ خان نائلہ اور دوسری لڑکی کو اس حویلی میں لے کر آیا تھا۔ میں حویلی پہنچ گیا۔ یہاں صوبہ خان کے ایک آدمی سے مدد بھیڑ ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ نائلہ دوسری لڑکی کے ساتھ حویلی سے فرار ہو گئی ہے۔ اسی دوران صوبہ خان کا دوسرا آدمی کہیں سے نکل آیا۔ اس نے میرے باڈی گارڈ پر گولی چلا دی جو اسی کے ساتھی کو لگی۔ ہم نے کسی طرح اسے گرفت میں لے لیا اور یہاں لے آئے۔“

”یہ نائلہ درانی وہی تو نہیں جس کی تلاش کے لیے صادق آباد پولیس نے سندھ کے بھی بہت سے تھانوں کو اطلاع دے رکھی ہے؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

”بالکل وہی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”وہ میری بہتیجی ہے اور صوبہ خان نے جن آدمیوں سے اس کی کاڈی پر حملہ کروایا تھا وہ سندھ کی مختلف جیلوں سے بھاگے ہوئے ہیں۔ جس آدمی کو ہم پکڑ کر لائے ہیں وہ مئی انہی حملہ آوروں میں سے ایک ہے۔ اگر آپ کو شش کریں تو اپنے علاقے سے ظلم کا خاتمہ کرنے کے

لے یہ ایک بہترین موقع ہے۔“

”میں نے کسی بے گناہ پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور کسی ظالم کو کبھی معاف نہیں کیا۔“ تھانیدار نے کہا، پھر اپنے ایک ماتحت کو آواز دی جو فوراً ہی حاضر ہو گیا۔ ”ولی محمد ایک چھاپہ مار پارٹی تیار کر دے... پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر۔۔۔“

”کوئی خاص اطلاع؟ کہاں چھاپہ مارنا ہے سر؟“ ولی محمد نے پوچھا۔ اس نے اسٹنٹ سب انسپکٹر کی وردی پہن رکھی تھی۔

”صوبہ خان کی حویلی پر۔۔۔ آج وہ موقع مل گیا ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہاں ایک لاش بھی پڑی ہے۔“ تھانیدار نے کہا۔

”بس سر۔ میں ابھی پارٹی تیار کرتا ہوں۔“ اے ایس آئی باہر نکل گیا۔

”آپ ہمارے ساتھ چلیں گے رائے صاحب؟“ تھانیدار بولا۔

”بالکل چلیں گے۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔

”شفیع محمد! تھانیدار نے سامنے کھڑے ہوئے حوالدار کو مخاطب کیا۔ ”یہ لوگ جس آدمی کو پکڑ کر لائے ہیں اس سے معلوم کرو تا، وہ کون ہے؟ کس جیل سے بھاگا تھا۔ اس نے اب تک کتنے قتل کئے ہیں، کتنے ڈاکے ڈالے ہیں اور صوبہ خان سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

”جی سائیں۔“ حوالدار باہر نکل گیا۔

پولیس پارٹی ایک گھنٹے بعد تیار ہو سکی تھی۔ اس دوران رائے صاحب تھانیدار کو تا ملکہ درانی کے کیس کا پس منظر سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے خیال میں یہ تھانیدار فرض شناس اور دیانت دار پولیس آفیسر تھا اور اب یہ صوبہ خان سے منٹ لے گا۔

پولیس کے پاس ایک کھٹارہ ساڑک تھا۔ تھانیدار کی جیب ایک سب انسپکٹر لے گیا تھا۔ دس بارہ پولیس والے ٹرک پر لد گئے اور تھانیدار رائے منصور کی پاجیرو میں آگیا اور اس طرح یہ چھاپہ مار پارٹی روانہ ہو گئی۔ آگے رائے منصور کی پاجیرو تھی اور پیچھے پولیس کا ٹرک۔

حویلی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کرامت تو پاجیرو کو جیب کے اندر لیتا چلا گیا البتہ پولیس کا ٹرک میٹ کے باہر ہی رگ گیا۔ پولیس والے ٹرک سے اتر کر حویلی میں پھیل گئے لیکن تھانیدار نے انہیں میٹ پر ہی روک لیا۔

”ہمیں پر پوزیشن لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ اگر کوئی اندر ہو تو اسے باہر مت نکلنے دو اور کوئی باہر سے آئے تو اسے وہیں روک لو۔“ تھانیدار نے کہا اور دوبارہ رائے منصور کے ساتھ جیب میں بیٹھ گیا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ رائے منصور نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں قانون کا لحاظ رکھتا ہوں سائیں۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”ابھی ہم یہاں پہنچ گئے ہیں تا؟ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ ہم جیسے ہی حویلی کے اندر داخل ہوں گے ہمارے خلاف قانون کا میسر چل پڑے گا۔ صوبہ خان بھی تو پولیس افسر ہے تا بابا۔ وہ بھی سارے قانون جانتا ہے۔ ہمارے خلاف قانونی کارروائی کر سکتا ہے کہ ہم بغیر اجازت اس کی حویلی میں داخل ہوئے ہیں۔ میں نے سب انسپکٹر کو اے سی صاحب کی طرف بھیجا ہے۔ وہ سرچ وارنٹ اور اے سی صاحب کو ساتھ لے کر آئے گا۔ وہ ایک قانونی کارروائی ہوگی اور پھر صوبہ خان کا قانون دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ رائے منصور کے منہ سے بے اختیار مگر سانس نکل گیا۔ تھانیدار واقعی ایک دلچسپ آدمی تھا۔ وہ رائے صاحب کو اپنی پولیس کی زندگی کے دلچسپ واقعات سناتا رہا۔

”میں ان پولیس مقابلوں کے سخت خلاف ہوں۔“ تھانیدار کہہ رہا تھا۔ ”میں یہ جانتا ہوں کہ اگر کوئی ملزم بھی ہے تو اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اسے بھی قانون کا سہارا ملنا چاہئے۔ اگر وہ بے گناہ ہے تو اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع دینا چاہئے نا۔“

”لیکن انسپٹر صوبہ خان ایسا نہیں سمجھتا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”وہ تو جلاہ ہے سائیں جلاہ۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”وہ تو انسان کو انسان نہیں سمجھتا۔ اس کی نظروں میں انسان اور کتا ایک برابر ہے۔ وہ اگر کسی کو معمولی سی چورہی کے الزام میں بھی پکڑتا ہے تو پولیس مقابلے میں گولی سے اڑا دیتا ہے۔“

رائے منصور خاموش رہے۔ ایک پولیس آفیسر دوسرے پولیس آفیسر کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کر رہا تھا۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ رقابت نہیں تھی اور نہ ہی اس میں کوئی مبالغہ تھا۔ صوبہ خان کے بارے میں ہر شخص کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے بلکہ عام آدمی تو اسے ماں بہن کی گالیاں دیتا تھا جبکہ یہ تھانیدار اس کے لیے بہت نرم الفاظ استعمال کر رہا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب شہر کی طرف سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دکھائی دی۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس کی جپ ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اے سی اور سب انسپکٹر جپ سے اتر کر ان کے قریب آ گئے۔ ”کیا معاملہ ہے حضور بخش؟“ اس نے تھانیدار سے ہاتھ ملا کر پوچھا پھر رائے منصور سے بھی ہاتھ

تھاندار نے مختصر طور پر قصہ بیان کر دیا۔

”ٹھک ہے“ اندر چلو۔“ اے سی نے کہا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا۔ لمبا قد، گورا چٹا رنگ اور کلین شیو۔ وہ لوگ حویلی میں آگئے۔ دو کانٹیل حویلی کے گیٹ پر ہی جم گئے تھے۔ تین چار نے مختلف جگہوں پر پریشانی سے سنبھال لی تھی جبکہ کچھ کانٹیل راقصین سنبھالے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حویلی سے حراب خان کی لاش بھی مل گئی اور بیرونی دیوار کے ساتھ سیڑھیوں پر پڑا ہوا ملوک کا پستول بھی۔ ایک کمرے میں ڈھانچہ دیکھ کر اے سی کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے اور جب مقبوت گاہ والے کمرے دیکھے تو وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔

”حضور بخش!“ وہ تھاندار کی طرف گھوم گیا۔

”یہ حوصلہ تمہارے علاقے میں ہے نا؟“ اے سی نے پوچھا۔

”جی سائرس۔“ تھاندار حضور بخش نے جواب دیا۔

"اور تمہیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا کچھ ہوتا رہا ہے؟" اے سی بولا۔

"آپ کو معلوم ہے سائیں کہ حویلی انجیلر سوہنے خان کی ملکیت ہے اور اس کی پہنچ کہاں تک ہے۔ ایک لمحے پر غور کیا تو پتا چلا تھا۔ میرا ایک اے ایس آئی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس طرف آیا تھا۔ اس خان بھی حویلی میں موجود تھا۔ اس نے میرے آدمیوں کو دھکا کر دیا پس بھیج دیا تھا۔ میں نے ڈی آر جی کے بارے میں شکایت کی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔"

میں نے ایک کمرے میں ٹیلی فون دیکھا تھا۔ میں ابھی ایس پی صاحب سے بات کرتا

ہوں۔" اے سی نے کہا۔ "غضب خدا کا! وہ ایک پولیس انسپکٹر ہے یا یہاں کا حکمران ہے! کوئی اس کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا۔ ایک معمولی سا انسپکٹر ایسی حویلی کس طرح خرید سکا ہے۔ تم بھی تو انسپکٹر ہو حضور بخش، تمہارے بچوں کے جسم پر تو میں نے کبھی ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں دیکھے۔"

"میں قانون کا محافظ ہوں، لیٹر انہیں۔" حضور بخش نے جواب دیا۔

"یہ کیس تمہارے لیے ایک چیلنج ہو گا حضور بخش۔" اے سی نے کہا۔

وہ لوگ بات کرتے ہوئے اس کمرے میں آگے جہاں ٹیلی فون موجود تھا۔ یہ وسیع و عریض کمرہ شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اتنا قیمتی اور اعلیٰ فرنیچر تو کسی جاگیردار کے گھر میں بھی نہیں ہو گا۔

اے سی نے صوفے پر بیٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ یہ فون گھونکی ٹیلی فون ایکنج سے منسلک تھا۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ کی سہولت موجود تھی لیکن ایس بی گھونکی میں نہیں ہوتا تھا۔ اے سی نے متعلقہ شہر کا کوڈ نمبر ملا کر ایس بی کا نمبر ڈائل کیا اور چند منٹ تک وہ فون پر ایس بی سے بات کرتا رہا۔ یہ بات چیت تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی اور پھر اے سی نے فون کا ریسیور جت دیا۔

"حضور بخش۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سخت غصے میں نظر آ رہا تھا۔

"یہ حویلی میل کر دو اور یہاں چار مسلح کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی لگا دو۔ کانسٹیبلوں کو حکم دے دو کہ اگر کوئی حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے گولی سے اڑا دیں۔"

اے سی نے قانون سے تعاون پر رائے صاحب کا بھی شکریہ ادا کیا۔ حویلی سر بھر کرنے کے بعد انہیں ایک بار پھر گھونکی تھانے واپس آنا پڑا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جب رائے منصور اور دلاور صادق آباد کے لیے روانہ ہوئے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

سڑک ویران تھی۔ پاجیرو تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ وہ ماتھیلو شہر کی حدود سے تقریباً نصف میل دور تھے کہ کرامت کو پاجیرو کی رفتار کم کر لینا پڑی۔ سامنے سڑک کے وسط میں تین چار پولیس والے کھڑے تھے۔

"گاڑی روکو کرامت۔" رائے صاحب نے کہا۔

کرامت نے پولیس والوں کے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی۔ اسی لمحہ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی جیب کی آڑ سے ایک اور پولیس والا نکل کر سامنے آ گیا۔ پاجیرو کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اس پولیس والے کو پہچاننے میں رائے صاحب یا دلاور کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ انسپکٹر صوبہ خان تھا جس نے دائیں ہاتھ میں ریو اور پکڑ رکھا تھا اور ریو اور کی ٹال پاجیرو کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

..... \* \* \* .....

گولیوں کی برستی ہوئی بارش میں نالکہ درانی گاڑی کو بھگائے لیتی چلی گئی۔ کوئی گولی پاجیرو کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ پاجیرو تیز رفتاری سے کچی سڑک پر اچھلتی ہوئی شہر کی طرف دوڑتی رہی۔ شہر کی اونگھتی ہوئی اکا دکا روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

پاجیرو چند منٹ میں کھونکی شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں سڑکوں پر دور دور کانوں کے سامنے کی بتیاں جل رہی تھیں لیکن پورے شہر پر سناٹا طاری تھا۔ نجانے یہ رات کا کون سا پہرہ تھا۔ لوگ گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ ہر طرف خاموشی تھی البتہ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی۔

شہر کے مین روڈ پر پہنچتے ہی نائلہ نے گاڑی روک دی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ یہ گھونکی شہر ہے لیکن اسے یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ اس نے گاڑی بائیں طرف تھما دی۔ ایک سڑک پر موڑ کاٹتے ہی آوارہ کتوں کی ایک فوج نے پاجیرو کا تعاقب شروع کر دیا۔ کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ لیکن نائلہ رفتار کم کئے بغیر پاجیرو کو دوڑاتی رہی۔ اس کے ساتھ پنجرہ سیٹ پر بیٹھی ہوئی سسی کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ وہ بار بار نائلہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اس لڑکی پر حیرت ہو رہی تھی جو ہندو روزیہ کے زخمی حالت میں ان کے پاس پہنچی تھی۔ اس وقت تو اس کے بچنے کی امید نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ حیرت انگیز طور پر چند ہی روز میں صحت یاب ہو گئی تھی اور پھر وہ غنڈے نائلہ کے ساتھ اسے بھی اٹھالائے تھے۔ انہیں ایک ویران حویلی میں لایا گیا تھا اور تب سسی پر انکشاف ہوا تھا کہ انہیں اٹھا کر لانے والا کوئی ڈاکو یا لٹیرا نہیں تھا بلکہ ایک تھاندار تھا۔ جس نے کسی کے گھنے رہنا نائلہ کو قتل کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے لیے تھے لیکن نائلہ کو دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی تھی اور وہ اسے قتل کرنے کے بجائے کسی وڈیرے کے پاس فروخت کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ نائلہ کے ساتھ یہ بھی پھنس گئی تھی۔

حویلی میں ان دونوں کو الگ الگ کمروں میں بند کیا گیا تھا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ایک آدمی اس کے کمرے میں گھس آیا تھا۔ یہ ان دو آدمیوں میں سے ایک تھا جو صوبہ خان کے ساتھ اسے گوتھ سے اٹھا کر لایا تھا اور اب اپنی محنت کا معاوضہ سسی سے وصول کرنا چاہتا تھا۔ سسی اپنے بچاؤ کی کوشش کرنے لگی۔ وہ آدمی بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر جھپٹ رہا تھا۔ سسی کی مزاحمت جاری رہی۔ اس کا شور سن کر صوبہ خان دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور اس نے سسی پر دست درازی کرنے والے کو گولی ماری۔

صوبہ خان نے سسی کی عزت بچانے یا اس سے کسی ہمدردی کی بناء پر اپنے آدمی کو گولی نہیں ماری تھی بلکہ وہ تو اس کے بھی پیسے کھرے کرنا چاہتا تھا اور اپنے گاہک کو بے داغ مال دینا چاہتا تھا۔ بہر حال سسی کی عزت بچ گئی تھی اور پھر اسے بھی نائلہ والے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ سسی نائلہ کے گلے سے لپٹ کر نوب روٹی تھی۔ اس کی قیص پھٹ گئی تھی۔ جسم جگہ جگہ سے چھلک رہا تھا لیکن ظاہر ہے ان کے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے۔

اور پھر... اسی رات نائلہ اسے لے کر حویلی سے فرار ہو گئی۔ اسے نائلہ کی ہمت اور حوصلے پر حیرت ہو رہی تھی۔ نائلہ بھی اسی کی طرح ایک عورت تھی۔ کتنی مختلف تھی وہ اس سے۔ اگر سسی اکیلی ہوتی تو ان اردوں کا شکار ہو جاتی مگر نائلہ تو عجیب عورت ثابت ہوئی تھی۔ اس نے جس طرح روشندان کی سلاخیں توڑی تھیں وہ سسی کے لیے حیرت انگیز تھا۔ نائلہ نے اس حویلی سے فرار کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ اگرچہ خود کشی کے مترادف تھا لیکن وہ اسے لے کر صاف بچ نکلتی تھی۔

”تم ڈر رہی ہو سسی؟“ نائلہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں ادی۔“ سسی نے گمراہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم تو بڑی دلیر عورت ہو۔ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔“

”دنیا کی کوئی عورت کمزور نہیں ہوتی سسی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”عورت کو کمزور سمجھ لیا گیا ہے۔ ہر قدم پر کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عورت کو دل بھلانے کا کھلونا سمجھا جاتا ہے لیکن عورت نہ تو اندر ہے اور نہ ہی مردوں کے دل بھلانے کا کھلونا۔ ان مردوں کو عورت ہی نے جنم دیا ہے اور یہی مرد عورت کو کمزور سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ عورت کے اندر بے پناہ قوت پوشیدہ ہے۔ وہ اتنی طاقتور ہے کہ اس دنیا

کو تہہ و بالا کر سکتی ہے۔ تم اگر تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ عورت نے میدان جنگ میں بھی بڑے بڑے جابر و طاقتور حکمرانوں کو شکست دی ہے۔ چاند بی بی، رضیہ سلطانہ.... اور بہت سے نام ایسے ہیں جو عورت کی طاقت و قوت کا مظہر ہیں۔ تم نے پڑھا ہے کہ....

”میں نے تو صرف قرآن شریف پڑھا ہے ادی۔“ سسی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اوہ!“ نالکہ چونک گئی۔ یہ تو وہ بھول ہی گئی تھی کہ سسی ایک ایسے علاقے میں پلی بڑھی ہے جہاں چاروں طرف جنگل ہے۔ ویرانہ ہے۔ میلوں دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کا کیا سوال!

”قرآن شریف میں نے اماں سے پڑھا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھا۔ میرا بھائی پڑھنا جانتا ہے۔ وہ ساندہ میں رہتا ہے۔ اپنی پھوپھی کے پاس۔ اسکول بھی جاتا ہے۔“ سسی نے کہا۔

نالکہ جواب دینے کی بجائے سامنے دیکھنے لگی۔ پاجیرواب گھونگنی شہر کی حدود سے باہر نکل آئی تھی۔ نالکہ نے ایک موڑ پر پاجیرواب کی طرف موڑ دی۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون سا راستہ ہے اور انہیں کہاں لے جائے گا۔ وہ تو یہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتی تھی۔ حوبلی میں اس پاجیرو کے علاوہ اگرچہ اور کوئی گاڑی نہیں تھی لیکن ٹیلی فون تو تھا۔ صوبہ خان ٹیلی فون پر گھونگنی اور آس پاس کے تھانوں کو یا اپنے حواریوں کو اطلاع کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ کم سے کم وقت میں کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہتی تھی جہاں صوبہ خان کی دسترس سے محفوظ رہ سکے۔ اسے اپنے سے زیادہ سسی کی فکر تھی۔ وہ پیجاری اس کی وجہ سے اس عذاب میں مبتلا ہوئی تھی۔ اس نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ اپنی جان دے دے گی مگر اس معصوم لڑکی کی عزت پر آج نہیں آنے دے گی۔

نالکہ کو راستے کا علم نہیں تھا اور اس لاعلمی کی وجہ سے اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اگر وہ شہر سے نکلنے کے بعد پاجیرو کو سیدھی سڑک پر رکھتی تو پتہ عاقل سے ہوتی ہوئی سکھر کی طرف جاسکتی تھی لیکن اس نے جس سڑک پر گاڑی موڑی تھی وہ عادل پور کی طرف چل گئی تھی۔

اس سڑک پر چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پاجیرو کا انجن غرغرانے لگا۔ نالکہ کچھ دیر تک ٹومیسٹر بدل بدل کر انجن کی غرغراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر اچانک ہی اس کی نظر ویش بورڈ کی طرف اٹھ گئی۔ فیول بتانے والی سوئی زیرو کے قریب کانپ رہی تھی۔ نالکہ نے ریڑرو لگا دیا۔ چند سیکنڈ بعد انجن کی غرغراہٹ بند ہو گئی لیکن پاجیرو زیادہ فاصلہ طے نہیں کر پائی۔ ایک چھوٹی سی نہر کے پل پر پہنچتے ہی انجن بند ہو گیا۔

نالکہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تیل کی ٹنکی خالی ہو چکی ہے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر پاجیرو کے پچھلے حصے میں دیکھنے لگی۔ لیکیج کمپارٹمنٹ میں ایک جیری کین رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے جیری کین اٹھالیا۔ وہ پورا بھرا ہوا نہیں تھا لیکن اس میں اتنا پیٹرول موجود تھا جو انہیں کسی منزل تک پہنچا سکتا تھا۔ پیٹرول ڈالنے کے بعد نالکہ کو دوبارہ انجن اشارت کرنے میں چند منٹ لگے تھے۔

عادل پور خاصا بڑا قصبہ تھا لیکن نالکہ پاجیرو روکے بغیر شہر سے نکل گئی۔ اب یہ سڑک خان پور نامی ایک چھوٹے سے قصبے کی طرف چلی گئی تھی۔ خان پور نامی یہ قصبہ مہرواد نامی نہر کے کنارے پر آباد تھا۔ اس نہر کی وجہ سے یہ علاقہ آباد تھا اور مہرواد سے اس نے پاجیرو کو دائیں طرف موڑ دیا۔ یہ پختہ سڑک تھی۔ لیکن چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے پاجیرو کو بائیں طرف ایک اور سڑک پر موڑ دیا۔ یہ سڑک کہیں

ہاتھ تھی اور کہیں سے چکی۔  
چند میل آگے ایک اور نہر تھی جس کے ساتھ ہی بخش علی لاشاری نامی قصبہ تھا۔ وہ قصبہ ابھی کافی دور  
نہا۔ اکا دکا روٹیاں نظر آرہی تھیں۔ نالکہ کا خیال تھا کہ وہ اس بستی سے بھی رکے بغیر گزر جائے گی لیکن  
ابھو کا انجن ایک بار پھر غرغرانے لگا اور بالاخر چند ہچکیاں لینے کے بعد انجن خاموش ہو گیا۔  
”لو بھئی“ قصہ ختم ہوا۔“ نالکہ نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا“

”اب کیا ہو گا ادی؟“ سسی نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔  
”درو نہیں سسی۔“ نالکہ نے کہا۔ ”یہ سامنے اتنی بڑی آبادی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی گھر میں پناہ مل  
جائے گی۔ اب ہمیں پیدل چلنا ہو گا۔ آبادی زیادہ دور نہیں ہے۔“  
وہ دونوں پاجیرو سے اتر آئیں۔ نالکہ ڈیش بورڈ کے کپار ٹنٹ کے خانوں کی تلاشی لینے لگی۔ ایک  
مانے میں گاڑی کے کاغذات کے ساتھ ایک ماچس اور چند نوٹ بھی رکھے ہوئے مل گئے۔ نالکہ نے نوٹ  
اٹھا کر گئے۔ چھ سو بیس روپے کی رقم تھی۔ اس نے نوٹ موڈ کر اپنی قمیص کے گریبان میں ٹھونس لئے پھر  
اس نے گیج کپار ٹنٹ سے ٹائر آؤن نکال لیا اور سیٹوں کے کشن اوڑھنے لگی۔  
آگے پیچھے کی سیٹوں کے کشن اوڑھنے کے بعد وہ ماچس جلا کر انہیں شعلہ دکھانے لگی۔ چند تیلیاں  
سالم کرنے کے بعد وہ پچھلی سیٹ کے کشن میں آگ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اگلی سیٹ  
لے کشن کو بھی آگ لگا چکی تھی۔

اس نے پاجیرو کے دونوں دروازے کھلے چھوڑ دیئے اور سسی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ایک طرف چلے  
گئے۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پاجیرو کے اندر شعلے اٹھ رہے  
تھے۔

وہ تیز تیز چلے گئیں۔ لیکن تھوڑی دور جانے کے بعد سامنے بہت دور کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی  
روشنیاں دیکھ کر وہ سڑک سے اتر کر کچے میں دوڑنے لگیں اور پھر کھیتوں میں گھس گئیں۔ پتہ نہیں کھیتوں  
میں کوئی فصل تھی لیکن پودے زیادہ بڑے نہیں تھے۔ وہ اندھا دھند دوڑتی چلی گئیں۔

نالکہ نے ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شعلے اب پاجیرو کی کھڑکیوں سے باہر لپک رہے تھے۔ آبادی کی  
طرف سے آنے والی گاڑی ابھی پاجیرو سے بہت دور تھی۔ نالکہ سسی کا ہاتھ پکڑ کر اور بھی تیزی سے دوڑنے  
لگی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتے ہوئے سڑک سے تقریباً نصف میل دور پہنچ چکی تھیں۔ نالکہ نے پھر مڑ کر دیکھا۔  
ادی کی طرف سے آنے والی گاڑی اب پاجیرو کے قریب رک گئی تھی اور پاجیرو پوری طرح آگ کے شعلوں  
میں گئی تھی۔ وہ دونوں چند لمبے وہاں کھڑی رہیں پھر کھیتوں میں آبادی کی طرف چلے گئیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایک احاطے کے قریب پہنچ گئیں جس کے اندر کسی قسم کی فیکٹری تھی لیکن ہر  
کچھ کی تاریکی تھی۔ نالکہ نے سسی کا ہاتھ پکڑا اور ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئیں۔  
ایک لمحے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کوئی جنسینگ فیکٹری تھی۔ یہ چونکہ کپاس کا میزن نہیں تھا اس لیے

وہاں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ اس کو غری کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ اس کو غری کا دروازہ نہیں تھا۔ نالکہ نے



جھانک کر دیکھا۔ کوٹھری خالی تھی۔ اندر فرش پر سوکھی گھاس وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔

”میرا خیال ہے رات اب زیادہ نہیں رہ گئی۔ ہم کچھ دیر بیس بیٹھ کر آرام کر لیتی ہیں۔ دن نکل آئے گا تو ہم آبادی میں چلے جائیں گے۔ اب تو ہمارے پاس کچھ پیسے بھی آگئے ہیں۔ آبادی سے ہمیں کہیں جانے کے لیے کوئی نہ کوئی بس مل جائے گی۔“ نائلہ نے کہا۔

”تم نے موٹر کیوں جلادی اوی۔“ مسی نے پوچھا۔

”دن کے وقت اس موٹر پر سفر کرنا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میں اس صوبہ خان کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس نے ٹیلی فون پر علاقے کے تمام تھانوں کو اس موٹر کے بارے میں اطلاع دے دی ہوگی۔ اس لیے میں نے اس موٹر کو جلادیا۔ ویسے بھی یہ اس کی حرام کی کمائی تھی۔“ وہ دونوں کوٹھری میں داخل ہو گئیں۔ کوٹھری صاف ستھری تھی۔ صرف گھاس پھوس بکھری ہوئی تھی۔ وہ دروازے والی دیوار کی آڑ میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ نائلہ نے دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں آگے کو پھیلائی تھیں۔ اس نے سسی کا سراپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

سسی بھی اگرچہ رات بھر جاگتی رہی تھی لیکن اس وقت بھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ان بچاروں کا کیا حال ہوگا؟ غربت اور فاقہ کشی کے باوجود انہوں نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ماں نے اسے قرآن شریف کی تعلیم دی تھی اور باپ نے اسے مردوں کی طرح محنت اور جفاکشی سکھائی تھی۔ وہ باپ کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتی تھی۔ ان کے پاس غربت اور افلاس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ غریبوں کے پاس تو عزت ہی ان کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے اور اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہوں گے۔ سسی جانتی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کا دامن صاف تھا لیکن وہ یہ بات بھی جانتی تھی کہ اگر کسی غریب گھر کی جوان لڑکی ایک رات بھی گھر سے باہر رہ جائے تو اس خاندان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ اور پھر اسے تو بد معاش زبردستی اٹھا کر لائے تھے۔ وہ واپس جائے گی تو کون اس کی پاک دامن پر یقین کرے گا۔ اب تک تو اس کے اغوا کی خبر جنگل میں واقع چار جھونپڑیوں کے اس چھوٹے سے گونڈے سے نکل کر ساندہ میں اس کے پورے خاندان میں پھیل چکی ہوگی۔ اس کے رشتہ دار اور فیملے والے کیا کیا باتیں نہیں کر رہے ہوں گے۔

نائلہ نے اسے بڑا سارا دیا تھا۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر اسے ان بد معاشوں کے چنگل سے نکال لائی تھی اور اس کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا تھا۔ اب وہ نائلہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ کتنی دولت مند تھی یہ عورت لیکن جان کے خوف سے بھاگی پھر رہی تھی۔ اس کے اپنے ہی رشتہ دار اس کی دولت اور جائیداد پر قبضہ جمانے کے لیے اسے قتل کروادینا چاہتے تھے اور کتنی دلیر تھی یہ نائلہ جو مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرتی چلی آ رہی تھی۔

سسی یہ سب کچھ سوچتے ہوئے نائلہ کی گود میں سر رکھے رکھے سو گئی۔ نائلہ کچھ دیر تک اس کا سر سلاتی رہی پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

آہٹ سن کر نائلہ کی آنکھ کھل گئی اور پھر اپنے سامنے ایک آدمی کو کھڑے دیکھ کر وہ گڑبڑا سی گئی۔ اس نے جلدی سے سسی کو جگایا جو ابھی تک اس کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی۔ اس آدمی کو دیکھ کر سسی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

”کون ہو تم لوگ.... اور یہاں کیسے آئی ہو؟“ سامنے کھڑے ہوئے شخص نے باری باری انہیں گھورا۔

وہ درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ بل ڈاگ جیسا چہرہ جیسے دیکھ کر ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں جیسے یا تو رات بھر جاگتا رہا ہو یا کسی قسم کے نشے کا عادی ہو۔ اس کی نظریں نالکہ کے چہرے سے پھسل کر سسی پر جم گئیں۔

سسی سمٹ کر بیٹھ گئی اور پھٹی ہوئی قمیص سمیٹ کر اپنے جسم کی برہنگی چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ نالکہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔  
”کون ہو تم لوگ... بتاتی کیوں نہیں؟“ اس شخص نے دوبارہ پوچھا۔ اس مرتبہ اس کے لمبے میں کسی قدر سختی تھی۔

”پردہ کی ہیں۔ راستہ بھول کر اس طرف آ گئے تھے۔ رات گزارنے کے لیے اس کوٹھری میں آ گئیں۔“  
نالکہ نے جواب دیا۔

”اکیلی ہو یا اور کوئی بھی ہے تم لوگوں کے ساتھ؟“ اس شخص نے پوچھا۔  
”اکیلی ہیں۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

”اوہ!“ وہ شخص بولا۔ وہ موٹر شاید تمہاری تھی جو جل کر تباہ ہو چکی ہے۔ آگ کیسے لگی تھی اس میں؟“  
”کون سی موٹر؟ ہم کسی موٹر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ نالکہ نے جواب دیا۔  
”قصبے سے تقریباً دو میل دور خان پور کی طرف سے آنے والی سڑک پر ایک پاجیرو آگ لگنے سے جل کر تباہ ہو گئی ہے۔ میں سمجھا شاید وہ تم لوگوں کی پاجیرو ہے۔“ وہ شخص بولا۔

”نہیں، ہمارا اس پاجیرو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ نالکہ نے جواب دیا۔  
”تو پھر کون ہو تم لوگ؟ یہاں کیسے آئیں؟ تم لوگ لاشاری کی تو نہیں لگتیں۔“ اس شخص نے کہا اس کی نظریں بار بار سسی کے جسم کے برہنہ حصوں پر مرکوز ہو رہی تھیں۔

”لاشاری!“ نالکہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
”ہاں۔ بخش علی لاشاری۔ یہ اس قصبے کا نام ہے اور یہ سینٹھ کھنول کی جنینگ فیکٹری ہے جو قصبے سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔“ اس شخص نے بتایا۔

”اوہ!“ نالکہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس قصبے کا نام اس نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ ظاہر ہے وہ سندھ کے دیہی علاقوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ لیکن یہ جان کر وہ قدرے پریشان ہو گئی تھی کہ وہ ایک ہندو سے مخاطب تھی۔

سندھ کے اندرونی علاقوں کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن اس خطے میں آباد ہندوؤں کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتی تھی۔ سندھ میں ہندوؤں کی آبادی لاکھوں کی تعداد میں تھی اور نانائے فیصد ہندو سندھ کے اس خطے میں آباد تھے جو بھارت کی سرحد کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ اس علاقے کی معیشت پر انہی کا قبضہ تھا۔ چند وڈیروں کو چھوڑ کر علاقے کے تمام مسلمان غلاموں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسلمان کاشتکاروں کی زمینیں ہندو مہاجنوں کے پاس رہن رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہندوؤں کے اس طرح مقروض تھے کہ نسل در نسل یہ قرضے ختم نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ بات تو سب ہی جانتے تھے کہ یہ ہندو پاکستان سے مخلص نہیں تھے۔ ان کی ہمدردیاں بھارت کے ساتھ تھیں۔ یہ لوگ نہ صرف بھارت کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے بلکہ پاکستان سے اناج، مکئی، تیل اور ضرورت کی ہر چیز بھارت کو اسمگل کر رہے تھے۔ سینٹھ جیٹھانند کی مثال اس کے سامنے تھی۔

وہ لاکھوں کا اناج خرید کر راجستھان کی طرف اسمگل کر دیتا تھا اور صوبہ خان جیسے بے ضمیر لوگ بھی دولت کے لالچ میں ان کے آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ دولت کی ہوس نے صوبہ خان جیسے لوگوں کو اس قدر بے حس کر دیا تھا کہ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے ملک و قوم کو کس قدر ناقابلِ طمانی نقصان پہنچا رہے تھے۔

سندھ کے اہتر سیاسی حالات کے بارے میں بھی نائلہ اچھی طرح جانتی تھی۔ بھارتی حکمران پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی آپس کی چپقلش سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی را کے ایجنٹ پورے سندھ میں پھیلے ہوئے تھے جو معصوم نوجوانوں اور ساج دشمن عناصر کو اپنا آلہ کار بنا کر سندھ میں بد امنی پھیل رہے تھے۔ ایسے لوگوں کو دولت کا لالچ دے کر سرحد پار بھیج دیا جاتا جہاں راجستھان کے مختلف علاقوں میں رائے نرنگ کیمپ قائم کر رکھے تھے۔ ان لوگوں کو کیمپوں میں دہشت گردی اور تخریب کاری کی تربیت دینے کے بعد دوبارہ سندھ بھیج دیا جاتا۔ سرحدوں پر آباد بااثر ہندو بھارتی ایشیائی ایجنسی را کے ایجنٹوں کے لیے رابطے کا کام دے رہے تھے۔ وہ نہ صرف ان بھارتی ایجنٹوں کو پناہ دیتے بلکہ انہیں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتے۔ ان بااثر ہندوؤں نے را کے بیشتر ایجنٹوں کو پاکستان کے قومی شناختی کارڈ تک بنا کر دیئے تھے اور یہ ایجنٹ آزادی سے دندناتے پھرتے تھے۔

اور اب نائلہ کے سامنے بھی ایک ہندو کھڑا تھا۔ جس جگہ اس نے پناہ لے رکھی تھی وہ بھی ایک ہندو ہی کی ملکیت تھا۔

”ہندو... اونندو...“ اس شخص نے باہر کی طرف رخ کر کے کسی کو پکارا۔ ”ادھر تو آ... دیکھ بھگوان نے صبح ہی صبح کیا چیز بھیجی ہے۔“

چند سیکنڈ بعد ہی ایک اور آدمی کو غمری میں آگیا۔ وہ پہلے آدمی سے قدرے لمبا تھا۔ اس نے بھی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ وہ چہرے سے نسبتاً ”شریف لگتا تھا۔

”ارے“ یہ کون ہیں؟“ اس کے لمبے میں حیرت تھی اور وہ بھی باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”پتہ نہیں بھاری کون ہیں۔ کبھی ہیں راستہ بھگ کر اس طرف نکل آئی ہیں اور رات گزارنے کے لیے اس کو غمری میں آگئی تھیں۔“ سرخ آنکھوں والے نے جواب دیا۔

”تم بھی بے وقوف ہو گزاری۔“ لمبے قد والے ہندو نے کہا۔ ”بھاری پتہ نہیں کون ہیں۔ رات بھر سردی میں یہاں بیٹھی رہی ہیں اور بھوک بھی ہوں گی۔ تمہیں ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ انہیں کمرے میں لے جا کر بٹھاؤ۔ میں ان کے لمبے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ وہ نائلہ اور سسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تم لوگ ڈرو نہیں۔ آؤ... ہمارے ساتھ آؤ۔“

نائلہ سسی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سسی نے دوسرے ہاتھ سے اپنی پٹنی ہوئی قمیض کو سمیٹ کر پکڑ رکھا تھا۔ وہ انہیں ایک اور کمرے کے سامنے لے آئے جس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

کو غمری سے باہر نکلے ہی نائلہ کی آنکھیں چند حیا گئیں۔ باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ جنگ فیکٹری خامے وسیع رہنے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف کھیت تھیں۔ بائیں طرف تقریباً ”ایک میل کے فاصلے“ پلش علی لاشاری نام کا وہ قصبہ تھا جس کے بارے میں سرخ آنکھوں والے گزاری نے بتایا تھا۔ فیکٹری سے ایک کچھ راستہ کھیتوں کے درمیان سے ہوتا ہوا قصبے کی طرف چلا گیا

تھا۔

فیکٹری کے احاطے میں گیٹ کے اندر کی طرف ایک نئی ہنڈاموٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ یہ دونوں یقیناً اسی موٹر سائیکل پر آئے تھے اور نائلہ کو حیرت تھی کہ وہ اتنی گہری نیند سو رہی تھی کہ موٹر سائیکل کی آواز بھی نہیں سن سکی تھی۔

گزاراری نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی منتخب کی اور دروازے کا تالا کھول دیا۔ کمرے میں سامنے ہی ایک جھلنگ سی چارپائی نظر آرہی تھی جس پر ایک میلی سی رلی چھٹی ہوئی تھی۔ ”تم لوگ آرام سے اس کمرے میں بیٹھ جاؤ۔“ مندو نے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ تمہیں کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا۔ میں موٹر سائیکل پر جا کر قصبے سے تم لوگوں کے لیے کھانے پینے کے لیے کوئی چیز لے آتا ہوں اور اس چھو کری کے لیے تو کپڑے بھی لانے ہوں گے۔ یہ ایسی حالت میں تو قصبے میں نہیں جاسکتی۔ گزاراری یہاں رہے گا اور تم لوگوں کا خیال رکھے گا۔“

مندو موٹر سائیکل پر چلا گیا۔ گزاراری دروازے سے کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے ایک ٹوٹے ہوئے بیچ پر بیٹھ گیا۔ چارپائی پر ایک اجرک بھی پڑی تھی جسے سسی نے اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔ وہ چارپائی پر لیٹ گئی جبکہ نائلہ بچی پر بیٹھ کر دروازے سے باہر دیکھنے لگی۔ سسی لپٹتی ہی سو گئی تھی۔ تقریباً ”پانچ منٹ بعد گزاراری دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور نائلہ کو اشارے سے باہر بلا لیا۔ نائلہ کو اس کی سرخ آنکھوں میں ہوس کی چمک صاف نظر آرہی تھی۔ ”کیا بات ہے؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”تمہاری ساتھی سو رہی ہے۔ اسے آرام سے سونے دو۔ تم اس کمرے میں بیٹھ جاؤ۔ چاہو تو اس صوفے پر آرام سے لیٹ جاؤ۔“ گزاراری نے ایک اور کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ نائلہ نے اس کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ ریگزیں کا ایک صوفہ... تین چار کرسیاں اور ایک کونے میں آفس ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ میز خالی تھی۔ صوفے اور میز پر گرد کی ہلکی سی تہ صاف نظر آرہی تھی۔ گزاراری لعل نے اپنے کندھے پر بڑی ہوئی اجرک اتار لی اور کمرے میں داخل ہو کر صوفے صاف کرنے لگا۔

”یہ ہمارے بیٹھ کھٹول کا دفتر ہے۔“ وہ صوفہ صاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”کام بند ہونے کی وجہ سے سیٹھ یہاں نہیں آتا۔ ہم کبھی کبھی یہاں آجاتے ہیں۔ یہاں ایک چوکیدار ہوتا ہے مگر دو دن سے اس کی طبیعت خراب ہے اور وہ قصبے ہی میں رہ رہا ہے۔ اچھا ہوا آج ہم لوگ ادھر آگئے ورنہ تم لوگ بھٹکتی ہوئی نجانے کس طرف نکل جاتیں۔ آؤ بیٹھ جاؤ... یہاں۔ میں باہری بیٹھا رہوں گا۔“

نائلہ بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گئی۔ یہ ہندو اس قدر شریف تو نہیں ہو سکتا تھا جو اس قدر مہمان نوازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یقیناً ”اس کی نیت میں کوئی فتور آگیا تھا لیکن نائلہ بے فکر تھی۔ اس نے شبیردرانی اور صوبہ خان جیسے لوگوں کو نچا دیا تھا تو یہ شخص اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ گزاراری لعل باہر جانے کے لیے اس کے قریب سے گزرا لیکن پھر اس نے اچانک ہی دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈا لگا دیا۔ نائلہ ایک دم مڑی لیکن گزاراری نے اس کے کندھے پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ کراہتی ہوئی پشت کے بل صوفے پر گر گئی۔

اس سے پہلے کہ نائلہ سنبھل سکتی گزاراری نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ نائلہ اس کے بوجھ کے نیچے دب رہ گئی۔ نائلہ اگرچہ پہلے ہی مشکوک ہو چکی تھی مگر گزاراری کا یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکی تھی۔

گلزاری لعل نالکے کے سینے پر سوار اسے بری طرح بھنبھوڑ رہا تھا۔ نالکے اس کے بوجھ کے نیچے دبلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ واقعی بے بس ہو کر رہ گئی ہو۔ گلزاری نے اس کی قمیص پھاڑ دی تھی۔ نالکے نے پوری قوت سے اسے بائیں طرف دھکیل دیا۔ صوفہ پیچھے الٹ گیا۔ وہ دونوں صوفے کے ساتھ ہی نیچے گرے۔

اب پوزیشن بدل گئی تھی۔ گلزاری لعل نیچے اور نالکے اوپر تھی۔ نیچے ہونے کے باوجود گلزاری اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مسلسل چل رہے تھے۔ نالکے کو بھی موقع مل گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ گلزاری لعل کے گلے پر جمادیئے اور انگوٹھوں سے اس کا زرخہ دبائے لگی۔ اس کے ساتھ ہی نالکے نے پیروں کی قوت سے گلزاری کو اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ گلزاری اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پیچھے گرا۔

وہ دونوں بیک وقت اٹھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ گلزاری لعل کوئی حرکت کرتا نالکے حرکت میں آگئی۔ اس نے مارشل آرٹ کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس کی ایک زوردار کک گلزاری کی گردن پر لگی۔ گلزاری کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھاتا ہوا میز سے ٹکرا گیا۔ نالکے نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ بیچ اور سکس سے گلزاری کی تواضع کرنے لگی۔ گلزاری کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکل رہی تھیں۔ نالکے کا ہر وار اسے چیخنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اچانک ہی دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سسی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

”ادی! دروازہ کھولو۔“ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

”فکر مت کرو سسی... میں ٹھیک ہوں.. ذرا اس کی شرافت نکال لوں۔“ نالکے نے بھی چیخ کر جواب دیا اور ساتھ ہی گلزاری پر ایک اور حملہ کر دیا۔ ”تم عورت کو اتنا کمزور سمجھتے ہو... تم مردوں کے لیے ہر عورت کھلوانا ہوتی ہے۔ میں موت سے لڑتی آرہی ہوں۔ تم کیا ہو۔ تمہاری ہڈیوں کا تو میں سرمہ بنا دوں گی....“

گلزاری لعل میز پر گرا اور قلابازی کھاتا ہوا دوسری طرف جا گرا۔ نالکے میز کے اوپر سے گھوم کر اس کی طرف جانا چاہتی تھی کہ گلزاری اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا اور ہوائی فائر کر دیا۔

”اگر تم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو دوسری گولی تمہارے سینے میں لگے گی۔“ گلزاری نے چیخ کر کہا۔

نالکے وہیں رک گئی۔ گلزاری لعل میز کے پیچھے سے نکل کر نالکے کی پہنچ سے دور رہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ گولی کی آواز سن کر باہر کھڑی ہوئی سسی اور زور زور سے چیخنے لگی تھی۔ گلزاری نے پستول کا رخ نالکے ہی کی طرف رکھا اور ہاتھ بڑھا کر کندھ کھول دیا اور بڑی پھرتی سے باہر نکل کر سسی کو پستول کی زد پر لے لیا۔ پستول دیکھ کر سسی بری طرح چیخ اٹھی تھی۔

”چلو... اندر چلو۔“ گلزاری دھاڑا۔

سسی فوراً ہی کمرے میں گھس گئی۔ نالکے کے پھٹے ہوئے کپڑے دیکھ کر دوڑ کر اس سے پلٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مجھے کچھ نہیں ہوا سسی۔“ نالکے نے اسے تسلی دی۔ ”یہ بھڑبھڑا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ ہماری

لاشوں کو تو مردار خوروں کی طرح نوچ سکتے ہیں لیکن میرے جیتے جی یہ لوگ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“

”ادی!“ سسی اس سے الگ ہنستے ہوئے بولی۔ ”اس کھڑکی سے بھاگ چلیں۔“  
 نائلہ نے مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کے پٹ بند تھے لیکن اس میں کوئی سلاخ وغیرہ نہیں تھی۔  
 سسی کا آئیڈیا غلط نہیں تھا۔ اگر وہ کھڑکی کے ذریعے اس فیکٹری سے نکل کر کھیتوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں تو ان لوگوں سے نجات مل سکتی تھی۔ یہی سوچ کر نائلہ دبے قدموں کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے بڑی آہستگی سے جھنجھکی مڑا کر پٹ کھول دیئے لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔  
 کھڑکی سے چند گز کے فاصلے پر گلزاری لعل پستول ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ جسم کے مختلف حصے سملا رہا تھا۔

”اگر تم میں سے کسی نے کھڑکی سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“ گلزاری غرایا۔  
 نائلہ نے کھڑکی بند کر دی اور سسی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ گلزاری نے اس کے کپڑے بھی پھاڑ دیئے تھے۔

تقریباً ”ایک گھنٹہ بعد گیٹ کی طرف ایک گاڑی اور ایک موٹر سائیکل رکنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا... نائلہ نے اپنی قمیص سینٹے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ سامنے چار آدمی کھڑے تھے۔ ان میں ایک تو مندو تھا اور باقی تین آدمیوں میں ایک اس جنگ فیکٹری کا مالک سیٹھ کھنول تھا۔ اس نے کھد رکی دھوٹی، کرتا اور اس پر سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید کپڑے کی ہندو ٹیپ تھی۔ ماتھے پر تلک بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کی توند لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کوٹ کے بن بند کرنا ممکن نہیں تھا۔ کلین شیو تھا۔ تنگ پیشانی اور آنکھوں میں عیاری کی چمک نمایاں تھی۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ کمرے میں نائلہ اور سسی کے پاس آ کر رک گیا۔ باقی آدمی باہری کھڑے رہے تھے۔ سسی تو اسے دیکھ کر سسم گئی تھی مگر نائلہ کے چہرے پر کسی قسم کا خوف نمودار نہیں ہوا تھا۔

”تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو اور کہاں جانا چاہتی ہو؟“ سیٹھ کھنول نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس چھو کرے سے دور رہ کر بات کرو سیٹھ۔ یہ بڑی خطرناک ہے۔ کرائے جانتی ہے۔ میرا تو اس نے حلیہ بگاڑ دیا ہے۔“ گلزاری لعل نے کہا۔

”تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی۔ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔“ سیٹھ نے کہا۔  
 ”انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی سیٹھ جی۔“ گلزاری لعل نے کہا۔  
 ”بکواس کرنا ہے یہ۔“ نائلہ ایک جھنجھٹے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دیکھو میرے کپڑے... اگر یہ پستول نہ نکال لیتا تو اس وقت تم لوگوں کو اس کی لاش ہی ملتی۔“

”جی جی...“ سیٹھ کھنول بولا۔ ”بڑی ذلیل حرکت کی ہے اس نے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر

”اب اچھا اب بتاؤ تم لوگ کون ہو؟“  
 ”سیٹھ جی مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی تعلق انکسٹر صوبہ خان سے ضرور ہے۔ میں نے مزک پر وہ جلی ہوئی پاجیرو دیکھی ہے۔ اس کی آگے والی نمبر پلیٹ جلنے سے محفوظ رہ گئی ہے اور وہ نمبر صوبہ

خان کی پاجیرو کا ہے اور تمہیں پتہ ہے یہاں کا صوبیدار کیا کہہ رہا تھا۔ ”نندو نے کہا۔  
 ”کیا کہہ رہا تھا؟“ سیٹھ کھنول نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”انسپکٹر صوبہ خان نے تمام تھانوں کو وائرلیس پر یہ اطلاع بھجوائی ہے کہ دو چھوکریاں اس کی پاجیرو لے کر بھاگ گئی ہیں۔ صوبیدار نے تو وائرلیس پر ہی اسے پاجیرو کے ملنے کی اطلاع بھی کر دی ہے۔ شاید وہ شام تک یہاں آجھی جائے۔ اس لیے تو میں نے شہر میں کسی کو ان چھوکرियों کے بارے میں بتایا بھی نہیں۔ صرف آپ کو اطلاع دی ہے۔“ نندو نے کہا۔

”تم تو واقعی بہت عقل مند ہو گئے ہو نندو۔“ سیٹھ نے کہا پھر نالکہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟“

”ہاں۔“ نالکہ نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”وہ ہمیں قتل کرنا چاہتا تھا۔ ہم موقع پا کر بھاگ نکلیں۔“

”کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟ کیا دشمنی ہے تم سے اس کی؟“ سیٹھ کھنول نے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ نالکہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں صوبہ خان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ سیٹھ نے کہا۔ ”اگر تمہاری اس سے کوئی دشمنی ہے تو وہ دنیا کے آخری سرے تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ کم از کم سندھ میں تو تم اس سے بچ کر نہیں رہ سکتیں۔ ہے تو وہ ایک معمولی سا انسپکٹر لیکن پتہ نہیں اس کا لیے کے پاس کیا جادو ہے کہ اس ڈویژن کے تمام تھانیدار اس سے ڈرتے ہیں۔ کوئی افسر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ تو اپنے افسروں کو بھی بلیک میل کرتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ صوبہ خان کو پتہ چل گیا ہے کہ اس کی گاڑی یہاں پر ہے۔ وہ تو تمہیں تلاش کرنے کے لیے اس علاقے کی ریت تک چھان ڈالے گا۔ مگر اس کی گاڑی کیسے جل گئی؟“

”گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے آگ لگا دی۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ”لیکن تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟“

”میں تم لوگوں کے لیے کھانا لایا ہوں اور کپڑے بھی۔ تم لوگ کھانا کھا کر اسی کمرے میں کپڑے بدل لو۔ میں تم دونوں کو ایسی جگہ چھپا دوں گا کہ صوبہ خان کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلے گا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”یہی بات اس نے بھی کہی تھی۔“ نالکہ نے گلزاری کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو کینہ آدی ہے۔“ لپچھ۔ ”سیٹھ کھنول نے کہا اور نندو کو اشارہ کیا۔

نندو نے سیٹھ کی گاڑی میں سے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری اور ایک کپڑے میں بندھا ہوا کھانا نکال کر کمرے میں لے جا کر میز پر رکھ دیا۔

”تم لوگ آرام سے کھانا کھاؤ اور کپڑے بدل لو۔“ سیٹھ نے کہا اور اپنے آدمیوں کو لے کر کار کی طرف چلا گیا۔

نالکہ کمرے میں آگئی۔ انہوں نے کل رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ سسی کو لے کر میز کے سامنے بیٹھ گئی اور وہ کپڑا کھولنے لگی جس میں کھانا بندھا ہوا تھا۔

”ابھی طرح پیٹ بھر کر کھاؤ۔ پتہ نہیں پھر کب نصیب ہو۔“ نالکہ نے کہا۔

”یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہ کریں ادی۔“ سسی نے کہا۔  
 ”مقدور میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو ہو کر بنی رہے گا۔ مگر تم اطمینان رکھو جب تک میں زندہ ہوں کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تم میری وجہ سے اس مصیبت میں پڑی ہو اور میں مرتے دم تک تمہاری حفاظت کروں گی۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ کھانا کھا رہی تھیں کہ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ نائلہ نے جھانک کر دیکھا۔ کار واپس جا رہی تھی اس میں ڈرائیور کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے کھانا کھاتی رہی۔

کھانا کھانے کے بعد نائلہ نے گٹھری کو کھول کر دیکھا۔ اس میں کپڑوں کے دو جوڑے تھے۔ راجستھانی لباس تھا۔ چیمٹ کی چولی، گھاگرا اور چنری۔ لباس کا جائزہ لینے کے بعد نائلہ نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور لباس کا ایک جوڑا سسی کی طرف بڑھا دیا۔ انہیں صرف پچھی ہوئی قمیص اتارنی پڑی تھی۔ گھاگرا سے شلوکاروں کے اوپر ہی پہن لئے تھے۔ سسی کو تو چولی ٹھیک آگئی تھی مگر نائلہ کے جسم پر بہت ٹائیٹ تھی۔ اس نے چنری اس طرح اوڑھ لی کہ سینہ چھپ گیا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد نائلہ نے دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ کھٹول اندر آ گیا اور گہری نظروں سے باری باری ان کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”میں نے گاڑی میں پیٹرول بھروانے کے لیے بھیجا ہے۔ وہ آجائے تو تم لوگوں کو یہاں سے روانہ کر دیتے ہیں۔“ سیٹھ کھٹول نے کہا۔

”کہاں بھجوا رہے ہیں آپ ہمیں؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”کاجیلو۔“ سیٹھ نے جواب دیا۔ ”وہاں میری بہن کا گھر ہے۔ ایک دو دن آرام سے وہاں رہنا، انپکڑ صوبہ خان یہاں سے ہو کر واپس چلا جائے گا تو میں تمہیں کراچی بھجوا دوں گا۔“

”آپ ہم سے اتنی ہمدردی کیوں کر رہے ہیں؟“ نائلہ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ارے بابا ہر کوئی صوبہ خان کی طرح وحشی تو نہیں ہوتا۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور انسانیت کا لوئی مذہب بھی نہیں ہوتا۔“ سیٹھ کھٹول نے جواب دیا۔

سیٹھ کھٹول نے بات تو ٹھیک کہی تھی کہ انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن نائلہ کو اس کی نیت پر شک تھا۔ کچھ جانے بوجھے بغیر وہ ان کی مدد کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس سے نائلہ کے شے کو مزید تقویت ملتی تھی لیکن بہر حال وہ چونکہ یہاں سے نکلتا چاہتی تھی اس لیے اس نے سیٹھ سے زیادہ جرح نہیں کی تھی۔  
 ”ندو کے کہنے کے مطابق صوبہ خان کو یہاں اپنی گاڑی کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی۔ وہ گاڑی کے لیے ان کی تلاش میں یہاں بھاگا آئے گا اور وہ اسی لیے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔“

آدھے گھنٹے بعد گاڑی آگئی لیکن یہ وہ گاڑی نہیں تھی جو یہاں سے گئی تھی۔ جب نما اس گاڑی کے نازر ماسے جوڑے تھے۔ اس کے پچھلے حصے میں پیٹرول کے دو جیری کین اور پانی سے بھرا ہوا پلاسٹک کا ایک بڑا ایندھن بھی رکھا ہوا تھا۔

”بیٹھے دیوی جی۔“ سیٹھ کھٹول نے کہا۔ ”میرے یہ دو آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے اور تمہیں کاجیلو میں میری بہن کے گھر چھوڑ کر واپس آجائیں گے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم لوگ کہاں ہو۔ جب صوبہ خان یہاں سے ہو کر چلا جائے گا تو میں خود کاجیلو آؤں گا اور تمہیں کراچی بھجوانے کا بندوبست کر دوں گا۔ وہاں سے تم جہاں چاہو چلی جاؤ۔“



جیب نما اس گاڑی کی دونوں سیٹیں آٹے سائے تھیں۔ ایک آدمی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسرا پچھلی سیٹ پر۔ ٹائلڈ اور سسی اس کے سائے والی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور جیب حرکت میں آگئی۔ ٹائلڈ نے سیٹھ کھٹول کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

جیب آبادی کی طرف جانے کے بجائے اس کے متوازی ایک کچے راستے پر دوڑنے لگی۔ تقریباً "تین چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیب اس سڑک پر آگئی جو بخش علی لاشاری سے شروع ہو کر ٹانڈے وارو کے قریب سے ہوتی ہوئی بھارتی سرحد کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ سڑک نیم پختہ تھی۔ اس سڑک پر چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیب بائیں طرف ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔

اس کچے راستے پر دو تین گھنٹوں کے سفر کے بعد کاجیلو کی آبادی نظر آنے لگی۔ مزید آدھے گھنٹے بعد وہ آبادی میں پہنچ گئے۔ جیب ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے نیچے اتر کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ ایک ہندو عورت نے کھولا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر وہ آدمی ٹائلڈ اور سسی کو لے کر اندر چلا گیا۔

اس مکان میں دروازہ کھولنے والی ادھیڑ عمر عورت کے علاوہ ایک جوان لڑکی اور دو بچے بھی تھے۔ ٹائلڈ اور سسی کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ وہ آدمی انہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی سی دیر بعد وہی آدمی دوبارہ آگیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ وہ ٹائلڈ کو ایک طرف لے گیا۔

"ابھی ابھی ایک آدمی بخش علی لاشاری سے آیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسپکٹر صوبہ خان لاشاری پہنچ چکا ہے اور اب کاجیلو آنے والا ہے۔ سیٹھ کھٹول نے پیغام بھیجا ہے کہ تم لوگوں کو فوراً "یہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیا جائے۔ جیب باہر کھڑی ہے۔ تم دونوں تیار ہو تو چلو۔"

"اب کہاں جانا ہو گا؟" ٹائلڈ نے گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں سے چند میل آگے... وہی ایک محفوظ جگہ ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

تھوڑی سی دیر بعد وہ جیب آبادی سے نکل رہی تھی۔ ٹائلڈ اور سسی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ ان کے سامنے وہی آدمی بیٹھا تھا جو پیغام لے کر آیا تھا اور ڈرائیور کے ساتھ دوسرا آدمی تھا۔ آبادی سے نکلتے ہی جیب کی رفتار تیز ہو گئی۔ راستہ کچا ہونے کی وجہ سے جیب اچھل رہی تھی اور انہیں بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ تقریباً "دو گھنٹوں تک سفر کرتے رہے۔ ان کے چاروں طرف ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی سندھ میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ادھر ادھر اشارے بھی کر رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر سسی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے چیزی سے چہرہ ڈھانپ لیا اور ٹائلڈ کی طرف جھک کر کچھ سرکوشی کی۔

"جیب روکو بھی ڈرائیور کو۔" ٹائلڈ نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے؟" ڈرائیور کا لہجہ کٹ کھانے والا تھا۔

ٹائلڈ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف جھک کر مدہم سے لہجے میں کچھ کہا۔ اس آدمی نے سندھی زبان میں ڈرائیور کو بتایا کہ یہ چھوکیاں جیب کیوں روکنا چاہتی ہیں۔ اس ڈرائیور نے رفتار کم کر دی اور بالا خر جیب رک گئی۔

"اس طرف چلی جاؤ... مگر زیادہ دور نہیں جانا۔ اور جلدی واپس آنا۔" ڈرائیور بولا۔

وہ دونوں جیب سے اتر گئیں۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ وہ دونوں جیب سے تقریباً "بیس  
مکز دور جا کر جھاڑیوں کے قریب بیٹھ گئیں۔

"ادی! یہ لوگ ہمیں راجستھان لے جا رہے ہیں۔ راجستھان تو ہندوستان میں ہے۔" سسی نے نالکہ  
کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

"کیا؟" نالکہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"ڈرائیور اور اس کا ساتھی راستے میں یہی باتیں کر رہے تھے۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ وہ آدھی رات  
کے وقت سرحد پر پہنچیں گے۔ سینٹھ کھٹول نے راجستھان میں اپنے آدمیوں کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ لوگ  
سرحد پر پہنچ جائیں گے اور یہ لوگ ہمیں ان کے حوالے کر کے واپس آجائیں گے۔" سسی نے سرگوشی میں  
یا۔

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ اب ہم راستے ہی میں ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔" نالکہ نے  
ما۔

"اس لیے تو میں نے تم سے بہانہ بنا کر جیب رکوانے کو کہا تھا۔" سسی نے کہا۔

"تم نے واقعی بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے سسی۔" نالکہ بولی۔

"میں سے بھاگ نکلیں۔" سسی نے کہا۔

"نہیں۔" نالکہ نے جواب دیا۔ "اس ریگستان میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ ہمیں زیادہ دور نہیں  
نے دیں گے۔ ویسے بھی ان کے پاس پستول وغیرہ ہوں گے۔ اس طرح بھاگنے کی کوشش کرنا ہمارے لیے  
رناک ہو گا۔ اب واپس چلو۔ کہیں انہیں شبہ نہ ہو جائے گا۔"

دونوں اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی واپس آکر جیب پر سوار ہو گئیں۔ اس کے فوراً ہی بعد جیب  
ت میں آگئی۔

"کتنی دور جانا ہو گا۔ تم تو کہتے تھے کہ چند میل کا فاصلہ ہے۔" نالکہ نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے  
کی کو مخاطب کیا۔

"خاموش بیٹھی رہو جھو کری۔" اس شخص نے غراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم پہلے ہی رابستہ بھول گئے  
پتہ نہیں کتنی دور اس ریگستان میں بھٹکنا پڑے۔"

نالکہ خاموش ہو گئی۔

تقریباً "آدھا گھنٹہ مزید سفر کرنے کے بعد جیب رک گئی۔ جیب کے ہیڈلیمپس کی روشنی میں سامنے دو  
تے نظر آ رہے تھے۔ دونوں راستے بھی ٹریک سے بنے ہوئے تھے۔ ڈرائیور اور اس کا ساتھی آپس میں  
کر رہے تھے۔ نالکہ کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے جسم پر اوڑھی ہوئی اجرک سے ہاتھ باہر  
تو اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر نالکہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ سسی کی باتوں کی تصدیق  
تھی اور نالکہ کا خیال بھی درست نکلا تھا کہ یہ لوگ مسلح ہوں گے اور سینٹھ کھٹول کی ہمدردی کا راز بھی  
نہا تھا۔

نالکہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے پستول والے ہاتھ کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے اچانک ہی جھپٹا  
اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے اس کے  
سے ہار کیا۔

وہ شخص اس طرح جیغ اٹھا جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ وہ دوسرے ہاتھ سے کندھا تھامے سیٹ پر لڑھک گیا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور یا اس کا ساتھی کچھ سمجھ سکتے نائلہ نے جب سے چلائنگ لگادی۔ اس کے ساتھ ہی سسی بھی چلائنگ لگا چکی تھی۔

”کوئی حرامزدگی مت کرنا۔“ نائلہ ڈرائیور اور اس کے ساتھی پر پستول تانے ہوئے غرائی۔ ”انجن بند کر دو اور تم دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر ہیڈلیمپس کی روشنی میں آ جاؤ۔ ایک مرتبہ پھر کہہ دی ہوں کہ کوئی حرامزدگی مت کرنا۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا چھو کری۔“ ڈرائیور نے انجن بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہیں اس بد معاش صوبہ خان سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور تم۔۔۔“

”بند کرو بکواس۔“ نائلہ غرائی۔ ”صوبہ خان سے بچانے کا لالچ دے کر تم ہمیں راجستھان لے جانا چاہتے ہو۔ ہم تمہاری تمام باتیں سن چکے ہیں لیکن ہم کوئی نیلائی کا مال نہیں ہیں۔ اتر آؤ نیچے اور کوئی حرامزدگی نہیں۔“

وہ دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر جب سے اتر کر ہیڈلیمپس کی روشنی میں کھڑے ہو گئے۔ نائلہ نے جیب کی آڑ لے کر ان کے تیسرے ساتھی کو گرفت میں لے کر پستول کی نال اس کی کینٹی سے لگادی۔

”تم دونوں کے پاس جو بھی اسلحہ ہے وہ نکال کر نیچے پھینک دو اور مڑ کر کم از کم دس قدم پیچھے چلے جاؤ۔ اگر کوئی گزربوکی تو میں اس کی کھوپڑی اڑا دوں گی۔“ نائلہ نے غراتے ہوئے کہا۔

”تمہیں شاید ہماری باتوں میں راجستھان کا نام سن کر غلط فہمی ہوئی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”ہم تو آپس میں یہ بات کر رہے تھے کہ کیسے راستہ بھٹک کر راجستھان کی طرف نہ نکل جائیں۔ سرحد یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ اس طرف سفر کرنے والوں کو اکثر یہ ڈر رہتا ہے۔“

”میں سندھی نہیں جانتی مگر یہ لڑکی۔“ اس نے سسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ لڑکی سندھی ہے۔ اس نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ اسی لیے بہانے سے ہم نے جب رکوائی تھی۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ سسی! نائلہ نے سسی کو مخاطب کیا۔ ”انہیں بتاؤ یہ کیا باتیں کر رہے تھے۔“

اور جب سسی نے سندھی میں بات کی تو وہ دونوں بری طرح اچھل پڑے۔

”اب اپنے پستول نکال کر پھینک دو اور مڑ کر دس قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔“ نائلہ غرائی۔

ان دونوں نے پستول نکال کر پھینک دیئے اور مڑ کر دس بارہ قدم پیچھے ہٹ گئے۔

”چلو تم بھی ان کے ساتھ۔“ نائلہ نے تیسرے کو بھی جیب سے انارکرن کی طرف دھکیل دیا۔ اور پھر آگے بڑھ کر دونوں پستول اٹھا کر جیب میں ڈال دیئے اور سسی کو اشارہ کرتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سسی بھی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ نائلہ نے جیسے ہی انجن اشارت کیا وہ تینوں جیب کی طرف مگھوم گئے۔

”بھگوان کے لیے ہمیں یہاں چھوڑ کر مت جاؤ۔۔۔ ہم اس ریگستان میں مرجائیں گے۔ تم جو کوگی ہم کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں یہاں چھوڑ کر مت جاؤ۔ ہم مرجائیں گے۔“ ڈرائیور نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”تم لوگوں نے چونکہ ہمارے ساتھ ابھی تک کوئی زیادتی نہیں کی اس لیے زندہ چھوڑ کر جا رہی ہوں اگر تم کسی آبادی تک پہنچ جاؤ تو تمہاری قسمت۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”نہیں! ڈرائیور چیخا۔ ”تمہیں اپنے اللہ کی قسم۔۔۔“

نالکھ نے پستول والا ہاتھ آگے بڑھا کر گولی چلا دی۔ جو ان سے تقریباً ”دو فٹ“ آگے ریت میں دھنس گئی۔

”اگر کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو دوسری گولی اس کے سینے میں لگے گی۔“ نالکھ نے غراتے ہوئے کہا اور جیب کو میٹر میں ڈال دیا۔

جیب ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی نالکھ نے بڑی تیزی سے اسٹیرنگ دائیں طرف گھمادیا تھا۔۔۔ جیب ان تینوں سے چند فٹ کے فاصلے سے نکل گئی۔ وہ تینوں چیختے ہوئے جیب کے پیچھے دوڑے۔ لیکن جیب بہت آگے نکل گئی تھی۔

نالکھ نے جیب اس راستے پر ڈال دی جو دائیں طرف کو قدرے ترچھا چلا گیا تھا۔ وہ رفتار بڑھاتی جا رہی تھی۔ سسی نے دونوں ہاتھوں سے سامنے ونڈ شیلڈ کے ساتھ لگے ہوئے راڈ کو پکڑ رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر نالکھ نے جیب کی رفتار کم کر دی۔

”تم تو بڑی ہمت والی ہو ادی۔“ سسی نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”عورت اگر ہمت سے کام لے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست نہیں دے سکتی۔ اب دعا کرو کہ ہم کسی آبادی تک پہنچ جائیں ورنہ کسی ریگستان میں راستہ بھٹک جانے کا مطلب تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔“

”اللہ سائیں نے چاہا تو ہم خیریت سے کسی بستی تک پہنچ جائیں گے۔“ سسی نے کہا۔

جیب تقریباً ”ایک گھنٹہ“ تک چلتی رہی۔ نالکھ نے ایک جگہ جیب روک کر جبری کین میں سے ٹنکی میں پیٹرول اور ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔

مزید آدھا گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ریت کے نیلے شروع ہو گئے اور ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں وہ راستہ غائب ہو گیا جس پر اب تک وہ سفر کرتی رہی تھیں۔ جیب ٹیلوں میں گھومتی رہی مگر وہ راستہ نہیں ملا۔ نالکھ نے جیب روک لی۔

”کیا ہوا ادی؟“ سسی نے پوچھا۔

”ہم جس راستے پر سفر کر رہے تھے وہ ان ٹیلوں میں کہیں کھو گیا ہے۔ مجھے ذرا سوچنے دو۔“ نالکھ نے کہا اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔

وہ تقریباً ”دس منٹ“ وہاں رکی رہی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بالاخر نالکھ جیب کو حرکت میں لے آئی۔ وہ علاقہ بھی کچھ عجیب سا تھا۔ ریت سخت تھی اور کہیں کہیں پتھر ملی زمین بھی تھی۔ کبھی تو بھر بھری زمین آجائی کبھی نرم ریت اور کبھی پتھر ملی زمین۔۔۔ نالکھ جیب کو ٹیلوں کی انہی بھول بھلیوں میں گھماتی رہی۔

دفعۃً ”ایک زوردار دھماکہ“ ہوا جیسے ان کی جیب کے نیچے بم پھٹا ہو۔ ان دونوں کے منہ سے بے اختیار نہیں نکل گئی تھیں۔ جیب لڑکھڑانے لگی۔ اور پھر یکایک نالکھ کو احساس ہوا جیب کیوں لڑکھڑا رہی ہے۔ اس نے بریک پر پیر رکھ دیا اور انجن بند کر کے نیچے اتر آئی۔

وہ جیب کے چاروں طرف گھوم کر ٹائروں کا جائزہ لینے لگی۔ بائیں طرف کا پچھلا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ ٹائر ’سی‘ نو کیلے پتھر سے برسٹ ہوا تھا۔ نالکھ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا ادی؟“ سسی نے نیچے اترتے ہوئے پوچھا۔

”ٹائر پھٹ گیا ہے اور جیب میں کوئی فالٹو ٹائر بھی نہیں ہے۔“ نالکھ نے جواب دیا۔

”اب کیا ہوگا؟“ سسی کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا گئے۔

”جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔“ نالکھ نے کہا۔ ”چلو بیٹھو۔ دیکھتے ہیں اس پٹے ہوئے ٹائر سے ہم کہاں تک جا سکتے ہیں۔“

وہ دونوں پھر جپ پر بیٹھ گئیں۔ نالکھ نے انجن اشارت کر دیا۔ اور پھر جپ لڑکھرائی ہوئی ریچنے لگی۔ اس کی رفتار بیل گاڑی سے زیادہ نہیں تھی۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد جپ کو جھٹکے لگنے لگے۔ نیلوں کے درمیان زمین چٹری سی تھی اور ٹائر کے چھترے بن گئے تھے۔ آہنی رم زمین پر کھٹ رہا تھا جس سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

آگے ایک بار پھر نرم ریت کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ بغیر ٹائر والا پیہر ریت میں دھنس گیا۔ اب ان کے لیے جپ پر سفر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ نالکھ نے انجن بند کر دیا اور سسی کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب کیا ہو گا ادا؟“ سسی کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

”آرام سے یہاں بیٹھی رہو۔“ نالکھ نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے رات ختم ہونے والی ہے۔ دن نکلے گا تو دیکھا جائے گا۔“

”اگر ہمیں کوئی راستہ نہ ملا تو؟“ سسی بولی۔

”تو پھر یہ ریگستان ہو گا اور ہم ہوں گے۔“ نالکھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دونوں اپنی اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر تک باتیں کرتی رہیں اور پھر دونوں ہی اوجھٹنے لگیں۔ یہ دوسری رات تھی جو جاگتے ہوئے گزر رہی تھی۔ کل رات کے آخری پر جنگ فیلڈری کی کوٹھری میں کچھ دیر سونے کا موقع ملا تھا لیکن پھر گلزاری اور تندو کی وجہ سے وہ ڈسٹ ہو گئی تھیں۔ اور پھر سیٹھ کھٹول نے انہیں کا پیلو بھیج دیا تھا۔ وہ بظاہر ان سے ہمدردی کا اظہار کرتا رہا تھا لیکن اس کی نیت میں اسی وقت فہم آ گیا تھا جب اس نے انہیں دیکھا تھا۔ نالکھ بے حد حسین تھی۔ اسے دیکھ کر کھٹول کے عیار ذہن نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنا لیا تھا۔

سیٹھ کھٹول بھی دوسرے ہندوؤں سے مختلف نہیں تھا۔ وہ اگرچہ ہمیں پیدا ہوا تھا۔ ہمیں پلا بڑھا تھا لیکن پاکستان کے نام سے اسے شدید نفرت تھی۔ اس کے باپ نے بچپن ہی سے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم ہی غلط ہوئی تھی۔ یہ سرزمین ہندوؤں کی ملکیت تھی جس پر پاکستان کے نام سے سرحد کی لکیر کھینچ دی گئی تھی۔

ہندوؤں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ پاکستان کا وجود قائم نہیں رہنے دیں گے۔ کچھ اپنوں کی نااہلی اور کچھ ہندو کی سازشوں سے پاکستان کا ایک حصہ تو الگ ہو چکا تھا اور اب ان ہندوؤں کی نظریں سندھ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ سندھ کو پاکستان سے الگ کرنے کی سازشیں کر رہے تھے اور یہ بھارتی حکمرانوں کی خوش قسمتی تھی کہ سرحدوں پر ہندو آبادی کے علاوہ انہیں اندرون سندھ اور حیدر آباد اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں ایسے بے ضمیر لوگ مل گئے تھے جو دولت کے لالچ میں اپنے ہی ملک کی جزیں کھوکھلی کر رہے تھے۔

بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی را کے ایجنٹوں نے سندھ پر یلغار کر رکھی تھی۔ بھارت سے ملنے والی سندھ کی سرحد بہت طویل تھی۔ ان بھارتی ایجنٹوں کی سرحد پر آمد و رفت میں کبھی بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کیونکہ انہیں سرحد کے ساتھ ساتھ آباد سیٹھ کھٹول جیسے ہندوؤں کا تعاون حاصل تھا۔

سیٹھ کھٹول بھی درحقیقت را کا ایجنٹ ہی تھا۔ اس نے راجستھان میں واقع را کے ایک ٹریننگ کیمپ میں باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ وہ مینے میں ایک بار ضرور بھارت جاتا تھا جہاں سے اسے باقاعدہ پروگرام

دیئے جاتے تھے۔ ویسے بھی راے اس کا رابطہ رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک طاقتور ٹرانسمیٹر موجود تھا جس کے ذریعے اسے تازہ ترین ہدایات ملتی رہتی تھیں۔ اس کے آدمی اندرون سندھ اور بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے جو سماج دشمن عناصر اور بے ضمیر نوجوانوں کو دولت کا لالچ دے کر پھانستے اور سیٹھ کھٹول انہیں سرحد پار پہنچا دیتا جہاں دہشت گردی اور تحریک کار کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی برین واشنگ بھی کی جاتی اور ان کے دلوں میں پاکستان کے لیے نفرت پیدا کر دی جاتی اور جب ان نوجوانوں کو واپس پاکستان بھیجا جاتا تو اشارہ ملتے ہی یہ لوگ تباہی و بربادی اور قتل و غارت شروع کر دیتے۔ یہ لوگ اتنے سنگدل اور بے رحم بن جاتے کہ انہیں معصوم بچوں پر بھی ترس نہ آتا۔ یہ دہشت گرد نو عمر بچوں کو بھی گولیوں سے بھونک دیتے۔

سیٹھ کھٹول جیسے اور بھی کئی بااثر ہندو را کے ایجنٹوں کے لیے رابطے کا کام کر رہے تھے اور یہ لوگ سرحد کے ساتھ ساتھ پورے سندھ میں پھیلے ہوئے تھے۔ را کے ایجنٹوں کو پناہ اور سہولتیں فراہم کرنے کے علاوہ یہ لوگ پاکستان کی معیشت کو بھی نقصان پہنچا رہے تھے۔ سیٹھ کھٹول کے بارے میں سب ہی لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک بہت بڑا اسمگلر ہے۔ بخش علی لاشاری اور کاجیلو چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے لیکن یہاں اناج اور دیگر اشیاء کے ٹرک بھر بھر کر آتے تھے۔ یہ سامان لاکھوں کی آبادی کے لیے کافی ہوتا لیکن سامان سے لدے ہوئے ان ٹرکوں کو جوں کا توں بھارتی سرحد کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ ادنیوں کے قاتلوں کے ذریعے بھی اناج وغیرہ کی اسمگلنگ زوروں پر تھی۔ سیٹھ کھٹول کو انسپٹر صوبہ خان جیسے لوگوں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔

انسپٹر صوبہ خان کے بارے میں سیٹھ کھٹول نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اپنے افسروں کو بھی بلیک میل کرتا ہے۔ اس ڈویژن میں واقع سرحد کے ساتھ ساتھ تمام تھانوں کے انچارج صوبہ خان کے ہم رتبہ ہونے کے باوجود اس سے ڈرتے تھے۔ صوبہ خان پورے علاقے میں دندناتا بھرتا تھا۔ اس جیسا سفاک اور بے رحم انسان سیٹھ کھٹول نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ معمولی سی چوری کے شے میں پکڑے جانے والے لوگوں کو بھی گولی سے اڑا دیتا اور انہیں خطرناک ڈاکو یا اسمگلر ظاہر کر کے پولیس مقابلے کا نام دے کر معاملہ ختم کر دیا جاتا۔

کھٹول کو مقامی تھانیدار سے گزشتہ رات ہی پتہ چل گیا تھا کہ دو لڑکیاں انسپٹر صوبہ خان کی پاجیرو لے کر بھاگ نکلی ہیں اور صوبہ خان نے وائرلیس کے ذریعے تمام تھانوں کو اطلاع کر دی تھی کہ وہ لڑکیاں جہاں بھی نظر آئیں انہیں پکڑ کر اسے اطلاع دے دی جائے۔ سیٹھ کھٹول کو یہ خبر سن کر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ صوبہ خان کے چنگل سے تو آج تک کوئی زندہ نہیں نکلا تھا۔ بڑے بڑے نائی گرامی بد معاش اور ڈاکو بھی اس سے بھاگتا جاتے تھے چہ جائیکہ دو لڑکیاں نہ صرف اس کی قید سے بھاگ گئی تھیں بلکہ اس کی پاجیرو بھی لے گئی تھیں۔

سیٹھ کھٹول کو کل صبح سویرے ہی پتہ چل گیا تھا کہ قصبے سے تقریباً ”دو میل دور سڑک پر جل کر تباہ ہونے والی پاجیرو صوبہ خان ہی کی تھی۔ لیکن ان لڑکیوں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اگر وہ لڑکیاں پاجیرو کے درمیان میں مر چکی تھیں تو ان کی لاشیں تو ضرور ملتیں۔ لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اس روز کھٹول ان لڑکیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ سندھ نے بتایا کہ اس کی جنگل فیکٹری میں دو لڑکیاں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی کھٹول اچھل پڑا تھا۔ اس کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ دونوں وہی لڑکیاں تھیں

جو صوبہ خان کی پاجیرو لے کر بھاگی تھیں۔ اس کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا تھا کہ وہ ان لڑکیوں کو پلیٹ میں سجا کر صوبہ خان کے سامنے پیش کر دے گا تو صوبہ خان اس کا احسان مند ہوگا۔ دو تین روز بعد اس کا اونٹوں کا ایک قافلہ اسمگلنگ کا مال لے کر سرحد پار جانے والا تھا۔ لڑکیوں کا تحفہ ملنے کے بعد صوبہ خان اسے کچھ مزید سہولتیں فراہم کرے گا۔

لیکن جب سینٹ کھٹول نے نائلہ کو دیکھا تو اس کی نیت بدل گئی۔ نائلہ بے حد حسین تھی۔ اس کے عیار ذہن نے فوراً ہی ایک اور منصوبہ بنالیا۔ یہ اس کا تجربہ تھا کہ خوبصورت لڑکیاں تحریب کاری اور جاسوسی کے کاموں میں زیادہ کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی حسین لڑکیوں کے ذریعے ایسے بہت سے نوجوانوں کو پھنسیا جاسکتا ہے جن سے تحریب کاری اور دہشت گردی کا کام لیا جاسکتا ہو۔ اس نے نائلہ اور سسی کو فوری طور پر سرحد پار پہنچانے کا منصوبہ بنالیا تھا۔

دوسری طرف اس نے نائلہ کو یہ فریب دیا کہ انسپٹر صوبہ خان کو اپنی پاجیرو کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے اور وہ شام تک بخش علی لاشاری پہنچ جائے گا۔ کھٹول نے یہ تاثر دیا کہ وہ محض انسانی ہمدردی کی بناء پر ان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ انہیں کاجیلو میں اپنی بہن کے پاس بھیج رہا ہے اور جب صوبہ خان واپس چلا جائے گا تو وہ خود کاجیلو آئے گا اور انہیں کراچی بھجوانے کا بندوبست کر دے گا۔

کاجیلو میں شام کا اندھیرا پھیلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد سینٹ کھٹول کے وہی آدمی دوبارہ پہنچ گئے۔ ان کی آمد طے شدہ منصوبے کے مطابق تھی۔ انہوں نے نائلہ اور سسی کو یہ تاثر دیا کہ صوبہ خان یہاں پہنچ رہا ہے اور سینٹ کھٹول نے پیغام بھیجا ہے کہ ان دونوں لڑکیوں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ سینٹ کھٹول نے اپنے ٹرانسمیٹر کے ذریعے راجستھان میں واقع را کے ایک ٹریننگ کیمپ کو یہ اطلاع بھجوا دی تھی کہ آج آدھی رات کی وقت اس کے آدمی دو حسین لڑکیوں کو لے کر آرہے ہیں۔ منصوبے کے مطابق نائلہ اور سسی کو سرحد پر بھارتی ایجنٹوں کے حوالے کر دیا جاتا جو انہیں رام گڑھ نامی شہر پہنچا دیتے جہاں بھارتی انٹیلی جنس راکا تحریب کاری کا ایک ٹریننگ کیمپ واقع تھا۔

لیکن ان دونوں کو سرحد کی طرف لے جانے والے سینٹ کھٹول کے آدمی سرحد کی طرف جانے والے راستے سے بھٹک گئے۔ ڈرائیور اور اس کا ساتھی سندھی میں باتیں کر رہے تھے اور سسی ان کے منصوبے سے آگاہ ہو گئی۔ اگر ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ ان میں ایک لڑکی سندھی بھی ہے تو وہ دونوں اس قسم کی باتیں کرنے کی حماقت نہ کرتے۔

بہر حال، نائلہ اور سسی کو ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ جیپ میں پیٹرول کے دو فالتو جیری کین بھی رکھے ہوئے تھے اور نائلہ کا خیال تھا کہ اگر وہ صحرائیں سفر کرتی رہیں تو کسی نہ کسی آبادی تک پہنچ جائیں گی۔ لیکن بد قسمتی سے جیپ کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اور اس وقت وہ دونوں آنے والے وقت سے بے خبر اپنی اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھیں۔

نائلہ کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس نے سسی کی طرف دیکھا جو اب بھی سو رہی تھی۔ نائلہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ چاروں طرف صحرا تھا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔

کچھ دیر بعد سسی بھی بیدار ہو گئی۔ وہ دونوں کچھ دیر تک جیپ میں بیٹھی رہیں پھر نائلہ نے جیپ سے اتر کر پانی کا کنٹینر کھولا۔ منہ پر دو چار چھینٹے دیئے، چند گھونٹ پانی پیا اور جیپ پر کھڑی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سسی بھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس نے بھی چند گھونٹ پانی کے پئے اور نائلہ کے ساتھ جیپ پر کھڑی

ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”ادی!“ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ بڑا ٹیلا ہے نا! اس پر چڑھ کر دیکھتے ہیں شاید کوئی راستہ نظر آجائے۔“

”چلو۔“ نائلہ کستی ہوئی جیب سے اتر آئی۔ اس نے احتیاطاً ”جیب کی سیٹ پر رکھا ہوا پستول اٹھایا تھا۔

وہ ٹیلا وہاں سے تقریباً ”سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ریت میں چلتے ہوئے ان کے پیر دھنس رہے تھے۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ٹیلے پر پہنچ گئیں۔ یہ ٹیلا خاصا اونچا تھا اور یہاں سے چاروں طرف دور دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔

سورج بلند ہو گیا تھا۔ ان کے چاروں طرف ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ دھوپ کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ وہ آنکھوں پر ہاتھوں کے ہڈ سے بنا کر چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ دھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے فضا میں الاء سے دھکنے لگے ہوں۔ لہریں سی چل رہی تھیں۔

”ادی!“ وہ دیکھو ادھر... درخت نظر آرہے ہیں اور پانی بھی ہے۔ وہاں یقیناً ”کوئی آبادی بھی ہوگی۔“ سسی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

نائلہ اس طرف دیکھنے لگی۔ بہت دور پانی کی ایک وسیع و عریض جھیل تھی جس کے پرلے کنارے پر درختوں کی بہت لمبی قطار تھی۔ جھیل کا پانی لہریں لے رہا تھا اور درختوں کے سائے ہلتے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔

”چلو... اس جھیل کے پری طرف درختوں کے قریب یقیناً ”کوئی بستی ہوگی۔ وہ درخت زیادہ دور نظر نہیں آرہے۔ ہم گھٹے ڈیزھ گھٹے میں پہنچ جائیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ دونوں ٹیلے کے دوسری طرف اتر گئیں اور ریت پر تیز تیز چلنے کی کوشش کرنے لگیں۔ دھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی انہیں اپنے جسم پر سونیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ چلتی رہیں...

تقریباً ”دو گھنٹے بیت گئے۔ وہ چلتے چلتے بے دم سی ہو رہی تھیں۔ نائلہ نے رک کر دیکھا۔ وہ جھیل اور درختوں کے لہراتے ہوئے سائے اب بھی بہت دور نظر آرہے تھے۔ اس نے دابیں طرف دیکھا۔ اس طرف بھی ایک جھیل اور درختوں کے سائے دکھائی دے رہے تھے۔ نائلہ اسی طرف مڑ گئی۔ سسی بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

وہ مزید دو ڈھائی گھنٹوں تک چلتی رہیں لیکن وہ جھیل اور درخت اب بھی ان سے میلوں دور تھے۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ آسمان پر آگ برس رہی تھی اور ریت انگاروں کی طرح تپ رہی تھی۔ وہ دونوں ننگے پیر تھیں اور تپتی ہوئی ریت پر پیر رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جہنم کے کسی گرم ترین خطے میں پہنچ گئی ہوں۔

”ادی!“ سسی کے منہ سے کراہ نکلی۔ ”اب میں نہیں چل سکتی۔ مجھے پیاس لگی ہے ادی۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔“

”ہمت کرو سسی۔“ نائلہ نے اسے سارا دے کر اٹھایا۔ ”وہ دیکھو... اس طرف پانی نظر آرہا ہے۔ زیادہ فاصلہ نہیں ہے ہم جلدی وہاں پہنچ جائیں گے۔“

نائلہ نے سسی کو سارا دے کر چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اپنے چاروں طرف لہریں لیتا ہوا پانی



دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتاً "نالکہ کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا... سراب! ہاں... یہ یقیناً "سراب تھا جس کے پیچھے وہ اب تک بھاگتی رہی تھیں۔ نالکہ نے سراب کے بارے میں پڑھا ضرور تھا اور آج وہ اس "سراب" کے چکر میں پھنس گئی تھی....!!!

چاروں طرف لہرس لیتا ہوا پانی اور دیکھتے ہوئے الاؤ... نالکہ کے جسم پر سونیاں چھ رہی تھیں اور دماغ پکھلا جا رہا تھا۔ انہوں نے کچھ اور فاصلہ طے کر لیا، پھر دونوں ہی لڑکھڑا کر چٹی ہوئی ریت پر گر گئیں۔

"ادی! یا... نی..." سسی کے منہ سے مردہ سی آواز نکلی۔  
نالکہ کھنکنی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے سسی کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا۔  
"ہمت سے کام لو سسی۔" وہ مردہ سی آواز میں بولی۔ "دیکھو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں... لو... میری زبان چوس لو۔ شاید کچھ تسکین ہو جائے..." نالکہ نے اپنی زبان سسی کے منہ میں ڈال دی۔

وہ آدمے کھٹے تک وہاں بڑی رہیں اور ایک بار پھر اپنے آپ کو کھنکنی ہوئی آگے چلے گئیں۔ ہر چند قدم کے بعد وہ لڑکھڑا کر گر پڑتیں۔ صحرائی گرمی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ انھیں اپنے جسموں پر لباس بھی بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ چیزیں تو کب کی ان کے سروں سے گر چکی تھیں۔ سسی نے چولی بھی اتار کر پھینک دی۔ برہنہ جسم پر دھوپ زیادہ شدت سے چھوئے لگی۔ نالکہ نے اسے دوبارہ چولی پہنا دی۔

"ادی! میں مر جاؤں گی ادی! سسی کراہ رہی تھی۔  
"ہمت کرو سسی۔" نالکہ نے اسے سارا دیا۔ "وہ دیکھو... سامنے ایک ٹیلہ نظر آ رہا ہے۔ وہاں شاید ہمیں کچھ سایہ مل جائے۔ اس گرمی سے بچ جائیں گے۔"

چٹی ہوئی ریت میں ان کے پیروں میں چھالے بڑھ گئے تھے۔ وہ اس جہنم میں اپنی لاشوں کو سمیٹتی رہیں۔ ان میں جھپٹنا "اب چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔" جسم پینے میں شرابور تھے اور دونوں کی زبانیں سوکھ کر کاٹا ہو رہی تھیں۔

نالکہ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اسے زندگی میں اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ اب تک انسانوں کے خلاف جنگ لڑتی آئی تھی۔ اس نے قدم قدم پر موت کو شکست دی تھی اور اب فطرت کے خلاف جنگ لڑ رہی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا خوفناک ترین مرحلہ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ زندگی ہار جائے گی۔ مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور معصوم زندگی تھی جو محض اس کی وجہ سے اس معیشت میں جھلا ہوئی تھی۔ خود بدترین حالات کا شکار ہونے کے باوجود وہ اسے بھی تسلی دے رہی تھی۔ اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

نالکہ کو اپنی زبان حلق میں کانٹنے کی طرح جھپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے اس کا دم گھٹ جائے گا۔ وہ ٹیلہ اگرچہ زیادہ دور نہیں تھا مگر انہیں وہاں تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔

ٹیلے کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ ریت کا ایک تودہ سانپان کی طرح کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا جس سے تھوڑا سا سایہ ہو رہا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ دونوں مردوں کی طرح گر گئیں۔ سسی کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی پھر اس نے اٹھ کر ایک بار پھر اپنی چولی اتار دی۔ اسے یہ ہلکا سا لباس بھی اپنے جسم پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

سسی کی چولی پینے سے تر تھی۔ نالکہ کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا۔ اس نے سسی کے ہاتھ سے چولی لے لی۔ سسی ویران سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نالکہ نے اس کا سراپا گود میں

میں رکھ لیا اور چولی کی تہہ کر کے سسی کی حلق میں نچوڑنے لگی۔ چولی پسینے سے تر تھی۔ پانی کی ایک دھاری سسی کے حلق میں گرنے لگی۔ پسینہ بے حد نمکین تھا لیکن سسی کا حلق تر ہو گیا۔ وہ نائلہ کے ہاتھ سے چولی لے کر اسے چومنے لگی۔

نائلہ کی اپنی حالت بھی سسی سے مختلف نہیں تھی۔ لیکن وہ آہنی اعصاب اور مضبوط قوت ارادی کی مالک تھی۔ اس نے اپنے حواس بحال رکھے تھے۔ اس نے اپنی چولی بھی اتار لی۔ اس چولی سے پسینے کے چند اور قطرے سسی کے حلق میں نچکائے اور پھر خود اپنی چولی سے پسینہ چومنے لگی۔

نیلے کا سایہ ان کے لیے غنیمت ثابت ہوا تھا۔ سورج اگرچہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا مگر فضا میں تپش جوں کی توں موجود تھی۔ ان کے چاروں طرف الاؤ سے دپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے جسم جھلس رہے تھے۔ دماغ جیسے پچھلے جا رہے تھے۔

سورج مغرب کی طرف جھکتا چلا گیا اور تپش میں بھی بتدریج کمی آتی چلی گئی۔ سورج غروب ہوتے ہی ان کے چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ دور دور تک پھیلا ہوا سناٹا اور تاریکی... بڑا ہی وحشت ناک ماحول تھا۔ سسی 'نائلہ سے لپٹ گئی۔

سورج غروب ہونے کے بعد انہیں گرمی سے نجات مل گئی تھی لیکن تاریکی اور سناٹا ان کے دلوں کو دہلائے دے رہا تھا۔ قدرت کا نظام بھی بڑا ہی زالا ہے۔ یہی رات جس کی تپش دن میں انہیں جھلسا رہی تھی اب ٹھنڈی ہو کر ان کے لیے ایک نئی مصیبت لا رہی تھی۔ سسی کا بالائی جسم برہنہ تھا۔ نائلہ نے اس کی چولی اس کی طرف بڑھا دی اور اپنی چولی بھی پسینے لگی۔ کپڑے پہن لینے سے سردی کا احساس کسی حد تک کم تو ہو گیا لیکن نائلہ جانتی تھی کہ رات جیسے جیسے گرمی ہوتی جائے گی سردی بڑھتی جائے گی۔

”مسی!“ نائلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہئے۔ رات کو ٹھنڈک کی وجہ سے ہمارے لیے چلنا آسان ہو گا۔“

”ہم کہاں تک چلیں گے ادی۔“ سسی نے کراہتے ہوئے کہا۔

”چلتے ہی رہنے میں ہماری زندگی ہے سسی۔“ نائلہ بولی۔ ”اگر ہم کسی ایک جگہ پر رکیں تو اس پتے ہوئے صحرا میں بھوک اور پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں گے۔ چلو اٹھو۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جائیں گے۔“

”میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں ادی، کیسے چلوں گی...“ سسی بولی۔

”چھالے تو میرے پیروں میں بھی پڑ گئے ہیں لیکن ہم یہاں بیٹھے بیٹھے موت کا شکار نہیں ہو سکتے۔ آؤ... آہستہ آہستہ چلتے رہیں گے۔“ نائلہ نے کہا اور سسی کو سہارا دے کر اٹھا دیا۔

وہ ایک دوسرے کا سہارا لے کر چلتے لگیں۔ ان کی رفتار اگرچہ بہت کم تھی لیکن نائلہ کو یقین تھا کہ اگر وہ اسی طرح چلتی رہیں تو کسی نہ کسی جگہ پہنچ ہی جائیں گی۔

پیروں میں چھالے پڑ جانے کی وجہ سے ان کے لیے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر چند گز کے بعد انہیں تھوڑی دیر کے لیے رکتا پڑنا، لیکن بہر حال ان کا سفر جاری رہا۔

رات بڑھنے کے ساتھ ساتھ سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سردی سے ٹھنڈی گرتی پڑتی آگے بڑھتی رہیں۔ ایک مرتبہ سسی جو گرمی تو نائلہ کے لیے اسے اٹھانا مشکل ہو گیا۔ وہ بھی اس کے قریب ہی گر گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر ریت پر پڑی رہیں۔

ایک گھنٹے تک وہ اسی جگہ پڑی رہیں اور ایک بار پھر اٹھ کر چلنے لگیں۔ وہ رات کا پچھلا پھر تھا کہ نالکہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر دوبارہ لڑکھڑا کر گرئی۔ اس مرتبہ سسی نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ نالکہ کو سہارا دے کر کچھ دور تک کھینچتی رہی پھر خود بھی گر گئی۔ وہ دونوں بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

نالکہ کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ چلنا تو کیا اب اس کے لیے اٹھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا رہی تھی۔ نالکہ نے سر کو دو تین جھٹکے دیئے لیکن آنکھوں کے سامنے تاریکی گہری ہوتی چلی گئی اور وہ بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی۔

سسی کچھ دیر تک اسے ہلا جلا کر دیکھتی رہی پھر دھاڑیں مارتی ہوئی نالکہ پر گر کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ دیر تک نالکہ سے لپٹی روتی رہی اور پھر وہ بھی بے حس و حرکت ہو گئی۔

نالکہ ہوش میں آئی تو اسے اپنے سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ وہ سسی تھی جو اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے آہستگی سے سسی کو اپنے اوپر سے اٹھایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ رات بیت گئی تھی۔ دن کی روشنی پھیل گئی تھی۔ اس نے سسی کو ہلایا۔ سسی نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ نالکہ کو مردہ سمجھ چکی تھی لیکن اسے اپنے سامنے زندہ دیکھ کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

”تم زندہ ہوادی! میں تو سمجھی تھی...“ سسی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔  
 ”میں بہت سخت جان ہو سکی۔“ نالکہ مسکرائی۔ ”اتنی آسانی سے نہیں مر سکتی۔ چلو اٹھو... ہم دھوپ نکلنے سے پہلے پہلے کچھ فاصلہ طے کریں گے۔“

وہ ایک دوسرے کو سہارا دے کر چلنے لگیں۔ آدھے گھنٹے بعد سورج نکل آیا۔ دھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی پیش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گرتی پڑتی آگے بڑھتی رہیں۔

سورج سوائیزے پر پہنچ چکا تھا۔ پیاس کی شدت سے ان کی بری حالت ہو رہی تھی۔ نالکہ لڑکھڑا کر گر گئی اور سسی بھی اس کے ساتھ ہی گر گئی۔ اچانک نالکہ کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی روح تک کانپ گئی۔ تین چار گدھ ان کے سروں پر آسمان پر منڈلا رہے تھے۔ وہ گدھ شاید ان کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔

”سسی! اٹھو... آسمان پر منڈلاتے ہوئے یہ گدھ ہمارے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ چلتی رہو تاکہ ہم زندہ رہ سکیں۔“ نالکہ نے کہا۔

انہوں نے بڑی مشکل سے ایک گھنٹے کا فاصلہ طے کیا تھا کہ بہت دور کہیں سے دھوپ کی ایک لکیر اٹھتے دیکھ کر نالکہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”سسی... سسی...!!!!“ نالکہ نے سسی کو جھنجھوڑ دیا۔ ”ہم نے موت کو شکست دے دی۔ وہ دیکھو... سامنے دھواں اٹھ رہا ہے۔ آگے یقیناً کوئی بستی ہے۔“

دھواں دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گئیں۔ دوسری طرف تقریباً نصف میل کے فاصلے پر درختوں کا جھنڈ اور کچھ مکان نظر آرہے تھے۔ وہ کوئی چھوٹی سی بستی تھی اور دھواں اسی بستی سے اٹھ رہا تھا۔

نالکہ نے شلوار میں ازسا ہوا ہسپتال نکالا اور وقفہ وقفہ سے ہوائی فائرنگ کرنے لگی۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ کچھ لوگ بستی سے نکل کر سامنے آ گئے۔ نالکہ اور سسی ٹیلے سے اتر کر دوڑنے لگیں۔ بستی سے نکلنے

والے آدمی بھی ان کی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ نائلہ اور سسی کی ہمت جواب دے گئی۔ منزل کو قریب دیکھ کر اب وہ ہمت ہار بیٹھی تھیں۔ دونوں بیک وقت لڑکھڑا کر گریں۔ نائلہ کی آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر پھیلنے لگی اور پھر اس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا۔

..... \* \* \* .....

دلاور نے صوبہ خان کو پاجیرو کے سامنے دیکھ کر چادر کے نیچے کندھے پر سے رائفل اتارنا چاہی لیکن رائے منصور نے آگے جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں دلاور۔“ وہ مدہم لہجے میں بولا۔ ”ایسی کوئی حرکت مت کرنا۔“

دلاور نے رائفل سے ہاتھ ہٹالیا اور سامنے کھڑے ہوئے صوبہ خان کو دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ کم از کم چھ پولیس والے تھے جو مختلف جگہوں پر رائفلیں سنبھالے کھڑے تھے۔ اگر دلاور کچھ کر دکھانے کی کوشش بھی کرتا تو یقیناً ”اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔“

صوبہ خان چند لمبے پاجیرو کے سامنے تن کر کھڑا رہا پھر اس نے ایک کانٹیل کو اشارہ کیا۔ کانٹیل نے آگے بڑھ کر ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ لاک تھا۔ اس نے اشارے سے کرامت کو دروازہ کھولنے کو کہا۔

”دروازہ کھول دو۔“ رائے صاحب نے کرامت کو مخاطب کیا۔

کرامت نے دروازہ کھول دیا۔ انجن ابھی تک اشارت ہی تھا۔

”انجن بند کر دو اور نیچے اتر آؤ۔“ کانٹیل نے غرا کر کہا۔

کرامت خاموشی سے پاجیرو سے اتر گیا۔ صوبہ خان کے اشارے پر دوسرا کانٹیل رائے صاحب والے دروازے کی طرف بڑھا۔ رائے منصور دروازہ کھول کر خود ہی نیچے اتر آئے۔ دلاور نے بھی نیچے اترنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کی چادر سینے پر سے ہٹ گئی تھی اور اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی آٹومٹک رائفل اور گلے میں میگنیز والا بیلت صاف نظر آ رہا تھا۔

”رائفل اتار کر میرے آدمیوں کے حوالے کر دو دلاور۔“ صوبہ خان نے کہا۔

دلاور نے رائے منصور کی طرف دیکھا اور پھر رائے منصور کا اشارہ پا کر اس نے رائفل کندھے سے اتار کر قریب کھڑے ہوئے کانٹیل کی طرف بڑھا دی۔

”کیا تمہارے پاس اس رائفل کا لائسنس ہے؟“ صوبہ خان کے لہجے میں غراہٹ تھی۔

دلاور نے جیب سے لائسنس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ صوبہ خان نے لائسنس کھول کر دیکھا اور پھر اس کے ٹکڑے کر کے پرزے ہوا میں اڑا دیئے۔

”کیا بات ہے انسپکٹر؟ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ یہ لائسنس ایک قانونی دستاویز ہے اور کسی قانونی دستاویز کو اس طرح ضائع کرنا جرم ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”قانونی دستاویز؟“ صوبہ خان کے ہونٹوں پر کسم کسم سی مسکراہٹ آگئی۔ ”یہاں صرف اس دستاویز کو قانونی حیثیت حاصل ہے جس پر میرے دستخط ہوں۔ لوگ مجھے اس علاقے کا بے تاج بادشاہ کہتے ہیں اور یہاں صرف اور صرف میرا قانون چلتا ہے۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ رائے منصور نے اسے گھورا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ تم صرف ایک پولیس انسپکٹر ہو

اور تمہاری ذمہ داری قانون کا تحفظ اور عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنا ہے، نہ کہ انہیں لوٹنا اور ہراساں کرنا۔“

”میری ذمہ داری کیا ہے؟ یہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں لیکن صوبہ خان اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا رائے منصور۔“ صوبہ خان نے کہا۔

”تم بہت زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہو صوبہ خان۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”اور تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ اس وقت کس سے مخاطب ہو۔“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”پنجاب کا ایک چھوٹا سا زمیندار۔ لیکن پنجاب کی سرحد یہاں سے کئی میل دور ہے رائے منصور۔ یہ سندھ کا علاقہ ہے اور یہاں میری عمل داری ہے۔“

اس دوران کرامت بھی ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن دلاور سے اب خاموش نہیں رہا جاسکا تھا۔

”سن او کالے کوے۔“ وہ صوبہ خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہارے جسم پر یہ وردی نہ ہوتی تو اب تک میں تمہاری گردن مروڑ چکا ہوتا۔ لیکن اب اگر تم نے رائے صاحب کی شان میں گستاخی کی تو میں اس وردی کا لحاظ بھی نہیں کروں گا۔“

”سنا ہے کہ بہت نہکا ہے تمہارا ضلع رحیم یار خان میں۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”لیکن یہ رحیم یار خان نہیں، سندھ کا علاقہ ہے۔ یہاں تو ایسی ایسی جیلیں ہیں جہاں کسی قیدی کو ڈال دیا جائے تو اس کا سراغ نہیں ملتا۔ میں نے تمہارے لیے بھی ایک ایسی ہی جیل کا انتخاب کر رکھا ہے۔“

”اور تمہاری وہ جیل ہم نے سیل کرادی ہے۔“ رائے منصور نے کہا۔

”مجھے تو اسی وقت اطلاع مل گئی تھی جب تم لوگ اس تھانیدار کے ساتھ میری حویلی کی طرف گئے تھے اور وہ اے سی، کل کا چھوکر، اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ صرف ایک دو دن کی بات ہے پھر نہ تو حلال کی روٹی کھانے والا وہ تھانیدار رہے گا اور نہ وہ اے سی۔ لیکن ان کے ساتھ تو بعد میں منٹا جائے گا مگر اس سے پہلے میں تم لوگوں سے نمٹ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ تم لوگوں کے بارے میں مجھے اسی وقت اطلاع مل گئی تھی جب تم لوگ گھونکی سے روانہ ہوئے تھے۔ میں تو بہت دیر سے یہاں تم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ ملنگ خان....“ وہ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ذہانتی کی اس واردات میں کتنے آدمی مارے گئے تھے؟“

”تین آدمی سائیں۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ ایک ایک آدمی ان کے حصے میں آتا ہے۔“ صوبہ خان نے کہا، پھر رائے منصور کی طرف مڑ گیا۔ ”میں اگر چاہوں تو ابھی اور اسی وقت تم تینوں کو چھٹی کر دوں۔ پولیس مقابلے میں ڈاکوؤں کا مارا جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بلکہ یہ پولیس مقابلے تو اس علاقے کی روایت ہے۔ صوبہ خان نے آج تک جتنے آدمیوں کو پولیس مقابلے میں مارا ہے وہ سندھ پولیس کا ریکارڈ ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو پولیس کے نہیں، دوسرے طریقے سے سکا سکا کر ماروں گا۔ ملنگ خان! گرفتار کر لو ان تینوں کو۔“ صوبہ خان نے آخری الفاظ ہیڈ کانسٹیبل سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

”تمہیں یہ حرکت بہت متنگی پڑے گی صوبہ خان۔“ رائے منصور نے کہا۔

”صوبہ خان نے ہمیشہ منگے سودے کئے ہیں اور کبھی کھانے میں نہیں رہا۔“ صوبہ خان نے جواب دیا۔

”لیکن آج تم گھائے میں رہو گے صوبہ خان!“ کرامت نے بڑی پھرتی سے صوبہ خان کو اس طرح گرفت میں لے لیا کہ اس نے بایاں بازو صوبہ خان کے گلے پر پلٹ لیا تھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال اس کی کپٹی سے لگادی تھی۔

”اپنے آدمیوں سے کہو رانٹھلیں پھینک دیں ورنہ تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

صوبہ خان کا چہرہ کچھ اور سیاہ ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور پھینک دیا۔ اس سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ دلاور کی رانٹھلی تو اس نے قبضے میں لے لی تھی مگر ان کی جامہ تلاشی نہیں لی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رائے منصور کے ڈرائیور کے پاس بھی پستول ہو سکتا ہے۔

”میں تین تک گنوں گا صوبہ خان۔“ کرامت غرایا۔ ”اگر تم نے انہیں رانٹھلیں پھینکنے کا حکم نہ دیا تو تین کتے ہی ٹرانسگر دبا دوں گا... ایک... دو...“

کرامت کے تین کہنے سے پہلے ہی صوبہ خان چیخ اٹھا۔

”رانٹھلیں پھینک دو۔“

تمام کانشیلوں نے رانٹھلیں پھینک دیں۔ دلاور نے لپک کر اپنی آٹومٹک رانٹھلی اٹھالی اور اس کا رخ صوبہ خان کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

”اپنے آدمیوں سے کہو کہ کھیتوں کی طرف رخ کر کے دوڑ لگا دیں۔ اگر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گولی سے اڑا دوں گا۔“

صوبہ خان نے اس کا حکم اپنے ماتحتوں تک پہنچا دیا۔ تمام پولیس والے کھیتوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے واقعی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

”نیچے بیٹھ کر اپنے جوتے اتار دو... جلدی کرو۔“ دلاور غرایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے سڑک پر پڑے ہوئے صوبہ خان کے ریوالور کو پیر سے ٹھوکر مار کر دوڑ ہٹا دیا تھا۔

صوبہ خان نے سڑک پر بیٹھ کر جوتے اتار دیئے۔ دلاور نے اس کی یونیفارم بھی اتروالی تھی۔ اب صوبہ خان کے جسم پر صرف انڈرویئر اور بنیان رہ گئی تھی۔

”یہ پولیس مقابلہ تمہیں بیش یاد رہے گا صوبہ خان۔“ دلاور نے کہا۔ ”اب تم بھی اپنے آدمیوں کے پیچھے دوڑ لگا دو... پیچھے مڑ کر دیکھا تو بھون دوں گا۔“

صوبہ خان نے خونخوار نگاہوں سے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا اور کھیتوں کی طرف دوڑ لگادی۔ رائے منصور کے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا تھا۔

”اس وردی کا کیا کروں رائے صاحب۔“ دلاور نے پوچھا۔

”اسے گاڑی میں رکھو اور کرامت... گاڑی پہلے ماتھیلو کے تھانے کی طرف لے چلو۔“ رائے منصور نے کہا۔

انہوں نے صوبہ خان کے ریوالور یا کانشیلوں کی رانٹھلی کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ وہ تینوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کرامت نے انجی اشارت کر کے گاڑی تیز رفتاری سے ماتھیلو شہر کی طرف دوڑادی۔

تھانے کے سامنے گاڑی روک کر دلاور نیچے اتر آیا۔ صوبہ خان کی وردی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وردی تھانے کے گیٹ کے اندر کھڑے ہوئے سنتری کے حوالے کردی۔

”یہ کیا ہے اور تم... تم وہی تو نہیں جو پہلے بھی آئے تھے؟“ سنتری بولا۔

”ہاں“ میں وہی ہوں اور یہ تمہارے انپکڑکی وردی ہے۔ وہ آئے تو اسے دے دیتا....“ دلاور کہتا ہوا واپس آگیا۔

اس کے بیٹھے ہی کرامت پاجیرو کو حرکت میں لے آیا۔ شہر کی سڑکوں پر سناٹا تھا۔ پاجیرو تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی شہر سے نکل کر صادق آباد کی طرف جانے والی نیشنل ہائی وے پر نکل آئی۔ اس سڑک پر آتے ہی کرامت نے پاجیرو کی رفتار بڑھا دی۔

”تم نے صوبہ خان کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے وہ اسے زندگی بھر یاد رہے گا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”لیکن میں نائلہ کی طرف سے پریشان ہوں۔ وہ پتہ نہیں کہاں ہوگی اور اس کے ساتھ سسی کا کیا حال ہوگا۔“ ”نائلہ بی بی کے بارے میں آپ پریشان نہ ہوں رائے صاحب۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”اس نے شبیر درانی کو لوہے کے پتے چبوا دیئے۔ وہ صوبہ خان جیسے شخص کی قید سے بھاگ نکلی۔ صوبہ خان وہ شخص ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس کا کوئی شکار آج تک اس کے چنگل سے نہیں نکلا لیکن نائلہ بی بی نے اس شخص کی قید سے فرار ہو کر اس کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا ہے جسے وہ مرتے دم تک نہیں بھولے گا۔ آپ نے وہ حویلی دیکھی ہے۔ وہاں سے کسی کے لیے فرار ہونا ممکن نہیں لیکن آپ نے دیکھا کہ نائلہ سسی کو لے کر وہاں سے کس طرح بھاگ نکلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نائلہ بی بی جہاں بھی ہوگی خیریت سے ہوگی اور وہ سسی کا بھی پوری طرح خیال رکھے گی۔ دیکھتے ہیں، اگر ایک دو دن تک اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تو میں خود اس کی تلاش میں نکلوں گا۔“

”ہاں... دیکھتے ہیں۔ سندھ میں میرے بھی دو چار وڈیروں سے تعلقات ہیں میں انہیں بھی نائلہ اور سسی کی تلاش کے سلسلے میں آگاہ کر دوں گا۔“ رائے منصور نے جواب دیا۔

پاجیرو صادق آباد شہر سے پہلے ہی احمد پور لاما کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی اور جب وہ حویلی پہنچے تو صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ دلاور حویلی کے گیٹ پر ہی پاجیرو سے اتر کر مسمان خانے والے مکان میں آگیا تھا۔

مسمان خانے کا نوکر سو رہا تھا لیکن پہلی دستک پر ہی اٹھ گیا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کاشٹکاروں کی زندگی کا ایک نیا دن شروع ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت بستر چھوڑ کر ڈھور ڈھگروں کے ساتھ کھیتوں کی طرف جانے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر دلاور نے رائے منصور کے ساتھ کھڑی کردی اور جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا اور پھر چند ہی منٹ بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

صبح جب دلاور کی آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ وہ اٹھنے ہی با تھ روم میں گھس گیا۔ جب وہ نماز کے باہر نکلا تو ملازم اس کے لیے ناشتہ لے آیا۔ وہ دلاور کے اٹھنے ہی ناشتہ لینے کے لیے حویلی چلا گیا تھا۔ رائے صاحب نے کہا ہے کہ ناشتہ کر کے حویلی آجائے۔ وہ صادق آباد جا رہے ہیں اور تم بھی ساتھ جاؤ گے۔“ ملازم نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔“ دلاور نے کہا اور بیٹھ کر اطمینان سے ناشتہ کرنے لگا۔

تقریباً پچیس منٹ بعد وہ تیار ہو کر حویلی میں رائے منصور کے سامنے موجود تھا۔

”ناشتہ کر لیا، تیار ہو؟“ رائے صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی تیار ہوں، کہاں جانا ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”فی الحال تو صادق آباد ہی جارہے ہیں لیکن ممکن ہے وہاں سے ہمیں ایک لمبے سفر پر جانا پڑے۔“  
رائے منصور نے کہا۔

”میں تیار ہوں سرکار۔“ دلاور نے جواب دیا۔  
”تو چلو۔“ رائے صاحب کرسی سے اٹھ گئے۔

کرامت باجو تیار کر چکا تھا۔ چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ ایک طویل سفر کر کے آئے تھے لیکن باجو اس طرح چمک رہی تھی جیسے ابھی شوروم سے نکلی ہو۔ رائے صاحب کو دیکھتے ہی اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ رائے صاحب کے بیٹھنے کے بعد دلاور نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی اور کرامت نے انیسٹرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔

احمد پور لاما کے بازار سے ہوتے ہوئے وہ صادق آباد جانے والی سڑک پر آ گئے۔ صادق آباد پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ رائے منصور کی ہدایت پر کرامت نے گاڑی پولیس اسٹیشن کے سامنے روک لی۔ رائے منصور اور ان کے پیچھے دلاور تھانے کے اندر چلے گئے۔ انیسٹر خلیل نے بڑے پر جوش انداز میں رائے منصور کا استقبال کیا۔

”میں نے کل دو تین مرتبہ فون کیا تھا مگر ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ آپ کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ کہاں ہوں گے۔“ انیسٹر خلیل نے انہیں کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”میں نالکہ درانی کی تلاش میں سندھ کی طرف نکل گیا تھا۔ ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد آج صبح ساڑھے چار بجے واپس آیا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو مجھے پیغام ملا تھا کہ آپ کا فون آیا ہے۔ فرمائیے کیسے یاد کیا؟“ رائے منصور نے کہا۔

”دلاور کی طرف سے درج کرائے جانے والی رپورٹ پر نالکہ درانی کی گاڑی پر حملہ کرنے اور اسے اغوا کرنے کے الزام میں جن تین زخمی ملزموں کو ریگستان سے گرفتار کیا گیا تھا انہوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ نالکہ درانی کی گاڑی پر حملہ ماتھیلو کے پولیس انسپکٹر صوبہ خان کے ایما پر کیا گیا تھا۔ اس حملے کا مقصد نالکہ درانی کو اغوا کرنا تھا۔“ انیسٹر خلیل نے بتایا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ رائے صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس حملے کے بعد صوبہ خان کم از کم دو مرتبہ نالکہ درانی کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے لیکن وہ دونوں مرتبہ اس کے چنگل سے بھاگ نکلی۔“ رائے منصور چند لمحوں کو خاموش ہوئے اور پھر پورے واقعہ کی تفصیل بتانے لگے۔ آخر میں وہ کہہ رہے تھے۔ ”صوبہ خان کا ایک آدمی ہم نے بھی گھونکی پولیس کے حوالے کیا ہے۔ اس نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ نالکہ کی گاڑی پر حملہ صوبہ خان کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ ملوک نامی وہ شخص خود بھی اس حملے میں شامل تھا۔ صوبہ خان کے خلاف اور بھی بہت سے سنگین جرائم کی شہادتیں ملی ہیں۔ گھونکی سے دو میل دور اس کی حویلی سربمہر کر دی گئی ہے اور اس کے خلاف کارروائی شروع ہونے ہی والی ہے۔ میں ایک دو روز میں سندھ پولیس کے اعلیٰ افسران سے مل کر کوشش کروں گا کہ اس کارروائی میں کوئی رخنہ نہ پڑنے پائے۔“

”ہم نے بھی کیس میں صوبہ خان کا نام شامل کر لیا ہے۔ کل یہ کیس مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا جائے گا اور میرا خیال ہے کہ مجھے عدالت سے انسپکٹر صوبہ خان کی گرفتاری کا وارنٹ مل جائے گا۔“  
انسپٹر خلیل نے کہا۔

”اور آپ کو یہ جان کر ہنسی آئے گی کہ کل رات واپسی پر انسپکٹر صوبہ خان نے ہمیں ڈیکیتی اور قتل کے



الزام میں گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی مگر دلاور نے اسے ننگا کر کے بھگا دیا۔" رائے منصور نے اس واقعہ کی تفصیل بتائی۔

"نمائتِ احمق آدمی ہے۔" خلیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بہر حال" میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ نائلہ درانی ایک اور لڑکی کے ساتھ صوبہ خان کی جس پاجیرو پر فرار ہوئی تھی وہ پاجیرو سندھ میں بخش علی لاشاری نامی قصبے کے قریب جلی ہوئی حالت میں ملی ہے۔ نائلہ اور دوسری لڑکی کا پتہ نہیں چل سکا لیکن اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نائلہ اسی علاقے میں کیس موجود ہے۔"

"اوہ!" رائے منصور چونک گیا۔ "آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"ان علاقوں میں ذرائع مواصلات اگرچہ نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن ایسی خبریں بڑی تیزی سے سفر کرتی ہیں۔" انسپکٹر خلیل نے کہا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور اس کے آدھے گھنٹے بعد دلاور ایک بس پر سوار میرپور ماٹیلو کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اپنی رانقل ساتھ نہیں لے جا رہا تھا لیکن اس کی جیب میں پستول موجود تھا۔

...●...●...●...

ہوش آنے پر نائلہ نے اپنے آپ کو ایک بھلا گاسی چارپائی پر پڑے ہوئے پایا۔ اس کا سر بے حد بو جھل ہو گیا تھا اور پورا جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھلنے کے بعد بھی اس کی نظروں کے سامنے کچھ دیر تک دھند سی چھائی رہی۔ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے اس کے آس پاس کچھ لوگ موجود ہوں۔ اسے اپنے سامنے بھی کچھ بیولے سے نظر آرہے تھے، گہری دھند میں لیٹے ہوئے بیولے... اس نے دائیں بائیں سر کو جھٹکے دیئے۔ اس کی نظروں کے سامنے چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی۔ بیولے جیسے انسانی مجسموں میں تبدیل ہونے لگے اور پھر اس کے سامنے کچھ انسانی چہرے واضح ہوتے چلے گئے۔

اس کے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ چہرے پر جھریاں، جیسے مکڑی نے جالاتان رکھا ہو۔ دھوپ جلی رنگت۔ ننگی بانسوں کی جلد پر بنے شمار دراڑیں نظر آرہی تھیں۔ اس نے نیلی چھینٹ کی مختصر سی چولی اور گھاگراپن رکھا تھا۔ اس کے ساتھ والی عورت جوان تھی۔ اس کی رنگت بھی دھوپ جلی تھی۔ ناک میں چوڑی جتنی بڑی تھ اور کانوں میں کئی کئی بالیاں تھیں۔ اس نے گہرے رنگ کی چولی اور گھاگراپن رکھا تھا۔ بانسوں میں لالہ اور رنگ برنگی پلاسٹک کی چوڑیاں اور پیشانی پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ نائلہ کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

نائلہ نے گردن گھما کر دائیں طرف دیکھا۔ اس طرف بھی دو عورتیں کھڑی تھیں۔ ان کے حلے بھی پہلی دو عورتوں سے مختلف نہیں تھے لیکن ان کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ ایک کی عمر تیس کے لگ بھگ اور دوسری تیس چوبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ان دونوں کی پیشانی پر بھی بندیا چمک رہی تھی۔ ان کی رنگت بھی دھوپ جلی تھی لیکن جسمانی لحاظ سے خاصی پرکشش تھیں۔ سب سے کم عمر لڑکی کے چہرے کے نقوش بھی خاصے وافر تھے۔

"میں کہاں ہوں اور... سسی کہاں ہے؟" نائلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ایک عورت نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سارا دیا۔ "تم ہوس میں آگئیں۔ اب تم ٹھیک

ہو جاؤ گی۔ ڈرو نہیں، ہم تمہارے دامن نہیں ہیں۔“  
 ”یہ... یہ کون سی جگہ ہے؟“ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئی پوچھا۔ ”میں یہاں کیسے آئی۔ میں تو ریگستان میں...“

”تم دونوں ریگستان میں بے ہوش ہو گئی تھیں۔“ اسی عورت نے جواب دیا۔ ”یہ راجستھان کا گاؤں گٹ والا ہے۔ تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟“  
 ”راجستھان!“ نائلہ چونک گئی۔ ”اور وہ... وہ سہی...“

”دوسری لڑکی ٹھیک ہے۔“ اس عورت نے جواب دیا۔ ”تم لوگ کہاں سے آئی ہو؟ بنتو!“ وہ عورت کم عمر لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”کھیا کو بلا کے لا۔ کہنا وہ لڑکی ہوش میں آگئی ہے۔“  
 حسین نقوش والی لڑکی جسے بنتو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، جلدی سے باہر نکل گئی۔ نائلہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی تھی۔ ایک عورت نے مٹی کے پیالے میں پانی اس کی طرف بڑھا دیا۔ نائلہ اس وقت واقعی بڑی شدت کے ساتھ پیاس محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیالہ تھام لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئی۔ اس نے پیالہ واپس کر دیا اور سر کو پھر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس عورت نے بتایا تھا کہ راجستھان کا گاؤں گٹ والا ہے۔ سینھ کھٹول کے آدی انہیں راجستھان ہی لے جانا چاہتے تھے اور وہ انہیں دھوکا دے کر بھاگ نکلی تھیں۔ ایک دن اور دو راتیں صحرا میں بھٹکنے اور موت سے لڑتے رہنے کے بعد وہ راجستھان پہنچ گئی تھیں۔ ریگستان میں انہیں اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ انہوں نے کب سرحد پار کی تھی اور گٹ والا یہ گاؤں سرحد سے کتنی دور تھا۔

نائلہ یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر آدی اندر داخل ہوا۔ وہ درمیانے قد کا قدرے بھاری بھر کم آدی تھا۔ وہی دھوپ جلی رنگت اور سر کے بال سفید تھے۔ اس کی عمر کا اندازہ پچاس اور پچپن کے درمیان لگایا جاسکتا تھا۔ اس نے مخصوص انداز میں لنکی باندھ رکھی تھی اور کرتے کی تراش بھی مخصوص طرز کی تھی۔ سر پر مٹی کھر پڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ سہی بھی تھی۔ وہ دوڑ کر نائلہ سے لپٹ گئی۔  
 ”تم ٹھیک ہوادی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مگر بڑا غضب ہو گیا سہی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”یہ عورت بتا رہی تھی کہ ہم راجستھان میں ہیں۔“

”ہاں، مگر یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔“ سہی نے جواب دیا۔  
 ”میں اس گاؤں کا کھیا سر بندر ہوں۔“ سہی کے ساتھ آنے والے شخص نے ان کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لونڈیا نے تو ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کیا تم بتاؤ گی کہ کون ہو اور اس ریگستان میں کہاں سے آئی ہو؟“

”کہاں سے آئی ہیں...“ نائلہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔  
 ”تم لوگ راجستھان کی تو نہیں لگتیں اور مسلمان بھی نہیں ہو۔“ کھیا نے کہا۔ ”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم ہمیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔“  
 نائلہ چند لمحے خاموش رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کھیا کو اپنے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتائے یا نہیں؟ کوئی غلط بیانی انہیں کسی مصیبت میں پھنسا سکتی تھی اور سچ بولنا بھی انہیں کسی خطرے میں مبتلا کر سکتا تھا۔  
 لیکن ہالا خراس نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

”اس عورت نے بتایا تھا کہ اس گاؤں کا نام گٹ والا ہے۔ یہ گاؤں کہاں پر واقع ہے؟ میرا مطلب ہے کہ سرحد سے کتنی دور ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”راجستان میں واقع یہ گاؤں سرحد سے کئی میل اندر ہے۔ تم لوگ کہاں سے آئی ہو؟“ کھیا نے پوچھا۔

”ہمارا تعلق پاکستان کے ایک شہر سے ہے۔ کچھ لوگ ہمیں دھوکے سے اغواء کر کے لے آئے تھے۔ وہ نجانے ہمیں کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ ہم موقع پا کر ان کے چنگل سے بھاگ نکلیں۔ ایک دن اور دو راتیں راجستان میں بھٹکنے کے بعد ہم یہاں پہنچ گئے۔ اگر یہ آبادی ہمیں نظر نہ آتی اور تم لوگ ہمیں نہ بچاتے تو شاید ہم صحرا میں بھوک پیاس سے اپڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے۔“

”بڑا ظلم ہوا ہے تم لوگوں کے ساتھ۔“ کھیا نے کہا۔ ”لیکن اب تم لوگ محفوظ ہو۔ دو چار روز تم لوگ آرام کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ تو ہم تم لوگوں کو شہر بھجوانے کا بندوبست کر دیں گے۔“

”شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”بہت دور ہے۔“ کھیا نے جواب دیا۔ ”گھوٹارو تک کچا راستہ ہے۔ ہفتے میں صرف ایک مرتبہ یہاں بس آتی ہے۔ گھوٹارو سے آوٹار اور وہاں سے رام گڑھ تک پکی سڑک ہے۔ رام گڑھ سے تمہارا پاکستان واپسی کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے۔“

رام گڑھ کا نام سن کر نائلہ کانپ اٹھی۔ سینٹھ کھنول کے آدمی انہیں رام گڑھ ہی تو پہنچانا چاہتے تھے۔

”کیا یہاں سے سرحد کی طرف کوئی راستہ نہیں جاتا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”شان گڑھ کی طرف سے ایک راستہ پاکستان کی سرحد تک جاتا ہے مگر شان گڑھ بھی یہاں سے کئی میل دور ہے۔“ کھیا نے کہا مگر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”یہاں تم لوگوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرف عام طور پر کوئی نہیں آتا۔ اگر کوئی آ بھی گیا تو گاؤں والے تم لوگوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ ہم راجپوت ہیں۔ گاؤں میں ایک مسلمان عورت بھی رہتی ہے۔ عائشہ دو سال پہلے دودھا ہو گئی تھی۔ اس کا بیٹا ہے چھ سات سال کا۔ اگر تم لوگ چاہو تو اس کے گھر میں رہ سکتی ہو۔ وہ تمہارا خیال رکھے گی لیکن... تمہارے پیروں کے یہ چھالے...“

نائلہ نے پہلی مرتبہ اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں پیروں پر میلے سے کپڑے کی پٹیاں لپی ہوئی تھیں۔ غالباً ”کسی قسم کا مزہم لگا کر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ سسی اس کی چار پائی پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے پیروں پر بھی پٹیاں لپی ہوئی تھیں۔“

”یہ میری بیٹی ہے، بنتو۔“ کھیا نے دل کش چہرے والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تم لوگوں کا خیال رکھے گی۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو اسے بتا دینا۔“

کھیا اور دوسری عورتیں چلی گئیں۔ بنتو ان کے پاس رہ گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتی ہوں۔ ہمارے گھر کا دندا ہوا کھا لو گی نا؟“

”جب بھوک لگی ہو تو انسان جنگلی جانوروں کا گوشت تک کھانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تمہارے گھر میں تو کوئی کھانے ہی کی چیز ہی ہو گی نا؟“ نائلہ بولی۔

”میرا مطلب تھا کہ تم مسلمان ہو اور...“

”کھانے کو جو کچھ بھی ہے لے آؤ۔ ہم دو دن سے بھوکے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔  
 بنتو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”یہ تو بہت برا ہوا ادی۔ ہم لوگ یہاں سے کیسے جائیں گے؟“ سسی نے کہا۔  
 ”پیروں کے آبلے تو ٹھیک ہونے دو۔ پھر دیکھا جائے گا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

آدھے گھنٹے بعد بنتو ان کے لیے کھانے لے کر آئی۔ پتلی سی دال، ایک کنورے میں آلو میتھی کی بھجیا اور  
 چپاتیاں تھیں۔ تین دن کی بھوک کے بعد انہیں کھانے کو ملا تھا۔ دال تو بس ایسے ہی تھی، بے ذائقہ، البتہ  
 آلو میتھی کی بھجیا بہت مزیدار تھی۔

رات کو انہیں عائشہ کے گھر پہنچا دیا گیا۔ عائشہ کی عمر ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی  
 رعنت بھی دھوپ سے جلی ہوئی تھی۔ لیکن چہرے کے نقوش اور جسمانی لحاظ سے وہ دوسری عورتوں سے  
 زیادہ پرکشش تھی۔ اس کا شوہر کریم دو سال پہلے بیمار ہو کر انتقال کر گیا تھا۔ اسے بخار ہوا تھا۔ گاؤں کا وید  
 اس کا علاج کرتا رہا لیکن ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی حالت مردوں سے بدتر ہو گئی۔ آخری روز اسے خون  
 کی دوالتیاں ہوئی تھیں اور پھر وہ ختم ہو گیا تھا۔

عائشہ کا بیٹا اکبر چھ سال کا تھا۔ اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ وہ سارا دن گاؤں کے بچوں کے  
 ساتھ کھیلتا رہتا۔ یہ گاؤں پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل تھا۔ آبادی کا انحصار کھیتی باڑی پر تھا۔ قابل کاشت  
 زمین کا رقبہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ جس سال برسات ہو جاتی اس سال فصل بھی کچھ اچھی ہوتی۔ فصلوں کو  
 بیاب کرنے کے لیے ان لوگوں نے کھیتوں میں جابجا کنویں کھود رکھے تھے۔ ان کنوؤں کا پانی بھی بہت گہرائی  
 میں تھا۔

عبدالکریم تھوڑی بہت زمین کا مالک تھا۔ اس کے انتقال کے بعد عائشہ نے یہ زمین کھیا سریندر ہی کو  
 بنائی پردے رکھی تھی۔ کھیا ایماندار آدمی تھا۔ وہ باقاعدگی سے عائشہ کو اس کا حصہ دے دیتا تھا۔  
 اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ مسجد کوئی نہیں تھی۔ عبدالکریم جب تک زندہ تھا گھر پر ہی نماز  
 پڑھ لیا کرتا تھا۔ عائشہ کو مذہب کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں وہ تو نماز پڑھنا بھی بھول گئی تھی۔  
 اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ زمین بیچ کر جودھ پور چلی جائے جہاں اس کے کچھ رشتہ دار تھے۔ مگر کھیا نے ہمیشہ  
 اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ زمین بیچنے سے جو رقم ملے گی وہ کچھ ہی عرصہ میں ختم  
 ہو جائے گی اس کے بعد وہ کیا کرے گی؟

اس رات عائشہ دیر تک نائلہ کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔

”اس گاؤں کے لوگ تو بہت اچھے ہیں لیکن ریگستان میں کسی جگہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کالی کی پوجا  
 کرتے ہیں۔ وہ انسانوں کی بھیٹ چڑھاتے ہیں، یہ سب کچھ چوری چھپے ہوتا ہے۔ اس گاؤں میں بھی دوچار  
 آدمی کالی کے ماننے والے ہیں۔ پنڈت رام ناتھ کے بارے میں کھیا کو شبہ ہے کہ وہ بھی کالی کا پجاری ہے  
 کیونکہ چاند کی آخری تاریخوں میں وہ گاؤں سے غائب ہو جاتا ہے۔ پورن ماشی کی رات ریگستان میں واقع  
 پنانون میں غاروں کے اندر کالی کا خفیہ مندر بنا رکھا ہے جہاں پورن ماشی کی رات کالی کی پوجا کی جاتی ہے اور  
 ایک انسان کی بھیٹ دی جاتی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں ہمارے اس گاؤں سے تین آدمی غائب ہو چکے  
 ہیں۔ اور یہ سب کچھ پنڈت رام ناتھ کے آنے کے بعد ہی ہوا ہے۔“  
 ”تو کیا پنڈت رام ناتھ پہلے یہاں نہیں تھا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ہیں۔“ عائشہ نے جواب دیا۔ ”رام ناتھ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ اس وقت یہاں ایک بوڑھا پنڈت تھا۔ جسے گاؤں کے لوگ بہت چاہتے تھے لیکن رام ناتھ کے آنے کے چند ہی روز بعد وہ بیمار ہو گیا۔ رام ناتھ نے وید کو بھی اس کا علاج کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ خود ہی اس کا علاج کرتا رہا اور پھر بوڑھا پنڈت مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد رام ناتھ نے مندر پر قبضہ کر لیا۔ اس نے یہاں اپنے چند حواری بھی پیدا کر لیے۔ رام ناتھ ہی ایک ایسا آدمی ہے جس پر کسی طرح بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔“

”تو کیا ہمارے لیے یہاں خطرہ نہیں ہو گا؟“ نالکھ نے پوچھا۔ اس نے عائشہ کو بھی اپنے اور سسی کے اغوا کی وہی فرضی کہانی سنائی تھی جو کھیا کو سنا چکی تھی۔

”پنڈت رام ناتھ ہی ایک ایسا آدمی ہے جو خطرناک ہو سکتا ہے لیکن تم فکر مت کرو۔ گاؤں کا کھیا بہت اچھا آدمی ہے۔ اگر رام ناتھ نے کوئی گڑبگڑ کرنے کی کوشش کی تو کھیا سنبھال لے گا۔“ عائشہ نے جواب دیا۔ سسی نے ان کی باتوں میں مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ ان کی باتیں سن کر اس کے دل میں ہول سے اٹھ رہے تھے۔ وہ سندھ کی رہنے والی تھی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں کی ذہنیت سے وہ واقف تھی۔ سیٹھ کھٹول بھی تو ہندو ہی تھا جو انسانی ہمدردی کی آڑ میں انہیں ہندوستان اسٹبل کر رہا تھا۔

دوسرے دن صبح پنڈت رام ناتھ، عائشہ کے گھر پہنچ گیا۔ عائشہ اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئی۔ رام ناتھ آج تک اس کے دروازے پر نہیں آیا تھا۔

”کسے پنڈت جی، کیسے آنا ہوا؟“ عائشہ نے جواب دیا۔

پنڈت رام ناتھ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسے ایک طرف ہٹاتا ہوا آنگن میں گیا۔

”وہ تاریاں کہاں ہیں جنہیں کھیا نے تمہارا اسمان بنایا ہے؟“ پنڈت نے اسے گھورا۔

”وہ اس کمرے میں ہیں پنڈت جی۔“ عائشہ نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

پنڈت رام ناتھ دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ نالکھ اور سسی چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس شخص کو کمرے میں آتے دیکھ کر نالکھ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پنڈت رام ناتھ ہے۔ عجیب خوفناک ہیئت کا مالک تھا وہ۔ لمبا قد، سیاہ رنگت، موٹی موٹی سرخ آنکھیں، منجے سر پر کھوڑی کے پچھلے حصے پر لمبی سی چٹیا بنی ہوئی تھی۔ پیشانی پر نقشہ تھا اور ہاتھ میں لوہے کا سریہ جس کے اوپر تین شامیں بنی ہوئی تھیں۔

سسی تو اسے دیکھ کر سسم سی گئی۔ نالکھ کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی تھی۔ پنڈت رام ناتھ کچھ دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا پھر کچھ کے بغیر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس نے جاتے ہوئے عائشہ سے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

عائشہ کے گھر سے نکلنے کے آدھے گھنٹے بعد پنڈت رام ناتھ کھیا کے گھر پر موجود تھا۔ اس نے گاؤں کے چند اور لوگوں کو بھی وہاں بلالیا تھا۔

”ان لپٹھ عورتوں کو پناہ دے کر تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے سریندر ناتھ۔“

پنڈت نے کھیا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہاں پہلے ہی ایک مسلمان عورت موجود ہے جس کے کارن اس گاؤں پر مسمیش نازل ہوتی رہتی ہیں۔ اور اب دو اور مسلمان لپٹھ عورتوں کو پناہ دے کر

تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں انہیں ابھی گاؤں سے نکال کر ریگستان کی طرف دھکیل دو ورنہ بھگوان..."

"پنڈت جی۔" کھیا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی دکھیا کی مدد کرنے سے بھگوان ناراض نہیں ہوتا۔ ان مسلمان لڑکیوں کے آجانے سے آسمان سے آگ نہیں برسنے لگے گی اور نہ ہی سیلاب آجائے گا۔"

"تم بہت بھولے ہو سرندر ناتھ۔" پنڈت نے کہا۔ "جب سے تم نے اس مسلمان عورت کے ساتھ اس کی زمین پر بٹائی پر کام شروع کیا ہے تم اپنے دھرم سے دور ہوتے جا رہے ہو۔ پتہ نہیں اس بلیچھ عورت نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے۔"

"مجھ پر کسی نے جادو نہیں کیا پنڈت جی۔" کھیا نے کہا۔ "ہم نے ان دکھیا عورتوں کو پناہ دی ہے کوئی گناہ نہیں کیا۔ وہ چند روز کی مہمان ہیں، چلی جائیں گی۔"

"بھائیو!" پنڈت رام ناتھ نے دوسرے آدمیوں کو مخاطب کیا۔ "میں خبردار کر رہا ہوں۔ اگر ان بلیچھ عورتوں کو گاؤں سے نہیں نکالا تو یہاں ایسی تباہی نازل ہوگی کہ چند روز کے اندر اندر یہ گاؤں سنسان ہو جائے گا۔ دھور ڈنگر مرجائیں گے۔ فصلیں سوکھ جائیں گی اور یہاں صرف گدھ منڈلاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میں نے بتا دیا ہے اب سوچنا تم لوگوں کا کام ہے۔"

پنڈت رام ناتھ پیر پختا ہوا چلا گیا۔ کھیا کے گھر میں موجود لوگ چہ گوئیاں کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ پنڈت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ان دونوں مسلمان لڑکیوں کو فوری طور پر گاؤں سے نکال دینا چاہئے۔ جبکہ بعض لوگ کھیا کے حق میں تھے۔

"بھائیو!" بالا خر کھیا نے کہا۔ "جب تک ان لڑکیوں کے پیر ٹھیک نہیں ہو جاتے اس وقت تک وہ ہماری مہمان رہیں گی۔ اس کے بعد ہم انہیں شہر بھیج دیں گے۔"

"یہ پنڈت جی تو بلا وجہ ان لونڈیوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" ایک آدمی نے کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ اس پنڈت ہی کو یہاں سے چلتا کر دیا جائے۔ یہ ہمارے گاؤں کے آدمیوں کو دور غلا رہا ہے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ یہ کالی کا پجاری ہے۔ ہر پورن ماشی کی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ان چٹانوں میں واقع خفیہ غار میں کالی کی بھیٹ میں شریک ہوتا ہے۔"

"یہ شبہ تو سب ہی کو ہے۔" کھیا نے کہا۔ "لیکن جب تک ہمیں اس بارے میں یقین نہ ہو جائے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔"

"چند روز بعد پورن ماشی کی رات آنے والی ہے۔ پنڈت دو دن پہلے ہی گاؤں سے غائب ہو جائے گا۔ کیوں نہ اس کا پیچھا کر کے معلوم کیا جائے کہ وہ کہیں اور جاتا ہے یا کالی کی بھیٹ میں شریک ہوتا ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ اس کا نام رکھول تھا۔

"اس کا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پورن ماشی کی رات ہم ریگستان میں ان چٹانوں میں کیوں نہ پہنچ جائیں۔ اگر پنڈت وہاں ہوا تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور جب وہ گاؤں واپس آئے گا تو اسے چٹا کر دیں گے۔" ہری رام نام کے ایک اور شخص نے مشورہ دیا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔" کھیا نے کہا۔ "لیکن بھائیو! پنڈت کو اس معاملہ کی ہوا نہیں لگنی چاہئے۔"

"پنڈت کو کوئی نہیں بتائے گا کھیا جی۔" رکھول نے جواب دیا۔

ادھر عائشہ پریشان تھی۔ پنڈت رام ناتھ کبھی اس کے گھر نہیں آیا تھا۔ وہ تو اس کا سخت مخالف تھا۔

گاؤں کی عورتوں اور دوسرے لوگوں سے وہ اکثر سنتی رہتی تھی کہ پنڈت گاؤں کے لوگوں کو اس کے خلاف درغلانا رہتا ہے۔ اسے اس بات کا بھی افسوس تھا کہ گاؤں کے کھیا نے اس کی زمین بٹائی پر کیوں لی تھی۔ وہ گاؤں کے لوگوں سے اکثر کما کرتا تھا کہ اس مسلمان عورت کو گاؤں سے نکال دینا چاہئے۔ لیکن گاؤں کے لوگوں نے کبھی پنڈت کی اس بات پر کان نہیں دھرا تھا۔ عبدالکریم اپنے باپ کے ساتھ بچپن میں یہاں آیا تھا۔ یہ تقسیم ہند سے بہت پہلے کی بات تھی۔ عبدالکریم کے باپ نے یہاں تھوڑی سی زمین خرید لی تھی۔ اس گھر میں صرف تین افراد تھے۔ عبدالکریم کے ماں باپ اور خود عبدالکریم جو اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ پھر عبدالکریم ذرا بڑا ہوا تو اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ گاؤں کے باہر کھیتوں کے قریب پہلی قبر بنی۔ پھر عبدالکریم جوان ہوا تو اس کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ پہلی قبر کے پہلو میں دوسری قبر بن گئی۔ عبدالکریم نے اپنے دن کے بارے میں جو کچھ سیکھا تھا اپنے ماں باپ سے سیکھا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی دی ہوئی اسلامی تعلیمات پر سختی سے کاربند تھا۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتا اور روزے بھی رکھتا۔ وہ گاؤں والوں کے تہواروں میں شریک ہوتا۔ ان کی غلی خوشی میں شامل رہتا۔ گاؤں کے ہندوؤں کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی تھی پھر عبدالکریم چند روز کے لیے جودھ پور چلا گیا۔ واپس آیا تو عائشہ اس کے ساتھ تھی۔ گاؤں پہنچتے ہی جب عبدالکریم نے بتایا کہ اس نے شادی کر لی ہے تو گاؤں والوں نے باقاعدہ جشن منایا تھا۔ گاؤں کے واحد مسلمان گھر کی یہ پہلی خوشی تھی اور گاؤں کے سب لوگ اس خوشی میں شریک تھے۔ عائشہ گاؤں میں اپنے اس استقبال پر بہت خوش ہوئی تھی اور پھر ایک سال بعد جب اس کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تب بھی بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ گاؤں کا بوڑھا پنڈت بھی ان لوگوں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ وہ اکثر شام کو ان کے ہاں آجاتا۔ کھیا اور کچھ اور لوگ بھی جمع ہو جاتے اور سب لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔

دو سال پہلے عبدالکریم بیمار ہو گیا۔ اسے معمولی سا بخار ہوا تھا۔ گاؤں کا بوڑھا وید اس کا علاج کرتا رہا لیکن ایک ہفتے بعد ایک روز عبدالکریم کو خون کی دو اٹلیاں ہوئیں اور اس کا انتقال ہو گیا۔ عبدالکریم کے انتقال کے چند روز بعد پنڈت رام ناتھ پتہ نہیں کہاں سے اس گاؤں میں آگیا۔ اس کے آنے کے چند روز بعد ہی بوڑھا پنڈت بیمار ہو گیا۔ رام ناتھ نے وید جی کو قریب نہیں پھنکنے دیا تھا۔ وہ خود ہی بوڑھے پنڈت کا علاج کرتا رہا لیکن دو ہفتے بعد بوڑھا پنڈت مر گیا۔ اور رام ناتھ نے مندر پر قبضہ جمایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے عائشہ کی مخالفت شروع کر دی تھی اور آج جب پہلی بار پنڈت رام ناتھ اس کے گھر آیا تو عائشہ کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

”یہ پنڈت بڑا کینہ آدمی ہے۔“ عائشہ نے نالہ کو بتایا۔ ”یہ مجھے اس گاؤں سے نکلوانے کی فکر میں ہے لیکن یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اس گاؤں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ شیطان کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔“

نالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے صرف ایک ہی خوف تھا کہ اس گاؤں میں ان کی موجودگی کی خبر رام گڑھ نہ پہنچ جائے۔ پنڈت رام ناتھ کے عائشہ کے گھر سے جانے کے تقریباً ”دو گھنٹے بعد ہی خبر بھی عائشہ کے گھر پہنچ گئی کہ پنڈت نے کھیا اور گاؤں کے لوگوں پر یہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا ہے کہ ان دونوں مسلمان لڑکیوں کو جتنی جلد ممکن ہو سکے گاؤں سے نکال کر ریگستان کی طرف دھکیل دیا جائے۔ بصورت دیگر گاؤں پر زبردست آفت نازل ہوگی، دھور دھگر مرنے شروع ہو جائیں گے اور فصلیں سوکھ جائیں گی۔ لیکن کھیا اور گاؤں کے لوگوں نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

اس شام ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ رگھول لاپتہ ہو گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ گاؤں پچاس ساٹھ گھروں کی آبادی پر تو مشتمل تھا۔ کسی کے اس طرح غائب ہو جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شام سے ذرا پہلے رگھول کو بھیرا چند کی دوکان پر بیٹھے ہوئے دیکھا گیا تھا پھر وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا تھا اور اس کے بعد سے وہ لاپتہ ہو گیا تھا۔ گاؤں کے تمام گھروں میں اسے تلاش کر لیا گیا۔ اس باس کے کھیتوں میں بھی دیکھ لیا گیا مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ رات گئے تک لوگ چوپال میں بیٹھے رگھول کی اس پر اسرار کشدگی کے بارے میں مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کرتے رہے مگر کسی واضح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔

صبح نو بجے کے لگ بھگ گاؤں میں کھرام ساچ گیا۔ شور کی آواز سن کر عائشہ بھی صورت حال معلوم کرنے کے لیے گھر سے باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً ”پون گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

”کیا ہوا؟ یہ شور کیسا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”رگھول مل گیا ہے۔“ عائشہ نے کہا۔ اس کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔ ”اس کی لاش ملی ہے۔ گاؤں سے تقریباً ”ایک میل دور جھاڑیوں میں۔ پنڈت رام ناتھ لوگوں کو دروغا رہا ہے کہ یہ سب کچھ گاؤں میں موجود ان دو مسلمان لڑکیوں کی وجہ سے ہوا ہے؟“

”لیکن... رگھول کی گمشدگی اور اس کی موت سے ہمارا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ نائلہ بولی۔

”اس گاؤں کے لوگ بہت سادہ لوح ہیں اور یہ پنڈت رام ناتھ شیطان ہے۔ یہ جب سے یہاں آیا ہے لوگوں کو ڈرانا دھمکانا رہتا ہے۔ بعض اوقات اس کے پاس شہر سے پر اسرار قسم کے لوگ بھی آتے ہیں۔ وہ گاؤں والوں سے نہیں ملتے۔ بس ایک رات مندر میں رہ کر واپس چلے جاتے ہیں۔“ عائشہ نے کہا۔

نائلہ کے چہرے پر بھی خوف کے سائے سے لرا گئے۔ سادہ لوح لوگ تو ہم پرست بھی ہوتے ہیں اور پھر ہندوؤں میں تو توہم پرستی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر وہ شیطان صفت پنڈت گاؤں کے لوگوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو تمام تر ہمدردیوں کے باوجود یہ لوگ انہیں دوبارہ ریگستان میں دھکیل دیں گے۔

گاؤں کے چوک پر ایک عجیب سی صورت حال تھی۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کا جھوم تھا۔ اس جھوم کے بیچ میں بان کی ایک چارپائی رکھی ہوئی تھی جس پر رگھول کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ لاش پر کالے رنگ کی ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ جھوم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گاؤں کا جو بھی شخص سننا دہاں چلا آتا۔

پنڈت رام ناتھ کو آتے دیکھ کر لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ رام ناتھ کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس علاقے کا عمران ہو اور کوئی اہم فیصلہ سننے کے لیے دربار میں آ رہا ہو۔ وہ چند لمحے چارپائی کے قریب کھڑا رہا پھر اس نے جھک کر ایک جھٹکے سے رگھول کی لاش پر سے کالی چادر ہٹا دی۔ رگھول کی لاش دیکھ کر قریب کھڑے ۱۱

لاش بالکل برہنہ تھی۔ پیٹ پھٹا ہوا تھا اور آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ سینہ بھی اس طرح ادھڑا ہوا تھا ۱۲ کسی درد نے نونیکیلے پنجوں سے نوچا ہو۔ اس کے رخسار بھی اسی طرح ادھڑے ہوئے تھے۔ زبان کٹی ہوئی تھی۔ منہ سے بنے والا خون پوری گردن پر جمنا ہوا تھا۔ اس کا زخروہ بھی کٹا ہوا تھا۔

”مٹرو! پنڈت نے جھوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تم لوگوں کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ ان



مسلمان لڑکیوں کو گاؤں سے نکال دو ورنہ اس گاؤں پر بھگوان کا ایسا عتاب نازل ہو گا کہ یہاں کچھ نہیں بچے گا۔ مگر تم لوگوں نے میری بات نہیں مانی اور اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ رگھول بھگوان کے عتاب کا پہلا شکار ہے۔ اس کے بعد کسی اور کی باری آئے گی۔ اب بھی وقت ہے۔ ان لڑکیوں کو گاؤں سے نکال دو... تم لوگوں نے جو گناہ کیا ہے اس کا اپناے ہو سکتا ہے۔“

”رگھول کی موت میں ان مسلمان لڑکیوں کا کوئی دوش نہیں ہے۔“ کھیا نے جواب دیا۔  
 ”رگھول کی حالت بتا رہی ہے کہ یہ کسی درندے کا شکار ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کسی ضرورت کے تحت ریگستان کی طرف گیا ہو اور خونخوار بھیڑیوں کے غول نے اسے گھیر لیا ہو۔ اس کے لیے کسی کو زبردوش قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

”بھیڑیے اپنے بچوں اور دانتوں سے کسی کا جسم تو ادھڑکتے ہیں مگر زبان نہیں کاٹ سکتے اور رگھول کی زبان بھی کٹی ہوئی ہے۔“ پنڈت نے کہا۔

”تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسے کسی نے قتل کیا ہے۔ مگر گاؤں میں رگھول کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟“ کھیا نے جواب دیا۔

”رگھول کا کوئی دشمن نہیں تھا“ یہ...“

”پنڈت جی۔“ ہری رام نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ مورکھ کون تھے جو کل شام موڑ پر شہر سے تمہارے پاس آئے تھے اور رات مندر میں تمہارے پاس گزارنے کے بعد صبح سویرے واپس چلے گئے تھے۔“

”وہ میرے مترتھے۔ کیا تم ان پر شبہ کر رہے ہو ہری رام؟“ پنڈت رام ناتھ، ہری رام کی طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سرخ ہو گئی تھیں۔

”ہاں۔“ ہری رام نے جرات سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”کیونکہ ریگستان میں جہاں رگھول کی لاش پڑی ہوئی ملی تھی وہاں موڑ کے پیوں کے نشان بھی تھے اور اس پاس خون کا ایک قطرہ تک نہیں تھا جس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ رگھول کو کسی اور جگہ قتل کر کے لاش اس جگہ پھینک دی گئی تھی۔ اگر رگھول کو بھیڑیوں نے نوچا ہوتا تو اس پاس خون ضرور بکھرا ہوتا۔“

”ہری رام!“ پنڈت رام ناتھ دھاڑا۔ ”تم مجھ پر شبہ کر کے بھگوان کے غضب کو لکار رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ پنڈت اور سوامی بھگوان کا اوتار ہوتے ہیں۔“

”پنڈت جی۔“ کھیا نے کہا۔ ”تم کیوں غصہ کرتے ہو۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ان مسلمان لڑکیوں کے دشمن کیوں ہو گئے ہو۔ وہ ریگستان میں بھکتی ہوئی اس طرف آگئی ہیں ان کے پیر زخمی ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گی تو خود ہی کہیں چلی جائیں گی۔ مگر آئے ہوئے مہمان کو نکال دینا ہم راجپوتوں کی روایات کے خلاف ہے۔“

”وہ مسلمان لڑکیاں اس گاؤں کے لیے بھگوان کا عذاب بن جائیں گی۔“ پنڈت رام ناتھ غصے میں پیر پختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اسی روز شام سے پہلے پہلے رگھول کا کرایا کرم کر دیا گیا۔ شمشان سے واپس آنے کے بعد لوگ چوپال میں بیٹھے رگھول کی پراسرار موت کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

اس کے دو دن بعد تک کوئی اور خاص واقعہ رونما نہیں ہوا نالکھ اور سسی کے پیروں میں چھالوں کے

رم بڑی حد تک ٹھیک ہو رہے تھے اور اب وہ عائشہ کے مکان کے صحن میں تھوڑا بہت چلنے بھی لگی تھی۔ پانچویں دن ایک اور پراسرار واقعہ پیش آیا۔ رات کو نجانے کس وقت ہری رام کے مویشیوں والے ہاڑے میں آگ لگ گئی تھی اور سارے مویشی جل کر مر گئے تھے۔ مویشیوں کے علاوہ اور بھی نقصان ہوا تھا۔ ہری رام کی بھی گاؤں میں کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ پنڈت رام ناتھ کو ایک بار پھر گاؤں کے لوگوں کو درغلانے کا موقع مل گیا۔ پہلے رکھول کی پراسرار موت اور پھر ہری رام کے ہاڑے میں یہ پراسرار آتشزدگی... پنڈت رام ناتھ کی باتوں میں آکر کچھ لوگ واقعی سہم گئے تھے لیکن کھیا اور گاؤں کے اکثر لوگ اب بھی اس بات پر قائم تھے کہ ان واقعات سے ان دو مسلمان لڑکیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض اتفاقی حادثات تھے بلکہ کھیا اور کچھ لوگ تو پنڈت رام ناتھ پر شہ کرنے لگے تھے۔ ہری رام نے تو دونوں کہہ بھی دیا تھا کہ ریگستان میں جس جگہ رکھول کی لاش پائی گئی تھی وہاں اس پانس خون کا کوئی قطرہ نہیں ملا تھا۔ اس کے برعکس وہاں موڑ کے پسوں کے نشان پائے گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ رکھول کو کہیں اور قتل کیا گیا تھا اور لاش وہاں لے جا کر پھینک دی گئی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کسی ثبوت کے بغیر کسی پر الزام نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

تیسرے روز گاؤں کی ایک جوان لڑکی لاپتہ ہو گئی۔ شکنتلا نام کی یہ لڑکی گاؤں کے ایک غریب کاشتکار کی بیٹی تھی۔ اس کی عمر چودہ اور پندرہ سال کے درمیان تھی۔ اس روز ان کے گھر میں آلو میتھی کی بھیجا بنائی گئی تھی۔ یہ بھیجا خود شکنتلا نے بنائی تھی اور اسے معلوم تھا کہ ان دو مسلمان لڑکیوں نے پہلے روز کھیا کے گھر میں آلو میتھی کی بھیجا بنی کھائی تھی اور ان دونوں لڑکیوں نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اور اس روز شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد ایک پلیٹ میں آلو میتھی کی بھیجا لے کر عائشہ کے گھر جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں مسلمان لڑکیاں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی بھیجا کھا کر بہت خوش ہوں گی۔

شکنتلا کے گھر والے اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب بہت دیر بعد بھی وہ نہیں آئی تو اس کے چھوٹے بھائی کو بھیجا گیا کہ شکنتلا کو ساتھ لے کر آئے۔ عائشہ کا گھر چند گھروں کے فاصلے پر تھا۔ بس گلی کا موڑ تھا۔ شکنتلا کا چھوٹا بھائی پانچ منٹ میں واپس آگیا اور جب اس نے یہ بتایا کہ شکنتلا تو عائشہ ماسی کے گھر پہنچی ہی نہیں تو پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد عائشہ بھی پہنچ گئی اور شکنتلا کی ماں سے اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”عائشہ بہن! وہ تو تمہارے گھر گئی تھی ان مسلمان لڑکیوں کے لیے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی آلو میتھی کی بھیجا لے کر۔“ شکنتلا کی ماں نے جواب دیا۔

پورے گاؤں میں دھونڈھیا بڑ گئی۔ ایک ایک گھر سے کئی کئی مرتبہ شکنتلا کے بارے میں پوچھا گیا۔ بہت سے لوگ کھیتوں اور ریگستان کی طرف نکل گئے۔ ہر ایک نے جلتی ہوئی مشعلیں اٹھا رکھی تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی کسی کے پاس کلباڑی۔ کھیتوں میں اور ریگستان میں دور دور تک دیکھ لیا گیا تھا لیکن شکنتلا کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ بعض لوگ اب واقعی سہم گئے تھے اور دبے لفظوں میں ان دونوں مسلمان لڑکیوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگے تھے۔ جن کی آمد کے بعد ہی سے یہ پراسرار واقعات رونما ہونے شروع ہوئے تھے اور اس گاؤں کا سکون غارت ہو کر رہ گیا تھا۔

کھیا اور تین چار آدمی عائشہ کے گھر آ گئے۔ سہی اور نالہ سہی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔

”ان دونوں لونڈیوں کو اٹھا کر ریگستان میں پھینک دو۔“ ایک آدمی نے پھرے ہوئے لہجے میں کہا۔  
 ”جب سے یہ منحوس لڑکیاں یہاں آئی ہیں اس دن سے ہی ہم پر آفتیں نازل ہونا شروع ہوئی ہیں۔“  
 ”نہیں۔“ کھیا نے کہا۔ ”کوئی مہمان منحوس نہیں ہوتا۔ اگر ہمارے گاؤں میں کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے تو  
 اس میں ان پجاری لونڈیوں کا کیا دخل۔ خبردار! اگر کسی نے ان لونڈیوں کے بارے میں کچھ کہا تو مجھ سے  
 برا کوئی نہیں ہوگا۔“

کھیا کے لہجے میں رعب و دبدبہ تھا۔ کسی کو اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں ہو سکی۔ وہ سب ہی  
 جانتے تھے کھیا نے آج تک کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ اس کے فیصلے بھی ہمیشہ درست ہوا کرتے تھے۔ وہ  
 اس گاؤں کا سربراہ تھا۔ اور گاؤں والوں کے لڑائی جھگڑے اور دیگر معاملات کے فیصلے بھی وہی کیا کرتا تھا اور  
 کسی کو کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔

”ارے! پنڈت جی کو کسی نے دیکھا؟“ ایک آدمی نے کہا۔ ”وہ تو ایسے معاملات میں ہمیشہ آگے رہتا ہے  
 پر آج وہ دکھائی نہیں دیا۔“

”میرا خیال ہے مندر میں ہوگا۔ چلو ذرا اس سے بھی پوچھ لیں۔“ کھیا نے کہا۔  
 ”اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔“ نانکھ نے کھیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا  
 اور پھر باری باری دوسروں کے چروں کا جائزہ لینے لگی۔  
 ”یہ ایک اچھی بات ہوگی۔ اگر تم چل سکو تو؟“ کھیا نے کہا۔

”میں اب چل سکتی ہوں۔“ نانکھ کہتی ہوئی چارباٹی سے اتر کر زمین پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے عائشہ کے  
 سلیپر پہنے، اس کی اوڑھنی لے کر اوڑھنی اور ان لوگوں کے ساتھ عائشہ کے مکان سے باہر آ گئی۔

مندر گاؤں سے باہر تھا۔ دو آدمی مشعلیں اٹھائے آگے آگے چل رہے تھے۔ رات اگرچہ تقریباً  
 آدمی بیت چکی تھی لیکن گاؤں کے لوگ اب بھی جاگ رہے تھے۔ کچھ لوگ چوپال کے سامنے جمع تھے۔ وہ  
 بھی ان کے ساتھ ہوئے۔ ان سب کو حیرت تھی کہ اب تک انہیں پنڈت رام ناتھ کا خیال کیوں نہیں آیا  
 تھا؟ حالانکہ جب سے وہ مسلمان لڑکیاں اس گاؤں میں آئی تھیں پنڈت ایسے معاملوں میں ہمیشہ آگے آگے رہا  
 کرتا تھا۔ ان لڑکیوں کے خلاف بولنے کا کوئی موقع اس نے بھی ہاتھ سے نہیں گنوا یا تھا۔

آبادی کے لحاظ سے یہ مندر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مندر کے دروازے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ٹھنک کر  
 رک گئے۔ کھیا کا پیر میڑھی پر کسی چیز پر پڑ کر پھسلا تھا اور وہ گرتے گرتے پچا تھا۔ ایک آدمی نے جھک کر  
 مشعل کی روشنی میں دیکھا اور پھر وہ سیدھا ہو گیا۔

”یہ تو آکو میتھی کی بجھیا ہے۔“ وہ بولا۔

”آکو میتھی کی بجھیا!“ شکنتلا کا باپ کرم چند بولا۔ ”یہ بجھیا ہی لے کر تو میری بیٹی گھر سے نکلی تھی  
 لیکن.... وہ تو عائشہ کے گھر گئی تھی۔“

”ابھی پتہ چل جائے گا، میرے ساتھ آؤ۔“ کھیا بولا۔

وہ لوگ مندر میں داخل ہو گئے۔ مندر میں دیوی کے مجسمے کے قریب طاقچے میں عام طور پر رات بھر دیا  
 جلا رہتا تھا لیکن آج وہ دیا روشن نہیں تھا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ مندر میں داخل ہوتے ہوئے نانکھ پر  
 عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے مندر صرف اندر قلموں میں دیکھے اور آج جب وہ پہلی مرتبہ ان عجیب  
 و غریب حالات میں اس مندر میں داخل ہو رہی تھی تو اس کے پورے جسم پر سنسنی کی کیفیت طاری ہو رہی

تھی۔

وہ لوگ مندر کے بڑے کمرے سے نکل کر پچھلی طرف آگئے۔ یہ مندر کے پنڈت کا رہائشی حصہ تھا۔ یہاں بھی تاریکی تھی۔ ٹھاکر نے پنڈت جی کو ایک دو آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے کے اندر دروازے کے قریب ہی کوئی کپڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے جھک کر وہ کپڑا اٹھایا۔ دوسرے ہی لمحہ کرم چند نے وہ کپڑا اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

”یہ... یہ میری بیٹی شکنتلا کی چڑی ہے۔“ کرم چند چیخا۔ ”جب وہ گھر سے نکلی تھی تو اس نے یہی چڑی اوڑھ رکھی تھی۔“

”دیکھ لیا بھائیو!“ ٹھاکر نے کہا۔ ”اب تو یہ ثبوت مل گیا ہے کہ اس گاؤں میں جو پراسرار واقعات رونما ہوئے ان میں ان مسلمان لڑکیوں کا کوئی دوش نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اسی پنڈت رام ناتھ کا کیا دھرا ہے۔ مجھے اس پر پہلے ہی شبہ تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ رگھول کو بھی اسی نے مارا تھا۔“ ایک آدمی بولا۔

”ہاں، اور ہری رام کے طویلے میں آگ بھی اسی نے لگائی ہوگی۔“ دوسرے نے کہا۔

وہ لوگ پنڈت رام ناتھ کے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑی جگت میں یہاں سے نکلا ہے۔

”چلو... اس راکشش کو تلاش کریں۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ ایک آدمی بولا۔

”بے کار ہے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”وہ اب اس گاؤں میں نہیں ملے گا۔ اب تک تو وہ بہت دور جا چکا ہو گا۔ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ لوگ مندر سے نکل آئے۔ شکنتلا کا باپ کرم چند پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ چڑی کو اس نے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ رکھا تھا۔

”گھبراؤ نہیں کرم چند۔“ ٹھاکر نے اسے تسلی دی۔ ”جنگوان نے چاہا تو ہم تمہاری بیٹی کو زندہ تلاش کر لیں گے۔“

گاؤں کے چوک پر آکر وہ لوگ کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے پھر ایک ایک دو دو کر کے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ ٹھاکر ناتھ کو لے کر عائشہ کے گھر آگیا۔

”کیا ہوا ٹھاکر چاچا؟ کچھ پتہ چلا؟“ عائشہ نے پوچھا۔

”ہاں، پتہ چل گیا۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

”کہاں ہے شکنتلا، ٹھیک تو ہے نا؟“ عائشہ نے دوسرا سوال کیا۔

”اسے پنڈت رام ناتھ لے گیا ہے۔ میں پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ انسان نہیں شیطان ہے۔ لیکن ہم اسے

ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ یاد رکھے گا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”اس شیطان کو جلدی تلاش کریں ٹھاکر چاچا۔ ایسا نہ ہو وہ شکنتلا کو کوئی نقصان پہنچا دے۔“ عائشہ

نے کہا۔

”نہیں۔“ ٹھاکر نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں شکنتلا کو کم از کم دو دن تک

تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”میں سمجھی نہیں کھیا چاچا۔“ عائشہ نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پہلے مجھے شبہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ پنڈت رام ناتھ کالی دیوی کا بچاری ہے۔ تم جانتی ہو کہ پہلے انسانوں کو کالی کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا لیکن پھر انسانی بھینٹ پر پابندی لگا دی گئی مگر کالی کے ماننے والوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اب بھی کالی کے چرنوں پر انسانوں کی بھینٹ دیتا ہے۔ راجستھان ہی میں پہاڑیوں میں ایک ایسی جگہ موجود ہے جہاں چوری چھپے ہر پورن ماشی کی رات ایک انسان کی بھینٹ دی جاتی ہے اور میرا خیال ہے اس مرتبہ بھینٹ کے لیے کرم چند کی بیٹی شکنتلا کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پورن ماشی میں ابھی دودن باقی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان دودنوں میں شکنتلا کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ ہم وقت سے پہلے اسے ان شیطانوں کے پنجے سے چھڑالیں گے۔“

”آپ کو پتہ ہے وہ پہاڑیاں کہاں ہیں؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ کھیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ پہاڑیاں یہاں سے بیس بائیس کوس کے فاصلے پر ہیں۔ میں کچھ آدمیوں کو لے کر کل شام کا اندھیرا پھیلنے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ شکنتلا کو زندہ سلامت واپس لانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔“

”اگر میں آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہوں تو کیا مجھے اس کی اجازت ہوگی؟“ نائلہ نے کہا۔

”تم؟“ کھیا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”راستہ بہت ٹھن ہے۔ تم پہلے ہی بہت دکھ جھیل کر یہاں آئی ہو اور پھر ہمارا مقابلہ مردوں سے ہو گا۔ تم ایک ناری ہو۔ تمہاری وجہ سے ہمارے ہاتھ بندھ کر رہ جائیں گے۔ ہمیں تمہارا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔“

”نہیں کھیا جی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ لوگوں کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں چار چھ آدمیوں پر بھی بھاری ہوں۔ یقین نہ ہو تو صبح گاؤں کے چار چھ گھروں سے میرا مقابلہ کرنا دیکھ لیتا۔ اگر وہ مجھے جھو بھی لیں تو میں ساتھ جانے کے لیے ضد نہیں کروں گی۔“

”کیا واقعی تمہیں اپنے آپ پر اتنا بھروسہ ہے؟“ کھیا نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے کھیا جی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو حق پر ہوتا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔“

”اچھا ٹھیک ہے، کل فیصلہ کریں گے۔“ کھیا کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

کھیا کے جانے کے بعد نائلہ سسی اور عائشہ دیر تک باتیں کرتی رہیں اور پھر انہیں بار بار بجائیاں آنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر سو گئیں۔ سسی حسب معمول نائلہ سے لپٹ کر سوئی تھی۔

دوسرے دن گاؤں کے لوگ اس موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ جو لوگ پنڈت رام ناتھ کی باتوں میں آکر سسی اور نائلہ پر کسی قسم کا شبہ کرنے لگے تھے اب وہ بھی عائشہ کے گھر آکر ان سے معذرت کر رہے تھے اور اب ساری بات پنڈت رام ناتھ پر آگئی تھی۔ مندر کی بیڑھیوں پر گری ہوئی آلو میتھی کی بجھیا اور پنڈت کے کمرے میں شکنتلا کی چڑی سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ شکنتلا کو پنڈت ہی نے اغوا کیا تھا۔

کھیا کا خیال تھا کہ کل شام پنڈت کے موٹر والے دوست آئے ہوں گے۔ موٹر انہوں نے گاؤں سے بہت دور چھوڑ دی ہوگی۔ پنڈت یا اس کا کوئی چیلہ شکنتلا کو کسی طرح درغلا کر مندر تک لایا ہو گا۔ مندر کے قریب پہنچ کر شکنتلا کو کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہو گا جس پر اس نے واپس جانے کی کوشش کی ہوگی مگر اسے

لہدستی دیوچ لیا گیا اور بھجیا والی پلیٹ اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ وہ لوگ اسے مندر لے آئے تھے یہاں  
 شکستہ مزاحمت کی ہوگی۔ اسے بے ہوش کر کے یا منہ پر کپڑا باندھ کر لے جایا گیا ہوگا۔  
 کھیا نے گاؤں کے کسی آدمی پر اپنے اس شے کا اظہار نہیں کیا کہ شکستہ کو کہاں لے جایا گیا ہوگا لیکن  
 اس نے چھ ایسے آدمی تیار کر لیے تھے جو گاؤں کی کسی لڑکی کی عزت و جان بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی  
 ادا کیتے تھے۔ یوں تو گاؤں کا ہر شخص ساتھ جانے کو تیار تھا مگر کھیا نے صرف چھ آدمیوں ہی کا انتخاب کیا تھا۔  
 باتیں ناکلہ اور آٹھواں وہ خود تھا۔

ان لوگوں کے پاس مختلف قسم کے ہتھیار تھے۔ دو آدمیوں کے پاس ڈبل بیرل کی بندوقیں تھیں جن میں  
 پہ نمبر کے کارتوس استعمال ہوئے تھے۔ دو آدمیوں نے اپنے لباس میں خنجر چھپائے تھے انہی میں سے ایک  
 نے پاس چوڑے پھل اور لمبے دسے والی کھانڈیاں تھیں۔ کھیا کے پاس صرف لاشی تھی۔ دست بدست  
 لڑائی میں اسے لاشی کے علاوہ کسی اور ہتھیار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کنگے کا مار تھا اور صرف لاشی کی  
 مدد سے اکیلا کئی آدمیوں کو اپنے سامنے کھینے پر مجبور کر سکتا تھا۔  
 ”میں جب ریگستان میں بھٹکتی ہوئی اس طرف آئی تھی تو میرے پاس ایک پستول بھی تھا۔ میرا وہ پستول  
 کسی کے پاس ہے؟“ ناکلہ نے کھیا سے پوچھا۔

”وہ پستول میرے پاس موجود ہے مگر اس میں کوئی گولی نہیں ہے۔“ کھیا نے جواب دیا۔  
 ”اگر تم خنجر استعمال کرنا جانتی ہو تو یہ اپنے پاس رکھ لو۔“ اس نے ایک دو دھاری خنجر ناکلہ کی طرف  
 بڑھا دیا۔

ناکلہ نے خنجر رکھ لیا۔ ضرورت کے وقت کوئی بھی ہتھیار کام آسکتا تھا۔  
 اس روز شام کا اندھیرا پھیلنے ہی یہ پارٹی گاؤں سے روانہ ہو گئی۔ وہ تقریباً دو میل تک گھومتا روکی  
 طرف جانے والے کچے راستے پر چلتے رہے پھر دائیں طرف ریگستان میں مڑ گئے تاریکی گہری ہوتی جا رہی  
 تھی۔ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ ریگستان میں بھٹکنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا مگر ریگستان میں رہنے والے لوگ  
 خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں کس طرف جانا ہے۔ کھیا بھی تاریک رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے  
 ستاروں سے اپنے راستے کا تعین کر رہا تھا۔  
 ”ہیں کتنی دور جانا ہوگا کھیا چاچا؟“ ناکلہ نے پوچھا۔

”ہیں بایں کوس کا فاصلہ ہے۔“ کھیا نے جواب دیا۔ ”کالی کے پجاریوں نے پھاڑیوں میں خفیہ ٹھکانہ  
 بنا رکھا ہے جہاں وہ ہر پورن ماشی کی رات کو جمع ہوتے ہیں اور کالی کے چرنوں پر ایک انسان کی بھیٹ  
 چڑھاتے ہیں۔ ہندوستان میں انسان کی بھیٹ دینا اگرچہ جرم ہے مگر کالی کے پجاری یہ سب کچھ چوری چھپے  
 کرتے ہیں۔ اس پوجا میں شریک ہونے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی اور جو لوگ آتے ہیں ان کا انتخاب  
 اسی بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ البتہ سال میں ایک مرتبہ ان پھاڑیوں میں کالی کی پوجا کا میلہ لگتا ہے۔  
 اس وقت سینکڑوں لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور بظاہر بکریوں کی بھیٹ دی جاتی ہے مگر اس وقت بھی کم از کم  
 لکھن انسانوں کو کالی کے چرنوں پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔“

کھیا کی باتیں سن کر ناکلہ کے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔  
 ہندوستان بڑا پراسرار ملک تھا۔ مندروں اور پنڈتوں کے بارے میں اس نے بڑی پراسرار داستانیں سن  
 رکھی تھیں۔ کالی دیوی کے بارے میں بھی اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ کالی کے پجاری غالباً سب سے

زیادہ انتہا پسند واقع ہوئے تھے جو اپنی دیوی کو خوش رکھنے کے لیے اس کے قدموں پر انسانوں کا خون بہاتے تھے۔ نائلہ یہ سوچ سوچ کر کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی کہ اس نے کتابوں میں جو کچھ پڑھا یا یا سنا تھا آج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے جا رہی تھی۔ اسے اس بات کا بھی بخوبی انداز تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہی ہے۔ اس قسم کی کوئی تقریب دیکھنا اور بات تھی اور اس میں مداخلت کرنا دوسری بات۔ وہ لوگ شکستہ کال دیوی کے پجاریوں کے چنگل سے جھڑانے جا رہے تھے۔ یہ گویا ایسے ہی تھا جیسے شیروں کی کچھار میں گھس کر ان کے منہ سے شکار چھیننے کی کوشش کی جائے۔

نائلہ اور سسی دو راتیں اور ایک دن صحرا میں بھٹکتی رہی تھیں لیکن اس وقت ان کے سامنے صرف اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا لیکن اب صورت حال کچھ مختلف تھی۔ وہ راجستھان میں سفر کر رہی تھی۔ یہ ہندوستان کا وہ خطہ تھا جو اپنے اندر ہزاروں اسرار چھپائے ہوئے تھا۔

وہ لوگ خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ رات جیسے جیسے گہری ہو رہی تھی سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کھیا بار بار رک کر آسمان پر جھکتے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھتا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتا ہوا پہلے سے زیادہ تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔

ان کے چاروں طرف تاریک ریگستان پھیلا ہوا تھا لیکن اب اونچے اونچے ٹیلوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹیلے کے قریب تھوڑی دیر کے لیے رکے تھے۔ نائلہ اگرچہ مسلسل چلتے رہنے سے تھک گئی تھی مگر اس نے اپنی تھکن کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ان ٹیلوں سے آگے نرم ریت بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ اس سے آگے سخت زمین شروع ہو گئی تھی۔ جا بجا پھیلے ہوئے ٹیلے بھی ٹھوس تھے۔ وہ ان ٹیلوں کے گرد گھومتے ہوئے چلتے رہے۔ آدھی رات کے قریب انہیں تاریکی میں پہاڑیوں کے ہولے دکھائی دینے لگے۔ وہ پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں تھیں اور نائلہ کے اندازے کے مطابق ان پہاڑیوں کا فاصلہ اب بھی دو میل سے کم نہیں تھا۔

وہ لوگ کچھ دیر تک ٹیلے کے پاس رکے ان پہاڑیوں کی طرف دیکھتے رہے پھر کھیا نے انہیں اشارہ کیا اور وہ قدرے بائیں طرف کو ہٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس طرح وہ ایک طویل چکر کاٹتے ہوئے ان پہاڑیوں کے دوسری طرف پہنچ گئے۔

ساتھ ساتھ دو پہاڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان ایک کشادہ درہ سا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے اس درے میں چلتے گئے۔ گہری تاریکی میں انہیں بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ نائلہ کھیا کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ایک جگہ وہ ٹھک کر رک گئی۔ اس نے کھیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔ دائیں طرف والی پہاڑی کی ایک دراڑ سے مدھم سی روشنی جھلک رہی تھی۔

کھیا نے اپنے ساتھیوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود پہاڑی دراڑ میں داخل ہو گیا۔ نائلہ بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔ دراڑ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ نائلہ چٹانی دیواروں کے ساتھ کھستی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کھیا اس سے دو قدم آگے تھا۔ یہ دراڑ تقریباً "بیس فٹ لمبی ثابت ہوئی۔ اس کے آخری سرے پر پہنچ کر کھیا رک گیا۔ اس جگہ دراڑ قدرے کشادہ تھی۔ نائلہ بھی کھیا کے قریب آگئی اور چٹان کی آڑ سے جھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

وہ ایک کشادہ غار تھا۔ جس میں غالباً "کوئی مشعل جل رہی تھی اور مشعل میں کسی جانور کی چربی استعمال ہو رہی تھی کیونکہ ہلکی سی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دراڑ اس غار کا اصل راستہ نہیں تھا۔ راستہ کسی

در طرف تھا۔

نالہ کو وہ غار پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ اور آگے بڑھ گئی اور اس مرتبہ جو اس نے جھانک کر دیکھا تو اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ غار میں دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ بائیں کا ایک بہت بڑا چوہرہ تھا۔ اس چوہرے کے پچھلے حصے پر ایک قد آدم جیسے جسم تھا۔ نالہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کالی دیوی کا مجسمہ تھا جسے دیکھ کر اس پر عجیب سی ہیبت طاری ہو گئی تھی۔

کالی کے جسم کے پچھلے حصے پر لنگوٹ کی طرح ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ پیٹ اور سینہ برہنہ تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اس طرح خون آلود تھیں جیسے مندی لگائی گئی تھیں۔ بائیں ہاتھ میں گڈا اور دائیں ہاتھ میں دھاگے سے لٹکی ہوئی ایک کنگورے والی تھالی تھی۔ اس تھالی کے نیچے دھاگے ہی کی مدد سے ایک اور تھالی لٹکی ہوئی تھی۔

کالی کے چہرے کی رنگت اگرچہ کسی حد تک سیاہی مائل تھی لیکن چہرے کے نقوش خاصے پرکشش تھے۔ موٹی آنکھیں، کمان کی طرح تہی ہوئی بھونپ، پیشانی پر چمکتی ہوئی سرخ بندیا ناک میں چمکتی ہوئی کیل اور سیاہ لمبی زلفیں۔ ناک کے عین وسط میں پیشانی پر سونے کا میکا بھی چمک رہا تھا۔ اس کی سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ اوپر کے دانت بھی نظر آرہے تھے۔

کالی کے گلے میں پتوں اور کانڈی پھولوں کے ہار تھے۔ سونے کا چمکتا ہوا ایک ہار اس کے سینے پر جھول رہا تھا۔ اس کے گلے میں ایک اور ہار دیکھ کر نالہ تعجب کر رہ گئی۔ یہ ہار انسانی کھوپڑیوں کا تھا۔ اس ہار سے ملکہ انسانی کھوپڑیاں اس کے برہنہ سینے کے دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔

مجسمے کے سامنے چوہرے پر مٹی کے ایک پیالے میں دودھ رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی بھگ کے بہت سارے پتے بھی بکھرے ہوئے تھے۔

کالی کا مجسمہ دیکھ کر نالہ کانپ اٹھی۔ اسے تباہی اور بربادی کی دیوی سمجھا جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں لہک، چور، ڈاکو اور لیٹیرے اپنے کسی مشن پر جانے سے پہلے کالی کے قدموں پر انسانی جانوں کی بھینٹ دیا کرتے تھے۔ وقت اگرچہ بدل چکا تھا مگر کالی کے پجاری اس کی تباہی و بربادی کا مشن اب بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

نالہ کالی کے مجسمے کو دیکھ رہی تھی کہ غار میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی دیر بعد دو آدمی کسی طرف سے نکل کر کالی کے مجسمے کے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک کو نالہ نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ گاؤں کا ہنڈ رام ناتھ تھا۔ نالہ نے کھیا کو اس طرف متوجہ کیا۔ رام ناتھ کو دیکھ کر کھیا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن وہ کوئی حرکت کرنے کی بجائے خاموشی سے اپنی جگہ پر کھڑا رام ناتھ کی طرف دیکھتا رہا۔

رام ناتھ اور اس کا ساتھی کالی کے مجسمے کے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد چار اور آدمی وہاں آ گئے۔ وہ سب اپنے حلقے سے ہنڈ ہی لگتے تھے مگر ان کے چہرے بڑے خوفناک تھے۔ اب وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”پھن کو آج یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا مگر حیرت ہے وہ آیا نہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”پھن اب بھی نہیں آئے گا۔“ ہنڈ رام ناتھ نے کہا۔ ”وہ جودھ پور میں پکڑا گیا ہے۔ وہ ایک لالہ کو اٹھا کر لے جا رہا تھا کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ وہ لڑکے کو لے کر ایک خالی مکان میں گھس گیا۔ لڑکے نے پھن کو لے کر کوشش کی تو پھن نے اس کا گلا گھونٹ دیا لیکن اس دوران لوگ بھی پیچھا کرتے ہوئے وہاں



پہنچ گئے۔ پھمن نے بچنے کے لیے اپنے پستول سے گولی چلا دی جس سے ایک آدمی بھی مارا گیا۔ مگر لوگوں نے اسے بھاگنے کا موقع نہیں دیا اور پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کے ہاتھوں دو قتل ہوئے ہیں۔ اب یا تو وہ پھانسی کے تختے پر چڑھے گا یا اس کی باقی زندگی جیل میں گزرے گی۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”رام نواس نے بتایا ہے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے یہاں پہنچا ہے۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ بھینٹ آج ہی دے دی جائے۔ پھمن نے اگر پولیس کو بتا دیا تو کل دن میں کسی بھی وقت پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔ ہم آج ہی بھینٹ دے کر صبح سویرے یہاں سے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف نکل جائیں گے۔“

”رام ناتھ ٹھیک کہتا ہے۔“ ایک اور پجاری نے کہا۔ ”رات آدھی ہو چکی ہے۔ ہمیں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، لاؤ اس لونڈیا کو۔“ پہلے آدمی نے کہا۔ ”پر رام ناتھ... وہ لونڈیا ٹھیک تو ہے نا؟ میرا مطلب ہے تم نے اس کے ساتھ کچھ...“

”ارے نہیں گوتم! رام ناتھ نے اس کی بات کاٹ دی۔“ تو جانتا ہے وہ لونڈیا کالی کی امانت ہے اور میں کالی کی امانت میں کبھی خیانت نہیں کرتا۔ منہ ماری کرنے کے لیے اور بدست کچھ ہے۔ میں جب بھی شہر جاتا ہوں پرکاش ایک سے ایک چیز میرے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ وہ تو عیش کرتا ہے عیش۔ اس کے مندر میں تو حسین و جوان لونڈیوں کا جھرمٹ لگا رہتا ہے وہ تو اپنے مندر میں راجہ اندر بنا رہتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”پر یار گوتم... وہ دو مسلمان لونڈیاں مجھے کبھی نہیں بھولیں گی جو چند روز سے میرے گاؤں میں ڈیرے جمائے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک تو ایسی ہے کہ بس دیکھتے ہی منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔ میں نے تو بہت کوشش کی تھی انہیں گاؤں سے نکلوانے کی ایک مرتبہ وہ گاؤں سے نکل دی جاتیں تو میں انہیں پکڑ کر شہر میں تمہارے پاس پہنچ جاتا۔ ارے ایسی گوری جٹی اور جوان لونڈیاں تو تم نے بھی کبھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ جوانی تو پھٹی بڑی ہے ان کی... مگر گاؤں کا وہ کھنیا...“ رام ناتھ خاموش ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

”تم تو پرلے درجے کے بے وقوف ہو...“ گوتم نے کہا۔ ”تم نے کبھی کبھی استعمال ہی نہیں کی۔ اگر تم بدھی استعمال کرتے تو آج وہ دونوں مسلمان لڑکیاں بھی تمہاری جھولی میں ہوتیں مگر اب تو تم اس گاؤں کا رخ بھی نہیں کر سکتے۔“

”ہاں یار گوتم۔“ رام ناتھ نے پھر گہرا سانس بھرا۔ ”ان لونڈیوں کے لیے میں نے رگھوئل کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہری رام کے مویشی جلادئے۔ لیکن کھنیا نے میرا ہر حربہ ناکام بنادیا اور پھر کرم چند کی اس لونڈیا کو اٹھانے میں بھی مجھ سے تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ مجھے گاؤں میں ہی رہنا چاہئے تھا۔ اس طرح میں گاؤں کے لوگوں کو کچھ اور ڈرا دھمکا کر ان مسلمان لونڈیوں کو گاؤں سے نکلوانے پر مجبور کر دیتا۔ اور پھر وہ دونوں میرے قبضے میں ہوتیں۔ سب سے پہلے تو میں اس لمبے قد والی کو گرٹا۔“

ناملہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جسم پر جیونیاں سی رہیں لگیں۔ پنڈت رام ناتھ کس بے غیرتی سے اس کے اور سسی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر رام ناتھ کا گلا گھونٹ دے۔ اس نے ہندو پنڈتوں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ بالکل سچ ثابت ہوا تھا۔ مسجد ہو، مندر یا گردوارہ... یہ جگہیں تو خدا کا گھر ہوتی ہیں۔ دنیا کے ہر مذہب کے لوگ اپنی عبادت گاہوں کا احترام کرتے

مگر مندو پنڈتوں نے تو بھگوان کے گھر کو بھی سازشوں کے مرکز اور عیاشیوں کے اڈے بنا رکھے ہیں۔  
 ”اچھا بھئی! اب زیادہ دیر مت کرو۔“ گوتم نے کہا۔ ”اس لونڈیا کو لے آؤ تاکہ جلد سے جلد فارغ ہو کر  
 تم لوگ بھی صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل چلیں۔“

”ابھی لے کر آتا ہوں۔“ پنڈت رام ناتھ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔  
 ”کھیا چاچا۔“ ناتھ نے کھیا کی طرف مرکز سرگوشی کی۔ ”اس غار کا راستہ کسی دوسری طرف ہے۔ میں  
 ماں کھڑی ہوتی ہوں تم اپنے آدمیوں کو لے کر غار میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔ اس طرف کی فکر مت  
 کرنا۔ یہاں سے کوئی بھی نہیں نکل پائے گا۔“

”لیکن۔۔۔“  
 ”میری فکر مت کرو کھیا چاچا۔“ ناتھ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم جلدی سے غار میں داخل ہونے  
 کی کوشش کرو۔“

کھیا دراڑ میں واپس مڑ گیا اور آواز پیدا کئے بغیر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ ناتھ اپنی جگہ پر کھڑی غار کے  
 اندر دیکھتی رہی۔ اس نے کھیا کا دیا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

تقریباً ”پانچ منٹ بعد پنڈت رام ناتھ“ شکنتلا کو لے کر غار میں داخل ہوا۔ ان کے ساتھ ایک اور  
 آدمی بھی تھا جس کی شکل دیکھ کر ناتھ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ کھیا کے گاؤں کا ہی آدمی تھا۔ شکنتلا  
 بالکل برہنہ تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات جیسے  
 بلند ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کی عمر ساڑھے چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اٹھتا شباب تھا، چہرے کے نقوش  
 بھی بڑے دلربا تھے۔ اسے صندلی حسن کا شاہکار قرار دیا جاسکتا تھا لیکن خوف نے اس کے چہرے کے  
 تاثرات بگاڑ دیئے تھے۔

پنڈت رام ناتھ اور دوسرے آدمی نے شکنتلا کو دونوں طرف سے قہام رکھا تھا۔ اور وہ اسے تقریباً  
 کہتے ہوئے لارہے تھے۔ غار میں موجود دوسرے پنڈتوں اور کالی کے مجسمے کو دیکھ کر شکنتلا بری طرح چیخنے  
 لگی۔

مجسمے کے سامنے بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی اٹھ گئے۔ ان کی شکلیں بڑی ہیبت ناک تھیں جنہیں دیکھ کر  
 آدمی خوف آتا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی کالی کے مجسمے کے پیچھے چلا گیا۔ صرف ایک منٹ بعد وہ واپس آیا  
 اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل کا ایک لمبا سا تینہ تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں تینہ پکڑے دوسرے ہاتھ کے  
 انگوٹھے سے اس کی دھار آزمانے لگا پھر اپنی انگلی تیز دھار پر پھیر دی۔ انگلی پر چرکا سا لگا۔ خون کے چند  
 قطرے بہر نکلے۔ اس نے انگلی سے نکلنے والے خون کے پہلے چند قطرے کالی کے مجسمے پر چھڑک دیئے اور پھر  
 اگلے سے بننے والے خون سے شکنتلا کی پیشانی پر کوئی نشان بنانے لگا۔

شکنتلا کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ پنڈت رام  
 ناتھ اور ایک دوسرے پنڈت نے شکنتلا کو پکڑ کر بکری کی طرح کالی کے مجسمے کے سامنے چبوترے پر بیٹھ دیا۔  
 وہاں بیٹھے ہوئے بری طرح ٹانگیں بٹخ رہی تھی، ساتھ ہی وہ سر کو زور زور سے جھٹکے دے رہی تھی۔ رام  
 ناتھ نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر اس طرح کھینچا کہ اس کا سر چبوترے کے بالکل کنارے پر پہنچ گیا۔ بلکہ  
 اس کا سر اسی نیچے لٹکا ہوا تھا اور اس کا گلا بالکل نمایاں ہو گیا تھا۔ دو پنڈتوں نے اس کی ٹانگیں جکڑ لی  
 تھیں۔ شکنتلا اب چیخنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک پنڈت کالی کے مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر

کچھ اشلوک بڑھنے لگا پھر اس نے نیبے والے کو اشارہ کیا۔

نانکہ کا جسم سینے میں شراور ہو رہا تھا۔ اس کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ شکنتلا اور موت کے درمیان چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا لیکن کھیا اور اس کے آدمی ابھی تک غار میں نہیں پہنچے تھے۔

نیبے والے کالے بھنگ پنڈت نے نیبے کو دونوں ہاتھ سے پکڑ کر سر سے اوپر اٹھالیا۔ مٹھلوں کی روشنی میں نیبے کا چہل چمک رہا تھا۔ نانکہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے اپنے خنجر کو نوک کی طرف سے پکڑ لیا۔ اس نے بھی خنجر استعمال نہیں کیا تھا لیکن یہاں ایک بے گناہ کی زندگی کا سوال تھا۔ وہ دراڑ سے نکل کر غار والے حصے میں آگئی اور اللہ کا نام لے کر چیختے ہوئے خنجر کو پوری قوت سے نیبے والے پنڈت کی طرف اچھال دیا۔

نانکہ کے چیختے سے سب ہی اس کی طرف گھوم گئے۔ اور پھر یہ نانکہ کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا پیچھا ہوا خنجر نیبے والے پنڈت کی گردن میں ترازو ہو گیا تھا۔ وہ چیخا ہوا پیچھے گرا۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تینہ بھی نیچے گر گیا تھا۔

پنڈت رام ناتھ اور دوسرے پنڈت شکنتلا کو چھوڑ کر اچھل پڑے تھے۔  
”یہ... یہ وہی مسلمان ناری ہے گوتم؟“ پنڈت رام ناتھ چیخا۔ ”مگر یہ یہاں کیسے آگئی۔ پکڑو اسے۔ جانے نہ پائے۔“

چبوترے پر چلتی ہوئی شکنتلا نیچے گر گئی تھی۔ دو پنڈت نانکہ کی طرف لپکے۔ نانکہ اسٹانس بنا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ مخصوص انداز میں آگے کو نکال لئے تھے۔  
”رک جاؤ۔“ غار میں ایک کڑک دار آواز گونجی۔ نانکہ نے بائیں طرف دیکھا، وہ کھیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دوسرے آدمی بھی تھے۔

”گوتم؟“ پنڈت رام ناتھ چیخا۔ ”پکڑو ان کو۔ یہ لوگ بچ کر نہ جانے پائیں اگر ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نکل گیا تو ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔“

کھیا کے دو آدمیوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ ایک نے گولی چلا دی۔ وہ گولی پنڈت رام ناتھ کے ساتھ اس آدمی کو لگی جس کا تعلق کھیا کے گاؤں سے تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ کھیا کے آدمی کو دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ نہ ہی دوسرا آدمی بندوق استعمال کر سکا تھا۔ کالی کے پجاری بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان پر جھپٹ پڑے تھے۔

نانکہ کی طرف پہلے دو پجاری آئے تھے۔ لیکن ایک دوسری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اب نانکہ کے مقابلے پر صرف ایک آدمی تھا۔ وہ لمبے قد کا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ نانکہ نے بڑی پھرتی سے اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ ٹنگ رسید کر دی۔ وہ پجاری کراہتا ہوا لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹا۔ نانکہ نے اچھل کر اس کی گردن پر ایک اور لگ رسید کر دی۔ وہ پجاری بری طرح بلبللا اٹھا۔

دوسری طرف کھیا ایک پجاری کی خبر لے رہا تھا۔ کھیا کے پاس صرف لاٹھی تھی۔ وہ کھٹکے کا ماہر تھا۔ وہ اچھل کر کھٹکے کے کتب دکھاتا ہوا لاٹھی سے پجاری کی تواضع کر رہا تھا۔ لاٹھی کی ہر ضرب پر پجاری بلبللا اٹھتا۔

رام ناتھ نے کھیا کے ایک آدمی کو زمین پر بیٹھنے کے بعد ادھر ادھر دیکھا۔ دونوں پارٹیوں کا ہر شخص لڑائی میں الجھا ہوا تھا۔ پنڈت رام ناتھ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور زمین پر پڑی ہوئی شکنتلا کو اٹھا کر غار کے

اندرونی حصے کی طرف بھاگا۔ اس نے شکنتلا کو اس طرح اٹھا رکھا تھا جیسے وہ کوئی جوان لڑکی نہیں معمولی سی لڑیا ہو۔

نالکہ نے پنڈت رام ناتھ کو شکنتلا کو اٹھا کر غار کے اندرونی حصے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے حریف کو دو تین سکس رسید کیں پھر کھڑی پھیلی کا بھرپور وار اس کے کندھے پر کیا۔ اس بھاری کویں لگا جیسے اس کے کندھے کی ہڈی پر کھانڈے سے زوردار ضرب لگائی گئی ہو۔ وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

نالکہ غار کے اندرونی حصے کی طرف دوڑی جہاں اس نے پنڈت رام ناتھ کو جاتے دیکھا تھا۔ غار آڑا ترچھا اور خاصا طویل تھا۔ کئی غار دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ نالکہ کو حیرت ہوئی کہ باہر سے بظاہر چھوٹی نظر آنے والی اس پہاڑی کے اندر غاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اب وہ پریشان ہو رہی تھی کہ کس طرف جائے۔ ہر طرف غاری غار تھے۔ پنڈت رام ناتھ، شکنتلا کو لے کر نجانے کس طرف گیا ہوگا۔

دفعۃً وہ چیخ کی آواز سن کر چونک گئی۔ یہ شکنتلا کی چیخ تھی۔ جو غار کے انتہائی اندرونی حصے کی طرف سے آئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے یہ آواز کنویں کی گہرائی سے آئی ہو۔ آواز کی سمت کا تعین کرنا مشکل تھا لیکن نالکہ محض اندازے کی بناء پر ایک غار میں بھاگتی چلی گئی۔ تمام غاروں میں مشعلیں جل رہی تھیں۔ روشنی میں اسے بھاگنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ اس غار میں بھی کئی موڑ تھے۔ ایک موڑ مڑتے ہی وہ ٹھنک کر رک گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ سامنے ہی دو انسانی ڈھانچے پڑے تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ غار کے اس حصے میں بہت سی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔

چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔ نالکہ بھر آگے دوڑنے لگی۔ اور بالا خرہ غار کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں پنڈت رام ناتھ شکنتلا کو دوپے ہوئے تھا۔ شکنتلا زمین پر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اب بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ شکنتلا کے اوپر لدا ہوا تھا اور شکنتلا چیختے ہوئے ٹانگیں چلا رہی تھی۔

”رام ناتھ! اس لڑکی کو چھوڑ دو۔“ نالکہ چیخی۔

پنڈت رام ناتھ آواز سن کر ایک دم اچھل پڑا۔ اس نے آواز کی سمت گردن مھمائی اور نالکہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ شکنتلا کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نالکہ آگے بڑھ کر اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔

”تمہاری موت بھی تمہیں یہاں پہنچ لائی ہے ناری۔“ رام ناتھ غرایا۔ ”لیکن تمہیں موت کے گھاٹ اُارنے سے پہلے میں تمہارے اس خوبصورت شریر کو اس طرح پامال کر دوں گا کہ یاد کر دوں گی۔ تمہیں گاؤں میں اکٹھ کر تو میں پاگل ہو گیا تھا۔“

”تم جیسے گھٹیا اور پست ذہنیت کے لوگوں نے اس دھرم کو بھی بدنام کر رکھا ہے رام ناتھ۔“ نالکہ نے اُپ دیا۔ ”اگر تم جیسے شیطان نہ ہوتے تو یہ دنیا جنت ہوتی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چند روز سے زیادہ نہیں لگتا لیکن تم نجانے کتنے بے گناہوں کو دیوی کی بیعت کے نام پر موت کے گھاٹ اتار چکے ہو اور نجانے کتنے معصوم لڑکیوں کی عزت پامال کر چکے ہو۔ یہ وہ لڑکی ہے جسے تم گاؤں والوں کے سامنے پتر اور بیٹی کہا لے تھے اور آج تم اسی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کرنے جا رہے ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گی!“ پنڈت رام ناتھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”آج تک بڑے بڑے سورا رام

ناٹھ کو ہاتھ نہیں لگا سکے۔ تم جیسی دہلی پتلی اور کمزور سی ناری میرا کیا بگاڑ لے گی۔ تم تو نازک اور خوبصورت سا کھلوتا ہو۔ بھگوان نے تمہیں ہم جیسے مردوں کا دل بھلانے کے لئے بنایا ہے۔ آؤ... میرے قریب آؤ۔“

رام ناٹھ دونوں بانہیں پھیلاتا ہوا آگے بڑھا۔ ناٹھ بھی دو قدم آگے بڑھ آئی اور پھر چاکل سی اس کی دائیں ٹانگ حرکت میں آئی۔ اس کی لکڑی رام ناٹھ کے دائیں بازو پر کلائی اور کہنی کے درمیان ہڈی پر لگی۔ رام ناٹھ بلبل کر پیچھے ہٹ گیا اور پھر ناٹھ نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ رام ناٹھ پر کھسک اور پنچر کی بارش کرتی رہی۔ رام ناٹھ کو حسرت ہی رہی کہ وہ اسے ہاتھ لگا سکتا۔

”تمہیں تو کوئی سورا آج تک ہاتھ نہیں لگا سکا رام ناٹھ!“ ناٹھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے غرائی۔ وہ زمین پر پڑا کر رہا تھا۔ ”مگر آج ایک دہلی پتلی اور کمزور سی ناری کے سامنے بے بس کیوں ہو رہے ہو؟ اٹھو بزدل...“ ناٹھ نے اس کی پسلیوں پر ایک اور زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

رام ناٹھ لوٹ لگا کر اٹھ گیا۔ ناٹھ کا خیال تھا کہ وہ اس پر حملہ کرے گا مگر دوسرے ہی لمحہ وہ ایک سرنگ کی طرف بھاگ نکلا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر ناٹھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”بھاگ گیا، بزدل!“ وہ بڑبڑاتی ہوئی شکنتلا کے قریب آگئی۔

شکنتلا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اس کے لیے واقعی یہ سب کچھ برا حیرت انگیز تھا۔ ایک کمزور سی لڑکی نے پنڈت رام ناٹھ جیسے مسئلے کو مار مار کر اس کا بھرتہ نکال دیا تھا اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ڈرو نہیں، اب تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ ناٹھ نے پشت پر بندھے ہوئے شکنتلا کے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا اور پھر اسے سہارا دے کر اٹھادیا۔ شکنتلا برہنہ تھی۔ ناٹھ اسے سہارہ دے کر غاروں سے باہر لے آئی۔ ایک جگہ کھیا اور اس کے ساتھیوں کی آوازیں سن کر وہ رک گئی۔ کھیا شکنتلا کا نام لے لے کر آوازیں دے رہا تھا۔

”تم بیس رکو... میں ابھی آتی ہوں۔“ ناٹھ نے شکنتلا کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ اور خود آگے بڑھ گئی۔ غار کا موڑ گھومتے ہی اسے کھیا اور اس کے آدمی نظر آ گئے۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں۔ شکنتلا کا پتہ چلا؟ اسے رام ناٹھ اٹھا کر لے گیا تھا۔“ کھیا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”شکنتلا ٹھیک ہے، اسے کچھ نہیں ہوا۔“ ناٹھ نے کہا۔ ”اسے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ کیا کسی کے پاس کوئی فالتو کپڑا ہے؟“

”شکنتلا کے کپڑے ہمیں ایک غار میں پڑے ہوئے مل گئے تھے۔“ ایک آدمی نے کپڑوں کی ایک پوٹلی سی ناٹھ کی طرف بڑھادی۔

ناٹھ وہ کپڑے لے کر غار کے دوسرے حصے میں آگئی جہاں شکنتلا کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ناٹھ نے اپنے ہاتھ سے اسے کپڑے پہنائے اور اسے لے کر غار سے باہر آگئی۔ شکنتلا دوڑ کر باپ سے لپٹ گئی۔

”باپو!“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اس دیوی نے بچالیا ورنہ وہ شیطان مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑتا۔“

”یہ تو واقعی دیوی ہے۔“ کھیا نے ناٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

”ابھی بہت رات باقی ہے۔ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہئے۔ ہم صبح تک گاؤں پہنچ جائیں گے۔“  
 ”وہ لوگ بھاگ گئے کیا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”راجپوت اپنے کسی دشمن کو بھاگنے کا موقع نہیں دیتا۔“ کھیا نے کہا۔ ”ان سب کی لاشیں غار میں پائی ہیں۔ ہمارا ایک آدمی زخمی ہوا ہے۔“  
 ”رام ناتھ تو بھاگ گیا۔“ نائلہ نے کہا۔

”باپو۔“ شکنتلا بولی۔ ”ویدی نے رام ناتھ کو مار مار کر اس کا بھر کس نکال دیا اور بالا خرا سے بھاگ کر جان بچانی پڑی ورنہ شاید ویدی اسے جان سے مار دیتی۔“  
 ”چلو اب دیر نہ کرو۔“ کھیا نے کہا۔

وہ لوگ غار سے نکل آئے۔ پاڑیوں سے باہر آنے کے بعد ان کا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔  
 وہ لوگ رکے بغیر چلتے رہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی تو وہ گاؤں سے چند میل دور رہ گئے تھے۔ وہ سب من جانتے تھے کہ سورج نکلنے کے بعد ریت تپ جائے گی تو راستہ طے کرنا دشوار ہو جائے گا اس لیے تیزی سے چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سورج نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد وہ گاؤں پہنچ گئے۔ وہ سب عائشہ کے گھر پر آئے تھے اور گاؤں کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ شکنتلا لوگوں کو نائلہ کی بہادری کے قصے سن رہی تھی۔  
 اس واقعہ کے بعد نائلہ کو واقعی اس گاؤں میں دیوی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ گاؤں کے لوگ اس کی پرستش کرنے لگے تھے۔ کھیا اور بہت سے لوگوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جائیں، مگر ظاہر ہے نائلہ اور سسی یہاں نہیں رہ سکتی تھیں۔

نائلہ ہر وقت یہی سوچتی رہتی تھی کہ وہ اپنے وطن واپس کس طرح جائے۔ اس گاؤں کے ہندو واقعی بہت اچھے تھے۔ نیک لوگ تھے اور اس کے احسان مند بھی تھے لیکن پورے ہندوستان کے لوگ ان کی طرح وہ رد اور نیک تو نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ہندو حکمرانوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ پاکستان کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ آدھا پاکستان تو وہ توڑ چکے تھے اور اب سندھ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ رائے ایجنٹوں کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ جو پاکستان میں تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ یہی ایک پاکستانی فوجیوں کو دولت کا لالچ دے کر یا دوسرے طریقوں سے ورغلا کر بھارت لے جاتے جہاں ان کا امتحان ہی میں انہیں رائے کیپیوں میں برین واشنگ کر کے ان کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت کا اہر بھر دیا جاتا اور پھر انہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے کر دوبارہ پاکستان بھیج دیا جاتا۔

سندھ کی سرحدوں پر آباد ہندو ان بھارتی ایجنٹوں کو پناہ دیتے اور انہیں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتے۔ ان کی مدد سے وہ پاکستان کی سرحدوں پر داخل ہوتے اور وہاں رہتے اور وہ انہیں بھی اسی مقصد سے راجستھان بھیجتے تھے جہاں رام گڑھ کے کیپ میں ان دونوں کی برین واشنگ کر کے انہیں تربیت دی جاتی اور پھر پاکستان بھیج دیا جاتا یا ہندوستان ہی میں ان سے کوئی کام لیا جاتا۔

نائلہ نے کھیا سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد کر سکے اور انہیں اس طرح سرحد پار کرادے۔

”چہ قہر کا ریگستان ہے دیوی۔“ کھیا نے کہا۔ ”سرحد تو یہاں سے چند میل دور ہے لیکن سنا ہے کہ اس طرف میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ اگر تم لوگ راستہ بھٹک گئیں تو قہر میں بھوک پیاس سے

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مچاؤ گی۔“

”مگر سنا ہے اسلگر بھی مال لے کر سرحد پار آتے جاتے ہیں؟“ نائلہ نے کہا۔

”ہاں۔“ کھیا نے سر ہلایا۔ ”مگر وہ یا تو شان گڑھ والا راستہ استعمال کرتے ہیں یا شمال کی طرف کا دوسرا راستہ جہاں سے وہ سیدھے رام گڑھ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ یہ راستہ کبھی استعمال نہیں ہوا کیونکہ سرحد کے دوسری طرف میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ میرا بیٹا ایک دو دن میں شہر سے آنے والا ہے۔ اس سے کہوں گا کہ اگر اس کا کوئی جاننے والا ہو تو بات کی جائے۔“

”نہیں کھیا چاچا۔“ نائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس طرح ہمارے لیے خطرہ ہو گا۔ اگر تم ہمیں شان گڑھ اپنے کسی جاننے والے کے پاس پہنچا دو تو وہاں سے ہم خود ہی کوشش کریں گی۔“

”اچھا بیٹا، میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ لیکن تمہیں دو تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔“ کھیا نے جواب دیا۔

دو تین روز گزر گئے۔ نائلہ اور سسی اب اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ جلد سے جلد میاں سے نکل جانا چاہتی تھیں کیونکہ نائلہ کو اندیشہ تھا کہ اگر یہاں ان کی موجودگی کی اطلاع شہر پہنچ گئی تو وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گی۔

نائلہ کو اب سب سے زیادہ خطرہ پنڈت رام ناتھ کی طرف سے تھا جو ان چٹانوں سے بھاگ نکلا تھا۔ وہ نہایت گھٹیا ذہنیت کا مالک اور کینہ پرور آدمی تھا۔ نائلہ ہی نے اسے مار مار کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نائلہ ہی نے اس کا شکار چھینا تھا اور نائلہ ہی نے کالی کی بیھٹ میں دخل اندازی کر کے شکنتلا کو بیھٹ نہیں چڑھنے دیا تھا۔ پنڈت رام ناتھ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ اس سے انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ اور نائلہ جانتی تھی کہ پنڈت کا انتقام بہت خوفناک ہو گا۔

نائلہ کا اندیشہ درست نکلا۔ چوتھے دن پولیس کی ایک جیب گاؤں پہنچ گئی۔ کئی سال بعد پہلی مرتبہ پولیس اس گاؤں میں آئی تھی۔ ان پولیس والوں میں ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور چار کانسٹیبل تھے۔ ان کے ساتھ پنڈت رام ناتھ بھی تھا۔ جسے جھکڑی لگی ہوئی تھی۔ ان پولیس والوں نے کھیا کے مکان پر ہی پڑاؤ ڈالا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔

”کھیا جی!“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”پنڈت رام ناتھ کو ہم نے رام گڑھ میں ایک قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا ہے کہ یہاں دو مسلمان لونڈیاں چھپی ہوئی ہیں۔ وہ لڑکیاں پاکستان کی سرحد غیر قانونی طور پر عبور کر کے آئی ہیں۔ وہ پاکستان کی جاسوس بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لیے آپ لوگ ان پاکستانی لڑکیوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔“

”وہ دونوں لڑکیاں تو دیویاں ہیں تھانیدار جی۔ وہ جاسوس کیسے ہو سکتی ہیں۔ اگر نائلہ نہ ہوتی تو وہ کرم چند کی بیٹی کو کالی کی بیھٹ چڑھا دیتے۔ اس شیطان نے...“ کھیا نے پنڈت کی طرف اشارہ کیا۔ ”گاؤں کے رکھو ناتھ کو قتل کر دیا۔ ہری رام کے باڑے میں آگ لگا کر مویشیوں کو زندہ جلا دیا اور شکنتلا کو اغواء کر کے چٹانوں میں لے گیا جہاں اسے کالی کی بیھٹ چڑھایا جا رہا تھا کہ نائلہ نے اسے بچالیا۔ تم ان عاروں میں جا کر دیکھو وہاں انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نجانے کتنے بے گناہوں کو کالی کی بیھٹ چڑھا چکے ہیں۔ یہ راکھش محض انتقام لینے کے لیے تم لوگوں کو یہاں لے آیا ہے۔“

”کھیا جی!“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”رام ناتھ نے ہمیں سب کچھ بتایا ہے۔ اس عار سے ہمیں کالی کے

چند پجاریوں کی لاشیں بھی ملی ہیں جو آپ لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ وہ سب لوگ قاتل تھے اور کسی قاتل کو سزا دینا صرف قانون کا کام ہے۔ کوئی دوسرا آدمی کسی قاتل کو بھی قتل کر دے تو وہ قانون کی گرفت میں آتا ہے۔ لیکن اس گاؤں سے ہمیں کبھی کوئی شکایت نہیں ملی۔ ہم ان خونی پجاریوں کا قتل بھی معاف کرنے کو تیار ہیں لیکن ان دونوں پاکستانی لڑکیوں کو ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔

”وہ لونڈیاں تو بے گناہ ہیں تھانیدارجی۔ راستہ بھٹک کر اس طرف آ گئی تھیں۔ ہم نے انہیں پناہ دی۔ اگر ہم انہیں پولیس کے حوالے کر دیں تو یہ ہم راجپوتوں کی شان کے خلاف ہے۔“

”کھیا جی!“ تھانیدار نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”ہم ان لڑکیوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے اور اگر وہ واقعی بے قصور ہوں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ خود عزت و احترام کے ساتھ انہیں یہاں چھوڑ کر جاؤں گا۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اگر وہ چاہیں گی تو انہیں پاکستان واپس بھیجے گا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔“

”مگر تھانیدارجی....“

”کچھ نہیں کھیا چاہا۔“ یہ آواز سن کر وہ سب اس طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ نائلہ تھی جو دروازے میں لٹری کہہ رہی تھی۔ ”آپ کو پولیس نے دشمنی مول لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان کے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔ دکھ، تکلیفیں اور مضیبتیں شاید ہمارا مقدر بن چکی ہیں۔ ہمارا اللہ مالک ہے۔ آپ رام ناتھ جیسے شیطانوں سے ہوشیار رہئے۔ اس گاؤں کے لوگوں نے جس طرح ہماری ممان نوازی کی ہے اسے ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔“

اور پھر آدھے گھنٹے بعد نائلہ اور سسی پولیس کی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سب انسپکٹر دوسرے فائنیبلوں اور پنڈت رام ناتھ کے ساتھ چھیلی سیٹوں پر تھا۔ جپ گاؤں سے نکل کر دھول اڑاتی ہوئی کچے راستے کی طرف روانہ ہو گئی۔ گاؤں کے لوگ ایک جھوم کی صورت میں کھڑے تھے۔ نائلہ نے مڑ کر دیکھا اور ہر سامنے دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب دیکھئے قسمت اسے کیا تماشہ دکھاتی ہے!

..... \* \* \* .....

دلاور صادق آباد سے روانہ ہو کر میرپور ماٹیلو پہنچ گیا۔ یہ سکھر کی بس تھی جو شہر کے اندرونی اڈے پر جانے کی بجائے بیرونی اڈے پر رکی تھی۔ وہاں سے شہر تک دلاور کو تانے پر آنا پڑا تھا۔

دلاور اپنی رائفل لے کر نہیں آیا تھا کیونکہ اس کا لائسنس انسپکٹر صوبہ خان نے پھاڑ دیا تھا۔ اور رحیم اراٹاں میں متعلقہ دفتر سے لائسنس کی ڈبلی کیٹ نکلوانے میں کچھ وقت لگتا۔ البتہ اس کے پاس ایک بھرا ہوا نائل تھا جو اس نے اپنے لباس میں چھپا رکھا تھا۔ یہ پستول بغیر لائسنس کے تھا۔ شہر پہنچ کر دلاور نے ایک بار لے پھل اور لمبے دستے والی کلہاڑی اور ایک اجرک بھی خرید لی۔ اجرک اس نے مخصوص سندھی انداز میں کمر پر اس طرح لپیٹی تھی کہ اس کے دونوں پلو آگے سے کندھے پر سے ہوتے ہوئے پیچھے چلے گئے تھے۔ کلہاڑی کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا جس کے لیے لائسنس کی ضرورت ہوتی۔ سندھی باشندے کلہاڑی کو تو اپنا اہل ہتھیار سمجھتے تھے۔ ایک گٹھ سے دوسرے گٹھ یا جنگل و صحرا میں سفر کرتے ہوئے تو کلہاڑی ان کے پاس طہر ہوتی تھی۔

اپنے محلے سے دلاور ایک سندھی نوجوان ہی لگتا تھا۔ پیروں میں کھسے، چوڑے گھیر والی شلوار، نیلے رنگ



کی قیص، میرون پرنٹ والی انٹرک اور چرے پر بڑی بڑی مومچیں۔

دلاور کو اگر کوئی خطرہ تھا تو انسپٹر صوبہ خان ہی کی طرف سے تھا۔ ابھی کل رات ہی تو اس نے صوبہ خان کو اس کے ماتحتوں کے سامنے دوڑ لگوائی تھی۔ صوبہ خان اپنی یہ بے عزتی کس طرح بھول سکتا تھا! اور پھر انہوں نے ہی صوبہ خان کی حویلی کا راز فاش کر دیا تھا۔ گھونگی کے اے سی نے وہ حویلی سرسبز کر دی تھی۔ صوبہ خان اسے بھی آسانی سے بھولنے والا نہیں تھا۔ دلاور کو یقین تھا کہ اگر صوبہ خان نے اسے دیکھ لیا تو وہ کچھ پوچھے بغیر اسے گولی مارے گا۔ وہ صوبہ خان سے خوفزدہ نہیں تھا۔ لیکن احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ جب بسوں کے اڈے پر پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ جردار کی طرف جانے والی بس تقریباً "ایک گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔ وہ وقت گزاری کے لیے ایک ہوٹل میں بیٹھ گیا جہاں اونچی آواز میں بھارتی فلمی گانے بجائے جا رہے تھے۔ دلاور نے ایک میز پر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا اور ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ابھی چائے پی ہی رہا تھا کہ ایک آدمی بڑی بے تکلفی سے اس کی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ دلاور نے اس شخص کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے انہیں صوبہ خان کی حویلی کے بارے میں بتایا تھا۔

"آپ کی مسکراہٹ بتاتی ہے سائیں کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔" وہ شخص بولا۔

"ہاں۔" دلاور بولا۔ "تمہارا تعلق پولیس سے ہے اور تم وہی ہو نا جس نے ہمیں صوبہ خان کی حویلی کے بارے میں بتایا تھا۔"

"ہاں سائیں، میری اطلاع غلط تو نہیں تھی نا؟" وہ شخص بولا۔

"تمہاری اطلاع بالکل درست ثابت ہوئی تھی لیکن ہمیں جن لڑکیوں کی تلاش تھی وہ حویلی میں نہیں تھیں۔" دلاور نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے وہ لڑکیاں کس طرف گئی ہیں۔" وہ شخص بولا۔ "لیکن سائیں! کل رات تم نے صوبہ خان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا مزہ آگیا۔ صبح سے سارے شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ کون جی دار تھا جس نے صوبہ خان کو بنگار کے سڑک پر دوڑ لگوائی تھی۔"

"اگر دن کا وقت ہوتا تو میں اس کامنہ کالا کر کے پورے شہر میں چکر لگواتا۔" دلاور بولا۔ "لیکن تم ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے وہ کس طرف گئی ہیں۔"

"بخش علی لاشاری۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"یہ کسی آدمی کا نام ہے یا جگہ کا؟" دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک قصبہ ہے سائیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "جب وہ لڑکیاں صوبہ خان کی پاجیرو لے کر حویلی سے بھاگی تھیں تو صوبہ خان نے دائرے پر تمام تھانوں کو اطلاع کر دی تھی اور آج صبح بخش علی لاشاری کے تھانے سے دائرے پر اطلاع ملی تھی کہ صوبہ خان کی پاجیرو بخش علی لاشاری سے دو میل دور سڑک پر مل گئی ہوئی ملی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکیاں بھی بخش علی لاشاری یا اس کے آس پاس کسی گوتھ میں موجود ہیں۔ صوبہ خان تو صبح یہ اطلاع ملتے ہی جیپ پر بخش علی لاشاری چلا گیا تھا۔ لیکن سائیں! گتا ہے کہ صوبہ خان کے دن پورے ہو چکے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" دلاور نے پوچھا۔

”صوبہ خان کے جانے کے دو گھنٹے بعد وائریس پر تھانے کو ڈی آئی جی کا پیغام ملا ہے کہ وہ فوری طور پر کراچی پہنچ کر آئی جی صاحب کے سامنے پیش ہو۔“ اس شخص نے بتایا۔

”بخش علی لاشاری یہاں سے کتنی دور ہے۔ اور میں کس طرح وہاں پہنچ سکتا ہوں؟“ دلاور نے پوچھا۔  
”یہاں سے جروار چلے جاؤ اور وہاں سے دوسری بس تمہیں شام تک بخش علی لاشاری پہنچا دے گی مگر تمہیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ صوبہ خان بھی اسی طرف گیا ہے۔“ اس شخص نے کہا۔

”تم میری فکر مت کرو۔“ دلاور نے کہا۔ ”لیکن تم صوبہ خان کے اتنا خلاف کیوں ہو؟“

”وہ بہت شیطان آدمی ہے سائیں۔ ہم لوگوں سے بھی ناجائز کام لیتا رہتا ہے۔ علاقے کا کوئی آدمی تو اس کے خلاف بول بھی نہیں سکتا مگر مجھے یقین ہے کہ تم لوگ اس کا تختہ ضرور الٹ دو گے۔ اسی لیے کل میں نے تم لوگوں کو اس کے بارے میں بتایا تھا۔ میں ہی نہیں، اس علاقے کا ہر شخص چاہتا ہے کہ یہ جلاد کیس اور غارت ہو جائے تاکہ اس علاقے کے لوگ سکھ کا سانس لے سکیں۔“

”فکر مت کرو۔ یہ جلاد جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔“ دلاور نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہئے جروار کی بس جانے ہی والی ہوگی۔“

”ہاں سائیں، تم جاؤ۔۔۔ مگر ٹھہرو۔۔۔ بخش علی لاشاری میں تم کہاں رہو گے؟“ اس شخص نے پوچھا۔  
”وہاں کوئی سرائے وغیرہ تو ہوگی۔“ دلاور بولا۔

”سرائے تو ہے مگر تمہیں سرائے میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ماما کا لڑکا وہاں رہتا ہے۔ تم اس کے پاس چلے جانا۔ وہ تمہیں اپنے گھر میں رہنے کو جگہ بھی دے دے گا اور کھانے پینے کا بندوبست بھی کرے گا اور بخش علی لاشاری کے خاندان پر ستار بکھیرو۔ وہ صوبہ خان کا خاص آدمی ہے۔ اگر اسے تم پر شبہ ہو گیا تو پکڑ کر بند کر دے گا۔“ اس شخص نے دلاور کو اپنے ماموں زاد بھائی بہاول کا پتہ لکھ کر دے دیا۔

دلاور نے پتہ سنہال کر رکھ لیا اور بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملا کر ہوٹل سے باہر آگیا۔ جروار جانے والی بس لی سٹیشن بھر رہی تھیں۔ دلاور بھی ٹکٹ لے کر بیٹھ گیا۔ تقریباً ”پندرہ منٹ بعد بس حرکت میں آئی۔“ اس تقریباً ”دو گھنٹے میں جروار پہنچی تھی۔ وہاں سے فوراً ہی بخش علی لاشاری کے لیے بس مل گئی۔ یہ بس ہری طرح بھری ہوئی تھی۔ سیٹوں کے درمیان راستے میں بھی چھوٹے چھوٹے اسٹول رکھے ہوئے تھے۔ اس سیٹوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ دلاور کو بھی ایک اسٹول پر بیٹھ جانا پڑا۔ بس جب روانہ ہوئی تو پوری طرح بھر چکی تھی۔ انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسنا گیا تھا۔ بہت سے مسافر بس کی چھت پر بھی بٹھے ہوئے تھے۔

بس شام کا اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے بخش علی لاشاری پہنچی تھی۔ اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا۔ کئی بازار تھے۔ دلاور نے بس سے اترتے ہی ایک دوکان والے کو بہاول کا پتہ بتا کر اس کے بارے میں پوچھا۔  
”اس بازار میں چلے جاؤ۔“ دوکاندار نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”بائیں طرف پانچویں گلی میں مڑ جانا۔“ اس سے بھی پوچھ لو گے تو وہ تمہیں بہاول کا گھر بتا دے گا۔“

دلاور اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ تنگ سا بازار تھا۔ پورے بازار پر ترپالوں اور ٹین کے ماٹوں کی چھت سی بنی ہوئی تھی۔ دوکانوں کے سامنے بوریوں کے انبار پڑے تھے۔ چٹے والوں کے لیے واسطو تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بازار میں ہاتھ کے ریزے بھی تھے اور گدھا گاڑیاں بھی۔ خانے والوں

نے الگ جگہ گھیر رکھی تھی۔ بازار میں گھما گھسی تھی لیکن ہر شخص جلدی میں نظر آ رہا تھا۔ قرب و جوار کے گونٹھوں سے آئے ہوئے لوگ جلدی جلدی اپنی ضرورت کی اشیاء خرید رہے تھے کیونکہ انہیں شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے اپنے گھروں کو واپس پہنچنا تھا۔

بازار میں چلتے ہوئے دلاور نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ یہاں زیادہ تر دوکانیں ہندوؤں کی ملکیت تھیں۔ تقریباً ہر کاروبار پر ہندو ہی چھائے ہوئے تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلتا رہا۔ پھر بائیں طرف کی پانچویں گلی میں مڑ گیا۔ گلی میں آتے ہوئے ایک آدمی کو روک کر اس نے بہاول کے بارے میں پوچھا۔

”اس گلی میں چلے جاؤ۔ دائیں طرف میرا مکان ہے۔“ اس شخص نے بتایا۔ دلاور اس گلی میں مڑ گیا۔ دائیں طرف تیسرے مکان کے سامنے وہ رک گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک لڑکی نے باہر جھانکا۔

”کیا بات ہے ادا؟ کس سے ملنا ہے تم کو؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”بہاول سے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”میں مائیلو سے آیا ہوں۔ شفیع محمد نے ایک پیغام دیا ہے بہاول کے لیے۔“

”بابا تو ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔ میں بیٹھک کا دروازہ کھول دیتی ہوں۔ تم اندر آ کر بیٹھ جاؤ۔ میں اماں کو بتاتی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔

”نہیں“ میں ایک گھنٹے بعد آ جاؤں گا۔“ دلاور نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر واپس مڑ گیا۔

وہ دوبارہ بازار میں آ گیا۔ اسے جلد ہی ایک چھوٹا سا ہوٹل مل گیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس دوران کھانے وغیرہ ہی سے منٹ لیا جائے۔ اس نے ہوٹل کے ملازم لڑکے کو بلا کر کھانے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کئی نام گنوا دیئے۔

”تم صرف ایک پلیٹ بھنا اور دو روٹی لے آؤ۔“ دلاور نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد لڑکے نے اس کے سامنے سالن کی پلیٹ اور ایک چنگیر میں دو روٹیاں اس کے سامنے لا کر رکھ دیں۔ پہلا ٹولا منہ میں رکھتے ہی دلاور نے برا سامنہ بنایا۔ بڑا ہی بد ذائقہ سالن تھا۔ لیکن بہر حال اسے یہ کھانا تو کھانا ہی پڑا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے چائے بھی پی تھی۔ چائے بہر حال اچھی تھی۔

چائے پینے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ یہاں بھی بھارتی فلمی گانے پورے زور و شور سے چل رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دلاور وہاں سے اٹھ گیا۔ کچھ دیر تک بازار میں گھوم پھر کر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر بہاول کے مکان پر آ گیا۔ اس وقت بہاول گھر پر موجود تھا۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا۔

”میرا نام دلاور ہے۔ میں مائیلو سے آیا ہوں۔ شفیع محمد نے مجھے آپ کا پتہ دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ میری مدد بھی کر سکیں گے۔“ دلاور نے کہا۔

”ایک منٹ سائیں۔“ بہاول نے کہا۔ ”میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔ آرام سے بات کریں گے۔“ بہاول اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ساتھ والا دروازہ کھلا اور بہاول نے اسے اندر بلا لیا۔

بیٹھک کا یہ کمرہ زیادہ بھرا نہیں تھا۔ ایک طرف پلاسٹک کی چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں ان کے سامنے پرانی سی کافی ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ فرش پر پلاسٹک کی چٹائی چبھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک بہت بڑی رلی چبھی ہوئی تھی اور دیوار کے ساتھ تین چار گاؤں تلنے لگے ہوئے تھے۔ دلاور نے جو تار دروازے کے قریب

ی اتار دیا اور رلی پر بیٹھ گیا۔ بہاول بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

بہاول کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ بڑی بڑی جفاوری مونچھیں تھیں۔ جنہیں گل مجھے کہتا زیادہ مناسب ہوگا۔ داڑھی نہیں تھی لیکن شاید دو دن سے شیو نہیں بنایا گیا تھا۔ کشادہ پیشانی اور موٹی موٹی آنکھیں۔ اس کے دائیں کان میں چاندی کی بالی تھی۔ یہ بالی بچپن میں کسی منت کے طور پر پرستانی تھی ہوگی جو اب کان کی لومیں پھنسی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

”دلاور سائیں، پہلے یہ بتاؤ کوئی ٹکرمائی کھایا ہے یا نہیں؟“ بہاول بولا۔  
”میں روٹی کھا چکا ہوں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”اور بتاؤ... میں آپ کی کیا خدمت کروں سائیں؟“ بہاول نے پوچھا۔

”کچھ روز پہلے ماتھیلو کے الپکڑ صوبہ خان نے دو لڑکیوں کو اسلحہ کے زور پر اغواء کیا لیکن وہ لڑکیاں اس کی پاجرو لے کر بھاگ نکلیں۔ آج پتہ چلا کہ وہ پاجرو یہاں سے قریب ہی چلی ہوئی پائی گئی تھی۔ میں ان لڑکیوں کی تلاش میں آیا ہوں بہاول سائیں۔ شفیع محمد نے کہا تھا کہ تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے۔“ دلاور نے کہا۔

”مجھ سے جو ہو سکے گا کروں گا سائیں۔“ بہاول نے کہا۔ ”صوبہ خان بھی آج یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ بہت بھرا ہوا ہے۔“

”میں صوبہ خان سے نہیں ڈرتا وہ مجھے اچھی طرح جان چکا ہے لیکن خوف اس بات کا ہے کہ اگر وہ لڑکیاں اس کے ہاتھ لگ گئیں تو وہ انہیں غائب کر دے گا، بلکہ ڈر ہے کہ وہ انہیں قتل نہ کر دے۔“ دلاور نے کہا۔

”وہ لڑکیاں کون ہیں اور تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟“ بہاول نے پوچھا۔

”ان میں ایک لڑکی رحیم یار خاں کی بہت بڑی زمیندار ہے۔ اس کا تعلق درانی قبیلے سے ہے۔ اس کے ماں باپ مرچکے ہیں اور اس کے بعض رشتہ دار اسے قتل کر کے اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی کا نام نائلہ درانی ہے اور اس کے ماموں زاد بھائی شیر درانی نے اسے قتل کروانے کے لیے صوبہ خان سے پانچ لاکھ روپے میں معاملہ طے کیا ہے۔ وہ لڑکی صوبہ خان کے ہاتھ آگئی تھی مگر کسی طرح اس کے چنگل سے ہماگ نکلی۔“ دلاور چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے نائلہ کی پوری کہانی سنائی۔

”اور وہ دوسری لڑکی کون ہے؟“ بہاول نے پوچھا۔

”وہ کسی چھوٹے سے گوتھ کے سندھی گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کا نام سسی ہے۔ نائلہ اس کے گھر میں نہا لے ہوئے تھی۔ صوبہ خان اور اس کے آدمی اسلحہ کے زور پر نائلہ کے ساتھ سسی کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ صوبہ خان نے ان دونوں لڑکیوں کو گھونگی کے قریب ایک حویلی میں بند کر دیا مگر یہ دونوں صوبہ خان کی پاجرو پر حویلی سے بھاگ نکلیں۔ میں انہی کی تلاش میں نکلا ہوں۔ آج جب ماتھیلو پہنچا تو شفیع محمد نے بتایا کہ صوبہ خان کی پاجرو چلی ہوئی حالت میں یہاں سڑک پر ملی ہے۔ وہ لڑکیاں بھی یقیناً اسی قصبے یا آس پاس کے کسی گوتھ میں موجود ہوں گی۔“

”ان دونوں لڑکیوں کا چرچا آج صبح ہی سے سننے میں آرہا ہے۔ صوبہ خان یہاں پہنچنے کے بعد یہاں کی پولیس کے ذریعے مشکوک گھروں کی تلاشی بھی لے چکا ہے اور آس پاس کے گوتھوں کو بھی چیک کیا جا رہا ہے۔ ایک منٹ...“ بہاول کتے کتے خاموش ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”آج صبح سینٹھ کھٹول اور اس کے آدمیوں کی نقل و حرکت بڑی مشکوک رہی ہے۔ اس کی جیب پیٹرول  
 بھر کر فیکٹری کی طرف گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔“ ہماول بولا۔  
 ”سینٹھ کھٹول کون ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”اس علاقے کا بہت بڑا سینٹھ ہے۔ بڑا کاروبار ہے اس کا۔ ایک کاشن جنگ فیکٹری بھی ہے۔ لیکن اس  
 کا اصل کام اسمگلنگ ہے۔ سرحد پار اس کے گمرے تعلقات ہیں۔ اس کے بارے میں اور بھی بہت سے  
 شبہات ہیں۔ اس کا مال لے جانے والے قافلے عام طور پر رات کے وقت سفر کرتے ہیں۔ لیکن آج اس کی  
 جیب میں صبح پپ سے پیٹرول بھرا گیا تھا اس کے بعد وہ جیب نظر نہیں آئی۔ اور اس کے دو تین آدمی بھی  
 سارا دن دکھائی نہیں دیئے... میرے ساتھ آؤ...“ ہماول کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دلاور بھی اٹھ کر کھسکے پہننے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں گھر سے نکل کر مختلف گلیوں میں چل رہے  
 تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ دستک دینے پر ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا۔  
 ”ہماول تم! اس وقت خیر تو ہے نا؟“ دروازہ کھولنے والے نے پوچھا۔ ”یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟“  
 ”میرا اسمان ہے ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آئے ہیں نبی بخش۔“ ہماول نے کہا۔

”آؤ... اندر آجاؤ آرام سے بات کرو۔“ نبی بخش نے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔ وہ دونوں نبی بخش  
 کے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔  
 ”اب بتاؤ کیا بات ہے؟“ نبی بخش نے پوچھا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے سینٹھ کھٹول کی جیب آج صبح کہاں گئی تھی اور اس میں کون کون تھا؟“ ہماول نے  
 پوچھا۔

”میرا خیال ہے سینٹھ کھٹول کی شامت ہی آگئی ہے جس نے صوبہ خان جیسے شخص کے شکار پر ہاتھ ڈال  
 دیا ہے۔“ نبی بخش نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں، کھل کر بات کرو نبی بخش۔“ ہماول نے کہا۔  
 ”صوبہ خان جن دو لڑکیوں کی تلاش میں آیا ہے نا۔ انہیں سینٹھ کھٹول نے صبح کاپیلو بھجوا دیا تھا اور  
 یہاں سے شاید اب وہ انہیں سرحد کی طرف بھیج چکا ہو۔“ نبی بخش نے کہا۔  
 ”تمہیں یہ سب کچھ کہنے پہ چلا اور وہ لڑکیاں سینٹھ کھٹول کے ہاتھ کیسے لگیں؟“ ہماول بولا۔

”آج دوپہر کو گلزاری لعل میرے پاس آیا تھا۔“ نبی بخش نے کہا۔ ”اس نے بتایا تھا کہ آج صبح سویرے  
 جب وہ مندو کے ساتھ سینٹھ کی جنگ فیکٹری پہنچا تو ایک کوٹھری میں دو لڑکیاں سو رہی تھیں۔ انہوں نے  
 لڑکیوں کو جگایا۔ وہ دونوں سہمی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کسی گوٹھ سے راستہ بھول کر اس طرف  
 آگئی ہیں اور رات گزارنے کے لیے کوٹھری میں گھس کر سو گئی تھیں۔ گلزاری نے لڑکیوں کو تو وہیں روکے  
 رکھا اور مندو کو سینٹھ کے گھر بھیج دیا اطلاع دینے کے لیے، سینٹھ کو صوبہ خان کی جلی ہوئی جیب کے بارے میں  
 پتہ چل چکا تھا۔ یہاں کے تھانیدار نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ سینٹھ کو شبہ ہو گیا تھا کہ یہ وہی لڑکیاں ہو سکتی  
 ہیں۔ وہ فیکٹری کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس دوران ایک لڑکی پر گلزاری کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے  
 لڑکی پر ہاتھ ڈالنا چاہا تو اس نے گلزاری کی پٹائی کر دی۔ اتنے میں سینٹھ لوگ بھی پہنچ گئے۔ اس نے لڑکیوں کو  
 صوبہ خان کا نام لے کر ڈرا دیا اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ انہیں کاپیلو اپنی بہن کے گھر بھیج

بتا ہے۔ اس طرح اس نے لڑکیوں کو جیپ پر کاجیلو بھیج دیا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ ان لڑکیوں کو وہاں سے سرحد پار بھیج دے اور میرا خیال ہے کہ اب تو وہ سرحد کی طرف چلے گئے ہوں گے مگر تم ان لڑکیوں کے رے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”یہ میرا مہمان دلاور ہے۔“ بہاول نے کہا۔ ”وہ شریف گھروں کی لڑکیاں ہیں۔ صوبہ خان نے انہیں بردستی اٹھالیا تھا۔ یہ انہی کی تلاش میں آیا ہے۔ میں نے سوچا تم سے پتہ کروں کیونکہ قصبے کی ہریات کی خبر کتنے ہوتا؟“

”اپنے مہمان سے کہو کہ اب پیچھے دوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ لڑکیاں اگر سرحد پار کر گئیں تو پھر ان کے ملنے کی امید دل سے نکال دینی چاہئے۔“ نبی بخش نے کہا۔

”اچھا، اب ہم چلتے ہیں۔“ بہاول اور اس کے ساتھ دلاور بھی اٹھ گیا۔  
 ”کہاں جاتے ہو سائیں، بیٹھو، چائے تو پیٹے جاؤ نا...“ نبی بخش نے کہا۔  
 ”تمہاری چائے کسی اور دن پی لوں گا نبی بخش، ابھی کچھ اور ضروری کام ہیں۔“ بہاول نے جواب دیا  
 روہ دلاور کے ساتھ مکان سے باہر آگیا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ بہاول نے گلی میں چلتے ہوئے کہا۔ ”اگر ان لڑکیوں کو واقعی سرحد کی طرف بھیج دیا ہے تو ان کے ملنے کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔“  
 ”کاجیلو یہاں سے کتنی دور ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”تقریباً دو گھنٹے کا راستہ ہے لیکن بس تو صبح ہی ملے گی۔“ بہاول نے جواب دیا۔  
 ”اس وقت کسی سواری کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ میرا مطلب ہے کوئی جیپ وغیرہ۔ میں منہ مانگے پیسے دے کر تیار ہوں۔“ دلاور نے کہا۔ ”ممکن ہے ان کے پر وگرام میں کوئی تبدیلی آگئی ہو۔ اور وہ لڑکیاں ابھی کاجیلو میں ہی موجود ہوں۔“

”اس وقت کاجیلو...“ بہاول نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ میں شیوا کی ایک آدمی کو جانتا ہوں۔ اس کے پاس ایک چھوٹا ٹپک اپ ٹرک ہے اور وہ تیار ہو جائے تو تم اسی وقت کاجیلو جا سکتے ہو۔ بصورت دیگر صبح بس پکڑنی پڑے گی۔“

وہ لوگ گلیوں ہی گلیوں میں چلتے ہوئے قصبے کے دوسرے علاقے میں واقع ایک مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں پتہ چلا کہ شیرا، گنگو کے ہوٹل پر بیٹھا قلم دیکھ رہا ہے۔ گنگو کا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ گنگو ایک ادھیڑ ہندو تھا۔ اس کے ہوٹل کی اس وقت ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف اونچی میز پر رنکین ٹی وی دی سی آر رکھا ہوا تھا۔ اور وی سی آر سے ٹی وی پر ایک بہت ہی بے ہودہ بھارتی فلم چل رہی تھی۔ قلم نے کسی کیلئے کسی ٹکٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف یہ شرط تھی کہ اگر پوری فلم دیکھنی ہو تو کم از کم تہہ چائے ضرور پینی پڑتی تھی۔ ہوٹل میں زیادہ تعداد نو عمر لڑکوں کی تھی۔

شیرا بھی موجود تھا۔ بہاول نے اسے اشارے سے باہر بلایا اور ایک طرف لے جا کر اس سے بات لے گا۔

”بہت مشکل ہے۔“ شیرا نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”رات کے وقت سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے اور سے بڑا خطرہ تو صوبہ خان ہے جو آج شام ہی کاجیلو گیا ہے۔“

”صوبہ خان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں تمہیں منہ مانگے پیسے دوں گا۔“

شیرا نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ دلاور نے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ بالا خر شیرا جانے پر آمادہ ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ بہاول نے کہا۔ ”تم گاڑی میں پیٹرول وغیرہ بھروا کر قصبے کے باہر کاچیلو والی سڑک پر آ جاؤ۔ ہم وہیں پر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔“

دلاور نے شیرا کو پیٹرول وغیرہ کے لیے کچھ رقم دے دی اور بہاول کے ساتھ وہاں سے چل پڑا۔ وہ دونوں مختلف گلیوں میں چلتے ہوئے تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد شہر سے باہر کاچیلو کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔

”کاچیلو میں کسی کو جانتے ہو دلاور سائیں؟“ بہاول نے پوچھا۔

”نہیں سائیں، یہ سارا علاقہ تو میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”کاچیلو میں میرا بہنوئی ہے، عبد الحمید نام ہے اس کا۔ وہ چنگی محرو ہے۔ جب تم شہر کی حد میں داخل ہو گے تو سب سے پہلے چنگی ناکہ پڑے گا۔ وہاں عبد الحمید کا پوچھ لینا اگر وہ خود موجود ہو تو اسے الگ لے جا کر پست کرنا۔ چنگی کا ٹھیکہ بھی سینٹھ کنٹول کے پاس ہے اور اس کے آدمی بیٹھے ہیں۔ عبد الحمید ہے تو سینٹھ کا ملازم مگر میرا بہنوئی ہے۔ وہ تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔ اگر وہ چنگی کے دفتر میں نہ ہو تو وہاں سے کوئی آدمی تمہیں اس کے گھر پہنچا دے گا۔ تم اسے سب کچھ بتا دینا اور میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ صوبہ خان بھی اسی طرف چلا گیا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔“ بہاول نے کہا۔

”صوبہ خان میرا پرانا واقف ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کی فکر مت کرو۔ بس تم یہ دعا کرو کہ مجھے ان لڑکیوں کا پتہ چل جائے۔“

”اللہ سائیں پر بھروسہ رکھو دلاور۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ بہاول نے کہا۔

وہ دونوں وہاں گھڑے باتیں کرتے رہے۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد شیرا پہنچ گیا۔ وہ ایک پرانی سی مزدا پک اپ پر تھا۔ اس کے ٹائر جوڑے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ پک اپ ریگستانی علاقے میں آسانی سے چل سکتی ہے۔ پک اپ بظاہر دیکھنے میں پرانی سی لگتی تھی لیکن اس کا انجن زوردار تھا۔ دراصل یہ پک اپ ہی شیرا کے روزگار کا ذریعہ تھی۔ وہ مال لے کر قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے گوتھوں اور بعض اوقات کاچیلو اور ماتھیلو کی طرف جاتا رہتا تھا۔ اس لیے وہ اس کے انجن کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔

دلاور نے بہاول سے بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملایا اور پک اپ کا دوسری طرف کا دروازہ کھول کر پیئرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”تم نہیں چلو گے بہاول؟“ شیرا نے سوالیہ نگاہوں سے بہاول کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ بہاول نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میرا سمان ہے اسے کاچیلو پہنچنا ضروری ہے۔“

شیرا نے انجن اشارت کر دیا اور پک اپ ایک ایک سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک کے دائیں بائیں کھیت نظر آ رہے تھے لیکن چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ریٹیل علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں چونکہ کئی سڑک نہیں تھیں۔ بس ایک ٹریک سا تھا۔ کچے راستے پر گاڑی چلانا خاصا دشوار ہوتا ہے۔ شیرا بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا اس لیے پک اپ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

جب وہ کاچیلو کے چنگی ناکہ پر پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ چنگی کے سامنے سڑک پر بیر لگا

تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر دو موٹی موٹی لکڑیاں گڑی ہوئی تھیں اور لوہے کی ایک زنجیر ان دونوں لکڑیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ جب کوئی گاڑی آتی تو یہ زنجیر گرا دی جاتی۔

دائیں طرف سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا جس پر چنگی ناکہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ شیرا نے سڑک کے پیر سے بچ کر بائیں طرف سڑک کی ڈھلان سے نکل جانا چاہا مگر دلاور نے اسے منع کر دیا۔

”گاڑی چنگی کے سامنے روک لو۔۔۔ سب سے پہلے مجھے چنگی پر ہی ایک آدمی سے ملنا ہے۔“

شیرا نے پیر کے سامنے سڑک پر روک لی۔ دلاور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ چنگی کے دفتر کا دروازہ بند تھا۔ ڈیوٹی پر جو بھی تھا وہ اطمینان سے سو رہا تھا۔ غالباً ”رات کے وقت یہاں گاڑیوں کی آمدورفت نہیں ہوتی تھی اس لیے چنگی محروم دفتر کا دروازہ بند کر کے اطمینان سے سو رہا تھا۔

دلاور نے پک اپ سے اتر کر ہونے سے دفتر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک جوان آدمی تھا۔ اس نے اجرک اوڑھ رکھی تھی اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل رہا تھا۔

”تم کون ہو بھی۔۔۔ اس وقت کہاں سے آئے ہو؟ گاڑی میں کیا ہے؟“ اس نے دروازے سے جھانک کر سڑک پر کھڑی ہوئی پک اپ کی طرف دیکھا۔

”مال وال کوئی نہیں ہے بھائی۔ مجھے عبدالحمید سے ملنا ہے۔“ دلاور نے کہا۔

”حمید تو میرا ہی نام ہے۔ تم کون ہو اور اس وقت کہاں سے آئے ہو؟ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ اس شخص نے جیب سے بیڑی نکال کر سگاتے ہوئے کہا۔ وہ مشتبہ نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اس طرح کھڑے کھڑے بات نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کر لیں۔“ دلاور نے کہا۔

”کیوں نہیں، مگر پک اپ میں کیا ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ پک اپ خالی ہے۔ اس وقت چونکہ بخش علی لاشاری سے کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی اس لیے میں شیرا کو خاص طور پر تیار کر کے اپنے ساتھ لایا ہوں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”شیرا کی پک اپ ہے۔“ حمید نے کہا پھر دروازے پر آکر شیرا کو آواز دے کر بلا لیا اور سلور کی ایک کالی ی کیتلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”شیرا! شہر سے چائے تولے آؤ۔ کوہلی کا ہو ٹل کھلا ہو گا۔ وہ رات بھر دی سی آر پر فلمیں چلاتا رہتا ہے۔“ اس نے کیتلی کے ساتھ پیسے بھی دینا چاہے تھے مگر شیرا نے پیسے نہیں لئے اور کیتلی لے کر باہر چلا گیا۔ اس نے خود ہی پیر کی زنجیر گرا دی اور پک اپ میں بیٹھ گیا۔

”بیٹھو سائیں۔“ حمید نے دلاور کو ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اب بتاؤ، تم کون ہو، کہاں سے آئے“ اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”معاملہ بڑا نازک ہے حمید سائیں۔ کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟ مجھے تمہارے سالے بہاول نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔“ دلاور نے کہا۔

”بہاول میرا سالہ تو بعد میں مگر دوست پہلے ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”ہماری دوستی ہی نے ہمارے درمیان ۱۰

نونی رشتہ بھی قائم کیا ہے۔ بہاول کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ کو کیا معاملہ ہے؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ تمہارا سیٹھ کھنول دو لڑکیوں کو دھوکے سے اس طرف لے آیا ہے۔ میں ان لڑکیوں کی بارے میں پتہ کرنے آیا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔

”میں نے ان لڑکیوں کو نہیں دیکھا لیکن لگتا ہے کہ معاملہ خاصا پر اسرار ہے۔ ماتھیلو کا پولیس انسپکٹر



صوبہ خان بھی ان دو لڑکیوں کی تلاش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”وہ لڑکیاں اس شرمیں موجود ہیں یا نہیں؟“ دلاور نے پوچھا۔

”نہیں۔“ حمید نے جواب دیا۔ ”میں نے دیکھا تو نہیں مگر اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ لڑکیاں اب اس شرمیں

نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت راجستھان کی سرحد پار کر چکی ہوں۔“

”انہیں سرحد کی طرف کس نے بھیجا تھا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”دیکھو سائیں۔“ حمید بولا۔ ”میں سیٹھ کھٹول کا ملازم ہوں۔ اصولی طور پر مجھے اس کے بارے میں

کھل کر کچھ نہیں بتانا چاہئے مگر تمہیں بہاول نے بھیجا ہے اور وہ میرا دوست ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش

ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کل دوپہر کو سیٹھ کھٹول کے تین آدمی اس کی جیب پر یہاں آئے

تھے۔ جیب پر پٹرول کے فالتو کین اور پانی کا بڑا ڈبہ بھی تھا جس سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ جیب سرحد پار جانے

والی ہے۔ سیٹھ کھٹول کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ وہ اسمگلنگ کرتا ہے۔ ٹرکوں کے ذریعے اور

اونٹوں کے ذریعے اس کا مال سرحد پار آتا جاتا رہتا ہے۔ لیکن خالی جیب کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی

تھی۔ اس کا ایک آدمی کل دوپہر کے بعد یہاں آکر کافی دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ اس وقت میں بھی یہاں موجود تھا

اور دوسرا محرر بھی۔ سیٹھ کا آدمی بتا رہا تھا کہ وہ آج رات دو خوبصورت لڑکیوں کو لے کر سرحد پار جانے

والے ہیں۔ میں نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ سیٹھ کھٹول لوگوں کو راجستھان بھجواتا رہتا ہے لیکن وہ تو

شام کے بعد پتہ چلا کہ ان لڑکیوں کا ڈرامہ کیا تھا۔ ان لڑکیوں کو دراصل صوبہ خان کیس سے پکڑ کر لایا تھا جو

اس کے چنگل سے بھاگ نکلیں اور کسی طرح سیٹھ کھٹول کے ہاتھ لگ گئیں جس نے انہیں سرحد پار

بھجوا دیا۔“

”کیا صوبہ خان کو معلوم ہے کہ ان لڑکیوں کو سرحد پار بھیجا جا چکا ہے اور بھیجنے والا کون ہے؟“ دلاور نے

پوچھا۔

”صوبہ خان کو ابھی تک یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ بھیجنے والا کون ہے لیکن اسے یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہاں

وہ کس کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس گھر کے لوگ اس وقت تھانے میں بند ہیں اور سنا ہے کہ صوبہ خان

تشدد کے ذریعے ان سے لڑکیوں کے بارے میں معلوم کر رہا ہے۔“ حمید نے بتایا۔

”وہ کس کے گھر میں ٹھہری تھیں؟“ دلاور نے پوچھا۔

”کشن کے گھر۔“ حمید نے جواب دیا۔ ”وہ دونوں میاں بیوی اکیلے ہی رہتے ہیں۔ کشن بوڑھا آدمی

ہے۔ اس کی بیوی کی عمر بھی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔“

”کیا انہوں نے بتا دیا ہے کہ انہیں سیٹھ کھٹول کے آدمی یہاں لائے تھے۔“ دلاور نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے نہیں، اگر انہوں نے بتا دیا ہوتا تو صوبہ خان انہیں چھوڑ کر سیٹھ کھٹول کے پیچھے پڑ چکا

ہوتا۔“ حمید نے بتایا۔

”میں نے سنا ہے کہ صوبہ خان، سیٹھ کھٹول کے غیر قانونی دھندوں میں بھی شریک ہے؟“ دلاور نے

پوچھا۔

”اسمگلنگ وغیرہ میں پولیس کے ذریعے وہ سیٹھ کھٹول کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ جس کا اسے کیشن ملا

ہے۔ سیٹھ کھٹول کے کچھ اور بھی غیر قانونی دھندے ہیں جن کی صوبہ خان کو ابھی تک ہوا بھی نہیں لگی۔

مجھے اس کے آدمیوں کے ذریعے کچھ بھنگ ملی ہے۔ میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا

ہوں اور جب مجھے اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مل گیا تو کھنول زندہ نہیں بچے گا۔“

”وہ کیا دھندے ہیں؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ابھی نہیں۔“ حمید نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے میں خود تصدیق کر لوں پھر تم جہاں بھی ہو گے اخبارات کے ذریعے تمہیں پتہ چل جائے گا۔“

اتنی دیر میں باہر پرک اپ رکنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی دیر بعد شیرا کیتلی لے کر اندر داخل ہوا۔ حمید نے ایک کھڑکی کی چوکت پر رکھے ہوئے تین مگے اٹھائے۔ مگے سے پانی لے کر انہیں دھویا اور ان میں چائے انڈیلنے لگا۔ شیرا بھی وہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ تینوں چائے پیتے رہے۔ حمید اب شیرا سے اس کے کام دھندے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

”تھانہ کہاں ہے؟“ دلاور نے خالی کپ میز پر رکھے ہوئے حمید سے پوچھا۔

”کیوں... خیریت؟“ حمید نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”صوبہ خان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان لڑکیوں کی بربادی کا اصل ذمے دار تو وہی ہے۔ اس سے ذرا دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔

”وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کے قریب بھی مت جانا۔“ عبد الحمید نے کہا۔

”وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”وہ اب تک نہیں بھولا ہو گا کہ میں نے اسے نکال کر کے سڑک پر دوڑایا تھا۔“

”اوہ!“ حمید اچھل پڑا۔ ”تو وہ تم تھے؟“ وہ چند لمحوں خاموش رہا پھر بولا۔ ”ایسی خبریں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ یہ واقعہ غالباً آدھی رات کے وقت پیش آیا تھا۔ دوسرے دن شام سے پہلے یہ خبر یہاں پہنچ چکی تھی۔“

”ابھی تو میں نے اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ تم مجھے تھانے کا راستہ بتا دو۔“ دلاور بولا۔

”شیرا کو معلوم ہے۔ یہ تمہیں تھانے تک لے جائے گا۔“ حمید نے کہا۔ ”بعد میں بھی میری ضرورت ہو

تو میں حاضر ہوں سائیں۔ اگر جلدی فارغ ہو جاؤ تو ادھر ہی آ جانا۔ رات ہمیں بیٹھ کر گزار دیں گے صبح میرے گھر جا کر سو رہنا۔“

”اچھا۔ میں تھانے سے ہو کر یہیں واپس آؤں گا۔“ دلاور کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

دلاور اور شیرا دفتر سے نکل کر پرک اپ میں بیٹھ گئے۔ تھانے تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے

تھے۔ دلاور نے شیرا کو پرک اپ ہی میں بیٹھ رہنے کو کہا اور خود نیچے اتر کر تھانے میں گھس گیا۔

”اے! کہاں منہ اٹھائے چلے جا رہے ہو کون ہو تم؟“ سنتری نے اسے روک لیا۔

”فریادی ہوں سائیں، صوبیدار سے ملنا ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”تمہارے گھر میں ڈاکہ پڑ گیا ہے، قتل ہو گیا ہے یا کوئی تمہاری عورت کو اٹھا کر لے گیا ہے؟“ سنتری

نے اسے گھورا۔

”ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوا مگر میں صوبیدار سے ملنا چاہتا ہوں۔“ دلاور بولا۔

”صوبے دار اس وقت مصروف ہے، صبح آنا۔“ سنتری نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”پولیس والوں کو اپنے

ہا پ کا نوکر سمجھ رکھا ہے کیا۔ جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ جاؤ.... باہر جا کر بیٹھ جاؤ۔ اگر صوبیدار

فارغ ہو گیا تو تمہیں بلا لوں گا۔ ورنہ صبح ہی اپنی فریاد لے کر آنا۔“

”انسپکٹر صوبہ خان تھانے میں ہے نا؟“ دلاور بولا۔

”ہے تو، پھر؟“ سنتری نے اسے گھورا۔

”تو پھر اسے بولو کہ مائیلو سے ایک آدمی آیا ہے۔ نالکہ درانی کی خبر لے کر۔“ دلاور بولا۔

”کس کی خبر لے کر؟“ سنتری کی سمجھ میں شاید نام نہیں آسکا تھا۔

”نالکہ درانی... تم صرف نالکہ بتا دو۔“ دلاور نے کہا۔

”تم یہاں رکو، میں بتاتا ہوں۔“ سنتری اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

”جاؤ بابا... اندر جاؤ... جلدی کرو۔“ وہ بولا۔

دلاور کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ بچے تلے قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ایک دروازہ پر ایسے اچھوٹے گلی ہوئی تھی۔ دلاور بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔ سامنے میز کے پیچھے کرسی پر سب انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں کا ایس اچھوٹا تھا۔ دائیں طرف ایک کرسی پر سادے لباس میں انسپکٹر صوبہ خان بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک اے ایس آئی اور دو کانسٹیبل بھی موجود تھے۔ صوبہ خان دلاور کو دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اسے شاید دلاور کو یہاں اپنے سامنے دیکھنے کی توقع نہیں تھی۔

”تت... تم؟“ صوبہ خان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”شکر ہے تم نے پہچان تو لیا۔“ دلاور مسکرایا۔ ”تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔“

”مجھوں خان!“ صوبہ خان سب انسپکٹر کی طرف گھوم گیا۔ ”اسے پکڑ کر بند کر دو اور اس کی ہڈیوں سے گوشت کا ریشہ ریشہ الگ کر ڈالو۔ یہی وہ شخص ہے جس کی وجہ سے میرے اوپر مصیبتیں نازل ہونا شروع ہوئی ہیں۔“

”مصیبتوں کا شکار تم میری یا کسی اور کی وجہ سے نہیں اپنی ہوس کی وجہ سے ہوئے ہو۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ میں کون ہوں۔ اس رات تو میں نے تمہیں بچا کر کے چھوڑ دیا تھا مگر اب تم نے اپنی دھونس جمانے کی کوشش کی تو اس مرتبہ نتیجہ مختلف ہو گا۔“

”بند کرو یہ بکواس....“ صوبہ خان دھاڑا۔ ”مجھوں خان! میں نے تم سے کیا کہا تھا۔“ اس نے آخری الفاظ سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

”یہ شریف لوگ تمہاری دھونس میں آکر اب تک تمہارے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے غیر قانونی حرکتوں کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ تمہاری دھونس میں نہیں آئیں گے۔ تمہارا جاؤدو تم ہو رہا ہے تمہارا سورج غروب ہونے والا ہے صوبہ خان۔ تم اس وقت نہ تو ڈیوٹی پر ہو اور نہ ہی یہ تمہارا علاقہ ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم کئی بے گناہ افراد کے قتل کے الزام میں گھونگی پولیس کو مطلوب ہو۔ تمہاری حویلی یا دوسرے لفظوں میں تمہاری پرائیویٹ جیل کے بارے میں آئی جی کو بھی کراچی میں اطلاع ملی چکی ہے اور تمہیں اب تک کراچی پہنچ کر ان کے سامنے پیش ہو جانا چاہئے تھا لیکن تم تو نالکہ درانی کے چکر میں پاگل ہوئے پھر رہے ہو کیونکہ وہ تمہارے ایسے بست سے راز جانتی ہے جن کا انکشاف تمہیں سیدھا چالشی کے تختے پر پہنچا سکتا ہے۔ تم اتنی بھاگ دوڑ کے بعد بھی نالکہ کو تلاش نہیں کر سکتے۔ لیکن تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ نالکہ اور سسی اس وقت میری تحویل میں ہیں۔“

”یہ آدمی بہت خطرناک ہے مجنوں خان۔“ صوبہ خان نے ایک بار پھر ایس ایچ او کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ساری باتیں تمہیں گمراہ کرنے کے لیے کر رہا ہے، اسے ختم کر دو۔“

”مجھے ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہو گا صوبہ خان۔“ دلاور نے کہا۔ ”اگر مجھے موت کا ڈر ہوتا تو میں اس طرح بے خوفی سے تھانے میں نہ چلا آتا۔ میرے پیچھے جو طاقت ہے تم ابھی تک اس کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ ایک معمولی سا انسپکٹر ہوتے ہوئے تم نے ان پورے علاقے پر اپنی حاکمیت کیسے قائم کر رکھی ہے۔ لیکن اب تمہارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموشی ہوا پھر ایس ایچ او کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ”صوبیدار! تمہارے تھانے میں وائرلیس موجود ہے۔ گھونگی پولیس سے میرے بیان کی تصدیق کر لو اور پھر اس شخص کو گرفتار کر کے گھونگی پولیس کے حوالے کر دو۔“

سب انسپکٹر نے ایک کانٹیلبل کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس تھانے کا انچارج صوبہ خان سے تنگ آچکا تھا اور موقع ملتے ہی اس کے خلاف کارروائی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

”مجنوں خان!“ صوبہ خان نے اسے گھورا۔ ”کیا واقعی تم اس بد معاش کی باتوں میں آگئے ہو؟“

”تصدیق کر لینے میں کیا حرج ہے۔“ مجنوں خان نے کہا۔ ”اگر اس کی بات غلط نکلی تو ہمارے پاس اس کے خلاف کارروائی کرنے کا کوئی جواز تو ہو گا۔“

صوبہ خان چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس نے اپنے کوٹ کے نیچے بیٹ میں اڑسا ہوا ریوالور نکال کر ان پر تان لیا۔

”اگر تمہیں نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گولی سے اڑا دوں گا۔“ صوبہ خان دھاڑا۔ ”آج تک کسی مائی کے لعل کو اتنی جرات نہیں ہوئی کہ صوبہ خان پر ہاتھ ڈال سکے۔“ وہ اٹلے قدموں چلتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازے پر کھڑا ہوا سنتری کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے صوبہ خان کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

صوبہ خان دوڑتا ہوا تھانے سے باہر آگیا۔ باہر اس کی جیب کھڑی تھی۔ اس نے جیب پر بیٹھ کر انجمن اشارت کیا اور جیب کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

سب انسپکٹر مجنوں خان اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ چند لمحوں تک تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ انسپکٹر صوبہ خان جس طرح بھاگا تھا اس پر وہ نہ صرف شدید حیران ہوا تھا بلکہ بری طرح بدحواس ہو کر بھی رہ گیا تھا۔ اس نے اپنا ریوالور نکال کر باہر کی طرف دوڑنا چاہا مگر دلاور نے اسے روک لیا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہو گا صوبیدار۔“ صوبہ خان کو تم جھ سے زیادہ جانتے ہو۔ اس کے بھاگنے سے یہ تصدیق تو ہو گئی کہ وہ قانون کا محافظ نہیں مجرم ہے۔ گھونگی پولیس سے تصدیق ہونے کے بعد تم یہ کر سکتے ہو کہ وائرلیس کے ذریعے علاقے کے تمام تھانوں کو اطلاع کر دو۔ اور کراچی میں آئی جی کو بھی مطلع کر دو۔ صوبہ خان اگر فرار ہونے میں کامیاب ہو بھی گیا تو مجھے معلوم ہے یہ کہاں جائے گا۔“

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کانٹیلبل واپس آگیا۔ جس نے وائرلیس پر گھونگی پولیس سے بات کی تھی۔ اس نے دلاور کے اس بیان کی تصدیق کر دی کہ صوبہ خان واقعی کئی افراد کے قتل میں ملوث ہے۔ اور آئی جی صاحب کو اس کی اطلاع دے دی گئی ہے۔

”ان لوگوں کا کیا قصہ ہے؟“ مجنوں خان نے پوچھا۔

”ان میں ایک لڑکی نالکہ درانی رحیم یار خان کی ایک بہت بڑی زمیندار ہے۔“ دلاور نے کہا اور پھر انہیں نالکہ درانی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ نالکہ درانی اور سسی کو سرحد کی طرف بھیجا جا چکا ہے اور اس وقت تک انہیں یقیناً ”سرحد یار راجستان پہنچا دیا گیا ہو گا۔ آپ لوگ سیٹھ کھنول کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں کہ وہ اناج اور دیگر چیزوں کی شکل میں ہماری دولت کو ہندوستان منتقل کر رہا ہے۔ انسانوں کی اسمگلنگ اور اس کے علاوہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس سے باخبر ہوتے ہوئے بھی آپ لوگ بے خبر کیوں ہیں؟ کیوں نہیں ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کی جاتی؟“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں صوبہ خان جیسے لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔“ مجنوں خان نے کہا۔ ”اگر کبھی کسی کو پکڑا بھی جاتا ہے تو اسمبلیوں میں شور مچ جاتا ہے۔ کیا کریں ہم لوگ۔ کس کے خلاف کارروائی کریں؟“

”آپ لوگ سیٹھ کھنول ہی کے بارے میں تحقیقات کریں کہ وہ اسمگلنگ کے علاوہ دیگر کون کون سے گھنٹاؤں کا ردبار کر رہا ہے تو پھر شاید آپ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے۔ بات صرف حوصلے اور جرات کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اسمبلیوں میں جو نمائندے جاتے ہیں وہ عوام کے مسائل حل کرنے جاتے ہیں؟ وہ صرف دولت بنانے کے لیے اسمبلیوں تک پہنچتے ہیں۔ انہیں کامیاب کرنے والے سیٹھ کھنول جیسے لوگ ہوتے ہیں جو ایک لاکھ خرچ کر کے دس کروڑ کا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اسمبلی کے ممبروں کو صرف اپنے استحقاق کا خیال رہتا ہے۔ ان کی گاڑی کو اگر اسمبلی کے گیٹ پر بھی ایک سیکنڈ کو روک لیا جائے تو ان کا استحقاق مجروح ہو جاتا ہے۔ اپنے استحقاق کے لیے تو وہ اسمبلیوں میں گالم گلوچ اور دھینگا مشینیاں کرتے ہیں لیکن عوام کے لیے کچھ نہیں کرتے۔۔۔۔۔!!! آپ جیسے لوگ اگر جرات سے کام لیں اور ان کے ناجائز احکامات ماننے سے انکار کریں تو آدھے سے زیادہ جرائم خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ میں گھونکی کے انپکڑ کو داد دیتا ہوں جس نے صوبہ خان جیسے شخص کے خلاف قدم تو اٹھایا۔“

”آپ نے تو مجھے شرمندہ کر دیا ہے سائیں۔“ مجنوں خان بولا۔

”نہیں صوبیدار صاحب۔“ دلاور بولا۔ ”میں ان پڑھ اور جاہل آدمی ہوں آپ پڑھے لکھے ہیں۔ قدرت نے آپ کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔ انسان اس کا جتنا بھی شکر ادا کرے کم ہے۔ حکومت نے آپ کو ایک ذمہ داری سونپی ہے۔ آپ پر اعتماد کیا ہے۔ آپ نے اگر کسی کے ہمکاروں میں آکر یہ اعتماد کھو دیا تو اسے بحال کریں۔ آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اپنے علاقے کے لوگوں کی دعائیں لیں۔ گھونکی کے انپکڑ کو جانتے ہیں آپ؟ اس کے بچوں کو نہ تو ڈھنگ کا کھانا ملتا ہے نہ وہ ڈھنگ کے کپڑے پہنتے ہیں مگر پھر بھی وہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اسے عزت کی روٹی ملتی ہے۔ اس نے دوسروں کی دولت پر کبھی نظر نہیں رکھی۔“

”میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“ مجنوں خان نے کہا۔ ”اس کی ماتحتی میں رہ بھی چکا ہوں۔ اس محکمہ میں رہ کر وہ جس طرح درویشوں جیسی زندگی بسر کر رہا ہے وہ قابل تعریف ہے۔“

”اسی طرح لوگ آپ کی بھی تعریفیں کریں گے۔“ دلاور بولا۔

”ہاں سائیں۔“ مجنوں خان نے گہرا سانس لیا۔ ”اب میں کم از کم اس کھنول کو تو سبق سکھا دوں گا۔ اسے ایک مرتبہ اس طرف آنے تو دو۔ میں آج ہی اس کے خلاف اسمگلنگ اور اغواء کی رپورٹ لکھتا

ہوں۔ وہ جیسے ہی ادھر آئے گا اسے اندر کردوں گا۔ صوبہ خان کا نام بھی رپورٹ میں شامل کروں گا۔ پھر دیکھتا ہوں کون آتا ہے کھٹول کی سفارش لے کر۔ بیٹھو سائیں... تم بیٹھو تو...“

دلاور ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ کبھی پر بیٹھ گیا۔ مجنوں خان نے محرر کو اپنے کمرے میں بلوایا اور رپورٹ کا ڈرافٹ لکھوانے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ رپورٹ کا مضمون تیار کرواتا رہا۔ اس میں بہت سی کٹنگ ہو گئی تھیں لیکن جب فائنل رپورٹ تیار ہوئی تو وہ واقعی بہت شاندار تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ مجنوں خان نے محرر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ رپورٹ سرکار بنام کھٹول صوبہ خان وغیرہ وغیرہ کے نام سے درج کرلو۔ اور کھٹول جیسے ہی کاجیلو کی حدود میں داخل ہو اسے ہتھکڑی لگا لو۔ اور ان دونوں لڑکیوں کے اغوا میں تعاون کے الزام میں ان دونوں میاں بیوی کے خلاف الگ رپورٹ درج کرلو جنہیں صوبہ خان لے کر یہاں آیا تھا۔ انہیں حوالات ہی میں بند رہنے دو۔“

”مجھے اجازت ہے سائیں؟“ دلاور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں صبح آپ سے ملوں گا۔“

”ٹھیک ہے سائیں۔“ مجنوں خان نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”اب صوبہ خان کا خوف ہمارے سر سے اتر گیا ہے۔ اب دیکھنا یہاں کیا ہوتا ہے۔“

دلاور اس سے ہاتھ ملا کر تھانے سے باہر آیا۔ شیراپک اپ کے اسٹیرنگ پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ دلاور نے اس کا کندھا تھپتھپا کر اسے جگایا اور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

”اس قصبے میں کوئی سرائے وغیرہ ہے؟ جہاں رات گزاری جاسکے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”ہاں۔ ایک ہندو کی چھوٹی سی سرائے ہے جسے اس نے فائیو اشار ہوٹل کا نام دے رکھا ہے۔ وہیں چلے ہیں۔“ شیرانے پک اپ کا انجن اشارت کرتے ہوئے کہا۔

وہ پانچ منٹ بعد سرائے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ دراصل بازار کے سرے پر واقع ایک مکان تھا جو پانچ چھ کمروں پر مشتمل تھا۔ دروازہ کھٹکھٹا کر سرائے کے فٹشی کو جگایا گیا۔ کرائے کا صرف ایک کمرہ بک تھا جس میں کوئی ہندو بیوی باری مقیم تھا۔ باقی تمام کمرے خالی تھے۔ دلاور نے دو کمرے لے لئے۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا شیرا کے لیے۔

دلاور تو حسب معمول صبح بات بجے اٹھ گیا۔ مگر شیرا اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ دلاور نے شیرا کو جگا کر اس کی طے شدہ رقم ادا کی اور اسے فارغ کر دیا۔ اپنے کمرے میں آکر دلاور نے صرف چائے منگوائی تھی۔ چائے پینے کے بعد بھی وہ دیر تک کمرے میں بیٹھا رہا۔ اس کی سوچوں کا محور نائلہ ہی تھی۔ اگر نائلہ واقعی سرحد پار پہنچا دی گئی تھی تو اس کی واپسی مشکل ہی تھی لیکن دلاور یہ امید لیے بیٹھا تھا کہ ممکن ہے سیٹھ کھٹول نے نائلہ اور سسی کو کہیں چھپا رکھا ہو تاکہ وہ صوبہ خان کو بلیک میل کر کے نہ صرف اس سے کچھ رعایتیں حاصل کر سکے بلکہ رقم بھی اینٹھ سکے لیکن اب صوبہ خان اور کھٹول کی چھورت حال کچھ بدل گئی تھی۔ دلاور کو یقین تھا کہ سب انسپکٹر مجنوں خان اب نہ تو سیٹھ کھٹول کو چھوڑے گا اور نہ ہی صوبہ خان کو۔ صوبہ خان کا خوف اس کے دل سے نکل چکا تھا۔ وہ اس کی نظروں میں اب پولیس آفیسر نہیں ایک مجرم تھا۔

تقریباً آٹھ بجے کے قریب دلاور سرائے سے نکل آیا۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ دو آدمی اس کے ساتھ والی میز پر آکر بیٹھ گئے۔ ان کی باتیں سن کر دلاور چونک گیا۔ وہ کچھ دیر تک اپنی میز پر بیٹھا باہم سنتا رہا پھر اٹھ کر ان آدمیوں والی میز پر چلا گیا۔

”کیا بات ہے سائیں!“ ایک آدمی نے اسے گھورا۔

”ابھی تم لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ریگستان کی طرف سے آئے ہوئے کچھ آدمی پکڑے گئے ہیں۔ کیا تم لوگ مجھے بھی کچھ بتاؤ گے۔“ دلاور نے کہا۔

”اوہ! وہ۔“ ایک آدمی بولا۔ ”وہ سیٹھ کھٹول کے آدمی ہیں۔ جو پتہ نہیں صحرائیں کہاں سے آرہے تھے کہ پولیس نے انہیں پکڑ لیا۔“

”کیا ان کے ساتھ کچھ لڑکیاں بھی تھیں؟“ دلاور نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ لیکن اگر تم زیادہ تفصیل جانا چاہتے ہو تو ہمارے چلے جاؤ۔ ویسے یہ پہلا موقع ہے کہ سیٹھ کھٹول کے آدمیوں کو پکڑا گیا ہے۔ میرا خیال ہے صوبیدار مجنوں خان کی شامت ہی آئی ہے۔“  
 دلاور نے مزید کچھ نہیں سنا۔ اس نے اٹھ کر کاؤنٹر پر مل دیا اور ہوٹل سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا تھانے کی طرف جانے لگا۔

تھانے پہنچنے میں اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ مجنوں خان تھانے میں موجود تھا۔  
 ”آؤ... دلاور سائیں! میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ سیٹھ کھٹول کے تین آدمیوں کو بند کر دیا ہے میں نے۔“ مجنوں خان نے اسے دیکھتے ہی کہا۔  
 ”کیا یہ وہی تین آدمی ہیں جو نالکہ اور سسی کو لے کر گئے تھے؟“ دلاور نے پوچھا۔  
 ”ہاں! یہ وہی ہیں۔ لیکن یہ تو کوئی اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ آؤ تم خود ہی مل لو ان سے۔“ مجنوں خان کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گیا۔

وہ حوالات کے سامنے آگئے۔ وہ تینوں ایک ہی حوالات میں بند تھے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ مجنوں خان نے ان سے پوچھ گچھ کے لیے ان کی ٹھیک ٹھاک تواضع کی تھی۔  
 ”ہاں! بتاؤ تم لوگ ریگستان کی طرف کس مشن پر گئے تھے۔“ مجنوں خان نے ایک سے پوچھا۔  
 ”ہم دو لڑکیوں کو سرحد پار پہنچانے کے لیے لے کر گئے تھے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”لیکن ہم راستہ بھول گئے اور پھر ایک موقع پر وہ لڑکیاں ہم سے جپ چھین کر بھاگ گئیں۔ ان میں ایک لڑکی تو سندھ ہی تھی اور دوسری پنجاب کی۔ پنجاب والی لڑکی بہت تیز تھی۔ ہم سے جپ اسی نے چھینی تھی۔ وہ ہمیں ریگستان میں چھوڑ کر جپ لے کر بھاگ گئیں۔ ہم بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں۔“  
 ”تمہارے خیال میں وہ کس طرف گئی ہوں گی؟“ دلاور نے پوچھا۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے وہ سندھ کے کسی گوشے میں پہنچ گئی ہوں یا سرحد پار کر گئی ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں بھٹک گئی ہوں۔ کسی ریگستان میں راستہ بھٹک جانے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو بھٹکا ہوا آدمی بار بار ایک ہی جگہ کے چکر لگاتا رہتا ہے لیکن اسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ جپ میں پیٹرول اور بانی اگرچہ کافی مقدار میں موجود تھا لیکن بھٹک جانے کی صورت میں یہ چیزیں بھی ان کے کام نہیں آسکتیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جپ کہیں خراب ہو گئی ہو۔ ایسی صورت میں تو ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ تھر کار ریگستان پاکستان سے راجستھان تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں۔ اس ریگستان میں بھٹکنے والوں کو صرف موت ہی کے دامن میں پناہ ملتی ہے۔۔۔۔“

دلاور نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ وہ مجنوں خان کے ساتھ دوبارہ اس کے دفتر میں آگیا اور نالکہ اور سسی کی تلاش کے سلسلے میں پروگرام بنانے لگا۔

”ریگستان میں انہیں تلاش کرنا ممکن نہیں۔“ مجنوں خان نے کہا۔ ”البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وائریس کے ذریعے قمر کے تمام تھانوں کو اطلاع دے دی جائے کہ اگر یہ لڑکیاں کہیں ملیں تو ان کی حفاظت کی جائے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے کم از کم آج کا دن یہاں رہنا پڑے گا۔“ دلاور بولا۔

”رہنا چاہو تو رہ لو سائیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ مجنوں خان بولا۔

”کم از کم پتہ تو چل جائے گا۔“ دلاور نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔“ مجنوں خان نے کندھے اچکا دیئے۔

دلاور تقریباً بارہ بجے تک تھانے میں بیٹھا رہا۔ وہ مجنوں خان سے اجازت لے کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک کاشییل دوڑا ہوا اندر آیا۔

”وہ سیٹھ کھٹول آیا ہے صوبیدار۔“ کاشییل نے مجنوں خان کو سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

”آئے دو۔“ مجنوں خان بولا۔

تھوڑی دیر بعد سیٹھ کھٹول اندر داخل ہوا۔ اس نے پہلے مجنوں خان کو دیکھا اور پھر دلاور کی طرف گھورتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے مجنوں خان۔“ سیٹھ کھٹول نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر کوئی ناراضگی تھی تو مجھ سے کہتے۔ میرے آدمیوں کو پکڑ کر بند کیوں کر دیا۔ ان کا کیا دوش ہے؟“

”دوش تو تمہارا بھی ہے سیٹھ کھٹول۔“ مجنوں خان نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔

سیٹھ کھٹول اس کے لہجے پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ جب بھی تھانے میں آتا تھا تمام پولیس والے اور یہ صوبیدار مجنوں خان ہاتھ باندھے اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے جیسے اس کے ذاتی ملازم ہوں۔ لیکن آج اس نے بدلی ہوئی صورت حال کو محسوس کر لیا تھا۔ نہ تو کسی سپاہی نے اسے سلام کیا تھا اور نہ ہی مجنوں خان اسے دیکھ کر کرسی سے اٹھا تھا۔ بلکہ اس کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔

”میرا کیا دوش ہے صوبیدار؟“ سیٹھ کھٹول نے پوچھا۔

”پہلے تو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ کسی ملزم کو تھانے میں اس طرح کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اٹھو! کھڑے ہو جاؤ۔“ مجنوں خان نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹک سے اسے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

”کیا کہہ رہے ہو مجنوں خان تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟“ کھٹول نے اسے گھورا۔

”اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم ایک اسمگلر، بلیک مارکنٹے، ذخیرہ اندوز اور نجانے کیا کیا ہو۔ تمہارے

خلاف تازہ ترین رپورٹ یہ ہے کہ تم نے دو مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے سرحد پار کرانے کی کوشش کی۔ وہ

دونوں لڑکیاں لاپتہ ہیں۔ لیکن تمہارے خلاف تمہارے آدمیوں کا بیان میں نے ریکارڈ کر لیا ہے۔ مہر علی!

اس نے کمرے میں کھڑے ہوئے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ ”اس کی تلاشی لو اور اسے حوالات میں بند

کر دو۔“

”تم شاید ہوش میں نہیں ہو مجنوں خان۔ تم جانتے ہو کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔“

”ہوش میں تو میں اب آیا ہوں سیٹھ کھٹول۔“ مجنوں خان نے کہا۔ ”تمہیں جس صوبہ خان کی پشت

پناہی حاصل تھی وہ بھی جلد ہی تمہارے پاس سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائے گا اور میں وہ لمبے ہاتھ بھی کاٹ دوں

گا جن پر تمہیں بہت گھمنڈ ہے۔“



سیٹھ کھٹول کی پیشانی مینے سے تر ہو گئی۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجنوں خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تھانیدار اس کے ساتھ اس قسم کا سلوک کر سکتا ہے۔ اے ایس آئی مرعلی آگے بڑھ کر اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیبوں سے کچھ رقم، کچھ کاغذات اور ایک پستول برآمد ہوا تھا۔

”اس پستول کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟“ مجنوں خان نے سیٹھ کھٹول سے پوچھا۔  
 ”مجنوں خان! تم جانتے ہو کہ مجھے کبھی لائسنس کی ضرورت نہیں پڑی۔“ سیٹھ کھٹول نے جواب دیا۔  
 ”مرعلی!“ مجنوں خان نے کہا۔ ”محرر سے کہو کہ کھٹول کے خلاف جو رپورٹ لکھی گئی ہے اس میں بغیر لائسنس اسلحہ کی برآمدگی بھی شامل کر لے۔“

”تم چھڑاؤ گے مجنوں خان۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔“ سیٹھ کھٹول نے کہا۔  
 ”میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لے جاؤ۔ بندو کر دو اسے۔“ مجنوں خان چنچا۔  
 سیٹھ کھٹول کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اور یہ خبر آتا ”فانا“ پورے شہر میں پھیل گئی کہ صوبیدار مجنوں خان نے سیٹھ کھٹول کو حوالات میں بند کر دیا تھا۔

دلاور تھانے سے آگیا تھا۔ اس نے چنگی محرر عبدالحمید سے رابطہ قائم کیا جو اسے اپنے گھر لے گیا۔ مگر میں اس کی بیوی اور بوڑھی ماں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ حمید کی بیوی کی عمر اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بے قد کی مالک دلی پتلی بہت حسین لڑکی تھی۔ حمید کی شادی کو تقریباً ”ایک سال ہو چکا تھا لیکن اس کی بیوی کے ہاں ابھی اولاد کے کوئی آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

”یہ تو بڑی انصونی ہو گئی دلاور سائیں۔“ حمید نے کہا۔ ”یہاں کئی صوبیدار آئے اور چلے گئے لیکن کسی کی بہت نہیں ہو سکی کہ سیٹھ کھٹول پر ہاتھ ڈال سکے۔ مگر صوبیدار مجنوں خان نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔“  
 ”بات صرف احساس کی ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”صوبیدار مجنوں خان کو اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ قانون کا محافظ ہے اور اسے کیا کرنا چاہئے۔“

”لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کھٹول کو صوبہ خان کی پشت پناہی حاصل ہے۔“ حمید بولا۔

”وہ تو پچھلی رات صوبہ خان کو بھی بند کر رہا تھا مگر وہ بھاگ نکلا۔ مجنوں خان اب نہ کسی صوبہ خان کو خاطر میں لائے گا اور نہ کسی اور کو۔ اگر پولیس افسروں کو اپنے فرائض کی ذمہ داری کا احساس ہو جائے تو کھٹول جیسے لوگوں کو اس ملک میں کہیں بھی پناہ نہ ملے۔“ دلاور نے کہا۔

”یہ صوبہ خان والی بات بھی تم نے عجیب بتائی۔“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”یہ حقیقت ہے۔ وہ گزشتہ رات ہی بھاگ گیا تھا۔“ دلاور بولا۔

”کھٹول کے وہ آدمی بھی تو پکڑے گئے ہیں جو ان لڑکیوں کو لے کر گئے تھے۔ ان لڑکیوں کا کچھ پتہ چلا۔ وہ کہاں ہیں؟“ حمید نے پوچھا۔

”وہ انہیں راجستھان کی سرحد کی طرف لے جا رہے تھے۔ لیکن ان تینوں کا بیان ہے کہ وہ لڑکیاں ریگستان میں انہیں دھوکا دے کر بھاگ نکلی تھیں۔ وہ ان کی جیب بھی لے گئی تھیں اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گی۔“ دلاور نے کہا۔

”اللہ سائیں اپنا کرم کرے گا۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں گی بالکل خیریت سے ہوں گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ دلاور نے کہا۔ ”صوبیدار مجنوں خان نے قہر کے تمام قہانوں کو دائر لیس پر اطلاع دے دی ہے۔ کوئی اطلاع ملنے تک مجھے کاجیلو ہی میں رہنا ہوگا۔ کیا یہاں کسی مسلمان کی سرائے ہے۔ جہاں میں ٹھہر سکوں۔“

”کسی سرائے میں جانے کی کیا ضرورت ہے دلاور سائیں۔“ حمید نے کہا۔ ”یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میری بیوی اور ماں رہتی ہے۔ اس میں اتنی گنجائش ہے کہ تم جیسا ایک مہمان رہ سکتے۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں حمید۔“ دلاور نے کہا۔

”اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں دلاور سائیں، میرا اور تمہارا مشن ایک ہے۔ تم دو معصوم لڑکیوں کی تلاش میں یہاں آئے ہو اور میں سیٹھ کھٹول کی ناک میں ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ اسمگلنگ کے علاوہ کسی اور قسم کی ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ میں اس کے خلاف کسی ثبوت کی تلاش میں ہوں۔ یہ ایک اچھی بات ہوئی ہے کہ صوبیدار مجنوں خان کو بھی اپنی ذمے داریوں کا احساس ہو گیا ہے۔ ہمیں مل کر کام کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم مل کر کام کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”میرے یہاں رہنے سے تمہاری نوکری چلی جائے گی حمید بھائی۔“ دلاور بولا۔

”مجھے اس ہندو کی نوکری کی پرواہ نہیں ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”یہاں ہماری تھوڑی بہت زمین ہے۔ اتنا اناج پیدا ہو جاتا ہے کہ سال بھر گھر بیٹھ کر کھا سکیں۔ سیٹھ کھٹول کی نوکری تو میں نے اس لیے کی تھی کہ اس کے خلاف کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔ اب اگر وہ مجھے نوکری سے نکال بھی دے تو میں نے ایسے لوگوں سے تعلقات بنائے ہیں جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں حمید بھائی۔“ دلاور نے کہا۔ ”میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بتانا۔“

”بالکل ہٹاؤں گا دلاور سائیں۔“ حمید نے کہا۔

اس روز کاجیلو شہر میں بڑی گرما گرمی رہی۔ سیٹھ کھٹول کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دور دور تک پھیل گئی تھی۔ شام ہوتے ہوتے بخش علی لاشاری اور ماتھیلو وغیرہ سے بہت سے بااثر لوگ کاجیلو میں جمع ہو چکے تھے۔ ان میں دڑپے بھی تھے اور وہ لوگ بھی جنہیں اعلیٰ افسران کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ سب لوگ باری باری قہانے سننے پہنچ رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے دوستانہ انداز میں صوبیدار مجنوں خان کو مشورہ دیا تھا اور کچھ لوگوں نے اسے برے نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ دائر لیس پر ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کا پیغام بھی ملا تھا کہ سیٹھ کھٹول کو فوری طور پر چھوڑ دیا جائے مگر مجنوں خان کسی کو بھی خاطر میں نہیں لایا تھا۔ اس نے کسی دھونس دھمکی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ البتہ اس اعلیٰ پولیس آفیسر کے پیغام کے جواب میں اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ اگر وہ تحریری حکم نامہ بھیج دے تو وہ کھٹول کو چھوڑ سکتا ہے اس کے بغیر نہیں۔

صوبیدار مجنوں خان نے سیٹھ کھٹول کو تین دن تک قہانے کی حوالات میں سرکاری مہمان بنائے رکھا۔ قہانے پر سخت پرہ تھا۔ کسی کو بھی سیٹھ کھٹول سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس دوران مجنوں خان نے کچھ اور لوگوں کو بھی حراست میں لے لیا تھا۔

سیٹھ کھٹول کے خلاف چالان مکمل کرنے کے بعد چوتھے دن اسے بخش علی لاشاری لے جا کر تحصیلدار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور مجنوں خان کو یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ اس نے جس خطرناک شخص کو سنگین الزامات کے تحت گرفتار کیا تھا عدالت نے اسے محض بیس ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا تھا۔

لیکن صوبیدار مجنوں خان نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ سینٹھ کھٹول جیسے لوگوں کو وہ نہ تو اس طرح آزاد گھومنے دے گا اور نہ ہی انہیں کسی بھی طرح ملک و قوم کو نقصان پہنچانے کی اجازت دے گا۔ دلاور جیسے جاہل آدمی کی باتوں نے اس کے ضمیر کو چنگا دیا تھا اور اس نے طے کر لیا تھا کہ خواہ اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے وہ ان جرائم پیشہ لوگوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔

دلاور کو بھی بڑی حیرت ہوئی تھی کہ سینٹھ کھٹول کو صرف بیس ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ صوبیدار مجنوں خان کی جرات اور حوصلے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ اس نے کسی کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے۔ وہ نہ تو کسی کی دھونس دھمکی میں آیا تھا اور نہ ہی اس نے کوئی رشوت قبول کی تھی۔ حالانکہ دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ تھانے سے کھٹول کی رہائی اور اس کے خلاف کیس ختم کر دینے کے لیے مجنوں خان کو دس لاکھ روپے کی پیشکش بھی کی گئی تھی۔ یہ کسی سب انپکڑ کے لیے ایک خطرہ رقم تھی مگر مجنوں خان نے یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی تھی۔

دلاور کو اس قصبے میں رہتے ہوئے چھ روز ہو چکے تھے۔ لیکن قہر کے کسی تھانے سے نالہ اور سسی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ دلاور کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ اگر وہ راجستھان کی سرحد پار کر گئی ہوں تو بھی خطرناک تھا۔ بھارتی حکمرانوں کے بارے میں وہ بہت کچھ سنتا رہتا تھا۔ وہ تو پاکستان سے ثقافتی دورروں پر جانے والے فنکاروں کو جاسوسی کے الزام میں پکڑ کر بند کر دیتے تھے اور نالہ اور سسی کے پاس تو کوئی پاسپورٹ ویزا نہیں تھا۔ انہیں آسانی سے جاسوس سمجھ کر گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ ان کی بات پر کون یقین کرے گا کہ وہ ریگستان میں بھگ کر سرحد پار کر آئی ہیں۔

ساتویں دن دلاور نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے حمید کو رائے منصور کا ایڈریس اور فون نمبر دے دیا تھا اور گزارش کی تھی کہ اگر نالہ اور سسی کے بارے میں کوئی بھی اطلاع ملے تو کسی نہ کسی طرح اس نمبر پر اطلاع کر دے۔

”تم سینٹھ کھٹول کے خلاف اپنا کام جاری رکھو۔ ہم صوبہ خان کا پیچھا جاری رکھیں گے۔ یہ دونوں بہت بڑے مجرم ہیں۔ ان کی غیر قانونی حرکتوں سے ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ میں نے سندھ کے جو علاقے دیکھے ہیں وہاں غریب ہی غریب ہے۔ یہاں کے لوگ اناج کے دانے دانے کو محتاج ہیں۔ بیماروں کے لیے دوائیں دستیاب نہیں“ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے حصہ کی ہر چیز سینٹھ کھٹول جیسے ضمیر فروش ہندوستان بھیج دیتے ہیں۔ انہیں ہندوستان میں بسنے والے ہندوؤں کا تو خیال ہے مگر اپنے گھر کے آس پاس فالتے کرنے والے غریب مسلمانوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔ یہ لوگ پاکستان میں رہ کر پاکستانیوں کا خون چوس رہے ہیں اور صوبہ خان جیسے وطن فروش ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ تم صوبہ خان کو نہیں جانتے۔ میں جانتا ہوں۔ وہ ایسا شخص ہے کہ اگر اسے اپنی ماں کی بھی اچھی قیمت مل جائے تو وہ اسے بھی بیچ دے گا۔ آج نالہ پر جو بھی مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں اس کا ذمہ دار صرف اور صرف صوبہ خان ہے۔ میں اسے کسی حالت میں معاف نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے دلاور سائیں۔“ عبد الحمید نے کہا۔ ”تم اپنا کام جاری رکھو۔ میں اپنا کام جاری رکھوں گا۔“ دلاور اس سے رخصت ہو گیا۔ روانگی سے پہلے اس نے تھانے کے ایس ایچ او مجنوں خان سے بھی ملاقات کی تھی۔ اور اسے بھی رائے منصور کا فون نمبر وغیرہ دے دیا تھا کہ اگر نالہ یا سسی کے بارے میں کچھ پتہ چلے تو انہیں مطلع کر دیا جائے۔

کاچیلو سے بخش علی لاشاری جانے والی بس کچا کچھ بھری ہوئی تھی۔ صوبیدار مجنوں خان کی وجہ سے دلاور کو فرنٹ سیٹ مل گئی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر بھی اگرچہ دو کی جگہ تین آدمی بٹھائے گئے تھے مگر یہ جگہ بہر حال بس کے پچھلے حصے سے بہتر تھی جہاں انسان بھیڑ بکریوں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔

بس کچے راستے پر سفر کرتی اور دھول کے بادل اڑاتی ہوئی اس نیم پختہ سڑک پر پہنچ گئی جو بخش علی لاشاری کی طرف چلی گئی تھی۔ دو تین میل آگے یہ سڑک ایک بہت بڑے برساتی نالے کو کراس کرتی تھی۔ یہ برساتی نالہ ایک طرف یا رولند کی طرف چلا گیا تھا اور دوسری طرف کندا ہو کی جانب۔ اس کے دونوں کناروں پر درودر تک گھٹا جنگل تھا۔ سندھ میں اس قسم کے جنگل ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھیں۔ کسی واردات کے بعد پولیس جب ڈاکوؤں کا پیچھا کرتی تو ڈاکو ان گھنے جنگلوں میں روپوش ہو جاتے۔ پولیس والے ان جنگلوں میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرتے تھے کیونکہ ان جنگلوں کے ڈاکوؤں کی ایسی ایسی کمین گاہیں تھیں جن کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔

بس ابھی نالے کے پل سے تقریباً "ایک فرلانگ دور تھی کہ پل پر گرے رنگ کی ایک لینڈر درودر کھڑی نظر آئی۔ ایک آدمی بارنٹ کھولے انجن پر جھکا ہوا تھا اور ایک اس کے قریب کھڑا تھا۔ دلاور کے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے سندھی زبان میں کچھ کہا۔ ڈرائیور نے فنی میں سرلاتے ہوئے سندھی ہی میں جواب دیا تھا۔ دلاور پوری طرح ان کی بات نہیں سمجھا تھا لیکن مفہوم سمجھ میں آ گیا تھا۔ مسافر نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ ڈاکو ہو سکتے ہیں جو راستہ روکے کھڑے ہیں مگر ڈرائیور نے اس کے خدشے کو بے بنیاد قرار دیا تھا۔ لیکن بہر حال اس نے بس کی رفتار کم کر دی تھی۔

لینڈر درودر کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے آگے بڑھ کر بس کو روکنے کا اشارہ کیا، دوسرا آدمی بدستور انجن پر جھکا رہا۔ دلاور بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ لینڈر درودر خراب ہو گئی ہے اور ان لوگوں کو کسی مدد کی ضرورت ہے وہ دونوں آدمی غیر مسلح تھے۔

ڈرائیور نے لینڈر درودر کے قریب پہنچ کر بس روک لی۔ بس رکتے ہی لینڈر درودر کا پچھلا دروازہ کھلا اور چار آدمی بڑی پھرتی سے نیچے اتر آئے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں آٹومٹک رائفلیں تھیں۔ لینڈر درودر کے انجن پر جھکا ہوا آدمی بھی سیدھا ہو گیا اس کا چہرہ بھی خوفناک تھا اور ہاتھوں میں رائفل تھی جو اب تک اس نے اپنے جسم کی آڑ میں چھپا رکھی تھی۔ دوسرے شخص نے پستول نکال لیا تھا۔ ان سب نے بس کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

بس میں سوار عورتیں اور بچے ان ڈاکوؤں کو دیکھ کر بری طرح چیخنے لگے۔ ایک ڈاکو رائفل تانے بس کے سامنے کھڑا تھا پستول والے نے لینڈر درودر کی طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی۔ ایک اور آدمی لینڈر درودر سے اتر آیا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی دلاور کو سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ماتھیلو تھانے کا ایک سپاہی تھا۔ دلاور اسے اس رات انسپکٹر صوبہ خان کے ساتھ دیکھ چکا تھا جب گھونکی سے واپسی پر صوبہ خان نے ہائی وے پر ان لوگوں کا راستہ روکا تھا اور دلاور نے صوبہ خان کو تنگ کر کے بھگا لیا تھا۔

"شاہو!" پستول والے نے اس شخص کو مخاطب کیا۔ "بس میں جا کر مسافروں کو غور سے دیکھو اور شناخت کرو کہ ان میں تمہارے صوبیدار کا مہمان ہے یا نہیں؟"

"مجھے بس میں سوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ سامنے بیٹھا ہے۔ فرنٹ سیٹ پر۔ سچ والا۔" اس شخص نے دلاور کی طرف اشارہ کیا۔

پستول والے نے آگے بڑھ کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ پچھلے دروازے والی سائیڈ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچا پھر دلاور کو پستول سے اشارہ کیا۔  
 ”نیچے آ جاؤ سائیں، تمہارا دوست صوبہ خان تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ تمہیں بڑی عزت سے اس کے پاس پھانچا دیا جائے۔“

دلاور کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ نیچے اتر آیا۔ پستول والے نے نیچے کھڑے ہوئے مسافر کو اشارہ کیا۔ وہ شخص جلدی سے بس میں بیٹھ گیا۔ پستول والے نے بس کے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس نے انجن اشارت کیا۔ اور بس کو سڑک پر کھڑی ہوئی لینڈ روور کے پہلو سے نکال لے گیا۔  
 ”چلو بیٹھو۔“ پستول والے نے دلاور کو لینڈ روور کی فرنٹ سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

دلاور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پستول والا اس کے ساتھ دروازے کی طرف بیٹھ گیا تھا۔ تمام ڈاکو لینڈ روور کے پچھلے حصے میں گھس گئے تھے۔ ڈرائیور نے اپنی رانقل بھی ان میں سے ایک کے حوالے کردی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ انجن اشارت کرتے ہی اس نے لینڈ روور کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا اور اسے کندا ہو کی طرف نالے کی پٹری پر ڈال دیا۔ گزرنے والے ہر لمحہ کے ساتھ لینڈ روور کی رفتار تیز ہو رہی تھی اور دلاور نالے کے دونوں طرف پھیلے ہوئے گھنے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے صوبہ خان کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے بالا خرڈاکوؤں کے پاس پناہ لی تھی۔

..... \* \* \* .....

گٹ والا سے گھوٹا رو تک کچا راستہ تھا۔ جیپ کی رفتار اگرچہ ہلکی تھی لیکن پھر بھی جھٹکے لگ رہے تھے۔ بالاخر یہ کچا راستہ ختم ہوا اور وہ گھوٹا رو پہنچ گئے۔ جیپ مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی تھانے کے سامنے پہنچ رک گئی۔ گھوٹا رو پندرہ سولہ ہزار کی آبادی والا قصبہ تھا اور گٹ والا بھی اسی تھانے کی حدود میں واقع تھا۔ سب انسپکٹر نے ایک کانٹیل کو جیپ ہی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور باقی کانٹیلوں کے ساتھ جیپ سے اتر کر تھانے میں داخل ہو گیا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ نالہ اور سسی بھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی رہیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ مزمر کران کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سب انسپکٹر کی واپسی میں پندرہ منٹ لگے تھے۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کے ساتھ اندر جانے والے کانٹیل اسی تھانے کے تھے اور وہ بیس رہ گئے تھے۔ سب انسپکٹر اور ایک کانٹیل رام گڑھ سے آیا تھا۔ ضابطے کے تحت اس نے متعلقہ تھانے کو اطلاع دی تھی اور ملزمان کی گرفتاری کے لیے اس تھانے کے چند کانٹیل اس کے ساتھ کر دیئے گئے تھے۔

”دیوی جی!“ سب انسپکٹر نے آگے آکر نالہ اور سسی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔  
 ”آپ لوگ پیچھے بیٹھ جائیے اور دیکھئے... گٹ والا کے کھیانے آپ دونوں کی بہت تعریف کی تھی۔ لیکن قانون کے نزدیک آپ کی حیثیت ملزموں کی ہے اور آپ کے خلاف جو چارجز لگائے گئے ہیں وہ بے حد سنگین ہیں... لیکن میں آپ لوگوں کو ہتھکڑیاں نہیں لگا رہا۔ امید ہے کہ آپ لوگ بھی ہمیں راستے میں پریشان نہیں کریں گی۔“

”مطلبن رہئے آفیسر! ہماری طرف سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ نالہ نے جواب دیا۔  
 وہ دونوں اگلی سیٹ سے اتر کر جیپ کے پچھلے حصے میں آگئیں۔ کانٹیل ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ

گیا تھا۔ سب انسپکٹر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کے اشارے پر ڈرائیور نے جیپ چلا دی۔ بازار میں سے گزرتے ہوئے سب انسپکٹر نے ایک جگہ جیپ رکوالی اور خود نیچے اتر کر مٹھائی کی ایک دوکان میں مکس گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مٹھائی کے دو چھوٹے ڈبے لے کر باہر آگیا۔ ایک ڈبہ اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نالکہ اور سسی کی طرف بڑھا دیا اور دوسرا ڈبہ خود لے کر اپنی سیٹ پر آگیا۔ جیپ پھر حرکت میں آگئی۔

نالکہ نے ڈبہ کھول کر دیکھا۔ اس میں راجستھان کی ایک مخصوص مٹھائی تھی۔ مٹھائی تقریباً ”آدھا کلو ہوگی۔ نالکہ نے کھلا ہوا ڈبہ سامنے بیٹھے ہوئے کاننیل کے آگے کر دیا۔ اس نے ایک کلوڑا اٹھالیا۔ نالکہ نے ڈبہ سسی کی طرف بڑھایا اور پھر خود بھی ایک کلوڑا اٹھالیا۔ مٹھائی بہت مزیدار تھی۔ آدھا کلو مٹھائی کی حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ تینوں منٹوں میں اسے چٹ کر گئے۔ نالکہ نے خالی ڈبہ سڑک پر اچھال دیا۔

سڑک پختہ تھی۔ اور جیپ تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ دوپہر کے ایک گھنٹہ بعد وہ لوگ آسوتا پہنچ گئے۔ یہ بھی بڑی آبادی والا قصبہ تھا یہاں انہوں نے رک کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ جیپ میں پیٹرول ڈلوایا اور پھر وہ لوگ رام گڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ پنڈت رام ناتھ کو انہوں نے گھوٹا روٹھانے ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک خطرناک مجرم تھا۔ اسے ان عورتوں کے ساتھ کھلی جیپ پر لے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے سب انسپکٹر نے اسے گھوٹا روٹھانے کی تحویل میں دے دیا تھا کہ کل تک اسے بھی رام گڑھ بھیج دیا جائے۔

نالکہ جیپ پر بیٹھی اپنے اطراف میں دیکھ رہی تھی۔ کبھی ریٹیل علائقہ شروع ہو جاتا اور کبھی کھیت اور سبزہ نظر آنے لگتا۔ جہاں سبزہ ہوتا وہاں چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی دکھائی دیتیں۔ بالاخر شام سے ڈرا پہلے وہ لوگ رام گڑھ میں داخل ہو گئے۔ رام گڑھ تیس پینتیس ہزار والی آبادی کا شہر تھا۔ یہاں سے ایک پختہ سڑک جیسلمیر کی طرف بھی چلی گئی تھی۔ نالکہ سیٹ نظرؤں سے سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگوں اور عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ البتہ سسی کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ مستقل طور پر خوف کی پلیٹ میں تھی اور نالکہ اسے مسلسل تسلیاں دے رہی تھی۔

جیپ شہر کی مختلف سڑکوں پر چلتی رہی۔ رنگ برنگے لباس اور رنگ برنگی پگڑیوں والے لوگ۔ ہر دوسرے آدمی کے چہرے پر بخاوری قسم کی مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سارا راجپوتوں کا علاقہ تھا۔ ان کی اپنی ایک ثقافت تھی۔ اپنا طرز زندگی تھا۔

جیپ شہر کے مرکزی قحانے کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ گیٹ کے دوسری طرف وسیع صحن تھا۔ اس صحن کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے جن کے سامنے برآمدے بھی تھے۔ انہی کمرؤں میں دفتر بھی تھے اور قیدیوں کے لیے حوالات بھی۔ صحن کے عین وسط میں چند درخت تھے جن کے نیچے لکڑی کے بچے کھتے ہوئے تھے۔

ڈرائیور نے جیپ اس جگہ روک لی جہاں پولیس کی دو تین گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ سب انسپکٹر جب نالکہ اور سسی کو لے کر جیپ سے اترا تو برآمدے میں کھڑے ہوئے کچھ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”سیلو سگرام!“ ایک باوردی سب انسپٹر نے نائلہ کے ساتھ سب انسپٹر کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ ”گلتا ہے اس مرتبہ تم نے کوئی خاص کارنامہ انجام دیا ہے۔“

”ابھی تو یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ کیس بنا بھی ہے یا نہیں۔“ سب انسپٹر سگرام کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ طویل برآمدے میں چلتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے جس کے دروازے پر انسپٹر گھنٹام کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

یہ خاصا وسیع و عریض کمرہ تھا۔ سامنے ایک بڑی سی آفس ٹیبل کے پیچھے سفید بالوں والا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی مونچھیں بھی سفید تھیں اور اس کے جسم پر انسپٹر کی وردی تھی۔ سینے پر چند تمغے بھی آویزاں تھے۔ اس کے علاوہ کمرے میں تین اور چھوٹے ریک کے پولیس آفیسر بھی موجود تھے۔ ایک آدمی سادہ کپڑوں میں تھا جسے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ چرے اور لباس سے وہ شخص خاصا معزز اور شریف دکھائی دے رہا تھا۔ سفید بالوں والا انسپٹر اپنے سامنے رکھے ہوئے فائل پر جھکا ہوا تھا۔

سب انسپٹر سگرام نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سیلوٹ کیا۔ سیلوٹ کی آواز سن کر انسپٹر گھنٹام نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر نائلہ اور سسی پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں عجب سی چمک ابھر آئی۔

”ویل آفیسر؟“ اس نے سب انسپٹر سگرام کی طرف دیکھا۔ ”تو یہ ہیں وہ مسلمان لڑکیاں، کچھ بتایا انہوں نے کہ یہ کیوں ہیں اور انہوں نے سرحد کیسے پار کی تھی؟“

”نو سرا ابھی ان سے کچھ نہیں پوچھا گیا۔“ سب انسپٹر سگرام نے جواب دیا۔

”انہیں ایس ایس پی صاحب کے سامنے پیش کر دو۔ انہیں ان لڑکیوں کے بارے میں کوئی خاص اطلاع ملی ہے۔“ انسپٹر گھنٹام نے کہا۔

”یس سرا“ سگرام نے ایک بار پھر سیلوٹ کیا اور نائلہ اور سسی کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

وہ ان دونوں کو لے کر اسی عمارت کی ایک اندرونی راہداری میں آگیا۔ ایک دروازے پر ایس ایس پی کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ دروازے پر ایک اردو لکھی موجود تھا۔

”صاحب سے کہو سب انسپٹر سگرام حاضر ہونا چاہتا ہے۔“ سگرام نے اردو سے کہا۔

”یس سرا“ اردو معنی خیز نظروں سے نائلہ اور سسی کی طرف دیکھتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کی واپسی میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اس نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔ سب انسپٹر سگرام، نائلہ اور سسی کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔

ایس ایس پی کے بال بھی سفید تھے۔ صندلی رنگت لیکن چرے پر پولیس والوں جیسی کڑنگی نہیں تھی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ لگ رہی ہوگی۔ وہ اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ سگرام کے سیلوٹ کے جواب میں اس نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ سگرام میز کے سامنے انٹشن کی پوزیشن میں کھڑا تھا اور نائلہ اور سسی طرزموں کی طرح کھڑی تھیں۔

ایس ایس پی تقریباً ”پانچ منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور نائلہ اور سسی کی طرف دیکھنے لگا۔

”سرا“ سب انسپٹر سگرام نے کہا۔ ”یہ وہ پاکستانی لڑکیاں ہیں جن کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے راجستھان میں داخل ہوئی ہیں۔ ان سے ابھی تک کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔“

”ٹھیک ہے آفیسر۔“ ایس ایس پی نے کہا۔ ”ان سے پوچھ گچھ اسپیشل برانچ والے کریں گے۔ تم اب

ہا سکتے ہو۔“  
 ”ہیں سر!“ سب انسپٹر سگرام نے ایک بار پھر سلیوٹ کیا اور ٹائلڈ اور سسی کی طرف دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

”بیٹھو تم لوگ!“ ایس ایس پی نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ٹائلڈ اور سسی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔  
 ”ہماری اسپیشل برانچ کو تم دونوں کے بارے میں کچھ خاص قسم کی اطلاع ملی ہے۔ وہ تم لوگوں کو اپنی تحویل میں لینے کو بے چین ہو رہے ہیں۔ ان کا پوچھ گچھ کا اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم لوگ کیا مقصد لے کر راجستھان آئی ہو؟“

”ہمارا کوئی مقصد نہیں۔“ ٹائلڈ نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”ہم ریگستان میں راستہ بھٹک گئی تھیں۔ دو دن تک ریگستان میں زندگی اور موت سے لڑتے رہنے کے بعد ایک گاؤں کے قریب پہنچ گئیں۔ گاؤں کے لوگوں نے ہمیں بچایا۔ ہمیں نئی زندگی مل گئی۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ گاؤں ہندوستان کی حدود میں واقع ہے۔ سرحد پار کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ یا مقصد نہیں تھا۔ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ ہم نے کب سرحد پار کی تھی۔“

”یہ تو تم لوگوں کی کہانی ہے۔ اسپیشل برانچ والے کچھ اور سننا چاہیں گے۔“ ایس ایس پی نے ٹائلڈ کے ہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔

”میں پنجاب کی ایک زمیندار ہوں۔ میرے کچھ عزیز مجھے قتل کر کے میری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک بددیانت پولیس آفیسر کے ذریعے مجھے اغوا کر دیا لیکن میں ان کے چنگل سے بھاگ اہل۔ میں نے سندھ کے ایک چھوٹے سے گوٹھ میں پناہ لی۔ چند روز بعد مجھے اس گوٹھ سے پھر اغوا کر لیا گیا۔ اور انہوں نے گوٹھ کی اس بے گناہ اور معصوم لڑکی کو بھی اغوا لیا۔ ہمیں ایک حویلی میں بند کیا گیا تھا جہاں سے ہمیں بھاگنے کا موقع مل گیا۔ ہم جان بچانے کی کوشش میں بھاگتی ہوئی سندھ کے ایک ہندو سینٹھ کے ہتھے پڑ گئیں۔ وہ ہمیں کسی وڈیرے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا لیکن ہم موقع پا کر ایک بار پھر بھاگ نکلیں اور دو دن تک ریگستان میں بھٹکنے کے بعد راجستھان کے اس گاؤں میں پہنچ گئیں جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو پاکستان کے شہر رحیم یار خان سے میرے بارے میں تصدیق کر سکتے ہیں۔“ ٹائلڈ نے کہا۔

”تمہاری کہانی واقعی دلچسپ ہے۔“ ایس ایس پی مسکرایا۔ ”بہر حال“ اس کی تصدیق کرنا یا تم لوگوں کے بارے میں دیگر معلومات حاصل کرنا اسپیشل برانچ کا کام ہے۔ وہ لوگ تمہیں لینے کے لیے کچھ دیر میں اس پہنچ جائیں گے۔ مجھے تم لوگوں سے پوچھ گچھ کا حق نہیں دیا گیا۔ البتہ میرے اسٹاف کے خلاف کوئی شکایت ہو تو بتا سکتی ہو۔“

”ابھی تک ہمارے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں کیا گیا۔“ ٹائلڈ نے جواب دیا۔ ”ہمیں گاؤں سے یہاں تک لانے والا سب انسپٹر ایک ڈے دار آفیسر ہے۔ اس نے راستے میں ہمارے کھانے پینے کا خیال رکھا تھا۔ ہمیں اس سے کوئی شکایت نہیں۔“  
 ”اس وقت کچھ کھانا چاہو تو؟“

”چائے کی طلب ہو رہی ہے۔“ ٹائلڈ نے بے تکلفی سے کہا۔  
 ایس ایس پی نے اردلی کو بلا کر چائے لانے کے لیے کہا اور فون کارڈ پر ایڈاکٹر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ



فون پر تقریباً ”پانچ منٹ تک کسی سے باتیں کرتا رہا۔ اس دوران اردلی چائے لے کر آگیا۔ اس نے ٹرے میں سے ایک کپ ایس ایس پی کے سامنے کر دیا اور ایک ایک کپ نائلہ اور سسی کے سامنے۔ چائے پینے کے تقریباً ”بیس منٹ بعد دو آدمی دھڑ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ لمبے ترنگے وہ دونوں آدمی سادہ لباس میں تھے۔ ایس ایس پی انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں یا تو اس سے بڑے آفیسر تھے یا ان کا تعلق اسپیشل برانچ سے تھا۔

”یہ ہیں وہ دونوں لڑکیاں؟“ ان میں سے ایک نے باری باری نائلہ اور سسی کی طرف دیکھا۔ ”ہاں، انہیں لے جاؤ۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ ایس ایس پی نے کہا۔

وہ دونوں نائلہ اور سسی کو لے کر کمرے سے باہر آگئے۔ برآمدے کے سامنے کپاؤنڈ میں میروں رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ نائلہ اور سسی کو دین کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ دین کے شیشوں پر سیاہ رنگ کی پلاسٹک شینس لگی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے باہر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دونوں آدمی آگے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے اسٹیرنگ سنبھال لیا تھا۔

دین تقریباً ”ایک گھنٹے تک سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ شروع میں تو سڑکوں پر ٹریفک کی آوازیں سنائی دی تھیں لیکن پھر یوں لگا جیسے وہ کسی دیرانے میں سفر کر رہے ہوں۔ پھر گاڑی کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ کسی جگہ صرف ایک سیکنڈ کو رک کر پھر آگے چل پڑی اور تقریباً ”پانچ منٹ بعد پھر رک گئی۔ انجن بند ہو گیا اور دین کا پچھلا دروازہ کھول دیا گیا۔

”نیچے اترو۔“ یہ ان دونوں میں سے ایک آدمی تھا جو انہیں پولیس اسٹیشن سے لے کر آئے تھے۔ نائلہ اور سسی نیچے اتر آئیں۔ اسٹیشن ویگن سے باہر آتے ہی نائلہ کو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ اگرچہ شام کا اندھیرا مگر ہوجکا تھا مگر ان کے چاروں طرف پہاڑیوں کے پہلے دکھائی دے رہے تھے۔ ان پہاڑیوں کے درمیان ایک کھلا میدان سا تھا جہاں جگہ جگہ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ان روشنیوں میں بہت سے خیمے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ نائلہ کو یوں لگا جیسے وہ کسی خیمہ بستی میں آگئی ہو۔ خیموں کے آس پاس کچھ لوگ بھی چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔

وہ دونوں آدمی نائلہ اور سسی کو لے کر ایک پہاڑی کی طرف چل پڑے۔ ایک خیمے کے سامنے دو مسلح سنتری کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ پہاڑی کے قریب پہنچ کر وہ لوگ ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے گھومتے ہوئے پہاڑی میں واقع ایک غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ غار میں روشنی تھی۔ نائلہ کو یہ خیمہ بستی دیکھ کر سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ کوئی کیمپ تھا۔ اور جگہ جگہ سے جزیروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ ان آدمیوں کے ساتھ غار کے دہانے میں داخل ہی ہونا چاہتی تھیں کہ پہاڑیاں زبردست فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھیں۔ سسی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ دوڑ کر نائلہ سے لپٹ گئی۔ فائرنگ کی آوازیں سے یوں لگتا تھا جیسے گولیاں ان کے آس پاس چلائی جا رہی ہوں۔ ان آدمیوں نے مڑ کر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”یہاں اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی رہیں گی۔ تم لوگ جلد ہی اس کی عادی ہو جاؤ گی۔“

وہ غار میں داخل ہو گئے۔ کئی سرنگیں تھیں۔ اور ہر سرنگ میں مرکزی ٹیوب لائیں جل رہی تھیں۔

ان سرنگوں میں ایسے چھوٹے چھوٹے غار بھی تھے جن میں باقاعدہ دروازے لگائے گئے تھے۔ وہ لوگ ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ ایک آدمی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دوسرا آدمی بھی نالکھ اور سسی کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا تھا۔

یہ غار ایک کمرے کی طرح تھا جو باقاعدہ دفتر کی طرح آراستہ تھا۔ دو میزیں تھیں۔ ایک میز کے پیچھے ایک بھاری بھر کمز آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی اور جسم پر فوجی وردی تھی۔ کندھوں پر لگے ہوئے بیچ اسے کرنل ظاہر کر رہے تھے۔ اس کے سامنے میز پر بہت سی فائلیں بڑی ہوئی تھیں۔ دوسری میز پر ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس چوبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے اسکرٹ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ یہ دونوں کپڑے اتنے مختصر تھے کہ اگر وہ نہ بھی پہنے جاتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔

”سرا“ نالکھ کے ساتھ آنے والے ایک آدمی نے کرنل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہ پاکستانی لڑکیاں ہیں جن کے بارے میں سرحد پار سے ہمارے ایجنٹ زیرو تھری ٹوڈن نے اطلاع دی تھی لیکن یہ دونوں راستے میں اس کے آدمیوں کو دھوکا دے کر بھاگ گئی تھیں۔“

”زیرو تھری ٹوڈن کون ہے؟“ کرنل نے پوچھا۔

”کنوٹل!“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”وہ سرحد پار اپنے علاقے کا ایک معزز آدمی ہے لیکن اس کی طرف سے تازہ ترین اطلاع یہ ملی ہے کہ اس علاقے کے تھانیدار نے اسے ان لڑکیوں کے اغوا کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ مگر ایک مسلمان ڈزیرو کی ضمانت پر اسے رہا کر دیا گیا ہے اور توقع ہے کہ اس کے خلاف کیس بھی جلد ہی خارج کر دیا جائے گا۔“

”اس کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔ لیکن اس کا انتخاب واقعی عمدہ ہے۔“ کرنل نے نالکھ اور سسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے یہ بہت تھکی ہوئی ہیں۔ انہیں وجہی کے سپرد کرو۔ آج کی رات انہیں مکمل آرام کرنے دو۔ کل صبح ان سے بات ہوگی۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

وہ دونوں نالکھ اور سسی کو لے کر غار سے باہر آ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک خیمے میں کھڑے تھے۔ نالکھ اور سسی کے ساتھ صرف ایک ہی آدمی خیمے میں آیا تھا جبکہ دوسرا کسی اور طرف نکل گیا تھا۔

اس خیمے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک عورت انہیں دیکھ کر اٹھ گئی۔ وہ وجہی تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ خاصی دراز قامت اور پرکشش عورت تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ دونوں کلائیوں میں سونے کا ایک ایک کڑا تھا۔ ناک میں لونگ چمک رہی تھی۔ اور کانوں میں بھی نہایت خوبصورت بندے تھے۔ پیشانی پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔

خیمے میں چھت کے پول سے ایک مرکزی ٹیوب لائٹ لگی ہوئی تھی۔ اس خیمے میں ایک کرسی، ایک بھونٹی فیمل اور دو اسپرنگ والے بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ ایک بیڈ کے نیچے لوہے کا ایک ٹرنک بھی نظر آ رہا تھا۔

”یہ سرحد پار سے زیرو تھری ٹوڈن کی بھیجی ہوئی مہمان ہیں لیکن یہ دونوں سرحد پار سے آنے والے مہمانوں سے قدرے مختلف ہیں کیونکہ انہیں ان کی مرضی کے بغیر یہاں بھیجا گیا ہے۔ بہت تھکی ہوئی ہیں۔ ان رات تمہارے پاس مکمل طور پر آرام کریں گی۔ تمہیں ان کے کھانے پینے اور آرام کا خیال رکھنا ہے۔“ اس شخص نے کہا۔

”تم فکر مت کرو۔“ وجہی نے جواب دیا۔ ”ایک دو دن تو انہیں اداسی رہے گی لیکن اس کے بعد ان کا

دل لگ جائے گا۔ بس اب تم جاؤ... میں دیکھ لوں گی۔“  
وہ شخص باہر نکل گیا۔ وضعتی، نائلہ اور سسی کے قریب آگئی۔

”میرا نام وضعتی ہے اور تم دونوں؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھا۔

”میں نائلہ ہوں اور یہ سسی ہے۔“ نائلہ نے تعارف کرایا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟ اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

”یہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی راکارٹینگ کمپ ہے۔“ وضعتی نے کہا۔ ”یہاں تمہارے ان ہم وطنوں کو خصوصی تربیت دی جاتی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنی حکومت سے نالاں ہیں اور وہ اپنی سرکار سے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ پاکستان میں ہمارے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہے جو بے روزگار ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اگر پاکستانی سرکار انہیں نوکری نہ دے تو احتجاج تو ان کا حق بنتا ہے۔ ہم ایسے نوجوانوں کی مدد کرتے ہیں۔ انہیں اتنی دولت دیتے ہیں جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے بدلے انہیں ہمارے بھی چھوٹے چھوٹے کام کرنا پڑتے ہیں۔“

نائلہ کانپ اٹھی۔ اس نے پاکستانی اخباروں میں راجستھان میں واقع راکے ٹریننگ کیمپوں کے بارے میں پڑھا تھا اور اس وقت خود یہاں موجود تھی۔ وضعتی نے بتایا تھا کہ یہاں آنے والے پاکستانی نوجوان از خود ان کے ایجنٹوں سے رابطہ کرتے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ راکے ایجنٹ پورے پاکستان خصوصاً ”سندھ کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پاکستانی نوجوانوں کو دولت، خوبصورت لڑکیوں اور روشن مستقبل کا لالچ دے کر ان کیمپوں میں لے آتے تھے جہاں انہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے کر پاکستان واپس بھیج دیا جاتا جہاں یہ لوگ اپنے بھارتی آقاؤں کے اشارے پر حکومت پاکستان کے خلاف تخریبی کارروائیاں کر کے دہشت پھیلاتے رہتے۔ ٹریننگ کے دوران انہیں اس طرح گرفت میں لیا جاتا کہ وہ بعد میں اگر چاہتے بھی تو زندگی بھر ان کے چنگل سے نہیں نکل سکتے تھے۔

”بقول تمہارے،“ پاکستانی نوجوان از خود تمہارے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ بھولے بھالے پاکستانی نوجوانوں کو سبز باغ دکھایا بلیک میل کر کے انہیں اس طرح چنگل میں پھانسا جاتا ہے کہ وہ تم لوگوں کے اشارے پر ناپنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کا کوئی بھی نوجوان اتنا بے حس اور بے ضمیر نہیں کہ محض نوکری نہ ملنے پر اپنے بے گناہ ہم وطنوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دے۔“ نائلہ نے کہا۔

”تم یہاں اپنے ہم وطنوں سے ملوگی تو تمہیں ان کی باتوں سے پتہ چل جائے گا کہ ہم انہیں سبز باغ دکھا کر لاتے ہیں یا وہ اپنی حکومت کے مظالم سے تنگ آکر ہماری طرف رخ کرتے ہیں۔ لیکن... ایک بات میں ابھی تم دونوں کو بتا دوں...“ وضعتی نے کہتے ہوئے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ”اس کیمپ سے فرار ہونے کا تصور بھی ذہن میں مت لانا۔ ان پہاڑوں پر چاروں طرف اونچی خاردار تاروں کے جھنگے لگے ہوئے ہیں جنہیں ملی کا پتھر بھی پار نہیں کر سکتا اور پھر جگہ جگہ حفاظتی چوکیاں بنی ہوئی ہیں۔ کوئی محافظ تمہیں نظر نہیں آئے گا لیکن جیسے ہی جھنگے کے قریب پہنچو گی تم پر گولیوں کی بارش شروع ہو جائے گی۔ جھنگے کے اندر اور باہر کی طرف جگہ جگہ بارودی سرنگیں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر کسی طرح جھنگہ عبور کر بھی لیا جائے تو باہر کی طرف سدھائے ہوئے خونخوار کتے رات کو گھسٹ کرتے رہتے ہیں جو کسی بھی انسان کو چند سیکنڈ میں چیر پھاڑ کر

برابر کر سکتے ہیں لیکن... مجھے یقین ہے کہ تم ایسا خیال بھی ذہن میں نہیں لاؤ گی۔ ایک دو دن بعد ہی تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تم نرگ سے نکل کر سو رنگ میں آگئی ہو۔ یہاں تمہیں جو عیش و آرام حاصل ہو گا اپنے دلش میں تو تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”میں اپنے ملک کی ایک بہت بڑی زمیندار عورت ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہزاروں ایکڑ زرعی اراضی کی تمام مالک ہوں۔ میرے پاس کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے!“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ وجنتی مسکرائی۔ ”یہاں کی ٹرننگ تمہارے کام آئے گی۔ تم اپنے آدمیوں سے بہتر طور پر کام لے سکو گی۔ ابھی تو ہزاروں ایکڑ کی مالک ہو پھر لاکھوں ایکڑ کی مالک بن جاؤ گی۔ دوسرے زمیندار تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”باتوں کے لیے بہت وقت بڑا ہے، چلو پہلے کچھ کھا پی لو۔ اس کپ کے تمام باورچی مسلمان ہیں۔ حلال کھانے پیتے ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے کھانا پکانے والے باورچی الگ ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

وہ دونوں وجنتی کے ساتھ اس خیمے سے نکل کر ایک اور بڑے خیمے میں آگئیں۔ جہاں ایک لمبی سی ڈائننگ ٹیبل بچھی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ تین نوجوان وہاں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے سامنے میز پر چٹا ہوا کھانا واقعی بہت شاندار تھا۔ وہ تینوں نوجوان پاکستانی تھے۔ وہ صاف اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ جس طرح ہنس بھس کر باتیں کر رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ بہت خوش ہوں۔ ان تینوں نے نائلہ اور سسی کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے کچھ کہا اور پھر تینوں کے قہقہے خیمے میں گونج اٹھے۔

”وجنتی رانی! ان تھری لونڈیوں کو کہاں سے پکڑ لائی ہو۔ مگر چیزیں غضب کی ہیں۔“ ایک نوجوان نے وجنتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”گھبراؤ نہیں۔ ایک دو دن میں ان سے متعارف ہو جاؤ گے۔“ وجنتی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر خیمے سے باہر منہ کر کے کسی کو پکارا۔ ”نورا! ہی ایک آدمی اندر آ گیا۔“

”رمضان!“ وجنتی اس شخص کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”ان دو مہمانوں کے لیے کھانا لگاؤ۔ کوئی ڈھنگ کی چیز لانا۔“

”ابھی لایا وجنتی رانی۔“ رمضان کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

چند منٹ کے بعد رمضان نے میز پر کھانا لگا دیا۔ مرغی کا روٹ، بکری کے گوشت کا قورمہ، آلو میتھی کی بھجیا، مونگ کی بھنی ہوئی دال اور ایک سالن اور تھا۔ ساتھ میں گرم گرم تندوری روٹی۔ یہ شاندار کھانا دیکھ کر نائلہ کی جھوک واقعی چمک اٹھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں کھانا اس قسم کا دیا جاتا ہے تو اور کیا کچھ نہیں لیا ہو گا۔

وہ دونوں کھانا کھاتی رہیں اور وجنتی ان کے پاس بیٹھی رہی۔ اس دوران دو تین اور نوجوان بھی آئے تھے۔ ان کے سامنے بھی ایسا ہی کھانا چٹا گیا تھا۔

تقریباً ”ایک گھنٹے بعد وجنتی ان دونوں کو لے کر دوبارہ اپنے خیمے میں آگئی۔“

”آج رات انہی کپڑوں میں سو جاؤ۔ کل تم لوگوں کے لیے دوسرے کپڑوں کا بندوبست کر دوں گی۔“ وجنتی نے کہا۔

نائلہ اور سسی راجستھانی لباس ہی پہنے ہوئے تھیں۔ انہیں یہ کپڑے گاؤں میں عائشہ نے دیئے تھے۔

سسی ایک کھاٹ پر لیٹ گئی۔ جبکہ ناملہ اور دجنتی دوسرے کھاٹ پر بیٹھ گئیں۔ دجنتی نے ناملہ کی کمر پر اس طرح بازو لپیٹ رکھا تھا جیسے ان میں بست پرانی دوستی ہو۔ دجنتی جیسے لمبے لمبے میں ناملہ کو تقسیم ہند کا پس منظر بتا رہی تھی۔ وہ اپنے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دو نظریہ کے تحت پاکستان کا قیام ہی غلط تھا۔ کیونکہ پاکستان کی موجودہ آبادی سے کئی گنا زیادہ مسلمان اب بھی ہندوستان میں آباد تھے۔

ناملہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کی برین واشنگ ہو چکی تھی۔ پہلے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ پاکستان کا قیام ہی غلط تھا۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے آتے۔ اس طرح مرحلہ وار کیبپ میں آنے والوں کے ذہن میں مملکت اسلامیہ پاکستان کے خلاف نفرت کا زہر بھریا جاتا۔ کیبپ میں ان نوجوانوں کو پڑھنے کے لیے ایسا لٹریچر دیا جاتا جس میں پاکستان اور اسلام کے خلاف جی بھر کے زہر اگلا گیا تھا۔ ناملہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اس نے ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نے تحریک پاکستان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان کس طرح معرض وجود میں آیا تھا اور اس کے لیے لقمی قربانیاں دی گئی تھیں۔ کوئی بھی محب وطن پاکستانی اپنے پیارے وطن کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن ایسے لوگ بھی تھے جو مایوس تھے اور اس کیبپ میں آنے والوں کا تعلق ایسے ہی مایوس طبقے سے تھا جو بڑی آسانی سے بھارتی ایجنٹوں کے ہاتھ لگ جاتے تھے۔

سسی سوچتی تھی۔ دجنتی چارپائی سے اٹھ کر ناملہ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور اس کی باتیں کچھ ایسی ہی تھیں جو دل میں مایوسی پیدا کر سکتی تھیں۔ لیکن ناملہ نے اس گفتگو کے آغاز ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ایسی باتوں کو ذہن میں نہ لے گی۔ دجنتی نے جیسے ہی باتیں شروع کی تھیں ناملہ نے دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا تھا۔

”میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہے۔“ دجنتی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم واقعی بہت تھکی ہوئی ہو، سو جاؤ، صبح باتیں ہوں گی۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ ناملہ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے کسی بھی خیمے میں جگہ مل جائے گی۔ اس کیبپ میں زیر تربیت تمام نوجوان میرے شیدائی ہیں۔ میرے لیے رات گزارنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دجنتی نے جواب دیا اور خیمے سے باہر نکل گئی۔

ناملہ نے اٹھ کر خیمے کا پردہ برابر کر دیا اور آہنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ خیمے کے وسط میں پول کے ساتھ اگرچہ ٹیوب لائٹ کا سونچ لگا ہوا تھا مگر ناملہ نے ٹیوب لائٹ جلٹی رہنے دی تھی۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا خوف تھا۔ ان کیبپوں میں وہ نوجوان آتے تھے جنہیں طرح طرح کے لالچ دیئے جاتے تھے۔ مرد کے لیے ایک جوان اور خوبصورت عورت سے بڑا لالچ اور کیا ہو سکتا ہے! اس نے کھانے کے خیمے ہی میں دیکھ لیا تھا کہ وہاں آنے والا ہر نوجوان لالچائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر ان نوجوانوں نے جس طرح دجنتی کو مخاطب کیا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دجنتی سے ان کے کس قسم کے تعلقات تھے اور پھر ابھی خیمے سے باہر جاتے ہوئے دجنتی نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ اس نے کس بے غیرتی سے اعتراف کیا تھا کہ اس کیبپ میں زیر تربیت نوجوان اس کے شیدائی ہیں اور اس کے لیے رات گزارنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسے کسی بھی خیمے میں جگہ مل جائے گی۔

ناملہ کو یقین تھا کہ اس کیبپ میں دجنتی جیسی اور بھی بہت سی عورتیں ہوں گی جنہیں ان نوجوانوں کا دل بسلانے کے لیے خاص طور سے رکھا گیا ہوگا۔ گویا ان کیبپوں میں پاکستانی نوجوانوں کو تخریب کاری اور

ہفت گروہ کی تربیت دینے کے علاوہ انہیں اخلاقی طور پر بھی دیوالیہ کیا جا رہا تھا۔  
 دل سے پاکستان کے وجود کو قبول نہ کرنے والے ہندو شروع ہی سے اس ملک کے خلاف گھناؤنی  
 زشوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان سازشوں پر جس طرح روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا وہی روپیہ اگر  
 دھوکھران اپنی قوم کی حالت سدھارنے پر خرچ کرتے تو آج ہندوستان کی معاشی حالت مختلف ہوتی۔  
 انجانے سے خوف سے دیر تک نالکہ گو نیند نہیں آسکی تھی۔ لیکن بالاخر اس کی پلکیں جھلنے لگیں اور وہ  
 کی آغوش میں چل گئی۔

...●...●...●...

”تمہیں یاد ہو گا کہ ایک روز میں نے کہا تھا کہ صوبہ خان اپنے دشمنوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔“ صوبہ  
 خان نے دلاور کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس وقت ایک دوسرے کے آنے سانسے کھڑے تھے۔ کچھ جھگ میں بنا ہوا وہ جھوپڑا ان  
 دوں کا مسکن تھا اور وہ لوگ اسے بس سے اتارنے کے بعد سیدھے بیٹھ لائے تھے۔ اس قسم کے تین  
 جھوپڑے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا جیسے یہ ڈاکو یاں بڑی آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔  
 جھوپڑے میں وہ ڈاکو دلاور کو لے کر آئے تھے وہاں بیوی اور بیٹی آرہی تھیں اور صوبہ خان اکیلا ہی  
 پڑے میں بیٹھا بیوی آرہی تھا ایک نہایت ہی بے ہودہ قسم کی بھارتی فلم دیکھ رہا تھا۔

مراد رند نامی جس شخص کے ہاتھ میں پستول تھا وہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ مراد رند سندھ کا  
 بہت مشہور اور خطرناک ڈاکو تھا۔ وہ جس بستی میں ڈاکہ ڈالتا اسے جلا کر راکھ کر دیتا۔ وہ اب تک کم از  
 کم چالیس افراد کے خون سے ہاتھ رنگ چکا تھا۔ اس کے کھاتے میں لاتعداد ڈکیتیاں بھی شامل تھیں۔  
 حکومت نے اس کے سر کی قیمت تیس لاکھ روپے مقرر کی تھی۔ مگر وہ آج تک پولیس کے ہاتھ نہیں  
 لگا تھا۔ علاقے کے وڈیرے اور صوبہ خان جیسے پولیس آفیسر اس کی پشت پر ہوں تو پھر اس پر کون ہاتھ  
 لگاتا تھا۔

مراد رند کی زندگی کی کمائی بھی بڑی دلچسپ تھی۔ وہ ایک کاشت کار کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ کی زمین بس  
 تھی کہ اس پر پیدا ہونے والی فصلوں سے تنگی ترشی میں گزارا ہو رہا تھا۔ مراد رند کو پڑھنے کا شوق تھا۔  
 اس میں اسکول صرف آٹھویں کلاس تک تھا۔ مراد رند نے آٹھویں کلاس پاس کر لی۔ میٹرک کرنے کے  
 اسے میرپور خاص کے ہائی اسکول میں داخلہ لینا تھا لیکن جب وڈیرے کو پتہ چلا کہ سراب رند اپنے بیٹے  
 کی اسکول میں داخل کروانا چاہتا ہے تو اس نے نہ صرف مخالفت کی تھی بلکہ سراب رند کو دھمکی بھی دی  
 کہ اگر اس نے اپنے بیٹے کو ہائی اسکول میں داخل کروایا تو اسے زمین سے بے دخل کر کے گاؤں سے  
 دیا جائے گا۔ اس وڈیرے کے اپنے دو بیٹے امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے  
 اس کی بیٹی بھی کراچی کے ایک کالج میں زیر تعلیم تھی۔ وہ تعلیم کو صرف دولت مندوں کا حق سمجھتا تھا۔  
 کے خیال میں کاشتکاروں اور ہاریوں کے بچوں کو تعلیم کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کمی کاری اور خدمت  
 قسم کے لوگ تھے۔ ان کی اولاد بھی اگر تعلیم حاصل کر کے ان کے مقابلے میں کریسوں پر بیٹھنے لگی تو ان  
 خدمت کون کرے گا۔ ان کے کھیتوں پر ہل کون چلائے گا اور ان کے پیر کون چومے گا؟

سراب رند وڈیرے کا مقروض تھا۔ اس کی زمین وڈیرے کے پاس گروہ رکھی ہوئی تھی۔ وڈیرے کی

دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ سراب رند نے بیٹے کے ہاتھوں سے کتابیں چھین کر اسے کسی تھادی کے کاشکار اور ہاری کا مقدر یہی ہے کہ وہ نسل در نسل زمین کا سینہ چیرتا رہے اور وڈیرے کی غلامی کرتا رہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ وڈیرہ ان دنوں کراچی گیا ہوا تھا۔ ڈاکوؤں نے مراد رند کے ماں باپ کو اس کی نظروں کے سامنے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گھر کا سارا قیمتی سامان لوٹ کر لے گئے اور اس کی جوان بہن کو اٹھا کر لے گئے۔ مراد رند نے چھپ کر اپنی جان بچائی تھی۔ اگر وہ ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ جاتا تو یقیناً "اسے بھی قتل کر دیا جاتا۔"

اس ڈاکے میں گوٹھ کے چھ آدمی مارے گئے تھے اور ڈاکو مراد رند کی جوان بہن کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ پولیس دوسرے دن صبح آئی تھی۔ وہ لوگ گوٹھ والوں کے بیانات لکھ کر چلے گئے۔ تیسرے دن صبح وڈیرہ بھی کراچی سے گوٹھ پہنچ گیا۔ مراد رند اس کے قدموں پر گر گیا کہ وہ اس کی بہن کو ڈاکوؤں سے بازیاب کرائے۔ وڈیرہ چند روز تک اسے تسلیاں دیتا رہا پھر اسے گوٹھ سے ہی نکال دیا کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔

مراد رند کو اپنے ماں باپ کے قتل اور بہن کے اغواء کا افسوس تو تھا ہی وڈیرے کے سلوک سے اس کا خون کھول اٹھا جس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کے بجائے اسے باپ کی زمین سے بھی بے دخل کر دیا تھا۔ مراد رند نے اسی روز قسم کھائی تھی کہ وہ ان ڈاکوؤں کو تلاش کر کے ان سے اپنے ماں باپ کے قتل اور بہن کے اغواء کا انتقام تولے گا ہی لیکن وڈیرے کو بھی معاف نہیں کرے گا۔ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک اپنی بربادی کا انتقام نہیں لے لے گا۔

وہ دہر دہر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ کبھی کبھی وڈیرے کی زمینوں پر کام کرنے لگتا اور کبھی کسی شہر کے ہوٹلوں میں برتن دھو کر یا بازار میں مزدوری کرنے لگتا۔ وہ ایک سمجھو جوان نکلا تھا۔ وہ ان ڈاکوؤں کو تو تلاش نہ کر سکا لیکن ایک روز جب اسے یہ پتہ چلا کہ کچے کے جنگلوں میں ڈاکوؤں کے کئی گروہوں نے اپنے اڑے ہتارے ہیں تو وہ سارے کام دھندے چھوڑ کر کچے کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو روز تک جنگلوں میں بھٹکنے کے بعد بالا خروہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ بدروما چھی کا گروہ تھا۔ مراد رند پر پہلے تو پولیس کا ایجنٹ ہونے کا شبہ کیا گیا لیکن جب بدروما چھی کو یقین ہو گیا کہ وہ پولیس کا ایجنٹ نہیں ہے تو چند کڑی آزمائشوں کے بعد مراد رند کو گروہ میں شامل کر لیا گیا۔ مراد رند نے بدروما چھی کو اپنے بچپن کے واقعہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس واقعہ کو تقریباً "بارہ سال ہو چکے تھے۔ ڈاکوؤں کو اس گروہ کا پتہ لگانا تو مشکل تھا جو اس کے ماں باپ کو قتل کر کے اس کی بہن کو اٹھا لے گیا تھا۔ البتہ وہ وڈیرہ ابھی زندہ تھا اور پھر ایک رات بدروما چھی کے گروہ نے وڈیرے کے گوٹھ پر ہلر بول دیا۔ گروہ کے کچھ آدمی تو گوٹھ میں پھیل کر باہو بچانے لگے۔ بدروما چھی نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ گوٹھ کے کسی شخص یا کسی گھر کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ جن آدمیوں نے وڈیرے کی حویلی پر حملہ کیا تھا ان میں مراد رند بھی تھا۔

کسی نے ٹھک ہی کہا ہے کہ ظالم جب ظلم کرتا ہے تو اسے ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ کسی کی آہ و فغاں اس پر اثر نہیں کرتی لیکن جب وہ خود کسی کے شکنجے میں آتا ہے تو وہ قہر قہر کاٹنے لگتا ہے اور اسے خدا اور رسول یاد آنے لگتا ہے۔ یہی حالت اس وڈیرے کی ہوئی تھی۔ وہ مراد رند کو اپنے سامنے دیکھ کر قہر قہر کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنی پگڑی اتار کر مراد رند کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ وہ اپنی تجوری سے بہت کچھ دینے کے علاوہ

اس کی زمین بھی درگزر کرنے کو تیار ہو گیا تھا مگر... مراد رند نے اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا۔  
وڈیرے کی حویلی سے بدروما چھی کو لاکھوں روپے کے زرو جو اہر نقدی اور بہت سی قیمتی چیزیں ہاتھ لگی  
تھیں۔ وہ مراد رند سے بہت خوش تھا۔

مراد رند نے وڈیرے سے تو اپنا انتقام لے لیا تھا لیکن وہ اپنی بہن کو ابھی نہیں بھولا تھا۔ اس نے  
ڈاکوؤں کے مختلف گروہوں کے بارے میں پوچھ گچھ اور اپنی بہن کی تلاش بھی جاری رکھی۔ ڈاکوؤں کے  
بعض گروہ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے ساتھ عورتیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے اس کی بہن بھی ابھی  
تک انہی ڈاکوؤں کے قبضے میں ہو۔

پورے سندھ میں خصوصاً "کچے کے علاقے میں حکومت نے ڈاکوؤں کے خلاف بڑے پیمانے پر  
کارروائی شروع کر دی۔ ڈاکوؤں کے خلاف اس کارروائی میں پولیس کے علاوہ فوجی جوان بھی حصہ لے رہے  
تھے۔ ڈاکوؤں کی تلاش کے سلسلے میں بعض علاقوں میں تو بلی کا پتہ بھی استعمال کئے جا رہے تھے۔  
ڈاکوؤں میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پناہ کی تلاش میں بھاگے پھر رہے تھے۔ بدروما چھی کا گروہ پولیس  
کے گھیرے میں آ گیا۔ پولیس کے ساتھ فوجی جوان بھی تھے۔ بڑا زبردست مقابلہ ہوا۔ بدروما چھی اور گروہ  
کے کئی آدمی مارے گئے۔ مراد رند پولیس کا گھیرا تو ذکر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈاکوؤں کے خلاف پولیس کا یہ آپریشن کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ مراد رند اپنی جان بچانے کے لیے  
پہتا پھرتا رہا تھا۔ بالآخر پولیس کا یہ آپریشن ختم ہو گیا۔ دیہی علاقوں میں رہنے والوں کے لیے حکومت کا یہ  
امان بڑا خوشگوار تھا کہ کچے کے علاقے سے ڈاکوؤں کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا ہے لیکن آپریشن ختم  
ہونے کے ایک ہفتے بعد ڈاکو پھر سرگرم عمل ہو گئے۔

مراد رند کو اپنے گروہ کا ایک آدمی مل گیا۔ کاجھو بھی مراد کی طرح پولیس کا گھیرا تو ذکر فرار ہونے میں  
کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے مراد کو بتایا کہ گروہ کا کوئی بھی آدمی زندہ نہیں بچا تھا۔ وہ تو مراد رند کو بھی مردہ  
سمجھ بیٹھا تھا۔

مراد رند اور کاجھو کو دوسرے گروہوں کے کچھ بچے کھجے آدمی مل گئے جو جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے۔  
مراد رند نے انہیں جمع کر کے ایک گروہ بنالیا۔ وہ خود اس گروہ کا سرغنہ تھا اور کاجھو کو اس کے نائب کی  
ذہنیت حاصل تھی۔

بہت جلد مراد رند کا نام پورے سندھ میں مشہور ہو گیا۔ اس نے پورے سندھ میں تباہی پھیلا رکھی  
تھی۔ وہ کبھی کسی ایک جگہ تک گرنے نہیں بیٹھتا تھا۔ ہمیشہ اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا۔ اس کے گوثہ کا ڈھیرہ اگرچہ  
اس کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ اب اس کے بڑے بیٹے نے باپ کی گجڑی پن لی تھی۔ مراد رند سال میں دو  
مرتبہ اس گوثہ پر حملہ ضرور کرتا۔ اس نے گوثہ کے کسی گھر کو بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا البتہ وڈیرے کی  
حویلی کا صفایا کر دیا جاتا۔

مراد رند نے اپنا گروہ بڑا مختصر رکھا تھا۔ صرف پانچ چھ آدمی تھے۔ اور انہی پانچ چھ آدمیوں نے پورے  
سندھ میں تباہی مچا رکھی تھی۔ مراد رند کے کھاتے میں کتنی قتل اور ذہنیتاں شامل ہو چکی تھیں۔ سب سے پہلے  
ملوث سندھ نے اس کی گرفتاری کے لیے دو لاکھ روپے کا اعلان کیا پھر اس کے سر کی قیمت پانچ لاکھ ہو گئی  
اور اہل گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قیمت میں اضافہ ہوتا گیا۔

تقریباً ایک سال پہلے مراد رند کو پتہ چلا کہ ڈاکوؤں کا جو گروہ اس کی بہن کو اٹھا کر بے گیا تھا وہ میرپور



ماحول اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں سرگرم عمل ہے۔ مراد رند نے اپنا ایک آدمی اس گروہ کے ٹھکانے کا سراغ لگانے کے لیے بھیج دیا۔ جس نے دو مہینے بعد اس گروہ کا پتہ لگالیا۔ وہ گروہ ان دنوں مردواہ کے قریبی جنگل کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھا۔

مراد رند نے ایک روز اچانک ہی جنگل میں اس گروہ کے ٹھکانے کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کے سراغرساں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ اس کی بہن کے علاوہ تین اور عورتیں ڈاکوؤں کے اس گروہ کے قبضے میں ہیں۔ ٹھکانے پر حملہ کے دوران سخت مقابلہ ہوا۔ وہ گروہ بھی آٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ چار عورتیں اس کے علاوہ تھیں۔ اس مقابلے میں صرف ایک آدمی اور دو عورتیں زندہ بچ سکی تھیں۔ مراد رند کی بہن بھی ماری گئی۔ اس نے زندہ بچ جانے والے ڈاکو کو بھی گولی مار کر ہلاک کر دیا اور دونوں عورتوں کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہیں چلی جائیں۔

مراد رند نے اپنے ماں باپ کے قتل اور بہن کے اغواء کا بدلہ لے لیا تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کے اس گروہ کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا تھا جس نے اس کا گھر برباد کیا تھا۔ مراد رند نے کئی سال پہلے جب انتقام کی قسم کھائی تھی تو اس نے یہ بھی عہد کیا تھا کہ انتقام پورا ہونے کے بعد وہ اس پیسے کو چھوڑ دے گا لیکن برسوں کی مسافت کے بعد اب وہ اس راستے پر اتنا آگے نکل چکا تھا کہ اب واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔

وہ چند ہفتے ڈاکوؤں کے اس گروہ کے ٹھکانے پر مقیم رہا جس کا اس نے خاتمہ کیا تھا۔ اسی دوران جروار سے ذرا آگے انیسٹر صوبہ خان سے ڈبھڑ گھٹی۔ صوبہ خان قانون کا محافظ تھا لیکن وہ اس سے بڑا ڈاکو تھا۔ مراد رند اور صوبہ خان میں معاہدہ ہو گیا۔ مراد رند اسے بڑی بڑی رقمیں دیتا اور صوبہ خان اسے اطلاعات فراہم کرنے کے علاوہ تحفظ بھی دے رہا تھا۔

مراد رند نے صوبہ خان پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی فطرت سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ صرف پیسے کی پوجا کرنے والا شخص تھا۔ مراد رند اچھی طرح جانتا تھا کہ صوبہ خان کسی وقت اس کے خلاف بھی کارروائی کر سکتا تھا اسی لیے وہ اس کی طرف سے ہمیشہ محتاط رہتا تھا۔

مراد رند نے کچیلو اور بخش علی لاشاری کے درمیان واقع اس جنگل میں مستقل ڈیرہ بنا لیا۔ یہ علاقہ صوبہ خان کے تھانے کی حدود سے باہر تھا لیکن صوبہ خان تو ہر جگہ دندناتا پھرتا تھا۔

مراد رند کچھ عرصہ سے محسوس کر رہا تھا کہ صوبہ خان کچھ پریشان تھا۔ اس کی پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ مراد رند کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے مگر مراد رند کو اس سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔

مراد رند کے سر کی قیمت اب پینتیس لاکھ روپے تک پہنچ چکی تھی۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ صوبہ خان جیسا شخص اس رقم کے حصول کے لیے اس کے ہاتھوں میں آہنی زیور پہنا سکتا تھا۔ اس کی طرف سے ملنے والے بیانات سے مراد رند کے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ صوبہ خان اسے دھوکے سے تو نہیں بلانا چاہتا۔

صوبہ خان کو یہ تو معلوم تھا کہ مراد رند نے اس جنگل میں کسی جگہ اپنا ٹھکانہ بنا رکھا ہے لیکن اسے ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔ ایک اجنبی کو اس گھنے جنگل میں مراد رند کا ٹھکانہ تلاش کرنے کے لیے کئی روز درکار تھے۔

تقریباً ”چھ روز پہلے مراد رند کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ صوبہ خان کی جیب جنگل میں داخل ہوئی

ہے۔ اس وقت ابھی صبح کی روشنی پھیلتا شروع ہوئی تھی۔ صوبہ خان نے جیپ کھنچے جنگل میں ایک جگہ چھوڑ دی اور پیدل بھی سارا دن جنگل میں بھٹکتا رہا۔ مراد رند کے دو آدمی اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی جنگل کے کنارے پر تھا تاکہ اگر کوئی اور جنگل میں داخل ہو تو اس کا پتہ چلایا جاسکے۔

کھنچے جنگلوں میں رہنے والے ڈاکوؤں نے پیغام رسانی کا بہترین نظام قائم کر رکھا تھا۔ اگر کوئی اجنبی ایک سرے سے جنگل میں داخل ہوتا تو اس کی اطلاع آن کی آن میں میلوں دور جنگل کے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی۔ مراد رند کو بھی صوبہ خان کے جنگل میں داخل ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔

صوبہ خان پورا دن جنگل میں بھٹکتا رہا اور مراد رند کے آدمی اس کی نگرانی کرتے رہے اور بالاخر اسے پکڑ کر مراد رند کے پاس لے آئے۔

”صوبہ خان۔“ مراد رند نے کہا۔ ”اگر تم دوست بن کر آئے ہو تو مراد رند تمہارے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر سکتا ہے اور اگر تم کسی اور نیت سے آئے ہو تو اس جنگل میں تمہاری لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ مراد رند سب کچھ معاف کر سکتا ہے مگر دھوکا دینے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔“

”کوئی دھوکا نہیں مراد رند۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں بڑی امید لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”کسی کو انھواتا ہے، کسی کا گھر جلواتا ہے یا پینتیس لاکھ کی کیش تمہیں یہاں لے آئی ہے؟“ مراد رند نے اسے گھورا۔

”تم جانتے ہو مراد رند کو میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن اب میں ایک ایسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں کہ صرف تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔“ صوبہ خان نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے سارا قصہ سنا دیا۔ مراد رند کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا کر اس نے بہت بڑا رسک لیا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس سے مراد رند کی دوستی صرف اس کی وردی کی وجہ سے تھی۔ دوستی بھی نہیں۔ وہ ایک کاروباری معاہدہ تھا اور اس کی بنیاد بھی صوبہ خان کی وردی ہی تھی۔

”تو یہ بات ہے۔“ مراد رند نے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔ ”ایک سرکاری ڈاکو وردی اتار کر ہمارے ماتھے شامل ہونا چاہتا ہے....؟“

”کچھ بھی کہہ لو مراد رند۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”میں نے ہمیشہ تمہاری مدد کی ہے۔ تمہیں تحفظ دیا ہے۔ اور اب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے تم انکار نہیں کرو گے۔ میں تمہاری تلاش میں صبح سے اس جنگل میں بھٹک رہا تھا۔“

”صوبہ خان!“ مراد رند نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”اگر تم نے ہماری کوئی مدد کی ہے یا تحفظ فراہم کرتے رہے ہو تو اس کا معاوضہ بھی لیتے رہے ہو۔ لیکن... فکر مت کرو۔“ مراد نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مراد رند اتنا بے غیرت نہیں ہے کہ کسی کے احسانوں کو بھلا دے۔ ارے تم تو میرے دوست ہو... بولو کیا چاہتے ہو۔ کاچیلو کے تھانے کو کھنڈر بنا دیا جائے۔ گھونکی کے تھانے کو آگ لگا دی جائے۔ یا ان دونوں صوبیداروں کو اڑا دیا جائے۔“

”نہیں مراد رند۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”کاچیلو میں ایک آدمی ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کا نام دلاور ہے۔ وہ صاف آباد کار بننے والا ہے۔ اس علاقے کا بہت بڑا ڈاکو ہے۔ میری بربادی کی اصل وجہ وہی ہے۔ اسے کسی طرح یہاں لے آؤ۔ اس کے بعد تمہیں کچھ نہیں کرنا ہو گا۔“

”بس اتنی سی بات۔“ مراد رند مسکرایا۔ ”میں تو سمجھا تھا پتہ نہیں تم کیا فرمائش کرو گے۔ میں پتہ کر لیتا ہوں وہ آدمی کون ہے۔“

”اے شہرے نہیں اٹھانا۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”جب وہ اس طرف سے گزرے تو اسے بس سے اتار لیا جائے۔ کاجیلو یا بخش علی لاشاری کی پولیس اس جنگل میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔“ مراد رند نے کہا۔

مراد رند کا ایک آدمی دوسرے دن صبح سویرے ہی جنگل سے نکل کر کاجیلو پہنچ گیا اور پھر اسی روز صوبہ خان کا ایک آدمی بھی جنگل میں آگیا۔ وہ ماکھیلو کا پولیس کانسٹیبل تھا اور صوبہ خان کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسے بھی مراد رند کا ایک آدمی جنگل سے پکڑ کر لایا تھا۔

”مجھے یقین تھا تم ہمیں ملو گے صوبیدار۔“ سپاہی نے صوبہ خان کو دیکھتے ہی کہا۔ ”کراچی سے وائریس پر آج صبح تازہ احکامات آئے ہیں۔ آئی جی صاحب نے آپ کو فوری طور پر معطل کر دیا ہے اور تمام تھانوں کو یہ احکامات دیئے گئے ہیں کہ آپ جہاں بھی نظر آئیں گرفتار کر لیا جائے۔“

”سن لیا تم نے مراد رند۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“

”میں سمجھ گیا ہوں صوبہ خان۔ تم میرے مہمان ہو اور تم جانتے ہو کہ پولیس مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔“ مراد رند نے کہا۔

مراد رند کا آدمی پانچویں دن واپس آیا۔ اس کے پاس بڑی دلچسپ خبریں تھیں۔ ایک اطلاع تو یہ تھی کہ دلاور چنگی محرر عبدالحمید کے گھر پر ٹھہرا ہوا ہے اور کل صبح بس کے ذریعے بخش علی لاشاری کے لیے روانہ ہوگا۔ دوسری دلچسپ خبر یہ تھی کہ کاجیلو کے صوبیدار مجنوں خان نے سیٹھ کھنول کو گرفتار کر کے تین دن تک حوالات میں بند رکھا تھا۔ کھنول کی رہائی کے لئے مجنوں خان نے نہ تو کسی قسم کا دباؤ قبول کیا تھا اور نہ ہی دس لاکھ کی رشوت۔ البتہ بخش علی لاشاری کے تحصیل دار نے اسے بیس ہزار کی ضمانت پر رہا کر دیا تھا۔ یہ خبر صوبہ خان کے لیے واقعی دلچسپ تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ صوبہ خان کا سحر ختم ہو چکا تھا۔ اس کی معطلی اور گرفتاری کے احکامات کاجیلو تھانے میں بھی پہنچ گئے ہوں گے۔ اب یہ جنگل ہی اس کے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔

اس سے اگلے روز دلاور اس کے سامنے موجود تھا اور وہ دلاور کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

”تم بھول رہے ہو صوبہ خان۔“ دلاور نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”جو شخص خود دوسروں کے رحم و کرم پر ہو وہ اپنے کسی دشمن کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے اور شاید تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ میں نے تمہیں سڑک پر اس وقت تنگ کیا تھا جب تمہارے جسم پر وردی تھی اور کم از کم چھ پولیس والے تمہارے ساتھ تھے۔“

”بند کرو یہ بکواس۔“ صوبہ خان نے اس کے منہ پر گھونہ رسید کر دیا۔ دلاور لڑکھڑا گیا۔ ”اب تم میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتے۔ میری بربادی کے ذمے دار تم لوگ ہو۔ پہلے میں تمہیں ختم کروں گا اور اس کے بعد تمہارے اس گردورائے منصور کی باری آئے گی۔“

”تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔“ دلاور نے کہا۔ ”یہ لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہیں۔“ اس نے قریب کھڑے ہوئے مراد رند کی طرف اشارہ کیا۔ ”جب تک تمہارے جسم پر وردی تھی تم

ان کے لیے کار آمد تھے اب تم ان لوگوں کے لیے بے حیثیت ہو چکے ہو۔ یہ لوگ اب تمہارے لیے کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ کسی کا گھر نہیں جلائیں گے۔“

”مراد رند میرا دوست ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی مدد کی ہے۔ یہ مجھے بے سارا نہیں چھوڑے گا۔“ صوبہ خان نے مراد رند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک طرف کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”دوسروں کا سہارا نامرود تلاش کرتے ہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”تم میں مردانگی ہوتی تو ان ڈاکوؤں کے ذریعے مجھے اٹھوانے کی بجائے خود میرا راستہ روکتے اور پھر میں تمہیں بتاتا کہ تم کتنے بہادر ہو۔“

”آج تم اپنی یہ حسرت بھی پوری کر لو۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”مراد رند یا اس کا کوئی آدمی مداخلت نہیں کرے گا۔“

صوبہ خان نے کہتے ہوئے اچانک ہی دلاور پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کا گھونسا دلاور کے جڑے پر لگا۔ دلاور کو یوں لگا جیسے کسی وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ اس نے جڑا سلاتے ہوئے مراد رند کی طرف دیکھا۔ مراد رند کندھے اچکا کر رہ گیا۔ دلاور، صوبہ خان کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس پر دوسرا وار کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ دلاور نے کلائی پر اس کا وارو کا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ناک پر گھونسا رسید کر دیا۔ ضرب زوردار تھی۔ صوبہ خان کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ دلاور نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ایک گھونسا اس کی کھوپڑی پر مار دیا۔ صوبہ خان کا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ دلاور نے اس کے پیٹ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ صوبہ خان دوہرا ہو گیا۔ دلاور کی دوسری ٹھوکر سے وہ الٹ کر جھونپڑے کے دروازے میں جا گرا۔ دلاور نے بھی اس پر چھلانگ لگادی۔ باہر بیٹھے ہوئے مراد رند کے ساتھی راتھلیں اٹھا کر لپکے۔ لیکن مراد رند نے انہیں روک دیا۔

”تم میں سے کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ انہیں دل کے ارمان نکال لینے دو۔“ اس نے کہا۔

مراد رند کے آدمی دور ہی رک گئے۔ دلاور، صوبہ خان کو رگیدتا ہوا جھونپڑے سے باہر لے آیا۔ صوبہ خان اس کے سینے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالاخر اس کا داؤ چل گیا۔ دلاور اس کے اوپر سے فلا بازی لھاتا ہوا پشت کے بل پیچھے جا گرا۔

صوبہ خان نے اٹھ کر دلاور پر چھلانگ لگادی۔ دلاور نے بچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ صوبہ خان نے اس کے سینے پر سوار ہو کر دونوں بچے اس کے زرخے پر جمادیئے۔ دلاور اس کی کلائیاں پکڑ کر پلمہ دیر تک اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر صوبہ خان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ دلاور کا سانس گھٹنے لگا۔ اس نے صوبہ خان کی کلائیاں چھوڑ دیں اور پوری قوت سے صوبہ خان کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ تھپڑ زوردار تھا۔ دلاور کے گلے پر اس کی گرفت ایک لمحہ کو ڈھیلی ہوئی تھی۔ اور دلاور نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ صوبہ خان دائیں طرف الٹ گیا۔ دلاور بڑی لھری سے اٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے صوبہ خان پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔ ہر ٹھوکر پر صوبہ خان ہلکا ہوتا۔

لیکن بالاخر دلاور ایک بار پھر اس کی گرفت میں آگیا۔ صوبہ خان نے اسے پشت سے گرفت میں لے کر اٹھا دیا بازوؤں اس کی گردن پر لپیٹ دیا اور ایک گھٹنا اس کی کمر پر رکھ کر اسے پوری قوت سے پیچھے کی طرف دھکے لگا۔ دلاور کے گلے پر بھی دباؤ پڑ رہا تھا اور ریڑھ کی ہڈی پر بھی۔ جیسے جیسے دباؤ بڑھ رہا تھا اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ وہ بڑی طرح ہاتھ چلا رہا تھا۔ صوبہ خان کے سر کے بال

اس کی مٹھی میں آگئے۔ وہ بالوں کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا لیکن صوبہ خان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دلاور نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور اس کی کھوپڑی کے پچھلے حصے پر ہتھیلی جما کر پوری قوت سے اس کے سر کو آگے کھینچنے لگا۔

دلاور کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ صوبہ خان کا سر آگے جھکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دلاور کی ریڑھ کی ہڈی پر اس کے مٹھنے کا دباؤ کم ہوتا چلا گیا۔ دلاور اب اس پوزیشن میں تھا کہ جوانی کارروائی کر سکے۔ وہ اس کی کھوپڑی کو ہتھیلی سے دباتا ہوا آگے کو جھٹکا چلا گیا۔ اور بالاخر صوبہ خان اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل گر ا۔

دلاور کچھ دیر تک کھڑا اپنا گلا سہلاتا رہا۔ اس دوران صوبہ خان اٹھ گیا مگر دلاور نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر گھونسلوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

مراد رند اور اس کے ساتھی دلچسپ نظروں سے ان کی یہ لڑائی دیکھ رہے تھے۔ کبھی صوبہ خان کا پلہ بھاری ہو جاتا اور کبھی دلاور کا، لیکن مجموعی طور پر دلاور ہی حاوی ہو رہا تھا۔ صوبہ خان کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا جبکہ وہ خود دلاور پر ایسا کوئی کاری وار نہیں کر سکا تھا۔

وہ دونوں باری باری ایک دوسرے پر تابوتوڑ حملے کرتے رہے۔ صوبہ خان کا سانس پھول گیا تھا۔ اس وقت دلاور اس پر گھونسلوں کی بارش کئے ہوئے تھا اور صوبہ خان لڑکھڑاتا ہوا مسلسل پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دلاور نے اس کے پیٹ پر گھونٹ مارا۔ صوبہ خان دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام کر دوہرا ہو گیا۔ دلاور نے اس کے منہ پر زوردار ٹھوکہ ماری۔ صوبہ خان بلبلاتا ہوا پیچھے گر گیا۔ دلاور آگے بڑھتا ہوا چاہتا تھا کہ صوبہ خان نے بڑی پھرتی سے جیب سے ریو الور نکال لیا۔

دست بدست لڑائی میں ریو الور نکالنا گویا صوبہ خان کی شکست کا اعلان تھا۔ لیکن مراد رند کے خیال میں یہ ایک بزدلانہ حرکت تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے جیب سے پستول نکال کر ہوائی فائر کر دیا۔

”نہیں صوبہ خان۔“ مراد رند نے کہا۔ ”ریو الور پھینک دو۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تم لوگوں کی لڑائی میں مداخلت نہیں کروں گا۔ لیکن تم نے اپنی شکست بے چہنے کے لیے ریو الور نکال لیا۔ یہ بزدلی ہے۔“

”یہ بہت خطرناک آدمی ہے مراد رند۔ اس کے زندہ بچ جانے سے تم بھی مصیبت میں پھنس سکتے ہو۔“

صوبہ خان نے کہا۔

”خطرناک نہیں، بہادر کو اس نوجوان کو۔“ مراد رند نے کہا۔ ”تم ریو الور پھینک دو۔“

صوبہ خان نے ادھر ادھر دیکھا۔ مراد رند کے آدمی راتھلیں تانے کھڑے تھے۔ اس نے خاموشی سے ریو الور پھینک دیا۔ دلاور ایک طرف کھڑا اپنے بے ربط شخص پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مراد رند نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر صوبہ خان کو اٹھایا اور اسے کونے والے جھونپڑے میں لے گئے۔

”میرے ساتھ آؤ نوجوان۔“ مراد رند نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم واقعی بہادر آدمی ہو اور مراد رند بہادروں کی قدر کرنا جانتا ہے۔“

وہ دلاور کو لے کر اس بڑے جھونپڑے میں آگیا جہاں ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ فرش پر ہاتھ کا بنا ہوا قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکتے بھی رکھے ہوئے تھے۔ مراد رند اسے لے کر قالین پر بیٹھ گیا۔

”میں تمہاری بہادری کی داد دیتا ہوں۔ صوبہ خان نے بتایا تھا کہ تم صادق آباد کے رہنے والے ہو۔“

ہمارا گروہ کس علاقے میں کام کرتا ہے؟“ مراد رند نے پوچھا۔  
 ”میرا گروہ!“ دلاور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے مراد رند۔“

”مگر صوبہ خان نے تو بتایا تھا کہ تمہارا بھی ہماری طرح گروہ ہے اور تم اس علاقے کے بہت خطرناک اکو ہو۔“ مراد رند نے کہا۔  
 ”جھوٹ بولتا ہے وہ۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ صوبہ خان میری مالکن کو اٹھالایا تھا۔ میں اس کی تلاش میں اس طرف آیا تھا۔“

”تمہاری مالکن!“ مراد رند نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ہاں وہ ضلع رحیم یار خان کی ایک بہت بڑی زمیندار ہے۔“ دلاور نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے نالکہ کے پارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

”نالکہ زخمی تھی۔ اس نے صوبہ خان کے آدمیوں سے بھاگ کر سندھ کے کسی چھوٹے سے گوٹھ میں پناہ لی۔ صوبہ خان کو پتہ چل گیا۔ وہ اسلحہ کے زور پر نالکہ کے ساتھ اس گوٹھ کی ایک لڑکی کو بھی اٹھالایا اور انہیں گھونکنی کے قریب اپنی حویلی میں قید کر دیا مگر وہ کسی طرح صوبہ خان کی پاجیرو لے کر وہاں سے بھاگ نکلیں۔ بخش علی لاشاری کے قریب پاجیرو جل گئی۔ دونوں لڑکیاں کسی طرح ہندو سینٹھ کھنول کے ہاتھ لگ گئیں جس نے انہیں مال غنیمت سمجھ کر اپنے آدمیوں کے ساتھ راجستھان کی طرف بھجوا دیا۔ اس کے آدمی دوسرے روز ریگستان میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لڑکیاں ریگستان میں دھوکے سے ان کی جپ چھین کر فرار ہو گئیں۔ میں انہی کو تلاش کرتا ہوا اس طرف آیا تھا کہ کاجیلو کے تھانے میں صوبہ خان سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے صوبیدار مجنوں خان کو جب بتایا کہ پولیس کے اعلیٰ حکام نے صوبہ خان کی گرفتاری کا حکم جاری کر رکھا ہے تو یہ وہاں سے بھاگ نکلا اور یہاں تمہارے پاس آکر پناہ لی۔ اب یہ اپنے مقاصد کے لیے تمہیں اور تمہارے گروہ کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

”تو اصل قصہ یہ ہے۔“ مراد رند نے کہا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ صوبہ خان ایک بے غیرت آدمی ہے۔ میں ایک ڈاکو ہوں مگر میں نے کسی عورت کی طرف کبھی میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن صوبہ خان نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اچھا نہیں کیا۔ ہم ڈاکو ضرور ہیں لیکن ہمارے بھی کچھ اصول ہیں۔ صوبہ خان میرے پاس پناہ لینے آیا تھا۔ میں اس جیسے بے غیرت اور دھوکے باز آدمی کو پناہ نہیں دے سکتا۔“ اس نے اپنے ایک آدمی کو آواز دے کر بلا یا۔

”جی سائیں۔“ وہ آدمی فوراً ہی جھونپڑے میں گیا۔

”صوبہ خان کو لے کر آؤ۔“ مراد رند نے کہا۔

چند منٹ بعد ہی صوبہ خان اس کے سامنے موجود تھا۔ مراد رند کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر صوبہ خان اور صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

”صوبہ خان۔“ مراد رند نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ دلاور ایک اہلرناک ڈاکو ہے۔ تم جھوٹ بول کر ایک شریف اور بہادر آدمی کو میرے ہاتھ سے مردانا چاہتے تھے۔ تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ سارا چکر ایک عورت کا ہے۔ تم نے ایک نہیں دو معصوم اور بے گناہ عورتوں کی لند کی برباد کی ہے صوبہ خان۔ تم بہت بے غیرت ہو۔ اگر تم نے مجھ پر کچھ احسانات نہ کئے ہوتے تو میں اپنے

ہاتھ سے تمہیں گولی مار دیتا۔ میں اگرچہ تمہارے احسانوں کا بدلہ چکا تا بھی رہا ہوں لیکن.... اتنا کم قزف تو میں بھی نہیں ہوں کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے ختم کر دوں۔ میں تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ تمہیں زندہ چھوڑ دوں... جتنی جلدی ہو سکے تم یہاں سے نکل جاؤ۔ جب تک اس جنگل سے نہیں نکل جاتے میرے آدی اس بات کا خیال رکھیں گے کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے لیکن اس جنگل سے نکلنے کے بعد تمہارے ساتھ جو کچھ ہو گا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی۔

”تم اس کی باتوں میں آگئے نا، مراد رند۔“ صوبہ خان بولا۔

”مراد رند بے وقوف نہیں ہے۔“ مراد رند نے کہا۔ ”میں سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا جانتا ہوں۔ اسے یہاں سے کم از کم سو گز دور چھوڑ آؤ۔“ مراد نے آخری الفاظ اپنے آدی سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

”اور اس کے ساتھی کا کیا کر پس سائیں، اسے بھی نکال دیں؟“ اس آدی نے کہا۔

”نہیں، اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دو۔ وہ ابھی پولیس ملازمت میں ہے۔ اس کے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے۔ اور صوبہ خان! میری ایک بات غور سے سن لو۔ اس جنگل سے نکلنے کے بعد اگر تم نے کوئی حرامزدگی کی تو مراد رند تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

مراد رند کے آدی صوبہ خان کو راتقل کی زد پر لے کر جھوپڑے سے نکل گئے۔

”مجھے معاف کرنا دلاور سائیں!“ مراد رند نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ ”اس خبیث نے مجھے تمہارے بارے میں غلط بتایا تھا اور میں واقعی تمہیں وہی سمجھا تھا جو اس نے بتایا تھا۔ میں نے دیکھ لیا ہے تم ایک بہادر آدی ہو اور میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔ تم میرے مہمان ہو۔ کچھ دن ہمارے ساتھ اس جنگل میں رہو۔ یہاں کی زندگی تمہیں بڑی عجیب لگے گی۔“

”میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا دوست۔“ دلاور نے کہا۔ ”تم نے میری زندگی بچائی ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آتا تو یقیناً وہ شیطان مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ زندگی میں کبھی موقع آیا تو میں تمہارے اس احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن.... میں یہاں رہ نہیں سکتا۔ واپس جا کر رائے صاحب کو صورت حال سے آگاہ کرنا ہے تاکہ نالہ اور سسی کے بارے میں کچھ سوچا جاسکے۔“

”ٹھیک ہے دلاور سائیں، جیسے تمہاری مرضی۔“ مراد رند نے کہا۔ ”روٹی کھاؤ تو میرے آدی تمہیں بخش علی لاشاری تک چھوڑ آئیں گے۔“

”ایک بات پوچھوں... برا تو نہیں مانو گے مراد؟“ دلاور بولا۔

”ضرور پوچھو۔“ مراد رند مسکرایا۔ ”دیے میں جانتا ہوں تم کیا پوچھو گے۔“

”تو پھر خود ہی بتا دو کہ اپنا گھر چھوڑ کر اس جنگل تک کیسے پہنچے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ مراد رند نے گہرا سانس بھرا اور پھر اسے اپنی زندگی کی داستان سنانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر وہ دؤیرہ مجھے میرے باپ کی زمین سے بے دخل کرنے کی بجائے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتا تو شاید میں یہ راستہ اختیار نہ کرتا۔“

”یہ دؤیرے اور زمیندار بڑے ظالم ہوتے ہیں۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میری کہانی بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ میں ایک اسکول ماسٹر کا بیٹا ہوں۔ پانچ جماعت پڑھنے کے بعد میرا دل پڑھنے سے اچاٹ ہو گیا۔ باپ نے مجھے زمیندار کے پاس اس کی زمینوں پر رکھوا دیا۔ زمیندار مجھے اپنا زر خرید غلام سمجھ بیٹھا۔ ایک روز کسی بات پر میں نے زمیندار کے ایک آدی کی پٹائی کر دی۔ زمیندار نے اس کا انتقام اس





آخری مرتبہ شبیردرانی نے جب ماتھیلوفون کیا تو تھانے کے محروم نے اسے یہ چونکا دینے والی اطلاع دی کہ آئی جی سندھ کے حکم سے انپکٹر صوبہ خان کو معطل کر کے اس کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا گیا ہے۔ شبیردرانی کو صوبہ خان کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے معطل کرنے کے بجائے اگر پھانسی پر بھی لٹکا دیا جاتا تو شبیردرانی کو افسوس نہ ہوتا۔ اسے پریشانی تو نالہ کی طرف سے تھی جو صوبہ خان کے قبضے سے بھاگ نکلی تھی۔ نالہ کا اس طرح فرار ہو جانا شبیردرانی کے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔

نالہ، شبیردرانی کے لیے ایک ایسا درد سببی ہوئی تھی جس کا کوئی علاج اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب اسے شبہ ہو رہا تھا کہ نالہ میں کوئی بدروح تو حلول نہیں کر گئی تھی۔ اس کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ کیسی کیسی سازشوں کے جال میں پھیلانے گئے تھے لیکن وہ ہر جال کو توڑتی چلی گئی تھی۔ اس کو قتل کرنے کی کیسی کیسی کوششیں کی گئی تھیں مگر اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ صوبہ خان کے آدمیوں نے صادق آباد کے قریب کار پر حملہ کر کے اسے اغوا کیا تھا تو اسے دو گولیاں لگی تھیں مگر اس کے باوجود وہ ریگستان میں صوبہ خان کے ایک آدمی کو ختم کر کے اور چار کو زخمی کر کے بھاگ نکلی تھی اور نجانے کیسے سندھ کے ایک گوشہ میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں سے وہ دوبارہ صوبہ خان کے ہاتھ لگی مگر پھر بھاگ گئی۔ اس میں یقیناً ”کوئی بدروح حلول کر گئی تھی جو اس کے تمام پھکنڈوں کو ناکام بنا رہی تھی۔“

شبیردرانی کو علم نہیں تھا کہ نالہ اب کہاں تھی۔ اسے صرف ایک اندیشہ تھا کہ وہ کسی طرح پولیس کے کسی ذمہ دار اور اعلیٰ افسر تک نہ پہنچ جائے۔ نالہ کی گاڑی پر حملہ کرنے والے صوبہ خان کے آدمی صادق آباد پولیس کی تحویل میں تھے۔

نالہ کے علاوہ اب پولیس نے بھی شبیردرانی کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ صادق آباد پولیس نے دوبارہ مراد اور اس کے شوہر بخشو کے قتل کی تحقیقات شروع کر دی تھیں۔ صادق آباد کا انپکٹر خلیل ہر دوسرے تیسرے دن مراد اور بخشو کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے آ جاتا تھا اور رحیم یار خان کی پولیس نے بھی اس کا ناٹھ بند کر رکھا تھا۔

موجمدار کی لاش نورپور والے ڈیرے سے ملی تھی۔ نورپور گاؤں کی آدمی سے زیادہ اراضی شبیردرانی کی تھی اور وہ ڈیرہ بھی اسی کی ملکیت تھا جہاں سے موجمدار کی لاش ملی تھی۔

اس روز جب پولیس نے موجمدار کے سلسلے میں شبیردرانی سے رابطہ قائم کیا تھا تو وہ زخمی تھا۔ پولیس کے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ گزشتہ رات اسے رہزموں نے گھیر لیا تھا جس سے مقابلے کے دوران وہ زخمی ہو گیا تھا۔ اور اب پولیس اسے موجمدار کے سلسلے میں پریشان کر رہی تھی۔ پولیس موجمدار کے قاتل کی تلاش میں تھی موجمدار کا وہ پستول بھی پولیس کی تحویل میں تھا اور شبیردرانی کے زخم سے برآمد ہونے والی گولی بھی۔ لیکن شاید ابھی تک پولیس کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس پستول اور گولی کا تجزیہ کیا جائے۔ شبیردرانی کو یقین تھا کہ جس روز پولیس کو یہ خیال آگیا اور یہ راز فاش ہو گیا کہ اس کے زخم سے نکالی جانے والی گولی اسی پستول سے چلائی گئی تھی، وہ شبیردرانی کی آزادی کا آخری دن ہو گا۔

حسین بیگم نے اسے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ وہ اسے بار بار مجبور کر رہی تھی کہ نالہ کو بھول کر کچھ عرصہ کے لیے ملک سے باہر چلا جائے۔ جب یہاں کے حالات بہتر ہو جائیں گے تو وہ اسے واپس بلا لے گی۔ لیکن شبیردرانی ماں کے اس مشورے پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بھاگ کر بزدل نہیں کھانا چاہتا تھا۔ بیس پر رہ کر حالات کا مقابلہ کر کے نالہ کی اراضی اور جائیداد پر قابض ہونا چاہتا تھا۔

موجہدار کے بعد اب کرم داد اس کا دست راست بنا ہوا تھا۔ ایک روز کرم داد نے دوپہر کو اسے سوتے میں سے جگا دیا۔

”کیا بات ہے۔ تم صادق آباد سے کب آئے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔ اس نے کل شام کرم داد کو کسی کام سے صادق آباد بھیجا تھا۔

”ابھی آیا ہوں۔ آپ نے جس کام سے بھیجا تھا وہ تو نہیں ہو سکا لیکن آپ کے لیے ایک اور اہم اطلاع ہے سرکار۔“ کرم داد نے بتایا۔

”وہ کیا؟“ شبیر درانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹائلنگ بی بی کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔“ کرم داد نے کہا۔

”کیا؟“ شبیر درانی اچھل بڑا۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا؟ کس نے بتایا تمہیں؟“

”صادق آباد میں حوالدار محمد شیر سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے۔“ کرم داد بولا۔

”ٹائلنگ کہاں ہے؟“ شبیر نے پوچھا۔ ”تفصیل سے بتاؤ۔“ شبیر درانی بولا۔

”حوالدار محمد شیر کے کہنے کے مطابق چند روز پہلے انسپکٹر خلیل نے رائے منصور کو بلا کر بتایا تھا کہ ٹائلنگ، صوبہ خان کی جو پاجیرو لے کر اس کی حویلی سے فرار ہوئی تھی وہ پاجیرو سندھ میں بخش علی لاشاری نامی قصبے کے قریب سڑک پر جلی ہوئی ملی تھی۔ اس نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ ٹائلنگ اور اس کے ساتھ حویلی سے فرار ہونے والی دوسری لڑکی اسی قصبے یا آس پاس کے کسی گھٹھ میں موجود ہیں۔ رائے منصور نے اسی روز دلاور کو سندھ بھیج دیا تھا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ کرم داد نے جواب دیا۔

”اور ٹائلنگ کہاں ہے؟“ شبیر درانی چنچا۔

”اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ کسی ہندو سیٹھ کے ہتھے چڑھ گئی تھی جس نے ٹائلنگ اور دوسری لڑکی کو دھوکے سے راجستھان کی طرف بھیج دیا۔ لیکن ٹائلنگ اس ہندو سیٹھ کے آدمیوں کو بھی دھوکا دے کر ریگستان میں بھاگ گئی۔ کئی روز گزرنے کے بعد بھی اس کا پتہ نہیں چلا۔ ٹائلنگ اور دوسری لڑکی کے بارے میں تصور کر لیا گیا ہے کہ وہ دونوں ریگستان میں بھٹک کر مر چکی ہیں۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو لیکن... محض تصورات قائم کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ اس ہندو سیٹھ کا کیا نام ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”یہ تو معلوم نہیں ہو سکا سرکار لیکن آپ جیٹھانند کو فون کر کے معلوم کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ ماتھیلو میں ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہوگا۔“ کرم داد نے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ... میں معلوم کر لیتا ہوں۔“ شبیر درانی نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

کرم داد کے جانے کے بعد شبیر درانی اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ماتھیلو میں سیٹھ جیٹھانند کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

اناج کے ٹرک پکڑے جانے کے بعد سے سیٹھ جیٹھانند اس سے ناراض تھا۔ وہ ناراض ہونے کے معاملے میں حق بجانب تھا۔ اس کی وجہ سے جیٹھانند کو کئی لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑا تھا اور زلت و رسوائی جو ہوئی تھی وہ الگ۔ شبیر درانی کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شرمندگی اور ندامت کے باعث اس سے بات نہ کرتا لیکن اپنی کسی غلطی پر شرمندہ ہونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

لائن مل گئی لیکن ریسیور پر انجیج ٹون آرہی تھی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور ایک دو منٹ بعد دوبارہ

ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس مرتبہ پہلی گھنٹی پر ہی دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔  
 ”سیٹھ جیٹھانند سے بات ہو سکتی ہے؟“ شیردرانی نے ہیلو کی آواز سنتے ہی کہا۔  
 ”بول رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”میں شیردرانی بول رہا ہوں جیٹھانند، کیا حال ہے؟“ شیردرانی بولا۔  
 ”میرے کو بریاد کر کے پوچھتا ہے کہ کیا حال ہے۔ کاہے کو پوچھتا ہے بھائی۔ سیٹھ جیٹھانند کا لٹیا تو تم نے ڈوبو یا نا۔“ سیٹھ جیٹھانند نے کہا۔ اس کی باتوں اور لہجے سے لگتا تھا کہ وہ اس سے سخت ناراض ہے۔  
 ”تم ابھی تک ناراض ہو سیٹھ۔“ شیردرانی بولا۔ ”ارے کاروبار میں ایسی چھوٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس لونڈیا کی وجہ سے ہوا تھا، ورنہ تم جانتے ہو کہ میں کتنی سال سے تمہارے ساتھ کاروبار کر رہا ہوں۔ کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔“  
 ”کون سی لونڈیا کا بات کرتا ہے بھائی؟“ سیٹھ جیٹھانند بولا۔  
 ”ارے دی میری کزن، نالکہ درانی۔“

”رام رام... رام رام...“ سیٹھ جیٹھانند کی آواز سنائی دی۔ ”وہ تو بہت خطرناک چھوکر ہے۔ ادھر میرے کو اندر کرا دیا۔ ادھر میری ہی برادری کے ایک اور سیٹھ کھٹول کو اندر کرا دیا۔ صوبہ خان جیسا جلا د پولیس افسر کا چھٹی کرا دیا۔ وہ بیچارہ گرفتاری کے خوف سے چھپتا پھرتا ہے۔ مگر تم اس چھوکر کی کابات کائے کو کرتا ہے۔ کیا ہمارے کو پھر اندر کرانے کو ہے کیا؟“  
 ”اس چھوکر کے بارے ہی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں سیٹھ۔“ شیردرانی بولا۔  
 ”ارے تو کیا وہ چھوکر میری بغل میں بیٹھا ہے؟ ہمارے نقصان کابات نہیں کرتا چھوکر کی کابات کرتا ہے۔“

”میں تمہارا نقصان بھی پورا کر دوں گا سیٹھ، مجھے ذرا...“  
 ”سچ بولتا ہے کیا؟“ سیٹھ نے اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”مجھے ذرا ان الجھنوں سے نکل آنے دو۔ تمہارے سارے گلے شکوے دور کر دوں گا۔“

”اپنا بات بکلی یاد رکھنا۔“ سیٹھ نے کہا۔ ”بولو“ اس چھوکر کے بارے میں کیا پوچھتا ہے؟“  
 ”کیا تم اس کے بارے میں پتا کتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟“ شیردرانی بولا۔  
 ”وہ چھوکر ہے یا آفت۔“ سیٹھ بولا۔ ”اس کو سیٹھ کھٹول نے راجستھان بھجوا دیا مگر وہ راستے میں بھاگ گیا۔ ریگستان میں غائب ہو گیا۔ تم نے تھر کار ریگستان نہیں دیکھا۔ یہ تو انسانوں کو نگل لیتا ہے اور ڈکار بھی نہیں لیتا۔ اس چھوکر کو بھول جاؤ بابا... وہ ریگستان میں مر چکا ہو گا۔“  
 ”تم کو یقین ہے کہ وہ مر گئی ہوگی؟“ شیردرانی نے کہا۔  
 ”ارے بابا ریگستان میں راستہ بھٹکنے کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا امید دل سے نکال دو اور اب ہمارا نقصان کابات کر دو کب اور کیسے پورا کرو گے؟“ سیٹھ نے کہا۔

شیردرانی نے جواب دینے کی بجائے ریسیور رکھ دیا۔ اب وہ سیٹھ جیٹھانند کی مزید بکواس نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اگر نالکہ واقعی تھر کے صحرائیں بھٹک کر موت کا شکار ہو گئی تھی تو اس کی ساری مشکلیں حل ہو جانے والی تھیں۔ نالکہ کی کمرڈوں کی جائیداد اس کے قبضے میں

آنے والی تھی۔ جہاں تک پولیس کے معاملات کا سوال تھا تو وہ کسی نہ کسی طرح اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر سکتا تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ ہر انسان کی کوئی نہ کوئی قیمت تو ضرور ہوتی ہے۔ آج جو پولیس آفیسر فرض شناسی پر تلے ہوئے تھے اور لاکھ دو لاکھ میں بکنے کو تیار نہیں تھے کل کو وہ دو گنی قیمت پر اس کے سامنے جھک سکتے تھے۔

لیکن... سب سے پہلے یہ تصدیق کر لینا ضروری تھا کہ نالکہ واقعی مرجی ہے یا نہیں؟ اور اس کے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ خود اس علاقے میں جا کر معلومات حاصل کرے لیکن اس کے خیال میں اتنی دور جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہاں جا کر بھی لوگوں سے یہی سننے کو ملتا کہ وہ چھو کری مرھپ گئی ہوگی۔ وہ ”ہوگی“ پر تکیہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو یقین کرنا چاہتا تھا کہ نالکہ واقعی مرجی ہے۔ کوئی ایسی معتبر شہادت جسے قانون بھی تسلیم کر لے۔

دفعہ ۱۱۱ اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ بہت ہی انوکھا خیال تھا۔ ذرا سی محنت کی ضرورت تھی اور کوئی نہ کوئی ایسی معتبر شہادت مل سکتی تھی کہ نالکہ واقعی مرجی ہے اور اب اس دنیا میں اس کا وجود نہیں رہا... پولیس... ہاں... اس علاقے کے تھانے کا انچارج اگر تحریری طور پر نالکہ کی موت کی تصدیق کر دے تو مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ علاقے کی کسی معتبر شخصیت سے بھی اس قسم کا بیان حاصل کیا جاسکتا تھا لیکن پولیس آفیسر کا بیان زیادہ معتبر ثابت ہو سکتا ہے اور چھوٹے علاقے کے کسی پولیس آفیسر کو خریدنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

ایک حتمی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد وہ بید روم میں آکر لباس تبدیل کرنے لگا۔ اس کے خیال میں حسینہ بیگم کو اس تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا ممکن ہے وہ کوئی اور مفید مشورہ بھی دے سکے۔ تقریباً ”ایک گھنٹے بعد وہ اپنی گاڑی میں سوار گل مرگ کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ حویلی پہنچا تو اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے اور حسینہ بیگم حویلی کے صحن میں کرسی پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ شیر بھی اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور پاس ہی زمین پر بیٹھی ہوئی ملازمہ کو چائے لانے کو کہا۔

”تم کل شام ہی کو تو یہاں سے گئے تھے۔ شہر میں دل نہیں لگ رہا یا کوئی اور خاص بات؟“ حسینہ بیگم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں“ ایک بہت ہی خاص بات ہے ماں جی۔“ شیر درانی نے کہا۔

”ایک بات سن لو۔“ حسینہ بیگم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اب کوئی ایسی بات مت کرنا جو ہمارے لیے مزید الجھنوں کا باعث بنے۔ نالکہ پر اب لعنت بھیج دو۔ اس کی جائیداد کا خیال ذہن سے نکال دو۔ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے اسی پر اکتفا کرو۔ تمہارے بڑے ماموں بھی اب یہی کہہ رہے ہیں کہ معاملہ ختم ہو رہا ہے تو ہونے دو۔ وہ دو تین دن بعد راولپنڈی جا رہے ہیں۔ وہ اسلام آباد میں کسی سے مل کر کوشش کریں گے کہ تمہارے خلاف یہ پولیس انکوائری بھی ختم ہو جائے۔“

”اماں جی۔“ شیر درانی بولا۔ ”کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ اتنی ذلت و رسوائی اٹھانے کے بعد ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں۔“

”لعنت بھیجو۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔ ”میں تو تمہیں پھر بھی مشورہ دوں گی کہ چند روز کے لیے ملک سے

باہر چلے جاؤ۔“

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ بہت ہار گئی ہیں۔“ شیر درانی نے کہا پھر ملازمہ کو چائے لاتے دیکھ کر

خاموش ہو گیا۔ ملازمہ چائے میز پر رکھ کر چلی گئی تو وہ بولا۔

”لیکن ماں جی! میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں تو آپ سے مشورہ کرنے آیا تھا۔“

”کیسا مشورہ؟“ حینہ بیگم نے اسے گھورا۔

”نانکھ کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ وہ قمر کے صحرا میں لاپتہ ہو گئی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ ریگستان میں کہیں مرکھپ گئی ہوگی۔“ شبیر درانی نے کہا۔ اور پھر اسے وہ تفصیل بتانے لگا جو اسے کرم داد اور سیٹھ جیٹھانند سے معلوم ہوئی تھی۔

”اگر وہ کہیں مرکھپ گئی ہے تو بہت اچھا ہوا ہے۔ ہمارا پیچھا تو چھوٹ گیا اس چڑیل سے۔“ حینہ بیگم نے ننگ کر کہا۔

”لیکن میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔“ شبیر درانی بولا۔

”کیسا منصوبہ؟“ حینہ بیگم نے اسے گھورا۔

”اگر ہم اس علاقے کے تھانیدار سے یہ تصدیق نامہ حاصل کر لیں کہ نانکھ درانی واقعی مرچکی ہے تو پھر ہم قانونی طور پر اس کی جائیداد کے مالک بن سکتے ہیں۔“ شبیر درانی نے کہا اور پھر اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

”کیا تمہارے خیال میں کوئی پولیس آفسر اس قسم کا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہے؟“ حینہ بیگم نے اس کا منصوبہ سننے کے بعد کہا۔ وہ ایک بار پھر لالچ میں آگئی تھی۔

”بیٹے میں بڑی کشش ہوتی ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”چھوٹے علاقے کے کسی پولیس آفسر کو اگر تیس چالیس ہزار کی رقم تھادی جائے تو وہ کسی زندہ انسان کو بھی قتل کر کے اس قسم کا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہے۔“

”سوچ لو... کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر الٹی آنتیں گلے کو آجائیں۔“ حینہ بیگم بولی۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔ میں کل ہی سندھ کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”اور وہ صوبہ خان... اس کا کیا ہوگا؟“ حینہ بیگم بولی۔

”اب وہ ہمارے لیے بیکار ہے۔ وہ خود اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے۔ ہمارے کس کام آئے

گا۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”وہ احسان فراموش آدمی ہے۔ اس جیسے شخص کا یہی انجام ہونا چاہئے۔“

وہ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ حینہ بیگم کے بڑے بھائی عبدالرحمن درانی حویلی میں داخل ہوئے۔

”ان کے سامنے کوئی بات مت کرنا۔“ حینہ بیگم نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے ہر گوشی کی۔

”آپ مطمئن رہئے۔ انہیں ہمارے منصوبے کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

عبدالرحمن درانی ٹٹلنے والے انداز میں چلتے ہوئے آ رہے تھے ان کے دائیں ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔

”اچھا ہوا تم آگئے۔“ وہ قریب پہنچ کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”صبح پڑاری آنے والا ہے۔

اس کے ساتھ زمینوں پر چلے جانا۔“

”کیوں؟ پڑاری یہاں کیوں آ رہا ہے؟“ شبیر درانی نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ارے بھی مر غلام رسول سے جو زمین کی حد بندی کا بھڑا چل رہا تھا اس کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ تحصیل

دار محبت علی اگر اس معاملے میں ذاتی دلچسپی نہ لیتا تو شاید یہ معاملہ طے نہ ہوتا۔ فیصلہ پر سوں رات اس کے گھر پر ہی ہوا تھا۔ کل پنزاری آئے گا تو یہ قصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔“

”مہر غلام رسول سے کیا جھگڑا چل رہا تھا؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”ارے بھئی وہ ٹوب وبل والی زمین کا جھگڑا تھا۔ ہماری زمین کا تقریباً ”آدھا کھیت کوٹا اس کی زمین میں تھا اور اس کی زمین کا ایک کوٹا ہماری طرف نکلا ہوا ہے وہ ہماری زمین میں شامل کر دیا جائے اور ہماری زمین کا جو کوٹا اس کی طرف نکلا ہوا ہے وہ اس کی زمین میں شامل کر دیا جائے۔ اس طرح یہ قصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔“ عبدالرحمن درانی نے کہا۔ اس گفتگو کے دوران بھی ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے دانے گر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ میں کل پنزاری سے مل لوں گا۔ لیکن آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”نہیں بھئی... میرے گھنٹوں میں تکلیف کچھ بڑھ گئی ہے۔ چلنے میں کچھ دشواری پیش آنے لگی ہے۔ پنزاری کے ساتھ کھیتوں میں جانا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔ اچھا ہی ہوا تم آگئے۔“ عبدالرحمن درانی نے جواب دیا۔

حسینہ بیگم نے ملازمہ کو بلا کر بھائی کے لیے چائے منگوائی اور پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ نالکہ کا کوئی تذکرہ نہ تو عبدالرحمن درانی نے کیا تھا اور نہ ان ماں بیٹے میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا تھا۔

گاؤں کی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی تو عبدالرحمن درانی اٹھ گئے۔

”اچھا بھئی... میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں... رات کو تم دونوں میرے ہاں آ جانا۔ کھانا وہیں کھا لینا۔“

”جی بہتر بھائی صاحب۔“ حسینہ بیگم نے کہا۔

عبدالرحمن درانی کے جانے کے بعد وہ دونوں ماں بیٹا ایک بار پھر نالکہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

”ماں جی۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اگر اس مرتبہ رائے منصور نے کسی قسم کی مداخلت کرنے کی کوشش کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”نالکہ کے مرنے کا ثبوت مل جائے تو ہم قانونی طور پر اس کی جائیداد کے وارث ہوں گے۔ رائے منصور یا کسی اور کو اس معاملے میں مداخلت کا حق نہیں پہنچتا۔ نالکہ بھی تو وہ اس کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ جب نالکہ ہی نہ رہی تو وہ کیا کریں گے۔“ حسینہ بیگم نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد حسینہ بیگم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شبیر درانی وہیں بیٹھا رہا لیکن جب پھر کائنات لگے تو وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

رات ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ دونوں اپنی حویلی سے نکل کر عبدالرحمن درانی والی حویلی میں آگئے۔ نوبے انہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔

”آپ راولپنڈی کب جا رہے ہیں ماموں؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”تین چار دن تک جانے کا ارادہ ہے۔ اگر کام ضروری نہ ہو تا تو میں ٹال جاتا۔“ عبدالرحمن درانی نے جواب دیا۔

شبیر درانی نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ راولپنڈی کس کام کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

جب وہ اپنی حویلی میں آئے تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ بستی پر سناٹا طاری تھا۔ گاؤں لوگ جلد ہی سو جانے کے عادی تھے کیونکہ صبح انہیں جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ شیردرانی اپنے کمرے میں بیٹھا کہ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ کتے حویلی کے گیٹ کے بالکل سامنے ہی بھونک رہے تھے اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آنے والا کوئی اجنبی ہے۔ بستی کے کتے یہاں رہنے والے ہر شخص کو بچھاڑتے تھے۔ اگر آنے والا بستی کا کوئی آدمی ہوتا تو کتے اس طرح نہ بھونکتے لیکن اس وقت کون اجنبی آسکتا تھا؟ شیردرانی کمرے سے نکل کر صحن میں آگیا اور پھر پنے تلے قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اب اور بھی زور و شور سے بھونک رہے تھے اور آواز گیٹ کے بالکل سامنے سے آ رہی تھی۔ شیردرانی نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا اور باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دائیں طرف لمبے قد کا ایک آدمی گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ کتے بھونکتے ہوئے اس پر لپک رہے تھے اور وہ شخص بار بار جھک کر زمین سے پتھر اٹھاتا اور کتوں کو اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”کون ہے؟“ شیردرانی نے چند قدم آگے بڑھ کر اونچی آواز میں پوچھا۔ ”میں ہوں بھئی، صوبہ خان... ایک تو یہ تمہارے گاؤں کے کتے بڑے خطرناک ہیں۔ آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے۔“

شیردرانی صوبہ خان کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر صوبہ خان کے قریب پہنچ گیا اور کتوں کو ہشکار کر دور بھگا دیا۔

”صوبہ خان تم!“ شیردرانی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”تم اس وقت کیسے...؟“

”میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں شیردرانی۔“ صوبہ خان نے جواب دیا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

حویلی کے گیٹ پر چلنے والے بلب کی روشنی میں صوبہ خان کی حالت نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر پینٹ کوٹ تھا۔ سفید شرٹ تھی۔ پتلون اور کوٹ بری طرح مسلا ہوا تھا اور شرٹ بھی میلی تھی۔ بال بکھرے ہوئے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ جوتے بھی گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ شیردرانی کو اس کا یہ حلیہ دیکھ کر یقیناً حیرت ہوئی تھی۔ حالانکہ صوبہ خان وہ شخص تھا جس نے کبھی اپنے لباس پر سلوٹ نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ صبح شام لباس تبدیل کرنے کا عادی تھا لیکن اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے یہ لباس کئی روز سے اس کے جسم سے الگ نہ ہوا ہو۔

”یہاں تک کیسے آئے؟ تمہیں کسی نے آتے ہوئے دیکھا تو نہیں صوبہ خان؟“ شیردرانی نے پوچھا۔ اس کا لہجہ دھیما تھا اور وہ بار بار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔“ صوبہ خان نے جواب دیا۔ ”سنی والا پل سے ایک ٹریکٹر زالی مل گئی تھی۔ وہ کوئی کاشتکار تھا جو ٹرائی پر یوریا کی بوریاں لاد کر لا رہا تھا۔ اس سے مجھے لفٹ مل گئی۔ میں سڑک پر ہی اتر گیا تھا۔“

”تم نے اسے بتایا تو نہیں کہ کس سے ملنے آئے ہو؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”میں نے تمہارا نام نہیں لیا۔“ صوبہ خان نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے بتایا تھا کہ اس گاؤں میں میری بہن رہتی ہے اس سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”یہ تو واقعی تم نے عقلمندی سے کام لیا ہے صوبہ خان لیکن...“

”لیکن کیا...؟ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے درانی“ میں اس وقت بہت بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ ”صوبہ خان نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔ سب جانتا ہوں لیکن... تمہیں اس گاؤں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ شام ہی کو پولیس ہماری تلاش میں یہاں آئی تھی۔ یہاں کے سب ہی پولیس والے جانتے ہیں کہ ہمارے گھرانے سے تمہارا تعلق ہے۔ اس لیے پولیس والے یہ پوچھنے آئے تھے کہ تم یہاں آئے تو نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پولیس شہر ہے کہ تم یہاں آسکتے ہو۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”کیا کتنا چاہتے ہو درانی؟“ صوبہ خان نے اسے گھورا۔ ”میں تم لوگوں کی وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا ہوں اور تم بھی اس آڑے وقت میں...“

”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں صوبہ خان۔“ شبیر درانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے تمہیں پناہ دینے سے انکار نہیں کیا۔ لیکن تمہیں اس گاؤں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ مجھے سوچنے دو۔“ وہ چند لمحوں کے لیے رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ باپس ہونے کی ضرورت نہیں، ایک ایسی جگہ ہے جہاں تمہیں کچھ عرصہ کے لیے رکھا جاسکتا ہے۔ ایک منٹ... یہیں روکو... میں کوٹ پس کر آتا ہوں۔“

شبیر درانی حویلی کے اندر آگیا اور دے قدموں چلتا ہوا اپنے کمرے میں ٹھس گیا۔ اس نے کرسی کی پشت پر بڑا ہوا کوٹ اٹھا کر پھرتا پھرتا کھول کر اس کے نچلے خانے سے پستول نکالا۔ اس کا میگزین نکال کر ہلک کیا۔ پستول کو احتیاط سے کوٹ کی جیب میں رکھا اور کمرے سے نکل کر بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ دے قدموں چلتا ہوا حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اندیشہ تھا کہ قدموں کی آواز سن کر میپز بیکم اپنے کمرے سے باہر نہ آجائے۔ حویلی سے باہر نکل کر اس نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا اور صوبہ خان کے قریب آگیا جو دیوار سے لگا لڑا تھا۔

”چلو...“ شبیر درانی بولا۔

صوبہ خان کوئی سوال کئے بغیر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ دونوں بہتی سے نکل کر کھیتوں میں آگئے۔ رات اندھیری تھی۔ وہ کھیتوں کے چچ میں ایک تنگ سی پگنڈی پر چلتے رہے۔ شبیر درانی کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اگرچہ اس وقت فوری طور پر صوبہ خان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک ٹیپے پر پہنچ گئے۔ اس ٹیپے پر ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ اور دن کے درختوں کا بہت بڑا جھنڈا تھا۔ اس ٹیپے کے دوسری طرف ایک کنواں تھا جس پر اب بھی رہٹ لگا ہوا تھا لیکن رہٹ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ جب کہ دوسری طرف والے کنویں پر ٹیوب ویل لگا تھا۔ یہ کنواں استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ دن کے وقت یہاں مویشی باندھے جاتے تھے۔ یہاں تک بجلی کی لائن بھی موجود تھی لیکن اس کوٹھری میں صرف ایک بلب کے علاوہ یہاں بجلی کا اور کوئی استعمال نہیں تھا۔ فصل پکنے کے دنوں میں یہاں رات کو بھی ایک آدمی رہا کرتا تھا۔

کوٹھری کو تالا لگا ہوا تھا۔ شبیر درانی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک اینٹ اٹھالی اور تالے پر ضربیں لگانے لگا۔ چوتھی ضرب پر تالا ٹوٹ کر لٹک گیا۔ شبیر درانی نے تالا نکال کر ایک طرف پیٹھک دیا اور کندھ ہاتھ دروازہ کھولتے ہوئے اندر آگیا۔ اس نے دیوار ٹٹول کر سوچ آن کیا۔ چٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ



کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

یہ کوٹھری خاصی بڑی تھی۔ اس کے ایک حصے میں بجوسے کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف بان کی ایک جھلنگ سی چارپائی پڑی تھی۔ بان جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ پائلٹی کی رسی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ چارپائی کے قریب ہی تین چار اور رسیاں پڑی تھیں۔ دن کے وقت ان رسیوں سے موٹی بانڈے جاتے تھے۔ کوٹھری میں گوبر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

”تم اپنی آخری منزل پر پہنچ گئے ہو صوبہ خان، اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں تمہیں تمام مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔“ شیردرانی نے کہا۔

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو درانی؟“ صوبہ خان نے اسے گھورا۔

”مطلب یہ کہ میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تمہاری مصیبتیں اپنے گلے میں ڈال لوں۔“ شیردرانی نے کہتے ہوئے جیب سے پستول نکال لیا۔

”یہ... یہ کیا؟“ صوبہ خان ہلکایا۔ پستول دیکھ کر اس کا چہرہ کچھ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ ”تت... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”ہر چیز کا ایک منطقی انجام ہوتا ہے صوبہ خان۔“ شیردرانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”آج تمہارے انجام کا وقت بھی آن پہنچا ہے۔“

”تم میرے احسانات کا یہ بدلہ دے رہے ہو درانی۔“ صوبہ خان بولا۔ ”میں نے تمہارے خاندان کی خدمت کی ہے۔ تم لوگوں کی خاطر اپنے ہاتھ خون سے رنگے ہیں۔ اس وقت مجھ پر جو مصیبتیں نازل ہوئی ہیں وہ بھی تمہاری وجہ سے ہیں۔ میری نوکری ختم ہو گئی۔ میری گرفتاری کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ اگر میں تمہارے اور حسینہ بیگم کے کہنے پر نالکے کے چکر میں نہ پڑتا تو آج میں اس حالت کو نہ پہنچتا۔ آج ہر شخص نے مجھ سے منہ موڑ لیا ہے۔ سندھ کے وہ وزیرے جو میرے رحم و کرم پر ہوا کرتے تھے آج انہوں نے بھی مجھے دھککا دیا ہے اور تم... تم بھی...“

”میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں صوبہ خان۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”میں تمہیں ایسی جگہ پہنچانے والا ہوں جہاں تم ہر خطرے سے بچے رہو گے۔ سندھ تو کیا پورے پاکستان کی پولیس بھی تمہیں تلاش نہیں کر سکتی۔“

”مجھ پر رحم کرو درانی۔“ صوبہ خان ہلکایا۔ ”میں نے تمہاری وجہ سے نالکے کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔ یہ سوچو کہ اگر میں کامیاب ہو جاتا تو تمہیں کتنا فائدہ ہوتا۔ تم اس کی کروڑوں کی جائیداد کے وارث بن جاتے۔“

”نالکے کی جائیداد کا وارث تو میں اب بھی بنوں گا۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”اور یہ بات بھی ذہن سے نکال دو کہ تم نے ہماری وجہ سے بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں اور ہمارے کہنے پر نالکے کی زندگی کو جہنم بنایا ہے۔ تم نہایت گھٹیا، کم ذات اور لالچی انسان ہو۔ تم نے جو کچھ بھی لیا دولت کے لالچ میں کیا۔ نالکے کے لیے تم نے پانچ لاکھ روپے طلب کئے تھے۔ اگر تمہیں ہمارے احسانات کا خیال ہوتا تو کسی کام کا معاوضہ طلب نہ کرتے اور پھر سندھ میں تم جو کچھ کرتے رہے ہو وہ ہمارے کہنے پر تو نہیں کیا۔ یہ سب تمہاری ہوس کا نتیجہ ہے اور اس کا انجام یہی ہونا چاہیے۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ صوبہ خان...!“

”سندو درانی! میں اب بھی تمہارے کام آسکتا ہوں۔“ صوبہ خان نے کہا۔ ”دلاور سندھ میں خطرناک

اکوؤں کے ایک کردہ سے مل گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے خطرہ بن سکتا ہے اور میں اس کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

”مجھے اب کسی کی مدد کی ضرورت....“

شیردرانی جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ صوبہ خان نے اچانک ہی اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کا ہاتھ شیردرانی کے پستول والے ہاتھ پر پڑا تھا۔ شیردرانی نے ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ گولی صوبہ خان کے بائیں بازو میں لگی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے شیر کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔

دونوں میں پستول کے لیے کشمکش ہونے لگی۔ صوبہ خان نے اس کے پیٹ پر کھنسنے سے ٹھوکر ماری۔ پستول کا ٹرائیگر ایک بار پھر دب گیا۔ اس مرتبہ گولی شیردرانی کے کان کے قریب سے نکل گئی۔ اس نے صوبہ خان کا ہاتھ مروڑنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلتا چاہا۔ صوبہ خان نے اس کی کہنی پر زوردار ٹھوکر ماری۔ پستول شیردرانی کے ہاتھ سے نکل کر چارپائی کے دوسری طرف جاگرا۔

اب وہ دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شیردرانی نے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر ماری۔ ہڈی پر لگنے والی ٹھوکر خاصی زوردار تھی۔ صوبہ خان بلبلاتا تھا۔ وہ ایک ٹانگ پر اچھل رہا تھا۔ شیردرانی نے اسے سنبھلنے کا موقع دینے بغیر اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

”نمک حرام!“ شیر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

صوبہ خان ایک گھونسہ کھاکر لڑکھڑاتا ہوا بھوسے کے ڈھیر پر گرا۔ اس نے صوبہ خان پر چھلانگ لگا دی مگر صوبہ خان بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ شیردرانی منہ کے بل بھوسے کے ڈھیر پر گرا۔ دوسرے ہی لمحہ صوبہ خان نے اسے چھاپ لیا۔ وہ اپنا زخمی بازو اس کی گردن پر لپیٹ کر دوسرے ہاتھ سے ہال منھی میں جکڑ کر زور زور سے جھٹکنے دینے لگا۔

شیردرانی کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ وہ جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے اپنے آپ کو صوبہ خان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا اور بالا خروہ اسے اپنے اوپر سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ شیردرانی نے سنبھل کر صوبہ خان کو گرفت میں لینا چاہا لیکن صوبہ خان نے اسے دونوں پیروں پر رکھ کر اچھال دیا۔ شیردرانی لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل چارپائی پر گرا۔ چارپائی کا بان بہت ڈھیلا تھا۔ اس کی ٹانگیں تو چارپائی کی بنی پر لٹکی رہ گئیں اور وہ خود ڈھیلے بان کے ساتھ اندر دھنس گیا۔

شیردرانی اٹھنے کی کوشش میں ہاتھ ادھر ادھر مار رہا تھا کہ پستول اس کے ہاتھ میں آگیا۔ ٹھک اسی لمحہ صوبہ خان بھوسے کے ڈھیر سے اٹھ کر اس کی طرف لپکا۔ درانی نے ہاتھ آگے نکال کر پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی صوبہ خان کے سینے میں لگی۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ لڑکھڑایا مگر پھر سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھے ہوئے تھے اور چہرے پر بڑے خوفناک تاثرات تھے۔ شیردرانی پستول کا ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ تین اور گولیاں صوبہ خان کے سینے میں بیوست ہو گئیں۔ ایک گولی اس کے حلق کو چیرتی ہوئی نکلی۔

صوبہ خان کے جسم سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ اور بھیانک ہو گئے تھے لیکن وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ شیردرانی کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ صوبہ خان چارپائی کے قریب پہنچ کر ایک سینڈ کور کا اور پھر جھومتا ہوا آگے کی طرف گرا۔

شیردرانی بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ صوبہ خان کی زد میں آنے سے بچ گیا تھا لیکن خون کے

چھینٹوں نے اس کا لباس رنگ دیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس نے پستول کا رخ صوبہ خان کی کھوپڑی کی طرف کر کے ٹرائیگر دیا۔ فائر نہیں ہوا۔ صرف سنک کی آواز نکال کر رہ گئی۔ پستول خالی ہو چکا تھا۔ سات میں سے چھ گولیاں صوبہ خان کے جسم میں پیوست ہو چکی تھیں۔۔۔۔۔

صوبہ خان منہ کے بل چارپائی کے اندر پڑا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں پٹی پر اٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم کو اس طرح جھٹکے لگ رہے تھے جیسے ہتی روکے جھٹکے دیئے جا رہے ہوں۔ بالاخر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

شیردرانی چارپائی کے قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے صوبہ خان کی لاش سے بھی خوف آ رہا تھا۔ براخت جان ثابت ہوا تھا وہ۔۔۔۔۔ چھ گولیاں کھانے کے بعد بھی وہ اسے دبوچنے کے لیے آگے بڑھتا رہا تھا۔

بالاخر شیردرانی نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھا۔ لاش کے قریب پہنچ کر پھر رکا اور آخر کار اس نے پیر سے دھکیل کر لاش کو سیدھا کر دیا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ صوبہ خان کا چہرہ بہت ہی بھیانک ہو گیا تھا۔

شیردرانی نے کپڑوں سے پکڑ کر لاش کو چارپائی سے باہر نکال کر زمین پر ڈال دیا۔ زخموں سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ خاموش کھڑا ایستے ہوئے خون کو دیکھتا رہا۔۔۔۔۔ شیردرانی بہت سنگدل آدمی تھا۔ اس نے بہت سے آدمیوں کو مرتے دیکھا تھا۔ کئی آدمیوں کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کا خون بہتے دیکھا تھا لیکن صوبہ خان کے جسم سے خون ابلتا دیکھ کر اسے ابکا ہی آئے گی۔ جی ستلانے لگا۔ وہ کوٹھری سے باہر آ گیا۔

تازہ اور ٹھنڈی ہوا سے اس کی کیفیت کچھ سنبھلنے لگی۔ وہ تقریباً ”آدھا گھنٹہ ٹیپے پر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کا اپنا گاؤں وہاں سے تقریباً ”نصف میل دور تھا۔ اس کے علاوہ قرب وجوار میں اور کوئی بستی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ کوٹھری کے اندر چلنے والی گولیوں کی آواز گاؤں میں نہیں سنی گئی ہوگی۔

وہ کچھ دیر اور وہاں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر کنویں کی طرف چلا آیا۔ کنویں کی منڈیر ٹوٹی ہوئی تھی اور اینٹیں آس پاس بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے چارپاچ ثابت اینٹیں اٹھائیں اور دوبارہ کوٹھری میں آ گیا۔

اینٹیں زمین پر پھینک کر وہ صوبہ خان کی لاش کو دیکھنے لگا۔ لاش کے آس پاس زمین پر خون جم رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک لاش کو دیکھتا رہا پھر اپنا پستول اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا اور لاش کو گھسیٹ کر وہاں سے کچھ دور ہٹا لیا۔ ایک ایک اینٹ کوٹ کی دونوں بیرونی جیبوں میں ٹھونس دی اور باقی اینٹیں اس کے پیٹ اور سینے پر رکھ کر انہیں رسیوں سے باندھنے لگا۔

شیردرانی کے خیال میں پانچ اینٹیں کم تھیں وہ کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر سے کچھ اور اینٹیں اٹھایا اور ایک ایک اینٹ لاش کے پیروں اور بازوؤں کے ساتھ بھی باندھ دی اور پھر لاش کو گھسیٹ کر کوٹھری سے باہر لے جانے لگا۔

صوبہ خان لمبا ترنگا اور قوی الجشہ آدمی تھا۔ اینٹیں بھی بندھی ہوئی تھیں جس سے لاش کا وزن کچھ اور بڑھ گیا تھا اور لاش کو گھسیٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے لاش کو گھسیٹتا ہوا کنویں کی طرف لے جانے لگا۔ کنویں تک پہنچتے ہوئے وہ بری طرح ہانپ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا اپنا سانس درست کرتا رہا جب حواس بحال ہوئے تو اس نے لاش کو گھسیٹ کر کنویں کی منڈیر پر رکھا اور پھر اسے کنویں میں دھکیل دیا۔ چند سیکنڈ بعد کنویں کی تہ سے شڑاپ کی آواز سنائی دی۔

شیردرانی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے اپنے ایک اور خطرناک دشمن سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ قیامت تک صوبہ خان کی لاش کا سراغ نہیں لگایا جاسکے گا۔ اسے گاؤں میں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ کوئی اس پر صوبہ خان کے قتل کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ صوبہ خان سے اس خاندان کے پرانے تعلقات کی بناء پر یہ امکان تو تھا کہ پولیس کبھی اس کے بارے میں پوچھتی ہوئی آجائے۔ لیکن پولیس کو یہ شبہ نہیں ہو سکے گا کہ وہ اس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔

لاش کو کنویں میں پھینکنے کے بعد شیردرانی دوبارہ کوٹھری میں آگیا۔ زمین پر ہر طرف خون پھیلا ہوا تھا۔ اس نے کوٹھری کے کونے میں پڑی ہوئی کسی اٹھائی اور باہر سے مٹی لالا کر بکھرے ہوئے خون پر ڈالنے لگا۔ چارپائی کا بان بھی خون آلود ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ مٹی چارپائی پر ڈال دی اور بھوسہ پوری کوٹھری میں بکھریا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے سوچ آف کر دیا اور دروازہ بھیڑ کر کچھ دیر تک ٹبے پر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر ٹبے سے اتر کر کھیتوں میں گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی کتوں نے بھونک کر اس کا استقبال کیا۔ شیردرانی نے کتوں کو ہشکار دیا۔ کتے اس کی آواز پہچان کر دبک گئے۔

حویلی کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے چھوٹے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے دھکیلا، دروازہ کھل گیا۔ شیردرانی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی عدم موجودگی میں گیٹ کی طرف کوئی نہیں آیا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کیا اور کنڈا چڑھا کر دبے قدموں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

کمرے کا دروازہ اسی طرح بھڑا ہوا تھا جیسے وہ بھیڑ کر گیا تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اسی احتیاط سے دروازہ بند کیا اور دروازے کے قریب ہی دیوار پر بجلی کا سوچ آن کر دیا۔ وہ بتی جلا کر جیسے ہی گھوما ایک دم اچھل پڑا۔ سامنے ہی ایک کرسی پر حسینہ بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔

”کہاں گئے تھے؟“ حسینہ بیگم نے اسے گھورا۔  
 ”وہ... وہ ذرا طبیعت گھبراہی تھی باہر چلا گیا تھا۔ لیکن آپ ماں جی... میرے کمرے میں کب آئیں؟“ شیردرانی ماں کو دیکھ کر ہلکا سا ہنسا۔

”گھڑی دیکھی ہے، ایک بج رہا ہے۔“ حسینہ بیگم نے دیوار گیر کلاک کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بیٹکی کی طرف دیکھتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”یہ... یہ خون... تمہارے لباس پر خون کے یہ دھبے کیسے ہیں۔ سچ بتاؤ کہاں گئے تھے؟ کیا ہوا؟“

”اوہ!“ شیردرانی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”کچھ نہیں ماں جی۔ ناک سے خون بہنے لگا تھا۔“

”دیکھو شیر!“ حسینہ بیگم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ کسی سے دھینگا مشتی ہوئی ہے، کون تھا؟ یہ نہ کہ کیا ہے؟“

شیردرانی کے منہ سے ایک بار پھر گہرا سانس نکل گیا۔

”ماں جی! وہ صوبہ خان آیا تھا۔“

”کب... کس وقت؟“

”کوئی گیارہ بجے کے لگ بھگ کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر میں حویلی سے باہر نکلا تھا۔ وہ صوبہ خان تھا جس پر کتے بھونک رہے تھے۔“ شیردرانی نے کہا۔

”وہ یہاں کیا لینے آیا تھا؟“ حینہ بیگم کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

”ہمیں بلیک میل کر کے پناہ لینے کے لیے۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔ ”وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا۔ میں نے اسے ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں پولیس تو کیا، ان کے فرشتے بھی اسے تلاش نہیں کر سکتے۔“

”کیا مطلب... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ کیا تم نے اسے...“ حینہ بیگم جملہ ادھر اچھوڑ کر گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”مجبوری تھی ماں جی۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”اگر میں اسے خاموش نہ کرتا تو وہ ہم سب کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتا۔ ملازمت سے معطل ہونے کے بعد وہ ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ وہ ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا تھا۔ گرفتار ہو جاتا تو پوچھ چمچ کے دوران ناکلہ کے سلسلے میں ہمارے تمام راز فاش کر دیتا۔“

”اس کی لاش؟“ حینہ بیگم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسی جگہ غائب کر دی ہے جہاں سے اسے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔ ”وہ چوری جیسے یہاں آیا تھا۔ کسی نے اسے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ صوبہ خان سے ہمارے خاندان کے برائے نقل کی بنا پر یہ تو ہو سکتا ہے کہ پولیس کسی وقت اس کے بارے میں پوچھتی ہوئی اس طرف آجائے لیکن انہیں یہ شبہ کبھی نہیں ہو سکے گا کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ پولیس زندگی بھر اسے تلاش کرتی رہے گی۔ ہو سکتا ہے یہ بھی تصور کر لیا جائے کہ وہ سرحد پار کر کے ہندوستان بھاگ گیا ہے یا کہیں اور چلا گیا ہے لیکن اس نے مرنے سے پہلے ایک اور اطلاع بھی دی تھی۔“

”وہ کیا؟“ حینہ بیگم نے پوچھا۔

”دلاور سندھ میں ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔“

”کیا؟“ حینہ بیگم اچھل پڑی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اس کی تصدیق تو میں خود جا کر کر لوں گا۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”اگر واقعی دلاور ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے تو وہ بھی کسی وقت ہمارے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔“

”خدا جانے ہم کیسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”بہر حال، تم ہاتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کرو اور یہ کپڑے مجھے دے دو۔“

شیردرانی ہاتھ روم میں گھس گیا۔ چند منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آگیا۔ خون آلود کپڑے وہ ایک پوٹلی کی صورت میں اٹھالایا تھا۔ حینہ بیگم نے اس کے ہاتھ سے پوٹلی لے لی اور کمرے سے نکل گئی۔

حویلی کے آگن کے ایک کونے میں تندور بنا ہوا تھا۔ حینہ بیگم نے شیردرانی کے خون آلود کپڑے تندور میں ڈال کر انہیں آگ لگا دی۔ اور اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک وہ کپڑے جل کر راکھ نہیں ہو گئے تھے۔ جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو شیردرانی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”میں سویرے ہی نکل جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے واپسی میں چند روز لگ جائیں۔ آپ پریشان نہ ہوئے گا۔“ شیردرانی نے کہا۔

”صبحِ رخصت ہائی تمہارے بارے میں ضرور پوچھیں گے۔ انہوں نے پڑاری والا کام تمہارے سپرد کیا حسینہ بیگم نے کہا۔

”مفتی کو پڑاری کے ساتھ بھیج دیجئے۔ اور ماموں سے کہہ دیں کہ مجھے ایک بہت ہی ضروری کام یاد باجس کی وجہ سے مجھے جگت میں شہر جانا پڑا۔ اب آپ بھی جا کر سو جائیے۔ دو بجنے والے ہیں۔“ شبیر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

حسینہ بیگم کمرے سے چلی گئی۔ شبیر درانی پلنگ پر لیٹ گیا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ نالکہ کے بارے میں سوچنے لگتا اور کبھی صوبہ خان کے بارے میں۔ یہ واقعی ان کی خوش قسمتی تھی کہ کے بعد صوبہ خان پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اگر وہ گرفتار ہو جاتا تو ان کے لیے حقیقتاً ”پھانسی کا ثابت ہوتا، لیکن اب یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔

شبیر درانی اگرچہ رات تین بجے کے بعد ہی سویا تھا لیکن صبح پونے چھ بجے کے قریب گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز سنتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ شبیر نے عرصہ سے نماز نہیں پڑھی تھی۔ جب سے وہ آوارہ س کی بری صحبت میں پڑا تھا اس نے تو عید کی نماز پڑھنا بھی چھوڑ دی تھی لیکن آج اذان کی آواز سن کر خفا یاد آگیا۔ چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ ایک انسان کے خون سے ہاتھ رنگ کر آیا تھا۔ اس نے اٹھ کر جلدی فصل کیا، کپڑے بدلے اور فجر کی نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑے وخضوع سے نالکہ کی موت کی دعا مانگنے لگا۔ اس جیسے انسان سے کسی کی سلامتی کی دعا مانگنے جانے کی میں کی جاسکتی تھی۔ کئی سال بعد رب العزت کی بارگاہ میں اس کے ہاتھ اٹھے بھی تھے تو ایک انسان کی کی دعا کے لیے۔

نماز پڑھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر لباس بدلا۔ اس مرتبہ اس نے پینٹ شرٹ پہنی تھی۔ صبح کی سائے بچنے کے لیے اس نے سویٹر بھی پہن لیا۔ گھر سے نکل آیا حویلی کا ایک ملازم جاگ چکا تھا۔ وہ اس کا دودھ دوہنے کے لیے بالٹی ہاتھ میں لئے حویلی سے باہر جا رہا تھا۔ شبیر درانی کو دیکھ کر اس کے چہرے ت کے تاثرات ابھر آئے۔ حیرت اسے اس بات پر ہو رہی تھی کہ شبیر تو صبح دس بجے سے پہلے کبھی نہیں

”اوئے! گیٹ کھولو... میں گاڑی نکالوں گا۔“ شبیر درانی کہتا ہوا اپنی ماں کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ گاڑی کی طرف آگیا۔ اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ ن اشارت کر دیا اور ریورس گئیر میں ڈال کر گیٹ کی طرف چلانے لگا۔ نوکر گیٹ کھولے کھڑا تھا۔ شبیر نے گاڑی گیٹ سے نکال کر روک لی اور جب نوکر گیٹ بند کر کے باڑے کی طرف جانے لگا تو شبیر نے آواز دے کر روک لیا۔

”ماں جی اٹھ جائیں تو انہیں بتا دیتا کہ میں چلا گیا ہوں۔ واپسی میں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں، پریشان نہ

”جی سرکار۔“ نوکر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

شبیر درانی گاڑی موڑ کر سڑک پر لے آیا اور اسے شہر کی طرف دوڑا دیا۔ سنی والے پل تک پہنچتے ہوئے صرف ایک ٹریکٹر ٹرائی نظر آئی تھی جو شہر کی طرف جارہی تھی۔ ٹرائی پر پچھلے لے ہوئے تھے۔

وہ حویلی سے روانہ ہونے کے بعد ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں شہر والے جنگلے پر پہنچ گیا۔ اس نے

گاڑی گیٹ کے سامنے روک کر ہارن بجایا اور نیچے اتر آیا۔ کرم داد جاگ رہا تھا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

”کرم داد۔“ شبیر درانی گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”ناشتہ بناؤ۔ لیکن اس سے پہلے مجھے چائے کا ایک کپ بنا کر دے دو۔“

”جی سرکار۔“ کرم داد نے جواب دیا۔

شبیر درانی اپنے بڈروم میں آگیا۔ اس نے الماری کھول کر سب سے نچلے خانے میں سے براؤن رنگ کا ایک بریف کیس نکالا۔ بریف کیس خالی تھا۔ وہ الماری میں سے کپڑے نکال کر بریف کیس میں رکھنے لگا۔ باجیچہ جوڑے اس میں بڑی آسانی سے آگئے تھے۔ اس دوران کرم داد چائے بنا کر لے آیا۔

آپ چائے پیئیں میں بیکری سے ڈبل روٹی لے کر آتا ہوں تو ناشتہ تیار کرتا ہوں۔“ کرم داد نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

کپڑے بریف کیس میں رکھنے کے بعد اس نے الماری میں سے چیک بک نکالی اور ایک چیک پر خانہ پری کرنے لگا۔ چیک کاٹ کر بریف کیس کی جیب میں رکھ کر بریف کیس بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کرم داد بھی واپس آگیا۔

شبیر درانی جب بیگلے سے نکلا تو نونج چکے تھے۔ گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑاتے ہوئے ایک بینک کے سامنے رک دی۔ شبیر درانی نے گاڑی سے اتر کر چیک کیش کروایا۔ گاڑی میں آکر نوٹوں کے ہنڈل بریف کیس میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیئے اور بریف کیس بند کر کے اسے پنجرہ سیٹ پر ڈال دیا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مختلف سڑکوں پر ہوتا ہوا وہ ہائی وے پر نکل آیا۔ ہائی وے پر آتے ہی اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔

جب وہ بخش علی لاشاری پینچا تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ ابھی اسے کاپیو جانا تھا۔ مگر جس ہوٹل میں بیٹھا وہ چائے پی رہا تھا اس کے مالک نے مشورہ دیا کہ اس وقت وہ آگے جانے کا ارادہ ترک کر دے کیونکہ راستہ خطرناک تھا۔ شبیر درانی نے اس کے مشورے پر عمل کرنا ہی مناسب سمجھا اور قریب ہی واقع ایک سرائے نما ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔

وہ میرپور ماٹیلو تو اکثر آتا رہتا تھا لیکن اس طرف پہلی مرتبہ آیا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گھسا تو دوبارہ باہر نہیں نکلا۔ وہ بستر پر لیٹا صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے کمرے کی جی جی بھی جلتی رہنے دی تھی۔ رات کے آخری پہراس کی آنکھ لگی تو صبح آٹھ بجے ہی جاگا تھا۔ اس وقت اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ ہوٹل کے ملازم لڑکے کو چائے لانے کو کہہ کر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد لڑکا چائے لے آیا۔ شبیر درانی بستر پر لیٹا چائے کی چسکیاں لیتا رہا اور ناکلہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

ساڑھے نو بجے وہ ہوٹل سے نکلا۔ وہ گاڑی پر ابھی چند گز دور گیا تھا کہ ایک جانے پہچانے چہرے کو دیکھ کر اس نے گاڑی روک لی۔ پہلے تو اس کے ذہن میں نہیں آیا کہ وہ شخص کون تھا لیکن پھر اچانک ہی یاد آگیا کہ وہ سیٹھ جیٹھانند کا فشی شوکت علی تھا جو ایک مرتبہ تقریباً ”تین سال پہلے جیٹھانند کے ساتھ اس کے پاس رحیم یار خان آیا تھا۔“

”ارے شوکت! تم یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟“ شبیر درانی نے کار میں بیٹھے بیٹھے اسے آواز دی۔ شوکت سامنے سے آرہا تھا۔ وہ اپنا نام سن کر رک گیا۔ چند لمحے غور سے شبیر درانی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بھی شبیر کو پہچان لیا۔

”درانی صاحب! آپ کو یہاں دیکھ کر تو مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ کیسے آئے؟ کاروباری معاملہ؟“ شوکت نے کہا۔

”ہاں یہی سمجھ لو مگر۔۔۔ تم تو جیٹھانند کے پاس تھے نا؟ کیا وہ بھی یہاں آیا ہوا ہے۔“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”نہیں جی۔ جیٹھانند کی نوکری چھوڑے ہوئے تو ایک سال ہو چکا ہے بلکہ اس نے مجھے نوکری سے نکال دیا تھا۔“ شوکت علی نے جج پانی سے کام لیا۔

”آج کل کیا کر رہے ہو؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں جناب بیکار پھر رہا ہوں۔ پندرہ بیس دن سے یہاں آیا ہوا ہوں بھائی کے پاس۔ یہاں ہی کوئی کام نہیں ہے۔ سوچتا ہوں سکھر چلا جاؤں۔ کئی سال پہلے وہاں ایک آزمستی کے پاس کام کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے پاس کام مل جائے۔“ شوکت نے جواب دیا۔

”آؤ بیٹھو۔“ شبیر درانی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ شوکت گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شبیر درانی نے گاڑی چلا دی لیکن کچھ ہی دور جانے کے بعد ایک ہوٹل کے سامنے اس نے گاڑی روک لی۔ ”آؤ۔۔۔ یہاں ٹھہر کر ایک پیالی چائے پیتے ہیں۔ باتیں بھی ہو جائیں گی۔“ شبیر درانی کہتا ہوا گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے شوکت کے اترنے کے بعد گاڑی کے پیشے چڑھا کر دروازے لاک کر دیئے اور ہوٹل کی طرف چلے لگا۔

شوکت بھی اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ تین سال پہلے شبیر درانی سے اس کی صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور اب اسے حیرت ہو رہی تھی کہ شبیر درانی اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا۔ یہ زمیندار اور وڈیرے لوگ تو ملازموں کو جوتوں کی ٹھوکروں پر رکھتے ہیں۔

ہوٹل میں وہ ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جہاں سے سامنے کھڑی ہوئی گاڑی پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ اس نے ہوٹل کے لڑکے کو اشارہ کر کے بلایا اور دوپ دودھ پتی لانے کو کہا۔

”آپ یہاں مال وغیرہ کا سودا کرنے آئے ہیں کیا؟“ شوکت نے پوچھا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی معاملہ ہے لیکن ابھی تک کسی سے بات نہیں بنی۔ کوئی اچھی پارٹی تمہاری نظروں میں ہو تو تاؤ۔“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”اس علاقے میں تو صرف سیٹھ کھنول ہی ایک ایسا آدمی ہے جو ٹرکوں کے حساب سے مال خرید کر نقد اور اجسی کر سکتا ہے۔ وہ بھی جیٹھانند کی طرح سارا مال راجستھان اسمگل کر دیتا ہے لیکن لین دین کے معاملے میں بہت کھرا ہے۔“ شوکت نے جواب دیا۔

شبیر درانی نے کاروبار کی بات تو ایسے ہی شروع کر دی تھی لیکن سیٹھ کھنول کا نام سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شوکت سے اسے کھنول کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔

”لیکن سنا ہے کہ کھنول تو بہت غلط قسم کا آدمی ہے۔ پچھلے دنوں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ کیا معاملہ تھا؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”اے، سیٹھوں کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ صوبیدار کو بھتہ نہیں ملا تو کبھی مال پکڑ لیا کبھی



کسی بندے کو۔ مگر ہوتا کچھ نہیں، البتہ سینٹھ کھٹول کو تین دن تک حوالات میں بند رکھنا واقعی صوبیدار  
 مجنوں خان کے بڑے حوصلے کی بات تھی۔ سینٹھ کو چھڑانے کے لیے اسے دس لاکھ کی رشوت دینے کی کوشش  
 کی گئی تھی مگر نہ تو اس نے رشوت لی اور نہ ہی کسی دباؤ میں آیا۔ تحصیل دار نے کھٹول کو بیس ہزار کی ضمانت  
 پر رہا کر دیا اور صوبیدار مجنوں خان ٹاپا رہ گیا۔ ”شوکت نے کہا۔  
 ”معاذہ کیا تھا؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”ہاتھیلو کے انسپکٹر صوبہ خان کے بارے میں تو آپ نے سنا ہوگا۔“ شوکت نے کہا۔ صوبہ خان کے ذکر  
 پر نجانے کیوں شبیر درانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ ”وہ بڑا خالم آدمی ہے۔ اس علاقے میں جلاد کے  
 نام سے مشہور ہے۔ اس کی ذاتی جیل سے دو لڑکیاں بھاگ نکلی تھیں جو کسی طرح سینٹھ کھٹول کے ہاتھ لگ  
 گئیں۔ کھٹول نے ان لڑکیوں کو مال غنیمت سمجھ کر راجستھان بھجوانے کی کوشش کی لیکن ریگستان میں وہ  
 لڑکیاں کھٹول کے آدمیوں سے بھاگ نکلیں۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا لیکن اسی دوران ان میں  
 سے ایک لڑکی کا وارث اسے تلاش کرتا ہوا کاجیلو پہنچ گیا۔ اس کی رپورٹ پر صوبیدار مجنوں خان نے سینٹھ  
 کھٹول کے خلاف پرچہ چاک کر کے اسے اندر کر دیا۔ مجنوں خان کے بارے میں کوئی بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ  
 اسے کیا ہو گیا تھا۔ ان علاقوں کے پولیس آفیسر بھی تو سیٹھوں اور وڈیروں کے غلام ہوتے ہیں مگر مجنوں خان  
 میں اچانک ہی یہ تبدیلی بڑی حیرت انگیز تھی۔ اس نے تو اسمبلی کے ممبر کی سفارش نہیں مانی تھی۔ جس کا  
 نتیجہ اسے بھگتنا پڑا۔ کھٹول کا تو کچھ نہیں بگڑا البتہ صوبیدار مجنوں خان کو وہاں سے تبدیل کر کے کسی اور جگہ  
 بھیج دیا گیا۔ اس کی جگہ جو نیا صوبیدار آیا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا وڈیرے اور سینٹھ چاہتے ہیں۔“  
 ”صوبہ خان کا کیا ہوا؟ وہ آج کل کہاں ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”اسے آئی جی کے حکم سے نوکری سے معطل کر دیا گیا تھا اور اس کی گرفتاری کا بھی حکم دے دیا گیا تھا۔  
 سنا ہے کہ پہلے تو اس نے مراد رند نامی ڈاکو کے پاس جنگل میں پناہ لی تھی لیکن پھر وہاں سے بھی کہیں اور چلا گیا  
 اور اس کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو چکا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے  
 لیے سرحد پار کر کے راجستھان چلا گیا ہے کیونکہ یہاں اس کے خلاف بہت سی سنگین قسم کے الزامات ہیں۔  
 کئی بے گناہوں کا قتل ہے اس کے کھاتے میں۔ سنا ہے کہ گھونکی کے قریب اس کی حوٹلی سے جسے وہ ذاتی  
 جیل کے طور پر استعمال کرتا تھا، کئی انسانی ڈھانچے بھی ملے ہیں۔ اگر وہ قانون کے ہاتھ لگ گیا تو میرا خیال  
 ہے عدالت اسے کئی مرتبہ موت کی سزا سنائے گی۔“

”اور ان لڑکیوں کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا۔ سنا ہے کہ وہ ریگستان میں گھس بھگ کر مرکھپ گئی ہیں۔ تھر کا پ  
 صحرا بڑا خطرناک ہے۔“ شوکت نے جواب دیا۔

”کاجیلو کا نیا صوبیدار کون ہے، کیسا آدمی ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”ویسا ہی ہے جیسا اس علاقے کے وڈیرے اور سینٹھ چاہتے ہیں۔“ شوکت نے مسکراتے ہوئے جواب  
 دیا۔ ”پیسہ دے کر جو کام چاہے کروالیں۔“

”کاجیلو میں تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔  
 ”ہاں ہے تو۔۔۔ میرا چاچا کالڑکا ہے۔ دوکان ہے اس کی انگیلا ہی رہتا ہے۔“ شوکت نے جواب دیا۔  
 ”دیکھو شوکت!“ شبیر درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم آج کل بیکار ہو۔ اگر تم

ساتھ رہو تو میں تمہیں سو روپیہ روز کا دے سکتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنے ساتھ رحیم یار بھی لے جاؤں۔ وہاں تم مستقل طور پر میرے پاس رہ سکتے ہو۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں جناب۔ میں تو آج کل ویسے ہی بیکار پھر رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ رہ کر میرا وقت کی روٹی کا آسرا ہو جائے گا۔“ شوکت نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے چلو۔ میں کاجیلو جا رہا ہوں اگر تم چاہو تو اپنے بھائی کو بتا دو۔“ شبیر درانی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

شوکت نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ شبیر درانی نے کاؤنٹر پر پہنچ کر چائے کے پیسے دیئے اور وہ دونوں ہوٹل باہر آ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں کار پر شوکت کے بھائی کے گھر کی طرف جارہے تھے۔

شوکت نے گاڑی اپنے بھائی کے گھر کے سامنے رکوالی۔ شبیر درانی تو گاڑی ہی میں بیٹھا رہا اور شوکت سے اتر کر مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس نے کپڑوں کی ایک پوٹلی رکھی تھی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن اشارت کرتے ہوئے شبیر درانی نے مکان کی طرف دو عورتیں دروازے کی آڑ میں کھڑی جھانک رہی تھیں۔ شبیر درانی گاڑی حرکت میں لے آیا۔

شہر سے نکل کر وہ کاجیلو کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔ شبیر درانی نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ کار کا بادل اڑاتی ہوئی تیزی سے کچے راستے پر دوڑنے لگی۔

کاجیلو زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا شوکت اسے راستہ بتاتا رہا۔ بالاخر گاڑی تھانے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ شبیر درانی انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ شوکت بھی نیچے اتر آیا تھا۔

نیا تھانیدار مرعلی ایک دہلا پتلا سا دیو عمر آدمی تھا۔ سب انسپکٹر کی وردی اس کے جسم پر کچھ عجیب سی رہی تھی۔ اس نے شبیر درانی سے ملنے ہوئے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”جی سائیں! آپ کون ہیں، کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

یدار مرعلی نے اسے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ضلع رحیم یار خان کے رئیس شبیر درانی صاحب ہیں صوبیدار۔“ شوکت نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”ایک کام کے سلسلے میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”حکم کرو سائیں، ہم خدمت کے لیے ہی تو یہاں بیٹھے ہیں۔“ صوبیدار مرعلی نے شبیر درانی کی طرف تہہ نہایت ہوئے کہا۔

”شوکت.... تم باہر جا کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں صوبیدار سے بات کر کے آتا ہوں۔“ شبیر درانی نے ت کی طرف دیکھا۔

”جی سرکار۔“ شوکت کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

”صوبیدار صاحب۔“ شبیر درانی نے مرعلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ان دو لڑکیوں کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں جو چند روز پہلے تھر کے صحرائیں لاپتہ ہو گئی تھیں۔“

”اوہ!“ صوبیدار سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”آپ ان چھو کر یوں کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں میں اور آپ کا ان سے کیا تعلق ہے؟“

”ان میں سے ایک لڑکی نائلہ درانی میری کزن ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ کچھ پہلے ماتھیلو کے انسپکٹر صوبہ خان کے آدمی صادق آباد سے نائلہ کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ اس

کارروائی میں نالکہ کا ایک باڈی گارڈ، ایک عورت اور ایک بچہ بھی ان کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ نالکہ بھی زخمی تھی مگر وہ ریگستان میں ان آدمیوں کے چنگل سے نکل بھاگی۔ ان میں سے تین آدمی دوسرے دن صاف آباد پولیس نے گرفتار کر لئے تھے۔ انہوں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ یہ کارروائی انہوں نے صوبہ خان کے کئے پر کی تھی۔ دراصل صوبہ خان نالکہ کو اغوا کر کے اس کی رہائی کے بدلے ہم سے کچھ تاوان وصول کرنا چاہتا تھا۔ صوبہ خان نے کسی طرح نالکہ کو تلاش کر لیا اور اسے گھونکی کے قریب اپنی حویلی میں قید کر دیا جہاں سے وہ ایک اور لڑکی کے ساتھ بھاگ نکلی۔ پھر سننے میں یہ آیا تھا کہ کسی ہندو سیٹھ نے انہیں سرحد پار اسمگل کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ دونوں لڑکیاں پھر بھاگ نکلیں اور ریگستان میں کسیں لاپتہ ہو گئیں....

”رئیس شبیر!“ صوبیدار مرعلی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے تو میں ان چھو کرپوں کے حوالے سے سیٹھ کھٹول کی پوزیشن کی وضاحت کر دوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ صوبیدار مجنوں خان کی سیٹھ کھٹول سے کچھ ذاتی دشمنی تھی۔ ان لڑکیوں کے چکر میں کسی نے سیٹھ کا نام لے دیا تو مجنوں خان نے سیٹھ کو پکڑ کر بند کر دیا اور اس کے خلاف اغواء، اسمگلنگ اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں مقدمہ بھی درج کر لیا۔ لیکن مجنوں خان کو ذلت اور رسوائی کے سوا کیا ملا؟ سیٹھ ضنات پر رہا ہو گیا اور مجنوں خان کو اس علاقے سے تبدیل کر دیا گیا۔ مجنوں خان ذرا بے وقوف آدمی ہے۔ اسے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے تھی کہ چھوٹے علاقوں میں حکومت دراصل دُزیروں، سیٹھوں اور جاگیرداروں کی ہوتی ہے۔ سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے تنخواہ تو سرکار سے لیتے ہیں مگر یہاں حکم انہی بڑے لوگوں کا چلتا ہے اور سیٹھ کھٹول... اس کی تو بہت پہنچ ہے سائیں۔ اس کے خلاف مجنوں خان کا درج کیا ہوا کیس بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ آپ خود ہی سوچیں رئیس شبیر، کھٹول جیسے شخص کے خلاف ناجائز اسلحہ رکھنے کا الزام ہے نا عجیب بات۔ اس کی جیب میں صرف پستول تھا اور آپ تو خود جانتے ہیں دُزیروں اور سیٹھوں کے باڈی گارڈ کے پاس تو کلاشنکوف اور دوسری ممنوعہ ہتھیار راقطیں ہوتی ہیں۔ ہماری سرکار تو ان راقطوں کے لائسنس بھی جاری نہیں کرتی۔ یہ سب غیر قانونی اسلحہ ہے۔ مجنوں خان کو یہ اسلحہ تو نظر نہیں آیا مگر سیٹھ کھٹول کی جیب میں رکھا ہوا ایک چھوٹا سا پستول نظر آیا۔“

”آپ سیٹھ کھٹول کی بہت اچھی وکالت کر رہے ہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ کھٹول جیسے لوگ اس ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مال سے لدے ہوئے ٹرک اور اونٹنوں کے قافلے آئے دن غیر قانونی طور پر ہندوستان کی سرحد عبور کرتے رہتے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ یہ اسمگلنگ کون کرتا ہے؟ حکومت نے آپ کو یہ وردی اس لیے نہیں پہنائی کہ آپ اسمگلروں اور ڈاکوؤں کو تحفظ فراہم کریں۔ اس قصبے کے بیسیویں لوگ جانتے ہیں کہ ان دونوں لڑکیوں کو سیٹھ کھٹول نے اسمگل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں ایک لڑکی میری کزن تھی۔ اگر کسی بڑے آدمی کے کہنے پر کھٹول کے خلاف کیس ختم کر دیا گیا ہے تو نالکہ کے وارث زندہ ہیں۔ میں کھٹول کا وہ حشر کروں گا کہ دنیا یاد کرے گی اور اسے تحفظ فراہم کرنے والوں کا انجام بھی کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ اگر کھٹول کے کسی بڑی شخصیت سے تعلقات ہیں تو میری بھی وزیراعظم اور صدر تک رسائی ہے۔ تم نے رحیم یار خان کے درانی خاندان کا نام سنا ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خاندان کتنا بااثر اور طاقتور ہے۔ کھٹول جیسے شخص کو تو میں چٹکیوں میں مسل دوں گا۔“

”دھیرج رئیس شبیر دھیرج...“ صوبیدار مرعلی نے کہا۔ ”آپ تو جذبات میں آگئے۔ میں مانتا ہوں کہ

اپ کے بہت اوپر تک تعلقات ہوں گے۔ لیکن اس طرح جذبات میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ کوئی شخص سینہ کھٹول کے خلاف کسی قسم کی گواہی دینے کو تیار نہیں ہوگا۔“

”مجھے کسی کی گواہی کی ضرورت نہیں ہوگی۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”آپ میری شکایت پر کھٹول کے خلاف رپورٹ درج کریں۔ میں دیکھتا ہوں کھٹول کیا ہے اور اس کی رسائی کہاں تک ہے؟“

”آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں رئیس شبیر۔“ صویدار مرعلیٰ نے پوچھا۔  
 ”ابھی تو کہیں بندوبست نہیں کیا۔ شوکت کا چچا زاد بھائی یہاں رہتا ہے۔ شاید اس کے گھر میں رہتا ہے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”تو آپ ایسا کریں سائیں!“ صویدار نے اس کے چہرے پر نظرسنجماتے ہوئے کہا۔ ”آپ تحریری شکایت لکھ کر دے دیں میں شام کو کسی وقت آپ سے بات کروں گا۔“

صویدار نے کاغذ اور بال پین شبیر درانی کے سامنے رکھ دیا۔ شبیر درانی نے نائلہ درانی کے حوالے سے تفصیلی شکایت لکھی جس میں سینہ کھٹول کو ملوث کرتے ہوئے نائلہ درانی کی گمشدگی کا ذمے دار اسی کو قرار دیا اور اس شبے کا اظہار بھی کیا گیا کہ ممکن ہے سینہ کھٹول نے نائلہ درانی کو قتل کر کے لاش کہیں پھینک دی ہو۔

شبیر درانی یہ درخواست صویدار مرعلیٰ کے حوالے کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”ٹھیک ہے صویدار۔ میں شام کو اگر معلوم کروں گا کہ تم نے اس درخواست کے بارے میں کیا سوچا ہے۔“

صویدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شبیر درانی تھانے سے باہر گیا۔ شوکت کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ شبیر درانی اس سٹریٹنگ کے سامنے بیٹھ گیا اور انجین اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔  
 ”ہاں بھی شوکت! کہاں ہے تمہارے بھائی کا گھر؟“

”قرب ہی ہے سرکار۔“ شوکت نے جواب دیا۔ ”آگے دائیں طرف والی گلی میں کار موڈلیں۔“  
 کار حرکت میں آئی۔ دو تین گلیوں میں گھومنے کے بعد شوکت نے کار ایک گلی میں واقع ایک کپڑے کی دکان کے سامنے رکوالی۔ یہ دوکان ایک دو منزلہ مکان ہی کے ایک حصے میں بنی ہوئی تھی۔ بالکل ایسی ہی دکان تھی جیسی محلے کی دوکانیں ہوتی ہیں۔ شوکت کار سے اتر کر دوکان میں داخل ہو گیا۔ اس وقت دو بچے مکان سے کچھ سدا لے رہے تھے۔ شوکت دوکاندار سے گلے ملا۔ کچھ دیر اس سے بات کی اور باہر آیا۔  
 ”آپ گاڑی کو اس طرف کھڑا کر دیں سرکار۔ عمر ابھی اندر سے دروازہ کھولتا ہے۔“ شوکت نے کار کے قریب آکر کہا۔

شبیر درانی نے کار سائیڈ پر لگالی۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھا کر دروازے اندر سے لاک کر دیئے اور برف سے اٹھا کر نیچے اتر آیا پھر اسٹریٹنگ سائیڈ کا دروازہ بھی لاک کر دیا۔ شوکت نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے برف کیس لے لیا۔ گلی میں آتے جاتے کچھ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند منٹ بعد دوکان کے ساتھ والے مکان کا دروازہ کھلا اور شوکت اسے اشارہ کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ان کے اندر آنے کے بعد عمر نے دروازہ بند کر دیا اور ان کی رہنمائی کرتا ہوا دوسری منزل پر گیا۔ ان بہت بڑا اور پرانے طرز کا بنا ہوا تھا۔ عمر نے اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا اور چارپائی پر چادر وغیرہ بچھانے کے لئے لگا۔

”حسل خانہ اس برآمدے کے سرے پر ہے سرکار۔ آپ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیں میں کھانے وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔“ شوکت نے کہا۔

”یہ رکھ لو۔ کھانا کسی ہوٹل سے لے آؤ۔“ شبیر درانی نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

شوکت اور عمر کرے سے چلے گئے۔ شبیر درانی نے بریف کیس کا نمبروں والا تالا کھولا۔ تویہ اور کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر بریف کیس دوبارہ لاک کر دیا اور دروازہ بند کر کے برآمدے کے آخری سرے پر واقع حسل خانے میں گھس گیا۔

ایک گھنٹے بعد شوکت کھانا لے کر آگیا۔ کھانے کے بعد اس نے شوکت کو برتن اٹھالینے کا اشارہ کیا۔

”میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں سو گیا تو پانچ بجے سٹے لگ بھگ مجھے جگا رہتا۔“

”جی سرکار۔“ شوکت نے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

شوکت کے جانے کے بعد شبیر درانی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور چارپائی بریٹ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے سینٹھ کھنول کے خلاف رپورٹ لکھ کر دی تھی اور تھانیدار کو بھی دھمکانے کی کوشش کی تھی لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صورت حال کو کس طرح چنڈیل کرے اور تھانیدار سے ناکہ کی موت کا سرٹیفکیٹ کس طرح حاصل کرے۔ صورت حال خاصی الجھ مٹی تھی اور اس کا ذمے دار وہ خود تھا۔ اس نے تھانیدار کو یہ دھمکی تو دے دی تھی کہ وہ بہت زیادہ اثر و رسوخ کا مالک ہے اور وہ کھنول جیسے لوگوں کو چٹکیوں میں مسل سکتا ہے لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایسا کوئی موقع آیا تو وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کا خاندان بڑے علاقے میں بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا مگر اس خاندان کی عظمت اور شان و شوکت قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ خاندان کی ذلت و رسوائی کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ جو لوگ ان کے سامنے گھٹنے ٹیکا کرتے تھے آج وہی اسے آنکھیں دکھا رہے تھے۔

شبیر درانی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

ادھر سب انسپکٹر مرعلی، شبیر درانی کے جانے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس نے شبیر درانی کی درخواست پڑھ لی تھی۔ وہ کئی سال پہلے اوباڑو میں رہ چکا تھا۔ اوباڑو، رحیم یار خان اور صادق آباد سے زیادہ دور نہیں تھا۔ درانی فیملی کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ اس خاندان کی سیاسی قوت سے واقف تھا۔ لیکن اب اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اب یہ خاندان اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ لیکن وہ شبیر درانی کی دھمکی میں آگیا تھا۔ شبیر درانی کی اس درخواست کے بارے میں اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ دوسری طرف وہ سینٹھ کھنول سے بھی دشمنی مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجنوں خان کا انجام وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ بری طرح الجھ گیا تھا۔ لیکن دفعتاً اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی گئی۔ اس نے آواز دے کر ایک سپاہی کو اندر بلا دیا۔

”جا کر معلوم کرو کہ سینٹھ کھنول ابھی یہیں پر ہے یا بخش علی رند واپس چلا گیا ہے۔“ اس نے سپاہی کے آنے پر کہا۔

”وہ یہیں ہے سائیں۔“ سپاہی نے جواب دیا۔ ”کل صبح واپس جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ مرعلی نے کہا اور کرسی سے اٹھ گیا۔ اس نے شبیر درانی کی درخواست بڑی احتیاط سے تمہ کر کے جیب میں رکھ لی تھی۔ تھانے سے نکلنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد صوبیدار مرعلی سینٹھ کھنول کے

مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع کو ادنیٰ تھی اور اندر بلائے جانے کا خطرہ تھا۔ تقریباً دس منٹ کے انتظار کے بعد مرعلیٰ کو اندر بلایا گیا۔

”صوبیدار... کو کیسے آنا ہوا؟“ سیٹھ کھٹول نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ بیٹھک میں قالین پر گاؤ نکتے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے تھانیدار کے استقبال کے لیے اٹھنے کی زحمت بھی مگوارا نہیں کی تھی۔

”ایک نازک مسئلہ آن پڑا ہے سائیں! آپ سے مشورہ کرنا ضروری تھا اس لیے آگیا ہوں۔“ صوبیدار نے کہا۔

”بیٹھو! سیٹھ کھٹول نے کہا۔ ”ایسا کیا مسئلہ ہے؟“

صوبیدار مرعلیٰ نے شیردرانی کی درخواست جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھادی۔ ”اسے پڑھ لیں سرکار آپ خود ہی معاملے کی نزاکت کو سمجھ لیں گے۔“

سیٹھ کھٹول درخواست پڑھنے لگا۔ وہ جیسے جیسے پڑھتا جا رہا تھا اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔

”یہ شیردرانی کون ہے؟“ اس نے کم از کم دو مرتبہ درخواست پڑھ لینے کے بعد ابھی ہوئی نگاہوں سے صوبیدار کی طرف دیکھا۔

”رحیم یار خان کا ایک بہت بڑا زمیندار ہے۔ سیاسی طوڑ پر یہ خاندان بڑا طاقتور ہے۔ قومی اسمبلی کے کئی رکن اس خاندان کے مرید ہیں۔ کئی وفاقی وزیر ان کے دروازوں پر حاضری دیتے ہیں۔ وزیر اعظم اور صدر تک براہ راست تعلق ہے اس شیردرانی کا... وہ خود یہاں آیا ہوا ہے اور اس کے ارادے کچھ اچھے نظر نہیں آرہے۔“ صوبیدار مرعلیٰ نے کہا۔

”صوبیدار! سیٹھ کھٹول نے اسے گھورا۔ ”کیا تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ سیٹھ کھٹول کون ہے؟“

”بتایا تھا سائیں۔“ صوبیدار نے کہا۔ ”وہ آپ کو ایک اسمگلر اور وطن دشمن شخص کی حیثیت سے جانتا ہے۔ وہ پچھلے کیس سے بھی واقف ہے اور کہتا ہے کہ پچھلی مرتبہ تو ضمانت ہو گئی تھی اب وہ ضمانت بھی نہیں ہونے دے گا۔“

سیٹھ کھٹول نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ درانی فیملی کے بارے میں وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ خود چور اور اسمگلر تھا۔ یہاں تک مسلمان اور وزیرے ایسے بھی تھے جو اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے پہچانے کے لیے شیردرانی کا ساتھ دے سکتے تھے۔ اس کے لیے سب سے بڑا خطرہ راکا وہ نیٹ ورک تھا جو اس نے پورے سندھ میں پھیلا رکھا تھا۔ اسمگلنگ کے کیس میں تو کچھ بچ بچاؤ ہو سکتا تھا لیکن اگر اس کا یہ راز فاش ہو گیا تو اسے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

”صوبیدار!“ بالاخر اس نے کہا۔ ”تم تو قانون کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ اس کا کوئی حل سوچو نا۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟“

”اس سے بچنے کی ایک ترکیب ہے میرے ذہن میں۔“ مرعلیٰ نے کہا۔

”وہ کیا؟ جلدی بولونا صوبیدار۔“ سیٹھ کھٹول نے کہا۔

صوبیدار چند لمحوں خاموش ہوا پھر بولا۔ ”ماٹھیلو کا انسپکٹر صوبہ خان مفرد ہے۔ ان چھو کریوں کو وہی افواہ کر کے لایا تھا جو اس کی ذاتی جیل سے بھاگ کر اس طرف آگئی تھیں۔ صوبہ خان ان کے تعاقب میں تھا۔ اس نے ریگستان تک ان کا پیچھا کیا اور بالاخر ان دونوں چھو کریوں کو قتل کر کے لاشیں ریگستان میں

پھینک دیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا سائیں!“ صویدار نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”صوبہ خان کے کھاتے میں بہت سے قتل ہیں۔ دو یہ بھی سہی۔ اول تو مجھے امید نہیں کہ صوبہ خان پکڑا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سرحد پار کر کے راجستھان جا چکا ہے اور بالفرض کبھی پکڑا بھی گیا تو اس کے ان لوڈیوں کے قتل کا اعتراف کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”لیکن کیا شیردرانی تمہاری اس بات سے مطمئن ہو جائے گا؟“ سیٹھ کھٹول نے پوچھا۔

”اے مطمئن ہونا ہی پڑے گا۔“ صویدار نے کہا۔ ”یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں سائیں لیکن آپ جانتے ہیں تاکہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ ایک منٹ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ سیٹھ کھٹول کہتے ہوئے اٹھ کر اندرونی دروازے میں چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے نوٹوں کی تین گڈیاں صویدار کے سامنے پھینک دیں۔ ”یہ تیس ہزار روپے ہیں شیردرانی مطمئن ہو کر چلا جائے گا تو بیس ہزار اور ملیں گے۔“

”صرف پچاس ہزار سائیں!“ صویدار کے لہجے میں حیرت تھی۔ حالانکہ پچاس ہزار بھی اس کے لیے بڑی رقم تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کھٹول کے خلاف الزامات سنگین تھے اور اس کے پاس پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔ ”آپ جانتے ہیں کہ معاملہ کتنا سنگین ہے اور شیردرانی جیسے شخص کو مطمئن کرنا کتنا مشکل کام ہو گا۔ اگر وہ اڑ گیا تو میری نوکری بھی جاسکتی ہے۔“

”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔“ سیٹھ کھٹول نے کہا۔

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ یہ ضمانت حاصل کرنا میرا کام ہے۔“ صویدار نے کہا۔

”ٹھیک ہے، یہ بھی رکھ لو۔“ سیٹھ نے دو اور گڈیاں نکال کر اس کے سامنے ڈال دیں۔ ”یہ پچاس ہزار ہو گئے۔ پچاس ہزار اور دوں گا۔ لیکن اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ایک ایک پائی نکالوا لوں گا۔“

”حاضر سائیں۔“ صویدار نے مسکراتے ہوئے کہا اور نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔ اسی شام وہ شوکت کے چچا زاد بھائی کے گھر پر شیردرانی کے سامنے موجود تھا۔ اس نے ایک کاغذ شیردرانی کی طرف بڑھا دیا۔

”رئیس شیر! یہ کاغذ پڑھ لیں۔ اگر آپ میری اس رپورٹ سے مطمئن نہ ہوں تو آپ جو کارروائی کرنا چاہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

شیردرانی نے وہ کاغذ پڑھا۔ اس کی آنکھوں میں عجب سی چمک ابھر آئی تھی۔ دل ہی دل میں لڈو پھونسنے لگے تھے۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا بغیر کے مل گیا تھا۔ یہ کاغذ ایک ذمہ دار پولیس آفیسر کی طرف سے اس بات کی تصدیق تھی کہ نالکہ درانی پولیس کے سابق انکپٹر صوبہ خان کے ہاتھوں قتل ہو چکی ہے جو اسے صادق آباد سے اغواء کر کے لایا تھا۔ اس رپورٹ پر اچارج تھانہ کی مراد سب انکپٹر مر علی کے دستخط بھی موجود تھے۔

”لیکن یہ...“

”رئیس شیر!“ صویدار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ مجھ جیسے شخص کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس معاملے پر میں نے پہلے بھی تحقیق کی تھی اور آج بھی بعض لوگوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ حقیقت وہی ہے جو میں نے اس رپورٹ میں لکھی ہے۔ آپ کی کزن نالکہ درانی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ مجھے

اس کا افسوس ہے۔ اس کا قاتل صوبہ خان ہے۔ میں نے سب کچھ اس رپورٹ میں لکھ دیا ہے۔ اگر آپ میری اس رپورٹ سے اتفاق نہ کرتے ہوں تو بے شک اوپر چلے جائیے۔ ہمیں اوپر سے احکامات ملے تو اعلیٰ حکام کی تسلی کے لیے تحقیقات از سر نو شروع کی جاسکتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے صوبیدار۔“ شیردرانی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہاری رپورٹ یہی کہتی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ نے صبح جو درخواست دی تھی وہ واپس لے رہے ہیں یا؟“ صوبیدار نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں! یہی سمجھ لو۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔

”تو پھر اس کاغذ پر لکھ دیجئے کہ آپ نے سیٹھ کھٹول کے خلاف اپنی شکایت واپس لے لی ہے۔“

صوبیدار نے ایک کاغذ اور بال پن اس کی طرف بڑھا دیا۔

شیردرانی نے کاغذ پر اس کے مطلب کی تحریر لکھ کر دستخط کر دیئے۔

”شکریہ رئیس شیر!!“ صوبیدار نے کاغذ کر کے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ ”میرے لائق کوئی

خدمت ہو تو مجھے یاد کر لیجئے رئیس شیر۔“

شیردرانی نے محض سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ صوبیدار ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی

جگہ پر بہت خوش تھے۔ دونوں کے مسئلے غیر متوقع طور پر نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو گئے تھے۔ شیردرانی

تو بہت ہی خوش تھا۔ قانونی طور پر نالکہ درانی کی موت کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اور اب وہ نالکہ درانی کی

دراشت کا دعویٰ کر سکتے تھے۔



دلاور جب صادق آباد پہنچا تو اسے شہری میں یہ اطلاع مل گئی کہ رائے منصور صاحب شدید بیمار تھے اور انہیں رحیم یار خان کے سلطان زائد ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ وہ صادق آباد سے احمد پور لا ما جانے کے بجائے رحیم یار خان والی بس پر سوار ہو گیا۔ جب وہ رحیم یار خان کے لاری اڈے پر بس سے اتر اتواس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

دلاور بس سے اتر کر سیدھا ہسپتال پہنچا۔ رائے منصور کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اسے ہسپتال کے ایک ملازم سے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ رائے منصور صاحب پر دل کا دورہ پڑا تھا اور انہیں انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا گیا تھا اور کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس وقت ویسے بھی رات کے گیارہ بجے تھے۔ اسے ہسپتال میں نہیں جانے دیا گیا۔

دلاور اپنی خالہ کے گھر گیا۔ طویل سفر سے وہ بے حد تھکا ہوا تھا اور ابھی تک اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ خالہ کے گھر میں جب اس کے سامنے کھانا رکھا گیا تو وہ شدید بھوک ہونے کے باوجود چند نوالوں سے زیادہ نہیں کھاسکا تھا۔ رائے منصور پر دل کے دورے کا سن کر اس کا اپنا دل بچھ سا گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ بستر لینا دیر تک رائے منصور ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور بالا خرہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح حسب معمول سات بجے دلاور کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر صرف ایک کپ چائے پی اور گھر سے نکل گیا۔ وہ ہسپتال جانا چاہتا تھا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ رائے صاحب کی بیماری کی وجہ سے ان



کے گھر والے بھی یہاں آگئے ہوں گے۔ وہ ہسپتال جانے کے بجائے تانگے پر بیٹھ کر رائے صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کا خیال درست نکلا۔ آصف بیگم بنگلے میں موجود تھیں۔ اس کی آنکھیں سو جھی ہوئی تھیں اور سرخی نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو۔

”کیا ہوا رائے صاحب کو؟“ دلاور نے پوچھا۔

”کل دوپہران کے سینے میں درد اٹھا تھا۔“ آصف بیگم نے بتایا۔ ”احمد پور لاما سے ڈاکٹر کو بلایا گیا تو انجکشن لگادیا اور کہا کہ انہیں فوری طور پر بڑے ہسپتال پہنچادیا جائے۔ ہم انہیں یہاں لے آئے۔ راتے میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ دعا کرو دلاور۔“

آصف بیگم جلد پورا نہیں کر سکی۔ اس کی آواز بھرا مٹی اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”حوصلہ رکھئے بیگم صاحبہ۔“ دلاور نے تسلی دی۔ ”رائے صاحب بہت نیک آدمی ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔ وہ تو لوگوں میں ہمیشہ پیار و محبت بانٹتے رہے ہیں۔ بہت سے دلوں سے ان کے لیے دعائیں نکل رہی ہوں گی۔ حوصلہ رکھئے بیگم صاحبہ! اللہ کرم کرے گا۔“ دلاور، آصف بیگم کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ دل کا پ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر رائے صاحب کو کچھ ہو گیا تو برائی کے سیلاب کے سامنے ایک مضبوط بند ٹوٹ جائے گا۔

”میں رات کو گیارہ بجے ہسپتال گیا تھا۔“ اس نے آصف بیگم کو بتایا۔ ”لیکن مجھے اندر نہیں جانے دیا گیا۔ ان کے پاس کون ہے؟“

”ان کا بھتیجا امجد ہے۔ وہ اتفاق سے دو دن پہلے لاہور سے آیا تھا۔“ آصف بیگم نے کہا۔ ”میں ابھی تھوڑی دیر میں ہسپتال جانے والی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ ہی چلنا اور ہاں... تم نے کوئی ناشتہ وغیرہ کیا ہے یا نہیں؟“

”رات کو میں اپنی خالہ کے ہاں چلا گیا تھا۔ صبح گھر سے نکلتے ہوئے چائے کا ایک کپ پی لیا تھا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”بیٹھو، میں تمہارے لیے ناشتہ بھیج رہی ہوں۔ بھوکے رہو گے تو تمہاری طبیعت بھی خراب ہو جائے گی۔“ آصف بیگم اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن پھر رک کر دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور ہاں، نانکھ کا کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں بیگم صاحبہ۔“ دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہی کمائی ہے پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ آپ تیار ہو جائیے تاکہ ہم جلدی ہسپتال پہنچ جائیں۔“

”یہ لڑکی بھی پتہ نہیں کیسی قسمت لے کر اس دنیا میں آئی ہے۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو ساری دنیا اس کی دشمن ہو گئی۔ اتنا کچھ ہوتے ہوئے درد کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔“ آصف بیگم نے کہا۔

”جو کچھ مقدر میں ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے بیگم صاحبہ۔“ دلاور نے کہا۔

”اللہ سب کی مشکلیں آسان کرے۔“ آصف بیگم کہتی ہوئی چلی گئی۔

حوالی کے دو مرد ملازم اور تین عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ تقریباً ”پندرہ منٹ بعد خادم دلاور کے لیے ناشتہ لے کر آیا۔ دلاور کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن آصف بیگم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ خالی پیٹ رہنے سے طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اس نے دو سلاٹس انڈے کے ساتھ کھائے۔ اور چائے پینے لگا۔

س نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ رکھا ہی تھا کہ آصفہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ حویلی کی ایک جوان ملازمہ رقیہ بھی تھی جس نے تھرس اور ٹفن کی برائیاں رکھا تھا۔  
”چلو دلاور۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔

وہ ڈرائنگ روم سے نکل آئے۔ پورچ میں رائے منصور کی پاجیرو کھڑی تھی اور ڈرائیور برکت شیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی انجن اشارت کر دیا۔ دلاور نے آصفہ بیگم کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ آصفہ بیگم اور رضیہ کے بیٹھنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور خود برکت کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ خادم نے باہر کا گیٹ کھول دیا۔ پاجیرو بنگلے سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی۔ ہسپتال پہنچ کر پتہ چلا کہ رائے صاحب کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی اور انہیں آئی سی یو سے اسپیشل روم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ایک وارڈ بوائے نے انہیں کمرے تک پہنچا دیا۔

رائے صاحب بیڈ پر سو رہے تھے اور ان کا بھتیجا امجد بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دلاور کا خیال تھا کہ رائے صاحب کے بھتیجے کی عمر بیس اکیس کے لگ بھگ ہوئی لیکن اسے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ تیس بیس کا ضرور ہوگا۔ دروازہ کھلنے اور قدموں کی آہٹ سن کر امجد جاگ گیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی سرفی بتا رہی تھی کہ وہ رات بھر جاگتا رہا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ آصفہ بیگم نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔  
”بہت بہتر ہے۔“ امجد نے جواب دیا۔ ”ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اسٹروک بہت مائلڈ تھا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن انہیں چند روز تک مکمل آرام کی ضرورت ہے۔“  
”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ آصفہ بیگم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ امجد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے لیے ناشتہ لے آئی ہوں۔ منہ ہاتھ دھو کر پہلے ناشتہ کر لو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“  
”جی بہتر۔“ امجد کسی سعادت مند بچے کی طرح سر ہلاتا ہوا ہاتھ روم میں گھس گیا۔

پانچ دس منٹ بعد وہ ہاتھ روم سے باہر نکلا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ رقیہ نے سامنے رکھی ہوئی چھوٹی کافی ٹیبل پر اس کے لیے ناشتہ لگا دیا تھا۔ کمرے میں صرف ایک کرسی اور تھی۔ آصفہ بیگم اس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ دلاور اور رقیہ دروازے کے قریب کھڑے تھے۔

”تقریباً“ آدھے گھنٹے تک آصفہ بیگم امجد سے رائے صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی پھر بولی۔

”ٹھیک ہے امجد۔ اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ تم رات بھر جاگتے رہے ہو۔ میں اور دلاور یہاں رہیں گے۔“

”دلاور؟“ امجد بولا۔ ”او۔۔۔ اچھا یہ ہے دلاور۔“ اس نے کرسی سے اٹھ کر بڑی مگر مجبوشی سے دلاور سے ہاتھ ملایا۔ ”بڑی تعریفیں سنی ہیں بھی تمہاری۔ اٹکل تو تمہارے دیوانے ہیں۔ میں حویلی میں دو دن رہا ہوں بس ہر وقت تمہارے ہی قصے سناتے رہتے تھے۔۔۔۔۔“

”میں کس قابل ہوں جی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ رائے صاحب خود بہت اچھے ہیں۔ بہت چاہتے ہیں مجھے اور میرے لیے تو دنیا میں سب کچھ یہی ہیں۔ خدا کرے یہ جلدی اچھے ہو جائیں۔“

”انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“ امجد نے کہا۔  
 وہ کچھ دیر تک دلاور سے باتیں کرتا رہا پھر بولا۔ ”تم سے تفصیل سے باتیں ہوں گی۔“  
 ”ضروری۔“ دلاور بولا۔

امجد رقیہ کے ساتھ گھر واپس چلا گیا۔ دلاور، آصف بیگم کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رائے منصور کی طرف دیکھتے رہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد رائے منصور نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کچھ بڑبڑائے تھے۔ دلاور کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انہوں نے نالکہ کو پکارا تھا۔

آصف بیگم اور دلاور فوراً ہی کرسیوں سے اٹھ کر پلنگ کے دائیں بائیں پہنچ گئے۔ رائے صاحب کی نظروں کے سامنے کچھ دیر تک دھند سی چھائی رہی پھر وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے آصف بیگم کو بھی پہچان لیا تھا اور دلاور کو بھی۔  
 ”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ آصف بیگم نے پوچھا۔

”میں... میں ٹھیک ہوں۔“ رائے صاحب نے جواب دیا۔ ”دلاور! تم کب آئے... نالکہ کا کچھ پتہ چلا؟ کیسی ہے وہ؟“

”نالکہ بی بی بالکل ٹھیک ہے رائے صاحب، آپ فکر ہی نہ کریں۔ بس آپ جلدی سے اچھے ہو جائیں۔“ دلاور کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
 ”رورہے ہو...“ رائے صاحب بولے۔ ”مرد ہو کر رورہے ہو۔“

”نن... نہیں رائے صاحب۔“ دلاور نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ ”مم... میں تو آپ کا بیٹا ہوں اور آپ کا بیٹا کیسے رو سکتا ہے...“  
 ”دیکھو آصف... اس بے وقوف کو دیکھو۔“ رائے صاحب نے آصف بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رو رہا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں رورہا۔“

”آپ کو بیمار دیکھ کر پریشان ہو گیا ہے رائے صاحب۔“ آصف بیگم نے جواب دیا۔ ”دلاور تو بڑا بہادر لڑکا ہے۔ بس ذرا جذباتی ہو گیا ہے۔ آپ کو بستر پر دیکھ کر جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔“ آصف بیگم دلاور کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“ رائے صاحب نے کہا۔

”دلاور!“ آصف بیگم نے دلاور سے کہا۔ ”ڈاکٹر شاہد کو بلا لاؤ۔ امجد نے کہا تھا کہ رائے صاحب جاگ جائیں تو ڈاکٹر کو اطلاع کردی جائے۔“

”جی بیگم صاحبہ۔“ دلاور کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد دلاور ڈاکٹر شاہد کو لے کر آگیا۔ ڈاکٹر نے رائے صاحب کا معائنہ کیا اور پھر ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

”آپ بالکل ٹھیک ہیں رائے صاحب۔ بس اب آپ کو چند روز آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ آصف بیگم کی طرف مڑ گیا۔ ”ان کی خوراک اور میڈیسن کا آپ کو خیال رکھنا ہوگا۔ مکھن، گھی، انڈے کی زردی، کسی قسم کی چکنائی اور ایسی کوئی چیز نہ دی جائے جس میں کولسٹرول ہو اور تمام میڈیسن آپ کو وقت پر اور باقاعدگی سے دینی ہوں گی۔“

”جی میں سمجھ گئی۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔ ”لیکن اس وقت انہیں کھانے میں کیا دیا جائے؟ میں تو مرغی کی فہمی لے کر آئی تھی۔“

”بھئی آپ دے سکتی ہیں۔ بریڈ کا ایک آدھ سلاٹس اگر لے لیتا پسند کریں تو کوئی حرج نہیں۔ مرغی اور پھلی کھانا چاہیں تو شوق سے کھائیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”مرغی یا پھلی زندہ کھائی جائے گی یا پکی ہوئی ڈاکٹر صاحب!“ رائے صاحب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”رائے صاحب!“ ڈاکٹر ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ ”آپ جیسے زندہ دل لوگ زیادہ دنوں تک بستر پر نہیں بڑے رہ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ دو چار روز بعد آپ اپنے کھیتوں میں بل چلاتے ہوئے نظر آئیں گے لیکن پکیزا، مشقت والا کوئی کام نہ کیجئے اور نہ ہی بوجھ اٹھانے کی کوشش کیجئے البتہ ہلکی پھلکی ورزش آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن ابھی نہیں، چند روز بعد۔“

ڈاکٹر شاہد، آصفہ بیگم کو دوواؤں کے بارے میں مزید ہدایات دینے کے بعد کمرے سے چلا گیا۔ دلاور نے رائے صاحب کا منہ دھلایا۔ اس دوران آصفہ بیگم الیکٹرک بیئر پر سوپ گرم کرنے لگیں۔ دلاور نے رائے صاحب کا بیڈ سر کی طرف سے کسی قدر اونچا کر دیا اور اپنے ہاتھ سے انہیں ناشتہ کرانے لگا۔

رائے منصور تین دن تک ہسپتال میں رہے۔ اس دوران دلاور مستقل طور پر ہسپتال ہی میں رہا۔ امجد اور آصفہ بیگم کے بار بار کہنے کے باوجود وہ رائے صاحب کے قریب سے نہیں ہٹا تھا۔ تین دن بعد رائے صاحب کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور وہ بنگلے میں منتقل ہو گئے۔

”دیکھو دلاور۔“ آصفہ بیگم نے دلاور کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اب رائے صاحب گھر آ گئے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے یہاں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ تم اوپر والے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ خدا نخواستہ اگر تم بیمار پڑ گئے تو پھر رائے صاحب کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میری بات مان لو اور جا کر سو جاؤ۔“

”جی بہتر ہے۔“ دلاور نے کہا اور اوپر چلا گیا۔ امجد کا کمرہ بھی اوپر ہی تھا۔ دلاور دوسرے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا۔ رائے منصور بڑی تیزی سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ اب وہ صبح شام لان میں تھوڑی بہت چل قدمی بھی کر لیتے۔ دلاور دونوں وقت باقاعدگی سے انہیں کمرے سے نکال کر لان میں لے جاتا۔ دلاور رائے صاحب کی اس طرح خدمت کر رہا تھا کہ اگر رائے صاحب کا اپنا بیٹا بھی یہاں ہوتا تو شاید وہ بھی اتنی لگن سے ان کی خدمت نہ کر سکتا۔ امجد، دلاور کی اس خدمت گزاری سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

دلاور تہہ دل سے رائے منصور کی خدمت کر رہا تھا لیکن اس دوران وہ نالکہ کو ایک لمحہ کو بھی نہیں بھول سکا تھا۔ وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ نالکہ زندہ بھی ہے یا واقعی مر کھپ چکی ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو کہاں ہوگی اور کس حالت میں ہوگی۔ نالکہ کے بارے میں سوچتے ہوئے بعض اوقات اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی...

اس روز وہ صبح رائے صاحب کو ناشتہ کروانے کے بعد ان کے کمرے سے نکلا تو رقیہ نے بتایا کہ بیگم صاحبہ اسے بلارہی ہیں۔ دلاور ڈرائنگ روم میں گیا۔ آصفہ بیگم وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

”بیٹھو دلاور۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔ ”اپنی پریشانیوں میں، میں تو نالکہ کو بھول ہی گئی تھی۔ اس دن تم کہہ

رہے تھے کہ لمبی کمائی ہے۔ فرصت میں سناؤ گے۔“

”جی بیگم صاحبہ!“ دلاور نے کہا۔ ”اس روز آپ نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد شاید ساری دنیا ہی نالکہ بی بی کی دشمن ہو گئی ہے۔“

”ہم نے تو سنا تھا کہ وہ سندھ کے کسی قصبے یا کوٹھ میں ہے۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔

”جی بیگم صاحبہ! اطلاع تو یہی ملی تھی کہ نالکہ، انسپکٹر صوبہ خان کی جس پانچویں فرار ہوئی تھی وہ بخش علی لاشاری نامی قصبے کے قریب چلی ہوئی پائی گئی تھی اور شبہ یہ تھا کہ وہ اور اس کے ساتھ بھاگنے والی دوسری لڑکی بخش علی لاشاری یا آس پاس کے کسی کوٹھ میں ہوں گی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو صورت حال بالکل مختلف نکلی۔ مجھے پتہ چلا کہ نالکہ اور سسی نامی دوسری لڑکی کسی ہندو سیٹھ کے ہاتھ لگ گئی تھی جس نے انہیں مال غنیمت سمجھ کر سرحد پار بھیجنے کی کوشش کی لیکن ریگستان میں پہنچ کر وہ دونوں ہندو سیٹھ کے آدمیوں کو دھوکا دے کر بھاگ گئیں۔ ہندو سیٹھ کے آدمی تو کسی نہ کسی طرح ہستی تک واپس پہنچ گئے لیکن نالکہ اور سسی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ تھر کے تمام تھانوں کو دائر لیس پر ان کے بارے میں اطلاع دے دی گئی۔ میں کئی روز تک اس گاؤں میں اسی لیے ٹھہرا ہوا کہ شاید کسی طرف سے کوئی اطلاع مل جائے لیکن کوئی اطلاع نہیں ملی۔ وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ تھر کا صحرا بڑا خطرناک ہے۔ اگر کوئی بھٹک جائے تو اس کا زندہ بچنا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرا شبہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے وہ سرحد پار کر کے راجستھان پہنچ گئی ہوں۔“

”ظلم خدا کا!!“ آصفہ بیگم دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”اس ہندو سیٹھ کے خلاف کسی نے کچھ نہیں کیا؟“

”چھوٹے علاقوں میں پیسے والے ہی آقا و ان داتا سمجھے جاتے ہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”اور پھر سندھ کے چھوٹے علاقوں میں تو عجیب ہی صورت حال ہے۔ زمینوں پر وڈیروں کا قبضہ ہے اور معیشت پر ہندوؤں کا۔ پولیس والے اور سرکاری ملازمین تنخواہ تو سرکار سے لیتے ہیں لیکن ان پر حکم وڈیروں اور سیٹھوں کا چلتا ہے۔ پولیس والے ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ میں نے تھانیدار کو اس کے فرض کا احساس دلایا تو شاید اس کا ضمیر جاگ اٹھا اور اس نے اس ہندو سیٹھ کو نالکہ بی بی اور سسی کے اغوا کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ تین دن بعد جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اسے صرف بیس ہزار کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔“

”تو اب نالکہ کا پتہ کیسے چلے گا؟“ آصفہ بیگم نے کہا۔

”میں نے تو یہ سوچا تھا کہ رائے صاحب بڑے افسروں سے مل کر کچھ کریں گے مگر وہ تو خود ہی بیمار پڑ گئے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے انہیں نالکہ بی بی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”اچھا کیا تم نے انہیں یہ خبر نہیں سنائی۔ ابھی انہیں کچھ بتانا بھی مت۔ بس ٹالتے رہو۔ میں امجد سے بات کروں گی۔“ آصفہ بیگم کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔

دوسرے دن صورت حال نے ایک نئی کرٹ ل۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رائے منصور سو رہے تھے۔ دلاور بھی ڈرائنگ روم میں قالین پر لیٹا اور نگہ رہا تھا کہ خادم نے آکر اسے اٹھا دیا۔

”باہر پولیس والے آئے ہیں، تمہیں پوچھ رہے ہیں۔“ خادم نے بتایا۔

”پولیس!!“ دلاور کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ وہ اٹھ کر باہر آیا تو امجد گیٹ پر کھڑا پولیس والوں سے باتیں کر رہا تھا۔

”دلاور تمہارا نام ہے؟“ اے ایس آئی نے دلاور کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں میں ہی دلاور ہوں کیا قصہ ہے؟“ دلاور بولا۔

”تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔ معاملہ ایک قتل کا ہے۔ پورا قصہ تمہیں تھانے پہنچ کر ہی بتایا جائے گا۔ چلو ہمارے ساتھ۔“ اے ایس آئی نے کہا۔

”لیکن... میں تو کئی روز سے اس جنگل کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلا۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”دیکھو دلاور۔“ اے ایس آئی نے کہا۔ ”ہم رائے منصور صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے تمہیں ہتھکڑی نہیں لگا رہے۔ بہتر ہو گا کہ تم خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں پولیس والوں جیسا رویہ اختیار کرنا پڑے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلنے کو تیار ہوں۔“ دلاور نے کہا پھر امجد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”رائے صاحب کو بالکل مت بتائیے کہ مجھے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اگر میرے بارے میں پوچھیں تو یہ کہہ دیں کہ میں اپنی خالہ کے گھر چلا گیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم ان کے ساتھ جاؤ... میں بھی تمہارے پیچھے ہی آ رہا ہوں۔“ امجد نے کہا۔  
دلاور نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر خاموشی سے پولیس والوں کے ساتھ چل پڑا۔

..... \* \* \* .....

رام گڑھ میں واقع بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی را کے ٹریننگ کیمپ میں نائلہ درانی اور سسی کی برین واشنگ شروع ہو چکی تھی۔

پہلی رات کے بعد کی صبح کو نائلہ اور سسی کو بہترین ناشتہ کروایا گیا اور پھر وجہی اے سے پورے کیمپ میں کھماتی رہی۔ یہ کیمپ تقریباً ”تین مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان وسیع و غریب میدان میں یہ کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ اس میدان میں بھی جگہ جگہ بڑے بڑے چٹان نما پتھر موجود تھے۔ کیمپ کے چاروں طرف پہاڑیوں پر خاردار تاروں کے اونچے دوہرے جنگل صاف نظر آ رہے تھے۔

ان خاردار تاروں کے بارے میں وجہی نے غلط نہیں کہا تھا۔ پہلے جنگلے اور دوسرے جنگلے کے درمیان تقریباً ”پندرہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی اس جگہ خونخوار کتے کھلے چھوڑ دیے جاتے جو دن کی روشنی پھیلنے تک پھرتے رہتے۔ پہلے جنگلے کے اندر کی طرف اور دوسرے جنگلے کے باہر کی طرف جگہ جگہ بارودی سرنگیں بھیجی ہوئی تھیں۔

نائلہ نے دوسری جنگ عظیم کے موضوع پر بننے والی کئی فلمیں دیکھی تھیں۔ جن میں جرمن نازیوں کے قائم کئے ہوئے جنگلی کیمپ دکھائے گئے تھے۔ وہ کیمپ بھی اسی طرح بنائے جاتے تھے اور حفاظتی انتظامات اتنے سخت ہوتے تھے کہ ان کیمپوں کے قیدی فرار کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بھارتی حکمرانوں نے پاکستانی نوجوانوں کو تحریب کاری اور دہشت گردی کی ٹریننگ کے لیے یہ کیمپ بالکل اسی طرز پر بنائے تھے۔ بلکہ ان میں حفاظتی انتظامات کچھ زیادہ ہی تھے۔ ان کیمپوں کے چاروں طرف بھی واچ ٹاور بنے ہوئے تھے جہاں ہلکی مشین گنتیں نصب تھیں۔ ان واچ ٹاورز کے علاوہ پہاڑیوں پر ایسی جگہوں پر مسلح محافظ چوبیس گھنٹے موجود

رہتے تھے جو دوسروں کو تو نظر نہیں آتے تھے البتہ وہ پورے کیمپ پر نگاہ رکھ سکتے تھے۔  
 پہاڑیوں کے درمیان میدان میں مناسب فاصلوں پر خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان خیموں میں ٹریننگ حاصل کرنے والے رہائش پذیر تھے۔ بعض خیموں میں کیمپ سے تعلق رکھنے والے بھارتی آفیسرز بھی رہ رہے تھے۔

ان پہاڑیوں میں کئی غار بھی تھے۔ بعض غاروں کو دفتر کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ بعض میں کیمپ کے افسروں کی رہائش تھی اور بعض غاروں میں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا تھا۔  
 کیمپ کا ایک حصہ فائرنگ رینج کے لیے مخصوص تھا۔ جہاں دہشت گردی، نشانہ بازی اور آتشیں ہتھیاروں کے استعمال کی ٹریننگ دی جاتی۔ دہشت گردوں کو تربیت کے دوران جو گولہ بارود اور کارتوس وغیرہ دیئے جاتے وہ تمام ڈمی یا ڈڈ ہوتے تھے۔ ان سے دھماکے تو اتنے ہی شدید ہوتے تھے لیکن وہ نقصان کا باعث نہیں بنتے تھے۔

کیمپ میں پاکستان کے خلاف زہریلے مواد پر مشتمل لٹریچر کے علاوہ بڑے بڑے شہروں خصوصاً "سندھ کے بڑے شہروں کراچی اور حیدر آباد کے تفصیلی نقشے بھی موجود تھے۔ ان نقشوں میں شہر کی ہر گلی، ہر موڑ، بڑی بڑی عمارتوں اور اہم تنصیبات کی اس طرح نشان دہی کی گئی تھی کہ واقعی حیرت ہوتی تھی۔ بڑی بڑی عمارتوں اور بعض اہم تنصیبات کے ماڈل بھی موجود تھے۔

وجہی انہیں کیمپ میں سمجھانے کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قیام پاکستان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ناکہ نے حسب معمول دلی ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا تھا۔ اس طرح وہ اس کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں تو کر رہی تھی لیکن اس کی باتیں دل پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھیں۔ دل میں تو کلمہ طیبہ تھا۔ اس میں کسی اور بات کے لیے جگہ کہاں تھی؟  
 ناکہ کو سسی کی زیادہ فکر تھی۔ اس کا دل ایک ایسا کورا کاغذ تھا جس پر کوئی بھی تحریر لکھی جاسکتی تھی۔ جب سے ان دونوں کا ساتھ ہوا تھا ناکہ سسی کو دین کی باتیں بتاتی رہتی تھی۔ ان بزرگان دین کی زندگی کے حالات سناتی رہتی تھی جنہوں نے اسلام کی خاطر بڑے دکھ اٹھائے تھے اور دنیا تاج دی تھی۔

لیکن۔۔۔ سسی کو دین کی باقاعدہ تربیت نہیں ملی تھی۔ اس کی ساری زندگی اس چھوٹے سے گھوٹھ میں گزری تھی جہاں صرف چار گھر تھے۔ ان چار گھروں میں بھی صرف اس کے ماں، باپ اور ماموں ہی باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے۔ بچے سارا دن کھیل میں مصروف رہتے۔ نہ انہیں نماز روزے کے بارے میں کچھ بتایا جاتا اور نہ ہی یہ بتایا جاتا کہ یہ ملک کس طرح حاصل کیا گیا۔ اور اس کی حفاظت کس طرح کی جانی چاہئے۔

سندھ کے سرحدی علاقوں کی آبادی کا زیادہ حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ اس علاقے کی زمینوں پر وڈیروں کا قبضہ تھا اور معیشت پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ مسلمان کاشتکار اور ہاری وقت کی چکی کے ان دونوں پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے۔ مسلمان وڈیرے اور ہندو سینٹھ۔ یہ غریب کاشتکار وقت کے گٹھنے میں اس طرح جکڑی ہوئے تھے کہ نسل در نسل غلام بن کر رہ گئے تھے۔ ان کا بال بال قرضوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ان کی زمینیں یا تو وڈیروں کے قبضے میں تھیں یا ہندو مہاجنوں کے پاس رہن رکھی ہوئی تھیں۔ سندھ کے ان سرحدی علاقوں میں ہندو کلچر کا غلبہ تھا۔ سادہ لوح مسلمان انہی کی تہذیب اپنائے ہوئے تھے۔ انہی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ مملکت اسلامیہ کے بارے میں ان کا شعور

جاگر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ ایک دھرتی پر رہ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر تو ایسے بھی تھے جو پاکستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اس میں ان کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ تصور تو پاکستانی حکمرانوں کا تھا جنہوں نے کبھی سنجیدگی سے ان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ آنے والی ہر حکومت انہیں صرف عوام سمجھتی رہی۔ نہ تو ان میں زندگی کا مقصد پیدا کیا گیا اور نہ ہی ان کا سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔ سیاست کے نام پر وہ صرف ووٹ کا نام جانتے تھے۔ ووٹ ان کے لیے کانڈ کی ایک پرچی تھی جو وڈیروں کے کٹنے پر کانڈ پر چپے ہوئے نشانوں میں سے کسی ایک نشان پر مہر لگا کر ایک ڈبے میں ڈال دی جاتی تھی اور بس۔ سیاست میں اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس کے برعکس بھارتی حکمران اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہندو ان علاقوں میں نہ صرف کھل کر اپنے مذہب کا پرچار کر رہے تھے بلکہ سیاسی طور پر بھی انہیں گمراہ کر رہے تھے۔ سرحدوں کے قریب بعض علاقے ایسے بھی تھے جہاں اسکولوں میں دینیات کی کتاب ممنوع تھی۔ یہاں مشاہیر اسلام اور تحریک پاکستان کے مجاہدین کے بارے میں کچھ پڑھانے کے بجائے مباحثات بڑھائی جاتی۔ ان علاقوں میں اسکولوں کے طالب علم پاکستان کے قومی ترانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے لیکن بندے ماترم انہیں خوب یاد تھا۔ وہ قائد اعظم، علامہ اقبال، سرسید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر اور سردار عبدالرب نثری لیاقت علی خان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہ نام ان کے لیے اجنبی تھے البتہ گاندھی، نہرو اور پٹیل کی سوانح انہیں زبانی یاد تھیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ سندھ کے ان سرحدی علاقوں میں رہنے والے مسلمان بہت سچے اور کھرے مسلمان تھے۔ لیکن ان کی سادہ لوحی سے فائدہ ہندو اٹھا رہے تھے۔ پاکستان کی مذہبی اور تبلیغی جماعتیں بڑے شہروں میں تو اپنے تبلیغی مشن جاری رکھے ہوئے تھیں لیکن ان چھوٹے چھوٹے گوشوں کی طرف ان علماء نے بھی کبھی توجہ نہیں دی تھی جہاں سادہ لوح مسلمانوں پر ہندوؤں نے یلغار کر رکھی تھی۔

سی کی کا تعلق بھی تو اسی علاقے سے تھا۔ وہ ان پڑھ تھی۔ پاکستان کے بارے میں وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ یہ ایک دھرتی ہے جہاں وہ پشت پائست سے رہ رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ اس لیے نائلہ کو زیادہ اندیشہ تھا کہ وہ آسانی سے و جنتی کی باتوں میں آسکتی ہے۔ اس لیے نائلہ نے سسی کو یہ بات اچھی طرح سمجھادی تھی کہ و جنتی جب اس سے اس قسم کی باتیں کر رہی ہو تو وہ دل ہی دل میں کلمہ طیبہ یا درود شریف کا ورد کرتی رہے۔ اس طرح و جنتی کی زہریلی باتیں اس کے دل پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔

نائلہ نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ کیمپ میں و جنتی جیسی اور بھی کئی حسین لڑکیاں موجود تھیں ان کی موجودگی کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا۔ کیمپ میں ٹریننگ حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تفریح اور دل لگی کا سامان! کل رات و جنتی خود ہی تو نائلہ کو بتا چکی تھی کہ کیمپ میں ٹریننگ حاصل کرنے والے اکثر نوجوان اس کے شیدائی ہیں۔

تین دن تک و جنتی، نائلہ اور سسی کو باتوں ہی باتوں میں لیکچر پلاتی رہی۔ اس کا انداز واقعی بڑا دل نشیں تھا۔ کوئی بھی شخص نہایت آسانی سے اس کی باتوں سے متاثر ہو سکتا تھا۔ جن نوجوانوں کو یہاں ٹریننگ کے لیے لایا جاتا تھا ایک تو وہ کسی نہ کسی صورت میں پہلے ہی اپنے ملک سے ناراض تھے اور پھر و جنتی جیسی حسین عورتوں کی باتیں ان کے ذہن اور دل کو زیادہ متاثر کرتی تھیں۔ اس لیے جب وہ اس کیمپ سے واپس جاتے تو ان کے دلوں میں اپنے ہی وطن اور اس کے لوگوں کے لیے شدید نفرت بھری ہوئی ہوتی۔ قومیت کا احساس



مٹ چکا ہوتا۔ وہ صرف دہشت گرد ہوتے۔۔۔ ان کا کام صرف اور صرف اپنے آقاؤں کے احکامات کی تعمیل کرنا ہوتا۔ انہیں اس بات کا کوئی احساس نہ رہتا کہ جب وہ کسی پر رونق بازار میں آٹومیک راکفل سے اندھا دھند فائرنگ کریں گے تو کتنے بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔ کتنی عورتوں کے سہاگ اجڑیں گے، کتنے بچے یتیم ہوں گے اور کتنے ماں باپ ایسے ہوں گے جن کے بڑھاپے کے سہارے جھن جائیں گے۔ ان کا یہ احساس ختم کرنے اور ضمیر کا گلا گھونٹنے کے لیے ہی تو یہ ٹریننگ کیمپ قائم کئے گئے تھے۔

تین دن بعد نائلہ اور سسی کو ایک غار میں لے جایا گیا۔ اس غار میں را کے ایک آفسر کا دفتر قائم تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وجہی بھی ان کے ساتھ تھی۔ نائلہ اور سسی تو کرسیوں پر بیٹھ گئیں مگر وجہی ایک طرف گھڑی رہی۔

”ارے تم بھی بیٹھو نا وجہی، تمہاری یہ مہمان کیسی ہیں؟“ اس آدمی نے کہا۔

”تھینک یو مسٹر رام سرورپ۔“ وجہی کہتے ہوئے نائلہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”یہ دونوں تو میری بڑی اچھی دوست بن گئی ہیں لیکن ایک بات ہے سہرا“

”وہ کیا؟“ رام سرورپ نے سوالیہ نگاہوں سے وجہی کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک فائل کھلا ہوا رکھا تھا اور گفتگو کے دوران وہ بار بار فائل کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔

”پاکستان میں ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں مسٹر رام سرورپ۔“ وجہی نے جواب دیا۔ ”یہ مس نائلہ۔۔۔ پاکستان کے ضلع رحیم یار خان کی ایک بہت بڑی زمیندار ہیں لیکن اس کے والدین کے انتقال کے بعد اس کے اپنے ہی خاندان کے لوگ اس کے دشمن بن گئے۔ اس کی پھوپھی اور اس کا بیٹا جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے اسے قتل کرنا چاہتے تھے اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ قانون کے محافظ اسے تحفظ فراہم کرنے کی بجائے اس کے دشمنوں کا ساتھ دیتے رہے۔ اس کی پھوپھی اور کزن نے نہ صرف پولیس کے ذریعے اسے جھوٹے الزامات میں پھنسانے کی کوشش کی بلکہ اسے قتل کروانے کے لیے پانچ لاکھ روپے کے عوض ایک پولیس انسپکٹر کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔ وہ تو ان کی قسمت اچھی تھی کہ ہمارے ایک دوست سیٹھ کٹول کے ہاتھ لگ گئیں۔ وہ انہیں اس پولیس انسپکٹر سے بچانے کے لیے اس کی پہنچ سے دور کسی محفوظ مقام تک بھیجنا چاہتا تھا لیکن یہ غلط سمجھیں اور ریگستان میں سیٹھ کے آدمیوں کو دھوکا دے کر بھاگ نکلیں۔ بھاری دودن تک ریگستان میں موت سے لڑتی رہیں اور بالا خرہ اجسٹھان کے ایک گاؤں گٹ والا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ گاؤں کے لوگوں نے انہیں بچالیا۔ اگر یہ دونوں اس گاؤں تک نہ پہنچ جاتیں تو ریگستان ہی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکی ہوتیں۔“

”مس وجہی!“ رام سرورپ نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”اسی طرح کی باتیں تو اپنوں کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہیں۔ اگر اپنے ہی دشمن ہو جائیں تو پھر ظاہر ہے کہ انسان اپنے بچاؤ کے لیے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ ہندو سرکار نے پاکستان کے ایسے ہی ستائے ہوئے اور مظلوم لوگوں کے لیے خصوصی شعبہ قائم کیا ہے۔ ہمارا یہ شعبہ ان مظلوم پاکستانیوں کی مدد کرتا ہے اور ان میں حوصلہ پیدا کر کے انہیں اس قابل بناتا ہے کہ یہ واپس جا کر ظلم کا مقابلہ کر سکیں۔ بات دراصل یہ ہے مس وجہی۔۔۔“ اس نے خاموش ہو کر نائلہ کی طرف دیکھا۔ ”بلکہ مس نائلہ ہم سے زیادہ بہتر جانتی ہوں گی کہ پاکستان میں آج تک کوئی ایسی حکومت قائم نہیں ہو سکی جس کے دل میں عوام کا درد ہو۔ پاکستان میں جمہوریت کا ڈھنڈوڑہ تو پٹنا جاتا ہے لیکن وہاں جمہوریت

نام کی کوئی چیز نہیں۔ جمہور کو تو ہر حکومت نے نظر انداز کیا ہے۔ حکمران صرف اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف رہے۔ دوسری پارٹیوں کے ممبروں کو توڑنے کے لیے تو کروڑوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں لیکن عوام کے مسائل حل کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا۔ عوام محرومی کا شکار ہیں۔ وہ اپنے حکمرانوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔ حکمرانوں کو عوام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ اپنے ہی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں بلکہ اب تو پاکستان میں انتہائی سیاست شروع ہو چکی ہے۔ ہر حکومت پچھلی حکومت کی باقیات ختم کرنے میں مصروف نظر آتی ہے۔ جب صورت حال ایسی ہو تو عوام پر توجہ کیسے دی جاسکتی ہے۔ حکمرانوں پر سے عوام کا اعتماد ختم نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ کیا ایسے میں عوام عدم تحفظ کا شکار نہیں ہوں گے۔ خود مس نائلہ کی مثال سامنے ہے۔ اگر قانون کے محافظ اسے تحفظ فراہم کرتے تو یہ اس وقت بڑے اطمینان اور سکون سے اپنے گھر میں بیٹھی ہوتی۔ صرف مس نائلہ ہی نہیں۔ اس کیمپ میں رہنے والا ہر نوجوان اس قسم کے حالات کا شکار ہو کر یہاں تک پہنچا ہے۔ انہیں کیمپ کے دوسرے لوگوں سے ملاؤ ناکہ یہ ان کے تاثرات سنیں اور ان کی باتوں سے انہیں پتہ چل جائے کہ ہم پاکستانی سرکار کے معاملات میں مداخلت نہیں کر رہے بلکہ ان لوگوں کی مدد کر رہے ہیں جو اپنے ہی دیش میں اپنے ہی حکمرانوں کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔

”یس مسٹر سروپ۔“ وجنتی نے جواب دیا۔ ”آج میرا یہی پروگرام ہے۔“

”اور وہ پنڈت کا کیا قصہ تھا؟“ رام سروپ نے پوچھا۔

”راجستھان کے جس گاؤں میں انہوں نے پناہ لی تھی وہاں کے مندر کا پنڈت رام ناتھ بلاوجہ ان کا دشمن ہو گیا تھا۔ وہ انہیں گاؤں سے نکلوانا چاہتا تھا۔ اس چکر میں اس نے گاؤں کے ایک آدمی کو قتل بھی کر دیا تھا۔ اس پر کچھ اور بھی الزامات ہیں۔ رام گڑھ کی پولیس اس کے بارے میں انکوائری کر رہی ہے۔“

وجنتی نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ رام سروپ نے کہا۔ ”میں رام گڑھ کے ایس ایس پی سے بات کرتا ہوں اور یہ سفارش کروں گا کہ وہ پنڈت سزا سے نہ بچ سکے۔ پنڈت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ دوسری قومیت رکھنے والوں کو پریشان کرتا رہے۔ ہند سرکار کی پالیسی تو یہی ہے تاکہ ہندوستان میں بسنے والے ہر شخص کو مساوی حقوق حاصل ہوں خواہ اس کا تعلق کسی بھی قومیت سے ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں تاکہ! کسی بھی ملک میں بسنے والے ہر شخص کو آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا فرقے سے ہو۔“

”جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر رام سروپ۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ اس کا دل تو چاہا تھا کہ کھری کھری سناوے کہ سیکولر ازم کا دعویٰ کرنے والے اس ملک میں سکھوں کے گولڈن ٹمپل کو آگ کس نے لگائی تھی؟ باری مسجد کو کس نے شہید کیا تھا؟ گوا میں عیسائیوں کے چرچ کو جلا کر کس نے راکھ کیا تھا؟ رام سروپ نے پاکستانی حکمرانوں کے مظالم کی ایک طویل داستان تو سنا دی تھی لیکن ہندوستان میں عام آدمی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ شاید اس کے علم میں نہیں تھا۔ نائلہ اس کی باتوں کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے زبان بند رکھی تاکہ اس کا یہ راز نہ کھل جائے کہ وہ ابھی تک وجنتی کی باتوں میں نہیں آسکی۔ وہ تو ان پر یہی تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ وجنتی کی باتوں سے متاثر ہو رہی ہے۔

”ٹھیک ہے وجنتی۔“ رام سروپ نے کہا۔ ”انہیں لے جا کر دوسروں سے ملاؤ۔ میں پھر کسی وقت ان سے تفصیلی گفتگو کروں گا۔“

”یس سرا“ و جنتی نے کہتے ہوئے سیٹ چھوڑ دی۔

نانکھ نے سسی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں بھی اٹھ کر و جنتی کے ساتھ عمار سے باہر آ گئیں۔  
 ”آؤ“ میں تمہیں ایک ایسی لڑکی سے ملاؤں جو تمہاری طرح اپنی ہی کی ستانی ہوئی ہے۔ وہ بڑی دلچسپ لڑکی ہے۔ تم اس سے مل کر یقیناً ”خوش“ ہوگی۔“ و جنتی کہتے ہوئے انہیں ایک خیمے میں لے گئی۔

خیمے میں اسپرنگ والا ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی میز اور دو تین کرسیاں تھیں۔ خیمے کی چھت والے بالوں کے ساتھ بیگروں پر چند کپڑے بٹھے ہوئے تھے۔ یہ تمام مردانہ کپڑے تھے۔ ایک کرسی پر ایک جوان اور خوبصورت لڑکی اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے دونوں پیر پلنگ پر رکھے ہوئے تھے اور پشت کرسی کی پشت سے تکی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب تھی۔ کتاب کا نام گریٹر انڈیا تھا۔ میز پر بھی کچھ پمفلٹ اور کتابچے بکھرے ہوئے تھے۔ اس لڑکی نے نیلی جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ لڑکی کی عمر بائیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد، سڈول جسم اور چہرے کے نقوش بے حد دلکش تھے۔ انہیں دیکھ کر لڑکی نے پیر پلنگ سے ہٹائے اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔  
 ”ہیلو و جنتی!“ وہ مسکراتے ہوئے بولی، پھر باری باری نانکھ اور سسی کی طرف دیکھنے لگی۔ ”ہیو، تم لوگ کھڑی کیوں ہو؟“

سسی پلنگ کی پٹی پر ٹک گئی اور نانکھ اور و جنتی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

”لو... یہ کھاؤ۔“ لڑکی نے میز پر پڑی ہوئی کاجو سے بھری ہوئی پلیٹ نانکھ کی طرف بڑھادی اور سسی کو بھی اشارہ کیا۔

”یہ سلطانہ ہے۔“ و جنتی نے تعارف کرایا۔ ”اور سلطانہ“ یہ نانکھ ہے اور یہ سسی... یہ دونوں تمہاری ہم وطن ہیں۔ تم لوگ باتیں کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ و جنتی اٹھ کر خیمے سے باہر چلی گئی۔  
 و جنتی کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سلطانہ کی پیدائش یوں تو سیالکوٹ کی تھی لیکن اس کی زندگی کا زیادہ حصہ لاہور میں گزرا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لیا تو کالج کے ایک لڑکے سے دوستی ہو گئی۔ ندیم اس سے عمر میں کئی سال بڑا تھا اور تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ جس طرح ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق کسی بہت بڑے گھرانے سے ہے۔ ہر دس پندرہ روز بعد اس کے پاس ایک نئی گاڑی نظر آتی۔ اسے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لگتا تھا جیسے وہ محض وقت گزارنے کے لیے کالج آتا ہے۔

سلطانہ سے گفتگو میں پبل ندیم نے ہی کی تھی اور پھر ان میں دوستی بڑھتی گئی۔ پھر اکثر یوں ہونے لگا کہ وہ سلطانہ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر سیر و تفریح کروا تا رہتا۔ کبھی شالامار باغ، کبھی جاناگیر کا مقبرہ، کبھی شاہی قلعہ اور کبھی راوی کی سیر...

تین مہینوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے ان کی ملاقاتیں کالج کے اوقات کے دوران ہی ہوتی تھیں لیکن ایک روز اس نے سلطانہ کو اپنے ایک دوست کے ہاں دعوت میں چلنے کو کہا تو سلطانہ سوچ میں پڑ گئی۔ دعوت رات کو تھی اور سلطانہ کو شام کے بعد گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی لیکن ندیم کے اصرار پر وہ اس شام اپنی ایک سہیلی کے ہاں جانے کا بہانہ کر کے گھر سے نکل آئی۔ ندیم ایک گلی کے موڑ پر گاڑی میں اس کا انتظار تھا۔

ندیم، سلطانہ کو لے کر گلبرگ کی ایک کوٹھی میں پہنچ گیا۔ اور تب سلطانہ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ

ندیم وہ نہیں جو اپنے آپ کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ کسی بڑے گھر کا فرد نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق ایک ایسے گروہ سے تھا جو نہ صرف منشیات کی تجارت کرتا تھا بلکہ یہ لوگ معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو پھانسل کر انہیں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ ندیم اب تک کئی لڑکیوں کو پھانسل کر ان کے دام کھڑے کر چکا تھا۔

گلابرگ والی اس کو خفی میں دو آدمی پہلے سے ہی موجود تھے۔ وہ لوگ اسے کو خفی کے تہ خانے میں لے گئے۔ وہ دونوں شکل ہی سے بد معاش نظر آتے تھے۔ تہ خانے میں لے جا کر پہلے ندیم نے نالکے کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور پھر دوسرے غنڈے اسے بھنبھوڑتے رہے۔ سلطانہ کی چیخوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

سلطانہ کو کئی روز تک گلابرگ کی اس کو خفی کے تہ خانے میں رکھا گیا اور پھر اسے ایک اور گروہ کے ہاتھ فروخت کر کے ساہیوال پہنچا دیا گیا۔ اسے تقریباً دو مہینوں تک ساہیوال میں رکھنے کے بعد ایک تیسرے گروہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جو اسے کراچی لے آیا۔ کراچی میں بھی سلطانہ کئی ہاتھوں میں بکتی ہوئی شانہ نامی ایک عورت کے پاس پہنچ گئی۔ شانہ اونچے درجے کی طوائف تھی۔ فیڈرل بی ایریا کی ایک شاندار کو خفی میں اس نے اپنا اڈہ قائم کر رکھا تھا جہاں شہر کے بڑے بڑے معززین اور صنعتکار بھی آتے۔ شانہ کے پاس کئی لڑکیاں تھیں وہ ٹیلی فون پر بھی بڑے بڑے لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرتی تھی اور اسے شانہ نے ہوم سروس کا نام دے رکھا تھا۔

سلطانہ نے کم از کم تین مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ شاید نہیں جانتی تھی کہ اس قسم کے لوگوں کے چنگل میں پھنسنے کے بعد کوئی لڑکی نہیں نکل سکتی تھی... سلطانہ نے فرار کی تیسری کوشش شانہ کے گھر سے کی تھی لیکن بد قسمتی سے پولیس کے ہاتھ لگ گئی۔ سلطانہ نے پولیس کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا مگر پولیس آفسر نے اس کی مدد کرنے کی بجائے شانہ کو ٹیلی فون پر اس کے بارے میں اطلاع دے دی۔ شانہ فوراً ہی تھانے میں پہنچ گئی۔ وہ صرف دس منٹ تک پولیس آفسر سے سرگوشیاں کرتی رہی پھر سلطانہ کو اپنے ساتھ لے کر کو خفی واپس آگئی۔ سلطانہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ پولیس آفسر نے بھی شانہ سے اس کی قیمت وصول کر لی تھی۔

سلطانہ کے دل میں نفرت کچھ اور بڑھ گئی وہ ان لوگوں سے اپنی بربادی کا انتقام لینے کے منصوبے بنانے لگی لیکن وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس پارہی تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً ایک مہینے کے بعد کو خفی میں آئے والے ایک نوجوان گاہک نے سلطانہ کو وہاں سے نکالنے کا وعدہ کیا اور اس کے ایک ہفتہ بعد وہ نوجوان واقعی سلطانہ کو اس کو خفی سے نکال کر میرپور خاص لے آیا۔

سلطانہ پر جلد ہی اس نوجوان کا راز فاش ہو گیا۔ وہ راکا ایجنٹ تھا۔ اس نوجوان نے سلطانہ کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ اگر وہ معاشرے سے اپنی بربادی کا انتقام لینا چاہتی ہے تو اسے دوسروں کی مدد حاصل کرنا ہوگی۔ سلطانہ تو انتقام لینا چاہتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی مدد کرنے والے کون ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت نیا چھوڑ اور ہسپتال سے ہوتی ہوئی سرحد پار کر کے راجستھان میں داخل ہو گئی۔ وہ نوجوان اس کے ساتھ تھا جو سلطانہ کو بے سندرنامی بھارتی قصبے میں کچھ اور لوگوں کے حوالے کر کے واپس آ گیا۔

سلطانہ کو بے سندر سے جیل میں پہنچا دیا گیا۔ وہ تقریباً دو ہفتے وہاں رہی، پھر رام گڑھ کے اس کمپ میں پہنچا دیا گیا جہاں اسے تربیت دی جانے لگی۔

نالکے کو سلطانہ کی باتوں سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ یہاں کے لوگوں سے بے

حد متاثر ہے۔ اس کے ذہن کی مکمل طور پر برین واشنگ کردی گئی تھی اور اب اس کے خیال میں پاکستان کا قیام ہی غلط تھا۔

نانکھ، سلطانہ سے باتیں کرتے ہوئے بے حد محتاط تھی۔ سلطانہ کی باتوں سے اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ اپنی تربیت مکمل کر چکی تھی اور ہفتہ دس دن میں واپس جانے والی ہے۔ اس روز نالکھ کو کچھ اور لوگوں سے بھی ملایا گیا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو بھارتیوں کے ظلم میں پوری طرح جکڑے جا چکے تھے۔ نالکھ سے ان لوگوں کی ملاقاتوں کا مقصد اسے یہ تاثر دینا تھا کہ اس کے ملک میں عوام پر واقعی ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اور وہ اپنے ملک کے خلاف کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی میں حق بجانب ہیں اور نالکھ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اس لیے کیا جا رہا تھا کہ تخریب کاری اور دہشت گردی کے ذریعے انتشار پھیلا کر پاکستانی عوام کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا جائے... سندھ کے بڑے شہروں کو خاص طور پر دہشت گردی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ بھارتی حکمرانوں کا اصل مقصد انتشار پھیلا کر سندھ میں علیحدگی کی تحریک کو ابھارنا تھا۔

وہ دن اسی طرح گزر گیا۔ نالکھ اور سسی نے پہلی رات و جنتی کے خیمے میں گزاری تھی جبکہ وہ خود کسی اور خیمے میں چلی گئی تھی، لیکن دوسرے روز نالکھ اور سسی کے لیے ایک علیحدہ خیمے کا بندوبست کر دیا گیا تھا جو و جنتی والے خیمے سے خاصے فاصلے پر تھا۔

اس رات کھانا کھانے کے بعد نالکھ اور سسی اپنے خیمے میں لیٹی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ یکمپ کے کسی خیمے سے ٹی وی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ بھارتیوں نے پاکستانی نوجوانوں کی اخلاقی بربادی کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ تشدد اور دہشت گردی کی ترغیب دینے والی بھارتی فلموں کے علاوہ ان نوجوانوں کو عوام فلمیں بھی فراہم کی جاتیں جنہیں وہ وی سی آر پر دیکھتے رہتے۔

نالکھ نے سسی کی طرف دیکھا۔ وہ سوچتی تھی۔ نالکھ بہت دیر تک بستر پر لیٹی موجودہ صورت حال کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اس کے ذہن میں دلاور کا خیال ابھر آیا۔ وہ دلاور کے بارے میں سوچنے لگی۔ صوبہ خان کے آدمیوں نے جب اس کی گاڑی پر فائرنگ کی تھی تو اس نے دلاور کو بھی زخمی ہو کر سیٹ پر لڑھکتے دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ زندہ بچا تھا یا روشن وغیرہ کی طرح وہ بھی ختم ہو گیا تھا... نالکھ دیر تک جاگتی کبھی دلاور اور کبھی رائے منصور کے بارے میں سوچتی رہی اور بالاخر وہ بھی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

وہ نجانے رات کا کون سا پہر تھا۔ نالکھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سانس گھٹ رہا ہو اور کوئی نا دیدہ قوت اس کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ وہ تین آدمی تھے جو اسے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے منہ میں فوراً "ہی کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ دو آدمیوں نے اسے ٹانگوں سے جکڑ لیا اور ایک نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گرفت میں لے رکھا تھا۔

نالکھ چند لمحوں تک تو کچھ بھی نہ سمجھ سکی لیکن پھر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ اس یکمپ کے لڑکے تھے جو اسے اغواء کر کے لے جا رہے تھے۔ نالکھ کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ اس نے دوسرے پلنگ کی طرف دیکھا۔ سسی اپنے بستر پر نہیں تھی۔ اسے بھی غالباً "اسی طرح اٹھا کر لے جایا جا چکا تھا۔ نالکھ نے چیخا جاہا مگر منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہونے کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکل سکی۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی لیکن ان لوگوں نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ اسی یکمپ کے ٹرینڈ دہشت گرد تھے۔

انہیں یہ بھی تربیت دی گئی تھی کہ کسی کو کس طرح اغوا کر لے جایا جاسکتا ہے۔

وہ لوگ نائلہ کو اٹھائے تیزی سے خیموں کی آڑ لے کر چلتے رہے۔ کسی طرف سے ٹی وی کی آوازاں بھی سنائی دے رہی تھی۔ اور وہ لمحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہے تھے۔ بالا خرہ وہ لوگ نائلہ کو لیے ایک بڑے خیمے میں داخل ہو گئے۔ یہ خیمہ کافی کشادہ تھا۔ فرش پر موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر سات آٹھ کٹن بڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں چھوٹی میز پر ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میز کے نیچے وی سی آر تھا۔ ٹی وی اسکرین پر کسی انگریزی فلم کا نہایت بے ہودہ سین چل رہا تھا۔

سسی قالین پر بے حس و حرکت چت پڑی تھی۔ وہ یقیناً ”خوف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ نائلہ کو بھی قالین پر ڈال دیا گیا۔ ایک نوجوان نے جیب سے لمبے پھل والا چاقو نکال لیا تھا۔ وہ چاقو کی نوک نائلہ کی شہ رگ پر رکھتے ہوئے غرایا۔

”میں تمہارے منہ سے کپڑا نکال رہا ہوں۔ اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو گلا کاٹ دوں گا۔“ اس شخص کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی... نائلہ نے خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ خیمے میں پانچ آدمی تھے۔ اور وہ سب اس کے ہم وطن تھے۔ جو اپنے ہی وطن میں بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہانے کے لیے یہاں دہشت گردی کی تربیت لینے آئے تھے۔

”ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔“ وہی آدمی بولا جس کے پاس چاقو تھا۔ ”بس آج کی رات ہمارے ساتھ گزار لو۔ ہم چار دن سے تمہیں دیکھ رہے ہیں اور آج تو یہ فلم دیکھ کر ہمارے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور تم دونوں کو یہاں اٹھا لائے۔ بس ایک رات۔“

نائلہ نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ اسکرین پر پہلے سے بھی زیادہ بے ہودہ منظر نظر آرہا تھا اس نے رخ پھیر لیا اور دوسرے ہی لمحہ اس نے بڑی نفرت سے چاقو والے کے منہ پر تھوک دیا۔

”یہ تو بہت بری بات ہے مشتاق۔“ اس کے قریب کھڑا ہوا دوسرا آدمی بولا۔ ”ایک لونڈیا نے تمہارے منہ پر تھوک دیا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔“

”تم لوگ باہر جاؤ... اس لونڈیا کو دوسرے خیمے میں لے جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتنا کتنی دیر تک اڑی کرتی ہے۔“ مشتاق نے کہا اور آستین سے چہرے پر سے تھوک پونچھنے لگا۔

وہ چاروں سسی کو ہاتھوں پیروں سے پکڑ کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے باہر لے گئے۔ ”اٹھو! مشتاق نے اسے چاقو سے اشارہ کیا۔

نائلہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس شخص کی شامت ہی آئی تھی جو اس نے اپنے ساتھیوں کو باہر بھیج دیا۔ اب نائلہ آسانی سے اپنا دفاع کر سکتی تھی۔ لیکن اسے سسی کی بھی فکر تھی جو بے ہوش تھی اور وہ درندے اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

”تارو... کپڑے اپنے ہاتھ سے اتارو۔ ورنہ میں اپنا طریقہ اختیار کروں گا۔“ مشتاق نے چاقو سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نائلہ نے اپنی جگہ سے اس طرح حرکت کی جیسے واقعی لباس اتارنا چاہتی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کے ایک پیر کی ٹھوک مشتاق کے چاقو والے ہاتھ پر لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا نائلہ کے دوسرے پیر کی ٹھوک اس کے پیٹ پر پڑی تھی۔

چاقو مشتاق کے ہاتھ سے نکل کر خیمے کی چھت کا کپڑا چیرتا ہوا پھنس گیا۔ پیٹ پر لگنے والی ٹھوکر نے اسے دو ہرا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ نائلہ نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر پہل کرتے ہوئے اس کی جھکی ہوئی گردن پر بیچ جمادیا۔ مشتاق کراہتا ہوا منہ کے بل قالین پر گر ا۔

نائلہ ہوا میں اچھلی اور جب وہ کولہوں کے بل نیچے گری تو اس کے دائیں بازو کی کہنی مشتاق کی پشت پر ریڑھ کی ہڈی کے قریب بائیں جانب لگی۔ مشتاق کے منہ سے بے اختیار زوردار چیخ نکل گئی۔ نائلہ نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر اس کی کھوپڑی پر دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں۔

اسی لمحہ باہر سے ایک ٹھنی ٹھنی سی نسوانی چیخ سنائی دی۔ وہ سسی کے چپنے کی آواز تھی۔ نائلہ نے مشتاق کے سر پر ایک اور ٹھوکہ ماری اور خیمے سے باہر چلا نک لگا دی۔ ٹھنی ٹھنی چیخ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ آواز تیسرے خیمے سے سنائی دی تھی۔ نائلہ اس طرف دوڑی۔

وہ خیمے کے دروازے کے سامنے رک گئی۔ سامنے ایک پلنگ پر دو آدمی سسی کو دلوچے ہوئے تھے۔ سسی مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کا اوپر کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

”چھوڑ دو اسے بزدلو! نائلہ چیخی۔

نائلہ کی آواز سن کر وہ سب اچھل پڑے۔ اور پھر دروازے کے سامنے نائلہ کو دیکھ کر ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مشتاق اس گروپ کا خطرناک ترین آدمی سمجھا جاتا تھا اور یہ سب لوگ اسے اپنا گرو مانتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ دو چار منٹ میں نائلہ کی ساری اکڑفوں نکال دے گا لیکن نائلہ کو اپنے سامنے دیکھ کر انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ خود اس لڑکی کے ہاتھوں چت ہو گیا تھا۔

”ارے پکڑو اسے۔“ ایک آدمی چیخا اور وہ سب دوڑ کر خیمے سے باہر آ گئے۔

نائلہ انہیں خیمے سے باہر ہی نکالنا چاہتی تھی خیمے کے اندر جا کر تو وہ خود پھنس سکتی تھی۔ وہ لوگ جیسے ہی خیمے سے باہر آئے نائلہ ان پر پل پڑی۔ کسی کا مقدر بیچ بنا اور کسی کے حصے میں لگ آئی.....!!!

نائلہ چیخ چیخ کر ان پر تابو توڑ حملے کر رہی تھی۔ ان میں صرف ایک آدمی ایسا تھا جو مارشل آرٹس جانتا تھا لیکن نائلہ نے اسے کوئی داؤ آزمانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ان پر حملے کر رہی تھی۔

اس دوران سسی بھی خیمے سے باہر آ گئی اور اس نے بھی زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ نائلہ بھی ان پر حملے کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ وہ ایک آدمی پر لگ لگانے کے لیے اچھلی مگر اس کا پیر رہٹ گیا اور وہ پشت کے بل گری۔ ان چاروں نے بیک وقت اسے چھاپ لیا۔

شور اور چیخوں کی آواز سن کر بہت سے خیموں سے لوگ نکل آئے۔ مشتاق بھی خیمے سے نکل کر کھوپڑی سہلاتا ہوا آگیا تھا۔ وہ آتے ہی نائلہ کو ٹھوکریں اور گھونے مارنے لگا...

بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ معاملہ سب کی سمجھ میں آگیا تھا۔ چند آدمیوں نے نائلہ اور سسی کو چھڑانے کی کوشش کی مگر مشتاق اور اس کے ساتھیوں پر تو جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ نائلہ اور سسی کو پینٹے رہے۔

شور سن کر کیمپ کے تین محافظ بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے مشتاق اور اس کے ساتھیوں کو وارننگ دی کہ وہ لڑکیوں کو چھوڑ دیں لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالآخر ایک محافظ نے

آٹومک راکٹل سے ہوئی برٹ مارا۔ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ مشتاق اور اس کے ساتھی اب بھی نائلہ اور سسی کو دوپچے ہوئے تھے۔ دو محافظوں نے آگے بڑھ کر مشتاق اور اس کے ساتھیوں کو ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ مشتاق نے ایک محافظ کی راکٹل چھیننا چاہی مگر محافظ کا زور دار گھونرہ اس کے جڑے پر لگا اور وہ چیخا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اب مشتاق کے ساتھی بھی نائلہ اور سسی کو چھوڑ کر ہٹ گئے تھے۔ چند ہی منٹ میں وجنتی اور کیمپ کے آفسر بھی وہاں پہنچ گئے۔ وجنتی، نائلہ اور سسی کو اٹھا کر خیمے کے اندر لے گئی۔ ان دونوں کے لباس تار تار ہو چکے تھے۔ چند سیکنڈ بعد کیمپ کا کمانڈنٹ کرنل اور رام سروپ بھی خیمے میں آ گئے۔

”کیا معاملہ ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا؟“ رام سروپ نے نائلہ سے پوچھا۔  
 ”یہ لوگ ہمیں سوتے میں سے زبردستی اٹھا کر نئی وی والے خیمے میں لائے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ مشتاق اس گینگ کا لیڈر ہے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 مشتاق اور اس کے ساتھیوں سے پوچھ کچھ ہوئی تو مشتاق کے ساتھیوں نے اعتراف کر لیا کہ یہ سب کچھ مشتاق کی وجہ سے ہوا تھا۔ نئی وی پر بلو فلم دیکھتے ہوئے مشتاق ہی نے نائلہ اور سسی کو اٹھا کر لانے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ نازک سی لڑکیاں ان کے لیے ترنوالہ ثابت ہوں گی مگر نائلہ نے تو ان سب کے جوڑ ہلا کر رکھ دیئے اور کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔  
 کرنل اور رام سروپ کچھ دیر تک ایک طرف کھڑے دھیمی آواز میں مشورہ کرتے رہے پھر کرنل نے محافظوں کو حکم دیا۔

”ان پانچوں کو اس چٹان کے سامنے لے جا کر شوٹ کر دو۔“  
 اس دوران کچھ اور محافظ بھی آچکے تھے۔ وہ لوگ مشتاق اور اس کے ساتھیوں کو راکٹلوں کی زد پر لے کر چٹان کی طرف دھکیلتے گئے۔ دوسرے محافظ بھی راکٹلیں تان کر مستعد ہو گئے تھے تاکہ کسی غیر متوقع صورت حال سے نمٹ سکیں۔  
 وجنتی، نائلہ اور سسی کو لے کر اپنے خیمے میں آ گئی۔ وہ جیسے ہی خیمے میں داخل ہوئیں فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ سسی نے چیخ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور نائلہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ اپنے ہم وطنوں کو خاک و خون میں لوٹانے کے لیے دشمنوں سے دہشت گردی کی تربیت لینے والے دہشت گرد اپنی ہی دہشت گردی کا شکار ہو گئے تھے۔

...•••••

فائرنگ کی بازگشت دیر تک فضا میں گونجتی رہی۔  
 سسی کے چہرے پر تو خوف تھا، لیکن نائلہ درانی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کے پانچ ہم وطنوں کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو یہاں ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد وطن واپس جا کر دہشت گردی کرتے۔ اپنے ہی شہروں کے گلی کوچوں میں خوف و ہراس پھیلاتے اور خون کی ندیاں بہاتے۔ اس لحاظ سے نائلہ کو ان کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے ملک واپس جا کر کوئی مذموم کارروائی کرنے سے پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے، لیکن نائلہ کو افسوس اس بات کا ہوا تھا کہ ان بھارتی افسروں نے کس بے دردی سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان کی نظروں میں پاکستانی فوجیوں کی زندگیوں کی کوئی اہمیت



نہیں تھی۔ انہیں کس طرح بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یہی تربیت ان نوجوانوں کو بھی دی جاتی تھی کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر اپنے لوگوں کو خاک و خون میں لوٹا دیں۔

ممکن ہے کیمپ کے بھارتی افسروں کے لیے یہ بہت معمولی بات ہو کہ کیمپ میں مسلمان لڑکیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا گیا تھا، اور ہاتھ ڈالنے والے نوجوان بھی پاکستانی تھے۔ اس لیے بلاشبہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ ان نوجوانوں کو گولی سے اڑا دینے کا مقصد انہیں سزا دینا مقصود نہیں تھا۔ اصل مقصد تو یہ تھا کہ دوسروں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جائے کہ کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کس قدر عجلت سے کام لینا چاہیے اور انہیں اس لیے بھی سزا دی گئی تھی بلکہ سزا دینے کی اصل وجہ یہی تھی کہ انہوں نے محافظ کا حکم نہیں مانا تھا اور ان کی بار بار کی وارننگ کے باوجود وہ لڑکیوں کو پیٹنے رہے تھے۔ اس کیمپ میں ان کی عیاشی کا ہر سامان موجود تھا لیکن ڈپلن کی خلاف ورزی پر ظاہر ہے سزا بھی ملتی ہی چاہیے تھی۔

نامکہ اور سسی آخر کار منصف نازک ہی سے تو تعلق رکھتی تھیں۔ نامکہ نے مارشل آرٹس کی ٹریننگ حاصل کی تھی لیکن اس فن کی تربیت حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس میں بے پناہ طاقت آگئی تھی، بلکہ اس فن کا اصل مقصد یہ تھا کہ اپنے اندر کی اصل قوت کو چند مخصوص طریقوں اور تکنیکس کے ذریعے استعمال میں لا کر اپنا دفاع کیا جائے۔ مارشل آرٹس کی یہ تربیت نامکہ کے بہت کام آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ بڑی کامیابی سے اپنا دفاع کیا تھا لیکن آج پیر پھسل جانے سے وہ ان کے قابو میں آگئی تھی۔ اگر حریف ایک دو ہوتے تو پھر بھی وہ ان کا مقابلہ کر سکتی تھی مگر وہ پانچ تھے جو جو کھوں کی طرح اس سے لپٹ گئے تھے اور لاتوں اور گھونٹوں سے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ جس سے خون رسنے لگا تھا۔ دائیں رخسار پر سیاہ دھبے سے بڑھ گئے تھے۔ سینے اور پسلیوں میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ طاقتور گھونٹوں اور ٹھوکروں سے اندرونی چوڑیں بھی لگی تھیں۔

سسی کی حالت اس سے زیادہ خراب تھی۔ نامکہ نے تو بڑی حد تک اپنا دفاع بھی کیا تھا لیکن سسی کچھ نہیں کر سکی تھی اور بری طرح چٹی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ سینے میں سب سے زیادہ تکلیف تھی جہاں بے در پے گھونٹوں سے شاید اندر کا گوشت پھٹ گیا تھا۔ دونوں رخساروں پر نیل پڑ گئے تھے۔ وہ چارپائی پر بیٹھی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

”کیمپ میں رونما ہونے والا یہ اس نوعیت کا دوسرا واقعہ ہے۔“ وجنتی نے ان دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”چند مہینے پہلے کیمپ کے نوجوان کسی بات پر آپس میں لڑ پڑے تھے۔ وہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور اس قدر فساد برپا ہوا تھا کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی محافظوں نے دو نوجوانوں کو گولی سے اڑا دیا تھا جب کہیں جاکر ہنگامے پر قابو پایا جاسکا تھا۔ وہ دوسرا گروپ تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد وہ ٹریننگ مکمل کر کے واپس چلے گئے تھے۔ ہمیں دراصل ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہوتی ہے جو بھڑک اٹھیں تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے۔ لیکن آج کے ہنگامے نے پانچ آدمیوں کی جان لے لی۔ مشتاق اس گروپ کا بہترین آدمی تھا۔ اس نے بڑی جلدی ہمارے نظریات کو سمجھ لیا تھا لیکن مجھے حیرت ہے کہ یہاں انہیں عیش و آرام کا ہر سامان میسر ہے۔ دل بہلانے کے لیے لڑکیوں کی بھی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہ حرکت کی.... لیکن یہ بھی ان کی تربیت کا ایک حصہ ہے کہ اگر کسی چیز کے آسانی سے ہاتھ آنے کی توقع نہ ہو تو اسے طاقت کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مشتاق اور اس کے ساتھیوں

نے غالباً اسی فارمولے پر عمل کیا ہے۔ بہر حال، تم دونوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ کیپ کا ڈاکٹر تو دو دن کی چھٹی پر رام گڑھ گیا ہوا ہے۔ میں اس کی اسٹنٹ کو بلاتی ہوں۔ بلا بھی بڑی ٹچی ڈاکٹر ہے۔ تم لوگ بیس بیٹھو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب کوئی تمہاری طرف دیکھنے کی جرات بھی نہیں کرے گا۔“

و جنتی انہیں اپنے خیمے میں چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ نائلہ اس کی موجودگی میں بڑی مشکل سے اپنے نفرت انگیز جذبات کو چھپا سکی تھی۔ و جنتی جیسے ہی باہر نکلی نائلہ دوڑ کر سی سے لپٹ گئی۔ سسی ہچکیاں لے رہی تھی۔ نائلہ بھی سکپاں بھرنے لگی۔

”ادی!“ سسی نے اپنی ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم کہاں پھنس گئے ہیں۔ کیسے نکلیں گے یہاں سے۔ کیا عورت کے مقدر میں یہی لکھا ہے۔ کہیں بھی عزت محفوظ نہیں ہے۔“

”حوصلے سے کام لو سسی۔“ نائلہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ”میں ایک بار پھر یہی کہوں گی کہ عورت اتنی کمزور نہیں جتنا اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ مجھے دیکھ رہی ہو۔ عرصہ بیت گیا ان انسان نما بھینڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے۔ میں نے ان کے سامنے اپنے آپ کو کمزور نہیں سمجھا۔ ان کے سامنے شکست تسلیم نہیں کی۔ تم خود بھی بڑی بہادر لڑکی ہو۔ بڑی ہمت اور دلیری سے تم نے حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ اسی طرح ڈٹی رہو گی تو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب تک زندہ ہوں تمہاری عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔“

”لیکن ادی۔“ سسی نے سسکی بھری۔ ”تم کب تک میری حفاظت کرو گی۔ تم بھی تو عورت ہو نا اور یہاں تو ہمارے چاروں طرف بھڑیے ہی بھڑیے ہیں۔ ہم کب تک ان خونخوار بھینڑیوں سے بچتی رہیں گی۔ یہ تو انسان نہیں درندے ہیں۔ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟“

”فکر مت کرو۔“ نائلہ نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ”اللہ نے چاہا تو ہم ایک نہ ایک دن یہاں سے نکل جائیں گے۔ ہم بے گناہ ہیں۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ قدرت نے ہمیشہ ہماری مدد کی ہے۔ وہ اب بھی ہماری مدد کرے گی۔ میں مایوس نہیں ہوں۔“

”مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے ادی۔“ سسی اپنا سینہ دباتے ہوئے بولی۔ ”بہت مارا ہے ان ظالموں نے۔“

”تکلیف تو مجھے بھی ہے سسی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”و جنتی ڈاکٹر کو بلانے گئی ہے۔ وہ کوئی دوا دے گی۔ بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی تم۔ فکر مت کرو۔“

سسی کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ باہر سے قدموں کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد سلطانہ خیمے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ قریب آ کر گہری نظروں سے نائلہ اور سسی کی طرف دیکھنے لگی۔

”ویل ڈن!“ سلطانہ نے نائلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم نے آج ثابت کر دیا ہے کہ عورت کمزور نہیں ہے۔ وہ اگر چاہے تو دنیا کی ہر طاقت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ کاش یہ حوصلہ میرے اندر بھی ہوتا تو میں اس طرح برباد نہ ہوتی۔۔۔ لیکن۔۔۔ ہر عورت تمہاری طرح نہیں ہو سکتی۔ تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت نہ تو مال غنیمت ہے اور نہ تر نوالہ جسے آسانی سے نگلا جاسکے۔ اس کیپ میں انسان نہیں وحشی اور درندے رہتے ہیں۔ انہیں تو تربیت ہی قتل و غارت اور تباہی و بربادی کی دی جاتی ہے۔ ان کے دلوں سے کسی کی

عزت و احترام کا ہر احساس مٹا دیا گیا ہے۔ عورت تو ان کے لیے ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کھلونے انہیں بڑی وافر مقدار میں فراہم کئے گئے ہیں لیکن مرد کی ہوس کبھی کم نہیں ہوتی۔ انہوں نے تمہیں اور اس لڑکی کو بھی ایک کھلونا سمجھ کر ہی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن تم نے تو کمال کر دکھایا۔

”اگر میں بھی کم ہمت ہوتی تو تمہاری طرح عرصہ پہلے اپنی عزت گنوا کر حالات سے سمجھوتہ کر چکی ہوتی لیکن میں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر بننے نہیں دیا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”ہاں“ میں تمہاری ہمت کی داد دیتی ہوں۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”اور جانتی ہو تمہاری اس ہمت و جرات مندانہ کارروائی نے تمہیں رام سروپ اور کرل گپتا کی آنکھوں کا تار بٹا دیا ہے۔ مشتاق شرینگھم حاصل کرنے والے اس گروپ کا بہترین آدمی تھا۔ انہوں نے مشتاق سمیت پانچ آدمیوں کو گولیوں سے اڑا دیا۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی بلکہ اس لیے کہ تم ان کے لیے مشتاق اور اس کے ساتھیوں سے زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتی ہو۔ انہوں نے مشتاق اور اس کے ساتھیوں کو اس لیے گولیوں سے اڑا دیا کہ تم ان پر اعتماد کرنے لگو۔ یہ ہندو کبھی کھانے کا سودا نہیں کرتے۔ یہ ہمیشہ اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ خواہ اس کے لیے دوسروں کو کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔“

”سلطانہ تمہیں...“ نائلہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یہی لڑکی آج صبح ہی اپنے خیمے میں بیٹھی ہندوؤں کے گن گاری تھی۔ ان کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے غلابے ملا رہی تھی۔ جس سے نائلہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ پاکستان کے خلاف ہندوؤں کے زہریلے پروپیگنڈے سے پوری طرح متاثر ہو چکی ہے لیکن اس وقت اس کا انداز گفتگو اور تھا۔

”نائلہ بی بی!“ سلطانہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”میں اتنی بے حس اور مردہ ضمیر نہیں ہوں کہ اپنی ذاتی بربادی کا انتقام لینے کے لیے اپنے پورے ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگا دوں۔ میری توہین کی گئی تھی۔ میری پاکیزگی اور عزت کا دامن تار تار کر دیا گیا۔ مجھے بیروں تلے روندنا گیا۔ میری بوئیاں فوجی گنیں اور مجھے بے ہوش ڈال دیا گیا۔ میں اپنی بربادی کا بدلہ لینا چاہتی تھی اور اپنے اس ارادے پر اب بھی قائم ہوں لیکن میری بربادی کے ذمے دار چند افراد ہیں پوری قوم نہیں... میں بدلہ ان افراد سے لوں گی جنہوں نے مجھے برباد کیا ہے۔ پوری قوم کو تباہی کے دہانے کی طرف کیوں دھکیلوں۔ اپنا ذاتی انتقام لینے کے لیے پورے ملک کی سلامتی کو داؤ پر کیوں لگاؤں۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر تم یہاں کیوں آئی تھیں؟“ نائلہ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”شی!“ سلطانہ نے ہنسنوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”میرا خیال ہے وجہتی ڈاکٹر کو لے کر آ رہی ہے۔ تمہارے بارے میں مجھے ابھی اسی نے بتایا تھا۔ میں بعد میں تم سے بات کروں گی۔“

نائلہ خاموش رہی۔ اسے سلطانہ کی اس کایا پلٹ پر بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وجہتی ایک اور دہلی پتلی عورت کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اسے شاید سوتے میں سے جگا کر لایا گیا تھا۔ آنکھوں سے نیند کا خمار صاف جھلک رہا تھا۔ اس کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی جو بے ترتیب ہو رہی تھی۔ وجہتی اور کیمپ میں موجود دوسری ہندو لڑکیوں کی طرح وہ بھی خوبصورت تھی۔ ہندو حکمرانوں نے دہشت گردی کی ان ترتیب گاہوں میں لڑکیوں کا انتخاب بھی خوب کیا تھا تاکہ میاں آنے والے نوجوانوں کو حسن و شباب کے ذریعے بھی اپنے حرم میں جکڑ کر رکھا جاسکے اور ان کا یہ نسخہ واقعی کامیاب رہا تھا۔

”یہ ڈاکٹر بلا ہے مس نائلہ۔“ وجنتی نے تعارف کرایا۔ ”پجاری مگری نیند سو رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ یہاں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ میں نے جگا کرتا تو فوراً ”ہی تار ہو گئی۔“

”ہم انہی لوگوں کی خدمت کے لیے تو ہیں۔“ ڈاکٹر بلا نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر نائلہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کہاں چوٹ لگی ہے؟“

”پہلے سسی کو دیکھ لو ڈاکٹر۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اسے زیادہ تکلیف ہے۔“

”لیٹو یہاں... آرام سے لیٹ جاؤ۔“ ڈاکٹر نے سسی کو اشارہ کیا۔

”سسی پلنگ پر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہوئے جسم کو کھینچ پڑنے سے اس کے منہ سے بے اختیار کراہیں نکل گئی تھیں۔ ڈاکٹر بلا نے اس کے جسم کو ٹٹول کر اچھی طرح معائنہ کیا اور پھر بتایا کہ جسم پر خصوصاً“ سینے پر زوردار ضربیں لگنے سے اندر سے گوشت پھٹ گیا ہے۔ اس نے اپنا بیگ کھولا اور درد رفع کرنے کی چند گولیاں دینے کے علاوہ آئنمنٹ کی ایک ٹیوب بھی نکال لی اور وجنتی کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

”اس مرہم سے دن میں دو تین مرتبہ مالش کرنے سے ٹھیک ہو جائے گی لیکن اسے ایک دو دن آرام کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے اور اب مس نائلہ کو بھی دیکھ لو ڈاکٹر۔“ وجنتی نے کہا۔

نائلہ کو دوسرے پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ اسے بھی تکلیف تھی۔ سینے کا اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر بلا نے اسے بھی وہی پین کلر گولیاں اور مرہم استعمال کرنے کی ہدایت کی۔

”ٹھیک ہے، اب میں جا رہی ہوں۔ صبح آکر دیکھوں گی۔“ ڈاکٹر بلا نے کہتے ہوئے اپنا میڈیسن کٹ والا بیگ اٹھالیا۔

ڈاکٹر بلا کے جانے کے بعد وجنتی اور سلطانہ ان دونوں کے مرہم کی مالش کرنے لگیں۔ مرہم لگاتے ہوئے سسی کے منہ سے مسلسل کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ اسے زیادہ مار پڑی تھی اور تکلیف بھی زیادہ ہی تھی۔

جسم پر مالش کرنے کے بعد دونوں کو پین کلر گولیاں کھلا دی گئیں اور انہیں کبیل اوڑھا دیئے گئے۔

”جاؤ سلطانہ... تم اب جا کر آرام کرو۔ رات کا تھوڑا ہی حصہ باقی رہ گیا ہے۔ میں یہاں کرسی پر بیٹھ کر وقت گزار لوں گی۔“ وجنتی نے کہا۔

”میں یہاں رہ جاتی ہوں۔ تم میرے بستر پر جا کر سو جاؤ۔“ سلطانہ نے نائلہ کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”چلو، کوئی سسی۔“ وجنتی نے جواب دیا۔ وہ کچھ دیر تک وہاں رکی اور پھر خیمے سے نکل گئی۔

سلطانہ کچھ دیر تک خاموشی سے کرسی پر بیٹھی رہی پھر بڑی احتیاط سے اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گئی۔ اس نے دبے قدموں خیمے کے چاروں طرف ایک چکر لگایا اور پھر اندر آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کرسی کو پلنگ کے مزید قریب کر لیا تھا۔

”کچھ دیر پہلے تم جن خیالات کا اظہار کر رہی تھیں کیا وہ...“

”یہ حقیقت ہے نائلہ۔“ سلطانہ نے نائلہ کی بات کاٹ دی۔ ”ہمیں اپنے کسی ذاتی نقصان کا بدلہ یا انتقام لینے کے لیے اس طرح اندھا نہیں ہو جانا چاہئے کہ معصوم اور بے گناہ بھی ہمارے اس انتقام کی لپیٹ

میں آجائیں۔“

”لیکن صبح جب تمہارے خیے میں ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت تو تمہارے خیالات کچھ اور تھے۔ تمہاری باتوں سے یوں لگتا تھا جیسے اپنا انتقام لینے کے لیے تم پورے ملک کو جلا کر راکھ کر ڈالو گی۔“ نائلہ نے کہا۔

”اس وقت میرے خیے کے آس پاس بہت سے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ اگر کسی کے کانوں میں میرے ان خیالات کی بھنگ بھی پڑ جاتی تو میں اس وقت یہاں نہ ہوتی بلکہ مجھے کسی اور کیپ میں منتقل کر دیا جاتا جہاں دوسرے طریقوں سے از سر نو میری ذہنی تربیت شروع کی جاتی۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے وطن سے محبت ہے تو دہشت گردی کی ٹریننگ لینے کے لیے یہاں کیوں آئی تھیں؟“ نائلہ نے کہا۔

”میں اپنی بربادی کا انتقام ان لوگوں سے لینا چاہتی ہوں جو اس کے ذمہ دار ہیں، پوری قوم سے نہیں۔“ سلطانہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں تمہاری طرح جرات مند اور باہمت نہیں تھی۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت تھی۔ شاہد نامی اس نوجوان نے جب اپنی مدد کی پیشکش کی تو میں فوراً ہی آمادہ ہو گئی۔ میں اس کے ساتھ شانہ کی کوٹھی سے بھاگ کر میرپور خاص پہنچ گئی۔ اس نے مجھے سرحد پار پہنچا دیا۔ جیسلمیر پہنچ کر انکشاف ہوا کہ شاہد راکا ایجنٹ ہے جو اس طرح لوگوں کو پھنسا کر سرحد پار پہنچا دیتا ہے۔ اسے بیس ہزار فی کس معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ یہاں ان لوگوں کی برین واشنگ کر کے ان کے ذہنوں میں پاکستان کے خلاف زہر بھردیا جاتا ہے اور پھر دہشت گردی کی تربیت دے کر انہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کو زیادہ کار آمد تصور کیا جاتا ہے۔ دہشت گردی کے علاوہ انہیں ایک اور مخصوص قسم کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ یہ لڑکیاں جب پاکستان واپس جاتی ہیں تو انہیں بریفنگ دی جاتی ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ پاکستان واپس جا کر یہ خوبصورت لڑکیاں حکومت کے اہم اور کلیدی عہدوں پر فائز افسران کو اپنے حسن و شباب کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس طرح ان سے اہم راز حاصل کر کے یہاں پہنچا دیتی ہیں۔ اس وقت بھی پاکستان میں کئی ایسی لڑکیاں موجود ہیں جو راز کے لیے کام کر رہی ہیں۔ میرے بارے میں بھی ان کا یہی خیال ہے کہ میں پاکستان واپس جا کر ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کروں گی۔“ سلطانہ ایک بار پھر چند لمحوں کو خاموش ہو گئی پھر بولی۔ ”یہاں آنے کے بعد جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے تو میں نے کسی قسم کا احتجاج کرنا بے کار سمجھا اور نہ ہی فرار کا خیال دل میں لائی کیونکہ فرار کی کوشش کرنے والوں کو اپنے لیے بے کار سمجھ کر گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ میں نے بہر حال، یہ طے کر لیا تھا کہ یہاں ٹریننگ حاصل کروں گی۔ ان کے احکامات کی تعمیل کر کے ان کا اعتماد حاصل کروں گی اور ان لوگوں کے بارے میں راز حاصل کروں گی جو یہاں سے دہشت گردی کی تربیت حاصل کر کے جا چکے ہیں یا مجھ سے پہلے چلے جائیں گے۔ پاکستان جانے کے بعد میں ان کی دی ہوئی تربیت انہی کے خلاف استعمال کروں گی....“

”اگر کسی کو تمہارے اس راز کا پتہ چل گیا تو؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تو مجھے بلا جھجک گولی سے اڑا دیا جائے گا۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”لیکن ابھی تک تو مجھ پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکا۔ انہیں مجھ پر مکمل اعتماد ہے۔ انہیں یقین ہے کہ میں ان کے سحر میں پوری طرح جکڑی جا چکی ہوں اور وہی کروں گی جو وہ چاہتے ہیں۔“

”تم کب واپس جا رہی ہو؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”چند روز بعد واپسی کا ارادہ تھا۔ لیکن تم لوگوں کی وجہ سے رک جاؤں گی۔ میں کوشش کروں گی کہ چند روز بعد جانے والے گروپ کی بجائے مجھے اس کے بعد کسی اور گروپ کے ساتھ بھیجا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بات مان لی جائے گی۔“ سلطانہ نے کہا۔

”لیکن تم نے اپنے بارے میں سب کچھ مجھے کیوں بتایا؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”کیا تمہارے خیال میں یہ نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے میں تمہارے بارے میں سب کچھ انہیں بتا دوں۔“

”نہیں۔“ سلطانہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”اس کیپ میں اگرچہ بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جو دوسروں کے بارے میں اس قسم کی اطلاعات کیپ کے بڑے افسروں کو پہنچاتے رہتے ہیں لیکن تمہارے بارے میں میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ آج صبح اگرچہ تم نے اس موضوع پر مجھ سے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں لیکن تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم بے پناہ قوت ارادی کی مالک ہو اور تم اپنے آپ کو ان کے زہریلے پروپیگنڈے سے بچائے رکھو گی۔ میں نے اس چھوٹی سی عمر میں اس دنیا سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ میں کسی کا چہرہ دیکھ کر بتا سکتی ہوں کہ اس کے دل میں کیا ہے؟“

”کیوں ایسا تو نہیں کہ تم یہ جاننے کہ کوشش کر رہی ہو کہ میرے ارادے کیا ہیں؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”ایسی بات نہیں ہے نائلہ۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”خدا گواہ ہے کہ میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے وہ میرے دل کی بات ہے۔ میں تمہارے ساتھ مل کر یہاں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مارا بھی کچھ ایسا ہی ارادہ ہو گا۔“

نائلہ چند لمحے خاموش ہو کر گہری نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی اور بالاخر اسے سلطانہ کی باتوں کا اعتماد برپا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے سلطانہ۔“ وہ بولی۔ ”میں تم پر یقین کر لیتی ہوں۔ لیکن بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”خاموشی سے ان کے احکامات کی تعمیل کرتی رہو لیکن بس اس بات کا خیال رکھنا کہ ان کی باتیں تمہارے ذہن کو متاثر نہ کر سکیں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہو اور اپنی باتوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو کہ تمہارے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں تم ان کا انتقام لینے کے لیے بے چین ہو رہی ہو اور صرف زیادتی کرنے والوں کو ہی نہیں پورے ملک کو اپنے انتقام کی آگ میں جلا کر بھسم کر دینا چاہتی ہو۔ اس طرح تم بہت کمزور رہو گی۔ ان کا اعتماد حاصل کر لو گی۔ اور پھر تمہیں بھی میری طرح کیپ کے ہر حصے میں جانے کی آزادی حاصل کی۔ ویسے تم لوگوں کے بارے میں بھی ان لوگوں نے ایک پلاننگ کر لی ہے۔“

”وہ کیا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم بڑھی لکھی ہو۔ دولت مند ہو۔ اپنے علاقے میں تمہارے خاندان کا نام ہے۔ اثر و رسوخ ہے۔ تم ان لوگوں کے ساتھ حسن و شائبہ، دولت اور اثر و رسوخ سے کام لے کر حکومت میں اعلیٰ سطح کے لوگوں سے رابطہ قائم کر سکتی ہو۔ وہ تمہیں اسی قسم کی تربیت دیں گے کہ تم ان اعلیٰ افسروں کا اعتماد حاصل کر کے قومی اہمیت کے راز حاصل کر سکو اور یہ سب....“ سلطانہ خاموش ہو کر سسکی کی طرف دیکھنے لگی۔

جو سوچتی تھی۔

”اور سسی کے بارے میں کیا منصوبہ ہے ان کا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”یہ ان پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ان کے کسی کام کی نہیں لیکن یہ ایک حسین لڑکی ہے۔ وہ اس کے حسن و شباب سے اس طرح فائدہ اٹھائیں گے کہ اس کے ذریعے ایسے نوجوانوں کو پھانسا جائے گا جنہیں بلیک میل کر کے دہشت گردی کی ٹریننگ دی جائے گی اور ان سے پاکستان کے کئی کوپوں میں خوف و دہشت پھیلانی جائے گی۔“

نائلہ کانپ اٹھی۔

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ مجھے ان لوگوں کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔  
”آج شام ہی رام سروپ“ وجنتی اور را کے ایک اور افسر میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ میں بھی وہاں موجود تھی۔ مشتاق اور اس کے چار ساتھیوں کو بھی محض اس لیے گولی سے اڑا دیا گیا تھا کہ تم اکیلی ان پانچوں سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہو۔ ان پانچوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہ تم پر یہ تاثر بھی دینا چاہتے ہیں کہ انہیں تم سے ہمدردی ہے۔“

”لیکن کیا۔۔۔“

”کوئی آ رہا ہے۔“ سلطانہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”اس طرح آرام سے لیٹ جاؤ جیسے

سورہی ہو۔“

نائلہ نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ سلطانہ نے بھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے بیٹھے بیٹھے سو گئی ہو۔ باہر دبے دبے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ قدموں کی آواز خیمے کے سامنے رک گئی پھر کسی نے جھانک کر اندر دیکھا۔ وہ وجنتی تھی۔ ان تینوں کو سوتے دیکھ کر وجنتی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور اسی طرح دبے قدموں چلتی ہوئی واپس چلی گئی۔

تین دن تک ان دونوں نے مکمل طور پر آرام کیا۔ اس دوران ڈاکٹر میلا انہیں دیکھنے کے لیے باقاعدگی سے آتی رہی۔ مکمل آرام اور علاج کی وجہ سے ان کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ اس دوران وجنتی نے انہیں بہت سی کتابیں اور پمفلٹ وغیرہ لا کر دے دیئے تھے۔ سسی ظاہر ہے کچھ نہیں پڑھ سکتی تھی۔

سلطانہ بھی کافی دیر نائلہ کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ اس نے نائلہ سے کہا تھا کہ وہ یہ کتابیں اور پمفلٹ وغیرہ ضرور پڑھے لیکن انہیں دل میں جگہ نہ دے۔ اس نے نائلہ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ اس سے ان کتابوں اور دیگر لٹریچر کے حوالے سے سوالات ضرور کریں گے۔ اس لیے بھی نائلہ کے لیے اس لٹریچر کا مطالعہ ضروری تھا۔

پانچ چھ دن اور گزر گئے۔ اس دوران نائلہ نے محسوس کیا کہ اس کی کمپ کی آبادی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ شاید اس گروپ کی ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی اور تربیت حاصل کرنے والے ان دہشت گردوں کو دو تین تین کی ٹولیاں میں رخصت کیا جا رہا تھا۔ سلطانہ کو بھی جانا چاہئے تھا لیکن وہ نہیں گئی تھی۔

تقریباً ”دس دن بعد“ نائلہ اور سسی کی ہتھیاروں کے استعمال کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ انہیں پستول لے کر راکٹ لانچر تک کے استعمال کی تربیت دی گئی۔ آٹومٹک رائفلیں، ہینڈ گرنٹ اور لائٹ مشین گنوں کے استعمال کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا۔ ان ہتھیاروں میں استعمال ہونے والا بارود ڈڈ تھا۔

نہیں بتایا گیا تھا کہ آخری تین دن انہیں اصل گولہ بارود استعمال کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اور یہ کہ جب وہ اپنے ملک واپس جائیں گی تو انہیں ضرورت کے مطابق ہر قسم کا اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کر دیا جائے گا۔ اس دوران کچھ نئے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان کی ٹریننگ بھی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن نائلہ کو اب کیونکیشن کی ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اسے پاکستان میں کسی ایک جگہ رہ کر کام نہیں کرنا بلکہ مختلف شہروں میں آنا جانا رہے گا۔ اسے وسیع حیطہ عمل والے ٹرانسپیر پر مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کے بارے میں بتایا گیا۔ پاکستان میں موجود اپنے خاص خاص ایجنٹوں کے نمبر دیئے گئے جن سے وہ وقت ضرورت رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ نائلہ کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے پاس پاکستان کی بعض اہم شخصیات کے کوڈ نمبرز بھی موجود تھے۔ سندھ پولیس کے انسپکٹر جنرل کا وہ کوڈ نمبر بھی ان کے پاس موجود تھا جو آئی جی صاحب ملک کی اہم شخصیات سے رابطہ قائم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے یا انہیں اس کوڈ نمبر کی فریکوئنسی پر خفیہ پغامات بھیجے جاسکتے تھے۔

”یہ نمبران شخصیات کی خفیہ گفتگو سننے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ خصوصاً پولیس کے کوڈ نمبر ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ ان نمبروں کے ذریعے ان کی باتوں سے ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ پولیس کس وقت کیا کارروائی کرنے والی ہے۔ کوئی خطرے کی بات محسوس کرتے ہی ہمارے آدی زیر زمین چلے جاتے ہیں۔“

نائلہ کو بتایا گیا۔

”کسی دشمن ملک کو نقصان پہنچانے کے لیے ضروری نہیں کہ فوجوں کے ذریعے اس کی سرحدوں پر یلغار کر دی جائے۔“ نائلہ کو ٹریننگ کے دوران بتایا جا رہا تھا۔ ”بہت سے طریقے ایسے ہیں جن پر عمل کرتے ہوئے اسے فوجی حملے سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں تو فتنہ کالم استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل اسی ملک کے باشندے ہوتے ہیں جو بیرونی طاقت کے اشارے پر ایسی افواہیں پھیلاتے ہیں جن سے عوام میں مایوسی اور بددی بھیل جاتی ہو۔ اس طرح اس حکومت کے لیے اپنے ملک کے اندر ہی کئی ہاڑا کھل جاتے ہیں اور حکومت کی قوت بٹ کر رہ جاتی ہے۔ جس سے حملہ آور ملک فائدہ اٹھاتا ہے لیکن امن کے زمانے میں اور بھی بہت سے جھکندے استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً ”ڈس انفارمیشن کے ذریعے حکومت کے خلاف عوام میں بددی پھیلاتا، دہشت گردی کے ذریعے امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنا اور عوام کے دلوں میں حکومت کے لیے نفرت پیدا کرنا۔ منشیات کا پھیلاؤ بھی عوام کو حکومت کے خلاف بھڑکانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کارروائیوں میں اگرچہ بیرونی طاقتوں کا سرمایہ تو بہت خرچ ہوتا ہے لیکن ان بیرونی طاقتوں کو فائدے بھی بہت ہوتے ہیں۔“

نائلہ کو ٹرانسپیر کی فریکوئنسیز، خفیہ کوڈ نمبر اور یہ سب باتیں اس وقت بتائی جا رہی تھیں جب وہ مکمل طور پر ان کا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا جیسے وہ پاکستان واپس پہنچتے ہی اپنی انتہائی غارروائیاں شروع کر دے گی اور پورے ملک کو اپنے انتقام کی آگ کی لپیٹ میں لے لے گی۔

”ایک سو انیس تربیت یافتہ ایجنٹ دو دن پہلے کی تاریخ تک مختلف راستوں سے سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ انہیں جو پروگرام دیا گیا ہے اس پر وہ ایک ہفتہ بعد سے عمل شروع کر دیں گے۔“ نائلہ کو یہ بات دہشت گردی نے بتائی تھی۔ ”اس کے علاوہ آج سے ٹھیک ایک ہفتہ بعد اونٹوں کے قافلے کی بھارت میں ایک اور گروپ کلغور کے راستے سرحد عبور کر کے تھر میں داخل ہوگا۔ وہاں سے یہ قافلہ ہٹار کے قریب ایک مقررہ مقام پر رک جائے گا۔ اس گروپ میں ہمارے سات آدمی ہوں گے اور اونٹوں



پر اسلحہ کے علاوہ چالیس ڈرم ایسے کیمیکل کے بھی شامل ہوں گے جن سے ہیروئن تیار ہوتی ہے۔ اس کیمیکل سے کئی ٹن ہیروئن تیار ہو سکتی ہے اور چند ہفتوں میں پاکستان میں ہیروئن کا ایسا سیلاب آجائے گا جسے روکنا حکمرانوں کے بس کی بات نہیں ہوگی۔“

یہ اطلاع نائلہ کے لیے بہت ہی خوفناک تھی۔ اس نے جب سلطانہ کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ”مجھے اس سلسلے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”یہ مال کسی اور کیمپ سے بھیجا جا رہا ہوگا۔ یہاں سے بھیجا جاتا تو قافلہ کسی قریبی مقام سے سرحد عبور کرتا۔ اسے سینکڑوں میل دور کلفور جانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن وجہی کو یہ اطلاع کیسے ملی؟“

”ممکن ہے اس کیمپ کے کچھ آدمی رہ گئے ہوں جو اس قافلے کے ساتھ جا رہے ہوں۔ ایسی صورت میں وجہی کو پتہ چل گیا ہوگا۔“ نائلہ نے کہا۔

”ہاں، ممکن ہے اس نے رام سروپ سے پتہ چلایا ہو۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”لیکن ایک بات طے ہے کہ اس قافلے میں شامل دہشت گرد اسلحہ اور کیمیکل کے ڈرم کراچی کی طرف ہی جائیں گے۔ خضار کے قریب مقررہ مقام سے مال ٹرکوں وغیرہ پر منتقل کر دیا جائے گا جو عمرکوٹ کے راستے کراچی کی طرف چلے جائیں گے۔ عمرکوٹ نہ کبھی سسی کراچی تک پہنچنے کے ایسے بیسیوں راستے ہیں جن پر زیادہ چیکنگ بھی نہیں ہوتی۔“

”میرے خیال میں یہ دہشت گرد اسلحہ اور کیمیکل کے یہ ڈرم اپنی منزل پر نہیں پہنچنے چاہئیں۔“ نائلہ نے کہا، ”وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔“ ”میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ انہوں نے ہمیں پاکستان کی اہم شخصیات کے ٹرانسپیر فریکوئنسی کوڈ وغیرہ بتا دیئے ہیں کیوں نہ سندھ کے انسپکٹر جنرل کو اس قافلے کے بارے میں اطلاع دے دی جائے۔“

”خیال برا نہیں ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”لیکن اگر ہماری کال پکڑی گئی تو یہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”لیکن انہوں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ اپنی کسی کال کو پروٹیکٹ کیسے کیا جاتا ہے؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔“ سلطانہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”تو ٹھیک ہے۔ ہم کل رات کال کریں گے۔“

”کل کیوں؟ آج رات کیوں نہیں؟“ نائلہ نے کہا۔

”ٹرانسپیر کا بندوبست بھی تو کرنا ہوگا۔ میں کل دن میں کسی وقت ٹرانسپیر چوری کر کے کہیں چھپا دوں گی اور پھر رات کو موقع پاتے ہی کال کر دیں گے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے اور انہوں نے ہماری واپسی کا کیا پروگرام بنایا ہے۔“ نائلہ نے پوچھا۔

”پتہ نہیں، کل رام سروپ سے معلوم کر دوں گی۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”میں نے ایک اور پروگرام بنا رکھا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”وہ کیا؟“ سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ جانے سے پہلے یہ کیمپ تباہ کر دیا جائے۔ اس طرح ہم تھوڑا بہت نقصان تو پہنچا ہی سکیں گے اور کچھ عرصہ کے لیے اس کیمپ میں دہشت گردوں کی تربیت کا سلسلہ بھی رک جائے گا۔۔۔“ نائلہ نے کہا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا....؟؟؟“ سلطانہ نے اسے کھورا۔ ”تم نے اس کیپ کے حفاظتی طامات دیکھے ہیں....!“

”میں سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن اگر عزم راسخ ہو تو دنیا کی نئی طاقت راستہ نہیں روک سکتی۔ اب ہمیں کیپ کے ہر حصے میں آنے جانے کی آزادی ہے۔ میں نے وہ ٹنگ بھی دیکھی ہے جس میں اصل گولہ بارود کا ذخیرہ ہے۔ اگر ہمیں چند ایسے ڈیوائسز مل جائیں جن سے ہم تیار کئے جاسکیں تو میں اس کیپ کو مکمل طور پر تباہ کر سکتی ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ سلطانہ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

نائلہ چند لمحوں خاموش رہی اور پھر سرگوشیوں میں اسے اپنا منصوبہ بتانے لگی۔

آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”کل ہی وجہی نے مجھے بتایا تھا کہ چاروں طرف حفاظتی جنگل کے ساتھ ساتھ ڈیوائسز لگے ہوئے ہیں جنہیں ایک ہی جگہ سے ٹائم بم کے ذریعے دھماکے سے اڑایا جاسکتا ہے۔ مجھے بلکہ بھی معلوم ہے۔ وہاں صرف دو تاروں کو ملا کر ان کے ساتھ ٹائم بم فٹ کرنا ہوگا۔“ نائلہ نے بتایا۔

”اور یہاں سے نکلنے کا کیا ہوگا؟ کیا خود بھی کیپ کے ساتھ تباہ ہونے کا ارادہ ہے؟“ سلطانہ نے کہا۔

”اس کی بھی ایک ترکیب ہے میرے ذہن میں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ ہمیں ہم گڑھ آنے جانے کی بھی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس رعایت سے ہم نے صرف ایک مرتبہ فائدہ اٹھایا جب کچھ شاپنگ کرنے کے لیے گئی تھیں۔ ہم شاپنگ کے بہانے یہاں سے نکل سکتی ہیں۔“

”تمہارا منصوبہ بہت ہی خطرناک ہے لیکن میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ ”اس دوران میں پاکستان میں ان کے ان تمام ایجنٹوں کے ایڈریس جمع کر لوں گی جو پچھلے دنوں یہاں سے شہر گردی کی تربیت حاصل کر کے گئے ہیں۔“

”کیونکہ ان ایجنٹوں کے بارے میں بھی ٹرانسمیٹر پر اطلاع کر دی جائے۔“ نائلہ بولی۔

”نہیں، ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے ہی ہم ٹرانسمیٹر کے بارے میں اطلاع دے دیں۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”کل سب سے پہلے تم ٹرانسمیٹر کا بندوبست کر دو گی اور اس کے بعد سری باتوں کے بارے میں سوچا جائے گا۔“

وہ دونوں اس وقت خیموں کے سامنے ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے اس طرح نیم دراز بیٹھی تھیں جیسے ام کر رہی ہوں۔ وجہی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر انہوں نے موضوع بدل دیا اور اب وہ ایک بھارتی قلم کارے میں گفتگو کرنے لگیں۔ شاہ رخ کی یہ قلم انہوں نے کل رات ہی دیکھی تھی۔ کنگ انکل میں شاہ رخ کی اداکاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ان میں باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔ اتنے میں وجہی بھی قریب پہنچ گئی۔

”اتنے زور و شور سے کس بات پر بحث ہو رہی ہے؟“ وجہی نے بھی ان کے قریب ہی زمین پر بیٹھے

”شاہ رخ کی بات ہو رہی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”مجھے تو اس کا ہیرو آنا ہی پسند نہیں ہے۔ چھوٹے قد کا زور سارے لڑکا جب اپنے مقابلے پر چھ سات ہٹے کئے غنڈوں کو ڈھیر کر دیتا ہے تو عجیب سا لگتا ہے۔ بھلا یہ کوئی سامنے کی بات ہے۔ اس قسم کے غیر فطری سین ساری قلم کا ہیرو غرق کر دیتے ہیں۔“

”ارے بھی اتنا کیوت سا تو ہے وہ۔“ وجہی نے کہا۔

”ارے لودہ میں بھی یہاں آکر آرام سے بیٹھ گئی۔“ وجہی اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں تو تم لوگوں کو یہ بتانے آئی تھی کہ رام سروپ کی خواہش ہے کہ تم لوگ آج شام کی چائے اس کے ساتھ پیو۔“

”پلی لیس گے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”چائے ہی تو پینی ہے۔ ساتھ بیٹھنے والا چاہے رام سروپ ہو یا شاہ رخ اور ایتھ جھنگن... کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ارے کس لبو کا نام لے دیا۔ اس کی شکل دیکھنے کے لیے تو میڑھی لگانی پڑتی ہے۔“ وجہی نے کہا۔

”میں کسی اور کام سے جا رہی ہوں تم لوگ آدھے گھنٹے بعد رام سروپ کے کمرے میں چلی جانا۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں بھی آجاؤں گی۔“

وجہی ایک طرف چلی گئی اور یہ دونوں بھی اٹھ کر خیمے میں آگئیں۔ جہاں سسی پٹنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ نالکہ اور سلطانہ کی طرح سسی نے بھی جینز اور نیلے چمک کی شرٹ پہن رکھی تھی اور یہ لباس اس پر خوب چمک رہا تھا۔ مشتاق اور اس کے ساتھیوں کو گولی مارے جانے کے اگلے روز انہیں بلاؤز اور ساڑھیاں دی گئی تھیں لیکن یہ لباس سسی اور نالکہ میں سے کسی کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ انہوں نے جینز اور شرٹس کو ترجیح دی تھی اور ان کے لیے اسی لباس کے کئی جوڑوں کا انتظام کر دیا گیا تھا۔

سسی انہیں دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تقریباً ”ایک گھنٹہ پہلے جب سلطانہ اور نالکہ خیمے سے نکلی تھیں تو میڑ پر کاجو سے بھری ہوئی پلیٹ رکھی تھی اور اب وہ پلیٹ بالکل خالی تھی۔ سسی سارے کاجو کھا گئی تھی۔“

”ارے! تم سارے کاجو کھا گئیں؟“ سلطانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”بڑے مزے کے ہیں ادی یہ!... سسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”دل چاہتا ہے بس کھاتے چلے جاؤ۔“

”کھاتے چلے جاؤ کی بچی یہ بڑے گرم ہوتے ہیں۔ زیادہ کھانے سے کچھ ہو گیا تو سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ گی۔“

سلطانہ نے اسے ڈانٹنے والے لہجے میں کہا۔

”اب نہیں کھاؤں گی ادی۔“ سسی نے معصومیت سے جواب دیا۔

”تیار ہو جاؤ... دعوت آئی ہے۔“ سلطانہ بولی۔

”میاں ہماری دعوت کون کرے گا ادی! سسی نے کہا۔

”ان کیمپ والوں کو اب تک نہیں سمجھ سکی ہو کیا؟ ہر شخص مجنوں کی نسل سے لگتا ہے۔ عورت کو دیکھتے ہی رال پٹکنے لگتی ہے ان کی۔“

تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ تینوں رام سروپ والے کمرے میں موجود تھیں۔ وہاں را کے دو آفیسر اور بھی تھے۔ چائے کا تو بہانہ تھا، وہ ان سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے اور نالکہ اور سلطانہ تو فر فر جواب دے رہی تھیں جیسے یہ جواب انہوں نے پہلے سے رٹ رکھے ہوں۔ وہ لوگ ان کی باتوں سے خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

”مس نالکہ! رام سروپ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے آنے کے چند روز بعد جو واقعہ پیش آیا تھا اس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ لیکن اس کے علاوہ یہاں آپ لوگوں کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”بالکل نہیں مسٹر رام سروپ!“ نالکہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم یہاں سے نئے انسان بن کر نکل رہے ہوں۔“

”نئے اور طاقتور انسان۔“ رائے سروپ نے لقمہ دیا۔

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے مسٹر رام سروپ۔“ سلطانہ بولی۔

”اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ لوگ کس راستے سے واپس جانا پسند کریں گی۔ کشن گڑھ سے سرحد عبور کر کے چولستان کی طرف، شان گڑھ سے سکھر کی طرف یا کلفور سے عمرکوٹ کی طرف جہاں سے کراچی قریب پڑتا ہے۔“

”میرا خیال ہے ہمیں کلفور کی طرف بھیج دیجئے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”نائلہ سے دوستی ہو گئی ہے یہ چند روز کراچی میں میری مسمان رہیں گی۔“

”ٹھیک ہے، ہم شان گڑھ کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ وہ جانے والے اگلے گروپ میں آپ لوگوں کو شامل کر دیں گے۔“ رام سروپ نے کہا۔

”آپ ہمیں کب بھیج رہے ہیں مسٹر رام سروپ۔“ نائلہ نے پوچھا۔

”آج سے ٹھیک دس دن بعد آپ کو یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔“ رام سروپ نے جواب دیا۔ ”آپ لوگوں کو کراچی میں ایک کنکٹ نمبر دے دیا جائے گا۔ کوڈ نمبر وغیرہ بھی آپ کو بتادیا جائے گا۔ آپ کراچی میں ہمارے اس ایجنٹ سے رابطہ کر لیجئے۔ وہ آپ کو ہر قسم کی سہولت فراہم کرے گا۔“

”تھینک یو مسٹر رام سروپ۔“ سلطانہ نے کہا۔

”میں اور کرنل گپتا کل صبح چند روز کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ آپ لوگوں کی روانگی سے ایک دن پہلے واپس آجائیں گے۔ اس دوران آپ لوگ آرام کریں۔ کمپ سے باہر بھی آپ چاہیں تو جاسکتی ہیں۔ رام گڑھ کے قریب ایک پرانے قلعے کے کھنڈرات ہیں۔ کسی روز وجہی کو ساتھ لے جائیے وہ آپ کو قلعے کے کھنڈروں کی سیر کرا دے گی۔“ رام سروپ نے کہا۔ اسی دوران وجہی بھی آگئی۔ رام سروپ اسے ان کے بارے میں ہدایات دینے لگا اور پھر کچھ ہی دیر بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔

رام سروپ اور کرنل گپتا صبح سویرے ہی کمپ سے چلے گئے تھے۔ کمپ میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے نئے آنے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں تھی۔ نائلہ اور سلطانہ پورے کمپ میں گھومتی رہتی تھیں۔ اس روز سلطانہ کسی طرح رام سروپ کے دفتر میں گھس کر ایک وسیع جیلہ عمل والا ٹرانسمیٹر بھی اڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہ ٹرانسمیٹر دن میں کمرے کی شکل کا تھا۔ جس چیمبر میں قلم لوڈ کی جاتی تھی اس کے پیچھے کی طرف اس ٹرانسمیٹر کا پورا نظام تھا۔ جبکہ فلیش لائٹ والے شیشے کے نیچے بھونٹے سے چیمبر میں فریکوئنسی سیٹ کرنے والے بٹن لگے ہوئے تھے۔ سلطانہ نے وہ ٹرانسمیٹر نیچے کے باہر چھو کے نیچے ایسی جگہ چھپا دیا جہاں سے اسے تلاش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے دوسرے ہی دن سلطانہ لہرہ نے رام گڑھ قلعہ کے کھنڈرات دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ ناشتے کے تقریباً ”ایک گھنٹے بعد وہ ایک جیب کمپ سے روانہ ہو گئیں۔ وہ ٹرانسمیٹر سلطانہ نے پتھروں کے نیچے سے نکال کر نائلہ کو دے دیا تھا۔ جسے نائلہ نے اپنے لباس کے اندر چھپا لیا تھا۔ سسی بھی ان کے ساتھ تھی۔ جیب وجہی ہی چلا رہی تھی۔

تقریباً ”دو گھنٹے بعد وہ قلعے کے کھنڈرات میں پہنچ گئیں۔ وہ کچھ دیر کھنڈرات کی سیر کرتی رہیں پھر سلطانہ اور سسی وجہی کو لے کر ایک طرف چلتی گئیں جبکہ نائلہ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب بیٹھ گئی تھی اور پھر موقع پاتے ہی اس نے لباس کے اندر سے ٹرانسمیٹر نکالا اور آئی جی سندھ کی خفیہ فریکوئنسی سیٹ کر کے کال ایل کرنے لگی۔ کال شکر کرنے سے پہلے اس نے سرخ رنگ کا وہ ننھا سا بٹن دبایا تھا جس سے کال محفوظ ہو گئی

تھی۔ اب یہ کال اس مخصوص فریکوئنسی کے علاوہ کہیں اور نہیں سنی جاسکتی تھی۔  
 نائلہ پہلے ہی حساب لگا کر اس تاریخ کو ذہن میں رکھ چکی تھی جس تاریخ کو اونٹوں کا وہ قافلہ سرحد عبور کرنے والا تھا۔ کال وائرلیس آپریٹر نے ریسیو کی تھی۔

”میں بھارت میں راجستھان کے شہر رام گڑھ سے بول رہی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”تین تاریخ کو آدھی رات کے وقت راجستھان کے گاؤں کلغور سے اونٹوں کا ایک قافلہ اسلحہ کی کھیپ اور خطرناک کیمیکل کے ڈرم لے کر سرحد پار کر کے پاکستانی گاؤں خسار کی طرف آئے گا۔ اس قافلے کے ساتھ را کے تربیت یافتہ سات دہشت گرد بھی ہوں گے۔ اس قافلے کو روکنا اور اسلحہ وغیرہ پر قبضہ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ پہلی فرصت میں یہ اطلاع آئی جی صاحب تک پہنچا دی جائے۔“

”آپ کون بول رہی ہیں محترمہ اور آپ کو یہ اطلاع کیسے ملی؟“ آپریٹر نے پوچھا۔

”میرے بارے میں جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس اطلاع کو مذاق سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔“ نائلہ نے جواب دیا اور ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔

اس نے ٹرانسمیٹر لباس میں چھپایا اور سلطانہ اور وحشی کو آوازیں دیتی ہوئی کھنڈرات میں پھرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی فراہم کردہ اطلاع فوراً ہی آئی جی تک پہنچ جائے گی۔

رام گڑھ سے واپس آتے ہی انہوں نے اپنے منصوبے کے اصل حصے پر کام شروع کر دیا۔ وہ مختلف چیزیں چرا کر اپنے خیمے میں جمع کر رہی تھیں۔ انہی چیزوں سے انہوں نے چھوٹے چھوٹے مگر نہایت طاقتور ٹائم ڈیوائس تیار کر لئے۔ موقع ملنے کے ساتھ ساتھ یہ ٹائم ڈیوائسز کیمپ کے مختلف مقامات پر فٹ بھی کرتی رہیں۔ ٹائم ڈیوائسز زیادہ تر انہوں نے ان غاروں میں لگائے تھے جہاں کیمپ کے افسروں کے دفتر اور گول پارود کے دفتر وغیرہ تھے۔ یہ ٹائم ڈیوائسز اس طرح لگائے گئے تھے کہ ان کی صرف تاریخیں جوڑنا باقی رہ گئی تھیں۔

نائلہ کو وہ تاریخ بھی اچھی طرح یاد تھی جب اونٹوں کے قافلے کو زہریلا کیمیکل اور اسلحہ لے کر سرحد پار کرنا تھی۔ اس روز دن میں ایک مرتبہ موقع ملنے ہی نائلہ وسیع حیطہ عمل والے ٹرانسمیٹر پر ایک بار پھر آئی جی سندھ کی فریکوئنسی پر کال نشر کرنے لگی۔ کال حسب معمول وائرلیس آپریٹر نے ریسیو کی تھی۔

”چند روز پہلے میں نے اطلاع دی تھی کہ اونٹوں کا ایک قافلہ اسلحہ اور زہریلے کیمیکل کی ایک بڑی کھیپ لے کر پاکستان آنے والا ہے۔ یہ قافلہ آج آدھی رات کے بعد سرحد عبور کرے گا۔“ نائلہ نے کہا۔

”ایک منٹ ہولڈ رکھئے خاتون۔ آئی جی صاحب خود آپ سے بات کریں گے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ٹرانسمیٹر پر آئی جی کی آواز سنائی دی۔

”سب سے پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہی ہیں؟“

”میرے بارے میں اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ میں ایک محب وطن پاکستانی ہوں اور راجستھان کے ایک قصبے رام گڑھ میں موجود ہوں۔ آج آدھی رات کے بعد کسی بھی وقت وہ قافلہ سرحد عبور کر سکتا ہے۔ ایک دو روز بعد میں آپ کو را کے ایسے ایجنٹوں کے نام اور پتے فراہم کروں گی جو تخریب کاری اور دہشت گردی کی نیت سے پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں۔“

”کیا تم اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی؟“ آئی جی نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ اس طرح میں مزید خطرات میں گھرجاؤں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”براہ کرم میری کما

ات کو نظر انداز مت کیجئے۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن یہ اطلاع اگر...“

”میں آپ کو غلط اطلاع نہیں دے رہی۔“ نائلہ نے بات کاٹ دی۔ ”پلیز! آپ اسے نظر انداز مت کیجئے۔ اگر میں زندہ بچ گئی اور وطن واپس پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو آپ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یاد رکھئے آج آدھی رات کے وقت خسار کی سرحد کے قریب... خدا حافظ...!!!“

نائیلہ نے ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔ وہ اس وقت کمپ کی حدود ہی میں ایک بڑے پتھر کی آڑ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹرانسمیٹر بند کر کے وہ جیسے ہی اپنی جگہ سے اٹھی اسے سینے میں اپنا سانس رکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے دائیں طرف صرف دو قدم کے فاصلے پر کمپ کا ایک محافظ کھڑا تھا۔ وہ سادہ لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالتور تھا جس کی ٹال نائلہ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں لپکتی رہی تھیں۔

”تمہارا راز کھل گیا ہے۔ اب تم زندہ نہیں بچ سکو گی۔“ محافظ کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

”گولی مت مارنا۔“ نائلہ محافظ کے پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔

محافظ تیزی سے پیچھے گھوما۔ یہ نائلہ کا ایک نفسیاتی حربہ تھا جو اس نے اپنی طرف سے محافظ کی توجہ اٹانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس کا یہ حربہ سو فیصد کامیاب رہا۔ محافظ جیسے ہی پیچھے گھومنا نائلہ برق کی طرح رکت میں آ گئی۔ اس کی ایک لگ محافظ کے ریوالتور والے ہاتھ پر لگی۔ ریوالتور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر اڑتا ہوا دور جاگرا۔ وہ کراہتا ہوا نائلہ کی طرف مڑا۔ مگر نائلہ کا ایک زوردار پینچ اس کے پیٹ پر لگا۔ منہ سے اوغ کی آواز نکالتا ہوا دوہرا ہو گیا۔ اس کی جھکی ہوئی گردن نائلہ کے سامنے تھی۔ نائلہ نے پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے کھڑی ہتھیلی کا ایک بھر پور وار اس کی گردن پر کیا۔ یہ وار کرنے میں نائلہ نے ہیکنگ کی ایک مخصوص ٹیکنیک استعمال کی تھی۔ کڑک کی آواز ابھری۔ محافظ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

روہ منہ سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

نائیلہ اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اگلا وار کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔ محافظ کسی ذبح شدہ بے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جھک کر محافظ کے سر کے بالوں کو پکڑ کر ایک دو جھٹکے دیئے۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ختم ہو چکا تھا۔

نائیلہ نے محافظ کے بال چھوڑ دیئے۔ ٹرانسمیٹر اٹھا کر لباس میں چھپایا اور پتھروں کی آڑ لیتی ہوئی غماض سے اڑا۔ وہاں سے ہٹنے لگی۔ وہاں سے تقریباً ”بیس گز دور ہٹ کر نائلہ خیموں کی طرف چلنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ کمپ کا کوئی آدمی اسے پتھروں کی طرف آتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ وہ جانتی تھی اس محافظ کی موت زیادہ دیر تک راز میں نہیں رہ سکے گی اور پھر کمپ میں اس کے قاتل کی تلاش شروع بائے گی...!!!

وہ جھپٹی چھپاتی اپنے خیمے میں پہنچ گئی۔ خیمے میں سسی موجود تھی۔ وہ نائلہ کو دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ کر اٹھی۔ نائلہ کے چہرے کے تاثرات سے اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ نائلہ کے ہاتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے۔

”کیا ہوا دی، تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“ سسی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں سسی... سلطانہ کہاں ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”اپنے خیموں۔ ابھی ابھی تو وہ یہاں سے گئی ہے۔“ سسی نے بتایا۔

”تم یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آرہی ہوں۔“ نائلہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔ اور صرف ایک منٹ بعد وہ سلطانہ کے خیمے میں موجود تھی جو پلنگ پر اپنے کھڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر تہہ کر رہی تھی۔

”کیا ہوا نائلہ؟ کہاں غائب تھیں۔ میں ابھی تمہاری طرف سے ہی آرہی ہوں۔“ سلطانہ نے پوچھا۔

”گزر رہی ہو گئی ہے سلطانہ۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمایاں تھی۔

”کیسی گزر رہی؟ کیا ہوا؟“ سلطانہ چونک گئی۔

”ایک محافظ میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔“ نائلہ نے بتایا۔

”کیا!“ سلطانہ اچھل پڑی۔ ”کیسے؟ کہاں؟ کسی نے دیکھا تو نہیں؟“

”کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن محافظ کی موت کے بارے میں بہت جلد سب کو پتہ چل جائے گا۔ اور پھر

پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی۔“

”یہاں آرام سے بیٹھو اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔“ سلطانہ نے اسے بازو سے پکڑ کر

کرسی پر بٹھادیا اور میز پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”لو... پانی پیو۔ تمہاری گھبراہٹ

کسی حد تک کم ہو جائے گی۔“

نائلہ کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس ختم کر گئی۔ اس نے خالی گلاس میز پر رکھ

دیا اور لباس میں چھپا ہوا ٹرانسپائر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”پہلے اسے کہیں چھپاؤ۔ اگر یہ

ہمارے پاس سے برآمد ہو گیا تو قیامت آجائے گی۔“

سلطانہ ٹرانسپائر لے کر خیمے سے باہر چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ خیمے میں داخل ہوئی تو خالی ہاتھ

تھی۔ وہ نائلہ کے قریب دو سری کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ہاں اب بتاؤ کیا ہوا؟“ سلطانہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ٹرانسپائر پر آئی جی سندھ کو اس قافلے کے بارے میں اطلاع دے رہی تھی۔“ نائلہ نے کہا اب وہ

بڑی حد تک اپنی کیفیت پر قابو پا چکی تھی۔ ”میں بات ختم کر کے چپے ہی اٹھی ایک محافظ کو اپنے سامنے کھڑے

دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ اس نے میری ساری باتیں سن لی تھیں اور وہ مجھے ریوالور کی زد پر لے لے ہوا

تھا۔ میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور اس پر حملہ کر دیا۔ میں نے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی۔ وہ مرہکا

ہے۔“

”تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں چھپتی ہوئی خیموں کی طرف آئی ہوں۔ کسی نے مجھے اس طرف سے آتے ہوئے نہیں

دیکھا۔“ نائلہ نے بتایا۔

”اس میں شبہ نہیں کہ اپنے ایک محافظ کی موت پر وہ لوگ ہنگامہ کھڑا کر دیں گے لیکن... انہیں ہم میں

سے کسی پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے نئے آنے والوں میں سے کسی کو محافظ کے قتل کے شے میں پکڑ کر گلا

سے اڑا دیا جائے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اور ہاں تم نے سسی کو تو نہیں بتایا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”نہیں اسے میں نے کچھ نہیں بتایا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے۔ تم اپنے خیمے میں جاؤ اور اگر کوئی محافظ کے بارے میں پوچھے تو لاعلمی کا اظہار کر دیتا۔“  
سلطانہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ نائلہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔ وہ ابھی خیمے کے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ  
رجسٹری تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ کچھ دیر تک گہری  
نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھتی رہی۔

”کیا بات ہے وجہی جی۔ تم ہمیں اس طرح کیوں گھور رہی ہو؟“ سلطانہ مسکراتے ہوئے بولی۔  
”تم میں سے کوئی ان چٹانوں کی طرف تو نہیں گیا تھا؟“ وجہی نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے  
ہوئے پوچھا۔

”وجہی جی۔“ سلطانہ نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا دماغ خراب ہے کہ ہم  
اس تیز دھوپ میں اس چپتی ہوئی چٹانوں کی طرف جائیں گی، لیکن بات کیا ہے؟“  
”ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ وجہی نے بتایا۔ ”ان چٹان نما پتھروں میں کسی نے یکپ کے ایک محافظ کو قتل  
کر دیا ہے۔“

”کیا!!“ سلطانہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”تم مذاق تو نہیں کر رہیں؟“  
”مذاق نہیں، یہ حقیقت ہے۔“ وجہی نے نائلہ کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے اس  
کی گردن کی ہڈی توڑ دی ہے۔“

نائلہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وجہی جس طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس سے تو یہی لگتا تھا  
ہے وہ اسی پر محافظ کے قتل کا شبہ کر رہی ہو۔ یکپ کے سب سے لوگ جانتے تھے کہ وہ مارشل آرٹس کی ماہر  
ہے اور اس نے جس طرح محافظ کی گردن کی ہڈی توڑی تھی اس سے بھی صاف اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ  
کس کا کام ہو سکتا ہے۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”نئے آنے والوں میں ایک دو ایسے ہیں جو یہاں بھی اپنی دادا  
گیری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک دو مرتبہ محافظوں سے بھی الجھ چکے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ انہی میں سے  
ایک کا کام ہو گا۔“

”محافظ کی گردن کی ہڈی اس طرح ٹوٹی ہے جیسے اس پر کرانے کی کوئی مخصوص ٹیکنیک استعمال کی گئی  
ہے۔“ وجہی ایک بار پھر نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
نائلہ کا دل ایک بار پھر تیزی سے دھڑک اٹھا۔

”پھر تو قاتل تک پہنچنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”نئے آنے والوں میں سے دو  
لاکے بلک بیٹھ ہیں۔ ان میں سے ایک تو اس روز تیار ہوا تھا کہ وہ بریکنگ کا ماہر ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ  
اس کا محافظ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو اور اس نے محافظ کی گردن توڑ دی....“

”نائلہ بھی تو بلک بیٹھ ہے۔ یہ بھی بریکنگ کی ماہر ہے۔“ وجہی نے کہتے ہوئے عجیب سی نگاہوں  
نائلہ کی طرف دیکھا۔

”وجہی جی۔“ نائلہ نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر  
کمی حسد کا شبہ ہے؟“

”ہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وجہی بولی۔ ”میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ تم میں سے



کوئی اس طرف تو نہیں گیا تھا؟“

”نہیں دیدی۔ نائلہ تو کافی دیر سے میرے پاس بیٹھی ہے اور سسی حسب معمول اپنے خیمے میں لیٹی آرام کر رہی ہوگی۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تم لوگ کم از کم دو تین گھنٹوں تک خیموں تک ہی محدود رہتا۔ کیمپ کے محافظ پھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ساتھی کے قاتل کی تلاش میں ہیں۔ اگر کسی پر شبہ بھی ہو گیا تو وہ بلا جھجک اسے گولی مار دیں گے۔“ وجہی کہتے ہوئے خیمے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد نائلہ اور سلطانہ نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے پاکستان واپس جا کر میں بھی کسی اچھے ماسٹر سے مارشل آرٹ سیکھ ہی لوں۔ میں تو اسے محض ایک ورزش ہی سمجھتی تھی مگر یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”ذاتی تحفظ کے لیے میں سمجھتی ہوں کہ مارشل آرٹ سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہے۔ خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی اپنا دفاع کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں لڑکیوں کو تو یہ فن ضرور سیکھنا چاہیے۔ میں کئی مرتبہ اس فن کے ذریعے اپنا دفاع کر چکی ہوں۔ وہ ایک مثال تمہارے سامنے ہے جب میں اس کیمپ میں آئی تھی اور مشتاق اور اس کے ساتھی مجھے اور سسی کو سوتے میں سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اگر میں اس فن سے واقف نہ ہوتی تو وہ لوگ ہمارا تپا پانچا کر چکے ہوتے۔ میں پچھلے چند مہینوں سے ایسے حالات کا شکار رہی ہوں کہ اگر کوئی عام لڑکی ہوتی تو پہلے ہی موقع پر اپنی عزت و آبرو لٹا چکی ہوتی، مگر یہ فن میرے بڑے کام آتا ہے۔ ہر موقع پر اس سے مجھے اپنے تحفظ اور بچاؤ میں مدد ملی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”تم نے یہ فن کہاں سے سیکھا تھا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”کہاں سے اور کس سے سیکھا والی بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آج کل تو ہر گلی کوچے میں مارشل آرٹس کے کلب کھلے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ اپنے آپ کو انٹرنیشنل انسٹرکٹر ماسٹر کہلانے لگے ہیں جو درحقیقت اس فن کا مفہوم بھی نہیں جانتے۔ یہ فن سیکھنے کے لیے کسی حقیقی ماسٹر کی تلاش ضروری ہے اور میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ایک ایسا شخص مل گیا تھا جو اس فن کا واقعی ماسٹر ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”حکیم نادر عباس۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ان کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہے اور وہ پورے پاکستان میں گھومتے رہتے ہیں۔ پورے ملک میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیں۔“

”یہ حکیم نادر عباس وہی تو نہیں جو بی وی ڈراموں اور فلموں میں بھی آتے ہیں۔“ سلطانہ نے پوچھا۔

”بالکل وہی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”وہ تو واقعی ماسٹر ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”اگر مجھے لاہور جانے کا موقع ملا تو میں اس سے یہ فن ضرور سیکھوں گی۔“

نائلہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کیمپ کی فضا اچانک ہی فائزنگ سے گونج اٹھی۔ بڑی زبردست فائزنگ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو پارٹیاں آپس میں ٹکرائی ہوئی۔ چند سیکنڈ بعد ہی سسی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

”کیا ہو؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ادھر گولیاں چل رہی ہیں ادی۔“ سسی نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ ایک منٹ بعد وجہی بھی

وڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

”ارے تم تینوں میرے ساتھ چلو۔۔۔ جلدی کرو۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔“ وجنتی نے کہا۔

”کیوں... کیا ہوا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”دو لڑکوں کو محافظ کے قتل کے شبے میں پوچھ گچھ کے لیے پکڑا گیا تھا۔ ان کے دوسرے ساتھیوں نے فسادات کردی۔ محافظوں سے اسلحہ چھین کر انہوں نے باقاعدہ محاذ کھول لیا ہے۔ یہ جگہ تم لوگوں کے لیے نکل محفوظ نہیں ہے۔ میرے ساتھ کسی غار میں چلو۔ جلدی کرو۔“ وجنتی نے کہا۔

وہ تینوں خیمے سے نکل کر اس کے ساتھ دوڑ پڑیں۔ واقعی محاذ کھلا ہوا تھا۔ چاروں طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ کئی گولیاں ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ ایک گولی تو زن کی آواز سے سسی کے کان کے قریب سے گزر گئی تھی۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اس کی کھوپڑی اور گولی کے درمیان صرف انداچ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

وجنتی انہیں چٹانی غار میں اس کمرے میں لے آئی جو رام سروپ کے بیڈروم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دو ہندو لڑکیاں اور بھی وہاں آگئی تھیں۔ ان کے چہرے بھی دھواں ہو رہے تھے۔

”وہ..... وہ لکشی ان کے قبضے میں آگئی ہے۔“ ایک ہندو لڑکی نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔ ”دو آدمی اسے خیمے سے نکال کر گھسیٹتے ہوئے چٹانوں کی طرف لے گئے ہیں۔“

”تم لوگ بیس رکو... میں ابھی آتی ہوں۔“ وجنتی کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

باہر کمپ سے فائرنگ کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں، لیکن چٹانوں کے اندر یہ غار بالکل محفوظ تھی۔ نالکہ حیرت سے اس غار کو دیکھ رہی تھی جسے بیڈروم کے طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ غار کی دیواروں پر نیم بیاں عورتوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک میز پر پی ڈی اور وی سی آر رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کئی بیو بیو کیسٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک میز پر شراب کی چند بوتلیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ بیڈ کے ساتھ ہی سائڈ ٹیبل پر چند دیگر چیزوں کے علاوہ اسٹیل کا ایک پکچر فریم بھی رکھا ہوا تھا۔ تصویر میں رام سروپ کے ساتھ ایک جوان عورت اور تقریباً ”تین چار سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ وہ عورت یقیناً ”رام سروپ کی بیوی اور وہ بچہ اس کا بیٹا تھا۔“

باہر تقریباً ”ایک گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وجنتی کی واپس آگئی۔

”چلو۔۔۔ اب لڑائی ختم ہو چکی ہے۔“ وجنتی نے کہا۔

”اور وہ لکشی...“ ایک ہندو لڑکی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ محفوظ ہے۔“ وجنتی نے جواب دیا۔ ”تم لوگ اپنے اپنے خیموں میں جاؤ۔“

وہ سب غار سے باہر آگئیں۔ وجنتی بھی سلطانہ وغیرہ کے ساتھ اس کے خیمے میں آگئی تھی۔

”یہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔“ وجنتی نے کہا۔ ”ایسے موقع پر ان لوگوں کے ساتھ ذرا سختی سے پیش نہ پڑتا ہے۔“

”میرے خیال میں تو ایسے لوگوں کو گولی ہی مار دینی چاہئے۔“ نالکہ نے دانت کچکپاتے ہوئے کہا۔ ایک تو ان لوگوں سے ہمدردی کی جائے اور اوپر سے یہ قتل و غارت پر اتر آئیں۔“ نالکہ نے یہ بات محض اس لیے کی تھی کہ وجنتی ان پر کسی قسم کا شبہ نہ کر سکے۔

”تین آدمی مارے گئے ہیں اور باقیوں کو باندھ کر ڈال دیا گیا ہے۔ دو محافظ زخمی ہوئے ہیں ان میں سے ایک کی حالت تشویش ناک ہے۔“ وجنتی نے بتایا۔

”کیا رام سروپ اور کرمل گپتا کو اس کی اطلاع کردی جائے گی۔“ نائلہ نے پوچھا۔

”رام سروپ کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ لیکن وہ جس کام سے گئے تھے اس کے لیے ان کا دہلی میں رکنا ضروری ہے۔ وہ تین دن بعد آئیں گے۔ انہوں نے اپنے اسٹنٹ مسزورما کو ہدایت کردی ہے وہ اپنے طور پر صورت حال سے نمٹ لے۔“ وجنتی نے بتایا۔ ”میں ابھی جاری ہوں۔ اب شام کی چائے پر تم لوگوں سے ملاقات ہوگی۔“

نائلہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہوں نے دو دن بعد یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔ رام سروپ اور کرمل گپتا کی واپسی سے کچھ مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ مگر یہ بھی مقام شکر تھا کہ وہ مزید تین دن کے لیے دہلی میں رک گئے تھے۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کرتے ہوئے نائلہ کو یہ خوشگوار خبر سننے کو ملی کہ گزشتہ رات پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی اونٹنوں کے اس قافلے کو پکڑ لیا گیا تھا جس میں سات تربیت یافتہ دہشت گردوں کے علاوہ بڑی مقدار میں اسلحہ اور زہریلے کیمیکل کے ڈرم بھی شامل تھے۔ یہ کارروائی پاکستانی رینجرز، فوجی جوانوں، پولیس اور کسٹمز کی ایک مشترکہ ٹیم نے کی تھی۔ مقابلے میں تین دہشت گرد مارے گئے تھے تین گرفتار ہو گئے تھے اور ایک دہشت گرد زخمی حالت میں سرحد پار کر کے واپس آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پولیس نے عمر کوٹ کے ایک ہندو سینٹر کو بھی گرفتار کیا تھا۔

نائلہ کو یہ ساری باتیں وجنتی نے بتائی تھیں۔ اور اس بات پر حیرت کا اظہار بھی کیا تھا کہ پاکستانی حکام کو اس قافلے کے بارے میں اطلاع کیسے ملی حالانکہ قافلے کی روانگی کو نہایت خفیہ رکھا گیا تھا۔

”ممکن ہے عمر کوٹ کے اس ہندو سینٹر کے کسی آدمی ہی نے مخبری کردی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ وجنتی نے کہا۔ ”بہر حال“ اس قافلے کے پکڑے جانے سے ہمیں کافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اسلحہ اور اس کیمیکل کی قیمت کروڑوں روپے تھی۔“

وجنتی ہندو سرکار کے نقصان کا ماتم کر رہی تھی اور نائلہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اس کی فراہم کردہ اطلاع پر دہشت گرد زہریلا کیمیکل اور بھاری مقدار میں اسلحہ پکڑا گیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی۔

تیسرے دن صبح سویرے ہی انہوں نے اپنی کارروائی شروع کردی۔ نائلہ نے وجنتی کو ناشتے کے بعد ہی بتادیا تھا کہ آج وہ رام گڑھ جانا چاہتی ہیں۔ ان کے لیے ایک گاڑی کا بندوبست کر دیا جائے۔“

”کس وقت جاؤ گی؟“ وجنتی نے پوچھا۔

”گیارہ بجے کے لگ بھگ۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”مجھے بھی کچھ چیزیں منگوانی ہیں۔ جاتے وقت مجھ سے پیسے لے لینا۔“ وجنتی نے کہا۔

”تم خود کیوں نہیں چلتیں ہمارے ساتھ؟“ نائلہ نے کہا۔

”اچھا دیکھو، موقع ملا تو میں بھی چلی چلوں گی، ورنہ پیسے لے جانا مجھ سے۔“ وجنتی نے جواب دیا۔

وجنتی نے ان کے لیے ایک جیب کا بندوبست کر دیا۔ نائلہ نے جیب چیک کر کے اطمینان کر لیا تھا۔ اس کا انجمن بہترین حالت میں تھا اور پیڑوں کی ٹنگی بھی بھری ہوئی تھی۔ اس نے جیب پر کیپ کا ایک مختصر سا چکر لگایا اور جیب کو اپنے خیمے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ کیپ کے گیٹ پر بھی ان کے بارے میں اطلاع دے دی گئی

اس وقت ساڑھے نو بجے تھے۔ نائلہ نے سسی کو کچھ ہدایات دیں اور پھر سلطانہ اور وہ اپنے اپنے  
 ہاں میں مصروف ہو گئیں۔ انہوں نے پورے کیمپ میں مختلف مقامات پر دھماکہ خیز مادے کے ٹائم  
 السننگار رکھے تھے۔ وہ دونوں مختلف جیلوں بہانوں سے ادھر ادھر کھومتے ہوئے ان ڈیوائسز کی تائریں جوڑ  
 لگا رہے تھے اور اس کے بعد ایک ایک منٹ کے وقفے کا ٹائم فنکس کر رہی تھیں۔

نائلہ شعلتی ہوئی اس غار کی طرف جارہی تھی جس میں اسلحہ اور گولہ بارود کا ذخیرہ تھا۔ اس نے اس بات  
 خیال رکھا تھا کہ کوئی اسے اس طرف آتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ اسلحہ کے اس ڈپو میں غار کے آہنی  
 فوں والے دروازے کے اندر کی طرف ایک مسلح سنتری ہر وقت موجود رہتا تھا۔ نائلہ نے اس سنتری

بھی سنسنے کا طریقہ سوچ لیا تھا۔  
 اس وقت پونے گیارہ بجے تھے۔ دھوپ خاصی تیز تھی۔ چٹانیں تپ جانے کی وجہ سے کچھ گرمی بھی  
 لگتی تھی۔ غار کی طرف جاتے ہوئے نائلہ نے اپنی شرٹ کے اوپر کے دو بٹن کھول دیئے۔ گریبان چاک  
 ہانے سے اس کا سینہ نیم برہنہ ہو گیا تھا۔ وہ آہنی جنگلے کے سامنے رگ گئی۔ شکر نامی اڈیز عمر سنتری کرسی پر  
 باہر ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں گھوم رہی ہو نائلہ جی؟“ سنتری نے پوچھا۔ اس کی نظریں نائلہ پر مرکوز تھیں۔  
 ”اس وقت تو تم سے ہی ملنے آئی ہوں۔ اف، کتنی گرمی ہو رہی ہے اس وقت۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے  
 اس کا ایک اور بٹن کھول دیا۔  
 ”مم... مجھ سے ملنے۔“ شکر ہکھلا گیا۔

”ہاں تم سے... حیران کیوں ہو رہے ہو؟“ نائلہ مسکرائی۔  
 ”تو اندر آؤ نا...“ شکر نے تالا کھول کر گیت کھول دیا اور کھلا ہوا تالا جنگلے کی ایک سلاخ میں اٹکا دیا۔  
 نائلہ نے اندر آکر گیت بھیڑ دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے شکر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شکر کا چہرہ  
 غمور ہوا تھا۔ اس نے یہ اٹکل ایک طرف رکھ کر نائلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یہاں نہیں شکر جی۔“ آندر چلو... یہاں اگر کسی نے دیکھ لیا تو...“ نائلہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے  
 ہوئے جملہ ادمورا چھوڑ دیا۔

”آؤ... آؤ... اندر آجاؤ۔“ شکر اس کا ہاتھ پکڑ کر غار کے اندرونی حصے کی طرف چلنے لگا۔  
 یہ غار خاصا لمبا چوڑا تھا۔ اس میں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لکڑی کی لاتعداد  
 ٹاپوں اور نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ شکر غار کا ایک موڑ گھوم کر اسے پینٹیوں کے ایک انبار کے پیچھے لے آیا۔  
 ”آؤ شکر جی۔ دیر کس بات کی ہے۔“ نائلہ نے دونوں ہاتھیں پھیلا دیں۔

پھر وہ نائلہ پر جھک ہی رہا تھا کہ نائلہ نے بڑی پھرتی سے دونوں ہاتھوں سے اس کا گھبراہٹ لیا۔ شکر کے  
 یہ صورت حال بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ اپنا گھبراہٹ کی کوشش کرنے لگا۔ نائلہ نے ٹانگ سے اڑنگا  
 کرا سے نیچے گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر دونوں انگوٹھوں سے اس کا زرخہ دبائے لگی۔

نائلہ کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ اس کے جسم کی ساری طاقت اس کے ہاتھوں میں سمٹ آئی  
 تھی۔ شکر کی زبان باہر نکل آئی اور آنکھیں حلقوں سے اٹنے لگیں۔ اس کے زرخہ پر نائلہ کی گرفت سخت  
 سخت ہوتی جارہی تھی۔

شکر بری طرح ہاتھ پیرنچ رہا تھا۔ اس کی مداخلت بندرتیج کم ہوتی چلی گئی اور بالا خروہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ نالکہ کو جب اطمینان ہو گیا کہ وہ ختم ہو چکا ہے تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی گلے پر سے گرفت ہٹانے سے شکر کے پیچیدوں میں رکی ہوئی ہوا ایک عجیب سی آواز پیدا کرتی ہوئی اس کے حلق سے نکلی تھی۔

نالکہ کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے قیص کے بن بند کرنے لگی۔ پھر اس نے اپنی جینز کی جیبوں سے ٹائم بم والے ڈیوائسز نکالے اور بڑی پھرتی سے انہیں مختلف جگہوں پر فٹ کرنے لگی۔ ان ڈیوائسز پر اس نے گیارہ بج کر دس منٹ کا ٹائم فکس کیا تھا۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر کوئی محافظ اس طرف آگیا تو وہ زندہ نہیں بچ سکے گی۔

اپنا کام انجام دینے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جنگلے والے گیٹ کے قریب آگئی۔ ایک لمحہ کو وہاں رکی اور پھر باہر نکل کر گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا۔

نالکہ پتھروں کی آڑ لیتی ہوئی تیزی سے چلتی ہوئی اپنے خیمے کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت گیارہ بجتے ہیں تین منٹ باقی تھے۔ سسی جیب کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور سلطانہ اور وجنتی جیب کے قریب کھڑی تھیں۔ نالکہ کو دیکھتے ہی سلطانہ جیب پر سوار ہو گئی اور نالکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بیٹھتے ہی انجن اشارت کر دیا تھا۔

”میں نے سلطانہ کو روپے دے دیئے ہیں اور یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ کیا لانا ہے۔ تم ذرا اپنی پسند سے بھی کچھ لے لینا۔“ وجنتی نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ نالکہ نے کہتے ہوئے گاڑی کو گیسٹر میں ڈال دیا۔

”اور سنو! وجنتی نے اسے رکے کا اشارہ کیا۔ ”میڈیکل اسٹور سے...“

”تم خود ہی بیٹھ جاؤ تا ہمارے ساتھ۔“ نالکہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے پہلا دھماکہ ہو جانا تھا۔ نالکہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ جیب خیمے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ نالکہ نے سلطانہ کو اشارہ کیا۔ سلطانہ جیب سے اتر آئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے لباس سے پستول نکال لیا تھا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے وجنتی کا منہ دبوچ لیا اور پستول کی نال اس کے سینے پر رکھ کر ٹرائیگر دبا دیا۔ سنک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ وجنتی کے سینے سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ سلطانہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھے اسے گھسیٹتی ہوئی خیمے کے اندر لے گئی وجنتی بری طرح زپ رہی تھی۔ سلطانہ نے اسے خیمے کے اندر لے جا کر فرش پر پٹنچ دیا اور دوڑ کر خیمے سے باہر آگئی۔ اور اچھل کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کے لباس پر خون کے چھینٹے پڑ گئے تھے۔

”سسی... ہوشیار۔“ نالکہ نے کہتے ہوئے جیب ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

سسی دونوں سینوں کے بیچ میں فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے جیب کی ایک سیٹ اٹھا کر اس کے نیچے سے ایک سب مشین گن نکال لی۔

جیب بڑی تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے محافظ نے جیب کو آتے دیکھا اور لکڑی کے بیر کی رسی بک میں سے نکالنے لگا۔ جیب ابھی گیٹ سے تقریباً ”میں گز دور تھی کہ کیمپ میں کسی جگہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ دھماکے کی آواز پہاڑیوں میں گونج گئی۔ گیٹ پر کھڑا ہوا سنتری جپ کا تیز رفتاری دیکھ کر اور پھر دھماکے کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے رسی دوبارہ بک میں پھنسا دی اور ام

ساتھی کو پکارتے ہوئے کندھے سے رانقل اتارنے لگا۔

”ہوشیار!“ نالکہ چیخی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک سیلیئر پٹر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔ اب جیب بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔

سلطانہ کھلی جیب میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ وڈا اسکرین کے فریم پر جمادیا اور پستول والا ہاتھ آگے نکال کر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس کیپ میں حاصل کی گئی دہشت گردی کی تربیت کی آزمائش کا پہلا موقع تھا۔ اس کی پستول سے نکلی ہوئی خاموش گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی۔ سنتری کو کندھے سے رانقل اتارنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سلطانہ کی گولی نے اس کی کھوپڑی پاش پاش کر دی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

اس دوران دوسرا محافظ گارڈ روم سے باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی سب مشین گن تھی مگر سلطانہ نے اسے بھی سب مشین گن سیدھی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے ایک ہی گولی میں اس محافظ کو بھی ڈھیر کر دیا۔

تیز رفتار جیب لکڑی کا بیر توڑتی ہوئی نکل گئی۔ ٹھیک اسی لمحہ کیپ میں دوسرا دھماکہ ہوا... یہ دھماکہ پہلے سے زیادہ زوردار تھا۔

جیب کیپ سے باہر آ گئی تھی۔ گیٹ کے قریب ہی واچ ٹاور تھا جس پر ایک لائٹ مشین گن نصب تھی اور دو سنتری ڈیوٹی پر موجود تھے۔ تیز رفتار جیب اور گیٹ کے سنتریوں کی چیخوں نے انہیں چونکا دیا۔ پہلے دھماکے پر وہ کیپ کی طرف دیکھنے لگے تھے لیکن پھر جیب کی طرف متوجہ ہو گئے جو طوفانی رفتار سے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ ان میں سے ایک سنتری لائٹ مشین گن کے ہیل کارخ نیچے کی طرف کرنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہیل کا زاویہ درست کرتا جیب کی پچھلی سیٹوں کے بیچ میں بیٹھی ہوئی سسی نے اپنی سب مشین گن کا رخ اوپر کر کے ٹرائیگر کھینچ دیا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ نکلی۔ واچ ٹاور کا ایک سنتری تھج کر قلابازی کھاتا ہوا تقریباً چالیس فٹ اونچے واچ ٹاور سے نیچے آن گرا۔ اسے سسی کی دو گولیاں لگی تھیں اور سر کے بل نیچے گرتے ہی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ دوسرا محافظ گولی کھا کر واچ ٹاور کے پلیٹ فارم پر ہی ڈھیر ہو گیا تھا۔

”ویل ڈن سلٹی!“ سلطانہ خوشی سے چیخی۔

”کیا بولا دی؟“ سسی نے بھی چیخ کر کہا۔

”ویل ڈن... بہت اچھے۔“ سلطانہ نے کہا۔

اسی لمحہ کیپ میں ایک اور دھماکہ ہوا... اور پھر پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ جیب کا رخ رام گڑھ کی طرف تھا لیکن تقریباً ”نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نالکہ نے جیب کا رخ بدل دیا۔ اب جیب ایک طویل چکر کاٹ کر اس سڑک پر آ گئی تھی جو کشن گڑھ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ پختہ سڑک تھی۔ اس لیے جیب کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

کیپ میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے اور پھر گیارہ بج کر دس منٹ پر جو دھماکہ ہوا وہ اس قدر خوفناک تھا کہ کئی میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود دھرتی کانپ اٹھی تھی۔ نالکہ کے ہاتھ سے اسٹیرنگ جھوٹ گیا۔ اگر وہ فوراً ہی دوبارہ اسٹیرنگ پر گرفت نہ بھالیتی تو تیز رفتار جیب کے الٹ جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ یہ دھماکہ اسلحہ اور گولہ بارود والے غار میں ہوا تھا اور پھر مسلسل اس طرح کے دھماکے ہونے لگے کہ زمین بار بار کانپ اٹھتی۔ نالکہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ کئی میل کا فاصلہ حائل ہو جانے کے باوجود چٹانیں

روٹی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ نالکہ جیب کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ وہ کیپ سے تقریباً "بیس میل دور نکل آئی تھیں۔ مسلسل دھماکوں کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ کیپ مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہوگا اور کوئی بھی زندہ نہیں بچا ہوگا۔ نالکہ کو ہر حال و جنتی کی موت کا افسوس تھا۔ وہ تقریباً "ڈیڑھ سہ ماہیہ اس کیپ میں رہی تھی اور اس دوران اس کا زیادہ واسطہ و جنتی ہی سے رہا تھا۔ وہ اچھی دوست بن گئی تھیں۔ لیکن و جنتی بھی ان لوگوں میں شامل تھی اور اس کے ملک کو تباہی کی طرف دھکیلنے میں دوسروں کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ اس کے ملک کی دشمن تھی اور کسی ملک دشمن سے دوستی کا کیا سوال....؟

چند میل کا مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر نالکہ نے جیب سڑک سے اتار کر ایک کچے راستے پر ڈال دی تھی۔ اس طرف کافی دور جھاڑیوں کا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔ نالکہ نے جھاڑیوں کی آڑ میں جیب روک لی۔ "نقشہ کہاں ہے؟" نالکہ نے سوالیہ نگاہوں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔

سلطانہ نے اپنی سیٹ کے نیچے چھپایا ہوا نقشہ نکال لیا۔ یہ راجستھان کا نقشہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی علاقوں، چولستان اور سندھ کے سرحدی علاقوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔

"اگر ہم اسی پختہ سڑک پر چلتے رہیں تو ایک طویل پکڑ کاٹنے کے بعد ہم کشن گڑھ پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے سرحد عبور کر کے چولستان میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ کشن گڑھ سے ایک کچی سڑک سرحد پار کر کے صادق آباد کی طرف چلی گئی ہے لیکن بیچ میں یہ نانو تو نامی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں سے ایک کچی سڑک سندھ اور پنجاب کے ایک سرحدی قصبے سانڈک کی طرف بھی چلی گئی ہے۔" سلطانہ نے بتایا۔

"ہم فی الحال سرحد کا رخ نہیں کریں گے۔ رام گڑھ میں کیپ کی تباہی کا پتہ چل گیا ہوگا۔ وہ لوگ سب سے پہلے سرحدی علاقوں پر توجہ دیں گے۔ اس لیے ہم فی الحال سرحد سے دور ہی رہیں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں کشن گڑھ کی بجائے بیکانیر کا رخ کرنا چاہئے۔ بیکانیر جیسے بڑے شہر میں ہم زیادہ محفوظ رہیں گے۔" نالکہ نے کہا۔

"تو پھر ہمیں یہاں سے بھنے والا کی طرف نکلنا چاہئے۔" سلطانہ نے کہا۔ "اس طرف کسی باقاعدہ راستے کی نشاندہی نہیں ہے۔ سارا ریگستانی علاقہ ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ تول ہی جائے گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اسی طرف چلتے ہیں۔" نالکہ نے کہتے ہوئے انجن اشارت کر دیا۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں ریگستان میں ایک ٹریک مل گیا۔ یہ سخت ریت والا علاقہ تھا اور جیب ڈرائیو کرنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ ریگستان میں کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ یہ راجپوتوں کی بستی تھی۔ یہاں نہ صرف کھانے پینے کو مل گیا بلکہ انہیں صحیح راستے کا بھی پتہ چل گیا۔

بھنے والا پہنچتے ہوئے شام کے چھ بج گئے۔ یہ نسبتاً بڑی آبادی والا قصبہ تھا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک کولایات کی طرف چلی گئی تھی۔ قصبے کے لوگوں نے اگرچہ انہیں رات کے وقت ریگستان میں سترجاری رکھنے سے منع کیا تھا مگر نالکہ اور سلطانہ نے سترجاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ بھنے والا سے کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں سامنے سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں دکھائی دیں۔ نالکہ نے فوراً ہی جیب کی بتیاں بجادیں اور جیب کو

سڑک سے ہٹا کر قدرے بائیں طرف ریگستان میں موڑ دیا۔

”گھاؤں والوں نے بتایا تھا کہ کولایات سے آخری بس شام سے پہلے پہلے یہاں پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بس نہیں آتی۔ لیکن یہ گاڑی...“ نائلہ نے سامنے سے آنے والی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہو سکتا ہے ہماری تلاش شروع ہو چکی ہو اور کولایات کی طرف سے آنے والی یہ پولیس کی کوئی گاڑی ہو۔ یہ گاڑی نکل جائے تو ہم دوبارہ سڑک پر آجائیں گے۔“

”لیکن اگر وہ پولیس کی کوئی گاڑی ہے تو انہوں نے ہماری جیب کے ہیڈلیمپس تو دیکھ ہی لئے ہوں گے اور پھر جیب کی عقبی سرخ بتیاں ہماری نشاندہی کر سکتی ہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔

”وہ گاڑی ابھی کافی دور ہے۔ ہم زیادہ آگے نہیں جائیں گے۔“ نائلہ نے جواب دیا اور تقریباً نصف میل کا مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے جیب روک کر اس کی ساری بتیاں بجھا دیں۔

وہ تینوں اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھی سڑک کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ گاڑی کہیں رکے بغیر چلی گئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ انہوں نے جیب کے ہیڈلیمپس پر توجہ نہیں دی تھی۔

جب اس گاڑی کی عقبی سرخ روشنیاں بھی ریگستان میں غائب ہو گئیں تو نائلہ نے جیب کا انجن اشارت کر دیا اور جیب کو حرکت میں لا کر اسے دوبارہ سڑک کی طرف موڑ دیا۔ انہوں نے تقریباً چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر لیا لیکن سڑک نہیں ملی۔ نائلہ کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی اور اس نے جیب روک لی۔

”کیا ہوا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”ہم نے سڑک سے ہٹ کر تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جیب روک لی تھی اور اب واپسی پر چار پانچ میل کا فاصلہ طے ہو چکا ہے۔ وہ سڑک ابھی تک نہیں آئی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”اوہ!“ سلطانہ بولی۔ ”واپس موڑو۔“

نائلہ نے جیب واپس موڑ لی لیکن وہ سڑک تک نہیں پہنچ سکیں۔

”ہم بھٹک تو نہیں گئے؟“ سلطانہ کے بلبے میں ہلکا سا خوف تھا۔ ”کسی ریگستان میں بھٹکنے کا مطلب سمجھتی

ہو؟“

”مجھے اور سسی کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں اسی طرف چلتے رہنا چاہئے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”تو پھر چلتی رہو۔ اللہ مالک ہے۔“ سلطانہ کے منہ سے بے اختیار مگر اسانس نکل گیا۔

جیب سخت ریت پر دوڑتی رہی۔ نائلہ کو صرف یہ خدشہ تھا کہ جیب کا پٹرول ختم ہو گیا یا جیب کہیں ریت میں دھنس گئی تو پہلے تو وہ چمکی تھیں لیکن شاید اس مرتبہ ریگستان میں بھٹکنے کے بعد زندہ نہ بچ سکیں۔

بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جیب کے پتے ریت میں دھنس گئے۔ ایک مرتبہ کو شش کر کے وہ جیب کو ریت سے نکالنے میں کامیاب ہو گئیں لیکن ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیب کے پچھلے پتے دوبارہ ریت میں دھنس گئے۔ فوراً وہیل ڈرائیو ہونے کے باوجود جیب ریت سے نہیں نکل سکی۔ پچھلے دونوں پتے ریت میں گھومتے رہے۔ ریت اڑتی رہی اور اس طرح جیب کے پیروں کے نیچے کھڈے کچھ اور گہرے

ہوتے چلے گئے۔

”ارے ادی!“ سسی نے کہا۔ ”ہم پھر ریگستان کے قیدی بن گئے کیا؟“



”واہ سسی واہ!“ سلطانہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”بہت اچھا جملہ استعمال کیا تم نے۔ ریگستان کے قیدی۔“

”اس قید سے نکلنے کی بھی سوچو ورنہ ہمیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔  
سلطانہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے وہ کوئی چٹان ہے۔“ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”کیوں نا اس چٹان پر چڑھ کر دیکھا جائے۔ ہو سکتا ہے اس پاس کسی بہتی کی روشنیاں نظر آجائیں۔“  
”چلو۔“ نائلہ جیب سے اتر آئی۔

وہ تینوں چٹان کی طرف چلے گئیں۔ اس چٹان تک پہنچنے کے لیے انہیں تقریباً ”دو میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ انہیں چٹان پر چڑھنے کا راستہ بھی مل گیا۔ بھر بھر میٹھی کی وہ چٹان تقریباً ”سو فٹ اونچی تھی۔ وہ اوپر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ چاروں طرف تاریک ریگستان کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔  
”ہمیں بیٹھ جاؤ۔“ سلطانہ ایک جگہ ڈھیر ہو گئی۔ ”دن چڑھے گا تو دیکھا جائے گا۔ رات تو ہمیں یہیں گزارنی ہوگی۔“

نائلہ اور سسی بھی بیٹھ گئیں۔ سسی نے جیب سے رائفل بھی اٹھالی تھی۔ اس نے رائفل ایک طرف پھینک دی اور زمین پر لیٹ گئی۔ اچھی خاصی سردی تھی۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے لپٹی باتیں کرتی رہیں لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نیند تو سوسلی پر بھی آجاتی ہے۔ وہ تینوں بھی آخر سو ہی گئیں.....  
دفعۃً نائلہ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے نیند میں یوں محسوس ہوا جیسے موسیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ اسے واہمہ یا خواب سمجھی، لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ گھنٹیوں کی آواز اب بھی اس کی سماعت سے نکل رہی تھی۔

دن کی بدھم سی روشنی پھیل رہی تھی۔ نائلہ نے سلطانہ اور سسی کو بھی جگا دیا۔  
”یہ آواز سن رہی ہو؟“ نائلہ نے کہا۔ ”جیسے موسیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔“  
”ہاں، کچھ آواز تو آرہی ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ پھر ایک دم اچھل پڑی۔ ”کارواں! میرا خیال ہے کوئی قافلہ گزر رہا ہے۔“

”وہ تینوں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ چٹان کی پچھلی طرف تقریباً ”نصف میل کے فاصلے پر اونٹوں کا ایک قافلہ جاتا ہوا نظر آیا۔ آوازیں انہی اونٹوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی تھیں۔ اگر سنا نا نہ ہوتا تو اتنی دور سے انہیں یہ آوازیں سنائی نہ دے پاتیں۔“

وہ تینوں چٹان سے اتر کر کارواں کی طرف دوڑنے لگیں۔ وہ قافلے والوں کو متوجہ کرنے کے لیے زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ اس کارواں میں چھ اونٹ شامل تھے، جن کے ساتھ صرف ایک ہی مرد تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر اونٹوں کو روک لیا۔

تینوں گرتی پڑتی ہانپتی ہوئی کارواں کے پاس پہنچ گئیں۔ سسی اپنی رائفل چٹان پر ہی چھوڑ آئی تھی البتہ سلطانہ نے اپنا پستول جینز کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

ساربان پہلے تو انہیں آدمی ہی سمجھا تھا۔ لیکن وہ قریب پہنچیں تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ریگستان میں اتنی حسین لڑکیاں کہاں سے آگئیں؟ اس نے اپنی انگلی کو دانتوں میں دبکا رکھا۔ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ اس شخص نے اینٹھی ہوئی زبان میں پوچھا اور باری باری تینوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اب بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”ہم مسافر ہیں۔ اس چٹان کے دوسری طرف ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ ہم راستہ بھٹک کر اس طرف آ گئے ہیں۔ کیا تم ہمیں کسی بستی تک پہنچا سکتے ہو۔ ہم تمہیں اس کا معاوضہ دیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”جانا کہاں ہے تم لوگوں کو؟“ اس شخص نے پوچھا۔ وہ راجپوت تھا۔ مخصوص انداز میں بندھی ہوئی گلابی رنگ کی پگڑی۔ بڑی بڑی بل کھائی ہوئی مونچھیں سفید کرتا اور مخصوص انداز میں بندھی ہوئی سفید دھوٹی۔ پیروں میں کھسہ نما جوتے تھے۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

”کولایات... ہمیں کولایات جانا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں تم لوگوں کو کولایات سے چند میل پہلے ایک بستی میں پہنچا دوں گا۔ وہاں سے تم لوگ بس پر بیٹھ کر چلی جانا۔“ اس شخص نے کہا اور ہش ہش کر کے اونٹوں کو بٹھانے لگا۔

سسی تو اونٹ پر سفر کرنے کی عادی تھی مگر نائلہ اور سلطانہ کے لیے اونٹ کی سواری کا پہلا تجربہ تھا۔ انہیں الگ الگ اونٹوں پر بٹھایا گیا تھا اور جب اونٹ کھڑے ہونے لگے تو نائلہ اور سلطانہ کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل گئی تھیں۔

”تم کہاں سے آرہے ہو۔ ہمیں تو ریگستان میں کوئی بستی نظر نہیں آئی۔“ نائلہ نے پوچھا وہ دوسرے اونٹ پر بھی اور اس سے آگے والے اونٹ پر وہ شتریان تھا۔

”دو کوس ادھر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔“ شتریان نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں اسی بستی میں رہتا ہوں۔ کولایات جا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے ایک بستی میں رکوں گا۔ وہاں سے اونٹوں پر سامان لادنا ہے۔ لیکن تم لوگ گھبراؤ نہیں۔ اس بستی سے تمہیں کولایات کے لئے بس مل جائے گی۔“

”وہ بستی یہاں سے کتنی دور ہے اور کولایات اس سے کتنا آگے ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”وہ بستی یہاں سے تین کوس ہے اور کولایات اس سے پندرہ کوس اور آگے۔“ شتریان نے بتایا۔

”کیا اس بستی میں کوئی ایسی دوکان ہے جہاں ہے ہمیں کوئی زنانہ لباس مل سکے۔ ان کپڑوں سے تو ہم نے توبہ کر لی ہے۔ بہت بے آرامی ہوتی ہے۔ ولائتی لباس پہننے کا شوق پورا ہو گیا۔“ نائلہ نے کہا۔

”مل جائیں گے لیزے لے لے۔“ شتریان نے کہا۔ ”میں دلا دوں گا۔ دوکاندار ہیرا مل میرا دوست ہے۔“

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”گھنیش داس۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

قافلہ چلتا رہا۔ باتوں میں سفر آسانی سے کٹ گیا تھا۔ اب وہ بستی نظر آنے لگی تھی۔

”ہمیں بستی سے باہری اونٹوں سے اتار دینا۔ ورنہ بستی کے لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

بستی سے کچھ پہلے جھاڑیوں اور کھجور کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ گھنیش داس نے انہیں بستی کے باہری اونٹوں سے اتار دیا۔ اونٹوں کے بیٹھتے ہوئے بھی انہیں اتنے ہی جھٹکے لگے تھے جتنے اونٹوں پر سوار ہوتے وقت لگتے تھے۔

گھنیش داس بھی اپنے اونٹ سے اتار کر ان کے ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ بستی کیا تھی اچھا خاصا گاؤں

تھا۔ نالکہ کے خیال میں پانچ چھ ہزار کی آبادی تو ضرور رہی ہوگی۔

گھنیش داس انہیں دو تین گلیوں میں گھماتا ہوا ایک دوکان کے سامنے رک گیا۔ دوکان ابھی ابھی کھلی تھی اور دوکاندار ہیرا مل پیتل کی لٹیا سے دوکان کے سامنے تھوڑے پرچم کاڑ کر رہا تھا۔ چمڑ کاڑ کیا کر رہا تھا بس انگلیاں بھگو کر جھینٹے دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رام رام کی مالا بھی جپ رہا تھا۔

”ہیرا مل، گھر کا دروازہ کھولو... تمہارے لیے گاہک لایا ہوں۔ ان میسوں کو کپڑے چاہئیں۔“ گھنیش داس نے کہا۔

ہیرا مل چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دوکان میں گھس گیا۔ اس وقت سورج نکل رہا تھا۔ اتفاق سے گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہیرا مل نے اندر سے ملحقہ دروازہ کھول دیا۔ وہ تینوں اندر داخل ہو گئیں۔ گھر خالی پڑا تھا۔

”کپڑے تو تم نے پہن رکھے ہیں میم صاحب اور کیا چاہئے؟“ ہیرا مل نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نالکہ نے اسے بتایا کہ انہیں کس قسم کے کپڑے چاہئیں اور پھر تقریباً ”پون گھنٹے بعد جب وہ ہیرا مل کے مکان سے باہر نکلیں تو مکمل طور پر راجستھانی لباس میں تھیں۔ یہ پورا صحرائے تھر کا خطہ تھا۔ سندھ میں تھر کے علاقے اور اس علاقے کی خواتین کے لباس میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ چولی، گھاگرا اور چڑی نما پیلے رنگ کی یا لال رنگ کی چادر... انہوں نے بانسوں میں سفید اور سرخ رنگ کی پلاسٹک کی چوڑیاں بھی پہن لی تھیں۔

جب وہ مکان سے نکلیں تو گھنیش داس اپنے اونٹ لے کر جا چکا تھا۔ ہیرا مل نے انہیں سمجھا دیا کہ کولایات کی بس کماں سے ملے گی اور پھر تھوڑی سی دیر بعد وہ بس پر سوار کولایات کی طرف جاری تھیں۔ اس بستی سے کولایات تک کچی سڑک تھی۔ بس نے ابھی تقریباً ”تین چار میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ سامنے سے ایک فوجی جیب اوڑا اس کے پیچھے ایک ٹرک آتا ہوا دکھائی دیا۔ جیب سڑک کے وسط میں رک گئی۔ مجبوراً ”بس ڈرائیور کو بھی بس روکنا پڑی۔ ایک فوجی جیب سے اتر کر بس میں آیا اور سوار یوں کو گھورنے لگا۔ نالکہ مسی اور سلطانہ نے دوسری راجستھانی عورتوں کی طرح اس طرح گھونگٹ کاڑھ لئے کہ چروں کے ساتھ ان کے ہاتھ بھی چھپ کر رہ گئے۔

”کیا بات ہے حوالدار جی؟ آج یہ چیکنگ کیوں ہو رہی ہے؟“ بس ڈرائیور نے پوچھا۔

”تین مسلمان لڑکیاں رام گڑھ میں بڑی تباہی پھیلا کر بھاگی ہیں۔ وہ پاکستانی جاسوس ہیں اور ہمیں انہی کی تلاش ہے۔“ فوجی نے جواب دیا۔

”وہ لڑکیاں رام گڑھ سے یہاں تک کیسے آسکتی ہیں حوالدار جی؟“ ڈرائیور بولا۔

”وہ جیب لے کر بھاگی تھیں بے وقوف۔ ہو سکتا ہے جیب چھوڑ کر ٹرک میں سفر کر رہی ہوں۔ اس لیے یہ چیکنگ ہو رہی ہے۔“ فوجی نے جواب دیا اور ایک بار پھر عورتوں کو دیکھتا ہوا جس نے اتر گیا۔ اسے یقیناً ایسی لڑکیوں کی تلاش تھی جنہوں نے شرٹس اور جینز پہن رکھی تھیں جبکہ اس بس میں تمام عورتیں راجستھانی تھیں۔

جیب اور ٹرک بستی کی طرف روانہ ہو گئے اور بس اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔ نالکہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ انہوں نے کپڑے بدل لئے تھے۔ اگر وہ جینز اور شرٹس میں ہوتیں تو اس وقت

پکڑی جا چکی ہوتیں لیکن ابھی وہ خطرے کی حد سے نہیں نکلی تھیں۔ بہتی پہنچ کر اگر انہیں کسی طرح پہ چل گیا کہ تین گوری چنی اجنبی لڑکیوں نے یہاں لباس خرید کر تبدیل کئے تھے تو وہ واٹرلیس پر کولایات کو اطلاع کردیں گے اور انہیں کولایات پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لیا جائے گا۔

سسی اور سلطانہ بھی اپنی جگہ بیٹھی یہی سوچ رہی تھیں۔ کولایات سے تقریباً ”دو میل پہلے بس ایک چھوٹی سی نواحی بستی کے قریب رک گئی۔ ایک بوڑھا آدمی اور دو عورتیں بس سے اترنے لگیں۔ نالکہ بھی سلطانہ اور سسی کی اشارہ کرتی ہوئی سیٹ سے اٹھ گئی اور وہ تینوں بھی ان مسافروں کے ساتھ بس سے اتر گئیں۔

کولایات درمیانے درجے کا شہر تھا۔ اس کی نواحی زمینیں آباد تھیں۔ بس سے اترنے والا بوڑھا اور دونوں عورتیں بستی کی طرف چلی گئیں اور یہ کھیتوں کی طرف مڑ گئیں جہاں تقریباً ”ایک فرلانگ آگے چند گھر نظر آرہے تھے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کھیتوں میں چلتی رہیں۔ اور ان گھروں کے قریب سے گزرتی ہوئی ایک کچی بستی میں سے ہو کر شہر میں داخل ہو گئیں۔ بسوں کے اڑے پر پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں فوراً ”یہ بیکانیر جانے والی بس مل گئی۔ جس نے انہیں تقریباً ”دو گھنٹے میں بیکانیر پہنچا دیا۔

بیکانیر ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔ مگر اپیل انہیں راستے میں بھی نظر آئی تھی اور بیکانیر میں بھی وہی اپیل دکھائی دی۔ بڑے وسیع پیمانے پر ان کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔ ان تینوں کے پاس خاصی بڑی رقم بھارتی کرنسی کی صورت میں موجود تھی۔ انہوں نے مٹھائی کی ایک دوکان سے کچوریاں لے کر کھائیں اور راستہ پوچھتی ہوئی پیدل ہی ریلوے اسٹیشن کی طرف چلتی رہیں۔

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ جودھ پور کے لیے ایک پسنجر ٹرین دوپہر دو بجے روانہ ہوگی۔ اور اس وقت بارہ بجتے ہیں چند منٹ باقی تھے۔ وہ اسٹیشن کے بیرونی مسافر خانے میں آ گئیں۔ سلطانہ الگ بیٹھی تھی اور نالکہ اور سسی الگ۔ ڈیزل بجے ٹکٹ لے کر وہ پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ جودھ پور جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ مسافر ٹرین میں سوار ہو رہے تھے۔ تیسرے درجے کے مسافروں کے پاس سامان زیادہ تھا۔ نالکہ نے بھی تیسرے درجے ہی کے ٹکٹ خریدے تھے۔ وہ اگرچہ ایک ہی کپار ٹمٹ میں تھیں مگر الگ الگ سیٹوں پر بیٹھی تھیں تاکہ اگر اسٹیشن پر بھی ان کی تلاش ہو رہی ہو تو تینوں کو اکٹھے دیکھ کر کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔

ٹرین مقررہ وقت کے بجائے پندرہ منٹ کی تاخیر سے روانہ ہوئی۔ ٹرین کی روانگی کے ساتھ ہی انہوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

تین گھنٹے بعد ٹرین ناگور پہنچی۔ بیکانیر کے بعد یہ دوسرا بڑا شہر تھا۔ اسٹیشن پر خاصا جھوم تھا۔ یہاں بہت سے مسافر ٹرین سے اترے تھے اور بہت سے نئے مسافر سوار ہوئے تھے۔ سلطانہ والی سیٹ سے بھی کچھ مسافر اترے تھے۔ وہ سیٹ خالی ہوتے ہی نالکہ اور سسی اسی سیٹ پر آ گئی تھیں۔

ٹرین جب جودھ پور پہنچی تو رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ نالکہ کے خیال میں ان کے لیے اصل پریشانی اب شروع ہوئی تھی۔ اگر کوئی گاؤں یا چھوٹی بستی ہوئی تو انہیں سہان سمجھ کر کسی بھی گھر میں جگہ مل سکتی تھی۔ مگر جودھ پور ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں لاتعداد ہوٹل بھی موجود تھے۔ مگر کسی ہوٹل میں ٹھہرنا خطرے

سے خالی نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ اکیلی عورتیں تھیں اور پھر ہوٹل میں قیام کے لیے انہیں رجسٹر خانہ پر کرنی پڑتی۔ ممکن ہے شے کی بناء پر ان سے کچھ پوچھ گچھ بھی کی جاتی۔ اس طرح وہ پھنس بھی سکتی تھیں۔ ان کے پاس کسی قسم کا سامان بھی نہیں تھا جو انہیں مزید مشکوک بنا سکتا تھا۔

”اب کہاں جانا ہے۔ رات کہاں گزاریں گے؟“ نانکھ نے اسٹیشن سے باہر آکر کہا۔  
 ”ظاہر ہے ہم کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لیکن رات گزارنے کا کوئی بندوبست تو کرنا ہی پڑے گا۔“  
 سلطانہ نے کہا۔ ”ایک منٹ، مجھے سوچنے دو۔“

”جلدی سوچو اور چلتی رہو۔ وہ دو آدمی ہمیں گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ سرکاری آدمی نہ بھی ہوں تو غنڈے ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں پریشانی ہو سکتی ہے۔“ نانکھ نے چلتے ہوئے کہا۔  
 نانکے اور ٹیکسیوں والے اسٹیشن سے باہر آنے والے مسافروں کو گھیر رہے تھے، ان کے پاس چونکہ سامان نہیں تھا اس لیے نانکے اور ٹیکسی والوں نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ وہ تینوں نانکھ اسٹینڈ کی طرف چلتی رہیں۔ جہاں اس وقت ایک خالی نانکھ آکر رکا تھا۔ کوچوان بوڑھا تھا۔ دھوٹی کرتا اور کیسری رنگ کی گجری۔ اس کی سفید مونچھیں لٹکی ہوئی تھیں۔ سلطانہ نے اشارہ کیا اور وہ تینوں نانکے پر سوار ہو گئیں۔  
 بوڑھے کوچوان نے ان کی طرف دیکھا اور نانکے پر بیٹھ کر گھوڑے کی لگام سنبھال لی۔  
 ”کہاں جانا ہے؟“ اس نے اٹینٹنی ہوئی زبان میں پوچھا۔

”یہاں سے نانکھ تو نکال دیتے ہیں۔“ سسی نے کہا۔ تھری میں بات نانکے والے کے لیے کوئی اچھے کی بات نہیں تھی۔ یہ علاقہ تھر کو بیچ کرتا تھا اور راجستھانی اور تھری زبان میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ بوڑھے نے نانکھ اڑے سے نکال لیا۔

”سن رے کا کا۔“ سسی نے بوڑھے کوچوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم ٹھاکر ہری چند کی مسمان ہیں مگر راستے میں ہمارا سامان چوری ہو گیا ہے۔ ٹھاکر کا پتہ بھی اسی میں تھا۔ ہمیں کسی ایسی جگہ لے چل جہاں ہم رات گزار لیں اور کوئی ہمیں پریشان نہ کرے۔ ہم پیسے دیں گے۔“  
 ”ٹھاکر ہری چند کون ہے؟“ نانکے والے نے پوچھا۔

”ہمارا چاچا ہے۔ ہم پہلی بار یہاں آئی ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ یہ ہو گیا۔“ سسی بولی۔

”میرا مطلب ہے ٹھاکر ہری چند کیا کام کرتا ہے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”کاروبار کرتا ہے۔ بہت بڑی حویلی ہے اس کی۔“ سسی نے بتایا۔

”اس طرح تو پتہ نہیں چلے گا۔ میرے گھر چلو گی۔ وہاں تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ میری بنیا ہے گھر میں۔“ بوڑھے نے کہا۔

”چل اپنے ہی گھر لے چل۔ ہم تیرے کو منجھی کا کرایہ دے دیں گے۔“ سسی نے جواب دیا۔

نانکھ اور سلطانہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ رات گزارنے کا بندوبست ہو گیا تھا اور اس میں خطرے کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ سسی نے پہلی مرتبہ غفلندی کا مظاہرہ کیا تھا.....!!!

نانکے والے کا مکان شہر کے پسماندہ علاقے میں ایک بہت بڑے چھپرے کنارے پر واقع تھا۔ بہت بڑا عمارت تھا۔ جس میں ایک نانکھ اور گھوڑا پہلے ہی سے موجود تھا۔ بوڑھا انہیں احاطے کے پچھلی طرف لے گیا۔ سلطانہ نے اپنے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ان کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا ہو سکتا تھا۔



تو ہماری مسمان ہو۔ بھلا مسمان کو کیسے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔“

”بات یہ ہے شکنتلا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہم تینوں مسلمان ہیں اور پاکستان کی رہنے والی ہیں۔ ہمیں پاکستان کے مختلف شہروں سے اغواء کر کے لایا گیا تھا۔ پتہ نہیں ہمیں کہاں کہاں رکھا گیا۔ وہ لوگ ہمیں بھی لے جانا چاہتے تھے جہاں سے شاید ہمیں ہندوستان سے باہر بھیج دیا جاتا۔ یہ کوئی بین الاقوامی گروہ ہے جو بڑا فروشی کا کام کرتا ہے۔ آخری مرتبہ ہمیں بے پور لایا گیا تھا۔ تین دن پہلے ہم موقع پا کر ان کے چنگل سے بھاگ نکلیں اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے ہوئی ہوئی یہاں پہنچ گئیں۔ اگر اسٹیشن کے باہر تمہارا دادا نہ مل جاتے تو پتہ نہیں ہمیں رات کہاں اور کیسے گزارنا پڑتی۔“

”میرا دادا بہت اچھا انسان ہے۔“ شکنتلا نے کہا۔ ”درحقیقت میرے دادا کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے جسے اب پاکستان کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی دادا مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہیں تو بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے انسان اس طرح کیوں بٹ گئے تھے۔ صدیوں کی محبت اور چاہت یکایک نفرت میں کیوں بدل گئی تھی۔ ایک برتن میں کھانے والے ایک دوسرے کی جان کے دشمن کیوں ہو گئے تھے؟“ شکنتلا چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ اس کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی تھی۔ پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میرے دادا ٹھاکر پریم سنگھ، عمر کوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان اس وقت سے اس علاقے میں آباد تھا جب مغل شہنشاہ اکبر نے اس علاقے میں جنم لیا تھا۔ ان کی زمینیں تھیں۔ بہت بڑا زمیندار خاندان تھا۔ پھر وقت بدل گیا۔ لوگ بدلنے لگے۔ جب سرحد کی لکیر کھینچی گئی تو دادا کی عمر اس وقت انیس سال تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ادھر آ گئے۔ یہاں انہیں کچھ نہیں ملا۔ وہ کچھ عرصہ مزدوری کرتے رہے پھر تانگہ چلانا شروع کر دیا۔ جس شخص کے آگے پیچھے نوکروں چاکروں کی فوج ہوا کرتی تھی آج وہ لوگوں کا سامان ڈھو رہا ہے۔ تانگے پر سواریاں ڈھوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوا گمراہ کی راجپوتوں والی آن نہیں گئی۔ وہ آج بھی اپنے قول کا کھرا اور سچا ہے۔ وہ تو مجھے بھی یہی سبق پڑھاتا رہتا ہے کہ سچائی سے ہلی کوئی چیز نہیں۔ دولت تو آتی جانی چیز ہے۔ انسان کی اصل دولت تو سچائی ہے۔“

”سچ کبھی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”تمہارے دادا جیسے لوگ آج اس دنیا میں کہاں رہے ہیں۔ آج کا انسان تو وحشی اور درندہ بن چکا ہے۔ یہ واقعی ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اسٹیشن سے نکلے ہی تمہارا دادا مل گیا تھا۔“

”تو اب تم لوگ پاکستان واپس جانا چاہتی ہو؟“ شکنتلا نے پوچھا۔

”ہاں، کوشش تو یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن پہنچ جائیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”میں دادا سے بات کرتی ہوں۔“ شکنتلا نے کہا۔ ”اس کے خاندان کے کچھ لوگ باڑمیر، سوئی گام

اور بعض دوسرے سرحدی علاقوں میں آباد ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو چوری چھپے سرحد پار آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہی کے ذریعے تمہارا کام بن جائے۔“

”ہم تم لوگوں کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”یہ کوئی احسان نہیں ہو گا۔ اگر تم لوگ خیریت سے اپنے گھر پہنچ جاؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔ دادا آ رہا ہے۔

میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔“ شکنتلا نے کہا۔

کمرے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر شکنتلا کا دادا ٹھاکر پریم سنگھ اندر داخل ہو گیا۔

”شکنتلا بیٹا۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان کا خیال رکھنا۔ خدمت خاطر میں کوئی کہہ

رہے۔ یہ کسی بڑے گھر کی لڑکیاں ہیں۔ بچاری پہلی مرتبہ یہاں آئی ہیں۔ ان کا سامان بھی چوری ہو گیا اور پتہ بھی... جو وہ پور بست بڑا شہر ہے۔ میں کل ٹھاکر ہری چند کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔  
 ”ان کی تم فکر مت کرو دادا اور نہ ہی کسی ٹھاکر ہری چند کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں بتاتی ہوں یہ کون ہیں؟“ شکنتلا نے کہا۔

بوڑھا ٹھاکر اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا اور شکنتلا اسے ان کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ بار بار ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور تینوں نے اس طرح نظریں جھکا رکھی تھیں جیسے کوئی جرم ثابت ہو جانے پر شرمندہ ہوں۔

”اور تم نے ان سے وعدہ کر لیا ہو گا کہ دادا انہیں سرحد پار کرا دے گا۔“ شکنتلا کے خاموش ہونے پر بوڑھے نے کہا۔

”ہاں دادا۔“ شکنتلا اس سے لپٹ گئی۔ ”تم ہی تو کہا کرتے ہو کہ کسی مظلوم کی مدد کرنا بہت بڑی نیکی ہے اور پھر راجپوت جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے۔“  
 ”تم نے ان سے جو وعدہ کر لیا ہے وہ ضرور پورا ہو گا۔“ بوڑھے ٹھاکر نے کہا۔ ”اب انہیں آرام کرنے دو۔ میں انہیں لے کر صبح سات بجے والی ٹرین سے باڑمیر روانہ ہو جاؤں گا۔“  
 ”باڑمیر میں بھی چلوں گی دادا۔ رجنی چاچی کئی مرتبہ بلا چکی ہیں۔ آج کل تو ویسے بھی میرے کالج کی چٹھیاں ہیں۔“ شکنتلا نے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم بھی چلتا، گھوم پھر آؤ گی۔ اب آرام کرو تم لوگ...“ بوڑھا ٹھاکر کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اور پھر صبح سات بجے والی پنجر ٹرین انہیں جو وہ پور سے دور باڑمیر کی طرف لے جا رہی تھی۔ بہت ست رفتار ٹرین تھی۔ ہر چھوٹے اسٹیشن پر بھی دیر تک کھڑی رہتی۔ دوپہر کے لگ بھگ وہ لوگ باڑمیر پہنچے۔ پاکستانی سرحد سے کئی میل دور یہ راجستھان کا آخری بڑا قصبہ تھا۔ اسے ایک چھوٹا شہر کہا جاسکتا تھا۔  
 باڑمیر میں ٹھاکر پریم سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ آڑھت کا کاروبار کرتا تھا اور سرحد پار کے لوگوں سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ اس رات بوڑھے ٹھاکر نے اپنے چچا زاد بھائی پر تاب سنگھ کو ان لڑکیوں کے بارے میں بتایا تو وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”اس علاقے سے سرحد پار کرنا بہت مشکل ہے ٹھاکر۔ تین چار دن سے بڑی سخت نگرانی ہو رہی ہے سرحد کی۔“ پر تاب سنگھ نے کہا۔

”تمہارے آدمی تو ہمیشہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک کام کہہ دیا تو سرحد کی نگرانی سخت ہو گئی۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم میرا یہ کام کرنا نہیں چاہتے۔“ ٹھاکر نے کہا۔  
 ”یہ بات نہیں ہے ٹھاکر۔“ پر تاب سنگھ نے کہا۔

”تو پھر اصل بات کیا ہے وہی بتا دو۔“ بوڑھے ٹھاکر نے اسے گھورا۔

”اصل بات یہ ہے کہ چند روز پہلے تین مسلمان لڑکیاں رام گڑھ میں بہت بڑی تباہی پھیل کر بھاگی ہیں۔ وہ مسلمان لڑکیاں پاکستان کی جاسوس ہیں۔ اس لیے سرحد کی نگرانی سخت کر دی گئی ہے۔ ویسے بھی ان علاقوں میں ان لڑکیوں کو تلاش کیا جا رہا ہے جو سرحد کے قریب واقع ہیں۔“ پر تاب سنگھ نے کہا۔  
 ”ارے یہ وہ لڑکیاں نہیں ہیں۔ یہ تو...“



”میں کب کتا ہوں کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں۔“ پر تاب سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن یہاں سرحد پر بڑی سختی ہو رہی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم انہیں سوئی گام لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے وہاں اتنی زیادہ سختی نہ ہو۔ یوں بھی اس طرف سرحد پار کرنے کے کئی راستے ہیں۔ بے سنگھ جیسے آدمی کو کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”تو ٹھیک ہے۔ میں صبح انہیں لے کر سوئی گام چلا جاتا ہوں۔“ بوڑھے ٹھاکر نے کہا۔ اور پھر صبح سویرے ہی وہ باڈ میر سے کانڈلہ جانے والی بس پر سفر کر رہے تھے۔ کچی سڑک تھی اور بس کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ شکنتلا بھی باڈ میر میں رکنے کے بجائے ان کے ساتھ ہی چلی آئی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک اور قصبے میں اتر گئے۔ وہاں سے سوئی گام چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اس قصبے سے انہیں سوئی گام کے لیے بھی بس مل گئی۔

بے سنگھ رشتے میں ٹھاکر پریم سنگھ کا بھتیجا لگتا تھا۔ سوئی گام میں اس کی دوکان تھی۔ مگر یہ چھوٹی سی کریانے کی دوکان تو ایک آڑ تھی۔ اس کا اصل کاروبار تو اسٹاکنگ تھا۔ ٹھاکر نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔

”یہ تو کوئی بڑی بات نہیں چاچا۔ اگر تم کو تو میں ہندوستان کی پوری آبادی کو سرحد پار پہنچا دوں۔“

”میں ہندوستان کو خالی نہیں کر دانا چاہتا۔ صرف ان تین لڑکیوں کو بھجواتا ہے۔“ ٹھاکر بولا۔

”آج رات میرے دو ٹرک مال لے کر سرحد پار جانے والے ہیں۔ میں ان لڑکیوں کو ٹرک پار پہنچا دوں گا۔ وہ پاکستان کا سرحدی قصبہ ہے۔ اس سے آگے یہ جہاں جانا چاہیں گی، چلی جائیں گی۔“ بے سنگھ نے کہا۔

”میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا بے سنگھ۔“ بوڑھے ٹھاکر نے کہا۔

”احسان کیسا چاچا!!“ بے سنگھ نے کہا۔ ”میری بہن شکنتلا نے انہیں وچن دیا ہے اس کا مان بھی تو رکھتا ہے، لیکن ہمیں شام سے پہلے پہلے ہیرو لانا پہنچنا ہو گا۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ بوڑھے ٹھاکر نے پوچھا۔

”سرحد کے قریب راجستھان کی آخری پستی ہے۔ وہاں سے سرحد دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ آدھی رات کے قریب ہم وہاں سے سرحد پار کریں گے۔“ بے سنگھ نے جواب دیا۔

اور پھر شام ہونے سے تقریباً ”ایک گھنٹہ پہلے سسی، نالکھ اور سلطانہ“ شکنتلا سے رخصت ہو رہی تھیں۔ شکنتلا اور اس کا دادا ٹھاکر پریم سنگھ سوئی گام ہی میں رہ گئے تھے۔ شکنتلا نے انہیں اس طرح رخصت کیا تھا جیسے اس کی سگی بہنیں رخصت ہو کر پردیس جا رہی ہوں۔ نالکھ اس کی محبت اور خلوص سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ ہندوؤں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے اب بھی محبت تھی۔ غربت کی سیاست نے ابھی ان کے خلوص کو متاثر نہیں کیا تھا۔

بے سنگھ کی بڑے ٹائروں والی جیب پر وہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہیرو والا پہنچ گئے۔ یہاں ایک مکان کے احاطے میں دو ٹرک کھڑے تھے۔ جن پر سامان لدا ہوا تھا۔

ہیروالا کی آبادی ڈیڑھ دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ مکان، جہاں نالکھ وغیرہ کو لایا گیا تھا خاصا بڑا تھا۔ عورتیں اور بچے بھی موجود تھے۔ بے سنگھ ان تینوں کو عورتوں کے حوالے کر کے باہر چلا گیا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے عورتوں کو ان تینوں کے بارے میں کچھ ہدایات بھی دے دی تھیں۔ وہ ان کی خاطر ہدایات میں لگ گئیں۔

جے سنگھ کو انہوں نے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ ان تینوں کو مکان کا ایک کمرہ دے دیا گیا تھا۔ تین رہائیاں ڈال کر صاف ستھرے بستر بچھادیئے گئے تھے۔ رات ہوتے ہی بستی پر سناٹا چھا گیا تھا۔ یہ تینوں کمرے میں بیٹھی کبھی باتیں کرنے لگتیں اور کبھی آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگتیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ گھر کے سارے افراد غالباً سوچکے تھے۔ لیکن ان تینوں کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کر رہی تھیں اور وقت تھا کہ جیسے اس کی رفتار ختم کر رہی ہو۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن غالباً ”آدھی رات بیت چکی تھی۔ دفععتاً“ یوں لگا جیسی کھلبلی سی گج گئی ہو۔ باتوں اور قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر دھڑے ان کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ بے سنگھ تھا۔

”تم لوگ جاگ رہی ہو۔“ وہ دروازے ہی میں رک گیا۔ ”چلو، جلدی کرو۔“

وہ تینوں بے سنگھ کے ساتھ کمرے سے باہر آگئیں۔ دونوں ٹرکوں کے انجن اشارت ہو گئے تھے۔ ایک آدمی نے مکان کا گیٹ کھول دیا تھا۔ ہر ٹرک پر دو دو تین تین آدمی رانٹھیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ بے سنگھ انہیں ساتھ لے کر مکان سے باہر آیا۔ گلی میں اس کی جیب کھڑی تھی۔ اس میں تین آدمی پہلے سے رانٹھیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ ایک اگلی سیٹ پر اور دو پیچھے۔ نائلہ وغیرہ کو پچھلی سیٹوں پر بٹھا دیا گیا۔ بے سنگھ نے اسٹیئرنگ سنبھال کر جیب اشارت کر دی۔

چند منٹ بعد ہی ایک جیب اور مال سے لدے ہوئے دو ٹرکوں پر مشتمل یہ قافلہ بستی سے نکل کر سرحد کی طرف بڑھنے لگا۔ جیب اور ٹرکوں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف ٹیلا نما چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ تاریکی میں ان پہاڑیوں میں ڈرائیونگ واقعی بڑی مہارت کا کام تھا۔

نائلہ اور سلطانہ وغیرہ کے دل بڑی تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ وہ جیب پر بیٹھیں تاریکی میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو گھور رہی تھیں۔

ان پہاڑیوں میں تقریباً ”دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیب رک گئی۔ اس کے پیچھے دونوں ٹرک بھی رک گئے تھے۔ بے سنگھ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی الیکٹرونک واپچ کاروشنی والا بین دبا دبا کر وقت دیکھ رہا تھا۔ اور پھر ایک اس نے پیچھے گردن گھما کر چیخ کر کچھ کہا اور سیدھا ہو کر جیب کا انجن اشارت کر دیا۔

جیب اور ٹرک حرکت میں آگئے۔ اس مرتبہ ان کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز تھی۔ تاریک پہاڑیوں میں اس قدر تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا مگر بے سنگھ اور اس کے آدمی اس کے عادی تھے۔

نائلہ اور سسی وغیرہ اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالے بیٹھی تھیں۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے تک جیب اور ٹرک پہاڑیوں میں اسی تیز رفتاری سے دوڑتے رہے۔ پھر ان کی رفتار کسی حد تک کم ہو گئی۔

”اب ہم سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو گئے ہیں لیکن خطرے کی حدود سے ابھی نہیں نکلے۔ تھوڑا ہی آگے کہ والا نامی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ رات کا باقی حصہ ہم اس بستی میں گزاریں گے اور پھر صبح تم لوگوں کو گنبار کر پھینچا دیں گے۔ وہاں سے تم کہیں بھی جاسکتی ہو۔“ بے سنگھ نے کہا۔

لیکن وہ کہ والا تک نہیں پہنچ سکے۔ پہاڑیوں میں اچانک ہی رنجرز نے انہیں گھیر لیا تھا۔ دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر رنجرز کی فائرنگ سے جیب اور ٹرکوں کے

ٹائز برسٹ ہو گئے تھے۔

”تم لوگ اس چٹان کے پیچھے چلی جاؤ۔ اگر ہم لوگ پکڑے بھی گئے تو تم لوگ آسانی سے بستی تک پہنچ جاؤ گی۔“ بے شک نے کہا۔

نانکھ سسی اور سلطانہ جیب سے اتر کر چٹان کی طرف دوڑیں لیکن کسی طرف سے آنے والی سنسنائی ہوئی ایک گولی سلطانہ کی ٹانگ میں لگی وہ چیخ مار کر گری۔ اس کے ساتھ ہی نانکھ اور سسی بھی رک گئیں۔ ان دونوں نے سلطانہ کو بانہوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے ٹھیکٹ کر چٹان کے پچھلی طرف لے جانا چاہتی تھیں کہ ایک گونجدار آواز سن کر رک گئیں۔

”دک جاؤ۔۔۔ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔“

نانکھ نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار مہراسانس نکل گیا۔ رنجبر کا ایک جوان ان کے سامنے سب مشین گن تانے کھڑا تھا۔

..... \* \* \* .....

دلاور کے ساتھ خطرناک مجرموں جیسا سلوک کیا جا رہا تھا۔

پولیس پارٹی اسے لے کر جیسے ہی تھانے پہنچی تھی، ایس ایچ او بھی کیس باہر سے آگیا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ ایس ایچ او نے پولیس پارٹی کے انچارج اے ایس آئی سے پوچھا۔

”یہ دلاور ہے سر۔“ اے ایس آئی نے سلیوٹ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”چند روز پہلے گل مرگ کے قریب کھیتوں میں واقع ایک کنویں سے جولا ش ملی تھی اس کی بھی شناخت ہو گئی ہے اور۔۔۔“

”تمہارے خیال میں میں یہاں آیا ہوں۔“ انسپکٹر نے اے گھورتے ہوئے بات کاٹ دی۔

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ لاش کی شناخت ہو گئی ہے، اے قتل کر کے کنویں میں پھینکا گیا تھا اور مقتول سندھ پولیس کا انسپکٹر صوبہ خان تھا۔ لیکن میں نے پوچھا تھا کہ یہ کون ہے؟“

انسپکٹر صوبہ خان کا نام سن کر دلاور کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ تو بالا خروہ شیطان اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ ابھی اے ایس آئی بتا رہا تھا کہ گل مرگ کے قریب کھیتوں میں ایک کنویں سے اس کی لاش دریافت ہوئی تھی۔ اسے قتل کس نے کیا تھا؟ دلاور کے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہا تھا۔

”سر!“ اے ایس آئی نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر صوبہ خان کی لاش دریافت ہونے کے بعد ابتدائی تحقیقات میں اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کنواں جس زمین پر واقع ہے وہ زمین نانکھ درانی کی ملکیت ہے اور یہ دلاور، نانکھ درانی کا باڈی گارڈ ہے۔ نانکھ درانی کی جس گاڑی پر حملہ ہوا تھا اسے یہی چلا رہا تھا اور یہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔ کل ہی ہمیں پتہ چلا تھا کہ جس روز انسپکٹر صوبہ خان کی لاش دریافت ہوئی تھی اس سے ایک روز پہلے دلاور کو کنویں والے ٹیسے کی طرف دیکھا گیا تھا۔“

”کیوں اوئے؟“ انسپکٹر نے دلاور کی طرف دیکھا۔ ”تم وہاں کیا کرنے گئے تھے۔ اور انسپکٹر صوبہ خان سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“

”یہ جھوٹ ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”میں نے انسپکٹر صوبہ خان کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی میں نانکھ درانی کی زمینوں کی طرف گیا تھا۔“

”تمہارے بارے میں ایک ایسی شخصیت نے گواہی دی ہے جسے جھٹایا نہیں جاسکتا۔“ اے ایس آئی

نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر صوبہ خان کو کب قتل کیا گیا تھا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”یہ بات تو تم ایسے پوچھ رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔“ اے ایس آئی بولا۔

”یہ حقیقت ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ گل مرگ کیسے اور کب پہنچا تھا اور اسے

قتل کس نے کیا تھا۔ لیکن میں اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا ہوں۔ صوبہ خان کو کب قتل کیا گیا تھا؟“ دلاور

نے اپنا سوال دہرایا۔

”یہ آج سے ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔“ اے ایس آئی نے کہا ”انسپکٹر صوبہ خان کی لاش سے پستول

کی چھ گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔ اسے قتل کرنے کے بعد تم نے اس کے جسم پر اینٹیں باندھ کر لاش کنویں میں

پھینک دی۔ تمہارا خیال تھا کہ لاش پانی میں ڈوب جائے گی اور کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ لیکن کنویں کی تہ

میں پانی بہت کم تھا۔ لاش پوری طرح نہیں ڈوب سکی اور دوسرے دن دوپہر کو اس کا پتہ چل گیا۔“

”آپ کے کہنے کے مطابق صوبہ خان کی لاش دریافت ہونے سے پہلے مجھے ٹیپے والی زمین پر دیکھا گیا

تھا کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ شہادت کس نے دی ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”حسین بیگم نے۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ”اسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ حسین بیگم اس

علاقے کی ایک معزز زمیندار خاتون ہے۔ اس کی گواہی کو آسانی سے نہیں جھٹلایا جاسکتا۔“

”سمجھ گیا۔“ دلاور کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”مجھے قتل کے کیس میں پھنسانے کی یہ

ایک بھونڈی کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان دونوں یہاں موجود نہیں تھا۔ انسپکٹر صوبہ خان کو میں نے

آخری مرتبہ سندھ کے گاؤں کاچیلو میں دیکھا تھا۔ صوبہ خان کے وہاں سے جانے کے بعد بھی میں تقریباً

ایک ہفتہ وہیں رہا تھا۔ اس کی گواہی کاچیلو تھانے کا انچارج سب انسپکٹر اور اس گاؤں کے بیسیوں لوگ

دے سکتے ہیں۔“

”تم کاچیلو کس لیے گئے تھے اوئے؟“ انسپکٹر نے اسے گھورا۔

”صادق آباد کے قریب نالندہ درانی کی گاڑی پر حملہ صوبہ خان نے کروایا تھا۔ وہ لوگ نالندہ کو زخمی

کر کے اٹھالے گئے تھے مگر نالندہ ریگستان میں ان کے چنگل سے بھاگ نکلی۔ اسے اغوا کرنے والوں کو ریگستان

سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ نالندہ نے سندھ کے ایک چھوٹے سے گوشہ میں پناہ لی تھی مگر صوبہ خان کو پتہ چل گیا

اور وہ نالندہ کے ساتھ گوشہ کی ایک لڑکی کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا، لیکن نالندہ اور وہ لڑکی صوبہ خان کی ذاتی جیل

سے بھاگ نکلیں اور تقریباً اسی روز میں اور رائے منصور صاحب نالندہ کی تلاش میں گھونگی گئے تھے۔ جہاں

ہم نے صوبہ خان کے خلاف پولیس میں رپورٹ کی اور اے سی صاحب نے گھونگی سے دو میل دور صوبہ

خان کی حویلی پر پھاپہ مارا۔ وہاں سے کئی انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے۔ وہاں ایک باقاعدہ محبوت خانہ بنا ہوا

تھا، جہاں صوبہ خان لوگوں کو اذیت دیا کرتا تھا۔ اے سی صاحب نے حویلی سیل کر کے اعلیٰ حکام کو صوبہ خان

کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع دے دی۔

پھر صادق آباد واپس آنے پر ہمیں پتہ چلا کہ نالندہ صوبہ خان کی جو پاجیرو لے کر فرار ہوئی تھی، وہ بخش

علی لاشاری نامی قصبے کے قریب جلی ہوئی ملی تھی۔ خیال تھا کہ نالندہ انہی اطراف میں کہیں ہوگی۔ میں نالندہ

کی تلاش میں وہاں گیا تھا لیکن پتہ چلا کہ نالندہ اور دوسری لڑکی کسی ہندو سیٹھ کے ہاتھ لگ گئی تھیں جسے اس

نے اپنے آدمیوں کے ساتھ سرحد کی طرف بھیج دیا۔ لیکن نالندہ اس سندھی لڑکی کے ساتھ ایک بار پھر بھاگ

نقلی۔ ہندو سیٹھ کے آدمی تو ریگستان میں بھٹکتے ہوئے دوسرے دن واپس آگئے مگر نالکہ کا پتہ نہیں چلا۔ میں چھ سات دن کاچیلو میں رہا۔ میری رپورٹ پر کاچیلو کے سب انسپکٹر مجنوں خان نے اس ہندو سیٹھ کو گرفتار کر لیا۔ میں جس روز کاچیلو پہنچا تھا، صوبہ خان وہیں تھا۔ آئی جی سندھ کے حکم سے اسے معطل کیا جا چکا تھا اور اس کی گرفتاری کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ صوبہ خان وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے جنگل میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے پاس پناہ لی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ یہاں کب پہنچا اور اسے کس نے قتل کیا تھا، لیکن آپ چاہیں تو میرے بارے میں کاچیلو تھانے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ صادق آباد واپس آتے ہی مجھے پتہ چلا کہ رائے صاحب بیمار ہیں اور سلطان زید ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں سیدھا یہاں آگیا اور اس روز سے اب تک ہسپتال یا رائے صاحب کے بیٹنگ سے باہر نہیں نکلا۔ آپ جس طرح چاہیں ان معاملات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ میرا صوبہ خان کے قتل والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ کہتا امجد بھی تھانے پہنچ گیا۔ امجد ایک سرکاری محکمہ میں گریڈ انیس کا ملازم تھا۔ اس کے اعلیٰ حکام سے کچھ تعلقات بھی تھے۔ دلاور کو تھانے لائے جانے کی تفصیل معلوم ہوئی تو اس نے کہا۔

”انسپکٹر صاحب! لگتا ہے کہ قتل کے اس کیس میں آپ کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس دن صوبہ خان کی لاش دریافت ہوئی دلاور اس سے ایک ہفتہ پہلے سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔“

”اس کی تصدیق تو ہم کر لیں گے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسینہ بیگم نے یہ بیان کیوں دیا کہ اس نے دلاور کو ٹیپے والی زمینوں پر دیکھا تھا۔“ انسپکٹر بولا۔

”آپ اس خاندان کے جھگڑوں سے تو واقف ہیں انسپکٹر صاحب۔“ دلاور نے کہا۔ ”حسینہ بیگم اور ان کا بیٹا شبیر درانی اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نالکہ بی بی کا باڈی گارڈ ہوں۔ وہ مجھے اور رائے منصور صاحب کو اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ رائے صاحب کے خلاف تو وہ کچھ نہیں کر سکتے البتہ مجھے پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”میرا خیال ہے اب آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی انسپکٹر۔“ امجد نے اپنا کارڈ جیب سے نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا کارڈ ہے۔ آپ کی اجازت سے میں دلاور کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ آپ جب بھی کہیں گے میں اسے تھانے لے آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر نے اس کا کارڈ دیکھ کر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر اے ایس آئی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صوبہ خان کے لباس کی جیب سے جو پستول ملا تھا اس کی فنگر پرنٹس کی رپورٹ آئی یا نہیں؟“

”ابھی نہیں سر۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے امجد صاحب۔“ انسپکٹر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”آپ دلاور کو لے جایئے۔ ضرورت ہوئی تو میں اسے دوبارہ بلاؤں گا۔“

”شکریہ انسپکٹر۔“ امجد نے کہا اور دلاور کو لے کر تھانے سے باہر آگیا۔

ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد انسپکٹر بھی اے ایس آئی کو ساتھ لے کر تھانے سے باہر آگیا۔

جماں گیٹ کے سامنے ہی اس کی جیب کھڑی تھی۔

”بیٹھو۔“ اس نے جیب کی طرف اشارہ کیا۔

”کہاں جانا ہے سر؟“ انپکڑ نے جواب دیا۔ ”میں بیس سال سے پولیس کی ملازمت کر رہا ہوں۔ اتنا تجربہ تو ہے کہ کسی شخص کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگا سکوں کہ وہ کسی جرم میں ملوث ہو سکتا ہے یا اور اگر وہ ملوث ہے تو اس جرم میں اس کا کتنا حصہ ہو گا۔ دلاور جس انداز سے بات کر رہا تھا اس سے ہوتا ہے کہ صوبہ خان کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کا یہ بیان یقیناً ”درست ہو گا کہ صوبہ خان کا قتل ہوا تو وہ اس علاقے میں نہیں تھا لیکن میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ حسینہ بیگم نے یہ بیان دیا ہے کہ اس نے قتل سے ایک روز پہلے دلاور کو ٹپے والی زمین پر دیکھا تھا۔“

”ہو سکتا ہے اے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔“ اے ایس آئی نے کہا۔  
 ”اور اس کی غلط فہمی پر تم دلاور کو پکڑ کر لے آئے۔“ انپکڑ نے اسے گھورا۔  
 ”اس میں کوئی شک نہیں کہ شبہ تحقیق کی بنیاد ہوتا ہے لیکن ذمے داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم محض ایک شخص کے کہنے پر کسی دوسرے کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند نہیں کر سکتے۔ گل مرگ میں صرف بیگم ہی تو نہیں رہتی۔ کیا کسی اور نے بھی دلاور کے بارے میں کچھ کہا تھا؟“  
 ”نہیں سر!“ اے ایس آئی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”حسینہ بیگم ایک معزز عورت ہے۔ میں نے اسی کے

پر یہ کارروائی کی تھی۔“  
 ”کیا تمہیں ان کے خاندانی جھگڑوں کا علم نہیں؟“ انپکڑ نے کہا۔ ”حسینہ بیگم اور اس کے بیٹے شبیر نے نالہ درانی کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ اس ضلع کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ ان خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے پولیس کو بھی بڑی رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ نالہ درانی کے خلاف جتنے بھی مزاحمتی وہ سب کے سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ صوبہ خان کا میں نے پہلے بھی اس کیس میں نام سنا تھا۔ تاہم دلاور کا کہنا درست ہو۔ نالہ کو کسی سازش کے تحت صوبہ خان کے ذریعے اغوا کروایا گیا ہو گا۔ درانی لاپتہ ہے۔ وہ زندہ یا مر چکی ہے؟ اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن میں

اور سازش کی پوسنگھ رہا ہوں۔“  
 وہ لوگ گل مرگ پہنچ گئے۔ انپکڑ نے حویلی میں حسینہ بیگم کو اپنی آمد کی اطلاع بھجوا دی۔ تھوڑی ہی دیر

نہیں اندر بلا لیا گیا۔  
 ”بیگم صاحبہ!“ انپکڑ فوراً ہی اصل مقصد پر آگیا۔ ”آپ کو ٹپے والے کنویں میں لاش کی اطلاع کس

دی تھی؟“  
 ”نذیر نے“ وہ ہمارا مزارع ہے۔“ حسینہ بیگم نے جواب دیا۔ ”جب میں ٹپے پر پہنچی تو وہاں آس پاس کھیتوں میں کام کرنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ لوگ لاش کو نکالنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں منع کیا کیونکہ پہلے پولیس کو مطلع کرنا ضروری تھا۔“

”گل آپ نے پولیس کو اطلاع دی تھی کہ لاش دریافت ہونے سے ایک روز پہلے آپ نے دلاور کو اس

گھومتے ہوئے دیکھا تھا اور....“  
 ”جی ہاں۔“ حسینہ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کیا آپ نے دلاور کو گرفتار کر لیا؟ مجھے یقین ہے کہ

خان کو اسی نے قتل کیا ہے؟“  
 ”دلاور کو ابھی ہم نے گرفتار نہیں کیا۔“ انپکڑ نے کہا۔ ”لیکن دلاور کے بارے میں آپ نے پولیس کو

”وقت کیوں نہیں بتایا تھا جب کنویں سے لاش دریافت ہوئی تھی؟“  
 ”مجھے یاد نہیں رہا ہو گا۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔

”کل یکا یک آپ کو کیسے یاد آگیا؟“ انسپکٹر نے کہا۔

”بس اچانک ہی مجھے یاد آگیا کہ لاش ملنے سے ایک روز پہلے میں نے دلاور کو اس طرف دیکھا تھا۔ اے میں نے پولیس کو اس کے بارے میں اطلاع دینا ضروری سمجھا۔“ حینہ بیگم نے کہا۔  
 ”لیکن دلاور کو صوبہ خان سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”دلاور کا خیال ہے کہ نالکہ کی گاڑی پر حملہ صوبہ خان ہی نے کروایا تھا۔ نالکہ کا کچھ پتہ نہیں کہ وہاں ہے یا مرگئی۔ دلاور نے انتقام لینے کے لیے صوبہ خان کو قتل کیا ہو گا۔ وہ اسی قسم کا آدمی ہے۔ اس کا نام بھی داغدار ہے۔ اگر اسے رائے منصور کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو وہ جیل میں پڑا سڑ رہا ہوتا۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔

”کیا آپ نے دلاور کو دور سے دیکھا تھا یا اس سے کوئی بات بھی ہوئی تھی؟“

”کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے اسے قریب سے دیکھا تھا۔ وہ بچے کی طرف جا رہا تھا۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ دلاور ہی تھا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہے انسپکٹر صاحب۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔ ”کیا میں دلاور کو نہیں پہچانتی؟ میری نظرس دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ دلاور ہی تھا۔“

”آپ کا بیٹا شیردرانی کہاں ہے؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”میرا بیٹا!“ حینہ بیگم اس اچانک سوال پر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ”وہ سندھ گیا ہوا ہے۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ نالکہ سندھ کے کسی گاؤں میں موجود ہے۔ شیردرانی کی تلاش میں گیا ہوا ہے۔“

”جب صوبہ خان کی لاش دریافت ہوئی تھی اس دن یا اس سے ایک روز پہلے شیردرانی کہاں تھا؟“ انسپکٹر نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ میرے بیٹے پر شبہ کر رہے ہیں؟“ حینہ بیگم نے اسے گھورا۔

”اے میں بھی آپ تفتیش کا ایک حصہ سمجھ لیجئے۔ اس سوال کا جواب ملتا بہت ضروری ہے بیگم صاحبہ۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”وہ لاش دریافت ہونے سے دو دن پہلے سندھ چلا گیا تھا۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”شکریہ بیگم صاحبہ۔“ انسپکٹر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”شیردرانی صاحب واپس آجائیں تو ان سے کہنے کا کہ مجھ سے زرا مل لیں۔“

”میں بھیج دوں گی۔ لیکن پہلے آپ دلاور کا بندوبست کیجئے انسپکٹر صاحب، اگر وہ فرار ہو گیا تو اس کا پالہ آنا مشکل ہو جائے گا۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”بیگم صاحبہ!“ انسپکٹر نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس روز کنویں سے صوبہ خان کی لاش دریافت ہوئی تھی، دلاور اس سے ایک ہفتہ پہلے سندھ چلا گیا تھا اور لاش دریافت ہونے کے دو دن بعد واپس آیا ہے۔“

حینہ بیگم سناتے میں آگئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے لیکن انسپکٹر اس کے چہرہ کے تاثرات دیکھنے کے لیے وہاں نہیں رکا۔ وہ اسے ایس آئی کو اشارہ کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حویلی سے نکل کر وہ جیب پر سوار ہوئے اور کھیتوں میں کچے راستے پر ایک طویل چکر کاٹتے ہوئے ٹبے کی طرف روانہ ہو گئے۔ آگے راستہ نہ ہونے کی وجہ سے جیب انہیں ٹبے سے دور ہی چھوڑنی پڑی تھی۔ وہ جیب سے اتر کر پیدل ہی ٹبے کی طرف چلنے لگے۔ اس پاس کھیتوں میں کام کرنے والے تین چار کاشتکار انہیں دیکھ کر ٹبے پر آگئے۔

”کچھ پتہ چلا سرکار؟ قاتل پکڑا گیا یا نہیں؟“ ایک کاشتکار نے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ابھی نہیں۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”ایک بات بتاؤ... تم نے شبیر درانی کو آخری مرتبہ گاؤں میں کب دیکھا تھا؟“

”جس دن کنویں سے لاش ملی تھی اس سے پچھلی رات وہ حویلی آئے تھے اور پھر شاید صبح سویرے ہی چلے گئے تھے۔ کاشتکار نے جواب دیا۔

انسپکٹر اس کاشتکار سے باتیں کرتا رہا اور اے ایس آئی ادھر ادھر گھومتا رہا۔ دن کے پودوں کے قریب وہ رک گیا۔ اسے جھاڑیوں میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے جب کربڑی احتیاط سے وہ چیز اٹھالی۔ وہ تالا تھا۔ جس کے کندھے پر اس طرح کا نشان نظر آرہا تھا جیسے کسی اینٹ سے ضربیں لگا کر اسے توڑا گیا ہو۔

”سرایہ تالا ان جھاڑیوں میں پڑا ہوا تھا۔“ اے ایس آئی نے انسپکٹر کے قریب پہنچ کر کہا۔  
 ”اوہ!“ انسپکٹر تالا دیکھ کر چونک گیا۔ ”اے رومال میں احتیاط سے پلیٹ کر رکھ لو۔ اس پر سے فنگر پرنٹس ضائع نہ ہونے پائیں۔“

”نہیں سر۔“ اے ایس آئی نے کہا اور جیب سے رومال نکال کر تالے کو بڑی احتیاط سے اس میں پلیٹ لیا۔

اس دوران دو تین آدمی اور بھی آگئے تھے۔  
 ”کیا لاش ملنے سے ایک روز پہلے کسی نے دلاور کو یہاں دیکھا تھا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔  
 ”نہیں جی۔“ ایک آدمی نے جواب دیا۔ ”دلاور کو تو بہت عرصہ سے ہم لوگوں نے یہاں نہیں دیکھا۔“  
 ”یہ زمین کس کی ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔  
 ”مالکہ بی بی کی زمین ہے سرکار۔“ اس آدمی نے جواب دیا۔  
 ”تم لوگ کس کے کارندے ہو؟“ انسپکٹر نے پھر سوال کیا۔

”ہم تو مالکہ بی بی کے کارندے ہیں سرکار اور یہ محمد حسین اور فقیرا بڑی بیگم صاحبہ کے کارندے ہیں۔ دونوں کی زمینیں ملی ہوئی ہیں۔ جھگڑے مالکوں میں ہوتے ہیں سرکار! ہم نوکروں کا آپس میں کیا جھگڑا؟“  
 ”تم نے بتایا تھا کہ شبیر درانی ایک رات پہلے گاؤں آیا تھا۔ تم شبیر درانی ہی کے کارندے ہوتا؟“ انسپکٹر نے اس شخص کی طرف دیکھا جس نے شبیر درانی کے بارے میں بتایا تھا۔

”جی سرکار۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میرا نام فقیرا ہے۔ میں نے ہی کیا، اور بھی کئی لوگوں نے چھوٹے سرکار کو گاؤں آتے دیکھا تھا؟“

”ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر اے ایس آئی سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ دونوں ٹبے سے اتر آئے۔ دو تین آدمی جیب تک ان کے ساتھ آئے تھے۔

تھانے واپس آتے ہی انسپکٹر نے رومال میں لپٹا ہوا وہ تالا سب انسپکٹر کے حوالے کر دیا۔  
 ”یہ تالا آج ہی فنگر پرنٹس کے لیے بھجوا دو۔ اور انہیں پستول کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ کے بارے



میں بھی یاد دہانی کرا دو۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”یس سر!“ سب انسپکٹر نے کہا اور رومال میں لپٹا ہوا تالا اٹھا کر لے گیا۔

”یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں ذرا ڈی ایس پی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ حسینہ بیگم کی باتوں نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان باتوں کا ڈی ایس پی صاحب جکے علم میں آنا بہت ضروری ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”اور سر!“ اے ایس آئی بولا۔ ”دلاور کی جائے واردات سے عدم موجودگی کی تصدیق کے بارے میں کیا ہو گا؟ کیا کچلو تھانے کو خط لکھ دیا جائے؟“

”نہیں۔“ انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”خط و کتابت میں خاصا وقت ضائع ہو جائے گا اور میں اس معاملے کو جلد سے جلد منظرِ اچھا ہوں۔ کل صبح تم خورد کچیلو کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن میں واپس آ جاؤ گے۔“

”یس سر۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔

انسپکٹر اپنی ٹوپی سر پر جھٹاتا ہوا تھانے سے باہر چلا گیا۔

ادھر دلاور جب امجد کے ساتھ تھانے سے واپس بیٹنگلے پر پہنچا تو آصفہ بیگم بے چینی سے برآمدے میں مثل رہی تھی۔ امجد کے ساتھ دلاور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔

”کیا ہوا؟ پولیس تمہیں کیوں لے گئی تھی؟“ آصفہ بیگم نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بیگم صاحبہ۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”کسی نے انسپکٹر صوبہ خان کو قتل کر دیا ہے اور پولیس کا خیال ہے کہ اسے قتل میں نے کیا تھا۔“

”اوہ! یہ کب کی بات ہے؟“ آصفہ بیگم چونک گئی۔ میرا مطلب ہے اسے کب اور کس نے قتل کیا ہے؟“

”یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نائلہ بی بی کی تلاش میں سندھ گیا ہوا تھا۔ لیکن حسینہ بیگم نے پولیس کو بتایا ہے کہ قتل سے ایک روز پہلے مجھے جانے دو قہر کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ صوبہ خان کو گل مرگ میں قتل کیا گیا تھا اور اس کی لاش اس کنویں میں پھینک دی گئی تھی جو نائلہ بی بی کی زمین پر واقع ہے۔ پولیس مجھے محض حسینہ بیگم کے بیان پر گرفتار کرنا چاہتی تھی، لیکن یہ تو غنیمت ہے کہ امجد صاحب بھی میرے پیچھے تھانے پہنچ گئے ورنہ وہ پولیس والے تو مجھے حوالات میں بند کر دیتے۔“

”مگر تم تو بتا رہے تھے کہ صوبہ خان سندھ میں تھا۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔

”جی ہاں۔“ دلاور بولا۔ ”اس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے پاس پناہ لے رکھی تھی۔ اس نے مجھے بھی اغوا کر لیا تھا اور مجھے ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں مروانا چاہتا تھا، مگر جب میں نے ڈاکوؤں کے سردار مراد رند کو بتایا کہ مجھے مروانے کی اصل وجہ کیا ہے تو وہ بھڑک اٹھا۔ آپ جانتی ہیں سندھ میں عورت کی کتنی عزت کی جاتی ہے۔ اسے جب پتہ چلا کہ نائلہ اسی صوبہ خان کی وجہ سے معیتوں کا شکار ہوئی ہے تو اس نے صوبہ خان کو بھگا دیا۔ ویسے بھی آپ جانتی ہیں کہ لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ صوبہ خان کے جسم پر جب انسپکٹر کی وردی تھی تو وہ ان ڈاکوؤں کے لیے بھی اہمیت رکھتا تھا۔ وردی اترنے کے بعد وہ ان کے لیے دو کوڑی کا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ صوبہ خان وہاں سے بھاگ کر پناہ کی تلاش میں شبیر درانی کے

پاس آیا ہوگا اور شبیر درانی نے بھی اسے بیکار سمجھ کر اسے ٹھکانے لگا دیا۔ بہر حال، پولیس پتہ چلا لے گی کہ صوبہ خان کا قاتل کون ہے۔“

”اللہ عارت کرے ان لوگوں کو۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔ ”ان لوگوں نے تو ناکلہ کی زندگی ہی برباد کر دی۔ وہ بچاری پتہ نہیں کہاں اور کس حال میں ہوگی؟“

”مجھے یقین ہے کہ ناکلہ بی بی جہاں بھی ہوگی خیریت ہی سے ہوگی۔“ دلاور بولا۔

”ایک بات بتاؤ دلاور۔“ آصفہ بیگم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”ناکلہ کے بارے میں میں بھی سوچتی ہوں تو کبھی کبھی مجھے بھی یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ بچاری اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں، لیکن تم ہمیشہ بڑے یقین سے کہتے ہو کہ وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔“

”بس جی... میرا دل کہتا ہے کہ ناکلہ بی بی زندہ ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

آصفہ بیگم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

اس سے اگلے دن صادق آباد سے مشتاق پہنچ گیا۔ اس نے رائے صاحب کی عیادت کی، کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا پھر دلاور کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں بولا۔

”میں تمہارے لیے ایک پیغام لے کر آیا تھا مگر ماں بات نہیں ہو سکتی۔“

”تو چلو... کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ دلاور نے کہا اور خادم کو بتا کر مشتاق کے ساتھ ہنگلے سے نکل گیا۔

وہ ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ ریسٹورنٹ میں اکاؤنٹانٹ گاہک تھے۔ وہ کونے کی میز پر بیٹھے تھے جہاں اطمینان سے بات کر سکتے تھے۔ دلاور نے ویٹر کو بلا کر چائے کے لیے کہا اور جب ویٹر ان کے سامنے چائے رکھ کر چلا گیا تو دلاور نے مشتاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اب کو کیا بات ہے؟“

”وہ تمہارا ایک دوست ہے یا رور...“

”ہاں، کیا ہوا اسے؟“ دلاور جلدی سے بولا۔ یارو کا نام سن کر وہ چونک گیا تھا۔

”اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے؟“ مشتاق نے بتایا۔

”ارے؟“ دلاور اچھل پڑا۔ ”کب! کیوں قتل کر دیا اسے؟ وہ تو اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔“

”اسے شبہ تھا کہ اس کی بیوی کے گاؤں کے کسی آدمی سے ناجائز تعلقات تھے۔ وہ اپنی بیوی کی نگرانی

کرتا رہا۔ کل دوپہر اس نے بیوی سے کہا کہ وہ بہاولپور جا رہا ہے۔ تین چار دن بعد واپس آئے گا لیکن آدھی

رات کے قریب وہ گاؤں واپس پہنچ گیا۔ اس کا شبہ درست نکلا۔ اس نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو رنگے

ہاتھوں پکڑ لیا۔ یارو نے اپنی بیوی کو تو گولی مار کر قتل کر دیا مگر اس کا آشنا فرار ہو گیا۔ یارو نے اپنے آپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ اس نے جس ریوالور سے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا وہ بھی پولیس کے قبضے میں

ہے۔ وہ سرکاری ریوالور ہے اور اس کے بارے میں یارو نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ وہ ریوالور اسے تم نے

دیا تھا۔“

”میں نے!“ دلاور چونک گیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یارو کو

کوئی ریوالور کب دیا تھا پھر دفعتاً اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ ریوالور اس تھانے

دار کا تھا جسے اس نے درخت سے لٹکا کر مار دیا تھا اور اس تھانیدار کا ریو الوور اس نے یارو کو دے دیا تھا۔  
 ”نہیں...“ وہ مشتاق کی طرف دیکھ کر بغیر بولا۔ ”میں نے تو اسے کوئی ریو الوور نہیں دیا۔ میری تو یارو سے بہت عرصہ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ اس نے میرا نام کیسے لے دیا؟“

”یارو نے اپنے آپ کو صادق آباد پولیس کے حوالے کیا ہے۔“ مشتاق نے کہا۔  
 ”انسپکٹر خلیل نے مجھے بتائے بلایا تھا۔ اس نے تمہارے نام پیغام دیا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے تم ان سے مل لو۔“

”ٹھیک ہے۔“ دلاور نے سر ہلایا۔ ”تم صادق آباد واپس چلے جاؤ اور انسپکٹر سے کہنا کہ میں شام تک جاؤں گا۔“

”بہتر ہے۔“ مشتاق نے اثبات میں سر ہلادیا۔

وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ مشتاق تو ہاتھ ملا کر لاری اڈے کی طرف چلا گیا اور دلاور رائے صاحب کے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یارو کی گرفتاری اس کے لیے مصیبتوں کے نئے راستے نہ کھول دے۔ تھانے دار اور منٹھار گاؤں کے چوہدری اور اس کے مہمانوں کے قتل کی کارروائی میں یارو بھی اس کے ساتھ شامل تھا۔ جب دلاور کے خلاف یہ کیسز شروع ہوئے تھے تو عدم ثبوت کی بناء پر اسے چھوڑ دیا گیا تھا لیکن یارو تو شریک جرم تھا۔ اس کی گرفتاری کے بعد اگر پولیس نے کڑے مردے اٹھا ڈنا شروع کر دیئے تو حالات اسے ایک بار پھر اسی راستے پر لے جائیں گے جس سے بچنے کے لیے اس نے بڑی جدوجہد کی تھی۔

اس شام دلاور ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے صادق آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ بس میں بیٹھے ہوئے بھی وہ یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔

..... \* \* \* .....

شبیر درانی بہت خوش تھا۔ کچیلو تھانے کے انچارج سب انسپکٹر مرعلی نے اس کی مرضی کے عین مطابق اسے نانکہ درانی کے بارے میں وہ تحریر دے دی تھی جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ حالانکہ وہ تو یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ پولیس آفیسر سے اس قسم کی تحریر کا مطالبہ کس طرح کرے گا اور جب شام کو سب انسپکٹر نے بغیر کسے ایسی تحریر اس کے ہاتھ میں تھادی تو اس کی حیرت اور خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ یہ تحریر دیتے وقت اگرچہ سب انسپکٹر مرعلی نے اسے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اس تحریر سے مطمئن نہ ہو تو بے شک اعلیٰ افسران سے رابطہ کر سکتا ہے لیکن کسی اعلیٰ افسر سے رابطہ قائم کرنے کا شبیر درانی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اس کی جیب میں موجود کانڈ گویا سرکاری طور پر نانکہ درانی کی موت کا تصدیقی نامہ تھا اور سابق انسپکٹر صوبہ خان کو اس کی موت کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ سب انسپکٹر نے یہ سوچ کر صوبہ خان کا نام لکھ دیا تھا کہ اس کے کھاتے میں جہاں اور بہت سے جرائم تھے وہاں ایک یہ بھی سہی۔ اسے یقین تھا کہ صوبہ خان پولیس کے ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ وہ صوبہ خان سے اچھی طرح واقف تھا اور اس کے خیال میں وہ سرحد پار کر کے ہندوستان جا چکا ہو گا۔

ادھر شبیر درانی اس لحاظ سے مطمئن تھا کہ صوبہ خان اس دنیا ہی میں نہیں رہا تھا کہ پکڑے جانے کی

اس سے کچھ باز پرس کی جاسکتی۔

دروانی کی موت کا یہ سرٹیفکیٹ اس کے لیے قارون کے خزانے سے کم نہیں تھا۔ کروڑوں کی مالکانہ دروانی کی۔ اس کی وراثت کے قانونی حقدار صرف دو افراد تھے۔ اس کی ماں حینہ بیگم اور راجہ راجن دروانی۔ یہ دونوں مالک کی حقیقی پھوپھی اور حقیقی تایا تھے۔ عبدالرحمن دروانی، مالک کی یا نے میں ان کی سازشوں میں شریک رہا تھا اور اس نے حینہ بیگم سے یہ معاہدہ بھی کر رکھا تھا کہ اس دو مربع زمین سے دلچسپی تھی جو وہ مقدمے میں ہارا تھا۔ اس دو مربع زمین کے علاوہ مالک کی نینداد انہی کو ملنے والی تھی۔

بلو میں وہ چائے پینے کے لیے تھوڑی دیر کو رکھا تھا۔ وہ چائے پی کر ہوٹل سے نکل رہا تھا کہ ہوٹل میں تے ہوئے دو آدمیوں سے سامنا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر شبیر دروانی چونکے بغیر نہیں رہ سکا اس کا کالج کا دوست الیاس تھا۔ وہ دونوں بہت عرصہ بعد ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے مگر فوراً ہی ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ الیاس تو بڑی گرجوٹی سے اس سے لپٹ گیا تھا۔

الیاس نے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا۔ ”یہ میرے دوست۔ مہر حامد ہیں۔ پنوعاقل میں ہے۔“

دروانی نے بڑی گرجوٹی سے مہر حامد سے ہاتھ ملایا اور وہ ان کے ساتھ ایک بار پھر ریسٹورنٹ میں دروانی کو ان کے ساتھ بھی چائے پینا پڑی۔ اس دوران وہ اور الیاس کالج کے زمانے کی یادیں تازہ

ہیں۔

الیاس نے پوچھا۔

”شبیر دروانی نے جواب

ب تم اتفاق سے ہمارے ہاتھ لگ گئے ہو تو آسانی سے رحیم یار خان تو نہیں جاسکو گے۔“ الیاس نے

پوچھا۔

”شبیر دروانی نے کہا۔ ”کم از کم دو تین دن ہمارے پاس پنوعاقل میں رہو۔ اس کے بعد ہی

میں بھی! مجھے جیل میں بند کروانے کا ارادہ ہے کیا؟“ شبیر دروانی بولا۔

”شبیر دروانی نے کہا۔ ”تم ابھی تو نیا ہی ہو۔ اس کے بعد ہی

میں بھی۔ میں صرف ایک رات تمہارے پاس رہ سکتا ہوں۔ اگر زیادہ دن رہا تو ماں جی پریشان

ہو جائے گی۔“

”شبیر دروانی نے کہا۔ ”تم ابھی تو نیا ہی ہو۔ اس کے بعد ہی

میں بھی۔ میں صرف ایک رات تمہارے پاس رہ سکتا ہوں۔ اگر زیادہ دن رہا تو ماں جی پریشان

کی میزبانی ہمیں کم از کم تین کروڑ کا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ تین کروڑ کے نام سے شیردرانی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”تفصیل گھر پہنچ کر بتائی جائے گی۔ اب اٹھو یہاں سے۔ میجر حامد کی جیب سڑک کے اگلے موڑ پر کھڑی

ہے۔“ الیاس کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ میجر حامد اور شیردرانی نے بھی سیٹ چھوڑ دی۔

”میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔“ شیردرانی نے ان کے ساتھ ہوٹل سے باہر آتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم اپنی گاڑی میں ہماری جیب کے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ ہماری جیب بائیں طرف کھڑی

ہے۔“ الیاس کہتے ہوئے میجر حامد کے ساتھ چوک کی طرف چلا گیا اور شیردرانی سامنے کھڑی ہوئی اپنی گاڑی

کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے شہر سے نکل رہی تھیں۔ جیب اور شیردرانی کی گاڑی کے

درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔ شیردرانی نظرس آگے جاتی ہوئی جیب کی عقبی سہا

بتیوں پر مرکوز تھیں لیکن اس کا ذہن کیس اور تھا۔ وہ الیاس کی کسی ہوئی بات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ”

تین دن پنوعاقل میں رہ جانے سے اسے تین کروڑ کا فائدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن الیاس نے تو خود اپنے بارے

میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ پنوعاقل میں کیا کر رہا ہے۔ وہ فوج میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

پنوعاقل چھاؤنی کے علاقے میں دونوں گاڑیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ مکان کے سامنے تقریباً ”تین فٹ

اونچی باؤنڈری وال تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف درخت لگائے گئے تھے جو ابھی زیادہ بڑے نہیں

ہوئے تھے۔ البتہ لان کی گھاس بہت سبز اور دبیز تھی۔ پھولوں کے پودے بھی تھے۔

یہ دراصل اس بنگلہ نما مکان کا عقبی حصہ تھا۔ مکان کا اصل رخ دوسری طرف تھا۔ اس طرف بھی دسٹا

آنگن تھا جس کی چار دیواری خاصی اونچی تھی۔ مکان کے ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ عقبی لان میں بھی

تھا۔

وہ مکان میں آگئے۔ ڈرائنگ روم قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میٹل

پیس پر فریم میں ایک حسین کے عورت کے ساتھ الیاس کی تصویر دیکھ کر شیردرانی کو سمجھنے میں دیر نہیں آئی

کہ یہ مکان الیاس کا تھا۔

”تو گویا تم شادی کر چکے ہو۔“ شیردرانی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”شادی کے بعد رنڈوا بھی ہو چکا ہوں۔“ الیاس نے کہا۔ ”یہ خاتون شادی کے بعد صرف ایک سال

شاہراہ حیات پر میرا ساتھ دینے کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی۔ لیکن اس نے میرے ذہن پر اپنی چاہت

ایسے نقش چھوڑے ہیں کہ میں مرتے دم تک انہیں نہیں بھلا سکتا۔“

شیردرانی خاموش رہا۔

”تم لوگ بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ میجر حامد کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

الیاس نے آواز دے کر نوکر کو بلایا اور اسے چائے کے لیے کہہ کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ شیردرانی

ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ کچھ دیر میں نوکر چائے لے آیا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے چائے پیتے رہا۔

الیاس ہی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو یہاں بہت بڑی چھاؤنی بن رہی ہے۔ ہر قسم کے کام بڑی تیزی سے ہو رہے ہیں۔ یہاں

بھی سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ کچھ اور کاموں کے ٹھیکے لے رکھے ہیں۔ یہاں کنسٹرکشن کا بہت بڑا کام

شروع ہونے والا ہے۔ اس کے لیے ابھی کاغذی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جی ایچ کیو سے پراجیکٹ کی منظوری کے بعد ٹینڈر کال کئے جائیں گے۔ کروڑوں کا پراجیکٹ ہوگا اور اس میں پرائنٹ بھی کروڑوں ہی کا ہوگا۔ میں اکیلا اتنے بڑے کام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ تین دن پہلے میں مبحر حامد سے بات کر رہا تھا کہ رحیم یار خان جا کر تم سے ملاقات کروں۔ اتفاق سے آج تم سے ملاقات ہو گئی۔ اگر تم چاہو تو کم سے کم لاٹ میں کروڑوں روپے کما سکتے ہو۔“

”ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“ شبیر درانی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”میرے ساتھ مل کر ٹھیکہ لے لو۔“ الیاس نے کہا۔

”لیکن فوج میں کاموں کے ٹھیکے ایسے ہی تو نہیں مل جاتے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”اگر میرا خیال غلط نہیں تو کمپنی کو جی ایچ کیو میں رجسٹر کروانا پڑتا ہے اور پھر سابقہ تجربہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں تو زمینوں پر مل چلا سکتا ہوں۔ کنسٹرکشن سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔“

”میری فرم جی ایچ کیو میں رجسٹر ہے اور اللہ کے فضل سے بڑی اچھی ساکھ بنی ہوئی ہے۔ بنیادی طور پر تو میں سول انجینئر ہوں۔ کنسٹرکشن کا تجربہ بھی ہے۔ میں ہر لحاظ سے جی ایچ کیو کی ڈیمانڈ پوری کر سکتا ہوں لیکن کمی صرف سرمائے کی ہے۔ مبحر حامد بھی اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔“ الیاس نے کہا۔

”اس کے لیے تو مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہئے۔ ماں جی سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”ابھی کم از کم ایک مہینے کا وقت ہے۔“ الیاس نے کہا۔ ”میں اسی لیے تو چاہتا ہوں کہ تم دو تین دن میاں رہ جاؤ۔ اس دوران بعض فوجی افسروں سے تمہاری ملاقاتیں کراؤں گا۔ ان کی باتوں ہی سے تم اندازہ لگا لو گے کہ فوجی افسروں سے تعلقات کتنے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”اعلیٰ افسروں سے تعلقات والی بات شبیر درانی کے دل کو لگی تھی۔ وہ جن نازک حالات سے گزر رہا تھا ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی ایسے تعلقات کی ضرورت تھی۔ اس دوران مبحر حامد بھی لباس تبدیل کر کے آگیا۔ الیاس نے اسے بھی اپنی گفتگو میں شامل کر لیا تھا۔

”اس چھاؤنی کی اب تک کی بننے والی ساری سڑکیں الیاس نے بنائی ہیں۔ اس نے اور بھی بہت سے کام کئے ہیں۔ جی ایچ کیو اس سے خوش ہے۔ اگر یہ اپنی کمپنی کے نام سے ٹینڈر داخل کر دے تو نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ٹھیکہ اسی کو ملے گا۔ اس میں ہماری بھرپور کوشش بھی شامل ہوں گی۔“ مبحر حامد نے کہا۔

وہ لوگ دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے، پھر نو بجے کے لگ بھگ وہ اٹھ کر میس میں چلے گئے۔ الیاس اگرچہ گھر پر ہی کھانا کھایا کرتا تھا لیکن آج اس نے نوکر کو کھانا تیار کرنے سے منع کر دیا تھا۔

میس میں کئی فوجی افسروں سے ملاقات ہوئی۔ شبیر درانی کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا ساڑھے دس بجے جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ مبحر حامد کے علاوہ دو فوجی آفیسر اور بھی تھے۔ ایک مبحر تھا اور دوسرا لیفٹیننٹ کرنل۔ تھوڑی دیر بعد ایک کیپٹن بھی آگیا اور پھر برج کی بازی شروع ہو گئی۔ شبیر درانی کو برج کھیلنا نہیں آتا تھا۔ تاش میں وہ صرف سوپ کھیلنا جانتا تھا البتہ شطرنج میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ الیاس کے پاس شطرنج بھی موجود تھی۔ شبیر درانی اور کیپٹن عقیل شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ گئے۔ رات تین بجے تک دونوں پارٹیوں کی بازیاں جھی رہیں اور پھر الیاس کے مہمان رخصت ہو گئے۔

ایلیاس نے بتایا کہ اس کے گھر میں روزانہ ہی اس قسم کی محفلیں جمتی ہیں۔ ان فوجی افسروں کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔

صبح جب شبیر درانی کی آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ ناشتے سے پہلے اس نے رحیم یار خان فون کیا۔ کال اس کے نوکر بہاول نے ریسیو کی تھی۔

”آپ جلدی سے واپس آجائیے سرکار۔“ بہاول نے اس کی آواز پہچانتے ہی کہا۔

”کیوں خیریت؟ ماں جی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”سرکار! وہ ٹھیکے والے پرانے کھوہ سے ایک لاش ملی ہے۔ کسی نے اسے قتل کر کے کنویں میں پھینک دیا تھا۔“ بہاول نے بتایا۔

”یہ کب کی بات ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی تھی۔

”کل کی بات ہے سرکار۔“ بہاول نے جواب دیا۔ ”پولیس والے لاش لے گئے ہیں ماں جی سے آپ کے بارے میں بھی پوچھ رہے تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ایک دو دن میں آجاؤں گا۔ ماں جی سے کہنا پریشان نہ ہوں۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اس کے دماغ میں اندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے صوبہ خان کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو بڑی احتیاط سے کنویں میں پھینکا تھا۔ اس کے ساتھ کئی اینٹیں بھی باندھ دی تھیں کہ وزن کی وجہ سے لاش پانی میں ڈوبی رہے۔ لیکن لاش پانی سے باہر کیسے آگئی تھی؟

اب شبیر درانی کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے صوبہ خان کے قتل کے لیے انتخاب تو اس جگہ کا کیا تھا جو نالہ کی اراضی میں شامل تھی لیکن اس سے بہت سی غلطیاں یا بے احتیاطیاں بھی ہو گئی تھیں۔ اس نے وہ پستول بھی صوبہ خان کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا تھا جس سے اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس پستول پر سے اس کی انگلیوں کے نشان آسانی سے مل سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن پر اس کی انگلیوں کے نشان رہ گئے تھے۔ سب سے پہلے تو وہ تالا تھا جسے اس نے اینٹ سے توڑا تھا اور تالے کو کنڈے میں سے نکال کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ اس تالے پر اور دروازے کے کنڈے پر بھی اس کی انگلیوں کے نشان موجود تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن پر اس کی انگلیوں کے نشان تلاش کئے جاسکتے تھے مثلاً ”وہ کسی“ جس سے اس نے کوٹھری میں پھیلے ہوئے خون پر مٹی ڈالی تھی۔ چارپائی کی پٹیوں پر اور بجلی کے سوئچ پر بھی اس کی انگلیوں کے نشان موجود تھے۔ پولیس اگر ان باتوں پر معمولی سی بھی توجہ دے تو اسے بڑی آسانی سے چھانسی کے تختے پر پہنچایا جاسکتا تھا۔

”ناشتہ لاؤں جناب؟“

یہ آواز سن کر شبیر درانی اچھل پڑا۔ اس نے مرکز دروازے کی طرف دیکھا۔ ایلیاس کا نوکر وہاں کھڑا سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں، تم ناشتہ لگاؤ۔ میں ہاتھ روم سے ہو کر آتا ہوں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اور ایلیاس دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے کس وقت آتا ہے؟“

”ایلیاس صاحب تو کبھی آتے ہیں اور کبھی میس میں کھانا کھا لیتے ہیں۔ آج کہہ کر تو نہیں گئے مگر میرا

ل ہے آپ کی وجہ سے وہ دوسرے کا کھانا کھانے گھر پر ہی آئیں گے۔“ نوکر نے جواب دیا۔  
 ”اچھا، ٹھیک ہے تم ناشتہ تیار کرو۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔  
 تقریباً ”پندرہ منٹ بعد وہ ہاتھ روم سے نکلا۔ ٹھیک اسی وقت نوکر دروازے میں نمودار ہوا۔  
 ”میں نے ناشتہ میز پر لگا دیا ہے جناب، ٹھنڈا نہ ہو جائے۔“

”چلو“ میں آ رہا ہوں۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔  
 ڈرائنگ روم بھی بڑا شاندار تھا۔ فرش پر گرے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ ڈائنگ ٹیبل اور کرسیاں  
 شاندار تھیں ایک دیوار پر لکڑی کے بنے ہوئے بہت بڑے بڑے چٹچے اور کانٹے وغیرہ آویزاں تھے۔  
 ڈائنگ روم سے ملحق تھا۔ بچ کی دیوار میں ایک کشادہ کھڑکی سی بنی ہوئی تھی۔ جس میں چیزیں وغیرہ  
 لکے کے لیے سبک مرمر کی ایک چوڑی سل لگی ہوئی تھی۔

میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ ہاف فرائی انڈہ، مکھن، پنیر، ڈبل روٹی کے سلائس اور چکن اسپرڈ کی بوتل بھی  
 لی ہوئی تھی۔ شبیر درانی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کرتے ہوئے بھی وہ صوبہ خان کی  
 ل برآمد ہونے کے بعد کی صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔  
 ناشتہ ختم کر کے وہ نوکر کو چائے کے لیے کہتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ سنئر ٹیبل پر اخبار رکھا ہوا تھا۔  
 اخبار رحیم یار خان ہی سے شائع ہوتا تھا۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اخبار اٹھا لیا۔ وہ خبر پہلے ہی صفحہ پر  
 جس کی اسے تلاش تھی۔

”گل مرگ کے قریب کنوئیں سے برآمد ہونے والی لاش کی شناخت ہو گئی۔“  
 ”مقتول ایک سابق پولیس آفیسر تھا جو کئی سنگین جرائم میں ملوث تھا۔“  
 شبیر درانی وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔

”سندھ کے سابق پولیس انسپکٹر کی لاش دو دن پہلے گل مرگ کے قریب کھیتوں میں واقع ایک کنوئیں سے  
 مل ہوئی تھی۔ وہ کنواں اور اس کے آس پاس کی اراضی نائلہ درانی کی ملکیت ہے جو گزشتہ کئی روز سے  
 یہاں پر ہے۔ یاد رہے کہ چند روز پہلے صادق آباد کے قریب نائلہ درانی پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس میں ان کا  
 ایک ہاڑی گارڈ شدید زخمی ہوا تھا اور ایک نو عمر لڑکے سمیت تین افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اس حملے میں نائلہ  
 والی بھی شدید زخمی ہوئی تھی۔ جسے حملہ آور اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد سے نائلہ  
 والی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

کنوئیں سے برآمد ہونے والی لاش کو سندھ کے ایک سابق پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے شناخت کر لیا گیا  
 تھا۔ صوبہ خان کو حال ہی میں آئی جی سندھ کے حکم سے معطل کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صوبہ خان نے  
 اس کی لاش کے قریب ایک حویلی میں ذاتی جیل قائم کر رکھی تھی جہاں اس نے اذیت رسانی کے جدید ترین  
 آلات پر مشتمل عقوبت گاہ بھی بنا رکھی تھی۔ حویلی سے انسانی ڈھانچے اور لاتعداد انسانی ہڈیاں بھی برآمد  
 ہوئی ہیں۔ خیال ہے کہ صوبہ خان نے ان لوگوں کو اذیتیں دے کر ہلاک کیا تھا۔ صوبہ خان ایک ظالم اور جابر  
 پولیس افسر کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ وہ اور بھی بہت سے سنگین جرائم میں ملوث بتایا جاتا ہے۔  
 اس کے سابق انسپکٹر صوبہ خان کے بارے میں مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

قارئین کے لیے یہ بات یقیناً ”دلچسپی کا باعث ہوگی کہ سندھ پولیس کے اس سابق انسپکٹر صوبہ خان کا  
 رحیم یار خان کی درانی خیملی سے بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ اس نے عبدالرحیم درانی کی سرپرستی میں پرورش



پانی اور تعلیم حاصل کی اور بعد میں سندھ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔  
یہ معرہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ صوبہ خان گل مرگ کیسے پہنچا تھا اور اسے کس نے قتل کیا تھا۔  
مقتول کے کوٹ کی جیب سے ایک پستول بھی برآمد ہوا ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ صوبہ خان کو اسی پستول  
سے قتل کیا گیا تھا۔ پولیس نے وہ پستول فنگر پرنٹس کے ماہرین کے حوالے کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں سنسنی  
خیز انکشافات کی توقع ہے۔

نوکر چائے لے آیا۔ شبیر درانی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اخبار کی دوسری خبریں پڑھنے لگا لیکن اسے  
کسی اور خبر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن دفعہاً اس کی نظر آخری صفحہ پر ایک اور چھوٹی سی خبر پر جم گئی۔  
”رائے منصور کو ہسپتال سے گھر منتقل کر دیا گیا“

شبیر درانی یہ سرنی پڑھ کر چونک گیا۔ اس نے پوری خبر پڑھ ڈالی۔ اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے شائع  
ہونے والی اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ گزشتہ دونوں صادق آباد کے معروف اور ہر دلچیز زمیندار رائے منصور پر  
دل کا دورہ پڑا تھا۔ جنسین فوری طور پر رحیم یار خان کے سلطان زائد ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ تین دن ہسپتال  
میں رکھنے کے بعد ڈاکٹروں نے رائے منصور کی حالت قسلی بخش قرار دیتے ہوئے انہیں ہسپتال سے گھر جانے  
کی اجازت دے دی تھی اور انہیں ان کی رحیم یار خان والی رہائش گاہ پر منتقل کر دیا گیا تھا جہاں ان کے  
سینکڑوں چاہنے والے ان کی عیادت کر رہے ہیں۔ شبیر درانی نے اخبار میز پر پھینک دیا۔ ”کاش! یہ بڑھا مر گیا  
ہوتا۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

شبیر درانی کے منہ سے نکلنے والا یہ جملہ اس کی فطرت کی عکاسی کرتا تھا۔ دراصل وہ ایک ایسا شخص تھا  
جس نے کبھی دوسرے کا بھلا نہیں چاہا تھا۔ دوسروں کے لیے تو اس کے منہ سے کبھی خیر کی دعا بھی نہیں نکلی  
تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنا فائدہ سوچا تھا۔ اپنے فائدے کے لیے کسی بے گناہ کو اس کی زندگی سے محروم کر دینا  
اس کے لیے معمولی بات تھی۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر صوبہ خان کے بارے میں سوچنے لگا۔ پولیس کو صوبہ خان  
کے کوٹ کی جیب سے وہ پستول بھی مل گیا تھا جس سے اس کے جسم میں چھ گولیاں اتاری گئی تھیں۔ پولیس  
نہ صرف یہ معلوم کر لے گی کہ صوبہ خان کو اسی پستول سے ہلاک کیا گیا تھا بلکہ پستول پر انگلیوں کے نشانات  
سے بھی پتہ چل جائے گا کہ قاتل کون تھا۔ شبیر درانی کو اب اپنی اس حماقت پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے  
پستول صوبہ خان کی جیب میں کیوں ڈال دیا تھا! لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے سر ہلادیا کہ اس نے تو یہ سوچ کر  
پستول صوبہ خان کی جیب میں ڈالا تھا کہ لاش کے ساتھ آلہ قتل بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گا لیکن  
اس وقت اسے کیا علم تھا کہ مقتول اتنی جلدی آلہ قتل سمیت پولیس کی نظروں میں آجائے گا۔ لیکن اسے  
حیرت تو اس بات پر بھی کہ کنویں میں بھینگی جانے والی لاش دوسروں کی نظر میں آئی کیسے؟ اس نے لاش کے  
پانی میں گرنے کی آواز سنی تھی۔ اگر پانی کی آواز سنائی نہ دیتی تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کنویں میں پانی نہیں تھا۔  
شبیر درانی جیسے جیسے سوچ رہا تھا اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ اس کا ستارہ ہی گردش میں آ گیا تھا۔ پولیس  
بعض دوسرے معاملات میں بھی اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ اس کے معتد خاص موجددار کے قتل سے  
اصل گڑبڑ شروع ہوئی تھی۔ اس نے موجددار کو اس لیے ٹھکانے لگایا تھا کہ وہ اس کے ہر راز سے واقف  
تھا اور رضیہ کے قتل کے سلسلے میں رضیہ کے قاتل نے مرتے وقت موجددار کا نام لے دیا تھا کہ یہ کارروائی  
اسی کے کہنے پر کی گئی تھی۔ اس کے بیان نے تو ناملہ کو بھی تمام الزامات سے بری کر دیا تھا۔ پولیس کو

ممدار کی تلاش تھی۔ شیردرانی کو یقین تھا کہ اگر موجددار پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ خود بھی نہیں بچتا تھا۔ اسی لیے اس نے موجددار کو ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن اس سے حماقت یہ ہوئی تھی کہ موجددار کی کو ٹھکانے لگانے کے بجائے ویران ڈیرے پر یونہی چھوڑ دیا گیا تھا جو گاؤں والوں کے ذریعے پولیس کی رس میں آگئی اور اس طرح پولیس اس کے پیچھے لگ گئی۔

پھر صوبہ خان کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی حد سے بہت زیادہ آگے نکل گیا تھا۔ اعلیٰ حکام کو اس کے کارروائی کرنی پڑی اور وہ پناہ کی تلاش میں اس کے پاس آگیا۔ اس وقت تو شیردرانی نے سوچا تھا کہ ابی ہوا جو صوبہ خان اس کے پاس آگیا تھا۔ اگر وہ گرفتار ہو جاتا تو نہ صرف ناکلہ کے بارے میں اس کی شوں سے پولیس کو آگاہ کر دیتا بلکہ اس کے اور بھی بہت سے راز فاش کر دیتا۔ یہی سب کچھ سوچ کر اس صوبہ خان کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اس کم بخت کے قتل کا راز اس قدر جلدی کھلے گا۔

باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آوازیں سن کر اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ چند منٹ بعد الیاس اندر داخل

”میں تو سمجھا تھا کہ تم ابھی تک سو رہے ہو گے۔“ الیاس اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے ساتھ ہی اس نے میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا تھا۔ ”یہ خبر دھی تم نے۔“ انسپکٹر صوبہ خان والی؟“ ”ہاں۔“ شیردرانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے حیرت ہے یہ کم بخت وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ اس کی سے ہمارے لیے بہت سی پریشانیاں پیدا ہو جائیں گی۔“

”کیوں؟ تمہارے لیے پریشانیاں کیوں پیدا ہو جائیں گی؟“ الیاس بولا۔

”تم نے پڑھا نہیں۔ اخبار والے ہمارے خاندان سے اس کا تعلق جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں شبہ نہیں کہ اس کی پرورش میرے ہی والدین نے کی تھی۔ اسے بڑھایا لکھایا تھا۔ پھر وہ کراچی جا کر پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا لیکن لوگ کسی کی نیکیوں کو کب دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہیں تو ہمیشہ برائیوں کی تلاش میں رہتی ہیں۔ پولیس کو تم جانتے ہو۔ یہ لوگ کیسے بال کی کھال نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”پولیس کچھ بھی کرتی رہے۔ تم کیوں گھبرا رہے ہو۔ صوبہ خان کو تم نے تو قتل نہیں کیا نا؟“ الیاس نے

”نہیں... نہیں۔“ شیردرانی کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ”میں اسے کیوں قتل کرنے لگا اور یوں بھی میں وہاں نہیں

سا۔ میں تو کاجیلو میں تھا۔“

”ویسے ایک بات ہے۔“ الیاس نے کہا۔ ”صوبہ خان جیسے شخص کا یہی انجام ہونا چاہئے۔ وہ بہت ظالم دی تھا رحم اور ہمدردی جیسے الفاظ تو شاید اس کی دشمنی میں تھے ہی نہیں۔ وہ تو جلا دے نام سے مشہور ما۔ اس نے کئی گھرا جاڑے ہیں۔ پولیس کی وردی پہن کر وہ اپنے آپ کو فرعون سمجھ بیٹھا تھا۔ اس کی موت رکنی گھروں میں خوشیاں منائی گئی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی دشمن اس کا چچا کرتے ہوئے گل مرگ تک پہنچ گیا ہو اور موقع ملے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ بہر حال، لعنت بیجو اس پر تم تیار ہو جاؤ۔ دوسرے کا کھانا ہم میں میں کھائیں گے اور پھر میں تمہیں وہ پراجیکٹس دکھاؤں گا جو میری فرم نے پایہ تکمیل کو پہنچائے ہیں۔ شام کو چند اعلیٰ فوجی افسروں سے بھی تمہاری ملاقات کرائی جائے گی۔ یہ سب لوگ شام کی

شیردرانی اٹھ کر بیڈروم میں چلا گیا۔ اور پھر آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں ایک جیپ پر سوار فوجی میس کی طرف جا رہے تھے۔

...●...●...●...

رنجیز کے اس جوان نے تینوں کو اپنی سب مشین گن کی زد پر لے رکھا تھا۔ نائلہ کو سینے میں دل ڈوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سسی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے خوف پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ وہ سلطانہ کے ساتھ لپٹ گئی۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ گولی سے اڑا دوں گا۔“ رنجیز کے جوان کی آواز سنائی دی۔ اس کے لمبے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ تھی۔

نائلہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت بھی کی تو رنجیز کا وہ جوان واقعی انہیں پھلنی کر ڈالے گا۔

”گولی مت چلا نا۔“ نائلہ چیخی۔ ”ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“

”اوہ! تم عورت ہو۔“ رنجیز کے جوان کے لمبے میں اس مرتبہ حیرت تھی۔

ہم تینوں عورتیں ہیں اور خالی ہاتھ ہیں۔ ہماری ایک ساتھی زخمی ہو گئی ہے۔ اسے ٹانگ میں گولی لگی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”تینوں ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو جاؤ۔ منہ دوسری طرف کر لو۔“ جوان نے حکم دیا۔

نائلہ اور سسی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے رخ بدل لئے تھے۔ اب ان کی پشت رنجیز کے جوان کی طرف تھی۔

”تم بھی کھڑی ہو جاؤ۔“ رنجیز کے جوان نے سلطانہ کو حکم دیا۔

”مم..... میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔ میری ٹانگ میں گولی لگی ہے۔“ سلطانہ کراہی۔

رنجیز کا جوان چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر اس نے اچانک ہی سلطانہ کو زوردار ٹھوکر رسید کر دی اس کے ساتھ ہی وہ غرایا۔

”کھڑی ہو جاؤ اٹھ کر“

سلطانہ کے منہ سے چیخ نکل گئی لیکن بہر حال اسے حکم کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔ وہ بھی نائلہ اور سسی کی طرح ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ رنجیز کا جوان مختاط انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے سب مشین گن بائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور سلطانہ کی پشت پر پہنچ کر دائیں ہاتھ سے اس کے جسم کو تھپتھپانے لگا۔ اس کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ ماضی میں عورتوں کے حوالے سے بھی کچھ ایسے تجربات ہو چکے تھے جن سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ انہیں عورتیں سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان عورتوں میں سے کسی کے پاس پستول، ریوا لوریا کوئی اور ہتھیار تو نہیں ہے۔

سلطانہ کو چپک کرنے کے بعد اس نے جیسے ہی سسی کے جسم کو تھپتھپایا وہ بھڑک اٹھی۔

”میرے کو ہاتھ نہیں لگاؤ خبیث۔“ وہ چیخی۔

”اپنی جگہ پر آرام سے کھڑی رہو۔“ جوان غرایا۔

”مسی! آرام سے کھڑی رہو۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے لیکن اسے بھی اپنی تسلی کر لینے دو۔“ نائلہ نے

کما۔

سسی خاموش ہو گئی۔ رنجرز کے جوان نے سسی کے جسم کو اوپر سے نیچے پھینٹا کر اپنا اطمینان کیا پھر نائلہ کی طرف آیا۔ وہ دائیں ہاتھ سے نائلہ کا جسم پھینٹا رہا تھا اور بائیں ہاتھ میں پٹری ہوئی رائل کی نال نائلہ کے بائیں پلو کو چھوری تھی۔ جوان کا دایاں ہاتھ نائلہ کے جسم کو ٹٹول رہا تھا نائلہ نے اچانک ہی دونوں ہاتھ نیچے گرا دیئے اس کا دایاں ہاتھ رائل کی نال پر پڑا، رائل پر گرفت جماتے ہی اس نے زوردار جھٹکا دیا اور تیزی سے نیچے جھک گئی۔

رنجرز کے جوان کو نائلہ کے اس اقدام کی قطعی توقع نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑا کر نائلہ کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ رائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ نائلہ نے بڑی پھرتی سے رائل پر قبضہ جمالیا۔ اس نے اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ رنجرز کے جوان کو رائل کی زد پر لیتے ہوئے غرائی۔

”اب تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

رنجرز کے جوان نے ہاتھ سر سے اوپر اٹھالئے۔

”تمہارا خیال ہے کہ تم فورس کا گھیرا توڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکو گی۔“ رنجرز کے جوان نے کہا۔  
”فائرنگ کی آوازیں سن رہی ہو۔ تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی بھی بچ کر نہیں جاسکے گا بہتر ہو گا کہ رائل پھینک دو اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”اپنے آپ کو تمہارے حوالے ضرور کر دیں گے لیکن پہلے ہمارے ساتھ چلو۔ اس طرف۔“ نائلہ نے چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔

دائیں طرف کا علاقہ فائرنگ کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ رنجرز اور بے سنگھ کے آدمیوں میں زبردست مقابلہ ہو رہا تھا۔ چٹانیں فائرنگ کی آوازوں سے گونج رہی تھیں رنجرز کا وہ جوان ہاتھ اٹھائے ان کے آگے آگے چٹانوں میں چل رہا تھا۔ نائلہ نے اسے رائل کی زد پر لے رکھا تھا۔ دوسری طرف فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی۔ تقریباً ”سو گز“ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نائلہ نے اپنے قیدی کو رکنے کا حکم دیا۔ سلطانہ کو چلنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔

”تم لوگوں کی گاڑیاں کہاں ہیں؟“ نائلہ نے رنجرز کے جوان سے پوچھا۔

”ان چٹانوں کے پیچھے۔“ جوان نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن اگر تم ہماری کسی گاڑی پر فرار ہونا چاہتی ہو تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ میں ایک بار پھر مشورہ دوں گا کہ اپنے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”اگر ہم کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہوتیں تو اپنے آپ کو تمہارے حوالے ضرور کر دیتیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ہم جس مشن پر ہیں وہ زیادہ اہم ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ گرفتاری کے چند گھنٹوں بعد ہمیں رہائی مل جائے گی مگر یہ چند گھنٹے بھی ہمارے لئے بہت اہم ہیں۔ ہمارا ان اسمگلروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے ساتھ تو ہم صرف سرحد پار کرنے کے لئے آئی تھیں۔ یہ ہم پر ان کا بہت بڑا احسان تھا۔ اگر اب انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو مجھے افسوس بھی ہو گا۔ لیکن انہیں ان کے جرم کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔ چلو اپنی گاڑیوں کی طرف چلو۔“

رنجرز کا نو جوان آگے چلے لگا۔ تقریباً ”سو گز“ آگے وہ ایک چٹان کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف

آگئے۔ یہاں ایک بڑا ٹرک اور ایک جیپ کھڑی تھی۔ ٹرک سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ رینجرز کے جوانوں کی تعداد کیا ہوگی۔

”چلو..... جیپ پر بیٹھو۔ تم ڈرائیو کرو گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔“ رینجرز کے جوان نے جواب دیا۔

”چلو..... بیٹھو اسٹیرنگ کے سامنے۔“ نائلہ کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

رینجرز کا جوان خاموشی سے جیپ پر بیٹھ گیا۔ نائلہ اور سسی نے سلطانہ کو سارا دے کر جیپ میں بٹھایا اور خود بھی سوار ہو گئیں۔ نائلہ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ رانٹل کی نال اس نے رینجرز کے جوان کی گردن سے لگادی تھی۔

”اشارت کرو گاڑی۔“ نائلہ نے رانٹل سے اس کی گردن پر دباؤ ڈالا۔

فائرنگ کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رینجرز کے جوان نے انجن اشارت کر دیا۔ نائلہ کو یقین تھا کہ فائرنگ کے شور میں انجن کی آواز دور تک نہیں سنی گئی ہوگی۔

”کو والا یہاں سے کتنی دور ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”دو کوس ہو گا۔“ رینجرز کے جوان نے جواب دیا۔

”چلو..... جیپ آگے بڑھاؤ۔“ نائلہ نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

جیپ حرکت میں آگئی۔ فائرنگ کی آوازیں بتدریج دور ہوتی چلی گئیں۔ کو والا نامی بستی تک پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ لیکن نائلہ نے ڈرائیور کو روکنے نہیں دیا۔

”بستی میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں باہر سے ہوتے ہوئے نگر پار کر کی طرف نکل چلو۔“

”جیپ میں اتنا پٹرول نہیں ہے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”میں ڈائل دیکھ رہی ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”جیپ میں اتنا تیل موجود ہے جس سے کم از کم سو میل کا فاصلہ طے کیا جاسکتا ہے۔“

ڈرائیور کے منہ سے بے اختیار گھرا سانس نکل گیا۔ اس نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ بستی پیچھے رہ گئی تھی۔ اب جیپ نگر پار کر کی طرف دوڑ رہی تھی۔ چند میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد نائلہ نے ڈرائیور کو جیپ روک دینے کا حکم دیا رینجرز کے جوان نے بلا جوں و چراں حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جیپ روک دی۔ وہ اس وقت کرو نجر ہلز کے سلسلہ کوہ میں تھے۔ چاروں طرف ٹیلوں نما چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں میں دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا ڈرائیور کو حیرت تھی کہ انہوں نے جیپ یہاں کیوں رکوائی تھی۔

”نیچے اترو۔“ نائلہ نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

”کیا مطلب؟“ ڈرائیور چونک گیا۔

”میں نے کوئی اجنبی زبان نہیں بولی۔ نیچے اتر جاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

رینجرز کا جوان انجن چلتا چھوڑ کر خاموشی سے نیچے اتر گیا۔

”یہاں سے واپس دوڑنا شروع کر دو۔ دو تین گھنٹوں میں تم کو والا پہنچ جاؤ گے۔ اپنے آفسر کو بتادینا یہ جیپ تم لوگوں کو عمر کوٹ میں مل جائے گی۔ چلو..... اب دوڑنا شروع کر دو۔“ نائلہ نے رانٹل سے اشارہ کیا۔

”م..... میں.....“ رنجرز کا جوان ہکلیا۔ ”اس علاقے میں خونخوار بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔ وہ مجھے.....“

”بھیڑیے ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”چلو۔ اب دوڑنا شروع کرو۔ ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔“

رنجرز کا جوان چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹکے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ ”تم لوگ بچ کر نہیں جا سکو گی۔ وائریس پر اطلاع دے کر پورے علاقے کی ناکہ بندی کر دی جائے گی اور پکڑے جانے کے بعد تمہارا جو حشر ہو گا اس کا تم ابھی اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔“

”ہمیں اپنے انجام کی پرواہ نہیں تم اپنی خیر متاؤ۔ میں تین تک گنوں گی اس کے بعد میں گولی چلا دوں گی۔“ نائلہ نے کہا اور کتنی شروع کر دی۔ اس نے دو کہا تھا کہ رنجرز کے جوان نے پیچھے مڑ کر دوڑ لگا دی۔

نائلہ نے رائفل سسی کو تھمادی اور خود اسٹیمرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے اسٹیمرنگ سنبھالا اور دوسری ہی لمحہ جیب تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ نائلہ نے رنجرز کے جوان کو بتایا تھا کہ انہیں جیب عمر کوٹ میں مل جائے گی۔ لیکن عمر کوٹ کی طرف جانے کا نائلہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ٹکڑا کر پہنچ گئیں۔ شرنیند کی آغوش میں تھا۔ دو تین کتے بھونکتے ہوئے جیب کے پیچھے لگ گئے۔ بازار کے اختتام پر ایک آدمی کولاشی لئے کھڑے دیکھ کر نائلہ نے اس کے قریب جیب روک لی۔ یہ بازار کا چوکیدار تھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اسے دیکھ کر نائلہ بڑی مشکل سے اپنی منہی ضبط کر سکی تھی۔ یہ تو خود لب گور کھڑا تھا۔ چوکیداری کیا کرتا ہوگا۔

”سسی“ اس سے پوچھو عمر کوٹ کا راستہ کس طرف ہے۔ ”نائلہ نے مدھم لہجے میں کہا۔ سسی جیب پر بیٹھے بیٹھے اس بوڑھے چوکیدار کی طرف جھک گئی۔

”ابا سائیں۔“ وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے تھری زبان میں بولی۔ ”عمر کوٹ جانے کا راستہ کس طرف ہے؟“

بوڑھا چند لمحوں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ تینوں لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے راجستھانی لباس پہن رکھے تھے لیکن چڑی کسی کے سر پر نہیں تھی۔

”تم لوگ کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”تم ہماری بات کا جواب دو“ عمر کوٹ جانے کا راستہ کس طرف ہے؟“ سسی نے کہا۔

”شہر سے نکل کر سیدھی چلی جانا۔ وہی سڑک دیراواہ سے ہوتی ہوئی چاچڑا اور عمر کوٹ کی طرف جاتی ہے۔ شہر سے نکل کر اٹلے ہاتھ کو مت چلی جانا۔ ادھر سے مٹھی کو راستہ جاتا ہے۔ مگر تم لوگ.....“

”شکریہ ابا سائیں۔“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی اور جیب آگے بڑھادی۔ بوڑھا چوکیدار اپنی جگہ پر کھڑا حیرت بھری نظروں سے جیب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

شہر سے نکلنے ہی نائلہ نے جیب کا رخ بائیں طرف والی سڑک پر موڑ دیا۔ کچی سڑک پر جیب کو اچھے خامے جھنگے لگ رہے تھے۔ ان جھنگوں کی وجہ سے سلطانہ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ سنہار تک کچی سڑک تھی اور اس سے آگے اسلام کوٹ تک کچی سڑک۔ جب وہ اسلام کوٹ کے نواح میں پہنچیں تو رات کی تاریکی رخصت ہونے لگی تھی۔

اسلام کوٹ سے ایک کچی سڑک مٹھی کی طرف چلی گئی تھی لیکن نائلہ نے جیب کا رخ ایک کچی سڑک پر

موڑ دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کچے راستوں پر وہ زیادہ دیر تک محفوظ رہیں گی۔ حالانکہ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ سڑک انہیں کہاں لے جائے گی۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتی تھی اور اس جیپ سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ وہ جیپ کی وجہ سے کیس پھنس بھی سکتی تھیں۔

”سلطانہ۔“ نائلہ نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ ٹانگ کی وجہ سے تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہوگی۔ لیکن صورتحال تمہارے سامنے ہے۔ ہم ابھی تک خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ ممکن ہے اس وقت ہماری تلاش شروع ہو چکی ہو اور اس علاقے میں واقع تمام تھانوں اور پولیس چوکیوں کو ہمارے بارے میں اطلاع دیدی گئی ہو۔ جب تک ہمیں کوئی محفوظ جگہ نہیں مل جاتی اس وقت تک تمہارے زخم کا بھی کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔“

”میری فکر مت کرو۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”یہ بھی غنیمت ہے کہ گولی گوشت کا ٹپتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے فیض کا دامن پھاڑ کر زخم پر باندھ لیا ہے۔ اب زیادہ خون بھی نہیں بہہ رہا۔ ویسے میرے خیال میں تم نے فرار ہو کر غلطی نہیں کی؟“

”کیا مطلب؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ہم رنجیز کی حراست میں رہ کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر سکتی تھیں۔ آئی جی کا نمبر ہمارے پاس موجود ہے۔ آئی جی سے رابطہ کر کے اسے اصل صورتحال سے آگاہ کر سکتے تھے۔ تم نے رام گڑھ سے دو مرتبہ آئی جی سے رابطہ کر کے انہیں اہم اطلاعات دی تھیں۔ وہ ہماری مدد کر سکتے تھے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”پہلے میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ اپنے آپ کو رنجیز کے حوالے کر دیا جائے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”لیکن رنجیز کا اپنا طریقہ کار ہے۔ اگر وہ ہمیں آئی جی سے رابطہ کرنے کی اجازت دے بھی دیتے تو یہ ایک بڑا لمبا پروکس ہوتا۔ پتہ نہیں ہمیں کتنے دن ان کی تحویل میں رہنا پڑتا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ہماری بات پر یقین کر لیا جاتا۔ ہم اسمگلروں کی ایک پارٹی کے ساتھ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ رنجیز ہماری بات پر یقین نہ کرتے اور ہمیں آئی جی سے رابطہ قائم کرنے کی اجازت دینے کے بجائے ہمیں باقاعدہ گرفتار کر کے ہمارے خلاف قانونی کارروائی شروع ہو جاتی۔ اسی لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ اس طرح ہم کوشش تو کر سکتی ہیں اور پھر ان دہشت گردوں کو بھی ذہن میں رکھو جو ہم سے پہلے سرحد پار کر کے کراچی پہنچ چکے ہیں۔“

”ہاں..... تم ٹھیک کہتی ہو۔“ سلطانہ نے ایک گہرا سانس لیا۔

”سسی! تم خاموش بیٹھی ہو۔ تم بھی تو کچھ بولو۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں کیا بولوں ادی“ سسی نے جواب دیا۔ ”مجھے تو خوشی ہے کہ ہم واپس آگئی ہیں۔ میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ ان کا پتہ نہیں کیا حال ہو گا۔ میں کب ان کے پاس جاسکوں گی۔ وہ مجھے قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں۔“

”اس میں تمہارا کیا قصور ہے سسی؟“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ لوگ تمہیں دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ قبول نہ کرنے کی کیا بات ہے۔“

”تم نہیں جانتیں ادی۔“ سسی نے کہا۔ ”جو ان لڑکی اگر ایک رات گھر سے باہر رہ جائے تو کوئی اس کی پاک دامنی کا یقین نہیں کرتا۔ ایسی لڑکیوں کو.....“

”تم فکر مت کرو۔“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہم تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ہم تمہاری پاکیزگی

کی گواہی دیں گی۔ بس دعا کرو کہ ہم خیریت سے کراچی پہنچ جائیں۔“

”اللہ سائیں ہماری مدد کرے گا۔“ مسی نے کہا۔

جیپ تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ سڑک کے دونوں طرف ریگستان تھا۔ چھوٹی جھاڑیاں تو جا بجا نظر آرہی تھیں۔ کہیں کہیں کیکر کے درختوں کے جھنڈ بھی نظر آجاتے۔

شاید گیارہ بجے کا وقت تھا۔ تیز دھوپ سڑیوں کی طرح جسم پر چھ رہی تھی۔ لوکے تھپڑے ان کے چروں کو جھلائے دے رہے تھے۔ دفعتاً ”جیپ کا انجن غرغرائے لگا۔ پہلے تو ناکہ سمجھی کہ شاید مسلسل چلتے رہنے سے جیپ کا انجن گرم ہو گیا ہو گا لیکن پھر ڈاکل پر نظر پڑتے ہی اسے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ فیول تانے والی سوئی زیر پر تھر تھرا رہی تھی۔ ناکہ نے ریڑرو لگا دیا۔ چند میل کا فاصلہ اور طے ہو گیا۔ انجن ایک بار پھر غرغرائے لگا۔ جیپ کی رفتار خود بخود کم ہونے لگی۔

”کیا ہوا ادی؟“ مسی نے پوچھا۔

”جیپ میں پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔“ ناکہ نے جواب دیا۔

”اللہ سائیں ہم پر رحم کرے۔“ مسی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”جیپ رک گئی۔“ ناکہ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسٹیرنگ پر مارے۔ انجن خود بخود بند ہو گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دائیں طرف ریگستان میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بکثرت نظر آرہی تھیں البتہ بائیں طرف سڑک سے ہٹ کر تقریباً ”دو فلائنگ“ کے فاصلے پر درختوں کا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس سے آگے کوئی جنگل ہو۔

”ہم اس جیپ کو اس طرح سڑک پر نہیں چھوڑ سکتے۔“ ناکہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر جیپ کو یہاں دیکھ لیا گیا تو انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ ہم کس طرف گئی ہیں۔ اس طرح ہمیں تلاش کر لیا جائے گا۔“

”تو پھر..... اس جیپ کا کیا کریں۔“ سلطانہ نے کہا۔

”میرا خیال ہے اسے دھکا دے کر ان درختوں تک لے جایا جائے۔“ ناکہ نے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ ”جیپ کو جنگل میں چھپا کر ہم لوگ کسی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔“

”کہیں پھر نہ بھٹک جائیں۔“ مسی نے کہا۔

”ہم لوگ سڑک سے زیادہ دور نہیں رہیں گے۔“ ناکہ نے جواب دیا۔ ”اؤسی! تم میرے ساتھ دھکا لگاؤ۔ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ ہم جیپ کو آسانی سے وہاں تک لے جائیں گے۔“

”میں بھی آؤں؟“ سلطانہ بولی۔

”نہیں۔ تم بیٹھی رہو۔ ہم دونوں کافی ہیں۔“ ناکہ نے کہا۔

سلطانہ جیپ میں بیٹھی رہی اور ناکہ اور مسی جیپ کو دھکا لگانے لگیں۔ ریت سخت تھی جس سے جیپ کو دھکا لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ سلطانہ پچھلی سیٹ سے اٹھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی اور اس نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ وہ دونوں جیپ کو دھکا لگاتی رہیں۔

ناکہ کا خیال تھا کہ وہ جیپ کو آسانی سے دھکا لگا کر لے جائیں گی۔ لیکن بھاری جیپ کو دھکیلنے میں انہیں ایڑی چونی کا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ ان کے جسم پینے میں شرابور ہو گئے۔ لباس پینے میں بھٹک کر جسم سے چپک گیا تھا جس سے انہیں بڑی دھشت سی ہو رہی تھی۔ ان دونوں کے سانس بھی بری طرح پھول گئے تھے۔



وہ رک گئیں اور جپ سے ٹیک لگا کر اپنے بے ربط شخص پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگیں۔ سسی تو بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس نے اچانک ہی ایک ایسی حرکت کی جس پر نائلہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی۔  
”ارے پاگل تو نہیں ہو گئی۔ یہ کیا کر رہی ہو؟“ نائلہ نے اسے ٹھہرا۔

”یہاں کون دیکھ رہا ہے ادی“ سسی نے اپنی قیض اتارتے ہوئے کہا۔ ”میری مانو تو تم بھی اتار دو قیض۔“

سسی نے قیض اتار کر جپ کی سیٹ پر پھیلا دی۔ لیکن نائلہ نے قیض نہیں اتاری کچھ دیر بعد جب اسکا سانس درست ہوا تو وہ ایک بار پھر جپ کو دھکا لگانے لگیں۔ جنگل وہاں سے خاصا دور ثابت ہوا تھا۔ لیکن بالا خرہ جپ کو وہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو گئیں۔ وہ جپ کو بیس پیچیں گز اندر تک لے گئیں تاکہ باہر سے اسے نہ دیکھا جاسکے۔

یہ جنگل خاصا گنجان تھا۔ وہ دھوپ سے تو بچ گئی تھیں لیکن گھٹن کا احساس نمایاں تھا۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سانس لینے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ تقریباً ”آدھا گھنٹہ تک جپ میں بیٹھی رہیں۔ گھٹن کی وجہ سے ان کے جسموں سے پسینہ مسلسل بہہ رہا تھا۔

”سلطانہ!“ نائلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم چل سکو گی؟“

”مجبوری ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ ظاہر ہے ہم یہیں تو نہیں بیٹھے رہ سکتے۔“

”تو پھر ہمت کرو۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور زمین پر پڑی ہوئی ایک موٹی سی شاخ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ”یہ پکڑ لو اس کے سارے چلنے میں کچھ آسانی رہے گی۔“  
نائلہ نے سارا دے کر سلطانہ کو جپ سے اتار دیا اور لکڑی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ سسی نے قیض اٹھا کر کندھے پر ڈال لی۔

”اس کا کیا کریں ادی؟“ اس نے راتقل کی طرف اشارہ کیا۔

”اسے ساتھ لے لو۔ شاید اس کی ضرورت پڑ جائے۔ لاؤ مجھے دیدو۔“ نائلہ نے آگے بڑھ کر سسی کے ہاتھ سے راتقل لے کر کندھے پر لٹکالی۔

وہ تینوں آہستہ آہستہ چلتے گئیں۔ جنگل خاصا گنجان تھا۔ کیکر کے علاوہ کچھ اور درخت بھی تھے جنہیں نائلہ شناخت نہیں کر سکتی تھی۔ زمین پر جا بجا سوکھی ہوئی شاخیں بکھری ہوئی تھیں۔ سلطانہ کی وجہ سے ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ انہیں بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ تقریباً ”ایک گھنٹے میں انہوں نے صرف ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔

کچھ اور فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ قدرے کھلی جگہ پر نکل آئیں۔ گرمی اور پیاس سے وہ نڈھال ہو رہی تھیں۔ درخت چھدرے ہونے کی وجہ سے یہاں کچھ ہوا بھی لگ رہی تھی لیکن یہ ہوا بھی خاصی گرم تھی۔ آگے پھر درخت گنجان ہو گئے تھے۔

سورج اب سر پر چمک رہا تھا۔ جس بڑھ گیا تھا اور انہیں سانس لینا واقعی دشوار ہو رہا تھا۔ سلطانہ کی حالت بہت ابتر تھی۔ زخم کی وجہ سے اس کی ٹانگ ایٹھ رہی تھی۔ بڑی شدت کی نیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن وہ جیسے تنھے لکڑی کے سارے چل رہی تھی۔

وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئیں جہاں درخت چھدرے تھے اور یوں پگڈنڈی سی نظر آرہی تھی جیسے یہ پیدل

آمدورفت کا کوئی باقاعدہ راستہ ہو۔

”یہ کوئی باقاعدہ راستہ ہے۔“ نائلہ گنڈنڈی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے ہمیں اس طرف چلنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے اس راستے پر چلتے ہوئے ہم کسی گوتھ میں پہنچ جائیں۔“

”کچھ دیر یہاں رک جاؤ۔ مجھ سے ایک قدم نہیں چلا جا رہا۔“ سلطانہ کراہتے ہوئے بولی۔

وہ تینوں گنڈنڈی پر بیٹھ گئیں۔ گرمی اور پیاس کی شدت نے انہیں بندھا کر دیا تھا۔ سسی کچھ زیادہ بے چین ہو رہی تھی۔ کیڑوں مکوڑوں نے اس کے جسم پر کاٹ کاٹ کر برا حشر کر دیا تھا۔ وہ تقریباً ”آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھی رہیں اور پھر اٹھ کر چلنے لگیں۔ انہوں نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ نائلہ چونک کر پیچھے مڑی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے ان کے پیچھے کوئی آ رہا ہو۔ وہ درختوں میں دیکھنے لگی۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر دوبارہ چلنے لگی۔

تقریباً ”بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نائلہ پھر رک گئی۔ قدموں کی نیچے شاخوں کی چرچرانے کی آواز اس نے صاف طور پر سنی تھی۔

”کیا ہوا ادی؟“ سسی نے پوچھا۔

”مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ان درختوں میں کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہو۔“ نائلہ نے کہا۔

”اللہ سائیں۔“ سسی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ جلدی سے فیض پہننے لگی۔

وہ ایک بار پھر چلنے لگیں۔ نائلہ کو بار بار احساس ہو رہا تھا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ لیکن وہ جب بھی مڑ کر دیکھتی کچھ بھی نظر نہ آتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر واقعی کوئی شخص ان کا پیچھا کر رہا تھا تو اب تک سامنے کیوں نہیں آیا تھا یا اسے دکھائی کیوں نہیں دے رہا تھا؟ یا پھر ہو سکتا ہے وہ کوئی جانور ہو۔ ایک اور خیال نائلہ کے ذہن میں ابھرا۔ جنگلوں میں ڈاکوؤں نے اپنے اڈے بنا رکھے تھے۔ اگر اس جنگل میں بھی ڈاکوؤں کا کوئی اڈہ ہوا تو وہ ان کے جنگل میں پھنس جائیں گی۔

نصف میل کا فاصلہ اور طے ہو گیا۔ وہ اسی گنڈنڈی پر چل رہی تھیں لیکن جنگل ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تھکن اور پیاس کے ساتھ اب بھوک بھی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ انہوں نے کل رات راجستھان کی آخری بستی میں جے سنگھ کے رشتہ داروں کے ہاں کھانا کھایا تھا اس کے بعد سے اب تک کچھ کھانے کو تو کیا، پانی کا ایک قطرہ تک نہیں ملا تھا۔ اپنے عقب میں سوکھی ہوئی شاخوں کے چرچرانے کی آوازیں سن کر نائلہ اس مرتبہ بڑی تیزی سے پیچھے مڑی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ لو مڑی یا اسی نسل کا کوئی جانور تھا جو پتہ نہیں کیا سمجھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ نائلہ جیسے ہی مڑی تھی اس جانور نے جھاڑیوں میں چھپنے کی کوشش کی تھی۔ نائلہ نے ہشکارہ تو وہ جانور مڑ کر ایک طرف کو بھاگ نکلا۔

”اللہ سائیں۔“ سسی گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”مرد تو عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں اب جانوروں نے

بھی ان کی یہ عادت سیکھ لی ہے۔“

صورتمال کی عین غیبتی اور نزاکت کے باوجود نائلہ کے حلق سے بے اختیار ایک تہقہ نکل گیا۔ سلطانہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لئے وہاں رک گئی تھیں۔ نائلہ سوچ رہی تھی کہ سورج اب مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا اور اگر وہ اس جنگل سے باہر نہ نکل سکیں اور شام سے پہلے کسی بستی تک نہ پہنچ سکیں تو انہیں رات اسی خوفناک جنگل میں گزارنی پڑے گی۔ ان علاقوں میں زہریلے سانپ اور بچھو وغیرہ

بکثرت تھے۔ اگر انہیں رات اس جنگل میں رہنا پڑا تو کیا وہ صبح کا سورج دیکھنے کے لئے زندہ رہ سکیں گی؟ دو گھنٹے اور گزر گئے۔ ان کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ سلطانہ تو اب بار بار گر رہی تھی۔ اس کے زخم سے پھر خون رشنا شروع ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ نائلہ اور سسی اسے سارا دے کر گھینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ ہانپتی ہوئی ایک بار پھر کھلی جگہ پر نکل آئیں اور پھر دوسرے ہی لمحہ نائلہ خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ بائیں طرف تقریباً ”بیس گز کے فاصلے پر ایک بوڑھا آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی زمین پر ایک چوڑے پھل والی کھلاڑی بھی پڑی ہوئی تھی۔

نماز پڑھنے والے اس شخص نے سلام پھیرتے ہوئے جیسے ہی انہیں دیکھا وہ بھی چونک گیا۔ اس کے چہرے پر انہجھن کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ منہ پر ہاتھ پھیرے اور اپنی کھلاڑی اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف آنکلا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سفید داڑھی، نیلی شلوار اور سرمئی رنگ کی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ سربرا جڑک پٹری کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

”کون ہو تم لوگ..... اس جنگل میں کہاں سے آئی ہو؟“ اس نے باری باری تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم بے سارا ہیں ابائیں۔“ سسی نے کہا۔ ”ہماری بس پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا وہ دوسرے مسافروں کے ساتھ ہمیں بھی پکڑ کر لے گئے۔ ہم ڈاکوؤں کو دھوکا دے کر بھاگ نکلیں۔ صبح سے اس جنگل میں بھگ رہی ہیں۔“

”اور یہ بندوق؟“ اس شخص نے نائلہ کے کندھے پر ہلکی ہوئی بندوق کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ..... یہ بندوق ہم نے ڈاکوؤں سے چھینی تھی۔“ سسی نے جواب دیا۔

”آؤ..... میرے ساتھ آؤ۔ میرا جھگی یہاں سے قریب ہی ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔

”یہ ادی زخمی ہے ابائیں۔ اسے ایک ڈاکو نے گولی مار دی تھی۔ قسمت اچھی تھی جو بچ گئی۔“ سسی نے سلطانہ کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا جھگی زیادہ دور نہیں ہے۔ آرام آرام سے چلو گی تو آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔“ بوڑھے نے کہا۔

وہ تینوں اس بوڑھے کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ ایک کھلی جگہ پہنچ گئے۔ یہاں گول چھت والے دو بڑے بڑے جھونپڑے تھے اور ان سے تھوڑے فاصلے پر کئی ہوئی لکڑیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سسی کو اپنا گھریا یاد آگیا۔ بالکل ایسی ہی صورت حال تھی۔

ان جھونپڑوں میں دو عورتوں اور ایک نو عمر لڑکے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ لڑکے کی عمر گیارہ بارہ سال رہی ہوگی۔ عورتوں میں ایک کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ اور دوسری تیس کے لگ بھگ تھی۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ وہ دونوں اس بوڑھے کی بیویاں تھیں اور وہ لڑکا اس کا بیٹا تھا جو بیوی نمبر ایک یعنی ادیمڑ عورت سے تھا۔

ایک درخت کے نیچے دو بکریاں اور ایک بیل بندھا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک بیل گاڑی بھی کھڑی تھی۔ کچھ مرغیاں ادھر ادھر چل قدی کر رہی تھیں۔

وہ دونوں عورتیں بوڑھے کے ساتھ ان تینوں کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

”یہ چھو کھیاں کون ہیں دین محمد“ انہیں کہاں سے لے آئے ہو؟“ بڑی عموالی عورت نے پوچھا۔

”یہ مظلوم چھو کر یاں ہیں بھاگی۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”ڈاکوؤں کی قبضے سے نکل کر بھاگی ہیں۔ بے چاری جنگل میں بھٹک رہی تھیں۔ ان میں یہ زخمی ہے۔ گولی لگی ہے۔ اے۔“

”اگر ڈاکو ان کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آگئے تو ان کے ساتھ ہمیں بھی لے جائیں گے پکڑ کے۔“ بھاگی نے کہا۔ ”ان کو کہیں اور چھوڑ کے آ۔“

”ارے بھاگی۔“ بوڑھے دین محمد نے جواب دیا۔ ”تمہیں کون لے کر جائے گا۔ ایک میں ہی بیوقوف تھا جو تمہیں لے آیا تھا۔ دیکھ یہ چھو کر یاں ہماری ممان ہیں۔ ان کی کوئی خدمت خاطر کر۔۔۔ ارے او فاطمہ۔۔۔۔۔ جان کے لئے پانی لے کر آ اور کچھ کھانے کا بندوبست کر۔“ بوڑھے نے آخری الفاظ اپنی دوسری بیوی سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

فاطمہ فوراً ہی اٹھ گئی۔ اس نے ملنے میں سے پانی لا کر انہیں پلایا اور سلطانہ کی طرف دیکھنے لگی جس کی شلوار خون آلود ہو رہی تھی۔

”کہاں گولی لگی ہے تجھے۔ تو زندہ کیسے بچ گئی گولی لگنے کے بعد؟“ فاطمہ نے کہا۔

”موت کا ایک وقت مقرر ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ ”وقت سے پہلے کوئی نہیں مر سکتا اور نہ ہی ایک لمحہ زیادہ زندہ رہ سکتا ہے۔“

بوڑھا دین محمد ایک جھوپڑے میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پولی فیکس مرہم کی ایک مڑی تڑی سی ٹیوب تھی جو آدمی سے زیادہ بچی ہوئی تھی۔

”پچھلے مہینے بھاگی کو چوہے لگ گئی تھی تو گوٹھ کے ڈاکدار نے یہ ملم دیا تھا۔ اس سے اس کا زخم ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کو کبھی یہ لگا دو۔“ اس نے کہتے ہوئے ٹیوب نالہ کی طرف بڑھادی۔

نالہ نے وہیں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے سلطانہ کا زخم دیکھا۔ گولی پنڈلی کا گوشت چرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زخم کے آس پاس خون جما ہوا تھا۔ نالہ نے کپڑا بھگو کر زخم صاف کیا اور مرہم لگا کر کپڑے کی ایک دھجی زخم پر باندھ دی۔ یہاں مرہم کامل جانا بھی غنیمت تھا۔ اس سے زیادہ کوئی طبی امداد نہیں دی جاسکتی تھی۔

”گوٹھ یہاں سے کتنی دور ہے؟“ نالہ نے بوڑھے سے پوچھا۔

”پلوان گوٹھ یہاں سے چھ سات کوس کے فاصلے پر ہے اور اس سے تین کوس آگے ڈیلو ہے۔“

بوڑھے نے جواب دیا۔

”تمہارے پاس بیل گاڑی ہے۔ کیا تم ہمیں پلوان گوٹھ یا ڈیلو پہنچا سکتے ہو؟“ نالہ نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیل گاڑی کا پیہ خراب ہے۔“ دین محمد نے جواب دیا۔ ”تم لوگ یہاں رہو۔ آرام کرو۔ میں کل صبح پلوان گوٹھ جا کر رئیس کریم بخش کو تم لوگوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ وہ تمہاری مدد ضرور کرے گا۔“

”ابھی تو شام ہونے میں بہت دیر ہے۔ کیا تم ابھی نہیں جاسکتے۔“ نالہ نے کہا۔

بوڑھے نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں چلا جاتا ہوں۔ تم لوگ یہاں آرام کرو۔ فاطمہ ابھی تم لوگوں کو مانی دیتی ہے۔ گھبرا نا نہیں۔ اللہ سائیں بھلا کرے گا۔“

فاطمہ ایک جھوپڑے کے دروازے کے سامنے بیٹھ کر آنا گوندھنے لگی۔ بھاگی چارپائی پر بیٹھی رہی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔ وہ بڑی ناگوار سی نظروں سے ان تینوں کو دیکھ

ری تھی۔ اسے شاید یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر دین محمد ان میں سے کسی کو تیسری شادی کے لئے منتخب نہ کر لے۔ تھوڑی دیر بعد دین محمد پہلوان گوٹھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے اجرک سر پر چڑی کی طرح لیٹی اور کھلاڑی اٹھالی، پھر فاطمہ کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ ان تینوں کے پاس آگیا۔

”میں جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے واپس آنے میں دیر ہو جائے۔ گھبرانا مت۔“  
 ”ایک بات ہے ابا سائیں۔“ سسی نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ ”گوٹھ میں کسی کو ہمارے بارے میں مت بتانا۔ صرف رئیس سے بات کرنا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ہو سکتا ہے وہ ڈاکو ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔“  
 ”میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ رئیس کریم بخش بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ تم لوگوں کی مدد ضرور کرے گا۔ اچھا“ میں جاتا ہوں۔“ بوڑھا چلا گیا۔

فاطمہ آٹا گوندھنے کے بعد چولہے میں آگ جلانے لگی تھی۔ پھر اس نے توا چولہے پر رکھ دیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ روٹیاں اور انڈے کا ایلٹ بنا کر لے آئی۔ یہ تینوں ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کھانا اپنے بیچ میں رکھ لیا اور نندیدوں کی طرح کھانے لگیں۔ فاطمہ بھی ان کے قریب زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ بھاگی اپنی چارپائی پر بیٹھی خونخوارہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی بد مزاج عورت ثابت ہوئی تھی۔

پیٹ بھرنے کے بعد ان کی جان میں جان آئی۔ اور اب تھکن بھی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ جس جگہ وہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں وہاں درختوں کا سایہ بہت گھنیرا تھا۔ ہوا بھی کسی قدر ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ وہ چارپائی پر آڑی ترچھی لیٹ گئی۔ سلطانہ اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور سسی چارپائی سے اتر کر فاطمہ کے قریب زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی اور اس سے باتیں کرنے لگی تھی۔

فاطمہ بتا رہی تھی کہ دین محمد سے اس کی شادی تقریباً ”چار سال پہلے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد اسے پتہ چلا تھا کہ وہ پہلے ہی سے شادی شدہ ہے اور ایک بیٹے کا باپ بھی ہے۔ شادی کے بعد وہ مینے بدین میں رہنے کے بعد وہ یہاں آئے تو بھاگی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ پہلے تو بھاگی بات بات پر اس سے لڑتی رہتی تھی۔ لیکن اب شاید اسے صبر آگیا تھا۔ دین محمد نے جنگل کی کٹائی کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ وہ سب مل کر لکڑیاں کاٹتے رہتے۔ جب انبار لگ جاتے تو وہ لکڑیاں بیل گاڑی پر لاد لاد کر پہلوان گوٹھ پہنچا دیتا جہاں سے ٹرک کے ذریعے بدین کا بیوپاری اٹھالے جاتا۔

فاطمہ بدین کی رہنے والی تھی۔ اس کے ماں باپ وہیں تھے۔ باپ ایک ہندو سیٹھ کے پاس ملازم تھا۔ فاطمہ کے کہنے کے مطابق اس کے دادا کی تھوڑی بہت زمینداری تھی۔ لیکن دادا کے انتقال کے بعد انکشاف ہوا کہ اس کی زمینیں ایک ہندو سیٹھ کے پاس گردی تھیں۔ اس ہندو سیٹھ نے فاطمہ کے باپ نور محمد اور اس کے بھائی اللہ بخش کو ایک سال کی مہلت دی تھی لیکن وہ ایک سال کی اس مدت میں ایک پائی بھی ادا نہ کر سکے۔ ہندو سیٹھ نے انہیں زمین سے بے دخل کر دیا۔ مکان ایک اور ہندو سیٹھ کے پاس گردی پڑا ہوا تھا۔ ان کی ایک دوکان بھی تھی جس کا معمولی سا کرایہ ملتا تھا۔ انہوں نے دکان بیچ کر مکان کا قرضہ ادا کر دیا۔

”ادی!! تم جانتی ہو یہ ہندو سینہ کیسے ہوتے ہیں۔ ان کا قرضہ تو سودور سود کرنی نسلوں تک چلا ہے۔ انسان مرتے رہتے ہیں مگر ان کا قرضہ ختم نہیں ہوتا۔ اللہ سائیں کا شکر ہے کہ ان کا قرضہ ختم ہو گیا۔ زمین چلی گئی تو کیا ہوا۔ قرضے سے تو جان چھوٹ گئی نا۔“

”ہاں ادی۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔“ سسی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان ہندوؤں کا قرضہ تو شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔“

”ارے ادی سسی۔“ فاطمہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی کیا باتیں لے بیٹھی۔ تم تھکی ہوئی ہو۔ وہ دوسری چارپائی پڑی ہے اس پر لیٹ جاؤ۔ میں کام کر لوں۔“

سسی دوسری چارپائی پر لیٹ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی اوجھنے لگی۔  
 نالکھہ باقاعدہ خرائے لے رہی تھی۔ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں اور پھر شدت کی گرمی میں دن بھر کی بھاگ دوڑنے ان سب کو بری طرح تھکا دیا تھا اور اس وقت وہ تینوں دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر سو رہی تھیں۔

”فاطمہ..... بھاگی نے فاطمہ کے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”یہ چھو کریاں تو مجھے کچھ گڑبڑ لگتی ہیں۔“

”تمہیں تو ہر ایک پر شک کرنے کی عادت ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔ ”ان میں گڑبڑ والی کیا بات نظر آتی ہے تمہیں؟“

”انہوں نے کپڑے تو تھروں جیسے پننے ہوئے ہیں مگر یہ چھو کریاں تھری نہیں ہیں۔ صرف ایک چھو کری‘ جو تم سے باتیں کر رہی تھی سندھی زبان جانتی ہے اور ان دونوں کو تو سندھی بولتی بھی نہیں آتی..... اور دیکھو‘ یہ تینوں ہیں کتنی سندر۔ ان کے ہاتھ کتنے ملائم ہیں۔ تھرمیں رہنے والی کسی چھو کری کے ہاتھ اتنے ملائم نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاتھ دیکھو نا۔ کام کرتے کرتے چھالے پڑ جاتے ہیں۔“

”کسی اچھے گھر کی ہوں گی۔ کام کو نوکر چاکر ہوں گے۔“ فاطمہ نے کہا۔  
 ”میرا دل نہیں مانتا فاطمہ۔“ بھاگی نے کہا۔ ”ان کے پاس بندوق بھی ہے۔ یہ بولتی ہیں کہ ڈاکوؤں کے قبضے سے نکل کر بھاگی ہیں۔ ڈاکو اتنے کمزور تو نہیں ہوتے کہ ایسی خوبصورت چھو کریاں ان سے بھاگ نکلیں۔“

”تو تمہارے خیال میں یہ کون ہو سکتی ہیں؟“ فاطمہ نے اسے گھورا۔  
 ”تمہیں یاد ہے چھ مہینے پہلے پہلوان گوٹھ سے ایک ادی اور دو چھو کریاں پکڑی گئی تھیں۔ وہ راجستان سے آئی تھیں۔ دین محمد تاربا تھا کہ وہ ہندوستان کی جاسوس تھیں۔“

”تو تمہارے خیال میں یہ بھی ہندوستان کی جاسوس ہیں؟“ فاطمہ نے کہا۔  
 ”مجھے تو کوئی گڑبڑ لگتی ہے ادی۔“ بھاگی نے کہا۔ ”اچھا ہوا دین محمد وڈیرے کو بتانے کے لئے چلا گیا ہے۔ یہ لوگ یہاں سے چلی جائیں تو اچھا ہے۔ مجھے تو ان چھو کریوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ ان کے پاس بندوق بھی بڑی خطرناک ہے۔“

”مجھے تو یہ بالکل معصوم لگتی ہیں ادی۔“ فاطمہ نے کہا۔ ”تمہیں وہم ہو گیا ہے۔“  
 نالکھہ کو چارپائی پر کروٹ لیتے دیکھ کر بھاگی وہاں سے اٹھ کر بکریوں کی طرف چلی گئی۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر بکریاں میاں نے لگیں۔ بکریوں کی آواز سن کر نالکھہ اٹھ گئی۔ سورج اس وقت مغرب کی طرف

جک رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد شام ہونے والی تھی۔ اس نے اپنی چارپائی پر پہلے سلطانہ اور پھر دوسری چارپائی پر سسی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بے خبر سو رہی تھیں۔ نائلہ اٹھ کر گھڑوچی کے قریب آگئی اور مٹکے سے پانی نکال کر پینے لگی۔

”تمہارے گھر والا واپس نہیں آیا؟“ اس نے چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی فاطمہ سے پوچھا۔  
 ”اے دیر ہو جائے گی۔ آؤ..... بیٹھو میرے پاس۔“ فاطمہ نے کہا۔

نائلہ اس کے پاس چوکی پر بیٹھ گئی۔ چولہے پر مٹی کی ہنڈیا میں دال پک رہی تھی۔ اس کی خوشبو بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”ایک بات بتاؤ ادی۔“ فاطمہ نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا۔ ”تم لوگ کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو؟“

”تمہیں بتایا تو تھا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”تمہیں شاید ہماری بات کا یقین نہیں آیا۔“

”یہ بات نہیں ہے ادی۔“ فاطمہ نے کہا۔ ”تم لوگوں نے کپڑے تو ہمارے جیسے پہنے ہوئے ہیں مگر تم لوگ تھر کی رہنے والی نہیں ہو۔ کہاں ہے تمہارا گونڈھ؟ کس شہر کی رہنے والی ہو؟“

”ہم کراچی کی رہنے والی ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”پہلی مرتبہ اپنے ایک رشتہ دار سے ملنے عمر کوٹ گئی تھیں۔ یہ کپڑے ہم نے وہیں سے لئے تھے۔ بس پھر دوسری جگہ جاری تھیں کہ ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگی ہیں ہم۔ تمہیں ہم پر کوئی شبہ ہے؟“

”بھاگی کو تم لوگوں پر شک ہے۔“ فاطمہ نے بھاگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کہہ رہی تھی کہ چھ مہینے پہلے پہلوان گونڈھ سے ایک آدمی اور دو چھو کریوں کو پکڑا تھا جو راجستھان کی سرحد پار کر کے آئی تھیں۔ وہ چھو کریاں ہندوستان کی جاسوس تھیں ادی۔“

”اوہ۔“ نائلہ نے گرن گھما کر بھاگی کی طرف دیکھا جو بکریوں کا دودھ دہ رہی تھی۔ ”لیکن فاطمہ۔ ہم پاکستانی ہیں، محب وطن ہیں۔ ہم تو پاکستان کی سلامتی کے لئے اپنی جانوں کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔“

”تو پھر وہ ڈاکوؤں والی کہانی جھوٹی ہے نا؟“ فاطمہ نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

نائلہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ دل ہی دل میں فاطمہ کی ذہانت کی داد دینے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ روماتی عورتوں کو عام طور پر جاہل اور احمق سمجھا جاتا ہے لیکن ان میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اس طرح دبا کر رکھا جاتا ہے کہ ذہانت کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ ان سادہ لوح عورتوں کو اپنی زمین سے بھی بڑی محبت تھی۔ اپنے وطن کی محبت کا بڑا جذبہ تھا ان میں۔ فاطمہ اور بھاگی کو یہ فکر ہو گئی تھی کہ یہ تینوں کہیں ہندوستانی جاسوس تو نہیں؟ نائلہ کے خیال میں فاطمہ پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔

”تمہارا خیال درست ہے فاطمہ۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کون ہو تم لوگ؟“ فاطمہ نے اسے گھورا۔

”ہم پاکستانی ہیں۔“ فاطمہ نے جواب دیا۔ ”یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن مختصراً“ اتنا بتا سکتی ہوں کہ ہمیں اغواء کر کے دھوکے سے راجستھان پہنچا دیا گیا تھا یہاں ہندوستانیوں نے ہمیں دہشت گردی اور تحریک کوری کی تربیت دی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم پاکستان واپس جا کر رہیں گی۔ بمبوں کے دھماکے کریں گی اور بے گناہ اور معصوم لوگوں پر گولیاں برسائیں گی۔ لیکن ہم اس ٹیکہ کو تباہ کر کے وہاں سے بھاگ نکلیں۔ ہمیں پورے

ہندوستان میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اسمگلروں کی ایک پارٹی کے ساتھ کووالا کی طرف سے سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو گئیں لیکن سرحد کے اس طرف رنجیز کے جوانوں نے ہمیں گھیر لیا۔ دوسرے اسمگلروں کا تو پتہ نہیں کیا حشر ہوا ہو گا لیکن ہم انہیں دھوکا دے کر بھاگ نکلیں۔ یہ رانقل بھی ہم نے رنجیز کے ایک آدمی سے چھینی تھی۔ ہمارے پاس ہندوستانیوں کے کچھ راز ہیں جنہیں ہم جلد سے جلد حکومت تک پہنچانا چاہتی ہیں۔ ہم اس لئے رنجیز کو دھوکا دے کر بھاگ گئیں تاکہ جلد سے جلد کراچی پہنچ سکیں۔ ہم اس جنگل میں بھگ رہی تھیں کہ اتفاق سے تمہارے گھروالا مل گیا۔

”فکر مت کرو ادی۔“ فاطمہ نے کہا۔ ”رئیس کریم بخش بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ تم لوگوں کو شہر پہنچا دے گا۔ لیکن اس کے بیٹے شاہنواز سے ہوشیار رہنا۔ وہ بڑا کینہ آدمی ہے۔ سنا ہے کہ جب رئیس کریم بخش گوٹھ میں نہیں ہوتا تو شاہنواز عورتوں کو حویلی میں لے آتا ہے۔ بڑا عیاش آدمی ہے۔ گوٹھوں سے عورتوں کو بھی اٹھاتا ہے۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ ہم ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتی ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”اگر رئیس کریم بخش نہ ملتا تو تم لوگ بدین چلی جانا۔ میں دین محمد سے کہوں گی کہ وہ تم لوگوں کو ڈیپلو سے بس پر بٹھا دے گا۔ بدین میں میرے بابا سے ملتا۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔“ فاطمہ نے کہا اور اسے بدین میں اپنے باپ کے گھر کا پتہ سمجھانے لگی۔ ”گھر کا پتہ نہ چلے تو سیٹھ سندر داس کی دوکان تلاش کر لیتا۔ بازار میں بہت بڑی دوکان ہے اس کی.....“

فاطمہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن بھاگی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ بھاگی نے دودھ والا برتن اس کے پاس رکھ دیا۔

”یہ دیمکڑی چولے پر چڑھا دینا فاطمہ۔ میں جی تو جلاؤں۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔“ بھاگی نے کہا پھر جھوپڑے کی طرف بڑھتے ہوئے رک گئی اور نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ان چھو کریوں کو جگا دو۔ شام کے وقت اس طرح سونا اچھا نہیں ہوتا۔“

نائلہ اٹھ کر سسی اور سلطانہ کو جگانے لگی۔ سلطانہ کو جگاتے ہوئے پتہ چلا کہ اسے بخار ہو رہا تھا۔ یہ بخار ٹانگ کے زخم اور ٹھکن کی وجہ سے ہو گیا تھا۔

فاطمہ دال پکا چکی تھی اور اب روٹیاں پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بھاگی نے لائینن جلا کر جھوپڑے کے سامنے ایک کھڑی پر ٹانگ دی تھی۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ سب بیٹھی روٹی کھا رہی تھیں۔

آٹھ بجے کے لگ بھگ بہت دور کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ راستہ کے بچ و خم اور درختوں کی وجہ سے روشنیاں بار بار زاویہ بدل رہی تھیں۔

”فاطمہ!“ نائلہ نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”ہم تینوں ان درختوں کی طرف جا رہی ہیں تاکہ اگر یہ ہمارے دشمن ہوئے تو تم لوگوں کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔“ اس نے رانقل اٹھالی اور سلطانہ اور سسی کو اشارہ کیا۔

”میرا خیال ہے یہ رئیس کریم بخش کی گاڑی ہوگی۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔

”ہو سکتا ہے یہ وڈیرے ہی کی گاڑی ہو لیکن احتیاط ضروری ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی تقریباً ”پچاس گز دور درختوں کے ایک جھنڈ میں گھس گئیں۔ نائلہ رانقل سنبھال کر ایک درخت کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی آڑے ترچھے اور ناہموار راستے



پر اچھلتی ہوئی جھوپڑوں کے سامنے آکر رک گئی۔ نائلہ گہری نظروں سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ چند ہی سیکنڈ بعد ایک آدمی گاڑی سے اتر کر ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آگیا۔  
وہ دین محمد تھا۔

”آؤ..... میرا خیال ہے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ تینوں درختوں کے جھنڈے سے نکل کر جھوپڑوں کی طرف چلے گئیں۔ دین محمد کے ساتھ اب ایک آدمی بھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے سر پر گچڑی باندھ رکھی تھی اور کندھوں پر اجرک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید فاطمہ اور بھائی نے انہیں بتادیا تھا کہ وہ لوگ اس طرف کو گئی ہیں۔

دو تین منٹ بعد وہ تینوں جھوپڑوں کے سامنے پہنچ گئیں۔ نائلہ نے غور سے اس آدمی کو دیکھا۔ وہ درمیانے قد کا نسبتاً بھاری بھرکم آدمی تھا۔ سمجھے دار مونچھیں اس کے چہرے پر بڑی خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔ اجرک کے نیچے کندھے پر اس نے آٹومیک رائفل لٹکا رکھی تھی۔ وہ بڑی گہری نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نائلہ نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ لینڈ روور تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بھی گچڑی باندھ رکھی تھی اور مونچھوں کے ساتھ داڑھی بھی تھی۔ داڑھی اور مونچھیں آپس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ مونچھیں کہاں ختم ہوتی ہیں اور داڑھی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

”یہ رئیس کریم بخش کا کادار ہے۔“ دین محمد نے گویا نائلہ وغیرہ سے اس کا تعارف کرایا۔ ”تم لوگ اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ رئیس کریم بخش تم لوگوں کی مدد کرے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”تم لوگوں کی میزبانی اور مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔“

وہ تینوں لینڈ روور کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور کادار ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کادار نے دین محمد کو خدا حافظ کہا اور لینڈ روور حرکت میں آگئی۔

پبلوان گوٹھ کا فاصلہ آٹھ نو میل سے زیادہ نہیں تھا مگر پہنچ اور ناہموار راستے کی وجہ سے لینڈ روور کی رفتار بہت سست تھی اور وہ تقریباً ”بیس منٹ بعد جنگل سے نکل کر گوٹھ تک پہنچ سکے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ لینڈ روور میں رات کے وقت جنگل میں یہ مختصر مسافر کرتے ہوئے انہیں کچھ عجیب سا لگا تھا۔ نائلہ نے تو پہلے ہی سندھ کے بعض علاقے دیکھے تھے۔ عام لوگ تو غربت اور افلاس کے مارے ہوئے تھے۔ انہیں نہ تو ذہنگ کے کپڑے پہننے کو ملتے تھے اور نہ پیٹ بھر کھانا۔ وہ زندگی نہیں گزار رہے تھے بلکہ زندگی انہیں گزار دیتی تھی۔ اس کے برعکس وہ ڈیرے ٹھاٹھ بانٹھ کی زندگی گزارتے تھے۔

وہ گوٹھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چند کچے مکان تھے اور چند جھوپڑے۔ ان سے ذرا ہٹ کر رئیس کریم بخش کی حویلی تھی۔ اس حویلی سے تقریباً ”دو فرلانگ آگے وہ سڑک تھی جو ایک طرف اسلام کوٹ اور دوسری طرف ڈیپلو کی طرف چلی گئی تھی۔ ڈیپلو ایک بڑا قصبہ تھا جو وہاں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہیں سے بدین اور سجاول کی طرف سڑک جاتی تھی۔

لینڈ روور حویلی کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ اس کے ایک منٹ بعد گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والے کے چہرے پر خوفناک سمجھے دار مونچھیں تھیں اور کندھے پر آٹومیک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ گیٹ کے دوسری طرف وسیع و عریض لان تھا جس کے چاروں طرف پختہ روش تھی۔ رہائشی عمارت اسی لان کے دوسرے طرف تھی۔ خوبصورت پورچ بنا ہوا تھا۔ گاڑی پورچ میں رک گئی۔

کامدار نے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ تینوں گاڑی سے اتر آئیں۔ نیچے قدم رکھتے ہی نالہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ حویلی کی فضا اسے بڑی پر اسرار سی لگ رہی تھی۔ وہ برآمدے میں کھڑی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ لان میں کئی جگہوں پر فینسی لپ پوسٹ لگے ہوئے تھے جن پر سفید گلوب والے بلب جل رہے تھے۔ لان میں ادھر ادھر چند کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

سسی اور سلطانہ بھی اس کے قریب کھڑی متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ سسی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اسی لمحہ برآمدے والے دروازے سے ایک ادھیڑ عمر عورت ان کے قریب آ گئی۔ اس کی عمر ڈھل رہی تھی لیکن جسم کی ساخت اور چہرے کے نقوش بیدار دلکش تھے۔ وہ جوانی میں یقیناً ”بہت حسین رہی ہوگی۔“

”رئیس کہاں بیٹھا ہے مائی سکھن؟“ کامدار نے اس عورت سے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں بیٹھا ہے۔ یہ چھو کریاں کون ہیں؟“ مائی سکھن نے کہتے ہوئے جھپتی ہوئی نظروں سے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔

”رئیس کی مہمان ہیں۔ تم ان کے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست کرو۔ میں انہیں رئیس کے پاس لے کر جاتا ہوں۔“ کامدار نے کہا اور ان تینوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

وہ تینوں اس کے ساتھ دروازے میں داخل ہو گئیں۔ یہ ایک کشادہ راہداری تھی فرش پر میالے سے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ کامدار اس راہداری کے آخر میں ہال نما کمرے میں پہنچ کر رکا۔ اس ہال میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ قیمتی ماڈرن صوفوں کے ساتھ سندھ کا خاص لکڑی کا رنگین فرنیچر بھی آراستہ تھا۔ دیواروں پر ہرن، بارہ سنگھا اور ایسے ہی جانوروں کے سر سجے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی دو قدیم بندوقیں بھی آراستہ تھیں۔ اس کمرے کے سازو سامان سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سندھ کے وڈیرے کس ٹھانڈی زندگی گزار رہے تھے۔ اس حویلی کے دامن میں وہ جھوپڑے بھی تھے جہاں زندگی سک رہی تھی۔ کامدار نے انہیں دہن رککنے کا اشارہ کیا اور ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے وہ دستک دینا نہیں بھولا تھا۔ اس کی واپسی میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

”آؤ..... رئیس تم لوگوں کو بلا رہا ہے۔“ کامدار نے ان تینوں کو اشارہ کیا۔

وہ تینوں کامدار کے پیچھے اس دروازے میں داخل ہو گئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی نالہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ خوبصورت دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ یہاں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ قالین کے ایک حصہ پر سفید چاندنی پتھر کی ہوئی تھی اور سرخ غلاف والے خوبصورت گاؤں تکتے رکھے ہوئے تھے، کمرے میں تین چار بلب روشن تھے لیکن ان پر لگے ہوئے شیڈز کی وجہ سے روشنی بہت مدہم تھی۔

ایک گاؤں تکتے سے ٹیک لگائے ایک جوان اور خوبو آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ٹوٹھ برش ٹائپ کی مونچھیں اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ لیکن وہ خود بھلا آدمی نہیں تھا۔ اس کے سامنے شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نیم عریاں لباس میں ایک خوبصورت عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی جس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا جو وہ اس آدمی کے ہونٹوں سے لگا رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر سسی اور سلطانہ بھی ٹھنک گئی تھیں۔ نالہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ دین محمد نے کہا تھا کہ وہ انہیں رئیس کریم بخش کے پاس بھیج رہا ہے اور بقول ان کے رئیس کریم بخش بہت شریف اور نیک آدمی تھا۔ نیک اور شریف آدمی اسی طرح نیم عریاں عورتوں کو اپنے پہلو میں

لے کر نہیں بیٹھتے اور نہ ہی شراب پیتے ہیں۔ دین محمد کی بیوی فاطمہ نے اسے خبردار کیا تھا کہ وہ رئیس کریم بخش کے عیاش بیٹے شاہنواز سے ہوسیار رہے اور یہ آدمی یقیناً ”شاہنواز تھا۔ کیا دین محمد نے ان کے ساتھ دھوکا کیا تھا یا دین محمد خود دھوکے کا شکار ہو گیا تھا۔

نیم عراں لباس میں وہ عورت انہیں دیکھ کر قدرے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ رئیس شاہنواز انہیں دیکھ کر اٹھ گیا۔

”میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ لگتا ہے میرے اوطاق میں پریاں اتر آئی ہیں۔ آؤ، آگے آؤ..... تم لوگ وہاں کیوں رک گئی ہو۔“ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہم شاید غلط جگہ پر آگئی ہیں۔ ہمیں تو رئیس کریم بخش سے ملنا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”بابا سائیں تو کراچی میں ہیں۔ میں جو یہاں موجود ہوں۔ مجھے بتاؤ۔ کیا معاملہ ہے۔ تم لوگ کون ہو؟ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“ شاہنواز بولا۔

”لیکن دین محمد نے تو بتایا تھا کہ رئیس کریم بخش.....“

”اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ شاہنواز نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں نے اسے کہا تھا کہ بابا سائیں ڈیلو گئے ہوئے ہیں تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ مگر تم لوگ آگے آؤ نا۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“

”نہیں۔ ہم واپس جا رہی ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”دیکھو بی بی۔“ شاہنواز اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولا۔ ”سمان آتا اپنی مرضی ہے اور جاتا گھر والوں کی مرضی سے ہے۔ اور ویسے بھی تم میں سے کوئی زخمی ہے۔ دین محمد نے بتایا تھا کہ گولی لگی ہے۔“

”ہاں..... میری اس ساتھی کی ٹانگ پر گولی لگی ہے۔“ نائلہ نے سلطانہ کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹھو نا بی بی..... میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ ڈیلو میں ایک ڈاکٹر ہے۔ وہ اسے دیکھ لے گا اور دیکھو..... عورتوں کے ہاتھوں میں یہ چیزیں اچھی نہیں لگتیں۔ یہ کاہدار کو دیدو۔ جب یہاں سے جاؤ گی تو یہ لیتی جانا پ۔ کاہدار۔“ وہ کاہدار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جی سائیں۔“ کاہدار فوراً ہی دو قدم آگے آگیا۔

”اس بی بی سے یہ گن لے لو اور ڈیلو جا کر ڈاکٹر کو لے آؤ۔“ شاہنواز نے کہا اور مائی سکھن کو کہتے ہوئے جاؤ کہ ان کے کھانے اور آرام کا بندوبست کرے۔“

”مجھ کو ذرا سائیں۔“ کاہدار کہتے ہوئے نائلہ کی طرف مڑ گیا اور اس نے ہاتھ نائلہ کی طرف بڑھا دیا۔

نائلہ کے چہرے پر الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ایک لمحہ تامل کیا اور پھر کندھے سے ران نقل اتار کر کاہدار کی طرف بڑھادی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ تینوں سمجھ چکی تھیں کہ وہ پھنس چکی ہیں اور اب یہاں سے نکلنے کے لئے حکمت عملی کی ضرورت ہو گی۔

”تم اسے کمرے میں جاؤ۔“ رئیس شاہنواز نے چاندنی پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور یہ سب کچھ لے جاؤ۔ مجھے ان سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

وہ عورت شراب کی بوتل اور گلاس اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ جاتے ہوئے اس نے بڑی ناگوار سی نگاہوں سے ان تینوں کی طرف دیکھا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔“ رئیس شاہنواز نے اشارہ کیا۔ وہ تینوں آگے آکر بیٹھ گئیں۔ ”ہاں اب بتاؤ کیا قصہ ہے۔“ لیکن وہ کمائی مت سنانا جو دین محمد سنا کر گیا ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”کیا ہم نے دین محمد سے جھوٹ بولا تھا؟“

”دین محمد سیدھا سادہ آدمی ہے۔ اس نے تمہاری بات کا یقین کر لیا تھا لیکن میں اس کی طرح بیوقوف نہیں ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رنجیز اور پولیس پورے علاقے میں ان تین لڑکیوں کو تلاش کر رہی ہے جو اسمگلروں کی ایک پارٹی کے ساتھ سرحد پار کر کے آئیں تھیں اور ایک جوان کو برغمال بنا کر بھاگ نکلی تھیں۔ رنجیز کے اس جوان کو تو انہوں نے راستے میں چھوڑ دیا لیکن وہ خود جب اور ایک سرکاری رائل نقل لے کر فرار ہو گئیں۔“

نائلہ کو سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے سسی اور سلطانہ کی طرف دیکھا، ان دونوں کے چہرے بھی دھواں ہو رہے تھے۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بری طرح پھنس گئی تھیں۔

”یہ..... یہ جھوٹ ہے۔ ہم وہ نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”تو پھر سچ کیا ہے؟ وہی بتا دو۔“ شاہنواز نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔

نائلہ خاموش رہی۔ وہ سسی اور سلطانہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سچ وہی ہے جو میں نے کہا ہے۔“ شاہنواز نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں رہتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے سرحد پر کیا ہوتا رہتا ہے۔ اسمگلنگ کا دھندہ تو برسوں سے ہو رہا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ سے ہندوستان کے تربیت یافتہ دہشت گرد بھی اس طرف آرہے ہیں۔ انڈیا نے تو اب تم جیسی خوبصورت لڑکیوں کو بھی اس طرف بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ تم جیسی حسین لڑکیاں مردوں سے زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔ تم جیسی حسین لڑکیاں کسی مرد کو اپنے جال میں پھانسا چاہیں تو وہ کیسے بچ سکتا ہے۔“

”یہ سب کچھ غلط ہے رئیس شاہنواز۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہمارا انڈیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم پاکستانی ہیں اور یہ.....“ اس نے سسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تھر میں ساندک کے قریب ایک گوتھ کی رہنے والی ہے۔ ہمارا تعلق کراچی سے ہے۔ ہمارا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ذرا نہیں۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”میں تم لوگوں کو پولیس یا رنجیز کے حوالے نہیں کروں گا۔ تم جیسی لڑکیوں کی جگہ جیل نہیں یہ حویلی ہے۔ میرے پاس اور بھی بہت سے لوگ آتے رہتے ہیں ان سب کی مدد کرتا ہوں اور تم لوگوں کی بھی مدد کروں گا۔ جہاں جانا چاہو گی میں تمہیں بحفاظت پہنچا دوں گا۔“

”ہم پاکستانی ہیں اور ہمارا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”رنجیز کے جوان سے چھینی ہوئی یہ رائل نقل بتا دے گی کہ تم لوگ کون ہو۔“ رئیس شاہنواز نے کہا۔

”اور وہ جیپ! اس کا بھی پتہ چل جائے گا۔ اسی جنگل میں کہیں چھپائی ہو گی نا۔ تلاش کر لیں گے اس جیپ کو بھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ بات قانون کے محافظوں تک پہنچ جائے، میرے ساتھ سمجھوتہ کر لو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ چند روز میری ممان بن کر رہو۔ پھر جہاں کو گو گی تم لوگوں کو پہنچا دیا جائے گا۔“

نائلہ پھر خاموش ہو گئی۔ اس کے پاس شاہنواز کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ رائل نقل اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اسمگلروں کی پارٹی کے ساتھ سرحد پار کر کے آئی تھیں اور رنجیز کے جوان سے وہ رائل نقل اور جیپ چھین کر فرار ہوئی تھیں۔

معاملہ بچہ گھمبیر ہو گیا تھا۔ وہ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے پاس رانا نکل کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ یہ تینوں وہی لڑکیاں تھیں جو سرحد پار کر کے آئی تھیں اور ریجنرز اور پولیس انہیں تلاش کر رہی تھی۔ رئیس شاہنواز انہیں بلک میل کر رہا تھا۔

”مائی سکھن۔“ شاہنواز نے دروازے کی طرف رخ کر کے آواز دی۔

چند سیکنڈ بعد ہی مائی سکھن کمرے میں داخل ہوئی۔

”جی سائیں۔“ وہ دروازے کے قریب ہی رک کر بولی۔

”ان تینوں کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ اور الماری سے کپڑے نکال کر دو۔ ان کے یہ کپڑے تو بہت گندے ہو رہے ہیں۔“ شاہنواز نے کہا۔

”سائیں۔ وہ چھوٹی بی بی کے کپڑے.....“

”میں نے جو کہا ہے وہ کرو۔“ شاہنواز نے غراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”جی سائیں۔“ مائی سکھن نے سر جھکا دیا اور پھر ان تینوں کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ عورت جو ان کے آنے سے پہلے شاہنواز کو شراب پلا رہی تھی بیرونی ہال میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ انہیں مائی سکھن کے ساتھ جاتے دیکھ کر اٹھ کر شاہنواز لے کمرے میں چلی گئی۔

مائی سکھن ان تینوں کو ایک بیڈ روم میں لے آئی۔ یہاں بھی فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور ایک کنگ سائز ڈبل بیڈ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی شوروم سے لا کر رکھا گیا ہو۔ دائیں طرف سفید فارمیکا کی بڑی الماری ایستادہ تھی۔ اس کے قریب ہی اسی ڈیزائن کا خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل بھی تھا۔ اس حویلی کے کمروں کو دیکھ کر سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کسی ایسے علاقے میں ہیں جہاں جدید تہذیب کا گزر بھی نہیں۔

عجیب رنگ تھے اس دنیا کے۔ غریب باریوں کا خون چوسنے والے وڈیرے شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور جن کے سر پر یہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے وہ گھاس پھوس کے جھوپڑوں میں پڑے تھے اور نالہ کو یقین تھا کہ ان میں سے بیشتر نے رات کو سونے سے پہلے پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ وہ خود بھی زمیندار تھی۔ کمڑوں کی مالک تھی۔ لیکن ایسے ٹھٹھا باٹھ کا قصور تو بھی اس نے بھی نہیں کیا تھا۔

”اس الماری میں چھوٹی بی بی کے کپڑے ہیں۔ تم لوگوں کو جو پسند ہو نکال کر پہن لو۔ میں رئیس شاہنواز کا حکم تو نہیں ٹال سکتی۔“ مائی سکھن نے کہا۔

”یہ چھوٹی بی بی کون ہے؟“ نالہ نے پوچھا۔

”رئیس شاہنواز کی بہن ہے۔ بابا سائیں کے ساتھ کل ہی کراچی گئی ہے۔“ مائی سکھن نے جواب دیا پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئی ہو؟ رئیس شاہنواز تو بہت برا آدمی ہے۔“

”اگر رئیس شاہنواز نے تمہارے یہ الفاظ سن لئے تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ نالہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ مائی سکھن نے کہا۔ ”لیکن مجھے تم لوگوں کا خیال ہے۔ تم شریف گھروں کی چھو کر یاں لگتی ہو۔ یہاں کیوں آئی ہو؟“

”ہمیں دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔“ نالہ نے جواب دیا۔ مائی سکھن کی باتیں سن کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔ یہ عورت ان کے کام آسکتی تھی۔

”یہ غسل خانہ ہے۔ چاہو تو نہال۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ کھانا تیار ہو جائے گا تو بلانے کے لئے آجاؤں۔“ مائی سکھن کستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

نانکھ نے دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ چڑھا دیا اور مڑ کر سسی اور سلطانہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”پھنس گئے نالکھ بی بی۔“ سلطانہ نے کہا۔

”ہاں۔ پھنس تو گئے ہیں لیکن یہ عورت سکھن ہمارے کام آسکتی ہے۔“ نالکھ نے جواب دیا۔

”اس سے پہلے کہ مائی سکھن ہمارے کسی کام آئے یہ وڈیرہ ہمارا تیا پانچا کر چکا ہو گا۔“ سلطانہ نے کہا۔

”تم شاید ان بھارتی درندوں کا کیمپ بھول گئی ہو۔“ نالکھ نے کہا۔ ”ہم نے وہاں کسی کو اپنے ناپاک اودوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا“ یہ وڈیرہ ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔“

سسی نے الماری کھول لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے سسکاری نکل گئی تھی۔ بیٹنگوں پر تعداد زنہ سوٹ ٹنگے ہوئے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی جوڑا تھا۔ سسی کپڑے نکال نکال کر اپنے جسم سے لگا کر دیکھنے لگی۔

”میں تو یہ جوڑا پہنوں گی۔“ اس نے ایک جوڑا الگ کر لیا۔

نانکھ اور سلطانہ نے بھی اپنے لئے ایک ایک جوڑا منتخب کر لیا۔ سلطانہ نے ہانہوں میں بھری ہوئی اسٹک کی چوڑیاں اتار کر پلنگ پر پھینک دیں اور ہاتھ روم میں ٹھس گئی۔ وہ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد نما کر اور اس بدل کر باہر نکلی۔“ نالکھ بھی اپنی ہانہوں سے چوڑیاں اتار کر پھینک چکی تھی۔ وہ اپنا منتخب کردہ جوڑا اٹھا

بر ہاتھ روم میں ٹھس گئی۔ ہاتھ روم میں گھستے ہی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بہت ہی شاندار ہاتھ روم تھا۔ دیواروں پر تین فٹ تک ٹائلیں لگی ہوئی تھیں اور اس سے اوپر چاروں طرف آئینے تھے۔ ایک

بصورت ہاتھ روم تھا، شاور بھی تھا، اس ہاتھ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ نالکھ کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ لوگ کس قدر عیاشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

نالکھ کو چاروں طرف آئینوں میں اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس نے نما کر لباس بدلا اور ہاتھ روم سے نکل آئی۔ وہ تولیے سے اپنے بال رگڑ رہی تھی کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ نالکھ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

مائی سکھن تھی۔

”ڈیپلو سے ڈاکٹر آگیا ہے۔ تم میں بیمار کون ہے؟“ مائی سکھن نے کہا۔

”چلو سلطانہ۔“ نالکھ نے کہا۔

وہ دونوں مائی سکھن کے ساتھ اس ہال میں آگئیں جہاں صوفے سجے ہوئے تھے۔ وہاں کا مدار کے ساتھ ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ چھینچر سا وہ آدمی لباس اور چہرے سے کسی طرح بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔

لیکن نالکھ جانتی تھی کہ گاؤں دیہاتوں میں اسی قسم کے ڈاکٹر ہوتے تھے۔ شہر میں کسی ڈاکٹر کے پاس سال دو سال کیا وڈر رہنے کے بعد یہ لوگ دیہی علاقوں میں آکر ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔ اور اپنے ناموں کے ساتھ اپنی

ہند کی ڈگریاں لگالیتے تھے۔

”پتی کس کو کرانی ہے۔ ادھر میرے سامنے بیٹھو۔“ ڈاکٹر نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔

سلطانہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے زخمی ٹانگ پر سے شلوار کا پانچہ اوپر کھینچ لیا۔ اس کی گوری گوری سڈول پنڈلی دیکھ کر سامنے بیٹھے ہوئے کا مدار کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ نالکھ بھی سلطانہ کے

قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ رئیس شاہنواز کی بہن کے کپڑے سلطانہ کے جسم پر کسی قدر ڈھیلے تھے اور نالکہ کے جسم پر ٹائٹ۔ کادار کن انکھیوں سے کبھی سلطانہ کی طرف دیکھتا اور کبھی نالکہ کی طرف دیکھنے لگتا۔ نالکہ اس کی نظروں سے واقف تھی لیکن وہ ذرا سی بھی جھجھک محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں جو منصوبہ گھلایا رہا تھا اس کے لئے تھوڑی بہت بے حیائی کا مظاہرہ ضروری تھا۔

ڈاکٹر نے سلطانہ کی ٹانگ پر بندھی ہوئی گیلی پٹی اتار دی۔ کچھ دیر تک زخم کا معائنہ کرتا رہا پھر زخم صاف کر کے دوا لگانے کے بعد دوسری پٹی باندھنے لگا۔

”ایک دو دن بھاگ دوڑ نہیں کرنا چھوڑی ورنہ زخم بگڑ جائے گا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”اوئے ڈاکٹر۔“ کادار نے اسی گھورا۔ ”ادب سے بات کر۔ یہ رئیس شاہنواز کی مہمان ہیں۔ رئیس کو پتہ چل گیا کہ تم ان کے مہمانوں سے اس طرح بات کرتے ہو تو وہ تمہاری زبان کھینچ لے گا۔“ غلطی ہو گئی کادار۔ ڈاکٹر نے سسے ہوئے لمبے میں کہا۔

”اور سن۔“ کادار اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”ڈیپلو میں کسی کو پتہ نہیں لگے کہ رئیس کی حویلی میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔“

”کسی کو پتہ نہیں لگے گا کادار۔“ ڈاکٹر کہتے ہوئے اپنی چیزیں تھیلے میں سینٹے لگا۔

”چل اٹھ..... منجھو تمہیں واپس چھوڑ آئے گا۔“ کادار نے اٹختے ہوئے کہا۔

”میرا خیال رکھنا کادار۔ کئی مریضوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔“ ڈاکٹر بولا۔

”ہاں ہاں۔ تمہارا خیال رکھوں گا۔ صبح رئیس کو بتا دوں گا کہ تو آیا تھا۔ چل میں منجھو کو کہہ دیتا ہوں۔ وہ تمہیں شہر چھوڑ آئے گا۔“

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ نالکہ اور سلطانہ دوبارہ اسی کمرے میں آگئیں۔ سسی نے بھی اس دوران نما کر کپڑے بدل لئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد مائی سکھن نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔ اس وقت ساڑھے دس بج چکے تھے۔ انہوں نے اگرچہ شام کو کھانا کھالیا تھا لیکن اس وقت واقعی بھوک محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ سکھن کے ساتھ کھانے کے کمرے میں آگئی۔ مائی سکھن نے کھانا اگرچہ غلت میں بنایا تھا لیکن بچہ مزیدار تھا۔ کھانے کے بعد وہ پھر اسی بیڈ روم میں آگئیں۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تینوں رات اسی کمرے میں گزاریں گی..... کمرے میں آکر وہ پینگ پر آڑی ترچھی لیٹ گئیں اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں۔

”اس بد معاش کے چنگل سے کیسے نکلا جائے۔ یہاں سے تو فرار کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔“ سلطانہ نے نالکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مائی سکھن سے بات کرنی پڑے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گی۔“ نالکہ نے کہا۔

”لیکن اگر اس نے انکار کر دیا تو؟“ سلطانہ بولی۔

”اسکے ساتھ ہی میں کادار کو بھی آزمانا ہا جاتی ہوں۔ اس کی نظروں سے میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ اگر اسے ذرا سالالچ دیا جائے تو وہ ہمارے کام آسکتا ہے۔“

”لیکن شاید تم یہ بات بھول رہی ہو کہ ان وڈیروں کے نوکر اپنی جانیں تو دیدیتے ہیں مگر ان سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”کیا تمہیں اپنے آپ پر یقین نہیں۔“ نالکہ نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”عورت کے پاس وہ

ملاقات ہے جس نے بڑے بڑوں کے سر جھکا دیئے ہیں۔ دنیا میں فساد کی تین بنیادی قوتیں ہیں۔ زن، زر اور زمین۔ زر اور زمین کا تو یہاں سوال نہیں ہے اور زن ایک نہیں تین تین ہیں۔ ہم چاہیں تو اس کا مدار کو اپنے پیروں کے تلوے چاٹنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”میں چٹاؤں گی اسے اپنے پیروں کے تلوے۔ لیکن..... آج کی رات..... اگر وڈیرہ ہمارے کمرے میں گھس آیا تو.....؟“

”نٹ لیس گی اس سے.....“ نائلہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ باہر قدموں کی آواز سن کر خاموش ہو گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد مائی سکھن کمرے میں داخل ہوئی۔

”تم تینوں اسی کمرے میں سو جانا اور دروازہ اندر سے بند کر لینا۔“ مائی سکھن نے کہا۔ ”کیا تمہیں واقعی ہم سے ہمدردی ہے مائی سکھن؟“ نائلہ نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”مجھے یقین ہے تم تینوں کا تعلق شریف گھروں سے ہے۔ اس کے جال میں کیسے پھنس گئیں؟ یہ مجھے پتہ نہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں عورت کی عزت کیا ہوتی ہے۔“

”کیا تم یہاں سے نکلنے میں ہماری مدد کر سکتی ہو؟“ سلطانہ نے کہا۔ ”یہاں سے رئیس کی اجازت کے بغیر نکلنا آسان نہیں ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو برباد ہوتے ہوئے بھی دیکھنا چاہتی۔ کوشش کروں گی کہ کل تم لوگوں کو یہاں سے نکال دوں۔“

”اگر آج رات کچھ ہو گیا تو؟“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ اس عورت کو پیسے دے کر لایا ہے۔ آج رات وہ اس سے اپنے پیسے پورے کرے گا۔ لیکن پھر بھی تم لوگ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر رکھنا۔“ مائی سکھن نے کہا۔

”کیا یہ اپنے گھر والوں کی موجودگی میں بھی یہ سب کچھ کرتا ہے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔ ”جب بابا سائیں یہاں ہوتے ہیں تو یہ حویلی میں قدم نہیں رکھتا۔ جب بابا سائیں کراچی یا کسی اور پلے جاتے ہیں تو اس کو موقع مل جاتا ہے۔“

”کیا کا مدار ہمارے کام آسکتا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”اس کے سامنے زبان بھی مت کھولنا۔ بڑا حرامی ہے۔ رئیس شاہنواز کو بگاڑنے والا بھی وہی ہے۔ یہ اس کے لئے عورتیں لاتا ہے۔ اگر اس کے کان میں بھنگ بھی پڑ گئی تو تم لوگ کبھی یہاں سے نہیں نکل سکو گی۔“ مائی سکھن نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگی۔ ”میں صبح بات کروں گی تم لوگوں سے“

”مائی سکھن نے کہا۔“ تم لوگ بھی سو جاؤ اور دروازے کو اندر سے کنڈا لگا لینا۔“

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا اور مائی سکھن کے جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔

”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“ سلطانہ نے کہا۔

”تمہارے خیال میں اس حویلی میں کتنے آدمی ہوں گے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”تین کو تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ کا مدار، ڈرائیور اور تیسرا وہ جس نے ٹیٹ کھولا تھا۔ ان کے علاوہ ایک آدمی اور بھی ضرور ہوں گے۔ ان وڈیروں کو گن مین رکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے اور یہ گن مین بھی عام وڈیرہ یا ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔ ان کی شکلیں نہیں دیکھیں تم نے..... خوف آتا ہے ان کی صورتوں سے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”صبح مائی سکھن سے پوچھ لیں گے کہ حویلی میں کتنے آدمی ہیں۔ اس کے مطابق ہی کوئی منصوبہ بنائیں



بس دعا کرو آج کی رات خیریت سے گزر جائے۔“ نائلہ نے کہا اور سسی کی طرف دیکھنے لگی۔ ”جہیں نیند نہیں آرہی سسی؟“

”ہندوؤں کے کیمپ میں تھے تو رات کو بے فکر ہو کر آرام سے سو جاتے تھے۔ اب اپنوں میں آئے ہیں تو ڈر لگ رہا ہے۔“ سسی نے جواب دیا۔

”ٹھیک کہتی ہو۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال‘ سونے کی کوشش کرو۔ دروازہ بند ہے۔ کوئی دروازہ توڑ کر تو اندر نہیں آجائے گا۔“

سسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطانہ بھی خاموش رہی۔

انہوں نے کمرے کی جتی جلتی رہنے دی تھی۔ وہ تینوں ایک پلنگ پر لیٹی تھیں۔ بظاہر وہ سونے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن نیند ان تینوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ تینوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھیں۔ سسی اپنے ماں باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ کس حال میں ہوں گے۔ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ اسے گورنمنٹ سے زبردستی اٹھا کر لے جایا گیا تھا لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ خاندان والے اسے قبول کریں گے یا نہیں؟ لڑکی ایک رات گھر سے باہر رہ جائے تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ وہ تو عرصہ سے گھر سے غائب تھی۔ کون اس کی پاک دامنی پر یقین کرے گا؟

سلطانہ بھی اپنے ماں باپ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اس نے بہر حال یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اپنے ماں باپ کے پاس نہیں جائے گی۔ اس کے پاس رہا ہی کیا تھا۔ عزت لٹ چکی تھی۔ وہ گناہوں کی پوٹ بن کر ماں باپ کے دروازے پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ ماں باپ اسے بھول چکے ہوں گے۔ وہ ان کے زخموں کو تازہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو انتقام لینا چاہتی تھی۔ ان لوگوں سے جو اس کی بربادی کے ذمے دار تھے۔

نائلہ پہلو کے بل لیٹی اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ کئی چہرے اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ اس کی پھوپھی حسینہ بیگم، شبیر دانی، یہی دونوں اس کی بربادی کے ذمے دار تھے۔ اگر رائے منصور ڈھال بن کر اس کے سامنے کھڑا نہ ہو جاتا تو یہ ماں بیٹا اسے بہت عرصہ پہلے ختم کر چکے ہوتے اور پھر دلاور.....! دلاور کا خیال آتے ہی اس کی سینے میں گدگد سی ہونے لگی۔ وہ ایک لمحہ کو بھی دلاور کے خیال کو ذہن سے نہیں نکال سکی تھی جب دلاور اس کے قریب تھا تو اس وقت اس نے کبھی بھی سنجیدگی سے اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن فاصلے بڑھے تو دلاور کا خیال ہر وقت اس کے دل و دماغ پر مسلط رہنے لگا تھا۔ اسے وہ منظر یاد آگیا جب صادق آباد کے قریب ان کی گاڑی پر حملہ ہوا تھا۔ اس نے دلاور کو بھی زخمی ہو کر گرتے دیکھا تھا۔ دلاور کو اگرچہ کئی گولیاں لگی تھیں لیکن نائلہ کا دل کہتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور آج پھر دلاور کی یاد نے بڑی شدت سے اس کے سینے میں ہلچل مچادی تھی۔

جوبلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی اور اس خاموشی میں اسے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ نائلہ نے کروٹ بدل لی۔ اس کے ساتھ سسی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جاگ رہی تھی۔

”سوئی نہیں تم؟“ نائلہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

”نیند نہیں آرہی ادی۔“ سسی کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

نائلہ نے بھی اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ سلطانہ سوچتی تھی۔ رات کے آخری پہر یہ دونوں بھی

آغوش میں پہنچ گئیں۔

دوسرا دن کسی غیر معمولی واقعہ کے بغیر گزر گیا۔ وہ خود دیر سے اٹھی تھیں۔ رئیس شاہنواز دوپہر تک اُٹ رہا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد رئیس شاہنواز لینڈ روور پر بیٹھ کر حویلی سے باہر چلا گیا۔ کادار اور اے کی وہ عورت بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی حویلی میں تین گمن مین نمودار تھے۔ ایک گیٹ پر تھا اور دو کو ادھر ادھر ٹھلٹے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ مائی سکھن ایک بار پھر نالکہ وغیرہ پاس آگئی۔

”میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔“

”وہ کیا؟“ خیتوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

”میرے پاس ایسی دوا بڑی ہے جسے اگر دارو میں ملا کر پلا دیا جائے تو رئیس شاہنواز بے ہوش ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں تم لوگوں کو گاڑی پر لے کر یہاں سے نکل جاؤں گی۔“ مائی سکھن نے کہا۔

”تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی؟“ نالکہ کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

”ہاں۔ تم لوگوں کو یہاں سے بھگانے کے بعد میں حویلی میں رہی تو زندہ نہیں بچوں گی۔ یہ لوگ میری آنکھوں کو کھلا دیں گے۔ اس لئے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی حالانکہ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ مجھے ش کر لیں گے۔“ سکھن نے کہا۔

”لیکن..... تمہاری ترکیب مجھے قابل عمل نہیں لگتی۔“ نالکہ نے کہا۔ ”کیا کادار یا دوسرے گمن مین اس کیلئے گاڑی پر حویلی سے نکلے دیں گے؟ نہیں مائی سکھن۔ ہمیں کچھ اور سوچنا ہو گا۔ کادار کو ساتھ ملانا۔“

”پر وہ بہت حرامی آدمی ہے۔“ مائی سکھن بولی۔

”اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مجھے سوچنے دو.....“ نالکہ چند لمحوں خاموش رہی پھر چٹکی بجاتے ہوئے

”ایک ترکیب آگئی ذہن میں۔“ وہ چند لمحوں خاموش رہی پھر انہیں اپنا منصوبہ بتانے لگی۔

”ٹھیک ہے۔“ سلطان نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

”بس تو پھر اب اطمینان سے رات کا انتظار کیا جائے۔“ نالکہ نے کہا۔

رئیس شاہنواز مغرب سے تھوڑی دیر پہلے واپس آیا تھا۔ اس کے تھوڑی سی دیر بعد اس نے نالکہ کو اپنے بیڈ روم میں بلایا۔ یہ بیڈ روم بھی بہت وسیع اور عالیشان تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت آرام دہ بھی بڑی ہوئی تھی۔ شاہنواز ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”بیٹھو۔“ اس نے سیٹی کی طرف اشارہ کیا۔ نالکہ سیٹی پر بیٹھ گئی۔ ”میں تم لوگوں کے بارے میں بات حاصل کر رہا تھا۔ پولیس کو وہ جیپ جنگل سے مل گئی ہے۔ انہیں شبہ ہے کہ تم لوگ جنگل میں یا کب کی کسی بستی میں چھپی ہوئی ہو۔ میں نے دین محمد اور اس کے گھروالوں کو بدین بھیج دیا ہے تاکہ اگر اس تم لوگوں کی تلاش میں اس کے جھوپڑوں تک پہنچ جائے تو دین محمد یا اس کے گھروالے تم لوگوں کے لئے میں تانہ دیں۔ وہ بہت سیدھے سادے اور معصوم لوگ ہیں، یہی سمجھتے ہیں کہ تم لوگ ڈاکوؤں کے لئے سے نکل کر بھاگی ہو۔ ڈیپلو میں بھی تم لوگوں کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ میری یہ حویلی تم لوگوں کے لئے سب سے محفوظ جگہ ہے۔ یہاں سے نکل کر تم لوگ چار قدم بھی نہیں چل سکو گی کہ دھری جاؤ گی۔ اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ میری پناہ میں رہنا چاہتی ہو یا یہاں سے جانا چاہتی ہو۔ اگر جانا چاہو تو مجھے کوئی

اعتراف نہیں ہے۔“

”رئیس شاہنواز۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”یہ جو کچھ بھی ہوا ہے بہت بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم رنجیز کے جوان سے رانگل اور جیب چھین کر بھاگی تھیں لیکن ہم وہ نہیں ہیں جو ہمیں سمجھا جا رہا ہے۔ ہم پاکستانی ہیں، ہندوستان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن بعض وجوہات کی بناء پر ہم پولیس سے چٹا چاہتی ہیں۔“

”تو بابا پھر یہاں رہو۔“ رئیس شاہنواز کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ ”یہاں تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کوئی اس حویلی میں جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔“ اس نے نائلہ کی دونوں ہانہیں پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

نائلہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ شاہنواز کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان نظروں میں ہوس کی چمک نمایاں تھی۔ وہ چند لمحوں کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں پھسلتی ہوئی نائلہ کے سینے پر مرکوز ہو گئیں۔ نائلہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہوس بھری نظریں کسی نشتر کی طرح اس کے سینے میں چبلی جا رہی ہوں۔ شاہنواز نے اس کا ایک بازو چھوڑ دیا اور انگلی سے اس کے سینے پر پتے کی شکل کے سرخ نشان کو چھونے لگا۔ نائلہ کو جھرجھری سی آگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دہکتا ہوا انگارہ اس کے سینے پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ شاہنواز کا گلا دوچ دے مگر اس طرح بات بگڑ سکتی تھی۔ انہوں نے ہمنصوبہ بنایا تھا اس کے لئے تھوڑی بہت بے حیائی برداشت کرنی تھی۔

”آؤ..... پلنگ پر آجاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ شاہنواز اسے بازو سے پکڑ کر پلنگ کی طرف لے جانے لگا۔

”ابھی نہیں۔“ نائلہ نے بڑی آہستگی سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ”اگر میں ایسی زیادہ دیر یہاں رکھ تو میری ساتھی لڑکیاں مجھ پر شبہ کرنے لگیں گی۔ میں ان کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی۔ رات کو ان کے سوجانے کے بعد....“

”اتنی دیر تک کون انتظار کرے گا۔“ شاہنواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”نہیں رئیس۔“ نائلہ نے ہلچلی لہجے میں کہا۔ ”میں کوئی بھاگی تو نہیں جا رہی۔ دو چار دن تمہاری پاس ہی رہوں گی۔ نکال لینا اپنے ارمان۔“

”ٹھیک ہے۔“ رئیس شاہنواز کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ”چند گھنٹے اور سی۔“ نائلہ اس کے کمرے سے نکل کر تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کمرے میں آگئی جہاں سلطانہ اور سسی موجود تھیں۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو رہی تھی۔ سلطانہ اور سسی اس کی حالت دیکھ کر چونک گئیں۔

”کیا ہوا؟“ اتنی بدحواس کیوں ہو؟“ سلطانہ نے پوچھا۔ ”وہ.... وہ بد معاش رئیس.....“ نائلہ ہکلائی۔ ”کیا..... کیا تم.....“

”نہیں۔“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس نے ہمارے بارے میں اور بھی بہت سی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ پولیس کو جنگل سے وہ جیب بھی مل گئی ہے۔“ ”اوہ۔“ سلطانہ چونک گئی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اگر پولیس دین محمد کے گھر تک پہنچ گئی تو وہ تاراج“

کہ ہم وڈیرے کی حویلی میں موند رہیں۔“  
 ”نہیں۔“ نائلہ نے کہا۔ وہ بڑی حد تک اپنی کیفیت پر قابو پا چکی تھی۔ ”یہ بد معاش وڈیرہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے دین محمد اور اسکے گھر والوں کو بدین بھیج دیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ پولیس ہمیں ڈیپلو میں بھی تلاش کر رہی ہے۔ لیکن اس حویلی کی طرف کوئی نہیں آسکتا۔ ہم یہاں محفوظ ہیں۔ وہ ہمیں بلیک میل کر رہا ہے۔ پناہ دینے کے بدلے جو معاوضہ.....“

”ہم رضا مند نہ بھی ہوں تو وہ بد معاش یہ معاوضہ زبردستی وصول کرے گا۔ اس وقت ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ہم زیادہ عرصہ تک مدافعت نہیں کر سکیں گی۔ اس لئے ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے آج ہی رات۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 ”ہاں۔ میں نے بھی یہی طے کر لیا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

سسی ان کی باتیں سن سن کر وحشت زدہ ہو رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوؤں کے کیمپ میں انہوں نے اپنے آپ کو بچائے رکھا تھا لیکن انہوں میں آنے کے بعد انہیں اپنی عزت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ بچاؤ کا وہی طریقہ تھا جو انہوں نے سوچ رکھا تھا۔  
 تھوڑی دیر بعد نائلہ مائی سکھن سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔

ساڑھے آٹھ بجے انہوں نے کھانا کھالیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو آدمی رئیس شاہنواز سے ملنے آ گئے۔ نائلہ پریشان سی ہو گئی۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ شاہنواز نے اپنے دوستوں کو دعوت دے کر نہ بلایا ہو۔ اگر ایسا تھا تو نہ صرف ان کے لئے اپنے منصوبے پر عمل کرنا مشکل ہو جائے گا بلکہ وہ اپنی عزت بھی نہیں بچا سکیں گی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد مائی سکھن نے شاہنواز کا پیغام دیا تو وہ مطمئن ہی ہو گئی۔  
 ”ڈیپلو سے دو آدمی رئیس سے ملنے آئے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ جب تک وہ آدمی حویلی میں موجود ہیں تم لوگ اپنے کمرے سے باہر مت آنا۔“

شاہنواز کے مسمان تقریباً ”دس بجے گئے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مائی سکھن نے نائلہ کو پیغام دیا کہ رئیس اسے بلا رہا ہے۔

”وہاں ٹرے میں گلاس رکھا ہے۔ میں نے گولیاں پیس کر گلاس میں ڈال دی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ چند گھنٹ بھرنے کے بعد ہی بے ہوش ہو جائے گا۔ اس کے بعد کا مدار کا بندوبست کر لیں گے۔“ مائی سکھن نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

نائلہ سر ملاتی ہوئی رئیس شاہنواز کے بیڈ روم میں آ گئی۔ شاہنواز بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔  
 ”دو دنوں با ہمیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔“

”پہلے میرے ہاتھ سے ایک گلاس۔“ نائلہ مسکراتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئی۔ اس نے ٹرے میں رکھا ہوا شیشے کا گلاس اٹھایا۔ اس کی تہ میں پانی کے چند قطرے تھے۔ اس نے شراب کی بوتل اٹھا کر شراب گلاس میں اڈیلی اور گلاس شاہنواز کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

شاہنواز نے کئی گھنٹ بھر کر گلاس نائلہ کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیا اور نائلہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پٹنگ پر کر گیا۔ نائلہ کراہت محسوس کر رہی تھی لیکن وہ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو شاہنواز کی گرفت سے چھڑایا اور گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک دو گھنٹ بھرنے کے بعد شاہنواز گلاس ہٹانا چاہتا تھا مگر نائلہ نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگائے رکھا۔ اس

مکملش میں کچھ شراب چھلک کر شاہنواز کے کپڑوں پر بھی گری تھی لیکن نائلہ نے گلاس اس وقت تک اس کے ہونٹوں سے نہیں ہٹایا جب تک شراب کا آخری قطرہ بھی اس کے حلق میں نہیں پہنچ گیا۔

نائلہ کی پریشانی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ مائی سکھن نے اس کے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا۔ وہ آخر اس وڈیرے کی نمک خوار تھی۔ ہو سکتا ہے وڈیرے ہی کے کہنے پر اس نے یہ ساری پلاننگ کی ہو تاکہ وہ ڈیرے کا کام آسان ہو جائے۔ لیکن نائلہ نے بھی فیصلہ کر لیا کہ چاہے اس کی جان چلی جائے وہ اس بد معاش وڈیرے کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

رئیس شاہنواز اسے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نائلہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہا لیکن اچانک اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ سر کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔

نائلہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ مائی سکھن کی نیت پر اس کا شبہ غلط نکلا تھا۔ شراب میں ملائی جانے والی نشہ آور دوائے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ شاہنواز کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے نائلہ کا بازو کندھے کے قریب سے پکڑا ہوا تھا اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کا ہاتھ نائلہ کے بازو پر پھسلتا ہوا نیچے گر گیا۔ نائلہ نے اپنے آپ کو الگ ہٹا کر اسے بستر پر دھکیل دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد رئیس شاہنواز بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

نائلہ پلنگ سے اتر گئی۔ وہ چند لمحے شاہنواز کی طرف دیکھتی رہی پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سلطانہ والے کمرے کی طرف چلے گئی۔ راستے میں مائی سکھن سے سامنا ہو گیا۔

”یہ..... یہ کیا...؟“ وہ نائلہ کی حالت دیکھ کر چونک گئی۔

”کچھ نہیں ہوا۔ نائلہ نے کہا۔“ کاہدار اگر اندر آجائے تو تم اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ شاہنواز کے کمرے میں نہ جانے پائے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

نائلہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سلطانہ والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے پٹھے ہوئے کپڑے دیکھ کر وہ دونوں بھی چونک گئیں۔

”کیا ہوا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔“ میں کپڑے بدل لوں۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے الماری کھول لی۔

”میں تیار ہوں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

نائلہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت باریک کپڑے کی نائی پنے ہوئے تھی۔ یہ نائی اس نے الماری ہی سے نکالی تھی۔ نائلہ نے الماری سے دیگر پرنگ ہوا ایک جوڑا نکال کر پلنگ پر پھینک دیا اور نائلہ اور سسی کی موجودگی میں وہیں کھڑے کھڑے اپنے کپڑے بدلنے لگی۔ سلطانہ اور سسی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ نائلہ نے کپڑے بدل کر جسم سے اتارے ہوئے کپڑے پلنگ کے نیچے پھینک دیئے۔

”تم اپنی پوزیشن سنبھال لو۔“ نائلہ نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سسی کو لے کر باہر نکل گئی۔ سسی کو اس نے سامنے والے کمرے میں دھکیل دیا اور مائی سکھن کے قریب آگئی جو ہال کمرے میں کھڑی تھی۔ ”اسے بلا لو۔ لیکن خیال رکھنا کاہدار کے علاوہ کوئی اور اندر نہ آئے پائے ورنہ سارے کئے کرائے، پانی پھر جائے گا۔“

”فکر مت کرو۔“ بلائے بغیر کوئی آدمی اندر آنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔“ مائی سکھن نے کہا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

نائلہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سلطانہ والے کمرے میں آگئی۔ سلطانہ پلنگ پر آڑی تر چھی لیٹی ہوئی تھی۔ نائلہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی ہاتھ روم میں گھس گئی۔ اس نے ہاتھ روم کا دروازہ بھینڑ دیا لیکن آدھے انچ کے قریب بھری رہنے دی تھی۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگی۔

دوسری طرف مائی سکھن برآمدے میں آکر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کا مدار کو آوازیں دینے لگی۔ کا مدار ایک اور گمن مین کے ساتھ لان میں گھاس پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں آگیا۔

”کیا بات ہے مائی سکھن؟“ رئیس بلارہا ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”ارے رئیس تو ایک چھو کری کے ساتھ اپنے کمرے میں ہے۔ تمہیں میں نے بلایا ہے۔“

”خیر ہے مائی سکھن؟“ کا مدار ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ان میں ایک چھو کری بست پریشان ہے۔ وہ حویلی سے نکلتا چاہتی ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اگر مدار کو خوش کر دے تو وہ اسے حویلی سے نکال دے گا۔ وہ مان گئی ہے۔“

”کون سی والی چھو کری مائی سکھن؟“ کا مدار کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

”ارے چھو کریاں تو ساری ایک جیسی ہوتی ہیں۔“ مائی سکھن نے کہا۔ ”وہ ہے جس کی ٹانگ پر ڈاکٹر نے پٹی باندھی تھی۔“

”وی تو ایک چیز ہے ان تینوں میں۔ کہاں ہے وہ؟“ کا مدار نے کہا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ مائی سکھن اندر آگئی۔ کا مدار کے اندر آنے کے بعد اس نے احتیاطاً ”دروازے

کنڈی لگا دی۔ وہ کا مدار کو لے کر سلطانہ والے کمرے کے سامنے رک گئی۔ ”وہ اسی کمرے میں ہے۔ زیادہ

بڑ نہیں کرنا ورنہ وہ شور مچا دے گی اور اگر رئیس کو پتہ چل گیا تو تیرے ساتھ مجھے بھی مار ڈالے گا۔

..... اندر جا۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“

”تو فکر مت کر مائی سکھن۔“ کا مدار نے مونچھوں کو ماؤ دیتے ہوئے کہا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر داخل ہو گیا۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے سلطانہ کو بستر پر لیٹے ہوئے دیکھا تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

سے جسم پر چیونٹیاں سی رہتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

”آجاؤ کا مدار۔ رک کیوں گئے۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ مائی سکھن نے کہا تھا کہ.....“ کا مدار پکلا کر رہ گیا۔

”اس نے ٹھیک کہا تھا۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”اگر تم مجھے حویلی سے باہر نکالنے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری

.....“

”رئیس کو پتہ چل گیا کہ میں نے تمہیں حویلی سے بھگایا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ لیکن

ری خاطر تو میں دوزخ میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں۔“ کا مدار کہتے ہوئے پلنگ کے اوپر سے گھوم کر آگے

.....“

”پہلے اسے اپنے سے الگ کر دو۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔“ سلطانہ نے اس کے کندھے پر ہلکی ہوئی

غل کی طرف اشارہ کیا۔

کادار نے راتقل کندھے سے اتار کر دیوار کے ساتھ کھڑی کردی اور سلطانہ کے قریب پٹنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ سلطانہ اسی انداز میں لپٹی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا انداز جذباتی، اشتعال دلانے والا تھا۔ کادار سرک کر اس کے اور قریب آگیا۔ بے گناہ اور معصوم عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس وقت نجانے کیوں اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

سلطانہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے پٹنگ پر کھینچتی ہوئی اس پوزیشن میں آگئی کہ اس کا اپنا رخ تو ہاتھ روم کے دروازے کی طرف تھا اور کادار کی پشت اس طرف ہو گئی تھی۔

سلطانہ ہاتھ روم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کادار کی پشت سے ہاتھ اٹھا کر اسے خصوصی انداز میں حرکت دی۔ ہاتھ روم کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر کادار کو نالکہ کی موجودگی کا پتہ چل گیا تو وہ اسے دیوچ لے گا لیکن کادار کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ وہ کسی اور کے بارے میں سوچتا۔ اسے تو ہوس نے اندھا کر دیا تھا۔

دروازہ آہستہ آہستہ پوری طرح کھل گیا۔ نالکہ ہاتھ روم سے نکل کر بہت دے قدموں چلتی ہوئی دیوار کے ساتھ کھڑی راتقل کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے راتقل اٹھائی اور پٹنگ کے قریب آگئی۔ اس نے راتقل کی نال کادار کی پشت سے لگا دی۔ سلطانہ کادار کو چھوڑ کر اچھل کر پٹنگ سے اتر گئی۔

اس کی یہ حرکت کادار کے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پہلی مرتبہ اس کی پشت پر راتقل کی نال کا ہلکا سا دباؤ پڑا تھا تو وہ اسے سلطانہ کے ہاتھ کا دباؤ سمجھا تھا۔ لیکن دوسری مرتبہ دباؤ پڑا تو اس نے گردن کھما کر دیکھا تو ایک دم اچھل پڑا۔ نالکہ اسے راتقل کی زور پڑے ہوئے تھی۔

”یہ..... یہ کیا.....؟“ کادار ہکلا گیا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

”یہ راتقل ہے اور تمہاری ہے۔“ نالکہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر تمہارے منہ سے آواز نکلتی تو چھلنی کر دوں گی۔“

”تنت..... تم لوگ یہاں سے بھاگنا چاہتی ہو مگر کامیاب نہیں ہو سکو گی۔“ کادار نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”سلطانہ! تم جلدی سے جا کر کپڑے بدللو۔“ نالکہ نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہاتھ روم میں ٹکس گئی۔ نالکہ کادار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”وہ راتقل کہاں ہے جو کل تم نے مجھ سے چھینی تھی؟“

”وہ..... وہ نہیں کے کمرے میں پٹنگ کے نیچے رکھی ہے۔“ کادار نے جواب دیا۔

نالکہ نے دروازے کی قریب جا کر سسی کو آواز دی۔ وہ فوراً ہی سامنے والے کمرے سے نکل آئی۔

”مسی۔“ نالکہ نے کہا۔ ”ذہریے کے کمرے میں پٹنگ کے نیچے راتقل رکھی ہے وہ اٹھا لاؤ۔“

”سی فوراً“ ہی اس طرف چلی گئی اور چند ہی منٹ بعد راتقل لے کر آگئی۔ اس دوران سلطانہ بھی کپڑے بدل کر ہاتھ روم سے نکل آئی اور مائی سکھن بھی وہاں پہنچ گئی۔

”یہ ساری سازش تمہاری ہے مائی سکھن۔“ کادار نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”رہیں شاہنواز ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ تمہارے ٹکڑے کر کے بوٹیاں کتوں کو کھلا دے گا۔ تم جانتی ہو؟“

”تمہارا رہیں کم از کم چھ گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آسکے گا اور اس وقت تک ہم یہاں سے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔“ نالکہ نے کہا۔

”حویلی سے نکلنے کا خیال دل سے نکال دو۔“ کا مدار نے کہا۔ ”رئیس یا میری اجازت کے بغیر گن مین تم لوگوں کو گیٹ کی طرف پھٹکنے بھی نہیں دیں گے۔“

”اس لئے تو تم ہمارے ساتھ چلو گے۔“ نانکھ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بتانے لگی کہ وہ کس طرح حویلی سے نکلیں گی۔

سسی نے کا مدار کو اپنی رائفل کی زد پر لے لیا۔ اس نے سیفٹی کچ بھی ہٹا دیا تھا تاکہ کا مدار کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ نانکھ نے کا مدار کی رائفل کا میگزین نکال لیا۔ جیسپر میں موجود گولی بھی نکال لی اور خالی رائفل کا مدار کی طرف بڑھا دی۔

”یہ رائفل کندھے پر لٹکا لو۔“ نانکھ نے کہا۔ ”تم ہمارے ساتھ باہر چلو گے اور اپنے ساتھیوں سے کہو گے کہ رئیس کی ہدایت پر ہمیں شہر چھوڑنے کے لئے جا رہے ہو۔ گاڑی تم چلاؤ گے۔ ڈرائیور ساتھ نہیں جائے گا۔ روانگی سے پہلے تم اپنے ساتھیوں سے یہ بھی کہو گے کہ وڈیرہ سو گیا ہے اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اور اگر تم نے کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔“

نانکھ نے خاموش ہو کر سسی کے ہاتھ سے رائفل لے لی اور کا مدار کو اشارہ کیا۔

کا مدار نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکالی اور ان کے آگے آگے کمرے سے نکل آیا۔ وہ سب پر آمدے میں آگئے۔ نانکھ نے رائفل دائیں ہاتھ میں لٹکا رکھی تھی لیکن وہ اسے کسی بھی وقت استعمال کرنے کی پوزیشن میں لاسکتی تھی۔

دو گن مین اس وقت بھی لان میں گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کا مدار نے ڈرائیور منجھو کو آواز دے کر بلایا۔

”گاڑی کی چابی مجھے دو۔“ کا مدار نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ”اکبر سے کو گیٹ کھولے۔ میں ان لوگوں کو شہر چھوڑنے جا رہا ہوں اور سنو۔ رئیس سو گیا ہے۔ تم لوگوں میں سے کوئی بھی اندر نہ جائے۔ اگر رئیس جاگ گیا تو ناراض ہو گا۔“

”مائی سکھن بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہے؟“ منجھو نے جیب سے چابیوں کا رنگ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ یہ بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔“ کا مدار نے جواب دیا۔

مائی سکھن اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور سلطانہ اور سسی پچھلی سیٹ پر۔ نانکھ اس وقت تک باہر ہی کھڑی رہی تھی جب تک کا مدار ڈرائیوگ سیٹ پر نہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور رائفل کی ٹال سیٹوں کی درمیانی خلا سے اس کے پہلو سے لگا دی۔

لینڈ روور حرکت میں آگئی۔ گن مین نے گیٹ کھول دیا تھا۔ لینڈ روور گیٹ سے نکل کر ڈیپلو کی طرف جانے والی پکی سڑک پر دوڑنے لگی۔

نانکھ نے رائفل کی ٹال اب اس کی گردن سے لگا رکھی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈیپلو شہر کی اکا دکا روشتیاں دکھائی دینے لگیں۔

”ہمیں ڈیپلو نہیں جانا۔ گاڑی بدین کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لینا۔“ نانکھ نے کا مدار کو ہدایت کی۔

کا مدار نے سر ہلا دیا۔ آگے پختہ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے گاڑی بائیں طرف موڑ دی۔ شراب دائیں



طرف رہ گیا تھا۔ لیکن اس سڑک پر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرتے ہی نانکھ چوک گئی۔ سامنے سڑک پر سرخ روشنی کی حرکت دیتے ہوئے انہیں رکنے کا اشارہ کیا جا رہا تھا۔ فاصلہ ذرا کم ہوا تو سڑک کے عین وسط میں تین پولیس والے کھڑے دکھائی دیئے۔

”گاڑی روک لینا۔“ نانکھ نے کہا۔ ”پولیس والوں کو تم بتاؤ گے کہ ہم رئیس کریم بخش کے مہمان ہیں اور تم ہمیں بدین چھوڑنے جا رہے ہو۔ اگر تم نے ان پولیس والوں کو کوئی اشارہ کرنے کی بھی کوشش کی تو میں بلا جھجک گولی چلا دوں گی۔“

کامدار نے پولیس والوں کے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی۔ وہ تین پولیس والے تھے۔ ان میں دو کانسیبل اور ایک ہیڈ کانسیبل تھا۔ دونوں پولیس والے رانقلیں تانے کھڑے تھے۔ ہیڈ کانسیبل کے دائیں ہاتھ میں ریوالور اور بائیں ہاتھ میں سرخ شیشے والی ٹارچ تھی۔ وہ ڈرائیونگ سائیڈ پر گیا۔

”کیا بات ہے صوبیدار۔ آج یہ چیکنگ کس خوشی میں ہو رہی ہے؟“ کامدار نے پوچھا۔ اس نے سیدھا ہاتھ مصافحے کے لئے کھڑکی سے باہر نکال دیا تھا۔

”تم اس وقت کہاں جا رہے ہو کامدار؟“ ہیڈ کانسیبل نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گاڑی میں بھانکا۔ ”یہ کون لوگ ہیں؟“

”رئیس کے مہمان ہیں صوبیدار۔ انہیں بدین چھوڑنے جا رہا ہوں۔“ کامدار نے کہا۔ ”مگر یہ چیکنگ کیوں ہو رہی ہے؟“

”ہندوستان کی تین جاسوس لڑکیاں ریجنرز والوں کی جیب اور رانقل چھین کر بھاگ گئی تھیں۔ جیب تو جنگل میں مل گئی ہے پر ان چھو کریوں کا پتہ نہیں چل رہا۔ ریجنرز والے بھی جوان بنے پھرتے ہیں۔ چھو کریاں انہیں لات مار کر بھاگ گئیں۔ ہم ہوتے تو بھلا دیکھتے کہ وہ کیسے بچ کر جاتی ہیں؟“ حوالدار نے کہا۔

”یہ لوگ سرحد کی حفاظت کے لئے تو نہیں آئے نا۔ کمائی کرنے آئے ہیں کمائی کرنے۔“ کامدار نے کہا۔ ”اب میں چلوں۔ مہمانوں کو در ہو رہی ہے۔“

”جاؤ سائیں جاؤ۔ عیش تو تم لوگ کرتے ہو نا۔“ ہیڈ کانسیبل کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کانسیبلوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ بھی راستے سے ہٹ گئے۔

گاڑی حرکت میں آگئی۔ نانکھ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نانکھ نے اسے گاڑی روک لینے کا حکم دیا۔

”یہاں گاڑی روک لو۔“

”یہاں۔ اس دیرانے میں؟“ کامدار کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں۔ اس دیرانے میں۔“ نانکھ نے جواب دیا۔

کامدار نے گاڑی روک لی۔

”انجن چلتا چھوڑ دو اور نیچے اتر جاؤ۔“ نانکھ نے تھکانہ لہجے میں کہا۔ کامدار انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر گیا اور نانکھ کے حکم پر وہاں سے تقریباً بیس گز دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ نانکھ پچھلی سیٹ سے اٹھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی۔ اس نے رانقل سسی کے ہاتھ میں تھمادی اور خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

کامدار دور کھڑا سوچ رہا تھا کہ شاید کسی فطری ضرورت کے تحت گاڑی رکوائی گئی تھی اور اس لئے اسے وہاں سے دور ہٹنے کا حکم بھی اس لئے دیا گیا تھا۔ لیکن جب گاڑی تیزی سے حرکت میں آگئی تو وہ بدحواس

ہو کر چیخا ہوا گاڑی کے پیچھے دوڑا۔

نانکھ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک سیلر بیئر پریر کا دباؤ بڑھاتی چلی گئی۔

آدھی رات کے بعد وہ وحیم کی بازار نامی قصبے میں پہنچ گئیں۔ یہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس وقت تاریکی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بستی کے آوارہ کتوں نے کچھ دور تک ان کی گاڑی کا پیچھا کیا پھر ہمت ہار گئے۔

لینڈ روڈ پر اب پختہ سڑک پر بدین کی طرف دوڑ رہی تھی۔ کادھن اور لواری نامی قصبوں کے قریب سے ہوتے ہوئے جب ان کی گاڑی بدین شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ بازار کے ایک چوک پر کھڑے چوکیدار کو دیکھ کر نانکھ نے اس کے قریب گاڑی روک لی۔

”اگر ہمیں کراچی جانا ہو تو کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے؟“ نانکھ نے چوکیدار سے پوچھا۔

”شہر سے باہر نکل کر بائیں ہاتھ والی سڑک پر مڑ جانا۔ وہ سڑک سجاد اور ٹھٹھہ سے ہوتی ہوئی کراچی جاتی ہے۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔

نانکھ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔ چوکیدار مڑ کر گاڑی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسے گاڑی میں صرف عورتوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ رات کے وقت سندھ کی سڑکوں پر سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ڈاکو اور لیبرے جگہ جگہ لگائے رہتے ہیں اور یہ عورتیں پتہ نہیں کہاں سے سفر کرتی ہوئی آ رہی تھیں اور ان کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں تھا۔

لینڈ روڈ پر گولارچی نامی قصبے میں پہنچی تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ گولارچی سے تھوڑا ہی آگے نہر کا پل تھا۔ نانکھ نے پل پر گاڑی روک لی۔

”تم لوگ اتر کر پل کے دوسری طرف چل جاؤ۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“ نانکھ نے کہا۔

سلطانہ، سسی اور مائی سکھن گاڑی سے اتر کر پل کے دوسری طرف چلی گئیں۔ نانکھ نے گاڑی کو ریورس گئیر میں ڈالا اور پل سے تقریباً ”پچاس گز پیچھے“ لے گئی اور پھر گاڑی کو آگے لانے لگی۔ پل کے قریب پہنچ کر اس نے گاڑی کو سڑک سے اتار لیا اب گاڑی کا رخ نہر کی طرف تھا۔ نہر کے کنارے سے ذرا پہلے نانکھ نے گاڑی سے چھلانگ لگادی۔ گاڑی نہر کے کنارے پر قلابازی کھاتی ہوئی نہر میں جاگری۔ نہر خاصی گہری تھی۔ گاڑی کچھ دیر تک اوپر نظر آئی اور پھر پانی کی تہ میں غائب ہو گئی۔ نانکھ پل پر دوڑتی ہوئی سلطانہ وغیرہ کے پاس پہنچ گئی۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ سلطانہ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہاں سے آگے ہم بس پر سفر کریں گے۔ اس لینڈ روڈ پر سفر جاری رکھنا ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی اس میں تیل ختم ہو رہا تھا۔“ نانکھ نے کہا۔

”بس پر سفر کرنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے اور تم جانتی ہو ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔

”میں نے مائی سکھن کو اپنی پوتلی میں کچھ رقم رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“ نانکھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے امید ہے مائی سکھن ہمارا گریہ بھی دیدے گی۔“

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔“ مائی سکھن نے کہا۔

”اس کا کیا کروں ادی؟“ سسی نے اپنے کندھے پر ہلکی ہوئی رانقل کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”اے بھی نہر میں پھینک دو۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 سسی نے رانقل نہر میں پھینک دی۔ وہ چاروں سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔  
 لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرف کوئی بس آتی بھی ہے یا نہیں؟“ سلطانہ بولی۔  
 ”میں نے قصبے میں ایک بس پر سجاد مل ٹھہر لکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ بس اسی طرف سے آئے گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”انہیں تقریباً“ آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ قصبے کی طرف سے بس کو آتے دیکھ کر وہ چاروں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس وقت دھوپ میں کچھ تیزی آگئی تھی۔ ان چاروں نے سروں پر دوپٹے اس طرح اوڑھ رکھے تھے کہ چہرے چھپ کر رہ گئے تھے۔ مائی سکھن نے بس کو رکنے کا اشارہ کیا۔ بس ان کے قریب آکر رک گئی۔

”کہاں جانا ہے مائی؟“ کنڈیکٹر نے پوچھا۔

”ٹھٹھہ۔“ مائی سکھن نے جواب دیا۔

”آؤ بیٹھو..... جلدی کرو۔“ کنڈیکٹر نے کہا۔

وہ چاروں بسی میں سوار ہو گئیں۔ بس میں سیٹوں کے درمیانی راستے پر بھی چھوٹے چھوٹے اسٹول رکھ کر سیٹیں بنائی گئی تھیں۔ کنڈیکٹر نے مسافروں کو ادھر ادھر منتقل کر کے ان کے لئے چار سیٹوں کا بندوبست کر دیا۔

بس تقریباً“ آدھے گھنٹے تک سجاد مل کے اڈے پر کھڑی رہی۔ نائلہ کو سندھ کی کسی بس پر سفر کرنے کا پہلا تجربہ تھا جو بیدار حالت میں مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بھرا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار بھی بہت کم تھی۔ جگہ جگہ رکتی اور چوٹی کی چال سے چلتی ہوئی یہ بس ٹھٹھہ بچتی تو سپر کے تین بج رہے تھے۔ حالانکہ نائلہ کے خیال میں یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں طے ہو جانا چاہئے تھا۔

بھوک کے مارے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتی تھیں۔ مائی سکھن ایک دوکان سے پکڑے اور تندوری روٹیاں لے آئی اور وہ ایک سائے دار جگہ پر بیٹھ کر روٹی کھانے لگیں۔ پکڑے بھی باقی تھے اور روٹیاں بھی ریوڑ جیسی لچکدار تھیں۔ لیکن بہر حال انہیں پیٹ کی آگ بجھانی تھی۔

آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نائلہ وغیرہ آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوئی روٹی کھاتی رہیں۔

چار بجے کے قریب وہ کراچی جانے والی بس پر بیٹھ گئیں۔ ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ وہ کراچی پہنچ گئیں۔ ڈرگ روڈ اسٹیشن کے سامنے وہ بس سے اتر گئیں۔ وہ مائی سکھن کے مٹھرے پر بس سے اتری تھیں۔

”تم رئیس کریم بخش کا بھگہ کار ساز کے قریب ہے۔ تم لوگ بھی میرے ساتھ چلو۔“

”تم رئیس کریم بخش کے گھر جاؤ گی؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”ہاں لی۔ی۔ اسے سب کچھ بتانا ہو گا۔ آؤ۔ وہ ٹیکسی کھڑی ہے۔“ مائی سکھن نے کہا اور وہ قریب کھڑی ہوئی ایک پہلی ٹیکسی کی طرف بڑھ گئی۔

رحیم کریم بخش کا بنگلہ کے ڈی اے اسکیم ون میں تھا۔ ٹیکسی گیٹ کے سامنے رک گئی۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر جیسے ہی گیٹ کی طرف بڑھیں اندر سے ایک آدمی ان کے سامنے آگیا۔ ناکلہ مسی اور سلطانہ ٹھنک کر رک گئیں۔ ان تینوں کے چہرے دھواں ہو گئے تھے۔ ناکلہ کو سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
وہ رئیس شاہنواز تھا!

\*\*\* ..... \* \* \* \* \*

وہ سکھر جانے والی بس تھی اس لئے دلاور کو شہر کے بیرونی اڈے پر ہی اترنا پڑا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ بس اسٹاپ کی وجہ سے یہ علاقہ بڑا بارونتی ہو گیا تھا۔ دلاور بس سے اتر کر اس طرف چلا گیا جہاں شہر کی طرف جانے والے تانگے کھڑے تھے۔ وہ ایک خالی تانگے پر بیٹھ گیا۔  
”چل یار۔ باقی سواریوں کے پیسے بھی میں دیدوں گا۔“ دلاور نے کوچوان سے کہا۔  
کوچوان نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر لگام سنبھالی اور گھوڑے کو ہانک دیا۔  
دلاور سیدھا تھانے جانے کے بجائے اپنے گھر آیا تھا۔ اس نے صبح مشاق سے ایک دو باتیں معلوم کرنے کے لئے کہا تھا۔ تھانے جانے سے پہلے وہ مشاق سے وہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مشاق گھر پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”بڑی دیر کردی تم نے۔“ مشاق اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”انسپکٹر ظلیل دو مرتبہ آدمی بھیج چکا ہے۔“  
”میں نے جو تم سے کہا تھا وہ معلوم کیا؟“ دلاور نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔  
”ہاں۔ میں بڑی مشکل سے حوالات میں یارو سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔“ مشاق نے جواب دیا۔ یارو کا کہنا ہے کہ اس نے ریوالور کے سلسلے میں تمہارا نام لیا۔ دراصل سب انسپکٹر ظہور قتل کے اس کیس کی تفتیش کر رہا ہے۔ اس نے یارو پر تشدد کر کے یہ بیان دینے پر آمادہ کیا تھا کہ وہ ریوالور اسے تم نے دیا تھا۔“

”ہوں۔“ دلاور نے ہٹکارہ بھرا۔ ”اور دوسری بات؟“  
”اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ وہ آدمی یہاں نہیں ہے۔“ مشاق نے جواب دیا۔  
”ٹھیک ہے۔ کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ بھوک لگ رہی ہے۔“ دلاور کہتے ہوئے اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا اور منہ ہاتھ دھوئے لگا۔

مشاق کھانا لینے کے لئے ہوٹل چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ دونوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ رحیم یار خان میں سارا دن مصروفیات کی وجہ سے دلاور نے آج دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ پتہ نہیں تھانے میں کیسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لئے پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا لینا چاہتا تھا۔

ساڑھے نو بجے وہ گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ مشاق نے جا کر دروازہ کھولا۔ اس کی واپسی میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔

”تھانے سے ایک سپاہی آیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”بلاؤ اسے۔“ دلاور کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد مشتاق ایک سادہ لباس پولیس والے کو لے کر اندر داخل ہوا۔  
 ”کیا بات ہے بھئی۔“ دلاور نے اسے گھورا۔ ”تھانے والوں کو میری اتنی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے؟“  
 ”تمہارے ہی فائدے کی بات ہے دلاور۔“ سادہ پوش نے کہا۔ ”اسی لئے انپکٹر چاہتا ہے کہ تم جلد  
 سے جلد اس سے مل لو۔ اگر معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔“  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ تم چلو۔ میں آ رہا ہوں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

وہ سادہ پوش اس طرح سلام کر کے رخصت ہو گیا جیسے وہ اس کا ذاتی ملازم ہو اور اس کے ہر حکم کی  
 تعمیل اپنا فرض سمجھتا ہو۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد دلاور بھی گھر سے نکل آیا۔ مشتاق بھی اس کے  
 ساتھ تھا۔ دلاور سوچ رہا تھا کہ انپکٹر خلیل جس طرح اس سے ملنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا اس سے  
 اندازہ ہوتا تھا کہ بات صرف اس ریوالتور کی نہیں۔ معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہو سکتا ہے۔  
 وہ دونوں تقریباً ”پندرہ منٹ بعد تھانے پہنچ گئے۔ تھانے میں داخل ہوتے ہی انپکٹر خلیل سے پہلے اس کا  
 سامنا سب انپکٹر ظہور سے ہو گیا جو دو کانشیلوں کے ساتھ باہر جا رہا تھا دلاور سب انپکٹر ظہور کو اچھی طرح  
 جانتا تھا۔ وہ شبیر درانی اور حسینہ بیگم کا نمک خوار تھا۔ وہ ملازم تو حکومت کا تھا۔ اس کا کام قانون کی بالادستی  
 قائم رکھنا تھا۔ لیکن ان لوگوں کا زیادہ وفادار تھا جو اس کا بینک بیننس بڑھا رہے تھے۔“  
 ”اوہ تم.....“ سب انپکٹر ظہور اسے دیکھ کر کر گیا۔ ”اچھا ہا تم خود ہی آ گئے۔ ورنہ تمہاری تلاش  
 میں مجھے رحیم یار خان جانا پڑتا۔“

”کیا بات ہے۔ اتنی شد و مد سے میری تلاش کیوں ہو رہی ہے۔ کیا یہاں کوئی قتل ہو گیا ہے یا کسی کو  
 اغواء کر لیا گیا ہے؟“ دلاور نے اسے گھورا۔

”تمیزے بات کرو۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت اندر بھی کر سکتا ہوں۔“ سب انپکٹر ظہور غرایا۔  
 ”تم بھی اپنی کھال میں رہو تھانیدار۔“ دلاور کے لہجے میں بھی تلخی آ گئی۔ ”میں تمہاری دھونس میں  
 آنے والا نہیں ہوں۔ سمجھے۔“

”تمہاری اکثر تو میں ایک منٹ میں نکال دوں گا۔ تم جیسے بد معاش تو میرے جوتے کی ٹھوکوں پر رہتے  
 ہیں۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔“ سب انپکٹر ظہور دھاڑا۔

”بد معاشی میں نے کبھی نہیں کی لیکن تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ تم نے اپنی حد سے بڑھنے کی کوشش  
 کی تو یہ وردی تمہارے جسم پر نہیں رہے گی۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ میری ضرورت ہو تو میں انپکٹر خلیل کے  
 کمرے میں بیٹھا ہوں وہاں آ جانا۔“ دلاور کہتے ہوئے لاپرواہی سے آگے بڑھ گیا۔

”تم انپکٹر خلیل سے نہیں مل سکتے۔“ سب انپکٹر ظہور نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔  
 ”کیوں۔“ دلاور نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چمڑا لیا۔ ”تم اس کے افسر ہو؟“

دلاور آگے بڑھ گیا۔ اس مرتبہ سب انپکٹر ظہور نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دانت کچکا  
 کر رہ گیا۔

دلاور انپکٹر خلیل کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے پاس دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں  
 ایک مرثیر علی بھی تھا۔ وہ بھی اس علاقے کا ایک چھوٹا زمیندار تھا اور رائے منصور کے دوستوں میں سے  
 تھا۔ دلاور سے بھی اس کی ملاقات رہتی تھی۔

”کیا قصہ ہے انپکٹر صاحب۔“ دلاور نے انپکٹر خلیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے اپنے

ماحتوں کے بچے کیوں کھول رکھے ہیں۔ ہر ایک کو کانٹے کو دوڑتے ہیں۔“  
 ”بیٹھ جاؤ دلاور۔“ انسپکٹر خلیل نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”معاہدہ کچھ زیادہ ہی محسوس ہے۔ تمہاری گرجوٹی اسے زیادہ پیچیدہ بنا سکتی ہے۔“

”پہلے آپ مجھے بات تو بتائیے۔“ دلاور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔  
 ”یارو تمہارا دوست ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔“ انسپکٹر خلیل کہہ رہا تھا۔ ”اس کے بیان کے مطابق اس نے جس ریو الور سے اپنی بیوی کو شوٹ کیا تھا وہ ریو الور اسے تم نے دیا تھا۔ وہ سرکاری ریو الور ہے۔ اس کا سیریل نمبر چیک کرنے سے انکشاف ہوا کہ یہ ریو الور اس انسپکٹر کی تحویل میں تھا جسے مدد مننہار کے قریب ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی دیدی گئی تھی اور تم پر اس کے قتل کا شبہ کیا گیا تھا۔“  
 ”لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ یارو پر تشدد کر کے اسے یہ بیان دینے پر مجبور کیا گیا تھا۔“ دلاور نے کہا۔  
 ”ہاں..... یہ مجھے بھی معلوم ہے۔“ انسپکٹر خلیل نے کہا۔ ”لیکن بات اب اس ریو الور تک محدود نہیں رہی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ مدد مننہار کے زمیندار اور اس کے مہمانوں کو بھی بڑی بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔“

”مجھے یاد ہے اور ان کے قتل کا شبہ بھی مجھ پر کیا جا رہا تھا۔“ دلاور نے کہا۔  
 ”بات اگرچہ رانی ہو چکی ہے لیکن پولیس کسی بات کو نہیں بھولتی۔ نہ ہی اس کے لئے کوئی بات پرانی ہوتی ہے۔“ انسپکٹر خلیل نے کہا۔  
 ”کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟“ دلاور نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کے دل کی دھڑکن بے ربط ہونے لگی تھی۔

”مننہار کے چوہدری اور اس کے مہمانوں کے قتل کی تحقیقات پر جو ٹیم مامور تھی اس میں سب انسپکٹر ظہور بھی شامل تھا۔ اس وقت یہ اے ایس آئی تھا۔ وہ کیس اگرچہ ختم ہو گیا تھا مگر ظہور کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو کسی بات پر مطمئن نہیں ہوتے۔ اس نے اپنے طور پر تحقیقات جاری رکھی تھی۔ اور اب وہ کچھ ایسی باتیں معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو اصل قاتل یا قاتلوں کی طرف رہنمائی کر سکتی ہیں۔ میں اسی لئے تم سے ملنا چاہتا تھا۔ یارو نے جو بیانات دیئے ہیں ان سے تمہاری شخصیت ایک بار پھر مشکوک ہو رہی ہے۔“

دلاور کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کتاب انسپکٹر ظہور کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے انسپکٹر کو سیوٹ کیا اور دو قدم آگے بڑھ آیا۔  
 ”پس ظہور۔ کیا بات ہے؟“ انسپکٹر خلیل نے پوچھا۔

”سر۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”میں مدد مننہار کے چوہدری اور اس کے مہمانوں کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں دلاور کو حراست میں لینا چاہتا ہوں۔“

”سب انسپکٹر۔“ دلاور نے اسے گھورا۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ عدالت مجھے اس کیس میں باعزت طور پر بری کر چکی ہے۔ میں قانون سے واقف نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم مجھے حراست میں لے کر عدالت کے فیصلہ کی توجہ نہیں کرو گے۔ اگر تم دوبارہ اس کیس کی تفتیش کرنا چاہتے ہو تو پہلے عدالت میں جا کر اس مقدمے کے فیصلے کی نظر ثانی اور از سر نو تفتیش کی درخواست دو۔ اس کے بعد مجھے حراست میں لینا۔“ ہاں، اس کے علاوہ مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوا ہو تو میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ مجھے ہتھکڑی لگا سکتے

ہو۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ ہی کئی دنوں سے اس علاقے میں موجود رہا ہوں۔

”ٹھیک ہے۔“ سب انسپکٹر ظہور نے اسے گھورا۔ ”لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

”تم نے وہ ریو الور کہاں سے لیا تھا؟“ سب انسپکٹر ظہور کے جانے کے بعد انسپکٹر خلیل نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”میں کسی ریو الور کے بارے میں نہیں جانتا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”دیکھو دلاور۔“ انسپکٹر خلیل نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم ایک شریف نوجوان ہو۔ اگر تم میں شرافت نہ ہوتی تو مر شیر علی اور رائے منصور جیسے معززین تمہاری پشت پناہی نہ کرتے۔ لیکن یارو کے بیان کے بعد معاملہ کچھ الجھ سکتا ہے۔“

”ابھی تو آپ نے تسلیم کیا تھا کہ اس سے یہ بیان زبردستی لیا گیا ہے۔“ دلاور بولا۔

”ہاں۔ لیکن ایک بات ریکارڈ پر آچکی ہے۔ وہ اگر چاہے تو عدالت میں اپنے اس بیان سے منحرف ہو سکتا ہے لیکن اس سے پہلے جو مشکلات پیدا ہوں گی اس کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔“

”میرا اس ریو الور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ دلاور نے پھر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر خلیل نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔“ ضرورت ہوئی تو تمہیں دوبارہ بلوالوں گا۔“

”شکریہ جی۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں یارو سے مل سکتا ہوں؟“

”نہیں۔“ انسپکٹر خلیل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

دلاور انسپکٹر اور مر شیر علی سے ہاتھ ملا کر باہر آگیا۔ مشتاق برآمدے میں ایک کانٹیل سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ دلاور کو دیکھ کر اس نے کانٹیل سے ہاتھ ملایا اور دلاور کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں تھانے سے نکل کر سیدھے گھر ہی آئے تھے۔ دلاور کا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس نے واقعی دوبارہ تفتیش شروع کر دی تو وہ شکبے میں آجائے گا۔ یارو اس کا شریک جرم تھا اور پولیس کی حراست میں تھا۔ وہ سب انسپکٹر ظہور کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ریو الور کے بارے میں اس کا بیان حاصل کر لیا تھا اور منشیہار کیس میں بھی اس کی زبان کھلوا سکتا تھا۔

دلاور رات بھر کسی سب کچھ سوچتا رہا۔ اس کی زندگی مسائل و مصائب کا شکار رہی تھی۔ ماں باپ اور بہن کو ذلیل و رسوا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور جب قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی تو اتنا اس کو ڈرایا دھمکایا گیا اور قانکوں کو تحفظ فراہم کیا گیا اس لئے کہ وہ دولت مند اور صاحب ثروت تھے اور قانون کو خریدنے کی طاقت رکھتے تھے۔ دلاور انتقام کی آگ میں جھلتا رہا۔ وہ قانون کا سہارا لینے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اس کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ دوڑ دوہوپ بیکار ثابت ہوئی۔ قانون کے محافظ خریدے جا چکے تھے اور پھر دلاور نے خود انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یارو اس کا دوست تھا۔ وہ اس کی خاطر زندگی داؤ پر لگانے کو تیار ہو گیا۔

اپنے ماں باپ اور بہن کی رسوائی اور قتل کا انتقام تو اس نے لے لیا لیکن خود اپنی زندگی بچانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اس موقع پر رائے منصور فرشتہ رحمت بن کر اس کی مدد کو آگیا۔ رائے منصور

کے وکیل نے اس کے مقدمے کی پیروی اس طرح کی کہ عدالت نے اسے بے گناہ قرار دیتے ہوئے بری کر دیا۔ لیکن اب یاروکی گرفتاری نے اسے وہیں لاکھڑا کیا تھا جہاں سے وہ چلا تھا۔

تفتیش یاروکی بیوی کے قتل کی ہو رہی تھی لیکن اس ریوالور کی وجہ سے پرانی گرہیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ دلاور پولیس کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ بعض اوقات ایک معمولی سا سراغ بھی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے حل کر دیتا ہے اور پولیس آفیسر اگر سب انسپکٹر ظہور جیسا ہو تو کڑے مردے اکھاڑنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔

یارو اس کا بہترین دوست تھا۔ دلاور کو یقین تھا کہ وہ اس کا نام زبان پر نہیں لائے گا لیکن سب انسپکٹر ظہور نے اس ریوالور کا پتہ چلا دیا تھا اور تشدد کے ذریعے یارو سے یہ بیان حاصل کر لیا تھا کہ یہ ریوالور اسے دلاور نے دیا تھا۔ اس طرح سب انسپکٹر ظہور اسے اس انسپکٹر کے قتل کے کیس میں پھسانا چاہتا تھا جسے درخت سے لٹکا کر پھانسی دی گئی تھی۔ اس طرح اور بہت سی باتیں بھی سامنے آ سکتی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر دلاور کی آنکھ لگ گئی۔

صبح دھوپ پھیل چکی تھی جب مشتاق نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔

”کیا بات ہے۔ سونے کیوں نہیں دیتے۔“ دلاور نے کسمساتے ہوئے کہا۔

”یارو ختم ہو گیا ہے۔“ مشتاق نے کہا۔ ”رات کو پولیس نے اس پر اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گیا۔“

”کیا؟“ دلاور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”رات کو اس نے تھانے میں خوشی محمد کا نشیمل کوپانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔“ مشتاق نے کہا۔

”اس نے رات کو یارو پر اتنا تشدد کیا کہ اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ لیکن اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ ہسپتال

پہنچائے جانے کے ایک گھنٹہ بعد وہ ختم ہو گیا۔“

”یہ تم نے کیا کیا۔“ دلاور بولا۔ ”اس کا بیان پولیس کے پاس موجود ہے جو میرے خلاف استعمال کیا

جاسکتا ہے۔ وہ زندہ رہتا تو عدالت میں اس بیان سے منحرف ہو سکتا تھا۔“

”مرنے سے پہلے یارو نے ہسپتال کے ڈاکٹروں اور ایک پولیس آفیسر کی موجودگی میں بھی ایک بیان دیا

تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ وہ پورا بیان کیا تھا لیکن کا نشیمل خوشی محمد نے بتایا ہے کہ وہ بیان تمہارے حق

میں ہے۔“ مشتاق نے بتایا۔

”اچھا تو چائے بنا جلدی ہے۔ میں تھانے جا کر پتہ کرتا ہوں۔“ دلاور اٹھ کر باہر تھانے میں گھس گیا۔

ٹھنڈے پانی کے غسل سے کسلندی کس حد تک دور ہو گئی۔ جب وہ کپڑے بدل کر باہر نکلا تو مشتاق چائے تیار

کر چکا تھا۔ ڈبل روٹی بھی موجود تھی۔ دلاور نے چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کے دو پیس کھائے اور تھانے جانے

کے لئے گھر سے نکل گیا۔

تھانے پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ انسپکٹر خلیل موجود نہیں تھا اور نہ ہی سب انسپکٹر ظہور

اپنے کمرے میں تھا۔ دلاور ہیڈ محرم کے کمرے میں گھس گیا۔

”آؤ دلاور۔“ ہیڈ محرم نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ہم تمہارے ہی بارے میں

باتیں کر رہے تھے۔“

”کیا باتیں ہو رہی تھیں اور یارو کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟“ دلاور بولا۔

”یارو تو واقعی تمہارا یار تھا۔“ ہیڈ محرم نے کہا۔ ”اس نے اپنی جان تو دیدی لیکن تمہاری جان بچا



”کیا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ دلاور نے کہا۔

”مرنے سے پہلے اس نے ہسپتال کے دو ڈاکٹروں اور میڈیکولجکل آفیسر کی موجودگی میں یہ بیان دیا تھا کہ ریوالور کے بارے میں اس کا بیان تشدد کے ذریعے حاصل کیا گیا تھا۔ سب انپکٹر ظہور کسی وجہ سے تمہیں اس کیس میں الجھانا چاہتا تھا۔ جبکہ تمہارا اس ریوالور سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس نے اپنی بیوی کے قتل کا اعتراف تو کر لیا لیکن تمہیں اس نے بچا لیا۔“ ہیڈ محرم نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا وہ بیان کہاں ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”انپکٹر خلیل کی تحویل میں ہے۔“ ہیڈ محرم نے کہا۔ ”بچ گئے تم دلاور ورنہ سب انپکٹر ظہور نے تو تمہیں اندر کرنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔“

”یا رو کی لاش کہاں ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”ہسپتال میں ہے۔ اگر تم لاش لے جانا چاہو تو ایس ایچ او کے نام ایک درخواست لکھ کر دیدو۔“ ہیڈ محرم نے کہا۔

”وہ میرا دوست تھا۔“ دلاور نے مگر اسانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ میرا فرض بنتا ہے کہ اس کے آخری سفر کا بندوبست کر دوں۔ تم جانتے ہو میں تو صرف پانچ جماعتیں پڑھا ہوا ہوں۔ درخواست کیسے لکھ سکتا ہوں۔ تم ہی لکھ دو۔“

”اچھا بیٹھو۔ میں لکھ دوں گا۔ ویسے بھی ایس ایچ او صاحب اس وقت موجود نہیں ہیں۔ درخواست پر کارروائی دی کریں گے۔“ ہیڈ محرم نے کہا اور ایک کانٹیل کو چائے لانے کے لئے کہا۔

دلاور آرام سے بیٹھا رہا۔ اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ یارو واقعی یاروں کا یار ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی جان دیدی تھی مگر یاری پر حرف نہیں آنے دیا تھا اور مرنے سے پہلے بیان دے کر اسے بچا گیا تھا۔

دلاور کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک انپکٹر خلیل کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ سب انپکٹر ظہور بھی اس کے ساتھ تھا۔ دلاور جب انپکٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو ظہور خوشخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیسے آئے دلاور؟“ انپکٹر خلیل نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یارو کی لاش لینا چاہتا ہوں جی اور اس کے ساتھ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی نقل بھی۔“ دلاور نے کہا اور ہیڈ محرم کی لکھی ہوئی درخواست اس کی طرف بڑھا دی۔

”لاش کا پوسٹ مارٹم تو نہیں ہوا۔“ انپکٹر خلیل نے کہا۔ ”البتہ لاش کو تدفین کے لئے لے جاسکتے ہو۔“

”مطلب یہ کہ تم بچ گئے ہو۔ اب زیادہ پھیلنے کی کوشش مت کرو۔“ سب انپکٹر ظہور نے ناگوار سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اگر پوسٹ مارٹم کا قانونی مطالبہ کر رہا ہوں تو یہ ایک ناجائز بات ہے اور تم جیسے لوگ وردی پن کر لوگوں کو قتل کرتے پھریں تو وہ قانونی بات ہے۔“ دلاور نے بھی اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”یارو تمہاری تحویل میں تھا۔ تم اس کے کیس کی تفتیش کر رہے تھے۔ تم نے اسے تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا اور کہتے ہو کہ میں پھیلنے کی کوشش نہ کروں۔ قتل تو قتل ہی ہوتا ہے سب انپکٹر صاحب چاہے وہ سادہ

کپڑوں میں کیا جائے یا پولیس کی وردی پہن کر۔ میں اس معاملے کو اوپر تک اٹھاؤں گا۔ تم نے اسے قتل کیا ہے۔“

”اس کی موت حرکت قلب بند ہونے سے واقع ہوئی ہے۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔  
 ”نہیں۔ تم نے اس پر بے پناہ تشدد کیا تھا۔ تم اس کی موت کے ذمے دار ہو۔ میں اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کروں گا۔“ دلاور نے کہا۔ کل رات تک وہ خوفزدہ تھا۔ لیکن یارو کے نزاعی بیان کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد وہ غڑ ہو گیا تھا۔

”دلاور۔“ انسپکٹر خلیل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ہم نے بھی تمہارے بارے میں بہت سی باتیں نظر انداز کر دی ہیں۔ تم بھی پوسٹ مارٹم والی بات کو نظر انداز کر دو۔ اس طرح ہم بھی بہت سی مشکلوں سے بچ جائیں گے اور تم بھی۔“  
 ”لیکن انسپکٹر صاحب.....“

”غصہ دے دماغ سے سوچو دلاور۔“ انسپکٹر خلیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یارو نے اپنے آخری بیان میں اپنی بیوی کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔ مقدمہ چلتا تو اسے عدالت سے بھی موت ہی کی سزا ملتی۔ وہ عدالت میں پیش ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ اس کی بھی جان چھوٹ گئی اور اس نے تمہیں بھی بچالیا۔ میں سمجھتا ہوں اس نے تم پر بہت برا احسان کیا ہے۔ اس کے احسان کا بدلہ یہی ہے کہ اسے عزت و احترام سے دفن کر دو۔ اس کی موت کی تحقیقات کرانے کے چکر میں پڑو گے تو یارو کو یا تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ سوائے اس کے کہ کھینچا تائی ہوگی۔ پولیس کو بھی اور تمہیں بھی..... اور تم جانتے ہو کہ پولیس کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ سب کچھ تو پولیس والوں کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ اس کیس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لہذا میرا مشورہ ہے کہ.....“

”اپنی زبان بند رکھو۔“ دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”یہی سمجھ لو۔“ انسپکٹر خلیل نے کہا۔ ”تم اسے بھول جاؤ۔ ہم بھی کچھ باتیں بھول جائیں گے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس جھنجھٹ میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو سب انسپکٹر ظہور کو ذرا دانا چاہتا تھا۔ انسپکٹر خلیل کی بات مان کر اس نے گویا ان پولیس والوں پر بہت برا احسان کیا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں بھول جاتا ہوں۔ یارو کی لاش مجھے کب ملے گی؟“  
 ”میں لیٹر دیدیتا ہوں۔ تم ہسپتال جا کر لاش لے لیتا۔“ انسپکٹر خلیل نے کہا اور محرر کو بلا کر اسے لیٹر تیار کرنے کی ہدایت کی۔

دلاور لیٹر لے کر تھانے سے باہر آگیا اور پھر اسی روز یارو کو دفن کر دیا گیا۔ اس کے جنازے میں صرف چند ہی آدمی تھے اور پھر اس رات دلاور رحیم یار خان واپس چلا گیا۔ وہ ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گیا تھا۔ یارو اگر زندہ رہتا تو سب انسپکٹر ظہور جیسا فرعون صفت آدمی اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتا اور اس طرح دلاور بھی قانون کے شکنجے میں جکڑا جاتا۔ یارو اس کے جرائم کا واحد گواہ تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ دلاور اب مطمئن تھا۔ یہ خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹل گیا تھا۔

لیکن..... دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی مصیبتوں کا دور ختم نہیں ہوا تھا۔ اس پر انسپکٹر صوبہ خان کے قتل کا بھی شبہ تھا۔ اس قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جن دنوں صوبہ خان کو قتل کیا گیا تھا وہ رحیم یار خان میں نہیں تھا۔ وہ اپنی عدم موجودگی کا ثبوت فراہم کر سکتا تھا لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حسینہ بیگم

اور اس کا بیٹا شیردرانی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اگر وہ بیچ میں نہ ہوتا تو وہ دونوں ماں بیٹا نالکھ کو ختم کر کے اس کی جائیداد پر قبضہ کر چکے ہوتے۔ لیکن رائے منصور اور دلاور ان کے راستے کی رکاوٹ بن گئے تھے۔ رائے منصور ایک بڑا زمیندار تھا۔ اس کے تعلقات بھی بہت اچھے اور تک تھے۔ شیردرانی وغیرہ اس کے خلاف تو کچھ نہیں کر سکتے تھے البتہ وہ دلاور کو راستے سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ حسینہ بیگم نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ انسپکٹر صوبہ خان کی لاش دریافت ہونے سے ایک دن پہلے دلاور کو اس طرف دیکھا گیا تھا۔ حالانکہ اس روز وہ کچیلو میں تھا۔ لیکن حسینہ بیگم کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے چھپانے کی کوشش دی لوگ کر رہے تھے۔ لیکن یارو کے کیس میں سرکاری ریوالور کا معاملہ کس طرح گیا تھا؟ سب انسپکٹر ظہور نے تشدد کر کے یارو سے یہ بیان لیا تھا کہ یہ ریوالور اسے دلاور نے دیا تھا۔ سب انسپکٹر ظہور کو کیسے پتہ چلا کہ اس ریوالور سے دلاور کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ وہ یا تو کسی اور وجہ سے دلاور کو اس کیس میں پھانسا چاہتا تھا یا حسینہ بیگم کے کہنے پر ایسا کیا گیا تھا۔ سب انسپکٹر ظہور حسینہ بیگم کا نمک خوار تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ یارو کے قبضے سے سرکاری ریوالور کی برآمدگی کے بعد ظہور نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا ہو!

لیکن بہر حال یہ قصہ ختم ہو گیا تھا البتہ صوبہ خان کے قتل والا معاملہ ابھی باقی تھا اور دلاور کو یقین تھا کہ یہ معاملہ بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ صوبہ خان وہاں کیسے پہنچا تھا اور اسے قتل کس نے کیا تھا؟ اس کے ذہن میں جو سیدھا سادھا جواب آیا وہ یہی تھا کہ صوبہ خان کو شیردرانی ہی نے ٹھکانے لگایا ہو گا تاکہ وہ ان کے راز فاش نہ کر سکے۔ صوبہ خان کے جسم پر جب تک پولیس کی وردی تھی وہ ان کے لئے کام کا آدمی تھا۔ لیکن وردی اترنے کے بعد وہ ان کے لئے نہ صرف بیکار ہو گیا تھا بلکہ بہت بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسے ٹھکانے لگادینا ہی مناسب سمجھا تھا اور اس کا قتل اس کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

صادق آباد سے واپس آنے کے دو سرے دن صبح دس بجے کے لگ بھگ دلاور رائے صاحب کے ایک کام سے ان کے ایک دوست کے ہاں گیا تھا۔ راستے میں سب انسپکٹر ظہور کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ سب انسپکٹر ظہور سادہ لباس میں تھا اور ایک رکشے میں گل گشت کی طرف جا رہا تھا۔ دلاور نے بھی اپنے رکشہ ڈرائیور کو اسی طرف چلنے کو کہہ دیا۔

سب انسپکٹر ظہور کا رکشہ گل گشت کے ایک بنگلے کے سامنے رک گیا۔ دلاور نے اپنے رکشے والے کو رکے بغیر چلتے رہنے کو کہہ دیا تھا۔ رکشہ اس بنگلے کے سامنے سے گزرا تو دلاور نے کن انکھیوں سے بنگلے کی طرف دیکھا۔ سب انسپکٹر ظہور گیٹ کے ساتھ کال بیل کا بٹن دبا رہا تھا۔

رائے منصور صاحب کے دوست کا بنگلہ بھی گل گشت ہی میں تھا۔ دلاور نے اس بنگلے کے سامنے رکشہ رکوا لیا۔ وہ تقریباً "آدھے گھنٹے تک اس بنگلے میں رہا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اسے دور تک پیدل چلنا پڑا تھا۔ اس گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ ٹھک گیا۔ حسینہ بیگم کی کار اس گلی میں گھوم رہی تھی۔ دلاور بڑی تیزی سے آڑ میں ہو گیا اور جب وہ کار گلی میں داخل ہو گئی تو وہ موڑ پر کھڑے ہو کر اس طرف دیکھنے لگا۔

کار اسی بنگلے کے سامنے رکی تھی جہاں سب انسپکٹر ظہور گیا تھا۔ کار رکنے کے چند سیکنڈ بعد حسینہ بیگم کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ اس نے مکان کی کال بیل بجائی، چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور حسینہ بیگم اندر چلی گئی۔

دلاور کے دماغ میں آنسوئیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک گلی کے موڑ پر کھڑا اس بجیلے کی طرف دیکھتا رہا پھر سوک کی طرف چلے گا۔ اس کا شبہ درست نکلا تھا۔ سب انسپکٹر ظہور اس کے ساتھ حینہ بیگم کا کھیل کھیل رہا تھا۔

\*\*\* .....

شبیر درانی تین دن پتو عاقل چھاؤنی میں رہا۔ اس دوران الیاس نے کئی فوجی افسروں سے اس کی ملاقات کرائی تھی۔ ان میں ایک کرنل شاگر بھی تھا جس نے بڑی تفصیل سے اسے اس تعمیراتی پراجیکٹ کے بارے میں سمجھایا تھا جو کانڈی تیاریوں کے آخری مرحلے میں تھا۔ کرنل شاگر کے کہنے کے مطابق کانڈی تیاریاں مکمل ہوتے ہی یہ منصوبہ جی ایچ کیو بھیج دیا جائے گا جہاں سے ٹینڈر کال کئے جائیں گے۔ اس نے بھی شبیر درانی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ الیاس کے ساتھ مل کر اس پراجیکٹ کا ٹھیکہ حاصل کر لے تو کروڑوں روپے کماسکتا ہے۔

ان سب کی باتیں سن کر شبیر درانی کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اگر وہ الیاس کے اشتراک سے یہ ٹھیکہ حاصل کر لے تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ لیکن اصل مسئلہ سرمائے کی فراہمی کا تھا۔ حینہ بیگم اسے کسی ایسے کاروبار کی اجازت نہیں دے گی جس کا اسے تجربہ نہ ہو۔ وہ تو خاندانی زمیندار تھے۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ کس فصل کے لئے فی ایکڑ کتنی کھاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کس فصل کو کب بانی لگانا چاہئے اور فصلوں کو کیڑوں سے بچاؤ کے لئے کب اور کیسے کرم کش ادویات کا اسپرے کرنا چاہئے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کوئی عمارت تعمیر کرنے کے لئے ریت اور سینٹ کاریشو کیا ہونا چاہئے۔ حینہ بیگم اگر کسی طرح مان بھی گئی تو سرمائے کی فراہمی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اس کے لئے زمین بیچنی پڑے گی اور اس کی ماں اراضی بیچنے کے لئے کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوگی۔

دفعتا" شبیر درانی کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کاجیلو کے پولیس آفیسر کی طرف سے جاری کردہ نالکہ کی موت کا وہ تصدیق نامہ اس کی جیب میں تھا۔ یہ نالکہ کی موت کا تصدیق نامہ ہی نہیں تھا بلکہ کانڈ کا یہ پڑوہ اس خزانے کی کنجی تھی جس کے حصول کے لئے وہ خوار ہو رہا تھا۔ نالکہ کی موت ثابت ہو جانے کے بعد اس کی جائیداد حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ نالکہ کی جائیداد ملنے کے بعد وہ اس کی اراضی کا کچھ حصہ فروخت کر کے مطلوبہ سرمایہ حاصل کر سکے گا۔

تیسرے روز شام سے ذرا پہلے وہ الیاس وغیرہ سے رخصت ہو کر رحیم یار خان کے لئے روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ پھر دفعتا" صوبہ خان کا خیال اس کے ذہن میں ابھر آیا۔ صوبہ خان کا قتل اس کے لئے کچھ دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے خیال میں وہ رحیم یار خان سے اپنی عدم موجودگی ثابت کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا۔ جائے واردات سے عدم موجودگی ثابت کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ صوبہ خان کی جیب سے برآمد ہونے والے پستول، کوٹھری کے تالے، کسی اور دیگر بہت سی چیزوں پر اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے اور یہ نشانات اسے چھنسا سکتے تھے۔

وہ رات دس بجے رحیم یار خان پہنچا۔ اس وقت گل مرگ جانا مناسب نہیں تھا وہ اپنے شہر والے مکان

میں آگیا۔

”کیا صورت حال ہے بہاول؟“ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”صورت حال خراب ہے سرکار۔“ بہاول نے جواب دیا۔ ”پولیس والے بڑی بیگم صاحبہ کو پریشان کر رہے ہیں۔ وہ بار بار آپ کا پوچھتے ہیں کہ کہاں گئے ہیں۔ کب آئیں گے؟“  
 ”کنویں سے ملنے والی لاش کس کی تھی؟“ شیردرانی نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہ صوبہ خان کی لاش تھی سرکار۔“ بہاول نے جواب دیا۔ ”کم بخت پتہ نہیں مرنے کے لئے یہاں کیوں آگیا تھا۔ مرنا ہی تھا تو کنویں اور چلا جاتا۔“  
 ”پولیس نے کسی کو پکڑا نہیں؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”نہیں سرکار۔“ بہاول نے جواب دیا۔ ”بیگم صاحبہ نے پولیس کو بتایا تھا کہ جس روز کنویں سے صوبہ خان کی لاش ملی تھی اس سے ایک روز پہلے شام کو دلاور کو اس طرف دیکھا گیا تھا۔ لیکن پولیس نے کھیتوں پر کام کرنے والے مزارعوں سے پوچھا تو انہوں نے بیگم صاحبہ کے اس بیان کی تردید کر دی۔ ان میں سے کسی نے بھی دلاور کو نہیں دیکھا تھا۔ پولیس نے دلاور کو پکڑا تھا لیکن پھر چھوڑ دیا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ وہ کئی روز سے سندھ گیا ہوا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ میرے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔ بھوک لگ رہی ہے۔“ شیردرانی بولا۔

”کھانا تو ہوٹل سے لانا پڑے گا سرکار۔“ بہاول نے جواب دیا۔

”کیس سے بھی لے کر آؤ۔ مگر جلدی..... یہ لو۔“ شیردرانی نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

بہاول فوراً ہی باہر چلا گیا۔ شیردرانی نے اپنے کمرے میں جا کر کپڑے بدلے اور منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد بہاول کھانا لے کر آگیا۔ شیردرانی کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

”بہاول۔“ وہ قریب کھڑے ہوئے بہاول کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں بہت تھکا ہوا ہوں، تم گاڑی لے کر گل مرگ چل جاؤ اور صبح ماں جی کو یہاں لے آؤ۔“

”بیگم صاحبہ تو شہری میں ہیں سرکار۔“ بہاول نے کہا۔ ”ملک صاحب کے بنگلے میں ہیں۔ آج صبح ہی آئی تھیں۔“

”ملک صاحب کے بنگلے پر کیوں؟ یہاں کیوں نہیں آئیں؟“ شیردرانی بولا۔

”پتہ نہیں سرکار۔“ بہاول نے ہولے سے جواب دیا۔

شیردرانی نے کھانا ختم کرنے کے بعد ٹیلی فون اپنے سامنے رکھ لیا۔ ریسیور اٹھا کر ملک صاحب کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ماں جی اپنے گھر آنے کے بجائے ملک صاحب کے ہاں کیوں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ملک اس کے والد کا دوست تھا۔ وہ اس شہر کا ایک بڑا کاروباری آدمی تھا۔ اس کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔ لیکن ماں جی اپنا گھر چھوڑ کر اس کے ہاں کیوں ٹھہری تھیں؟ دوسری طرف کھٹی بیجے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ تیسری تھنٹی پر کال ریسیور کر لی گئی۔

”ملک صاحب۔“ شیردرانی ملک کی آواز پہچان کر بولا۔ ”میں شیردرانی بول رہا ہوں۔ ماں جی آپ کے ہاں آئی ہوئی ہیں۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم کہاں سے بول رہے ہو شیر؟“ ملک نے پوچھا۔

”میں شہر میں ہوں اور گھر سے ہی بول رہا ہوں۔ مجھے ابھی بھاول نے بتایا ہے کہ ماں جی آپ کے ہاں آئی ہوئی ہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”ہولڈ کرو۔ میں بلاتا ہوں۔“ ملک نے کہا۔

شبیر درانی ریسور کان میں لگائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی ماں کی آواز سنائی دی۔

”تم کہاں ہو بیٹا..... کب آئے ہو؟“

”تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔ معاملہ کیا ہے ماں جی۔ آپ ملک صاحب کے ہاں کیوں ٹھہری ہوئی ہیں؟“

شبیر درانی نے پوچھا۔

”فون پر بات نہیں ہو سکتی بیٹا۔ تم یہاں آ جاؤ۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔“ شبیر درانی نے کہتے ہوئے ریسور رکھ دیا۔ اور بھاول کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں ملک صاحب کے ہاں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی میرے بارے میں پوچھے تو لاعلمی ظاہر کر دیتا۔“

”جی سرکار۔“ بھاول نے سر ہلا دیا۔ وہ باہر کے گیٹ تک شبیر درانی کے ساتھ آیا تھا۔

شبیر درانی کو گل گشت میں ملک صاحب کے بچکے تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے کار سے اتر کر تیل بجائی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

”آئیے جناب۔ ملک صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ دروازہ کھولنے والے نوکر نے کہا اور اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے آیا۔

ڈرائنگ روم میں ملک صاحب کے ساتھ حینہ بیگم بھی موجود تھیں۔ حینہ بیگم کے چہرے پر تشویش اور افسردگی نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔

”کیا ہوا ماں جی۔ کیا قصہ ہے۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”اب پریشانیوں کے سوا اپنے مقدر میں رہ ہی گیا گیا ہے۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔ ”تمہارے جانے کے دوسرے دن کھیتوں والے کنویں سے انسپکٹر صوبہ خان کی لاش ملی تھی۔ پولیس کو تم پر شبہ ہے۔ وہ بار بار تمہارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ انہوں نے دلاور کو بھی تھانے بلایا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی چھوڑ دیا۔ پولیس اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہے کہ جس روز صوبہ خان کی لاش دریافت ہوئی تھی اس سے ایک دو روز پہلے وہ کہاں تھا؟“

”کیا تم نے پولیس والوں کو یہ نہیں بتایا کہ میں کئی روز سے سندھ گیا ہوا ہوں؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”میں نے تو یہی بتایا تھا لیکن پولیس نے تمہارے اور دلاور کے بارے میں گاؤں کے لوگوں سے معلومات حاصل کی تھیں۔ دلاور کے بارے میں تو سب نے یہی کہا کہ اسے عرصہ سے کسی نے نہیں دیکھا لیکن تمہارے بارے میں کہا گیا کہ لاش ملنے سے ایک روز پہلے تم گاؤں میں تھے۔ اس طرح معاملہ کچھ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ماں جی۔ یہ کاغذ ثابت کر دے گا کہ میں یہاں موجود نہیں تھا۔“

اس نے جب سے ایک کاغذ نکال کر ماں کو دکھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ حینہ بیگم نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹائلہ درانی کی موت کا تصدیق نامہ، جس پر کاپیو تھانے کے ایس ایچ او کی مہر اور دستخط موجود ہیں۔“

اس کا مطلب ہے کہ پولیس نے ٹائلہ کی موت کی تصدیق کر دی ہے۔“

”کیا وہ واقعی مرچکا ہے؟“ حسینہ بیگم نے پوچھا۔

”کانڈ کا یہ گلہز اس کی موت کی تصدیق کرنا ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔“ شبیردرانی نے جواب دیا۔  
 ”اس پولیس آفیسر کے بیان کے مطابق نالکہ درانی ریگستان میں لاپتہ ہو گئی تھی۔ تلاش کے باوجود اس کا پتہ نہیں چلا تو اسے مردہ تسلیم کر لیا گیا۔ کانڈ کا یہ گلہز دراصل اس خزانے کی کنجی ہے جسے ہم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ قانونی طور پر ہم اس کے وارث ہیں اور اس کی تمام جائیداد کے حق دار بھی ہم ہیں۔ بس دو چار دن کی بات ہے اس کے بعد ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔“

”بہت بڑی خوش فہمی میں جھلا ہو تم۔“ ملک صاحب نے پہلی مرتبہ ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی نظرس شبیردرانی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ”میں قانون دان تو نہیں ہوں لیکن جو حالات اور واقعات اب تک سامنے آئے ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے نالکہ کی جائیداد حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس پر قاتلانہ حملے کروائے گئے۔ میری ناقص رائے میں قانون کسی ایسے شخص کو کسی جائیداد کا وارث قرار نہیں دے سکتا جو جائیداد کے حصول کے لئے ملک صاحب جائیداد کو قتل کرنا چاہتا ہو۔“  
 ”لیکن ہمارے خلاف اب تک ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہو سکی اور پھر نالکہ کی موت میں ہمارا ہاتھ نہیں ہے۔“ شبیردرانی نے جواب دیا۔

”لیکن تم لوگوں پر یہ شبہ تو ہے۔“ ملک صاحب نے جواب دیا۔ ”اور پھر تم لوگ یہ بھول رہے ہو کہ رائے منصور جیسا شخص نالکہ کی پشت پر ہے۔“

”رائے منصور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“ شبیردرانی نے کہا۔

”بہر حال، کسی وکیل سے اس سلسلے میں مشورہ کر لینا چاہئے۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”اور آج صبح صادق آباد کا وہ پولیس آفیسر بھی تو آیا تھا۔ وہ کیا معاملہ تھا؟“

”کون پولیس آفیسر؟“ شبیردرانی نے سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

”سب انسپکٹر ظہور۔“ حسینہ بیگم نے جواب دیا۔ ”دلاور کے ایک دوست یارو نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ جس ریوالور سے گولی ماری گئی تھی وہ سرکاری ریوالور تھا اور اس انسپکٹر کی تحویل میں تھا جسے عرصہ پہلے مدھ منٹھار کے قریب درخت سے لٹکا کر پھانسی دی گئی تھی۔ دلاور پر اس انسپکٹر کے قتل کا شبہ تھا۔ لیکن وہ صاف بچ گیا۔ یارو کے کیس میں وہ ریوالور سامنے آگیا۔ سب انسپکٹر ظہور نے یارو سے یہ بیان حاصل کر لیا تھا کہ یہ ریوالور اسے دلاور نے دیا تھا لیکن مزید بیان حاصل کرنے کے لئے یارو پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ پہلے اس نے ڈاکٹروں اور میڈیکو لیگل آفیسر کے سامنے یہ بیان دیا کہ اس ریوالور سے دلاور کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے پہلا بیان تشدد کے ذریعے لیا گیا تھا۔ اس طرح دلاور ایک بار پھر بچ گیا۔ ویسے بھی انسپکٹر ظلیل، رائے منصور کی وجہ سے دلاور پر کچھ مہمان ہے۔“

”یہ مہمانی کب تک رہے گی۔“ شبیردرانی نے کہا۔ ”بس دو چار دن کی بات ہے۔ دلاور کو صوبہ خانہ ہی کے کیس میں پھنسواؤں گا۔“

”میں ایک مشورہ دوں گا۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”تم لوگوں کے حق میں بہتر تو یہی ہے کہ دو سرودں کے خلاف سازشوں کے جال بننے کے بجائے معاملے کو یہیں ختم کر دو۔ اور اپنا دفاع کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ نے تم لوگوں کو بہت کچھ دیا ہے۔ نالکہ کی جائیداد کے چکر میں کہیں یہ سب کچھ بھی تم لوگوں کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔“

”کون مائی کالا لال ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا ہے؟“ شبیر درانی نے ناگواری نگاہوں سے ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس سے زیادہ اور کیا ہو گا؟“ ملک صاحب نے کہا۔ ”تم لوگ مجرموں کی طرح پولیس سے چھپتے پھر رہے ہو۔ کسی کا سامنا کرنے کی جرات نہیں رہی تم لوگوں میں۔ خاندان کی عزت و وقار خاک میں مل چکا ہے۔ جن لوگوں کو نظریں اٹھا کر بات کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی آج وہ بھی مذاق اڑا رہے ہیں۔ خدا کے لئے قسم کرو یہ سب کچھ۔ اپنی عزت کو اس طرح سڑکوں پر نپلا مٹ کر دے۔۔۔۔۔ ختم کر دو یہ سب کچھ۔۔۔۔۔“

”ملک صاحب۔“ شبیر درانی نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ ہمارے ذاتی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں جس کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔“

”تم لوگوں کی وجہ سے میری عزت بھی داؤ پر لگ چکی ہے۔“ ملک نے جواب دیا۔ ”پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ انہیں اگر پتہ چل جائے کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو تو میری کیا عزت رہے گی۔ لوگ نفرت کرنے لگیں گے مجھ سے۔“

”آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کی یہ عزت اور ٹھاٹھ میرے باپ کی وجہ سے ہے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”آپ کیا تھے؟ ایک آڑھتی کے معمولی سے فٹن! میرے باپ نے تمہیں گندگی کے ڈھیر سے اٹھا کر اس مقام پر پہنچایا۔“

”تمہاری بی بی خاندان کی ذلت و رسوائی کا باعث بن رہی ہیں۔“ ملک نے کہا۔ ”میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ تمہارے باپ کے وہ احسان ہی مجھے زبان کھولنے پر مجبور کر رہے ہیں۔“

”ماں جی۔ یہ شخص مسلسل ہماری توہین کر رہا ہے۔“ شبیر درانی کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

”میں ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رک سکتا۔ آپ بھی ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلے۔“

”شبیر۔“ حسینہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”تمہارے دماغ کی گری نے ہی ہمیں یہ دن دکھایا ہے۔ ملک صاحب ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”بھیک ہے ماں جی۔“ شبیر درانی کے لہجے میں بیحد سختی تھی۔ ”آپ اس کی باتیں سنتی رہے۔ میں جا رہا ہوں۔“

حسینہ بیگم بیٹے کو پکارتی رہ گئی لیکن وہ پیر پختا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر شبیر درانی نے انجن اشارت کیا اور اسے ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ گلی سے نکل کر سڑک پر آتے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔ اس کا دماغ سگ رہا تھا۔ ملک کی باتوں سے اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ اگر کوئی شخص مشورہ دے رہا ہو تو اس پر غور بھی کر لینا چاہئے۔ اس نے ہمیشہ اپنے آپ ہی کو درست سمجھا تھا اور اپنے ہی فیصلوں پر عمل کیا تھا۔ اس کی یہ خود سری ہی اسے بتدریج تباہی کی طرف لے جا رہی تھی لیکن اس نے کبھی اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھا تھا بلکہ ہمیشہ دوسروں ہی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

ملک کی باتیں سن کر بھی وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ حالانکہ اگر وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا تو اسے بچاؤ کا کوئی راستہ مل سکتا تھا۔ اس وقت جو صورتحال درپیش تھی اس کے تحت اسے دوسروں کے خلاف سازشیں جاری رکھنے کے بجائے اپنا دفاع کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ملک کی باتوں نے اسے بھڑکا دیا تھا۔

شبیر درانی کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو رہی تھی۔ کپٹیاں سگ رہی تھیں اور دماغ کی رگیں گویا



پھنی جا رہی تھیں۔ اسی گرم دماغی نے اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب کر لی تھیں اور وہ غیر ارادی طور پر کاری رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

سامنے چوک پر ٹریفک سگنل تبدیل ہو چکا تھا۔ سگنل کی سرخ آنکھ اس طرف سے آنے والے ٹریفک کو رکنے کا اشارہ کر رہی تھی مگر شبیر درانی اس سرخ بتی پر توجہ دینے بغیر کاری رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ ٹھیک اسی لمحہ بائیں طرف سے ایک ٹرک چوک کے وسط میں پہنچ گیا۔ ٹرک کو دیکھ کر شبیر درانی اچانک ہی جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس نے کار کو بریک لگانے کی کوشش کی لیکن بدحواسی میں پیر کا دباؤ ایکسلریٹر پر بڑھ گیا۔ اس نے اشیئرنگ بڑی پھرتی سے ایک طرف موڑ دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ کاری ایک زوردار دھماکے سے ٹرک سے ٹکرا گئی..... اور شبیر درانی کے سامنے تاریکی پھیلی چلی گئی وہ سیٹ پر لڑھک گیا اور سیٹ اس کے خون سے تر ہونے لگی۔

\*\*\* ..... \* \* \*

”تت..... تم.....“ نالکہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے ہکلائی۔ ”تم..... یہاں پہنچ گئے؟“

سلطانہ اور سسی بھی اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئی تھیں۔ سسی کا چہرہ تو اس طرح سفید پڑ گیا تھا جیسے جسم کا سارا خون خچو گیا ہو۔

”کیا بات ہے۔ تم لوگ مجھے اس طرح گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو؟ کون ہو تم لوگ؟“ وہ شخص باری باری ان کے چروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تت..... تم شاہنواز.....“

”ارے ادی نہیں۔“ مائی سکھن نے فوراً ہی صورتحال کا اندازہ لگالیا۔ یہ شاہنواز نہیں ہے۔ رئیس کریم بخش کا چھوٹا بیٹا ہے۔ رئیس احمد علی..... یہ یہاں کالج میں لڑکوں کو پڑھاتا ہے۔“

نالکہ کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ کتنی مشابہت تھی شاہنواز اور اس شخص میں۔ وہ دونوں بھائی تھے۔ ان کی شکلیں ایک تھیں مگر کردار میں کتنا فرق تھا۔ شاہنواز شیطان کا پیرو کار تھا اور یہ علم کی روشنی پھیلا رہا تھا۔ نالکہ نے پہلی مرتبہ غور سے دیکھا تو اسے شاہنواز اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص میں ایک معمولی سا فرق نظر آیا۔ شاہنواز کے بال بالکل سیاہ تھے جبکہ احمد علی کے بال شمد کی رنگت کے اور زیادہ چمکدار تھے۔

”یہ کون ہیں مائی سکھن اور تم یہاں کیسے آئی ہو، تم تو گوٹھ میں تھیں؟ احمد علی نے مائی سکھن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“

”یہ مظلوم چھو کر یاں ہیں رئیس۔“ مائی سکھن نے کہا۔ ”کاہار انہیں دھوکے سے حویلی میں لے آیا تھا۔ رئیس شاہنواز انہیں برباد کرنا چاہتا تھا۔ میں انہیں بڑی مشکل سے حویلی سے نکال کر لائی ہوں۔ ہم بڑی مصیبتوں سے یہاں پہنچے ہیں۔“

”اچھا کیا تم نے کہ انہیں یہاں لے آئیں۔ انہیں اندر لے کر چلو۔ احمد علی نے کہا اور پھر نالکہ وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ لوگ اندر تشریف لے چلے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے بڑے بھائی کی وجہ سے آپ لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ آپ لوگ اندر چلے۔ میں پانچ دس منٹ میں آتا ہوں۔“

”رہیں کریم بخش موجود ہیں؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”بابا سائیں تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے غزالہ بھی ان کے ساتھ گئی ہے لیکن ایک گھنٹے تک آجائیں گے وہ لوگ۔ آپ لوگ اندر جا کر بیٹھیں۔“ مائی سکھن۔ ”وہ مائی سکھن کی طرف متوجہ ہو گیا۔“

”انہیں اندر لے آؤ اور میرا سے کو تم لوگوں کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرے۔“

”آؤ چھو کر پو اندر آؤ..... اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ مائی سکھن نے کہا۔ وہ کونٹھی میں داخل ہو کر ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ وسیع و عریض ڈرائنگ روم بہت ہی عالیشان طریقے پر آراستہ تھا۔ مائی سکھن انہیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر میراں کو آوازیں دیتی ہوئی اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میراں نے بھی دروازے میں آکر جھانکا۔ وہ ملازمہ تھی۔ عمر سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دلی پتلی سی، گوری رنگت، وہ سندھی لباس پہنے ہوئے تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد میراں ٹرائل دھکیلاتی ہوئی اندر آگئی۔ اس کے ساتھ مائی سکھن بھی تھی۔ ٹرائل پر چائے کے علاوہ کھانے پینے کے کچھ لوازمات بھی تھے۔ اس نے ٹرائل روک دی تو مائی سکھن بسکٹ، نمکو اور دوسرے لوازمات کی پلیٹیں اٹھا کر ان کے سامنے میز پر رکھنے لگی۔

”یہ میری بیٹی ہے۔“ مائی سکھن نے میراں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نائلہ وغیرہ اس تعارف پر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ دونوں ماں بیٹیوں میں بڑی مشابہت تھی، مائی سکھن بھی جوانی میں یقیناً ایسی ہی رہی ہوگی۔

”تم لوگ یہ کھاؤ.....“ مائی سکھن نے کہا۔ ”یہاں شہر والے کھانا دیر سے کھاتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہوگی تا تم لوگوں کو..... یہ کھاؤ۔“

”تم بھی تو کھاؤ..... تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں کھاؤں گی۔ تم لوگ لوٹا۔“ مائی سکھن نے جواب دیا۔

وہ تینوں پلیٹوں پر ٹوٹ پڑیں۔ انہیں واقعی بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ پلک جھپکنے کی دیر میں انہوں نے تمام پلیٹیں خالی کر دیں۔ وہ چائے پی رہی تھیں کہ احمد علی آگیا۔ وہ دروازے ہی میں رک گیا۔ غالباً آگے آتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

”ارے آپ آئے۔“ رک کیوں گئے۔“ نائلہ نے کہا۔

”میرے آجانے سے آپ لوگ برا نہ مانیں۔“ احمد علی آگے آگیا۔

”یہ آپ کا گھر ہے، ہم کیوں برا ماننے لگیں۔ آپ بیٹھئے۔“ نائلہ نے کہا۔

احمد علی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ کے لئے چائے بناؤں۔“ مائی سکھن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بنا دو۔“ احمد علی نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ بھی چائے پی رہا تھا۔ مائی سکھن اور میراں باہر چلی گئیں تو ان میں تعارف ہونے لگا۔ احمد علی نے انگلش میں ایم اے کیا تھا اور ایک گورنمنٹ کالج میں لیکچرار تھا۔ وہ پید شرمیلا واقع ہوا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے برعکس وہ شاہنواز کو بھی دیکھ چکی تھیں۔ جس سے وہ اپنی عزت بچا کر بھاگی تھیں۔

”آپ لوگ اس شیطان کے جال میں کیسے پھنس گئیں؟“ احمد علی نے پوچھا۔

”ہم.....“ نائلہ نے رک کر سلطانہ اور سسی کی طرف دیکھا۔ ”دراصل ہمیں کچھ لوگ دھوکے سے اغواء کر کے راجستان لے گئے تھے۔ ہم کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اسمگلروں کی ایک پارٹی کے ساتھ سرحد پار کرتے ہی ریجنرز کے گھیرے میں آ گئیں لیکن ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم وہاں سے بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ ڈییلو کے قریب جنگل میں ایک بوڑھے نے ہمیں پناہ دی۔ اس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم رئیس کریم بخش کے پاس چلی جائیں وہ ہماری مدد کرے گا۔ کادار ہمیں حویلی میں لے گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ اگر مائی سکھن ہماری مدد نہ کرتی تو ہم برباد ہو چکی ہوتیں۔“

”آپ واقعی خوش قسمت ہیں کہ اس شیطان کے چنگل سے بچ نکلیں۔“ احمد علی نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”شاہنواز میرا بڑا بھائی ہے لیکن حیدر آباد میں تعلیم کے دوران وہ غلط سوسائٹی میں بڑ کر غلط راستوں پر چل نکلا۔ اس کی وجہ سے ہم سب کو اکثر شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ بابا سائیں نے اسے سمجھایا، ڈانٹا، عاق کر دینے کی دھمکیاں دیں لیکن وہ اس راستے پر اتنا آگے نکل چکا ہے کہ واپسی ممکن نہیں رہی۔ بابا سائیں جب گوٹھ میں ہوتے ہیں تو وہ حویلی چھوڑ کر اپنے دوستوں کے پاس چلا جاتا ہے اور بعض اوقات دو دو مہینے حویلی کا رخ نہیں کرتا۔“

”یہ واقعی افسوسناک بات ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”آپ لوگوں کا تعلق کراچی سے ہے یا.....؟“

”ہم کراچی ہی میں رہتی تھیں۔“ سلطانہ جلدی سے بول پڑی۔ ”دراصل ہم ملازمت پیشہ خواتین ہیں۔ چند خواتین نے مل کر فیڈرل بی ایریا میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ اب جا کر معلوم کریں گی کہ کیا صورتحال ہے۔“

”میرا خیال ہے بابا سائیں آپ لوگوں کو نہیں جانے دیں گے اور.....“ میری چھوٹی بہن..... آپ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ وہ بھی آپ لوگوں کو نہیں جانے دے گی۔“ احمد علی نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد کوٹھی کے پورچ میں ایک گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور اسکے تھوڑی دیر بعد ایک جوان لڑکی اور ایک بوڑھا آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ دوڑیہ کریم بخش اور لڑکی اس کی بیٹی غزالہ تھیں۔ وہ دونوں ابھی ہوئی نظروں سے نائلہ وغیرہ کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر جب مائی سکھن کمرے میں داخل ہوئی تو بوڑھا کچھ اور بھی چونک گیا۔

”تم کس کے ساتھ آئی ہو سکھن؟ کادار آیا ہے کیا؟“ کریم بخش نے پوچھا۔

”نہیں بابا سائیں۔ میں ان کے ساتھ آئی ہوں۔“ مائی سکھن نے نائلہ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کون ہیں؟“ دؤیرے نے پوچھا۔

”یہاں سے گفتگو کی ذمہ داری احمد علی نے سنبھال لی۔ وہ رئیس کریم بخش کو ان کے بارے میں بتانے

لگا۔

”اچھا کیا تم لوگ یہاں آ گئیں۔ یہ تمہارا گھر ہے جب تک چاہو یہاں رہو۔ یہ میری بیٹی غزالہ ہے۔ بیٹی، ان کو اوپر لے جاؤ۔ تھکی ہوئی لگتی ہیں تھوڑا آرام کر لیں تو رات کے کھانے پر ان سے باتیں کریں گے۔“ رئیس کریم بخش نے کہا۔

”جی بابا سائیں۔“ غزالہ نے کہا اور ان تینوں کو لے کر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔

غزالہ فیشن کی پرستار لیکن ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکی تھی۔ گوئدہ والی حویلی میں نائلہ وغیرہ اس کے ملبوسات کی الماری دیکھ چکی تھی اور یہاں بھی اس کا وارڈروب نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات سے بھرا ہوا تھا۔ غزالہ نے آنرز میں لی اے کیا تھا اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

”تم نے مزید کیوں نہیں پڑھا؟“ نائلہ نے کہا۔

”بابا سائیں نے اتنا ہی پڑھا دیا کافی ہے۔“ غزالہ نے جواب دیا۔

وہ دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ غزالہ نے ان تینوں کو اپنے وارڈروب میں سے کپڑے نکال کر دیئے اور جب نائلہ نے بتایا کہ وہ اس کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو غزالہ مسکرا دی۔

”میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ.....“

”کہ تمہارے کپڑے ہم نے کیسے پہن لئے۔“ سلطانہ نے جملہ پورا کر دیا۔

غزالہ نے بات فحشہ میں اڑا دی۔

ان تینوں نے نہانے کے بعد کپڑے بدل لئے اور غزالہ ہی کے کمرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ وہ کھانا کھانے نیچے آ گئیں۔ کھانے کے دوران وڈیرہ کریم بخش ان سے پوچھتا رہا۔ سلطانہ نے جب یہ کہا کہ وہ لوگ صبح چلی جائیں گی تو رئیس کریم بخش نے اسے گھورنے ہوئے کہا۔

”میں تو اجازت دیدوں گا پر میری بیٹی سے پوچھ لو کہ وہ تم لوگوں کو جانے دے گی یا نہیں۔ وہ تو کہہ رہی تھی کہ تم لوگ بیس رہ جاؤ۔ میں بھی سمجھوں گا کہ میری ایک نہیں چار بیٹیاں ہیں۔“

”جب سے ہم اپنے گھروں سے نکلی ہیں پہلی مرتبہ ایسی محبت ملی ہے۔ لیکن ہم آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”سمان تو اللہ سائیں کی رحمت ہوتا ہے۔“ رئیس کریم بخش نے کہا۔ ”اور پھر بیٹیاں جس گھر میں ہوں وہاں تو اللہ کی رحمت بے حساب ہوتی ہے۔“

”بابا سائیں ٹھیک کہتے ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔ ”اتنا بڑا گھر ہے۔ آپ لوگوں کے آنے سے کتنی رونق ہو گئی ہے۔“

”اچھا۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔“ نائلہ نے کہا۔

کھانے کے بعد غزالہ انہیں پھر اوپر لے آئی۔ اوپر کی منزل پر تین بیڈ رومز تھے ایک غزالہ کے استعمال میں تھا اور دو خالی تھے۔ ان تینوں نے ایک ہی بیڈ روم میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ یہ بیڈ روم خاصا وسیع و عریض تھا۔ دیزر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ نائلہ نے چادر اٹھا کر قالین پر بچھالی۔

”ہم تینوں کے لئے یہی بستر مناسب رہے گا۔“ نائلہ نے کہا۔

غزالہ بھی ان کے ساتھ قالین پر بیٹھ گئی۔

”ہم تم لوگوں کے خلوص سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔“ نائلہ نے غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم دو چار دن تو تمہاری سمان رہ سکتی ہیں اس سے زیادہ نہیں۔“

”وہ کیوں؟“ غزالہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم کچھ ایسے مسائل میں الجھی ہوئی ہیں جس سے دوسروں کو بھی پریشانی ہو سکتی ہے۔ ہم نہیں چاہتیں کہ ہماری وجہ سے تم لوگوں کو بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔“

”اگر مجھے قابل اعتماد سمجھو تو کچھ بتا دو۔“ غزالہ نے کہا۔

نالہ چند لمبے خاموش رہی اور پھر کمر سانس لیتے ہوئے بولی۔

”میں رحیم یار خان کی رہنے والی ہوں۔ میری زمینیں ہیں، کڑوٹوں کی جائیداد ہے لیکن اپنوں کی سازش کا شکار ہو کر بھاگی پھر رہی ہوں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”یہ سسی میری وجہ سے مصائب کا شکار ہوئی۔ سلطانہ سے ہماری ملاقات راجستان کے کیمپ میں ہوئی تھی۔ وطن کی محبت نے ہم تینوں کو اکٹھا کر دیا۔ ہم نے اپنی جان کو داؤ پر لگا کر وہ کیمپ تباہ کیا اور یہاں تک کس طرح پہنچی ہیں، یہ ایک طویل کہانی ہے۔ ہمارے پاس ان تمام دہشت گردوں کے نام اور پتے موجود ہیں جو راجستان کے اس کیمپ سے ٹریننگ حاصل کر کے آئے ہیں۔ یہاں آتے ہی مجھے حالات کا کچھ اندازہ ہو گیا ہے۔ دہشت گردی کی وارداتیں وہی لوگ کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں روکنا ہے۔ قانون کے تعاون سے ان دہشت گردوں کا قلع قمع کرنا ہے۔“

”ایسے حالات میں تو تم لوگوں کا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے۔“ غزالہ نے کہا۔ ”کم از کم کوئی ایسی جگہ تو ہو جہاں تم لوگ محفوظ رہ سکو۔ بابا سائیں اور بھائی احمد علی اس سلسلے میں تم لوگوں کی ہر قسم کی مدد کریں گے۔“

”لیکن..... ہمیں تمہارے بڑے بھائی کی طرف سے خطرہ ہے۔“ نالہ نے کہا۔

”وہ یہاں نہیں آتا۔“ غزالہ نے کہا۔ ”تم لوگوں کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ایک آدھ دن بعد فیصلہ کریں گے۔“ نالہ نے کہا۔

اس کے بعد وہ دوسرے موضوع پر بات کرنے لگیں۔ وہ رات کے پچھلے پہر تک باتیں کرتی رہیں۔ پھر غزالہ بھی وہیں سو گئی تھی۔

نالہ نے صبح سب سے پہلے آئی جی سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ کال اس کے پی اے نے ریسیو کی تھی۔

”آئی جی صاحب میٹنگ میں ہیں۔ آپ پیغام دیدیجئے۔“

”پیغام نہیں دے سکتی۔ میں خود بات کرنا چاہتی ہوں۔ معاملہ قومی سلامتی کا ہے۔ آپ ان سے میری بات کروائیے۔ میرا نام نالہ ہے۔ میں نے چند روز پہلے راجستان میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی را کے ایک کیمپ سے انہیں کچھ اطلاعات فراہم کی تھیں اور ان پر کارروائی بھی ہوئی تھی۔“

”اوہ..... مس نالہ.....“ اس مرتبہ پی اے کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”آپ ہولڈ کیجئے۔ میں صاحب سے بات کرتا ہوں۔“

تقریباً ”ایک منٹ خاموشی رہی پھر پی اے کی آواز سنائی دی۔

”مس نالہ، بات کیجئے۔ صاحب لائن پر ہیں۔“ کچھ ہی دیر بعد آئی جی کی آواز سنائی دی۔

”مس نالہ، آپ خیریت سے ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ کا راز.....“

”ہم بالکل خیریت سے ہیں سر۔“ نالہ نے جواب دیا۔

”آپ نے جو اطلاعات فراہم کی تھیں اس کے لئے حکومت پاکستان آپ کی بھلا شکر گزار ہے۔ اگر وطن سے محبت کا یہ جذبہ ہر شخص کے دل میں ہو تو دشمن ہماری سرحدوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کا جذبہ حب الوطنی اور جرات قابلِ داد ہے۔“

”وطن سے محبت کا جذبہ ہر شخص کے دل میں موجود ہے۔ پاکستان کے ہر باشندے کو اپنی سرزمین سے بڑی محبت ہے۔ چند لوگ ایسے ہیں جو محرمیوں اور نا انصافیوں کی وجہ سے دشمنوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں

”نہیں، میں بھی راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔  
 ”آپ کے جذبات قابلِ تعریف ہیں مس نائلہ۔“ آئی جی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کوئی خاص  
 کتنا چاہتی ہیں۔“

”ہیں سر۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اندرون سندھ سرحد کے قریب کاجیلو اور بخش علی لاشاری نامی قصبے ہیں۔  
 علاقوں کا رہنے والا ایک ہندو سیٹھ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی را کا ایجنٹ ہے۔ صوبہ خان نامی ایک پولیس  
 سپکٹر بھی اس کے ساتھ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ یہ ہندو سیٹھ پاکستانی نوجوانوں کو بلیک میلنگ  
 کے ذریعے اپنے جال میں پھانس کر دہشت گردی کی تربیت کے لئے راجستھان بھیجتا ہے۔ یہ ہندو سیٹھ  
 مگنک میں بھی ملوث ہے۔ آپ اس کا نام پتہ نوٹ کیجئے۔“ نائلہ اس ہندو سیٹھ کا نام اور پتہ بتانے لگی  
 اس نے اسے اور سسی کو بھارت اسمگل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”انسپکٹر صوبہ خان کو دلاور نامی ایک نوجوان کی رپورٹ پر تحقیقات کے بعد معطل کیا جا چکا ہے۔ وہ فرار  
 چکا ہے لیکن جلد ہی اسے گرفت میں لے لیا جائے گا۔ اس ہندو سیٹھ کے بارے میں آپ مطمئن رہئے۔  
 اب آدھ روز میں اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”دلاور.....!“ نائلہ کے منہ سے بے اختیار نکلا.....  
 ”آپ اپنا خیال رکھئے مس نائلہ۔“ آئی جی نے کہا۔ ”دشمن کے علاقے میں رہ کر اپنے وطن کی  
 امتی کے لئے ایسی سرگرمیاں..... آپ کسی وقت بھی.....“  
 ”اس وقت میں اپنے وطن کی سرزمین پر ہوں سر۔“ نائلہ نے کہا۔ ”راجستھان کا وہ یکمپ تباہ کرنے کے  
 ہم وہاں.....“

”اوہ۔“ آئی جی صاحب چونک گئے۔ ”وہ یکمپ آپ نے تباہ کیا تھا؟“  
 ”ہیں سر۔ میرے ساتھ دو اور پاکستانی لڑکیاں بھی ہیں۔ ہم اس وقت کراچی میں ہیں۔“ نائلہ نے  
 اب دیا۔

”اوہ۔“ آئی جی صاحب نے کہا۔ ”کیا آپ میرے دفتر آسکتی ہیں؟ ہم ان دخترانِ پاکستان کو دیکھنا چاہتے  
 ہیں جنہوں نے دشمن کی سرزمین پر یہ عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔“  
 ”مناسب وقت آنے پر ہم آپ کے سامنے پیش ہو جائیں گے اور عنقریب میں آپ سے دوبارہ رابطہ  
 دلانے گی۔ اس وقت تک کے لئے خدا حافظ۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔  
 غزالہ بھی فون پر نائلہ کی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ نائلہ کی باتیں سن کر غزالہ کے چہرے پر حیرت کے  
 رات پھیلتے جا رہے تھے۔

وہ سارا دن یونیورسٹی گزر گیا۔ شام کو وہ سب لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ باہر تین چار گاڑیاں رکنے کی  
 آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً ہی بعد دؤیرے کا نوکر دوڑتا ہوا اندر آگیا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا۔  
 ”بابا سائیں۔“ وہ دؤیرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پولیس بنگلے کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ ان  
 ساتھ رئیس شاہنواز بھی ہے۔“

نائلہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپ سے چائے پھلک گئی۔ اس نے سلطانہ اور سسی کی طرف دیکھا۔  
 کے چہرے بھی دھواں ہو رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دھڑ سے  
 تنگ روم کا دروازہ کھلا اور ایک انسپکٹر اور تین چار دیگر پولیس اہل کار راتھلیں تانے اندر داخل

ہوئے۔ ان کے ساتھ شاہنواز بھی تھا۔

”یہ ہیں وہ تینوں جاسوس لڑکیاں انپکڑ، جو سرحد پار کر کے فرار ہوئی تھیں۔“ شاہنواز نے ان تینوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تم تینوں زیر حراست ہو۔“ انپکڑ نے کہا۔ ”کوئی حرکت مت کرنا۔“

نالکہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے دوڑ کر کریم بخش کی طرف دیکھا وہ بے حس و حرکت بیٹھا شاہنواز کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نالکہ سسی اور سلطانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ پولیس کے گھیرے میں بنگلے سے نکل رہی تھیں۔

...●...●...●...

نالکہ درانی، سسی اور سلطانہ کو پولیس موبائل میں بٹھایا جا رہا تھا تو دُورے کریم بخش کا بڑا بیٹا رئیس شاہنواز ایک سفید ٹویٹا کار کے پاس گھڑا موٹھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی کمزور سی مسکراہٹ تھی۔ کار میں دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے، ایک ڈرائیونگ سیٹ پر۔ وہ شو فر نہیں تھا بلکہ شاہنواز کا دوست اور اس قیمتی ٹویٹا کا مالک تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر شیشوں والی سندھی ٹوپی اور چہرے پر خباثت تھی۔ پچھلی سیٹ پر شاہنواز کا کادار بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کندھے پر حسب معمول آٹومیک رائفل لٹکی ہوئی تھی اور اجرک اوڑھ رکھی تھی۔

نالکہ، سسی اور سلطانہ کو موبائل میں سیٹوں پر سب سے آگے والے سرے پر بٹھایا گیا تھا۔ ان کے ساتھ چار پولیس والے بیٹھے تھے۔ انہوں نے رائفلیں اس طرح سنبھال رکھی تھیں جیسے کسی بھی لمحہ ایکشن کے لئے تیار ہوں۔ ایک موبائل ان کے آگے تھی اور ایک موبائل پیچھے۔ اس میں چھ مسلح کانسٹیبل موجود تھے جن میں ایک موبائل کے کہیں پر رائفل لٹکائے کھڑا تھا۔ اس طرح نالکہ والی موبائل ان کی زد میں تھی۔ سب سے آخر میں وہ سفید ٹویٹا کار تھی جس میں شاہنواز اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

تمام گاڑیاں ایک بھوس کی شکل میں چلتی ہوئی تھانے کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ نالکہ وغیرہ کو موبائل سے اتار کر مسلح کانسٹیبلوں کے گھیرے میں لے کر تھانے کے اندر بچھا دیا گیا۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج سب انپکڑ بہت خوش تھا۔ اس نے بھارت کی تین جاسوس لڑکیاں پکڑ لی تھیں۔ تینوں بیچد حسین اور خطرناک تھیں۔ سب انپکڑ جانتا تھا کہ حسین لڑکیاں اس لئے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں کہ وہ آسانی سے حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو اپنے حسن کے جال میں پھانس کر قومی سلامتی کے راز اگلا لیتی ہیں۔ آئے دن اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں کہ خوبصورت بھارتی جاسوس لڑکیاں پاکستانی سرحد میں داخل ہو گئیں۔ بعض اوقات ان کے عزائم کے بارے میں بھی لکھ دیا جاتا تھا لیکن کبھی کوئی لڑکی پولیس یا سپی اور سیکورٹی افسر کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان حسین لڑکیوں کو اعلیٰ تربیت دے کر بھیجا جاتا تھا اور پھر بھارت اور پاکستان کے باشندوں کے رہن سہن، لباس اور زبان میں بھی فرق نہیں تھا۔ یہاں ان کے ہمدرد بھی موجود تھے۔ سرحد پار کرتے ہی انہیں ہتھیاری رقم کے عوض یہاں کے قومی شناختی کارڈ مل جاتے تھے۔ یہ جاسوس لڑکیاں یہاں آسانی سے کب جاتی تھیں اور ان کا سراغ لگانا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تین بھارتی جاسوس لڑکیاں پولیس کی گرفت میں آئی تھیں۔ یہ تینوں

کل صورت اور لباس سے پاکستانی ہی لگتی تھیں۔ تینوں روانی سے اردو بولتی تھیں اور ایک تو سندھی بھی اس طرح بولتی تھی جیسے یہ اس کی مادری زبان ہو۔ سب انسپکٹر اچھی طرح جانتا تھا کہ جاسوسی کے لئے ایسی لڑکیوں کا انتخاب کیا جاتا تھا جو دشمن کے علاقے میں جا کر کھپ جائیں اور ان پر غیر ملکی ہونے کا شبہ نہ کیا جاسکے۔ سب انسپکٹر کو یقین تھا کہ یہ لڑکیاں کچھ سنسنی خیز انکشافات کریں گی اور اسے فوراً ہی انسپکٹر کے عہدے پر ترقی مل جائے گی۔

وہی سب انسپکٹر اس تھانے کا انچارج بھی تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا تو ان تینوں کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ رئیس شاہنواز بھی کمرے میں آگیا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا طنزیہ نگاہوں سے نالکہ وغیرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”رئیس شاہنواز۔“ سب انسپکٹر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے قانون سے تعاون کر کے حکومت کی ایک بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اگر آپ ان کے بارے میں اطلاع نہ دیتے تو یہ کہیں غائب ہو جاتیں اور ملکی سلامتی کے لئے خطرہ بن جاتیں۔ لیکن آپ کو ان پر شبہ کیسے ہوا تھا۔“

”میں بھی تو ایک محب وطن پاکستانی ہوں جناب۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”چار دن پہلے یہ تینوں لڑکیاں میری حویلی میں آئی تھیں۔ اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ایک فرضی کہانی سنائی تھی۔ میں نے انہیں مظلوم سمجھ کر سنا دیا۔ لیکن اسی روز شام کو مجھے پتہ چلا کہ سرحد پار کرنے والی تین بھارتی جاسوسی لڑکیاں رنجیز کی حراست سے فرار ہو گئی ہیں مجھے ان پر شبہ ہوا۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں تو انکشاف ہوا کہ یہ وہی تینوں جاسوسی لڑکیاں ہیں۔ ڈیپلو کا صوبیدار اس وقت شہر میں نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ صبح ان تینوں کو صوبیدار کے حوالے کر دوں گا لیکن انہوں نے کسی طرح ہماری نوکرائی مانی سکھن کو درغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا اور مجھے بے ہوش کر کے کادار کو گن پوائنٹ پر لے کر حویلی سے بھاگ نکلیں۔ انہوں نے کادار کو بھی دیرانے میں اتار دیا۔“ وہ خاموش ہو کر نالکہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تینوں خاموش بیٹھی اس کی ہرزہ سرائی سن رہی تھیں۔ شاہنواز بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ کہاں گئی ہوں گی۔ وہ تو کل رات میرے دوست نے ڈیپلو میں اپنے بھائی کو فون کر کے پیغام دیا کہ ایک گھنٹے بعد مجھے فون پر بلا لے۔ ایک گھنٹے بعد اس سے میری بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ انہی سکھن تین لڑکیوں کے ساتھ بابا سائیں کے بنگلے پر آئی ہیں۔ فون تو اس نے کسی اور مقصد کے لئے کیا تھا لیکن باتوں میں یہ تذکرہ بھی آگیا۔ میں صبح چار بجے کوٹھ سے نکلا اور یہاں آکر پہلے خود تصدیق کی پھر آپ لوگوں کو اطلاع دی۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی لڑکیاں بڑے بڑے لوگوں کو پھانس کر پہلے اپنے ٹھکانے اور تحفظ کا بندوبست کرتی ہیں۔ بابا سائیں کو بھی انہوں نے کوئی جھوٹی کہانی سنائی ہوگی۔ آپ ہمارے بابا سائیں کو نہیں جانتے۔ وہ بہت رحمدل ہیں۔ انہیں ترس آگیا ہو گا ان پر۔“

”قانون سے تعاون کا بہت بہت شکریہ مسٹر شاہنواز۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”ہم ان سے معلوم کر لیں گے کہ یہ کس مشن پر آئی ہیں۔ بھارتی دہشت گردوں نے تو کراچی کا سکون برباد کر رکھا ہے یہ ان دہشت گردوں کے بارے میں میں بھی جانتی ہوں گی۔ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

”تم نے اس کی کہانی پر یقین کر لیا آفیسر؟“ نالکہ نے پچھتی ہوئی نظروں سے سب انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ ”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”کوئی عملی کارروائی شروع کرنے سے لے کر میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم ٹھیک ٹھیک جواب دو گی۔ تم لوگوں نے پاکستان کی



سرحد کب پار کی تھی اور یہاں کن کن لوگوں سے تمہارے رابطے ہیں۔“  
 ”شاہنواز کا بیان اس حد تک تو درست ہے کہ ہم نے غیر قانونی طور پر پاکستان کی سرحد پار کی تھی اور  
 رنجیزی حراست سے بھی فرار ہوئی تھیں۔ لیکن ایسا ہم نے صرف ملکی سلامتی کے لئے کیا تھا۔ ہمیں معلوم  
 نہیں تھا کہ یہاں اس جیسے بے ضمیر لوگ بھی موجود ہیں جنہیں نہ تو مادر وطن کے تحفظ کا احساس ہے اور نہ  
 ہی ہو بیٹیوں کی عزت کا خیال۔ اس جیسے لوگ ہی اپنے ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملاتے ہیں اور ملکی  
 سلامتی کے لئے خطرے کا باعث بنتے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں نے اس کے بارے میں نہیں پوچھا، تمہارے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“ سب  
 انپکٹر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

نائلہ جواب دیتا ہی چاہتی تھی کہ دؤیرہ کریم بخش، احمد علی اور غزالہ تھانے میں داخل ہوئی۔  
 ”صوبیدار۔“ دؤیرہ کریم بخش نے سب انپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ان تینوں لڑکیوں کے  
 بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب جھوٹ ہے، میرا یہ بیٹا“ اس نے شاہنواز کی طرف اشارہ کیا۔ ”آوارہ  
 اور بدعاش ہے۔ اس نے ان لڑکیوں پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ میں ان لڑکیوں کی ضمانت دینے آیا ہوں۔“  
 ”بابا سائیں۔ آپ سچ میں نہ بڑیں۔ یہ لڑکیاں جاسوس ہیں۔“ شاہنواز بولا۔

”تمہاری شرافت کو تو سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔“ احمد علی نے کہا۔ ”تم نے ہمارے خاندان کی  
 رسوائی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شرم آتی چاہئے نہیں۔“

”شاید ان لڑکیوں نے آتے ہی تم لوگوں پر جادو کر دیا ہے۔“ شاہنواز نے اسے گھورا۔  
 اس دوران باہر بہت سی گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ ایک کانشیل بدحواسی کی حالت میں  
 دوڑتا ہوا اندر آیا۔

”آئی جی صاحب آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ڈی آئی جی اور ایس پی صاحب بھی ہیں۔“ کانشیل نے  
 کہا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا۔

”اوہ۔ انہیں شاید ان جاسوس لڑکیوں کی گرفتاری کی اطلاع مل گئی ہے۔“ سب انپکٹر گڑبڑا گیا۔ وہ  
 تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

نائلہ کو حیرت تھی کہ اگر آئی جی صاحب اس سلسلے میں آئے تھے تو انہیں ان کے پکڑے جانے کی  
 اطلاع کیسے ملی تھی۔

”مج تم فون پر آئی جی صاحب سے باتیں کر رہی تھیں تو میں نے سب کچھ سن لیا تھا۔“ غزالہ نے نائلہ  
 کی طرف جھپٹتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”جب یہ لوگ تمہیں پکڑ کر لائے تھے تو میں نے آئی جی صاحب کو فون کیا  
 تھا۔ بڑی مشکل سے ان سے رابطہ ہو سکا تھا۔ میں نے تمہارا نام لے کر انہیں ساری بات بتادی تھی۔ میرا  
 خیال تھا وہ تمہانے والوں سے فون پر بات کریں گے لیکن وہ خود چلے آئے۔“  
 ”اوہ۔“ نائلہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

تھانے میں کھلبلی سی بچ مچ گئی تھی۔ کھٹا کھٹ اڑیاں بچ رہی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد آئی جی صاحب اور دیگر  
 پولیس افسران کمرے میں داخل ہوئے۔ سب انپکٹر بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ بہت بری طرح بوکھلایا ہوا  
 تھا۔

”سر۔ یہ ہیں وہ تینوں بھارتی جاسوس لڑکیاں جنہیں ہم نے گرفتار کیا ہے۔ ان سے بہت سے سنسنی خیز

عکسفات کی توقع ہے۔ سب انسپکٹر نے کہا۔

”آپ تینوں میں نائلہ کون ہے؟“ آئی جی صاحب باری باری ان تینوں کی طرف دیکھنے لگے۔

”میں نائلہ ہوں۔“ نائلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”آفرین۔“ آئی جی صاحب نے آگے بڑھ کر نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”قوم کی بیٹیوں میں وطن سے بہت کا یہ جذبہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اس قوم کو شکست نہیں دے سکتی۔“

”یہ تو ہمارا فرض تھا سر۔“ نائلہ نے کہا اور پھر سسی اور سلطانہ کا تعارف کرانے لگی۔ ”یہ سلطانہ ہے سر اور یہ سسی۔ یہ دونوں میری سرگرمیوں میں برابر کی شریک ہیں۔ سلطانہ اگر ہمارا ساتھ نہ دیتی تو ہم کچھ کی نہیں کر سکتی تھیں۔“

آئی جی صاحب نے آگے بڑھ کر ان دونوں کے سروں پر بھی ہاتھ پھیرا۔ صورتحال بدلتی دیکھ کر شاہنواز اموشی سے باہر نکل گیا تھا۔ سب انسپکٹر بھی بدحواس ہو رہا تھا۔ آئی جی صاحب جس طرح پکڑی جانے والی ن جاسوس لڑکیوں سے شفقت کا مظاہرہ کر رہے تھے اس سے سب انسپکٹر کو اپنی شامت صاف نظر آرہی تھی۔

”سب انسپکٹر۔“ آئی جی صاحب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”لیس سر۔“ سب انسپکٹر ایک دم اٹنیشن ہو گیا۔

”تمہیں ان کے بارے میں اطلاع کیسے ملی تھی۔“ آئی جی صاحب نے پوچھا۔

”یہ خواتین غیر قانونی طور پر سرحد پار کرتے ہوئے رینجرز کی نظروں میں آگئی تھیں، یہ رینجرز کے ایک ان سے رانقل اور جیب چھین کر بھاگ نکلیں۔ انہوں نے ڈیلو کے قریب ایک وڈیرے کی حویلی میں پناہ اور اسے بھی غصہ دے کر بھاگ نکلیں۔ اس وڈیرے کو پتہ چل گیا کہ یہ تینوں کراچی میں اس کے والد کے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ وہ خود کراچی آیا اور ان کی نشاندہی کی۔ ہم کو بھی پریڈ کر کے انہیں یہاں لے گئے۔“ سب انسپکٹر نے تفصیل سے بتایا۔

”تم نہیں جانتے ان لڑکیوں نے وطن کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر کیا کارنامے انجام دیئے۔ یہ تینوں ہمارے لئے قابل فخر اور قابل احترام ہیں۔ وہ وڈیرے کہاں ہے جس نے ان کے بارے میں اطلاع دی تھی۔“ آئی جی صاحب نے پوچھا۔

”وہ.....“ سب انسپکٹر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”وہ..... وہ کہاں گیا؟“

”فوراً ہی پتہ چل گیا کہ شاہنواز تھانے سے بھاگ گیا ہے۔ نائلہ نے وڈیرہ کریم بخش، احمد علی اور غزالہ تعارف کرایا۔

”میں اس شخص کا بد نصیب باپ ہوں جس نے میری عزت کو پامال کیا اور مجھے کہیں منہ دکھانے کے لئے نہیں چھوڑا۔“ وڈیرے کریم بخش نے کہا۔

”آپ ہمارے لئے قابل احترام ہیں۔“ آئی جی صاحب نے وڈیرے کو گلے سے لگالیا۔ ”آپ پریشان ہوں۔ ہم اسے بھی سیدھے راستے پر لے آئیں گے۔“

”میرا غریب خانہ زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ ایک پالی چائے.....“

”ضرور ضرور۔“ آئی جی صاحب نے وڈیرہ کریم بخش کی بات کاٹ دی۔ ”یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ سب آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیں گے کہ آپ نے ان بچیوں کو اپنے ہاں پناہ دے کر حکومت پر بہت بڑا

احسان کیا ہے۔“

”یہ میری بچیاں ہیں صاحب۔“ وڈیرہ کریم بخش نے کہا۔ ”احسان کی کوئی بات نہیں۔“ اور پھر پولیس افسران کا یہ جلوس وڈیرہ کریم بخش کی کونٹھی پر پہنچ گیا۔ جن لوگوں نے کچھ دیر پہلے پولیس کے چھاپے اور نائلہ وغیرہ کی گرفتاری کا منظر دیکھا تھا وہ یہ دلچسپ منظر بھی دیکھ رہے تھے کہ پولیس کے اعلیٰ ترین افسران وڈیرہ کریم بخش کے ممان تھے۔

”تم لوگ راجستان کیسے پہنچی تھیں؟“ آئی جی نے نائلہ سے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی داستان ہے۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس میں میرے کچھ اپنوں کا ہاتھ ہے اور کچھ انسپکٹر صوبہ خان کا..... جو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ میں اور سسی اس کی ذاتی جیل سے بھاگ کر نکلیں تو بخش علی لاشاری میں اس ہندو سینٹھ کے ہاتھ لگ گئیں جس کے بارے میں انکشاف ہوا کہ وہ اسمگلر ہی نہیں را کا ایجنٹ بھی ہے۔ وہ پاکستانی نوجوانوں کو چالس کر راجستان ٹرننگ کمپ میں بھیجتا ہے۔ اس نے ہمیں بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ راجسھستان کی سرحد کی طرف بھیجا تھا لیکن ہم راستے میں بھاگ نکلیں اور ریگستان میں بھٹک کر نجانے کس طرح سرحد پار پہنچ گئیں۔ یہاں سے ہمیں گرفتار کر کے اس کمپ میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ سے ہماری ملاقات اسی کمپ میں ہوئی تھی۔ اس نے ہمارا بڑا ساتھ دیا۔ راجستان کے اسی کمپ میں جن لوگوں کو یہاں سے دہشت گردی اور تخریب کاری کی تربیت کے لئے بھیجا جاتا تھا انہیں دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ ان میں بعض تو واقعی جرائم پیشہ تھے جو مختلف سنگین جرائم میں یہاں کی پولیس کو مطلوب ہیں اور بعض اچھے گھروں سے تعلق والے تعلیم یافتہ نوجوان..... میرا تجربہ ہے کہ ایسے نوجوانوں کو بگاڑنے میں ان کے گھر والوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جب گھروں سے ان کے مطالبات پورے نہیں ہوتے تو وہ رقم حاصل کرنے کے لئے دوسرے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ چوری، رہنمی اور پھر بڑے پیمانے پر ڈکیتیاں، اس طرح یہ لوگ دشمن کے ایجنٹوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور ان کے آلہ کار بن کر ملک کی سلامتی کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔“

”تمہارا تعلق کہاں سے ہے۔ تم انسپکٹر صوبہ خان کے ہاتھ کیسے لگیں؟“ آئی جی نے پوچھا۔

”میرا تعلق رحیم یار خان سے ہے۔ درانی فیملی کم از کم دو صدیوں سے اس علاقے میں آباد ہے۔ اس فیملی کو اس علاقے کی معزز ترین فیملی سمجھا جاتا ہے لیکن اب ساری عزت خاک میں مل چکی ہے۔ دولت کی ہوس نے ہمارے خاندان کے بعض لوگوں کو اندھا کر رکھا ہے۔ وہ اپنے ہی خاندان کی عزت کو مٹی میں ملانے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں ان کی جائیداد کی اکیلی وارث ہوں۔ گردنوں کی زرعی اراضی اور شہری جائیداد ہے۔ میری سگی چھوٹی میری اس جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتی تھی مگر میرے انکار پر وہ میری دشمن ہو گئی۔ میرے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دی گئیں۔ مجھے قتل اور دیگر سنگین مقدمات میں پھنسانے کی کوشش کی گئی۔ میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھاگتی رہی۔ مجھ پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ لیکن میں بچتی رہی۔ سندھ کے ایک پولیس انسپکٹر صوبہ خان کو پانچ لاکھ روپے دے کر مجھے قتل کرانے کی کوشش کی گئی۔ میں اس کے شکنجے سے بھاگ نکلی۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا، میں زخمی حالت میں سندھ کے جنگل میں واقع ایک غریب سندھی کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے مجھے مرنے سے بچایا۔ مجھے بٹی کی طرح رکھا۔ یہ سسی اسی غریب سندھی کی بیٹی ہے۔ انسپکٹر صوبہ خان کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ میں کہاں چھپی ہوئی ہوں۔ وہ میری تلاش میں وہاں پہنچ گیا اور اسلحہ کے زور پر میرے ساتھ

سسی کو بھی اٹھا کر لے گیا۔ ہمیں گھونکی کے قریب ایک حویلی میں قید رکھا گیا۔ ہم دونوں اس حویلی سے بھاگ نکلیں اور بخش علی لاشاری نامی قبے کے قریب ایک ہندو سیٹھ کے ہاتھ لگ گئیں۔ وہ ہندو اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار ہے۔ اس کی کئی جنگ فیکٹریاں ہیں۔ وہ پاکستان سے اناج، کھج، تیل اور دیگر اجناس بھارت کو اسمگل کرتا ہے۔ ہم سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے دھوکے سے ہم دونوں کو بھی سرحد پار بھیجنے کی کوشش کی لیکن ہمیں اس سازش کا پتہ چل گیا اور ہم صحرا میں اس کے آدمیوں کو دھوکا دے کر بھاگ نکلیں اور ریگستان میں بھٹکتی ہوئی سرحد پار پہنچ گئیں۔ ہمیں سرحد کے دوسری طرف ہندوؤں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پناہ مل گئی۔ مگر اس گاؤں کے مندر کا پجاری بہت کینہ آدی تھا۔ اس کی وجہ سے ہم پولیس کے ہاتھ لگ گئیں اور ہمیں رام گڑھ کے اس کیمپ میں پہنچادیا جہاں پاکستانی نوجوانوں کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے۔ سلطانہ ہم سے پہلے وہاں موجود تھیں۔ ہم تینوں نے کیمپ کے افسروں کا اعتماد حاصل کیا اور اس کیمپ کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگیں۔ اس دوران ہمیں کیمپ کے کچھ اور راز معلوم ہو گئے۔ ایک ایسی کتاب بھی مل گئی جس میں آپ کے اور دیگر اعلیٰ افسران کے خفیہ فلی فون کوڈز بھی تھے۔ ان کے پاس ایسے آلات تھے جن کی مدد سے آپ کے اور دیگر افسران کے فون پر ہونے والی گفتگو سن لیتے تھے۔ ہم نے وہ کوڈ نمبر معلوم کر لئے۔ اس دوران مجھے آپ کو وہ اطلاعات فراہم کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے بروقت کارروائی کر کے دشمن کے ان منصوبوں کو ناکام بنادیا۔

ہم نے اس کیمپ کی تباہی کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ایک کیمپ کی تباہی سے ان پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔ راجستان میں ایسے کئی کیمپ قائم ہیں جہاں پاکستانی نوجوانوں کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے۔ لیکن اس ایک کیمپ کی تباہی سے ان کی سرگرمیاں کسی حد تک ماند پڑ سکتی تھیں۔ قدم قدم پر ہمیں خطرات کا سامنا تھا۔ کیمپ کی تباہی کے بعد پورے ہندوستان میں ہماری تلاش شروع ہو گئی۔ ہم قدم قدم پر موت کو ٹھکت دیتی رہیں اور اسمگلروں کی ایک پارٹی کے ساتھ سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس کے بعد جو بھی حالات پیش آئے ہیں وہ آپ کو بتا چکی ہوں۔

”جو لوگ یہاں بھارتیوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں انہیں جانتی ہو؟“ آئی جی صاحب نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”ایک تو وہی ہندو سیٹھ ہے جس کے بارے میں آپ کو بتا چکی ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”انسپکٹر صوبہ خان اس کے ساتھ جرائم میں برابر کا شریک ہے۔ وہ اناج کی اسمگلنگ میں بھی اسے تحفظ فراہم کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو دہشت گردی کی تربیت حاصل کر کے آئے ہیں اور یہاں معصوم اور بے گناہ لوگوں پر موت برسا رہے ہیں۔“

”چند روز پہلے رحیم یار خان سے تعلق رکھنے والے دلاور نامی ایک نوجوان اور رائے منصور نامی ایک زمیندار نے صوبہ خان کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دی تھی۔ میں نے بعض ذمے دار افسران کے ذریعے تحقیقات کرائی تو الزامات درست ثابت ہوئے۔ انسپکٹر صوبہ خان کی فوری معطلی اور گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے گئے، لیکن وہ فرار ہو گیا۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ امید ہے کہ وہ جلد ہی گرفت میں آجائے گا۔“ آئی جی صاحب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے۔ ”اس ہندو سیٹھ کے بارے میں بھی میں نے آج صبح ہی احکامات جاری کر دیے تھے۔ مجھے امید ہے کہ آج رات اسے بھی حراست میں لیا جائے گا۔ ان کے علاوہ دہشت گردوں کے بارے میں کچھ جانتی ہو تو ان کے نام بتاؤ۔“

”بہت سے نام ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”فوری طور پر ان کے پتے ذہن میں نہیں آرہے جیسے ہی یاد آتے جائیں گے میں بتاتی رہوں گی۔“

”ایک کے بارے میں تو میں آپ کو ابھی بتا سکتی ہوں۔“ سلطانہ نے پہلی بار ان کی گفتگو میں حصہ لینے ہوئے کہا۔ ”شاید نام ہے اس کا اور وہ فیڈرل بی ایریا میں رہائش پذیر ہے۔ وہ بھی میاں را کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ مجھے اس نے سرحد پار پہنچایا تھا۔ اس کے علاوہ فیڈرل بی ایریا ہی میں ایک طوائف کا بچہ بھی بھارتی ایجنٹوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بظاہر نہایت شریف اور معزز نظر آنے والی وہ عورت دراصل ایک سلاٹر ہے۔ وہ بڑے بڑے لوگوں کو لڑکیاں سلائی کرتی ہے اور عیاشی کے لئے بچکے میں آنے والے نوجوانوں کی قابل اعتراض حالت میں فلمیں بنا کر انہیں بلیک میل کرتی ہے اور پھر انہیں ملکی سلامتی کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔“

”کیا آپ ان کے ایڈریس بتا سکتی ہیں؟“ اس مرتبہ ڈی آئی جی صاحب نے پوچھا۔  
”شاید کے بچکے کا نمبر تو بتا سکتی ہوں لیکن اس طوائف کے بچکے کی نشاندہی کے لئے مجھے خود جانا پڑے گا۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

آئی جی اور ڈی آئی جی صاحب کچھ دیر آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے مس سلطانہ! آج رات گیارہ بجے ہم بیک وقت دونوں مقامات پر ریڈ کریں گے۔ دس بجے کے قریب گاڑی آپ کو لینے کے لئے پہنچ جائے گی۔“

”جی ٹھیک ہے۔ میں تیار رہوں گی۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔  
اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ آئی جی اور ڈی آئی جی صاحب دوڑیرہ کریم بخش سے گلے ملے۔ دوڑیرہ کریم بخش بہت خوش تھا۔

”اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو دو مسلح کانسٹیبل حفاظت کے لئے یہاں تعینات کر دیئے جائیں؟“ ڈی آئی جی نے دوڑیرہ کریم بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”جیسے آپ مناسب سمجھیں جناب۔“ دوڑیرہ کریم بخش نے جواب دیا۔

ڈی آئی جی نے اس علاقے کے تھانہ انچارج سب انسپکٹر کو فوری طور پر یہاں دو کانسٹیبل تعینات کرنے کا حکم دیا اور پھر وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ دوڑیرہ کریم بخش اور اس کا بیٹا احمد علی انہیں رخصت کرنے کے لئے گیٹ تک آئے تھے۔ گلی میں کچھ لوگ اب بھی کھڑے تھے۔ پہلے کوٹھی پر چھاپے اور پھر اعلیٰ ترین پولیس افسران کی آمد ان سب کے لئے حیرت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اور ان پولیس افسران کے جانے کے بعد دو مسلح کانسٹیبلوں کو کوٹھی کے گیٹ پر تعینات دیکھا تو ان کی حیرت دوچند ہو گئی۔

یہ لوگ دوبارہ ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ دوڑیرہ کریم بخش توصیفی نگاہوں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان لڑکیوں کی ہمدردی پر اسے حیرت بھی تھی اور خوشی بھی لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے بیٹے شائخواز کے کردار پر اسے افسوس بھی ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد غزالہ ان تینوں کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

ٹھیک دس بجے پولیس کی ایک جیپ کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئی۔ سلطانہ تیار بیٹھی تھی۔ نائلہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔ فیڈرل بی ایریا کے تھانے تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہاں علاقے کے ایس بی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب بھی موجود تھے۔ پولیس کی دو چھاپے مار پارٹیاں تیار تھیں لیکن انہیں

علم نہیں تھا کہ چھاپہ کہاں مارتا ہے۔ روانگی سے تھوڑی دیر پہلے ایس بی کی نگرانی میں ایک چھاپہ مار پارٹی کو بریٹنگ دی گئی۔ شاہد کے مکان کی لوکیشن سمجھا کر انہیں بتادیا گیا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ پارٹی ایس بی صاحب کی نگرانی میں روانہ ہو گئی۔

دوسری پارٹی میں ایک ڈی ایس پی بھی شامل تھا اور ڈی آئی جی صاحب نے اس پارٹی کی نگرانی کرنے کا خود فیصلہ کیا تھا۔ پونے گیارہ بجے یہ پارٹی بھی روانہ ہو گئی۔ نالہ اور سلطانہ ڈی آئی جی کی گاڑی میں تھیں۔ سلطانہ انہیں بتا رہی تھی کہ کس طرف جانا ہے۔

یہ بڑی غیر معمولی بات تھی کہ پولیس کے اعلیٰ ترین افسران چھاپہ مار کارروائیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ عام طور پر اعلیٰ افسران اپنے ایئر کنڈیشن کمروں میں بیٹھ کر احکامات جاری کیا کرتے تھے اور چھوٹے افسران ہی قربانی کے بکرے بنتے تھے لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ اعلیٰ ترین افسران چھاپہ مار پارٹیوں کو لیڈ کر رہے تھے۔

فیڈرل بی ایریا میں ہلاک بارہ کی ایک گلی کے موڑ پر سلطانہ نے گاڑی روکنے کو کہا اور گلی میں واقع ایک بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”وہ جس بنگلے کے گیٹ کے ساتھ ناریل کے دو درخت نظر آرہے ہیں وہی بنگلہ ہے۔“

ڈی آئی جی صاحب گاڑی سے اتر آئے۔ دوسرے افسران بھی اتر آئے تھے۔ اس بنگلے کے سامنے دو قیمتی کاریں بھی کھڑی تھیں۔ ڈی آئی جی صاحب نے ڈی ایس پی سے کچھ کہا۔ ڈی ایس پی نے دونوں موبائلوں کو حکم دیا۔ ایک موبائل تیزی سے پچھلی گلی میں چلی گئی اور دوسری موبائل کے جوانوں نے اتر کر گلی میں پوزیشن سنبھال لی۔ ڈی ایس پی ایک اے ایس آئی اور دو تین مسلح کانسٹیبلوں کو لے کر بنگلے کے سامنے پہنچ گیا۔ بنگلے میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ جس سے اندازہ ہوا کہ بنگلے والوں کو پولیس کی آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ ڈی ایس پی اور پولیس کے جوان جیسے ہی بنگلے کے گیٹ میں داخل ہوئے برآمدے کی طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ کسی آٹونیک رائفل سے کی جا رہی تھی۔ ایک گولی ایک کانسٹیبل کے بازو پر لگی۔ وہ چیخ کر گرا۔ ڈی ایس پی اور جوانوں نے فوراً ہی ادھر ادھر کر پوزیشن سنبھال لی۔

”فائر!“ ڈی ایس پی نے چیخ کر حکم دیا۔

پولیس اہلکاروں نے فائر کھول دیا۔ کچھ ہی دیر بعد پچھلی گلی سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پورا علاقہ فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

ایک آدمی برآمدے کے ایک ستون کی آڑھ سے نکل کر ایک طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ لیکن دو تین قدم بعد ہی وہ چیخ کر گرا۔ ایک کانسٹیبل کی رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے اس کا جسم پھینکی کر دیا تھا۔

”تم لوگ چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو۔“ ڈی ایس پی نے چیخ کر کہا۔ ”مقابلہ کرنا بیکار ہے۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔“

اندرا چند لمحے خاموشی رہی پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”فائرنگ روک دو۔ ہم باہر آرہے ہیں۔“

”ہولڈ فائرنگ۔“ ڈی ایس پی نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

صرف ایک منٹ بعد بنگلے کا برآمدے والا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت عورت ہاتھ اٹھا کر باہر

آئی۔ اس کے پیچھے تین لڑکیاں اور دو آدمی بھی تھے۔ وہ سب ہاتھ اٹھائے برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ ڈی ایس پی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر برآمدے میں گئے۔ ان کے ہاتھ میں کلاٹکوف رائل تھا۔ اے ایس آئی اور ایک کانٹیل بھی رائلیں تانے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

”انہیں لان میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دو۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کرے تو گولی ہے اڑا دیتا۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”یس سر۔“ اے ایس آئی نے کہا پھر ملزمان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”چلو۔۔۔ اس دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔“

دو کانٹیل انہیں رائلوں کی زد میں لے کر کھڑے ہو گئے۔ اسی دوران ڈی آئی جی صاحب بھی اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ نائلہ اور سلطانہ بھی تھیں۔ وہ خوبصورت دراز قامت عورت جو سب سے پہلے ہاتھ اٹھا کر باہر آئی تھی وہ فاشی کے اس اڈے کی مالکہ اور مشہور طوائف ممتاز تھی، وہ سلطانہ کو دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔

”ت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ وہ سلطانہ کی طرف دیکھ کر ہلکائی۔

”ہاں میں۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

...•••••

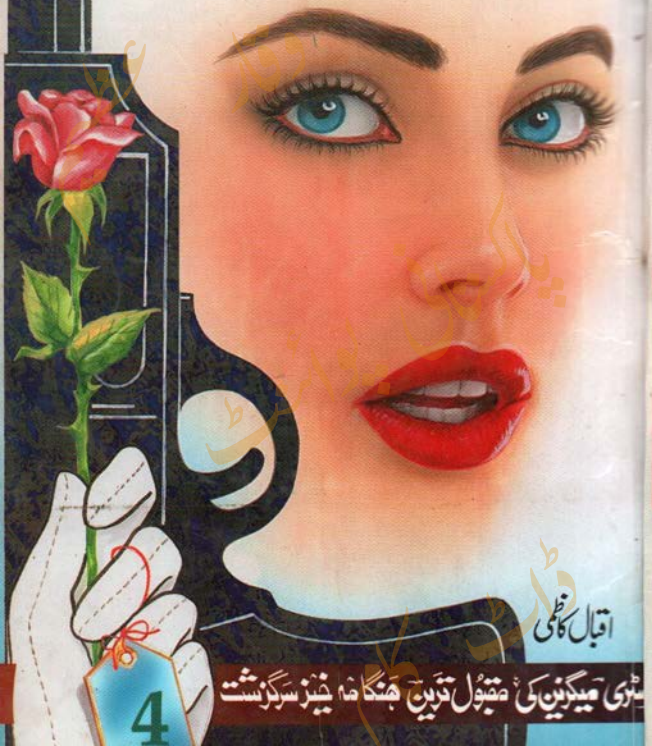
## دشت جنوں

مظلوم اور معصوم دو شیرہ نائلہ درانی کی لہو رنگ داستان کا تیسرا حصہ ختم ہوا مزید ہنگامہ خیز واقعات کے لئے دشت جنوں کی جلد نمبر 4 ملاحظہ فرمائیں

...•••••

سید عالم و شیرازی ہنگامِ غیظ و آستان

# دشمنِ جنوں



اقبال کاظمی

سٹری میگزین کی مقبول ترین ہنگامہ شیر سرگزشت

4



# 4

## دشت جنوں

### اقبال کاظمی

”تت..... تم.....“ وہ سلطانہ کی طرف دیکھ کر ہکلائی۔

”ہاں میں۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم سمجھتی تھیں کہ کوئی تمہیں پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ دیکھ لیا اپنا انجام۔ اب تمہاری باقی زندگی جیل ہی میں گزرے گی۔“

”او نہ۔“ مناز کے لہجے میں نفرت تھی۔ ”تم سمجھتی ہو کہ یہ پولیس والے مجھے زیادہ عرصہ تک اپنی کسٹڈی میں رکھ سکیں گے۔“

”پتہ چل جائے گا۔“ سلطانہ نے کہا۔

ڈی آئی جی صاحب برآمدے میں ڈی ایس پی کے ساتھ کھڑے تھے۔ پھر وہ ڈی ایس پی کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے ان لوگوں کے قریب آگئے۔ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک شہر کا بہت بڑا تاجر تھا اور دوسرا ایک صنعتکار۔ وہ دونوں ڈی ایس پی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان دونوں نے نظریں جھکا لیں۔

”یہ دونوں اس حرافہ کے خاص آدمی ہیں وقتاً فوقتاً“ اسے لمبی لمبی رقیں دیتے رہتے ہیں جو ملکی سلامتی کے خلاف استعمال ہوتی ہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔

”تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔“ ڈی آئی جی صاحب نے سلطانہ اور نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں ڈی آئی جی کے ساتھ ہنگلے سے باہر آگئیں۔ گلی میں لوگوں کا جھوم لگا ہوا تھا۔ وہ دونوں ڈی آئی جی کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ڈی آئی جی کے اشارے پر گاڑی حرکت میں آگئی۔ اور وہ لوگ تھانے پہنچ گئے۔

”مس سلطانہ۔“ ڈی آئی جی صاحب باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”آپ دونوں کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ گاڑی میں بیٹھے، ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔“

سلطانہ اور نائلہ گاڑی میں بیٹھی رہیں اور گاڑی حرکت میں آگئی۔



وہ دونوں جب وڈیرہ کریم بخش کی کوٹھی پر پہنچیں تو بارہ بجنے والے تھے۔ وہ سب لوگ ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا ادی؟“ سسی دوڑ کر سلطانہ کے پاس پہنچ گئی۔ ”وہ لوگ پکڑے گئے؟“  
 ”ہاں۔ پکڑے گئے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

وڈیرہ کریم بخش بہت خوش تھا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یہ تینوں اس کی اپنی بیٹیاں ہوں۔ اس رات وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ احمد علی بھی بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ غزالہ جب انہیں اوپر لے گئی تو وہ چاروں ایک ہی کمرے میں بیٹھی رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔

صبح نائلہ نے اخبار دیکھا تو اچھل پڑی۔ شاہد اور مناز کے اڈوں سے اسلحہ، کیرے، قابل اعتراض فیلوں کے کیسٹ اور پاکستان کے خلاف بہت سالز پچر بھی ملا تھا۔ ان کی شناسدیں پر پولیس رات بھر شہر کے مختلف مقامات پر چھاپے مارتی رہی تھی۔ اخبارات پولیس کی اس کارروائی کو بڑی اہمیت دے رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پولیس کے اعلیٰ ترین افسران خود ان چھاپے مار کارروائیوں کی قیادت کر رہے تھے۔ درجنوں افراد کو حراست میں لیا گیا تھا۔ پولیس نے رات کو چند ایسے معززین کو بھی گرفتار کیا تھا جو دہشت گردوں اور تحریک کاروں کی پشت پناہی کرتے ہوئے انہیں تحفظ اور سرمایہ فراہم کرتے تھے۔

اخبار میں نائلہ یا سلطانہ کا نام نہیں آیا تھا اور اس کی درخواست خود نائلہ نے کی تھی کہ ان کا نام اخبارات میں نہ آنے پائے۔ احمد علی صبح سویرے ہی کالج چلا گیا تھا۔ وڈیرہ کریم بخش اپنے کمرے میں تھا۔ البتہ غزالہ نے ان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا۔

”آج صبح سویرے بھائی کا ٹیلی فون آیا تھا۔“ غزالہ نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”کس کا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بھائی شاہنواز کا۔“ غزالہ نے بتایا۔ ”کہہ رہا تھا کہ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔“  
 ”مجھے افسوس ہے غزالہ۔“ نائلہ نے کہا۔ ”میری وجہ سے تمہارے بھائی.....“

”لعلت بھیجو اس پر۔“ غزالہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس نے تو تمہارے خاندان کی عزت کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ گھر سے باہر رہتا ہے تو ڈاکوؤں کے ساتھ گھومتا ہے۔ ماں اس کے غم میں کھل کھل کر مر گئی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اب نیا شوشہ چھوڑا ہے اس نے۔“

”کیسا شوشہ؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”کہہ رہا تھا کہ پولیس تم لوگوں کی وجہ سے اس کے پیچھے لگی ہے۔ وہ تم لوگوں کو معاف نہیں کرے گا بابا سائیں اور بھائی احمد علی کو بھی دھمکیاں دے رہا تھا کہ تم لوگوں کو گھر سے نکال دیں۔“

”ہوں۔“ نائلہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”ہماری وجہ سے تم لوگوں کو بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک آدھ دن میں ہم یہاں سے چلی جائیں گی۔“

”بالکل نہیں۔“ غزالہ نے کہا۔ ”بابا سائیں تم لوگوں کو نہیں جانے دیں گے۔“

”لیکن میں نہیں چاہتی کہ ہماری وجہ سے تم لوگوں میں رنجش پیدا ہو۔“ نائلہ نے کہا۔

”ہم لوگ تو پہلے ہی شاہنواز سے تنگ آ چکے ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔ ”بابا سائیں تو پہلے ہی کئی مرتبہ اسے عاق کرنے کے بارے میں سوچ چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اب وہ یہ فیصلہ کر ہی لیں گے۔“

نائلہ خاموش ہو کر رہ گئی۔ ان لوگوں کا خلوص دیکھ کر تو اس کا بھی دل چاہنے لگا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے

یہیں رہ جائے لیکن وہ ان کے لئے مسئلہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ آنے والے حالات کا خود اسے بھی علم نہیں تھا۔ اس نے راجستھان کے کیمپ میں رہتے ہوئے جو کچھ بھی کیا تھا اور پھر یہاں آکر اس نے پولیس سے جو تعاون کیا تھا جس کے نتیجے میں چند خطرناک مجرم پکڑے گئے تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اس سے خوش تھے۔ لیکن وہ صرف پولیس پر ہی تکیہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو یہاں سے فوراً ہی رحیم یار خان روانہ ہو جاتی اور حسینہ بیگم اور شبیر درانی کا حساب کتاب برابر کر دیتی لیکن کراچی کے حالات وہ دیکھ رہی تھی۔ یہاں دہشت گردوں کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا تھا، بھارت کے تربیت یافتہ دہشت گرد اور نخریب کار بے گناہوں پر گولیاں برس رہے تھے۔ معصوم اور بے گناہ عوام کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار جا رہا تھا۔ یہاں اسے شبیر درانی یا اس کے گروگوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ یہاں رہ کر دہشت گردوں کے خلاف کام کرنا چاہتی تھی اور ظاہر ہے جب وہ اس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہوگی تو غزالہ کے گھر والوں کے لئے بھی مسائل پیدا ہوں گے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے ان شریف لوگوں کے لئے کسی قسم کی مشکلات پیدا ہوں۔ شاہنواز تو ابھی سے دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔ غزالہ نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں سے اس کے تعلقات تھے۔ یقیناً ”کراچی میں بھی اس قسم کے لوگوں سے اس کے تعلقات ہوں گے اور اب اس کی وجہ سے وہ پولیس کو بھی مطلوب ہو گیا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی اور اگر وہ انتقامی کارروائی پر اتر آیا تو وزیرہ کریم بخش کے لئے بھی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ شاہنواز جیسے لوگ جنہیں اپنے ماں باپ کی عزت کا بھی خیال نہ ہو، ان سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس لئے نائلہ یہاں سے نکل کر اپنا کوئی اور بندوبست کرنا چاہتی تھی۔

نائلہ کے والد کے ایک دو دوست کراچی میں موجود تھے۔ وہ پیسے والے لوگ تھے۔ لیکن نائلہ ان کے ہاں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ کسی کے لئے مسئلہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اسی رات نائلہ نے موقع پا کر سلطانہ اور سسی سے مشورہ کیا۔

”سسی۔“ تم اگر چاہو تو اپنے گونگھ جاسکتی ہو۔ ہم وزیرہ کریم بخش سے کہہ کر تمہارا بندوبست کروادیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”نہیں ادی۔“ سسی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اب تو میرا مرنا جیتا تم دونوں کے ساتھ ہے۔ جہاں تم رہو گی میں بھی وہیں رہوں گی۔ تم نے تو مجھے زندگی کا ایک نیا رخ دکھایا ہے۔ ہمارے ہاں تو عورت کو پیشہ کمزور سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں جب جوان ہوتی ہیں تو انہیں بھیمز بکریوں کی طرح دوسرے گھروں میں ہانک دیا جاتا ہے۔ تم نے ہی تو مجھے بتایا ہے کہ عورت کمزور نہیں ہوتی۔ بہت بڑی طاقت ہے عورت کے ہاتھ میں۔۔۔۔ اور پھر دوسروں کے لئے جینے کا تو مزہ ہی کچھ اور ہے۔ نہیں ادی میں اپنے گونگھ نہیں جاؤں گی تم لوگوں کے ساتھ رہوں گی۔ یاد ہے کیمپ میں ہم تینوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا تھا۔“

”بہت فلسفہ آگیا ہے تمہیں۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”میں نے سب کچھ تم دونوں ہی سے تو سیکھا ہے۔“ سسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم تینوں آج سے پھر یہ عہد کرتی ہیں کہ ہم ہاں مارنا جیتا ایک ساتھ ہوگا ہم اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جنیں گے۔ اپنے لوگوں کے لئے جنیں گے۔“

”ہم تینوں۔۔۔۔۔“

”ہم تینوں۔۔۔۔۔“

دروازے کی طرف سے یہ آواز سن کر وہ تینوں اچھل پڑیں۔ ان تینوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا۔ غزالہ دروازے میں کھڑی تھی۔

”تم تینوں یہ بھول گئی ہو کہ اس گھر میں تمہاری ایک اور بہن بھی رہتی ہے۔“ غزالہ کہتے ہوئے آگے آگئی۔

”تم ہماری باتیں سن رہی تھی!“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”میں کمرے میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ باتوں کی آواز سن کر رک گئی اور پھر میں نے تم لوگوں کی ساری باتیں سن لیں۔ تم تینوں اگر سب کچھ کر سکتی ہو تو میں کیوں نہیں کر سکتی۔ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔“ غزالہ نے کہا۔

”سوچ لو غزالہ۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”ہم جس راستے پر چل رہی ہیں وہ بھید خطرناک ہے۔ قدم قدم پر موت کا سامنا ہے۔ اس میں وہ آرام و آسائش نہیں ہے۔“

”نائلہ اور تم دونوں اگر سب کچھ چھوڑ سکتی ہو تو میں کیوں نہیں چھوڑ سکتی۔“ غزالہ نے کہا۔ ”تو آئیے عہد کریں کہ ہم چاروں.....“ غزالہ وہ الفاظ دہرانے لگی جو کچھ دیر پہلے نائلہ نے سلطانہ اور سسی کے سامنے دہرائے تھے۔

”گڈ۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا غزالہ۔ یہ عہد ہم چاروں کا راز ہے جو کسی پانچویں کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ ہمارا یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔“ غزالہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اور پھر ان میں کچھ اور باتیں ہونے لگیں۔ اگلے روز غزالہ نے شام کے وقت ان تینوں کو تیار ہونے کے لئے کہا تو سلطانہ نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں..... کیا بات ہے؟ کہیں ہماری نمائش کرنی ہے کیا؟“

”بابا سائیں نے پیسے دیئے ہیں اور کہا ہے کہ تم لوگوں کے لئے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید لی جائیں۔“ غزالہ نے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی بھئی۔“ سلطانہ نے کہا۔

”ضرورت ہے۔“ غزالہ نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ تم لوگ میرے کپڑے پہن پہن کر ختم نہ کرو۔“

غزالہ کی اس بات پر دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نائلہ اور غزالہ بھی اس قہقہے میں شامل ہو گئیں۔

شام کی چائے پینے کے تھوڑی سی دیر بعد وہ چاروں شاپنگ کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔ گھر میں اگرچہ گاڑی موجود تھی اور ڈرائیور بھی تھا لیکن غزالہ نے ٹیکسی پر جانے کو ترجیح دی تھی۔ کوئٹہ کی گلیوں سے نکل کر کارساز والی سڑک پر آتے ہی انہیں ٹیکسی مل گئی اور وہ چاروں ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔

طارق روڈ پر لہنی چوک کے قریب انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور گھوم پھر کر شاپنگ کرنے لگیں۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ مختلف دکانوں پر شاپنگ کرتی ہوئی کوئلڈ ڈرنکس اور فروٹ چاٹ کی دکان پر آگئیں۔ چاٹ کھاتے کھاتے غزالہ کو اچانک ہی یاد آگیا کہ وہ ایک شاپنگ بیک کیفے لہنی سے ذرا آگے ایک دکان پر بھول آئی ہے۔

”تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ غزالہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”وہ دوکان یہاں سے کافی دور ہے۔ اکٹھے ہی چلتے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”نہیں۔ تم لوگ بیٹھو۔ میں سسی کو ساتھ لے جاتی ہوں۔“ غزالہ نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ مگر ذرا جلدی آجانا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی اور چیز کی تلاش میں دوسری دوکانوں میں جھانکنا شروع کر دو۔“ نائلہ نے کہا۔

”بس۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“ غزالہ کہتی ہوئی سسی کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ ان کے مانے کے پانچ منٹ بعد نائلہ اور سلطانہ بھی چائے والی دوکان سے نکل کر باہر آگئیں۔ دوکان کے اندر خاصی ٹھنکن تھی۔ باہر فٹ پاتھ پر تازہ ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔  
 دس منٹ گزر گئے۔ نائلہ اور سلطانہ بار بار اس طرف دیکھ رہی تھیں جس طرف سسی اور غزالہ گئی تھیں۔ دوکانوں کے سامنے بڑی رونق تھی۔ لوگ شاپنگ میں بڑی تھے۔ اچانک ایک آدمی ان دونوں کے قریب آکر رکا۔

”نائیلہ بی بی۔“ وہ آدمی نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”غزالہ بی بی آپ کو بلارہی ہیں۔ میرے ساتھ آئیے۔“

نائیلہ اور سلطانہ اس کے ساتھ چل پڑیں۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد ہی وہ شخص ایک سرمئی رنگ کی ہجیرو کے قریب رک گیا۔ ہجیرو کے نشیوں پر سیاہ پلاسٹک شیشس لگی ہوئی تھیں اور باہر سے یہ جانا مشکل تھا کہ اندر کوئی بیٹھا ہوا ہے یا نہیں۔

”گاڑی میں بیٹھے آپ لوگ۔“ اس شخص نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔  
 نائلہ آگے بڑھی اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ جس جگہ وہ کھڑی تھیں وہاں سے لبرٹی کی طرف ون دے ٹریفک تھا۔ نیز لبرٹی کی طرف گاڑیاں جاتو سکتی تھیں آ نہیں سکتی تھیں لیکن وہ ہجیرو وہاں کھڑی تھی اور اس کا رخ بھی لبرٹی کی طرف تھا۔ وہ دوکان لبرٹی سے کافی آگے تھی۔ اگر وہ شخص لبرٹی چوک پر غزالہ سے ملا تھا تو وہ گاڑی کو یہاں تک کیسے لایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی پہلے ہی سے یہاں کھڑی تھی۔ لیکن اس وقت نائلہ یا سلطانہ کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

نائیلہ جیسے ہی گاڑی میں داخل ہوئی ٹھنک گئی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آخری کونے میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے نائلہ پہلے تو اس کی شکل نہ دیکھ سکی لیکن پھر اس کی شکل دیکھتے ہی اس کا دل اچھل کر قلع میں آیا۔

وہ شاہنواز تھا۔ نائلہ نے تیزی سے پیچھے ہٹنا چاہا مگر شاہنواز اسے راقط کی زد پر لیتے ہوئے غرایا۔  
 ”خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ آواز نکلی تو آڑا دوں گا۔“

نائیلہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ انہیں ساتھ لانے والا شخص خوفناک نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس دور ان ایک اور آدمی کیس سے نکل کر گاڑی کے قریب آ گیا تھا۔ اس کے کندھے پر بھی آٹومٹک راقط لٹکی ہوئی تھی۔ نائلہ کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں گھس گئی۔ اس کے پیچھے جب سلطانہ گاڑی میں داخل ہوئی تو شاہنواز کو دیکھ کر اس کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ ہی وہ گن مین بھی گاڑی میں گھس گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔  
 گاڑی کی سیٹ کافی کشادہ تھی۔ ایک طرف شاہنواز بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ نائلہ اور سلطانہ تھی۔ آخر میں وہ گن مین تھا۔ اس طرح وہ دونوں شاہنواز اور گن مین کے درمیان دب کر رہ گئی تھیں۔ نائلہ کو

دروازے کی طرف سے یہ آواز سن کر وہ تینوں اچھل پڑیں۔ ان تینوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا۔ غزالہ دروازے میں کھڑی تھی۔  
 ”تم تینوں یہ بھول گئی ہو کہ اس گھر میں تمہاری ایک اور بہن بھی رہتی ہے۔“ غزالہ کہتے ہوئے آگے آگئی۔

”تم ہماری باتیں سن رہی تھی!“ نائلہ نے اسے گھورا۔  
 ”میں کمرے میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ باتوں کی آواز سن کر رک گئی اور پھر میں نے تم لوگوں کی ساری باتیں سن لیں۔ تم تینوں اگر سب کچھ کر سکتی ہو تو میں کیوں نہیں کر سکتی۔ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔“ غزالہ نے کہا۔

”سوچ لو غزالہ۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”ہم جس راستے پر چل رہی ہیں وہ بھید خطرناک ہے۔ قدم قدم پر موت کا سامنا ہے۔ اس میں وہ آرام و آسائش نہیں ہے۔“  
 ”نائلہ اور تم دونوں اگر سب کچھ چھوڑ سکتی ہو تو میں کیوں نہیں چھوڑ سکتی۔“ غزالہ نے کہا۔ ”تو آئیے عہد کریں کہ ہم چاروں.....“ غزالہ وہ الفاظ دہرانے لگی جو کچھ دیر پہلے نائلہ نے سلطانہ اور سسی کے سامنے دہرائے تھے۔

”مکذ۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا غزالہ۔ یہ عہد ہم چاروں کا راز ہے جو کسی پانچویں کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ ہمارا یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔“ غزالہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اور پھر ان میں کچھ اور باتیں ہونے لگیں۔ اگلے روز غزالہ نے شام کے وقت ان تینوں کو تیار ہونے کے لئے کہا تو سلطانہ نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”کیوں..... کیا بات ہے؟ کہیں ہماری نمائش کرنی ہے کیا؟“

”بابا سائیں نے پیسے دیئے ہیں اور کہا ہے کہ تم لوگوں کے لئے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید لی جائیں۔“ غزالہ نے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی بھئی۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 ”ضرورت ہے۔“ غزالہ نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ تم لوگ میرے کپڑے پہن پہن کر ختم نہ

کرو۔“  
 غزالہ کی اس بات پر دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نائلہ اور غزالہ بھی اس قہقہے میں شامل ہو گئیں۔

شام کی چائے پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ چاروں شاپنگ کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔ گھر میں اگرچہ گاڑی موجود تھی اور ڈرائیور بھی تھا لیکن غزالہ نے ٹیکسی پر جانے کو ترجیح دی تھی۔ کوٹھیوں کی گلیوں سے نکل کر کراساز والی سڑک پر آتے ہی انہیں ٹیکسی مل گئی اور وہ چاروں ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔

طارق روڈ پر لہری چوک کے قریب انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور محوم پھر کر شاپنگ کرنے لگیں۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ مختلف دکانوں پر شاپنگ کرتی ہوئی کولڈ ڈرنکس اور فروٹ چاٹ کی دوکان پر آ گئیں۔ چاٹ کھاتے کھاتے غزالہ کو اچانک ہی یاد آ گیا کہ وہ ایک شاپنگ بیک کیفے لہری سے ذرا آگے ایک دوکان پر بھول آئی ہے۔

”تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ غزالہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”وہ دوکان یہاں سے کافی دور ہے۔ اکٹھے ہی چلتے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”نہیں۔ تم لوگ بیٹھو۔ میں سسی کو ساتھ لے جاتی ہوں۔“ غزالہ نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ مگر ذرا جلدی آجانا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی اور چیز کی تلاش میں دوسری دوکانوں میں جھانکتا شروع کر دو۔“ نائلہ نے کہا۔

”بس۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“ غزالہ کہتی ہوئی سسی کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ ان کے جانے کے پانچ منٹ بعد نائلہ اور سلطانہ بھی چائے والی دوکان سے نکل کر باہر آ گئیں۔ دوکان کے اندر خاصی ٹھنڈ تھی۔ باہر فٹ پاتھ پر تازہ ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔  
 دس منٹ گزر گئے۔ نائلہ اور سلطانہ بار بار اس طرف دیکھ رہی تھیں جس طرف سسی اور غزالہ گئی تھیں۔ دوکانوں کے سامنے بڑی رونق تھی۔ لوگ شاپنگ میں بڑی تھے۔ اچانک ایک آدمی ان دونوں کے قریب آ کر رکا۔

”نائلہ بی بی۔“ وہ آدمی نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”غزالہ بی بی آپ کو بلا رہی ہیں۔ میرے ساتھ آئیے۔“

نائلہ اور سلطانہ اس کے ساتھ چل پڑیں۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد ہی وہ شخص ایک سرمئی رنگ کی پجیرو کے قریب رک گیا۔ پجیرو کے ٹیشوں پر سیاہ پلاسٹک شیٹس لگی ہوئی تھیں اور باہر سے یہ جانتا مشکل تھا کہ اندر کوئی بیٹھا ہوا ہے یا نہیں۔

”گاڑی میں بیٹھے آپ لوگ۔“ اس شخص نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔  
 نائلہ آگے بڑھی اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ جس جگہ وہ کھڑی تھیں وہاں سے لبرٹی کی طرف ون وے ٹریفک تھا۔ نیز لبرٹی کی طرف گاڑیاں جاتو سکتی تھیں آنی سکتی تھیں لیکن وہ پجیرو وہاں کھڑی تھی اور اس کا رخ بھی لبرٹی کی طرف تھا۔ وہ دوکان لبرٹی سے کافی آگے تھی۔ اگر وہ شخص لبرٹی چوک پر غزالہ سے ملا تھا تو وہ گاڑی کو یہاں تک کیسے لایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی پہلے ہی سے یہاں کھڑی تھی۔ لیکن اس وقت نائلہ یا سلطانہ کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

نائلہ جیسے ہی گاڑی میں داخل ہوئی ٹھک گئی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آخری کونے میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے نائلہ پہلے تو اس کی شکل نہ دیکھ سکی لیکن پھر اس کی شکل دیکھتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ شاہنواز تھا۔ نائلہ نے تیزی سے پیچھے ہٹا چاہا مگر شاہنواز اسے رائل کی زد پر لیتے ہوئے غرایا۔

”خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ آواز نکلی تو آزادوں گا۔“

نائلہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ انہیں ساتھ لانے والا شخص خوفناک نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس دوران ایک اور آدمی کہیں سے نکل کر گاڑی کے قریب آ گیا تھا۔ اس کے کندھے پر بھی آٹومیک رائل لٹکی ہوئی تھی۔ نائلہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں گھس گئی۔ اس کے پیچھے جب سلطانہ گاڑی میں داخل ہوئی تو شاہنواز کو دیکھ کر اس کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ ہی وہ گن مین بھی گاڑی میں گھس گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

گاڑی کی سیٹ کافی کشادہ تھی۔ ایک طرف شاہنواز بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ نائلہ اور سلطانہ تھی۔ آخر میں وہ گن مین تھا۔ اس طرح وہ دونوں شاہنواز اور گن مین کے درمیان دب کر رہ گئی تھیں۔ نائلہ کو



شاہنواز نے اور سلطانہ کو دوسرے گمن مین نے اپنی راتقل کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ آدمی جو انہیں بلا کر لایا تھا بڑی بھرتی سے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسٹیشنرنگ کے سامنے بیٹھ گیا اور انجن اشارت کر دیا۔  
 نائلہ کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ حلق میں کانٹے سے جھپٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے سلطانہ کی طرف دیکھا اور پھر باہر دیکھنے لگی۔ شیشوں پر نگلی ہوئی پلاسٹک شینس اس طرح کی تھیں کہ باہر سے اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا لیکن اندر سے باہر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔

ابھی رات کے آٹھ ہی بجے تھے۔ دوکانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر بڑی گھما گھمی تھی۔ لیکن کسی کو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس چل چل میں دو لڑکیوں کو اغواء کر کے لے جایا جا رہا تھا۔  
 تقریباً "بیس گز آگے جا کر نائلہ نے غزالہ اور سسی کو دیکھ لیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگ لٹکائے باتیں کرتی ہوئی تیز تیز قدموں سے چائے والی دوکان کی طرف جا رہی تھیں۔ نائلہ کا دل چاہا کہ وہ چچ کر غزالہ کو آگاہ کر دے۔ مگر شاہنواز نے بھی غزالہ کو دیکھ لیا تھا اور اس نے غالباً "نائلہ کی نیت بھی بھانپ لی تھی۔"  
 "خاموشی سے بیٹھی رہو۔" وہ اس کے پہلو پر راتقل کی ٹال کا دباؤ ڈالتے ہوئے غرایا۔ "آواز نکلی تو ٹرائیگر بادوں گا۔"

نائلہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ غزالہ اور سسی پیچھے رہ گئی تھیں۔ پجیرو لبرٹی چوک سے بائیں طرف علامہ اقبال روڈ پر مڑ گئی۔ آگے جا کر وہ گاڑی خالد بن ولید روڈ پر مڑ گئی اور کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک گلی میں گھوم گئی۔ اس گلی کے دونوں طرف بڑے بڑے رہائشی بنگلے تھے۔ پجیرو ایک اور گلی میں مڑ کر کارنر والے ایک بنگلے کے سامنے رک گئی ڈرائیور نے ہارن بجایا تو فوراً "ہی گیٹ کھل گیا۔ وہ پجیرو کو اندر لیتا چلا گیا۔

یہ ڈبل اسٹوری بنگلہ تھا۔ ناریل اور یوکلپس کے درختوں نے چاروں طرف سے اس بنگلے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پجیرو پورچ میں رک گئی۔ سلطانہ کے ساتھ بیٹھا ہو اگن مین دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور سلطانہ کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچنے لگا۔

"چھوڑ دو میرا ہاتھ۔ میں خود اتر رہی ہوں نیچے۔" سلطانہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔  
 "بڑی اکڑ ہے بھی تم میں تو۔" گمن مین مسکرایا اور پھر مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ "دیکھیں گے تمہاری اکڑ کب تک تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ تم جیسی چھوکیاں تو ایک منٹ میں سیدھی ہو جاتی ہیں۔"

نائلہ بھی نیچے اتر آئی تھی اور شاہنواز بھی..... دوسرے گمن مین نے ان دونوں کو راتقل کی زد پر لے رکھا تھا۔ ڈرائیور بھی انجن بند کر کے نیچے اتر آیا تھا۔ شاہنواز نے اپنی راتقل ڈرائیور کی طرف بڑھا دی۔  
 "انہیں اندر لے آؤ۔ یہ ہماری مہمان ہیں۔ ان کی کچھ خاطر تواضع تو کی جائے۔" وہ کہتے ہوئے پورچ کی میڑھیاں چڑھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

نائلہ اپنی جگہ پر کھڑی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ بنگلے کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ گیٹ کے اندر کی طرف بھی گری پر ایک گمن مین بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے گیٹ کھولا تھا۔ لان خاصا وسیع و عریض تھا۔ لان کے وسط میں دس پندرہ فٹ اونچی ایک مصنوعی پہاڑی بنی ہوئی تھی۔ اس پہاڑی پر بھی پودے بکثرت نظر آ رہے تھے۔ بائیں طرف بھی ایک کوٹھی تھی لیکن دائیں طرف کوٹھی کی دیوار سے ذرا ہٹ کر غالباً "مڑک تھی میاں سے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو۔ تمہیں یہاں سے بھاگنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔“ ڈرائیور نے نالکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھاگنے کا خیال دل سے نکال دو اور اندر چل۔۔۔۔۔ شاہنواز تو تم لوگوں سے ملنے کو بہت بے چین ہو رہا تھا۔“

وہ لوگ ان دونوں کو گمن پوائنٹ پر لے کر اندر آ گئے۔ وسیع و عریض ہال بڑے قیمتی ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ٹرائی پر بڑے اسکرین کا ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا اور ٹرائی کے نچلے حصے میں وی سی آر بھی نظر آ رہا تھا۔ شاہنواز سینئر ٹیبل کے قریب کھڑا تھا، ان دونوں کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

”وڈیہ شاہنواز جس لڑکی کو حاصل کر لینے کا ارادہ کر لیتا ہے تا تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔“ وہ نالکہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ مائی سکھن کو تم لوگوں نے کیا بٹی پڑھائی تھی کہ وہ تم لوگوں کے ساتھ حویلی سے بھاگنے پر تیار ہو گئی۔“

”وہ ایک غیرت مند عورت ہے۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ”وہ عورت ہے اور اچھی طرح جانتی ہے کہ عزت ہی عورت کا سرمایہ ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہمیں تمہاری حویلی سے نکالنے پر تیار ہو گئی تھی۔“

”مجھے شبہ تھا کہ وہ بابا سائیں کے پاس ہی جانے کی کوشش کرے گی کیونکہ اس کی بیٹی وہیں رہتی ہے نا۔ لیکن یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم تینوں بھی وہیں جاؤ گی اور میرے باپ، بھائی اور بہن کو بھی میرے خلاف بھڑکا دو گی۔“

”وہ شریف لوگ ہیں۔“ نالکہ نے کہا۔ ”لیکن تمہارا ضمیر مرچکا ہے۔ تم اپنے باپ کی عزت کو مٹی میں ملا رہے ہو۔ تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تمہاری بھی ایک جوان بہن ہے اور۔۔۔۔۔“

”مت نام لو میری بہن کا اپنی زبان سے۔“ شاہنواز چنچا۔

”کیوں؟“ نالکہ نے اسے گھورا۔ ”کیا دوسری عورتوں کی عزت نہیں ہوتی؟“

”میں ابھی تمہیں بتاؤں گا کہ عزت کیا ہوتی ہے۔“ شاہنواز غرایا۔ ”آئی جی اور ڈی آئی جی کے ساتھ تو تم نے بہت سیر کر لی۔ باتیں بھی کر لیں۔ پتہ نہیں تم نے ان لوگوں پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ تمہیں گرفتار کرنے کے بجائے عزت دے رہے ہیں۔ عزت تو ہم بھی دے سکتے ہیں بابا۔۔۔۔۔ بس ہمارے ساتھ سمجھو تو کر لو۔۔۔۔۔ خوش رہو گی۔“

”کوئی سمجھو شریف اور قابل اعتماد لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تم جیسے بد معاشوں اور ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں۔“ نالکہ نے جواب دیا۔

”یہ ڈاکو اور بد معاش بھی بڑے کام کی چیز ہوتے ہیں۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”ان سے تو بعض اوقات حکومتیں بھی کاہنتی ہیں اور بعض اوقات ان سے بڑے بڑے کام بھی لئے جاتے ہیں۔ یہی بد معاش، ڈاکو اور اسمگلر بعض اوقات حکومتوں کے لئے ایک مضبوط ستون کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔“

”وہ اور لوگ ہوتے ہیں۔“ نالکہ نے کہا۔ ”وہ تمہاری طرح مردہ ضمیر نہیں ہوتے۔ انہیں عورتوں کی عزت اور اپنے وطن کی سلامتی اور ناموس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تمہاری طرح کے بد معاش نہیں ہوتے جو اپنے ماں باپ کی عزت کو بھی خاک میں ملا دیتے ہیں۔“

”زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں چھو کر۔“ شاہنواز دھاڑا۔

”میری ایک بات یاد رکھو شاہنواز۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”محرم چاہے کتنا ہی چالاک اور طاقتور کیوں نہ ہو قانون کی زد سے بچ نہیں سکتا۔“

”قانون میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔“ شاہنواز نے کہا اور پھر کمرے میں کھڑے ہوئے ایک مگن مین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کھوکھر کے بچے کو بلاؤ تا نازا۔ ان چھو کریوں کو بھی پتہ چلے کہ ہم کیا چیز ہیں۔ قانون کے محافظ ہمارے سامنے کس طرح نظریں جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ڈی آئی جی اور آئی جی سے بات کر کے یہ چھو کری سمجھتی ہے کہ اس نے بڑا تیرمارا ہے۔“

وہ آدمی ایک سائینڈ نیبل کے قریب آیا جس پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ وہ فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لائن ملنے پر وہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر فون بند کر کے شاہنواز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کھوکھر گیارہ بجے آئے گا رئیس۔“

”ٹھیک ہے۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”اے بھی آ لینے دو۔ وہ بھی اس دعوت میں ہمارے ساتھ شریک ہو جائے۔ کیا یاد کرے گا وہ بھی۔“

”اس وقت تک ہم اپنا دل خوش کر لیں رئیس؟“ اس مگن مین نے کہا۔

”نیا ز۔“ شاہنواز نے اسے گھورا۔ ”تم میرے دوست ہو۔ میں تمہارا مہمان ہوں۔ یہ گھر تمہارا ہے۔

کیا تم اپنی روایات کو بھول گئے ہو کہ کھانے پر پہلے مہمان کا ہاتھ بڑھتا ہے اور میزبان کا ہاتھ بعد میں..... ارے بابا..... اتنے بے صبرے تو مت بنو۔ سب مل کر کھائیں گے۔“

”ٹھیک ہے رئیس۔“ نیا ز نے ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر اس وقت تک ان کا کیا کریں؟“

”ان کی خاطر تواضع کرو۔ چائے پانی کو پچھو۔ وی سی آر رکھا ہوا ہے انہیں کوئی اچھی سی فلم دکھاؤ۔ وقت پاس ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے رئیس۔ میں پہلے فلم لگا دیتا ہوں اور پھر چائے بنا کر لاتا ہوں۔ میرے نوکر کو تو تم نے چھٹی پر بھیج دیا ہے۔ سارے کام مجھے ہی کرنا پڑتے ہیں۔“ نیا ز نے کہا۔

”ارے بابا یہ گلو کس مرض کی دوا ہے۔ اس کو بولونا یہ بڑی اچھی چائے بتاتا ہے۔“ شاہنواز نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ ڈرائیور نے کلاشفکوف کندھے پر لٹکانی اور کچن کی طرف چلا گیا۔

نائلہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی جس جگہ ٹی وی رکھا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی اوپر جانے کا زینہ بھی تھا۔ نیا ز نے ٹی وی کا سوچ آن کر دیا اور وی سی آر پر فلم کا کیسٹ لگانے لگا۔

کچھ دیر بعد گلو چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے تمام کپ سینئر نیبل پر رکھ دیئے۔ ان تینوں نے تو ایک ایک کپ اٹھالیا لیکن سلطانہ اور نائلہ نے چائے کی طرف دیکھا تک نہیں۔

”ارے بابا۔ چائے تو پیو۔“ شاہنواز نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں خواہش نہیں ہے۔“ نائلہ نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”بہتر ہو گا کہ تم ہمیں یہاں سے جانے دو۔ ابھی بات آگے نہیں بڑھی۔ معاملہ یہیں ختم ہو سکتا ہے لیکن اگر ہمارے اغواء کی خبر پولیس تک پہنچ گئی تو تم لوگ بچ نہیں سکو گے۔ پولیس تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گی۔“

”ہم پولیس سے ڈرتے نہیں ہیں۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”پولیس کو تو ہم نے خود یہاں بلایا ہے تھوڑی دیر میں وہ یہاں آجائی گا۔ ہے تو وہ انسپکٹر لیکن دیکھ لینا کس طرح ہمارے قدموں کو چومتا ہے۔“

”میں بے ضمیر لوگوں کی بات نہیں کر رہی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”تم جیسے کیفے اور گھٹیا لوگوں کی بھی اس ملک میں کمی نہیں ہے۔ وہ پولیس انسپکٹر بھی تمہارے ہی جیسا کوئی ہو گا۔“

”بند کرو یہ بکواس۔“ شاہنواز دھاڑا پھر نیاز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نیاز یہ چھو کر کچھ زیادہ سی تیز لگتی ہے۔ تم اس دوسری چھو کر کو ذرا دوسرے کمرے میں لے جاؤ نا۔ میں اس کو دیکھتا ہوں۔“

”چلو چھو کر۔“ نیاز نے چائے کا کپ میز پر رکھ کر سلطانہ کو اشارہ کیا۔

”نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“ سلطانہ اکڑ گئی۔

”ارے چلو بھی۔“ نیاز نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹا ہوا باہر لے گیا۔

”گلف.... تم بھی جاؤ..... مگر دیکھنا اس چھو کر کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔“ شاہنواز نے کہا۔

گلو بھی سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ شاہنواز نے اٹھ کر دروازے کو کھٹک لگا دیا اور بچے تلے قدم اٹھاتا ہوا نائلہ کی طرف بڑھنے لگا۔ نائلہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ شاہنواز اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے۔

نائلہ کے لئے یہ صورتحال نئی نہیں تھی۔ جب سے اس کے ستارے گردش میں آئے تھے وہ اسی قسم کے حالات سے دوچار رہی تھی۔ سب سے پہلے شبیر درانی نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس کے گروں نے اسے روندنا چاہا تھا۔ اس کے بعد انسپکٹر صوبہ خان نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی اور پھر راجستان کیس میں تو اسے متعدد بار اس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس نے ہر مرتبہ اللہ پر بھروسہ کیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب رہی تھی۔ اب بھی اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ اسے اپنے اللہ پر کامل بھروسہ تھا۔

شاہنواز اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں سرنخی تھی۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”دیکھو لڑکی۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم شرافت سے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو تو آسانی رہے گی۔ بصورت دیگر....“

”تم اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“ نائلہ نے کہا۔

شاہنواز اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اچانک ہی اس نے جھپٹ کر نائلہ کو دو بچ لیا، نائلہ ایسی صورتحال کے لئے تیار تو تھی لیکن اسے شاہنواز سے اس پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ شاہنواز نے اسے دونوں ہانوں سے پکڑ لیا تھا اور اسے صوفے پر گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نائلہ نے جھٹکا دے کر اپنا ایک بازو پھرایا تو شاہنواز کا ہاتھ اس کی قبض پر پڑ گیا۔ قبض ایک جھٹکے سے پھٹ گئی۔ نائلہ کا کندھا برہنہ ہو گیا۔ شاہنواز کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے نائلہ کو صوفے پر گرا دیا۔

نائلہ پشت کے بل صوفے پر پڑی خوفزدہ سی نظروں سے شاہنواز کی طرف دیکھنے لگی۔ شاہنواز نے اس پر ہلکا ہلکا لگائی تو نائلہ بڑی پھرتی سے حرکت میں آ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شاہنواز صوفے پر گرا تھا مگر اس نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

نائلہ خوفزدہ رہنی کی طرح اٹھنے کے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ لیکن اب وہ شاہنواز کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار

تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ مارشل آرٹ کے ایک مخصوص اسٹانس میں آگے نکال لئے۔ شاہنواز کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ مارشل آرٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔  
 ”تم مجھے غصہ دلارہی ہو لڑکی۔“ شاہنواز غراتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے پہلے کی طرح نالکہ کو گرفت میں لینا چاہا تھا مگر نالکہ بڑی تیزی سے حرکت میں آئی تھی۔

نالکہ کی کھڑی ہتھیلی شاہنواز کی دائیں کلائی کی ہڈی پر لگی۔ شاہنواز بلبلاتا ہوا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ وہ ہاتھ جھٹکتا ہوا آگے بڑھتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھلی۔ اس کی راؤنڈ ہاؤس کلک شاہنواز کی گردن پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

شاہنواز نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے خوفزدہ سی نگاہوں سے نالکہ کی طرف دیکھا۔ نالکہ مخصوص اسٹانس میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ بلکہ وہ مخصوص چمک تھی جو ایسے موقعوں پر اس کی آنکھوں میں ابھر آیا کرتی تھی۔

شاہنواز اب بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مارشل آرٹس کے داؤ استعمال کر رہی ہے وہ یوں سمجھا تھا کہ نالکہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے یونہی ہاتھ پیر چلا رہی ہے۔

”تم مجھ سے بچ تو نہیں سکو گی۔“ وہ غراتے ہوئے پھر نالکہ کی طرف لپکا۔

نالکہ اب پوری طرح فارم میں آچکی تھی۔ اس نے شاہنواز کو قریب آنے کا موقع دیئے بغیر اس کے پہلو پر ایک اور زوردار کلک رسید کر دی۔ شاہنواز کراہتا ہوا دوہرا ہو گیا۔ نالکہ نے اس کی گردن پر ہلکا سا چوہ رسید کر دیا۔ شاہنواز منہ کے بل اس کے قدموں میں گرا لیکن گرنے کے ساتھ ہی اس نے بڑی پھرتی سے نالکہ کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ نالکہ ٹوکڑا کر پشت کے بل گری۔

شاہنواز نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر نالکہ پر چھلانگ لگادی۔ کوشش کے باوجود اس مرتبہ نالکہ بچ نہیں سکی۔ شاہنواز اس کے اوپر گرا تھا۔ نالکہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چٹان اس کے اوپر آن گری ہو.....  
 نالکہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس کی گرفت سے نہیں نکال سکی تھی۔ شاہنواز نے اب اس کے دونوں بازو بھی فرش پر لگا دیئے تھے۔

نالکہ نے بڑی سختی سے اپنے دانت بھیجنے رکھے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا سیدھا ہاتھ شاہنواز کی گرفت سے چھڑایا اور پوری قوت سے اس کے بال پکڑ کر کھینچنے لگی۔ اس کا چہرہ جیسے ہی اوپر ہوا نالکہ نے چوڑی ہتھیلی سے اس کی ناک پر ضرب لگائی۔ شاہنواز کراہا۔ نالکہ نے ایک اور ضرب لگائی۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی شاہنواز کی گرفت سے نکل گیا۔ نالکہ نے اب دونوں ہاتھوں سے اس پر حملے شروع کر دیئے۔ اس نے زور سے انگلی شاہنواز کی آنکھ میں ماری۔ شاہنواز کراہتا ہوا اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل رہا تھا۔

نالکہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شاہنواز بھی اٹھ گیا تھا مگر نالکہ نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ پے در پے اس پر بمکس برساتی رہی۔ شاہنواز کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اب وہ باقاعدہ چیخ رہا تھا۔ وہ بچنے کی کوشش کرتے ہوئے ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور نالکہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس پر پے در پے حملے کر رہی تھی۔

اب باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔ نالکہ کے خیال میں یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ شاہنواز نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور اب اسے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ نالکہ بھی دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

اس نے شاہنواز کو کہیں بھی نکلنے نہیں دیا۔ وہ اس پر پے در پے حملے کر رہی تھی۔  
 ”تم عورتوں کو اتنا کمزور سمجھتے ہو کہ وہ آسانی سے تمہاری ہوس کا شکار ہو جائیں۔ میں تمہیں اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ آئندہ کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکو۔“ نائلہ نے غراتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے شاہنواز کے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

شاہنواز ذبح ہوتے ہوئے بکمرے کی طرح بلبلاتا ہوا دوہرا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے رکھ لئے تھے۔ نائلہ نے اس کی ٹھوڑی پر ٹھوکر ماری۔ وہ الٹ کر پشت کے بل گرا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ نائلہ اس پر ٹھوکریں برساتی رہی۔ باہر نیاز یا گلو زور زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ پھر شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ گلو تھا اس نے دروازے کا اوپر کا شیشہ توڑ دیا اور ہاتھ اندر ڈال کر کنڈا کھول دیا۔ وہ دروازہ کھولتے ہی رائفل لے کر چچتا ہوا اندر آ گیا۔ شاہنواز کی حالت دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”اے چھوکر!..... چھوڑ دو اسے، ورنہ گولی مار دوں گا۔“ وہ چیخا۔  
 مگر نائلہ کے ہاتھ پیر نہیں رکے۔ گلو نے آگے بڑھ کر رائفل کا بٹ نائلہ کے کندھے پر مارا۔ نائلہ کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ کندھے کی ہڈی پر لگنے والی ضرب خاصی زوردار تھی لیکن اس نے شاہنواز پر حملے جاری رکھے۔ گلو نے رائفل کے بٹ سے ایک اور حملہ کیا۔ اس مرتبہ بھی ضرب شوٹڈر بلڈ پر لگی۔ نائلہ لڑکھڑائی۔ شاہنواز قائلین پر پڑا چیخ رہا تھا۔ نائلہ اسے ایک ٹھوکر مارنا چاہتی تھی کہ گلو نے اچانک ہی آگے بڑھ کر سر سے اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر ماری۔ نائلہ کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ گلو نے اسے دو تین ٹھوکریں مار دیں اور پھر رائفل تان کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”اب اگر تم نے حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ گلو غرایا۔

”نف ہے تمہاری مردانگی پر۔“ نائلہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”نہنی اور کمزور عورت پر اس طرح حملہ تم جیسے کینوں ہی کا کام ہے۔ رائفل چھوڑ دو پھر مجھ پر حملہ کر کے دیکھو۔“  
 ”تم پر تو ایسے حملے کریں گے کہ زندگی بھریا کر دو گی۔“ گلو غرایا اور پھر شاہنواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاہنواز قائلین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ گلو نے اسے سارا دے کر اٹھایا اور صوفے پر بٹھادیا۔ شاہنواز دونوں ہاتھ ناف پر رکھے کراہ رہا تھا نائلہ نے اس کی اچھی خاصی تواضع کر دی تھی۔  
 ”رہیں۔“ گلو نے کہا۔ ”اگر تم کو تو اس چھوکر کی کو گولی مار دوں۔“

”نہیں.... اسے اوپر والے کمرے میں بند کر دو اور دوسری چھوکر کی کو بھی۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”کسی مائی کے لال کو آج تک میرے اوپر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں پڑی۔ مگر اس چھوکر نے میرے پر ہاتھ اٹھا کر میرے قہر کو لٹکا رہا ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اسے اوپر لے جا کر بند کر دو۔“  
 ”چلو.... آگے لگو۔“ گلو نے نائلہ کو رائفل سے اشارہ کیا۔

نائلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی قبض دائیں کندھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے پھٹی ہوئی قبض کو سمیٹ لیا اور گلو کے ساتھ کمرے سے نکلتا ہی چاہتی تھی کہ ایک کمرے سے کسی مرد کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے دوسرے ہی لمحہ راہداری میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور نیاز لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اس کی بہت بری حالت ہو رہی تھی۔ قبض تار تار ہو رہی تھی۔ بال الجھے ہوئے اور چہرے پر خراشوں کے نشان تھے۔ نائلہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نیاز کی یہ حالت لمٹانے نے بنائی تھی۔

چند سینڈ بعد سلطانہ کمرے سے نکلے۔ اس کے چہرے پر درندگی تھی اور اس کے ہاتھوں میں نیاز والی رانفل تھی۔ لیکن اس کے باہر نکتے ہی گلو اس پر جھٹ پڑا اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلطانہ کے ہاتھ سے رانفل چھین لی تھی سلطانہ نے نائلہ کو دیکھا تو اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

گلو نے ایک رانفل نیاز کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ دونوں انہیں رانفلوں کی زد میں لئے دھکے دیتے ہوئے زینے سے اوپر لے آئے۔ اوپر بھی تین کمرے تھے انہیں ایک کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر کے نالہ لگا دیا گیا۔

نالہ اور سلطانہ کمرے کے وسط میں کھڑی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں پھر سلطانہ دوڑ کر نائلہ سے لپٹ گئی۔

”یہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”عورت کو کمزور سمجھنے والوں کو ایسا سبق سکھایا جائے گا کہ یہ زندگی بھر یاد کریں گے۔“

”ایسا ہی ہو گا۔“ نائلہ نے اس کی پشت چھتھپاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ یہ بیڈ روم تھا۔ فرش پر نیلے رنگ کا ایکر الک قالین بچھا ہوا تھا۔ بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ڈریسنگ ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ نائلہ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک دراز میں ایک ہتھوڑی چند کپلیں اور ایک اسکرپو ڈرائیور پڑا ہوا تھا۔ عقبی سمت میں اس کمرے کی ایک ہی کھڑکی تھی۔ نائلہ نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ کھڑکی میں آہنی سلاخوں والی گرل لگی ہوئی تھی۔ دوسری طرف تاریکی تھی۔ ٹارل کا ایک درخت کھڑکی کے اوپر مکان کی چھت پر جھکا ہوا تھا۔ نائلہ نے پردہ چھوڑ دیا اور ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگی۔ پھر اندر کھس کر بین میں منہ ہاتھ دھونے لگی۔

”منہ ہاتھ دھولو۔ حواس ٹھکانے آئیں تو کچھ سوچتے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

سلطانہ بھی ہاتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر آگئی۔ وہ دونوں پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئیں۔ انہیں یقین تھا کہ شاہنواز اور نیاز اپنی بیگانی کر رہے ہوں گے۔

اس کمرے میں کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی جس سے انہیں وقت کا اندازہ ہو سکتا۔ لیکن نائلہ کے خیال میں اس وقت دس بج رہے ہوں گے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھی سوچ رہی تھیں۔ دونوں فرار کے بارے میں سوچ رہی تھیں، دفعتاً نائلہ اٹھ کر ایک بار پھر ہاتھ روم میں کھس گئی اور روشن دان کا جائزہ لینے لگی۔ اس روشندان میں سلاخیں وغیرہ نہیں تھیں لیکن وہ روشندان بہت چھوٹا تھا۔ لبائی میں تو وہ ڈھالائی فٹ کے لگ بھگ تھا لیکن چوڑائی میں سات آٹھ انچ سے زیادہ نہیں تھا اس روشندان میں سے انسان کے بچے کا نکلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ ہاتھ روم سے باہر آئی تو سلطانہ کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ ٹارل کے درخت کا تھکڑی سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔

”اگر اس کھڑکی میں یہ گرل نہ ہوتی تو ہم اس درخت کے ذریعے آسانی سے فرار ہو سکتی تھیں۔“

سلطانہ نے کہا۔

”یہ گرل“ نائلہ چونک گئی۔ ”ایک منٹ.....“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے قریب پہنچ گئی اور دراز کھول کر اسکرپو ڈرائیور نکال لیا۔ ”میرا خیال ہے یہ اسکرپو ڈرائیور ہمارے کام آ سکتا ہے۔“

”اوہ گڈ۔“ سلطانہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس نے نائلہ کے ہاتھ سے اسکرپو ڈرائیور لے

لیا اور کھڑکی کی چوٹ میں لگی ہوئی سلاخوں والی گرل کا جائزہ لینے لگی۔ گرل کو اسکرپوز کے ذریعے  
میں فٹ کیا گیا تھا اور تمام اسکرپوز اندر کی طرف تھے۔ گرل فٹ کرنے کے بعد کھڑکی پر رنگ کیا گیا۔ اس  
سے تمام اسکرپوز کی جھریوں پر بھی رنگ جما ہوا تھا۔  
سلطانہ اسکرپوز ڈرائیور کی نوک سے ایک اسکرپو کا رنگ کھرپنے لگی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اسکرپو  
کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رنگ جما ہوا ہونے کی وجہ سے اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔  
تقریباً ”دس منٹ بعد وہ اسکرپو کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے نائلہ کی طرف  
دیکھا۔

”دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دو۔“ سلطانہ نے سرگوشی کی۔

نائلہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کا بولٹ چڑھا دیا۔ جب وہ واپس پلٹی تو سلطانہ دوسرے  
اسکرپو پر طبع آزمائی کر رہی تھی۔ بیشتر اسکرپو اس طرح لگے ہوئے تھے کہ ان میں اسکرپو ڈرائیور پھنسا مشکل  
ہو رہا تھا۔ ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ ایک طرف کے صرف تین اسکرپو نکال سکی تھیں۔ یہ اسکرپو کھلنے  
ہی گرل کی مضبوطی پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ کم از کم سات اسکرپو اور نکلتے تو گرل ایک طرف سے اکھڑ سکتی  
تھی۔ نائلہ چوتھے اسکرپو پر طبع آزمائی کر رہی تھی کہ باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ نائلہ نے اسکرپو ڈرائیور  
اور نکالے ہوئے اسکرپو قالمین کے نیچے چھپا دیئے اور وہ دونوں پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد قدموں کی  
آواز دروازے کے سامنے رک گئی۔ پھر نائلہ کھولنے کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔  
”دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ نہیں تو اسے توڑ دیا جائے گا۔“ یہ نیازی کی آواز تھی۔

قدموں کی آوازوں سے انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ تین چار آدمی تھے۔ نائلہ اور سلطانہ نے ایک  
دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سلطانہ نے اٹھ کر دروازے کا بولٹ گرا دیا۔

سلطانہ نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ دونوں کسی بھی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھیں۔ انہیں  
اگر خوف تھا تو صرف یہ کہ کھڑکی کی گرل ان کی نظروں میں نہ آجائے۔ نائلہ نے اگرچہ کھڑکی کے سامنے پردہ  
کھینچ دیا تھا لیکن ایک غدشہ تو بہر حال تھا۔

وہ تین آدمی تھے۔ نیاز، شاہنواز اور تیسرا آدمی پولیس انسپکٹر کی وردی میں تھا۔ درمیانہ قد، کندھی  
رنگت، منکے کی طرح نکلی ہوئی توند جس پر پتلون بڑی مشکل سے لگی ہوئی تھی۔ دائیں رخسار پر زخم کا ایک  
پرانا نشان تھا۔ سر پر اس نے ٹوپی ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ پولیس انسپکٹر سے زیادہ کوئی غنڈہ یا بد معاش ہی  
لگتا تھا۔ ہولسر میں ریوالتور ڈنکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں موبائل ٹیلی فون تھا۔ وہ گہری نظروں سے نائلہ اور  
سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اچھا تو یہ ہیں وہ دونوں لڑکیاں۔“ وہ بولا۔

”ارے بابا۔ ان کو لڑکیاں مت کہو۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”ہم دونوں کی یہ حالت دیکھ رہے ہو نا۔۔۔۔۔ یہ  
ہندوستان کی سرحد پار کر کے آئی ہیں۔ تربیت یافتہ ہیں، سرحد پر پکڑی گئی تھیں مگر یہ ریجنرز کے ایک جوان کی  
راکت چھین کر بھاگ نکلیں۔ پھر میری حویلی میں ایک رات رہیں۔ مجھے بے ہوش کر دیا اور کمندار کو گن  
پوائنٹ پر لے کر فرار ہو گئیں۔ کمندار کو گم جانتے ہو نا کیسا آدمی ہے، وہ بھی ان سے مار کھا گیا۔ مجھے پتہ  
چل گیا کہ یہ لوگ میرے بابا سائیں کے گھر پر گھری ہیں انہوں نے پتہ نہیں کیا پٹی پڑھائی کہ میرا باپ میری  
بہن اور میرا بھائی بھی میرے خلاف ہو گیا۔ میں نے انہیں پولیس کے ہاتھوں پکڑوا دیا مگر تھوڑی دیر بعد ہی



آئی جی ڈی آئی جی اور دوسرے افسر بھی تھانے پہنچ گئے۔ یہ تو کوئی بہت سی اونچی شے لگتی ہیں مجھے۔ ان کے لئے جگہ پر گاڑ بھی لگا دیئے گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ چھوکریاں کوئی اونچا کھیل کھیل رہی ہیں۔  
 ”ان کا کھیل جلد ہی ختم ہو جائے گا۔“ انسپکٹر نے ایک ہاتھ سے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔  
 ”بڑے بڑے لوگ دیکھے ہیں میں نے، یہ تو لڑکیاں ہیں۔ انسپکٹر کو کھر کے سامنے ایک سیکنڈ بھی نہیں تک سکیں گی۔“

”تو بابا کچھ کرونا ان کا۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”اسی لئے تو تمہیں بلایا ہے۔“  
 ”تم نے ان کے بارے میں جو کمائی سنائی ہے اس سے لگتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنی مشکل ہو جائے گی۔ ان کے ساتھ تو دوسرا طریقہ استعمال کرنا ہو گا۔“ انسپکٹر کو کھر نے کہا۔ ”میں ایسا طریقہ استعمال کروں گا کہ تمہاری بھی شکایت دور ہو جائے گی۔ ارے بابا یہ خود ہی تمہارے قدموں میں گریں گی۔“

”ایسا کب ہو گا بابا۔“ شاہنواز بولا۔ ”میرا تو جسم اب بھی دکھ رہا ہے۔ میں اس چھوکری کو اس طرح کلنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بھول جائے اور صرف میرا نام ہی یاد رکھے۔“  
 ”ہو جائے گا ریس۔“ انسپکٹر کو کھر نے کہا۔ ”ابھی ان چھوکریوں کو بیس رکھو۔ رات کے آخری پر میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔ میرا لاندھی والا مکان تو دیکھا ہے تا تم نے۔۔۔ اس مکان کے اندر کی سجاوٹ دیکھ کر تو بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ یہ چھوکریاں تو مکان میں داخل ہوتے ہی قدموں پر گر پڑیں گی۔“

”رات کے آخری پھر کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟“ شاہنواز نے پوچھا۔  
 ”اس وقت میرے علاقے میں کچھ گنڈ ہے۔ میں کہیں ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بھی بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔ تم تھوڑا اور انتظار کر لو۔“ انسپکٹر نے کہا۔  
 ”ایک بات کا خیال رکھنا کو کھر۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”یہ چھوکریاں آئی جی وغیرہ کی جیتی ہیں۔ بات باہر نہیں نکلی چاہئے۔ اگر کسی اور کو پتہ چل گیا تو تمہیں بھی لٹکا دیا جائے گا۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔“ انسپکٹر کو کھر نے کہا۔ ”ان کا تو ایسا بندوبست کروں گا کہ کسی کو ہوا تک نہیں لگے گی۔ اگر یہ سامنے آ بھی گئیں تو بولنے کے قابل نہیں رہیں گی اور پولیس کے بڑے سے بڑے افسران بھی ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔“ وہ دو قدم آگے بڑھ کر نالکے کے قریب پہنچ گیا۔ ”کیا تعلق ہے تمہارا پولیس کے ان بڑے بڑے افسران سے؟“ اس نے نالکے کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کرنا چاہا۔

”اپنے گندے ہاتھ دور رکھو مجھ سے۔“ نالکے نے غراتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”وہ ذمے دار افسران ہیں۔ انہیں اپنے فرض کا احساس ہے۔ وہ لوگ تمہاری طرح بددیانت، راشی اور جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرستی کرنے والے نہیں ہیں۔ یہ وردی تمہیں لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے دی گئی تھی لیکن اس وردی کو جسم پر سجا کر تم اپنے آپ کو قانون کے مالک سمجھ بیٹھے ہو۔ اپنے فرائض تو تم بھول گئے۔ تمہیں صرف یہ یاد رہ گیا ہے کہ جرائم پیشہ افراد اور وطن دشمن لوگوں کی سرپرستی کر کے دولت کمائی جاسکتی ہے۔ تمہیں یہ احساس نہیں کہ ان جیسے بے ضمیر لوگ وطن کو کس طرح نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ تم لوگ ہو جو دیکھ کی طرح اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ تم لوگ

اپنے اہمام سے نہیں بچ سکو گے۔“

”دیکھا..... دیکھ لیا تم نے کھوکھر..... یہ کس طرح بول رہی ہے۔“ شاہنواز بولا۔

”دیکھ رہا ہوں۔“ انیسٹر کھوکھر نے کہا۔ ”بس۔ چند گھنٹوں کی بات ہے۔ اس کے بعد اس کی ساری اکڑ اکل جائے گی۔ اس وقت تک اس کو حفاظت سے رکھنا۔ یہ یہاں سے بھاگ تو نہیں جائیں گی۔“ وہ کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

نالہ اور سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کن انکھیوں سے انیسٹر کھوکھر کی طرف دیکھنے لگیں۔ انیسٹر کھوکھر کو کھڑکی کا پردہ ہٹاتے دیکھ کر نالہ کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ انیسٹر کھوکھر نے کھڑکی کا پردہ دوسری طرف سے ہٹایا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے گرل کو پکڑ کر ایک دو جھٹکے دیئے، گرل مضبوط تھی۔ اس نے پردہ چھوڑ دیا۔ نالہ کے منہ سے اطمینان کا سانس نکل گیا۔ اگر انیسٹر کھوکھر پردہ اس طرف سے ہٹاتا جہاں سے انہوں نے اس کی طرف نکالے تھے تو فریم سے نکلے ہوئے اس کی نظروں میں آجاتے۔“

”کیا دیکھ رہے ہو کھوکھر؟“ شاہنواز نے پوچھا۔

”میں دیکھ رہا ہوں یہ چھوکر یاں یہاں سے بھاگ تو نہیں سکیں گی۔“ کھوکھر بولا۔

”یہاں سے کیسے نکلیں گی۔“ شاہنواز کے بجائے نیاز نے جواب دیا۔ ”کھڑکی پر مضبوط جنگلا لگا ہوا ہے۔

دروازے پر تالا ڈال دیں گے۔ یہ کیسے نکلیں گی یہاں سے۔“

”میں یہی دیکھ رہا تھا۔“ انیسٹر کھوکھر نے کہا۔ ”اب میں چلوں گا رنیں۔ آج میرے علاقے میں کچھ

زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ دیر تک باہر نہیں رہ سکتا۔“

”کس وقت آؤ گے تم؟“ شاہنواز نے پوچھا۔

”تین اور چار بجے کے درمیان پہنچ جاؤں گا۔“ کھوکھر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کریں گے۔“ شاہنواز نے کہا اور وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ دروازہ بند

کر کے باہر سے نالا لگادیا گیا۔

نالہ اور سلطانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ایک دوسرے سے پٹ گئیں۔ بلا

وقتی طور پر ٹل گئی تھی۔ اس وقت بارہ بجتے والے تھے اور ان کے پاس تین ساڑھے تین گھنٹوں کا وقت تھا۔

نالہ نے آگے بڑھ کر بڑی آہستگی سے دروازے کا بولٹ چڑھا دیا اور قالین کے نیچے سے اس کی ڈرائیور نکال

کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

بعض اس کی تو بڑی آسانی سے نکل گئے لیکن بعض اس کی ایسے تھے جن پر پتہ کس سیٹ نہیں ہو رہا تھا۔

ایسے اس کی نکالنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ دو بجے کے لگ

بھگ انہوں نے کئی اس کی نکال لئے۔ نالہ نے اس کی ڈرائیور سلطانہ کے حوالے کر دیا اور گرل کو باہر کی

طرف دھکیلنے لگی۔ گرل اس سائڈ سے ساتھ آٹھ انچ ہٹ گئی تھی لیکن وہ اس میں سے باہر نہیں نکل سکتی

تھیں۔ وکٹ کے بیچ میں اوپر نیچے کے دو اس کی اور اکھاڑنے کی ضرورت تھی۔ ان میں آدھا گھنٹہ لگ

گیا۔

تقریباً ”دھائی بجے کے لگ بھگ انہوں نے وہ اس کی بھی نکال دیئے۔ اب وہ گرل اتنی جھول گئی تھی کہ وہ اس میں سے آسانی سے نکل کر ٹاریل کے درخت تک پہنچ سکتی تھیں۔

آئی جی ڈی آئی جی اور دوسرے افسر بھی تھانے پہنچ گئے۔ یہ تو کوئی بہت ہی اونچی شے لگتی ہیں مجھے۔ ان کے لئے بنگلے پر گارڈ بھی لگا دیئے گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ چھوکریاں کوئی اونچا کھیل کھیل رہی ہیں۔“  
 ”ان کا کھیل جلد ہی ختم ہو جائے گا۔“ انسپکٹر نے ایک ہاتھ سے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔  
 ”بڑے بڑے لوگ دیکھے ہیں میں نے، یہ تو لڑکیاں ہیں۔ انسپکٹر کو کھر کے سامنے ایک سیکنڈ بھی نہیں ٹک عکس کی۔“

”تو بابا کچھ کرونا ان کا۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”اسی لئے تو تمہیں بلایا ہے۔“

”تم نے ان کے بارے میں جو کمائی سنائی ہے اس سے لگتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنی مشکل ہو جائے گی۔ ان کے ساتھ تو دوسرا طریقہ استعمال کرنا ہو گا۔“ انسپکٹر کو کھر نے کہا۔ ”میں ایسا طریقہ استعمال کروں گا کہ تمہاری بھی شکایت دور ہو جائے گی۔ ارے بابا یہ خود ہی تمہارے قدموں میں گریں گی۔“

”ایسا کب ہو گا بابا۔“ شاہنواز بولا۔ ”میرا تو جسم اب بھی دکھ رہا ہے۔ میں اس چھوکرے کو اس طرح چکنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بھول جائے اور صرف میرا نام ہی یاد رکھے۔“  
 ”ہو جائے گا ریس۔“ انسپکٹر کو کھر نے کہا۔ ”ابھی ان چھوکریوں کو یہیں رکھو۔ رات کے آخری پر میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔ میرا لاندھی والا مکان تو دیکھا ہے تا تم نے..... اس مکان کے اندر کی سجاوٹ دیکھ کر تو بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ یہ چھوکریاں تو مکان میں داخل ہوتے ہی قدموں پر گر پڑیں گی۔“

”رات کے آخری پر کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟“ شاہنواز نے پوچھا۔

”اس وقت میرے علاقے میں کچھ گڑبڑ ہے۔ میں کہیں ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بھی بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔ تم تھوڑا اور انتظار کر لو۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”ایک بات کا خیال رکھنا کو کھر۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”یہ چھوکریاں آئی جی وغیرہ کی چیتی ہیں۔ بات باہر نہیں نکلتی چاہئے۔ اگر کسی اور کو پتہ چل گیا تو تمہیں بھی لٹکا دیا جائے گا۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔“ انسپکٹر کو کھر نے کہا۔ ”ان کا تو ایسا بندوبست کروں گا کہ کسی کو ہوا تک نہیں لگے گی۔ اگر یہ سامنے آ بھی گئیں تو بولنے کے قابل نہیں رہیں گی اور پولیس کے بڑے سے بڑے افسران بھی ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔“ وہ دو قدم آگے بڑھ کر نالہ کے قریب پہنچ گیا۔ ”کیا تعلق ہے تمہارا پولیس کے ان بڑے بڑے افسران سے؟“ اس نے نالہ کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کرنا چاہا۔

”اپنے گندے ہاتھ دور رکھو مجھ سے۔“ نالہ نے غراتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”وہ ذمے دار افسران ہیں۔ انہیں اپنے فرض کا احساس ہے۔ وہ لوگ تمہاری طرح بددیانت، راشی اور جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرستی کرنے والے نہیں ہیں۔ یہ وردی تمہیں لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے دی گئی تھی لیکن اس وردی کو جسم پر سجا کر تم اپنے آپ کو قانون کے مالک سمجھ بیٹھے ہو۔ اپنے فرائض تو تم بھول گئے۔ تمہیں صرف یہ یاد رہ گیا ہے کہ جرائم پیشہ افراد اور وطن دشمن لوگوں کی سرپرستی کر کے دولت کمائی جاسکتی ہے۔ تمہیں یہ احساس نہیں کہ ان جیسے بے ضمیر لوگ وطن کو کس طرح نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ تم لوگ ہو جو دیمک کی طرح اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ تم لوگ

اپنے انجام سے نہیں بچ سکو گے۔“

”دیکھا..... دیکھ لیا تم نے کھوکھو..... یہ کس طرح بول رہی ہے۔“ شاہنواز بولا۔

”دیکھ رہا ہوں۔“ انسپٹر کھوکھو نے کہا۔ ”بس۔ چند گھنٹوں کی بات ہے۔ اس کے بعد اس کی ساری اکثر لکل جائے گی۔ اس وقت تک اس کو حفاظت سے رکھنا۔ یہ یہاں سے بھاگ تو نہیں جائیں گی۔“ وہ کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

نانکھ اور سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کن انکھیوں سے انسپٹر کھوکھو کی طرف دیکھنے لگیں۔ انسپٹر کھوکھو کو کھڑکی کا پردہ ہٹاتے دیکھ کر نالکھ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ انسپٹر کھوکھو نے کھڑکی کا پردہ دوسری طرف سے ہٹایا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے گرل کو پکڑ کر ایک دو جھٹکے دیئے، گرل مضبوط تھی۔ اس نے پردہ چھوڑ دیا۔ نالکھ کے منہ سے اطمینان کا سانس نکل گیا۔ اگر انسپٹر کھوکھو پردہ اس طرف سے ہٹاتا جہاں سے انہوں نے اسکیون نکالے تھے تو فریم سے نکلے ہوئے اسکیون بقیہ ”اس کی نظروں میں آجاتے۔“

”کیا دیکھ رہے ہو کھوکھو؟“ شاہنواز نے پوچھا۔

”میں دیکھ رہا ہوں یہ چھوکیاں یہاں سے بھاگ تو نہیں سکیں گی۔“ کھوکھو بولا۔

”یہاں سے کیسے نکلیں گی۔“ شاہنواز کے بجائے نیاز نے جواب دیا۔ ”کھڑکی پر مضبوط جنگلا لگا ہوا ہے۔“

”دروازے پر آلاؤل دیں گے۔ یہ کیسے نکلیں گی یہاں سے۔“

”میں یہی دیکھ رہا تھا۔“ انسپٹر کھوکھو نے کہا۔ ”اب میں چلوں گا رئیس۔ آج میرے علاقے میں کچھ

زیادہ ہی گزریا ہے۔ دیر تک باہر نہیں رہ سکتا۔“

”کس وقت آؤ گے تم؟“ شاہنواز نے پوچھا۔

”تین اور چار بجے کے درمیان پہنچ جاؤں گا۔“ کھوکھو نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کریں گے۔“ شاہنواز نے کہا اور وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ دروازہ بند

کر کے باہر سے آلا لگادیا گیا۔

نالکھ اور سلطانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ بلا

وقتی طور پر ٹل گئی تھی۔ اس وقت بارہ بجنے والے تھے اور ان کے پاس تین ساڑھے تین گھنٹوں کا وقت تھا۔

نالکھ نے آگے بڑھ کر بڑی آہستگی سے دروازے کا بوٹ چڑھا دیا اور قالین کے نیچے سے اسکیون ڈرائیور نکال

کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

بعض اسکیون تو بڑی آسانی سے نکل گئے لیکن بعض اسکیون ایسے تھے جن پر پہنچ کس سیٹ نہیں ہو رہا تھا۔

ایسے اسکیون نکالنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ دو بجے کے لگ

بھگ انہوں نے کئی اسکیون نکال لئے۔ نالکھ نے اسکیون ڈرائیور سلطانہ کے حوالے کر دیا اور گرل کو باہر کی

طرف دھکیلنے لگی۔ گرل اس سائیڈ سے ساتھ آٹھ انچ ہٹ گئی تھی لیکن وہ اس میں سے باہر نہیں نکل سکتی

تھیں۔ دھٹ کے پہنچ میں اوپر نیچے کے دو اسکیون اور اکھاڑنے کی ضرورت تھی۔ ان میں آدھا گھنٹہ لگ

گیا۔

تقریباً ”ڈھائی بجے کے لگ بھگ انہوں نے وہ اسکیون بھی نکال دیئے۔ اب وہ گرل اتنی جھول گئی تھی کہ

وہ اس میں سے آسانی سے نکل کر ناریل کے درخت تک پہنچ سکتی تھیں۔

دفعۃً" باہر قدموں کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑیں۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے شاہنواز ہو۔

"جلدی کرو سلطانہ۔" نائلہ نے سرگوشی کی۔ "اس چوکھٹ پر چڑھ کر درخت تک پہنچنے کی کوشش کر ہری اپ۔"

سلطانہ کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ گئی۔ گرل پوری طرح پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ سلطانہ نے ایک ہاتھ۔ چوکھٹ کے اوپر والے کنارے کو تھام لیا۔ ایک پیر چوکھٹ پر رہنے دیا اور دوسرا ہاتھ اور پیر آہستہ آہستہ درخت کے تنے کی طرف بڑھانے لگی۔

درخت کا تنا کھڑکی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سلطانہ کا ہاتھ آسانی سے وہاں تک پہنچ گیا۔ لیکن ایک عجیب سا خوف اس کے دل پر طاری تھا۔ ناریل کا تنا بالکل چمکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ہاتھ پھسل گیا تو وہ گرے گی اگر گر کر مرنے سے بچ بھی گئی تو ان درندوں کو پتہ چل جائے گا اور وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔۔۔۔۔ باہر سے تالے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"جلدی کرو سلطانہ" وہ آلاکھول رہا ہے۔" نائلہ نے سرگوشی کی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔

سلطانہ نے چوکھٹ پر رکھے ہوئے پیر پر زور دے کر اوپر سے ہاتھ چھوڑ دیا اور بڑی پھرتی سے دونوں بازو درخت کے تنے کے گرد لپیٹ دیئے۔ اس کے ہاتھوں میں پینہ آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں بھی تنے کے گرد لپیٹ لیں اور تیزی سے نیچے پھسلنے لگیں۔

باہر سے اب آلاکھول لیا گیا تھا اور شاہنواز کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ کھٹ کھٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ میں آیا ہوں۔"

اس کے منہ سے گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔ نائلہ کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ دروازہ اب زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ نائلہ کے جسم کے مسام پینہ اگلنے لگے۔ اس کی ہتھیلیاں بھی پسینے میں تر ہو رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ قبض پر رکڑے اور اللہ کا نام لے کر درخت کی طرف چھلانگ لگا دی۔

وہ چھپکلی کی طرح درخت سے لپٹ گئی اور بڑی تیزی سے نیچے پھسلنے لگی۔ ناریل کا یہ درخت باؤنڈری وال کے ساتھ اندر کی طرف تھا۔ نائلہ پھسلتی ہوئی دیوار پر پہنچ گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سلطانہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ البتہ اوپر سے اب دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "نائلہ۔۔۔۔۔ میں یہاں ہوں۔ باہر کی طرف۔ چھلانگ لگا دو۔ تقریباً" دس فٹ نیچے کچی جگہ ہے۔" دیوار کے باہر کی طرف سے سلطانہ کی سرگوشی سنائی دی۔

نائلہ دیوار کے ساتھ لٹک گئی اور پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ وہ بھوکی آواز کے ساتھ نیچے گری۔ اوپر سے اب شاہنواز کے ساتھ نیاز اور گھوکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھی۔

"بھاگو۔۔۔۔۔ اس طرف۔" سلطانہ نے نائلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ اس گلی کا آخری بنگلہ تھا۔ اس کے ساتھ کشادہ گلی تھی۔ وہ دونوں اس گلی میں دوڑتی ہوئی سڑک پر آ گئیں۔

یہ کشمیر روڈ تھا۔ سڑک کے دوسری طرف اسپورٹس کمپلیکس تھا۔ اس کے لائنز پر میرج گارڈن بنے ہوئے تھے۔ ایک ڈیڑھ بجے تک تو شادیوں کی تقریبات کی وجہ سے یہ علاقہ جگہ نور ہوتا تھا بڑی رونق رہتی تھی مگر اس وقت ہر طرف تاریکی تھی۔ دائیں طرف بہت دور ایک جگہ کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہاں بھی شادی کی کوئی تقریب تھی جو غالباً ”دیر سے ختم ہوئی تھی اور ملازمین میزس کرسیاں وغیرہ سمیٹ رہے تھے۔“ اس طرف میرے ساتھ آؤ۔“ سلطانہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتی ہوئی اسپورٹس کمپلیکس کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

وہ دونوں دوڑتی ہوئی پچھلے حصے میں پہنچ گئیں۔ اس طرف بھی ایک گیٹ تھا جو اس وقت بند تھا۔ وہ ملاخوں پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئیں۔ اسپورٹس کمپلیکس کے چھلی طرف رہائشی علاقہ تھا۔ وسیع و سرسبز مریض پچھلے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی بڑی سڑک پر آ گئیں۔ دائیں طرف جیل چورنگی تھی اور بائیں طرف اسلامپورہ فالج۔ سامنے سڑک سے دوسری طرف حیدر آباد کالونی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی سڑک کے دوسری طرف پہنچ گئیں۔

”کہاں جا رہی ہو تم..... اگر کسی نے ہمیں اس حالت میں پکڑ لیا تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“ ٹائلڈ نے کہا۔

”یہاں سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا پارک ہے۔“ سلطانہ بولی۔

”تو کیا اس پارک میں رات گزارنے کا ارادہ ہے؟“ ٹائلڈ نے کہا۔

”نہیں۔“ سلطانہ بولی۔ ”اس پارک کے قریب ہی ایک گلی میں نعیم نامی ایک نوجوان رہتا ہے۔ وہ پونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہے۔ ایک مرتبہ مجھے سناڑکی کوٹھی سے لے کر آیا تھا۔ اس کا گھر مل جائے تو ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔“

”لیکن اس کے گھروالے؟“ ٹائلڈ بولی۔

”گھروالے ہوتے تو وہ مجھے لے کر نہ آتے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”وہ کسی دوسرے شرے سے پڑھنے کے لئے

یہاں آیا ہوا ہے۔ دولت مند باپ کا بیٹا ہے۔“

چھوٹا سا پارک اور پھر وہ مکان تلاش کرنے میں انہیں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ سلطانہ نے ٹھنکی

کے بیسن پر انگلی رکھی ہی تھی کہ حبشہ روڈ کی طرف سے زبردست فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

سلطانہ نے ایک بار پھر ٹھنکی کا بٹن دبا دیا۔ فائرنگ کی آوازیں اب قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی

تھیں۔ سلطانہ نے تیسری مرتبہ ٹھنکی بجائی۔

”کون ہے..... باہر کون ہے؟“ اندر سے ایک خوابیدہ اور سہمی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ یوں لگا تھا

جیسے وہ شخص کسی کمرے کی کھڑکی سے بول رہا ہو۔

”دروازہ کھولنے۔ پلیز دروازہ کھولنے۔ باہر فائرنگ ہو رہی ہے۔“ سلطانہ نے چیخ کر کہا۔

”کون ہو تم اور اتنی رات گئے.....“

بولنے والے کی آواز فائرنگ کی آواز میں دب گئی۔ یوں لگا تھا جیسے گلی کے موڑ کے دوسری طرف

فائرنگ ہو رہی ہو۔

”پلیز دروازہ کھولنے..... باہر فائرنگ ہو رہی ہے۔“ سلطانہ چچی۔

جواب میں چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ پھر اندر سے دروازہ کھول دیا گیا۔ ٹھیک اسی لمحہ ایک گاڑی اسی گلی

میں مڑی۔ گاڑی میں جو بھی لوگ تھے فائرنگ کر رہے تھے۔ گاڑی اسی طرف آرہی تھی۔ دروازہ کھلے سلطانہ اور نائلہ نے اندر چھلانگ لگادی اور اس شخص نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

وہ گاڑی فائرنگ کرتی ہوئی دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔ چند قہقہوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ بڑے وحشانہ قہقہے تھے جیسے وہ لوگ خوشی کے کسی موقع پر فائرنگ کر رہے ہوں..... وہ گاڑی غالباً ”گلی“ موڑ گھوم چکی تھی کہ ایک اور گاڑی اسی گلی میں داخل ہوئی۔ یہ غالباً ”پولیس“ کی گاڑی تھی اور اس سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد یہ گاڑی بھی آگے والی گلی میں مڑ گئی۔

وہ شخص ان لوگوں کو ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں مدہم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ کھڑکی کا پردہ کھینچ کر برابر کر دیا اور ایک سوچ آن کر کے مرکزی ٹیوب لائٹ جلادی۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی عمر کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ بلیڈ کے استعمال سے واقف ہو۔ تھوڑی پرواز مہمی کے چند بال تھے، چند بال دائیں بائیں کھول پر بھی نظر آرہے تھے۔ اس نے چمکدار باندھ رکھی تھی اور اوپر بنیان پسنی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے کھونٹے سے قبضہ اتار کر پہن لی..... اور عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں کی قمیضیں پھٹی تھیں۔ اس نوجوان نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

”آپ لوگ کون ہیں۔ رات کے آخری پہر..... یہ حالت.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر کن انکھیں۔ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”مصیبت کی ماری ہوئی ہیں۔ ہناوہ دینے کا شکریہ۔“ سلطانہ نے کہا۔

”لیکن یہ حالت.....“ اس نوجوان نے جملہ پھر ادھورا چھوڑ دیا۔

نائلہ خاموش کھڑی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت۔ تاثرات نمایاں تھے۔ سلطانہ نے بتایا تھا کہ نعیم نامی نوجوان اسے عیاشی کے لئے لایا تھا۔ اگر یہ نوجوان تھا تو پھر اس قوم کے کردار پر فاتحہ پڑھ لینے کی ضرورت تھی۔ بظاہر شرمیلا اور بچہ شریف اور غالباً ”کمزور“ مذہبی تنظیم سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان اس قدر عیاش تھا تو پھر کوئی بھی قابل اعتماد نہیں ہو سکتا تھا۔ ”کچھ لوگ ہمیں اغواء کر کے لے جا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ سلطانہ نے کہا۔

”کیا یہ فائرنگ وہی لوگ کر رہے تھے؟“ اس نوجوان نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ تو غالباً ”دہشت گرد“ تھے۔ اگر آپ بروقت دروازہ نہ کھولتے تو شاید ہم بھی ان کی گولیوں نشانہ بن جاتیں۔“ سلطانہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولی..... ”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ نعیم ہی کا مکان ہے نا؟“

”نعیم؟“ اس نوجوان کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ ”میرا نام عبدالقدوس ہے۔ نعیم تو یہاں کوئی نہیں رہتا۔ میرے دوسرے ساتھی کا نام رحمن ہے اور افتاح سے وہ آج ہی سکھر گیا ہے۔“

”لیکن یہ مکان.....“ سلطانہ پر سوچ انداز میں کہا۔ ”آپ اس مکان میں کب سے رہ رہے ہیں؟“

”مجھے یہاں آئے ہوئے کل پورا ایک مہینہ ہو جائے گا۔“ عبدالقدوس نے کہا اور پھر جیسے کچھ یاد آجانے پر بولا۔ ”آپ اس تعلیم کی بات تو نہیں کر رہیں جو یونیورسٹی میں ایم اے فاضل کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ گورے سے اور اسارٹ سے“ ان کا تعلق غالباً ”بلوچستان“ سے ہے۔“

”جی ہاں۔ بالکل وہی۔ وہ کوئٹہ کے رہنے والے ہیں۔“ سلطانہ نے جلدی سے کہا۔  
 ”اب سمجھ گیا۔“ عبدالقدوس بولا۔ ”ہم سے پہلے یہاں وہی رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے گلستان جوہر  
 اس ایک مکان خرید لیا ہے۔“

”مکان خرید لیا ہے؟“ سلطانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔  
 ”جی ہاں..... وہ بلوچستان کے ایک بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ پیسے کی ان کے پاس کیا کمی ہے۔ مکان کیا  
 وہ بڑا جگہ بھی خرید سکتے ہیں۔“ عبدالقدوس کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ  
 اس کتری کا شکار تھا۔

”کیا آپ ان کے مکان کا پتہ بتا سکتے ہیں۔“ سلطانہ نے پوچھا۔  
 ”مجھے پتہ تو معلوم نہیں ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ صبح یونیورسٹی میں اس سے ملاقات کر کے پتہ معلوم  
 لیں۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”کیا آپ ہمیں رات یہاں گزارنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں اس حالت میں اس  
 ہاؤسنگ کا مسئلہ خطرناک ہے۔“ سلطانہ نے کہتے ہوئے کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کمرے میں  
 دیواری بھی ہوئی تھی۔ اس درمی پر ایک طرف بستر بچھا ہوا تھا اور ایک طرف کاپیاں اور کتابیں بکھری  
 لی تھیں۔ نالکہ بھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایک کتاب پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔  
 ”آپ ایم ایس سی کر رہے ہیں؟“ نالکہ نے پوچھا۔

”جی ہاں.....“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔  
 ”کیا کریں گے آپ سائنس پڑھ کر۔“ نالکہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
 ”جی..... میں سمجھا نہیں؟“ عبدالقدوس نے اسے گھورا۔  
 ”لگ..... کچھ نہیں۔“ نالکہ ہٹلا گئی۔ ”میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔“  
 ”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہم  
 رات یہاں گزار سکتی ہیں؟“

”جی کیوں نہیں۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔ ”دوسرا کمرہ خالی ہے۔ میں اس کمرے کا تالا کھول دیتا  
 ہوں۔ آپ وہاں سو جائیے۔“

عبدالقدوس نے کارنس پر رکھی ہوئی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھائی تھا کہ کھلی میں ایک دم  
 لارنک شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی دو تین آدمیوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی تھی۔  
 عبدالقدوس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے لپک کر ٹیوب لائٹ آف کر دی۔ فائرنگ کی آوازوں سے یوں لگتا  
 تھا جیسے دو پارٹیاں آپس میں ٹکرائی ہوئی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد فائرنگ کی آوازیں بتدریج دور ہوتی چلی گئیں  
 عبدالقدوس نے اٹھ کر جتنی جلدی اور ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف بڑھا۔  
 ”میرے ساتھ آئیے آپ۔“ اس نے مڑ کر دونوں کی طرف دیکھا۔

نالکہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اکیلا صحن میں نکلتے ہوئے  
 ہی ڈر رہا تھا۔ نالکہ نے سلطانہ کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئیں۔  
 عبدالقدوس ان کی طرف دیکھے بغیر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ٹیبل کر تالا کھولا اور پھر دروازہ  
 کھول کر اندر داخل ہو گیا اور دیوار پر ٹیبل کر سوچ آن کر دیا۔



یہ کمرہ بھی سازمیں اتا ہی تھا لیکن عبدالقدوس کے کمرے سے بالکل مختلف۔ یہاں ایک طرف آراہ وہ بیڈ بچھا ہوا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ رائفنگ ٹیبل تھی جس پر سیلے سے کتابیں رکھی ہوئیں تھیں۔ میز کے اوپر دیوار پر ایک شیٹ میں بھی کتابیں جی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب دو کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تمام کتابیں انجینئرنگ سے متعلق تھیں۔

”آپ کا دوست رحمن غالباً“ انجینئرنگ کر رہا ہے۔“ نانکھ نے پوچھا۔  
”جی ہاں۔ وہ واؤڈ کالج آف انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ کل ٹیلی فون پر پیغام ملا تھا کہ اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے وہ آج شام سکھر چلا گیا ہے۔ آپ اسی کمرے میں رات گزار لیں۔“  
عبدالقدوس نے کہا۔

”شکریہ۔ آپ ہماری تھوڑی سی اور مدد کریں۔“ نانکھ نے کہا۔  
”جی۔ فرمائیے۔“ عبدالقدوس نے پوچھا۔  
”آپ کے پاس سوئی دھاگہ تو ہوگا۔ اگر ہو تو ہمیں دیدیتے۔ یہ دیکھئے نامارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ سوئی دھاگہ مل جائے تو ان کی مرمت کر لیں گے۔“ نانکھ نے کہا۔  
”ابھی لا دیتا ہوں۔“ عبدالقدوس کتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سوئی دھاگہ لا کر دیدیا۔

”آپ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے اور کھڑکی کے سامنے پردہ کھینچ دیجئے۔ اگر باہر فائرنگ کی آواز سنائی دے تو فوراً“ جی بند کر دیجئے۔ کراچی آج کل آفتوں کا شہر بنا ہوا ہے۔ تخریب کاروں اور دہشت گردوں نے اس شہر کا سکون برباد کر رکھا ہے۔“

”آپ مطمئن رہئے۔ آپ کی ہدایات پر پورا پورا عمل کیا جائے گا۔“ نانکھ نے کہا۔  
عبدالقدوس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تو نانکھ نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا اور کھڑکی کے سامنے پردہ کھینچ کر اپنی قبض اتار لی۔ سلطانہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ نانکھ نے سوئی میں لمبا سا دھاگہ ڈالا اور قبض سینے لگی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے مقدر پر مسکرا رہی تھی۔ وہ ناز و خرم میں پٹی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن گزشتہ چند مہینوں سے وہ ماری ماری پھر رہی تھی۔ قبض سینے کے بعد اس نے سوئی دھاگہ سلطانہ کی طرف بڑھا دیا اور قبض پٹنے لگی۔ کچھ دیر بعد سلطانہ اس کے سامنے اسی حالت میں بیٹھی اپنی قبض سی رہی تھی۔ سلطانہ نے بھی قبض پٹن لی۔ سوئی دھاگہ میز پر دکھ دیا اور اٹھ کر ٹائٹ بلب روشن کرنے کے بعد ٹیوب لائٹ بجھا دی۔ وہ دونوں پٹنگ پر لپٹ گئی تھیں۔

وقتے وقتے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں پٹنگ پر لیٹی سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں۔

”مسی اور غزالہ نے ہمیں وہاں نہ پا کر نجانے کیا سوچا ہوگا۔“ سلطانہ نے کہا۔  
”وہ دونوں پریشان تو ہوئی ہوں گی۔“ نانکھ نے جواب دیا۔ ”اپنے طور پر تلاش کرنے کے بعد ہو سکتا ہے غزالہ نے پولیس کو ہماری گمشدگی کی اطلاع بھی دیدی ہو۔“  
”اس بھاری کو کیا پتہ کہ اس کا بھائی ہی ہمارے لئے اس معیبت کا باعث بنا ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔  
”اے جب حقیقت کا پتہ چلے گا تو کتنا دکھ ہوگا اسے۔“

”ہاں۔“ نائلہ بولی۔ ”جب کوئی برے راستے پر چل نکلتا ہے تو اسے روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

وازان کے لئے ایک ناسور بن چکا ہے۔“

”یہ فہم کون ہے؟“ نائلہ نے موضوع بدل دیا۔

”بلوچستان کے کسی زمیندار کا بیٹا ہے۔ پھلوں کے باغات ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا ہے۔“

”نوجوان ہے۔ منازکی کوٹھی پر اس کا آنا جانا تھا۔ ایک رات کے لئے مجھے بھی لے کر آیا تھا۔“

”کس بے شرمی بھارتی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔

”حقیقت کو جھٹلایا تو نہیں جاسکتا۔“ سلطانہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تمہیں اپنے

سے میں بتا چکی ہوں۔ پتہ نہیں کتنے ہاتھوں کا کھلوانا بن چکی ہوں، کتنے مردوں کی ہوس کا شکار ہو چکی ہوں۔

میں یہ سب کچھ چھپاؤں گی تو اس سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آج کے بعد تم یہ سب کچھ بھول جاؤ گی۔“ نائلہ نے کہا۔

”ممکن ہے میں سب کچھ بھول چکی ہوں لیکن جہاں قدم قدم پر شاہنواز جیسے بے ضمیر لوگوں کا سامنا ہو

میں یہ سب کچھ کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ یہاں تو ہر قدم پر پرانے زخموں کو کھیرا جاتا ہے تاکہ ہم جیسی لوگ

کی سکھ کا سانس نہ لے سکیں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”خدا غلام کی رسی دراز ضرور کرتا ہے لیکن بالاخر اسے ایک نہ ایک دن گرفت میں آنا ہوتا ہے اور پھر

سے سارا حساب کتاب بھی دیتا ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ زیادتیاں کی ہیں۔ میرے ساتھ

دیتیاں کی ہیں، وہ آج آزاد ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں لیکن ایک دن ایسا لمحہ ضرور آئے گا کہ وہ اپنے

سائے ہوئے جال میں پھنس جائیں گے۔ اپنے گناہوں کی سزا وہ خود اپنے ہاتھوں سے پائیں گے۔“ نائلہ

نے کہا۔

”اور جب تک یہ لوگ سزا نہیں پالیں گے اس وقت تک مجھے چین نہیں آئے گا۔“ سلطانہ نے گہرا

انس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا۔ اب قصہ پارینہ ختم کرو اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”یہ

بولی ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے۔ فہم کا نام لینے سے اس نے ہمیں آج کی رات یہاں پناہ تو دیدی ہے

لیکن کل کی رات ہم یہاں نہیں گزار سکیں گی۔ یہ کل یونیورسٹی سے فہم کے بارے میں معلوم کر لے گا اور

ہمیں اس گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں اب خزانہ کے گھر نہیں جانا

ہتی۔ شاہنواز انتقامی کارروائی پر اتر آیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ اپنے گھروالوں کا جینا بھی حرام کر دی گا۔

میں نہیں چاہتی کہ ڈیرہ کریم بخش کی رسوائی ہو۔“

”کل کا دن تو یہاں گزار لیں۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”فہم کا پتہ معلوم ہو جائے تو ہم اسکے گھر پر پناہ لے سکتے

ہیں۔“

”ویسے میرے ذہن میں ایک اور تجویز بھی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”وہ کیا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”شوکت نام کا وہ نوجوان یاد ہے جو ہم سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے راجستان کے کیمپ سے نکلا تھا؟“

نائلہ نے کہا۔

”ہاں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ چھوٹے قد کا کالا سا لڑکا جو ہر وقت سسی کو گھورتا رہتا تھا۔“ سلطانہ

یہ کمرہ بھی سازشیں اتا ہی تھا لیکن عبدالقدوس کے کمرے سے بالکل مختلف۔ یہاں ایک طرف آراہ و بیڈ بچا ہوا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ رائیٹنگ ٹیبل تھی جس پر سیلے سے کتابیں رکھی ہوئیں تھیں۔ میز کے اوپر دیوار پر ایک شیٹ میں بھی کتابیں جچی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب دو کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تمام کتابیں انجینئرنگ سے متعلق تھیں۔

”آپ کا دوست رحمن غالباً“ انجینئرنگ کر رہا ہے۔“ نائلہ نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ وہ داؤد کالج آف انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ کل ٹیلی فون پر پیغام ملا تھا کہ اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے وہ آج شام سکھر چلا گیا ہے۔ آپ اسی کمرے میں رات گزار لیں۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”شکریہ۔ آپ ہماری تھوڑی سی اور مدد کریں۔“ نائلہ نے کہا۔

”جی۔ فرمائیے۔“ عبدالقدوس نے پوچھا۔

”آپ کے پاس سوئی دھاگہ تو ہوگا۔ اگر ہو تو ہمیں دیدیتے۔ یہ دیکھئے نامارے کپڑے پھنے ہوئے ہیں۔ سوئی دھاگہ مل جائے تو ان کی مرمت کر لیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”ابھی لا رہا ہوں۔“ عبدالقدوس کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سوئی دھاگہ لا کر دیدیا۔

”آپ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے اور کھڑکی کے سامنے پردہ کھینچ دیجئے۔ اگر باہر فائرنگ کی آواز سنائی دے تو فوراً“ حق بند کر دیجئے۔“ کراچی آج کل آفتوں کا شہر بنا ہوا ہے۔ تخریب کاروں اور دہشت گردوں نے اس شہر کا سکون برباد کر رکھا ہے۔“

”آپ مطمئن رہئے۔ آپ کی ہدایات پر پورا پورا عمل کیا جائے گا۔“ نائلہ نے کہا۔

عبدالقدوس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تو نائلہ نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا اور کھڑکی کے سامنے پردہ کھینچ کر اپنی قیض اتار لی۔ سلطانہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ نائلہ نے سوئی میں لمبا سا دھاگہ ڈالا اور قیض سینے لگی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے مقدر پر مسکرا رہی تھی۔ وہ ناز و خم میں پٹی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن گزشتہ چند مہینوں سے وہ ماری ماری پھر رہی تھی۔ قیض سینے کے بعد اس نے سوئی دھاگہ سلطانہ کی طرف بڑھا دیا اور قیض پنے لگی۔ کچھ دیر بعد سلطانہ اس کے سامنے اسی حالت میں بیٹھی اپنی قیض سی رہی تھی۔ سلطانہ نے بھی قیض پہن لی۔ سوئی دھاگہ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر ناٹ بلب روشن کرنے کے بعد ٹیوب لائٹ بجھا دی۔ وہ دونوں پٹنگ پر لیٹ گئی تھیں۔

وقتے وقتے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں پٹنگ پر لیٹی سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں۔

”مسی اور غزالہ نے ہمیں وہاں نہ پا کر نجانے کیا سوچا ہوگا۔“ سلطانہ نے کہا۔

”وہ دونوں پریشان تو ہوئی ہوں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”اپنے طور پر تلاش کرنے کے بعد ہو سکتا ہے غزالہ نے پولیس کو ہماری گمشدگی کی اطلاع بھی دیدی ہو۔“

”اس بھاری کو کیا پتہ کہ اس کا بھائی ہی ہمارے لئے اس مصیبت کا باعث بنا ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”اے جب حقیقت کا پتہ چلے گا تو کتنا دکھ ہوگا اے۔“

”ہاں۔“ نائلہ بولی۔ ”جب کوئی برے راستے پر چل نکلتا ہے تو اسے روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ شاہنواز ان کے لئے ایک ناسور بن چکا ہے۔“

”یہ فہم کون ہے؟“ نائلہ نے موضوع بدل دیا۔  
 ”بلوچستان کے کسی زمیندار کا بیٹا ہے۔ بھلوں کے باغات ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا ہے۔ میاش نوجوان ہے۔ مناز کی کوٹھی پر اس کا آنا جانا تھا۔ ایک رات کے لئے مجھے بھی لے کر آیا تھا۔“

”کس بے شرمی سے بتا رہی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”حقیقت کو جھٹلایا تو نہیں جاسکتا۔“ سلطانہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تمہیں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں۔ پتہ نہیں نکلتے ہاتھوں کا کھلونا بن چکی ہوں، کتنے مردوں کی ہوس کا شکار ہو چکی ہوں۔ اگر میں یہ سب کچھ چھپاؤں گی تو اس سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آج کے بعد تم یہ سب کچھ بھول جاؤ گی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”ممکن ہے میں سب کچھ بھول چکی ہوئی لیکن جہاں قدم قدم پر شاہنواز جیسے بے ضمیر لوگوں کا سامنا ہو وہاں یہ سب کچھ کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ یہاں تو ہر قدم پر پرانے زخموں کو کھریدا جاتا ہے تاکہ ہم جیسی لوگ کبھی شکہ کا سانس نہ لے سکیں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”خدا عالم کی رسی دراز ضرور کرتا ہے لیکن بالا خرا سے ایک نہ ایک دن گرفت میں آنا ہوتا ہے اور پھر اسے سارا حساب کتاب بھی دینا ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ زیادتیاں کی ہیں۔ میرے ساتھ زیادتیاں کی ہیں، وہ آج آزاد ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں لیکن ایک دن ایسا لمحہ ضرور آئے گا کہ وہ اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جائیں گے۔ اپنے گناہوں کی سزا وہ خود اپنے ہاتھوں سے پائیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”اور جب تک یہ لوگ سزا نہیں پالیں گے اس وقت تک مجھے چین نہیں آئے گا۔“ سلطانہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا۔ اب قصہ پارینہ ختم کرو اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”یہ مولوی ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے۔ فہم کا نام لینے سے اس نے ہمیں آج کی رات یہاں پناہ تو دیدی ہے لیکن کل کی رات ہم یہاں نہیں گزار سکیں گی۔ یہ کل یونیورسٹی سے فہم کے بارے میں معلوم کر لے گا اور پھر ہمیں اس گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لے گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ میں اب غزالہ کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ شاہنواز انتقامی کارروائی پر اتر آیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ اپنے گھروالوں کا جینا بھی حرام کر دی گا۔ میں نہیں چاہتی کہ وڈیرہ کریم بخش کی رسوائی ہو۔“

”کل کا دن تو یہاں گزار لیں۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”فہم کا پتہ معلوم ہو جائے تو ہم اسکے گھر پر پناہ لے سکتے ہیں۔“

”ویسے میرے ذہن میں ایک اور تجویز بھی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”وہ کیا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”شوکت نام کا وہ نوجوان یاد ہے جو ہم سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے راجستان کے کیمپ سے نکلا تھا؟“

نائلہ نے کہا۔

”ہاں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ چھوٹے قد کا کالا سا لڑکا جو ہر وقت سسی کو گھورتا رہتا تھا۔“ سلطانہ

نے جواب دیا۔

”بالکل وہی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”مجھے اس کا پتہ یاد ہے۔ وہ رفاع عام سوسائٹی میں رہتا ہے۔ کیوں نہ اسے قابو کیا جائے۔ اسے یہ تو نہیں معلوم کہ ہم کیپ تباہ کر کے بھاگی ہیں۔ اگر وہ ہماری گرفت میں آجائے تو ہمیں رہنے کا ٹھکانہ بھی مل سکتا ہے اور اسلحہ بھی۔ جو ہم انہی جیسے لوگوں کے خلاف استعمال کریں گی۔ یہ میں نے عہد کیا ہے کہ جو لوگ راجستھان کے کیپ سے دہش گردی کی تربیت لے کر آئے ہیں اور جن جن لوگوں کے ٹھکانے ہمیں معلوم ہیں انہیں جن جن کر ختم کر دیا جائے گا یا گناہم ذرائع سے پولیس کو ان کی نشاندہی کر دی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے اپنا کوئی ٹھکانہ تو تلاش کیا جائے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”یہ مولوی اگر کل قیم کا پتہ معلوم کر لے تو ہم ایک دو دن وہاں رہ سکتی ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ سلطانہ بولی۔ ”اب تھوڑی سی نیند لے لیتی چاہئے۔ رات ختم ہونے والی ہے۔“

رات واقعی ختم ہونے والی تھی۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے ان کی آنکھیں بھی نیند کے بوجھ سے جھکنے لگی تھیں۔ ویسے بھی اب انہیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اس مکان میں رہائش پذیر مولوی ٹائپ کا یہ نوجوان شریف بھی تھا اور بزدل بھی۔ ویسے شریف لوگ بزدل ہی ہوتے ہیں۔ اس شریف آدمی نے تو ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جتنی دیر ان کے سامنے رہا تھا نظریں جھکائے رہا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو آدمی رات کو دو خوبصورت لڑکیوں کو اپنی دروازے پر دیکھ کر انہیں نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ان سے مستفید ہونے کی کوشش ضرور کرتا۔ لیکن اس کے برعکس یہ مولوی ان کے نیم برہنہ جسم دیکھ کر شرمانا رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی سکھر گیا ہوا تھا۔ اس کا کمرہ خالی تھا۔ اگر نائلہ اور سلطانہ چاہیں تو انہیں دو چار روز اس گھر میں پناہ مل سکتی تھی۔ اس مولوی ٹائپ نوجوان کو آسانی سے رام کیا جاسکتا تھا۔

صبح دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز سن کر سلطانہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے انگڑائی لیتے ہوئی ادھر ادھر دیکھا۔ نائلہ سو رہی تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ سلطانہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور جلن اس طرح ہو رہی تھی جیسے مٹی بھر مرچیں جھونک دی گئی ہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ عبدالقدوس سامنے کھڑا تھا اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔

”معاف کیجئے۔ میں نے آپ کو جگادیا۔“ عبدالقدوس کے لہجے میں ندامت تھی جیسے اس نے انہیں جگا کر جرم کیا ہو۔

”جاگنا تو تھا ہی۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ جی دراصل میں ناشتہ لے آیا تھا۔ آپ لوگ ناشتہ کر لیں پھر میں یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔ طوہ پوری لے آیا ہوں۔ میں نے کچن میں رکھ دیا ہے۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”دیکھیں تو کیا لائے ہیں۔“ سلطانہ کہتی ہوئی اس کے ساتھ کچن میں آگئی۔

کچن میں زیادہ برتن نہیں تھے۔ چند پلیٹیں، گلاس اور چائے بنانے کا سامان، اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دو پلیٹوں میں ان کا ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ ایک پلیٹ میں پنے اور آلو کی ترکاری اور دوسری پلیٹ میں کاغذ میں لپی ہوئی پوریاں۔

”میں یونیورسٹی جا کر قیم کا پتہ معلوم کر لوں گا۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”آپ لوگ آج شام تک چلی

ہائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس محلے کے لوگ ہمیں پریشان کرنے لگیں۔“  
 ”لوگ آپ کو کیوں پریشان کریں گے۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
 ”دیکھیں نا جی۔ ہم یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے لوگ ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔“ عبد القدوس نے کہا۔

”آپ بھی کتنے سیدھے سادھے ہیں مسٹر عبد القدوس۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”آپ یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے گھر کی خواتین آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوئی ہیں۔“  
 ”ہمارے گھر کی خواتین برقعہ استعمال کرتی ہیں۔“ عبد القدوس نے کہا۔

”ہم بھی پردہ کر لیں گی۔“ سلطانہ نے کہا۔ عبد القدوس کی بات پردہ بڑی مشکل سے اپنا قہقہہ روک سکی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے آگے بڑھ کر عبد القدوس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

عبد القدوس کے پورے جسم میں بجلی کی لہریں سی دوڑ گئیں۔ اسے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر سلطانہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئی۔ اس نے عبد القدوس کا ہاتھ چھوڑ کر اسے اچانک ہی اپنے ساتھ لپیٹ لیا تھا۔ عبد القدوس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”یہ..... یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ چھوڑ دیجئے مجھے..... کلک..... کوئی دیکھ لے گا.....“

سلطانہ نے اسے چھوڑ دیا۔ عبد القدوس کچن سے نکل کر دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سلطانہ بڑی مشکل سے اپنا قہقہہ روک سکی تھی۔ عبد القدوس اس طرح بھاگا تھا جیسے اس کی عزت خطرے میں ہو۔ وہ چند لمحوں میں کچن میں کھڑی مسکراتی رہی پھر وہیں کھڑے کھڑے ناشتہ کرنے لگی۔ کل رات بھی انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس وقت واقعی اسے بڑی شدت کے ساتھ بھوک لگ رہی تھی۔ فائدہ میں لپٹی ہوئی چند روہ سولہ پوریاں تھیں۔ اسی پتہ نہیں تھا کہ عبد القدوس نے ناشتہ کیا تھا یا نہیں۔ بہر حال وہ اطمینان سے ناشتہ کرتی رہی۔ وہ چھ سات پوریاں کھا گئی۔ باقی لپیٹ کر رکھ دیں اور چولہا جلا کر چائے تیار کرنے لگی۔

اس نے چائے تین گلوں میں انڈلی۔ ایک مگا اٹھا کر عبد القدوس کے کمرے کی طرف آگئی۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دسک دی۔  
 ”کلک..... کیا بات ہے۔“ اندر سے عبد القدوس کی آواز سنائی دی۔  
 ”یہ چائے لیجئے قدوس صاحب۔“ سلطانہ نے کہا۔

عبد القدوس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے چائے کا کاک اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور دوبارہ کچن میں آگئی۔ چائے کے دونوں گک اٹھائے اور اپنے کمرے میں آگئی۔ مگ میز پر رکھ کر وہ نالکہ کو جگانے لگی۔

وہ دونوں چائے پی رہی تھیں کہ عبد القدوس دروازے پر نمودار ہوا۔  
 ”میں یونیورسٹی جا رہا ہوں جی۔ آپ دروازہ بند کر لیجئے اور اگر محلے والے کچھ دریافت کریں تو انہیں کہہ دیجئے کہ آپ رحمن کی رشتہ دار ہیں اور سکھر سے آئی ہیں۔“ عبد القدوس نے کہا۔  
 ”آپ سے کوئی رشتہ کیوں نہ بتائیں۔“ سلطانہ کے لہجے میں شوخی تھی۔

”میری رشتہ دار خواتین یہاں نہیں آئیں۔ رحمن کے گھر والے آتے رہتے ہیں۔ بات بن جائے گی۔“ عبد القدوس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کہہ دیں گی۔ مر آپ کب تک لونٹیں گے اور فیم کے بارے میں ضرور معلوم کر کے آئیں۔“ سلطانہ نے کہا۔

”میں معلوم کر لوں گا۔ تین بجے تک میری واپسی ہوگی۔“ عبد القدوس نے کہا۔  
وہ رخصت ہو گیا تو سلطانہ نے اٹھ کر باہر کا دروازہ بند کر دیا اور کمرے میں آگئی۔ ”میں نے دو چار دن یہاں رہنے کا بندوبست کر لیا ہے۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”وہ کیسے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

سلطانہ اسے عبد القدوس کے ساتھ کی جانے والی حرکت کے بارے میں بتانے لگی۔  
”بڑی کمینہ ہو تم۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”ایسا میں نے مجبوراً کیا ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ ”ہم فیم کے گھر جائیں گے تو میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ عیاش آدمی ہے۔ وہ ہماری مجبوری سے فائدہ ضرور اٹھائے گا۔ اس کے برعکس یہ عبد القدوس ایک شریف آدمی ہے۔ اسے میں نے ایک لالچ دیدیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ حد سے بڑھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اسی تحریص کے سارے ہم دو چار دن یہاں رہ سکتے ہیں۔“  
”یہ بات تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یونور شی سے واپس آتے ہی وہ ہمیں یہاں سے چلا کر دے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”تم ان مرد کو ابھی تک نہیں سمجھ سکیں۔ یہ تو عورت کے پیر تک جاننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عبد القدوس نے شاید پہلی مرتبہ کسی عورت کو اتنا قریب سے محسوس کیا ہے۔ اس کا پورا دن بے چینی میں گزرے گا۔ ہم دو چار دن بڑے اطمینان سے یہاں رہ سکتی ہیں۔ اس کے بعد ہم شوکت کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں گے۔ اس کے لئے بھی عبد القدوس ہی کو استعمال کیا جائے گا۔“

”لیکن اگر وہ نہ مانا تو؟“ نائلہ نے کہا۔

”انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ سلطانہ مسکرائی۔ ”اب دیکھنا وہ کس طرح میرے آگے پیچھے دم ہلاتا پھرے گا۔“

چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد نائلہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے اس کی کسمندی دور ہو گئی۔

”نکن میں حلوہ پوری رکھی ہے۔ تم ناشتہ کرلو۔ میں بھی نہالوں۔“ سلطانہ کہتے ہوئے ہاتھ روم میں گھس گئی۔

عبد القدوس کے بارے میں سلطانہ کا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔ اسنے کہا تھا کہ واپسی تین بجے کے لگ بھگ ہوگی لیکن جب وہ ساڑھے بارہ بجے ہی واپس آگیا تو نائلہ بھی دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”آپ نے تو تین بجے آنا تھا مسٹر عبد القدوس۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”جی ہاں۔ لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ گھر میں تو کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ آپ لوگ دوپہر

کا کھانا کہاں سے کھائیں گی۔ اس لئے میں جلدی آگیا۔“ عبد القدوس نے کہا۔  
 ”کیا آپ کو ہمارا اتنا ہی خیال ہے۔“ سلطانہ مسکرائی۔

”آپ لوگ مہمان ہیں جی اور مہمانوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے نا۔“ عبد القدوس نے سلطانہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظریں نیچے کی طرف پھسلتی چلی گئیں۔  
 ”نعیم کے بارے میں معلوم کیا آپ نے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ عبد القدوس نے جواب دیا۔ ”آپ اس کو کیسے جانتی ہیں۔ وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے“ اس کی ریپوٹیشن بہت خراب ہے۔ میرا مطلب ہے آپ اکیلی اس کے گھر میں کیسے رہیں گی۔ وہ..... وہ.....“  
 ”آپ رک کیوں گئے؟“ سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے اگر آپ کو دو چار دن رہنا ہو تو ہمیں رہ لیجئے..... رحمت دویسے بھی ایک ہفتے بعد ہی آئے گا۔“ عبد القدوس نے کہا۔

”آپ محلے والوں کو کیا بتائیں گے؟“ سلطانہ بولی۔

”ابھی بیک صاحب سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ تیسرے مکان میں رہتے ہیں۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں آج یونیورسٹی سے اتنی جلدی کیسے آگیا تو میں نے بتایا کہ نواب شاہ سے میری کزنز آئی ہوئی ہیں۔ اسی لئے جلدی آگیا ہوں۔“

”اوہ۔“ سلطانہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”لیکن آپ کے خاندان کی عورتوں تو برقعہ استعمال کرتی ہیں جبکہ ہم برقعہ نہیں پہنتیں۔“

”خاندان کی ساری عورتیں تو برقعہ استعمال نہیں کرتی جی۔“ عبد القدوس نے جواب دیا۔ وہ واقعی بھید سادہ لوح اور شریف آدمی تھا۔ سلطانہ کو یہ احساس بھی تھا کہ وہ ایک شریف آدمی کو اس کے راتے سے بھٹکانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن یہ ان کی ضرورت تھی۔ اسے بے وقوف بنانے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

عبد القدوس کھانا لینے کے لئے چلا گیا تو سلطانہ نے نالہ کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کر دیا۔

”تم واقعی بہت بے شرم ہو۔“ نالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجبوری ہے۔“ سلطانہ نے کندھے اچکائے۔ ”لوگ ہماری مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

اگر میں کسی کو یہ قوف بنا رہی ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اور پھریوں بھی ہم اس بدھو سے کوئی غیر قانونی کام تو نہیں لے رہے۔“

”ہاں۔ ٹھیک کہتی ہو۔“ نالہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد عبد القدوس کھانا لے کر آگیا۔ سلطانہ نے پلیٹوں میں کھانا نکالا اور عبد القدوس ہی کے کمرے میں درمی پرانا اخبار بچھا کر کھانا لگا دیا۔ عبد القدوس بڑی مشکل سے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے پر آمادہ ہوا تھا۔ کھانے کے دوران وہ بار بار کن انگلیوں سے سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور سلطانہ بھی اس کے سامنے اس طرح بیٹھی تھی کہ وہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔

پانچ بجے کے لگ بھگ عبد القدوس اپنے کمرے میں درمی پر بیٹھا اسٹڈی کر رہا تھا کہ سلطانہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ نزوس سا ہو گیا۔

”آپ سے ایک کام آن پڑا ہے قدوس صاحب۔“ سلطانہ اس کے سامنے اس طرح بیٹھ گئی کہ سامنے



بیٹھے ہوئے عبدالقدوس کی نظریں اس کی قمیض کے گریبان کے اندر تک جاسکیں۔  
 ”جی..... جی..... آپ علم کیجئے.....“ عبدالقدوس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ اس کی نظریں بار بار سلطانہ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”ہمارے ایک جاننے والے ہیں۔ الفلاح سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 ”کیسی معلومات؟“ عبدالقدوس نے پوچھا۔

”یہی کہ وہ اکیلی رہتے ہیں یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ اگر کوئی اور ہے تو کتنے آدمی ہیں۔ بس یہی معلوم کرنا ہے۔“

”ان کا نام اور پتہ بتائیے۔ میں آج ہی معلوم کر لیتا ہوں۔“ عبدالقدوس بولا۔  
 ”اس کا نام شوکت ہے اور مکان نمبر۔“ سلطانہ نے اسی شوکت کا مکان نمبر بتادیا۔ راجستھان کے کیمپ میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کرنے والے بہت سے لوگوں کے نام پتے انہیں معلوم تھے۔ ”اس بات کا خیال رکھئے کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ آپ کس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔“  
 ”آپ مطمئن رہئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔

”آپ کتنے اچھے ہیں۔“ سلطانہ نے آگے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔  
 عبدالقدوس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے پورے جسم پر چیونٹیاں سی ریگیٹیں لگیں اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ اس مرتبہ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی اس کے برعکس اس نے اپنا دوسرا ہاتھ سلطانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔  
 سلطانہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔ اس کا جادو کام کر گیا تھا۔ اس مولوی ٹائپ نوجوان کی رال بھی ٹپک پڑی تھی۔

”میرا خیال ہے اب آپ روانہ ہو جائیے۔ رات کو واپس آئیں تو ہمارے لئے کھانا بھی لیتے آئیے۔ اور کوشش کیجئے کہ نودس بجے تک واپس آجائیں۔“ سلطانہ نے آہستہ آہستہ چھڑاتے ہوئے کہا۔  
 ”جی جی..... میں ابھی جا رہا ہوں۔ آپ ذرا باہر جائیے۔ میں تیار ہو لوں۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

سلطانہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئی جہاں نائکہ بستر پر لیٹی اور نگہ رہی تھی۔  
 عبدالقدوس کی واپسی ساڑھے نو بجے کے قریب ہوئی تھی۔ وہ ان کے لئے ہوتل سے کھانا بھی لے آیا تھا۔ کھانا اس نے کچن میں رکھ دیا۔ سلطانہ بھی اس کے پیچھے ہی کچن میں داخل ہو گئی۔  
 ”شوکت کے بارے میں معلوم کیا؟“ سلطانہ نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”جج..... جی ہاں۔“ عبدالقدوس ہلکاتے ہوئے بولا۔ ”مکان اچھا خاصا ہے لیکن کافی پیچھے کی طرف ہے۔ ابھی شاید کچھ کام باقی ہے۔ پلستر وغیرہا دھورا چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے آس پاس کے مکان بھی ایسے ہی ہیں۔ لیکن وہ علاقہ ذرا ویران ہے۔ یعنی رفاع عام کا آخری حصہ ہے۔ شوکت اکیلا نہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی رہتا ہے۔ لیکن آپ شوکت کے بارے میں یہ معلومات کیوں حاصل کر رہی ہیں۔“  
 ”اس کے پاس کوئی گاڑی وغیرہ بھی ہے؟“ سلطانہ نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔  
 ”ہاں۔ سرخ رنگ کی ایک شیراؤ گیٹ کے اندر کھڑی دیکھی تھی میں نے۔“ قدوس نے کہا۔

”اسے یا کسی اور کو شبہ تو نہیں ہوا کہ آپا سکے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔“ سلطانہ نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ.....“  
 ”کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“ سلطانہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل میری ایک پہلی کا دور کا رستہ دار ہے۔ شوکت سے اس کا رشتہ طے ہوا ہے۔ ہم نے سوچا کہ اس کے بارے میں معلوم ہی کر لیا جائے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔“  
 ”اوہ۔“ عبدالقدوس چونک گیا۔ ”یہ بات آپ مجھے پہلے بتاتیں تو میں کسی اور طریقے سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔“

”آپ نے جو کچھ معلوم کر لیا وہی کافی ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔  
 دس بجے کے قریب انہوں نے کھانا کھایا۔ سلطانہ اور نائلہ اپنے کمرے میں آخر شوکت کے بارے میں پانک کرنے لگیں۔ انہوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ کل رات شوکت کے مکان پر ہلہ بول دیا جائے اور شوکت کو زیر کر کے اس کے ٹھکانے پر قبضہ کر لیا جائے اور اس کے بعد جن دہشت گردوں کے بارے میں معلوم ہے ان کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے۔

”انسپکٹر کھوکھر اور شاہنواز کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے گا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ایک دو روز تک انہیں ڈھیل دی جائے گی تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں کہ ہم ان کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتیں اور پھر سب سے پہلے ہماری کارروائی انہی کے خلاف ہوگی۔“

”مسی اور غزالہ کو تو اپنی خیریت کی اطلاع دیدی جاتی۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 ”ہمارے فرار کے بعد شاہنواز اپنی بہن سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ غزالہ وغیرہ اگر مطمئن نظر آئیں تو اسے شبہ ہو جائے گا۔ اس لئے ان کا پریشان رہنا ہی ضروری ہے تاکہ شاہنواز وغیرہ کو صحیح تاثر مل سکے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔

اس سے اگلے روز عبدالقدوس جب یونیورسٹی سے واپس آیا تو سلطانہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اس پر پوری طرح ریشہ ختمی ہو چکا ہے۔ وہ یونیورسٹی سے بھی جلدی واپس آگیا تھا اور آج تو وہ جیلوں بہانوں سے سلطانہ کے قریب رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔  
 ”عبدالقدوس صاحب۔ آپ سے ایک اور کام آن پڑا ہے۔“ سلطانہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ عبدالقدوس ہمہ تن گوش ہو گیا۔  
 ”ہمیں کچھ رقم چاہئے۔ چار پانچ سو روپے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”دراصل نائلہ کی ایک رشتے در شاہ اہل کالونی میں رہتی ہے۔ ہم ان کے ہاں جانا چاہتی ہیں۔“  
 ”تت..... تو آپ یہاں سے چلی جائیں گی۔“ عبدالقدوس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔  
 ”میں آپ سے ملتی رہوں گی۔ اور آپ کی رقم بھی جلد ہی واپس کر دی جائے گی۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 ”میں دیکھتا ہوں میرے پاس کتنی رقم ہے۔“ عبدالقدوس کمرے کے کونے میں رکھا ہوا لوہے کا ٹرنک

کھولنے لگا۔ وہ کپڑوں میں ٹٹول رہا پھر کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ساڑھے تین سو روپے ہیں۔ یہ آپ رکھ لیجئے۔“

”آپ کو بھی تو ضرورت ہوگی۔ ایسا کیجئے آپ صرف دو سو روپے دیدیجئے۔ یہ میں آپ کو جلد ہی لوٹا دوں گی۔“ سلطانہ نے کہتے ہوئے دو سو روپے لے لئے اور پھر اسی شام اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد وہ عبدالقدوس سے رخصت ہو رہی تھیں۔ عبدالقدوس بچہ اداس نظر آ رہا تھا۔

بلیر کے علاقے میں واقع رفاع عام سوسائٹی میں شوکت کا مکان تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ علاقہ واقعی ویران تھا۔ اکا دکا مکانوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ زیادہ تر مکان زیر تعمیر تھے۔ بہت سے مکان تو ادھورے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اس طرف لوگوں کی آمد و رفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

وہ دونوں گیٹ کے سامنے رک گئیں۔ اندر سرخ رنگ کی ایک گاڑی نظر آ رہی تھی۔ ٹائلہ نے کال بیل کا بھند بایا تو اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ایک آدی نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی عمر بیسٹس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

”کس سے ملتا ہے آپ لوگوں کو؟“ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”شوکت سے۔ ہم اس کی پرانی دوست ہیں۔“ ٹائلہ نے کہا۔

”آپ لوگ کہاں سے آئی ہیں۔ شوکت تو اس وقت نہیں ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”ہم بہت دور سے آئی ہیں۔ انتظار کر لیں گی۔“ ٹائلہ نے کہا۔

وہ شخص چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر انہیں اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر خوبصورت پلاسٹک میٹ بچا ہوا تھا۔ ریگڑین کے صوفے تھے۔ تین چار کرسیاں تھیں جن پر روئی والے کٹن رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹی آئین ٹیبل بھی ہوئی تھی لیکن اس پر کوئی چیز نہیں تھی۔ میز کی لکڑی کی سطح پر آؤسی تر بھی لکیوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ کيس کوئی نمبر لکھے ہوئے تھے۔ بالکل ایسے ہی تھا کہ میز کے قریب بیٹھنے والا ہر شخص نے اپنی ذہانت کے مطابق بال پین یا پینسل وغیرہ سے میز کی سطح پر کسی نہ کسی فن کا مظاہرہ کیا تھا..... میز کی سب سے نیچے والی دراز میں چھوٹا سا ٹالا لگا ہوا تھا۔

”آپ لوگ بیٹھیں۔“ اس شخص نے کہا۔ ”چائے پیئیں گی یا ٹھنڈا؟“

”چائے چلے گی۔“ ٹائلہ نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”ویسے شوکت کب تک آجائے گا۔“

”اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ چاہے تو ابھی آجائے اور چاہے تو رات بھر غائب رہے۔ آپ لگ

بیٹھئے۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ شخص کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

سلطانہ ریگڑین کے صوفے پر بیٹھ گئی اور ٹائلہ کرسی پر۔ چند سیکنڈ بعد ہی اسے کوئی چیز چھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ذرا سا پہلو بدل کر کشن کو ٹٹول کر دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں ابھرنی سی ابھرائی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کشن کو ٹٹولنے لگی۔ سلطانہ ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کشن کے اندر کوئی چیز تھی۔ کشن کے کور کو بیچ بن لگے ہوئی تھی۔ ٹائلہ نے بیچ بن کھول کر ہاتھ اندر ڈال دیا اور جب ہاتھ باہر نکلا تو اس میں ایک ٹی پیسٹول دبا ہوا تھا۔ اس پر سائلنسز بھی لگا ہوا تھا۔

ٹائلہ کی آنکھوں میں چمک ابھرائی۔ اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ بھی حیرت سے پستول دیکھ رہی تھی۔ ٹائلہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف دیکھتے

۸۸ پستول چیک کرنے لگی۔ اس کا میگزین بھرا ہوا تھا۔ اس نے پستول قبض کے نیچے شلوار کے نیچے میں اس لپا اور کرسی سے اٹھ کر سلطانہ کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ کرسی کا نشان اس نے دوبارہ اسی حالت میں رکھ دیا تھا۔

تقریباً ”پندرہ منٹ بعد وہ آدمی چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے دونوں کے سامنے میز پر چائے کے کپ رکھ دیے اور دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

”آپ لوگ کہاں سے آئی ہیں اور شوکت کو کیسے جانتی ہیں؟ اس شخص نے پوچھا۔

”ایک لمبے سفر کے دوران شوکت سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں پتہ دیا تھا کہ کراچی آئیں تو اس سے ضرور ملیں۔“ نائلہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

اسی لمحہ مکان میں اندر کبیس فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ آدمی معذرت کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نائلہ نے فون کی گھنٹی کی آواز سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ موبائل فون تھا۔ ریگولر فون کی گھنٹی کی آواز قدرے مختلف ہوتی ہے۔ تقریباً ”پانچ منٹ بعد وہ آدمی واپس آگیا۔

”شوکت کا فون تھا۔ وہ آدھے گھنٹے میں آرہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آپ ان کے بھائی ہیں یا دوست؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”دوست سمجھ لیں۔ ہم اکٹھے رہتے ہیں۔ میرا نام شرافت ہے۔“ اس شخص نے کہا۔

نائلہ اور سلطانہ دیر تک شرافت سے باتیں کرتی رہیں۔ شرافت کے کہنے کے مطابق شوکت کوئی بارہ پار کرتا ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کاروبار کس قسم کا ہے۔ شوکت آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ دوسرا آدمی شکل ہی سے چھٹا ہوا بد معاش لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آئوٹریک رائفل تھی۔ نائلہ اور سلطانہ کو وہ رائفل پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ رائفل انڈیا کی بنی ہوئی تھی اور راجستھان کے کیمپ میں انہیں ایسی ہی رائفوں سے ٹریننگ دی گئی تھی۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں ٹھک گئے۔ شوکت نے فوراً ہی انہیں پہچان لیا تھا۔

”اوہ! تم لوگ!“ اس کے لمبے میں حیرت تھی۔ وہ گرم جوش کار اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

”رک جاؤ شوکت۔“ دوسرا آدمی بولا۔ اس نے ایک دم اپنی رائفل سیدھی کر لی تھی۔ ”یہ دبی اٹرنک لڑکیاں ہیں جو راجستھان میں ٹریننگ کیمپ تباہ کر کے فرار ہوئی تھیں۔ انڈیا میں تو اب بھی انہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں بھی ان کے بارے میں اطلاع دیدی گئی تھی۔ اور یہ ہدایت کی گئی تھی کہ انہیں دھمکتے ہی گولی مار دی جائے۔“

”اوہ!“ شوکت کی بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ”تمہاری تیسری ساتھی کہاں ہے؟“ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ سرحد پار کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”اور تم لوگوں کو یہاں گولی مار دی جائے گی۔“ رائفل والے نے غراتے ہوئے کہا۔ ”انہیں تہ خانے میں لے چلو۔ ان کی وجہ سے جو نقصان ہماری حکومت کو آتھا نا بڑا ہے اس کا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اہلک۔ اسکی کیمپ میں صرف دو آدمی زندہ بچے تھے۔ سب ختم ہو گئے اور انہوں نے وہ کیمپ اس طرح تباہ کیا تھا کہ وہاں کچھ بھی نہیں بچا۔ اور میرا خیال ہے یہ لوگ بہت دنوں سے یہاں ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ممتاز اور شاہد کے اڈوں پر چھاپے اور گرفتاریاں انہی کی نشاندہی پر ہوئی تھیں اور رند علی

لاشاری کا ہمارا مین ایجنٹ ہندو سیٹھ بھی انہی کی نشاندہی پر پکڑا گیا ہے۔ یہ ہمارے بہت سے لوگوں کے بارے میں جانتی ہیں اور یہاں بھی یہ تم سے بغل گیر ہونے کے لئے نہیں آئی ہوں گی۔ انہیں تہ خانے میں لے چلو۔ سب پتہ چل جائے گا۔“

سلطانہ کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا لیکن نائلہ مطمئن تھی۔

”تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہم تو خود وہاں سے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگی تھیں۔ اگر ہمیں بھاگنے کا موقع نہ ملتا تو اس کیپ میں ہمارے بھی پرچے اڑ گئے ہوتے۔“

”تم لوگ مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔“ رانفل بردار نے کہا۔ ”پوری تفصیل مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ زندہ بچ جانے والے دو آدمیوں میں سے ایک گیٹ کا کن مین بھی تھا۔ وہ اگرچہ شدید زخمی ہوا تھا لیکن اس نے تم لوگوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ سب بھی زندہ ہے اور رام گڑھ کے ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ شوکت! لے چلو انہیں۔ ابھی معلوم کر لیں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ستیش۔“ شوکت نے کہا اور پھر ان دونوں کی طرف مڑ کر بولا۔ ”چلو۔۔۔ اس مکان کے نیچے ایک بڑی پرسکون جگہ ہے۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر تم سے باتیں کریں گے۔ شرافت۔۔۔ تہ خانے کا دروازہ کھولو۔“

ستیش نے نائلہ اور سلطانہ کو رانفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ انہیں لے کر ایک دوسرے کمرے میں آگئے۔ اس کمرے میں بھی فرش پر پلاسٹک میٹ بچھا ہوا تھا اور ایک دیوار کے ساتھ بٹنگ پڑا ہوا تھا۔ شرافت نے وہ بٹنگ گھسیٹ کر دیوار سے دور ہٹا دیا اور میٹ کا کونا اٹھا کر فرش پر ایک فائل کو دبائے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرش کا ایک حصہ کسی صندوق کے ڈھکنے کی طرح اوپر اٹھ گیا۔ فرش میں چار مربع فٹ کی غلاء پیدا ہو گئی۔

اس غلاء میں بیڑھیاں تھیں۔ پہلے شرافت نیچے اترا۔ اس نے اپنی قبض کے نیچے سے پستول نکال لیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے تہ خانے میں اترا اور آخری بیڑھی سے اترتے ہی اس نے مرکز پستول کا رخ نائلہ اور سلطانہ کی طرف کر دیا تھا جو بیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ ان کے پیچھے ستیش رانفل تانے ہوئے تھا اور سب سے آخر میں شوکت تھا۔

تہ خانہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس میں ایک طرف لکڑی کی کئی پٹیاں اوپر نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کچھ کاٹھ کباڑ بکرا ہوا تھا۔ وہ انہیں سامنے والی دیوار کے قریب لے گئے۔ ستیش نے رانفل شوکت کو تھمادی اور پنے تلے قدم اٹھاتا ہوا نائلہ کے سامنے آگیا۔ نائلہ پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے لگ گئی۔

”ڈر رہی ہو!“ ستیش اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”اس وقت تو تمہیں ڈر نہیں لگا ہو گا جب کیپ تباہ کیا تھا۔ اس کیپ کی تباہی سے جو مالی نقصان ہوا سو ہوا۔ لیکن ہمارے بہت سے قیمتی آدمی بھی مارے گئے تھے۔ تم سے ان سب کا حساب لیا جائے گا۔“

”اور تم لوگوں نے یہاں جو تباہی مچا رکھی ہے اس کا حساب کون دے گا؟“ نائلہ نے کہا۔

”گڈ۔“ ستیش کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”تو گویا تم اس بات کا اعتراف کر رہی ہو کہ کیپ کو تم ہی لوگوں نے تباہ کیا تھا۔“

”ہاں۔ ہم نے ہی کیپ تباہ کیا تھا۔“ نائلہ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”اور یہاں بھی تم لوگ نہیں بچ سکے گے۔ ایک ایک کو جہن چن کر ختم کر دیا جائے گا۔ اگر شوکت جیسے لوگ اپنے وطن کی عزت کا سودا

کر سکتے ہیں تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس قوم میں ہم جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی جان تو دے سکتے ہیں مگر وطن کی عزت و سلامتی پر حرف نہیں آنے دیں گے۔“

”تقریر اچھی کر لیتی ہو۔“ ستیش نے کہا۔ ”یہ تمہاری زندگی کے آخری لمحات ہیں جو بولنا چاہتی ہو بولی رہو۔ تمہیں کوئی منع نہیں کرے گا۔“ وہ مڑ کر سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تم بھی ادھر آکر اس کے ساتھ غزنی ہو جاؤ۔“

ستیش کی توجہ نالکہ کی طرف سے ایک لمحہ کو ہٹی تھی۔ نالکہ نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیض کے نیچے شلوار کے نیچے میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چھلانگ لگا کر ستیش کی ہات پر پھینکی گئی تھی۔ اس نے پستول کی نال ستیش کی کھوپڑی سے لگا دی۔

”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ نالکہ کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ”ان سے کو ہتھیار پھینک دیں ورنہ تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گی۔“

”کسی خوش فہمی میں جھلومت رہنا۔“ ستیش نے کہا۔

”میں صرف تین تک گنوں گی۔“ نالکہ غرائی۔ ”اگر تین کہنے تک انہوں نے ہتھیار نہ پھینکے تو میں گولی چلا دوں گی۔“ نالکہ نے گنتی شروع کر دی۔ اس نے جیسے ہی تین کیا ستیش کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

”شوکت..... شرافت..... ہتھیار پھینک دو۔“

شوکت اور شرافت ایک لمحہ کو ہچکچائی پھر انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔

”گنڈ۔“ نالکہ بولی۔ ”سلطانہ رانا نقل اٹھا لو۔“

سلطانہ نے فوراً ہی آگے بڑھ کر رانا نقل اٹھالی اور پستول کو ٹھوکر مار کر دور ہٹا دیا۔

”اب تم تینوں سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ نالکہ نے ستیش وغیرہ کو حکم دیا اور اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ تینوں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

”تم یہ بھول گئے تھے کہ ہم نے بھی اسی یکپ سے ٹریننگ حاصل کی تھی۔ نالکہ نے ستیش کی طرف اچھلتے ہوئے کہا۔ ”ہماری یہ ٹریننگ اب تم ہی لوگوں کے خلاف استعمال ہوگی۔ تمہارے جتنے بھی آدمیوں کے نام پتے ہمیں معلوم ہیں انہیں اس طرح ختم کر دیا جائے گا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چل سکے گا۔ سب سے پہلے تمہاری باری ہے..... مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”نالکہ پلیز۔“ شوکت چیخا۔ ”مجھے مت مارو۔ پلیز..... میں۔“

”نجانے کتنے بے گناہوں کو تم نے اب تک موت کے گھاٹ اتارا ہو گا۔ ہر شخص نے تم سے اس طرح زندگی کی بیک مانگی ہوگی۔ آج تم پر بھی وہی وقت آ گیا ہے۔ سلطانہ۔ ختم کرو ان درندوں کو۔“ نالکہ چیخی۔

سلطانہ نے ٹرانسگر دبا دیا۔ یہ خانہ چیخوں اور فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔

ان تینوں کے جسم چھلکی ہو گئے۔ زمین پر گرنے کے چند ہی سیکنڈ بعد وہ تینوں بے حس و حرکت ہو چکے تھے ان کے جسموں سے بننے والا خون فرش پر پھیل رہا تھا۔ نالکہ یا سلطانہ کو انہیں موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آیا تھا۔ یہ بھارت کے تربیت یافتہ دہشت گرد تھے۔ انہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کے لئے کراچی بھیجا گیا تھا اور اب تک نجانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔

نالہ کے خیال میں انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ دونوں انہیں ختم کرنے کے بعد تیزی سے بے غاے سے باہر آگئیں۔ تہخانے میں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں اگرچہ باہر سن لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا لیکن وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔

بے غاۃ کا راستہ بند کر کے انہوں نے اوپر پلنگ سر کا دیا اور دروازے وغیرہ چپک کرنے کے بعد دروازے

روم میں آکر بیٹھ گئیں۔ فائرنگ کی آواز اگر باہر سن بھی گئی ہوگی تو نالہ کو یقین تھا کہ محلے کا کوئی بھی شخص تحقیق حال کے لئے نہیں آئے گا۔ دہشت گردوں نے شہر میں قیامت مچا رکھی تھی۔ بعض علاقے تو رات بھر فائرنگ سے گونجتے رہتے تھے۔ پولیس ان دہشت گردوں پر قابو پانے میں بالکل ناکام رہی تھی۔ بے گناہ عوام کو سڑکوں پر گولیوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا گھروں میں گھس کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا مگر کوئی انہیں بچانے والا نہیں تھا۔ پولیس کے انکار فرض شناسی بھول گئے تھے پولیس کی گشتی پارٹیاں ان علاقوں میں گھومتی رہتیں جہاں قدرے سکون ہوتا۔ وہ لوگ متاثرہ علاقوں کی طرف جانے سے گریز کرتے۔ انہیں عوام سے زیادہ اپنی جانیں عزیز تھیں۔

اول تو فائرنگ کی آواز تہ خانے میں دب گئی ہوگی اور اگر کہیں سنی بھی گئی ہوگی تو کوئی شخص یہ معلوم کرنے نہیں آئے گا کہ فائرنگ کیوں ہوئی تھی۔ خوف کے مارے ہوئے لوگ ایسے مواقع پر گھروں میں گھس کر دروازے اندر سے بند کر لیتے تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر سناٹا طاری ہو جاتا۔

وہ دونوں تقریباً ”آدھا ٹھنڈا ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہیں۔ پھر نالہ اٹھ کر باہر آگئی۔ گیٹ کے اندر کی طرف سرخ رنگ کی ایک شیراز کھڑی تھی۔ نالہ کار کے اوپر سے گھوم کر گیٹ کے قریب آگئی۔ اس نے چھوٹا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ گلی میں کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔

اس مکان میں ڈرائنگ روم کے علاوہ دو بیڈ روم اور ایک ٹی وی لائونج بھی تھا۔ دونوں بیڈ رومز میں پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ پلاسٹک میٹ تمام کمروں میں بچھے ہوئی تھے۔ پلنگ بھی عام سے تھے۔ اس مکان میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں تھی جسے قیمتی کہا جاسکتا ہو۔ لگتا تھا جیسے تمام چیزیں کسی کباڑیے سے کپڑی گئی ہوں۔ ٹی وی لائونج میں ایک میز پر ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سی آر جی موجود تھا۔ فلموں کے دو کیسٹ بھی میز پر پڑے ہوئے تھے۔ نالہ نے کیسٹ اٹھا کر دیکھے۔ وہ بھارتی فلمیں تھیں۔

وہ ایک بیڈ روم میں آگئیں۔ پلنگ کے قریب ہی دیوار پر کھونٹی لگی ہوئی تھی جس پر چند کپڑے ٹنگے ہوئی تھے۔ سلطانہ ایک ایک کپڑا اتار کر جیبوں کی تلاشی لینے لگی لیکن کسی جیب سے کچھ نہیں ملا۔ اس نے بستر پر بڑا ہوا میلا سا تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ تکتے کے نیچے بھی کچھ نہیں تھا۔ اس نے میٹرلس کا ایک کونا اٹھا دیا۔ نیچے کچھ نہیں تھا۔ وہ میٹرلس چھوڑنا ہی چاہتی تھی کہ چونک گئی۔ میٹرلس کے نیچے کا کپڑا ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور ہلکے نیلے رنگ کا کوئی کاغذ جھلک رہا تھا۔ اس نے میٹرلس پوری طرح اٹھا دیا اور پھٹے ہوئی کپڑے میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگی اور جب ہاتھ باہر نکلا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ہزار ہزار کے نوٹوں کے دو ہنڈل تھے۔ اس نے میٹرلس کے مزید اندر تک ٹٹول کر دیکھا مگر اور کچھ نہیں تھا۔ سلطانہ نے میٹرلس چھوڑ دیا اور نوٹوں کے ہنڈل اٹھا کر دوسرے کمرے میں آگئی یہاں نالہ تلاشی لینے میں مصروف تھی۔

”میرا خیال ہے یہ رقم دو لاکھ تو ہوگی۔“ سلطانہ نے نوٹوں کے ہنڈل دکھاتے ہوئے کہا۔

نالہ نے مزید اس کی طرف دیکھا۔

”دوسرے کمرے میں میٹریس کے اندر چھپائے ہوئے تھے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”یہ میٹریس بھی چپک کر۔ میں الماری دیکھتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔

لوہے کی الماری بھی پرانی سی تھی۔ نائلہ نے الماری کے دونوں دروازے کھول دیئے۔ ایک طرف بیگروں پر کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ ان میں شلوار قمیض والے سوئے بھی تھے اور پینٹ شرٹس بھی۔ دوسرے خانے میں بھی استری شدہ کپڑے تہ کئے ہوئے رکھے تھے۔ وہ بیگروں پر ٹنگے ہوئے کپڑوں کی تلاشی

پینے لگی۔ مگر کچھ نہیں تھا۔ اس نے تہ شدہ پیروں لے پیچے ہی ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ کچھ نہیں ملا۔ الماری کا تجوری والا خانہ مقل تھا۔ نائلہ کو شش کے باوجود اسے نہیں کھول سکی تھی۔

”ایک منٹ۔“ وہ سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ دونوں تہ خانے میں آگئیں اور فرش پر بڑی ہوئی لاشوں کے لباس کی تلاشی لینے لگیں۔ شرافت کے لباس سے کچھ رقم برآمد ہوئی تھی۔ شوکت کے لباس سے رقم کے علاوہ اس کا شناختی کارڈ اور چابیوں کا ایک گچھا بھی برآمد ہوا تھا۔ ستمیش کے لباس سے بھی رقم اس کا شناختی کارڈ اور چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا تھا۔ ستمیش کا شناختی کارڈ سید کے ایک سرحدی قصبے سے جاری کیا گیا تھا۔

”آؤ..... اوپر چلیں۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ دوبارہ اسی کمرے میں آگئیں۔ نائلہ، شوکت کی جیب سے برآمد ہونے والے چابیوں کے گچھ کی ایک چابی الماری کے تجوری والے خانے پر آزمانے لگی۔ بالاخر ایک چابی لگ گئی۔ کھٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔ اس نے پنڈل گھما کر دراز کھول دی اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں ہلکے پھلکے آنسو آئے۔ یہ درتہ سو پانچ سو اور ہزار روپے والے نوٹوں کے بندل رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک ڈائری نما چھوٹی نوٹ بک بھی رکھی ہوئی تھی اس خانے کے آخر میں پلاسٹک کا ایک تھیلا بھی پڑا ہوا تھا۔ نائلہ نے وہ تھیلا باہر نکال لیا۔ تھیلا کھولتے ہی اس کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی۔ اس تھیلے میں طلائی زیورات بھرے ہوئے تھے۔ نائلہ نے پیچھے ہٹ کر وہ تھیلا بستر پر الٹ دیا۔ جو اہرات جگمگا اٹھیں۔

”یہ..... یہ زیورات.....“ سلطانہ زیورات دیکھ کر ہکا بکا ہوئی۔

”ظاہر ہے کسی جوہری کی دوکان سے لوٹے گئے ہوں گے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو ان کی مالیت ایک لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔“ نائلہ نے کہا۔

”زیادہ ہو سکتی ہے۔ کم نہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔

زیورات سمیٹ کر دوبارہ تھیلے میں ڈال دیئے گئے۔ الماری کے سب سے نچلے خانے میں سیمسوناٹ براؤن رنگ کا ایک بریف کیس بھی پڑا ہوا تھا۔ نائلہ نے بریف کیس نکال کر پلنگ پر رکھ دیا۔ بریف کیس اسے نہیں تھا۔ اسے بریف کیس کھولا تو ڈھکنے کے اندر کی طرف اس کے تالے کا خفیہ نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ نائلہ نے وہ نمبر ذہن نشین کر لیا اور الماری سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اس میں رکھنے لگی۔ سو والے نوٹوں کا ایک بندل باہر رہنے دیا تھا۔ سلطانہ نے بھی دو نوٹوں بندل اس میں رکھ دیئے تھے۔ زیورات کا تھیلا بھی اس میں رکھ کر بریف کیس بند کر دیا گیا۔

نائلہ نے بریف کیس الماری کے نچلے خانے میں رکھ کر الماری بند کر دی اور وہ دونوں ایک بار پھر تہ خانے میں آگئیں۔ اب وہ لکڑی کی ان پیچوں کا جائزہ لینے لگیں جو ایک دوسرے کے نیچے اوپر رکھی ہوئی



کلدی کی ان پٹیوں میں اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ جدید ترین آٹومیک ریفلکٹس پستول، ریپونور دسٹی بم، راکٹ اور جہازوں کی تیز ادیش گولیاں بھی موجود تھیں۔ ان پٹیوں کے پچھلی طرف ایک چھوٹی میز پر وسیع جیٹہ عمل والا ایک وائرلیس سیٹ بڑا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک کاپی بھی بڑی ہوئی تھی۔ نائلہ نے کاپی کو اٹھا کر دیکھا۔ ایک صفحہ پر کچھ نمبر لکھے ہوئے تھے اور کاپی کے باقی صفحات خالی تھے۔ نائلہ نے وہ کاپی اٹھالی۔

کراچی، دہشت گردوں کے کچھ گروہ گھناؤنی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ہر گروہ کا اناٹا الگ الگ ہڈ کو اڑ رہا تھا۔ وائرلیس کے ذریعے ان کا آپس میں رابطہ رہتا تھا اور وائرلیس ہی کے ذریعے انہیں بھارتی آقاؤں سے بھی ہدایات ملتی تھیں۔ یہ مکان اس گروہ کا ہیڈ کوارٹر تھا اور غالباً "شوکت اس کا انچارج تھا اور منیش غالباً" اس کا ایجنٹ باس تھا۔ یہیں سے دہشت گردوں کو اسلحہ فراہم کیا جاتا ہے۔ وہ دونوں پھر اوپر آگئیں۔ الماری والا کمرہ غالباً "شوکت کا تھا یہاں انہیں ایک موبائل ٹیلی فون بھی مل گیا تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ سلطانہ کو بھوک محسوس ہونے لگی۔ وہ باورچی خانے میں آگئی۔ یہاں ایک چھوٹا فرج بھی رکھا ہوا تھا۔ اس میں پانی کی دو بوتلیں، جوس کے ڈبے، کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ لوگ شاید پانی سے زیادہ جوس اور کولڈ ڈرنکس استعمال کرتے تھے۔ دروازے کے خانے میں سات آٹھ انڈے بھی رکھے ہوئے تھے۔ سلطانہ نے چار انڈے نکال کر فرج بند کر دیا۔ اس نے دودھ کا ملک پیک والا ڈبہ بھی نکال لیا تھا۔

کچن میں چائے کا سارا سامان موجود تھا۔ اسے پلاسٹک کے ایک ڈبے میں ڈبل روٹی کے چند سلائس بھی مل گئے جو غالباً "صبح کے ناشتے سے بچے ہوئے تھے۔ اس نے انڈوں کا آلیٹ بنالیا۔ سلائس گرم کئے اور پلیٹوں میں سجا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں نائلہ بیٹھی ہوئی تھی۔

"لگتا ہے یہ لوگ گھر پر صرف صبح کا ناشتہ ہی کرتے تھے۔ کھانا کھیں باہر کھایا کرتے تھے۔ اس وقت کچن میں بھی کچھ لا ہے۔ کچھ آسرا ہو جائے گا۔" سلطانہ نے کہتے ہوئے دونوں پلیٹیں میز پر رکھ دیں اور دوبارہ کچن میں جا کر پانی کی ایک بوتل اور گلاس لے آئی۔

"یہ بھی غنیمت ہے۔" نائلہ نے کہا۔

وہ دونوں آلیٹ کے ساتھ ڈبل روٹی کے سلائس کھانے لگیں۔

"ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟" سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے نائلہ کی طرف دیکھا۔

"بڑی رہنے دوتہ خانے میں۔ صبح ان کے بارے میں سوچیں گے۔" نائلہ نے جواب دیا۔

"اگر رات کو یہاں کوئی آگیا تو؟" سلطانہ بولی۔

"دیکھا جائے گا۔" نائلہ نے جواب دیا۔ "ہمیں صرف آج کی رات یہاں گزارنی ہے۔ کل کوئی اور

ٹھکانہ ڈھونڈ لیں گے۔"

"غزالہ کے ہاں نہ چلیں۔ وہ لوگ بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔ سسی نے تو رو کر اپنا برا حال کر

ہو گا۔ وہ تم سے بہت انیچ ہے۔"

"ابھی ان کے ہاں جانا مناسب نہیں ہے۔" نائلہ نے جواب دیا۔ "شاہنواز اور انسپکٹر کھوکھر ہمارے

ٹاک میں ہوں گے۔ زرا اس معاملے سے نمٹ لیں پھر انہیں بھی دیکھیں گے۔"

"تو کل یہاں سے نکل کر یہاں جائیں گے۔" سلطانہ نے پوچھا۔

”تمہارا عبدالقدوس تو ہے نا۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک آدھ دن اس کے ہاں نکال ہی لیں گے۔“

”پیارے عبدالقدوس۔“ سلطانہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ”نجانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔“  
 ”یہ راہ تو اسے تم ہی نے دکھائی تھی۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”تم نے اچھے بھلے آدمی کا سکون برباد کر رکھا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ نیند میں بھی تمہارے ہی خواب دیکھ رہا ہوگا۔“  
 ”یہ یقین ہے لیکن ہے کام کا آدمی۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

اسی وقت کہیں دور سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ فائرنگ کی آوازیں کبھی تیز ہو جاتیں اور کبھی ملاوٹی چھا جاتی۔

”گلتا ہے دہشت گردوں کی کسی پارٹی اور پولیس میں ٹھن گئی ہے۔ اگر وہ دہشت گرد اس طرف آگئے.....“

”ان دہشت گردوں کا تعلق کسی دوسرے علاقے سے ہوگا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”کمپ میں تربیت کے دوران یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ ایک علاقے کے دہشت گرد ہمیشہ دوسرے علاقے میں جا کر کارروائی کریں اور اگر پولیس کی گھیرے میں آجائیں تو قریب ترین ٹھکانے میں پناہ لینے کی کوشش کریں، فائرنگ کرنے والے دہشت گرد یقیناً دوسرے علاقے کے ہوں گے لیکن عین ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی پناہ لینے کے لئے اسی طرف آجائے۔ ہمیں بہر حال ہوشیار رہنا چاہئے۔ رائفل اور پستول کہاں ہے؟“  
 ”دوسرے کمرے میں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”یہاں لے آؤ..... گلتا ہے ہمیں رات جاگ کر ہی گزارنی ہوگی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 سلطانہ دوسرے کمرے میں رائفل اور پستول لے آئی۔ پستول نائلہ نے اپنی سامنی رکھ لیا اور رائفل سلطانہ نے اپنے سامنے میز پر رکھ دی۔

فائرنگ کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ اب تو فائرنگ میں اور شدت آگئی تھی..... ان کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ آواز بھی کس طرف سے آرہی تھیں کبھی گلتا سامنے کسی جگہ فائرنگ ہو رہی ہو، بس مکان کے عقبی سمت سے اور کبھی چاروں طرف سے گونجتی ہوئی سنائی دینے لگی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد فائرنگ بہت کم ہو گئی۔ اب اکا دکا فائر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن گلتا تھا کہ وہ لوگ اسی علاقے میں موجود ہیں۔ نائلہ اور سلطانہ اس فائرنگ کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ دھب کی آواز سن کر دونوں چونک گئیں۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی دیوار سے کودا ہو۔ نائلہ نے فوراً ہی رائفل اٹھالیا اور رائفل بھی سلطانہ کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز مانی دی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی سرگوشیانہ انداز میں پکار رہا تھا۔

”شوکت..... دروازہ کھولو..... میں عامر ہوں۔ دروازہ کھولو شوکت.....“

نائلہ نے سلطانہ کو اشارہ کیا۔ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ نائلہ پستول لے کر دھواں دروازے کی طرف چلی گئی اور دروازے کی ساتھ لگ کر آواز سننے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر جو کوئی بھی تھا سرگوشیانہ انداز میں کبھی شوکت کو پکارتا اور کبھی شرافت کو آوازیں دینے لگتا۔ نائلہ کو یہ اندازہ اگلے ہی میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کا یہ اندازہ بھی درست نکلا تھا کہ اسی علاقے میں فائرنگ کرنے والے دہشت گردوں کا تعلق کسی دوسرے علاقے سے تھا اور ان میں سے ایک پناہ لینے

کے لئے یہاں آگیا تھا۔

دروازہ کھولو شوکت۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔“ آواز پھر سنائی دی۔

نانکھ نے دائیں ہاتھ میں پستول سنبھالا اور بائیں ہاتھ سے دروازے کے لاک کی ناب ہٹادی اور پینٹا گھما کر دروازہ کھول دیا۔ باہر عامر نامی جو شخص موجود تھا وہ دروازے کو دھکا دے کر اندر آگیا۔ نانکھ دروازے کے پیچھے تھی۔ وہ شخص جیسے ہی اندر داخل ہوا نانکھ نے پستول کی نال اس کی پشت سے لگا دی۔

”کوئی حرکت مت کرنا۔ ہاتھ اوپر اٹھالو۔“ نانکھ غرائی۔

”کک..... کون ہو تم.....“ عامر نامی وہ شخص ہکلا کر رہ گیا۔ یہ صورتحال اس کے لئے بالکل غیر متو

تھی۔

”رائفل پھینک دو۔ اور کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولی مار دوں گی۔“ نانکھ نے کہا۔ اس کے

میں بے پناہ سرد مہری تھی۔

عامر نے رائفل پھینک دی.....

”تم غالباً شوکت کی کوئی دوست ہو اور غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ میں شوکت کا دوست ہوں۔ وہ کہ

ہے؟“ عامر نے کہا۔

”تہ خانے میں موت کی نیند سو رہا ہے۔ تمہیں بھی اسی کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ آگے بڑھو۔“ نانکھ

نے کہا۔

عامر آگے بڑھ گیا۔ راہداری میں دو تین قدم چلنے کے بعد ہی عامر بڑی تیزی سے نیچے جھکا۔ نانکھ

پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ پستول پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ سنک کی آواز سے گولی نکلی اور سامنے والے کمر

کے دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ نانکھ کچھ سمجھ سکتی عامر نے

ہی لینے ٹانگ چلا دی اس کے پیر کی ٹھوکرا نانکھ کی پنڈلی پر لگی۔ نانکھ کراہ کر نیچے گری۔ پستول بھی اس

ہاتھ سے نکل کر دور جا گر ا تھا۔

عامر نے لینے ہی لینے پستول کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کا ہاتھ پستول تک پہنچا ہی تھا کہ ایک

غراہٹ سن کر چونک گیا۔

”خبردار.....! کوئی حرکت مت کرنا۔ جسم چھپائی کر دوں گی۔“

عامر کا ہاتھ پستول سے صرف تین چار انچ کے فاصلے پر تھا۔ اسی گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ ایک اور

اس پر آٹومیک رائفل تانے کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے ہاتھ

ہٹالیا۔

”کھڑے ہو جاؤ اٹھ کر۔“ سلطانہ نے اسے زوردار ٹھوکر ماری۔

نانکھ نے بھی جلدی سے اٹھ کر پہلے اپنا پستول اٹھایا اور پھر عامر کی رائفل پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دو

اسے رائفلوں کی زد پر لئے ڈرائنگ روم میں آگئیں۔

”اس کا خیال رکھنا۔ میں کوئی رستی تلاش کر کے لاتی ہوں۔“ سلطانہ کہتی ہوئی۔ ڈرائنگ روم

نکل گئی۔ نانکھ رائفل تانے کھڑی رہی۔

”تمہارا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔ کون ہو تم؟“ عامر نے اس کے چہرے پر نظریں جم

ہوئے کہا۔

”ضرور دیکھا ہو گا مجھے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”میں بھی راجستھان کے کیمپ میں رہ چکی ہوں۔“  
 ”اودہ!“ عامر چونک گیا۔ ”اب میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تمہارا نام یاد نہیں رہا لیکن تم تو ہماری

ساتھی ہو بھریے۔۔۔۔۔“  
 ”ہم نے ٹریننگ اس لئے کی تھی کہ تم جیسے لوگوں کی گردنیں مروڑ سکیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ اس  
 دوران سلطانہ ایک لمبی سی سی لے کر آگئی۔ اس نے پہلے عامر کے ہاتھ پشت پر باندھے پھر اسے نیچے گرا دیا  
 اور اسی سی سے اس کے پیچھے باندھ دیئے۔

”تم لوگ بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔“ عامر بولا۔ ”سنیش کو تم لوگوں کی اس حرکت کا پتہ چل گیا تو وہ  
 تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”سنیش شوکت اور شرافت اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ یہ خانے میں ان تینوں کی لاشیں پڑی ہیں  
 اور تم جانتے ہو کہ مردے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”یہاں اکیلا سنیش ہی نہیں تھا۔ گپت لور دوسرے لوگ بھی موجود ہیں۔ وہ تم لوگوں کا سراغ لگالیں

گے۔“ عامر بولا۔  
 ”اس سے پہلے ہم ان کا سراغ لگالیں گی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”تم لوگوں کا کوئی آدمی ہماری نظروں  
 سے نہیں بچ سکتا۔ ایک ایک کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔“

اچانک ہی فائرنگ کی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ سلطانہ نے جلدی سے پٹنگ پر پڑا ہوا ایک کپڑا  
 اٹھا کر عامر کے منہ میں ٹھونس دیا اور راستہ اٹھا کر نائلہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی وقت ایک گاڑی تیز  
 رفتاری سے مکان کے سامنے سے گزر گئی۔ گاڑی سے غالباً ”ہوائی فائرنگ کی جارہی تھی۔“ نائلہ نے لپک کر  
 حق بجمادی۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس کی ایک گاڑی بھی فائرنگ کرتی ہوئی مکان کے سامنے سے گزر گئی۔

”معلوم ہوتا ہے پولیس دہشت گردوں کے تعاقب میں لگی ہوئی ہے۔“ سلطانہ نے کہا اور صوفے پر  
 چڑھ کر کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی۔

وہ دونوں گاڑیاں غالباً ”دور نکل چکی تھیں۔ لیکن فائرنگ کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔  
 سلطانہ نے صوفے سے اتر کر حق جلادی اور کھڑکی کے سامنے پردے کو پوری طرح کھینچ دیا۔ فرش پر پڑا ہوا  
 عامر بے بسی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تقریباً“ آدمی ٹھنڈے اور گزر گیا۔ گلی میں ایک بار پھر بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ باتوں کی  
 آوازیں بھی ان کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں اور پھر ان کے مکان کا گیٹ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے  
 لگا۔ نائلہ اور سلطانہ نے معنی کیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تیسری مرتبہ دروازہ دھڑ  
 دھڑائے جانے کے بعد نائلہ صوفے پر چڑھ گئی اور کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بولی۔

”کون ہے۔ باہر کون ہے۔“  
 ”پولیس۔“ باہر سے کہا گیا۔ ”دروازہ کھولنے، تین دہشت گردان گلیوں میں کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔  
 ہمیں ان کی تلاش ہے۔“

”یہاں کوئی نہیں آیا بھی۔ ہم دروازہ نہیں کھول سکتے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”ہم چپک کر نا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی دہشت گرد اس مکان میں کود گیا ہو دروازہ کھولنے۔“ باہر  
 سے کہا گیا۔

”گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ ہم دروازہ نہیں کھول سکتیں ویسے یہاں کوئی نہیں آیا۔ آپ کہیں تلاش کر لیں۔“ نائلہ نے کہا اور صوفے سے اتر آئی۔

اس مرتبہ باہر سے کچھ نہیں کہا گیا۔ نائلہ سوچ رہی تھی کہ اگر پولیس والے زبردستی گھر آئے انہیں نہیں روک سکیں گی۔ ایسی صورت میں ان کے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس نے عامر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔

”اطمینان رکھو۔“ نائلہ نے اس کے قریب جھک کر سرگوشی کی۔ ”تمہیں پولیس کے حوالے نہیں جائے گا۔ آج کی رات تو تم ہمارے سہمان رہو گے۔“

دروازہ دوبارہ نہیں کھٹکھٹایا گیا۔ پولیس والے اب آگے چلے گئے تھے۔ تقریباً دو گھنٹوں تک باہر سے آوازیں آتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ نائلہ اور سلطانہ صوفے پر بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور پھر ازان کی آواز سن کر وہ دونوں چونک گئیں۔ رات بیت تھی۔ نیا دن شروع ہو رہا تھا۔ نائلہ نے عامر کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔

چائے بنا دو گی سلطانہ۔“ نائلہ نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”بنا تی ہوں۔“ سلطانہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ ”مجھے غنودگی آ رہی ہے۔“  
سلطانہ تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ عامر نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتا رہا پھر زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ اس کے منہ۔ آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”آرام سے پڑے رہو۔“ نائلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے تمہارے بارے میں ا پروگرام بدل دیا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم یہاں سے چلی جائیں گی۔ اور پھر پولیس آجائے گی۔ یہ اب پولیس والوں کی مرضی پر منحصر ہو گا کہ وہ تمہیں ناشتہ چائے ڈبل روٹی سے کرواتے ہیں یا چھتروں سے۔“  
عامر زور زور سے سر ہلانے لگا۔ اس مرتبہ نائلہ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی وہ دونوں اطمینان سے چائے پیتی رہیں۔

سورج نکل آیا۔ دھوپ کی کرنیں کھڑکی کے شیشوں پر چمک رہی تھیں۔ مگر دبیز پردہ ہونے کی وجہ سے دھوپ اندر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ نائلہ نے پلنگ پر پڑا ہوا موبائل ٹیلی فون اٹھایا اور آئی جی صاحب کا نمبر ملانے لگی۔ ہیڈ کوارٹر کے آپریٹر نے فوراً ”ہی کال ریسیو کر لی تھی۔ نائلہ کو معلوم تھا کہ اتنی صبح آئی جی صاحب دفتر میں نہیں ہوں گے۔ وہ آپریٹر سے ان کے گھر کا یا موبائل نمبر لینا چاہتی تھی۔

”آئی جی صاحب کے گھر کا یا موبائل نمبر معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔

”آپ کون ہیں بی بی اور نمبر کیوں معلوم کرنا چاہتی ہیں۔“ آپریٹر نے پوچھا۔

”میرا نام نائلہ ہے اور.....“

”اوہ نائلہ بی بی۔“ آپریٹر اس کی بات پوری ہونی سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”آپ کہاں ہیں نائلہ بی بی۔ وہ تین دن سے پولیس کا پورا محکمہ آپ کی اور سلطانہ بی بی کی تلاش میں ہے۔ آپ جن کے ہاں رہ رہی تھیں وہ بھی بھید پریشان ہیں۔“

”میں اور سلطانہ بی بی خیریت سے ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”اس رات ہمیں طارق روڈ سے اسلو

کے زور پر اغواء کر لیا گیا تھا لیکن ہم ان کے چنگل سے نکل گئیں اور اب محفوظ ہیں۔ آئی جی صاحب کا موبائل یا گھر کا نمبر دیجئے۔ ایک اہم اطلاع دینی ہے۔“

”نوٹ کر لیجئے۔“ آریٹر نے نمبر بتا دیئے۔

نانکھ نے لائن کاٹ کر آئی جی صاحب کے گھر کا نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر بعد میں کال ریسیو کر لی گئی۔ کال کسی خاتون نے ریسیو کی تھی۔ لیکن جب نانکھ نے اپنا نام بتایا تو آئی جی صاحب لائن پر آگئے۔ وہ بھی اس کے بارے میں اپنی پریشانی کا اظہار کرتے رہے۔

”آپ میری فکر مت کیجئے سر۔“ نانکھ نے کہا۔ ”مجھے موقع نہیں مل سکا تھا کہ آپ کو یا کسی اور کو اطلاع دے سکوں۔ بہر حال ایک اہم اطلاع ہے۔“ نانکھ چند لمبے خاموش رہی پھر شوکت اور ستیش وغیرہ کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہم نے ایک دہشت گرد کو زندہ بھی پکڑا ہے اور اسے ہاتھ کر اس مکان میں ڈال دیے۔ اس سے بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ خانے میں تینوں لاشیں اور اسلحہ کی کئی پیمتیاں موجود ہیں۔“

”ڈی آئی جی صاحب اسی علاقے میں موجود ہیں۔“ آئی جی صاحب نے کہا۔ ”رات کے آخری پر دہشت گردوں نے ڈی ایس پی اور ایک سب انسپکٹر سمیت پانچ پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر دیا ہے۔ میں ابھی ای آئی جی صاحب کو اطلاع دے رہا ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔“

اس نے جس دہشت گرد کو زندہ پکڑا ہے اس کا تعلق غالباً ”دہشت گردوں کے اس گروہ سے ہے جس نے گزشتہ رات یہ کارروائی کی تھی۔ اس سے دوسروں کے بارے میں معلوم ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں موجود نہیں ہوں گی لیکن مکان کا دروازہ کھلا ہوا ملے گا۔ میں دوبارہ آپ سے رابطہ کروں گی۔ خدا حافظ۔“ نانکھ نے فون بند کر دیا۔ اس نے الماری میں سے بریف کیس نکالا۔ دونوں پستول بھی بریف کیس میں رکھ دیئے فون آف کر کے ایک کپڑے میں لپیٹ لیا اور بریف کیس سلطانہ کی طرف بڑھا دیا۔

”اب نکل چلو یہاں سے تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچنے والی ہے۔“ نانکھ نے کہا۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں آگئیں۔ پتنگ ہٹا کر یہ خانے کا راستہ کھول دیا اور ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ عامرا نہیں دیکھ کر ایک بار پھر زور زور سے سر ملانے لگا۔

”خدا حافظ مسٹر دہشت گرد۔“ نانکھ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئی کہا۔ ”تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچنے والی ہے۔ اگر تم ان سے تعاون کرو گے تو شاید بچ جاؤ گی۔ ورنہ ڈی ایس پی اور دوسرے پولیس والوں کے قتل کا حساب وہ تم سے لیں گے۔“

اس نے مڑ کر سلطانہ کو اشارہ کیا اور وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں۔ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر نانکھ نے ادھر ادھر دیکھا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ وہ دونوں باہر آگئیں۔ نانکھ نے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا اور وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گلی میں چلنے لگیں۔

کئی گلیاں گھومنے کے بعد وہ پارک کے سامنے نکل آئیں۔ یہاں آتے ہی انہیں ایک چلی عیسیٰ مل گئی۔ وہ عیسیٰ میں بیٹھ رہی تھی کہ پولیس کی ایک جیپ اور تین موبائیل وینز اگلے موڑ سے اس طرف مڑیں اور پھر فوری سے ان کے قریب سے گزر گئیں۔

”کہاں جانا ہے بی بی۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔ وہ بڑھا کھٹا آدی لگتا تھا۔

”واپس موڑ لو..... میں کوئی چیز گھر میں بھول آئی ہوں۔“ نانکھ نے کہا۔

ڈرائیور نے ٹیکسی گھمائی۔ نائلہ اسے راستہ بتاتی رہی۔ ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد وہ شوکر مکان والی گلی میں آگئی۔ مکان وہاں سے خاصا دور تھا۔ اس مکان کے سامنے پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر مطمئن سی ہو گئی۔

”ارے سلطانہ اودہ فائل تو میں کل دفتر سے لائی ہی نہیں تھی۔ میری یادداشت بھی دن بدن جوار جا رہی ہے۔ بلاوجہ اتنا چکر لگ گیا اور وقت بھی ضائع ہوا۔ ڈرائیور گاڑی واپس موڑ لو۔“ نائلہ نے کہا۔ ڈرائیور نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھا اور گاڑی ایک گلی میں گھمادی۔ ٹیکسی چھوٹے سے بنگلہ کر شاہراہ فیصل پر آگئی اور تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ شہید ملت والے کراسنگ پر ٹیکسی رکوالی اور سوکانوٹ نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا۔ میٹر پر پینتالیس روپے بنی تھے۔ ڈرائیور سوکانوٹ لے کر پچاس کانوٹ واپس کیا۔

”پانچ روپے اور۔“ نائلہ نے کہا۔  
”ٹھکے نہیں ہیں بیگم صاحب۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

نائلہ بڑبڑاتی ہوئی ٹیکسی سے اتر آئی۔ سلطانہ بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اتر چکی تھی۔ دونوں شہید ملت روڈ اور شاہراہ فیصل پر بننے والا فلائی اوور برج تکمیل کے آخری مرحلے میں تھا۔ شہید روڈ کا ٹریفک کی آمد و رفت شہید ملت روڈ کی طرف سے تھی۔ وہ دونوں سڑک پار کر کے ٹیو سلطان روڈ موڑ پر آگئیں۔ یہاں سے انہیں فوراً ہی ٹیکسی مل گئی۔ وہ ٹیکسی پر بیٹھ کر حیدر آباد کالونی کی طرف ہو گئیں۔ نائلہ کو یقین تھا کہ عبدالقدوس اس وقت گھر پر ہی ہو گا۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ جب وہ مکان کی سامنے ٹیکسی سے اتریں تو عبدالقدوس دروازہ کھول کر نکل رہا تھا۔ انہیں ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی گئی۔

”عبدالقدوس صاحب۔“ نائلہ نے اندر آکر کہا۔ ”آج آپ یونیورسٹی نہیں جائیں گے ہمارا ایک کرنا ہے اور ممکن ہے اس کام میں پورا دن لگ جائے۔“

”فرمائیے کیا کام ہے۔“ عبدالقدوس نے سوالیہ نگاہوں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔  
”پہلے تو آپ ہمارے ناشتے کا بندوبست کیجئے۔“ سلطانہ کی بجائے نائلہ بولی۔ اس نے گریبان سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”کھانے پینے کی کچھ ایسی چیزیں بھی لے آئیے کہ ہمیں دوپہر کو نہ رہنا پڑے۔“

”جی بہتر۔“ عبدالقدوس باہر چلا گیا۔

آدھے گھنٹے میں عبدالقدوس ان کے لئے ناشتہ اور کھانے پینے کی دیگر اشیاء لے آیا کہ دوپہر کھانے کا بھی بندوبست ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں نائلہ نے کچھ رقم الگ کر لی تھی۔

”یہ تو بچے وہ دوسو روپے جو سلطانہ نے کل آپ سے لئے تھے۔“ نائلہ نے دوسو روپے اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ”اور یہ پانچ ہزار روپے ہیں۔ ہمارے لئے آج ہی ایک مکان کا بندوبست کیجئے۔ گرائے کی فکر مت کیجئے۔ اگر بنگلہ فرنشڈ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ سنا ہے مجلس اقبال کا علاقہ پرسکون ہے۔ اسی طرح کوشش کیجئے۔“

”فرنشڈ بنگلہ۔ گلشن اقبال۔“ عبدالقدوس بڑبڑایا۔ ”میرے ایک عزیز ہیں۔ گلشن اقبال میں ان کا ہے۔ بالکل فرنشڈ ہر چیز موجود ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں ان سے بات کر لوں لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ نائلہ نے کہا۔

”چار سو گز کا بنگلہ ہے۔ کرایہ شاید کچھ.....“

”کرائے کی پروا نہیں۔“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ ان سے بات کر لیجئے۔ ہم چاہتے ہیں

کہ ایک دو روز میں وہاں منتقل ہو جائیں۔“

”آپ لوگ میرے ساتھ لیجئے۔ بات ہو جائے تو آج ہی ایگریمنٹ بھی ہو جائے گا۔ ان کی رہائش بھی

وہاں قریب ہی ہے۔“ عبد القدوس نے کہا۔

نائلہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم ناشتہ کر لیں تو آپ سلطانہ کو ساتھ لے جائیے۔“

ناشتہ کرنے کے بعد سلطانہ عبد القدوس کے ساتھ چلی گئی اور نائلہ کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ گئی۔

بریف کیس اس نے پلنگ کے نیچے رکھ دیا تھا۔

سلطانہ اور عبد القدوس تقریباً ”ڈیڑھ بجے واپس آئے تھے۔

”بنگلہ بلاک سیون میں ہے۔ پرائیویسی بھی ہے۔ وال تو ال کارپٹ بھیجے ہوئے ہیں اور بہترین فرنیچر سے

آراستہ ہے۔ ٹیلی فون بھی موجود ہے۔ کرایہ سات ہزار روپے ہے۔ چھ مہینے کا ایڈوانس اور چھ مہینے کا

ڈیپازٹ دینا پڑے گا۔ میں نے ایگریمنٹ بھی تیار کروا لیا ہے۔ اگر ادائیگی کر دی جائے تو ہم آج ہی وہاں

شفٹ ہو سکتی ہیں۔“

”انہوں نے کچھ پوچھا نہیں۔ کوئی اعتراض نہیں کیا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”عبد القدوس جیسے پائلے کر گیا تھا وہ رشتے میں اس کی چچی ہوتی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ میں ان کے

ایک پروفیسر کی بہن ہوں اس طرح مزید جرح نہیں کی گئی۔“ سلطانہ نے بتایا۔

”بنگلہ کس کا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”اس خاتون کے بھائی کا ہے اور وہ لوگ دو مہینے پہلے امریکہ چلے گئے ہیں۔ خاتون کے پاس بنگلے کو

کرائے پر دینے کے اختیارات ہیں۔ وہ بنگلہ قابل اعتماد قسم کے لوگوں کو کرائے پر دینا چاہتی تھی اور ہم سے

زیادہ قابل اعتماد کون ہو سکتا ہے۔ میں نے ان سے بات فاسل کر لی اور عبد القدوس جا کر ایگریمنٹ بھی تیار

کر دیا ہے۔ اسی خاتون نے ہمارے شناختی کارڈ کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔“ سلطانہ نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم آج شام ادائیگی کر کے اس بنگلے میں چلے جائیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

اسی شام وہ دونوں عبد القدوس کو لے کر اس خاتون کے مکان پر پہنچ گئیں۔ اس خاتون کی رہائش بلاک

تھری میں تھی۔ ادائیگی کر کے ایگریمنٹ اور رسید پر دستخط ہو گئے۔ عبد القدوس نے دنس کے دستخط کئے

تھے۔ وہ خاتون انہیں لے کر بنگلے پر آگئی۔

بنگلہ نائلہ کو پسند آیا۔ اس کی لوکیشن بھی اس کی پسند کے مطابق تھی۔

”آپ سامان کب لائیں گی؟“ خاتون نے پوچھا۔

”ہمارے پاس سامان کے نام پر ایک سوٹ کیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میں

در اصل بی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ جانتی ہیں چھوٹے سے قصبے میں رہ کر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے

کراچی آئی ہوں۔ یہاں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں اچھی لائبریریاں بھی ہیں جن سے مجھے مدد مل سکتی ہے۔

اس لئے یہ بنگلہ لیا ہے کہ سکون سے اپنا کام کر سکوں۔“

وہ خاتون انہیں بنگلے کے بارے میں بتاتی رہی پھر رخصت ہو گئی۔ عبد القدوس بھی جانا چاہتا تھا لیکن



سلطانہ نے اسی روک لیا۔ وہ تینوں فرنیچر وغیرہ کی صفائی کرنے لگے۔ نوبجے کے لگ بھگ انہوں نے ڈسٹ بکری کے قریب واقع ایک ایئر کنڈیشنڈ ریٹورنٹ میں آکر کھانا کھایا اور صبح کے ناشتے کا سامان لے کر واپس آگئے۔

”عبدالقدوس صاحب۔“ نائلہ نے کہا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ وہ مکان چھوڑ کر یہاں آجائیں ہمارے ہی ساتھ رہیں۔“

”جی!“ عبدالقدوس گڑبدا گیا۔ ”مجھے سوچنا پڑے گا۔“

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”آپ یہاں رہیں گے تو میں بھی حوصلہ رہے گا ہم ڈرتی تو نہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ عورتوں کا اکیلے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔“

”کل دوپہر کے قریب رحمن سکھر سے واپس آجائے گا تو شام کو میں اپنا سامان لے کر یہاں آجاؤں گا۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”ہم آپ کا انتظار کریں گی۔“

گیارہ بجے کے لگ بھگ عبدالقدوس واپس چلا گیا۔ سلطانہ اور نائلہ گھوم پھر کر ایک بار پھر بیگلے کے دروازے وغیرہ چیک کئے اور اس بیڈ روم میں آگئیں جو انہوں نے اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ یہاں ڈبل بیڈ بچا ہوا تھا۔ نائلہ نے بریف کیس کھول کر دونوں پستول نکال لئے اور بریف کیس بند کر کے بیڈ کے سرہانے کی طرف میٹریس کے نیچے رکھ دیا۔ دونوں پستول انہوں نے اپنے تکتے کے نیچے رکھ لئے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح اکیلی رات گزار رہی تھیں۔ گزشتہ رات کچھ عجیب و غریب صورتحال میں گزری تھی۔ پہلے شوکت اور سنبیش وغیرہ سے نمٹا گیا۔ پھر رات بھر فائرنگ ہوتی رہی اور رات کے آخری پہر عامر نامی اس دہشت گرد سے واسطہ پڑ گیا جو پناہ لینے کے لئے وہاں آیا تھا مگر ان کا شکار ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے گزشتہ رات بڑی مصروف گزری تھی کہ انہیں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک ایک لمحہ مصروف گزرا تھا۔ لیکن یہاں کچھ نہیں تھا۔ ان کے چاروں طرف گھمبیر سا نا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اگر شہر کے کسی ایک علاقے میں کچھ ہوتا تھا تو اس کا اثر پورے علاقے میں پڑتا تھا۔ ہر شخص کے دل پر خوف طاری تھا۔ یہ علاقہ اگرچہ نسبتاً ”پر سکون“ تھا لیکن لوگ سرشام ہی گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔

وہ دونوں دیر تک لیٹی باتیں کرتی رہیں۔ پھر سلطانہ تو سو گئی مگر نائلہ کو نیند نہیں آسکی۔ اس کے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات ابھرنے لگے۔ خیالات ایک تسلسل سے چلے آ رہے تھے۔ حسینہ بیگم، شبیر درانی، رائے منصور اور دلاور..... اسے ان میں سے کسی کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس روز آئی جی صاحب نے بتایا تھا کہ رحیم یار خان کے دلاور نامی ایک نوجوان کی رپورٹ پر انسپکٹر صوبہ خان کے خلاف تحقیقات کی گئی تھی۔ الزامات سنگین تھے جو درست ثابت ہوئے تھے اور صوبہ خان کو معطل کر کے اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے گئے تھے لیکن وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے فرار ہو گیا تھا۔

نائلہ کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ انسپکٹر صوبہ خان گرفتار ہوا تھا یا نہیں لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ دلاور چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ کار پر ہونے والی فائرنگ میں وہ بھی شدید زخمی ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے ٹھیک ہونے کے بعد وہ اس کی تلاش میں سندھ کے اندرونی علاقے تک آیا ہو اور اسے یہ بھی پتہ چل گیا ہو کہ کار پر حملہ کرانے اور نائلہ کو اغواء کرانے میں انسپکٹر صوبہ خان کا ہاتھ ہو اور عین ممکن ہے انسپکٹر صوبہ خان سے اس

کا تصادم بھی ہوا اور اسے صوبہ خان کے خلاف کچھ ایسے ثبوت مل گئے ہوں جن کی بناء پر آئی جی کو اذیت بھیجی تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ صوبہ خان کہاں غائب ہو گیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد نائلہ کے ذہن میں صرف یہی بات آئی تھی کہ صوبہ خان سندھ سے فرار ہو کر حیدر بیگم کے پاس ہی پہنچا ہو گا۔ وہی ایک ہستی ایسی تھی جو اسے پناہ دے سکتی تھی یا پھر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ اسے پناہ دے سکتا تھا۔

لیکن دلاور کہاں ہو گا؟ یہ خیال نائلہ کے ذہن سے گویا چپک کر رہ گیا تھا۔ ممکن ہے وہ اب بھی اسے اندرون سندھ کے گاؤں دیہاتوں میں تلاش کر رہا ہو۔ ایک مرتبہ تو نائلہ کے ذہن میں خیال آیا کہ رائے منصور کی حویلی کے نمبر پر فون کرے۔ لیکن رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ صبح ضرور فون کرے گی۔

نائلہ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے بالا خرید کی آغوش میں پہنچ گئی۔ صبح وہ دونوں دیر سے اٹھیں۔ ناشتہ کے بعد وہ قریبی مرکیٹ چلی گئیں جہاں سے راشن وغیرہ اور ضرورت کی دیگر چیزیں خریدی گئیں۔ واپسی پر نائلہ نے اخبار بھی لے لیا تھا۔ گھر آکر اخبار کھولا تو پہلا صفحہ رفاع عام سوسائٹی میں دہشت گردوں کی کارروائی اور ان کے ایک ٹھکانے سے برآمد ہونے والی دہشت گردوں کی لاش اور اسلحہ سے متعلق خبروں اور تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ اخبار نے ادارہ یہ بھی اسی موضوع پر لکھا تھا اور دہشت گردوں کی خلاف اس کارروائی کو بڑی اہم کارروائی قرار دیا تھا۔ ان خفیہ ذرائع کو بھی بڑی اہمیت دی گئی تھی جن کی اطلاع پر پولیس نے دہشت گردوں کے اڈے سے بھاری مقدار میں اسلحہ برآمد کرنے کے علاوہ ایک دہشت گرد کو زندہ بھی گرفتار کر لیا تھا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ نائلہ نے رائے منصور کی حویلی کے نمبر پر فون کای تو وہاں ایک نوکر سے یہ الموسناک خبر ملی کہ رائے منصور پر دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ رحیم یار خان والے ہنگلے میں ہیں۔ نائلہ نے ہنگلے کا نمبر لے لیا اور کچھ دیر بعد وہ دوسرا نمبر ملا رہی تھی۔ کال آصفہ بیگم نے ریسیو کیا تھی۔ وہ نائلہ کی آواز نہیں پہچان سکی تھی لیکن جب نائلہ نے اپنا نام بتایا تو اس کی آواز میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔

”ارے نائلہ بیٹا تم کہاں ہو۔ کیسی ہو؟ ہم تو نصیب دشمنان تمہیں مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ صرف دلاور ہی ایک ایسا ہے جسے ہر لمحہ یہ یقین تھا کہ تم زندہ ہو۔“

”جی ہاں۔ میں زندہ ہوں اور خیریت سے ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”رائے صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے اور.....“

”اب خدا کے فضل سے ٹھیک ہیں۔ لو بات کرلو۔“ آصفہ بیگم نے کہا اور پھر چند سیکنڈ بعد رائے صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ نائلہ کے بارے میں اطلاع پا کر خوشی سے پھولے نہیں مارتے تھے۔

نائلہ دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے دلاور کے بارے میں بھی پوچھا۔ دلاور اس وقت گھر پر نہیں تھا رائے صاحب نے تفصیل سے اس کے بارے میں بتا دیا کہ وہ ایک لمحہ کو بھی اسے نہیں بھولا۔

”اور حیدر بیگم کے کیا حال ہیں؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ان کی سانشین بدستور جاری ہیں۔“ رائے منصور نے بتایا۔ ”چند روز پہلی گل مرگ میں تمہاری زمین پر واقع کنویں سے انسپکٹر صوبہ خان کی لاش ملی تھی۔ اسے گولی مار کر لاش کنویں میں بھیج دی گئی تھی۔ حیدر بیگم نے دلاور کو پھانسنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ شبیر درانی کا ایکسٹنٹ ہو گیا تھا۔ وہ کئی روز ہسپتال میں رہا۔ اب پولیس اس کے پیچھے لگ گئی ہے۔ تم کہاں ہو نائلہ بیٹی؟“

”میں کراچی میں ہوں انکل اور بالکل ٹھیک ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میرا نمبر لکھ لیجئے۔ دلاور سے کہئے مجھے فون کرے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں چند روز کراچی ہی میں رہوں گی۔“

نائلہ کچھ دیر تک اور باتیں کرتی رہی پھر فون کر دیا۔  
عبدالقدوس شام سے پہلے آیا تھا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ سوک سینٹر کے قریب ایک شاپنگ سینٹر چلی گئیں۔ وہاں سے اپنے لئے کچھ ملبوسات خریدے اور واپس آگئیں۔ عبدالقدوس کو ایک بیڈ روم دیدیا گیا۔ کھانے کے بعد وہ تینوں دیر تک باتیں کرتے رہے پھر عبدالقدوس اپنے کمرے میں چلا گیا۔  
رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سلطانہ سوچتی تھی مگر نائلہ جاگ رہی تھی۔ وہ اس وقت دلاور کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دفععتاً دھب دھب کی آوازیں سن کر وہ چونک گئی۔ یوں لگا تھا جیسے یکے بعد دیگرے دو آدمی سے دیوار سے کودے ہوں۔

نائلہ خاموشی سے بستر سے اٹھ گئی۔ اس نے نکتے کے نیچے سے اپنا پستول نکال لیا اور کھڑکی کے قریب آکر پردے کا کوتا زرا سا ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ دائیں طرف دو انسانی ہیولے دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ ایک طرف سرک رہے تھے۔

...●y...●...●...

وہ دونوں سائے دیوار کے ساتھ ساتھ ریگیتی ہوئے پچھلی طرف جارہے تھے، پچھلی طرف بھی دروازہ تھا اور تقریباً ”دس فٹ کھلی جگہ اس کے بعد دیوار تھی اور اس کے ساتھ پچھلی طرف کا بجلہ تھا۔“  
نائلہ نے بڑی آہستگی سے سلطانہ کو جگا دیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے قریب جھپٹتے ہوئے سرگوشی میں اسے صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔

”وہ دو آدمی ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے اور وہ پچھلے دروازے کی طرف جارہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ پچھلا دروازہ کسی طرح کھولنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں ان کے استقبال کے لئے وہاں موجود ہونا چاہئے۔“

سلطانہ نے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے نیند کا فور ہو چکی تھی۔ اس نے نکتے کے نیچے سے اپنا پستول نکالا اور پلنگ سے اتر آئی۔ دونوں نکتے پیر بڑی آہستگی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر کئی دی لاؤنج میں آگئیں۔ یہاں بھی فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اس لئے ان کے چلنے سے معمولی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لاؤنج سے نکل کر اس راہداری میں آگئیں جس کے اختتام پر عقبی دروازہ تھا۔

وہ دونوں دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئیں اگر دروازہ کھلتا تو وہ اس کی آڑھ میں رہتیں۔ دروازے پر بہت ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں صاف لگ رہا تھا جیسے کوئی تالے میں چابی لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

نائلہ نے اوپر دیکھا۔ اوپر کا بولٹ لگا ہوا تھا۔ اگر تالا کھل بھی جاتا تو اس بولٹ کی وجہ سے دروازے کو باہر سے کھولنا آسان نہ ہوتا۔ نائلہ چند لمبے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے سلطانہ کا ہاتھ دبا کر اشارہ کیا وہ دونوں دبے قدموں چلتی ہوئی دوبارہ لاؤنج میں آگئیں۔

”یہ کون ہو سکتے ہیں؟“ سلطانہ نے سرگوشی میں پوچھا۔  
”چور... ڈاکو کوئی بھی ہو سکتے ہیں ہم یہاں بیٹھے ان کے اندر آنے کا انتظار نہیں کر سکتیں۔“ نائلہ نے

”عبدالقدوس کو جگا دیا جائے۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 ”نہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”وہ مخبوط الحواس قسم کا آدمی ہے کہیں شور نہ مچا دے۔ ہمیں یہاں  
 لڑے رہنے کے بجائے باہر نکل کر انہیں گھیرنا ہوگا۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ سلطانہ نے اسے گھورا۔

”میرا دماغ ٹھیک ہے۔ ان کا دماغ درست کرنا پڑے گا۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں تمہیں باہر نکلنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”ہم اندر زیادہ محفوظ ہیں سب سے پہلی  
 بات تو یہ ہے کہ ہمیں شور مچا دینا چاہئے تاکہ وہ بھاگ جائیں لیکن اگر تمہیں ان سے دو دو ہاتھ کرنے کا شوق  
 نہ تو انتظار کرو۔ اگر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم آسانی سے ان کی  
 گردن دو بچ سکیں گی۔ باہر کھلی جگہ نکلنا ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔“

بات نائلہ کی سمجھ میں آگئی۔ وہ دونوں ایک بار پھر دیے قدموں چلتی ہوئی اس دروازے کے قریب دیوار  
 کے ساتھ چپک کر کھڑی ہو گئیں دروازے کا ٹالا کھل گیا تھا۔ اب دروازے کے اوپر والے حصے پر کوئی چیز  
 پھنسا کر اسے آہستہ آہستہ دھکا دیتے ہوئے چٹنی کو اکھاڑنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

راہداری کے وسط میں روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ نائلہ نے اوپر  
 دیکھا۔ باہر سے دروازے میں کوئی چیز پھنسائی گئی تھی جس سے دروازے کو دھکا دیا جا رہا تھا۔ چٹنی زیادہ  
 مضبوط نہیں تھی۔ اس میں لگی ہوئی ٹیکلیں آہستہ آہستہ اکھڑ رہی تھیں۔ نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ  
 ایک زوردار دھکے سے چٹنی اکھڑ جائے گی۔ اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ دونوں نے اپنی سانس تک روک  
 رکھے تھے۔

نائلہ کا اندازہ درست نکلا۔ دروازے کو زوردار دھکا لگا۔ چٹنی اکھڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ چھ  
 سات انچ کے قریب کھل گیا۔ باہر جو کوئی بھی تھے ایک دم اندر داخل نہیں ہوئے تھے۔ وہ غالباً ”دروازہ کھلنے  
 کی آواز کا رد عمل دیکھنے کے لئے رک گئے تھے۔ سلطانہ کو تیز تیز سانسوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی  
 تھیں۔ تقریباً ”ایک منٹ گزر گیا اور پھر دفعتاً“ ایک سرگوشیاں آواز سنائی دی۔

”اندر خاموشی ہے۔ میرا خیال ہے کسی کی آنکھ نہیں کھلی۔“

”تو اندر چلو۔۔۔ اب سوچ کیا رہے ہو؟“ دوسری آواز سنائی دی۔

اس کے چند ہی سیکنڈ بعد دروازہ ہلکی سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ کھل گیا۔ ایک آدمی اندر  
 داخل ہوا۔ اس کی پشت نائلہ وغیرہ کی طرف تھی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ اس نے چہرے پر ڈھانٹا باندھ رکھا  
 تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفل پکڑ رکھی تھی۔ اس کے فوراً ہی بعد دوسرا آدمی اندر  
 داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی رائفل تھی اور چہرے پر ڈھانٹا باندھا ہوا تھا۔ وہ دونوں جیسے ہی دو قدم  
 آگے بڑھے نائلہ نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیک وقت حرکت میں آ گئیں۔

”خبردار!“ سلطانہ کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ”رائفلیں پھینک کر ہاتھ اٹھاؤ ورنہ دونوں کے پیچھے باہر  
 آجائیں گے۔“

نائلہ کا پستول ایک نقاب پوش کی کھوپڑی سے لگا ہوا تھا اور سلطانہ کا پستول دوسرے نقاب پوش کی  
 کھوپڑی سے۔ وہ دونوں اس اچانک افتاد پر اچھل پڑے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہوں نے دروازہ آسانی

سے کھول لیا تھا اور انہیں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن صورت حال ان کی توقع کے خلاف ثابت ہوئی تھی۔

”سنا نہیں تم نے راتھیں پھینک دو۔“ نائلہ غرائی۔ ”میرا پستول شور مچانا پسند نہیں کرتا۔ میں تین تک منوں گی۔ اگر تم لوگوں نے راتھیں نہ پھینکیں تو دونوں کی کھوپڑیاں بیک وقت اڑ جائیں گی۔“

نائلہ نے گھٹنی شروع کر دی۔ سلطانہ نے بھی اپنے شکار کی کھوپڑی پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ نائلہ نے دو کہا اور ان دونوں نے راتھیں پھینک دیں۔ نائلہ نے پھر کی ٹھوکر سے دروازہ بند کر دیا۔

”گدا!“ وہ بولی۔ ”اب ذرا آگے چلو۔ کھلی جگہ پر پہنچ کر تم سے بات کریں گے۔“

”وہ لاؤنج میں آگئے۔ نائلہ کے اشارے پر سلطانہ نے اپنے شکار کی کھوپڑی سے پستول ہٹا لیا اور باری باری ان دونوں کے لباس چھینٹنے لگی۔ وہ اس بات کا اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ ان کے پاس پستول یا ریوالتور قسم کا کوئی اور ہتھیار تو نہیں تھا۔

”اب ذرا منہ پھیر کر کھڑے ہو جاؤ اور چروں سے یہ نقاب ہٹا دو۔“ نائلہ نے حکم دیا۔

ان میں سے ایک پنٹ شرٹ میں تھا جبکہ دوسرے نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ پنٹ شرٹ والا لمبے قد کا مالک تھا اور دوسرا قدرے چھوٹے قد کا۔ لمبے قد والے کو نائلہ نے کور کر رکھا تھا اور شلوار قمیض والا سلطانہ کے پستول کی زد میں تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ گھومنے لگے اور پھر اچانک ہی بڑی تیزی سے دونوں کے ہاتھ بیک وقت حرکت میں آئے تھے۔

نائلہ اور سلطانہ میں سے کسی کو بھی اس اقدام کی توقع نہیں تھی جھٹکا لگانے سے سلطانہ کے پستول کا ٹائیگر دب گیا۔ اس کے ساتھ ہی پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر ت دور جا گرا تھا۔ پستول سے نکلنے والی گولی چھت میں لگی تھی۔ نائلہ کے ہاتھ سے بھی پستول نکل کر دور جا گرا تھا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔

ان دونوں نے بیک وقت نائلہ اور سلطانہ پر چلائنگ لگادی۔ سلطانہ تو بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئی تھی مگر نائلہ اپنے حریف کی زد میں آ گئی تھی۔ وہ اسے لئے ہوئے قالین پر گرا۔ نائلہ اس کے نیچے دب گئی تھی۔

سلطانہ نے پستول ہاتھ سے نکلنے ہی ایک طرف چلائنگ لگادی تھی۔ اس کے حریف نے جب چلائنگ لگائی تو وہ اس کی زد میں آنے سے بچ گئی تھی۔ اس کا حرف اپنی ہی جھونک میں لڑکھڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ سلطانہ نے بڑی پھرتی سے گھوم کر اس کے کولہوں پر زور دار ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ محض لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ سلطانہ نے چلائنگ لگادی۔ وہ اس کی پشت پر سوار ہو گئی اور ایک بازو اس نے حریف کے گلے پر لپیٹ لیا تھا اور دوسرے ہاتھ کی ٹمٹمی میں اس کے بال جھڑ لئے تھے۔ اس کا حریف اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر سلطانہ کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اس محض کادم کھٹنے لگا۔ وہ جھٹکا ہوا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پیچھے کی طرف جھٹکا چاہا مگر سلطانہ نے اپنے جسم کا سارا بوجھ اس کی گردن پر ڈال دیا۔ لیکن بالاخر اس محض کا داؤ چل گیا۔ وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا اور پھر اچانک ہی اس نے اپنے آپ کو پوری قوت سے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ دونوں اس طرح گرے کہ سلطانہ پشت کے بل نیچے گری۔ وہ محض بھی پشت کے بل تھا لیکن سلطانہ کی گود میں اس کی گردن پر سے سلطانہ کی گرفت چھوٹ گئی تھی۔ سلطانہ نے دوبارہ گرفت جمانا چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکی وہ محض سلطانہ

کے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا پیچھے جا کر۔ لیکن سلطانہ اور نائلہ کا یقین تھا کہ اس پاس کے جنگوں میں ٹھوڑی دیر پہلے قاز کی آواز گونجی تھی۔ لیکن سلطانہ اور نائلہ کا یقین تھا کہ اس پاس کے جنگوں میں آواز سنی جانے کے باوجود کوئی بھی شخص باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ گولی چلنے کی آواز سے عبدالقدوس کی آنکھ بھی نہیں مٹی تھی۔ وہ بند کمرے کا دروازہ بند کر کے سو رہا تھا۔ ممکن ہے قاز کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی ہو لیکن کمرے سے نکلنے کی بجائے بستر پر لیٹا قرآنی آیات کا ورد کر رہا ہو۔ نائلہ کا حریف اس کے سینے پر سوار تھا اور اس نے دونوں ہاتھ نائلہ کے گلے پر جم رکھے تھے۔ نائلہ کو سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس گرفت سے نجات حاصل نہ کی گئی تو وہ ختم ہو جائے گی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس شخص کی کلائیوں پر جم رکھے تھے اور اپنے گلے سے گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن یہ دفعہ اس نے ایک ہاتھ چھوڑ دیا اور انگلی اس شخص کی آنکھ میں ماری۔ وہ شخص بلبلاتا ہوا۔ نائلہ کے گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ نائلہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کے بال پکڑ لئے اور اسے پوری قوت سے ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا حریف بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نائلہ نے اسے موقع نہیں دیا اور اس کی کھوپڑی پر لگ لگادی۔ وہ شخص پھر گر گیا۔ نائلہ چند فٹ دور قلائین پر بڑے ہوئے پتھروں کی طرف لپکی لیکن اس شخص نے بڑی پھرتی سے پیر آگے کر دیا۔ نائلہ اس کے پیر میں الجھ کر منہ کے بل گر گئی۔ اس کے حریف نے اٹھ کر چھلانگ لگادی مگر نائلہ بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ حریف منہ کے بل گرا۔

نائلہ اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس دوران اس کا حریف بھی اٹھ گیا وہ جیسے ہی نائلہ کی طرف برہا نائلہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کی اسٹریٹ لک حریف کے سینے پر لگی۔ وہ راہ اٹھا نائلہ نے فوراً ہی لٹو کی طرح گھوم کر ایک اسپن لک لگادی۔ اور پھر نائلہ پوری طرح فارم میں آگئی۔ ایک اسٹریٹ لک اور دوسری اسپن لک۔۔۔ وہ اپنے حریف کو سنبھالنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ دوسری طرف سلطانہ ایک بار پھر اپنے حریف کی گرفت میں آگئی تھی۔ مگر اس مرتبہ اس نے جلد ہی نجات حاصل کر لی۔ اس نے بھی اپنے حریف پر کھسکی بارش کر دی تھی لیکن ایک بار پھر حریف کے قابو میں آگئی۔ اس نے جیسے ہی لک مارنا چاہی حریف نے اس کا پیر پکڑ لیا اس کے ساتھ ہی زوردار جھٹکا دیا۔ سلطانہ لڑکھڑا کر پشت کے بل نیچے گر گئی۔ اس کی ایک ٹانگ سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور پیر حریف کی گرفت میں تھا اس کے حریف نے سلطانہ کے پیٹ پر پیر رکھ دیا اور اس کے پیر کو پوری قوت سے مروڑنے لگا۔ سلطانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پیر کی ہڈی ٹوٹ رہی ہو۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکلتی گئیں۔ اس نے سختی سے دانت بچھنے لگے اور سر ہنسنے لگی۔

نائلہ بھی اپنے حریف کی گرفت میں آگئی تھی۔ اس کی پوزیشن بھی خاصی نازک تھی۔ صورت حال سے اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ دونوں جلد ہی ان کی گرفت میں آجائیں گی لیکن اچانک ہی ایک آواز سن کر وہ چونک گئے۔

”ارے! یہ کیا ہو رہا ہے، یعنی حد ہو گئی شرافت کی۔ عورتوں کے ساتھ ریلنگ ہو رہی ہے چھوڑو۔“

پھوڑو۔۔۔“

نائلہ نے آواز کی سمت دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ عبدالقدوس کا شکوفہ لئے

ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کب اپنے کمرے سے نکلا تھا اور اس نے کب کلا شکوف اٹھائی تھی۔

”ارے بھائی چھوڑ بھی دو ان خواتین کو۔“ عبد القدوس نے کہا۔ ”اگر آپ لوگوں نے ہماری بات نہ مانی تو بخدا ہم بہت سی گولیاں چلا دیں گے۔“

ان دونوں نقاب پوشوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر انہوں نے نائلہ اور سلطانہ کو چھوڑ دیا۔ عبد القدوس شکل صورت سے بے وقوف ہی نظر آتا تھا مگر اس کے ہاتھوں میں کلا شکوف تھی اور سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ اس کی انگلی ٹرانسگر پر تھی۔

نائلہ اور سلطانہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ سلطانہ نے دوڑ کر اپنا پستول اٹھلایا اور نائلہ نے دوسری کلا شکوف اٹھائی۔ ان دونوں کے سانس پھولے ہوئے تھے اور وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”اس وقت تم نے ایسا کام کیا ہے کہ تمہارا منہ چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔“ سلطانہ نے عبد القدوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ“ عبد القدوس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر بولا۔ ”آپ ذرا انہیں نشانے پر رکھئے۔ میں ان کا بندوبست کرتا ہوں۔“

عبد القدوس کو کوئی رسی نہیں ملی۔ اس نے بستری ایک چادر پھاڑ لی۔ لمبی لمبی پٹیوں کو رسی کی طرح بٹ کر ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ کر قالین پر ڈال دیا۔

”ذرا ان کی شکلیں تو دیکھی جائیں کیسے شریف لوگ ہیں۔ منہ چمپا کر عورتوں سے لڑنے آگئے ہیں۔“ عبد القدوس نے پہلے پنٹ شرٹ والے چہرے سے نقاب اتارا پھر دوسرے آدمی کے چہرے سے نقاب اتارا نہ صرف عبد القدوس بلکہ نائلہ اور سلطانہ بھی چونک گئیں۔

”تت... تم...“ عبد القدوس اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم خطرناک ڈاکو بھی ہو۔“

”کون ہے یہ۔ جانتے ہو اسے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”اس کا نام جاوید ہے اور یہ یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہے۔“ عبد القدوس نے کہا۔

”ہم اسے ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے جانتی ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”کل تمہارے گھر آنے سے پہلے رفاع عالم سوسائٹی میں ہم اسی کی ٹیکسی پر بیٹھی تھیں۔ اس کی ٹیکسی ہم نے شہید ملت روڈ کی کراسنگ پر چھوڑ دی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے یہ ہمارا پیچھا کرتا رہا تھا اور اس نے ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ اب اس سے معلوم کریں گے کہ یہ درحقیقت کون ہے اور ہمارے پیچھے کیوں آیا ہے۔“

”خوش فہمی ہے تمہاری۔“ جاوید نے جواب دیا۔ ”ہمیں اس طرح باندھ کر تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم پر فتح حاصل کر لی... تم لوگ ہم سے کچھ بھی معلوم نہیں کر سکو گے۔“

”ابھی پتہ چل جائے گا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”تم سے معلومات حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں پہلا یہ کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے وہ لوگ تھرو ڈگری کے ذریعے تمہاری زبان کھلوایں گے اور تم جانتے ہو کہ پولیس والے آج کل ویسے ہی جھٹائے ہوئے ہیں جس نے کوئی جرم نہ بھی کیا ہو تو وہ اس سے قبول کر دیتے ہیں لیکن ہمیں پولیس کی تھرو ڈگری سے بہتر طریقے آتے ہیں۔ ہم وہ طریقے آزمائیں گی۔ اگر

ناکام رہی تو پھر تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ جب کوئی ملزم زبان نہیں کھولتا تو پولیس مقابلہ ہوتا ہے اور ملزم کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتا ہے۔“ نائلہ خاموش ہو کر چند لمبے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر عبد القدوس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھائی عبد القدوس! ذرا ان دونوں کے منہ بھی بند کر دو تاکہ ان کی آوازوں سے پڑوسیوں کی نیند خراب نہ ہو۔“

عبد القدوس اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے چادر کے دو ٹکڑے پھاڑ کر ان کے گولے سے بنائے اور یہ گولے ان دونوں کے منہ میں ٹھونس دیئے اور منہ پر پٹی بھی باندھ دی تاکہ گولہ منہ سے نہ نکل سکے۔

”سگریٹ کا پیکٹ تمہاری جب سے نکلا ہے نا۔“ نائلہ نے گولڈن کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھا ٹیسٹ ہے تمہارا۔“ اس نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ پہلا کش لگاتے ہی اسے پھندہ لگ گیا اور وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ جب وہ سنبھلی تو ایک اور کش لگایا پھر سگریٹ کے سلگتے ہوئے سرے دیکھنے لگی۔

سلطانہ اور عبد القدوس حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نائلہ نے سگریٹ کا ایک اور کش لگایا اور پھر سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا جاوید کے رخسار پر لگادیا۔ جاوید بری طرح چھلا۔ وہ لوٹ لگا کر اوندھا ہو گیا۔ وہ غالباً چیخا چاہتا تھا مگر منہ میں کپڑا ٹھسا ہوا ہونے کی وجہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ عبد القدوس نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر زوردار ٹھوکر ماردی اور اسے پکڑ کر سیدھا کر دیا۔ نائلہ نے سگریٹ کا سرا اس کے دوسرے رخسار سے لگادیا۔ جاوید پھر بری طرح چھلا مگر اس مرتبہ عبد القدوس نے اسے جکڑ لیا تھا۔

جاوید کے چہرے پر اذیت کے آثار ابھر آئے تھے مگر اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی سلگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ نائلہ کی گردن مروڑ دیتا تاکہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا اس کی دائیں آنکھ سے ذرا نیچے رخسار پر رکھ دیا۔ جاوید اس طرح جھلا کر وہ عبد القدوس کی گرفت سے نکل گیا اور قالین پر ادھر سے ادھر لوٹ لگا لگا۔

”کچھ بتانے کو تیار ہو یا نہیں؟“ نائلہ نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

جاوید نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تمہارے چہرے کو اس طرح بگاڑ دوں گی کہ تمہاری ماں بھی نہیں پہچان سکے گی۔“ نائلہ نے کہا اس کے چہرے پر درد نغمی تھی۔ اس نے سگریٹ کی طرف دیکھا۔ سگریٹ بجھ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ سلگایا اور اس کا سلگتا ہوا سرا اس مرتبہ اس کے زرخرے پر رکھ دیا۔ عبد القدوس نے جاوید کو جکڑ رکھا تھا لیکن وہ بری طرح چھلنے لگا۔

کمرے میں گوشت جلنے کی بو پھیل رہی تھی۔ نائلہ چند لمبے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا اس شخص کے چہرے کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ وہ شخص زور زور سے سر ہلانے لگا جیسی کسی بات کا اصرار کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔ نائلہ نے عبد القدوس کو اشارہ کیا اور اس نے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھول کر منہ سے کپڑا نکال دیا۔

”تم کچھ کہنا چاہتے ہو، بولو کون ہو تم لوگ؟“ نائلہ نے غرائی۔

”مم... میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ مجھے لالچ دے کر اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔“ وہ شخص کہنے لگا۔ ”اس نے کہا تھا کہ وہ خوبصورت لڑکیاں ہیں جن پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ میری شامت ہی آئی تھی کہ میں اس کے ساتھ آگیا۔“



”تمہارا نام کیا ہے اور تم کرتے کیا ہو؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔  
 ”میرا نام احمد ہے۔ میں شاہ فیصل کالونی میں بن کباب کا ٹھیلا لگاتا ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔  
 ”بن کباب کا ٹھیلا لگاتے ہو اور کلا شکوف لئے پھرتے ہو۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔  
 ”میں سچ سنا چاہتی ہوں مسٹر احمد۔ اس کے لئے میں تمہیں صرف ایک منٹ کا وقت دے سکتی ہوں۔  
 اس کے بعد تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ احمد خوفزدہ لمبے میں بولا۔ ”یہ رائل مجھے اسی نے دی تھی۔ اس نے مجھے دھڑا  
 ہزار دینے کا بھی وعدہ کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔“  
 نائلہ چند لمبے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے عبد القدوس کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً ہی احمد کے  
 منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ عبد القدوس، جسے وہ اسحق اور گاؤدی سمجھتی رہی تھیں بڑے کام کا آدمی نکلا تھا۔  
 اس نے ابھی تک نائلہ وغیرہ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ یہ سب کیا چکر ہے۔ وہ تو شاید یہی سمجھا تھا کہ گھر میں  
 ڈاکو گھس آئے تھے جن پر ان لوگوں نے قابو پایا تھا اس نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ ان لوگوں کو پولیس کے  
 حوالے کرنے کے بجائے خود ان سے سوال جواب کیوں کر رہی ہیں۔ احمد کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے بعد  
 اس نے بڑی عجلندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے سر کی طرف بیٹھ کر اسے بالوں سے پکڑ لیا۔

نائلہ نے سگریٹ کا سلکا ہوا سر اس کی آنکھ کے نیچے رخسار پر رکھ دیا۔ گوشت جلنے کی بو پھیلی وہ بری  
 طرح چلا لیکن عبد القدوس نے اسے زیادہ ہلنے کا موقع نہیں دیا۔ نائلہ نے سگریٹ دوسری آنکھ کے نیچے رکھ  
 دیا۔ تیسری مرتبہ اس کی ناک کو داغا۔ وہ ایک بار پھر سر کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔

”اور اب پھر تمہاری باری ہے۔“ نائلہ جاوید کی طرف آگئی۔ عبد القدوس نے فوراً ہی جاوید کو  
 جکڑ لیا۔ جاوید کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ نائلہ نے اس مرتبہ دیا سلائی جلائی اور اس کا شعلہ جاوید کے  
 ٹھوڑی کے نیچے کر دیا۔ جاوید سر جھٹکنے لگا مگر عبد القدوس نے بڑی سختی سے اس کے پال جکڑ رکھے تھے کمرے  
 میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ ماچس کی تیلی آخر تک جل گئی۔ شعلے نے اس کی ٹھوڑی کا گوشت جلا دیا تھا  
 نائلہ نے دوسری تیلی جلائی شعلہ ایک بار پھر جاوید کی ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت جلائے لگا۔

”مجھے افسوس ہے کہ بے سرو سامانی کی حالت میں ہم کوئی اور طریقہ نہیں اپنا سکتے یہ معمولی سا طریقہ  
 شاید تم پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو رہا۔ لیکن میں اسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے تمہیں زبان کھولنے پر مجبور  
 کر سکتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ موم بیٹوں کا ایک پیکٹ  
 بھی لائی تھی۔

نائلہ نے پیکٹ میں سے ایک موم بتی نکال کر جلائی اور دوبارہ جاوید کے قریب آگئی۔ اس مرتبہ وہ اس  
 کے پیروں کے قریب بیٹھی تھی۔ عبد القدوس اس کا مطلب سمجھ گیا وہ بھی جلدی سے جاوید کے پیروں کے  
 طرف آگیا اور اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر پوری قوت سے گرفت میں لے لیں۔

نائلہ نے موم بتی کا شعلہ جاوید کے ایک پیر کے تلوے کے نیچے کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد گوشت کی بو پھیل  
 گئی۔ جاوید اپنی ٹانگوں کو زور زور سے جھٹکنے دینے لگا۔ مگر عبد القدوس نے اس کی ٹانگوں کو بڑی سختی سے  
 رکھا تھا۔ تھا تو وہ دھپلا پٹلا سا لیکن اس میں بے پناہ طاقت تھی۔ وہ جاوید کو ہلنے کا موقع تک نہیں دے رہا تھا  
 نائلہ باری باری اس کے دونوں پیروں کے تلوؤں کو جلاتی رہی اور کمرے میں گوشت جلنے کی بو پھیلتی رہی۔  
 ”میں جانتی ہوں تم لوگ کون ہو سکتے ہو۔“ نائلہ کے لمبے میں بے پناہ درندگی تھی۔ ”لیکن میں یہ معلوم

کرنا چاہتی ہوں کہ یہاں کیوں اور کس کے کہنے پر آئے تھے۔ اب بھی اگر تم نے نہیں بتایا تو میں تمہارا پورا جسم داغ دوں گی۔“

جاوید کا ایک پیر کا تلوآ آدھے سے زیادہ جل گیا تھا۔ اگر اس کے منہ میں نہ ٹھسا ہوتا تو اس کی پنجیں آسمان کی خبر لاتیں۔ لیکن اب شاید اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ سر کو اوپر سے نیچے جھٹکے دیتے لگا۔

نانکھ نے موم بنی مٹالی عبد القدوس نے بھی اس کی ٹانگیں بٹخ دیں جاوید بری طرح لوٹنے لگا۔ نانکھ اس کے سامنے آگئی۔

”زبان کھولنے کو تیار ہو یا نہیں!“ نانکھ نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

جاوید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نانکھ کے اشارے پر عبد القدوس نے اس کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔

”پہم... پانی...“ جاوید کے منہ سے کراہ نکلی۔

”پانی تمہیں اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک تم میری باتوں کا جواب نہیں دے دیتے۔“ نانکھ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اس کے لمبے میں دردنگی تھی۔

”مم... میں مر جاؤں گا۔“ جاوید کرا رہا۔

”میں تمہیں اس وقت تک مرنے نہیں دوں گی جب تک تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دے

اے۔“ نانکھ نے کہا۔ ”بتاؤ تم کون ہو؟“

”ڈڈ... اکو...“ جاوید نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”مم... مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ تم لوگ کہیں سے بھاگی

ہوئی ہو اور تم لوگوں کے پاس کوئی بڑی رقم بھی موجود ہے۔“

”میں سچ سنا چاہتی ہوں۔“ نانکھ غرائی اس نے ایک بار پھر موم بنی اٹھالی۔

”بب... بتانا ہوں۔“ جاوید کرایا۔

”بس اب شروع ہو جاؤ ہم ساری رات یہاں بیٹھ کر تمہارے ساتھ ڈائلاگ نہیں بول سکتے۔“

”وعدہ کرو کہ تم ہمیں پولیس کے حوالے نہیں کرو گی۔“ جاوید بولا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔“ نانکھ نے کہا۔ ”اب شروع ہو جاؤ۔“

”اس رات ہم رفاق عام سوسائٹی میں فائرنگ کر رہے تھے۔ مقصد صرف خود و ہراس پھیلانا تھا لیکن

ہمتی سے پولیس پارٹی سے سامنا ہو گیا۔“

”ایسا کس کے کہنے پر کیا تھا؟“ نانکھ نے پوچھا۔

”گپتا... وہی ہمیں احکامات دیتا ہے۔“ جاوید نے کہا۔ ”شہر میں فائرنگ کر کے خوف و ہراس پھیلانے

لے لئے ہمیں بڑی بڑی رقیں دی جاتی ہیں۔ اگر ہمارے سامنے مزاحمت کی جائے تو اسے موت کے گھاٹ

ار آنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ اس رات ہمارا مقصد یہی تھا کہ فائرنگ کر کے اس علاقے میں خوف و

ہراس پیدا کیا جائے لیکن بد قسمتی سے پولیس کی ایک موبائل سے ہمارا سامنا ہو گیا۔ انہوں نے ہمارا ایک

ادلی مار دیا۔ ہم نے بھی جوانی کارروائی کرتے ہوئے پولیس پارٹی کو گھیرے میں لے کر فائر کھول دیا۔ یہ تو

میں اہم میں پتہ چلا تھا کہ پولیس کے جو آدمی ہمارے ہاتھوں مرے تھے ان میں ایک ڈی ایس پی بھی شامل

تھا۔

”پولیس کی دوسری موبائیلوں نے اس علاقے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا فرار کی

کوشش میں ہمارا ایک اور آدمی مارا گیا تھا۔ ایک آدمی کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ میں بھی اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پولیس نے اگرچہ اس علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا لیکن میں اس علاقے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

”عامر تمہارا ہی ساتھی ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”ہاں... تم اسے کیسے جانتی ہو؟“ جاوید چونک گیا۔

”جس طرح تم ہمارے ہاتھ لگے ہو نا اسی طرح عامر بھی ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ بہر حال، تم اپنا بیان

جاری رکھو۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں صبح ٹیکسی لے کر صورت حال معلوم کرنے کے لئے اس طرف چلا گیا۔“ جاوید کہنے لگا۔ ”اتفاق سے تم لوگ مل گئیں۔ ممکن ہے میں تم لوگوں کو ٹیکسی میں نہ بٹھاتا لیکن تمہارے ہاتھ میں وہ بریف کیس دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ شوکت کا وہ بریف کیس میں نے پہچان لیا تھا۔ اسی لئے میں نے تم لوگوں کو ٹیکسی میں بٹھالیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ تم لوگ شوکت کے ساتھ کوئی فراڈ کر کے آئی ہو اور جب تم نے کوئی چیز گھر میں بھولنے کا بہانہ کر کے واپس چلنے کو کہا اور شوکت کے مکان کے ساتھ پولیس کو دیکھ کر پھر واپس چلنے کو کہا تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔

”تم لوگوں نے شہید ملت روڈ کے کراسنگ پر میری ٹیکسی چھوڑ دی تھی۔ لیکن میں تم لوگوں کا پیچھا کرتا رہا۔ تم لوگ اس کے گھر کے سامنے ٹیکسی پر اتریں۔“ اس نے عبدالقدوس کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے احمد کے ذریعے تم لوگوں کی نگرانی شروع کرادی۔ میں کل ہی اس جینگے پر ریڈ کر دیتا لیکن پہلے میں یہ تصدیق کر لینا چاہتا تھا کہ تم لوگ کون ہو۔ کل اور آج سارا دن میں اسی چکر میں رہا اور بالاخر میں نے معلوم کر لیا کہ تم لوگ کون ہو۔ تم لوگوں نے ہی شوکت، مستیش اور شرافت کو قتل کیا تھا لیکن عامر کے بارے میں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے۔“

”وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ پناہ لینے کے لئے شوکت کے گھر آیا تھا۔ ہم نے اسے بھی ہاتھ پیر باندھ کر شوکت کے مکان میں ڈال دیا تھا۔ پولیس نے شاید رازداری کے خیال سے اس کے بارے میں پریس کو کوئی بات نہیں بتائی۔ بہر حال، اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے اس رات فائرنگ کر کے ڈی ایس پی اور دیگر پولیس والوں کو ہلاک کیا تھا... اس سے پہلے نبھانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہوں۔ تمہارا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ تم لوگوں کو نہ اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال ہے نہ وطن کی ناموس و سلامتی کا احساس۔ حالانکہ تم لوگوں نے اسی وطن کی مٹی سے جنم لیا۔ یہیں پلے بڑھے۔ اس وطن نے کیا کچھ نہیں دیا تم لوگوں کو؟ اس وطن کے ہم پر اتنے زیادہ احسانات ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑی نعمت تو آزادی ہے جو ہمیں اس وطن کی وجہ سے ملی۔ یہ وطن ہماری شناخت ہے۔ ہماری عظمت کی علامت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے لاکھوں قربانیاں دے کر یہ آزاد وطن حاصل کیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے ناموس کی حفاظت اور سلامتی کے لئے ہم اپنی جانیں قربان کر دیں لیکن تم جیسے بے ضمیران لوگوں کا آلہ کار بن گئے جنہوں نے آج تک ہمارے اس ملک کو دل سے قبول نہیں کیا۔ وہ دشمن آج بھی ہمارے اس وطن کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے۔ انہیں تم جیسے بے ضمیر لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہمارے ملک کا ایک حصہ ہم سے الگ ہو گیا اور اب ہمارا وہی ہمارے ملک کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتا ہے تم جیسے بے ضمیر اور

وطن فروش ان کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ پیسے کی خاطر تم لوگ اپنے اس وطن کے احسانات کو بھی بھول گئے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی شخص تمہاری ماں یا بہن کا سودا کرنا چاہے تو تم اس سے بھی انکار نہیں کرو گے۔ تم جیسے لوگوں کو تو ایسی بھیانک سزا ملنی چاہئے کہ دوسرے بھی عبرت حاصل کریں۔ اپنے ہی بہن بھائیوں پر گولیاں چلاتے ہوئے تمہیں ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ اپنے ہندو آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے تم اب تک نجانے کتنے گھروں میں صف ماتم بچھا چکے ہو۔ یہاں تم لوگ کس لئے آئے ہو؟ ہمیں قتل کرنے کے لئے؟

”ہاں۔“ جاوید نے کہا۔ ”تمہاری وجہ سے ہمارے تین آدمی مارے گئے۔ لاکھوں کی مالیت کا اسلحہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔ تمہیں کیسے معاف کیا جاسکتا تھا۔“

”اور کس کس کو معلوم ہے کہ تم لوگ یہاں آئے تھے؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”کاش! کسی اور کو بھی معلوم ہوتا۔“ جاوید نے جواب دیا۔ ”میں نے گیتا کو تمہارے بارے میں بتایا تو تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ تم نے یہاں بنگلہ لے لیا ہے اور میں یہاں کوئی کارروائی کرنے والا ہوں لیکن کاش! میں نے گیتا کو یہاں کا بھی بتادیا ہوتا۔“

”تم تو یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ ہو۔“ نائلہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تعلیم کو جہالت کے اندھیروں سے نکالتی ہے اچھے برے میں تمیز کا احساس دلاتی ہے۔ آپس میں محبت اور اخوت کا درس دیتی ہے لیکن تم....“

”مم.... مجھے پانی دو....“ جاوید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میرے زخموں پر کوئی دوا لگاؤ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

”جن معصوم اور بے گناہوں پر تم گولیاں برساتے تھے انہیں اس سے کہیں زیادہ تکلیف ہوتی تھی مگر تمہیں ان کی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ انہیں خاک و خون میں دیکھ کر تو تم خوش ہوتے تھے۔ خوب فتنہ لگاتے تھے۔ اب اپنی معمولی سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے....؟“ نائلہ نے کہا۔ ”ابھی تو یہ ابتدا ہے تمہاری تکلیف تو ابھی شروع نہیں ہوئی تم سے تو ابھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ جو کچھ پوچھنے والی ہوں تم آسانی سے نہیں بتاؤ گے۔ اس کے لئے ہمیں ایک بار پھر موم بنی کا سارا لینا پڑے گا۔“  
 ”تت.... تم لوگ کون ہو؟“ جاوید نے خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں پولیس میں عورتیں بھی ہیں لیکن پولیس کی عورتیں اتنی بہادر نہیں ہوتیں۔ کس ایجنسی سے تعلق ہے تمہارا؟“

”ہمارا تعلق نہ پولیس سے ہے نہ کسی اور ایجنسی سے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”تم دشمن کے ایجنٹ ہو اور ہم اپنے ملک کے... ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ تم جیسے لوگوں کو جن جن کر ختم کر دیں گی۔ تمہارے اس گروہ میں اور کون کون لوگ شامل ہیں گیتا کہاں ملے گا۔“

”کس خوش فہمی میں مت رہنا۔“ جاوید نے کہا۔ ”ہم لوگ تو دھوکے سے تمہارے قابو میں آ گئے لیکن گیتا ایسا نہیں ہے۔ تم لوگ اس کا سراغ نہیں لگا سکو گی۔“

”تم سے اس کا سراغ ہی تو پوچھ رہی ہوں۔ وہ کہاں ملے گا؟“ نائلہ نے کہا۔  
 ”اس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔“ جاوید نے کہا۔ ”وہ ہمیں ٹیلی فون پر احکامات دیتا ہے۔ کبھی ملاقات بھی ہو جاتی ہے لیکن اس نے آج تک ہمیں اپنا ٹھکانا نہیں بتایا۔“

”اس کا فون نمبر بتاؤ۔“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”ہم نے کبھی اس سے رابطہ نہیں کیا اس لئے ہمیں اس کا نمبر معلوم نہیں ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ خود ہی ہم سے رابطہ قائم کرتا ہے۔“ جاوید نے جواب دیا۔  
 نائلہ چند لمحے اس کی طرف دھمکتی رہی اور پھر دیا سلائی کی ڈبیہ اٹھا کر موم بتی جلائی۔  
 ”تم آسانی سے زبان نہیں کھولو گے۔“ وہ بولی۔ ”عبدالقدوس! اس کا سیدھا ہاتھ پکڑو۔ ذرا اس کی ہتھیلی کی سکاکی کردی جائے۔“  
 ”نن... نہیں... خدا کے لئے نہیں۔“ جاوید کے لہجے میں بے پناہ خوف تھا۔

”تو پھر گیتا کا پتہ بتاؤ۔“ نائلہ بولی۔  
 ”میں سچ کہتا ہوں۔ اس کا پتہ مجھے نہیں معلوم... فون نمبر بتا سکتا ہوں۔“ جاوید نے کہا۔ ”اس کے پاس موبائل فون ہے۔ بلکہ سب سے کے پاس موبائل فون ہے۔ اس طرح کال نہیں پکڑی جاسکتی۔ پکڑی بھی جائے تو لوکیشن کا پتہ نہیں چل سکتا۔“  
 ”نمبر بتاؤ۔ میں پتہ معلوم کر لوں گی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 جاوید نے گیتا کا موبائل فون کا نمبر بتادیا۔ نمبر ایک کانڈ پر نوٹ کر کے نائلہ نے عبدالقدوس کو اشارہ کیا۔ اس نے جاوید کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر پٹی باندھ دی۔  
 ”انہیں اٹھا کر اس کمرے میں بند کر دیا جائے۔“ نائلہ نے تیسرے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا جو خالی پڑا تھا۔

وہ باری باری ان دونوں کو گھسیٹ کر اس بیڈروم میں لے آئے۔ ان دونوں کے ہاتھ اگرچہ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن اس بات کا اندیشہ بہر حال موجود تھا کہ وہ ایک دوسرے کو کھولنے کی کوشش نہ کریں عبدالقدوس نے اس کا بھی حل تلاش کر لیا اس نے چادر کی ایک اور لمبی سی پٹی بھاڑ کر اسے رسی کی طرح بٹا۔ اس کا ایک سرا احمد کے پیروں سے باندھا اور دوسرا سر کھڑکی سے باندھ دیا۔ جاوید کو بھی اسی طرح ہاتھ روم کے دروازے کے ہینڈل سے باندھ دیا گیا۔  
 ”اب صبح کے چار بجتے والے ہیں کل سارا دن آرام سے یہاں سوتے رہنا۔ میں صبح یونیورسٹی میں تمہارے دوستوں کو بتادوں گا کہ پیٹ میں مروڑ کی وجہ سے تم نہیں آسکے۔“ عبدالقدوس نے کہا اور نائلہ اور سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اپنے بیڈروم میں آگئیں۔ عبدالقدوس بھی ان کے ساتھ تھا۔ دونوں کلاشکوف رائفلیں پٹنگ کے نیچے چھپادی تھیں۔ نائلہ اور سلطانہ نے اپنے اپنے پستول ٹکیوں کے نیچے رکھ دیئے تھے۔ بیڈروم میں آنے سے پہلے انہوں نے لاؤنج کا سارا سامان ٹھیک کر دیا تھا اور عقبی دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی اوپر کی چٹخی کے کیل اکٹھے گئے تھے عبدالقدوس نے اس کا جائزہ لے کر بتایا تھا کہ صبح بازار سے کیلیں لا کر وہ اس چٹخی کو بھی ٹھیک کر دے گا۔“

”جی خواتین!“ عبدالقدوس ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب بتائیے کیا قصہ ہے؟ میں تو آپ دونوں کو بہت مسکین اور مظلوم لڑکیاں سمجھتا تھا لیکن آپ تو بہت خطرناک نکلیں۔ عورتیں اپنے پاس پستول نہیں رکھا کرتیں اور پھر ان دونوں سے آپ کی جو گفتگو ہوئی ہے اس سے بھی میرا ذہن الجھ رہا ہے۔ لہذا مجھے اپنا سمجھ کر... مم... میرا مطلب ہے اپنا دوست سمجھ کر

اس راز سے پردہ اٹھا دیجئے اور ذرا تفصیل سے کچھ بتائیے تاکہ میری ذہنی الجھن دور ہو سکے اور بندہ آپ دونوں کو سمجھنے کی کوشش کر سکے۔“

”ہم آپ کو اپنے بارے میں ضرور بتائیں گی لیکن اس سے پہلے ایک کپ چائے ہو جائے۔ اب نیند کس کو آئے گی۔ چائے پیتے ہوئے باتیں بھی کریں گے۔“ نائلہ نے کہا۔  
”چائے میں بنا کر لانا ہوں۔“ عبدالقدوس کرسی سے اٹھ گیا۔

”اور آپ بیٹھئے۔ س صاف چائے بنا کر لے آئے گی۔“ نائلہ نے کہا۔  
”میرے ہاتھ کی چائے پیئیں گی تو زبان چابٹی رہ جائیں گی۔“ عبدالقدوس کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کی ٹرے تھی جس میں چائے کے تین کپ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ٹرے ان کے سامنے بستر پر رکھ دی اور ایک کپ اٹھا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کی عدم موجودگی میں نائلہ اور سلطانہ نے باہمی مشورے سے یہ طے کر لیا تھا کہ عبدالقدوس قابل اعتماد ہے اس لئے اسے اپنے راز میں شریک کر لینا چاہئے۔  
”جی! کوئن ابتدا کرے گا؟“ عبدالقدوس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے باری باری ان کے چہروں کی طرف دیکھا۔

”میں پنجاب کی ایک زمیندار خاتون ہوں۔ ماں باپ انتقال کر چکے ہیں۔ بالکل اکیلی ہوں۔ جو قریبی رشتہ دار ہیں ان کی نظریں میری دولت پر ہیں۔ انہوں نے میرے خلاف بہت سی سازشیں کیں۔ میری جائیداد پر قبضہ کرانے کے لئے مجھے قتل کرنے کی کوشش بھی کی مگر میں جان بچانے کے لئے بھاگتی رہی۔“  
نائلہ چند لمحوں کو خاموش رہی پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہم وڈیرہ شاہنواز کی قید سے بھاگنے کے بعد پناہ کی تلاش میں تمہارے مکان پر پہنچ گئیں۔ پہلے سلطانہ کا ایک جاننے والا یہاں رہتا تھا۔ لیکن آپ نے بتایا کہ وہ جا چکا ہے۔ اگر اس رات فائرنگ نہ ہو رہی ہوتی تو شاید آپ ہمیں باہر سے رخصت دیتے لیکن آپ نے ہمیں پناہ دی۔ ہمیں آپ میں شرافت نظر آئی۔ غلوں نظر آیا۔ ہم نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ آپ کو اپنے اعتماد میں لے کر ان دہشت گردوں کے خلاف کارروائیاں کریں گے جنہیں ہم جانتی ہیں۔ رفاع عام سوسائٹی میں شوکت کے خلاف کارروائی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اس میں آپ نے بھی ہماری مدد کی اور خلاف توقع ہمیں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ جاوید کسی طرح ہمارے پیچھے لگ گیا۔ یہ دونوں یقیناً ہمیں قتل کرنا چاہتے تھے لیکن خود پھنس گئے۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں۔ ہاتھوں کو کبھی فتح نہیں ہوتی۔ حق و صداقت کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوتا آپ نے دیکھ لیا۔ وہ دو جوان مرد کلاشکوف رائفلیں لے کر آئے تھے۔ ہم کمزور اور ناتواں عورتوں نے انہیں بے بس کر دیا۔“

”کمزور اور ناتواں عورتیں۔“ عبدالقدوس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ”اگر سارے ملک کی عورتیں آپ کی طرح ہوں تو لمبی چوڑی فوج رکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔“

”جسمانی کمزوری یا قوت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بات دراصل جذبے کی ہوتی ہے۔ ہم میں اگر جذبہ نہ ہوتا تو بڑی آسانی سے ان کا شکار ہو جاتیں۔ ویسے ہماری اس کامیابی کا سارا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔ اگر آپ بروقت اپنے کمرے سے نہ نکلے تو ہم ان کی گرفت میں آ جاتیں اور پھر شاید صورت حال مختلف ہوتی۔“



اور حوالہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کون ہو سکتا ہے۔  
 مہ القدوس اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا تھا کہ نائلہ نے اسے روک دیا۔  
 ”تم بیٹھو۔ میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔  
 گیٹ کے سامنے ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ دو کانسٹیبل موبائل سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور  
 اہل اے ایس آئی گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ نائلہ پولیس کو دیکھ کر ایک لمحہ کو پریشان ہوئی تھی لیکن پھر اس  
 نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

”جی فرمائیے؟“ اس نے چوہا دروازہ کھول کر پوچھا۔  
 ”اس بنگلے میں کون رہتا ہے؟“ اے ایس آئی نے پوچھا۔ وہ نوجوان تھا اور غالباً ”نیا نیا پولیس ایڈی  
 “ لگا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر اندر بٹے ہیں ہنسنے کا رنگ تھا۔  
 ”ہم رہتے ہیں یہاں کیا بات ہے؟“ نائلہ نے کہا۔  
 ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ رات کو اس بنگلے میں فائر کی آواز سنی گئی تھی۔“ اے ایس آئی نے کہا۔  
 ”یہ اطلاع آپ کو کب ملی تھی؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔  
 ”دھائی بجے۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔

”پھر تو بڑی مستعدی دکھائی آپ نے۔“ نائلہ کے لہجے میں طنز تھا۔ ”اطلاع دھائی بجے ملی اور انکوائری  
 نہ لائے آپ اب آرہے ہیں چھ گھنٹے بعد۔۔۔ بہر حال یہاں کوئی فائرنگ نہیں ہوئی۔ کوئی اور بنگلہ ہو گا۔“  
 ”لیکن بنگلے کا نمبر تو یہی بتایا گیا تھا۔“ اے ایس آئی نے گیٹ کے پلر پر لکھا ہوا نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”اما اندر آکر چیک کر سکتے ہیں؟“  
 ”جی نہیں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”میں آپ کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہاں کوئی ایسی بات  
 ایسی نہیں تو چیک کیا کریں گے کہیں اور جا کر معلوم کریں۔“  
 ”نہیں۔۔۔“

”آپ اندر نہیں آسکتے۔“ نائلہ نے درشت لہجے میں کہا۔  
 ”آپ کا سرکار میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔“ اے ایس آئی نے بھی ک سخت لہجے میں کہا۔ ”ہم چاہیں  
 کہ فرانسس کی ادائیگی کے لئے زبردستی بھی اندر آسکتے ہیں لیکن۔۔۔۔“  
 ”دردی کے محمد میں مت رہتا۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”بڑے فرض شناس ہو۔ ایک اطلاع ملنے  
 پر ہم کتنے بعد چلے آرہے ہو۔ پلیز! پریشان مت کریں۔ آپ چلے جائیے یہاں سے آپ غلط جگہ پر آگئے  
 ہیں۔۔۔۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ لیکن مجھے انکوائری ٹیڑھی کرنا بھی آتی ہیں۔“ اے  
 ایس آئی نے کہا۔  
 ”میں ٹیڑھی انکوائری کو تو کیا ٹیڑھے آدمیوں کو بھی سیدھا کر سکتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا اور پھر اندر کی  
 راہ کر کے پکارا۔ ”مہ القدوس ٹیلی فون لے کر آؤ۔“

مہ القدوس موبائل ٹیلی فون لے آیا۔ نائلہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے آئی جی جیسے ریک کے آدمی کو  
 بلا لیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس وقت مجبوری یہ تھی کہ اس کے بنگلے کے ایک کمرے میں دو ایسے آدمی  
 بٹھے ہوئے تھے جنہیں ازیتیں دی گئی تھیں۔ وہ قانون کی گرفت میں آسکتی تھی۔ اے ایس آئی واقعی



پانچھ نے ان جی صاحب کا موبائل فون کا نمبر لپایا تھا۔ کیونکہ اسے شبہ تھا کہ آئی جی صاحب دھوکے لئے گھر سے نکلتے ہی اپنے موبائل فون پر دو درانی سرکاری رابطہ بوجھتا تھا۔ فوراً ہی راجہ مگنی تھی لیکن کال آئی جی صاحب نے انہیں ان کے اسکاؤ انچارج انسپکٹر نے ریسو کی تھی۔

”میں نانکہ درانی بول رہی ہوں آئی جی صاحب سے بات کروائیے۔“ نانکہ نے کہا۔

چند لمحوں بعد آئی جی صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”یس مس نانکہ؟“

”معاہلہ کیا ہے؟“ آئی جی صاحب نے پوچھا۔

”فون اسے دو۔“ آئی جی صاحب نے کہا۔

”چلو۔“ اس نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ہم واقعی غلط جگہ پر آ گئے تھے۔“

64

مات گھنٹے کی تاخیر سے آئی تھی لیکن پڑوسیوں کو یقین تھا کہ پولیس والے ان دونوں لڑکیوں کو لے جائیں گے اور نہیں تو فحاشی کے الزام میں تو انہیں بند کیا ہی جاسکتا تھا۔

پڑوسی اس جنگلے میں آنے والی ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس جنگلے میں محل ہوتے وقت یہ اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں لائی تھیں۔ اس قسم کی عورتوں کے بارے میں لوگوں نے تاثرات اچھے نہیں تھے۔ قیمتی اور عالی شان جنگلوں میں ایسی ہی خوبصورت عورتوں نے فحاشی کے اڈے قائم کر رکھے تھے ان کے گاہکوں میں بڑے بڑے لوگ شامل ہوتے تھے صنعت کار، تاجر، اسمبلیوں کے ممبر اور وزیر تک ان کو ٹھیوں پر حاضری دیتے تھے۔

پڑوسیوں نے نالکھ کو پولیس آفیسر سے الجھتے ہوئے دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ اب پولیس والے انہیں نہیں چھوڑیں گے لیکن موبائل فون پر بات کرنے کے بعد لوگوں نے جب اے ایس آئی کو سلیوٹ مارتے دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ پولیس آفیسر کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد موبائل چلی گئی اور لوگ می خاموشی سے ادھر ادھر ہو گئے۔ نالکھ اور عبدالقدوس اندر آ گئے۔

”کیا قصہ تھا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”رات ڈھائی بجے ان حضرات کو یہاں فائرنگ کی اطلاع ملی تھی۔ اور اب یہ تفتیش کے لئے آئے۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ آفیسر نوکری پر نہیں رہے گا۔“ نالکھ کہتے ہوئے میز پر بیٹھ گئی۔ ”چلو... بیٹھو۔“

”اگر یہ پولیس والے زبردستی اندر گھس آتے تو گڑبڑ ہو جاتی۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”اندر آنے ہی کون دیتا انہیں۔“ نالکھ نے کہا۔ ”لیکن ان دونوں کا بندوبست ہمیں جلدی کرنا پڑے گا۔“

”کیسا بندوبست؟“ عبدالقدوس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہمیں ڈرائیونگ آتی ہے؟“ نالکھ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ عبدالقدوس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کچھ دیر بعد میں اور تم باہر جائیں گے۔ ہمیں ایک گاڑی کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے ہماری یہ ضرورت چوری ہی سے پوری ہو سکتی ہے۔“ نالکھ نے کہا۔

”کھ... کیا مطلب! آپ گاڑی چوری کریں گی...“ عبدالقدوس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اور تم۔“ نالکھ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”م... میں...“ عبدالقدوس ہلکا گیا۔

”ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے کام بھی کرنے پڑیں گے۔“ نالکھ نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہی۔ ”یہ دونوں بیسیوں بے گناہ اور معصوم لوگوں کے قاتل ہیں یہ لوگ رحم یا کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔ اگر انہیں پولیس کے حوالے کر دیا گیا تو پولیس انہیں عدالت میں پیش کرے گی۔ اور ہو سکتا ہے یہ پہلے ہی روز ضمانت پر رہا ہو جائیں کیا تمہارے خیال میں ان لوگوں کو آزاد رہنا چاہئے؟“ نالکھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کرنا کیا چاہتی ہیں؟“ عبدالقدوس نے پوچھا اس کی آنکھوں میں خوف کے ہلکے سے سائے جھلکنے لگے۔

”یہ دہشت گرد ہیں۔ کئی بے گناہوں کے قاتل ہیں۔ تمہارے سامنے ڈی ایس پی اور دیگر والوں کے قتل کا اعتراف کر چکے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے اور بھی کئی گھرا جاڑے ہوں گے۔ انہیں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں اگر مصنف ہوتی تو انہیں موت کی سزا دیتی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”تو گویا آپ نے ان کے لئے سزائے موت کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”ہاں۔ یہ اسی سزا کے مستحق ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔  
 ”اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر ہم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں۔“ عبدالقدوس کہتے ہوئے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ نے بھی سر ہلا دیا۔

”اس کے لئے ہمیں گاڑی کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ایک منٹ...“ سلطانہ کچھ کہتے کہتے رک مٹھوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔ ”رات کو یہ لوگ بھی کسی گاڑی پر ہی آئے ہوں گے۔ ان سے چاہئے کہ انہوں نے گاڑی کہاں چھوڑی تھی۔“

ناشتے کے بعد وہ تینوں اس کمرے میں آگئے جہاں وہ دونوں بندھے ہوئے تھے۔ دونوں بری جا تھے۔ دونوں کے چروں پر سگریٹ کے جلانے جانے سے چھالے پڑے ہوئے تھے جاوید کے پیروں کے پر بھی آبلے نظر آرہے تھے۔ وہ دونوں خوفزدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نائلہ کے اٹھا عبدالقدوس نے جاوید کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

”خدا کے لئے ہم پر رحم کرو۔“ جاوید بولا۔ ”اتنی بے رحم مت بنو۔ پانی... پانی... پلاؤ... میرے نکل رہی ہے...“

نائلہ نے عبدالقدوس کو اشارہ کیا۔ وہ ڈانٹنگ ٹیبل سے پانی کا بھرا ہوا جگ اور ایک گلاس اٹھا۔ نائلہ نے گلاس بھر کر جاوید کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ کچھ پانی تھا۔

”اسے بھی پانی پلاؤ۔“ نائلہ نے کہا اور جاوید کے قریب بیٹھ گئی۔ ”رات کو تم لوگ جس گاڑی تھے وہ کہاں کھڑی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”خدا کے لئے ہمیں قتل کر دیا پولیس کے حوالے کر دو۔“ جاوید کھکھکیا۔  
 ”پولیس یہاں آئی تھی لیکن میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا بھی نہیں۔ میں نے تم سے تھا تا کہ تم لوگوں کو پولیس کے حوالے نہیں کروں گی اور اب تم کہہ رہے ہو کہ پولیس کے حوالے کر تم جانتے ہو پولیس والے کتنے ظالم ہوتے ہیں۔“

”وہ تم سے زیادہ ظالم نہیں ہوں گے۔“ جاوید بولا۔  
 ”گاڑی کہاں کھڑی ہے؟“ نائلہ نے اپنا سوال دہرایا۔

”بھلی گلی کے موڑ پر ایک اسکول کی عمارت ہے۔ اس کے ساتھ ہی درخت کے نیچے میری ٹیکہ ہے۔“ جاوید نے بتایا۔

”چالی کہاں ہے؟“

”میری جیب میں۔“ جاوید نے کہا۔

نائلہ نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر چابیوں کا چھلکا نکال لیا۔  
 ”یکسی کا نمبر کیا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

جاوید نے نہرتا دیا پھر پانی مانگنے لگا۔ نائلہ نے عبد القدوس کو اشرہ کیا۔ اس نے جاوید کو ایک گلاس اور پانی پلا دیا اور پھر ان دونوں کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے لگا۔

”ہمارے منہ میں کپڑا مت ٹھونسو... خدا کے لئے...“ جاوید بولا۔ ”ہم بالکل خاموش رہیں گے۔ ہمارے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلے گی۔“

”مگر میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

ان کے منہ باندھ کر وہ کمرے سے نکل آئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نائلہ اور عبد القدوس جھنگلے سے نکل کر پچھلی گلی میں چلے گئے۔ وہ اسکول گلی کے آخری موڑ پر تھا۔ جھنگلے سے تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ اسکول کی عمارت سے چند گز کے فاصلے پر وہ پہلی عیسائی کھڑی تھی۔ اسکول کے سامنے تین چار اسکول کی وینز بھی کھڑی تھیں لیکن کوئی ڈرائیور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی اپنی دین کھڑی لڑکے چلے گئے تھے اور اب چھٹی کے لگ بھگ ہی آئے۔ اسکول گیٹ کے سامنے اسٹول پر چوکیدار بیٹھا ہوا تھا۔ نائلہ نے عیسائی کے قریب پہنچ کر بوئے اطمینان سے جاہلی لگا کر اسٹیرنگ سائیڈ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھتی ہی دوسرے دروازے کے لاک کی تاب بھی اٹھا دی۔ عبد القدوس جلدی سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ نائلہ نے انجن اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد عیسائی ان کے جھنگلے کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ گلی اس وقت ویران تھی اور کسی نے عیسائی کو جھنگلے کے گیٹ میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ نائلہ نے اندر کی طرف عیسائی اس طرح کھڑی کہہ کر باہر سے نظر نہ آ سکے۔

دن گزر گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے آرام فاضل کرنے لگے اور بالا خرات گیارہ بجے انہوں نے ان دونوں کو کمرے میں سے نکال کر عیسائی کی کھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ نائلہ نے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور عبد القدوس اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لمٹانے نے گیٹ کھول دیا اور عیسائی تیزی سے نکل گئی۔

مختلف گلیوں سے نکلے ہوئے وہ ابوالا صفحانی روڈ پر آگئے۔ اس سڑک کے ایک طرف تو وسیع و عریض جھنگلے تھے۔ تین چار بنگلوں میں اسکول تھے اور سڑک کے دوسری طرف سوئی گیس تھا۔ دفتر خاصا اندر کی طرف تھا اور وسیع و عریض علاقہ جھاڑیوں میں اٹا ہوا تھا۔ اس سڑک پر دن میں بھی ٹریفک کم ہی رہتا تھا اور اس وقت تو سناٹا طاری تھا۔

نائلہ نے عیسائی سڑک کے کنارے جھاڑیوں کے قریب روک لی۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ نائلہ نے سالنسر والا پستول نکالا۔ جاوید اور احمد کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ نائلہ کو ان پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ ٹرائیگر زبا دیا۔ دونوں کی پیشانیوں میں سوراخ ہو گئے اور خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔

دفعۃً سڑک کے دوسری طرف بنگلوں والی گلی سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نظر آئی نائلہ ایک جھنگلے سے سیدھی ہو گئی۔ اسی وقت گاڑی گلی سے نکل کر سڑک پر آگئی۔ نائلہ اور عبد القدوس تیز روشنی میں نہا گئے۔

نائلہ کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ پولیس کی عسکری موبائل تھی!



دل اور کوشید ہی نہیں یقین تھا کہ حسینہ بیگم ایک بار پھر نائلہ یا اس کے خلاف کوئی نئی سازش تیار کر رہی

تھی صادق آباد کے سب الیکٹر طور نے اسے یارو والے کیس میں پھنسانے کی جو کوشش کی تھی وہ بھی غالباً اسی سازش کا ایک حصہ تھا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ یارو نے مرنے سے پہلے ذمہ دار لوگوں کی موجودگی میں بیان دے کر اسے بچا لیا تھا۔ یارو کے بارے میں اس کے ذہن میں پہلے جو شبہات پیدا ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے تھے۔ وہ واقعی ایک وفادار دوست ثابت ہوا تھا۔ اور اب سب الیکٹر طور اور حسینہ بیگم اس بچگلے میں دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ کوئی نئی سازش تیار ہو رہی تھی۔

دوسرے دن دلاور نے اس بچگلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اسے مایوس نہیں ہوئی۔ وہ ملک الہ یار کا مکان تھا۔ ملک کے بارے میں بھی اس نے بہت جلد سب کچھ معلوم کر لیا۔

ملک الہ یار اس شہر ایک بہت بڑا کاروباری آدمی تھا۔ اناج منڈی میں اسے سب سے بڑا آرٹھی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سے کاروبار پھیلے ہوئے تھے۔ الیکٹرونگس کی سب سے بڑی دوکان بھی اسی کی تھی۔ رحیم یار خان کے علاوہ صادق آباد اور خانپور میں بھی اس کی دوکانیں تھیں۔ ان تینوں شہروں میں کئی مکان بھی تھے جو کرائے پر دے رکھے تھے۔

ملک الہ یار بنیادی طور پر سرگودھا کا رہنے والا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ گھر سے بھاگ کر دروہ ٹھو کریں کھاتا ہوا رحیم یار خان آیا تھا۔ یہاں وہ پہلے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں کئی روز تک برتن دھوتا رہا۔ اس کام کے عوض اسے پیٹ بھر روٹی مل جاتی تھی۔ پھر ہوٹل کی نوکری چھوڑ کر وہ ایک دوکان پر ملازم ہو گیا لیکن وہاں بھی زیادہ دن نہ ٹک سکا۔ دوکان کی نوکری چھوڑ کر وہ اناج منڈی میں ایک آرٹھی کے پاس آ گیا یہاں سے وہ حسینہ بیگم کے والد کی نظروں میں آ گیا۔ وہ اسے اپنے پاس لے گئے اور خوشی کے حوالے کر دیا۔

ملک الہ یار چالاک آدمی تھا۔ اس نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ منشی اس خاندان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ وہ بھی اس بہتی لنگا میں ہاتھ دھونے لگا۔ حسینہ بیگم کی شادی کے چند ہی سال بعد اس کے والد انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد جائیداد کا بٹوارہ ہو گیا۔ جائیداد کے بٹورے کا شوشہ حسینہ بیگم کے شوہر نے ہی چھوڑا تھا۔ وہ چھوٹے گھر کا آدمی تھا اور جانتا تھا کہ اگر جائیداد اکٹھی رہی تو دونوں سالوں کے دباؤ میں رہے گا۔ اسی نے حسینہ بیگم کو جائیداد کے بٹوارے پر اکسایا تھا۔

کئی مربع زرعی اراضی حسینہ بیگم کے حصے میں آئی تھی۔ اس کے شوہر نے ملک الہ یار کو بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ بڑے لوگوں میں جائیداد کے ساتھ گھر کے نوکر بھی مویشیوں کی طرح تقسیم ہوتے تھے اور ملک الہ یار ان کے حصے میں آیا تھا۔

اب سب کچھ ملک الہ یار کے کنٹرول میں تھا۔ وہ ڈنڈی مارتا رہا اور مالکوں سے چوری چھپے اپنا گھر بھر رہا۔ شبیر درانی جب تعلیم سے فارغ ہوا تو اس نے سارا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ملک الہ یار محتاط ہو گیا تھا اور پھر اسے یہ بھی سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اگر پکڑا گیا تو اسے اگلا پچھلا سارا حساب دینا پڑے گا۔ اس نے شبیر درانی کے باپ کی زندگی ہی میں نوکری چھوڑ دی اور اناج منڈی میں آڑھت کی دوکان کھول لی۔ چالاک اور تجربہ کار آدمی تھا۔ بڑے بڑے زمینداروں سے اس کے تعلقات تھے۔ اس کا کاروبار چل نکلا۔ اس نے صرف آڑھت کی دوکان پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر ہاتھ پیر پھیلاتا شروع کر دیئے۔ چھ بھائیوں میں وہ شہر کی اہم ترین شخصیت بن گیا۔ جب شبیر درانی کے والد کا انتقال ہوا تو ملک الہ یار نے اپنے کاروبار صادق آباد اور خانپور تک پھیلا لیا تھا۔

شیردرانی کے باپ کے انتقال کے بعد بھی ملک الہ یار کے اس گھرانے سے تعلقات قائم رہے تھے۔ شیردرانی بھی کبھار اسے اپنے باپ کے احسانات یاد دلاتا رہتا تھا۔ ملک الہ یار حینہ بیگم اور اس کے دونوں بھائیوں کے تعلقات کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ جائیداد کے بٹوارے کے بعد ان کے تعلقات میں رخنہ آ گیا تھا۔ حینہ بیگم اور اس کے شوہر کی نظریں عبدالصمد درانی کی جائیداد پر لگی ہوئی تھیں۔ عبدالصمد درانی کی ایک ہی بیٹی تھی نائلہ اور وہ جانتے تھے کہ باپ کی موت کے بعد وہی جائیداد کی وارث ہوگی۔ ان دونوں نے بھرپور کوشش کر ڈالی کہ شیر سے نائلہ کی شادی ہو جائے اس طرح وہ اس کی جائیداد کے وارث بھی بن سکتے تھے لیکن شیر کے لہجے اچھے نہیں تھے۔ نائلہ کے باپ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ حینہ بیگم کا شوہر کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد بھی حینہ بیگم نے اس رشتے کے لئے کوشش جاری رکھی مگر اسے ہر مرتبہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نائلہ کے ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی حینہ بیگم نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے زبردستی شیر اور نائلہ کا نکاح پڑھانے کی کوشش بھی کی تھی مگر نائلہ بھاگ نکلی تھی اور پھر حینہ بیگم اور شیردرانی نے نائلہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ انہیں اپنے مقصد میں کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن اس معزز اور معتبر خاندان کو جن ذاتوں اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا اس سے بلکہ الہ یار بخوبی واقف تھا۔ ملک الہ یار نے پیش حینہ بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ نائلہ اور اس کی جائیداد کا خیال ذہن سے نکال دے۔ حینہ بیگم بعض اوقات اس کے مشوروں پر سجدگی سے غور بھی کرتی لیکن اس کا بیٹا شیردرانی اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیتا۔

شیردرانی نے ایک آدھ بار کوشش کی تھی کہ وہ ملک الہ یار کو بھی اس معاملے میں گھسیٹ لے مگر ملک ہمیشہ اپنے آپ کو بچا گیا تھا۔

دلاور نے دو تین دن کی محنت کے بعد حینہ بیگم اور ملک الہ یار کے تعلقات کے بارے میں معلوم کر لیا۔ اس نے یہ بھی پتہ چلا لیا تھا کہ حینہ بیگم نے صادق آباد کے سب انسپکٹر ظہور کو خاص طور پر ملک الہ یار کے گھر بلایا تھا تاکہ لوگوں کو ان کی ملاقات کا علم نہ ہو سکے۔ اس سے پہلے بھی ان میں اسی طرح ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔

یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد دلاور ایک روز رات کے وقت ملک الہ یار کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ملک الہ یار جس حیثیت کا آدمی تھا اس کے پیش نظر دلاور جانتا تھا کہ اس سے ملاقات آسان نہیں ہوگی۔ اسی لئے جب اس نے پیغام بھجوایا تو نائلہ درانی کے نام کا حوالہ بھی دے دیا تھا۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اسے فوراً ہی اندر بلا لیا گیا۔

”تمہارا نام تو میرے لئے اجنبی نہیں ہے لیکن تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ ملک الہ یار نے گہری نظروں سے دلاور کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ملک صاحب۔“ دلاور نے کہا۔ ”آپ درانی خاندان کے پرانے نمک خوار رہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس خاندان کی کتنی عزت تھی کتنا احترام تھا لوگوں کی نگاہوں میں لیکن آج جو صورت حال ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ سچ لوگ بھی آج اس خاندان کے افراد کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بتاتے ہیں نظر آتے ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی خوف نہیں کوئی احترام نہیں رہا۔ درانی خاندان کی اس رسوائی میں کسی اور کا نہیں خود انہی کے افراد کا ہاتھ ہے۔ کیا یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا....؟“

”تمہارا اس سارے معاملے سے کیا تعلق ہے؟“ ملک نے اسے گھورا۔  
 ”میں تو ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں نے نالکہ بی بی کا نمک کھایا ہے۔ یہ پیسے والوں کے کھیل ہیں۔ مجھ جیسے لوگوں کو اس معاملے میں نہیں آنا چاہئے تھا لیکن بعض اوقات سچائی دوسروں کی بھی زبان کھولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔“

”سچائی کیا ہے؟“ ملک نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔  
 ”ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کو سازشوں کے جال میں پھسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ اسے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا گیا اسے ایک بار نہیں کئی بار موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی۔ دولت کی ہوس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے خون سفید ہو گیا ہے ان کا.... وہ جان کے خوف سے بھاگی پھر رہی ہے... میں آپ کے پاس صرف اس لئے آیا ہوں کہ آپ کے اس خاندان سے پرانے تعلقات ہیں۔ آپ سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ آپ اپنا تعلق استعمال کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“  
 ”تم شبیر درانی کو جانتے ہو؟“ ملک الہ یار نے کہا۔  
 ”بہت اچھی طرح جی۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے نہیں جانتے۔“ ملک الہ یار نے کہا۔ ”اگر جانتے ہوتے تو مجھ سے یہ بات نہ کہتے۔ شبیر درانی وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو دنیا کا سب سے عقلمند آدمی سمجھتا ہے۔ وہ خود سر بھی ہے۔ وہ اپنی ماں کی بات بھی نہیں مانتا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ماں بھی اسی کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ پیسے والوں کا کھیل ہے اور تم جیسے لوگوں کو اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہئے لیکن میں جانتا ہوں تم بھی اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہو چکے ہو۔ تمہارے ہاتھ بھی خون میں رنگے ہوئے ہیں بہتر یہی ہے کہ تم کنارہ کشی اختیار کر لو۔“

”میرے یا نالکہ بی بی کے بارے میں آپ کو جو بھی اطلاعات ملتی رہی ہیں وہ یکطرفہ ہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”آپ کو یہ نہیں معلوم کہ مجھے راستے سے ہٹانے کے لئے یہ لوگ کیا کچھ نہیں کرتے رہے۔ مجھے انسپکٹر صوبہ خان کے قتل میں پھسانے کی کوشش کی گئی۔ حینہ بیگم نے پولیس کو یہ بیان دے کر بہت بڑی غلطی کی تھی کہ انہوں نے صوبہ خان کی لاش دریافت ہونے سے ایک روز پہلے شام کے وقت مجھی گل مرگ میں دیکھا تھا۔ حالانکہ ان کے اپنے بندوں کا بیان یہ ہے کہ میں بہت عرصہ سے گل مرگ نہیں گیا۔ میں نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے کہ جن دنوں صوبہ خان کو قتل کیا گیا ان دنوں میں سندھ میں تھا۔ وہاں کی پولیس بھی ان دنوں وہاں میری موجودگی کی تصدیق کر چکی ہے۔ صرف یہی نہیں وہ مجھے ایک اور قتل میں بھی پھسانے کی کوشش کر چکی ہے۔ میں جانتا ہوں حینہ بیگم کے پاس بہت پیسہ ہے۔ پیسے سے سب انسپکٹر ظہور جیسے بے ضمیر لوگوں کو تو خریدا جاسکتا ہے لیکن سچائی کو نہیں دیا جاسکتا۔“  
 ”یہ انسپکٹر ظہور کا تذکرہ کیسے آگیا؟“ ملک الہ یار نے کہا۔

”آپ سب کچھ جانتے ہیں ملک صاحب۔“ دلاور نے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔  
 ”دو تین روز پہلے سب انسپکٹر ظہور یہاں آیا تھا۔ آپ کے گھر پر حینہ بیگم سے ملاقات کرنے کے لئے اور یہ ملاقات یقیناً آپ کی موجودگی میں ہوئی تھی۔“  
 ”اس کا مطلب تم بہت کچھ جانتے ہو؟“ ملک نے اسے گھورا۔

”میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ پہلے تو آپ یہ کوشش کیجئے کہ حسین بیگم اور شبیر درانی اس مکمل کو ختم کر دیں اور اگر وہ یہ مکمل ختم نہ کرنا چاہیں تو کم از کم دلاور کے خلاف کوئی نئی سازش نہ کریں۔ اگر دلاور کے اندر کا حیوان بیدار ہو گیا تو پھر یہاں کچھ بھی نہیں رہے گا سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”دیکھو دلاور۔“ ملک الہ یار نے کہا۔ ”تمہارا اور شبیر درانی کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ وہ ایک بہت بڑا زمیندار ہے اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ پیسے کے بل بوتے پر بہت کچھ کیا جاسکتا ہے اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اس معاملے سے الگ رہو۔“

”میں الگ رہنا چاہتا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔ ”مگر حسین بیگم اور شبیر درانی مجھے زبردستی اس معاملے میں کھیٹ رہے ہیں کبھی مجھ پر قاتلانہ حملے کرائے جاتے ہیں اور کبھی پولیس کے ذریعے کسی جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں میں الگ کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں آپ کے ذریعے یہ پیغام ان دونوں تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لیں۔ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔“

”انہیں شکایت ہے کہ تم ان کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کر رہے ہو۔“ الہ یار نے کہا۔ ”تاہم یہ جھگڑا ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم تاہم کی حمایت کر کے ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کر رہے ہو۔“

”ذاتی معاملات گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہ کر طے کئے جاتے ہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”مگر حسین بیگم اور شبیر درانی ان معاملات کو سرکوں پر لے آئے تاہم بی بی پر بار بار قاتلانہ حملے کئے گئے۔ ان کے خلاف جھوٹے مقدمات بنا کر ان کی تشریح کی گئی۔ انہیں راستے سے ہٹانے کے لئے پیشہ ور قاتلوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مجھے ان کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔ ان کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ اگر میرے اراض کو مداخلت سمجھا جاتا ہے تو یہ ان کی کم عقلی ہے۔ اب تک تو میں نے یہ سب کچھ برداشت کیا ہے ان پانی سرے گزر چکا ہے انہیں یہ پیغام بھیجاؤں کہ مجھے عزت اور شرافت کی زندگی گزارنے دیں۔ مجھے اپنی کارروائی کرنے پر مجبور نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ لیکن تمہارے لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ تم بھی اس معاملے سے الگ رہو۔“

”میں بھی آپ کو ایک مشورہ دوں گا ملک صاحب۔“ دلاور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے معاشرے میں مقام بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔ شبیر درانی کی حمایت کر کے آپ اس سے محروم ہو سکتے ہیں۔ شبیر درانی وہ شخص ہے جس نے اپنے ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ بھی یہی سلوک کرے گا۔“

دلاور جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ ملک الہ یار کے بنگلے سے نکلا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ سیدھا راتے منصور کے بنگلے پر آیا تھا۔

حسین بیگم اور سب انسپکٹر ظہور میں ملاقات کو تین چار روز گزر گئے تھے۔ دلاور کو یقین تھا کہ اس ملاقات میں کوئی نئی سازش تیار کی گئی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔

راتے منصور ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ وہ صادق آباد والی حویلی جانا چاہتے تھے لیکن انہیں فی الحال شہری میں رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اسی دوران انہیں اطلاع ملی کہ ان کے گاؤں میں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ بظاہر جھگڑے کی وجہ بہت معمولی سی تھی لیکن زمیندار ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی اپنی ادا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ راتے منصور اور دوسرے زمیندار کی اراضی کی حد بندی والی پگڈنڈی کے ساتھ



ایک چھوٹی سی ندی تھی جس کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ ندی کھیتوں میں آب پاشی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس ندی کے کنارے پر شیشم کے درخت تھے۔ شیشم کے یہ درخت رائے منصور کی زمین پر تھے مگر دوسرا زمیندار ان کا دعویٰ دار بن گیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ یہ درخت کاٹنے کی کوشش کی تھی مگر رائے منصور کی وجہ سے وہ کبھی بھی اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور اب رائے صاحب بیمار ہو کر ہسپتال چلے گئے تھے تو اس زمیندار کو موقع مل گیا اس نے درخت کٹوانا شروع کر دیئے۔ لیکن ابھی چند ہی درخت کاٹے گئے تھے کہ رائے منصور کے مزارع پہنچ گئے۔ انہوں نے زمیندار کے آدمیوں کو درخت کاٹنے سے روکا تو جھگڑا شروع ہو گیا۔ حویلی کے ایک ملازم نے رائے منصور کو اس جھگڑے کی اطلاع بھجوا دی رائے منصور ظاہر ہے خود نہیں جاسکتے تھے انہوں نے دلاور کو بھیج دیا اور اسے یہ بھی سمجھادیا کہ جھگڑا بڑھنے نہ پائے۔ معاملہ انعام و تعظیم سے طے ہو جائے تو بہتر ہے۔

دلاور رات کے وقت حویلی میں پہنچا تھا۔ حویلی کے ملازموں نے بتایا کہ اصل معاملہ کیا تھا۔  
 ”دلاور بھائی۔“ فضل نے کہا۔ ”زمیندار کے آدمیوں نے کل رات درخت کاٹنا شروع کئے تھے۔ ہمیں پتہ چل گیا ہم نے وہاں جا کر انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہوائی فائرنگ کر کے ہمیں وہاں سے بھاگ دیا۔ تین درخت کاٹ کر وہ خود بھی چلے گئے تھے۔ صبح پھر آگئے اس وقت زمیندار بھی ان کے ساتھ تھا ہمارے آدمی بھی بندوقیں لے کر پہنچ گئے۔ زمیندار نے ہمارے تیور دیکھے تو اپنے آدمیوں کو لے کر چلا گیا۔“

”وہ کئے ہوئے درخت اٹھا کر لے گیا ہے کیا؟“ دلاور نے پوچھا۔  
 ”نہیں، درخت ابھی وہیں پڑے ہیں۔“ فضل نے جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ صبح آدمیوں کو لے کر میرے ساتھ چلنا اور وہ درخت اٹھا لیتا۔ اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ دلاور نے کہا۔

”وہ لوگ تو لڑنے مرنے پر تیار ہیں دلاور بھائی۔“ فضل نے کہا۔  
 ”تم لوگ ڈرتے ہو کیا؟“ دلاور نے اسے گھورا۔ ”چوڑیاں پن رکھی ہیں تم لوگوں نے؟ ان کی حرکتوں کا جواب نہیں دے سکتے۔۔۔“  
 ”یہ بات نہیں دلاور بھائی۔“ فضل نے کہا۔ ”رائے صاحب نے ہمیں ہمیشہ یہ کہا ہے کہ لڑائی جھگڑے سے پرہیز کیا جائے۔“

”لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے گھر میں گھس کر تمہارا سامان اٹھا کر لے جائے تو تم خاموش بیٹھے اسے دیکھتے رہو۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ کسی دوسرے کی چیز قبضہ کرنا بری بات ہے لیکن اپنا حق نہیں چھوڑا جاسکتا۔ کسی کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ہمارا حق بھی چھین کر لے جائے یہ درخت ہماری زمین پر ہیں۔ ہماری ملکیت ہیں کوئی دوسرا انہیں کاٹ کر کیسے لے جاسکتا ہے۔ صبح سویرے میرے ساتھ چلنا اور تمام لکڑی اٹھا کر حویلی میں ڈال دینا۔“  
 ”ٹھیک ہے، صبح چلے چلیں گے۔“ فضل نے کہا۔

دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ زمیندار حسینہ بیگم کا دور کارشتے دار بھی ہوتا تھا اور عین ممکن ہے کہ جھگڑا بھی حسینہ بیگم ہی کے ایما پر شروع کیا گیا ہو۔ حسینہ بیگم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ رائے منصور، نالکہ کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ رائے منصور ہی کی وجہ سے نالکہ کے خلاف ان کے بیشتر منصوبے ناکام ہوئے تھے۔

اگر رائے منصور نالکہ کی پشت پناہی نہ کرتے تو حسینہ بیگم اور شیردرانی، نالکہ کو کسی نہ کسی جھوٹے کیس میں پھنسا کر اپنے راستے سے ہٹا چکے ہوتے مگر رائے منصور ک بوجہ سے ان کی ہر سازش ناکام ہو گئی تھی اور اب ایک معمولی سی بات کی آڑھ لے کر حسینہ بیگم رائے منصور کے خلاف محاذ کھولنا چاہتی تھی۔

زمیندار فرزند علی سے رائے منصور کی تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے تھے۔ زمین ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے زمیندار اکثر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے مگر رائے منصور کا اپنے پڑوسیوں سے کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ کبھی کوئی ایسی بات ہو بھی جاتی تو رائے منصور معاملے کو بڑی خوش اسلوبی سے طے کر لیتے۔ باضی میں ندی کے کنارے ان درختوں کی وجہ سے فرزند علی سے ایک آدھ مرتبہ ناخوشگوار پیدا ہوئی تھی مگر رائے منصور نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملے طے کر دیا تھا لیکن... ان کی عدم موجودگی میں درختوں کی کٹائی کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ فرزند علی جان بوجھ کر جھگڑا پیدا کرنا چاہتا تھا اور ایسا وہ کسی کے اشارے پر ہی کر رہا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے فوراً ہی بعد دلاور اور فضل پانچ چھ آدمیوں کو لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ دلاور کے کندھے پر حسب معمول آٹومیک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ آج کئی دنوں بعد اس نے یہ رائفل اٹھائی تھی۔

جب وہ ندی کے کنارے پر پہنچے تو وہاں کی صورت حال کچھ مختلف نظر آئی۔ فرزند علی کے آدمی کٹے ہوئے درختوں کے تنوں کی شاخیں کاٹ رہے تھے۔ وہ تعداد میں چھ تھے۔ ان سے تقریباً ”پچاس گز کے فاصلے“ فرزند علی بھی ایک درخت کے نیچے گھوڑی پر بیٹھا تھا۔ اس کے گلے میں پستول والا بیلٹ لٹکا ہوا تھا۔ دلاور اور فضل کے ساتھ تین آدمی اور تھے اور ان سب کے پاس کھانا پیاں تھیں۔ یہ کھانا پیاں وہ کرے ہوئے درخت کاٹنے کے لئے لائے تھے۔ کٹے ہوئے درختوں کی تعداد آٹھ تھی۔

”اوئے بھلول۔“ دلاور نے فرزند علی کے ایک آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ درخت کس کی اجازت پر کاٹے گئے ہیں؟“

”ہمیں یہ درخت کاٹنے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔“ بھلول نے کہا۔

”میں کہتا ہوں یہ درخت ہمیں چھوڑ دو۔ کیس ایسا نہ ہو کہ تمہارے وارثوں کو درختوں کی بجائے تمہاری لاشیں لٹھائی پڑیں۔“ دلاور نے کہا۔

اسی دوران فرزند علی بھی وہاں پہنچ گیا۔

”کیا بات ہے دلاور۔“ وہ دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کس کی لاشیں اٹھوانے کی بات کر رہے“

”چوہدری صاحب۔“ دلاور نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ درخت رائے منصور صاحب کی زمین پر ہیں اور انہی کی ملکیت ہیں۔ آپ ایک نئے جھگڑے کو جنم دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تم کون ہوتے ہو ہمیں روکنے والے۔“ چوہدری فرزند علی نے ہولشر سے پستول نکال لیا۔ ”تم اپنی محال میں رہو۔ میں شیردرانی نہیں ہوں۔ میرا نام چوہدری فرزند علی ہے اور تم جانتے ہو کہ میں اپنے بالوں کے گلے کر کے ڈال دیا کرتا ہوں۔“ پھر وہ اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ لکڑیاں

اٹھا کر ڈیرے پر پہنچا دوں۔“

”میں دیکھتا ہوں کون مائی کا لعل یہاں سے لکڑی اٹھاتا ہے۔“ دلاور نے کہتے ہوئے کندھے سے رائفل اتاری۔ ”مجھے کچھ کرنے پر مجبور مت کرو چوہدری۔ اپنے بندوں کو لے کر چلے جاؤ یہاں سے۔ تم دلاور کو بھی جانتے ہو۔ میں جس کی عزت کرتا ہوں اس کے لئے جان بھی دینے کو تیار رہتا ہوں لیکن اپنے دشمن کو کیسے قتل نہیں دیتا۔ بہتر ہو گا کہ اپنے بندوں کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ خون خرابہ نہ کرو۔“

چوہدری فرزند علی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے پستول ہولسٹریں ڈالا اور ہملول کو اشارہ کیا ہملول اور اس کے ساتھی اپنی کلماڑیاں کندھوں پر رکھ کر وہاں سے چل پڑے۔

”رائے منصور کی وجہ سے اس وقت میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔“ فرزند علی نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے اس وقت میری جو توہین کی ہے اسے میں یاد رکھوں گا۔“

دلاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چوہدری فرزند چند لمحے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گھوڑی کی لگام کھینچ کر اسے ایڑھ لگا دی۔

دلاور کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔

”یہ تمام لکڑیاں اٹھا کر حویلی کی دیوار کی قریب ڈال دو اور آئندہ کوئی شخص درخت کاٹنے کی کوشش کرے تو ٹکڑے کر دیتا اس کے۔“ دلاور نے کہا اور کھیتوں کے درمیان گینڈنڈی پر حویلی کی طرف چلنے لگا۔

دلاور سارا دن حویلی میں رہا۔ وہ بار بار چوہدری فرزند علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے واپس چلا گیا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والا تو نہیں تھا۔ کوئی وجہ ضرور تھی جو وہ کوئی ہنگامہ کئے بغیر واپس چلا گیا تھا اور شام سے کچھ پہلے وہ وجہ بھی اس کی سمجھ میں آگئی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا دلاور ندی کی طرف سے آ رہا تھا کٹے ہوئے درختوں کی تمام لکڑیاں حویلی کے پاس پہنچائی جا چکی تھیں۔ دلاور کے ساتھ فضل بھی تھا۔ وہ ابھی کھیتوں ہی میں تھے کہ سب انسپکٹر ظہور حویلی کی طرف سے آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ اسے دور سے دیکھ کر ہی دلاور کا مٹھا ٹھنکا تھا۔

”لگتا ہے پولیس والوں کے پاس کوئی کام نہیں رہ گیا۔“ دلاور نے سب انسپکٹر ظہور کے قریب آنے پر کہا۔

”تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا دلاور۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”چوہدری فرزند علی نے تمہارے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے کہ تم نے آج صبح بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اسے قتل کی دھمکی دی تھی۔“

”صرف دھمکی دی تھی۔ اسے قتل تو نہیں کیا تھا۔“ دلاور نے کہا۔

”کسی کو قتل کی دھمکی دینا بھی عظیم جرم ہے۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔

”تھانیدار۔“ دلاور نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”ان دولت مندوں کی غلامی کے علاوہ تم کوئی اور کام بھی کر لیا کرو۔ حکومت نے تمہیں یہ وردی دی ہے۔ اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ کوئی فرض عائد ہوتا ہے تم پر۔ مگر لگتا ہے تم اپنے فرائض بھول کر ان کے غلام بن گئے ہو۔“

”بکواس بند کرو۔ میرے ساتھ چلو ورنہ میں ہتھکڑی لگا کر لے جاؤں گا تمہیں۔“ سب انسپکٹر ظہور نے غراتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں تمہارے پاس قانون کی طاقت ہے۔ تم قانون کے محافظ نہیں مالک ہو۔ قانون کو جس

کے خلاف اور جس طرح چاہو استعمال کر سکتے ہو لیکن کم از کم میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ تم نے میرے خلاف اب تک جو کچھ کرنا تھا کر چکے۔ اب تم میرے خلاف کوئی غیر قانونی ہتھکنڈہ استعمال نہیں کر سکتے۔“ دلاور نے کہا۔

”مجھے دھمکی دے کر تم اپنے جرم کو مزید سنگین بنارہے ہو۔“ ظہور نے کہا۔  
 ”تھانیدار۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں یہ سب کچھ تم کس کے اشارے پر کر رہے ہو اگر تم اپنے جسم پر اس وردی کو سجائے رکھنا چاہتے ہو تو بہتر یہی ہے کہ سب کچھ بھول کر واپس چلے جاؤ۔ ورنہ تمہارے جسم پر نہ تو یہ وردی رہے گی اور نہ تم کسی کو اس طرح ہتھکڑیاں لگانے کی دھمکیاں دے سکو گے۔“  
 ”تم میرے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں۔“ سب انسپکٹر نے ریوالتور نکال لیا۔  
 ”اس کو جیب ہی میں رکھ لو۔“ دلاور نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”تھانے میں لکڑی کے پنج پر میں اکیلا نہیں بیٹھوں گا میرے ساتھ حسینہ بیگم بھی ہوگی اور ملک الہ یار بھی۔“  
 ”کیا بکو اس کر رہے ہو۔“ سب انسپکٹر ظہور دھاڑا۔

”یہ بکو اس نہیں حقیقت ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”تم حسینہ بیگم کے ساتھ مل کر میرے خلاف جو سازشیں کر رہے ہو میں ان سے پوری طرح واقف ہوں۔ چوہدری فرزند علی کو یہاں درخت کاٹنے کی ہمت بھی نہ ہوتی مگر تم جیسے ایمان فروشوں نے اچھے بھلے شریف آدمیوں کو بھی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ مجھے کس جرم میں تھانے لے جانا چاہتے ہو؟ ہماری زمینوں پر درخت چوہدری فرزند نے کاٹے اور الٹا ہمیں ہی بند کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے! اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ دولت مندوں کی غلامی کرنے کے علاوہ کوئی اور کام بھی کر لیا کرو۔۔۔“

”دلاور!“ سب انسپکٹر ظہور دانت کچکا کر رہ گیا۔

”بہتر ہو گا کہ اب تم یہاں ہی چلے جاؤ تھانیدار۔“ دلاور نے کہا۔ ”اور ایک بات ذہن میں رکھو کہ یہ اراضی رائے منصور کی ملکیت ہے۔ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ قانون کا احترام کرتا ہے۔ اس نے کبھی قانون شکنی نہیں کی۔ وہ یہ بات بھی پسند نہیں کرے گا کہ قانون کو اس کے خلاف غلط طور پر استعمال کیا جائے۔ آئندہ اگر تم ان زمینوں کی طرف رخ کرو تو پہلے اچھی طرح سوچ لیتا۔“  
 ”اب تو میں تمہیں صرف وارننگ دے کر چھوڑ رہا ہوں لیکن آئندہ اگر تم بارے بارے میں کوئی شکایت ملی تو رائے منصور کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔  
 ”یہ تم مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”اپنی کھال بچانے کے لئے مجھے چھوڑ کر

ہار رہے ہو۔“  
 ”تم ایک نہ ایک دن میرے ہاتھ لگو گے پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کون بچانے کے لئے آتا ہے۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا اور کانٹیل کو اشارہ کرتے ہوئے مڑ گیا۔

وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے جبکہ دلاور اور فضل شلنے والے انداز میں چل رہے تھے۔ جب وہ بستی میں پہنچے تو سب انسپکٹر ظہور اپنے آدمیوں کے ساتھ جیب پر وہاں سے جا چکا تھا۔  
 دلاور تین دن حویلی میں رہا۔ اسے اندیشہ تھا کہ چوہدری فرزند علی پھر کوئی شرارت کرے گا۔ لیکن تین دن گزرنے کے بعد جب اس کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا تو دلاور کسی قدر مطمئن ہو گیا۔  
 رات کا کھانا حویلی میں کھانے کے بعد وہ فضل کو کچھ ہدایات دیتا ہوا شہر جانے کے لئے حویلی سے نکل کھڑا

ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ رات شرمیں مشتاق کے پاس رہے گا اور صبح سویرے رحیم یار خان چلا جائے گا۔ شہر صرف دو میل کے فاصلے پر ہی تو تھا۔ دلاور نے سوچا کہ وہ پیدل ہی چلا جائے گا لیکن فضل نے اسے اپنی سائیکل دے دی تھی۔ سڑک ویران تھی۔ اس سڑک پر بستی کے لوگوں کے علاوہ اور کسی قسم کی آمدورفت نہیں تھی۔ شہر سے بستی تک یہ پختہ سڑک رائے منصور صاحب ہی نے تعمیر کروائی تھی۔ سڑک پر مناسب فاصلوں پر بجلی کے کھمبے بھی تھے۔ ایک آدھ کھمبے کا بلب فیوز ہونے کے علاوہ باقی تمام کھمبوں پر بلب روشن تھے۔

تقریباً ”نصف میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ بستی کے دو آدمی سائیکلوں پر آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے دلاور کو دیکھ کر سائیکلیں روک لیں۔ دلاور بھی رک گیا۔ پانچ دس منٹ تک گپ شپ ہوتی رہی اور پھر وہ اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

دلاور سائیکل کے پیڈل چلاتا ہوا اونچی آواز میں ماہیا بھی گارہا تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ رائے منصور کی حویلی میں ہونے والی تقریبات میں اس نے لوگ گیت سنائے تھے جو بے حد پسند کئے گئے تھے۔ رائے صاحب کا بھتیجا احمد تو اس کا شیدائی ہو گیا تھا وہ جب بھی لاہور سے چھٹی پر آتا دلاور سے روزانہ رات کو باقاعدگی سے گانے سنا کرتا تھا۔ اس وقت بھی دلاور بڑے موڈ میں ماہیا گارہا تھا۔ سامنے سے ایک گاڑی آتے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ یہ گاڑی کس کی ہو سکتی ہے۔ رائے منصور کے تو آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں احمد کا خیال آیا۔ لیکن پھر جھٹک دیا یہ احمد بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ آج شام کے تھوڑی دیر بعد ہی تو ٹیلی فون پر احمد سے اس کی بات ہوئی تھی۔ اگر احمد نے گاؤں آنا ہوتا تو ہتا دیتا تو پھر کون ہو سکتا ہے؟

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی اس کے بالکل سامنے آگئی۔ ہیڈلیمپس کی تیز روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے سائیکل سائیڈ پر کئی۔ سامنے سے آنے والی گاڑی بھی اسی کی طرف ہو گئی۔ دلاور سائیکل کو پکچے میں اتار لی گیا۔ لیکن گاڑی اسی طرف اس کے بالکل سامنے آگئی تھی۔ اور بالآخر گاڑی اس کی سائیکل سے ٹکرا کر رک گئی۔ دلاور سائیکل سمیت کھیت کے کنارے پر گرا۔ وہ بیڑاٹا ہوا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گاڑی سے دو آدمی اترے اور اس سے لپٹ گئے۔

”ارے! کون ہو تم لوگ... چھوڑو مجھے... کون ہو تم لوگ؟“

دلاور اپنے آپ ک چمڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ان دونوں نے اسے دونوں ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا۔ اسی دوران ایک تیسرا آدمی گاڑی سے اتر کر اس کے سامنے آگیا۔ دلاور کی آنکھوں میں ہیڈلیمپس کی روشنی پڑ رہی تھی جبکہ اس کے سامنے والا آدمی دو تین قدم پیچھے تاریکی میں تھا۔

”کون ہو تم لوگ اور یہ کیا مذاق ہے۔ اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟“ دلاور نے سامنے والے شخص کی شکل دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں اس کے منہ پر زور دار گھونسہ لگا۔ دلاور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑایا لیکن دائیں بائیں کھڑے آدمیوں نے اسے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ محض دو قدم اٹھا کر روشنی میں آگیا۔ اسے دیکھ کر دلاور چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ سب انپکٹر ظہور تھا۔ سادہ لباس میں اس نے اچانک ہی دلاور کے سینے پر ایک زوردار گھونسہ مار دیا۔ دلاور کے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ ”قانونی طور پر تم سے منٹے کے لئے کچھ قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔“ سب انپکٹر ظہور نے کہا۔

”میں نے سوچا کہ تم سے دوسرے طریقے سے نمٹا دیا جائے۔“  
دلاور اپنے آپ کو دونوں آدمیوں کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ان دونوں آدمیوں نے بڑی مضبوطی سے اسے پکڑ رکھا تھا۔ پھر دفعتاً ”دلاور نے اپنے آپ کو ان دونوں کی گرفت کے زور پر اوپر اٹھایا اور دونوں پر پوری قوت سے سامنے کھڑے ہوئے سب انسپکٹر ظہور کے سینے پر مارے۔ سب انسپکٹر ظہور کے منہ سے بھیاں بچ نکلی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اپشت کے بل گرا۔

دلاور نے اپنے آپ کو ایک اور جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ وہ پوری قوت سے آگے کی طرف جھکا تھا۔ وہ دونوں آدمی اس کے پہلوؤں میں غلازبائی کھاتے ہوئے گرے۔ دلاور بھی گرا تھا۔ اس نے بھی غلازبائی کھائی لیکن بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے سنبھلتے ہی سب انسپکٹر ظہور کے سر پر زوردار ٹھوکر ماری جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظہور ایک بار پھر جیج کر گرا۔

دلاور نے محوم کر دوسرے آدمی کو ٹھوکر سید کر دی۔ وہ بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ٹھوکر کھا کر دوبارہ گر گیا۔ اسے ٹھوکر مارنے کے ساتھ دلاور خود بھی لڑکھڑا گیا تھا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تیسرا آدمی اٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر کھیت کے کنارے پر پودوں میں گرے۔ دلاور نیچے تھا اور وہ آدمی اس کے اوپر۔ دلاور نے بڑی پھرتی سے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا۔ وہ خود اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوسرے آدمی نے اٹھ کر اس پر چلا ٹنگ لگا دی۔ اس مرتبہ دلاور اس کی گرفت میں آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پہلا آدمی بھی اٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ دونوں بری طرح اس کی دھنسانی کرنے لگے۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں ان کی ٹھوکریں یا گھونسنے نہ پڑ رہے ہوں۔ دلاور پدوں میں لوٹنے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی اور بالاخر ان دونوں نے ایک بار پھر اسے گرفت میں لے لیا۔ سب انسپکٹر ظہور پھر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ چند لمحوں تک خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بھیڑیے کی طرح فرایا۔

”میں اگر چاہوں تو انگلی کے ایک اشارے پر تمہاری کھوپڑی اڑا سکتا ہوں۔“ اس نے ریوالور دلاور کے چہرے کے سامنے نہایا۔ ”لیکن ابھی میں نے تم سے ان چوٹوں کا حساب لیتا ہے جو تم نے ابھی ابھی مجھے لگائی ہیں۔“

”بڑے بہادر ہو۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”ان سے کہو مجھے چھوڑ دیں پھر دیکھو تمہیں کس طرح حساب دیتا ہوں۔“

”اب تو تمہیں موت ہی ان کے ہتھکنڈے سے نکال سکے گی۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”اور موت بھی ایسی کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکو گے۔ تمہیں اس طرح سکا سکا کر ختم کیا جائے گا کہ تم ہر لمحہ مجھ سے زندگی کی نہیں موت کی جھیک مانگو گے اور موت تمہیں آسانی سے نہیں آئے گی۔“

”بزدل! آخ تھو۔“ دلاور نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

سب انسپکٹر ظہور کا خون کھول اٹھا۔ اس نے ریوالور کی نال اس کے جڑے پر ماری۔ ضرب زوردار

فی۔ دلاور کے منہ سے بے اختیار جیج نکل گئی۔

”اے گاڑی میں ڈالو اور لے چلو یہاں سے۔“ سب انسپکٹر نے جیج کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

وہ دونوں دلاور کو دھکیلے ہوئے کار کی طرف لے چلے۔ کار کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا دلاور کو زبردستی

سیٹ پر ٹھونس دیا گیا۔ ایک آدمی نے اسے بازو سے پکڑے رکھا اور دوسرا اسے چھوڑ کر بڑی تیزی سے گاڑی کے اوپر سے گھوم کر دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا۔ اس طرح دلاور ان دونوں کے بیچ میں سینڈیچ بن کر رہ گیا تھا۔ ان دونوں آدمیوں نے سیٹ پر بیٹھے ہی جیبوں سے پستول نکال لئے تھے۔ دلاور کو دونوں پہلوؤں میں پستولوں کی چیم محسوس ہو رہی تھی۔

”اگر تم نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں بچ سکو گے۔“ دلاور کے دائیں طرف والا آدمی غرایا۔

دلاور خاموش رہا۔ سب انسپکٹر ظہور اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے انجن اشارت کیا اور یوٹرن لیتے ہوئے گاڑی موڑ دی۔ دلاور کا خیال تھا کہ وہ لوگ اسے تھانے لے جائیں گے اور کسی نہ کسی سنگین الزام میں پھنسانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن گاڑی صادق آباد شہر کی طرف جانے کے بجائے بائیں طرف کھیتوں کے درمیان ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔

کار کھیتوں میں کچے رستوں پر چلتی ہوئی تقریباً ”ایک گھنٹے بعد“ کی تو دلاور چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ شبیر درانی کی آموں والی حویلی تھی۔ سب انسپکٹر ظہور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ اس نے فوراً ہی ریا لور نکال لیا تھا۔ اس کے آدمی دلاور کو لے کر نیچے اتر آئے ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی پستول تھے۔ وہ دونوں دلاور کو دھکے دیتے ہوئے حویلی کے گیٹ کی طرف لے چلے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجتے والے تھے۔ گیٹ میں داخل ہو کر چند قدم آگے بڑھتے ہی دلاور اچھل پڑا۔ برآمدے میں ایک کرسی پر حسینہ بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ایک گن مین بھی تھا جو آٹومیک رائفل کندھے سے لٹکائے کرسی کے قریب مستعد کھڑا تھا۔ سب انسپکٹر ظہور نے دلاور کو گردن سے پکڑ کر حسینہ بیگم کے قدموں پر گرا دیا۔

”نیچے بیگم صاحبہ۔“ وہ حسینہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے راستے کا ایک کانٹا میری چنگی میں آگیا ہے۔ یہ اب صرف چند گھنٹوں کا ممان ہے۔ اس کے بعد آپ کو کم از کم اس کی طرف سے تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”بھئی ہمارے راستے کا سب سے بڑا کانٹا تھا۔“ حسینہ بیگم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ اس حرافہ کے ساتھ نہ ملا ہوتا تو اس کی ساری جائیداد ہمارے قبضے میں آچکی ہوتی لیکن اس کی وجہ سے ہمارے سارے منصوبے ناکام ہوتے رہے۔ اب صرف ایک کانٹا رہ گیا ہے۔“

”آپ کا اشارہ غالباً“ رائے منصور کی طرف ہے۔“ سب انسپکٹر ظہور بولا۔

”ہاں۔“ حسینہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اگر اس کا قصہ بھی تمام ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نالہ کی جائیداد پر قابض ہونے سے نہیں روک سکتی۔“

”اس کا قصہ بھی تمام ہو جائے گا بیگم صاحبہ۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”دو چار دن کی بات ہے۔ بس یہ سمجھئے کہ اب آپ کی مشکلوں کے دن ختم ہونے والے ہیں۔“

”رائے منصور بھی ہمارے راستے سے ہٹ جائے تو ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔“ حسینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”انعام تو میں لوں گا بیگم صاحبہ۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ آپ کی خاطر میں نے اپنی نوکری، عزت اور زندگی تک داؤ پر لگا رکھی ہے۔“

”ہمیں احساس ہے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”صوبہ خان کو بھی ہم نے یہی فریضہ سونپا تھا لیکن وہ بیکار آدمی ثابت ہوا وہ نالکہ جیسی ایک لڑکی کو قابو میں نہیں کر سکا۔“

”وہ بے وقوف تھا بیگم صاحبہ۔“ سب انسپکٹر ظہور نے جواب دیا۔ ”اس نے سندھ میں اپنے نام کی دہشت پھیلا رکھی تھی لیکن جب کام کا وقت آیا تو بالکل کھوکھلا ثابت ہوا لیکن مجھے آپ اس سے بالکل مختلف پائیں گی۔ اس کا اندازہ آپ نے اس کارکردگی سے لگایا ہوگا۔“ اس نے کہتے ہوئے دلاور کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”صبح اس کی موت کی خبر کے ساتھ مجھے رزلٹ بھی چاہئے۔ تم جانتے ہو کہ انسپکٹر صوبہ خان کے قتل کے سلسلے میں پولیس اب میرے بیٹے پر شبہ کر رہی ہے۔ میں نے اسے پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے بڑی چالاکی سے اپنی عدم موجودگی ثابت کر دی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بیٹے کی گرفتاری سے ہمارے خاندان کا رہاسا وقار بھی ختم ہو جائے۔ اس سے تم نے یہ بیان حاصل کرنا ہے کہ انسپکٹر صوبہ خان کو اسی نے قتل کر کے لاش کنویں میں پھینکی تھی۔ اگر تم یہ بیان حاصل کر لو تو شبیر کا راستہ بھی صاف ہو جائے گا۔“

”آپ مطمئن رہیں بیگم صاحبہ صبح آپ کو اچھی خبر سننے کو ملے گی۔“ ظہور نے کہا۔

”ٹھیک ہے اب میں جاری ہوں لیکن صبح یہ نہ سننا پڑے کہ یہ تمہاری حراست سے فرار ہو چکا ہے۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”اب تو موت ہی اسے میری حراست سے نجات دلائے گی بیگم صاحبہ۔ یہ میرے بارے میں بھی بہت کچھ جان چکا ہے۔ اس کی زندگی میری موت بن جائے گی۔ اسے تو اس طرح ختم کیا جائے گا کہ اس کی لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ اب میں جاری ہوں۔ صبح تمہاری طرف سے اطلاع کی منتظر رہوں گی۔ امیر علی۔۔۔“ حینہ بیگم نے آخر میں اپنی گن مین کی طرف دیکھا۔ گن مین نے اپنی صدری کی اندر کی جیب سے براؤن رنگ کا ایک پھولا ہوا تھیلیا نکال کر حینہ بیگم کے ہاتھ میں تھمادیا۔ ”یہ رکھ لو۔۔۔ پچاس ہزار ہیں۔“ حینہ بیگم نے وہ لفافہ سب انسپکٹر ظہور کی طرف بڑھادیا۔ ”کام مکمل ہو جانے پر تمہیں اتنا کچھ ملے گا کہ زندگی بھر عیش کرو گے۔“

”شکریہ بیگم صاحبہ۔“ سب انسپکٹر ظہور نے لفافہ لے لیا۔ ”آپ جیسے مہربان نہ ہوں تو ہم لوگ بھی صرف پولیس والے ہی بن کر رہ جائیں۔“

”اچھا۔۔۔ اب میں چلتی ہوں صبح تمہاری طرف سے اطلاع کی منتظر رہوں گی۔ چلو، امیر علی۔۔۔“ حینہ بیگم نے کہتے ہوئے گن مین کی طرف دیکھا۔

”جانے سے پہلے میری ایک بات سنی جاؤ حینہ بیگم۔“ دلاور نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دلاور ایک ایسا طوفان ہے جسے قابو میں نہیں کیا جاسکتا۔ ایک گولا ہے اور تم جانتی ہو کہ گولے کے بیروں میں بیڑیاں نہیں ڈالی جاسکتیں۔ اس بے ضمیر آدمی کی باتوں کا یقین مت کرنا۔ میری آج کی رات اس حویلی میں نہیں کہیں اور گزرے گی اور اس کے بعد جو طوفان آئے گا تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکو گی۔“

”تم ہو تو ان پڑھ لیکن باتیں اچھی کر لیتے ہو۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”لیکن میں سب انسپکٹر ظہور پر پورا



یقین ہے۔ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات ثابت ہوگی۔“

”اور مجھے اپنے خدا پر یقین ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”خدا ظلم کی رسی ضرور دراز کرتا ہے لیکن ظلم آخر ایک دن مٹ کر ہی رہتا ہے۔“

”آج کی رات جتنا بولنا چاہو بول لو۔ اس کے بعد تمہاری یہ زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔“ اس نے خاموش ہو کر دلاور کے سر پر ٹھوکر مارنا چاہی مگر دلاور نے بڑی پھرتی سے اس کے پیر کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ حسینہ بیگم پشت کے بل گری۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ گرنے سے اس کے کولے پر چوٹ لگی تھی۔

سب انسپکٹر ظہور اور حسینہ بیگم کے گن میں نے سہارا دے کر حسینہ بیگم کو اٹھایا جبکہ ظہور کے دونوں آدی دلاور پر پل پڑے تھے وہ دلاور پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کرنے لگے۔ دلاور کی چیخیں گونجنے لگیں۔

”اے اندر لے چلو۔“ سب انسپکٹر ظہور نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا پھر حسینہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آئیے بیگم صاحبہ آپ کو گاڑی تک چھوڑ دوں۔“

”غلامی کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہو۔“ دلاور نے سب انسپکٹر ظہور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارا بس چلے تو کتنے کی طرح اس حرافہ کے پیر بھی چائے لگو۔“

سب انسپکٹر ظہور پیش میں آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دلاور کو ایک زوردار ٹھوکر سید کر دی اور پھر حسینہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر حویلی میں کھڑی ہوئی کار کی طرف لے چلا۔

حسینہ بیگم کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ایک ہاتھ کو لے کر رکھا ہوا تھا۔ کار کے قریب پہنچ کر گن مین نے جلدی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ظہور نے سہارہ دے کر حسینہ بیگم کو سیٹ پر بٹھایا اور دروازہ بند کر کے کار کے قریب اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وہ واقعی اس کا زور خرید غلام ہو۔ گن مین نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی ایک منٹ کے بعد چلتے سے آگے بڑھا دی۔ سب انسپکٹر ظہور واپس آگیا۔ اس کے دونوں آدی دلاور کو گھیسنتے ہوئے کمرے کی طرف لے جا رہے تھے۔

دلاور ان کے قابو میں تو آگیا تھا لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ آخر وقت تک آزادی کی جدوجہد جاری رکھے گا۔ وہ دونوں آدی جب اسے چھینٹتے ہوئے کمرے کی طرف لے جا رہے تھے تو اس وقت بھی وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ سب انسپکٹر ظہور نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سینے پر گھونسے مارتے ہوئے اسے آگے کھینچنے لگا۔ کمرے میں لے جا کر دلاور کو ستون سے باندھ دیا گیا۔ سب انسپکٹر ظہور اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”تم دنیا کے سب سے بڑے بے وقوف آدی ہو دلاور۔ رائے منصور کے کہنے میں اگر تم نے ایک ایسی لڑکی کا ساتھ دیا جس کے چاروں طرف موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ تمہیں کیا دے سکتی تھی۔ اگر تم شبیر درانی کی پیشکش قبول کر کے اس کے پاس آجاتے تو آج اس صورت حال کا سامنا کرنے کے بجائے عیش کر رہے ہوتے۔ لیکن تمہاری وجہ سے انہیں بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے حسینہ بیگم کا خیال ہے کہ جب تک تم اور رائے منصور زندہ ہیں اس وقت تک اسے نالکہ کی جائیداد نہیں مل سکتی۔ اس لئے انہوں نے تم دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن تم اگر چاہو تو میں تمہاری جان بخشی کر سکتا ہوں۔“

”مجھے بلک میں ملی ہوئی زندگی نہیں چاہئے۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں نے نالکہ درانی کا ساتھ اس لئے دیا

کہ وہ مظلوم ہے۔ وہ حق پر ہے۔ شبیر درانی اور حسینہ بیگم جیسے شیطانوں کا ساتھ تم جیسے ایمان فروش ہی دے سکتے ہیں اور تم یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں تم سے رحم کی بجائے مانگوں گا۔ تم میری جان تو لے سکتے ہو لیکن مجھے ان شیطانوں کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہیں ان کا ساتھ دینے کے لئے نہیں کہوں گا۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”مقدمے بازی، مار دھاڑ اور قتل و غارت ان زمینداروں اور جاگیرداروں کا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ ان کے جھگڑوں میں ہمارے ہمیشہ غریب لوگ ہی جاتے ہیں۔ ہم بھی ان کا آلہ کار بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ جس شخص کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں اسے چوٹی کی طرح مسل دیتے ہیں اب تمہاری ہی مثال سامنے ہے۔ حسینہ بیگم تمہیں رکاوٹ سمجھ کر اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتی ہے لیکن میں اتنا ظالم نہیں ہوں۔ تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ تم چاہو تو اپنی جان بچا سکتے ہو۔“

”اس کے بدلے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ دلاور نے اسے گھورا۔  
 ”اس کاغذ پر تمہارے دستخط۔“ ظہور نے جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ کیا ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”تمہاری طرف سے اعتراف نامہ۔“ سب انسپکٹر ظہور نے جواب دیا۔ ”اس میں تمہاری طرف سے یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ سندھ پولیس کے انسپکٹر صوبہ خان کو تم نے قتل کر کے اس کی لاش کنویں میں پھینک دی تھی۔ اس میں قتل کی وجہ بھی ہے۔ تمہیں شبہ ہو گیا تھا کہ نائلہ درانی کو انسپکٹر صوبہ خان نے قتل کر کے لاش کہیں غائب کر دی تھی۔ تم نائلہ درانی سے محبت کرنے لگے تھے۔ اس کی موت کا بدلہ لینے کے لئے تم نے صوبہ خان کو قتل کر دیا۔“

”کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو کہ میں ایک ایسے جرم کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کیا۔“ دلاور نے اسے گھورا۔

”نہیں“ میں تمہیں بے وقوف نہیں سمجھتا۔“ ظہور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھنڈے ذہین ہو۔ اپنی ذہانت سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اس اعتراف نامے پر دستخط کر دو تو تمہیں ابھی اور اسی وقت چھوڑ دیا جائے گا تمہیں پچاس ہزار کی وہ رقم بھی دے دی جائے گی جو حسینہ بیگم مجھے دے کر گئی ہے۔ تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں ہندوستان کی سرحد بھی پار کروا سکتا ہوں۔ تم آرام سے کہیں بھی رہ سکتے ہو۔“

”میرا ضمیر ابھی زندہ ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں تو کہتا ہوں تمہاری اس پیشکش پر میں جان دے دوں گا لیکن اس کاغذ پر دستخط نہیں کروں گا۔“

”سوچ لو دلاور۔“ سب انسپکٹر ظہور نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اس کاغذ پر دستخط کر کے تم اپنی جان بچا سکتے ہو۔ تمہارے جانے کے بعد میں حسینہ بیگم کو یہ کہہ کر مطمئن کروں گا کہ تمہیں قتل کر کے لاش غائب کر دی گئی ہے۔ بصورت دیگر... تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہاری موت کتنی اذیت ناک ہوگی۔ یہ دونوں آدمی...“ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دونوں ذات کے قصائی ہیں اور بکے ہی کی طرح تمہارے جسم کے ٹکڑے کر کے کسی دیرانے میں پھینک دیں گے۔“

”مجھے مرنا قبول ہے۔“ دلاور نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔  
 سب انسپکٹر ظہور چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ایک آدمی آگے

بڑھ کر دلاور کے سامنے کھڑے ہو گیا اور دلاور پر گھونٹوں کی بارش کر دی۔ دلاور کے ہاتھ پشت پر ستون کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور دونوں پیر بھی رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ ان تادیب توڑ حملوں سے بچاؤ کے لئے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ سینے پر لگنے والا ایک گھونٹ اس قدر زوردار تھا کہ دلاور کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ گھونٹ اس کے دل پر لگا تھا۔ دلاور کو یوں لگا تھا جیسے اس کا دل پھڑپھڑا کر رہ گیا ہو۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔ اس شخص نے دلاور کے سر پر ایک اور زوردار گھونٹ مار دیا۔ دلاور کا سر اس کے سینے پر جمول گیا۔

”بے ہوش ہو گیا ہے۔“ اس شخص نے ظہور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
ظہور نے آگے بڑھ کر دلاور کو بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا اور ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا دلاور واقعی بے ہوش ہو چکا تھا۔

”اسے ہوش میں لاؤ۔“ سب انسپکٹر ظہور غرایا۔  
دوسرے آدمی نے میز پر سے پانی کا بھرا ہوا جگ اٹھالیا اور سارے پانی دلاور کے منہ پر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد دلاور ہوش میں آ گیا۔

”کیوں بلا وجہ اپنے آپ کو اذیت میں ڈالے ہوئے ہو۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”اس کاغذ پر دستخط کرو۔ ساری تکلیفیں ختم ہو جائیں گی۔“

دلاور نے جواب دینے کے بجائے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ سب انسپکٹر ظہور کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے دلاور کے پیٹ اور سینے پر پے در پے کئی گھونٹے مار دیے۔ ہر گھونٹے پر دلاور کے منہ سے چیخ نکل جاتی۔  
”یہ اس طرح نہیں مانے گا۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”اسے چمت کے ساتھ الٹا لٹکا دو دیکھتا ہوں یہ کتنا سخت جان ہے۔ میں تو پتھروں تک کو زبان کھولنے پر مجبور کر چکا ہوں۔ یہ کیا چیز ہے اس کے تو فرشتے بھی دستخط کریں گے۔“

کمرے میں ایک میز بھی پڑی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے میز ٹھیکٹ کر چمت کے شہتیر کے نیچے کر دی۔ اس پر چڑھ کر ہاتھ اوپر اٹھایا۔ لیکن چمت کا شہتیر اب بھی اونچا تھا۔ وہ باہر سے کرسی اٹھالایا۔ اس نے کرسی کو میز پر رکھا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے ستون سے وہ رسی کھول دی جس سے دلاور کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ پھر پیر بھی کھول دیئے رسیاں کھلتے ہی دلاور کٹنے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر گیا۔

ان دونوں نے دلاور کو ٹھیکٹ کر ستون سے دور ہٹایا اور اس کے دونوں پیر ملا کر باندھنے لگا اور پھر ایک لمبی سی رسی پیروں کے ساتھ باندھ دی ایک آدمی میز پر رکھی ہوئی کرسی پر چڑھ گیا اور رسی کا دوسرا شہتیر کے اوپر سے نکالنے لگا۔

چند منٹ بعد دلاور چمت کے شہتیر سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا سر زمین سے تقریباً ”دو فٹ“ اوپر تھا۔ اس کا سارا خون اس کے سر میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ چلانے لگا جھٹکنے لگنے سے وہ ہوا میں جھولنے لگا۔

”اس کاغذ پر دستخط کرنے کو تیار ہو یا نہیں؟“ سب انسپکٹر ظہور نے پوچھا۔  
”نہیں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

سب انسپکٹر ظہور نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اسے ٹھو کریں مارنے لگے دلاور کے منہ سے نکلنے والی چیخیں آسمان کی خبر لاری تھیں مگر ان بے رحم درندوں پر اس کی چیخوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دلاور رسی کے ساتھ جھولتا رہا اور وہ اسے ٹھو کریں مارتے رہے۔ بالاخر دلاور کی چیخیں معدوم ہو گئیں۔ وہ ایک

ہر چہرے ہوش ہو چکا تھا۔  
 ”یہ تو واقعی بڑا سخت جان ہے۔“ سب انسپکٹر ظہور نے کہا۔ ”لیکن میں بھی اسے چھوڑوں گا نہیں۔  
 اس وقت ڈیڑھ بج رہا ہے۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”میں شہر جا رہا ہوں صبح پانچ بجے تک  
 واپس آ جاؤں گا۔“ نذیر تم میرے ساتھ چلو۔ اور شکور تم یہیں رہو گی۔ اسے اسی طرح لٹکا رہے دو۔“  
 ”اگر یہ ختم ہو گیا تو؟“ شکور نے کہا۔

”مرنے دو۔“ ظہور نے جواب دیا۔ اس کے لمبے میں سرد مری تھی۔ ”اس طرف کسی کے آنے کا  
 اندیشہ تو نہیں۔ مگر تم زرا محتاط رہنا۔“

”فکر نہ کریں سر۔“ شکور نے جواب دیا۔ ”کوئی آیا بھی تو بچ کر نہیں جائے گا۔“  
 سب انسپکٹر ظہور، نذیر کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کار کے اشارت ہونے کی آواز سنائی  
 دی۔ شکور برآمدے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے حویلی کا بیرونی گیٹ بھی بند کرنے کی ضرورت نہیں  
 سمجھی تھی۔ اس نے جیب سے ہتھول نکال کر گود میں رکھ لیا تھا۔

تقریباً ”پون گھنٹہ گزر گیا۔“ شکور کرسی پر بیٹھے بیٹھے اوجھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک انسانی ہیولہ نہایت  
 دبے قدموں حویلی کی چھت کی میڑھیوں سے اترتا ہوا نظر آیا۔ وہ آدمی سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے چہرے پر  
 بھی سیاہ کپڑے کا ڈھانا بندھا ہوا تھا۔ میڑھیوں سے اتر کر وہ بہت ہی دبے قدموں چلا ہوا کرسی پر اوجھتے  
 ہوئے شکور کی طرف بڑھنے لگا وہ جیسے ہی قریب پہنچا اس کا پیچہ کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ وہ کوئی ڈبہ تھا جو برآمدے  
 میں بڑا ہوا تھا۔ ٹھوکر لگنے سے ڈبہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

ٹھوکر کھراہٹ کی آواز سن کر شکور کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن اس کے منہلنے سے پہلے یہ سیاہ پوش نے اس پر  
 جھٹاک لگادی۔ شکور کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ ہتھول بھی اس کی گود سے نکل کر برآمدے کے فرش پھر  
 گر گیا تھا۔

شکور کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ کرسی سے گر کر وہ قلابازی کھاتا ہوا دور جا کر اٹھا اور اٹھنے کی  
 کوشش کر رہا تھا کہ سیاہ پوش نے اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر جمادی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔  
 سیاہ پوش نے جیسے ہی اسے دوسری ٹھوکر مارنا چاہی شکور نے اس کا پیچہ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ سیاہ پوش  
 لڑکھڑا کر گر گیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے ستم گتھا ہو گئے۔ شکور اب پوری طرح حواس میں آچکا تھا اور اپنے حریف  
 پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سیاہ پوش اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ شکور تو اپنی کوشش میں کامیاب نہ  
 ہو سکا البتہ سیاہ پوش نے اسے اپنے گھٹنے میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ شکور کے گلے پر تھے اور وہ اپنے  
 انگوٹھے شکور کے نرخرے میں گاڑ رہا تھا۔ شکور کو سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سیاہ پوش نے  
 اسے تین چار زوردار جھٹکے دیئے۔ شکور کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلیں اور پھر اس کی گردن  
 اھلک گئی۔ سیاہ پوش نے ایک اور زوردار جھٹکا دی کر اسے چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فرش پر  
 سے شکور کا ہتھول اٹھایا اور تیزی سے کمر میں جھانکنے لگا۔ جب وہ تیسرے کمرے میں داخل ہوا تو دلاور کو  
 ہمت سے لٹکا ہوا دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اس نے جیب سے چاقو نکال کر کھولا۔ دلاور کو اپنے دائیں بازو  
 کی لپٹ میں لے لیا اور بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے چاقو سے رسی کاٹ دی۔

اس نے بڑی احتیاط سے دلاور کو فرش پر لٹا دیا اور اس کے پیروں کے گرد لپٹی ہوئی رسی کاٹنے لگا۔ دلاور

بے ہوش تھا۔ سیاہ پوش دوڑ کر برآمدے میں گیا۔ اس نے برآمدے میں گھڑوچی پر ایک مٹکا دیکھ لیا تھا۔ اس پر ایلو مینیم کا ایک گلاس بھی پڑا تھا۔ وہ مٹکے سے گلاس بھر کر اندر آگیا اور دلاور کے چہرے ربانی کے چھینٹے دینے لگا۔ گھوڑی ہی دیر بعد دلاور ہوش میں آگیا۔ سیاہ پوش نے اس کے حلق میں تھوڑا سا پانی ٹپکا دیا۔ دلاور آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھکے ہوئے سیاہ پوش کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں دھندلا رہی تھیں اور اسے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دلاور کی ٹاک، ہونٹوں اور ٹھوڑی پر خون جما ہوا تھا۔ سیاہ پوش چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے دلاور کو اٹھا کر کندھے پر لاوا اور کمرے سے باہر آگیا۔ ٹھکور برآمدے میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ سیاہ پوش کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ زندہ تھایا مر گیا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک ٹھوکہ مار دی اور دلاور کو کندھے سے سنبھالے حویلی سے باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کھیتوں میں چلا جا رہا تھا۔۔۔

وہ شخص دلاور کو اٹھائے تقریباً ”دو سو گز تک دوڑتا رہا۔ پھر برگد کے ایک درخت کے نیچے رک گیا۔ یہاں رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دلاور کو زمین پر لٹا دیا اور دوڑتا ہوا کھیتوں میں گھس گیا۔ اونچے پودوں میں ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو کھینچتا ہوا برگد کے نیچے لے آیا۔ موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور دلاور کے قریب آگیا۔

دلاور ہوش میں تھا۔ لیکن ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اسے صرف یہ احساس تھا کہ کوئی اسے اپنے کندھے پر لا کر لایا تھا۔

”تم ہوش میں ہو۔۔۔ کیا تم موٹر سائیکل پر بیٹھ سکتے ہو؟“ سیاہ پوش نے اسے سارا دے کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”تنت۔۔۔ تم کون ہو؟“ دلاور نے انک انک کر پوچھا۔  
 ”میں جو کوئی بھی ہوں تمہارا ہمدرد ہوں۔ اس وقت تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا ہے۔ موٹر سائیکل پر بیٹھ سکتے ہو یا نہیں۔“ سیاہ پوش نے کہا۔

”ہاں، باب۔۔۔ بیٹھ جاؤں گا۔“ دلاور نے جواب دیا۔  
 اس شخص نے دلاور کو چھوڑ دیا اور اٹھ کر موٹر سائیکل اشارت کرنے لگا۔ موٹر سائیکل دوسری لگ میں اشارت ہو گئی انجن کی آواز زیادہ نہیں تھی۔ اس نے دلاور کو اٹھا کر سیٹ کے پچھلے حصے پر بٹھایا اور خود آگے بیٹھ گیا۔

”مجھے جھبی مار لو۔ کہیں جھٹکا لگنے سے گر نہ جاؤ۔“ سیاہ پوش نے کہتے ہوئے کود ہی اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر پٹیٹ لئے۔ دلاور نے انگلیوں میں انگلیاں پھنسا لیں اور پھر دونوں طرف پائیدانوں پر نکادیئے۔ سیاہ پوش نے اپنے چہرے پر لپٹا ہوا کپڑا ہٹا دیا اور موٹر سائیکل ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

موٹر سائیکل کھیتوں کے درمیان کچے راستوں پر چلتی رہی۔ اس کی رفتار اگرچہ زیادہ تیز نہیں تھی لیکن دلاور کو زوردار جھٹکے لگ رہے تھے۔ ان جھٹکوں سے اس کے اندر کی پوری مشینری ہل کر رہ جاتی اور وہ بے اختیار کراہ اٹھتا۔

تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ آدم صحابہ کے قریب سڑک پر نکل آئے۔ سڑک پر آتے ہی سیاہ پوش نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی۔ دلاور جھکی کی طرح اس سے لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو اس

کے سینے پر پریٹ رکھے تھے۔  
 رحیم یا رخاں شہری اور عھتسی ہوئی روخیاں دکھائی دینے لگیں۔ سیاہ پوش نے موڑسائیکل میں روڑے  
 ہٹا کر ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ میں روڑ پر چورنگی کا ناکہ تھا جہاں پولیس والے بھی بیٹھے رہتے تھے  
 اور پولیس والوں سے بچنے کے لئے ہی اس نے موڑسائیکل ایک چھوٹی سڑک پر موڑی تھی۔  
 تقریباً ”پون گھنٹے تک موڑسائیکل مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی شہری حدود میں داخل ہو گئی۔ اس وقت  
 ان کی روکھنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ مزید دس پندرہ منٹ مختلف سڑکوں پر دوڑنے کے بعد موڑسائیکل متوسط  
 علاقے میں ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ سیاہ پوش نے موڑسائیکل روک کر دلاور کو سارا دے کرا تارا۔  
 اسے دروازے کے سامنے چھوٹے سے چوترے کی سیڑھی پر بٹھادیا اور دروازہ کھٹ کھٹانے لگا۔  
 دروازہ جلد ہی کھل گیا جس سے اندازہ ہوا کہ گھر کے کھین یا کم از کم دروازہ کھولنے والا جاگ رہا تھا۔  
 سیاہ پوش دلاور کو سارا دے کر اندر لے گیا۔

”یہ کون ہے؟“ ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔  
 ”ہیلے اسے اندر لے جا کر بستر لٹائے دو۔ پھر بتاؤں گا یہ کون ہے۔“ سیاہ پوش دلاور کو ایک کمرے  
 میں لے گیا اور ایک چارپائی پر لٹا کر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ موڑسائیکل کو اندر لا کر کھین میں کھڑا کر دیا اور باہر  
 کا دروازہ بند کر کے کمرے میں آگیا۔ وہ عورت اب بھی چارپائی کے قریب کھڑی دلاور کو دیکھ رہی تھی۔  
 اس عورت کی عمر پینتیس کے گٹھ بگڑ رہی ہوگی۔ اس نے کاشن کا نیلے پرنٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جسم  
 کے خطوط اور چہرے کے نقوش دلکش تھے۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے دلاور کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
 ”یہ کون ہے بچی۔ اسے کہاں سے اٹھا کر لائے ہو۔ یہ تو بہت زخمی ہے۔“ عورت نے کہا۔  
 ”یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ کہ یہ کون ہے۔ مگر میں اسے منہ سے نکال کر لایا ہوں۔ تو تھوڑا سا  
 پانی گرم کر کے لا۔ میں اس کے ناک اور منہ پر لگا ہوا خون تو صاف کروں۔ ان کم بختوں نے اسے اتنا مارا  
 ہے کہ کوئی اور ہوتا تو مر چکا ہوتا۔“

”مگر یہ ہے کون؟“ عورت نے پھر پوچھا۔  
 ”اچھی طرح ہوش میں آئے گا تو پوچھ لیں گے۔“ بچی نے جواب دیا۔  
 وہ عورت کمرے سے نکل گئی بچی جھک کر دلاور کا جائزہ لینے لگا۔ ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ ناک بھی موٹی  
 تھی اور دائیں رخسار پر بھی زخم نظر آ رہا تھا۔ وہ بلا کچھ دیر بعد ایک پتیلی میں پانی گرم کر کے لے آئی بچی کپڑا  
 بگھو کر دلاور کے زخم صاف کرنے لگا دلاور کسمسکایا اس کے منہ سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔

”حوصلہ رکھ اوئے جوان۔ تو تو بڑا بہت والا ہے۔“ بچی نے کہا۔  
 بچی نے دلاور کی قیض بھی اتار دی تھی۔ جسم پر کوئی ظاہری زخم نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جگہ جگہ نیل  
 ہارے ہوئے تھے۔ وہ گرم پانی سے دلاور کے جسم کی سینکائی کرتا رہا اور دلاور کراہتا رہا۔ پھر بچی نے اسے قیض  
 پہنادی اور آنتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”گھزاری! ایک گلاس گرم دودھ میں تھوڑی سی ہلدی ملا کر لے آؤ۔“  
 گھزاری فوراً ہی باہر چلی گئی۔ تقریباً ”پندرہ منٹ بعد وہ دودھ کا گلاس لے آئی۔ بچی نے دلاور کو سارا  
 دے کر بٹھادیا اور دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔  
 ”لو یہ گرم گرم دودھ پی لو۔ اس میں ہلدی ملی ہوئی ہے۔ اس سے تمہاری اندر کی چونٹیں ٹھیک ہو جائیں

دلاور نے بڑی مشکل سے وہ دودھ پیا تھا۔ اس سے بیضا نہیں جا رہا تھا۔ وہ لیٹ گیا۔ دلاور کے حوالے سے اب بحال ہو رہے تھے۔ وہ بکی اور گلزاری کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دونوں چہرے اس کے لئے اجنبی تھے۔  
”تو کون ہے جو ان؟“ دلاور بکی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ان بھڑیوں کے منہ سے کیسے نکال لائے ہو تم؟“

”وہ واقعی بھڑیئے تھے۔“ بکی نے جواب دیا۔ ”انسان اتنا خونخوار نہیں ہو سکتا۔“  
”جب ہوس سوار ہوتی ہے تو انسان خونخوار درندوں سے بھی زیادہ خوفناک ہو جاتا ہے۔ مگر تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ دلاور نے کہا۔

”میں اس حویلی میں گیا تو تھا کسی کی جان لینے کے لئے لیکن میں تمہاری جان بچا کر لے آیا۔“  
”پھر تو ہے کون؟“ دلاور نے اپنا سوال دہرایا۔  
”میں بکی ہوں۔“ سیاہ پوش نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”جھگ کارہنے والا ہوں۔ موجودہ میرا بھائی تھا۔ جانتے ہو نا اسے؟“

”موجودہ؟“ دلاور کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ”شیردرانی کا بندہ؟“  
”ہاں۔“ بکی نے کہا۔ ”چند روز پہلے مجھے پتہ چلا کہ یہاں میرے بھائی موجودہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میں تین چار روز پہلے یہاں آیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ موجودہ کے قتل میں شیردرانی کا ہاتھ ہے۔ شیردرانی اور اس کی ماں حسینہ بیگم دونوں بے حد زہریلے انسان ہیں۔ مجھے پتہ چلا کہ شیردرانی سندھ گیا ہوا ہے۔ پھر آج شام کو مجھے پتہ چلا کہ حسینہ بیگم اس حویلی میں جانے والی ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شیردرانی اس حویلی میں آیا ہو گا یا آنے والا ہو گا۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ بعض معاملات میں پولیس شیردرانی کو تلاش کر رہی ہے۔ اس لئے میرا یہ شبہ زیادہ قوی ہو گیا کہ شیردرانی شہر نہیں آئے گا۔ میں موٹر سائیکل پر حویلی کی طرف چلا گیا اور حسینہ بیگم سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ حویلی میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کھیت میں چھپا دی اور حویلی کی چھت پر چھپ کر بیٹھ گیا۔ حسینہ بیگم تو اپنی ایک گن من کے ساتھ حویلی پہنچ گئی مگر شیردرانی نہیں آیا۔ پھر بارہ بجے کے قریب وہ موٹر آئی تو میں سمجھا کہ شیردرانی آیا ہے مگر وہ لوگ کوئی اور تھے جو تمہیں لے کر آئے تھے۔ میں چھت پر چھپا بیٹھا رہا پھر تمہاری چیخوں کی آواز سنانی دینے لگی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ تمہاری مدد کروں لیکن میں جانتا تھا کہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں وقت کا انتظار کرنے لگا۔

حسینہ بیگم اور اس کا گن من تو پہلے ہی جا چکے تھے اور بالا خرد آدمی اور بھی چلے گئے۔ اب وہاں صرف ایک آدمی رہ گیا تھا۔ میں کچھ دیر چھت پر انتظار کرتا رہا اور بالا خرب میں چھت سے اترا تو وہ آدمی برآمدے میں کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اسے چھاپ لیا اور جب کمرے میں داخل ہوا تو تم چھت سے اٹکا لٹکے ہوئے تھے۔ میں تمہیں کھول کر اپنے ساتھ لے آیا لیکن... میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ لوگ کون تھے؟ میں صرف اتنا سمجھ سکا ہوں کہ وہ لوگ حسینہ بیگم کے کہنے پر تم سے کسی کانڈ پر دستخط کروانا چاہتے تھے۔ کون تھے وہ لوگ اور تم سے اس کانڈ پر دستخط کیوں کروانا چاہتے تھے؟“ بکی خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”جو آدمی مجھ سے کانڈ پر دستخط کروانا چاہتا تھا وہ پولیس کا سب انسپکٹر ہے۔ حسینہ بیگم کے ہاتھوں بکا ہوا

ہے۔ وہ مجھ سے ایک ایسے جرم کے اقبال نامے پر دستخط کروانا چاہتا تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔“  
دلاور نے بتایا۔

”جب تم نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تو وہ تم سے ایسے بیان پر دستخط کیوں کروانا چاہتا تھا؟“ بکی نے سوالیہ  
نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارا شاہد کبھی پولیس سے واسطہ نہیں پڑا۔“ دلاور نے کہا۔ ”یہاں تو بے گناہ دھر لئے جاتے ہیں  
اور جرم کرنے والے آزادی سے دندناتے پھرتے ہیں۔“ حسینہ بیگم کا بیٹا شبیر درانی بہت سے جرائم میں ملوث  
ہے۔ اس کے گاؤں کے قریب ایک پولیس انسپکٹر کو قتل کر دیا گیا تھا۔ پہلے حسینہ بیگم نے مجھے اس کیس میں  
پھنسانے کی کوشش کی لیکن میں ان دنوں اس شہر ہی میں نہیں تھا۔ سندھ گیا ہوا تھا۔ پولیس کو شبیر درانی پر  
شبہ ہے اس کے خلاف اس روز گاؤں میں موجودگی کی شہادتیں بھی ملی ہیں۔ وہ ان دنوں سندھ گیا ہوا ہے۔  
اور حسینہ بیگم اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے مختلف چالیں چل رہی ہے۔ آج یہ لوگ مجھے دھوکے سے پکڑ  
لائے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا پہلے سے یہ پروگرام رہا ہو گا کہ آج مجھے پکڑ کر اس حویلی میں لے آیا جائے۔  
اسی لئے حسینہ بیگم بھی حویلی میں آگئی تھی۔ میں تمہارا بڑا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری زندگی بچالی۔ میں  
تمہارا یہ احسان زندگی کے آخری لمحوں تک نہیں بھولوں گا۔ دلاور احسان فراموش نہیں ہے۔ مجھے ٹھیک  
ہو لینے دو۔ پھر کبھی آزمائینا دلاور کو۔“

”میں شبیر درانی کی ماموں زاد بہن نائلہ درانی کا پاؤں گاڑ رہی ہوں۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”اس کے  
ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ اکیلی ہے اور کروڑوں کی جائیداد کی مالک ہے یہ ماں بیٹا اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا  
چاہتے ہیں۔ اس مردانے کے لئے کئی قاتلانہ حملے کئے گئے انسپکٹر صوبہ خان کو پانچ لاکھ روپے دیئے گئے کہ وہ  
اسے سندھ لے جا کر ختم کر دے لیکن وہ اس کی قید سے بھاگ نکلی۔ آخری مرتبہ اسے قمر کے ایک سرحدی  
گاؤں میں دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر چکی ہے  
لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے ایک نہ ایک دن اس کا پتہ ضرور چل جائے گا۔“

”تم میرے بھائی کو جانتے ہو“ موجودہ ار کو۔“ بکی نے کہا۔ ”وہ شبیر درانی کے پاس تھا۔ کئی برسوں سے...  
لوگ کہتے ہیں کہ اسے شبیر درانی نے مروایا ہے۔ تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”موجودہ ار...“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”معاف کرنا میرے دوست تمہارا بھائی بھی  
شبیر درانی کے جرائم میں برابر کا شریک تھا۔ لوگ سے شبیر درانی کا دایاں ہاتھ سمجھتے تھے۔ وہ شبیر درانی کے ہر  
راز سے واقف تھا۔ اور پھر ایک روز پتہ چلا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ اسے شبیر درانی  
نے قتل کیا تھا۔ پولیس بھی اس سلسلے میں شبیر درانی سے پوچھ پچھ کر چکی ہے لیکن پولیس کے بیشتر آفیسر حسینہ  
بیگم کے نمک خوار ہیں اس لئے ابھی تک شبیر درانی آزاد ہے لیکن اب ایک سو دیانت دار پولیس آفیسر یہاں  
آگئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اب حسینہ بیگم کا اثر و رسوخ اور دولت بھی شبیر درانی کو نہیں بچا سکے گی۔ اس  
نے بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں اور بے گناہوں کا خون رایگاں نہیں جائے گا۔ میں بھی شبیر  
درانی کا انتظار کر رہا ہوں کہ وہ واپس آئے تو اس سے دودھ ہاتھ کر لوں۔“

”رائے منصور کون ہے؟“ بکی نے پوچھا۔

”وہ احمد پور لاما کا زمیندار ہے۔“ دلاور نے بتایا۔ ”بہت شریف اور نیک آدمی ہے میں اسی کے پاس  
رہتا ہوں۔ رات کو میں اس کی حویلی سے نکل کر شہر جا رہا تھا کہ سب انسپکٹر ظہور اور اس کے آدمیوں نے



مجھے گھیر لیا۔ رائے منصور انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ ان کی وجہ سے نالہ درانی اب تک ان شیطانوں سے بچی رہی ہے۔ لیکن تم رائے منصور کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”مجھے کسی نے بتایا تھا کہ میں رائے منصور سے ملوں۔ وہ شبیر درانی کے سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔“ بکی نے کہا۔ ”میں نے رائے منصور سے ملنے کی کوشش کی لیکن سنا ہے کہ وہ بیمار ہیں۔ اس لئے میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔“

”میں رائے صاحب سے تمہاری ملاقات کروادوں گا۔ لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ شبیر درانی کے سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکیں گے۔“ دلاور نے کہا۔ ”شبیر درانی نے بارے میں تم جو کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو وہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔“

”تم ابھی ٹھیک نہیں ہو۔“ بکی نے کہا۔ ”دو چار روز یہاں رہو۔ آرام کرو۔ پھر دیکھ لیں گے اس دوران شاید شبیر درانی بھی واپس آجائے۔ اب وہ ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے نہٹ لیں گے اس سے۔ اگر کو تو میں رائے منصور کے گھر تمہاری خیمت کا پیغام دے آؤں۔“

”نہیں، ابھی نہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”مجھے حویلی سے غائب پا کر سب انپکڑ بری طرح بدحواس ہو گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ احمد پور لاما والی حویلی کے علاوہ اس شہر میں رائے صاحب کے بنگلے کی بھی عمرانی کروا رہا ہو۔ اس سلسلے میں ایک آدھ دن خاموشی ہی اختیار کی جائے تو بہتر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ بکی نے کہا۔ ”تم ایک دو دن یہاں آرام کرو۔ میں اس دوران تمہارے اس سب انپکڑ کے بارے میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ دلاور نے کہا۔

اسی دوران گلزاری ناشتہ بنا کر لے آئی۔ گھی میں ترتراتے ہوئے پراٹھے، دہی اور آم کا اجار۔ بکی نے دلاور کو سہارہ دے کر بٹھادیا اور وہ دونوں ناشتہ کرنے لگے۔ گلزاری قریب کھڑی گھری نظروں سے دلاور کی

طرف دیکھ رہی تھی۔ ..... ❁ ❁ ❁ .....

دیکھتے ہی دیکھتے ٹریفک جام ہو گیا اور لوگوں کا جھوم لگ گیا۔ شبیر درانی کی گاڑی کا اگلا حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ شبیر درانی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ اسپیئرنگ والی سیٹ میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے گاڑی میں سے نکالا اور ایک اور کار میں ڈال کر زید سلطان ہسپتال لے گئے۔ ٹرک ڈرائیور موقع سے فرار ہونے کی کوشش میں لوگوں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور لوگ اس کی دھمائی کر رہے تھے حالانکہ اس حادثے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

شبیر درانی کو شعبہ حادثات میں پہنچادیا گیا۔ ڈاکٹروں کو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ حادثے میں زخمی ہونے والا شبیر درانی ہے۔ کئی ڈاکٹر شعبہ حادثات میں جمع ہو گئے۔ یہ شبیر درانی کی خوش قسمتی تھی کہ سر کے علاوہ اسے کہیں زخم نہیں آیا تھا۔ سر کا زخم بھی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ڈاکٹروں نے مکمل چیک اپ کے بعد اس کے سر کے زخم کی ڈریسنگ کر دی لیکن وہ ہوش میں تقریباً ”ایک گھنٹے بعد ہی آسکا تھا۔“

حادثے کی خبر کسی طرح حیدر بیگم تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ شبیر درانی کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی ہسپتال پہنچ چکی تھی۔ اس کے کہنے پر شبیر درانی کو شعبہ حادثات سے ایک پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

شیردرانی کو جب ہوش آیا تو کمرے میں ایک ڈاکٹر کے علاوہ اس کی ماں حینہ بیگم اور ایک پولیس آفیسر بھی موجود تھا جو اس حادثے کے سلسلے میں اس کا بیان لیتا چاہتا تھا شیردرانی کو ہوش میں آتے دیکھ کر پولیس آفیسر جیسے ہی آگے بڑھا ڈاکٹر نے اسے روک دیا۔

”ابھی نہیں آفیسر۔ جب تک مریض مکمل طور پر اپنے حواس میں نہیں آجاتا میں اس وقت تک آپ کو اس سے بات چیت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ باہر جا کر تشریف رکھئے۔ میں آپ کو بلا لوں گا۔“

پولیس آفیسر اسے گھورتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

”بیگم صاحبہ، آپ بھی زیادہ بات چیت مت کیجئے اس اسٹیج پر زیادہ بولنا مریض کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے حینہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”فکر مت کرو ڈاکٹر میں احتیاط کروں گی۔“ حینہ بیگم نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کمرے سے نکل گیا۔ حینہ بیگم بیڈ کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی اور بیٹے کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟ یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟“ حینہ بیگم نے پوچھا۔

”پتہ نہیں ماں جی۔“ شیردرانی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”چوک پر وہ ٹرک بس اچانک ہی سامنے آگیا تھا۔ میں نے بھانے کی کوشش کی مگر بے قابو ہو کر ٹرک سے ٹکرائی۔“

”شکر کو بچ گئے ہو۔“ حینہ بیگم نے کہا۔ ”میں یہاں سے جاتے ہی صدقے کا بکرا دوں گی۔ اب تمہیں لی روز تک ہسپتال میں رہنا ہو گا۔“

”پتہ نہیں کس منحوس کی صورت دیکھ لی تھی۔“ شیردرانی نے کراہتے ہوئے کہا اور پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”کیا ہوا تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟“ حینہ بیگم نے پوچھا۔

شیردرانی جواب دینے کے بجائے سر کو دائیں بائیں ہٹاتے لگا اور پھر اچانک ہی وہ چیخنے لگا۔ حینہ بیگم ایک دم پریشان ہو گئی۔ اس نے شیردرانی کو سنبھالنے کی کوشش کی شیردرانی سر ہٹاتے ہوئے بری طرح چیخ رہا تھا۔ حینہ بیگم اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور رابڈاری میں کرسی پر اُلٹے ہوئے کانٹیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر کو بلاؤ جلدی کرو۔“

کانٹیل اٹھ کر ایک طرف دوڑ گیا حینہ بیگم دوبارہ بیڈ کے قریب آگئی اور شیردرانی کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ سر کو مسلسل جھٹکتے لگتے سے زخم سے خون بننے لگا تھا۔ جس سے نہ صرف سر پر بندھی ہوئی تریز ہو گئی تھی بلکہ سر کے نیچے تک بھی سرخ ہونے لگا تھا۔ حینہ بیگم بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔

وہ ہائپرڈارنہ ذہنیت کی مالک تھی۔ بے حد ظالم اور سفاک عورت۔ اس کے احکامات پر اس کے کارندوں نے لای کمر اجاڑے تھے۔ پتہ نہیں کتنوں کا خون بہایا تھا۔ لیکن حینہ بیگم کا دل کبھی نہیں لپیٹا تھا اس کے دل میں کسی کے لئے کبھی ہمدردی کے جذبات نہیں ابھرے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی اس نے اپنی سگی بیٹی کو

مہالے کی کوشش کی تھی اس پر کئی قاتلانہ حملے کروائے تھے۔ خود سامنے کھڑے ہو کر اسے تشدد کا نشانہ بنایا تھا انکسڑ صوبہ خان کو باغ لاکھ روپے دے کر اسے قتل کروانا چاہا تھا مگر حینہ بیگم کے دل میں کبھی ہمدردی کا جذبہ نہیں ابھرا تھا لیکن آج اپنے بیٹے کے سر سے خون بہتے دیکھ کر وہ بے چین ہو گئی تھی۔

بھائی دیر بعد دو ڈاکٹر اور نرسیں دوڑتی ہوئی کمرے میں پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر نے شیردرانی کی حالت دیکھی

تو فوراً ہی اسٹریچر منگو لیا اور شیردرانی کو اسٹریچر پر ڈال کر آپریشن ٹیبلر میں پہنچا دیا گیا۔ سب سے پہلے شیردرانی کو ڈائز ایام کا انجکشن دیا گیا۔ پانچ سات منٹ بعد انجکشن نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ شیردرانی کی حالت قدرے تسکین ملی تو سب سے پہلے اس کے سر کے ایکسرے لئے گئے۔ ڈاکٹر کو شبہ تھا کہ سر کی کوئی بڑی کریک نہ ہو گئی ہو لیکن اس کا شبہ غلط نکلا۔ کھوپڑی کی تمام ہڈیاں سلامت تھیں۔ زخم کی دوبارہ ڈریسنگ کی گئی۔ اسے ایک اور انجکشن دیا گیا اور تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے بعد اسے اسے اسٹریچر پر ڈال کر آپریشن ٹیبلر سے باہر لایا گیا تو دروازے کے سامنے بچہ پر بیٹھی ہوئی حسینہ بیگم اٹھ کر اسٹریچر کی طرف لپکی۔

”کیا ہوا ڈاکٹر میرا بچہ ٹھیک تو ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بیگم صاحبہ۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”دماغ پر چوٹ تو لگی ہے لیکن تشویش ناک نہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

حسینہ بیگم اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ڈاکٹر سے پوچھتی رہی اور ڈاکٹر اسے تسلی دیتا رہا۔ شیردرانی کو کمرے میں لا کر بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ انجکشن کے اثر سے شیردرانی پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ اس نے آخری بار حسینہ بیگم کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

”انہیں آرام کرنے دو۔ ہوش میں آنے کے بعد ان سے کوئی بات نہ کی جائے۔“ ڈاکٹر نے حسینہ بیگم سے کہا پھر قریب کھڑی ہوئی نرس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نرس“ تم اسی کمرے میں رہو گی کوئی بھی شخص کمرے میں داخل نہیں ہو گا۔“

”ییس ڈاکٹر۔“ نرس نے اثبات میں سر ہلادیا۔  
 ڈاکٹر چلا گیا۔ حسینہ بیگم کچھ دیر تک بیٹے کی طرف دیکھتی رہی پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

تقریباً ”ایک گھنٹے بعد دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور وہی پولیس انسپٹر اندر داخل ہوا جو انسپٹر صوبہ خان کے قتل کی تحقیقات کر رہا تھا۔  
 ”سوری بیگم صاحبہ۔“ انسپٹر نے پہلے حسینہ بیگم کی طرف دیکھا پھر شیردرانی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”میرا اس حادثے کے کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی تحقیقات مقامی تھانے کا ایک آفیسر کر رہا ہے۔ میں تو انسپٹر صوبہ خان کے قتل کے کیس میں آپ کے بیٹے سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

”شیردرانی تمہارے سامنے پڑا ہے اگر وہ اس وقت تمہارے سوالوں کا جواب دے سکے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ حسینہ بیگم نے بے حد خشک لہجے میں جواب دیا۔

”یہ کب تک ہوش میں آجائیں گے نرس؟“ انسپٹر نے نرس سے پوچھا۔  
 ”تین چار گھنٹوں بعد۔“ نرس نے جواب دیا۔ ”لیکن ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر آپ مریض سے بات نہیں کر سکیں گے پلیز! اس وقت آپ تشریف لے جائیں مریض ڈسٹرب ہو گیا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔“ انسپٹر نے کہتے ہوئے حسینہ بیگم کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تقریباً ”ایک گھنٹے بعد حسینہ بیگم بھی کمرے سے نکلی تو راہداری میں شیردرانی کا خاص ملازم ہبلول اور ان کے تین چار کارندے کھڑے تھے۔

”کیا ہوا بیگم صاحبہ؟“ ہبلول نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے پتہ چلا

ہے۔ یہ لوگ بھی اتفاق سے گل مرگ سے آئے ہوئے تھے یہ بھی میرے ساتھ آگئے ہیں اب چھوٹے سرکار کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بے ہوش پڑا ہے۔ دماغ پر چوٹ لگی ہے۔“ حسینہ بیگم نے جواب دیا۔ اسی کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔

”اللہ اپنا کرم کرے گا بیگم صاحبہ۔ آپ تسلی رکھیں۔“ بھلول نے کہا۔

حسینہ بیگم کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں بیٹے کی حالت نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

شبیر درانی تقریباً ”پانچ گھنٹوں بعد ہوش میں آسکا تھا۔“ نرس نے اسی وقت ڈاکٹر کو اطلاع دے دی۔ ڈاکٹر نے آکر شبیر درانی کو دیکھا۔ اس نے حسینہ بیگم کو تسلی دی اور سختی سے منع کر دیا کہ کسی کو مریض سے نہ ملنے دیا جائے اور اس سے زیادہ بات چیت بھی نہ کی جائے۔

تین روز تک کسی کو شبیر درانی سے نہیں ملنے دیا گیا۔ پولیس آفیسرز بار بار چکر لگا رہے تھے لیکن ڈاکٹر نے کسی کو بھی شبیر درانی سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بالآخر چوتھے روز مقامی تھانے کے سب انسپکٹر کو شبیر درانی سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ سب انسپکٹر نے حادثے کے حوالے سے اس کا بیان قلمبند کیا اور چلا گیا۔

اسی روز شام سے کچھ پہلے وہ پولیس انسپکٹر بھی پہنچ گیا جو انسپکٹر صوبہ خان کے قتل کی تحقیقات کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا۔

”درانی صاحب!“ انسپکٹر شبیر درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جس روز سندھ پولیس کے انسپکٹر صوبہ خان کی لاش ملی تھی۔ اس سے ایک روز پہلے آپ کہاں تھے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ انسپکٹر صوبہ خان کی لاش کب ملی تھی۔ اس لئے میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ میں اس روز کہاں تھا۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”یہ چار اپریل کی بات ہے میرا مطلب ہے صوبہ خان کی لاش چار اپریل کو ملی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی موت کا وقت آٹھ سے سولہ گھنٹے کے درمیان طے کیا تھا۔ اب آپ یہ بتائیے کہ تین اپریل کو آپ کہاں تھے؟“ انسپکٹر نے وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں سندھ گیا ہوا تھا اور اس روز غالباً ”کاچیلو نامی گاؤں میں تھا۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”اگر تم چاہو تو اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔“

”کاچیلو آپ کیا لینے گئے تھے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میری کرن نانہل درانی لا پتہ تھی۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ کاچیلو نامی گاؤں میں موجود ہے۔ میں اسی سلسلے میں گیا تھا۔“

”نامہ درانی کا کچھ پتہ چلا؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”وہ مرچکی ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”کاچیلو پولیس نے اس کی موت کی تصدیق کر دی ہے۔ میرے پاس کاچیلو تھانے کے انچارج کی تحریر موجود ہے۔“

”کیا آپ کو صوبہ خان کے قتل کی اطلاع ملی تھی؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”ہاں میں اس وقت پڑواٹل چھاؤنی میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ کئی اعلیٰ فوجی آفیسر بھی وہاں میری موجودگی کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ فوجی افسروں کا نام اس نے انسپکٹر کو مرعوب

کرنے کے لئے استعمال کیا تھا لیکن انسپکٹر متاثر نہیں ہوا۔  
 ”یہ اطلاع آپ کو کیسے ملی تھی؟“ انسپکٹر نے سپاٹ لمبے میں پوچھا۔  
 ”اخبار میں پڑھا تھا۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”اس کے باوجود آپ یہاں نہیں آئے۔“ انسپکٹر نے اسے گھورا۔

”صوبہ خان کوئی اتنا اہم آدمی نہیں تھا کہ اس کے قتل کی خبر سن کر میں اپنے سارے کام چھوڑ کر بھاگا چلا آتا۔“ شبیر درانی نے خشک لمبے میں جواب دیا۔

”میرا خیال ہے تمام اخباروں میں یہ خبر چھپی بھی تھیں کہ پولیس اس قتل کے سلسلے میں حینہ بیگم سے پوچھ کچھ کر رہی ہے۔ اپنی والدہ کا نام پڑھنے کے بعد بھی آپ واپس نہیں آئے۔“ پولیس انسپکٹر نے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”انسپکٹر! حینہ بیگم بول پڑی۔“ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہاری الٹی سیدھی باتوں سے اس کی حالت بگڑ جائے گی۔“  
 ”ان کی حالت اب تشویش ناک نہیں ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”میرے سوالات سے ان کی طبیعت بگڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔“

”اب میں تمہیں مزید اوٹ پٹانگ سوالات کی اجازت نہیں دے سکتی۔ جب یہ ٹھیک ہو کر گھر چلا جائے گا تو وہاں آکر پوچھ لینا ہو پوچھنا ہے۔“

”آپ سرکاری کام میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں بیگم صاحبہ۔“ اس مرتبہ انسپکٹر نے خشک لمبے میں کہا۔  
 ”آپ اس گری پر تشریف رکھئے۔ اتفاق سے آپ یہاں موجود ہیں مجھے آپ سے بھی کچھ پوچھنا ہے۔“  
 ”اب تم مجھ سے یا میرے بیٹے سے کچھ نہیں پوچھ سکتے۔ میں اپنے وکیل سے بات کروں گی اس کے بعد تم سے بات ہوگی۔“ حینہ بیگم نے کہا۔

”کسی وکیل سے مشورہ کرنا آپ کا پورا حق ہے۔ لیکن پولیس کی تفتیش میں وکیل آپ کو زبان بند رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ پلیز! مجھے ان سے بات کرنے دیجئے۔“ انسپکٹر نے کہا پھر شبیر درانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”ہاں تو درانی صاحبہ جس کنویں سے انسپکٹر صوبہ خان کی لاش ملی تھی اس کے ساتھ ہی ایک کو ٹھری بھی ہے جس میں غالباً جانوروں کا بھوسہ وغیرہ اور پھاؤڑے وغیرہ رکھے رہتے ہیں۔ آپ آخری مرتبہ اس کو ٹھری میں کب گئے تھے۔“

”وہ کنواں اور کو ٹھری ہماری زمین پر نہیں ہے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”وہ نالکہ درانی کی اراضی ہے۔ میں کبھی اس طرف نہیں گیا۔“

”انسپکٹر صوبہ خان سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”مجھے یاد نہیں۔ ویسے میں نے اسے کافی عرصہ سے نہیں دیکھا۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”کیا آپ نے صوبہ خان کو کوئی پستول بھی دیا تھا؟“ انسپکٹر نے ایک اور سوال کیا۔

”اس سے میری ملاقات ہی نہیں ہوئی تو پستول دینے کا کیا سوال۔“ شبیر درانی بولا۔

”معاف کیجئے درانی صاحب۔“ انسپکٹر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے میرے کسی سوال کا ٹھیک جواب نہیں دیا۔ آپ جھوٹ کا سارا لے کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آپ تین اپریل کے دن کاجیلو میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ پانچ اپریل

کو کاپیلو پہنچے تھے۔ تین اپریل کو آپ گل مرگ میں تھے۔ اسی رات انسپکٹر صوبہ خان گل مرگ آیا۔ آپ اسے لے کر اس کنویں والی کو غری میں چلے گئے۔ جہاں آپ نے اسے قتل کر کے لاش کو کنویں میں پھینک دی اور۔۔۔“

”یہ سب جھوٹ ہے۔“ شبیر درانی چیخا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں وہ سب درست ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”صوبہ خان کی جیب سے برآمد ہونے والے پستول، کو غری کے تالے، کسی اور دوسری بہت سی چیزوں پر آپ کی انگلیوں کے نشانات کی شناخت ہو گئی ہے۔ ہم نے کاپیلو پولیس سے بھی یہ تصدیق کر لی ہے کہ آپ تین گونہ پانچ اپریل کو وہاں پہنچے تھے۔ ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صوبہ خان کے قتل میں آپ کا ہاتھ ہے۔ اب آپ اپنے آپ کو زیر حراست سمجھیں! یہاں آپ کا علاج مکمل ہونے کے بعد آپ کو جیل منتقل کر دیا جائے گا اور بیگم صاحبہ آپ۔۔۔ انسپکٹر حسینہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”میں صرف آپ کو اتنی رعایت دے سکتا ہوں کہ آپ اپنے بیٹے سے اس بیماری کے دوران جب چاہیں ملاقات کر سکتی ہیں۔ آپ کے علاوہ کسی اور کو درانی صاحب سے ملاقات کی اجازت نہیں ہوگی۔“

”میرے بیٹے پر لگائے جانے والے تمام الزامات جھوٹے ہیں۔ میں دیکھ لوں گی تمہیں۔“ حسینہ بیگم چیخی۔

”اگر الزامات جھوٹے ہیں تو آپ عدالت میں ثابت کیجئے۔ میں نے انہیں صرف گرفتار کیا ہے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ چالان عدالت میں پیش ہو تو انہیں اپنے دفاع کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔“ انسپکٹر نے کہا اور ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔

راہداری میں دو مسلح کانسٹیبل موجود تھے۔ انسپکٹر نے انہیں ہدایات دیں اور چلا گیا۔ کمرے میں حسینہ بیگم اور شبیر درانی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔

”دیکھ لیا!“ بالاخر حسینہ بیگم کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ ”میں نے ہمیشہ تمہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر تم نہیں مانے اور آج اس کا نتیجہ دیکھ لیا تم نے؟“

”کچھ نہیں ہو گا ماں جی۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”آپ وکیل سے جا کر بات کیجئے۔ وہ سارا معاملہ سنبھال لے گا پیسہ کیا نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں ہر شخص کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے اس انسپکٹر کی بھی کوئی قیمت ہوگی جو اسے ادا کر دی جائے گی اور معاملہ ختم ہو جائے گا اور ہاں میرے بیڑ روم کی الماری کے سیف والے دراز میں ایک کانڈ تمہ کیا ہوا رکھا ہے وہ کانڈ دراصل کاپیلو تھانے کے انچارج کی طرف سے اس امر کی تصدیق ہے کہ نائلہ درانی کا انتقال ہو چکا ہے اور آپ جانتی ہیں کہ نائلہ کے انتقال کے بعد ہم ہی اس کی جائیداد کے وارث بنتے ہیں۔ الماری کی چابی آپ کو پتہ ہے کہاں رکھی ہوئی ہے وہ کانڈ بھی وکیل کو دے دیجئے تاکہ وہ اس سلسلے میں فوری کارروائی شروع کر سکے۔“

حسینہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹے کی طرف دیکھتی رہی پھر اپنا شولڈر بیگ سنبھالتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

شبیر درانی بیڈ پر لیٹا اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انسپکٹر کے کہنے کے مطابق صوبہ خان کی جیب سے برآمد ہونے پستول، کو غری کے تالے اور کسی وغیرہ پر اس کی انگلیوں کے نشانات کی شناخت

ہو گئی تھی۔ اس طرح اگرچہ صورت حال نہایت سنگین ہو گئی تھی مگر اسے اب بھی یقین تھا کہ دولت کے بل بوتے پر سارے کام ہو سکتے ہیں۔ اس انسپکٹر کو بھی خرید جاسکتا ہے۔ پیسے کی اب اسے پرواہ نہیں تھی۔ نالہ کی کمرڈوں کی جائیداد اسے ملنے والی تھی۔ اس میں سے اگر دس بیس لاکھ اس پولیس انسپکٹر کو بھی دے دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے پاس پولیس کے ایک ذمے دار آفیسر کی تحریر تھی جس سے اس امر کی تصدیق کی گئی تھی کہ نالہ درانی مرچکی ہے۔ اور ظاہر ہے نالہ کی موت کے بعد وہی اس کے وارث تھے اور کوئی ان کی وراثت کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

ہسپتال میں چار دن اور گزر گئے۔ اس دوران حسینہ بیگم کے علاوہ کسی اور کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ دروازے پر ہر وقت دو مسلح پولیس والے موجود رہتے تھے۔ ایک پولیس والا کمرے کے عقبی سمت بھی رائل لے ٹھہرتا تھا تاکہ وہ عقبی کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔

شبیر درانی اب اگرچہ ٹھیک ہو چکا تھا بہت معمولی سی تکلیف باقی تھی لیکن حسینہ بیگم نے ڈاکٹر کی مٹھی گرم کر دی تھی تاکہ شبیر درانی کو چند روز اور ہسپتال ہی میں رکھا جاسکے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر شبیر درانی کو ہسپتال سے جیل منتقل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس رات تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ شبیر درانی اپنے بیڈ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے لکڑی کے بیچ پر بیٹھے ہوئے دو کانسٹیبلوں میں سے ایک اونگھ رہا تھا اور دوسرا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ بہت ہی گھٹیا قسم کا سگریٹ تھا۔ اس کی ناگواری بو پوری راہداری میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کانسٹیبل بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ تین پولیس والوں کو اس طرف آتے دیکھ کر چونک گیا۔ ان کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ کانسٹیبل نے جلدی سے سگریٹ بچھا دیا اور اپنے اونگھتے ہوئے ساتھی کانسٹیبل کو کہنی مار کر بگا دیا۔

وہ چاروں قریب آ گئے۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا۔ ایک سب انسپکٹر اور تیسرا کانسٹیبل تھا جس نے ہتھکڑی پکڑ رکھی تھی۔ شبیر درانی کے دروازے پر متعین دونوں کانسٹیبلوں نے اٹھ کر سلیوٹ کیا۔

”تمہارا انسپکٹر ابھی تک نہیں پہنچا؟“ انسپکٹر کی وردی والے نے پوچھا۔

”نوسر“ انہیں آنا تھا کیا؟“ کانسٹیبل نے پوچھا۔

”ہاں اگر نہیں پہنچا تو کوئی بات نہیں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”دروازہ کھولو۔ قیدی کو جیل منتقل کرنا ہے فوری طور پر اطلاع ملی تھی کہ اسے آج رات قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس لئے اسے جیل منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“

”لیکن سرب۔“ کانسٹیبل نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وقت ضائع مت کرو دروازہ کھولو۔“ انسپکٹر نے کہا۔

کانسٹیبل نے دروازہ کھول دیا وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ آوازوں سے شبیر درانی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اتنے سارے پولیس والوں کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر شبیر درانی کا معائنہ کیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ اب بالکل ٹھیک ہے۔ آپ اسے لے جاسکتے ہیں۔“

”تھینک یو ڈائرن۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”کک... کیا بات ہے۔ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ شبیر درانی نے کہا۔ وہ کچھ بدحواس سا ہو رہا تھا۔

”تمہیں جیل منتقل کیا جا رہا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”ہتھکڑی لگا دوں جناب؟“ کانسٹیبل نے ہتھکڑی کی زنجیر سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک معزز آدمی ہے۔ ہتھکڑی سے اس کی توہین

ا۔“ وہ شبیر درانی کی طرف گھوم گیا۔ ”چلے درانی صاحب۔“

شبیر درانی بیڈ سے اتر آیا۔ اس نے سیلپر پہنے اور ان کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ وہ ہسپتال کی

ت سے نکل کر گیٹ پر پہنچ گئے۔ گیٹ کے سامنے سفید رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ پولیس پارٹی کے

فہ آئے والا کانسٹیبل اسٹیزنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہتھکڑی اس نے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دی

۔ ”تم دونوں کسی رکشے یا ٹانگے پر بیٹھ کر تھانے پہنچو اور انسپکٹر سے کہو کہ قیدی کو جیل منتقل کر دیا گیا ہے۔

وہ ضروری سمجھے تو کافذات کی خانہ پری کے لئے جیل آجائے ورنہ صبح دیکھا جائے گا۔“ انسپکٹر نے ڈیوٹی

فہ والے دونوں کانسٹیبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس سر۔“ دونوں کانسٹیبلوں نے سیلوٹ کیا۔ ان میں سے ایک کی آنکھوں میں اب بھی الجھن تیر رہی

ا۔ اس نے کار کا نمبر زہن نشین کر لیا۔

انسپکٹر اور سب انسپکٹر شبیر درانی کو لے کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں نے شبیر درانی کو اپنے

س بٹھایا تھا۔ کار حرکت میں آگئی۔

”یہ تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ کچھ دیر بعد شبیر درانی نے پوچھا۔ کیونکہ کار جس راستے پر

ی تھی وہ راستہ جیل کی طرف نہیں جاتا تھا۔

”ایسی جگہ جہاں پولیس تمہارا سراغ نہ لگا سکے۔“ یہ جملہ اس کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر

لما تھا۔

شبیر درانی یہ آواز سن کر چونک گیا۔ ہسپتال کے کمرے میں اس نے صرف انسپکٹر کو دیکھا تھا۔ سب

اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ کمرے سے نکلے ہوئے اور کار میں بیٹھے ہوئے بھی وہ سب انسپکٹر کی شکل نہیں

کا تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو کسی نے توجہ نہیں دی تھی لیکن اب یہ آواز سن کر وہ بری طرح چونک گیا تھا۔

نے گردن گھما کر دیکھا سب انسپکٹر اپنے سر سے ٹوپی اتار چکا تھا۔

”تت... تم... کون ہو؟“ شبیر درانی ہکا گیا۔

”آپ کا خادم دلاور۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”آپ کی والدہ محترمہ کو بڑی شدت سے میری تلاش

ا۔ انہوں نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن آپ جانتے ہیں بچانے والا مارنے والے

لاواہ طاقتور ہوتا ہے۔ میں اپنے دشمنوں کو مارنے کے بعد ہی مروانے گا شبیر درانی۔“

”تم لوگ مجھے دھوکے سے اغوا کر کے لے جا رہے ہو۔ پولیس تم لوگوں کو نہیں چھوڑے گی۔“ شبیر

لے کہا۔

”پولیس کے ساتھ اتنا واسطہ رہا ہے ناکہ اب پولیس سے کوئی خوف نہیں رہا۔ ویسے بھی اب ہم دونوں



ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تمہاری نگرانی پر مامور ایک کانٹیل کو کچھ شبہ سا ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے اس نے تھانے پہنچ کر اطلاع کردی ہوگی اور ہو سکتا ہے اس وقت تمہاری اور ہماری تلاش شروع ہو چکی ہو۔ لیکن ہم تمہیں ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں پولیس کبھی تمہارا سراغ نہیں لگا سکے گی۔“ دلاور نے کہا۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی شرے باہر نکل چکی تھی۔ اس کا رخ آدم صحابہ کی طرف تھا۔ لیکن مین روڈ پر آنے کے بجائے وہ کھیتوں میں کچے راستوں پر ہی جا رہے تھے۔ تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی کاہلی کے درختوں کے ایک جھنڈ میں رک گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک کچا مکان بنا ہوا تھا اور جھنڈ کے دوسری طرف ایک وسیع احاطہ تھا۔ جہاں سے گوبر کی بو اٹھ رہی تھی۔

گاڑی رکتے ہی دلاور شیردرانی کو لے کر نیچے اتر آیا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر انسپکٹر کی وردی میں ملبوس کئی بھی نیچے اتر آیا تھا۔ وہ دونوں شیردرانی کو لے کر مکان میں داخل ہو گئے۔ دروازے کا تالا کئی نے کھولا تھا۔ دلاور شیردرانی کو پستول کی زبردستی کھڑا رہا اور کئی نے اندر داخل ہو کر لائین جلا دی۔ یہ خاصا وسیع کمرہ تھا۔ تین چار بان کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں لیکن بستر کسی پر بھی نہیں تھا۔ شیردرانی کو ایک چارپائی پر لٹا کر اس کے ہاتھ اور پیر چارپائی کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیئے گئے۔ اور وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ کانٹیل کی وردی میں ملبوس ڈرائیور کار کو آگے احاطے کے اندر لے گیا تھا۔ احاطے میں ایک جگہ لکڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ غالباً بہت پہلے دو تین درخت کاٹ کر ان کی لکڑیاں یہاں ڈال دی گئی تھیں۔ وہ شخص کار کو لکڑیوں کے اس انبار کے پیچھے لے گیا۔ اس نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی کہ اگر کوئی احاطے کے گیت کے سامنے سے گزرے بھی تو گاڑی کو نہ دیکھ سکے۔ گاڑی کھڑی کر کے وہ بھی مکان کی طرف آ گیا۔

کئی دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ اس نے اس کمرے میں بھی لائین جلا دی اور کپڑے بدل کر باہر آ گیا۔ اس کے بعد دلاور نے کپڑے بدلے اور پھر کانٹیل نے۔ پولیس کی وردیاں انہوں نے ایک ٹھہری کی صورت میں باندھ کر اس کمرے میں ایک طرف ڈال دی تھیں۔ وہ تینوں اس کمرے میں آ گئے جہاں چارپائی پر شیردرانی بندھا ہوا تھا۔

”جی درانی صاحب۔“ دلاور چارپائی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”اب بتائیے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

”تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ شیردرانی نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی اور چہرے پر بھی خوف نمایاں تھا۔

”تمہارے ساتھ کچھ حساب کتاب برابر کرنا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”میرا اور تمہارا حساب بہت پرا ہے۔ اسے برابر کرنے میں ذرا وقت لگے گا مگر یہ جوان ذرا جلدی میں ہے اس لئے پہلے یہ تم سے حساب کتاب کرے گا۔“

”یہ کون ہے اور میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟“ شیردرانی بولا۔

”یہ کہو کہ کون ایسا آدمی ہے جس کا تم نے کچھ نہیں بگاڑا۔“ دلاور نے کہا۔ ”تم سے تعلق رکھنے والا شخص کسی نہ کسی طرح تم سے چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ تم نے تو ان بے گناہوں کو بھی زندہ جلا دیا ہے۔ وردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جس نے مظلوم نالکے سے ہمدردی کا اظہار کیا یا اس کی کوئی مدد کی۔ مجھ تم کتنی مرتبہ قاتلانہ حملے کروا چکے ہو۔ ابھی چند روز پہلے ہی تمہاری ماں نے سب انسپکٹر ظہور کے ذریعے مجھے اغوا کروا کر آموں والی حویلی میں مجھے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اگر یہ جوان مجھے وہاں سے نہ نکالتا تو وہ میرا

زندگی کی آخری رات ہوتی... دولت کی ہوس نے تم دونوں ماں بیٹیوں کو اندھا کر رکھا ہے۔ تم لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ تم نے تو ان لوگوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جنہوں نے تمہاری خاطر اپنی زندگیاں داؤ پر لگائے رکھیں۔“ دلاور چند لمبے خاموش رہا پھر بکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس کا نام بکی ہے۔ بی اے تک پڑھا ہوا ہے۔ جھنگ میں کھیتی باڑی کرتا ہے۔ تم سے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے یہاں آیا ہے۔ یہ تمہاری تلاش میں آموں والی حویلی گیا تھا لیکن وہاں سے مجھے چاکر لے آیا۔ اس نے مجھے موت کے منہ سے نکالا ہے کئی دن سے یہ میری خدمت کر رہا تھا۔“

”بھائی کے قتل کا انتقام!“ شبیر درانی نے کہا۔ ”لیکن میں تو اسے نہیں جانتا۔“

”تم اس کے بھائی کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے زندگی بھر تمہاری خدمت کی۔ تمہاری خاطر اپنے ہاتھ خون میں رنگے اور تم نے اس کی وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لئے کھیتوں میں پھینک دی موجد ار تمہارے ہر راز سے واقف تھا اور تم نے اسے محض اس لئے موت کے گھاٹ اتار دیا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو تمہارے سارے راز فاش کر دے گا اور اس کے ساتھ تمہیں بھی پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے گا۔“

”موجد ار۔“ شبیر درانی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ”نہیں... یہ جھوٹ ہے۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔“

”بکی سب کچھ معلوم کر چکا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”نور پور کے بست سے لوگوں نے بتایا ہے کہ اس رات انہوں نے تمہیں بھی ڈیرے پر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور موجد ار کو بھی۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ شبیر درانی بولا۔ ”اگر انہوں نے مجھے دیکھا تھا تو پولیس کو کیوں نہیں بتایا حالانکہ پولیس نور پور کے لوگوں سے پوچھ گچھ کرتی رہی ہے۔ اگر انہوں نے مجھے ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہو تو پولیس کو ضرور بتاتے۔“

”ہر شخص تم سے خوفزدہ تھا۔“ دلاور نے کہا۔ ”وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر کسی نے پولیس کو تمہارے بارے میں کچھ بتایا تو تم اس کا گھر جلا کر راکھ کر ڈالو گے۔ ہر شخص زبان بند رکھنے پر مجبور تھا۔ لیکن اب چند روز پہلے اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ تمہیں انسپکٹر صوبہ خان کے قتل کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا ہے تو تم لوگوں کی خوشیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہو سکتا ہے اب کچھ لوگ موجد ار کے قتل کے سلسلے میں بھی پولیس سے رابطہ کریں۔ لیکن بہر حال ہم نے تمہیں پولیس کی حراست سے نکال لیا ہے۔ یہ ہمارے لئے کچھ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ شہر میں دو دوکانیں ایسی ہیں جہاں سے پولیس کی ضروریات کا سامان ملتا ہے۔ لہذا یہ وردیاں اور سب چیزیں انہی دوکانوں سے لے کر آیا تھا۔ اور یہ آدمی...“ اس نے کانٹیل کی وردی والے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بکی کا دور کار شہر دار ہے۔ پہلے یہ دونوں تم سے ٹھیس گئے۔ اگر تم ان لے ہاتھوں خرچ ہونے سے بچ گئے تو میں اپنا حساب کر لوں گا۔“

”دیکھو دلاور۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ کچھ زیادتیاں کی ہیں۔ لیکن میں ان کی عطا فی کر سکتا ہوں۔ اور تمہارے اس دوست بکی کی بھی مدد کر سکتا ہوں۔ پانچ لاکھ... دس لاکھ... میں لاکھ... جتنی رقم چاہو تم لوگ مجھ سے لے لو۔“

”رقم ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔“ دلاور نے کہا۔ ”اگر ہم تمہیں چھوڑ بھی دیں تو پولیس نہیں چھوڑے

کی۔ تم پر قتل کا الزام تو تھا ہی اب فرار کے بعد تمہارا جرم اور بھی سنگین ہو گیا ہے۔ اس لئے سب کچھ بیکار ہے۔“

”پولیس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”میں اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ کراچی کی طرف نکل جاؤں گا۔ وہاں انسانوں کا جنگل آباد ہے۔ اس جنگل میں کسی ایک آدمی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہو گا۔“

”بڑی خوشی منی میں جلتا ہو۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”انسانوں کے جنگل میں تو تم اس وقت کم ہو گے تا جب ہمارے جنگل سے نکلو گے۔ پہلے کی تم سے اپنے بھائی کے قتل کا حساب لے گا اور اس کے بعد میں تم سے ناکہ بی بی اور مجھ پر کئے گئے مظالم کا حساب لوں گا۔ تم نے ناکہ کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی وہ لڑکی نجانے کہاں ٹھو کریں کھاری ہوگی۔“

”ناکہ مر چکی ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔  
 ”ناکہ مر چکی ہے!“ دلاور کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”نہیں، وہ نہیں مر سکتی۔ وہ بڑی باہمت لڑکی ہے تمہاری وجہ سے اس نے بڑے دکھ سے ہیں۔ وہ بڑے بڑے طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے وہ نہیں مر سکتی۔۔۔۔۔“  
 ”وہ مر چکی ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔ میں اس کی تلاش میں سندھ کے گاؤں کا چیلو گیا تھا۔ کاچیلو کے تھانیدار نے اس کی موت کی تصدیق کر دی ہے میرے پاس تھانیدار کی تحریر موجود ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ دلاور دھاڑا۔ ”وہ نہیں مر سکتی۔“  
 ”وہ مر چکی ہے۔“ شیردرانی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم ناکہ کے پاؤں گارڈ تھے۔ وہ ختم ہو چکی ہے۔ اس طرح اب تمہارا کام بھی ختم ہو گیا تم سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ اب ہے۔ میری پیشکش پر سوچ لو۔ یہاں کی پولیس تمہارے پیچھے بھی لگی ہوئی ہے۔ مجھ سے پانچ دس لاکھ روپے لے لو اور میری طرح یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ تمام بھیلیوں سے جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔“  
 ”میں نہ تو پولیس سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی مجھے کسی اور بات کا خوف ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”ناکہ کے بارے میں تمہاری بات تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں خود اس معاملے کی تصدیق کروں گا۔ اس کے بعد میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ اگر واقعی ناکہ مر چکی ہے تو تمہیں بھی ایسی اذیت ناک موت ماروں گا کہ دنیا یاد کرے گی! تم میرے ساتھ آؤ۔“ دلاور نے آخری الفاظ کی سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔  
 وہ دونوں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ وہ بہت دیر تک کسی بحث میں الجھے رہے بالاخر بی بی نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔

”ٹھیک ہے دلاور۔“ اس نے کہا۔ ”میں وہی کرو گا جو تم کہو گے۔ تم اچھے دوست ہو اور میں کسی بات پر ضد کر کے تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس جیسے خبیث سے تو بعد میں بھی نہٹتے رہیں گے۔“  
 ”تو پھر چلیں۔ دن چڑھنے والا ہے۔ ہم دھوپ نکلنے سے پہلے پہلے شہر پہنچ جائیں گے۔“ دلاور نے کہا۔  
 ”ہاں چلو۔“ بی بی نے کہا اور پھر اپنے ساتھی کو بلا کر اسے شیردرانی کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔  
 ”اس کا خیال رکھنا منظور۔ ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔ اگر رات کو نہ بھی آسکے تو پریشان منت ہونا اور ایک بات یاد رکھنا۔ اول تو اس طرف کوئی آئے گا نہیں اور اگر اتفاق سے کوئی آ بھی جائے تو اسے گلا مار دینا۔ اسے زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہئے۔“

”فکر مت کرو۔“ منظور نے جواب دیا۔ ”اگر پولیس والے تلاش کرتے ہوئے اس طرف آگئے تو میں بندوبست کر لوں گا۔“

”چلو دلاور بھائی۔“ بکی نے کہا۔  
 وہ دونوں مکان سے نکل کر کھیتوں میں پگھنڈی پر چلے گئے۔ تقریباً ”دو میل کا فاصلہ طے کر کے وہ سڑک پر پہنچے۔ کچھ ہی دیر بعد انہیں صادق آباد کی طرف سے آنے والی بس مل گئی۔ اس وقت شرقی افق پر سرخی دیکھی تھی۔

جب وہ رحیم یار خان کے لاری اڈے پر اترے تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ انہیں شہر میں داخل ہوتے ہی سنا گیا تھا کہ شبیر درانی اور ان جعلی پولیس والوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا جو گزشتہ رات شہر سے شبیر درانی کو لے اڑے تھے۔ شہر سے باہر جانے والی تمام بسوں اور گاڑیوں کو چیک کیا جا رہا تھا۔ اڈے پر بھی لاتعداد مادہ پوش پولیس والے موجود تھے۔ وہ ان بسوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے جو شہر سے آنے والی تھیں۔

وہ دونوں بس سے اتر کر ایک ٹانگے پر بیٹھ گئے۔  
 ”ہل بھی۔“ دلاور نے کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دوسری سواریوں کا انتظار مت کرتے ہیں۔ پیسے ملیں گے۔“

کوچوان نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر گھوڑے کو ہانک دیا۔ شہر میں بھی جگہ جگہ گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ پولیس والوں کی اس حماقت پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ پولیس کی حراست سے فرار ہونے والے طرح آزادی سے شہر میں تو نہیں گھومتے کہ دوبارہ پولیس کی نظروں میں آجائیں۔  
 آدھے گھنٹے بعد ٹانگہ رائے منصور کے بچکے والی گلی کے موڑ پر رکا۔ دلاور نے ٹانگے والے کو پیسے دیئے۔

”دلاور! نیچے اتر کر رائے منصور کے بچکے کی طرف چلے گئے۔ وہ اس طرح لے پیسے بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملاقات ہو رہی

”تم کہاں غائب ہو گئے تھے بیٹا، میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔  
 ”بب تک حسینہ بیگم اور شبیر درانی زندہ ہیں یہ سب کچھ ہوتا رہے گا۔“ دلاور نے کہا اور پھر اپنے لہجے میں آنے والے پورے واقعہ کی تفصیل بتانے لگا پھر بکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر یہ وقت حویلی میں نہ پہنچ جاتا تو وہ میری زندگی کی آخری رات ہوتی۔“

”پو کون ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔  
 ”اس کا نام بکی ہے۔ موجودہ کار کا بھائی ہے جسے شبیر درانی نے قتل کر دیا تھا۔“ دلاور نے کہا اور پھر بکی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

”اور ہاں۔“ رائے منصور صاحب بولے۔ ”شبیر درانی کو پولیس نے انپکڑ صوبہ خان کے قتل کے

”ام میں حراست میں لے لیا تھا لیکن....“  
 ”مچھلی رات وہ ہسپتال سے فرار ہو گیا۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے جملہ پورا کر دیا۔  
 ”مہیں کیسے پتہ چلا۔“ رائے منصور چونک گیا۔

”اب وہ شیطان ہماری حراست میں ہے۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”رات کو ہم دونوں

گی۔ تم پر قتل کا الزام تو تھا ہی اب فرار کے بعد تمہارا جرم اور بھی سنگین ہو گیا ہے۔ اس لئے سب کچھ بیکار ہے۔“

”پولیس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ کراچی کی طرف نکل جاؤں گا۔ وہاں انسانوں کا جنگل آباد ہے۔ اس جنگل میں کسی ایک آدمی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہو گا۔“

”بڑی خوشی منی میں جتلا ہو۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”انسانوں کے جنگل میں تو تم اس وقت کم ہو گے تا جب ہمارے جنگل سے نکلو گے۔ پہلے ہی تم سے اپنے بھائی کے قتل کا حساب لے گا اور اس کے بعد میں تم سے نالہ بی بی اور مجھ پر کئے گئے مظالم کا حساب لوں گا۔ تم نے نالہ کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی وہ لڑکی نجانے کہاں ٹھوکریں کھا رہی ہوگی۔“

”نالہ مر چکی ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”نالہ مر چکی ہے!“ دلاور کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”نہیں، وہ نہیں مر سکتی۔ وہ بڑی باہمت لڑکی ہے تمہاری وجہ سے اس نے بڑے دکھ سے ہیں۔ وہ بڑے بڑے طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے وہ نہیں مر سکتی۔۔۔“

”وہ مر چکی ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔ میں اس کی تلاش میں سندھ کے گاؤں کا چیلو گیا تھا۔ کاچیلو کے تھانیدار نے اس کی موت کی تصدیق کر دی ہے میرے پاس تھانیدار کی تحریر موجود ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ دلاور دھاڑا۔ ”وہ نہیں مر سکتی۔“

”وہ مر چکی ہے۔“ شبیر درانی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم نالہ کے پاؤں گارڈ تھے۔ وہ ختم ہو چکی ہے۔ اس طرح اب تمہارا کام بھی ختم ہو گیا تم سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ اب ہے۔ میری پیشکش پر سوچ لو۔ یہاں کی پولیس تمہارے پیچھے بھی لگی ہوئی ہے۔ مجھ سے پانچ دس لاکھ روپے لے لو اور میری طرح یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ تمام جھیلیوں سے جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔“

”میں نہ تو پولیس سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی مجھے کسی اور بات کا خوف ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”نالہ کے بارے میں تمہاری بات تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں خود اس معاملے کی تصدیق کروں گا۔ اس کے بعد میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ اگر واقعی نالہ مر چکی ہے تو تمہیں بھی ایسی اذیت ناک موت ماروں گا کہ دنیا یاد کرے گی! تم میرے ساتھ آؤ۔“ دلاور نے آخری الفاظ کی سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

وہ دونوں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ وہ بہت دیر تک کسی بحث میں الجھے رہے بالاخر بی بی نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔

”ٹھیک ہے دلاور۔“ اس نے کہا۔ ”میں وہی کرو گا جو تم کو گے۔ تم اچھے دوست ہو اور میں کسی بات پر ضد کر کے تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس جیسے خبیث سے تو بعد میں بھی نمٹتے رہیں گے۔“

”تو پھر چلیں۔ دن چڑھنے والا ہے۔ ہم دھوپ نکلنے سے پہلے پہلے شہر پہنچ جائیں گے۔“ دلاور نے کہا۔

”ہاں چلو۔“ بی بی نے کہا اور پھر اپنے ساتھی کو بلا کر اسے شبیر درانی کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

”اس کا خیال رکھنا منظور۔ ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔ اگر رات کو نہ بھی آ سکے تو پریشان مت ہونا اور ایک بات یاد رکھنا۔ اول تو اس طرف کوئی آئے گا نہیں اور اگر اتفاق سے کوئی آ بھی جائے تو اسے گلا مار دینا۔ اسے زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہئے۔“

”فکرمات کرو۔“ منظور نے جواب دیا۔ ”اگر پولیس والے تلاش کرتے ہوئے اس طرف آگئے تو میں مابند و بست کر لوں گا۔“

”چلو دلاور بھائی۔“ مکی نے کہا۔

وہ دونوں مکان سے نکل کر کھیتوں میں پگھڑی پر چلے گئے۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر کے وہ سڑک پر آئے۔ کچھ ہی دیر بعد انہیں صادق آباد کی طرف سے آنے والی بس مل گئی۔ اس وقت مشرقی افق پر سرخی رہی تھی۔

جب وہ رحیم یار خان کے لاری اڈے پر اترے تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ انہیں شہر میں داخل ہوتے ہی ہل گیا تھا کہ شبیر درانی اور ان جعلی پولیس والوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا جو گزشتہ رات ال سے شبیر درانی کو لے اڑے تھے۔ شہر سے باہر جانے والی تمام بسوں اور گاڑیوں کو چیک کیا جا رہا تھا۔ لاری اڈے پر بھی لا تعداد سادہ پوش پولیس والے موجود تھے۔ وہ ان بسوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے جو شہر سے ہانے والی تھیں۔

وہ دونوں بس سے اتر کر ایک ٹانگے پر بیٹھ گئے۔

”چل بھئی۔“ دلاور نے کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دوسری سواریوں کا انتظار مت کرتے ہیں۔“

کوچوان نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر گھوڑے کو ہانک دیا۔ شہر میں بھی جگہ جگہ گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ اور پولیس والوں کی اس حماقت پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ پولیس کی حراست سے فرار ہونے والے طرح آزادی سے شہر میں تو نہیں گھومتے کہ دوبارہ پولیس کی نظروں میں آجائیں۔

آدھے گھنٹے بعد ٹانگہ رائے منصور کے بنگلے والی گلی کے موڑ پر رکا۔ دلاور نے ٹانگے والے کو پیسے دیئے۔

وہ دونوں نیچے اتر کر رائے منصور کے بنگلے کی طرف چلے گئے۔

رائے منصور دلاور کو دیکھ کر کھل اٹھے۔ وہ اس طرح طے جیسے جھجھکے ہوئے بیٹے سے ملاقات ہو رہی

”تم کہاں غائب ہو گئے تھے بھٹا، میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“ رائے منصور نے کہا۔

”جب تک حسینہ بیگم اور شبیر درانی زندہ ہیں یہ سب کچھ ہوتا رہے گا۔“ دلاور نے کہا اور پھر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر رائے منصور کے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر یہ

انہی مدت حویلی میں نہ پہنچ جاتا تو وہ میری زندگی کی آخری رات ہوتی۔“

”یہ کون ہے؟“ رائے منصور نے پوچھا۔

”اس کا نام مکی ہے۔ موجودہ کار کا بھائی ہے جسے شبیر درانی نے قتل کر دیا تھا۔“ دلاور نے کہا اور پھر مکی

ہمارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

”اور ہاں۔“ رائے منصور صاحب بولے۔ ”شبیر درانی کو پولیس نے انکپٹر صوبہ خان کے قتل کے

مقام میں حراست میں لے لیا تھا لیکن....“

”گھلی رات وہ ہسپتال سے فرار ہو گیا۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے جملہ پورا کر دیا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا۔“ رائے منصور چونک گیا۔

”اب وہ شیطان ہماری حراست میں ہے۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”رات کو ہم دونوں

اسے ہسپتال سے فرار کرا کے لے گئے تھے۔ اس کی زندگی اس وقت تک ہے جب تک میں اس سے ٹائلہ لی۔۔۔۔۔

”دلاور بیٹا مبارک ہو۔“ آصفہ بیگم کی آواز سن کر دلاور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ”رائے صاحب نے تمہیں ابھی تک نہیں بتایا۔ ٹائلہ زندہ ہے۔“

”ٹائلہ زندہ ہے!“ دلاور اچھل پڑا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”ہاں، ٹائلہ زندہ ہے اور کراچی میں ہے۔ چارپانچ روز پہلے اس کا فون آیا تھا۔ اس نے اپنا نمبر بھی دیا تھا۔ اس کے بعد رائے صاحب نے دو تین مرتبہ فون کیا تھا مگر اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ بہر حال،“

خیریت سے ہے۔“

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ دلاور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ شیردرانی جھوٹ بول رہا ہے۔“

”کیسا جھوٹ؟“ رائے منصور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ کاجیلو کے تھانیدار سے کوئی تحریر لے آیا ہے جس میں یہ تصدیق کی گئی ہے کہ ٹائلہ درانی مرچکا ہے۔“

”جھوٹ بکاتا ہے وہ۔“ آصفہ بیگم نے کہا۔

”آپ ٹیلی فون کریں شاید ٹائلہ بی بی سے بات ہو جائے۔“ دلاور نے کہا۔

آصفہ بیگم ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ لائن فوراً ہی مل گئی لیکن کال سلطانیہ ریسیور کی تھی۔ اس نے بتایا کہ ٹائلہ کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔

”آپ مجھے ایک کانڈ پر یہ نمبر لکھ کر دے دیں۔ میں ٹائلہ بی بی کو لینے کراچی جاؤں گا۔“ دلاور نے آمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آصفہ بیگم نے ٹیلی فون کے قریب پڑے ہوئے پیڈ کے ایک کانڈ پر ٹائلہ کا فون نمبر لکھ کر اس کے حوالہ کر دیا۔ دلاور نے وہ کانڈ سنبھال کر جب میں رکھ لیا۔

”مزہ تو اب آئے گا۔“ دلاور نے کہا۔ ”حینہ بیگم اور شیردرانی شاید یہ سمجھتے ہیں کہ کاجیلو تھانے۔ ٹائلہ بی بی کی موت کے بارے میں تحریر لے کر انہوں نے بازی جیت لی ہے۔ شیردرانی کو ہم اس وقت تک زندہ رکھیں گے جب تک ٹائلہ بی بی یہاں نہیں آ جاتی اور جب ٹائلہ بی بی کو ان کے ہمارے لایا جائے گا تو ان ماں بیٹوں کی حالت قابل دید ہوگی۔“

وہ دونوں پورا دن رحیم یار خان میں رہے اور پھر شام ہوتے ہی رخصت ہو گئے دلاور یہ کہہ کر گھر نکلا تھا کہ اب وہ ٹائلہ کو لے کر ہی واپس آئے گا۔

شہر سے باہر جانے والی بسوں اور گاڑیوں کی چیکنگ اس وقت بھی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی ایر میں تھے لیکن ایک دوسرے سے لا تعلق الگ الگ سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

وہ بس لاری اڈے سے نکلی ہی تھی کہ ایک پولیس پارٹی نے اسے روک لیا۔ دو پولیس والے بس میں آ گئے۔ وہ ایک ایک شخص کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک پولیس والا بکی کی سیٹ کا قریب رک گیا۔ وہ بڑی گہری نظروں سے بکی کو دیکھ رہا تھا۔

”تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟“ پولیس والے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”پرہیزی ہوں سنتری بادشاہ۔“ بکی نے جواب دیا۔ ”جھنگ سے آیا ہوا ہوں۔ آج کا دن یہاں اپنے ایک رشتے دار کے ہاں گزارہ اور اب پنوں عاقل جا رہا ہوں۔ میرا بھائی فوج میں ہے۔“

”اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔“ پولیس والے نے کہا۔  
بکی نے جب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر پولیس والے کے حوالے کر دیا۔ پولیس والا کچھ دیر تک کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر کارڈ بکی کو واپس کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہی پولیس والا دلاور کے قریب آکر رک گیا۔

”اوہ! دلاور... تم کہاں جا رہے ہو بھی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”صادق آباد۔“ دلاور نے مختصر سا جواب دیا۔

”تمہارے رائے صاحب اب کیسے ہیں؟“ کانٹیل نے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ اب تو ٹھیک ہیں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”اور ہاں تم صادق آباد جا رہے ہو۔ سب انسپکٹر ظہور تمہاری تاک میں ہے۔ اس سے کوئی ذاتی معاملہ ہے تو طے کرلو۔ وہ بڑا کمینہ آدمی ہے۔“ کانٹیل نے کہا۔

”ہم جیسے لوگوں کا بھی اللہ مالک ہے۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

دونوں پولیس والے بس سے اتر گئے اور بس آگے روانہ ہو گئی۔

وہ دونوں آدمی صحابہ سے پہلے ہی بس سے اتر گئے۔ اس وقت تقریباً ”آٹھ بج رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ وہ کچھ دیر سڑک پر کھڑے رہے پھر سڑک سے اتر کر کھیتوں میں پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ مکان تک پہنچنے میں تقریباً ”آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ جب وہ مکان کے سامنے والے رخ پر پہنچے تو دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور کمروں میں تاریکی تھی۔ دلاور کا ماتھا ٹھکا۔

”منظور... اوئے منظور... کہاں ہو تم... حق کیوں نہیں جلائی....“ بکی کہتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے ماچس جلا کر لائٹیں جلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں انہوں نے کپڑے وغیرہ بدلے تھے۔ یہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی تھی۔

بکی لائٹیں لٹیکھوٹے سے باہر آگیا۔ دلاور دوسرے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت دروازے میں داخل ہوئے لیکن پہلا قدم اندر رکھتے ہی ٹھک کر رک گئے۔ دروازے سے دو قدم اندر فرش پر منظور کی لاش پڑی تھی۔ اس کی پیشانی میں سوراخ تھا جس سے بننے والے خون نے اس کے چہرے اور گردن کو تر کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جس سے اس کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا۔

دلاور نے چارپائی کی طرف دیکھا جہاں وہ شبیر درانی کو باندھ کر رکھے تھے۔ چارپائی خالی تھی... دلاور نے بکی کے ہاتھ سے لائٹیں لے لی اور جھک کر منظور کی لاش کو دیکھنے لگا۔ بکی بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ دونوں متوحش نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

...●...●...●...

دلاور اور بکی کے جانے کے بعد ان کا تیسرا ساتھی منظور بھی کیس چلا گیا تھا۔ شبیر درانی بان کی کمزوری چارپائی پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر چارپائی کے ساتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان ہندشوں کی وجہ سے وہ اپنے سر کے علاوہ جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔



رات کو وہ ہسپتال کے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ سونے سے پہلے وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ اس کی گرفتاری کا مسئلہ اگرچہ خاصا سنگین تھا مگر اس کے خیال میں دولت میں ہر مسئلے کا حل موجود تھا۔ یہ انسپکٹر بظاہر اپنے آپ کو بڑا اصول پسند اور قانون پسند ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے یقین تھا کہ دولت کی چمک اسے مرعوب کر دے گی اور وہ سارے اصول اور قانون بھول جائے گا۔ خود اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اور پھر نالہ کی دولت بھی اسے ملنے والی تھی۔ وہ اب تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ دولت سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ سو گیا تھا۔ اور پھر رات کے پچھلے پہر جب اسے جاگایا گیا تو وہ پولیس والوں کے چہرے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے سر کی چوٹ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے تو تین چار دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو گھر جاسکتا ہے مگر حسینہ بیگم بھی جانتی تھی کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی اس کے بیٹے کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس لئے اس نے ڈاکٹر کی منہ می گرم کر دی تھی اور ڈاکٹر نے شبیر درانی کو پولیس کی تحویل میں دینے سے انکار کر دیا تھا اور یہ عذر پیش کیا تھا کہ ابھی اسے کم از کم ایک ہفتہ اور ہسپتال میں رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس رات اچانک ہی پولیس والوں کو دیکھ کر وہ بدحواس ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ رات کی ڈیوٹی والا ڈاکٹر بھی تھا اور اس نے شبیر درانی کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

اور یہ انکشاف تو بعد میں ہوا تھا کہ وہ دراصل پولیس والے نہیں تھے۔ اور اسے جیل منتقل کرنے کے بجائے اغواء کر کے لے جایا جا رہا تھا۔ اور اب اسے کسی ڈیرے پر لا کر باندھ دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت بڑی خوفناک تھی کہ اسے اغواء کرنے والوں میں ایک دلاور تھا جسے اس کی ماں نے متعدد بار مختلف کیسوں میں پھنسانے یا مروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھی یقیناً ”انتقام کی آگ میں جل رہا ہو گا اور دوسرا اس کے پرانے ملازم موجددار کا بھائی تھا جو اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ موجددار نے اکثر اپنے بھائی کا ذکر تو کیا تھا مگر شبیر درانی کو اسے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اب وہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے دلاور کے ساتھ مل کر اسے اغواء کر لایا تھا۔ شبیر درانی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ تھوڑی ہی دیر کا مسمان تھا۔ اس نے دلاور اور بی کو لاکھوں روپے کی پیشکش کی تھی۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ شبیر درانی کو یقین تھا کہ وہ صبح کا سورج نہیں دیکھ سکے گا لیکن جب وہ دونوں اسے چھوڑ کر چلے گئے تو اسے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ اس کا سازشی ذہن ایک بار پھر منصوبے بنانے لگا تھا۔

دلاور اور بی کے جانے کے تقریباً ”آدھے گھنٹہ بعد ان کا تیسرا ساتھی منظور بھی کہیں چلا گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے باہر سے آلا لگا دیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے شبیر درانی کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا تاکہ وہ چیخ چلانہ سکے۔

اس کمرے میں سامنے والی دیوار میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ اس کے علاوہ کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ شبیر درانی سامنے روشن دان کی طرف دیکھتا رہا۔ دروازہ بند ہونے سے کمرے میں اندھیرا سا ہو گیا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد جب سورج طلوع ہوا تو روشن دان سے دھوپ کی کرنیں اندر آنے لگیں جس سے کمرے میں مدھم سی روشنی ہو گئی شبیر درانی زیادہ دیر تک روشن دان کی طرف نہیں دیکھ سکا۔ دھوپ کی چمک سے اس کی آنکھیں چند حیا نے لگی تھیں۔

ہا ہر جیسے جیسے دھوپ تیز ہو رہی تھی کمرے میں گرمی بڑھ رہی تھی۔ اس روشن دان کے علاوہ ہوا کی آمد و رفت کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھنسا ہوا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری

ہوری تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کا سر دکنے لگا۔ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔  
 بلکہ وہ سر کو بار بار ہٹاتے لگا۔ لیکن اس طرح سر کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔  
 شبیر درانی کے لئے وقت کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ  
 منظور کو گمے ہوئے تفتی دیر ہوئی ہوگی۔ ایک گھنٹہ... دو گھنٹے یا شاید پندرہ بیس منٹ...

دفعۃً "باہر قدموں کی آواز سن کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ بہت سے قدموں کی آوازیں تھیں۔ جو اس کو ٹھری  
 کے آس پاس ہی سنائی دے رہی تھیں اور پھر بچوں کی آواز سنائی دینے لگیں۔ شبیر درانی کو سمجھنے میں دیر نہیں  
 لگی کہ وہ بچے تھے جو شاید کھیلتے ہوئے اس طرف نکل آئے تھے۔ وہ چیخ کر ان بچوں کو متوجہ کرنا چاہتا تھا مگر  
 اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ کوشش کے باوجود اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ وہ سر کو زور زور  
 سے ہٹاتے لگا مگر اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ پھر دفعۃً "ایک اور آواز سنائی دی۔ وہ کسی آدمی کی  
 آواز تھی جو ان بچوں کو ڈانٹ کر وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ اس کے تقریباً "دس منٹ بعد تالے میں چابی گھومنے  
 کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ ایک دم تیز روشنی پڑنے سے شبیر درانی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔  
 اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو منظور اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے  
 ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی جسے اس نے زمین پر رکھ دیا اور آگے بڑھ کر شبیر درانی کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"اچھا ہوا میں وقت پر پہنچ گیا۔" منظور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بہتی یہاں سے اگرچہ تقریباً"  
 ایک کوس دور ہے لیکن بچے میرے توڑنے کے لئے دور دور تک گھومتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی میری کے دو ٹین  
 اہل ہیں۔ انہیں اگر موقع ملتا تو ان کمروں کے تالے بھی توڑ ڈالتے۔ بڑے شیطان ہیں اس بہتی کے  
 بچے۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ ورنہ گڑبڑ ہو جاتی۔"

"یہاں گھرے میں میری سانس گھٹ رہی ہے۔" شبیر درانی کراہا۔ "خدا کے لئے مجھے کھول کر باہر لے  
 جا۔" میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"میں تمہیں باہر ضرور لے چلوں گا لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو کامیاب نہیں ہو سکو گے۔  
 میرے پستول کی گولی تمہیں چند قدم سے زیادہ آگے نہیں جانے دے گی۔" منظور نے جیب سے پستول نکال کر  
 اٹھایا اور پھر اس کے ہاتھ پر پتھر کھولنے لگا۔

منظور اسے پستول کی زد پر احاطے میں لے آیا۔ وہاں پانی بھی موجود تھا۔ شبیر نے ایک کونے میں جا کر  
 لمبا ریت سے فراغت حاصل کی۔ پیٹھ پر منہ ہاتھ دھویا اور منظور کے ساتھ مکان کی طرف واپس  
 آیا۔ منظور نے اسے پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔  
 "مجھے یہیں بیٹھنے دو، تازہ ہوا میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔" شبیر درانی  
 اہل درخت کے نیچے رک گیا۔

"نہیں۔" منظور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "تمہیں کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہئے۔ اندر چلو۔"  
 وہ اندر آگئے۔ شبیر درانی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ منظور نے زمین پر پڑی ہوئی پوٹلی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا

۱۰۔ "میں تمہارے لئے ناشتہ لے کر آیا ہوں۔ اس میں پراٹھے ہیں اور تھراپاس میں چائے بھی۔ پراٹھے  
 اچھے ہیں کہ دوسرے کو بھی پیٹ بھرا جاسکتا ہے۔" منظور نے کہا۔  
 شبیر درانی نے پوٹلی کھول لی اور ناشتہ کرنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا۔ اس طرح وہ زیادہ

سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ منظور پستول سنبھالے بڑی مستعدی سے دروازے میں بیٹھا ہوا تھا۔  
 ”یہ کون سی جگہ ہے اور کس کا ڈیرہ ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”یہ جمال شاہ کا ڈیرہ ہے۔“ منظور نے جواب دیا۔ ”لیکن بہت عرصہ سے ویران پڑا ہے۔ میں اس کا  
 کارندہ ہوں۔ اس کی چالی میرے ہی پاس رہتی ہے۔“

”دلاور اور بکی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”دلاور کو تو میں نہیں جانتا۔ بکی میرا رشتے دار ہے۔ اسی نے مجھے اس کام کے لئے کہا تھا۔ یاروں کے  
 لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔“ منظور نے جواب دیا۔

شبیر باتوں میں وقت گزارتا رہا اور بالاخر اس نے منظور کو یہ پیشکش کر دی کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے اور  
 اسے چار پانچ لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔ اس پیشکش کے جواب میں منظور نے اسے دوبارہ چار پانچ لاکھ روپے  
 دوپہر دو بجے کے قریب منظور نے اسے کھانا کھلایا۔ کھانا کھلانے کے لئے منظور نے اس کے صرف ہاتھ  
 کھولے تھے اور اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے پھر لٹا کر باندھ دیا گیا تھا۔ شبیر درانی منظور سے  
 باتیں کرتا رہا۔ وہ اسے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اسے رشوت لے کر چھوڑ دے۔

”میری بات مان لو۔“ وہ منظور کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”چار پانچ لاکھ روپے بہت بڑی رقم  
 ہوتی ہے۔ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ تم یہاں سے کہیں اور چلے جانا اور کوئی کاروبار شروع کر دینا۔“

”میں دوستوں سے غدار کی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ منظور نے کہا۔ ”میری یہی پوجا صرف تم جیسے لوگ  
 کرتے ہیں ہم غریب تو دوستی نبھاتے ہیں۔ اس کے لئے خواہ جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

”اس دوستی سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“ شبیر درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”پولیس میری اور تم لوگوں کی تلاش میں ہوگی۔ اگر پکڑے گئے تو تمہارا جو انجام ہو گا اس کا تصور بھی نہ  
 نہیں کر سکتے۔“

”کیا ہو گا درانی سائیں۔“ منظور نے جواب دیا۔ ”پچانسی تو نہیں ہوگی۔ کوئی قتل تو نہیں کیا میں نے۔  
 دو چار سال کی سزا ہو جائے گی تا نا اور بس۔ یار کی یاری کے لئے مجھے یہ سزا منظور ہے۔“

شبیر درانی اس کے بعد بھی اسے رام کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن منظور ٹیس سے مس نہیں ہوا۔ شبیر  
 درانی پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں نیند کا  
 بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ اور بالاخر وہ سو گیا۔ یہ نیند بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے پچانسی کے تختے پر بگ  
 آجاتی ہے۔

منظور دروازے میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اونگھنے لگا۔

چھ بجے کے قریب شبیر درانی کی آنکھ کھلی۔ اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا منظور موجود نہیں تھا  
 لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ آگیا۔

”مجھے کھول کر باہر لے چلو“ میرے پیٹ میں مروڑاٹھ رہا ہے۔“ شبیر درانی نے اس کی طرف دیکھا  
 ہوئے مسکین سے لہجے میں کہا۔

منظور کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کی بندشیں کھولنے لگا۔ دائیں ہاتھ کی آخری گرہ کھولا  
 سے پہلے اس نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ شبیر درانی چار پانچ لاکھ روپے سے پہلے ہاتھوں پہلا  
 کو حرکت دیتا رہا پھر منظور کے اشارے پر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ منظور اسے پستول کی زد پر لئے احاطہ

میں لے آیا۔ وہاں پانی بھی موجود تھا۔ شبیر نے ایک کونے میں جا کر ضروریات سے فراغت حاصل کی۔ ہینڈ پمپ سے منہ ہاتھ دھویا اور منظور کے ساتھ مکان کی طرف واپس آگیا۔ منظور نے اسے پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔

”مجھے ہمیں بیٹھنے دو، تازہ ہوا میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“ شبیر درانی ایک درخت کے نیچے رک گیا۔

”نہیں۔“ منظور نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”تمہیں کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہئے۔ اندر چلو۔“ وہ اندر آگئے۔ شبیر درانی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ منظور نے زمین پر پڑی ہوئی پوٹلی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔

”میں تمہارے لئے ناشتہ لے کر آیا ہوں۔ اس میں پراٹھے ہیں اور تھرباس میں چائے بھی۔ پراٹھے اتنے ہیں کہ دوپہر کو بھی پیٹ بھرا جاسکتا ہے۔“ منظور نے کہا۔

شبیر درانی نے پوٹلی کھولی اور ناشتہ کرنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا۔ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ منظور پستول سنبھالے بڑی مستعدی سے دروازے میں بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ کون سی جگہ ہے اور کس کا ڈیرہ ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”یہ جمال شاہ کا ڈیرہ ہے۔“ منظور نے جواب دیا۔ ”لیکن بہت عرصہ سے ویران پڑا ہے۔ میں اس کا

کارندہ ہوں۔ اس کی چالی میرے ہی پاس رہتی ہے۔“

”دلاور اور کی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ شبیر درانی نے پوچھا۔

”دلاور کو تو میں نہیں جانتا۔ مکی میرا رشتے دار ہے۔ اسی نے مجھے اس کام کے لئے کہا تھا۔ یاروں کے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔“ منظور نے جواب دیا۔

شبیر باتوں میں وقت گزارتا رہا اور بالاخر اس نے منظور کو یہ پیشکش کردی کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو اسے چارپانچ لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔ اس پیشکش کے جواب میں منظور نے اسے دوبارہ چارپائی پر باندھ دیا۔

دوپہر دو بجے کے قریب منظور نے اسے کھانا کھلایا۔ کھانا کھلانے کے لئے منظور نے اس کے صرف ہاتھ کھولے تھے اور اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے پھر لٹا کر باندھ دیا گیا تھا۔ شبیر درانی منظور سے باتیں کرتا رہا۔

”یہ ایسے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اسے رشوت لے کر چھوڑ دے۔“

”میری بات نہ مان لو۔“ وہ منظور کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”چارپانچ لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ تم یہاں سے کہیں اور چلے جانا اور کوئی کاروبار شروع کر دیتا۔“

”میں دوستوں سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ منظور نے کہا۔ ”میسے کی پوجا صرف تم جیسے لوگ کرتے ہیں ہم غریب تو دوستی بھاتے ہیں۔ اس کے لئے خواہ جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

”اس دوستی سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“ شبیر درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”پولیس میری اور تم لوگوں کی تلاش میں ہوگی۔ اگر پکڑے گئے تو تمہارا جو انجام ہوگا اس کا تصور بھی تم

نہیں کر سکتے۔“

”کیا ہوگا درانی سائیں۔“ منظور نے جواب دیا۔ ”پھانسی تو نہیں ہوگی۔ کوئی قتل تو نہیں کیا میں نے۔“

دو چار سال کی سزا ہو جائے گی اور بس۔ یار کی باری کے لئے مجھے یہ سزا منظور ہے۔“

شبیر درانی اس کے بعد بھی اسے رام کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن منظور ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شبیر

درانی پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ اور بالا خرہ سو گیا۔ یہ نیند بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔

منظور دروازے میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اوجھلنے لگا۔  
چھ بجے کے قریب شبیر درانی کی آنکھ کھلی۔ اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا منظور موجود نہیں تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ آگیا۔  
”مجھے کھول کر باہر لے چلو“ میرے پیٹ میں مروڑاٹھ رہا ہے۔ ”شبیر درانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکین سے لہجے میں کہا۔

منظور کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کی بند شیش کھولنے لگا۔ دائیں ہاتھ کی آخری گرہ کھولنے سے پہلے اس نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ شبیر درانی چارپائی سے اٹھ کر کچھ دیر پہلے ہاتھوں پیروں کو حرکت دیتا رہا پھر منظور کے اشارے پر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ منظور اسے پستول کی زد پر لئے احاطے میں لے آیا۔

تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ احاطے سے نکلے۔ اس وقت سورج درختوں کے پیچھے مغربی افق پر روپوشی کی تیاری کر رہا تھا۔ شبیر درانی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ چند منٹ بعد سورج غروب ہو جائے گا اور ہر طرف تاریکی پھیل جائے گی۔ وہ ایک جگہ رک کر تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر منظور نے پستول سے اشارہ کیا تو وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شبیر درانی نے دہلیز کے اندر قدم رکھا۔ منظور اس کے پیچھے ہی تھا۔ دو سرا قدم اٹھاتے ہی شبیر درانی بڑی تیزی سے گھوم گیا۔

شبیر درانی کی یہ حرکت منظور کے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ شبیر درانی کے پیر کی ٹھوک منظور کے پستول والے ہاتھ پر لگی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں جا گرا۔ اس سے پہلے کہ منظور کچھ سمجھ سکتا شبیر درانی نے اس کے جڑے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ منظور لڑکھڑا کر دروازے سے نکل گیا۔ شبیر درانی نے اسے گریبان سے پکڑ کر کمرے کے اندر کھینچ لیا۔ اور اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ منظر کچھ دیر پٹا رہا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس نے بھی شبیر درانی پر جوابی حملے شروع کر دیے مگر وہ جوابی کارروائی زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکا۔ شبیر درانی نے جلد ہی اسے دبوچ لیا۔

منظور دبلا پتلا سا تھا اور شبیر درانی اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے منظور کو نیچے گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جمادیئے۔ منظور نے اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹ لیں۔ اس کے گٹھ پر شبیر درانی کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ منظور کو سینے میں سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنی سمٹی ہوئی دونوں ٹانگیں شبیر درانی کی ٹانگوں میں پھنسا دیں اور جسم کی تمام تر قوتیں مجتمع کر کے اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ بالا خرہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ شبیر درانی اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پیچھے جا گرا۔ منظور ایک ہاتھ سے اپنا گلا سلاتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شبیر درانی بھی سنبھلنے کی کوشش میں تھا۔ دفعہ ”اس کی نظر منظور کے پستول پر پڑی جو اس سے صرف دو تین فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ اس نے لپک کر پستول اٹھالیا اور ٹھیک اس وقت جب منظور نے اس پر چھلانگ لگائی شبیر درانی نے پستول کا ٹرانزیکٹر دبا دیا۔

فائر کی آواز کے ساتھ منظور کے حلق سے بھیا تک جھج نکل۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر

دو قدم پیچھے ہٹا اور کہنے ہوئے درخت کی طرح دروازے کے قریب گرا۔  
شیردرانی اپنی جگہ پر بیٹھا متوحش نگاہوں سے منظور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے بننے والا  
خون اس کے چہرے اور گردن کو تر کرتا ہوا زمین پر ٹپک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جس سے  
اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔

کسی کو موت کے گھاٹ اتارنا شیردرانی کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس قتل نے اسے کچھ  
متوحش کر دیا تھا۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی  
طرف دیکھا پھر اسے جب میں ڈال لیا اور اٹھ کر منظور کے قریب آگیا تھا۔ گولی پیشانی کے عین وسط میں لگی  
تھی اور اس نے زندگی کو ایک لمحہ کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ وہ منظور کے لباس کی تلاش لینے لگا۔

منظور کی جیب سے صرف ساڑھے تین سو روپے برآمد ہوئے تھے۔ اس نے یہ رقم اپنی جیب میں ڈال لی  
اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں بعض چیزوں پر اس کی اگلیوں کے نشان ہو سکتے تھے، خصوصاً  
تھراپاس کپ پر، لیکن اب اسے ان نشانات کی پرواہ نہیں تھی۔ اگر وہ یہاں ہر چیز پر اپنی اگلیوں کے نشانات  
مٹا بھی دیتا تو اس قتل کا راز فاش ہونے کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا کہ قتل اسی نے کیا تھا۔ دلاور اور کبی اس کے  
گواہ ہو سکتے تھے۔

کمرے میں اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ باہر آگیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ سرمئی دھند لگا گھبراہٹ ہو رہا تھا۔ اس  
نے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر درختوں کے جھنڈے سے نکل کر گھیتوں میں ایک طرف چلنے لگا۔ اس نے  
اپنے سر پر بندھی ہوئی پٹی اتار کر پھینک دی تھی۔ اس کے سر کا زخم ٹھیک ہو چکا تھا۔ اور اس کے خیال میں  
اب پٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ یوں بھی سر پر پٹی دیکھ کر اسے دور سے ہی شناخت کیا جاسکتا تھا۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ سڑک پر نکل آیا۔ اس وقت رحیم یار خان کی طرف سے  
کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور  
روشنیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ شیردرانی کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری  
پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی ٹرک تھا۔ ٹرک جیسے ہی قریب پہنچا شیردرانی سڑک پر آگیا اور ٹرک کو روکنے کا اشارہ  
کرنے لگا۔ ٹرک کی رفتار کم ہو گئی اور پھر وہ اس کے قریب رک گیا۔

”کیا بات ہے بھئی... کون ہو تم؟“ ڈرائیور نے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ڈاکو میری کار چھین کر لے گئے ہیں۔ اگر تم مجھے پتہ عاقل تک...“

”پیچھے کبین میں بیٹھ جاؤ۔“ ڈرائیور نے اس کی بات کاٹ دی۔

ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اس کا کلینر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیورنگ کبین کے پیچھے ایک اور تنگ سا  
کبین تھا۔ شیردرانی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرک حرکت میں آگیا۔ کبین بہت تنگ  
سا تھا شیردرانی ٹانگیں سیدھی کر کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ سیٹ پر لیٹ گیا۔

یہ ٹرک غالباً کراچی جا رہا تھا۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر پشتوں میں باتیں کر رہے تھے ان کی آواز کو درمیان والی  
کمری سے صاف سنا جاسکتا تھا لیکن باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ شیردرانی آرام سے سیٹ پر لیٹا رہا۔

صادق آباد کے بیرونی اوڑے پر ٹرک تھوڑی دیر کے لئے رکا تھا۔ کنڈکٹر نے اتر کر غالباً ”سگریٹ خریدنے  
تھے۔ اس کے فوراً ہی بعد ٹرک حرکت میں آگیا تھا اور جب ٹرک پتہ عاقل پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے  
تھے۔ ٹرک رکتے ہی شیردرانی نیچے اتر آیا۔ اس نے ڈرائیور کو کرایہ دینے کی کوشش کی تھی مگر بھان

ایور نے اس سے پیسے نہیں لئے۔  
 ”تم ادھر کیا کرتا ہے صاب۔ اس جنگل میں؟ میرا مطلب ہے یہ تو بہت چھوٹا شہر ہے۔“ ڈرائیور نے

”میں یہاں فوج میں آفسر ہوں۔“ شبیر درانی نے جھوٹ بولا۔ ”ایک کام سے رحیم یار خان گیا تھا کہ  
 پسپا ہوا ڈاکوؤں نے راستہ روک لیا اور میری کار چھین کر لے گئے۔“  
 ”اللہ رحم کرے صاب۔ اس ملک میں ڈاکو بہت ہو گیا ہے۔ اچھا صاب، اللہ حافظ۔“ ڈرائیور نے کہتے

ہاتھ ہلایا اور ٹرک کو حرکت میں لے آیا۔  
 شبیر درانی بڑی مشکل سے راستہ تلاش کرتا ہوا جب الیاس کے مکان پر پہنچا تو رات کے بارہ بج چکے  
 تھے۔ اس کا ملازم اکیلا تھا۔ اس نے بتایا کہ الیاس میجر صاحب کے بنگلے میں بیٹھا آتش کھیل رہا ہے۔  
 ”اسے بلا کر لاؤ۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”یہ مت بتانا کہ میں آیا ہوں۔ صرف یہ کہنا کہ مہمان آئے  
 ہیں۔“  
 ”جی صاحب۔ میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔“ ملازم کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

الیاس تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد آیا تھا۔  
 ”تم؟“ وہ شبیر درانی کو دیکھتے ہی چونک گیا۔ ”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔“  
 ”میں کچھ عجیب سی صورت حال سے دوچار ہوں الیاس۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ شبیر

درانی نے کہا۔  
 ”تم جس قسم کی صورت حال سے دوچار ہو مجھے اس کا علم ہو چکا ہے۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کچھ کھانا وغیرہ  
 کی کیا کیا ہے یا نہیں؟“ الیاس نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ شبیر درانی نے مختصر سا جواب دیا۔

الیاس نے اپنے ملازم کو کھانا تیار کرنے کو کہا اور شبیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”آج دن میں پولیس تمہاری تلاش میں یہاں آئی تھی۔ کیا قصہ ہے؟“  
 ”اوہ!“ شبیر درانی چونک گیا پھر بولا۔ ”میں نے تمہیں ایک پولیس انسپکٹر کے قتل کے بارے میں بتایا تھا  
 اور تم نے اخبار میں بھی پڑھا تھا۔“

”ہاں... مجھے معلوم ہے اور تم نے کہا تھا کہ پولیس تمہیں اس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کرے  
 گی۔“ الیاس نے کہا۔

”ہاں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اور تم بھی جانتے ہو کہ ان دنوں میں رحیم یار خان سے باہر تھا لیکن ایک  
 پولیس انسپکٹر سے ذاتی رنجش کی بنا پر مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اس معاملے میں مجھے الجھانے کی کوشش کرے  
 گا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ اس روز یہاں سے جانے کے دوسرے دن میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔  
 میں ہسپتال ہی میں تھا کہ پولیس نے مجھے حراست میں لے لیا تھا۔ میری والدہ اس سلسلے میں کچھ بھاگ دوڑ  
 کر رہی تھیں لیکن کل رات پولیس کی وردی میں تین آدمی مجھے ہسپتال سے اغواء کر کے لے آئے۔ سارا  
 دن انہوں نے مجھے جنگل میں واقع ایک کوٹھری میں چارپائی سے باندھ کر رکھا۔ دو آدمی کسی کام سے چلے  
 گئے۔ شام کے وقت میں تیسرے آدمی کو دھوکا دے کر بھاگ نکلا۔ وہ کوٹھری سڑک سے تقریباً ”دو میل دور  
 تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح سڑک پر پہنچ گیا جہاں مجھے کراچی جانے والا ایک مال بردار ٹرک مل گیا جس کے

یہ میں یہاں پہنچ گیا۔“  
 ”تم نے یہاں آکر غلطی کی۔“ الیاس نے کہا۔ ”پولیس یہ سمجھے رہے ہیں کہ تم اپنے ساتھیوں کی مدد  
 پولیس کی حراست سے فرار ہوئے ہو۔ اس طرح پولیس کا یہ شبہ یقین میں بدل گیا ہے کہ اس انپکٹر کے  
 ساتھ ہی ہو۔“

”میں فرار نہیں ہوا مجھے اغواء کیا گیا تھا؟“ شبیر درانی نے جواب دیا۔  
 ”کون لوگ تھے وہ اور انہوں نے تمہیں اغواء کیوں کیا تھا؟“ الیاس نے پوچھا۔  
 ”میں انہیں نہیں جانتا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے انہوں نے میرے گھر والوں سے تاوان  
 دل کرنے کے لئے مجھے اغواء کیا ہو۔“

”اگر تم ان کے شکنجے سے بھاگ ہی نکلے تھے کہ تو تمہیں چاہئے تھا کہ رحیم یار خان جا کر اپنے آپ کو  
 پولیس کے حوالے کر دیتے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیتے۔“ الیاس نے کہا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”مجھ پر قتل کا الزام ہے۔ فرار کے الزام سے صورت  
 حال مزید سنگین ہو گئی ہے۔ مجھے اپنی صفائی کے لئے دو چار دن کا وقت چاہئے۔ اس کے بعد میں خود ہی پولیس  
 کے سامنے پیش ہو جاؤں گا۔ مجھے صرف دو چار روز کی مہلت چاہئے اگر تم۔“

”سوری درانی!“ الیاس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ پولیس یہاں ایک چکر  
 لگاتی ہے۔ تم نے شاید پولیس کو بتایا تھا کہ میرے پاس رہ کر گئے ہو۔ رحیم یار خان کی پولیس نے تمہاری  
 تلاش کے سلسلے میں یہاں کی پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا۔ یہاں کا انپکٹر شریف آدمی ہے مجھے بھی اچھی  
 طرح جانتا ہے۔ وہ یہاں اس طرح آیا تھا کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو سکے کہ کیوں آیا ہے۔ میری یہاں ایک  
 ماکہ ہے۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ تم یہاں موجود ہو تو تم سمجھ سکتے ہو کہ صورت حال کیا رخ اختیار کرے  
 گی۔ یہ فوجی علاقہ ہے۔ میرا سارا کاروبار فوج سے وابستہ ہے۔ یہاں سے تمہاری گرفتاری مجھے بھی تباہ  
 کرے گی۔ اس لئے میں تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔“

”بڑا مایوس کیا ہے تم نے مجھے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ اس کے لہجے میں واقعی بے حد مایوسی تھی۔  
 ”اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔“ الیاس نے کہا۔

”وہ کیا؟“ شبیر درانی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔  
 ”مجھ بچے میری ایک گاڑی کچھ سامان لینے کے لئے سکھر جا رہی ہے۔“ الیاس نے اس کی طرف  
 اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اگر چاہو تو سکھر چلے جاؤ۔ وہاں میرے ایک دوست کے پاس تمہاری رہائش کا  
 بندوبست بھی ہو جائے گا۔ میرا ڈرائیور تمہیں وہاں پہنچا دے گا۔“  
 شبیر درانی چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”نہیک ہے۔ مجھے صرف دو چار دن کی مہلت چاہئے اور... اور کچھ رقم کی ضرورت بھی ہوگی۔ میں  
 نہیں جلد ہی لوٹا دوں گا۔“

اسی دوران ملازم کھانا لے کر آیا۔ اس نے دو انڈوں کا آلیٹ اور تین روٹیاں بنائی تھیں۔ شبیر درانی  
 ادا شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ تینوں روٹیاں اور سارا آلیٹ چٹ کر گیا۔  
 ”اب تم آرام کرو۔ میں میرے صاحب کے ہاں جا رہا ہوں۔ وہاں تاش کی بازی جی ہوئی تھی۔ اگر کوئی  
 لانے آیا تو ان لوگوں کو تمہارے بارے میں پتہ چل جائے گا۔ میں ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“



ڈرائیور نے اس سے پیسے نہیں لئے۔

”تم ادھر کیا کرتا ہے صاب۔ اس جنگل میں؟ میرا مطلب ہے یہ تو بہت چھوٹا شہر ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”میں یہاں فوج میں آفیسر ہوں۔“ شبیر درانی نے جھوٹ بولا۔ ”ایک کام سے رحیم یار خان گیا تھا کہ واپسی پر ڈاکوؤں نے راستہ روک لیا اور میری کار چھین کر لے گئے۔“

”اللہ رحم کرے صاب۔ اس ملک میں ڈاکو بہت ہو گیا ہے۔ اچھا صاب، اللہ حافظ۔“ ڈرائیور نے کہتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور ٹرک کو حرکت میں لے آیا۔

شبیر درانی بڑی مشکل سے راستہ تلاش کرتا ہوا جب الیاس کے مکان پر پہنچا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس کا ملازم اکیلا تھا۔ اس نے بتایا کہ الیاس بحیر صاحب کے جنگلے میں بیٹھا آتش کھیل رہا ہے۔

”اے بلا کر لاؤ۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”یہ مت بتانا کہ میں آیا ہوں۔ صرف یہ کہنا کہ مہمان آئے ہیں۔“

”جی صاحب۔ میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔“ ملازم کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

الیاس تقریباً آدھے گھنٹے بعد آیا تھا۔

”تم؟“ وہ شبیر درانی کو دیکھتے ہی چونک گیا۔ ”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔“

”میں کچھ عجیب سی صورت حال سے دوچار ہوں الیاس۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”تم جس قسم کی صورت حال سے دوچار ہو مجھے اس کا علم ہو چکا ہے۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کچھ کھانا وغیرہ بھی کھایا ہے یا نہیں؟“ الیاس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ شبیر درانی نے مختصر سا جواب دیا۔

الیاس نے اپنے ملازم کو کھانا تیار کرنے کو کہا اور شبیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آج دن میں پولیس تمہاری تلاش میں یہاں آئی تھی۔ کیا قصہ ہے؟“

”اوہ!“ شبیر درانی چونک گیا پھر بولا۔ ”میں نے تمہیں ایک پولیس انسپکٹر کے قتل کے بارے میں بتایا تھا نا اور تم نے اخبار میں بھی پڑھا تھا۔“

”ہاں... مجھے معلوم ہے اور تم نے کہا تھا کہ پولیس تمہیں اس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کرے گی۔“ الیاس نے کہا۔

”ہاں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”اور تم بھی جانتے ہو کہ ان دنوں میں رحیم یار خان سے باہر تھا لیکن ایک پولیس انسپکٹر سے ذاتی رنجش کی بناء پر مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اس معاملے میں مجھے الجھانے کی کوشش کرے گا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ اس روز یہاں سے جانے کے دوسرے دن میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

میں ہسپتال ہی میں تھا کہ پولیس نے مجھے حراست میں لے لیا تھا۔ میری والدہ اس سلسلے میں کچھ بھاگ دوڑ کر رہی تھیں لیکن کل رات پولیس کی وردی میں تین آدمی مجھے ہسپتال سے اغواء کر کے لے آئے۔ سارا دن انہوں نے مجھے جنگل میں واقع ایک کوٹھری میں چارپائی سے باندھ کر رکھا۔ دو آدمی کسی کام سے چلے گئے۔ شام کے وقت میں تیسرے آدمی کو دھوکا دے کر بھاگ نکلا۔ وہ کوٹھری سڑک سے تقریباً دو میل دور تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح سڑک پر پہنچ گیا جہاں مجھے کراچی جانے والا ایک مال بردار ٹرک مل گیا جس کے

ارہیے میں یہاں پہنچ گیا۔  
 ”تم نے یہاں آکر غلطی کی۔“ الیاس نے کہا۔ ”پولیس یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ تم اپنے ساتھیوں کی مدد  
 ہے پولیس کی حراست سے فرار ہوئے ہو۔ اس طرح پولیس کا یہ شبہ یقین میں بدل گیا ہے کہ اس انسپکٹر کے  
 قاتل تم ہی ہو۔“

”میں فرار نہیں ہوا مجھے اغواء کیا گیا تھا؟“ شبیر درانی نے جواب دیا۔  
 ”کون لوگ تھے وہ اور انہوں نے تمہیں اغواء کیوں کیا تھا؟“ الیاس نے پوچھا۔  
 ”میں انہیں نہیں جانتا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے انہوں نے میرے گھروالوں سے تاوان  
 وصول کرنے کے لئے مجھے اغواء کیا ہو۔“

”اگر تم ان کے ٹکٹے سے بھاگ ہی نکلے تھے کہ تو تمہیں چاہئے تھا کہ رحیم یار خان جا کر اپنے آپ کو  
 پولیس کے حوالے کر دیتے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیتے۔“ الیاس نے کہا۔  
 ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”مجھ پر قتل کا الزام ہے۔ فرار کے الزام سے صورت  
 حال مزید سنگین ہو گئی ہے۔ مجھے اپنی صفائی کے لئے دو چار دن کا وقت چاہئے۔ اس کے بعد میں خودی پولیس  
 کے سامنے پیش ہو جاؤں گا۔ مجھے صرف دو چار روز کی مہلت چاہئے اگر تم۔۔۔“

”سوری درانی!“ الیاس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ پولیس یہاں ایک چکر  
 لگا چکی ہے۔ تم نے شاید پولیس کو بتایا تھا کہ میرے پاس رہ کر گئے ہو۔ رحیم یار خان کی پولیس نے تمہاری  
 تلاش کے سلسلے میں یہاں کی پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا۔ یہاں کا انسپکٹر شریف آدمی ہے مجھے بھی اچھی  
 طرح جانتا ہے۔ وہ یہاں اس طرح آیا تھا کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو سکے کہ کیوں آیا ہے۔ میری یہاں ایک  
 ماہ ہے۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ تم یہاں موجود ہو تو تم سمجھ سکتے ہو کہ صورت حال کیا رخ اختیار کرے  
 گی۔ یہ فوجی علاقہ ہے۔ میرا سارا کاروبار فوج سے وابستہ ہے۔ یہاں سے تمہاری گرفتاری مجھے بھی تباہ  
 لڑے گی۔ اس لئے میں تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔“

”بڑا مایوس کیا ہے تم نے مجھے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ اس کے لمبے میں واقعی بے حد مایوسی تھی۔  
 ”اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔“ الیاس نے کہا۔

”وہ کیا؟“ شبیر درانی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔  
 ”صبح پانچ بجے میری ایک گاڑی کچھ سامان لینے کے لئے سکھر جا رہی ہے۔“ الیاس نے اس کی طرف  
 اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اگر چاہو تو سکھر چلے جاؤ۔ وہاں میرے ایک دوست کے پاس تمہاری رہائش کا  
 انتظام بھی ہو جائے گا۔ میرا ڈرائیور تمہیں وہاں پہنچا دے گا۔“

شبیر درانی چند لمبے خاموش رہا پھر بولا۔  
 ”تھیک ہے۔ مجھے صرف دو چار دن کی مہلت چاہئے اور۔۔۔ اور کچھ رقم کی ضرورت بھی ہوگی۔ میں  
 تمہیں جلد ہی لوٹا دوں گا۔“

اسی دوران ملازم کھانا لے کر آیا۔ اس نے دو اینڈوں کا آلیٹ اور تین روٹیاں بنائی تھیں۔ شبیر درانی  
 اپنی شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ تینوں روٹیاں اور سارا آلیٹ چٹ کر گیا۔

”اب تم آرام کرو۔ میں میجر صاحب کے ہاں جا رہا ہوں۔ وہاں تاش کی بازی جی ہوئی تھی۔ اگر کوئی  
 بلائے آگیا تو ان لوگوں کو تمہارے بارے میں پتہ چل جائے گا۔ میں ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“

الیاس نے کہا۔

الیاس چلا گیا۔ شیردرانی ڈرانگ روم ہی میں صوفے پر لیٹ گیا۔ اس کی حالت اگرچہ خاصی ابتر ہو رہی تھی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پولیس کے ساتھ اب دلاور اور بکی بھی اس کی تلاش شروع کر دیں گے۔ اس نے ان کا ایک بندہ مار دیا تھا۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اسے امید تھی کہ الیاس کے ہاں اسے پناہ مل جائے گی مگر الیاس نے اسے ہری جھنڈی دکھادی تھی۔ وہ ایک لحاظ سے دلاور اور بکی کا شکر گزار تھا جنہوں نے اسے پولیس کی حراست سے اغواء کیا تھا۔ اگر وہ اسے ہسپتال سے نہ نکالتے تو شاید وہ پولیس کے شکنجے سے نجات نہ حاصل کر سکتا۔ لیکن اب وہ دو طرف سے گھر گیا تھا۔ ایک طرف پولیس تھی اور دوسری طرف دلاور اور بکی۔ لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ الیاس نے اس کا سکھر میں اپنے ایک دوست کے ہاں دو چار روز کے لئے بندوبست کر دیا تھا۔

ڈیڑھ بجے الیاس واپس آ گیا۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ الیاس بھی ڈرانگ روم ہی میں دوسرے صوفے پر لیٹ کر اوکھ گیا تھا۔ چار بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شیردرانی اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ الیاس اپنے بید روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی ایک پینٹ شرٹ لے آیا۔ ”ہم دونوں کے قد و قامت تقریباً“ ایک جیسے ہی ہیں۔“ وہ شیردرانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نہا کر یہ کپڑے پہن لو۔ تمہیں پورے آجائیں گے۔“

شیردرانی اٹھ کر صوفے پر کچھ دیر بیٹھا رہا پھر کپڑے اٹھا کر دوسرے بید روم کے غسل خانے میں گھس گیا۔ الیاس کے کپڑے اسے پورے ہی آگئے تھے۔ ”لو یہ رکھ لو۔“ الیاس نے کچھ کرنسی نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ڈھائی ہزار روپے ہیں۔ اس وقت میرے پاس اتنی ہی رقم ہے۔“

شیردرانی نے شکریہ کہتے ہوئے رقم لے کر جیب میں ڈال لی۔ ٹھیک پانچ بجے ایک گاڑی دروازے پر آکر رکی۔ ملازم نے دروازہ کھولا اور الیاس کا ایک فٹشی اندر آ گیا۔

”اکرام! یہ میرے دوست ہیں۔ تمہارے ساتھ سکھر جائیں گے۔ انہیں وشواتا تھ کے پاس پہنچا دینا اور کہنا کہ یہ چند روز اس کے مسمان رہیں گے۔ ان کا خیال رکھے۔“ الیاس نے اپنے فٹشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جی بہتر ہے۔“ اکرام نے جواب دیا۔ شیردرانی اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ ڈبل کیبن والی ٹیوٹا ٹیک اپ تھی۔ اکرام ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور شیردرانی پچھلے کیبن کی سیٹ پر۔ یہ سیٹ کافی کشادہ اور آرام دہ تھی۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا رہا اور پھر اسے اوکھ سی آنے لگی۔ وہ سیٹ پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ہو گا۔ زوردار جھٹکوں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے دونوں طرف کی کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ وہ دریائے سندھ کا برج عبور کر کے سکھر شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ سڑک اس طرح ٹوٹی پھوٹی تھی جیسے وہ غلطی سے چاند کی سطح پر پہنچ گئے ہوں۔ ہر چند گز کے بعد گڑھے بڑے ہوتے تھے۔

شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے گاڑی ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گئی۔ اس سڑک کے دونوں طرف

رہائشی بنگلے تھے۔ گاڑی ایک گلی میں گھوم کر ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ اکرام گاڑی سے اتر کر بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا اور کال بیل بجا کر انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد گیٹ کھلا اور ایک ادیب عمر آدمی باہر آگیا۔ وہ لباس اور طے ہی سے سو فیصد ہندو لگ رہا تھا۔

”مہنجا سر... کھوڑی کے پچھلے حصے پر ایک موٹی سی چٹیا جو اس کی گردن کے قریب سے ہوتی ہوئی اس کے کندھے کو چھو رہی تھی۔ ماتھے پر کشتہ، چوہے کی دم کی طرح ہونٹوں کے دونوں طرف لگی ہوئی مونچھیں، ایک کان میں سونے کی بالی، جسم پر بنیان اور مخصوص انداز میں بندھی ہوئی سفید دھوٹی، پیروں میں اسفنج کی چپل۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اکرام کو پر نام کیا۔

”دشوانا تھ جی کہاں ہیں بھولے؟“ اکرام نے پوچھا۔

”وہ تو صبح سویرے شکار پور چلے گئے ہیں۔ شام کو لوٹیں گے۔“ بھولے ناتھ نے جواب دیا۔

”اچھا سن بھولے۔“ اکرام نے کہا۔ ”یہ الیاس صاحب کے دوست ہیں۔ بنو عاقل سے آئے ہیں۔“

اس نے مڑ کر شیردرانی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دو چار دن یہاں مہمان رہیں گے۔ ان کی خدمت داری میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہئے۔ دشوانا تھ جی کو بتا دیتا۔ یہ ان کے بہت قریبی دوست ہیں۔“

”فکرمت کرو اکرام بھائی۔“ بھولا بولا۔ ”مہمان آئے ہیں۔ دھن بھاگ ہمارے۔“ وہ گیٹ سے نکل کر گاڑی کے قریب پہنچ گیا اور شیردرانی کو پر نام کرتے ہوئے بولا۔ ”پدھاریے مہاراج۔ آپ آئے ہیں۔ ہمارے بھاگ جاگ اٹھے۔“

شیردرانی گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اکرام نے اسے بتا دیا کہ دشوانا تھ شکار پور گیا ہوا ہے شام تک آجائے گا۔ اس دوران بھولا ناتھ اس کا خیال رکھے گا۔ اکرام گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شیردرانی بھولا ناتھ کے ساتھ اندر آگیا۔ بہت شاندار بنگلہ تھا۔ پورچ میں سفید رنگ کی ایک نئی شیراؤ کھڑی تھی۔ بھولا ناتھ، شیردرانی کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ڈرائنگ روم بھی قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک بہت بڑی تصویر آویزاں تھی۔ سنہری فریم میں اس تصویر کو دیکھ کر شیردرانی ایک لمحہ کورکا۔

”یہ ٹھاکر مندر ناتھ کی مورتی ہے جی۔“ بھولے نے شیردرانی کو تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

”دشوانا تھ جی کے پتا جی۔ پچھلے سال ان کا انت ہو گیا تھا۔“

شیردرانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تصویر سے نظریں ہٹا کر کمرے میں آراستہ فرنیچر کو دیکھنے لگا۔ یہ فرنیچر دیکھ کر ہی دشوانا تھ کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

”یہ تمہارے دشوانا تھ کیا کرتے ہیں؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے بھولے کی طرف دیکھا۔

”سرکاری محکموں کو مال سپلائی کریں جی۔ بھگوان کا بڑا کرم ہے، بڑی سکھی ہیں اپنے دشوانا تھ

جی۔“ بھولا ناتھ نے جواب دیا۔

”باہر جو گاڑی کھڑی ہے انہی کی ہے؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”جی سرکار، دو گاڑیاں ہیں ایک پر وہ شکار پور گئے ہیں۔“ بھولا ناتھ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی

کے بعد بولا۔ ”آپ نہادو بھیجئے سرکار۔ میں آپ کے لئے ناشتہ تیار کرواتا ہوں۔ آئیے میں آپ کو غسل

خانہ دکھا دوں۔“

شیردرانی اس کے ساتھ ایک اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔ مگر دو سراقدم اٹھاتے ہی وہ ٹھک کر

رک گیا۔ رابداری میں سامنے والے کمرے سے ایک لڑکی باہر نکلی تھی۔ اس کا حسن و شباب دیکھ کر شبیر درانی کے دماغ میں چیونٹیاں سی ریگنے لگیں۔ اس نے گھاگھا اور مختصر سا بلاؤز پہن رکھا تھا شبیر درانی ایک عیاش آدمی تھا اس کی زندگی میں حسین سے حسین تر لڑکیاں آئی تھیں لیکن ایسی حسین لڑکی اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کی عمر بیس اکیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

”یہ چندو ہے سرکار۔“ بھولا ناتھ نے بتایا۔ ”یہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کے ماں باپ اسے چھوڑ کر سو گمبشتی ہو گئے تھے۔ اسے بڑے ٹھاکر جی نے پالا ہے۔ گھر کا سارا کام ہی سنبھالے ہوئے ہے۔“

”گھر میں تم دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی ہے؟ میرا مطلب ہے وشواناتھ کی بیگم یا بچے وغیرہ۔“ شبیر درانی نے پوچھا۔ اس کی نظریں اب بھی چندو پر مرکوز تھیں۔

”چھوٹے سرکار کی شادی کو تین سال ہو گئے سرکار مگر بھگوان نے ابھی اس گھر میں بالکوں کی رونق نہیں دی۔ بیگم صاحبہ بھی چھوٹے سرکار کے ساتھ شکار پور گئی ہیں وہاں کسی کی سگائی ہے جی۔ وہ لوگ رات تک آجائیں گے۔“ بھولا ناتھ نے کہا پھر چندو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ چھوٹے سرکار کے دوست ہیں چندو۔ دو چار دن یہیں رہیں گے۔ یہ ابھی نہانے جا رہے ہیں تو ان کے لئے ناشتہ بنا۔“

چندو کچھ کئے بغیر کچن کی طرف چلی گئی۔ شبیر درانی، بھولا ناتھ کے ساتھ ایک بیڈ روم میں آگیا۔ وہ ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ غسل خانہ ہے سرکار۔ آپ غسل کر لیجئے۔ اتنے میں ناشتہ تیار ہو جاتا ہے۔“

شبیر درانی ہاتھ روم میں گھس گیا۔ چندو بیس منٹ بعد جب وہ نما کر باہر نکلا تو اپنے آپ کو بے حد تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آگیا کچھ ہی دیر بعد چندو ٹرائل دھمکیاتی ہوئی آگئی۔ اس نے میز پر ناشتہ لگا دیا۔ شبیر درانی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں ہوس نمایاں تھی۔ چندو میز پر ناشتہ لگا کر جلد ہی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

شبیر درانی نے بڑے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ اسی دوران بھولا ناتھ بھی اس کے پاس آکر قالین پر بیٹھ گیا۔ شبیر درانی اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ کرید کرید کر وشواناتھ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد بھولا برتن اٹھا کر لے گیا اور دوبارہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کی باتوں سے شبیر درانی نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ بہت سیدھا سادہ آدمی ہے۔ بات بات میں وہ بے رام جی کا نعرو لگا رہا تھا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد شبیر درانی سو گیا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کا پروگرام یہ تھا کہ تھوڑی دیر یہاں رکنے کے بعد کراچی کی طرف چلا جائے گا۔ کیونکہ اس کے خیال میں یہاں بھی اس کا رہنا ٹھیک نہیں تھا مگر چندو کو دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی تھی اور اس نے چند روز یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رات آٹھ بجے کے قریب شکار پور سے وشواناتھ کا فون آگیا۔ اس نے بھولا ناتھ کو بتایا کہ وہ آج رات نہیں آئیں گے۔ بھولا ناتھ نے بھی بتادیا کہ پتو عاقل سے الیاس کا دوست آیا ہوا ہے۔ وشواناتھ نے اس کی خدمت خاطر کی ہدایت کردی تھی۔ شبیر درانی کو جب یہ پتہ چلا کہ وشواناتھ رات کو واپس نہیں آ رہا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”سرکار... آپ کو دارو کا شوق ہو تو...“ بھولا ناتھ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”الیاس صاحب جب بھی یہاں آتے ہیں تو چھوٹے سرکار کے ساتھ بیٹھ کر رات بھر شغل کرتے

ہیں۔“

”میںے کو مل جائے گی؟“ شبیر درانی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔  
 ”بالکل مل جائے گی سرکار۔“ بھولا ناتھ مسکراتے ہوئے بولا۔  
 شبیر درانی نے جیب سے پانچ سوکانوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔  
 ”جاؤ... بڑھیا سی چیز لے کر آؤ۔ باقی پیسے تم رکھ لینا۔“

بھولا ناتھ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نوٹ مٹھی میں دبایا اور خاموشی سے  
 انرنگ روم سے نکل گیا۔ شبیر درانی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چشم تصور  
 چندو کو دیکھ رہا تھا۔

تقریباً ”ایک گھنٹے بعد بھولا ناتھ شراب کی دو بوتلیں لے کر آگیا۔ وہ سکی پاکستانی تھی لیکن لیبل لندن کا  
 لگا ہوا تھا۔ ملک میں شراب پر اگرچہ پابندی تھی۔ لیکن ہندوؤں اور دیگر غیر مسلموں کو کچھ سولتیں حاصل  
 تھیں۔ یوں بھی وہ جانتا تھا کہ کون سی چیز تھی جو اس ملک میں نہیں مل سکتی تھی۔ بھولا ناتھ نے بوتلیں میز پر  
 رکھ دیں اور اندر سے دو گلاس اور پانی کا جگ اٹھالایا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ شبیر درانی نے چندو کے سلسلے میں ایک منصوبہ بنالیا تھا۔  
 مہلا ناتھ اس کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا تھا لیکن شراب کی بات کر کے اس نے یہ مسئلہ بھی خود ہی حل  
 کر لیا تھا۔

”چندو کہاں ہے؟ وہ سو گئی کیا؟“ شبیر درانی نے دونوں گلاسوں میں شراب اندیلنے ہوئے کہا۔ اپنے  
 گلاس میں اس نے پانی ملا لیا تھا جبکہ بھولا ناتھ کو بغیر پانی ملائے شراب دی تھی۔  
 ”وہ سو گئی سرکار۔“ بھولا ناتھ نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بیکم صاحبہ گھر پر ہوتی ہیں تو اسے دیر  
 لگ جاتا پڑتا ہے۔ آج جلدی سو گئی۔“ اس نے جگ اٹھا کر اپنے گلاس میں پانی ڈالنا چاہا مگر شبیر درانی نے  
 اس کے ہاتھ سے جگ لے لیا۔

”اگر مزہ لینا چاہتے ہو تو بغیر پانی کے پیو۔“ وہ بولا۔

”بہت تیز ہے سرکار۔“ بھولا ناتھ بولا۔

”اسی میں تو مزہ ہے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

وہ کھونٹ کھونٹ شراب پیتے رہے۔ شبیر درانی اسے زیادہ سے زیادہ شراب پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔  
 مہلا ناتھ بھی بڑا سخت ثابت ہوا تھا۔ لیکن ڈیڑھ بجے کے قریب وہ ادھر ادھر جھومنے لگا۔ اور بالا خرپانچ دس  
 اسی گلاسوں پر لڑھک گیا۔ شبیر درانی کو یقین تھا کہ اب وہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ اس نے  
 ”اٹا“ اسے بلا جلا کر دیکھا۔ بھولا ناتھ اٹا غصیل ہو چکا تھا۔

شبیر درانی ڈرائنگ روم سے نکل کر رباری میں آگیا۔ اس نے اگرچہ بہت کم شراب پی تھی لیکن ہلکا  
 اٹا طاری ہونے لگا تھا۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ چندو کس کمرے میں تھی۔  
 دروازہ بند تھا۔ شبیر درانی نے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ سے کھمایا۔ اندر سے لاک نہیں لگا ہوا  
 دروازہ آہستہ سے کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں نیلی روشنی کا ناٹ بلب جل رہا تھا۔ سامنے ہی پتنگ پر چندو  
 بٹل بٹل تھی۔ شبیر درانی نے بڑی آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور آہستہ آہستہ پتنگ کی طرف بڑھنے لگا۔

بٹل بٹل روشنی میں سوئی ہوئی چندو پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔  
 شبیر درانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کے دماغ میں آنندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ پتنگ کے

قریب رک کر کچھ دیر چندو کو دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس پر جھکے لگا۔

یہ شاید چندو کی پھٹی حس تھی جس نے اسے نیند میں بھی خبردار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے شیردرانی کو اپنے اوپر جھکے دیکھا تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر شیردرانی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے دبوچ لیا۔

چندو اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بری طرح جھل رہی تھی۔ مگر شیردرانی نے اسے کسی جنگلی درند کی طرح دبوچ رکھا تھا۔ وہ اس کے پنجے میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ دونوں پلنگ پر ایک دوسرے سے محکم ہوتے ہوئے نیچے گرے۔ چندو ایک لمحہ کو اس کی گرفت سے نکلی تھی۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش مگر شیردرانی نے لپک کر اسے پھر دبوچ لیا۔

ان دونوں میں بہت دیر تک دھینگا مشتی جاری رہی اور بالاخر چندو کی مزاحمت جواب دینے لگی۔ شیردرانی نے اسے قائلین پر گر لیا۔ چندو نے آخری مرتبہ جدوجہد کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

چندو لٹ گئی۔ اس نے نجانے کیسے کیسے سہانے خواب دیکھے تھے۔ کیا کیا ارمان تھے اس کے دل میں مگر اس شیطان نے سب کچھ پامال کر دیا تھا۔ وہ قائلین پر پڑی آنسو بہا رہی تھی۔ شیردرانی اسے چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب چندو کچھ نہیں کرے گی۔

شیردرانی کچھ دیر تک چندو کے قریب قائلین پر پڑا رہا۔ پھر اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک اور طرز ابھرا۔ اس نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور دشوئاتھ والے بیڈروم میں آگیا۔ اور ان کی الماریاں کھول کر دیکھنے لگا۔ اسے الماریوں کے تالے توڑنے پڑے تھے۔ ایک الماری کی لاکر والی دراز میں اسے نوٹوں کا بڈل مل گئے۔ اس نے تمام بڈل نکال لئے۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ رقم پچاس ساٹھ ہزار روپے کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی۔

شیردرانی جو کچھ بھی کر رہا تھا یہ اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ اس جیسے شخص سے کبھی نیکی یا اچائی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہاں یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی حرکتوں کا خفیہ اس کے دوست الیاں کو بھگتنا پڑے گا۔ لیکن وہ تو دوستی کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا تھا۔ یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اس کی جھوٹی کمائی سن کر الیاں اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کا تھا۔ دشوئاتھ اس کا محسن تھا جس نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا اور اس کی آمد کے بارے میں سن کر اپنے نوکر کو ہدایت کی تھی کہ اس کی خدمت خاطر میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ لیکن شیردرانی افراموش ہی نہیں محسن کش بھی تھا۔

وہ دوسری الماری کی تلاشی لینے لگا۔ یہ دشوئاتھ کی بیوی کی الماری تھی۔ اس میں زنانہ لمبوساں ہوئے تھے۔ اس کا لاکر والا دراز کھولنے میں بھی اسے دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ دراز کھولتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دشوئاتھ اپنی بیوی کے ساتھ کسی کی سگائی پر گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی زیور وغیرہ لے کر گئی ہوگی لیکن دراز میں بھی طلائی زیورات کے تین سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ دو ہیروں کے اور چار پانچ ہیروں کی انگوٹھیاں اس کے علاوہ تھیں۔ لاکر میں کچھ رقم بھی تھی۔

شیردرانی یہ سب کچھ سمیٹ ہی رہا تھا کہ اپنے عقب میں آہٹ سن کر چونک گیا۔ اس نے تیز مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ چندو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے سیدھے ہاتھ میں تیز دھار والی چھری تھی۔ اس کا ہاتھ وار کرنے کے انداز میں اوپر اٹھا ہوا تھا۔

آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کا سیدھا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا ہونے کی وجہ سے اس کے جسم کے اعضاء تنے ہوئے تھے۔

شیردرانی گھوم کر سنبھلا بھی نہیں تھا کہ چندو نے چھری سے اس پر حملہ کر دیا۔ شیردرانی ایک ہاتھ سے اس کا وار روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹا مگر وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ چھری اس کی دائیں کلائی سے ذرا اوپر چر کا لگاتی ہوئی نکل۔ چندو بھی اپنی جھونک میں آئے نکل گئی تھی لیکن وہ سنبھل کر فوراً ہی مڑی۔

”مم... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی پاجی۔“

چندو نے ایک بار پھر شیردرانی پر حملہ کر دیا۔ مگر وہ اس مرتبہ تیار تھا اس نے چندو کی چھری والی کلائی پکڑ لی اور اسے پوری قوت سے مروڑنے لگا۔ نازک اندام عورت ہونے کے باوجود چندو میں اس وقت بے پناہ طاقت آگئی تھی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر شیردرانی اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے زور دار جھٹکا دیا۔ چندو لڑکھڑا کر گری۔ چھری ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی اور کلائی شیردرانی کی گرفت میں۔ شیر نے کرتے ہوئے اس کی کلائی موڑ دی تھی۔ چندو اس طرح گری کہ چھری اس کے سینے میں پیوست ہو گئی اس کے منہ سے چیخ نکلی مگر شیردرانی نے بڑی پھرتی سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کا منہ دبایا تھا۔

چندو قالین پر اوڑھ لی بڑی تھی۔ جسم کے بوجھ کی وجہ سے چھری دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ تڑپ رہی تھی مگر شیردرانی نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو مروڑ کر نہ صرف پشت پر لگا رکھا تھا بلکہ اس کی پشت پر کھٹنے کا دباؤ بھی ڈال رکھا تھا تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ چندو کے جسم کے نیچے قالین پر خون پھیلتا جا رہا تھا۔

شیردرانی نے چندو کو اس وقت تک دبائے رکھا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہو گئی پھر وہ اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا اپنا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سانس درست کرتا رہا پھر اس نے چندو کو سیدھا کیا۔ چھری چندو کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ چندو کی آنکھیں مکلی ہوئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شیردرانی کو دیکھ رہی ہو۔

شیردرانی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کمرے سے نکل کر تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ بھولا ناٹھ قالین پر اٹھا غصیل پڑا تھا۔ شیردرانی باہر والے دروازے کے قریب آ کر کچھ اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ فضا میں گہرا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں کبھی کبھار علاقے کے چوکیدار کی سیٹی کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

وہ دوبارہ بیڈ روم میں آ گیا۔ اس نے رقم اور تمام زیورات سمیٹ کر ایک تھیلے میں ڈال لئے اور ایک اور خیال کے تحت اس نے دوبارہ دشواناٹھ والی الماری کھول لی اور اس میں ٹھکے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے ایک پینٹ شرٹ نکال لی اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ دشواناٹھ غالباً اسی کے قد و قامت کا تھا۔

شیردرانی نے اپنے کپڑے اتار کر قالین پر پھینک دیئے اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔ جب وہ ناکر باہر نکلا تو اپنے آپ کو بالکل تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اس نے دشواناٹھ والے کپڑے پہنے اور ڈرائنگ روم میں ٹھیک ٹھاک سامنے کھڑے ہو کر بال بنانے لگا۔ وہ بڑا پرسکون نظر آ رہا تھا حالانکہ اس وقت وہ ٹھنڈی ترین صورت حال



سے دو چار تھا اور اس کے سامنے ایک لاش پڑی تھی۔ اس نے نکٹھا ڈرننگ ٹیبل پر پھینک دیا اور ڈرننگ ٹیبل کی درازوں کی تلاشی لینے لگا۔ اوپر والی دراز میں اسے گاڑی کی چابیاں مل گئیں۔ اس نے چابیوں کا رنگ اٹھایا، رقم اور زیورات والا تھیلا سنبھالا اور چندوں کی لاش پر نگاہ ڈالتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ڈرائنگ روم میں آکر اس نے بھولانا تھ کی طرف دیکھا۔ اسی لمحہ اس نے کسمسا کر کوٹ بدلی تھی۔ شیردرانی باہر والا دروازہ کھول کر پورچ میں آگیا۔

چوکیدار کی سیٹی کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی تھی۔ وہ پورچ کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی کے پاس آگیا اور دروازہ کھول کر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ڈیش بورڈ کے ڈائلز کا جائزہ لیتا رہا۔ فیول بتانے والی سوئی بتا رہی تھی کہ ٹنکی میں مناسب مقدار میں پٹرول موجود تھا۔ اس نے انجن اشارت کر دیا پھر نیچے اتر کر باہر کا گیٹ کھولا، گاڑی کو باہر نکالا اور گیٹ بند کر کے دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحہ گاڑی جنگلوں والی گلیوں سے نکل کر سڑک پر آگئی۔

وہ کئی سڑکوں پر گھومتا ہوا ایک چوراہے پر آگیا۔ وہ اگرچہ ایک آدھ بار پہلے بھی کام کے سلسلے میں سکر آچکا تھا لیکن اس وقت اسے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کراچی جانے کے لئے وہ کون سا راستہ اختیار کرے۔ دن کا وقت ہوتا تو وہ کسی سے پوچھ بھی سکتا تھا لیکن اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس نے چوک کے قریب گاڑی روک لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر پولیس کی کسی ہشتی پارٹی نے اسے روک لیا تو اس کے لئے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ اس نے چوک پر ایک لمحہ کو گاڑی روکی اور اسے بائیں طرف موڑ دیا جہاں کافی فاصلے پر تیز روخیاں نظر آ رہی تھیں۔

اس طرف تقریباً "ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک پیٹرول پمپ پر پہنچ گیا۔ اس پیٹرول پمپ پر چوبیس گھنٹے سروس دستیاب تھی۔ شیردرانی نے گاڑی پیٹرول پمپ کی حدود میں موڑ کر ایک پمپ کے سامنے روک دی۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ایک ملازم وہاں آگیا۔

"ٹنکی خل کر دو!" شیردرانی نے کہا اور پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی جیب خالی تھی۔ پھر دفعاً "اسے یاد آگیا کہ اس نے پتو عاقل میں الیاس سے جو ڈھائی ہزار روپے لئے تھے ان میں سے پانچ سو روپے تو بھولانا تھ کو شراب لانے کے لئے دے دیئے تھے اور باقی رقم اسی لباس میں تھی۔ منظور کو قتل کرنے کے بعد اس کی جیب سے جو تھوڑی سی رقم نکالی تھی وہ بھی اسی قبض کی جیب میں تھی جو اس نے اتار کر دشوانا تھ کے بیڈ روم میں پھینک دی تھی۔ اس نے یہ لباس دشوانا تھ کی الماری سے نکال کر پہنا تھا۔ دشوانا تھ کی الماری سے نکلنے والی ہزاروں روپے کی رقم اور زیورات کا تھیلا اس نے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دیا تھا۔ اس نے پیٹرول پمپ کے ملازم کی طرف دیکھا وہ ٹنکی میں پیٹرول ڈالنے میں مصروف تھا۔ شیردرانی نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر بڑی احتیاط سے اس میں سے تھیلا نکالا اور چند نوٹ نکال کر تھیلا دوبارہ ڈیش بورڈ میں ڈال دیا۔ پیٹرول پمپ کے ملازم نے پیٹرول بھرنے کے بعد ٹنکی کا کپ بند کیا اور چابی درانی کی طرف بڑھا دی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کتنے پیسے ہوئے؟ ٹنکی خل کر دی نا؟" شیردرانی نے پوچھا۔

"ایک سو ستر روپے جناب۔" ملازم نے جواب دیا۔

شیردرانی نے سو سو کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور ملازم کو عجیب سی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟“  
 ”یہ گاڑی...“ ملازم بولا۔ ”ٹھاکر دشنا تھ کی ہے نا جناب؟“  
 ”ہاں اسی کی ہے۔ میں نے ایک دو دن کے لئے اس سے مستعار لے رکھی ہے۔ وہ میرا دوست ہے  
 لیکن تم نے گاڑی کو خوب پہچانا۔“ شبیر درانی بولا۔

”ٹھاکر صاحب اپنی گاڑیوں میں اکثر بیس سے پیٹرول ڈلواتے ہیں جناب۔“ ملازم نے کہا۔  
 ”شاید۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”وہ دوسری گاڑی لے کر شکار پور گئے ہوئے ہیں۔ وہاں کسی کی سگائی  
 ہے۔ یہ گاڑی میں نے کل شام ہی ان سے لی تھی اور ہاں... میں چاندنی رات میں لمبی ڈرائیو کا شوقین ہوں۔  
 طر پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ مجھے راستوں کا علم نہیں ہے۔ کراچی کی طرف جانے والی سڑک کس طرف ہے۔“  
 ”یہ سڑک تو شکار پور جاتی ہے صاحب۔“ ملازم نے جواب دیا۔ ”آپ یوں کریں۔“  
 وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے کراچی کی طرف لے جانے والی سڑک کا آسان راستہ سمجھانے  
 لگا۔ ”وہ خیر پور روڈ ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”سڑک اتنی اچھی نہیں ہے۔ آپ کو ڈرائیو کا مزہ نہیں آئے گا۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ وقت تو گزر جائے گا رات کو جب مجھے خند نہیں آتی تو اسی طرح لمبی ڈرائیو پر نکل  
 جاتا ہوں۔“ شبیر درانی نے کہا اور پیٹرول پمپ کی حدود سے گاڑی نکال کر اس کے بتائے ہوئے راستے پر

موڑ دی۔  
 شہر سے نکلنے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ بہترین کار تھی۔ انجن بھی بہترین حالت میں تھا۔ سڑک  
 اگرچہ پختہ تھی لیکن اس پر چاند کی سطح کی طرح کڑھے بڑے ہوئے تھے۔ سڑک ناہموار ہونے کے باوجود وہ  
 پور رفتاری سے گاڑی چلا رہا۔ یہ سڑک خیر پور ٹکٹ ڈبھی رانی پور، نوشہرہ فیروز، مور اور نوابشاہ ہوتی ہوئی  
 مہر آباد اور کراچی تک چلی گئی تھی۔

ڈیش بورڈ میں گاڑی کے کاغذات موجود تھے۔ اس لئے اسے اس طرح پکڑے جانے کا زیادہ اندیشہ  
 نہیں تھا۔ وہ دن نکلنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہتا تھا۔ چندو کے قتل کا انکشاف صبح سات  
 آٹھ بجے سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ بھولا تھ ہوش میں آنے کے بعد جب چندو کی لاش دیکھے گا تو سب سے  
 پہلے ٹیلی فون پر شکار پور میں دشنا تھ کو اطلاع دے گا۔ اگر اس نے پولیس کو بھی اطلاع دی تو پولیس اس  
 قدر مستعد نہیں تھی کہ اطلاع ملتے ہی جائے وقوعہ پر جاتی۔ اس کے اندازے کے مطابق پولیس نو بجے سے  
 پہلے دشنا تھ کے جنگلے پر پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس طرح اس کے پاس کم از کم پانچ گھنٹے تھے۔ اگر وہ بیس  
 میل رفتار سے بھی گاڑی چلا رہا ہے تو ان پانچ گھنٹوں میں تقریباً ”سو میل دور نکل سکتا تھا لیکن اسپڈ میٹر کی  
 سوئی چالیس اور پچاس کے درمیان ٹھہر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ اس وقت تقریباً ”دو سو میل کا  
 فاصلہ طے کر لے گا۔“

جب وہ خیر پور کے نواح میں پہنچا تو دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ وہ گاڑی روک کے بغیر شہر سے نکل گیا۔  
 شبیر درانی کو یہ بھی یقین تھا کہ پولیس جب دشنا تھ کے جنگلے پر پہنچے گی اور جب انہیں یہ معلوم ہو گا کہ  
 گاڑی غائب ہے تو وہ سب سے پہلے وہ قریبی شہروں کو گاڑی کے بارے میں اطلاع دیں گے۔ اس لئے وہ جلد  
 سے جلد اس گاڑی سے بھی نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

رانی پور پہنچ کر اس نے کار ایک ویرانے میں چھوڑ دی اور تقریباً ”ایک میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوا  
 ہر پہنچ گیا۔ دھوپ تیز تھی۔ اتنا فاصلہ پیدل طے کرتے ہوئے اس کی قیض پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔

پاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ تھیلا ہاتھ میں لٹکائے ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلا رہا اور بالا خرا یک چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ تین چار عکھے لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک عکھے کے نیچے اس میز پر بیٹھ گیا جس پر دو آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے تھیلا کرسی پر اپنی ٹانگ کے نیچے دبایا اور قیض کے تمام بن کھول دیئے۔ اس کی گردن پر بننے والے پسینے کی دھاریں گینچوں کی طرح اس کے جسم پر رینگ رہی تھیں۔

”جی سائیں، کیا لاؤں سائیں؟“ یہ آواز سن کر شبیر درانی اس لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی عمر بمشکل بارہ سال رہی ہوگی۔ اس نے کالے رنگ کی شلوار اور اوپر میلی جیکٹ بنیان پن رکھی تھی۔ بنیان کسی بڑے آدمی کی تھی اور دو جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بست میلی سی صافی تھی جس سے وہ میز صاف کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر شبیر درانی کو کراہیت سی محسوس ہونے لگی۔ لیکن ظاہر ہے وہ اپنے بنگلے میں نہیں تھا کہ لڑکے کو تھپڑ مار دیتا۔ وہ حالات کا شکار تھا۔

”پہلے ٹھنڈا پانی پلاؤ بچہ۔ خوب ٹھنڈا، جگ بھر کے لانا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ وہ لڑکا اس کی طرف دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پانی سے بھرا ہوا جگ لے آیا۔ پلاسٹک کا جگ بھی میلا تھا اور گلاس بھی۔ مگر شبیر درانی اسکی پرواہ کئے بغیر دو تین گلاس چڑھا گیا۔ پانی واقعی ٹھنڈا تھا۔ لیکن دو تین گلاس پینے کے بعد بھی اس کی پیاس نہیں بجھی تھی۔

”چائے لے کر آؤ بچہ، دودھ پتی۔“ شبیر درانی نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ کھانے کو بھی لاؤں سائیں۔ کیک، بکٹ، پیٹری.....؟“ لڑکے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا تم ایسا کرو ایک بن پر مکھن لگا کر لے آؤ۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لڑکا چائے اور مکھن لگا بن لے آیا۔ شبیر درانی نے پہلے بن کھایا پھر دو گلاس پانی حلق میں اندیلا اور پھر چائے کی چشکیاں لینے لگا۔ اس کی میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے دونوں آدمی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

چائے پینے کے بعد بھی شبیر درانی کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے دونوں آدمی جا بکے تھے۔ شبیر کا پسینہ ابھی تک خشک نہیں ہوا تھا۔ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی، وہ کچھ دیر اور عکھے کے نیچے بیٹھے رہنا چاہتا تھا۔ عکھے کی ہوا بھی گرم تھی لیکن باہر چلتی ہوئی لو سے بہتر تھی۔

تقریباً ”ایک گھنٹے بعد اس نے لڑکے کو اشارے سے قریب بلایا۔

”کتنے پیسے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”پندرہ روپے۔“ لڑکے نے فوراً ہی جواب دیا اور پھر حساب گنوانے لگا۔ ”تین روپے چائے، آٹھ روپے مکھن چار روپے بند کے۔“

”ٹھیک ہے بابا، میں نے تم سے حساب تو نہیں پوچھا۔“ شبیر درانی نے کہا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ”بانی پانچ روپے تمہارے۔ لیکن یہ بتاؤ بسوں کا اڈہ کس طرف ہے؟“

”تم کو کہاں جانا ہے سائیں؟“ لڑکے نے پوچھا۔ پانچ روپے ٹپ ملنے پر اس کی باجیس کھل گئی تھیں۔

”کراچی۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

”کراچی کی بس تو چلی گئی سائیں، اب تو بس سکھر سے آئے گی بہت دیر میں۔ تم نواب شاہ چلے جاؤ وہاں

سے تمہیں کراچی کا بس مل جائے گا۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

شبیر درانی کچھ دیر اور ہوٹل میں بیٹھا رہا پھر اس نے ایک گلاس پانی پیا اور ہوٹل سے نکل کر لڑکے کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ وہ جلد ہی بسوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔ نواب شاہ کی بس تلاش کرنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ چند بیٹیں خالی تھیں وہ ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھپلا اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔ بس آدھے گھنٹے بعد حرکت میں آئی تھی۔ گرمی سے شبیر درانی کی بری حالت ہو رہی تھی۔ وہ اس قسم کے حالات کا عادی نہیں تھا۔ حویلی میں اور شہر والے مکان میں بھی ایئر کنڈیشنر لگے ہوئے تھے۔ وہ کہیں باہر بھی جاتا تو اپنے آرام و آسائش کا پورا بندوبست رکھتا۔ لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ کم از کم کراچی پہنچنے تک تو اسے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا ہی تھا۔

نوشہروز اور مور میں بس آدھے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ رکی رہی۔ شبیر درانی کو کسی بس میں سفر کرنے کا یہ پہلا اتفاق ہوا تھا۔ مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بس میں بھرا ہوا تھا۔ اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اگر اس کی سیٹ کھڑکی کی طرف نہ ہوتی تو وہ یقیناً ”بے ہوش ہو چکا ہوتا۔“

خدا خدا کر کے بس نواب شاہ پہنچ ہی گئی۔ اس وقت شام ہونے والی تھی۔ شبیر درانی جب سیٹ سے اٹھنے لگا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے بس میں بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں جڑ گئی ہوں۔ گھٹنوں میں بڑی شدت کا درد اٹھا تھا۔ وہ گھٹنوں کو سلاتا ہوا بڑی مشکل سے اٹھنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

لیکن بعد میں یہ انکشاف اور بھی تشویش ناک تھا کہ اس وقت اسے کراچی کے لئے کوئی بس نہیں مل سکتی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اسے رات نواب شاہ ہی میں گزارنی پڑے گی جو وہ نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ کسی ہوٹل میں قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی ہوٹل میں کمرہ لینے پر اس سے بیسیوں سوالات پوچھے جاتے۔ اس کے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں تھا اور وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ ہوٹلوں میں قیام کرنے والوں کو پولیس والے کس طرح تنگ کرتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ایک عام سے تھیلے میں ہزاروں روپے نقد اور لاکھوں روپے کی مالیت کے زیورات تھے۔ ان چیزوں کی موجودگی اسے مشکوک بنا سکتی تھی۔

ایک دو جگہوں سے مزید معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ ایک ایئر کنڈیشنڈ کوچ سکھر سے آنے والی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے اس کوچ میں سیٹ مل جائے۔ شبیر درانی اس ٹرانسپورٹ آفس پہنچ گیا جہاں اسے پتہ چلا کہ کوچ آٹھ بجے آئے گی۔ دو افراد پہلے ہی ویٹنگ لسٹ پر تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ شبیر درانی نے بھی ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوا دیا اور کھانا کھانے کے لئے کسی اچھے ہوٹل کی تلاش میں چل پڑا۔ اس وقت چھ بجے تھے اور وہ بڑی شدت سے بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اسے جلد ہی ایک اچھا ریستورنٹ مل گیا۔ اس نے خوب ڈٹ کر اپنی پسند کا کھانا کھایا اور وقت گزارنے کے لئے وہیں بیٹھا رہا۔ اور پھر پونے آٹھ بجے وہ کوچ کے دفتر پہنچ گیا۔

کوچ میں صرف ایک سیٹ خالی تھی۔ ویٹنگ لسٹ میں تین اور آدمیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلا حق ان میاں بیوی کا تھا جو شبیر درانی سے پہلے تھے لیکن سیٹ ایک تھی اس لئے انہوں نے منع کر دیا۔ بعد میں آنے والے تینوں آدمی کلرک کو گھیرے ہوئے تھے کہ سیٹ ان میں سے کسی کو مل جائے لیکن وہ سیٹ شبیر درانی کو دے دی گئی۔

کوچ نواب شاہ سے روانہ ہو کر چند منٹ کے لئے سکرنڈ کے اسٹاپ پر رکی تھی۔ یہاں بھی ایک مسافر

اترا اور ایک سوار ہوا تھا۔ کوچ جب سکرٹڈ سے روانہ ہوئی تو بس کے بیشتر مسافر اونگھنے لگے۔ حالانکہ زیادہ وقت نہیں ہوا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے رات آدمی سے زیادہ بیت گئی ہو۔ شبیر درانی کڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا لیکن باہر گہری تاریکی تھی۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہالہ سے چند میل پہلے کوچ کی رفتار اچانک ہی کم ہونے لگی۔ شبیر درانی اچک کر آگے دیکھنے لگا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دے سکا البتہ ڈرائیور کی آواز سن کر وہ چونک گیا تھا۔

”اے صدیق، مسافروں کو جگا دے۔ دیکھ سامنے کیا ہے؟“

ڈرائیور نے یہ جملہ کنڈکٹر سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ایک دو مسافر ڈرائیور کی آواز سن کر جاگ گئے۔ شبیر درانی ایک بار پھر اپنی سیٹ سے اچک کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ سامنے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک کا منظر دیکھتے ہی شبیر درانی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ درخت کا ایک تنہا سڑک پر اس طرح پڑا تھا کہ راستہ بند ہو گیا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ اس کے دونوں کناروں پر ڈھلان تھی اور جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ شبیر درانی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکوؤں نے راستہ بلاک کر رکھا تھا اور وہ خود ادھر ادھر جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے اور کوچ رکستے ہی وہ جھاڑیوں سے نکل کر اسے گھیرے میں لے لیں گے۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ کوچ رک گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد ڈاکو جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ تین ڈاکو دائیں طرف تھے تین بائیں طرف اور ایک سامنے تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں کلاشنکوف یا دوسری آٹومٹک رائفلیں تھیں اور سینوں پر کراس کی صورت میں پیٹ بھی گولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کوچ کے تمام مسافر جاگ گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر نے ڈاکوؤں کو دیکھ لیا تھا اور ان سب کے چروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جن مسافروں نے ابھی تک ڈاکوؤں کو نہیں دیکھا تھا وہ دوسروں سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا۔ کوچ کیوں رکی ہے۔ شبیر درانی کے ہونٹ بھی خشک ہو رہے تھے وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اسی دوران تین ڈاکو کوچ میں گھس آئے۔ بڑی بڑی مونچھوں نے ان کے چروں کو بے حد خوفناک بنا رکھا تھا۔ ایک کی داڑھی بھی تھی لیکن داڑھی اور مونچھیں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ مونچھیں کہاں سے ختم ہوتی تھیں اور داڑھی کہاں سے شروع ہوتی تھی۔

ایک ڈاکو ڈرائیور کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس نے کلاشنکوف رائفل کی ٹال ڈرائیور کی گردن سے لگا دی۔ ایک ڈاکو نے اپنی رائفل مسافروں کی طرف اٹھادی۔ مسافروں میں دو کسن بچے اور تین عورتیں بھی تھیں۔ عورتیں اور بچے ان ڈاکوؤں کو دیکھ کر چیخنے لگے۔

”بند کرو یہ چیخا اور رونا دھونا۔“ تیسرا ڈاکو دھاڑا۔ ”مجھے یہ شور پسند نہیں ہے۔ اب کوئی چیخا تو گولی مار دوں گا۔“

شبیر درانی نے اس ڈاکو کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ہماری بھر کم جسم، لمبا قد، موٹی موٹی آنکھیں جن میں خون کی سرفی تیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آٹومٹک رائفل تھی جسے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس کا سنگ چڑے کے بجائے رنگین دھاگوں میں پروئے ہوئے رنگ برنگے موتیوں سے بنا ہوا تھا۔ رائفل کی ٹال کے ساتھ بھی موتیوں کی ایک خوبصورت جھار لٹکی ہوئی تھی۔ یہی ڈاکو غالباً اس گروہ کا سرغنہ تھا۔

”سائیں، ہماری کمپنی والے تین دن پہلے نذرانہ تو دے چکے ہیں۔ ہمیں کیوں روکا گیا ہے؟“ ڈرائیور نے گردن گھما کر کہا۔

”میرا نام بشیر ملاح ہے۔ مجھے نذرانہ نہیں ملا، تمہاری کہنی نے کسی اور کو نذرانہ دیا ہوگا۔“ سردار نے کہا۔ اسی دوران پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک آدمی اٹھ گیا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے اٹھتے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ اور اٹھایا ہی تھا کہ ایک ڈاکو نے بڑی پھرتی سے انفل کی نال اس کی طرف اٹھا کر ٹرائیگر دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی چیخ کی آواز بھی ابھری گولی اس لمس کے سینے میں لگی اور وہ اوندھے منہ سیٹوں کے درمیان کی جگہ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے سے خون کا ارہ بہہ نکلا تھا۔

”کوئی اور بہادری دکھانا چاہتا ہو تو سامنے آجائے۔“ فائر کرنے والے ڈاکو نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ عورتیں اور بچے چیختے لگے۔ ڈاکوؤں کے سرغنہ نے کوچ کے دروازے سے باہر منہ نکال کر چیخ کر کہا۔ ہار اور ڈاکو کوچ میں ٹھس آئے۔

”اپنی گاڑی کو ادھر کچے کی طرف اتار کر لے چلو۔ جلدی کرو۔“ ڈاکوؤں کے سرغنہ نے چیخ کر ڈرائیور اہم دیا۔

ڈرائیور نے انجن اشارت کر کے کوچ کو سڑک کے دائیں طرف کچے میں اتار لیا۔ ان چار ڈاکوؤں نے اپنی پر سوار ہونے سے پہلے سڑک پر پڑا ہوا درخت کا تانہ ایک طرف ہٹا دیا تھا۔ تاکہ ان کے بعد آنے والی آل گاڑی وہاں نہ رک سکے۔

کوچ جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ کچھ آگے جا کر گھنے درخت شروع ہو گئے تھے۔ ان درختوں کی سڑک کے متوازی ایک کچا راستہ بھی تھا۔ اس راستے پر عام طور پر ٹیل گاڑیاں چلا کرتی تھیں جن کی وجہ سے گھرے کھڑے بن گئے تھے۔ کوچ ڈنگا گئی ہوئی اس کچے راستے پر چل رہی تھی۔ اس راستے پر چند گز کا اصل طے کرنے کے بعد سرغنہ کی ہدایت پر ڈرائیور نے کوچ دائیں طرف ایک اور کچے راستے پر موڑ لی۔ اس راستے کے دونوں طرف گنجان درخت تھے۔ درختوں کی شاخیں کوچ سے الجھ رہی تھیں۔ کوچ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی درخت مزید گنجان ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ کوچ کے لئے مزید آگے بڑھنا مشکل بن گیا۔ وہ اس جنگل میں تقریباً ”ایک میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ بالا خور ڈرائیور نے کوچ روک لی۔

”کوچ آگے نہیں جاسکتی۔ راستہ نہیں ہے۔“ ڈرائیور نے بے بسی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، یہاں روک لو۔“ ڈاکوؤں کے سردار نے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اہم زبان میں کچھ کہا۔

ایک ڈاکو ڈرائیور کی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے تمام مسافروں کو اپنی رائفل کی لے رکھا تھا۔ باقی ڈاکو نیچے اتر گئے۔ ایک دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور باقی کوچ کے آگے بالعموم کی روشنی میں ایک بڑا سا دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ڈاکو نے زمین پر ایک بڑی سی چادر پھالی۔ سردار ابھی تک کوچ میں دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

”تمام مسافر ایک ایک کر کے نیچے اترتے جائیں۔“ سردار نے مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے حکمانہ لہجے میں کہا۔ ”اپنی تمام قیمتی چیزیں اور نقدی اس چادر میں ڈال کر زمین پر بیٹھتے جائیں۔ اگر کسی نے کوئی بہادری دکھانے کی یا بھاگنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بھی اس جیسا ہوگا۔“ اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔

تمام مسافر ایک ایک کر کے نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے سامنے کھڑا ہوا ایک ڈاکو انہیں رائفل کی

زد میں لئے ہوئے تھا۔ بس سے اترنے والا ہر مسافر اپنی جیبوں سے نقدی اور ہاتھوں سے گھڑیاں یا انگوٹھ وغیرہ اتار کر زمین پر پھینکی ہوئی چادر پر ڈالتا جا رہا تھا۔

شیردرانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس کی باری آئی تو پہلے اس نے سوچا کہ رقم اور زیور کا تھیلا سیٹ کے نیچے چھپا دے لیکن پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ڈاکو بس کی تلاشی بھی لیں اور تھیلا ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔ اس کے شیطان ذہن نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنالیا تھا۔ وہ تھیلا سیٹ سے اٹھ گیا لیکن اترنے کے بجائے سردار کے قریب رک گیا اور تھیلا اس کی طرف بڑھاتے بولا۔

”ایک دوست کی طرف سے ایک دوست کو تحفہ۔“

”یہ کیا ہے چرچا؟“ سردار نے اسے گھورا۔

”کھول کر دیکھ لو۔“ شیردرانی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”زیادہ چالاک مت بنو۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھول کر دکھاؤ۔“ سردار غرایا۔

شیردرانی نے دونوں ہاتھوں سے تھیلا اس کے سامنے کھول دیا۔ اس میں بھرے ہوئے زیورات نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر سردار کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”تم تو بڑی موٹی آسامی ہو۔“ سردار نے اس کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ لیا۔ ”نیچے اترو اور جیبوں

جو کچھ ہے اسے چادر پر ڈال دو۔ چلو... ہٹو راتے سے...“

شیردرانی نیچے اتر آیا اور جیب میں رکھی ہوئی رقم نکال کر چادر پر ڈال دی اور ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا جو اپنی جیبیں خالی کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔

عورتوں کے کانوں اور ہاتھوں سے زیورات تک اتار لئے گئے تھے۔ خوف کے مارے ہر شخص حالت غیر ہو رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے ڈاکو لوٹنے کے بعد چھوڑ دیں اور اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان سب کو لائن میں کھڑے گولی سے اڑا دیا جائے۔

تمام مسافروں کا سامان بھی کوچ سے اتار لیا گیا۔ ہر مسافر کے سامان سے قیمتی چیزیں اور نقدی نکال لی گئی اور پھر سردار ان مسافروں سے اس طرح سوال جواب کرنے لگا جیسے ملازمت کے لئے کر رہا ہو۔

سردار نے تین مسافروں کو الگ کر لیا تھا۔ ان میں ایک شیردرانی تھا۔ دوسرا ایک ہندو سیٹھ جنگ فیکٹریوں کا مالک تھا۔ تیسرا مسافر کراچی کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ وہ ایک کاروباری سلسلے میں تھا۔ راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی اور وہ ڈرائیور کو گاڑی میں چھوڑ کر اس کوچ میں سوار ہو گیا تھا۔ ”بیٹھو بابا۔“ سردار دوسرے مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ اپنا اپنا سامان لے

میں بیٹھو۔ ڈرائیور تم بھی اپنی سیٹ پر بیٹھو اور ان کو لے جاؤ یہاں سے۔“

تمام مسافر اپنا اپنا سامان لے کر بس میں بیٹھ گئے۔ اس طرح جان چھوٹنے دیکھ کر ان کی جان بھر آئی تھی۔ ایک ڈاکو نے لوٹے ہوئے مال کی پوٹلی باندھ کر سنبھال لی تھی۔

”ارے بابا... مجھے بھی جانے دو نا۔“ ہندو سیٹھ گھمگھمایا۔ ”میری جیب میں آٹھ ہزار روپیہ تھا نے تم لوگوں کو دے دیا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ دیکھو میری جیبیں خالی ہیں۔ مجھے چھوڑ دو نا۔“

”تمہاری جیبیں خالی ہیں لیکن تمہارے گھر میں تجوریاں نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تمہارا بینک بیلنس کی بہت لمبا چوڑا ہوگا۔ تمہارے وارثوں سے پچاس ساٹھ لاکھ روپے تول ہی جائیں گے۔“ سردار نے

”میں بہت غریب ہوں۔ میرے وارث کچھ نہیں دے سکیں گے۔“ ہندو سینھ بولا۔ اس کے ساتھ ہی

”ہندو کو یہ رونا دھونا۔“ سردار نے دھاڑتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہندو سینھ کے منہ پر

اردار پتھر سید کر دیا۔ ہندو سینھ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور ٹانگیں قہر قہر

اٹھ گئیں۔ ”اوڈرا یور۔۔“ سردار نے ڈرا یور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنی سیٹ پر بیٹھا انجن اسٹارٹ کر رہا

”بس میں جو لاش پڑی ہے نا اسے تمہانے میں جمع کروا دینا اور کہنا کہ میرے سر کی قیمت میں پانچ لاکھ کا

اور اضافہ کرو۔“ ”اچھا سردار۔“ ڈرا یور نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا اور درختوں میں تنگ سی جگہ پر کوچ کو موڑنے کی

کوشش کرنے لگا۔ کوچ کے جانے کے بعد سردار نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ان تینوں کو رانٹلوں کی زد پر لے کر

ہل میں آگے کی طرف چلے گئے۔ ”تم تینوں ایک بات سن لو۔“ سردار نے کہا۔ ”اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی

جائی گی۔“ ہندو سینھ اور کراچی کے تاجر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن شیردرانی کا بھاگنے کا کوئی

ادارہ نہیں تھا۔ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے لئے اسے ایسے ہی لوگوں کی تلاش تھی۔ وہ جنگل میں چلتے رہے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل زیادہ گہنا ہوتا جا رہا تھا۔ شیردرانی نے

وہ جنگلات کے بارے میں سن رکھا تھا۔ بڑے خطرناک جنگل تھے۔ ان جنگلوں میں ڈاکوؤں کے کئی

گروہوں نے اڈے بنا رکھے تھے اور یہ جنگل اس قدر گہنے اور دشوار گزار تھے کہ پولیس نے ڈاکوؤں کا پیچھا

لانے کے لئے کبھی جنگلوں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس طرح یہ جنگل ان خطرناک

الہاں کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہیں بن گئی تھیں۔ ان جنگلوں میں زہریلے سانپوں اور بھجوروں کے علاوہ

الہاں کو کسی اور دشمن کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ لوگ مسلسل چل رہے تھے۔ ڈاکو انہیں تیز سے تیز چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہندو سینھ اور



زد میں لئے ہوئے تھا۔ بس سے اترنے والا ہر مسافر اپنی جیبوں سے نقدی اور ہاتھوں سے گھڑیاں یا انگلیٹھیا وغیرہ اتار کر زمین پر پھینکی ہوئی چادر پر ڈالتا جا رہا تھا۔

شبیر درانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس کی باری آئی تو پہلے اس نے سوچا کہ رقم اور زیورات کا تھیلا سیٹ کے نیچے چھپا دے لیکن پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ڈاکو بس کی تلاشی بھی لیں۔ اور تھیلا ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔ اس کے شیطان ذہن نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنا لیا تھا۔ وہ تھیلا اٹھا سیٹ سے اٹھ گیا لیکن اترنے کے بجائے سردار کے قریب رک گیا اور تھیلا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ایک دوست کی طرف سے ایک دوست کو تحفہ۔“

”یہ کیا ہے چرچا؟“ سردار نے اسے گھورا۔

”کھول کر دیکھ لو۔“ شبیر درانی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”زیادہ چالاک مت بنو۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھول کر دکھاؤ۔“ سردار غرایا۔

شبیر درانی نے دونوں ہاتھوں سے تھیلا اس کے سامنے کھول دیا۔ اس میں بھرے ہوئے زیورات اور نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر سردار کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”تم تو بڑی موٹی آسامی ہو۔“ سردار نے اس کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ لیا۔ ”نیچے اترو اور جیبوں میں جو کچھ ہے اسے چادر پر ڈال دو۔ چلو... بھڑا تے سے...“

شبیر درانی نیچے اتر آیا اور جیب میں رکھی ہوئی رقم نکال کر چادر پر ڈال دی اور ان لوگوں کے ساتھ ہاتھ بٹھک کر بیٹھ گیا جو اپنی جیبیں خالی کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔

عورتوں کے کانوں اور ہاتھوں سے زیورات تک اتار لئے گئے تھے۔ خوف کے مارے ہر شخص کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے ڈاکو انہیں لوٹنے کے بعد چھوڑ دیں اور اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان سب کو لائن میں کھڑے کرکے گولی سے اڑا دیا جائے۔

تمام مسافروں کا سامان بھی کوچ سے اتار لیا گیا۔ ہر مسافر کے سامان سے قیمتی چیزیں اور نقدی رقم نکال لی گئی اور پھر سردار ان مسافروں سے اس طرح سوال جواب کرنے لگا جیسے ملازمت کے لئے انتظار کر رہا ہو۔

سردار نے تین مسافروں کو الگ کر لیا تھا۔ ان میں ایک شبیر درانی تھا۔ دوسرا ایک ہندو سیٹھ کا جنگ فیلڈروں کا مالک تھا۔ تیسرا مسافر کراچی کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ وہ ایک کاروباری سلسلے میں سکھ تھا۔ راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی اور وہ ڈرائیور کو گاڑی میں چھوڑ کر اس کوچ میں سوار ہو گیا تھا۔

”بیٹھو بابا۔“ سردار دوسرے مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ اپنا اپنا سامان لے کر“

”بیٹھو۔ ڈرائیور، تم بھی اپنی سیٹ پر بیٹھو اور ان کو لے جاؤ یہاں سے۔“

تمام مسافر اپنا اپنا سامان لے کر بس میں بیٹھ گئے۔ اس طرح جان چھوٹنے دیکھ کر ان کی جان میں ہلچل آئی تھی۔ ایک ڈاکو نے لوٹنے ہوئے مال کی پوٹلی باندھ کر سنبھال لی تھی۔

”ارے بابا... مجھے بھی جانے دونا۔“ ہندو سیٹھ کھکھکیا۔ ”میری جیب میں آٹھ ہزار روپیہ تھا۔“

”تم لوگوں کو دے دیا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ دیکھو میری جیبیں خالی ہیں۔ مجھے چھوڑ دونا۔“

”تمہاری جیسی خالی ہیں لیکن تمہارے گھر میں تجوریاں نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تمہارا بینک بیلنس اسی بہت لمبا چوڑا ہوگا۔ تمہارے وارثوں سے پچاس ساٹھ لاکھ روپے تول ہی جائیں گے۔“ سردار نے کہا۔

”میں بہت غریب ہوں۔ میرے وارث کچھ نہیں دے سکیں گے۔“ ہندو سینہ بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔

”ہندو کرو یہ رونا دھونا۔“ سردار نے دھاڑتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہندو سینہ کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

ہندو سینہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور ٹانگیں تھر تھر اٹھنے لگیں۔

”او ڈرائیو۔۔۔“ سردار نے ڈرائیو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنی سیٹ پر بیٹھا انجن اسٹارٹ کر رہا تھا۔ ”بس میں جو لاش پڑی ہے نا اسے تمہانے میں جمع کروادینا اور کتنا کہ میرے سر کی قیمت میں پانچ لاکھ کا اضافہ کر دے۔“

”اچھا سردار۔“ ڈرائیو نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا اور درختوں میں تنگ سی جگہ پر کوچ کو موڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

کوچ کے جانے کے بعد سردار نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ان تینوں کو رانٹلوں کی زد پر لے کر محل میں آگے کی طرف چلے گئے۔

”تم تینوں ایک بات سن لو۔“ سردار نے کہا۔ ”اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“

ہندو سینہ اور کراچی کے تاجر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن شیردرانی کا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے لئے اسے ایسے ہی لوگوں کی تلاش تھی۔

وہ جنگل میں چلتے رہے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل زیادہ گہنا ہوتا جا رہا تھا۔ شیردرانی نے لکڑی کے جنگلات کے بارے میں سن رکھا تھا۔ بڑے خطرناک جنگل تھے۔ ان جنگلوں میں ڈاکوؤں کے کئی گروہوں نے اڈے بنا رکھے تھے اور یہ جنگل اس قدر گہنے اور دشوار گزار تھے کہ پولیس نے ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کے لئے کبھی جنگلوں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس طرح یہ جنگل ان خطرناک اکوؤں کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہیں بن گئی تھیں۔ ان جنگلوں میں زہریلے سانپوں اور بچھوؤں کے علاوہ اکوؤں کو کسی اور دشمن کا خطرہ نہیں تھا۔

وہ لوگ مسلسل چل رہے تھے۔ ڈاکو انہیں تیز سے تیز چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہندو سینہ اور کراچی کا تاجر ادھر عمر آدی تھے۔ وہ جلد ہی تھک گئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن ڈاکوؤں کے دھکے اٹھاتے رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔

تقریباً ”تین گھنٹے“ مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گئے۔

”صرف دس منٹ یہاں رگ کر سانس لے لو۔ اس کے بعد صبح سے پہلے کہیں رکنے کا موقع نہیں ملے گا۔“ سردار نے کہا۔

یہاں تھوڑی سی جگہ صاف تھی۔ ڈاکو اس طرح بیٹھ گئے کہ تینوں پر غالی ان کے گھیرے میں تھے۔

زمین لئے ہوئے تھا۔ بس سے اترنے والا ہر مسافر اپنی جیبوں سے نقدی اور ہاتھوں سے گھڑیاں یا انگور وغیرہ اتار کر زمین پر پھینکی ہوئی چادر پر ڈالتا جا رہا تھا۔

شبیر درانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس کی باری آئی تو پہلے اس نے سوچا کہ رقم اور زیور کا تھیلا سیٹ کے نیچے چھپا دے لیکن پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ڈاکو بس کی تلاشی بھی لیں اور تھیلا ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔ اس کے شیطان ذہن نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنالیا تھا۔ وہ تھیلا سیٹ سے اٹھ گیا لیکن اترنے کے بجائے سردار کے قریب رک گیا اور تھیلا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ایک دوست کی طرف سے ایک دوست کو تحفہ۔“

”یہ کیا ہے چایا؟“ سردار نے اسے گھورا۔

”کھول کر دیکھ لو۔“ شبیر درانی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”زیادہ چالاک مت بنو۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھول کر دکھاؤ۔“ سردار غرایا۔

شبیر درانی نے دونوں ہاتھوں سے تھیلا اس کے سامنے کھول دیا۔ اس میں بھرے ہوئے زیورات ٹوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر سردار کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”تم تو بڑی موٹی آسامی ہو۔“ سردار نے اس کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ لیا۔ ”نیچے اترو اور جیبوں

جو کچھ ہے اسے چادر پر ڈال دو۔ چلو... ہنورا سٹے سے۔“

شبیر درانی نیچے اتر آیا اور جیب میں رکھی ہوئی رقم نکال کر چادر پر ڈال دی اور ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا جو اپنی جیبیں خالی کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔

عورتوں کے کانوں اور ہاتھوں سے زیورات تک اتار لئے گئے تھے۔ خوف کے مارے ہر شخص حالت غیر ہو رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے ڈاکو لوٹنے کے بعد چھوڑ دیں اور اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان سب کو لائن میں کھڑے کر گولی سے اڑا دیا جائے۔

تمام مسافروں کا سامان بھی کوچ سے اتار لیا گیا۔ ہر مسافر کے سامان سے قیمتی چیزیں اور نقدی نکال لی گئی اور پھر سردار ان مسافروں سے اس طرح سوال جواب کرنے لگا جیسے ملازمت کے لئے کمرہا ہو۔

سردار نے تین مسافروں کو الگ کر لیا تھا۔ ان میں ایک شبیر درانی تھا۔ دوسرا ایک ہندو سینٹھ جنگ فیکٹریوں کا مالک تھا۔ تیسرا مسافر کراچی کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ وہ ایک کاروباری سلسلے میں کام کرتا تھا۔ راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی اور وہ ڈرائیور کو گاڑی میں چھوڑ کر اس کوچ میں سوار ہو گیا تھا۔

”بیٹھو بابا۔“ سردار دوسرے مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ اپنا اپنا سامان لے کر کوچ میں بیٹھو۔ ڈرائیور تم بھی اپنی سیٹ پر بیٹھو اور ان کو لے جاؤ یہاں سے۔“

تمام مسافر اپنا اپنا سامان لے کر بس میں بیٹھ گئے۔ اس طرح جان چھوٹنے دیکھ کر ان کی جان میں آئی تھی۔ ایک ڈاکو نے لوٹے ہوئے مال کی پوٹلی باندھ کر سنبھال لی تھی۔

”ارے بابا... مجھے بھی جانے دونا۔“ ہندو سینٹھ گھگھکیا۔ ”میری جیب میں آٹھ ہزار روپیہ تھا۔“

نے تم لوگوں کو بے دیا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ دیکھو میری جیبیں خالی ہیں۔ مجھے چھوڑ دونا۔“

”تمہاری جیبیں خالی ہیں لیکن تمہارے گھر میں تجوریاں نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تمہارا بینک بیلنس اب بہت لمبا چوڑا ہوگا۔ تمہارے وارثوں سے پچاس ساٹھ لاکھ روپے تولی ہی جائیں گے۔“ سردار نے کہا۔

”میں بہت غریب ہوں۔ میرے وارث کچھ نہیں دے سکیں گے۔“ ہندو سینھ بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔

”ہندو کرو یہ رونا دھونا۔“ سردار نے دھاڑتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہندو سینھ کے منہ پر زردار تھڑر سید کر دیا۔

ہندو سینھ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور ٹانگیں قمر قرم اپنے لگیں۔

”او ڈرائیو۔۔۔“ سردار نے ڈرائیو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنی سیٹ پر بیٹھا انجن اسٹارٹ کر رہا تھا۔ ”بس میں جو لاش پڑی ہے نا اسے تھانے میں جمع کروادینا اور کہنا کہ میرے سر کی قیمت میں پانچ لاکھ کا اضافہ کر دے۔“

”اچھا سردار۔“ ڈرائیو نے خوفزدہ سے لمبے میں کہا اور درختوں میں تنگ سی جگہ پر کوچ کو موڑنے کی اشارش کرنے لگا۔

کوچ کے جانے کے بعد سردار نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ان تینوں کو رانٹلوں کی زد پر لے کر اگل میں آگے کی طرف چلتے گئے۔

”تم تینوں ایک بات سن لو۔“ سردار نے کہا۔ ”اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“

ہندو سینھ اور کراچی کے تاجر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن شیردرانی کا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے لئے اسے ایسے ہی لوگوں کی تلاش تھی۔

وہ جنگل میں چلتے رہے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل زیادہ گہنا ہوتا جا رہا تھا۔ شیردرانی نے مدد کے جنگلات کے بارے میں سن رکھا تھا۔ بڑے خطرناک جنگل تھے۔ ان جنگلوں میں ڈاکوؤں کے کئی گروہوں نے اڈے بنا رکھے تھے اور یہ جنگل اس قدر گہنے اور دشوار گزار تھے کہ پولیس نے ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کے لئے کبھی جنگلوں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس طرح یہ جنگل ان خطرناک اٹالوں کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہیں بن گئی تھیں۔ ان جنگلوں میں زہریلے سانپوں اور بچھوؤں کے علاوہ اٹالوں کو کسی اور دشمن کا خطرہ نہیں تھا۔

وہ لوگ مسلسل چل رہے تھے۔ ڈاکو انہیں تیز سے تیز چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہندو سینھ اور راہی کا تاجر اچھڑ عمر آدی تھے۔ وہ جلد ہی تھک گئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن ڈاکوؤں کے دھکے اٹھاتے چلتے رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔

”تھیں تھیں مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گئے۔

”صرف دس منٹ یہاں رک کر سانس لے لو۔ اس کے بعد صبح سے پہلے کہیں رکنے کا موقع نہیں ملے گا۔“ سردار نے کہا۔

یہاں تھوڑی سی جگہ صاف تھی۔ ڈاکو اس طرح بیٹھ گئے کہ تینوں پر غالی ان کے گھیرے میں تھے۔

آسمان پر اگرچہ چاند روشن تھا مگر اس کی روشنی گھنے درختوں کی وجہ سے زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ سناٹے میں حشرات الارض کی آوازیں بڑا پر اسرار تاثر دے رہی تھیں۔ ہندو سیٹھ زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ مسلسل چلتے رہنے سے اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دفعۃً "ایک خوفناک چیخ کی آواز سن وہ سب اچھل پڑے۔ چیخ ڈاکوؤں کے ایک ساتھی کی تھی۔ سردار تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اس کا ساتھی زمین پر پڑا ترپ رہا تھا۔ اسی وقت شیردرانی نے ایک سیاہ ناگ کو جھاڑیوں کی طرف رینگتے ہوئے دیکھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس ڈاکو کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔

تین ڈاکوؤں نے شیردرانی اور دونوں آدمیوں کو رائفلوں کی زد پر لئے رکھا اور باقی اپنے ساتھی سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے جو زمین پر بری طرح ترپ رہا تھا۔ سانپ غالباً "بہت ہی زہریلا تھا۔ سانپ زہر اس کے جسم میں پھیل رہا تھا اور اس کے جسم کی رنگت میں نیلا ہٹ سی آ رہی تھی۔ "سردار!" اس کے ایک ساتھی نے سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بچنے کا نہیں ہے۔ زہر پورے جسم میں پھیل رہا ہے۔"

"تو پھر اس کو تکلیف سے نجات دلا دو نا بابا۔ یہ کیوں اذیت اٹھا رہا ہے۔" سردار نے کہا۔ وہ سب لوگ مار گزیدہ غصے سے دور ہٹ گئے۔ ایک ڈاکو نے رائفل کی نال اس کے سینے پر ٹھیک کے مقام پر رکھ کر ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس کے سینے میں اتر گئی۔ وہ چند لمحوں اور ترپا پھر ختم ہو گیا۔ ہندو سیٹھ تو بری طرح پیچھے لگا تھا۔ تاجر کا چہرہ بھی خوف سے ایک دم سفید پڑ گیا تھا۔ شیردرانی چہرے پر بھی خوف کے سائے لہرا گئے تھے۔

"چلو بابا اٹھو، چلو یہاں سے..." سردار نے کہا۔ وہ سب ایک بار پھر چلنے لگے۔ تقریباً "دو میل کا فاصلہ اور طے ہو گیا۔ ہندو سیٹھ سے اب بالکل دور چلا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے والا ڈاکو اسے دھکے دیتے ہوئے چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات بیت رہی تھی۔ رات بھر مسلسل چلتے رہنے سے شیردرانی کی ٹانگیں بھی شل ہو چکی تھیں اب اس سے بھی نہیں چلا جا رہا تھا لیکن وہ چلتے رہنے پر مجبور تھا۔

صبح کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا۔ وہ ایک نہر کے کنارے پر پہنچ گئے۔ نہر زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دونوں کناروں سے درختوں کی شاخیں پانی میں جھکی ہوئی تھیں۔ نہر میں پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ وہ لوگ نہر کنارے پر رک گئے۔

"بھل..." سردار نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں رک جاؤ بابا، کچھ کھاؤ۔ بندوبست کرو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔ تھک بھی گئے ہیں نا۔"

انہوں نے نہر کے کنارے ایک درخت کے نیچے صاف سی جگہ پر ڈیرہ ڈال دیا۔ بچل نے اپنے کندھے سے ایک تھیلا نکال کر زمین پر رکھ دیا اور اس میں سے مختلف چیزیں نکال کر باہر رکھنے لگا۔ ایلو مینیم کی کالی سی کیتلی۔ چارپانچ پلاسٹک کے مگے، پتی کا ڈبہ اور پلاسٹک کی ایک ٹھیلی میں چینی۔ ایک ٹھیلی میں مونئی چند روٹیاں بھی لپٹی ہوئی تھیں۔ بچل زمین کھود کر چولہا بنانے لگا۔ اس کا دوسرا ساتھی لکڑیاں جمع کر لایا۔ بچل نے نہر سے کیتلی

اس میں پانی بھرا اور چولے میں آگ جلا کر کیتلی اوپر چڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بغیر دودھ کی چائے تیار کر چکا تھا۔ اس نے ایک مگ سردار کی طرف بڑھا دیا۔

”ارے بابا... پہلے ان کو دے۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔“ سردار نے کہا۔ ”ہم ڈاکو تو ہیں بھلے۔ مگر ہمیں اپنی مہمان نوازی کی روایات تو نہیں بھولنی چاہئے۔“

بھلے نے پہلے شیر درانی اور دوسرے دونوں یہ غالیوں کو چائے کے مگھے دیئے۔ ایک مگ سردار کو دے دیا اور ایک اپنے دوسرے ساتھی کو، یہی پانچ مگھے تھے۔ اس نے درمیان میں ایک کپڑا بچھا کر اس پر روٹیاں بھی رکھ دی تھیں۔ شیر درانی تو وہ کی چمکیوں کے ساتھ روٹی کے ٹکڑے بھی منہ میں ڈالنے لگا۔

”تم ادھر آؤ نا بابا۔ تم سے ذرا دو باتیں تو کر لیں۔“ سردار نے شیر درانی کو اشارہ کیا۔

شیر درانی اٹھ کر سردار کے پاس آگیا۔ ”تم کون ہو اور یہ مال تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“

”مجھے بھی اپنی برداری کا سمجھو سردار۔“ شیر درانی نے کہا۔ ”میں نے پولیس کے صوبہ خان نامی ایک انسپٹر کو قتل کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو یہ بات چھپی رہی لیکن پھر رحیم یار خان کی پولیس کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا لیکن میں ایک اور آدمی کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔ سکھر میں ایک ہندو سینھ کے گھر پر پناہ لی لیکن اس نے چالاکی دکھاتے ہوئے مجھے پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش کی مگر میں اسے بھی قتل کر کے بھاگ نکلا۔ یہ سارا مال اسی کے گھر سے ہاتھ لگا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں اسی علاقے میں تم جیسے کسی آدمی سے رابطہ کر کے اس کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کروں گا۔ خوش قسمتی سے تم لوگ مل گئے۔ تم مجھے پسند آئے تھے اسی لئے میں نے وہ مال تمہیں دے دیا تھا۔“

”وہ مال اگر تم خود میرے حوالے نہ کرتے تو بھی وہ ہمارے قبضے میں آجاتا۔“ سردار نے کہا۔ ”لیکن تم نے جو کہانی سنائی ہے اس پر یقین نہیں آتا۔ تمہاری شکل صورت، تمہاری باتوں کا یہ انداز بتاتا ہے کہ تم اس قسم کا کام کرنے والے نہیں ہو۔“

”میرا تعلق ایک بہت معزز گھرانے سے ہے لیکن بعض اوقات حالات بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ میں بھی حالات کا شکار ہوں۔“ شیر درانی نے کہا۔ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مظلوم بنا کر پیش کر کے ڈاکوؤں کے سردار کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر تم چاہو تو کسی کورجیم یار خان بھیج کر تصدیق کر سکتے ہو۔“

”کیا یہ بات سچ ہے کہ صوبہ خان کو تم نے قتل کیا تھا؟“ سردار نے اسے گھورا۔

”ہاں، میں نے اسے گولی ماری تھی۔“ شیر درانی نے جواب دیا۔ ”وہ ہمارے کلڈوں پر پلا تھا اور ہی کو آنکھیں دکھانے لگا تھا۔ جب اسے معطل کیا گیا تو وہ جان بچانے کے لئے بھاگتا پھر رہا تھا۔ آخر وقت میں اس نے مجھے اور میری ماں کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے گولی مار کر لاش کنویں میں پھینک دی لیکن اس کنویں میں پانی نہیں تھا۔ دوسرے ہی دن لاش کا پتہ چل گیا اور اس طرح پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔“

”انسپٹر صوبہ خان آدمی نہیں درندہ تھا۔“ سردار اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”ایک دفعہ میں بھی اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے بچا تھا۔“

”پولیس میری تلاش میں سرگرداں ہے۔“ شیر درانی نے کہا۔ ”میں آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتا خوش قسمتی سے تمہارے پاس آگیا ہوں۔ اگر تم مجھے پناہ دے دو تو میں تمہارا بہترین دوست ثابت ہو سکتا

ہوں۔“

”تم پولیس کے جاسوس بھی ہو سکتے ہو۔“ سردار نے کہا۔

”تم اپنا ایک آدمی رحیم یار خان بھیج دو۔ وہ میرے بارے میں تصدیق کر لے گا۔“ شبیر نے کہا۔

”ایسا کرنا پڑے گا۔“ سردار نے کہا۔ ”اور پھر تمہاری بات درست بھی ثابت ہوئی تو مجھے اپنے

ساتھیوں سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ ہمارا دھندہ تم جانتے ہو۔ ہر شخص نے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے اور ہر شخص پولیس کو مطلوب ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے سر کی قیمت مقرر ہے۔ میرے سر کی قیمت پندرہ لاکھ روپے لگائی گئی ہے۔ پہلے بھی ایک جاسوس آیا تھا مظلوم بن کے۔ لیکن ہمیں پتہ چل گیا۔ ہم نے اس کی لاش تھانے والوں کو بھجوا دی تھی۔ اب تم اپنے آپ کو مفروضہ بنا کر ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہو۔ ہمیں اس کی تصدیق کرنا پڑے گی۔ اگر تمہاری بات سچ ثابت ہوئی تو ہم تمہارے بارے میں غور کریں گے۔ دوسری صورت میں تمہاری لاش بھی کسی تھانے کو بھجوا دی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اپنی تسلی کر لو۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔

وہ تقریباً ”ایک گھنٹہ وہاں رکے پھر نہر پار کر کے جنگل کے دوسرے حصے میں داخل ہو گئے۔ یہ جنگل پہلے سے زیادہ گھنا تھا اور دریائے سندھ کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بالا خروہ ایک جگہ رک گئے۔ یہاں درخت بہت زیادہ گنجان تھے۔ ان کے بیچ میں درختوں کی شاخوں ہی سے چند جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اگر پہلی کا پڑ سے بھی اس علاقے کا جائزہ لیا جاتا تو ڈاکوؤں کا یہ ٹھکانہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔

دن کے وقت تو شبیر درانی اور دوسرے پرغمالیوں کو کھلا رکھا گیا۔ دو آدمی راتھیں سنبھالے ان پر پہرہ دیتے رہے تھے۔ رات کو ان کے ہاتھ پیرباندھ کر ایک جھونپڑے میں ڈال دیا گیا۔

اس سے اگلے دن دو ڈاکو وہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہ اپنا اسلحہ اور ہر چیز وہیں چھوڑ گئے تھے جس سے ڈاکو کی حیثیت سے ان کی شناخت ہو سکتی ہو۔ ایک ڈاکو تیسرے دن واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ راشن اور کھانے پینے کا سامان بھی لے کر آیا تھا۔ وہ سردار کے ساتھ تنہائی میں بیٹھا دیر تک کھسپ پھر کر رہا۔

کچل نامی دوسرا ڈاکو پانچویں دن لوٹا تھا۔ وہ بھی کچھ راشن اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر آیا تھا۔ وہ بھی سردار کے ساتھ الگ بیٹھا دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں بار بار کن انکھوں سے شبیر درانی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تقریباً ”ایک گھنٹے بعد سردار اپنی جگہ سے اٹھ کر شبیر درانی کے پاس آ گیا۔

”میرا آدمی تمہارے بارے میں معلومات حاصل کر کے آیا ہے۔“ وہ شبیر درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری باتیں بڑی حد تک درست ثابت ہوئی ہیں۔ پولیس کو واقعی تمہاری تلاش ہے۔ انکسپٹر صوبہ خان ہی نہیں اور بھی بہت سے آدمیوں کے قتل کا الزام ہے مگر۔ لیکن تمہارا کسی عورت سے بھی کوئی جھگڑا ہے کیا؟“

”ہاں۔“ شبیر درانی نے گہرا سانس لیا۔ ”وہ عورت میری رشتے دار ہے اور وہی سارے فساد کی جڑ

ہے۔“

”سننا ہے تم نے اسے قتل کرانے کی کوشش کی تھی؟“ سردار نے پوچھا۔

”اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ غلط باتوں میں پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنے غنڈوں کے ذریعے مجھے مروانے کی کوشش کی تھی۔ میرا ایک باڈی گارڈ اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔

لیکن جب اسے عدالت میں پیشی کے لئے لایا جا رہا تھا تو اس کے آدمیوں نے پولیس وین پر حملہ کر کے اسے چھڑالیا۔ اس کارروائی میں سات پولیس والے مارے گئے تھے۔ وہ عورت جس کا نام نانکہ درانی ہے پولیس سے بچنے کے لئے تھری طرف نکل گئی اور ریگستان میں بھٹک کر مر گئی۔ اسی دوران انسپکٹر صوبہ خان میرے ہاتھوں مارا گیا اور مجھے بھی پولیس سے بچنے کے لئے راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔“

”تمہیں بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارے پاس تو بہت پیسہ ہے۔ بہت زمینیں ہیں تمہاری۔ کچھ دے دلا کر پولیس کا راستہ روک دیتے۔“ سردار نے کہا۔

”تمہارا یہ آدمی کچل میرے بارے میں بہت تفصیلی معلومات حاصل کر کے آیا ہے۔“ شبیر درانی نے کہا پھر گراسانس لیتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کوشش کی تھی لیکن دولت ہر کام نہیں کر سکتی۔ وہ انسپکٹر مجھے ہر گت پر اندر کرنا چاہتا تھا۔“

”تمہیں ہسپتال سے کس نے اغواء کیا تھا؟“ سردار نے پوچھا۔

”اسی عورت نانکہ درانی کے آدمیوں نے۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”انہوں نے مجھے ہسپتال سے اغواء کر کے شہر سے بیس بائیس میل دور کھیتوں میں واقع ایک ویران ڈیرے میں قید کر دیا تھا لیکن مجھے موقع مل گیا اور میں ان کا ایک آدمی قتل کر کے بھاگ نکلا اور پھر سکھر میں اس ہندو سینٹھ کا واقعہ پیش آیا۔ اس طرح میں بھاگتا ہوا تمہارے ہاتھ لگ گیا۔ اب تم میرے بارے میں تصدیق کر چکے ہو کہ میں پولیس کا ایجنٹ نہیں ہوں۔ مجھے اب ساری زندگی انہی جنگلوں میں گزارنی ہے۔ میں اپنے بارے میں تمہارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ تم پولیس کے ایجنٹ نہیں ہو۔“ سردار نے کہا۔ ”لیکن مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ ویسے تم ہمارے کام کے آدمی ثابت ہو سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔“ شبیر درانی نے کہا۔

اور پھر اس سے اگلے روز شبیر درانی کو بتا دیا گیا کہ اسے ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ شبیر درانی نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ محض ڈاکو بننے کے لئے اس گروہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس کا اصل منصوبہ کچھ اور تھا جس پر عمل کرنے کے لئے اس نے ڈاکوؤں کے اس گروہ کا سہارا لیا تھا۔

اس سے اگلے روز شام کے وقت ایک آدمی وہاں پہنچ گیا۔ شبیر درانی نے اس سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”کیا بات ہے ماڈو، خیر تو ہے؟“ سردار بشیر صلاح نے پوچھا۔

”خبری تو نہیں ہے سردار۔“ ماڈو نامی اس شخص نے جواب دیا۔ ”تم جن تین آدمیوں کو پکڑ کر لائے ہو ان میں صفدر نامی کراچی کا ایک تاجر بھی ہے۔ سنا ہے وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے لئے کراچی میں ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور اب کراچی کے تاجروں نے حکومت کو دھمکی دی ہے کہ اگر صفدر کو دو دن کے اندر اندر الاب نہ کرایا گیا تو تاجر برادری پورے ملک میں ہڑتال کر دے گی۔ ہالہ اور آس پاس کی پولیس تو جنگل کے اس پاس کارروائی کرتی رہی لیکن اب اوپر سے دباؤ کی وجہ سے بڑی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان پولیس والوں کو جنگل کے کنارے پر جمع کیا جا چکا ہے۔ اور غالباً کل صبح سے یہ کارروائی شروع کر دی جائے گی۔ جنگل کے وسیع علاقے کو گھیرے میں لے لیا جائے گا اور دریا کی طرف سے بھی راستہ بند کر دیا جائے گا۔ اس کارروائی میں شاید ہیلی کاپٹر بھی استعمال کئے جائیں گے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اس



کارروائی کی عمرانی کریں گے۔ تم لوگ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ میں اپنی جان خطرے میں ڈال تمہیں یہ اطلاع دینے آیا ہوں۔

”تم نے بہت اچھا کیا ماڈو۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”ہم لوگ تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ تم رات یہیں رہو اور صبح ہوتے ہی واپس چلے جانا۔“

”ٹھیک ہے سردار۔“ ماڈو نے جواب دیا۔ ”اس ہندو سیٹھ کے رشتہ دار بھی پولیس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ہندو پنچائت نے بھی دھمکی دی ہے کہ اگر دو دن میں سیٹھ کارول کو ڈاکوؤں سے بازیاب کرایا گیا تو وہ اس معاملے کو اسمبلی تک لے جائیں گے۔“

”اس ہندو سیٹھ کے رشتہ داروں کو تو میں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ وہ اسمبلی تو کیا اپنے گھر کا راستہ بھول جائیں گے۔“ بشیر ملاح نے دانت پیچتے ہوئے کہا پھر اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی مانی شانی بناؤ نا... ماڈو کیسی خبر لایا ہے... مانی کھا کر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ اور پھر تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مجھے جنگل میں گہری تاریکی تھی لیکن لوگ اس طرح چل رہے تھے جیسے یہ راستے دیکھے بھالے ہوں۔ بشیر درانی پر اب زیادہ عمرانی نہیں آ رہی البتہ ہندو سیٹھ اور صفدر نامی تاجر کو رانٹلوں کے ہٹ مار مار کر چلنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

وہ لوگ رات بھر چلتے رہے۔ راستے میں صرف ایک دو مرتبہ تھوڑی تھوڑی دیر کو سانس لینے کو روکے تھے۔ ہندو سیٹھ کارول سے بالکل نہیں چلا جا رہا تھا۔ بشیر ملاح اس کے پیچھے تھا۔ وہ اسے چلانے کے لئے بار ٹھوکریں مار رہا تھا۔ سیٹھ کارول نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھگوان

ساتھ ساتھ اپنے گھروالوں کے نام لے لے کر انہیں بھی یاد کر رہا تھا۔ صبح چار بجے کے لگ بھگ وہ دریاۓ سندھ کے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہ دریا کے بالائی رخ پر کنارے کے ساتھ ساتھ تقریباً ”دو میل تک چلتے رہے۔ ایک جگہ وہ رک گئے۔

”جھل! جاکر دیکھو ادھر کوئی کشتی ہے یا نہیں۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ جھل کچھ اور آگے چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ ”کنارے پر ایک کشتی موجود ہے سردار۔“ جھل نے کہا۔ ”یہ موقع ہے۔ اس پاس کوئی بھی

ہے۔“ ”تو چلو... دیر مت کرو۔“ بشیر ملاح فوراً ہی اٹھ گیا۔ گھاٹ تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گھاٹ پر صرف ایک ہی کشتی تھی جو خاصی بڑی تھی اس میں بیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کشتی موٹے رے سے گھاٹ کے کنارے پر گڑھے ہوئے

کے ایک شہتیر سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ لوگ کشتی پر سوار ہو گئے۔ ایک آدمی نے رسہ کھول دیا اور کشتی دھکیلنے لگا۔ اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ کشتی میں چوڑوں کے بجائے لمبے بانس پڑے ہوئے تھے اس جگہ دریا کا پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ وہ بانسوں کے ذریعے کشتی کو کھینچتے ہوئے دوسرے کنارے

آ گئے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بھی گھنا جنگل تھا۔ لیکن وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل چھدر جا رہا تھا۔ وہ بالاخر ایک جگہ رک گئے۔

”جھل!“ بشیر ملاح نے جھل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم جاؤ نا دؤیرہ احمد خان کے پاس“ اس نے بشیر ملاح نے بلایا ہے جلدی آجائے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

بھل اسی وقت روانہ ہو گیا۔

دریا پار کر کے یہ لوگ ضلع دادو میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں سے چند میل آگے مان جند نامی گاؤں تھا۔  
دوڑیہ احمد خان اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کی بڑی لمبی چوڑی زمین تھیں اور مان جند سے تقریباً  
دوڑیہ میل پہلے اس کا ایک چھوٹا سا گٹھ تھا جہاں اس کی حویلی بھی تھی۔  
اس وقت دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ دفعتاً ”پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر وہ چونک گئے۔ وہ پہلی کا پڑ  
تھا جو دریائے سندھ کے اوپر سے چکر لگاتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ شیر درانی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ  
ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ سینکڑوں پولیس والے جنگل میں داخل ہو چکے ہوں گے۔  
پہلی کا پڑ کے ذریعے بھی انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن وہ لوگ بروقت خبر مل جانے سے  
اس جنگل سے نکل آئے تھے۔

تقریباً ”دو گھنٹے بعد سرسئی رنگ کی ایک پاجیرو آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ لوگ درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔  
پاجیرو کچھ فاصلے پر رک گئی۔ جنگل کے ساتھ ایک بھاری بھر کم دوڑیہ بھی پاجیرو سے اترا اور وہ درختوں کی  
طرف بڑھنے لگے۔ شیر ملاح وغیرہ درختوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ دوڑیہ شیر ملاح سے اس طرح  
بغل گیر ہوا تھا جیسے مدتوں سے پچھڑے ہوئے کسی قریبی عزیز سے مل رہا ہو۔  
”دوڑیہ احمد خان۔“ بالاخر شیر ملاح نے کہا۔ ”دو بندے امانت کے طور پر تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا  
ہوں کم از کم ایک ہفتہ تک تمہیں ان کی حفاظت کرنا ہوگی۔“

”تمہیں شاید معلوم نہیں تمہاری اور ان آدمیوں کی تلاش کے لئے جنگل میں کارروائی شروع ہو چکی  
ہے۔ مان جند پولیس کو بھی کل اطلاع دے دی گئی ہے کہ وہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ نگرانی  
رکھیں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو دوڑیہ احمد خان۔“ شیر ملاح نے اسے گھورا۔

”کچھ نہیں۔“ دوڑیہ احمد خان جلدی سے بولا۔ ”تمہارے یہ بندے...؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی  
طرف دیکھنے لگا۔

”ہم لوگ چلے جائیں گے۔ ان میں سے کوئی تمہارے گٹھ کا رخ نہیں کرے گا۔ البتہ میں اور میرا یہ  
دوست آج دوپہر تک تمہارے گٹھ میں رہیں گے۔“ شیر ملاح نے کہا۔  
”ٹھیک ہے۔ تم دونوں بھی میرے ساتھ ہی چلو۔“ دوڑیہ احمد خان نے کہا۔

سیٹھ کارول اور کراچی کے تاجر صدر کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ انہیں اٹھا کر پاجیرو میں ڈال  
دیا گیا۔ شیر ملاح نے اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دیں۔ ان میں کچھ رقم تقسیم کی اور شیر درانی کو لے کر  
پاجیرو میں بیٹھ گیا۔ دوڑیہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور پاجیرو حرکت میں آ گئی۔

پاجیرو کے شیشوں پر کالے رنگ کی پلاسٹک شینس لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا  
تھا کہ اندر کوئی بیٹھا ہوا ہے یا نہیں۔ پاجیرو ایک چھوٹے سے گٹھ میں پہنچ گئی۔ پندرہ بیس کچے مکان اور  
جھونپڑے تھے۔ یہ دوڑیہ کے ہاریوں کے جھونپڑے تھے۔ یہاں زندگی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ گٹھ  
کے لوگ پاجیرو کو دیکھ کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کرنے لگے۔ اس گٹھ سے تقریباً ”سو گز کے فاصلے پر دوڑیہ احمد  
خان کی حویلی تھی۔ اس نے ہارن دیا۔ گیٹ کھل گیا اور پاجیرو حویلی میں داخل ہو گئی۔

سیٹھ کارول اور سیٹھ صدر کو دو آدمیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کا کیا کرنا ہے۔ وہ

انہیں لے کر حویلی میں ایک طرف چلے گئے۔ وڈیرہ، شبیر درانی اور بشیر ملاح کو لے کر اپنے اوطاق میں آگیا۔ یہاں بشیر ملاح کی جو آؤ بھگت کی گئی اسے دیکھ کر شبیر درانی کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ایک ڈاکو کی اتنی آؤ بھگت۔ اسے شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ڈاکو انہی وڈیروں کے پروردہ تھے اور ان کے کاروبار میں برابر کے حصہ دار تھے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بشیر ملاح اور شبیر درانی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ بشیر ملاح نے اپنا اسلحہ وغیرہ حویلی ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک بس پر بیٹھ کر مان جند سے کوٹری پہنچ گئے۔ انہوں نے رات حیدر آباد میں گزاری اور صبح سویرے بس کے ذریعے کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔ کراچی پہنچ کر بشیر ملاح شبیر درانی کو نارنجہ ناظم آباد کے ایک بنگلے پر لے آیا۔ یہ بشیر ملاح کے ایک دوست کا بنگلہ تھا۔ اس نے بڑی گرجوشی سے ان کا استقبال کیا۔

شبیر درانی بہت تھکا ہوا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھاتے ہی وہ سو گیا اور جب بیدار ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ اس نے نما دو کر بشیر ملاح کے دوست حضور بخش کے دیئے ہوئے کپڑے پہنے اور چائے پینے کے بعد وہ بشیر ملاح اور حضور بخش کے ساتھ کار میں بیٹھ کر صدر آگیا۔ بشیر ملاح کے پاس تھیلے میں وہ زیورات تھے جو شبیر درانی نے اسے دیئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی تھیلے میں اور بہت سے زیورات تھے۔ جو اس نے مختلف وارداتوں میں لوٹ کر جمع کر رکھے تھے۔

حضور بخش انہیں صدر میں ایک صراف کی دوکان پر لے آیا۔ صراف اور بشیر ملاح کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ دونوں اجنبی نہیں تھے۔ شبیر درانی کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ بشیر ملاح لوٹا ہوا مال اسی دوکان پر بچھا کر آتا تھا۔

تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ دوکان سے باہر نکلے۔ شبیر درانی کار میں بیٹھ رہا تھا کہ سڑک کے دوسری طرف دو لڑکیوں کو ایک پبلی ٹیکسی میں بیٹھے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان میں ایک لڑکی اس کی کزن نائلہ درانی تھی۔

وہ تیزی سے سڑک عبور کرنے لگا لیکن عین اسی وقت ایک مٹی بس اس کے سامنے آگئی اور جب مٹی بس اس کے سامنے سے نکل گئی تو وہ پبلی ٹیکسی وہاں سے جا چکی تھی۔ وہ تیزی سے حضور بخش کی کار کی طرف لپکا۔

”اس ٹیکسی کا پیچھا کرو حضور بخش، وہ پبلی ٹیکسی بائیں طرف مڑی ہے۔“ وہ جلدی سے کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

حضور بخش مرکز حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اسے شبیر درانی کی ذہنی کیفیت پر شبہ ہو پھر اس نے مرکز سیدھا بیٹھتے ہوئے انجمن اشارت کر دیا۔

..... \* \* \* .....

پولیس موبائل کو دیکھ کر نائلہ درانی ایک لمحہ کو بدحواس ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پایا۔ اس کی آنکھیں پولیس موبائل کے ہیڈلیمپس کی روشنی میں چند لمحوں کی گئی تھیں۔ لیکن موبائل کا رخ بدلا تو روشنی کا زاویہ بھی بدل گیا۔ اس کے ساتھ ہی نائلہ نے ٹیکسی کے پچھلی طرف چلاٹنگ لگادی۔

”عبدالقدوس بھاگو... جلدی۔“ نائلہ نے کہا اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔  
عبدالقدوس بہت زیادہ بدحواس ہو رہا تھا۔ اسی بدحواسی میں اس نے نائلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نائلہ اسے  
کھینچتی ہوئی سڑک سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں کی طرف دوڑی۔  
پولیس موبائل کی انگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پارٹی کے انچارج ہیڈ کانٹیل نے ہیڈلیمپس کی روشنی میں  
سڑک کے دوسری طرف پبلی ٹیکسی اور اس کے قریب کھڑی ہوئی ایک عورت کو دیکھ لیا تھا لیکن وہ صورت  
حال کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

”گاڑی روکو نا ذرا۔“ ہیڈ کانٹیل نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ سامنے ٹیکسی کے پاس  
ایک عورت کھڑی ہے۔ مجھے کچھ گڑباز لگتی ہے۔“  
ڈرائیور نے موبائل ذرا سی گھما کر روک لی۔ اسی دوران ہیڈ کانٹیل نے اس عورت کو ٹیکسی کے پچھلی  
طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

نائلہ درانی اور عبدالقدوس جھاڑیوں کے قریب پہنچ گئے۔ عبدالقدوس نے جیسے ہی جھاڑیوں میں گھسنا  
چاہا اس کے منہ سے ہلکی سی سکاری نکل گئی۔ وہ اس خاردار تار کو نہیں دیکھ سکا تھا جو جھاڑیوں کی وجہ سے  
چھپ کر رہ گئی تھی۔ نائلہ نے ایک اوپر اور ایک نیچے کی تار پکڑ کر اسے مخالف سمتوں میں کھینچا۔  
عبدالقدوس جبک کر تاروں کے دوسری طرف نکل گیا۔ نائلہ بھی تاروں کے دوسری طرف آگئی۔ ان کے  
آگے دور تک جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ان جھاڑیوں میں دوڑنے  
لگے۔

ہیڈ کانٹیل دو پولیس والوں کو لے کر سڑک پار کر کے ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں کانٹیلوں کے  
ہاتھوں میں راتھلیں تھیں۔ ہیڈ کانٹیل کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں نارچ۔ اس نے نارچ  
چلائی اور اس کی روشنی میں ٹیکسی کے اندر جھانکنے لگا۔ پچھلی سیٹ پر دو بندھے ہوئے آدمی دیکھ کر وہ ایک  
جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

”اوائے سراج... یہ دیکھ... یہاں تو دو بندھے بندھے پڑے ہیں۔“ وہ مرکز کانٹیلوں کی طرف دیکھتے  
ہوئے بولا۔ ”ادھر ایک عورت بھی تھی۔ دیکھو وہ کہاں ہے؟“

چند سیکنڈ بعد دوسرے پولیس والے بھی موبائل سے اتر کر وہاں پہنچ گئے اور سڑک کے ساتھ ساتھ  
جھاڑیوں میں اس عورت کو تلاش کرنے لگے جسے ہیڈ کانٹیل نے دیکھا تھا۔

”وہ کوئی عورت نہیں ہوگی جی، آپ کا وہم ہو گا۔“ ایک کانٹیل نے کہا۔  
”اوائے میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ تلاش کرو اسے۔ وہ ہمیں کہیں جھاڑیوں میں چھپی  
ہوگی۔“ ہیڈ کانٹیل نے کہا۔

اسی لمحہ جھاڑیوں کے اندر کافی دور سے ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی۔  
”یہ... یہ چیخ کی آواز سنی تم نے؟“ ہیڈ کانٹیل بولا۔ ”وہ ادھر گئی ہے۔ ڈھونڈو، پکڑو اسے“  
دو کانٹیل جھاڑیوں کی طرف دوڑے مگر خاردار تاروں سے ٹکرا گئے۔ ان کے منہ سے گالیاں نکل  
ری تھیں۔ وہ تاروں کے اندر سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

نائلہ درانی اور عبدالقدوس ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اونچی جھاڑیوں میں اندھا دھند دوڑے جا رہے  
تھے۔ جگہ ناہموار تھی۔ بڑے بڑے کھڈے تھے۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہے تھے مگر انہیں ایک دوسرے کا سہارا

حاصل تھا۔

ان کے بائیں طرف تقریباً ”سو گز کے فاصلے پر وہ بلند آہنی ٹاور تھا جس کی چوٹی پر سرخ بتی جل بجھ رہی تھی۔ اس ٹاور کے قریب ہی دفتر کی عمارت تھی اور اس کے ساتھ نئے زیر تعمیر بلاک تھے۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے ان زیر تعمیر بلاکوں کے پچھلی طرف پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دفعۃً ”ایک گڑھے میں نائلہ کا پیر رہ پٹ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس چیخ کی آواز سن کر ہی پولیس والے اس طرف دوڑے تھے۔

عبدالقدوس نے سارا دے کر نائلہ کو اٹھایا۔ یہ غنیمت تھا کہ نائلہ کے پیر کو موج نہیں آئی تھی۔ وہ ایک بار پھر دوڑنے لگے۔ اب انہیں اپنے عقب میں بھی دوڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ پولیس والے تھے جو انہیں تلاش کرتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔

نائلہ اور عبدالقدوس دوڑتے ہوئے ٹاور سے کافی دور نکل چکے تھے۔ کھڑوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے انہیں زیر تعمیر عمارتوں کی طرف مڑنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور وہ سیدھے دوڑتے چلے گئے تھے۔

”اس طرف دیکھو... میں نے ادھر آواز سنی ہے۔“ ایک آواز سن کر وہ چونک گئے۔

”عبدالقدوس...“ نائلہ نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”وہ لوگ اسی طرف آرہے ہیں۔“

ادھر آؤ... اس طرف جھاڑیاں زیادہ اونچی ہیں۔ ہم آسانی سے چھپ سکتے ہیں۔“

وہ دونوں تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگے۔ اس طرف جھاڑیاں بہت بڑی بڑی تھیں۔ دوڑتے ہوئے اچانک یوں لگا جیسے ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر گرے اور تقریباً ”عمودی ڈھلان پر قلابا زیاں کھاتے ہوئے لڑھکتے چلے گئے۔

یہ تقریباً ”بیس بائیس فٹ گہرا کھڈ تھا جو خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس کھڈ میں جھاڑیاں زیادہ گنجان اور زیادہ اونچی تھیں۔ وہ دونوں لڑھکتے ہوئے بالا خر جھاڑیوں میں الجھ کر رک گئے۔ جھاڑیوں میں الجھنے سے نائلہ کی قبض دو جگہوں سے پھٹ گئی تھی اور پورے جسم پر خراشیں آئی تھیں جن میں جلن ہو رہی تھی۔ عبدالقدوس کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

دفعۃً ”دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن کر وہ چونک گئے۔ عبدالقدوس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر

نائلہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔ وہ کھڈ میں مزید نیچے اترتے چلے گئے اور بالا خر عبدالقدوس اسے لے کر گنجان جھاڑیوں میں کھس گیا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے انہیں کچھ اور خراشیں آئی تھیں۔ جھاڑیوں میں کافی اندر جا کر وہ رک گئے۔ دونوں کے سانس پھول گئے تھے اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ پولیس والے کس طرف تھے۔ دوڑتے ہوئے قدموں اور سوکھی ہوئی جھاڑیوں کے پھینکنے کی آوازیں مختلف سمتوں سے آرہی تھیں۔ دفعۃً ”یوں لگا جیسے کوئی دوڑتا ہوا ڈھلان پر اتر رہا ہو۔ وہ کم از کم دو آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں تھیں۔

”وہ لوگ اسی طرف آرہے ہیں۔“ نائلہ نے سرگوشی کی۔ ”تمہارے منہ سے کوئی آواز نہ نکلے اور نہ ہی اپنی جگہ سے حرکت کرنا۔“

جھاڑیوں میں بیٹھنے کے لئے جگہ ویسے ہی تنگ تھی۔ عبدالقدوس، نائلہ کے ساتھ چٹ کر بیٹھ گیا۔ نائلہ

درانی نے اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ واضح طور پر محسوس کر لی تھی۔ نائلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے آہستہ آہستہ سسلانے لگی۔

دوڑنے کی آواز رک گئی تھی اور اب خشک جھاڑیاں چنچنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے کوئی بہت ہی محتاط ہو کر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”اسے میں نے اسی طرف دیکھا تھا۔“ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”وہ عورت تھی یا چھلاوہ؟“ دوسری آواز نائلہ کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”ایسی دلیر عورت۔ دو آدمیوں کو پیٹ کر اور باندھ کر بھاگی ہے اور اس دیرانے میں اسے ڈر بھی نہیں لگتا۔“

”جو عورت دو آدمیوں کو بے بس کر سکتی ہے وہ ان جھاڑیوں سے کیا ڈرے گی؟“ پہلی آواز نے کہا۔ ”ویسے مجھے شبہ ہے کہ وہ اکیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ کوئی آدمی ضرور ہوگا اور وہ یہیں کہیں جھاڑیوں میں چھپے ہوں گے۔“

”مجھے تو لگتا ہے وہ کہیں دور نکل گئے ہوں گے۔“

”ہو سکتا ہے۔ لیکن آس پاس دیکھ لینے میں کیا حرج ہے ہو سکتا ہے وہ یہیں کہیں موجود ہوں۔“

دوسرے نے جواب دیا۔

نائلہ اور عبد القدوس سانس روکے بیٹھے تھے۔ ان کے آس پاس قدموں اور سوکھی ہوئی جھاڑیوں کے چنچنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ نائلہ نے ایک ہاتھ سے عبد القدوس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پستول سنبھال رکھا تھا۔ وہ پولیس والوں کے خلاف پستول استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی لیکن انتہائی مجبوری کی صورت میں وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

پولیس والے اب دور چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد جھاڑیوں کے چنچنے کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں۔ نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ اس کھڈ سے نکل کر دور جا چکے تھے۔

”میرا خیال ہے وہ لوگ جا چکے ہیں ہمیں اس طرف سے نکل جانا چاہئے۔“ عبد القدوس نے نائلہ کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

”چلو نکلو۔“ نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

وہ دونوں رینگتے ہوئے جھاڑیوں سے نکلے گئے۔ خراشوں کی وجہ سے انہیں جسم میں جگہ جگہ جلن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دونوں جھاڑیوں میں جھک کر چلتے ہوئے کھڈ سے باہر نکل آئے۔ ان دونوں نے اب بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تمام رکھا تھا۔

”وہ پولیس والے اس طرف گئے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمیں اس طرف چلنا چاہئے۔“ نائلہ نے عبد القدوس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں آگے چلے گئے۔ یہاں بھی جھاڑیاں قد آدم تھیں۔

”اگر ہم اس طرف چلتے رہیں تو این ای ڈی ہو سٹل کے عقب سے ہوتے ہوئے بھائیانی ہائیٹس کی پشت پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں سے مین روڈ پر نکل آئیں گے۔“ عبد القدوس نے کہا۔

”چلو۔۔۔ اسی طرف چلو۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے رہے۔ ایک کانٹے دار جھاڑی عبد القدوس کے کپڑوں میں الجھ گئی۔ وہ رک کر جھاڑی کو کپڑوں سے الگ کرنے لگا۔ نائلہ کو اس کے رکنے کا پتہ نہیں چلا وہ چلتی ہوئی اس سے چند رہے گز

آگے نکل گئی۔  
 نائلہ کچھ اور آگے نکل چکی تھی۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا کھڈ تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر اس کھڈ کو عبور کرنا چاہتی تھی کہ اپنے عقب میں ایک غراتی ہوئی آواز سن کر اچھل پڑی۔  
 ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا گولی مار دوں گا۔“

نائلہ رک گئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ اس نے گردن سمٹا کر دیکھا۔ ایک کانٹیل اس پر راقفل تھانے کھڑا تھا۔ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کانٹیل غالباً ”اکیلا تھا کیونکہ اس پاس کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ عبد القدوس بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ کہاں غائب ہو گیا۔  
 ”تمہارا خیال تھا کہ تم بھاگنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔“ پولیس والے نے کہا۔ ”لیکن جو ایک مرتبہ پولیس کی نظروں میں آجائے وہ بچ کر نہیں جاسکتا۔“

نائلہ پریشان ہو رہی تھی اس لئے نہیں کہ وہ پولیس والے کی راقفل کی زد پر تھی بلکہ اس لئے کہ عبد القدوس غائب ہو گیا تھا۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چپکے سے کسی اور طرف تو نہیں نکل گیا۔ لیکن پھر خود ہی اپنے اس خیال کی نفی کر دی۔ عبد القدوس بزدل ضرور تھا لیکن وہ اسے اس طرح چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔

دفعتا ”وہ چونک گئی۔ پولیس والے کے عقب میں ایک انسانی ہیولہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا جو بڑے محتاط انداز میں جھک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ نائلہ درانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ عبد القدوس تھا!

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے مسٹر کانٹیل۔“ نائلہ نے پولیس والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے باتوں میں لگائے رکھنا چاہتی تھی تاکہ اس کا دھیان عبد القدوس کی طرف نہ جاسکے۔ ”میں عورت نہیں طوفان ہوں۔۔۔ مجھے گرفت میں لینا آسان نہیں ہو گا۔“

”تو اس بند کرو۔ بہت دیکھے ہیں تم جیسے طوفان۔“ پولیس والے نے کہا۔ ”چلو اس طرف۔۔۔ آگے لگو۔۔۔ اور اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو بے دریغ گولی چلا دوں گا۔“

نائلہ نے پولیس والے کے پیچھے دیکھا۔ عبد القدوس اب پولیس والے سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ دفعتا ”اس کا پیر کسی خشک جھاڑی پر پڑا۔ جھاڑی کی شاخوں کے پھٹنے کی آواز سن کر پولیس والا تیزی سے پیچھے مڑا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ اسی لمحہ عقب سے عبد القدوس نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ پولیس والا بوکھلا گیا۔ اسی بوکھلاہٹ میں اس نے راقفل کا ٹراننگر دبا دیا۔ راقفل آٹومیک پر تھی۔ ٹرانز ایٹ کی آواز سے دیرانہ گونج اٹھا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ پولیس والے کے مڑتے ہی نائلہ بڑی پھرتی سے زمین پر گر گئی تھی۔ اگر وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہتی تو اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔

عبد القدوس نے ایک ہاتھ پولیس والے کی گردن پر ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی کھٹنے سے اس کے پیٹ پر ٹھوکر مار دی تھی راقفل پولیس والے کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ پولیس والا اس اچانک افتاد پر بری طرح بوکھلا گیا تھا اس لئے وہ آسانی سے عبد القدوس کے قابو میں آگیا تھا۔

نائلہ درانی اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے پولیس والے کی طرف لپکی۔ وہ پولیس والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ نائلہ نے راجستھان کے کیمپ میں اپنے حریف کو بے بس کرنے کی بھی ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اس نے پستول زمین پر رکھ دیا اور پولیس والے کی گردن پر دونوں طرف نہیں ملنے لگی۔

اسی وقت ویرانہ ایک بار پھر فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ یہ فائرنگ تقریباً ”دو سو گز دور کسی اور پولیس والے نے کی تھی۔“  
عبدالقدوس نے پولیس والے کو دبوچ رکھا تھا۔ پولیس والا اپنے آپ کو چھوڑنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔  
نالہ تیزی سے اس کی گردن کی نیسیں مسل رہی تھیں۔ گردن کی یہ نیسیں دراصل پریشر پوائنٹ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی کانفیبل کی مزاحمت ختم ہو گئی اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ نالہ نے اس کی گردن چھوڑ کر اپنا پستول اٹھالیا۔

”چلو... جلدی کرو۔ بھاگو یہاں سے۔“ نالہ نے کہا۔  
عبدالقدوس نے بھی پولیس والے کو چھوڑ دیا۔ بائیں طرف سے فائرنگ اور بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پولیس والے بلاوجہ اپنا ایمونیشن ضائع کر رہے تھے۔ نالہ درانی اور عبدالقدوس وہاں سے اٹھ کر ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس جگہ سے بہت دور نکل چکے تھے۔  
این ای ڈی ہوسٹل کے عقب سے ہوتے ہوئے وہ بھائیانی ہائینس کی پشت پر پہنچ گئے۔ یہ سارا علاقہ بھی جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ بھائیانی ہائینس کے اوپر سے گھوم کر وہ ایک اسکول کی عمارت کے قریب ابوالحسن اصفہانی روڈ پر نکل آئے اور سڑک پار کر کے بلاک فور کی ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ اور پھر گلیوں ہی گلیوں میں ہوتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی روڈ پر آ گئے۔ رات اگرچہ کافی ہو چکی تھی لیکن اس سڑک پر اکا دکا ٹریفک اب بھی جاری تھا۔ موقع پا کر انہوں نے سڑک پار کر لی۔  
سڑک کے دوسری طرف بلاک سیون تھا۔ گلیوں ہی گلیوں سے ہوتے ہوئے اپنے بچلے تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گیٹ کی تیل بجانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سلطانہ نے دروازہ کھول دیا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

”میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ تم لوگ کہیں پولیس کے ہاتھ نہ لگ جاؤ۔ یہ فائرنگ....“  
”پولیس کے ہاتھ لگ تو گئے تھے۔“ نالہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تو ایک پولیس والے کے قابو آئی گئی تھی۔ اس نے مجھ پر رائفیل تان رکھی تھی لیکن عبدالقدوس نے اس وقت بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔“

”دراصل میرے کپڑوں میں خاردار جھاڑی کی ایک شاخ الجھ گئی تھی۔“ عبدالقدوس نے نالہ کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”میں وہ جھاڑی چھڑانے کے لئے رک گیا تھا۔ اس دوران نالہ کافی آگے نکل گئی تھی اور جب میں وہاں پہنچا تو پولیس والے کو نالہ پر رائفیل تانے دیکھ کر ایک لمحہ کو توجہ اس ہو کر رہ گیا تھا لیکن پھر میں نے ہمت سے کام لیا اور پولیس والے پر چھلانگ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ اسے خاموشی سے قابو میں کر لیا جائے گا لیکن اس کی رائفیل چل گئی جس سے دوسرے پولیس والے بھی متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے بھی ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ میرا خیال ہے وہ لوگ اب بھی ہمیں ان جھاڑیوں میں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”عورت کو میں نے بیشہ نازک اور کمزور سمجھا ہے لیکن تم دونوں.... لگتا ہے فولاد کی بنی ہوئی ہو۔ کوئی عورت اتنی بے باک اور نڈر نہیں ہو سکتی۔ تم لوگ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق تو نہیں؟“  
”ہم مخلوق تو اسی سیارے کی ہیں جس پر تم رہ رہے ہو لیکن تم یہ بتاؤ کہ ہم سے پہلے کتنی عورتوں سے واسطہ پڑ چکا ہے تمہارا؟“ سلطانہ نے اسے گھورا۔



”کک... کسی سے نہیں۔“ عبد القدوس ہٹکا کر رہ گیا۔ ”میں تو عورت کے تصور ہی سے شرماتا تھا مگر... تم لوگوں نے مجھے بھی اس معاملے میں پیٹا بنا دیا ہے۔“

”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ...“  
 ”مہ... میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“ عبد القدوس نے جلدی سے سلطانہ کی بات کاٹ دی۔ ”میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔“  
 ”اپنا حلیہ دیکھا ہے تم دونوں نے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”تم لوگ اپنا حلیہ درست کرو۔ میں چائے بناتی ہوں۔“

”میں ابھی حلیہ درست کر کے آتا ہوں۔“ عبد القدوس جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔  
 نالہ بھی کپڑوں کا ایک جوڑا لے کر ہاتھ روم میں کھس گئی۔ تقریباً ”بیس منٹ بعد وہ تینوں ایک بار پھر نالہ والے بیڈ روم میں جمع تھے اور چائے پی رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ موجودہ صورت حال کے بارے میں گفتگو بھی کرتے جا رہے تھے۔

”مجھے خوشی ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف کارروائی میں مجھے بھی اپنا کردار ادا کرنے کا موقع مل رہا ہے۔“ عبد القدوس نے کہا۔ ”ان وطن دشمنوں کو واقعی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا خوبصورت سب سے بارونق شہر جہاں کبھی رات نہیں ہوتی تھی، جو روٹینوں کا شہر کہلاتا تھا، ان دہشت گردوں کی وجہ سے تاریکیوں میں ڈوب گیا ہے۔ جس کی سڑکوں پر ٹریفک جام رہتا تھا اب وہ سڑکیں ویران رہنے لگی ہیں۔ لوگ دن کے وقت بھی گھروں میں تالے لگا کر رکھتے ہیں۔ کوئی شخص خوف کے مارے گھر سے نہیں نکلتا۔ ہر شخص کے دل میں یہ خوف سایا ہوا ہے کہ نجانے کس طرف سے آنے والی کوئی گولی اسے چاٹ جائے۔ یہ لوگ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ سینکڑوں گھراڑ دیئے ہیں ان لوگوں نے۔ ایک ایک گھر سے کئی کئی جنازے اٹھتے ہیں۔ ان بے ضمیر لوگوں نے تو خانہ خدا کے تقدس کو بھی پامال کر دیا ہے۔ مسجدوں میں نماز پڑھتے ہوئے نمازیوں پر فائرنگ کر کے انہیں خاک و خون میں لوٹایا ہے۔ ان لوگوں کو واقعی زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ دونوں نے مجھے یہ حوصلہ بخشا کہ میں بھی ان دہشت گردوں کے خلاف اپنا کردار ادا کر سکوں۔“

”تمہارے جذبات تعریف کے قابل ہیں۔“ نالہ درانی نے توصیفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”اگر ہر شخص کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ دہشت گرد اپنی موت آپ مرجائیں۔“

”یہ جذبہ ہر شخص کے دل میں موجود ہے۔“ عبد القدوس نے جواب دیا۔ ”بات صرف اتنی ہے کہ وہ نیتے ہیں، خالی ہاتھ ہیں۔ دہشت گرد اگر لٹکار کر کوئی کارروائی کریں تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نیتے اور خالی ہاتھ لوگ بھی ان سے لپٹ جائیں گے اور ان کی کارروائی کو ناکام بنا دیں گے۔ لیکن یہ دہشت گرد چھپ کر اور اچانک ہی کارروائی کرتے ہیں جس سے بے گناہ، معصوم اور نیتے لوگ مارے جاتے ہیں۔“

”ہم نے لوگوں میں یہ جذبہ اجاگر کرنا ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”اسی لئے ہم نے دہشت گردوں کے خلاف عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب تک ہم نے صرف دو جگہوں پر کارروائی کی ہے اور دونوں موقعوں پر ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اگر تم جیسے محب وطن نوجوان ہمارا ساتھ دیں تو ہم ان دہشت گردوں کے خاتمے کا دعویٰ تو نہیں کرتیں لیکن دہشت گردی کی یہ وارداتیں کم کر سکتی ہیں۔ ہمارے پاس کچھ دہشت گردوں کے پتے موجود ہیں۔ ایک تو شوکت تھا۔ جس کے بارے میں تم نے رفاہ عام سوسائٹی جا کر

معلومات حاصل کی تھیں۔ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ شوکت ہی کے گروہ کے یہ دودھشت گرد ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ یہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ اب ہمیں ایک اور جگہ پر کارروائی کرنی ہے۔“

”کس جگہ؟“ عبد القدوس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نارتھ ناظم آباد کا ایک جگہ ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”وہ بونی والا جگہ۔“ نانکھ درانی نے کہا۔ ”نارتھ ناظم آباد کے حوالے سے سب سے پہلے اسی کا نام

زہن میں آتا ہے۔ راجستان کے کیمپ میں وہ سب سے زیادہ چھپھورا آدمی تھا۔“

”بالکل وہی۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کا پتہ تو کمپیوٹر کی طرح میرے ذہن میں محفوظ ہے۔“

”وہ میرا خیال ہے کہ ہلاک آئی میں رہتا ہے۔ اس کے مکان کا نمبر ہے۔“ نانکھ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی چند لمحوں تک کپٹی پر انگلی مارتی رہی پھر اس نے بونی کے مکان کا پتہ بتا دیا۔

”بالکل یکی پتہ ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”یہ مکان دراصل اس کے باپ کا ہے۔ کسٹرز کے محکمہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ رشوت کی کمائی سے اس نے شہر کے مختلف علاقوں میں تین چار بنگلے بنائے ہیں، کوئی بیوی کے نام، کوئی بیٹی کے نام، کوئی بیٹے کے نام اور کوئی کسی اور کے نام۔ نارتھ ناظم آباد والا یہ مکان بونی کے نام ہے۔ بونی نے خود بتایا تھا کہ اس کی شادی ہوئی تھی تو وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس مکان میں منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن صرف چھ ماہ بعد اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد بھی وہ اسی مکان میں رہتا رہا۔ باپ سے بھی کچھ ان بن ہو گئی تھی۔ پھر پتہ نہیں کس طرح راکے کسی ایجنٹ کے ہاتھ لگ گیا جس نے اسے ٹینک کے لئے راجستان کے اس کیمپ میں بھیج دیا۔ وہ ایک عیاش آدمی ہے اور میاں بیوی میں جھگڑا بھی اسی بات پر ہوا تھا کہ وہ آوارہ عورتوں اور غنڈہ قسم کے دوستوں کو گھر لے کر آتا ہے۔ یہ جھگڑا طلاق پر ختم ہوا تھا۔“

”بونی نے کیمپ میں سب ہی لوگوں کو یہ کمائی سنائی تھی۔“ نانکھ نے کہا۔ ”اب صورت حال یہ ہے کہ وہ کراچی میں دہشت گردی کی وارداتوں میں مصروف ہے۔ ہمیں اس کی سرگرمیوں کو روکنا ہے عبد القدوس۔“ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”کل تم بونی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو گے۔ اس کے بعد عملی قدم اٹھایا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ عبد القدوس نے کہا۔ ”اس وقت تو میں سوئے جا رہا ہوں۔ رات بہت ہو چکی ہے۔ بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے، صبح بروگرام بنائیں گے۔“ سلطانہ نے کہا۔

عبد القدوس اپنے کمرے میں چلا گیا اور نانکھ درانی اور سلطانہ اپنے بیڈ پر لیٹ گئیں۔

وہ تینوں صبح دیر سے اٹھے تھے۔ سلطانہ ان سب سے پہلے بیدار ہوئی تھی۔ اس نے کچن میں جا کر اپنے لئے چائے کا ایک کپ بنایا اور برآمدے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ صورت حال کے بارے میں سوچنے لگی۔ کراچی کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے۔ مٹھی بھر دہشت گردوں نے ایک کروڑ کی آبادی کو پر غمال بنا رکھا تھا۔ وہ جہاں اور جب چاہتے اندھا دھند فائرنگ کر کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو خاک و خون میں لوٹا دیتے۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ پولیس ناکام ہو چکی تھی۔ کسی علاقے میں دہشت گردی کی اطلاع ملنے پر بھی پولیس اس طرف کا رخ نہیں کرتی تھی۔ شہریوں کے دلوں میں پولیس

کے خلاف بھی نفرت بڑھ رہی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں یہ تاثر جڑیں پکڑنے لگا تھا کہ پولیس ان دہشت گردوں سے ملی ہوئی ہے۔ تخریب کاری اور دہشت گردی کی ساری وارداتیں پولیس کی سرپرستی میں ہو رہی ہیں لیکن سنجیدہ خیالات رکھنے والے جانتے تھے کہ اس میں پولیس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ شہر کی آبادی کے لحاظ سے پولیس کی نفری بہت کم تھی جو صورت حال پر قابو پانے کے لئے قطعی ناکافی تھی۔

شہر میں روزانہ دس پندرہ افراد دہشت گردی کا شکار ہو رہے تھے۔ سلطانہ نے چائے پیتے ہوئے گیٹ کی طرف دیکھا۔ گیٹ کے اندر کی طرف اخبار پڑا تھا۔ وہ جا کر اخبار اٹھا لائی۔ اخبار کی شہ سرخ دہشت گردی کی وارداتوں سے متعلق تھی۔ اخباری اطلاع کے مطابق گزشتہ روز شہر کے مختلف علاقوں میں بارہ افراد دہشت گردی کا شکار ہوئے تھے جن میں دو بچے بھی شامل تھے۔

اخبار کی لوح کے عین نیچے ایک اور تین کالی دلچسپ خبر تھی۔  
 ”پراسرار عورت دودھ دہشت گردوں کو باندھ کر فرار ہو گئی“

”دونوں دہشت گرد فوج عامہ سوسائٹی میں ہونے والی خونریزی میں ملوث تھے“

اس کے نیچے نائلہ کے حوالے سے گزشتہ رات کے واقعے کی تفصیل تھی۔ پولیس کے ذرائع کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ وہ پراسرار عورت پولیس کو دیکھ کر جھاڑوں میں فرار ہو گئی تھی۔ پولیس نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اس پراسرار عورت کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ اس آدمی کے بارے میں صرف ایک کانشیل کا بیان تھا جبکہ دوسرے پولیس والوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ تاہم، پولیس پارٹی کے انچارج ہیڈ کانشیل نے اسے پراسرار عورت قرار دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اسے فوری طور پر پولیس سے رابطہ قائم کرنا چاہئے تاکہ اس سے ان دہشت گردوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جاسکیں۔ خبر کے آخر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ پولیس بڑی سرگرمی سے اس پراسرار عورت کو تلاش کر رہی تھی۔

سلطانہ نے خبر پڑھنے کے بعد اخبار ایک طرف رکھ دیا اور چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے سوچنے لگی کہ رات کو پولیس والے نائلہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ محفوظ تھی۔

کچھ دیر بعد نائلہ اور عبد القدوس بھی اپنے کمروں سے نکل کر برآمدے میں آگئے۔ سلطانہ ان کے لئے بھی چائے بنا لائی۔ چائے کے دوران وہ اخبار کی اس خبر پر تبصرہ کرتے رہے۔

”پولیس نے مشورہ دیا ہے کہ تم ان سے رابطہ قائم کرو۔ تاکہ تم سے دہشت گردوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جاسکیں۔“ سلطانہ نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جانتی ہو کہ کسی سے معلومات حاصل کرنے کے لئے پولیس کیا طریقہ اختیار کرتی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”اس لئے میں اس مشورے پر عمل نہیں کر سکتی۔“

وہ کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے۔ پھر سلطانہ نے اٹھ کر ناشتہ تیار کیا۔ ناشتے کے بعد عبد القدوس یونیورسٹی چلا گیا۔ اسے اگرچہ دیر ہو چکی تھی مگر وہ ناغہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تین بجے کے لگ بھگ واپس آیا تھا۔ نائلہ اور سلطانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھا چکی تھیں۔ عبد القدوس نے بھی کھانا

کھایا اور بونی کے مکان کا نمبر معلوم کرنے کے بعد اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنا وہی پرانا لباس پہنا تھا، بڑے بڑے پائے اور ڈھیلا ڈھالا کرتا۔ چہرے پر کس کس داڑھی کے بے ترتیب بال... اس حلقے میں

اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

عبدالقدوس کی واپسی رات کو تقریباً ”نوبے ہوئی تھی۔ وہ بڑی تفصیل سے معلومات حاصل کر کے آیا تھا۔

”بونی کا اصل نام تنویر احمد تھا۔ وہ کراچی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ گریجویشن کے بعد وہ کافی عرصہ بیکار رہا۔ باپ کی دولت پر عیش کرتا رہا۔ آوارہ دوستوں کے ساتھ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہتا تھا۔ باپ نے یہ سوچ کر اس کی شادی کر دی کہ شاید ذمے داریوں کا احساس کرتے ہوئے وہ سنبھل جائے لیکن وہ کچھ اور مجذوب گیا۔ باپ نے اسے رہائش کے لئے نارتھ ناٹم آباد والا وہ بنگلہ دے دیا تھا۔ اس طرح الگ رہنے سے اسے مزید آزادی مل گئی اور وہ آوارہ دوستوں اور لڑکیوں کو گھیر لے لگا۔ اس کی بیوی نے کئی مرتبہ احتجاج کیا لیکن اسے نہ تو اپنی بیوی کی پرواہ تھی اور نہ باپ کی دھمکیوں کی۔

شادی کے بعد وہ تقریباً ”دو ماہ تک گھر سے غائب رہا تھا۔ واپس آنے کے بعد اس کی آوارگیوں میں اضافہ ہوا تھا۔ باپ نے اور دوسرے عزیزوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کسی کی نصیحت قبول کرنے کے بجائے بیوی کو طلاق دے دی۔ باپ نے غصے میں آکر اسے عاق کر دیا۔ لیکن وہ اس بنگلے پر قابض ہے۔ تقریباً ”تین ہفتے پہلے باپ نے اس سے بنگلہ خالی کرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے باپ کو دھمکی دی کہ اگر اس سے بنگلہ خالی کروایا گیا تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ باپ بھجارہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

اس محلے کے لوگ بھی بونی اور اس کے دوستوں کی حرکتوں سے پریشان ہیں۔ وہ آوارہ لڑکیوں کو لے آتے ہیں اور رات بھر ہلچلی بازی کرتے رہتے ہیں۔ محلے کے لوگوں نے ایک دو مرتبہ پولیس میں ان کے خلاف شکایت کی تھی لیکن پولیس نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی البتہ محلے کے بعض لوگوں کو دھمکا دیا گیا۔ بونی اور اس کے ساتھیوں نے بھی محلے والوں کو دھمکیاں دی تھیں کہ اگر آئندہ ان کے خلاف پولیس میں شکایت کی گئی تو انہیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ محلے کے لوگ خاموش ہو گئے اور یہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں لیکن وہ ان سے خوفزدہ ہیں۔ ان کے ساتھ والے بنگلے کے کمین تو بنگلہ خالی کر کے کہیں اور جا چکے ہیں اور مکان پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

میری معلومات کے مطابق قریبی مارکیٹ میں ایک پان والا بونی کے ایجنٹ کے حیثیت سے کام کرتا ہے۔ وہ اسے مختلف قسم کی معلومات فراہم کرتا رہتا ہے۔ میں نے اس پان والے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ پہلے اپنے پان سگریٹ کے کیبن پر ہیروئن بھی بیچتا تھا لیکن ایک دو مرتبہ پکڑے جانے کے بعد اس نے ہیروئن کا دھندہ چھوڑ دیا۔ اب سننے میں یہ آیا ہے کہ وہ بونی اور بعض دیگر گبڑے ہوئے نوادہ لٹیوں کو لڑکیاں سلایا کرتا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ پان سگریٹ بیچنے والے اس شخص کے پاس موبائل ٹیلی فون بھی ہے۔

”گڈ! نالکھ کی آنکھوں میں چمک۔ بھر آئی۔“ تمہیں تو سراغ رسانی کے محکمہ میں ہونا چاہئے۔ تم نے جس

تفصیل سے معلومات حاصل کی ہیں وہ قابل تعریف ہے۔“

”جب کچھ کرنے کی لگن ہو تو پھر کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔ ”اس طرح ہمت بھی آ جاتی ہے اور عقل بھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ پہلے تم عقل سے پیدل تھے؟“ سلطانہ نے کہا۔

”ہاں، یہی سمجھ لو۔“ عبدالقدوس بولا۔ ”پہلے مجھ میں نہ عقل تھی نہ ہمت۔ لیکن اس رات جب تم

دونوں میرے گھر میں داخل ہوئیں اور بعد میں جب پتہ چلا کہ تم لوگ کیا کر کے آئی ہو تو میں واقعی بڑا حیران ہوا تھا۔ میں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا کہ میں تمہارے حسن سے متاثر ہو گیا تھا۔“ اس نے عجیب سی نگاہوں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کچھ عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے صرف تمہاری خاطر تم لوگوں کو وہاں رہنے کی اجازت دی تھی لیکن....“

”لیکن کیا؟“ سلطانہ نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ دو لڑکیاں اپنے وطن کے لئے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں تو مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ میں ایک مرد ہو کر بھی گھر میں چھپا رہتا ہوں۔ کہیں گولی چلنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے تو میں دروازے بند کر کے دبک کر بیٹھ جاتا ہوں۔ تم لوگوں کو دیکھ کر مجھے حوصلہ ملا اور میں نے بھی اس نیک کام میں تم لوگوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب میری زندگی وطن کے لئے ہے جس کی مٹی سے میں نے جنم لیا تھا۔“

”اور میں؟“ سلطانہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”تمہاری قدر اب بھی میرے دل میں ہے۔“ عبدالقدوس نے کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

”شرمانے کی ضرورت نہیں۔“ نانکھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو سلطانہ ہے نا، یہ اتفاق سے بڑی بے شرم اور ڈھیٹ واقع ہوئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر اکثر تمہارا ہی تذکرہ رہتا ہے۔“

عبدالقدوس نے جواب دینے کے بجائے کن انھیوں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکیوں سے زیادہ شرابا تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”اچھا اب کچھ کام کی بات ہو جائے۔“ نانکھ نے کہا۔ ”ہمارا ارادہ ہے کہ آج ہی رات بولی کے بنگلے پر ریڈ کیا جائے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس وقت اپنے بنگلے پر موجود ہو۔ اس لئے تم یوں کرو کہ کھانا کھانے کے بعد رات دس بجے کے قریب وہاں پہنچ جاؤ اور بنگلے کی نگرانی کرتے رہو۔ تمہارے پاس ٹیلی کارڈز ہوں گے اور اس علاقے میں ٹیلی فون بوتھ بھی ہوں گے۔ صورت حال موافق ہو تو فون کر دینا۔ ہم فوراً پہنچ جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے میں کھانا کھا کر روانہ ہو جاؤں گا۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

اور پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد عبدالقدوس دس بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت اس نے پینٹ شرٹ پہن لی تھی تاکہ بھاگ دوڑ میں آسانی رہے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سلطانہ اور نانکھ بھی بنگلے سے نکل آئیں۔ انہیں اپنے اس مشن کے لئے ایک گاڑی کی ضرورت تھی اور وہ گاڑی حاصل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنا کر گھر سے نکلی تھیں۔

ڈسکو بیکری والے چوک پر خاصی چہل پھل تھی۔ وہ ادھر ادھر شعلتی رہیں اور پھر ایک سفید سوزوکی کے قریب رک گئیں جو ابھی ابھی وہاں آکر رکی تھی۔ سوزوکی میں صرف ایک ہی آدمی تھا جو گاڑی سے اتر کر ان کی طرف دیکھتا ہوا سگریٹ پان کی ایک دوکان کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جب وہ قریب سے گزرا تو قیمتی سینٹ کی ممک ان کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ ایک جوان آدمی تھا اور حلے اور لباس سے شوقین مزاج بھی لگتا تھا۔ سگریٹ کی دوکان کے سامنے کھڑا وہ بار بار ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سگریٹ کا پیکنٹ لے کر واپس آیا تو گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بھی ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بائیں آنکھ کا گوشہ دبا دیا۔

”آپ کو اگر کہیں جانا ہے تو میں چھوڑ دوں۔“ وہ آدمی سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”اگر ایسا ہو تو ہم آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”تو آئیے، بیٹھے۔“ اس شخص نے اسٹینرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔  
 نائلہ پیچھے بیٹھ گئی اور سلطانہ اگلی سیٹ پر۔ گاڑی حرکت میں آگئی۔ سلطانہ کے کہنے پر اس شخص نے  
 کارڈوراجی کالونی کی طرف موڑی اور پھر اس کی ہدایات پر مختلف گلیوں میں گھماتا رہا۔ وہ آدمی کچھ پریشان  
 سا ہو گیا۔

”اگر آپ کے پاس کوئی جگہ نہیں تو میں۔۔۔“  
 ”نہیں، یہ بات نہیں۔“ سلطانہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”دراصل ہم نہیں چاہتیں کہ ہمارے  
 ساتھ جانے والا کوئی شخص ہماری رہائش گاہ دیکھ لے۔ آپ سمجھتے ہیں نا۔ بعض پولیس والے بھی سادہ لباس  
 میں ہم جیسی عورتوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ ہم کسی پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتیں۔“  
 ”میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ شخص بولا۔  
 ”میں جانتی ہوں لیکن ہم ہمیشہ محتاط رہتی ہیں اور ایک ترکیب پر عمل کرتی ہیں۔“  
 ”وہ کیا؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”آپ پچھلی سیٹ پر چلے جائیے۔ میں ڈرائیو کروں گی اور میری دوست آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیں  
 گی۔ تاکہ آپ ہمارا گھر نہ دیکھ سکیں۔ واپسی پر بھی آپ کو اسی طرح مین روڈ پر لے آیا جائے گا۔“ سلطانہ  
 نے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔“ اس شخص نے کہتے ہوئے گاڑی روک لی۔ دو جوان اور حسین لڑکیوں کو پا کر وہ  
 سب کچھ بھول گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ پچھلی سیٹ پر چلا گیا اور سلطانہ نے اسٹینرنگ  
 سنبھال لیا۔

اس شخص نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہی نائلہ کی ران پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ نائلہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی  
 بلکہ اپنا دوشہ اتار کر اس شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 سلطانہ گاڑی کو تیز رفتاری سے مختلف گلیوں میں گھماتی ہوئی اپنے جنگلے والی گلی میں آگئی۔ گلی میں داخل  
 ہوتے ہی نائلہ نے اس شخص کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے جھکا دیا تھا۔ گاڑی جیسے ہی جنگلے کے سامنے رکی  
 نائلہ نے جلدی سے نیچے اتر کر گیٹ کھول دیا اور سلطانہ گاڑی کو اندر لیتی چلی گئی۔ نائلہ گیٹ بند کر کے آگئی  
 اور اس شخص کو ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی سے اتار لیا۔

”اب آنکھوں سے پٹی ہٹا دو؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”ابھی نہیں، پلیز۔“ نائلہ نے کہا۔

اس شخص کو اندر لانے کے بعد نائلہ نے اس کی آنکھوں سے دوشہ کھول دیا۔

وہ شخص کچھ دیر تک آنکھیں جھپک رہا پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”بیٹھے مسٹر۔۔۔“ سلطانہ نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جملہ ادھر وہ چھوڑ دیا۔

”انیں۔۔۔ میرا نام انیں ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”بیٹھے، مسٹر انیں۔“ سلطانہ نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

انیں نامی وہ شخص اتنا لوکا چھا ثابت ہوا تھا کہ اس کے دل میں اب بھی کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ابھرا

تھا۔ حالانکہ جب سلطانہ نے اسے آنکھوں پر پٹی باندھنے کو کہا تھا تو اسے اسی وقت چونک جانا چاہئے تھا۔ مگر دو خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو دیکھ کر شہوانی جذبات تو اسے پہلے ہی اندھا کر چکے تھے۔

”کہئے‘ چائے چلے گی؟“ سلطانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ضرور... کیوں نہیں۔“ انیس نے جواب دیا۔

نانکہ چائے بنا کر لے آئی۔ وہ تینوں چائے پینے لگے۔۔۔ چائے پینے کے بعد نانکہ بھی اسی صوفے پر آگئی۔ انیس دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں حسین اور جوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی سمجھ رہا تھا جسے بن مانگے دو جوان لڑکیاں مل گئی تھیں۔

نانکہ نے دونوں بازو اس کی گردن میں حائل کر دیئے۔ اور پھر اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ اس کی گردن کی مخصوص رگوں پر آگئے۔ وہ انگوٹھوں سے اس کی نیس سلانے لگی۔

”ارے... ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ...“ انیس بولا۔

سلطانہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور نانکہ کے ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ انیس مزاحمت کرتا رہا لیکن دو منٹ کے بعد اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی اور وہ نانکہ کی ہانہوں میں جھول گیا۔

”کم بخت!“ نانکہ اسے دھکیل کر اٹھ گئی۔ ”ہوس نے ان مردوں کو اندھا کر رکھا ہے۔ عورت کو دیکھ کر ان کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔۔۔۔۔!!!“

”اگر اس کی عقل گھاس نہ چرنے چلی جاتی تو اس وقت ہمارا کام کیسے بنتا؟“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اب یہ کم از کم دو گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ لیکن اسے اس طرح نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ نانکہ نے کہا اور وہ دونوں اسے گھسیٹی ہوئی تیسرے بیڈروم میں لے آئیں جو عام طور پر خالی ہی رہتا تھا۔ انیس کو قالین پر ڈال کر ہاتھ پیر باندھے دیئے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا۔

انہوں نے دونوں دہشت گردوں سے چھپتی ہوئی آٹومٹک رائفیں نکال کر چیک کیں اور انہیں کار کی سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئیں۔ ٹیلی فون انہوں نے اپنے سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔ وہ فون کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرتی رہیں۔ تقریباً ”ساڑھے بارہ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ سلطانہ نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔

”عبدالقدوس بول رہا ہوں۔“ ریسیور کان سے لگاتے ہی عبدالقدوس کی آواز اس کی سماعت سے

فکرائی۔

”ییس.. کیا رپورٹ ہے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”بونی تھوڑی دیر پہلے دو آدمیوں کے ساتھ بنگلے میں واپس آیا ہے ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔“ عبدالقدوس نے بتایا۔

”گذا تم اس وقت کہاں ہو؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”علاقے کے شاپنگ سینٹر میں لگے ہوئے ٹیلی فون بوتھ سے بول رہا ہوں۔ یہاں ایک پان سگریٹ کی دوکان اور ریسیورنٹ کھلا ہوا ہے۔ میں اس ریسیورنٹ میں انتظار کروں گا۔“ عبدالقدوس نے کہتے ہوئے ریسیورنٹ کا نام بھی بتا دیا۔

”ٹھیک ہے، ہم فوراً یہاں سے روانہ ہو رہی ہیں۔“ سلطانہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور نانکہ کو

صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔

”تو پھر کھل پڑو۔“ نائلہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس نے الماری میں سے پستول بھی نکال لیا تھا۔ وہ اس بیڈروم میں آگئی جہاں انیس بندھا پڑا تھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ نائلہ کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ نائلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں کچھ دیر کے لئے تمہاری گاڑی کی ضرورت تھی اس لئے ہم نے تمہیں پھانسا تھا۔ اور تم ایک بات یاد رکھنا، سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ہر عورت آوارہ اور بد چلن نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ تم کسی عورت کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھو گے۔ اس وقت ہم جاری ہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد واپسی ہوگی۔ تمہیں صبح ہونے سے پہلے چھوڑ دیا جائے گا۔“

وہ کمرے سے باہر آگئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ سوزوکی پر سوار بیچلے سے نکل رہی تھیں۔ مین روڈ پر آتے ہی سلطانہ نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ کلشن چورنگی پر پولیس گاڑیوں کی چیکنگ کر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ کہیں کوئی واردات ہوئی تھی۔ کسی واردات کے بعد ہی پولیس گاڑیوں کی چیکنگ شروع کرتی تھی۔ ان کی کار کو بھی رکنے کا اشارہ کیا گیا۔ نائلہ نے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی۔ ایک پولیس والے نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں عورتیں تھیں اس لئے انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔

نائلہ نے چورنگی سے گاڑی دائیں طرف موڑ لی اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ سراب گوتھ والے چوراہے پر بھی چیکنگ ہو رہی تھی۔ وہاں دو تین گاڑیاں پہلے ہی کھڑی تھیں اور پولیس والے سیٹیں تک اٹھا اٹھا کر گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ دور کہیں سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دو پولیس والے ان کی گاڑی کے دائیں بائیں آگئے۔ ایک پولیس والے نے پچھلی سیٹ پر جھانک کر دیکھا پھر نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ لوگ کہاں سے آ رہی ہیں اور کہاں جا سکتی گی؟“ پولیس والے نے پوچھا۔

”شادی کی ایک تقریب سے آ رہی ہیں۔ نار تھ ناظم آباد جانا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”بغرزوں میں بڑی زبردست فائرنگ ہو رہی ہے۔ پولیس نے دہشت گردوں کے ایک گروہ کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ آپ اس طرف نہیں جا سکتیں۔ گلیٹرگ کی طرف سے نکل جائیے۔“ پولیس والے نے کہا۔

”شکریہ جناب۔“ نائلہ کہتے ہوئے گاڑی کو ریورس کرنے لگی۔

اس پولیس والے نے دوسرے پولیس والوں کو اشارہ کر دیا۔ نائلہ کی گاڑی مزید رکاوٹ کے بغیر وائرپ کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

”اس ملک میں عورت ہونے کا یہی فائدہ ہے۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں عورت ہونے کے ناطے کم از کم اتنی رعایت تو حاصل ہے کہ ہماری گاڑی کو چیک نہیں کیا گیا۔“

”اگر چیک کر لیتے تو؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”تو پھر وہ پراسرار عورت حراست میں لے لی جاتی جس کی پولیس کو تلاش ہے۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

سلطانہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نائلہ نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ اس وقت رات کا ایک بجتے والا تھا۔ سوک پر ٹریفک بہت کم تھا۔ نیو کراچی کے لئے رات بھر چلنے والی مٹی بسیں بھی اکا دکا ہی دکھائی دے رہی



تھیں۔ وائپرپ سے گلبرگ کی طرف موڑنے کی بجائے نائلہ گاڑی کو سیدھی لیتی چلی گئی اور پھر عائنہ چورنگی سے اس نے گاڑی دائیں طرف گھمادی۔

نارتھ ناظم آباد کے بلاک آئی کے شاپنگ سینٹر تک پہنچنے میں پینتالیس منٹ لگے۔ اس وقت سوا ایک بج رہا تھا۔ تمام دوکانیں بند تھیں۔ وہ ریسٹورنٹ بھی بند ہو رہا تھا۔ نائلہ کچھ دور گاڑی روک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد ہی عبدالقدوس کہیں سے نکل کر سامنے آگیا۔

”ہوٹل والے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے میں وہاں سے اٹھ کر اس چھوٹے سے پارک میں چلا گیا تھا۔“ عبدالقدوس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں راستہ بتاؤ۔“ نائلہ نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آگے بائیں طرف موڑو۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔

نائلہ اس کی ہدایت پر مختلف گلیوں میں گاڑی موڑتی رہی اور پھر ایک جگہ گاڑی روک لی۔ وہ بنگلوں کی آخری قطار تھی اور اس سے آگے کچھ فاصلے پر پہاڑی تھی۔

”اس گلی میں بائیں طرف تیسرا بنگلہ ہے۔“ عبدالقدوس نے بتایا۔

وہ تینوں نیچے اتر آئے۔ نائلہ نے سیٹ کے نیچے سے اسلحہ نکال لیا۔ پستول خود لے لیا۔ ایک رانقل عبدالقدوس کو گھمادی اور ایک سلطانہ کے حوالے کر دی۔

”قدوس! تم بنگلے کے پچھلی طرف سے جاؤ۔ اور سلطانہ تم میرے ساتھ آؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

عبدالقدوس رانقل سنبھالے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پہاڑی والی سمت میں چلا گیا اور نائلہ اور سلطانہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گلی میں چلنے لگیں۔ دوسرے بنگلے کے گیٹ پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ کسی پیٹزر کا لکھا ہوا بورڈ نہیں تھا۔ گھر کے کسی فرد نے ہی گتے پر لکھ کر لگا دیا تھا۔ اس بنگلے میں شاید کوئی چوکیدار نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ بنگلہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس بنگلے کے سامنے پہنچی ہی تھیں کہ چوکیدار کی سٹی کی آواز سنائی دی۔

”جلدی کرو۔۔۔ اس دیوار پر چڑھ کر اندر کود جاؤ۔“ نائلہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

سلطانہ بڑی پھرتی سے گیٹ کا سارا لے کر دیوار پر چڑھ گئی اور دوسری طرف کود گئی۔ نائلہ بھی دیوار پر چڑھ گئی۔ ٹھیک اسی لمحہ سائیکل سوار چوکیدار اس گلی میں گھوما تھا۔ نائلہ نے جلدی سے اندر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ان دونوں کے باری باری کودنے سے دھب دھب کی اچھی خاصی آوازیں ابھری تھیں۔ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھا اور سلطانہ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کے نیچے گھس گئی۔

چوکیدار سٹی بجاتا ہوا سامنے سے گزر گیا۔ ساتھ والے بنگلے سے ٹی وی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً ”وی سی آر“ پر کوئی انڈین فلم چل رہی تھی۔ اسی کے ساتھ قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ان قہقہوں میں ایک نسوانی آواز بھی شامل تھی۔

وہ دونوں کچھ دیر تک سیڑھیوں کے نیچے دکی رہیں پھر باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینے لگیں۔ اس لائن کے چار بنگلے کسی کنسرکشن کمپنی نے تعمیر کئے تھے۔ تمام بنگلوں کا ڈیزائن اور طرز تعمیر ایک جیسا ہی تھا اور ان بنگلوں کے کینوں نے بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ نائلہ گہری نظروں سے ساتھ والے بنگلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے اس بنگلے کی چھت سے دوسرے بنگلے تک پہنچا جاسکتا ہے۔“ نائلہ نے سلطانہ کی طرف

دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔  
 ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ دونوں بنگلوں کی چمتوں کے ساتھ کارنس اس بنگلے سے دوسرے بنگلے تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

وہ دونوں دبے قدموں میڑھیوں پر چڑھتی ہوئی چھت پر آگئیں اور منڈیر پر جھک کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ وہ کارنس منڈیر سے تقریباً ”چار فٹ نیچے تھی اور دوسرے بنگلے کی کارنس بھی اس کے برابر ہی تھی۔ پہلے نائلہ منڈیر پر چڑھ کر نیچے اتری اور پھر سلطانہ... کارنس تقریباً ”تین فٹ چوڑی تھی۔ دوسری طرف کی کارنس بھی اتنی ہی چوڑی تھی لیکن دونوں کے درمیان چار فٹ کا فاصلہ تھا۔“  
 ”چلا تگ لگا کر دوسری کارنس پر جانا ہو گا۔ وہ لوگ آواز سن کر ہوشیار ہو جائیں گے۔“ سلطانہ نے

سرگوشی کی۔

”نی وی چل رہا ہے اور ان کے قہقہے گونج رہے ہیں۔ وہ اس شور میں ہمارے کودنے کی آواز نہیں سن سکیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔ وہ چند لمبے دوسری کارنس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے چلا تگ لگادی۔ آواز زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر دیکی رہیں اور جب کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تو سلطانہ نے پہلے اپنی رائفل نائلہ کی طرف بھرا دی اور پھر خود چلا تگ لگادی۔ سلطانہ کے کودنے کی آواز کسی قدر زیادہ تھی۔ وہ دونوں بڑی پھرتی سے کارنس پر لیٹ گئیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی نیچے کوئی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی آواز ابھری اور پھر ایک آواز سنائی دی۔  
 ”کوئی نہیں ہے۔ کسی کو مرنے کا ارادہ آگے۔“

نائلہ اور سلطانہ نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر وہ ٹھنص اوپر آیا تو وہ نہیں بچ سکیں گی لیکن یہ غیبت تھا کہ وہ ٹھنص اوپر آنے کے بجائے کمرے میں واپس چلا گیا تھا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اور اپنی جگہ پر دیکی رہیں پھر اٹھ کر بڑی آہستگی سے منڈیر پر چڑھنے لگیں۔ چھت پر وہ بہت دبے قدموں چلتی ہوئی زینے پر آگئیں اور پھر بڑی آہستگی سے میڑھیاں اترنے لگیں۔ ان دونوں کے دل کے دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ انہیں پوری طرح احساس تھا کہ وہ مجیڑوں کے بھٹ میں کھس رہی ہیں۔ ان کی ذرا سی غلطی انہیں موت کے منہ میں پہنچا دے گی۔

وہ دونوں اچھی طرح جانتی تھیں کہ بولی راجستھان میں را کے کیپ کا تربیت یافتہ تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے ساتھی بھی اسی کیپ کے تربیت یافتہ ہوں۔ اگر وہ تربیت یافتہ نہ بھی ہوں تو وہ بہر حال خطرناک لوگ تھے اور اب تک نجانے کتنے لوگوں کو موت کی نیند سلا چکے تھے۔

میڑھیوں سے اتر کر وہ برآمدے میں آگئیں۔ نائلہ نے برآمدے کے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کے ساتھ والی کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس کمرے میں روشنی تھی لیکن کھڑکی کے سامنے پردہ پڑا ہوا تھا اور اندر جھانکنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔

”تم یہیں رکو... میں دوسری طرف جا رہی ہوں۔“ نائلہ کہتی ہوئی برآمدے سے نکل کر بائیں طرف مڑ گئی۔ اس طرف تقریباً ”چھ فٹ اوپن اسپیس تھی اور اس سائیڈ کی کھڑکیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ نائلہ دبے قدموں آگے بڑھتی گئی اور ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ دروازے کے دونوں طرف کھڑکیوں پر دیہڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے جھک کر دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگادی لیکن اندر کا

منظر دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ وہ چند لمحے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر اس نے دوبارہ کی ہول سے آنکھ لگا دی۔

یہ ٹی وی لاؤنج تھا۔ قالین بچھا ہوا تھا۔ ٹی وی سائیڈ میں رکھا ہوا تھا جو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ سامنے ایک آدمی ایک عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ شخص عورت سے چمچر چاڑھ کر رہا تھا اور عورت قہقہے لگاری تھی۔ تقریباً "اسی لمحہ ایک اور آدمی عورت کو بازو سے پکڑ کر بائیں طرف لے گیا۔ وہ شخص ایک لمحہ کی ہول کی ریش میں آیا تھا اور نالکہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ بولی تھا۔

نالکہ سیدھی ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے دائیں ہاتھ میں پستول سنبھالا اور بایاں ہاتھ دروازے کے پینڈل پر رکھ کر اسے بڑی آہستگی سے کھانے لگی۔ دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ پینڈل آہستہ آہستہ گھومتا چلا گیا۔ اور پھر نالکہ نے ایک زوردار دھکے سے دروازہ کھول دیا۔

”خبردار کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ وہ پستول تانتے ہوئے غرائی۔

وہ سب ایک دم گڑبڑ گئے۔ عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے آپ کو بولی کی گرفت سے چھڑایا اور دوڑ کر ایک کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ آدمی جس نے پہلے اس عورت کو دلوچا ہوا تھا دیوار کے قریب پڑی ہوئی کلا شکوف کی طرف لپکا۔ نالکہ نے پستول کا ٹرائیگر دبایا۔ سنک کی آواز ابھری۔ پستول کی نال سے شعلہ لپکا اور گولی اس شخص کے ہاتھ پر لگی۔ اس کی ایک انگلی کی پورا ڈگنی تھی۔ وہ شخص چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ گولی تمہاری گھوڑی میں بھی لگ سکتی تھی۔“ نالکہ کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

”اور یہ تو تم لوگ دیکھ چکے ہو کہ یہ پستول شور مچانا پسند نہیں کرتا اور تم لوگوں کے شور کی مجھے پرواہ نہیں۔ محلے کا کوئی آدمی چیخوں کی آواز سن کر تمہاری مدد کو نہیں آئے گا اور نہ ہی کوئی پولیس کو اطلاع دے گا۔ اس علاقے کے سب ہی شریف آدمی تم لوگوں سے عاجز آچکے ہیں۔ تم لوگوں کی لاشیں دیکھ کر انہیں خوشی ہوگی۔ اب کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“

”تم کون ہو؟“ زخمی آدمی نے اسے گھورا۔ اس کی انگلی سے خون ٹپک رہا تھا۔ ”تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم شیروں کی کچھار میں گھس آئی ہو اور یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکوگی۔“

”شیر نہیں، بھڑیے...“ نالکہ نے غراتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ خونخوار بھڑیے ہو جو اب تک نستے اور معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے رہے ہو۔ لیکن شاید یہ بھول گئے تھے کہ ایک یوم حساب بھی ہوتا ہے اور آج تمہارا یوم حساب ہے۔ تمہیں بے گناہوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہو گا۔“

”ہم پر تو آج تک وہ لوگ بھی ہاتھ نہیں ڈال سکے جو اپنے آپ کو قانون کے محافظ کہلاتے ہیں۔ تم ایک عورت... اس کھلونے سے ہمارا کیا بگاڑ سکوگی۔“ اس شخص نے کہا۔ اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں اگر ہم سے کوئی نقصان پہنچا ہے تو ہم اس کا ازالہ کرنے کو تیار رہیں۔ وہ بریف کیس نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ اسے اٹھاؤ اور یہاں سے چلی جاؤ۔ ہم میں سے کوئی بھی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔“ اس نے کمرے میں رکھے ہوئے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

نالکہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں وال ٹودال قالین بچھا ہوا تھا اور کسی قسم کا فرنیچر نہیں تھا۔ ایک طرف ٹی وی رکھا ہوا تھا اور اسی ٹرائی کے نچلے حصے میں وی سی آر بھی رکھا ہوا تھا۔ ٹی وی پر جو فلم چل رہی

تھی وہ بھی خاصی حیا سوز تھی۔ ایک طرف شراب کی دوغالی بوتلیں پڑی تھیں۔ تیسری بوتل میں آدمی کے قریب شراب موجود تھی۔ چار گلاس بھی پڑے تھے۔ دو گلاسوں میں شراب تھی اور دوغالی تھے۔  
 ”میرا نقصان جو ہوا ہے وہ تم کبھی پورا نہیں کر سکتے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”کیا تم ان لوگوں کی زندگیاں لوٹا

سکتے ہو جنہیں تم لوگوں نے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“  
 ”ان لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے، تم اپنی بات کرو۔“ وہ غصہ بولا۔

”وہ سب میرے لوگ تھے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”میرے ہم وطن.... میرے ہم مذہب۔ لیکن تم لوگ اپنا ایمان سچ چکے ہو۔ تمہارا ضمیر مچکا ہے۔ ہندو بیوں کے کہنے پر تم لوگ اپنے ہی لوگوں کو خاک و خون میں لوٹا رہے ہو۔ لیکن اب تمہارا وقت ختم ہو چکا ہے۔“

”کون ہو تم؟“ اس مرتبہ بولی نے کہا۔ وہ مہری نظروں سے نائلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔  
 ”تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔“ نائلہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بھی راجستھان کے اسی کیمپ میں ٹینک لی ہے جہاں سے تم نے دہشت گردی کی تربیت حاصل کی تھی۔“

”اوہ تم!“ اس مرتبہ بولی چونک گیا۔ ”تم نائلہ درانی ہو۔ تمہارے بارے میں تو یہاں تمام لوگوں کو آگاہ کر دیا گیا ہے تمہارے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں جو کیمپ تباہ کر کے بھاگی تھیں۔ تم بیویوں کو تو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ملا ہوا ہے۔ حیرت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو.....!“  
 ”میں آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”شوکت اور اس کے کچھ ساتھیوں کو تو ہم ان کے انجام تک پہنچا چکی ہیں اور آج تم لوگوں کی باری ہے۔“

”اوہ!“ بولی چونک گیا۔ ”تو وہ تم تھیں۔“  
 ”ہاں اور تمہارے بعد کسی اور کی باری آئے گی۔ میں ایک ایک کر کے تم سب لوگوں کو ٹھکانے لگا دوں گی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ بولی نے مسکراتے ہوئے کہا پھر نائلہ کے پیچھے دیکھتے ہوئے چیخا۔ ”رک جاؤ“

گولی مت مارنا...“  
 نائلہ درانی نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اسی ایک لمحہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولی نے راہداری والے دروازے کی طرف چھلانگ لگادی۔ جبکہ اس کے دوسرے دونوں ساتھی بیک وقت نائلہ کی طرف لپکے تھے۔  
 نائلہ درانی، بولی کے اس نفسیاتی حربے کا شکار ہو گئی تھی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر زخمی انگلی والا اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیروں کی ٹھوک نائلہ کے ہاتھ پر لگی۔ پستول نائلہ کے ہاتھ سے جھوٹ کر گر گیا۔ اس کی دوسری ٹھوک نائلہ کے پیٹ پر لگی۔ نائلہ چیختی ہوئی دوہری ہو گئی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر زخمی انگلی والا اور اس کا دوسرا ساتھی نائلہ پر چل پڑے تھے۔ نائلہ کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش ہو رہی تھی مگر اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔

بولی راہداری کے آخر میں برآمدے میں کھلنے والے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا لیکن سہلا قدم باہر رکھتی ہی یوں لگا جیسے اس کے سینے پر کسی وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑاکر پیچھے ہٹا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا تھا۔

سلطانہ نے رائفل کے بٹ سے بولی کو ایک اور ضرب لگائی۔ بولی چیخا ہوا اور پیچھے ہٹا۔ سلطانہ نے رائفل سیدھی کر لی اور بولی کو ٹھوکریں مارتی ہوئی اس کمرے میں لے آئی جہاں بولی کے دونوں ساتھی نائلہ

کی پٹائی کر رہے تھے۔

سلطانہ نے راقل کا رخ چھت طرف کر کے ٹرانگر دبا دیا۔ کئی گولیاں تڑٹراتی ہوئی راقل سے نکلیں اور چھت میں کئی جگہ سوراخ ہو گئے۔

”اس لڑکی کو چھوڑ کر الگ ہٹ جاؤ ورنہ چھلنی کروں گی سب کو۔“ سلطانہ چیخی۔

زخمی انگلی والا اور اس کا دوسرا ساتھی نالکہ کو چھوڑ کر الگ ہٹ گئے۔ ان دونوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔ نالکہ قالین پر اوندھی پڑی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کھڑی ہو سکی تھی۔ اس کے جسم کا ہر حصہ دکھ رہا تھا۔ خالوں نے بڑی بے رحمی سے اسے پیٹا تھا۔ زخمی انگلی والا اس دروازے کے قریب کھڑا تھا جہاں سے پہلے نالکہ اندر داخل ہوئی تھی۔

”تم سمجھتے تھے کہ دہشت گردی صرف مرد ہی کر سکتے ہیں اور عورتیں صرف مردوں کو لہانا جانتی ہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”جو کام مرد نہیں کر سکتے وہ اب عورتیں کریں گی۔ تم جیسے بے غیرتوں اور بے رحم قاتلوں کو عورتیں ہی ٹھکانے لگائیں گی۔“ اس نے خاموش ہو کر پولی کو ایک زوردار ٹھوکر ماری۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زخمی انگلی والے نے دروازے کی طرف چھلانگ لگادی۔ نالکہ نے اس کے پیروں میں پیر بھسانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ شخص دروازے سے نکل گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کی ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ اور صرف تیس سیکنڈ بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا دوبارہ اندر داخل ہوا۔ عبدالقدوس راقل کے ہٹ سے اسے نہیں لگا رہا تھا۔

”چیخ کو بھٹنا چھتا چاہو کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔“ عبدالقدوس نے اس کے کندھے پر راقل کے ہٹ سے ایک اور ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ پھر دفعہ ”اس نے راقل کو سیدھا کر لیا اور اس شخص کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

ان کا تیسرا ساتھی دیوار کے ساتھ لگا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسے ان لڑکیوں کے روپ میں شیرنیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کے چہروں پر بے پناہ درندگی تھی۔

”اوئے! ادھر آؤ۔ تم وہاں کیوں کانپ رہے ہو۔“ سلطانہ نے کہتے ہوئے اسے انگلی سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

”مم... میں بے قصور ہوں۔“ وہ ہکھلایا۔ ”یہ لوگ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں مارا۔“

”ادھر آؤ۔“ سلطانہ غرائی۔

وہ شخص کانپتا ہوا جیسے ہی قریب پہنچا سلطانہ نے اس کے پیٹ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ شخص بلبلا کر دوہرا ہو گیا۔ سلطانہ نے اس کے کندھے پر راقل کے ہٹ سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ شخص اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ اور پھر سلطانہ نے اسے کسی پھلو تگنے نہیں دیا، وہ اس پر پے در پے ٹھوکروں کی بارش کرتی رہی۔

”اس حرافہ کو بھی نکالو، وہ اس کمرے میں بند ہے۔“ نالکہ چیخی۔

”اے... دروازہ کھولو نہیں تو دروازے ہی سے گولیوں کی بوچھاڑ کروں گی۔“ سلطانہ نے دروازے پر راقل کا ہٹ مارتے ہوئے کہا۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ عورت کپڑے پن پکی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے صرف

ایک لڑکی کو پستول کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اب دوسری لڑکی کو راقط نقل لئے دیکھ کر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سلطانہ نے اسے بالوں سے پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے قالین پر مگرادیا۔

”تم جیسی آوارہ اور بد چلن عورتوں نے عورت کا نام بدنام کر رکھا ہے۔ عورت کے نام پر بد نما دھبہ ہو تم۔“ سلطانہ غرائی۔

وہ عورت قالین پر پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”یہ... یہ لوگ مجھے زبردستی اٹھا کر لائے تھے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”چپ رہ۔“ نائلہ نے اسے ایک ٹھوکہ ماری۔ ”اگر یہ تمہیں زبردستی اٹھا کر لائے تھے تو تم نے اپنا بچاؤ کیوں نہیں کیا؟ شور کیوں نہیں مچایا؟ چیخ چلائی کیوں نہیں؟ میں نے تو تمہارے قہقہے سنے تھے۔ زبردستی اٹھائی جانے والی لڑکیاں اس طرح قہقہے نہیں لگاتیں۔ عبد القدوس!“ وہ عبد القدوس کی طرف مڑ گئی۔ ”تین چار رسیاں تلاش کرو۔ اور انہیں باندھ دو۔ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جلدی کرو۔“

نائلہ نے ان میں سے ایک کی راقط اٹھالی تھی۔ وہ اور سلطانہ دہشت گردوں پر راقطیں آنے لکڑی رہیں اور عبد القدوس رسیاں تلاش کر لایا۔

”دوسرے کمرے میں اسلحہ بھی موجود ہے۔“ وہ بولا۔ ”کلاٹھکوف راقطیں، میگزین، ایمونیشن کی پٹیاں اور راکٹ وغیرہ...“

”ٹھیک ہے تم انہیں باندھو۔ اسلحہ بعد میں دیکھ لیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم انہیں باندھو۔ اسی لمحہ دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کی کھٹی بجی۔ نائلہ نے عبد القدوس بار باری انہیں باندھنے لگا۔

راقط سے بولی کو اشارہ کیا۔

”چلو فون اٹھ کر دو اور اگر تم نے اشاروں میں بھی کوئی بات کہنے کی کوشش کی تو چھلنی کر دوں گی۔“

نائلہ اسے راقط کی زد پر لے کر ٹیلی فون والے کمرے میں آگئی۔ ٹیلی فون سیٹ دیکھ کر نائلہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ یہ وہ سیٹ تھا جس میں اسپیکر لگا ہوا تھا اور ایک مٹن دبانے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ فون پر ہونے والی گفتگو سن سکتے تھے۔

”ریسیور اٹھانے کی ضرورت نہیں، مٹن آن کر دو۔“ نائلہ نے کہا۔

بولی نے قریب پہنچ کر فون کا مٹن دبا دیا۔

”نہیں، بولی آن دی لائن۔“ بولی کسی قدر آگے جھک کر بولا۔

”پاشا بول رہا ہوں بولی۔“ ٹیلی فون کے اسپیکر پر آواز سنائی دی۔ ”آج صبح پانچ بجے تم اپنے آدمیوں کو لے کر کروڑ لگی پہنچ جاؤ۔ گندے نالے کے پل کے قریب بدر تمہیں گاڑی میں اپنے آدمیوں کے ساتھ تیار لے گا۔ جامع مسجد وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ فجر کی نماز شروع ہوتے ہی تم لوگوں کو کارروائی کرنی ہے۔ جب تم لوگ وہاں سے رخصت ہو تو آدھے سے زیادہ نمازیوں کی لاشیں پڑی ہونی چاہیں۔“

”لیکن پاشا...“

”لیکن وہیں کچھ نہیں۔“ پاشا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ پولیس کو وہاں سے تقریباً ایک میل دور مصروف رکھا جائے گا۔ تم اپنے آدمیوں کو لے کر ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچ جاؤ گے۔“

149

لائن کٹ گئی۔ بوبی نے مٹن آف کر کے نائلہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ کتنا خوفناک منصوبہ بنایا تھا ان لوگوں نے۔

”پاشا کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ میں تین تک گنوں گی اگر مجھے جواب نہ ملا تو ٹرانسگر دبا دوں گی۔“ نائلہ نے غراتے ہوئے بوبی پر رائفل تان لی۔

”پہ۔۔۔ پاشا۔۔۔“ بوبی ہلکا گیا اور پھر وہ پاشا کا پتہ بتانے لگا۔

”چلو۔۔۔ اسی کمرے میں چلو۔“ نائلہ نے اسے حکم دیا۔

عبدالقدوس بوبی کے دونوں ساتھیوں اور اس عورت کے ہاتھ پیر باندھ چکا تھا۔ بوبی کے بھی ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے اور پھر ان سب کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے گئے۔

”چلو۔۔۔ جلدی کرو“ ایک اور سازش کا اعلان ہوا ہے۔ کئی لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔“ نائلہ نے کہا اور کمرے میں ایک طرف قالین پر پڑا ہوا وہ بریف کیس اٹھالیا جو زخمی انگلی والے نے اسے رشوت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ بنگلے سے باہر آکر دوڑتے ہوئے اپنی گاڑی میں آگئے۔ اس مرتبہ اسٹینٹرنگ نائلہ نے سنبھالا تھا۔ اس بنگلے میں اگرچہ کئی مرتبہ فائرنگ ہو چکی تھی مگر پولیس کا دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ شاپنگ سینٹر کے سامنے ٹیلی فون بوتھ کے قریب نائلہ نے گاڑی روک لی اور نیچے اتر کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ ان ٹیلی فون بوتھس پر بعض ایمرجنسی نمبر ملانے کے لئے کارڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے پولیس ایمرجنسی کا نمبر ملایا، ”کال فوراً“ ہی ریسیور کر لی گئی۔

”ہاتھ ناظم آباد بلاک آئی کے ایک بنگلے میں چند دہشت گرد بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ یہ دہشت گرد بھارتی اٹھیلی جنس را کے تربیت یافتہ ہیں۔ اس بنگلے میں بڑی مقدار میں اسلحہ بھی موجود ہے۔“ تفصیل سے تلاشی لیں گے تو اور بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔“ نائلہ نے کہا اور بنگلے کا نمبر بتایا۔

”آپ کون ہیں محترمہ؟“ ڈیوٹی آفیسر نے پوچھا۔

”پراسرار لڑکی۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ ڈیوٹی آفیسر کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کل گلشن پولیس نے دو دہشت گردوں کو گرفتار کر کے قبضے میں لے لیا تھا اس وقت میں بھی موجود تھی لیکن پولیس کے ہاتھ نہیں آسکی تھی۔ گلشن پولیس نے مجھے پراسرار عورت کا نام دیا تھا لیکن میں عورت کے بجائے لڑکی کہلاتا پسند کروں گی۔“

”اوہ!“ ڈیوٹی آفیسر چونک گیا۔

”ایک اور اہم ترین اطلاع ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”دہشت گردوں نے آج صبح فجر کی نماز کے وقت کورنگی کی ایک جامع مسجد میں نمازیوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا ہے۔ دہشت گرد ٹھیک پانچ بجے گندے نالے کے قریب ایک کار میں موجود ہوں گے۔ انہیں اپنے دوسرے ساتھیوں کا انتظار ہو گا۔ نماز شروع ہوتے ہی یہ لوگ بے گناہ نمازیوں پر فائر کھول دیں گے۔ اس وقت مقامی پولیس کو وہاں سے تقریباً ایک میل دور مصروف رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”آپ مذاق تو نہیں کر رہیں محترمہ؟“ ڈیوٹی آفیسر نے پوچھا۔ ”گلشن اقبال والا واقعہ درست ہے لیکن کہاں گلشن کہاں ہاتھ ناظم آباد اور کہاں کورنگی! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

”گلشن پولیس کے ہیڈ کانسٹیبل نے اگر مجھے پراسرار عورت کا نام دیا ہے تو اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“  
 نائلہ نے کہا۔ ”میں نے آپ کو اطلاع دے دی ہے۔ اگر کورنگی کی جامع مسجد میں کسی نمازی کے خون کا ایک  
 قطرہ بھی بہا تو اس کے ذمے داری آپ پر ہوگی مسٹر ڈیوٹی آفیسر۔ پہلی فرصت میں انتظامات کیجئے اور نارتھ  
 ٹاؤن آباد والے بنگلے پر پولیس پارٹی بھیج دیجئے۔“ نائلہ نے بنگلے کا نمبر ایک بار پھر دہرایا اور فون بند کر دیا۔  
 وہ دوبارہ کار میں آگئی۔ اس دوران سلطانہ اور عبدالقدوس رانقلیں سیٹوں کے نیچے چھپا چکے تھے۔  
 نائلہ نے انجن اشارت کر دیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ گاڑی گلیوں سے نکل کر مین روڈ  
 پر پہنچی تھی کہ دائیں طرف سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک نہیں دو موبائلز تھیں جو تیزی  
 سے ان کے قریب ہلاک آئی والی سڑک پر مڑ گئیں۔  
 نائلہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ گاڑی کو لے کر بائیں طرف موڑ کر اس کی رفتار

بڑھاتی چلی گئی۔  
 راستے میں انہیں دو جگہ روکا گیا۔ لیکن کسی جگہ بھی نہ تو ان کی کار کی تلاشی لی گئی اور نہ ہی ان سے  
 زیادہ باز پرس کی گئی۔ ایک جگہ تو پوچھنے پر نائلہ نے پولیس کو بتایا تھا کہ ان کے ایک عزیز کو گولی لگنے کی  
 اطلاع ملی ہے اور وہ لوگ ہسپتال جا رہے ہیں۔  
 جب وہ لوگ موتی محل کے بل پر پہنچے تو انہوں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ آگے گلشن چورنگی پر پولیس  
 موبائل کھڑی تھی اور پولیس والے وہاں سے گزرنے والی اکا دکا گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ موتی محل کا  
 بل پار کرتے ہی نائلہ نے گاڑی ہلاک تھری کی ایک گلی میں موڑ دی اور پھر گلیوں ہی گلیوں میں ہوتی ہوئی  
 گاڑی ڈسکو بیکری کے چوک پر مین روڈ پر نکل آئی۔  
 جب وہ بنگلے پر پہنچے تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ نائلہ نے گاڑی پورچ میں روک دی اور خود اسٹیرنگ  
 کے سامنے بیٹھی رہی۔ اس نے انجن بھی بند نہیں کیا تھا۔  
 ”تم دونوں اس عاشق مزاج مہمان کو لے کر آؤ۔ اسے بھی چھوڑ آئیں۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”کیسا مہمان؟“ عبدالقدوس کے لہجے میں حیرت تھی۔  
 ”اندر جاؤ۔۔۔ تمہیں پتہ چل جائے گا۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سلطانہ اور عبدالقدوس اندر چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ انیس کو کھینٹے ہوئے لے آئے۔ انیس کو بچھلی  
 سیٹ پر ڈال کر اس کی آنکھوں پر دوشہ باندھ دیا گیا۔ نائلہ کے اشارے پر عبدالقدوس اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔  
 سلطانہ نے گیٹ کھول دیا اور نائلہ گاڑی کو باہر لے آئی۔ کئی گلیوں میں ٹھونسنے کے بعد اس نے گاڑی  
 ریجنی اپارٹمنٹ کے سامنے ایک زیر تعمیر عمارت کے قریب روک لی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آئی۔ اس  
 نے انیس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی۔  
 ”صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔“ وہ انیس پر جھپٹتے ہوئے بولی۔ ”کوئی نہ کوئی تمہیں اس اذیت سے  
 نجات دلا دے گا۔ اور آئندہ عورتوں کے سلسلے میں محتاط رہنا ورنہ کسی روز جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“  
 وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گلی میں گھس گئے۔ انیس اپنے بنگلے تک پہنچنے میں دس منٹ سے  
 زیادہ نہیں لگے تھے۔ سلطانہ ان کے انتظار میں برآمدے ہی میں بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ اٹھ گئی اور وہ  
 تینوں اندر آگئے۔  
 ”وہ بریف کیس کہاں ہے کھول کر دیکھا؟“ نائلہ نے پوچھا۔



”اندر رکھا ہے میں نے کھولا نہیں ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔  
 بریف کیس ڈرائنگ روم میں میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا تالا نمبروں والا تھا لیکن نائلہ نے نمبروں کا معرہ  
 حل کرنے میں وقت ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بریف کیس عبد القدوس کے حوالے کر دیا۔  
 ”اس کے تالے توڑ کر دکھاؤ۔“

عبد القدوس پلاس لے آیا۔ اسے بریف کیس کے تالے توڑنے میں پانچ منٹ لگے تھے۔ اور جب اس  
 کا ڈھکنا اٹھایا گیا تو تینوں کی آنکھیں چمک اٹھیں بریف کیس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے بلاشبہ لاکھوں کی رقم  
 تھی۔

”اسے بھی دوسرے بریف کیس کے ساتھ الماری میں رکھ دو۔“ نائلہ نے بریف کیس بند کر کے سلطانہ  
 کے حوالے کر دیا۔

سلطانہ نے بریف کیس الماری میں بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اپنے اپنے بستروں  
 پر جا کر سو گئے۔

وہ دوپہر تک سوتے رہے۔ عبد القدوس جب بیدار ہوا تو ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ  
 آج یونیورسٹی نہیں جاسکا تھا۔ سلطانہ اس وقت کچن میں تھی اور دوپہر کا کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔  
 ڈھائی بجے دوپہر کا کھانا کھایا گیا اور پھر عبد القدوس اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ ایک ماہ بعد اس کے  
 امتحان ہونے والے تھے اور وہ پڑھائی میں ناغہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شام چھ بجے کے قریب سلطانہ اس کے  
 کمرے میں گھس آئی۔

”چلئے جناب شام کی چائے تیار ہے۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 عبد القدوس اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ نائلہ درانی پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔ وہ تینوں  
 چائے پینے لگے۔

اور پھر رات دس بجے نائلہ اور سلطانہ کسی گاڑی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔ انہیں آج پاشا کے  
 خلاف کارروائی کرنا تھی اور اس کے لئے بھی گاڑی کی ضرورت تھی۔ انہیں مایوسی نہیں ہوئی۔ رات گیارہ  
 بجے وہ ایک شیراڈ پر واپس آئی تھیں لیکن اس مرتبہ ان کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔  
 اور پھر رات ایک بجے وہ تینوں اپنے ایک خطرناک مشن پر نکل کھڑے ہوئے۔

...●...●...●...

کار تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ اسٹیرنگ نائلہ درانی کے ہاتھوں میں تھا اور سلطانہ اور عبد ا نائلہ  
 نے آگے کھڑی ہوئی دو گاڑیوں کے پیچھے اپنی گاڑی روک لی۔ اس سے آگے والی گاڑی کی سیٹیں تک اٹھا کر  
 گاڑی کو چیک کیا جا رہا تھا۔ دو نوجوان گاڑی سے ذرا فاصلے پر کھڑے تھے اور ایک پولیس والے نے انہیں  
 راقفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ جس پولیس والے نے نائلہ والی گاڑی روکی تھی وہ گاڑی کے سامنے آگیا۔  
 اس کے ایک ہاتھ میں راقفل تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس نے کانڈ کا ایک پرزہ سنبھال رکھا تھا۔ اس نے  
 پہلے کانڈ کی طرف دیکھا پھر گاڑی کی نمبر پلیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ نائلہ درانی نے ادھر ادھر دیکھا۔ دوسرے  
 پولیس والوں کے ہاتھوں میں بھی کانڈ نظر آرہے تھے۔ نائلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انہیں کسی خاص  
 گاڑی کی تلاش تھی جس کا نمبر انہوں نے نوٹ کر رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ گاڑی چوری ہو گئی ہو یا دہشت

کردی کی کسی واردات میں استعمال کی گئی ہو اور وائریس کے ذریعے شہر بھر کی پولیس موبائز کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی گئی ہو۔ لیکن نائلہ درانی مطمئن تھی۔ پولیس کے پاس اس گاڑی کا نمبر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ گاڑی بھی اگرچہ چوری کی تھی لیکن اس کا مالک بھی ان کی قید میں تھا اس لئے گاڑی کی چوری کی رپورٹ لکھوائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”یہ گاڑی آپ کی ہے؟“ پولیس کانسٹیبل نے گھڑی پر جھکتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے نائلہ درانی کی طرف دیکھا۔

”تو کیا تمہارے خیال میں ہم یہ گاڑی چرا کر لائے ہیں؟“ نائلہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”کانڈات دکھائیے۔“ پولیس والے نے کہا۔ وہ اس کے لہجے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

نائلہ نے ڈیش بورڈ کے خانے سے کانڈات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ گاڑی کے کانڈات وغیرہ وہ گہری چمک کر چکی تھی۔ یہ گاڑی عبدالرحمن نامی کسی شخص کے نام تھی اور پتہ فیڈرل بل ایریا کا لکھا ہوا تھا۔ پولیس والا کانڈات دیکھنے لگا۔

”یہ گاڑی عبدالرحمن نامی کسی شخص کی ملکیت ہے۔“ پولیس والے نے کہا۔

”اب تم اس سے میرا رشتہ بھی پوچھو گے۔“ نائلہ درانی نے کہا۔ ”عبدالرحمن نامی یہ شخص اتفاق سے رشتے میں میرا شوہر ہوتا ہے۔ اگر تم کو تو ہم نیچے از آئیں تاکہ تم گاڑی کو اچھی طرح چک کر سکو۔“

اس سے پہلے کہ وہ پولیس والا کوئی جواب دیتا ایک ہیڈ کانسٹیبل ان کے قریب آگیا۔

”کیا بات ہے یارا۔ جانے دو نا ان خواتین کو۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے کار میں عورتوں کو بیٹھے دیکھ کر کہا، پھر نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”ایئر پورٹ۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”ہاتھ گوثھ کے آس پاس فائرنگ ہو رہی ہے۔ ذرا عطا رہئے۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ نائلہ درانی نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”میرا تو خیال تھا کہ آج پھنس ہی جائیں گے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”وہ کانسٹیبل تمہارے انداز گفتگو سے بالکل متاثر نہیں ہوا تھا مجھے شبہ تھا کہ وہ کار کی تلاشی لینے پر اصرار کرے گا۔“

”مجھے بھی یہی شبہ تھا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ ہیڈ کانسٹیبل بروقت پہنچ گیا۔ اس نے ہماری مشکل حل کر دی ورنہ آج تو واقعی پھنس جاتے۔“

نائلہ نے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور پھر دائیں طرف موڑ دیا۔ مین روڈ کے رخ پر فلیٹوں کی بلند وبالا عمارتیں تھیں اور ان کے پیچھے رہائشی بنگلے تھے۔ یہ گلشن اقبال کا بلاک ٹین اے تھا۔ بیس سے ایک سڑک بلاک ٹین سے ہوتی ہوئی عزت بخشی پارک کی پشت کی طرف نکل گئی تھی اور ایک دو ذیلی سڑکیں بلاک انیس کو اس علاقے سے ملاتی تھیں۔ بلاک ٹین اے اور بلاک انیس نیشنل سینٹ فیکٹری کی پشت پر واقع تھا۔ اس سینٹ فیکٹری ہی کی وجہ سے یہ علاقے ابھی تک پوری طرح آباد نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن جب سے سینٹ فیکٹری بند ہوئی تھی ان علاقوں کی ویلیو بھی بڑھ گئی تھی اور تیزی سے تعمیراتی کام ہونے لگے تھے۔ وہ پلاٹ جو برسوں سے خرد و خرد جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے اب وہاں بنگلے تعمیر ہو رہے تھے۔

نائلہ نے گاڑی ایک گلی کے موڑ پر ایک زیر تعمیر بنگلے کی پشت پر روک لی۔ اس گلی میں دونوں طرف کچھ بنگلے آباد تھے۔ کچھ زیر تعمیر تھے اور کچھ پلاٹ اب بھی خالی پڑے تھے۔ اس علاقے میں سڑکیں ابھی تک تعمیر

نہیں ہوئی تھیں۔ تمام گلیاں کچی تھیں۔ گندے پانی کی نکاسی کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا جس وجہ سے بیشتر گلیوں میں کچڑ رہتا تھا۔

نالکہ درانی نے انجن بند کر دیا اور وہ تینوں نیچے اتر آئے۔ عبدالقدوس نے سیٹیں اٹھا کر تینوں آٹومبیک رانٹھیں نکالیں ایک ایک فالتو میگزین بھی نکال لیا اور سیٹیں درست کر کے کار کا دروازہ بڑی آہستگی سے بند کر دیا۔ اس نے اپنا فاضل میگزین پتلون کے بیٹھک میں اڑس لیا اور رانٹھل چیک کرنے لگا۔ نالکہ درانی اور سلطانہ نے بھی قیضوں کے نیچے کمر پر اسی مقصد سے چڑے کے بیٹھ باندھ رکھے تھے۔ انہوں نے فاضل میگزین بیلٹوں میں اڑس لئے اور اپنی اپنی رانٹھیں چیک کرنے لگیں اور پھر وہ تینوں محتاط انداز میں چلتے ہوئے اس زیر تعمیر مکان کی دیوار کی آڑ میں آگئے۔ نالکہ ذرا سا باہر نکل کر گلی میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”یہاں تک تو ہم بالکل ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔“ نالکہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”ببولی نے بتایا تھا کہ تقریباً ”پچاس گز آگے دائیں طرف ایک اور گلی میں چو تھا مکان ہے جس کے آگن میں سفیدے کا درخت لگا ہوا ہے۔ سفیدے کا درخت صرف اسی ایک گھر میں ہے۔“

”وہ ایک درخت ہوا سے جھومتا ہوا نظر آرہا ہے۔“ عبدالقدوس نے اشارہ کیا۔ وہ درخت خاصا بلند تھا اور ہوا سے بار بار تقریباً ”دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ اتنی جگہ سفیدے ہی کے درخت میں ہوتی ہے۔“

”ہاں... میرا خیال ہے وہی مکان ہے۔ ہمیں اس گلی میں جانا ہوگا۔“ نالکہ نے کہا۔

چند لمبے وہاں کھڑے رہے پھر مکان کی آڑ سے نکل کر گلی میں آگئے۔ ان تینوں نے جو گز پن رکھے تھے۔ ویسے بھی گلی کی زمین کچی تھی۔ ان کے چلنے سے ذرا سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ گلی میں بجلی کے کچھ کھمبے تو موجود تھے مگر بلب کسی کھمبے پر بھی نہیں جل رہا تھا۔ گلی میں تاریکی تھی البتہ جن بنگلوں میں آبادی تھی ان کے گھنٹوں پر یا برآمدوں میں مدھم مدھم روشنی والے بلب جل رہے تھے۔

دفعہ ”سلطانہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کا پیر کچڑ میں پڑ کر پھسلا تھا اور وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ اگر عبدالقدوس فوراً ہی اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو وہ یقیناً ”گر پڑتی۔“

”سنبل کر۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”گلی میں کچڑ ہے اور اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا۔“ وہ کچھ دور تک سلطانہ کا ہاتھ پکڑے رہا۔ پھر سلطانہ نے اس سے ہاتھ چھڑا لیا اور محتاط انداز میں چلتے گئی۔ وہ جلد ہی دائیں طرف ایک اور گلی کے موڑ پر پہنچ گئے۔ نالکہ دیوار کی آڑ سے جھانکنے لگی۔ دائیں طرف کی لین میں پانچ چھ بنگلے آباد تھے جن کے گھنٹوں پر مدھم مدھم روشنی نظر آ رہی تھی۔ دو تین بنگلے ایسے تھے جو زیر تعمیر تھے۔ بائیں طرف والی لین میں پہلا بنگلہ زیر تعمیر تھا۔ اگلے چھ بنگلوں میں آبادی تھی۔ آخری بنگلہ زیر تعمیر تھا اور اس سے آگے دو تین خالی پلاٹ تھے۔ لین کے چوتھے بنگلے کے آگن میں سفیدے کا وہ اونچا درخت تھا جو تیز ہوا سے بار بار جھکا جا رہا تھا۔

”میرا خیال ہے وہی بنگلہ ہے۔“ نالکہ درانی نے سرگوشی کی۔

”بولی کل رات تار تھ ناظم آباد والے بنگلے سے پولیس کی گرفت میں آگیا ہوگا۔ کیا اس نے پولیس کو پاشا کے بارے میں نہیں بتا دیا ہوگا؟“ سلطانہ نے کہا۔

”اگر ایسا ہوتا تو اخبار میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔“ نالکہ نے کہا۔ ”ویسے بھی اس بنگلے میں روشنی ہو رہی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ موجود ہیں۔ اگر پاشا کے بارے میں پولیس کو پتہ چل گیا ہوتا تو یہ مکان ویران ہوتا۔ میرا خیال ہے وہ لوگ بنگلے میں موجود ہیں۔ چلو آگے بڑھو، مگر احتیاط سے۔“

وہ تینوں گلی میں داخل ہو گئے۔ نائلہ درانی سامنے والے بنگلوں کی لین کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور عبد القدوس اور سلطانہ دوسری لین کے بنگلوں کے ساتھ۔ عبد القدوس آگے تھا اور سلطانہ اس سے دو قدم پیچھے۔

نائلہ درانی اپنی لین میں تیسرے بنگلے کے سامنے پہنچی تھی کہ سفیدے والے بنگلے میں کسی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس لمحہ کسی نے بنگلے کا گیٹ بھی کھول دیا تھا۔ نائلہ تیزی سے اگلے بنگلے کی طرف لپکی جو زیر تعمیر تھا۔ اسی لمحہ گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ نائلہ ہیڈلیمپس کی روشنی کی زد میں آگئی۔

”وہ دیکھو... وہ عورت۔“ بنگلے میں سے کوئی چیخا۔ ”اس کے ہاتھ میں آئوٹک رائفل ہے۔ مجھے تو یہ دی پر اسرار عورت لگتی ہے جس نے بولی اور اس کے ساتھیوں کو پکڑوایا تھا۔ اخباروں میں بھی اس کا بہت تذکرہ ہے۔“

نائلہ نے زیر تعمیر بنگلے کے گیٹ کی طرف چھلانگ لگادی۔ پلر زتیار ہو چکے تھے لیکن ابھی تک گیٹ نہیں لگایا گیا تھا۔

”یہ وہی ہے۔ شوٹ کر دو۔“ دوسرا آدمی چیخا۔

اسی کے ساتھ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ آئوٹک رائفل سے برسٹ مارا گیا تھا۔ نائلہ چھلانگ لگا کر دیوار کے پیچھے پہنچ گئی تھی۔ اگر اسے ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتا۔

عبد القدوس اور سلطانہ بھی پہلے شور اور پھر فائرنگ کی آواز سن کر اچھل پڑے۔ کار اس طرح رک گئی تھی کہ وہ آدمی گیٹ کے اندر بھی اور آدمی باہر۔ عبد القدوس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایک گھٹنا زمین پر ٹاکر پوزیشن لی اور کاری کی طرف ایک برسٹ مار دیا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکا ہوا۔ کار کا سامنے کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔

”اندر چلو“ اس کے ساتھی بھی ہیں۔ ”کاری کی طرف سے ایک چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ کار کے دوسرے دروازوں سے نکل کر دوبارہ بنگلے میں گھس گئے۔ عبد القدوس نے جس جگہ سے فائرنگ کی تھی وہاں اس بنگلے کے گیٹ کے دونوں طرف کنکریٹ کے بچ رکھے ہوئے تھے۔ شام کو یہاں ٹھنڈی ہوا میں گھروالے اہلے ہوں گے۔ عبد القدوس نے اس ایک بچ کی سیٹ الٹ دی اور لیٹ کر اس کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ سلطانہ بھی اس کے ساتھ ہی پوزیشن لے چکی تھی۔

دوسری طرف نائلہ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ کر جیسے ہی دیوار کی آڑ میں پہنچی وہاں ایک جھلنگی چارپائی سویا ہوا چوکیدار اٹھ کر چیخنے لگا۔

”خاموش رہو۔ شور مت مچاؤ۔“ نائلہ درانی غرائی۔ ”اندر چلو اور مجھے اوپر جانے کا راستہ بتاؤ۔“

چوکیدار خوف کے مارے ہر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ نائلہ کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔

”ڈرو نہیں، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے اوپر جانے کا راستہ بتاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔

”مم... مجھے مت مارنا۔ میرے معصوم بچے...“

”دیر مت کرو۔“ نائلہ غرائی۔ ”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

ٹھیک اسی لمحہ سامنے والے بنگلے سے برسٹ مارا گیا۔ گولیاں دیواروں میں پیوست ہو گئیں۔ نائلہ بوڑھے چوکیدار کو رانقل کی زد پر لے کر بنگلے کے اندرونی حصے میں آگئی۔ اس دو منزلہ بنگلے کا اسٹرکچر تیار ہو چکا تھا۔ دیواروں پر پلستر کا کام ہو رہا تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے ابھی تک نہیں لگے تھے۔ اوپر جانے والے زینے کے قریب پہنچ کر نائلہ رک گئی۔

”تم بنگلے کے پچھلی طرف کسی محفوظ جگہ پر چلے جاؤ۔ سامنے والے رخ سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ چھٹی ہو جاؤ گے۔“ نائلہ نے چوکیدار سے کہا اور کانپتا ہوا بوڑھا چوکیدار پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

نائلہ بیڑھیوں پر دوڑتی ہوئی اوپر کی منزل پر آگئی۔ اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کسی کھڑکی یا دروازے کے سامنے نہ آنے پائے۔ وہ کھٹنوں کے بل جھک کر مختلف کمروں سے ہوتی ہوئی ایک ایسے کمرے میں آگئی جس کی ایک کھڑکی گلی کی طرف تھی۔ اس نے رانقل کی نال کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھی اور بڑی احتیاط سے دیوار کی آڑ لیتی ہوئی اٹھ کر کھڑکی ہو گئی۔

سامنے والے بنگلے کا برآمدہ اس کی نظروں کی زد میں تھا۔ بنگلے کی تمام بتیاں بجھادی گئی تھیں لیکن برآمدے کے ستون کی آڑ میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے شاید اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پہلو بدلا تھا۔ نائلہ کو اس کی قبض کا دامن ہوا سے ہلتا ہوا نظر آیا تھا۔ اس نے رانقل سیدھی کر کے ٹرانسکر دبا دیا۔ رانقل کی نال سے یکے بعد دیگرے تین چار گولیاں نکلیں۔ تمام گولیاں برآمدے کے ستون میں پیوست ہو گئیں۔

نائلہ درانی نے فائر کرنے کے فوراً ہی بعد اپنی پوزیشن بدل لی۔ تقریباً ”اسی لمحہ بنگلے سے بھی جوابی فائرنگ کی گئی۔ گولیاں کھڑکی میں سے ہوتی ہوئی کمرے کی چھت میں پیوست ہو گئی تھیں۔ اگر نائلہ اپنی جگہ تبدیل نہ کرتی تو یقیناً ”نشانہ بن جاتی۔ بنگلے سے مسلسل فائرنگ کی جا رہی تھی۔

اس گلی میں واقع تمام بنگلوں کی بتیاں بجھ چکی تھیں۔ ایک بنگلے سے عورتوں کے چیخنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ تمام بتیاں بجھ جانے کی وجہ سے گلی میں مکمل طور پر تاریکی چھا چکی تھی۔

”عبدالقدوس۔“ سلطانہ نے سرگوشی کی۔ ”تم یہیں رکو۔ میں پچھلی گلی میں جا رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ پچھلی طرف سے نکلنے کی کوشش کریں۔ میرے اس طرف جانے سے نائلہ پر بھی دباؤ کم ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ مگر اپنا خیال رکھنا۔“ عبدالقدوس نے اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا۔ سلطانہ سینے کے بل ریختی ہوئی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگی اور پھر وہ اٹھ کر تیزی سے دوڑنے لگی۔ اس لین میں گلی کا پہلا بنگلہ زیر تعمیر تھا۔ باؤنڈری وال ابھی تک نہیں بنی تھی۔ سلطانہ اس بنگلے کے اسٹرکچر سے گزرتی ہوئی پچھلی طرف آگئی۔

یہ تمام بنگلے سنگل پٹی پر بنے ہوئے تھے۔ ان کے دروازے پچھلی گلی میں بھی تھے۔ کسی نے بواگیٹ بنا رکھا تھا اور کسی نے چھوٹا دروازہ ہی بنایا تھا۔ اس کے سامنے والی لین میں صرف دو بنگلے آباد تھے۔ دو تین زیر تعمیر تھے اور باقی خالی پلاٹ تھے جن پر خوردرو جھاڑیوں نے قبضہ جمار کھا تھا۔

اس طرف پاشا والے بنگلے کے سامنے دو بنگلے زیر تعمیر تھے۔ ایک تو سنگل اسٹوری تھا اور دوسرا ڈبل اسٹوری۔ سلطانہ دوڑتی ہوئی ڈبل اسٹوری بنگلے میں گھس گئی۔ اسے بیڑھیاں تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ تاریکی میں سنبھل کر چلتی ہوئی اوپر والی منزل پر پہنچ گئی۔ اسے اس زیر تعمیر بنگلے میں داخل ہونے یا اوپر آنے میں کسی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا تھا، چوکیدار فائرنگ کی آواز سن

کر یا تو کہیں بھاگ گیا تھا یا کہیں چھپ گیا تھا۔

سلطانہ بدوقت ہی اس طرف آگئی تھی۔ اس نے دوسری منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی میں پوزیشن سنبھالی تھی کہ پاشا والے بچکے کے ایک کمرے کا پچھلا دروازہ کھلا۔ سلطانہ تاریکی کی وجہ سے کسی کو دیکھ نہیں سکی تھی۔ لیکن اس نے نظریں باہر والے دروازے پر مرکوز رکھیں۔ اسے یقین تھا کہ جو کوئی بھی کمرے سے نکلا تھا اس طرف سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ وہ راتقل سنبھالے تیار کھڑی تھی۔

سلطانہ کا خیال درست نکلا۔ کچھ ہی دیر بعد بچکے کا باہر والا دروازہ کھلا اور دو آدمی باہر نکلے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں راتقلیں تھیں۔ سلطانہ نے اپنی راتقل سیدھی کر کے فائر کھول دیا۔ گولیاں ان دونوں آدمیوں سے ایک دو فٹ آگے زمین پر لگیں۔ ان میں سے ایک بری طرح چیخ کر دوبارہ دروازے میں گھس گیا اور دوسرا دائیں طرف بھاگ نکلا۔ سلطانہ نے اس دوڑتے ہوئے اس شخص پر فائرنگ کر دی۔ وہ چیخ کر گرا لیکن دوسرے ہی لمحہ اٹھ کر پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دوڑنے میں لنگڑا رہا تھا سلطانہ نے فائرنگ جاری رکھی لیکن وہ سائیڈ میں نکل گیا تھا۔

جو شخص دوبارہ بچکے میں گھسا تھا اس نے پوزیشن لے کر فائرنگ شروع کر دی تھی لیکن سلطانہ اس کی فائرنگ سے محفوظ رہی البتہ وہ خود وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہی تھی۔

پاشا والا بچکے دونوں طرف سے فائرنگ کی زد میں تھا۔ وہ لوگ کمرے ہوئے ہونے کے باوجود دونوں طرف اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ سلطانہ بھی انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے وقفے وقفے سے پوزیشن بدل بدل کر فائرنگ کر رہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف سے ناکہ درانی بھی اکا دکا فائرنگ جاری رکھے ہوئے تھی۔

سلطانہ ساتھ والے کمرے میں آگئی۔ کھڑکی کے قریب رک کر اس نے سامنے والے بچکے پر ایک برسٹ مارا۔ اسے فوراً ہی دوسری طرف سے جواب بھی مل گیا۔ اس دوران سلطانہ پوزیشن بدل چکی تھی۔ وہ دوبارہ ٹرائیگر دبانے جا رہی تھی کہ اپنے عقب میں غراہٹ سن کر اچھل پڑی۔

”اگر تم نے حرکت کی تو چھلکی کر دوں گا۔ راتقل پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ سلطانہ کے منہ سے بے اختیار گھرا سانس نکل گیا۔ اس کے پیچھے جو کوئی بھی تھا اس کی راتقل کی ٹال سلطانہ کی گردن کو چھو رہی تھی۔ ویسے سلطانہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ وہی آدمی تھا جو گلی میں بھاگا تھا۔

سلطانہ نے راتقل پھینک دی اور دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس نے اس شخص کے آنے کی آہٹ کیوں نہیں سنی تھی۔

”اب شرافت سے دائیں طرف مڑ جاؤ۔“ اس شخص نے غراتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت بہادر بننے کی کوشش کر رہی ہو پر اسرار عورت۔ لیکن اب تمہارا وقت ختم ہو گیا ہے۔“

”وہ پراسرار عورت دوسری طرف ہے۔ میں تو اس کی ہیلپر ہوں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔

”ہیلپر ہو یا جو کوئی بھی ہو۔ دائیں طرف مڑ جاؤ۔“ وہ شخص غرایا۔

سلطانہ گھرا سانس لیتے ہوئے دائیں طرف مڑ گئی۔ وہ شخص اسے راتقل کی زد میں لئے ہوئے دوسرے

کمرے میں آگیا۔ یہاں فائرنگ کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

”اب میری طرف گھوم جاؤ۔“ اس شخص نے سلطانہ کی گردن سے راتقل ہٹائی۔ سلطانہ نے اس کے

ہم کی قہقہہ کی۔ وہ شخص اسے راتقل کی زد میں لئے کھڑا تھا۔ ”تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟“ اس

فخص نے پوچھا۔

”چھ!“ سلطانہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”انہوں نے بنگلے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ تم لوگوں کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

”اس امکان کا جائزہ تو بعد میں لیا جائے گا لیکن پہلے تم سے....“

”اے... رک جاؤ۔“ سلطانہ اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے چلتی۔

وہ فخص تیزی سے پیچھے مڑا۔ سلطانہ نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے دونوں ہاتھ رائل کی ٹال پر ڈال دیئے۔ رائل کا رخ اوپر کی طرف کرنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے حریف کی کہنی پر بڑی زوردار ٹھوکر ماری تھی۔ سلطانہ نے جیسے ہی رائل کی ٹال اوپر کی طرف اٹھائی تھی اس فخص کی انگلی سے ٹرانگر دب گیا تھا۔ رائل سے نکلنے والی گولیاں چھت سے ٹکرانے لگیں۔ لیکن اس کے بازو پر سلطانہ کی ٹھوکر سے رائل اس فخص کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے مجروح کہنی پکڑ کر چیخا ہوا دوہرا ہو گیا۔

سلطانہ نے رائل کو لٹھ کی طرح ٹال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے لٹھ ہی کی طرح رائل کو سمٹا دیا۔ اس فخص کے کندھے پر بٹ کی زوردار ضرب لگی۔ وہ فخص ایک بار پھر بلبلاتا تھا۔ سلطانہ اس پر وار کرتی رہی۔ کمرے کا فرش بھی ابھی تک نہیں بتا تھا۔ پتھر وغیرہ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ فخص لڑکھڑاکر گرا۔

”تم نے عورت کو اتنا کمزور اور بزدل کیوں سمجھ لیا تھا؟“ سلطانہ غرائی۔ اب وہ اس پر ٹھوکروں کی بارش کر رہی تھی۔

دفعۃً سلطانہ کا پیر بھی ایک پتھر پر پڑا۔ وہ لڑکھڑائی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ دھڑام سے نیچے گری۔ ایک چھوٹا پتھر اس کے کولے کے نیچے آیا تھا جس سے اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔ اس کے منہ سے کراہی نکل گئی۔

سلطانہ کو گرتے دیکھ کر وہ فخص بڑی پھرتی سے اٹھ گیا تھا۔ اس نے سلطانہ کی پسلیوں پر ٹھوکر مارنا چاہی مگر سلطانہ نے بڑی پھرتی سے اس کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ فخص دھڑام سے سلطانہ کے قریب ہی گرا۔ سلطانہ بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رائل بھی دوبارہ اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ اس نے اپنے حریف سے چند فٹ دور فرش پر ایک برسٹ مار دیا۔

”یہ گولیاں تمہارا جسم بھی چھلنی کر سکتی ہیں۔“ سلطانہ غرائی۔ ”اٹھو اور کھڑکی کے قریب جا کر اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ وہ فائرنگ بند کر دیں۔“

”وہ میری بات نہیں مانیں گے۔“ وہ فخص کراہتے ہوئے بولا۔ ”کل رات تم لوگوں نے بوبی اور اس کے ساتھیوں کا جو حشر کیا تھا وہ اس سے بھی واقف ہیں۔ اس لئے وہ مرنے کو ترجیح دیں گے لیکن میری بات نہیں مانیں گے۔“

”تم کون ہو؟“ سلطانہ نے کہا، پھر خود ہی بولی۔ ”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم پاشا ہو۔“

”ہاں، میں ہی پاشا ہوں۔“ وہ فخص بولا۔

”ایسی صورت میں وہ تمہارا حکم نہیں ٹال سکتے۔ تم ہی اس گروہ کے سرغنہ ہو۔ جلدی کرو، انہیں فائرنگ بند کرنے کا حکم دو ورنہ میں تمہیں چھلنی کر دوں گی۔“ سلطانہ غرائی۔

وہ پاشا کو دوسرے کمرے میں لے آئی۔ بنگلے کے دوسرے رخ پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ پاشا کھڑکی کی آڑ

میں کھڑا ہو گیا اور گردن باہر نکال کر اونچی آواز میں چیخا۔  
 ”راجہ... فائرنگ بند کر دو... میں پاشا ہوں اور تم لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ فائرنگ بند کر دو۔“  
 نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ جنگل سے فائرنگ بند ہو گئی۔ دوسری طرف سے نائلہ نے بھی فائرنگ روک دی تھی۔

”چلو... نیچے چلو۔“ سلطانہ نے پاشا کو حکم دیا۔ ”اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو زندہ نہیں بچو گے۔“  
 پاشا خاموشی سے آگے چل پڑا۔ سلطانہ اسے راتقل کی زد پر لئے ہوئے تھی وہ زیر تعمیر جنگل سے نکل کر اس جنگل کے سامنے آگئے۔ سلطانہ نے پاشا کو آگے رکھا تھا۔ جنگل کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے وہ خاصی محتاط تھی۔

”اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ وہ ایک کمرے میں جمع ہو جائیں اور کمرے کی بتی جلادیں۔“ سلطانہ نے اس کی پشت پر راتقل کا ہواؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

پاشا نے چیخ کر اس کی بات دوہرا دی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک کمرے میں بتی جل گئی۔ سلطانہ، پاشا کو راتقل کی زد پر لئے جنگل کے پہلو میں اوپن اسپیس سے گزرتے ہوئے سامنے والے رخ پر آگئی اور برآمدے میں رک کر نائلہ اور عبدالقدوس کو پکار کر کہا کہ وہ لوگ یہاں آجائیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی نائلہ اور عبدالقدوس بھی اندر آگئے۔ اس جنگل میں پاشا سمیت چار آدمی تھے۔ وہ لوگ اس وقت کسی اور علاقے میں دہشت گردی کے لئے جا رہے تھے۔ اگر نائلہ وغیرہ کو وہاں پہنچنے میں چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو وہ لوگ نکل چکے ہوتے اور اب تک نجانے کتنے بے گناہوں کو خاک و خون میں لوٹا چکے ہوتے۔

پاشا کو جب یہ پتہ چلا کہ وہ صرف دو لڑکیاں تھیں اور ان کے ساتھ مبہول سا نوجوان تھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی تھی اور غصہ بھی آیا تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو سرنڈر کیوں کر دیا تھا لیکن وہ ان میں سے ایک لڑکی کی خوشخواری دیکھ چکا تھا۔ وہ راجستھان ہی میں واقع بھارتی اٹلی جنس ایجنسی راکا تربیت یافتہ تھا۔ نائلہ درانی اور سلطانہ اور سسی نامی تین لڑکیوں کے بارے میں اسے بھی اطلاع مل چکی تھی کہ وہ رام گڑھ کے قریب ایک کیمپ تباہ کر کے واپس پاکستان جا چکی ہیں۔ اس نے ان تینوں کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے بہت کچھ سنا تھا لیکن وہ انہیں پہچانتا نہیں تھا۔

گزشتہ چند روز سے کراچی کے اخبارات میں ایک پراسرار عورت کا بڑا چرچا تھا۔ یہ عورت دہشت گردوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھی اور اب تک کئی دہشت گردوں کو گرفتار کروا چکی تھی حالانکہ وہ سب کے سب راکا کے تربیت یافتہ تھے لیکن اس پراسرار عورت کے سامنے موم کے پتلوں کی طرح بے بس ہو گئے تھے۔

گزشتہ رات ہی اس نے بونی کے گروہ کو بے بس کر کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے رات کو بونی کو فون کیا تھا کہ وہ اپنے آدمیوں کو لے کر صبح پانچ بجے کو رگلی پہنچ جائے لیکن وہ نہیں پہنچا تھا۔ وہ تو صبح کے المہارات کے ذریعے اسے پتہ چلا تھا کہ جب اس نے فون کیا تھا اس وقت بونی اس پراسرار عورت کے رحم و کرم پر تھا اور اب وہ اس کے سر پر مسلط تھی۔ ایک نہیں بلکہ دو پراسرار عورتیں!

”تم لوگوں کو میرا پتہ کیسے معلوم ہوا؟ حالانکہ میری پارٹی کے بھی بہت کم لوگ میرے ٹھکانے کے بارے میں جانتے ہیں؟“ پاشا نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔



”بولی ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ہمیں تمہارا پتہ کل رات ہی معلوم ہو گیا تھا۔“

”بولی ہے!“ پاشا کے لمبے میں حیرت تھی۔ ”لیکن آج دن میں تو پولیس اس کے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں معلوم کرتی رہی۔ اسے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا مگر اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ تھا۔ اس لئے تو میں نے اپنا یہ ٹھکانہ نہیں بدلا۔“

”ہمارا اپنا طریقہ کار ہے۔“ نائلہ درانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے صرف ایک مرتبہ پوچھا تھا اور اس نے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ چند لمبے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔“

”یہاں کیا کیا ہے؟“

”بہت کچھ ہے۔“ پاشا نے جواب دیا اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔ ”کیا چاہئے تمہیں؟ جتنی دولت چاہو تمہیں مل سکتی ہے۔“

نائلہ نے اچانک ہی آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

”اگر مجھے دولت کی ہوس ہوتی تو میرے پاس اور بھی ذرائع تھے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم جیسے بے ضمیر اور وطن فروشوں کا خاتمہ میری زندگی کا مقصد بن گیا ہے میں جانتی ہوں سب کو تو ختم نہیں کر سکتی لیکن جن کے بارے میں جانتی ہوں انہیں تو ٹھکانے لگا سکتی ہوں۔“

اسی لمحہ پولیس کے سائرن کی آواز سن کر وہ چونک گئے۔ ”غالباً“ محلے میں سے کسی نے فون پر پولیس کو فائرنگ کی اطلاع دے دی تھی۔ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے کمرے کے ایک کونے میں اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ اس نے ریسپورڈ اٹھایا اور پولیس کا ایمر جنسی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اسی دوران گلی میں بنگلے کے دونوں طرف پولیس کی موبائلز آچکی تھیں۔ اور پولیس والوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نائلہ نے عبدالقدوس اور سلطانہ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پاشا اور اس کے ساتھیوں کو رائفٹوں کی زد پر لئے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر عجیب سے تاثرات تھے۔

”ہیلو۔ ڈیوٹی آفسر۔“ نائلہ دوسری طرف کی آواز سننے ہی بولی۔ ”میں اور میرے ساتھی اس وقت پولیس کے گھیرے میں ہیں اور ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں تم کون ہو؟“ ڈیوٹی آفسر کے لمبے میں حیرت تھی۔

”مم۔۔۔ میں وہی پراسرار عورت۔“ نائلہ نے جلدی سے کہا۔ ”اس وقت چند دہشت گرد ہماری تحویل میں ہیں۔ پولیس نے شاید فائرنگ کی آوازیں سن کر یا کسی اور طرف سے ٹیلی فون پر اطلاع پا کر بنگلے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ آپ اس پولیس پارٹی کو وائرلیس پر حکم دیں کہ مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو بحفاظت یہاں سے نکلنے کی اجازت دے دی جائے۔۔۔“

اسی لمحہ باہر سے میگافون پر ایک پولیس آفسر کی آواز سنائی دی۔

”اس بنگلے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا گیا ہے تم لوگ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ بصورت دیگر تم لوگوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے گی۔“

”ہیلو مسٹر ڈیوٹی آفسر۔“ نائلہ ریسپورڈ بولی۔ ”آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم وہی پراسرار عورت ہو جو قانون کی مدد کر رہی ہے؟“ ڈیوٹی آفسر نے کہا۔

”میں نے کل رات تقریباً اسی وقت نارتھ ناظم آباد کے ایک بنگلے میں دہشت گردوں کے بارے میں اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ دہشت گردوں کی ایک پارٹی فجر کی نماز کے وقت کورنگی کی ایک مسجد میں نمازیوں کا قتل عام کرنے والی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کی سلی ہو گئی ہوگی۔ باہر پولیس پارٹی ہمیں وارننگ دے رہی ہے انہیں حکم دیں کہ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیا جائے۔“

”میں ایسے احکامات جاری نہیں کر سکتا خاتون۔ مجھے ایسے احکامات جاری کرنے کے اختیارات نہیں ہیں۔ آپ

اپنے آپ کو سڑ کر دیں۔ اس کے بعد معاملہ طے ہو جائے گا۔“ ڈیوٹی آفسر نے جواب دیا۔  
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے کڑیل دبا دیا اور ڈی آئی جی کا نمبر ملانے لگی۔ باہر سے مسلسل وارننگ  
 دی جا رہی تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک منٹ بعد کال ریسیو ہو گئی۔ کال گھر کے  
 ایک ملازم نے ریسیو کی تھی۔ اس نے بتایا کہ صاحب سو رہے ہیں۔ اس وقت انہیں جگانا ممکن نہیں۔  
 ”ایمر جنسی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ان سے کو شہر میں معصوم اور بے گناہ شہریوں کا خون بہہ رہا ہے اور قانون کا  
 محافظ خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے خاتون۔“ ملازم نے جواب دیا۔ ”صاحب ایک گھنٹہ پہلے ہی تو باہر سے آئے تھے۔ بہت تھکے  
 ہوئے تھے۔ انہوں نے وردی بھی نہیں اتاری، کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے ہیں۔“  
 ”ان سے کو نائلہ درانی بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”ہولڈ کیجئے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔“ جواب ملا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ریسیور ڈی آئی جی صاحب کی آواز  
 سنائی دی۔

نائلہ نے جلدی جلدی صورت حال سے آگاہ کیا۔ پھر بولی۔ ”میں پولیس کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ اس وقت  
 مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“  
 ”تھیک ہے، میں بات کرتا ہوں۔“ ڈی آئی جی صاحب نے جواب دیا۔  
 نائلہ نے فون بند کر دیا۔ باہر سے ایک بار پھر میگافون پر آواز سنائی دے رہی تھی۔  
 ”یہ تم لوگوں کے لئے آخری وارننگ ہے میں پانچ منٹ گنوں گا اور اس کے بعد کارروائی شروع کر دی جائے  
 گی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔“

آواز خاموش ہو گئی۔ تقریباً ”ایک منٹ بعد میگافون پر وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔  
 ”مس نائلہ درانی! آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر جگہ سے باہر نکل آئیں۔ آپ کا راستہ نہیں روکا جائے گا۔“  
 نائلہ درانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے عبدالقدوس کو اشارہ کیا وہ کہیں سے رسیاں  
 اھونٹ لایا۔ پاشا اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔ وہ تینوں کمرے سے نکل کر گیٹ کی طرف  
 آگئے۔ پولیس کے جوانوں نے گلی میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ تاریکی کی وجہ سے وہ لوگ ان کے  
 ہرے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پولیس پارٹی کا انچارج انسپکٹر فوراً ہی ان کے قریب آیا۔  
 ”پلیز! آپ لوگ اندر جائیے۔ ہم نے انہیں باندھ دیا ہے۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”تھینک یو مس نائلہ۔“ انسپکٹر بولا۔

نائلہ، سلطانہ اور عبدالقدوس تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گلی میں چلنے لگے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں آئوٹریک  
 رائفلیں تھیں۔ نائلہ نے مڑ کر دیکھا، انسپکٹر اپنے آدمیوں کو لے کر جگہ میں داخل ہو رہا تھا۔  
 ان کی گاڑی اسی جگہ موجود تھی جہاں چھوڑی گئی تھی۔ عبدالقدوس نے رائفلیں سیٹوں کے نیچے چھپا دیں۔ پھر  
 وہ تینوں اندر بیٹھ گئے۔ اسٹیئرنگ اس مرتبہ بھی نائلہ ہی نے سنبھالا تھا۔ دوسرے ہی لمحہ گاڑی حرکت میں آگئی۔ اس  
 لارخ عزیز بھٹی پارک کی عقبی سمت جانے والی تھوک کی طرف تھا۔



یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نائلہ زندہ ہے اور کراچی میں موجود ہے، دلاور کا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ وہ جلد سے  
 ملے اس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا مگر شیر درانی اور اس کی ماں حسینہ بیگم نے اس کے راستے میں دیواریں کھڑی کر دی  
 ہیں۔ حسینہ بیگم کا اپنا بیٹا قانون کے جال میں پھنس رہا تھا۔ اس نے پہلے دلاور کو صوبہ خان کے قتل میں پھنسانے کی  
 کوشش کی تھی۔ اس نے پولیس کے سامنے یہ بیان بھی دیا تھا کہ اس نے صوبہ خان کی لاش دریافت ہونے سے ایک

روز پہلے شام کے وقت دلاور کو کھیتوں میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن اس کا یہ بیان غلط ثابت ہوا تھا۔ اس کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعین نے حینہ بیگم کے بیان کی نفی کر دی تھی۔ اور پھر صادق آباد کے سب انسپکٹر ظہور نے اسے ایک پولیس انسپکٹر کے قتل کے برسوں پرانے کیس میں پھنسانا چاہا۔ اس نے یارو پر تشدد کر کے اس سے یہ بیان حاصل کر لیا تھا کہ جس ریوالور سے اس نے اپنی بیوی کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا وہ ریوالور اسے دلاور نے دیا تھا اور وہ ریوالور اس پولیس انسپکٹر کی ملکیت تھا جسے برسوں پہلے مدھ منٹھار کے قریب ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی تھی اور دلاور کو اس کے قتل کے شبہ میں پکڑا گیا تھا مگر کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بچ گیا تھا۔ یہ دلاور کی خوش قسمتی تھی کہ یارو حالات میں پولیس کے تشدد سے ہلاک ہو گیا تھا۔ ہسپتال میں اس نے مرنے سے پہلے ڈاکٹروں اور میڈیکل آفیسر کے سامنے یہ بیان دے کر دلاور کو بچایا تھا کہ پولیس نے اس سے دلاور کے خلاف بیان تشدد کر کے حاصل کیا تھا اور یہ کہ دلاور کا اس ریوالور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دلاور کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ اس کے خلاف ان سازشوں کے پیچھے حینہ بیگم کا ہاتھ تھا۔ اسی نے سب انسپکٹر ظہور کو پیسہ دے کر اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ دلاور کو کسی نہ کسی میں پھنسا دیا جائے۔ محتاط رہنے کے باوجود دلاور سب انسپکٹر ظہور کے ہتھے چڑھ گیا، اسے اغواء کر کے آموں والی حویلی میں پھنچا دیا گیا جہاں حینہ بیگم بھی موجود تھی۔ وہ لوگ دلاور پر تشدد کر کے اس بیان پر دستخط حاصل کرنا چاہتے تھے کہ انسپکٹر صوبہ خان کو اسی نے قتل کیا تھا۔ مگر دلاور کی قسمت نے ایک بار پھر یادری کی اور کئی اسے آموں والی حویلی سے نکال لایا۔

دلاور کی قسمت نے ایک الگ داستان بھی۔ وہ بھی شیردرانی سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے جنگ سے آیا تھا۔ بکلی کی ایک الگ داستان تھی۔ وہ بھی شیردرانی سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے جنگ سے آیا تھا۔ اس کا مقصد تو پورا نہیں ہو سکا مگر اسے دلاور مل گیا۔ اس نے دلاور کی بڑی خدمت کی۔

اسی دوران شیردرانی ایک حادثے میں زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ پولیس نے شیردرانی کے خلاف بہت سی شہادتیں جمع کر لی تھیں۔ انہیں یہ ثبوت مل گیا تھا کہ نہ صرف صوبہ خان، شیردرانی کے ہاتھوں قتل ہوا تھا بلکہ وہ اور بھی بہت سے سنگین جرائم میں ملوث تھا۔ پولیس نے ہسپتال ہی میں شیردرانی کو حراست میں لے لیا اور اس پر پھر بٹھادیا گیا۔

دلاور اور بکلی کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ دولت کے بل بوتے پر شیردرانی پھر بچ نکلے گا۔ اس لئے انہوں نے اسے ہسپتال سے اغواء کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ اس منصوبے کے پیچھے ان کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ پولیس کو یہ تاثر ملتا کہ شیردرانی اپنے ساتھیوں کی مدد سے فرار ہوا ہے۔ اس طرح اس کے خلاف کیس اور مضبوط ہو جاتا۔ اور دوسرا مقصد اس سے انتقام لینا تھا۔ وہ شیردرانی کو موت کے گھاٹ نہیں اتارنا چاہتے تھے۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ اسے عبرت ناک سزا دے کر کسی نہ کسی طرح دوبارہ پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے لیکن ان کی عدم موجودگی میں شیردرانی ان کے تیسرے ساتھی کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔

”وہ انسان نہیں، شیطان ہے۔“ بکلی نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت اس کوٹھری کے سامنے کھڑے تھے جس کے دروازے کے اندر کی طرف ان کے تیسرے ساتھی اکرم کی لاش پڑی تھی۔ ”میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ اس کا قصہ تمام کر دیا جائے۔ مگر تم نے نجانے کیا سوچ کر اسے زندگی کی اتنی سہلت دے دی کہ وہ ہمارے ساتھی کی زندگی کا چراغ گل کر کے فرار ہو گیا۔“

”اکرم کی موت کا مجھے بھی افسوس ہے بکلی۔“ دلاور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن فکر مت کرو۔ اکرم کو قتل کر کے اس نے اپنے گناہوں میں ایک اور گناہ کا اضافہ کر لیا ہے۔ خدا ظالم کی رسی دراز ضرور کرنا ہے مگر اسے معاف نہیں کرتا۔ فرعون، شداد جیسے دنیا کے ظالم ترین انسان خدا کے قہر سے نہیں بچ سکے تو یہ شیردرانی کیا ہے۔ ایک دن یہ بھی گرفت میں اس طرح آئے گا کہ بچ نہیں سکے گا۔“

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کہاں گیا ہوگا؟“ بکلی نے کہا۔ ”اس علاقے میں تو اسے کہیں پناہ مل نہیں سکتی۔“

پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔  
 ”کراچی۔“ دلاور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہیں یاد ہے اس نے کہا تھا کہ پیسہ لے کر مجھے چھوڑ دو۔ میں کراچی چلا جاؤں گا جہاں انسانوں کا جنگل ہے اور اسے تلاش نہیں کیا جاسکے گا۔ اب ہم نے اسے انسانوں کے اسی جنگل میں تلاش کرنا ہے اور اسے اس کے انجام تک پہنچانا ہے۔“  
 ”کراچی میں ہم اسے کیسے تلاش کریں گے وہ تو ایک بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں ایک دنیا آباد ہے اور پھر سنا ہے کہ وہاں بھی آج کل ہنگامے ہو رہے ہیں ہر طرف ہر وقت گولیاں چلتی رہتی ہیں۔“ بکی نے کہا۔  
 ”ہم ان برستی ہوئی گولیوں ہی میں اسے تلاش کر لیں گے۔ اب چلو پہلے ہمیں شہر جانا ہوگا۔“ دلاور نے کہا۔  
 ”اس بیچارے کا تو کوئی بندوبست کر دیا جائے۔“ بکی نے اکرم کی لاش کی طرف دیکھا۔ ”اسے یوں تو نہیں چھوڑا

جاسکتا۔“  
 وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے احاطے میں آگئے۔ یہاں انہیں ایک چھاؤں بھی مل گیا انہوں نے احاطے کے کونے میں قبر کھودی اور اکرم کی لاش کو لاکر اس میں ڈال دیا گیا۔ لاش کے اوپر خشک شاخیں ڈال کر مٹی ڈال دی گئی۔

”اس گاڑی کا کیا کیا جائے؟“ دلاور نے لکڑیوں کے ڈھیر کے دوسری طرف اشارہ کیا۔  
 ”اسے یہیں رہنے دو۔ کبھی نہ کبھی کسی کی نظروں میں آجائے گی۔“ بکی نے جواب دیا۔  
 وہ احاطے سے نکل آئے۔ اس وقت شام گہری ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ وہ کھیتوں میں پگھنڈی پر چلتے ہوئے سڑک پر آگئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہیں رحیم یار خان کی طرف جانے والی بس مل گئی۔  
 رات انہوں نے رائے منصور کی کوٹھی پر گزار دی۔ دلاور نے رائے منصور کو بتا دیا کہ وہ ناکہ درانی کی تلاش میں کراچی جا رہا ہے۔ اس نے ناکہ کا فون نمبر بھی لے لیا تھا۔ شبیر درانی کا انہوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔  
 ”میں بھی آج شام تک حویلی چلا جاؤں گا۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”ناکہ اگر مل جائے تو اسے لے کر جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔ اسے بتاؤں گا کہ اس کے خلاف تمام کھسڑ جھوٹے ثابت ہو کر ختم ہو چکے ہیں اور اصل مجرم اب قانون کی گرفت میں آنے ہی والے ہیں۔ وہ بے خوف ہو کر واپس چل آئے۔“  
 ”کراچی میں وہ پتہ نہیں کن حالات سے دوچار ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”لیکن بہر حال میں کوشش کروں گا کہ اسے لے کر واپس آجاؤں۔“

اور پھر اسی روز دلاور اور بکی کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔  
 اس ٹرین کو شام پانچ بجے کے گھنگھریلا ہوا کراچی پہنچنا تھا لیکن چار گھنٹے لیٹ ہونے کی وجہ سے ٹرین فوجی رات کے قریب کراچی پہنچی تھی۔ بکی ایک دو مرتبہ پہلے بھی کراچی آچکا تھا لیکن دلاور پہلی مرتبہ آیا تھا۔ بکی کا ایک دور کا رشتہ دار پاپوش نگر میں رہتا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب بکی کراچی آیا تھا تو انہی کے ہاں ٹھہرا تھا۔ اب بھی اس کا ارادہ یہی تھا کہ ایک دو روز کے لئے انہی کے ہاں قیام کیا جائے۔ اس نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی تو اس نے دو سو روپے طلب کر لئے۔

”کیوں بھی؟ یہ میٹر کس لئے لگے ہوئے ہیں؟“ بکی نے اسے گھورا۔  
 ”کراچی میں ٹیکسیاں میٹر نہیں، ہماری مرضی سے چلتی ہیں۔“ ڈرائیور نے کہا۔  
 ”تو پھر دو سو روپے تو بہت زیادہ ہیں۔“ بکی نے کہا۔  
 ”میں نے تو بہت کم مانگے ہیں۔ اس وقت کوئی ٹیکسی والا اس طرف جانے کو تیار نہیں ہوگا۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”کیوں؟ ادھر سیلاب آیا ہوا ہے؟“ اس مرتبہ دلاور بولا۔  
 ”سیلاب نہیں، بارش۔ گولیوں کی بارش، کون اپنی جان خطرے میں ڈالنا پسند کرے گا؟ پاپوش کے پورے

علاقے میں صبح سے فائرنگ ہو رہی ہے۔ جانا ہے تو بیٹھ جاؤ۔ ساتھ میں ایک دوسواریاں اور ہتھالوں کا اور عباسی شہید ہسپتال کے مین روڈ پر آمادوں گا۔ لالو کھیت اور گولیہار میں بھی فائرنگ ہو رہی ہے۔ تمام راستے بند پڑے ہیں پتہ نہیں کہاں کہاں سے گھوم کر جانا پڑے گا۔“

”نہیں بھئی، ہم رات ہوئی ہی میں گزار لیں گے۔“ بکی نے کہا۔

وہ دونوں کینٹ اسٹیشن پر اترے تھے۔ انہوں نے ایک دو اور ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھی بات کی مگر کوئی بھی ڈرائیور اس طرف جانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ آرام سے چلتے ہوئے چوک پر آگئے۔ جہاں لاقعدادبوں اور منی بسوں کی وجہ سے ٹریفک جام ہو رہا تھا۔ دلاور ٹریفک کا یہ بیجوم دیکھ کر بدحواس سا ہو گیا۔ چوک کے آس پاس لاقعداد ہوٹل تھے۔ پہلے ہوٹل میں جگہ نہیں ملی، کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ منشی نے ہوٹل کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے بھیجی ہوئی چارپائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو انہیں رات گزارنے کے لئے چارپائیاں مل سکتی ہیں۔ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ اس قسم کے ہوٹلوں میں قیام کرنے والوں کو پولیس کس طرح تنگ کرتی ہے اور چارپائیوں پر رات گزارنے والوں کی تو شامت ہی آجاتی ہے۔ پولیس والے مختلف الزامات میں بند کر دینے کی دھمکی دے کر ان کی جیبیں خالی کر دیتے تھے اور آج کل تو کراچی کے حالات ویسے بھی تشویش ناک تھے۔ کسی بھی شخص کو مشتبہ سمجھ کر بند کر دینے کی دھمکی دے کر اس کی جیبیں خالی کر دانی جا سکتی تھیں۔

دوسرے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے پان سگریٹ کے ایک کین کے قریب دلاور رک گیا۔ کین کے ساتھ ہی ٹیلی کارڈ کا ایک بوتھ بھی موجود تھا۔ دلاور بوتھ کے سامنے رک گیا اور اس میں لگے ہوئے ٹیلی فون کو دیکھنے لگا۔ یہ ٹیلی فون اس کے لئے کچھ عجیب سا تھا۔

”ٹھہر جا بکی۔“ اس نے بکی کو آواز دی جو اس سے دو تین قدم آگے نکل چکا تھا۔

”میرے پاس ناکہ کا فون نمبر موجود ہے میرے خیال میں اسے فون کر کے بتا دینا چاہئے۔ وہ ہمیں آکر لے جائے گی یا اسے گھر کا پتہ سمجھا دے گی۔“

”یہ کوشش بھی کر دیکھو۔“ بکی نے جواب دیا۔

دلاور کچھ دیر ٹیلی فون کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ناکہ درانی کا فون نمبر والا کاغذ جیب سے نکالا اور ہک پر منٹا ہوا ریسیور اٹھالیا۔ اس فون پر ڈائل کے بجائے ہنسی بٹن تھے اور یہ بات دلاور کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس پر نمبر سمھانے کے بجائے نمبروں والے بٹنوں کو دبا دیا جائے گا۔ اس نے سامنے لگی ہوئی سلائیڈ پر توجہ نہیں دی تھی جس پر مختلف ہدایات آ رہی تھیں۔ وہ ریسیور اٹھا کر نمبروں والے بٹن ہنسی کرنے لگا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔

”یہاں اس طرح فون نہیں ہو گا بھائی۔“ بان والے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو کیا یہاں سے فون کرنے کے لئے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرنا پڑتی ہیں۔“ دلاور نے کہا۔

بان والے نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ دہماتی ہیں اور غالباً ابھی ابھی ٹرین سے اترتے ہیں۔ وہ کارڈ لے کر اپنے کین سے باہر آگیا۔

”فون کرنے کے لئے اس میں یہ کارڈ ڈالنا پڑتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر ڈال دو کارڈ۔“ دلاور نے کہا۔

”کراچی کے لئے پانچ روپے ایک کال کے ہوں گے۔“ دوکان والے نے کہا۔

”تم چھ روپے لے لینا یا رکنہ۔ یہ نمبر ملا کر دو۔“ دلاور نے کہتے ہوئے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

دوکان والے نے ریسیور اٹھا کر سلاٹ میں کارڈ ڈالا اور چند سیکنڈ بعد نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف سے کھنٹی کی

آواز سننے ہی اس نے ریسیور دلاور کی طرف بڑھا دیا۔

”مواہبات کرلو۔ اس میں جتنے یونٹ استعمال ہوں گے فی یونٹ پانچ روپے کے حساب سے پیسے لوں گا۔“

دلاور نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ کھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی پھر ایک مردانہ آواز اس کی

سماعت سے کرائی۔

”تم کون بول رہے ہو بھائی؟“ دلاور نے پوچھا۔

”عبدالقدوس۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”ناٹک بی بی سے۔ ان سے کہو کہ دلاور بول رہا ہے۔“ دلاور نے کہا۔

”ایک منٹ ہولڈ کریں۔ ابھی بلاتا ہوں۔“ جواب ملا۔

دلاور ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ اس کے دماغ میں چوٹیاں سی ریک ری تھیں۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ یہ عبدالقدوس کون ہے اور ناٹک سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

”ہیلو دلاور۔“ ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے کرائی۔

”اودہ۔ ناٹک بی بی، کیسی ہیں آپ۔“ دلاور نے پوچھا۔ ناٹک کی آواز سن کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟ رائے صاحب کیسے ہیں؟“ ناٹک نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں جی اور سب بھی ٹھیک ہیں۔ آپ مجھے گھر کا پتہ سمجھائیں۔ باقی باتیں وہیں آکر ہوں گی۔“

”کیا مطلب!“ ناٹک چونک گئی۔ ”تم کہاں سے بول رہے ہو؟“

”کراچی سے جی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچا ہوں۔ اسٹیشن کے قریب ہی سے فون کر رہا ہوں۔ آپ مجھے گھر کا پتہ سمجھائیں۔“

”پتہ اس طرح تمہاری سمجھ میں نہیں آسکے گا۔“ ناٹک نے جواب دیا۔ ”تم اپنا کمرہ کسی ٹیکسی پر بیٹھ کر گلشن

اقبال آجاؤ۔ ڈرائیور سے کہنا ڈسکو بیکری کے سامنے رک جائے۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔“

”بیکری۔“ دلاور کے لبے میں حیرت تھی۔ ”آپ بیکری پر کیا کرتی ہیں جی؟“

”میں بیکری پر کچھ نہیں کرتی۔ جس ایک نشانی تائی ہے نام یاد رکھنا، ڈسکو بیکری۔ میں اس دوکان کے بالکل

سامنے کھڑی ہوں گی۔“ ناٹک نے کہا۔

”ٹھیک ہے جی۔ مجھے نام یاد رہے گا۔“ دلاور نے جواب دیا۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے پان والے کی طرف

دیکھا اور ریسیور ہک پر ٹانگ دیا۔

پان والے نے فون کے اوپر سلائڈ دیکھتے ہوئے سلاٹ میں سے کارڈ نکال لیا اور دلاور سے پندرہ روپے لے

لئے۔

”پہل میرے یار۔“ دلاور بکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ ہمیں ہوٹلوں میں دھکے کھانے کی ضرورت

نہیں۔“

وہاں کئی پہلی ٹیکسیاں بھی کھڑی تھیں۔ وہ جس ڈرائیور سے بھی بات کرتے وہ زبان سے جواب دینے کے بجائے

ٹلی میں سر ہلاتا دیتا۔

”اس شہر کے لوگ تو بڑے عجیب ہیں یار۔“ دلاور بولا۔

”ہر شہر کے لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔“ بکی نے جواب دیا۔ ”یہ ٹیکسی والے جو ہمیں دیکھ کر انکار میں

سر ہلا دیتے ہیں نا اس کی وجہ میری سمجھ میں آگئی ہے۔“

”کیسی وجہ؟ کیا ہم انہیں قتل کر کے ٹیکسی چھین کر بھاگ جائیں گے؟“ دلاور بولا۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ بکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں ٹیکسیاں چھیننے اور قتل و غارت کی

وارداتیں عام ہو رہی ہیں۔ ہمارے محلوک قسم کے چلنے دیکھ کر ٹیکسی ڈرائیور ہمیں انکار کر دیتے ہیں۔“

”اچھا دیکھو، میں ابھی ٹیکسی لیتا ہوں۔“ دلاور کہتے ہوئے ایک اور پہلی ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے

ڈرائیور سے چلنے کو کہا تو ڈرائیور نے پہلے ان دونوں کو سر سے پیر تک سمجھ کر پھر ٹلی میں سر ہلا دیا۔ ”اوبھائی۔“ دلاور

اس کے چہرے پر نظرسنجماتے ہوئے بولا۔ ”ہم مسافر ہیں، ابھی ابھی ٹرین سے اترے ہیں۔ شریف آدمی ہیں۔ تم چاہو تو پہلے ہماری تلاش کیلے لو ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ تم جتنے پیسے کو گے ہم تمہیں دے دیں گے۔“

”سورہ پیہ ہوگا۔“ ڈرائیور نے نکت سے کہا۔

دلاور جواب دینے کے بجائے کبھی کو اشارہ کرتا ہوا فوراً ہی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ کبھی بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے انجن اشارت کیا اور ٹیکسی حرکت میں آگئی۔ راستے میں باتوں کے دوران ڈرائیور نے کبھی کے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ ٹیکسیوں والے ڈرتے ہوئے مشکوک قسم کے لوگوں کو اپنی گاڑیوں میں نہیں بٹھاتے۔ اسلحہ کے زور پر ٹیکسیاں اور گاڑیاں چھیننے کی وارداتوں میں بڑا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس قسم کی آٹھ دس وارداتیں روز کا معمول بن چکی ہیں۔ چھینی جانے والی گاڑیاں یا ٹیکسیاں ڈیوٹی یا دہشت گردی کی کسی واردات میں استعمال کرنے کے بعد چھوڑ دی جاتی ہیں۔ وارداتیں کرنے والے تو پولیس کے ہاتھ نہیں آتے البتہ پولیس ان گاڑیوں کے مالکان کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ ٹیکسی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ کشادہ سڑکیں اور بلند بالا عمارتیں دیکھ کر دلاور کو بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ لیکن ان سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور انہیں بتا رہا تھا کہ شہر کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے سڑکوں کی رونق اجڑ چکی ہے۔

تقریباً چالیس منٹ تک ان کا سفر جاری رہا۔ اس دوران دلاور، عبدالقدوس نامی اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا جس نے کال ریسیو کی تھی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ نالکہ کا اس شخص سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ بالا خرچہ ٹیکسی رک گئی تو وہ ڈرائیور کی آواز سن کر چونک گیا۔

”یہ ڈسکو پکری ہے۔ اب آپ کو کہاں جانا ہے۔“

دلاور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور بالا خرچہ ایک جگہ مگاتی ہوئی دوکان کے سامنے اسے نالکہ نظر آگئی۔ وہ بھی وہاں رکنے یا گزرنے والی ٹیکسیوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس پہلی ٹیکسی کو رکنے دیکھ کر اس نے اس طرف دیکھا تھا اور جب اس نے دلاور کو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی ٹیکسی کے قریب آگئی۔ دلاور نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترنا چاہا مگر نالکہ نے اسے روک دیا اور اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”زیادہ دور نہیں جانا، ذرا آگے جا کر دائیں طرف موڑ لینا۔“ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور کے چہرے کے تاثرات مجھڑے لیکن اسے گاڑی تو آگے بڑھانی پڑی تھی۔ چند منٹ بعد ہی ٹیکسی ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ وہ تینوں اتر آئے۔ کبھی نے سوکانوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں بٹھوایا۔ بنگلے کا گیٹ عبدالقدوس نے کھولا تھا۔ وہ اس وقت بڑے بڑے پاجامے اور ڈھیلے ڈھالے کرتے میں لمبوس تھا۔ بے ترتیب داڑھی اور اس لباس نے اس کا حلیہ عجیب سا بنا دیا تھا۔

”یہ کیا شے ہے جی؟“ دلاور نے پوچھا۔

”عبدالقدوس۔“ نالکہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہاری کال اسی نے ریسیو کی تھی۔“

دلاور کے منہ سے بے اعتبار گہرا سانس نکل گیا۔ اس کے ذہن سے سارا بوجھ اتر گیا تھا۔ عبدالقدوس کے بارے میں اس کے ذہن میں نجانے کیسے کیسے خیالات آئے تھے۔ معاملہ دراصل دل کا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی نالکہ سے اپنے دل کی بات نہیں کی تھی مگر وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ وہ نالکہ کو چاہنے لگا تھا۔ وہ اپنی حیثیت سے بھی واقف تھا۔ نالکہ ایک بہت بڑی زمیندار تھی اور وہ معمولی سا آدمی! دوسروں کے عکروں پر پلنے والا۔ اس کے اور نالکہ کے درمیان دولت اور حیثیت کی بہت لمبی خلیج حائل تھی۔ وہ اس خلیج کو نہیں پاٹ سکتا تھا لیکن اسے اپنے دل پر بھی قابو نہیں تھا۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جسے نہ تو زبردستی دل میں بسایا جاسکتا ہے اور نہ ہی نکالا جاسکتا ہے۔ لیکن اپنے اس جذبے کا اظہار کرنا یا نہ کرنا تو اس کے بس میں تھا۔ وہ نالکہ درانی کو دل ہی دل میں چاہتا

رہا لیکن دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لایا تھا۔  
 نائلہ جب تک لاپتہ رہی تھی وہ کانٹوں پر لوٹا رہا تھا۔ نائلہ کی خاطر اس نے بڑی سختیاں برداشت کی تھیں۔  
 بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ زندگی کو داؤ پر لگائے رکھا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو حسینہ بیگم اور شیردرانی کی بات مان کر نائلہ سے  
 لاتعلقی ہو جاتا۔ وہ ماں بیٹا اسے اتنی دولت دے دیتے کہ وہ زندگی بھر عیش کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے سختیاں برداشت  
 کرنا قبول کر لیا تھا مگر نائلہ کا ساتھ چھوڑنے کا خیال بھی اس کے دل میں کبھی نہیں آیا تھا۔  
 وہ سچائی کا قائل تھا۔ نائلہ حق پر تھی۔ بعض طاغوتی قوتوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اپنوں کے خون  
 سفید ہو گئے تھے۔ دولت کی ہوس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ نائلہ درانی ان طاغوتی طاقتوں کے چنگل  
 سے نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی اور وہ بھی اس جدوجہد میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے ہر ممکن مرحلے میں نائلہ کا ساتھ  
 تھا۔ کئی بار موت کے منہ میں چٹان لگائی تھی۔

اور پھر یکایک نائلہ غائب ہو گئی۔ صوبہ خان کے آدمی اسے زخمی کر کے اٹھالے گئے تھے۔ وہ خود بھی زخمی ہوا  
 تھا۔ پھر کئی روز بعد اطلاع ملی کہ نائلہ صوبہ خان کے آدمیوں کے چنگل سے بھاگ نکلی تھی اور وہ سندھ کے کسی  
 چھوٹے سے گوشے میں موجود تھی۔ وہ اس کی تلاش میں سندھ پہنچ گیا۔ اس دوران صوبہ خان ایک بار پھر نہ صرف  
 نائلہ بلکہ اس گوشے کی سسی نامی ایک لڑکی کو بھی اٹھالے گیا۔ دلاور نے اس کا تعاقب اور نائلہ کی تلاش جاری رکھی  
 اور پھر اسے یہ بھی پتہ چلا کہ نائلہ تھر کے صحرا میں لاپتہ ہو چکی ہے۔ اس کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد سب لوگ  
 مایوس ہو چکے تھے۔ ہر شخص کا یہی خیال تھا کہ نائلہ اور اس کے ساتھ سسی نامی دوسری لڑکی بھی موت کا شکار ہو چکی  
 ہے۔ رائے منصور بھی مایوس ہو چکے تھے لیکن دلاور مایوس نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نائلہ زندہ ہے اور پھر چند  
 روز پہلے جب رائے منصور نے اسے یہ اطلاع دی کہ نائلہ زندہ ہے اور کراچی میں موجود ہے تو اس پر ایک عجیب سی  
 کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ فوراً ”کراچی پہنچنا چاہتا تھا مگر حسینہ بیگم اور شیردرانی نے سب انکسٹر طور کے ساتھ مل  
 کر اسے اپنی سازشوں کے جال میں پھنسانے رکھا اور اب نائلہ اس کے سامنے تھی۔ نائلہ کو دیکھ کر اس کے دل پر  
 عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ سلطانہ کو دیکھ کر دلاور کی آنکھوں میں  
 الجھن سی تھری۔

”یہ سسی ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے نائلہ کی طرف دیکھا۔  
 ”نہیں۔“ نائلہ اس کے منہ سے سسی کا نام سن کر چونک گئی۔ ”تم سسی کو جانتے ہو؟“  
 ”نہیں، لیکن سننے میں آیا تھا کہ صوبہ خان سسی نامی لڑکی کو بھی تمہارے ساتھ سندھ کے اس گوشے سے اٹھا کر  
 لے گیا تھا۔ میں اس کے ماں باپ سے ملا تھا۔ بہت برا حال تھا ان کا۔ تمہارے بارے میں سب لوگ مایوس ہو چکے  
 تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ تم زندہ ہو۔“ دلاور نے کہا۔  
 نائلہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔  
 ”تمہیں میرے زندہ ہونے کا یقین کیوں تھا؟“ اس نے عجیب سی نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھا۔  
 ”بس جی، میرا دل کہتا تھا کہ آپ... زندہ ہیں...“ دلاور نے جواب دیا۔ وہ نائلہ کو کبھی تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا  
 اور کبھی آپ۔

”ہوں۔“ نائلہ مسکرائی۔ ”سنا ہے تم نے صوبہ خان کے خلاف آئی جی کو شکایت کی تھی جس کے نتیجے میں اسے  
 ملازمت سے معطل کر دیا گیا تھا۔ اب کہاں ہے وہ؟“  
 ”وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔“ دلاور نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ پناہ لینے کے لئے شیردرانی  
 کے پاس گل مرگ پہنچا تھا۔ شیردرانی نے اسے قتل کر کے لاش کنویں میں پھینک دی اور ان ماں بیٹوں نے مجھے اس  
 قتل میں پھنسانے کے کوشش کی لیکن بالاخر پولیس نے شیردرانی کو حراست میں لے لیا۔ وہ اس وقت ہسپتال میں  
 تھا۔ ہم نے اسے پولیس کی حراست سے فرار کر لیا لیکن وہ ہمارے ایک آدمی کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔ مجھے شبہ ہی



نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ کراچی آیا ہوا ہے۔ اس نے تو کاجیلہ کے پولیس آفیسر سے آپ کی موت کا سرٹیفکیٹ بھی لے لیا تھا۔ میں رائے صاحب کو سب کچھ بتا کر آیا ہوں۔ وہ ماں بیٹا اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دلاور اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”انہوں نے مجھ پر ہر حربہ آزما ڈالا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ آپ بتائیں جی کہاں رہیں اور کیا جتنی آپ پر؟“

”بہی کمائی ہے۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم لوگ لمبے سفر سے آئے ہو، نہاد ہو کر کھانا کھاؤ۔ پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔“

عبدالقدوس نے انہیں دو غسل خانوں کا راستہ دکھادیا۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ نما کر ڈرائنگ روم میں آئے تو سلطانہ ان کے لئے کھانا تیار کر چکی تھی۔ ڈرائنگ روم کی میز پر ہی کھانا لگا دیا گیا۔“

”یہ تمہارا دوست۔۔۔“

”یہ بکلی ہے۔“ دلاور نے نائلہ کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی اسی سانپ کا ڈسا ہوا ہے۔ موجودہ طور پر آپ جانتی ہیں۔ وہ اسی کا بھائی تھا جو شیردرانی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے آیا تھا لیکن میرے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ اگر یہ بروقت آموں والی حویلی میں نہ پہنچ جاتا تو اس رات میرا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ اب یہ بھی میرے ساتھ ہی گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شیردرانی وہاں سے بھاگ کر کراچی آیا ہے۔ لیکن ہم اسے جلد ہی تلاش کر لیں گے۔“

”یہاں اور بھی بہت سے شیردرانی ہیں۔“ نائلہ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”ہم تینوں ان سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم دونوں کے آجانے سے ہماری طاقت بڑھ جائے گی۔“

”آپ ذرا تفصیل سے بتائیے۔ یہ سب قصہ کیا ہے۔ آپ یہاں تک کیسے پہنچیں؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہی کمائی ہے۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور انہیں تفصیل سے سب کچھ بتانے لگی۔ دلاور اور بہی کھانا کھاتے رہے۔ نائلہ کی باتیں سنتے ہوئے دلاور کے چہرے کے تاثرات بار بار بدل رہے تھے۔ اگر نائلہ کے دشمن اس کے سامنے ہوتے تو وہ ان کی گردنیں موڑ دیتا۔

نائلہ کی بہت اور جرات سے وہ پہلے ہی واقف تھا۔ وہ بڑی باہمت اور حوصلہ مند لڑکی تھی۔ اس نے بڑے ظلم سے تھے اور برداشت کئے تھے۔ اگر کوئی اور اس کی داستان سنا تو شاید یقین نہ کرتا مگر دلاور اس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اس لئے نائلہ اب جو کچھ بھی بتا رہی تھی اس کے بارے میں بھی دلاور کو یقین تھا کہ اس کی کمائی میں جھوٹ کا ایک لفظ بھی شامل نہیں تھا۔

”کاش! میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا۔“ دلاور نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”اس طرح شاید آپ کے تھوڑے بہت دکھ تو بانٹ لیتا۔“

نائلہ مسکرا کر رہ گئی۔

”تم لوگ شیردرانی کو یہاں کیسے تلاش کرو گے؟“ سلطانہ نے پہلی مرتبہ ان کی گفتگو میں حصہ لینے ہوئے کہا۔ ”کراچی تو واقعی انسانوں کا جنگل ہے۔ کسی نشان پتے کے بغیر یہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں ہے۔“

”میں اس کے بارے میں تمہارا بہت جانتی ہوں۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”کئی سال پہلے پھلوں کا ایک بیوپاری کاروبار کے سلسلے میں اس کے پاس رحیم یار خان آیا کرتا تھا۔ یہاں منڈی میں اس کی دوکان بھی ہے۔ اگر شیردرانی واقعی کراچی آیا ہے تو اس سے رابطہ ضرور کیا ہو گا یا کرے گا۔ اس بیوپاری سے بہر حال شیردرانی کے بارے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔“

”وہ بیوپاری کون ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”اس وقت مجھے نام یاد نہیں آرہا میں کوشش کروں گی کہ صبح تک وہ نام یاد آجائے۔ اب رات کے دو بج چکے

ہیں۔ سو جانا چاہئے۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اٹھ گئے۔ دلاور اور کی کو وہ بیڈ روم دے دیا گیا جو خالی پڑا تھا۔ اس کمرے میں ڈبل بیڈ  
 بچا ہوا تھا اور وہ دونوں بڑے اطمینان سے اس پر سو سکتے تھے۔  
 دلاور نے نیلگوں روشنی والا نائٹ بلب جلا دیا تھا۔ کی تو بستر پر لیٹے ہی سو گیا تھا مگر دلاور جاگتا رہا۔ وہ نائلہ کے  
 بارے میں سوچ رہا تھا۔ نائلہ کو زندہ اور سلامت پا کر اسے کتنی خوشی ہوئی تھی اس کا اندازہ وہی لگا سکتا تھا!  
 دوسرے کمرے میں نائلہ اور سلطانہ بھی ایک ہی بنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بھی جاگ رہی تھیں۔  
 ”اچھا۔ تو یہ ہے وہ دلاور جس کا تم اکثر ذکر کیا کرتی تھیں۔“ سلطانہ نے اس کی طرف کٹھ بدلتے ہوئے کہا۔  
 ”ہے تو واقعی خوب اور کچھ جوان۔ کیا یہ بھی کوئی زمیندار یا رئیس زادہ ہے؟“  
 ”نہیں۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ نہ تو زمیندار ہے اور نہ رئیس زادہ۔ میں تمہیں پہلے  
 بھی بتا چکی ہوں کہ رائے منصور صاحب نے اسے میری حفاظت کی ذمہ داری سونپی تھی۔ ہمارے ہونے ساتھ یہ  
 شریف بھی بست ہے۔ اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ اس نے میری خاطر کی مرتبہ موت سے بچہ  
 آزمائی کی۔ بڑی اذیتیں اور تشدد برداشت کیا۔ ابھی تم نے خود بھی اس کی زبان سے سنا تھا کہ وہ میری تلاش میں کہاں  
 کہاں بھٹکتا رہا ہے اور کیسے کیسے ظلم برداشت کئے ہیں اس نے۔“  
 ”ہاں۔“ سلطانہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے لئے  
 کچھ بھی کر سکتا ہے اور۔۔۔“

”اور کیا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”اور یہ کہ وہ تمہیں چاہتا بھی ہے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔  
 ”میں جانتی ہوں۔“ اس مرتبہ نائلہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔  
 ”تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔ ”چاہتی تو تم بھی ہو اسے۔ جس انداز سے تم اس کا تذکرہ  
 کرتی رہی ہو اور آج اس کا فون ملنے کے بعد تم جس طرح مضطرب رہی ہو اس سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں کہ  
 تمہارے دل میں اس کے لئے کیا جذبات ہیں۔ اب جبکہ تمہارے تمام ذاتی مسائل حل ہو چکے ہیں۔ کوئی رکاوٹ باقی  
 نہیں رہ گئی، تمہیں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔“  
 ”تمہارا خیال درست ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔“

”کیا اس لئے کہ وہ زمیندار یا رئیس زادہ نہیں ہے اور ایک معمولی سا آدمی ہے؟“ سلطانہ نے اسے گھورا۔  
 ”نہیں۔“ نائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ان خرافات پر یقین نہیں رکھتی۔ لیکن ابھی اور بہت سے مسائل  
 اور رکاوٹیں ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ حینہ بیگم اور اس کا بیٹا شیردرانی ہے۔ انہیں جب یہ پتہ چلے گا کہ میں نے  
 دلاور کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ دلاور کے دشمن ہو جائیں گے اور اپنی تمام تر قوتیں اس کے خلاف استعمال کریں  
 گے۔ میں نہیں چاہتی کہ شادی کرتے ہی پوہ ہو جاؤں۔“  
 ”لیکن حینہ بیگم اور شیردرانی تو اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”دلاور کی باتوں سے یہ  
 اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ماں بیٹا اب تمہارے خلاف کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ انہیں تو اپنی جان  
 کے لالے بڑے ہوئے ہیں۔ کسی اور کے خلاف کیا کر سکتے ہیں۔“

”تم انہیں نہیں جانتیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ان دونوں میں اتنا زہر بھرا ہوا ہے جس کا تم اندازہ نہیں  
 لگا سکتیں۔ مسائل میں الجھے ہونے کے باوجود وہ میرے اور دلاور کے خلاف کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

سلطانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے نائلہ کی طرف دیکھتی رہی۔ تین بج چکے تھے۔ اس کے کچھ دیر  
 بعد سلطانہ تو سونگی مگر نائلہ کو نیند نہیں آسکی تھی۔ وہ دلاور کے بارے میں سوچتی رہی۔ دلاور محض ایک باڈی گارڈ کی  
 حیثیت سے اس کی زندگی میں آیا تھا لیکن وہ چپکے ہی چپکے اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ گیا تھا۔ نائلہ پہلے اس کی

دلیری اور وفاداری سے متاثر ہوئی پھر اس کی شرافت نے نالکھ کو قائل کیا۔ بہت سے ایسے مواقع آئے تھے جب دلاور بڑے اطمینان سے اس پر ہاتھ صاف کر سکتا تھا مگر دلاور نے کبھی میلی آنکھ سے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ نالکھ بہت پہلے یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ دلاور اسے چاہنے لگا ہے لیکن اس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ نالکھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتی تھی کہ وہ بھی دلاور کو چاہنے لگی تھی۔ لیکن اس نے بھی کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اس کی چاہت کا اظہار ہوتا ہو۔ دونوں اپنی چاہت کو سینوں میں چھپائے ہوئے تھے۔۔۔

سلطانہ بڑی ذہین لڑکی تھی۔ اس نے فوراً ہی ان دونوں کی چاہت کا اندازہ لگا لیا تھا اور نالکھ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کرے بلکہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دلاور کے بارے میں اس کا یہ فیصلہ قیامت پر پاکر دے گا حسینہ بیگم اور شبیر درانی اپنے مسائل میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود انہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ حسینہ بیگم یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ جس لڑکی کو اپنی بیوی بنانا چاہتی تھی وہ کسی اور کی ہو جائے۔ اس کے علاوہ معاملہ کروڑوں کی جائیداد کا تھا۔ یہ سب کچھ جائیداد کے لئے ہو رہا تھا۔ اس جائیداد کے لئے وہ ماں بیٹا اب تک نجانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ وہ آسانی سے تو اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے۔ نالکھ رات بھر جاگتی رہی اور دلاور کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ صبح پانچ بجے کے لگ بھگ سلطانہ کی آنکھ کھل گئی۔

”اوئے۔۔۔ تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔ سوئی نہیں؟“ سلطانہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی اور آنکھیں ملے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”نیند نہیں آ رہی۔“ نالکھ نے جواب دیا۔  
 ”تو کیا رات بھر تم اس سے باتیں کرتی رہی ہو؟“ سلطانہ نے اسے گھورا۔  
 ”کس سے باتیں کرتی رہی ہوں؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ نالکھ اسے گھورنے لگی۔  
 ”میرا مطلب ہے خیالوں میں۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اے بھئی تصور بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہزاروں میل دور سے محبوب کو آنکھوں کے سامنے لاکر ٹھہراتا ہے۔ اور یہاں تو صرف ایک دیوار حائل ہے۔ اس پچارے کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔ وہ بھی سویا ہے یا تمہاری طرح جاگ رہا ہوگا میرا خیال ہے میں دیکھ کر آتی ہوں۔۔۔“ سلطانہ کہتے ہوئے ہلکے سے اترنے لگی۔  
 ”آرام سے بیٹھی رہو۔ بد تمیز کہیں کی۔“ نالکھ نے جلدی سے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

”اے بھئی میں یکن میں یکن میں جا رہی ہوں۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”باہر دن کا ہلکا سا اجالا پھیل رہا ہے۔ توڑی دیر میں پوری طرح روشنی پھیل جائے گی۔ اب نیند کسے آئے گی۔ میں اپنے اور تمہارے لئے چائے بنانے جا رہی ہوں۔“ نالکھ نے اسے چھوڑ دیا۔ سلطانہ دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گئی۔ نالکھ کچھ دیر تک بیڈ پر لیٹی رہی پھر اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آگئی۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کا خوشگوار جھونکا اس کے چہرے سے ٹپرایا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سلطانہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”اوئے۔۔۔ باہر آ جاؤ برآمدے میں۔۔۔ بڑی اچھی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 نالکھ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔ چھوٹی میز پر چائے کے دو کپ رکھے ہوئے تھے۔ ہانس کی کھچھچوں سے بنی ہوئی دو کرسیاں مستقل طور پر برآمدے ہی میں پڑی رہتی تھیں۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور اپنا اپنا کپ اٹھا کر چائے کی چسکیاں لینے لگیں۔ ٹھنڈی اور نرم آلود ہوا واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ابھی انہیں وہاں بیٹھے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک ہی فضا تڑتڑا ہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ سلطانہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپ سے چائے پھٹک گئی۔ ایک گاڑی فائرنگ کرتے ہوئے گلی میں سے گزری تھی۔ اس کے ایک منٹ بعد ایک اور تیز رفتار گاڑی گیٹ کے سامنے سے گزری۔ وہ پولیس موبائل تھی اس سے بھی

فائرنگ کی جارہی تھی۔ تقریباً اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور دلاور اور بکی دوڑتے ہوئے برآمدے میں آگئے۔

”یہ۔ یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟“ دلاور نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”کچھ جرائم پیشہ اور پولیس والے آنکھ پھولی کھیلنے ہوئے یہاں سے گزرے تھے۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے

پوچھا۔

”آنکھ پھولی!“ دلاور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”اے میوزیکل آنکھ پھولی کہتے ہیں۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ ”یہ معمول کی بات ہے۔ کراچی کے رہنے والے ان آوازوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ تم اگر ابھی تک نہیں سوتے تو جا کر سو جاؤ اور اگر چائے پینا چاہو تو بیٹھ جاؤ۔“  
”اب نیند کہاں آئے گی۔ چائے چلے گی۔“ دلاور بولا۔

”میں تو جا کر سو رہا ہوں۔“ بکی کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

سلطانہ اپنا کپ میز پر رکھ کر کچن میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے میں پلاسٹک کی ایک کرسی لئے آگئی۔ وہ میز کے دوسری طرف کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ چائے کا کپ دلاور کی طرف بڑھا دیا اور اپنا کپ اٹھالیا اور کھنکھناتے ہوئے دلاور اور کبھی نالکھ کی طرف دیکھنے لگی۔

فائرنگ کی آوازیں اب بہت دور یونیورسٹی روڈ کی طرف سے آرہی تھیں۔ نالکھ دلاور کو بتا رہی تھی کہ ڈکیتیاں اور دہشت گردی کی وارداتیں یہاں روز کا معمول بن چکی ہیں۔ ان وارداتوں کے خلاف اگر عوام پر امن طور پر احتجاج کے لئے سڑکوں پر آتے ہیں تو شہرینہ عناصر سے بھی پر تشدد بنادیتے ہیں جس میں کئی بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ املاک کو اور بسوں اور دیگر گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ پولیس موبائلز اور تھانوں پر حملے کر کے پولیس اہلکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ کسی کو چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے۔ یہ وارداتیں بھارتی اٹھیلی جنس ایجنسی راکے تربیت یافتہ ایجنٹ کر رہے ہیں۔ مقامی شہرینہ عناصر بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ڈکیتوں اور لوٹ مار کی وارداتیں کر رہے ہیں جس سے پاکستان کے خلاف بھارتی کاڈ کو تقویت مل رہی ہے۔

نالکھ دلاور کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہندو بیوں نے قیام پاکستان کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔

وہ شروع ہی سے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی سازشوں میں مصروف رہے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان پر بعض جنگیں بھی مسلط کی گئیں۔ بھارت نے سب سے پہلے سندھ کی طرف سے رن آف کچھ میں جنگ چھیڑی۔ اس وقت

پاکستان نوزائیدہ بچے کی طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہوا تھا لیکن بھارت کو اس جنگ میں منہ

ٹکی کھانی پڑی۔ اس جنگ میں پاکستان نے بھارت کو ایسی چوٹیں لگائیں کہ وہ عرصہ تک اپنے زخم چاٹتے رہے۔ پھر

۱۹۶۵ء میں کشمیر کو بہانہ بنا کر بھارتی فوجوں نے چوروں کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں بھارت نے چاروں

طرف سے پاکستان پر حملہ کیا تھا اور درحقیقت پہلی مرتبہ پاکستانوں کا جذبہ قومیت پوری طرح ابھر کر سامنے آیا۔ نہ

صرف افواج پاکستان بلکہ پاکستانی عوام نے بھی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ ہر شخص اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا۔ بھارتی

طیاروں کی شیلنگ اور بمباری سے بے نیاز بچے بھی پاکستانی پرچم لہراتے ہوئے سڑکوں پر کرش انڈیا کے نعرے لگاتے

پھر رہے تھے۔ بھارتی حکمرانوں کو پہلی مرتبہ پاکستان کی قوت کا اندازہ ہوا۔ بھارتی فوجی دھوئیاں اور جوتے تک چھوڑ کر

بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس جنگ میں بھارتیوں کو لگنے والے زخم اتنے گہرے تھے کہ وہ عرصہ تک نہ سنبھل سکے۔

اس عبرت ناک شکست کا بدلہ لینے کے لئے بھارت اندر ہی اندر ایک اور بڑی جنگ کی تیاری کرنا رہا۔ بھارتی

حکمران سمجھ گئے تھے کہ پاکستان پر کوئی بھی براہ راست حملہ کامیاب نہیں ہوگا۔ اس مرتبہ انہوں نے جنگ کی حکمت

عملی بھی تبدیل کر لی۔ پاکستان کے اندر سازشوں کے جال پھیلانے جانے لگے۔ مسلمانوں میں میر جعفر اور میر صادق

جیسے سازشی اور غدار تو ہر دور میں رہے ہیں۔ بھارتیوں کو بھی پاکستان میں چند میر صادق اور میر جعفر مل گئے تھے۔

شرقی پاکستان سے انہوں نے شیخ مجیب الرحمن جیسے لوگوں کو اٹھایا۔

تمام سازشی ہتھیاروں سے لیس ہونے کے بعد اے میں بھارت نے پھر پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستان کے اندر سازشی عناصر بھارتیوں کے ساتھ تھے۔ ان کی وجہ سے اس مرتبہ بھارت کو اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ پاکستان دو لخت ہو گیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ مگر بھارتیوں کے کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑی۔ وہ پاکستان کا نام و نشان تک مٹانے پر تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے سندھ کی سرزمین کا انتخاب کیا تھا۔

دوسری طرف طاقت کے بل بوتے پر بھارت نے کشمیر کے ایک بڑے حصے پر قبضہ جمارکھا تھا۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہ بھارت کے تسلط سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں اور اس کے بعد بھی اقوام متحدہ نے کئی مرتبہ یہ قرارداد پاس کی تھی کہ بھارت کشمیر میں ریفرنڈم کرائے جس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ کشمیری بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بھارت نے کبھی بھی اقوام متحدہ کی قراردادوں کا احترام نہیں کیا اس کے برعکس وہ کشمیر میں اپنی فوجی قوت بڑھاتا چلا گیا۔

کشمیری مسلمان بھارتی حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ وہ اپنی ہی سرزمین پر غلاموں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ غاصب بھارتی تسلط سے آزادی کی انگنگ نے ان کے جذبے کو ابھارا اور پورے مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی لہر پھیلی چلی گئی۔ پوری وادی آزادی کے نعروں سے گونجنے لگی۔ پاکستان کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی حمایت اور اخلاقی مدد کر رہا تھا۔ بھارتی حکمران تو بیشہ ہی سے موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو کشمیریوں کی حمایت کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا اور سندھ میں گڑبڑ شروع کر دی۔

بھارت نے راجستھان میں دہشت گردی کے تربیت کیمپ قائم کر دیئے۔ انہیں سندھ کے شہری علاقوں خصوصاً ”کراچی سے ایسے بے ضمیر اور ایمان فروش تلاش کرنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی جو دولت کے حصول کے لئے اپنے ہی وطن کے خلاف سب کچھ کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کو بھارتی کیمپوں میں تربیت دے کر واپس بھیجا جا رہا تھا۔ سندھ کی سرحدوں پر آباد ہندوؤں کی اکثریت بھارت کی ان سازشوں میں شریک تھی۔ وہ بھارتی ایجنٹوں کو ہر قسم کی سولتیں فراہم کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے خاندان کے افراد کا ہر کر کے پاکستانی شناختی کارڈ بھی بنا کر دے رہے تھے تاکہ ان کی قومیت پر شبہ نہ کیا جاسکے۔

نانکہ دلاور کو کراچی میں دہشت گردی کی ان وارداتوں کا پس منظر سمجھاتے ہوئے بتا رہی تھی کہ مقبوضہ کشمیر میں جب بھی مسلمانوں کی آزادی کی لہر زور پکڑتی ہے بھارت کراچی میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیتا ہے۔ اس کے تربیت یافتہ دہشت گرد اچانک ہی سڑکوں پر آکر بموں کے دھماکے اور گولیوں کی بارش شروع کر دیتے ہیں۔ معصوم اور بے گناہ شہری خاک و خون میں لوٹنے لگتے ہیں۔ ان دہشت گردوں نے عبادت گاہوں کو بھی نہیں بخشا۔ مساجد اور امام باڑوں میں گھس کر عبادت الہی میں مشغول نمازیوں کو گولیوں سے چھلکی کر کے انہیں خون میں نہلا دیا جاتا ہے۔

”ممکن ہے میں راجستھان سے واپس آنے کے بعد رحیم یار خان پہنچ جاتی۔“ نانکہ کہہ رہی تھی۔ ”لیکن جب ہم نے کراچی کی صورت حال دیکھی تو کچھ عرصہ یہیں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم کچھ ایسے لوگوں کے نام پتوں سے واقف ہیں جنہوں نے بھارتی کیمپ میں دہشت گردی اور خزیب کاری کی تربیت حاصل کی تھی اور اب کراچی میں دہشت گردی کی وارداتوں میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کچھ کو تو ہم نے پکڑ کر قانون کے حوالے کر دیا ہے اور کچھ ابھی باقی ہیں۔ ہم ان کے خلاف بھی کارروائی کے لئے موقع کی تلاش میں ہیں۔“

”اپنے شہر کب واپس چلیں گی؟“ دلاور نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”یہ بھی میرا شہر ہے جو زخموں سے چور ہے۔“ نانکہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک کم از کم ان دہشت گردوں کو ٹھکانے نہ لگادیا جائے جن کے بارے میں ہم جانتی ہیں۔ ہاں تم اگر واپس جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”آپ نے عجیب بات کہہ دی نانکہ بی بی۔“ دلاور نے کہا۔ ”آپ کی تلاش میں تو میں نجانے کہاں کہاں گیا

ہوں۔ اور اب آپ ملی ہیں تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کو ان حالات میں چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ اور پھر یہ ملک تو میرا بھی وطن ہے میں نے بھی اسی مٹی میں جنم لیا ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی بتایا ہے پہلے میں اس سے ناواقف تھا۔ ان بڑھ جو ہوا۔ لیکن وطن کی محبت تو میرے دل میں تھی۔ اب آپ سے یہ سب کچھ سننے کے بعد کیا میں یہ شر چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ اگر جسم کا کوئی حصہ زخمی ہو تو اس کا علاج کیا جاتا ہے اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ میں کراچی کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ کے ساتھ رہ کر دہشت گردوں کا مقابلہ کروں گا خواہ اس کے لئے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ نائلہ کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ آگئی۔

”دلاور! تم ان بڑھ ہو؟“ سلطانہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”جی سلطانہ بی بی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”میرے والد اسکول میں استاد تھے۔ وہ مجھے بھی پڑھانا چاہتے تھے

لیکن میں چار پانچ جماعتوں سے زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ شوق ہی نہیں تھا۔ اب بچھڑتا ہوں۔“

”لیکن تم باتیں تو بہت اچھی کر لیتے ہو۔“ سلطانہ نے کہا۔

”یہ سب کچھ میں نے انہی سے سیکھا ہے جی۔“ دلاور نے نائلہ کی طرف اشارہ کیا۔

”داناؤں نے ٹھیک ہی کہا ہے جی کہ علم و حکمت والوں کی محبت میں بیٹھ کر آدمی کچھ نہ کچھ سیکھ ہی جاتا ہے۔“

”تم تو واقعی کمال کے آدمی ہو۔“ سلطانہ نے کہا۔ اسی لمحہ گیٹ کے سامنے ایک موٹر سائیکل رکنے کی آواز سنائی

دی۔ سلطانہ کرسی چھوڑ کر اٹھ گئی۔ ”دودھ والا آیا ہے۔“ دودھ لے کر آؤں تو تم سے باتیں کرتی ہوں۔“

وہ کچن سے برتن لے کر دودھ لینے چلی گئی۔

”تمہارا یہ دوست۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟“ نائلہ نے دلاور کی طرف دیکھا۔

”بکی۔“ دلاور نے کہا۔ ”پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے بی اے کیا ہے۔ جنگ کا رہنے والا ہے۔“

”میرا مطلب ہے کہ بکی کس قسم کا آدمی ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”یاروں کا یار ہے جی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”وہ اگرچہ شیردرانی سے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے

لئے یہاں تک آیا ہے لیکن وہ اس مشن میں ہمارا ساتھ ضرور دے گا۔ انکار نہیں کرے گا۔ وہ رہا شیردرانی کا معاملہ۔“

تو اس کی تلاش بھی جاری رکھی جائے گی۔ وہ مل گیا تو اس سے بھی منٹ ہی لیا جائے گا۔“

”بکی سے بات کر لیتا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اگر وہ بھی ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائے تو ہماری اچھی خاصی طاقت

بہن جائے گی۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں پھر بھی میں بات کروں گا لیکن۔“

”لیکن کیا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دہشت گردوں سے نمٹنے کے لئے اسلحہ کی ضرورت ہوگی۔“ دلاور بولا۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہمارے پاس چند آٹومٹک رائفیں ہیں۔ ایمونیشن کا مزید بندوبست

کر لیا جائے گا۔“

اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لان میں دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ گلی میں بھی لوگوں کی تھوڑی بہت آمدورفت

شروع ہو چکی تھی۔

”ارے ہاں۔ مجھے یاد آگیا۔“ نائلہ دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پھلوں کے اس بیوپاری کا نام رسول

بخش ہے۔ تم دن چڑھنے پر عبدالقدوس کو ساتھ لے کر بنری منڈی چلے جانا شاید اس سے شیردرانی کے بارے میں

کچھ معلوم ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ دلاور نے کہا، پھر لان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پودے سوکھ رہے ہیں شاید بہت دنوں سے

پانی نہیں دیا گیا۔

”موقع ہی نہیں ملتا حالانکہ پائپ بھی لا کر رکھا ہوا ہے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”آج ان کی پیاس بجھائی دی جائے۔“ دلاور کہتے ہوئے اٹھ کر لان میں آگیا۔ پودوں کے پتے مرچائے ہوئے تھے اور گھاس زرد ہو رہی تھی۔ لان میں ایک طرف بہت بڑا پائپ بھی رول کیا ہوا پڑا تھا۔ دلاور نے پائپ کا ایک سرا اٹھالیا اور نکلے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اسے نکلا بھی نظر آگیا اس نے پائپ کھول کر ایک سرا نکلے میں پھنسایا اور دوسرا سرا اٹھا کر پودوں کو پانی دینے لگا۔ نائلہ برآمدے میں بیٹھی دلچسپ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نوبتے ان سب نے ناشتہ کر لیا اور دس بجے کے قریب دلاور اور بکی، عبدالقدوس کے ساتھ سبزی منڈی کے لئے روانہ ہو گئے۔

سبزی منڈی میں رسول بخش نامی بیوپاری کی دوکان تلاش کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ ایک ادیمز عمر آدمی تھا۔ وہ ان سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔

”ہم دراصل ایک آدمی کے بارے میں آپ سے کچھ معلوم کرنے آئے ہیں۔ شاید آپ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکیں۔“ دلاور نے کہا۔

”اگر مجھے کچھ معلوم ہوا تو ضرور بتاؤں گا۔ کون ہے وہ؟“ رسول بخش بولا۔

”اس کا نام شبیر درانی ہے۔ رحیم یار خان کا زمیندار ہے۔ اس کے باغات بھی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے آپ کا اس سے کچھ کاروبار بھی رہا ہے۔“ دلاور نے کہا۔

”میں بالکل سمجھ گیا۔“ رسول بخش نے کہا۔ ”لیکن عرصہ سے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ صرف دو سال تک ان کا کاروبار رہا پھر وہ کسی اور بیوپاری کو اپنے باغ ٹھیکے پر دینے لگے۔“

”وہ آج کل کراچی آیا ہوا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”ہمارا بہت اچھا دوست ہے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ آپ کے بارے میں ہمیں معلوم تھا اس لئے سوچا کہ شاید وہ آپ سے ملا ہو اور ہمیں آپ سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے۔“

”میرے پاس تو ابھی تک نہیں آیا۔ اگر آگیا تو کیا بتاؤں؟“ رسول بخش نے پوچھا۔

”اسے کچھ بتانا نہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”اس کا پتہ معلوم کرنا ہے۔ ہم اچانک اس کے گھر پہنچ کر اسے حیران کر دینا چاہتے ہیں۔ بہت پرانا دوست ہے ہمارا۔“

”سمجھ گیا... سمجھ گیا...“ رسول بخش نے کہا۔ ”اپنا فون نمبر دے جاؤ۔ اگر وہ آگیا تو میں پتہ معلوم کر کے فون کر دوں گا۔“

”ہمارے پاس تو ٹیلی فون ہی نہیں ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”آپ اپنا نمبر دے دیں ہم وقتاً فوقتاً فون کر کے معلوم کرتے رہیں گے لیکن اسے بالکل پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ اس کے کوئی دوست اسے تلاش کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ رسول بخش نے کہا اور اپنا دوکان کا ایک کارڈ دلاور کی طرف دے کر فرمایا۔ ”یہ رکھ لو۔ اس پر فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ میں شام سات بجے تک یہاں ہوتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم ایک دو دن بعد فون کر کے معلوم کر لیں گے۔“ دلاور نے کارڈ جیب میں رکھ لیا اور رسول بخش کا شکریہ ادا کر کے وہ تینوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔

وہ سبزی منڈی سے نکل کر سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ سڑک کے کنارے پھلوں کی جی ہوئی ایک دوکان کے سامنے سفید ٹوبوٹا کار میں شبیر درانی کو اترتے دیکھ کر دلاور اور بکی اچھل پڑے۔ شبیر درانی اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بھاری موٹوں والا ایک اور آدمی بھی تھا۔ بکی نے آگے بڑھنا چاہا مگر دلاور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ایک ٹھیکے کے بجھے چلا گیا۔

”اس وقت اس کے سامنے آنا مناسب نہیں ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”وہ رسول بخش کے پاس جا رہا ہے۔ ہمیں اس کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ ویسے ہم عبدالقدوس کو یہاں چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اس کا پیچھا کر کے ٹھکانہ معلوم کر لے گا۔“

”آپ لوگ فکر مت کریں۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”آپ دونوں اس بس پر بیٹھ جائیں۔“ اس نے سامنے ہی رکنے والی محل کوچ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کوچ آپ کو ڈسکو بیکری کے سامنے آنا دے گی۔ وہاں سے گھر پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔“

وہ دونوں کوچ میں بیٹھ گئے۔ دلاور کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ نالکہ کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ پہلی ہی کوشش میں کامیابی نے ان کے قدم چومے تھے۔



اس روز شیردرانی، نالکہ والی ٹیکسی کا تعاقب جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ نالکہ کی ٹیکسی شاہراہ عراق سے ہوتی ہوئی محبوب مارکیٹ کے قریب عبداللہ ہارون روڈ پر مڑ گئی تھی۔ ٹیکسی اور شیردرانی کی گاڑی کے درمیان دو اور گاڑیاں حاصل تھیں۔ نالکہ والی ٹیکسی نے جیسے ہی ریفل چوک پار کیا ٹریفک سگنل کی سبز روشنی زرد روشنی میں تبدیل ہو گئی۔ شیردرانی سے آگے والی گاڑی کا ڈرائیور شاید کچھ زیادہ ہی قانون پسند تھا۔ اس نے روشنی زرد ہوتے ہی گاڑی روک لی۔ شیردرانی کی گاڑی کے ڈرائیور نے اپنی گاڑی کو ذرا سا ٹھکرا کر آگے ٹھکانا چاہا تھا لیکن اس دوران دائیں بائیں سے آنے والا ٹریفک چوراہے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ شیردرانی والی گاڑی پھنس کر رہ گئی۔ ڈرائیور کو مجبوراً گاڑی پیچھے ہٹانا پڑی تھی۔

شیردرانی ٹھکرا کر رہ گیا۔ اس نے زور سے سیٹ کی پشت کو گھونسن مارا۔ ڈرائیور اگر کوئی ملازم ہوتا تو شیردرانی کا یہ گھونسن شاید اس کی گردن پر پڑتا لیکن وہ شیرملاح کا کزن تھا۔ شیردرانی خون کے گھونٹ پی کر رہ جانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکا تھا اور جب ٹریفک سگنل کھلا تو نالکہ والی ٹیکسی غائب ہو چکی تھی۔

”نکل مٹی حرامزادی۔“ شیردرانی بڑبڑایا۔

”غصہ کیوں کرتے ہو؟“ اٹلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شیرملاح نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ چھوکیاں کوئی جنت کی حوریں تو نہیں تھیں جن کے نکل جانے پر تمہیں افسوس ہو رہا ہے۔ ارے تم حکم کرو۔ ایسی بیسیوں چھوکیاں اٹھا کر لے آئیں گے۔ گھبراتے کیوں ہو۔۔۔“

”اس جیسی چھوکی کیس نہیں مل سکتی۔“ شیردرانی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ۔۔۔ یہ وہی تھی۔۔۔“

”نکون تمھی بابا، کھل کر بات کرو۔۔۔“ شیرملاح نے کہا۔

”وہی۔۔۔ جس کی وجہ سے آج مجھے دردِ دل ٹھوکریں کھانے پڑی ہیں۔“ درانی نے کہا۔

”اچھا اچھا، وہی جس کی جائیداد پر تم قبضے کے خواب دیکھ رہے ہو۔“ شیرملاح نے کہا۔ ”مگر تم نے تو بولا تھا کہ وہ چھوکی مرچیں ہے۔ وہ زندہ کیسے ہو گئی؟“

”اس بات پر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔ ”کاچیلو کے پولیس آفیسر نے مجھے لکھ کر دیا تھا کہ وہ قحط کے صحرائیں جھٹک کر مر چکی ہے۔ مگر اسے زندہ دیکھ کر میں خود حیران ہو رہا ہوں۔“

”اس پولیس آفیسر نے تم سے مذاق کیا ہوگا۔“ شیرملاح نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”یہ پولیس والے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ اگر چاہیں تو سامنے کھڑے ہوئے آدمی کو مردہ ثابت کر دیں اور چاہیں تو برسوں پہلے مرے ہوئے شخص کو زندہ ثابت کر دیں۔ انہوں نے تم سے بھی کوئی ایسا ہی مذاق کیا ہوگا۔ یا پھر ہو سکتا ہے وہ کوئی اور چھوکی ہو اور تمہیں دھوکہ ہوا ہو۔ ارے بابا۔۔۔ ملتی جلتی شکل کے بھی تو مت سے لوگ ہیں اس دنیا میں۔۔۔“

”نہیں۔“ شیردرانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں۔ میں بھیجیں سے اسے دیکھ آیا



ہوں۔ میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔“

”اب تو وہ چلی گئی۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”گردہ چھوڑی واقعی دی ہے جو تم سمجھ رہے ہو تو کراچی میں کہیں نہ کہیں اس سے آنا سامنا ہو ہی جائے گا۔“

”لیکن۔۔۔ اس کی زندگی میرے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اگر پولیس کے سامنے پیش ہو گئی تو میری ماں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”تم تو بڑے بزدل نکلتے۔“ بشیر ملاح نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر اسے گھورا۔ ”اگر خطروں کا اتنا ہی احساس ہو رہا ہے تو یہ کام شروع ہی کیوں کیا تھا۔ اس چھوڑی کے پیچھے کروڑوں کی جائیداد ہے اور کچھ حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ خطروں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”میں خطرات سے نہیں گھبراتا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”لیکن تم اس لڑکی کو نہیں جانتے“ قیامت ہے قیامت۔۔۔“

”اب اس قیامت کا قصہ ختم کرو۔“ بشیر ملاح کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی۔  
شبیر درانی خاموش ہو کر رہ گیا۔ ان کی گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی نارتھ ٹاؤن آباد میں اسی بنگلے میں آگئی جہاں سے وہ چلے تھے۔

”ارے او بھیرے۔“ بشیر ملاح کے کزن خانو نے گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہوتے ہوئے ملازم کو آواز دی۔  
”ارے بابا کوئی مانی شانی کا بندو بست کرو۔ بھوک لگ رہی ہے۔“

”جی سائیں“ آدمے کھٹنے میں آپ کو کھانا مل جائے گا۔“ بھیرے نے جواب دیا۔  
وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اس ڈرائنگ روم میں سستے قسم کا قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنچیز بھی معمولی سا تھا۔ بشیر ملاح نے کپڑے کی ایک پوٹلی میز پر رکھ کر کھول دی۔ اس میں ہزار اور پانچ سو والے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ یہ وہ رقم تھی جو زیورات فروخت کرنے سے حاصل ہوئی تھی۔

”یہ سو ادولاکھ کی رقم ہے۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”حالانکہ ان زیورات کی قیمت چھ سات لاکھ سے کم نہیں تھی۔ ارے خانو بھائی۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ کوئی اور بارانی تلاش کرو۔ یہ نیار تو اب بہت کم دام لگاتا ہے۔“  
”چوری اور ڈکیتیوں میں لوٹے ہوئے مال کے دام تو ایسے ہی لگیں گے۔“ خانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو ایسا مال خریدنا بھی سنگین جرم ہے۔ کوئی ایسا مال خریدنے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی خریدتا بھی ہے تو اسے اپنا رسک بھی دیکھنا ہے اگر بھی پکڑا گیا تو اگلی پچھل ساری کسر نکل جائے گی۔“  
”لیکن یہ تو بہت کم دام لگاتا ہے۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”لفٹی لفٹی تو ملنا چاہئے نا۔ آخر ہم بھی تو اپنی زندگیاں خطرے میں ڈالتے ہیں۔“

”اچھا بابا۔۔۔ دیکھوں گا۔“ خانو نے کہا۔

آج جو زیورات پیچھے گئے تھے ان میں وہ زیورات بھی شامل تھے جو شبیر درانی نے بشیر ملاح کو دیئے تھے۔ ان زیورات کے علاوہ ساٹھ ستر ہزار کی رقم الگ تھی جو اس کے حوالے کی گئی تھی۔

بشیر ملاح نے ہزار ہزار روپے کے پانچ نوٹ اس رقم میں سے نکال کر شبیر درانی کی طرف بوجھ دیئے۔  
”خرج وغیرہ کے لئے یہ رقم اپنے پاس رکھو۔“ وہ بولا۔ ”ابھی ہماری اور تمہاری دوستی کی ابتدا ہے۔ کوئی کام کر کے دکھاؤ تو تمہیں برابر کا حصہ ملا کرے گا۔“

شبیر درانی عجیب سی نگاہوں سے ان نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ حقیر سی رقم اسے اس طرح دی گئی تھی جیسے کتے کے سامنے بڑی ڈالی گئی ہو۔ اس کے دماغ میں سنسنی مٹ ہی ہوئے تھے۔ زیادہ برائی بات تو نہیں تھی۔ وہ اپنی عیاشیوں پر رقم پانی کی طرح بہایا کرتا تھا۔ اتنی معمولی معمولی رقمیں تو وہ اپنے گروگوں کو انعام میں دے دیا کرتا تھا اور آج ایک ڈاکو نڈا اسی کی لوٹی ہوئی رقم میں سے پانچ ہزار روپے دے کر اس پر بہت بڑا احسان کر رہا تھا۔

”ارے بابا“ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ بشیر ملاح نے اسے گھورا۔ ”اس رقم کا میں اکیلا ہی مالک تو نہیں، سارے ساتھیوں میں تقسیم کرنا ہے اسے اور پولیس کا حصہ بھی دینا ہے۔ مان چند والا دُذیرہ بھی اڑو ہے کی طرح منہ کھولے بیٹھا رہتا ہے۔ ان سب کو اگر حصہ نہ ملے تو ہم ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔“

”میں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔“ شبیر درانی نے مردہ سے لمبے میں جواب دیا۔

”بہت دولت ملے گی تمہیں۔ اپنی جاگیر کو بھول جاؤ گے۔“ بشیر ملاح نے کہا اور پھر خانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنا حصہ بعد میں لینا بابا“ ابھی مجھے رقم کی ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے بعد میں دے دیتا۔“ خانو نے جواب دیا۔

اسی دوران بھیرا کھانا لے کر آیا۔ ”بھئی ہوئی مرغی اور چپاٹیاں تھیں۔ وہ تینوں کھانا کھانے لگے۔ بھوک ہونے کے باوجود نوالہ بشیر درانی کے حلق سے چپچپ نہیں اتر رہا تھا۔ عجیب صورت حال سے دو چار تھادہ دوسروں پر حکم چلانے والا اور ہر شخص کو اپنے سے کم تر سمجھنے والا آج خود دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب دو آدمی اور آگئے۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ ایک نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور دوسرا شلوار قمیض میں تھا۔

”کون۔ کیسے آنا ہوا بابا؟“ خانو نے سوالیہ نگاہوں سے پینٹ شرٹ والے کی طرف دیکھا۔

”ایک اہم اطلاع ملی ہے۔“ بابر نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا پھر شبیر درانی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

”اپنا ہی آدمی ہے۔“ خانو اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ کر بولا۔ ”بولو۔ کیا اطلاع ہے؟“

”کل ہادی مل کے ملازموں کو تنخواہ بننے والی ہے۔“ بابر نے کہا۔ ”آج کشمیر کو ساڑھے سات لاکھ روپے کا چیک دے دیا گیا ہے۔ وہ صبح ٹھیک نو بجے چیک کیش کروانے کے لئے بینک پہنچ جائے گا۔“

”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہوں گے؟“ خانو نے پوچھا۔

”دو۔“ بابر نے جواب دیا۔ ”ایک ڈرائیور اور دو سرائمن مین۔“

”اور وہ بینک کہاں ہے جہاں سے چیک کیش ہو گا؟“ خانو نے ایک اور سوال کیا۔

”غنی چورنگی کے قریب۔“ بابر نے جواب دیا۔ ”مل سے اس بینک کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ میل کے لگ بھگ ہے۔ غنی چورنگی سے ذرا آگے جب مل والی سڑک پر گھومتے ہیں تو اس سڑک پر زیادہ رش نہیں ہوتا۔ فرار کے لئے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ خانو نے کہا۔ ”صبح تم اپنے وقت پر دفتر پہنچ جانا اور اس کو یہیں چھوڑ جاؤ یہ مل کی گاڑی اور

کھینچو کو بچھاتا ہے نا؟“

”بالکل بچھاتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ اسے کوئی نہیں جانتا۔“ بابر نے جواب دیا۔ پھر اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”محمد تم یہیں رہو۔ صبح ان کے ساتھ ہی نکلتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ محمد نے سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد بابر چلا گیا۔

”بشیر۔“ خانو بشیر ملاح کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ساتم نے بابر کیا بتا کر گیا ہے؟“

”ہاں سن لیا ہے۔ صبح چلیں گے۔ ساڑھے سات لاکھ روپے بڑی رقم ہوتی ہے۔ ہم اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں ہمارا یہ دوست بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔“ بشیر ملاح نے کہتے ہوئے شبیر درانی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں بھئی۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں کسی واردات میں شامل نہیں ہوں گا۔“

”کیسے شامل نہیں ہو گے سائیں؟“ بشیر ملاح نے اسے گھورا۔ ”ہمارے دوست بنے ہو تو ہمارے کاموں میں

شریک بھی ہونا پڑے گا۔“

”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں ایک شریف اور خاندانی آدمی ہوں۔ چوری اور دہشتی کی

وارداتیں نہیں کر سکتا۔

”ڈاڑھے۔“ بشیر ملاح نے اس کے چہرے پر نظرس جمادیں۔ بست شریف اور خاندانی ہو۔ اپنی پھوپھی زاد بہن کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے اسے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ تم جیسا بے غیرت تو میں نے نہیں دیکھا جو بہن کے سر سے دوپٹہ چھین لے۔ تم اپنے آپ کو خاندانی اور شریف کہتے ہو۔ کتنے آدمیوں کو مروا چکے ہو اب تک۔ سکھر میں کیا کر کے آئے تھے۔ کیا وہ ڈاکہ نہیں تھا۔ تم نے تو بتایا تھا کہ ایک آدمی کو قتل کیا تھا مگر میں نے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ میں جب کسی کو اپنے گروہ میں شامل کرتا ہوں تو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیتا ہوں۔ سکھر میں تم نے ایک ہندو سیٹھ کے گھر میں پناہ لی۔ تم نے اس کی جوان اور خوبصورت نوکرانی کو پہلے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور پھر اسے قتل کر کے بھاگ نکلے۔ بڑے جوان مرد ہو تم تو ریکس شیر! ہم ڈاکو ہیں، بڑے لوگ ہیں مگر ہم نے کسی عورت کی طرف کبھی میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ اور ایک تم ہو کہ اپنی پھوپھی زاد بہن کی عزت اور جان کے پیچھے بڑے ہوئے ہو۔ جو ان مردی کا وقت تو اب آیا ہے دیکھتے ہیں تم کتنے بہادر ہو۔ صبح تم ہمارے ساتھ چلو گے۔“

شیر درانی خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو رہا تھا۔ کسی کو آج تک اس کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ اور بشیر ملاح اسے بست کچھ کہہ گیا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب وہ ان ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ بشیر ملاح نے اس کے بارے میں بست کچھ معلوم کر لیا تھا۔ وہ اسے اپنے اشاروں پر نچانا چاہتا تھا اور شیر درانی اس کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور تھا۔

وہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکل گئے۔ روانگی سے پہلے انہوں نے نوپوٹا کی نمبر پلیٹیں تبدیل کر لی تھیں۔ سائینٹ کے علاقے میں پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ انہوں نے مل سے بینک تک کے راستے کا دو مرتبہ جائزہ لیا اور پھر بینک سے کچھ فاصلے پر مین روڈ کے کنارے ایک درخت کے نیچے گاڑی روک لی۔ نونج کرباچ منٹ پر سرخ رنگ کی ایک سوزوکی ہائی روف بینک کے سامنے آکر رکی۔

”یہ لڑکی گاڑی ہے۔“ ممو نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”وہ آدمی جو گاڑی سے اتر رہا ہے وہی مل کا کشیشو ہے۔“

”ٹھیک ہے، سب لوگ تیار رہو۔“ خانو نے کہا اور پھر سیٹوں کے نیچے سے کلا شکوفہ رانٹلیں نکال کر پیروں کے قریب رکھ لی گئیں۔

مل کا کشیشو ہائی روف سے اتر کر بینک میں داخل ہو چکا تھا۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ بینک سے باہر آیا تو اس نے کپڑے کا ایک ٹھیلہ اٹھا رکھا تھا۔ اس مرتبہ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آگیا تھا۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر گن مین ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ڈبل بیل بندوق تھی۔ جس سے گنا یا اس قسم کی کوئی جانور تو شکار کیا جاسکتا تھا مگر کلا شکوفہ رانٹلوں کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

سوزوکی ہائی روف جیسے ہی چورنگی عبور کر کے ایک سائینڈ روڈ پر مڑی خانو بھی اپنی گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ چورنگی پار کرتے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔ ہائی روف مل کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ چکی تھی۔

”تیار!“ خانو نے کار اس سڑک پر موڑتے ہی کہا۔

انہوں نے پیروں کے قریب بڑی ہوئی رانٹلیں اٹھالیں۔ یہ سڑک بالکل سیدھی چلی گئی تھی۔ اکا دکا ٹرکوں کی آمدورفت جاری تھی۔ خانو نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی اور پھر بڑی پھرتی سے اسے سوزوکی ہائی روف کے سامنے لے آیا۔

سوزوکی کے ڈرائیور کو بریک لگا دینا پڑا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا کشیشو اور گن مین چونک گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ سکتے نضا فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھی۔

ہائی روف کے سامنے کار رکتے ہی شیر درانی، بشیر ملاح اور ممو بڑی پھرتی سے نیچے اتر آئے۔ خانو اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا رہا تھا۔ ممو نے اترتے ہی کلا شکوفہ کا ایک ہوائی برست مارا تھا۔ بشیر ملاح اور شیر درانی ہائی روف کی

طرف لپکے۔ وہ جیسے ہی دروازے کے سامنے پہنچ گمن مین نے اپنی بندوق کا ٹرانسنگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ کھڑکی کا شیشہ پھٹا چور ہو گیا۔ شبیر درانی بال بال بچا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کلا شکوف کا ٹرانسنگر دبا دیا۔ گمن مین کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس کا جسم چھٹکی ہو گیا اور وہ سیٹ سے نیچے لڑھک گیا۔ اس کا خون سوزوکی کے فرش پر بہنے لگا تھا۔

”یہ تھیلا ہمارے حوالے کر دو۔“ بشیر ملاح نے کشیمو پر کلا شکوف تانتے ہوئے کہا۔  
 ”نہیں۔۔۔ تم یہ تھیلا مجھ سے نہیں لے سکتے۔“ کشیمو چیخا۔ اس نے رقم سے بھرا ہوا تھیلا اپنے سینے سے لپٹا لیا تھا۔

بشیر ملاح نے اس کے سر کا نشانہ لے کر کلا شکوف کا ٹرانسنگر دبا دیا۔ کشیمو کی کھوپڑی کے پر فچے اڑ گئے۔ بیچر چاروں طرف بکھر گیا۔ اسی دوران سوزوکی کا ڈرائیور اتر کر چچتا ہوا ایک طرف دوڑا لیکن وہ چند قدم سے زیادہ دور نہیں جاسکا تھا۔ ممدو کی رانٹل سے نکلی ہوئی گولیوں نے اسے چھٹکی کر دیا تھا۔  
 ٹھیک اسی لمحہ چورنگی کی طرف سے پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ بشیر ملاح نے رقم والا تھیلا اٹھایا اور چچتا ہوا کار کی طرف دوڑا۔ شبیر درانی نے بھی چھلانگ لگا دی۔ وہ کار میں ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ خانو نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

ٹھیک اسی لمحہ پچھلے موڑ سے پولیس کی ایک موبائل اس طرف گھومتی ہوئی نظر آئی۔ موبائل میں کڑے ہوئے پولیس والے نے فائر کھول دیا۔ شبیر درانی اور ممدو دونوں طرف کھڑکیوں سے رانٹلیں نکال کر پولیس موبائل پر جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ موبائل کی رفتار کم ہو گئی لیکن فائرنگ جاری رہی۔

خانو نے کار ایک اور سڑک پر موڑ دی۔ یہ تمام علاقہ فیکٹریوں اور بڑے بڑے کارخانوں ہی پر مشتمل تھا۔ جو لوگ سڑک پر تھے وہ فائرنگ کی آوازیں سن کر اپنی اپنی جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔  
 کار مختلف ذیلی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی مین روڈ پر نکل آئی۔ پولیس موبائل بھی اس کے تعاقب میں تھی۔ خانو اپنی کار کو چورنگی سے نکال لے گیا لیکن پولیس موبائل ایک ٹرک راستے میں آ جانے کی وجہ سے رک گئی۔  
 خانو بڑا مہر ڈرائیور ثابت ہوا تھا۔ وہ بڑی طوفانی رفتار سے کار کو چلاتا ہوا بڑا بوڑھی کی طرف نکل آیا۔ پولیس موبائل اب بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ خانو کار کو فست روڈ پر لے آیا اور پھر وہاں سے وہ لیبیل چوک کی طرف مڑ گئے۔

”اپنے اڈے پر پہنچنے کی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا خانو۔“ بشیر ملاح نے کہا۔  
 ”ڈرائیور پر پورے شہر کی موبائلز کو سفید ٹوپوٹا کے بارے میں اطلاع دے دی گئی ہوگی۔ اس لئے اپنے علاقے کی طرف جانے کے بجائے جبار کے گھر کی طرف موڑ لو۔“

”ایسا ہی کرتا پڑے گا۔“ خانو نے جواب دیا۔

تین بیٹی کے موڑے خانو گاڑی کو سیدھا نکال لے گیا اور پھر کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی کو پی آئی بی کالونی کی طرف موڑ دیا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ پی آئی بی کالونی کے ایک مکان کے سامنے موجود تھے۔ بشیر ملاح نے نیچے اتر کر کال بیل بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھولا تھا۔

”گیٹ کھولو بابا۔۔۔ جلدی کرو۔“ بشیر ملاح نے کہا۔

اس آدمی نے فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔ خانو گاڑی کو اندر لے گیا۔ گیٹ فوراً بند کر دیا گیا۔

”جبار کہاں ہے؟“ بشیر ملاح نے گیٹ کھولنے والے سے پوچھا۔

”اندروں رہا ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

بشیر ملاح نے کار میں سے رقم کا تھیلا اور اپنی رانٹل نکال لی۔ شبیر درانی اور دوسرے ساتھی بھی اتر آئے۔ وہ سب ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ آدمی ایک اور کمرے میں چلا گیا تھا۔ چند ہی منٹ بعد ایک اور آدمی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی آنکھیں سرخ، چہرہ ستا ہوا اور بال بکھرے

ہوئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے سوتے میں سے جگایا گیا تھا۔ وہ جبار تھا۔

”تم لوگ کیسے آگئے؟“ جبار نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”مردہ راتھیں دیکھ کر ہلک گیا۔“

”ہاں، کچھ رقم ہاتھ لگنے کا چانس تھا۔ سوچا کیوں نہ چانس سے فائدہ اٹھایا جائے۔“ بشیر صلاح نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کس جگہ؟“ جبار نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سائیٹ میں۔“ بشیر صلاح نے جواب دیا۔ ”تین بندے مارے گئے ہیں۔ پولیس ہمارے پیچھے لگ تو مئی تھی لیکن ہم انہیں دھوکا دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔“

”یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ جبار نے پوچھا۔

”دیکھا بھی ہو گا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہم تمہارے رشتہ دار ہیں اور اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔“ اس مرتبہ خانو نے جواب دیا تھا۔ ”اب تم ہمیں جلدی سے ناشتہ کراؤ۔ ہم نے تو ابھی تک چائے بھی نہیں پی ہے۔“

جبار نے ادھیڑ عمر آدمی کو بلا کر سب کے لئے ناشتہ تیار کرنے کو کہا اور پھر شبیر درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ کون ہے؟“

”اپنا دوست ہے۔“ بشیر صلاح نے جواب دیا۔ ”مذاقت بھلا پور کے ایک علاقے کا بہت بڑا رئیس ہے۔ بڑی زمینیں ہیں اس کی لیکن اس کا ستارہ آج کل گردش میں ہے۔ پولیس اسے کئی لوگوں کے قتل کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے پھانچنا چاہتی تھی یہ پتاہ لینے کے لئے ہمارے پاس آگیا ہے۔ بہت دیر آدمی ہے۔ آج اس کا انداز دیکھا ہے ہم نے۔ اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔“

جبار چند لمحے شبیر درانی کی طرف دیکھتا رہا پھر غلطی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ بیٹھو۔ میں نمالوں۔ اسے میں ناشتہ بھی تیار ہو جائے گا۔“

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ خانو اور بشیر صلاح ابھی میں باتیں کرنے لگے اور شبیر درانی خاموش بیٹھا آج کے اس واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ایک معزز زمیندار سے بلاخر ڈاکو بن گیا تھا اور اس کے ہاتھوں ایک ہندو بھی مارا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس نے ان کا سراغ لگایا تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس قتل اور ڈکیتی کی بہت سی اور وارداتیں بھی اسی کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کرے۔

جبار ایک سرکاری محکمہ میں ملازم تھا اور خانو اور بشیر صلاح کا رشتہ دار بھی تھا۔ وہ اگرچہ خود کبھی ان کے ساتھ کسی واردات میں شریک نہیں ہوا تھا لیکن انہیں اکثر اپنے ہاں پناہ دیا کرتا تھا۔ محلے کے لوگوں سے اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ وہ اسے بہت شریف آدمی سمجھتے تھے۔ خانو وغیرہ کے بارے میں اس نے یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اس کے رشتہ دار ہیں جو ملنے کے لئے کبھی کبھار آجاتے ہیں۔ محلے والے یہ جانتے تھے کہ جبار بدین کے ایک بہت بڑے وڈیرے کا بھتیجا ہے۔ اس کے پوی بچے بھی بدین ہی میں رہتے تھے۔ یہاں بھی کبھاری آیا کرتے تھے۔

ناشتے کے بعد بشیر صلاح نے رقم والا ٹھیکہ کھول لیا اور رقم گننے لگا۔ پورے ساٹھ لاکھ پچاس ہزار روپے تھے۔ کچھ اس کے بارے میں اس نے ابھی کہہ دیے تھے جس نے انہیں اطلاع فراہم کی تھی۔ تیس ہزار جبار کو دے دیے اور باقی بڑا روپے اس کے ملازم کو۔ باقی رقم اس نے تین حصوں میں تقسیم کر دی۔ ہر ایک حصے میں دوا لاکھ ایکس ہزار سے کچھ اوپر رقم آئی تھی۔ خانو کا حصہ تو بشیر صلاح نے اس کے حوالے کر دیا اور پھر شبیر درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”رکھیں شبیر۔ تمہاری یہ رقم میرے پاس امانت ہے۔ کچھ دن بعد میں تمہیں دے دوں گا۔“

شبیردرانی تھلا کر ہی تو رہ گیا۔ وہ کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش بیٹھا رہ گیا۔ ویسے وہ سمجھ گیا تھا کہ بشیر ملاح اسے یہ رقم نہیں دینے کا۔ شبیردرانی پر اس کی گرفت کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ پنجاب پولیس کو تو وہ مختلف کمپنیز میں مطلوب تھا ہی اب کراچی میں یقینی اور قتل کی ایک واردات کرنے کے بعد وہ اس شر اور صوبے کی پولیس کے لئے بھی من چاہا بن گیا تھا۔ مگر ابھی اس کا نام سامنے نہیں آیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر خانو اور بشیر ملاح کے ساتھ اس کا نام بھی سامنے آجائے گا۔

انہوں نے وہ دن جبار کے مکان پر ہی گزارا اور پھر ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ پہلے خانو نکلا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد ممدو رخصت ہوا اور مزید آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد بشیر ملاح اور شبیردرانی اس مکان سے باہر نکلے۔ سفید ٹیوٹا انہوں نے جبار کے مکان پر ہی چھوڑ دی تھی۔ پورے شہر کی پولیس کو یقیناً "سفید ٹیوٹا کی تلاش رہی ہوگی اور وہ کم از کم دو تین دن یہ کار استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ مکان سے باہر نکلے ہوئے شبیردرانی نے دیکھا تھا کہ کار پر کور ڈال دیا گیا تھا تاکہ گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے کوئی اس طرف جھانکے بھی تو کار کو نہ دیکھ سکے۔

وہ رات شبیردرانی نے بڑے کرب و اذیت میں گزار دی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ عجیب قسم کے حالات میں پھنس گیا تھا۔ ایک معزز خاندان کا فرد۔ کوڑھتی زمیندار۔ ایک ڈاکو بن گیا تھا اور ڈاکو بھی ایسا جو دوسروں کے رحم و کرم پر تھا اور خالی ہاتھ تھا۔ وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ بڑی زمینیں تھیں۔ پورے ضلع کے لوگ جب تک کہ اسے سلام کرتے تھے۔ بڑی عزت تھی اس کے گھرانے کی۔ لیکن جب اس نے آنکھوں پر ہوس کی ٹہنی باندھی تو سب کچھ ختم ہوتا چلا گیا۔ خاندانی عزت و وقار مٹی میں ملنے لگا۔ جو لوگ اس کے سامنے آنکھیں جھکائے کھڑے رہتے تھے اب انکس ملاکرات کرنے لگے۔ ان کے ایک اشارے پر آگ میں کود پڑنے والے ان سے دور ہٹنے لگے۔ اس نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر اپنی بھوپھی زاد بہن نالکہ درانی کے خلاف سازشوں کے جو جال پھیلانا شروع کئے تھے وہ رفتہ رفتہ لوگوں کی نظروں میں بھی آنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد پتہ چل گیا کہ وہ مکار اور دھوکے باز ہے اور اپنی بھوپھی زاد بہن کو مہوا کر اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ذلت و رسوائی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنے ہی پھیلائے ہوئے جالوں میں چپھنے لگا۔ اسے جب پولیس نے ہسپتال میں حراست میں لیا تھا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ اب نہیں بچے گا۔ لیکن پھر دلاور اور بکی نے اسے ہسپتال سے اغواء کر لیا۔ دلاور اور بکی کی عدم موجودگی میں وہ ان کے ایک ساتھی کو قتل کر کے بھاگ نکلا۔

فرار ہوتے وقت اس نے یہی سوچا تھا کہ کچھ عرصہ روپوش رہ کر بعض لوگوں کو بچ میں ڈال کر معاملے کو رفع دفع کرانے کی کوشش کرے گا۔ وہ پتہ عاقل الیاس کے پاس آگیا۔ الیاس کے بڑے بڑے فوجی افسروں سے تعلقات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ الیاس سے کہہ کر ان فوجی افسروں سے پولیس پر دباؤ ڈالا کر اپنے خلاف معاملے کو ختم کروا دے گا۔ الیاس سے اس کی تین چار کوڑ روپے کی پارٹنرشپ کی بات ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ الیاس انکار نہیں کرے گا لیکن الیاس اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگالیا تھا اور شبیردرانی کو چند گھنٹوں سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھنے دیا تھا اور سکھر روانہ کر دیا تھا۔ سیٹھ وشوانتھ اس کا دوست تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ

بعد میں وشوانتھ کو فون کر دے گا کہ وہ بھی کوئی عذر بنا کر ایک آدھ روز میں اسے چلا کر دے۔ شبیردرانی سکھر پہنچا تو سیٹھ وشوانتھ شکار پور گیا ہوا تھا۔ اس کی جوان اور حسین گھریلے ملازمہ کو دیکھ کر شبیر درانی کے اندر کا حیوان جاگ اٹھا۔ اس نے معصوم لڑکی کی عزت کو اپنے گندے وجود سے روند ڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ عزت لٹ جانے کے بعد لڑکی اپنی زبان بند رکھے گی۔ رسوائی کے خوف سے وہ اپنے ہونٹوں پر خاموشی کے تالے لگالے گی۔ لیکن اس نے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے شبیردرانی پر چھری سے حملہ کیا تو شبیردرانی کے ہاتھوں خود موت کے گھاٹ اتر گئی۔ شبیردرانی گھر میں موجود نقدی اور زیورات لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس کا خیال تھا

کہ اسے کراچی میں پناہ مل جائے گی لیکن راستے میں وہ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا۔ ڈاکوؤں کے سردار بشیر ملاح کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے شبیر درانی نے اپنے آپ کو مفروز بتایا اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ وہ وقتی طور پر پناہ حاصل کرنے کے لئے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد موقع ملے ہی وہاں سے بھی بھاگ نکلے گا۔ مگر بشیر ملاح ایسا بے وقوف بھی نہیں تھا۔ اس نے شبیر درانی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لیں اور اب شبیر درانی اس کا آلہ کار بن گیا تھا۔ وہ بھی ان ڈاکوؤں کی فہرست میں شامل تھا جنہیں پورے شہر کی پولیس چیک کر رہی تھی۔

شبیر درانی نے اب تک جو کچھ بھی کیا تھا اپنی کزن نائلہ درانی کی دولت ہتھیانے کے لئے کیا تھا۔ وہ نائلہ کی تعاقب میں قمر کے آخری گاؤں تک گیا تھا اور جب اس گاؤں کے پولیس آفیسر نے یہ یقین دہانی کروادی کہ نائلہ صحرا میں بھٹک کر مر چکی ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سہا تھا۔ اس نے پولیس آفیسر سے نائلہ کی موت کی تصدیق کی تحریر بھی حاصل کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے نائلہ درانی کی جائیداد پر قبضہ کرنے سے نہیں روک سکتی۔ لیکن جب وہ رجم یا رخاں والپس پہنچا تو حالات بدل چکے تھے۔ بلکہ بازی پلٹ چکی تھی۔ نائلہ کی جائیداد پر قبضے کا خواب پورا نہ ہو سکا اور اسے اپنا بھی سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اور اب وہ ان بے رحم ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر تھا جن کے نزدیک انسانی زندگی کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ وہ صرف دولت کی پوجا کرنا جانتے تھے۔ لیکن شبیر درانی حیران تھا کہ نائلہ زندہ کیسے بچ گئی تھی۔ کاچیلو کے پولیس آفیسر نے تو بڑے یقین سے کہا تھا کہ وہ ریگستان میں بھوک اور پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکی ہے اسی یقین کی بناء پر اس نے شبیر درانی کو وہ تحریر بھی دے دی تھی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ نائلہ درانی اگر ریگستان میں مرنے سے بچ گئی تھی تو اب تک کہاں رہی تھی۔ ان دنوں تو ریگستان کے چاروں طرف بستیوں میں کئی روز تک اسے تلاش کیا جاتا رہا تھا مگر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ہر شخص نے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔

وہ اتنے روز کہاں رہی؟ شبیر درانی نے اسے جس طرح صحت مند اور تندرست دیکھا تھا اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا تھا کہ اس دوران اسے کوئی پریشانی نہیں رہی۔ اس نے یہ عرصہ بڑے آرام اور سکون سے گزارا تھا۔ اور اب وہ کراچی میں تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور بھی حسین لڑکی تھی۔ شبیر درانی نے سنا تھا کہ جب نائلہ صوبہ خان کی قید سے فرار ہوئی تھی تو اس کے ساتھ سسی نامی ایک سندھی لڑکی بھی تھی جسے صوبہ خان نے نائلہ کے ساتھ اس گوتھ سے اٹھایا تھا جہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ سسی نامی وہی لڑکی ہو۔ وہ دونوں غالباً شاہپنگ کر کے ایک پہلی ٹیکسی میں بیٹھی تھیں۔ ان کے لباس اور چروں کی مازکی سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بڑی آسائش کے دن گزار رہی ہیں۔ شبیر درانی کو افسوس تو اس بات کا تھا کہ اس شام اس پہلی ٹیکسی کا تعاقب جاری نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ورنہ پتہ چلا لیا جاتا کہ نائلہ کہاں رہی ہے۔

رات گزرتی رہی اور شبیر درانی کبھی اپنے حالات کے بارے میں اور کبھی نائلہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ نائلہ کراچی میں تھی اور اسے نائلہ کو ہر صورت میں تلاش کرنا تھا لیکن ان ڈاکوؤں سے نجات حاصل کرنا تھی جنہوں نے اسے اپنا آلہ کار بنالیا تھا۔ شبیر درانی کو یقین تھا کہ اگر اس نے ان لوگوں سے نجات حاصل نہ کی تو وہ زندگی بھر اسے اپنا آلہ کار بنائے رکھیں گے اور وہ شخص ایک ڈاکو بن کر رہ جائے گا۔ ایک مرتبہ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے بھاگ نکلے لیکن اس نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ جب تک کسی اور ٹھکانے کا بندوبست نہ ہو جائے وہ یہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ کراچی کے حالات اس کے سامنے تھے۔ دہشت گردوں نے پورے شہر کو پر غمال بنا رکھا تھا۔ پولیس دہشت گردوں کے خلاف تو کچھ نہیں کر رہی تھی البتہ خانہ پری کے لئے بے گناہوں کو پکڑ پکڑ کر تھانوں کے حوالات بھرے جا رہے تھے۔ پولیس راہ چلتے کسی بھی آدمی کو پکڑ لیتی اور اگر وہ شخص پولیس کے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ دے پاتا تو اسے مشکوک قرار دے کر پکڑ لیا جاتا۔ شبیر درانی کسی ہوٹل

میں ٹھہرا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ہوٹلوں میں بھی یہی مسئلہ تھا۔ اس نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ موقع ملتے ہی ان کے چگل سے نکل جائے گا۔

دو تین روز گزر گئے۔ اس دوران وہ زیادہ تر گھر پر ہی محدود رہے تھے۔ وہ شہر کی صورت حال پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اخبار کا مطالعہ وہ باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ ان دو تین دنوں کے دوران شہر میں ڈیمپتی کی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ کئی چیکوں میں ڈاکے پڑے تھے۔ جوہریوں کی کئی دوکانیں لوٹ لی گئی تھیں۔ کئی گھروں میں بھی ڈاکے پڑے تھے۔ ان وارداتوں میں ڈاکو لاکھوں کا مال لے اڑے تھے اور دو آدمی بھی ڈاکوؤں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔

ان خبروں سے شبیردرانی نے اندازہ لگایا تھا کہ برہنہ واردات کے بعد پولیس پرانی واردات کو بحال جاتی تھی۔ دہشت گردی کی وارداتوں نے بھی پولیس کو مصروف کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شہر میں ڈاکوؤں اور چور اچلوں کی بھی بن آئی تھی اور وہ بڑی آزادی سے شہر بھر میں وارداتیں کرتے پھر رہے تھے۔ شبیردرانی کے خیال میں پولیس اس سفید ٹوپوٹا کو بحال بھی تھی اور انہیں تازہ ترین وارداتوں میں استعمال ہونے والی گاڑیوں کی تلاش تھی۔

چوتھے دن خانو صبح سویرے پی آئی بی کالونی سے گاڑی لے آیا اور جعلی نمبر پلیٹیں اتار کر اصلی نمبر پلیٹیں لگا دیں۔ خانو نے بتایا کہ آج پولیس کو کسی سرخ شیراؤ کی تلاش تھی جس میں سوار دہشت گردوں نے ڈرگ کالونی میں فائرنگ کر کے خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔

ٹانٹے کے بعد شبیردرانی کو تیار ہوتے دیکھ کر بشیرملاح نے پوچھا۔

”کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے سائیں؟“

”سبزی منڈی کا ایک بیوپاری جانے والا ہے۔ کئی سال پہلے اس سے میرے کچھ کاروباری تعلقات تھے۔ سوچ

رہا ہوں کہ آج اس سے ملاقات کر آؤں۔“ شبیردرانی نے جواب دیا۔

”چلو۔ میں بھی چلتا ہوں۔“ بشیرملاح نے کہا۔ ”یہاں توقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس شہر سے تو اپنا وہ جھگل ہی اچھا

ہے۔ آزادی سے ہر طرف گھوم پھرتے توکتے ہیں۔“

”شاید تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں اس لئے ساتھ جانا چاہتے ہو۔“ شبیردرانی بولا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ بشیرملاح نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بھی تو گھر میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں

بار۔ تھوڑا گھوم پھر آؤں گا۔ تم سبزی منڈی میں جس سے ملنا چاہتے ہو میں وہاں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ باہر

میں روڈ پر ہی کھڑا رہوں گا۔ تم اپنے دوست سے مل آنا۔ پھر ہم کہیں اور چلیں گے، کلفٹن چلیں گے۔ تمہیں سمندر

کا لہارہ کراؤں گا۔“

”ایسی دھوپ میں سمندر کی سیر۔“ شبیردرانی نے اسے گھورا لیکن بہر حال وہ بشیرملاح کو روکنے میں کامیاب نہیں

ہو سکا تھا۔

وہ دونوں سفید ٹوپوٹا پر ہی گھر سے نکلے تھے۔ تقریباً ”پونے گیارہ بجے وہ سبزی منڈی پہنچ گئے۔ شبیردرانی کار سے

اُترا تو بشیرملاح بھی اس کے ساتھ ہی اتر آیا۔

”تم جاؤ۔ اپنے دوست سے مل آؤ۔ میں یہاں کچھ پھل وغیرہ دیکھ لیتا ہوں۔“ بشیرملاح نے کہا۔

وہ دونوں اکٹھے ہی آگے بڑھے تھے۔ بشیرملاح تو ایک جگہ رک گیا اور شبیردرانی آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ اس

حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس کے بدترین دشمن دلاور نے اسے دیکھ لیا تھا۔

شبیردرانی اُدھر اُدھر دھڑکتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اسے شبہ تھا کہ بشیرملاح چھپ کر اس کی گھرائی کر رہا تھا۔ لیکن

اس کا یہ خیال غلط تھا۔ بشیرملاح وہیں رک گیا تھا۔ شبیردرانی پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

وہ غلام انداز میں اُدھر اُدھر دھڑکتا ہوا رسول بخش کی دوکان پر پہنچ گیا۔ رسول بخش بڑی مگر جوشی سے اس سے ملا تھا۔

”درانی صاحب! اگر برائے نامیں تو ایک بات پوچھوں۔“ رسول بخش نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ شبیردرانی بولا۔



”آپ کا پولیس کے ساتھ کوئی جھگڑا تو نہیں چل رہا؟“ رسول بخش نے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر کیا۔

شیردرانی کا چہرہ خنجر ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

”کیوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”تھوڑی دیر پہلے میں آدی تمہارے بارے میں پوچھنے آئے تھے۔“ رسول بخش نے کہا۔ ”ان میں ایک تو لونڈا سا تھا۔ بے ترتیب چھوٹی داڑھی تھی اس کی۔ چار بال تھوڑی پر، چار ادھر، چار ادھر۔ لیکن باقی دونوں اونچے لمبے آدی تھے۔ مجھے تو وہ پولیس والے لگ رہے تھے۔“

”کیا کہہ رہے تھے۔ وہ تمہارے پاس کیوں آئے تھے؟“ شیردرانی بولا۔

”تمہارا پتہ پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ تمہارے پرانے دوست ہیں۔“

”ان کے حلقے بتا سکتے ہو؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

رسول بخش چند لمبے خاموش رہا اور پھر دلاور اور بکی کے حلقے بتائے لگا۔ شیردرانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دلاور اور بکی ہی تھے۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”وہ واقعی میرے پرانے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک آدی کے کان میں سونے کی بالی تھی؟“

”ہاں ہاں۔“ رسول بخش بولا۔ ”بالکل وہی۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔“ شیردرانی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”مجھے یہاں آئے ہوئے چند روز ہوئے ہیں اور پانچ چھ مہینے رہنے کا ارادہ ہے۔ اگر میرے لئے کرائے کے کسی مکان کا بندوبست کر سکتے تو۔“

”مکان کا بندوبست ہو جائے گا مگر دو تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔ اپنا پتہ بتادو، جیسے ہی کوئی بندوبست ہوا تمہیں اطلاع دے دوں گا۔“ رسول بخش نے کہا۔

شیردرانی چند لمبے سوچتا رہا پھر اس نے خانووالے مکان کا فون نمبر بتادیا۔

”اگر میں اس نمبر پر موجود بھی نہ ہوں تو پیغام دے دینا۔ میں تم سے رابطہ کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ دو تین دن میں مکان کا بندوبست ہو جائے تو تمہیں فوراً اطلاع کر دوں گا۔“ رسول بخش نے کہا۔

شیردرانی اس سے ہاتھ ملا کر واپس آیا۔ اس کا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ رسول بخش نے جو حلقے بتائے تھے اس سے اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ دلاور اور بکی ہی تھے۔ لیکن وہ کراچی پہنچ کر اتنی جلدی رسول بخش تک کیسے پہنچ گئے تھے؟ دلاور یا بکی کو کیسے پتہ چلا کہ اس سے شیر کے کبھی کسی قسم کے کاروباری تعلقات تھے۔

دلھنتا ایک اور خیال شیردرانی کے ذہن میں ابھرا۔ کیا دلاور اور نالکہ کراچی میں ایک دوسرے سے مل چکے ہیں یا ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر ہیں؟ اگر وہ لوگ مل چکے ہیں تو یہ اس کے خلاف ایک نہایت خطرناک ٹیم بن جائے گی۔ نالکہ درانی اور دلاور کے اتحاد نے اب تک اسے ناکوں پہنے چوائے تھے۔ نالکہ اکیلی بھی اس کے لئے خطرناک ثابت ہوئی تھی۔ دلاور اس سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہ دونوں اگر ایک بار پھر مل گئے تو اس کے لئے قیامت بن جائیں گے۔ ستم یہ کہ بکی بھی دلاور کے ساتھ تھا۔ ان دونوں کے ساتھ رسول بخش کی دوکان پر آنے والا تیسرا کون ہو سکتا تھا؟ رسول بخش کے کہنے کے مطابق وہ لڑکا سا تھا جس کی داڑھی بھی شاید پوری طرح نہیں آئی تھی۔ چہرے پر کہیں کہیں بال تھے۔ اس کے بارے میں شیردرانی کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ گاڑی کے قریب پہنچا تو بشیر ملاح گاڑی سے نیک لگائے کھڑا تھا۔ بھلی سیٹ پر پھلوں سے بھرے ہوئے تین چار تھیلے رکھے ہوئے تھے۔ شیردرانی کار کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے، تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو؟“ بشیر ملاح نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ مگر چلو، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ شیردرانی نے کہا۔  
 ”مگر؟“ بشرملاح نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ارے بابا۔۔۔ سندھ پر چلتے ہیں۔ ہوا لگے گی تو  
 لپٹ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”نہیں۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں مگر چلو۔“ شیردرانی کہتے ہوئے پنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھے ہی لگا  
 لاکہ پیچھے بس اسٹاپ کے قریب ٹھہرنے کے ساتھ گلی کھڑی ایک پہلی ٹیکسی دیکھ کر چونک گیا۔ چونکے والی بات  
 اصل وہ متحی سانوجوان تھا جو ٹیکسی اور ٹھہرنے کے درمیان کھڑا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔  
 اس نوجوان نے جینز کی چٹون اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی داڑھی تھی۔  
 لوڑی پر چند بال، چند دائیں کلمے پر اور چند بائیں کلمے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس نوجوان نے استرے کو ابھی تک  
 اپنے چہرے سے متعارف نہیں کرایا تھا۔

شیردرانی کار میں بیٹھے بیٹھے رک گیا اور مری نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رسول بخش کے بتائے ہوئے محلے  
 کے مطابق شیردرانی نے اس نوجوان کو پہچان لیا تھا۔ اس کے خیال میں دلاور اور کبی کو بھی کہیں آس پاس ہی ہونا  
 چاہئے تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔  
 بشرملاح اوپر سے گھوم کر ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ شیردرانی بھی سیٹ پر بیٹھ گیا اور  
 دروازہ بند کر دیا۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ بشرملاح نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اچانک تمہاری طبیعت خراب کیوں  
 ہو گئی ہے۔ تمہارے اس دوست نے تو کچھ نہیں کہہ دیا۔“  
 ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔ ”میں سبزی منڈی میں اس قدر بدبو، بلکہ تعفن پھیلا  
 ہوا ہے کہ میرا دماغ گھوم گیا ہے۔ پیٹ میں درد ہونے لگا ہے۔“  
 ”بڑے نازک مزاج ہو۔“ بشرملاح بولا۔ ”ہمارے دھندے میں نازک مزاجی نہیں چلتی۔ دل کو سخت کرنا پڑتا  
 ہے۔“

گاڑی حسن اسکوڑے سے سیدھی کھل گئی تھی۔ شیردرانی بار بار سامنے لگے ہوئے سائڈ مرر میں دیکھ رہا تھا۔ اس  
 پہلی ٹیکسی کو اس نے سبزی منڈی سے ہی اپنے تعاقب میں روانہ ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اب بھی وہ ان کے پیچھے  
 تھی۔

گاڑی نیا چورنگی سے بائیں طرف راشد منہاس روڈ پر مڑ گئی۔ اس نے سراب کو ٹھہر دالا چورنگی بھی پیچھے  
 ہموڑ دیا۔ شیردرانی بار بار سائڈ مرر میں دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلی ٹیکسی بدستور ان کے تعاقب میں تھی۔  
 ”نامن چورنگی سے گاڑی مین روڈ کے بجائے سروس روڈ پر موڑنا۔“ شیردرانی نے بشرملاح کی طرف دیکھتے  
 ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ بشرملاح نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ہمارے پیچھے ایک پہلی ٹیکسی آ رہی ہے۔ مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ٹیکسی سبزی منڈی سے ہمارے  
 تعاقب میں لگی تھی۔ اس میں مجھول سا ایک نوجوان بیٹھا ہوا ہے مجھے شبہ ہے وہ پولیس کا ایجنٹ نہ ہو۔ میں ٹھکانے پر  
 پہنچنے سے پہلے ہی اسے گرفت میں لینا چاہتا ہوں۔“  
 ”حیرت ہے! میں نے اس ٹیکسی پر توجہ نہیں دی۔“ بشرملاح نے سامنے لگے ہوئے آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے  
 کہا۔

”حالا کہہ تمہیں ان باتوں کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔“ شیردرانی بولا۔  
 گاڑی نامن چورنگی کے ساتھ ہی مین روڈ کی بجائے سروس روڈ پر مڑ گئی۔ ذرا آگے ایک بہت بڑا شاپنگ سینٹر تھا  
 جو دریاں پڑا تھا۔ شیردرانی نے اس پہلی ٹیکسی کو بھی اس سروس روڈ پر مڑتے دیکھا تھا۔ وہ متحی حسن چورنگی کے قریب

ہنچ رہے تھے۔

”وہ ٹیکسی اب قریب ہنچ رہی ہے۔ گاڑی اس طرح روک لو کہ اس کے آگے نکلنے کا راستہ نہ رہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“ بشیر صلاح نے پوچھا۔

”دیکھ لینا جو کچھ کون گا اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔“ شبیر درانی نے کہا۔

بشیر صلاح نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھا اور گاڑی سڑک کے وسط میں آڑی ترچھی کر کے روک لی۔ پہلی ٹیکسی قریب آگئی تھی۔ آگے نکلنے کا راستہ نہ پا کر ڈرائیور نے ٹیکسی روک لی۔ شبیر درانی اپنی گاڑی سے اتر کر تیز قدم اٹھاتا ہوا پہلی ٹیکسی کے قریب ہنچ گیا اور بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھے ہوئے نوجوان کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

”کک۔۔۔ کون ہو تم اور اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟“ وہ نوجوان بوکھلا گیا۔ وہ عبد القدوس تھا۔

شبیر درانی نے بڑی پھرتی سے اس کی چٹلون کی جیبوں کو تھپتھپایا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا۔ اس وقت قریب سے ایک موٹر سائیکل سوار گزر رہا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ شاید شبیر درانی کو سی آئی اے آدمی سمجھا تھا جس نے پہلی ٹیکسی رکوا کر اس نوجوان کو باہر کھینچا تھا۔ سادہ لباس پولیس والے اور سی آئی اے والے یہی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ شبیر درانی نے عبد القدوس کو پھر بازو سے پکڑ لیا اور ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم اس چورنگی سے بائیں طرف مڑ کر کے بغیر چلے جاؤ اور۔۔۔“

”لیکن جناب میرا کیا ہے۔۔۔ اسی روپے سے زیادہ بن۔۔۔“

”ابے جاتے ہو یا دوں کرایہ۔“ شبیر درانی غرایا۔

ٹیکسی ڈرائیور بھی اسے سی آئی اے کا آدمی ہی سمجھا تھا۔ وہ چپکے سے ٹیکسی اشارت کرنے لگا۔ بشیر صلاح نے گاڑی سائیڈ میں کر لی تھی۔ ٹیکسی چند گز آگے بائیں طرف مڑ گئی۔ شبیر درانی، عبد القدوس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا ہوا کار کے قریب گیا اور پچھلا دروازہ کھول کر پہلے اسے اندر ٹھونسا پھر خود بھی اندر بیٹھ گیا۔ سیٹ پر پڑے ہوئے پھلوں کے تھیلے سیٹ سے نیچے گر گئے تھے۔ بشیر صلاح نے فوراً ہی کار آگے بڑھا دی۔

”تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح پکڑ کر کیوں لے جا رہے ہو؟“ عبد القدوس بولا۔

”ہمادیس گے نہیں۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں نے سبزی منڈی سے تمہیں تعاقب شروع کرتے دیکھ لیا تھا۔“

”میں نے تمہارا تعاقب نہیں کیا۔ میں تو شرکی سیر کر رہا تھا۔“ عبد القدوس نے کہا۔

”سیر کر رہے تھے۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”ہم تمہیں شہر تو کیا، اگلی دنیا کی بھی سیر کروادیں گے۔“

گاڑی جاک این کے سامنے ہنچ چکی تھی۔ بشیر صلاح نے گاڑی ایک مینج ہال کے قریب سے ایک گلی میں مڑا دی اور پھر دو تین گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد ایک جنگلے میں داخل ہو کر رک گئی۔ شبیر درانی نے عبد القدوس کو پکڑ لیا اور بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔

”بھیرے!“ اس نے ملازم کو آواز دے کر بلا لیا۔ ”رسی لے کر آؤ اور اسے اس کرسی سے باندھ دو۔ اور اگر وہ چیخنے چلانے کی کوشش کرے تو اس کی زبان کاٹ دینا۔“

اسی دوران بشیر صلاح بھی کمرے میں آگیا۔

”یہ چھو کر اکن ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے شبیر درانی کی طرف دیکھا۔

”رجیم یار خان سے میرے دو خطرناک دشمن کراچی پہنچ گئے ہیں۔“ شبیر درانی نے جواب دیا۔ ”وہ دونوں اور لڑکا ہم سے کچھ دیر پہلے سبزی منڈی میں میرے اسی دوست کے پاس میرے بارے میں پوچھنے گئے تھے۔ واپسی پر میں نے اسے ایک ٹیکسی کے قریب کھڑے دیکھ لیا۔ دوست کے بتائے ہوئے محلے سے میں نے اسے پہچان لیا کہ اگلی

دونوں کا ساتھی ہے اور جب اس نے ہمارا تعاقب شروع کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے۔“

”تم اس لئے تمہاری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔“ بشیر ملاح بولا۔

”یہ اگر اتفاق سے میری نظروں میں نہ آ جاتا تو ہمارا ٹھکانہ دیکھ کر واپس چلا جاتا اور اس کے وہ دونوں ساتھی رات کو ہم پر بلہ بول دیتے۔“

”دو آدمی ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟“ بشیر ملاح نے کہا۔

”تم انہیں نہیں جانتے۔“ شبیر درانی بولا۔ ”جو لوگ مجھے پولیس کی حراست سے نکال سکتے ہیں تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کتنے خطرناک ہوں گے۔ اگر وہ خود کوئی کارروائی نہ کریں تو پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع دے سکتے ہیں۔ لیکن اب ہم ان پر چھاپہ ماریں گے۔ ان کا پتہ یہ بتائے گا۔“

اور پھر شبیر درانی عبدالقدوس سے دلاور کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”بتاؤ وہ کہاں ہیں؟“ وہ اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے غرایا۔ ”اگر تم شرافت سے بتاؤ گے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ انعام بھی دیا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے شرافت سے زبان نہیں کھولی تو تمہارے گلے گلے کر دوں گا۔“

”تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا تمہیں ویسا ہی پایا ہے شبیر درانی۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”تم ایک نہایت گلیا اور کینے انسان ہو۔ دولت کی ہوس میں تم نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو انسانی بھیڑیوں کے حوالے کر دیا۔ بیسیوں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔“

شبیر درانی نے اس کے منہ پر ایک اور تھپڑ سید کر دیا۔

”تو دلاور نے تمہیں بت کچھ بتا دیا ہے۔“ وہ غرایا۔

”دلاور نے نہیں تمہاری کزن نائلہ درانی نے۔“

”نائلہ درانی۔“ شبیر درانی چونک گیا۔ ”تم اسے کیسے جانتے ہو۔ وہ تو۔۔۔“

”وہ تم سے انتقام لینے کے لئے زندہ ہے اور اسی شرم میں موجود ہے۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”تم اس کے انتقام سے نہیں بچ سکو گے۔ تم اس کے ہی نہیں قانون کے بھی مجرم ہو۔ نائلہ درانی عورت نہیں تم جیسے بے غیرتوں کے لئے ایک خوفناک طوفان بن چکی ہے۔ تم اس طوفان سے نہیں بچ سکو گے۔“

”اب تو تم میرے لئے اور بھی اہم بن چکے ہو۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں تم اپنی زبان کیسے بند رکھتے ہو۔ میں تم سے ان کا پتہ پوچھ کر ہی رہوں گا۔“

”یہ زبان اب صرف سچائی کے لئے کھلے گی۔“ عبدالقدوس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تم جیسے بے ایمان اور بے ضمیر لوگ کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

”ابے او مرغے۔“ شبیر درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تو دو چار ہاتھوں سے زیادہ ہدایت نہیں کر سکے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تکلیف اور اذیت سے بچنے کے لئے بتا دو کہ نائلہ اور دلاور کہاں ہیں۔ تم سے تو میرا کوئی جھگڑا نہیں بنا۔ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔“

”نہیں۔“ عبدالقدوس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتے۔“

”نائلہ سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔ کیا دیتی ہے وہ تمہیں جس کے لئے تم اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہو؟“

شبیر درانی نے کہا۔

”ہمارا رشتہ انسانیت کا رشتہ ہے۔ خلوص اور سچائی کا رشتہ ہے۔ اس سے مجھے بہن کا پیا ر ملا ہے۔ اس کے لئے میری جان بھی چلی جائے تو مجھے افسوس نہیں ہو گا۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”رہیں شبیر۔“ بشیر ملاح نے دو قدم اور آگے آتے ہوئے کہا۔ ”یہ چھو کر ایسے نہیں مانے گا۔ اسے میرے لئے کر دو۔ چند منٹ میں طوطے کی طرح نہ بولنے لگے تو میرا نام بدل دیتا۔“

بچ رہے تھے۔

”وہ ٹیکسی اب قریب پہنچ رہی ہے۔ گاڑی اس طرح روک لو کہ اس کے آگے نکلنے کا راستہ نہ رہے۔“ شیردرانی نے کہا۔

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“ بشیر ملاح نے پوچھا۔

”دیکھ لینا جو کچھ کروں گا اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔

بشیر ملاح نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھا اور گاڑی سڑک کے وسط میں آڑی ترچھی کر کے روک لی۔ ٹیکسی قریب آگئی تھی۔ آگے نکلنے کا راستہ نہ پا کر ڈرائیور نے ٹیکسی روک لی۔ شیردرانی اپنی گاڑی سے اتر کر تیز قدم اٹھاتا ہوا پبلی ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا اور بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ ہوئے نوجوان کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

”کک۔۔۔ کون ہو تم اور اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟“ وہ نوجوان بوکھلا گیا۔ وہ عبدالقدوس تھا۔

شیردرانی نے بڑی پھرتی سے اس کی پتلون کی جیبوں کو تھپتھپایا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا۔ اس وقت قریب سے ایک موٹر سائیکل سوار گزرا۔ وہ ان کی طرف دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ شاید شیردرانی کو سی آئی اے آدمی سمجھا تھا جس نے پہلی ٹیکسی روکا کہ اس نوجوان کو باہر کھینچا تھا۔ سادہ لباس پولیس والے اور سی آئی اے والے کی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ شیردرانی نے عبدالقدوس کو پھر بازو سے پکڑ لیا اور ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم اس چورنگی سے بائیں طرف مڑ کر کے بغیر چلے جاؤ اور۔۔۔“

”لیکن جناب میرا کرایہ۔۔۔ اسی روپے سے زیادہ بن۔۔۔“

”اے جاتے ہو یا دوں کرایہ۔“ شیردرانی غریبا۔

ٹیکسی ڈرائیور بھی اسے سی آئی اے کا آدمی ہی سمجھا تھا۔ وہ چپکے سے ٹیکسی اشارت کرنے لگا۔ بشیر ملاح نے گاڑی سائیڈ میں کر لی تھی۔ ٹیکسی چند گز آگے بائیں طرف مڑ گئی۔ شیردرانی، عبدالقدوس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا ہوا کار کے قریب آگیا اور پچھلا دروازہ کھول کر پہلے اسے اندر ٹھوسا پھر خود بھی اندر بیٹھ گیا۔ سیٹ پر پڑے ہوئے پھلوں کے تھیلے سیٹ سے نیچے گر گئے تھے۔ بشیر ملاح نے فوراً ہی کار آگے بڑھا دی۔

”تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح پکڑ کر کیوں لے جا رہے ہو؟“ عبدالقدوس بولا۔

”بتاؤ میں تمہیں۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”میں نے سبزی منڈی سے تمہیں تعاقب شروع کرتے دیکھ لیا تھا۔“

”میں نے تمہارا تعاقب نہیں کیا۔ میں تو شہر کی سیر کر رہا تھا۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”سیر کر رہے تھے۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”ہم تمہیں شہر تو کیا، اگلی دنیا کی بھی سیر کروا دیں گے۔“

گاڑی ہلاک این کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ بشیر ملاح نے گاڑی ایک میرج ہال کے قریب سے ایک گلی میں موڑ لی اور پھر دو تین گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد ایک بنگلے میں داخل ہو کر رک گئی۔ شیردرانی نے عبدالقدوس کو پہلے اتارا اور بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔

”بھیرے!“ اس نے ملازم کو آواز دے کر بلایا۔ ”رسی لے کر آؤ اور اسے اس کرسی سے باندھ دو۔ اور اگر ہر چننے چلانے کی کوشش کرے تو اس کی زبان کاٹ دیتا۔“

اسی دوران بشیر ملاح بھی کمرے میں آگیا۔

”یہ چھو کر اکون ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے شیردرانی کی طرف دیکھا۔

”رجیم یار خان سے میرے دو خطرناک دشمن کراچی پہنچ گئے ہیں۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔ ”وہ دونوں اور ہر لڑاکا ہم سے کچھ دیر پہلے سبزی منڈی میں میرے اسی دوست کے پاس میرے بارے میں پوچھنے گئے تھے۔ واپسی پر میں نے اسے ایک ٹیکسی کے قریب کھڑے دیکھ لیا۔ دوست کے بتائے ہوئے محلے سے میں نے اسے پہچان لیا کہ اگلی

دونوں کا ساتھی ہے اور جب اس نے ہمارا تعاقب شروع کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے۔  
 ”تو اس لئے تمہاری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔“ بشیر ملاح بولا۔  
 ”یہ اگر اتفاق سے میری نظروں میں نہ آ جاتا تو ہمارا ٹھکانہ دیکھ کر واپس چلا جاتا اور اس کے وہ دونوں ساتھی رات کو ہم پر حملہ بول دیتے۔“

”دو آدمی ہمارا کیا لگاڑ سکتے ہیں؟“ بشیر ملاح نے کہا۔  
 ”تم انہیں نہیں جانتے۔“ بشیر درانی بولا۔ ”جو لوگ مجھے پولیس کی حراست سے نکال سکتے ہیں تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کتنے خطرناک ہوں گے۔ اگر وہ خود کوئی کارروائی نہ کریں تو پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع دے سکتے ہیں۔ لیکن اب ہم ان پر چھاپہ ماریں گے۔ ان کا پتہ یہ بتائے گا۔“  
 اور پھر بشیر درانی، عبدالقدوس سے دلاور کے بارے میں پوچھنے لگا۔  
 ”بتاؤ وہ کہاں ہیں؟“ وہ اس کے منہ پر تھمڑا کرتے ہوئے غرایا۔ ”اگر تم شرافت سے بتا دو گے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ انعام بھی دیا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے شرافت سے زبان نہیں کھولی تو تمہارے گلڑے گلڑے کر دوں گا۔“

”تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا تمہیں ویسا ہی پایا ہے بشیر درانی۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”تم ایک نہایت گلیا اور کینے انسان ہو۔ دولت کی ہوس میں تم نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو انسانی مجیزوں کے حوالے کر دیا۔ بیسیوں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔“  
 بشیر درانی نے اس کے منہ پر ایک اور تھمڑا کر دیا۔  
 ”تو دلاور نے تمہیں بہت کچھ بتا دیا ہے۔“ وہ غرایا۔  
 ”دلاور نے نہیں تمہاری کزن نائلہ درانی نے۔“

”نائلہ درانی۔“ بشیر درانی چونک گیا۔ ”تم اسے کیسے جانتے ہو۔ وہ تو۔۔۔“  
 ”وہ تم سے انتقام لینے کے لئے زندہ ہے اور اسی شرم میں موجود ہے۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”تم اس کے انتقام سے نہیں بچ سکو گے۔ تم اس کے ہی نہیں قانون کے بھی مجرم ہو۔ نائلہ درانی عورت نہیں تم جیسے بے میرتوں کے لئے ایک خوفناک طوفان بن چکی ہے۔ تم اس طوفان سے نہیں بچ سکو گے۔“  
 ”اب تو تم میرے لئے اور بھی اہم بن چکے ہو۔“ بشیر درانی نے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں تم اپنی زبان کیسے بند رکھتے ہو۔ میں تم سے ان کا پتہ پوچھ کر ہی رہوں گا۔“

”یہ زبان اب صرف سچائی کے لئے کھلی۔“ عبدالقدوس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔  
 ”تم جیسے بے ایمان اور بے ضمیر لوگ کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔“  
 ”اے او مرغے۔“ بشیر درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تو دو چار ہاتھوں سے زیادہ ہدایت نہیں کر سکے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تکلیف اور اذیت سے بچنے کے لئے بتا دو کہ نائلہ اور دلاور کہاں ہیں۔ تم سے تو میرا کوئی جھگڑا نہیں بنا۔ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔“

”نہیں۔“ عبدالقدوس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتے۔“  
 ”نائلہ سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔ کیا دیتی ہے وہ تمہیں جس کے لئے تم اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہو؟“  
 بشیر درانی نے کہا۔

”ہمارا رشتہ انسانیت کا رشتہ ہے۔ خلوص اور سچائی کا رشتہ ہے۔ اس سے مجھے بہن کا پاپا ملا ہے۔ اس کے لئے میری جان بھی چلی جائے تو مجھے افسوس نہیں ہو گا۔“ عبدالقدوس نے کہا۔  
 ”نہیں شہیر۔“ بشیر ملاح نے دو قدم اور آگے آتے ہوئے کہا۔ ”یہ چھو کر ایسے نہیں مانے گا۔ اسے میرے اے کر دو۔ چند منٹ میں طوطے کی طرح نہ بولنے لگے تو میرا نام بدل دیتا۔“

”پہلے مجھے کوشش کر لینے دو۔ اگر میں کامیاب نہ ہو سکا تو پھر اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔“ شبیر درانی نے کہا اور ایک بار پھر عبدالقدوس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”میں آخری بار تم سے شرافت سے پوچھ رہا ہوں۔ اس کے بعد میری زبان نہیں ہاتھ حرکت میں آئیں گے۔“

”اگر تم میں شرافت ہوتی تو میں تمہاری بات مان لیتا۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔ ”مگر تم تو یہی ہے۔ غیرت۔ تمہارا خمیر مرد کا ہے۔ تم تو یہ جانتے ہی نہیں کہ شرافت ہوتی کیا ہے۔“

شبیر درانی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا دماغ سلگ اٹھا۔ اس نے عبدالقدوس پر تھپڑوں اور گھونسلوں کی بارش کر دی۔ عبدالقدوس مار کھاتا رہا مگر اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ شبیر درانی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر ماری۔ عبدالقدوس کے منہ سے آواز کی آواز نکلی اور وہ کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔

شبیر درانی محوم کر دوسری طرف اٹھیا اور عبدالقدوس کے سر پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ عبدالقدوس ہر ٹھوکر پر کرا، اٹھا مگر شبیر درانی کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ وہ زور زور سے چیخا اور اس سے رحم کی بھیک مانگتا۔

بھیرے نے آگے بڑھ کر کرسی سیدھی کر دی۔ عبدالقدوس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ شبیر درانی اب اس کے سینے پر گھونٹے برسا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درد نہی تھی۔ اس کے ہر گھونٹے پر عبدالقدوس کرا، اٹھا۔ اس کے منہ سے ابھی تک کوئی چیخ نہیں نکلی تھی۔ اس نے زبان سے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ شبیر

درانی نے میز پر بڑی ہوئی چھری اٹھالی۔ اس چھری سے کل رات وہ اسی کمرے میں بیٹھا سب کاٹ کر کھاتا رہا تھا۔

”اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا تاکہ یہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے۔“ وہ چھری ہاتھ میں لے کر عبدالقدوس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”زبان تو کیا۔۔۔ اگر تم میرے جسم کے ٹکڑے بھی کر دو تو میں تمہیں۔۔۔ کچھ نہیں بتاؤں گا۔۔۔!!!“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔ اس کے لبے میں ایک عزم تھا۔

شبیر درانی ایک قدم اور آگے آگیا۔ وہ چند لمبے عبدالقدوس کے چہرے پر نظریں جمائے رہا پھر اس نے جاکوئی نوک اس کی پیشانی پر رکھی اور ایک لمبا چرکا لگا دیا۔ اس مرجعہ عبدالقدوس کے منہ سے چیخ نکلی۔ پیشانی پر کھال

تقریباً ”دو انچ کے قریب کٹ گئی تھی جس سے رنے والا خون اس کی آنکھ اور چہرے کو بھی تر کرنے لگا۔ وہ سر کو ذرا زور سے جھٹکے دینے لگا۔

”رئیس شبیر!“ شبیر ملاح نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے چھری لے لی۔ ”چھو کر اُختر پر آگیا ہے۔ اس وقت کچھ نہیں بتائے گا۔ کچھ دیر کے لئے اسے چھوڑ دو۔ میں خود ہی معلوم کر لوں گا کہ یہ کون ہے اور اس کے ساتھی کہاں مل سکتے ہیں۔“

شبیر درانی غصے سے کانپ رہا تھا۔ دہلا پٹلا سا یہ لڑکا کس قدر سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو ہوسے دیر پہلے زبان کھول چکا ہوتا۔ لیکن یہ تو ناکہ اور دلاور سے بھی سخت جان ثابت ہوا تھا۔ ان دونوں نے بھی اسے

ناکوں پنے چوائے تھے اور اب کل کا یہ لوبڈ ابھی اس کے لئے لوہے کا چٹا ثابت ہو رہا تھا۔

”بھیرے۔۔۔“ شبیر ملاح نے ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چھو کرے کو پانی دانی پلاؤ اور اس کا خیال رکھنا۔“

رئیس شبیر تو اس سے کچھ نہیں معلوم کر سکا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس سے معلوم کروں گا۔ رئیس شبیر ’تم میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے آخری الفاظ شبیر درانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں آگئے۔ خانو اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ شبیر ملاح نے پھلوں کے ایک تھیلے میں سے کیونو میز پر لٹا دیئے ایک کیونو خود اٹھالیا اور دوسرا شبیر درانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”نہ۔ کیونو کھاؤ۔ دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ بہت گرم ہے۔ تم میں صبر اور برداشت کا مادہ نہیں ہے۔ اس گرم دماغی نے تمہارے کو اس حال میں پہنچایا ہے۔ اگر آدی ٹھنڈے دماغ سے سوچے اور اور عقل استعمال کرے تو کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں جو حل نہ ہو سکتا ہو۔ دماغ گرم رہے تو بتانا یا کام بھی بگڑ جاتا ہے۔“

شیردرانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کینو چھیلتا رہا۔ ویسے وہ بشیر ملاح کی بات پر بھی غور کر رہا تھا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جو چیز اسے پسند آجاتی تھی وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کر لیتا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ کوئی دوسرا راستہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی گرم دماغی نے اسے کسی دوسرے راستے کے بارے میں کبھی سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ بشیر ملاح کا یہ تجزیہ بالکل درست تھا کہ اس کی گرم دماغی نے ہی اسے اس مقام تک پہنچایا تھا۔ وہ ناکلہ اور اس کی جائیداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے بھی اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا۔ طاقت استعمال کی تھی۔ حالانکہ اگر وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا تو یہ مسئلہ بھی حل ہو سکتا تھا۔ اپنی روش تبدیل کر کے شرافت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے ناکلہ کو اپنی طرف مائل کر سکتا تھا۔ لیکن شرافت کا راستہ اختیار کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”یہ دو آدمی کون ہیں بابا اور اچانک کہاں سے نچک پڑے ہیں؟“

بشیر ملاح کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

”میرے پرانے دشمن ہیں۔“ شیردرانی نے کینو کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان میں ایک کا نام دلاور ہے۔ اسی کی وجہ سے میرے سارے کام بگڑے ہیں۔ ناکلہ اور اس کی جائیداد بھی اسی کی وجہ سے میرے ہاتھ سے نکلی۔ میرے خلاف کئی جھوٹے مقدمات ہوئے اور پولیس میرے پیچھے لگی۔“

”یہ دلاور ہے کون؟“ بشیر ملاح نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کوئی وڈیرہ، جاگیردار یا کوئی اور اونچی شے؟“

”وہ کچھ بھی نہیں ہے۔“ شیردرانی نے گھرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ایک بہت معمولی سا آدمی ہے۔ جھوٹے سے گاؤں کے ایک اسکول ماسٹر کا بیٹا، جس کے ماں باپ اس گاؤں کے زمیندار کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ وہ پیسے والا آدمی تھا۔ پولیس اس بات کو اپنی فحشی لیکن کچھ عرصہ بعد اس زمیندار اور اس کے ممانوں کو زندہ جلا دیا گیا اور اس کا پولیس انسپکٹر کو بھی جنگل میں ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی جس نے اس زمیندار سے پیسے لے کر اس کے بڑے پروردہ والا تھا۔ شبہ تھا کہ زمیندار اس کے ممانوں کو زندہ جلائے اور پولیس انسپکٹر کو پھانسی دینے میں اسی دلاور کا ہاتھ ہے۔ لیکن اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہو سکا۔ اسی علاقے کے ایک زمیندار رائے منصور نے اسے اپنے ہاں پناہ دے دی۔ رائے منصور کی پشت پناہی پر دلاور پھیلتا چلا گیا۔ ناکلہ بھی رائے منصور کی پناہ میں تھی۔ دلاور کو اس کا باڈی گارڈ مقرر کر دیا گیا۔ ناکلہ کے خلاف پولیس میں کئی مقدمات تھے۔ یہ دلاور اسے پولیس سے بچاتا رہا۔ مجھے یہ ہے کہ اس میں اور ناکلہ میں کسی قسم کے ناجائز تعلقات بھی تھے۔ خدا جانے ناکلہ اتنے غمخوار کہاں غائب رہی۔ اور اب یہ دونوں ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ان کا اتحاد میرے لئے خطرناک ہو سکتا ہے اور تمہارے لئے بھی۔“

”ہم تو اپنا بچاؤ کرنا جانتے ہیں۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”مسئلہ تمہارا ہے۔ لیکن ہم تمہیں اتنا نہیں جھوڑیں گے۔ ویسے تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ دلاور ہے جی دار آدمی۔ ایسے آدمیوں سے دودھ ہاتھ کرنے میں مزہ آتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس فاری مرغے سے کسی طرح اس کا پتہ معلوم کر کے آج ہی رات ان کے ٹھکانے پر ریڈ کر دیا جائے۔“ شیردرانی نے کہا۔

”پتہ ضرور معلوم کریں گے لیکن ہم چوروں کی طرح ان کے اڈے پر حملہ نہیں کریں گے۔ انہیں لٹکار کر مقابلہ کیا جائے گا۔ مزہ آجائے گا۔“ بشیر ملاح نے کہا۔

”اور اگر انہوں نے ہمارے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی تو؟“ شیردرانی ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں دعوے سے کہتا ہوں وہ ایسا نہیں کریں گے۔“ بشیر ملاح نے جواب دیا۔ ”ایسے لوگ، اپنی قوت بازو پر

لمحہ کرتے ہیں دوسروں کے سارے نہیں ڈھونڈتے۔“



”وہ دونوں بہت خطرناک ہیں، انہیں لکارنا۔۔۔“

”تم ڈرتے کیوں ہو؟“ بشیر ملاح نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اس لئے کہ مجھے اس حال تک پہنچانے والے وہی لوگ ہیں۔“ بشیر درانی نے جواب دیا۔

”اب وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دیکھ لیں گے کہ وہ لوگ کتنے خطرناک ہیں۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”اب تم معاملے کو میرے اوپر چھوڑ دو۔ میں نمٹ لوں گا۔ میں تمہاری مشکلیں آسان کر دوں گا۔“

بشیر درانی خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال آیا۔ بشیر ملاح تو ڈاکو تھا۔ وہ خود بھی دیکھ چکا تھا کہ بشیر ملاح اور اس کے ساتھی کتنے سفاک اور خطرناک آدمی ہیں۔ اس نے اس کی توہین بھی کی تھی۔ اسے بے غیرت اور بزدل کہا تھا۔ بشیر درانی اس سے اپنی اس بے عزتی کا بدلہ بھی لینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف ناکلہ اور دلاور تھے۔ کبھی بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ تینوں بھی اس کے بدترین دشمن تھے۔ ان کے بیچ میں وہ خود تھا۔ اگر یہ دونوں پارٹیاں آپس میں بھڑجائیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اگر دونوں طرف سے کوئی مارا بھی جائے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ وہ فائدے ہی میں رہے گا۔ خاتمہ اس کے دشمنوں ہی کا ہوگا۔

یہی سب کچھ سوچ کر بشیر درانی نے اطمینان کا سانس لیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد دوبارہ اسی کمرے میں آگئے جہاں عبدالقدوس کو کرسی سے باندھا ہوا تھا۔ اس مرتبہ بشیر درانی دور کھڑا رہا اور بشیر ملاح عبدالقدوس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد کمرے میں عبدالقدوس کی چیخیں گونجنے لگیں۔

\*\*\*\*\*

دلاور اور بکی ڈسکو بیکری کے سامنے گلی کوچ سے اتر گئے۔ وہاں سے انہیں جنگلے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس وقت ناکلہ گھر میں اکیلی تھی۔ سلطانہ سودا سلف لینے کے لئے باہر گئی ہوئی تھی۔

”بڑی جلدی واپس آگئے تم لوگ؟“ ناکلہ نے سوالیہ نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھا۔ ”کچھ پتہ چلا؟ اور یہ عبدالقدوس کہاں ہے؟“

”ایک وقت میں اتنے ہمارے سوالوں کا جواب تو نہیں دے سکتا۔“ دلاور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”باری باری جواب دوں گا۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس دوکان کی تلاش میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ رسول بخش سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مطلب کی بات کی اور واپس آگئے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ رسول بخش تو ابھی تک بشیر درانی کی کراچی موجودگی کے بارے میں لاعلم تھا۔ اس نے ہمیں اپنا فون نمبر دے دیا ہے کہ وقتاً فوقتاً ”معلوم کرتے رہیں“ بشیر درانی نے جیسے ہی اس سے رابطہ کیا قائم کیا وہ ہمیں بتا دے گا۔ لیکن جب ہم بڑی منڈی سے نکل رہے تھے تو بشیر درانی کو ایک کار سے اتر کر منڈی میں جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو صورت ہی سے ڈاکو یا بد معاش لگتا تھا۔“

”اس کے تعلقات اسی قسم کے لوگوں سے ہو سکتے ہیں۔“ ناکلہ نے کہا۔ ”بہر حال“ آگے کو۔“

”یہ بکی تو اسے وہیں دلوچتا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا۔ اس طرح گڑبڑ ہو جاتی۔ میں نے عبدالقدوس کو وہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ ان کا تعاقب کر کے ان کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے بعد ہم اس پر ہاتھ ڈالیں گے۔ ویسے یہ عبدالقدوس کیسا ہے؟“

”بڑے کام کا آدمی ہے۔“ ناکلہ نے جواب دیا۔ ”وہ سب کچھ معلوم کر لے گا اور بشیر درانی نے تم لوگوں کو دیکھا تو نہیں تھا؟“

”نہیں، ہم اسے دیکھتے ہی چھپ گئے تھے۔“ دلاور نے جواب دیا۔

اسی لمحہ دروازے کی کھنٹی بجی اور نالکہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

”میں تو جا رہا ہوں یا ر، تھوڑا ایٹ لوں۔“ مکی بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد نالکہ سلطانہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھری گوشت وغیرہ لے کر آئی تھی۔ اس نے تھیلے وہیں میز پر رکھ دیے اور گمرے گمرے سانس لینے لگی۔ گرمی سے اس کی بری حالت تھی، پینہ بہہ رہا تھا۔

”گرمی سے برا حال ہو رہا ہے۔ چند قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ اب تو گاڑی کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“ سلطانہ نے کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“ نالکہ بولی۔ ”آج اخبار میں ایک شیراؤ کا اشتہار چھپا ہے۔ پتہ بلاک سکس کا ہے۔ میرا خیال ہے کھانا کھانے کے بعد ہم وہ گاڑی دیکھ آئیں۔ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، چلے چلیں گے۔ تم لوگ بیٹھو۔ میں تو جا رہی ہوں کچن میں۔“ سلطانہ بھری گوشت کے تھیلے اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

”جب آپ صوبہ خان کی حویلی سے بھاگی تھیں تو سسی نام کی ایک لڑکی بھی آپ کے ساتھ تھی۔ وہ بھی آپ کے ساتھ لا پتہ ہو گئی تھی۔ آپ نے اس کا ذکر تو کیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے؟“ دلاور نے کہا۔

”وہ کراچی ہی میں ہے لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے ہم اب تک اس سے دور رہی ہیں۔ آج تم نے یاد دلایا ہے تو اس کی خیریت بھی معلوم کر لی جائے۔“ نالکہ نے کہتے ہوئے ٹیلی فون اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور ریسیور اٹھا کر

وڈیہ کریم بخش کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد کال ریسیور کر لی گئی۔ نالکہ کو مائی سکھن کی آواز پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”میں نالکہ درانی بول رہی ہوں اماں سکھن۔“ نالکہ نے کہا۔ ”کیسی ہو تم؟“

”ارے بٹی تم کہاں غائب ہو گئی ہو گمرے کے سب لوگ پریشان ہیں اور سسی کا تو برا حال ہے۔ ہر وقت تمہیں اور سلطانہ کو یاد کرتی ہے۔“

”اسے بلاؤ ذرا اور غزالہ کو بھی۔“ نالکہ نے کہا۔

”چھوٹی بی بی تو بڑے رئیس کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے۔ میں سسی کو بلاتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوگی تمہاری آواز سن کر۔“ مائی سکھن نے جواب دیا اور پھر سسی کو پکارنے لگی۔ نالکہ ریسیور پر اس کی آواز سن رہی تھی۔ کچھ

ہی دیر بعد سسی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”ارے ادی! کہاں ہو تم۔ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی ہو؟“

”تمہیں چھوڑ کر ہم کہیں نہیں گئیں۔ کراچی ہی میں ہیں۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ”کسی وجہ سے تم سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ تم کیسی ہو؟“

”بہت ادا اس ہوں ادی۔“ سسی نے جواب دیا۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ تم دونوں مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو اور وہ سلطانہ کہاں ہے؟“

”ہمیں پر ہے۔ ابھی تمہاری بات کرواتی ہوں۔“ نالکہ نے کہا اور سلطانہ کو آوازیں دینے لگی۔

”نعمہ سسی سے بات کرو۔“ سلطانہ کے آنے پر نالکہ نے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔

سلطانہ کچھ دیر باتیں کرتی رہی پھر اس نے ریسیور نالکہ کی طرف بڑھا دیا۔

”ہم ایک دو دن بعد آئیں گے سسی۔ رئیس کریم بخش اور غزالہ کو ہمارا سلام کہنا۔“ نالکہ نے کہا۔

”ایک بات بتاؤ ادی۔“ سسی نے پوچھا۔ ”اس روز طارق روڈ سے تم دونوں کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ چاٹ

والے نے بتایا تھا کہ اس نے تم دونوں کو ایک پاجرو میں بٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”لمبی داستان ہے سسی۔ ایک دو دن بعد ملاقات ہوگی تو تفصیل سے بتاؤں گی۔ اچھا اب خدا حافظ۔“ نالکہ نے

کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

سسی کی خیریت دریافت کر کے اسے اطمینان ہوا تھا۔ دوسرا ایک بچے انہوں نے کھانا کھایا اور پھر نالہ اور سلطانہ گاڑی کی بات کرنے کے لئے چلی گئیں۔ نالہ کے ایک ہاتھ میں بریف کیس تھا اور دوسرے میں وہ اخبار تھا جس میں گاڑی کے سلسلے میں اشتہار تھا۔

وہ بنگلہ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ نمبر تلاش کرتی ہوئی آسانی سے وہاں پہنچ گئیں۔ بہت بڑا بنگلہ تھا۔ پورچ میں آگے پیچھے تین گاڑیاں کھڑی تھیں ان میں سرخ رنگ کی شیراڈ بھی تھی۔ اس وقت دو آدمی اور بھی آئے ہوئے تھے جو گاڑی کے قریب کھڑے غالباً مالک ہی سے بات کر رہے تھے۔ اونچا لمبا وہ شخص بڑی پروکار شخصیت کا مالک تھا۔ نالہ اور سلطانہ بھی ان کے قریب رک گئیں اور گاڑی کو دیکھنے لگیں جس کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی۔ دوسری پارٹی چلی گئی۔ ان کی بات نہیں بن سکی تھی۔ نالہ نے بات شروع کر دی۔ وہ شخص ڈیڑھ لاکھ مانگ رہا تھا۔

”کیا ہم ٹرائی لے سکتی ہیں؟“ نالہ نے کہا۔  
 ”ضرور۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”یہ گاڑی میں نے صرف دو سال پہلے خریدی تھی۔ اب بیٹی کے دل سے اتر گئی ہے۔ وہ نئے ماڈل کی گاڑی لینا چاہتی ہے۔“

نالہ دروازہ کھول کر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گئی اور انجن اشارت کرنے لگی۔ سلطانہ اس شخص کے قریب کھڑی رہی۔ نالہ گاڑی کو گیٹ سے باہر نکال لے گئی۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اسے یہ گاڑی پسند آئی تھی۔ انجن بہترین حالت میں تھا۔ بھادڑا شروع ہو گیا اور بالا خرابات ایک لاکھ چالیس ہزار پر ختم ہو گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ نالہ نے سادے کانڈر پر رسید کھوا کر ادائیگی کر دی اور رسید بریف کیس میں رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلطانہ بھی اٹھ گئی۔ وسیع و عریض بنگلہ، تین تین گاڑیاں اور ڈرائنگ روم کا سارو سامان دیکھ کر ان کی دولت مندی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ نالہ اور سلطانہ کی واپسی سرخ شیراڈ پر ہوئی تھی۔ وہ سیدھا گھر واپس آنے کے بجائے حسن اسکوآر کی طرف نکل گئیں۔ وہاں ایک دو اچھے گارمنٹس اسٹورز تھے۔ نالہ نے دلاور اور بی کے لئے کپڑوں کے چند جوڑے خریدے اور واپس آ گئیں۔ گیٹ دلاور ہی نے کھولا تھا۔

”یہ گاڑی ہم خرید کر لاتی ہیں، کیسی ہے؟“ نالہ نے دلاور سے پوچھا۔  
 ”دیکھنے میں تو بہت اچھی ہے جی۔ اب اس کے اندر کا حال تو مجھے معلوم نہیں۔“ دلاور نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اندر کا حال بھی بہت اچھا ہے۔“ نالہ نے جواب دیا، پھر بولی۔ ”عبدالقدوس ابھی تک نہیں آیا؟“  
 ”نہیں جی۔ نہ تو وہ خود آیا ہے اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی ہے۔ میں اسی کی طرف سے پریشان ہو رہا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔

”عبدالقدوس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ دیکھنے میں تو پاگل اور احمق سا لگتا ہے لیکن بہت ذہین آدمی ہے۔ وہ شبیردرانی کے بارے میں سب کچھ معلوم کر کے آئے گا۔ تم اس کی فکر مت کرو۔“ نالہ نے کہا۔

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دلاور باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگا۔ اسے اونگھتے دیکھ کر نالہ اور سلطانہ ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔ وہ اپنے کمرے میں آکر گاڑی کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ نالہ کے خیال میں وہ گاڑی بہت اچھی تھی اور انہیں سستی مل گئی تھی۔  
 بانچ بچے کے قریب دلاور کی آنکھ کھل گئی۔ عبدالقدوس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دلاور پریشان ہو رہا تھا اور اب تو نالہ کو بھی تشویش ہو گئی تھی۔

”میرے پاس رسول بخش کا فون نمبر ہے۔ میں اس سے شبیردرانی کے بارے میں پتہ کرتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے عبدالقدوس اس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔“ دلاور نے کہتے ہوئے جیب سے رسول بخش کا کارڈ نکال لیا۔

”لاؤ“ میں بات کرتی ہوں۔“ نائلہ نے اس سے کارڈ لے لیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کال دوکان کے فکشی نے ریسیور اٹھ لیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد رسول بخش کی آواز سنائی دی تو نائلہ نے کہا۔ ”آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔“

”آپ کون ہیں بی بی؟“ رسول بخش نے پوچھا۔  
 ”میرزا نام نائلہ درانی ہے۔ شیردرانی کی کزن ہوں۔ آج ہی رحیم یار خان سے آئی ہوں۔ شیردرانی پہلے سے کراچی آیا ہوا ہے۔ کراچی آنے سے پہلے اس نے آپ کا نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ کوئی بات ہو تو میں آپ سے رابطہ کر لوں۔ اتفاق سے میں بھی آج کراچی آئی ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ شیردرانی کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔“  
 ”ان کی رہائش کا تو مجھے پتہ نہیں۔ فون نمبر دے سکتا ہوں۔ اتفاق سے وہ آج صبح میرے پاس آئے تھے اور یہ نمبر دیا تھا۔ آپ ہولڈ کیجئے۔ میں نمبر بتاتا ہوں۔“ رسول بخش نے کہا اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے شیردرانی کا فون نمبر بتا دیا۔

نائلہ نے نمبر نوٹ کر لیا اور شکریہ ادا کئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔  
 ”وہ اسے اپنا فون نمبر بتا کر گیا تھا۔“ نائلہ نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال“ فون نمبر سے بھی ایڈریس معلوم کیا جاسکتا ہے۔“  
 اور پھر تقریباً ”آدمے گھنٹے بعد ٹیلی فون ہی کے ذریعے وہ ایڈریس معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ نارتھ ٹاؤن آباد کے بلاک این کے ایک بنگلے کا نمبر تھا۔

”کیا خیال ہے“ جا کر معلوم کیا جائے؟“ دلاور نے کہا۔  
 ”ابھی نہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ابھی دن کی روشنی ہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد چلیں گے۔“  
 ”اگر قدوس ان کے ہاتھ لگ گیا ہو تو وہ لوگ اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔“ دلاور نے کہا۔  
 ”اگر کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی تو اب تک بہت کچھ ہو چکا ہوگا۔“ نائلہ نے کہا۔

اسی دوران سلطانہ چائے بنا کر لے آئی اور کبھی بھی وہاں آگیا۔ چائے کے دوران بھی وہ عبدالقدوس ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

تقریباً ”آٹھ بجے وہ لوگ روانہ کی تیاری کرنے لگے۔ نائلہ اور سلطانہ نے آئوٹریک رائٹنگل سیٹوں کے نیچے چھاپ دیں۔ اس مرتبہ رائٹنگل میں لگے ہوئے میگزین کے ساتھ ایک فاضل میگزین ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا کہ اگر ایک میگزین خالی ہو جائے تو فوری طور پر دوسرا میگزین لگالیا جائے۔

نائلہ نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ دلاور اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا، سلطانہ اور کبھی پیچھے بیٹھے تھے۔ نائلہ گاڑی کو بلاک تھری کی گلیوں سے نکال کر موٹی ٹرل مریج پر نکل آئی۔ سراب گوٹھ سے ذرا پہلے ایک پینٹرول پمپ سے اس نے کار کی فکشی فل کروائی اور مین روڈ پر آنے کے بجائے پینٹرول پمپ کے ساتھ والی گلی سے ہوئی ہوئی یوسف پلازہ کے ساتھ مین روڈ پر نکل آئی اور وہاں سے انچولی میں داخل ہو گئی۔

نائلہ گاڑی کو مین روڈ پر لانے سے احتیاط برت رہی تھی۔ کیونکہ مین روڈ پر چیکنگ کا اندیشہ تھا۔ جبکہ گلیوں میں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر دلاور اور کبھی ان کے ساتھ نہ ہوتے تو وہ مین روڈ ہی کا راستہ اختیار کرتی۔ دلاور اور کبھی کے چلنے اگرچہ خاصے بارعب تھے مگر یہاں کی پولیس بدک ہوئی تھی۔ شلوار قمیض اور بھاری موچکوں والا ہر شخص ان کی نظروں میں ملھوک تھا۔ انہیں گاڑی میں دیکھ کر پولیس والے یقیناً ”گاڑی کی تلاشی لینا چاہیں گے۔ اسی لئے وہ بڑی سڑکوں پر آنے کے بجائے گاڑی کو گلیوں میں سے نکال رہی تھی۔

انچولی سے گلبرگ ہوتے ہی گاڑی رشید ترابی روڈ کی چورنگی پارکر کے اس سڑک پر نکل آئی جو سید میمن غنی حسن کی طرف چلی گئی تھی۔ اسی سڑک کے ایک طرف بلاک این تھا اور دوسری طرف بلاک ایم۔ سڑک بہت کشادہ تھی۔ درمیان میں ایک پختہ نالہ تھا جس کے دونوں کناروں پر سفیدے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ نائلہ نے صفائی نہ

ہونے کی وجہ سے آس پاس سخت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔  
 ہلاک اس خاصا بڑا تھا۔ نائلہ نے دوسری گلی کے موڑ پر دو کانوں کے قریب گاڑی روک لی اور نیچے اتر کر ایک دوکان والے کو کاغذ پر لکھا ہوا نمبر دکھا کر راستہ پوچھنے لگی۔

”آپ اس گلی میں سیدھی چلی جائیے۔“ دوکاندار نے پتہ دیکھنے کے بعد اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جامع مسجد کے ساتھ پارک کے دائیں طرف والی سڑک آپ کو مسجد کے پچھلی طرف لے جائے گی۔ مسجد کے پچھلی طرف تیسری گلی میں پوچھ لیجئے۔ اگر یہ نمبر اس گلی میں نہ ہو تو اس سے آگے والی گلی میں ہوگا۔“

نائلہ شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ گاڑی میں آگئی اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھادی۔ وہ جلد ہی مسجد والے پارک کے سامنے پہنچ گئے۔ ساپنگ سینٹر اگرچہ کچھ رونق تھی مگر یہ پارک سنسان پڑا ہوا تھا۔ حالات نارمل ہوتے تو اس پارک میں اس وقت بڑی رونق ہوتی مگر اب یہاں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک سڑک پارک کے ساتھ ساتھ دائیں طرف چلی گئی تھی اور ایک بائیں طرف۔ نائلہ نے گاڑی دائیں طرف موڑ لی۔

تیسری گلی کے سامنے اس نے گاڑی روک لی۔ اس طرف بھی سناٹا تھا۔ اگرچہ ابھی صرف نو بجے تھے مگر گلی میں کوئی بھی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ بیشتر گھروں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔  
 ”سلطان۔“ نائلہ نے پیچھے مڑ کر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم جا کر معلوم کرو کہ اس نمبر کا بنگلہ اسی گلی میں ہے یا ہمیں اگلی گلی میں جانا پڑے گا۔“

سلطانہ دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی اور بنگلوں کے نمبر دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ نمبر دیکھنے کے لئے اسے ہر بنگلے کے گیٹ کے قریب جانا پڑا تھا۔ وہ چوتھے بنگلے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ گیٹ کھلا اور ایک نوجوان موٹر سائیکل کھینچ کر باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ دس بارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا بھی تھا اور گیٹ اسی لڑکے نے کھولا تھا۔ وہ نوجوان موٹر سائیکل کھینچ کر باہر آ چکا تھا۔ وہ مشکوک نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ بنگلہ کس طرف ہے؟“ سلطانہ نے اسے بنگلے کا نمبر بتاتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس نوجوان کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔

ساتھ والی گلی میں ہے۔ اس بنگلے کی پشت پر۔“ نوجوان نے سامنے والی روکے ایک بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ کارنر سے دوسرا بنگلہ تھا۔ سلطانہ اس کا شکریہ ادا کر کے کاری طرف آگئی۔ وہ نوجوان موٹر پر بیٹھ کر مخالف سمت میں چلا گیا تھا۔ سلطانہ نے کار کے قریب رک کر نائلہ کو بتایا اور خود پیدل ہی آگے بڑھ گئی۔

نائلہ نے اگلی گلی کے موڑ پر گاڑی روک لی۔ یہ جگہ بھی سنسان تھی۔ یہ مسجد کا قبلہ رخ والا علاقہ تھا اور پارک کا کچھ حصہ اس طرف بھی تھا جو سنسان پڑا تھا۔ سلطانہ گلی میں داخل ہو گئی۔ کارنر والا بنگلہ سنسان پڑا تھا۔ بنگلے کی تاریکی اور سناٹا اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ یہ بنگلہ یا تو خالی پڑا ہوا ہے یا لیکن کہیں گئے ہوئے ہیں البتہ ساتھ والے بنگلے میں روشنی تھی۔ سلطانہ نے قریب جا کر دیکھا۔ ہلو پر وہی نمبر لکھا ہوا تھا جس کی انہیں تلاش تھی۔ سلطانہ واپس آگئی۔

”وہی بنگلہ ہے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ موجود ہیں اندر کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔“ سلطانہ نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا۔

نائلہ اور دلاور وغیرہ فوراً ہی نیچے اتر آئے۔ سیٹوں کے نیچے سے رائفلیں نکال لی گئیں۔ نائلہ کی بھی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”بہن! اتم تمہیں روک اور گاڑی کے دروازے کھلے رکھو۔ ہو سکتا ہے ہمیں غلٹ میں یہاں سے بھاگنا پڑے۔“  
 بکی نے اثبات میں سر ہلادیا۔ نائلہ، دلاور اور سلطانہ بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے دیواریں پھانڈنے کے بجائے دستک دے کر براہ راست دروازے سے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

میں نے رانقلیں سنبھال رکھی تھیں۔ نائلہ نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ کچھ دیر بعد اندر سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ابھی ہوئی نظروں سے نائلہ کی طرف دیکھنے لگا۔ دلاور نے اچانک ہی رانقل اس کے سینے سے لگا دی۔

”تمہارے منہ سے آواز نہ نکلے۔ اندر چلو۔“ دلاور نے غراتے ہوئے اسے رانقل سے دھکا دیا۔ نائلہ اور سلطانہ بھی اندر داخل ہو گئیں۔ سلطانہ نے دروازہ بھڑکایا اور ان دونوں نے بھی رانقلیں تان لیں۔ وہ خانہ تھا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ رانقل کے زور پر اٹکے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔

”کھٹک... کون ہو تم لوگ؟“ وہ پھلایا۔

”شیردرانی کہاں ہے اور وہ لڑکا کہاں ہے جسے تم لوگ پکڑ کر لائے ہو؟ جلدی بتاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ دلاور لڑایا۔

”بب... بتاتا ہوں۔“ خانہ پھلایا اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس نے بڑی پھرتی سے رانقل کو ہاتھ سے ایک طرف اٹھال کر آئین میں کھڑی سفید کاری کی چٹانک لگا دی۔ وہ کار کے پیچھے پناہ لینا چاہتا تھا لیکن سلطانہ نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رانقل کا ٹرانسگر دبا دیا۔ خانہ جھجک کر گرا۔ اس کی ٹانگ پر گولی لگی تھی۔

خانہ کی جھج اور فائرنگ کی آواز سے جھٹکے کے اندر ایک کمرے میں کھلبلی سی جھج گئی اور پھر دوسرے ہی لمحہ اندر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ دو آدمی تھے جو کمرے کی کھڑکیوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ نائلہ اور سلطانہ سفید ٹوپوٹا لڑائی آڑ میں ہو گئیں اور دلاور نے آئین میں لگے ہوئے درخت کی آڑ لے لی۔

”شیردرانی۔“ دلاور نے جھج کر کہا۔ ”تم بچ کر نہیں جاسکتے۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”تمہاری موت ہی تمہیں یہاں پہنچانی ہے دلاور۔ اب تم زندہ نہیں بچو گے۔“ شیردرانی نے بھی جھج کر کہا۔

فائرنگ تیز ہو گئی۔ لیکن پھر دھماکا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کمرے سے اب صرف ایک ہی آدمی فائرنگ کر رہا ہو۔

نائلہ کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا اور وہ کاری کی آڑ لیتی ہوئی دوڑ کر جھٹکے کے پہلو میں اپنی اسپیٹ کی طرف نکل آئی۔ جب وہ پچھلی طرف پہنچی تو ایک آدمی پچھلے جھٹکے کی دیوار پر کھڑا تھا۔ نائلہ نے اسے لٹکا کر امگروہ شخص پھلے جھٹکے میں چٹانک لگا چکا تھا۔ نائلہ دوڑتی ہوئی پچھلی طرف آگئی۔ اس طرف کمرے کا ایک عقبی دروازہ تھا۔ نائلہ نے دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ ایک آدمی کھڑکی سے آئین کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔

”فائرنگ روک دو اور رانقل پیچید کر دو۔ ورنہ چھلٹی کر دوں گی۔“ نائلہ جھنجی۔

وہ شیرملاح تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اس نے رانقل سیدھی کرنا چاہی مگر نائلہ نے اس کے پیروں پر ایک برسٹ اٹھا۔ شیرملاح نے رانقل پیچید کر ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے۔ نائلہ کمرے میں آگئی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔

”سلطانہ... دوسرے کمرے میں دیکھا؟“ نائلہ نے کہا۔

سلطانہ دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں عبدالقدوس کو کرسی سے بندھے دیکھ کر وہ بدحواس سی ہو گئی۔ وہ بہت ہی اجترہاں میں تھا۔ چہرہ خون آلود تھا۔ سلطانہ کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سلطانہ نے میز پر سے چھری اٹھا کر ریاں کاٹ دیں اور عبدالقدوس کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ اس کی ٹانگیں بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ گرتے گرتے پچا۔ سلطانہ اسے سہارا دینے رہی۔ کچھ دیر بعد جب اس کی ٹانگیں جسم کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل ہوئیں تو سلطانہ اسے سہارے سے چلائی ہوئی دوسرے کمرے میں لے آئی۔ وہاں دلاور اور

”اے شیرملاح کو رسیوں میں باندھ چکے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر عبدالقدوس کمزور سی آوازیں بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ لوگ مجھے ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے۔“

”تمہاری حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ میں اس کا بدلہ ضرور لوں گی۔“ نائلہ نے کہا پھر دلاور کی طرف گھولی۔

”اس بد معاش کو اٹھا کر گاڑی کی ڈکی میں ڈال دو۔ جلدی کرو کہیں پولیس نہ پہنچ جائے۔“

”شبیرو رانی کہاں ہے؟“ عبد القدوس نے پوچھا۔

”وہ بھاگ گیا۔ مگر میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکے گا۔“ نائلہ نے کہا۔

دلاور نے جھک کر بشیر ملاح کو کندھے پر اٹھالیا اور وہ تیزی سے باہر آگئے۔ کچی رانقل لئے کار کے قریب ہوشیار کھڑا تھا۔ نائلہ نے آگے بڑھ کر انگنیشن سے چابیوں کا کچھانکال کر ڈکی کھولی۔ دلاور نے بشیر ملاح اور خانو کو ڈکی میں ٹھونس دیا اور ڈکی بند کر دی۔

کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ دلاور نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ اس وقت تمام بنگلوں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

نائلہ نے تیزی سے گاڑی موڑ لی اور پارک کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی ایک اور گلی میں موڑ لی۔ کئی گھنٹوں گھومنے کے بعد وہ رشید ترابی روڈ پر نکل آئی۔ اس نے گاڑی بائیں طرف موڑ لی۔ اسی طرح کچھ آگے وہ چورنگی گلی جہاں سے وہ پہلے آئے تھے۔ ان کی کار ابھی دور ہی تھی کہ ایک پولیس موبائل تیزی سے چورنگی پر گھومتی ہوئی ہلاک ابن کی طرف چلی گئی۔ نائلہ گاڑی کو سیدھی لیتی چلی گئی۔ چورنگی پارک کے اب وہ ہلاک ایم کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ایک موٹر پر اچانک ہی ایک پولیس موبائل گلی سے نکل کر سامنے آگئی۔ نائلہ اگر تیزی سے اسٹیزنگ نہ گھما دیتی تو تصادم ہو جانا لازمی تھا۔

کار کو اس طرح خطرناک انداز اور تیز رفتاری سے ٹکڑے دیکھ کر پولیس والے چونکے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ ڈرائیور نے بھی موبائل موڑ لی۔

”کچی!“ نائلہ نے کہا۔ ”اس موبائل کو ہمارے پیچھے نہیں آنا چاہیے۔“

”فکری نہ کریں جی۔“ کچی نے کہتے ہوئے جھک کر پیروں کے قریب پڑی ہوئی رانقل اٹھالی اور سیٹ سے اتر کر مڑک بیٹھ گیا۔ رانقل کی ٹال کھڑکی سے باہر نکالی اور ٹرانسگر دبا دیا۔ کچی شعلے پولیس موبائل کی طرف لپکے ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ پولیس موبائل کا اگلا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ پولیس موبائل لڑکھڑا کر رک گئی۔ نائلہ نے گاڑی اگلے موڑ پر دائیں طرف موڑ لی۔

اب وہ فیڈرل بی ایریا میں داخل ہو چکے تھے۔ نائلہ کو یقین تھا کہ ناکارہ ہونے والی موبائل کے وائرلیس سے دوسری گمشدگی گاڑی کو اطلاع مل گئی ہوگی۔ نائلہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں انہیں چیکنگ کے لئے نہ روک لیا جائے۔ یہ گلی آگے ایک چھوٹے سے پارک سے جا ملی تھی۔ اس پارک میں گھاس تو برائے نام بھی نہیں تھی لیکن بلند والے اسے پارک ہی کہتے تھے اور بورڈ بھی پارک ہی کا لگا ہوا تھا۔ نائلہ نے پارک کے قریب گاڑی روک لی۔

”دلاور! کچی، تم لوگ یہاں اتر جاؤ۔ دائیں طرف تھوڑی ہی دور بس اسٹاپ ہے۔ وہاں سے تمہیں یو فور مل جائے گی۔ موتی محل پر اتر جانا۔ وہاں سے گھر تک پہنچنے میں تم لوگوں کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی اور ہ رانقلیں سیٹوں کے نیچے چھپا دو۔“

”اور آپ نائلہ بی بی۔۔۔ دلاور نے کہا۔

”ہماری فکر مت کرو۔ ہم پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو اگر گاڑی کی تلاش شروع ہو گئی تو ہمارے لئے بھی خطر ہو جائے گی۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ دونوں جلدی سے نیچے اتر آئے۔ نائلہ بھی اتر کر باہر کھڑی ہو گئی تھی۔ دلاور اور کچی نے سیٹیں اٹھا کر رانقل چھپا دیں۔ نائلہ دوبارہ اسٹیزنگ کے سامنے بیٹھ گئی اور ان دونوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھ دی۔

دلاور اور کچی اس کے بتائے ہوئے راستے کی طرف چل دیئے۔

نائلہ گاڑی کو مختلف گلیوں میں دوڑاتی ہوئی ایک بار پھر انجلی سے یوسف پلازہ کے سامنے مین روڈ پر نکل کر مڑک کے درمیان ٹریفک آئی لینڈ میں ایک کٹ دیکھ کر اس نے گاڑی یوسف پلازہ کی طرف موڑ لی اور ٹنگ سی

ہا میں ہوتی ہوئی فیڈرل بی ایریا کالاک سولہ پار کر کے پونی ایل اسپورٹس کمپلکس کے سامنے نکل آئی۔ یہاں اس گاڑی بائیں طرف موڑ لی اور فضل لڑکے کے سامنے موٹی محل کی طرف گاڑی موڑتے ہی اسے بریک پر پیر رکھ لینا آگے پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی اور پولیس والے گاڑیوں کو روک رہے تھے۔ دو تین گاڑیاں اور بھی لی تھیں۔ ایک پولیس والے نے گاڑی کو سائیڈ پر لگانے کا اشارہ کیا۔ ٹائلہ نے سڑک کے وسط میں ہی گاڑی پارکی۔ پولیس والا جیسے ہی قریب پہنچا دو عورتوں کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

”ارے بھائی ہمیں جانے دو ہمارے ساتھ ایک لڑکا شدید زخمی ہے اسے جناح ہسپتال لے جا رہے ہیں۔“ ٹائلہ

”زخمی کیسے ہوا؟“ پولیس والا چونک گیا۔

”ہمارے بڑوس والے گھر میں ڈاکہ بڑا تھا۔ اسے گولی لگی ہے۔ ہم اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ پلیز جو بھی کہتا ہے جلدی چیک کرو اور ہمیں جانے دو۔“ ٹائلہ بولی۔

ٹھیک اسی لمحہ ڈکی میں سے ڈب ڈب کی آوازیں آنے لگیں۔ ٹائلہ چونک گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹی بدن ان کے قیدی موقع سے فائدہ اٹھا کر پولیس والوں کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر پولیس والے نے شاید اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

”جائیں لی بی۔ آپ لوگ جلدی جائیں۔“ پولیس والے نے کہا اور دوسرے پولیس والوں کو اشارہ کر دیا۔

ٹائلہ نے گاڑی آگے بڑھادی۔ موٹی محل کا پل پار کرتے ہی ٹائلہ نے گاڑی بائیں طرف ہلاک تھری کی گلی میں لہ آگے ٹریفک جام ہو رہا تھا اور ٹائلہ کو یقین تھا کہ گلشن چورنگی پر بھی چیکنگ ہو رہی ہوگی۔ اسی لئے اس نے اس گلی میں موڑ لی تھی۔

پہلے میں پہنچتے ہی انہوں نے پہلے عبدالقدوس کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا پھر ڈکی میں سے بشیر صلاح اور خانو کو بھی گراؤدر لے گئیں۔ ان کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ انہیں ایک کمرے میں قالین پر ڈال کر وہ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ٹائلہ دوڑ کر فرسٹ ایڈ کبس لے آئی جو انہوں نے دو دن پہلے ہی تیار کیا تھا۔ سلطانہ عبدالقدوس کا سر کود گئے بیٹھی تھی اور عبدالقدوس ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد دلاور اور بی بی بھی پہنچ گئے۔

”لوگ پریشانی تو نہیں ہوئی تم لوگوں کو؟“ ٹائلہ نے پوچھا۔

”ہم لوگ بس میں بیٹھنے کے بعد اس جگہ کو نہیں پہچان سکے تھے۔ سبزی منڈی پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم تو بہت آگے آئے ہیں۔ وہاں سے اتر کر گل کوچ میں بیٹھے جس نے ہمیں ڈسکو بیکری کے سامنے اتار دیا۔“ دلاور نے بتایا۔ ”وہ

”ہاں؟“

”انہیں ہمارے کمرے میں ڈال دیا ہے۔“ ٹائلہ نے بتایا۔ ”ان سے پوچھنا ہے کہ وہ کون ہیں اور بشیر درانی

بھی فرار ہو کر کہاں جا سکتا ہے۔“

”ڈورا اسے دیکھ لیں۔“ دلاور نے کہا اور وہ دونوں اپنے کمرے میں آگئے۔

دلاور بشیر صلاح بندھے ہوئے قالین پر پڑے تھے۔ وہ دونوں چند لمحے ان کی طرف دیکھتے رہے پھر دلاور آگے

صلاح کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔

”لڑکے سے کچھ بتاؤ گے یا ہمیں کوئی طریقہ استعمال کرنا پڑے گا؟“

صلاح نے اثبات میں سر ہلادیا۔ دلاور نے اس کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔

”میں دلاور کون ہے؟“ اس نے گھرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ دلاور نے جواب دیا۔



”شیردرانی کہاں ہے؟“ عبدالقدوس نے پوچھا۔

”وہ بھاگ گیا۔ مگر میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکے گا۔“ نائلہ نے کہا۔

دلاور نے جھک کر بشیر ملاح کو کندھے پر اٹھالیا اور وہ تیزی سے باہر آگئے۔ کئی رات قبل لئے کار کے قریب ہوشیار کھڑا تھا۔ نائلہ نے آگے بڑھ کر انگنیشن سے چابیوں کا کچھا نکال کر ڈکی کھولی۔ دلاور نے بشیر ملاح اور خانو کو ڈکی میں ٹھونس دیا اور ڈکی بند کر دی۔

کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ دلاور نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ اس وقت تمام بنگلوں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

نائلہ نے تیزی سے گاڑی موڑ لی اور پارک کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی ایک اور گلی میں موڑ لی۔ کئی گلیاں گھومنے کے بعد وہ رشید ترابی روڈ پر نکل آئی۔ اس نے گاڑی بائیں طرف موڑ لی۔ اسی طرح کچھ آگے وہ چورنگی تھی جہاں سے وہ پہلے آئے تھے۔ ان کی کار ابھی دور ہی تھی کہ ایک پولیس موبائل تیزی سے چورنگی پر گھومتی ہوئی بلاک این کی طرف چلی گئی۔ نائلہ گاڑی کو سیدھی لپٹی چلی گئی۔ چورنگی پارک کے اب وہ بلاک ایم کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ایک موٹر پر اچانک ہی ایک پولیس موبائل گلی سے نکل کر سامنے آگئی۔ نائلہ اگر تیزی سے اسٹیئرنگ نہ گھمادی تو تصادم ہو جانا لازمی تھا۔

کار کو اس طرح خطرناک انداز اور تیز رفتاری سے نکلنے دیکھ کر پولیس والے چونکے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ ڈرائیور نے بھی موبائل موڑ لی۔

”کی! نائلہ نے کہا۔“ اس موبائل کو ہمارے پیچھے نہیں آنا چاہئے۔“

”فکر ہی نہ کریں جی۔“ کی نے کہتے ہوئے جھک کر پیروں کے قریب پڑی ہوئی راتقل اٹھالی اور سیٹ سے اتر کر مرکز بیٹھ گیا۔ راتقل کی ٹال کھڑی سے باہر نکالی اور ٹرانسگر دبا دیا۔ کئی شیط پولیس موبائل کی طرف لپکے ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ پولیس موبائل کا اگلا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ پولیس موبائل لڑکھڑا کر رک گئی۔ نائلہ نے گاڑی اگلے موڑ پر دائیں طرف موڑ لی۔

اب وہ فیڈرل بی ایریا میں داخل ہو چکے تھے۔ نائلہ کو یقین تھا کہ ناکارہ ہونے والی موبائل کے وائرلیس سے دوسری سفتی گاڑی کو اطلاع مل گئی ہوگی۔ نائلہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں انہیں چیکنگ کے لئے روک لیا جائے۔ یہ کبھی آگے ایک چھوٹے سے پارک سے جا ملی تھی۔ اس پارک میں گھاس تو برائے نام بھی نہیں تھی لیکن بلدیہ والے اسے پارک ہی کہتے تھے اور بورڈ بھی پارک ہی کا لگا ہوا تھا۔ نائلہ نے پارک کے قریب گاڑی روک لی۔

”دلاور۔۔۔ کی! تم لوگ یہاں اتر جاؤ۔ دائیں طرف تھوڑی ہی دور بس اسٹاپ ہے۔ وہاں سے تمہیں یو فور مل جائے گی۔ موتی محل پر اتر جانا۔ وہاں سے گھر تک پہنچنے میں تم لوگوں کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی اور یہ راتقلیں سیٹوں کے نیچے چھپا دو۔“

”اور آپ نائلہ بی بی۔۔۔“ دلاور نے کہا۔

”ہماری فکر مت کرو۔ ہم پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو اگر گاڑی کی تلاش شروع ہو گئی تو ہمارے لئے بھی مشکل ہو جائے گی۔“ نائلہ نے کہا۔

وہ دونوں جلدی سے نیچے اتر آئے۔ نائلہ بھی اتر کر باہر کھڑی ہو گئی تھی۔ دلاور اور کی نے سٹیپ اٹھا کر راتقلیں چھپا دیں۔ نائلہ دوبارہ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گئی اور ان دونوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بھا

دی۔

دلاور اور کی اس کے بتائے ہوئے راستے کی طرف چل دیئے۔

نائلہ گاڑی کو مختلف گلیوں میں دوڑاتی ہوئی ایک بار پھر انجلی سے یوسف پلازہ کے سامنے مین روڈ پر نکل آئی۔

سڑک کے درمیان ٹریفک آئی لینڈ میں ایک کٹ دیکھ کر اس نے گاڑی یوسف پلازہ کی طرف موڑ لی اور ٹنگ سی،

میں ہوتی ہوئی فیڈرل بی ایریا کالیاک سولہ پارکر کے پونی ایل اسپورٹس کمپلکس کے سامنے کھل آئی۔ یہاں اس ٹری بائیں طرف موڑنی اور فضل لڑکے کے سامنے موتی محل کی طرف گاڑی موڑنے ہی اسے بریک پر پھر رکھ لینا گئے پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی اور پولیس والے گاڑیوں کو روک رہے تھے۔ دو تین گاڑیاں اور بھی تھیں۔ ایک پولیس والے نے گاڑی کو سائیڈ پر لگانے کا اشارہ کیا۔ ٹائلڈ نے سڑک کے وسط میں ہی گاڑی لی۔ پولیس والا جیسے ہی قریب پہنچا دو عورتوں کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

”ارے بھائی ہمیں جانے دو ہمارے ساتھ ایک لڑکا شدید زخمی ہے اسے جناح ہسپتال لے جا رہے ہیں۔“ ٹائلڈ

زخمی کیسے ہوا؟“ پولیس والا چونک گیا۔

”ہمارے پڑوس والے گھر میں ڈاکہ بڑا تھا۔ اسے گولی لگی ہے۔ ہم اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ پلیز جو بھی جانتا ہے جلدی چیک کرو اور ہمیں جانے دو۔“ ٹائلڈ بولی۔

ایک اسی لمحہ ڈکی میں سے ڈب ڈب کی آوازیں آنے لگیں۔ ٹائلڈ چونک گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ بند ان کے قیدی موقع سے فائدہ اٹھا کر پولیس والوں کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر پولیس والے نے شاید اس رتوجہ نہیں دی تھی۔

جانیس بی بی۔ آپ لوگ جلدی جائیں۔“ پولیس والے نے کہا اور دوسرے پولیس والوں کو اشارہ کر دیا۔ ٹائلڈ نے گاڑی آگے بڑھادی۔ موتی محل کا بل پار کرتے ہی ٹائلڈ نے گاڑی بائیں طرف بلاک تھری کی گلی میں آگے ٹریفک جام پور ہا تھا اور ٹائلڈ کو یقین تھا کہ گلشن چورنگی پر بھی چینگک ہو رہی ہوگی۔ اسی لئے اس نے اس گلی میں موڑ لی تھی۔

گلے میں پہنچتے ہی انہوں نے پہلے عبدالقدوس کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا پھر ڈکی میں سے بشیر ملاح اور خانو کو بھی اندر لے گئیں۔ ان کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ انہیں ایک کمرے میں قالین پر ڈال کر وہ ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ ٹائلڈ دو دو کر فرسٹ ایڈ بکس لے آئی جو انہوں نے دو دن پہلے ہی تیار کیا تھا۔ سلطانہ عبدالقدوس کا سر کوڈ لکھے بیٹھی تھی اور عبدالقدوس ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد دلاور اور بی بی پہنچ گئے۔

گوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تم لوگوں کو؟“ ٹائلڈ نے پوچھا۔

ہم لوگ بس میں بیٹھنے کے بعد اس جگہ کو نہیں پہچان سکے تھے۔ سبزی منڈی پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم تو بہت آگے آئے ہیں۔ وہاں سے اتر کر گل کوچ میں بیٹھے جس نے ہمیں ڈسکو بیکری کے سامنے آنا دیا۔“ دلاور نے بتایا۔ ”وہ

بس؟“

”انہیں ہمارے کمرے میں ڈال دیا ہے۔“ ٹائلڈ نے بتایا۔ ”ان سے پوچھنا ہے کہ وہ کون ہیں اور بشیر درانی سے فرار ہو کر کہاں جا سکتا ہے۔“

”آؤ ذرا اسے دیکھ لیں۔“ دلاور نے کہا اور وہ دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔

خانو اور بشیر ملاح بندھے ہوئے قالین پر پڑے تھے۔ وہ دونوں چند لمحے ان کی طرف دیکھتے رہے پھر دلاور آگے پیش قدمی کرنا شروع کر رہے ہوئے بولا۔

”فرافت سے کچھ بتاؤ گے یا ہمیں کوئی طریقہ استعمال کرنا پڑے گا؟“

ملاح نے اثبات میں سر ہلادیا۔ دلاور نے اس کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔

”میں دلاور کون ہے؟“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”میں ہوں۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”اور وہ لڑکی جس نے مجھ سے گمن پھکوائی تھی، غالباً ”نائلہ درانی تھی؟“ بشیر ملاح نے کہا۔

”ہاں۔“ دلاور نے کہا۔ ”ہم تم سے متعارف ہونے کے لئے تمہیں یہاں نہیں لائے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ بشیر ملاح بولا۔ ”تم دونوں بہادر ہو اور میں بہادر دشمن کی بھی قدر کرتا ہوں۔ آج تک کوئی بشیر ملاح کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکا۔ لیکن ایک چھوڑی نے میرے ہاتھ سے بندوق پھکوا دی۔ آج کے بعد یہ ہاتھ بندوق نہیں اٹھائیں گے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری ہر بات کا جواب دوں گا۔ بشیر درانی تو بزدل نکلا!“

”تم کون ہو اور بشیر درانی تمہیں کیسے ملا تھا؟“ دلاور نے کہا۔

”میرا نام بشیر ملاح ہے۔ سندھ کا ایک نامی گرامی ڈاکو ہوں۔ لوگ میرا نام سنتے ہی کانپنے لگتے ہیں۔ سرکار نے میرے سر کی قیمت پندرہ لاکھ مقرر کی ہے۔ لیکن پولیس والے آج تک میرے علاقے میں گھسنے کی ہمت نہیں کر سکے۔“ وہ چند لمحوں خاموش ہوا پھر کہنے لگا۔

”میں پیدائشی ڈاکو نہیں ہوں ایک غریب ہاری کا بیٹا ہوں۔ بڑا ہوا تو ڈیرہ مجھ سے اپنے مطلب کے کام لینے لگا۔ مونٹی چوری کرنا، عورتیں اٹھوانا، اس کا حکم نہ ماننے والے غریب ہاریوں کی پٹائی کرنا، یہی میرا کام تھے۔ پھر ڈیرہ مجھ سے چوریاں کروانے لگا۔ میں اکیلا نہیں تھا۔ ڈیرے کے اور آدمی بھی میرے ساتھ تھے۔ چوریاں کرتے کرتے ہم ڈاکے مارنے لگے۔ میں نے گوتھوں کے گٹھ اجاڑ دیئے۔ بسوں کو لوٹ لینے لوٹے ہوئے مال کا ادھا حصہ ڈیرے کو دے دیتے اور ادھا آپس میں بانٹ لیتے۔ ہمارے حوصلے بڑھ گئے۔ کئی قتل کئے ہیں میں نے۔ جب پانی سر سے گزر گیا تو سرکار نے میری طرف توجہ دی۔ میرے سرا قیمت پہلے پانچ لاکھ روپے مقرر ہوئی پھر دس لاکھ اور پھر پندرہ لاکھ۔

ایک بس لوٹنے کے دوران بشیر درانی ہمارے ہاتھ لگا۔ یہ سکھر میں کسی ہندو سیٹھ کی نوکرانی کو ہوس نشانہ بنا کر اسے قتل کر کے گھر سے نقدی اور زبور لوٹ لایا تھا۔ اس نے وہ مال میرے حوالے کر دیا۔ ہمارے گروہ میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ ہمارے ساتھ کراچی میں ایک ڈکیتی میں بھی شامل ہے۔ اس واردات میں تین آدمی مارے گئے تھے۔“

”یہ رحیم یار خان میں بھی ہمارے ایک آدمی کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ بسٹ بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ پورے ضلع کی پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ میں بھی اس تلاش میں یہاں آیا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تھا۔ وہ تم سے اور نائلہ سے خوفزدہ ہے۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”میں نے مجھے تم دونوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے لیکن اپنے طریقے سے... وہ بڑا بے ضمیر آدمی ہے۔ اس نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ اور آج تم لوگوں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے۔ نائلہ اور تم واقعی بے گناہ ہو۔ سارا قصور اسی کا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے نائلہ کی جائیداد پر قبضہ کر کے لئے کیا تھا۔ لیکن اب اپنا بھی سب کچھ اس سے چھین چکا ہے اور وہ در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہئے۔“

اس دوران نائلہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”کچھ بتایا اس نے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”یہ ہمارے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہے۔“ دلاور نے کہا۔

”میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں نائلہ بی بی۔“ بشیر ملاح نے کہا۔  
 ”کیا؟“ نائلہ اچھل پڑی۔

”تم نے میرے ہاتھ سے بندوق گروائی ہے اور میں نے قسم کھائی ہے کہ آج کے بعد یہ ہاتھ بندوق نہیں اٹھائیں گے۔ مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔“ بشیر ملاح نے کہا۔

”ضرور کریں گے۔“ دلاور نے کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ شیردرانی کہاں چھپا ہو گا؟“

”وہ یقیناً پی آئی بی کالونی میں میرے ایک دوست کے پاس گیا ہو گا۔ اسے وہیں پناہ مل سکتی ہے۔“ بشیر ملاح نے کہا اور پھر پی آئی بی کالونی میں جبار کا پتہ بتانے لگا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا اور پھر نائلہ کے پوچھنے پر اپنے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتانے لگا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بس کے مسافروں میں سے ایک ہندو سینٹھ اور کراچی کے ایک صنعتکار کو اس نے مان چند کے ایک وڈیرے کی حویلی میں یہ غمال بنا رکھا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ چند روز بعد اس کے وارثوں سے رابطہ قائم کر کے تادان کا مطالبہ کرے گا۔

”مجھے بے شک تم لوگ باندھ کر رکھو۔ میرے منہ میں کپڑا مت ٹھونسو۔ میں شاہ لطیف سائیں کی قسم کھاتا ہوں کہ منہ سے آواز تک نہیں نکالوں گا۔“

نائلہ اور دلاور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔  
 ”ہم تمہاری زبان پر یقین کر لیتے ہیں لیکن اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں بچو گے۔“ دلاور نے کہا۔

”یہ مرد کی زبان ہے۔“ بشیر ملاح نے کہا۔

اور پھر رات گزرنے کے بعد صبح پانچ بجے نائلہ اور دلاور کار میں سواری پی آئی بی کالونی کی طرف جا رہے تھے۔ اس مرتبہ انہیں راستے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پی آئی بی کالونی میں وہ مکان بھی آسانی سے مل گیا۔ جبار کے نوکر نے گھنٹی کی آواز سن کر یہ سمجھا کہ دودھ والا آیا ہو گا۔ لیکن دلاور اسے گن پوائنٹ پر دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ نائلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

”شیردرانی کہاں ہے؟“ دلاور نے غراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ اس کمرے میں سو رہا ہے۔“ نوکر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”یہاں اور کون کون ہے؟“

”جبار ہے، وہ دوسرے کمرے میں سویا ہے۔“ نوکر نے جواب دیا۔

”چلو۔۔۔ میرے ساتھ جبار کے کمرے کی طرف۔“ دلاور اسے دھکیلتا ہوا لے گیا۔ اس نے نائلہ کو اشارہ کر دیا

تھا۔

نائلہ اس کمرے کی طرف آگئی جہاں شیردرانی تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ ٹائٹ بلب کی نیلگوں روشنی تھی۔ شیردرانی صوفے پر سویا ہوا تھا۔ صوفے کے قریب ہی کلا شکوف بھی بڑی تھی۔ نائلہ نے کلا شکوف اٹھا کر بڑی احتیاط سے دوسرے صوفے پر رکھ دی اور اپنی رائفل کی نال سے شیردرانی کو شوکا دیا۔

شیردرانی گڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اور پھر نائلہ کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھیلی چلی گئیں۔۔۔۔۔!!!



شیردرانی اس طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ وہ پلک جھپکے بغیر نائلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی گہری دھند اور آنکھوں میں وحشت تھی۔

”تنت۔۔۔۔۔“ بلاخر اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی اور دونوں کنٹیاں صوفے پر ٹکا کر اٹھنے کی

کرنے لگا۔

آرام سے بڑے رہو۔" نائلہ درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے راتقل کی ٹال بیٹے پر رکھ کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "ڈر گئے مجھے دیکھ کر۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ تو میری موت کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا تھا لیکن تم کا گھر کے اس کھڑے سے فائدہ نہ اٹھا سکے کیونکہ گھناؤنی سازشوں کے جال کے پھندے ٹوٹ رہے تھے۔ میری طرف غور سے دیکھو۔ میں کوئی بد روح نہیں بندھ ہوں۔ اور اب تمہارے حساب کا وقت آگیا ہے۔ یقین کرو میں تم سے اپنی ایک ایک تزیل کا حساب اور اس کے بعد اگر تم سے کچھ بچا تو تمہیں قانون کے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ قانون تم سے ان بے حساب لے سکے جو تمہاری ہوس اور ظلم و ستم کا شکار ہو چکے ہیں۔ تم نے تو ان لوگوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے تمہاری خاطر اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے۔ تمہیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے انہوں نے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر جب انہیں تحفظ اور پناہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو تم نے انہیں بھی بے حساب سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صوبہ خاں اور موجودہ کے نام تو میں جانتی ہوں۔ اس کے علاوہ اور کتنے گے جن کی خدمات کا صلہ تم نے موت کی صعوبت میں دیا تھا۔ دوسروں کے بارے میں میں نہیں جانتی لیکن مدار کا بھائی تم سے انتقام لینے کے لئے یہاں موجود ہے۔ وہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے ایک لبا کے آیا ہے۔ ایک مرتبہ تم اسے دھوکا دے کر بھاگ چکے ہو لیکن اب وہ دھوکا نہیں کھائے گا۔

"دیکھو نائلہ۔" شبیر درانی ایک بار پھر کنبیوں کے ٹل پر کسی قدر اوپر ہو گیا۔ "جہاں تک دوسرے لوگوں کا ہے تو ان میں سے کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن تم۔" وہ شہر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "تمہارے اور میرے درمیان جو کچھ بھی ہو وہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے۔ تم کزن ہو۔ ہمیں اپنے خاندانی معاملات اس طرح دوسروں کے سامنے نہیں لانے چاہئیں۔ پہلے ہی بہت رسوائی ہو چکی ہے۔ تم اگر چاہو تو ہمارے تمام اختلافات ختم ہو سکتے ہیں۔ ہم مزید رسوائی سے بچ سکتے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہو گا کہ ہم مزید تماشہ بننے کے بجائے یہاں سے نکل چلیں؟ تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے میں اس کی عطا کی ہوں گا۔ میری بات مان لو میری بہن۔"

"بہن! نائلہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "میں تمہاری بہن کیسے ہو گئی؟ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "میں تو ایک حسین کھلونا ہوں جس سے تم کھیلنا چاہتے تھے لیکن تمہارے ہاتھ نہ آسکی۔ میرے ماں باپ چھوڑی ہوئی کروڑوں کی جائیداد تک پہنچنے کا وہ ذمہ تمہیں جسے تم نے نہ کر سکے۔ ہوس اور زبردستی کے راستے کی نشان دہی جسے تم سر نہ کر سکے۔ میں تمہارے لئے اور تو سب کچھ تھی لیکن بہن کبھی نہیں تھی۔"

"نہیں نائلہ۔" شبیر درانی بولا۔ "خون کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹ سکتے۔ تم کل بھی میری بہن تھیں اور آج بھی۔"

"بہن۔۔۔" نائلہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اسی بہن کو چت کرنے کے لئے تم نے پورے ضلع کی پولیس کے پیچھے لگا دی۔ اسے قتل اور دیگر سنگین مقدمات میں جھنڈانے کے لئے راشی پولیس افروں کو تم نے بھی لپی لٹا دیا۔ شہر بھر کے غنڈے اور بد معاش اپنی بہن کے پیچھے لگا دیے اور انہیں اس بات کی اجازت دے دی کہ جہاں بھی ملوں میری عزت پامال کر دی جائے اور میری لاش کسی دیرانے میں پھینک دی جائے۔ عجیب بے غیرت کی ہو کہ بہن کے سر سے دوپٹہ اتار لیا اور اسے سرعام برہنہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جسے مروانے کے لئے 2 صوبہ خاں جیسے بے غیرت اور بے ضمیر پولیس آفیسر کو پانچ لاکھ روپے رشوت دیئے۔ تم نے اپنی اس بہن کو مل و رسوا کر کے اور مروانے کے لئے کیا کیا جھنجھٹے استعمال نہیں کئے اور اب تمہیں خون کے رشتے اور بہن کی بہت یاد آگئی۔ میں تو سب کچھ بھول سکتی ہوں لیکن ان لوگوں کو نہیں بھول سکتی جن کے گھر تم نے اجاڑے ہیں۔ میں جیسے بھول جاؤں ان سب لوگوں کو جن کے چہرے آج بھی میری نظروں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ جن کے جسم تم

نے چھلی کر دیا ہے تھے۔ جنہیں ان کے گھروں میں زندہ جلا دیا تھا۔ تمہارا تازہ ترین شکار وہ معصوم اور بے گناہ ہندو لڑکی تھی جو تمہاری ہوس کی بیعت چڑھ گئی۔ میں نے اس ہندو لڑکی کو نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت معصوم ہوگی۔ نہیں شبیر درانی! تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں معاف کیا جاسکے۔ تم۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔ ایسے درندے جس کے منہ کو خون لگ چکا ہے اور کسی خونی درندے کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔“

”تم جذبات سے مغلوب ہو رہی ہو نائلہ۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”یہ رانگل ہٹا لو اور بیٹھ جاؤ۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ یقین کرو۔ میں نے کبھی بھی تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ میں۔ میں تو تمہیں صرف مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ قتل و غارت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ موجددار کرتا رہا ہے۔“

”وہی کرتا رہا ہے لیکن تمہارے حکم پر۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”اور جب تمہیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے اور تمہارے سارے راز فاش کر دے گا تو تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔“

”تمہیں موجددار جیسے لوگوں سے ہمدردی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ کمی کاری لوگ ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ مالکوں کی خدمت کرتے رہیں اور ان کے لئے جان دے دیں۔ وہ مالکوں سے زندگی بھر اس کا معاوضہ وصول کرتے رہتے ہیں اور وقت آنے پر اپنے مالکوں کو بلیک میل کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ موجددار بھی مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔“

”اور صوبہ خان؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”اس نے تو تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔“

”تم نہیں جانتیں۔ وہ موجددار سے بڑا حرامزادہ تھا۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”میں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے لیکن وہ تمہیں اپنی ملکیت سمجھ بیٹھا۔ وہ تمہاری جوانی اور حسن سے کچھ ناجائز فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے تمہیں اپنا ذاتی قیدی بنالیا لیکن جب تم اس کی قید سے بھاگ نکلیں تو اس کے ظلم کی داستان کسی طرح سندھ پولیس کے آئی جی تک پہنچ گئی۔ وہ بہت ظالم آدمی تھا۔ اس نے اپنے علاقے کے شریف لوگوں کا بیٹا حرام کر رکھا تھا۔ ڈاکوؤں سے اس کے تعلقات تھے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے خلاف آئی جی کو رپورٹیں بھیجی تھیں۔ صوبہ خان کو ملازمت سے معطل کر کے اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔ وہ چند روز تک ایک ڈاکو کے ڈیرے پر روپوش رہا پھر میرے پاس آیا۔ وہ مجھے اور ماں جی کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے۔“

”گھڑ!“ نائلہ مسکرا دی۔ ”میرے سامنے تم نے کم از کم دو آدمیوں کے قتل کا اعتراف تو کر لیا۔ تم دلاور کو صوبہ خان کے قتل میں پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے تمہارے اس بیان سے دلاور کی پوزیشن تو واضح ہو گئی۔“

”دیکھو نائلہ۔“ شبیر درانی نے کہا۔ ”دلاور ہی دراصل اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ وہ سچ آدمی تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ تمہاری جائیداد پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر وہ سچ میں نہ کو دپڑتا تو ہمارے تعلقات میں اس قدر بگاڑ پیدا نہ ہوتا۔ رائے منصور کی شہ پر ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہمارے خاندان کو رسوا کیا گیا ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم خاندان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سارا دے سکتے ہیں۔“

”دلاور کو میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ سچ سچی اس میں انسانیت ہے، وہ انسانی رشتوں کی قدروں کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت بھی بچاتا ہے۔ کئی مواقع ملنے کے باوجود اس نے اپنی حد پار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور تم۔“

اچانک ہی مکان کے کسی حصے سے غازی آواز گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ بھی سنائی دی۔ نائلہ کو چیخ کی آواز پہچاننے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ دلاور کی چیخ تھی۔ نائلہ اچھل پڑی۔ اس کا دھیان ایک لمحہ کو شبیر درانی کی طرف سے ہٹا تھا۔ اسے باتوں میں لگائے رکھنے کے ساتھ ساتھ شبیر درانی کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں

ش کرنے لگا۔

”آرام سے بڑے رہو۔“ نائلہ درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے راتقل کی ٹال کے سینے پر رکھ کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ”ڈر گئے مجھے دیکھ کر۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ نے تو میری موت کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا تھا لیکن تم کا تھ کے اس ٹکڑے سے فائدہ نہ اٹھا سکے کیونکہ ری گناؤنی سازشوں کے جال کے پھندے ٹوٹ رہے تھے۔ میری طرف غور سے دیکھو۔ میں کوئی بد روح نہیں ہوں۔ اور اب تمہارے حساب کا وقت آگیا ہے۔ یقین کرو میں تم سے اپنی ایک ایک تزیل کا حساب لگی اور اس کے بعد اگر تم سے کچھ بچا تو تمہیں قانون کے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ قانون تم سے ان بے ہوں کا حساب لے سکے جو تمہاری ہوس اور ظلم و ستم کا شکار ہو چکے ہیں۔ تم نے تو ان لوگوں کو بھی نہیں چھوڑا ہوں نے تمہاری خاطر اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے۔ تمہیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے انہوں نے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر جب انہیں تحفظ اور پناہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو تم نے انہیں بھی بے دی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صوبہ خاں اور موجودہ کے نام تو میں جانتی ہوں۔ اس کے علاوہ اور کتنے س گمے جن کی خدمات کا صلہ تم نے موت کی صورت میں دیا تھا۔ دوسروں کے بارے میں میں نہیں جانتی لیکن جعدار کا بھائی تم سے انتقام لینے کے لئے یہاں موجود ہے۔ وہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے ایک لمبا کر کے آیا ہے۔ ایک مرتبہ تم اسے دھوکا دے کر بھاگ چکے ہو لیکن اب وہ دھوکا نہیں کھائے گا۔“

”دیکھو نائلہ۔“ شبیر درانی ایک بار پھر کنبیوں کے ٹل پر کسی قدر اوپر ہو گیا۔ ”جہاں تک دوسرے لوگوں کا وال ہے تو ان میں سے کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن تم۔“ وہ اموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تمہارے اور میرے درمیان جو کچھ بھی ہوا وہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے۔ تم میری کزن ہو۔ ہمیں اپنے خاندانی معاملات اس طرح دوسروں کے سامنے نہیں لانے چاہئیں۔ پہلے ہی بت رسوائی ہو چکی ہے۔ تم اگر چاہو تو ہمارے تمام اختلافات ختم ہو سکتے ہیں۔ ہم مزید رسوائی سے بچ سکتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ ہم مزید تماشہ بننے کے بجائے یہاں سے نکل چلیں؟ تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے میں اس کی تلافی کروں گا۔ میری بات مان لو میری بہن۔“

”بہن!“ نائلہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ”میں تمہاری بہن کیسے ہو گئی؟ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”میں تو ایک حسین کھلوا ہوں جس سے تم کلیتا چاہتے تھے لیکن تمہارے ہاتھ نہ آ سکی۔ میرے ماں باپ کی چھوڑی ہوئی کروڑوں کی جائیداد تک پہنچنے کا وہ زینہ تھی جسے تم نے نہ کر سکے۔ ہوس اور زبردستی کے راستے کی وہ چٹان تھی جسے تم سر نہ کر سکے۔ میں تمہارے لئے اور تو سب کچھ تھی لیکن بہن کبھی نہیں تھی۔“

”نہیں نائلہ۔“ شبیر درانی بولا۔ ”خون کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹ سکتے۔ تم کل بھی میری بہن تھیں اور آج بھی۔“

”بہن۔“ نائلہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اسی بہن کو چت کرنے کے لئے تم نے پورے ضلع کی پولیس اس کے پیچھے لگا دی۔ اسے قتل اور دیگر سنگین مقدمات میں پھنسانے کے لئے راشی پولیس افروں کو تم نے بھی لمبی رشوتیں دیں۔ شہر بھر کے غنڈے اور بد معاش اپنی بہن کے پیچھے لگا دیئے اور انہیں اس بات کی اجازت دے دی کہ میں جہاں بھی ملوں میری عزت پامال کر دی جائے اور میری لاش کسی دیرانے میں پھینک دی جائے۔ عجیب بے غیرت بھائی ہو کہ بہن کے سر سے دوپٹہ اتار لیا اور اسے سرعام برہنہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جسے مروانے کے لئے تم نے صوبہ خاں جیسے بے غیرت اور بے ضمیر پولیس آفیسر کو پانچ لاکھ روپے رشوت دیئے۔ تم نے اپنی اس بہن کو ذلیل و رسوا کر کے اور مروانے کے لئے کیا کیا جھنجھٹے استعمال نہیں کئے اور اب تمہیں خون کے رشتے اور بہن کی محبت یاد آگئی۔ میں تو سب کچھ بھول سکتی ہوں لیکن ان لوگوں کو نہیں بھول سکتی جن کے گھر تم نے اجاڑے ہیں۔ میں کیسے بھول جاؤں ان سب لوگوں کو جن کے چہرے آج بھی میری نظروں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ جن کے جسم تم

نے چھٹی کروا دیے تھے۔ جنہیں ان کے گھروں میں زندہ جلا دیا تھا۔ تمہارا تازہ ترین شکار وہ معصوم اور بے گناہ ہندو لڑکی تھی جو تمہاری ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی۔ میں نے اس ہندو لڑکی کو نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت معصوم ہوگی۔ نہیں شیردرانی! تم اس قاتل نہیں ہو کہ تمہیں معاف کیا جاسکے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔ ایسے درندے جس کے منہ کو خون لگ چکا ہے اور کسی خونی درندے کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔

”تم جذبات سے مغلوب ہو رہی ہو نائلہ۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”یہ راقل ہٹا لو اور بیٹھ جاؤ۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ یقین کرو۔ میں نے کبھی بھی تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ میں۔۔۔ میں تو تمہیں صرف مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ قتل و غارت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ موجددار کرتا رہا ہے۔“

”وہی کرتا رہا ہے لیکن تمہارے حکم پر۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”اور جب تمہیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے اور تمہارے سارے راز فاش کر دے گا تو تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔“

”تمہیں موجددار جیسے لوگوں سے ہمدردی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ کی کاری لوگ ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ مالکوں کی خدمت کرتے رہیں اور ان کے لئے جان دے دیں۔ وہ مالکوں سے زندگی بھر اس کا معاوضہ وصول کرتے رہتے ہیں اور وقت آنے پر اپنے مالکوں کو بلیک میل کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ موجددار بھی مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔“

”اور صوبہ خان؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”اس نے تو تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔“

”تم نہیں جانتیں۔ وہ موجددار سے بڑا حرامزادہ تھا۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”میں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے لیکن وہ تمہیں اپنی ملکیت سمجھ بیٹھا۔ وہ تمہاری جوانی اور حسن سے کچھ ناجائز فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے تمہیں اپنا ذاتی قیدی بنالیا لیکن جب تم اس کی قید سے بھاگ نکلیں تو اس کے ظلم کی داستان کسی طرح سندھ پولیس کے آئی جی تک پہنچ گئی۔ وہ بہت ظالم آدمی تھا۔ اس نے اپنے علاقے کے شریف لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ڈاکوؤں سے اس کے تعلقات تھے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے خلاف آئی جی کو رپورٹیں بھیجی تھیں۔ صوبہ خان کو ملازمت سے معطل کر کے اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔ وہ چند روز تک ایک ڈاکو کے ذریعے پر روپوش رہا پھر میرے پاس آگیا۔ وہ مجھے اور ماں جی کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے۔۔۔“

”گڈ!“ نائلہ مسکرا دی۔ ”میرے سامنے تم نے کم از کم دو آدمیوں کے قتل کا اعتراف تو کر لیا۔ تم دلاور کو صوبہ خان کے قتل میں پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے تمہارے اس بیان سے دلاور کی پوزیشن تو واضح ہو گئی۔“

”دیکھو نائلہ۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”دلاور ہی دراصل اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ وہ بیچ آدمی تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ تمہاری جائیداد پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر وہ بیچ میں نہ کود پڑتا تو ہمارے تعلقات میں اس قدر لگاؤ پیدا نہ ہوتا۔ رائے منصور کی شہ پر ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہمارے خاندان کو رسوا کیا گیا ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم خاندان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سارا دے سکتے ہیں۔“

”دلاور کو میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ بیچ سہی اس میں انسانیت ہے، وہ انسانی رشتوں کی قدروں کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت بھی پہچانتا ہے۔ کئی مواقع ملنے کے باوجود اس نے اپنی حد پار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور تم۔۔۔“

اچانک ہی مکان کے کسی حصے سے فائر کی آواز گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ بھی سنائی دی۔ نائلہ کو چیخ کی آواز پہچانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ دلاور کی چیخ تھی۔ نائلہ اچھل پڑی۔ اس کا دھیان ایک لمحہ کوشمیر درانی کی طرف سے ہٹا تھا۔ اسے باتوں میں لگائے رکھنے کے ساتھ ساتھ شیردرانی کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں



کوشش کرنے لگا۔

”آرام سے بڑے رہو۔“ نائلہ درانی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رانقل کی نال اس کے سینے پر رکھ کر اسے ہلکا سا جھکا دیا۔ ”ڈر گئے مجھے دیکھ کر۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”تم نے تو میری موت کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا تھا لیکن تم کاغذ کے اس ٹکڑے سے قائلہ نہ اٹھا سکے کیونکہ تمہاری گھناؤنی سازشوں کے جال کے پھندے ٹوٹ رہے تھے۔ میری طرف غور سے دیکھو۔ میں کوئی بد روح نہیں ہوں، زندہ ہوں۔ اور اب تمہارے حساب کا وقت آگیا ہے۔ تعین کرو میں تم سے اپنی ایک ایک تزیل کا حساب لوں گی اور اس کے بعد اگر تم سے کچھ بچا تو تمہیں قانون کے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ قانون تم سے ان بے گناہوں کا حساب لے سکے جو تمہاری ہوس اور ظلم و ستم کا شکار ہو چکے ہیں۔ تم نے تو ان لوگوں کو بھی نہیں چھوڑا جنہوں نے تمہاری خاطر اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے۔ تمہیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے انہوں نے کئی کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر جب انہیں تحفظ اور پناہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو تم نے انہیں بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صوبہ خاں پور موجددار کے نام تو میں جانتی ہوں۔ اس کے علاوہ اور کتنے ہوں گے جن کی خدمات کا صلہ تم نے موت کی صدمت میں دیا تھا۔ دوسروں کے بارے میں میں نہیں جانتی لیکن موجددار کا بھائی تم سے انتقام لینے کے لئے یہاں موجود ہے۔ وہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے ایک لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ ایک مرتبہ تم اسے دھوکا دے کر ہماگ چکے ہو لیکن اب وہ دھوکا نہیں کھائے گا۔“

”دیکھو نائلہ۔“ شیر درانی ایک بار پھر کنبیوں کے ٹل پر کسی قدر اوپر ہو گیا۔ ”جہاں تک دوسرے لوگوں کا سوال ہے تو ان میں سے کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن تم۔“ وہ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تمہارے اور میرے درمیان جو کچھ بھی ہو وہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے۔ تم میری کزن ہو۔ ہمیں اپنے خاندانی معاملات اس طرح دوسروں کے سامنے نہیں لانے چاہئیں۔ پہلے ہی بہت رسوائی ہو چکی ہے۔ تم اگر چاہو تو ہمارے تمام اختلافات ختم ہو سکتے ہیں۔ ہم مزید رسوائی سے بچ سکتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ ہم مزید تماشہ بننے کے بجائے یہاں سے نکل چلیں؟ تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے میں اس کی غلطی کروں گا۔ میری بات مان لو میری بہن۔“

”بہن!“ نائلہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ”میں تمہاری بہن کسے ہو گئی؟ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”میں تو ایک حسین کھلونا ہوں جس سے تم کھیلنا چاہتے تھے لیکن تمہارے ہاتھ نہ آسکی۔ میرے ماں باپ کی چھوڑی ہوئی کروڑوں کی جائیداد تک پہنچنے کا وہ زینہ تھی جسے تم ملے نہ کر سکتے۔ ہوس اور زہر پرستی کے راستے کی وہ چٹان تھی جسے تم سرنہ کر سکتے۔ میں تمہارے لئے اور تو سب کچھ تھی لیکن بہن کبھی نہیں تھی۔“

”نہیں نائلہ۔“ شیر درانی بولا۔ ”خون کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹ سکتے۔ تم کل بھی میری بہن تھیں اور آج بھی۔“

”بہن۔۔۔“ نائلہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اسی بہن کو چت کرنے کے لئے تم نے پورے ضلع کی پولیس اس کے پیچھے لگا دی۔ اسے قتل اور دیگر سنگین مقدمات میں جھنڈانے کے لئے راشی پولیس افسروں کو تم نے کئی لمبی رشوتیں دیں۔ شہر بھر کے غنڈے اور بد معاش اپنی بہن کے پیچھے لگا دیے اور انہیں اس بات کی اجازت دے دی کہ میں جہاں بھی ملوں میری عزت پامال کر دی جائے اور میری لاش کسی دیرانے میں پھینک دی جائے۔ عجیب بے غیرت بھائی ہو کہ بہن کے سر سے دوپٹہ اتار لیا اور اسے سرعام برہنہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جسے مروانے کے لئے تم نے صوبہ خاں پور بے غیرت اور بے ضمیر پولیس آفیسر کو پانچ لاکھ روپے رشوت دیئے۔ تم نے اپنی اس بہن کو ذلیل و رسوا کر کے اور مروانے کے لئے کیا کیا جھنجھٹے استعمال نہیں کئے اور اب تمہیں خون کے رشتے اور بہن کی محبت یاد آگئی۔ میں تو سب کچھ بھول سکتی ہوں لیکن ان لوگوں کو نہیں بھول سکتی جن کے گھر تم نے اجاڑے ہیں۔ میں کہنے بھول جاؤں ان سب لوگوں کو جن کے چہرے آج بھی میری نظروں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ جن کے جسم تم

نے چٹائی کروا دی تھی۔ جنہیں ان کے گھروں میں زندہ جلادیا تھا۔ تمہارا تازہ قرین شکار وہ معصوم اور بے گناہ ہندو لڑکی تھی جو تمہاری ہوس کی بیھت چڑھ گئی۔ میں نے اس ہندو لڑکی کو نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت معصوم ہوگی۔ نہیں شیردرانی! تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں معاف کیا جاسکے۔ تم۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔ ایسے درندے جس کے منہ کو خون لگ چکا ہے اور کسی خون درندے کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔

”تم جذبات سے مغلوب ہو رہی ہو نالک۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”یہ راقش ہٹالو اور بیٹھ جاؤ۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ یقین کرو۔ میں نے بھی بھی تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ میں۔ میں تو تمہیں صرف مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ قتل و غارت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ موجددار کرتا رہا ہے۔“

”وہی کرتا رہا ہے لیکن تمہارے حکم پر۔“ نالک نے جواب دیا۔ ”اور جب تمہیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ پکڑا جائے والا ہے اور تمہارے سارے راز فاش کر دے گا تو تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔“

”تمہیں موجددار جیسے لوگوں سے ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کی کاری لوگ ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ مالکوں کی خدمت کرتے رہیں اور ان کے لئے جان دے دیں۔ وہ مالکوں سے زندگی بھر اس کا معاوضہ وصول کرتے رہتے ہیں اور وقت آنے پر اپنے مالکوں کو بلیک میل کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ موجددار بھی مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔“

”اور صوبہ خان؟“ نالک نے اسے گھورا۔ ”اس نے تو تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔“ ”تم نہیں جانتیں۔ وہ موجددار سے برا حرامزادہ تھا۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”میں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے لیکن وہ تمہیں اپنی ملکیت سمجھ بیٹھا۔ وہ تمہاری جوانی اور حسن سے کچھ ناجائز فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے تمہیں اپنا ذاتی قیدی بنالیا لیکن جب تم اس کی قید سے بھاگ نکلیں تو اس کے ظلم کی داستان کسی طرح سندھ پولیس کے آئی جی تک پہنچ گئی۔ وہ بہت عالم آدمی تھا۔ اس نے اپنے علاقے کے شریف لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ڈاکوؤں سے اس کے تعلقات تھے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے خلاف آئی جی کو رپورٹیں بھیجی تھیں۔ صوبہ خان کو ملازمت سے معطل کر کے اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔ وہ چند روز تک ایک ڈاکو کے ڈیرے پر روپوش رہا پھر میرے پاس آگیا۔ وہ مجھے اور ماں جی کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے۔“

”مگر!“ نالک مسکرا دی۔ ”میرے سامنے تم نے کم از کم دو آدمیوں کے قتل کا اعتراف تو کر لیا۔ تم دلاور کو صوبہ خان کے قتل میں پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمہارے اس بیان سے دلاور کی پوزیشن تو واضح ہو گئی۔“ ”دیکھو نالک۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”دلاور ہی دراصل اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ وہ سچ آدمی تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ تمہاری جائیداد پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر وہ سچ میں نہ کوہڑتا تو ہمارے تعلقات میں اس قدر بگاڑ پیدا نہ ہوتا۔ رائے منصور کی شہ پر ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہمارے خاندان کو روسا کیا گیا ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم خاندان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دے سکتے ہیں۔“

”دلاور کو میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔“ نالک نے کہا۔ ”وہ سچ سہی اس میں انسانیت ہے، وہ انسانی رشتوں کی قدروں کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت بھی پہچانتا ہے۔ کئی مواقع ملنے کے باوجود اس نے اپنی حد پار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور تم۔“

اچانک ہی مکان کے کسی حصے سے غازی کی آواز گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ بھی سنائی دی۔ نالک کو چیخ کی آواز پہچاننے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ دلاور کی چیخ تھی۔ نالک اچھل پڑی۔ اس کا دھیان ایک لمحہ کو شیردرانی کی طرف سے ہٹا تھا۔ اسے باتوں میں لگائے رکھنے کے ساتھ ساتھ شیردرانی کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں

تھا۔ نائلہ کا دھیان جیسے ہی اس کی طرف سے ہٹا وہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کے پیر کی ٹھوکر نائلہ کے منہ پر لگی تھی۔ نائلہ چیختی ہوئی پیچھے الٹ گئی۔ رائنفل بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر گر گئی۔ شیردرانی نے بڑی پھرتی سے اس کی رائنفل کی طرف چھلانگ لگادی۔ لیکن نائلہ غافل نہیں تھی۔ وہ بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلی اور اس نے دونوں پیر شیردرانی کی گردن کے گرد لپیٹ کر پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ شیردرانی قلابازی کھاتا ہوا اگرالین اس نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ نائلہ نے اس پر کھڑی تھیلی کا وار کرنا چاہا مگر شیردرانی نے بڑی پھرتی سے نہ صرف اس کا وار روکا بلکہ اس کی کلائی پکڑ کر اس کی ٹانگ میں ایک زوردار کلک لگادی۔ نائلہ کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ شیردرانی نے ایک اور وار کیا اور پھر نائلہ کے بازو کو زوردار جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ نائلہ صوفے پر گر گئی اور صوفے سمیت دوسری طرف الٹ گئی۔

شیردرانی کے لئے بہترین موقع تھا۔ وہ اگر چاہتا تو رائنفل اٹھا کر نائلہ کو بے بس کر کے اپنے پیر چاٹنے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن وہ دو مرتبہ پہلے نائلہ کے ہاتھ دیکھ چکا تھا۔ ایک مرتبہ آموں والی حویلی میں اور دوسری مرتبہ اپنی شر والی کوٹھی میں۔ اس کے دل پر نائلہ کا خوف سایا ہوا تھا اور اس خوف نے ہی اس وقت اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے رائنفل یا نائلہ پر توجہ دینے کے بجائے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگادی۔ اس سے پہلے کہ نائلہ سنبھلتی شیردرانی کھڑکی کے باہر پہنچ چکا تھا۔ نائلہ اٹھ کر رائنفل کی طرف لپکی۔ اسی لمحہ ایک اور فائر کی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ چیخ دلاور کی نہیں کسی اور کی تھی۔ نائلہ دروازے کی طرف لپکی لیکن اسے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگادینا پڑی۔ اگر اسے ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو یہ آمد سے چلائی جانے والی پستول کی گولی اس کی کھوپڑی کے پرچھے اڑا دیتی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا باہر بھاگ گیا تھا۔ نائلہ کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف دوڑی جہاں سے پہلے فائرنگ اور چیخوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ دلاور فرش پر پڑا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بائیں بازو پر کندھے سے ذرا نیچے خون بہہ رہا تھا۔ نائلہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔

”کیا ہوا۔۔۔ یہ یہ خون۔۔۔؟“

”گولی لگی ہے، آپ۔۔۔“ دلاور بولا۔ ”آپ اسے دیکھیں نائلہ بی بی۔“ اس نے بیڈ کے دوسری طرف اشارہ کیا۔

نائلہ فوراً ہی اس طرف متوجہ ہو گئی۔ پلنگ کے دوسری طرف فرش پر ایک آدمی پڑا ہوا تھا اور اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔

”اوہ۔“ نائلہ ٹھٹھوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کی دائیں کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ شخص زندہ تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”تم کون ہو؟“ نائلہ بولی۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟ اگر تم سچ بتا دو تو تمہاری جان بچانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔“

”آدی۔“ اس شخص کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔ ”میں جانتا ہوں اب مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میرا وقت آگیا ہے۔ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے جو مجھے ملی ہے۔ میں مرتے وقت جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

”تم کون ہو۔ شیردرانی اور دوسرا آدمی کہاں گئے؟“ نائلہ درانی نے پوچھا۔

”میرا نام پیرل ہے۔ میں جبار سامیں کا نوکر ہوں۔“ وہ شخص رک رک کر کہہ رہا تھا۔ ”جبار شریف آدمی تھا لیکن یہاں آکر اسے شرکی ہوا لگ گئی تھی۔ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ مل گیا تھا۔ اس نے کسی ڈاکے میں کبھی خود حصہ نہیں لیا لیکن ڈاکوؤں کو پناہ دیتا تھا۔ وہ لوگ واردات کرنے کے بعد کئی کئی روز یہاں چھپے رہتے تھے اور ڈاکو اسے اپنی لوٹ میں سے حصہ دیتے تھے۔ مجھے بھی حصہ ملتا تھا۔ میں یہاں سے جانا چاہتا تھا مگر جبار نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں یہاں سے جانے کا خیال دل میں لایا یا میں نے یہ راز کھولا تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں۔۔۔

میں۔۔۔ پیرل کی آواز مزید کمزور ہو گئی۔ ”میں جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہوگا۔ جبار نے تمہارے ساتھی کو گولی ماری تو میں نے جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس بد بخت نے مجھ پر بھی گولی چلا دی۔ بہت اچھا ہوا۔ مجھ جیسے آدمی کا یہی انجام ہونا چاہئے۔“

”وہ لوگ کہاں گئے ہوں گے؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”رئیس شاہنواز کے بچلے پر۔ وہی انہیں پناہ دے سکتا ہے۔“ پیرل نے جواب دیا۔ اب وہ رک رک کر بول رہا تھا جیسے سانس اکٹھ رہی ہو۔

”رئیس شاہنواز؟“ نائلہ یہ نام سن کر چونک گئی۔ ”یہ ڈیپلو وا لے رئیس کریم بخش کا بیٹا تو نہیں؟“  
 ”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ ہی۔۔۔ بد۔۔۔ معا۔۔۔ ش۔۔۔“

”وہ کہاں رہتا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا اور اس کی آواز سننے کے لئے کان اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔  
 ”ڈی۔۔۔ ڈی۔۔۔ سلوا۔۔۔“ پیرل جملہ پورا نہیں کر سکا۔ اس کی زبان بیشہ بیشہ کے لئے بند ہو چکی تھی۔

نائلہ درانی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دلاور کی طرف دیکھا۔  
 ”شیر درانی بھاگ گیا؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ تمہارے بازو کا یہ زخم۔۔۔“  
 ”گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی ہے۔“ دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے تو اتنے زخم کھائے ہیں کہ اب کسی نئے زخم کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔“  
 ”اپنی رائفل اٹھاؤ اور نکلو یہاں سے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ دونوں تو فرار ہو چکے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم

دونوں دھر لے جائیں۔“

دلاور نے کرسی کی پشت پر پڑا ہوا سرخ رنگ کا تولیہ اٹھا کر اپنے کندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا بازو بھی چھپ گیا۔ پھر اس نے رائفل اٹھائی اور نائلہ کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ نائلہ آگن عبور کرتی ہوئی بیرونی دروازے کے قریب رک گئی۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی بھی گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اور غالباً کچھ ہی دیر میں سورج بھی طلوع ہونے والا تھا۔ وہ دونوں مکان سے نکل کر دوڑتے ہوئے اپنی کار کے قریب پہنچ گئے۔ دلاور نے سیٹ اٹھا کر رائفلیں اس کے نیچے چھپائیں۔ اتنی دیر میں نائلہ اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارت کر چکی تھی۔ دلاور کے بیٹھے ہی کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ آس پاس کی گلیوں میں سناٹا تھا۔ گلیوں کی آواز سن کر کوئی بھی شخص گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔

کار مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئی کالونی کے مین روڈ پر آگئی اور پھر نائلہ نے کار اس تنگ سی سڑک پر موڑ دی جو سیدھی جمیل کی دیوار کے ساتھ ہوتی ہوئی نیو ٹاؤن تھانے والے چوراہے پر جا نکلتی تھی۔

اس طرف بسوں اور دیگر گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ نائلہ نے کار کا رخ سبزی منڈی کی طرف موڑ دیا۔ سبزی منڈی کے قریب ایک پولیس موہاں کھڑی تھی۔ کبین کی چمٹ پر سب مشین گن فٹ تھی اور پولیس کا ایک جوان بھی مستعد کھڑا تھا۔ وہ سڑک پر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو گھور رہا تھا۔

حسن اسکو اتر پر بھی پولیس کی دو موہاں کھڑی تھیں۔ پولیس اہلکار مستعد تھے لیکن یہاں بھی گاڑیوں کو نہیں روکا جا رہا تھا۔ نائلہ بڑے اطمینان سے اپنی گاڑی نکال لے گئی۔

دلاور پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے زخمی بازو کو ذرا اوپر سے دبا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

آدھے گھنٹے بعد نائلہ اپنے بچلے پر پہنچ گئی۔ اندر گاڑی روکتے ہی وہ نیچے اتر کر کمرے کی طرف دوڑی۔ باہر کو

تھا۔ نائلہ کا دھیان جیسے ہی اس کی طرف سے ہٹا وہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کے پیر کی ٹھوکر نائلہ کے منہ پر لگی تھی۔ نائلہ جھنجھتی ہوئی پیچھے الٹ گئی۔ رائٹل بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر گر گئی۔ شیر درانی نے بڑی پھرتی سے اس کی رائٹل کی طرف چھلانگ لگادی۔ لیکن نائلہ غافل نہیں تھی۔ وہ بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلی اور اس نے دونوں پیر شیر درانی کی گردن کے گرد لپیٹ کر پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ شیر درانی قلابازی کھاتا ہوا گرا لیکن اس نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ نائلہ نے اس پر کھڑی ہتیلی کا وار کرنا چاہا مگر شیر درانی نے بڑی پھرتی سے نہ صرف اس کا وار روکا بلکہ اس کی کلائی پکڑ کر اس کی بغل میں ایک زوردار کک لگادی۔ نائلہ کے منہ سے کراہی نکل گئی۔ شیر درانی نے ایک اور وار کیا اور پھر نائلہ کے بازو کو زوردار جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ نائلہ صوفے پر گری اور صوفے سمیت دوسری طرف الٹ گئی۔

شیر درانی کے لئے بہترین موقع تھا۔ وہ اگر چاہتا تو رائٹل اٹھا کر نائلہ کو بے بس کر کے اپنے پیر چاٹنے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن وہ دو مرتبہ پہلے نائلہ کے ہاتھ دیکھ چکا تھا۔ ایک مرتبہ آموں والی حویلی میں اور دوسری مرتبہ اپنی شروالی کوٹھی میں۔ اس کے دل پر نائلہ کا خوف سایا ہوا تھا اور اس خوف نے ہی اس وقت اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے رائٹل یا نائلہ پر توجہ دینے کے بجائے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگادی۔

اس سے پہلے کہ نائلہ سنبھلتی شیر درانی کھڑکی کے باہر پہنچ چکا تھا۔ نائلہ اٹھ کر رائٹل کی طرف لپکی۔ اسی لمحہ ایک اور فائز کی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ جج دلاور کی نہیں کسی اور کی تھی۔ نائلہ دروازے کی طرف لپکی لیکن اسے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگادینا پڑی۔ اگر اسے ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو برآمدے سے چلائی جانے والی بوتل کی گولی اس کی کھوپڑی کے پرچھے اڑا دیتی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا باہر بھاگ گیا تھا۔ نائلہ کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف دوڑی جہاں سے پہلے فائزنگ اور چیخوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ دلاور فرش پر پڑا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بائیں بازو پر کندھے سے ذرا نیچے خون بہہ رہا تھا۔ نائلہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔

”کیا ہوا۔۔۔ یہ یہ خون۔۔۔؟“

”گولی لگی ہے، آپ۔۔۔“ دلاور بولا۔ ”آپ اسے دیکھیں نائلہ بی بی۔“ اس نے بیڈ کے دوسری طرف اشارہ کیا۔

نائلہ فوراً ہی اس طرف متوجہ ہو گئی۔ پتنگ کے دوسری طرف فرش پر ایک آدمی پڑا ہوا تھا اور اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔

”اوہ۔“ نائلہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کی دائیں کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ شخص زندہ تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”تم کون ہو؟“ نائلہ بولی۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟ اگر تم سچ بتا دو تو تمہاری جان بچانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔“

”آدی۔“ اس شخص کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔ ”میں جانتا ہوں اب مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میرا وقت آگیا ہے۔ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے جو مجھے ملی ہے۔ میں مرتے وقت جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

”تم کون ہو۔ شیر درانی اور دوسرا آدمی کہاں گئے؟“ نائلہ درانی نے پوچھا۔

”میرا نام پیرل ہے۔ میں جبار ساتیس کا نوکر ہوں۔“ وہ شخص رک رک کر کہہ رہا تھا۔ ”جبار شریف آدمی تھا لیکن میاں آکر اسے شرکی ہوا لگ گئی تھی۔ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ مل گیا تھا۔ اس نے کسی ڈاکے میں کبھی خود حصہ نہیں لیا لیکن ڈاکوؤں کو پناہ دیتا تھا۔ وہ لوگ واردات کرنے کے بعد کئی کئی روز بیتاں چھپے رہتے تھے اور ڈاکو اسے اپنی لوٹ میں سے حصہ دیتے تھے مجھے بھی حصہ ملتا تھا۔ میں میاں سے جانا چاہتا تھا مگر جبار نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں میاں سے جانے کا خیال دل میں لایا یا میں نے یہ راز کھولا تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں۔

میں۔۔۔ پیرل کی آواز مزید کمزور ہو گئی۔ ”میں جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہوگا۔ جبار نے تمہارے ساتھی کو گولی ماری تو میں نے جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس بد بخت نے مجھ پر بھی گولی چلا دی۔ بہت اچھا ہوا۔ مجھ جیسے آدمی کا یہی انجام ہونا چاہئے۔“

”وہ لوگ کہاں گئے ہوں گے؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”رئیس شاہنواز کے بچکے پر۔ وہی انہیں پناہ دے سکتا ہے۔“ پیرل نے جواب دیا۔ اب وہ رک رک کر بول رہا تھا جیسے سانس اکھڑ رہی ہو۔

”رئیس شاہنواز!“ نائلہ یہ نام سن کر چونک گئی۔ ”یہ ڈھیلو والے رئیس کریم بخش کا بیٹا تو نہیں؟“

”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ ہی۔۔۔ بد۔۔۔ محلہ۔۔۔ ش۔۔۔“  
 ”وہ کہاں رہتا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا اور اس کی آواز سننے کے لئے کان اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔

”ڈی۔۔۔ ڈی۔۔۔ سلوا۔۔۔“ پیرل جملہ پورا نہیں کر سکا۔ اس کی زبان بیشہ بیشہ کے لئے بند ہو چکی تھی۔  
 نائلہ درانی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دلاور کی طرف دیکھا۔  
 ”شیر درانی بھاگ گیا؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ تمہارے بازو کا یہ زخم۔۔۔“  
 ”گولی گوشت چرتی ہوئی نکل گئی ہے۔“ دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے تو اتنے زخم کھائے ہیں کہ اب کسی نئے زخم کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔“

”اپنی رات نکل اٹھاؤ اور نکلو یہاں سے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ دونوں تو فرار ہو چکے ہیں کیس ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں دھرتے جائیں۔“

دلاور نے کرسی کی پشت پر پڑا ہوا سرخ رنگ کا تولیہ اٹھا کر اپنے کندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا بازو بھی دلاور نے کرسی کی پشت پر پڑا ہوا سرخ رنگ کا تولیہ اٹھا کر اپنے کندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا بازو بھی چھپ گیا۔ پھر اس نے رات نکل اٹھاؤ اور نکلو یہاں سے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”وہ دونوں تو فرار ہو چکے ہیں کیس ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں دھرتے جائیں۔“

دروازے کے قریب رک گئی۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی بھی گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔  
 دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اور غالباً کچھ ہی دیر میں سورج بھی طلوع ہونے والا تھا۔ وہ دونوں مکان سے نکل کر دوڑتے ہوئے اپنی کار کے قریب پہنچ گئے۔ دلاور نے سیٹ اٹھا کر رات نکل لیا اس کے نیچے چھپا لیا۔ اتنی دیر میں نائلہ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر ایجن اشارت کر چکی تھی۔ دلاور کے بیٹھے ہی کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ آس پاس کی گلیوں میں سناٹا تھا۔ گولیوں کی آواز سن کر کوئی بھی شخص گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔

کار مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئی کالونی کے مین روڈ پر آگئی اور پھر نائلہ نے کار اس تنگ سی سڑک پر موڑ دی جو سیدھی جمیل کی دیوار کے ساتھ ہوتی ہوئی نیو ٹاؤن تھانے والے چوراہے پر جا نکلتی تھی۔

اس طرف بسوں اور دیگر گاڑیوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ نائلہ نے کار کا رخ سبزی منڈی کی طرف موڑ دیا۔ سبزی منڈی کے قریب ایک پولیس موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ لیکن کی چھت پر سب مشین گن فٹ تھی اور پولیس کا ایک جوان بھی مستعد کھڑا تھا۔ وہ سڑک پر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو گھور رہا تھا۔

حسن اسکوائر پر بھی پولیس کی دو موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ پولیس اہلکار مستعد تھے لیکن یہاں بھی گاڑیوں کو نہیں روکا جا رہا تھا۔ نائلہ بڑے اطمینان سے اپنی گاڑی نکال لے گئی۔

دلاور پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے زخمی بازو کو ذرا اوپر سے دبا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

آدھے گھنٹے بعد نائلہ اپنے بچکے پر پہنچ گئی۔ اندر گاڑی روکتے ہی وہ نیچے اتر کر کمرے کی طرف دوڑی۔ باہر کا

کیٹ سلطانہ نے کھولا تھا۔ وہ نالکہ کی بدحواسی دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اور جب اس نے دلاور کو گاڑی سے اترتے دیکھا تو اس کی پریشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ دلاور کے بازو پر لپٹا ہوا تولیہ بھی خون سے تر ہو چکا تھا۔

”ارے کیا ہوا؟“ سلطانہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

”کچھ نہیں سلطانہ بی بی۔ گولی لگی ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”گولی لگی ہے اور کمرہ رہے ہو کچھ نہیں۔“ سلطانہ نے اسے گھورا اور بازو سے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے

آئی۔

کچھ ہی دیر بعد نالکہ بھی فرسٹ ایڈ بکس لے کر آئی۔ اس نے بکس میز پر رکھ دیا اور دلاور کو صوفے پر بٹھا کر اس کی قیض اتارنے لگی۔

”نالکہ بی بی پریشان نہ ہوں۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔“ دلاور نے کہا۔

”زخم چھوٹا ہوا ہے۔ زخم ہی ہوتا ہے۔“ نالکہ نے کہا اور اسپرٹ سے اس کا زخم صاف کرنے لگی۔

سلطانہ قریب کھڑی بڑی دلچسپ نظروں سے نالکہ کو دیکھ رہی تھی۔ دلاور کو تکلیف میں دیکھ کر وہ کس قدر بدحواس ہو رہی تھی۔ اس سے اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہیں تھا کہ اس کے دل میں دلاور کے لئے بے پناہ محبت تھی۔

اسپرٹ سے زخم صاف کرنے کے بعد نالکہ نے دوا لگائی اور ڈرنجنگ کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر اب کسی قدر ملانیت سی آئی تھی کیونکہ گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی اور زخم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس لئے تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔

”شکر ہے گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اندر رہ جاتی تو پریشانی ہوتی۔“ نالکہ نے تمام چیزیں فرسٹ ایڈ بکس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ صرف ایک گولی تھی۔“ دلاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چند مہینے پہلے جب صادق آباد کے قریب صوبہ خان کے آدمیوں نے ہماری گاڑی پر حملہ کیا تھا اور وہ لوگ آپ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس وقت مجھے سات گولیاں لگی تھیں۔“

”سات گولیاں؟“ سلطانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اس کے باوجود تم بچ گئے؟“

”میں صرف ایک بات جانتا ہوں سلطانہ بی بی۔“ دلاور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”آدمی اتنی ہی زندگی اس دنیا میں گزارتا ہے جتنی وہ لے کر آتا ہے۔ اگر میری زندگی باقی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں مار سکتی۔ اور اگر میرا وقت پورا ہو چکا ہو تو میں ایک بل بھی زیادہ سانس نہیں لے سکتا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر نالکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت مجھے افسوس اس بات کا ہوا تھا کہ میں نالکہ بی بی کو نہیں بچا سکا تھا۔ اور نہ ہی روشن اور اس کے بیٹے کی کوئی مدد کر سکا تھا۔ وہ دونوں جھلٹی ہو گئے تھے لاقعداد گولیاں لگی تھیں ان کے جسموں میں۔ ان ماں بیٹے کی موت میں بھی نہیں بھول سکوں گا۔“

نالکہ خاموش بیٹھی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟ اپنی جان کی بازی کیوں لگائے ہوئے ہو؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”نالکہ بی بی کے لئے جی۔“ دلاور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

سلطانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اس نے نالکہ کی طرف دیکھا۔ وہ ہلک جھپکے بغیر دلاور کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کہاں چلی گئیں؟“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔

”اوہ۔۔۔ لگ۔۔۔ کچھ نہیں۔“ نالکہ درانی ایک دم جیسے چونک گئی۔

حقیقت یہ تھی کہ وہ دلاور کے بارے میں سوچ رہی تھی دلاور جسے رائے منصور نے اس کا باڈی گارڈ مقرر

کیا تھا۔ ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ان دونوں کی معاشی اور سماجی حیثیتوں میں بھی فاصلے مائل تھے۔ کوئی برابری نہیں تھی ان میں۔ دلاور اس کا زرخیز غلام بھی نہیں تھا۔ لیکن اس نے کئی مرتبہ نائلہ کے لئے جان کی بازی لگادی تھی۔ کئی مرتبہ موت کے منہ میں چلا تک لگائی تھی۔ آخری مرتبہ صوبہ خان کے آدمیوں نے اسے اغواء کرنے کے لئے جب گاڑی پر حملہ کیا تھا تو اس نے دلاور کو کئی گولیاں کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ وہ تو چند روز پہلے تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ دلاور مرچکا ہو گا لیکن راجستھان سے واپس آنے کے بعد جب اس نے ٹیلی فون پر رائے منصور سے بات کی تھی تو اسے پتہ چلا تھا کہ دلاور زندہ ہے۔ وہ اس وقت شدید زخمی ہوا تھا اور رائے منصور نے بتایا تھا کہ وہ پوری طرح ٹھیک ہوئے بغیر اس کی تلاش میں سندھ کے گوشوں میں بھٹکا رہا تھا۔

نائلہ ایک بار پھر گری سوچ میں غرق ہو گئی۔ ”آخر دلاور کو کیا لگا تھا اس سے؟ وہ اس کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر کیوں لئے پھر رہا ہے۔ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟ کہیں اور جا کر آرام و سکون کی زندگی بسر کیوں نہیں کرتا؟ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ خود دلاور کا خیال دل میں کیوں بسائے ہوئے ہے؟ ہر وقت اس کے بارے میں کیوں سوچتی رہتی ہے؟ دلاور کا خیال تو اس وقت بھی اس کے دل سے نہیں نکلا تھا جب وہ راجستھان کے کیمپ میں زندگی کے ٹھن ترن لمحات گزار رہی تھی۔ وہ اس کی تکلیف پر اس طرح کیوں تڑپ اٹھتی ہے۔ دلاور کے تصور سے اس کے دل میں گم گمادی کیوں ہونے لگتی ہے اور اس کے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں کیوں بچھنے لگتی ہیں؟“

”کیا سوچ رہی ہیں نائلہ بی بی؟“ دلاور کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر چوک گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سلطانہ وہاں نہیں تھی۔ وہ شاید جان بوجھ کر وہاں سے کھسک گئی تھی۔

”کچھ نہیں دلاور۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ یہ سب کچھ کب ختم ہو گا۔ ہم کبھی کبھی سانس کب لیں گے؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا نائلہ بی بی۔“ دلاور نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں جو ہوں آپ کے ساتھ۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ پر آج نہیں آنے دوں گا۔“

دلاور نے پہلے بھی کئی مرتبہ بھاگ دوڑ میں اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ لیکن نائلہ نے ایسی کیفیت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس وقت دلاور کے ہاتھ کے لمس سے اسے اپنے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس نے دلاور کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چمڑانے کی کوشش نہیں کی۔

بلکے بلکے قدموں کی آہٹ سن کر وہ دونوں چوک گئے۔ نائلہ نے جلدی سے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اسی لمحہ سلطانہ ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ چائے بنا کر لائی تھی۔ اس نے ایک ایک کپ ان دونوں کے سامنے رکھ دیا اور ایک خود اٹھا لیا۔

”کیا فیصلہ کیا ہے تم لوگوں نے؟“ سلطانہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب؟ کیا فیصلہ؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”میں تم لوگوں کی زندگی کے فیصلے کے بارے میں نہیں پوچھ رہی۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں کی زندگیوں کے فیصلے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جو اس کمرے میں بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ میں ان مشنوں کو پکا پکا کر نہیں کھلا سکتی۔“

”اوہ! آپس تو میں بھول ہی گئی تھی۔“ نائلہ نے چہرے چمکتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ان کی بھی خبر لیتے ہیں۔“

نائلہ، دلاور کے خیالات میں کھوکھریاں ملاح اور اس کے ساتھی کو واقعی بھول گئی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ صوفے سے اٹھ گئی۔

”تمہارا وہ مولوی عبدالقدوس کہاں ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”اب اسے آپ مولوی نہیں کہہ سکتیں۔ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ دیکھو۔ کیا لگ رہا ہے۔“



عبدالقدوس۔ ”اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

اسی لمحہ عبدالقدوس اندر داخل ہوا۔ نائلہ اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ عبدالقدوس جیسے ابھی ابھی شیوہ کر کے آیا تھا۔ اس نے بے ترتیب مونچھیں بھی صاف کر دی تھیں۔ اس حالت میں وہ واقعی بڑا سارٹ لگ رہا تھا۔

”تو گویا تم دونوں نے فیصلہ کر لیا؟“ نائلہ نے مسکراتی ہوئی نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔

”کیسا فیصلہ؟“ سلطانہ نے اسے گھورا۔

”کچھ نہیں، بعد میں بات کروں گی۔“ نائلہ نے کہا اور دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آؤ دلاور۔ ذرا ان دونوں کی خبر بھی لیں۔“

وہ دونوں اس کمرے میں آگئے جہاں بشیر ملاح اور اس کا ساتھی خانو بندھے ہوئے تھے۔

”ارے ادی۔“ بشیر ملاح، نائلہ کو دیکھتے ہی بولا۔ ”ارے بابا، ہم لوگوں کو کوئی چائے شائے بھی پلاؤ نا۔ یا ایسے

بھوکے بڑے رہیں گے۔“

”تمہیں بھوکا تو نہیں رہنے دیں گے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ تم نے مجھے ادی

کہا ہے اور۔۔۔“

”یہ الفاظ مرد کے منہ سے نکلے ہیں ادی۔“ بشیر ملاح نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہم سندھی لوگ جب کسی لڑکی کو بہن کہتے ہیں تو اسے بہن ہی سمجھتے ہیں۔ جان دے دیتے ہیں، بہن کی عزت پر حرف نہیں آنے دیتے۔ کبھی وقت آئے تو آزمائتا بھائی کو۔“

”اوہ، لیکن شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ اس وقت ہماری قید میں ہو اور تمہارے ہاتھوں سے بہت سے بے گناہ مارے جا چکے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”جانتا ہوں ادی۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”میں نے تمہیں ادی اس لئے نہیں کہا کہ مجھے چھوڑ دو۔ میں نے ایک نہیں بہت سے جرائم کئے ہیں اور مجھے ان جرائم کی سزا ملنی چاہئے۔ اسی لئے تو میں نے رات ہی کو کہا تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔“

”پولیس کے حوالے تو کیا ہی جائے گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ ڈی سلوا کون ہے؟“ نائلہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”ڈی سلوا۔۔۔ یہ کیا چیز ہے ادی؟“ بشیر ملاح نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کسی آدمی کا نام ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”ہم نے آج صبح پی آئی بی کالونی میں تمہارے دوست جبار کے مکان پر چھاپہ مارا تھا۔ بشیر درانی اور جبار بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ جبار نے نہ صرف میرے اس ساتھی کو گولی مار کر زخمی کر دیا بلکہ اپنے نوکر کو بھی گولی مار دی۔ وہ مر گیا ہے لیکن مرنے سے پہلے میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا سکتے ہیں تو اس کے منہ سے صرف ڈی سلوا کا لفظ نکلا تھا۔ وہ بات پوری کرنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں جانتا چاہتی ہوں ڈی سلوا کون ہے؟“

”اوہ۔۔۔ سمجھ گیا۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”ڈی سلوا کسی آدمی کا نام نہیں ہے۔ یہاں کا ایک علاقہ ہے۔ ڈی سلوا ٹاؤن۔۔۔ اب تو اس کا نام بدل گیا ہے۔ اقبال ٹاؤن کہلاتا ہے لیکن بہت سے لوگ اب بھی اسے ڈی سلوا ٹاؤن ہی بولتے ہیں لیکن۔ وہاں کون ہے، کس کا نام بتایا تھا اس نے؟“

”رئیس شاہنواز کو جانتے ہو؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”رئیس شاہنواز۔۔۔ وہ ڈھیلو والا۔۔۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”اسے کون نہیں جانتا۔ وہ تو ڈاکوؤں کا ڈاکو ہے۔ میں بھی اس سے چوٹ کھایا ہوا ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ آج تک میرے ہاتھ نہیں لگا۔ کئی سال پہلے ایک مرتبہ میرے جال میں پھنسا بھی تھا تو اس کے باپ کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا میں نے۔ بہت شریف آدمی ہے اس کا باپ۔“

ملت مندوں میں ایسے شریف آدمی کم ہی ہوتے ہیں۔“

”رئیس کریم بخش واقعی بہت شریف آدمی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”تنت۔ تم اسے جانتی ہوادی۔“ بشیر ملاح نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھی طرح۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ ڈی سلوا ٹاؤن میں کون ہے؟ میرا

مطلب ہے رئیس شاہنواز کا وہاں اپنا مکان ہے یا وہ کسی اور کے پاس رہتا ہے؟“

”اس کا اپنا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہےادی۔ لیکن چند روز پہلے مجھے بھی پتہ چلا تھا کہ وہ کراچی آیا ہوا ہے۔ پہلے وہ

موسائی میں اپنے کسی دوست کے پاس تھا پھر پتہ چلا کہ وہاں سے بھاگ کر سجاد کے پاس چلا گیا۔ میرا خیال ہے ڈی

سلوا میں سجاد ہی کا مکان ہوگا۔ لیکن میں نے وہ مکان دیکھا نہیں ہے۔ مگرادی، تم جیسے لوگ تو آسانی سے ایسے

لوگوں کا پتہ چلا سکتے ہیں۔“

”شیردرانی پاتال میں بھی چلا جائے تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔“ نائلہ نے کہا۔

”ادی!“ بشیر ملاح اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں کچھ کھلاؤ پلاؤ، پھر پولیس کے حوالے کر دو۔۔۔ وہاں

اتھ بھر تو کھلے رہیں گے۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا اور دلاور کو اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

ایک گھنٹے بعد بشیر ملاح اور اس کے ساتھی کو ناشتہ وغیرہ کروادیا گیا۔ پھر نائلہ نے اپنے علاقے کے پولیس

اطیشین کا نمبر فون پر ملایا۔

”ایس ایچ او صاحب تعریف رکھتے ہیں؟“ نائلہ نے دوسری طرف کی آواز سن کر کہا۔

”جی ٹھیک ہیں، آپ کون ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”وہ مجھے نہیں جانتے۔ میری بات کرو ایسے۔“ نائلہ نے کہا۔

چند منٹ خاموشی رہی پھر ریسپورڈر ایس ایچ او کی آواز سنائی دی۔

”میں وہی پراسرار لڑکی بول رہی ہوں ایس ایچ او صاحب۔“ نائلہ نے اس کی آواز سن کر کہا۔ ”بشیر ملاح کا

ام نام ہے، کبھی آپ نے؟“

”اوہ آپ۔“ ایس ایچ او بولا۔ ”بشیر ملاح سندھ کا بدنام ڈاکو ہے۔ اس کے سر کی پندرہ لاکھ روپے قیمت مقرر

ہے لیکن آپ۔۔۔“

”مگر بشیر ملاح آپ کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے تو؟“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ابنی ایسی قسمت کہاں؟“ ایس ایچ او نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”کبھی کبھی قسمت کی دیوی مہربان بھی ہو جاتی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ تھانے ہی میں رہئے۔ میں بعد میں

آپ سے بات کروں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا اور بشیر ملاح والے کمرے میں جا کر بتایا کہ کچھ دیر بعد ان دونوں کو پولیس کے حوالے

کر دیا جائے گا۔

”مجھے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے میری ایک درخواست ہےادی۔“ بشیر ملاح بولا۔

”کیا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں مان جند کے ایک وڈیو سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ٹیلی فون پر کال بک کرانی پڑے گی۔“ بشیر ملاح نے

کہا۔

”کون ہے وہ؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ ہمیں اپنی حویلی میں پناہ دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی تین برغالی اس کی تحویل میں ہیں۔ انہیں تاوان کے

لغلولہ کیا گیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔“

عبدالقدوس۔ ”اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی لمحہ عبدالقدوس اندر داخل ہوا۔ نالکہ اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ عبدالقدوس جیسے ابھی ابھی شیو کر کے آیا تھا۔ اس نے بے ترتیب مونچھیں بھی صاف کر دی تھیں۔ اس حالت میں وہ واقعی بڑا اسارت لگ رہا تھا۔

”تو گویا تم دونوں نے فیصلہ کر لیا؟“ نالکہ نے مسکراتی ہوئی نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔

”کیسا فیصلہ؟“ سلطانہ نے اسے گھورا۔

”کچھ نہیں“ بعد میں بات کروں گی۔“ نالکہ نے کہا اور دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آؤ دلاور۔ ذرا ان دونوں کی خبر بھی لیں۔“

وہ دونوں اس کمرے میں آگئے جہاں بشیر ملاح اور اس کا ساتھی خانو بھٹے ہوئے تھے۔

”ارے ادی۔“ بشیر ملاح، نالکہ کو دیکھتے ہی بولا۔ ”ارے بابا، ہم لوگوں کو کوئی چائے شائے بھی پلاؤ نا۔ یا ایسے بھوکے بڑے رہیں گے۔“

”تمہیں بھوکا تو نہیں رہنے دیں گے۔“ نالکہ نے جواب دیا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ تم نے مجھے ادی کہا ہے اور۔۔۔“

”یہ الفاظ مرد کے منہ سے نکلے ہیں ادی۔“ بشیر ملاح نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہم سندھی لوگ جب کسی لڑکی کو بہن کہتے ہیں تو اسے بہن ہی سمجھتے ہیں۔ جان دے دیتے ہیں، بہن کی عزت پر حرف نہیں آنے دیتے۔ کبھی وقت آنے تو آتا لیکن بھائی کو۔“

”اوه، لیکن شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ اس وقت ہماری قید میں ہو اور تمہارے ہاتھوں سے بہت سے بے گناہ مارے جا چکے ہیں۔“ نالکہ نے کہا۔

”جانتا ہوں ادی۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”میں نے تمہیں ادی اس لئے نہیں کہا کہ مجھے چھوڑ دو۔ میں نے ایک نہیں بہت سے جرائم کئے ہیں اور مجھے ان جرائم کی سزا ملنی چاہئے۔ اسی لئے تو میں نے رات ہی کو کہا تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔“

”پولیس کے حوالے تو کیا ہی جائے گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ ڈی سلوا کون ہے؟“ نالکہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”ڈی سلوا۔۔۔ یہ کیا چیز ہے ادی؟“ بشیر ملاح نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کسی آدمی کا نام ہے۔“ نالکہ نے کہا۔ ”ہم نے آج صبح پی آئی بی کالونی میں تمہارے دوست جبار کے مکان پر چھاپہ مارا تھا۔ بشیر درانی اور جبار بھاگے میں کامیاب ہو گئے۔ جبار نے نہ صرف میرے اس ساتھی کو گولی مار کر زخمی کر دیا بلکہ اپنے نوکر کو بھی گولی مار دی۔ وہ مر گیا ہے لیکن مرنے سے پہلے میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا سکتے ہیں تو اس کے منہ سے صرف ڈی سلوا کا لفظ نکلا تھا۔ وہ بات پوری کرنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں جانا چاہتی ہوں ڈی سلوا کون ہے؟“

”اوه۔۔۔ سمجھ گیا۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”ڈی سلوا کسی آدمی کا نام نہیں ہے۔ یہاں کا ایک علاقہ ہے۔ ڈی سلوا ٹاؤن۔۔۔ اب تو اس کا نام بدل گیا ہے۔ اقبال ٹاؤن کہلاتا ہے لیکن بہت سے لوگ اب بھی اسے ڈی سلوا ٹاؤن ہی بولتے ہیں لیکن۔۔۔ وہاں کون ہے، کس کا نام بتایا تھا اس نے؟“

”رئیس شاہنواز کو جانتے ہو؟“ نالکہ نے پوچھا۔

”رئیس شاہنواز۔۔۔ وہ ڈیہلو والا۔۔۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”اسے کون نہیں جانتا۔ وہ تو ڈاکوؤں کا ڈاکو ہے۔ میں بھی اس سے چوٹ کھایا ہوا ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ آج تک میرے ہاتھ نہیں لگا۔ کئی سال پہلے ایک مرتبہ میرے جال میں پھنسا بھی تھا تو اس کے باپ کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا میں نے۔ بہت شریف آدمی ہے اس کا باپ۔“

دولت مندوں میں ایسے شریف آدمی کم ہی ہوتے ہیں۔“

”رئیس کریم بخش واقعی بہت شریف آدمی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”تھت۔ تم اسے جانتی ہوادی۔“ بشیر ملاح نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھی طرح۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ ڈی سلوا ٹاؤن میں کون ہے؟ میرا

مطلب ہے رئیس شاہواز کا وہاں اپنا مکان ہے یا وہ کسی اور کے پاس رہتا ہے؟“

”اس کا اپنا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ادی۔ لیکن چند روز پہلے مجھے بھی پتہ چلا تھا کہ وہ کراچی آیا ہوا ہے۔ پہلے وہ

سوسائٹی میں اپنے کسی دوست کے پاس تھا پھر پتہ چلا کہ وہاں سے بھاگ کر سجاد کے پاس چلا گیا۔ میرا خیال ہے ڈی

سلوا میں سجاد ہی کا مکان ہوگا۔ لیکن میں نے وہ مکان دیکھا نہیں ہے۔ مگر ادی، تم جیسے لوگ تو آسانی سے ایسے

لوگوں کا پتہ چلا سکتے ہیں۔“

”شیردرانی پاتال میں بھی چلا جائے تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔“ نائلہ نے کہا۔

”ادی!“ بشیر ملاح اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں کچھ کھلاؤ پلاؤ، پھر پولیس کے حوالے کر دو۔ وہاں

ہاتھ چیر تو کھلے رہیں گے۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا اور دلاور کو اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

ایک گھنٹے بعد بشیر ملاح اور اس کے ساتھی کو ناشتہ وغیرہ کروادیا گیا۔ پھر نائلہ نے اپنے علاقے کے پولیس

اشیش کا نمبر فون پر ملایا۔

”ایس ایچ او صاحب تعریف رکھتے ہیں؟“ نائلہ نے دوسری طرف کی آواز سن کر کہا۔

”جی ٹھیک ہیں، آپ کون ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”وہ مجھے نہیں جانتے۔ میری بات کروائیے۔“ نائلہ نے کہا۔

چند منٹ خاموشی رہی پھر ریسورپر ایس ایچ او کی آواز سنائی دی۔

”میں وہی پر اسرار لڑکی بول رہی ہوں ایس ایچ او صاحب۔“ نائلہ نے اس کی آواز سن کر کہا۔ ”بشیر ملاح کا

نام سنا ہے کبھی آپ نے؟“

”اوہ آپ۔“ ایس ایچ او بولا۔ ”بشیر ملاح سندھ کا بدنام ڈاکو ہے۔ اس کے سر کی پندرہ لاکھ روپے قیمت مقرر

ہے لیکن آپ۔۔۔“

”اگر بشیر ملاح آپ کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے تو؟“ نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اپنی ایسی قسمت کہاں؟“ ایس ایچ او نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”کبھی کبھی قسمت کی دیوی مہربان بھی ہو جاتی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ تھانے ہی میں رہے۔ میں بعد میں

آپ سے بات کروں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا اور بشیر ملاح والے کمرے میں جا کر بتایا کہ کچھ دیر بعد ان دونوں کو پولیس کے حوالے

کر دیا جائے گا۔

”مجھے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے میری ایک درخواست ہے ادی۔“ بشیر ملاح بولا۔

”کیا؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں مان چند کے ایک وڈیرے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ٹیلی فون پر کال بک کرانی پڑے گی۔“ بشیر ملاح نے

کہا۔

”کون ہے وہ؟“ نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ ہمیں اپنی حویلی میں پناہ دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی تین رہنما اس کی تحویل میں ہیں۔ انہیں تاوان کے

لئے لایا گیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔“

”گویا وہ بھی تمہارا ساتھی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اسے سزا ہے تو نہیں جتنا چاہئے تم پولیس کو الٹے بارے میں بتا دینا پولیس ان پر غالیوں کو چڑالے گی۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ بشیر صلاح نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

نائلہ نے دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر ٹیلی فون پر پولیس اسٹیشن کا نمبر لایا۔ کال فوراً ہی ریسپونڈ کر لی۔

”ایس ایچ او پولیس اسٹیشن۔“

”پراسرار لڑکی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ ایک موبائل لے کر آدھے گھنٹے میں ایوان الحسن اصفہانی روام ٹرانسمیشن کے مرکزی گیٹ سے کچھ آگے پہنچ جائیں۔ بشیر صلاح اور اس کا ایک ساتھی آپ کی تحویل میں آجائے گا لیکن آپ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ اس کی گرفتاری کو جعلی پولیس مقابلہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔“

”آپ مطمئن رہئے۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔ ”آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیے۔ قیدی آپ تک پہنچ جائیں گے لیکن ان قیدیوں کو والوں سے کوئی سوال جواب نہیں ہوگا۔“ نائلہ نے کہا۔

”آپ مطمئن رہئے۔ ہم ان سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔

نائلہ نے مزید کچھ کے بغیر ریسپونڈ کر رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے بشیر صلاح اور خانو کو کمرے سے نکال کر ان کے چیر کھول دیئے گئے تھے مگر ہاتھ پشت پر بندھے رہنے دیئے گئے تھے۔ ان دونوں کو کار کی کچلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ دلاور اور عبدالقدوس بھی ان کے ساتھ پھنس کر بیٹھ گئے۔ سلطانہ نائلہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

نائلہ گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھماتی ہوئی کئی اسکول کے قریب ایوان الحسن اصفہانی روڈ پر نکل آئی۔ یہ الٹا تھی۔ درمیان میں ایک کھادری سی بنی ہوئی تھی جس میں خود دو جھاڑیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ سامنے والے پر جانے کے لئے نائلہ کو گاڑی بائیں طرف موڑنی پڑی۔ تقریباً ”تیس گز آگے ٹریفک آئی لینڈ میں کٹ دیکھ کر“

نائلہ نے گاڑی کو دوسری سڑک پر دائیں طرف گھمادیا اور سامنے دیکھنے لگی۔

گیس ٹرانسمیشن کے دفتر کے مرکزی گیٹ کے تقریباً ”سوغز آگے“ پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی۔ پولیس والے رانٹھیں سنبھالے وہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ دو پولیس والے سڑک دوسری طرف بھی کھڑے تھے۔

نائلہ نے پولیس موبائل کے پیچھے گاڑی روک لی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پہلے بھی دودھشت گردوں کو پکڑا گیا تھا۔ اس وقت عبدالقدوس اس کے ساتھ تھا۔ گاڑی روکتے ہی پولیس والے مستعد ہو گئے۔ انہوں نے رانٹھیں اس طرح سنبھال لی تھیں جیسے وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اسی وقت ایچ او موبائل سے اتر کر گاڑی کے قریب آگیا اس کے ایک ہاتھ میں موبائل فون تھا اور کندھے پر تین اطارات جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انسپکٹر ہے۔ نائلہ گاڑی کا انجن بند کر کے نیچے اتر آئی۔ دوسری طرف سے سلطانہ بھی آئی تھی۔ اس وقت صبح کے تقریباً ”دس بجے“ تھے۔ سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ وہاں سے گاڑیوں پر گزرنے والے لوگ بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسل پولیس والوں نے اب نائلہ کی گاڑی کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔

”ہیلو انسپکٹر۔“ نائلہ نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میں نے سوچا تھا کہ کسی اور کو دوں گی لیکن مجھے خود آنا پڑا۔ آپ کو یہ جگہ یاد ہے؟“ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھا۔

”اسی جگہ دودھشت گرد ڈرامائی انداز میں پولیس کی تحویل میں دیئے گئے تھے۔ اس وقت میں تو نہیں تھا۔“

یہ ہیڈ کانسٹیبل اس پارٹی میں شامل تھا اور اسی نے آپ کو پراسرار عورت کا نام دیا تھا۔“ انسپکٹر نے قریب کراہہ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

”اور آپ کو وہ منگتو بھی یاد ہوگی جو تھوڑی دیر پہلے میرے اور آپ کے درمیان فون پر ہوئی تھی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”اچھی طرح یاد ہے۔“ انسپکٹر نے کار کی پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ بالکل مطمئن رہئے۔ ویسا ہی ہوگا جو آپ نے کہا تھا۔“  
 اس دوران دلاور اور عبدالقدوس بھی گاڑی سے اتر آئے تھے۔ دلاور کا بازو گردن میں پڑی ہوئی سلنگ میں لٹکا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، آپ انہیں اپنی تحویل میں لے لیں۔“ نائلہ نے کہا۔ دلاور نے کار کا دروازہ کھول دیا اور بشیر ملاح اور خانو کو باہر نکال لیا۔ ”یہ بشیر ملاح ہے۔“ نائلہ نے اشارے سے بتایا۔ ”یہ آپ کو کچھ اور بھی بتائے گا۔ چند انسانوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ انہیں بچانا آپ کے محکمہ کا فرض ہے اور بشیر۔“ وہ بشیر ملاح کی طرف مھوم مھنی۔ ”بشیر ملاح! تم ایک بہادر آدمی ہو تم جیسے آدمی کا اپنے آپ کو سرخیز رکھنا بلاشبہ بہادری کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے قانون تمہارے ساتھ کچھ رعایت بھی کر دے۔“  
 ”میں جانتا ہوں مجھے موت سے کم سزا نہیں ہوگی ادی۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”میرے لئے دعا کرنا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ کاش! تم واقعی میری بہن ہو تیں۔ میرا سر خسرے تن جاتا۔ لیکن میں اب بھی بہت خوش ہوں۔ خدا کسی کو بے نی اور بہن دے تو وہ تم جیسی ہو، دلاور۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں۔“  
 ”انہیں لے جائیے انسپکٹر۔“ نائلہ نے جلدی سے بشیر ملاح کی بات کاٹ دی۔  
 ”میں ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”یہ آپ کے ہاتھ کیسے لگا؟“  
 ”اس کی تفصیل بھی بشیر ملاح آپ کو بتا دے گا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”کیا آپ سے بھروسہ۔“  
 ”ضرور۔“ نائلہ نے انسپکٹر کی بات کاٹ دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ”ہم چاروں کسی دن بغیر اطلاع کے آپ کے گھر آجائیں گے اور کھانا کھائیں گے۔“  
 ”شکریہ۔“ انسپکٹر نے کہا پھر اس نے دلاور اور عبدالقدوس سے ہاتھ ملایا۔ بڑی عقیدت مندانہ نگاہوں سے نائلہ اور سلطانہ کی طرف دیکھا اور پھر کانشیلوں کی طرف دیکھا۔  
 کانشیلوں نے بشیر ملاح اور اس کے ساتھی کو پکڑ کر موبائل میں بٹھا دیا اور خود بھی سوار ہو گئے۔ انسپکٹر بھی موبائل میں بیٹھ چکا تھا۔ موبائل حرکت میں آکر تیزی سے آگے نکل گئی۔ وہ لوگ کچھ دیر وہیں کھڑے رہے پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”میرا خیال ہے آج تھوڑی تفریح نہ کی جائے۔“ سلطانہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا مطلب؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔  
 ”بھئی میرا مطلب ہے دلاور پہلی مرتبہ کراچی آیا ہے۔ اسے کچھ سیر کروائی جائے۔ سفاری پارک سامنے ہی تو ہے۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں سفاری پارک ہی محوم لیا جائے۔“ سلطانہ نے کہا۔  
 ”چلو، آج تمہارا مشورہ بھی مان لیتی ہوں۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سفاری پارک میں موجود تھے۔

جھیل کے قریب سے گھومتے ہوئے وہ پہلی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ دوسری طرف اتر کر طویل چکر کاٹتے ہوئے وہ دوسری پہاڑی پر آگئے۔ یہاں ہوا کچھ زیادہ تیز تھی۔ وہ لوگ سب سے اوپر آگئے۔ اس پہاڑی سے ایئر پورٹ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ لوگ دیر تک وہاں کھڑے جہازوں کو اترتے چڑھتے دیکھتے رہے پھر واپس آ رہے تھے کہ سلطانہ جیسے کچھ یاد آنے پر بولی۔  
 ”ارے غضب ہو گیا۔“

”گھوڑا وہ بھی تمہارا ساتھی ہے“ نائلہ نے کہا۔ ”اسے سزا سے تو نہیں بچنا چاہئے۔ تم پولیس کو اس بارے میں بتا دو تا پولیس ان پر غالیوں کو چھڑالے گی۔“

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔“ بشیر ملاح نے کمراسائیں لیتے ہوئے کہا۔

نائلہ نے دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر ٹیلی فون پر پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ کال فوراً ہی ریسپونڈ کر گئی۔

”ایس ایچ او پولیس اسٹیشن۔“

”پراسرار لڑکی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ ایک موبائل لے کر آدھے گھنٹے میں ایوان الحسن اصفہانی روڈ پر گھر ٹرانسمیشن کے مرکزی گیٹ سے کچھ آگے پہنچ جائیں۔ بشیر ملاح اور اس کا ایک ساتھی آپ کی تحویل میں دے جائے گا لیکن آپ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ اس کی گرفتاری کو جعلی پولیس مقابلہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہونی چاہئے کہ بشیر ملاح نے تائب ہو کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کیا ہے۔“

”آپ مطمئن رہئے۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔ ”آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیے۔ قیدی آپ تک پہنچ جائیں گے لیکن ان قیدیوں کو لا والوں سے کوئی سوال جواب نہیں ہوگا۔“ نائلہ نے کہا۔

”آپ مطمئن رہئے ہم ان سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔

نائلہ نے مزید کچھ کے بغیر ریسپونڈ کر رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے بشیر ملاح اور خانو کو کمرے سے نکال دیا۔ ان کے پیر کھول دیئے گئے تھے مگر ہاتھ پشت پر بندھے رہنے دیئے گئے تھے۔ ان دونوں کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ دلاور اور عبدالقدوس بھی ان کے ساتھ پھنس کر بیٹھ گئے۔ سلطانہ نائلہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

نائلہ گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھماتی ہوئی کئی اسکول کے قریب ایوان الحسن اصفہانی روڈ پر نکل آئی۔ یہ اہل تھی۔ درمیان میں ایک کیاری بی بی ہوئی تھی جس میں خود دو جھاڑیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ سامنے والے پر جانے کے لئے نائلہ کو گاڑی بائیں طرف موڑنی پڑی۔ تقریباً ”تیس گز آگے ٹریفک آئی لینڈ میں کٹ دیکھ کر آگے نئے گاڑی کو دوسری سڑک پر دائیں طرف گھمایا اور سامنے دو گھینے لگی۔

گیس ٹرانسمیشن کے دفتر کے مرکزی گیٹ کے تقریباً ”سوکز آگے پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی۔ ہالہ پولیس والے رانٹھیں سنبھالے وہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ دو پولیس والے سڑک دوسری طرف بھی کھڑے تھے۔

نائلہ نے پولیس موبائل کے پیچھے گاڑی روک لی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پہلے بھی دودھشت گردوں کو پھانسی میں چھوڑ کر وہ جھاڑیوں میں فرار ہوئی تھی۔ اس وقت عبدالقدوس اس کے ساتھ تھا۔ گاڑی روکتے ہی پولیس اسٹیشن مستعد ہو گئے۔ انہوں نے رانٹھیں اس طرح سنبھال لی تھیں جیسے وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اسی وقت ایچ او موبائل سے اتر کر گاڑی کے قریب آگیا اس کے ایک ہاتھ میں موبائل فون تھا اور کندھے پر تین اٹار جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انسپکٹر ہے۔ نائلہ گاڑی کا انجن بند کر کے نیچے اتر آئی۔ دوسری طرف سے سلطانہ بھی آئی تھی۔ اس وقت صبح کے تقریباً ”دس بجے تھے۔ سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ وہاں سے گاڑیوں پر گزرنے والے لوگ بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسلح پولیس والوں نے اب نائلہ کی گاڑی کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔

”ہیلو انسپکٹر۔“ نائلہ نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میں نے سوچا تھا کہ کسی اور آدمی کو دوں گی لیکن مجھے خود آنا پڑا۔ آپ کو یہ جگہ یاد ہے؟“ نائلہ نے اوپر اصرار دیکھا۔

”اسی جگہ دودھشت گرد ڈرامائی انداز میں پولیس کی تحویل میں دیئے گئے تھے۔ اس وقت میں تو نہیں آئی تھی۔“

یہ بیٹھ کانشیل اس پارٹی میں شامل تھا اور اسی نے آپ کو پراسرار عورت کا نام دیا تھا۔“ انسپکٹر نے قریب آگے بیٹھ کانشیل کی طرف اشارہ کیا۔

”اور آپ کو وہ گفتگو بھی یاد ہوگی جو تھوڑی دیر پہلے میرے اور آپ کے درمیان فون پر ہوئی تھی۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”اچھی طرح یاد ہے۔“ انسپکٹر نے کار کی پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ بالکل مطمئن رہئے۔ دیا ہی ہو گا جو آپ نے کہا تھا۔“

اس دوران دلاور اور عبدالقدوس بھی گاڑی سے اتر آئے تھے۔ دلاور کا بازو گردن میں پڑی ہوئی سلنگ میں لٹکا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، آپ انہیں اپنی تحویل میں لے لیں۔“ نائلہ نے کہا۔ دلاور نے کار کا دروازہ کھول دیا اور بشیر ملاح اور خانو کو باہر نکال لیا۔ ”یہ بشیر ملاح ہے۔“ نائلہ نے اشارے سے بتایا۔ ”یہ آپ کو کچھ اور بھی بتائے گا۔ چند انسانوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ انہیں بچانا آپ کے محکمہ کا فرض ہے اور بشیر۔۔۔ وہ بشیر ملاح کی طرف محکوم گئی۔“ بشیر ملاح! تم ایک بہادر آدمی ہو تم جیسے آدمی کا اپنے آپ کو سرنڈر کرنا بلاشبہ بہادری کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے قانون تمہارے ساتھ کچھ رعایت بھی کر دے۔“

”میں جانتا ہوں مجھے موت سے کم سزا نہیں ہوگی اوی۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”میرے لئے دعا کرنا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ کاش! تم واقعی میری بہن ہو تیں۔ میرا سر فخر سے تن جاتا۔ لیکن میں اب بھی بت خوش ہوں۔ خدا کسی کو بیٹا اور بہن دے تو وہ تم جیسی ہو، دلاور۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں۔۔۔“

”انہیں لے جائیے انسپکٹر۔“ نائلہ نے جلدی سے بشیر ملاح کی بات کاٹ دی۔

”میں ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”یہ آپ کے ہاتھ کیسے لگا؟“

”اس کی تفصیل بھی بشیر ملاح آپ کو بتا دے گا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”کیا آپ سے پھر۔۔۔“

”ضرور۔“ نائلہ نے انسپکٹر کی بات کاٹ دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ”ہم چاروں کسی دن بغیر اطلاع کے آپ کے گھر آجائیں گے اور کھانا کھائیں گے۔“

”شکریہ۔“ انسپکٹر نے کہا پھر اس نے دلاور اور عبدالقدوس سے ہاتھ ملایا۔ بڑی عقیدت مندانہ نگاہوں سے نائلہ اور سلطانہ کی طرف دیکھا اور پھر کانشیلوں کی طرف دیکھا۔

کانشیلوں نے بشیر ملاح اور اس کے ساتھی کو پکڑ کر موبائل میں بٹھا دیا اور خود بھی سوار ہو گئے۔ انسپکٹر بھی موبائل میں بیٹھ چکا تھا۔ موبائل حرکت میں آکر تیزی سے آگے نکل گئی۔ وہ لوگ کچھ دیر دیں کھڑے رہے پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”میرا خیال ہے آج تھوڑی تفریح نہ کی جائے۔“ سلطانہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”بھئی میرا مطلب ہے دلاور پہلی مرتبہ کراچی آیا ہے۔ اسے کچھ سیر کروائی جائے۔ سفاری پارک سامنے ہی تو ہے۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں سفاری پارک ہی محکوم لیا جائے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”چلو، آج تمہارا مشورہ بھی مان لیتی ہوں۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سفاری پارک میں موجود تھے۔

تجیل کے قریب سے گھومتے ہوئے وہ پہلی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ دوسری طرف اتر کر طویل چکر کاٹتے ہوئے وہ دوسری پہاڑی پر آگئے۔ یہاں ہوا کچھ زیادہ تیز تھی۔ وہ لوگ سب سے اوپر آگئے۔ اس پہاڑی سے ایئر پورٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ دیر تک وہاں کھڑے جہازوں کو اترتے چڑھتے دیکھتے رہے پھر واپس آ رہے تھے کہ سلطانہ جیسے کچھ یاد آنے پر بولی۔

”ارے غضب ہو گیا۔“



”گویا وہ بھی تمہارا ساتھی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اسے سزا سے تو نہیں بچنا چاہئے تم پولیس کو اس بارے میں بتادینا پولیس ان رہنماؤں کو چمڑالے گی۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ بشیر ملاح نے گہرا سانس لینے ہوئے کہا۔

نائیلہ نے دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر ٹیلی فون پر پولیس اسٹیشن کا نمبر لایا۔ کال فوراً ہی ریسو کر لی گئی۔

”ایس ایچ او پولیس اسٹیشن۔“

”پراسرار لڑکی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”آپ ایک موبائل لے کر آدھے گھنٹے میں ابوالحسن اصفہانی روڈ پر گئے ٹرانسمیشن کے مرکزی گیٹ سے کچھ آگے پہنچ جائیں۔ بشیر ملاح اور اس کا ایک ساتھی آپ کی تحویل میں دے جائے گا لیکن آپ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ اس کی گرفتاری کو جعلی پولیس مقابلہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہونی چاہئے کہ بشیر ملاح نے نائب ہو کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کیا ہے۔“

”آپ مطمئن رہئے۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔ ”آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیے۔ قیدی آپ تک پہنچ جائیں گے لیکن ان قیدیوں کو لا والوں سے کوئی سوال جواب نہیں ہوگا۔“ نائلہ نے کہا۔

”آپ مطمئن رہئے۔ ہم ان سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔

نائیلہ نے مزید کچھ کے بغیر ریسو رو رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے بشیر ملاح اور خانو کو کمرے سے نکال لیا۔ ان کے ہتھکڑی دیئے گئے تھے مگر ہاتھ پشت پر بندھے رہنے دیئے گئے تھے۔ ان دونوں کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا گیا۔ دلاور اور عبدالقدوس بھی ان کے ساتھ بٹھ کر بیٹھ گئے۔ سلطانہ نائلہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

نائیلہ گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھماتی ہوئی سٹی اسکول کے قریب ابوالحسن اصفہانی روڈ پر نکل آئی۔ یہ ذیل رو تھی۔ درمیان میں ایک کیاری سی بنی ہوئی تھی جس میں خود رو جھاڑوں نے قبضہ بنا رکھا تھا۔ سامنے والے رو پر جانے کے لئے نائلہ کو گاڑی بائیں طرف موڑنی پڑی۔ تقریباً ”تیس گز آگے ٹریفک آئی لینڈ میں کٹ دیکھ کر ٹانگا نے گاڑی کو دوسری سڑک پر دائیں طرف گھمایا اور سامنے دیکھنے لگی۔

گیس ٹرانسمیشن کے دفتر کے مرکزی گیٹ کے تقریباً ”سو گز آگے پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی۔ بائیں پولیس والے رانٹھلیں سنبھالے وہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ دو پولیس والے سڑک کی دوسری طرف بھی کھڑے تھے۔

نائیلہ نے پولیس موبائل کے پیچھے گاڑی روک لی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پہلے بھی دودھشت گردوں کو پکڑ لیا گیا تھا۔ اس وقت عبدالقدوس اس کے ساتھ تھا۔ گاڑی روکتے ہی پولیس والے مستعد ہو گئے۔ انہوں نے رانٹھلیں اس طرح سنبھال لی تھیں جیسے وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اسی وقت ابوالحسن اصفہانی موبائل سے اتر کر گاڑی کے قریب آگیا اس کے ایک ہاتھ میں موبائل فون تھا اور کندھے پر تین اشارہ کی جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انسپکٹر ہے۔ نائلہ گاڑی کا انجن بند کر کے نیچے اتر آئی۔ دوسری طرف سے سلطانہ بھی آئی تھی۔ اس وقت صبح کے تقریباً ”دس بجے تھے۔ سڑک پر ٹریفک روان تھا۔ وہاں سے گاڑیوں پر گزرنے والے لوگ بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسلح پولیس والوں نے اب نائلہ کی گاڑی کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔

”ہیلو انسپکٹر۔“ نائلہ نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میں نے سوچا تھا کہ کسی اور کو گم دوں گی لیکن مجھے خود آنا پڑا۔ آپ کو یہ جگہ یاد ہے؟“ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھا۔

”اسی جگہ دودھشت گرد رانائی انداز میں پولیس کی تحویل میں دیئے گئے تھے۔ اس وقت میں تو نہیں تھا۔ یہ ہیڈ کانسٹیبل اس پارٹی میں شامل تھا اور اسی نے آپ کو پراسرار عورت کا نام دیا تھا۔“ انسپکٹر نے قریب کچھ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

”اور آپ کو وہ گفتگو بھی یاد ہوگی جو تھوڑی دیر پہلے میرے اور آپ کے درمیان ہوئی تھی۔“ نائلہ نے کہا۔

”اچھی طرح یاد ہے۔“ انسپٹر نے کار کی پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ بالکل مطمئن رہئے۔ ویسا ہی ہوگا جو آپ نے کہا تھا۔“

اس دوران دلاور اور عبدالقدوس بھی گاڑی سے اتر آئے تھے۔ دلاور کا بازو گردن میں پڑی ہوئی سلفک میں لٹکا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، آپ انہیں اپنی تحویل میں لے لیں۔“ نائلہ نے کہا۔ دلاور نے کار کا دروازہ کھول دیا اور بشیر ملاح اور خانو کو باہر نکال لیا۔ ”یہ بشیر ملاح ہے۔“ نائلہ نے اشارے سے بتایا۔ ”یہ آپ کو کچھ اور بھی بتائے گا۔ چند انسانوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ انہیں بچانا آپ کے محکمہ کا فرض ہے اور بشیر۔“ وہ بشیر ملاح کی طرف گھوم گئی۔ ”بشیر ملاح! تم ایک بہادر آدمی ہو تم جیسے آدمی کا اپنے آپ کو سرخوردہ کرنا بلاشبہ بہادری کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے قانون تمہارے ساتھ کچھ رعایت بھی کر دے۔“

”میں جانتا ہوں مجھے موت سے کم سزا نہیں ہوگی اوی۔“ بشیر ملاح نے کہا۔ ”میرے لئے دعا کرنا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ کاش! تم واقعی میری بہن ہو تیں۔ میرا سرخرو سے تن جاتا۔ لیکن میں اب بھی بہت خوش ہوں۔ خدا کسی کو بیٹا اور بہن دے تو وہ تم جیسی ہو، دلاور۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں۔“

”انہیں لے جائیے انسپٹر۔“ نائلہ نے جلدی سے بشیر ملاح کی بات کاٹ دی۔

”میں ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔“ انسپٹر نے کہا۔ ”یہ آپ کے ہاتھ کیسے لگا؟“

”اس کی تفصیل بھی بشیر ملاح آپ کو بتا دے گا۔“ نائلہ نے جواب دیا۔

”کیا آپ سے کچھ۔“

”ضرور۔“ نائلہ نے انسپٹر کی بات کاٹ دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ”ہم چاروں کسی دن بغیر اطلاع کے آپ کے گھر آجائیں گے اور کھانا کھائیں گے۔“

”شکریہ۔“ انسپٹر نے کہا پھر اس نے دلاور اور عبدالقدوس سے ہاتھ ملایا۔ بڑی عقیدت مندانہ نگاہوں سے نائلہ اور سلطانہ کی طرف دیکھا اور پھر کانشیلوں کی طرف دیکھا۔

کانشیلوں نے بشیر ملاح اور اس کے ساتھی کو پکڑ کر موبائل میں بٹھا دیا اور خود بھی سوار ہو گئے۔ انسپٹر بھی موبائل میں بیٹھ چکا تھا۔ موبائل حرکت میں آکر تیزی سے آگے نکل گئی۔ وہ لوگ کچھ دیر وہیں کھڑے رہے پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”میرا خیال ہے آج تھوڑی تفریح نہ کی جائے۔“ سلطانہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”بھئی میرا مطلب ہے دلاور پہلی مرتبہ کراچی آیا ہے۔ اسے کچھ سیر کروائی جائے۔ سفاری پارک سامنے ہی تو ہے۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں سفاری پارک ہی گھوم لیا جائے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”چلو، آج تمہارا مشورہ بھی مان لیتی ہوں۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سفاری پارک میں موجود تھے۔

جھیل کے قریب سے گھومتے ہوئے وہ پہلی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ دوسری طرف اتر کر طویل پتھر کاٹتے ہوئے وہ دوسری پہاڑی پر آگئے۔ یہاں ہوا کچھ زیادہ تیز تھی۔ وہ لوگ سب سے اوپر آگئے۔ اس پہاڑی سے ایئر پورٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ دیر تک وہاں کھڑے جہازوں کو اترتے چڑھتے دیکھتے رہے پھر واپس آ رہے تھے کہ سلطانہ جیسے کچھ یاد آنے پر بولی۔

”ارے غضب ہو گیا۔“

”کیا ہوا؟“ نائلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”وہ دلاور کا دوست بنی۔ وہ تو اپنے کمرے میں ہی سو رہا تھا۔“ سلطانہ بولی۔

”وہ اس وقت بھی سو رہا ہوگا۔“ دلاور نے کہا۔ ”اسے اگر جگایا نہ جائے تو سارا دن سو تا رہے گا۔ ویسے کمرے کو باہر سے تالا تو نہیں لگایا تھا؟“

”تمام کمروں کے تالے کھلے والے ہیں۔ دروازہ بند ہوتے ہی لاک ہو جاتا ہے۔ باہر سے کھولنے کے لئے تو چابی کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اندر سے چابی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تاب ہنا کر کھولا جاسکتا ہے۔“

”پھر خیر ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”اگر وہ جاگ بھی گیا تو بہن میں آکر کچھ کھالے گا۔ اس کی گھر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

وہ دیر تک سفاری پارک میں ٹہلتے رہے جب وہاں سے نکلے تو ایک بچے والا تھا۔ وہاں سے وہ سیدھے گھر ہی واپس آئے تھے۔ دلاور کا کتنا درست ثابت ہوا تھا۔ کئی ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اسے دلاور ہی نے جھجھوڑ کر جگایا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دلاور ڈرائنگ روم میں صوفے پر لیٹے لیٹے سو گیا تھا۔ نائلہ بھی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھی۔

پانچ بجے دلاور کی آنکھ کھل گئی۔ سلطانہ سامنے والے صوفے پر نیم دراز کوئی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ دلاور نے گھر میں خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”نائلہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے اور عبدالقدوس اور بکی ڈسکو بیکری گئے ہیں۔ ناشتہ لینے کے لئے۔“ سلطانہ

نے جواب دیا۔

”ناشتہ اس وقت!“ دلاور کے لمبے میں حیرت تھی۔

”یہ کراچی ہے۔ یہاں شام کو بھی ناشتہ کیا جاتا ہے۔“ سلطانہ نے کہا پھر دلاور کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے

بولی۔ ”ایک بات پوچھوں دلاور؟“

”جی پوچھیں؟“ دلاور بولا۔

”یہ نائلہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

دلاور کا چہرہ ایک دم خفیہ ہو گیا۔ اس کا دل گیارہ کی دھڑک اٹھا۔ کیا سلطانہ نے اس کی کسی بات سے اس کے دل کا راز جان لیا تھا؟ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مدھم لمبے میں بولا۔

”بہت اچھی ہیں جی، بہت نیک دل اور بہت۔“

”میں نے پوچھا تھا تمہیں کیسی لگتی ہے؟“ سلطانہ نے اسے گھورا۔

”سلطانہ لی بی۔“ دلاور نے جواب دیا۔ ”جن معنوں میں آپ پوچھ رہی ہیں اگر میں کچھ کہوں تو یہ میری بددیانتی ہوگی۔ میں نے نائلہ لی بی کا نمک کھایا ہے۔ میں نمک حرام نہیں ہوں کہ ان کی یا اپنی حیثیت کو نظر انداز کر دوں۔

میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ۔۔۔“

”بس۔“ سلطانہ اس کی بات کاٹتے ہوئے مسکرائی۔ ”میں یہی جانا چاہتی تھی۔“

”جی کیا۔ میں نے تو کوئی بات نہیں کہی۔“ دلاور بوکھلا گیا۔

ٹھیک اسی لمحہ باہر کی گھنٹی بجی۔

”جاؤ۔۔۔ دروازہ کھولو۔ بکی اور عبدالقدوس آئے ہوں گے۔“ سلطانہ نے کہا۔

دلاور عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ بکی اور عبدالقدوس ہی تھے۔ دونوں نے ایک

ایک شاپنگ بیگ اٹھا رکھا تھا جو انہوں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر میز پر رکھ دیئے۔

”دلاور، جانے ہو آج ہم نے کیا پروگرام بنایا ہے؟“ عبدالقدوس نے کہا۔

”کیا؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”چائے پینے کے بعد ہم سب کافشن چلیں گے۔ سمندر کا کنارہ، کھلی ریت پر دوڑتے ہوئے بچے، جھگڑاتی ہوئی روشنیاں، جمولے، چیتے چلاتے لوگ، بڑی رونق ہوتی ہے وہاں۔“ عبدالقدوس بچوں کی طرح اسے کافشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”ہم تو سمندر دیکھیں گے بھی۔۔۔ جمولے تم جمول لیتا۔“ مکی نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔  
 اسی دوران نائلہ بھی آئی۔ سلطانہ چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے بکٹ، ٹیک پیس اور دیگر لوازمات ہلہلوں میں سجادیئے اور پھر ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ وہ گاڑی میں لدر کر کافشن روانہ ہو گئے۔  
 گاڑی سلطانہ چلا رہی تھی۔ سب سے پہلے وہ انہیں ساحل سمندر پر لے گئی۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ پٹنے کے نیچے کھلی ریت پر بچے ہی نہیں بوڑھے اور جوان بھی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ چلتی ہوئی لہروں سے کھیل رہے تھے۔ گھونٹے اور سپیال جمع کر رہے تھے۔ عبدالقدوس انہیں بھی زبردستی پٹنے سے نیچے اتار لے گیا۔ وہ کچھ دیر تک تو کھلی ریت پر آرام سے چلتے رہے پھر عبدالقدوس نے شرارتیں شروع کر دیں اور پھر وہ سب وقتی طور پر سب کچھ بھول گئے۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ یہاں تفریح کرنے آئے ہیں۔

اندھیرا پھیلنے کے کافی دیر بعد وہ فن لینڈ میں آ گئے۔ دلاور کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جھگڑاتی رنگ پرنگی روشنیوں کا ایک سیلاب تھا جو چاروں طرف سے اڑا رہا تھا۔ یہاں لوگوں کی تفریح کے لئے ایسی ایسی چیزیں تھیں جنہیں دلاور نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ گزشتہ دو چار روز سے شہر کے حالات کچھ بستر تھے جس کی وجہ سے تفریح گاہوں کی رونق بھی لوٹ آئی تھی۔ سلطانہ نے عبدالقدوس کی طرف جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی اور وہ چپکے سے جاکر مونو ریل کے پانچ ٹکٹ لے آیا۔

”نہیں بھی، میں اس شیطانی چرخ پر نہیں بیٹھوں گا۔“ مکی نے کہا۔ وہ ریل کو چلتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ پڑی زمین کی سطح سے کئی فٹ اوپر تھی۔ اس مختصر سی جگہ میں پڑی میں کئی خط ناک موڑ تھے۔ کبھی ایک دم اوپر اور کبھی ایک دم نیچے۔ ریل کی رفتار بہت تیز تھی اور وہ اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی جینیں سن چکا تھا۔  
 ”کیسے نہیں بیٹھو گے۔ ہم تو ہمیں باندھ کر ڈال دیں گے۔“ عبدالقدوس نے کہا اور بلی کو کھینچ کر ایک کیرج میں بٹھا دیا۔ وہاں ایک آدمی پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ ”بھائی صاحب،“ انہیں ذرا سمجھا دیں کہ سیفٹی بیلٹ کیسے باندھنا ہے اور اپنے آپ کو گرنے سے کیسے بچانا ہے۔“ پھر وہ دلاور اور نائلہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تشریف لائیے، یہ کیرج خالی ہے۔“

نائلہ نے دلاور کی طرف دیکھا اور پھر کیرج میں بیٹھ گئی۔ دلاور بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہر کیرج صرف دو افراد کے لئے تھا۔ اس کے پیچھے والے کیرج میں سلطانہ اور عبدالقدوس بیٹھ گئے۔ ایک انڈنٹ ہر کیرج کے پاس جا کر لوگوں کو بتا رہا تھا کہ چڑے کے سیفٹی بیلٹ کیسے باندھنے ہیں اور لوہے کے سیفٹی راڈ کیسے لگانے ہیں۔  
 چند سیکنڈ بعد ہی یہ الیکٹرک ریل حرکت میں آ گئی۔ چلنے کے فوراً ہی بعد اس کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ نائلہ اور دلاور نے سامنے والے سیفٹی راڈ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ریل جب ایک دم اوپر گئی تو دلاور کو یوں لگا جیسے وہ کیرج سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا کہیں دور جا کرے گا لیکن چڑے کے سیفٹی بیلٹ نے اسے جکڑ رکھا تھا اور جب ریل اچانک ہی تیزی سے بائیں طرف کو بھجتی ہوئی مڑی تو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نائلہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی گئی۔ اور وہ دلاور پر جھک گئی۔ اس کا سر دلاور کے سینے پر ٹک گیا اور اس نے اپنا ایک بازو دلاور کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ دلاور نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے سختی سے اپنے ساتھ لپیٹا لیا۔

گرد لپیٹ لیا تھا۔ دلاور نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے سختی سے اپنے ساتھ لپیٹا لیا۔  
 ریل کی رفتار اچانک ہی کم ہونے لگی اور پھر وہ رک گئی۔ ان کا کیرج پلٹ فارم سے کسی قدر پیچھے تھا لیکن نیچے کھڑے ہوئے لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ نائلہ اب بھی دلاور سے لپٹی ہوئی تھی اور دلاور کا ہاتھ اب بھی اس کی پشت پر تھا۔

”کٹ ختم چہ ہضم!“

سلطانہ کی آواز سن کر وہ دونوں جیسے ہوش میں آگئے۔ دلاور نے جلدی سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور نائلہ بھی سیدھی ہو کر بدحواس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بچے کھڑے ہوئے بت سے لوگوں کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے دلاور کی طرف دیکھا اور اپنا سینہ پیٹ کھولنے لگی۔

دلاور کی کیفیت بھی کچھ عجیب سی تھی۔ ایسے کئی مواقع آئے تھے جب وہ نائلہ کے بت قریب آ گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ دشمن سے بچانے کے لئے نائلہ کو گھوڑے پر لے کر بھاگا تھا۔ نائلہ گھوڑے پر اس کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ دلاور کے گرد لپیٹ رکھے تھے اور وہ اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت دلاور نے ایسی کیفیت محسوس نہیں کی تھی۔

دلاور نے کیرج سے اتر کر نائلہ کو سہارا دینے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ نائلہ ایک لمحہ کو جھجکی پھر اس نے دلاور کا ہاتھ تھام لیا اور نیچے اتر آئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ سلطانہ اور عبدالقدوس بھی اتر آئے تھے۔

”کیسا رہا مونوریل کا یہ ٹرپ؟“ سلطانہ نے نائلہ کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

”یہ تمہاری شرارت تھی۔ تمہیں تو میں گھر جا کر سمجھوں گی۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”اے واہ۔“ سلطانہ ٹک کر بولی۔ ”کیا یہ میں نے کہا تھا کہ اس کے سینے پر سر نکلا کر اس سے پٹ جاتا۔“

”بند کرو بکواس۔“ نائلہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”دماغ گھوم رہا ہے میرا۔“

”تو پھر ہو جائے کولڈ ڈرنکس۔“ سلطانہ نے کہا۔

دلاور بکی اور عبدالقدوس ان سے ذرا آگے چل رہے تھے۔ اس لئے وہ ان کی باتیں نہیں سن سکے تھے۔ ایک اسٹال پر انہوں نے کولڈ ڈرنکس پی اور چلے ہوئے الیکویریم میں آگئے۔ مانی خانے میں سمندر کی مخلوقات کو دیکھ کر دلاور حیران ہو رہا تھا۔ بکی، سلطانہ اور عبدالقدوس کے ساتھ تھا اور دلاور نائلہ کے ساتھ۔ نائلہ ہر خانے پر لگا ہوا کانڈ پڑھ کر دلاور کو بتا رہی تھی کہ یہ کون سی پھلی ہے اور کہاں پائی جاتی ہے۔

جب وہ الیکویریم سے نکلے تو دس بجنے والے تھے۔ فن لینڈ کی روٹن میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ فن لینڈ سے نکل کر اس پھلی بڑک پر آگئے جہاں ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اسٹیرنگ کے سامنے اس مرتبہ بھی سلطانہ ہی تھی۔ گاڑی عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے قریب سے گھومتی ہوئی مین روڈ پر آگئی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں جان سکا تھا کہ ایک گاڑی ان کے پیچھے لگ چکی تھی۔ اس گاڑی کے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا آدمی دراصل ساحل سے ان کے پیچھے لگا تھا اور اس نے ایک لمحہ کو بھی ان کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا اور اب بھی بڑی کامیابی سے ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

سلطانہ متوسط رفتار سے کار چلا رہی تھی اور وہ سب باتیں کر رہے تھے اور جب گاڑی کنکشاں میں ایک ریٹورنٹ کے سامنے رکی تو وہ اس وقت بھی نہیں جان سکے تھے کہ ان کے پیچھے آنے والی گاڑی بھی ان سے کچھ فاصلے پر رک چکی تھی اور اس میں بیٹھا ہوا آدمی بڑے غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

\*\*\*

اس رات خانو کے مکان پر جب نائلہ اور اس کے ساتھیوں نے حملہ کیا تھا تو شیردرانی بری طرح بدحواس ہو گیا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ مکان میں گھس آیا ہے، یہاں ڈاکوؤں کا طریقہ واردات کچھ عجیب تھا۔ آدمی رات کے بجائے یہ لوگ عام طور پر رات کے ابتدائی حصے کا انتخاب کرتے۔ اس وقت ٹیلی وژن پر یا تو کوئی ڈرامہ آ رہا ہو یا کوئی فلم۔ ہر گھر میں ٹی وی کھلے ہوتے ڈاکو بڑے اطمینان سے پہلے سے منتخب کردہ کسی مکان کی تیل بجاتے اور جب دروازہ کھولا جاتا تو اسلحہ کے زور پر اندر گھس جاتے۔ اس وقت تمام گھروں کے عام

طور پر پی دی والے کمرے میں جمع ہوتے اس طرح انہیں ایک ہی کمرے تک محدود رکھنے میں آسانی رہتی اور دوسرے کمروں میں بھی چونکہ لوگ پی دی کے سامنے بیٹھے ہوتے تھے اس لئے پڑوسیوں کی مداخلت کا خطرہ بھی نہیں رہتا تھا۔ اس رات بیل بچے کے بعد خانودہ کو لے گیا تھا۔ اس کے چند ہی منٹ بعد فائر کی آواز اور خانو کی چیخ سن کر وہ اور بشیر ملارج چونک گئے تھے۔ انہوں نے دوڑ کر اپنا اسلحہ اٹھا لیا تھا اور کمرہ کیوں سے اندر داخل ہو کر فائرنگ شروع کر دی تھی اور جب شیردرانی کو یہ پتہ چلا کہ حملہ آور ڈاکو نہیں بلکہ درانی اور اس کے ساتھی تھے تو اس کی روح ٹٹو گئی تھی۔

شیردرانی کو حیرت تھی کہ نالکہ یہاں تک کیسے پہنچی تھی۔ اسے یہاں کا پتہ کیسے معلوم ہوا تھا حالانکہ وہ آج دن میں سبزی منڈی سے اپنا حاقب کرنے والے بھجول سے نوجوان کو پکلائے تھے۔ اس نوجوان نے اپنا نام بتانے کے علاوہ یہ بھی اعتراف کر لیا تھا کہ وہ نالکہ درانی کا ساتھی ہے لیکن انتہائی تنید اور ایذا رسانی کے بعد بھی اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ نالکہ کہاں ہے۔ بظاہر کمزور اور دبلا پتلا سا عبدالقدوس بہت ہی سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اسے اس کمزور سے نوجوان کی سخت جانی پر حیرت تھی لیکن سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ نالکہ کو اس کے ٹھکانے کا پتہ کیسے چلا تھا۔

وہ بشیر ملارج کے ساتھ مل کر نالکہ اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کرتا رہا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ نالکہ کے ساتھی کون ہو سکتے تھے لیکن کچھ دیر بعد جب اس نے دلاور کی بھی آواز سنی تو وہ کانپ کر رہ گیا۔ نالکہ اکیلی ہی کیا کم تھی کہ اب دلاور بھی پہنچ گیا تھا۔ ان دونوں کا ساتھ کسی طوفان سے کم نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

مکان کے سامنے کے رخ سے تو فرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر مکان کے پچھلے حصے کی طرف گیا۔ پچھلے بنگلے کی دیوار تقریباً ”آٹھ فٹ اونچی تھی۔ شیردرانی کو اس دیوار پر چڑھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہر گھر سے ٹیلی وژن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن اب سنا تھا۔ لوگوں نے نہ صرف پی دی بند کر دیئے تھے بلکہ جتان تک بھادی تھیں اور کمروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔

شیردرانی نے ایک عورت کو بنگلے کے بائیں طرف اوپن امپیس کی طرف دوڑتے دیکھا۔ اس نے نالکہ کو پہچان لیا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو فائر کر سکتا تھا لیکن اس پر اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ فائر تو کیا کرتا وہ دیوار پر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دوسری طرف چلا گیا۔ وہ اس بنگلے کے پہلو کے اوپن امپیس میں دوڑنے لگا۔ اس نے ایک کمرے سے ایک عورت اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں سنی تھیں لیکن وہ رکتے بغیر دوڑتا چلا گیا۔ دوسری طرف اس بنگلے کا گیٹ تھا۔ اس نے گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہ دیوار پر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا کشادہ سڑک پر گیا۔

فائرنگ کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔ ایک پہلی ٹیکسی کسی گلی سے نکل کر اس سڑک پر آگئی۔ ٹیکسی والا بھی شاید اسی فائرنگ سے بدحواس ہو رہا تھا اور کسی نہ کسی طرح اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ شیردرانی راٹھل نے ایک دم سڑک کے بیچ میں گیا۔ ڈرائیور نے بدحواس ہو کر ٹیکسی روکنا چاہی تو وہ ایک مکان کے سامنے کیاری کے بنگلے سے غرا گئی۔ شیردرانی دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”نیچے اترو جلدی کرو۔“ وہ ڈرائیور پر راٹھل تانتے ہوئے غرایا۔

ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس نے انجن چلتا ہوا چھوڑ دیا۔ وہ خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔

”مہمہ مجھے۔ کچھ مت۔ کہنا۔ میرے چھوٹے چھوٹے۔“

”میں جانتا ہوں تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ شیردرانی غرایا۔ ”اگر جان بچانا چاہتے ہو تو اس طرف

بھاگ جاؤ۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو آڑوں گا گولی سے۔“

ڈرائیور نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر گلی میں مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ شیردرانی نے پہلے پچھلی سیٹ اٹھا کر

را نقل اس کے نیچے رکھ کر سیٹ کو ٹھیک سے جمایا اور پھر اسٹیرجک کے سامنے بیٹھ کر گاڑی کو دوڑا دیا۔ وہ مین روڈ پر آنے سے گریز کرتا رہا اور ٹیکسی کو گلیوں ہی گلیوں میں دوڑاتا رہا۔

وہ اس علاقے سے نکل آیا۔ اب وہ فیڈرل بی ایریا میں تھا۔ ایک گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے ٹیکسی کی رفتار کم کر دی۔ کچھ آگے ایک مکان کے سامنے سفید رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ دو عورتیں اور بچے کار سے اتر کر مکان میں داخل ہو رہے تھے اور کار میں بیٹھا ہوا آدمی کھڑکیوں کے شیشے چڑھا رہا تھا۔ شبیر درانی نے کار کے قریب ٹیکسی روک لی اور نیچے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔ کار میں بیٹھا ہوا شخص پنبہ ز سائیڈ والی کھڑکی کا شیشہ چڑھا رہا تھا پھر اس نے ڈرائیونگ سائیڈ کا شیشہ چڑھایا اور دروازہ کھول کر اترنے کے لئے ایک پیر نیچے رکھا ہی تھا کہ شبیر درانی اس کے سامنے را نقل تان کر کھڑا ہو گیا۔

”چابی اکشن میں لگاؤ اور نیچے اتر آؤ۔“ شبیر درانی غریبا۔

خوف سے اس شخص کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا، گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے گھروالے بھی مکان میں جا چکے تھے۔

”جلدی کرو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ شبیر درانی نے را نقل کو حرکت دی۔

اس شخص نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اکشن میں چابی لگائی اور نیچے اتر آیا۔

”اس ٹیکسی کے پیچھے جا کر کھڑے ہو جاؤ۔“ شبیر درانی نے حکم دیا۔

وہ شخص ٹیکسی کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا بلکہ ٹیکسی کے پیچھے چھپ گیا۔ شبیر درانی نے گاڑی میں بیٹھ کر انجن اشارت کیا اور گاڑی کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

وہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ہنزئی منڈی والی سڑک پر آگیا اور نیو ٹاؤن تھانے والے چوک سے اس نے گاڑی دائیں طرف جیل کی دیوار کے ساتھ والی تنگ سی سڑک پر موڑ دی۔

تار تھ ناظم آباد والے اس مکان سے فرار کے بعد شبیر درانی کے لئے پناہ کی ایک ہی جگہ تھی۔ بی آئی ٹی کالونی میں جبار کا مکان۔ وہ بشیر ملاح کے ساتھ دو تین مرتبہ اس کے مکان پر جا چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جبار کے پاس اسے پناہ مل جائے گی۔

ایک گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گلی تو سنسان تھی البتہ سڑک پر کچھ لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ را نقل اس کے پیروں کے پاس فٹ میٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ راستے میں اس کی گاڑی کو چیکنگ کے لئے نہیں روکا گیا تھا۔ اگر روکا جاتا تو را نقل فوراً ہی پولیس کی نظروں میں آجاتی اور وہ دھر لیا جاتا اور اس وقت بھی وہ سرعام را نقل لے کر نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے گاڑی میں ادھر ادھر دیکھا، کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے را نقل کو چھپایا جاسکتا۔ دھغتاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے نیچے اتر کر ڈکی کھولی۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ کار کی ڈکی میں کار کو ڈھانپنے والا کپڑا تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ اس نے وہ کپڑا نکال لیا۔ را نقل کو اس کپڑے میں لپیٹا اور کار کا دروازہ بند کر کے گلی میں داخل ہو گیا۔ تہہ کیا ہوا کپڑا اس نے بغل میں دبا رکھا تھا۔

وہ مختلف گلیوں میں ہوتا ہوا اسی گلی میں آگیا۔ وہ دو تین مرتبہ بشیر ملاح کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس وقت رات کے اوقات میں اسے مکان تلاش کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی لیکن بھر حال وہ مکان تک پہنچ گیا تھا۔ جبار اس وقت گھر پر ہی تھا۔ شبیر درانی نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ کسی قدر بدحواس ہو گیا تھا۔

”وہ دونوں کہاں ہیں؟“ جبار نے پوچھا۔

”وہاں سے نکل گئے تھے۔“ شبیر درانی نے جھوٹ بولا۔ ”میرا خیال ہے وہ باہر کی طرف یا کسی اور طرف نکل گئے ہوں گے۔ اگر ان میں سے کوئی نہ ملا تو ہو سکتا ہے وہ لوگ بھی یہاں آجائیں۔“

”شبیر درانی۔“ جبار اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تم جانتے ہو میں سرکاری ملازم ہوں، یہاں

لوگوں کی آمد و رفت سے علاقے کے لوگوں کو شبہ بھی ہو سکتا ہے تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“  
 ”جی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ شیردرانی نے اس کے چہرے پر نظر سجاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم بشیر ملاح کے  
 رے میں پوری طرح شریک ہو۔ تمہیں حصہ ملتا ہے اور میں جی بشیر ملاح کا ساتھی ہی تو ہوں۔ اگر بشیر ملاح  
 بے ساتھ ہوتا تو کیا تم ایسی باتیں کر سکتے تھے؟“

”تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ جبار نے جواب دیا۔ ”کراچی کے حالات تم دیکھ رہے ہو۔ پولیس  
 روں پر چھاپے مار کر حلاشیاں لے رہی ہے۔ معمولی معمولی بات پر لوگوں کو لے جا کر بند کر دیا جاتا ہے۔ تم۔“  
 ”میں جانتا ہوں۔“ شیردرانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بشیر ملاح نے تمہیں بتایا تھا کہ میں رحیم یار خان کا  
 بہت بڑا زمیندار ہوں۔ ہزاروں ایکڑ زمین ہے میری، آج کل کچھ پریسیڈنٹوں میں جٹا ہوں۔ میرے حالات جلد  
 ٹھیک ہو جائیں گے اور پھر میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“  
 ”میں تمہیں یہاں پناہ دینے سے انکار نہیں کر رہا رہیں شیر۔“ جبار کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ”میرا مطلب تو یہ  
 کہ ہو سکتا ہے میرا یہ مکان بھی لوگوں کی نظروں میں آگیا ہو۔ میرا ایک دوست ہے۔ سندھ کا وڈیرہ ہے۔ رہیں  
 ہوا۔ وہ ڈی سلوا ٹاؤن میں اپنے ایک دوست کے پاس رہ رہا ہے۔ وہ محفوظ ترین جگہ ہے۔ رہیں شاہنواز اور  
 دل تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ تم یہ رات تو یہاں گزارو۔ صبح میں تمہیں خود لے کر ان کے پاس جاؤں  
 ۔ کہو تو میں ابھی فون پر بات کر لوں۔“

”ٹھیک ہے، بات کر لو۔“ شیردرانی نے کہا۔  
 جبار نے فون پر نمبر ملا کر سجاد اور رہیں شاہنواز سے بات کی پھر ریسیور رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ ماں گئے ہیں،  
 جیسے رہیں کو لاوارث تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔“  
 ”ڈی سلوا ٹاؤن میں سجاد اور رہیں کا مکان کہاں ہے؟“ شیردرانی نے پوچھا۔  
 ”سجاد کا مکان جامع مسجد کے قریب ہی ہے۔ بہت معزز اور مشہور آدمی ہے سب لوگ جانتے ہیں اسے۔“  
 ہارنے جواب دیا۔

”اور یہ رہیں شاہنواز کیسا آدمی ہے؟“ شیردرانی نے پوچھا۔  
 ”بہت اچھا آدمی ہے لیکن ذرا خود سر ہے۔ کسی چھوڑی کے معاملے پر باپ سے لڑ بیٹھا ہے آج کل سجاد کے  
 اس ٹھہرا ہوا ہے۔“

”بشیر ملاح جانتا ہے اسے؟“ شیردرانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”وہ دونوں تو ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔ رہیں شاہنواز کے سامنے کبھی بھول کر بھی بشیر ملاح کا  
 نام مت لیتا۔ میرے تعلقات ان دونوں سے ہیں لیکن ان دونوں کو معلوم نہیں ہے۔ تم بھی اس بات کا خیال  
 رکھنا۔“ جبار نے کہا۔

”فکرمات کرو۔ میں محتاط رہوں گا۔“ شیردرانی نے جواب دیا۔  
 وہ دونوں دیر تک سجاد اور رہیں شاہنواز کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ جبار کی باتوں سے شیردرانی کو  
 گھٹ میں دیر نہیں لگی کہ رہیں شاہنواز کس قسم کا آدمی ہو سکتا ہے۔  
 وہ تقریباً ”دوبجے تک جاتے رہے، پھر جبار تو اپنے کمرے میں چلا گیا اور شیردرانی وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔  
 راتو رات کے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹنے ہی ہو گیا تھا لیکن شیردرانی کو دیر تک نیند نہیں آسکی وہ بشیر ملاح اور خانو کے  
 بے میں سوچ رہا تھا۔ وہ خود تو موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ نکلتا تھا لیکن ان دونوں کی اس نے پرواہ نہیں کی تھی۔  
 نے جبار سے یہ تو کہہ دیا تھا کہ وہ دونوں بھی وہاں سے نکل گئے تھے اور باورڈ کی طرف چلے گئے تھے لیکن اسے کچھ  
 نہیں تھا کہ وہ واقعی وہاں سے نکل سکے تھے یا نہیں۔ اگر وہ ناکلہ اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارے گئے  
 تو بہت اچھی بات ہوگی اور اگر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو کر یہاں پہنچ گئے تو اس کا جھوٹ پکڑا جائے گا



اور اس کے لئے بات بنانی مشکل ہو جائے گی۔

اس کا ذہن بشیر صلاح سے ہٹ کر نائلہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ پہلے نائلہ اس سے بچنے کے لئے بھاگی تھی اور اب اس کی باری تھی۔ نائلہ زخمی ناگن کی طرح اس کا پیچھا کر رہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ زخمی ناگن خطرناک ہوتی ہے۔ وہ بے حد غضب ناک تھی اور وہ اس سے بچنے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ نائلہ صوبہ غلام حراست سے فرار ہونے کے بعد جب سے غائب ہوئی تھی اس کے بعد پہلی مرتبہ سامنے آئی تھی اور اس نے بھرپور وار کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ پوری طرح تیار ہو کر اس کے مقابلے پر آئی تھی اور ستم غریبی تو وہ دلاور بھی اس کے ساتھ تھا۔

ایک اور خیال بھی شبیر درانی کے ذہن میں تھا۔ اگر بشیر صلاح یا خانو نائلہ کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ان کا جوا اکھاڑ کر معلوم کر لے گی کہ شبیر درانی کہاں چھپا ہوا ہے۔ اور پھر وہ یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ وہ دل و میں دعا مانگ رہا تھا کہ آج کی رات خیریت سے گزر جائے صبح ہوتے ہی وہ جبار کے ساتھ ریش شاہنواز کے چلا جائے گا اور پھر وقتی طور پر نائلہ کے خوف سے نجات مل جائے گی۔

نائلہ درانی ہی کے خوف سے اسے نیند نہیں آسکی۔ وہ کبھی اٹھ کر ٹیبلے لگتا اور کبھی دوبارہ صوفے پر جاتا۔ پچھلے چلنے کے باوجود اسے کمرے میں ٹھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کڑی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھوٹا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ کچھ دیر تک کڑی کے سامنے کھڑا رہا۔ ہر سو گہرا سناٹا تھا۔ باہر کسی طرف کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کڑی کے سامنے کھڑا رہا پھر دوبارہ صوفے پر لیٹ گیا۔ اسے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ شدید خوف کی لپیٹ میں ہونے کے باوجود وہ سو گیا۔

اسے اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے پر کسی چیز سے ٹوکا دیا ہو۔ اس نے گڑبڑا کر آٹھ کھول دیں اور دوسرے ہی لمحہ اسے سینے میں اپنا سانس رکھا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے سامنے نائلہ راٹانے کڑی تھی۔

شبیر درانی کو نائلہ کی صورت میں موت اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اچانک ہی اس نے پینتڑا بدلا اور رشتوں کے حوالے سے اسے مصالحت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن نائلہ کا دل پتھر ہو چکا تھا۔ لگتا کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑے گی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ نائلہ اکیلی نہیں ہوگی۔ دلاور بھی اس کے ساتھ ہوگا اور شاید اس وقت دلاور نے جبار اور اس کے نوکر پہل کو گن پوائنٹ پر لے رکھا ہو۔

اچانک ہی خاموش فضا میں فائر کی آواز ابھری۔ یہ پستول کا فائر تھا جس کی آواز ساتھ والے کمرے سے تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چٹخ بھی سنائی دی تھی۔ نائلہ فائر اور چٹخ کی آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے کچھ دیکھا، شبیر درانی کو کسی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی اس نے صوفے پر لیٹے لیٹے پوری طاقت سے اچھل کر اٹھ کر دیا۔

کئی منٹ تک وہ ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور بالاخر شبیر درانی کو ہارنے کا ساممہ گیا۔ اس نے کڑی کے باہر چلائنگ لگا دی۔ اور مکان کی دیوار پر چڑھ کر گلی میں گھس گیا۔ اس وقت دن کی پچھل چکی تھی۔ اسی لمحہ ایک اور فائر ہوا۔ اس نے گلی کے موڑ پر رک کر دیکھا۔ اسی لمحہ جبار دوڑتا ہوا مکان باہر آگیا۔ شبیر درانی نے آواز دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور جبار اس کی طرف دوڑا۔

گلیوں میں سناٹا تھا۔ دو فائر ہوئے تھے اور ظاہر ہے کون باہر نکل سکتا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بہت دور سے روک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک کار دیکھ کر رک گئے۔ ایک اوجڑ عمر آدی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا تھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ جبار نے قریب پہنچ کر اس شخص کی کھوپڑی پر زور سے پہنچل دینے کی ضرب لگائی۔ وہ شخص چپٹا ہوا لہرا گیا۔ شبیر درانی اور جبار نے اسے پکڑ کر ایک مکان کی دیوار کے

ل دیا اور کار کی طرف دوڑے۔

”رئیس شیر! تم کار چلاؤ میں تمہیں راستہ بتاؤں گا۔“ جبار چمکا۔

کار کی چابیوں کا کچھادروازے کے لاک ہی میں تھا۔ شیردرانی نے جلدی سے چابی کھاکردروازہ کھولا اور اندر بڑھ کر دوسری چابی اکشن میں لگائے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پنجرہ سائیڈ والے دروازے کے لاک کا کھٹکا کھٹکا دیا تھا۔ جبار جلدی سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

شیردرانی انجن اشارت کر چکا تھا۔ جبار کے پیٹھے ہی اس نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

جبار اسے راستہ بتاتا رہا اور شیردرانی ڈرائیو کرتا رہا۔ تین ہفتی، سبیلہ اور گوہیار سے ہوتے ہوئے ناظم آباد پور بھی پہنچ گئے۔ ابھی ٹریفک زیادہ نہیں تھا اس لئے شیردرانی کو تیز رفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ عباسی شہید ہسپتال سے اس نے گاڑی بائیں طرف موڑی اور پاپوش میں خلافت چوک کے قریب ایک گلی میں گاڑی روک کر وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ انہیں وہاں گاڑی چھوڑتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اطمینان سے چلتے ہوئے چوک عبور کر کے سیدھے نکل گئے۔

نیا دن شروع ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے کام و دھندوں کے سلسلے میں گھروں سے نکل آئے تھے۔ سڑکوں پر ابھی خاصی آمدورفت تھی۔ جس سڑک پر وہ چل رہے تھے وہ سیدھی پاپوش قبرستان کی طرف چلی گئی تھی لیکن وہ دونوں اس سے پہلے ہی ایک گلی میں مڑ گئے اور پھر دو تین گلیاں گھومنے کے بعد ایک مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہو گئے اور بالاخر ایک دو منزلہ مکان کے سامنے رک گئے۔ برسوں پہلے جب یہ علاقہ آباد ہوا تھا تو یہاں مشکل اسٹوری خوبصورت جھٹکے تھے لیکن پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان خوبصورت جھنگوں کے طے بھی بدلتے گئے۔ اب تقریباً ہر جھنگ دو منزلہ تھا۔ جبار نے دروازے کی کال بیل پر انگلی رکھ دی، دوسری مرتبہ گھنٹی بجانے کے بعد ہی دروازہ کھلا تھا۔

”ارے جبار! تم صبح ہی صبح کیسے آ گئے ہو۔ خیر تو ہے نا بابا؟“ دروازہ کھولنے والے نے پوچھا۔ وہ سہاول تھا۔ درمیانی عمر اور قد بھی درمیانہ ہی تھا۔ چھوٹی گول داڑھی اور نوکدار مونچھیں۔ داڑھی میں اکا دکا سفید بال بھی نظر آ رہے تھے۔

”خیری تو نہیں ہے رئیس سہاول۔“ جبار نے کہا۔ ”بڑی مشکل سے جان بچا کر آئے ہیں۔“

”آؤ! اندر آ جاؤ۔ یہ کون ہے؟“ سہاول نے انہیں اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔

”یہ بھی اپنے جن ہیں۔“ تفصیل آرام سے بتاؤں گا۔“ جبار نے جواب دیا۔

وہ دونوں اندر آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر خالص سندھی تہذیب کا عکاس تھا۔ اس کے علاوہ بھی کمرے کی ہر چیز تئیس اور چھتیس نظر آ رہی تھی۔ گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے شیردرانی پوریچ میں ایک چم چماتی پابجی دیکھ چکا تھا۔ ان تمام چیزوں سے شیردرانی کو سہاول کی مالی حیثیت کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”بیرو۔ ارے اوئے بیرو۔“ سہاول نے نوکر کو آواز دی۔

”جی سائیں۔“ بیرو فوراً ہی حاضر ہو گیا اور روایتی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سفید داڑھی اور سفید جھکی ہوئی مونچھیں۔ اس نے نیلے رنگ کی شلوار فیض پن رکھی تھی۔ سر پر میوٹن رنگ کا ایک کپڑا پکڑی کی طرح لپٹا ہوا تھا۔

”ارے بابا سمان آئے ہیں۔“ سہاول نے کہا۔ ”پہلے چائے لاؤ پھر کچھ ناشتے کا بندوبست کرو۔“

”جی سائیں۔“ بیرو کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

”ہاں جبار سائیں کیا معاملہ ہے؟ کیا افتاد پڑی ہے صبح ہی صبح؟“ سہاول نے کتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے جبار کی طرف دیکھا۔

”سائیں، پولیس کو شک ہو گیا تھا کہ میرے مکان پر کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جنہیں پولیس پسند نہیں کرتا۔“  
 پرسوں رات کو رئیس شاہنواز آیا تھا تو اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دو سادہ لباس پولیس والے آئے تھے۔  
 مجھ سے دیر تک رئیس شاہنواز کے بارے میں پوچھتے رہے اور میں ہر بات سے انکار کرتا رہا۔ سائیں بھلا  
 رات۔۔۔ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا۔ پھر شیردرانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”رئیس شیر میرے گھر  
 آگیا۔ ان سے ایک مرتبہ پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے میں نے اسے ہار  
 دے دی۔ رئیس شیر کو یقین تھا کہ اسے میرے گھر آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج صبح سویرے پولیس  
 کی ایک پارٹی نے میرے مکان پر چھاپہ مارا۔ وہ چار آدمی تھے اور رئیس شاہنواز کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔  
 انہیں کسی نے اطلاع دی تھی کہ رئیس شاہنواز رات کو میرے مکان پر آیا ہے اور یہیں موجود ہے پولیس واسے  
 تلاشی لے رہے تھے اور پھل کو آپ جانتے ہیں نا۔ ذرا گرم دماغ کا ہے۔ اس نے ایک پولیس والے سے رائفل  
 چھیننے کی کوشش کی، ہم نے بھی پولیس والوں پر حملہ کر دیا۔ پھل تو پولیس کے ہاتھوں مارا گیا مگر ہمیں بھاگنے کا موقع  
 مل گیا۔“

”ہوں۔“ سجاد نے کہا۔ ”اگر پولیس تمہارے پیچھے یہاں آگئی تو؟“  
 ”نہیں سائیں نہیں۔“ جبار جلدی سے بولا۔ ”پولیس ہمارے پیچھے نہیں آئی۔ ہم نے راستے میں ایک گاڑی  
 چھین لی تھی جسے ہم نے بہت دور چھوڑ دیا ہے۔ پولیس ہمارا سراغ نہیں لگا سکتی۔“  
 اسی دوران پھر دو چالے کر آگیا۔ اس نے چائے ان تینوں کے سامنے رکھی اور باہر نکل گیا۔  
 ”یہ رئیس شیر کون ہیں۔ ذرا ان کے بارے میں بھی بتاؤ نا؟“ سجاد نے کہا۔  
 ”سائیں یہ پنجاب کے بہت بڑے وڈیرے ہیں۔ آپ کو اپنے بارے میں خود ہی بتائیں گے۔“ جبار نے کیلا  
 ہوئے شیردرانی کی طرف دیکھا۔ سجاد بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔  
 شیردرانی چند لمحے خاموش رہا پھر اپنے بارے میں بتانے لگا۔ سجاد بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔  
 آخر میں شیردرانی کہہ رہا تھا۔  
 ”میں اس عورت کا دُسا ہوا ہوں رئیس سجاد! میرے پاس کیا کچھ نہیں ہے لیکن میں اس طرح درہار  
 ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ زمینداروں، وڈیروں کے خلاف مقدمے تو جتنے ہی رہتے ہیں لیکن اس نے میرے خلاف اسے  
 فوجداری مقدمے بنادے ہیں جس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آپ انسپکٹر صوبہ خان کو تو جانتے ہوں گے؟“  
 ”اے کون نہیں جانتا۔“ سجاد نے کہا۔ ”وہ انسان نہیں ناگ تھا۔ زہر ملا ناگ۔ لیکن سنا ہے کہ اسے معطل  
 کر دیا گیا ہے اور آج کل مفور ہے۔“

”مفور نہیں معقول۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”کئی روز پہلے اسے قتل کر دیا گیا تھا اور اتفاق سے اس کا قتل ہم  
 زمینوں پر ہوا تھا۔ ناکہ درانی ایک موقع پر انسپکٹر صوبہ خان کے بچے چڑھ گئی تھی لیکن کسی طرح بھاگ نکلے۔  
 یقین ہے کہ صوبہ خان کو اسی نے قتل کیا یا گروایا ہو گا لیکن یہ قتل میرے کھاتے میں ڈال دیا گیا اور میری گرفتاری  
 کے لئے ناقابلِ ضمانت وارنٹ جاری کر دئے۔ میں وہاں سے نکل آیا۔ میرا خیال تھا کہ میں کچھ عرصہ باہر رہ کر  
 اپنے دوستوں کی مدد سے اس کے خلاف کوئی ثبوت تلاش کروں گا لیکن وہ یہاں بھی پہنچ گئی۔ اس نے کرائے کے  
 قاتلوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ کراچی میں اس کی طرف سے مجھ پر دو قاتلانہ حملے  
 ہو چکے ہیں اور گزشتہ رات دراصل اسی کے آدمیوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور میں جان بچا کر ہمارے  
 کے گھر پہنچ گیا تھا۔ لیکن وہاں بھی نہ ٹک سکا۔ پولیس نے رئیس شاہنواز کی تلاش میں وہاں چھاپہ مارا تو مجھے وہاں  
 سے بھی بھاگنا پڑا۔ اب آپ کے پاس آیا ہوں مجھے صرف چند روز کے لئے پناہ چاہئے سجاد سائیں۔“  
 ”کیوں نہیں بابا۔“ سجاد نے کہا۔ ”تم تو معزز آدمی ہو۔ ہمارے مسمان ہو۔ چند روز کیا، جب تک چاہو یہاں  
 رہو اور وہ لڑکی کیا نام بتایا۔ ہاں، ناکہ درانی۔ اسے بھی ہم تلاش کر لیں گے۔“

”ناکلہ درانی کو انجام تک پہنچانا ہی میری زندگی کا سب سے اہم مشن ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔  
 ”واہ سائیں واہ۔“

دروازے کی طرف سے یہ آواز سن کر شیردرانی نے چونک کر اس طرف دیکھا، وہ رئیس شاہنواز تھا۔ بڑی  
 میٹھی مٹھیوں نے اس کے چہرے کو خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔ وہ اندر آگیا۔ سجاد نے اس کا تعارف کرایا۔ دونوں  
 نے بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملایا۔

”سائیں“ میں بھی اسی نام کا ڈسا ہوا ہوں جس نے تمہاری زندگی میں زہر بھرا ہے۔“ رئیس شاہنواز نے  
 کہا۔ ”وہ لڑکی بڑی قیامت ہے۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی ہیں ارے بابا اس نے تو پولیس کے بڑے بڑے  
 افسروں کو بھی اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ بڑا جادو ہے اس کے حسن میں۔ کمال کی چھوکری ہے وہ۔“

”تم اسے جانتے ہو؟“ شیردرانی نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس نے تو میرے باپ کو میرا دشمن بنا دیا ہے۔“ رئیس شاہنواز نے کہا اور پھر ناکلہ، سلطانہ اور سسی کے  
 ارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس کی وجہ سے تو پولیس بھی میری دشمن ہو گئی ہے۔ میں  
 اس کی تلاش میں ہوں۔ اس کی ساتھی دو لڑکیاں بھی بڑی قیامت کی چیز ہیں۔“

”دو لڑکیوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا لیکن ایک بہت ہی خطرناک آدمی ہے اس کے ساتھ۔ دلاور نام ہے  
 اس کا اور وہ بھی کئی سنگین مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔ اس میں غیرت نام کی اب کوئی  
 چیز نہیں رہی تھی۔ شاہنواز اس کی ماموں زاد بہن کے بارے میں اول فول بک رہا تھا اور وہ اسے ناکلہ کے خلاف  
 مزید بھڑکا رہا تھا۔ جبار نے رئیس شاہنواز کا نام لے کر اپنے مکان پر پولیس کے چھاپے کی ایک فرضی کہانی سنائی  
 تھی۔ اس طرح وہ سجاد اور شاہنواز کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور ناکلہ کے بارے میں جھوٹ بولتے  
 ہوئے شیردرانی نے بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا تھا۔ اس طرح اسے ناکلہ کے خلاف ان لوگوں کی ہمدردیاں تو  
 حاصل ہو گئی تھیں۔

”فکرمت کرو بابا۔ اس سورا کو بھی دیکھ لیں گے۔“ رئیس شاہنواز نے کہا۔ ”ان کا پتہ چلانا ہے کہ وہ ہیں  
 کہاں۔ اس چھوکری کے ساتھ تو میں ایسا سلوک کروں گا کہ اسے دن میں بھی تارے نظر آنے لگیں گے۔“  
 ”تمہارے ساتھ وہ کیسے ٹکرائی تھی رئیس شاہنواز۔“ شیردرانی نے پوچھا۔

”میں ان دنوں ڈھول میں تھا اور بابا سائیں یہاں آئے ہوئے تھے۔“ رئیس شاہنواز نے بتایا۔ ”وہ تین لڑکیاں  
 تھیں۔ کس سے بھاگتی ہوئی تھیں اور پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں پناہ دی اور بابا تم جانتے ہوتا  
 کہ جب خوبصورت اور جوان لڑکیاں اپنے قریب ہوں تو دل کب مانتا ہے۔ میرا دل بھی جھل گیا لیکن وہ تو چپے پر  
 اٹھ نہیں رکھتے دیتی تھیں اور پھر اس رات میں شراب کے نشے میں تھا۔ وہ تینوں ہماری پرانی نوکرانی کو ساتھ لے کر  
 مہلی سے بھاگ گئیں۔ ہماری نوکرانی نے بھی مجھ سے غداری کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مائی سکھیں ان کو لے کر  
 کراچی میں بابا سائیں کے پاس ہی آئے گی۔ میں بھی ان کے پیچھے آگیا لیکن بابا سائیں نے تو مجھے گھر میں بھی نہیں  
 گھسنے دیا۔ پتہ نہیں ان لڑکیوں نے کیا جادو کر دیا تھا کہ میری بہن اور میرا بھائی بھی میرے خلاف ہو گئے۔ میرے  
 خلاف پولیس میں اغواء، ڈکیتی، قتل اور نجائے کیسی کیسی رپورٹیں لکھوا دیں۔ مجھے پولیس سے بچنے کے لئے روپوش  
 ہونا پڑا اور پھر ایک دن دو لڑکیاں میرے ہاتھ لگ گئیں۔ تمہاری بہن ناکلہ اور سلطانہ۔ میں نے انہیں طاری روڈ  
 پہ اٹھالیا تھا۔ تیسری لڑکی میری بہن کے ساتھ تھی اس لئے بچ گئی۔ وہ اب بھی بابا سائیں کے گھر میں ہے۔

ناکلہ اور سلطانہ کو میں اپنے ایک دوست کے بنگلے پر لے آیا۔ ہم نے سوچا تھا کہ رات کو دعوت اڑائیں گے۔  
 لیکن وہ دونوں وہاں سے بھاگ گئیں۔ بہت تیز ہیں وہ لڑکیاں۔ تمہاری بہن تو قیامت ہے قیامت۔ معاف کرنا  
 نہیں شیر۔ ”وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر کہنے لگا۔ ”اس سارے فساد کی جڑ ناکلہ ہی ہے۔ وہ ایک بار میرے ہاتھ  
 لگائے تو اس کے سارے کس بل نکال دوں گا۔“

”میں بھی اسی انتظار میں ہوں۔“ شیردرانی نے بے غیرتی سے کہا۔

”تم لوگ باتیں کرو۔ میں نادمہو کر تیار ہو جاؤں۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ سجادول کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

اس کے کمرے سے جانے کے بعد بھی وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ موضوع نائلہ کے گرد ہی گھوم رہا تھا۔ جبار خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد نوکر نے آکر بتایا کہ ناشتہ تیار ہے۔ وہ لوگ اٹھ گئے۔ شیردرانی نے ابھی منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا۔ چائے تو وہ پی ہی چکا تھا۔ ناشتہ پر بھی اسی طرح بیٹھ گیا۔ ناشتہ کے بعد سجادول تباہیوڑے کر چلا گیا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کی واپسی شام تک ہوگی۔

شیردرانی اور رئیس شاہنواز دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگئے اور نائلہ ہی کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ وہ منصوبہ بنا رہے تھے کہ نائلہ کا سراغ کس طرح لگایا جائے۔

”تم نے کہا تھا کہ ان کے ساتھ ایک لڑکی اب بھی تمہارے بابا سائیں کے گھر رہی ہے۔“ شیردرانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نائلہ نے اس سے رابطہ رکھا ہو گا اور اسے معلوم ہو گا کہ نائلہ کہاں ہے۔“

”ارے ہاں۔“ رئیس شاہنواز بولا۔ ”یہ بات تو میرے ذہن میں ہی نہیں آئی تھی۔ میں ابھی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب آیا۔ ریسپور اٹھا کر اپنے باپ کے گھر کا نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ایک منٹ بعد کال ریسپو کر لی گئی۔ مائی سکھن کی آواز شاہنواز کی ساعت سے گھرائی۔

”میں رئیس شاہنواز بول رہا ہوں مائی سکھن۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”گھر میں جو سمان لڑکی ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔“

”ہاں۔ سسی۔ اس سے میری بات کراؤ۔“

”جی اچھا۔“ مائی سکھن نے جواب دیا۔

چند لمبے خاموشی رہی اور پھر ریسپور جو پر آواز سنائی دی اسے سن کر شاہنواز کے چہرے کی رنگت خفیر ہو گئی۔ وہ اس کے باپ کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”اس گھر سے اب تمہارا کوئی نائلہ نہیں رہا شاہنواز۔ آئندہ یہاں فون بھی مت کرنا۔“ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے فون بھی بند کر دیا گیا۔ شاہنواز کچھ دیر تک ریسپور ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا پھر اس نے دانت کچکچاتے ہوئے ریسپور پٹخ دیا۔

”کیا ہوا؟“ شیردرانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بابا سائیں گھر میں موجود ہیں۔ اس لڑکی سے بات نہیں ہو سکی۔ اس سے بات کرنے کے لئے اب دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“ رئیس شاہنواز نے جواب دیا۔

”دوسرا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟“ شیردرانی نے پوچھا۔

”سوچنا پڑے گا۔“ شاہنواز نے کہا۔

وہ دونوں سوچتے رہے اور بالاخر ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔

”ترکیب تو لا جواب ہے۔“ رئیس شاہنواز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے لئے ہمیں شام کا انتظار کرنا پڑے گا۔ سجادول آجائے گا تو گاڑی لے کر چلیں گے۔“

”اور عورت کا بندوبست کہاں سے کرو گے؟“ شیردرانی نے کہا۔

”وہ بھی ہو جائے گا۔ عورتیں بہت ہیں شیر سائیں۔“ شاہنواز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ منصوبہ طے ہو جانے کے بعد دونوں مطمئن سے ہو گئے تھے۔

شیردرانی نے کچھلی رات تقریباً ”جاگ کر گزاری تھی اور بھر صبح سویرے ہی اسے جبار کے گھر سے دوڑ لگالی پڑی تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے بار بار اٹھنے لگتا۔“

”بھرا خیال ہے تم تھوڑی دیر سو لو رئیس شیر۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”میں بھی ایک دو کام کر لوں۔ پھر شام کو

کے کنار پر۔“  
 رئیس شاہنواز اٹھ کر چلا گیا اور شیردرانی صوفے پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ خرائے لے رہا تھا۔ جبار اس پہلے ہی قائلین پر لیٹ کر سوچا تھا۔ شیردرانی تقریباً دو بجے کے قریب اٹھا۔ کھانا کھایا اور پھر سو گیا۔ دوسری اس کی آنکھ پانچ بجے کھلی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا چلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد تو بہت تازہ دم ہو گیا۔

تقریباً چھ بجے سجاوٹ بھی آگیا۔ سات بجے کے قریب شیردرانی اور رئیس شاہنواز اس کی پانچو پر نکل گئے۔ مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ٹکشن اقبال میں آگئی۔ شاہنواز نے ایک چنگے کے سامنے گاڑی روک لی اور وہ ان اتر کر چنگے میں آگئے۔

اندر داخل ہوتے ہی شیردرانی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ چار پانچ خوبصورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بی اندر داخل ہوئے ایک ادیبہ عورت کسی کمرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس نے بڑی ادا سے مسکراتے ایش کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑے باقیں کرتے رہے پھر وہ عورت انہیں لے کر کمرے میں آگئی یہاں ٹیلی فون بھی تھا۔

”ہاں، اب مکمل کرنا کیا کام ہے؟“ اس عورت نے کہا۔  
 ”کام تو بہت معمولی سا ہے۔“ رئیس شاہنواز نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے  
 ”ایک ٹیلی فون کرنا ہے۔“ وہ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اسے سمجھانے لگا کہ اسے فون پر کیا کہنا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر اپنے گھر کا نمبر لپایا اور ریسیور اس عورت کی طرف بڑھا دیا۔

”ہلو گھن بول رہا ہے؟“ وہ دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سن کر بولی۔  
 ”مائی سکھن بول رہی ہوں۔ آپ کون ہیں جی؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔  
 ”میں ٹائلر بول رہی ہوں، ٹائلر درانی۔“ اس عورت نے کہا۔ ”کیسی ہو مائی سکھن۔ ذرا اسی سے بات

کر۔“  
 ”ٹائلر بی بی۔ آپ کیسی ہو بیٹی؟“ مائی سکھن نے کہا۔ ”آپ ہولڈ کر وہ میں سسی کو بلاتی ہوں۔“  
 چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر ریسیور پر سسی کی آواز سنائی دی۔

”ہلو ادی، آپ کہاں ہو بیٹی۔ ہم کو بھول گئیں کیا۔ سلطانہ کیسی ہے؟“  
 ”ب ٹھیک ہے۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میری ایک بات غور سے سنو۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ تم لا کر کہ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد گھر سے نکل کر مین روڈ پر آجانا۔ کار ساز والے روڈ پر میں بھی آ رہی ہوں۔ تم سے ملنا ضروری بات کرنی ہے۔ اکیلی آنا اور بابا سائیں یا کسی اور کو مت بتانا کہ کہاں جا رہی ہوں۔“

”بابا سائیں مجھے اکیلے تو گھر سے نہیں نکلنے دیں گے۔ مائی سکھن میرے ساتھ آئے گی۔“ سسی نے جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے اسے لے آنا۔ اپنے چنگے والی گلی سے نکل کر مین روڈ پر میرا انتظار کرنا میں ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے ادی۔ میں آ جاؤں گی۔“ سسی نے جواب دیا۔  
 اس عورت نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور شاہنواز کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”تم تو بڑی فکارتگلیں ستارہ۔“ رئیس شاہنواز نے کہا۔  
 ”تم جیسے لوگوں کا سکھایا بڑھایا ہے۔“ ستارہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دو تین منٹ وہاں بیٹھے پھر ستارہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر آگئے۔  
 پانچو کو کار ساز روڈ پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ شاہنواز گاڑی کو سٹل کے قریب ٹریفک آئی لینڈ کے الٹ سے گھما کر کے ڈی اے اسکیم دن کے بنگلوں کے ساتھ سروس روڈ پر لے آیا اور اپنے چنگے والی گلی سے

تقریباً پچاس گز دور ہی روک دی۔ سروس روڈ کے ساتھ ساتھ کھنے درخت تھے۔ اس جگہ تاریکی تھی۔ ویسے بھی پاجیرو کے شیشوں پر پلاسٹک کی سیاہ شیشیں لگی ہوئی تھیں۔ ان شیشوں کی وجہ سے اندر سے باہر کا منظر تو دیکھا جاسکتا تھا لیکن باہر سے اندر کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

وہ لوگ وقت سے کچھ پہلے آگئے تھے۔ انہیں تقریباً دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پھر چادروں میں لپٹی ہوئی وہ عورتیں گلی سے باہر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ گلی کے موڑ پر ہی رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔  
 ”وہی ہیں۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”میں ان کے قریب گاڑی روکوں گا۔ تم جوان لڑکی کو سنبھالنا میں بوڑھی مائی سکھن کو دیکھ لوں گا۔“

اسی وقت سڑک پر بھی اچھا خاصا ٹریفک تھا اور سروس روڈ پر بھی اکا دکا گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ پاجیرو ہلکی رفتار سے چلتی ہوئی ان دونوں عورتوں کے قریب رک گئی۔ گلی کے موڑ پر اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں ان نے چہرے آسانی سے دیکھ جاسکتے تھے۔ ان میں ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی جس نے نیلے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی اور دوسری سفید چادر میں ادھیڑ عمر عورت تھی۔

گاڑی رکتے ہی شیردرانی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ وہ جوان لڑکی پر اس طرح جھنپا جیسے چپل ماس پر جمبھڑا ہے۔ وہ سہمی تھی جو اس اچانک افتادے گھبرا گئی تھی۔ وہ چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ مائی سکھن بھی اسے بچانے کے لئے جتنی ہوئی آگے بڑھی لیکن اسی لمحہ رئیس شاہنواز دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ ساتھ ہی اس نے جیب سے پتول بھی نکال لیا تھا۔ اس نے مائی سکھن کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔ مائی سکھن اس کی شکل دیکھتے ہی چونک گئی۔

”تنت۔۔۔ تم۔۔۔“ وہ چیختی۔ ”جھوڑو اس جھوکری کو۔“  
 ”بیچھے ہوئے ننگ حرام“ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ رئیس شاہنواز غرایا۔  
 ”مار دو گولی۔ تمہیں اپنے باپ کی عزت کا خیال۔۔۔“  
 رئیس شاہنواز نے مائی سکھن کو ایک طرف کھینچ کر اس کے سینے میں تین چار گولیاں اتا دیں۔ مائی سکھن چیختی ہوئی سڑک پر گری۔ اس کے جسم سے خون کے فوارے بہہ نکلے تھے۔  
 اس وقت بیچھے سے ایک کار آ رہی تھی۔ فائرنگ کی آواز گونجتے ہی کار دور ہی رک گئی۔  
 ”اے اٹھا کر اندر ڈالو۔ جلدی کرو۔“ رئیس شاہنواز چیخا۔

اور پھر ان دونوں نے بڑی مشکل سے سسی کو اٹھا کر پاجیرو میں ڈال دیا۔ شاہنواز نے پتول شیردرانی سے حوالے کر دیا۔

”زیادہ چلے تو گولی مار دینا اسے۔“ اس کے منہ سے غراہٹ نکلی۔  
 شیردرانی بڑی مشکل سے سسی کو قابو کر سکا تھا۔ اس نے پتول سسی کے پھلو سے لگا دیا۔ رئیس شاہنواز نے اسٹیرنگ سنبھال کر پاجیرو کو تیز رفتاری سے دوڑا دیا۔  
 پاجیرو لمحہ بہ لمحہ اس جگہ سے دور ہو رہی تھی جہاں اب کچھ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ پاجیرو اسٹیلیم روڈ کر اس کر کے تیز رفتاری سے سرشاہ سلیمان روڈ پر دوڑ رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر سسی بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

\*\*\*\*\*

لکھنؤ والے ریٹائرمنٹ سے نکلے تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔  
 ”اب کیا پروگرام ہے؟“ عبدالقدوس نے پوچھا۔  
 ”گھر چلیں۔ مگر اور کیا؟“ نائلہ نے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے کہا۔

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس وقت وڈیرہ کریم بخش کے ہاں سے ہوتے ہوئے چلا جائے۔ سسی سے ملے ہوئے کئی روز ہو گئے ہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ اسی طرف سے ہوتے ہوئے چلتے ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ گاڑی ہوٹل میٹروپول کے اوپر سے گھومتی ہوئی شاہراہ فیصل پر آگئی۔ مہراں ہوٹل کا چوراہا پار کرتے ہی نائلہ نے رفتار بڑھا دی۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا اس لئے نائلہ کو تیز رفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ وہ دوسری گاڑی اب بھی ان کے پیچھے تھی۔ نائلہ نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں اسے دیکھا تو تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔

کار ساز والے موڑ سے پہلے ہی نائلہ نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ اس نے بائیں طرف مڑنے کا انڈیکسٹر بھی دے دیا تھا۔ کار ساز مین روڈ پر موڑنے کی بجائے اس نے گاڑی سروس روڈ پر موڑ لی۔ پیچھے آنے والی گاڑی بھی اسی طرف مڑی تھی۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نائلہ نے گاڑی ایک گلی میں موڑ لی۔ جگہ اس گلی میں زیادہ آگے نہیں تھا۔ بنگلے کے سامنے گاڑی روکتے ہی نائلہ کی چھٹی حس نے کھٹی بجائی شروع کر دی۔ اچانک ہی عجیب سے خیالات اس کے ذہن میں آنے لگے تھے۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور دو پولیس والے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی نائلہ کا ہاتھ ٹھنکا تھا۔ جب نائلہ اور سلطانہ یہاں تھیں تو ڈی آئی جی نے بنگلے پر ان کی حفاظت کے لئے دو آدمیوں کی گارڈ لگوا دی تھی لیکن سلطانہ کو پتہ چلا تھا کہ بعد میں ریس کریم بخش کی درخواست پر گارڈ ہٹائی گئی تھی مگر اب دو پولیس والوں کی موجودگی ایک نئی کہانی سنار ہی تھی۔

اس گلی میں چار پانچ اور گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے آنے والی کار آگے نکل گئی تھی۔ نائلہ نے انجن بند کر دیا اور پیچھے اتر آئی۔ سلطانہ اور دلاور وغیرہ بھی اتر آئے تھے۔

”کیا بات ہے۔ پولیس یہاں کیوں کھڑی ہے؟“ نائلہ نے ایک پولیس والے سے پوچھا۔

”یہاں ایک قتل ہو گیا ہے اور اغواء کی واردات بھی ہوئی ہے۔“ پولیس کا نشیبل نے جواب دیا۔

نائلہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک دم سسی کا خیال ابھرا تھا۔ وہ سلطانہ وغیرہ کی طرف دیکھتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی۔ سلطانہ اور دلاور وغیرہ بھی اس کے پیچھے گیٹ میں داخل ہو گئے تھے۔

پورچ میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نائلہ رابداری میں آگے بڑھ گئی۔ ایک کمرے سے غزالہ نکلتی ہوئی نظر آئی۔ غزالہ نے نائلہ کو دیکھا تو دو دو کر اس سے پٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”کیا ہوا غزالہ؟“ سب کیا ہے؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”غضب ہو گیا ادی۔“ غزالہ نے کہا۔ ”مائی سکھن کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور سسی کو اغواء کر کے لے گئے ہیں۔“

”کیا؟“ نائلہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

سلطانہ تو ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔ غزالہ کا بھائی علی احمد اسے دیکھ کر ہار اٹھا۔

سلطانہ کے پوچھنے پر اس نے مختصر سا بتا دیا پھر بولا۔

”تم اندر جاؤ ادی۔ اور آپ لوگ ادھر آجائیے۔“

دلاور وغیرہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ سلطانہ آگے آگئی۔ غزالہ اور نائلہ ابھی رابداری ہی میں کھڑی تھیں پھر غزالہ انہیں کمرے میں لے گئی جہاں تین چار عورتوں نے مائی سکھن کی بیٹی کو سنبھال رکھا تھا۔ بہت ہی برا حال ہو رہا تھا اس کا تو۔ سلطانہ اور نائلہ بھی کچھ دیر اسے تسلی دیتی رہیں پھر غزالہ ان دونوں کو دوسرے کمرے میں لے آئی۔



”یہ سب کچھ کیسے ہوا غزالہ؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”تقریباً“ ساڑھے سات بجے کسی کا فون آیا تھا۔ کال مائی سکھن نے ریسیو کی تھی۔ سسی نے بھی بات کی تھی۔  
 اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ نائلہ کی کال ہے۔“

”میری کال!“ نائلہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں“ اس نے تمہارا ہی نام لیا تھا۔ پھر آدھے گھنٹے بعد وہ مائی سکھن کے ساتھ باہر چلی گئی۔ کئی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور کسی نے آکر بتایا کہ کسی نے ہماری نوکرانی کو قتل کر دیا ہے اور دو سری لڑکی کو اغوا کر لے گئے ہیں۔ ہم دوڑ کر باہر گئے تو گلی کے موڑ پر لوگ جمع تھے اور مائی سکھن کی لاش پڑی تھی۔ فوراً ہی پولیس کو اطلاع دی گئی۔ اسی گلی میں رہنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ وہ اسی طرف آ رہا تھا کہ گولیوں کی آواز سن کر اس نے دور ہی کار روک لی۔ اس جگہ ایک پاجیرو کھڑی تھی اور دو آدمی ایک عورت کو زبردستی اغوا کر گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ وہ اس عورت کو پاجیرو میں ڈال کر لے گئے۔ کار والا پاجیرو کا نمبر نہیں دیکھ سکا تھا۔ قریب آکر اس نے مائی سکھن کی لاش دیکھی تو اسے پہچان کر نہیں اطلاع دے دی۔“

”مگر میں نے تو فون نہیں کیا تھا۔“ نائلہ نے کہا۔

”اس واردات کے بعد ہم سمجھ گئے تھے کہ سسی کو دھوکے سے باہر بلایا گیا تھا۔“ غزالہ نے کہا۔

”لیکن وہ کون ہو سکتا ہے؟“ نائلہ بیڑوائی۔

”ہماری گلی میں رہنے والے نے ان دو آدمیوں کے جوڑے بتائے ہیں ان کے مطابق ایک تو میرا بھائی ہے شاہنواز، جس نے ہمیں اس دنیا میں ذیل کر رکھا ہے۔ دوسرے کو میں نہیں سمجھ سکی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“  
 غزالہ نے دوسرے آدمی کا جو حلیہ بتایا اسے سن کر نائلہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ حلیہ شبیر درانی پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ حلیہ۔۔۔ وہ بیڑوائی۔“ یہ حلیہ تو میرے کزن شبیر درانی کا ہے جس کی وجہ سے میں اب تک خوار ہو رہی ہوں۔ لیکن اگر شبیری ہے تو تمہارے بھائی سے کیسے مل گیا؟“

”برے کو برے لوگ مل ہی جاتے ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔

”لیکن وہ عورت کون ہو سکتی ہے جس نے میرے نام سے فون کیا تھا؟“ نائلہ بولی۔

”کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے آوارہ عورتوں کی کمی ہوتی ہے کیا۔“ غزالہ نے کہا۔

وہ دوبارہ اسی کمرے میں آگئیں۔ مائی سکھن کی بیٹی کی حالت واقعی بہت بری تھی۔ رو رو کر اس نے اپنے آپ کو ہلکان کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد رئیس کریم بخش، نائلہ اور سلطانہ کو بلا کر ایک طرف لے گیا۔

”بابا سائیں، مجھے افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے اس گھر کا سکون برباد ہوا ہے۔“ نائلہ بولی۔

”ایسی باتیں مت کرو بیٹی۔“ رئیس کریم بخش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”قیمت کا کھٹا تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ افسوس تو مجھے ہے کہ ہم اپنی ممان کی حفاظت نہیں کر سکے۔“

”میں ان کا پتہ چلا لوں گی بابا۔“ نائلہ نے کہا۔ ”خدا غلام کی رسی دراز ضرور کرتا ہے لیکن یہی رسی ایک دن اس کے لئے پھندہ بن جاتی ہے۔“

اسی دوران باہر گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد علی احمد نے آکر بتایا کہ نقش ہسپتال سے آگئی ہے۔

”پولیس والے مائی سکھن کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئے تھے۔“ رئیس کریم بخش نے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بھی کمرے سے باہر آگئیں۔ مائی سکھن کی نقش کو بڑے ہال نما کمرے میں رکھوا دیا گیا۔ اس کی بیٹی نقش سے لپک کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سلطانہ، نائلہ اور دو سری عورتیں اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی

تھیں۔ سلطانہ اور نائلہ بھی ضبط نہ کر سکیں۔ ان کی آنکھوں سے بھی زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ یہی وہ عورت تھی جس نے ان کی عزت اور جان بچائی تھی اور بالاخر سی کو بچانے کی کوشش میں آج اس نے اپنی جان دے دی تھی۔

نائلہ وغیرہ کا پروگرام یہی تھا کہ اب وہ رات بیس رہیں گی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ یہاں سے نہیں جاسکتی تھی۔

اس وقت تقریباً "ایک بجاتا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جس جگہ نائلہ بیٹھی تھی اس کے قریب ہی ٹیلی فون رکھا تھا۔ نائلہ نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا نا چاہا مگر پھر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ظاہر ہے یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ فون کی ایک ایکس ٹینس ڈرائنگ روم میں بھی تھی وہاں سے کسی نے ریسیور اٹھالیا۔ تقریباً "تین چار منٹ بعد علی احمد دروازے میں نمودار ہوا۔ اس نے نائلہ کو اشارہ کیا کہ ریسیور اٹھا لے۔

"میرے لئے کال ہے! کون ہو سکتا ہے؟" نائلہ نے کہا۔  
 "کوئی عورت ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نائلہ درانی کے خوالے سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا کہ نائلہ درانی موجود ہے تو اس نے کہا کہ اب وہ آپ ہی سے بات کرے گی۔" علی احمد نے کہا۔  
 نائلہ نے ریسیور اٹھالیا۔

"میں" نائلہ درانی بول رہی ہوں۔ آپ کون ہیں؟" نائلہ نے کہا۔  
 "میرا نام ستارہ ہے۔ آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن میں اپنے سینے پر ایک بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ اسی لئے فون کیا تھا۔ پتہ چلا کہ آپ بھی موجود ہیں تو سوچا کہ کسی اور کے بجائے آپ ہی سے بات کی جائے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"وہ" نائلہ نے کہا۔ "غالبا" آپ وہی خاتون ہیں جس نے آج شام اسی نمبر پر میرے نام سے کوئی پیغام دیا تھا۔"

"ہاں" میں وہی ہوں۔ "دوسری طرف سے جواب ملا۔  
 "اور شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ میرے نام سے اس پیغام نے یہاں کیا قیامت مچائی ہے۔" نائلہ نے کہا۔  
 "مجھے تقریباً "نو بجے پتہ چلا تھا۔" ستارہ نے جواب دیا۔ "اسی وقت سے میرا ضمیر مجھے بچو کے لگا رہا ہے۔ اور بالاخر میں نے اس نمبر پر فون کر کے صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"  
 "فون پر تفصیل سے بات نہیں ہو سکتی۔ کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔" نائلہ نے کہا۔  
 "ہاں" کیوں نہیں۔" ستارہ نے کہا اور پھر اسے اپنے مکان کا پتہ سمجھانے لگی۔ آخر میں وہ بولی۔ "میں انتظار کر رہی ہوں۔"

نائلہ نے ریسیور رکھ دیا اور اٹھتے ہوئے علی احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 "آپ میرے ساتھ چلے اور دلاور کو بھی ساتھ لے لیں۔"  
 وہ باہر آگئی۔ اس کے پیچھے ہی علی احمد اور دلاور بھی آگئے۔ نائلہ گاڑی میں اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گئی اور وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ نائلہ ایک جھگڑے سے گاڑی کو حرکت میں لے آئی۔ گلشن اقبال تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے اور پھر ہلاک فائیو میں ستارہ کا بنگلہ بھی آسانی سے تلاش کر لیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں ستارہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"جی" آپ کچھ بتانا چاہتی تھیں۔" نائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 "میں بہت بری عورت ہوں۔ لوگ مجھے طوائف کہتے ہیں۔ میں جوان اور خوبصورت جسموں کا دھندہ کرتی ہوں لیکن کسی کی جان لینا میرے اس دھندے میں شامل نہیں۔" ستارہ نے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر انہیں بتانے لگی کہ نائلہ کے نام سے وہ فون کس طرح کیا گیا تھا۔

”شاہنواز کے ساتھ دوسرا آدمی کون تھا؟“ نائلہ نے پوچھا۔  
 ”میں اسے نہیں جانتی۔ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔“ ستارہ نے جواب دیا۔ ”شاہنواز اسے بشیر یا پتہ نہیں کس نام سے مخاطب کر رہا تھا۔“

”بشیر۔۔۔ بشیر درانی۔“ نائلہ نے کہا۔

”ہاں بالکل یہی نام تھا اس کا۔“ ستارہ جلدی سے بولی۔

نائلہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”شاہنواز کا ٹھکانا بتا سکتی ہو؟“

”اس کے کئی ٹھکانے ہیں لیکن سنا ہے کہ آج کل ڈی سلوا ٹاؤن میں سجادول کے پاس رہ رہا ہے۔“ ستارہ چند لمبے خاموش رہی پھر بولی۔ ”پہلے میں اسے مذاق سمجھی تھی۔ لیکن نوبت کے قریب مجھے پتہ چلا کہ ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے اور سسی نامی لڑکی کو اغوا کر لیا گیا ہے تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری کال کا اتنا بھیاک نتیجہ برآمد ہوگا۔ میں اس وقت سے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں اور بالآخر میں نے اسی نمبر فون کر کے صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہاں کس سے بات کی جائے لیکن جب نائلہ درانی کا حوالہ دیا تو پتہ چلا کہ آپ وہاں موجود ہیں۔“

”آپ جانتی ہیں وہ فون نمبر کس کا ہے؟“ نائلہ نے کہا۔

”نہیں۔“ ستارہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ شاہنواز کے والد کا گھر ہے اور یہ شاہنواز کا چھوٹا بھائی ہے۔“ نائلہ نے علی احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ مجھے افسوس ہے۔“ ستارہ نے کہا۔ ”یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے اور ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔“

”فی الحال آپ خاموش رہیں گی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”اس دوران اگر شاہنواز نے آپ سے رابطہ کیا تو آپ اسے بھی کچھ نہیں بتائیں گی۔ میں دوبارہ آپ سے رابطہ قائم کروں گی۔“

”ٹیلے۔۔۔ علی احمد۔“ وہ دونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔ ستارہ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ جب وہ دوبارہ گھر پہنچے تو تین بچے والے تھے۔

”کیا ہوا۔۔۔ کہاں گئے تھے تم لوگ؟“ رئیس کریم بخش نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

”ایک ضروری کام سے گئے تھے بابا سائیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آپ جائیں آرام کریں۔“ نائلہ نے کہا۔

”آرام تو اب اپنی زندگی سے ہی رخصت ہو چکا ہے بیٹی۔“ رئیس کریم بخش نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”کتنے لاڈلے ہمارے پالا تھا اس کم بخت کو۔ کیا خبر تھی کہ وہی آستین کا سانپ ثابت ہوگا۔ بڑھاپے میں ہمیں اس طرح ذلیل و رسوا کرے گا۔“

”آپ کیوں غم کرتے ہیں بابا سائیں۔“ علی احمد نے کہا۔ ”راتے سے بھگ گیا ہے۔ دو چار ٹھوکریں لگیں گی تو سیدھے راتے پر آجائے گا۔“

”اب وہ کبھی سیدھے راتے پر نہیں آسکتا۔“ رئیس کریم بخش بولا۔ ”ڈاکوؤں سے اس کا ملنا ملتا ہے۔ قاتلوں سے اس کے تعلقات ہیں اور اب تو اس نے بھی اپنے ہاتھ خون میں رنگ لئے ہیں۔ نہیں اب وہ سیدھے راتے پر نہیں آسکتا۔“

علی احمد اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں لے گیا۔ دلاور ڈرائنگ روم میں چلا گیا تھا وہاں چار پانچ آدمی قالین پر آڑے تڑپتے سو رہے تھے۔ دلاور بھی لیٹ گیا۔ نائلہ اس کمرے میں آئی جہاں میت رکھی ہوئی تھی۔ پانچ چھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سلطانہ نے مائی سکھن کی بیٹی کا سر باغی گود میں رکھا ہوا تھا۔ وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔

نالکھ نے غزالہ کو اشارے سے دوسرے کمرے میں بلا لیا۔

”تمہارے پاس ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے۔ ایس سیریز والا نمبر چاہئے۔“ نالکھ نے کہا۔

”میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ غزالہ نے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوسرے کمرے سے ٹیلی فون ڈائریکٹری لے آئی۔

”کس کا نمبر تلاش کرنا ہے اسی؟“

”سجاد نام کے ایک آدمی کا جو ڈی سلوا ٹاؤن میں کیس رہائش پذیر ہے۔“ نالکھ نے اس سے ڈائریکٹری لیتے ہوئے کہا۔

”وہ تو بھائی شاہنواز کا دوست ہے۔ میں دیتی ہوں اس کا فون نمبر۔ لیکن تم اسے کیوں فون کرنا چاہتی ہو؟“ غزالہ نے کہا۔

”تمہارے پاس ہے اس کا فون نمبر؟“ نالکھ نے پوچھا۔ وہ اس کے سوال کو نظر انداز کر گئی تھی۔

”دو تین مہینے پہلے شاہنواز یہاں آیا تھا تو اپنی ڈائری یہاں بھول گیا تھا۔ اس میں اس کے سارے دوستوں کے فون نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے وہ ڈائری سنبھال کر رکھ دی تھی اسے لے کر آتی ہوں۔“ غزالہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

تقریباً ”پانچ منٹ بعد اس نے ڈائری نالکھ کے حوالے کر دی۔ یہ جیسی سائز کی عام سی نوٹ بک تھی جس میں کئی لوگوں کے پتے اور فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ یہ نالکھ کی خوش قسمتی تھی کہ سجاد کے فون نمبر کے ساتھ اس کا اقبال ٹاؤن کا ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ اقبال ٹاؤن ہی پہلے ڈی سلوا ٹاؤن کہلاتا تھا۔

”غزالہ!“ وہ ڈائری اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ایڈریس اس نے ذہن نشین کر لیا تھا۔ ”اے سنبھال کر رکھو۔ میں ابھی جا رہی ہوں۔ سسی کا انہوں نے پتہ نہیں کیا حال کیا ہو گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی جان بچائی جاسکتی ہے۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ لوگ سجاد کے مکان پر موجود ہیں؟“ غزالہ نے اسے گھورا۔

”ہاں۔ میرے پاس اس کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔“ نالکھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ایک بچے جس عورت کا فون آیا تھا میں اسی سے ملنے گئی تھی۔ شام کو میرے نام سے فون پر پیغام اسی نے دیا تھا۔ ایسا اس نے شاہنواز کے کہنے پر کیا تھا۔ اسی نے بتایا تھا کہ شاہنواز ان دنوں سجاد ہی کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے اور میرا کزن شیردرانی بھی اس کے ساتھ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے خلاف کارروائی کر کے سسی کو بازیاب کر لیا جائے۔“

”اکیلی جاؤ گی؟“ غزالہ نے اسے گھورا۔

”نہیں یہ کارروائی پولیس کے ذریعے ہوگی۔ میں اور دلاور ان کے ساتھ رہیں گے۔“ نالکھ نے جواب دیا۔

نالکھ نے ڈرائنگ روم سے دلاور کو اٹھالیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے قاتلین پر لیٹ کر آنکھیں بند کی تھیں۔ لیکن پہلی ہی سرگوشیاں آواز پر اٹھ کر نالکھ کے ساتھ چل پڑا۔ غزالہ گیٹ تک ان کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے خدا حافظ کہا اور گیٹ بند کر کے دو عائیں مانگتی ہوئی واپس آگئی۔

مقامی پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ایس ایچ او تھا نے میں موجود نہیں تھا۔ لیکن ان کے پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی واپس آ گیا۔

”آج شام آپ کے علاقے میں ایک قتل اور اغوا کی واردات ہوئی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے ملزموں کا کوئی سراغ لگایا یا نہیں؟“ نالکھ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”آپ یہ سوال پوچھنے والی کون ہیں محترمہ؟“ انسپکٹر نے اسے گھورا۔ وہ نالکھ کو پہچان نہیں سکا تھا۔ ”کیا آپ کا تعلق کسی اخبار سے ہے؟ اگر ایسا ہے تو آپ نے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہوا؟“ نالکھ نے اسے گھورا۔

”بات یہ ہے محترمہ کہ اس قسم کی وارداتیں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کی جاتی ہیں اور ملزمان اپنے پیچھے

کوئی سراغ نہیں چھوڑتے۔ اس واردات کا طریقہ کار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ملزمان دو تھے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں ریس کریم بخش نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ان کا بیٹا ہو سکتا ہے جبکہ دوسرے کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔

”دوسرا میرا کزن ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”کمال ہے!“ انسپکٹر بولا۔ ”لوگ ایسے موقعوں پر اپنوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہاں صورت حال یہ ہے کہ اپنوں کے خلاف بیان دیئے جا رہے ہیں۔“

”اس لئے کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں بچانے کی کوشش کی جائے۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ان دونوں کے ہاتھ بے گناہوں کے خون میں رگے ہوئے ہیں۔ وہ قانون کے مجرم ہیں۔ کم از کم میں اپنے کزن کے بارے میں کہہ سکتی ہوں کہ اس کی گردن پر کئی بے گناہوں کا خون ہے۔ وہ رحیم یا رخان پولیس کے علاوہ سکھر پولیس کو بھی مطلوب ہے جہاں اس نے ایک ہندو سیٹھ کی خوبصورت نوکرانی کو قتل کیا تھا۔ کراچی میں بھی وہ ڈکیتی اور قتل کی متعدد وارداتوں میں ملوث ہے۔ ریس کریم بخش بھی اپنے بیٹے کے بارے میں خوب جانتا ہے۔ آپ تو ابھی تک ان کا سراغ نہیں لگا سکیے لیکن میں آپ کو یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ وہ دونوں کس جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ ایک جوان لڑکی ان کی تحویل میں ہے جسے وہ اغواء کر کے لے گئے تھے۔ اس کی زندگی کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے آپ چھاپہ مار پارٹی تیار کیجئے اور میرے ساتھ چلئے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ لوگ وہاں سے فرار ہو جائیں۔“

”دیکھئے محترمہ۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”چھاپے اس طرح نہیں مارے جاتے۔“

”تو کس طرح چھاپے مارے جاتے ہیں؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”پہلے ہم اپنے ذرائع سے تصدیق کریں گے کہ ملزمان واقعی اس جگہ موجود ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد ہی چھاپے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“

”ہوں۔“ نائلہ نے اس کے چہرے پر نظرسنجاتے ہوئے کہا اور ہاتھ بڑھا کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

”یہ سرکاری فون ہے۔ آپ اسے اجازت کے بغیر استعمال نہیں کر سکتیں۔“ انسپکٹر نے اسے گھورا۔

”تو پھر آپ خود ہی یہ نمبر ملا دیجئے۔“ نائلہ نے بال پین اٹھا کر ایک کاغذ پر دو تین نمبر لکھ دیئے۔ ”ان میں سے کوئی بھی نمبر ملا دیں۔“

”یہ۔۔۔ یہ تو ڈی آئی جی صاحب کے نمبر ہیں۔“ انسپکٹر چٹ دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں! یہ دفتر کا نمبر بھی ہے گھر کا بھی اور موبائل بھی۔ آپ گھر کا نمبر ملا دیں۔ وہ اس وقت گھر پر ہی سو رہے

ہوں گے۔“ نائلہ نے کہا۔

”آپ کون ہیں؟“ انسپکٹر نے اسے گھورا۔

”آپ شاید مجھے بھول گئے ہیں؟“ نائلہ نے کہا۔ ”میں وہ ہوں جس کے لئے ڈی آئی جی اور آئی جی بھی یہاں پہنچ گئے تھے۔ معاملہ اس وقت بھی ریس شاہنواز کا ہی تھا جس کے کہنے پر آپ مجھے پلازکہ میاں لے آئے تھے۔ اب میں آپ کو شاہنواز کے بارے میں اطلاع دے رہی ہوں تو بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا یہی آپ کی فرض مشا ہے؟“

”بب۔ بات یہ نہیں ہے محترمہ۔“ انسپکٹر ایک دم سنبھل گیا۔ اب اس نے نائلہ کو پہچان بھی لیا تھا۔ ”اس وقت ہمارے پاس نفری نہیں ہے۔“

”باہر جو ڈیڑھ درجن پولیس والے بیٹھے ہیں کیا وہ آپ کی حفاظت کے لئے ہیں؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”میں آپ کو پانچ منٹ دے رہی ہوں۔ اگر آپ نے چھاپے کے لئے پولیس پارٹی تیار نہ کی تو میں خود ڈی آئی جی سے بات کروں گی۔“

”وہ کہاں روپوش ہیں؟“ انسپکٹر نے شکست خوردہ سے لہجے میں پوچھا۔

”اقبال ٹاؤن میں۔“

”لیکن وہ تو ہمارا علاقہ نہیں ہے۔“ انکپٹر مسکرایا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ ٹائلہ نے کہا۔ ”آپ اس علاقے کے ایس ایچ او سے فون پر رابطہ کر کے کہیں کہ وہ دو تین آدمی آپ کی پارٹی کے لئے تیار رکھے۔ وہاں پہنچ کر ضابطے کی کارروائی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ اگر مغویہ کو کچھ ہو گیا وہ لوگ وہاں سے فرار ہو گئے تو اس کی تمام تر ذمہ داری آپ اور صرف آپ پر ہوگی۔ میں باہر اپنی گاڑی میں بیٹھی ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کتنی دیر میں یہاں سے نکلتے ہیں۔“ ٹائلہ دلاور کو اشارہ کرتی ہوئی باہر آگئی۔

اور پھر ٹھیک پانچ منٹ بعد ایس ایچ او چار مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ موبائل میں سوار ہو رہا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ اقبال ٹاؤن کے تھانے میں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ٹائلہ نے اپنی کار موبائل کے پیچھے ہی روک لی تھی۔ انکپٹر موبائل سے اتر کر اندر چلا گیا تھا۔ ٹائلہ نے دلاور کو گاڑی ہی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اندر پہنچ گئی۔

”وہ کس مکان میں چھپے ہوئے ہیں؟“ اس تھانے کے ایس ایچ او نے پوچھا۔ وہ سب انکپٹر تھا۔ ٹائلہ نے مکان کا نمبر لکھ کر دے دیا۔ نمبر دیکھتے ہی سب انکپٹر چونک گیا۔ ”یہ تو ڈیڑھ سچاول کا بنگلہ ہے۔ وہ تو بہت شریف آدمی ہے۔ آپ کس۔“

”لیکن اس مکان میں جو لوگ چھپے ہوئے ہیں وہ شریف نہیں ہیں۔“ ٹائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ وقت ضائع مت کیجئے۔“

سب انکپٹر اور انکپٹر تھوڑی دیر آپس میں بحث کرتے رہے پھر سب انکپٹر اپنے ایک اے ایس آئی کو لے کر انکپٹر کے ساتھ موبائل میں بیٹھ گیا۔ ٹائلہ نے بھی اپنی گاڑی موبائل کے پیچھے لگا دی۔ موبائل اقبال ٹاؤن کی ایک گلی میں ایک دو منزلہ بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ٹائلہ اپنی گاڑی کو ریورس میں قدرے پیچھے لے گئی۔ اس کے یا دلاور کے پاس اسلحہ نہیں تھا اور وہ ذرا ہٹ کر ہی رہتا چاہتی تھی۔۔۔ موبائل کے رکنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بنگلے کی دوسری منزل سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ پولیس والے پوزیشن لینے کے لئے ادھر ادھر بھاگے لیکن بد خواہی کی وجہ سے ان میں سے دو گولیاں لگنے سے زخمی ہو چکے تھے۔

تقریباً بیس منٹ تک زبردست فائرنگ ہوتی رہی پھر بنگلے سے فائرنگ بند ہو گئی۔ پولیس والوں نے دو تین منٹ انتظار کیا اور پھر دو اہلکار دیوار پر چڑھ کر اندر کود گئے۔ چند منٹ بعد انکپٹر اور دوسرے پولیس والے بھی اندر جا چکے تھے۔ بنگلے کی دونوں منزلوں کی بیتیاں جل چکی تھیں۔ ٹائلہ اور دلاور بھی گاڑی سے اتر کر بنگلے کی طرف دوڑے۔

پولیس نے سچاول، جبار اور اس کے نوکر کو راتھوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ ٹائلہ انکپٹر کے قریب کھڑی تھی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے آگرتائی کہ اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں ایک عورت بندھی پڑی ہے۔ ٹائلہ انکپٹر سے پہلے بیڑھیوں کی طرف دوڑی۔

وہ سہمی گئی۔ اسے دیکھ کر ٹائلہ کانپ اٹھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ ناک اور ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا۔ پیٹ پر دو تین جگہ ایسے نشان یا زخم نظر آ رہے تھے جیسے سگریٹ سے داغا گیا ہو۔ پیروں کے ٹکڑوں پر بھی دانے جانے کے نشان موجود تھے۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا اور منہ میں کپڑا ٹھسا ہوا تھا۔

ٹائلہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور سب سے پہلے اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور پھر ہاتھوں اور پیروں کی بندشیں کھولنے لگی۔ آزاد ہوتے ہی سہمی روتے ہوئے ٹائلہ سے لپٹ گئی۔

”ادی! انہوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ سگریٹوں سے جلایا ہے مجھے، لیکن میں نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں

بتایا۔ ”وہ روتے ہوئے بولی۔

”حوصلہ رکھو سسی۔“ نائلہ نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ بچ کر نہیں جا سکیں گے اور تمہارے ساتھ کوئی۔“ نائلہ کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

”نہیں ادی۔“ سسی نے جواب دیا۔ ”انہوں نے مجھے دوپہر تک کا وقت دیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ پھر بھی میں نے زبان بند رکھی تو وہ میرے ساتھ۔“ وہ خاموش ہو گئی پھر بولی۔ ”شکر ہے تم لوگ آگئے ادی۔“

”ہم تمہیں بے یار و مددگار کیسے چھوڑ سکتے تھے۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنا دوپٹہ اتار کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔

وہ سسی کو نیچے لے آئے۔ جبار، وزیرہ، سجاد اور اس کے نوکر کو حراست میں لے لیا گیا۔ پتہ چلا کہ شبیر درانی اور شاہنواز کو شبہ تھا کہ پولیس کا چھاپہ نہ پڑ جائے اس لئے وہ رات بھر جاگتے رہے تھے اور پھر انہوں نے پولیس کو دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ چونک جھپٹے سے ہوشیار تھے اس طرح انہیں فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

نائلہ اور دلاور پولیس اسٹیشن پر ضابطے کی کارروائی مکمل ہونے پر سسی کو لے کر گھر واپس پہنچے تو صبح کے چھ بج رہے تھے سسی کو راستے میں ہی بتا دیا گیا تھا کہ مائی سکھن ختم ہو چکی ہے۔ گھر بچ کر سسی مائی سکھن کی فحش سے لٹ کر خوب روئی۔ میاں رہتے ہوئے اسے مائی سکھن سے بڑا لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ اسے اپنی ماں ہی کی طرح سمجھنے لگی تھی اور مائی سکھن نے اسے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی جان دے دی تھی۔

سسی کی بات یابی پر غزالہ، علی احمد اور رئیس کریم بخش خوش تھے۔ لیکن رئیس کریم بخش کو اس بات کا افسوس تھا کہ شاہنواز بچ نکلا تھا۔

صبح ہوتے ہی کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ لوگ صبح سویرے ہی آنا شروع ہو گئے تھے۔ محلے کے تمام لوگ رئیس کریم بخش کے جاننے والے اور کراچی میں موجود ان کے تمام رشتہ دار آئے تھے۔ مائی سکھن چالیس سال سے رئیس کریم بخش کے گھر میں خدمات انجام دے رہی تھی۔ وہ کسی کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ سب کو اس کی موت کا افسوس تھا اور سب ہی اسے اس کی آخری منزل تک پہنچانے آئے تھے۔

دن کو گیارہ بجے جنازہ اٹھا تو ایک کھرام سا بچہ گیا۔ مائی سکھن کی بیٹی دھارمیاں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس دنیا میں صرف ماں ہی تھی اور وہ بھی اسے چھوڑ گئی تھی۔

نائلہ اور سلطانہ کے آنسو نہیں ٹھہر رہے تھے۔ وہ مائی سکھن کی بیٹی اور غزالہ سے گلے لگ کر روتی رہیں اور اپنے دل کا غبار ہلکا کرتی رہیں۔



شبیر درانی اور شاہنواز کو سجاد کے بنگلے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

گیٹ کے سامنے گاڑی رکھتے ہی سجاد کے نوکر بیرونے گیٹ کھول دیا اور شاہنواز پاجیرو کو اندر لیتا چلا گیا۔ پہلے خود نیچے اتر کر اس نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے بھی دو منزلہ بنگلہ تھا اور اوپر کی منزل کے کمروں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس نے پیرو کو اشارہ کیا۔ پیرو نے برآمدے والی جی بجادی۔ شاہنواز نے مطمئن ہونے کے بعد پاجیرو کا کچھلی طرف کا دروازہ کھول کر شبیر درانی کو اشارہ کیا۔ وہ سسی کو ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اتر آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔

”تمہارے منہ سے آواز نکلی تو گولی مار دوں گا۔“ وہ سسی کی طرف دیکھ کر غرایا اور اسے کھینچتا ہوا راہداری میں داخل ہو گیا۔

شاہنواز بھی ان کے پیچھے ہی تھا۔ وہ سسی کو اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں لے آئے جی جلانے سے پہلے شاہنواز نے تمام کمر کیوں کے سامنے پردے کھینچ دیئے تھے۔

خاصا وسیع و عریض کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور چند گول ٹکٹے پڑے ہوئے تھے۔ شیردرانی نے دروازے میں داخل ہوتے ہی سسی کو دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل قالین پر گر گئی۔  
 ”یہ تم نے اچھا نہیں کیا ریس شاہنواز۔“ سسی نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا سائیں کو جب تمہاری اس حرکت کا پتہ چلے گا تا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“  
 ”بابا سائیں کو بتائے گا کون؟“ شاہنواز نے کہا۔

”مائی سکھن اور کون۔ جسے تم گولی مار کر پھینک آئے ہو۔“ سسی نے کہا۔  
 ”اس بڑھیا کے لئے تو ایک ہی گولی کافی تھی۔ میں نے بلا وجہ تین چار گولیاں ضائع کر دیں۔ وہ نمک حرام تو اسی وقت ختم ہو گئی ہوگی۔ اس کے فرشتے تو آکر نہیں بتائیں گے کہ اسے کس نے مارا ہے اور تمہیں کون اٹھا کر لے گیا ہے۔ بات تو تمہاری ادبی پر آئے گی۔ جس نے تمہیں فون کیا تھا۔“  
 ”ادبی پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ پر تم مجھے کیوں اٹھا کر لائے ہو؟“ سسی نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

”یہ بھی بتا دیں گے کہ تمہیں یہاں کس لئے لے کر آئے ہیں پہلے اس کی طرف دیکھو جانتی ہو اسے؟“ شاہنواز نے کہتے ہوئے شیردرانی کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”میں نہیں جانتی اسے۔ یہ تو شکل ہی سے تمہاری طرح بد معاش لگتا ہے۔“ سسی نے جواب دیا۔  
 ”یہ شیردرانی ہے۔ تم بہت دنوں سے نالکہ کے ساتھ ہو۔ اس نے تمہیں اس کے بارے میں تو ضرور بتایا ہو گا۔“ شاہنواز نے کہا۔

شیردرانی کا نام سن کر سسی چونک گئی۔ اس نے غور سے شیردرانی کی طرف دیکھا۔  
 ”تو یہ ہے وہ بے غیرت بھائی جس نے اپنی بہن کو بار بار سرعام ننگا کرنے کی کوشش کی۔ اس کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے کئی بے گناہوں کو قتل کیا۔ اپنی بہن کو قتل کروانے کے لئے ایک پولیس انسپکٹر کو پانچ لاکھ روپے دیئے لیکن اپنی ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں کیا ملا۔ ویسے ایک بات ہے۔ تم بے زیادہ بے غیرت آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“

شیردرانی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ سسی کے منہ پر سید کر دیا۔ سسی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس کے رخسار پر شیردرانی کی اٹھلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ وہ اپنا گال سٹلانے لگی۔  
 ”اب اگر تم نے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا تو گولی مار دوں گا۔“ شیردرانی نے پستول سیدھا کرتے ہوئے کہا۔  
 ”مار دو گولی۔“ سسی نے جواب دیا۔ وہ خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”نہ بابا! یہ نہیں۔“ شاہنواز بولا۔ ”تمہیں صرف گولی مارنے کے لئے تو یہاں نہیں لائے تا۔ اگر گولی مارنا ہوتی تو وہیں مار دیتے۔ تمہیں تو کسی اور مقصد کے لئے یہاں لائے ہیں۔ پہلے وہ مقصد پورا کریں گے پھر ضرورت پڑی تو گولی بھی مار دیں گے اور تمہاری لاش کسی سڑک پر پھینک دی جائے گی۔“  
 ”تم کوئی بھی مقصد پورا نہیں کر سکتے۔“ سسی نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”ایسا نہ کہو بابا۔“ شاہنواز بولا۔ ”تم عورت ہو اور عورت زیادہ دیر تک کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی۔“  
 اسی لمحہ جبار کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کچھ دیر تک سسی کی طرف دیکھتا رہا پھر شیردرانی اور شاہنواز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”سائیں، کھانا تیار ہو گیا ہے۔ پہلے کچھ کھائی لو۔ پھر اس سے کھیلنے کے لئے تو ساری رات پڑی ہے۔“  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ تم ایک لمبی سی رسی لے کر آؤ تا۔“ شاہنواز نے کہا۔

تقریباً ”پانچ منٹ بعد جبار رسی لے آیا۔ شیردرانی نے سسی کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے پھر اسے نیچے گر کر پیر بھی باندھ دیئے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ وہ تینوں سسی کو کمرے میں بند کر کے نیچے آگئے۔ میز پر کھانا لگا ہوا تھا مگر



سجاد موجود نہیں تھا۔

”وڈیہ کہاں چلا گیا ہے؟“ شاہنواز نے بیرو سے پوچھا۔

”اسی محل میں اپنے ایک دوست کے گھر گئے ہیں، آجائیں گے۔ آپ لوگ کھانا کھالیں۔“ بیرو نے جواب دیا۔ وہ تینوں میز پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے کہ سجاد بھی آگیا۔ چائے کے بعد جبار تو نیچے ہی رہ گیا اور وہ تینوں اوپر آگئے۔ ایک خوبصورت لڑکی کو بندھے ہوئے دیکھ کر سجاد پریشان سا ہو گیا۔

”یہ کون ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”ناکدرانی کی ساسھی۔“ شاہنواز نے جواب دیا۔ ”جس کی وجہ سے مجھے بابا سائیں کا گھر چھوڑنا پڑا اور پولیس کو اپنے پیچھے لگالیا۔ آج پولیس کو پہلے سے کہیں زیادہ میری تلاش ہے۔“

”اسے یہاں کیوں لائے ہو؟“ سجاد نے پوچھا۔

”اس سے پوچھتا ہے کہ ناکدرانی کہاں پھنسی ہوئی ہے؟“ شاہنواز نے کہا۔

”یہ شور چائے کی اور تم جانے ہو یہاں۔“

”اس کی فکر مت کرو بابا۔“ شاہنواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں بیرو ٹیلی ویژن اور دی سی آر اوپر لے آئے گا۔ لوگ فلمیں تو ساری رات دیکھتے ہیں، کوئی فلمی آواز میں، کوئی اونچی اونچی آواز میں۔ ہم ذرا آواز اونچی رکھتے ہیں۔ بیرو سی زیادہ سے زیادہ بد اخلاق اور بد تمیزی کہیں گے تاہم کمر کسی کو یہ تو پتہ نہیں چلے گا کہ یہاں کیا ڈرامہ چل رہا ہے۔“

”ہے تو بیرو اچھی چیز۔“ سجاد نے لچائی ہوئی نظروں سے سسی کی طرف دیکھا۔

”ابھی مکلی نظروں سے اس کی طرف مت دیکھو بابا۔“ شاہنواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ہم اس سے ناکدرانی کا پتہ پوچھ لیں پھر اسے تمہارے حوالے کر دیں گے۔ کھیلنے رہتا اس سے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ خند آ رہی ہے۔ تم لوگ ڈرامہ کرتے رہو۔“ سجاد کتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد بیرو اور سجاد وی سی آر اور ٹی وی اٹھا کر لے آئے۔ دونوں چیزیں اس دیوار کے قریب رکھ دی گئیں جس پر سوچ بچ ڈنگا ہوا تھا۔ بیرو نے پہلے پلگ لگایا اور بیرو وی سی آر کی لیڈ لگانے لگا۔

سسی قالین پر پہلو کے بل بیڑی وحیاناہ نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وی سی آر اور ٹی وی آن کر کے بیرو نے فلم لگادی۔ ٹی وی اسکرین پر کچھ دیر لہرس سی آتی رہیں پھر فلم شروع ہوگئی۔ انڈین فلم تھی۔ شروع ہی کا منظر بڑا پر شور تھا۔ غنڈوں کی ایک پارٹی نے غریبوں کی کسی بستی پر حملہ کر دیا تھا اور اس بستی میں قیامت کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ”تم لوگ جاؤ۔ ضرورت بیڑی تو بلا لیں گے۔“ شاہنواز نے بیرو اور جبار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں باہر نکل گئے اور دروازہ بند کر دیا۔

شبیردرانی نے سسی کے منہ سے کپڑا نکال دیا اور اس کے ہاتھ بھی کھول دیئے۔

”اگر تم ہماری باتوں کا ٹھیک جواب دے دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بصورت دیگر تم یہاں دیکھ رہی ہو کہ پانچ آدمی ہیں اور سب کے سب بھوکے ہیں۔ تمہیں اس طرح ہنہوڑ کر رکھ دیں گے کہ تم سانس نہیں لے سکو گی۔“ شبیردرانی نے کہا۔ سسی جواب دینے کے بجائے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ”تم ناکدرانہ کے ساتھ کب سے ہو؟“

”جب وہ صوبہ خان کے آدمیوں کے چنگل سے بھاگ نکلی تھی۔ وہ ہمارے گوشہ میں آئی تو زخمی تھی۔ میرے بابا نے اس کا علاج کیا۔ ہم نے اس کی خدمت کی اور جب وہ ٹھیک ہوگئی تو وہ ظالم صوبہ خان وہاں پہنچ گیا اور ناکدرانہ کے ساتھ مجھے بھی اٹھا کر لے گیا۔“ سسی نے کہا۔

”اوہ! تو تم وہ لڑکی ہو۔“ شیردرانی نے کہا۔ ”صوبہ خان تمہیں لے گیا تھا تو اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ تم چیز ہی ایسی ہو۔ ہر حال وہ تمہیں کہاں لے گیا تھا۔“

”اس نے ہمیں اپنی ذاتی جیل میں لے جا کر بند کر دیا تھا۔“ مہسی نے جواب دیا۔ ”مگر ادنیٰ تاں بھت بہادر لڑکی ہے۔ اس نے مجھے نکلی دی اور پھر ہم لوگ صوبہ خان کی جیل سے بھاگ نکلیں۔ صوبہ خان کی پاجیرو بھی ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ہمیں راستوں کا پتہ نہیں تھا۔ ہم لوگ بخش علی لاشاری کی طرف نکل گئے۔ پاجیرو میں پیٹرول ختم ہو گیا تو ادنیٰ نے اسے آگ لگا دی اور ہم ایک جنگل فیکٹری میں چھپ گئیں۔ فیکٹری کے ہندو مالک کو ہمارا پتہ چل گیا۔ اس نے ہمدردی جتاتے ہوئے ہماری مدد کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ ہمیں حفاظت سے شہر پہنچا دے گا۔“

اس ہندو سینٹھ نے دو تین آدمیوں کے ساتھ ہمیں جیپ پر بھیج دیا۔ اس نے کہا تھا کہ انسپکٹر صوبہ خان ہماری تلاش میں ہے۔ ہم ایک دو دن اس کی بہن کے گھر رہیں۔ صوبہ خان اس علاقے سے واپس چلا جائے گا تو وہ ہمیں شہر بھجوا دے گا۔ لیکن ہمیں راستے میں ان آدمیوں کی باتوں سے پتہ چل گیا کہ وہ ہندو سینٹھ اسمگلر ہے اور ہمیں ہندوستان بھجوا رہا ہے۔ ہم راستے میں ان آدمیوں کو کسی طرح دھوکا دے کر ان کی جیب چھین کر بھاگ نکلیں لیکن ہم ریگستان میں راستے سے بھٹک گئیں۔ جیپ میں پیٹرول ختم ہو گیا تو ہم ریگستان میں بھٹکتی ہوئی تیسرے دن راجستھان کے ایک گاؤں میں پہنچ گئیں۔ ان لوگوں نے ہماری مدد کی۔ ہمیں اپنا سمان رکھا اور پھر ہمیں دوسری طرف سے سرحد پار کروا دیا۔ ”مہسی چند گھنٹوں کو خاموش ہو گئی۔ اس نے راجستھان کے کیپ کا تذکرہ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ چند گھنٹوں بعد وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔“

”ہم نے جن لوگوں کے ساتھ سرحد پار کی تھی وہ اسمگلر تھے۔ سرحد پار کرتے ہی ہم سب کو رنجیز نے گھیرے میں لے لیا۔ راجستھان سے ایک اور لڑکی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ ہم تینوں رنجیز کے زخموں سے بھاگ نکلیں۔ ان کی ایک جیب بھی ہمارے ہاتھ لگ گئی۔ جیپ کا پیٹرول ختم ہو گیا تو اسے جنگل میں چھپا کر ہم جنگل ہی میں چھپ کر چلتی ہوئی ایک غریب ہاری کے گھر پہنچ گئیں۔ اسے ہم نے بتایا کہ ہمیں ڈاکو اٹھا لائے تھے اور ہم ان کے چنگل سے بھاگ کر چھٹی پھر رہی ہیں۔ وہ بہت سادہ لوح آدمی تھا۔ اس نے ہماری بات پر یقین کر لیا۔ اس نے بتایا کہ ڈھیلو کا دؤرہ کریم بخش بہت نیک اور شریف آدمی ہے۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔ وہ دؤرے کو ہمارے بارے میں اطلاع دینے چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو ہمیں اپنی گاڑی میں دؤرے کی حویلی میں لے آیا۔“

”حویلی میں آکر پتہ چلا کہ دؤرہ کریم بخش تو کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ شیطان وہاں موجود تھا۔“ اس نے شاہنوازی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے ہمیں دھوکے سے حویلی میں بلالیا تھا۔ اور پھر اسے پتہ چل گیا کہ ہم ڈاکوؤں کے چنگل سے نہیں بھاگیں بلکہ سرحد پار کر کے آئی ہیں اور یہ کہ پولیس اور رنجیز والے ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے ہمیں انڈیا کا جاسوس سمجھ لیا اور ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحفہ کے بدلے ہماری عزت کا سودا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے گھر کی ایک اڈیز عمر ملازمہ مائی سکھن ہمارے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی۔ وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہمیں حویلی سے نکال لائی۔ ہم کسی نہ کسی طرح کراچی پہنچ گئے۔ اس کے باپ نے ہمیں پناہ دی لیکن یہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ ہمیں لے جانا چاہتا تھا لیکن بابا سائیں اڑ گیا۔ اس نے اسے گھر سے نکال دیا۔ یہ اپنے باپ کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا گیا تھا اور پھر یہ ہماری گرفتاری کے لئے پولیس لے آیا۔ اس نے پولیس کو بتایا تھا کہ ہم انڈیا کی جاسوس ہیں لیکن ہم نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی اور انٹا اسی کو پولیس سے بچنے کے لئے بھانگنا پڑا اور آج۔“ مہسی ایک بار پھر خاموش ہو گئی اور پھر شاہنوازی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اور آج اس شیطان نے مائی سکھن کو قتل کر دیا۔ اس عورت کو قتل کر دیا جس نے اسے بیٹھ اولاد کی طرح چاہا تھا اور بیٹھ اس کا بھلا چاہا تھا اور ہر لمحہ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی تھیں۔ یہ انسان نہیں شیطان ہے، تمہاری طرح۔“ اس نے شیردرانی کی طرف دیکھا۔ ”تم دولت کے لالچ میں ایک ایسی عورت کو رسوا اور قتل کرنا چاہتے ہو جو درحقیقت پوجے جانے کے قابل ہے۔ مگر ہوس نے تمہاری اور تمہاری ماں کی آنکھوں پر پنی باندھ رکھی

ہے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا شبیر درانی! ادی نالہ ایک ایسی چٹان ہے جس سے سرگرا کر تم اپنے آپ کو لومنان تو کر سکتے ہو لیکن اسے تسخیر نہیں کر سکتے۔“

”بڑی دلچسپ کہانی سنائی ہے تم نے۔“ شبیر درانی نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”لیکن اب صرف اتنا بتادو کہ وہ چٹان ہے کہاں؟ ایک مرتبہ میرے سامنے آجائے پھر دیکھنا تمہارے سامنے ہی اسے کس طرح تسخیر کرتا ہوں۔“

”وہ تمہارے سامنے ابھی گئی تو تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔“ سسی نے جواب دیا۔ ”اگر اسے پتہ چل گیا کہ تم نے مائی سکھن کو قتل کر کے مجھے اغواء کر لیا ہے تو وہ تمہیں تلاش کر لے گی اور پھر تم اس کے غضب سے نہیں بچ سکو گے۔ وہ عورت نہیں شیرنی ہے شیرنی۔“

”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ شیرنی کہاں چھپی ہوئی ہے؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ اگر معلوم ہوتا بھی تو میں بتاتی۔“ سسی نے نفوس لہجے میں جواب دیا۔ شبیر درانی نے ٹی وی کی آواز تیز کر دی اور دوبارہ سسی کے قریب آکر چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ سسی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ پیچھے الٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی دھار بہ نکلی تھی۔ شبیر درانی نے اس کے سینے پر دو تین ٹھوکریں ماریں مگر اس مرتبہ سسی کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ اس نے دانت سختی سے سمجھنے لگے تھے اور پھر اس نے اچانک ہی شبیر درانی کا پیڑ پر زوردار جھکا دیا۔ شبیر درانی لڑکھڑاکر پشت کے بل پیچھے گرا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

”تم ایسے نہیں مانو گی۔“ شبیر درانی غراتا ہوا دوبارہ اس کی طرف لپکا۔

وہ ایک بار پھر سسی پر پل پڑا۔ شاہنواز نے ٹی وی کی آواز کچھ اور تیز کر دی۔ لڑائی کا منظر تھا۔ گولیاں چل رہی تھیں، دھماکے ہو رہے تھے اور سسی کی چیخیں اس شور میں دب کر رہ گئی تھیں۔ شبیر درانی ہانپ گیا مگر سسی نے زبان نہیں کھولی۔

”چھوڑو رئیس شبیر۔“ شاہنواز سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”تم ایک لڑکی کی زبان بھی نہیں کھلو اسکے۔ اب دیکھو یہ کیسے فر فر رہی ہے۔“

سسی کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ شاہنواز چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر قبض کو ایک زوردار جھکا دیا۔ قبض نیچے تک پھٹ گئی۔ شاہنواز کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے اچانک ہی سگریٹ سسی کے پیٹ سے لگا دیا۔ سسی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شاہنواز نے سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا ایک جگہ سے ہٹا کر پیٹ پر دوسری جگہ رکھ دیا اور اسے آہستہ آہستہ دبا تا رہا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی بو پھیل گئی۔ زیادہ دبانے سے سگریٹ بجھ گیا۔ شاہنواز نے سگریٹ دوبارہ سلگالیا۔

”اب کیا خیال ہے چھو کر۔“ کچھ بولو گی یا۔۔۔“ وہ سگریٹ کو سسی کے برہنہ پیٹ کی طرف بڑھانے لگا۔

”نہیں۔“ سسی کے منہ سے کراہ نکلی۔ ”میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تم مجھے جلا ڈالو“ میرے گلے کر دو۔ مجھ سے ادی کا پتہ نہیں پوچھ سکو گے۔“

شاہنواز نے سگریٹ پھر اس کے پیٹ سے لگا دیا۔ سسی چیخی۔ شاہنواز نے اس کے پیٹ کو تین چار جگہوں سے داغا لیکن سسی نے زبان نہیں کھولی۔

”بڑی ڈھیٹ ہے بھئی۔“ شاہنواز ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جسم کے بعض حصے ایسے نازک ہوتے ہیں کہ ان پر ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں ہوگی۔“

”میں تم سے رحم کی بجائے نہیں مانگوں گی۔“ سسی نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

”رہیں شبیر۔“ شاہنواز آستین سے چہرہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ”اس ٹی ٹانگیں قابو کرو، پہلے اس کے پیروں کو آزما

کر دیکھتے ہیں۔“ شیردرانی سسی کی ٹانگوں پر اس طرح بیٹھ گیا کہ وہ بل بھی نہیں سکتی تھی۔ شاہنواز نے سلگتا ہوا سگریٹ سسی کے پیر کے تلوے سے لگا دیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ اس کے دونوں پیروں کے تلوے و احتارہا لیکن سسی نے زبان نہیں کھولی۔

”بڑی بے غیرت ہے بھی۔“ شاہنواز کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”بند کر دوٹی وی اور اس کو بھی باندھ دو۔ تین بج گئے ہیں۔ اب صبح دیکھیں گے اس کو۔“ پھر وہ سسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں دوپہر تک کا وقت دیتا ہوں۔ سوچ لو اچھی طرح۔ اگر اس وقت بھی تم نے ناکلہ کا پتہ نہیں بتایا تو وہ حشر کروں گا تم سوچ بھی نہیں سکو گی۔“ سسی کے چہرے پر بے پناہ اذیت کے تاثرات تھے۔ وہ ان دونوں کو خونخوار نگاہوں سے گھورتی رہ گئی۔ شیردرانی نے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ساتھ والے کمرے میں آگئے۔ یہاں بھی قالین بچھا ہوا تھا گول ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ دو آئینک رانٹلیں بھی پڑی تھیں۔

”سو جاؤ رئیس شبیر۔“ شاہنواز قالین پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ”کل اس چھوکر کی دیکھیں گے۔“

”تم سو جاؤ، مجھے نیند نہیں آرہی۔“ شیردرانی نے جواب دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ سسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ نازک اور دلی پکلی سی لڑکی تو ناکلہ سے بھی زیادہ سخت جان نکلی تھی۔ اس کی جگہ اگر کوئی ہٹا کتا مرد بھی ہوتا تو وہ مدت دیر پہلے زبان کھول چکا ہوتا۔ لیکن اس لڑکی نے تو منہ سے ایک لفظ تک نہیں پھوٹا تھا۔

سامنے والی کھڑکی سے بہت ہلکا سا اجالا دکھائی دینے لگا تھا۔ اسی لمحہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ شیردرانی نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ ہلٹ کر شاہنواز کو جھنجھوٹنے لگا۔

”اٹھو۔ جلدی کرو۔ پولیس آئی ہے۔“ شاہنواز گڑبڑا کر اٹھ گیا۔ ان دونوں نے رانٹلیں اٹھالیں۔ شبیر نے کھڑکی سے ذرا آڑے رخ سے جھانکا تو کئی میں کچھ دور اسے ایک کار بھی نظر آگئی۔ وہ کار میں بیٹھی ہوئی ناکلہ اور دلور کو بیٹھے دیکھ کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ شاہنواز نے بھی کھڑکی سے جھانکا اور پھر فائرنگ کھول دیا۔ پہلی بار میں دو پولیس والے زخمی ہو کر گرے گئے تھے۔

شبیردرانی نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس والے بھی اب پوزیشن لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔ تقریباً ”میں منٹ تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔“

”مقابلہ کرنا مشکل ہے رئیس شبیر۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”میرا میگنٹ ختم ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس ہمیں گھیر لے۔ نکل چلو۔“ وہ دونوں کمرے سے نکل کر عقبی زینے پر آگئے۔ دونوں نے رانٹلیں سیڑھیوں پر پھینک دیں کیونکہ دونوں کے میگنٹ خالی ہو چکے تھے۔ زینے سے عقبی کھلی میں نکل کر وہ ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔ پولیس والے اب بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ شیر اور شاہنواز پانچ چھ گھبراہٹ سے نکل گئے تھے۔

”اب کہاں جائیں گے۔“ شیردرانی نے پوچھا۔

”میرے ساتھ چلتے رہو سائیں۔“ دوسری سی ہے۔ تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ دوں گا نا۔“ شاہنواز نے کہا۔

اور وہ دونوں تیزی سے ایک طرف چلتے رہے۔



ناکلہ درانی پورے شہر میں پاگلوں کی طرح گھوم رہی تھی۔ اس نے غزالہ سے شاہنواز کی ڈائری لے لی تھی۔ اس ڈائری میں کوئی ایسا پتہ نہیں تھا جہاں پہنچ کر ناکلہ نے شاہنواز کے بارے میں دریافت نہ کیا ہو۔ کوئی ایسا ٹیلی

فون نمبر نہیں تھا جہاں رنگ کر کے معلومات حاصل نہ کی ہوں لیکن شاہنواز یا شیردرانی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ دونوں مگرہے کے سر سے بیگنوں کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ گلتا تھا جیسے اس شہر میں ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ دلاور بھی ناکہ کے ساتھ تھا۔ سلطانہ اور عبدالقدوس اپنے طور پر انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

سسی کو گھر پر ہی ڈاکٹر کو بلال کر دکھایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ سگریٹ سے جلائے جانے سے بیرونی زخم تو زیادہ تکلیف دہ نہیں تھے لیکن ٹھوکروں اور گھونٹوں کی وجہ سے اسے جو اندرونی چوٹیں لگی تھیں ان کی وجہ سے اسے چند روز بستر پر ہی رہنا پڑے گا۔

اس روز مائی مسکھن کا سوئم تھا۔ ناکہ اور دلاور وغیرہ پہلے ہی دن سے یہاں تھے۔ انہوں نے یہی سوچا تھا کہ اب سوئم کے بعد ہی یہاں سے جائیں گے۔ سوئم والے دن بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں ایک آدمی عبدالقدوس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار عجیب سی نگاہوں سے عبدالقدوس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فاتحہ کے بعد اکثر لوگ چلے گئے لیکن کچھ بیٹھے رہے۔ ان میں وہ آدمی بھی تھا جو عبدالقدوس میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس وقت بھی اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت ان کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

”آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں سائیں؟“ اس شخص نے عبدالقدوس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”رہیں کریم بخش سے آپ لوگوں کا کیا تعلق ہے؟“

”جاننے والے ہیں۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ بہت قریبی تعلقات ہیں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ تین دن سے یہاں ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

عبدالقدوس چونک گیا۔ اس نے تین دنوں میں اس آدمی کو ایک بار بھی یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو آج پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا۔

”ناکہ درانی سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ اس شخص نے پوچھا۔

عبدالقدوس کو ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ اس نے کن آنکھوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اسے یہ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

”میری نزن ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور وہ دراز قامت آدمی غالباً“ ناکہ درانی کا شہر ہے۔“ اس شخص نے دور بیٹھے ہوئے دلاور کی طرف اشارہ کیا۔

”مگتیر ہے۔“ عبدالقدوس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور پھر اچانک ہی اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس شخص کو اس نے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ اس رات کلشن میں ساحل سمندر پر وہ پہلی مرتبہ اس کی نظروں میں آیا تھا اور جب وہ موٹوریل سے اتر رہے تھے تو وہ دوسری مرتبہ دکھائی دیا۔ یہ شخص اتفاق بھی ہو سکتا تھا کہ اس روز وہ شخص بھی تفریح کے لئے کلشن گیا ہو اور دو مرتبہ اس کی نظروں میں آ گیا ہو لیکن وہ ناکہ اور ان لوگوں کے بارے میں اتنا کزید کزید کر کیوں پوچھ رہا ہے۔

”آپ کے تو رہیں کریم بخش سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گا کہ وڈیرے اور اس کے بیٹے میں کیا مسئلہ چل رہا ہے۔“ اس شخص نے پوچھا۔

”ہمارے تعلقات اتنے زیادہ گہرے نہیں ہیں۔ آپ تو ان کے خاندان کے ہیں۔ آپ کو ہم سے زیادہ بہتر معلوم ہونا چاہئے۔ ویسے آپ کا نام کیا ہے؟“ عبدالقدوس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا نام مشہل ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”شاہنواز میرا گلاس فیلو رہ چکا ہے۔ کئی روز پہلے یہاں کراچی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ باپ کے بارے میں شکوے شکایت کر رہا تھا۔ محل میں نے مائی مسکھن لے انتقال کی اطلاع اخبار میں پڑھی تھی۔ اس لئے آج آ گیا ہوں۔ بہت اچھی اور نیک عورت تھی۔“

عبدالقدوس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ شخص نالکہ ہی کے بارے میں معلومات جمع کر رہا ہے۔ اس کا رئیس کریم بخش کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بقول اس کے کہ اگر وہ امانواز کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا تو گھر کے کسی فرد کو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے تھا۔ اگر امانواز کے باپ نہیں تو اس کے بھائی کو تو ضرور معلوم ہوتا۔ کوئی تھوڑی بہت جان پہچان ہونی لیکن علی احمد سے اس کی ملاقات ہوئی تھی تو بالکل اجنبیوں کی طرح۔ علی احمد کی آنکھوں میں اس کے لئے ڈرامی بھی تو شہسائی نظر نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد مٹھل چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے رئیس کریم بخش یا علی احمد سے ملنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ بابا برگیا تو عبدالقدوس بھی ٹیٹ پر اُٹھیا۔ اس نے مٹھل کو سرخ رنگ کی ایک شیراڑ میں بیٹھے دیکھ کر اس گاڑی دانہ زہن نشین کر لیا اور اندر اُٹھیا۔

”ہاں۔“ وہ اللہ کو نے اٹھائے تھے۔ ۱۹۷۱ء۔ ”ایک آدمی آپ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ اس رات میں آپ کے مکان میں میری آمد ہوئی۔ اچھا تھا۔ مجھے یہ کہ وہ شاید آنا آدمی ہے۔“

توڑی دیر بعد دلاور بھی باہر آگیا۔ عبدالقدوس نے اسے بھی مٹھل کے بارے میں پوچھا۔

نائلہ کی آواز سن کر دلاور نے جلدی سے عبدالقدوس کی گر ن چھوڑ دی۔ اور مڑ کر آمدی طرف دیکھنے لگا۔ نائلہ کے ساتھ خوالہ اور سلطانہ بھی تھیں۔

”او، کچھ نہیں نائلہ بی بی۔“ دلاور جلدی سے بولا۔ ”یہ لڑکا ذرا بد تمیزی کر رہا تھا۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ ہی نہیں جو منہ میں آتا ہے بول دیتا ہے۔“

”بری بات ہے عبدالقدوس۔“ نائلہ نے اسے گھورا۔ ”دلاور تم سے بڑا ہے۔ کیا کہا تھا تم نے۔ سوری کہو!“

فون نمبر نہیں تھا جہاں رنگ کر کے معلومات حاصل نہ کی ہوں لیکن شاہنواز یا شبیر درانی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ دونوں گدھے کے سر سے سیگوں کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ لگتا تھا جیسے اس شہر میں ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ دلاور بھی نائلہ کے ساتھ تھا۔ سلطانہ اور عبدالقدوس اپنے طور پر انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

سسی کو گھر پر ہی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ سگریٹ سے جلانے جانے سے بیرونی زخم تو زیادہ تکلیف دہ نہیں تھے لیکن ٹھوکروں اور ٹھونسوں کی وجہ سے اسے جو اندرونی چوٹیں لگی تھیں ان کی وجہ سے اسے چند روز بستری ہی رہنا پڑے گا۔

اس روز مائی سکھن کا سوئم تھا۔ نائلہ اور دلاور وغیرہ پہلے ہی دن سے یہاں تھے۔ انہوں نے یہی سوچا تھا کہ اب سوئم کے بعد ہی یہاں سے جائیں گے۔ سوئم والے دن بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں ایک آدمی عبدالقدوس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار عجیب سی نگاہوں سے عبدالقدوس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فاتحہ کے بعد اکثر لوگ چلے گئے لیکن کچھ بیٹھے رہے۔ ان میں وہ آدمی بھی تھا جو عبدالقدوس میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس وقت بھی اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت ان کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

”آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں سائیں؟“ اس شخص نے عبدالقدوس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”رئیس کریم بخش سے آپ لوگوں کا کیا تعلق ہے؟“

”جاننے والے ہیں۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ بہت قریبی تعلقات ہیں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ تین دن سے یہاں ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

عبدالقدوس چونک گیا۔ اس نے تین دنوں میں اس آدمی کو ایک بار بھی یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو آج پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا۔

”نائلہ درانی سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ اس شخص نے پوچھا۔

عبدالقدوس کو ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ اس نے کن آنکھوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اسے یہ چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

”میری کرن ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور وہ دراز قامت آدمی غالباً“ نائلہ درانی کا شوہر ہے۔“ اس شخص نے دور بیٹھے ہوئے دلاور کی طرف اشارہ کیا۔

”مستحیر ہے۔“ عبدالقدوس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور پھر اچانک ہی اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس شخص کو اس نے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ اس رات کلشن میں ساحل سمندر پر وہ پہلی مرتبہ اس کی نظروں میں آیا تھا اور جب وہ مونو ریل سے اتر رہے تھے تو وہ دوسری مرتبہ دکھائی دیا۔ یہ شخص اتفاق بھی ہو سکتا تھا کہ اس روز وہ شخص بھی تفریح کے لئے کلشن گیا ہو اور دو مرتبہ اس کی نظروں میں آ گیا ہو لیکن وہ نائلہ اور ان لوگوں کے بارے میں اتنا کزید کزید کر کیوں پوچھ رہا ہے۔

”آپ کے تو رئیس کریم بخش سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گا کہ وڈیرے اور اس کے بیٹے میں کیا مسئلہ چل رہا ہے۔“ اس شخص نے پوچھا۔

”ہمارے تعلقات اتنے زیادہ گہرے نہیں ہیں۔ آپ تو ان کے خاندان کے ہیں۔ آپ کو ہم سے زیادہ بہتر معلوم ہونا چاہئے۔ ویسے آپ کا نام کیا ہے؟“ عبدالقدوس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا نام منہل ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”شاہنواز میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ کئی روز پہلے یہاں کراچی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ باپ کے بارے میں شکوے شکایت کر رہا تھا۔ کل میں نے مائی سکھن کے انتقال کی اطلاع اخبار میں پڑھی تھی۔ اس لئے آج آ گیا ہوں۔ بہت اچھی اور نیک عورت تھی۔“

عبدالقدوس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ شخص نالکہ ہی کے بارے میں معلومات جمع کر رہا ہے۔ اس کا رئیس کریم بخش کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بقول اس کے کہ اگر وہ شاہنواز کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا تو گھر کے کسی فرد کو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے تھا۔ اگر شاہنواز کے باپ کو نہیں تو اس کے بھائی کو تو ضرور معلوم ہوتا۔ کوئی تھوڑی بہت جان پہچان ہوتی لیکن علی احمد سے اس کی ملاقات ہوئی تھی تو بالکل اجنبیوں کی طرح۔ علی احمد کی آنکھوں میں اس کے لئے ذرا سی بھی توشہ ساسائی نظر نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد منٹھل چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے رئیس کریم بخش یا علی احمد سے ملنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ جب باہر گیا تو عبدالقدوس بھی گیٹ پر آگیا۔ اس نے منٹھل کو سرخ رنگ کی ایک شیراز میں بیٹھتے دیکھ کر اس کا ڈیڑھ کانبر ذہین نشین کر لیا اور اندر آگیا۔

سب لوگ چلے گئے۔ شامیانہ خالی ہو گیا تھا۔ رئیس کریم بخش، علی احمد اور دلاور وغیرہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ عبدالقدوس بھی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے نالکہ کو راہداری سے نکل کر ان کی طرف جاتے دیکھا تو وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے آگیا۔ نالکہ شامیانے کے ایک پول سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ ”آئیے، آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ عبدالقدوس اسے لے کر کھاس پر بھیجی ہوئی چاندنی پر بیٹھ گیا۔ ”کوئی خاص بات ہے؟“ نالکہ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ عبدالقدوس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ایک آدمی آپ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ اس رات میں نے اسے کفن میں بھی دو مرتبہ دیکھا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ شاہنواز کا آدمی ہے۔“

”کون ہے وہ اور کہاں ہے؟“ نالکہ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”اس کا نام منٹھل ہے اور وہ جا چکا ہے۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔ ”اس کا تعاقب میں نے اس لئے نہیں کیا کہ اسے شبہ ہو جائے کیونکہ وہ میرے ہی پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ صبح رجسٹریشن آفس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ گاڑی کس کی ہے۔“

”ہوں!“ نالکہ کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ غزالہ نے پورچ میں آکر اسے آواز دی اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ عبدالقدوس وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دلاور بھی باہر آگیا۔ عبدالقدوس نے اسے بھی منٹھل کے بارے میں بتایا تو وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”منٹھل نے آپ کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ آپ نالکہ درانی کے کیا لگتے ہیں۔“ عبدالقدوس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا۔ کیا کہا تم نے؟“ دلاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ تو سمجھ رہا تھا کہ آپ ان کے شوہر ہیں لیکن میں نے اسے بتایا کہ آپ ان کے منگیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد شادی ہونے والی ہے۔“ عبدالقدوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوئے مولوی۔“ دلاور نے اس کی گردن پکڑ لی۔ ”اے! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”نالکہ کی آواز سن کر دلاور نے جلدی سے عبدالقدوس کی گردن چھوڑ دی۔ اور مرکز برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔ نالکہ کے ساتھ غزالہ اور سلطانہ بھی تھیں۔

”او، کچھ نہیں نالکہ لی لی۔“ دلاور جلدی سے بولا۔ ”یہ لڑکا ذرا بد تمیزی کر رہا تھا۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ ہی نہیں جو منہ میں آتا ہے بول دیتا ہے۔“

”بری بات ہے عبدالقدوس۔“ نالکہ نے اسے گھورا۔ ”دلاور تم سے بڑا ہے۔ کیا کہا تھا تم نے۔ سوری کو!“



”یہ سو رہی کہنے والی بات نہیں ہے۔“ عبدالقدوس نے جواب دیا۔  
 ”میں پوچھتی ہوں بتاؤ تم نے اسے کیا کہا تھا؟“ نائلہ کے لیے میں ہلکی سی ڈانٹ تھی۔  
 دلاور کا چہرہ ایک دم متحیر ہو گیا۔ وہ گھورتی ہوئی نگاہوں سے عبدالقدوس کی طرف دیکھنے لگا۔  
 ”بتاؤ تا تم نے دلاور بھائی کو کیا کہا تھا؟“ اس مرتبہ سلطانہ نے کہا۔

”میں نے انہیں مٹھل کے بارے میں بتایا تھا کہ اس نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا دلاور نائلہ کا شوہر ہے تو میں نے جواب دیا تھا کہ ابھی تو مختیر ہے۔ یہی بات میں نے دلاور بھائی کو بتائی تو یہ میری گردن توڑنے پر تیار ہو گئے۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”گردن تو تمہاری میں توڑوں گی۔“ نائلہ غراتی ہوئی عبدالقدوس کی طرف بڑھی۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔

”ارے رہنے بھی دو۔“ سلطانہ نے نائلہ کا بازو پکڑ لیا۔ ”پہلی مرتبہ تو کسی کے منہ سے ایسی بات سنی ہے۔“ نائلہ اسے گھور کر رہ گئی۔ دلاور بھی عجیب کیفیت میں مبتلا تھا!

رات کو تمام مہمان چلے گئے تو سب لوگ غزالہ کے کمرے میں جمع ہو گئے کی البتہ نیچے ڈرائنگ روم ہی میں تھا جہاں دو اور مہمان بھی تھے۔

”مٹھل کون ہو سکتا ہے؟“ نائلہ نے کہا۔ ”بقول اس کے کہ وہ شاہنواز کا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ غزالہ، تم اس کے دوستوں میں سے مٹھل کے کسی آدمی کو جانتی ہو؟“

”میں شاہنواز کے اسکول اور کالج کے اکثر دوستوں کو جانتی ہوں لیکن یہ نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔“ غزالہ نے جواب دیا۔ ”عبدالقدوس کو اسی وقت بتانا چاہئے تھا ہم اسے پکڑ کر پوچھتے تو۔“

”گاڑی کے نمبر کے ذریعے صبح معلوم کر لیں گے۔“ عبدالقدوس نے کہا۔

”اگر وہ گاڑی کسی اور کی ہوئی تو؟“ سلطانہ نے کہا۔

”گاڑی کسی کی بھی ہو، معلوم ہو جائے گا کہ مٹھل کون ہے اور پھر ہم اس سے پوچھ لیں گے کہ وہ دو اجنبیوں کے رشتوں کے بارے میں کیوں پوچھتا پھر رہا ہے۔“ عبدالقدوس نے شوفی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم مجھ سے پٹ جاؤ گے عبدالقدوس۔“ نائلہ غراتی۔

دلاور نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت کے تاثرات تھے جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

”خاموشی کچھ کہہ رہی ہے۔“ سلطانہ، دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

”اچھا جی، میں نیچے جا رہا ہوں۔ نیند آ رہی ہے۔“ دلاور نے کہا اور کسی کی بات سننے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ صبح عبدالقدوس اور نائلہ گاڑی کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے رجسٹریشن آفس جائیں گے اور پھر مٹھل کے بارے میں معلوم کریں گے۔ یہ طے ہو جانے کے بعد عبدالقدوس بھی کمرے سے نکل کر نیچے آ گیا۔

دلاور ڈرائنگ روم میں قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ بکی سو گیا تھا۔ عبدالقدوس، دلاور کے پاس آکر لیٹ گیا۔

”دلاور بھائی۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ”یہ ساری شرارت سلطانہ کی تھی۔ ویسے میرا

دل بھی یہی چاہتا تھا کہ آپ اور نائلہ۔۔۔ میرا مطلب ہے آئیڈیا برا نہیں ہے۔“

”ایسی باتیں مت کرو عبدالقدوس۔“ دلاور نے کہا۔ ”نائلہ نے لی دل کی بہت اچھی ہیں۔ میں ان کی عزت کرتا ہوں۔ قدر کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھ پر مہربان ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں ایسی امیدیں وابستہ کر لوں جن کے پورے ہونے کا امکان نہ ہو۔ میں اپنی حیثیت بھی جانتا ہوں۔“

”آپ کی حیثیت سے تو وہ بھی واقف ہیں۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کی

حیثیت کا تعین اس کی دولت اور جائیداد سے نہیں اس کی شرافت سے کرتے ہیں اور ناکہ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ آپ کی شرافت کی قائل ہو چکی ہیں۔ آپ کی قدر کرتی ہیں اور آپ کا احترام کرتی ہیں اوسے اور آپ کو پسند بھی کرتی ہیں۔ سلطانہ ان کے دل کی بات معلوم کر چکی ہیں۔ اور آپ بھی۔۔۔

”یار مولوی۔“ دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ عبدالقدوس کو چڑانے کے لئے اسے مولوی کہا کرتا تھا حالانکہ اب وہ کلین شیو تھا۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ!“

عبدالقدوس نے بڑبڑاتے ہوئے کوٹ بدل لی۔ کچھ دیر بعد وہ تو سو گیا لیکن دلاور رات کے آخری ہر تک جاگتا رہا۔ عبدالقدوس کی باتیں اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ ناکہ اسے پسند کرتی تھی۔ اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ دلاور مفلس و فلاح ہے۔ وہ ایک اسکول ماسٹر کا بیٹا ہے۔ وہ تو شرافت کی بنیاد پر کسی کا تعین کرنے کی قائل تھی اور بقول عبدالقدوس ”اس کی حیثیت کا ناکہ نے تعین کر لیا تھا!

دلاور یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ اس کے سینے میں گدگدی کا ایک عجیب سا احساس تھا اور یہی احساس لئے وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

دوسری طرف ناکہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال کا شکار تھی۔ عبدالقدوس نے دلاور سے اس کا ایک رشتہ قائم کروا دیا تھا اور سلطانہ نے اس کی تائید بھی کر دی تھی۔ اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ خود اس نے اس رشتے کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ لٹی ہوئی سلطانہ دیر تک اسے پھیرتی رہی اور پھر وہ دونوں نیند کی آغوش میں پہنچ گئیں۔

صبح ناشتہ کرتے ہی ناکہ اور عبدالقدوس رجسٹریشن آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔ دفتر تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ عبدالقدوس نے کانڈر کلکھے ہوئے نمبر کے ساتھ سو روپے کا ایک نوٹ بھی لگادیا تھا۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ چند منٹ بعد وہی کانڈر اسے لوٹا دیا جس پر پوری تفصیل درج تھی۔

وہ کار عبدالخالق نامی ایک شخص کی ملکیت تھی جو فیڈرل لی ایریا کے بلاک چھ میں رہائش پذیر تھا۔ اس سے رابطہ کرنے پر انکشاف ہوا کہ وہ کار اس نے تقریباً ”دو مہینے پہلے مٹھل نامی ایک آدمی کو فروخت کر دی تھی اور پانچ ہزار اب بھی اس کی طرف باقی ہیں۔ مٹھل عصمت پلازہ کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔

وہ لوگ عصمت پلازہ پہنچ گئے۔ اس نمبر کی سرٹیفکاٹ کپڑ میں کھڑی تھی۔ فلیٹ کا نمبر انہیں عبدالخالق سے معلوم ہو چکا تھا۔ تیسرے بلاک کی پہلی منزل کے ایک فلیٹ کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئے۔ عبدالقدوس نے کھنٹی بجائی۔ دروازہ مٹھل ہی نے کھولا تھا وہ دونوں اسے دیکھتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

”کیا بات ہے۔ تم لوگ اس طرح میرے گھر میں کیوں گھس آئے ہو؟“ مٹھل بد خواس سا ہو گیا۔

”بابر پولیس کی موبائل کھڑی ہے۔ پولیس کے ساتھ جانا پسند کرو گے یا شرافت سے ہمارے سوالوں کا جواب دو گے؟“ ناکہ نے اسے گھورا۔

اس دوران ایک کمرے سے ایک بوڑھی عورت نکل آئی۔ وہ مٹھل کی ماں تھی جو ان مہمانوں کو دیکھ کر قدرے حیران سی ہوئی تھی۔

”یہ کون ہیں بیٹا۔ سہمان ہیں“ ان کو بٹھاؤ کھڑے کیوں ہیں۔ ”بوڑھی عورت نے کہا۔

”تم اندر جاؤ ماں۔“ مٹھل نے کہا پھر ناکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”تم میرے بارے میں کیوں معلوم کر رہے تھے اور شاہنواز کہاں ہے؟“ ناکہ نے پوچھا۔

”میں ریس شاہنواز کے لئے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا ہوں جن سے مجھے چار پیسے مل جاتے ہیں۔ مجھے معلوم

تھا کہ ان دنوں اسے تمہاری تلاش ہے۔ میں نے رئیس کریم بخش کے ہاں تمہیں دیکھا تھا۔ اس روز میں نے کلشن میں تم لوگوں کو دیکھا تو میں نے تم لوگوں کا تعاقب کیا۔ میرا خیال تھا کہ تمہارے بارے میں اطلاع پا کر وہ مجھے اچھی خاصی رقم انعام میں دے گا لیکن جب میں اس کے ٹھکانے پر پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ کئی روز سے سباجول کے ہاں رہ رہا

ہے۔ مجھے سجاد کا گھر معلوم نہیں تھا۔ کل میں نے سوچا کہ تمہارے بارے میں مزید معلومات حاصل کر لی جائیں  
اسی لئے رئیس کریم بخش کے ہاں گیا تھا۔ بعد میں میں نے دو تین جگہوں سے شاہنواز کے بارے میں معلوم کیا لیکن  
بالآخر ایک جگہ سے پتہ چلا کہ وہ اپنے دوست کو لے کر ڈھیلو چلا گیا ہے کیونکہ مائی سکھن کے قتل اور سجاد کے  
مکان پر چھاپے کے بعد پولیس اس کے پیچھے لگ چکی ہے۔ وہ تین چار دن ڈھیلو میں رہے گا اور اگر وہاں بھی خطرہ  
محسوس کیا تو بچے کے علاوہ کسی طرف نکل جائے گا۔

”سچ کہہ رہے ہو؟“ نائلہ نے اسے گھورا۔

”ہاں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ مٹھل نے اثبات میں سر ہلایا۔

نائلہ نے عبدالقدوس کو اشارہ کیا اور وہ دونوں فلیٹ سے نکل گئے۔

”کیا رہا؟“ بنگلے میں داخل ہوتے ہی سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے نائلہ کی طرف دیکھا۔

”وہ دونوں یہاں سے فرار ہو کر ڈھیلو چلے گئے ہیں۔“ نائلہ نے جواب دیا۔ ”ہم بھی کل روانہ ہو رہے ہیں۔“

اب رئیس کریم بخش سے اجازت لو اور اپنے گھر چلو۔ تاکہ رات کو اطمینان سے بیٹھ کر کوئی پلان بنا سکیں۔“

”اور سسی کا کیا ہو گا؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ جاسکے۔ تم جانتی ہو راستے کیسے ہیں۔ ممکن ہے کہ ڈھیلو سے بھی  
آگے ان کا تعاقب کرنا پڑے۔ میں سسی اور رئیس کریم بخش سے بات کرتی ہوں۔“ نائلہ نے کہا اور سسی والے  
کمرے میں آگئی۔ اور جب نائلہ نے سسی کو صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بے سوچ کر بہت خوش ہوئی تھی کہ یہاں  
سے تو نجات ملے گی۔ یہاں اسے کوئی تکلیف تو نہیں تھی لیکن وہ بے حد بوری محسوس کرنے لگی تھی۔  
”تم ٹھیک ہونے تک یہیں رہو گی سسی۔“ نائلہ نے کہا۔ ”میں سائیں کریم بخش سے بات کر لوں گی۔ وہ خود  
تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔“

”نہیں ادی۔“ سسی جلدی سے بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ کیا تم یہ بھول گئی ہو کہ ہم نے ساتھ جینے  
مرنے کی قسم کھائی تھی۔“

”وہ قسم ایک مخصوص حالات میں کھائی گئی تھی سسی۔ وہ حالات ختم ہو گئے۔ اس لئے اب وہ قسم بھی برقرار  
نہیں رہی۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم بولو نا سلطانہ۔“ وہ سلطانہ کی طرف دیکھنے لگی۔ ”تم  
کچھ کیوں نہیں کہتیں ادی سے؟“

”نائلہ ٹھیک کہہ رہی ہے سسی۔“ سلطانہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں  
ہے۔ سفر بہت طویل ہے اور راستے غیر ہموار شاید تم ہمارا ساتھ نہ دے سکو۔“

”میں چل سکتی ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ سسی ایک دم پلنگ سے اتر آئی اور تیز قدموں سے ادھر ادھر  
چلنے لگی۔

نائلہ اور سلطانہ بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان دونوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ  
سسی کسی صورت میں ان کی تجویز نہیں مانے گی۔

”ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اپنا سامان سمیٹو اور ہمارے ساتھ گھر چلو۔ ہم کل کسی بھی  
وقت روانہ ہو جائیں گے۔“

سسی کھل اٹھی۔ وہ بڑی عجلت میں سوٹ کیس میں اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ اسی دوران غزلہ بھی آگئی اور جب  
نائلہ نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ پریشان سی ہو گئی۔

”تو تم لوگ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ افسردگی تھی۔

”مجبوری ہے غزالہ۔“ نائلہ نے کہا۔ ”لیکن ہم ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہیں۔ حالات جیسے ہی ٹھیک ہوں گے

ہم تم سے ملنے کے لئے آئیں گی۔“

”لیکن اب تو جاری ہوتا۔“ غزالہ منہ بسور کر بولی۔

”مجبوری ہے۔“ نائلہ بولی۔ ”لیکن ہمیں تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیسی مدد۔ جلدی بولوادی۔ مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔“ غزالہ نے کہا۔

”مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اور میری گاڑی چھوٹی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔ ”بابا سائیں کے پاس پانچرو کے علاوہ لینڈ کروزر بھی ہے۔ اگر یہ لینڈ کروزر چند روز کے لئے ہمیں مستعار مل جائے تو۔۔۔“

”مستعار۔“ غزالہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ارے ادی۔ تم چاہو تو پانچرو لے جاؤ۔ بابا سائیں بالکل منع نہیں کریں گے۔“

”نہیں، لینڈ کروزر ہی ٹھیک رہے گی۔ تم بابا سائیں سے بات کرلو۔ اگر وہ مان جائیں تو ہم اپنی گاڑی یہیں آکر چھوڑ دیں گی۔ ہم تھوڑی دیر بعد ہی یہاں سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”میں ابھی بات کرتی ہوں۔“ غزالہ باہر نکل گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد رئیس کریم بخش غزالہ کے ساتھ دوڑا ہوا آگیا۔

”ارے کیا بات ہے نائلہ بیٹی۔ تم لوگ کیوں جاری ہو۔ ہم تمہاری خدمت نہیں کر سکے کیا؟ یا ہم سے کوئی کوتاہی ہوگئی؟“ رئیس کریم بخش نے کہا۔

”نہیں بابا سائیں۔“ نائلہ نے کہا۔ ”چاک ہی کچھ ضروری کام یاد آگئے ہیں اس لئے فوری طور پر آپ سے رخصت ہو رہی ہیں۔ لیکن انشاء اللہ جلد ہی واپس آئیں گی۔“

”جیسے تم لوگوں کی مرضی بیٹا۔“ کریم بخش نے کہا۔ ”غزالہ نے کہا تھا کہ تمہیں گاڑی چاہئے۔ چاہو تو پانچرو لے جاؤ۔“

”نہیں بابا سائیں۔ ہمارے لئے لینڈ کروزر ہی ٹھیک رہے گی۔“ نائلہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے لے جاؤ۔ ڈرائیور ابھی پٹرول بھرا کر لایا ہے۔ کاغذات بھی گاڑی میں موجود ہیں۔“ رئیس کریم بخش نے کہا۔

”شکریہ بابا سائیں، اب ہمیں اجازت دیجئے۔“ نائلہ نے کہا۔

رئیس کریم بخش نے تینوں لڑکیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ تینوں غزالہ اور مائی سکھن کی بیٹی سے بھی گلے ملیں اور پھر باہر آکر پورچ میں کھڑی ہوئی لینڈ کروزر میں بیٹھ گئیں۔ دلاور وغیرہ بھی آگئے تھے۔ نائلہ نے اسٹیرنگ سنبھال لیا تھا۔ ان سب کے پیچھے ہی نائلہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

گھر پہنچ کر وہ دیر تک آپس میں صلاح مشورے کرتی رہیں۔ صبح ناشتہ کرتے ہی نائلہ، اور سلطانہ عیسیٰ پر بیٹھ کر آئی جی آفس کی طرف روانہ ہو گئیں۔ نائلہ نے دلاور اور عبدالقدوس کو سمجھایا تھا کہ رانٹھیں اور قاضی میگزین لینڈ کروزر کی سیٹوں کے نیچے اس طرح چھپادی جائیں کہ اگر راستے میں چیکنگ ہو تو انہیں برآمد نہ کیا جاسکے۔ اس نے سامان بھی پیک کرنے کو کہہ دیا تھا۔

وہ ایک گھنٹے میں آئی جی آفس پہنچ گئیں۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کے گیٹ سے اندر داخل ہونے میں تو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی لیکن آئی جی کا پالی اے نیا آدمی تھا وہ نائلہ کے نام سے واقف نہیں تھا۔ اس نے بڑی رکھائی سے کہہ دیا تھا کہ صاحب میٹنگ میں ہیں آج کسی صورت میں ملاقات نہیں ہو سکتی۔

”اچھا، یہ چلے جا کر ان کے سامنے رکھ دو۔ اگر وہ منع کر دیں تو ہم واپس چلی جائیں گی۔“ نائلہ نے کہا اور ایک چٹ پر اپنا نام لکھ دیا۔

پہلے اے نے چٹ لے کر پڑھی۔ زیر لب نائلہ درانی کا نام دہرایا اور بادل خواستہ اٹھ کر آئی جی صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی واپسی میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔

”آئیے۔ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ پی اے نے کہا اور انہیں آئی جی صاحب کے کمرے میں لے گیا۔

دفتر میں آئی جی صاحب کے علاوہ ڈی آئی جی اور بعض دیگر سینئر آفیسرز بھی موجود تھے۔ آئی جی صاحب نے بڑے فخر سے تمام افسران سے ان دونوں کا تعارف کرایا اور پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بیٹھو بیٹا، کو کیسے آتا ہوا؟“

”سر!“ نائلہ نے کہا۔ ”بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہمیں کراچی سے جانا پڑ رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کی فہرست ہے جو راجستھان کے کیمپ سے دہشت گردی کی تربیت حاصل کر کے آئے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کو میں پولیس کے حوالے کر چکی ہوں۔ کچھ لوگوں کے بارے میں یہ بھی بتا دیں گے جن کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔“

آئی جی صاحب نے فہرست لے کر دیکھی پھر اسے ڈی آئی جی کی طرف بڑھا دیا اور انٹرکام کا ریکورڈ اٹھا کر پی اے سے کافی بجوانے کے لئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کالی آگئی۔ کالی کے دوران کراچی کی تازہ ترین صورت حال پر تبادلہ خیال ہوتا رہا پھر نائلہ اور سلطانہ ان سے رخصت ہو کر دفتر سے نکل گئیں۔ پولیس ہیڈ آفس سے وہ سیدھی اپنے بنگلے پر پہنچیں۔ نائلہ کی ہدایت کے مطابق رانٹیلیں اور دیگر ضروری سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔

دوپہر کا کھانا انہوں نے گھر پر ہی کھایا اور پھر احتیاط سے تمام کمریوں کے دروازے لاک کئے اور لینڈ کروز پر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ اسٹیزنگ دلاور کے ہاتھ میں تھا اور گاڑی کا رخ پینٹل ہائی وے کی طرف تھا۔

\*\*\*\*\*

کراچی میں ان کے لئے کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ پولیس پوری سرگرمی سے ان کی تلاش میں تھی اور ہر چند گھنٹوں بعد انہیں اپنا ٹھکانہ تبدیل کرنا پڑ رہا تھا۔

تین دن انہوں نے بڑی مشکل میں گزارے تھے اور بالا خرا انہوں نے کراچی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

”کراچی سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے؟“ شبیر درانی نے شاہنواز کے اس فیصلے پر تہمہ کرتے ہوئے کہا۔

”کراچی انسانوں کا جنگل ہے۔ ہم کیسے نہ کہیں چند روز کے لئے روپوش رہ سکتے ہیں۔“

”انسانوں کا یہ وسیع و عریض سمندر ہمارے لئے سٹ کر بہت مختصر ہو گیا ہے۔ یہاں کی پولیس پوری طرح حرکت میں آگئی ہے۔ کوئی بھی جگہ ہمارے لئے محفوظ نہیں رہی۔“ شاہنواز نے کہا۔

”تو پھر کہاں چلیں؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”پہلو!“ شاہنواز نے کہا۔ ”سب جانتے ہیں کہ بابا سائیں نے مجھ سے لاطینی کا اعلان کر دیا ہے اور میں

ٹھیکو کا رخ نہیں کر سکتا لیکن وہی ہمارے لئے محفوظ ترین جگہ ہے۔ ارے بابا بہت بڑی حویلی ہے ہماری۔ ہر چیز

موجود ہے وہاں۔ اسلحہ بھی ہے۔ بننے پلانے کا بندوبست بھی ہے اور چھو کریاں بھی بہت ہیں وہاں۔ دو چار دن آرام

سے رہیں گے اور اس کے بعد آگے کی سوچیں گے۔“

”تو کیا وہاں پیدل جائیں گے؟“ شبیر درانی نے کہا۔

”ارے بابا فکر کیوں کرتے ہو۔ گاڑی مل جائے گی۔“ شاہنواز نے کہا۔

وہ دونوں اس وقت شاہنواز کے پنہور نامی دوست کے گھر میں تھے۔ پنہور اسے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ آج صبح

ان کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے کسی نے فون کر کے ان کے بارے میں دریافت کیا تھا اور شاہنواز نے اس سے

وعدہ کیا تھا کہ وہ شام ہوتے ہی وہاں سے چلا جائے گا اور اس وقت شام ہونے والی تھی اور یہ دونوں کراچی سے نکلنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

”پنہور۔“ شاہنواز نے پنہور کو بلا کر کہا۔ ”تم ذرا امام بخش کی طرف جاؤ۔ اس سے میرا نام لینا اور کہنا چند

سمٹھنوں کے لئے گاڑی مانگی ہے اور یہ پیسے رکھ لو۔ واپس آتے ہوئے پیٹرول بھروالینا گاڑی میں۔ ٹھکی نقل کروالینا۔“ اس نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ہنہور کی طرف بڑھا دیا۔  
ہنہور نوٹ جیب میں ڈالتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اس کی واپسی تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ گاڑی لے آیا تھا۔ اندر راکر اس نے چالی شاہنواز کے حوالے کر دی۔ نو بجے رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں ہنہور کے مکان سے رخصت ہو گئے۔ وہ گاڑی سے ماڈل کی نشان تھی۔

مختلف سڑکوں پر ہوتے ہوئے شاہنواز گاڑی کو بیشل ہائی وے پر لے آیا اور پھر وہ رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ قائد آباد کے قریب پولیس کی ایک پارٹی نے انہیں چیکنگ کے لئے روکا تھا۔ پولیس پارٹی کو ایک چوری شدہ گاڑی کی تلاش تھی۔ پارٹی کا انچارج فوجوان اے ایس آئی تھا۔ وہ ان دونوں کی شخصیت سے مرعوب ہو گیا تھا اور سرسری سی چیکنگ کے بعد انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔

ٹھٹھہ کی طرف جانے والی بیشل ہائی وے سنان تھی۔ کبھی کبھی سامنے سے آنے والا کوئی مال بردار ٹرک نظر آ جاتا۔ وہ ایک گھنٹے میں ٹھٹھہ پہنچ گئے لیکن یہاں رکے بغیر آگے نکل گئے۔

سجاد میں انہوں نے رات بھر کھلے رہنے والے ایک پیٹرول پمپ سے گاڑی میں پیٹرول ڈلوایا پھر ایک چھوٹے سے ریستورنٹ کے سامنے گاڑی روک لی۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے چائے منگوا کر پی اور بدین کی طرف روانہ ہو گئے۔

بدین سے آگے اسٹیرنگ سیٹ پر شیردرانی آ گیا۔ یہاں سے گاڑی کا رخ ایک بار پھر کمری قدر جنوب کی طرف موڑنا پڑا۔ میل پر میل طے کرتے ہوئے وہ رحیم کی بازار نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ رات کمری ہو چکی تھی۔ قصبے کے باسی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ یہاں بھی انہوں نے گاڑی نہیں روکی اور سارے ہوتے ہوئے بالا خرچ کی روشنی طلوع ہونے کے ساتھ ہی وہ ڈھلوان پہنچ گئے۔

حویلی دیکھ کر شیردرانی حیران رہ گیا۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ دو نوکر بھی موجود تھے۔

”حاکم علی۔“ شاہنواز نے گاڑی سے اترتے ہوئے ایک ملازم کو مخاطب کیا۔

”جی سائیں۔“ حاکم علی اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”ہمارے لئے ناشتے کا بندوبست کرو۔ اور کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں یہاں آ گیا ہوں۔“ شاہنواز

نے کہا۔  
”جی سائیں۔“ حاکم علی نے کہا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ ”سائیں، سنا ہے کہ مائی سکھن کو کسی نے قتل کر دیا

ہے۔“

”ہاں، وہ نمک حرام تھی اور نمک حراموں کا انجام تو ایسا ہی ہوتا ہے نا۔ تم جاؤ ناشتہ بناؤ۔“ شاہنواز نے کہا۔

وہ دونوں حویلی کے اندر آ گئے۔ شاہنواز، شیردرانی کو گھوم پھر کر حویلی دکھا رہا تھا۔ شیردرانی خود بھی اپنے

علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ زرعی اراضی کے علاوہ بہت لمبی چوڑی جائیداد تھی اس کی۔ لیکن یہ حویلی دیکھ کر

تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اس نے سندھ کے وڈیروں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا ٹھیک ہی سنا تھا۔

یہ وڈیرے اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ ہوتے ہیں اور باری ان کی رعیت۔ یہ باری نسل در نسل غلاموں کی سی

زندگی بسر کرتے ہیں اور کبھی انہیں اپنے وڈیرہ کے سامنے سرائٹھلے یا ان کے خلاف زبان ہلانے کی جرات نہیں

ہوتی۔

وہ اس کمرے میں آ گئے جو شاہنواز نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ کمرہ کیا تھا، عشرت کدہ تھا۔ شیردرانی

حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد حاکم علی ناشتہ لے آیا۔ انہوں نے خوب بھر پور ناشتہ

کیا اور پھر وہیں لیٹ گئے۔ رات بھر جاگنے اور طویل سفر نے انہیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ جلد ہی وہ دونوں سو گئے۔

حاکم علی نے کھانا تیار کر لیا تھا لیکن انہیں جگانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ تین بجے کے لگ بھگ شاہنواز کی

آٹھ خود ہی کھل گئی۔ اس نے شیردرانی کو بھی جگا دیا۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ شاہنواز کی ہدایت کے مطابق حویلی میں صرف ضرورت کے مطابق بٹیاں جلائی گئی تھیں۔ باقی بٹیاں بند رکھی گئی تھیں تاکہ باہر والوں کو پتہ نہ چل سکے۔  
 ”حاکم علی۔“ شاہنواز نے رات کے کھانے کے بعد نوکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا یہ رہیں شیر ہمارے مسماں ہیں۔ ان کی کوئی خدمت خاطر نہیں کرو گے؟“  
 ”تھم کریں سائیں۔“ حاکم علی نے کہا۔

”کو روئل کے پاس جاؤ بابا، اس سے کوئی رنگین پانی لے کر آؤ نا اور پھر رات گزارنے کا بھی توبہ دوست ہونا چاہئے نا۔“ شاہنواز نے کہا۔

”سمجھ گیا سرکار۔“ حاکم علی دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”یہ گاڑی کی چابی لو۔“ شاہنواز نے گاڑی کی چابی اس کی طرف اچھال دی۔ ”اس کی ٹنگی بھی بھرو الینا۔ پتہ نہیں کب یہاں سے نکلنے کی ضرورت پڑ جائے۔“

حاکم علی گاڑی لے کر چلا گیا۔ شاہنواز، شیردرانی کو لے کر ایک اور کمرے میں آگیا۔ اس نے دیوار میں لگی ہوئی ایک الماری کھولی۔ اس میں کچھ کپڑے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ شاہنواز نے الماری میں ہاتھ ڈال کر باتیں طرف لگی ہوئی ایک چھوٹی سی زنجیر کو کھینچا۔ الماری پر والونگ ڈور کی طرح گھوم گئی۔ اس کے پیچھے دیوار میں الماری جتنی سی لمبی چوڑی خلا تھی جس میں تین چار آؤٹریجک رائفلیں اور ان کے چند میگزین پڑے ہوئے تھے۔ اس نے دو رائفلیں اور میگزین نکال لئے۔ ایک رائفل اس نے مسکراتے ہوئے شیردرانی کی طرف بڑھا دی۔ شیردرانی رائفل چیک کرنے لگا۔

”مجھے اسلحہ کے بارے میں زیادہ تجربہ نہیں ہے لیکن اس رائفل کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بہترین چیز ہے۔“ شیردرانی نے کہا۔

”ایسی چیزوں کا بندوبست رکھنا پڑتا ہے۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”یہاں نہ صرف چوروں ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے بلکہ ہاریوں کو قابو میں رکھنے کے لئے بھی یہ چیزیں ضروری ہیں۔ یہ جو ہمارے علاقوں میں تعلیم پھیل رہی ہے نا، اس سے ان ہاریوں کے دماغوں میں بھی کچھ کیڑے کلبلائے گئے ہیں۔ ان لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لئے یہ چیزیں ضروری ہیں۔“

شاہنواز نے الماری بند کر دی اور وہ دونوں رائفلیں اور میگزین لے کر شاہنواز والے کمرے میں آگئے۔ تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے بعد حاکم علی شراب کی بوتلیں اور دو عورتوں کو لے آیا۔ اس کے ساتھ اس کا دو سرا ساتھی دبو بھی تھا۔ وہ ان دونوں عورتوں کو قریبی گوشے سے اٹھا کر لائے تھے۔ ان میں سے ایک کسی ہاری کی بو تھی اور دوسری ایک اور ہاری کی بیٹی جو سسرال سے میکے آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں عورتیں حسین تو نہیں البتہ قبول صورت ضرور تھیں۔ ان کے چہروں پر خوف کے سائے تھے اور وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر خدا اور رسول کے واسطے دے کر رحم کی درخواست کر رہی تھیں۔

”تم لوگ جاؤ۔“ شاہنواز نے حاکم علی اور دوسرے نوکر کو اشارہ کیا۔

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ شاہنواز اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں عورتوں کے قریب آگیا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی چوٹیں پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے جوڑے بار بار رحم کی ہیک مانگ رہی تھیں مگر وہ شاہنواز تھا۔ انسان نہیں شیطان کا دو سرا روپ۔  
 شاہنواز نے ایک عورت کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اسے ہلکا سا جھکا دیتے ہوئے بولا۔

”اس حویلی میں آنے کے بعد سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ تمہارا بھی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ بہترینی ہے کہ

راضی خوشی ہماری بات مان لو۔“

”نہیں رہیں۔“ وہ عورت ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑائی۔ ”ہم پر رحم کرو رہیں۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔“

”کسی کو منہ دکھانے کے قابل تو تم اب بھی نہیں رہی ہو۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”اگر تمہیں ایسے ہی چھوڑ بھی دیا جائے تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ تم پاک دامن ہو۔ کوئی عورت ایک مرتبہ شاہنواز کے سامنے آجائے تو اس کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے دھبہ لگ جاتا ہے۔“

”نہیں رہیں۔ ہم پر رحم کرو۔“ وہ عورت گڑ گڑائی۔

”تم ایسے نہیں مانو گی۔“ شاہنواز دھاڑا، پھر شیر درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”رہیں شیر! تم ممان ہو“

پہلا حق تمہارا ہے۔ ان میں سے جو پسند ہو وہ لے لو۔“

شیر درانی نے اسی عورت کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا جو شاہنواز سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ دوسری کو شاہنواز نے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر وہاں ایک شیطانی کھیل شروع ہو گیا۔ ان مصوم اور بے گناہ عورتوں کی چیخیں شیطانی قہقہوں میں دب گئیں۔

دوسری رات بھی یہی سب کچھ ہوا۔ وہی دو کمزور اور کچلی ہوئی لڑکیاں تھیں اور وہی شیطان تھے جو ان سے کہیں زیادہ طاقتور تھے۔

رات آخری پر میں داخل ہو چکی تھی۔ حویلی کے اس کمرے میں شیطانی کھیل عروج پر تھا۔ شاہنواز اور شیر درانی شراب کے نشے میں دھت ہو رہے تھے۔

شاہنواز نے اپنی شکار عورت کو چھوڑ دیا اور شراب کی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکھائے ہوئے لمبے میں بولا۔

”وہ بوتل اٹھا کر لاؤ۔ حرامی کو روٹل نے پتہ نہیں کہیں کسی چیز بھیجی ہے کہ اس میں نشہ ہی نہیں ہے۔“

وہ عورت بوتل اٹھانے کے لئے آگے بڑھی۔ اچانک ہی اس کی نظروں پر اس کے قریب بڑی ہوئی رات نقل پر بڑی۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ دوسرے ہی لمحہ اس نے لپک کر رات نقل اٹھالی۔ وہ ایک دیہاتی عورت تھی۔ اسلحہ کا استعمال نہیں جانتی تھی۔ لیکن اتنا جانتی تھی کہ رات نقل کا ٹھوڑا دبانے سے اس کی ٹال سے شعلے نکلنے ہیں اور سامنے والا خون میں نہا جاتا ہے۔ اس نے رات نقل کا رخ شاہنواز کی طرف کر کے دانت چبھتے ہوئے ٹانگیں دبا دی۔

کمرہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور شاہنواز کی بھیاک چیخوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

شیر درانی نے اپنے ساتھ کی عورت کو دھکا دے کر دور بھاڑا اور شاہنواز کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل اچھل رہا تھا۔ شاہنواز کے جسم سے خون کی کئی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ وہ چند لمبے پھٹی پھٹی سی نظروں سے شاہنواز کی طرف دیکھتا رہا پھر اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ رات نقل کا جھکا گئے سے پیچھے گر گئی تھی اور رات نقل بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ شیر درانی نے جلدی سے آگے بڑھ کر رات نقل اٹھا کر دور پیچھنک دی اور خونخوار نظروں سے اس عورت کی طرف دیکھنے لگا جس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بھی تھی اور چہرے پر خوف کی دھند بھی۔

اس لمحہ دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز سنائی دی۔ شیر درانی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ حاکم علی تھا۔

”رہیں حویلی کے باہر۔“

حاکم علی بات کرتے کرتے رک گیا اور پھٹی پھٹی سی نظروں سے شاہنواز کی چھلنی لاش کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا؟“ وہ ہٹلا کر رہ گیا۔

”اسے اس حرامزادی نے مار دیا ہے۔“ شیر درانی نے اس عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم کیا کہہ رہے تھے۔ حویلی کے باہر کیا ہے؟“

”وہ پولیس رہیں شیر۔“ حاکم علی بولا۔ ”باہر پولیس کی گاڑی آکر رکی ہے۔ ان کے ساتھ رہیں کریم بخش کی



لینڈ کروزر بھی ہے۔ اس میں عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔“  
 ”پولیس۔ عورتیں۔“ شیردرانی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ”کون ہیں وہ عورتیں؟“  
 ”حویلی کے گیٹ پر چلنے والے بلب کی روشنی بت چکی ہے۔ ان کے چہرے نظر نہیں آرہے۔“ حاکم علی نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ شیردرانی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”پندرہ منٹ بعد انہیں گیٹ کھول کر اس طرف لے آنا۔ میں منٹ لوں گا ان سے۔“

حاکم علی باہر چلا گیا۔ شیردرانی نے جلدی سے کپڑے پہنے۔ میز پر سے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ شاہنواز کے لباس کی جیب سے رقم نکال کر اپنی جیب میں خف کی اور ایک رائفل اٹھائی۔ دوسری رائفل کا میگنیز اٹھا کر اس نے چٹون کی بیٹ میں اڑس لیا اور ان دونوں عورتوں کی طرف دیکھتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ وہ مختلف راہداریوں میں گھومتا ہوا عمارت کے بائیں پہلو سے باہر آگیا۔ یہاں گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر پہلے رائفل اندر رکھی اور پھر خود اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر حویلی کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا جو وہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ جس جگہ گاڑی کھڑی تھی وہاں اندر رہا تھا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد حاکم علی نے حویلی کا گیٹ کھولا۔ باہر کچھ فاصلے پر پولیس کی جیب اور ایک لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ گیٹ کھولتے ہی حاکم علی چیخ چیخ کر صوبے دار سے کچھ کہنے لگا۔ ساتھ ہی وہ شاہنواز کے کمرے کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔

صوبیدار اور تین پولیس والے گیٹ میں داخل ہو کر اس طرف دوڑے۔ ان کے پیچھے نائلہ اور دلاور بھی تھے۔ انہیں دیکھ کر شیردرانی کے جڑے پہنچ گئے۔ اس نے ایک سیکنڈ انتظار کیا اور اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے اکشن کی گھادی۔ پہلی ہی کوشش میں انجن بیدار ہو گیا۔ شیردرانی نے گاڑی کو گیسٹر میں ڈالا اور اسے زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ گاڑی طوفانی رفتار سے حویلی کے کھلے ہوئے گیٹ سے نکل گئی۔

گاڑی کی آواز سن کر نائلہ دلاور اور پولیس والے برآمدے ہی سے مڑ کر تیزی سے گیٹ کی طرف دوڑے۔ نائلہ گیٹ کے باہر آکر سامنے دیکھنے لگی۔ دھول کا پادل نظر آ رہا تھا۔

”وہ۔ وہ شیردرانی تھا۔ وہ بھاگ گیا۔“ سلطانہ لینڈ کروزر سے اتر کر چیخی۔

”وہ ہم سے بچ کر نہیں جاسکتا۔“ نائلہ نے دانت بچھتے ہوئے کہا۔ پھر صوبیدار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”چلو آفیسر۔ حویلی میں اپنی کارروائی پوری کرو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ مفروضہ کی فکر مت کرو۔ وہ بھی بہت جلد قانون کی گرفت میں آجائے گا۔“

وہ لوگ حاکم علی کے ساتھ ایک بار پھر برآمدے کی طرف چلنے لگے۔

\*\*\*\*\*

شیردرانی پر موت کا خوف طاری تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جنم کی ساری باتیں اس کا چچا کر رہی ہوں۔ وہ کار کو طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے، یہ ناہموار اور کچی سڑک اسے کہاں لے جائے گی، لیکن وہ رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ وہ کم سے کم وقت میں یہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اس کے دماغ میں آندھیاں ہی چل رہی تھیں۔ نائلہ اس کے لئے قیامت بن گئی تھی۔ وہ موت کے سائے کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ پہلے وہ اس سے بچتی پھر رہی تھی اور اب وہ خود بھاگ رہا تھا۔ نائلہ نے اسے کیس بھی نکلنے نہیں دیا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ نائلہ کو اس کے ٹھکانوں کا پتہ کیسے چل جاتا ہے۔ پہلے بشر صلاح اور خانو کا ٹھکانہ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ پھر جبار کے مکان پر اس نے چھاپ مارا۔ اس کے بعد انہوں نے سجاد کے

گھر نہ لی تھی۔ وہ سسی کو اٹھلائے تھے تاکہ اس سے نالکہ کا ٹھکانہ معلوم کر کے بے خبری میں حملہ کر کے اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن سسی تو نالکہ سے بھی زیادہ سخت جان نکلی تھی۔ اس نے اذیتیں برداشت کر لی تھیں مگر نالکہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور پھر رات کے آخری پر نالکہ نے خودی پولیس کے ساتھ اس مکان پر بلر بول دیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے تھے۔

وہ شاہنواز کے ساتھ جہاں بھی گیا تھا پتہ چلا تھا کہ وہ ٹھکانہ پہلے ہی نالکہ کی نظروں میں آچکا ہے۔ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ کہیں بھی نہیں ٹک سکے تھے۔ آخر میں جب وہ ہنسپور کے گھر آئے تو انکشاف ہوا کہ وہاں بھی کسی عورت نے فون کر کے شاہنواز کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس طرح چند گھنٹوں بعد انہیں وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ اس مرتبہ شاہنواز نے اپنے گاؤں کی حویلی کا رخ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں وہ محفوظ ترین جگہ تھی۔ لیکن یہاں بھی وہ اڑنا لیس کھٹے پورے نہیں کر سکے تھے کہ نالکہ پولیس کو لے کر پہنچ گئی۔ وہ کسی بد روح کی طرح اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ شیردرانی کو یہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ شاہنواز اپنی ہی حویلی میں ایک بے گناہ عورت کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ شیردرانی کا خیال تھا کہ اگر ایک جھٹکا لگنے سے رائل اس عورت کے ہاتھ سے نہ چھوٹی تو شاید وہ اسے بھی چھٹی کر دیتی لیکن وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا کہ رائل اس عورت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

کراچی آنے کے بعد شیردرانی کو پہلے بشیر ملاح کا سہارا ملا۔ پھر شاہنواز کی پناہ میں آیا لیکن اب وہ اکیلا تھا۔ اجنبی علاقہ، اجنبی رات، اجنبی لوگ اور تعاقب میں موت اور وہ اس موت سے بچنے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ مٹی سے ہوتے ہوئے وہ ایک طویل پکڑ کاٹ کر عمر کوٹ پہنچ گیا۔ یہاں اس نے گاڑی کی ٹنگی میں پیٹرول بھروایا اور آگے روانہ ہو گیا۔ کپڑوں میں بھی وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ یہاں اس نے کھانا بھی کھایا اور آگے روانہ ہو گیا۔ سانگھڑ سے چند میل پہلے ٹنڈو مٹھا خان نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں وہ رک گیا۔ وہ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ اسے ایک وڈیرے کے اوطاق میں رات گزارنے کی جگہ مل گئی۔ وڈیرے کو اس نے ایک فرضی کمائی ستادی تھی۔ وڈیرے نے اس کی خاطر تواضع بھی کی اور رات گزارنے کو آرام دہ بستر بھی فراہم کر دیا۔

صبح سویرے ناشتہ کرتے ہی وہ ٹنڈو مٹھا خان سے روانہ ہو گیا۔ سانگھڑ میں وہ صرف کار کی ٹنگی میں پیٹرول بھروانے کے لئے رکا تھا۔ وہاں سے روانہ ہونے کے بعد وہ میل پر میل طے کرتا ہوا سوراہا نامی قصبے میں پہنچ گیا۔ یہاں اس نے رات ایک سرائے میں گزاری اور صبح سویرے اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ حالانکہ اسے اپنی منزل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

وہ ایک برساتی نالے کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ اس نالے میں پانی کا ایک قطرہ تک نہیں تھا۔ یہاں پانی صرف برسات کے دنوں میں جمع ہوتا تھا اور برسات اس علاقے میں کئی کئی سال بعد قسمت ہی سے ہوتی تھی۔

سہ پہر کے قریب وہ کاجیلو پہنچ گیا۔ یہ علاقہ اسے کچھ جانا پہچانا سا لگا اور جب اسے پتہ چلا کہ یہ کاجیلو ہے تو وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلا اور شام کے وقت سانڈک پہنچ کر دم لیا۔ اس نے رات اسی کوٹھ میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

سانڈک ضلع رحیم یار خان کی سرحد کے قریب واقع تھا۔ شیردرانی نے نہ صرف رات بلکہ پورا دن اسی کوٹھ میں گزار دیا اور پھر شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد صادق براچ نہر کا علاقہ شروع ہو گیا۔ وہ چاندنی رات میں نہر کے ساتھ کچے راستے پر درمیانی رفتار سے گاڑی چلاتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ نالکہ اب اس کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔ وہ اسے میلوں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ آدھی رات کے قریب اس نے نہر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کچا راستہ تھا جس کے دونوں طرف تاحد نگاہ وہیر نہ ہی تھا۔ شیردرانی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ راستہ اسے کہاں لے جائے گا۔

صبح چار بجے کے لگ بھگ ایک چھوٹی سی بستی دیکھ کر اس نے اچانک ہی گاڑی روک لی اور متوش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر چند سیکنڈ بعد اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ وہ اس جگہ کو شناخت کر کے کانپ اٹھا تھا۔ یہ اسی کی زمینیں تھیں اس سے آگے نالکہ کی زمین تھی اور پھر اس کے دوسری طرف گل مرگ تھا۔ اس کا اپنا گاؤں، جہاں اس کی اپنی حویلی تھی اور حویلی میں اس کی ماں تھی۔ قسمت اسے وہیں لے آئی تھی جہاں سے وہ چلا تھا!

پہلے تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ بھادلوہر کی طرف نکل جائے لیکن پھر یہ خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ اپنے گھر کے کتنا قریب پہنچ چکا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر واپس آ سکتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ موڑ دیا اور کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر آہستہ آہستہ چلا نا ہوا گاؤں کے اوپر سے گھوم کر اپنی حویلی کے سامنے آیا۔ اس وقت چاروں طرف سناٹا تھا، کسی نے اسے حویلی کی طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد کاشتکار گھروں سے ٹکٹا شروع ہو جائیں گے۔ اس نے حویلی کے سامنے گاڑی روک کر پارن نہیں بھایا بلکہ نیچے اتر کر آہستہ آہستہ گیٹ کھٹ کھٹانے لگا۔ تقریباً ”دو منٹ بعد ایک نوکر نے گیٹ کھولا۔ وہ شیردرانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”شور مچانے کی ضرورت نہیں۔“ شیردرانی نے کہا اور دوبارہ گاڑی میں آکر بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے حویلی کے اندر لے آیا۔ نوکر نے گیٹ بند کر دیا۔ ”ماں جی کہاں ہیں۔“ شیردرانی نے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہیں جی۔“ نوکر نے جواب دیا۔

”خوبی کا گیٹ بند رکھو اور کسی کو میرے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔“ شیردرانی کتا ہوا حینہ بیگم والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ بند تھا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔ حینہ بیگم حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے والمانہ انداز میں آگے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لپٹا لیا۔

”ماں جی!“ شیردرانی کے منہ سے سسکی سی نکلی۔

وہ اندر آگئے۔ شیردرانی ماں کی آغوش میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ بڑا سکون مل رہا تھا اسے۔ لیکن یہ سکون زیادہ دیر یا ثابت نہیں ہو سکا۔



سندھ کے انتہائی اندرونی علاقوں میں رات کو سفر کرنا اگرچہ خطرناک تھا لیکن سلطانہ اور نالکہ کی پارٹی اپنی لینڈ کروزر میں بلا خوف و خطر سفر کرتی رہی۔ ان کے پاس تین آٹومٹک رائفلیں تھیں۔ ایک رائفل نالکہ سنبھالے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی جبکہ دو رائفلیں بی اور عبدالقدوس لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ اس وقت دلاور کر رہا تھا۔

رات گیارہ بجے وہ ساندک پہنچ گئے۔ اس جیسے چھوٹے علاقے عام طور پر نوبجے کے بعد خاموشی اور سناٹے میں ڈوب جاتے ہیں۔ ساندک میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ البتہ ایک دو چھوٹے چھوٹے چائے خانے کھلے ہوئے تھے۔ ایسے ہی ایک چائے خانے کے سامنے دلاور نے گاڑی روک لی۔ چائے خانے کے باہر سڑک کے کنارے بھی کچھ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ گاڑی سے اتر کر کچھ دیر اسٹریچنگ کرتے رہے پھر ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس طویل سفر سے وہ بہت تھک گئے تھے۔ دلاور نے چائے کے لئے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ان کے کرسیوں پر بیٹھے ہی انہیں چائے مل گئی۔

”یہاں کوئی سرائے بھی ہے جہاں رات گزارا جا سکے؟“ نالکہ نے چائے والے سے پوچھا۔

”بھیلی سے بھیلی سڑک پر ایک سرائے ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”وہاں شہر کا ایک اور آدمی بھی آیا ہے۔ بڑی شاندار موٹر ہے اس کے پاس۔“

ناٹک کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ وہ سب سمجھ گئے تھے کہ وہ شہری شبیر درانی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

”تم لوگ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ دلاور چائے ختم کر کے اٹھ گیا۔

”میں بھی آرہا ہوں۔ دولہا بھلا۔ میرا مطلب ہے دلاور بھائی۔“ عبدالقدوس بھی چائے کا آخری گھونٹ بھر کر اٹھ گیا۔

سلطانہ اور سسی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ عبدالقدوس راستے بھر اسی قسم کی حرکتیں کرتا آیا تھا۔ کبھی اسے ناٹک سے ڈانٹ سنتا پڑتی اور کبھی دلاور سے۔ مگر کسی کی ڈانٹ میں غصہ نہیں تھا!

وہ دونوں کچھ دور آگے جا کر ایک گلی میں مڑ گئے اور پھر بھیلی سے بھیلی سڑک پر پہنچ گئے۔ وہ ایک ہندو کی سرائے تھی۔ جس کے سامنے وہ نسان کار بھی کھڑی تھی جسے انہوں نے ڈھیلو سے شاہنواز کی حویلی سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شبیر درانی کی کار تھی اور وہ اس وقت یقیناً ”سرائے کے کسی کمرے میں گمری نیند سو رہا ہوگا۔ وہ دونوں واپس آگئے۔“

”اطلاع درست ہے۔“ دلاور نے ناٹک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ناٹک نے کہا۔ ”میں اس کی منزل سمجھ گئی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ صبح سات آٹھ بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ابھی یہاں سے نکلتے ہیں۔ رات سسی کے ماں باپ کے پاس گزاریں گے اور صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

”نہیں ادی۔“ سسی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

یہ بحث کا موقع نہیں تھا۔ اس لئے ناٹک خاموش ہی رہی لیکن بہر حال ناٹک نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ رات یہاں نہیں رہیں گے۔ چائے پینے کے بعد وہ پھر گاڑی میں لد گئے۔ اس مرتبہ اسٹیرنگ کی بجائے سنبھالا تھا اور دلاور را نقل سنبھالے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

ڈھیلو سے نکلتے کے بعد ناٹک مختلف مقامات سے اس نئی گاڑی کے بارے میں پوچھتی آئی تھی۔ شبیر درانی جس طرف کا رخ کر رہا تھا اس سے ناٹک کو اس کی منزل کا پتہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی اور اس وقت شبیر درانی سے پہلے روانہ ہونے کا مطلب بھی یہ تھا کہ وہ اس سے پہلے وہاں پہنچا جائی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ سسی کو راستے میں چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن سسی کسی صورت میں اس سے الگ ہونے کو تیار نہیں تھی۔ سسی کے اس انکار کے بعد ہی اس نے ایک اور منصوبہ بنالیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے بی بی کو بتا دیا تھا کہ کہاں جانا ہے۔

رات بھر سفر کرنے کے بعد وہ صبح سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے رحیم یار خان پہنچ گئے۔ اس وقت ڈرائیونگ دلاور کر رہا تھا۔ وہ لینڈ کروزر کو شہر کی مختلف سڑکوں پر گھماتا ہوا رائے منصور کے شہر والے بنگلے پر لے گیا۔ رائے منصور اور تمام گھروالے گاؤں جا چکے تھے اور یہاں بنگلے پر ان کا ملازم خادم حسین تھا۔ وہ دلاور اور ناٹک کو دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔

”آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے ناٹک بی بی۔“ رائے صاحب آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں انہیں فون پر اطلاع دے دوں؟“ خادم نے کہا۔

”ابھی نہیں۔“ ناٹک نے کہا۔ ”میں خود ہی انہیں فون کر لوں گی۔ تم ناشتہ تیار کرو۔ سب کو بھوک لگ رہی ہے۔“

”جی ہنتر ہے جی۔ میں بیکری سے انڈے اور ڈبل روٹی لے آؤں۔ بس یوں گیا اور یوں آیا!“ اس نے چکی بجائی۔

”اور سنو“ نائلہ نے اسے روک لیا۔ ”گھر سے باہر کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے کہ ہم لوگ آئے ہیں۔“  
 ”آپ فکر نہ کریں نائلہ بی بی، کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔“ خادم کھٹے ہوئے باہر نکل گیا۔  
 سب لوگ بہت ہلکے ہوئے تھے۔ راستے کی دھول مٹی نے ان کے طے گاڑ رکھے تھے۔ اس جگہ میں  
 چار بیڑے دو مڑتے اور ہریز دوم کے ساتھ الحجہ ہاتھ تھا۔ نائلہ، سلطانہ، عبدالقدوس اور دلاور ایک ایک کمرے میں  
 ٹھہر گئے۔

ناشتہ انہیں ایک گھنٹے کے بعد مل سکا تھا۔ ناشتے سے پہلے نائلہ نے رائے صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع دے  
 دی۔ وہ واقعی بہت خوش ہوئے تھے۔

”میں آرہا ہوں نائلہ بیٹی۔“ رائے صاحب نے کہا تھا۔  
 ”آپ کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ میرا خیال ہے آپ کو وہیں آرام کرنا چاہئے۔ میں کل آؤں گی آپ کے  
 پاس۔“ نائلہ نے کہا۔  
 ”میری طبیعت پہلے خراب تھی لیکن تمہاری آواز سن کر میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ دلاور کیا ہے؟“ رائے  
 صاحب نے پوچھا۔  
 ”بالکل ٹھیک ہے جی۔ میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ آپ بات کر لیجئے۔“ نائلہ نے کہتے ہوئے ریسور دلاور کو دے  
 دیا۔

دلاور تین چار منٹ تک رائے صاحب سے باتیں کرتا رہا پھر ریسور رکھ کر نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”وہ آرہے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھی ساتھ ہوں گی۔“  
 ناشتے کے بعد نائلہ، خادم حسین کو الگ لے گئی اور وہ کئی منٹ تک اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہی۔  
 ”ٹھیک ہے نائلہ بی بی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔“ خادم حسین نے کہا۔  
 خادم حسین چاچا تھا۔ وہ لوگ مختلف جگہوں پر لیٹ کر سو گئے تھے۔ نائلہ بھی ایک کمرے میں سہی کے ساتھ بہتر  
 پریٹ کر سو چکی تھی۔ مگر دلاور جاگ رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا  
 تھا۔

نائلہ نے جو پروگرام بنایا تھا اس سے وہ واقف تھا۔ آج یا کل یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔ نائلہ اور اس کا ساتھ  
 ختم ہو جائے گا۔ ممکن ہے رائے صاحب اسے اپنے پاس رکھنا چاہیں مگر دلاور نے طے کر لیا تھا کہ وہ کہیں اور چلا  
 جائے گا۔

دوپہر کے لگ بھگ رائے صاحب اور آصف بیگم بھی پہنچ گئیں۔ ان کی آواز سن کر سب لوگ جاگ گئے تھے۔  
 آصف بیگم نائلہ کو لپٹا کر رو رہی تھیں۔ عجیب جذباتی منظر تھا۔

آدھا گھنٹہ ملنے ملانے میں نکل گیا۔ اسی دوران خادم حسین بھی واپس آگیا۔ اس نے نائلہ کو بتایا کہ وہ جس کام  
 سے گیا تھا وہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ کھانے کی تیاری میں لگ گیا۔

نائلہ نے سلطانہ وغیرہ کا تعارف رائے صاحب سے کرا دیا تھا۔ وہ ان سے بھی بڑی شفقت سے پیش آئے تھے۔  
 ”لیکن یہ بتاؤ تم اتنا عرصہ غائب کہاں رہیں؟“ آصف بیگم نے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی داستان ہے۔“ نائلہ نے کمراساں لینے ہوئے کہا اور پھر انہیں شروع سے آخر تک پوری  
 داستان سنانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں جلد ہی آجاتی لیکن کراچی کے حالات کی وجہ سے رکنا پڑا۔ بہت  
 سے دہشت گردوں کے نام پتے ہمیں معلوم تھے۔ کچھ کو ہم نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا اور باقیوں کے نام میں  
 پولیس کو دے آئی ہوں۔ امید ہے کہ وہ لوگ بھی جلد ہی قابو آجائیں گے۔“

آصف بیگم حیرت سے یہ سب کچھ سن رہی تھیں۔

تین بجے کے لگ بھگ انہیں کھانا ملا۔ کھانے کے بعد رائے منصور صاحب نائلہ اور دلاور کو لے کر ایک الگ

کمرے میں آگئے۔  
 ”میرا خیال ہے کہ انسپکٹر کو یہاں بلا کر اس سے ساری بات کہلی جائے۔“ رائے صاحب نے کہا۔  
 ”شیردرانی کے بارے میں اطلاع مل جائے تو کوئی ایسا قدم اٹھائیں گے۔“ ٹائلڈ بولی۔  
 ”لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے خیال کے مطابق اس منزل کا رخ کرنے کی بجائے کسی اور طرف نکل جائے۔“

”اگر وہ کسی اور طرف نکل بھی گیا تو اس کی گاڑی کا نمبر میرے پاس ہے۔ وہ نمبر پولیس کو دے دیا جائے گا پولیس کے لئے اس نمبر کے ذریعے اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ ویسے مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ اسی جگہ جائے گا۔ ہم آج کا دن اور رات انتظار کر لیتے ہیں۔“ ٹائلڈ نے کہا۔  
 ”میں تو سمجھتا ہوں کہ انسپکٹر سے بات کر رکھنی چاہئے۔“ رائے منصور نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیں۔“ ٹائلڈ نے کہا۔ ”ویسے قانونی طور پر یہاں میری اور دلاور کی پوزیشن کیا ہے؟“

”بالکل صاف۔“ رائے منصور نے کہا۔ ”تم دونوں کے خلاف اب کوئی الزام نہیں ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے جو بھی قتل و غارت ہوئی ہے اس میں شیردرانی اور اس کے گرگوں کا ہاتھ ہے۔ عدالت اسے اشتہاری ظرم قرار دے چکی ہے۔“  
 ”سکھر اور کراچی پولیس کو بھی اس کی تلاش ہے۔“ ٹائلڈ نے کہا۔ ”وہ سکھر میں ایک ہندو سیٹھ کی ملازمہ کو قتل کر چکا ہے۔ کراچی میں بھی اس کے خلاف ڈیٹیموں اور قتل کے کئی الزامات ہیں۔ اب اسے کیس بھی پتاہ نہیں ملے گی۔“  
 ”برے کاموں کا انجام تو ایسا ہی ہوتا ہے نا بیٹی۔“ آصف بیگم نے کہا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی کمرے میں آئی تھی۔

”دلاور بیٹے۔ وہ ٹیلی فون مجھے دو۔ میں انسپکٹر سے بات کرتا ہوں۔“ رائے منصور نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 دلاور نے فون اٹھا کر رائے منصور کے سامنے رکھ دیا۔ رائے صاحب نے ریسور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بات کرتے رہے پھر رکھ دیا۔

”وہ آ رہا ہے۔“ انہوں نے ٹائلڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر آگیا۔ ٹائلڈ اور دلاور کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر رائے منصور اصل موضوع پر آگئے۔

”قانونی طور پر ان دونوں کی کیا پوزیشن ہے؟“ رائے صاحب نے پوچھا۔  
 ”شہر کے کسی قحانے میں ان کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں ہے۔“ انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور آپ جانتے ہیں کہ ان دونوں کے خلاف جو کسز عدالت میں تھے وہ جموئے ثابت ہو کر ختم ہو چکے ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا وہ شیردرانی نے کروایا تھا۔ اس کے جرائم کی فرسٹ بہت طویل ہے اور اس فرسٹ میں کئی قتل بھی شامل ہیں۔ سنا ہے ان دونوں وہ کراچی میں کہیں روپوش ہے۔ لیکن کب تک روپوش رہے گا۔ ایک نہ ایک دن تو قانون کی گرفت میں آ ہی جائے گا۔“

”فرض کرو کہ اگر تم شیردرانی کو گرفتار کر لو تو تمہارا کیا فائدہ ہوگا؟“ رائے صاحب نے اس کے چہرے پر نظرسن جھاتے ہوئے کہا۔

”فائدہ۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”اس کی گرفتاری کے چند منٹ بعد ہی مجھے ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی مل سکتی ہے۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کہاں روپوش ہے؟“

”ہاں۔“ رائے صاحب نے اثبات میں سرھلایا۔ ”لیکن ابھی اس کی تصدیق ہونا پاتی ہے۔ میں کل صبح تمہیں فون کروں گا لیکن شرط یہ ہے کہ ابھی تم کسی کے سامنے اس کا نام زبان پر نہیں لاؤ گے۔ اگر ڈی ایس بی بننا چاہتے ہو تو کل تک انتظار کرو۔“

”میری زبان بند رہے گی رائے صاحب۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔  
”ٹھیک ہے۔ میں کل صبح تمہیں فون کروں گا۔“ رائے صاحب نے کہا۔  
کچھ دیر بعد انسپکٹر چلا گیا۔

شام ہو رہی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ سب لوگ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔  
”آصف بیگم۔“ رائے صاحب نے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے بھی، یہ لڑکیاں صبح سے گھر میں قید ہو کر بیٹھی ہیں۔ تم سسی اور سلطانہ کو ذرا شرگھملاؤ اور انہیں کم از کم ایک ایک جوڑا کپڑوں کا تو دلاؤ۔ باقی معاملات ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ آپ نے کہہ دیا۔“ آصف بیگم نے کہا۔  
”با سائیں میں تو نہیں جاسکتی۔ مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔ بیروں میں زخم ہیں۔“ سسی نے رائے صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے معاف کرنا بیٹی۔ تمہارے زخموں کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ آصف بیگم، جاتے ہوئے ڈاکٹر کو بھیج دینا۔ وہ اسے دیکھ لے گا۔“ رائے صاحب نے آخری الفاظ بیگم سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔  
تھوڑی دیر بعد سلطانہ اور عبدالقدوس، آصف بیگم کے ساتھ چلے گئے۔ راستے میں سلطانہ کو موقع مل گیا۔ اس نے نالکہ اور دلاور کے بارے میں بات چیمز دی۔

”میں خود اور رائے صاحب بھی یہ چاہتے ہیں۔ شبیردرانی والا معاملہ ڈرامٹ جائے تو رائے صاحب سے بات کرتی ہوں۔“ سلطانہ بیگم نے جواب دیا۔

”کیا آپ کے خیال میں نالکہ مان جائے گی۔ دلاور کی حیثیت تو آڑے نہیں آئے گی؟“ سلطانہ نے پوچھا۔  
”میرا خیال ہے نالکہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں یہ جوڑی بہت ہی اچھی رہے گی۔ دلاور کے بارے میں تو میں جانتی ہوں کہ وہ نالکہ کو چاہتا ہے مگر کبھی دل کی بات زبان پر نہیں لایا۔“ آصف بیگم نے کہا۔  
وہ تقریباً ”دو تین گھنٹوں تک شرکی دوکانوں پر کھوٹے رہے۔ واپس آئے تو خوب لدے پھندے تھے۔ سلطانہ“ سسی، نالکہ کے علاوہ عبدالقدوس، دلاور اور بکی کے لئے بھی کئی کئی جوڑے لے لئے گئے تھے۔

کھانے کے بعد وہ دیر تک جاگتے رہے۔ نالکہ اپنی جگہ پریشان تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ شبیردرانی کسی اور طرف تو نہیں نکل گیا۔

رات آہستہ آہستہ بتتی رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ نالکہ کی پریشانی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں گزار دی۔ صبح سات بجے کے قریب کال بیل بجی تو وہ اچھل پڑی۔ کھنٹی جب دو سری مرتبہ بجی تو وہ اپنے کمرے سے نکل کر گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔

وہ نالکہ کا ایک مزاحیہ شباب الدین تھا۔ نالکہ دروازہ کھول کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ کل صبح ناشتہ کے بعد نالکہ نے اس کے نام ایک پیغام دے کر خادم حسین کو گل مرگ بھیجا تھا۔

”وہ آگیا ہے جی۔“ شباب الدین نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔  
نالکہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اس کے وسوسے بے بنیاد ثابت ہوئے تھے اور شبیردرانی کے بارے میں اس کا پہلا اندازہ درست نکلا تھا۔

”کب آیا ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟“ نالکہ نے پوچھا۔  
”جی نالکہ بی بی۔“ شباب الدین نے کہا۔ ”آپ کا پیغام ملنے کے بعد میں کل سارا دن اس کے انتظار میں رہا۔“

اور پھر کل شام کا اندھیرا پھیلنے ہی میں اپنے کو ٹھہر چلا گیا تھا۔ میں رات بھر جاگتا رہا فجر کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے ایک موٹر اس کی حویلی کے گیٹ کے سامنے رکی۔ آپ جانتی ہیں جی میرے مکان کی چھت سے حویلی کا گیٹ صاف نظر آتا ہے۔ وہ شبیر درانی ہی ہے جی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

”ٹھیک ہے۔ تم اب شام تک بیٹیں رہو گے۔“ نائلہ نے کہا۔ اسی وقت خادم حسین ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ نائلہ نے اسے چائے کے لئے کہا اور رائے صاحب کے بارے میں پوچھا۔

”وہ کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں جی۔ میں انہیں چائے دے کر آیا ہوں۔“

”انہیں یہاں بھیج دو۔“ نائلہ نے کہا اور خادم حسین باہر چلا گیا۔

چند ہی منٹ بعد رائے صاحب بھی چائے کا کپ اٹھائے ڈرائنگ روم میں آگئے۔

”یہ کون ہے؟“ انہوں نے صوفے پر بیٹھے ہوئے نائلہ سے پوچھا۔

”شاب الدین ہے۔ ابھی ابھی گل مرگ سے آیا ہے۔“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر شبیر درانی کے بارے میں بتانے لگی۔

”گڈ!“ رائے صاحب کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”میرا خیال ہے ناشتے کے بعد انسپکٹر کو اطلاع دے دینی چاہئے۔“

”ناشتے کے بعد نہیں، ابھی۔“ نائلہ نے ٹیلی فون اٹھا کر رائے صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ”ان سے کہئے کہ پولیس پارٹی تیار رکھے۔ میں دلاور کو ساتھ لے کر زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ میں تمہارے پہنچ رہی ہوں۔ ہم دونوں پولیس پارٹی کے ساتھ جائیں گے اور ہاں انسپکٹر کو ابھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔“ نائلہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

”تم دونوں کیوں جاؤ گے بھی۔“ رائے صاحب نے کہا۔

”میں نے سینکڑوں میل اس کا تعاقب کیا ہے۔ اس کی بے بسی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

نائلہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ چند منٹ بعد ہی تیار ہو کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ خادم حسین چائے رکھ کر جا چکا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد دلاور بھی چائے کا کپ لئے ہوئے آیا۔

”میں نے انسپکٹر سے بات کر لی ہے۔“ رائے صاحب نے کہا۔ ”اسے گھر سے بلایا گیا تھا بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمہارے پہنچنے تک چھاپہ مار پارٹی تیار کر چکا ہو گا۔ تم لوگ چائے پی کر نکل جاؤ۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ نائلہ نے کہا اور چائے پینے لگی۔ اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

چائے پی کر وہ دلاور کے ساتھ نکل گئی۔ انہوں نے لینڈ کروز پر جانا پسند کیا تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ پولیس اسٹیشن کے سامنے پولیس کا ایک ٹرک کھڑا تھا اور درجن بھر مسلح پولیس والے ادھر ادھر ٹھہر رہے تھے۔ نائلہ اور دلاور گاڑی سے اتر کر تھانے میں داخل ہو گئے۔ انسپکٹر اس کا منہر بیٹھا تھا۔

”جی، بتائیے نائلہ بی بی، چھاپہ کہاں مارتا ہے۔“ انسپکٹر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

نائلہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور اسے بتانے لگی کہ چھاپہ کہاں مارتا ہے۔

”آپ کو یقین ہے کہ وہ اس وقت حویلی میں موجود ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”وہ صبح چار بجے حویلی میں داخل ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت حویلی ہی میں موجود ہو گا۔“ نائلہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اللہ کا نام لے کر کارروائی شروع کر دیتے ہیں۔“ انسپکٹر اٹھ گیا۔

دس منٹ بعد پولیس پارٹی گل مرگ کی طرف روانہ ہو گئی۔ آگے انسپکٹر کی جیپ تھی اس میں تین چار دیگر پولیس اہلکار تھے۔ پیچھے ٹرک تھا اور آخر میں نائلہ کی گاڑی جسے دلاور چلا رہا تھا۔



ساڑھے نو بجے تھے۔ پولیس والوں نے شیردرانی کی حویلی کو گھرے میں لے لیا تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ سب کچھ دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گئے تھے۔ انسپکٹر نے میگا فون پر وارننگ دی کہ شیردرانی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے۔ وہ تین منٹ تک یہ وارننگ دہراتا رہا اور پھر اچانک ہی اندر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ پولیس نے بھی چاروں طرف سے فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس والے حویلی کے آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔

نالکہ اور دلاور حویلی کے گیٹ سے تقریباً سو گز دور سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے لینڈ کوزر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فضا فائرنگ سے گونج رہی تھی۔ حویلی سے فائرنگ کا مطلب تھا کہ شیردرانی وہاں موجود تھا اور پوری طرح مزاحمت کر رہا تھا۔

پندرہ منٹ تک فائرنگ ہوتی رہی۔ چند پولیس والے دیواروں پر چڑھ کر حویلی میں کود گئے۔ چند منٹ اور فائرنگ ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ نالکہ اور دلاور اپنی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ آدمے گھنٹے بعد پولیس والے حویلی کے گیٹ سے نکلے۔ دو پولیس والوں نے شیردرانی کو دائیں بائیں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ اسے جیب میں بٹھا دیا گیا۔ دو پولیس والے اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور انسپکٹر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دوسرے پولیس والے بھی ٹرک پر سوار ہو رہے تھے۔

جیب حرکت میں آئی اور لینڈ کوزر کے پاس آکر رک گئی۔ شیردرانی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے لینڈ کوزر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”قانون سے تعاون کا بہت شکریہ نالکہ بی بی۔ آپ لوگ جاپیے۔ میں بعد میں کسی وقت آکر آپ سے ملوں گا۔“ انسپکٹر نے نالکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نالکہ کا نام سن کر شیردرانی نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر لینڈ کوزر میں نالکہ اور دلاور کو بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اسی وقت جیب حرکت میں آگئی۔

ٹرک گزر جانے کے بعد دلاور نے بھی لینڈ کوزر اشارت کر کے پوٹرن لیتے ہوئے اسے موڑ دیا۔ نالکہ درانی کے چہرے پر بہت طمانیت اور بے حد سکون تھا۔ دلاور نے اس کی طرف دیکھا تو نالکہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی چلی گئی اور پھر بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسٹیرنگ پر دلاور کا ہاتھ کانپ گیا۔ نالکہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

\*\*\*\*\*

دوپہرے پہلے پہلے اخبارات نے جیسے چھاپ دیئے۔

”خونی بھیڑیا پکڑ لیا گیا“

ہر اخبار نے اپنے طور پر سنسنی خیز شہ سرخی لگائی تھی۔ شیردرانی کے علاوہ نالکہ درانی کے بارے میں بھی کئی سرخیاں تھیں اور تصویریں بھی تھیں۔

اخبارات نے اس کیس میں رائے منصور کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی اور لکھا تھا کہ اگر رائے منصور جیسے انسان دوست اور اصول پرست آدمی نالکہ درانی کی حمایت میں اور اس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے سامنے نہ آتے تو نالکہ درانی اور اس کے ساتھ دلاور بھی بے گناہ وہ بے قصور ہونے کے باوجود دیا تو مارے جاتے یا اس وقت جموئے مقامات میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہوتے۔

رائے منصور کے ہاں ٹیلی فون کالز کا اتنا بندا ہوا تھا۔ نالکہ درانی کے جاننے والے اور ہمدرد اسے مبارک باد دینے کے لئے جوق در جوق رائے صاحب کے بنگلے پر چلے آ رہے تھے۔

وہ پورا دن اسی ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ رات کو بھی دیر تک لوگ آتے رہے۔ رائے صاحب نے ایک ہفتہ بعد جمعہ کے روز شکرانہ ادا کرنے کا اعلان کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاندار جشن کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ شہر کے بے شمار معززین اور جاننے والوں کو جمعہ کی شب کھانے پر مدعو کر لیا گیا تھا اور دوسرے ہی دن سے اس جشن کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ جنگلے کے قریب واقع کھیل کے میدان کی صفائی وغیرہ شروع ہو گئی تھی۔ بدھ کو صبح سلطانہ اور عبدالقدوس لینڈ کروزر پر کہیں نکلے اور پھر واپس نہیں آئے۔ سب لوگ پریشان تھے کہ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ سسی تو ان کے اس طرح غائب ہو جانے پر بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس نے بار بار ناکلہ سے دریافت کیا تھا اور ناکلہ ہر بار کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ رائے صاحب کے جنگلے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ سلطانہ اور عبدالقدوس کو غائب ہوئے تیسرا دن تھا۔ سب کو حیرت تھی کہ وہ دونوں کہاں غائب ہو گئے تھے۔ سسی نے ایک بار پھر تشویش کا اظہار کیا تو ناکلہ نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”ارے بھئی! تم ان دونوں کا رویہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ میرا خیال ہے چپکے سے بھاگ گئے ہوں گے۔“

”ہم میدان چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں ہیں۔“

عبدالقدوس کی آواز سن کر سب ہی مرکز دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ آصف بیگم اور رائے صاحب بھی اس وقت ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ سسی بھی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں پیراں اس طرح قائلین پر رکھے ہوئے تھے کہ تلوے زمین کو نہیں چھو رہے تھے۔ اس نے بھی دروازے کی طرف دیکھا۔ عبدالقدوس کے ساتھ سلطانہ بھی تھی۔

”میں جانتی تھی ادی سلطانہ ہمیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ کہاں چلی گئی تھیں تم ادی۔“ سسی نے کہا۔

”ذرا تمہارے گوٹھ تک گئے تھے۔“ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی۔

سسی کی ماں اور باپ کمرے میں داخل ہوئے تو سسی پر گویا ایک لمحہ کو سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور پھر اٹھ کر بیروں کے زخموں کی پرواہ کئے بغیر دوڑتی ہوئی والمانہ انداز میں ماں سے لپٹ گئی۔ پھر باپ نے اسے گلے سے لگالیا۔ سسی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”ارے بھئی!“ بوڑھے باپ نے اس کی پیشانی پر ہوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”تم سمجھتی تھیں کہ ہم تمہیں بھول جائیں گے۔“

عجب رقت آمیز منظر تھا۔ اس ملاپ پر سب کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ناکلہ اٹھ کر سسی کے قریب آگئی اور اس کا کندھا تھمتھانے لگی۔

”اس خوشی میں تمہارے ماں باپ شامل کیوں نہ ہوتے۔ اس لئے میں نے انہیں بھی بلوایا۔“ ناکلہ نے کہا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا ادی۔“ سسی نے ہیکلی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

آصف بیگم اور رائے صاحب نے بھی اٹھ کر سسی کے ماں باپ کا استقبال کیا تھا۔ وہ بچارے یہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔

”آپ اپنی امانت سنبھالئے۔“ ناکلہ نے سسی کا ہاتھ اس کی ماں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”یہ جس حالت میں میرے ساتھ گوٹھ سے اٹھائی گئی تھی آج بھی اسی طرح پاک صاف ہے۔ میں اس کی پاک دامنی کی قسم کھا سکتی ہوں۔“

”بھئی! ہم تمہارا شکریہ کیسے ادا کریں۔“ سسی کی ماں نے کہا۔

”شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ناکلہ نے کہا۔ ”میری چھوٹی بہن ہے اور اس کی حفاظت کرنا میرا فرض تھا۔“

دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

رات کو رائے صاحب کا بنگلہ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ لمبھقہ میدان میں شامیانے لگے ہوئے تھے۔ تیز روشنیوں والے ہزاروں بلب روشن تھے۔ ایک حصے میں کھانے کی لائق اد میزیں لگی ہوئی تھیں۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ٹائلڈ اور رائے منصور اپنی بیگم کے ساتھ آرائشی گیٹ پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔

دس بجے کے لگ بھگ تقریباً ”سب ہی مہمان آپکے تھے۔ کھانا کھانے میں چند منٹ باقی تھے۔ رائے منصور صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اوپنی آواز میں مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”خواتین و حضرات! آپ لوگ جانتے ہیں کہ آج کی یہ دعوت کس سلسلے میں ہے۔ میں اس خوشی کے موقع پر ایک اور اعلان کرنا چاہتا ہوں جسے سن کر آپ لوگ بہت خوش ہوں گے۔“

”ایک منٹ اٹکل۔“ عبدالقدوس اٹھ کر رائے صاحب کے قریب آگیا۔ ”اس قسم کے اعلان عام طور پر بزرگ ہی کیا کرتے ہیں لیکن آج یہ اعلان ایک خورد کو کرنے دیں۔“

”تمہیں کیا معلوم کہ میں کیا کھانا چاہتا ہوں؟“ رائے صاحب نے اسے گھورا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ عبدالقدوس نے کہا اور رائے صاحب کی طرف جھکتے ہوئے ان کے کان میں سرگوشی کی۔

رائے صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”خواتین و حضرات! روایت کے برعکس آج خوشی کا یہ اہم اعلان ایک خورد کر رہا ہے اور اس میں میری اجازت اور رضامندی شامل ہے۔“

عبدالقدوس نے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب ہی ٹائلڈ اور دلاور موجود تھے۔ عبدالقدوس نے ان دونوں کا ایک ایک ہاتھ پکڑا اور رینگنے کے ریفزی کی طرح ان دونوں کے ہاتھ بیک وقت اوپر اٹھاتے ہوئے حلق بھاڑ کر چنچا۔

”والہ ورنہ۔ آج یہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہو رہے ہیں۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں نا۔۔۔ مگنی۔۔۔!!!“

پورا پنڈال تالیوں اور مبارک باد کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

رائے صاحب نے جب سے اور آصف بیگم نے پرس میں سے بیک وقت انگوٹھیاں نکال لیں۔ رائے صاحب، ٹائلڈ کی طرف آئے تو آصف بیگم نے انہیں ٹوک دیا۔

”آپ بھول رہے ہیں رائے صاحب۔“ آصف بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ٹائلڈ میری بیٹی ہے اور آپ کا بیٹا وہ کھڑا ہے۔“ اس نے دلاور کی طرف اشارہ کیا۔

رائے صاحب، بیگم کو گھورتے ہوئے دلاور کی طرف مڑ گئے۔

ٹائلڈ اور دلاور عجیب کیفیت میں جھلا تھے۔ انہوں نے کن انہیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پہلے دلاور نے ٹائلڈ کو اور پھر ٹائلڈ نے دلاور کو انگوٹھی پٹنادی۔ پنڈال ایک بار پھر مبارک باد کی صداؤں سے گونج اٹھا۔

عبدالقدوس وہاں سے ہٹنے لگا تو رائے صاحب نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

”جانتے کہاں ہو؟ اب تمہاری باری ہے!“ رائے صاحب بولے۔

اور پھر سلطانہ اور عبدالقدوس کو بھی جگمگاتی ہوئی انگوٹھیاں پٹنادی گئیں۔

”خواتین و حضرات!“ رائے صاحب مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ”اگلے جمعہ کے مبارک دن کو ان کی شادی کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے اور۔۔۔“

”نہیں۔۔۔!!!“ ایک نسوانی چیخ سن کر وہ سب چونک گئے۔ حسین بیگم مہمانوں کو دھکیلتی ہوئی آگے آگئی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ غیظ و غضب تھا۔ اس نے اچانک ہی اپنے لباس میں چھپا ہوا پتول نکال لیا۔ ”یہ حرامزادی میرے بیٹے کی نہیں ہو سکی تو کسی اور کی بھی نہیں ہو سکتی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

حسین بیگم نے پتول والا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ عبدالقدوس ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر جاگرا۔ وہ دونوں پہلے

گرے تھے۔ عبدالقدوس نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور بڑی بھرتی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔  
 ”نانکھ کا بھائی ابھی زندہ ہے۔ میری زندگی میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ عبدالقدوس نے کہا اور  
 پستول رائے صاحب کے حوالے کر دیا۔

حسینہ بیگم بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے کی شدت اور غیظ و غضب نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا تھا۔ آنکھیں سرخ  
 ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک قہر آلود نظروں سے عبدالقدوس کی طرف دیکھتی رہی پھر چیختے ہوئے اس سے لپٹ گئی  
 اور خوار پلکی کی طرح اسے نوچنے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگاری تھی۔  
 مہمانوں میں پولیس آفیسر بھی تھے۔ دو تین نے آگے بڑھ کر حسینہ بیگم کو گرفت میں لے لیا۔ وہ اپنے آپ کو  
 چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پیچ رہی تھی۔

”چھوڑو۔ چھوڑو مجھے۔۔۔ وہ میرا بیٹا آ رہا ہے۔ دیکھو دیکھو۔ اس کے سر پر سہرا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔۔۔ میرا  
 بیٹا۔۔۔ اسے بھیڑیوں نے پکڑ لیا ہے۔ وہ اسے کھا رہے ہیں۔۔۔“

حسینہ بیگم اول فول پکتی رہی، کبھی وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگتی۔ لوگوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پاگل  
 ہو گئی تھی۔ چند آدمی اسے بڑی مشکل سے گرفت میں لے کر پنڈال سے باہر چلے گئے۔  
 فضا کچھ دیر تک مکدر رہی اور پھر بتدریج ماحول خوشگوار ہوتا چلا گیا۔ کھانا کھل گیا اور پھر ناشائستہ کے ساتھ  
 مہمانوں کے قہقہے بھی فضا میں گونجنے لگے۔

عبدالقدوس اور دلاور دوڑ دوڑ کر مہمانوں کے پاس جا رہے تھے۔ ویٹروں کو ہدایات دے رہے تھے۔ وہ دونوں  
 کھوتے ہوئے بیک وقت اس میز پر پہنچ گئے جہاں نانکھ، سلطانہ اور سسی بھی موجود تھیں۔ سسی بیروں کی تکلیف  
 سے وجہ سے بڑی مشکل سے کھڑی ہوئی تھی۔  
 دلاور اور عبدالقدوس نے وہاں سے ہٹنا چاہا تو آٹھ دس لڑکیوں نے انہیں گھیر لیا۔

آصفہ بیگم اور رائے منصور صاحب بھی مہمانوں سے پوچھتے ہوئے میزوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔ وہ بھی  
 اتفاق سے اسی میز پر پہنچ گئے جہاں لڑکیوں نے نانکھ، سلطانہ، دلاور اور عبدالقدوس کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔  
 رائے صاحب نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے آصفہ بیگم کی طرف دیکھا اور پھر آصفہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر انہیں  
 کہنے لگے: ”زہرا لڑکیوں کے حصار میں گھس گئے۔ تمام لڑکیاں چند لمحوں کو خاموش ہو گئیں اور پھر فضا نفرتی  
 لہروں سے گونجنے لگی۔ ان قہقہوں میں رائے منصور اور آصفہ بیگم کی آوازیں بھی شامل تھیں۔“

(ختم شد)

—•—•—•—

حرم کے مول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز  
 آفیشل ڈسٹریبیوٹر  
 0301-7253258  
 0334-9633541 عظیم اسلام آباد  
 نزد محنت گھر کالمیہ